تفسیر موضوعی

جلد ششم

زیر نظر

آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی

اہل قلم کی ایک جماعت

مولانا قیصر عباس

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311

نام کتاب ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تفسیر موضوعی: پیامِ قرآن
جلد ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ششم
مؤلف ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔آیۃ اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی
مترجم ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔مولانا قیصر عباس
فنی معاون ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔قلب علی سیال
کمپوزنگ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فضل عباس سیال (الحمد گرافکس لاہور)
سال اشاعت ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔جون 2012ء
ناشر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور
ہدیہ مکمل سیٹ (جلد اوّل تا دہم) ۔۔۔۔۔۔3000 روپے

اس کتاب کی اشاعت کیلئے مدینۃ العلم فاؤنڈیشن کراچی نے بطور قرضِ حسنہ تعاون فرمایا ہے ہماری دعا ہے کہ خداوند عالم ان کی توفیقاتِ خیر میں اضافہ فرمائے اور ان کے مرحومین کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔ ادارہ۔

ملنے کا پتہ

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اُردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311

www.misbahulqurantrust.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرضِ ناشر

قارئین کرام!۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ! مصباح القرآن ٹرسٹ۔۔۔۔۔عرصہ دراز سے دورِحاضر کی بعض عظیم ترین تفاسیر وتالیفات کی نشر واشاعت کے سلسلہ میں ایک عظیم اور پُروقار مرکز کی حیثیت سے اُمت مسلمہ کیلئے اپنی عاجزانہ خدمات انجام دے رہا ہے۔

دورِحاضر میں جب تفسیر قرآن کی بات ہوتو ذہن میں انہی کتب کا تصور آتا ہے جو عموماً صدرِاوّل سے لے کر آج تک لکھی جارہی ہیں کہ جن میں سورتوں اور آیتوں کی ترتیب کے مطابق نوبت بہ نوبت ان کی تفسیر کی جاتی ہے۔مگر تفسیر قرآن کا یہی ایک طریقہ نہیں ہے بلکہ اس کتابِ الٰہی کی تفسیر کے پانچ طریقے ہیں۔۱۔تفسیرِ مفرداتی ۲۔تفسیر ترتیبی ۳۔تفسیرِ موضوعی ۴۔تفسیر ارتباطی ۵۔تفسیرِ کلی۔

تفسیر کے پہلے دو طریقے عام طور پر متعارف ہیں۔بلاشبہ تفسیر قرآن کا قدیمی طریقہ یہ رہا ہے کہ بالترتیب ایک کے بعد دوسری سورۃ کی تفسیر کرتے ہوئے پورے قرآن کی تفسیر مکمل کی جاتی ہے۔لیکن آیت اللہ جعفر سبحانی اور آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی نے تفسیر کی ایک نئی روش اپنائی ہے کہ جس میں کسی اصل وفرع یا مضمون وعنوان سے تعلق رکھنے والی آیاتِ قرآنی کو ایک مقام پر لاکر ان کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔چونکہ اس میں ہرعنوان اور موضوع کی جملہ آیات اور ان کی تفسیر یکجا کردی گئی ہے،لہٰذا اس کو تفسیر موضوعی کا نام دیا گیا ہے۔

ادارہ ہذا کے ذریعے تفسیرِ موضوعی کا 12 جلدوں پر مشتمل پہلا سلسلہ (قرآن کا دائمی منشور) منظر عام پر آچکا ہے۔تفسیر موضوعی کا زیرِ نظر سلسلہ (پیام قرآن) جو کہ آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی کی سعی جمیل کا نتیجہ ہے،اس کی دس جلدیں (جلد اوّل تا جلد دہم) قارئین کی خدمت میں پیش کی جارہی ہیں۔

زیرِنظر کتاب ''تفسیر موضوعی۔پیامِ قرآن جلد ششم'' کا اردو ترجمہ مولانا قیصر عباس نے کیا ہے۔جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔اس کتاب کی اشاعت میں مدینۃ العلم فاؤنڈیشن کراچی نے بطور قرضِ حسنہ تعاون فرمایا ہے۔

ہمیں اُمید ہے کہ صاحبانِ علم وتحقیق حسبِ سابق ''مصباح القرآن ٹرسٹ'' کی اس کوشش کو بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے اور اس گوہرِ نایاب سے بھرپور علمی وعملی استفادہ فرمائیں گے۔اور ادارہ کو اپنی قیمتی تجاویز وآراء سے ضرور مستفید فرمائیں گے۔

مزید برآں مصباح القرآن ٹرسٹ کی ویب سائٹ تیاری کے آخری مراحل میں ہے۔جون 2012ء تک آپ ہماری تمام کتب ہماری ویب سائٹ www.misbahulqurantrust.com کے ذریعے گھر بیٹھے پڑھ سکتے ہیں۔۔۔۔والسلام

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

فہرست

تفسیر موضوعی: پیامِ قرآن جلد نمبر 6

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
۱۔ایمان۔۔۔۔عمل صالح	149	۴۔قالین اور تخت:	179
۲۔تقویٰ	150	۵۔جنتی کھانے	183
۳۔احسان اور بھلائی:	152	۶۔پاکیزہ شراب	186
۴۔جہاد اور شہادت	153	۷۔بہشت کی سب سے اعلیٰ شراب	190
۵۔نفسانی خواہشات سے دستبرداری	155	۸۔برتن اور جام	192
۶۔ایمان میں سبقت	156	۹۔لباس اور سنگھار	195
۷۔ہجرت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔جہاد:	158	بہشتی سنگھار	197
۸۔مصیبتوں میں صبر وتحمل:	159	۱۰۔بہشتی ازواج	198
۹۔جادہ مستقیم پر ایمان اور بقاء	160	۱۱۔غلام اور ساقی	203
۱۰۔خدا اور رسولؐ کی اطاعت	162	۱۲۔استقبال کرنے والے	206
۱۱۔اخلاص:	163	۱۳۔ابتدائی خدمت	207
۱۲۔صدق وسچائی	164	۱۴۔ناقابل تصور نعمات	209
۱۳۔خودسازی اور تزکیہ نفس:	166	(۳)روحانی لذتیں	212
۱۴۔انفاق اور استغفار	166	۱۔خصوصی احترام	212
۱۵۔خوف خدا	168	۲۔پرسکون ماحول	215
۱۶۔تولیٰ۔۔۔۔تبریٰ	169	۳۔امن وامان۔۔۔۔۔۔۔۔خوف کا زائل ہونا	217
۱۷۔نماز کو اہمیت دینا	170	۴۔ہمدرد اور باوفا دوست	218
نتیجہ	171	۵۔محبت بھرا سلوک	221
(۲) جنت کی جسمانی نعمات	172	۶۔بے انتہا خوشی	223
۱۔جنت کے باغات	173	۷۔خدا کی رضایت کا احساس	224
۲۔بہشت کے سائے	175	۸۔خدا کا انہیں دیکھنا اور اُن کا خدا کو دیکھنا:	227
۳۔بہشت کے محلات	177		

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اہداء

ان لوگوں کے نام جو قرآن مجید سے عشق کی حد تک محبت کرتے ہیں۔

ان لوگوں کے نام جو اس چشمہ زُلال سے زیادہ آب حیات نوش کرنا چاہتے ہیں۔

ان لوگوں کے نام جو قرآن مجید کو زیادہ سے زیادہ جاننا اور سمجھنا چاہتے ہیں۔

۱۔ حجۃ الاسلام آقائے محمد رضا آشتیانی

۲۔ حجۃ الاسلام آقائے محمد جعفر آملی

۳۔ حجۃ الاسلام آقائے عبدالرسول حسنی

۴۔ حجۃ الاسلام آقائے محمد اسدی

۵۔ حجۃ الاسلام آقائے حسین طوسی

۶۔ حجۃ الاسلام آقائے محمد محمدی

کے تعاون اور ہمکاری کے ساتھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

تفسیر موضوعی اور اُس کے موضوعات

تفسیر موضوعی کیا ہے اور کن مسائل کو حل کرتی ہے ان دو اہم سوالوں کا جواب اس کتاب اور اسی طرح کی دوسری کتابوں کے صحیح اور بہتر طور پر سمجھنے میں بہت معاون ثابت ہوگا، جب تک ان دو سوالوں کا جواب واضح نہ ہوجائے اس وقت تک یہ سمجھنا بہت مشکل ہے کہ اس طرح کی کتب کن مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے لکھی گئی ہیں۔

پہلے سوال کے جواب کے سلسلے میں ہم اس بات کی یاد دہانی کرواتے ہیں کہ قرآن مجید ۲۳ سال کے عرصے میں مختلف معاشرتی حالات، مختلف واقعات اور معاشرے کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے بتدریج نازل ہوا اور اسلامی معاشرے کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا رہا۔

مکہ میں نازل ہونے والی سورتوں کی آیات کا بنیادی محور توحید اور معاد پر ایمان کی بنیادوں کو مضبوط کرنا و شرک و بُت پرستی کے ساتھ مسلسل و بے امان مقابلہ و مبارزہ ہے جب کہ مدینہ میں نازل ہونے والی سورتیں چونکہ اسلامی حکومت کی تشکیل کے بعد نازل ہوئی ہیں، لہذا طبعی طور پر اُن کی آیات کا مطمع نظر یہ تھا کہ اسلام کے اجتماعی، عبادتی اور سیاسی احکام کے ساتھ بیت المال کی تشکیل، اسلام کا عدالتی اور قضائی نظام، صلح اور جنگ سے متعلق مسائل، منافقین اور اسی طرح کی دوسری جماعتوں کے ساتھ تعلقات کی نوعیت جن سے اسلام نبرد آزما تھا، کے بارے میں احکام و مسائل بیان کئے جائیں۔

ظاہر ہے کہ یہ مسائل کسی فقہی مسائل کی کتاب یا درسی اور کلاسیکی کتاب کی صورت میں بیان نہیں ہوئے تھے بلکہ مختلف مناسبتوں، ضرورتوں اور احتیاجات کو مدنظر رکھتے ہوئے آیات نازل ہوتی ہیں، مثلا ہم دیکھتے ہیں کہ جہاد، جنگی قوانین، پیمان صلح، قیدیوں، تاوان جنگ اور اسی طرح کے دوسرے مسائل سے مربوط احکام ہر جنگ میں، اس جنگ کی مناسبت سے، جدا جدا نازل ہوئے ہیں بالکل ایک ماہر حکیم کے نسخوں کی طرح کہ جو ہر روز بیمار کی حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے نسخہ تحریر کرتا ہے تاکہ اسے صحت یابی کی منزل تک پہنچا دے۔

اگر ہم قرآن کی آیات کی تفسیر ان سورتوں کے لحاظ سے ترتیب وار کریں جن میں وہ نازل ہوئی ہیں تو اس کا نام ''تفسیر ترتیبی'' ہوگا، اسی طرح اگر ایک موضوع سے متعلق آیات کو پورے قرآن سے جمع کرنے کے بعد ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر اور ان کی باب بندی کرنے کے بعد تفسیر کریں تو اس کا نا ''تفسیر موضوعی'' ہوگا۔

مثلاً اگر ہم جہاد سے متعلق تمام آیات کو جو دس سال کے عرصے میں مدنی سورتوں میں نازل ہوئی ہیں یا اسمائے خدا اور صفات خدا سے متعلق ۲۳ سال کے عرصے میں پورے قرآن میں نازل ہونے والی آیات کو جمع کر کے ایک دوسری کے ساتھ ملائیں اور ایک دوسری کے ساتھ ان کے تعلق اور رابطے کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کی تفسیر کی جائے تو یہ ''تفسیر موضوعی'' کہلائے گی جب کہ ہر آیت کو اس کی جگہ پر الگ سے مورد بحث قرار دینے کا نام ''تفسیر ترتیبی'' ہے۔

تفسیر کی ان دونوں قسموں میں سے ہر ایک کی چند خصوصیات جو ہمیں ایک کو چھوڑ کر دوسری کو سمجھنے سے بے نیاز نہیں کرتی بلکہ ''ہر چیز اپنی جگہ پر خوب ہے'' کے مصداق کے طور پر قرآن شناسی کے سلسلے میں کام کرنے والوں کے لئے ان دونوں قسموں سے کام لینا ضروری ہے (البتہ کام کے پہلے مرحلے میں تفسیر ترتیبی ہے اور دوسرے مرحلے میں تفسیر موضوعی)۔

تفسیر ترتیبی کی خصوصیات:

اس میں ہر آیت کا اس کے نزول کے زمان اور مکان کے ساتھ اور اس کے ماقبل و مابعد کی آیات کے ساتھ ارتباط ملحوظ رکھا جاتا ہے، نیز اس میں ہر آیت کے خارجی اور داخلی قرائن کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کا مقام واضح کیا جاتا ہے، ان تمام امور کے بغیر آیت کے دقیق اور وسیع معنی کو سمجھنا امکان پذیر نہیں ہوتا۔

دوسرے لفظوں میں تفسیر ترتیبی ہر آیت کو اس کے مقام اور محل پر دیکھتی ہے اور اسلامی معاشرے کی زندگی، ترقی اور تکامل کے ساتھ اس کے رابطے کو مدنظر رکھتی ہے یہ تعلق کئی مسائل کو حل کرتا ہے۔

تفسیر موضوعی میں آیات اپنی جزئی اور انفرادی حیثیت سے نکل کر ایک عمومی اور کلی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور اپنی مخصوص جگہ سے کسی حد تک بالا ہو جاتی ہیں۔

تفسیر موضوعی کی خصوصیات:

''تفسیر موضوعی'' مندرجہ ذیل مسائل کو واضح کرتی ہے:

۱۔ ایک موضوع کے مختلف اور ان متفرق پہلوؤں کو جو مختلف آیات میں بیان ہوئے ہوتے ہیں، ایک جگہ جمع کر دیتی ہے اور موضوعات کو ان کی مختلف جہات اور جامع صورت میں مدنظر رکھتی ہے، لہذا طبعی طور پر نئے حقائق کا انکشاف ہوتا ہے۔

۲۔ بادی النظر میں بعض قرآنی آیات میں جو ابہام محسوس ہوتا ہے وہ اس بنیادی قانون ''القرآن یفسر بعضہ بعضا'' آیات قرآن ایک دوسرے کی تفسیر کرتی ہیں'' کو مدنظر رکھتے ہوئے دور ہو جاتا ہے۔

۳۔ اسلامی تصور کائنات اور مجموعی طور پر ہر مسئلے اور موضوع سے متعلق اسلام کے نکتہ نظر کو واضح کرتی ہے۔

۴۔ قرآن میں مخفی بہت سے رازوں سے فقط تفسیر موضوعی کے طریقے سے پردہ اٹھایا جا سکتا ہے اور آیات کی گہرائیوں اور گیرائیوں تک،

جہاں تک کہ انسانی بساط کی پرواز ہے، رسائی حاصل کی جاسکتی ہے۔

لہذا کوئی بھی باریک بین مسلمان تفسیر کی ان دومختلف قسموں سے بے نیاز نہیں۔

بہت پہلے سے، یہاں تک کہ آئمہ معصومین علیہم السلام کے زمانے میں بھی تفسیر موضوعی کی طرف توجہ دی جاتی رہی اور مسلمان مفکرین نے اس سلسلے میں کئی کتابیں تحریر کیں جن میں سے بہترین نمونہ ''آیات الاحکام'' سے متعلق کتب ہیں،لیکن اس امر کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ تفسیر موضوعی اپنی شیان شان ترقی و تکمیل سے محروم رہی اور ابھی تک اپنے ابتدائی مراحل طے کر رہی ہے،مفکرین اور علماء کی شبابہ روز کاوشوں کے ذریعے اسے اپنے مقام تک پہنچانے کی ضرورت ہے۔

زیرنظر کتاب ''پیام قرآن'' میں بالکل نئے طریقے سے کام لیتے ہوئے قرآن کی تفسیر موضوعی کے سلسلے میں قدم اٹھایا گیا ہے، بحمداللہ لوگوں کی بہت بڑی تعداد نے اس کی حوصلہ افزائی کی ہے اور یہ سلسلہ روز بروز آگے بڑھ رہا ہے لیکن پھر بھی یہ اس راستے پر پہلا قدم ہے منزل تک پہنچنے کے لئے علمائے اسلام اور مفسرین کی علمی اور فکری راہنمائی اور تعاون کی اور زیادہ ضرورت ہے، ہم ہمیشہ سے اہل نظر وفکر کی تعمیری اور مثبت رائے کے منتظر رہے ہیں اور ہیں۔

ہم خداوند تعالیٰ سے اس سے زیادہ توفیق اور ہدایت کے طالب ہیں۔

ناصر مکارم شیرازی

حوزہ علمیہ۔قم

قیامت کی منزلیں

''قیامت'' کا موضوع بہت وسعت رکھتا ہے کیونکہ یہ ایک بہت وسیع دنیا کے سلسلے میں گفتگو کرتا ہے چونکہ وہ ایک پر اسرار دنیا ہے اور ہماری دنیا سے بہت مختلف ہے، لہٰذا اس سلسلے میں ہونے والی گفتگو بھی فطر تا کسی حد تک پیچیدہ اور پر اسرار ہوگی۔

لیکن دو وجہوں سے یہ گفتگو بہت ''جاذب'' اور ''پرکشش'' ہے۔

ایک تو اس لئے کہ یہ نیا موضوع ہونے کی وجہ سے ہر انسان کے احسان تجسس کو ابھارتی ہے اور دوسرے یہ کہ قیامت کے موضوع کے متعلق بحث، بالخصوص اس کی جزئیات کے بارے میں گفتگو انسان کی روح کی تہذیب اور تزکیہ کے لئے بہت بڑے نفسیاتی اور تربیتی اثر کی حامل ہے، بلکہ طبعی طور پر یہ انسان کی پوری زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ قرآن میں اس موضوع پر کی جانے والی گفتگو اپنے دامن میں اتنے ظریف، جاذب توجہ اور قابل سماعت نکات کی حامل ہے جو کسی اور موضوع کے سلسلے میں موجود نہیں ہیں۔

پہلے تو ہمارا خیال تھا کہ ''قیامت بزبان قرآن'' جیسے موضوع سے متعلق تمام بحثوں کو ایک مجموعے اور ایک جلد کی صورت میں قارئین کے سامنے پیش کریں، اسی وجہ سے جہاں تک ممکن ہوسکا ہم نے مباحث میں اختصار سے کام لیا (البتہ اس بات کو ملحوظ خاطر رکھا کہ ان مسائل کو پیش کرنے کے سلسلے میں کسی طرح کی خامی نہ رہے) لیکن جب ہم نے قرآنی آیات کے بیکراں سمندر میں اپنی فکر کی تنگی داماں کے ساتھ غوطہ زن ہونے کی کوشش تو ہمارے ہاتھ ایسے ایسے قیمتی موتی لگے جن کا ایک مجموعے میں جمع کرنا امکان پذیر نہ تھا، چونکہ اس صورت میں وہ کتاب ایک ہزار صفحات سے کم نہ ہوتی، لہٰذا اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ تھا کہ ہم اپنی پہلی رائے میں تجدید نظر کرتے اور اس مجموعے کو دو جلدوں میں شائع کرتے۔

حسن اتفاق سے پہلی اور دوسری جلد کی ابحاث ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں، گذشتہ جلد میں گفتگو کا محور معاد سے مربوط کلیات اور اساسی نکات تھے، جب کہ اس جلد میں معاد کی جزئیات اور خصوصیات کو قرآنی نکتہ نظر سے زیر بحث لایا گیا ہے۔

دوسرے لفظوں میں اگر ہم معاد کے موضوع کو ایک بلند اور باعظمت عمارت سے تشبیہ دیں تو گزشتہ جلد میں اس عمارت کی بنیادوں کی تعمیر کی گئی اور اس جلد میں اس عمارت کی ژرف نگاری اور تزئین و آرائش کا کام کیا گیا ہے، اسی وجہ سے اس کا نام ''منازل آخرت'' یا ''قیامت کی منزلیں'' رکھنا بالکل مناسب ہے۔

اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ معاد کی بحث عمومی طور پر اور اس کی جزئیات سے متعلق گفتگو خصوصی طور پر بہت سے سوالات کو ذہن میں ابھارتی ہے، جہاں تک ہماری طاقت میں تھا ہم نے یہ کوشش کی ہے کہ ان تمام سوالوں کے جوابات خود قرآن یا روایات اور علمی و منطقی دلائل کے ساتھ دیئے جائیں، ان اہمیت کے حامل مشکل مفاہیم کو ذہن کے قریب کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے، نیز ہماری یہ بھی سعی

رہی ہے کہ ان مطالب کی وضاحت کے لئے واضح اور روزمرہ مثالوں سے بھی کام لیں، تفسیر اور عقائد سے مربوط مباحث کے سلسلے میں جو ہمارے تجربات تھے انہیں بھی پیش نظر رکھا گیا ہے، امید ہے کہ اس کوشش کے ذریعہ اس راستہ میں توفیق ہمارے شامل حال رہی ہوگی، البتہ فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔

یقینی طور پر یہ کتاب آئندہ آنے والے لوگوں کے لئے راہ ہموار کرے گی کیونکہ کوئی شخص بھی یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اس سلسلے میں اس نے حرف آخر کہہ دیا ہے اور کہنے کے لئے کوئی اور بات باقی نہیں رہی۔

خداوند عالم ہمیں علم، عمل، تحریر، گفتگو اور ہر طرح کے باقی امور میں ہر قسم کی لغزش سے اپنے لطف و کرم کے ساتھ، محفوظ رکھے اور ہمیں اپنی رحمت اور لطف کے سائے میں اس منزل سے اصلی منزل یعنی اپنی رحمتوں کی جلوہ گاہ ''جنات عدن''، ''جنتہ الخلد'' تک صحیح و سالم پہنچائے کہ ان سنگلاخ راہوں سے عبور اس کی عنایت والطاف کے بغیر کسی کے لئے ممکن نہیں۔

ناصر مکارم شیرازی

قم۔حوزہ علمیہ

شعبان۔۱۴۱۱

اسفند ۱۳۶۹ ھ ش

اَشۡرَاطُ السَّاعَةِ

قیامت کی نشانیاں

اشارہ:

حقیقت میں پہلی منزل قیامت کی علامتوں سے شروع ہوتی ہے یہ حقیقت قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید میں قیامت کے نزدیک ہونے کی علامتوں کو بہت سی آیات میں بیان کیا گیا ہے، یہ علامات ''اشراط الساعۃ'' کے نام سے مشہور ہیں، جیسا کہ آگے بیان ہوگا، یہ نام بھی قرآن مجید سے ہی لیا گیا ہے، ''اشراط'' جمع ہے، اس کا واحد ''شرط'' (بروزن ہدف) ہے، اس کے معنی ''نشانی'' ہیں اور ''ساعت'' یہاں پر قیامت کے معنی میں ہیں۔

یہ نشانیاں وہ اہم واقعات اور خوف ناک حادثات ہیں جو قیامت سے پہلے وقوع پذیر ہوں گے، ہر ایک نشانی دنیا کے خاتمہ کا اعلان ہوگی، یا قیام قیامت کے آغاز کی علامت، قابل توجہ بات یہ ہے کہ یہ واقعات ایک طرح کے نہیں ہوں گے، بلکہ ایک دوسرے سے مختلف ہوں گے ایک طائرانہ نظر سے انہیں تین اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ وہ اہم حوادث جو اس جہان کے اختتام سے پہلے وقوع پذیر ہوں گے۔

۲۔ وہ ہولناک واقعات جو اس جہان کے خاتمے کے ساتھ ہی رونما ہوں گے۔

۳۔ وہ لرزا دینے والے حادثات جو قیامت کے آغاز اور نئی زندگی کی طرف لوٹنے کے ساتھ منصۂ شہود پر آئیں گے، ان میں سے ہر کیفیت قابل غور ہے۔

مندرجہ بالا مختصر گفتگو کے ساتھ ہم دوبارہ قرآن کی طرف پلٹتے ہیں، پہلے ہم قسم اول کے واقعات کے متعلق گفتگو کرتے ہیں اور ان سے متعلق آیات پر غور وفکر کرتے ہیں:

۱۔ فَهَلۡ یَنۡظُرُوۡنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنۡ تَاۡتِیَهُمۡ بَغۡتَةً ۚ فَقَدۡ جَآءَ اَشۡرَاطُهَا ۚ

(محمد: ۱۸)

۲۔ اِقۡتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانۡشَقَّ الۡقَمَرُ ﴿القمر: ۱﴾

۳۔ فَارۡتَقِبۡ یَوۡمَ تَاۡتِی السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِیۡنٍ ۱۰ ﴿الدخان: ۱۰﴾

ترجمہ:

۱۔ پس کیا وہ انتظار نہیں کرتے مگر قیامت کا کہ وہ ان کے پاس اچانک آجائے (تب وہ ایمان لائیں گے) جب کہ اس کی نشانیاں آ گئی ہیں۔

۲۔ قیامت کی گھڑی قریب آ گئی اور چاند شق ہو گیا۔

۳۔ تو اس دن کا منتظر رہ جب آسمان پر ایک ظاہر دھواں چھا جائے گا۔

تفسیر اور جمع بندی آیات

قیامت کی نشانیاں واضح ہو گئیں!

موردِ بحث آیات میں پہلی آیہ مبارکہ میں ''اشراط الساعۃ'' کے موضوع کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، لیکن اس کے مصداق کو بیان نہیں کیا گیا، ارشاد ہوتا ہے ''کیا وہ (کافر اور مذاق اڑانے والے افراد) اس کے علاوہ کسی اور چیز کا انتظار کر رہے ہیں کہ ناگہاں قیامت آجائے اور اس وقت وہ ایمان لائیں، جب کہ اس کی علامتیں تو واضح ہو گئی ہیں (فهل ینظرون الا الساعة ان تاتیهم بغتة فقد جآء اشراطها) لیکن جب قیامت آ گئی تو اس وقت ان کا ایمان لانا فائدہ مند نہیں ہوگا، (فانی لهم اذا جاء تهم ذکرهم)۔

جس طرح پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے ''اشراط'' جمع ہے ''شرط'' کی جس کے معنی علامت اور نشانی ہیں، لہٰذ ''اشراط الساعۃ'' کے معنی قیامت کی نشانیاں ہوگا، لیکن ان نشانیوں کے وقوع پذیر ہونے سے کیا مراد ہے جس کی طرف مندرجہ بالا آیت نے اشارہ کیا ہے؟ اس سلسلے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

اکثر مفسرین کا نظریہ ہے کہ یہاں پر ''اشراط'' سے مراد نبی اکرمؐ کی بعثت وقیام اور آخری آسمانی کتاب یعنی قرآن مجید کا نزول ہے، اس بات پر گواہی کے طور پر ہم نبی اکرمؐ کی ایک مشہور حدیث پیش کرتے ہیں۔

آپؐ نے فرمایا:

بعثت انا والساعة کھا تین، وضم السبابة والواسطی۔

''میری بعثت اور قیامت ان دو کے مانند ہیں'' اپنی دو مبارک انگلیوں کی طرف اشارہ کیا اور ''شہادت'' کی انگلی کو

بڑی انگلی کے ساتھ ملایا۔[1]

بعض مفسرین نے ''شق القمر'' والے واقعے کو بھی ''اشراط الساعۃ'' میں قرار دیا ہے، یہ تمام باتیں اس صورت میں ہیں کہ ان سے مراد قیامت کے نزدیک ہونے کی علامتیں ہوں نہ کہ اس کے امکان کی علامتیں، جب کہ بعض مفسرین نے دوسرے معنیٰ کو اختیار کیا ہے، انہوں نے کہا ہے کہ مٹی سے انسان کو پیدا کرنا اور زمین وآسمان کی تخلیق، یہ سب کچھ مُردوں کو دوبارہ زندہ کرنے پر خدا کی قدرت کی علامتیں ہیں، اس صورت میں معاد کے امکان پر جو دلائل بھی لائے جائیں وہ قیامت کی علامتوں اور ''اشراط الساعۃ'' میں شمار ہوں گے (غور کیجئے گا)۔

لیکن پہلے معنیٰ زیادہ صحیح معلوم ہوتے ہیں کیونکہ روایات میں ایسے امور کو قیامت کے نزدیک ہونے کی علامتوں اور ''اشراط الساعۃ'' کے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے، جیسے یہ حدیث جو پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے، آپؐ نے فرمایا:

من اشراط الساعة ان يرفع العلم، ويظهر الجهل، ويشرب الخمر و يفشوالزنا۔

''قیامت کی علامتوں میں بساطِ علم کا اُٹھ جانا، جہالت کا عام ہوجانا، شراب نوشی اور زنا کا عام ہوجانا ہے''۔[2]

نیز بعض روایات میں حضرت مہدی (ارواحنا فداہ) کے ظلم وفساد کے خلاف قیام اور معرکے کو بھی ''اشراط الساعۃ'' میں سے شمار کیا گیا ہے۔

قیامت نزدیک آگئی:

دوسری آیت میں قیامت کے نزدیک ہونے اور چاند کے شق ہوجانے کے متعلق گفتگو ہے، ارشاد ہوتا ہے۔ ''قیامت نزدیک آگئی اور چاند شق ہوگیا''۔(اقتربت الساعة وانشق القمر)

یہ ایک ایسا واقعہ تھا جو ایک طرف تو خدائے بزرگ وبرتر کے ہر چیز (ضمناً مردوں کے زندہ کرنے) پر قادر ہونے کی دلیل تھا، دوسری طرف خدا کے آخری سفیر پیغمبر اکرمؐ کے دعویٰ کی تصدیق کرتا تھا، اور قیامت کے نزدیک ہونے کی حکایت بھی کرتا تھا، کیونکہ جیسے گزشتہ آیت کی تفصیل میں یہ بات گزر چکی ہے کہ خود آنحضرتؐ نے فرمایا:

''میری بعثت قیامت کے نزیک ہونے کی علامتوں میں سے ہے۔''

لیکن بعض دوسرے مفسرین، جن میں کئی گذشتہ اور کئی موجودہ مفسرین شامل ہیں، کا نظریہ یہ ہے کہ یہ آیت ان حوادث اور واقعات کی

---

[1] اس حدیث کو بہت سے شیعہ اور اہل سنت مفسرین نے تھوڑے فرق کے ساتھ نقل کیا ہے جیسے مجمع البیان، تفسیر قرطبی، فی ظلال القرآن، روح البیان اور دیگر تفاسیر (آیہ زیر بحث کے ذیل ہیں)۔

[2] تفسیر نور الثقلین، ج ۵۔ حدیث ۱۴، ص ۳۷

طرف اشارہ ہے جو اس جہان کے اختتام اور قیامت کے آغاز پر ظہور پذیر ہوں گے، انہی میں سے سورج کا تاریک ہوجانا اور چاند کا ٹکڑے ٹکڑے ہوجانا ہے، رہی بات آیت کی تعبیر ''انشق'' کی جو فعل ماضی کی صورت میں ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ لغت عرب میں بہت سے ایسے مسائل جن کا آئندہ واقع ہونا قطع اور یقینی ہے، انہیں ماضی کی شکل میں ذکر کیا جاتا ہے۔

لیکن چند مفسرین نے اس تفسیر کو قبول کیا ہے کہ یہ آیت اُن واقعات کی طرف اشارہ ہے جو دنیا کے اختتام پر ظہور پذیر ہوں گے، کیونکہ ہر صورت میں آیت کا ظاہر ماضی اور گذشتہ واقعات کے ساتھ مربوط ہے اور اس بات پر کوئی دلیل نہیں کہ ہم کسی واضح قرینہ کے بغیر اس کے معنی مستقبل اور آئندہ کے کریں، دوسری طرف بہت سی روایات جو کہ ''فی ظلال القرآن'' کے بقول تواتر کی حد تک پہنچ چکی ہیں۔ اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ ''شق القمر'' والا معجزہ پیغمبر اسلامؐ کے زمانے میں رونما ہوا۔[۱]

''المیزان'' میں مرحوم علامہ طباطبائی کے مطابق علمائے حدیث اور علمائے تفسیر دونوں نے متفقہ طور پر اس معنی کو قبول کیا ہے کہ ''شق القمر'' کا واقعہ پیغمبر اکرمؐ کے دور میں وقوع پذیر ہوا، صرف چند ایک غیر معروف مفسرین نے اس بات سے انکار کیا ہے۔[۲]

ابوالفتوح رازی بھی کہتے ہیں:

''جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ مندرجہ بالا آیت آئندہ وقوع پذیر ہونے والے واقعات کی طرف اشارہ ہے، اُن کی یہ بات علماء کے اجماع اور اتفاق کے خلاف ہے''۔ [۳]

''شق القمر'' کیسے ہوا؟ اس معجزہ نبویؐ کی تفصیل، اس سے متعلق روایات اور جدید علوم کی نظر میں اس کے امکان سے متعلق بہت سی ابحاث ہیں، چونکہ یہ ہمارے موضوع بحث ''اشراط الساعۃ'' کی تشریح سے خارج ہیں، لہٰذا انہیں یہاں بیان نہیں کیا گیا۔

قارئین اس سلسلے میں تفسیر نمونہ جلد ۲۳ صفحہ ۱۲ سے ۱۹ تک رجوع کر سکتے ہیں۔

جس دن غلیظ دھواں آسمان کو ڈھانپ لے گا۔

تیسری آیت میں قیامت کے نزدیک ہونے کی علامتوں میں سے ایک اور علامت کو بیان کیا گیا ہے، یہ وہ دن ہوگا جب تاریک دھواں پورے آسمان کو ڈھانپ لے گا، یہ ایک عذاب کی صورت میں آئے گا، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

''اُس دن کے منتظر رہو جب آسمان پر تاریک دُھواں ظاہر ہوگا جو تمام لوگوں کو ڈھانپ لے گا، یہ دردناک عذاب ہے''۔

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ يَّغْشَى النَّاسَ هٰذَا عَذَابٌ

---

[۱] فی ظلال القرآن۔ ج ۷ صفحہ ۶۴۴

[۲] تفسیر المیزان۔ ج ۱۹۔ ص ۶۱۔ ۶۰

[۳] تفسیر ابوالفتوح رازی۔ ج ۱۰ صفحہ ۳۶۴

اَلِیۡمٌ

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین کے درمیان بہت بحث ہوئی ہے، البتہ تین قول قابل توجہ ہیں:

بعض مفسرین اس کو روز قیامت کے عذاب کی طرف اشارہ جانتے ہیں، جب ایک وحشت ناک اور چنگاریاں اڑانے والا دھواں مجرموں کے سروں پر آجائے گا، لیکن یہ احتمال بہت بعید معلوم ہوتا ہے کیونکہ آیت کے ذیل میں ہے:

''کافر اس دن عذاب الٰہی کے ختم ہونے کی استدعا کریں گے اور ایمان کا اظہار کریں گے، اُن سے خطاب کیا جائے گا کہ ہم تھوڑے سے عذاب کو کم کر دیتے ہیں لیکن تم پھر بھی اپنے کام (کفر) کی طرف پلٹ جاؤ گے۔''

اِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيْلًا اِنَّكُمْ عَآئِدُوْنَ ١٥ ﴿الدخان: ١٥﴾

یہ معنی قیامت میں متصور نہیں ہیں، بالخصوص اس لئے کہ بعد کی آیت میں مستقل طور پر قیامت اور اس میں دیئے جانے والے بدلہ کے متعلق گفتگو کی گئی ہے جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس سے پہلے جو کچھ ذکر ہوا ہے وہ قیامت سے متعلق نہیں ہے۔

يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى ۚ اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ ١٦ ﴿الدخان: ١٦﴾

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ آیت اس قحط، خشک سالی اور اسی طرح کے دیگر امور کی طرف اشارہ کرتی ہے جن میں رسول اکرمؐ کے زمانے کے کفار گرفتار ہوئے تھے، وہ پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں آئے اور اس عذاب الٰہی کے خاتمہ کی درخواست کی، آنحضرت نے دعا کی اور یہ عذاب ختم ہو گیا، لیکن وہ پھر بھی ایمان نہ لائے۔

اس تفسیر کے مطابق ''دخان'' (دھواں) یہاں پر ایک مجازی معنی میں استعمال ہوا ہے کیونکہ ''دخان'' کا کلمہ عربی قواعد میں ایک ہمہ گیر عذاب اور بلا کے لئے استعارے کے طور پر استعمال ہوتا ہے جیسا کہ فخر رازی نے ذکر کیا ہے۔[۱]

یا یہ اس اعتبار سے ہے کہ خشک سالی کے دوران بہت زیادہ گرد و غبار آسمان پر چھا جاتا ہے، اس لئے یہاں پر اسے ''دخان'' سے تعبیر کیا گیا، کیونکہ بارش گرد و غبار کے ختم کرنے میں ایک موثر حیثیت کی حامل ہے۔[۲]

اس لئے قحط والے سال کو ''سنته الغبرا'' (گرد و غبار سے بھرا ہوا سال) یا ''عام الرماد'' (راکھ والا سال) کہا جاتا ہے۔

اس تفسیر پر جو اعتراض وارد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ہر حال میں لفظ ''دخان'' اپنے حقیقی اور اصلی معنی یعنی دھوئیں میں استعمال نہیں ہوا اور کسی قرینے کے بغیر اس کے مجازی معنی مراد لئے گئے ہیں۔

اس سلسلے میں تیسری تفسیر یہ ہے کہ آیت مبارکہ قیامت کے نزدیک ہونے کی ایک نشانی بیان کر رہی ہے کہ آسمان کو دھواں

---

[۱] تفسیر کبیر۔ ج ۲۷۔ صفحہ ۲۴۲

[۲] روح المعانی۔ ج ۲۵ ص ۱۰۷۔ اور روح البیان۔ ج ۸، ص ۴۰۶

ڈھانپ لے گا اور لوگ خدا کے دامن لطف کی طرف ہاتھ بڑھائیں گے، خدا اپنے لطف وکرم سے اس عذاب کو تھوڑا سا کم کر دے گا لیکن منکر پھر بھی ایمان نہیں لائیں گے۔

یہ تفسیر آیت کے ظاہر کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہے اور بہت سے روایت کے بھی مطابق ہے جو شیعہ اور اہل سنت کی تفاسیر کے منابع میں ذکر ہوئی ہیں۔

رسول خداؐ سے ایک حدیث میں مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

چار چیزیں قیامت کے نزدیک ہونے کی علامتوں میں سے ہیں:

۱۔ دجال کا ظاہر ہونا۔

۲۔ عیسیٰؑ کا (زمین) پر اترنا۔

۳۔ سرزمین عدن کی گہرائیوں سے ایک آگ کا نکلنا۔

۴۔ دھواں۔

ایک صحابی عرض کرتے ہیں: دھواں کیا ہے؟

پیغمبر اکرمؐ نے مندرجہ بالا آیت کی تلاوت فرمائی:

فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَاءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ ۱۰ ﴿الدخان:۱۰﴾

پھر فرمایا:

"یملا ما بین المشرق والمغرب یمکث اربعین یوما ولیلة اما المومن فیصیب منه کھیئة الزکمة واما الکافر بمنزلة السکون یخرج من منخریه واذنیه ودبره"۔

ایسا دھواں ہے کہ جو مشرق سے لے کر مغرب تک پھیل جائے گا، چالیس دن رات تک باقی رہے گا، مومن کو زکام کی سی کیفیت محسوس ہوگی اور کافر دیوانے شخص کی طرح ہوگا، دھواں اس کی ناک، کانوں اور پیچھے سے نکلے گا۔[1]

یہی معنی تھوڑے سے فرق کے ساتھ شیعہ ماخذ میں بھی آئے ہیں جہاں امیر المومنین حضرت علیؑ نے رسول خداؐ سے نقل کیا ہے کہ قیامت سے پہلے دس چیزیں یقینی طور پر ظہور پذیر ہوں گی اور میں حضرت مہدیؑ کا ظہور، حضرت عیسیٰؑ کا زمین پر اترنا اور دھوئیں کا ظاہر ہونا ہیں۔

کچھ اور روایات بھی اس سلسلے میں وارد ہوئی ہیں جو اس تفسیر کی تائید کرتی ہیں، لہٰذا وہی تیسری تفسیر بہترین ہے۔

---

[1] تفسیر در المنثور ج۶ ص۲۹

پہلے حصے میں ان اہم ترین ''اشراط الساعۃ'' کا بیان تھا جن کی طرف قرآن مجید میں اشارہ ہوا ہے۔

علامتیں جو اختتام دُنیا پر ظاہر ہوں گی

قرآن کی دوسری آیات سے استفادہ ہوتا ہے کہ اس جہان کے خاتمہ پر کائنات اور زمین و آسمان میں ایک عظیم انقلاب رونما ہوگا، دوسرے لفظوں میں اس جہان کی موت ایک تدریجی موت نہیں، بلکہ ایک ناگہاں اور اچانک موت ہے، جولرزا دینے والے حوادث کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہوگی۔

یہ حوادث جو قیامت کی علامتوں کا حصہ ہیں مندرجہ ذیل ہیں:

ا۔ پہاڑوں کی نابودی

یہ بات قرآن کی متعدد آیات میں بیان کی گئی ہے اور اس کے لئے مختلف مراحل ذکر کئے گئے ہیں، ان کا سات مراحل میں خلاصہ کیا جا سکتا ہے۔

ا۔ اول پہاڑ لرزنے لگ جائیں گے:

يَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ (مزمل۔ ۱۴)

۲۔ دوسرے مرحلے میں وہ اپنی جگہ سے اکھڑ جائیں گے:

وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ ﴿الحاقۃ: ۱۴﴾

۳۔ تیسرے مرحلے میں وہ چلنا شروع کردیں گے:

وَّتَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا ۱۰ؕ ﴿الطور: ۱۰﴾

۴۔ چوتھے مرحلے میں وہ آپس میں ٹکرانا شروع کردیں گے:

''فدکتا دکۃ واحدۃ'' (حاقہ۔ ۱۴) ''زمین اور پہاڑ ریزہ ریزہ کردیے جائیں گے''

چوتھے مرحلے میں یہ سنگریزوں کی چھوٹی چھوٹی ڈھیریوں میں تبدیل ہوجائیں گے:

وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيْبًا مَّهِيْلًا ۱۴ ﴿المزمل: ۱۴﴾

۵۔ پانچویں مرحلے میں گرد وغبار کی صورت میں اُڑ جائیں گے:

وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا فَكَانَتْ هَبَاءً مُّنْۢبَثًّا ﴿الواقعۃ: ۵۔۶﴾

٦۔ چھٹے مرحلے میں وہ دھنکی ہوئی روئی کی طرح ہو جائیں گے جو تیز ہوا کے ساتھ محو سفر ہوتی ہے اور آسمان میں فقط اس کا رنگ دیکھا جا سکتا ہے۔

وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ۝ ﴿القارعة: ٥﴾

٧۔ آخرکار ساتویں مرحلے میں فقط اُن کا ایک سایہ سا رہ جائے گا جیسے ایک لق ودق خشک صحرا میں سراب دکھلائی دیتا ہے:

وَّسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا۝٢٠ ﴿النبا: ٢٠﴾

اس ترتیب میں پہاڑ بالکل ختم ہو جائیں گے، اُن کا نشان تک باقی نہیں رہے گا اور زمین بالکل صاف اور ہموار ہو جائے گی:

فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا۝١٠٦ ﴿طه: ١٠٦﴾ [1]

یہ عجیب اور ہولناک حوادث جو پہاڑوں پر ٹوٹ پڑیں گے، کیا یہ ان کے اندرونی دھماکوں، ان کے ایٹمی نظام کی تباہی اور ان میں موجود مخفی قوتوں کے نکلنے کی وجہ سے ہوں گے یا باہر سے ان پر کوئی کاری ضرب لگے گی، جیسے آسمانی سیاروں کا تیزی کے ساتھ آپس میں ٹکرانا جو ایک دوسرے کی طرف کشش کی شدید قوت کے باعث ہوسکتا ہے یا اس کے کوئی اور عوامل ہوں گے، جو آج ہمارے لئے نامعلوم ہیں؟

کوئی شخص ان سوالات کا یقینی اور صحیح جواب نہیں دے سکتا، موجودہ علوم بھی اس سلسلے میں کوئی وضاحت پیش کرنے سے عاجز ہیں، وہ فقط یہ کہتے ہیں کہ آسمانی کروں پر اس سے پہلے بہت بڑے دھماکے ہوئے ہیں اور اب بھی ہو رہے ہیں۔

یہاں تک کہ وہ ان عوامل کی تفسیر کرنے سے عاجز ہیں، ہمیں صرف اتنا ہی معلوم ہے کہ قرآن کی گواہی کے مطابق یہ واقعات دنیا کے خاتمہ پر وقوع پذیر ہوں گے، اگرچہ ان کے اسباب کے بارے میں ہمیں کچھ معلوم نہیں۔

٢۔ دریاؤں کا پھٹنا

اس جہان کے خاتمے اور قیامت کے نزدیک ہونے کی ایک اور علامت دریاؤں کا پھٹ جانا ہے، چنانچہ اس سلسلے میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ﴿الإنفطار: ٣﴾

اور جب دریا پھوٹ پڑیں گے۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

---

[1] ''قاع'' ایسی زمین کے معنی میں ہے جو بالکل صاف اور ہموار ہو اور ''صفصف'' ایسی زمین کے معنی میں ہے جو کسی قسم کے سبزے سے خالی ہو، یا صاف اور ہموار زمین کے معنی میں ہے، اس صورت میں دونوں کے ایک ہی معنی ہوں گے اور یہ تاکید کے لئے ہوگا۔

وَإِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ﴿التکویر:٦﴾

اور جب دریا چڑھ آئیں گے۔

سورہ طور کی آیت ٦ میں متعدد اور مسلسل قسموں کے ضمن میں ارشاد ہوتا ہے:

وَالْبَحْرِ الْمَسْجُورِ ﴿الطور:٦﴾

چڑھے ہوئے دریا کی قسم۔

پہلی اور دوسری آیات یقیناً ''اشراط الساعة'' کی طرف اشارہ کر رہی ہیں چونکہ بعد والی آیات واضح طور پر اس بات پر گواہی دے رہے ہیں، تیسری آیت کے سلسلے میں بھی یہ تفسیر کی گئی ہے کہ یہ بھی قیامت کی نشانیوں سے متعلق ہے۔

ان آیات میں ایک جگہ ''فجرت'' کی تعبیر لائی گئی ہے جو ''فجر'' سے ماخوذ ہے جس کے معنی پھاڑنا ہیں، ممکن ہے یہ دریاؤں کے پھٹنے اور طغیانی کی طرف اشارہ ہو۔

یہ بات آج کل ہمارے لئے بالکل واضح ہے کیونکہ پانی دو عنصروں سے مل کر بنا ہے، یعنی ''آکسیجن'' اور ''ہائیڈروجن''، اور یہ دو عناصر جلنے کی شدید خاصیت رکھتے ہیں، اگر کچھ عوامل پانی کے عناصر کا تجزیہ کر دیں تو سب سمندر پھڑکتی ہوئی آگ کی بڑی بڑی بھٹیوں میں تبدیل ہو جائیں گے اور ایک چھوٹی سے چنگاری ہی آگ کا ایک محشر برپا کر دینے کے لئے کافی ہوگی۔

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ قیامت کے آنے پر شدید زلزلوں کی وجہ سے زمین پھٹ جائے گی، جس کی وجہ سے دریاؤں کا رخ ایک دوسرے کی طرف پھر جائے گا، جس کے نتیجہ میں وہ آپس میں مل جائیں گے اور زمین کے تمام چھوٹے بڑے دریا ایک ہو جائیں گے، اس آیہ کی تفسیر یہ بھی ہے۔

اس سلسلے میں تیسری تفسیر بھی موجود ہے، وہ یہ کہ پہاڑوں کے نابود ہو جانے کی وجہ سے اُن کا گرد و غبار دریاؤں میں جا پڑے گا، جس کی وجہ سے دریا بھر جائیں گے اور پانی پوری خشکی پر پھیل جائے گا۔

یہی تینوں تفسیریں لفظ ''سجرت'' کے سلسلے میں بھی کی گئی ہیں اور یہ ''تسجیر'' کے مادہ سے ہے، ''تسجیر'' حقیقت میں آگ بھر جانے کے معنی میں آتا ہے اور کبھی بھڑکانے کے معنی میں بھی آتا ہے اسی وجہ سے آگ کے بھرے ہوئے تنور کو ''مسجر'' کہتے ہیں۔

دریاؤں کے شعلہ ور ہونے کی وجہ یا تو یہ ہے کہ ان کے جلنے والے مادے یعنی آکسیجن اور ہائیڈروجن کا تجزیہ ہو جائے گا یا بعض اور ایسے عوامل کی بناء پر ایسا ہوگا جو ہماری نظروں سے مخفی ہیں، دریاؤں کے پر ہونے کی وجہ یا تو یہ ہوگی کہ پہاڑوں کے تباہ ہو جانے کی وجہ سے ان کا ملبہ دریاؤں میں گر جائے گا یا آسمان سے بڑے بڑے پتھر آپ میں گر جائیں گے یا کوئی دوسرے نامعلوم عوامل ہوں گے۔

۳۔تباہ کن زلزوں کا آنا

دنیا کے خاتمہ اور قیامت کی نزدیکی کی ایک اور علامت ایسے بے سابقہ اور عظیم زلزلوں کا وقوع پذیر ہونا ہے جو ہمارے پورے کرہ ارض کو ہلا کر رکھ دیں گے، تمام چیزوں کو درہم برہم کر دیں گے اور انسانوں کو منٹوں میں دفن کر کے رکھ دیں گے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ ۱ ﴿الحج: ۱﴾

اے لوگو! اپنے پرودگار سے ڈرو اور تقویٰ اختیار کرو، بےشک قیامت کا زلزلہ ایک عظیم چیز ہے۔

پھر ارشاد ہوتا ہے:

يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ ۲

۲ الحج:۲

جس دن تم اسے دیکھو گے (تو اس طرح گھبرا جاؤ گے) کہ دودھ پلانے والی مائیں اپنے دودھ پینے والے بچوں سے غافل ہو جائیں گی، ہر حاملہ عورت اپنے حمل کو زمین پر گرا دے گی اور تم لوگوں کو مدہوش دیکھو گے، حالانکہ وہ مدہوش نہیں ہوں گے، لیکن اللہ تعالیٰ کا عذاب بہت ہی سخت ہے۔

البتہ جیسے کہ ''اشراط الساعۃ'' کے تیسرے حصے میں ذکر کیا جائے گا، مُردوں کے زندہ ہونے سے پہلے بھی ایک زلزلہ وقوع پذیر ہوگا، قرآن کی بعض دوسری آیات میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اس امر کا بھی احتمال ہے کہ یہ آیت بھی اسی زلزلے سے مربوط ہو اور اس امر پر دلیل ممکن ہے ''عذاب اللہ شدید'' کا جملہ ہو، لیکن اس صورت میں حاملہ عورتوں اور دودھ پیتے بچوں کو مجاز پر محمول کرنا پڑے گا، یعنی اس زلزلے سے پیدا ہونے والا خوف اتنا شدید ہوگا کہ حاملہ عوت کا حمل ساقط ہو جائے گا لیکن یہ تفسیر ظاہر آیت کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے۔

بہر حال سورہ مزمل آیت نمبر ۱۴ میں بھی یہ مطلب آیا ہے:

يَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ [1]

جس دن زمین اور پہاڑ لرزیں گے۔

اسی طرح سورہ واقعہ آیت نمبر ۴ میں بھی ہے:

[1] ''ترجف'' ''رجف'' کے مادہ (بروزن کشف) سے ہے، یہ اضطراب اور شدید طور پر کپکپاہٹ کے معنی میں آتا ہے، چونکہ فساد پھیلانے والی خبریں معاشرے پر کپکپاہٹ اور اضطراب کی کیفیت طاری کر دیتی ہیں، اس لئے انہیں ''اراجیف'' کہا جاتا ہے)

اِذَا رُجَّتِ الۡاَرۡضُ رَجًّا وَّبُسَّتِ الۡجِبَالُ بَسًّا ﴿الواقعة: ۵﴾

جب زمین بہت لرزنے لگے گی اور پہاڑ ریزہ ریزہ کردیئے جائیں گے۔

۴۔ سورج، چاند اور ستاروں کا بے نور ہو جانا

قیامت کی نزدیکی کی ایک اور علامت سورج کا بجھ جانا اور ستاروں کا تاریک ہو جانا ہے، چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

اِذَا الشَّمۡسُ كُوِّرَتۡ وَاِذَا النُّجُوۡمُ انۡكَدَرَتۡ ۲ ﴿التکویر: ۲﴾

جس وقت سورج (کے نور کے صحیفے) کو لپیٹ دیا جائے گا اور ستارے تاریک ہو جائیں گے۔

''کورت'' کا ماخذ ''تکویر'' ہے جس کے لغوی معنی کسی چیز کا باندھنا اور اکٹھا کرنا، ہیں جیسے عمامے کو سر پر باندھنا، یہ کلمہ تاریک ہونے اور بجھ جانے کے معنی میں بھی آتا ہے، ظاہراً سورج کے سلسلے میں یہ دونوں معانی لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں، اس لحاظ سے کہ خورشید تدریجاً کم ہوتا، سکڑتا جارہا ہے اور پھر تاریکی وسیاہی کی جانب محوِ سفر ہے۔

''انکدرت'' کا ماخذ ''انکدار'' ہے، جس کے معنی تیرگی، تاریکی یا سقوط اور منتشر ہو جانا ہیں، ظاہراً یہ دونوں معانی ستاروں کے سلسلے میں لازم وملزوم ہیں۔

قرآن کی گواہی کے مطابق اس جہان کے خاتمہ پر ہمارے شمسی نظام کا روشن ترین منبع جو تمام سیاروں کو روشن کرتا ہے، بجھ جائے گا اور ختم ہو جائے گا، ستارے بھی اسی انجام کار سے دوچار ہوں گے۔

فخر الدین رازی اپنی ایک عبارت میں کہتے ہیں کہ بعض لوگ ''کورت'' کا اصل ''کور'' سمجھتے ہیں جس کے معنی نابینا اور اندھا ہیں، یہ بھی سورج کے بجھ جانے کے معنی میں ہی ہیں۔ [۱]

آج کے سائنس دانوں کا خیال ہے کہ خورشید کی توانائی جو فضا میں منتشر ہوتی ہے وہ ایٹم کے مرکزی حصے کے جلنے سے حاصل ہوتی ہے جس کا ایندھن ہائیڈروجن گیس اور راکھ ہیلیم گیس (HELIUM GAS) ہوتی ہے۔ [۲]

اس بناء پر ہر روز اس کرہ کے وزن میں تین لاکھ پچاس ہزار ملین ٹن کی کمی واقع ہو رہی ہے، یہ چیز اس بات کا باعث بنے گی کہ سورج آہستہ آہستہ چھوٹا اور کم نور ہو جائے گا، یہ وہی سورج کا اکٹھا ہونا اور اس کی روشنی کا کم ہونا ہے، یعنی یہ ایسے دو مفہوم ہیں جو اربابِ لغت کے مطابق ''تکویر'' کے مادہ میں پائے جاتے ہیں، اگرچہ موجودہ شرائط اور اس کرہ کی بڑائی کے پیش نظر اس میں سے اتنی مقدار کا کم ہونا اس پر فوری طور پر کسی قسم کا اثر نہیں رکھتا۔

---

[۱] تفسیر کبیر، جلد ۳۱ ص ۶۶

[۲] زندگی ومرگ ستارگان۔ ص ۹۲

البتہ سورج کے گھٹنے کی رفتار اگر اسی حد تک رہے تو ممکن ہے کہ اس بات کے وقوع پذیر ہونے کے لئے کئی ملین یا کئی ارب سال لگ جائیں، لیکن کوئی بھی نظام شمسی پر وقوع پذیر ہونے والے آئندہ حالات سے واقف نہیں، اس لئے ممکن ہے کہ آئندہ ایسے حالات پیش آئیں جن کی وجہ سے سورج کی اس ٹکیہ کے حجم اور نور کے کم ہونے کی رفتار تیز تر ہو جائے اور تھوڑی ہی مدت میں یہ نور اور حرارت کا عظیم اور بھڑکتا ہوا منبع بالکل خاموش ہو جائے۔

باقی آسمانی کروں کے سلسلے میں بھی یہی معنی صادق آتے ہیں۔

ستاروں کا موجودہ مظام بھی درہم برہم ہو جائے گا، اس کا مطلب یہ ہے کہ ان ستاروں کے اجسام اور ان کی رفتار کے درماین جو قوت کشش اور قوت دافعہ کا توازن وتعادل موجود ہے وہ ختم ہو جائے گا اور شاید یہ وہی بات ہے جس کی طرف قرآن نے ایک اور جگہ پر اشارہ فرمایا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ۲ ﴿الإنفطار: ۲﴾

جب ستارے منتشر ہو جائیں گے۔

البتہ اس آیت کی تفسیر خدا کے فضل سے آئندہ آئے گی۔

سورہ قیامت میں ارشادہ ہوتا ہے:

فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ وَخَسَفَ الْقَمَرُ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ اَيْنَ الْمَفَرُّ ﴿القیامة﴾

پس جب آنکھیں خوف کی وجہ سے حرکت کرنے لگیں گی، چاند کو گہن لگ جائے گا اور سورج و چاند کو اکٹھا کر دیا جائے گا تو انسان کہے گا آج کے دن بھاگنے کی جگہ کہاں ہے۔

ان آیات سے اس مطلب کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ تمام واقعات اچانک وقوع پذیر ہوں گے نہ کہ آہستہ آہستہ، ورنہ اس زمانے میں تو کسی انسان کا وجود باقی نہیں رہے گا کہ جو ایسی بات کرے۔(غور کیجئے گا)

سورج اور چاند کی بساط کا لپیٹا جانا ممکن ہے اُن کے درمیان کشش اور دفع کی قوت کے توازن کے ختم ہو جانے کی وجہ سے ہو، جس کی بناء پر چاند اپنے اصلی مرکز یعنی سورج میں جذب ہو جائے گا۔

ہم گفتگو کے اس سلسلے کو قرآن کریم کی ایک اور آیت کی طرف اشارے کے ساتھ ختم کرتے ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے:

فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ ۸ ﴿المرسلات: ۸﴾

جب ستارے بے نور اور تاریک ہو جائیں گے۔

یہ تعبیر بھی مندرجہ بالا آیات کے ساتھ ہم آہنگ اور اُن کے لوازم سے ہے۔

دوبارہ اس بات کی یاد دہانی کراتے چلیں کہ یہ حوادث اور مسائل اب بھی جہان ہستی میں جاری و ساری ہیں، لیکن تدریجی شکل میں، دنیا کے خاتمہ پر ان کی رفتار بڑھ جائے گی، تند و تلخ حوادث کے ایک سلسلے کے ساتھ ہی یہ نظام کائنات ختم ہو جائے گا، اس دنیا کی عمر تمام ہو جائے گی اور خدا کے حکم سے یہ نظام ختم ہو جائے گا۔

۵۔ آسمانی کروں کا پھٹ جانا

دنیا کے خاتمہ کی ایک اور علامت ستاروں کے نظام کا درہم برہم ہونا اور آسمانی کروں کا پھٹ جانا ہے، اس کی طرف قرآن مجید کی متعدد آیات میں اشارہ ہوا ہے اور اس سلسلے میں مختلف تعبیرات نظر آتی ہیں کبھی تو ''انشقاق'' جیسی تعبیر لائی گئی ہے:

اِذَا السَّمَآءُ انۡشَقَّتۡ ۱ ﴿الإنشقاق: ۱﴾

جب آسمان پھٹ جائے گا۔

اسی معنی کی مثل سورہ حاقہ کی آیت ۱۶ میں بھی ہے:

وَانۡشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوۡمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ ۱۶ ﴿الحاقة: ۱۶﴾

اور آسمان پھٹ جائیں گے، کمزور ہو جائیں گے اور گر جائیں گے۔

سورہ فرقان کی آیت ۲۵ میں بھی یہی مطلب تھوڑے سے فرق کے ساتھ بیان کیا گیا ہے:

وَيَوۡمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالۡغَمَامِ ﴿الفرقان: ۲۵﴾

(اس دن کو یاد کرو) جب آسمان بادلوں کے ساتھ پھٹ جائے گا۔

ان آیات میں ''سما'' سے مراد آسمانی کرات ہیں جو کائنات کے خاتمے پر مسلسل دھماکوں سے پھٹ جائیں گے، لیکن بادلوں کے ذریعے اُن کے پھٹنے سے کیا مراد ہے، اس سلسلے میں یہ احتمال پایا جاتا ہے کہ آسمانوں کے ختم ہونے کے ساتھ ہی بڑے بڑے بادل پیدا ہو جائیں گے جو آسمانوں کے گرد و غبار سے بنیں گے، (ادبی اصطلاح کے مطابق ''الغمام'' پر جو باداخل ہے وہ ملابست اور ہمراہی کے معنی میں ہے جس طرح یہ بات ''تفسیر المیز ان'' میں ایک احتمال کے طور پر ذکر کی گئی ہے)[1]

البتہ علامہ طباطبائی مرحوم اس بات کو بعید نہیں سمجھتے کہ مندرجہ بالا تعبیر استعارہ ہو، یعنی مراد جہالت اور نادانی کے پردوں کا

[1] تفسیر المیز ان۔ ج۱۵، ص ۲۰۲

اُٹھ جانا ہو، جس سے عالم غیب نمایاں اور واضح ہو جائے گا، (اس وقت ''با'' ''عن'' کے معنی میں ہوگی) یعنی بادل چھٹ جائیں گے اور جہان غیب منصۂ شہود پر آ جائے گا۔

لیکن جب تک اس ستعاراتی تفسیر پر کوئی دلیل نہ ہو، اس وقت تک اُسے قبول نہیں کیا جا سکتا، قابل توجہ بات یہ ہے کہ حضرت علیؑ کا ایک فرمان اس طرح ہے:

''انها تنشق من المجرة''

آسمان کہکشاؤں کی جانب سے پھٹ جائیں گے۔[1]

یہ دلنشین تعبیر ان آخری انکشافات سے ہم آہنگ ہے جو سائنسدانوں نے کہکشاؤں کے سلسلے میں کئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ جو منظومہ شمسی اور ستارے ہم دیکھ رہے ہیں، یہ اُس بڑی کہکشاں کا ایک چھوٹا سا حصہ ہیں جسے (MALKY WAY) کہتے ہیں اور جسے دوربین کے بغیر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

اور سورج، چاند اور ستاروں کا پھٹنا اس عظیم کہکشاں کے پھٹنے کے ساتھ ہے (غور کیجئے گا)۔

اسی طرح کبھی ''انفطار'' کی تعبیر لائی گئی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ۱ ﴿انفطار: ۱﴾

جب آسمان پھٹ جائے گا۔

سورہ مزمل کی آیت ۱۸ میں بھی یہی معنی آئے ہیں، ارشاد ہوتا ہے:

السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ

اُس دن آسمان اُس کے ساتھ ہی پھٹ جائے گا۔

جیسے پہلے بھی کہا جا چکا ہے ''انفطار'' کا اشتقاق ''فطر'' سے ہے جس کے معنی پھارنا ہیں۔

کبھی اس طرح ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ ۱۱ ﴿التکویر: ۱۱﴾

اور جب آسمان سے پردہ ہٹا دیا جائے گا۔

ممکن ہے یہ تعبیر اُن پردوں کے اُٹھ جانے کی طرف اشارہ ہو جو اس دنیا میں آسمانوں کے ملکوت، فرشتوں جنت اور دوزخ کے دیکھنے

---

[1] تفسیر فخر رازی۔ ج ۱۳، ص ۱۰۳

میں حائل ہیں، اُس دن یہ پردے اُٹھ جائیں گے اور انسان عالم ہستی کے حقائق کا مشاہدہ کرے گا اس صورت میں اس آیت کا آسمانوں کے ختم ہوجانے والے موضوع کے ساتھ ارتباط نہیں پایا جاتا۔

بعض مفسرین، جیسے مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں اس کے معنی آسمانوں (کرات آسمانی) کا اپنی جگہ سے اکھڑ جانا کئے ہیں، اس کا لازمہ بھی اس نظام ہستی کا درہم برہم ہوجانا اور اس کی بساط کا لپیٹ لیا جانا ہے۔[۱]

کبھی اس طرح ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَإِذَا السَّمَاءُ فُرِجَتْ﴾ (المرسلات: ۹)

اور جب آسمان پھاڑ دیا جائے گا۔

''فطر'' اور ''فرج'' کا مادہ ایک ہی معنی میں ہے یا ان میں معمولی سا فرق ہے، اسی لئے مشکلات کے دروازے کھل جانے کو بھی ''فرج'' کہتے ہیں، اس کا متضاد شدت ہے جس کے معنی مشکلات میں گھر جانا ہیں۔ کبھی ''فتح'' کی تعبیر لائی گئی ہے، چنانچہ سورہ نبا کی آیت ۱۹ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَفُتِحَتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ أَبْوَابًا ۱۹﴾ (النبإ: ۱۹)

اور آسمان کھول دیا جائے گا اور وہ متعدد دروازوں میں بٹ جائے گا۔

یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تعبیر آسمانوں کے پھٹ جانے کی طرف اشارہ ہو، جیسا کہ بعض مفسرین نے اس بات کا اظہار بھی کیا ہے، اس صورت میں یہ گزشتہ آیات کے ساتھ ہم آہنگ ہوگی، یعنی آسمانی کروں میں بہت سے شگاف پیدا ہوجائیں گے، گویا پورا آسمان دروازوں اور سوراخوں میں تبدیل ہوجائے گا۔

لیکن بعض مفسرین نے اس کے استعاراتی معنی مراد لئے ہیں اور کہا ہے کہ اس سے مراد عالم غیب کے دروازوں کا کھل جانا، حجابوں کا اُٹھ جانا اور فرشتوں کے جہان کا انسانوں کے جہان کے ساتھ ارتباط قائم ہوجانا ہے۔[۲]

کبھی ارشاد ہوتا ہے:

﴿يَوْمَ تَمُورُ السَّمَاءُ مَوْرًا ۹﴾ (الطور: ۹)

جس دن آسمان تیز گردش کرے گا۔

---

[۱] مجمع البیان۔ ج ۱۰، ص ۴۴۴

[۲] پہلی تفسیر مرحوم طبرسی، فخر رازی اور بعض دوسرے مفسرین نے کی ہے، جب کہ دوسری تفسیر کو علامہ طباطبائی نے المیزان میں اسی آیت کے ذیل میں ذکر کیا ہے

''مور'' بروزن ''قول'' کبھی تو تیز حرکت کے معنی میں آیا ہے، کبھی دائرے میں گردش کے معنی میں اور کبھی آمد و رفت اور بے چینی کے معنی میں آتا ہے، اس لئے جس گرد و غبار کو ہوا ہر طرف لے جاتی ہے، اسے ''مور'' (بروزن ''زور'') کہتے ہیں۔

بہر حال یہ تعبیر آسمانی کرات کے متزلزل ہونے، اُن کے نظام کے درہم برہم ہو جانے اور نیست و نابود ہو جانے کے معنی میں ہیں۔

کبھی ارشاد ہوتا ہے:

يَوْمَ تَكُونُ السَّمَاءُ كَالْمُهْلِ ٨ ﴿المعارج: ٨﴾

جس دن آسمان پگھلے ہوئے تانبے کی مانند ہو جائے گا۔

مفسرین نے ''مهل'' کے معنی تیل کے وہ ذرات، جو تہہ میں بیٹھ جاتے ہیں اور درختوں سے نکلنے والے ایک مضر قسم کے مادے کے ہیں، کبھی یہ لفظ پگھلی ہوئی چاندی اور سونے کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے، یہ آخری معنی اس آیہ کی تفسیر کے لئے مناسب تر ہیں، بہر حال کرات آسمانی میں ایسی حالت کا پیدا ہونا اُن کے نابود ہونے کے نتیجے کے طور پر ہوگا۔

آخر کار ایک لرزا دینے والی تعبیر لائی جاتی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

يَوْمَ نَطْوِي السَّمَاءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ۚ كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيدُهُ ۚ وَعْدًا عَلَيْنَا ۚ إِنَّا كُنَّا فَاعِلِينَ ١٠٤ ﴿الأنبياء: ١٠٤﴾

اس دن ہم آسمان کو اس طرح لپیٹیں گے جس طرح صحیفوں میں نوشتے لپیٹے جاتے ہیں، جس طرح ہم نے اُسے پہلے پیدا کیا تھا، اسی طرح ہم اُسے دہرا دیں گے۔

یہ تعبیر جہان کے خاتمہ پر آسمانوں اور ستاروں کے دگرگوں ہونے کی مختلف جہات کو واضح کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ تمام ستارے، سیارے اور دوسرا نظام ایک دوسرے کے ساتھ ایسے لپیٹ دیے جائیں گے جیسے صحیفوں میں نوشتے لپیٹے جاتے ہیں وہ ایسے ہو جائیں گے گویا ابتدائے خلقت میں ایک ٹیلے کی طرح تھے، ایک بار پھر خدا اس عالم ہستی کے لئے ایک نئی تدبیر بنائے گا اور قیامت اس نئی دنیا میں برپا ہوگی۔

گزشتہ آیات میں جو کچھ گزرا ہے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ قیامت اس دنیا کے دوام کا سلسلہ نہیں ہے بلکہ یہ عالم بالکل ختم ہو جائے گا، کیونکہ مسلسل دھماکے اور خطرناک زلزلے تمام چیزوں کو درہم برہم کر کے رکھ دیں گے، پھر ایک نئے لائحہ عمل کے مطابق اس جہان کے کھنڈرات پر ایک نئی دنیا آباد کی جائے گی اور قیامت بھی اسی نئے عالم میں برپا ہوگی۔

آغاز قیامت کی نشانیاں

قیامت کے آنے پر بڑے بڑے حوادث وقوع پذیر ہوں گے، دنیا کا خاتمہ بہت بڑے حادثات کے ساتھ ہوگا، اسی طرح قیامت کا آغاز بھی بہت بڑے حوادث کے ساتھ ہوگا، یہ معنی قرآن مجید کی مختلف آیات میں پائے جاتے ہیں۔

۱۔ ایک جگہ ارشاد ہے:

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۴۸

﴿ابراھیم: ۴۸﴾

خدا کا وعدہ اس دن پورا ہوگا، یہ زمین ایک دوسری زمین میں تبدیل ہو جائے گی، آسمان (دوسرے آسمانوں میں) اور تمام انسان خدائے واحد وقہار کے سامنے ظاہر ہوں گے، یہ تبدیلی تیسرے مرحلے کی طرف اشارہ ہے کیونکہ آیت کے ذیل میں ارشاد ہوتا ہے:

''اس دن ہر شخص، اور جو کچھ بھی وہ رکھتا ہے، خدائے واحد وقہار کے سامنے ظاہر ہوگا''

یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ یہاں پر زمین کے دوسری زمین میں تبدیل ہو جانے سے مراد زمین کی ذات اور ماہیت کا تبدیل ہو جانا نہیں، جیسا کہ بعض لوگ تصور کرتے ہیں، بلکہ مراد یہ ہے کہ اس کی صفات اور خصوصیات تبدیل ہو جائیں گی، جیسے اُس پر پہاڑوں کا ختم ہو جانا، اس کا صاف اور ہموار ہو جانا اور لامحدود وسعت تک پھیل جانا، اس کے بغیر کہ اس کی ذات تبدیل ہو۔

اس بات کی دلیل وہ متعدد آیات ہیں جو کہتی ہیں کہ:

قیامت کے دن انسان اپنی قبروں سے اٹھیں گے، بالخصوص سورہ طٰہٰ کی آیت ۵۵ جو ارشاد فرماتی ہے:

مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرٰى ۵۵ ﴿طه: ۵۵﴾

ہم نے تمہیں اس زمین سے پیدا کیا پھر اسی کی طرف پلٹائیں گے اور دوبارہ اس سے نکالیں گے۔

بہرحال مفسرین نے اس آیت کی متعدد تفاسیر بیان کی ہیں، جن میں سے اکثر کی دلیل بعض مرسل احادیث یا بعض سابقہ مفسرین کے اقوال ہیں۔

کسی نے کہا ہے کہ زمین چاندی میں اور آسمان سونے میں تبدیل ہو جائے گا۔

کسی نے کہا ہے زمین آگ میں اور آسمان بہشت کے باغوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔

یا زمین کا ہر حصہ اس پر بسنے والے مومنوں اور کافروں کی نسبت سے چاندی یا آگ میں تبدیل ہو جائے گا۔

لیکن اس آیت سے اجمالی طور پر جو بات سمجھی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک عظیم تبدیلی رونما ہوگی، اگرچہ اس کی جزئیات اور تفصیل ہمارے لئے زیادہ روشن نہیں ہے۔

۲۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

اِذَا زُلۡزِلَتِ الۡاَرۡضُ زِلۡزَالَهَا وَاَخۡرَجَتِ الۡاَرۡضُ اَثۡقَالَهَا ﴿الزلزلة: ۱۔۲﴾

جب زمین شدید طور پر لرزنے لگے گی اور اپنی تمام بھاری چیزوں کو باہر نکال پھینکے گی۔

کیا اس زلزلے سے مراد وہ زلزلہ ہے جو دنیا کے خاتمہ پر پوری زمین کو اپنی لپیٹ میں لے لیگا، اور پوری دنیا کو نیست و نابود کردے گا، یا وہ زلزلہ ہے جو قیامت کے آغاز میں وقوع پذیر ہوگا، مفسرین کے درمیان اس سلسلے میں اختلاف نظر ہے، (فخر رازی نے اپنی تفسیر میں دونوں اقوال کو ذکر کیا ہے)[1]

البتہ اسی سورۃ کی دوسری آیت کو مدنظر رکھتے ہوئے دوسرے معنی مناسب تر معلوم ہوتے ہیں کیونکہ آیت میں ہے:

''زمین اپنی بھاری چیزوں کو باہر نکال دے گی'' اس لئے کہ اثقال جمع ہے ''ثقل'' کی جس کے معنی خزانہ ہیں، احتمال قوی یہ ہے کہ یہاں پر یہ انسانوں کے معنی میں ہے جو اس وقت قبروں سے باہر نکالے جائیں گے۔

جیسے سورہ انشقاق کی آیت ۴ میں بھی ارشاد ہوتا ہے:

وَاَلۡقَتۡ مَا فِيۡهَا وَتَخَلَّتۡ ﴿الانشقاق: ۴﴾

زمین اپنے اندر والی چیزوں کو باہر نکال دے گی اور خالی ہوجائے گی۔

اس لحاظ سے دوسرا زلزلہ وہ ہے جو مُردوں کے زندہ ہونے سے پہلے اور قیامت کے شروع میں وقوع پذیر ہوگا، یہ ایک بہت بڑا زلزلہ ہوگا جو ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا، بخلاف دوسرے زلزلوں کے جو زمین کے ایک مختصر سے خطے پر واقع ہوتے ہیں ''اذا زلزلت الارض'' کی تعبیر میں عمومیت موجود ہے، اسی طرح ''زلزالها'' کی تعبیر بھی اسی معنی کی تائید کرتی ہے۔

اسی تعبیر کی طرح بلکہ اس سے واضح تر تعبیر سورۃ ق کی آیت ۴۴ میں آئی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

يَوۡمَ تَشَقَّقُ الۡاَرۡضُ عَنۡهُمۡ سِرَاعًا ۚ ذٰلِكَ حَشۡرٌ عَلَيۡنَا يَسِيۡرٌ ﴿ق: ۴۴﴾ [2]

---

[1] تفسیر کبیر۔ ج ۳۲۔ ص ۵۸

[2] ''تشقق'' کی اصل ''تتشقق'' ہے ایک تا کو حذف کردیا گیا ہے

جس دن زمین اوپر سے پھٹ جائے گی اور (مردے) تیزی کے ساتھ (قبروں سے) نکلیں گے، انہیں جمع کرنا ہمارے لئے آسان ہے۔

ظاہر ہے کہ پوری زمین کا پھٹنا اور تیزی کے ساتھ قبروں سے مُردوں کا نکلنا، یہ سب ان ہمہ گیر زلزلوں کے ذریعے ہوگا جو پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیں گے۔

بہر حال یہ زلزلہ مردوں کے زندہ کرنے کے وقت کا ہے نہ کہ دنیا کے خاتمہ کا، بالخصوص اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ آیت کے ذیل میں مردوں کو زندہ کرنے کے بجائے حشر کا عنوان لایا گیا ہے (جس کے معنی انسانوں کو زندہ ہونے کے بعد اکٹھا کرنا، یا بدن کے اجزا کو اکٹھا کرنا، یا روحوں اور بدنوں کو جمع کرنا ہے)۔

یہ زلزلہ باقی زلزلوں کے خلاف ایک تعمیر کنندہ زلزلہ ہے، جب کہ باقی زلزلے تباہی اور موت لانے والے ہوتے ہیں، یہ ایسا زلزلہ ہو گا جو انسانوں کو اس بات کی مہلت دے گا کہ وہ قبروں سے نکلیں اور نئی زندگی سے بہرہ مند ہوں۔

اس معنی کی نظیر سورہ نازعات میں بھی آئی ہے۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ ۝ [۷۹:۶،۷]

جس دن زلزلے تمام چیزوں کو لرزا دیں گے اور ایک زلزلے کے بعد دوسرا زلزلہ آئے گا۔

بہت سے مفسرین نے پہلی آیت کو پہلی مرتبہ کے نفخ صور (ایسی بڑی چیخ جس کے ساتھ ہی دنیا کا خاتمہ ہو جائے گا) کی طرف اشارہ سمجھا ہے اور دوسری آیت کو نفخۂ دوم (دوسری چیخ، قیامت جس کے ساتھ شروع ہوگی) کی طرف اشارہ سمجھا ہے، جب کہ یہ معنی آیت کے ظاہر کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہیں کیونکہ ''راجفه'' ''رجف'' کے مادہ سے ہے، مقائیس اللغت کے بقول یہ اصل میں اضطراب اور بے چینی کے معنی میں ہے، یا راحب کے بقول شدید اضطراب کے معنی میں ہے، لہٰذا موجزن دریا کو ''بحر رجاف'' کہتے ہیں اور ''اراجیف'' ان خبروں کو کہتے ہیں جو معاشرے کے عمومی افکار کو متزلزل اور مضطرب کر دیتی ہیں۔

درست ہے کہ بڑی چیخیں زلزلوں کے ساتھ نکلتی ہیں، لیکن یہاں پر اس بات کی کوئی ضرورت نہیں کہ ہم حقیقی معنی یعنی پہلے زلزلہ اور دوسرے زلزلہ کو چھوڑ کر مجازی معنی یا معنی کے لوازم کو مراد لیں۔

۳۔ زمین کا دگرگوں ہونا قیامت کے شروع ہونے کی ایک اور نشانی ہے، زمین بالکل ہموار ہو جائے گی اور تمام انسان صفحۂ زمین پر نکل آئیں گے، چنانچہ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْأَرْضَ بَارِزَةً ۙ وَّحَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ

اَحَدًا ٤٧﴿الکهف: ٤٧﴾

اور اس دن کو یاد کرو جس دن ہم پہاڑوں کو چلائیں گے اور زمین کو تو آشکار اور ہموار دیکھے گا، اُس دن ہم تمام انسانوں کو محشور کریں گے۔

پہاڑوں کا حرکت کرنا ان کے تباہ ہونے کا مقدمہ ہے جیسے مندرجہ بالا آیت اور اسی طرح کی دوسری آیات سے استفادہ ہوتا ہے، زمین مکمل طور پر ہموار ہو جائے گی اور اس ویرانی کے بعد تمام انسان اس پر ظاہر و آشکار ہو جائیں گے۔

ان آیات کی طرف توجہ فرمائیں:

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا لَّا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا

يَوْمَئِذٍ يَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهٗ (طه۔۱۰۵تا۱۰۸)

اور تم سے پہاڑوں کے متعلق سوال کرتے ہیں، کہہ دیجئے میرا خدا ان کو (ختم) نیست و نابود کر دے گا، پھر زمین کو صاف اور ہموار بنا دے گا اور آب و گیاہ کے بغیر چھوڑ دے گا، اس طرح کہ تم اس میں کسی قسم کی بلندی یا پستی نہیں دیکھو گے، اُس دن سب، خدا کی طرف اس بلانے والے، جس میں کسی قسم کا انحراف نہیں ہے، کی پیروی کریں گے۔

یوں لگتا ہے کہ ان آیات میں دنیا کے خاتمہ پر وقوع پذیر ہونے والے کچھ واقعات اور پھر قیامت کے آغاز پر رونما ہونے والے بعض واقعات کو بیان کیا گیا ہے۔

یہ ''اشراط الساعۃ'' اور قیامت کی نشانیوں کے متعلق بحث کا خلاصہ تھا جسے قرآن مجید کی آیات سے استفادہ کرتے ہوئے تین حصوں میں بیان کیا گیا ہے، اس میں دنیا کے خاتمہ پر رونما ہونے والی عظیم تبدیلیوں اور قیامت کے آغاز پر وقوع پذیر ہونے والے حوادث میں سے بعض کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

نفخ صور موت اور حیات کی چیخ

اشارہ:

قرآن کی بہت سی آیات میں نفخ صور کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ان آیات سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ یہ صور دو مرتبہ پھونکا جائے گا۔

ایک مرتبہ تو دنیا کے خاتمہ پر، جس سے پوری مخلوق مرجائے گی، یہ موت کی چیخ ہے۔

دوسری مرتبہ قیامت کے آغاز پر جب تمام مردے زندہ ہوجائیں گے، یہ زندگی کی چیخ ہے۔

حقیقت میں اس دنیا کا رک جانا اور دوسری دنیا کا آغاز ہونا، لشکروں اور قافلوں کی حرکت اور قیام کی طرح ہے جو ایک مخصوص طبل یا بلند آواز پر تمام کے تمام ایک جگہ رک جاتے اور قیام پذیر ہوجاتے ہیں، دوسری آواز پر کھڑے ہوکر کوچ کر جاتے ہیں۔

''صور'' کیا ہے اور ''نفخ'' سے کیا مراد ہے، اس سلسلے میں ہم تفصیلی بحث کریں گے، خداوند تعالیٰ کی توفیق سے آئندہ ان باتوں کا ذکر کیا جائے گا، یہاں پر جس امر کی طرف توجہ مبذول کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ان دو اہم واقعات کے متعلق قرآن مجید میں چھ مختلف تعبیریں آئی ہیں:

کبھی تو ''نفخ صور'' کی تعبیر آئی ہے۔

کبھی ''صیحة'' کی تعبیر آئی ہے۔

کبھی ''نقر فی الناقور'' کی عبارت آئی ہے۔

کبھی ''صاخة'' کی تعبیر آئی ہے۔

کبھی ''قارعة'' کی عبارت آئی ہے۔

اور کبھی ''زجرة'' کی تعبیر آئی ہے۔

ان چھ عنوانات کی شرح اور تفصیل آپ آئندہ آنے والی آیات میں ملاحظہ کریں گے، اس مختصر سے اشارے کے ساتھ ہم دوبارہ قرآن کی طرف پلٹتے ہیں اور مندرجہ ذیل آیات بغور ملاحظہ کرتے ہیں:

۱۔ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَاۗءَ اللّٰهُ ۭ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ۶۸﴿الزمر: ۶۸﴾

۲۔ وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ

شَاءَ اللّٰهُ ۚ وَكُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ ٨٧ ﴿النمل: ٨٧﴾

٣۔ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ ٥١

؎ یس: ۵۱

٤۔ فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ۝ وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ۝ (حاقة: ١٣۔١٤)

٥۔ فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَاءَلُوْنَ ١٠١ ﴿المؤمنون: ١٠١﴾

٦۔ وَّنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا ٩٩ ﴿الكهف: ٩٩﴾

٧۔ يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ زُرْقًا ١٠٢ ﴿طه: ١٠٢﴾

٨۔ يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا ١٨ ﴿النبإ: ١٨﴾

٩۔ قَوْلُهُ الْحَقُّ ۭ وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ ﴿الأنعام: ٧٣﴾

١٠۔ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ ۭ ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ ٢٠ ﴿ق: ٢٠﴾

١١۔ اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ٥٣

؎ یس: ۵۳

١٢۔ مَا يَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً تَاْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُوْنَ ٤٩ ﴿يس: ٤٩﴾

١٣۔ وَمَا يَنْظُرُ هٰٓؤُلَاءِ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً مَّا لَهَا مِنْ فَوَاقٍ ١٥ ﴿ص: ١٥﴾

١٤۔ يَّوْمَ يَسْمَعُوْنَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ ۭ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُرُوْجِ ٤٢ ﴿ق: ٤٢﴾

١٥۔ فَاِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُوْرِ فَذٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَّوْمٌ عَسِيْرٌ ٩ ﴿المدثر: ٩﴾

١٦۔ فَاِذَا جَاءَتِ الصَّاۗخَّةُ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ۝ [٨٠: ٣٣]

١٧۔ اَلْقَارِعَةُ مَا الْقَارِعَةُ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ

كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوثِ(قارعة:۱ تا ۴)

۱۸۔ فَإِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ فَإِذَا هُمْ يَنْظُرُونَ ۱۹ ﴿الصافات:۱۹﴾

ترجمہ:

۱۔ صور پھونکا جائے گا، پھر سب لوگ جو زمین اور آسمانوں میں ہیں مر جائیں گے، سوائے اس کے جسے اللہ چاہے، پھر دوسری بار اس میں پھونکا جائے گا، پھر وہ یکا یک سب کھڑے ہو کر (حساب و کتاب کا) انتظار کرنے لگیں گے۔

۲۔ (اس دن کو یاد کرو) جس دن صور میں پھونکا جائے گا، پس جو شخص بھی آسمانوں اور زمین میں ہوگا، دہل جائے گا، سوائے اس کے جسے اللہ تعالیٰ چاہے، اور تمام اللہ کے سامنے خضوع کے ساتھ حاضر آئیں گے۔

۳۔ اور (دوسری مرتبہ) صور میں پھونکا جائے گا، پھر یکا یک وہ قبروں میں سے نکل کر اپنے پروردگار (کی عدالت) کی طرف دوڑے چلے جائیں گے۔

۴۔ صرف اس سے کہ ایک بار صور میں پھونکا جائے گا اور زمین اور پہاڑ اٹھائے جائیں گے، پھر ایک ہی بار توڑ کر ریزہ ریزہ کر دیئے جائیں گے۔

۵۔ جب صور میں پھونکا جائے گا تو اس دن نہ اُن کے درمیان رشتے ناطے رہ جائیں گے اور نہ وہ ایک دوسرے کو پوچھ سکیں گے۔

۶۔ اور صور میں پھونکا جائے گا، پھر ہم سب کو اکٹھا کر لیں گے۔

۷۔ جس دن صور میں پھونکا جائے گا اور تمام مجرم اس دن نیلگوں جسم کے ساتھ محشور کئے جائیں گے۔

۸۔ جس دن صور میں پھونکا جائے گا اور تم فوج فوج ہو کر محشر میں وارد ہو گے۔

۹۔ اس کا قول سچا ہے اور جس دن صور میں پھونکا جائے گا اس دن حکومت اسی کی ہوگی۔

۱۰۔ اور صور میں پھونکا جائے گا، یہی عذاب کے وعدہ کا دن ہے۔

۱۱۔ اُن کا عذاب ایک تند آواز کے سوا کچھ نہ تھا، پس وہ سب یکا یک ہمارے حضور کئے جائیں گے۔

۱۲۔ وہ انتظار نہیں کرتے مگر ایک عظیم (آسمانی) چیخ کا جو ان کو گھیر لے جب کہ وہ (دنیا کے معاملات میں) جھگڑتے ہوں گے۔

۱۳۔ وہ (اپنے ان اعمال کی وجہ سے) انتظار نہیں کرتے مگر ایک چیخ کا جو آسمان سے آئے جس سے کوئی چھٹکارا نہیں (اور وہ تمام کو نابود کردے گی)

۱۴۔ جس دن وہ ایک سخت چیخ حق کے ساتھ سنیں گے، یہ خروج کا دن ہوگا۔

۱۵۔ جب صور میں پھونکا جائے گا وہ دن بہت سخت ہوگا۔

۱۶۔ جب وہ کان پھاڑ دینے والی (قیامت کی) چیخ آئے گی (کافر غم میں ڈوب جائیں گے) جس دن آدمی اپنے بھائی سے بھاگتا پھرے گا۔

۱۷۔ کھڑکھڑا دینے والی، کیا ہے کھڑکھڑا دینے والی؟ اور تم کیا جانو کہ کھڑکھڑا دینے والی کیا ہے؟ جس دن لوگ بکھرے ہوئے پتنگوں کی طرح ہو جائیں گے۔

۱۸۔ صرف ایک چیخ اُٹھے گی، اچانک سب (قبروں سے نکل آئیں گے) اور دیکھیں گے۔

تفسیر و جمع بندی آیات

موت کی پُھونک اور زندگی کی پُھونک:

مندرجہ بالا اٹھارہ آیات میں، جیسے کہ پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے، چھ مختلف انداز سے ''نفخ صور'' کا ذکر آیا ہے، مندرجہ بالا آیات میں انہیں ترتیب کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، اب جب کہ ہم نے ان سب کو باہم ملا دیا ہے اور ایک جگہ اکٹھا ذکر کر دیا ہے، تو ان کی تفسیر کی طرف توجہ کرتے ہیں تا کہ اس پیوستگی کے ساتھ ''نفخ صور'' کا واقعی مفہوم واضح ہو جائے۔

پہلی آیت میں صور کے پہلی دفعہ پھونکنے اور اس طرح دوسری دفعہ پھونکنے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، فقط یہ ہی ایک ایسی آیت ہے جس میں ان دونوں کو ذکر کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

ونفخ فی الصور فصعق من فی السموات ومن فی الارض الا من شآء اللہ

اور صور پُھونکا جائے گا، زمین و آسمان میں جو بھی ہوگا مر جائے گا مگر وہ کہ جسے خدا چاہے۔

صاحب مقائیس اللغت نے ''صعق'' (بروزن ''صعب'') کے مادہ کو تیز آواز کے معنی میں لیا ہے، وہ صاعقہ کو اسی معنی سے مشتق سمجھتے ہیں، چونکہ ''صاعقه'' (آسمانی بجلی) موت اور بربادی کا باعث بنتی ہے اس لئے یہ مادہ ''موت'' کے معنی میں بھی آتا ہے لیکن لسان العرب میں اس کا پہلا معنی لیا گیا ہے یعنی کسی تیز آواز کی وجہ سے بے ہوش ہونا اور عقل کا ضائع ہو جانا۔

اس نے دوسرے معنی موت لئے ہیں بعض لوگوں کے بقول اس نے صاعقہ کے ایک معنی موت کا ذکر کیا ہے۔

بہر حال مندرجہ بالا آیت میں اس سے مراد وہ اچانک موت ہے جو زمین و آسمان میں رہنے والوں کو (نفخ صور کی وجہ سے) دامن گیر ہوگی، یہ کہ ''الا من شآء الله'' مگر وہ کہ جسے خدا چاہے سے کیا مراد ہے، اس سلسلے میں مفسرین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے، بعض نے اس سے خدا کے بعض عظیم فرشتے (جیسے جبرئیل، میکائیل، اسرافیل اور عزرائیل) مراد لئے ہیں، بعض نے اسے راہ خدا میں شہید ہونے والے لوگوں کی طرف اشارہ سمجھا ہے اور بعض نے مذکورہ بالا چار فرشتوں کے ساتھ عرش الٰہی کو اٹھانے والے فرشتوں کو بھی شامل کیا ہے۔

لیکن بہر حال یہ بات مسلم ہے کہ وہ بھی آخر کار خدا کے حکم

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ (آل عمران۔١٨٥)

کے مطابق موت کا ذائقہ چکھیں گے اور صرف خدا کی ذات جو ''حی لا یموت'' ہے، باقی رہ جائے گی۔

وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ٢٧ ﴿الرحمن: ٢٧﴾

آیہ کے ذیل میں دوسری دفعہ صور پھونکنے کا بھی ذکر ہے، ارشاد ہوتا ہے:

ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ٦٨ ﴿الزمر: ٦٨﴾

پھر دوسری مرتبہ صور میں پھونکا جائے گا اور اچانک سب کھڑے ہو جائیں گے اور منتظر ہوں گے (تا کہ حساب لیا جائے)۔

''صور'' اصل میں ''بگل'' کے معنی میں ہے جو عموماً لشکروں اور کبھی کاروانوں کے روکنے یا چلانے کے لئے بجایا جاتا ہے، اس آیت میں عالم ہستی میں قافلہ زندگی کے عمومی توقف اور دوبارہ چلنے کے لئے یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے، اس سلسلے میں تفصیلاً گفتگو خداوند تعالیٰ کی توفیق کے ساتھ توضیحات کے حصے میں ذکر کی جائے گی۔

دوسری آیت میں فقط دوسری مرتبہ صور میں پھوکنے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ

اس دن کو یاد کرو جب صور میں پھونکا جائے گا اور زمین و آسمان میں بسنے والے تمام لوگ خوف میں مبتلا ہو جائیں گے۔

بعض مفسرین (مثلاً علامہ طباطبائی) اس بات کو بعید نہیں سمجھتے کہ یہ آیت ہر دو صور پھونکنے کی طرف اشارہ ہو، لیکن ذیل آیہ میں ہے کہ "تمام کے تمام خضوع کے ساتھ خدا کے سامنے حاضر ہوں گے"۔

وَكُلٌّ أَتَوْهُ دَاخِرِينَ ﴿النمل: ٨٧﴾

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مراد دوسرا صور ہے، یہاں پر بھی استثناء یہ جملہ ہے: "الا من شآء" "مگر وہ کہ جسے خدا چاہے" اس کی تفسیر پہلی آیت کے ذیل میں گزر چکی ہے۔

تیسری آیت دوسرے نفخہ جو قیامت کا نفخہ ہے، سے متعلق ہے، ارشاد ہوتا ہے "ونفخ فی الصور فاذا هم من الاجداث الی ربهم ینسلون" [1] صور پھونکا جائے گا، اچانک وہ قبروں سے تیزی کے ساتھ اپنے پروردگار (کی عدالت) کی طرف حرکت کریں گے۔

مفسرین نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ یہ آیت نفخہ دوم سے متعلق ہے، نیز اسی آیت کی تشریح اور اس کے بعد والی آیات بھی اسی بات کی شہادت دیتی ہیں، بعض لوگوں نے یہاں پر یہ سوال اٹھایا ہے کہ اگر اس دن انسان خدا کے حساب و کتاب سے خوف زدہ ہوں گے تو کیسے اس کی طرف تیزی سے پلٹیں گے؟ جواب یہ دیا گیا کہ یہ حالت اُن میں بغیر ان کے اختیار کے پیدا ہو جائے گی، اس طریقے سے خدا انہیں اپنی عدالت کی طرف بلائے گا۔

چوتھی آیت پہلی دفعہ والے صور میں پھونکنے سے متعلق ہے، وہ پھونک جس کے ساتھ انسان اور پوری عالم ہستی وادی فنا کی طرف کوچ کر جائیں گے، ارشاد ہوتا ہے:

"فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ نَفْخَةٌ وَاحِدَةٌ وَحُمِلَتِ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَاحِدَةً فَيَوْمَئِذٍ وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ﴿الحاقة: ١٣﴾

جب ایک بار صور میں پھونکا جائے گا اور زمین اور پہاڑوں کو ان کی جگہ سے اُٹھا لیا جائے گا پھر ایک ہی بار وہ توڑ کر ریزہ ریزہ کر دیئے جائیں گے۔

ان آیات میں "واحدة" کی تعبیر دو جگہ استعمال کی گئی ہے، جو یہ ظاہر کرتی ہے کہ یہ واقعات اچانک اور ہنگامی صورت میں وقوع پذیر ہوں گے، دوسری طرف یہ تمام کی تمام تعبیرات خدا کی لامحدود قدرت کی علامت ہیں کہ ایک ہی دفعہ صور میں پھونکنے سے پوری کائنات فنا ہو جائے گی، بالکل ایک بگل بجانے کی طرح، جس سے ایک عظیم لشکر رک جاتا ہے یا چل پڑتا ہے۔

---

[1] "اجداث" جمع ہے "جدث" (بروزن "قفس") کی جس کے معنی "قبر" ہیں، "ینسلون" "نسل" (بروزن قفل) کے مادہ سے ہے جس کے معنی تیز تیز چلنا ہیں، راغب نے مفردات میں اس کے اصل معنی "جدا ہونا" ذکر کئے ہیں، فرزندان آدم پر نسل کا اطلاق بھی اسی لحاظ سے ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا آیات نفخہ اول کی طرف اشارہ کرتی ہیں اگر چہ آئندہ آنے والی آیات میں کہیں کہیں محشر کے واقعات اور نامۂ اعمال اور بہشت کے اوصاف کا بھی ذکر ہے، یہ اس لئے ہے کہ یہ مذکورہ حوادث دنیا کے خاتمے اور قیامت کی ابتداء کے ساتھ ہی وقوع پذیر ہوں گے، ان کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں ہوگا، اسی لئے قرآن کی بہت سی آیات میں دنیا کے خاتمہ پر وقوع پذیر ہونے والے واقعات اور قیامت کے شروع میں رونما ہونے والے حادثات کا ذکر ایک دوسرے کے فوراً بعد نظر آتا ہے۔

رہی یہ بات کہ بعض بڑے مفسرین نے اس آیت کو نفخہ دوم سے متعلق سمجھا ہے [1]، تو یہ بات بہت بعید لگتی ہے کیونکہ اس صورت میں اگلی آیت جو اس کے فوراً بعد ہے اور زمین و آسمان کی تباہی کی خبر دے رہی ہے یہ اس کے ہم آہنگ نہ ہوگی، گویا وہ آیات جو اس سے کافی فاصلے پر ہیں انہوں نے اس آیت کو اس معنی کی طرف چلایا ہے جب کہ قرآن کی مختلف آیات جو کہ قیامت کے سلسلے میں نازل ہوئی ہیں، میں غور وفکر کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان دو پھونکوں کے حوادث کبھی اکٹھے بھی ذکر ہوتے ہیں، ضروری ہے کہ قرائن اور شواہد کے ذریعے انہیں ایک دوسرے سے جدا کیا جائے۔

پانچویں آیت واضح طور پر ''نفخه دوم'' کی طرف اشارہ کرتی ہے کیونکہ وہ اس بات کی خبر دے رہی ہے کہ صور میں پھونکنے کے ساتھ ہی تمام رشتہ داریاں اور تعلقات ختم ہو جائیں گے، ارشاد ہوتا ہے: ''فاذا نفخ فی الصور فلا انساب بینهم یومئذ ولا یتسآء لون'' (جب صور میں پھونکا جائے گا تو اُس دن اُن کے درمیان کوئی رشتہ نہیں رہے گا اور وہ ایک دوسرے سے سوال نہیں کریں گے)۔

واضح رہے کہ ایک دوسرے سے سوال کرنا چاہے ایک دوسرے کے حالات سے متعلق خبر معلوم کرنا ہو یا دوسرے سے مدد کی التجا ہو، یہ صرف قیامت اور زندگی کے صور میں ہی متصور ہے، عجیب بات یہ ہے کہ بعض مفسرین نے یہاں بھی یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ اس آیت سے مراد ''نفخہ اول'' ہے۔

بہرحال ایک دوسرے سے سوال نہ کرنا، چاہے مندرجہ بالا معنوں میں سے کسی معنی میں بھی ہو، اس لئے ہے کہ اُس دن ہر شخص اپنے آپ میں اتنا مصروف اور گرفتار ہوگا کہ دوسرے کے متعلق کچھ سوچ بھی نہیں سکے گا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا آیت قرآن کی اُن دوسری آیات کے ساتھ کیسے ہم آہنگ رہے جو یہ کہتی ہیں کہ وہ ایک دوسرے سے سوال کریں گے اور مدد کی التجا کریں گے جیسے:

وَاَقۡبَلَ بَعۡضُهُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ يَّتَسَآءَلُوۡنَ ۲۷ ﴿الصافات: ۲۷﴾

اسی طرح سورہ ابراہیم کی آیت ۲۱ میں ارشاد ہوتا ہے:

---

[1] یہ تفسیر المیزان۔ج ۱۹، ص ۳۹۷ پر موجود ہے

وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ﴿ابراهيم: ۲۱﴾

وہ تمام خدا کے سامنے ظاہر ہوں گے، اس دوران کمزور (نادان پیروکار) مستکبروں سے کہیں گے ہم تمہارے پیروکار تھے، کیا تم حاضر ہو ہم پر ہونے والے عذاب الٰہی میں سے کچھ قبول کرلو اور اُسے ہم سے دور کردو۔

اس سوال کا جواب قرآن کی دوسری آیات کو مدنظر رکھتے ہوئے واضح ہوجاتا ہے کہ قیامت کے مختلف مراحل ومواقف ہیں اور ہر مرحلے کی اپنی الگ الگ خصوصیات ہیں، اس بات کی تائید پیغمبر اکرمؐ کی اس حدیث سے ہوتی ہے، جو اس سوال کے جواب کے سلسلے میں آئی ہے:

"ثلاثة مواطن تذهل فيها كل نفس۔ حين يرمى الى كل انسان كتابه۔ وعند الموازين۔ وعلى جسر جهنم۔

تین جگہیں ایسی ہیں جہاں انسان اپنے علاوہ سب کچھ بھول جائے گا:

۱۔ جب اس کا نامہ اعمال اسے دیا جائے گا۔

۲۔ جب اعمال کو تولنے والی میزان کے سامنے پہنچے گا۔

۳۔ اور جب جہنم کے پل پر پہنچے گا۔[۱]

چھٹی اور ساتویں آیت میں "نفحہ دوم" کے متعلق گفتگو ہے، ارشاد ہوتا ہے: "وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ ﴿الكهف: ۹۹﴾" (دنیا کے خاتمے پر ہم اُن کو ایک دوسرے پر موجیں مارتا چھوڑ دیں گے)۔

یہ انسانوں کی تعداد کے زیادہ ہونے یا ان کے زیادہ خوف زدہ اور مضطرب ہونے یا دنیا کے خاتمے پر ایک بدنظمی پیدا ہونے کی وجہ سے ہے، بعض مفسرین نے اس آیت کو سید ذوالقرنین بنانے کے بعد یاجوج ماجوج کی تعداد کی طرف اشارہ سمجھا ہے، (اس سے پہلی آیات کے ساتھ مناسبت کی وجہ سے) لیکن یہ معنی بعد والی آیات کو دیکھتے ہوئے کچھ بعید معلوم ہوتے ہیں۔[۲]، (غور کیجئے گا)

بہرحال آیت کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے: "وَّنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا" (صور میں پھونکا جائے گا اس کے بعد ہم سب کو اکٹھا کریں گے)

بعد والی آیت میں ارشاد ہوتا ہے: "يوم ينفخ في الصور ونحشر المجرمين يومئذ زرقا" (قیامت کا دن وہ دن ہے

---

[۱] روح البیان۔ ج۶، ص ۱۰۷

[۲] یاجوج وماجوج اور سید ذوالقرنین کی داستان تفسیر نمونہ۔ ج ۱۲ (سورہ کہف آیہ ۹۸ کے ذیل) میں تفصیلا بیان کی گئی ہے۔

کہ جب صور میں پھونکا جائے گا اور ہم مجرموں کو اس دن نیلگوں بدن کے ساتھ اکٹھا کریں گے)۔

''زرق'' کی جمع ''ازرق'' ہے اس کے معنی نیلا یا نیلگوں رنگ ہیں، ممکن ہے یہاں یہ مجرموں کے بدن کے نیلگوں ہونے یا اُن کی آنکھوں کے اندھے پن یا شدید پیاس، جو بدن پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتی ہے، کی طرف اشارہ ہو (اس کے لئے یہ تینوں تفسیریں ذکر ہوئی ہیں) پہلے معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں کیونکہ یہ حقیقی معنی ہیں جب کہ دوسرے اور تیسرے معنی استعاراتی معنی ہیں۔

نویں اور دسویں آیت میں بھی نفخہ دوم کی طرف ہی اشارات ملتے ہیں، یعنی زندگی اور قیامت سے متعلق پھونک، ایک جگہ پر ارشاد ہوتا ہے: ''يَّوۡمَ يُنۡفَخُ فِى الصُّوۡرِ فَتَاۡتُوۡنَ اَفۡوَاجًا﴿النبإ: ١٨﴾ ''(قیامت کے دن صور میں پھونکا جائے گا اور تم گروہ گروہ کر کے (میدان محشر میں) آؤ گے۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے: ''وَنُفِخَ فِى الصُّوۡرِ‌ؕ ذٰلِكَ يَوۡمُ الۡوَعِيۡدِ ۲۰ ﴿ق: ٢٠﴾ ''(صور میں پھونکا جائے گا اور یہی وعید کا دن ہے)۔

لوگوں کا اس دن گروہ گروہ ہونا یا تو اس لئے ہے کہ ہر گروہ اپنے پیشوا کے ساتھ میدان حشر میں آئے گا، چاہے وہ پیغمبر ہو یا غیر پیغمبر یا مجرموں کا ہر گروہ جس نے ایک خاص گناہ کیا ہو گا وہ اکٹھا محشور ہو گا، یا یہ کہ ہر امت اپنے پیغمبر کے ساتھ میدان محشر میں وارد ہو گی۔

ہر صورت میں یہ تعبیر سورہ مریم کی آیت ۹۵ کے ساتھ کسی قسم کا تضاد نہیں رکھتی، جو یہ ارشاد فرماتی ہے:

وَكُلُّهُمۡ اٰتِيۡهِ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ فَرۡدًا ۹۵ ﴿مریم: ۹۵﴾

ان میں سے ہر ایک قیامت کے دن تنہا اُس کے حضور آئے گا۔

کیونکہ جیسے پہلے گذر چکا ہے قیامت کے مختلف موقف اور مراحل ہیں، ممکن ہے ابتدا میں گروہ گروہ بن کر لوگ آئیں پھر الگ الگ ہو کر خدا کی عدالت میں حاضری دیں (غور کیجئے گا)۔

''وعید'' راغب اور بعض مفسرین اور ارباب لغت کے بقول عذاب کے وعدہ میں ہے، جب کہ ''وعد'' کا لفظ ثواب اور عقاب دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، آیہ مذکور میں خصوصا ''وعید'' ذکر کرنا جب کہ اس دن تو ثواب اور عقاب دونوں ہوں گے، مجرموں کے لئے ایک تنبیہ کے طور پر ہے۔

گیارہویں اور برہویں آیات میں جو دونوں سورہ یٰسین سے ہیں، ایک عظیم مبارزہ کا ذکر کیا گیا ہے جو اس عالم کے خاتمہ پر ''موت کی چیخ'' کے طور پر، یا قیامت کے آغاز میں ''زندگی کی چیخ'' کے طور پر ہر جگہ پر گونجے گی۔

ایک جگہ پر دنیا کے اختتام پر اٹھنے والی چیخ کی طرف اشارہ ہے، ارشاد ہوتا ہے:

وہ ہمیشہ سوال کرتے ہیں کہ خدا کا یہ وعدہ کب پورا ہو گا؟ وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ یہ کام خدا کے لئے مشکل ہے، نہیں! ایسا ہر گز نہیں ہے، وہ اس کے علاوہ کسی چیز کا انتظار نہیں کرتے کہ ایک آسمانی چیخ بلند ہو اور اچانک سب کو

گھیر لے جب کہ وہ (دنیاوی امور میں) باہم لڑائی جھگڑا کر رہے ہوں۔

مَا يَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً تَاْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُوْنَ ﴿یس: ۴۹﴾

دوسری جگہ دوسری چیخ کی طرف اشارہ ہے، ارشاد ہوتا ہے:

یہ بھی کوئی مشکل بات نہیں ہے، یہ بہت آسان ہے اور جلدی ہونے والی ''وہ ایک چیخ سے زیادہ نہیں، اچانک سب ہمارے سامنے حاضر ہو جائیں گے''۔

اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ﴿۵۳﴾ (یٰس)

''صیحۃ'' راغب کے بقول، جیسا کہ اس نے ''مفردات'' میں ذکر کیا ہے، اصل میں کپڑے یا لکڑی کا اس طرح سے پھٹنا ہے کہ اس کے ساتھ آواز پیدا ہو، پھر یہ کلمہ ہر اونچی آواز اور پکار کے لئے استعمال ہونے لگا، یہ کلمہ کبھی قد کی بلندی کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے کیونکہ ایک لمبا درخت گویا فریاد کر رہا ہوتا ہے اور لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہا ہوتا ہے۔

لیکن ''مقائیس اللغۃ'' نے اس کے اصلی معنی ''بلند آواز'' کئے ہیں اور ''تصیح'' جس کے معنی لکڑی کا پھارنا ہیں، اسے ''مادہ وادی'' سے سمجھا ہے، اس کے مطابق یہ اصل میں ''تصوح'' تھا۔ (غور کیجئے گا)

بہر حال مفسرین نے ''پہلی چیخ'' کو پہلی دفعہ صور میں پھونکنا اور ''دوسری چیخ'' کو دوسری مرتبہ صور میں پھونکنا سمجھا ہے، جب کہ اسی سورت کی آیت ۵۱ میں، جو کہ ان دو آیتوں کے درمیان واقع ہے، واضح طور پر صور پھونکنے اور مردوں کے قبروں سے اٹھنے کی طرف اشارہ موجود ہے، مگر یہ کہا جائے کہ ان دو کے درمیان کسی قسم کا تضاد نہیں ہے کیونکہ دوسری حقیقت میں پہلی ہی کی وضاحت کرتی ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ دوسری مرتبہ پھونکنا اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ ایک عظیم چیخ بلند ہوگی اور تمام لوگ ہمارے حضور پیش ہو جائیں گے۔

یہ تمام تعبیرات اس حقیقت کو بیان کرتی ہیں کہ دنیا کا خاتمہ اور آخرت کا آغاز خدا کے لئے بالکل معمولی سی بات ہے اور مخالفین کا اس سلسلے میں تعجب فضول ہے، صرف ایک بہت بڑی چیخ کے ساتھ سب مر جائیں گے، پھر بوسیدہ ہو کر خاک بن جائیں گے، اور ایک دوسری چیخ کے ساتھ تمام کے تمام ایک نئی زندگی حاصل کر لیں گے اور تیزی کے ساتھ خدا کے حضور پیش ہو جائیں گے۔

تیرھویں اور چودھویں آیت میں ایک بار پھر زندگی اور موت کی دو بلند چیخوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، پہلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

یہ (پیغمبروں کو جھٹلانے والے) اس کے علاوہ کسی چیز کا انتظار نہیں کر رہے کہ ایک چیخ بلند ہو، ایسی چیخ جس سے مفر نہیں (اور وہ سب کو نیست و نابود کر دے گی)'' وما ينظر هو لآء الا صيحة واحدة ما لها

من فواق ‘‘۔

اس آیت کی تفسیر کے سلسلے میں مفسرین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے،بعض لوگوں نے اسے عذاب استیصال (وہی عذاب دنیوی جو کافروں اور ظالموں کو تباہ و برباد کر دیتا ہے جیسے قوم نوح، قوم لوط اور انہی جیسی دوسری قوموں پر نازل ہوا) کی طرف اشارہ سمجھا ہے، جب کہ بعض دوسرے مفسرین کہتے ہیں کہ یہ آیت صور میں پھونکنے کی طرف اشارہ ہے، پہلے معنی اس سے پہلے والی آیات کے ساتھ جو کہ قوم نوح، عاد، ثمود، اور انہی کی طرح کی دوسری اقوام پر نازل ہونے والے عذاب کے متعلق گفتگو کرتی ہیں، زیادہ ہم آہنگ ہیں،لیکن اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ یہ آیت کفار مکہ کے لئے ایک تنبیہ ہے اور سورہ انفال کی آیت ۳۳ میں ہے:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ

جب تک تم ان کے درمیان ہو خدا اُن پر عذاب نازل نہیں کرے گا۔

کے مطابق ان کے لئے عذاب استیصال کا تصور نہیں کیا جا سکتا،لہٰذا اس اعتاب سے دوسرے معنی مناسب تر معلوم ہوتے ہیں (غور کیجئے گا)۔

اس تفسیر کے مطابق کیا یہ آیت پہلی دفعہ صور میں پھونکنے کی طرف اشارہ ہے یا دوسری دفعہ؟ اس سلسلے میں بھی مفسرین کے درمیان اختلاف ہے،لیکن بغیر کسی شک کے آیت کا انداز گفتگو پہلے صور کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے، چونکہ آیت کے ذیل میں ارشاد ہوتا ہے: ’’اس سے کوئی مضر نہیں‘‘ اور ایسا عموماً موت کی پھونک کے لئے کہا جاتا ہے۔

ایک حدیث جو پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے، اس میں بھی اس آیت کو نفخہ اول کے لئے دلیل کے طور پر لایا گیا ہے۔[1]

’’فواق‘‘ دراصل، جیسا کہ بہت سے مفسرین اور اہل لغت نے کہا ہے، اُس فاصلے کے معنی میں ہے جو اونٹنی کے دو مرتبہ دودھ دوہنے کے درمیان ہوتا ہے، اس میں ضمنی طور پر بازگشت کے معنی بھی پائے جاتے ہیں، مریض کے کسی حد تک درست ہونے اور بے ہوش افراد کے ہوش میں آجانے کے لئے جو ’’افاقہ‘‘ کا لفظ استعمال ہوتا ہے، وہ اس لئے ہے کہ وہ تندرستی اور ہوش کی طرف لوٹ آتا ہے، بہر حال مراد یہ ہے کہ دنیا کے خاتمے والی چیخ کسی کو لوٹنے یا بچنے کا موقع نہیں دے گی، تمام چیزیں تھوڑے سے وقت میں ختم ہو جائیں گی، صفحہ الٹ جائے گا اور انسانوں اور گذشتگان کے درمیان ایک ناقابل نفوذ دیوار حائل ہو جائے گی۔

بعد والی آیت میں قیامت کی پکار اور چیخ کی طرف اشارہ ہے، ارشاد ہوتا ہے: اس روز کی چیخ وہ حق کے ساتھ سنیں گے، وہ نکلنے کا دن ہوگا۔ يَّوْمَ يَسْمَعُوْنَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ ۭ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُرُوْجِ ۴۲ ﴿ق: ۴۲﴾

مفسرین اس چیخ کو وہی قیامت کے موقع پر بلند ہونے والی چیخ قرار دیتے ہیں، آیت کی عبارت بھی اس بات پر بخوبی دلالت کر رہی ہے۔ ’’حق سے مراد، جیسا کہ مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں، فخر رازی نے تفسیر کبیر مین اور آلوسی نے روح المعانی میں بیان کیا ہے، ممکن ہے

[1] تفسیر قرطبی، جلد ۸، ص ۵۶۰۱، تفسیر فخر رازی، ج ۲۶، ص ۱۸۳

مردوں کا زندہ ہونا اور مبعوث ہونا ہی ہو، لیکن ظاہر یہ ہے کہ حق یہاں پر اپنے حقیقی معنی میں ہے یعنی ''المیز ان'' کی تعبیر کے مطابق حتمی اور یقینی قضا کے معنی میں ہے، اور قیامت اس کا ایک مصداق ہے، ''یوم الخروج'' کی تعبیر قبروں سے نکلنے والے دن کے لئے لائی گئی ہے۔

رہی یہ بات کہ اس چیخ کو کون سنے گا، روحیں بدنوں میں داخل ہونے سے پہلے، یا یہ کہ چیخ کی آواز پیدا ہونے کے ساتھ ہی بدن زندہ ہو جائیں گے اور ان میں روح پڑ جائے گی اور پھر انسان باقی چیخ کی آواز پیدا ہونے کے ساتھ ہی بدن زندہ ہو جائیں گے اور اُن میں روح پڑ جائے گی اور پھر انسان باقی چیخ کو سنیں گے، جیسا کہ ایک سوئے ہوئے شخص کے سرہانے کھڑے ہو کر بلند آواز سے اُسے بیدار کیا جاتا ہے، اس سلسلے میں مفسرین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے، اگر چہ دوسرے معنی مناسب تر معلوم ہوتے ہیں۔

پندرھویں آیت میں جو ایک نئی تعبیر نظروں سے گزرتی ہے، وہ ''نقو '' ہے ارشاد ہوتا ہے، پس جب نرسنگا میں پھونکا جائے گا تو وہ دن کافروں پر بہت سخت ہوگا۔ فَاِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُوْرِ ﴿٨﴾ فَذٰلِكَ يَوْمَىِٕذٍ يَّوْمٌ عَسِيْرٌ ﴿٩﴾ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ غَيْرُ يَسِيْرٍ ﴿١٠﴾

''نقر'' اہل لغت کے بقول کسی چیز کو کوٹنے کے معنی میں ہے۔ ''منقار'' وہ چیز ہے جس کے ساتھ کوٹا جائے، چونکہ کوٹنے سے آواز پیدا ہوتی ہے اس لئے کبھی یہ کلمہ آواز پیدا کرنے یا آواز پیدا کرنے کے آلہ، یعنی نرسنگا میں پھونکنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

اسی لئے مفسرین کی ایک جماعت نے اس آیت کو ''صور'' پھونکنے کے معنی میں لیا ہے (''نقر'' یعنی پھونکنا اور ''ناقور'' یعنی صور)۔[1]

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ نقر کی تعبیر اس لئے ہے کہ قیامت کے موقع پر نرسنگا کی آواز اس قدر ہیبت ناک ہوگی کہ وہ کان پھاڑ کر مغز میں اُتر جائے گی۔

بہر حال یہ تعبیر ''نفخ دوم'' کی طرف اشارہ ہے اور اس امر پر دلیل وہ آیات ہیں جو اس کے بعد ہیں اور اس دن کافروں کی بری حالت کے متعلق خبر دیتی ہیں، فخر رازی کے بقول اگر مراد ''نفخہ اول'' ہو (جیسا کہ بعض مفسرین نے اس امر کا احتمال ذکر کیا ہے) تو وہ دن تو کافروں کے لئے سخت نہیں ہوگا کیونکہ وہ تو موت اور آزادی کا دن ہے، سخت دن تو قیامت کا ہے کہ زندگی کی چیخ جس کے ساتھ ہے۔[2]

سولھویں آیت میں پھر ایک نئی تعبیر سامنے آتی ہے اور وہ ''صاختہ'' ہے، ارشاد ہوتا ہے: جب صاخہ (یعنی ڈراونی آواز) آئے گی، اس دن انسان اپنے بھائی سے بھی بھاگے گا، ''فاذا اجاءت الصآخة ۔ یوم یفر المرء من اخیه''۔

''صاخة'' ''صخ'' کے مادہ سے ہے، راغب کے بقول یہ ایسی شدید آواز کو کہتے ہیں جو بولنے والے شخص سے بلند ہوتی ہے اور ''مقائیس اللغت '' کے بقول یہ ایک ایسی چیخ ہے جو کان کو بہرہ کر دیتی ہے، بعض مفرسین نے اس کے معنی انسانی سر کو پتھر پر مارنا لئے

---

[1] مجمع البیان، روح المعانی، تفسیر فخر رازی اور تفسیر قرطبی کی طرف زیر بحث آیت کے ذیل میں رجوع کیا جائے

[2] تفسیر رازی۔ ج ۳۵، ص ۱۹۷

ہیں۔اور بعض نے اسے توجہ سے سننے کے معنی میں بھی لیا ہے۔[۱]

بہرحال یہ تعبیر بھی ''صور پھونکنے'' کی طرف اشارہ ہے، وہ بھی دوسری مرتبہ پھونکنا مراد ہے، وہی عظیم چیخ جو بیداری اور زندگی کی چیخ ہو گی، جو تمام لوگوں کو زندہ کر کے میدان محشر کی طرف روانہ کر دے گی، اس دن ہر انسان اپنے آپ میں اس قدر کھویا ہوا ہو گا کہ وہ بھائی، ماں، باپ اور دوستوں سے بھی بھاگتا پھرے گا۔

سترھویں آیت میں ''صور پھونکنے'' کے لئے ایک اور تعبیر لائی گئی ہے، ارشاد ہوتا ہے: ''قارعة'' (یعنی وہ زبردست حادثہ) اور کیا ہے زبردست حادثہ؟ اور تم کیا جانو وہ زبردست حادثہ کیا ہے؟ جس دن لوگ پتنگوں کی طرح بکھرے ہوں گے اور پہاڑ دھنی ہوئی رنگین روئی کی طرح (فضا میں) بکھر جائیں گے جس کے اعمال کا پلڑا اس دن بھاری ہو گا وہ خوشحال زندگی میں ہو گا۔''

اَلْقَارِعَةُمَا الْقَارِعَةُ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُيَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَهُوَ فِيْ

''القارعة'' ''قرع'' (بروزن ''فرع'') کے مادہ سے ہے جو حقیقت میں کسی چیز کو زور کے ساتھ کوٹنے کے معنی میں ہو، جس سے بلند آواز پیدا ہو، اسی لئے ہتھوڑے کو ''مقرعہ'' کہا جاتا ہے۔

ان آیات میں ''قارعہ'' سے کیا مراد ہے، اس سلسلے میں بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ یہ قیامت کا ایک نام ہے کیونکہ جو حوادث قیامت کے وقت واقع ہوں گے وہ ظاہراً بھی سخت اور کوٹنے والے ہوں گے اور دل کو شدید خوف سے ریزہ ریزہ کر دیں گے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ تعبیر اُن تمام واقعات کے لئے ہے جو قیامت میں پہلی دفعہ صور پھونکنے سے لے کر بندوں کے خدا کے دربار میں حاضر ہونے تک رونما ہوں گے۔[۲]

فخر رازی اپنی تفسیر میں بیان کرتے ہیں:

مفسرین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ یہ کلمہ قیامت کے ناموں میں سے ایک نام ہے، پھر انہوں نے یہ نام رکھنے کی وجہ کے طور پر چند امور کا ذکر کیا ہے، مثلاً یہ کہ یہ نام اس نفخۂ اول کی وجہ سے ہے جس کے ساتھ ہی زمین و آسمان میں بسنے والی مخلوق فنا ہو جائے گی۔

دوسرے یہ کہ یہ نام اُس بڑی تباہی کی وجہ سے ہے جو اس وقت اس دنیا کو لاحق ہو گی۔

تیسرے یہ کہ دل پر مختلف قسموں کے خوف اور ڈر طاری ہونے کی وجہ سے ہے۔

---

[۱] تفسیر مجمع البیان، ج ۱۰، ص ۴۴۰، تفسیر کبیر، ج ۳۱، ص ۶۳۔ روح المعانی، ج ۳۰، ص ۴۸ اور تفسیر قرطبی، ج ۱۰، ص ۷۰۱۵ کی طرف رجوع کیا جائے

[۲] روح البیان، ج ۱۰، ص ۴۹۹۔ روح المعانی، ج ۳۰، ص ۲۲۰

چوتھے یہ کہ خدا کے دشمنوں کے عذاب اور ذلت کی چکی میں پسنے کی وجہ سے ہے۔[۱]

لیکن اس کے بعد والی آیات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہ تعبیر عموماً پہلے نفخہ کے لئے ہے جو تمام انسانوں پر خوف طاری کردے گا، پھر تباہی و بربادی لائے گا اور پہاڑوں کو نیست و نابود کردے گا، اس کے ساتھ ہی قیامت کے واقعات کا ذکر ایک فطری انداز سے ہوا ہے۔

بہرحال مذکورہ تعبیر یا تو نفخہ اول کی طرف اشارہ ہے، یا یہ کہ نفخہ اول بھی اس کا ایک حصہ ہے، البتہ یہ امکان کہ یہ تعبیر نفخہ دوم کی طرف اشارہ ہو، آیات کی فطری ترتیب کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا، کیونکہ یہ بہت مشکل ہے کہ ''يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ'' کی آیت دوسرے نفخہ کی طرف اشارہ ہو اور ''وتكون الجبال كالعهن المنفوش'' پہلے نفخہ کی طرف اشارہ ہو (غور کیجئے گا)۔

آخرکار اٹھارہویں اور آخری آیت میں پھر اس حادثے کے سلسلے میں ایک نئی تعبیر لائی گئی ہے، اور وہ ''زجرۃ'' (بہت بڑی چیخ) کی تعبیر ہے۔

جو لوگ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کے سلسلے میں تعجب کا اظہار کرتے تھے اُن کے جواب میں ارشاد ہوتا ہے: (تعجب نہ کرو! یہ مشکل کام نہیں ہے) صرف ایک بلند چیخ اٹھے گی، پھر اچانک سب (قبروں سے اُٹھ کھڑے ہوں گے) حیرانی سے دیکھنے لگیں گے ''فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ فَاِذَا هُمْ يَنْظُرُوْنَ''

''زجرۃ'' حقیقت میں بلند آواز کے ساتھ ہانکنے کے معنی میں ہے، جیسے اونٹ کو ہانکنا، پھر یہ دور پھینکنے کے معنی میں بھی استعمال ہونے لگا، کبھی یہ آواز کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔[۲]

''ینظرون'' ممکن ہے خوف کی زیادتی کی وجہ سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کے معنی میں ہو، یا ایک دوسرے کو دیکھنے کے معنی میں ہو، یا خدا کے آخری حکم کا انتظار کرنے کے لئے ہو، بہرحال آیت کا ظاہر اس امر کی بخوبی وضاحت کررہا ہے کہ یہ ''زندگی کی پھونک'' کی طرف اشارہ ہے جس کے ساتھ ہی مردے قبروں سے اُٹھ کھڑے ہوں گے اور حساب و کتاب کے لئے تیار ہوجائیں گے، اکثر مفسرین نے بھی اس نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

مجموعی طور پر ان تمام آیات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اس دنیا کا خاتمہ اور اس جہان کا آغاز اچانک اور ایک بہت بڑی چیخ کے ساتھ ہوگا، کبھی اس کے لئے ''صيحة'' کی تعبیر لائی گئی ہے تو کبھی ''زجرة'' اور ''صاخة'' کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اور کبھی ''نقر'' کا کلمہ لایا گیا ہے، بہت سی جگہوں پر ''نفخ صور'' کی تعبیر لائی گئی ہے۔

ان آیات میں ظاہری طور پر صور پھونکنے کے سلسلے میں کسی قسم کی توضیح اور تشریح نہیں کی گئی، حقیقت میں یہ آیات قیامت کے باقی

---

[۱] تفسیر فخر رازی، ج ۳۲، ص ۷۰

[۲] مقائیس اللغت اور مفردات راغب کی طرف مادہ ''زجر'' کے ذیل میں رجوع کیا جائے۔

واقعات کی طرح ہمارے لئے فقط ایک اجمالی سی تصویر پیش کرتی ہیں، لیکن جیسا کہ آگے آئے گا، احادیث میں یہ موضوع کچھ وضاحت کے لئے ساتھ بیان ہوا ہے، اگر چہ اس سے بھی پوری طرح صورت حال واضح نہیں ہوتی، یا یہ کہ اس صورت حال کو پوری طرح واضح نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ یہ دوسرے عالم کے رازوں میں سے ایک راز ہے اور اس دنیا میں بسنے والے لوگوں کی عقل اس کی پوری تفصیل جاننے سے عاجز ہے۔

توضیحات

۱۔ ''صور پھونکنا'' یا ''موت وحیات کی پکار'' کیا ہے؟

نفخ، پھونکنے اور صور، جیسے کہ بہت سے ارباب لغت نے کہا ہے، طبل یا سینگ کے معنی میں ہے (کسی جانور کے سینگ کو کھوکھلا کر لیتے ہیں جو کہ نرسنگا کی شکل اختیار کر لیتا ہے، ایک طرف سے اس میں پھونک ماری جاتی ہے اور دوسری طرف سے ایک بلند آواز نکلتی ہے)۔

کیا یہ تعبیر اس جہان کے خاتمہ اور نئی دنیا کے آغاز کے فرمان کے لئے ہے جو خدا کی طرف سے صادر ہوگا اور یہ اس بات کی طرح ہے جیسے انسانوں میں معمول ہے کہ ایک قافلے کو چلانے یا روکنے کے لئے بگل بجایا جاتا ہے تاکہ تمام لوگوں کو معلوم ہوجائے؟ (البتہ قافلے کو روکنے اور چلانے کے وقت بجائے جانے والے بگل کے آہنگ میں فرق ہوتا ہے)۔

اب بھی بعض فوجی چھاونیوں میں یہ طریقہ ہے کہ رات کے وقت خاموش باش کا بگل بجایا جاتا ہے، اور تمام فوجیوں کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ اس کے ساتھ ہی آرام کریں اور صبح کے وقت بیدار باش کا بگل بجایا جاتا ہے جس کے ساتھ ہی تمام لوگ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔[1]

یا یہ کہ یہ تعبیر کسی قسم کے استعاری معنی اپنے دامن میں نہیں رکھتی بلکہ حقیقت میں ہی بگل بجایا جائے گا، لیکن یہ بات واضح ہے کہ وہ کوئی عام بگل نہیں ہوگا، بلکہ ایک عظیم بجلی اور آواز ہوگی جو پوری دنیا میں گونج اُٹھے گی اور تمام موجودات کو ایک لحظہ میں تباہ و برباد کر دے گی، یا تمام لوگوں کو حرکت میں لے آئے گی اور اُن میں زندگی کا سانس پھونک دے گی، یہ احتمال زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے اور آیات کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہے۔

امام علی بن الحسینؑ سے ایک حدیث مروی ہے کہ:

ان الصور قرن عظیم له رائس واحد و طرفان، وبین الطرف الاسفل الذی یلی الارض الی الطرف الاعلی الذی یلی السماء مثل ما بین تخوم الارحنین السابعة الیٰ فوق السماء السابعة. فیه اثقاب بعد دار

[1] یہ احتمال تفسیر ابوالفتوح رازی، ج۹ ص۴۲۱ پر ذکر ہوا ہے۔

واح الخلائق، وسع فمه ما بين السماء والارض۔

یعنی ''صور'' ایک بہت بڑا سینگ ہے جس کا ایک سر اور دو کنارے ہیں، نیچے والا کنارہ جو کہ زمین کی طرف ہے اوپر والے کنارے سے کہ جو آسمان کی طرف ساتویں زمین کی تہہ سے لے کر ساتویں آسمان کی بلندی جتنا فاصلہ رکھتا ہے اس میں مخلوق کی روحوں کی تعداد جتنے سوراخ ہیں اور اس کا منہ زمین و آسمان سے زیادہ کھلا ہے۔[۱]

پیغمبر اکرمؐ سے منقول ایک حدیث اس طرح ہے:

"الصور قرن من نور فيه اثقاب على عدد ارواح العباد

''صور'' ''نور'' کا ایک سینگ ہے جس میں بندوں کی روحوں جتنے سوراخ ہیں۔[۲]

یہ احادیث واضح کرتی ہیں کہ یہ تعبیر ایک بہت اہم بات کی طرف اشارہ ہے جو اس طریقے سے بیان کی گئی ہے، لیکن بعض مفسرین کے کلام میں یہ بات نظر آتی ہے کہ انہوں نے ''صور'' کو ''صورة'' کی جمع سمجھا ہے اور کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ انسانوں کی شکلوں اور جسموں میں پھونکا جائے گا اور وہ زندہ ہو جائیں گے،۔

یہ تفسیر فقط دوسری دفعہ صور پھونکنے کے ساتھ مناسب معلوم ہوتی ہے نہ کہ پہلے نفخہ کے ساتھ، علاوہ ازیں بعض ارباب لغت نے بھی اسے سختی کے ساتھ رد کر دیا ہے۔

ابن منظور نے لسان العرب میں بعض علماء لغت کی یہ بات بیان کی ہے کہ یہ ایک بہت بڑی غلطی اور خدا کے کلام میں تحریف ہے کیونکہ ''صور'' کی جمع قرآن کی دوسری آیت میں ''صور'' (بروزن سخن) کی شکل میں آئی ہے نہ کہ ''صور'' کے شکل میں اور اگر کوئی ''نفخ فی الصور'' کو ''نفخ فی الصوَر'' (واؤ پر زبر) پڑھے تو اس نے گویا خدا پر جھوٹ باندھا ہے اور کتاب خدا میں تحریف کی ہے۔

اس کے علاہ یہ تفسیر گذشتہ روایات کے ساتھ بھی ہمنوا نہیں ہے اسی طرح اُن آیات کے ساتھ بھی ہم آہنگ نہیں ہے، جن میں ''صعقة''، ''زجرة'' اور ''ناقور'' جیسی تعبیرات استعمال میں لائی گئی ہیں۔

یہ بات بعید نہیں کہ یہ تفسیر بیان کرنے والے چونکہ ''صور پھونکنے'' کو بگل بجانے یا سینگ میں پھونکنے کے معنی میں نہ سمجھ سکے ہوں، تو مجبوراً انہوں نے یہ تفسیر بیان کر دی ہو، جب کہ نہ تو ''صور'' ایک عام ''بگل ہوگا اور نہ ''نفخ'' ہمارے پھونکنے کی طرح ہوگا۔

بہر حال مذکورہ تینوں تفسیروں میں سے دوسری تفسیر زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے اور یہی آیات کے ظاہر کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہے، یہ تفسیر صور پھونکنے کی ایک اجمالی صورت ہمارے لئے بیان کرتی ہے، اگر چہ ہم اس کی پوری طرح وضاحت کرنے سے عاجز ہیں۔

---

[۱] لئالی الاخبار، ج ۵، ص ۵۳ (نیا ایڈیشن، مکتبہ العلامہ)۔
[۲] علم الیقین، ص ۸۹۲۔

۲۔انسان اور باقی موجودات پر صوتی لہروں کے اثرات:

ہم جانتے ہیں کہ ”آواز“ اُن لہروں کا ایک حصہ ہے جو ہوا، پانی یا ٹھوس چیزوں میں پیدا ہوتی ہیں، انسانی کان تک جو کچھ پہنچتا ہے وہ ایسی آوازیں ہیں جن کی لہروں کی رفتار ایک سیکنڈ میں کم از کم بیس مرتبہ اور زیادہ سے زیادہ بیس ہزار مرتبہ ہے لیکن ایسی مخلوقات بھی ہیں جو اس سے بھی تیز لہروں کو سننے کی صلاحیت رکھتی ہیں، جانوروں میں چمگادڑ ایسی آوازوں کو بھی سن لیتی ہے جن کی رفتار ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ پینتالیس ہزار مرتبہ سے بھی زیادہ ہو۔[۱]

یہ جو بات مشہور ہے کہ حیوان انسان سے پہلے زلزلے کے آنے سے مطلع ہو جاتے ہیں یہ بھی شاید اس وجہ سے ہو کہ وہ زلزلے سے پیدا ہونے والی ان لہروں کو پہلے محسوس کر لیتے ہیں جنہیں انسان محسوس نہیں کر سکتا۔

یہ بھی واضح ہے کہ کبھی یہ تیز لہریں تمام چیزوں کو نابود کر دیتی ہیں، بموں اور دھاکہ خیز مواد اثرات انسانی جسموں اور عمارتوں پر بھی انہی شدید لہروں کی بدولت ہوتے ہیں جنہیں امواج انفجار (یا دھماکے کی لہریں) کہا جاتا ہے، یہ ایک لحمہ کے اندر ہر قسم کی رکاوٹ کو تباہ کر دیتی ہیں اور کبھی تو انسان یا کسی عمارت کے بالکل پرزے پرزے کر دیتی ہیں، الٰہذا یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے کہ قیامت کی چیخ ایک مختصر سے لمحے میں انسانوں کو فنا اور پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر دے۔

حضرت علیؑ نے نہج البلاغہ میں کیا خوبصورت جملہ فرمایا ہے:

”وینفخ فی الصور فتزهق کل مهجة وتبکم کل لهجة وتذل الشم الشوامخ۔ والصم الرواسخ فیصیر صلدها سرابا رقرقا۔ ومعهدها قاعا سملقا“۔

صور پھونکا جائے گا، اس کے ساتھ ہی دلوں کی دھڑکن بند ہو جائے گی، زبانیں گنگ ہو جائیں گی، بلند و بالا پہاڑ اور سخت پتھر آپس میں ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گے، اُن کی زمین ایسی ہموار اور برابر ہو جائے گی جیسے اس پر کبھی کوئی پہاڑ تھا ہی نہیں۔[۲]

البتہ یہ باتیں موت کی پھونک سے متعلق ہیں اور زندگی کی پھونک قطعی طور پر ایک الگ چیز ہے، وہ تو ایک زندگی بخش آواز ہے جو قافلہ حیات کو رواں دواں، متحرک کر دے گی، اس سے متعلق بھی ہماری معلومات بالکل کم ہیں جیسا کہ قیامت کے باقی امور کے متعلق بھی واضح طور پر کم ہیں۔

---

[۱] کتاب صوت، ص ۵۷، کتاب نجوم برای ہمہ، ص ۹۰ کی طرف رجوع کیا جائے۔

[۲] نہج البالاغہ۔خطبہ، ص ۱۹۵۔

۳۔ ''نفخِ صُور'' کے بارے میں چند سوالوں کے جوابات

۱۔ کیا صُور صرف دو مرتبہ پُھونکا جائے گا؟

قرآنی آیات میں دو دفعہ صُور پھونکنے (موت کی پھونک اور زندگی کی پھونک) کے بارے میں واضح طور پر گفتگو کی گئی ہے، گذشتہ آیات میں اس امر کا بخوبی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے، لیکن بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ''صور'' تین مرتبہ پھونکا جائے گا، ان روایات میں قرآنی آیات سے بھی استدلال کیا گیا ہے۔

دیلمی مرحوم کی لئالی الاخبار اور ارشاد القلوب میں ایک حدیث اس طرح نقل کی گئی ہے:

اسرافیل تین دفعہ پھونکے گا ''نفخہ فزع'' ''نفخئہ موت'' اور نفخہ بعث----------

دنیا کے خاتمے پر اسرافیل زمین پر آئے گا اور پہلی مرتبہ صور پھونکے گا جو ڈر اور خوف کا باعث بنے گا جیسے ارشاد خداوندی ہے:

وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ۭ وَكُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ ۸۷ ﴿النمل: ۸۷﴾

اس دوران زمین ایک بہت بڑے زلزلے کی زد میں آجائے گی اور انسان مدہوش افراد کی طرح حیران و پریشان ادھر اُدھر دوڑنے لگیں گے، اس کے بعد ''نفخۂ صعق'' (موت کی پھونک) ہوگی جیسے قرآن نے فرمایا ہے:

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ

اس کے بعد زندگی کی پھونک ماری جائے گی جیسے ارشاد خداوندی ہے:

ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ۶۸ ﴿الزمر: ۶۸﴾ [۱]

بعض نے چوتھی مرتبہ پھونکنے کا بھی اضافہ کیا ہے اور وہ اکٹھے ہونے اور خدا کے حضور حاضر ہونے کی پھونک ہے۔

اُسے ظاہراً سورہ یٰسین کی آیت ۵۳ سے سمجھا گیا ہے:

---

[۱] لئالی الاخبار، ج ۵، ص ۵۴ (اختصار کے ساتھ) مذکورہ تینوں آیات کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

اِنۡ كَانَتۡ اِلَّا صَيۡحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمۡ جَمِيۡعٌ لَّدَيۡنَا مُحۡضَرُوۡنَ﴿۵۳﴾

لیکن حقیقت میں وہی دو پھونک وسعت اختیار کر کے چار پھونکوں میں تبدیل ہوگئی ہیں ، کیونکہ ہر طرف خوف ووحشت کا پھیل جانا اہل دنیا کی موت کے لئے ایک تمہید ہوگی جس کے بعد پہلی پھونک ماری جائے گی جب کہ اکٹھا کرنا بھی اسی زندگی کی پھونک کی ایک کڑی ہے۔

اس بات کی تائید سورہ نازعات کی آیت ۶، ۷ سے ہوتی ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

يَوۡمَ تَرۡجُفُ الرَّاجِفَةُ تَتۡبَعُهَا الرَّادِفَةُ

جب سخت زلزلہ ہر ہر جگہ کو ہلا کر رکھ دے گا اور اس کے بعد ایک ایسا زلزلہ وقوع پذیر ہوگا جو بندوں کو ایک صف میں میدان محشر میں حاضر کردے گا۔(غور کیجئے گا)

۲۔کون سا فرشتہ صور پھونکے گا؟

احادیث میں آیا ہے کہ یہ فرشتہ اسرافیل ہے،بعض علماء کے رائے ہے کہ اسرافیل سریانی زبان میں خدا کے بندے کو کہتے ہیں۔[۱]

امام سجاد علی بن الحسینؑ سے منقول ایک حدیث میں اس طرح ہے:

خدا اسرافیل کو حکم دے گا کہ وہ دنیا میں جائے اور وہی صور پھونکے گا۔[۲]

بعض روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خدا کا مقرب ترین فرشتہ ہے۔[۳]

وہ سب سے پہلے آدمؑ کو سجدہ کرنے والا فرشتہ ہے۔[۴]

اصلی طور پر اس کے ہاتھ میں موت اور حیات کے سانس کا پھونکنا ہونا اس کی عظمت کی علامت ہے۔

لیکن امام علیؑ بن الحسینؑ سے مروی ایک حدیث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ:

موت کی پھونک اسرافیل کی طرف سے ہوگی، اس کے بعد خود اسرافیل پر موت طاری ہو جائے گی اور زندگی کا نفخہ خدا کی طرف سے ہوگا۔[۵]

---

[۱] لغت نامہ دھخدا، ج۶، مادہ اسرافیل۔

[۲] بحارالانوار۔ج۶،ص ۳۲۴،حدیث ۲۔

[۳] سفینۃ البحار۔ج۱،ص۶۱۶،(مادہ سرف

[۴] لغت نامہ دھخدا۔(مادہ اسرافیل)۔

[۵] نورالثقلین۔ج۴،ص ۵۰۲،حدیث ۱۱۶۔

۳۔نفخوں کے درمیان کا عرصہ:

قرآنی آیات سے اجمالی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ موت کی پھونک اور زندگی کی پھونک کے درمیان کچھ فاصلہ ہوگا، (ثُم کی تعبیر جو سورہ زمر کی آیت ۶۸ میں آئی ہے اس بات کی نشاندہی کرتی ہے) لیکن یہ عرصہ کتنا ہوگا، قرآنی آیات سے اس سلسلے میں کوئی بات واضح نہیں ہوتی ،البتہ بعض روایات میں آیا ہے کہ یہ عرصہ چالیس سال ہے:

ان مابین النفختین اربعون سنة

کیا یہ سال اس دنیا کے سالوں کی مانند ہوں گے یا قیامت کے دنوں اور سالوں کی مانند جس کا ہر دن پچاس ہزار سال کے برابر ہے؟ یہ بات بھی ہمارے لئے واضح نہیں ہے، بہر حال اس عرصے کے دوران اس عالم ہستی میں بہت بڑی تبدیلیاں رونما ہوں گی، انسانوں کو پھر بسانے کے لئے ایک نئی دنیا آباد کی جائے گی، پس اس عرصے اور وقفے کے دوران پوری کائنات میں خدا کی ذات کے علاوہ کوئی موجود زندہ نہیں رہے گا۔

سورہ نمل کی آیت ۱۸۷ اور سورہ زمر کی آیت ۶۸ میں جو استثنائیہ جملہ ''الا من شاء الله'' آیا ہے، اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ کچھ موجودات موت سے بچ جائیں گی بلکہ مراد یہ ہے کہ اُن کی موت کچھ تاخیر سے واقع ہوگی، اس بات کی گواہی یہ جملہ دے رہا ہے:

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ

یہ جملہ قرآن کی تین آیات میں آیا ہے۔[1]

یہ بات قابل غور ہے کہ ''نفس'' ایک وسیع مفہوم کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے جو تمام زندہ موجودات پر محیط ہے۔

البتہ یہ سوال کہ کن کا استثناء ہوا ہے، اس سلسلے میں مفسرین نے مختلف احتمالات کو ذکر کیا ہے بعض نے کہا ہے کہ بعض مقرب فرشتے مثلاً اسرافیل، جبرائیل، میکائیل اور عزرائیل مراد ہیں، بعض نے عرش کو اٹھانے والے فرشتوں کا بھی اضافہ کیا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد شہداء کی روحیں ہیں (جو ابدان مثالی میں ہوں گی) بعض نے جنت اور دوزخ کے داروغاؤں کا ذکر کیا ہے۔

امام علیؑ بن الحسینؑ سے مروی ایک حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہلی چیخ کے وقت ''اسرافیل'' کے علاوہ جو صور پھونک رہا ہوگا، سب مر جائیں گے، پھر وہ بھی خدا کے حکم سے مرجائے گا۔

---

[1] آل عمران، ۱۸۵۔ انبیاء، ۳۵۔ عنکبوت، ۵۷۔

۴۔ صور پھُونکنے کی حکمت:

اگر چہ صور پھونکنے کی حقیقت ہمارے لئے پوری طرح واضح نہیں ہے تاہم تربیتی لحاظ سے اس کا فلسفہ اور حکمت ہماری نظروں سے پوشیدہ نہیں ہے ، ہمارے لئے قابل غور بات بھی ان عقائد حقہ کے تربیتی آثار ہی ہیں۔ اولا تو صور پھونکنا یہ حقیقت بیان کرتا ہے کہ اس عالم کے موجودات کی زندگی اور موت کا کام خدا کے لئے کچھ مشکل نہیں ہے، فقط ایک عالم گیر اور پراسرار چیخ کے ذریعہ پوری مخلوق مر جائے گی، اور دوبارہ ایک بلند و پراسرار آواز کے ذریعہ تمام زندہ ہو جائیں گے، گویا کچھ ایسے سوئے ہوئے لوگ ہیں جو اس بیدار باش کی آواز کے ساتھ بیدار ہو جائیں گے۔

حقیقت میں یہ ان لوگوں کا جواب ہے جو قیامت کے سلسلے میں شک اور تردد کا شکار تھے، اُسے ایک مشکل اور ناممکن کام سمجھتے تھے اور ہمیشہ پیغمبر اسلامؐ پر اعتراض کرتے تھے۔

دوسرے یہ کہ یہ پوری دنیا کے انسانوں کے لئے ایک خطرے کی گھنٹی ہے کہ وہ اس زندگی کو پائیدار و جاوداں نہ سمجھیں، کسی قسم کے غرور یا غفلت میں مبتلا نہ ہوں اور ہر وقت موت کا نقارہ بجنے کے منتظر رہیں، جب موت کا اعلان ہوگا تو وہ وادی عدم کی طرف کوچ کر جائیں گے، ان کی تمام خواہشات اور امیدیں موت کے شکنجے میں جکڑی جائیں گی۔

تیسرے یہ ہے کہ صور پھونکنا، اس عالم کا خاتمہ اور ایک نئی دنیا کا آغاز بھی انسانوں کو ایک عمیق تربیتی درس دیتا ہے کہ وہ ہر حالت میں اس طرح کے واقعے کے منتظر رہیں، آج کے کام اور ذمہ داری کو کل پر نہ ٹالیں کیونکہ اس ناگہانی حادثہ کے لئے کوئی تاریخ معین نہیں ہے اور یہ کسی پیش خیمے کے بغیر ہی وقوع پذیر ہوگا۔

امام علیؑ بن الحسینؑ سے مروی ایک حدیث میں صور پھونکنے سے متعلق پوری تفصیل کے بعد یوں مرقوم ہے کہ راوی کہتا ہے: جب امام کی بات اس مقام تک پہنچی:

"رایت علی بن الحسین یبکی عند ذٰلك بكاء شديدا"

تو امام کو میں نے اس حالت میں دیکھا کہ آپؑ شدید گریہ فرما رہے ہیں (اور دنیا کے اچانک خاتمہ، قیامت کی آمد اور خدا کے دربار میں حاضر ہونے کے متعلق سخت پریشان ہیں) [1]

---

[1] تفسیر علی بن ابراہیم۔ زمر، آیہ ۶۸ کے ذیل میں، ج ۲ ص ۲۵۳۔ بحار الانوار۔ جلد ۶ ص ۳۲۴، حدیث ۲۔

اعمال نامہ

اشارہ:

قرآن کی آیات میں نامہ اعمال کے متعلق مفصل گفتگو کی گئی ہے اور اس سلسلے میں مختلف ومتنوع قسم کی عبارات وتعبیرات ذکر کی گئی ہیں۔

ان میں سے بہت سی آیات میں کتاب کی تعبیر لائی گئی ہے جو ایک وسیع مفہوم کی حامل ہے اور نامہ اعمال وکتاب دونوں پر محیط ہے۔

بعض دوسری آیات میں ''زبر'' کی تعبیر لائی گئی ہے جو کہ ''زبور'' کی جمع ہے، اس کا مفہوم بھی کتاب کے نزدیک نزدیک ہے۔

بعض دیگر آیات میں طائر کی تعبیر لائی گئی ہے جس کے معنی پرندہ ہیں، پرندوں سے عرب فال لیتے تھے اور اپنی قسمت کو ان کے ساتھ وابستہ سمجھتے تھے، قرآن اس تعبیر کے ذریعہ کہہ رہا ہے کہ تمہاری خوش بختی یا بدبختی کا پرندہ تمہارا یہی نامہ اعمال ہے۔

بعض آیات میں فقط نامہ اعمال لکھنے والوں کا تذکرہ ہے، انہیں ''رقیب''، ''عتید'' یا ''خدا کے پیغام رساں'' یا ''کراماً'' یا ''متلقیان'' کے ناموں سے یاد کیا گیا ہے، ان میں سے ہر نام اپنے ساتھ ایک مخصوص پیغام لئے ہوئے ہے (غور کیجئے گا)۔

نامہ اعمال کیا ہے؟ کیا ہر شخص کا ایک ہی نامہ عمل ہوگا یا زیادہ؟ نامہ اعمال لکھنے والے کون ہیں؟ وہ کیسے لکھا جاتا ہے؟ کس طرح انسان کے دائیں اور بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا؟ یہ سب مختلف سوالات ہیں جن کا جواب اس سلسلے میں وارد ہونے والی آیات کی تفسیر کے بعد دیا جائے گا۔

لیکن یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ یہاں بھی ان آیات کا تربیتی پیغام اور ان سے متعلق اخلاقی مسائل پہلے درجہ کی اہمیت کے حامل ہیں۔

اس مختصر سے اشارے کے ساتھ ہی ہم قرآن کی طرف پلٹتے ہیں اور اس موضوع سے مربوط آیات کا مطالعہ کرتے ہیں:

۱۔ اِنَّا نَحۡنُ نُحۡیِ الۡمَوۡتٰی وَنَکۡتُبُ مَا قَدَّمُوۡا وَاٰثَارَهُمۡ ؕ وَکُلَّ شَیۡءٍ اَحۡصَیۡنٰهُ فِیۡۤ اِمَامٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۱۲﴾ (یس: ۱۲)

۲۔ وَوُضِعَ الۡکِتٰبُ فَتَرَی الۡمُجۡرِمِیۡنَ مُشۡفِقِیۡنَ مِمَّا فِیۡهِ وَیَقُوۡلُوۡنَ یٰوَیۡلَتَنَا مَالِ هٰذَا الۡکِتٰبِ لَا یُغَادِرُ صَغِیۡرَةً وَّلَا کَبِیۡرَةً اِلَّاۤ اَحۡصٰهَا (الکهف: ۴۹)

۳۔ اَمۡ یَحۡسَبُوۡنَ اَنَّا لَا نَسۡمَعُ سِرَّهُمۡ وَنَجۡوٰهُمۡ ؕ بَلٰی وَرُسُلُنَا لَدَیۡهِمۡ

يَكْتُبُوْنَ۸۰ ﴿الزخرف:۸۰﴾

۴۔ وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً۰ۣ كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰٓى اِلٰى كِتٰبِهَا۰ۭ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۲۸ ﴿الجاثية:۲۸﴾

۵۔ وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰۗىِٕرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ۰ۭ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا اِقْرَاْ كِتٰبَكَ۰ۭ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا۱۴

۲ ال اِسراء:۱۴

۶۔ وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوْهُ فِي الزُّبُرِ وَكُلُّ صَغِيْرٍ وَّكَبِيْرٍ مُّسْتَطَرٌ ﴿القمر:۵۲﴾

۷۔ وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ كِتٰبًا۲۹ ﴿النبا:۲۹﴾

۸۔ كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ...... كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ۱۸

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ۱۹ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ۲۰ يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ۲۱

۲ المطففین:۸

۹۔ اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ﴿ق:۱۸﴾

۱۰۔ وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ

۲ ال اِنفطار:۱۰۔۱۲

۱۱۔ فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ۰ۙ فَيَقُوْلُ هَاۗؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ فَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُوْتَ كِتٰبِيَهْ وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ۲۶ (حاقه:۱۹۔۲۵۔۲۶)

۱۲۔ فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا وَّيَنْقَلِبُ

اِلٰٓی اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ فَسَوْفَ یَدْعُوْا ثُبُوْرًا وَّیَصْلٰی سَعِیْرًا (انشقاق۔۷تا۱۲)

۱۳۔ فَاَصْحٰبُ الْمَیْمَنَةِ مَآ اَصْحٰبُ الْمَیْمَنَةِ وَاَصْحٰبُ الْمَشْــَٔمَةِ مَآ اَصْحٰبُ الْمَشْــَٔمَةِ (واقعہ:۸۔۹)

۱۴۔ وَاَصْحٰبُ الْیَمِیْنِ مَآ اَصْحٰبُ الْیَمِیْنِ فِیْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ وَاَصْحٰبُ الشِّمَالِ مَآ اَصْحٰبُ الشِّمَالِ فِیْ سَمُوْمٍ وَّحَمِیْمٍ (واقعہ:۲۷۔۲۸۔۴۱۔۴۲)

۱۵۔ وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ (التکویر: ۱۴)

ترجمہ:

۱۔ یقیناً ہم مُردوں کو زندہ کرتے ہیں اور جو کچھ انہوں نے آگے بھیجا اور (جو کچھ اُن کے) پیچھے ہے ہم لکھتے جاتے ہیں اور ہم نے ہر چیز کو امام مبین میں جمع کر رکھا ہے۔

۲۔ اعمال نامے پیش کئے جائیں گے، پھر تم اس وقت مجرموں کو دیکھو گے کہ جو کچھ اس میں (درج) ہوگا، اس سے وہ ڈر رہے ہوں گے اور کہیں گے: ہم پر وائے! یہ کیسا اعمال نامہ ہے جو نہ چھوٹی بات کو چھوڑتا ہے نہ بڑی کو۔

۳۔ کیا وہ گمان کرتے ہیں کہ ہم ان کی راز کی باتوں اور ان کی سرگوشیوں کو نہیں سنتے؟ ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) تو اُن کے پاس ہیں اور وہ لکھتے رہتے ہیں۔

۴۔ اور تو ہر امت کو (خوف اور ڈر کی وجہ سے) دیکھے گا کہ زانو ٹیک دے گی، ہر امت اپنے نوشتہ کی طرف بلائی جائے گی، یہ ہمارا نوشتہ ہے جو تمہارے خلاف حق کے ساتھ بولتا ہے (اور تمہارے اعمال کو بیان کرتا ہے) جو کچھ تم کرتے تھے ہم اُسے لکھتے جاتے ہیں۔

۵۔ اور ہم نے ہر انسان کے اعمال کو اس کے گلے میں لٹکا رکھا ہے اور ہم قیامت کے دن اس کے لئے ایک نوشتہ نکالیں گے جسے وہ اپنے سامنے پھیلا ہوا پائے گا (یہ اُس کا وہی اعمال نامہ ہوگا اور ہم اس سے کہیں گے) تو اپنا نوشتہ پڑھ لے، کافی ہے کہ آج کے دن تو اپنی ذات کا حساب لینے والا خود ہی ہو۔

٦۔ ہر وہ کام جو انہوں نے کیا، ان کے نامہ اعمال میں درج ہے اور ہر چھوٹا اور بڑا عمل لکھا جاتا ہے۔

۷۔ ہم نے ہر چیز کو جمع اور درج کر رکھا ہے۔

۸۔ ایسا نہیں ہے (جیسا کہ وہ قیامت کے متعلق خیال کرتے ہیں) یقیناً بروں کا اعمال نامہ سجین میں ہے، تم کیا جانو کہ سجین کیا ہے؟ وہ لکھی ہوئی دستاویز ہے اور یقینی ہے۔۔۔۔ ایسا نہیں ہے جیسا (قیامت کے متعلق) وہ سوچتے ہیں، بلکہ نیک لوگوں کا نامہ اعمال علیین میں ہے، اور تم کیا جانو کہ علیین کیا ہے؟ وہ ایک نوشتہ ہے! اور حتمی نتیجہ، مقربین جس کے گواہ ہیں،۔

۹۔ توجہ رکھو کہ دائیں اور بائیں دو فرشتے جو انسان کے نگران ہیں، اس کے اعمال کو لکھتے ہیں، انسان جو بات بھی کرتا ہے اس کے پاس ایک فرشتہ اس کو لکھنے کے لئے مامور ہے۔

۱۰۔ بے شک تم پر نگہبان مقرر کئے گئے ہیں، جن کا مقام بلند ہے اور وہ لکھنے والے ہیں، (تمہارے برے اور اچھے اعمال کو) تم جو کچھ کرتے ہو وہ جانتے ہیں۔

۱۱۔ جس کا نامہ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں ہے (وہ خوشی اور اعزاز کے ساتھ) پکارے گا کہ (اے اہل محشر!) میرا اعمال نامہ پکڑو اور پڑھو، لیکن جس کا اعمال نامہ اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، وہ کہے گا! اے کاش! مجھے میرا نامہ اعمال نہ دیا جاتا اور مجھے معلوم نہ ہوتا کہ میرا حساب کیا ہے۔

۱۲۔ جس کا نامہ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، جلد ہی اُس کا حساب آسانی سے ہو جائے گا اور وہ خوشی خوشی اپنے خاندان کی طرف چلا جائے گا، لیکن جس کا نامہ اعمال اس کی پیٹھ کے پیچھے سے دیا جائے گا اور جلد ہی اُس کی فریاد بلند ہوگی، وائے ہو مجھ پر کہ میں ہلاک ہو گیا اور وہ دوزخ کی جلتی ہوئی آگ میں داخل ہوگا۔

۱۳۔ (پہلا گروہ) ''اصحاب میمنہ'' کا ہے، کیا ہیں اصحاب میمنہ؟ اور دوسرے اصحاب مشئمہ ہیں اا ور کیا ہیں اصحاب مشئمہ؟

۱۴۔ اور دائیں ہاتھ والے، کیا (اچھا نصیب ہے) دائیں ہاتھ والوں کا! وہ بغیر کانٹوں کی جھکی بیریوں میں ہوں گے۔۔۔۔۔ اور بائیں ہاتھ والے (کیا برا نصیب ہے) بائیں ہاتھ والوں کا (کہ اُن کے بائیں ہاتھ میں اعمال نامے کا ہونا اُن کے مجرم ہونے کی علامت ہوگا) وہ زہریلی گرم ہوا اور کھولتے ہوئے پانی کے درمیان ہوں گے۔

۱۵۔ جب نامہ اعمال کو کھولا جائے گا، اس وقت ہر شخص جان لے گا کہ اس نے کیا عمل کیا ہے!۔

تفسیر وجمع بندی آیات

اعمال نامہ

پہلی آیت میں موت کے بعد زندہ ہونے اور اعمال نامے کے متعلق گفتگو کی گئی ہے، ایسا نامہ اعمال خدا کے قادر ہاتھ سے لکھا جائے گا انسانوں کے تمام اعمال اس میں اکٹھے لکھ دے جائیں گے، اسے امام ''مبین'' کے نام سے یاد کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: ہم ہیں جو مردوں کو زندہ کریں گے اور جو کچھ انہوں نے آگے بھیجا ہے اور ان کے تمام آثار کو لکھیں گے اور تمام چیزیں کو ہم نے کتاب مبین میں جمع کر دیا ہے ''انا نحن نحی الموتی و نکتب ما قدموا و اثارھم و کل شئی احصینہ فی امام مبین''

سوال یہ ہے کہ آثار سے کیا مراد ہے؟ بعض نے تو یہ کہا ہے کہ ''ما قدموا'' ان اعمال کی طرف اشارہ ہے جو انسان انجام دیتا ہے اور ''اثارھم'' اُن عادتوں کی طرف اشارہ ہے جنہیں وہ پیچھے چھوڑ کر جاتا ہے یا نیکی اور صدقات جاریہ کی طرف اشارہ ہے کوئی فلاحی مرکز قائم کرنا، اوقاف، علمی اور اخلاقی کتابیں تحریر کرنا وغیرہ۔

بعض نے کہا ہے کہ ''ما قدموا'' اچھے اور برے کاموں کی طرف اشارہ ہے جب کہ ''اثار'' ان قدموں کی طرف اشارہ ہے جو یہ کام سرانجام دینے کے لئے اٹھائے جاتے ہیں، قدم کو اس لحاظ سے اثر کہا گیا ہے کہ یہ زمین پر اپنا اثر چھوڑتے ہیں، بالخصوص نرم زمین پر۔

اس آیت کی شان نزول کے سلسلے میں مروی ایک حدیث میں ہے:

انصار کی ایک جماعت (قبیلہ بنی سلمہ) کے گھر مسجد النبوی سے دور تھے، انہوں نے نبیؐ سے اس سلسلے میں شکایت کی کہ اُن کے لئے نماز جماعت میں شریک ہونا مشکل ہے، لہٰذا آیت نازل ہوئی اور انہیں یہ نوید دی کہ وہ اس راہ میں جو قدم بھی اٹھائیں گے اس کا ثواب لکھا جائے گا۔[۱]

''امام مبین'' سے مراد بہت سے مفسرین کے بقول ''لوح محفوظ'' ہے، جس میں تمام حقائق کو لکھ دیا گیا ہے، لہٰذا اس تعبیر سے یہ مطلب سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک مخصوص نامہ اعمال کے ساتھ ساتھ ایک عمومی نامہ اعمال بھی ہوگا جس میں تمام انسانوں کے اعمال درج ہوں گے، اس بات کی مزید وضاحت ''نامہ اعمال کی تعداد'' کے زیر عنوان بحث میں آئے گی۔[۲]

''مبین'' کی تعبیر لوح محفوظ اور نامہ اعمال کے بالکل واضح اور روشن ہونے کی طرف اشارہ ہے جس میں انسان کے تمام کام بالکل

---

[۱] مجمع البیان۔ ج ۸ ص ۴۱۸، تفسیر رازی۔ ج ۲۶ ص ۴۹، تفسیر قرطبی ج ۸ ص ۵۴، ۵۶۔

[۲] لوح محفوظ کے سلسلے میں تفسیر نمونہ، ج ۲۶، سورہ بروج ۲۲ کے ذیل میں بحث کی گئی ہے۔

وضاحت سے درج ہوں گے اور نیک و بد کوئی چیز لکھنے سے رہ نہ گئی ہوگی۔

بہت سی روایات میں آیا ہے کہ ''امام مبین'' سے مراد امام معصوم ہے جو خدا کے حکم اور پیغمبر کے سکھائے ہوئے علم کے ذریعہ تمام حقائق کو بیان کرتا ہے۔

اس سلسلے میں تفسیر علی بن ابراہیم میں امیر المومنین حضرت علیؑ سے منقول ایک حدیث اس طرح ہے:

انا واللہ الامام المبین۔ ابین الحق من الباطل وورثته من رسول اللہ

اللہ کی قسم! میں امام مبین ہوں، جو حق کو باطل سے جدا کرتا ہوں اور یہ میرے پاس رسول اکرمؐ کی میراث ہے۔[1]

مذکورہ بالا تمام تفسیروں سے مراد یہ ہے کہ ''امام مبین'' کی تعبیر ایک وسیع مفہوم کی حامل ہے جیسا کہ اس کا ظاہر اُس نامہ اعمال کی طرف اشارہ کرتا ہے جس میں انسانوں کے تمام اعمال درج ہوں گے، اس کا باطن امام معصوم کی طرف اشارہ ہے، جو اپنے اُس فراوان علم کے ذریعے، جو اُسے پیغمبرؐ سے وراثت میں ملا ہے، حق کو باطل سے جدا کرتا ہے۔

دوسری آیت بھی اسی معنی کو زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کرتی ہے، ارشاد ہوتا ہے: قیامت کے دن نوشتہ (انسانوں کے تمام اعمال پر مشتمل خدا کی عدالت میں) رکھا جائے گا اور گنہگاروں کو دیکھو گے کہ جو کچھ اس میں ہے اس سے بہت خوف زدہ ہیں اور کہتے ہیں: افسوس ہم پر! یہ کیسی کتاب ہے جس میں ہر بڑا اور چھوٹا کام درج ہے: ''ووضع الکتاب فتری المجرمین مشفقین مما فیه ویقولون یویلتنا مال هذا الکتب لا یغادر صغیرة ولا کبیرة الا احصها''۔

کیا اس نوشتہ سے مراد انسانوں کا وہ عمومی نامہ اعمال ہے جس کی طرف پہلی آیت میں بھی اشارہ ہوا ہے؟ یا ہر امت کا عمومی نامہ اعمال ہے؟ یا وہ خصوصی اور انفرادی نامہ اعمال ہے جو ہر انسان کے ساتھ ہوگا (اور جس کے متعلق گفتگو انشاءاللہ آگے چل کر کی جائے گی، ان تینوں قسم کے اعمال ناموں کا ذکر قرآن کی مختلف آیات میں ہوا ہے)۔ اس آیت کی تفسیر میں تینوں مذکورہ احتمال ممکن ہیں، گرچہ ''کتاب'' کا لفظ جو بطور مفرد ذکر ہوا ہے، انسانوں کے عمومی نامہ اعمال کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے۔

ضمناً اس آیت سے یہ بات بھی بخوبی سمجھی جاسکتی ہے کہ اس اعمال نامے میں ہر چھوٹے اور بڑے انسان کا چھوٹے سے چھوٹا عمل بھی، چاہے وہ برا ہو یا اچھا، لکھا ہوا ہوگا، یہاں تک کہ جس کا یہ نامہ عمل ہوگا وہ اسے دیکھ کر خوف زدہ ہوجائے گا، ان کے اس خوف کا سبب ایک طرف تو ان اعمال کی وجہ سے اُن کا خدا کی عدالت میں حاضر ہونا ہے اور دوسری طرف یہ کہ وہ ان میں سے بہت سے کاموں کو بھلا بیٹھے ہوں گے، یا ان کے لئے وہ کسی اہمیت کے قائل نہ ہوں گے لیکن اب وہ ان تمام کاموں کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھیں گے اور لوگوں کے سامنے بھی ذلیل وخوار ہوں گے۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ''لا یغادر'' کا مادہ ''غدر'' ہے، جس کے معنی دنیا ہیں، للہٰذا اس جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ کسی چیز کو چھوڑا

---

[1] تفسیر علی بن ابراہیم، ج ۲، ص ۲۱۲۔

نہیں جائے گا، پیمان شکنی کو جو غدر کہتے ہیں تو اس کی وجہ بھی وفا اور عہد کو چھوڑ دینا ہے۔

تیسری آیت میں خدا کی طرف سے اس نامہ اعمال کو لکھنے والے فرشتوں کا ذکر ہے، ارشاد ہوتا ہے: وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم اُن کے پوشیدہ رازوں اور سرگوشیوں کو نہیں جانتے، ہاں ہم سنتے ہیں اور ہمارے بھیجے ہوئے ان کے پاس موجود ہیں اور وہ سب کچھ لکھتے ہیں ''ام یحسبون انا لا نسمع سرھم ونجوھم بلی ورسلنا لدیھم یکتبون''

یہ بات واضح ہے کہ اس آیت اور پہلی آیت جس میں تھا کہ ہم اُن کے اعمال لکھتے ہیں کے درمیان کسی قسم کا تضاد نہیں ہے، خدا کے فرستادوں اور فرشتوں کا کام حقیقت میں خدا کا کام ہی ہے، کیونکہ وہ یہ کام اس کے حکم سے انجام دیتے ہیں۔

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ انسانوں کا عمومی اعمال نامہ ''امام مبین'' خدا کی قدرت سے کسی وسیلہ کے بغیر لکھا جائے جب کہ ہر انسان کا خصوصی اعمال نامہ، جو اس آیت میں بیان ہوا ہے، اُسے فرشتے لکھیں۔

''رسل''، ''رسول'' کی جمع ہے، یہاں اس سے مراد خدا کے فرشتے ہیں، اس کے معنی یہ نہیں کہ ہر انسان کے ساتھ کئی کئی فرشتے ہیں جو اس کے اعمال لکھتے ہیں، بلکہ اس بات کا امکان ہے کہ ہر انسان کے ساتھ ایک یا دو فرشتے ہوں لہٰذا تمام انسانوں کے لئے اس کلمہ و بطور جمع ذکر کیا گیا ہے۔

''زمخشری'' کشاف میں کہتے ہیں کہ مندرجہ بالا آیت میں ''سر'' سے مراد حدیث نفس ہے جو انسان باطنی طور پر اپنے ساتھ کرتا ہے یا کسی دوسرے کے ساتھ خلوت میں جو گفتگو کرتا ہے، لیکن نجوی وہ سرگوشی ہے جو محفل میں دوسرے کے کان میں کی جائے۔[1]

اعمال نامے بول اٹھیں گے:

چوتھی آیت میں ایک بار پھر اعمال درج کرنے کی نسبت خداوند عالم کی طرف دی گئی ہے، اس کے علاوہ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اعمال نامے اس دن گفتگو کریں گے اور بول اٹھیں گے، ارشاد ہوتا ہے: اس دن تم ہر قوم کو دیکھو گے کہ خوف کی زیادتی کی وجہ سے وہ لوگ زانو ٹیک دیں گے، ہر قوم اپنے نوشتہ اور نامہ اعمال کی طرف بلائی جائے گی اور (اس سے کہا جائے گا) جو کچھ تم نے انجام دیا ہے آج تمہیں اس کا بدلہ ملے گا، پھر ارشاد ہوتا ہے: یہ ہمارا نوشتہ ہے جو تم سے حق کے ساتھ بات کرتا ہے (ہاں) جو کچھ تم نے کیا ہم نے اسے لکھا ہے۔

وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً ۫ كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰۤى اِلٰى كِتٰبِهَا ؕ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۞۲۸ هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۞۲۹ ﴿الجاثیة: ۲۸﴾

یہ آیت واضح طور پر امتوں کے اعمال نامے کے متعلق گفتگو کر رہی ہے، یہ تین قسم کے اعمال ناموں میں سے ایک ہے، ان اعمال ناموں کے تعدد کا تذکرہ حقیقت میں اس امر پر تاکید کے لئے ہے کہ انسان کے تمام اعمال لکھے جائیں گے اور اس کا چھوٹے سے چھوٹا عمل بھی

---

[1] تفسیر کشاف، ج ۴، ص ۲۶۵۔

نظر انداز نہیں کیا جائے گا۔

''تدعی'' کی تعبیر یہ بتاتی ہے کہ اُن سے کہا جائے گا کہ اپنے اعمال نامے پڑھیں اور حقیقت میں اپنا محاسبہ خود کریں، جیسے کہ سورہ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۱۴ میں یہ بات پوری وضاحت کے ساتھ آئی ہے:

''اقرا کتابك کفی بنفسك الیوم علیك حسیبا''

اپنا نامہ اعمال پڑھو، کافی ہے کہ آج کے دن خود اپنے محاسب بنو۔

''جاثیة'' کا مادہ 'جثو' (بروزن 'علوّ') ہے جس کے معنی زانو ٹیک کر بیٹھنا ہیں، اہل محشر کی یہ حالت یا تو اس لئے ہے کہ خوف کی شدت سے تمام لوگ زانو ٹیک کر بیٹھ جائیں گے، یا یہ اس حالت کی مانند ہے جو گذشتہ زمانے میں عدالت میں آنے کے بعد اور فیصلہ سننے کے بعد ملزم اختیار کرتے تھے، یعنی کھڑے کھڑے جھک جایا کرتے تھے جیسا کہ انسان کسی عظیم چیز کے انتظار میں بھی اسی حالت کو اختیار کرتا ہے۔

قابل توجہ یہ ہے کہ یہاں پر نامہ اعمال لکھنے کی نسبت خدا کی طرف دی گئی ہے تا کہ یہ بات معلوم ہو جائے کہ نامہ اعمال لکھنے والی ذات ایسی ہے کہ نہ تو اس کے بارے میں غفلت کا تصور کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی کسی غلطی کا سوچا جا سکتا ہے، وہ ہر شے سے آگاہ ہے اور تمام چیزوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

''نستنسخ'' کا مادہ 'نسخ' ہے جو ارباب لغت کے بقول حقیقت میں کسی چیز کو دوسری چیز کے ذریعے مٹا دینے کے معنی میں ہے چونکہ اس کا لازمہ ایک چیز کی نفی اور دوسری چیز کا اثبات ہے، اس لئے کبھی یہ کلمہ 'نفی'' کے معنی میں اور کبھی اثبات کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی کبھار ہر دو معنی میں آتا ہے، چونکہ کسی چیز کا نسخہ بنانا یا فوٹو گرافی بھی ایک مطلب کے اثبات کے لئے ہوتی ہے جب کہ پہلے مطلب سے چشم پوشی کی جاتی ہے، اس لئے اس کے لئے 'نسخ'' اور ''استنساخ'' کے کلمات استعمال ہوتے ہیں۔

پانچویں آیت میں اعمال نامہ کے لئے ایک اور تعبیر لائی گئی ہے اور وہ ہے طائر (پرندے) کی تعبیر، ارشاد ہوتا ہے: ہم نے ہر انسان کے پرندے کو اس کی گردن پر قرار دیا ہے اور قیامت کے دن اُس کے لئے ایک کتاب نکالیں گے جسے وہ اپنے سامنے کھلا ہوا پائے گا۔

پھر ارشاد ہوتا ہے:''ہم اُسے کہیں گے: اپنی کتاب پڑھ۔ کافی ہے کہ آج کے دن تم خود اپنے محتسب بنو!۔۔۔''وکل انسان الزمنه طٰئرہ فی عنقه۔ ونخرج له۔ یوم القیمة کتبا یلقه منشورا۔ اقر کتبك۔ کفی بنفسك الیوم علیك حسیبا'۔

طائر حقیقت میں پرندے کو کہتے ہیں، یہاں پر بہت سے مفسرین کے بقول نامہ اعمال کے لئے یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے، یہ اس لئے ہے کہ عربوں میں یہ رواج تھا کہ پرندوں کے ذریعے اچھی یا بری فال نکالتے تھے، بعض پرندوں کو تو وہ خوش بختی اور سعادت کی علامت سمجھتے تھے اور اگر گھر سے یا شہر سے نکلتے وقت اُن پرندوں سے سامنا ہو جاتا تو اُسے کامیابی اور کامرانی کا ذریعہ سمجھتے، جب کہ بعض دوسرے پرندوں کو بدبختی اور ناکامی کی علامت سمجھتے، اس لئے'' طائر'' خوش قسمتی اور ناکامی دونوں کے لئے استعمال ہونے لگا، لہٰذا

بعض مفسرین نے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ فارسی میں کلمہ طائر کا مترادف ''بخت'' ہے[1] چونکہ قرآن اعمال کو انسان کی خوش بختی اور بدبختی کا بنیادی عامل سمجھتا ہے، اس لئے یہ کلمہ نامہ اعمال کے لئے استعمال کیا گیا ہے، یعنی قرآن نے ایک خیالی بات سے ایک مشاہداتی واقعیت پیدا کی اور لوگوں کو اس کی طرف بلایا ہے۔

البتہ''ونخرج له یوم القیمة کتبا یلقه منشورا''(قیامت کے دن اس کے لئے نوشتہ نکالا جائے گا جسے وہ اپنے سامنے کھلا ہوا پائے گا) کے جملہ کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ''طائر'' کے معنی نامہ اعمال کرنے کے بجائے عمل کرنا زیادہ مناسب ہیں، کیونکہ نامہ اعمال کو دوبارہ الگ سے ذکر کیا گیا ہے، انسان کے اعمال کا اس کی گردن پر ہونے کے یہ معنی ہیں کہ یہ اس سے الگ نہیں ہوں گے، اگر اچھے ہوئے تو اس کی زینت اور عزت کا باعث ہوں گے اور اگر برے ہوئے تو طوق وزنجیر کے مانند اسے تکلیف دیتے رہیں گے۔

اس آیت میں دو اور نکتے بھی قابل توجہ ہیں، ایک تو یہ کہ قیامت کے دن اعمال نامہ کھولے جائیں گے اور تمام لوگ اُن سے آگاہ ہو جائیں گے اور ہر کسی کا نامہ عمل اس کے لئے دوسروں کی نظر میں رسوائی یا عزت کا باعث ہوگا، دوسرا یہ کہ نامہ عمل کی تحریر اس قدر واضح ہوگی کہ کسی دوسرے حساب کرنے والے کی ضرورت نہیں ہوگی، اتنا ہی کافی ہوگا کہ خود انسان اپنا حساب کرلے یا تو وہ ایک اُڑی رنگت اور بیمار وافسردہ شخص کی مانند حساب کرے گا، جس سے اُس کی بیماری اور بداعمالی ظاہر ہوجائے گی، یا پھر اس کے برعکس ایک شاداب چہرے اور مسکراہٹ کے ساتھ، اور یہ کیفیت اس کی فلاح کی دلیل ہوگی، لہٰذا وہ خود اپنی حالت سے اپنا اندازہ لگا سکے گا، کسی دوسرے کی گواہی کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔

چھٹی آیت میں اعمال نامہ کے سلسلہ میں ایک اور تعبیر لائی گئی ہے اور وہ''زبر'' ہے جو''زبور'' کی جمع ہے یہ کلمہ کتاب کے معنی میں ہے، ارشاد ہوتا ہے: وہ تمام اعمال جو انہوں نے انجام دیے کتابوں (اُن کے نامہ اعمال) میں درج ہیں اور ہر چھوٹا بڑا کام لکھا جائے گا۔''وکل شئی فعلوه فی الزبر۔ وکل صغیر و کبیر مستطر''

اگرچہ یہ آیت ان گذشتہ اقوام کی طرف اشارہ کرتی ہے جن کے اعمال پیغمبر اکرمؐ کے زمانے کے کفار جیسے تھے، تاہم یہ بات واضح ہے کہ جب یہ کہا جائے کہ اُن کے اعمال لکھے گئے ہیں تو اس کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ تمہارے اعمال بھی اسی طرح لکھے جارہے ہیں۔

''زبر'' حقیقت میں''زبرة''(بروزن''سفرة'') سے ماخوذ ہے، جو لوہے کے ایک بڑے ٹکڑے کے معنی میں ہے، پھر یہ کلمہ ان موٹے اور بڑے خطوط کے لئے استعمال ہونے لگا جو بڑے صفحات پر کھینچے جاتے ہیں، راغب مفردات میں کہتے ہیں:

"کل کتاب غلیظ الکتابة یقال له زبور"

ہر وہ تحریر جو جلی حروف میں لکھی جائے اُسے زبور کہتے ہیں۔

اس تعبیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ''زبور'' ہر کتاب کو نہیں کہتے بلکہ اس میں الفاظ کا بڑا اور واضح ہونا بھی ضروری ہے، نامہ اعمال کے لئے اس تعبیر کا انتخاب بہت بامعنی ہے، جو نامہ اعمال کے واضح اور مستحکم ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

---

[1] فخر رازی نے یہ بات اپنی تفسیر کی جلد ۲۰، ص ۱۶۷ پر ابوعبیدہ سے نقل کی ہے۔

''صغیر''اور''کبیر'' کی تعبیر بالخصوص''صغیر'' کوکبیر پر جومقدم کیا گیا ہے،جیسا کہ قرآن کی چند دیگر آیات میں بھی ایسا ہی ہوا ہے،اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ نامہ اعمال کے سلسلے میں کسی شخص اور کسی عمل کی بھی چھوٹ نہیں ہوگی، بلکہ سب کچھ تحریر کیا جائے گا۔[1]

''مستطر'' کا مادہ''سطر'' ہے یہ بھی لکھنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، یہ اعمال کے ثبت ہونے کے لئے مزید تاکید ہے،البتہ نہ فقط اعمال کولکھا جائے گا بلکہ گفتار اور نیتوں کا ثبت ہونا بھی دونوں آیات کے مفہوم میں موجود ہے(غور کیجئے گا)۔

ساتویں آیت میں یہ اعلان کرنے کے بعد کہ کافر قیامت کے دن ہرگز اپنے اعمال کے حساب کے سلسلے میں امیدوار نہیں ہوں گے، (اور اسی وجہ سے)وہ آیات الٰہی کو جھٹلاتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے:(یہ اس حالت میں ہے) کہ ہم یقینی طور پر تمام چیزوں کو شمار کرلیا ہے اور لکھ لیا ہے،''و کل شیءٍ احصینه کتابا''۔

''احصینه'' کا مادہ''احصاء'' ہے جو حقیقت میں ''حصی'' سے ماخوذ ہے، جس کے معنی سنگریزہ ہیں، چونکہ پہلے زمانے میں چیزوں کی گنتی کے لئے انگلیوں کے بجائے پتھر کے ٹکڑوں سے کام لیا جاتا تھا، اس لئے''احصاء'' کا کلمہ گننے اور کسی چیز کا حساب رکھنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، لہٰذا بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس کلمے کا مفہوم یہاں''لکھنا'' ہے اسی لئے''کتابا'' کو''احصینا'' کے لئے مفعول مطلق کے طور پر لایا گیا ہے، جب کہ مفعول مطلق کو چاہیے کہ وہ پہلے والے فعل کے مصدر سے ہی ہو، لیکن یہاں پر چونکہ ہر دو کلموں کے ایک ہی معنی ہیں اس لئے ایک کو دوسرے کا جانشین بنایا جا سکتا ہے۔[2]

علیین اور سجین میں رکھے جانے والے اعمال نامے

آٹھویں آیت ورہ مطففین میں دوجگہ آئی ہے یہ نیک اور برے لوگوں کے نامہ اعمال کی طرف اشارہ کرتی ہے اور اس سلسلے میں کچھ زیادہ جزئیات بیان کرتی ہے، پہلے تو بروں کے نامہ اعمال کے سلسلے میں ارشاد ہوتا ہے: ایسا نہیں ہے جیسا کہ وہ (قیامت کے متعلق) خیال کرتے ہیں یقینی طور پر گنہگاروں کا اعمال نامہ''سجین'' میں ہے اور تم کیا جانو کہ سجین کیا ہے؟ وہ ایک نوشتہ ہے اور یقنی ہے''کلا ان کتب الفجار لفی سجین، وما ادرك ما سجين ۔ کتب مرقوم ۔''

چند آیات کے بعد اسی سورہ میں نیک لوگوں کے نامہ اعمال کے متعلق ارشاد ہوتا ہے: ایسا نہیں ہے جیسا کہ وہ (قیامت کے متعلق سوچتے ہیں) نیک لوگوں کا نامہ اعمال''علیین''میں ہے اور تم کیا جانو کہ علیین کیا ہے؟ وہ ایک حتمی اور لکھی ہوئی کتاب ہے جس کے گواہ مقربین ہیں''کلا ان کتب الابرار لفی علیین ۔ وما ادرك ما علیون، کتب مرقوم ۔ یشهده المقربون''۔

ان آیات میں''سجین''اور''علیین'' کے متعلق گفتگو کی گئی ہے جن میں برے اور اچھے لوگوں کے نامہ اعمال کو رکھا جائے گا، لہٰذا ان

---

[1] سورہ توبہ، آیت نمبر ۱۲۱، اور سورہ کہف، آیت ۴۹ کی طرف رجوع کیا جائے۔

[2] بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ''کتابا'' حال ہو، لیکن پہلا احتمال زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

لفظوں کے معنی کو پوری طرح واضح ہونا چاہیے۔

''سجین''، مبالغے کا صیغہ ہے جو ''سجن'' کے مادہ سے ہے، جس کے معنی قید خانہ ہیں، یہاں اس کے لئے مختلف معانی بیان کئے گئے ہیں، جیسے دوزخ، یا دوزخ کا ایک خاص حصہ جس میں برے لوگوں کا اعمال نامہ رکھا جائے گا، لیکن سب سے زیادہ مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ''سجین'' ایک جامع نوشتہ ہے جس میں تمام برے لوگوں کے اعمال مجموعی طور پر لکھ دیئے جائیں گے، سادہ الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک جرنل کی مانند ہوگا جیسے وہ بہی کھاتہ جس میں تمام قرض خواہوں اور قرض داروں کا حساب کتاب لکھا جاتا ہے کیونکہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ اعمال نامے متعدد ہیں۔

''علیین''، جمع ہے علی (بروزن ''ملی'') کی جو حقیقت میں ''علو'' سے ماخوذ ہے جس کے معنی بلندی ہیں، یہ بلند و بالا مکان کی طرف اشارہ ہے، جو افراد پہاڑوں کی بلندیوں پر ساکن ہوں ان پر بھی اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے، بہت سے مفسرین کے بقول یہاں یہ بہشت کے بہترین مکان یا آسمان کے بالاترین مکان کی طرف اشارہ ہے لیکن اوپر جو کچھ ''سجین'' کے متعلق کہا گیا ہے اس کے ساتھ اس کا موازنہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی ایک بڑی کتاب کے معنی میں ہے جس میں تمام نیک لوگوں کے اعمال مجموعی طور پر درج ہوں گے۔ یہ ایک بلند مرتبہ کھاتہ ہوگا جو خدا کے قرب میں ہوگا۔[1]

نگران فرشتے:

نویں آیت میں ظاہری طور پر تو نامہ اعمال کی کوئی بات نہیں لیکن حقیقت میں یہ بات ایک دوسری تعبیر کے ساتھ بیان کی گئی ہے، ارشاد ہوتا ہے: ''یاد کرو جب کہ دائیں اور بائیں دو فرشتے جو انسان کے نگہبان ہیں، اُس کے اعمال حاصل کرتے ہیں'' ''اذ یتلقی المتلقین عن الیمین وعن الشمال قعید''۔

واضح ہے کہ ان کا حاصل کرنا نامہ اعمال لکھنے کی طرف اشارہ ہے، پھر مزید تاکید کے لئے ارشاد ہوتا ہے: انسان جو بات بھی کرتا ہے اس کے پاس فرائض کو پوری طرح ادا کرنے والا ایک بالکل تیار نگران کھڑا ہے ''ما یلفظ من قول الالدیہ رقیب عتید''۔

''یتلقی'' کا مادہ ''لقی'' ہے جو ''ملاقات'' کے معنی میں ہے، لیکن یہاں پر تلقی اعمال اُن کو لکھنے اور درج کرنے کی طرف کنایہ ہے اور ''متلقیان'' سے مراد وہ دو فرشتے ہیں جو انسانوں کے اعمال لکھنے پر متعین ہیں۔

''قعید'' کا مادہ ''قعود'' ہے جس کے معنی بیٹھنا ہیں یہاں یہ نگہبان اور نگران کے معنی میں آیا ہے جیسا کہ روزمرہ کی گفتگو میں بھی

---

[1] یہ بات قابل توجہ ہے کہ ''علیین'' قاعدے کے مطابق تو جمع مذکر عامل ہے (جب کہ ''سجین'' مفرد ہے) لیکن یہ اس امر سے مانع نہیں کہ یہ ایک بلند و بالا مکان کے لئے اس کے بلند مقام ساکنین کی وجہ سے استعمال ہو۔

کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص فلاں کا ہم نشین اور مصاحب ہے یعنی اس کا نگہبان ہے۔[1]

''یلفظ''، ''لفظ'' کے مادہ سے ہے جو حقیقت میں کسی چیز کو پھینکنے کے معنی میں ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے لفظ ''الرحی الدقیق، (چکی نے آٹے کو باہر نکال پھینکا)۔

یہ کلمہ اس چیز کے لئے بھی بولا جاتا ہے جو انسان اپنے منہ سے نکالتا ہے، اس لئے یہ اس بات کے لئے جو کہ منہ سے نکلتی ہے، ایک خوبصورت کنایہ ہے گویا یہ ایسی چیز ہے جو باہر نکالی جاتی ہے۔

''رقیب'' جیسا کہ راغب نے مفردات میں ذکر کیا ہے ''رقبہ'' کے مادہ سے ہے جس کے معنی گردن ہیں، جو شخص ایک چیز کی حفاظت اور نگرانی کرے اُسے ''رقیب'' کہتے ہیں، یا تو اس لئے کہ وہ چاروں طرف گردن گھماتا رہتا ہے تاکہ جو کچھ اُس کے پاس واقع ہو اُس سے باخبر رہے، یا اس لئے کہ رقبہ اور گردن اپنی زیر نگرانی چیز کی حفاظت اور نگرانی کرتی ہے۔

''عتید'' کا مادہ ''عتاد'' (بروزن ''جہاد'') ہے جس کے معنی ضرورت پڑنے سے پہلے کسی چیز کو آمادہ کرنا یا ذخیرہ کرنا ہیں، لہٰذا جو شخص ایک کام کے لئے آمادہ اور تیار ہو اُسے ''عتید'' کہا جاتا ہے۔

لیکن مقائیس اللغت میں اس کے حقیقی معنی ''طاقت'' اور نزدیکی'' کئے گئے ہیں جو پہلے معنی کی نسبت لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بہر حال کیا ان دونوں وصفوں میں سے ہر ایک اُن دو فرشتوں میں سے ایک سے متعلق ہے جو نگرانی کا فریضہ سرانجام دے رہا ہے اور دوسرا لکھنے کے لئے تیار بیٹھا ہے، یا یہ کہ یہ دونوں کی صفت ہے، اس لحاظ سے کہ وہ دونوں انسان کے کاموں کی نگرانی کر رہے ہیں اور دونوں ہی لکھنے کے لئے تیار بیٹھے ہیں؟

بعض مفسرین کی رائے یہ ہے کہ ''رقیب' دائیں فرشتے کا نام ہے (جو اچھے اعمال لکھنے پر مامور ہے) اور 'عتید'' بائیں فرشتے کا نام ہے (جو برے اعمال لکھنے پر متعین ہے)۔

لیکن بعض دوسرے مفسرین کی عبارات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دونوں وصف دونوں فرشتوں کے لئے ہیں، یعنی اُن میں سے ہر ایک نگرانی کا کام بھی کر رہا ہے اور لکھنے کے لئے بھی تیار بیٹھا ہے۔

ان دو فرشتوں کے متعلق کئی روایات ذکر ہوئی ہیں جو بہت بامعنی ہیں انہی میں سے ایک حدیث پیغمبر اکرمؐ سے یوں منقول ہے:

''جب انسان اچھا کام کرتا ہے تو دائیں طرف والا فرشتہ دس ثواب اس کے لئے لکھ دیتا ہے اور جب کوئی برا کام کرتا ہے تو بائیں طرف والا فرشتہ اسے لکھنا چاہتا ہے تو دائیں طرف والا فرشتہ اس سے کہتا ہے کہ اسے سات گھنٹے

---

[1] ''متلقیان'' تثنیہ ہے لہٰذا ''قعید'' کو بھی تثنیہ یعنی ''قعیدان' ہونا چاہیے، لیکن آیت میں درحقیقت کچھ محذوف ہے اور پوری عبارت یوں ہے: ''عن الیمین قعید و عن الشمال قعید'' پہلا دوسرے کے قرینہ کی وجہ سے محذوف ہو گیا ہے۔

مہلت دو، اگر اس دوران اس نے توبہ کر لی تو اس کے لئے کچھ نہ لکھو، لیکن توبہ نہ کرے تو اُس کے نامہ اعمال میں فقط ایک گناہ لکھو۔[1]

اس طرح کی روایات کا تربیتی پیغام بہت واضح اور روشن ہے اس روایت اور اسی طرح کی دوسری روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان دو فرشتوں کا کام جدا جدا ہے، اس سلسلے میں مزید وضاحت انشاء اللہ آگے چل کر آئے گی۔

اعمال نامہ لکھنے والے:

دسویں آیت میں نامہ عمل کے ''کاتبوں'' کا تذکرہ ہے اور ان کی معلومات کے وسیع ہونے کی طرف اشارہ ہے، ارشاد ہوتا ہے: یقینی طور پر تم پر نگہبان مقرر کئے گئے ہیں جو بلند مقام اور لکھنے والے ہیں۔۔۔۔۔۔۔تمہارے اعمال سے پوری طرح آگاہ ہیں اور جو کچھ تم کرتے ہو وہ جانتے ہیں'' وان علیکم لحفظین، کراما کاتبین، یعلمون ما تفعلون''۔

ظاہر ہے کہ حافظین سے مراد وہ فرشتے ہیں جو انسانوں کے اعمال کی نگہبانی پر مقرر کئے گئے ہیں نہ کہ مختلف حوادث سے اس کی حفاظت کے لئے۔

درحقیقت خداوند عالم نے ان فرشتوں کی چار صفات بیان کی ہیں جو ایک دوسرے کی لازم و ملزوم ہیں، ایک تو انسانوں کے اعمال کی نگرانی اور نگہبانی، پھر اُن کو کرام (جمع کریم) کی صفت سے متصف کیا ہے جو اُن کی عظمت کی طرف اشارہ ہے اگرچہ اُن کی ذمہ داری انسان کے اعمال لکھنا ہے، لیکن وہ یہ کام کسی کدورت کے ساتھ انجام نہیں دیتے، بلکہ مہربانی اور کرم فرمائی سے یہ فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ اُن کی بزرگواری اس لحاظ سے ہے کہ وہ نیک اعمال اور ان کے دس گناہ ثواب کو تو فوراً لکھ لیتے ہیں، جب کہ برے اعمال لکھنے کے سلسلے میں بہت تاخیر کرتے ہیں، جیسا کہ پہلے حدیث میں بھی گذر چکا ہے، اس لئے کہ شاید یہ برا کام کرنے والا توبہ کر لے یہ بھی کہا گیا ہے کہ اُن کی مہربانی اس لحاظ سے ہے کہ وہ نیک اعمال آسمانوں پر لے جاتے ہیں اور فرشتوں کی محفل میں اُن کا اظہار کرتے ہیں جب کہ برے کاموں کو اس ستارالعیوب ذات کی ہدایت سے چھپا لیتے ہیں۔

علاوہ ازیں اُن کی مہربانی اس بات کا باعث بنے گی کہ انسان اپنے اعمال کی طرف زیادہ متوجہ رہے کیونکہ کوئی شخص بھی یہ نہیں چاہتا کہ وہ کسی مہربان اور بزرگ شخص کی موجودگی میں کوئی برا کام انجام دے۔

اُن کی تیسری صفت'' کاتبین'' بیان کی گئی ہے جو انسان کے کاموں پر اُن کی نگرانی کی تشریح اور وضاحت ہے، واضح طور پر ارشاد ہوتا ہے: کہ وہ تمام اعمال کو لکھتے ہیں تا کہ تم جان لو کہ اُن سے کوئی چیز نہیں چھوٹتی۔

چونکہ یاد رکھنے اور پھر لکھنے کے لئے ایک ہمہ پہلو علم کی ضرورت ہے اس لئے ان کی چوتھی صفت کے طور پر ارشاد ہوا کہ وہ جانتے ہیں

---

[1] مجمع البیان، ج۹ ص ۴۴۱، یہی مضمون روح المعانی، ج۲۶ ص ۱۶۴ اور تفسیر مراغی، ج۲۶ ص ۱۶۱ پر بھی آیا ہے۔

تم جو کچھ کرتے ہو، یہ تعبیر جسمانی کام اور قلبی کام کے ساتھ ساتھ گفتگو پر بھی محیط ہے۔

کلمہ ''حافظین'' کو جمع یا تو اس لئے لایا گیا ہے کہ دن کے وقت دو فرشتے اور رات کے وقت دو دوسرے فرشتے انسانی کاموں کی نگرانی کرتے ہیں (جیسا کہ بعض روایات میں بھی آیا ہے [1]) یا اس لئے ہے کہ یہاں پر مخاطب تمام انسان ہیں اور جو فرشتے تمام لوگوں کی نگرانی کر رہے ہیں ان کا ذکر جمع کے طور پر لایا گیا ہے۔

نامہ اعمال دائیں بائیں ہاتھ میں

گیارہویں آیت ایک نئے مطلب کی طرف اشارہ کر رہی ہے اور وہ ہے نامہ اعمال کا انسان کے ہاتھوں میں دیا جانا، قیامت کے دن برے لوگوں کا نامہ اعمال اُن کے بائیں ہاتھ میں اور نیک لوگوں کا نامہ اعمال اُن کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، یہ کام بذات خود محشر میں بروں اور اچھوں کے ایک دوسرے سے جدا ہونے کی علامت ہوگا، ارشاد ہوتا ہے: جس کا نامہ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں ہوگا (ایک اعزاز کے ساتھ) پکارے گا کہ اے اہل محشر! میرا نامہ اعمال لو اور پڑھو! مجھے معلوم ہوتا تھا کہ قیامت آئے گی اور میرے اعمال کا حساب لیا جائے گا۔''

فاما من اوتی کتبه بیمینه فیقول هآؤم اقرءوا کتبیه، انی ظننت انی ملق حسابیه"

اس کے برعکس جس کا نامہ اعمال اس کے بائیں ہاتھ میں ہوگا وہ پکارے گا: اے کاش! مجھے میرا نامہ اعمال دیا ہی نہ جاتا، اے کاش مجھے کبھی معلوم نہ ہوتا کہ میرا حساب کیا ہے؟ اے کاش مجھے موت آجاتی'' واما من اوتی کتبه بشماله، فیقول یلیتنی لم اوت کتبیه، ولم ادر ما حسابیه، یلیتها کانت القاضیة''۔

کیا دایاں اور بایاں ہاتھ انسانی جسم کے اس خاص حصے کی طرف اشارہ ہے یا یہ کہ یہ نیکی اور برائی کے لئے کنایہ ہے کیونکہ دائیں ہاتھ کو نیکی کے لئے کنایہ سمجھا جاتا ہے اور بائیں ہاتھ کو برائی کے لئے کنایہ کے طور پر لایا جاتا ہے؟

یہ معنی تفسیر ''فی ظلال القرآن'' میں ایک احتمال کے طور پر ذکر کئے گئے ہیں، لیکن اس تاویل کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ واقعی طور پر نیک لوگوں کا نامہ عمل اُن کے دائیں ہاتھ اور برے لوگوں کا نامہ عمل اُن کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا تاکہ قیامت کے دن وہ پہچانے جاسکیں۔

بہت سے مفسرین اور اہل لغت کے بقول ''ھاؤم'' دو کلموں کا مرکب ہے، ایک کلمہ ''ھاء'' ہے جو اسم فعل ہے اور ''خذ'' (پکڑو) کے معنی میں ہے اور دوسرا ''میم'' ہے جو جمع مذکر مخاطب کی ضمیر سے مرکب ہے، اس کلمے کی گردان فعل امر کی طرح کی جاتی ہے۔ھاءَ، ھاءِ، ھائُما،

---

[1] وسائل الشیعہ، ج ۳، ص ۱۵۴، ۱۵۵ باب ۲۸، از باب مواقیت۔ اس باب میں بہت سی روایات ہیں جن کے مطابق جو شخص بھی صبح کی نماز طلوع فجر کے آغاز میں ادا کرے گا دن اور رات کے فرشتے، جن کی ڈیوٹی اس وقت تبدیل ہو رہی ہوتی ہے، دونوں اس کا ثواب لکھ لیتے ہیں، سورہ بنی اسرائیل، آیت ۷۸ (ان قرآن الفجر کان مشهودا) کی تفسیر میں سنی اور شیعہ دونوں نے اسی طرح کی متعدد احادیث نقل کی ہیں۔ (تفسیر نمونہ میں اسی آیت کے ذیل کی طرف رجوع کیا جائے)۔

ھائوم، ھائن (واحد مذکر، واحد مونث تثنیہ و جمع مذکر اور تثنیہ و جمع مونث) اور کبھی اس کا ہمزہ کاف میں بدل جاتا ہے اور یوں کہا جاتا ہے: **ھاكَ،ھاكِ، ھا كُما،ھا كُمۡ، ھا كُنَّ۔**

''کتابیہ اور حسابیہ'' کے آخر میں آنے والی ھاء کو اصطلاح میں ''ھاءِ سکت'' کہتے ہیں یہ ضمیر نہیں ہے اس لئے یہ کلام میں صرف آسانی کے لئے لائی گئی ہے اور کسی خاص مفہوم کی حامل نہیں ہے، اس لئے یہ کلام میں صرف آسانی کے لئے لائی گئی ہے اور کسی خاص مفہوم کی حامل نہیں ہے۔

حنظلہ جو غسیل الملائکہ کے لقب سے مشہور ہیں اور جنگ اُحد کے شہداء میں شامل ہیں، اُن کے بیٹے عبداللہ ایک حدیث کے راوی ہیں جو اس طرح ہے:

قیامت کے دن خدا اپنے بندے کو روکے گا، اُس کے گناہ اس کے نامہ اعمال کی دوسری طرف ظاہر کرے گا اور اس سے پوچھے گا: ''کیا تم نے یہ گناہ کیا ہے؟'' وہ کہے گا: ''ہاں! اے میرے پروردگار'' پھر اس سے خطاب ہوگا: ''میں نے تجھے ذلیل و رسوا نہیں کیا (لہٰذا میں نے یہ حکم دیا کہ تیرے گناہ نامہ اعمال کی دوسری طرف لکھے جائیں تاکہ کوئی انہیں دیکھ نہ سکے) اور میں نے تیرے یہ گناہ (تیری نیکیوں کی وجہ سے) بخش دیے، یہاں پر مومن (بہت خوشی اور سرور کے ساتھ) آواز بلند کرے گا: ''**ھاؤم اقرء وا کتابیہ**'' (اے اہل محشر! یہ میرا نامہ اعمال پکڑو اور اسے پڑھو)[1]

نامہ اعمال کے دائیں یا بائیں ہاتھ میں ہونے کا تذکرہ ہی بارہویں آیت میں تھوڑے سے فرق کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: جس کا نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں دیا گیا ہے اس کا حساب جلدی اور آسانی کے ساتھ ہو جائے گا اور وہ خوشی خوشی اپنے خاندان کی طرف پلٹ آئے گا، لیکن جس کا نامہ اعمال اُسے پیچھے کی طرف سے پکڑایا جائے گا جلد ہی اُس کی آواز بلند ہوگی: مجھ پر وائے کہ میں برباد ہو گیا، اور وہ جہنم کے لپکتے ہوئے شعلوں میں داخل ہو جائے گا'' (**فاما من اوتی کتبه بیمینه، فسوف یحاسب حسابا یسیرا، وینقلب الیٰ اھله مسرورا، واما من اوتی کتبه ورآء ظھره، فسوف یدعوا ثبورا، و یصلی سعیرا**)۔

پہلی آیات میں برے لوگوں کے نامہ اعمال کا اُن کے دائیں ہاتھوں میں ہونے کا تذکرہ ہے، لیکن ان آیات میں پچھلی طرف سے نامہ اعمال پکڑانے کی بات ہے، یہ اس لئے ہے کہ جب مجرموں کو اُن کا نامہ اعمال بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا تو وہ شرمندگی کے مارے اپنے ہاتھ کو پیچھے کی طرف چھپا لیں گے تاکہ لوگ اُن کے جرم اور رسوائی کے اس ثبوت کو نہ دیکھ سکیں، یا یہ اس لئے ہے کہ اُن کا بایاں ہاتھ پیچھے کی طرف باندھ دیا جائے گا، جیسا کہ انہوں نے دنیا میں کتاب خدا کو پیچھے کی طرف دھکیل دیا تھا، قیامت میں اُن کا نامہ اعمال بھی اُن کے پیچھے ہوگا، یا یہ اس لئے ہے کہ اُن کے چہرے پچھلی طرف مڑ جائیں گے اور وہ اپنا نامہ عمل دیکھنے کے لئے دائیں ہاتھ کو پیچھے کی طرف لائیں گے۔

---

[1] تفسیر درمنثور، ج٦ ص ٢٦١، تفسیر فی ظلال القرآن، ج٨ ص ٢٥٦ (اگرچہ یہ حدیث عبداللہ بن حنظلہ سے منقول ہے لیکن قاعدے کے مطابق اس نے اُسے پیغمبر اکرمؐ سے بالواسطہ سنا ہے۔

ان تینوں معنوں میں سے جو بھی مراد ہو یہ پہلی آیات جو یہ کہتی ہیں کہ بدکاروں کا نامہ اعمال اُن کے بائیں ہاتھ میں ہوگا، کے ساتھ کسی قسم کا تضاد نہیں رکھتیں۔

یہاں خاندان سے کیا مراد ہے؟ بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ ان سے مراد وہ عورتیں، اولاد اور قریبی رشتہ دار ہیں جو اہل ایمان تھے اور اب کشتی نجات پر بیٹھ کر اس سے پہلے جنت میں داخل ہو چکے ہیں۔

بعض دوسرے مفسرین نے اُسے جنتی بیویوں کی طرف اشارہ قرار دیا ہے اور بعض دیگر نے اس سے مراد وہ سب مومن لئے ہیں جو اس سے پہلے جنت میں داخل ہو چکے ہوں گے کیونکہ تمام مومنین ایک دوسرے کے رشتہ دار ہیں اور حقیقت میں تمام ایک ہی خاندان کے افراد ہیں۔

لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے، بالخصوص اس بات کے پیش نظر کہ اسی سورت کی آیت ۱۳ میں یہی اہل کی تعبیر خاندان، بیوی، اولاد اور قریبی رشتہ داروں کے لئے لائی گئی ہے اور وحدت سیاق کا یہ تقاضا ہے کہ یہاں پر بھی وہی معنی مراد لئے جائیں۔

تیرہویں آیت میں افراد کی یہی گروہ بندی (دائیں ہاتھ اور بائیں ہاتھ میں نامہ اعمال والے) ایک اور شکل میں بیان کی گئی ہے، ارشاد ہوتا ہے: ''اصحاب میمنہ! کیا ہیں اصحاب میمنہ (اُن کا کیا پر افتخار اور مسرت آمیز انجام ہے)''فا صحاب المیمنة ما اصحاب المیمنة، پھر ارشاد ہوتا ہے: «اصحاب مشمه، کیا هیں اصحاب مشمه؛ (کس دردناک اور شرمناک انجام سے دوچار ہیں؟)''' واصحاب المشئمة ما اصحاب مشمة»۔

میمنه ''یمن'' کے مادہ سے ہے، جس کے معنی سعادت اور خوش بختی ہیں، بعض لوگوں نے اسے ''یمین'' کے مادہ سے سمجھا ہے جس کے معنی دایاں ہاتھ ہیں، وہ کہتے ہیں یہ وہی لوگ ہیں جن کا نامہ اعمال اُن کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا (یہ تو صحیح ہے کہ یمن اور یمین کا مادہ ایک ہی بنیاد سے ہے، لیکن پہلے کے معنی برکت اور سعادت اور دوسرے کے دایاں ہاتھ ہیں جو کہ برکت کی ایک علامت ہے)۔

راغب نے مفردات میں اپنی اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ اس کی بنیاد وہی دائیں ہاتھ والا مفہوم رکھتی ہے اور چونکہ دائیں ہاتھ سے انجام پانے والے کاموں سے ہی برکت حاصل ہوتی ہے، اس لئے یہ کلمہ خیر اور برکت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

اس کا متضاد لفظ ''مشمه'' ہے جو ''شوم'' کے مادہ سے ہے، مقائیس اللغت کے بقول اس کے حقیقی معنی بایاں ہاتھ ہیں، لیکن چونکہ بائیں ہاتھ اور اس سے انجام پانے والے کاموں کو بدبختی اور بدقسمتی کی علامت سمجھا جاتا تھا، اس لئے کلمہ ''شوم'' اس معنی میں استعمال ہوا ہے اس طرح سے «اصحاب المیمنة» اور «اصحاب المشئمة» حقیقت میں انہی افراد کے معنی میں ہیں، جن کا نامہ اعمال اُن کے دائیں یا بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، اس کی تفسیر خوش قسمت اور سعادت مند جماعت اور بدقسمت اور ناکام جماعت کے عنوان سے دوسرے معنی کے زمرے میں آتی ہے۔

فخر رازی نے اپنی تفسیر میں ''اصحاب المیمنۃ'' کو اصحاب جنت کے عنوان سے یاد کیا ہے، وہ کہتے ہیں:

''یہ یاتو اس لئے ہے کہ ان کا نامہ اعمال اُن کے دائیں ہاتھ میں ہے یا اس لئے ہے کہ میدان محشر میں اُن کے دائیں ہاتھ سے ایک نور پھوٹے گا'' (یسعی نورھم بین ایدیھم وبایمانھم) (حدید۔ ۱۲)

یا یہ اس لئے ہے کہ دایاں ہاتھ اچھائی اور نیکی کی علامت ہے اور عرب ان پرندوں کو جو ان کے دائیں طرف سے گزرتے تھے، نیک فال سمجھتے تھے اور جو اُن کے بائیں طرف سے اڑ جاتے تھے انہیں فال بد سمجھتے تھے۔[۱]

''مآ اصحاب المیمنة وما اصحاب الشئمة'' جو سوالیہ جملے کے طور پر ہیں، پہلے گروہ کے بہت بلند مقام ہونے اور دوسرے گروہ کے بہت پست مقام ہونے کی طرف اشارہ ہیں گو یا پہلے گروہ کے مقام کی بلندی اور ان کے لئے برکات کی فراوانی فکرانسانی کے دائرہ سے باہر ہے، یہ تعبیر اس معنی کے لئے ایک بہت لطیف کنایہ بھی ہے، جب کہ دوسری تعبیر اُن کے انحطاط اور ذلت کی اتھاہ گہرائیوں میں گرے ہوئے ہونے کی طرف اشارہ ہے، اگر چہ ان آیات میں نامۂ عمل کے متعلق کوئی بات نہیں کی گئی، تاہم قرآن کی باقی آیات کو مدنظر رکھتے ہوئے جن میں ان دوکلموں کو نامہ اعمال کے لئے بھی استعمال کیا گیا ہے، مذکورہ بالا تفسیر زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔

چودھویں آیت جو سورہ واقعہ میں مذکورہ بالا آیت کا تتمہ ہی ہے، میں ارشاد ہوتا ہے: ''اور اصحاب یمین (دائیں ہاتھ والے لوگ) کیا ہیں اصحاب یمین؟ وہ بغیر کانٹوں کی بیری کے درخت کے (سکون بخش) سایوں میں ہوں گے''۔ ''واصحاب الیمین، مآ اصحاب الیمین، فی سدر مخضود''۔

پھر بعد والی آیت میں ارشاد ہوا: ''اور اصحاب الشمال (بائیں ہاتھ والے لوگ) کیا ہیں اصحاب الشمال؟ وہ جان سوز ہواؤں اور تلخ پانیوں کے درمیان ہوں گے'' ''واصحاب الشمال مآ اصحاب الشمال فی سموم وحمیم''۔

ان آیات کی تفسیر میں بہت سے مفسرین نے پہلے والی آیات کے ذیل میں مذکورہ تفسیر کو ہی اختیار کیا ہے، کبھی تو یہ کہا گیا ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جن کا نامہ اعمال اُن کے دائیں یا بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اور کبھی انہیں فلاح یافتہ، سعادت منداور بدبخت وبدقسمت لوگوں کے معنی میں لیا گیا ہے۔

اور کبھی ان لوگوں کے معنی میں لیا گیا ہے جو دائیں طرف سے جنت کی طرف اور بائیں طرف سے جہنم کی طرف جائیں گے یا نور ان کی دائیں طرف سے ضوفشاں ہوگا۔[۲]

نامہ عمل سب کے سامنے

پندرھویں اور آخری آیت میں نامہ اعمال کے سلسلے میں ایک نئی تعبیر پیش نظر ہے جو بہت واضح ہے، ارشاد ہوتا ہے: ''جب اعمال

---

[۱] تفسیر کبیر، فخر رازی، ج۲۹ ص ۱۴۲۔

[۲] تفسیر تبیان، ج۹ ص ۴۹۳، تفسیر مجمع البیان، تفسیر فخر رازی، تفسیر فی ظلال القرآن، زیر نظر آیت کے ذیل میں۔

نامے کھولیں جائیں گے۔۔۔۔ جب ہر شخص یہ جان لے گا کہ اس نے کیا تیار کیا ہے" واذا الصحف نشرت، واذا السماء کشطت، واذا الجحیم سعرت، واذا الجنة ازلفت، علمت نفس ما احضرت"۔

"نشرت" کا مادہ "نشر" ہے جو کھولنے اور پھیلانے کے معنی میں ہے، نامہ اعمال کے لئے یہ تعبیر یا تو اس لئے ہے کہ یہ نامہ اعمال موت کے بعد بند ہوں گے اور حساب و کتاب کے موقع پر دوبارہ کھولے جائیں گے، جیسے کسی مقدمہ کی مسل تفتیش کے ختم ہوجانے پر بند کر دی جاتی ہے اور پھر عدالت میں کھولی جاتی ہے، یا پھر یہ اس لئے ہے کہ وہ تمام اعمال نامے خدا کے پاس جمع ہو جائیں گے اور قیامت میں انسانوں کے درمیان تقسیم کر دیئے جائیں گے۔

ہر ایک مفسر نے ان دونوں معانی میں سے ایک کا چناؤ کیا ہے اور بعض نے ان دونوں احتمالوں کو اکٹھا ذکر کیا ہے لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔

بہر حال اعمال نامے اس طرح پھیلا دیے جائیں گے کہ نہ فقط یہ کہ جس کا نامہ اعمال ہوگا وہ دیکھے گا اور اپنے بھولے ہوئے کاموں کو یاد کرے گا، بلکہ اہل محشر بھی دیکھیں گے، یہ امر خود نیک لوگوں کے لئے خوشی کا باعث اور بروں کے لئے عذاب کا باعث ہوگا۔

سورہ بنی اسرائیل آیت ۱۳ میں ہے:

"ونخرج له یوم القیامة کتابا یلقه منشورا"

ہم قیامت کے دن اس کے لئے نامہ عمل یوں لائیں گے کہ وہ اُسے کھلا ہوا پائے گا"۔

یہ آیت بھی اسی معنی کی تائید کرتی ہے۔

مذکورہ بالا تمام آیات سے مجموعی طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ خدا کے ان تمام کاموں پر آگاہ و عالم ہونے کے ساتھ ساتھ جسمانی اعضاء بھی قیامت کے گواہوں میں شامل ہوں گے، اعمال کے متعلق ان کی گواہی بھی نامہ اعمال میں ثبت ہوگی اور یہ کام خدا کے فرشتوں کے ذریعے انجام پائے گا، قیامت کے دن برے لوگوں کا نامہ اعمال اُن کے بائیں ہاتھ میں اور نیک لوگوں کا نامہ اعمال اُن کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، یہ نامہ اعمال خود بات کرے گا اور تمام کہنے والی باتیں کہے گا۔

اعمال نامے کھول دیئے جائیں گے اور اہل محشر ان کی برائیوں اور نیکیوں سے آگاہ ہو جائیں گے، نیک عمل انجام دینے والے خوشی اور اعزاز کے ساتھ تمام لوگوں کو اپنا نامہ اعمال پڑھنے کی دعوت دیں گے جب کہ برے لوگ خوف، شرمندگی اور رسوائی کے ڈر سے آہ و نالہ کرتے پھر رہے ہوں گے۔

یہ تعبیرات بہت سے تربیتی نکات کی حامل ہیں جنہیں "توضیحات" کے حصہ میں بیان کیا جائے گا۔

توضیحات

ا۔ اسلامی روایات میں اعمال نامے کا تذکرہ:

''نامہ اعمال'' یا ''صحیفہ اعمال'' کے موضوع کو احادیث میں بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے، ان میں سے کچھ روایات گذشتہ آیات کی تفسیر کے سلسلے میں گزر چکی ہیں، ان کے علاوہ بھی کچھ روایات الگ سے ہیں جن میں سے نمونے کے طور پر چند کو ذکر کیا جا رہا ہے، ان میں سے ہر ایک اہم نکات کی حامل ہے۔

ا۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ایک حدیث میں ہے:

اذا کان یوم القیامة دفع الی الانسان کتابه، ثم قیل له اقرا قلت: فیعرف مافیه؟ فقال: ان الله یذکره فما من لحظة ولا کلمة ولا نقل قدم ولا شیء فعله، الا ذکره کانه، فعله تلك الساعة! فلذلك قالوا یاویلتنا ما لهذا الکتاب لا یغادر صغیرة ولا کبیرة الا احصاها۔

جب قیامت برپا ہوگی تو انسان کا نامہ اعمال اس کے ہاتھ میں دیا جائے گا، پھر اس سے کہا جائے گا کہ (اسے) پڑھ۔

راوی کہتا ہے: میں نے عرض کیا: جو کچھ اس میں ہے وہ اسے جانتا ہوگا؟

امام نے ارشاد فرمایا: خدا اسے یاد دلائے گا، آنکھ کی کوئی جھپک، زبان کی کوئی بات، پاؤں کا کوئی قدم اور ہر ایسا دوسرا کام جو اس نے انجام دیا ہوگا اُسے یاد آ جائے گا، اس طرح گویا یہ کام اس نے ابھی ابھی انجام دیا ہے۔

''وہ کہے گا: مجھ پر وائے! یہ کیسی کتاب ہے جس میں ہر چھوٹا اور بڑا کام لکھ دیا گیا ہے''۔

۲۔ نہج البلاغہ کے ایک خطبے میں امیر المومنینؑ کا یہ ارشاد ہے:

وتستغفره مما احاط به علمه واحصاه کتابه علم غیر قاصر و کتاب غیر مغادر۔

''میں خدا سے مغفرت طلب کرتا ہوں اس چیز پر جس کا اس کے علم نے احاطہ کیا ہوا ہے اس کی کتاب (بندوں کے

نامہ اعمال) نے ان کو شمار کیا ہوا ہے، اس کے علم میں کوئی کمی نہیں، وہ ایسا نامہ عمل ہے جس نے کوئی بات (لکھنے سے)نہیں چھوڑی''۔[1]

۳۔ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ایک حدیث اس طرح ہے:

ولیست تشھد الجوارح علی مومن ، انما تشھد علی حقت علیه کلمة العذاب فاما المومن فیؤتی کتابه بیمینه۔

''مومن کے اعضاء اس کے خلاف گواہی نہیں دیں گے، یہ شہادت صرف ان کے خلاف ہوگی جو عذاب کے مستحق ہیں، مومن کا نامہ عمل تو اس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔[2]

۴۔ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ایک اور حدیث اس طرح ہے:

'' خدا جب کسی مومن کا حساب لینا چاہے گا تو نامہ عمل اس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اور اُسے خود اپنا حساب لینے کے متعلق کہے گا اور ارشاد کرے گا: اے میرے بندے! کیا تم نے فلاں فلاں کام کیا ہے؟ تو وہ عرض کرے گا: اے میرے پالنے والے! ہاں! میں نے یہ کیا ہے؛

ارشاد ہوگا: میں نے تجھے بخش دیا اور تیرے ان گناہوں کو (ان نیکیوں کی وجہ سے جو زیادہ ہیں) نیکیوں میں تبدیل کر دیا، (اس دوران وہ ہر گناہ سے پاک لوگوں کے سامنے آئے گا) لوگ کہیں گے: سبحان اللہ! کیا اس بندے نے ایک گناہ بھی نہیں کیا؟ اور یہی خدا نے قرآن میں فرمایا ہے:

فاما من اوتی کتابه بیمینه فسوف یحاسب حسابا یسیرا وینقلب الی اهله مسرورا۔

یعنی جس کا نامہ عمل اس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اُس کا حساب آسان ہوگا، پھر وہ خوشی خوشی اپنے خاندان کی طرف (جنت میں) چلا جائے گا۔[3]

۵۔ سنن الترمذی میں رسول خداؐ سے یہ حدیث منقول ہے:

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۱۴۔

[2] بحارالانوار، ج ۷ ص ۳۱۸، حدیث ۱۴۔

[3] بحارلانوار، ج ۷ ص ۳۲۴، حدیث ۱۷۔

يعرض الناس يوم القيامة ثلاث عرضات: فاما عرضتان فجدال ومعاذير، و اما العرضة الثالثة فعند ذلك تطير الصحف فی الایدی، فاخذ بیمینه فاخذ بشماله۔

''قیامت کے دن لوگ تین مرتبہ خدا کے حضور حاضر ہوں گے، پہلی اور دوسری مرتبہ تو بحث و عذر خواہی ہوگی (یہ کبھی کوشش کریں گے کہ اپنے گناہوں کو دوسروں کی گردن میں ڈال دیں اور کبھی عذر خواہی کریں گے) لیکن تیسری مرتبہ اُن کے اعمال نامے پرواز کریں گے اور اُن کے ہاتھوں میں آجائیں گے، بعض کے دائیں ہاتھ میں اور بعض کے بائیں ہاتھ میں''۔[1]

اس تعبیر سے ضمنی طور پر ''تطایر کتب'' (اعمال ناموں کے اڑنے) کے معنی کی نشاندہی ہورہی ہے اور یہ بات مختلف عبارات میں بیان ہوئی ہے، اعمال نامے اپنے اصلی مقام (عرش خدا کے پاس سے یا علیین اور سجین کے پاس سے، یا جو بھی ان کے جمع ہونے کا مرکز ہوگا) سے پرواز کریں گے اور انسانوں کے ہاتھوں میں آجائیں گے، یہ تعبیر واضح طور پر بتاتی ہے کہ نامہ اعمال انسانی روح کا ایک صفحہ نہیں، بلکہ ایسے آثار ہیں جو انسانی وجود سے باہر کسی اور چیز پر ثبت ہوتے ہیں (غور کیجئے گا)۔

۲۔ نامہ عمل کی حقیقت

اس میں کوئی شک نہیں کہ اعمال نامہ کسی معمولی کتاب، کاغذ یا کاپی کی طرح نہیں ہوگا بلکہ وہ ایک بولنے والی تحریر کی صورت میں ہوگا جسے کوئی جھٹلا نہیں سکے گا، اس بات کی دلیل یہ ہے کہ اگر وہ عام کاغذوں کا کوئی مجموعہ ہوتو ایک آدمی کے ہی عمر بھر کے اعمال لکھنے کے لئے ہزاروں کاغذات کی ضرورت پڑے گی، اور پھر اس طرح کے مجموعے کا مطالعہ تمام لوگوں کے لئے کوئی آسان بات نہیں ہوگی، نیز یہ بدکاروں کے لئے رسوائی اور نیک لوگوں کے لئے کسی اعزاز کا ذریعہ نہیں بن سکتا، جب کہ کئی آیات واحادیث سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ انسان کے اعمال اس میں اس طریقے سے درج ہوں گے جنہیں ایک نگاہ سے ہی پڑھا جا سکے گا۔

علاوہ ازیں عام قسم کی لکیریں اور نقش ایسے نہیں ہوتے جن کا انکار نہ کیا جا سکے، جب کہ آیات وروایات سے یہ بات بخوبی معلوم ہوتی ہے کہ اس کے مندرجات کا کوئی انکار نہ کر سکے گا، یہاں تک کہ جس کا یہ اعمال نامہ ہے وہ بھی اسے نہیں جھٹلا سکے گا۔

اعمال نامے کے سلسلے میں مختلف تفسیریں کی گئی ہیں، جن کا مطالعہ دقیق نظر سے ضروری ہے۔

(ا)۔ بعض نے اس کی تفسیر یوں کی ہے:

---

[1] سنن ترمذی، ج ۴، ص ۶۱۷، حدیث ۲۴۲۵۔

هی بعینها نفسه التی رسخت فیها اثار اعماله بحیث انتقشت بها۔

یہ بالکل وہی انسانی روح ہے جس میں اس کے اعمال کے اثرات اس طرح نفوذ کر چکے ہیں کہ اس (روح پر ان کا نقش جم گیا ہے)۔[1]

یہ تفسیر فیض کاشانی مرحوم نے کی ہے، اس کے مطابق اعمال نامہ انسان کی روح کے لئے کنایہ ہے جس پر اُس کے اعمال کے اثرات نقش بٹھا چکے ہوں۔

واضح سی بات ہے کہ یہ کنایہ والے معنی قرآنی آیات کے ظاہر کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہیں، کیونکہ قرآن یہ کہتا ہے کہ نیک لوگوں کا اعمال نامہ اُن کے دائیں ہاتھ میں جب کہ برے لوگوں کا اعمال نامہ اُن کے بائیں ہاتھ میں یا پیٹھ کے پیچھے سے دیا جائے گا، یہ تعبیر مذکورہ بالا تفسیر کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے، صرف ایک صورت نکل سکتی ہے اور وہ یہ کہ یمین اور شمال اور اسی طرح قرآن وحدیث میں اس سلسلے میں آنے والی تمام تعبیرات سے کنایہ والے معنی مراد لئے جائیں لیکن یہ ظاہر کے خلاف ہے جو کہ دلیل کے بغیر جائز نہیں ہے، علاوہ ازیں یہ تفسیر ''نوشتوں کی پرواز'' کے مفہوم کے ساتھ بھی ہم آہنگ نہیں ہے۔

(۲)۔علامہ طباطبائی مرحوم نے المیزان میں اس سلسلے میں ایک اور تفسیر کی ہے انہوں نے سورہ آل عمران کی آیت ۳۰ سے استفادہ کرتے ہوئے یہ فرمایا، وہ آیت یہ ہے:

''یوم تجد کل نفس ما عملت من خیر محضرا وما عملت من سوء''

جس دن ہر انسان اپنے برے اور اچھے اعمال کو اپنے ساتھ حاضر دیکھ لے گا۔

علامہ کہتے ہیں:

اعمال نامہ انسانی اعمال کے حقائق پر مشتمل ہوگا یہ عام لکیروں اور نقوش کی طرح نہیں کہ جو دنیا کی کتابوں میں ہوتے ہیں، بلکہ وہ خود انسان کے اعمال کی صورت میں ہے جن سے خدا انسان کو واضح طور پر آگاہ کرے گا جس پر مشاہدہ سے بہتر کوئی دلیل نہیں ہے، یہ نوشتہ دنیا میں انسانی نگاہوں سے اوجھل ہے اور غفلت کے پردوں نے اُسے ڈھانپا ہوا ہے، قیامت کے دن خدا اُسے کھولے گا، غفلت کے حجابوں کو ہٹا دے گا اور انسان کو اس کے متعلق بتائے گا۔[2]

مختلف آیات وروایات میں اعمال نامہ لکھنے والے فرشتوں اور اُن کی خصوصیات کے متعلق جو کچھ بیان ہوا ہے، یہ تفسیر اس کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے، کیونکہ حقائق اعمال سے ظاہری طور پر مراد اعمال کے وہی آثار ہیں جو وہ انسان کی روح پر ترتب کرتے ہیں، مرحوم فیض کاشانی

---

[1] تفسیر صافی، آیت ۱۳ سورہ اسراء ص ۳۱۲ (سنگی ایڈیشن)۔

[2] تفسیر المیزان، ج ۱۳، ص ۵۸ سورہ بنی اسرائیل آیہ ۱۳ کے ذیل میں (اختصار کے ساتھ)۔

پر ہونے والا اعتراض یہاں پر بھی وارد ہوتا ہے:

''روح المعانی'' کے مصنف نے اسی تفسیر کو بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، پھر وہ خود ہی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ یہ تفسیر آیات کے ظاہر کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے۔[۱]

ممکن ہے یہ بات کہی جائے کہ انسانی اعمال، جیسا کہ انسانی روح پر اثر انداز ہوتے ہیں، اسی طرح بیرونی دنیا، اردگرد کی فضا و ہوا، جس زمین پر وہ زندگی بسر کرتا ہے اور باقی تمام چیزوں پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں، گویا یہ اُن پر اپنا نقش جما دیتے ہیں، طبیعی اور نا قابل انکار نقش، ایسے نقوش جو اس عالم ہستی کی طاقت ورذات اور فرشتوں کے ذریعے ان موجودات پر ثبت ہوتے ہیں، قیامت کے دن اس سے پردہ ہٹا دیا جائے گا اور وہ سامنے آجائے گا، پورے ماحول کے اثرات ایک جگہ اکٹھے کر دیئے جائیں گے اور مختصر صورت اختیار کر لیں گے، پھر ہر شخص کے ہاتھ میں انہیں تھما دیا جائے گا، انہیں صرف ایک نظر دیکھنے سے ہی پوری معلومات حاصل ہو جائیں گی۔

یہ اثرات یقینی طور پر اس دنیا میں ہمارے لئے قابل فہم نہیں ہیں، لیکن ان کا وجود ایک قطعی چیز ہے، جس دن ہمیں ایک نئے نور بصارت سے نوازا جائے گا اس دن انہیں دیکھ لیں گے، پھر پڑھیں گے اور اُن کی تصدیق کریں گے۔

آثار قدیمہ کے ماہرین ہزاروں سال قبل کے مجسموں کو دیکھ کر نہ فقط یہ کہ ان کی شکل وصورت کا اندازہ لگا لیتے ہیں بلکہ اُن کی زندگی سے متعلق کئی حقائق کا بھی انکشاف کرتے ہیں، یہ مجسمہ یقیناً خود حیوان نہیں ہے بلکہ اس کا وہ اثر ہے جو زمین پر باقی بچا ہے، حقیقت میں زمین کے یہ پتھر ان حیوانات کے کاموں اور شکلوں کا نامہ اعمال ہیں، البتہ یہ ایسے نقوش سے مرتب ہوا جن سے انکار کی مجال کسی کو نہیں ہے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ اعمال نامہ قیامت میں اس طرح کا نہیں ہوگا کیونکہ کئی مرتبہ یہ بات دہرائی جا چکی ہے کہ ہم قیامت اور اس سے متعلق مسائل کے بارے میں فقط اجمالی حد تک معلومات رکھتے ہیں۔ لیکن بعض جہات سے طبعی اثر کے اعتبار سے یہ ایک دوسرے کے مانند ہو سکتے ہیں، حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ایک حدیث میں ہے:

یذکر العبد جمیع ما عمل وما کتب علیه، حتی کانه فعله تلك الساعة فلذلك قالوا یویلتنا مال هذا الکتاب لا یغادر صغیرة ولا کبیرة الا احصاها۔

انسان اعمال نامے کے مطالعہ سے اپنے تمام اعمال سے یوں آگاہ ہوجائیگا جیسا کہ اس نے انہیں ابھی ابھی انجام دیا ہے، لہٰذا کہے گا: مجھ پر وائے! یہ کیسا نوشتہ ہے جس نے کسی چھوٹے اور بڑے عمل کو نہیں چھوڑا۔[۲]

---

[۱] روح المعانی، ج ۱۵ ص ۳۲۔

[۲] نور الثقلین، ج ۳ ص ۲۶۷، حدیث ۱۱۵۔

(۴) بعض مفسرین نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ انسان کا اعمال نامہ اس کا وجدان باطنی یا ضمیر ہے علم نفسیات میں یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ انسان کے اعمال اس کے ضمیر یا تحت الشعور پر اثر انداز ہوتے ہیں، یہ تفسیر بھی فیض کا شانی اور دوسرے مفسرین کی تفسیر کے ساتھ ملتی جلتی ہے حقیقت میں اُسی پرانی بات کے لئے ایک نیا انداز اختیار کیا گیا ہے۔

اب تک اعمال نامے کے سلسلے میں چار تفسیریں بیان کی گئی ہیں جن میں سے دوسری تفسیر سب سے زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔

بہر حال یا تو یہ کہا جائے کہ چونکہ اعمال نامے کا موضوع قرآن کی مختلف آیات اور بہت سی روایات میں ذکر ہوا ہے اس لئے اس پر ایمان رکھنا ضروری ہے، اگر چہ اس کا مفہوم اور پوری تفصیل ہمیں معلوم نہ ہو، جیسا کہ قیامت سے متعلق دوسرے امور میں بھی معاملہ کچھ اسی طرح ہے، یا پھر یہ کہا جائے کہ اعمال نامہ ہمارے کاموں کا وہی اثر ہے جو ہمارے وجود سے باہر ہوتا ہے، قیامت کے دن خدا کے حکم سے یہ آثار اکٹھے ہو جائیں گے اور ہمارے ہاتھ میں تھما دئے جائیں گے، دوسرے لفظوں میں اس طرح کہ یہ ان تکوینی اور حقیقی آثار کا مجموعہ ہے جنہیں ایک لحاظ سے وڈیو کیسٹ، آڈیو کیسٹ یا مجسموں (Fossile) کی طرح سمجھا جا سکتا ہے، ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ بالکل اسی طرح ہے بلکہ ہماری بات کا مطلب یہ ہے کہ یہ ایک لحاظ سے اُن سے ملتا جلتا ہے (غور کیجئے گا)۔

۳۔ اعمال نامے کا فلسفہ:

مختلف آیات وروایات میں اعمال نامے کے متعلق تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے، بالخصوص اس بات کے پیش نظر کہ انسان کا ہر چھوٹے سے چھوٹا عمل، اس کی ہر بات اور نیت کو اعمال نامے میں درج کیا جائے گا، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی سب سے زیادہ اہمیت اس کے تربیتی آثار کے حوالے سے ہے، ہم نے کئی بار یہ بات کی ہے کہ تمام حقیقی معارف کی شرح وتفصیل سے قرآن کا مقصد تزکیہ نفس، بالیدگی روح اور اخلاق وتقویٰ کے زیور سے انسان کو مزین کرتا ہے، یہ انسان کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کراتا ہے کہ وہ اپنے گفتار و کردار پر غور کرے، ہر چیز لکھی جائے گی اور قیامت کے دن کسی کمی پیشی کے بغیر سب کچھ اس کے سامنے لایا جائے گا۔

یہ بات صحیح ہے کہ خدا کا علم ان سب چیزوں کو اپنے وسیع دامن میں سمیٹے ہوئے ہے اور جو شخص خدا کے حاضر و ناظر ہونے اور اس کے علم کے بیکراں ہونے پر ایمان رکھتا ہے اس کے لئے اعمال نامے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن لوگوں کی اکثریت کا اس بات کی طرف متوجہ ہونا بھی کئی تربیتی آثار کا باعث بنتا ہے۔

جسے یہ معلوم ہے کہ ایک ٹیپ ریکارڈر ہمیشہ اس کے ساتھ ہے اور ایک بہترین وڈیو کیمرہ ہے جو خلوت وجلوت، ظاہر و باطن اور ہر جگہ پر اس کی فلم بنا رہا ہے اور ایک دن یہ تمام فلمیں اور کیسٹیں ایک زندہ، نا قابل انکار صورت میں خدا کی عدالت میں پیش کی جائیں گی، تو ایسا انسان یقینی طور پر اپنے اعمال، رفتار اور گفتار کی طرف ہمہ وقت توجہ رکھے گا اور اس کا ظاہر و باطن تقویٰ کے لباس سے مزین رہے گا۔

ایسے اعمال نامے پر ایمان جس میں ہر چھوٹا اور بڑا عمل لکھا جائے گا، اس بات پر یقین کہ انسان کے کے ساتھ کچھ ایسے فرشتے ہیں جو روز شب اس کے اعمال لکھتے ہیں، اس حقیقت پر ایمان کہ روز محشر اعمال نامے کو تمام لوگوں کیسا منے کھولا جائے گا اور اس کے تمام چھپے ہوئے گناہ

اس دن ظاہر ہو جائیں گے جس سے دوستوں اور دشمنوں کے درمیان اس کی رسوائی ہوگی، یہ سب کچھ گناہوں سے روکنے کے لئے ایک بہت موثر اور حیرت انگیز عامل ہے۔

جب کہ نیک لوگوں کے اعمال نامے اُن کے لئے عزت اور آبرو کا باعث بنیں گے، فلم اور کیسٹ وغیرہ میں جو کچھ کہا جاتا ہے یہ بات اس سے بھی زیادہ موثر ہوتی ہے، یہ نیک اعمال پر ابھارنے کے لئے ایک اہم عامل ہے لیکن کبھی ایمان کمزور ہوتا ہے اور کبھی غفلت اور جہالت کے پردے انسان کو ان حقائق سے دور کر دیتے ہیں ورنہ اس قرآنی حقیقت پر ایمان ہر انسان کی تربیت اور اصلاح کے لئے کافی ہے۔

لہٰذا بعض دعاؤں میں (جو کہ یقینی طور پر انسان کی اصلاح کے لئے لائحہ عمل ہیں) اس بات کو بیان کیا گیا ہے معروف دعائے کمیل میں اس طرح ہے:

وكل سيئة امرت باثباتها الكرام الكاتبين، الذين وكلتهم بحفظ ما يكون منى وجعلتهم شهودا على مع جوارحى، وكنت انت الرقيب على من ورائهم، والشاهد لما خفى عنهم۔

خدایا! میرے ان تمام گناہوں کو جنہیں تو نے اپنے فرشتوں کو لکھنے کا حکم دیا تھا، معاف فرما دے، وہی فرشتے جنہیں تو نے اس بات پر مامور فرمایا ہے کہ مجھ سے جو کچھ سرزد ہوا اُسے لکھ لیں، اور تو نے انہیں میرے بدن کے علاوہ مجھ پر بھی گواہ بنایا ہے، ان سے اوپر تو میرا نگہبان ہے، اور گواہ ہے اس بات پر جو اُن سے پوشیدہ ہے۔

اس سلسلہ گفتگو کو حضرت امام جعفر صادقؑ سے منقول ایک حدیث پر ختم کرتے ہیں:

احتجاج طبرسی میں آیا ہے کہ ایک شخص نے امام جعفر صادقؑ سے پوچھا کہ اچھے اور برے اعمال کے لکھنے پر فرشتے کیوں مامور کئے جاتے ہیں جب کہ ہمیں معلوم ہے کہ خدا ''عالم السر والخفيات وما هو اخفى'' ہے اور ہر مخفی (پوشیدہ) سے مخفی (پوشیدہ) بات کو وہ جانتا ہے، امامؑ نے جواب میں فرمایا:

استعبد هم بذلك وجعلهم شهودا على خلقه ليكون العباد بملا زمتهم اياهم اشد على طاعة الله مواظبة، وعن معصيته اشد انقبا ضا وكم من عبد يهم بمعصية فذكر مكانهما فارعوى وكف فيقول ربى يرانى، وحفظتى على بذالك تشهدا:

خدا نے ان فرشتوں کو اپنی عبادت پر مامور کیا ہے، اور انہیں اپنے بندوں پر گواہ بنایا ہے، تاکہ بندے اُن کی

ہمراہی کی وجہ سے خدا کی اطاعت کے لئے اور آگے بڑھیں اور اس کی نافرمانی سے زیادہ سے زیادہ بچیں، بہت سے ایسے بندے ہیں جو کسی گناہ کا ارادہ کر لیتے ہیں، پھر انہیں یہ دو فرشتے یاد آجاتے ہیں، لہٰذا وہ گناہ سے رک جاتے ہیں اور کہتے ہیں! ہمارا رب ہمیں دیکھ رہا ہے! اور اعمال پر نگران فرشتے بھی گواہی دیتے ہیں۔

۴۔اعمال نامے کی قسمیں:

جیسا کہ پہلے بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے قرآن سے اس بات کی بخوبی وضاحت ہوتی ہے کہ ہر انسان کے لئے تین طرح کے نامہ اعمال ہوں گے!

(۱)۔ ہر انسان کے لئے ایک الگ کتاب ہوگی جس میں اس کے تمام اعمال درج ہوں گے یہ اس کے دائیں یا بائیں ہاتھ میں دی جائے گی، یہ بات قرآن کی متعدد آیات میں بیان کی گئی ہے، مثلاً سورہ اسراء آیت نمبر ۱۳ ''**وکل انسان الزمنه طائرہ فی عنقه و نخرج له یوم القیمة کتبا یلقه منشورا۔ اقرا کتبك کفی بنفسك الیوم علیك حسیبا**''۔

کل انسان (ہر انسان) اور کتبك (تیرا اعمال نامہ) کی تعبیرات واضح طور پر اس خصوصی اعمال نامے کی طرف اشارہ کر رہی ہیں، ''**هاؤم اقرء وا کتابیه**'' (آؤ میرا اعمال نامہ پڑھو) یا ''**یلیتنی لم اوت کتابیه**'' (اے کاش مجھے میرا نامہ اعمال نہ دیا جاتا) کی تعبیرات جو کہ سورہ حاقہ آیت ۱۹ اور ۲۵ میں آئی ہیں، بھی اسی سلسلے کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔

(۲)۔ امتوں کا نامہ اعمال جس میں پوری امت کے اعمال اکٹھے لکھے ہوں گے، سورہ جاثیہ آیت ۱۸ میں ارشاد ہوتا ہے ''**کل امة تدعی الی کتابها**'' (ہر امت اپنے اعمال نامے کی طرف بلائی جائے گی)، ''کتاب'' کی تعبیر اور وہ بھی جمع کی صورت میں، نہ کہ مفرد کی صورت میں، ہماری بات کی تائید کرتی ہے۔

(۳)۔ ایک ہی اعمال نامہ ہوگا جس میں تمام امتوں اور اول سے لے کر آخر تک تمام لوگوں کے اعمال درج ہوں گے، یہ حقیقت میں ایک مرکزی نوشتہ کے مانند ہوگا، سورہ کہف، آیت ۴۹ میں اس اعمال نامے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: ''**ووضع الکتاب فتری المجرمین مشفقین مما فیه**'' (وہاں پر نوشتہ رکھ دیا جائے گا، تم دیکھو گے کہ تمام گنہگار اُس میں موجود باتوں سے خوف زدہ ہوں گے)، اس سے بھی واضح تر سورہ یٰسین آیت ۱۲ ہے جو مُردوں کے زندہ ہونے اور خدا کی طرف سے اُن کے اعمال اور آثار کے لکھے جانے کا ذکر کرنے کے بعد فرماتی ہے: ''**وکل شئی احصینه فی امام مبین**'' (ہم نے تمام چیزوں کو واضح نوشتہ میں جمع کر دیا ہے) اس میں ''کتاب'' کو بطور نکرہ لانا جو کہ مفرد کے معنی میں ہے، اور پھر تمام چیزوں کے لکھے جانے کا ذکر کرنا، اس بات پر واضح دلیل ہے کہ تمام انسانوں کے اعمال، بلکہ تمام اشیاء ایک نوشتہ میں اکٹھی لکھی ہوئی ہوں گی۔

علامہ طباطبائی مرحوم نے بھی تفسیر ''المیزان'' میں ان تین قسموں کے اعمال نامے کی طرف اشارہ کیا ہے اگرچہ اس سلسلے میں انہوں

نے جن آیات سے استفادہ کیا ہے وہ مذکورہ بالا بیان سے کسی حد تک فرق رکھتی ہیں۔[1]

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ سورہ مطففین (آیت ۷، ۱۸) سے ایک چوتھی قسم کے اعمال نامے کا اثبات بھی ممکن ہے جو ''ابرار'' اور ''فجار'' (نیکو کاروں اور بروں) کے لئے ایک الگ الگ نامہ اعمال کی صورت میں ہوگا۔

ان کتاب الفجار لفی سجین........ ان کتاب الابرار لفی علیین۔

بہر حال یہ بات واضح ہے کہ ان اعمال ناموں کے درمیان کسی قسم کا تفاوت نہیں ہے اور اس بات سے کوئی چیز بھی مانع نہیں ہے کہ ایک عمل کو مضبوطی اور تاکید کیلئے مختلف جگہوں پر لکھا جائے، لوگ اپنے دنیاوی معاملات میں بھی اسی طرح کرتے ہیں۔

بہر حال یہ سب کچھ اس حقیقت پر تاکید کے لئے ہے کہ انسان پوری طرح بیدار اور متوجہ رہے اور اسے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اُس کے اعمال نہ فقط ایک جگہ پر، بلکہ کئی جگہ پر لکھے جارہے ہیں، اس بات کا امکان نہیں ہے کہ اس سے کوئی کام سرزد ہو لیکن قیامت کے دن اس کا حساب نہ لیا جائے، بلکہ ان سے بڑھ کر خدا کی علم وآگہی بھی اس کے اعمال کے متعلق ہے۔

۵۔ اعمال نامے کی خصوصیات

گذشتہ آیات وروایات سے مجموعی طور پر اعمال نامے کی مندرجہ ذیل خصوصیات سامنے آتی ہیں:

۱۔ اعمال نامہ انسان کی پوری زندگی کے اعمال کا نتیجہ ہے جس میں کوئی چیز چھوڑی نہیں جائے گی۔

۲۔ اعمال نامہ ایک ایسی گویا اور بولتی ہوئی سند ہے جو قابل انکار نہیں ہوگی، ہر شخص اُسے دیکھ کر فیصلہ کرسکتا ہے، یہاں تک کہ خود گنہگار بھی۔

۳۔ اعمال نامہ لکھنے والے دو فرشتے ہیں جو قرآن کی زبان میں ''رقیب'' اور ''عتید'' کے نام سے پکارے جاتے ہیں، جیسا کہ بعض روایات سے استفادہ ہوتا ہے دن اور رات کے فرشتے جدا جدا ہیں، ہر ایک اپنی جگہ دوسرے کو دے دیتا ہے، قرآن کی بھی بعض آیات میں اس معنی کی طرف ایک مبہم سا اشارہ پایا جاتا ہے۔

۴۔ بعض روایات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے علاوہ کچھ اور فرشتے بھی ہیں جو چند خاص قسم کے اعمال لکھنے پر مامور ہیں، مثلاً رسول اکرمؐ سے مروی ایک حدیث اس طرح ہے:

اذا کان یوم الجمعة کان علی کل باب من ابواب المسجد ملائکة یکتبون الاول فالاول، فاذا جلس الامام طووا الصحف وجاء وایستمعون الذکر!

---

[1] تفسیر المیزان، ج ۳ ص ۳۴۸۔

جب جمعہ کا دن آتا ہے تو مسجد کے ہر دروازے پر فرشتے بیٹھ جاتے ہیں جو آنے والے لوگوں کے نام ترتیب سے لکھتے ہیں اور جب امام جماعت (منبر پر) بیٹھ جاتا ہے (خطبہ شروع کرنے سے پہلے) تو وہ اپنی تحریریں ایک جگہ اکٹھی کر لیتے ہیں اور خدا کا ذکر سننے لگتے ہیں۔[۱]

۵۔ بعض احادیث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نیکیاں تو فوراً لکھ لیتے ہیں، لیکن برائیاں کچھ عرصے بعد (شاید برائی کرنے والا پشیمان ہو جائے اور توبہ کر لے)، اس بحث کو امام سجادؑ کے صحیفہ سجادیہ کی مشہور دعاؤں کے چند پر معنی جملات پر ختم کرتے ہیں اور ان جملات میں ہم سب امامؑ کے ساتھ ہم آواز ہوتے ہیں۔

امامؑ خدا کے حضور یوں عرض کرتے ہیں:

اللھم یسر علی الکرام الکاتبین مونتنا واملالنا من حسنا تنا صحائفنا، ولا تخزنا عندھم بسوء اعمالنا۔۔۔[۲] فصل علی محمد والہ، واجعل ختام ما تحصی علینا کتبۃ اعمالنا توبۃ مقبولۃ۔[۳]

خدایا! ہمارے کام کو ان مہربان فرشتوں کے لئے، جو اُسے لکھتے ہیں، آسان فرما، ہمارے اعمال نامے کو ہماری نیکیوں سے بھر دے اور ہمیں ان کے سامنے ہمارے برے اعمال کی وجہ سے رسوا نہ فرما!۔۔۔۔خدایا! محمدؐ و آل محمدؐ پر درود بھیج، اور اعمال نامہ لکھنے والے جو ہماری آخری بات لکھیں اُسے ہماری توبہ مقبولہ قرار دے۔

---

[۱] صحیح مسلم، ج ۲ صفحہ ۵۸۷، حدیث ۸۵۰، شاید حدیث کے ذیل کا مفہوم یہ ہو کہ جو لوگ نماز جمعہ میں دیر سے جاتے ہیں اُن کا نام اس نوشتے میں نہیں لکھا جائے گا۔

[۲] صحیفہ سجادیہ، دعائے ششم۔

[۳] صحیفہ سجادیہ، دعائے یازدہم۔

تجسمِ اعمال

اشارہ

جولوگ قرآنی آیات سے کچھ آشنائی رکھتے ہیں انہیں یہ بات بخوبی معلوم ہے کہ قرآن میں ایسی متعدد آیات ہیں جو ظاہری طور پر قیامت کے دن ''تجسم'' یا ''تجسد'' اعمال کے متعلق گفتگو کرتی ہیں، یعنی اس دن ہر شخص کا عمل چاہے وہ برا ہو یا اچھا، اس کے سامنے آئے گا، یہ یا تو اس کے خوشی وانبساط کا باعث بنے گا یا سزا اور عذاب کا موجب ہوگا، اس کے ذریعے یا تو وہ عزت وافتخار محسوس کرے گا یا شرمندگی اور رسوائی۔

کیا یہ ممکن ہے کہ انسان کے اعمال باقی رہ جائیں جب کہ یہ اعمال چند ایسی حرکات کا مجموعہ ہوتے ہیں جو محو اور نابود ہو جاتی ہیں؟ اس سے بڑھ کر کیا یہ ممکن ہے کہ عمل جو انسانی وجود کے عوارض میں سے شمار ہوتا ہے وہ ایک جسم کی شکل اختیار کر لے اور ایک الگ صورت میں ظاہر ہو؟

چونکہ بعض مفسرین ان دو سوالوں کا جواب نہیں دے سکے، لہٰذا ناچار ہو کر وہ اس طرح کی آیات کی تفسیر میں کسی محذوف کے قائل ہو گئے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ عمل کے حاضر ہونے یا اُسے دیکھنے سے مراد یہ ہے کہ انسان اس عمل کی جزا یا سزا کا مشاہدہ کرے گا۔

لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ مذکورہ بالا سوالوں میں سے کوئی بھی لاجواب نہیں ہے، لہٰذا وہ آیات جو تجسم اعمال پر دلالت کرتی ہیں اُن سے انکار کرنے کی کوئی وجہ نہیں، بلکہ ان آیات کے حقیقی معنی (نہ کہ مجازی معنی) سے قیامت اور ثواب وعتاب سے متعلق بہت سے سوالات اور مشکلات کو حل کیا جا سکتا ہے، ان آیات کے مطابق بہت جاذب، بامعنی اور بہت موثر ہونے کے ساتھ ساتھ تربیتی نکتہ نظر سے بھی حد درجہ اہمیت کے حامل ہیں۔

اس کی تفصیل انشاء اللہ آگے آئے گی، اس مختصر سے اشارے کے ساتھ ہی ہم دوبارہ قرآن کی طرف پلٹتے ہیں اور اس موضوع سے متعلق آیات کو دیکھتے ہیں۔

۱۔ يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا ۥ لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ

۲۔ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۭ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا

۳۔ يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۚ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْءٍ ۚ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ اَمَدًاۢ بَعِيْدًا

۴۔ وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ۴۸
﴿الزمر:۴۸﴾[۱]

۵۔ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ(آل عمران۔۱۸۰)

۶۔ وَاِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ وَاِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّآ اَحْضَرَتْ
(تکویر۔۱۲ تا۱۴)

۷۔ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۚ وَلِيُوَفِّيَهُمْ اَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ
(احقاف۔۱۹)

۸۔ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَا يَفْعَلُوْنَ۷۰(زمر۔۷۰)

۹۔ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ(بقرہ:۲۷۲)[۲]

۱۰ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ(بقرہ:۲۸۱
۔آل عمران:۱۶۱)

۱۱ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ۭ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ
(التوبۃ۔۳۵)[۳]

۱۲ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ(طور:۱۶۔ تحریم ﷺ۷)[۴]

---

[۱] اسی سے ملتا جلتا زمر آیت ۵۱ آیت میں بھی آیا ہے۔
[۲] اسی مضمون کی اور آیات بھی ہیں۔ جیسے نحل ۱۱۱، آل عمران ۲۵، ہود ۱۱۱۔
[۳] سورہ زمر آیت ۲۴ میں بھی یہی مضمون آیا ہے۔
[۴] اسی معنی کی اور آیات بھی ہیں۔ جیسے اعراف ۷، ۱۴۷، ۱۸۰۔ سباء ۳۳۔

ترجمہ

۱۔ اس دن لوگ مختلف گروہوں کی شکل میں قبروں سے نکل پڑیں گے تا کہ انہیں انکے اعمال دکھائے جائیں، پس جوکوئی ذرہ بھر بھی نیکی کرے گا وہ اسے دیکھ لے گا، اور جو کوئی ذرہ بھر بھی برائی کرے گا وہ بھی اُسے دیکھ لے گا۔

۲۔ وہ اپنے تمام اعمال کو اپنے سامنے دیکھ لے گا اور تیرا پروردگار کسی پر ظلم نہیں کرتا۔

۳۔ اس دن ہر شخص اپنی نیکی جو وہ کر چکا ہے سامنے دیکھے گا اور ہر برائی جو وہ کر چکا ہے اُسے موجود پائے گا، (اور وہ یہ) خواہش کرے گا کہ اُس (برائی) کے اور اس کے اپنے درمیان ایک لمبی مدت حائل ہوجائے۔

۴۔ جو برے اعمال انہوں نے انجام دیئے ہوں گے وہ اس دن ان کے لئے ظاہر ہوں گے اور انہیں وہی عذاب گھیر لے گا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔

۵۔ جلد ہی قیامت کے دن، جس چیز کے بارے میں انہوں نے بخل کیا وہ ان کے گلے میں طوق بنا کر پہنایا جائے گا۔

۶۔ جب دوزخ بھڑکائی جائے گی اور جب جنت نزدیک ہوجائے گی تو ہر نفس جو کچھ لایا ہوگا اُسے جان لے گا۔

۷۔ اوران میں سے ہر ایک کے لئے درجات ہیں اُن کے اعمال کے اعتبار سے جو انہوں نے انجام دئے تا کہ خدا ان کے اعمال کسی کمی بیشی کے بغیر اُن کے سپرد کردے اور اُن پر کسی قسم کا ظلم نہیں ہوگا۔

۸۔ ہر ایک کو جو اس نے انجام دیا ہے بغیر کسی کمی بیشی کے دیا جائے گا اور جو کچھ وہ کرتے ہیں خدا اسے خوب جانتا ہے۔

۹۔ اور جو کچھ تم نیکی میں خرچ کرو گے اس کا فائدہ تمہاری اپنی ذات کے لئے ہوگا، البتہ وہ کہ جو کچھ تم خدا کی خوشنودی کے لئے خرچ کرتے ہو اور جو کچھ تم نیکی میں خرچ کرو گے، تم کو پورا پورا دیا جائے گا۔

۱۰۔ پھر ہر شخص نے جو کچھ انجام دیا ہے اُسے لوٹا دیا جائے گا۔

۱۱۔ جس دن کہ اُس سونے اور چاندی (مال و دولت) کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا، پھر اس سے اُن کی پیشانیاں، ان کے پہلو اور اُن کی پیٹھیں داغی جائیں گی (اور اُن سے کہا جائے گا) یہ وہی ہے جو تم اپنی ذات کے

لئے جمع کرتے تھے، پس تم جو کچھ جمع کرتے تھے اُس کا مزہ چکھو۔

۱۲۔ صرف تمہارے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا۔

تفسیر

انسان اس دن اپنے تمام اعمال دیکھ لے گا:

سب سے پہلی آیت جو کہ سورہ زلزال کے آخر میں آئی ہے اس میں تقسیم اعمال کی طرف تین مرتبہ اشارہ کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:
اس دن لوگ مختلف گروہوں کی شکل میں قبروں سے نکل پڑیں گے تاکہ انہیں انکے اعمال دکھائے جائیں "یومئذ یصدر الناس اشتاتا لیروا اعمالھم" پھر ارشاد ہوتا ہے: جس نے ذرہ برابر بھی نیکی کی وہ اسے دیکھ لے گا "فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ" پھر اس کے فوراً بعد ارشاد ہوتا ہے: جس نے ذرہ برابر بھی بدی کی وہ اسے دیکھ لے گا "ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ"۔

"اشتات" جمع ہے "شت" (بروزن "شط") کی جس کا معنی ہے متفرق اور جدا جدا۔[1]

لوگوں کا اس دن جدا جدا ہو کر آنا شاید اس لئے ہو کہ ہر امت اپنے امام کے ساتھ میدان محشر میں وارد ہوگی یا برے لوگوں کا گروہ الگ اور اچھے لوگوں کا الگ اور اسی طرح علماء طلباء، شہیداء وغیرہ کے گروہ الگ الگ آئیں گے۔

"مثقال" کے معنی بھاری ہونا اور "ذرہ" کے معنی بہت چھوٹا سا ذرہ ہیں، اس لئے کبھی اس کے معنی غبار کے ذرات اور کبھی چھوٹے پتنگے کئے گئے ہیں۔

ان آیت کا ظاہر واضح طور پر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ خود برے اور اچھے اعمال انسان کے سامنے پیش کئے جائیں گے اگرچہ بعض مفسرین نے یہاں پر کلمہ "جزاء" کو محذوف سمجھا ہے جس کی وجہ ان کا تجسم اعمال کو قبول نہ کرنا ہے، جس کی طرف پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے، ان کا خیال ہے کہ اس سے مراد اعمال کے ثواب اور عذاب کو دیکھنا ہے، بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہاں پر "رویت" (دیکھنے) سے مراد علم اور معرفت ہے جس کا تعلق عقلی مشاہدے سے ہے، بعض نے کہا ہے کہ مراد اعمال نامے کا دیکھنا ہے، یہ بات یقینی ہے کہ یہ تینوں تفاسیر آیت کے ظاہر کے خلاف ہیں کیونکہ اعمال کی جزا یا اعمال نامے کو محدوف سمجھنا آیت کے ظاہر کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے اور رویت کے معنی بھی ظاہری آنکھ سے دیکھنا ہیں، کلمہ "رویت" جب علم اور معرفت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے تو عموماً اس کے لئے دو مفعول درکار ہوتے ہیں جب کہ یہاں پر صرف ایک مفعول ذکر ہوا ہے (غور کیجئے گا)۔

قابل غور بات یہ ہے کہ ابن عباسؓ جو کہ اسلامی مفسرین میں بہت قدیم ہیں، انہوں نے بھی اس جگہ پر تجسم اعمال کو قبول کیا ہے ان

---

[1] تاج العروس فی شرح القاموس، مادہ "شت"، بعض نے اسے "شیت" اور بعض نے "شتات" کی جمع قرار دیا ہے۔

سے جو حدیث مروی ہے وہ یوں ہے:

لیس من مومن ولا کافر عمل خیرا اوشرا الا اراہ الله ایاہ اما المومن فیغفر لہ سیئاتہ و یثیبہ بحسناتہ واما الکافر فیرد حسناتہ تحسیرا لہ۔

ہر مومن اور کافر جس نے بھی کوئی نیکی اور برائی کی ہے، خدا اس کا عمل اُسے دکھائے گا، مومن کے گناہ بخش دے گا اور نیکیوں کی اُسے پاداش ملے گی اور کافر کی نیکیاں ٹھکرا دے گا تا کہ وہ حسرت میں مبتلا ہو جائے۔[۱]

مذکورہ بالا آیت کی تفسیر کے سلسلے میں معصومین علیہم السلام سے منقول احادیث میں تجسم اعمال کے متعلق کئی تعبیرات آئی ہیں، مثلاً حضرت علی علیہ السلام سے منقول ایک حدیث میں یوں آیا ہے:

فمن کان من المومنین عمل فی هذه الدنیا مثقال ذرة من خیر وجده ومن کان من المومنین عمل فی هذه الدنیا مثقال ذرة من شر وجده۔

جو مومن بھی اس دنیا میں ذرہ برابر بھی نیک کام کرے گا اُسے پالے گا اور جو مومن بھی اس دنیا میں ذرہ برابر بھی برائی کرے گا اُسے بھی پالے گا۔[۲]

دوسری آیت میں اسی موضوع سے متعلق ایک اور تعبیر لائی گئی ہے، اعمال نامے کی طرف اشارہ کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے: وہ اپنے تمام اعمال کو حاضر دیکھ لیں گے ''ووجدوا ما عملوا حاضرا''۔

لہذا وہ اپنے عمل سے جیسی کھیتی بوئیں گے ویسی ہی کاٹیں گے، ''اور تیرا پروردگار کسی پر ظلم نہیں کرتا'' ''ولا یظلم ربك احدا''۔

جو مفسرین تجسم اعمال کے قائل نہیں انہوں نے یہاں پر بھی آیت سے مراد اعمال ناموں کا حاضر کرنا لیا ہے، یا پھر اعمال کی جزا ملنے کا معنی کیا ہے، اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے خود عمل کے حاضر ہونے کا احتمال بھی ذکر کیا ہے۔[۳]

علامہ طباطبائی مرحوم کے بقول آیت کا ذیل بھی اسی بات کی تائید کر رہا ہے کیونکہ خود عمل کا حاضر ہونا خدا کے ظالم ہونے کی نفی کرنے کے لئے زیادہ بہتر اور واضح ہے۔ (غور کیجئے گا)

تیسری آیت میں یہی بات زیادہ واضح اور عمومی انداز میں بیان کی گئی ہے کیونکہ پہلی آیت میں کافروں اور مجرموں کے متعلق گفتگو کی

---

[۱] تفسیر روح البیان، ج۱۰ ص ۴۹۴۔

[۲] تفسیر نور الثقلین، ۵، ص ۶۵۰۔

[۳] روح المعانی، ج۱۵، ص ۲۶۷ اور روح البیان، ج ۵ ص ۲۵۴۔

گئی تھی لیکن یہاں پر ارشاد ہوتا ہے: اس دن ہر شخص اس نیک کام کو دیکھ لے گا جو اس نے انجام دیا ہوگا اور یہ پسند کرے گا کہ برے عمل اور اس کے درمیان ایک لمبا فاصلہ حائل ہو جائے'' یوم تجد کل نفس ما عملت من خیر محضرا ۔ وما عملت من سوء۔ تودلو ان بینھا وبینہ امدا بعیدا''۔

اس آیت کی ۲ تفسیریں بیان کی گئی ہیں، ایک یہ کہ جو بھی کوئی اچھا یا برا عمل انجام دے گا وہ اسے اس دن دیکھ لے گا، دوسرا یہ کہ جس نے بھی کوئی نیک کام کیا ہوگا اُسے حاضر دیکھے گا اور چاہے گا کہ برے کام اور اس کے درمیان ایک لمبا فاصلہ حائل ہو جائے (یہ اختلاف اس امر سے مربوط ہے کہ ہم آیت میں کس جگہ پر وقف کرتے ہیں ''محضرا'' کے بعد یا ''سوء'' کے بعد)۔

لیکن ہر دو کا نتیجہ ایک ہی ہے کیونکہ دوسرے معنی کا بھی یہی مطلب ہے کہ اس کے برے اعمال بھی اس کے سامنے موجود ہوں گے اگرچہ اس شخص کی آرزو یہ ہوگی کہ وہ اس سے دور چلے جائیں، بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ گنہگار یہ خواہش کریں گے کہ اُن کے درمیان اور اس دن کے درمیان بہت زیادہ فاصلہ حائل ہو جائے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ عموماً ہر انسان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کے درمیان اور اس کے ناپسندیدہ کاموں کے درمیان مکانی اعتبار سے بہت فاصلہ حائل ہو جائے، جب کہ آیت میں جو ''امدا بعیدا'' آیا ہے، اس کا معنی زمانے کے اعتبار سے ایک لمبا فاصلہ ہونا ہے، یہ تعبیر شاید اس لئے ہو کہ مکان کے اعتبار سے فاصلوں میں ٹکراؤ اور آمنے سامنے کا زیادہ خدشہ ہوتا ہے جب کہ زمانی فاصلوں میں آمنے سامنے ہونے کا اندیشہ نہیں ہوتا، مثلاً جو شخص عالمہ جنگ کے دوران جنگی علاقے سے بہت دور کسی علاقے میں رہتا تھا اسے بھی تھوڑا بہت خطرہ تھا لیکن جن لوگوں کا اس جنگ سے فاصلہ زمانی اعتبار سے تھا اُن کے لئے کسی قسم کی پریشانی یا خطرے کا سوال ہی نہ تھا۔

یہ بات قابل غور ہے کہ ''امد'' ہمیشہ وقت کے لئے آتا ہے اور جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے اس کا معنی ''ابد'' کے قریب قریب ہے، فرق صرف یہ ہے کہ ''ابد'' ایسا زمانہ ہے جس کی کوئی حد نہیں لیکن ''امد'' کی ایک مبہم سی حد ہوتی ہے، پہلی آیت میں اعمال کے حاضر ہونے کے متعلق گفتگو تھی، جب کہ اس آیت میں اعمال کے حاضر کرنے کے متعلق گفتگو کی گئی ہے، یعنی یہ اس سے زیادہ مطالب پر مشتمل ہے۔

اس آیت کے مطابق خدا اپنی قدرت مطلقہ کے ذریعے تمام اچھے اور برے اعمال کو حاضر کرے گا چاہے اس عمل کے انجام دینے والے لوگ اسے پسند کریں یا نہ کریں، اسی لئے بعض مفسرین نے اس آیت کی عبارت کو پہلی آیت کی عبارت سے زیادہ سخت اور زیادہ خبردار کرنے والی قرار دیا ہے۔

چوتھی آیت میں اس سلسلے سے متعلق ایک اور تعبیر لائی گئی ہے، ارشاد ہوتا ہے، انہوں نے جو برے کام انجام دیئے ہوں گے اس دن وہ ان کے لئے ظاہر ہو جائیں گے ''وبدالھم سیات ما کسبوا'' اور وہ جس روز قیامت، عذاب اور خدا کے عقاب کا مذاق اڑاتے تھے وہ ان پر نازل ہوگا ''وحاق بھم ما کانو بہ یستھزؤن''۔

''بدا'' کا مادہ ''بدو'' ہے جس کا معنی پوری طرح ظاہر ہو جانا ہے ''بادیہ'' کو اسی لئے ''بادیہ'' کہتے ہیں کہ وہ واضح اور آشکارا سرزمین ہوتی ہے جب کہ شہروں میں ایسے نہیں ہوتا بلکہ پہلے زمانے کے شہر اتنے مکانوں اور پر پیچ گلیوں کے باوجود شہر کی فصیل میں چھپ جاتے تھے۔

''سیئات ما کسبوا'' برے اعمال کے معنی میں ہے لیکن بعض لوگوں نے اس سے برے اعمال کی سزا مراد لی ہے یا یہ کہ کلمہ ''جزا'' کو انہوں نے یہاں محذوف سمجھا ہے، لیکن ظاہری طور پر یہاں مراد برے اعمال ہی ہیں جو اُس دن آشکار ہوں گے، کیونکہ ''سیئات'' جمع ہے ''سیئة'' کی، جس کا معنی برا کام ہے نہ کہ عمل کی بری سزا۔ (غور کیجئے گا)

ممکن ہے یہ تعبیر اس امر کی طرف اشارہ ہو کہ اس دنیا میں بہت سے برے اعمال کا اپنا حقیقی چہرہ چھپ جاتا ہے جیسے وہ ریاکارانہ کام جو غیر خدا کے لئے انجام دیئے جائیں لیکن وہ دن چونکہ ظاہر اور آشکار ہونے کا دن ہے لہٰذا تمام اعمال کا حقیقی رخ واضح ہو جائے گا، اسی آیت کی تفسیر میں بنی اکرمؐ کی ایک حدیث یوں ہے:

"هی الاعمال حسبوها حسنات فوجدوها فی کفة السیئات"

یہ وہی اعمال ہیں جنہیں وہ نیکیاں خیال کرتا تھا اس دن انہیں وہ برائیوں کے پلڑے میں دیکھے گا۔[1]

(خود اس حدیث کی عبارت اپنی جگہ پر تجسم اعمال کے موضوع پر ایک اور دلیل ہے)۔

پانچویں آیت میں اس موضوع سے متعلق ایک اور تعبیر لائی گئی ہے، بخیل لوگوں کی مذمت اور یہ کہنے کے بعد کہ بخل اُن کے فائدے میں نہیں بلکہ نقصان میں ہے، ارشاد ہوتا ہے: ''جلد ہی قیامت کے دن جس چیز کے متعلق وہ بخل کرتے تھے وہ (ایک بھاری) طوق کی صورت میں اُن کے گلے میں ڈال دی جائے گی''۔ ''سیطوقون ما بخلوا به یوم القیامة''

اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دولت جس کے واجب حقوق ادا نہ کئے جائیں اور کوئی دوسرا اس سے بہرہ مند نہ ہو سکے، قیامت کے دن اُن کے گلے میں ایک طوق کی شکل میں پڑ جائے گی جیسا کہ دنیا میں بھی وہ اس مال سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے تھے اور یہ اُن کے کندھوں پر ایک بوجھ کی صورت میں تھا۔

تفسیر عیاشی میں اس معنی کی وضاحت میں حضرت امام محمد باقرؑ کی ایک حدیث یوں ذکر ہوئی ہے:

ما من عبد منع زکاة ماله الا جعل الله ذلك یوم القیمة ثعبانا من نار مطوقا فی عنقه۔

جو بندہ بھی زکوۃ ادا نہ کرے تو قیامت کے دن خدا اس کے مال کو آگ کے ایک اژدہے کی صورت میں اس کے گلے کا طوق بنا دے گا۔[2]

خدا نے جو کچھ دیا ہے اس میں کنجوسی اور بخل سے کیا مراد ہے؟ بعض مفسرین نے اس سے علم و دانش کے سلسلے میں کنجوسی سے کام لینا

---

[1] تفسیر روح البیان، ج۸، ص۱۲۱۔

[2] تفسیر عیاشی، ج۱، ص۲۰۷ و ص۱۵۸۔

مراد لیا ہے اور اس پر دلیل اس شان نزول کو قرار دیا ہے جسے ابن عباسؓ نے ذکر کیا ہے وہ یہ ہے کہ یہ آیت یہودیوں کی طرف سے پیغمبرؐ کی نشانیوں کو چھپانے کے سلسلے میں نازل ہوئی ہے۔[1] جب کہ دوسری طرف بہت سی روایات میں آیت کی تفسیر زکوۃ ادا نہ کرنے والوں کے متعلق کی گئی ہے، یہ بات بھی بعید نہیں ہے کہ یہ آیت ایک وسیع اور عمومی مفہوم کی حامل ہو اور خدا کی تمام نعمتوں کے بارے میں ہو، چاہے اُن کا ذکر ہوا ہے چاہے نہیں۔

یہاں پر بھی بعض مفسرین نے آیت کے ظاہر کو قبول نہیں کیا اور اس کی تفسیر اعمال کی جزاء کے معنی میں کی ہے، یا یہ کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ انہیں قیامت کے دن اس بات پر مجبور کیا جائے گا کہ وہ اپنے مال جیسا لائیں جب کہ وہ ایسا نہیں کرسکیں گے، (یعنی اُن کی گردنوں میں جو طوق کی صورت میں ہے وہ تکلیف ہے نہ کہ خود مال)، لیکن یہ تفسیر کسی قسم کی دلیل نہ رکھنے کے ساتھ ساتھ آیت کے ظاہر کے ساتھ بھی ہم آہنگ نہیں ہے اور اس سلسلے میں ہادیان دین سے جو متعدد احادیث منقول ہیں ان سے بھی ہمنوا نہیں ہے۔

چھٹی آیت میں ایک بار پھر عمل کے حاضر ہونے کے متعلق گفتگو کی گئی ہے، ارشاد ہوتا ہے: جب دوزخ شعلے اگلے گی اور جنت نزدیک ہوگی، ہر شخص یہ جان لے گا کہ اُس نے کیا حاضر کیا ہے" **واذا الجحیم سعرت۔ واذا الجنة ازلفت۔ علمت نفس ما احضرت**"۔

طبرسی مرحوم نے مجمع البیان میں ذکر کیا ہے کہ "**ما احضرت**" کا معنی "**ماوجدت حاضرا من عملها**" (یعنی اس کے وہ اعمال جنہیں وہ حاضر پائے گا)۔

تعجب کی بات ہے کہ اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ عمل کا حاضر ہونا ایک مجازی بات ہے کیونکہ عمل کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو باقی رہ جائے، انجام پانے کے بعد وہ ختم ہوجاتا ہے، لہٰذا مراد یہ ہے کہ کسی کا حساب بھی نہیں چھوڑا جائے گا، بعض مفسرین نے کہا ہے کہ مراد اعمال ناموں کا حاضر ہونا ہے۔[2]

بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اس کا معنی اعمال کا بدلہ ملنا ہے جب کہ جیسا آئندہ توضیحات میں آئے گا عمل کوئی فنا ہونے والی چیز نہیں ہے، وہ ہمیشہ باقی رہتا ہے، لہٰذا یہ بات مشکل نہیں کہ قیامت کے دن وہ کسی مناسب صورت میں ظاہر ہو۔

احضار عمل کا معنی چاہے حاضر کرنا ہو، چاہے حاضر ہونا ہو (کیونکہ دونوں تفسیریں ذکر ہوئی ہیں) ہر صورت میں ہماری بات کی تائید ہوتی ہے۔

---

[1] ابن عباسؓ کی یہ روایت بہت سی تفسیروں میں آئی ہے مثلاً تفسیر قرطبی، تفسیر روح المعانی اور تفسیر المنار میں زیر نظر آیت کے ذیل میں۔

[2] مجمع البیان، ج ۱ ص ۴۴۴۔

اعمال سپرد کردیئے جائیں گے

ساتویں، آٹھویں، نویں اور دسویں آیت میں بھی تجسم اعمال کے متعلق ہی گفتگو کی گئی ہے، کیونکہ ان آیات میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ انسان کے تمام اعمال، چاہے برے ہوں یا اچھے پوری طرح اس کے سپرد کردیئے جائیں گے اور انسان اُن سب کو وصول کرے گا (غور کیجئے گا)۔

ان آیات کا یہ ظاہر یہ بتا تا ہے کہ انسان خود اپنے عمل کو وصول کرے گا نہ کہ اُن کی جزا وسزا یا نامہ عمل کو، ساتویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے: ان (جن وانس) میں سے ہر ایک کے لئے اُن کے اعمال کے مطابق درجات ہیں، مقصد یہ ہے کہ اُن کے اعمال کسی کمی بیشی کے بغیر اُن کے سپرد کئے جائیں گے اور اُن پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔

"ولکل درجات مما عملوا ولیوفیھم اعمالھم وھم لا یظلمون"

آٹھویں آیت میں قیامت کی عدالت، اعمال نامے، گواہوں کی حاضری اور کسی پر ظلم نہ ہونے کی طرف اشارہ کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے: جس نے جو کچھ بھی کیا ہے وہ اس کے سپرد کیا جائے گا، جو کچھ وہ کرتے ہیں خدا اسے سب سے زیادہ جانتا ہے۔ "**ووفیت کل نفس ما عملت وھو اعلم بما یفعلون**"۔

نویں آیت میں بھی یہی معنی آیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: (خدا کی راہ میں) جو نیکیاں تم خرچ کرتے ہو، وہ کسی کمی بیشی کے بغیر تمہیں دی جائیں گی اور تم پر ظلم نہیں ہوگا "**وما تنفقوا من خیر یوف الیکم وانتم لا تظلمون**"۔

دسویں آیت میں بھی یہی مسئلہ زیادہ مکمل انداز میں بیان ہوا ہے، ارشاد ہوتا ہے: جس دن تم خدا کی طرف پلٹو گے، جس نے جو کچھ بھی کیا ہوگا اسے لوٹا یا جائے گا اور اُن پر ظلم نہیں ہوگا " **ثم توفی کل نفس ما کسبت وھم لا یظلمون**"۔

''**وفیت**''، ''**توفی**'' اور ''**یوفی**'' سب ''وفا'' کے مادہ سے ہیں جس کا معنی کمال تک پہنچنا ہے ''توفیۃ'' کسی چیز کو پوری طرح ادا کرنے کے اور ''توفی'' کسی چیز کو مکمل طور پر لینے کے معنی میں ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

"انما یوفی الصابرون اجرھم بغیر حساب"

صابر لوگ اپنی بے حساب جزالیں گے۔ (زمر۔۱۰)

لیکن مذکورہ بلا آیات اور کلام الٰہی میں بعض دوسری آیات کے مطابق: خود اپنے اعمال وصول کریں گے، جیسا کہ آگے ذکر ہوگا، یہ دو مفہوم آپس میں کسی قسم کا تضاد نہیں رکھتے کیونکہ قرآن کی آیات سے مجموعی طور پر یہ واضح ہوتا ہے کہ اس دن اعمال کا بدلہ بھی ملے گا اور خود اعمال کو بھی انسان کے سامنے لایا جائے گا، یہ بالکل ایسا ہے کہ جب انسان ٹریفک کے قوانین کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اُسے جرمانہ بھی ادا کرنا پڑتا ہے

اور حادثے کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔

بہت سے مفسرین نے ان آیات کو اعمال کی جزا دینے سے متعلق کنایہ قرار دیا ہے جو کسی دلیل کے بغیر ہے، بلکہ بہت سی آیات و روایات آگے چل کر آئیں گی، جو واضح طور پر اس امر کی تائید کرتی ہیں کہ انسان قیامت کے دن خود اعمال کو دیکھ لے گا، لٰہذا ہم ان آیات کو ان کے ظاہر پر باقی رکھتے ہیں اور اسی کی بنیاد پر تجسم اعمال کے موضوع کو آگے بڑھاتے ہیں، بعض مفسرین اور محققین نے بھی یہی روش اپنائی ہے۔

گیارہویں آیت میں بھی اس مال کا ذکر ہے کہ جسے لوگ خزانے کی صورت میں اپنے پاس جمع کر لیتے ہیں اور راہ خدا میں خرچ نہیں کرتے اور جس کی وجہ سے اُن پر شدید عذاب نازل ہوگا، اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے: یہ دردناک عذاب اس دن ہوگا جب ان سکوں کو جہنم کی جلا دینے والی آگ میں تپایا جائے گا اور اُن کے پہلوؤں، پیشانیوں اور پُشتوں کو ان سے داغا جائے گا (اور اُن سے کہا جائے گا) یہ وہی ہے جس کا تم نے اپنے لئے ذخیرہ کر رکھا تھا اور جو کچھ تم نے خزانے (کی صورت میں) جمع کیا تھا اب اس کا مزہ چکھو' یوم یحمی علیھا فی نار جھنم فتکوی بھا جباھھم و جنوبھم وظھورھم ھذا ما کنزتم لا نفسکم فذوقوا ما کنتم تکنزون"

یہ آیت واضح طور پر بتاتی ہے کہ جو درہم دینار خزانے کی صورت میں جمع کئے جائیں اور انہیں راہ خدا میں خرچ نہ کیا جائے وہ قیامت کے دن سامنے آئیں گے، انہیں جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا اور مال جمع کرنے والوں کی پیشانی، پشت اور پہلوؤں کو اُن سے داغا جائے گا اور اُن سے کہا جائے گا یہ وہی کچھ ہے جو تم نے خزانے کی صورت میں جمع کر رکھا تھا (غور کیجئے گا)۔

صرف ان تین اعضاء کو ہی کیوں داغا جائے گا؟ اس کا جواب بعض نے تو یہ دیا ہے کہ بدن کے اہم حصے یہی ہیں۔[۱]

بعض نے کہا ہے کہ یہ لوگ چونکہ سائل کے سامنے اپنا چہرا بگاڑا کرتے تھے، پھر پہلو بچاتے تھے اور آخر میں پشت پھیر کر چل پڑتے تھے اس لئے اُن کے ان تین اعضاء کو جلایا جائے گا جن کے ساتھ وہ غریبوں سے بے اعتنائی کرتے تھے۔

بعض نے کہا ہے کہ جب یہ دولت کے پجاری اپنا مقصد حاصل کر لیتے تھے، اور مال و دولت ان کے ہاتھ آجاتا تھا تو پہلے تو یہ قہقہے لگاتے اور خوشی کے آثار ان کے چہروں پر ظاہر ہوتے، اس کے بعد وہ بغلیں بجاتے اور اس مال سے فائدہ اٹھاتے، شاہانہ لباس تیار کرواتے اور پشت پر ڈال لیتے، اسی لئے ان تین اعضاء پر سزا دی جائے گی۔[۲]

یہ آیت اگر چہ واضح طور پر تجسم اعمال کو بیان نہیں کر رہی بلکہ صرف مال و دولت کے حاضر ہونے کے متعلق گفتگو کر رہی ہے لیکن یہی تعبیر تجسم اعمال کی طرف بھی اشارہ قرار پا سکتی ہے، اس لحاظ سے کہ یہ سکے اور مال تو ظاہری طور پر نابود ہو جاتے ہیں لیکن قیامت کے دن یہ دوبارہ لوٹ آئیں گے اور ان سے پیشانیوں، پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغنے کا کام لیا جائے گا۔

---

[۱] مجمع البیان، ج ۵، ص ۲۶۔

[۲] فخر رازی نے اپنی تفسیر، ج ۱۶ ص ۴۸ پر اس بات کے لئے مجموعی طور پر چھ وجوہ ذکر کی ہیں، تفسیر روح المعانی، روح البیان اور قرطبی میں بھی زیر نظر آیت کے ذیل میں ان وجوہات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

یہاں پر کنز (خزانے) سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلے میں بہت سی باتیں کہی گئی ہیں لیکن یہ بات واضح ہے کہ ''کنز'' ایک وسیع مفہوم کا حامل ہے جو ہر اُس قیمتی مال کے لئے استعمال ہوتا ہے جسے ایک جگہ چھپا کر ذخیرہ کرلیا جائے۔

کیا آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جو شخص بھی اپنی ضروریات سے زائد کسی مال کو چھپا کر خزانے کی صورت میں جمع کرلے تو اس نے حرام کام کیا ہے اور وہ خدا کی اس سزا کا موجب ہے، یا یہ کہ یہ آیت ان افراد سے متعلق ہے جو واجب حقوق مثلاً زکوۃ وغیرہ ادا نہیں کرتے لیکن جو شخص ان واجب حقوق کو پوری طرح ادا کرتا ہے، اس نے کوئی حرام کام انجام نہیں دیا اور وہ اس سزا کا بھی مستحق نہیں؟

فقہا مفسرین اور محدثین کے درمیان دوسرا معنی زیادہ مشہور ہے، اس سلسلے میں شیعہ اور سنی مآخذ سے متعدد احادیث بیان کی گئی ہیں، چنانچہ پیغمبر اسلامؐ سے منقول ایک حدیث میں ہے:

ای مال ادیت زکاته فلیس بکنز

ہر وہ مال کہ جس کی زکوۃ دے دی جائے وہ کنز نہیں ہے۔[1]

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ جب بھی اسلامی معاشرہ دولت کے ارتکاز کی وجہ سے تنگ دستی اور سختی میں مبتلا ہو جائے تو صاحبان ثروت پر واجب ہے کہ وہ انفاق یا کام کے لئے سرمایہ گزاری کریں اور ضرورتمندوں کی حاجت کے لئے اپنے مال کو خرچ کریں، چنانچہ ایسی صورت میں اگر انہوں نے اپنا مال خرچ کرنے سے اجتناب کیا اور ذخیرہ کرلیا تو مذکورہ بالا آیت ان پر بھی محیط ہو جائے گی، شاید حضرت امیر المومنینؑ سے منقول حدیث بھی اسی طرف اشارہ ہو۔

"ماذا د علی اربعة الاف فهو کنز ادی زکاته اولم یودها وما دونها نهی نفقه فبشر هم بعذاب الیم"

جو کچھ چار ہزار (درہم) سے زائد ہو وہ خزانہ شمار کیا جائے گا، چاہے اس کی زکوۃ دی گئی ہو چاہے نہ دی گئی ہو، جو کچھ اس سے کم ہو وہ زندگی کا خرچ ہے، پس اس طرح کے لوگوں کو دردناک عذاب کی خبر دے دو۔[2]

تمہارے اعمال۔۔۔۔۔۔۔۔تمہاری جزا

آخری اور بارہویں آیت میں اس سلسلے میں ایک اور تعبیر لائی گئی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قیامت کے دن تمہاری جزا تمہارے

---

[1] تفسیر المنار، ج ۱۰، ص ۴۰۶۔ صحیح بخاری میں بھی ایک بات ''ما ادی زکاتہ فلیس بکنز'' کے عنوان سے آیا ہے، ج ۱ جز ۳، ص ۱۳۲ اور تفسیر نور الثقلین، ج ۲ ص ۲۱۳۔

[2] تفسیر نور الثقلین، ج ۲ ص ۲۱۳، حدیث ۱۳۲۔

اعمال ہیں، یہ تعبیر قرآن کی متعدد آیات میں آئی ہے مثلاً ارشاد ہوتا ہے:

تمہاری جزا فقط تمہارے وہ اعمال ہیں جو تم انجام دیتے ہو"انما تجزون ما کنتم تعملون"۔

بالکل یہی تعبیر طور،۱۶ اور تحریم ۷ میں بھی آئی ہے۔

سورہ یٰسین، آیت ۵۴ میں ارشاد ہوتا ہے:

"ولا تجزون الا ما کنتم تعملون"

تمہیں جزا نہیں دی جائے گی مگر تمہارے اعمال۔

سورہ نمل کی آیت ۹۰ میں ارشاد ہوتا ہے:

"هل تجزون الا ما کنتم تعملون"

کیا تمہاری جزا تمہارے اعمال کے علاوہ بھی کچھ ہوگی؟

سورہ یونس آیت ۵۲ میں یوں ہے:

"هل تجزون الا بما کنتم تکسبون"

کیا تمہاری جزا اس کے علاوہ کچھ اور ہوگی کہ جو تم نے انجام دیا ہے۔؟

تھوڑے سے فرق کے ساتھ اسی طرح کی کئی اور تعبیرات بھی ہیں ان آیات کا ظاہر یہ ہے کہ انسان کی جزاء اس کے اعمال ہی ہیں، اُس کے اعمال ہی اُس کی طرف لوٹ کر آئیں گے، یہی اُسے تکلیف پہنچائیں گے یا خوشی ومسرت کا باعث بنیں گے، یہ تجسم اعمال پر ایک واضح دلیل ہے جو یہ بتاتی ہے کہ انسان کے اعمال اس کی طرف پلٹ کر آئیں گے اس کے ساتھ ساتھ یہ خدا کے عادل ہونے پر بھی تاکید کرتی ہے۔

یہاں پر بھی بعض لوگوں نے"کلمہ با" کو محذوف سمجھا ہے (باسببیت کو) اور کہا ہے کہ یہ حقیقت میں"بما کنتم تعملون" یعنی تمہاری جزا اُن اعمال کی وجہ سے ہے جو تم نے انجام دیئے ہیں۔[1]، جب کہ یہاں پر کسی چیز کو محذوف سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں اس میں کیا مانع کیا ہے، خود انسان کے اعمال حاضر ہوں اور اس کی جزاء کا زیادہ حصہ انہی اعمال پر مشتمل ہو۔

علامہ طباطبائی مرحوم نے تفسیر المیزان میں سورہ تحریم کی آیت نمبر ۴ کے ذیل میں یوں کہا ہے:

"ای ان العذاب الذی تعذبونه هو عملکم السئی الذی عملتموه وقد برزلکم الیوم حقیقته"

---

[1] بعض لوگوں نے"علیٰ" کو تقدیر میں لیا ہے اور کہا ہے کہ حقیقت میں یوں تھا"علی ما کنتم تعلمون"

یعنی تم جس عذاب میں گرفتار ہو یہ تمہارے برے اعمال ہی ہیں جنہیں تم نے انجام دیا تھا اور آج اُن کی حقیقت واضح ہو گئی ہے۔[۱]

مذکورہ بالا آیات سے مجموعی طور پر یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ اگر ان آیات کے ظاہر میں کسی قسم کی تاویل نہ کریں اور کسی جملے یا کلمے کو محذوف نہ سمجھیں یعنی ان کے ظاہر کی واضح طور پر تفسیر کریں تو ان سے یہ استفادہ ہوتا ہے کہ خدا کی عدالت یا قیامت کے دوسرے مراحل میں ہمارے اعمال ہمارے سامنے آئیں گے، برے اعمال بری اور ڈراؤنی صورت میں ظاہر ہوں گے جب کہ اچھے اعمال خوبصورت، دل پذیر اور روح بخش شکل میں ظاہر ہوں گے اور اپنے عمل کنندہ کی ہمراہی کریں گے۔

توضیحات

اسلامی احادیث میں تجسمِ اعمال:

شیعہ اور سنی ہر دو سے منقول متعدد روایات میں ''تجسم اعمال'' کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے، جیسا کہ شیخ بہائی مرحوم نے کہا ہے:

"تجسم الاعمال فی النشاۃ الا خرویۃ قد ورد فی احادیث متکثرۃ من طرق المخالف والموالف"

دوسرے جہان میں تجسم اعمال سے متعلق فریقین (شیعہ اور سنی) نے بہت سی روایات ذکر کی ہیں۔[۲]

ہم یہاں پر صرف چند احادیث ذکر کرتے ہیں:

۱۔ پیغمبر اکرمؐ سے منقول ایک حدیث یوں ہے:

مشہور صحابی قیس بن عاصم کہتے ہیں کہ میں قبیلہ بنی تمیم کے ایک گروہ کے ساتھ پیغمبر اسلامؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔۔۔۔۔۔ میں نے عرض کی: ''اے پیغمبر اسلامؐ! ہمیں نصیحت کیجئے، ایسی نصیحت جو ہمارے لئے سود مند ہو کیونکہ ہم لوگ بیابانوں سے گزرتے ہیں (اور شہروں سے دور زندگی گزارتے ہیں) پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا:

"قا قیس! ان مع العز ذلا، وان مع الحیاۃ موتا۔ وان مع الدنیا اخرۃ، فان لکل شئی حسیبا وان لکل اجل کتابا وانه لا بدلك یا قیس من قرین

---

[۱] تفسیر المیزان، ج ۱۹ ص ۳۸۸۔

[۲] بحار الانوار، ج ۷ ص ۲۲۸۔

يدفن معك و هو حي، وتدفن معه وانت ميت، وان كان كريما اكرمك وان كان ليما اسلمك ثم لا يحشر الا معك، ولا تحشر الا معه، ولا تسئل الا عنه. فلا تجعله الا صالحا. فانه ان صلح انست به وان فسد لا تستوحش الا منه وهو فعلك"۔

''اے قیس! عزت کے ساتھ ذلت ہے اور موت کے ساتھ زندگی اور دنیا کے ساتھ آخرت اور ہر چیز کا ایک حساب کرنے والا ہے اور ہر اجل کے لئے کتاب ہے۔

''اے قیس! تو اُس چیز کو دوست بنا جو تیرے ساتھ دفن ہو جب کہ وہ زندہ ہے اور تو اُس کے ساتھ دفن ہو جب کہ تو مردہ ہو، اگر وہ کریم ہوا تو تجھے بھی کریم بنا دے گا اور اگر وہ پست ہوا تو تجھے بھی پست بنا دے گا، وہ فقط تیرے ساتھ اٹھایا جائے گا اور تو بھی فقط اُس کے ساتھ، فقط اس کے بارے میں تجھ سے سوال کیا جائے گا، پس اسے نیک بنا، اگر وہ نیک ہوا تو تیرے لئے راحت کا باعث ہوگا اور اگر برا ہوا تو تیرے لئے خوف اور ڈر کا باعث ہوگا، اور وہ تیرا عمل ہے''۔

جاذب نظر یہ ہے کہ اس روایت کے ذیل میں یہ بھی ہے:

قیس بن عاصم نے عرض کی: ''اے رسول خدا! کیا خوب ہے اگر اس بات کو شعر کے انداز میں بیان کیا جائے تا کہ جو لوگ ہمارے ساتھ ہیں وہ فخر محسوس کریں اور اپنے پاس رکھ لیں''۔ رسول اسلامؐ نے 'حسان بن ثابت'' کو حاضر کرنے کا حکم فرمایا 'صلصال بن صلصال'' نامی شخص بھی اسی محفل میں موجود تھا، اس نے عرض کی:

''یا رسول اللہؐ! مجھے کچھ اشعار سوجھے ہیں، میرا خیال ہے کہ یہ قیس کی مراد کے مطابق ہیں!''

آپؐ نے فرمایا: ''پڑھو!'' اس نے اشعار پڑھے جن میں سے کچھ یوں ہیں!

تجنب خليطا من مقامك انما
قرين الفتى فى القبر ما كان يفعل
ولن يصحب الانسان من قبل موته
ومن بعده الا الذى كان يعمل

یعنی متفرق باتوں سے بچو کہ قبر میں انسان کا ہم نشین اُس کے اعمال ہوں گے، اور اس کے عمل کے علاوہ کوئی اور چیز

موت سے پہلے اور موت کے بعد اس کے ہمراہ نہیں ہوگی۔[1]

۲۔　ابوبصیر نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام یا حضرت امام جعفر صادقؑ سے ایک حدیث یوں روایت کی ہے:

''جب بندہ مومن مرتا ہے تو اس کے ساتھ قبر میں چھ صورتیں آتی ہیں جن میں ایک صورت سب سے خوبصورت ہوتی ہے۔۔۔۔ ایک صورت دائیں طرف اور ایک بائیں طرف، ایک صورت سامنے اور دوسری پیچھے، ایک پاؤں کی طرف، اور جو صورت سب سے خوبصورت ہے وہ سر کے اوپر کھڑی ہوتی ہے، جب بھی عذاب دائیں طرف سے آتا ہے تو دائیں طرف والی صورت اُسے روک لیتی ہے اور باقی پانچ صورتیں بھی اسی طرح کرتی ہیں، جو صورت سب سے خوبصورت ہے وہ باقی صورتوں سے مخاطب ہو کر کہتی ہے:

''تم کون ہو؟ خدا تمہیں جزائے خیر دے، دائیں طرف والی صورت کہتی ہے میں نماز ہوں، بائیں طرف والی کہتی ہے میں زکوۃ ہوں، سامنے والی کہتی ہے میں روزہ ہوں، پیچھے والی کہتی ہے میں حج اور عمرہ ہوں، پاؤں کی طرف والی کہتی ہے میں وہ نیکیاں ہوں جو تم نے اپنے بھائیوں کے ساتھ کیں، پھر وہ سب اس خوبصورت سے پوچھیں گی کہ تم کون ہو کہ جو تمام سے خوبصورت ہو۔۔۔۔۔ وہ اپنا تعارف یوں کرائے گی:

انا الولایۃ لآل محمد

میں ولایت آل محمد ہوں۔[2]

۳۔　رسول خداؐ سے منقول ایک حدیث یوں ہے کہ آپ نے فرمایا:

جبرائیل نے مجھ سے کہا:

یامحمد! عش ماشئت فانك ميت..........واعمل ماشئت فانك ملاقيه

یا محمد! جتنی چاہو زندگی گزار لو، آخر کار اس زندگی کو الوداع کہنا ہے، جو دل چاہے عمل انجام دو کہ سرانجام اس عمل سے ملاقات ہوگی۔[3]

---

[1] گذشتہ حوالہ، ص ۲۲۸، ص ۲۲۹ لیکن ''خصال'' میں صدوق مرحوم کی روایت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اشعار خود قیس بن عاصم نے فی البدیہ کہے، صدوق کے بقول پہلا شعر یوں تھا: تخیر خلیطا من فعالک انما۔ قرین الفتی فی القبر ما کان یفعل (اپنا دوست اپنے اعمال کو بنا، قبر میں انسان کا ساتھ اس کا عمل ہوگا) خصال ج ابات الثلاثۃ، حدیث ۹۳۔

[2] کتاب محاسن کے حوالے سے اُسے علامہ مجلسی نے ذکر کیا ہے، ج ۶ بحار الانوار ص ۲۳۴، حدیث ۵۰۔

[3] کنز العمال، ج ۱۵ ص ۵۴۶۔

۴۔ ایک اور حدیث جو پیغمبر اسلامؐ سے منقول ہے اُس میں ہے:

ان المومن اذا خرج من قبره صور له عمله فی صورة حسنة فیقول له ما انت؟ فوالله انی لا راك امرا صدق، فیقول له انا عملك فیکون له، نورا وقآئدا الی الجنة...................

''جب مومن (قیامت کے دن) اپنی قبر سے نکلے گا تو اس کا عمل اس کے سامنے ایک خوبصورت شکل میں ظاہر ہو گا، یہ اُس سے کہے گا: تم کون ہو؟ خدا کی قسم میں تمہیں ایک سچا شخص پاتا ہوں، وہ جواب میں کہے گا: میں تمہارا عمل ہوں، یہ اُس مومن کے لئے نور وضیاء اور جنت کی طرف راہنما بنے گا''۔ [۱]

۵۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ایک حدیث میں آپ نے یوں فرمایا:

اذا وضع المیت فی قبره، مثل له شخص وقال له یا هذا کنا ثلاثة کان رزقك فانقطع بانقطاع اجلك وکان اهلك فخلفوك وانصر فواعنك وکنت عملك فبقیت معك، اما انی کنت اهون الثلاثة علیك.........

''جب میت قبر میں رکھ دی جاتی ہے تو ایک شخص اُس کے سامنے آتا ہے اور اس سے کہتا ہے: اے انسان! ہم تین تھے، ایک تمہارا رزق تھا جو تیری عمر کے خاتمے کے ساتھ ختم ہو گیا، دوسرا تیرا خاندان تھا جس نے تجھے یوں رکھا اور چل دیا، میں تیرا عمل ہوں جو تیرے ساتھ ہوں، لیکن میں تیرے لئے ان سب سے کم اہمیت تھا''۔ [۲]

اس سلسلے میں احادیث بہت زیادہ ہیں، انہی میں سے معراج پیغمبرؐ کی احادیث میں ہے کہ آپؐ جنت اور دوزخ کے پاس سے گزرے اور گنہگاروں کو اُن کے اعمال کے عذاب میں گرفتار دیکھا، اسی طرح نیک لوگوں کی امیدوں کو دیکھا جن کے سبب سے وہ جنت کی نت نئی نعمتوں کو حاصل کر رہے تھے، غیبت کے سلسلے میں منقول احادیث غیبت کے بدبودار گوشت میں مجسم ہونے کی خبر دیتی ہیں جو غیبت کرنے والا کھائے گا، یہ بھی ہمارے دعویٰ کی تصدیق کرتی ہیں۔

---

[۱] کنز العمال، ج ۱۴ ص ۳۶۶۔

[۲] فروع کافی، ج ۳ (کتاب الجنائز) ص ۲۴۰ حدیث ۱۴۔

گزشتہ آیات و روایات سے مجموعی طور پر یہ نتیجہ حاصل کیا جا سکتا ہے کہ انسان کے اعمال کسی مناسب صورت میں عالم برزخ یا قیامت کے دن سامنے آئیں گے، مزید برآں:

الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا

۳ النساء:۱۰

جو یتیموں کا مال ظلم وستم کے ساتھ کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں صرف آگ داخل کر رہے ہیں۔

یہ آیت بھی بتاتی ہے کہ ہر عمل کا باطن اس دنیا میں بھی ایک تجسم اور ظہور رکھتا ہے چنانچہ یتیم کا مال باطن میں جہنم کی آگ ہے اگر چہ کوتاہ نظر لوگ اسے اس دنیا میں نہیں دیکھ سکتے۔

اس بات کی کوئی دلیل نہیں کہ ہم ان تمام آیات و روایات کو کسی مجازی اور استعاری معنی پر محمول کریں اور سب کی تاویل وتوجیہہ کریں جب کہ ان کے ظاہر کو قبول کرنے میں بھی کوئی اشکال نہیں، اس کی وضاحت انشاء اللہ آگے آئے گی۔

تجسم اعمال ۔۔۔۔۔اور۔۔۔۔۔۔منطق عقل

تجسم اعمال پر سب سے بڑا اعتراض وہ ہے جسے طبرسی مرحوم نے مجمع البیان میں ذکر کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ عمل ''اعراض'' میں شامل ہے نہ کہ ''جوہر'' میں (وہ نہ تو خود مادہ ہے اور نہ ہی مادہ کے خواص کا حامل ہے)، دوسرا یہ کہ عمل انجام ہونے کے بعد نابود اور فنا ہو جاتا ہے، اسی لئے ہمارے گذشتہ اعمال، گفتار اور رفتار کا اثر باقی نہیں رہتا، صرف ان اعمال کا اثر باقی رہ جاتا ہے جو بعض مادوں پر اثر انداز ہوتے ہیں جیسے لکڑی، پتھر اور اینٹوں کو ملا کر ایک عمارت بنادی جاتی ہے، حقیقت میں یہ بھی تجسم عمل نہیں ہے بلکہ عمل سے پیدا ہونے والی تبدیلیاں اور تغیرات ہیں۔ (غور کیجئے گا)

لیکن دو نکتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ان اعتراضوں کا جواب بالکل واضح ہو جاتا ہے اور اسی طرح تجسم اعمال کی کیفیت بھی بالکل روشن ہو جاتی ہے۔

پہلا یہ کہ آج یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ اس جہان میں کوئی چیز مکمل طور پر ختم نہیں ہوتی، یہاں تک کہ ہمارے اعمال بھی کہ جو مختلف توانائیوں کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں، اگر ہم کوئی بات کرتے ہیں تو ہماری آواز مخصوص قسم کی لہروں کی شکل میں فضا میں پھیل جاتی ہے جو ہوا کے موجزن ذرات (MOLECULES) ہمارے اطراف میں موجود دیواروں اور دیگر جسموں سے ٹکرا کر ایک دوسری توانائی میں تبدیل ہو جاتی ہے، یہ دوسری توانائی بھی ممکن ہے کئی اور صورتیں بدلے، لیکن بہت حال یہ نابود اور فنا نہیں ہوتی، ہمارے ہاتھ اور پاؤں کی حرکات بھی توانائی (ENERGY) کی ایک قسم ہیں، یہ مکینیکل توانائی بھی ہرگز فنا نہیں ہوتی، البتہ اس بات کا امکان ہے کہ وہ حرارتی توانائی یا کسی اور توانائی میں تبدیل ہو جائے، خلاصہ کلام یہ کہ اس جہان میں موجود مادہ ہی فقط پائیدار نہیں ہے بلکہ اُن میں موجود توانائی بھی ثابت اور قائم رہتی ہے،

اگر چہ وہ مختلف شکلیں بدلتی رہتی ہے۔

دوسرا یہ کہ سائنسدانوں کی کاوشوں اور اُن کے تجربات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ مادہ (M A T T E R) اور توانائی (ENERGY) کے درمیان ایک قریبی رابطہ موجود ہے، یعنی مادہ اور توانائی ایک ہی حقیقت کے دو جلوئے ہیں، مادہ سمٹی ہوئی توانائی ہی کا نام ہے اور توانائی پھیلا ہوا مادہ ہی ہے ، لہٰذا مخصوص حالات میں یہ ایک دوسرے میں تبدیل ہو جاتے ہیں (یعنی ان کی تحویل (REDUCTION) کا عمل جاری رہتا ہے۔

ایٹمی توانائی (ATOMIC ENERGY) مادے کا توانائی میں تبدیل ہونا ہی ہے یا دوسرے الفاظ میں ایٹم کو پھاڑنا اور اس میں موجود توانائی کو آزاد کرنا ہے۔

یہ بات بھی پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ سورج کی حرارتی توانائی (HEAT ENERGY) بھی ایٹمی توانائی کا ہی کرشمہ ہے جو سورج کے ایٹموں کے پھٹنے سے حاصل ہوتی ہے، اسی لئے ہر چوبیس گھنٹوں میں سورج کا وزن کچھ کم ہو جاتا ہے، اگر چہ سورج کے وزن اور حجم کے مقابلے میں یہ مقدار بالکل معمولی ہے۔

جیسے مادہ توانائی میں تبدیل ہو سکتا ہے اسی طرح توانائی بھی مادہ میں تبدیل ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے، اگر متفرق اور پھیلی ہوئی توانائیاں ایک جگہ جمع ہو جائیں اور ایک جسم کی صورت اختیار کر لیں تو پھر یہ وہی مادہ ہوگا۔

اس بناء پر اس امر میں کسی قسم کی مشکل نہیں ہے کہ ہمارے اعمال اور گفتار جو مختلف توانائیوں کی صورت میں ہیں وہ نابود اور فنا نہ ہوں بلکہ خدا کے حکم سے ایک جگہ جمع ہو کر ایک جسم کی صورت اختیار کر لیں، یہ بات قطعی ہے کہ ہر عمل ایک ایسے جسم کی صورت میں ہوگا جو اس کی خصوصیات اور اُن توانائیوں کے مطابق ہوگا جو اس نے لوگوں کی خدمت، معاشرے کی اصلاح اور تقویٰ وفضیلت کے حصول کے لئے خرچ کی ہوں گی، یہ جسم بھی خوبصورت شکل کا ہوگا، لیکن وہ توانائیاں جو اُس نے ظلم وستم کرنے اور معاشرے میں برائی کے فروغ کے لئے استعمال کی ہوں گی اُن کا جسم بھی ایک بری اور نفرت آور صورت میں ظاہر ہوگا۔

لہٰذا تجسم اعمال کو قرآن کا ایک علمی معجزہ سمجھا جا سکتا ہے، جن دونوں اصلاً توانائی کی بقاء، مادہ کا توانائی میں تبدیل ہونا یا توانائی کا مادہ میں تبدیل ہونا اور اس طرح کے دوسرے موضوعات کسی کو معلوم نہ تھے، قرآن نے واضح طور پر اس بات کو بیان فرمایا۔

لہٰذا نہ تو عمل کا ''عرض'' ہونا قابل اعتراض ہے اور نہ اس کا نابود ہونا کیونکہ عمل نابود نہیں ہوتا اور عرض اور جوہر بھی ایک ہی حقیقت کے دو کرشمے ہیں، یہ بات حرکت جوہری کو مدنظر رکھتے ہوئے پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کیونکہ جو لوگ حرکت جوہری کے قائل ہیں وہ عرض میں واقع ہونیوالی تبدیلیوں سے جوہر میں حرکت کا استدلال پیش کرتے ہیں، ان کا یہ خیال ہے کہ یہ دونوں تبدیلیاں (جوہر اور عرض میں تبدیلی) ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں۔

مذکورہ مطلب کی تکمیل کے لئے اس نکتے کی یاد آوری بھی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ مشہور فرانسیسی مفکر ''لاوازیہ'' نے ''بقائے مادہ'' کو مسلسل سعی وکوشش کے ساتھ کشف کیا ہے اور اُس نے یہ بات ثابت کی ہے کہ مادہ ختم اور نابود نہیں ہوتا بلکہ ہمیشہ صورتیں بدلتا رہتا ہے، اس بات

کو گزرے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ پیر کوری اور اس کی بیوی نے پہلی مرتبہ مادہ اور توانائی کے درمیان رابطے کو ریڈیو ایکٹو (RADIO ACTIVE) جسام (وہ اجسام جو ناپائیدار ایٹمز کے حامل ہوتے ہیں اور اُن کے بعض حصے تدریجا توانائی میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں) کے مطالعے سے کشف کیا جس سے بقاء مادہ کا قانون مادہ اور توانائی کے بقاء کے قانون میں تبدیل ہوگیا، اس طرح سے بقاء مادہ والا قانون ختم ہوگیا اور مادہ اور توانائی کے بقاء کا قانون اس کا جانشین ہوگیا، پھر رفتہ رفتہ مادہ سے توانائی کی تبدیلی کا یہ قانون ایٹمی دھماکے سے تجرباتی طور پر ثابت ہو گیا اور واضح ہوگیا کہ یہ دو چیزیں (مادہ اور توانائی) آپس میں ایک قریبی رابطہ رکھتی ہیں اور ایک دوسرے میں تبدیل ہونے کی صلاحیت بھی رکھتی ہیں، دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک ہی حقیقت کے دو مظہر ہیں۔

اس عظیم سائنسی انکشاف نے سائنسدانوں کے مطالعے کو ایک نئی جہت عطا کردی جس سے اس کائنات کی وحدت کے نظریے کی زیادہ سے زیادہ تائید ہوئی۔

اس قانون نے معاد اور تجسم اعمال سے متعلق ابحاث اور کئی سوالات کو بھی حل کردیا۔

اس سلسلے میں اس کی معاونت واضح ہے، تجسم اعمال کے سلسلے میں جو اعتراضات کئے جاتے تھے وہ بھی اس کے ذریعے دور ہوگئے۔

تجسمِ اخلاق۔۔۔۔۔۔۔اور۔۔۔۔۔۔۔۔۔انسانی خصائل:

اسلامی روایات سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ قیامت کے دن انسانی اعمال کے مجسم ہونے کے ساتھ ساتھ انسان کا اخلاق اور عادات بھی ظاہر ہوں گی، اسی لئے انسان شکلوں اور صورتوں میں میدان محشر میں آئیں گے، ایسی صورتیں جو ان کے اخلاق اور عادات کے مطابق ہوں گی، جن کا دل ایمان کی روشنی سے منور تھا وہ سفید اور نورانی چہروں کے ساتھ آئیں گے اور جن کا دل کفر کی تاریکیوں سے سیاہ تھا وہ سیاہ اور ڈراؤنی صورت میں آئیں گے، چنانچہ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

یوم تبیض وجوہ و تسود وجوہ فاما الذین اسودت وجوھھم اکفرتم بعد ایمانکم فذوقوا العذاب بما کنتم تکفرون۔۔۔۔ واما الذین ابیضت وجوھھم ففی رحمتہ اللہ ھم فیھا خلدون۔

جس دن چہرے سفید اور سیاہ ہوجائیں گے، جن کے چہرے سیاہ ہوں گے (اُن سے کہا جائے گا) کیا تم ایمان کے بعد کافر ہوگئے تھے؟ پس اپنے کفر کی وجہ سے اب عذاب کا مزہ چکھو اور وہ کہ جن کے چہرے سفید ہیں وہ خدا کی رحمت میں ہوں گے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ (آل عمران، ۱۰۶، ۱۰۷)

ایک اور جگہ گنہگاروں کے انجام کے متعلق یوں خبر دی:

کانما اغشیت وجوھھم قطعامن الیل مظلما۔

اُن کے چہرے یوں تاریک ہوں گے کہ تاریک رات کے ایک حصے نے ان کوڈھانپ رکھا ہو۔ (یونس، ۲۷)

ہاں! وہ ظاہراور آشکار ہونے کا دن ہے، انسان کی اندرونی نیتیں اور ذاتی ملکات ظاہر ہوں گے اور انسان کے تمام جسم پر اپنا رنگ چڑھادیں گے۔

ہر خیالی کو کند در دل وطن
روز محشر صورتی خواہد شدن
سیرتی کان در وجودت غالب است
ہم بر آن تصویر حشرت واجب است

سورہ نبا آیت نمبر ۱۸ میں ہے:

یوم ینفخ فی الصور فتاتون افواجا۔

جس دن صُور پھُونکا جائے گاتم فوج درفوج میدان محشر میں آؤ گے۔

بعض بزرگ مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں پیغمبراسلامؐ کی ایک حدیث ذکر کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:

ابوایوبؓ انصاری کے گھر میں بعض صحابہ رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر تھے، معاذ بن جبلؓ نے مذکورہ بالا آیت کی تفسیر پوچھی تو پیغمبراسلامؐ نے فرمایا:

''اے معاذ! تم نے ایک بہت بڑی بات دریافت کی ہے''، پھر آپؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور آپؐ نے فرمایا:

''میری امت کے دس گروہ جدا جدا میدان محشر میں آئیں گے، جو تمام مسلمانوں سے مختلف ہوں گے، بعض جانوروں کی صورت میں ہوں گے اور بعض اندھے ہوں گے، بعض گونگے اور بہرے ہوں گے تو بعض مردار سے بھی زیادہ بدبودار، چغل خور بندروں کی شکل میں اور حرام خور خنزیروں کی شکل میں آئیں گے، ظالم حکمران اندھے ہوکر اور مغرور لوگ گونگے اور بہرے ہوکر اور شہوت پرست مردوں سے بھی زیادہ بدبو دار ہوکر محشور ہوں گے''۔ [1]

گشتہ گرگان یک بہ یک خوہای تو
می درانند از غضب اعضای تو

---

[1] مجمع البیان، ج ۱۰ ص ۴۲۳، اس حدیث کو کئی اور مفسرین نے بھی ذکر کیا ہے جیسے ابوالفتوح رازی، قرطبی، صاحب روح البیان اور صاحب تفسیر صافی، اس آیت کے ذیل میں ہیں۔

این سخن ہای چو مار و کژدمت
مار و کژدم فی شود گیرد دمت
زانیاں را گندہ اندام نہاں
خمر خوران را بود گندہ دہان
گند مخفی کان بہ دلہا می رسید
گشت اندر حشر محسوس و پدید

ترجمہ: تمہاری خصلتیں ایک ایک کر کے وحشی جانوروں کی طرح ہو جائیں گی جو غصے سے تمہارے اعضاء کو چیر پھاڑ کھائیں گے۔ یہ تمہاری سانپ اور بچھو جیسی باتیں سانپ اور بچھو ہی بن جائیں گی، اور تمہیں دامن گیر ہو جائیں گی۔ زانیوں کے اندر سے گندے جسم اور شراب خواروں کے بد بودار منہ کی مخفی گندگی ان کے دلوں تک جا پہنچے گی۔ اور میدان محشر میں محسوس اور ظاہر ہو جائے گی۔

خدا کی عدالتِ انصاف

گواہ ـــــــ میزان ـــــــ حساب

اشارہ:

قیامت کا سب سے مشکل مرحلہ لوگوں کے اعمال کا حساب کتاب ہے، جب تمام لوگ خدا کی عدالت میں حاضر ہوں گے اور مختلف گواہوں کی موجودگی میں اُن کے اعمال کے ترازو میں رکھیں جائیں گے۔

ایک ایسی عدالت جو انسانوں کے لئے کمر شکن ہوگی اور جس سے تمام لوگوں پر ایک خوف اور اضطراب طاری ہو جائے گا، ایسی عدالت جس کا جج اور منصف خدا ہے اور جس کے گواہ خدا کے مقرب فرشتے ہیں۔

ایک ایسی عدالت جس میں انسان کے ہر بڑے اور چھوٹے عمل کا ریکارڈ ہوگا، جس میں انسان کی نیت تک کا حساب کیا جائے گا۔

اس سلسلے میں معاد کی بہت سی آیات ہیں، اُن میں کبھی تو اس عدالت کے حاکم، خدا تعالیٰ کا ذکر ہے، اور کبھی اس عدالت کے گواہوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اور کبھی ترازو کا تذکرہ کیا گیا ہے، تو کبھی اس بات کو بیان کیا گیا ہے کہ لوگوں کا حساب کتاب کیسے ہوگا۔

اس موضوع سے متعلق آیات بہت سے دقیق اور ظریف نکات کی حامل ہونے کے ساتھ ساتھ چند اہم تربیتی پیغامات کو بھی اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں جو دلوں اور جانوں کو تقویٰ اور ہدایت کی شمع کی طرف لے جاتے ہیں اور انسانوں کو اس کی ذمہ داریاں بتاتے ہیں اور سعادت اور کمال کی طرف اس کی راہنمائی کرتے ہیں۔

اس اشارے کے ساتھ ہی ہم قرآن کی طرف پلٹتے ہیں اور اس موضوع کے مختلف عنادین سے متعلق منتخب آیات کا مطالعہ کرتے ہیں:

۱۔ وَاِنْ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ (یٰس۔ ۳۲)

۲۔ اَللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۶۹﴾ (حج)

۳۔ فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ (التین۔ ۸،۷)

۴۔ فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ (یونس۔ ۴۶

۵۔ فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰۤؤُلَاۤءِ شَهِيْدًا

(نسآء۔ ۴۱)

۶۔ وَجَاءَتۡ كُلُّ نَفۡسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيۡدٌ (ق۔۲۱)

۷۔ يَّوۡمَ تَشۡهَدُ عَلَيۡهِمۡ اَلۡسِنَتُهُمۡ وَاَيۡدِيۡهِمۡ وَاَرۡجُلُهُمۡ بِمَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ (نور:۲۴)

۸۔ وَقَالُوۡا لِجُلُوۡدِهِمۡ لِمَ شَهِدْتُّمۡ عَلَيۡنَا ؕ قَالُوۡۤا اَنۡطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِىۡۤ اَنۡطَقَ كُلَّ شَىۡءٍ (حٰم السجدۃ:۲۱)

۹۔ يَوۡمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخۡبَارَهَا بِاَنَّ رَبَّكَ اَوۡحٰى لَهَا (زلزال:۴،۵)

۱۰۔ وَنَضَعُ الۡمَوَازِيۡنَ الۡقِسۡطَ لِيَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ فَلَا تُظۡلَمُ نَفۡسٌ شَيۡـئًا ؕ وَاِنۡ كَانَ مِثۡقَالَ حَبَّةٍ مِّنۡ خَرۡدَلٍ اَتَيۡنَا بِهَا ؕ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيۡنَ (انبیاء:۴۷)

۱۱۔ وَالۡوَزۡنُ يَوۡمَئِذِ الۡحَـقُّ ۚ فَمَنۡ ثَقُلَتۡ مَوَازِيۡنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ مَنۡ خَفَّتۡ مَوَازِيۡنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ خَسِرُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ بِمَا كَانُوۡا بِاٰيٰتِنَا يَظۡلِمُوۡنَ (اعراف:۸،۹)

۱۲۔ هٰذَا مَا تُوۡعَدُوۡنَ لِيَوۡمِ الۡحِسَابِ (ص:۵۳)

۱۳۔ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيۡعُ الۡحِسَابِ

(آل عمران:۱۹۹۔ مائدہ:۴۔ ابراهیم:۵۱۔ مومن:۱۷)

۱۴۔ اَلَا لَهُ الۡحُكۡمُ وَهُوَ اَسۡرَعُ الۡحٰسِبِيۡنَ (انعام:۶۲)

۱۵۔ اِنَّ اِلَيۡنَاۤ اِيَابَهُمۡ ثُمَّ اِنَّ عَلَيۡنَا حِسَابَهُمۡ (الغاشية:۲۵،۲۶)

۱۶۔ اِقۡرَاۡ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفۡسِكَ الۡيَوۡمَ عَلَيۡكَ حَسِيۡبًا (اسراء:۱۴)

ترجمہ

۱۔ وہ سب قیامت کے دن ہمارے سامنے حاضر ہوں گے۔

۲۔ تم جس چیز میں اختلاف رکھتے ہو قیامت کے دن خدا اس کا فیصلہ کرے گا۔

۳۔ پس کیا چیز سبب بنی ہے (اے انسان) کہ ان تمام (دلائل) کے باوجود تم روز جزا کو جھٹلاتے ہو؟ کیا خدا سب سے اچھا فیصلہ کرنے والا نہیں؟

۴۔ انہیں لوٹ کر ہماری ہی طرف آنا ہے، پھر خدا گواہی دے گا اس پر جو انہوں نے انجام دیا ہے۔

۵۔ اُن کا حال کیا ہوگا جس دن ہر امت پر ہم اس کے اعمال کا گواہ بلائیں گے اور تجھے ہم اس امت پر گواہ قرار دیں گے۔

۶۔ ہر انسان محشر کے میدان میں آئے گا جب کہ اس کے ساتھ ایک چلانے والا اور ایک گواہ ہوگا۔

۷۔ اُس دن اُن کی زبانیں، ہاتھ اور پاؤں اُن کے خلاف اس عمل پر گواہی دیں گے جو انہوں نے انجام دیا ہوگا۔

۸۔ وہ اپنی جلدوں سے کہیں گے: کیوں ہمارے خلاف گواہی دے رہی ہو؟ (وہ) جواب دیں گی: وہی خدا کہ جس نے ہر موجود کو بولنے کی صلاحیت دی ہے اسی نے ہمیں گویائی عطا فرمائی ہے۔

۹۔ اس دن زمین اپنی تمام خبریں بیان کرے گی کیونکہ تیرے پروردگار نے اس کی طرف وحی کی ہے۔

۱۰۔ اور ہم قیامت کے دن عدل کے ترازو کو قائم کریں گے، لہٰذا کسی پر کچھ ظلم نہیں ہوگا، اور اگر (کوئی عمل) رائی کے دانے کے برابر بھی ہوگا (برا کام ہو یا اچھا) تو ہم اُسے حاضر کریں گے، اور ہم حساب لینے والے کافی ہیں۔

۱۱۔ اُس دن (اعمال کا) وزن کرنا (اور ان کی اہمیت کو پرکھنا) حق ہے، پس جن کی (نیکیوں) کا پلہ بھاری ہوا، وہی لوگ فلاح پانے والے ہوں گے اور جن کا (نیکیوں) کا پلہ ہلکا ہوا یہ وہی لوگ ہوں گے جنہوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا اس لئے کہ وہ ہماری آیتوں کے ساتھ ظلم کرتے تھے۔

۱۲۔ یہ وہی چیز ہے جس کا تمہیں حساب کے دن کے لئے وعدہ دیا گیا ہے۔ (ایک اٹل وعدہ)

۱۳۔ اللہ سریع الحساب ہے (نیک اعمال کا جلدی سے حساب کر دیتا ہے اور ان کی جزا دیتا ہے)۔

۱۴۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔ جان لو کہ فیصلے کا حق صرف اسی کو ہے، بے شک اللہ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔

۱۵۔ بے شک اُن کی بازگشت ہماری طرف ہی ہے اور یقیناً اُن کا حساب بھی ہمارے ہاتھ ہے۔

۱۶۔ (یہ اس کا وہی اعمال نامہ ہے، ہم اس سے کہیں گے) اپنے نوشتے کو پڑھ، کافی ہے کہ آج تو خود اپنا حساب کرنے والا ہو۔

تفسیر

سب کی اس عدالت میں حاضری:

پہلی آیت میں تمام قوموں کے خدا کی عدالت میں حاضر ہونے کے متعلق گفتگو ہے، پہلی قومیں اپنے گناہوں کی وجہ سے کس طرح ہلاک ہوئیں، یہ بیان کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے: یقیناً وہ سب ہماری بارگاہ میں حاضر ہوں گے (تا کہ اُن سے حساب لیا جا سکے) ''وان کل لما جمیع لدینا محضرون''[1]

یہ بات بھی صحیح ہے کہ اس دنیا میں اور ہر وقت تمام انسان اور تمام اشیاء خدا کے سامنے حاضر ہیں کیونکہ وہ ہر جگہ موجود ہے اور ہم سے بھی زیادہ ہمارے نزدیک ہے لیکن یہ چیز قیامت کے دن ایک نئی شکل میں ہوگی، کیونکہ ایک طرف تو غفلت، جہالت اور نادانی کے پردے اٹھا دیئے جائیں گے، نظر تیز ہو جائے گی اور دل کی آنکھیں کھل جائیں گی تو دوسری طرف خدا کے آثار وہاں ہر دور سے زیادہ آشکار ہوں گے، اُس کی عدالت انصاف سجائی جائے گی، اس لئے اس عدالت میں سب لوگوں کی حاضری ایک نئے طریقے سے ہوگی اور تمام لوگوں کو اس بات کا احساس بھی ہوگا۔

دوسری آیت میں اس کے فیصلہ کرنے اور انسانوں کے درمیان قضاوت کرنے کے متعلق گفتگو ہے، اس دنیا میں جو بھی اختلاف تھے اُن کو اس عدالت میں حل کر دیا جائے گا، چاہے وہ اختلاف عقائد سے متعلق ہوں یا زندگی کے عملی پروگرام کے بارے میں یا کسی اور معاملے میں، ارشاد ہوتا ہے: تم جن چیزوں میں اختلاف کرتے تھے خدا قیامت کے دن تمہارے درمیان اُن کا فیصلہ کرے گا۔ ''اللہ یحکم بینکم یوم القیمۃ فیما کنتم فیہ تختلفون''۔

اس دنیا میں انسانی فکر و نظر اور قلب و دماغ پر جو مختلف قسم کے پردے پڑے ہوئے ہیں، (مثلاً حب ذات، خود پرستی، شخصی اور گروہی مفادات، تعصب، کینہ، گناہوں اور عالم مادہ کے دوسرے رنگا رنگ پردے) وہ انسان کو اس بات کی مہلت نہیں دیتے کہ وہ قوموں، گروہوں اور ملتوں کے درمیان اختلاف ختم کر سکے، لیکن وہاں یہ تمام پردے اُٹھ جائیں گے اور فیصلہ بھی خدا کے ہاتھ میں ہوگا، تو یہ تمام اختلاف ختم ہو جائیں گے، وہاں اس بات کا مشاہدہ کیا جا سکے گا کہ جھوٹے اور خود غرض مدعی ایسے نرم ہو جائیں گے اور اُن کی عقل یوں ٹھکانے

---

[1] بعض مفسرین نے مذکورہ بالا آیت کا تجزیہ و ترکیب یوں کیا ہے ''ان'' نافیہ ہے اور ''لما'' الا کے معنی میں ہے جب کہ ''جمیع''، ''مجموع'' کے معنی میں ہے اور ''کل'' کے لئے ''خبر'' ہے، ''کل'' کی تنوین بھی ''مضاف الیہ'' کے بدلے میں ہے جو کہ محذوف ہے اور حقیقت میں ''کلھم'' تھا اور ''محضرون'' یا تو خبر کے بعد خبر ہے یا ''جمیع'' کے لئے صفت ہے، لہٰذا پورا جملہ یوں ہے: ''وما کلھم الا مجمعون یوم القیمۃ محضرون لدینا'' اس آیت کی ترکیب نحوی کے سلسلے میں اور بھی کئی اقوال ذکر کئے گئے ہیں، جو قابل قبول نہیں ہیں۔

آجائے گی کہ وہ خود اپنے محاسب بن جائیں گے۔

یہی مفہوم تیسری آیت میں ایک اور پیرائے میں ذکر کیا گیا ہے، پیغمبر اکرمؐ نے گفتگو کا رخ اس انسان کی طرف کیا ہے، جسے خدا نے ''احسن التقویم'' سے پیدا کیا لیکن وہ اپنے برے اعمال کی وجہ سے ''اسفل السافلین'' تک جا پہنچا، اور قیامت و معاد کا مذاق اور تمسخر اڑانے لگا، چنانچہ ارشاد فرمایا: کیا چیز سبب بنی ہے کہ اتنی ساری دلیلوں کے باوجود تو روز جزا کا انکار کرتا ہے (''فما یکذبك بعد بالدین''[1]

کیا خدا سب سے اچھا حاکم نہیں ہے؟ ''الیس اللہ باحکم الحاکمین''

ہاں! وہ بہترین منصف ہے کیونکہ ایک طرف تو اس کا علم سب چیزوں پر حاوی ہے اور کوئی چیز اس سے پوشیدہ نہیں ہے اور فیصلہ کرنے کی سب سے بڑی شرط بھی قضیے سے مکمل اور صحیح آگاہی ہے، دوسری طرف وہ کسی چیز اور شخص کا محتاج نہیں کہ جس کی وجہ سے ناحق فیصلہ کرے، یہ تو ضرورت مند انسان ہیں جو کبھی اپنے شخصی اور گروہی مفادات اور کبھی غلط جذبات اور احساسات کے تابع ہو کر ناحق فیصلے کرتے ہیں، لیکن وہ احکم الحاکمین ہے اور بہترین منصف ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ بہت سی تفاسیر میں پیغمبر اکرمؐ سے یہ حدیث منقول ہے جو آپؐ نے ان آیات کے خاتمے پر ارشاد فرمائی:

بلی و انا علی ذلك من الشهدین

ہاں! میں گواہی دیتا ہوں کہ روز جزا حق ہے اور خدا احکم الحاکمین ہے۔

یہ حدیث بھی مذکورہ بالا تفسیر کی ہی تائید کرتی ہے۔ (غور کیجئے گا)

محشر کے گواہ

چوتھی آیت میں قیامت کے گواہوں کے متعلق گفتگو کی گئی ہے، سب سے پہلے تو خدا کی پاک ذات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جو سب سے بڑا گواہ ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

ہماری طرف ہی تمام لوگوں نے لوٹ کر آنا ہے، پھر خدا گواہ ہے اُس پر جو وہ انجام دیتے ہیں۔

---

[1] اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ اس آیت کے مخاطب وہ انسان ہیں جن کی صفات کی طرف اس سے پہلے والی آیات میں اشارہ کیا گیا ہے، لیکن بعض نے یہ احتمال ذکر کیا ہے، کہ مخاطب رسول اسلامؐ ہیں (تفسیر مجمع البیان، فخر رازی، قرطبی اور فی ظلال القرآن، زیر نظر آیت کے ذیل میں) پہلی صورت میں ''یکذبك'' کا معنیٰ ''یجعلك کاذبا'' کیا گیا ہے لیکن اگر مخاطب پیغمبر اسلامؐ ہوں تو پھر ''یکذب'' اپنے اسی ظاہری معنیٰ پر باقی رہے گا یعنی ''ما ینسبك الی الکذب'' بہرصورت مراد یہ ہے کہ اتنی واضح اور روشن دلیلوں کے ہوتے ہوئے قیامت کو جھٹلانے کی کوئی وجہ نہیں اور نہ ہی قیامت کے مدعی کو جھٹلانے کا کوئی سبب ہے۔

"فالینا مرجعھم ثم اللہ شھید علی ما یفعلون" [۱]

ایک ایسی عدالت کہ جس کا حاکم بھی خدا ہے اور پہلے درجے پر گواہ بھی وہی ہے کیا ممکن ہے کہ اس میں کسی بات سے غفلت برتی جائے اور حساب کے وقت کسی چیز کو بھلا دیا جائے؟

لہٰذا ایسی عدالت سے یقینی طور پر اضطراب ہونا چاہیے البتہ اس امر سے نہیں کہ کوئی فیصلہ ناحق کیا جائے گا بلکہ اپنے اعمال کی وجہ سے ڈرنا چاہیے۔

بعض مفسرین نے یہاں پر گواہی اور شہادت کو سزا اور جزا کے معنی میں لیا ہے جب کہ کسی ایسی خلاف کر گذریں گے اس طرح سے کہ کبھی آگ اُن کے کسی حصے کو پکڑ لے گی اور کسی حصے کو چھوڑ دے گی۔[۲]

جہنم کے اوپر سے ہی کیوں گزر کر جنت میں جانا پڑے گا؟ اس سلسلے میں بہت دقیق اور لطیف نکات ہیں، ایک تو یہ کہ اہل جنت دوزخ کا نظارہ کرنے سے جنت کے راحت وسکون کی قدر جان لیں گے، دوسرا وہاں صراط کی حالت اس دنیا میں ہمارے اعمال کی حالت کے مطابق ہی مجسم ہوگی، اس دنیا میں بھی شہوت کے دھکتے ہوئے پُل سے گزر کر ہی تقویٰ کی جنت میں پہنچا جا سکتا ہے، تیسرا مجرموں اور گنہگاروں کے لئے یہ ایک تنبیہہ اور خطرے کا اعلان ہے کہ آخر کار انہیں اس باریک اور خطرناک راستے سے گذرنا ہوگا۔

مفضل بن عمر نے امام جعفر صادقؑ سے حدیث روایت کی ہے، کہتے ہیں میں نے صراط کے بارے میں امامؑ سے پوچھا:

تو آپؑ نے فرمایا: صراط خدا کی معرفت اور شناخت کا راستہ ہے۔

پھر آپ نے فرمایا:

ھما صراطان: صراط فی الدنیا۔ صراج فی الاخرۃ۔ فاما الصراط الذی فی الدنیا فھو الامام المفروض الطاعۃ۔ من عرفہ فی الدنیا واقتدی بھداہ مر علی الصراط الذی ھوا جسر جھنم فی الاخرۃ ومن لم یعرفہ فی الدنیا زلت قدمہ عن الصراط فی الاخرۃ فتر دی فی نار جھنم۔

صراط دو ہیں! ایک دنیا میں ہے اور ایک آخرت میں، دنیا میں صراط واجب الاطاعت امام ہے، جو بھی اُسے پہچان

---

[۱] تفسیر المیزان میں ذکر ہوا ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں "ثم" بیان میں تاخیر کے لئے ہے نہ کہ زمان میں تاخیر کے لئے جب کہ اس آیت کے سلسلے میں تراخی زمان کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے، کیونکہ خدا پہلے لوگوں کو محشور کرے گا اور پھر اس کے بعد اُن کے اعمال پر گواہی دے گا، کیونکہ مراد حساب کے وقت کی گواہی اور شہادت ہے۔

[۲] امالی صدوق، مجلس ۳۳۔

لے اور ہدایت کے لئے اس کی پیروی اور اطاعت کرے وہ آخرت کے پل صراط سے بھی گزر جائے گا، جو جہنم پر ہے، لیکن جو شخص دنیا میں اُسے نہ پہچانے اس کے قدم آخرت کے صراط پر ڈگمگا جائیں گے، اور وہ جہنم میں گر جائے گا۔[1]

تفسیر امام حسن عسکریؑ میں ان دو صراط (دنیا اور آخرت کے صراط) کی تفسیر یوں کی گئی ہے کہ ایک تو غلو اور تقصیر کے مابین معتدل صراط مستقیم ہے اور دوسری صراط آخرت۔[2]

ظاہر تفسیر کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اس بات سے کوئی چیز مانع نہیں ہے کہ خدا اس دن بندوں کے اعمال پر گواہی دے اور اپنی یہ گواہی حساب پر متعین فرشتوں پر الہام کے ذریعے دے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ خدا کی گواہی یوں ہوگی کہ وہ انسان کے مختلف اعضاء کو بولنے کی صلاحیت عطا کر دے گا، تا کہ انہوں نے جو کچھ کیا ہو اُسے بیان کریں۔

پانچویں آیت میں بھی قیامت کے گواہوں کے متعلق گفتگو کی گئی ہے، لیکن یہاں پر پیغمبروں کی اپنی امتوں اور پیغمبر اسلامؐ کی تمام پیغمبروں پر گواہی کا تذکرہ کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: اُن کا کیا حال ہوگا جس دن ہم ہر امت کے اعمال پر گواہ کو بلائیں گے اور تجھے اُن پر گواہ قرار دیں گے ''فکیف اذا جئنا من کل امۃ بشھید وجئنا بك علی ھو الآء شھیدا ''۔

البتہ مذکورہ بالا آیت میں یہ بات واضح طور پر بیان نہیں کی گئی کہ ہر امت کا گواہ اُس کا پیغمبر ہوگا لیکن مختلف قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ بات یوں ہی ہے کیونکہ ہر امت کا پیغمبر اس بات کی زیادہ لیاقت رکھتا ہے کہ وہ اپنی امت پر بطور گواہ پیش ہو۔

نیز آیت میں یہ بھی بیان نہیں ہوا کہ ''ھولاء'' (یہ لوگ) سے کون سے لوگ مراد ہیں، اسی لئے مفسرین نے یہاں پر دو احتمال ذکر کئے ہیں، بعض نے کہا ہے کہ یہ پیغمبر اسلامؐ کی امت کی طرف اشارہ ہے اور آپؐ قیامت کے دن اپنی امت کے لوگوں پر گواہ ہوں گے، امت کے صالحین کو بھی پہچان کروائیں گے اور جھوٹوں اور بروں کا بھی تعارف کروائیں گے۔[3]

لیکن بہت سے مفسرین نے کہا کہ ''ھو الائ'' انبیاء کے گروہ کی طرف اشارہ ہے جن کی طرف پہلے جملے میں اشارہ کیا گیا ہے، اس لحاظ سے پیغمبر اسلامؐ گواہوں پر گواہ اور شاہدوں پر شاہد ہیں۔

انبیاء کی اپنی اُمتوں پر گواہی یا رسول اسلامؐ کی انبیاء کے لئے گواہی کس طرح سے ہوگی جب کہ ''شھود'' کا معنی ایسی آگاہی ہے جو اس واقعے کے وقت حاضر ہونے کی صورت میں ہو اور ہر ایک نبی اور اسی طرح نبی اکرمؐ اپنی امت کے ایک خاص دور میں تھے، ممکن ہے یہ اس

---

[1] معانی الاخبار، ص ۳۲ (حدیث ۱)۔

[2] بحار، ج ۸، ص ۶۹ (حدیث ۱۸)۔

[3] یہ احتمال تفسیر کشاف، ج ۱ ص ۵۱۲ اور تفسیر مجمع البیان، ج ۳ ص ۴۹ پر ذکر ہوا ہے۔

لحاظ سے ہو کہ عالم برزخ میں اُن کی روح تمام امتوں کے احوال و افعال کا مشاہدہ کرتی ہے، یہ بات سورہ مائدہ کی آیت ۱۱۷ کے بالکل منافی نہیں ہے کہ جو حضرت مسیحؑ کی زبانی کہتی ہے:

" وکنت علیهم شهیدا مادمت فیهم فلما توفیتنی کنت انت الرقیب علیهم "

میں جب تک اُن (عیسائیوں) کے درمیان تھا اُن کے اعمال پر گواہ تھا پھر جب تو نے مجھے اٹھا لیا تو پھر تو اُن پر نگران تھا۔

کیونکہ یہاں پر شہادت اور گواہی ایسی موجودگی کی صورت میں ہے کہ جو انحراف سے روکے یہاں صرف گواہی اور موجودگی کا مسئلہ نہیں ہے (غور کیجئے گا)۔

پیغمبر اکرمؐ کے سلسلے میں بھی ممکن ہے یہ بات کہی جا سکے کہ اُن کی پاکیزہ روح پوری تاریخ بشریت کے درمیان موجود رہی ہو اور اُن کے اعمال اور کردار کو دیکھ رہی ہو جیسا کہ روایات میں بھی ہے کہ خدا کی سب سے پہلی مخلوق پیغمبر اسلام کا نور ہے۔ [۱]

یہاں پر گواہی کا ایک اور معنی بھی بیان کیا گیا ہے اور وہ ایک چیز کا دوسری چیز سے موازنہ کرنے کی میزان اور معیار ہے کیونکہ ایک مثالی فرد نیک لوگوں کی نیکی (یعنی جو لوگ اس جیسے ہیں) اور برے لوگوں کی برائی (جو لوگ اس سے دور ہیں) پر عملی طور پر ایک بہترین گواہ ہو سکتا ہے، اس صورت میں اس آیت کا مفہوم قیامت کے گواہوں سے مختص نہیں ہوگا۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کی ایک حدیث یوں ہے:

ایک دن آنحضرتؐ نے ابن مسعودؓ سے فرمایا: ''مجھے قرآن سناؤ''۔

انہوں نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! آپؐ نے تو قرآن ہمیں سکھایا ہے''۔

آپؐ نے فرمایا: ''میری خواہش ہے کہ میں کسی دوسرے سے قرآن سنوں''۔

ابن مسعودؓ نے سورہ نساء پڑھنا شروع کی، جب وہ مذکورہ بالا آیت ''فکیف اذا جئنا من کل امة بشهید'' پر پہنچے تو رسول اللہؐ نے گریہ فرمایا۔ [۲]

ایک اور جگہ پر اسی حدیث کا باقی حصہ یوں آیا ہے:

آپؐ نے یوں گریہ فرمایا کہ آپؐ کا چہرہ مبارک تر ہو گیا، پھر آپؐ نے فرمایا:

---

[۱] بحار الانوار، ج ۱۵، ص ۴۔

[۲] تفسیر کبیر، ج ۱۰، ص ۱۰۵۔

"یا رب هذا علی من انا بین ظهرانیهم، فکیف من لم ارهم"

خدایا! یہ اُن لوگوں کی نسبت ہے میں جن کے درمیان ہوں، پس اُن لوگوں کی نسبت کیا ہوگا کہ جنہیں میں نے دیکھا نہیں ہے۔"[1]

پیغمبر اسلامؐ کا گریہ ظاہری طور پر قیامت کی وحشت کے متعلق اور اُس عظیم ذمہ داری پر تھا، جو اُن پر ڈالی گئی تھی یعنی حاضرین پر گواہی کا فریضہ اور اس سے بڑھ کر غائبین پر گواہی کی ذمہ داری کہ جس پر آپؐ خدا کی نصرت سے قادر ہوں گے۔

چھٹی آیت میں خدا کی عدالت میں فرشتوں کی گواہی کے متعلق گفتگو کی گئی ہے، ارشاد ہوتا ہے: ہر انسان میدان محشر میں آئے گا جب کہ اُس کے ساتھ چلانے والا اور گواہ ہوگا 'وجآءت کل نفس معها سائق وشهید"۔

''سائق'' اُسے خدا کی عدالت کی طرف چلائے گا اور ''شهید'' اس کے اعمال پر گواہی دے گا۔

اگر چہ آیت میں اس بات کی وضاحت نہیں کی گئی کہ وہ چلانے والا اور گواہ فرشتوں میں سے ہوگا یا کوئی اور، اور اگر وہ فرشتہ ہوگا تو خدا کا کون سا فرشتہ ہوگا، لیکن مختلف قرائن وشواہد سے یہ بات واضح ہوتی ہے، کہ وہ یقینی طور پر فرشتہ ہوگا کیونکہ اس عظیم کام کے لئے مناسب ترین فرشتہ ہی ہے نیز یہ بات اور زیادہ مناسب ہے کہ جو دو فرشتے نیکیاں اور برائیاں لکھنے پر مامور ہیں اور وہ آدمی کے اعمال پر باقی تمام فرشتوں کی نسبت زیادہ باخبر ہیں وہ ہی یہ فریضہ انجام دیں، لیکن بعض لوگوں نے ''سائق'' سے مراد موت کا فرشتہ لیا ہے جو اُسے موت کی طرف چلائے گا اور ''شاهد'' سے مراد انسان کا عمل یا اس کے بدن کے اعضاء یا اس کا اعمال نامہ لیا ہے جب کہ بعض دوسرے مفسرین نے ''سائق'' سے مراد شیطان اور ''شاهد'' سے مراد فرشتہ لیا ہے، لیکن مذکورہ بالا تفسیر کے سوا ان تمام تفسیروں میں سے کوئی بھی آیت کے ظاہر کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے۔

بہرحال پہلا فرشتہ اُسے بھاگنے نہیں دے گا اور دوسرا فرشتہ اسے انکار نہیں کرنے دے گا یعنی

نہ جای ماندن نہ پای رفتن۔

ان اشخاص کی حالت بالکل ایسے مجرموں کی سی ہے جنہیں اس دنیا میں عدالت کی طرف لایا جاتا ہے، ایک سپاہی انہیں آگے کی طرف دھکیلتا ہے جب کہ دوسرا سپاہی اس کے اعمال کی فائل اٹھائے ساتھ ہوتا ہے، نہج البلاغہ میں آیا ہے کہ امیر المومنین حضرت علیؑ نے اس آیت کو ذکر کرنے کے بعد فرمایا:

"سائق یسوقها الی محشرها وشاهد یشهد علیها بعملها"

ایک اُسے میدان محشر کی طرف دھکیلنے والا ہوگا اور ایک اس کے اعمال پر گواہی دینے والا۔

---

[1] تفسیر قرطبی، ج ۳، ص ۱۷۶۷، یہ حدیث دوسروں نے تھوڑے سے فرق کے ساتھ ذکر کی ہے۔

ساتویں آیت میں اس عدالت میں انسانی اعضاء کی گواہی کے متعلق گفتگو کی گئی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

اس دن ان کی زبانیں، ہاتھ اور پاؤں ان کے خلاف ان اعمال پر گواہی دیں گے جو انہوں نے انجام دے ہیں، ''یوم تشھد علیھم السنتھم وایدیھم وارجلھم بما کانو یعملون''۔

جی ہاں! اُس دن خدا اُن کی واقعی جزا کسی کمی وبیشی کے بغیر دے گا "یومئذ یوفیھم اللہ دینھم الحق"

آٹھویں آیت بھی اسی سے ملتی جلتی ہے لیکن اس فرق کے ساتھ کہ اب انسانی جلد کی گواہی دینے کی بات ہے، ارشاد ہوتا ہے: جب دشمنان خدا دوزخ کے کنارے پر آئیں گے تو اُن کے کان، آنکھیں اور جلد ان کے اعمال پر گواہی دیں گے، اس وقت وہ اپنے بدن کی جلدوں سے کہیں گے:

ہمارے خلاف کیوں گواہی دے رہے ہو "وقالو الجلودھم لم شھد تم علینا"

تو وہ جواب میں کہے گی: وہی خدا جو ہر موجود کو بولنے کی صلاحیت عطا کرتا ہے اُسی نے ہمیں نطق عطا کیا ہے ''قالوا انطقنا اللہ الذی انطق کل شئی''

مذکورہ بالا آیات کا ظاہر یہ ہے کہ خدا بدن کے اعضاء یہاں تک کہ جلد کو بھی شعور اور توانائی عطا کر دے گا تا کہ وہ بات کریں اور ہر عضو نے جو کام انجام دیا ہے، اُسے بیان کرے گا، کان نے جو کچھ سنا ہے، آنکھ نے جو کچھ دیکھا ہے، جلد سے جو کچھ مس ہوا ہے، زبان نے جو کچھ کہا ہے، ہاتھ نے جو کچھ انجام دیا ہے اور پاؤں نے جو حرکت کی ہے، سب بیان کریں گے (یہ چھ اعضاء اپنے اپنے اعمال کی گواہی دیں گے)۔

بعض مفسرین نے جو یہ بیان کیا ہے کہ ان اعضاء میں سے بعض زمانے کی طرح انسان کے پورے اعمال پر گواہی دیں گے، نہ کہ فقط اپنے اعمال پر، آیات کے ظاہر کے ساتھ کوئی زیادہ مناسبت نہیں رکھتا، یہاں سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اگر بعض اعضاء کا ذکر ان آیات میں نہیں آیا (مثلاً دل، دماغ، لب، دانت اور اسی طرح دوسرے اعضاء جن سے نیت، کھانے اور گفتار کا تعلق ہے) تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ فقط یہی چھ اعضاء گواہی دیں گے بلکہ ہر عضو اپنے اعمال کا اعتراف کرے گا، لہٰذا ان سے بڑھ کر کونسا گواہ ہوسکتا ہے۔

واضح ہے کہ یہ گواہی اعضاء کی گواہی ہے، اگر چہ یہ خدا کی طرف سے دی گئی قدرت کے ساتھ ہوگی لیکن یہ خود خدا کی طرف سے گواہی نہیں ہوگی جب کہ تفسیر رازی میں یہ بات بعض مفسرین کی طرف سے ذکر کی گئی ہے۔[1]

یہ بات قابل غور ہے کہ ان آیات کے مطابق اس دن گنہگار فقط اپنے جسم کی جلد سے سوال کریں گے کہ تم ہمارے خلاف گواہی کیوں دے رہی ہو یا تم ہمارے خلاف کیونکر گواہی دے رہی ہو، (پہلی صورت میں علت کے متعلق سوال ہے جب کہ دوسری صورت میں کیفیت کے متعلق سوال ہے) لیکن باقی پانچ اعضاء سے ایسا سوال نہیں کیا جائے گا، ایسا شاید اس لئے ہو کہ جلد کی گواہی باقی تمام گواہیوں کی نسبت عجیب اور

---

[1] تفسیر فخر رازی، ج ۲۳، ص ۱۹۴۔

غیر متوقع ہے، علاوہ ازیں بدن کی جلد سے اُن کاموں کے متعلق سوال کیا جائے گا کہ جو کسی طریقے سے اُس کے ساتھ مس ہوئے ہیں اور کسی مخصوص عضو کے ساتھ مختص نہیں ہیں، ایسا نہیں کہ یہ فقط ''شرم گاہ'' کی طرف اشارہ ہو جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے:

اس سلسلے میں آخری بات یہ ہے کہ قرآن کی بعض آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے زبان کے علاوہ باقی اعضاء گواہی دیں گے اور یہ باتیں بالکل روشن اور واضح ہوگئیں تو پھر زبان بھی حقیقت کا اعتراف کرے گی، جیسا کہ سورہ یٰسین آیت ۶۵ میں ہے:

اليوم نختم على افواههم وتكلمنا ايديهم وتشهد ارجلهم بما كانو يكسبون۔

آج اُن کے مونہوں پر مہر لگا دی جائے گی اور ان کے ہاتھ ہمارے ساتھ گفتگو کریں گے اور اُن کے پاؤں اُن اعمال پر گواہی دیں گے جو انہوں نے انجام دے ہیں۔

نویں آیت میں انسانی اعمال پر زمین کی شہادت اور گواہی کو بیان کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: اُس (قیامت کے) دن زمین اپنی تمام خبریں بیان کرے گی ''يومئذ تحدث اخبارها'' کیونکہ تیرے پروردگار نے اس کی طرف وحی کی ہے ''بان ربك اوحى لها''

اس طرح ایک نہایت اہم گواہ زمین ہوگی جو اس دن اُن اعمال پر گواہی دے گی جو اس پر انجام پائے ہیں، پیغمبر اسلامؐ کی ایک حدیث میں ہے:

آپؐ نے پوچھا کہ کیا تمہیں معلوم ہے کہ ''اخبار'' سے کیا مراد ہے؟

صحابہ نے عرض کی: ''خدا اور اُس کا رسولؐ بہتر جانتے ہیں''۔

تو آپؐ نے فرمایا:

اخبارها ان تشهد على كل عبد و امة بما عملوا على ظهرها تقول عمل كذا و كذا، يوم كذا، فهذا اخبارها۔

''زمین کے خبر دینے سے مراد یہ ہے کہ بندگان خدا چاہے وہ مرد ہوں یا عورت، اُن کے وہ اعمال جو زمین پر انجام پائے ہیں وہ ان کے متعلق بتائے گی اور کہے گی: فلاں شخص نے فلاں دن فلاں کام کیا تھا، یہ ہے زمین کا خبر دینا''۔[1]

ابوسعیدؓ خدری سے روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں:

---

[1] تفسیر مجمع البیان، ج۱۰، ص۵۲۶، زیر نظر آیت کے ذیل میں یہی مفہوم قرطبی، تفسیر روح المعانی اور تفسیر فخر رازی میں بھی مذکور ہے۔

جب تم بیابان میں ہوتو اپنی آواز اذان کے وقت بلند کرو کیونکہ میں نے رسول خداؐ کو فرماتے ہوئے سنا ہے:

لا یسمعه انس ولا جن ولا حجر (ولا شجر) الا یشهدله

''جو انسان، جن، پتھر اور درخت بھی اُسے سنے گا وہ (قیامت کے دن) اس کی گواہی دے گا۔[1]

لیکن بعض مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں کئی اور احتمالات بھی ذکر کئے ہیں، مثلاً یہ کہ زمین قیامت کے متعلق خبر دے گی، اُس وقت انسان قیامت کا زلزلہ دیکھ کر کہے گا: زمین کو کیا ہو گیا ہے (کہ یوں لرز اٹھی ہے)''وقال الانسان مالها''۔

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ زمین اُن انسانوں کے متعلق خبر دے گی جنہیں وہ باہر نکالے گی اور کہے گی یہ فلاں کا جسم ہے اور یہ فلاں آدمی ہے۔[2]

لیکن پہلی تفسیر سورت کی تمام آیات کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کے ساتھ ساتھ اس سلسلے میں منقول متعدد احادیث کے ساتھ بھی ہمنوا ہے۔

بہت سی احادیث میں حضرت علیؑ کا یہ قول مذکور ہے:

''زمین قیامت کے دن نماز اور یہاں تک کہ بیت المال کی تقسیم پر بھی گواہی دے گی''

ایک اور حدیث میں ہے:

صلوا المساجد فی بقاع مختلفة فان کل بقعة تشهد للمصلی علیها یوم القیمة

مساجد میں مختلف جگہوں پر نماز پڑھو کیونکہ زمین کا ہر حصہ قیامت کے دن اس پر نماز پڑھنے والے کے لئے گواہی دے گا۔[3]

زمین کیسے خبر دے گی؟ بعض نے تو اس سلسلے میں آیت کے ظاہر کو ہی قبول کیا ہے کہ خدا کے حکم سے اُس دن اُسے شعور اور فہم کی قوت حاصل ہو گی اور وہ بولنے لگے گی۔۔۔۔اور اُس پر جو کام ہوئے ہیں، اُن کو بیان کرے گی، یہ بات کچھ عجیب بھی نہیں ہے کیونکہ قیامت کا دن حقیقی زندگی اور حیات کا دن ہے:

---

[1] مجمع البیان، ج۱۰،ص۵۲۶۔ کالموں میں دی گئی عبارت اس روایت کے مطابق ہے جو روح البیان ص ۴۹۳، ج۱۰ میں مذکور ہے۔

[2] تفسیر قرطبی۔ زیرنظر آیت کے ذیل میں۔

[3] لئالی الاخبار، ج۵،ص۹۷ (نیا ایڈیشن)۔

وان الدار الاخرة لھی الحیوان(عنکبوت:۶۴)

لہٰذا ممکن ہے کہ زمین بھی ایک قسم کی زندگی اور شعور کی حامل ہو۔

بعض نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ خدا آواز کی لہروں کو اس میں پیدا کر دے گا، لہٰذا درحقیقت بات کرنے والا خدا ہے (اس کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی باشعور شخص اپنی آواز ٹیپ ریکارڈر کے ذریعے ریکارڈ کر لیتا ہے)۔

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ زمین کے بات کرنے اور بولنے سے مراد اُن اعمال کے اثرات کا ظاہر ہونا ہے جو اس پر انجام پائے ہیں کیونکہ انسان جو عمل بھی انجام دیتا ہے اُس کے آثار اس دنیا اور زمین پر نقش ہو جاتے ہیں۔

لیکن سب سے بہتر وہی پہلی تفسیر ہے۔

گذشتہ آیات سے مجموعی طور پر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قیامت کے دن خدا کی گواہی کے علاوہ فرشتے، انسانی بدن کے اعضاء اور زمین بھی انسان کے اعمال پر گواہی دیں گے۔

اعمال کا ترازو

دسویں آیت ''میزان'' اور اعمال کے ترازو کے متعلق گفتگو کرتی ہے، ارشاد ہوتا ہے: ہم قیامت کے دن انصاف کا ترازو رکھیں گے، کسی پر بھی کچھ ظلم نہیں ہوگا ''ونضع الموازین القسط لیوم القیمة فلا تظلم نفس شیئا''۔

اس ترازو سے تمام چیزوں کو تولا جائے گا، چاہے وہ چھوٹی ہوں یا بڑی، ''یہاں تک کہ اگر کچھ رائی کے دانے کے برابر بھی ہو تو اس کا حساب کیا جائے گا اور کافی ہے کہ ہم حساب کرنے والے ہوں''۔'' وان كان مثقال حبة من خردل اتينا بها و كفى بنا حسبين''

رائی کا دانہ بہت چھوٹا اور کم وزن ہوتا ہے، چھوٹے اور حقیر ہونے میں اس کی مثال دی جاتی ہے، یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ چھوٹے سے چھوٹا عمل بھی اُس دن اس ترازو کے پلڑے میں رکھا جائے گا ''موازین'' جمع ہے میزان کی جو وزن تولنے کے آلہ کے معنی میں ہے، یہ تعبیر بتاتی ہے کہ اس دن صرف ایک ترازو نہیں ہوگا بلکہ اعمال تولنے کے لئے متعدد ترازو رکھے جائیں گے۔

بعض نے کہا ہے کہ ممکن ہے ہر انسان کے لئے ایک الگ ترازو ہو یا ہر امت کے لئے ایک الگ ترازو یا ہر عمل کے لئے الگ ترازو مثلاً نمازوں کو ایک ترازو میں تولا جائے گا اور روزہ، حج اور جہاد کو بھی الگ الگ ترازو میں رکھا جائے گا۔

بعض نے کہا ہے کہ حقیقت میں ترازو ایک ہی ہوگا اور اس پر کئی احادیث بھی ہیں جو آئندہ آئیں گی، یہاں پر جمع کا صیغہ اس ترازو کی عظمت کو بیان کرنے کے لئے لایا گیا ہے، وہ ایک ترازو ہی اتنا بڑا ہوگا، جو ہزاروں جتنا کام کرے گا۔[1]

---

[1] روح المعانی، ج ۱۷، ص ۵۰، ۵۱۔

لیکن جیسا کہ ہم بیان کریں گے اس تفسیر پر جو کہ خلاف ظاہر ہے کسی قسم کی دلیل موجود نہیں ہے جب کہ کئی ترازو ہونے پر ہمارے پاس دلیل موجود ہے۔

اہم یہ ہے کہ یہاں پر یہ بات واضح ہو جائے کہ ''میزان'' سے کیا مراد ہے، کیا یہ مروجہ ترازو کے مانند ہوگا جس کے دو پلڑے ہوتے ہیں اگر چہ وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو؟ اس صورت میں اس میں اعمال تولنے کا معنی یہ ہوگا کہ اس میں اعمال ناموں کو رکھ کر تولا جائیگا کیوں کہ عمل خود تو کوئی وزن نہیں رکھتا یا اس طرح ہوگا کہ عمل مجسم ہو کر ایک صورت اختیار کرلے گا اور وزنی ہو جائے گا۔

بہر حال جو لوگ کہتے ہیں کہ وہ ترازو ہمارے معمول کے ترازو کی طرح ہوگا وہ مجبور ہیں کہ انسان کے اعمال کے لئے ایک قسم کا وزن تصور کریں تا کہ انہیں اس ترازو میں تولا جا سکے۔

لیکن مختلف شواہد سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ ''میزان'' سے مراد تولنے کا آلہ ہے اور وہ بھی عمومی مفہوم میں کیونکہ ہر چیز کے لئے اُس کی مناسبت سے ایک ترازو ہوتا ہے، درجہ حرارت ناپنے کے لئے ''میزان الحرارہ'' ہوتا ہے جسے تھرمامیٹر کہتے ہیں، ہوا کو ''میزان الہوا'' کے ذریعے ناپتے ہیں جسے بیرومیٹر (BAROMETER) کہتے ہیں۔

لہٰذا اعمال تولنے کے ترازو سے مراد یہاں وہ افراد ہیں جن کے اعمال کے ساتھ نیک اور برے لوگوں کے اعمال کا موازنہ کیا جائے گا، چنانچہ علامہ مجلسی مرحوم نے شیخ مفید سے یہ روایت ذکر کی ہے:

ان امیر المومنین والائمۃ من ذریتہ هم الموازین۔

امیر المومنینؑ اور اُن کے امام بیٹے قیامت کے دن عدل کے ترازو ہیں۔[1]

اصول کافی اور معانی الاخبار میں بھی حضرت امام جعفر صادقؑ سے یہ حدیث منقول ہے کہ ایک شخص نے مذکورہ بالا آیت کے معنی کے متعلق سوال کیا تو آپؑ نے فرمایا:

هم الانبیآء ولا وصیاء۔

عدل کے ترازو، انبیاء اور اُن کے جانشین ہیں۔[2]

حضرت علیؑ کی ایک زیارت مطلقہ میں یہ جملہ ہے:

السلام علی میزان الاعمال

---

[1] بحار الانوار، ج ۷، ص ۲۵۲۔

[2] تفسیر برہان، ج ۳، ص ۶۱، اصول کافی، ج ۱، ص ۴۱۹، اسی حدیث سے ملتی جلتی دیگر احادیث بھی تفسیر کی دوسری کتب میں آئی ہیں۔

اعمال کے ترازو پر سلام![1]

حقیقت میں عظیم اور مثالی شخصیتیں ہی اعمال کو ناپنے کا پیمانہ ہیں، جس کے اعمال ان سے جتنی حد تک ملتے ہوں گے اتنے ہی وزنی ہوں گے اور جو ان سے نہیں ملتے ہوں گے یا تو وہ ہلکے ہوں گے یا بالکل بے وزن ہوں گے، اس جہان میں اولیائے خدا اعمال کی پیمائش کا ترازو ہیں، لیکن اُس عالم میں یہ بات ثبوت اور ظہور کے مقام تک پہنچ جائے گی، یہیں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ''موازین'' جمع اس لئے ہے کیونکہ یہ بزرگ ہستیاں متعدد ہیں۔

البتہ ''میزان عمل'' کے سلسلے میں چند اور روایات اور مفاہیم بھی ہیں جن کا ذکر توضیحات کے ذیل میں آئے گا۔

گیارہویں آیت میں بھی میزان عمل سے مربوط بحث کی تشریح اور تکمیل کے لئے ہے، ارشاد ہوتا ہے: اُس دن (اعمال کا) وزن کرنا حق ہے، جن کے عمل کے ترازو بھاری ہوں گے وہ کامیاب ہوں گے اور جن کے (عمل کے) ترازو ہلکے ہوں گے یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہماری آیات پر ظلم کرنے کی وجہ سے اپنا سرمایہ ضائع کر دیا'' **والوزن یومئذن الحق فمن ثقلت موازینه فآولیك هم المفلحون، ومن خفت موازینه فاولیك الذین خسروا انفسهم بما كانو بآیتنا یظلمون** ''،

قابل توجہ بات یہ ہے کہ یہاں پر ہر انسان کے لئے کئی ترازو ذکر کئے گئے ہیں، یہ تعبیر اُسی تفسیر کی تائید کرتی ہے جس کے مطابق ہر عمل کے لئے الگ ترازو ہوگا۔

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ انسان کی روح، گفتار، کردار، بدن اور نیت ہر ایک کے لئے اُس دن الگ الگ ترازو ہوگا۔

یہ سب کچھ اس صورت میں ہے جب ہم ''موازین'' کو ''میزان'' کی جمع قرار دیں جب کہ بعض لوگوں نے موازین کو ''موزون'' کی جمع قرار دیا ہے، (یعنی جس چیز کا وزن کیا جائے گا اور وہ انسان کے اعمال ہی ہیں)، اس صورت میں ہر انسان کئی ''موازین'' کا حامل ہے، یعنی اس کے مختلف اعمال ہیں جن کا اس دن وزن کیا جائے گا، لیکن یہ معنی بعید معلوم ہوتا ہے کیونکہ مفسرین اور اہل لغت کی اکثریت نے ''موازین'' کو ''میزان'' کی جمع قرار دیا ہے، گذشتہ روایات میں بھی موازین ''تولنے کے آلہ'' کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

لہٰذا ترازو کا وزنی ہونا اُن اعمال کے بھاری ہونے کی وجہ سے ہے جو اس میں رکھے جائیں گے، قیامت کے میزان عدل سے متعلق کئی اور موضوعات بھی ہیں جو توضیحات کے ذیل میں آئیں گے۔

اعمال کا حساب جلدی ہوگا

زیر نظر آیات میں سے بارہویں، تیرہویں اور چودھویں آیت حساب کے دن اور خدا کی طرف سے جلدی حساب لینے کے متعلق ہیں، پہلی آیت میں بہشت کی مختلف نعمات اور جاودان باغات کی طرف اشارہ کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے: یہ وہ چیز ہے جس کا تم سے حساب

---

[1] شیخ عباس قمی مرحوم نے یہ روایت مفاتیح الجنان میں پہلی زیارت مطلقہ کے عنوان سے ذکر کی ہے۔

کے دن کے لئے وعدہ کیا گیا ہے"هذا ما توعدون لیوم الحساب"۔

یعنی اس دن حساب اور اعمال کے محاسبے کا مسئلہ اتنا واضح اور روشن ہے کہ اس دن کا نام ہی روز حساب رکھ دیا گیا ہے۔ ا ؎، بعد والی آیت میں حساب کی جلدی کے متعلق گفتگو کی گئی ہے، ارشاد ہوتا ہے: خدا سریع الحساب ہے"ان الله سریع الحساب"[۱]

یہ بات کہ خدا بندوں کا جلدی حساب لے گا کلام خدا کی متدد آیات میں بیان ہوئی ہے۔[۲]، بار بار اس بات کا ذکر موضوع کی اہمیت کے پیش نظر ہے کیونکہ ایک طرف تو یہ نیک لوگوں کے لئے خوشخبری ہے کہ اُس دن انہیں جلدی ہی جزا مل جائے گی، اور دوسری طرف گنہگاروں کے لئے ایک تہدید ہے کہ اُن کی سزا میں کسی قسم کی تاخیر نہیں ہوگی، اُن کا حساب جلدی ہی نمٹا دیا جائے گا اور اُن کا حق ان کے سپرد کر دیا جائے گا۔

اُس دن خدا کے حساب کی سرعت کے متعلق روایات میں بہت لرزا دینے والی تعبیرات آئی ہیں، حضرت علیؑ سے ایک حدیث یوں منقول ہے:

انه سبحانه یحاسب جمیع عباده علی مقدار حلب شاة

خدا اس دن تمام بندوں کے حساب کو بھیڑ کے دودھ کے دوہنے جتنی دیر میں (یعنی بہت تھوڑے وقت میں) مکمل کر دے گا۔[۳]

یہ تشبیہ حقیقت میں حساب کے عرصے کے بہت مختصر ہونے کے لئے لائی گئی ہے، اسی لئے ایک اور حدیث ہے:

ان الله یحاسب الخلآئق کلهم فی مقدار لمح البصر

خدا بندوں کا حساب پلک جھپکنے جتنے عرصے میں نبٹا دے گا۔[۴]

اس جلدی کی دلیل بالکل واضح ہے کیونکہ حساب و کتاب مکمل علم اور آگاہی، قدرت کاملہ اور ہر لحاظ سے عدالت کو ملحوظ رکھنے سے وابستہ ہوتا ہے، چونکہ خدا میں یہ صفات کمال درجے کی پائی جاتی ہیں، اس لئے وہ پلک جھپکنے میں ہی لوگوں کا حساب نبٹا سکتا ہے۔

اصولی طور پر انسانوں کے اعمال اور اُن کے وہ اثرات جو روح و جسم پر مرتب ہوتے ہیں ایسے ہیں کہ خود بخود اُن کا حساب محفوظ رہتا ہے، اس لحاظ سے انہیں کاروں، جہازوں اور بحری جہازوں کے مسافت پیما سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے، جو پورے فاصلے کا حساب محفوظ رکھتا ہے، انہوں نے پوری عمر میں جتنا فاصلہ بھی طے کیا ہوتا ہے مسافت پیما اُس کا حساب رکھتا ہے، صرف ایک نظر سے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے

---

[۱] "لیوم الحساب" میں "لام" اختصاص کے لئے ہے، بعض نے یہ جو کہا ہے کہ یہ لام علت ہے کچھ درست معلوم نہیں ہوتا۔

[۲] مذکورہ بالا آیات کے علاوہ مائدہ، ۴، ابراہیم، ۵۱ اور مومن ۱۷ میں بھی یہی تعبیر آئی ہے۔

[۳] مجمع البیان، ج ۳، ص ۳۱۳۔

[۴] مجمع البیان، ج ۱، ۲، ص ۲۹۸۔

اب تک کتنا سفر طے کیا ہے،لیکن انسانوں کا حساب دیکھنے کے لئے اُس چشم بینا کی ضرورت ہے جو اُن کا حساب دیکھ سکے، یہ سب تعبیرات بہت سے اہم ترین پیغامات کی حامل ہیں کہ جو تھوڑے سے غور وفکر کے ساتھ روشن ہوجاتے ہیں۔

پندرہویں آیت میں بندوں کا حساب لینے والی ذات یعنی خدا کا تذکرہ کیا گیا ہے، چنانچہ واضح طور پر ارشاد ہوتا ہے: بے شک اُن سب نے ہماری طرف ہی لوٹ کر آنا ہے اور پھر یقیناً اُن سب کا حساب ہم پر ہے ''ان الینا ایابھم ثم ان علینا حسابھم ''

البتہ مذکورہ بلا دونوں تعبیروں کے درمیان باہم کوئی تضاد نہیں ہے، اصلی حساب لینے والا خدا ہے لیکن انسان سے بھی کہا جائے گا کہ تم اپنا حساب خود بھی کر سکتے ہو، ان حسابوں کا نتیجہ ایک ہی ہے، کیونکہ حساب کا ماخذ بھی روشن اور واضح ہوگا اور خدا کے قوانین اور جزا بھی معین ہے لہٰذا کسی استنباطی نظریے کی ضرورت نہیں ہوگی کہ جس سے فیصلہ کرنے کے سلسلے میں کوئی اختلاف پیدا ہو۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ''ان الینا ایابھم ''اور ''ثم ان علینا حسابھم '' میں ''الینا'' اور ''علینا'' کہ جو خبر ہیں اور مقدم ہیں، لہٰذا حصر کا فائدہ دے رہے ہیں، یعنی اُن کی برگشت صرف خدا کی نفی کی گئی ہے۔

بہر حال یہ کفار اور مجموں کے لئے خطرے کی گھنٹی ہے جو حق کی آیات سے روگردانی کرتے تھے۔ گذشتہ آیات میں بھی اس طرف اشارہ کیا گیا ہے، اس کے ساتھ ساتھ یہ اولیائے خدا کے لئے ایک خوشخبری بھی ہے کہ اُن کا حساب خدا کے ہاتھ ہے اور اُن کی برگشت بھی اپنے محبوب حقیقی کی طرف ہے، اس لئے اگر نیک اعمال کے ساتھ کوئی خطا اور لغزش بھی ہوئی تو وہ اس کے لطف وکرم سے بخش دی جائے گی۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ بعض احادیث اور زیارتوں میں ہے کہ مخلوق کی بازگشت اور اُن کا حساب حضرت علیؑ یا باقی آئمہ معصومینؑ کے ہاتھ میں ہے یہی بات بعض اہل سنت مفسرین کے اعتراض کا باعث بنی ہے جیسا کہ آلوسی نے روح البیان میں کہا ہے کہ یہ بات مذکورہ بالا آیات کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے۔

لیکن یہ بات سب کو معلوم ہے کہ حضرت علیؑ اور باقی آئمہ خدا کے فرمان کو ہی انجام دینے والے ہیں، لہٰذا اُن کا حساب لینا بھی خدا ہی کا حساب لینا ہے، بالکل ایسے جیسے فرشتے جو اعمال تکوین یا عالم تشریع میں انجام دیتے ہیں، یہ تمام خدا کے کام ہی سمجھے جاتے ہیں کیونکہ اس کے حکم اور فرمان پر انجام پاتے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ ان کاموں کی نسبت فرشتوں کی طرف بھی دی گئی ہے۔

حقیقت میں ان بھائیوں نے جو غلطی سب جگہوں پر کی ہے یہاں پر بھی اسی کو دہرایا ہے اور وہ ''ما بالعرض'' اور ''ما بالذات'' کا اشتباہ ہے، واضح لفظوں میں یہ کہ کوئی شخص بھی یہ نہیں کہتا ہے کہ لوگوں کی برگشت، اُن کا حساب حضرت علیؑ اور آئمہ معصومینؑ کی طرف بطور استقلال ہے بلکہ سب یہ کہتے ہیں کہ یہ کام ذاتاً خدا کے لئے ہے، آئمہ کے لئے بالواسطہ ہے (جیسا کہ ہم نے شفاعت، علم غیب اور اسی طرح کے دوسرے مسائل کے متعلق کہا ہے کہ یہ تمام امور بالذات تو خدا کے لئے ہیں اور بالعرض انبیاء اولیاء اور فرشتوں کے لئے ہیں)۔

عجیب بات یہ ہے کہ جناب آلوسی اپنے کلام کے خاتمے پر اس نکتے کی طرف متوجہ ہوئے ہیں لیکن پھر انہوں نے بحث کے سیاق کو

تبدیل کر دیا ہے اور کہا ہے کہ اگر مراد یہی ہے تو پھر انبیاء اولیاء اور ملائکہ مقربین کے درمیان علیؑ کیا خصوصیت رکھتے ہیں۔ [۱]

اس سوال کا جواب بھی بالکل واضح ہے، علیؑ اُن میں ایک ممتاز اور عظیم شخصیت ہیں چونکہ وہ امت اسلامی میں اس لحاظ سے غیر معروف رہے، خدا یہ چاہتا ہے کہ وہ اس طریقے سے ان کا بلند مرتبہ اور مقام پورے عالم کو دکھائے، اس بات کی دلیل یہ ہے کہ اہلسنت کی بہت سی کتب میں ایسی احادیث منقول ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ نے حضرت علیؑ کے متعلق فرمایا:

تم جنت اور دوزخ تقسیم کرنے والے ہو۔

علاوہ ازیں یہ احادیث بھی ہیں:

۱۔ ''ابن مغازلی'' نے کتاب ''مناقب امیر المومنینؑ'' میں پیغمبر اسلامؐ کی یہ حدیث ذکر کی ہے کہ آپ نے حضرت علیؑ کو مخاطب کر کے فرمایا:

انك قسيم الجنة والنار۔

تو جنت اور دوزخ کو تقسیم کرنے والا ہے۔ [۲]

۲۔ مناقب خوارزمی میں بھی یہی بات رسول اکرمؐ سے منقول ہے۔ [۳]

۳۔ ''ابن حجر'' نے ''الصواعق المحرقہ'' میں دار قطنی سے روایت کی ہے کہ حضرت علیؑ نے حضرت عمر کی تشکیل کردہ چھ اشخاص پر مشتمل شوریٰ میں ایک طویل گفتگو کے ذیل میں فرمایا:

کیا تمہارے درمیان میرے سوا کوئی اور ایسا شخص ہے جس کے متعلق رسول اکرمؐ نے یہ فرمایا ہو:

يا على انت قسيم النار والجنة

سب نے کہا: نہیں۔ [۴]

۴۔ حافظ سلیمان قندوزی حنفی نے اپنی کتاب ''ینابیع المودۃ'' کا ایک باب اسی عنوان ''فی بیان علیؑ قسیم الجنۃ والنار'' کے تحت بیان کیا ہے اور اس ضمن میں متعدد احادیث ذکر کی ہیں۔ [۵]

۵۔ یہاں تک کہ ''ابن اثیر'' نے بھی اپنی کتاب ''نہایہ'' میں مادہ ''قسم'' کے ذیل میں اس حدیث کو ذکر کیا ہے۔

---

[۱] تفسیر روح المعانی، ج ۳۰، ص ۱۱۸ و ۱۱۹۔

[۲] احقاق الحق، ج ۴، ص ۲۵۰۔

[۳] مناقب، صفحہ ۲۳۴۔

[۴] الصواعق المحرقہ، ص ۱۲۴ (قاہرہ ایڈیشن)۔

[۵] ینابیع المودۃ، ص ۸۶۔

٦۔ امام شافعی کی طرف منسوب ان اشعار میں بھی یہی بات کہی گئی ہے:

علی　　حبه　　جنة

قسیم　　النار　　والجنة

وصی　　المصطفی　　حقا

اما الانس　　والجنة [1]

ایسی اور بھی کئی احادیث ہیں، نجانے اس کے باوجود آلوسی نے روح المعانی میں حضرت علیؑ کے متعلق اس بات کو جھوٹ اور تہمت کیوں سمجھا ہے، اس بات کی اجازت نہیں ہونا چاہیے کہ تعصّبات علمی تحقیقات کے راستے میں حائل ہوں۔

توضیحات:

اس عظیم عدالت کی ایک جھلک

اگرچہ قیامت سے متعلق حقائق کا تفصیلی طور پر سمجھنا اور جاننا ہم ایسے قیدیوں کے لئے کہ جو اس دنیا کے اسیر ہیں، امکان پذیر نہیں کیونکہ وہ اس عالم سے بالاتر ایک عالم ہے، اُس جہان میں موجود مفاہیم کا سمجھنا ہمارے لئے بہت مشکل ہے، جیسے پرائمری کلاس کے بچے کے لئے یونیورسٹی کے علوم کی وسعت کا اندازہ مشکل ہے، لیکن اس کے باجود مذکورہ بالا آیات واحادیث کے ذریعے اُس عدالت کے متعلق ایک اجمالی ساخاکہ ہمارے ذہن میں ابھر آتا ہے۔

وہ ایسی دنیا ہے جس میں تمام پوشیدہ باتیں آشکار ہوجائیں گی، بے جان چیزوں میں زندگی پڑ جائے گی، ہر جگہ اور ہر چیز میں زندگی کی لہر دوڑ جائے گی۔

ہاتھ، پاؤں، کان اور آنکھ سے لے کر بدن کی جلد تک سب اعضا بولنے لگیں گے وہ ان اعمال کا اعتراف کریں گے جو انہوں نے انجام دیئے ہوں گے۔

دوسری طرف انسان کے تمام اعمال اُس کی آنکھوں کے سامنے مجسم ہوجائیں گے، سب کے سب ظاہر ہوجائیں گے، اعمال نامے ناقابل انکار تحریر کی صورت میں سامنے آئیں گے اور فرشتے، انبیاء اور اولیاء بطور گواہ پیش ہوں گے، ان سب سے بڑھ کر انسان کے اعمال پر خدا کی گواہی ہوگی، یہ بہت لرزا دینے اور خوف زدہ کردینے والا منظر ہوگا، اس وقت ایک رائی کے برابر عمل کا بھی حساب ہوگا، اعمال ناموں میں نیتوں کا فتور یا پاکیزگی بھی بالکل نمایاں صورت میں ظاہر ہوگی۔

ایک لحظے میں سب کا حساب ہوجائے گا، اُس عدالت میں حق وانصاف کی حکمرانی ہوگی، ہر چھوٹا بڑا حتی کہ انبیاء بھی اُس عدالت

---

[1] ینابیع المودة، ص٨٦۔ (طبع دار الکتب العراقیه)

میں حاضر ہوں گے۔

تمام جھگڑے ختم ہو جائیں گے، ہر قسم کی بحث و جدال رک جائے گی، پوری دنیا کے مظلوموں کا حق ظالموں سے واپس لیا جائے گا، اور دوسری اور بہت سے باتیں جن کا عام آدمی سوچ بھی نہیں سکتا، اُس عدالت میں ظاہر ہوں گی۔

ان حقائق پر ایمان اور عقیدہ انسانی روح میں تربیتی لحاظ سے ایک انقلاب برپا کر سکتا ہے، خواہش نفس کو روک کے شہوت پرستی کو لگام ڈال سکتا ہے، بے ایمانی کا خاتمہ کر کے تقویٰ کی شمع روشن کر سکتا ہے اور اس خاکی انسان کو ایک پاک و پاکیزہ فرشتہ بنا سکتا ہے۔

قرآن مجید میں ان حقائق کی تشریح سے بھی کلام الٰہی کا مقصد یہی ہے۔

قیامت کے گواہ

جیسا کہ مذکورہ بالا آیات میں بیان ہوا ہے اس عدالت کے گواہ مختلف ہوں گے:

۱۔ پہلے درجے پر تو خدا کی ذات پاک ہے۔

۲۔ پھر انبیاء اور رسل۔

۳۔ پھر مقرب فرشتے۔

۴۔ اُس کے بعد انسانی اعضاء و جوارح۔

۵۔ پھر وہ زمین کہ انسان جس پر زندگی بسر کرتا رہا ہے۔

مزید برآں احادیث میں ان پانچ گواہوں کے علاوہ بھی دوسرے گواہوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، مثلاً

۶۔ اوصیاء اور آئمہ کی گواہی۔

چنانچہ اس سلسلے میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ایک حدیث سورہ نساء کی اس آیت کے ذیل میں ہے:

فَكَيۡفَ اِذَا جِئۡنَا مِنۡ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيۡدٍ وَّجِئۡنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَاۤءِ شَهِيۡدًا ۴۱

۲ النساء: ۴۱

آپ نے فرمایا:

نزلت فی امة محمد خاصة، فی کل قرن منهم امام منا شاهد علیهم، و محمد شاهد علینا۔

یہ آیت حضرت محمدؐ کی امت کے سلسلے میں خصوصی طور پر نازل ہوئی ہے، اس امت کی ہر صدی میں ہم میں سے امام

ہوگا جواس پر گواہ ہوگا اور حضرت محمدؐ ہم پر گواہ ہیں ۔[1]

آنحضرتؐ کی امت کا خصوصی طور پر ذکر ممکن ہے تاکید کے لئے ہو، یعنی اس امت میں بالخصوص ہر صدی میں امام معصوم گواہ ہوگا، لہٰذا اس بات کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے کہ پیغمبر اسلامؐ گذشتہ انبیاء پر بھی گواہ ہوں۔

محشر کا ساتواں گواہ بعض روایات کے مطابق زمانہ ہے، جیسا کہ امیر المومنین علیہ السلام سے مروی اس حدیث میں ہے۔

ما من یوم یمر علی ابن ادم الا قال له ذلك الیوم یا بن ادم انا یوم جدید ، و انا علیك شهید فقل فی خیر، واعمل فی خیر اشهد لك به فی القیامة، فانك لن ترانی بعده ابدا ۔

فرزند آدم پر جو دن بھی گذرتا ہے وہ اسے کہتا ہے: اے فرزند آدم! میں ایک نیا دن ہوں اور تجھ پر گواہ ہوں، مجھ میں اچھی بات کہہ اور نیک کام انجام دے تاکہ قیامت کے دن تیرے بارے میں گواہی دوں کیونکہ اس کے بعد تو مجھے دیکھ نہیں سکے گا۔[2]

ذرا سوچئے تو! یہ تمام گواہ کس لئے ہیں؟ زمین، زمان، فرشتے، پیغمبر، انسانی بدن کے اعضاء اور سب سے بڑھ کر خدا، کیا صرف خدا کی گواہی کافی نہیں ہے؟

بالکل کافی ہے کیونکہ وہ ''احسن الناظرین'' اور ''احسن الحاکمین'' ہے اور 'عالم السر والخفیات'' ہے لیکن چونکہ مقصد انسان کی تربیت ہے اس لئے گواہوں اور نگرانوں کی تعداد جتنی زیادہ ہو اس کا تربیتی اثر اتنا ہی زیادہ ہوگا، اسی لئے گواہوں کی تعداد اتنی رکھی گئی ہے، ایسے گواہ جنہوں نے چاروں طرف سے انسان کو گھیرے میں لے رکھا ہے اور اُس کے اعمال سے پوری طرح آگاہ ہیں۔

جو شخص ان میں سے کسی ایک گواہ کا بھی خیال کر لے تو وہ اپنے اعمال کا خیال رکھے گا، اگر ان سب گواہوں پر ایمان لے آئے تو اس کی کیا منزلت ہوگی۔

یہ گواہ کسی قرارداد یا دفتری نظام کے تحت نہیں ہیں کہ یہ سوال کیا جائے کہ ایک عمل کے لئے اتنے گواہ کیوں مقرر کئے گئے ہیں، بلکہ یہ حقیقی اور واقعی امور کے سلسلے کی کڑی ہیں کیونکہ ہم جو کام بھی کرتے ہیں وہ ہمارے وجود پر اثر انداز ہوتا ہے اور ہمارے بدن کی جلد اُس کیسٹ کی مانند ہے جو ہمارے عمر بھر کے اعمال کو ریکارڈ کرتی ہے، یہ زمین ہمارے ارد گرد کا ماحول اور جس زمانے میں ہم زندگی گزار رہے ہیں وہ بھی اسی طرح ہے، وہ ہمارے تمام آثار کو ثبت کر رہا ہے۔

---

[1] اصول کافی، ج۱ ص۱۹۰۔

[2] بحار الانوار، ج۶۸، ص۱۸۱ حدیث ۳۶ (طبع بیروت)۔

فرشتوں کا آنا یا انبیاء اور اوصیاء کی مقدس روحوں کی گواہی بھی ایک حقیقت ہے جو ان کی روحانی عظمت اور بلندی سے پھوٹتی ہے اس طرح ہر جگہ اور ہر زمان و مکان میں خدا کا حاضر و ناظر ہونا بھی ایک نا قابل انکار حقیقت ہے۔

آج کے ماہرین آثار قدیمہ زمین کے مختلف حصوں اور طبقات اور اسی طرح اُن میں پوشیدہ حیوانات کے مجسموں اور گذشتہ انسان کے آثار کا مطالعہ کر کے یہ بتا دیتے ہیں کہ اُن کی زندگی کیسی تھی، اس سلسلے میں وہ کئی کتابیں اور رسالے لکھ دیتے ہیں۔

اگر انسان اپنے محدود سے علم کیساتھ گذشتہ حیوانوں، انسانوں اور مختلف حادثات کے متعلق اُن کے آثار دیکھ کر رائے قائم کر سکتا ہے اور گواہی دے سکتا ہے تو قیامت میں کیا ہوگا جب کہ دنیا میں کئی راز پوشیدہ ہیں اور آخرت کے دن سب کچھ ظاہر ہو جائے گا۔

یہی وجہ ہے کہ جب انسان ان عمیق موضوعات پر غور و فکر کرتا ہے اور ان کی گہرائیوں کے متعلق غور و خوض کرتا ہے تو وہ لرز جاتا ہے، کبھی تو اس کی فریاد بلند ہوتی ہے کہ ہائے افسوس! میری غفلت کا کیا عالم ہے، اتنے گواہوں کی موجودگی میں بھی میرا عمل اسطرح کا ہے؟۔

عمل کا ناپنے والا ترازو

شیخ مفید مرحوم کہتے ہیں:

میزان کا معنی ایسا ترازو نہیں جیسا اس دنیا کا دو پلڑوں والا ترازو ہوتا ہے، فکری جمود کے شکار بعض اخباریوں نے یہی سمجھا ہے بلکہ جیسا کہ حدیث میں بھی آیا ہے حضرت علیؑ اور اُن کی اولاد میں سے جو امام ہیں وہ قیامت کے دن اعمال کے تولنے کا ترازو ہیں، یہی وہ ہستیاں ہیں کہ جو اعمال اور اُن کے بدلے کے درمیان موازنہ قائم کریں گی۔[1]

لیکن بعض مفسرین نے اس بات کو قبول نہیں کیا، اُن کا خیال ہے کہ وہ ترازو بھی اس دنیا کے ترازو کی طرح ہوں گے انسانی اعمال کا بھی وزن ہوگا یا اعمال نامے کہ جو اس دن وزنی ہو جائیں گے ان کو تولا جائے گا۔

علامہ مجلسی مرحوم کہتے ہیں:

ہم میزان پر اجمالی طور پر ایمان رکھتے ہیں، البتہ اس کی جزئیات اور باقی تفصیلات کے متعلق ہم اپنے پاس سے کچھ نہیں کہتے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ حضرت داوٗدؑ نے خدا سے کہا کہ انہیں میزان دکھائی جائے، خدا نے انہیں میزان دکھائی جس کا ہر پلڑے کا آپس میں فاصلہ مغرب سے لے کر مشرق تک تھا، جب حضرت داوٗدؑ نے یہ منظر دیکھا تو بے ہوش ہو گئے، جب ہوش میں آئے تو عرض کی: میرے خدا! اس کے پلڑے کو نیکیوں سے کون بھر سکتا ہے؟ تو جواب آیا: اے داوٗد! جب میں کسی بندے سے راضی ہو جاؤں تو اُسے ایک کھجور کے بدلے (جو کہ راہ خدا میں خرچ کرتا ہے) بھر دیتا ہوں، حدیث کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

روی ان داؤد۔ سال ربه ان یریه المیزان فاراه، کل کفة کما بین

---

[1] بحار الانوار، ج ۷، ص ۲۵۲ (کچھ اختصار کے ساتھ)۔

المشرق والمغرب۔ فغشی علیه! ثم افاق فقال: الهی !من الذی یقدر ان یملا کفته حسنات؟ فقال : یاداؤد! انی اذا رضیت عن عبدی ملا تها بتمرة۔ [1]

امام جعفر صادقؑ سے ایک حدیث میں منقول ہے کہ جب آپؑ سے ''میزان'' کے معنی کے متعلق سوال کیا گیا تو آپؑ نے فرمایا!''المیزان العدل'' عدل ہی ترازو ہے۔ [2]

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان حدیثوں کو آپس میں کیسے جمع کیا جائے کیونکہ بعض میں تو میزان آئمہ معصومین کو قرار دیا گیا ہے اور بعض میں اس سے عدل مراد لیا گیا ہے جب کہ حضرت داؤدؑ سے متعلق حدیث میں ایسی چیز مراد لی گئی ہے جس کے دونوں پلڑے زمین وآسمان پر حاوی ہوں گے، یہ تین تفسیریں ظاہری طور پر باہم تضاد رکھتی ہیں۔

لیکن ایک نکتے کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ ظاہری تضاد حل ہوجاتا ہے، وہ یہ کہ میزان کی حقیقت وہی عدل الٰہی ہے، جب کہ پیغمبر اسلامؐ، آئمہ معصومینؑ اس کے عدل کا ایک نمونہ اور مظہر ہیں، دوسری طرف یہ بھی واضح ہے کہ اس کا قانون عدل سب زمین وآسمان کو اپنے وسیع دامن میں لئے ہوئے ہے۔

"بالعدل قامت اسموات والارض" [3]

یہاں سے اس بات کی بھی وضاحت ہوجاتی ہے کہ حضرت داؤد اس میزان کی عظمت کو دیکھ کر بے ہوش ہو گئے کیونکہ عدل کا مقام اور محمدؐ وآل محمدؐ کی بلندی اس درجہ پر تھی کہ انہوں نے اپنے اعمال کو اس کے سامنے معمولی سمجھا۔

یہ بات قابل غور ہے کہ یہ اتنا عظیم ترازو کھجور کے اس دانے سے ہی پر ہوجاتا ہے جس میں اخلاص کی روح کارفرما ہواور جوحق کی رضا کا باعث ہو۔

بعض محققین کا نظریہ ہے کہ رہبران دین اور اولیائے خدا اس ترازو کے ایک پلڑے کے مانند ہیں اور خود انسان اپنے اعمال، عقیدوں اور نیتوں کے ساتھ دوسرے پلڑے کے مانند ہیں، قیامت کے دن ان دو پلڑوں کا آپس میں موازنہ کیا جائے گا، اس بات کا خود اُن قرآنی تعبیرات سے استفادہ کیا جاسکتا ہے جہاں پر یہ ارشاد ہوتا ہے:

---

[1] تفسیر روح البیان، ج۵، ص۴۸۶ آیت ۲۰ سورہ انبیاء کی تفسیر کے ذیل میں، نیز یہی بات کچھ فرق کے ساتھ تفسیر فخر رازی میں مذکورہ بالا آیت کے ذیل میں بھی آئی ہے اور تفسیر المعانی میں اسی آیت کے ذیل میں مذکور ہے۔

[2] تفسیر نور الثقلین، ج۲، ص۵۔

[3] فیض کاشانی مرحوم نے پیغمبر اکرمؐ کی اس حدیث کو تفسیر صافی سے سورہ رحمن آیت ۸ کے ذیل میں ذکر کیا ہے۔

من خفت موازینه (جن کا میزان عمل ہلکا ہوگا) یا

فمن ثقلت موازینه (جن کا میزان عمل بھاری ہوگا) یا

(سورہ کہف:۱۰۵) میں کافروں کے ایک گروہ کے متعلق ہے:

فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ﴿الكهف:۱۰۵﴾

قیامت کا دن ان کے لئے وزن برپا نہیں کرے گا۔

کیونکہ میزان کا ہلکا ہونا اُن افراد کے اعمال صالح کی کمی اور حق کے متعلق اُن کے عقیدے کی کمزوری کی کمی کی وجہ سے ہے اور میزان کا بھاری ہونا اس سرمائے کی فراوانی کی وجہ سے ہے، بہر حال ایک طرف انسان ہوں گے اور دوسری طرف اولیا خدا اور پھر اُن کا آپس میں وزن کیا جائے گا، لہٰذا ہمارے اعمال اور عقائد جتنے بھی اُن کے قریب اور اُن سے ملتے جلتے ہوں گے ہماری میزان عمل اتنی ہی بھاری ہو گی۔ (غور کیجئے گا)

میزان میں کون سے اعمال بھاری ہوں گے

اسلامی احادیث میں اُن اعمال کے متعلق متعدد عبارات پائی جاتی ہیں جن کا وزن قیامت کے دن بھاری ہوگا جو انسان کے لئے نجات کا باعث ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی سربلندی کا بھی موجب ہوں گے، یہ حقیقت میں مختلف مسائل میں اسلام کے نظام اقدار کی طرف اشارہ ہیں۔

۱۔ پیغمبر اسلامؐ کی ایک حدیث ہے:

ما من شئی یوضع فی المیزان اثقل من حسن الخلق، وان صاحب حسن الخلق لیبلغ به درجة صاحب الصوم والصلاة۔

میزان عمل میں کوئی چیز حسن اخلاق سے بڑھ کر وزنی نہیں ہوگی، اچھے اخلاق والا اپنے اخلاق کی وجہ سے اہل روزہ اور اہل نماز کے درجات کا حامل ہوگا۔[1]

۲۔ پیغمبر اسلامؐ کی ہی ایک اور حدیث ہے جس میں توحید اور آپ کی نبوت کے سلسلے میں ارشاد ہوتا ہے:

خف میزان ترفعان منه، وثقل میزان توضعان فيه

جس ترازو سے یہ دو چیزیں اٹھالی جائیں وہ ہلکا ہو جائے گا، جس میں یہ دو چیزیں رکھ دیں جائیں وہ بھاری ہو

---

[1] سنن ترمذی، ج ۴ ص ۳۶۳، (حدیث ۲۰۰۳)۔

جائے گا۔[۱]

۳۔ امام محمد باقرؑ یا امام جعفر صادقؑ سے مروی ایک حدیث یوں ہے:

ما فی المیزان شئی اثقل من الصلاۃ علی محمد وال محمد وان الرجل لتوضع اعمالہ فی المیزان فتمیل بہ. فیخرج الصلاۃ علیہ فیضعھا فی میزانہ فیرجع (بہ)۔

میزان عمل میں کوئی چیز محمدؐ وآل محمدؐ پر صلوات سے بڑھ کر بھاری نہیں ہے، بعض لوگوں کے تمام اعمال ترازو میں رکھے جائیں گے پھر بھی وہ ہلکا ہوگا، پھر محمدؐ وآل محمدؐ پر درود کو لیا جائے گا اور اُس میں رکھ دیا جائے گا جس سے اُن کا میزان عمل بھاری ہوجائے گا۔[۲]

۴۔ بعض احادیث میں یوں آیا ہے کہ:

بعض ذکر جیسے ''الحمدللہ وسبحان اللہ واللہ اکبر'' اور اسی طرح ''لا الہ الا اللہ'' قیامت کے دن میزان عمل کو بھر دیں گے۔[۳]

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات وہ اعمال جو دیکھنے میں معمولی اور مختصر سے معلوم ہوتے ہیں خدا کی بارگاہ میں اتنی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں کہ عمل کے ترازو کو بھر دیتے ہیں، یہ ان چیزوں کی اسلام میں اہمیت کے پیش نظر ہے۔

حقیقت توحید، حقیقت حمد، حقیقت تسبیح، محمدؐ وآل محمد کے ساتھ روحانی وابستگی اور حسن خلق انہی امور میں سے ہیں، نیز یہ بھی آپ نے پڑھا کہ بعض اوقات خلوص نیت سے راہ خدا میں خرچ کی ہوئی ایک کھجور ہی عدل الٰہی کے پلڑوں کو بھر دیتی ہے، جب کہ یہ ترازو بھی پورے زمین وآسمان پر حاوی ہے۔

۵۔ بعض احادیث سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس دن انسانوں کو بھی ترازو میں رکھا جائے گا اور پھر اُن کا وزن کیا جائے گا، پیغمبر اسلامؐ سے مروی ایک صحیح حدیث میں ہے:

انہ لیأتی الرجل العظیم السمین یوم القیمۃ لا یزن جناح بعوضۃ۔

---

[۱] نور الثقلین، ج۵ ص۶۵۹ (حدیث ۸)۔

[۲] اصول کافی، ج۲ ص ۴۹۴۔ باب الصلاۃ علی النبی (حدیث ۱۵) بحار الانوار، ج۹۱ ص۵۶ (حدیث ۳۱) میں بھی یہی مفہوم پیغمبر اسلامؐ سے مروی ہے۔

[۳] اصول کافی، ج۲ ص۵۴۷ (حدیث ۵)۔

قیامت کے دن خدا کی بارگاہ میں بہت موٹا شخص آئے گا جس کا وزن مچھر کے پر جتنا بھی نہیں ہوگا۔[۱]

یہ اس لئے ہے کہ اس دنیا میں اُن کے اعمال، افکار اور شخصیت ظاہری خوبصورتی کے باجود اندر سے خالی ہوتے ہیں۔

کن چیزوں کے متعلق سوال کیا جائے گا؟

اس سلسلے میں بھی متعدد احادیث ہیں جن میں اُن کاموں کا تذکرہ کیا گیا ہے جن کا سب سے پہلے حساب کتاب ہوگا، ہر ایک کے متعلق بہت بامعنی قسم کی عبارات پائی جاتی ہیں، ان کا مطالعہ انسان کی اخلاقی تربیت کرنے کے ساتھ ساتھ اسلامی اقدار کو بھی واضح کرتا ہے۔

۱۔ پیغمبر اسلامؐ کی ایک حدیث ہے:

لا تزول قد ما عبد یوم القیامة حتی یسئل عن اربع: عن عمرہ فیمآ افناہ، و شبابہ فیمآ ابلاہ وعن ما لہ من این اکتسبہ وفیمآ انفقہ وعن حبنآ اھل البیت۔

قیامت کے دن کوئی بندہ اس وقت تک پاؤں آگے نہیں بڑھا سکے گا جب تک اُس سے ان چار چیزوں کے متعلق پوچھ نہ لیا جائے:

اس نے اپنی عمر کو کیسے گزارا؟

اس نے اپنی جوانی کہاں کھوئی؟

اس نے دولت کہاں سے حاصل کی اور کہاں خرچ کی؟

اور ہم اہل بیت سے اُس کی محبت کیسی تھی؟[۲]

۲۔ پیغمبر اسلامؐ سے ایک اور حدیث میں ہے:

قیامت کے دن بندگان خدا میں سے ہر ایک کے لئے دن رات کے گھنٹوں کے مطابق اس کی عمر کے ہر دن میں چوبیس خزانے کھولے جائیں گے، ایک خزانہ تو نور اور خوشی سے معمور ہوگا، اسے دیکھ کر وہ بندہ اتنا خوش ہوگا کہ اگر اس کو تمام دوزخیوں میں تقسیم کر دیا جاتا تو اُن کی آگ بجھ جاتی، یہ اُسی لمحے کا خزانہ ہوگا جب اس نے خدا کی اطاعت کی تھی۔

پھر اس کے لئے دوسرے خزانے کا منہ کھولا جائے گا جسے وہ تاریک، بدبودار اور ہولناک پائے گا، اس پر اس قدر خوف اور دہشت

---

[۱] مجمع البیان، ج ۶ ص ۴۹۷۔

[۲] خصال صدوق (بحار الانوار، ج ۷، ص ۲۵۸۔ حدیث (۱) کے مطابق)۔

طاری ہوگی کہ اگر اُسے اہل بہشت میں تقسیم کیا جائے تو وہ اپنی نعمتوں کی لذت کو بھول جائیں، یہ اُس لمحے کا خزانہ ہوگا جس میں اس نے خدا کی نافرمانی کی تھی۔

پھر اس کے لئے تیسرے خزانے کو کھولا جائے گا جسے وہ خالی پائے گا، اس میں نہ تو خوشی کا سامان ہوگا اور نہ ہی خوف کا، یہ اس لمحے کا خزانہ ہوگا جس میں وہ سویا ہوا تھا یا دنیا کے جائز کاموں میں مشغول تھا، یہ دیکھ کر اُسے اتنا افسوس ہوگا کہ قابل بیان نہیں کیونکہ وہ اسے نیکیوں سے بھر سکتا تھا، اسی وجہ سے خدا نے فرمایا ''ذٰلك یوم التغابن''[1]

۳۔ پیغمبر اسلامؐ سے ہی ایک اور حدیث میں ہے:

انا اول قادم علی اللہ، ثم یقدم علی کتاب اللہ، ثم یقدم علی اهل بیتی، ثم یقدم علی امتی، فیقفون، فیسئلهم، ما فعلتم فی کتابی واهلبیت نبیکم۔

میں سب سے پہلے خدا کی بارگاہ میں حاضر ہوں گا، پھر میرے سامنے کتاب خدا کو لایا جائے گا، پھر میرے اہل بیت آئیں گے، پھر میری امت میرے سامنے آئے گی، وہ کھڑے ہو جائیں گے اور خدا ان سے پوچھے گا کہ تم نے میری کتاب اور اپنے پیغمبرؐ کی اہل بیت کے ساتھ کیا سلوک کیا؟[2]

۴۔ امام محمد باقرؑ سے ایک حدیث یوں مروی ہے:

"اول ما یحاسب به العبد الصلاة فان قبلت قبل ما سواها"

بندے سے سب سے پہلے جس کا حساب لیا جائے گا وہ نماز ہے، اگر وہ قبول ہوگئی تو باقی اعمال قبول ہوں گے۔[3]

ایک اور حدیث ہے کہ:

ان اول ما یسئل عنه العبد یوم القیامة عن جلسآئه۔

بندے سے قیامت کے دن سب سے پہلے اُس کے ہم نشینوں کے متعلق سوال کیا جائے گا۔[4]

---

[1] بحار الانوار، ج ۷، ص ۲۶۳ (حدیث ۱۵)۔

[2] بحار الانوار، ج ۷، ص ۲۶۳ (حدیث ۲۲)۔

[3] بحار الانوار، ج ۷، ص ۲۶۷ (حدیث ۳۳)۔

[4] در المنثور، ج ۵، ص ۲۷۳۔

ممکن ہے سب سے پہلے جس چیز کے بارے میں سوال ہونا ہے اس سے متعلق احادیث میں کسی قسم کا تضاد محسوس ہو، یعنی اگر چہ یہ چیز اول ہے تو دوسری اس سے پہلے کس طرح ہوسکتی ہے؟ لیکن مراد یہ ہے کہ چند کام ایسے ہیں کہ جن کے بارے میں پہلے مرحلے میں سوال کیا جائے گا، احادیث میں جن چیزوں کا ذکر اس حوالے سے ہے وہ سب پہلے مرحلے میں شامل ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ احادیث اسلام میں مذکورہ مسائل کی اہمیت کو بھی روشن کرتی ہیں یعنی توحید اور نبوت پر ایمان، محبت اہل بیتؑ، نماز اور ساتھی وغیرہ۔

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ قیامت میں مختلف مواقف ہوں گے اور ہر موقف پر جس چیز کے بارے میں پہلے سوال کیا جائے گا وہ ان امور میں سے ہی ایک ہوگا۔

۶۔ امیر المومنین حضرت علیؑ سے مروی ایک حدیث میں ہے:

"اتقوا اللہ فی عبادہ وبلادہ فانکم مشولون حتی عن البقاع والبھآئم"

خدا سے اس کے بندوں اور آبادیوں کے بارے میں ڈرو کیونکہ خدا کی بارگاہ میں تم سے زمین اور حیوانوں تک کے بارے میں پوچھا جائے گا۔[1]

یہ حدیث بتاتی ہے کہ انسان سے فضائی ماحول کی تباہی اور حیوانوں کو بلاوجہ قتل کرنے کے بارے میں بھی اس روز سوال ہوگا۔

حساب محشر کی آسانی اور مشکل

احادیث اور قرآن کی بعض آیات میں موجود اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن حساب بہت باریک بینی سے لیا جائے گا۔

امام جعفر صادقؑ سے ایک حدیث یوں منقول ہے:

آپؑ نے ایک شخص سے فرمایا:

تم اپنے مسلمان بھائی کے ساتھ یہ سلوک کیوں کرتے ہو؟

اُس نے عرض کیا:

آپؑ پر قربان! میرا حق اس کے ذمے تھا اور آخر تک میں نے اس سے نہ لیا۔

امامؑ نے فرمایا:

ذرا بتاؤ تو کہ خدا نے جو یہ کہا ہے کہ بعض لوگ اپنے حساب عمل کی برائی سے ڈریں گے "ویخافون سوٓء الحساب" کیا تمہارا

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۶۷۔

خیال ہے کہ وہ لوگ خدا کے ظلم سے خوف زدہ ہوں گے؟ اللہ کی قسم! نہیں بلکہ وہ اس بات سے ڈریں گے کہ کہیں اُن کے حساب میں باریک بینی سے کام نہ لیا جائے اور آخری مرحلے تک اُن سے حساب نہ لیا جاتا رہے۔[1]

امام محمد باقرؑ سے منقول ایک حدیث میں ہے:

انما یداق اللہ العباد فی الحساب یوم القیمة علی قدر مآ اتاھم من العقول فی الدنیا.......

خدا قیامت کے دن ہر شخص کا حساب اس کی عقل کے مطابق لے گا، جو اس نے اس دنیا میں انہیں دی ہے۔[2]

اس تعبیر سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ فہم وشعور کی مقدار اور ذمہ داریوں کے درمیان ایک رابطہ ہے کیونکہ خدا کا حساب ذمہ داریوں کے لحاظ سے ہوگا۔

ایک تو یہ گروہ ہے کہ جس کے حساب کتاب کے سلسلے میں سختی اور باریک بینی سے کام لیا جائے گا لیکن دوسرا وہ گروہ ہے جس کا حساب بالکل آسان ہوگا، یہ وہی لوگ ہوں گے جن کے بارے میں کلام الٰہی میں ارشاد ہوتا ہے:

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیْرًا

﴿ ال اِنشقاق:۷-۸﴾

جس کا اعمال نامہ اُس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا جلد ہی اس کا حساب آسانی سے ہو جائے گا۔

(انشقاق۔۷،۸)

رسول اسلامؐ کی ایک حدیث ہے:

"ثلاث من کن فیه حاسبه اللہ حسابا یسیرا، وادخله الجنة برحمته"

تین باتیں جس میں بھی ہوں خدا اس کا حساب آسان لے گا اور اُس کو اپنی رحمت کیساتھ جنت میں داخل کر دے گا۔

عرض کیا گیا: یارسول اللہؐ وہ کیا ہیں؟

آپ نے فرمایا:

---

[1] بحارالانوار، ج ۷، ص ۲۶۶ (حدیث ۲۷)۔

[2] اصول کافی، ج ۱، ص ۱۱ (حدیث ۷)

تعطی، من حرمك، وتصل من قطعك، وتعفوا عمن ظلمك

جس نے تجھے محروم کیا ہے اُسے عطا کر، جس نے تجھ سے قطع تعلق کیا ہے اس سے صلہ رحمی کر اور جس نے تجھ پر ظلم کیا ہے اُسے معاف کر دے۔[۱]

روایات سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ حسن اخلاق بھی حساب میں آسانی کا باعث بنتا ہے، رسول اکرمؐ کی ایک حدیث میں ہے:

"حسن خلقك يخفف الله حسابك"

اپنا اخلاق اچھا کرو، خدا تمہارے لئے حساب آسان کر دے گا۔[۲]

بہر حال ان اسلامی سرچشموں سے مجموعی طور پر یہ بات حاصل ہوتی ہے کہ حساب الٰہی کے سلسلے میں لوگ ایک دوسرے سے مختلف ہیں، بعض لوگوں کے حساب کے سلسلے میں بہت سختی اور باریک بینی سے کام لیا جائے گا یہ وہ لوگ ہیں، جو دنیا میں بندگان خدا کے حساب کے سلسلے میں سختی سے کام لیتے تھے یا بداخلاقی، ظالم اور ستم پیشہ تھے جب کہ دوسرے گروہ کا حساب بالکل آسان لیا جائے گا، یہ اُن کے نیک اعمال، خوش اخلاقی اور دنیا میں بندوں پر آسانی کی وجہ سے ہوگا، پھر اس لئے کہ وہ دنیا میں دولت اور منصب کی خرابیوں میں گرفتار نہیں ہوئے ہوں گے۔

لیکن ایک تیسرا گروہ بھی ہے جو بغیر حساب و کتاب کے جنت میں داخل ہو جائے گا، جیسے پیغمبر اسلامؐ نے ایک حدیث کہ جو قیامت کے دن لوگوں کی مختلف جماعتوں میں تقسیم کے سلسلے میں ہے میں ارشاد فرمایا:

ومنهم الذين يدخلون الجنة بغير حساب لا نهم لم يلبسوا من امر الدنيا بشئي وانما الحساب هناك على من تلبس بها ههنا۔

بعض لوگ بغیر حساب کے جنت میں داخل ہو جائیں گے کیونکہ وہ دنیا کی کسی برائی سے آلودہ نہیں ہوئے، وہاں حساب اُن کے لئے ہے جو یہاں پر دنیاوی امور میں آلودہ رہے ہیں۔[۳]

دوسری طرف ایسے لوگ بھی ہیں جو کسی حساب کتاب کے بغیر جہنم میں جائیں گے، پیغمبر اسلامؐ کی ایک حدیث میں ہے:

ان الله عزوجل يحاسب كل خلق الا من اشرك بالله عزوجل فانه لا يحاسب و يوم به الى النار۔

---

[۱] نور الثقلین، ج ۵ ص ۵۳۷ (حدیث ۱۲)۔

[۲] بحار الانوار، ج ۶۸، ص ۳۸۳ (حدیث ۲۰)

[۳] میزان الحکمۃ، ج ۲ ص ۴۱۴۔

خدا تمام مخلوقات کا حساب لے گا سوائے اُس شخص کے کہ جس نے خدا کے ساتھ کسی اور کو شریک ٹھہرایا ہوگا، اُسے بغیر حساب کے جہنم میں دھکیل دیا جائے گا۔[1]

امام جعفر صادقؑ سے ایک حدیث یوں مروی ہے:

واما الثلاثة الذين يدخلهم النار بغير حساب فاما م جآئر، وتاجر كذوب وشيخ زان۔

تین گروہ بغیر حساب کے جہنم میں داخل ہوں گے، ظالم پیشوا، جھوٹا تاجر اور بوڑھا زانی۔[2]

اس گفتگو کو اسی سلسلے کی ایک اور حدیث پر ختم کرتے ہیں، رسول اکرمؐ کی ایک حدیث ہے:

ستة يدخلون النار بغير حساب الامرآء بالجور، والعرب بالعصبية، والدها قين بالكبر واتجار بالكذب، والعمآء بالحسد، والا غنيآء بالبخل۔

چھ طرح کے افراد بغیر حساب کے جہنم میں داخل ہوں گے۔(۱)۔حکمران ظلم کی وجہ سے،(۲)۔عرب تعصب کی وجہ سے،(۳)۔سردار تکبر کی وجہ سے،(۴)۔تاجر جھوٹ کی وجہ سے،(۵)۔علماء حسد کی وجہ سے،(۶)۔اور دولت مند کنجوسی کی وجہ سے۔[3]

خدایا! اپنے لطف و کرم سے ہمارے قیامت کے حساب کو آسان فرما، ہم پر رحم فرما، تو جانتا ہے کہ ہم خالی ہاتھ اور تاریک اعمال نامے کے ساتھ تیری بارگاہ میں آرہے ہیں۔

یا ارحم الرحمین ویا اکرم الاکرمین۔

---

[1] بحارلانوار، ج ۷ ص ۲۶۰ (حدیث ۷)۔

[2] بحارلانوار، ج ۷۲، ص ۳۳۷ (حدیث ۵)۔

[3] میزان الحکمۃ، ج ۲ ص ۴۱۹۔

صراط۔۔۔۔۔مرصاد

اشارہ

احادیث میں بالکل واضح طور پر ”صراط“ کا ذکر ہے جب کہ آیات میں مختلف استعاروں کی صورت میں ہے، یہ ایک پل ہے جو دوزخ کے اوپر بنا ہوگا، سب کو اس پر سے گذرنا ہوگا، اسی طرح ”مرصاد“ کی طرف بھی کئی اشارات کئے گئے ہیں یہ یا تو وہی پُل صراط ہے یا اُس پُل کا ایک خاص حصہ ہے۔

ان تمام تعبیرات سے واضح ہوتا ہے کہ رحمت الٰہی کے خزینے یعنی بہشت تک پہنچے کے لیے جہنم کے اوپر سے گزرنا پڑے گا، یہ کام نیک اور پاک لوگوں کے علاوہ کسی کے لئے آسان نہیں ہے۔

گنہگار، مجرم، ظالم اور فسادی لوگ اس پل پر سے گزرنے کی طاقت نہیں رکھتے، بلکہ وہ جہنم کی اتھاہ گہرائیوں میں گر جائیں گے۔

ان دو لفظوں کی تفسیر اور اسی طرح ”صراط“ اور مرصاد“ کی حقیقت کے سلسلے میں بہت سی باتیں کی گئی ہیں کہ جن میں سے بعض احادیث سے متعلق ہیں اور بعض مفسرین کی گفتگو سے، اُن کی طرف توجہ نہ فقط یہ کہ معاد سے متعلق بہت سے مسائل کو حل کرتی ہے بلکہ بیدار دل لوگوں پر بہت تربیتی اثرات بھی چھوڑتی ہے۔

اس اشارے کے ساتھ ہم قرآن کی طرف پلٹتے ہیں اور مندرجہ ذیل آیات کا مطالعہ کرتے ہیں:

۱۔ وَإِنْ مِّنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلَىٰ رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِينَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيهَا جِثِيًّا (مریم: ۷۲،۷۱)

۲۔ اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ﴿۱۴﴾ (الفجر: ۱۴)

۳۔ وَلَوْ نَشَاءُ لَطَمَسْنَا عَلٰٓى اَعْيُنِهِمْ فَاسْتَبَقُوا الصِّرَاطَ فَاَنّٰى يُبْصِرُوْنَ ۶۶

یس: ۶۶

۴۔ اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا لِّلطَّاغِيْنَ مَاٰبًا (نبا: ۲۱۔۲۲)

ترجمہ:

۱۔ تم سب (بغیر استثناء کے) جہنم میں وارد ہوگے، یہ تمہارے رب کا حتمی اور قطعی حکم ہے، پھر ہم ان لوگوں کو

نجات دیں گے جو پرہیز گار ہوں گے اور ظالموں کو (ضعف وذلت کے عالم میں) اس کے اندر زانو کے بل اوندھا گرا ہوا چھوڑ دیں گے۔

۲۔ یقینا تیرا پروردگار گھات میں ہے۔

۳۔ اگر ہم چاہیں تو اُن کی آنکھوں کو زائل کر دیں، پھر وہ راستہ طے کرنے کے لئے ایک دوسرے سے آگے بڑھنا چاہیں گے لیکن دیکھیں گے کیسے؟

۴۔ یقینا دوزخ بہت بڑی گھات ہے اور سرکشوں کی واپسی کا ٹھکانا ہے۔

تفسیر

جنت کا راستہ دوزخ سے ہو کر جاتا ہے

پہلی آیت میں تمام انسانوں کو مخاطب قرار دیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: تم سب کے سب جہنم میں وارد ہو گے اور یہ تمہارے رب کا حتمی وقطعی فیصلہ ہے۔(وان منکم الا واردھا کان علی ربك حتما مقضیا)۔

پھر ارشاد ہوتا ہے: پھر جو تو پرہیز گار ہوں گے انہیں ہم اس سے نجات دے دیں گے، اور ظالموں کو اس کے اندر زانو کے بل اوندھا گرا ہوا چھوڑ دیں گے (ثم ننجی الذین اتقوا ونذر الظلمین فیھا جثیا)۔

یہاں پر جہنم میں داخل ہونے سے کیا مراد ہے؟ مفسرین نے اس سلسلے میں مختلف باتیں کی ہیں اور کئی قسم کی تفاسیر ذکر کی ہیں۔

بعض کا تو یہ نظریہ ہے کہ یہاں پر ''ورود'' ''دخول'' کے معنی میں نہیں ہے کیونکہ یہ کلمہ حقیقت میں پانی کے لئے ارادہ کرنے کے معنی میں ہے، لہٰذا جب اونٹ کو پانی کی طرف لے جایا جاتا ہے تو ''اوردت الابل المآء'' کی تعبیر استعمال کی جاتی ہے، قرآن مجید میں بھی حضرت موسیٰؑ کے متعلق یہی کلمہ استعمال ہوا ہے۔ جب وہ شہر مدائن میں پانی کے کنویں پر پہنچے تو اس کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

(وَلَمَّا وَرَدَ مَاءَ مَدْيَنَ

جب موسیٰ مدین کے پانی پر وارد ہوئے (قصص، ۲۳)

اس بات کا مفہوم یہ ہے کہ تمام لوگ جہنم کے نزدیک آئیں گے، یہ وہی چیز ہے جسے ''صراط'' قرار دیا گیا ہے یعنی وہ پل کہ جو جہنم کے اوپر ہوگا، تمام لوگوں کو اس پل پر سے گزرنا ہوگا، مجرم تو اس سے نہیں گذر سکیں گے اور جہنم میں گر جائیں گے، جب کہ مومن اس سے جلدی سے گزر کر جنت میں داخل ہو جائیں گے، مختصر بات یہ ہے کہ المیز ان کے بقول ''ورود کا معنی وہاں پر قصد کے ساتھ حاضر ہونا اور قریب آنا ہے'' یا

فخر رازی کے مطابق (جیسا کہ) ورود کا معنی نزدیک اور قریب آنا ہے، (انہوں نے دو تفسیریں میں سے ایک یہ ذکر کی ہے)۔

لیکن قرآن کی مختلف آیات کہ جن میں یہ کلمہ استعمال ہوا ہے، سے مجموعی طور پر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ لفظ حاضر ہونے اور نزدیک ہونے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور داخل ہونے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، یعنی یہ ایک ایسے عام اور وسیع مفہوم پر مشتمل ہے جو ان دونوں معانی کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے، لہٰذا بت پرستوں کو مخاطب کر کے ارشاد ہوتا ہے:

انکم وما تعبدون من دون الله حصب جهنم انتم لها واردون۔ لو کان هولآء الهة ما وردوها وکل فیها خلدون۔

تم اور خدا کے علاوہ جس چیز کی تم عبادت کرتے ہو سب جہنم کا ایندھن ہو اور اس میں داخل ہو گے، اگر یہ خدا ہوتے تو ہرگز جہنم میں وارد نہ ہوتے اور یہ تمام اس میں ہمیشہ کے لئے رہیں گے۔ (انبیاء: ۹۸،۹۹)

لہٰذا اس امر سے کوئی چیز مانع نہیں کہ زیر نظر آیت میں ورود قریب ہونے اور نزدیک ہونے کے معنی میں ہو اور پل صراط کی طرف اشارہ ہو، اس بات پر گواہ وہ حدیث ہے جو مذکورہ بالا آیت کی تفسیر کے سلسلے میں حضرت امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے، آپؑ نے فرمایا:

اما تسمع الرجل یقول۔ وردناماآء بنی فلان فهو الورود ولم یدخله.......

کیا تم نے کسی کو یہ کہتے نہیں سنا کہ میں فلاں قبیلے کے پانی پر وارد ہوا (یعنی پانی کے کنارے چلا گیا) تو یہ ورود ہے جب کہ وہ داخل نہیں ہوا ہوتا۔[۱]

اس سے بھی واضح تر وہ مختصر سی حدیث ہے جسے قرطبی نے پیغمبر اکرمؐ کی حدیث کے طور پر ذکر کیا ہے، جس کا مضمون یہ ہے:

الورود الممر علی الصراط

ورود، پُل صراط سے گزرنا ہے۔[۲]

دوسری تفسیر جس کی تائید بہت سے مفسرین نے کی ہے یہ ہے کہ حقیقت میں تمام انسان جہنم میں داخل ہوں گے، لیکن یہ جہنم مومنین کے لئے تو ٹھنڈی اور سلامتی کا باعث ہوگی، جیسا کہ آتش نمرود حضرت ابراہیمؑ کے لئے ٹھنڈی اور سلامتی والی ہوگئی تھی لیکن یہ کافروں اور گنہگاروں کے لئے دہکتی ہوئی اور جلانے والی ہوگی۔

---

[۱] تفسیر برہان، ج۳، ص۲۰۔

[۲] تفسیر قرطبی، ج۶، زیر نظر آیت کے ذیل میں۔

گویا مومن آگ کے ساتھ کسی قسم کا تعلق نہ ہونے کی وجہ سے بجھانے کا مادہ ہیں جب کہ کفار آگ کے ساتھ ہم تعلق ہونے کی وجہ سے اُسے اور زیادہ بھڑکانے کا وسیلہ ہیں۔(غور کیجئے گا)

اس تفسیر کا ثبوت وہ روایت ہے جو جابرؓ بن عبداللہ انصاری سے منقول ہے، ایک شخص نے ان سے اس آیت کی تفسیر پوچھی، جابرؓ نے اپنے کانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

میں نے خود اپنے ان دو کانوں سے رسول اسلامؐ سے سنا ہے اور اگر جھوٹ بولوں تو میرے یہ کان بہرے ہوجائیں، آپ فرما رہے تھے:

ورود کا معنی داخل ہونا ہے، ہر نیک اور برا جہنم میں داخل ہوگا لیکن جہنم مومنین کے لئے ٹھنڈی اور سلامتی والی ہوگی جیسا کہ ابراہیمؑ کے لئے آگ ہوگئی تھی۔[۱]

اگر ہم اس تفسیر کو قبول کریں تو پھر یہ آیت پل صراط کے لئے دلیل نہیں ہوگی۔

دوسری آیت میں فسادیوں پر نازل ہونے والے دنیوی عذاب اور انہیں سخت ترین سزا ملنے کی طرف اشارہ کرنے کے بعد انہیں تنبیہ کے عنوان سے ارشاد ہوتا ہے:

یقینا تیرا پروردگار گھات میں ہے''ان ربك لبالمرصاد''

''مرصاد''''رصد''(بروزن حسد) کے مادہ سے ہے جس کا معنی کسی چیز کی نگہبانی کے لئے آمادہ ہونا ہے، لہٰذا مرصاد کا معنی''کمین گاہ''یا''گھات''ہے۔

یہاں پر''مرصاد''سے کیا مراد ہے؟ بعض نے تو کہا ہے کہ خدا اس دنیا میں اُن لوگوں کی گھات میں ہے اور کسی مناسب موقع پر اُن سے نبٹ لے گا، دوسرے الفاظ میں جیسا کہ''تفسیر المیز ان''نے کہا ہے:

خدا اپنے بندوں کے اعمال کی نگرانی کررہا ہے، جب اُن کی سرکشی اور فساد حد سے تجاوز کرجاتا ہے تو انہیں شدید عذاب میں مبتلا کردیتا ہے۔[۲]

اس صورت میں یہ آیت مسئلہ''صراط''کی طرف اشارہ نہیں ہے، لیکن امام جعفر صادقؑ کی ایک حدیث میں ہے:

المرصاد قنطرة على الصراط لا يجوزها عبد بمظلمة

---

[۱] تفسیر ابوالفتوح رازی، ج۷، ص۴۳۱ (اس حدیث کو بعض دوسری تفسیروں میں بھی ذکر کیا گیا ہے مثلا نور الثقلین، تفسیر رازی وغیرہ میں۔

[۲] تفسیر المیز ان، ج۲۰، ص۴۰۹ (ص۴۸۱ بیروت ایڈیشن)۔

مرصاد صراط پر ایک پل ہے، جس کے ذمے کسی مظلوم کا کوئی حق ہو وہ اس سے گذر نہیں سکے گا۔ [۱]

ایک اور حدیث روضہ کافی میں امام محمد باقرؑ سے منقول ہے، یہ حدیث امامؑ نے پیغمبر اکرمؐ سے روایت کی ہے، اس میں پل صراط کی خصوصیات ذکر کرنے کے بعد امامؑ نے فرمایا:

وهو قول الله تبارك و تعالى: ان ربك لبا لمر صاد

یہ وہی چیز ہے جس سے متعلق خدا نے فرمایا ہے کہ ''ان ربک لبا لمر صاد'' [۲]

یہ دو حدیثیں جن کا محور مذکورہ بالا آیت ہے واضح کرتی ہیں کہ یہ آیت قیامت اور پل صراط کے متعلق ہے۔

لیکن اس بات میں بھی کوئی اشکال نہیں کہ آیت دونوں چیزوں کی طرف اشارہ کر رہی ہو، یعنی خدا اس جہان میں بھی مجرموں کی گھات میں ہے اور اُس جہان میں بھی پل صراط کے کنارے کمین گاہ میں ہے۔

بہر حال یہ آیت مفہوم مکانی کی حامل نہیں ہے کیونکہ خدا کسی مکان کا محتاج نہیں ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ خدا ان تمام امور پر احاطہ وجودی رکھتا ہے۔

ابن عباسؓ سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ جہنم پر سات پل ہیں، پہلے پل پر ایمان سے متعلق سوال کیا جائے گا، جس نے پوری طرح ایمان ثابت کر دیا تو دوسرے پل پر پہنچ جائے گا، وہاں پر نماز کے متعلق پوچھا جائے گا، اگر نماز دکھا دی تو تیرے پل پر پہنچ جائے گا، وہاں پر ''زکوۃ'' کے متعلق سوال کیا جائے گا، اگر وہ دکھا دی تو چوتھے پل پر پہنچ جائے گا، وہاں پر رمضان کے روزے کے متعلق پوچھا جائے گا، اگر دکھا دیے تو پانچویں پُل پر پہنچ جائے گا، وہاں پر حج اور عمرے کے متعلق سوال ہوگا، اگر وہ دکھا دیے تو چھٹے پل پر پہنچ جائے گا، وہاں پر صلہ رحمی کے متعلق سوال ہوگا، اگر دکھا دیا تو ساتویں پل پر پہنچ جائے گا، وہاں پر بندوں کے حقوق اور اُن پر ظلم وستم کے متعلق باز پرس ہوگی۔۔۔۔۔اور یہی ہے خدا کے اس قول ''ان ربك لبا لمر صاد'' کا معنی [۳]

یہ امر بہت مشکل معلوم ہوتا ہے کہ اتنی تفصیلات کے ساتھ یہ بات ابن عباسؓ کی ذاتی رائے ہو، اصولی طور پر انہوں نے یہ بات رسول اسلامؐ یا حضرت علیؑ سے ایک حدیث کی شکل میں سنی ہے۔

''مرصاد'' کی تعبیر سورہ نباء آیت ۲۱ میں بھی آئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

---

[۱] بحارالانوار، ج ۱۱ ص ۶۴ یہی روایت برہان، ج ۴، ص ۴۵۸ میں ''ان ربک لبالمرصاد'' کی تفسیر کے سلسلے میں امام جعفر صادقؑ سے ذکر ہوئی ہے۔

[۲] نور الثقلین، ج ۵، ص ۵۷۲، تفسیر برہان، ج ۴، ص ۴۵۸۔

[۳] تفسیر قرطبی، ج ۱۰، زیر نظر آیت کے ذیل میں۔

ان جھنم کانت مرصادا

یقیناً دوزخ (گنہگاروں کے لئے) گھات ہے۔

اس آیت کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ خود دوزخ مجرموں اور گنہگاروں کے لئے گھات ہے، لیکن پہلے جو بات گزری ہے اس کے پیش نظر بعض مفسرین نے کہا کہ یہاں پر ''مرصاد'' سے مراد ایک پل ہے جو جہنم کے اوپر بنایا گیا ہے، یہ ان لوگوں کے لئے کمین گاہ ہے، چونکہ یہ لوگ اُسے پار کرنے کی طاقت نہیں رکھتے لہٰذا جہنم میں گر جائیں گے۔[1]

علاوہ ازیں میں کی تعبیر عموماً سڑکوں اور راستوں کے لئے استعمال ہوتی ہے اور جہنم جو کہ انجام کار اور آخری منزل ہے کمین کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں رکھتی، یہ بھی مذکورہ بالا تفسیر پر ایک شاہد ہے۔

آخری آیت میں قیامت کے دن کفار اور مجرموں کی حالت بیان ہوئی ہے، اُس دن ان کے لبوں پر مہر لگا دی جائے گی، صرف اُن کے ہاتھ اور پاؤں بولیں گے، اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے: اگر ہم چاہتے تو اُن کی آنکھوں کو زائل کر دیتے، پھر وہ پل صراط عبور کرنے کے لئے ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے لیکن وہ کیسے دیکھ سکتے ہیں (''**ولو نشآء لطمسنا علی اعینھم فاستبقوا الصراط فانی یبصرون**)۔[2]

بہت سے مفسرین نے اس آیت کو اس دنیا میں اس گروہ کی حالت زار سے متعلق قرار دیا ہے اور صراط سے مراد ''حق کا راستہ لیا'' ہے، یعنی اُن کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ حق کے راستے یا نجات کے راستے کو پالیں، لیکن خدا اُن کے برے اعمال کی وجہ سے اُن کی آنکھوں کو بے نور کر دیتا ہے، لہٰذا وہ جادہ حق کے مشاہدے پر قدرت نہیں رکھتے۔

لیکن یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ یہ آیت اس گروہ کی قیامت کے دن حالت کو بیان کرتی ہے جب وہ صراط (دوزخ کے پل) سے عبور کریں گے، وہاں پر اگر خدا ارادہ کرلے گا تو اُن کی آنکھیں بالکل بے نور ہو جائیں گی، پھر وہ لاکھ کوشش و جستجو کریں اس پل سے پار نہیں جاسکیں گے۔

تفسیر ''فی ظلال القرآن'' کی ظاہری عبارت بھی یہی تفسیر بیان کرتی ہے، تفسیر قرطبی میں بھی اسے ایک احتمال کے طور پر ذکر کیا گیا ہے، علاوہ ازیں ''عبداللہؓ بن سلام'' نے اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے:

جب قیامت برپا ہوگی اور (جہنم کے اوپر) پُل صراط کھینچ دیا جائے گا تو ایک منادی آواز دے گا: محمدؐ اور اُن کی امت کھڑے ہو

---

[1] یہ تفسیر ''علامہ طباطبائی مرحوم'' نے ''المیزان میں''، ''فخر رازی'' نے ''تفسیر کبیر میں''، راغب نے ''مفردات'' میں اور ''قرطبی'' نے اپنی تفسیر میں سورہ نباء کی مذکورہ آیت کے ذیل میں فقط یہی تفسیر، یا کئی تفسیروں میں سے ایک تفسیر کے طور پر ذکر کی ہے۔

[2] ''طمسنا'' کا مادہ ''طمس'' (بروزن شمس) ہے جس کا معنیٰ ایک چیز کے اثرات کو پوری طرح ختم کر دینا ہے یہاں پر ممکن ہے آنکھ کو مکمل طور پر ختم کر دینے یا اس کے نور اور بینائی کو ختم کر دینے کے معنی میں ہو۔

جائیں، پوری امت کے لوگ، نیک اور برے سب کھڑے ہوجائیں گے اور آنحضرتؐ کے پیچھے چلنے لگیں گے تا کہ پل صراط کو عبور کریں، جب صراط کے کنارے آئیں گے تو گنہگاروں کو اندھا کر دیا جائے گا، وہ پل صراط سے گزرنا چاہیں گے، لیکن اُسے کیسے دیکھ سکیں گے؟[۱]

یہ بات مشکل معلوم ہوتی ہے کہ یہ عبداللہؓ بن سلام کی ذاتی رائے ہو، کیونکہ یہ غیب سے متعلق خبروں کا ایک حصہ ہے جسے معصومینؑ کے علاوہ کوئی اور نہیں جانتا، اس لئے اس بات کو رسول اسلامؐ کی حدیث سمجھنے میں کوئی اشکال نہیں۔[۲]

توضیحات

صراط کیا ہے؟

جیسا کہ پہلے بھی متعدد بار اس امر کا ذکر ہوا ہے کہ قیامت سے متعلق حقائق کے بارے میں تفصیلی معلومات کا جاننا اس دنیا کے لوگوں کے لئے ناممکن ہے کیونکہ وہ اس عالم سے آگے کی دنیا ہے لیکن یہ امر مانع نہیں ہے کہ اس سے متعلق کچھ اجمالی معلومات ہمیں حاصل ہوں۔

اسلامی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ صراط جنت کی طرف جانے والے راستے پر ایک پل ہے، جو جہنم کے اوپر ہے، ہر اچھے اور برے کو اس پر سے گذرنا ہوگا، نیک لوگ تو تیزی کے ساتھ اسے عبور کر جائیں گے، اور خدا کی بیکراں نعمتوں تک پہنچ جائیں گے، جب کہ برے لوگ اس پر سے گر کر جہنم کا لقمہ بن جائیں گے، بعض احادیث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ پل صراط سے لوگوں کے تیزی سے گزرنے کا دارومدار اُن کے ایمان، اخلاص اور نیک اعمال پر ہے۔

امام جعفر صادقؑ کی ایک حدیث میں ہے:

منهم من يمر مثل البرق۔ ومنهم من يمر مثل عدوالفرس۔ ومنهم من يمر حبوا۔ ومنهم من يمر مشياء۔ ومنهم من يمر متعلقا قد تأخذ النار مينه شيئا وتترك شيئا۔

---

[۱] تفسیر قرطبی، ج۸، ص ۵۴۹۴ (زیر نظر آیت کے ذیل میں)۔

[۲] عبداللہ بن سلامؓ اہل کتاب کے علماء میں سے تھے، انہوں نے اسلام قبول کیا، ان کا نام "الحصین" تھا، اسلام لانے کے بعد پیغمبر اکرمؐ نے ان کا نام عبداللہ رکھ دیا، بعض علمائے رجال نے انہیں مجہول الحال قرار دیا ہے اور کبھی ان کے کمزور راوی ہونے پر دلیلیں قائم کی ہیں، لیکن ابن داوٗد نے اپنی کتاب کے پہلے حصے میں کہ جو معتبر راویوں کے بارے میں ہے ان کا ذکر کیا ہے، بعض نے اس امر کو اُن کے حسن حال کے لئے قرینہ قرار دیا ہے۔

بعض لوگ تو بجلی کی مانند اس سے گزریں گے، بعض تیز گھوڑوں کی رفتار سے گزریں گے، بعض ہاتھ اور پاؤں کے بل، بعض پیدال لوگوں کی طرح، بعض لوگ اس پر معلق ہو یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ بعض روایات میں اس خطرناک راہ سے گذرنے کو ایک بہت مشکل کام قرار دیا گیا ہے۔

پیغمبر اکرمؐ سے ایک حدیث (کہ جو امام جعفر صادقؑ سے بھی) منقول ہے، میں ہے:

ان علی جهنم جسرا ادق من الشعر واحد من السیف۔

دوزخ پر بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز دھار ایک پل ہے۔[1]

صراط مستقیم، حقیقت ولایت اور عدالت بھی اس دنیا میں یوں ہی ہے، بال سے باریک تر اور تلوار سے تیز تر کیونکہ صراط مستقیم صرف ایک باریک راستہ ہے، اس کے علاوہ جو کچھ بھی دائیں یا بائیں خطوط ہیں، سب ٹیڑھے اور غیر مستقیم راستے ہیں، لہٰذا قیامت کے صراط کا کہ جو اسی صراط کی تجسیم شدہ صورت ہے، ایسا ہونا طبعی سے بات ہے، لیکن اس کے باوجود بعض لوگ ایمان اور اعمال صالح کے سائے میں اس خطرناک راستے کو تیزی سے طے کرلیں گے۔

یہ بات بھی یقینی ہے کہ پیغمبر اسلامؐ اور اُن کے خاندان سے تعلق اس خوفناک راستے کو آسان کردیتا ہے۔

پیغمبر اسلامؐ کی ایک حدیث میں ہے:

اذا کان یوم القیامة ونصب الصراط علی جهنم لم یجز علیه الا من کان معه جواز فیه ولایة علی بن ابی طالب۔

جب قیامت کے دن جہنم پر پل صراط کھینچ دیا جائے گا تو اس سے وہی لوگ پار جاسکیں گے جن کے پاس وہ پروانہ ہوگا، جس میں علیؑ کی ولایت لکھی ہوگی۔[2]

یہی معنی ایک اور عبارت کے ساتھ خاتون اسلام فاطمۃ زہراء سلام اللہ علیہا کے متعلق بھی آیا ہے، واضح ہے کہ علیؑ اور فاطمہؑ کی محبت و ولایت پیغمبر اسلامؐ، قرآن، اسلام اور دیگر آئمہ معصومینؑ کی محبت سے الگ نہیں ہے، حقیقت میں جب تک ایمان، اخلاق اور عمل کے لحاظ سے ان عظیم ہستیوں کے ساتھ تعلق قائم نہ ہو، اس وقت تک صراط سے گزرنا ممکن نہیں ہے، اس سلسلے میں متعدد احادیث بھی آئی ہیں۔ (خواہشمند

---

[1] ا۔ میزان الحکمته، ج۵، ص۳۴۸، امام جعفر صادقؑ کی ایک حدیث ان علی جهنم جسرا میں ''جسرا'' کی جگہ پر ''الصراط'' کا کلمہ آیا ہے، (بحار، ج۸، ص۶۴، حدیث ۱)۔

[2] بحار الانوار، ج۸، ص۶۸ (حدیث ۱۱)۔

حضرات زیادہ معلومات کے لئے بحارالانوار ج ۸ فصل صراط بالخصوص روایت ۱۲ تا ۱۷ کی طرف رجوع کریں)

اس سلسلے میں آخری بات اس پُل پر ایمان رکھنے کے تربیتی اثرات سے متعلق ہے۔

یہ ایک خوفناک، خطرناک، بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز راستہ ہے، اس گزرگاہ پر کئی جگہ ٹھہرنا پڑے گا، ہر جگہ پر ایک چیز کے متعلق سوال ہوگا، ایک جگہ پر نماز، دوسری جگہ پر امانت اور صلہ رحمی، تیسری جگہ پر عدالت اور اسی جیسی دوسری چیزوں کے متعلق سوال ہوگا، اس راستے سے پیغمبرؐ اور علیؑ کی محبت کے بغیر اور ان کے اعمال و اخلاق کی خلاف ورزی کر کے نہیں گذرا جا سکتا، یہ ایک ایسا پل ہے جس پر سے ہر شخص اپنے ایمان اور عمل صالح کے نور کی روشنی میں ہی گذر سکتا ہے، جو اس پل سے خیریت سے نہ گزر سکا اس کا جہنم میں گرنا یقینی ہے، وہ خدا کی روحانی اور مادی نعمتوں کے سرچشمے یعنی جنت سے محروم رہے گا۔

ان مطالب کی طرف توجہ اور ان پر ایمان انسان کے اعمال میں ایک انقلاب برپا کر سکتا ہے، یہ اُسے زندگی کے راستوں کے چناؤ میں اور زیادہ غور و فکر کرنے اور باطل کی حق سے جدائی کی طرف زیادہ توجہ کرنے کی دعوت دے گا، یہ اُسے اولیاء اللہ کے اخلاق و اعمال کی پیروی کی طرف بلاتا ہے۔

جنت۔۔۔اور۔۔۔جنتی

اشارہ

معاد سے متعلق تمام ابحاث آخر کار ان دو نکتوں میں سے کسی ایک پر ختم ہوتی ہیں:

''بہشت'' اور ''دوزخ''۔۔۔

بہشت یعنی خدا کی نعمتوں اور عطیوں کا سرچشمہ، جس میں ہر قسم کی مادہ اور روحانی نعمتیں ہوں گی، دوزخ یعنی دکھ درد، اذیتوں اور ہر قسم کی محرومیوں کی جگہ۔

جنت کی حقیقت کیا ہے؟ وہ کیسی ہے؟ وہ کہاں ہے؟ آیا وہ اب موجود ہے یا بعد میں خلق کی جائے گی؟ اس بارے میں گفتگو کے سلسلے بہت دراز ہیں، ان سوالات کے جواب حاصل کرنے کے لئے قرآن کی اُن آیات سے مدد لی جاسکتی ہے جو ان موضوعات کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

جنت اور جنتیوں کی صفات، جنت کی مختلف نعمتوں، اس میں بہنے والے مختلف چشموں، نہروں اور باغوں اس کے پاک و پاکیزہ کھانوں، اس میں بہترین بیویوں، دوستوں اور خدمت گذاروں، فرشتوں کی طرف سے انتہائی احترام اور اسی طرح کی دوسری مادہ اور روحانی نعمات سے متعلق قرآن کی بہت سی آیات میں گفتگو کی گئی ہے، معاد سے مربوط بہت سی آیات انہی موضوعات کے بارے میں ہیں۔

ایک بار پھر اس نکتے کی یاددہانی ضروری ہے کہ ہم جنت سے متعلق جو تصویر اور خاکہ بھی اپنے ذہن میں بنائیں وہ اس دنیا کی نعمتوں کے معیار کے مطابق ہوگا، وہ جنت کی مکمل تصویر نہ ہوگا، وہ تو اس سے بڑھ کر ایک اور ہی عظیم چیز ہے، وہ ہماری تحریر اور مطالعے کی وسعت میں نہیں سماسکتی۔

لیکن اس کے باوجود ہم مختلف آیات وروایات کے مطالعے سے اس کا ایک اجمالی خاکہ پیش کرسکتے ہیں، ایک ایسی مبہم سی تصویر جو بہت زیادہ تربیتی اثرات کی حامل ہے۔

حقیقت میں ہر انسان جو کسی مادی یا روحانی نعمت کے حصول کا جذبہ رکھتا ہو، یہ اُسے اپنی طرف بلاتی ہے، یہ اُسے ان نعمات کے حصول کے لئے تہذیب نفس، تطہیر فکر، اعمال خیر اور پسندیدہ کردار و گفتار کی دعوت دیتی ہے۔

اس اشارے کے بعد ہم بہشت سے متعلق مختلف آیات کا مطالعہ کرتے ہیں۔

جنت کے دروازوں کی تعداد کے مطابق ان آیات کو بھی آٹھ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

جنت میں داخلہ اور قرآن

اہل جناں کی صفات قرآن کی متعدد آیات میں بیان ہوئی ہیں، یہ اُن اعمال اور اوصاف کو واضح طور پر بیان کرتی ہیں جو انسان کو اس بلند مقام تک پہنچا دیتے ہیں، انسانی کمال اور اُخروی نجات سے متعلق اسلامی نکتہ نظر کی وضاحت بھی ان آیات سے ہوتی ہے۔

یہ صفات مندرجہ ذیل ہیں:

ا۔ ایمان۔۔۔۔عمل صالح

سب سے پہلی چیز جسے نجات کے حقیقی سرمائے، سعادت کی بنیاد اور جنت کے دروازوں کی چابی کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے، وہ ایمان اور اچھے اعمال ہیں، کلام مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۸۲ ﴿البقرة: ۸۲﴾

جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے اعمال انجام دیئے وہ اہل جنت ہیں، وہ اس میں ہمیشہ کے لئے رہیں گے۔ (بقرہ، ۸۲)

بالکل یہی تعبیر یا اس سے ملتی جلتی کئی اور تعبیرات قرآن مجید کی متعدد آیات میں آئی ہیں، یہ سب اس موضوع کی اہمیت اور قرآن کے حوالے سے اس بات کی عظمت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔[۱]

اس سے قرآن نے اس تو ہم پرستی کے نظریے کا خاتمہ کر دیا جو یہ تھا کہ نجات اور جنت میں داخلے کا مسئلہ ایمان اور اچھے اعمال سے ہٹ کر کسی اور امر سے وابستہ ہے، اس نظریے کا پرچار کرنے والے بعض اہل کتاب اور دوسری قوموں میں اُن جیسا نظریہ رکھنے والے افراد تھے، لیکن قرآن اس کے لئے عقیدہ اور عمل کے دو توانا بازوؤں کی موجودگی ضروری سمجھتا ہے، زیر نظر آیت بھی آیات کے اس سلسلے کے فوراً بعد آئی ہے جو یہودیوں کے بارے میں ہے وہ اپنے آپکو خدا کی پسندیدہ امت قرار دیتے تھے، اور بعض اوقات تو اپنے آپ کو خدا کے بیٹے سمجھتے تھے اور کہتے تھے:

''اگر ہم نے کبھی گناہ بھی کیا ہوگا تو پھر بھی چند ہی دن کے لئے جہنم میں جائیں گے''

گو یا انہوں نے خدا سے اس بات کا عہد لے رکھا ہو۔

یہ بات واضح ہے کہ ایمان اور نیک اعمال کا آپس میں درخت اور پھل کا سا تعلق ہے، پھل کا ایک اچھا درخت پھل سے خالی نہیں ہوگا،

---

[۱] آل عمران، ۱۳۶۔ نسائی، ۱۲۴۔ اعراف، ۴۲۔ حج، ۱۴، ۲۳، ۵۶۔ عنکبوت، ۵۸۔ زمر، ۷۴۔ احقاف، ۱۴۔ محمد، ۱۲ وغیرہ۔

اسی طرح ایمان بھی عمل صالح سے خالی نہیں ہوگا،مگر وہ ایمان کہ جو کمزور اور بے نور ہو وہ نفسانی خواہشات کے سامنے سرنگوں ہو جاتا ہے، جب امام جعفر صادقؑ سے ایمان کے متعلق سوال کیا گیا تو آپؑ نے فرمایا:

الایمان ان یطاع اللہ فلا یعصی

ایمان یہ ہے کہ خدا کی اطاعت کی جائے اور اُس کی نافرمانی نہ کی جائے۔[1]

دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ عمل صالح ایمان قلبی کی ہی تصویر ہے۔

البتہ اس سے یہ مراد نہیں کہ گنہگار یا کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کرنے والے لوگ کافر ہیں۔[2]

یہ عقیدہ تو خوارج کا ہے،مراد یہ ہے کہ پائیدار ایمان نیک اعمال سے جدا نہیں ہوتا اگر چہ کمزور ایمان کے ساتھ کبیرہ گناہوں کا ارتکاب بھی ہوسکتا ہے۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن کی بہت سی آیات میں ایمان عمل صالح سے پہلے ذکر کیا گیا ہے جب کہ واجبات کی انجام دہی اور محرمات سے بچنا ایمان سے مشکل کام ہے،لہٰذا اصولی طور پر اُسے پہلے آنا چاہیے تھا،ایسا اس لئے ہے کہ قرآن اس ترتیب اور بیان کے ذریعے یہ بتانا چاہتا ہے کہ اعمال صالح کی بنیاد اور جڑ ایمان ہی ہے۔

اس سلسلے کی گفتگو میں آخری بات یہ ہے کہ ایمان اور عمل صالح کی تعبیر بہت وسیع مفہوم کی حامل ہے،ایک طرف تو یہ خدا اور دین کی تمام بنیادی باتوں اور ایمان پر محیط ہے اور دوسری طرف ہر اچھا اجتماعی،انفرادی،عبادتی اور سیاسی کام اس میں آجاتا ہے، یہ جنت کی سب سے پہلی کنجی کا ذکر تھا۔

۲۔تقویٰ

دوسرا عامل تقویٰ اور پرہیز گاری ہے قرآن کی بہت سی آیات میں اس کا ذکر آیا ہے،مثلاً سورہ مریم میں ''جنات عدن'' (بہشت کے جاودانی باغات) اور جنت کی بعض دوسری نعمتوں کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

تِلۡكَ الۡجَنَّةُ الَّتِىۡ نُوۡرِثُ مِنۡ عِبَادِنَا مَنۡ كَانَ تَقِيًّا ﴿۶۳﴾ (مریم:۶۳) [3]

---

[1] اصول کافی،ج۲،ص۳۳،حدیث ۳۔

[2] خوارج کا ایک مسلم عقیدہ یہ ہے کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر ہے (سفینۃ البحار،مادہ ''خرج'')

[3] ا۔ مندرجہ ذیل آیات بھی ''تقویٰ'' اور جنت میں داخلے کے رابطے کو بیان کرتی ہیں:(آل عمران۔۱۵،۱۳۳،۱۹۸)،(رعد،۳۵)،(حجر،۴۵)،(نحل،۳۱)　　(فرقان،۱۵)،(شعراء،۹۰)،(زمر،۲۰،۷۳)،(دخان،۵۱)،(محمد،۱۵)،(ق،۳۱)،(ذاریات،۱۵)وغیرہ۔

یہ وہی جنت ہے جو ہم اپنے پرہیزگار بندوں کو بطور میراث دیتے ہیں۔

اسلامی نکتہ نظر سے تقویٰ ایک بہت بلند و بالا مقام کا حامل ہے جیسا کہ سورہ حجرات کی آیت ۱۳ ایک اسلامی شعار کے عنوان سے مشہور ہے:

"ان اکرمکم عند اللہ اتقکم"

خدا کے نزدیک تم میں سے زیادہ باعزت زیادہ تقویٰ والا ہے۔

لہٰذا یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے کہ قرآن کی متعدد آیات میں تقویٰ کو جنت کی کلید قرار دیا گیا ہے، تقویٰ کے معنی اپنے آپ کو روکنا، گناہوں سے بچنا، خدا کے ہر فرمان کے سامنے سر تسلیم خم کرنا اور حق و عدالت کو ملحوظ رکھنا ہے، دوسرے الفاظ میں تقویٰ خدا سے ڈرنے کی باطنی حالت اور اندرونی طور پر کنٹرول کا نام ہے، یہ حالت انسان کو ہر برائی سے روکتی ہے، اس کا ایک ایسا جامع مفہوم ہے جو تمام الٰہی، اخلاقی اور انسانی ذمہ داریوں کی ادائیگی پر محیط ہے۔

آیت کے شروع میں "تلک" کی تعبیر جو کہ دور کی طرف اشارہ ہے، یہاں پر حقیقت میں جنت کے عظیم اور بلند و بالا مقام کی طرف اشارہ ہے، گویا وہ اس قدر بلند ہے کہ ہماری فکر و نظر کی دسترس سے کوسوں دور ہے۔

"ارث" کی تعبیر ممکن ہے درج ذیل نکات میں سے کسی ایک کی طرف اشارہ کررہی ہو:

۱۔ ارث ہر پائیدار ملکیت کے معنی میں ہے کیونکہ ایسی ملکیت جو فسخ نہ ہو سکے اور واپس نہ لی جا سکے صرف وہی ہے جو انسان تک میراث کے ذریعے پہنچتی ہے، پرہیزگاروں کے لئے جنت بھی ایسی ہی ہے۔

۲۔ میراث ایک قانونی اور تشریعی پہلو کے ساتھ ساتھ ایک تکوینی اور طبیعی پہلو بھی رکھتی ہے، جس کے مطابق ماں باپ کی صفات اپنی اولاد کی طرف منتقل ہوتی ہیں، لہٰذا مذکورہ بالا آیت میں ارث سے مراد یہ ہے کہ تقویٰ اور بہشت کے درمیان ایک معنوی اور تکوینی رابطہ موجود ہے۔

۳۔ جو مال انسان کو میراث کے طور پر ملتا ہے معمولاً انسان اس کے لئے کوئی مشقت نہیں کرتا، بہشت کی نعمات اس قدر عظیم اور برتر ہیں کہ پرہیزگاروں کے اعمال اُن کے مقابلے میں بالکل معمولی ہیں، گویا انہیں بہشت بغیر کسی مشقت کے مفت میں دے دی گئی ہے، کیونکہ ان نعمتوں کے مقابلے میں اُن کی مشقت اور زحمات بالکل معمولی ہیں، دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ یہ بات درست ہے کہ انسان کے اعمال اور اس کا تقویٰ بہشت کے استحقاق کی بنیاد ہیں، لیکن جنت کی نعمتیں اتنی عظیم ہیں کہ گویا پرہیزگاروں کو یہ مفت میں مل گئی ہوں۔

اسی وجہ سے ہم کہتے ہیں کہ خدا کی نعمتوں میں استحقاق کا پہلو ہونے کے ساتھ ساتھ تفضّل اور کرم کا پہلو بھی کارفرما ہے۔

۴۔ اس آیت کی تفسیر میں رسول اسلامؐ کی یہ حدیث بھی مروی ہے:

ما من احد الا ولہ منزل فی الجنۃ۔ ومنزل فی النار۔ فاما الکافر فیرث المومن منزلہ من النار والمومن یرث الکافر منزلہ من الجنۃ۔

ہرانسان جنت میں بھی ایک منزل رکھتا ہے اور جہنم میں بھی، کافر مومن کے جہنمی مقام کو بطور میراث لے لیتے ہیں اور مومن کافر کے جنتی مقام کو۔[1] یہ تعبیر واضح طور پر بتاتی ہے کہ تمام انسان آزاد پیدا کئے گئے ہیں، وہ جنت اور جہنم دونوں میں جانے کی صلاحیت رکھتے ہیں، یہ تو اُن کے انتخاب اور پسند پر منحصر ہے۔[2]

۳۔احسان اور بھلائی:

خدا کی نعمات کے اس عظیم ذخیرے میں داخل ہونے کا ایک اور عامل احسان اور بھلائی ہے، قرآن کی متعدد آیات میں اس کے وسیع مفہوم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، سورہ مائدہ کی آیت ۸۵ میں اُن بعض عیسائی علماء کی حالت بیان کی گئی ہے جو قرآن کی آیات سن کر اتنے متاثر ہوتے تھے کہ اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے تھے اور وہ ایمان لاکر حق کا اعتراف کر لیتے تھے، اُن کی یہ حالت بیان کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

فاثابھم اللہ بما قالو اجنات تجری من تحتھا الانہار خلدین فیھا و ذلک جزاء المحسنین[3]

خدا نے اُن کی اس بات کی وجہ سے انہیں جنت کے وہ باغات عطا کر دیئے جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں، وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے اور یہی ہے احسان کرنے والوں کی جزاء۔

درست ہے کہ قرآن یہ کہتا ہے کہ اُن کو یہ تمام نعمات قرآن کی عظمت اور اس پر ایمان لانے کی وجہ سے دی گئیں لیکن ہرگز یہ فقط ایک بات نہ تھی بلکہ ایسی بات تھی جو پورے ایمان کے ساتھ کہی جارہی تھی، اور یہ ایمان ان کے پورے وجود پر طاری تھا، لہٰذا اس سے پہلی آیات میں ہے:

---

[1] نور الثقلین، ج ۲ ص ۱۳۰، حدیث ۱۲۱۔ مجمع البیان آیت ۴۳، سورہ اعراف کے ذیل میں۔۔۔۔تفسیر علی بن ابراہیم میں بھی یہی معنی دوسرے الفاظ میں امام جعفر صادقؑ سے سورہ مومنون آیت ۱۱ کے ذیل میں منقول ہے۔

[2] علامہ اقبال کا یہ معروف شعر اس مفہوم کی اپنے انداز سے ترجمان کرتا ہے

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی　یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے (مترجم)

[3] (زمر، ۳۴) اور (مرسلات، ۴۴) میں بھی یہی بات آئی ہے۔

ترى اعينهم تفيض من الدمع مما عرفوا من الحق

تم اُن کی آنکھوں کو دیکھو گے کہ حق کو پا لینے کے باعث وہ شدت شوق سے برس رہی ہیں۔

اُن کی بات احسان اور نیکی کی مصداق کیسے تھے؟ اس سلسلے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے قرآن کا اچھی طرح مطالعہ کیا اور تحقیق بھی کی، پھر اچھی طرح اعتراف اور اقرار بھی کیا اور اچھی طرح سے عمل بھی کیا۔

بعض احادیث میں ''احسان'' کی تفسیر یہ کی گئی ہے کہ یہ ایک ایسی عبادت اور بندگی سے عبارت ہے جو یقین کامل کے ساتھ ہو اور ہر حال میں خدا کی موجودگی کا احساس جس کے ہمراہ ہو، حضور اکرمؐ سے احسان کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا:

ان تعبد اله كانك تراه فان لم تكن تراه فانه يراك۔

خدا کی ایسی عبادت کر گویا تو اسے دیکھ رہا ہے اور اگر تو اُسے نہیں دیکھ رہا تو وہ تو تجھے دیکھ رہا ہے۔[1]

یہ بات واضح ہے کہ جو شخص اس بات کا احساس رکھے کہ خدا اُسے دیکھ رہا ہے تو نہ فقط یہ کہ اس کی عبادت حقیقی اور معنوی ہو جائے گی بلکہ اس احساس کے اثرات اس کے دیگر تمام اعمال، رفتار اور گفتار میں بھی ظاہر ہوں گے۔

۴۔ جہاد اور شہادت

جو شخص قرآن و اسلام سے تھوڑی بہت واقفیت بھی رکھتا ہوا سے یہ معلوم ہے کہ اسلام میں مجاہدوں اور شہیدوں کا مقام بہت بلند ہے، قرآن نے واضح طور پر اس ایثار پیشہ جماعت کو جنت کی بشارت دی ہے، سورہ توبہ کی آیت ۱۱۱ میں ارشاد ہوتا ہے:

ان الله اشترى من المومنين انفسهم واموالهم بأن لهم الجنة
يقاتلون فى سبيل الله فيقتلون و يقتلون وعدا عليه حقاً فى التورة
والانجيل والقران ومن اوفى بعهده من الله فاستبشروا ببيعكم الذى
بأيعتم به وذلك هو الفوز العظيم۔[2]

خدا نے مومنوں سے اُن کی جانیں اور مال خرید لئے ہیں (جس کے بدلے میں) بہشت اُن کے لئے ہے، وہ خدا کی راہ میں لڑتے ہیں، مارتے ہیں اور مارے جاتے ہیں، یہ اس کا سچا وعدہ ہے جو تورات، انجیل اور قرآن (تین

---

[1] تفسیر نور الثقلین، ج۱ص ۵۵۳ حدیث ۵۷۹ (نساء، ۱۲۵ کے ذیل میں)۔

[2] (توبہ، ۲۰، ۲۱، ۸۸، ۸۹)، (صف، ۱۲) اور (آل عمران، ۱۴۲) میں بھی یہی مفہوم آیا ہے۔

بڑی کتابوں) میں آیا ہے، کون خدا سے بڑھ کر اپنے وعدے کو پورا کرنے والا ہے؟ جب ایسا ہے تو تمہیں مبارک ہو اس معاملے پر جو تم نے خدا سے کیا ہے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

واقعاً یہ کتنی بے نظیر اور بے مثال تجارت ہے جس میں خریدار خدا اور بیچنے والے مجاہد مومنین ہیں، جس جنس کی خریداری ہو رہی ہے وہ جانیں اور مال ہیں، جو خود خدا نے ہی انہیں عطا کی ہیں، اس کی جو قیمت عطا کی جائے گی وہ جاوداں جنت کی صورت میں ہے، اس خرید و فروخت کی گواہ تین عظیم آسمانی کتابیں ہیں اور پھر اس کے بعد وہ مبارک باد ہے جو خریدار نے بیچنے والے کو دی ہے۔

کتنی خوبصورت اور دلنشین تعبیرات ہیں، کتنا نفع بخش معاملہ ہے! ایک کمزور اور ناپائیدار جنس کو کس بابرکت اور جاودانی قیمت پر خریدا گیا ہے، کس محبت کے ساتھ خدا کی طرف سے یہ کاروبار ہوا ہے۔

چنانچہ ایک حدیث شریف میں ہے کہ جب مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی تو آنحضرتؐ مسجد میں تشریف فرما تھے، آپؐ نے بلند آواز سے اس آیت کی تلاوت کی اور لوگوں نے نعرۂ تکبیر بلند کیا، انصار میں سے ایک شخص آنحضرتؐ کی خدمت میں آیا اور دریافت کیا! کیا واقعی یہی آیت تھی جو نازل ہوئی ہے؟ پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا: ہاں! تو اس شخص نے (خوشی سے چلا کر) کہا:

بیع ربیح لا نقیل ولا نستقیل

یہ ایسی تجارت ہے جو بہت فائدہ مند ہے نہ تو ہم اُسے رد کریں گے اور نہ ہی اس کے رد کو قبول کریں گے۔ [1]

بقول شاعرؔ

آں بیع را کہ روز ازل با تو کردہ ایم
ہرگز در آن حدیث اقالہ نمی رود

(یعنی وہ تجارت جو ہم نے تیرے ساتھ روز ازل کی ہے اس کو رد کرنے کا کوئی امکان نہیں)۔

ضمنی طور پر مذکورہ بالا آیت سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تجارت نہ فقط شہیدان راہ حق سے کی گئی ہے بلکہ جہاد میں کامیاب و کامران ہونے والے لوگ بھی اس میں شامل ہیں، اسی بات پر کہ وہ اپنی جان کو خلوص کیساتھ ہتھیلی پر رکھ کر میدان جنگ میں آ گئے ہیں وہ بھی خدا کے ساتھ معاملے اور تجارت کے مصداق ہیں۔ یقتلون (دشمن کو مارتے ہیں) کو یقتلون (خود شہید ہو جاتے ہیں) سے پہلے لایا گیا ہے، یہ بھی اس بات پر دلیل ہے کہ اصلی ہدف دشمن کو ختم کرنا ہے نہ کہ شہادت کا حصول، شہادت تو ایک بلند مرتبہ ہے جو اس راہ کے سالکوں میں سے بعض سعادت مندوں کے نصیب میں آتا ہے، لیکن جہاد کبھی بھی شہادت کے حصول کے لئے نہیں کیا جاتا، واضح تر لفظوں میں یہ کہ شہادت ہدف اور منزل نہیں ہے بلکہ ہدف تک پہنچنے کا ایک راستہ ہے۔

---

[1] تفسیر المیزان، جلد ۹ ص ۴۲۹ بحوالہ تفسیر درمنثور۔

۵۔نفسانی خواہشات سے دستبرداری

ایک اور چیز جو جنت میں جانے کے اسباب میں سے ذکر ہوئی ہے وہ خدا سے ڈرنا اور نفسانی خواہشات کا مقابلہ کرنا ہے، سورہ نازعات کی آیت ۴۰ و ۴۱ میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى

البتہ وہ جو اپنے رب کی عظمت سے ڈرا اور اس نے نفس کو خواہشات سے روکا تو اس کا ٹھکانا جنت ہے۔

خوف خدا کے اور ہوا پرستی سے روکنے کے درمیان ایک قریبی رابطہ ہے، ایک درخت کے مانند ہے تو دوسرا پھل کے مانند، جب خوف خدا انسانی روح کی اتھاہ گہرائیوں میں جاگزیں ہوجائے تو نفسانی خواہشات سے پوری طرح مقابلہ ہوسکتا ہے، یہ بھی واضح ہے کہ زمین پر ہونے والی تمام برائیوں اور گناہوں کا سرچشمہ نفسانی خواہشات ہیں، تو تمام بھلائیوں اور خوبیوں کا سرچشمہ خدا کی ذات ہے۔

سورہ فرقان کی آیت ۴۳ ''ارایت من اتخذ الهه هویه'' کے ذیل میں ایک حدیث میں ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا:

ما تحت ظل السمآء من اله یعبد من دون الله اعظم عند الله من هوی متبع۔

خدا کے نزدیک روئے زمین پر خواہشات نفسانی کی پیروی سے بڑھ کر بڑا بت کوئی نہیں۔[1]

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ان دو صفات (خوف خدا اور خواہشات نفسانی سے اجتناب) کے مدمقابل صفات کو بھی سورہ نازعات کی پہلی آیات میں ذکر کیا ہے اور وہ ہے سرکشی اور آخرت پر دنیا کو ترجیح دینا جن کا نتیجہ دوزخ ہے۔

فاما من طغی واثر الحیوة الدنیا فان الجحیم هی الماوی۔

(نازعات۔۳۷تا۳۹)

اور یہ سچ بھی ہے کہ تمام بدبختیوں اور برائیوں کا سرچشمہ، یہ دو صفات ہیں اور تمام سعادتوں کا منبع وہ پہلی دو صفات ہیں (غور کیجئے گا)۔

بعض مفسرین کے بقول سورہ آل عمران کی آیت ۱۴ میں گناہوں کے جن سات سرچشموں کی بات کی گئی ہے وہ سب کے سب نفسانی خواہشات کے زمرے میں آتے ہیں اور نفسانی خواہشات کا سرچشمہ خدا کی معرفت اور اس کا خوف نہ ہونا ہے، وہ سات سرچشمے یہ ہیں:

زین للناس حب الشهوت من النسآء والبنین والقنا طیر المقنطرة

---

[1] تفسیر درمنثور۔ج۵ص۷۲

من الذهب والفضة والخيل المسومة والانعام والحرث۔

عورتوں، اولاد، سونے اور چاندی کے ذخیروں، ممتاز گھوڑوں، جانوروں اور کھیتی باڑی کی محبت کو لوگوں کی نظروں میں جلوہ گر کیا گیا ہے۔

سورہ نازعات کی زیر نظر آیت میں ''مقام رب'' سے کیا مراد ہے، مفسرین نے اس سلسلے میں متعدد تفسیریں بیان کی ہیں، بعض اسے قیامت کی منزلوں کی طرف اشارہ قرار دیتے ہیں جن میں سے ایک حساب کی منزل ہے، بعض دوسرے مفسرین اُسے خدا کے علم کی بلندی اور بندوں کے اعمال پر اس کی نظر کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں، بعض اس سے مراد اُس کی عدالت لیتے ہیں، حقیقت میں ان سب تفاسیر کی برگشت اپنے گناہوں اور اعمال سے ڈرنے کی طرف ہے، کیونکہ خدا ''ارحم الراحمین'' ہے اُس کی ذات میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس سے انسان ڈرے، لیکن جیسا کہ مجرم ایک منصف قاضی کو دیکھ کر ڈرتے ہیں اور عدالت اور محاسبے کے نام سے گھبراتے ہیں اسی طرح گنہگار بھی خدا کے مقام عدل، حساب اور علم سے ڈرتے ہیں (غور کیجئے گا)۔ حقیقت میں اس دنیا میں بھی ایک دوزخ ہے جو کہ خواہشات کا دوزخ ہے، آخرت میں بھی ایک دوزخ ہے جو سزاؤں کا دوزخ ہے، اس دوزخ کا سرچشمہ وہی پہلے والا دوزخ ہے۔

اس گفتگو کو ہم حضرت امام جعفر صادقؑ کی اس حدیث پر ختم کرتے ہیں:

من علم ان الله يراه ويعمع ما يقول۔ ويعلم ما يعمله من خير اوشر فيحجزه ذلك عن القبيح من الاعمال، فذلك الذى خاف مقام ربه ونهى النفس عن الهوى۔

جو یہ جانتا ہو کہ خدا اُسے دیکھ رہا ہے، جو کچھ وہ کہتا ہے وہ سن رہا ہے اور جو نیکی یا برائی وہ انجام دیتا ہے خدا اُسے جانتا ہے، اور یہ توجہ اُسے برے اعمال سے روک لے، تو یہ وہی شخص ہے جو اپنے رب کے مقام سے خوف زدہ ہے اور اپنے آپ کو نفسانی خواہشات سے روکتا ہے۔[1]

۶۔ ایمان میں سبقت

ہر نئے الٰہی مکتب کی پیدائش سے کئی فرسودہ روایات ٹوٹ جاتی ہیں، بالخصوص اسلام تو ایک ایسے معاشرے میں رونما ہوا جو برائیوں سے پر تھا اور جھوٹے امتیازات پر مبنی تھا، واضح ہے کہ ایسے دین کے پیغمبر پر پہلے ایمان لانا مشکل کام ہے، اس کے لئے بہت زیادہ دلیری اور ہمت کی ضرورت ہے، کیونکہ ہمیشہ ایمان میں سبقت لے جانے والے لوگوں پر ہی متعصب جاہل حملہ آوار ہوتے ہیں، چونکہ یہ لوگ اقلیت میں

---

[1] تفسیر نور الثقلین، ج ۵ ص ۱۹۷، حدیث ۴۸، (اصول کافی، ج ۲ ص ۷۰ باب الخوف والرجاء، حدیث ۱۰)۔

ہوتے ہیں اس لئے اُن کی جان اور مال کو ہمیشہ خطرہ رہتا ہے۔

علاوہ ازیں وہ دوسروں کے لئے بھی اسوۂ عمل بن جاتے ہیں جس سے دنیا میں دین حق تیزی سے پھیلتا ہے، ان چار وجوہات کی بناء پر سابقین کا درجہ بہت بلند ہے، اسی لئے قرآن نے ان سے جنت کا یقینی وعدہ کیا ہے، سورہ واقعہ کی آیت ۱۰ میں ارشاد ہوتا ہے:

والسابقون السابقون۔ اولٓئك المقربون۔ فی جنت النعیم۔ [۱]

اور آگے بڑھنے والے ہی سب سے آگے ہوں گے، وہی اللہ تعالیٰ کے مقرب ہوں گے۔ وہ نعمتوں والی جنت میں ہوں گے۔

یہ اس صورت میں ہے جب ہم ''سابقون'' کا معنی ایمان میں سبقت لے جانے والے کریں، لیکن بعض مفسرین نے اس کا معنی خدا کی اطاعت میں سبقت لے جانا کیا ہے، یا پنجگانہ نمازوں یا جہاد یا ہجرت یا توبہ میں سبقت لے جانا کیا ہے، یہ مفہوم بھی ہمارے مقصد کے لئے دلیل بن سکتا ہے کیونکہ ان اعمال میں سبقت لے جانے والے لوگ وہی ہیں جو دوسروں کے لئے اسوہ اور مثال ہیں، اسی طرح وہ لوگ جو ایثار پیشہ، شجاع اور خدا پر بھروسہ کرنے والے ہیں وہ جنت کی نعمات سے بہرہ مند ہونے کے سزاوار ہیں۔

روایات میں ''سابقون'' سے مراد حضرت علیؑ کو لیا گیا ہے کہ جو مردوں میں سب سے پہلے ایمان لانے والے تھے اور کبھی اس سے مراد چار حضرات ''ہابیل''، ''مومن آل فرعون''، ''حبیب نجار''، ''اور حضرت علیؑ لئے گئے ہیں، ان میں سے ہر ایک اپنے دور میں ایمان میں سبقت لے جانے اور جہاد اور اچھے اعمال کا روشن اور واضح ترین مصداق ہے۔ [۲]

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ان آیات کے مطابق خدا نے سب سے پہلی نعمت جو انہیں عطا کی ہے وہ اپنے قرب کی نعمت ہے ''اولٓئک المقربون'' اور یہ نعمت عظیم نعمتوں اور جنات النعیم سے بڑھ کر ہے۔

''جنات'' (جنت کے باغات) کا ذکر بغیر ''نعیم'' کے کہ جو نعمت کی جمع ہے، مقصود سمجھانے کے لئے کافی ہے، لیکن ان دونوں لفظوں کو اکٹھا ذکر کیا گیا ہے جو جنت کی نعمتوں پر زیادہ تاکید اور اہمیت کے لئے ہے، یہ تعبیر ایک اور مطلب کی طرف اشارہ بھی ہو سکتی ہے کہ نعمت کا مرکز صرف جنتی باغات ہی ہیں، دنیاوی باغات کے خلاف کہ اُن کی حفاظت اور پرورش کے لئے بہت زیادہ محنت کرنا پڑتی ہے اور ہر لمحے اُن کے تباہ اور خراب ہونے کا دھڑکا بھی لگا رہتا ہے۔

---

[۱] حدید، ۲۱۔ آل عمران، ۱۳۳ میں بھی یہی معنیٰ آیا ہے۔

[۲] ان حدیثوں کے لئے احقاق الحق، ج ۳، ص ۱۱۴، ج ۱۵ ص ۳۴۵ کے بعد اور تفسیر نور الثقلین ج ۵، ص ۲۰۹ حدیث ۱۸، ۱۹، ۲۰ اور ۲۱ کو ملاحظہ کیا جائے۔

۷۔ ہجرت ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ جہاد:

ہجرت سے مراد ”کفر، شرک، ظلم اور گناہ کے مرکز سے دور ہو جانا ہے، بہت سے مقامات پر مومنوں اور نیک و پاکیزہ لوگوں کی مشکلات کا حل صرف ہجرت میں پنہاں ہوتا ہے، وہ ایسے ماحول سے دور جا کر اپنے آپ کو بناتے ہیں، اپنی آبادی کو تیار کرتے ہیں، قوت جمع کرتے ہیں تاکہ شرک اور ظلم کے نمائندوں کے ساتھ جہاد و مبارزہ کر سکیں۔

یہ کام مسلمانوں نے دو مرتبہ انجام دیا ہے، مسلمانوں کی ایک مخصوص جماعت کی مکہ سے حبشہ کی طرف ہجرت اور پھر سب مسلمانوں کی مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت جو تاریخ اسلام میں ایک درخشاں باب کا اضافہ تھی۔

واضح ہے کہ گھر بار، پیاروں، دوستوں، کام اور وطن کو چھوڑنا بہت مشکل کام ہے اور پھر جہاد اور کفر و فساد کی سرزمین پر حملے کی تیاری اس سے بڑھ کر ایک اور مشکل کام ہے، اسی لئے قرآن نے مہاجرین کو واضح طور پر جنت کی نوید سنائی ہے، سورہ توبہ کی ۲۰ سے لے کر ۲۲ آیت تک میں ارشاد ہوتا ہے:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ [۱]

وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور خدا کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کیا اُن کا مرتبہ خدا کے نزدیک بلند ہے، وہی کامیاب ہیں، اُن کا رب انہیں اپنی رحمت، خوشنودی اور جنت کے اُن باغات کی خوشخبری دیتا ہے جن میں جاودانی نعمات ہیں۔

اس آیت میں ان لوگوں کے متعلق گفتگو ہے جو ”ایمان“، ”ہجرت“ اور ”جہاد“ جیسے اوصاف کے حامل ہیں، (البتہ ان میں سے ہر ایک صفت دوسری صفت کے ساتھ علت اور معلول کے رابطے کی حامل ہے یعنی اُن کا ایمان ہجرت کا سبب بنا اور اُن کی ہجرت جہاد کا پیش خیمہ ثابت ہوئی)، اُن کی جزا کے طور پر بھی تین چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے، رحمت الٰہی، خوشنودی حق اور جنت کے پرنعمت باغات، اس لحاظ سے ہر نیک کام کے بدلے میں ایک عظیم نعمت اور صلے سے انہیں نوازا گیا، ایمان گناہوں کی بخشش کا باعث بنا، تو ہجرت رب کی خوشنودی کا موجب بنی، جب کہ مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد جنت کے پرنعمت باغات کے حصول کا سبب بنا۔

مفسرین کے درمیان مشہور ہے کہ ”شیبہ“ اور ”عباس“ دونوں ایک دوسرے پر برتری کا دعوے کر رہے تھے، ایک کہہ رہا تھا:

---

[۱] یہی معنی توبہ، ۱۰۰ میں بھی آیا ہے۔

میں خانہ کعبہ کا کلید بردار اور مسجد الحرام کا متولی ہوں۔

جب کہ دوسرا کہہ رہا تھا:

حاجیوں کو پانی پلانے کا عظیم منصب میرے پاس ہے۔

اسی دوران میں حضرت علیؑ نے کہا:

مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں ایمان لایا، ہجرت کی اور جہاد میں حصہ لیا۔

چنانچہ مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی جس نے باقی سب پر علیؑ کی برتری اور فضیلت کو ثابت کر دیا۔[1]

مفسرین نے اس سلسلے میں کئی اقوال ذکر کئے ہیں کہ قرآن مجید نے مہاجر و مجاہد مومنین کا مقام دوسروں سے کیسے بلند قرار دیا ہے جب کہ جو لوگ مومن نہیں ہیں وہ اصلا کسی مقام کے حامل نہیں ہیں، لیکن ایک مختصر سا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ ایک یہ کہ صفات تفضیلی میں ایسا اکثر ہوتا ہے کہ دوسری جانب کے لئے کسی قسم کی فضیلت نہیں ہوتی جیسے:

ولعبد مومن خیر من مشرك

بندہ مومن مشرک سے بہتر ہے۔ (بقرہ، ۲۲۱)

اس طرح کی تعبیرات قرآن، روایات اور روزمرہ کے محاورات میں بہت زیادہ استعمال ہوتی ہیں، دوسرا یہ کہ حاج کو پانی پلانا اور مسجد الحرام کو آباد کرنا بذات خود ایک فضیلت والا کام ہے، جو کوئی بھی اسے انجام دینے والا ہو، تاہم اگر یہ کام انجام دینے والے کافر اور بے ایمان ہوں تو اُن کا یہ نیک عمل حبط اور بے اثر ہو جاتا ہے۔

۸۔ مصیبتوں میں صبر و تحمل:

پامردی تمام مثبت کاموں کی بنیاد اور ہر اطاعت کی اساس ہے، اسی لئے جنت میں جانے کا ایک سبب استقامت اور پامردی کو قرار دیا گیا ہے، سورہ دہر کی آیت ۱۲ میں ارشاد ہوتا ہے:

"وجزاھم بما صبروا جنة وحریرا"[2]

---

[1] شواہد التنزیل میں ابوالقاسم حسکانی نے زیر نظر آیت کے ذیل میں ص ۲۴۴ اور اس کے بعد (البتہ خلاصے کے ساتھ) اسی مضمون کو تھوڑے سے فرق کے ساتھ اہل سنت کی متعدد کتابوں سے ذکر کیا ہے۔ (مزید تفصیل کے لئے احقاق الحق ج ۳ ص ۱۲۲، ص ۱۲۷ کی طرف رجوع کیا جائے)۔

[2] یہی معنی رعد ۲۱ تا ۲۴ اور فرقان ۷۵ میں بھی آیا ہے۔

خدا نے اُن (نیک بندوں) کو اُن کے صبر کی وجہ سے بہشت اور حریر کے لباس (بہشتی کپڑے) صلے کے طور پر دیئے ہیں۔

جب وہ جنت میں داخل ہوں گے تو فرشتے انہیں خوش آمدید کہیں گے جو ان صابر لوگوں کی عظمت اور بلندی کی دلیل ہوگی، ان سے کہیں گے:

"سلام علیکم بما صبرتم" (رعد: ۲۴)

تم پر سلامتی، اس صبر اور استقامت کی وجہ سے جس کا تم نے مظاہرہ کیا۔

زیر نظر آیت سورہ دھر کی آیات میں سے ہے، بہت سے شیعہ اور سنی مفسرین کے بقول یہ علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ، اور حسینؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے، کیونکہ انہوں نے صبر کے بہت بلند مرتبے کا مظاہرہ کیا، تین دن مسلسل پانی کے ساتھ روزہ افطار کیا اور اپنا کھانا مسکین، یتیم اور اسیر کو دے دیا، یہی اطاعت میں صبر ہے۔

واضح ہے کہ زندگی کے مصائب اور تکالیف کے مقابلے میں صبر اور مختلف مشکلات میں استقامت اور اسی طرح گناہ پر اُبھارنے والے عوامل کے مقابلے میں صبر و استقامت بھی جنت کی کنجی شمار ہوتے ہیں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس آیت میں جنت کی تمام عظیم نعمتوں میں سے خوبصورت اور قیمتی لباسوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، یہ یا تو اس لئے ہے کہ صابرین کی یہ جماعت اپنا کھانا بھوکوں کو کھلانے کے ساتھ ساتھ اپنے لباس بھی انہیں عطا کر دیتے تھے یا اس لئے کہ انسان کا ظاہری جمال اور خوبصورتی لباس کے ساتھ ہے جیسا کہ انسان کے باطن کی خوبصورتی تقویٰ اور پرہیزگاری کے ساتھ ہے جسے قرآن میں ''لباس تقویٰ'' کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

۹۔ جادہ مستقیم پر ایمان اور بقاء

بعض دوسری آیات میں ایمان و اطاعت کے لئے سیدھے راستے پر گامزن رہنے کو جنت میں داخلے کا سبب قرار دیا گیا ہے، سورہ احقاف کی آیت ۱۳ اور ۱۴ میں ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۝۱۴

[۴۶:۱۴]

جنھوں نے کہا ہمارا پروردگار خدا ہے، پھر انہوں نے استقامت کی تو اُن کے لئے خوف ہے اور نہ ہی غم، وہ اصحاب

جنت میں اور اُس میں ہمیشہ کے لئے رہیں گے، یہ اُن اعمال کا صلہ ہے جو انہوں نے انجام دیئے۔ [۱]

''استقاموا'' کا مادہ ''استقامت'' ہے جس کا معنی سیدھے اور صحیح راستے پر ثابت قدم رہنا ہے، دوسرے الفاظ میں اس میں اعتدال اور انحراف سے دوری کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے اور اسی طرح ثابت قدم رہنے کا بھی، اگر بعض ارباب لغت نے اس کا معنی اعتدال اور میانہ روی کیا ہے تو وہ بھی اسی لحاظ سے ہے۔

راغب مفردات میں کہتے ہیں:

استقامت اس راہی کے لئے کہا جاتا ہے جو سیدھے راستہ پر گامزن ہو، اسی لئے راہ حق کو ''صراط مستقیم'' کہتے ہیں، انسان کی استقامت کا لازمہ صراط مستقیم پر ہونا ہی ہے۔ [۲]

لہٰذا استقامت کے مفہوم میں راستہ صاف ہونے کا معنی بھی پایا جاتا ہے اور اس کے پائیدار اور مضبوط ہونے کا بھی، لہٰذا جنت میں داخل ہونے کا ایک سبب حق اور سچ کے راستے پر گامزن اور ثابت قدم رہنا ہے۔

بعض روایات میں جو آئمہ معصومین سے اس آیت کی تفسیر کے سلسلے میں مروی ہیں اُن میں ہے کہ:

استقاموا علی ولایۃ امیرالمومنین۔

یعنی مراد علیؑ کی ولایت پر ثابت قدم رہنا ہے (جو کہ حقیقی اسلام کا جادہ حق ہے) [۳]

پہلے جو ایمان کی بات کی گئی ہے اور کہا گیا ہے (قالو ربنا اللہ) اور پھر صحیح راستے پر استقامت کو ''ثم'' کے ذریعے عطف کیا گیا ہے جو کہ عموماً فاصلے کے لئے استعمال ہوتا ہے، اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایسا عمل ایسے ایمان کا ہی نتیجہ ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ انسان کو پریشانی یا توان کاموں کی وجہ سے ہوتی ہے جو اس سے پہلے سرزد ہوئے ہیں، اُن پر وہ غمگین ہوتا ہے اور کبھی اُس کی پریشانی کا سبب آئندہ آنے والے امور ہوتے ہیں، اُن سے خوف زدہ ہوتا ہے، قرآن زیر نظر آیت میں کہتا ہے کہ ''جو ان دو صفات کے حامل ہیں نہ تو انہیں گزشتہ کا کوئی غم ہے اور نہ ہی آئندہ کا کوئی خوف''۔

لا خوف علیهم ولا هم یحزنون

گفتگو کے اس سلسلے کو پیغمبر اسلامؐ کی اس حدیث پر ختم کرتے ہیں:

---

[۱] آیات ۳۰، ۳۱ سورہ فصلت میں بھی اسی معنی کو بیان کیا گیا ہے۔

[۲] مفردات راغب، مادہ ''قوم''۔

[۳] تفسیر علی بن ابراہیم۔ سورہ حم سجدہ کی آیہ کے ذیل میں جو کہ مذکورہ بالا آیت سے ملتی جلتی ہے ج ۲، ص ۲۶۵ اسی طرح زیر نظر آیت کے ذیل میں، ص ۲۹۷۔

کسی نے آنحضرتؐ کی خدمت میں عرض کیا:

مجھے وہ عمل بتایئے جس کے باعث میں جنت میں داخل ہوجاؤں۔

آنحضرتؐ نے فرمایا:

"قل ربی اللہ ثم استقم"

کہو میرا رب اللہ ہے اور پھر اس پر قائم رہو (کہ جنت میں داخل ہونے کا سرمایہ یہی ہے)۔

پھر اس نے سوال کیا:

سب سے خطرناک چیز کیا ہے جس سے مجھے بچنا چاہیے؟

آپؐ نے اپنی زبان کو پکڑا اور فرمایا: "یہ" [۱]

۱۰۔ خدا اور رسولؐ کی اطاعت

جنت میں داخلے کی ایک کنجی خدا اور رسول خداؐ کے فرمان کی اطاعت وفرمانبرداری ہے، سورہ نساء کی آیت ۱۳ میں ارشاد ہوتا ہے:

ومن یطع اللہ ورسولہ یدخلہ جنت تجری من تحتها الانہر خلدین فیها و ذلك الفوز العظیم۔

جو خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرے اُسے جنت کے باغات میں داخل کیا جائے گا جن کے نیچے ہمیشہ نہریں جاری ہیں، اُس میں ہمیشہ کے لئے رہے گا اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ [۲]

"جنات" کی تعبیر جنت کے کئی باغات ہونے پر دلیل ہے جن میں عرفاء، صلحاء، نیک اور پاک لوگوں کا مقام ہوگا۔

"تجری من تحتها الانہر" کی تعبیر اُن باغات کے سرسبز اور انتہائی خوبصورت ہونے کی دلیل ہے کیونکہ جو درخت نہروں کے کنارے پر ہوتے ہیں وہ ہمیشہ سرسبز اور شاداب ہوتے ہیں۔

"خلدین فیها" کی تعبیر نعمتوں کے ایک ختم نہ ہونے والے سلسلے کی طرف اشارہ کررہی ہے کیونکہ معمولاً نعمتوں کے ختم ہوجانے اور فنا ہونے کا خطرہ انسان کو پریشان رکھتا ہے، یہ تعبیر اس دھڑکے کو بھی ختم کررہی ہے، یہاں پر صیغہ جمع کو لانا اس بات کی نشاندہی کررہا ہے کہ جنتی لوگ آپس میں مل جل کر رہنے اور پیار ومحبت سے زندگی گذارنے کی نعمت سے بہرہ مند ہوں گے، جب کہ بعد والی آیت جس میں خدا اور رسول کی

[۱] تفسیر ابوالفتوح رازی، ج۱۰، ص ۲۲۔

[۲] فتح ۱۷ میں بھی یہی معنیٰ آیا ہے۔

نافرمانی کر کے جہنم میں ہمیشہ کے لئے رہنے کا تذکرہ ہے وہاں پر ”خالدا“ کو ”مفرد“ کی صورت میں ذکر کیا گیا ہے جو اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ وہ لوگ جہنم میں تنہائی کے عذاب سے بھی دوچار ہوں گے، گویا ہر ایک جہنم میں قید تنہائی کا شکار ہوگا۔

۱۱۔اخلاص:

عقیدہ، عمل اور نیت میں خلوص سے کام لینا بھی جنت میں جانے کا ایک عامل ہے، سورہ صافات کی آیت ۳۹ تا ۴۳ میں ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُوْمٌ فَوَاكِهُ وَهُمْ مُّكْرَمُوْنَ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ

جو کچھ تم نے انجام دیا ہے تمہیں اسی کا بدلہ دیا جائے گا، مگر خدا کے مخلص بندے کہ جن کے لئے ایک معین اور مخصوص رزق ہے، مختلف میوے ہیں اور اُن کی تکریم کی جائے گی جنت کے نعمات سے بھرے ہوئے باغات ہیں۔

ان آیات میں جہنمیوں کے دردناک عذاب کی طرف اشارہ کرنے کے بعد ”مخلصین“ کو جدا کر لیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے کہ وہ ان تمام سزاؤں سے محفوظ ہیں۔ [1]

لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ مخلصین (لام پر زبر کے ساتھ) کون لوگ ہیں؟ کلام مجید کی آیات میں غور وفکر کے ساتھ یہ نکتہ واضح ہوتا ہے کہ مخلِص (لام پر زیر کے ساتھ) وہ ہے جو اپنے آپ اپنے اعمال اور اپنی نیت کو خالص کر لے، یہ عموماً ایسے موارد پر استعمال ہوتا ہے جن میں انسان خودسازی کے مراحل طے کر رہا ہے جب کہ مخلَص (لام پر زبر کے ساتھ) وہ ہے جس کو خالص کر دیا گیا ہو، یہ گویا اُس شخص کو کہا جاتا ہے جو ایمان، معرفت اور عمل کے لحاظ سے اس بلند وعظیم مرتبہ تک پہنچ چکا ہو جو شیطانی وسوسوں کے اثر انداز ہونے سے محفوظ ہو، ابلیس اس کے مقابلے میں شکست کھا چکا ہو، چنانچہ قرآن کریم ابلیس سے یہ بات ذکر کرتا ہے:

فبعزتك لا غوينهم اجمعين الا عبادك منهم المخلصين۔

تیری عزت کی قسم! میں اُن سب کو تیرے مخلص بندوں کے سوا گمراہ کروں گا۔ (ص، ۸۳)

حقیقت میں انسان کے وجود کی ناخالص باتیں دو طرح کی ہیں، بعض تو اُن میں سے قابل تشخیص اور قابل رفع ہیں جب کہ بعض اس قدر باریک اور مخفی ہیں کہ یا تو انسان پر پوشیدہ رہتی ہیں یا اگر آشکار ہو بھی جائیں تو انسان انہیں دور کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، جب انسان

---

[1] واضح ہے کہ اس صورت میں یہ استثناء منقطع ہے، بہت سے مفسرین نے بھی یہی کہا ہے لیکن اگر ”ما تجزون“ کا خطاب تمام انسانوں کے لئے ہو جس میں مومن اور کافر سب شامل ہیں تو اس صورت میں یہ استثناء متصل ہوگا، لیکن یہ مطلب کچھ بعید محسوس ہوتا ہے۔

جادہ اخلاص پر قدم رکھتا ہے اور پہلی قسم کی ناخالصیوں کو اپنی روح، جان اور اعمال سے دور کرتا ہے تو خدا اپنے لطف وکرم سے دوسری قسم کی نا خالص چیزوں کو اس سے دور کر دیتا ہے، پھر ہی اُس کا نام مخلص (خالص کہا گیا) رکھا جاتا ہے۔

خدا نے اس جماعت کو اُن امتیازات سے نوازا ہے جو اس نے اپنے دوسرے بندوں میں سے کسی کو بھی عطا نہیں کئے۔

مثلاً زیر نظر آیات کے مطابق خدا انہیں اپنے مخفی الطاف کا مخصوص رزق عطا کرتا ہے، وہ اس کی ذات پاک کے جلوے سے سرور حاصل کرتے ہیں، اس کے باطن کے شہود سے مست ہو جاتے ہیں، اُن کا دل شوق خدا کے پیانے سے لبریز ہوتا ہے، وہ سر سے لے کر پاؤں تک اس کے عشق اور وصال کے جذبے سے مخمور ہوتے ہیں یہ وہی ہے جسے ایک اشارے میں بیان کیا گیا ہے کہ:

اولئك لهم رزق معلوم

اُن کا ایک اور امتیاز شیطانی وسوسوں سے محفوظ رہنا ہے، اس کی طرف بھی اوپر اشارہ ہو چکا ہے۔

ان کا تیسرا امتیاز عرفان کے بلند مقام تک پہنچ جانا ہے، اُن کی معرفت کا یہ مقام ہے کہ وہ خدا کی صحیح توصیف کر سکتے ہیں، وہ توصیف نہیں جس میں شرک جلی یا خفی ہو۔

صافات ۱۵۹، ۱۶۰ میں ارشاد ہوتا ہے:

سُبۡحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یَصِفُوۡنَ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الۡمُخۡلَصِیۡنَ

خدا اس توصیف سے پاک ہے جو وہ کرتے ہیں مگر خدا کے مخلص بندے (کہ جو ہر عیب اور نقص سے پاک خدا کی توصیف کرتے ہیں)۔

اس لحاظ سے اُن کی معرفت سب سے بلند، شیطان اور نفسانی خواہشات کے مقابلے میں اُن کا دفاع سب سے بہتر اور قیامت میں اُن کی پاداش سب سے بڑھ کر ہے اور یہی مخلصین کی جزا ہے۔

اللهم اجعلنا من المخلصين۔ بحق محمد واله الطاهرين۔

۱۲۔صدق وسچائی

انسانی اعمال میں صدق وسچائی سے بڑھ کر کوئی اور عمل خوبصورت اور جاذب نظر نہیں ہے، روایات سے واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ عمل کے ترازو میں بھی اس کا وزن بہت بھاری ہے کیونکہ اولیاء اللہ کی ایک بلند ترین صفت یہی صدق بیان کی گئی ہے، قرآن بھی اسے جنت میں جانے کی ایک اہم کنجی قرار دیتا ہے۔ مائدہ ۱۱۹ میں ارشاد ہوتا ہے:

هٰذَا یَوۡمُ یَنۡفَعُ الصّٰدِقِیۡنَ صِدۡقُهُمۡ ؕ لَهُمۡ جَنّٰتٌ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ

خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ

آج (قیامت کا دن) وہ دن ہے کہ سچوں کا سچ بولنا انہیں فائدہ پہنچائے گا، اُن کے لئے جنت کے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، وہ اس میں ہمیشہ کے لئے رہیں گے۔ [۱]

واضح ہے کہ اس سے مراد دنیا میں سچ بولنا ہے، عقیدے میں سچائی، گفتار میں سچائی اور عمل میں سچائی، ہر ایک تقویٰ کی ایک مسلم علامت ہے، وگرنہ آخرت میں تو صدق اور سچائی کا حکم نہیں دیا گیا، لہذا وہاں پر اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا، علاوہ ازیں اس دن حالات کچھ اس طرح کے ہوں گے کہ سچ بولنے کے علاوہ چارہ ہی نہیں ہوگا، اگر گنہگار بھی وقتی طور پر حقائق کا انکار کریں گے تو جلد ہی متوجہ ہوجائیں گے کہ اُن کی یہ کوشش فضول ہے، لہٰذا آخرکار اپنے تمام گناہوں کا اعتراف کرلیں گے۔

اس تعبیر سے یہ بھی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ تمام نیک اعمال کا خلاصہ سچ اور صدق میں کیا جاسکتا ہے، تھوڑے سے منطقی غور وفکر سے بھی یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کیونکہ تمام گناہوں کی برگشت اسلام اور ایمان کے دعویٰ میں سچے نہ ہونے کی طرف ہے، وگرنہ جو شخص ایک آئین اور قانون کو باقاعدہ طور پر مانتا ہو، وہ عمل کے مقام پر اس کی خلاف ورزی کیسے کرسکتا ہے۔

صدق وسچائی کی اہمیت اس لیے ہے کہ اسے افراد کے امتحان اور آزمائش کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے، رسول اسلامؐ کی ایک حدیث میں ہے کہ:

لا تنظروا الی کثرۃ صلاتھم و صومھم و کثرۃ الحج والمعروف وطنطنتھم باللیل ولکن انظروا الی صدق الحدیث واداء الامانۃ۔

ان کے نماز اور روزہ، حج، نیک کاموں اور رات میں ان کی (عبادت کی) آوازوں کی طرف نہ دیکھو بلکہ اُن کی بات کی سچائی اور امانت کی ادائیگی کی طرف دیکھو۔ [۲]

رسول اکرمؐ کی ایک حدیث ہے کہ:

ان الصدق یھدی الی البر والبر یھدی الی الجنۃ

صدق نیکی کی طرف لے جاتا ہے اور نیکی جنت کی طرف۔ [۳]

---

[۱] اس آیت میں ''ہذا'' مبتداء اور ''یوم'' اس کی خبر ہے اور ''ینفع'' ۔۔۔۔۔۔ کا جملہ ''یوم'' کے لئے مضاف الیہ ہے۔

[۲] بحارالانوار، ج ۶۸ ص ۹، حدیث ۱۳۔

[۳] محجۃ البیضاء، ج ۸ ص ۱۴۰۔

اس لحاظ سے صدق وسچائی جنت کی ایک کلید اور کنجی ہے۔

۱۳۔خودسازی اور تزکیہ نفس:

بے شک جنت نیک اور پاک لوگوں کی جگہ ہے، اسی لئے قرآن میں ایسے لوگوں کی پاداش اور صلے کے سلسلے میں ہی جنت کا ذکر ہوا ہے، سورہ طہٰ آیت ۷۵، ۷۶ میں دربار فرعون کے اُن جادوگروں کی بات ذکر کی جاتی ہے جو موسیٰ کے اُس معجزے پر ایمان لائے جو اُن کے جادو پر غالب آ گیا تھا، فرعون اور فرعون پرست لوگوں کی دھمکیوں کے جواب میں ہے:

وَمَنۡ يَّاۡتِهٖ مُؤۡمِنًا قَدۡ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓـئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الۡعُلٰى جَنّٰتُ عَدۡنٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا‌ ؕ وَذٰ لِكَ جَزٰٓؤُا مَنۡ تَزَكّٰى

جو لوگ ایمان اور عمل صالح کے ساتھ اپنے رب کے سامنے حاضر ہوتے ہیں، اُن کے لئے بلند درجات ہیں، یہ بلند درجات وہی جنت کے جاودانی باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، وہ اُن میں ہمیشہ کے لئے رہیں گے یہی جزاء ہے اس شخص کی جو اپنے آپ کو پاکیزہ کرے۔

''تزکی'' کا مادہ ''تزکیہ'' ہے جس کا معنی پاک کرنا ہے، عقیدے، گفتار اور عمل کی پاکیزگی اس میں شامل ہے، حقیقت میں جنت ایک ایسی جگہ ہے جو ہر لحاظ سے پاک و پاکیزہ ہے، لہٰذا یہ بات بالکل فطری ہے کہ پاکیزگی سے تہی دست لوگ اس میں داخل نہیں ہوسکیں گے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس آیت میں جنت کے بلند درجات اُن لوگوں کے لئے قرار دیئے گئے ہیں، جو ایمان، اچھے اعمال، اور تزکیہ نفس کے حامل ہوں گے، لہٰذا اس میں کوئی اشکال نہیں ہے کہ ''نیچے والے درجات'' اُن لوگوں کے لئے ہوں جو ایمان تو رکھتے ہیں لیکن کبھی اچھے کام انجام دیتے ہیں اور کبھی برے کاموں کا ارتکاب کرتے ہیں (لیکن جب تک وہ بھی پاک و پاکیزہ نہیں ہوجائیں گے اس وقت تک پاک لوگوں کی جگہ یعنی جنت میں داخل نہیں ہوسکیں گے)۔

اس نکتے کی طرف توجہ بھی ضروری ہے کہ یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ یہ آیات دربار فرعون کے جادوگروں کی زبان سے نہ ہوں بلکہ بلاواسطہ خدا کی بات ہو، بہرحال ہر دو کا نتیجہ یہاں پر ایک ہی ہے۔

۱۴۔انفاق اور استغفار

گناہوں سے توبہ، خدا کی طرف رجوع، تنگدستی اور خوشحالی کے دوران خدا کی راہ میں خرچ کرنا، غصے کو ٹھنڈا کرنا اور عفو و درگذر سے کام لینا اور گناہ کا تکرار نہ کرنا، یہ سب ہی ایسی باتیں ہیں جن پر عمل کرنے سے انسان کو جنت کی خوشخبری سنائی گئی ہے۔ آل عمران (۱۳۳ تا ۱۳۶) میں ارشاد ہوتا ہے:

وسارعوا الی مغفرة من ربکم وجنة عرضها السموات والارض اعدت للمتقین۔

اپنے رب کی مغفرت اوراس جنت کی طرف ایک دوسرے سے آگے بڑھوجس کا پھیلاؤ (سب) آسمانوں اور (ساری) زمین جتنا ہےاور جو پرہیز گاروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

پھران لوگوں کا ذکر ہے جوفراخی اور تنگدستی دونوں حالتوں میں خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، اپنے غصے کوروک لیتے ہیں، گنہگاروں سے درگذر کرتے ہیں، یہ نیک کام کرنے والے ہیں، یہ لوگ جب کوئی برا کام کریں یا اپنے آپ پرظلم کریں تو خدا کی یاد میں مصروف ہو جاتے ہیں اوراپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں:

الذین ینفقون فی اسرآء والضرآء والکاظمین الغیظ والعافین عن الناس والله یحب المحسنین۔ والذین اذا فعلوا فاحشة اوظلموا انفسهم ذکرو الله فاستغفرو لذنوبهم.........)

آخر میں انہیں ایک بار پھر جنت کی نوید دی گئی ہے ارشاد ہوتا ہے:

اولٓئك جزآء هم مغفرة من ربهم وجنت تجری من تحتها الانهر.......

ان کی جزاان کے پروردگار کی مغفرت اور جنت کے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔

مغفرت کی طرف ایک دوسرے سے آگے بڑھنا اور جلدی کرنا اسباب مغفرت کی طرف جلدی سے ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی طرف اشارہ ہے، لہٰذا بعض نے اس کی تفسیر اسلام کی ہے، بعض نے فرائض کی بجا آوری، بعض نے ہجرت، بعض نے پنجگانہ نمازیں، بعض نے جہاد اور بعض نے توبہ سے اس کی تفسیر کی ہے، ان میں سے ہر ایک امر خدا کی طرف سے مغفرت کا باعث بنتا ہے، یہ تمام امور مجموعی طور پر جنت کی تیزی سے بڑھنے کا وسیلہ ہیں، لہٰذا بعد کی آیات میں انفاق، استغفار، عفوو درگذر اور احسان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو مغفرت کے اسباب کا نمایاں عنوان ہیں اور جنت کے دروازوں کی کنجیاں ہیں۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ یہی معنی اس مختصر سے فرق کے ساتھ کہ ''سارعوا'' کے بجائے ''سابقوا'' آیا ہے، سورہ حدید، ۲۱ میں بیان ہوا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

سابقوا الی مغفرة من ربکم و جنة عرضها کعرض السمآء والارض۔

''سارعوا'' جو کہ باب ''مفاعله'' میں سے ہے اور جس کا معنی ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنا ہے،

کالازمی نتیجہ مسابقہ اورایک دوسرے سے آگے نکلنا ہے (غور کیجئے گا)۔

لیکن بعض مفسرین نے ''سارعوا'' کوجلدی یا تیز رفتاری کے معنی میں لیا ہے، انہوں نے باب مفاعلہ کے معنی سے چشم پوشی کی ہے۔

بہر حال یہ تعبیرات اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ دنیا مقابلے اورا یکدوسرے سے آگے بڑھنے کا میدان ہے، اس مقابلے کا آخری کنارہ خدا کی بخشش اور جنت تک پہنچنا ہے اور وہ جنت بہت وسیع اور بے نظیر ہے۔

جنت کی وسعت کے سلسلے میں اسی جلد میں گفتگو ہوگی۔

۱۵۔خوف خدا

خوف خدا یعنی اس کی عدالت، حساب وکتاب اور سزا سے ڈرنا مختلف گناہوں کے مقابلے میں ایک ڈھال کا کام دیتا ہے اور گناہوں سے روکنے کے لئے ایک موثر عامل ہے، اسی لئے اُسے جنت کی ایک کنجی شمار کیا گیا ہے، سورہ رحمن کی آیت ۴۶ میں ارشاد ہوتا ہے:

ولمن خاف مقام ربه جنتان۔

جو اپنے رب کے مقام سے ڈرے اس کے لئے جنت کے دو باغ ہیں۔

''مقامه ربه'' کی تفسیر میں دو احتمال ذکر کئے گئے ہیں، ایک تو یہ کہا گیا ہے کہ اس سے مراد انسان کے تمام اعمال اور نیتوں پر خدا کا احاطہ علمی ہے اور دوسرا یہ کہا گیا ہے کہ اس سے مراد انسان کا قیامت کے دن خدا کی عدالت میں کھڑا ہونا ہے، اس صورت میں آیت میں کچھ الفاظ کو محذوف سمجھنا پڑے گا، اور عبارت یوں ہوگی ''مقامه بین یدی ربه'') [۱]

بہر حال جس تفسیر کو بھی اختیار کیا جائے اس طرح کا خوف ہر قسم کے گناہ اور شہوات ترک کرنے کا سرچشمہ ہے، حضرت امام جعفر صادقؑ سے مروی ایک حدیث یوں ہے:

من علم ان الله یراه ویسمع ما یقول من خیر و شر فیحجزه ذلك عن القبیح من الاعمال فله جنتان۔

جو یہ جانتا ہو کہ خدا اسے دیکھ رہا ہے اور جو اچھی یا بری (بات) وہ کہہ رہا ہے خدا اُسے سن رہا ہے اور یہ علم و آگاہی اُسے برے کاموں سے روک لے تو اس کے لئے جنت کے دو باغ ہیں۔ [۲]

---

[۱] دونوں احتمالوں کو تفسیر ''مجمع البیان'' اور ''المیزان'' میں ذکر کیا گیا ہے۔

[۲] مجمع البیان، ج۹و۱۰، ص۲۰۷۔

''جنّتان''(دو جنتیں) کی بھی مختلف تفاسیر ذکر کی گئی ہیں۔ مثلا:

۱۔ اس سے مراد ''مادی'' اور ''روحانی'' بہشت ہے جس کی طرف سورہ آل عمران، ۱۵ میں بھی اشارہ ہوا ہے:

جنات تجری من تحتها الانهر .... ورضوان من الله

پہلی نعمت تو جنت کے وہ باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں اور دوسری نعمت محبوب حقیقی یعنی خدا کی رضا ہے۔

۲۔ پہلی بہشت ایمان کے بدلے میں اور دوسری نیک اعمال کے بدلے میں ہے۔

۳۔ پہلی بہشت اطاعت پر اور دوسری گناہ کو ترک کردینے پر ہے۔

۴۔ پہلی بہشت تو عمل کا صلہ ہے اور دوسری خدا کی طرف سے فضل اور احسان کے طور پر ہے۔

البتہ ان میں سے کوئی تفسیر بھی خاص دلیل نہیں رکھتی، بہر حال پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے، ان کے درمیان جمع کرنا بھی ممکن ہے۔

۱۶۔ تولیٰ ..... تبریٰ

خدا کے پیاروں سے محبت اور اس کے دشمنوں سے دشمنی یا دوسرے الفاظ میں پاک اور نیک لوگوں کے ساتھ ہم آہنگی اور برے لوگوں سے دوری جنت میں جانے کا ایک سبب ہے، اس کی طرف کلام مجید میں اشارہ ہوا ہے، سورہ مجادلہ کی آیت ۲۲ میں ارشاد ہوتا ہے:

لَا تَجِدُ قَوۡمًا يُّؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ يُوَآدُّوۡنَ مَنۡ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ وَلَوۡ كَانُوۡۤا اٰبَآءَهُمۡ اَوۡ اَبۡنَآءَهُمۡ اَوۡ اِخۡوَانَهُمۡ اَوۡ عَشِيۡرَتَهُمۡ

تم کبھی نہ پاؤ گے کہ جو لوگ اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ اُن لوگوں سے محبت کرتے ہوں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی، خواہ وہ ان کے باپ ہوں یا اُن کے بیٹے یا اُن کے بھائی یا اُن کے اہل خاندان۔

پھر ارشاد ہوتا ہے:

اولئك كتب فى قلوبهم الايمان وايدهم بروح منه ويدخلهم جنت تجری من تحتها الانهر ....

یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت کر دیا ہے، اور اپنی طرف سے ایک روح کے ساتھ انہیں قوت

دی ہے، وہ انہیں ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔

آیت کے ذیل میں اُن کی روحانی جزاء کی طرف اشارہ ہے:

رضی اللہ عنہم ورضوا عنه

اللہ اُن سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔

اور آخرکار

اولٓئك حزب اللہ

کا نشان امتیاز انہیں عطا کیا گیا۔ (مجادلہ، ۲۲)

بن کہے یہ بات واضح ہے کہ ایک دل میں دو محبتیں جمع نہیں ہوسکتیں، یا تو خدا کی محبت یا اُس کے دشمنوں کی محبت، اسی لئے محبت کا وہ شدید ترین جذبہ جو انسان کا اپنے قریبیوں کے واسطے ہوتا ہے اگر وہ خدا کی محبت اور الفت کے مدمقابل آجائے تو وہ بھی پھیکا اور ماند پڑ جاتا ہے، علاوہ ازیں یہاں پر فقط محبتوں اور وابستگیوں کی بات نہیں ہے بلکہ یہ محبت تو ظالموں کے ظلم وفساد اور زندگی کے تمام پروگراموں میں ان کے ساتھ ہم آہنگی پر منتہی ہوتا ہے، خدا کا گروہ یہ کام کبھی بھی نہیں کرسکتا۔

"اولٓئك کتب فی قلوبہم الایمان" کی تعبیر بہت دقیق اور خوبصورت ہے کیونکہ لکھنا اور وہ بھی خدا کے قدرت مند ہاتھ سے اور پھر صفحہ دل پر، یہ سب کچھ اُن کے پورے وجود میں حقیقت ایمان کے پوری طرح رسوخ کر جانے کی طرف اشارہ ہے۔

ہاں! ایسے لوگ ہی جن کی تائید روح القدس کے ساتھ کی جاتی ہے اس بات کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ اُن کو "حزب اللہ" کہا جائے، یہ تولیٰ اور تبریٰ کا کامل نمونہ ہیں۔

۱۷۔ نماز کو اہمیت دینا

سورہ معارج آیت ۲۲ تا ۳۴ میں چند صفات (نو صفات) کو ذکر کیا گیا ہے، اس کے بعد اُن کے حامل لوگوں کو جنت کی بشارت دی گئی ہے، وہ صفات یہ ہیں:

نماز کی ادائیگی میں تسلسل، اپنے مال سے محروم لوگوں کیلئے حصہ مقرر کرنا، روز جزاء پر ایمان، خدا کے عذاب کا خوف، اپنے دامن عصمت کو آلودگی سے محفوظ رکھنا، امانت کی ادائیگی، ایفائے عہد، حق کی گواہی دینا اور نماز اور کی روح، شرائط اور آداب کا خیال رکھنا، اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

اولٓئك فی جنت مکرمون۔

اس باعظمت گروہ کی جنت کے باغات میں تکریم ہوگی۔

یہ تعبیر تمام مادی اور روحانی نعمات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے، یہ بات قابل توجہ ہے کہ یہ ۹ صفات نماز سے ہی شروع ہوتی ہیں اور نماز پر ہی ختم ہوتی ہیں، فرق یہ ہے کہ پہلے مرحلے میں نماز پر دوام کی بات کی گئی ہے اور آخری مرحلے میں اس کی حفاظت کا تذکرہ کیا گیا ہے، جس کی تفسیر نماز کی خصوصیات، آداب اور شرائط کا خیال رکھنے کے ساتھ کی گئی ہے، وہ آداب و شرائط کہ جو نماز کو ظاہری طور پر فاسد اور باطل ہوں سے بچاتے ہیں اور روح نماز جو کہ دل کی توجہ اور حضور قلب ہے اس کی بھی تقویت کرتے ہیں، اسی طرح یہ اُن موانع اور مشکلات کو دور کرتے ہیں جو نماز کی قبولیت کی راہ میں حائل ہوتے ہیں، مثلاً مال حرام کھانا، شراب پینا، غیبت اور اسی طرح کی دوسری برائیوں کا خاتمہ کرتے ہیں۔

اس لحاظ سے نیک اعمال کی ابتداء بھی نماز سے ہوتی ہے اور انتہاء بھی نماز پر، اتفاق کی بات ہے کہ زمانے کے لحاظ سے بھی انسان پر جو چیز سب سے پہلے واجب ہوتی ہے، وہ نماز ہے اور آخر عمر تک جو چیز اس کے ساتھ رہتی ہے وہ بھی نماز ہی ہے۔

نماز کی حفاظت کرنا ایک دوطرفہ معاملہ ہے، یعنی انسان اس کی حفاظت باطل ہونے سے کرتا ہے، اور نماز بھی انسان کو تباہی، بربادی اور فساد سے بچاتی ہے۔

ان الصلوٰة تنهى عن الفحشآء والمنكر

گفتگو کے اس سلسلے کو رسول اسلامؐ کی اس حدیث پر ختم کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

من حافظ علیها کانت له نورا وبرهانا ونجاة یوم القیامة

جو بھی اپنی نماز کی حفاظت کرے گا نماز اس کے لئے نور، روشنی اور علم و آگاہی کا سبب بنے گی اور قیامت کے دن اس کی نجات کا ذریعہ بنے گی۔[۱]

نتیجہ

اوپر جو کچھ سترہ عنوانات کے تحت بیان ہوا وہ ان اہم چیزوں کا تذکرہ تھا جو سرچشمہ نعمات یعنی جنت میں داخلے کی کلید اور سبب ہیں، یہ ایک طرف تو قیامت میں نجات کے اسباب کے سلسلے میں اسلامی نظام کی وضاحت کرتے ہیں اور دوسری طرف یہ قابل اہمیت انسانی، اخلاقی اور اجتماعی کاموں کی انجام دہی کے قدرت مند عوامل شمار ہوتے ہیں، ان سے پیغام لے کر انسان کمال، تربیت اور افتخار کی اعلیٰ منازل پر پہنچ سکتا ہے۔

خدایا! سعادت کے ان خزانوں کے حصول کے لئے ہماری توفیقات میں اضافہ فرما۔

---

[۱] تفسیر روح البیان، ج۱۰، ص۱۶۷۔

(۲) جنت کی جسمانی نعمات

اشارہ:

معاد جسمانی کی بحث میں اس حقیقت کی پوری طرح وضاحت ہو چکی ہے کہ قرآنی نکتہ نظر سے قیامت جسمانی پہلو بھی رکھتی ہے اور روحانی پہلو بھی، کیونکہ انسان میدان محشر میں جسم اور روح دونوں کے ساتھ حاضر ہوگا لہٰذا طبعی طور پر ہر دو خدا کی برکات اور نعمتوں سے فیض یاب بھی ہوں گے۔

جو لوگ جنت کی نعمات کو فقط روحانی اور معنوی سمجھتے ہیں اور جو آیات جسمانی نعمات کی طرف اشارہ کرتی ہیں انہیں کنایہ سمجھتے ہیں وہ اس نکتے سے غافل ہیں کہ جنت کی نعمات کو معنوی نعمتوں میں منحصر کر دینے سے جسمانی معاد کی نفی ہو جاتی ہے، جو کہ قرآن کی بالکل واضح آیات کی مخالفت ہے۔

اصولی طور پر جیسا کہ معاد جسمانی'' کے سلسلہ گفتگو میں بھی اس بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ ''جسم'' اور ''روح'' ایک دوسرے کے بالکل ساتھ ساتھ ایک قسم کے ہمزاد ہیں، جیسے اس دنیا میں وہ ایک دوسرے سے جدا ہو کر کمال اور ارتقاء کا راستہ طے نہیں کر سکتے، اسی طرح اُس دنیا میں بھی خدا کی عطا کردہ برکات اور نعمتوں سے فیض یاب ہونے کے لئے ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے (غور کیجئے گا)۔

بہر حال جنت کی جسمانی نعمتیں اُس کی روحانی نعمتوں کی طرف مختلف، وسیع، دل پذیر اور سرور بخش ہوں گی، قرآن نے اس پر بہت تاکید کی ہے تاکہ اس طریقے سے تمام لوگوں کو اُن صفات اور اعمال کی طرف متوجہ کرے جو ان تمام نعمتوں کا سرچشمہ ہیں (یہ بات بھی واضح ہے کہ انسان روحانی نعمتوں کی نسبت جسمانی نعمتوں کے متعلق زیادہ سوچتا ہے)۔

اس کے باوجود جیسا کہ بعد والے باب میں ہے، معنوی نعمات اور روحانی لذات کے بیان کے لئے ایک تفصیلی باب ذکر کیا گیا ہے، اگر چہ یہ وسعت بیان کے اعتبار سے مادی نعمتوں کے بیان کی حد تک نہیں ہے لیکن معنی اور کیفیت کے اعتبار سے اس سے بہت بلند مرتبے کا حامل ہے۔

اس اشارے کے بعد ہم جنت کی مادی نعمات کی ایک مختصر سی فہرست پیش کرتے ہیں اور انہیں مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت ذکر کرتے ہیں:

۱۔ بہشت کے باغات

۲۔ اس کے سرور آفریں سائے

۳۔ گھر اور محلات

۴۔ قالین، تکیے اور تخت

۵۔ کھانے اور برتن

۶۔ پاکیزہ شراب

۷۔ سب سے عمدہ شراب

۸۔ برتن۔جام

۹۔ لباس۔زینت

۱۰۔ ازواج بہشت

۱۱۔ غلام۔ساقی

۱۲۔ استقبال کرنے والے

۱۳۔ ابتدائی پذیرائی

۱۴۔ نا قابل تصور نعمات

مذکورہ بالا موضوعات میں سے ہر ایک کے متعلق قرآن کی متعدد آیات ملتی ہیں، اب ہم اس چمنستان کی طرف جاتے ہیں اور مختلف پھولوں کو اپنے دامن میں سمیٹتے ہیں۔

۱۔جنت کے باغات

اس سلسلے میں آنے والی متعدد آیات سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ بہشت مجموعی طور پر انتہائی خوبصورت اور بے نظیر باغوں پر مشتمل ہوگی، ان باغات کا اس دنیا کے باغات کے ساتھ موازنہ نہیں کیا جاسکتا، قرآن میں ان کے متعلق جو گفتگو کی گئی ہے وہ ان کی ایک اجمالی صورت ہے کہ جو ہم جیسے اس دنیا کے باسیوں کے لئے قابل فہم ہوسکتی ہے، وگرنہ اس کی پوری حقیقت ہماری فکر کی دسترس سے کوسوں دور ہے۔

قرآن کی ایک سو سے زیادہ آیات میں ''جنات'' (باغات) یا ''جنت'' (باغ) یا ''جنتان'' (دو باغ) کی تعبیر آئی ہے۔

سورہ نساء کی آیت ۱۳ میں ارشاد ہوتا ہے:

''ومن یطع اللہ ورسولہ یدخلہ جنت تجری من تحتھا الانھر''

جو بھی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے اُسے جنت کے اُن باغات میں داخل کیا جائے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔

بقرہ، ۲۲۱ میں ہے:

واللہ یدعوا الی الجنۃ والمغفرۃ باذنہ

اللہ جنت کے باغ اور (گناہوں کی) مغفرت کی طرف بلاتا ہے، اپنے اذن کے ساتھ۔

رحمن، ۴۶ میں ارشاد ہوتا ہے:

ولمن خاف مقام ربہ جنتان

جو اپنے رب کے مقام سے ڈرے اس کے لیے بہشت کے دو باغ ہیں۔

ان کلمات (جنات، جنتان، جنۃ) کا مادہ جن (بروزن فن) ہے جس کا معنی ڈھانپنا ہے، راغب کے بقول اس کا معنی ایک چیز کو ظاہری حس سے چھپانا ہے، اسی بنیاد پر اس کے کئی مشتقات ہیں۔

''جنۃ'' کا معنی باغ ہے کیونکہ اس کی زمین درختوں کے نیچے چھپ جاتی ہے، دوسرے لفظوں میں اس کی زمین کو درخت ڈھانپ لیتے ہیں، لیکن مقائیس اللغت کے مطابق بہشت کو اس وجہ سے جنت کہتے ہیں کہ یہ ایک ایسی جزا ہے جو آج اہل ایمان کی نظروں سے چھپی ہوئی ہے، لیکن یہ معنی کچھ بعید محسوس ہوتا ہے کیونکہ دنیا کے باغات کو بھی جنت کہتے ہیں، یہ اسی لئے ہے کہ ان کی زمین ان کے درختوں کی وجہ سے چھپ جاتی ہے (غور کیجئے گا)۔

''جنین'' اس بچے کو کہتے ہیں جو شکم مادر میں ہو اور نظروں سے پوشیدہ ہو۔

''جنان'' (بروزن ''امان'') دل کو کہا جاتا ہے کیونکہ یہ سینے میں نظروں سے پوشیدہ ہوتا ہے۔

''مجن'' (میم پر زیر، جیم پر زبر اور نون پر شد کے ساتھ) کا معنی ڈھال ہے، مقائیس اللغت کے بقول جنگ میں استعمال ہونے والے دفاعی اسلحے کو جنۃ (جیم پر پیش کے ساتھ) کہتے ہیں، دوسری طرف ''سلاح'' اس اسلحے کو کہتے ہیں جس سے حملہ کیا جائے۔

''جن'' اور ''جان'' اس زندہ موجود کو کہتے ہیں نظروں سے پنہاں ہو۔

بڑے بڑے سانپوں اور گھروں میں رہنے والے سانپوں کو بھی ''جن'' اور ''جان'' کہا جاتا ہے یہ اُن کے جنوں کے ساتھ مشابہ ہونے کی وجہ سے ہے (کیونکہ عام لوگوں کا تصور یہی تھا کہ جن ایک خطرناک اور مخفی موجود ہے، سانپ بھی ایسے ہی ہیں)۔

سینے کی ہڈیوں کے ڈھانچے کو بھی ''جنا جن'' کہتے ہیں (یہ شاید اس لئے ہو کہ یہ دل کی حفاظت کے لئے ایک ڈھال ہے)۔

''جنون'' کا معنی دیوانگی اور پاگل پن ہے کیونکہ یہ عقل اور ہوش کو ڈھانپ دیتا ہے۔

''جنون اللیل'' اور ''جنان اللیل'' کا معنی وہ لباس ہے جو رات کی تاریکی ہر چیز کو پہنا دیتی ہے، بہر حال یہاں پر جو بات قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ بہشت کے باغات ایسے ہیں جن میں درخت کثرت سے ہیں اور اُن کی زمین کو درختوں نے ڈھانپ دیا ہے۔

قرآن کی بہت سی آیات میں ''جنات'' (بہشت کے باغات) کا ذکر کرنے کے بعد ''تجری من تحتھا الانھر'' کا جملہ لایا گیا ہے، جو اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ بہشت کے باغات کے نیچے پانی ہمیشہ جاری رہتا ہے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہ اس کے درختوں کی شاخیں

پانی پر سایہ فگن ہیں اور پانی اُن کے نیچے ہے (غور کیجئے گا)۔

یہ اس لئے ہے کہ ایک تو پانی اور درختوں کا ایک جگہ پر اکٹھا ہونا ایک بہت دلفریب منظر پیش کرتا ہے، جیسے ہر ایک دوسرے کے بغیر ادھورا ہو اور اس میں کسی قسم کا احساس ہو، دوسرا یہ کہ سبزی و شادابی ہمیشہ اُن باغات کے درختوں میں ہوتی ہے جن کے پاس سے ہمیشہ پانی گذرتا رہتا ہو، وہ درخت جن کے ساتھ ہمیشہ کا پانی نہیں ہوتا، بالکل کبھی کبھار کہیں اور سے اُن کے پاس آتا ہے ان میں وہ طراوت اور شادابی نہیں ہوتی، طبعی طور پر درخت کی زندگی تو پانی کے ساتھ ہے، لہٰذا اس مایہ وحیات کو ہمیشہ اس کے ساتھ ہونا چاہیے۔

یہ امر جاذب نظر ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ:

ان انهار الجنة ليست فى اخاديد۔ انما تجرى علىٰ سطح الجنة منضبطة بالقدرة حيث شآء اهلها۔

جنت کی نہریں سوراخوں یا گڑھوں میں نہیں بہہ رہی ہوں گی، بلکہ وہ سب کی سب زمین کی سطح پر ہوں گی، اہل بہشت جس طرف کا بھی ارادہ کریں گے وہ خدا کی قدرت کے ساتھ اس طرف بہنے لگیں گی۔[۱]

اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ نہ فقط بہشت کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہوں گی بلکہ بعض آیات سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بہشت کے مکانات بھی نہروں پر بنائے گئے ہوں گے اوران کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔

عنکبوت۔۸۵ میں ارشاد ہوتا ہے:

والذين امنوا وعملو الصلحت لنبوئنهم من الجنة غرقفا تجرى من تحتها الانهار۔

جولوگ ایمان لائے اور وہ نیک اعمال بجالائے ہم انہیں بہشت کے اُن بالا خانوں میں جگہ دیں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔[۲]

۲۔بہشت کے سائے

بہت سی آیات میں بہشت کے سایوں کی طرف اشارہ ہوا ہے، مثلاً سورہ واقعہ میں ارشاد ہوتا ہے:

---

[۱] تفسیر قرطبی۔ج ص ۲۰۶۔

[۲] یہی معنی زمر۔۲۰ میں بھی آیا ہے۔

واصحب الیمین مآ اصحب الیمین۔۔۔ فی سدر مخضود۔۔۔ وطلح منضود

وظل ممدود۔۔۔ ومآء مسکوب۔

اور اصحاب یمین اور کیا (شان ہے) اصحاب یمین کی، وہ بیری، بغیر کانٹوں کی جھکی ہوئی بیری، کے سائے میں ہوں گے اور تہ بہ تہ لگے ہوئے کیلے اور پھیلے ہوئے سائے آبشاروں کے کنارے پر۔ (واقعہ: ۲۷ تا ۳۱)

درختوں کا سایہ سب سے بڑھ کر خوبصورت اور لطیف ہوتا ہے یہ خیموں اور کمروں کے سایوں کی مانند تاریک نہیں ہوتا اور نہ ہی ہوا کی ٹھنڈک سے خالی ہوتا ہے، دوسری طرف پتوں کی ملائم تری سایے کو خوش گوار بنا دیتی ہے، درختوں، پنکھڑیوں اور پھولوں کی دل میں اتر جانے والی مہک اُسے کچھ اور بھی لذت بخش بنا دیتی ہے۔

بہشت کے سائے دائمی اور جاودانی ہیں، اس لئے یہ انسان کے آرام و سکون میں مخل نہیں ہوں گے۔

اکلھا دآئم وظلھا

اس کے میوے اور سائے دائمی ہیں۔ (رعد: ۳۵)

کبھی انہیں ''ظل ظلیل'' بھی کہا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

وندخلھم ظلا ظلیلا

اور ہم انہیں ان سایوں میں داخل کریں گے جو کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ (نساء: ۵۷) [۱]

ان چیزوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جنت کی فضا، خوشگوار، دلربا اور پر کشش ہو گی۔

چنانچہ سورہ دھر کی آیت ۱۳ میں ارشاد ہوتا ہے:

لا یرون فیھا شمسا ولا زمھریرا

(جنتی لوگ) نہ تو اس میں جلا دینے والے سورج کو دیکھیں گے اور نہ سردی کو۔ [۲]۔ [۳]

---

[۱] ''ظل ظلیل'' کا معنی سایہ دار کا سایہ ہے، یہ مجموعی طور پر ایک مکمل، دائمی اور بلند سائے کے لئے کنایہ ہے اور بھی متعدد آیات میں سایوں کے موضوع کی طرف اشارہ ہوا ہے، مثلاً رعد۔ ۳۵۔ یٰسین، ۵۶ اور مرسلات، ۴۱ میں بھی آیا ہے۔

[۲] ''زمھریر'' کا مادہ ''زمھر'' ہے جس کا معنی شدید سردی یا بہت زیادہ غضب ناک ہونا ہے، یہاں پر پہلا معنی مراد ہے۔

[۳] یہی مفہوم (واقعہ، ۳۰)، (یٰسین، ۵۶)، اور (مرسلات، ۴۱) میں بھی آیا ہے۔

۳۔ بہشت کے محلات

کلام مجید کی متعدد آیات میں بہشتیوں کے رہنے کی جگہ کی طرف ایک اجمالی سا اشارہ ہوا ہے، اس سلسلے میں مختلف تعبیرات لائی گئی ہیں۔

سورہ توبہ کی آیت ۷۲ میں ارشاد ہوتا ہے:

ومساكن طيبة فی جنت عدن

اور پاکیزہ گھر بہشت کے جاودانی باغات ہیں۔

یہ تعبیر سورہ صف کی آیت ۱۲ میں بھی آئی ہے۔

لفظ ''طيبة'' ایک بہت جامع معنی کا حامل ہے، جو تمام خصوصیات اور فضائل پر مشتمل ہے، یہ حقیقت میں اس چیز کے لئے بولا جاتا ہے جو بہت دل پسند اور دلربا ہو، جس سے انسان کو ''طيب نفس'' حاصل ہو یا اس میں زندگی ہر لحاظ سے پاک و پاکیزہ ہو، اس لحاظ سے گھر میں جن چیزوں کا تصور کیا جا سکتا ہے وہ اس لفظ میں جمع ہیں۔

لیکن سورہ فرقان کی آیت ۷۵ میں اُسے ''غرفة'' سے تعبیر کیا گیا ہے، جس کا معنی ایک عمارت کی سب سے بلند و بالا منزل ہے، ارشاد ہوتا ہے:

اولٓئك يجزون الغرفة بما صبروا۔

خدا پرہیز گاروں اور عباد الرحمن (خدا کے خاص بندوں) کو اُن کے صبر اور استقامت کی وجہ سے بہشت کے بالا خانے جزا کے طور پر دے گا۔

''غرفة'' کا مادہ ''غرف'' (بروزن ''برف'') ہے، جس کا معنی ایک چیز کو اٹھا کر کھا لینا ہے۔

''غرفة'' اس چیز کو کہتے ہیں جسے اٹھاتے ہیں اور پھر کھا لیتے ہیں (جیسے وہ پانی انسان پینے کے لئے چشمے سے اٹھاتا ہے)، بعد ازاں یہ لفظ عمارتوں کی سب سے اوپر والی منزل کے لیے بولا جانے لگا، گویا انہیں زمین سے اوپر کی طرف اٹھا لیا گیا ہے، یہاں پر ممکن ہے اس سے مراد بہشت کا سب سے بلند اور بڑا درجہ مراد ہو۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ ایسے گھروں کی ہوا بہت خوشگوار اور اُن کا منظر زیادہ دلکش ہوتا ہے۔

رہنے کے لئے سب سے بہترین مکان ایسا ہی ہوتا ہے، اس لحاظ سے یہ پرکشش ہوتے ہیں ''غرفة'' کی تعبیر بھی انہی خصوصیات کی طرف اشارہ کرتی ہے، لہٰذا سباء، ۳۷ میں ارشاد ہوتا ہے:

وهم فی الغرفات امنون

اور وہ بالا خانوں میں امن وامان سے رہنے والے ہوں گے

زمر،۲۰ میں اس سلسلے میں ایک اور تعبیر آئی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

لهم غرف من فوقها غرف مبنية تجری من تحتها الانهر

اُن (پرہیز گاروں) کے لئے بالا خانے ہیں، اُن کے اوپر اور بالا خانے بنے ہوئے ہیں، اُن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔

دخان، ۵۱و۵۲ میں بہشتیوں کے مکانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

ان المتقين فی مقام امين فی جنت و عيون

پرہیز گار پرامن مقام میں ہوں گے، باغوں اور چشموں کے درمیان۔

یہاں پر دو نکتے قابل توجہ ہیں:

۱۔ بعض قرآنی آیات (مثلاً سورہ صف کی آیت ۱۲ جس کی طرف اوپر بھی اشارہ ہوا ہے) میں جنت کی تمام نعمتوں میں سے صرف ''پاک و پاکیزہ مکانوں'' کا ذکر ہوا ہے، یہ اس لئے ہے کہ انسان کی آسائش وسکون کا اہم ترین ذریعہ مکان ہے، وہ بھی پاک و پاکیزہ مکان جو ہر ظاہری اور باطنی آلودگی سے پاک ہو، جو امن امان کا گہوارہ ہو، جس میں انسان آرام وسکون سے رہ سکے (توجہ اس بات کی جانب بھی رہے کہ کلمہ ''مسکن'' کا مادہ بھی ''سکون'' ہے جس کا معنی آرام وسکون ہے)۔

۲۔ کلام مجید میں چند چیزوں کو آرام وسکون کا باعث قرار دیا گیا ہے۔

رہنے کے لئے مناسب مکانات، چاہے دنیا ہو چاہے آخرت:

واللہ جعل لکم من بیوتکم سکنا۔ (نحل:۸۰)

مناسب اور ہم مزاج بیوی:

ومن ایته ان خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیها۔ (روم:۲۱)

رات کو بھی چین اور آرام کا ایک ذریعہ قرار دیا گیا ہے:

وجعل اللیل سکنا۔ (انعام۔۹۶)

زکوہ ادا کرنے والے مومنین کے حق میں پیغمبرؐ کی دعا بھی سکون کا باعث ہے:

ان صلاتك سكن لهم

ایمان سے بھی سکون حاصل ہوتا ہے:

هو الذی انزل السكينة فی قلوب المومنين۔ (فتح:۴)

البتہ ان میں بعض امور مادی پہلو کے حامل ہیں اور بعض روحانی پہلو کے۔

۴۔قالین اور تخت:

بہشت کی ایک اور بہت ہی عمدہ نعمت خوبصورت اور نفیس قالین اور مختلف تخت ہیں، سورہ رحمن (کہ جس میں جنت کی مختلف نعمتوں کا تذکرہ آیا ہے) کی آیت ۵۴ میں ارشاد ہوتا ہے:

متكئين علی فرش بطآئنها من استبرق

ایسے بچھونوں پر تکیہ لگائے ہوں گے جن کے استر دیبا کے ہوں گے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ دنیا کا قیمتی ترین کپڑا ان بچھونوں کا استر ہے، لہٰذا اس کے اوپر والا حصہ اس چیز سے بنا ہوا ہے جس کی خوبصورتی اور نرمی ناقابل بیان ہے۔

بعض مفسرین کے بقول یہ اُن چیزوں میں سے ہے قرآن نے جن کے بارے میں فرمایا ہے:

فلا تعلم نفس ما اخفی لهم من قرة اعين۔ (سجدہ:۱۷)

کوئی نہیں جانتا کہ اُن کی آنکھوں کی ٹھنڈک سے کیا کیا چیزیں ان کے لئے چھپائی گئی ہیں۔

رسول اسلامؐ کی ایک حدیث ہے:

ظواهرها نور يتلالا [1]

اُن بچھونوں کا اوپر والا حصہ ایک چمکتا ہوا نور ہے۔

سورہ غاشیہ کی آیت ۱۶ میں اسی سلسلے میں ایک اور تعبیر آئی ہے، بہشت کی متنوع اور روح پرور نعمات کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

وزرابی مبثوثة

---

[1] تفسیر قرطبی، ج۹، ص۶۳۴۹

وہاں پر بہت خوبصورت اور آرام دہ قالین بچھے ہوئے ہوں گے۔

''زرابی'' جمع ہے زربیة (بروزن ''شرقیة'') کی، بعض ارباب لغت کے بقول یہ حقیقت میں فارسی کے لفظ ''زربفت'' سے ماخوذ ہے، یہ وہ کپڑا ہوتا ہے جس میں دھاگے کے بجائے سونے کی تاریں استعمال کی جاتی ہیں، بعض اوقات اس کی تفسیر بہت خوبصورت، آرام بخش اور قیمتی کپڑے سے کی جاتی ہے۔[1]

بعض مفسیرین اور اہل لغت نے کہا ہے کہ ''زرابی'' جمع ہے ''زربي'' (زا پر زیر کے ساتھ) کی اور ''زردربیة'' اصل میں مختلف ایسی بوٹیوں کے معنی میں ہے کہ جن میں سرخ، زرد اور سبز رنگ کا امتزاج ہوتا ہے، اسی وجہ سے وہ کپڑے یا بچھونے جن کو مختلف رنگوں سے خوبصورت بنایا جاتا ہے اُن کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔[2]، بعض نے اس کی تفسیر اُن بچھونوں کے ساتھ کی ہے جن پر سکون بخش نیند آتی ہے۔

ان بچھونوں کی توصیف ''مبثوثة'' کے ساتھ کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ مختلف جگہ پر بچھے ہوئے یا پھیلے ہوئے ہوں گے۔

اسی سورت میں مذکورہ بالا آیت سے پہلی آیت میں تکیوں اور گدیوں کے متعلق تعبیر آئی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

ونمارق مصفوفة

وہاں تختوں پر ترتیب سے تکیے لگے ہوں گے۔

''نمارق'' جمع ہے ''نمرقه'' (بروزن ''غلغلة'') کی، ''صحاح اللغت'' کے بقول اس کا معنی وہ چھوٹا تکیہ ہے جس پر ٹیک لگاتے ہیں۔

رحمن، ۷۶ میں بہشتی بچھونوں کے سلسلے میں ایک اور تعبیر ملتی ہے، ارشاد ہوتا ہے۔

متکین علی رفرف خر و عبقری حسان۔

وہ (جنتی لوگ) سبز قالینوں اور خوبصورت قیمتی بچھونوں پر تکیہ لگائے ہوں گے۔

راغب کے بقول ''رفرف'' حقیقت میں درختوں کے پراگندہ پتوں کے معنی میں ہے، بعد ازاں یہ اُن رنگا رنگ کپڑوں کے لئے بولا جانے لگا جو باغ کا سا منظر پیش کرتے ہیں، بعض ارباب لغت نے ''رفرف'' کا معنی خیمے کا وہ پردہ لیا ہے جو ہوا سے ہلتا ہے (پرندوں کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ کو بھی ''رفرفة'' کہتے ہیں)۔[3]

---

[1] التحقیق فی کلمات القرآن الکریم۔ مادہ ''زرب''۔

[2] تفسیر مراغی، ج ۳۰، ص ۱۳۳۔ قاموس اللغت مادہ ''زرب''۔

[3] مقائیس اللغت۔

بعض نے اُسے سبز رنگ کے کپڑوں کے معنی میں بھی لیا ہے جس سے ایک طرح کا قالین (یا غالچہ) بناتے ہیں، یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کلمہ باغات، سبزہ زار (یا سونے والے کپڑے) کے معنی میں ہو جو کہ ہوا چلنے سے ہلتے ہیں، کیونکہ ''رفرف'' لغت کی بہت سی کتابوں میں خیمے کے پچھلے پردے اور اُن کپڑوں کے معنی میں آیا ہے جو ہوا سے ہلتے ہیں، ابوالفتوح رازی اپنی تفسیر میں کہتے ہیں:

''رفرف'' جنت کے وہ سبزہ زار ہیں جو تازہ اور سبز گھاس سے بھرے ہوئے ہیں۔

''عبقری'' کا مادہ ''عبقر'' (بروزن جعفر) ہے ''صحاح اللغت'' اور ''مفردات'' کے بقول یہ حقیقت میں ایک خاص جگہ کا نام ہے، عرب اسے پریوں اور جنوں کی سرزمین خیال کرتے تھے، بعدازاں یہ لفظ ہر عجیب اور نادرالوجود یا ہر پڑھے لکھے اور ماہر شخص کے لئے بولا جانے لگا جسے ''عبقری'' کہتے تھے، اس کی جمع ''عباقرہ'' [1] ہے، بہرحال اس کا بنیادی معنی آہستہ آہستہ ختم ہو گیا اور یہ انتہائی بلند مرتبت اشخاص اور بہت قیمتی اور نفیس چیزوں کے لئے استعمال ہونے لگا، مذکورہ بالا آیت میں بھی یہ جنت کے بہت خوبصورت اور زیب نظر کپڑوں کے لئے استعمال ہوا ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ ''عبقری'' ایک شہر کا نام تھا جس میں بہترین ریشمی کپڑے تیار ہوتے تھے، [2] وہ تخت جن پر بہشتی بیٹھیں گے اور محظوظ ہوں گے انہیں قرآن میں ''سرر'' بھی کہا گیا ہے، جو جمع ہے ''سریر'' کی۔ واقعہ، ۱۵، ۱۶ میں ارشاد ہوتا ہے:

''علی سرر موضونة متكئين عليها متقابلين''

وہ سونے کی تاروں سے بنے ہوئے جڑاؤ تختوں پر ہوں گے، اُن پر (بیٹھے) آمنے سامنے تکیہ لگانے والے ہوں گے۔

یہ تعبیر قرآن کی پانچ آیات میں آئی ہے، ایک جگہ پر (جیسا مذکورہ بالا آیت) اس کی صفت ''موضونة'' لائی گئی ہے جو کہ ''وضن'' (بروزن ''وزن'') کے مادہ سے ہے جس کا معنی زرہ بننا ہے، بعدازاں یہ ہر اُس بنی ہوئی چیز کے لئے بولا جانے لگا جس کے تانے مضبوط ہوں، یہاں پر ممکن ہے یہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ جنت کے تخت لولو، یاقوت اور جواہرات سے بنے ہوئے ہوں گے یا سونے اور چاندی کی تاروں سے اُن پر کام ہوا ہوگا یا اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ وہ ایک خاص ترتیب سے ایک دوسرے کے ساتھ رکھے ہوں گے، مختلف مفسرین نے ان میں سے ایک ایک بات کی ہے۔

بعض آیات میں ''مصفوفة'' کی تعبیر لائی گئی ہے، جیسے:

---

[1] بعض ارباب لغت اور مفسرین نے اس جمع پر اعتراض کیا ہے کیونکہ جو کسی چیز کی طرف منسوب ہو اس کی جمع نہیں بنائی جا سکتی مگر یہ کہ نسبت دینے سے پہلے اس کلمے کی جمع بنالی جائے جیسے ''عباقر'' اس کے بعد نسبت دی جائے (عباقری) علاوہ ازیں منسوب کی جمع اور صیغہ جمع کو اکٹھا لانا اہل ادب اچھا نہیں سمجھتے۔

[2] تفسیر ابوالفتوح رازی، مذکورہ بالا آیت کے ذیل میں۔

"متکئین علی سرر مصفوفة" (طور:۲۰)

بعض میں "مرفوعة" کی تعبیر لائی گئی ہے، جیسے

"فیھا سرر مرفوعة" (غاشیه: ۱۳)

پہلی تعبیر تو اُن تختوں کے ترتیب سے رکھے ہونے اور دوسری اُن کے بلند جگہ پر رکھے ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

ان تختوں کے بلندی پر ہونے کی وجہ یا تو یہ ہوگی یہ بہشتی اُن پر بیٹھ کر چاروں طرف کے حسین مناظر کو دیکھ سکیں یا پھر یہ اُن کے مقام کی بلندی کی طرف اشارہ ہے، جس سے اُن کی معنوی عظمت اور تقدس ظاہر ہوتا ہے۔

یا یہ دونوں باتیں ہی مراد ہیں۔

بہر حال جنت کے تخت مجموعی طور پر رکھے ہوں گے تا کہ بہشتی ایک دوسرے کے قرب اور محبت سے لطف اندوز ہو سکیں، جب کہ قرآن کی دو آیات میں صرف "علیٰ سرر متقابلین" کی تعبیر آئی ہے جس کا معنی آمنے سامنے ہونا ہے۔ (حجر ۴۷ وصافات ۴۴)

یہ بات قابل توجہ ہے کہ "سرر" جمع ہے "سریر" کی، جس کا مادہ "سرور" ہے جس کا معنی خوشحال ہونا ہے گویا تخت پر عمومی طور پر بیٹھنا اور بالخصوص جنت کے تخت پر بیٹھنا سرور اور لذت بخش ہے۔

علاوہ ازیں یہ پیار اور محبت کی محفلوں سے بھی متعلق ہے۔

کبھی "ارآئك" کی تعبیر آئی ہے، یہ تعبیر بھی قرآن کی پانچ آیات میں جنت کے تختوں کے متعلق آئی ہے۔

ایک جگہ پر ارشاد ہوتا ہے:

متکئین فیھا علی الارآئك۔

صالح مومنین جنت کے باغوں میں تختوں پر ٹیک لگائے ہوں گے۔ (کہف ـ ۳۱)

یہی تعبیر کچھ فرق کے ساتھ یٰسین، ۵۶ میں آئی ہے:

فی ظلال علی الارآئك متکئون

سورہ دھر، ۱۳ اور مطففین ۲۳ و ۲۵ میں یہ تعبیر آئی ہے:

علی الارآئك ینظرون

تختوں پر بیٹھ کر نظارہ کر رہے ہوں گے۔

"ارائک" جمع ہے "اریکة" کی، بہت سے مفسرین کے بقول (جیسے مجمع البیان، قرطبی، فخر رازی اور روح المعانی) اس کا معنی وہ تخت ہے جو حجلہ عروسی میں رکھا جاتا ہے، بعض نے اس کی تفسیر اس تخت کے ساتھ کی ہے جس پر سایہ ہو۔ "مفردات" میں "راغب" کے

بقول حقیقت میں یہ ''اراک'' سے ماخوذ ہے جو ایک مشہور درخت ہے، عرب اس سے سائبان بناتے تھے، یا یہ ''اروک'' سے ہے جس کا معنی ٹھہرنا اور توقف کرنا ہے۔

ابوالفتوح رازی نے سورہ دھر کی آیت ۱۳ کے ذیل میں یہ بات بالکل واضح طور پر کہی ہے کہ: ''سریر'' اور ''اریکه'' دو الگ الگ معانی رکھتے ہیں، ایک سے سائبان والا اور دوسرے سے بغیر سائبان کے تخت مراد ہے۔

آیات میں آنے والی تعبیرات بھی اسی معنی کی تائید کرتی ہیں کیونکہ ''سرر'' کی بات اس جگہ کی گئی ہے جہاں پر جنتی ایک دوسرے کے ساتھ پیار و محبت کی محفل سجائے ہوئے ہیں، ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے ہیں اور باتیں کر رہے ہیں جب کہ ''ارائک'' اُن کی خصوصی محفلوں سے متعلق ہے، اس وقت جب وہ اپنی بیویوں کے ساتھ تنہائی میں ہوں گے، چنانچہ یٰسین، ۵۶ میں ارشاد ہوتا ہے:

هم وازواجهم فی ظلال علی الارآئك متكئون۔

وہ اور اُن کی بیویاں سایوں میں مخصوص تختوں پر ٹیک لگائے ہوئے ہوں گے۔

یہاں سے ہی یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اگر قرآن یہ کہتا ہے کہ:

متكئين فيها علی الارآئك لا يرون فيها شمسا ولا زمهريرا۔

بہشتی وہاں پر سایہ دار تختوں پر ٹیک لگا کر بیٹھے ہوں گے وہاں پر نہ تو وہ جلتے ہوئے سورج کو اور نہ ہی سردی کو۔

(سورہ دھر)

تو ممکن ہے یہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ سورج کا چمکنا اس زمانے سے متعلق ہو جس میں وہ ان مخصوص تختوں پر جلوہ افروز ہوں، اگرچہ اس آیت کی ایک اور تفسیر بھی بیان کی گئی ہے جس کی طرف پہلے اشارہ کیا جاچکا ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ قرآن کی پانچ آیات میں جنت کے تختوں اور پانچ میں جنت کی چارپائیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، یہ آیات بہشتیوں کی خصوصی اور عمومی زندگی کی طرف ایک جیسے اشارات کی حامل ہیں نا چارپائیوں اور تختوں کے اوصاف اور اُن کی حیران کن خوبصورتی سے متعلق احادیث میں بہت سے مطالب ذکر کئے گئے ہیں، اختصار کے پیش نظر اُن سے گریز کیا گیا ہے۔

۵۔جنتی کھانے

قرآن مجید سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جنتیوں کی جسمانی غذائیں متنوع اور رنگا رنگ ہیں، لیکن آیات سے مجموعی طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جنتیوں کی بہترین خوراک پھل ہوں گے، یہ بات ''فاکهة'' ''فواکه'' ''ثمرة'' ''ثمرات'' اور ''اكل'' کے عناوین کے تحت بہت سے آیات میں بیان کی گئی ہے۔

بعض آیات میں ارشاد ہوتا ہے:

فیہا من کل فاکهة زوجان

بہشت کے ان دو باغوں میں جو خدا سے ڈرنے والوں کے لئے مخصوص ہیں، دو دو قسم کے پھل ہوں گے۔(رحمن، ۵۲)

مقائیس اللغت کے بقول ''فاکهة'' حقیقت میں ''فکه'' کے مادہ سے ماخوذ ہے، جس کا معنی ہے ''دل پسند''، پھلوں کو عموماً ''فاکھه'' کہا جاتا ہے کیونکہ یہ دل کی شادابی کا موجب بنتے ہیں، ''مفاکھه'' کا معنی مزاحیہ کلام ہے۔ ''فاکه'' کا معنی خوش خوراک اور مزاحیہ آدمی ہے۔

بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ ''فاکھه'' پھلوں کی تمام اقسام کے لئے ہے، راغب نے بھی مفردات میں اسی معنی کی تائید کی ہے جب کہ بعض نے یہ کہا ہے کہ ''فاکھه'' انگور اور انار کے علاوہ سب پھلوں کے لئے ہے (یا یہ کھجور اور انار کے علاوہ باقی پھلوں کے لئے ہے) یہ اس لئے ہے کہ سورہ رحمن، ۶۸ میں ان دو قسم کے پھلوں کا ''فاکھه'' پر عطف کیا گیا ہے، لہٰذا اُن کے خیال میں یہ دو پھل ''فاکھه'' کے مفہوم سے خارج ہیں جب کہ آیت اس طرح کے کسی معنی پر دلالت نہیں کر رہی، بلکہ ایسا بہت ہوتا ہے کہ ایک عام کے بعد اس کے خاص افراد کو اُن کی اہمیت کے پیش نظر صراحت کے ساتھ بیان کر کے اُن کا عام پر عطف کر دیتے ہیں۔

بعض کے نظریے کے مطابق جنت کے پھلوں کے متعلق ''زوجان'' کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ یہ سب کے سب پھل دو قسم کے ہوں گے، اُن کی ایک قسم تو دنیا میں بھی تھی اور دوسری وہ ہے جس کی نظیر آج تک کسی نے نہیں دیکھی، بعض نے کہا ہے کہ یہ تعبیر جنت کے پھلوں کے متنوع اور رنگا رنگ ہونے کی طرف اشارہ ہے جن میں سے ہر ایک دوسرے سے بڑھ کر لذیذ اور ذائقہ دار ہوگا۔

سورہ واقعہ کی آیت، ۲۰ میں ان پھلوں کا متنوع ہونا یوں بیان کیا گیا ہے:

وفاکهة مما یتخیرون

جس پھل کو بھی چاہیں وہ انہیں پیش کیا جائے گا۔

مرسلات، ۴۲ میں ارشاد ہوتا ہے:

وفواکه مما یشتهون

اور مختلف پھل جن کی وہ خواہش کریں گے۔

بعض آیات میں خاص قسم کے پھلوں کو جنت کے پھلوں کے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

فیہما فاکهة ونخل ورمان

اُن دو باغوں میں بہشتی پھل کھجور اور انار ہیں۔ (رحمن، ٦٨)

بعض مفسرین نے یہاں پر بہت غور و فکر سے کام لیا ہے اور کہا ہے کہ ان دو پھلوں کا ذکر اُس فرق کی وجہ سے ہے جو ان میں مختلف جہات سے پایا جاتا ہے، ایک میٹھا ہے دوسرا ایسا نہیں ہے، ایک گرم اور ایک ٹھنڈا، ایک غذائی مواد کا حامل اور دوسرا اس سے خالی، ایک ٹھنڈے علاقوں کا پھل ہے اور ایک گرم علاقوں کا، ایک کا درخت بہت اونچا ہے اور دوسرے کا چھوٹا، گویا قرآن اس بیان کے ذریعے ان تمام پھلوں کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہے جو ان دو مختلف صفات کے حامل ہیں۔ [1]

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

حدآئق واعنابا

خدا نے پرہیزگاروں کے لئے (پھلوں سے بھرے ہوئے) سرسبز باغات اور انگور قرار دیئے ہیں۔ (نباء۔ ٣٢)

ایک اور آیت میں ہے:

فی سدر مخضود طلح منضود

وہ بغیر کانٹوں کی جھکی ہوئی بیریوں میں ہوں گے اور تہ بہ تہ لگے ہوئے کیلے کے درختوں میں۔ (واقعہ: ٢٨، ٢٩)

اکثر مفسرین نے ''طلح'' کو کیلے کے درخت کے معنی میں لیا ہے جس کے پتے بہت سرسبز، خوبصورت اور بڑے بڑے ہوتے ہیں اور اس کا پھل بہت لذیز ہوتا ہے، ''منضود'' کا مادہ ''نضد'' ہے جس کا معنیٰ ''تہ بہ تہ'' ہونا ہے یہ کیلے کے ان گچھوں کی طرف اشارہ ہے جو ایک دوسرے کے اوپر ہوتے ہیں۔

بعض نے ''منضود'' کو اس درخت کے پتوں کے تہ در تہ ہونے کی طرف اشارہ قرار دیا ہے اس بات کے پیش نظر کہ بیری کے پتے بہت چھوٹے ہوتے ہیں اور کیلے کے بہت بڑے، ان دونوں درختوں کا ایک ساتھ ذکر جنت میں درختوں کے تنوع کی طرف ایک لطیف اور خوبصورت اشارہ ہے۔ [2]

کلام مجید میں پھلوں کی مختلف اقسام کو بہشتی کھانوں کے عنوان سے ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ ایک عمومی اشارہ گوشت کی طرف بھی کیا گیا ہے، اور ''لحم طیر'' (پرندوں کے گوشت) کی طرف خصوصی طور پر اشارہ کیا گیا ہے۔

ایک جگہ پر جنت کی اہم ترین نعمات کا ذکر کرنے کے بعد اشارہ ہوتا ہے:

وامددنھم بجا کھة ولھم مما یشتھون۔

---

[1] تفسیر فخر رازی، ج ٢٩، ص ١٣٤۔

[2] تفسیر فخر رازی، ج ٢٩، ص ١٦٢۔

اور ہم انہیں پھلوں سے اور گوشت سے جو کچھ وہ چاہیں گے دیں گے۔[1] (طور:۲۲)

''مما یشتھون''(جس قسم کی بھی چاہیں) کا جملہ ایک وسیع مفہوم کا حامل ہے جو ہر قسم اور ہر طرح کے کھانے کے لئے ہے۔

ایک اور جگہ پر جنت کی مختلف نعمتوں اور متنوع پھلوں کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

ولحم طیر مما یشتھون۔

اور پرندوں کا گوشت جس طرح کا بھی چاہیں۔(واقعہ،۲۱)

دونوں جگہوں پر پھلوں کا ذکر پہلے اس لئے ہے کہ پھل ایک بہترین ،لذیذ اور عمدہ غذا ہے،بعض لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ انسان کی طبعی غذا پھل ہی ہے،وہ انسان کو''پھل خور''موجود سمجھتے ہیں،اسی لئے انسان طبعی طور پر گوشت کو استعمال نہیں کرسکتا بلکہ گوشت میں چند ایک تبدیلیاں کرکے یا اس کے ساتھ کسی اور چیز کو ملا کر استعمال کرسکتا ہے،جب کہ پھلوں کو اُن کی طبعی حالت اور بغیر کسی تبدیلی کے استعمال کرسکتا ہے، اس سے بڑھ کر یہ کہ گوشت والا کھانا کھانے سے پہلے پھل کھانا ایک خاص ہی لطف اور مزہ رکھتا ہے۔

۶۔ پاکیزہ شراب

بہشت میں پینے والی چیزیں بھی اس کے کھانوں کی طرح بڑی متنوع اور نشاط افریں ہیں،قرآن نے مختلف تعبیرات سے کے ساتھ انہیں بیان فرمایا ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ان میں سے بعض تو نہروں کی شکل میں ہیں جن کی چار قسموں کو سورہ محمد کی آیت ۱۵ میں بیان کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

مثل الجنة التی وعد المتقون فیھا انھا ر من مآء غیر اسن وانھار من لبن لم یتغیر طعمه وانھار من خمر لذه للشار بین وانھار من عسل مصفی۔

وہ جنت جس کا وعدہ پرہیزگاروں سے کیا گیا ہے وہ یوں ہے کہ اس میں صاف اور خالص پانی کی نہریں ہیں جن کی خوشبو ختم نہیں ہوتی اور دودھ کی نہریں ہیں جس کا ذائقہ تبدیل نہیں ہوتا اور (پاک) شراب کی نہریں ہیں جو پینے والوں کے لئے لذت بخش ہے اور صاف شہد کی نہریں ہیں۔

---

[1] ''امددنھم''کا مادہ'امداد''ہے جس کا معنی مسلسل اور جاری عطا ہے،یہ حقیقت میں مدد پہنچانے کے معنی میں آتا ہے،بعض ارباب لغت مثلا صاحب قاموس نے اسے موت کے موخر ہونے اور زندگی کے جاری رہنے کے معنی میں بیان کیا ہے،یہ پہلے معنی سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔

یہ چار قسم کی پینے والی چیزیں ہیں جو کہ جنت کی چار نہروں میں ہوں گی، (نہ یہ کہ ایک نہر میں بلکہ ہر ایک کی کئی نہریں جاری ہوں گی)، اُن میں پینے کی مختلف چیزوں کو بیان کیا گیا ہے، پانی پیاس بجھانے کے لئے، دودھ غذائیت کے لئے، شہد توانائی اور لذت کے لئے اور پاک و پاکیزہ شراب سرور کے لئے۔

یہ چیزیں ایسی خلق کی گئی ہیں کہ زمانے کی تبدیلی ان میں کسی قسم کی خرابی پیدا نہیں کرسکتی، یہ ہمیشہ تازہ اور مزے دار رہیں گی، گویا جنت کا ماحول ایسا ہے کہ بیماری اور خرابی پھیلانے والا کوئی جراثیم اس میں نہیں ہوتا، وہ ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک ماحول ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس دنیا کا پانی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بدبودار ہو جاتا ہے یا اس کی رنگت تبدیل ہو جاتی ہے، لیکن جنت کے پانی کی نہریں ایسی ہیں کہ وہ ہمیشہ کی طرح صاف اور خوشبودار رہیں گی۔

اس دنیا میں جو دودھ ہوتا ہے وہ تھوڑا سا وقت گزرنے کے ساتھ تبدیل ہو جاتا ہے، اس کی مٹھاس ترشی میں تبدیل ہو جاتی ہے جو اس کے خراب ہو جانے کی دلیل ہوتی ہے لیکن جنت کا دودھ ہمیشہ تازہ، خوشگوار اور میٹھا ہی رہے گا۔

اس دنیا کی شراب کا پینا لذت بخش نہیں ہے چونکہ سب لوگ اسے تلخ اور بدذائقہ کہتے ہیں جو لوگ اسے پیتے ہیں وہ بھی اُس کے نشے کی وجہ سے پیتے ہیں لیکن بہشت کی پاک شرابوں کا پینا لذت بخش بھی ہے اور سرور آفرین بھی، اس کا سرور روحانی ہے نہ کہ شیطانی۔

اس دنیا کا شہد بھی اکثر اوقات ناخالص ہوتا ہے، لیکن جنت کا شہد ہر لحاظ سے خالص اور صاف ہے، یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن نے شہد کو پینے والی چیزوں میں سے شمار کیا ہے، سورہ نحل میں جو شہد کی مکھیوں کے متعلق گفتگو ہے اس میں یوں ارشاد ہوتا ہے:

يخرج من بطونها شراب مختلف الوانه

اُن کے پیٹ میں سے ایک خاص قسم کی پینے والی چیز نکلتی ہے جس کے مختلف رنگ ہوتے ہیں۔ (نحل، ٦٩)

یہ تعبیر شاید اس لئے ہو کہ اگر شہد کو پینے کے طور پر استعمال کیا جائے (شہد کا شربت) تو وہ زیادہ خوش ذائقہ، مفید اور قوت بخش ہوتا ہے۔

''سورہ دھر'' کی آیات میں جہاں نیک لوگوں کے لئے مختلف نعمات بہشت کا ذکر ہوا ہے وہاں جنت میں پینے کی چند اور چیزوں کو بیان کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

ان الابرار يشربون من كاس كان مزاجها كافورا۔ عينا يشرب بها عباد الله يفجرونها تفجيرا۔

یقینا نیک لوگ اس پیالے میں سے پیئیں گے جس میں کافور ملا ہوگا، وہ ایک چشمہ ہے جس سے اللہ کے خاص بندے پیئیں گے اور وہ اسے جہاں چاہیں بہالے جائیں گے۔ (دھر، ٥ و ٦)

چند آیات کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

ویسقون فیھا کاسا کان مزاجھا زنجبیلا۔ عینا فیھا تسمی سلسبیلا

اور بہشت میں انہیں ایسا جام پلایا جائے گا جو شراب طہور سے لبریز ہوگا، جس میں سونٹھ کی ملاوت ہوگی، بہشت کے ایک چشمے سے جس کا نام سلسبیل ہے۔ (دھر، ۱۷و۱۸)

پھر چند آیات کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

وسقاھم ربھم شرابا طھورا

اُن کا رب انہیں شراب طہور پلائے گا (ایسی شراب جس کا ساقی خدا ہے جو خود پاک ہوگی اور جو تمام برائیوں اور پلیدیوں سے پاک کردے گا)۔ (دھر۔۲۱)

ان آیات میں بھی جنت کی چند پاکیزہ شرابوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

پہلے تو وہ خاص شراب جو سکون بخش ہے کیونکہ کافور لغت میں متعدد معانی رکھتا ہے، اُن میں سے ایک خوشبو، دوسرا وہ سفید رنگ کا مادہ جو ٹھنڈک اور سفیدی میں ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے اور بہت تیز قسم کی خوشبو رکھتا ہے اور سکون بخش ہے، یہ بالکل زنجبیل کے مدمقابل ہے جو بہت گرم ہوتی ہے (زنجبیل وہ خوشبودار جڑیں ہیں جو دوائیوں، کھانوں اور بعض اوقات بوتلوں میں استعمال ہوتی ہیں)۔

معلوم ہوتا ہے کہ لوگ دو مختلف طرح کی شرابیں بناتے تھے، ایک تو نشاط آور اور ہشاش بشاش کر دینے والی ہوتی جب کہ دوسری سستی پیدا کر کے ایک سکون کی سی کیفیت طاری کر دیتی۔

پہلی میں زنجبیل ملا ہوا ہوتا تھا جب کہ دوسری میں کافور، چونکہ دوسری دنیا کے حقائق ہماری دنیا کے محدود لفظوں میں سمٹ نہیں سکتے اس لئے مجبوراً ان الفاظ کو وسیع اور بلند معانی کیلئے استعمال کرتے ہیں تا کہ اُن بلند مرتبہ حقائق کو بیان کیا جا سکے۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ کافور بہشت کا ایک چشمہ ہے جس کی سفیدی، ٹھنڈک اور خوشبو اسی کافور کی مانند ہے، لیکن اس کا ذائقہ ایسا نہیں اور نہ اس کا کوئی نقصان ہے (یہ بات معلوم ہونا چاہیے کہ عام کافور ایک طرح کی گوند ہے جسے چین کے جنوبی حصے یا ہندوستان میں پائے جانے والے ایک درخت سے لیتے ہیں، یہ طبی مقاصد کے لئے استعمال ہوتا ہے) لیکن پہلے جو تفسیر بیان کی گئی ہے وہ زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے کیونکہ شراب کافور کو شراب زنجبیل کے مدمقابل ذکر کیا گیا ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے قرآن کہتا ہے کہ زنجبیل کی شراب بہشت میں واقع ایک چشمے سے بنائی گئی ہے جس کا نام ''سلسبیل'' ہے، بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ سلسبیل کو ''سلاسته'' سے بنایا گیا ہے جس کا معنی رواں ہونا ہے، یہ ایک خاص قسم کی پینے والی چیز کی طرف اشارہ ہے جو

بہت لذیذ ہے اور گلے اور منہ میں سے آسانی سے چلی جاتی ہے اور بہت خوشگوار ہے۔

بعض نے اُسے ''تسلسل'' کا مرکب جانا ہے جس کا معنی راستہ طلب کرنا ہے، یہ بھی رواں اور خوشگوار ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

بعض نے اسے ''سال'' اور ''سبیل'' کا مرکب جانا ہے جس کا معنی راستہ طلب کرنا ہے، یہ بھی رواں اور خوشگوار ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

بہرحال تمام تفاسیر سے مجموعی طور پر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ''سلسبیل'' کے چشمے کی شراب بہت خوشگوار اور لذیذ ہے۔

بہشت کی تیسری پینے والی چیز جس کی طرف مذکورہ بالا آیات میں اشارہ ہوا ہے ''شراب طہور'' ہے جس کا ساقی خدا ہے، اس کی تاثیر یہ ہے کہ وہ جسم اور روح کو تمام نجاستوں سے پاک کر دیتی ہے (یہ شراب بھی پہلی دو شرابوں کی طرح نیک لوگوں کے لئے مخصوص ہے) یہ شراب دنیا کے بالکل برعکس ہے جو نجس اور ناپاک بھی ہے اور جسم و روح کو بھی آلودہ کر دیتی ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ شراب بھی پینے کی ایک چیز ہے جسے بہشتی کھانوں کے بعد پیا جائے گا، یہ تمام اندرونی فضلات کو پاک کر دے گی، صرف ایک چیز خوشبودار پسینے کی صورت میں جلد سے ٹپکے گی، تفسیر فخر رازی، میں یہ بات ایک حدیث کے عنوان سے ذکر ہوئی ہے، تفسیر المیز ان میں اس ''شراب طہور'' کی روحانی طہارت کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ یہ شراب خدا سے غفلت اور اس کی طرف توجہ کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو ختم کر دے گی۔

تفسیر ''منہاج الصادقین'' میں امام جعفر صادقؑ سے یہ حدیث نقل کی گئی ہے:

''جب مومن شراب طہور پی لے گا تو اللہ کے سواسب کو فراموش کر دے گا اور پوری طرح خدا کی طرف متوجہ ہو جائے گا۔[1]

سورہ مطففین میں نیک لوگوں کو ملنے والی جنتی نعمات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

''یسقون من رحیق مختوم''

انہیں سربمہر شراب ناب پلائی جائے گی۔

پھر ارشاد ہوتا ہے:

ختمه مسك وفی ذٰلك فلیتنافس المتنافسون

جو اس پر مہر لگائی گئی ہے وہ کستوری کی ہے۔ خواہش کرنے والوں کو اس کی خواہش کرنا چاہیے۔

آخر میں ارشاد ہوتا ہے:

''ومزاجه من تسنیم عینا یشرب بها المقربون''

---

[1] منہاج الصادقین۔ ج ١٠ ص ١١٠ ''تفسیر اثنیٰ عشر کے مطابق زیر نظر آیت کے ذیل میں''

اس شراب میں آب تسنیم ملا ہوگا اور یہ وہ چشمہ ہے کہ جس سے مقربین سیراب ہوں گے۔

بہت سے مفسرین کے بقول ''رحیق'' کا معنی وہ خالص شراب ہے جو ہر قسم کی ملاوٹ اور آلودگی سے پاک ہو،بعض نے اس بات کا بھی اضافہ کیا ہے کہ وہ صاف ستھری، درخشاں اور چمک دار بھی ہوتی ہے۔

''مختوم'' کا معنی ہے ''مہر لگا ہوا'' آج کل اس کے لئے لاک لگانے کی تعبیر استعمال کی جاتی ہے، یہ بھی اس کے پاکیزہ، خالص اور نئی ہونے پر تاکید ہے۔

''ختمه مسک'' کی تعبیر اس چیز کی طرف اشارہ ہے جو پہلے زمانے میں اور موجودہ زمانے میں بھی رائج ہے وہ یہ کہ کسی چیز کو محفوظ اور نئی رکھنے کے لئے اُسے ایک برتن یا کسی اور چیز میں رکھ کر اس کا منہ کسی رسی وغیرہ کے ساتھ باندھ دیتے ہیں پھر اسے گرہ لگا دیتے ہیں، پھر گرہ کے اوپر کچھ سخت مٹی یا آٹا یا لاک اور کبھی سیسہ لگا دیتے ہیں، اس کے بعد اس پر ایک مخصوص مہر لگا دیتے ہیں، اس برتن میں موجود چیز تک پہنچنے کے لئے اس مہر کو توڑنے کے علاوہ کوئی اور چارہ کار نہیں ہوتا، لہٰذا ایسی چیز کو وصول کرنے کے بعد سب سے پہلے اُس کی مہر کو دیکھتے ہیں کہ وہ محفوظ ہے یا نہیں، عرب اس کیلئے ''مختوم'' (مہر لگا ہوا) کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ مذکورہ بالا آیات میں ارشاد ہوتا ہے کہ ان محفوظ اور نئے ظروف پر کستوری کی مہر لگی ہوگی، جو ایک بہت مشہور خوشبودار مادہ ہے، جب بہشتی اس مہر کو توڑیں گے تو کستوری کی خوشبو پوری فضا میں پھیل جائے گی۔

اس آیت کی کئی اور تفسیریں بھی بیان کی گئی ہیں جن میں سے کوئی بھی آیت کے ظاہر کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے۔

''تسنیم'' کا مادہ ''سنم'' (بروزن ''صنم'') ہے، مقائیس اللغت کے بقول اس کا معنی ارتفاع اور بلندی ہے ''سنام بعیر'' کا معنی اونٹ کی کوہان ہے، اسی وجہ سے زمین پر سے آگ کے شعلوں کے بلند ہونے، بادلوں کے بلند ہونے، دھوئیں کے بلند ہونے اور پودوں کے خوشوں کے لئے بھی یہ کلمہ استعمال ہوتا ہے، لہٰذا ''چشمه تسنیم'' کا معنی وہ چشمہ ہے جو اوپر لے جانے اور بلندی کی طرف پہنچانے کا سبب ہے، یہ شاید اس لحاظ سے ہو کر مقربان یہ شراب پی کر قرب الٰہی کے مقام تک پہنچ کر حق کے نور میں فنا ہو جائیں گے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ ''چشمه تسنیم'' ایسا چشمہ ہے جو بہشت کے اونچے درجے پر واقع ہے، وہ وہاں سے بہتا ہے، کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ایسی شراب ہے جو آسمان بہشت سے برستی ہے، ''مقربان'' اسے بالکل خالص حالت میں پئیں گے، ''ابرار'' کے لئے اُسے ایک اور شراب سے ملایا جائے گا جس کا نام ''رحیق مختوم'' ہے۔

ان معانی کے درمیان جمع شاید یوں ہو سکے کہ یہ چشمہ مکان کے اعتبار سے بھی ایک بلند جگہ پر واقع ہے اور وہاں سے بہتا ہوا آتا ہے اور اسی طرح معنوی اور روحانی تاثیر کے اعتبار سے بھی یہ روح کو ایک بہت بلند اور اونچے مقام تک پہنچا دیتا ہے، یہ خدا کے قرب کا مقام ہے۔

۷۔ بہشت کی سب سے اعلیٰ شراب

مذکورہ بالا آیات میں سات قسم کی بہشتی شرابوں کا ذکر ہوا ہے۔ ان سے مجموعی طور پر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بہشت میں پینے والی

چیزوں کی مختلف اقسام ہوں گی۔ بعض کی تو نہریں بہہ رہی ہوں گی، دودھ، شہد، پانی اور شراب کی نہریں۔ بعض بند منہ والے برتنوں میں ہوں گی۔ بعض چشمے ہوں گے جو بہت کے آسمان یا کسی اور بلندی سے گر رہے ہوں گے۔ معلوم یہی ہوتا ہے کہ بہشت کی سب سے اعلیٰ شراب یہی ہے جس کا نام "شراب تسنیم" ہے یہ مقربین کیلئے مخصوص ہوگی۔

تفسیر علی ابن ابراہیم میں ہے:

اشرف شراب اهل الجنة یاتیهم فی عالی تسنیم وهی عین یشرب بهاالمقربون والمقربون اٰل محمدٍ......والمقربون یشربون من تسنیم بحتًا صرفًاوسآئر المومنین ممروجًا

اہل بہشت کیلئے سب سے اعلیٰ شراب ایک خاص قسم کی ہوگی جو اوپر سے (آبشار کے مانند) ان کی طرف آئے گی۔ وہ ایک چشمہ ہے جس سے مقربین پئیں گے، مقربین آلِ محمدؐ ہیں......وہ خالص شرابِ تسنیم پئیں گے اور دوسرے مومنین اسے (شراب طہور کے ساتھ) ملا کر پئیں گے۔[1]

اس کے بعد "شراب طہور" مرحلہ ہے۔ سورہ دہر کی آیت ۲۱ میں اس کی طرف اشارہ ہوا تھا۔ خدا جس شراب کا ساقی ہوگا وہ صرف یہی شراب طہور ہے۔

یہ بات مدنظر رہے کہ یہ تمام کے تمام اوصاف ہیں جو ہم نے سنے ہیں یا پڑھے ہیں۔ جو کچھ اس بلند مقام پر ہوگا یہ تو فقط اس کی ایک معمولی سی جھلک ہے جو ہمارے ذہنوں میں منعکس ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بہشت کی نعمات اور پاک شرابوں کی تعریف ہماری قدرت سے باہر ہے۔ اس کا صحیح تصور مادی دنیا کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے لوگوں کیلئے محال ہے۔

فلاتعلم نفس مااخفی لهم من قرة اعین

کوئی نہیں جانتا کہ وہ پوشیدہ نعمات جو آنکھوں کی ٹھنڈک کا ذریعہ ہیں، کیسی ہوں گی۔ (الم سجدہ۔۱۷)

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن نے اس دنیا کی آلودہ شراب اور اس جہان کی پاک و پاکیزہ شراب کے درمیان فرق کو مختلف تعبیرات کے ساتھ بیان کیا ہے ایک جگہ پر ارشاد ہوتا ہے:

بیضآء لذةٍ للشاربین

وہ ایک چمکدار، سفید اور لذت بخش شراب ہے پینے والوں کیلئے۔ (صافات۔۴۶)

---

[1] تفسیر علی ابن ابراہیم جلد ۲ ص ۴۱۲

وہ اس دنیا کی شراب کی طرح کڑوی، بدبودار اور بری نہیں ہوگی بلکہ وہ ایک ایسی شراب ہوگی جو شروع سے ہی لذت پہنچائے گی۔ اس کے پینے سے جو روحانی اور معنوی سرور آئے گا وہ بیان کی حدوں میں نہیں سما سکتا۔ پھر ارشاد ہوتا ہے:

لا فیها غول ولا هم عنها ینزفون

اس سے نہ تو عقل زائل ہوگی اور نہ بدن سست ہوگا۔ (صافات۔ ۴۷)

اس دنیا کی شراب تو عقل کو زائل کر دیتی ہے اس کا نشہ بدن کو اس طرح سست اور کمزور کر دیتا ہے کہ انسان چلنے اور بدن کا توازن قائم رکھنے پر قادر نہیں رہتا۔ لیکن بہشت کیا پاکیزہ شرابیں عقل وشعور کو جلا بخشیں گی یہ جذبہ عشق کو شعلہ ور کریں گی اور جسم وروح کو معنوی اور مادی لذتوں سے فائدہ اٹھانے کیلئے آمادہ کریں گی۔ [1]

ایک اور جگہ پر بشت کی شرابوں کا ذکر کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

لا یصدعون عنها ولا ینزفون

جس سے نہ تو انہیں سر درد ہوگا اور نہ وہ بہکیں گے۔ (واقعہ۔ ۱۹)

''یصدعون'' کا مادہ ''صداع'' (بروزن غبار) ہے، جس کا معنی سر درد ہے اس کی بنیاد ''صدع'' ہے، جس کا معنی ''پھاڑنا'' ہے، جب انسان شدید سر درد میں مبتلا ہوتا ہے تو گویا چاہتا ہے کہ اپنے سر کو پھاڑ ڈالے، لہٰذا یہ لفظ شدید قسم کے سر درد کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ دنیا کی شرابیں بدبودار، بدذائقہ، سر درد لانے والی، عقل کو زائل کر دینے والی اور مختلف قسم کی جسمانی اور روحانی بیماریوں کا باعث بنتی ہیں، بعض اوقات ان کے پینے سے جی متلانے لگتا ہے اور دل میں درد شروع ہو جاتا ہے جب کہ جنت کی شرابیں لذیذ، عقل آفریں، نشاط انگیز اور جسم وجان کی پرورش کا باعث بنتی ہیں، یہ خدا کی جانب توجہ مبذول کروا کے روحانی اور معنوی نشے کا سامان فراہم کرتی ہیں۔

۸۔ برتن اور جام

بے شک کھانے اور پینے کے وقت حقیقی مطلوب کھانا یا پینا ہی ہوتا ہے نہ کہ برتن، لیکن یہ بات بھی شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ کھانے کو پیش کرنے کا انداز اور کھانے کے برتن بھی اس کی لذت میں بہت اثر انداز ہوتے ہیں، بعض اوقات تو یہ کھانے اور پینے کی لذت کو کئی گنا بڑھا

[1] ''غول'' (بروزن ''قول'') حقیقت میں غافل کر دینے کے معنی میں ہے (اسی لئے ''غیلہ'' قتل کر دینے کے معنی میں آتا ہے) یہ کلمہ اس مخفی اور پوشیدہ برائی کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے جو کسی چیز میں نفوذ کر جائے۔ ''ینزفون'' کا مادہ ''نزف'' (بروزن ''حذف'') ہے جس کا معنی کسی چیز کو آہستہ آہستہ کر کے ختم کر دینا ہوتا ہے۔ اسی لئے رگوں سے خون بہنے کو ''نزوف الدم'' کہتے ہیں۔ اس دنیا کی شراب بھی انسانی وجود کے ساتھ یہی کچھ کرتی ہے اسے آہستہ آہستہ تباہی کی طرف لے جاتی ہے۔

دیتے ہیں، اسی وجہ سے قرآن مجید کی متعدد آیات میں بہشت کے خوبصورت برتنوں کا ذکر کیا گیا ہے، جن میں کھانے کے برتن بھی شامل ہیں اور شراب طہور پینے کے بھی، بہت مختصر اور معنی خیز تعبیروں میں اُن کی تصویر کشی کی گئی ہے، یہ باتیں قطعی طور پر وہاں کی صورت حال کا ایک اجمالی سا خاکہ ہمارے سامنے پیش کرتی ہیں، وگرنہ وہاں کی تو ہر چیز ہمارے تصورات کی حدوں سے کہیں دور ہے، ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:

"یطاف علیهم بصحاف من ذهب واکواب"

بہشتی کھانے اور شراب طہور سونے کے برتنوں اور جاموں میں ان کے ارد گرد پھرائے جائیں گے۔(ازخرف۔۷۱)

''صحاف'' جمع ہے ''صحفه'' (بروزن ''صفحه'') کی جس کا معنی ہے بہت کھلا اور بڑا برتن، (کیونکہ حقیقت میں یہ مادہ پھیلانے کے معنی میں ہے)۔

''اکواب'' جمع ہے ''کوب'' (بروزن ''قوم'') کی جس کا معنی وہ جام ہے جو دستے کے بغیر ہو (اس کے اور معانی بھی ذکر کئے گئے ہیں لیکن مشہور معنی یہی ہے جو بیان کیا گیا ہے)۔

اگر چہ ذهب (سونے) کا وصف فقط کھانے کے برتنوں کے لئے استعمال ہوا ہے لیکن جام اور پیالوں کا ان پر عطف اس بات کی بھی نشاندہی کرتا ہے کہ یہ بھی سونے کے ہوں گے۔[1]

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

"باکواب واباريق وکاس من معين"

بہشتی غلام اُن کے اردگرد بہشت کی نہروں سے جام لے لے کر گردش کریں گے۔(واقعہ۔۱۸)

''اباریق'' جمع ہے ''ابریق'' کی، بعض ارباب لغت کے بقول یہ حقیقت میں فارسی کلمے ''آبریز'' سے ماخوذ ہے، جو حقیقت میں اس ظرف کے معنی میں ہے جو دستہ بھی رکھتا ہو اور مائع چیز کے نکلنے کے لئے ٹونٹی بھی رکھتا ہو۔

''جوالیقی'' نے ''المعرب من الكلام الاعجمى'' میں کہا ہے کہ یہ کلمہ فارسی میں یا تو پانی سے گزرنے کے راستے کے معنی میں ہے یا پانی گرنے کے معنی ہیں، بعض نے تو اس بات کی صراحت کی ہے کہ یہ کلمہ عربی کے مادہ ''برق'' سے ماخوذ نہیں ہے۔[2]

لہٰذا تفسیر مجمع البیان اور تفسیر قرطبی میں اس آیت کے ذیل میں جو یہ کہا گیا ہے کہ ''ابریق'' کا یہ نام اس کی چمک اور روشنائی کی وجہ سے

---

[1] حقیقت میں یہ جملہ ''اکواب من ذهب'' تھا، تکرار سے بچنے کے لیے ''من ذهب'' کو حذف کر دیا گیا ہے ''الذاکرین الله کثیرا والذاکروت''

[2] التحقیق فی کلمات القرآن الکریم

ہے، درست نہیں ہے۔

''کاس'' کا معنی شریں پانی سے لبریز جام ہے، بعض مفسرین نے کہا ہے کہ جیسا کہ اس دنیا کے مشروبات کو پہلے بڑے بڑے برتنوں میں ڈالتے ہیں اور پھر اس سے جام بھر لیتے ہیں، یہی ترتیب بہشت کی شراب کے سلسلے کی آیت میں بھی ملحوظ خاطر رکھی گئی ہے، پہلے ''اکواب'' کا ذکر ہے، پھر ''اباریق کا اور آخر میں ''کائس'' کا۔[۱]

قدیم شعراء کے کلام میں بھی اس کے لئے ''ساغر''، ''صراحی'' اور جام کی تعبیرات پائی جاتی ہیں۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ بہشتی برتنوں کی انواع اور اقسام مختلف ہوں گی، بعض سونے کے ہوں گے، بعض چاندی کے اور بعض بلور کے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

"ویطاف علیهم بآنیة من فضة واکواب کانت قواریرا"

ان کے اردگرد چاندی کے برتنوں اور بلوریں جاموں کو پھرایا جائے گا، (جو بہترین کھانوں اور شرابوں سے لبریز ہوں گے)۔ (دھر۔۱۵)

قابل غور بات یہ ہے کہ اس کے فورا بعد ارشاد ہوتا ہے:

"قواریرا من فضة قدروها تقدیرا"

چاندی کے بلورین برتن جنہیں ضروری تعداد میں تیار کیا گیا ہے۔

یہ بھی جنت کی خصوصیات میں سے ہے کیونکہ دنیا میں کوئی ایسا بلوریں برتن نہیں ہے جو چاندی سے بنایا گیا ہو، بلور تو شیشے کے ایک مخصوص پتھر سے بنایا جاتا ہے جب کہ چاندی ایک دھات ہے، لیکن یہ بات قابل تعجب نہیں ہے کہ خدا ایک شفاف قسم کی چاندی پیدا کر دے، حضرت امام جعفر صادقؑ سے مروی ایک حدیث میں ہے:

ینفذ البصر فی فضة الجنة کما ینفذ فی الزجاج

آنکھوں کی روشنی بہشت کی چاندی میں یوں سرایت کر جائے گی جیسے اس دنیا کا شیشہ اور بلور۔[۲]

یہ سب اس بات کی دلیل ہے کہ اس دنیا کی ہر چیز نرالی ہوگی، بہر حال جیسا کہ ہم نے پہلے کہا ہے بہشت کے برتن اتنے خوبصورت اور جاذب نظر ہوں گے کہ کھانے اور پینے کی لذت کو دوبالا کر دیں گے۔

---

[۱] تفسیر فخر رازی، زیر نظر آیت کے ذیل میں

[۲] مجمع البیان۔ ج۱۰۔ ص۴۱۰

۹۔لباس اور سنگھار

اس دنیا کی زندگی میں لباس ایک خاص اہمیت کا حامل ہے، ایک تو یہ جسم کو گرمی، سردی اور مختلف نقصانات سے بچاتا ہے، دوسرے یہ کہ یہ انسان کے لئے ایک زینت کا کام بھی دیتا ہے، اکثر اوقات کپڑے پہننے کا انداز، کپڑے کا رنگ اور سلائی انسان کی فکر اور خیالات کی ترجمان بن جاتی ہے۔

انسانی تاریخ میں لباس ایک زینت کے طور پر انسان کے لئے استعمال ہوتا رہا ہے، اب بھی اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔

جنت کا لباس یقینی طور پر سردی، گرمی یا دوسری تکالیف سے محفوظ رہنے کے لئے نہیں ہے، کیونکہ وہاں پر تو ہر چیز حد اعتدال پر ہے، وہاں پر کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی، لہٰذا وہاں پر لباس کا پہننا فقط زیبائش کا پہلو رکھتا ہے، شاید اسی لئے قرآن کی آیات میں لباس کے آرائشی پہلو کو زیادہ بیان کیا گیا ہے، اس سلسلے میں مختلف تعبیرات لائی گئی ہیں، جو بہشتی لباسوں کے خوبصورت اور جاذب نظر ہونے کی حکایت کرتی ہیں، ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:

ویلبسون ثیابا خضرا من سندس واستبرق

وہ (خوبصورت اور قیمتی) ریشم کے باریک سبز اور موٹے لباس پہنیں گے۔(کہف۔۳۱)

اسی عبارت سے ملتی جلتی عبارت سوہ دخان کی آیت ۵۳ اور سورہ دہر کی آیت ۲۱ میں بھی آئی ہے، پہلی آیت یوں ہے:

یلبسون من سندس واستبرق

دوسری یوں ہے:

عالیھم ثیاب سندس خضر واستبرق

ان کے جسموں پر ریشم کے باریک سبز اور دیبا کے موٹے کپڑے ہوں گے۔[1]

ایک اور جگہ پر ارشاد ہوتا ہے:

ولباسھم فیھا حریر

بہشت میں اُن کے کپڑے ریشم کے ہوں گے۔(حج، ۲۳)

بالکل یہی تعبیر سورہ فاطر آیت ۳۳ میں آئی ہے اور اسی سے ملتی جلتی تعبیر سورہ دہر کی آیت ۱۲ میں آئی ہے، کلمہ ''سندس'' مفسرین اور

---

[1] ''عالیھم'' کا مادہ ''علو'' ہے، اس کا معنی ہے ''ان کے اوپر''۔۔۔۔۔۔۔اعراب کے لحاظ سے اس میں دو احتمال ذکر کئے گئے ہیں، ایک یہ کہ یہ ''ظرف'' ہے کیونکہ یہ ''فوق'' والا معنی رکھتا ہے، دوسرا یہ کہ یہ ''حال'' ہے اُس ''ھم'' کی ضمیر کے لئے جو اس سے پہلی آیت میں آئی ہے۔

علماء لغت کی متفقہ رائے کے مطابق باریک ریشم کے کپڑے کے معنی میں ہے جو بہت قیمتی ہوتا ہے، اس کلمے کی بنیاد عربی نہیں ہے (بعض کتابوں میں اس کی بنیاد فارسی یا رومن کو قرار دیا گیا ہے [1] اگرچہ فارسی میں اس معنی کا لفظ موجود نہیں ہے۔

بعض نے اس کی بنیاد یونانی کو سمجھا ہے۔ [2] بعض نے اس کا معنی وہ ریشمی کپڑا کیا ہے جو سونے کی تاروں سے بنا جائے۔

''استبرق'' علماء لغت اور مفسرین کے بقول موٹے ریشمی کپڑے کے لئے استعمال ہوتا ہے، یہ فارسی کے کلمے ''استبر'' یا ''ستبر'' سے ماخوذ ہے جس کا معنی موٹا اور بھاری ہونا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ''دیبا'' اور ''حریر'' ایسے کپڑے کو کہتے ہیں جو ریشم سے بنا جائے، یہ ایک بہت وسیع مفہوم کا حامل ہے، اگر یہ کپڑا بہت باریک ہو تو اُسے ''سندس'' کہتے ہیں، اگر بھاری ہو تو اسے ''استبرق'' کہتے ہیں، یہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ جنتیوں کے کپڑے خالص ریشم کے بنے ہوئے ہوں گے، یہ لباس طرح طرح کے ہوں گے۔

شاید یہ بات کہنے کی ضرورت نہ ہو کہ ریشمی کپڑے اپنی نرمی، لطافت، جاذبیت اور مختلف رنگوں کی اثر پذیری کے سلسلے میں سب سے عمدہ اور اعلیٰ ہوتے ہیں، چونکہ اس دنیا کے باسیوں کی زندگی میں ان سے بڑھ کر کوئی کپڑا قیمتی اور خوبصورت نہیں ہوتا اس لئے بہشتی لباسوں کے لئے بھی یہی تعبیر استعمال کی گئی ہے ورنہ بہشت کی تو ہر چیز ہمارے تصور کی حدوں سے بہت آگے ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ بہشتی لباسوں کے سلسلے میں فقط سبز رنگ کی بات کی گئی ہے، یہ شاید اس لئے ہو کہ عالم طبیعت میں پائے جانے والے رنگوں میں سے یہ رنگ سب سے خوبصورت اور جاذب نظر ہے، پودے عموماً سبز ہوتے ہیں، دریاں اور دوسری جگہوں کا پانی کبھی نیلگوں دکھائی دیتا ہے اور کبھی سبز، اسی وجہ سے انسانی طبیعت اس رنگ کے ساتھ زیادہ مانوس ہے، یہ رنگ دل کو بھاتا ہے، بعض سائنسدانوں نے سبز رنگ کو باعث تسکین اور آرام بخش قرار دیا ہے۔

ایک کتاب جو ''صحت اور لباس'' کے سلسلے میں لکھی گئی ہے اُس میں ہے:

سبز رنگ نفسیاتی اور اعصابی بیماریوں کے لئے نیز ہسٹریا (HYSTERIA) کے لئے بطور علاج بہت اچھا ہے تھکاوٹ دور کرنے، خوش مزاجی اور اعتدال کے لئے بھی سبز رنگ بہت اچھا ہے، بے خوابی دور کرنے، بلڈ پریشر کے خاتمے اور اعصابی درد کی تسکین کے لئے بھی سبز رنگ بہت کارآمد ہے، جو لوگ سبز رنگ انتخاب کرتے ہیں، یہ اُن کی طبیعت کی نرمی، مزاج کے اعتدال اور روح کی سرشاری کی علامت ہے۔

ایک جگہ پر مزدوروں کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا، ایک گروپ کو سبز رنگ کے صندوق دئے گئے، دوسرے کو سیاہ رنگ کے اور تیسرے کو سرمئی رنگ کے، ان میں سے ہسپتالوں کی طرف رجوع کرنے والے زیادہ افراد کا تعلق دوسرے یا تیسرے گروپ سے تھا، یہ لوگ کمر درد یا کسی اور درد کا شکار ہوئے۔

لندن میں ایک سیاہ رنگ کا پل تھا، اس پر خودکشی کے بہت سے واقعات رونما ہوئے، لیکن جب اس پر سبز رنگ کر دیا گیا تو ایسے

---

[1] التحقیق فی کلمات القرآن الکریم

[2] لغت نامہ دھخدا

واقعات کم ہو گئے۔[۱]

بہت پہلے سے یہ بات مشہور ہے کہ تین چیزیں غم اور پریشانی کو ختم کر دیتی ہیں:

پانی، سبزہ، اور خوبصورت چہرہ

کلام کے اس سلسلے کو ایک مفسر کی اس بات پر ختم کرتے ہیں کہ وہ کہتا ہے کہ بہشت کے لباس اس قدر خوبصورت ہیں کہ اگر اُن میں سے ایک کو اس دنیا کے سامنے پھیلا دیا جائے تو پوری دنیا مدہوش ہو جائے۔[۲]

بہشتی سنگھار

اہل بہشت کے کپڑوں کی بات تو ہوگئی، ان کے سنگھار کے متعلق بھی کچھ گفتگو ہو جائے۔

مناسب حد تک بناؤ سنگھار ایک قسم کا نفسیاتی اثر رکھتا ہے، یہ انسانی روح کو خوش اور تر و تازہ کر دیتا ہے، اگر یہ اعتدال کی حد سے خارج نہ ہو تو ایک پسندیدہ کام ہے، اسی لئے قرآن اور اسلامی روایات میں اس بات کی تاکید کی گئی ہے کہ مسلمان عبادت کی حالت میں بھی جائز سنگھار کو نہ بھولیں، مثلاً پاک لباس، مناسب رنگ، بالوں میں کنگھی کرنا، عطر اور خوشبو لگانا، اور مختلف قسم کی انگوٹھیاں پہننا۔

قرآن کی متعدد آیات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بہشتی بھی اپنے آپ کو مختلف چیزوں سے آراستہ کریں گے، وہ اس سے نفسیاتی خوشی محسوس کریں گے۔

قرآن کی تین آیات میں یوں آیا ہے:

یحلون فیہا من اساور من ذهب

انہیں بہشت میں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے۔[۳]

''اساور'' جمع ہے ''اسورة'' (بروزن'' تجربہ'') کی، جو جمع ہے ''سوار'' (بروزن'' غبار'') کی، اس کا معنی ہے کنگن، یہ فارسی کے کلمے ''دستوار'' سے ماخوذ ہے۔

ان تین آیات میں سے دو میں ''ذھب'' (سونا) کے علاوہ لؤ لؤ (مروارید) کا بھی ذکر کیا گیا ہے، بعض مفسرین کے بقول یہ جواہرات اور مروارید کے کنگنوں کی طرف اشارہ ہے لیکن اس بات کے پیش نظر کہ لؤلؤ کا عطف محلی ''من اساور'' پر ہے اور یہ منصوب ہے لہٰذا یہ ''یحلون'' کے لئے مفعول کے مانند ہے۔

---

[۱] اولین دانشگاہ و آخرین پیامبر'' از ڈاکٹر پاک نژاد شہید۔ ج ۱۸ ص ۱۳۴۔ ص ۱۳۳

[۲] روح المعانی۔ ج ۱۵۔ ص ۲۴۹

[۳] سورہ کہف۔ ۳۱)، (حج۔ ۲۳) اور (فاطر۔ ۳۳)

مجموعی طور پر آیت کا معنی یوں ہوگا، وہ بہشت میں سونے کے کنگنوں اور مروارید سے آراستہ ہوں گے، لہٰذا اس بات کا امکان ہے کہ مروارید سے آراستگی کنگنوں کے علاوہ ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ بھی کنگنوں کا ہی ایک حصہ ہو۔

بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ وہ سونے کے کنگنوں کے علاوہ خالص مروارید کے کنگن بھی پہنے ہوئے ہوں گے۔

قرآن کی ایک آیت میں چاندی کے کنگنوں کی طرف بھی اشارہ ہوا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

وحلو اساور من فضة

وہ چاندی کے کنگنوں سے آراستہ ہوں گے۔ (دھر۔۲۱)

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کنگن چاہے سونے کے ہوں یا چاندی کے یا کسی اور چیز کے، ہمارے معاشرے میں تو یہ عورت کا سنگھار شمار ہوتے ہیں، کیا بہشت میں معاملہ اور طرح کا ہوگا؟

لیکن اس بات کی طرف توجہ رہے کہ اولاً تو اس دنیا میں ہی بہت سے معاشروں میں کنگن عورت اور مرد دونوں کے لئے زینت سمجھے جاتے ہیں، فرعون نے موسیٰؑ بن عمران پر اعتراض کیا تھا:

فلو لا القی علیه اسورة من ذهب

موسیٰ علیہ السلام کو سونے کے کنگن کیوں نہیں دیئے گئے۔ (زخرف۔ ۵۳)

اس آیت سے واضح طور پر اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ مصر کے معاشرے میں یہ بات عام تھی، کنگن مردوں کے لئے زینت اور ان کی شخصیت اور عظمت کی علامت تھے۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ ہم نے کئی بار یہ بات ذکر کی ہے کہ قرآن ان مسائل میں ہماری زبان میں گفتگو کرتا ہے اور اہل بہشت کی زینت کا سامان قطعی طور پر ہمارے ادراک کی وسعتوں سے بالاتر ہے۔

۱۰۔ بہشتی ازواج

زندگی میں آرام، سکون اور چین کے لئے ایک مناسب ساتھی کا ہونا بہت ضروری ہے جو ہر اعتبار سے کمالات کا حامل ہو، انسان کی زندگی میں ایسے ساتھی کا وجود، چاہے وہ مرد ہو یا عورت مشکلات کو آسان کر دیتا ہے، یہ اُس کی زندگی کو لذت، سرور اور سکھ چین بخشتا ہے، اس کے برعکس کسی ایسے ساتھی کا نہ ہونا (یا غیر مناسب ساتھی کا ہونا) انسانی زندگی کو جہنم بنا دیتا ہے، اگرچہ ایسے انسان کو زندگی کی باقی ساری سہولیات میسر ہوں پھر بھی زندگی اس کے لئے زہر کا ایک پیالہ بن جاتی ہے۔

دوسرے الفاظ میں مناسب، کامل اورمہربان ساتھی کا ہونا فقط جسمانی لذت کے لئے ہی نہیں ہے بلکہ یہ روحانی لذت کا سامان بھی فراہم کرتا ہے۔

قرآن نے بہشت کی نعمات کو بیان کرنے کے سلسلے میں اس مسئلہ کی طرف بھی کافی توجہ دی ہے،اس سلسلے میں بڑی مناسب اور خوبصورت تعبیرات لائی گئی ہیں،ایک جگہ پر جنت کی دوسری نعمتوں کے ذکر کے بعدارشاد ہوتا ہے:

ولھم فیھا ازواج مطھرة

بہشتیوں کے لئے وہاں پر پاک وپاکیزہ بیویاں ہوں گی۔(بقرہ۔۲۵)

اُن کا پاک ہونا ایک وسیع مفہوم کا حامل ہے،جسمانی اوراخلاقی نقائص سے دوری کے ساتھ ساتھ یہ روحانی اورمعنوی برائیوں سے دوری پر بھی محیط ہے،حقیقت میں ایک بہترین ساتھی کے لئے بنیادی شرط اس کا پاکیزہ ہونا ہے۔

''مطھرة'' کی تعبیر''طاھرة'' کی تعبیر سے زیادہ گویا اور بلند ہے،کیونکہ یہ اس بات کی طرف اشارہ کررہی ہے کہ خدا نے انہیں پاکیزہ قرار دیا ہے،جسے خدا پاکیزہ کردے اوراس کی طہارت کی گواہی دے اس کی کیفیت بالکل واضح ہے۔

ایک حدیث میں بھی یہی مفہوم آیا ہے کہ:

وہ ہرعیب اور بری چیز سے پاک ہیں۔[1]

قرآن مجید کی بعض آیات میں بہشتی بیویوں کے لئے''حور العین'' کی تعبیر لائی گئی ہے،سورہ دخان آیت ۵۴ میں ارشاد ہوتا ہے:

وزوجنھم بحور عین

ہم اُن کی شادی حورالعین سے کریں گے۔

سورہ طور کی آیت ۲۲ میں بھی یہی تعبیر آئی ہے،سورہ واقعہ کی آیت ۲۲، ۲۳ میں اس سے بڑھ کر ہے،ارشاد ہوتا ہے:

وحورعین کامثال اللولو المکنون

حورالعین کی مثال ایسے گوہر کی سی ہے جوصدف میں پنہاں ہوتا ہے۔[2]

سورہ رحمن کی آیت ۷۲ میں ارشاد ہوتا ہے:

---

[1] تفسیر المیز ان ج ا،زیرنظر آیت کے ذیل میں،علامہ مجلسی نے اس حدیث کو بحارالانوار ج ۸۔ص ۱۴۰ پر ذکر کیا ہے''ازواج مطھرة من انواع الاقذار والمکارہ''

[2] ''حورعین'' کے محل اعراب کے سلسلے میں کئی احتمالات ذکر کئے گئے ہیں،مثلا یہ کہ یہ ایک خبر محذوف کے لئے مبتداء ہے(لھم حورعین)یا ولدان مخلدون پرعطف ہے،لیکن پہلا احتمال زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ حورالعین خدمت کے لئے نہیں ہیں

حور مقصورات فی الخیام

جنتی عورتیں ایسی حوریں ہیں جو بہشتی خیموں میں پردہ نشین ہوں گی۔

سورۂ رحمن کی آیت ۵۶ و ۵۸ میں ارشاد ہوتا ہے:

فیهن قصرات الطرف لم یطمثهن انس قلهم ولا جآن......کانهن لیاقوت والمرجان

بہشت کے باغات میں ایسی عورتیں ہیں جو اپنے شوہر کے علاوہ کسی سے عشق نہیں کرتیں، انہیں ان سے پہلے نہ تو کسی انسان نے چھوا تھا اور نہ کسی جن نے۔۔۔۔۔۔۔گویا کہ وہ یاقوت اور مونگے کی طرح ہیں۔

''حور'' کی جمع ''حوراء'' اور ''احور'' ہے، بہت سے علمائے لغت کے بقول اس سے مراد ہے کہ وہ جس کی آنکھ کی سیاہی مکمل طور پر سیاہ اور سفیدی پوری طرح صاف شفاف اور چمک دار ہو اور یہ آنکھ خوبصورتی کی آخری حد ہے۔

قرآن میں اُن کی آنکھوں کی خوبصورتی کو اس لئے زیادہ بیان کیا گیا ہے کہ انسان کی زیادہ خوبصورتی اُس کی آنکھوں کے حسن سے وابستہ ہوتی ہے۔

بعض نے اس کا معنی پورے بدن کی سفیدی کیا ہے، اسی لئے ''تحویر'' کپڑے دھونے اور انہیں پاک اور سفید کرنے کے معنی ہیں۔

ان دونوں معانی کے درمیان جمع شاید یوں ہو کہ وہ سفید بدن اور خوبصورت آنکھوں والی ہوں گی، ''حواریون'' کا لفظ بھی حضرت عیسیٰؑ کے اُن خاص ساتھیوں کے لئے بولا جاتا ہے جو سفید لباس زیب تن کرتے تھے۔

کلمہ ''عین'' کی جمع ''اعین'' (بروزن ''افضل'') اور ''عیناء'' ہے، جس کا معنی ہے بڑی آنکھ، یہ اس عورت یا مرد کے لئے بولا جاتا ہے جس کی آنکھیں بڑی بڑی اور خوبصورت ہوں۔

یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ ''حور'' اور ''عین'' کے کلمے مذکر اور مونث دونوں کے لئے بولے جاتے ہیں، لہٰذا یہ ایک وسیع مفہوم کے حامل ہیں جو سب بہشتی ساتھیوں کے لئے ہیں، مومن مردوں کے لئے بیویاں اور مومن عورتوں کے لئے شوہر (اس سلسلے میں آگے چل کر بھی کچھ گفتگو ہوگی) اُن کی آنکھ کی خوبصورتی کا تذکرہ اس لئے ہے کہ انسان کا حسن پہلے اُس کی آنکھوں میں ہے، حقیقت میں یہ تعبیر پورے جسم کی خوبصورتی کے لئے علامت کے طور پر استعمال ہوئی ہے۔

''لولو'' کا معنیٰ ہے موتی اور ''مکنون'' کا معنی ہے صدف میں پوشیدہ ہونا، جب وہ سیپ سے باہر آتا ہے تو انتہائی خوبصورتی، جاذبیت اور زیبائی کا حامل ہوتا ہے، ''حور العین'' کو ''لولو مکنون'' سے تشبیہ دینا ان کی بہت خوبصورتی اور زیبائی کی طرف اشارہ ہے، ممکن ہے یہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ وہ دوسرے لوگوں کی نظروں سے بالکل پوشیدہ ہیں، نہ تو ان تک کوئی ہاتھ پہنچا ہے اور نہ کوئی

نظران پر پڑی ہے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ''حور'' کو ''حیرت'' کے مادہ سے بنایا گیا ہے، لہٰذا اس کا مفہوم یہ ہے کہ جنتی بیویاں اس قدر خوبصورت ہوں گی کہ آنکھ ان کو دیکھ کر حیران رہ جائے گی۔[1]

''حوران بہشتی'' کی تعریف میں اُن نیک اور خوبصورت بیویوں کے طور پر بیان کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

حور مقصورات فی الخیام

وہ خیموں میں پردہ نشین ہوں گی۔

''مقصور'' کا معنی مستور اور پردہ نشین کیا گیا ہے، بعض نے کہا ہے کہ اس کا معنی اُن کا دوسروں کی نظروں سے محفوظ رہنا ہے، جوان کی پاکیزگی کی طرف اشارہ ہے، بعض نے یہ تفسیر کی ہے کہ وہ فقط اپنے شوہروں پر آنکھیں لگائے بیٹھی ہوں گی، وہ ان کے علاوہ کسی اور سے عشق نہیں کریں گے یہ وہی بات ہے جو ''قاصرات الطرف'' کی تفسیر میں بھی ذکر کی گئی ہے۔

کیونکہ طرف (بروزن حرف) کا معنی آنکھ کی پلک ہے، چونکہ دیکھنے کے وقت پلکیں حرکت کرتی ہیں اس لئے یہ لفظ آنکھوں کی حرکت کے لئے استعمال ہونے لگا، لہذا ''قاصرات الطرف'' ان عورتوں کی طرف اشارہ ہے جن کی نظریں جھکی ہوئی ہیں، یعنی اُن کی محبت اور نظر اپنے شوہروں کے لئے مخصوص ہے، اور یہ بیوی کی سب سے بڑھ کر فضیلت ہے، کہ وہ اپنے شوہر کے علاوہ کسی کے متعلق نہ سوچے، اس کی محبت کا مرکز اس کا شوہر ہی ہو۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ عربی زبان میں ''خیمہ'' صرف کپڑے کے خیمے کے معنی میں نہیں ہے بلکہ ہر گول عمارت کو خیمہ کہتے ہیں، یہاں تک کہ بعض علماء لغت نے تو یہ کہا ہے کہ ہر وہ عمارت جو پتھر اور اینٹوں وغیرہ سے بنی ہوا سے خیمہ کہتے ہیں، ''مقائیس اللغت'' کے بقول اس کی بنیاد مضبوطی اور ثبات سے ہے۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بہشت کے خیمے باقی چیزوں کی مانند اس دنیا کے خیموں کے ساتھ کسی قسم کی مشابہت نہیں رکھتے، ان میں سے بعض تو صرف مروارید اور موتیوں کے ہیں۔

بہشتی عورتوں کی ایک صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ یاقوت اور مرجان کی طرح ہیں۔

کانھن الیاقوت والمرجان (رحمن۔ ۵۸)

یعنی سرخی، درخشندگی اور جلا میں یاقوت جب کی سفیدی اور خوبصورتی میں مرجان یہ بھی واضح ہے کہ جب یہ دو رنگ یعنی ''سفید'' اور ''سرخ'' آپس میں مل جائیں تو خوبصورت ترین رنگ میں تبدیل ہو جاتے ہیں،

[1] ابوالفتوح رازی نے اپنی تفسیر میں اسے بعض گذشتہ مفسرین کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ ج ۱۱۔ ص ۱۳

''یاقوت'' ایک معدنی پتھر ہے جو بہت شفاف اور عموماً سرخ رنگ کا ہوتا ہے جب کہ مرجان درخت کی ڈالی کی مانند ہوتا ہے، یہ سمندر میں پایا جاتا ہے، اس کے مختلف رنگ ہوتے ہیں، یہاں پر ظاہراً سفید رنگ والا مراد ہے، بعض نے اس کا معنی چھوٹے چھوٹے موتی کیا ہے [1]۔ کیونکہ اس طرح کے موتی سفید، خوبصورت اور بہت شفاف ہوتے ہیں۔

لیکن موجودہ سائنسدان ''مرجان'' کو ایک زندہ موجود سمجھتے ہیں جو درخت کی چھوٹی ڈالیوں کے مانند ہے، یہ سمندر کی تہ میں پایا جاتا ہے، بہت عرصے تک سائنسدان اسے ایک قسم کا پودا سمجھتے رہے لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ حیوانی خصوصیات کا حامل ہے اگرچہ یہ سمندر کی تہ میں موجود بڑے بڑے پتھروں سے چمٹا ہوتا ہے۔

ایک اور بیان میں انہیں ''ابکار'' اور پھر ''عرب'' اور ''اتراب'' کی صفات کے ساتھ یاد کیا گیا ہے۔

فجعلنهن ابكارا، عربا اترابا (واقعه۔۳٦و ۳۷)

''ابکار'' جمع ہے ''بکر'' کی جس کا معنی ہے ''کنواری''، بعض احادیث اور مفسرین کے کلمات سے ظاہر ہوتا ہے کہ بہشتی بیویوں میں یہ حالت ہمیشہ کے لئے رہے گی۔ ملاپ کے ساتھ یہ حالت ختم نہیں ہوگی۔

''عرب'' (بروزن ''کتب'') جمع ''عروب'' (بروزن ''صبور'') ہے، یہ اس عورت کے معنی میں ہے جو شیریں سخن اور فصیح ہو، جو اپنی میٹھی میٹھی باتوں کے ساتھ اپنے شوہر سے اظہارِ محبت کرے، حقیقت میں یہ ''اعراب'' کے مادہ سے لیا گیا ہے جو اظہار کے معنی میں ہے، بعض اوقات اس کا معنی یہ کیا گیا ہے کہ وہ عورت جس کی ظاہری حالت ہی اُس کی عفت اور پاک دامنی کی حکایت کر رہی ہو۔

بعض نے اس کا معنی ناز و ادا کیا ہے، یہ مذکورہ بالا معنی سے زیادہ فرق نہیں رکھتا، کلمہ ''اتراب'' بھی قرآن کی تین آیات میں بہشتی بیویوں کی صفت کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ [2]

یہ کلمہ جمع ہے ''ترب'' (بروزن ''حزب'') کی، جس کا معنی ہم عمر افراد ہیں، عموماً یہ کلمہ عورتوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے بعض کے بقول یہ ''ترائب'' سے ماخوذ ہے جس کا معنی سینے کی پسلیاں ہیں جو آپس میں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں۔

بعض نے اُسے ''تُراب'' (مٹی) کے مادہ سے سمجھا ہے گویا سب اکٹھے پیدا ہوئے ہیں اور زمین پر انہوں نے اکٹھے قدم رکھا ہے۔

بہر حال بہشتی بیویوں کا ہم عمر ہونا ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ وہ اپنے شوہروں کی ہمعمر ہوں گی، کیونکہ ہم عمر ساتھی ایک دوسرے کے جذبات اور احساسات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں، یا ممکن ہے کہ ان کا ہم عمر ہونا اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ وہ جوانی، اچھائی، ظاہری اور باطنی حسن میں ایک جیسے ہوں گے، بالکل اس مشہور تعبیر کی طرح کہ آنہا ہمہ خوبند یک بہ یک از ہمہ بہتر (وہ سب اچھے ہیں اور ایک دوسرے سے بڑھ کر ہیں)۔

---

[1] راغب نے یہ معنی ''مفردات'' میں بیان کیا ہے، بعض دوسرے مفسرین نے بھی یہی معنی ذکر کیا ہے۔

[2] راغب نے یہ معنی ''مفردات'' میں بیان کیا ہے، بعض دوسرے مفسرین نے بھی یہی معنی ذکر کیا ہے۔

لیکن اس کو ''عرب'' ''کواعب'' اور ''قاصرات الطرف'' جیسے اوراوصاف کے ساتھ ذکر کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلا زیادہ مناسب ہے۔

کلمہ ''کواعب'' جو کہ سورہ نباء میں بہشتی عورتوں کی توصیف کے لئے لایا گیا ہے، جمع ہے ''کاعب'' کی، جس کا معنیٰ کم عمر کی باکرہ لڑکی ہے، یہ ''کعب'' کے مادہ سے لیا گیا ہے جس کا معنی پاؤں کا اُبھار ہے، یہاں پر یہ اس عورت کی طرف اشارہ ہے جس کے سینے کا اُبھارا بھی بھی نمایاں ہوا ہو، ایسا جوانی کی ابتداء میں ہوتا ہے، یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ یہ جسمانی بلوغ کی طرف اشارہ ہے جس وقت پورا بدن تیزی سے نشوونما پانے لگتا ہے۔

اس طرح سے بہشتی بیویاں ہرلحاظ سے ممتاز، خوبصورت، ظاہری اور باطنی حسن کی حامل اور جسمانی، اخلاقی اور روحانی کمالات کی حامل ہیں، جو حسن تمام حسینوں میں مل کر ہوتا ہے وہ ان میں اکیلی اکیلی میں ہوگا۔

ایک بار پھر اس بات کی یاددہانی کراتے چلیں کہ یہ کچھ اُس عالم بالا کی طرف ایک اشارے کے طور پر ہی ہے اس کی تفصیل اور توضیح تو ہماری بساط سے باہر ہے۔

۱۱۔غلام اور ساقی

خدا نے بہشتیوں پر نعمات کو کمال کی حد تک پہنچا دیا ہے، انہیں ہر چیز عطا کی گئی ہے وہ ایسی خدمت گزار ہیں کہ بہت خدمت کریں گی، اہل بہشت کے اردگرد ساقی گھوم رہے ہوں گے، جو انہیں بہشتی شراب پلائیں گے۔

اُن کا ظاہری اور باطنی حسن، ان کی نیک عادات اور خصائل اہل بہشت کی توجہ اپنی طرف یوں مبذول کرلیں گے کہ وہ دنیا کا ہرغم اور دکھ بھول جائیں گے، وہ تکالیف جو انہوں نے خدا کی اطاعت کے سلسلے میں جھیلی ہوں گی سب محو ہوجائیں گی۔

قرآن کی متعدد آیات میں اُن کا ذکر ہوا ہے، ان کی تعریف اس انداز میں کی گئی ہے جس سے ہر پڑھنے والا متاثر ہوجاتا ہے، جیسا کہ بہشت کی باقی نعمات کے سلسلے میں ہے ویسا ہی یہاں قرآن نے مختلف تعبیرات استعمال کی ہیں، ایک جگہ پر ''غلمان'' کی تعبیر لائی گئی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

ویطوف علیهم غلمان لهم کانهم لؤلؤ مکنون۔

اُن کے اردگرد غلام ان کی (خدمت کے لئے) پھریں گے جو سیپ میں چھپائے ہوئے موتیوں کی مانند ہوں گے۔(طور۔۲۴)

یطوف کی تعبیر اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وہ ہمیشہ بہشتیوں کے اردگرد محو طواف ہوں گے (کیونکہ فعل مضارع عموماً استمرار اور ہمیشگی کے معنی پر دلالت کرتا ہے)

"لو لو مکنون" (صدف میں موتی) اس قدر شفاف، خوبصورا ور انوکھا ہوتا ہے جس کی کوئی حد نہیں، جس وقت اسے سیپ سے باہر نکالا جاتا ہے اس وقت وہ ایک عجیب نکھار کا حامل ہوتا ہے، بہشتی خدمت گزار بھی اس قدر حسین، سفید رنگ اور پاکیزہ ہوں گے گویا وہ سیپ میں بند ایک موتی کی مانند ہیں یا جس موتی کو ابھی ابھی باہر نکالا گیا ہو اس کی طرح۔

یہ بات صحیح ہے کہ آیات اور روایات کی تعبیرات کے مطابق بہشت میں کسی خدمت گزار کی ضرورت نہیں، بہشتی جو بھی چاہیں گے فوراً انہیں مل جائے گا لیکن ان غلاموں کا خدمت کے لئے ہونا بھی بذات خود ایک بہت بڑی عزت افزائی ہے۔

اگر چہ اس آیت میں یہ بات واضح طور پر نہیں آئی کہ وہ کس کام کے لئے ان کے ارد گرد طواف کریں گے لیکن دوسری آیات سے جن کو آگے ذکر کیا جائے گا ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کا کام بہشتیوں کی خدمت میں مختلف کھانے اور پینے کی چیزیں پیش کرنا ہے۔

"لھم" کی تعبیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر بہشتی کے لئے مخصوص خدمت گزار ہوں گے، چونکہ جنت غم و اندوہ کی جگہ نہیں ہے لہٰذا وہ غلام بھی خدا کے ان خاص بندوں کی خدمت سے خوشی اور لذت محسوس کریں گے۔

یہ بات قابل توجہ ہے بہت سے مفسرین نے پیغمبر گرامی اسلامؐ سے نقل کیا ہے کہ

آپؐ سے پوچھا گیا کہ جب خدمت گزار سیپ کے موتیوں جیسے ہوں گے تو مخدوم (یعنی بہشتی مومنین) کیسے ہوں گے؟

آپ نے فرمایا:

والذی نفسی بیدہ ان فضل المخدوم علی الخادم کفضل القمر لیلۃ البدر علیٰ سآئر الکواکب۔

اس کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، وہاں پر "مخدوم" کی خادم پر برتری ایسے ہی ہے جیسے چودھویں کے چاند کی دوسرے ستاروں پر۔[1]

اس نکتہ کی یاد دہانی بھی ضروری ہے کہ "غلمان" جمع ہے "غلام" کی جس کا لغت میں معنی نوجوان ہے، یہ نوکر اور خدمت کے لئے غلام کے معنی میں نہیں ہے۔[2]

یہ بات واضح ہے کہ جو لوگ جوانی کی عمر میں ہوتے ہیں وہ تیز، مضبوط، فعال اور پر جوش ہوتے ہیں، قرآن ایک جگہ پر ان کو "ولدان" (نوجوان) کے عنوان سے یاد کرتا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

---

[1] مجمع البیان، ابوالفتوح رازی، روح البیان، قرطبی، تفسیر کشاف، زیر نظر آیت کے ذیل میں۔

[2] بہت سے علمائے لغت نے اس کی تفسیر میں یوں لکھا ہے "الغلام ھو الطار الشارب" یعنی جس کی مسیں تازہ بھیگی ہوں، مقائیس، مفردات، لسان العرب۔

یطوف علیھم ولدان ......مخلدون ....باکواب
واباریق ....وکاس من معین

اُن کے اردگرد ہمیشہ تازہ دم اور باوقار رہنے والے نوجوان بہشت کی جاری نہروں سے پیالوں، صراحیوں اور جاموں کے ساتھ گردش کریں گے۔ (واقعہ۔۱۷و۱۸)

''ولدان'' جمع ہے ''ولید'' کی جو ''مولود'' (بچے) کے معنی میں ہوتا ہے، یہاں پر یہ نوجوان کے معنی میں ہے، یہ جو بعض نے ذکر کیا ہے کہ یہ مومنین کے بچوں کی طرف اشارہ ہے جو اپنے والدین کی خدمت کریں گے کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتا[1]۔ کیونکہ اگر وہ خود مومن ہوئے تو ان کی خدمت کی جائے گی نہ یہ کہ ان سے خدمت لی جائے گی، اگر وہ مومن نہیں تو جنت میں ان کا داخلہ ممنوع ہوگا۔

''مخلدون'' کی تعبیر اُن کی خوبصورتی اور تازگی کے دائمی ہونے کے لئے ہے۔

ایک اور آیت میں یہی تعبیر کچھ زیادہ وضاحت اور خوبصورتی کے ساتھ آئی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

ویطوف علیھم ولدان مخلدون اذا رایتھم حسبتھم لؤ لؤا منثورا۔

اور ان کے اردگرد ہمیشہ رہنے والے نوجوان (خدمت کے لئے) گردش میں رہیں گے، جب تو انہیں دیکھے گا تو انہیں بکھرے ہوئے موتی خیال کرے گا۔ (دھر۔۱۹)

یہ بھی اسی امر کی تائید کرتا ہے کہ ''ولدان'' سے مراد ''غلمان'' ہی ہیں جنہیں پہلی آیات میں ''لؤ لؤ مکنون'' کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے، یہاں پر انہیں ''لو لو منثور'' کہا گیا ہے۔

البتہ بہت سے مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ یہ نوجوان مشرکین کے بچے ہیں یا اُن مومنین کے جنہوں نے کوئی نیکی انجام نہیں دی، خدا ان بچوں کو ان کے والدین کی وجہ سے سزا نہیں دے گا، بلکہ انہیں خدمت گزاروں کی صورت میں جنت میں لے آئے گا، یہ مومنین کی خدمت کریں گے، اس خدمت سے وہ بھی خوشی اور سرور محسوس کریں گے۔

لیکن ہم نے جو کچھ اوپر ذکر کیا ہے اس کے پیش نظر یہ بات کچھ بے وزن محسوس ہوتی ہے جو روایت بھی اس سلسلے میں ذکر کی گئی ہے وہ بھی مرسلہ ہے۔

ایک اور جگہ پر اجمالی طور پر (فعل مجہول کی صورت میں) خدمت گزاروں کا تذکرہ کیا گیا ہے،۔

ارشاد ہوتا ہے:

---

[1] فخر رازی نے اپنی تفسیر میں یہ احتمال ذکر کیا گیا ہے اور اُسے بعید سمجھا ہے۔ (ج۲۹۔ص۱۴۹)

یطاف علیھم بکاس من معین

ان کے اردگرد شراب طہور سے بھرے ہوئے جام گھمائے جائیں گے۔ (صافات۔ ۴۵)

اس سے ملتا جلتا مفہوم سورہ دھر کی آیت ۱۵ میں بھی آیا ہے جو خدمت کے مختلف اندازوں پر دلیل ہے۔

ویطاف علیھم بانیۃ من فضۃ واکواب کانت قواریرا

اور ان کے اردگرد چاندی کے برتن اور بلوریں جام (بہترین کھانوں اور شرابوں سے بھرے ہوئے) کو گھمایا جائے گا۔

سورہ زخرف آیت ۷۱ میں ارشاد ہوتا ہے:

یطاف علیھم بصحاف من ذھب واکواب

ان کے اردگرد سونے کے برتن (بہشتی کھانوں سے بھرے ہوئے) اور جام (شراب طہور سے لبریز) گردش دیئے جائیں گے۔

''صحاف'' جمع ہے ''صحفه'' کی، زمخشری کے بقول (بحوالہ مصباح اللغت) اس کا معنی بڑا مستطیل نما برتن ہے، اس کے اصلی مادے کا معنی پھیلاؤ اور ہموار ہونا ہے، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ برتن طشت کے مانند ہو گا، ''اکواب'' جمع ہے ''کوب'' (بروزن ''خوب'') کی، جس کا معنی پینے کے لئے استعمال ہونے والا وہ برتن ہے جو دستہ نہ رکھتا ہو، اس کے لئے کبھی ''قدح'' کی تعبیر بھی لائی جاتی ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ بعض مفسرین کے بقول ''صحاف'' جمع کثرت کا صیغہ ہے اور ''اکواب'' جمع قلت کا، یعنی پہلا زیادہ تعداد پر دلالت کر رہا ہے، یہ اس لئے ہے کہ کھانے اور اس کے لئے برتن ہمیشہ پینے والی اشیاء اور ان کے برتنوں سے تعداد اور انواع و اقسام میں زیادہ ہوتے ہیں۔[1] قرآنی فصاحت و بلاغت کا تقاضا یہی ہے کہ اس طرح کی باریک بینیوں کو بھی مدنظر رکھے (غور کیجئے گا)۔

یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ ان آخری آیات میں اگرچہ خدمت گزاروں کی خصوصیات کو بیان نہیں کیا گیا تاہم گزشتہ آیات ان کی تفسیر کر سکتی ہیں، وہ اس بات کی وضاحت کر سکتی ہیں کہ وہ کون ہیں اور اُن کی خصوصیات کیا ہیں۔

۱۲۔ استقبال کرنے والے

دعوتوں کی تکمیل اور مہمانوں کے احترام کے لئے دعوتوں میں ایک یا کئی معزز افراد موجود ہوتے ہیں جو مہمانوں کو کھانے پینے کی

---

[1] تفسیر روح المعانی ج ۲۵ ص ۹۰

دعوت دیتے ہیں، یہ لوگ خدمت گزاروں کے علاوہ ہوتے ہیں اس سے نہ فقط یہ کہ دعوت پرلطف ہوجاتی ہے بلکہ مہمانوں کی بھی عزت افزائی ہوتی ہے،قرآن کی آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ بہشتیوں کے لئے یہ کام فرشتے اور خازنان جنت انجام دیں گے، وہ مہمانوں کو بہشتی نعمات سے محظوظ ہونے کی دعوت دیں گے۔

سورہ طور کی آیت ۱۹ میں بغیر اس کے کہ یہ بتایا گیا ہو کہ اس بات کا کہنے والا کون ہے، بہشتیوں کو مخاطب کر کے ارشاد ہوتا ہے:

کلوا واشربوا ھنیا ،بما کنتم تعملون

کھاؤ، پیوتمہارے لئے خوشگوار ہوان نیک اعمال کے صلے میں جوتم نے انجام دیئے، بالکل یہی تعبیر سورہ مرسلات کی آیت ۴۳ میں بھی آئی ہے۔

کیا یہ بات کہنے والا خدا ہے جو اپنے لطف وکرم اور جنتیوں کی عزت افزائی کے لئے اس طرح انہیں بلا رہا ہے، یا جنت کے فرشتے اور خزانہ دار ہیں؟ بہرحال جنت کی تمام نعمتیں خوشگوار ہیں، البتہ یہ جو انہیں کہا گیا ہے تمہارے لئے خوشگوار ہو یہ اس کے لطف اور مزاج کے ساتھ موافقت کو اور افزوں کر دیتا ہے۔

اسی سے ملتی جلتی تعبیر تھوڑے سے فرق کے ساتھ سورہ حاقہ آیت نمبر ۲۴ میں آئی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

کلوا واشربوا ھنیئا بمآ اسلفتم فی الایام الخالیۃ

کھاؤاور پیو خوشگوار، اُن (نیک) اعمال کے بدلے میں جوتم نے گزشتہ ایام میں انجام دیئے۔[1]

یہاں پر یہ بھی اس بات کے متکلم کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہوا، یہاں بھی وہی بات ہے جو اس سے پہلی آیت میں ذکر کی گئی ہے۔

۱۳۔ابتدائی خدمت

یہ بات قابل توجہ ہے کہ قرآن کی چند آیات میں ایک بہت ہی معنی خیز تعبیر نظر آتی ہے جو کئی پہلوؤں سے پردہ اٹھاتی ہے اور وہ ''نزول'' کی تعبیر ہے، یہ سب سے پہلے سورہ آل عمران کی آیت ۱۸ میں آئی ہے:

لھم جنت تجری من تحتھا الانھر خلدین فیھا نزلا من عند اللہ وما عند

---

[1] یہاں پر''ھنیئا''،محل اعراب کے اعتبار سے کیا ہے!اس سلسلے میں بہت کچھ کہا گیا ہے!بعض اسے''مفعول مطلق'' کی جگہ پر''وصف'' قرار دیتے ہیں، گویا پوری عبارت یوں ہے''کلوا اکلا ھنیئا''، بعض نے اسے ''مفعول بہ'' کے لئے وصف شمار کیا ہے گویا عبارت یوں ہے:''کلوا واشربوا ما کولا ومشروبا ھنیئا'' حقیقت میں خوشگوار وہی ماکول ومشروب ہے، بہرحال کھانے اور پینے کے خوشگوار ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ انسان پر کوئی مضر اثر مرتب نہ کرے بلکہ آسانی کے ساتھ ہضم ہوجائے۔)

اللہ خیر للابرار۔

اُن کے لئے جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، یہ اللہ کی طرف سے مہمانی ہوگی، اور جو اللہ کے پاس ہے وہ نیکوں کے لئے بہتر ہے۔

اسی سے ملتی جلتی تعبیر سورہ کہف کی آیت ۱۰۷، سورہ سجدہ کی آیت ۱۹، سورہ صافات کی آیت ۶۲ اور سورہ حم سجدہ کی آیت ۳۲ میں بھی آئی ہے۔

ان آیات کے حقیقی معنی کی وضاحت کے لئے ضروری ہے کہ ''نزول'' کا دقیق مفہوم سمجھا جائے ''راغب'' مفردات میں کہتے ہیں:

"النزل ما یعد للنازل من الزاد"

یعنی ''نزل وہ چیز ہے جو آنے والے مہمان کی خدمت کے لئے تیار کی جاتی ہے'' اس تفسیر کے مطابق وہ تمام نعمتیں جو مہمان کی پذیرائی کے لئے تیار کی جائیں ''نزول'' کا مصداق ہیں۔ ''صحاح اللغت'' اور ''مقائیس'' میں بھی یہی معنی ذکر کیا گیا ہے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ''نزل'' کا معنی بادشاہ کا ان افراد کی خاطر تواضع کرنا ہوتا ہے جو اس کے پاس آتے ہیں، اُن کا وظیفہ یا مشاہرہ مقرر کرنے سے پہلے۔[1]

لیکن بعض دوسرے مفسرین نے کہا ہے کہ ''نزل'' وہ سب سے پہلی چیز ہے جو مہمان کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے (جیسے شربت یا پھل وغیرہ کہ ہمارے دور میں مہمان کو یہ پیش کئے جاتے ہیں)۔[2]

یہ معنیٰ ''نزول'' (یعنی اترنا) کے مفہوم کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہے، بالخصوص اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ قرآن کہتا ہے کہ بہشت کے باغات (اپنی تمام نعمتوں اور عطیوں کے ساتھ) اس عظیم دعوت خانے میں ابتدائی دعوت کے طور پر ہیں، اس کا مفہوم یہ ہے کہ اس سے بڑھ کر نعمات بھی ان کے انتظار میں ہیں، شاید یہ اُن معنوی نعمات اور ذات حق کے جلووں کی طرف اشارہ ہو، اسی لئے سورہ آل عمران آیت ۱۹۸ میں ''نزلا من عنداللہ'' کے بعد ارشاد ہوتا ہے ''وما عند اللہ خیر للابرار''، جو خدا کے پاس ہے وہ نیکوں کے لئے بہتر ہے (غور کیجئے گا)۔ حتیٰ کہ اگر نزل اس پورے کھانے کے لئے جو مہمان کے لئے تیار کیا جاتا ہے (جیسا کہ بعض علمائے لغت کے کلمات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے) بھی بولا جائے پھر بھی اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کریم اور عظیم ہستی کی مہمان نوازی فقط کھانے کی حد تک محدود نہیں ہوگی، بلکہ اس کے علاوہ وہ اپنے مہمانوں کو خلعتوں، نعمتوں اور دوسرے گراں بہا تحفوں سے بھی نوازے گا، لہذا ''نزل'' کا جو معنی بھی کریں یہ بہشت کی روحانی اور معنوی نعمات کی طرف بھی ایک لطیف اشارہ ہے۔

---

[1] تفسیر فخر رازی ج ۲۵ ص ۱۸۲

[2] تفسیر المنار ج ۴۔ ص ۳۱۴ اس طرح سے ''نزل'' کے لئے تین مختلف لیکن قریب الافق معانی بیان کئے گئے ہیں

۱۴۔ناقابل تصور نعمات

بے شک جنت کی نعمات فقط ان چیزوں میں منحصر نہیں ہیں جن کا تذکرہ کیا گیا ہے، اگر چہ یہ بھی بہت اہم نعمات ہیں، اس مادی جہان کی محدود فکر اتنی پرواز نہیں کر سکتی کہ وہ آخرت کی مادی اور معنوی نعمات کا ادراک کر سکے، دوسری طرف انسان کی تنوع طلب طبیعت مختلف اور قسم قسم کی نعمات کا تقاضا کرتی ہے، لہٰذا قرآن نے اس مسئلے کی طرف خاصی توجہ دی ہے، وہ واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ وہاں جس بھی مادی یا روحانی نعمت کا تقاضا کروگے وہ تمہیں ملے گی، ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:

وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ ۚ

اور بہشت میں وہ چیزیں ہوں گی جو دل چاہیں گے اور آنکھیں لذت پائیں گی۔(زخرف۔۷۱)

بہشتی نعمات کے بارے میں امکان کی حد تک یہ تعبیر سب سے بڑھ کر ہے،''مجمع البیان'' میں طبرسی مرحوم کے بقول اگر پورے عالم کی مخلوقات جمع ہو جائیں اور بہشتی نعمات کی تعریف کرنا چاہیں تو وہ اس چیز پر ہرگز قادر نہیں ہو سکیں گی، اس آیت پر وہ کسی چیز کا اضافہ کر سکتیں۔[1]

یہ بات قابل توجہ ہے کہ مذکور جملے کو بہشت کی نعمات کے ایک قابل توجہ حصہ کے ذکر کے بعد لایا گیا ہے تاکہ اس بات کی وضاحت کر دی جائے کہ بہشتی نعمات فقط ان میں منحصر نہیں ہیں، آنکھ کی لذت کا ذکر دل کی لذت کے بعد کیوں ہے؟ اس سلسلے میں چند احتمالات ذکر کئے گئے ہیں:

ایک یہ کہ ''تشتھیه الانفس''، تمام لذتوں کو شامل ہے لیکن آنکھوں کی لذت چونکہ انتہائی اہمیت کی حامل ہے اس لئے اسے بعد میں الگ سے ذکر کر دیا گیا ہے، اسے اصلاح میں ''ذکر خاص بعد از عام'' کہتے ہیں۔

دوسرا یہ کہ پہلا جملہ حِس شنوائی، لامسہ، ذائقہ اور شامہ کی لذت پر مشتمل ہے جب کہ '' تلذ الاعین '' کا جملہ فقط لذت بینائی کو بیان کرتا ہے، یہ لذت یا تو اُن کے برابر ہے یا اُن سے بڑھ کر ہے۔

تیسرا یہ کہ پہلا جملہ تمام مادی لذتوں کی طرف اشارہ ہے جب کہ دوسرا جملہ روحانی اور معنوی لذتوں کو بیان کرتا ہے، یعنی دل کی آنکھ کے ساتھ خدا کے بے مثال جمال کا نظارہ اور اس کی جلالی اور جمالی صفات کے باطنی مشاہدے کا ایک لحظہ بھی بہشت کی تمام مادی نعمتوں سے بڑھ کر ہے۔

البتہ یہ بات واضح ہے کہ پاکیزہ ماحول میں بہشتیوں کی روح اور جان بھی ان پاک لذتوں کا تقاضا کرے گی جو ایک پاکیزہ انسان کے شایانِ شان ہیں، لہٰذا آیت کی عمومیت کسی قسم کا استثناء نہیں رکھتی، اس کے لئے کسی تاویل کی بھی ضرورت نہیں کہ کیا یہ آیت نفس کے ناپسندیدہ

---

[1] تفسیر مجمع البیان۔ج۹۔ص۵۶

تقاضوں پر بھی حاوی ہے یا نہیں۔

بہر حال اسی معنی کی مانند سورہ حم سجدہ آیت ۳۱ میں بھی ارشاد ہوتا ہے:

وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيَ أَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ

جنت میں جو کچھ چاہو گے اور جو کچھ مانگو گے تمہیں دیا جائے گا۔[1]

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ پہلا جملہ بہشت کی تمام مادی نعمتوں کی طرف اشارہ ہے جب کہ دوسرا جملہ روحانی نعمتوں کی طرف اشارہ ہے، سورہ یونس کی آیت ۱۰ بھی اسی کی تائید کرتی ہے:

دعواهم فيها سبحٰنك اللهم و تحيتهم فيها سلام واٰخر دعواهم ان الحمد لله رب العلمين۔

بہشت میں اُن کی بات اور دعا یہ ہوگی ''اے اللہ تو پاک ہے'' اور اُن کی تحیت اس میں سلام ہوگی اور اُن کی دعا کا اخیر یہ ہوگا: ہر حمد تمام جہانوں کے پروردگار اللہ کے لئے ہی ہے۔

یہ تفسیر اس بات کے پیش نظر کہ نفس کی خواہش عموماً مادی امور میں ہوتی ہے اور دعا معنوی امور میں زیادہ استعمال ہوتی ہے، زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔

سورہ انبیاء آیت نمبر ۱۰۲ میں ارشاد ہوتا ہے:

وهم فی ما اشتهت انفسهم خلدون

وہ ان چیزوں میں جن کو اُن کا دل چاہے گا ہمیشہ رہیں گے۔

مذکورہ بالا آیات کے علاوہ بھی قرآن میں اس سلسلے کی کئی آیات نازل ہوئی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

لهم فيها ما يشآءون

وہ جو بھی چاہیں گے وہاں پر ہے۔ (نحل۔۳۱)

سورہ فرقان آیت ۱۶ میں یہی تعبیر آئی ہے ، تھوڑے سے فرق کے ساتھ قرآن کی دیگر تین آیات میں بھی یہ تعبیر آئی ہے۔ (زمر۔۳۴، شوریٰ۔۲۲ اور ق۔۳۵)۔

اب تک جو کچھ بیان ہوا ہے اس سے مجموعی طور پر اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ بہشت کی نعمات کی کوئی حد نہیں، نہ مقدار کے

---

[1] ''یدعون'' ''ادعاء'' کے مادہ سے ہے (اختصال از دعا) جس کا معنی ہے کوئی چیز مانگنا اور طلب کرنا

لحاظ سے، نہ کیفیت کے لحاظ سے، نہ نوع کے لحاظ سے، نہ زمانے کے لحاظ سے اور نہ مکان کے لحاظ سے، لہٰذا گزشتہ ابواب میں جو کچھ ذکر کیا گیا ہے یہ اُن نعمات کی ایک جھلک ہے جو ہم مادی انسانوں کے لئے ممکن ہے جو اس سے بڑھ کر ہے اور ہمارے ادراک کی وسعتوں سے بھی آگے ہے وہ مذکورہ آیات میں عمومی اور جامع انداز میں بیان ہوا ہے۔

حقیقت میں جنت اور اس کی نعمات خدا کے لطف اور قدرت کا ایک مکمل شاہکار ہیں چونکہ اس کی قدرت اور لطف و کرم لامحدود ہے، لہٰذا جنت کی نعمات بھی لامحدود اور بے انتہا ہیں (غور کیجئے گا)۔

(۳) روحانی لذتیں

اس بات کے پیش نظر کہ معاد روحانی پہلو بھی رکھتی ہے اور جسمانی بھی، نیز یہ کہ روح کا مقام اور مرتبہ جسم سے بلند ہے، اس بات میں کسی قسم کی تردید نہیں رہتی کہ بہشت کی معنوی اور روحانی نعمات وہاں کی مادی نعمات سے بلند وبالا اور زیادہ پرشکوہ ہوں گے۔

چونکہ معمولاً ان نعمتوں کا بیان اور تعریف نہ ہی کی جاسکتی ہے اور نہ ہی سنی جاسکتی ہے (البتہ دل کی آنکھوں کے ساتھ انہیں دیکھا جاسکتا ہے) لہٰذا نعمات کے اس سلسلے سے متعلق قرآن میں اجمالی طور سے اشارے ملتے ہیں، جس جگہ پر وضاحت کی ضرورت تھی وہاں قرآن نے وضاحت بھی کردی ہے۔

دوسرے لفظوں میں معرفت خدا کے ادراک کی لذت، اُس کے جمال اور جلال کی تڑپ، اس کے الطاف خفیہ کی جھلک اور اس کی ذات سے عشق کے جام کا سرور اس طرح ہے کہ وہاں کا ایک لحظہ بھی دنیا کی تمام مادی نعمتوں سے بڑھ کے ہے۔

بعض اوقات ہم اس سلسلے کے بہت کم ترین مرحلے کا نظارہ کرتے ہیں، جب خدا کی عبادت اور اس سے خلوت کی گھڑی نصیب ہو جائے اور انسان اس حاجت روا سے ملاقات کرے تو وہ پوری دنیا کو بھلا دیتا ہے، چندلمحات کے لئے وہ اس کے بے مثال جمال کے نظاروں میں کھو جاتا ہے، بالخصوص اگر یہ کسی قابل اہمیت جگہ پر ہو مثلاً خانہ کعبہ، عرفات یا مشعر وغیرہ میں جو مراکز خدا کی عبادت کے لئے مختص ہیں، انسان وہ سکون اور لذت محسوس کرتا ہے کہ کوئی قلم یا زبان اسے بیان نہیں کرسکتے۔

غور کیجئے اگر یہ حالت ہزاروں مرتبہ اور ہر بار پہلے سے زیادہ قوت کے ساتھ کئی گھنٹوں، راتوں، دنوں، مہینوں، اور سالوں تک جاری رہے تو کیا مزہ ہوگا؟ خصوصاً اس بات کو سامنے رکھتے ہوئے بہشت میں خدا کی یاد سے غافل کردینے والی بھی کوئی چیز نہیں ہوگی، جو حضور دل کو ختم کرسے، معرفت کی راہ میں حائل پردے دل کی آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جائیں گے، انسانی شعور اور فکر کئی گنا بلند ہو جائے گی، وہاں شیطانی وساوس کا کوئی پتہ ہی نہیں ہوگا جو کہ ہمیشہ اس راہ کے سالکوں کے لئے رکاوٹ بنتا ہے۔

اب اس بات کا تصور کیا جاسکتا ہے کہ وہاں کیا ہوگا؟ وہاں معنوی نعمات کی کیسی بہار آئی ہوگی! وہ کیسے تند و تیز جذبات ہوں گے جو روح کو خدا کے قرب کی طرف کھینچیں گے، جو روح کو ذات حق کے نور میں مدہوش کردیں گے، انسان اپنے آپ کو بھول جائے گا، محبوب کے علاوہ کسی چیز کو نہیں دیکھے گا، اُس کے علاوہ کسی چیز کی طلب اور خواہش نہیں کرے گا، جو کچھ اُس کا دل چاہے گا وہی کچھ دیکھے گا اور جو کچھ وہ دیکھے گا وہی اس کے دل کی چاہت ہوگی، ان مختصر سے اشارات کے ساتھ ہم قرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں، ان نعمات کی تفصیل قرآن کی زبانی سنتے ہیں، ان مواہب اور نعمات کا خلاصہ چند عناوین کے تحت کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ خصوصی احترام

بہشتیوں کا خصوصی احترام بہشت میں داخل ہوتے ہی شروع ہو جائے گا، بہشت کے نگہبان انہیں خوش آمدید کہیں گے، چنانچہ ارشاد

ہوتا ہے:

وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ

جن لوگوں نے تقویٰ اختیار کیا انہیں بہشت کی طرف گروہوں کی صورت میں بھیجا جائے گا، یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس آئیں گے اور اس کے دروازے کھول دیئے جائیں گے اور اُن سے ان کے نگہبان کہیں گے تم پر سلامتی ہو، یہ نعمتیں تمہارے لئے خوشگوار ہوں اور تم اس میں ہمیشہ رہنے والے ہو کر داخل ہو جاؤ۔

(زمر۔ ۷۳)

اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت کے نگہبان ان پرہیزگاروں کا بڑی شدت سے انتظار کر رہے ہیں، ان کے آنے سے پہلے ہی جنت کے دروازے کھول دیئے گئے ہیں، جب یہ لوگ بہشت میں داخل ہوں گے تو اُن کا پُرتپاک استقبال کیا جائے گا، نگہبان انہیں خوش آمدید کہیں گے، وہ بہت خوبصورت الفاظ کے ساتھ انہیں جنت اور اُس کی جاوداں زندگی کی طرف بلا رہے ہوں گے۔[1]

ہاں! اسی طرح ہی کسی معزز اور محترم مہمان کا استقبال کیا جاتا ہے، پہلے دروازے کھولے جاتے ہیں، میزبان بڑی شدت سے مہمان کا انتظار کرتے ہیں، مہمان کے آتے ہی اُسے خوش آمدید کہتے ہیں، یہ ایک بہت اہم روحانی لذت ہے۔

''خزنہ'' جمع ہے ''خازن'' کی جس کے معنی نگہبان اور رکھوالا کے ہیں، یہاں پر اُن فرشتوں کی طرف اشارہ ہے جو جنت کے نگہبان اور اس کا نظام چلاتے ہیں۔

جب یہ لوگ جنت میں داخل ہو جائیں گے تو فرشتوں کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ جنت کے ہر دروازے سے داخل ہو کر انہیں خوش آمدید کہیں، اور تبریک پیش کریں۔

سورہ رعد کی آیت ۲۳۔ ۲۴ میں ارشاد ہوتا ہے:

والملئکته ید خلون علیهم من کل باب۔سلام علیکم بما صبر تم فنعم عقبی الدار۔

[1] قابل توجہ یہ ہے کہ قرآن نے بہشت کے سلسلے میں ''واؤ'' حالیہ کو استعمال کیا ہے ''وفتحت ابوابها'' کا جملہ یہ بتاتا ہے کہ یہ دروازے پہلے سے ہی کھول دیئے جائیں گے (جیسا کہ سورہ ص آیت ۵۰ میں آیا ہے ''جنات عدن مفتحة لهم الابواب'' لیکن جہنم کے سلسلے میں ارشاد ہوتا ہے جب دوزخی پہنچیں گے تو دروازے کھولے جائیں گے۔ ''حتی اذا جآءوها فتحت ابوابها'' یہ واؤ حالیہ کے بغیر ہے۔

فرشتے اُن پر ہر دروازے سے داخل ہوں گے اور اُن سے کہیں گے! تم پر سلام ہو تمہارا صبر اور استقامت کی وجہ سے، دنیا کے بعد تمہیں کیسی اچھی عاقبت نصیب ہوئی ہے۔[۱]

اس آیت سے واضح طور پر اس مطلب کو سمجھا جا سکتا ہے کہ فرشتوں کے مختلف گروہ ہر دروازے سے ان کے پاس آئیں گے، اس بات کے پیش نظر کہ بہشت کا ہر دروازہ کسی ایک عمل صالح کی علامت کے طور پر ہے (باب الصلوٰۃ، باب الجھاد، باب الحج) معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کا ہر گروہ ان کے کسی نیک عمل کی وجہ سے اُن کے پاس آئے گا، ان تمام اعمال کا خلاصہ ''صبر'' میں کر دیا گیا ہے، صبر اپنے تمام شعبوں کے ساتھ، اطاعت پر صبر، مصیبت پر صبر، گناہ پر صبر۔

اس سے زیادہ اہم وہ سلام و رحمت ہے جو خدا بہشتیوں پر نازل کرے گا، لطف و رحمت اور محبت سے بھر پور سلام، سورہ یٰسین کی آیت ۵۸ میں ارشاد ہوتا ہے:

سلام قولا من رب رحیم

بہت رحم کرنے والے پروردگار کی طرف سے انہیں سلام کہا جائے گا۔

یہ الٰہی درود و سلام، یہ روح پرور، نشاط آفرین اور لطف و احسان سے معمور صدا بہشتیوں کو یوں مدہوش کر دے گی اور اُن پر سرور کی وہ کیفیت طاری ہو جائے گی جس کا مقابلہ کوئی نعمت نہیں کر سکتی۔

ہاں! محبوب کی پیار اور لطف سے بھری آواز کو ایک بار ہی سننا دنیا اور اس کی تمام نعمتوں سے بڑھ کے ہے۔

بقول شاعر!

پیام دوست شنیدن سعادت است و سلامت
فدای خاک در دوست باد جان گرامی

دوست کی چوکھٹ کی مٹی پر ہی میری جان قربان ہو۔

یا دوسرے شاعر کے بقول!

سلامت من دل خستہ در سلام تو باشد
زہی سعادت اگر دولت سلام تو یابم [۲]

محبوب سے وصال کا جذبہ، دوست کے دیدار کی تڑپ اور محبوب کا وہ سلام جو تمام حجابوں کو ختم کر دے گا اس قدر لذت بخش اور روح

---

[۱] یہاں پر کچھ محذوف ہے جو یوں ہے: ''فنعم عاقبۃ الدنیا الجنۃ

[۲] مجھ دل شکستہ کی سلامتی تو تیرا سلام ہے، اگر تیرے سلام کی دولت مجھ تک پہنچے تو زہے نصیب۔

پرور ہوگا کہ اگر عاشق اس معنوی فیضان سے دور رہ جائیں تو بے حال ہو جائیں، بعض اہل سنت مفسرین نے حضرت علیؑ سے یہ معنی خیز جملہ نقل کیا ہے: آپؑ نے فرمایا:

"لو حجبت عنه ساعة لمت"

اگر ایک لمحے کے لئے بھی اس کے دیدار سے محروم ہو جاؤں تو مر جاؤں۔[1]

بہشتیوں کی آخری آرزو ہوگی، یہ اُن کے لئے عظیم ترین افتخار ہوگا اور دل پذیر ترین گھڑی کہ جب رحیم و مہربان خدا ان پر سلام و درود بھیجے گا۔

قرآن کی متعدد آیات میں بہشتیوں پر درود و سلام کا ذکر کیا گیا ہے لیکن ان میں سلام کہنے والے کا ذکر نہیں کیا گیا۔ (جیسے سورہ حجر۔٤٦، فرقان۔٧٥ اورق۔٣٤)۔

ممکن ہے ان سلاموں کے کہنے والے فرشتے ہوں، بعض آیات میں اس بات کا بھی امکان ہے کہ یہ سلام کرنے والے بہشتی ہی ہوں جو ایک دوسرے کو سلام کہیں گے، یا ان سب سے بلند اور اعلیٰ ہستی یعنی خدا کی طرف سے اُن پر یہ سلام ہو۔

٢۔ پرسکون ماحول

زندگی میں انسانی روح کو جو چیز سب سے زیادہ مضطرب کرتی ہے وہ امن و سکون کا نہ ہونا ہے، اس دنیا کی زندگی کا عموماً تلخ ہونا اس بات کی بناء پر ہے کہ انسان کے پاس جو کچھ ہے وہ اس پر راضی نہیں اور نہ ہی اُسے مستقبل کے بارے میں کوئی اطمینان ہے اور نہ ہی اپنے جیسے دوسرے لوگوں کی طرف سے اُسے امن حاصل ہے، بالخصوص اگر کسی دوسرے کے پاس کوئی نعمت زیادہ ہے تو یہ شخص کینے، حسد اور رقابت کی آگ میں جلتا رہتا ہے۔

بہشت کی ایک معنوی نعمت یہ ہے کہ وہاں ہر طرف امن و سکون کا راج ہوگا، وہاں نہ تو جنگ کا خطرہ ہے اور نہ لڑائی جھگڑے کا خوف، وہاں نہ تو کینہ ہوگا اور نہ ہی حسد، ہر جگہ عشق و وفا کا دور دورہ ہوگا، ہر طرف محبت اور بھائی چارے کی حکمرانی ہوگی۔

قرآن مجید کی دو آیات میں بہشت کے متعلق ایک بہت خوبصورت اور معنی خیز تعبیر ملتی ہے، بہشت کو دارالسلام (امن و سکون کا گھر) کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے۔ سورہ انعام کی آیت ١٢٧ میں ارشاد ہوتا ہے:

لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۱۲۷

اہل بہشت کے لئے ان کے رب کے پاس پُر امن گھر ہے وہ ان کا ولی اور مددگار ہے، اُن (نیک) اعمال کی وجہ

---

[1] تفسیر روح البیان۔ ج٧ ص٤١٦)

سے جو انہوں نے انجام دیئے۔

سورہ یونس آیت ۲۵ میں ارشاد ہوتا ہے:

واللہ یدعوآ الیٰ دار السلام

خدا امن وسکون کے گھر کی طرف بلاتا ہے۔

مفسرین نے ''داراسلام'' کی تفسیر میں دو بیان ذکر کئے ہیں۔

اوّل یہ کہ ''سلام'' جو کہ ہر طرح کی مصیبت اور بلا سے سلامتی کے معنی میں ہے، یہ ''دار'' (بہشت) کے اوصاف میں سے ہے، وہاں نہ تو اس مادی دنیا کے لٹیروں کا کوئی وجود ہوگا اور نہ ہی خدا سے نا آگاہ دولت کے پجاریوں کی احمقانہ مزاحمت، نہ وہاں جنگ وجدال ہوگا اور نہ ہی استعمار اور استحصال، ہاں! وہاں تو صلح وصفائی اور امن وسکون کا راج ہوگا۔[۱]

دوسرا یہ کہ ''سلام'' خدا کے ناموں میں سے ایک نام ہے، لہٰذا دارالسلام'' مضاف اور مضاف الیہ ہے یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بہشت خدا کا مکان ہے، دونوں معانی ہی ٹھیک ہیں، اگرچہ پہلا معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس کلمے کی اصلی بنیاد ہر طرح کی ظاہری اور باطنی مصیبت سے محفوظ ہونا ہے، راغب نے مفردات میں یہی ذکر کیا ہے، اس کلمے کا اطلاق خدا کی ذات پر ایک صفت کے لحاظ سے ہے، یعنی اس کی ذات پاک تمام عیبوں اور برائیوں سے محفوظ ہے۔

''لھم دار السلام عند ربھم'' کا جملہ بھی اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ''داالسلام'' وہی پہلے معنی میں ہے (غور کیجئے گا)۔

ابن عباسؓ سے مروی ایک حدیث میں یوں آیا ہے کہ:

دارالسلام وہی بہشت ہے جس کے رہنے والے تمام مصیبتوں، بیماریوں اور بلاؤں سے محفوظ رہیں گے، اسی طرح بڑھاپے، موت اور حالات کی تبدیلی سے بھی محفوظ رہیں گے، ان کا عزت واحترام ہمیشہ ہوتا رہے گا، وہ ہمیشہ غنی اور بے نیاز رہیں گے، ہمیشہ کے خوش نصیب اور سعادت مند رہیں گے، نہ تو انہیں کوئی غم واندوہ ہوگا اور نہ ہی موت کا خطرہ۔[۲]

سورہ حجر آیت ۴۷، ۴۸ میں اسی بیان کو مکمل کرنے کے لئے ارشاد ہوتا ہے۔

وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ لَا یَمَسُّهُمْ فِیْهَا

[۱] یہ سطریں جس وقت رشتہ تحریر میں لائی جا رہی تھیں اسی وقت یہ خبر ملی کہ چند گھنٹے پہلے طاغوت کا حملہ امریکہ کی زیر قیادت عراق پر شروع ہو چکا ہے، ہزاروں طیاروں نے اس ملک کے اہم اور حساس مراکز پر مسلسل بمباری کی۔ (۳۰/ جمادی الثانی ۱۴۱۱ھ)

[۲] بحارالانوار، ج ۸ ص ۱۹۴ حدیث ۱۷۶

نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ

ہم ہر طرح کے حسد، دشمنی اور عداوت کو بہشتیوں کے سینے سے نکال دیں گے، وہ ایک دوسرے کے سامنے بھائیوں کی حیثیت سے تختوں پر بیٹھے ہوں گے، اس میں نہ تو انہیں کوئی تکلیف پہنچے گی اور نہ ہی وہ بہشت سے نکالے جائیں گے۔[1]

اس بات کے پیش نظر کہ ''غلل'' ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے جو ان تمام اندرونی برائیوں پر حاوی ہے جو روح اور جسم اور گھر اور معاشرے کے آرام وسکون کو ختم کر دیتی ہیں اس آیت سے یہ نتیجہ واضح طور پر اخذ کیا جا سکتا ہے کہ بہشتیوں کا سینہ دشمنی اور عداوت سے خالی ہوگا، ان کے دل میں کسی قسم کا حسد اور تکبر یا کینہ نہیں رہے گا، خدا یہ تمام بری صفات ان کے دل سے نکال دے گا، اسی وجہ سے برادری اور بھائی چارے کی روح اُن میں پروان چڑھے گی، کیسا خوبصورت اور روح پرور وہ معاشرہ ہوگا جس میں اس طرح کی بری صفات نہ ہوں گی، ہر جگہ پر مہر ومحبت اور صلح وصفائی کی بات ہوگی، اس دنیا میں کسی معاشرے سے یہ صفات جتنی زیادہ ختم ہوتی جائیں اتنا ہی وہاں چین وسکون بڑھتا جائے گا، اس کے برعکس کسی بھی گھرانے یا معاشرے میں ان صفات کا وجود آرام وسکون کا قاتل اور افسوس ناک اور سنگین دشمنیوں کا باعث بنتا ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن اس اندرونی امن وسکون کی تکمیل بیرونی سکھ اور چین کے ساتھ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ بہشت میں کوئی تکلیف اور تھکاوٹ نہیں ہوگی، نعمتوں کے ختم ہو جانے کا خوف نہیں ہوگا جو کہ انسان کو ہمیشہ ہراساں رکھتا ہے، یہ پورا ماحول بہشتی نعمتوں کو اور زیادہ خوشگوار بنا دے گا۔[2]

۳۔امن وامان۔۔۔۔۔۔۔خوف کا زائل ہونا

امن وامان ان بنیادی باتوں سے قطع نظر ہو کر جن کی طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے، بذات خود ایک بہت بڑی معنوی نعمت ہے، ایک لمحہ کے لئے بھی اس کا فقدان بہت تکلیف دہ امر ہے، اس حقیقت کو اچھی طرح تو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو پر خطر جگہوں یا جنگ زدہ علاقوں میں پھنسے ہوئے ہوں، جہاں پر ہر وقت بمباری اور میزائل گرنے کا خوف دامن گیر رہتا ہے، زندگی کی مٹھاس وہاں پر ختم ہو جاتی ہے، ایک ایک لمحہ عذاب بن جاتا ہے، لیکن امن وامان سے بھرپور ماحول میں اس کے برعکس ہوتا ہے۔[3]

---

[1] غل کا مادہ غلل (بروزن ضرر) ہے جس کا معنی کسی چیز کا آہستہ آہستہ اثر انداز ہونا ہے، لہٰذا وہ پانی جو درختوں کے اردگرد ہوتا ہے اسے ''غلل'' کہتے ہیں، کینہ اور عداوت کو بھی ''غلل'' کہتے ہیں کیونکہ یہ بھی دل میں آہستہ آہستہ نفوذ کرتے ہیں اسی وجہ سے خیانت کو بھی ''غلل'' کہتے ہیں

[2] یہی مفہوم تھوڑے سے فرق کے ساتھ سورہ اعراف آیت ۴۳ اور سورہ فاطر آیت ۳۵ میں بھی آیا ہے

[3] بہشتیوں کے لئے'' اٰمنین '' کی تعبیر (دخان۔۵۵)، (حجر۔۴۶) اور ''امنون'' کی تعبیر (سبا۔۳۷) میں آئی ہے جہاں پر'' وھم فی الغرفات امنون'' کہا ہے وہ بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

قرآن پرہیز گاروں کے متعلق کہتا ہے:

ان المتقین فی مقام امین

پرہیز گار امن وامان والی جگہ پر ہیں (دخان۔۵۱)

نہ تو وہاں شیطان کے حملوں کا خوف ہے اور نہ ہی ظالموں کی حکمرانی کا، نہ مصیبتوں اور بلاؤں کا خوف نہ ہی غم واندوہ کا خطرہ۔

اسی وجہ سے ایک اور جگہ پر ارشاد ہوتا ہے:

ادخلو الجنة لا خوف علیکم ولا انتم تحزنون

بہشت میں داخل ہوجاؤ! نہ تمہیں کوئی خوف ہوگا اور نہ کوئی غم۔ (اعراف ۴۹)

بعض اوقات یہ بات تجربے میں بھی آئی ہے کہ کبھی ایک شخص کی خدمت اور آسائش کے لئے تمام مادی نعمتیں موجود ہیں لیکن اس کے دل پر غم واندوہ کا جو پہاڑ ہے یا اُسے اندرونی طور پر جو خوف یا خطرہ محسوس ہوتا ہے اس کی وجہ سے وہ ان نعمتوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا، وہ ان کی طرف بالکل اعتناء نہیں کرتا، اس بات سے آپ بہشت کے متعلق قرآنی تعبیرات کی دقت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

بہشتی لوگ تو اپنے ایمان کے طفیل اس دنیا میں بھی ایک طرح کا امن وسکون محسوس کرتے ہیں، توکل، رضائے خدا اور اس کے ارادے کے سامنے سرتسلیم خم کرنے سے وہ زندگی کے مشکل ترین لمحات میں بھی ایک خاص قسم کا سکون وآرام محسوس کرتے ہیں:

اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْن لَھُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ

آگاہ رہو کہ خدا کے دوستوں کے لئے نہ تو کوئی خوف ہے اور نہ غم۔۔۔۔ان کے لئے دنیا اور آخرت کی زندگی میں خوشی اور سرور ہے۔ (یونس، ۶۲۔۶۴)

۴۔ ہمدرد اور باوفا دوست

ایک بہت بڑی معنوی اور روحانی خوشی یہ ہوتی ہے کہ انسان کے باوفا اور پُرخلوص دوست ہوں، ایسے دوست جو ایمان اور انسانی خصائل سے آراستہ ہوں، جو پیکر مہر ووفا ہوں، ان کی ہمراہی اتنی پرنشاط ہوتی ہے جو بیان نہیں کی جاسکتی، قرآنی آیات سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ بہشتی اس خصوصی نعمت سے بھی بہرہ مند ہوں گے، وہ پرخلوص ساتھیوں کے ساتھ بیٹھ کر گفتگو کریں گے، وہ کیا باتیں کریں گے اس کے متعلق پوری طرح کچھ نہیں کہا جاسکتا، شاید وہ ایسے موضوعات پر گفتگو کر رہے ہوں گے جن کا سمجھنا ہمارے لئے اس دنیا میں ممکن نہیں ہے، لیکن یہ بات یقینی ہے کہ ان کی گفتگو ان کی روح اور حیات کے لئے شادمانی کے اسباب فراہم کرے گی۔

سورہ نساء کی آیت ۶۹ اور ۷۰ میں ارشاد ہوتا ہے:

وَمَنۡ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوۡلَ فَاُولٰٓـئِكَ مَعَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيۡقِيۡنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيۡنَ‌ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓـئِكَ رَفِيۡقًا ۚ ذٰلِكَ الۡـفَضۡلُ مِنَ اللّٰهِ‌ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيۡمًا [۱]

جو خدا اور رسول کی اطاعت کرے (قیامت کے دن) وہ ان کے ہمراہ ہوگا جن پر خدا نے اپنی نعمتوں کو کمال کی حد تک پہنچا دیا ہے، پیغمبروں، صدیقین، شہداء اور صالحین میں سے، وہ کتنے اچھے ساتھی ہیں، یہ خدا کی طرف سے فضل ہے اور کافی ہے کہ خدا (اپنے بندوں کے حال) سے آگاہ ہے۔

ہاں! بہشت کے ساتھ تو دنیا کے افضل ترین لوگ ہیں! عظیم انبیائے خدا، ان کے خاص خاص فرمانبردار، صدیقین، شہداء اور صالحین۔

اگر ہم اس کا موازنہ اس دنیا سے کریں تو اس وقت ہی یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ بہشت کی دنیا کیسی ہوگی، اس دنیا میں تو انسان برے لوگوں کے ساتھ وقت گذارنے پر مجبور ہوتا ہے جو اس کے لئے باعث زحمت ہوتے ہیں۔

اس آیت کی شان نزول کے متعلق بہت سے مفسرین نے ایک حدیث نقل کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے (البتہ تھوڑے سے فرق کے ساتھ جو مفسرین کے درمیان ہے)۔

ایک دن پیغمبر اسلامؐ کا ایک صحابی جو آپؐ کی زیارت کا شیدا تھا، آپ کی خدمت میں آیا، وہ پریشان دکھائی دے رہا تھا، پیغمبر اکرمؐ نے اس سے اس پریشانی کے متعلق دریافت کیا، اس نے عرض کی، جب میں آپ سے دور ہو جاتا ہوں تو بہت رنجیدہ ہوتا ہوں، آج مجھے یہ خیال آیا کہ کل قیامت کے دن اگر میں بہشت میں بھی چلا گیا تو پھر بھی یقینی طور پر آپ والے مقام پر نہیں پہنچ سکوں گا جس کی وجہ سے آپ کے دیدار سے ہمیشہ کے لئے محروم رہوں گا، (اگر دوزخ میں چلا گیا پھر تو بات اور واضح ہے) لہٰذا مجھے پریشانی ہو رہی ہے، مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی اُسے اور اس جیسے دوسرے لوگوں کو بشارت دی گئی کہ مومن اور خدا اور رسولؐ کے مطیع افراد بہشت میں اولیاء اللہ اور انبیاءؑ کے ہمنشین ہوں گے۔ [۲]

''ذلک'' کی تعبیر جو کہ عموماً دور کی طرف اشارہ کے لئے ہوتی ہے ایسی جگہ پر اس نعمت الٰہی کی عظمت اور بلندی کے پیش نظر لائی گئی ہے، گویا یہ نعمت اس قدر بلند اور باعظمت ہے کہ ہماری دسترس اور پہنچ سے دور ہے، نیز ''الفضل من اللہ'' کی تعبیر بھی اسی معنی پر تاکید کے لئے

---

[۱] بعض کا یہ نظریہ ہے کہ ''رفیقا'' یہاں پر ''تمیز'' ہے اس لیے مفرد آیا ہے، بعض کہتے ہیں کہ یہ ''حال'' ہے اور اس کا مفرد آنا (جب کہ ذوالحال جمع ہے) یا تو اس لئے ہے کہ ''رفیق'' واحد کے معنی میں بھی ہوتا ہے اور جمع کے معنی میں بھی یا اس لئے ہے کہ یہ ''جنس'' کا معنیٰ رکھتا ہے۔

[۲] تفسیر مجمع البیان، فخر رازی، قرطبی، مراغی، روح المعانی اور فی ظلال القرآن میں زیر نظر آیت کے ذیل میں۔

ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ نعمت فقط عمل کے ذریعے سے ہی حاصل نہیں ہوتی بلکہ یہ تو خدا کے فضل وہ کرم کا ہی عطیہ ہے، صرف اس کی نظر کرم سے ہی اس نعمت تک پہنچا جا سکتا ہے۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ آیت میں یہ چار طرح کے افراد بالترتیب بہشتی ساتھیوں کے طور پر ذکر ہوئے ہیں، ''انبیاء'' ''صدیقین'' ''شہداء'' اور ''صالحین'' یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ ترتیب اُن کے درجات پر دلالت کرتی ہے، بعض نے یہ کہا ہے کہ انبیاء اس لئے پہلے ذکر کئے گئے ہیں چونکہ یہ معرفت خدا میں اُس مقام تک پہنچ چکے ہیں کہ دل کی آنکھوں سے خدا کو اپنے نزدیک دیکھ رہے ہیں۔ ''صدیقین'' وہ ہیں جو معرفت کے دوسرے درجے پر ہیں، یہ اس شخص کی مانند ہیں جو ایک چیز کو دور سے آنکھوں کے ذریعے دیکھتا ہے، شہداء تیسرے درجے پر ہیں، یہ اس کی مانند ہیں جو عقلی دلائل کے ساتھ کسی چیز تک پہنچے اور ''صالحین'' چوتھے درجے پر ہیں، یہ اس شخص کے مانند ہیں جو کسی علم کے بڑے لوگوں کی تقلید اور پیروی سے کسی چیز کو قبول کرتا ہے۔[1]

البتہ بعض اوقات انبیاء پر بھی ''شہداء'' اور ''صالحین'' کا لفظ بولا جاتا ہے، بہر حال یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب یہ چار اوصاف اکٹھے ذکر ہوں تو اس وقت وہی مذکورہ معنی سمجھا جاتا ہے۔

ان چار اوصاف کے لئے ایک بہتر تفسیر یہ ہے کہ انسانی معاشرے کی ہدایت اور راہنمائی کے لئے پہلے انبیاء (ہادیان الٰہی) کا آنا ضروری ہے، اس کے بعد صدیقین کا جو اپنے قول وفعل کے ساتھ انبیاء کی دعوت کو آگے پہنچاتے ہیں، اس کے بعد جب راستے میں کوئی رکاوٹ آئے تو ایسے افراد کا ہونا ضروری ہے جو اپنی جان کی قربانی دے کر اس دعوت اور تبلیغ کا دفاع کریں تا کہ آخر کار اس معاشرے پر نیک اور صالح لوگوں کی حکمرانی قائم ہو سکے۔

اس نکتے کی طرف توجہ ضروری ہے ان چار طرح کے گرہوں کا ایک ساتھ ہونا ان کے مقام کے برابر ہونے کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ ان کے درمیان ایک تعلق اور واسطہ ہے، جیسا کہ ایک شاگرد کا استاد سے یا ایک سپاہی کا اپنے کمانڈر سے رابطہ ہوتا ہے۔

یہی مفہوم البتہ ایک اور پیرائے میں سورہ حجر آیت ۴۷ میں آیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

وَنَزَعۡنَا مَا فِیۡ صُدُوۡرِهِمۡ مِّنۡ غِلٍّ اِخۡوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیۡنَ

ہم ہر طرح کے حسد اور کینہ کو ان کے دلوں سے نکال دیں گے، وہ سب بھائیوں کی طرح ہوں گے اور تختوں پر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوں گے۔

(اس آیت کی تفسیر وتشریح پہلے گزر چکی ہے)

سورہ کہف آیت ۳۱ میں بھی اسی مفہوم کی طرف کچھ اشارات ملتے ہیں، بہر حال ان سراپا خلوص، باعظمت اور نیک دوستوں کی موجودگی بہشت کی بہت بڑی معنوی لذتوں میں سے ہے۔

---

[1] تفسیر روح المعانی، ج۵، ص۶۸ سے اقتباس۔

سورہ کہف آیت ۳۱ میں بھی اسی مفہوم کی طرف کچھ اشارات ملتے ہیں، بہر حال ان سراپا خلوص، باعظمت اور نیک دوستوں کی موجودگی بہشت کی بہت بڑی معنوی لذتوں میں سے ہے۔

۵۔محبت بھرا سلوک

زندگی کو جو چیز خوشگوار اور فرحت آمیز بنا دیتی ہے وہ ان پیار بھرے جملات کا تبادلہ ہے جو انسانوں کے درمیان ہوتا ہے، اگر سب لوگ سچ بولیں، صحیح سوچیں، انصاف کا دامن تھامے رکھیں، ہمدردی کریں اور ایک دوسرے کا احترام کریں تو ہر طرف سکون اور مسرت ہوگی، لیکن جب بری اور جھوٹی باتوں، تہمت، دغابازی، دھوکہ، فراڈ، سرزنش، بے ادبی اور غصے والی گفتگو رواج پا جائے تو ایسے ماحول میں شخصیت دار افراد کی زندگی اجیرن ہوجاتی ہے، ان کے لئے زندگی کا ایک ایک لمحہ طاقت فرسا ہوجاتا ہے۔

بہشت کی ایک خصوصیت یہی ہے کہ بہشتی پوری زندگی میں نہ جھوٹ سنیں گے اور نہ ہی کوئی بری بات، یہ ایک بہت بڑی معنوی نعمت ہے۔

کلام خدا میں ارشاد ہوتا ہے:

لا یسمعون فیھا لغوا ولا تاثیما الا قیلا سلاما سلاما

بہشت میں نہ تو کوئی فضول اور بے ہودہ بات سنیں گے اور نہ گناہ آمیز گفتگو۔(وہ تو صرف) سلامتی سلامتی کی صدائیں سنیں گے۔(واقعہ۔۲۵۔۲۶)

ان کا ایک دوسرے پر درود وسلام، فرشتوں کا ان پر درود وسلام، ان سب سے بڑھ کر خدا کی طرف سے اُن پر سلامتی اور رحمت کا پیغام، یہ سلام پیار، محبت اور خلوص سے معمور ہوں گے۔

ہاں! بہشتیوں کی محفل میں تو ہر طرف صلح وصفا اور خلوص کا دور دورہ ہوگا، جس جگہ پر بھی یوں ہو وہ بہشت کا ایک نمونہ ہے۔

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

"لا یسمعون فیھا لغوا ولا کذبا"

وہ وہاں پر نہ تو کوئی فضول بات سنیں گے اور نہ جھوٹ۔(نبا۔۳۵)

''لغو''لغت میں فضول گفتگو کے معنی میں ہے، دوسرے الفاظ میں یوں کہ یہ ایسی گفتگو ہے جو بغیر سوچے سمجھے کی جاتی ہے، یہ حقیقت میں ''لغا'' سے ماخوذ ہے جو چڑیوں کے شور کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

بہت سے مفسرین نے ''فیھا'' کی ضمیر کے مرجع سے متعلق دو احتمال ذکر کئے ہیں:

۱۔ یہ کہ ضمیر ''بہشت'' کی طرف لوٹ رہی ہے۔

۲۔ یہ کہ یہ ’’کاس‘‘ (جام) کی طرف لوٹ رہی ہے، جواس سے پہلی آیت میں آیا ہے۔
پہلی صورت میں اس کا معنی واضح ہے، دوسری صورت میں اس کا معنی یہ ہے کہ بہشت کی شراب مستی اور نشہ نہیں لائی گی اور اُس کے پینے سے کوئی فضول اور بے ہودہ گفتگو بھی نہیں کی جائے گی، لیکن پہلی تفسیر ’’فی‘‘ کے معنی اور اس سے ملتی جلتی دیگر آیات سے زیادہ ہم آہنگ ہے، یہی معنیٰ ایک بہت مختصر اور واضح عبارت میں آیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

فی جنة عالیة.........لا تسمع فیھا لا غیة

(مومن) شاداب چہروں کے ساتھ عالی شان بہشت میں ہوں گے، اس میں کوئی فضول (بے ہودہ) بات نہیں سنیں گے۔ (غاشیہ۔۱۰۔۱۱)[۱]

علاوہ ازیں بہشتی آپس میں پیار و محبت کی نشستیں رکھیں گے، دوسری مسرت آمیز تفریحات کریں گے، خوبصورت مزاج کریں گے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

ان اصحاب الجنة الیوم فی شغل فا کھون

یقینا اس دن جنت والے کسی شغل میں خوشحال ہوں گے۔ (یسین۔۵۵)

’’شغل‘‘ (بروزن شتر) ہے جس کا معنی ہر وہ واقعہ یا حالت ہے جو انسان کی توجہ اپنی طرف مبذول کروالے، لیکن یہاں پر یہ مسرت بخش تفریحات کے معنی میں ہے۔ ’’فاکھون‘‘ جو جمع ہے ’’فاکہ‘‘ کی، یہ بھی مسرور اور خوشحال انسان کی طرف اشارہ ہے، یہ ’’فکاھه‘‘ کے مادہ سے ہے جس کا معنی مزاح ہے، ’’فاکہ‘‘ لسان العرب کے بقول خوش مزاج اور شیریں سخن آدمی کو کہتے ہیں۔
یہ بات واضح ہے کہ ہمیں اس بات کا کوئی علم نہیں کہ وہاں پر بہشتیوں کی تفریحات اور مصروفیات کیا ہوں گی کیونکہ ہم ہر چیز کو اپنی اس مادی دنیا کے معیار کے مطابق سوچتے ہیں، وہ وہاں ایسی نعمات میں کھوئے ہوں گے کہ اس جہان میں جن کا تصور بھی ہمارے لئے ممکن نہیں ہے۔
بہرحال یہ مصروفیات اس بات کا باعث بنیں گی کہ اس جہان کے مصائب، میدان محشر کی مصیبتیں یا بعض دوسرے عزیز و اقارب کا ان سے دور ہو جانا انہیں بالکل بھول جائے، مفسرین نے بہشتیوں کی مصروفیات کو جو دس یا سات حصوں میں تقسیم کیا ہے یہ ان مفسرین کے اس جہان کی سرگرمیوں کے تصورات کی وجہ سے ہے، وگرنہ اُس دنیا کا نقشہ تو کچھ اور ہی ہوگا۔[۲]

---

[۱] قرآن کی اور آیات بھی اسی معنی پر تاکید کرتی ہیں جیسے (مریم۔۶۲ اور یونس۔۱۰

[۲] یہی مضمون سورہ طور آیت ۱۸ میں بھی آیا ہے

٦۔ بے انتہا خوشی

کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ انسان کو بہت خوبصور باغات کی سیر کرنے کی دعوت دی جاتی ہے، اس کی خدمت اور تفریح کے پورے سامان مہیا کر دیئے جاتے ہیں، لیکن وہ کسی چیز سے بھی لطف واندوز نہیں ہو پاتا کیونکہ اس کی روح پریشان ہوتی ہے، انسان اس وقت ہی خدا کی نعمات سے لطف اٹھا پاتا ہے جب اس کی روح پرسکون اور پر نشاط ہو۔

قرآن کی متعدد آیات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بہشتی خوشی وسرور میں یوں ڈوبے ہوئے ہوں گے کہ خوشی اُن کے چہروں سے چھلکتی ہوگی اس سلسلے میں قرآن نے جو جملات استعمال کئے ہیں وہ بہت خوبصورت اور قابل توجہ ہیں، ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:

ادخلوا الجنة انتم وازوجکم تحبرون

(اُن سے کہا جائے گا) جنت میں داخل ہو جاؤ تم اور تمہاری بیویاں جب کہ خوشی کے آثار تمہارے چہرے پر نمایاں ہیں۔(زخرف۔٧٠)

''تحبرون'' کا مادہ ''حَبَرَ'' (بروزن فکر) ہے ''مقائیس اللغت'' کے بقول یہ اصل میں خوبصورت اثرات کے معنی میں ہے، اسی لئے سجائی ہوئی چیزوں کو ''محبر'' کہتے ہیں، لکھنے والی سیاہی کو بھی ''حبر'' کہتے ہیں چونکہ یہ ایک خوبصورت اثر چھوڑتی ہے، علما کو ''احبار'' کہتے ہیں کیونکہ وہ بھی بہت مفید اثرات چھوڑتے ہیں، یہ کلمہ اُس خوشی اور سرور کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جس کے اثرات چہرے پر نمایاں ہوں، یہاں یہی معنی مراد ہے:[١]

یہی بات سورہ مطففین آیت ٢٤ میں دوسرے لفظوں میں آئی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

تعرف فی وجوھھم نضرۃ النعیم

ان کے چہروں پر نعمت کی خوشی اور چمک کو دیکھو گے۔

''نضرۃ'' حقیقت میں خوبصورتی کے معنی میں ہے ''نضرۃ النعیم'' سے مراد وہ خاص شادابی اور رونق ہے جو نعمت اور پرسکون زندگی کی وجہ سے انسان کے چہرے پر نمایاں ہوتی ہے، یہ انسان کے اندرونی طور پر پرسکون اور خوش ہونے کی حکایت کرتی ہے، بقول شاعر:

''رنگ رخسارہ خبرمی دھد از سر درون''[٢]

---

[١] سورہ روم آیت ١٥ میں بھی یہ مفہوم آیا ہے۔

[٢] اسی سے ملتی جلتی تعبیر سورہ قیامت آیت ٢٢ اور سورہ دہر آیت ١١ میں آئی ہے۔

دل کی لو دیکھ رہا ہوں تیرے رخساروں میں

بعض مفسرین نے اس کلمے کو خوش حال ہونے اور ہنسنے کے معنی میں لیا ہے، جیسا کہ سورہ عبس آیت ۳۹ میں آیا ہے:

وجوہ یومئذ مسفرۃ ضاحکۃ مستبشرۃ

اس دن ان کے چہرے کھلے ہوئے، نورانی، مسکراتے ہوئے اور مسرور ہوں گے۔[۱]

لیکن اس سے پہلی آیات یہ بتاتی ہیں کہ یہ آیت میدان حشر میں مومنین کی حالت کو بیان کر رہی ہے، نہ کہ بہشت میں بعض نے اس کو ناقابل بیان نورانیت، خوبصورتی اور چمک کے معنی میں لیا ہے۔[۲]

بعض نے اسے اس بشاشت اور تازگی کے معنی میں لیا ہے جو محبوب یعنی خدا کی رضا کے احساس سے ان کے چہروں پر نمایاں ہو گی۔[۳]

سورہ غاشیہ آیت ۸ میں ایک اور تعبیر ہے:

وجوہ یومئذ ناعمۃ لسعیها راضیۃ

اُس دن چہرے شاداب اور روشن ہوں گے (کیونکہ) وہ اپنی کوشش اور جدوجہد سے راضی ہوں گے۔

''ناعمۃ'' کا مادہ نعمت ہے، یہاں پر نعمت میں غرق ہونے کے معنی میں ہے، اس طرح کہ اس خوشی اور سرور کے آثار اُن کے چہروں پر نمایاں ہوں گے، بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ ''نعومت'' سے ماخوذ ہے جس کا معنی نرم اور آرام دہ ہے، ایسا بھی مختلف نعمات کے نتیجے میں ہی ہوتا ہے۔[۴]

بعض مفسرین کے بقول یہ شاداب و پر رونق نورانی چہرے چودھویں کے چاند کی طرح چمک رہے ہوں گے۔

یہ بات واضح ہے کہ یہ صرف مادی نعمات کی وجہ سے نہیں ہوگا کیونکہ صرف مادی نعمات اس طرح کے اثرات نہیں چھوڑ سکتیں بلکہ یہ تو ایک بہت بڑی روحانی خوشی کی وجہ سے ہوگا، جس نے ان کے پورے وجود کا احاطہ کر رکھا ہوگا، آیت کا ذیل بھی اسی معنی کی تائید کرتا ہے۔

۷۔ خدا کی رضایت کا احساس

جس انسان کو یہ احساس ہو کہ اس کا پیارا محبوب اس سے راضی ہے اس کے لئے یہ خوشی سب خوشیوں سے بڑھ کے ہوتی ہے، محبوب کی

---

[۱] تفسیر فخر رازی۔ج،۲۶،ص ۹۸ (ایک قول کے طور پر ذکر ہوا ہے

[۲] تفسیر فخر رازی۔ج ۲۶۔ص ۹۹

[۳] روح البیان۔ج ۱۰۔ص ۳۷۱

[۴] تفسیر المیزان۔ج ۲۰۔ص ۲۷۴

رضایت کا یہ احساس انسان کو وہ سکون اور نشاط بخشتا ہے جس کا مقابلہ کوئی چیز نہیں کرسکتی۔

ہاں! محبوب کی مرضی پالینے کی لذت ایک سب سے بڑی معنوی لذت ہے، یہ ایسی لذت ہے جو شخصیت اور اپنے وجود کی اہمیت کے احساس کے ساتھ ہوتی ہے، کیونکہ اگر اس کا وجود کوئی اہمیت نہ رکھتا ہوتا تو اسے محبوب قبول ہی نہ کرتا۔

قرآن نے متعدد مرتبہ اس لطیف نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے، سورہ آل عمران آیت ۱۵ میں بہشت کے سبز باغات اور پاک و پاکیزہ ساتھیوں کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

"ورضوان من الله"

پرہیزگاروں کے لئے خدا کی خوشنودی ہے۔

یہ تمام نعمتوں سے بڑھ کر ہے جسے ایک چھوٹے سے جملے میں بیان کیا گیا ہے۔

سورہ توبہ آیت ۷۲ میں اس موضوع کی کچھ وضاحت کی گئی ہے، بہشت کی مادی نعمات کی ایک جھلک اور اس کے اُن سرسبز وشاداب باغات کا ذکر کرنے، جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی اور اسی طرح بہشتیوں کے پاک و پاکیزہ مکانوں کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

ورضوان من الله اکبر

خدا کی رضا اور خوشنودی ان تمام سے بڑھ کر ہے۔

پھر آیت اس جملے پر ختم ہوتی ہے:

ذلك هو الفوذ العظيم

سب سے بڑی کامیابی یہی ہے۔

''اکبر'' کی تعبیر اور اسی طرح ''ذلك الفوز العظيم'' کی تعبیر واضح طور پر یہ بتاتی ہے کہ خدا کی کوئی نعمت بھی اس نعمت کا مقابلہ نہیں کرسکتی، آخری جملہ جو کہ ''حصر'' کا مفہوم ادا کررہا ہے کہتا ہے:

''بس سب سے بڑی کامیابی یہی ہے''

ہم نے متعدد بار یہ بات ذکر کی ہے کہ ہم اُس جہان کی کسی مادی نعمت کے متعلق بھی اس محدود دنیا میں نہیں سوچ سکتے، اس عظیم معنوی نعمت ''رضوان اللہ'' کا تو اور ہی عالم ہے۔

البتہ مادی اور معنوی نعمات اور اُن سے ملنے والی لذت کے فرق کو اجمالی طور پر سمجھ سکتے ہیں، مثلاً ہمیں یہ معلوم ہے کہ کسی پیارے محبوب کی لمبی جدائی کے بعد اس کے وصال کی لذت، یا کسی مشکل علمی مسئلے کے حل ہونے سے حاصل شدہ لذت یا اس سے بڑھ کر وہ روحانی خوشی اور سکون جو عبادت یا خدا سے اس راز و نیاز کے وقت حاصل ہوتی ہے جو حضور قلب کے ساتھ انجام پائے، ان چیزوں کا موازنہ ہم ہرگز کھانے،

پینے، لباس یا باقی مادی لذتوں کے ساتھ نہیں کر سکتے۔

''ابوسعید خدریؓ'' نے رسول اکرمؐ سے یہ حدیث ذکر کی ہے:

خدا اہل بہشت کو مخاطت کر کے کہے گا! کیا تمہیں جو نعمتیں میں نے دی ہیں ان پر راضی ہو؟

وہ عرض کریں گے! ہم کیوں راضی نہ ہوں! آپ نے ہمیں ایسی ایسی نعمتیں عطا کی ہیں جو کسی مخلوق کو عطا نہیں کی گئیں۔

ارشاد ہوگا! کیا تمہیں وہ چیز عطا کروں جو ان سب سے بڑھ کر ہے؟

عرض کریں گے! پروردگار! اس سے اچھا اور کیا ہوگا۔

ارشاد ہوگا! میں نے تمہیں اپنی رضا اور خوشنودی عطا کی، اس کے بعد میں کبھی بھی تم پر غضب ناک نہیں ہوں گا۔[۱]

یہی مفہوم حضرت امام زین العابدینؑ نے دوسرے الفاظ میں بیان کیا ہے:

فیقول تبارك وتعالیٰ: رضاق عنکم و محبتی لکم خیر واعظم مماّ انتم فیه۔

میری خوشنودی اور محبت تمہارے لئے اُن نعمتوں سے بڑھ کے ہے جن میں تم ہو، وہ بھی سب کے سب اس حقیقت کی تائید کریں گے۔[۲]

''رضوان'' مصدری معنی رکھتا ہے یعنی راضی ہونا، چونکہ یہاں پر یہ ''نکرہ'' کی صورت میں آیا ہے اس لئے عظمت اور بلندی پر دلالت کرتا ہے، یعنی خدا کی عظیم خوشنودی سب چیزوں سے بڑھ کے ہے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں پر نکرہ ہونا قلت اور کمی کے معنی میں ہے، یعنی خدا کی تھوڑی سی رضایت بھی بہشت کی تمام مادی نعمات سے بڑھ کے ہے۔

بہر حال کوئی شخص بھی اس لذت اور روحانی خوشی کو بیان نہیں کر سکتا جو خدا کی رضایت اور خوشنودی کے احساس سے انسان کو حاصل ہوگی۔

ہاں! اس روحانی لذت کا ایک تھوڑا سا حصہ ہی بہشت کی تمام نعمات سے بڑھ کے ہوگا، قابل توجہ بات یہ ہے کہ سورہ مائدہ آیت ۱۱۹ میں بہشت کی مادی نعمات ذکر کرنے کے بعد خالق اور مخلوق دونوں کے ایک دوسرے سے راضی ہونے کی بات کی گئی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

''رضی اللہ عنھم و رضوا عنه ذٰلك الفوز العظیم''

---

[۱] تفسیر ابوالفتوح رازی۔ ج۶۔ ص ۷۰، روح المعانی۔ ج۱۰ ص ۱۲۲

[۲] تفسیر عیاشی زیر نظر آیت کے ذیل میں بحوالہ تفسیر المیزان۔ ج۹

خدا بھی اُن سے راضی ہوگا اور وہ بھی خدا سے، اور یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

کتنا اچھا ہوگا کہ یہ خوشنودی دونوں طرف سے ہوگی، وہ بندوں کو اس قدر عطا کرے گا کہ سراپا رضا میں ڈوب جائیں گے اور ان سے اتنی محبت کرے گا جس سے اس کی مکمل مرضی اور رضا کا اعلان ہوگا، خلاصۂ کلام یہ کہ اس سے بڑھ کر اور کوئی کامیابی نہیں کہ انسان یہ محسوس کرے کہ اُس کا محبوب اور معبود اس سے راضی ہے، اس خوشنودی کی علامت یہ ہے کہ جتنی نعمات بھی ہوں گی، چاہے وہ اس کے تصور میں ہوں یا نہ ہوں، اسے عطا کی جائیں گی۔

''راضیۃ مرضیۃ'' کی تعبیر جو کہ سورہ فجر آیت ۲۸ میں آئی ہے جو خدا کے مخلص بندوں کی روح مطئمنہ کو بیان کرتی ہے جو محبوب کے جوار اور قرب میں پہنچ جائے گی، یہ تعبیر بھی اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

اے نفس مطئمنہ! خدا کی طرف لوٹ آ ؤ جب کہ وہ بھی خدا سے راضی ہے اور خدا بھی اس سے، اس کے بعد

''فادخلی فی عبادی'' ''میرے بندوں میں داخل ہوجا''

کا انعام ایک کرامت اور عظمت کے تاج کے طور پر اس کے سر پر سجایا جاتا ہے اس سے بڑھ کے اور کیا اعزاز ہوسکتا ہے کہ انسان کو ''عبادی'' (مرا خاص بندہ) کہہ کر خطاب کیا جائے گا۔

ہاں! یہی انعام ہے اُن لوگوں کے لئے جو نفس ''امارہ'' اور ''لوامہ'' کے مراحل سے گزر کر ''نفس مطمئنہ'' کے مرحلے تک پہنچ جائیں، اپنی خواہشات کو مٹادیں، شیطان کو شکست دے دیں اور تقویٰ و پرہیزگاری کی سواری پر سوار ہوجائیں۔

قیامت کے دن خدا کی رضا اور خوشنودی سے متعلق آیات فقط وہی نہیں ہیں جنہیں اوپر ذکر کیا گیا ہے بلکہ یہ معنی اور بھی کئی آیات میں آیا ہے، یہ سب کچھ اس امر کی حد درجہ اہمیت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔[1]

۸۔ خدا کا انہیں دیکھنا اور اُن کا خدا کو دیکھنا:

ان کے لئے ایک اور بہت بڑی معنوی لذت ان کے محبوب کا اُن کی طرف نظر کرم کرنا ہے، محبوب سے ہم کلامی کی نعمت کتنی عظیم نعمت ہے، بلکہ اس سے بڑھ کے یہ کہ انسان اس کی ذات پاک کے مشاہدے سے ہم کنار ہو، یعنی دل کی آنکھوں سے اس کی زیارت کرے، اس کے جمال کی رعنائیوں میں ڈوب جائے۔

قرآن نے اس معنوی نعمت کا تذکرہ بھی کئی بار کیا ہے، ایک جگہ پر خدا کی آیات کو چھپانیوالوں پر دردناک عذاب کے نازل ہونے کے سلسلے میں ارشاد ہوتا ہے:

وَلَا یُکَلِّمُھُمُ اللّٰہُ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَلَا یُزَکِّیْھِمْ ۰ وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ

---

[1] (قارعہ۔۷)، (توبہ۔۲۱)، (حدید۔۲۰)، اور (بینہ۔۸) کی طرف رجوع کیا جائے۔

خدا قیامت کے دن ان سے بات نہیں کرے گا اور انہیں پاک بھی نہیں کرے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔(بقرہ۔۱۷۴)

ایک اور جگہ پر اس سے زیادہ سختی کا اظہار کیا گیا ہے، انہی جیسے دوسرے لوگ کہ جو پیمان الٰہی کو بہت کم قیمت پر بیچ دیتے ہیں کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

ولا یکلمھم اللہ ولا ینظر الیھم یوم القیامۃ ولا یز کیھم ولھم عذاب الیم۔

خدا قیامت کے دن نہ تو اُن سے بات کرے گا اور نہ ان کی طرف دیکھے گا اور نہ ہی ان کو پاک کرے گا، اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔(آل عمران۔۷۷)

ہاں! وہ خدا سے بات کرنے کی لذت اور اس کی نگاہ لطف ورحمت سے محروم رہیں گے، اسی وجہ سے پاک نہیں ہوسکیں گے، چونکہ بہشت بھی پاک لوگوں کی جگہ ہے وہ اس میں نہیں جاسکیں گے بلکہ وہ ایک دردناک عذاب میں مبتلا ہوں گے۔

ان دونوں آیتوں سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ یہ نعمتیں فقط مومنین اور اہل بہشت کو ہی ملیں گی، خدا ان سے اپنے لطف کے ساتھ گفتگو کرے گا، یعنی وہی عظیم مقام جو اس دنیا میں پیغمبروں کو ملا ہوا تھا، اور جس سے وہ لذت محسوس کرتے ہیں قیامت کے دن مومنین کو بھی اس مقام پر فائز کیا جائے گا، اس سے بڑھ کے اور کون سی لذت ہوسکتی ہے؟ بات کرنے کے علاوہ خدا اُن کی طرف اپنی نظر رحمت اور کرم بھی کرے گا، اس سے بڑی نعمت اور کون سی ہوسکتی ہے، کہ وہ محبت اور رحمت سے معمور نظریں اپنے بے قرار عاشق کی طرف کرے اور اپنے سچے چاہنے والے کو دیکھے۔

یہ بات واضح ہے کہ نہ تو وہ گفتگو زبان کے ذریعے ہے اور نہ وہ دیکھنا آنکھ کے ذریعے کیونکہ خدا جسم اور اس کے تقاضوں سے بلند و برتر ہے۔

کبھی انسان اپنے بیٹے سے ناراض ہوتا ہے، اس وقت نہ تو وہ اس سے بات کرتا ہے اور نہ ہی اس کی طرف دیکھتا ہے۔ اگر بیٹا سمجھدار ہو تو باپ کی یہ بے اعتنائی اس کے لئے سب سے بڑی روحانی تکلیف ہوتی ہے، لیکن جب باپ بیٹے سے راضی ہوتا ہے تو اس کی طرف توجہ کرتا ہے، اُسے پوری طرح دیکھتا ہے اور اس سے محبت وشفقت کے ساتھ گفتگو کرتا ہے، بیٹے کے لئے یہ ہی سب سے بڑا اعزاز ہے۔

البتہ اس مادی اور جسم وصورت کی دنیا میں اسی طرح ہوتا ہے یہی بات البتہ بعض بلند درجے کے ساتھ اس معنوی دنیا میں مولا اور اس کے بندوں کے درمیان بھی ہے۔

سورہ قیامت میں اُس بے نظیر محبوب کے جمال کی طرف ایک نظر کی لذت کو بیان کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

وجوہ یومئذ ناضرۃ الیٰ ربھا ناظرۃ

اس دن اُن کے چہرے خوش اور مسرور دیکھائی دیں گے، اپنے پروردگار کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔
(قیامت۔۲۲۔۲۳)

قابل توجہ یہ ہے کہ ''الیٰ ربھا'' کی تعبیر جو کہ حصر پر دلالت کرتی ہے اس کا پہلے آنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اس دن فقط اُس کی ذات پاک کا نظارہ کریں گے نہ کہ اس کے غیر کا، اگر اس کے علاوہ وہ کسی چیز کی طرف دیکھیں گے بھی تو وہ بھی ایک طائرانہ سی نظر ہوگی، بلکہ دوسری چیزوں میں بھی اس کی جھلک ہی دیکھیں گے کیونکہ اس کائنات میں جو کچھ بھی ہے وہ اس کی ذات کا جلوہ ہی ہے، اُس کی رحمت اور لطف کی علامت ہی ہے، اثر کا دیکھنا حقیقت میں موثر کا دیکھنا ہی ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں ایک اور احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ ''الیٰ ربھا ناظرۃ'' کا جملہ اس انتظار کی طرف اشارہ ہے جو لوگ خدا کی رحمت اور کرم کے متعلق کر رہے ہیں، اسی لئے بعض اوقات یہ تعبیر لائی جاتی ہے کہ فلاں شخص کی نظریں صرف تیری طرف ہی ہیں یعنی تیرے کرم کا منتظر ہے یا یہ کہ ہماری اُمید کا محور تم ہی ہو۔

اس میں کسی قسم کا اشکال نہیں کہ آیت ایک وسیع مفہوم کی حامل ہو جو ان دونوں معانی پر محیط ہو، اکثر اہلسنت مفسرین جب اس آیت پر آتے ہیں تو بعض ضعیف اور کمزور احادیث کا سہارا لے کر قیامت کے دن خدا کے ان ظاہری آنکھوں کے ساتھ دکھائی دینے کو ثابت کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اہل بہشت کے لئے ایک نعمت یہ بھی ہے کہ قیامت کے دن وہ خدا کو انہی معمولی آنکھوں سے دیکھیں، بعض تو یہ کہتے ہیں کہ خدا ایک نور کی صورت میں آسمان پر نمودار ہوگا، وہ اوپر دیکھیں گے خدا کو وہ انہی آنکھوں سے دیکھیں گے اور لذت محسوس کریں گے۔

ہم نے اسی تفسیر کی چوتھی جلد میں اس طرح کے شرک آلود نظریات کے متعلق تفصیلی بحث کی ہے جو خدا کو ایک جسم کی حد تک محدود کر دیتے ہیں، اس سلسلے میں آنے والی روایات کے کمزور ہونے کے متعلق بھی گفتگو کی گئی ہے اس کو دوبارہ دہرانے کی ضرورت نہیں ہے، ہم ان غلطیوں اور اشتباہات کو اہل بیتؑ کی تعلیمات سے دوری اور تواتر سے ثابت شدہ حدیث ثقلین کو بھلانے کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ [1]

جو کچھ قطعی طور پر ثابت ہے وہ یہ ہے کہ خدا کی عظمت اور بلندی کے آثار اُس دن دنیا کی نسبت زیادہ آشکارا ہوں گے، اسی طرح اس جہان کے تاریک پردے بھی مومنین کے دلوں سے ہٹا دیئے جائیں گے، گویا وہ دلی مشاہدے اور روحانی ادراک کے ساتھ اس کی ذات پاک کا نظارہ کریں گے۔

اور کبھی تو اُس کا شہود کا فیض اس حد تک انہیں حاصل ہوگا اور وہ اس کے جمال اور دیدار میں اس طرح محو ہوں گے کہ بہشت کی باقی ساری نعمات کو بھلا دیں گے۔

ہم گفتگو کے اس سلسلے کو ایک آیت کے ساتھ ختم کرتے ہیں جو ایک نئی تعبیر کے ذریعے مذکورہ بالا مفہوم ادا کرتی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

---

[1] اس کی مکمل تفصیل اور وضاحت کے لئے ''پیام قرآن'' ج ۴۔ ص ۲۳۲ تا ص ۲۵۴ (فارسی) کی طرف رجوع کیا جائے

كَلَّا إِنَّهُمْ عَنْ رَبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَمَحْجُوبُونَ

(جیسا کہ کافر سوچتے ہیں نہیں ہوگا) بلکہ وہ اس دن اپنے پروردگار (کا دیدار کرنے سے) روک دیئے جائیں گے۔ (مطففین ۔ ۱۵)

اس سے بڑی سزا اور کیا ہوسکتی ہے کہ انہیں خدا کے قرب اور اس کی بارگاہ میں حاضری سے روک دیا جائے، اس بات کا مفہوم یہ ہے کہ مومنین اس دن حجاب میں نہیں ہوں گے، وہ جمال حق کے مشاہدے سے لطف اندوز ہوں گے، وہ اس بے مثل محبوب کے دیدار سے فیض یاب ہوں گے، اگر کوئی عذاب الیم کا حجاب ہے تو وہ کافروں کے لئے ہی ہے، مومنین کے لئے یہ دیدار ہی سب سے بڑی لذت ہے۔

۹۔ جو چاہیں گے ملے گا

بعض اوقات میزبان اپنے پیارے مہمان کی خدمت کے لے تمام نعمتوں کو مہیا کرتا ہے، لیکن عموماً یہ نعمات محدود اور معین ہوتی ہیں، لیکن جب اُس سے یہ وعدہ کرلیا جائے کہ تم جو کچھ بھی چاہو گے وہ تمہیں ملے گا تو اس سے اس کی روح خوشی میں ڈوب جاتی ہے کیونکہ اُسے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ کسی قسم کی محدودیت یا کمی نہیں ہوگی۔

یہ بات جس طرح بہشت کی مادی نعمات کے متعلق سچ ہے اسی طرح اس کی معنوی نعمات کے متعلق بھی درست ہے بلکہ بعض آیات کی تعبیرات تو معنوی نعمات سے زیادہ ہم آہنگ ہیں، مثلاً سورہ شوریٰ آیت ۲۲ میں بہشتی باغات کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

لهم ما يشآء ون عند ربهم ذلك هو الفضل الكبير

وہ جو کچھ بھی چاہیں گے اُن کے پروردگار کے پاس مہیا ہے اور یہ بہت بڑا فضل ہے۔

"عند ربھم" کی تعبیر اور "ذلک ھو الفضل الکبیر" کی تعبیر معنوی نعمات سے زیادہ ہم آہنگ ہے جو کہ مادی نعمات کے بعد ذکر کی گئی ہیں۔

سورہ زمر آیت ۳۴ میں مادی نعمات کا ذکر کئے بغیر ارشاد ہوتا ہے:

لهم ما يشآء ون عند ربهم ذلك جزآء المحسنين۔

وہ جو کچھ بھی چاہیں اُن کے پروردگار کے پاس ہے اور نیک کام کرنے والوں کا انعام یہی ہے۔

اس لحاظ سے بہشتی نعمات کے سلسلے میں کسی قسم کی محدودیت نہیں ہوگی، بالخصوص مادی اور معنوی اعتبار سے، یہ تعبیرات اس بات کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ کہ بہشت کی نعمات فقط مادی نعمات میں منحصر نہیں ہیں، اس حقیقت کی وضاحت بھی کرتی ہیں کہ یہ نعمات لامتناہی اور لامحدود ہیں۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہ خدا وہاں پر انسان کو اتنی قدرت عطا کر دے گا کہ اس کا ارادہ کرنا ہی ہر قسم کی نعمت کی پیدائش کا سبب بن جائے گا، اس دنیا کے بالکل برعکس کہ یہاں پر انسان کا ارادہ مختلف اسباب کی موجودگی اور حالات کے سازگار ہونے کے تابع ہوتا ہے، انسان اس وقت ہی باغ یا صحرا کی سیر کا ارادہ کر سکتا ہے جب ہوا معتدل ہو، درخت سرسبز و شاداب ہوں، انسان کا ارادہ کبھی بھی بہار آفرین نہیں ہوتا، لیکن قیامت کے دن صرف کسی چیز کے چاہنے اور مانگنے سے وہ چیز خدا کے حکم سے فوراً حاضر ہو جائے گی، یہ ایک عجیب اعزاز ہے۔[1]

بعض مفسرین جو "خدا کو دیکھنے" کے عقیدے پر زیادہ تاکید کرتے ہیں یہاں پر بھی انہوں نے یہ کہا ہے کہ یہ آیت خدا کو ان آنکھوں کے ساتھ دیکھے جانے کی طرف اشارہ کرتی ہے، کون ہے جو خدا کو دیکھنا نہیں چاہتا۔[2]

لیکن اُن کی سب سے بڑی غلطی یہی ہے کہ وہ اس بات کو قبول نہیں کرنا چاہتے کہ خدا کے متعلق "حسی مشاہدہ" ناممکن اور محال ہے، کیونکہ جسم، مکان اور جہت رکھنا مخلوقات کی خصوصیات میں سے ہے، اور یہ خدا کے لئے محال ہیں اور اہل بہشت کبھی بھی محال چیز کا تقاضا نہیں کریں گے، لیکن قلبی اور باطنی مشاہدہ اس دنیا میں بھی ممکن ہے اور اس دنیا میں بھی۔

سورہ ق آیت ۳۵ میں اسی سلسلے کی ایک اور تعبیر آئی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

لھم ما یشآء ون فیھا ولدینا مزید

جو کچھ وہ چاہیں ان کے لئے بہشت میں ہے اور ہمارے پاس تو اس سے بڑھ کے ہے۔

یہ تعبیر بتاتی ہے کہ "لھم ما یشاء ون فیھا" کے جملے میں اتنی وسعت بھی ہے جس کا بھی وہ ارادہ کریں گے وہ اس کا مصداق ہے، خدا کے پاس اس سے بڑھ کر نعمات ہیں جہاں تک کوئی انسانی عقل نہیں پہنچ سکتی، کوئی اسے سمجھ نہیں سکتا، جو کچھ ان کے لئے فراہم کیا جائے گا وہ کسی تصور میں بھی نہیں ہوگا، وہ اپنے بیکراں الطاف وعنایات کے دروازے ان پر اس طرح سے کھول دے گا کہ جس کی حقیقت کسی طور پر بھی بیان نہیں کی جاسکتی۔

بعض احادیث میں یہ ملتا ہے کہ "ولدینا مزید" کا جملہ اہل بہشت کے جمعہ کے دن کی طرف اشارہ ہے اس دن اُن پر کرامات اور خصوصی عنایات کا دروازہ کھولا جائے گا، جو کچھ ان کے پاس ہے اُس سے ستر گنا اور ستر مرتبہ زیادہ انہیں دیا جائے گا۔[3]

قرآن میں اور بھی آیات ہیں جو مذکورہ بالا آیات سے ہم آہنگ ہیں۔[4]

---

[1] تفسیر المیزان ج ۱۷۔ص ۲۹۰ سے اقتباس

[2] تفسیر فخر رازی ج ۲۶۔ص ۲۸۰

[3] بحارالانوار، ج ۸۔ص ۱۲۶ حدیث ۲۷

[4] مثلاً (یٰسین۔ ۵۷) اور (حمٓ سجدہ۔ ۳۱) ہے ان میں ولھم ما یدعون (اُن کے لئے جو کچھ وہ مانگیں ان کے لئے ہے) یا "ولکم فیھا ماتدعون" (تمہارے لئے جو کچھ مانگو گے وہاں پر ہے) کی تعبیر ہے، یہ مختلف اور طرح طرح کی معنوی نعمات کو شامل ہے۔

۱۰۔ناقابل تصور نعمات

قرآن میں بعض تعبیرات ایسی نظر آتی ہیں جو گذشتہ تمام تعبیرات سے وسیع تر اور بڑھ کے ہیں یہ ایک ایسے مرحلے میں لے جارہی ہیں جو تمام انسانوں کی فکر اور دائرہ سوچ سے باہر ہے، جو کچھ ہم نے پڑھا ہے اور لکھا ہے اس تمام سے بڑھ کے ہے!

قرآن نے ان عظیم نعمات الٰہی کو بیان کیا ہے (جن کی تشریح ہماری بساط سے باہر ہے) یہ قرآن کی تعجب خیز آیات میں سے ہیں، ارشاد ہوتا ہے:

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ

کیسی کیسی جزائیں کہ جو ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک کا باعث ہوں گی، ان کے لئے چھپا رکھی گئی ہیں۔ (سجدہ۔۱۷)

پیغمبر اسلامؐ کی ایک مشہور حدیث ہے:

ان الله یقول اعددت لعبادی الصالحین مالا عین رات، ولا اذن سمعت ولا خطر علیٰ قلب بشرٍ۔

خدا فرماتا ہے کہ میں نے اپنے نیک بندوں کے لئے وہ انعامات رکھے ہیں جنہیں کسی آنکھ نے نہیں دیکھا، کسی کان نے نہیں سنا اور کسی کے ذہن میں ان کا تصور تک بھی نہیں آیا۔[۱]

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن میں یہ بہت بڑی خوش خبری مومنین کا ذکر کرنے کے بعد دی گئی ہے مومنین کی تعریف راتوں میں اٹھ کر خدا سے راز و نیاز کرنے (نماز تہجد) اور خدا کی راہ میں اپنا سب کچھ خرچ کر دینے کے ساتھ کی گئی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان اطاعتوں، عبادتوں اور نیک اعمال میں ''نماز تہجد'' اور ''خدا کی راہ میں انفاق'' سب سے بڑھ کر ہیں، نماز شب بھی ایک پوشیدہ عبادت ہے اور خدا کی راہ میں خلوص سے خرچ کرنا بھی اکثر ایک پوشیدہ عمل ہوتا ہے، خدا نے ان کا بدلہ اور جزاء بھی اس طرح پوشیدہ رکھی ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ ''قرۃ اعین'' کی تعبیر اصل میں آنکھوں کی ٹھنڈک کے لئے استعمال ہوتی ہے۔[۲] کیونکہ عرب میں یہ مشہور تھا کہ بہت زیادہ خوشی کے وقت جو آنسو آنکھوں سے نکلتے ہیں وہ ٹھنڈے ہوتے ہیں جب کہ غم اور مصیبت کے وقت جو آنسو نکلتے ہیں وہ بہت گرم ہوتے ہیں، چنانچہ جب عرب یہ کہنا چاہتے کہ فلاں بات فلاں واقعہ بہت زیادہ خوشی اور مسرت کا باعث ہے تو ''قرۃ العین'' یا ''قرۃ

---

[۱] اس حدیث کو بہت سے مسلم مفسرین نے ذکر کیا ہے، مثلاً طبرسی نے مجمع البیان میں، آلوسی نے روح المعانی میں، قرطبی نے اپنی تفسیر میں، علامہ طباطبائی نے المیزان میں، نیز ''بخاری'' اور ''مسلم'' نے بھی اس کو اپنی حدیث کی کتابوں میں ذکر کیا ہے۔

[۲] قر (بروزن حر) لغت میں سردی اور خنکی کے معنی میں ہے)

اعین'' کی عبارت لاتے، چونکہ یہ تعبیر فارسی میں موجود نہیں ہے اس کے مترادف تعبیر استعمال کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے'' آنکھوں کے نور کا سبب'' ہے۔

بہرحال بعض کلمات اور آیات ایسی ہیں کہ انسانی فکر جتنی بھی پرواز کر لے ان کی گرد تک نہیں پا سکتی، وہ اس کے متعلق جتنا بھی غور کرے آخر کار اس بات کا اعتراف کر لیتی ہے کہ وہ اس مفہوم کی روح اور گہرائی تک نہیں پہنچ سکتی، زیر نظر آیت بھی جو بہت معنی خیز عبارت لیے ہوئے ہے، جو بہت ہی پر معنی اور مزید انداز کی حامل ہے بہشتیوں کے لئے عظیم روحانی اور معنوی نعمات کی طرف اشارہ کر رہی ہے، کیونکہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ انبیاء رسل، فرشتے تک بھی اس حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے کہ خدا نے اپنے خاص بندوں کے لئے کیا انعام رکھا ہوا ہے جو یقینی طور پر وہ اُس کی ذات کے قرب اور وصال کے اس مرتبے پر پہنچ جائیں گے جسے صرف وہی سمجھ سکتا ہے جو اس درجے تک پہنچ گیا ہے۔

ایک شاعر نے کیا خوبصورت کہا ہے:

روزی که روم همره جانان به چمن
نه لاله و گل بینم و نه سرو سمن
رازی که میان من واد گفته شود
من دانم واو داند واد داند ومن [1]

۱۱۔ بہشتی نعمات کا ابدی ہونا

جو بات بہشتی نعمات کی اہمیت کو غیر معمولی کر دیتی ہے اور انہیں اس دنیا کی نعمات سے پوری طرح جدا کر دیتی ہے وہ اُن نعمات کا ابدی اور دائمی ہونا ہے، اُن پر فنا اور خاتمے کا سایہ تک نہیں پڑے گا، وہاں پر نعمتوں کے ختم ہو جانے کا خطرہ نہیں ہوگا، اُن کے کم ہو جانے کا خوف نہیں ہوگا، اس لحاظ سے انسان پوری طرح آسودہ خاطر رہے گا، یہ امن وسکون کا احسان اُن نعمات کے لطف کو دوبالا کر دے گا۔

اس حقیقت کو تو وہی لوگ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں جن کے پاس کوئی بہت بڑی نعمت ہو اور پھر انہیں اس نعمت کے زائل ہو جانے کا خوف دامن گیر ہو جائے، نعمت کی مٹھاس کڑواہٹ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

قرآن کی متعدد آیات اسی حقیقت کو بیان کرتی ہیں وہ انسان کو اس بات کی بشارت اور نوید دیتی ہیں کہ خدا کے لطف وکرم کا یہ دریا بیکراں ہے، خوش رہو اور ہنسی خوشی زندگی بسر کرو اور ان نعمات سے لطف اٹھاؤ۔

سورہ رعد کی آیت ۳۵ میں ارشاد ہوتا ہے:

---

[1] جس دن میں محبوب کے ہمراہ چمن کو جاؤں تو نہ لالہ وگل پہ نگاہ ڈالوں اور نہ سرو سمن پر، راز کی جو بات میرے اور اس کے مابین ہو، میں جانوں اور وہ جانے، وہ جانے اور میں جانوں۔)

"اکلها دآئم وظلها"

اس کے میوے دائمی اور سائے جاودانی ہیں۔

چونکہ یہ امر "خلود" کے ساتھ ایک نزدیکی رابطہ رکھتا ہے اس لئے ہم اُسے ایک الگ باب کے تحت زیر بحث قرار دیں گے۔

(۴) بہشت کے دروازے

اشارہ:

عموماً ہر گھر، عمارت اور باغ میں داخل ہونے کا راستہ ان کے دروازے سے ہوتا ہے، اس لئے جنت کے دروازے بھی اُس میں داخلے کے راستے کو متعین کرتے ہیں، دروازے میں کبھی تو ایسا تالا لگا ہوتا ہے جسے اُس کی مخصوص چابی کے ساتھ ہی کھولا جا سکتا ہے، عرب اسے ''مفتاح'' کہتے ہیں جس کی جمع ''مفاتیح'' ہے (یا مقلید ومقالید کہتے ہیں)۔

لیکن بہشت کے دروازے اور چابیاں ایک دوسرے مفہوم کے حامل ہیں، یہ اُن مفید اور مخلصانہ اعمال کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو بہشت میں داخلے کا سبب بنتے ہیں، البتہ قرآن کی آیات میں بہشت کے دروازے کی طرف بھی اجمالی سا اشارہ ہوا ہے، لیکن احادیث میں جو کچھ آیا ہے وہ اُن اعمال کے متعلق تفصیلی گفتگو ہے جو اس عظیم سرچشمہ رحمت یعنی جنت میں داخلے کا سبب ہیں، اس مختصر سے اشارے کے ساتھ ہم قرآن کی طرف آتے ہیں اور اس سلسلے میں آنے والی مختلف آیات کا مطالعہ کرتے ہیں۔

۱۔ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ ﴿الزمر: ۷۳﴾

۲۔ جَنّٰتِ عَدْنٍ مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ ۝ ﴿ص: ۵۰﴾

۳۔ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ (رعد: ۲۳،۲۴)

ترجمہ:

۱۔ جب وہ اس کے پاس پہنچیں گے اور جنت کے دروازے کھول دیئے جائیں گے، جنت کے نگہبان ان سے کہیں گے! تم پر سلامتی ہو۔

۲۔ بہشت کے جاوداں باغات جن کے دروازے اُن کے لئے کھلے ہوئے ہوں گے۔

۳۔ ہر دروازے سے فرشتے ان کے پاس آئیں گے (اور اُن سے کہیں گے) تم پر تمہارے صبر اور استقامت

کی وجہ سے سلامتی ہو۔

تفسیر

بہشت انتظار کررہی ہے

پہلی آیت میں بہشتیوں کے اکٹھے ہوکر اور گروہ گروہ کی صورت میں جنت کی طرف جانے کا ذکر ہے، ارشاد ہوتا ہے: ''حتیٰ اذا جآء وھا وفتحت ابوابھا وقال لھم خزنتھا سلم علیکم ''''جب وہ اس کے پاس پہنچیں گے اور جنت کے دروازے کھول دیئے جائیں گے، جنت کے نگہبان ان سے کہیں گے! تم پر سلامتی ہو''۔

اس تعبیر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب اہل بہشت نزدیک پہنچیں گے تو جنت کے دروازے کھول دیئے جائیں گے گویا بہشت اُن کا انتظار کررہی ہے، وہ اپنی آغوش پھیلائے گی اور انہیں اندر آنے کی دعوت دے گی، اُن کے لئے خود دروازے کھولنے تک کی زحمت بھی نہیں ہوگی۔

دوسری آیت میں یہی بات اور انداز میں بیان کی گئی ہے، ارشاد ہوتا ہے: ''جنت عدن مفتحة لھم الابواب''ہمیشہ رہنے والے باغات کہ جن کے دروازے اُن کے لئے پوری طرح کھلے ہوئے ہیں۔

''مفتحة'' کی تعبیر چونکہ باب ''تفعیل'' سے ہے یہ ایسی جگہ پر کثرت اور تاکید کا مفہوم عطا کرتی ہے یہ ممکن ہے اس معنی میں ہو کہ نہ صرف ایک دروازہ بلکہ تمام دروازے اور وہ بھی ادھ کھلے نہیں بلکہ پوری طرح کھلے ہوئے ہوں گے۔

کیا یہ دروازے خودبخود کھل جائیں گے جیسے یہ زندگی اور روح رکھتے ہوں اور اہل بہشت کے نزدیک آنے کے ساتھ ہی اُن کے احترام کے طور پر کھل جائیں گے یا یہ کہ صرف ارادے، قصد اور حکم کے ساتھ ہی کھل جائیں گے کسی اور ذریعے کی ضرورت نہیں پڑے گی؟

یا یہ کہ فرشتوں اور بہشت کے محافظوں نے احترام کے طور پر انہیں پہلے ہی کھول رکھا ہوگا اور دروازے پر کھڑے ہوکر وہ خوش آمدید کہیں گے، جیسا کہ ہم بہت ہی معزز مہمانوں کے لئے کرتے ہیں؟

پہلی بات زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔''صیغہ مجہول'' لانا بھی شاید اسی کی طرف اشارہ ہو۔

فرشتوں اور جنت کے نگہبانوں کا دروازے پر کھڑے ہوکر انتظار کرنا بھی پہلی آیت کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہے۔

تیسری اور آخری آیت میں فرشتوں کے مختلف دروازوں سے آنے کا ذکر ہے، یہ اہل بہشت کے بہشت میں داخلے کے بعد ہے، ارشاد ہوتا ہے: ''والملئکة ید خلون علیھم من کل باب ۔ سلم علیکم بما صبر تم ''''ہر دروازے سے فرشتے ان کے پاس آئیں گے اور اُن سے کہیں گے تم پر تمہارے صبر اور استقامت کی وجہ سے سلامتی ہو''۔

کیا اس کا یہ معنی نہیں کہ تمام نیک اعمال جو کہ حقیقت میں بہشت کے دروازے ہیں ان کا خلاصہ صبر و استقامت میں کیا جا سکتا ہے؟ (غور کیجئے گا)۔

توضیحات:

ا۔احادیث۔۔۔۔اور جنت کے دروازے:

قرآن کی کسی آیت میں بھی یہ نہیں آیا کہ جنت کے آٹھ دروازے ہیں، صرف دوزخ کے متعلق ہے کہ:

"لھا سبعة ابواب"

اس کے لئے سات دروازے ہیں۔ (حجر۔۴۴)

لیکن روایات میں کئی جگہ اس بات کا ذکر ہے کہ بہشت کے آٹھ دروازے ہیں، یہ شاید اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ بدبختی اور گمراہی کے سرچشمے یعنی جہنم میں گرنے کے لئے کم راستے ہیں لیکن سعادت اور خوش بختی کے سرچشمے تک پہنچنے کے لئے زیادہ راہیں ہیں، خدا کی رحمت واسعہ اس کے غضب پر سبقت رکھتی ہے۔

"سبقت رحمته غضبه"

امیر المومنین حضرت علیؑ سے ایک حدیث منقول ہے:

"ان للجنة ثمانية ابواب"

بہشت کے آٹھ دروازے ہیں۔

پھر ان دروازوں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا:

بعض دروازوں سے تو "صدیقین" داخل ہوں گے اور بعض سے "شہداء" اور "صالحین" اور بعض سے محمدؐ و آل محمدؐ کے پیروکار اور چاہنے والے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔[1]

امام محمد باقرؑ سے ایک حدیث یوں منقول ہے:

احسنو الظن بالله واعلموا ان للجنة ثمانية ابواب۔ عرض كل باب منها مسيرة اربعين سنة۔

---

[1] بحارالانوار۔ج۸۔ص۱۲۱۔حدیث ۱۲

خدا کے متعلق نیک گمان رکھو اور جان لو کہ بہشت کے آٹھ دروازے ہیں، ہر ایک دروازے کی چوڑائی چالیس سال کی مسافت جتنی ہے۔[۱]

بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بہشت کے دروازوں کی تعداد اکہتر (۷۱) ہے، امیر المومنین حضرت علیؑ سے مروی ایک حدیث میں بھی اس طرح ہے۔[۲]

ممکن ہے کہ یہ تعداد اُن کی کثرت کی طرف اشارہ ہو، یعنی جنت کے دروازوں کی تعداد بہت زیادہ ہے، البتہ ایک جگہ پر جہنم کے ساتھ موازنے کے وقت اس کے آٹھ دروازوں کا ذکر کیا گیا ہے تا کہ یہ بتایا جائے کہ سعادت اور نیکی تک پہنچنے کی رائیں گمراہی اور ضلالت تک پہنچنے کی راہوں سے زیادہ ہیں، دوسری جگہ پر قوموں کے زیادہ ہونے کی طرف اشارہ ہے جن میں سے ہر ایک ایک راستے سے خدا کی رحمت کے اس سرچشمے میں داخل ہوگی۔

ان روایات کی مختلف تعبیرات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جنت کے یہ دروازے ان اعمال سے پوری طرح ہم آہنگ اور موزوں ہیں جو نیک اور پاک لوگ انجام دیتے ہیں، مثلاً حضرت امام جعفر صادقؑ سے مروی ایک حدیث یوں ہے:

للجنة باب يقال باب المجاهدين ،يمضون اليه فاذا هوا مفتوح وهم متقلدون بسيوفهم....... والملئكة ترحب بهم

بہشت کا ایک دروازہ ہے جسے ''مجاہدین کا دروازہ'' کہا جائے گا، جب وہ اس کی طرف چلیں گے تو وہ دروازہ کھل جائے گا، اُن کی تلواریں اُن کی کمر کے ساتھ لٹک رہی ہوں گی، فرشتے انہیں خوش آمدید کہیں گے۔[۳]

یہی بات نہج البلاغہ میں ایک اور انداز میں آئی ہے:

ان الجهاد باب من ابواب الجنة فتحه الله لخاصة اوليآئه

جہاد جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے جسے خدا اپنے خاص بندوں کے لئے کھولتا ہے۔[۴]

نبی اسلامؐ سے منقول ایک حدیث ہے:

---

[۱] بحارالانوار۔ج ۸۔ص ۱۳۱۔حدیث ۳۲

[۲] بحارالانوار۔ج ۸۔ص ۱۳۹۔حدیث ۵۵

[۳] اصول کافی۔ج ۵۔ص ۲۔حدیث ۲

[۴] نہج البلاغہ۔خطبہ نمبر ۲۷

"ان للجنة باباً یدعی الریان لا یدخله الا الصآئمون"

بہشت کا ایک دروازہ ہے جسے ''سیراب کرنے والا'' کہا جاتا ہے، اُس دروازے سے صرف روزہ دار داخل ہوں گے۔[1]

نبی رحمتؐ کی ہی ایک اور حدیث ہے:

ان للجنة باب تقال له باب المعروف لا یدخله الا اهل المعروف

بہشت کے ایک دروازے کا نام ''نیکی کا دروازہ'' ہے اس سے فقط نیک لوگ ہی داخل ہوسکیں گے۔[2]

اسی طرح دوسری احادیث میں ''باب الصبر'' ''باب الشکر'' اور ''باب البلاء'' کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے، بعض جگہ پر تو یہ ہے کہ جنت کے دروازے شمشیروں کے سائے میں ہیں۔

ان ابواب الجنة تحت ظلال السیوف [3] (جہاد کی طرف اشارہ ہے)

قابل توجہ بات یہ ہے کہ بعض احادیث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بہشت کے دروازے خدا کے عظیم بندے ہیں، چنانچہ اصول کافی میں حضرت امام موسیٰ کاظمؑ سے ایک حدیث میں ہے:

"ان علیا باب من ابواب الجنة"

علیؑ بہشت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہیں۔ [4]

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو بھی اپنے اخلاق، اطوار، ایمان اور عمل میں حضرت علیؑ کی پیروی کرے اور ان کے راستے پر چلے تو وہ بہشت میں داخل ہوگا۔

جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے بہشتی دروازوں کا معنی و مفہوم اور ان کی کیفیت بالکل واضح ہوگئی۔

۶۔ بہشتی دروازوں پر لکھی ہوئی عبارات

ہر عمارت پر لکھی ہوئی عبارات عموماً اس عمارت کے حقیقی اہداف اور مقصد کی ترجمانی کرتی ہیں، احادیث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ

---

[1] بحار الانوار۔ ج ۹۳۔ ص ۲۵۲۔ حدیث ۱۷

[2] بحار الانوار۔ ج ۱۷۔ ص ۴۰۸۔ حدیث ۳

[3] میزان الحکمہ۔ ج ۲۔ ص ۱۰۴ (بحوالہ درالمنثور۔ ج ۱۰ ص ۲۴۸

[4] کافی۔ ج ۶۔ ص ۳۸۹۔ حدیث ۲۱

بہشت کے دروازوں پر مختلف عبارات تحریر ہوں گی، ان روایات میں غور وفکر سے کچھ نکات کی وضاحت ہوتی ہے، بہشتی دروازوں کے متعلق جو تفسیر کی گئی ہے یہ اُس میں بھی کئی ظریف حقائق کا اضافہ کرتی ہیں۔

''جابرؓ بن عبداللہ'' نے پیغمبر اسلامؐ کی یہ حدیث بیان کی ہے:

مکتوب علیٰ باب الجنة لآاله الا الله محمد رسول الله علی اخو رسول الله۔

جنت کے دروازے پر یہ لکھا ہوگا کہ خدا کے علاوہ کوئی معبود نہیں، محمدؐ خدا کے رسول ہے اور علیؑ رسول اللہؐ کے بھائی ہیں۔[۱]

اس بات کے پیش نظر کہ مذکورہ حدیث شیعہ اور اہل سنت کی بہت سی کتابوں میں مختلف عبارات کے ساتھ ذکر ہوئی ہے اس سے اسلام کے تین بنیادی اور اساسی اصولوں کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔

حضرت امام جعفر صادقؑ سے ایک حدیث منقول ہے:

علی باب الجنة مکتوب: الصدقة بعشرة والقرض بثمانية عشر

جنت کے دروازے پر لکھا ہوگا کہ خدا کی راہ میں صدقہ دینا دس گنا نیکیاں رکھتا ہے اور قرض دینا اٹھارہ گنا نیکیوں کا حامل ہے[۲]۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بہشت میں داخل ہونے کی ایک بنیاد معاشرے میں کمزور اور غریب لوگوں کی مالی مشکلات کی طرف توجہ اور ان کی مدد ہے۔

ایک بہت تفصیلی حدیث ہے جس میں رسول اکرمؐ کی معراج کا واقعہ اور اس سفر میں اُن کا بہشت اور درزخ کو دیکھنا ہے، حدیث یوں ہے۔

---

[۱] بحارالانوار ج۸ ص۱۳۱ حدیث ۳۴۔ یہ حدیث یا اس سے ملتی جلتی حدیث اہل سنت کی بہت سی کتابوں میں بھی آئی ہے۔ مثلاً حافظ ابونعیم اصفہانی نے حلیة اولیاء (ج ۷ ص ۲۵۶)، حافظ ابوبکر بغدادی نے تاریخ بغدادی (ج ۷ ص ۳۸۷)، ابن معازلی نے کتاب مناقب امیرالمومنین (قلمی نسخہ)، حافظ سمعانی نیشاپوری نے مناقب الصحابہ، طبری نے ذخائر العقبیٰ (ص۶۶) اور ابن حجر عسقلانی نے لسان المیز ان (۴ ص۸۱) پر اس حدیث کو ذکر کیا ہے اور بہت سے علماء نے اس حدیث کو ذکر کیا ہے (مزید وضاحت کیلئے ''احقاق الحق'' ج ۴ ص ۱۹۹ اور ص ۳۸۷ کی طرف رجوع کیا جائے)

[۲] بحارالانوار۔ ج۸۔ ص۱۸۱۔ حدیث ۱۴۰۔ ممکن ہے اٹھارہ گنا کی تعبیر اس لئے ہو کہ قرض دینے میں دو نیک کام ہیں ''مومن کی حاجت دور کرنا'' اور اس کے ''مقام اور آبرو کی حفاظت'' ہر ایک دس گنا نیکیاں رکھتا ہے، چونکہ جب وہ قرض واپس لیتا ہے تو دو نیکیاں کم ہو جاتی ہیں۔ باقی اٹھارہ نیکیاں رہ جاتی ہیں)۔

پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا:

بہشت کے آٹھ دروازے ہیں، ہر دروازے پر چار کلمات لکھے ہوئے تھے، جو بھی اُن پر عمل کرے یہ اُس کے لئے دنیا اور اس کی تمام چیزوں سے بہتر ہے۔

پھر آپؐ نے ہر دروازے پر لکھے ہوئے چار کلمات بیان فرمائے، ہر دروازے پر ان چار کلمات سے پہلے یہ جملہ تحریر تھا:

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ علی ولی اللہ

پہلے دروازے پر لکھا تھا!

ایک صحیح زندگی کے وسائل:

۱۔ قناعت۔

۲۔ حق شناسی۔

۳۔ عداوت سے دوری۔

۴۔ اور نیک لوگوں کی ہم نشینی ہے۔

دوسرے دروازے پر لکھا تھا!

آخرت کی خوشی کے چار ذریعے ہیں:

۱۔ یتیموں پر دست شفقت رکھنا۔

۲۔ غریب اور بیوہ عورتوں کے ساتھ ہمدردی۔

۳۔ مومنین کی حاجتیں پوری کرنے کے لئے کوشش کرنا۔

۴۔ فقراء اور مساکین پر مہربانی۔

تیسرے دروازے پر لکھا تھا!

دنیا میں تندرست اور سالم رہنے کے اسباب چار ہیں:

۱۔ کم بولنا۔

۲۔ کم سونا۔

۳۔ کم پھرنا۔

۴۔ کم کھانا۔

چوتھے دروازے پر لکھا تھا!

جو خدا اور روز قیامت پر ایمان رکھتا ہے اُسے چاہیے کہ وہ

۱۔ مہمان کا احترام کرے۔
۲۔ ہمسائے کا خیال رکھے۔
۳۔ ماں باپ کی عزت کرے۔
۴۔ اچھی بات کرے یا پھر چپ رہے۔

پانچویں دروازے پر تحریر تھا!

۱۔ جو چاہے کہ اُس پر ظلم نہ ہو وہ کسی پر ظلم نہ کرے۔
۲۔ جو چاہے کہ اُسے گالی نہ دی جائے وہ دوسرے کو گالی نہ دے۔
۳۔ جو چاہے ذلیل نہ ہو وہ دوسروں کو ذلیل وخوار نہ کرے۔
۴۔ جو چاہے کہ وہ دنیا اور آخرت میں کسی محکم رسی کو پکڑ لے تو یہ کہے:

لا اله الا الله محمد رسول الله علی ولی الله

چھٹے دروازے پر لکھا تھا!

۱۔ جو بھی چاہے کہ اُس کی قبر کھلی ہو وہ مسجد بنوائے۔
۲۔ جو بھی چاہے کہ اُس کا بدن زمین کے حشرات کا لقمہ نہ بنے وہ مسجد میں زیادہ دیر ٹھہرا کرے۔
۳۔ جو بھی چاہے کہ اُس کا بدن (قبر میں) صحیح وسالم رہے تو وہ مسجد کی صفائی کیا کرے۔
۴۔ جو بھی چاہے کہ اُس کا مکان بہشت میں ہو تو وہ مسجد میں فرش اور چٹائی بچھائے۔

ساتویں دروازے پر لکھا تھا!

دل کی نورانیت چار چیزوں سے ہے:

۱۔ بیماروں کی عیادت۔
۲۔ تشیع جنازہ۔
۳۔ کفن خریدنا۔

۴۔ قرضے کی ادائیگی۔

آٹھویں دروازے پر لکھا تھا!

جو بھی ان دروازوں سے جنت میں داخل ہونا چاہے، چار چیزیں اختیار کرے:

۱۔ سخاوت۔

۲۔ نیک اخلاق۔

۳۔ صدقہ۔

۴۔ بندگان خدا کو تکلیف نہ پہنچائے۔[1]

اس حدیث کے تربیتی اور اخلاقی پہلو بہت زیادہ ہیں، یہ واضح طور پر بتاتی ہے کہ خدا کی رحمت کے اس مخزن یعنی بہشت جاوید میں داخل ہونے کے لئے کن اعمال اور اوصاف کی ضرورت ہے۔

---

[1] بحارالانوار، ج ۸ ص ۱۴۵، حدیث ۶۷ '' کچھ اختصار کے ساتھ''

(۵) بہشت کی وُسعت

اشارہ:

ہم نے کئی بار اس بات کا ذکر کیا ہے کہ یہ دنیا جس میں ہم بس رہے ہیں یہ اُس دوسری دنیا کی نسبت بہت محدود اور حقیر ہے، آخرت کی زندگی کا وسعت کے لحاظ سے ہماری زندگی کے ساتھ موازنہ نہیں کیا جا سکتا، اسلامی احادیث میں اہل بہشت کے مکانوں اور ان کی وسعت کے متعلق جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ بھی ہمارے اس دعویٰ کی تائید کرتا ہے، یقیناوہ عظیم نعمتیں اور بے پایاں عطا وکرم ایک بہت عظیم اور وسیع دنیا میں ہوگا، ہم قرآن کی طرف لوٹتے ہیں اور اس وسعت کا حال قرآن کی زبانی سنتے ہیں:

۱۔ سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ۔ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ۔ (حدید:۲۱)

۲۔ وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ۔ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۱۳۳ ﴿آل عمران: ۱۳۳﴾

۳۔ وَاِذَا رَاَيْتَ ثَمَّ رَاَيْتَ نَعِيْمًا وَّمُلْكًا كَبِيْرًا (دھر:۲۰)

ترجمہ

۱۔ اپنے رب کی مغفرت کی طرف ایک دوسرے سے آگے بڑھنے میں جلدی کرو اور اس بہشت کی طرف جس کی وسعت آسمان اور زمین کی وسعت کے برابر ہے، جو ان لوگوں کے لئے تیار کی گئی ہے جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں۔

۲۔ اپنے پروردگار کی مغفرت کے لئے ایک دوسرے سے آگے بڑھنے میں جلدی کرو اور اس بہشت کی طرف جس کی وسعت آسمانوں اور زمین میں جتنی ہے، جو متقین کے لئے تیار کی گئی ہے۔

۳۔ اور اگر تو اس جگہ کو دیکھے تو تجھ کو بڑی نعمت اور سلطنت دکھائی دے۔

تفسیر

آسمان و زمین جتنی وسیع

پہلی آیت بہشت کی وسعت کو زمین و آسمان کی وسعت کے برابر قرار دیتی ہے، ارشاد ھوتا ھے "سابقوٓا الیٰ مغفرۃ من ربکم وجنۃ عرضھا کعرض السمآء والارض اعدت للذین اٰمنوا باللہ ورسلہ "

" اپنے رب کی مغفرت اور س جنت کی طرف ایک دوسرے سے آگے بڑھنے میں جلدی کرو اور اس بہشت کی طرف جس کی وسعت آسمان اور زمین کی وسعت کے برابر ہے، جو ان لوگوں کے لئے تیار کی گئی ہے جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں"۔

واضح ہو کہ یہاں پر لفظ "عرض" کلمہ "طول" کے مقابل نہیں ہے بلکہ اس سے مراد وہی اس کا لغوی معنی ہے یعنی وسعت [1] بعض مفسرین نے یہاں سے بہشت کے لمبائی کا اندازہ کرنے کے سلسلے میں ایسے ہی تکلیف کی ہے۔ایسا "عرض" کا صحیح مفہوم نہ سمجھنے کی وجہ سے ہوا ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ عبارت ایک کنایہ ہے کیونکہ سب سے بڑی وسعت جو انسان کے ذہن میں آسکتی ہے وہ زمین و آسمان کی وسعت ہے، وگرنہ حقیقت میں تو بہشت کی وسعت ان سے کہیں زیادہ ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ پہلے خدا کی مغفرت اور بخشش کی بات کی گئی ہے، اس کے بعد بہشت اور اس کی وسعت کا تذکرہ ہے، کیونکہ مغفرت یعنی گناہوں سے پاک ہو جانا خدا کے قرب کا باعث بنتا ہے جو کہ بہشت سے بھی بڑی نعمت ہے، دوسرا یہ کہ جب تک وہ پاکیزگی اور بخشش و مغفرت حاصل نہ ہو اُس وقت تک جنت میں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

"سابقو" جو کہ "مسابقۃ" کے مادہ سے ہے، اس طرف اشارہ ہے کہ بہشت اور مغفرت اس قدر اہم ہیں کہ مومنین ان کے حصول کے لئے ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کریں جیسا کہ ایک ہدف اور مقصد تک پہنچنے کے لئے باہمت لوگ آپس میں مقابلہ کرتے ہیں۔

یہ تعبیر اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے کہ یہ دنیا تو ایک مقابلے کا میدان ہے، مقصد اور ہدف وہ دوسری دنیا ہی ہے۔

کس چیز میں آگے بڑھیں؟ بہت سے مفسرین نے اس کے مصادیق کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے، جیسے "اسلام" "ہجرت"،

---

[1] بہت سے علمائے لغت نے "عرض" کو "طول" کے مقابل شمار کیا ہے، لیکن انہوں نے اس بات کا بھی انکار نہیں کیا کہ "عرض" ایک وسیع معنی بھی رکھتا ہے، "التحقیق فی کلمات القرآن الکرم" کے بقول "عرض" کا اصلی معنیٰ کسی چیز کو آنکھوں کے سامنے رکھنا ہے، چونکہ انسان بھی چیزیں دیکھتے وقت معمولاًان کی "چوڑائی" کو دیکھتا ہے نہ کہ لمبائی کو، اس لئے یہ کلمہ مذکورہ معنی میں استعمال ہونے لگا، اس بناء پر زمین و آسمان کی چوڑائی سے مراد اُن کا وہ پورا وجود اور وسعت ہے جو دیکھا جا سکے۔

پنجگانہ نماز''، ''جہاد' یا ''توبہ'' کی طرف بڑھیں، لیکن یہ بات واضح ہے کہ یہ آیت ایک وسیع مفہوم کی حامل ہے جو تمام نیک اعمال اور اطاعتوں کو شامل ہے، ان مفسرین کے کلمات میں جو کچھ آیا ہے حقیقت میں اس وسیع مفہوم کا مصداق ہی ہے۔

دوسری آیت میں اسی موضوع کو اور الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، وہاں پر آگے بڑھنے کی بات تھی اور یہاں پر تیزی کرنے کی بات ہے، وہاں پر تو یہ کہا گیا تھا کہ بہشت کی وسعت زمین و آسمان کی وسعت کے برابر ہے، یہاں پر برابر کے کلمے کو بھی حذف کر دیا گیا ہے، وہاں آسمان کی بات تھی اور یہاں آسمانوں کی، وہاں یہ کہا گیا کہ بہشت اُن لوگوں کے لئے تیار کی گئی ہے جو خدا اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں اور یہاں پر یہ کہا گیا ہے کہ بہشت پرہیزگاروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

وسارعوٓا الیٰ مغفرۃ من ربکم وجنۃ عرضھا السموت والارض اعدت للمتقین۔

یہ بات واضح ہے کہ آگے بڑھنے کے لئے بھی تیزی کی ضرورت ہوتی ہے اور پرہیزگار بھی وہی ہیں جو خدا اور اس کے رسولوں پر حقیقی ایمان رکھتے ہیں کیونکہ تقویٰ بھی ایمان کا ہی اثر ہے، ''سما'' بھی جنس اور عمومیت کے معنی کا حامل ہے جو تمام آسمانوں کو شامل ہے، پس دونوں آیات ایک ہی حقیقت کو بیان کرتی ہیں۔

یہاں پر مفسرین کے سامنے ایک اور سوال بھی آیا ہے وہ یہ کہ اگر بہشت کی وسعت تمام آسمانوں اور زمین کی وسعت کے برابر ہے تو دوزخ کے لئے تو کوئی جگہ باقی نہ رہی؟

اس سوال کا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ اس دن یہ کائنات آج کی کائنات سے وسیع تر ہوگی کیونکہ وہ عظیم اور مکمل دنیا ہوگی، اس دن بہشت آج کے آسمانوں اور زمین کے برابر ہوگی، دوزخ اس سے الگ ہوگی کیونکہ وہ دنیا تو اس دنیا سے ہر لحاظ سے وسیع تر ہے۔

یہاں اور بھی جواب ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس دنیا میں نور اور ظلمت، نعمت اور عذاب آپس میں مخالف ہیں، لہٰذا طبعی طور پر ایک جگہ پر یہ دونوں اکٹھے نہیں ہو سکتے، لیکن اُس دنیا میں ان کے درمیان کسی قسم کی مخالفت نہیں، لہٰذا ممکن ہے کہ دونوں ہی پوری دنیا پر چھائے ہوئے ہوں لیکن چونکہ یہ وجود اور ہستی کے دو الگ الگ مرحلے ہیں اس لئے ایک دوسرے کے مزاحم نہیں ہوں گے۔

اس معنی کو ذہن کے قریب کرنے کے لئے یہ سادہ سی مثال پیش کی جا سکتی ہے کہ ممکن ہے کہ ایک بہت خوبصورت، دلنواز اور پیاری آواز ایک ریڈیائی ٹرانسمیشن (RADIO TRANSMISSION) سے کسی خاص میٹر بینڈ کے ذریعے پوری دنیا میں نشر ہو لیکن اسی وقت ہی ایک بہت بری اور بھدی آواز وحشت ناک سازوں سے دوسرے ریڈیائی ٹرانسمیشن سے سنائی دے، ممکن ہے ان دونوں لہروں کی پہنچ پورے کرہ ارض پر حاوی ہو، اس کے باوجود یہ عام لوگوں کے لئے قابل فہم نہیں، جن لوگوں نے اپنے ریڈیو کی سوئی پہلے اسٹیشن پر سیٹ کی ہوگی وہ اس خوبصورت نغمے سے لطف اندوز ہوں گے اور جنہوں نے دوسرا اسٹیشن لگایا ہوا ہوگا وہ عذاب اور ناراحتی کا شکار ہوں گے، پہلے لوگ گویا بہشت میں ہیں اور دوسری طرح کے لوگ گویا جہنم میں۔

اس گفتگو کی تفصیل انشاء اللہ آگے جلد آئے گی۔

تیسری آیت میں بہشت کی عظمت سے متعلق ایک بہت معنی خیز اور سربستہ تعبیر آئی ہے، رسول اللہؐ کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: واذا رایت ثم رایت نعیما وملکا کبیرا۔ [1]

''جب تم وہاں دیکھو گے تو تم بہت بڑی نعمتیں اور مملکت دیکھو گے۔''

''ملک کبیر'' کی تفسیر میں بہت کچھ کہا گیا ہے، ان تفسیروں کا اصلی محور دو باتیں ہیں:

۱۔ بعض مفسرین نے ''ملک کبیر'' کو بہشت، اس کے مکانات، محلات اور باغات کی وسعت کی طرف اشارہ قرار دیا ہے، ایک تفسیر میں یوں آیا ہے:

بہشت کے سب سے نچلے افراد کی مملکت کی حدود بھی اتنی وسیع ہیں کہ جب ان کو دیکھو تو ہزار سال کے راستے جتنا فاصلہ نظر آئے گا، بعض احادیث میں دو ہزار سال کے فاصلے جتنا ذکر ہوا ہے [2]

۲۔ بعض مفسرین نے اسے بہشت کے معنوی مقام کی بلندی اور اہل بہشت کے مقامات کی عظمت کی طرف اشارہ سمجھا ہے اُن کی عظمت ایک یہ ہوگی کہ فرشتے ان کی اجازت کے بغیر ان کے پاس نہیں آسکیں گے وہ ہمیشہ انہیں سلام کریں گے، یا یہ کہ وہاں پر فنا اور زوال نہیں ہوگا، یا یہ کہ اُن میں سے ہر ایک کے لئے ستر دربان ہوں گے۔ [3]

بعض نے ملک کا معنی ''مالکیت'' اور بعض نے ''حاکمیت'' بھی کیا ہے۔

بعض مفسرین نے ''ملک کبیر'' کو ''قرب الی اللہ'' اور اس کے جلال و جمال کے معنوی مشاہدے کے معنی میں لیا ہے (ان تمام معانی کو باہم جمع کرنا بھی ممکن ہے کیونکہ ان کا آپس میں کوئی تضاد نہیں ہے)

ان آیات سے مجموعی طور پر جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جیسا کہ جنت کی نعمات اہمیت تنوع اور رنگا رنگ ہونے کے اعتبار سے ناقابل بیان ہیں اس طرح اس کی عظمت اور وسعت بھی ناقابل بیان ہے، اس سلسلے میں جتنی گفتگو بھی کی جائے پھر بھی اس کی حقیقی تصویر کشی نہیں ہوسکتی۔

---

[1] ''ثم'' یہاں پر ''ظرف مکان'' ہے اور ''رأیت'' فعل لازم ہے، لہٰذا آیت کا معنی یہ ہوگا کہ: جب تم وہاں دیکھو گے تو فراوان نعمات اور ایک عظیم مملکت کو دیکھو گے،'' ایک دوسری تفسیر کے مطابق ''رأیت'' فعل متعدی ہے اور ''ثم'' دور کے لئے اسم اشارہ ہے اور مفعول بہ ہے۔ لہٰذا معنی یہ ہوگا ''واذا رأیت المکان ایت نعیما وملکا کبیرا''

[2] تفسیر ابوالفتوح رازی۔ ج ۱۱ ص ۳۵۲، قرطبی۔ ج ۱۰ ص ۶۹۲۹، روح المعانی۔ ج ۲۹ ص ۱۶۱۔ مجمع البیان۔ ج ۹، ۱۰۔ ص ۴۱۱

[3] تفسیر برہان۔ ج ۴ ص ۴۱۵، تفسیر مجمع البیان۔ ج ۹، ۱۰۔ ص ۴۱۴

(۴) کیا بہشت بنائی جا چکی ہے؟

اشارہ:

وعدہ الٰہی تو حق ہے، وعدہ خلافی کا تو اصلاً امکان ہی نہیں ہے، مومنین کو جن انعامات اور مجرمین کو جس عذاب اور سزا کا وعدہ سنایا گیا ہے وہ یقینی طور پر پورا ہوگا کیونکہ وعدہ خلافی یا کمزوری اور عجز و ناتوانی کی وجہ سے ہوتی ہے یا جہالت اور نادانی یا پشیمانی کی وجہ سے، ان چیزوں کا یقینی طور پر اس کی ذات پاک کے متعلق تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، اسی لئے سب لوگ اس کے انعام کے وعدے پر خوش اور سزا کے وعدے پر خوف زدہ ہو سکتے ہیں، اس کے باوجود قرآن اس بات پر بہت تاکید کرتا ہے کہ بہشت اور جہنم اب بھی موجود ہیں، یہ مستحق لوگوں کے لئے بالکل تیار ہیں۔ مختلف احادیث سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسانوں کے نیک اعمال بہشت بناتے ہیں، یہ بھی اس بات پر دلیل ہے کہ بہشت اب بھی موجود ہے یہ تاکید اس لئے ہے تاکہ جزاء اور سزا کا موضوع زیادہ جاگزیں ہو جائے، نیک لوگ اپنے اعمال کی جزاء اپنے ساتھ محسوس کریں اور برے لوگ بھی سزا کی سختی کو محسوس کرنا شروع کر دیں۔

اس مختصر سے اشارے کے ساتھ ہی ہم قرآن کی طرف لوٹتے ہیں اور اس سلسلے میں آنے والی آیات کا مطالعہ کرتے ہیں:

۱۔ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۚ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۱۳۳

آل عمران: ۱۳۳

۲۔ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ ۙ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ (الحدید: ۲۱)

۳۔ فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِىْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ښ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۲۴

البقرۃ: ۲۴

۴۔ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِىْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۱۳۱ ﴿آل عمران: ۱۳۱﴾

۵۔ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى

(النجم: ۱۳ تا ۱۵)

۶۔ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ۭ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ۵۴

العنکبوت: ۵۴

۷۔ اِنَّ الۡاَبۡرَارَ لَفِیۡ نَعِیۡمٍ وَاِنَّ الۡفُجَّارَ لَفِیۡ جَحِیۡمٍ یَّصۡلَوۡنَہَا یَوۡمَ الدِّیۡنِ وَمَا ہُمۡ عَنۡہَا بِغَآئِبِیۡنَ (انفطار:۱۳ تا ۱۶)

۸۔ کَلَّا لَوۡ تَعۡلَمُوۡنَ عِلۡمَ الۡیَقِیۡنِ لَتَرَوُنَّ الۡجَحِیۡمَ ثُمَّ لَتَرَوُنَّہَا عَیۡنَ الۡیَقِیۡنِ (التکاثر:۵ تا ۷)

ترجمہ

۱۔ بہشت جس کی وسعت آسمان اور زمین ہیں، جو متقین کے لئے تیار کی گئی ہے۔

۲۔ وہ بہشت جس کی وسعت آسمان اور زمین جتنی ہے ان لوگوں کے لئے تیار کی گئی ہے جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں۔

۳۔ اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن لوگ (گنہگار) اور پتھر ہیں وہ کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

۴۔ اس آگ سے بچو جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

۵۔ دوبارہ (رسول اللہؐ) نے اُسے دیکھا، سدرۃ المنتہٰی کے نزدیک جنۃ الماوٰی وہاں پر ہے۔

۶۔ یہ لوگ آپ سے عذاب کے جلدی آنے کا تقاضا کرتے ہیں جب کہ جہنم تو کافروں کو گھیرے ہوئے ہے۔

۷۔ یقینا نیک لوگ بہت نعمات میں ہیں اور برے لوگ جہنم میں۔ روز جزا کو اس میں داخل ہوں گے اور جلیں گے وہ کسی وقت بھی اس سے غائب اور دور نہیں ہیں۔

۸۔ جیسے تم خیال کرتے ہو ویسے نہیں ہے، اگر تم ''علم الیقین'' رکھتے ہوتے تو یقینا جہنم کو دیکھتے، پھر تم لوگ ''عین الیقین'' کے ساتھ اُسے دیکھو گے۔

تفسیر

پرہیزگاروں کے لئے تیار:

پہلی اور دوسری آیت میں بہشت کی وسعت اور عظمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کی وسعت تمام آسمانوں اور زمین

کے برابر ہے،اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے:''اعدت للمتقین '' یہ پرہیز گاروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

بہت سے مفسرین نے اس آیت کے ذیل میں یہ بات صراحت سے بیان کی ہے کہ اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بہشت اب بھی تیار اور موجود ہے۔[۱]

قابل توجہ یہ ہے کہ قرطبی زیرنظر آیت کے ذیل میں کہتا ہے:

علمائے اسلام کی اکثریت کا یہ عقیدہ ہے کہ بہشت اب بھی موجود ہے اور خلق کی جا چکی ہے،''معراج'' سے متعلق صریح روایات اور دوسری روایات جو''صحیحین ''وغیرہ میں آئی ہیں وہ بھی اسی بات کی تائید کرتی ہیں،اگر چہ معتزلہ نے اس نظریے کو قبول نہیں کیا،ان کا یہ خیال ہے کہ اس دنیا کے ختم ہونے کے بعد اُسے پیدا کیا جائے گا کیونکہ وہ جزاء اور بدلہ دینے کی دنیا ہے،اور یہ تکلیف اور ذمہ داری کی دنیا ہے، یہ دونوں آپس میں اکٹھے نہیں ہو سکتے[۲]

البتہ معتزلہ کی یہ دلیل ایک مغالطہ ہے کیونکہ گفتگو تو بہشت کے اس وقت موجود ہونے کے بارے میں ہے نہ کہ بہشت میں داخلے سے متعلق۔

تیسری اور چوتھی آیت میں''دوزخ'' کے ابھی موجود ہونے کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

"فاتقوا النار التی وقودها الناس والحجارۃ۔ اعدت للکفرین" اُس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں اور جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

یہ آیات بھی ایک دہکتی ہوئی جہنم کی ابھی موجودگی کا پتہ دے رہی ہیں،بعض مفسرین نے بھی اسی بات کی تصریح کی ہے، جو تفسیر کی گئی ہے کہ''اعدت''(تیار کی گئی ہے) کی تعبیر اگر چہ فعل ماضی ہے لیکن یہ مستقبل کا معنی دیتی ہے کیونکہ کبھی یقینی مستقبل کے لئے فعل ماضی کی تعبیر لے آتے ہیں، یہ تفسیر آیت کے ظاہر کے خلاف ہے اور ایسی تفسیر کے لئے کسی قرینے اور موید کی ضرورت ہوتی ہے۔

پانچویں آیت نبی رحمتؐ کی معراج کا واقعہ بیان کرتی ہے،ارشاد ہوتا ہے:''ولقد راہ نزلۃ اخری۔ عند سدرۃ المنتھیٰ۔ عندھا جنۃ الماوی ''رسول اللہؐ نے اُسے دوبارہ دیکھا،سدرۃ المنتہیٰ (ایک بہت سائے اور پتوں والا درخت ہے آسمان کی بلندیوں تک) کے پاس،اس کے قریب ہی جنۃ الماویٰ اور بہشت ہے۔

کیا''جنۃ الماوی ''سے مراد برزخ والا بہشت ہے یا وہ بہشت جو دائمی اور ہمیشہ رہنے والا ہے؟ اس سلسلے میں مفسرین کے

---

[۱] مجمع البیان،ج ۲ ص ۵۰۴۔فخر رازی،ج ۹ ص ۴۔روح البیان،ج ۲ ص ۹۴۔ابوالفتوح رازی،ج ۳ ص ۱۸۸۔قرطبی،ج ۲ ص ۱۴۶، روح المعانی،ج ۴ ص ۵۱۔المنار،ج ۴ ص ۱۳۲

[۲] قرطبی،ج ۲ ص ۱۴۴۷

درمیان اختلاف ہے، ممکن ہے ''ماوٰی'' کی تعبیر سے دائمی بہشت کا تصور ذہن میں آئے، اگرچہ اس بہشت کے بعض آسمانوں پر ہونے سے برزخ والی بہشت ذہن میں آتی ہے کیونکہ جاوداں بہشت تو پوری زمین اور آسمانوں کی وسعت کے برابر ہوگی۔

اس آیت سے بہشت کے پہلے سے موجود ہونے پر استدلال کرنا صرف پہلی تفسیر کے مطابق ہی درست ہے، بعض مفسرین نے بھی اسی تفسیر کا انتخاب کیا ہے، مثلاً ''طبرسی'' نے ''مجمع البیان'' میں اور علامہ ''طباطبائی'' نے ''المیزان'' میں۔

بعد والی آیت میں جہنم کے کافروں پر چھائے ہونے کے متعلق گفتگو ہے یہ اُن کی اُس ہٹ دھرمی کی وجہ سے ہے جس کا وہ مظاہرہ کرتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے: "یستعجلونك بالعذاب وان جهنم لمحيطة بالكفرين" وہ تجھ سے عذاب کی جلدی کا تقاضا کرتے ہیں جب کہ جہنم تو اس وقت بھی کافروں کو گھیرے ہوئے ہے۔

انہوں نے اپنے گناہ، ظلم وستم اور شرک کی وجہ سے نہ فقط اس دنیا کو اپنے لئے جہنم بنالیا ہے بلکہ آخرت کی جہنم بھی اب ہی ان کو گھیرے ہوئے ہے، بالخصوص اس بات کے پیش نظر کہ آیت کی ابتدا میں کافروں کی جلدی سے متعلق گفتگو کی گئی ہے، اس لئے مناسب یہی تھا کہ ان سے کہا جائے! اتنی جلدی کیوں کرتے ہو؟ تم اب بھی دوزخ میں ہی ہو، البتہ اس دنیا کے پردوں اور حجابوں نے تمہیں اس کے بلاواسطہ اثر سے محفوظ رکھا ہوا ہے، لیکن قیامت کے دن جب یہ پردے ہٹا دیئے جائیں گے تو اس وقت اپنی آنکھوں سے اس گھیراؤ کو دیکھ لوگے۔[1]

آیت کی تفسیر کے سلسلے میں یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ یہ آیت قیامت سے متعلق ہے اور اس کے بعد والی آیت جو کہتی ہے ''یوم یغشهم العذاب من فوقهم'' یہ جہنم کے گھیرا کرنے کے لئے قید کے طور پر ہے۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہ یہ آیت ایک یقینی اور قطعی مستقبل کی طرف اشارہ کرتی ہے کیونکہ عربی ادب میں یقینی مستقبل (مضارع محقق الوقوع) کو کبھی تو حال اور کبھی ماضی کی صورت میں بھی بیان کیا جاتا ہے۔

لیکن سورہ انفطار کی آیات سے پہلی تفسیر کی تائید کے لئے مدد لی جاسکتی ہے، اُن میں یوں ارشاد ہوتا ہے: "ان الابرار لفی نعیم۔ وان الفجار لفی جحیم۔ یصلونها یوم الدین۔ وما هم عنها بغآئبین" یقیناً نیک لوگ (بہشت) کی نعمات میں ہیں، اور برے دوزخ میں، جزاء کے دن اس میں جلیں گے، وہ یقیناً اس سے دور نہیں ہیں۔

یہ تعبیر بھی بتاتی ہے کہ ''صلی'' (آگ میں جلنا) قیامت کے دن ہے، لیکن اب بھی دوزخ نے برے لوگوں کو گھیرے میں لیا ہوا ہے اگرچہ اس دنیا میں اُن کے جلنے سے کچھ پردے حائل ہیں، بالخصوص "وما هم عنها بغائبین" کا جملہ پھر دوبارہ بھی اسی معنی پر تاکید کرتا ہے۔ (ذرا غور کیجئے گا)

آخری آیت میں قیامت کا انکار کرنے والے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے "کلا لو تعلمون علم الیقین۔ لترون الجحیم" جیسے تم سوچتے ہو اس طرح نہیں ہے، اگر تم علم الیقین رکھتے ہوتے تو دوزخ کو یقیناً دیکھتے۔

---

[1] علامہ شعرانی مرحوم نے تفسیر ابوالفتوح رازی، ج ۹ ص ۳۰ کے حاشیے پر اسی معنی کو اختیار کیا ہے

اس کے بعد دوبارہ ارشاد ہوتا ہے: '' ثم لترونھا عن الیقین '' پھر (قیامت میں) اسے عین الیقین کے ساتھ دیکھو گے۔

اگر آیت کا ظاہری معنی ہی کریں (یعنی ''لو'' شرط کے لئے ہو اور لترون الجحیم'' اس کی جزاء ہو) تو مفہوم یہ ہوگا: ''علم الیقین'' کے حامل لوگ اسی دنیا میں ہی جہنم کو دیکھ لیتے ہیں، اس کا لازمہ یہ ہے کہ دوزخ اب بھی موجود ہے۔

مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں ایک طوفان وغوغا بلند کیا ہوا ہے، ہر کسی نے ایک الگ راہ اختیار کی ہے، گویا بیشتر اس بات کو ہضم نہیں کر سکے کہ ممکن ہے یہ آیات اس دنیا میں ہی شہود دوزخ کی طرف اشارہ ہوں، اس کے بعد آخرت میں بھی اس کا مشاہدہ ہوگا۔

ایک طرف تو وہ یہ دیکھتے ہیں کہ آیت کو صرف آخرت میں منحصر نہیں کیا جا سکتا کیونکہ تمام کافر اور مجرم قیامت کے دن درزخ دیکھیں گے اس کے لئے شرط کی ضرورت نہیں ہے، لہٰذا بعض مفسرین نے یہ نظریہ اپنا لیا ہے کہ شرط کی جزاء یہاں پر محذوف ہے، بلکہ فخر رازی نے تو اس بات پر مفسرین کے اتفاق کا دعویٰ کیا ہے۔[1]

لیکن یہ بات یقنی طور پر مبالغہ ہے ایسا نہیں ہے کہ اس موضوع پر اتفاق رائے ہو۔

بہر حال انہوں نے آیت کا مفہوم یہ بیان کیا ہے: ''لو تعلمون علم الیقین لما الھا کم التکاثر '' اگر تم علم الیقین رکھتے ہوتے تو ایک دوسرے پر فخر ومباحات تمہیں اپنے آپ میں مصروف نہ کر لیتا اور تمہیں خدا اور قیامت سے غافل نہ کر دیتا۔[2]

بعض دوسرے مفسرین جن کے نزدیک جزا کا حذف کرنا درست نہیں ہے، انہوں نے اس دیکھنے اور مشاہدے کو دل اور علم کے ساتھ دیکھنے کے معنی میں لیا ہے، اس تفسیر کے مطابق آیت کا معنیٰ یہ ہوگا! اگر تم علم الیقین رکھتے ہوتے تو دوزخ پر ایمان لے آتے۔

یہ بات واضح ہے کہ پہلی اور دوسری دونوں تفسیریں آیت کے ظاہر کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہیں کیونکہ جزاء کا محذوف ہونا بھی قواعد کے مخالف ہے اور اسی طرح رویت کو علم کے معنی میں لینا بھی خلاف قاعدہ ہے۔[3]

لہٰذا اگر آیت کو واضح طور پر، بغیر کچھ حذف کئے معنی کریں اور اسی طرح اس کے الفاظ کا حقیقی معنیٰ کریں تو نتیجہ وہی تفسیر نکلے گی جو ہم نے پہلے بیان کی ہے، بعض مفسرین نے بھی اسے قبول کیا ہے اگر چہ ایک احتمال کے طور پر۔

اسلامی احادیث میں بہت سی واضح عبارات ہیں جو اس تفسیر سے ہم آہنگ ہیں! مثلاً اس مومن نوجوان کا واقعہ جو کہ اصول کافی میں حضرت امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے، امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:

ایک دن رسول اسلامؐ نے صبح کی نماز لوگوں کے ساتھ پڑھی، اچانک آپؐ کی نظر ایک ایسے نوجوان پر پڑی جو مسجد میں خواب آلود

---

[1] فخر رازی، ف ۳۲ ص ۷۸

[2] مجمع البیان، ج ۱۰ ص ۵۳۰

[3] البتہ رویت (دیکھنا) علم کے معنی میں آتا ہے، لیکن یہ اس وقت ہوتا ہے جب اس کے لئے دو مفعول ذکر کئے جائیں، آیت میں بھی ایسا نہیں ہے اس بات کی بھی توجہ رہے کہ بعد والی آیت ''ثم لترونھا عین الیقین'' قیامت کی طرف اشارہ ہو سکتی ہے

حالت میں پڑا ہوا تھا، اُس کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا، بدن کمزور اور لاغر دکھائی دے رہا تھا، آپ نے اُس کا نام لیا اور فرمایا:

اے جوان کیسے ہو؟

اس نے عرض کی!

میں نے یقین کی حالت میں صبح کی ہے!

پیغمبرؐ (اس بات سے خوش ہوئے اور) فرمایا:

یقین کی کچھ علامات ہوتی ہیں، تیرے یقین کی نشانی کیا ہے؟

اُس نے عرض کی!

اے خدا کے رسولؐ! میرا یقین وہی ہے جس نے مجھے بہت غمگین کر دیا ہے، راتوں کو مجھے عبادت میں مصروف رکھتا ہے، دنوں کو روزے میں، دنیا اور اس کی تمام چیزوں سے اس نے مجھے بے نیاز کر دیا ہے، گویا میں خدا کے عرش کو دیکھ رہا ہوں! میدان محشر برپا ہے! لوگ حساب کے لئے اُٹھ اُٹھ کر آ رہے ہیں، میں بھی اُن کے درمیان ہوں! گویا میں بہشت کو دیکھ رہا ہوں جس کے رہنے والے نعمتوں میں ہیں، وہ تختوں پر ٹیک لگائے بیٹھے ہیں!

گویا میں اہل جہنم کو بھی دیکھ رہا ہوں، وہ آگ میں جل رہے ہیں اور چیخ و پکار کر رہے ہیں! گویا میں ابھی جہنم کی شعلہ ور آگ کی آواز سن رہا ہوں یہ آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔

رسول اللہؐ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا:

هذا عبد نور الله قلبه بالا يمان

اس بندے کا دل خدا نے نور ایمان سے روشن کر دیا ہے۔

پھر آپؐ نے اس سے فرمایا:

الزم ماأنت عليه

جس حالت پر اب ہو اس پر باقی رہو اور اس کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔

اس نوجوان نے عرض کی:

ادع الله لی یا رسول الله ان ارزق الشهادة معك

یارسول اللہؐ! میرے لئے خدا سے دعا کیجئے کہ وہ مجھے آپ کی ہمراہی میں شہادت کا درجہ عطا فرمائے:

پیغمبرؐ نے اس کے حق میں دعا فرمائی۔

چند دنوں کے بعد ہی وہ پیغمبر اسلامؐ کے ہمراہ ایک جنگ پر گیا اور نو مسلمانوں کے شہید ہونے کے بعد شہید ہو گیا اور اپنی آرزو پالی۔ [1]

''کانی الا ان اسمع زفیر النار یدور فی مسامعی '' (گویا میں ابھی سن رہا ہوں کہ جہنم کی آگ کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے) کا جملہ بھی اسی بات پر دلیل ہے کہ دوزخ اب بھی موجود ہے، ایمان جب شہود کی منزل پر پہنچ جائے تو اُسے اپنی آنکھوں سے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

مذکورہ بالا آیات سے مجموعی طور پر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بہشت اور جہنم اب بھی موجود ہیں اگر ان آیات میں سے بعض کی دلالت میں کوئی تردد ہو تو پھر بھی سب کو ملا کر مجموعی طور پر کوئی تردد باقی نہیں رہتا، بالخصوص ان آیات کو مدنظر رکھتے ہوئے جن میں اعدت (تیار کی گئی ہے) کی تعبیر ہے۔

توضیحات

ا۔ جنت اور جہنم کی موجودگی کے متعلق مسلم علماء کے نظریات:

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے مسلمان علماء کی اکثریت کا یہ نظریہ ہے کہ بہشت اور دوزخ اب بھی موجود ہیں، اس عقیدے کے اثبات کے لئے بعض گذشتہ آیات سے استدلال بھی کیا گیا ہے، لیکن بعض قدیم متکلمین جیسے ابو ہاشم اور عبدالجبار کا نظریہ یہ ہے کہ بہشت اور دوزخ ابھی موجود نہیں ہیں، بلکہ انہیں بعد میں پیدا کیا جائے گا، انہوں نے اپنے نظرئے کے ثبوب کے لئے اس آیت کو پیش کیا ہے:

"کل شیءٍ ھالك الا وجهه"

اس کی ذات کے علاوہ ہر چیز فنا ہو جائے گی۔ (قصص:۸۸)

انہوں نے یوں استدلال کیا ہے کہ اگر وہ اب موجود ہوں تو اس دنیا کے خاتمے پر وہ بھی فنا ہو جائیں گی اس صورت میں یہ ایک اور آیت کے ساتھ جو یہ کہتی ہے ''اکلها دائم'' [2] بہشت کے میوے دائمی اور جاوداں ہیں) سے متضاد ہو جائے گی۔

علامہ حلی مرحوم نے اس استدلال کا جواب یوں دیا ہے کہ آیت میں جو ''ہلاک اور فنا'' آیا ہے اس کا معنی یہ ہے کہ اُن چیزوں میں فائدہ پہنچانے کی صلاحیت ختم ہو جائے گی اور یہ بات قطعی ہے کہ جب انسان اور باقی مخلوقات فنا ہو جائیں گی تو بہشت سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جا سکے گا۔

---

[1] اصول کافی، ج ۲ ص ۵۳، باب حقیقة الایمان حدیث ۲ (کچھ اختصار کے ساتھ)

[2] رعد۔ ۳۵

اس سوال کا جواب اور بھی دیا جا سکتا ہے وہ یہ کہ بہشت اور دوزخ اس دنیا میں ظاہری طور پر موجود نہیں ہیں بلکہ اس دنیا کے باطن میں وہ پوشیدہ ہیں جب کہ فنا اور ہلاکت اس دنیا کے ظاہر سے مربوط ہیں (اس سلسلے کی زیادہ وضاحت آئندہ آئے گی)۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ "کل شیءٍ ھالك الا وجھه" کی آیت یہ کہتی ہے کہ خدا اور وہ چیز جو کسی مادی عامل کے بغیر خدا کی عنایت سے خلق ہوتی ہے وہ جاودانی ہوگی۔ "وجه الله" کا کلمہ ان تمام پر محیط ہے جس میں بہشت اور دوزخ بھی ہیں، جو کچھ فانی اور ہلاک ہونا ہے وہ یہ مادی دنیا ہے جو مادی عوامل کی وجہ سے وجود میں آئی ہے۔ (غور کیجئے گا)۔

۲۔ احادیث اور بہشت و دوزخ کی موجودگی

بہت سی احادیث بھی اس بات کی تائید اور تاکید کرتی ہیں کہ بہشت اور جہنم اب بھی موجود ہیں، حضرت امام علی بن موسیٰ الرضاؑ سے مروی ایک حدیث میں آیا ہے کہ آپ کے ایک صحابی نے آپؑ سے بہشت اور دوزخ کے متعلق پوچھا کہ کیا وہ پیدا کی جا چکی ہیں یا نہیں؟ امام نے فرمایا:

وان رسول الله قد دخل الجنة ورای النار لما عرج به الیٰ السمآء

ہاں! وہ پیدا ہو چکی ہیں! پیغمبرؐ معراج کے وقت بہشت میں گئے تھے اور دوزخ کو بھی دیکھا تھا۔

راوی کہتا ہے میں نے عرض کی: بعض لوگ کہتے ہیں وہ ابھی پیدا نہیں کی گئیں، امامؑ نے فرمایا:

مآ اُولٰئك منا ولا نحن منهم ، من انكر خلق الجنة والنار فقد كذاب النبی و كذبنا....

وہ ہم میں سے نہیں ہیں اور ہم اُن میں سے نہیں ہیں! جو بہشت اور درزخ کی خلقت کا انکار کرے اُس نے رسول اللہؐ کو جھٹلایا ہے اور ہمیں بھی جھٹلایا ہے۔[1]

نبیؐ کی معراج سے متعلق بہت سی روایات میں بہشت اور جہنم کے خلق شدہ ہونے کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

حقیقت میں یہ اس بات کی تاکید ہیں جو ہم نے مذکورہ بالا آیات میں بیان کی ہے، قرآن نے سورہ نجم میں نبی اکرمؐ کی معراج کی طرف اشارہ کیا ہے، تفسیر علی بن ابراہیم میں "ولقد راٰہ نزلت عند سدرۃ المنتھیٰ" کی آیت کی تشریح یوں کی گئی ہے۔

واما الرد علیٰ من انكر خلق الجنة والنار فقوله عندها جنة الماوی ای عند سدرۃ المنتھیٰ فسدرۃ المنتھیٰ فی السمآء السابعة وجنة الماوی

---

[1] بحار الانوار، ج ۸ ص ۱۱۹، حدیث ٦

عندھا۔

جو بہشت اور دوزخ کی تخلیق کا انکار کرتے ہیں ان کا جواب ''عند ھا جنة الماوی'' کی آیت ہے یعنی سدرة المنتہٰی جو کہ ساتویں آسمان میں ہے، کے پاس دائمی بہشت ہے [۱]

حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی ولادت با سعادت سے متعلق جو روایات شیعہ اور اہل سنت کی کتابوں میں آئی ہیں وہ بھی اسی معنی تائید کرتی ہیں، وہ روایات یوں ہیں!

پیغمبر اسلامؐ معراج کی رات بہشت میں گئے، آپؐ نے بہشتی درختوں کا پھل کھایا، اُسی پھل سے جناب فاطمہ زہراؑ کا نطفہ قرار پایا، لہٰذا پیغمبرؐ انہیں چومتے تھے اور کہتے تھے ''اس سے جنت کی خوشبو آتی ہے'' [۲]

سورہ آل عمران کی آیت ۳۷--------- كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا --------- جب بھی زکریاؑ مریمؑ کے محراب میں آتے تو وہاں پر ایک مخصوص کھانا دیکھتے --------- اور جب وہ پوچھتے کہ یہ کہا سے لائی ہو تو وہ کہتیں کہ خدا کی طرف سے ہے۔

اس آیت کی تفسیر کے سلسلے میں بہت سی شیعہ اور سنی کتب میں یوں آیا ہے کہ یہ کھانا جنت کے پھل ہوتے تھے جن کا موسم نہیں ہوتا تھا، لیکن خدا یہ مریمؑ کو عطا کرتا۔ [۳]

حضرت فاطمہ زہراؑ کے متعلق بھی روایات میں ہے کہ خدا بہشتی کھانے اُن کے لئے بھیجتا، پیغمبر اسلامؐ حضرت علیؑ اور آنحضرتؐ کی بعض بیویاں اور ہمسائے انہیں کھاتے، پیغمبرؐ انہیں مریمؑ کے واقعے کے ساتھ تشبیہ دیتے اور فرماتے:

الحمد الله الذی جعلك شبيهة بسيدة نسآء بنی اسرآئيل!

میں اُس خدا کا شکر ادا کرتا ہوں جس نے تمہیں بنی اسرائیل کی عورتوں کی سردار حضرت مریمؑ جیسا قرار دیا۔ [۴]

---

[۱] تفسیر علی بن ابراہیم، ج ۲ ص ۳۳۸

[۲] اس حدیث کے مضمون کو شیعہ کتب کے علاوہ بہت سی اہل سنت کتب میں بھی ذکر کیا گیا ہے، مثلا ذخائر العقبیٰ ص ۳۶، ص ۴۴ ''مستدرک الصحیحن'' ج ۲ ص ۱۵۶، الدر المنثور سیوطی آیہ ''سبحان الذی اسری بعبده'' کی تفسیر کے ذیل میں ------ اور دوسری بہت سی کتب میں)۔

[۳] تفسیر عیاشی، تفسیر برہان، نور الثقلین، درالمنثور، سورہ آل عمران آیت ۳۷ کے ذیل ہیں)۔

[۴] اس حدیث کو زمخشری نے کشاف میں، سیوطی نے درالمنثور میں (آل عمران۔ ۳۷) کے ذیل میں، اسی طرح ثعلبی نے قصص الانبیاء ص ۵۱۳ پر ذکر کیا ہے

ممکن ہے یہ بات کہی جائے کہ یہ تو برزخ والی بہشت سے متعلق ہیں، وہی جنت جس میں شہداء کی روحیں شہادت کے بعد اور قیامت سے پہلے ٹھہریں گی، لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ برزخ والی بہشت مادی نہیں بلکہ وہ ''مثالی'' پہلو کی حامل ہے، ارواح مثالی شکلوں میں اس بہشت کی نعمت سے فائدہ اٹھائیں گے، لہٰذا وہ بہشت جو مادی اور عنصری پہلو نہیں رکھتی اُس کے پھل اور کھانے اس مادی جسم کے کام یقیناً نہیں آسکتے، بلکہ یہ تو ایک لحاظ سے اس خواب کی طرح ہوگی جسے انسان دیکھتا ہے اور لطف اندوز ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں متعدد روایات میں بھی یہ ہے کہ بہشت اب بھی تشکیل پا رہی ہے، اُس کی وسعت انسانوں کے اعمال کے ساتھ ساتھ بڑھتی جارہی ہے، بعض اعمال تو جنت میں نئے درخت لگنے کا موجب بنتے ہیں، اس طرح کی روایات صرف اس وقت ہی بامعنی ہوسکتی ہیں جب بہشت اب بھی موجود ہو، چند سبق آموز احادیث ملاحظہ کریں۔

۱۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ نے پیغمبر اسلامؐ سے روایت کی ہے!

معراج کی رات ابراہیم خلیل اللہ میرے پاس سے گزرے اور فرمایا:

مر امتك ان يكثروا من غرس الجنة، فان ارضها واسعة، وتربتها طيبة قلت، وما غرس الجنة؟ قال: لا حول ولا قوة الا بالله۔

اپنی امت کو یہ حکم دو کہ وہ بہشت میں زیادہ درخت لگائیں کیونکہ اس کی زمین وسیع، مٹی پاک اور زرخیز ہے!

میں نے کہا:

بہشت میں کیسے درخت لگائے جاتے ہیں؟

انہوں نے کہا:

یہ ذکر کرنا!

لا حول ولا قوة الا بالله [۱]

۲۔ پیغمبر رحمتؐ کی ہی ایک اور حدیث ہے:

من قال لا اله الا الله غرست له شجرة في الجنة

جو بھی ''لا الہ الا اللہ'' کہے اس کے لئے بہشت میں ایک درخت لگا دیا جاتا ہے۔ [۲]

۳۔ حضرت امام جعفر صادقؑ نے اپنے آباؤ اجداد سے اور انہوں نے نبی اکرمؐ سے یہ روایت کی ہے:

---

[۱] بحارالانوار، ج ۸ ص ۱۴۹ (حدیث ۸۳)

[۲] یہ حدیث بہت سی کتابوں میں ذکر ہوئی ہے جیسے محاسن، ثواب الاعمال، بحارالانوار، اصول کافی ج ۲ ص ۵۱۷، حدیث ۲)

من قال سبحان الله، غرس الله له بها شجرة فی الجنة

من قال الحمد لله، غرس الله له بها شجرة فی الجنة

من قال لا اله الا الله، غرس الله له بها شجرة فی الجنة

من قال الله اکبر، غرس الله له بها شجرة فی الجنة

جو ''سبحان اللہ'' کہے خدا اس کے لئے جنت میں ایک درخت لگا دیتا ہے۔

جو ''الحمد للہ'' کہے خدا اس کے لئے جنت میں ایک درخت لگا دیتا ہے۔

جو ''لا الہ الا اللہ'' کہے خدا اس کے لئے جنت میں ایک درخت لگا دیتا ہے۔

جو ''اللہ اکبر'' کہے خدا اس کے لئے جنت میں ایک درخت لگا دیتا ہے۔

قریش کا ایک آدمی وہاں بیٹھا تھا، اُس نے عرض کی! یارسول اللہ! اس طرح جنت میں ہمارے لئے بہت درخت ہیں۔

آپؐ نے جواب میں فرمایا:

نعم، ولکن ایاکم ان ترسلوا علیها نیرانا فتحرقوها

ہاں! لیکن اس بات سے بچو کہ کہیں اُن کی طرف آگ نہ بھیج دینا جو انہیں جلا ڈالے۔[1]

۴۔ پیغمبر اسلامؐ کی ایک حدیث میں اس سلسلے میں بڑی خوبصورت تعبیر آئی ہے، آپ نے فرمایا:

جب میں معراج پر گیا تو بہشت میں گیا، وہاں میں نے ایسے فرشتے دیکھے جو محلات تعمیر کر رہے تھے، کبھی وہ رک جاتے، میں نے اُن سے اس کی وجہ دریافت کی، انہوں نے کہا کہ ہم سامان تعمیر کا انتظار کر رہے ہیں میں نے پوچھا! وہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا:

''سبحان الله والحمد لله ولا اله الا الله والله اکبر'' کا ذکر جو مومن کرتا ہے، جب وہ یہ ذکر کرتا ہے تو ہم محل بناتے رہتے ہیں اور جب وہ رک جاتا ہے تو ہم بھی اپنے ہاتھ روک لیتے ہیں۔[2]

گفتگو کے اس سلسلے کو علامہ مجلسی کی بات پر ختم کرتے ہیں، انہوں نے ''بحار الانوار'' میں جنت اور جہنم سے متعلق احادیث کے ذیل میں یوں کہا ہے:

اس بات کو جان لو کہ بہشت اور دوزخ پر اس طرح بلا تاویل ایمان رکھنا جیسا کہ آیات اور روایات میں آیا ہے، دین کی

---

[1] بحار الانوار۔ ج ۸ ص ۱۸۶، حدیث ۱۵۴

[2] بحار الانوار۔ ج ۱۸ ص ۳۷۵، حدیث ۸ (کچھ اختصار کے ساتھ)

ضروریات میں سے ہے۔

۔۔۔۔البتہ یہ کہ آیا وہ اب بھی پیدا ہو چکی ہیں یا نہیں اس سلسلے میں اکثر علمائے اسلام کا یہ نظریہ ہے کہ وہ اب بھی موجود ہیں، صرف چند معتزلی علماء نے اس کا انکار کیا ہے، آیات اور تواتر سے ثابت احادیث ان کی بات کو جھٹلاتی ہیں اور ان کے عقیدے کو جھوٹا ثابت کرتی ہیں، کوئی بھی شیعہ عالم اس غلط نظریے کا قائل نہیں ہے، صرف سید رضی کی طرف اس کی نسبت دی گئی ہے۔[1]

۲۔ دو اعتراض۔۔۔۔۔۔۔اور ان کے جوابات

بہشت اور دوزخ کے ابھی موجودگی کے منکر ممکن ہے عقلی اور نقلی طور پر دو اشکال کریں۔

اشکال عقلی یہ ہے کہ قیامت سے پہلے ان کو پیدا کرنا فضول ہے کیونکہ یہ بات یقینی ہے کہ روز قیامت کے حساب سے پہلے نہ تو کوئی جنت میں داخل ہو سکے گا اور نہ جہنم میں، یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ ہزار سال بعد آنے والے لوگوں کے لئے ہزار سال پہلے ہی گھر بنا دیا جائے، کیا یہ فضول اور بیکار سی بات نہیں ہے؟

اس اعتراض کا جواب بالکل واضح ہے، وہ یہ ہے جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ یہ مسئلہ حد درجہ نفسیاتی اور تربیتی اثرات کا حامل ہے، خدا اس کام کے ذریعے انسان کو یہ سمجھانا چاہتا ہے کہ نہ وہ عظیم انعام قرض رہے گا اور نہ ہی وہ بہت بڑی سزا، بلکہ دونوں اب بھی بالکل آمادہ اور تیار ہیں یہ بالکل ایسے ہی ہے کہ ہم سال کی ابتداء میں ہی انعامات مہیا کر دیں اور کہہ دیں کہ جو طالب علم سال کے آخر میں سب سے زیادہ نمبر لے گا اسے یہ انعامات دئے دیئے جائیں گے، یہاں تک کہ سکول کے دفتر میں یہ طلباء کے سامنے رہیں، یہ کہیں کہ یہ اُن کا انعام ہے جو سال کے دوران سب سے زیادہ محنت کریں یا یہ کہ جیل اور پھانسی کا پھندا قاتلوں اور مجرموں کے لئے پہلے سے تیار کر کے رکھ دیں۔

یہ کام یقینی طور پر نہ فقط یہ کہ فضول نہیں ہے بلکہ حد درجہ موثر بھی ہے، البتہ جنت اور دوزخ اس دنیا کے باشندوں کے لئے چند پردوں کی وجہ سے قابل مشاہدہ نہیں ہیں، لہٰذا خدا اور معصوم وصادق انبیاء کا کہنا بھی اُسی اثر کا حامل ہوگا۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اس دنیا کے خاتمے پر ہر چیز فنا ہو جائے گی، خود قرآن کہتا ہے:

كل شيءٍ هالك الا وجهه

اُس کی ذات پاک کے علاوہ سب چیزوں نے فنا ہو جانا ہے۔

اس اعتراض کے بھی چند جواب دیئے جا سکتے ہیں:

ا۔ ''کل شیءٍ'' سے مراد پوری دنیا ہے اور جو کچھ اس فانی دنیا سے متعلق ہے، لیکن بہشت اور درزخ کہ جو اُس ابدی دنیا کا ایک حصہ ہیں اُن کے لئے ''فنا یا نابود ہونا'' کوئی معنی نہیں رکھتا، کیونکہ وہ اس فانی دنیا کی حدود سے باہر ہیں۔

---

[1] بحار الانوار۔ ج۸ ص۲۰۵ (حدیث ۶۲ کے ذیل میں)

۲۔ ''وجه'' (خدا کی ذات پاک) اُن تمام چیزوں کو شامل ہے جو اس عظیم ذات سے منسوب ہیں، چونکہ بہشت اور درزخ بھی اس کی رحمت اور غضب کے دو مظہر ہیں اس لئے یہ بھی ''وجه'' میں شامل ہیں۔

۳۔ ''هلاك'' کا معنی ان لوگوں کا نہ ہونا ہے جو اس چیز سے فائدہ اٹھا سکیں، جیسے ایک آبادی کے تمام باشندے مرجائیں اور وہ بغیر کسی مالک کے رہ جائے تو اس ے لئے ''هلاك'' کی تعبیر استعمال ہوتی ہے۔

۴۔ بہشت کہاں ہے؟

ان دو نکتوں کی طرف توجہ کرنے سے کہ ایک تو یہ کہ بہشت اب بھی موجود ہے (جیسا کہ بہت سی آیات اور روایات سے اس کو ثابت کیا گیا)، دوسرا یہ کہ بہشت کی وسعت آسمان وزمین جتنی ہے (اس سلسلے میں بھی پہلے آیات کو ذکر کیا گیا ہے) مذکورہ بالا سوال پوری طرح سامنے آتا ہے۔

ممکن ہے کوئی یہ سوال کرے کہ اس طرح کی چیز جس کی وسعت پورے آسمان اور زمین جتنی ہے اس وقت کہاں ہے؟ اصولا یہ بات کیسے ممکن ہے کہ اس طرح کی چیز موجود ہو اور ہمارے محسوسات سے باہر ہو۔

بعض لوگوں نے اس سوال کا یہ جواب دیا ہے کہ قرآنی آیات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بہشت آسمانوں پر ہے کیونکہ سورہ نجم کی آیت ۱۵ میں نبی اکرمؐ کے آسمانوں پر معراج سے متعلق ہے، ارشاد ہوتا ہے:

''عندها جنة الماوی''

دائی بہشت سدرۃ المنتہٰی کے نزدیک ہے۔ (وہی جگہ جو آسمان کی سب سے بلندتر اور برتر جگہ ہے)[1]

بعض لوگوں نے اسے برزخ والی جنت سمجھا ہے، جس میں شہداء کی روحیں ہوں گی، اور بعض نے اس کو حضرت آدمؑ والی جنت سے مربوط سمجھا ہے لیکن یہ دونوں تفسیریں ''جنة الماویٰ'' کے ظاہری مفہوم کے خلاف ہیں۔

اسی طرح سورہ ذاریات کی آیت ۲۲ میں ارشاد ہوتا ہے:

''وفی السمآء رزقکم وما توعدون''

تمہارا رزق (اور اسی طرح) جس کا تم سے وعدہ کیا جائے گا، آسمان میں ہے۔

بہت سے مفسرین کی یہ رائے ہے کہ ''ماتوعدون'' سے مراد وہی جاودانی بہشت ہے جس کا وعدہ خدا نے اپنے

---

[1] طبرسی نے مجمع البیان میں فخر رازی نے تفسیر کبیر میں، علامہ طباطبائی نے المیزان میں اور صاحب روح البیان نے اپنی تفسیر میں سورہ ذاریات کی آیت ۲۲ یا سورہ نجم کی آیت ۱۵ کے ذیل میں یا دونوں کے ذیل میں اس معنی کو ذکر کیا ہے)۔

بندوں سے کیا ہے[1] بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ جنت اور دوزخ دونوں کے بارے میں ہے، بعض نے اُسے دنیوی عذاب کی طرف اشارہ قرار دیا ہے جو آسمان سے کافروں اور ظالموں پر نازل ہوتا ہے اور ہوگا (جیسے قوم نوحؑ اور قوم لوطؑ پر نازل ہونے والا عذاب)۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ خدا کی جاودانی بہشت اس دنیا کے آسمان سے بھی ماوراء ہے، اس کی وسعت زمین اور اس دنیا کی وسعت کے برابر یا اس سے بھی زیادہ ہے، کیونکہ اس سے زیادہ کسی وسعت کا تصور نہ تھا جسے قرآن نے بہشت کے متعلق ذکر کیا ہے، اس لحاظ سے وہ موجود بھی ہے اور آسمان پر بھی ہے اور اس کی وسعت بھی زمین اور اس دنیا کے آسمان جتنی ہے۔

بعض نے اس نظریئے پر اعتراض کیا ہے کہ اگر بہشت نویں آسمان سے بھی اوپر ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ لامکان اور لاجہت جگہ پر ہے اور اگر وہ آسمانوں کے طبقات یا ان افلاک میں سے دو فلکوں کے درمیان ہو تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ ایک دوسرے میں داخل ہو یا افلاک ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں، یہ سب باتیں محال اور ناممکن ہیں اور یہ قرآن کی تعبیرات کے ساتھ بھی ہم آہنگ نہیں جو یہ کہتا ہے کہ جنت کی وسعت آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ مذکورہ بالا اعتراض بطلیموس کی ہیئت اور افلاک کو تعداد کے لحاظ سے نو سمجھنے کی بنیاد پر ہے، بطلیموس کے نظریئے کے مطابق فلک نو ہیں اور پیاز کے چھلکے کی مانند وہ ایک دوسرے پر چڑھے ہوئے ہیں، ان کے درمیان ذرا سا فاصلہ بھی نہیں ہے۔

آج جب کہ محکم دلائل کے ساتھ نظریہ رد ہو چکا ہے تو اس طرح کے اعتراضات کی کوئی بنیاد نہیں رہتی، اس میں کسی قسم کا اشکال نہیں کہ ان ثابت اور سیار ستاروں اور کہکشاؤں سے اوپر بھی بہت بڑی دنیا ہو جو ہماری زمین اور آسمان سے کئی گنا وسیع ہو، اس طرح سے مذکورہ بالا آیت کے ساتھ بھی کوئی تضاد نہیں ہوگا، ایک اور نظریہ بعض فلاسفہ کا ہے، انہوں نے بہشت اور جہنم کے مادی ہونے کا انکار کیا ہے، اس نظریئے کے مطابق بہشت کے لئے کسی مادی جگہ اور مکان کی ضرورت نہیں بلکہ حس اور مادہ سے بلند تر ایک عالم اس کا مقام ہے، صدر المتالہین شیرازی اپنی کتاب اسفار میں یہ کہتے ہیں:

جان لو کہ ہر سعادت مند نفس (ذات) کے لئے آخرت کی دنیا میں ایک وسیع ملک ہوگا، ایک ایسا عالم کہ جو تمام زمینوں اور آسمانوں سے عظیم تر اور کشادہ تر ہوگا، لیکن یہ ملک خود اُن کی ذات سے باہر نہیں ہے، بلکہ یہ تمام ملک، خدمت گزار، خادم، باغات، درخت، حور و قصور اور غلمان خود اس کی ذات کے اندر ہیں، اسی سے قائم ہیں، وہ ہی خدا کے حکم اور اذن سے انہیں ایجاد کرنے والا ہے۔

پھر وہ کہتے ہیں:

اُس دنیا کی چیزوں کا وجود اگرچہ اُن صورتوں کے ساتھ ملتا جلتا ہے جو انسان خواب یا آئینے میں دیکھتا ہے، لیکن ذاتاً یا حقیقتاً اُن سے

---

[1] طبرسی نے مجمع البیان میں فخر رازی نے تفسیر کبیر میں، علامہ طباطبائی نے المیزان میں اور صاحب روح البیان نے اپنی تفسیر میں سورہ ذاریات کی آیت ۲۲ یا سورہ نجم کی آیت ۱۵ کے ذیل میں یا دونوں کے ذیل میں اس معنیٰ کو ذکر کیا ہے)۔

مختلف ہے، یہ صحیح ہے کہ اس لحاظ سے وہ ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں کہ ان میں سے کوئی بھی ہیولا (جسمانی مادی) کے موضوع میں نہیں ہیں، اوراسی طرح یہ مواد جس مکان یا جہت کے محتاج ہوتے ہیں یہ ان میں نہیں ہیں۔۔۔۔۔۔۔لیکن ان دونوں کا آپس میں فرق یہ ہے کہ آخرت کی دنیا اور اس میں جوصورتیں ہیں وہ جوہری لحاظ سے قوی تر، وجودی لحاظ سے شدید تر اور لذت اور درد کے اعتبار سے زیادہ اثر انگیز ہیں، وہ تو اس دنیا کی موجودات سے ہی خوب تر، محکم تر اور شدید تر ہیں، وہ صورتیں، جو انسان خواب یا آئینے میں دیکھتا ہے اُن کا ان کے ساتھ کیا موازنہ ،آخرت کی نسبت اس دنیا کی طرف ایسے ہی ہے جیسے کہ بیداری کی نسبت نیند کی طرف ہوتی ہے۔[1]

اگر چہ معاد کے سلسلے میں وہ مختلف عبارتیں لائے ہیں اور صرف اسی عبارت کے ساتھ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ بات واضح ہے کہ معاد کی یہ تفسیر ظاہر قرآن بلکہ قرآن کی واضح آیات کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے، یہ فقط ان لوگوں کی بات سے ہم آہنگ ہے جو معاد کو فقط روحانی سمجھتے ہیں کیونکہ مذکورہ بالا بیان میں انہوں نے یہ بات واضح لفظوں میں کہی ہے کہ بہشت خود انسان کے اندر موجود ہے، اس کی روح اور نفس میں ہے، وہاں پر سب چیزیں شکل مثالی رکھتی ہے، تمام چیزیں روحانی ہیں، بلکہ انہیں پیدا کرنے والی بھی انسانی روح ہی ہے۔

ہم نے پہلے سینکڑوں ایسی آیات ذکر کی ہیں جو ''معاد جسمانی'' پر شاہد ہیں، ان کو ہم نے مختلف عنوانوں کے تحت ذکر کیا ہے، ہر عنوان اس طرح کے نظریات کا جواب بن سکتا ہے۔

اس سلسلے میں جو تیسرا نظریہ بیان کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ بہشت اور دوزخ دونوں اس دنیا کے باطن میں موجود ہیں، اس دنیا کے حجابات انہیں دیکھنے کی راہ میں حائل ہو گئے ہیں، اولیاء اللہ انہیں دیکھ سکتے ہیں، پیغمبر اسلامؐ بھی جب معراج پر اس دنیا کے لوگوں کے شور وغل سے دور ہوئے تو انہوں نے بھی اپنی آنکھوں سے اس جنت کے کچھ حصے کا عالم بالا میں مشاہدہ کیا، بلکہ خدا کے خاص بندوں کے لئے تو یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنی خاص معنوی طاقت کے ذریعے اس زمین پر بیٹھے ہوئے کبھی کبھی اس کا نظارہ کر سکیں، درج ذیل تعبیرات بھی ممکن ہے اسی معنی کی طرف اشارہ کر رہی ہوں:

وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۴﴾ ﴿العنکبوت: ۵۴﴾

بے شک دوزخ کافروں کو گھیرے ہوئے ہے۔ (عنکبوت۔ ۵۴)

اور

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ

نیک لوگ بہشت میں اور برے لوگ دوزخ میں ہیں۔ (انفطار ۱۳۔ ۱۴)

اور

---

[1] اسفار، ج ۹ ص ۱۷۶، فصل دہم

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ (التکاثر: ۵ تا ۶)

اگر تم علم الیقین رکھتے ہوتے تو دوزخ کو دیکھ لیتے۔ (تکاثر۔ ۵،۶)

اس دنیا کے باطن میں بہشت کی موجودگی کو اس مٹی میں گلاب کی موجودگی کے ساتھ تشبیہ دی جا سکتی ہے، یہ بات صحیح ہے کہ گلاب بھی مادی اور مٹی بھی، لیکن اس میں کوئی چیز مانع نہیں کہ ایک دوسرے میں پہناں اور پوشیدہ ہو جسے کوئی آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔

اس مطلب کو ذہن کے نزدیک کرنے کے لئے ایک اور مثال بھی دی جا سکتی ہے جس کی طرف پہلے بھی اشارہ کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ:

اسی مادی دنیا میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو عام حالات میں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں، ان میں بہت سی چیزیں اس دنیا کے مادی باطن میں پوشیدہ ہیں، مثلاً ایک ہی وقت میں دنیا کے ریڈیو اور ٹی وی اسٹیشنوں سے مختلف لہریں اس فضا میں بھیجی جاتی ہیں۔

بلکہ بعض اوقات تو سیاروں کے ذریعے انہیں پوری دنیا تک پہنچایا جاتا ہے، ہر گھر میں ان لہروں کی مختلف قسمیں موجود ہوتی ہیں، لیکن انہیں کوئی بھی محسوس نہیں کرتا، ممکن ہے بعض اسٹیشنوں سے خوبصورت اور روح پرآوازیں نشر ہو رہی ہوں اور بعض سے ہولناک اور نفرت انگیز، اسی طرح بعض ٹیلی ویژن اسٹیشن بہت خوبصورت، روح پرور اور نشاط آمیز مناظر دکھا رہا ہو، جب کہ دوسری طرف جنگ، خونریزی، آگ اور جرائم کے مناظر دکھائے جا رہے ہوں، یہ تمام مناظر، تصویریں اور آوازیں اسی مادی دنیا میں ہمارے اردگرد کی فضا میں پھیلی ہوئی ہیں، انہوں نے اس دنیا کے اندر ہی ایک چھوٹی سی جنت اور دوزخ بنا دی ہے۔

بعض سامعین تو اپنے ریڈیو کی سوئی اس سٹیشن پر لگاتے ہیں جہاں سے خوبصورت آوازیں، پیارے پیارے نغمات اُبھر رہے ہوں جب کہ بعض سوئیوں کو اپنی مرضی اور اختیار سے اس جگہ لگاتے ہیں جہاں اس کے برعکس ہوتے ہیں، پہلی طرح کے لوگ ایک لذت بخش دنیا میں جب کہ دوسری طرح کے ایک تکلیف دہ دنیا میں آجاتے ہیں، اس جہان کے مادی ہونے کے باوجود یہ سب کچھ ہے، یہ تمام چیزیں بھی اسی مادی دنیا کے اندر پوشیدہ اور پنہاں ہیں۔

یہ بات ذہن میں نہ آئے کہ بہشت اور دوزخ بالکل اسی طرح ہوں گے، بلکہ ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس میں کسی قسم کی مشکل نہیں کہ اس دنیا کے باطن میں اور اندر ہی کئی اور دنیا اور جہان آباد ہوں، ہم موجودہ حالات میں جنہیں نہیں دیکھ سکتے، کیونکہ ہمارے اور ان کے درمیان کئی رکاوٹیں ہیں، لیکن جو لوگ ان پردوں اور رکاوٹوں کو ہٹا سکتے ہیں وہ اس دنیا میں ان دوسرے جہانوں کا نظارہ کر سکتے ہیں (غور کیجئے گا)۔

پیغمبر اسلامؐ نے اپنے آسمانی سفر پر ہی جہاں پر اس مادی دنیا کا شور وغل کم تھا اور جہاں ایسے عوامل کم تھے کہ جن میں انسان کھو جائے اور خدا کے جمال وجلال کے جلوئے بہت زیادہ تھے ان پردوں کو ہٹا دیا، آپ نے وہاں پر ہی ان دو دنیا (بہشت، دوزخ) کے بعض حصوں کو دیکھا، جو اس دنیا کے اندر ہی پوشیدہ اور پنہاں ہیں۔

اس کا یہ معنی ہے کہ پیغمبر اکرمؐ یا خدا کے خاص بندے اس دنیا پر بہشت یا دوزخ کا مشاہدہ نہیں کر سکتے، بلکہ جیسا کہ روایات میں بھی

آیا ہے، ایسا بعض اوقات اسی دنیا میں بھی ہوا ہے، ''راوندی'' نے ''خرائج'' میں یہ روایت ذکر کی ہے:

عاشور کی شب جب امام حسینؑ کے ساتھیوں نے آپؑ کے ساتھ پوری وفاداری کا اعلان کیا اور میدان کربلا چھوڑنے اور آپؑ کی بیعت توڑنے سے انکار کیا تو

دعالهم بالخير و كشف عن ابصارهم فراوا ماحباهم الله من نعيم الجنان وعرفهم منازلهم فيها۔

امامؑ نے اُن کے حق میں دعا کی، اُن کی آنکھوں کے سامنے سے پردے ہٹا دیئے، خدا نے جنت کی جو نعمتیں انہیں عطا کی تھیں انہوں نے اپنی آنکھوں سے اُن نعمتوں کو دیکھا، امامؑ نے ان کے گھر اور مقامات انہیں بتائے۔ [1]

''مقتل الحسین'' کا مصنف یہ روایت ذکر کرنے کے بعد کہتا ہے:

یہ خدا کی قدرت کے سامنے بے مثال نہیں لگتا اور امامؑ کی کرامات کے پیش نظر بھی یہ عجیب نہیں لگتا کیونکہ جب فرعون کے جادوگر حضرت موسیٰؑ پر ایمان لے آئے اور فرعون نے انہیں قتل کرنے کا ارادہ کیا تو حضرت موسیٰؑ نے انہیں بہشت میں ان کے مکانات دکھائے۔ [2]

بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ:

حضرت امام جعفر صادقؑ نے اپنے بعض ساتھیوں کو حوض کوثر دکھایا۔ [3]

بہشت کس جگہ پر ہے، اس موضوع کے متعلق نظریہ بہشت کی وسعت کے موضوع کو بھی حل کر دیتا ہے، بعض متکلمین نے اس پر جو بے بنیاد اعتراضات کئے ہیں وہ بھی حل ہو جاتے ہیں۔

بہرحال اس دنیا کے اندر اور باطن میں بہشت اور دوزخ کی موجودگی کے متعلق ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ ایک نظریے کے طور پر ہے، اس پر عقیدہ اور ایمان قائم کرنے کے لئے اس سے زیادہ کوشش، شواہد اور استدلالات کی ضرورت ہے۔

---

[1] خرائج راوندی بحوالہ ''مقتل الحسین مقدمہ'' ص ۲۶۱، بحار الانوار ج ۴۴ ص ۲۹۸

[2] اخبار الزمان مسعودی، ص ۲۴۷، بحوالہ مقتل الحسین ص ۲۶۱

[3] بحار الانوار، ج ۶ ص ۲۸۷، حدیث ۹

(۷) بہشت کے درجات

اشارہ:

قران مجید کی مختلف آیات سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ بہشت کے باغات متعدد اور مختلف طرح کے ہوں گے، ان آیات کی تفسیر کے سلسلے میں جو احادیث موجود ہیں اُن سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ یہ اہل بہشت کے درجات کی طرف اشارہ ہیں، ہر ایک اپنی لیاقت کی بنیاد پر ان بہشتی باغات میں ہوگا جو ایک دوسرے سے برتر اور اعلیٰ ہوں گے۔

سورہ رحمٰن کی تفسیر میں بہشتی باغات کے متعلق رسول اکرمؐ کی ایک حدیث یوں ہے:

"جنتان من ذھب للمقربین۔ وجنتان من ورق لاصحب الیمین"

جنت میں دو سونے کے باغ مقربین کے لئے اور دو چاندی کے باغ اصحاب الیمین کے لئے ہیں۔[۱]

یہ بات واضح ہے کہ سونے اور چاندی کی تعبیر بہشت کے درجات کی طرف اشارہ ہے کیونکہ یہ دونوں بھی ایک درجے کے نہیں ہیں۔

اس مختصر سے اشارے کے ساتھ ہم قرآن کی طرف لوٹتے ہیں اور بہشتی باغات کے متعدد ہونے سے متعلق آیات کا مطالعہ کرتے ہیں۔

۱۔ قُلْ اَذٰلِكَ خَيْرٌ اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ كَانَتْ لَهُمْ جَزَاۗءً وَّمَصِيْرًا ۱۵ ﴿الفرقان: ۱۵﴾

۲۔ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ

(کھف: ۳۱)

۳۔ اَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ جَنّٰتُ الْمَاْوٰى ۡ نُزُلًۢا بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۱۹ ﴿السجدۃ: ۱۹﴾

۴۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ۱۰۷ ﴿الکھف: ۱۰۷﴾

۵۔ وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ اُولٰۗىِٕكَ الْمُقَرَّبُوْنَ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ

---

[۱] تفسیر درالنشور، ج۶ ص۱۴۶

(واقعہ:۱۰ تا ۱۲)

۶۔ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ .....وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ....مُدْهَآمَّتٰن (رحمن:۴۶۔۴۸۔۶۲۔۶۴)

ترجمہ

۱۔ کہہ دیجئے! کیا یہ بہتر ہے یا جاودانی بہشت جس کا پرہیز گاروں سے وعدہ کیا گیا ہے، وہ بہشت جواُن کے اعمال کا صلہ اوراُن کا ٹھکانا ہے؟

۲۔ وہ ایسے لوگ ہیں جن کے لئے ہمیشہ رہنے والی جنت ہے،جس کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں۔

۳۔ وہ لوگ جو ایمان لائے اورانہوں نے نیک اعمال انجام دئے تو ان کے لئے ہمیشہ رہنے والی بہشت کے باغات ہیں، یہ خدا کی طرف سے اُن کی پذیرائی ہے اُن اعمال کے بدلے میں جوانہوں نے انجام دیئے۔

۴۔ بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اورانہوں نے نیک عمل انجام دیئے فردوس (جنت) کے باغ اُن کی منزل ہوں گے۔

۵۔ اورآگے بڑھنے والے ہی سب سے آگے ہوں گے، وہی اللہ تعالیٰ کے مقرب ہوں گے، وہ نعمتوں والی جنتوں میں ہوں گے۔

۶۔ جو اپنے رب کے مقام سے ڈرے اس کے لئے بہشت کے دو باغ ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ دو باغ جو کہ مختلف نعمتوں اورسرسبز وشاداب درختوں سے بھرئے ہوئے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ان سے نیچے دو اور باغ بھی ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔دونوں بڑے شاداب اورسرسبز ہیں۔

تفسیر

ایک بہشت یا کئی بہشت:

پہلی آیت میں دوزخیوں پر دردناک عذاب کا ذکر کیا گیا ہے، ان کے ساتھ اہل بہشت کی قدرومنزلت کا موازنہ کیا گیا ہے،

ارشاد ہوتا ہے:

"قل اذلك خير ام جنة الخلد التي وعد المتقون كانت لهم جزآء ومصيرا"

کیا وہ (دردناک عذاب) بہتر ہے یا جنۃ الخلد (ہمیشہ رہنے والی جنت) جس کا پرہیزگاروں سے وعدہ کیا گیا ہے؟ یہ اُن کی جزا بھی ہے اور ٹھکانا بھی۔

''جنۃ الخلد'' کی تعبیر قرآن کی صرف ایک آیت میں ہی ہے، یہ بہشت کے ہمیشہ اور جاوداں رہنے کی طرف اشارہ ہے۔

''راغب'' ''مفردات'' میں کہتے ہیں کہ ''خلود'' کا معنی ایک چیز کا خراب ہونے سے محفوظ رہنا اور اپنی حالت پر برقرار رہنا ہے۔''مقائیس اللغت'' نے اسے ثبات اور دوام کے معنی میں پالیا ہے،''مصباح اللغت'' نے اس کا معنی ایک حال اور جگہ پر ٹھہرنا کیا ہے،'' جنۃ الخلد'' کی تعبیر اگرچہ اضافے کی حالت میں ذکر ہوئی ہے لیکن یہ وصفی اور صفتی معنی کی حامل ہے، ظاہری طور پر یہ بہشت کی مجموعی صفت ہے، کیونکہ بہشت کی تمام نعمات جاودانی ہیں، اہل بہشت کا اس میں رہنا بھی ہمیشہ کے لئے ہے، اس وجہ سے یہ بہشت کے کسی ایک حصے سے مختص نہیں ہے، بلکہ بہشت کے تمام باغات ہی اسی طرح ہیں۔

بعض علمائے لغت جیسے ''ابن منظور'' نے ''لسان العرب'' میں ''خلد'' کو بہشت کا ایک نام قرار دیا ہے، لیکن اس بات کا امکان ہے کہ ان کی مراد ایک دائمی صفت کا بیان ہو جو کہ آہستہ آہستہ بہشت کا ایک نام بن گئی۔

دوسری آیت میں اور تعبیر نظر آتی ہے، نیک وصالح مومنین کی پاداش ضائع نہیں جائے گی، اس کی طرف اشارہ کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے: ''اولئک لهم جنت عدن تجری من تحتهم الانهر'' ''اُن کے لئے عدن کے باغات ہیں جن کے درختوں کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔

''جنات عدن'' کی تعبیر قرآن کی گیارہ آیات میں آئی ہے [1] یہ تکرار اور تاکید ان صفات کی اہمیت کی دلیل ہیں جو ان میں ذکر کی گئی ہیں۔

''جنات'' جمع ہے ''جنت'' کی، یہ بہشت کے متعدد باغات کی طرف اشارہ ہے، عدن (بروزن عدل) ''مقائیس اللغت'' کے بقول حقیقت میں ثبات کے معنی میں ہے یا ''مفردات'' میں ''راغب'' کے بقول دوام اور پائیداری کے معنی میں ہے، اس لئے قیمتی دھاتوں اور فولاد وغیرہ کی جگہ کو ''معدن'' (کان) کہتے ہیں، یہ یہاں پر بہشت کے جاوداں ہونے کی طرف اشارہ ہے، دنیا کے باغات کی طرح اس میں خزاں کا گزر نہیں ہوگا، دنیا کے باغات تو کچھ عرصے بعد سوکھ جاتے ہیں، ان کے چشمے خشک ہوجاتے ہیں، کبھی ان کے پھلوں کو کوئی چیز خراب کر

---

[1] توبہ:۷۲)، (رعد:۳۲)، (نحل: ۳۱)، (کہف:۳۱)، (مریم:۶۱)، (طٰہٰ:۷۶)، (فاطر: ۳۳)، (ص:۵۰)، (مومن:۸)، (صف:۱۲) ، (بینہ:۸)۔

دیتی ہے اتنے اندر سے کھوکھلے ہوجاتے ہیں، زیادہ گرم اور ٹھنڈی ہوائیں بھی ان کو خشک کر دیتی ہیں، کبھی ان پر بجلی گر کر راکھ میں تبدیلی کر دیتی ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ اس دنیا کے باغوں پر تو ہزاروں طرح کی مصیبتیں ٹوٹ سکتی ہیں جب کہ بہشت کے باغات ایسے ہیں جو ہمیشہ سرسبز و شاداب اور قائم ودائم رہیں گے، وہاں نہ تو کسی آفت کا گزر ہوگا، نہ خزاں کا اور نہ درختوں کے سوکھ جانے کا۔

بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ ''جنات عدن'' سے مراد بہشت کا درمیان والا حصہ ہے، یہ بھی حقیقت میں بہشت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے، لیکن بہت وسیع، گویا اس کا ہر حصہ ایک مستقل بہشت کی حیثیت رکھتا ہے، اسی لئے اسے جمع کی صورت میں لایا گیا ہے۔[1] لیکن جو کچھ ہم نے اوپر بیان کیا ہے اس کے پیش نظر یہ معنی کچھ بعید دکھائی دیتا ہے۔

تیسری آیت بھی اسی بات کو دوسرے انداز میں پیش کرتی ہے، ارشاد ہوتا ہے: ''اما الذین امنوا وعملو الصلحت فلهم جنت الماوٰی نزلا بما کانو یعملون''۔ جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال انجام دئے ان کے لئے ''جنت الماویٰ'' ہے یہ اُن کی پذیرائی ہے ان کے اعمال کے صلے میں جو انہوں نے انجام دیئے۔

''ماوٰی'' کا مادہ ''اوی'' (بروزن قوی) یا ''اوی'' (بروزن قی) ہے۔ ''مفردات'' میں ''راغب'' کے بقول اس کا معنی ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ ضم کر دینا ہے، بعدازاں یہ کسی چیز کے پاس ٹھہرنے کے لئے استعمال ہونے لگا، ''مقائیس اللغت'' نے بھی اس کا ایک اصلی معنیٰ ''تجمع'' کیا ہے، جس کا لازمہ کسی چیز کے پاس ٹھہرنا ہی ہے، خلاصہ کلام یہ ہے کہ ہر وہ مکان، یا جگہ کہ جہاں پر انسان دن یا رات میں رہتا ہے اور وہاں پر آرام کرتا ہے، اُسے ''ماویٰ'' کہتے ہیں، لہٰذا ''جنات الماوٰی'' کی تعبیر بھی جنت کے ہمیشگی اور دائمی ہونے کی طرف اشارہ ہے، یہ آرام اور سکون کے مفہوم کی بھی ادائیگی کر رہی ہے۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ تعبیر اس حقیقت کی طرف ایک لطیف سا اشارہ ہے کہ یہ دنیا انسان کے لئے ماویٰ (انسان کا اصلی مکان) نہیں ہے، بلکہ یہ تو راستہ ہے جسے عبور کر کے انسان نے اپنی منزل تک پہنچنا ہے، یا روایت کے الفاظ میں کہ ''الدنیا فنطرۃ'' (دنیا ایک پل ہے) اس میں ثبات اور ہمیشہ رہنے کا معنی ہی نہیں۔

یہ بات واضح ہے کہ یہ صفت پوری بہشت کے لئے ہے، لیکن اس کے باوجود ابن عباسؓ سے یہ منقول ہے کہ وہ کہتے ہیں:

بہشت کے آٹھ باغات ہیں، ان میں سے ایک ''جنۃ الماویٰ'' ہے، باقی باغوں کے نام یہ ہیں: ''دار الجلال''، ''دار القرار''، ''دار السلام''، ''جنۃ عدن''، جنۃ الخلد''، ''جنۃ الفردوس'' اور ''جنۃ النعیم''۔

پہلے ہم نے ذکر کیا تھا کہ ''نزل'' کا معنی وہ چیز ہے جسے مہمان کے سامنے سب سے پہلے پیش کیا جاتا ہے (جیسا کہ آج کل شربت یا ٹھنڈا پانی یا چائے وغیرہ پیش کی جاتی ہے)۔

---

[1] مجمع البیان۔ ج ۶، ص ۴۶۷، تفسیر قرطبی، ج ۶ ص ۴۰۱۳۔

اگراس طرح ہو تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ''جنات الماوٰی '' اپنی تمام وسعتوں اور عظمتوں کے ساتھ خدا کے خالص بندوں کے لئے ایک معمولی سی خدمت کے طور پر پیش کی جائے گی! ان کی اصلی خدمت تو اُن نعمات سے کی جائے گی جن کے مقابلے میں جنت الماوی معمولی سی چیز ہے۔ وہ نعمت خدا کے قرب ولقاء کی جنت اور اس کی معرفت کے جلال و جمال کی بہشت کے علاوہ کیا ہوسکتی ہے۔

فیض الٰہی کے اس عظیم سرچشمے کے لئے ایک اور تعبیر جولائی گئی ہے وہ ''جنات الفردوس'' کی ہے، ارشاد ہوتا ہے: ''ان الذین امنوا وعملو الصلحت کانت لھم جنات الفردوس نزلا'' جولوگ ایمان لائے اور انہوں نے عمل صالح بھی انجام دیئے اُن کی پذیرائی کے لئے جنات الفردوس ہے۔

کلمہ ''فردوس'' رومی ہے یا سریانی، نبطی ہے یا حبشی یا پھر عربی، اس سلسلے میں علمائے لغت اور مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، ہر ایک نے کسی ایک کو اختیار کیا ہے۔

بعض نے اس کی بنیاد فارسی کو قرار دیا ہے، جو پہلے ''پرادیزس'' اور ''پرادیز'' کی صورت میں تھا، پھر ''فردایس'' اور ''فردوس'' کی شکل اختیار کر گیا۔

اس کلمے کے لئے متعدد معانی ذکر کئے گئے ہیں: باغ وبستان، انگور کے باغات، ایسے باغ جو ہر طرح کے پھل اور پھول رکھتے ہوں، ایسے باغات جن میں درخت بہت زیادہ ہوں، پانی بھی فراوان ہو اور انگور کے درخت بھی ان میں ہوں۔

جولوگ اس لفظ کو ''عربی'' سمجھتے ہیں وہ اسے ''الفردسة'' کے مادہ سے لیتے ہیں جس کا معنی وسیع اور کھلی ہے، یہ کلمہ قرآن میں صرف دو بار استعمال ہوا ہے (کہف۔۱۰۷، مومنون۔۱۱) اور بہشت کے لئے ہی استعمال ہوا ہے، پیغمبر اسلامؐ اور اہل بیتؑ سے منقول احادیث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بہشت کے ایک بہت بلند مقام کا نام ہے۔

حضور اکرمؐ کی ایک حدیث ہے:

"اذا ساء لتم الله تعالیٰ فاسا لوه الفردوس، فانه وسط الجنة واعلی الجنة وفوقه عرش الرحمن۔ ومنها تفجر انهار الجنة۔"

جب تم اللہ تعالیٰ سے مانگو تو فردوس مانگو جو بہشت کا درمیان اور سب سے اعلیٰ حصہ ہے، اُس کے اوپر خدا کا عرش ہے اور فردوس سے بہشت کی نہریں پھوٹتی ہیں۔ [1]

حضرت علی علیہ السلام سے ایک حدیث یوں مروی ہے:

لکل شیءٍ ذروة و ذروة الجنة الفردوس وھی المحمد وآل محمد

[1] صحیح بخاری ومسلم (بحوالہ روح المعانی، ج۱۶، ص۴۷)

ہر چیز کا ایک بلند مقام ہوتا ہے اور بہشت کا بلند مقام فردوس ہے، یہ محمدؐ و آل محمد کے لئے ہے۔[۱]

حضرت امام جعفر صادقؑ نے اس آیت کی تفسیر کے سلسلے میں فرمایا کہ:

یہ آیت حضرت ابوذرؓ، سلمانؓ، مقدادؓ، اور عمار یاسرؓ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔

آیت یہ ہے: ''جعل الله لهم جنات الفردوس نزلا ای ماوی و منزلا''

خدا نے فردوس کے باغات کو اُن کی منزل قرار دیا ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ دوسری اور تیسری حدیث میں کسی قسم کا تضاد نہیں، چونکہ باایمان افراد جیسے ابوذرؓ، سلمانؓ۔۔۔۔۔۔۔ جو کہ محمدؐ وآل محمدؐ کے سچے پیروکار ہیں وہ بھی دراصل انہی کے زمرے میں شمار ہوتے ہیں۔

یہاں پر ''نزلا'' کیا معنی رکھتا ہے؟ بعض نے اسے منزل اور جائے سکونت کے معنی میں لیا ہے، جیسا کہ امام جعفر صادقؑ سے مذکور حدیث میں بھی اشارہ ہوا ہے، بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ نزل کا معنی وہ چیز ہے جو مہمان کو پیش کی جاتی ہے، یا وہ چیز جو مہمان کو سب سے پہلے پیش کی جاتی ہے، ان دونوں معانی کے درمیان جمع کرنا بھی درست ہے۔

بہشتی باغات کے متعلق سورہ واقعہ میں ایک اور تعبیر آئی ہے جو کہ ''جنات النیعم'' کی ہے، ارشاد ہوتا ہے: (ایمان اور عمل میں) آگے بڑھنے والے ہی سب سے آگے ہوں گے، وہ اللہ تعالیٰ کے مقرب ہوں گے اور نعمتوں والی جنتوں میں ہوں گے۔

''جنات'' جمع ہے ''جنت'' کی، شاید یہ تعبیر اس لئے ہو کہ ہر ایک بہشتی کے لئے باغ ہوگا، یہ مجموعی طور پر کئی باغات بن جائیں گے، نعیم جمع ہے نعمت کی، چونکہ بہشت میں ہمیشہ کے لئے مختلف طرح کی مادی اور معنوی نعمات ہوں گی، یہ دنیا کے باغات کی طرح نہیں ہوگی کہ کبھی انسان کی تکلیف کا باعث بن جاتے ہیں اور کبھی راحت کا، علاوہ ازیں دنیا کے ہر کسی باغ میں کوئی ایک نعمت ہوتی ہے نہ کہ سب نعمتیں۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ پہلے اُن کے ''مقام قرب'' کا تذکرہ ہوا ہے، ارشاد ہوتا ہے ''اولئک المقربون'' پھر ''جنات النعیم'' کی بات کی گئی ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ ''جنات النعیم'' اپنی تمام نعمتوں اور عظمتوں کے باوجود خدا کے قرب کے مقام کے سامنے ایسے ہی ہے جیسے سمندر کے سامنے قطرہ۔

یہ تعبیر (جنۃ النعیم۔ جنات النعیم) قرآن کی آیات میں تقریبا دس مرتبہ آئی ہے اس کا بار بار آنا اس کی اہمیت اور عظمت پر دلیل ہے۔[۲]

قابل توجہ بات یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں جتنا بھی کسی سرچشمہ قوت کے نزدیک تر اور قریب تر ہوتا ہے اس کی فکر و پریشانی بڑھتی

---

[۱] تفسیر برہان، ج ۲ ص ۴۹۵، حدیث ۲۔

[۲] (مائدہ۔۶۵)، (یونس۔۹)، (حج۔۵۶)، (شعراء۔۸۵)، (لقمان۔۸)، (صافات۔۴۳)، (واقعہ۔ ۱۲، ۸۹)، (قلم۔۳۴)، (معارج۔۳۸)۔

جاتی ہے کیونکہ اُسے اس بات کا ہمیشہ خوف رہتا ہے کہ کہیں کسی وجہ سے وہ شخص اس سے اپنی نظریں پھیر نہ لے جس سے وہ بہت بڑی بدبختی میں مبتلا ہو جائے، اسی لئے ارباب معرفت بڑی شخصیات کو ''قرب سلطان'' سے روکتے ہیں، لیکن خدا کے قریب ہونا اس کے بالکل برعکس ہے، اس قرب کا نتیجہ تو آرام و سکون، معنوی اور روحانی سرور اور ''جنات النعیم'' کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ بہت سی روایات میں اس آیت:

ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَىِٕذٍ عَنِ النَّعِيْمِ (تکاثر۔۸)

کے ذیل میں ''نعیم'' کی تفسیر ''نعمت ولایت'' کی گئی ہے،[1] اس سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ ممکن ہے ''جنات النعیم'' ولایت والی بہشت ہو، خدا اور اس کے اولیاء کی محبت وولایت اُن سے عشق ومحبت اور ان کے نور سے فیضیاب ہونے کی جنت۔

''جنات النعیم'' سے مراد تمام تر بہشت ہے یا اس کے بعض خاص حصوں کی طرف اشارہ ہے، اس سلسلے میں دو احتمال ہیں، ایک طرف اس کا وعدہ چونکہ مقربین کو دیا گیا ہے اس لئے ممکن ہے یہ دوسرے احتمال کی طرف اشارہ ہو، بالخصوص اس لئے کہ اس سورۃ کی آیت ۸۸ اور ۸۹ میں بھی اسی سے ملتی جلتی تعبیر دکھائی دیتی ہے، ارشاد ہوتا ہے: ''فاما ان کان من المقربین فروح وریحان و جنۃ نعیم'' (واقعہ۔۸۸۔۸۹)

اس سلسلہ آیات کے آخری حصے میں خدا کی چار جنتوں کی طرف ایک اجمالی سا اشارہ کیا گیا ہے، اُن کی خصوصیات کو دو دو کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: ''ولمن خاف مقام ربہ جنتان'' جو اپنے رب کے مقام سے ڈرے اس کے لئے دو جنتیں ہیں، ''ذواتا افنان'' اُن میں مختلف نعمتیں اور ہرے بھرے درخت ہیں، ''ومن دو نہما جنتان...... مدھآمتان'' ان کے نیچے دو اور بہشتی باغات ہیں، وہ دونوں پوری طرح شاداب اور سرسبز ہیں۔

بعض اوقات یہ سوچا گیا ہے کہ یہ چار باغ تمام مومنین کے لئے ہیں یہ تعدد تنوع کی وجہ سے ہے کیونکہ انسان کی طبیعت تنوع پسند ہے، وہ اس سے ہی لطف پاتا ہے لیکن آیات وروایات کا طرز گفتگو اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ وہ دو مختلف طرح کے لوگوں کے لئے ہوں گی، ''من دونہما'' کی تعبیر بھی نیچے ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

اس لحاظ سے بہشت کے دو پہلے باغ ''مقربین'' کے لئے ہیں، اور ان سے نیچے دو باغات ''اصحاب الیمین'' کے لئے، یہ حقیقت میں اہل بہشت کے درجات اور مقامات کی طرف اشارہ ہے، ایسا ہونا بھی چاہیے کیونکہ تمام بہشتی ایک سطح کے لوگ تو نہیں ہیں، ان کا مقام اور مرتبہ ایک جیسا تو نہیں ہے، لہٰذا ان کے درجات بھی مختلف ہونے چاہئیں۔

اہل بہشت کے درجات کے اس فرق کو نبی اکرمؐ کی ایک حدیث میں بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا گیا ہے:

'' جنتان من فضۃ انیتہما وما فیہما، جنتان من ذھب انیتہما وما

---

[1] اس حدیث کے لئے بحارالانوار، ج ۲۴، ص ۴۸، باب ۲۹ کی طرف رجوع کیا جائے۔

فیهما"

بہشت کے دو باغ ایسے ہیں جن کے برتن اور ہر چیز چاندی کی ہے اور باغات کے برتن اور ہر چیز سونے کی ہے۔[۱]

حضرت امام جعفر صادقؑ سے مروی ایک روایت میں ہی معنی زیادہ وضاحت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے:

لا تقولن واحدة ان الله يقول: ومن دونهما جنتان ۔ولا تقولن درجة واحدة ان الله يقول: درجات بعضها فوق بعض انما تفاضل القوم بالاعمال۔

یہ نہ کہو کہ بہشت ایک ہی ہے کیونکہ خدا نے فرمایا ہے: ''اس سے نیچے دو اور بہشتیں ہیں'' یہ نہ کہو کہ سب کا درجہ ایک ہی ہے کیونکہ خدا نے فرمایا ہے: ''بعض درجات بعض سے بلند ہیں''، اور یہ فرق ان کے اعمال کی وجہ سے ہے۔[۲]

ان دونوں گروہوں میں سے ہر ایک کے لئے دو باغ کیوں ہوں گے؟ مفسرین نے اس سلسلے میں کئی احتمالات ذکر کئے ہیں، ان کے درمیان کسی قسم کا تضاد نہیں پایا جاتا، ممکن ہے آیت کے مفہوم میں سب کے سب جمع ہوں۔ احتمالات یہ ہیں:

۱۔ ایک تو روحانی جنت کی طرف اشارہ ہے اور دوسرا جسمانی جنت کی طرف۔

۲۔ ہر بہشتی کے لئے دو باغ ہیں، ایک عمومی اور دوستوں سے ملاقات کے لئے اور دوسرا خصوصی اپنی بیویوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لیے۔

۳۔ ایک باغ تو عقیدے کی پاداش کے طور پر ہے اور دوسرا نیک اعمال کے بدلے میں۔

۴۔ ایک تو اپنے عمل کی جزاء کے طور پر ہے لیکن دوسرا خدا کے فضل اور کرم کے طفیل۔

۵۔ ایک خدا کے فرمان کی اطاعت کرنے کی وجہ سے اور دوسرا ترک گناہ کرنے کی وجہ سے۔

مذکورہ بالا آیات سے مجموعی طور پر اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ بہشت کے مختلف درجات اور مقامات ہیں ان میں سے ہر درجہ ہی اپنی جگہ پر بہشت ہے، اولیائے خدا کے مقامات کا مختلف ہونا ہی اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ بہشت میں بھی ان کے درجات میں فرق ہو،

---

[۱] تفسیر مجمع البیان، ج۹و۱۰، ص۲۱۰۔

[۲] تفسیر مجمع البیان، ج۹و۱۰، ص۲۱۰۔

مقربین کی بہشت اصحاب الیمین کی بہشت سے مختلف ہے، جولوگ ایمان، معرفت اور ایمان صالح کی بلندیوں پر فائز ہیں ان کا درجہ ان سے بلند ہے جو اس سے کم رتبے کے لوگ ہیں۔

اگر چہ ان میں سے کسی ایک کے بھی اوصاف پوری طرح ہمارے ذہن میں نہیں سما سکتے، لیکن یہ بات قطعی ہے کہ ان کے درجات مختلف ہیں، یہاں تک کہ خود قیامت کے دن بھی جولوگ نچلے درجے کے ہیں وہ اوپر والے درجے کے متعلق تصور نہ کر سکیں گے کہ وہاں پر کیا ہے۔

''جنت'' قرآنی آیات میں کبھی تو''واحد'' کی صورت میں آیا ہے جو کہ نوع اور عموم کا معنی عطا کرتا ہے، یہ تمام بہشتی باغات کے لئے ہے، اور کبھی جمع کی شکل میں آیا ہے (جنات)، یہ بھی تمام بہشتی باغات اور اُن کے مختلف مراحل، مراتب اور درجات پر محیط ہے، اور کبھی ''تثنیہ'' (جنتان) کی صورت میں آیا ہے، یہ دو مختلف مرحلوں کی طرف اشارہ ہے جس کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے۔

کبھی تو بہشت کے دوام اور جاوداں ہونے کا تذکرہ ہوا ہے اور ''جنات عدن'' یا ''جنة الماوی'' یا ''جنة الخلد'' کی تعبیرات لائی گئی ہیں، لیکن کبھی اُس کی مادی اور معنوی نعمات کے متنوع ہونے کا ذکر ہوا ہے جس کے لئے ''جنات النعیم'' کی تعبیر لائی گئی ہے، کبھی بہشت کے بہت بلند اور ممتاز حصے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور ''جنات الفردوس'' کی تعبیر لائی گئی ہے۔

ان معنی خیز تعبیرات میں سے ہر ایک خدا کے فیض کے اس عظیم سرچشمے کی کسی ایک جہت کی طرف اشارہ کرتی ہیں، نیز یہ تعبیرات اس محبوب حقیقی کے قرب ووصال کے مختلف مقامات کی حکایت کرتی ہے۔

اللھم ارزقنا بمنك ورحمتك یاارحم الراحمین۔

بہشت کے متعلق چند سوال

۱۔ کیا تکرار و یکسانیت ناگوار نہیں ہے؟

بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ آیات اور روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رحمت کے اس عظیم سرچشمے میں خدا کی نعمات میں یکسانیت ہوگی، یہ بات بالخصوص اگر کافی مدت تک رہے تو اس شوق اور نشاط کو خاموش کر دیتی ہے کیونکہ بہترین مناظر، خوبصورت زندگی اور لذیذ غذائیں بھی اگر بار بار سامنے آتی رہیں تو وہ ایک عام سی حالت اختیار کر جاتی ہیں، یہاں تک کہ بعض اوقات انسان یکسانیت کی اس زندگی سے جان چھڑانے کے لئے ایک سادہ اور محنت طلب زندگی اختیار کر لیتا ہے تا کہ اس کی زندگی میں ایک تنوع آ جائے۔

اس کے جواب میں تین نکتوں کی طرف توجہ فرمایئے:

۱۔ ہم اس دنیا کے جسمانی اور نفسیاتی معیاروں کا موازنہ اُس دنیا سے نہ کریں کیونکہ اس دنیا میں جو ہماری کیفیت ہوتی ہے وہ یہ ہے ایک چیز کے بار بار سامنے آنے سے ہمارا ذہن تھک جاتا ہے اور ہمارے اندر بیزاری اور عدم میلان کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، لیکن وہاں پر اس کے برعکس ہے، انسان جتنا بھی دیکھے گا اس کا شوق اور جذبہ بڑھتا جائے گا، چیز جتنی بار بھی سامنے آئے گی اس کی لذت دو چند ہوتی جائے گی، اس طرح اس کا بار بار سامنے آنا معنوی اور مادی لذت میں اضافہ کرتا جائے گا، ہمارے پاس کیا دلیل ہے کہ یہاں کی اور وہاں کی روحانی اور نفسیاتی کیفیت ایک ہی ہے؟

۲۔ اس دنیا میں بھی کئی نعمتیں ایسی ہیں جن سے انسان کبھی بھی سیر نہیں ہوتا، ہم جتنا بھی تازہ ہوا میں سانس لیتے جائیں اس سے تھکاوٹ نہیں ہوتی، بلکہ ہمیشہ اس سے لذت محسوس کرتے ہیں، یہ ہمارے لئے نشاط اور فرحت کا باعث بنتی ہے۔

پانی ایک پینے کی معمولی سی چیز ہے ہم ہمیشہ اسے ہی پیتے ہیں، اگر ہم اس دنیا میں سو سال تک بھی رہیں تب بھی شدید پیاس کی حالت میں آب شیریں ہمارے لئے سب سے زیادہ لذت بخش ہے، اسی لئے کہتے ہیں کہ پانی زندگی کا سرچشمہ ہے نہ تو اس کے پینے سے تھکتے ہیں اور نہ ہی اسے بیکار سمجھتے ہیں، بلکہ پیاسوں کے لئے آب شیریں ہمیشہ معمولی، جذب کنندہ اور کیفیت آور نعمت ہوتا ہے۔

اس میں کیا مانع ہے کہ اس دنیا میں بھی خدا انسان پر ایک تشنگی کی سی کیفیت طاری کر دے (البتہ وہ تشنگی اور پیاس آور ہوتی ہے نہ کہ وہ پیاس جو وبال جان ہو، جیسے محبوب سے ملاقات کی پیاس کتنی سرور آفریں ہوتی ہے) جس کی وجہ سے وہ بہشت کی جسمانی اور روحانی نعمات سے ہمیشہ غیر معمولی لذت پاتا رہے۔

۳۔ خدا کی ذات اور صفات لامحدود ہیں، اس کے روحانی اور معنوی جلوئے بھی لامحدود ہیں، اہل بہشت پر ہر دن ایک نئے کرم کی بارش اور ہر لحہ ایک نئی رحمت اور ہدایت کی برسات ہوتی رہے گی ایسے کہ وہ اصلا مکرر نہ ہوں، کیا لامحدود چیز بھی مکرر ہو سکتی ہے؟

جنت کی مادی نعمات بھی اس کی رحمانیت اور رحیمیت کے جلوئے ہیں، وہ بھی لامحدود اور بے انتہا ہوں گے اس میں کیا مانع ہے کہ

بہشت کے وہی درخت، وہی نہریں، وہی پھول، وہی رنگ و بو، وہی پاکیزہ شرابیں، ہر دن اور ہر لحہ ایک نیا رنگ و بو اختیار کرتے رہیں، ان سے ہر دفعہ خوشبو کی ایک نئی لہر اٹھتی رہے، ان کی شکل بدلتی رہے، ان کے رنگ ہمیشہ متغیر رہیں، ہر لمحے ان کے جلوئے اور ہوں، اس طرح ایک کھانا یا ایک منظر پوری عمر میں بہشتی صرف ایک بار ہی دیکھیں اور اس سے لطف اٹھائیں (کیا پیارا سماں ہوگا)۔

بعض آیات اور روایات بھی اسی کی تائید کرتی ہیں، سورہ رحمن کی آیت نمبر ۲۹ میں ارشاد ہوتا ہے:

کل یوم ھو فی شان

ہر وقت اس کی ایک نئی شان اور ہر زمان اُس کا ایک نیا کام

اس آیت کی تفسیر کے سلسلے میں مفسرین کی مختلف آرائیں، ہر ایک خدا کے کسی فعل کی طرف اشارہ کرتا ہے، کوئی انسانوں کی خلقت اور موت کی طرف اشارہ کرتا ہے، کوئی اُن کی زندگی اور رزق کی طرف، کوئی قوموں کی عزت یا ذلت کی طرف، کوئی گناہوں کی بخشش اور غم واندوہ کے دور کردینے کی طرف، کوئی فائدہ پہنچانے اور نقصان کو دور کردینے کی طرف، لیکن یہ بات قطعی ہے کہ یہ آیت اپنے دامن میں ایک وسیع مفہوم لئے ہوئے ہے، جو اس کائنات میں ہر طرح کی تبدیلی کو شامل ہے، چونکہ ہمارے پاس اس امر پر کوئی دلیل نہیں کہ یہ آیت فقط دنیا کے لئے مختص ہو کیونکہ اس آیت سے پہلے ارشاد ہوتا ہے:

كل من عليها فان ويبقى وجه ربك ذوالجلال والاكرام

جو کچھ روئے زمین پر ہے وہ فنا ہوجائے گا، صرف تیرے ذوالجلال والاکرام رب کی ذات باقی رہے گی۔

ہوسکتا ہے یہ اس امر کے لئے قرینہ ہو، یہ تبدیلیاں اور تنوعات دوسری دنیا میں بھی جاری وساری ہوں گے اور اہل بہشت خدا کے ارادے سے ایک کام میں مصروف رہیں گے، اور ہر روز وہ ایک نئی کیفیت میں ہوں گے۔

بعض مفسرین نے ''کل یوم'' کو بھی عام قرار دیا ہے، جو دنیا اور آخرت دونوں کے ایام کے لئے ہے۔[1]

حضرت امام جعفر صادقؑ سے ایک حدیث یوں مروی ہے:

ان الله خلق جنة لم يرها عين، ولم يطلع عليها مخلوق، يفتحها الرب تبارك وتعالى كل صباح فيقول ازدادي طيبا، ازدادي ريحا۔

خدا نے جنت پیدا کی ہے جسے کسی آنکھ نے نہیں دیکھا اور کوئی مخلوق اس سے آگاہ نہیں، ہر صبح خدا اسے کھولتا ہے اور

---

[1] تفسیر روح المعانی، ج ۲۷، ص ۹۶۔

کہتا ہے! اپنی خوشبو کو زیادہ کرو، اپنی ہواؤں کو اور بڑھاؤ۔[1]

حضرت امام محمد باقرؑ سے ایک حدیث مروی ہے:

ان اهل الجنة توضع لهم موآئد عليها من سآئر ما يشتهونه من الا طعمة التي لا الذمنها ولا اطيب ثم يرفعون عن ذلك الیٰ غيره۔

بہشتیوں کے لئے ایسے دسترخوان بچھائے جائیں گے جن پر اُن کی پسند کے کھانے لگے ہوں گے ایسے کھانے جن سے لذیذ اور خوشبودار کھانا کوئی نہیں ہے، پھر وہ دسترخوان بڑھا لیا جائے گا اور اُن کے لئے ایک اور دسترخوان بچھایا جائے گا۔[2]

ان تعبیرات سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ وہاں پر کوئی چیز مکرر نہیں ہوگی بلکہ ہر لمحے نئے الطاف وعنایات ہوتے رہیں گے۔

گفتگو کے اس سلسلے کو ایک مفسر کی اس بات پر ختم کرتے ہیں، انہوں نے کہا ہے:

''مذکورہ بالا آیت ہر زمانے میں خدا کی تجلی، اور ہر انسانی جان میں اس کی صلاحیت کے مطابق جمال کے جلوے کی طرف اشارہ ہے، یہ بات بھی معلوم ہے کہ خدا کی تجلیات محدود اور ختم ہونے والی نہیں۔''[3]

قطعی طور پر یہ بات آیت کا پورا پورا مفہوم بیان نہیں کرتی بلکہ یہ تو آیت کے مفہوم کا ایک جزء اور حصہ ہے (غور کیجئے گا)

۲۔تضادات پہچان کا ذریعہ ہیں

یہ بات معروف ہے کہ ''کھونا'' ہی ''پانے'' کی اہمیت کو ظاہر کرتا ہے، دوسرے الفاظ میں یوں کہ خدا کی نعمتوں کا موازنہ ہمیشہ اُن کے زائل ہو جانے کے ساتھ ہی کیا جا سکتا ہے، اگر اس دنیا میں بیماری نام کی کوئی چیز نہ ہوتی تو کسے یہ معلوم ہو پاتا کہ تندرستی ایک بہت بڑی نعمت ہے، اگر دنیا میں بے سکونی نہ ہوتی تو آرام وسکون کی نعمت کا احسان کیسے ہو پاتا۔

اس لحاظ سے بہشت میں تو کسی قسم کا زوال نہیں ہے، وہاں نہ بے سکونی ہے اور نہ بیماری، نہ قحط ہے اور نہ دوسری مصیبتیں۔۔۔۔۔۔اس وجہ سے وہاں کی نعمات کی قدر ومنزلت آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گی، لہٰذا کسی قسم کی لذت نہیں بخش سکیں گی۔

اس سوال کا جواب کوئی ایسا مشکل نہیں کیونکہ ایک طرف تو بہشتی اہل دوزخ کو دیکھ رہے ہوں گے، اس لئے اپنا موازنہ اُن سے کر سکتے

---

[1] بحارالانوار، ج ۸، ص ۱۹۹، حدیث ۱۹۸۔

[2] بحارالانوار، ج ۸، ص ۱۹۹ حدیث ۱۹۹۔

[3] روح البیان، ج ۹، ص ۳۰۰۔

ہیں جب وہ اتنے بڑے فرق کو دیکھیں گے اور ان لامحدود نعمتوں کی طرف نظر کریں گے تو بہت لذت اور سرور محسوس کریں گے۔

قرآن نے اس بات کو کئی جگہ پر ذکر کیا ہے کہ اہل بہشت دوزخیوں کی حالت کو دیکھتے رہیں گے، سورہ اعرف کی آیت ۵۰ میں ارشاد ہوتا ہے:

وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۭ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝۵۰

اہل دوزخ بہشتیوں کو آواز دیں گے کہ (تھوڑی سی مہربانی کر کے) تھوڑا سا پانی یا خدا نے تمہیں جو رزق دیا ہے اس میں سے کچھ ہمیں دے دو، وہ کہیں گے خدا نے انہیں کافروں پر حرام کیا ہے۔

سورہ صافات میں ارشاد ہوتا ہے:

فاقبل بعضهم على بعض يتسآء لون۔ قال قآئل منهم انى كان لى قرين........ فاطلع فراٰه فى سوآء الجحيم........ قال تا لله ان كدت لتردين........ ولو لا نعمة ربى لكنت من المحضرين۔

بعض بہشتی بعض دوسرے بہشتیوں کی طرف متوجہ ہو کر سوال کریں گے، ان میں سے ایک کہے گا۔۔۔۔ میرا ایک (گنہگار اور بے ایمان) ساتھی ہوا کرتا تھا۔۔۔۔ اچانک وہ اسے جہنم میں دیکھے گا اس سے کہے گا! خدا کی قسم تو تو مجھ کو بھی تباہ کرنے کو تھا، اور اگر میرے رب کا مجھ پر کرم نہ ہوتا تو میں بھی جہنم میں موجود لوگوں میں ہوتا۔

(صافات۔ ۵۰، ۵۱، ۵۵ تا ۵۷)

سورہ اعراف میں ارشاد ہوتا ہے:

وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ اَنْ قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ۭ قَالُوْا نَعَمْ ۚ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۝۴۴ [۷:۴۴]

اہل بہشت دوزخیوں کو آواز دیں گے کہ ہم سے تو جو ہمارے رب نے وعدہ کیا تھا ہم نے اسے حق پایا، کیا تم سے جو تمہارے رب نے وعدہ کیا تھا اُسے تم نے بھی حق پایا ہے؟ وہ کہیں گے! ہاں! پھر ایک پکارنے والا اُن کے

درمیان پکارے گا کہ ظالموں پر اللہ کی لعنت ہو۔ (اعرف۔ ۴۴)

ان آیات کے مجموعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نہ تو اہل بہشت دوزخیوں کی حالت سے بے خبر ہیں اور نہ دوزخ میں رہنے والے بہشتیوں کے حال سے بے خبر، اہل بہشت کی آگاہی اُن کے سرور اور نعمت میں اضافے کا باعث بنے گی کہ وہ دردناک عذاب سے محفوظ ہیں اور نعمتوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں جب کہ اس کے برعکس دوزخی اس موازنے سے اور غمگین ہوں گے۔

حضرت امام جعفر صادقؑ سے ایک حدیث یوں منقول ہے:

ہر انسان کا ایک گھر جنت میں ہوتا ہے اور ایک دوزخ میں، جب بہشتی بہشت میں سکونت اختیار کر لیں گے اور دوزخی دوزخ میں ڈال دیئے جائیں گے تو ایک آواز آئے گی، کہ اے بہشت کے رہنے والو ادھر دیکھو! وہ دوزخ کی طرف دیکھیں گے، اس وقت اُن کے دوزخ والے گھر اوپر اٹھیں گے جو انہیں دکھائے جائیں گے پھر ان سے کہا جائے گا: اگر تم اپنے رب کی نافرمانی کرتے تو ان گھروں میں ہوتے۔

پھر امامؑ نے فرمایا:

اگر کوئی شخص زیادہ خوشی سے مرسکتا ہوتا تو اہل بہشت اُس وقت خوشی سے مرجاتے، کیونکہ اتنا بڑا عذاب ان سے دور کر دیا گیا ہے، (اسی طرح دوزخیوں کی حالت بھی حدیث کے ذیل میں ذکر کی گئی ہے کہ وہ بہشت میں اپنے مکانات دیکھ کر اتنے غمگین ہوں گے گویا وہ اس غم کی وجہ سے مرجانا چاہتے ہیں)۔[۱]

اسی مفہوم سے ملتا جلتا مفہوم البتہ کچھ فرق کے ساتھ نبی اکرمؐ سے منقول ہے جسے **در المنثور** میں ذکر کیا گیا ہے۔[۲] ہر انسان کے لئے دو مکانوں اور منزلوں کی موجودگی انسان کی ان صلاحیتوں اور استعداد کی طرف اشارہ ہیں جو اس کے اندر پوشیدہ ہیں، ان صلاحیتوں کے مطابق ہی اس کے لئے بہشت اور جنت میں مکان بنائے گئے ہیں، پہلے جو کچھ ہم نے ذکر کیا تھا کہ انسان اپنے اعمال کے ساتھ ہی اپنا مقام متعین کرتا ہے یہ اس کے ساتھ تضاد نہیں رکھتی۔

یہ سب کچھ ایک طرف، دوسری طرف یہ کہ اہل بہشت کبھی بھی اس دنیا کے حادثات اور واقعات کو فراموش نہیں کریں گے، وہ اس دنیا کے ساتھ اپنی حالت کا موازنہ کرکے خدا کی اُن بے شمار نعمات کی قدر و منزلت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

سورہ طور کی آیت ۲۵ سے لے کر ۲۷ تک میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاَقۡبَلَ بَعۡضُهُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ يَّتَسَآءَلُوۡنَ۝۲۵ قَالُوۡۤا اِنَّا كُنَّا قَبۡلُ فِىۡۤ اَهۡلِنَا مُشۡفِقِيۡنَ۝۲۶ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيۡنَا وَوَقٰٮنَا عَذَابَ السَّمُوۡمِ۝۲۷

---

[۱] بحار الانوار، ج ۸ ص ۱۲۵، حدیث ۲۶۔

[۲] تفسیر در المنثور بحوالہ المیزان ص ۱۳۹ (سورہ اعراف کی آیت کے ذیل میں)۔

اہل بہشت ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر بات چیت کریں گے، (اور ان کی گذشتہ زندگی کے متعلق پوچھیں گے)اور پوچھیں گے، وہ کہیں گے ہم اپنے خاندان میں (انجام کار سے) بہت ڈرا کرتے تھے، پس خدا نے ہم پر بڑا احسان کیا اور ہمیں مہلک عذاب سے بچالیا۔

اس آیت سے یہ بات بالکل واضح ہوتی ہے کہ بہشتی اس دنیا کی مصیبتوں اور پریشانیوں کو یاد رکھے ہوئے ہیں، جس حالت میں وہ اب ہیں، اس کے ساتھ گذشتہ حالت کا موازنہ بھی کرتے ہیں، یہ بات واضح ہے کہ یہ موازنہ اُن نعمات کی عظمت کو آشکار کر دیتا ہے، جو انہیں اب حاصل ہیں۔

۳۔کیا بہشت میں ترقی کا امکان بھی ہے؟

اگر چہ اس سوال کا جواب بھی گذشتہ سوال کا جواب دینے سے کسی حد تک معلوم ہو گیا لیکن ضروری ہے کہ ایک واضح جواب دیا جائے، وہ یہ ہے! یقینی طور پر وہاں بھی آگے بڑھنے کے امکانات ہیں، بہشتی ایک جگہ پر ٹھہر نہیں جائیں گے بلکہ خدا کے لطف و کرم کے سائے میں روز بروز اس کی ذات کے قریب تر ہوتے جائیں گے، خدا کے نزدیک پہنچنے کے لئے اس راستے میں وہ آگے بڑھتے رہیں گے۔

اس بات کا یہ طلب نہیں ہے کہ وہاں اطاعت، عبادت یا کچھ اعمال کی ذمہ داری ہوگی بہشت فریضے اور ذمہ داری کی جگہ نہیں ہے کیونکہ ذمہ داری کے لئے جن بنیادی عناصر کی ضرورت ہوتی ہے وہ وہاں پر نہیں ہوں گے، بلکہ انہوں نے اس دنیا میں جو اعمال انجام دیئے ہیں اُن کے سائے میں اپنی ترقی اور ارتقاء کے اس سفر کو آگے بڑھاتے رہیں گے، بالکل ان بہت زیادہ پھل دینے والے درختوں کے مانند جنہیں انسان ایک دفعہ لگا دیتا ہے، پھر وہ ہمیشہ بیج اگاتے ہیں، اُن کی جڑیں آگے پھیلتی ہیں اور کسی اور جگہ سے سر نکال لیتے ہیں اور دشت و صحرا پر چھا جاتے ہیں، یا اُن خلائی جہازوں کی طرح جنہیں پہلی حرکت اور زمین کی کشش کے دائرہ کار سے باہر نکلنے کے لئے ایک بڑی توانائی کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اس دائرے سے نکلنے کے بعد کسی اور نئی توانائی کے بغیر آخر تک آگے بڑھتے رہتے ہیں، البتہ اگر راستے میں کوئی رکاوٹ نہ آئے تو۔

قرآن کی بعض آیات میں اس کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے، سورہ مریم کی آیت ۶۲ میں ارشاد ہوتا ہے:

ولھم رزقھم فیھا بکرۃ و عشیا

بہشت میں ہر صبح و شام اُن کے لئے رزق مقرر ہے۔

اس آیت سے جو پہلی آیات ہیں اُن سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ یہ صفت آخرت کی بہشت کے لئے ہے، جسے ''جنات عدن'' کہتے ہیں نہ کہ برزخ والی بہشت کے لئے، اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ قرآن کی بعض دوسری آیات سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بہشتی جو کچھ بھی چاہیں اور جس وقت بھی چاہیں، اُن کے لئے آمادہ اور تیار ہوگا، یہ کون سی نعمت اور عطا ہے جو ہر صبح و شام انہیں عطا کی جائے گی؟

یقینا یہ ایک نئی معنوی اور مادہ نعمت ہو گی جو انہیں ان دو وقتوں میں عطا کی جائے گی، جس کے نتیجے میں اُنہیں اوپر والے درجات پر فائز کیا جائے گا۔

اس سلسلے میں نبی اکرمؐ کی ایک بڑی معنی خیز حدیث ذکر ہوئی ہے جو اس بات کو پوری طرح واضح کر دیتی ہے۔

آنحضرتؐ نے فرمایا:

وتاتیھم طرف الھدایا من اللہ تعالی لمواقیت الصلاۃ التی کانوا یصلون فیھا فی الدینا تسلم علیھم الملئکۃ۔

خدا کی جانب سے اُن کے لئے بڑے قیمتی اور خوبصورت تحفے لائے جائیں گے، اُن اوقات میں جن میں وہ اس دنیا میں نماز پڑھتے تھے فرشتے ان پر درود و سلام بھیجیں گے۔[1]

آیت کی تعبیرات کو دیکھ کر ایک اور سوال جو سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ بہشت میں تو دن رات ہی نہیں ہوں گے، اس لئے اس میں صبح وشام ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس سوال کا جواب بھی یوں دیا جا سکتا ہے کہ بہشت میں اگر چہ دائمی طور پر نور اور روشنی ہو گی لیکن اس نور میں ایک حرکت ہو گی، اس نور کے گھٹنے اور بڑھنے سے بہشتی دن اور رات کا اندازہ لگا لیا کریں گے، بالکل قطب شمالی یا قطب جنوبی پر بسنے والے لوگوں کی طرح جہاں پر چھ مہینے مسلسل دن رہتا ہے، یہ لوگ روشنی کے کم یا زیادہ ہونے سے دن اور رات کا اندازہ لگا لیتے ہیں، چونکہ یہ دو سوال (نئے رزق اور صبح وشام سے متعلق سوالات) بہت سے مفسرین سے حل نہیں ہو سکے اس لئے انہوں نے اس آیت کی کئی توجیہات کی ہیں جن میں سے اکثر آیت کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہیں، مثلاً یہ کہ یہ نعمت کے دوام کے لئے کنایہ ہے، کیونکہ عرب میں یہ رواج تھا کہ جن کے پاس صبح اور شام کے لئے کھانا ہوتا تھا اُسے وہ بے نیاز سمجھتے تھے، یا یہ کہ وہ نعمتیں مختلف وقفوں سے جن کی مقدار ہمارے دن رات کے برابر ہے، ان کے پاس پہنچتی رہیں گی۔

یہ بات واضح ہے کہ یہ سب آیت کے ظاہر سے ہم آہنگ نہیں، اس سے بہتر اور کون سا معنی ہو سکتا ہے کہ وہاں پر بھی ہم ایک دن اور رات کا تصور کریں جن کا اندازہ نور کے بڑھنے اور گھٹنے سے لگایا جا سکے گا، اسی طرح ایک نئے رزق کا تصور کریں جس کا سرچشمہ خدا کا لطف وکرم ہو جو اس ارتقاء اور تکامل کے راستے پر آگے بڑھنے کی خوشخبری سنائے، یہ معنی آیت کے ظاہر سے ہم آہنگ ہے یا کم از کم اس میں ظاہر کے ساتھ کم اختلاف پایا جاتا ہے۔

نبی اکرمؐ کی ایک حدیث ہے:

والذی انزل الکتاب علی محمد ان اھل الجنۃ لیزدا دون جمالا و حسنا

---

[1] تفسیر روح المعانی، ج ۱۶ ص ۱۰۳، قرطبی، ج ۶ ص ۴۱۶۶ (زیر نظر آیت کے ذیل میں)

كما يزدادون في الدنيا قباحة وهرما.

اس خدا کی قسم جس نے محمدؐ پر قرآن نازل کیا اہل بہشت کا حسن و جمال بڑھتا رہے گا (ان کا جتنا بھی وقت گزرتا جائے گا) جیسا کہ اس دنیا میں (زمانے کے گزرنے کے ساتھ) ان کی بدصورتی اور بڑھاپا بڑھتا رہتا تھا۔[1]

یہ حدیث بھی اہل بہشت کے تدریجاً ارتقاء اور ترقی کی بات کرتی ہے، یہ اگرچہ صرف جسمانی پہلو کی جانب اشارہ کر رہی ہے لیکن یہ بات قطع ہے کہ روحانی اور معنوی پہلو بدرجہ اولیٰ اس میں شامل ہیں۔

[1] علم الیقین ص ۱۰۳، (بحوالہ ''معاذ'' گفتار ظرفی)۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جہنم اور جہنمی:

۱۔ جہنم کس کے لئے ہے؟ (جہنم کے راہی)

۲۔ جہنم کی ماہیت اور اس کا فلسفہ

۳۔ جہنم کے دروازے اور اُس کے درجات

۴۔ اہل جہنم کے جسمانی عذاب

۵۔ اہل جہنم کے روحانی عذاب

۶۔ سزاؤں کی ہمیشگی

۷۔ ہلکے اعمال والے

(۱) جہنم کس کے لئے ہے؟

اشارہ:

اگر چہ قاعدے کے مطابق سب سے پہلے جہنم کی ماہیت اوراس کے اوصاف کے بارے میں بحث ہونی چاہیے اور دوسرے مرحلے میں اہل جہنم کے بارے میں، لیکن چونکہ قرآن کی سنت اور روش یہ رہی ہے کہ اس طرح کی بحثوں میں ہمیشہ تربیتی امور اوراس کے اخلاقی، اجتماعی اورانسانی نتائج پر بہت تاکید کرتا ہے، لہٰذا ہم بھی اس مثبت روش کی پیروی کرتے ہوئے پہلے ان افراد کے بارے میں گفتگو کریں گے جو اس عظیم سزا کے مستحق ہیں تاکہ اہل جہنم کے بارے میں نازل شدہ آیتوں کے بارے میں تحقیق کرتے ہوئے اس امر میں اسلام کی منطق سے آشنا ہوں۔

دوزخیوں کے بارے میں نازل شدہ آیتیں بہت زیادہ ہیں، لہٰذا ہم ہر حصے سے چند نمونے اور مصادیق بیان کریں گے، اس ضمن میں ان آیات کی مختلف تعبیروں سے گناہوں کا آپس میں فرق اوران کی کراہت کے درجات کا بھی پتہ چل جاتا ہے، اس اشارے کے ساتھ ہم قرآن کی طرف لوٹتے ہیں اور جہنمیوں کے مختلف طبقوں کے بارے میں قرآن کی آیتوں کی روشنی میں تحقیق کرتے ہیں۔

۱۔ کفار اور منافقین:

دوزخ میں جانے والوں میں پہلا گروہ کفار اور منافقین کا ہے، قرآن مجید سورہ نساء کی آیت ۱۴۰ میں یوں کہتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعًا ﴿۱۴۰﴾

خدا تمام منافقین اور کافروں کو جہنم میں جمع کرنے والا ہے۔

سورہ توبہ کی آیت ۴۹ میں ہم پڑھتے ہیں:

وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۹﴾

جہنم نے کافروں کا احاطہ کر رکھا ہے۔

سورہ نساء کی آیت ۱۴۵ میں یوں بیان ہوا ہے:

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ﴿۱۴۵﴾

منافقین دوزخ کے سب سے نچلے طبقے میں ہیں اور تم اُن کا کوئی مددگار نہیں پاؤ گے۔

حقیقت میں گناہوں اور آلودگیوں کا سب سے اہم اور وسیع سرچشمہ کفر، بے ایمانی اور نفاق ہی ہے کیونکہ جب تک ایمان کا نور انسان کے باطن اور روح کو جلا نہ بخشے اور وہ شرک، کفر اور نفاق سے خالص نہ ہو جائے، کارِ خیر کا موثر انگیزہ اس میں پیدا نہیں ہوسکتا اور وہ صرف مادی اور

شہوانی محرکات کا اسیر رہے گا، اس طرح کے محرکات کے انسان پر حاکمیت کا نتیجہ کسی سے پوشیدہ نہیں، اس کے نمونے دنیا کے موجودہ ظالموں کے ظلم میں کامل طور پر نمایاں ہیں، کفرحق کو چھپانے کے معنی میں ہے اور نفاق ظاہر اور باطن کی دوگانگی کے معنی میں ہے (یعنی ایمان کا اظہار اور کفر کا چھپانا) انسانی معاشرے کی اصلاح کے راستے میں سب سے اہم رکاوٹ یہ دو چیزیں ہیں، لہٰذا دوزخ اور اہل دوزخ سے مربوط بہت سی آیتیں ان دو گروہوں کے بارے میں ہیں۔

۲۔لوگوں کو خدا تک پہنچنے سے روکنا:

قرآن کریم نے لوگوں کو پیغمبر اسلامؐ اور آیات قرآنی کے حوالے سے دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے اور کہا ہے:

فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ؕ وَ كَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا ۵۵

ان میں سے کچھ لوگ اس پر ایمان لائے اور کچھ نے اس کے راستہ میں رکاوٹ پیدا کی جن کے لئے آتش دوزخ کا بھڑکتا شعلہ کافی ہے۔(نساء۔۵۵)

قرآن مجید کی آیتوں میں (راہ خدا میں حائل) اس گروہ کے لئے بہت سی تہدیدات نظر آتی ہیں، یہ وہی لوگ ہیں جو نہ صرف خود گمراہ ہیں بلکہ دوسروں کو بھی گمراہ کرنے پر مصر ہیں، گویا اس طرح انہیں لذت ملتی ہے، بلکہ لوگوں کے کفر اور بے ایمانی ہی میں انہیں اپنے ناجائز مفادات نظر آتے ہیں کیونکہ ایک مومن اور الٰہی اقدار کی حامل اور معتقد قوم کبھی بھی فرعونوں، شیطانوں اور ان کی پارٹیوں کی پیروی نہیں کر سکتی، لہٰذا لوگوں پر تسلط پانے کا تنہا راستہ ہی ان سے گوہر ایمان کا چھین لینا ہے، امتوں کی تاریخ اس کی بہترین گواہ ہے کہ یہ فاسد گروہ ہمیشہ لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے، آج کے دور میں بھی استکباری حکومتوں اور جمعیتوں کی پوری کوشش یہی ہے کہ لوگوں کو ایمان باللہ اور الٰہی اقدار سے محروم کر دیں تاکہ وہ ان کے مفادات کے حصول کی راہ میں رکاوٹ نہ بنیں۔

۳۔ترک اطاعت خدا اور مسلمانوں کی صفوں میں تفرقہ بازی

سورہ جن کی آیت ۲۳ میں ہے:

وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۲۳[۱]

[۱] الجن:۲۳

جو لوگ خدا اور رسول کی نافرمانی کریں ان کیلئے جہنم کی آگ ہے اور وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔

سورہ نساء کی ۱۱۵ ویں آیت میں یوں بیان ہوتا ہے:

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ

الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۚ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ۱۱۵

۲ النساء:۱۱۵

جو بھی حق کے ظاہر ہونے کے بعد پیغمبرؐ کی مخالفت کرے اور مومنین کے رستے کے بجائے کسی اور رستے پر چلے ہم بھی اسے اسی راہ پر چلائیں گے، جس پر وہ چلتا ہے اور ہم اُسے جہنم کی آگ میں جلائیں گے، اور وہ کیا برا ٹھکانا ہے۔

''یشاقق''، ''شقاق'' کے مادے سے ہے اور ایسی عمداً مخالفت کے معنی میں ہے جس میں دشمنی بھی شامل ہو، دشمنی سے مخالفت کرنے کے بعد کا یہ جملہ من بعد ما تبین له الهدیٰ (ہدایت کا راستہ اس کے لئے واضح ہونے کے بعد) بھی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس مخالفت کا سرچشمہ ہٹ دھرمی اور عناد ہی ہے، اور یہ مسلمانوں کی صفوں میں تفرقہ اور اختلاف پیدا کرنے کے لئے ہے۔ واضح ہے کہ ایسے افراد جہنمیوں کا واضح ترین مصداق ہیں۔

۴۔ الٰہی آیات کا تمسخر

اگرچہ آیات خداوندی کا مذاق اڑانا کفر اور بے ایمانی کی دلیل ہے اور کفر دوزخ میں جانے کا سبب ہے، تاہم قرآنی آیات میں اس چیز کا خصوصی طور پر ذکر کیا گیا ہے اور اسے دوزخ میں لے جانے والے اسباب میں سے ایک اہم سبب گردانا گیا ہے، سورہ کہف کی آیت ۱۰۶ میں یوں مخاطب ہے:

ذٰلِكَ جَزَاۗؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوْا وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَرُسُلِيْ هُزُوًا ۱۰۶

۲ الکہف:۱۰۶

ایسوں کی سزا جہنم ہے کیونکہ وہ کافر ہو گئے ہیں اور میری آیات اور میرے رسولوں کا تمسخر اڑاتے ہیں۔

حق کا مذاق عموماً جہل، عناد، تعصب، ہٹ دھرمی، دشمنی اور عداوت کی وجہ سے اُڑایا جاتا ہے اور ان امور میں سے ہر ایک جہنم کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے، اس بناء پر اگر استہزاء کرنے والوں کی جگہ دوزخ یا جہنم کے بدترین مقامات ہوں تو تعجب کا مقام نہیں جب کہ یہ لوگ زیادہ تر انبیاء اور اولیاء اللہ ہی کا تمسخر اُڑاتے رہے ہیں:

۵۔ عقل، آنکھ اور کان سے کام نہ لینے والے

ایک اور گروہ جو واقعاً جہنم کا حقدار ہے ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جو معرفت اور شناخت کے دروازے اپنے آپ پر بند کر دیتے ہیں، خداداد عقل کا دروازہ بند کر دیتے ہیں، آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور اپنے کانوں میں یوں روئی ٹھونستے ہیں کہ حق کی صدا اندر جا ہی نہ سکے، اور

حقیقت کے خوبصورت چہرے کو نہ دیکھ سکیں اور جو چیزیں بیداری وہوش کا موجب بنتی ہیں ان میں تعقل نہ کریں، قرآن مجید سورہ اعراف کی ۱۷۹ ویں آیت میں یوں فرماتا ہے:

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۚ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۚ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۗ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ [۷:۱۷۹]

ہم نے یقیناً بہت سے جنوں اور انسانوں کو دوزخ کے لئے بنایا ہے، اُن کے پاس ایسے دل (اور عقلیں) ہیں، کہ جن سے وہ سوچتے ہیں، ایسی آنکھیں ہیں کہ جن سے دیکھتے نہیں اور ایسے کان رکھتے ہیں کہ جن سے سنتے ہیں، وہ چوپایوں کی مانند ہیں، بلکہ ان سے بھی گمراہ تر ہیں وہ غفلت میں پڑے ہیں۔

واضح ہے کہ یہ بنانا ہرگز جبری نہیں ہے اور فخر رازی کی طرح کے بعض طرفداران جبر کا اپنے نظریے کے اثبات کے لئے اس سے استدلال قائم کرنا بالکل بے بنیاد ہے چونکہ اس استدلال کا جواب خود آیت میں موجود ہے، آیت کہتی ہے کہ ہم نے تمام اسباب معرفت اُن کے اختیار میں دیئے ہیں۔ (عقل امور عقلیہ کے ادراک کے لئے آنکھ امور محسوسہ کے مشاہدے کے لئے اور کان علوم نقلی کے لئے) لیکن وہ ان اسباب سے استفادہ نہیں کرتے اور بہرہ مند نہیں ہوتے (غور کیجئے گا)۔

اسی لئے فرماتا ہے کہ وہ لوگ حیوانیت کی حد تک جا پہنچتے ہیں بلکہ اس سے بھی نیچے گر جاتے ہیں کیونکہ اگر حیوان ادراک اور فہم نہیں رکھتا تو اس وجہ سے ہے کہ اسباب اس کے پاس نہیں اور وہ اختیار نہیں رکھتا، حیوان سے زیادہ گمراہ وہ ہیں جو ان وسائل اور اسباب اور ان سے استفادہ کرنے کا امکان ہونے کے باوجود ان سے بہرہ مند نہیں ہوتے، ان تمام امور کا سرچشمہ غفلت اور بے خبری ہے جس کی طرف آیت میں اشارہ ہوا ہے، ''اولئك هم الغفلون'' اسی معنی سے مشابہ مطلب سورہ ملک کی ۱۰ ویں آیت میں یوں مذکور ہے کہ جہنمی داروغوں اور عذاب کے فرشتوں کے جواب میں اہل جہنم کہیں گے اگر ہم سنتے اور اپنی عقل استعمال کرتے تو ہرگز دوزخیوں میں سے نہ ہوتے ''وقالو لو كنا نسمع او نعقل ما كنا فی اصحب السعير''۔

حقیقت میں انسان کی تمام بدبختیوں کی جڑ اور اُم الفساد یہی ہے کہ عقل، کان اور آنکھ کو وہ استعمال نہیں کرتا اور ان عظیم الٰہی سرمایوں سے شناخت اور معرفت کے لئے استفادہ نہیں کرتا، ایسا نہیں ہے کہ خدا نے معرفت کے یہ سرچشمے اور منابع اسے نہ دیئے ہوں بلکہ اس کے پاس موجود ہیں، لیکن وہ فائدہ نہیں اٹھاتا۔

۶۔ شیطان کی پیروی:

خدا کے غضب اور قہر میں مبتلا ہونے کے عوامل میں سے ایک اہم عامل شیاطین کے سامنے سر تسلیم خم کرنا، اپنے تمام امور کی باغ ڈور

ان کے سپرد کر دینا ہے جیسا کہ قرآن سورہ اعراف کی ۱۸ ویں آیت میں کہتا ہے: جب شیطان کو بارگاہ الٰہی سے نکالا جا رہا تھا تو خدا نے اس سے یوں کہا:

قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُومًا مَّدْحُورًا ۖ لَّمَن تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنكُمْ أَجْمَعِينَ ﴿١٨﴾

فرمایا کہ اس (جگہ) سے ذلت اور رسوائی کے ساتھ نکل جاؤ، انسانوں میں جو بھی تمہاری پیروی کرے گا میں قسم کھاتا ہوں کہ جہنم کو ان سب سے بھر دوں گا۔

اگرچہ اس آیت میں خصوصیت سے شیطانوں کے سردار ابلیس کے بارے میں بات ہوئی ہے لیکن ہمیں یہ معلوم ہے کہ ابلیس کے پیروکار شیطانوں کا طریقہ کار ہر جگہ ایک سا ہی ہوتا ہے اور شیاطین جن وانس کی پیروی ہے اور ان تمام پیروکاروں کا انجام جہنم ہے، جھوٹے وعدے، دعوت گناہ، نیکیوں کی نہی، انحرافات کی تشویق اور شہوات کو خوبصورت دکھا کر وہ اپنے پیروکاروں کو خدا سے دور کرتے ہیں اور انہیں اُس کے قہر وغضب میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ [1]

۷۔ تکبر اور سرکشی:

تکبر خواہ خالق کے مقابلے میں ہو یا مخلوق کے مقابلے میں یا حقائق کے مقابلے میں ہو (یعنی انسان سے روگردانی کرے) جہنم میں گرنے کے اسباب میں سے ایک سبب ہے، استکبار (خود کو بڑا سمجھنا) جو کہ بہت سے مظالم، جرائم اور حق تلفیوں کا سرچشمہ ہے، تکبر ہی کی طرح ہے اور انسان کو خدا کے قہر وغضب کے اس مرکز میں لے جاتا ہے، قرآن مجید سورہ زمر آیت ۶۰ میں یوں فرماتا ہے:

أَلَيْسَ فِي جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِينَ ﴿٦٠﴾ (الزمر: ۶۰)

کیا جہنم میں متکبروں کا ٹھکانا نہیں ہے؟

نیز سورہ اعراف کی آیت ۳۶ میں فرماتا ہے:

وَالَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٣٦﴾

جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور اُن کے مقابلے میں تکبر کیا وہ اہل نار میں سے ہیں اور ہمیشہ اس میں

[1] اسی سے ملتا جلتا مفہوم سورہ لقمان آیت ۲۱ اور سورہ ابراہیم آیت ۲۲ میں بھی آیا ہے۔

رہیں گے۔[1]

یہی مطلب قرآن مجید کی دوسری آیتوں میں بھی آیا ہے، سورہ ابراہیم کی آیت ۱۵ اور ۱۶ میں ''جباران عنید'' کے بارے میں فرماتا ہے:

وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ مِّنْ وَّرَآئِهٖ جَهَنَّمُ وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ

انہوں (اللہ کے رسولوں) نے خدا سے کامیابی کی دعا مانگی (اور اُن کی دعا قبول ہوئی) اور ہر جبار عنید نا اُمید ہوا اور نقصان میں رہا، دوزخ اُن کے پیچھے ہے اور انہیں غلیظ پانی پلایا جائے گا۔

''جبار'' کے مختلف معانی ہیں ان میں ایک معنی غلبہ، بالا دستی اور تسلط ہے، لیکن کبھی یہ امر رحمانی پہلو سے ہے مثلا خدا کا عالم ہستی اور ہر شئے پر تسلط اور اس کی بالا دستی، اور کبھی شیطانی پہلو سے ہے، مثلا ظالموں، سرکشوں اور جباروں کا تسلط، غلبہ اور بالا دستی، ''لسان العرب''[2] کے بقول عنید وہ شخص ہے جو سیدھے راستے سے منحرف ہوجائے اور جانتے ہوئے حق کا انکار کرے، یہ تمام چیزیں تکبر، غرور اور اپنے آپ کو بڑا سمجھنے کے آثار ہیں، اگر تھوڑا سا بھی غور کیا جائے تو سمجھ آتی ہے کہ یہ اخلاقی پستی، معرفت اور شناخت کی راہ میں ایک اہم حجاب ہے اور انسان کی گمراہی، حق کشی، دوسروں کے حقوق کی پائمالی اور دوسرے مختلف گناہوں کے عوامل میں سے ایک عامل ہے۔[3]

۸۔ ظلم اور بیداد:

قرآن مجید کی بہت سی آیتوں میں ظالموں اور ستم گروں کو جہنم کی آتش سوزاں کی دھمکی دی گئی ہے اور جو تعبیریں ان کے بارے میں وارد ہوئی ہیں کسی اور کے بارے میں کم دکھائی دیتی ہیں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام ظلم وستم کے ترک کرنے کو کتنی اہمیت دیتا ہے، سورہ کہف کی آیت ۲۹ میں سخت تہدید کے ساتھ فرماتا ہے:

اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا، اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا، وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِى الْوُجُوْهَ، بِئْسَ الشَّرَابُ، وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا

---

[1] اس سے ملتا جلتا مفہوم سورہ مومن کی آیت ۶۰، ۷۲، ۷۶۔ اعراف آیت ۴۰، ۴۱، نبا آیت ۲۱، ۲۲، نازعات کی ۳۷ اور سورہ ص کی آیت ۵۵، ۵۶ میں بھی آیا ہے۔

[2] ابن منظور کی عربی لغات پر مبنی گراں قدر کتاب جو ۱۸ جلدوں میں چھپ چکی ہے۔

[3] اس سے ملتی جلتی تعبیر مدثر کی آیت ۱۶ اور ق کی آیت ۲۴ میں آئی ہے۔

۳ الکہف:۲۹

ہم نے ستمگروں کے لئے آگ تیار کر رکھی ہے جو ہر طرف سے اُن پر محیط ہے، جب وہ پیاسے ہوں گے اور پانی طلب کریں گے تو اُن کے لئے سرخ دھات کی طرح گرم پانی لایا جائے گا جو اُن کے چہروں کو جھلسا دے گا، کتنا برا مشروب اور کتنا برا ٹھکانا ہے۔

ایک اور سخت عبارت میں سورہ جن کی آیت ۱۵ میں فرماتا ہے:

"واما القاسطون فکانوا لجهنم حطبا"

ظالم لوگ جہنم کی آگ کا ایندھن ہیں۔

اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ جہنم کی آگ اُن کے اندر سے بھڑکے گی اور وہ جس طرح اس دنیا میں مظلوموں کے لئے آتش سوزاں کی حیثیت رکھتے تھے وہ کہ جو "تجسم اعمال کا عالم ہے وہاں پر ان کا وجود سراپا آگ ہوگا، ظالم اور ستم گر قوموں کے لئے اس سے زیادہ مناسب اور واضح تعبیر استعمال نہیں ہوسکتی۔[۱]

۹۔ظالموں کا سہارا لینا

نہ صرف ظلم اور ستم ظالموں کو خدا کے قہر وغضب کے مرکز جہنم بھیجنے کا باعث بنے گا بلکہ قرآن مجید کے بقول جو لوگ ظالموں کا سہارا لیں گے یا (ان کی نصرت اور معاونت کریں گے) وہ بھی اس آیت کا مصداق ہوں گے، اس لئے فرمایا گیا ہے:

"ولا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار وما لکم من دون الله من اولیآء ثم لا تنصرون، ظالموں کا سہارا نہ لینا ورنہ آگ تمہیں گھیر لے گی اور خدا کے علاوہ تمہارا کوئی ولی اور سرپرست نہیں ہو گا (اور کوئی بھی تمہاری مدد کو نہیں پہنچے گا)۔(سود ۱۱۳)

ارباب لغت کے مطابق "ترکنوا" "رکون" کے مادے سے ہے اور اس کا معنی کسی شے پر اعتماد، میلان اور اس کی خواہش ہے جس کا لازمہ قوت اور قدرت ہے کیونکہ انسان ایسی چیز پر اعتماد کرتا ہے جو طاقت ور ہو، لہٰذا کلمہ رکن کا اطلاق ایسے ستون یا دیوار پر ہوتا ہے جو کسی عمارت یا اور چیز کو کھڑا ہونے میں مدد دے۔[۲]

---

[۱] اس سے مشابہ تعبیر سبا آیت ۴۲، زخرف کی آیت ۶۵، آل عمران کی آیت ۱۵۱، مائدہ کی آیت ۱۲۹، ابراہیم کی آیت ۲۲، مریم کی آیت ۷۲، اعراف کی آیت ۲۹ اور شوریٰ کی آیت ۴۵ میں آئی ہے۔

[۲] مصباح اللغه۔ صحاح اللغه والتحقیق فی کلمات القرآن الکریم۔

اس بات کے پیش نظر مندرجہ بالا آیت ظالموں کے لحاظ سے بھی مطلق ہے اور ''رکون'' کی تعبیر کے لحاظ سے بھی اور کسی بھی ظالم سے کسی بھی قسم کی وابستگی اور اعتماد اس کے مفہوم میں شامل نہیں ہے۔

آیت کہتی ہے کہ بالآخر ان سب کا انجام عذاب الٰہی میں مبتلا ہونا ہے بلکہ دنیا میں بھی ناکامی اور بدبختی کے علاوہ کوئی ثمر انہیں نہیں ملے گا کیونکہ جب ظالم طاقت ور ہو جائیں گے تو وہ اُن پر بھی رحم نہیں کریں گے، بہرحال جب ظالموں کا سہارا لینا اس طرح باعث بدبختی ہو جائے تو مسلمان کی تقویت اور مدد بطریق اولیٰ انسان کو جہنم کی طرف کھینچ لے جائے گی، اس دلیل کی بناء پر قرآن نے صراحت سے کسی بھی طرح کے گناہ اور ظلم سے تعاون اور مدد کرنے سے منع کر دیا ہے اور فرمایا ہے:

وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (سورہ مائدہ: آیة ۲)

اسلامی روایت میں بھی ان لوگوں کے لئے جو کسی بھی طرح سے ظالموں کی مدد کریں اور حتی کہ ایک ظالمانہ حکم کے لکھنے کے لئے قلم یا دوات تک بھی مہیا کریں سخت ترین عذاب اور سزاؤں کا ذکر ہوا ہے جس کی تفصیل انشاءاللہ مناسب موقع پر بیان ہوگی۔

۱۰۔ آخرت کا بھول جانا

سورہ جاثیہ کی آیت ۳۴ میں اس بارے میں یوں بیان ہوتا ہے:

وقیل الیوم ننسکم کما نسیتم لقآء یومکم ھذا وما ولکم النار وما لکم من نصرین۔

(خدا کی طرف سے) اُن سے کہا جائے گا آج ہم تمہیں بھول جاتے ہیں جس طرح تم آج کی ملاقات کو بھول بیٹھے تھے، تمہارا ٹھکانا آگ ہے اور تمہارا کوئی مددگار نہیں۔

قیامت کی الٰہی عدالت کو بھول جانا برائیوں کی تمام اقسام کا سرچشمہ اور گناہوں اور ظلم وفساد کے دلدل میں پھنس جانے کا سبب ہے، یہی اعمال باعث بنتے ہیں کہ خدا بھی ان سے بھولنے والوں کی طرح سلوک کرے۔

مسلماً ہر چیز میں خدا کا حضور اور تمام اشیاء پر ہر حال میں اس کا علمی احاطہ اس طرح سے ہے کہ اس میں فراموشی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، لیکن ان بھول جانے والے انسانوں کے ساتھ وہ بھی بھولنے والا سلوک ہی کرتا ہے یعنی اپنا لطف، رحمت اور عنایت اُن سے بالکل منقطع کر دیتا ہے اور اس صورت میں نجات کا ہر راستہ ان پر بند ہو جاتا ہے اور ان کے لئے دوزخ (خدا کے غضب کے مرکز) میں گرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔[1]

---

[1] اسی طرح کا مفہوم سورہ ص کی آیت ۲۶ اور الم سجدہ کی آیت ۱۴ میں مذکور ہے۔

۱۱۔ دُنیا پرستی

تمام گناہوں کا اصل سرچشمہ دنیا کی محبت ہے اور ان اہم عوامل میں سے ہے جو بہت سے انسانوں کو جہنم کی طرف لے جاتا ہے جیسا کہ سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۱۸ میں بیان ہوتا ہے:

من كان يريد العاجلة عجلنا له فيها ما نشآء لمن نريد ثم جعلنا له جهنم يصلها مذموما مدحورا۔

جو شخص صرف (مادی دنیا کی) زود گذر زندگی کا خواہاں ہو، جتنا چاہیں گے اور جسے چاہیں گے اس میں سے دے دیں گے، پھر اس کے لئے جہنم قرار دیں گے وہ ایسی حالت میں آگ میں جلے گا کہ راندہ درگاہ خدا ہوگا۔

یعنی ایسا ہر گز نہیں ہے کہ دنیا پرست لوگ اپنی تمام خواہشات اور مقاصد تک پہنچ سکیں، بلکہ ممکن ہے ہزاروں کوششوں، طرح طرح کے گناہوں اور جرائم کے ارتکاب کے بعد بھی اپنے بعض مقاصد تک ہی پہنچ سکیں، لیکن خدا کے قہر وغضب کا مرکز دوزخ ان کے انتظار میں ہے، لہذا ان کے جسموں کو بھی جلا یا جائے گا اور مذموم ومدحور ہونے اور راندہ درگاہ خدا ہونے کی وجہ سے ان کی روح کو بھی جلا ڈالے گا۔[1]

۱۲۔ زراندوزی

اگر چہ زراندوزی دنیا پرستی کے مظاہر میں سے ایک ہے لیکن قرآن نے خصوصی طور پر اس موضوع کا آتش جہنم میں مبتلا ہونے کے اسباب میں سے ایک سبب کی حیثیت سے ذکر کیا ہے اور یوں فرمایا ہے:

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝۳۴ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ۭ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۝۳۵

اور وہ لوگ جو سونا اور چاندی جمع کرتے رہتے ہیں اور اُسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے پس آپ انہیں درد ناک عذاب کی بشارت دیں، جس دن (یہ سونا، چاندی اور سکے) جہنم کی آگ میں تپائے جائیں گے پھر اس سے

[1] اسی طرح کا مفہوم سورہ نازعات کی آیت ۳۷ میں بھی استعمال ہوا ہے کہ جو شخص دنیا کو آخرت پر ترجیح دے اس کی جگہ دوزخ ہے۔

اُن کی پیشانیاں، ان کے پہلو اور ان کی پیٹھیں داغی جائیں گی اور (ان سے کہا جائے گا) یہی ہے جو تم اپنے لئے جمع کرتے تھے، پس تم مزہ چکھو اس کا جو تم جمع کیا کرتے تھے۔ (توبہ۔ ۳۴،۳۵)[۱]

اس آیت میں بہت سے نکات اور ابحاث ہیں جو اپنی جگہ پر بیان ہوں گے، لیکن یہاں پر دو نکتوں کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے، پہلا یہ کہ کس قدر مال جمع کرنا کنز کہلاتا ہے؟ یہ ایسا موضوع ہے جو مفسرین کے مابین بہت زیر بحث رہا ہے بہت سی شیعہ اور سنی روایات میں جو کچھ ملتا ہے اور بہت سے مفسرین نے جسے قبول کیا ہے وہ یہ ہے کہ ہر وہ مال کہ جس کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے وہ کنز محسوب نہیں ہوتا۔

ای مال ادیت زکاته فلیس بکنز [۲]

البتہ ممکن ہے ہنگامی اور غیر معمولی مواقع پر جب اسلامی معاشرے کی مصلحتوں کی حفاظت کا تقاضا ہو تو اسلامی حکومت کی جانب سے مال جمع کرنے پر پابندیاں اور حدود عاید کر دی جائیں، (جیسا کہ بعض روایات میں علی علیہ السلام سے منقول ہے) بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ممکن ہے کسی خاص موقع پر اعلان کیا جائے کہ لوگ اپنا تمام ذخیرہ شدہ مال اسلامی معاشرے کے وجود کی حفاظت کی خاطر خرچ کریں، (جیسا کہ بعض روایات میں قیام حضرت مہدیؑ کے بارے میں آیا ہے) لیکن ان میں سے کوئی بھی کلی قانون نہیں ہے، کنز کا اصلی قانون وہی ہے جو اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔

دوسرا یہ کہ کیوں قرآن کہتا ہے کہ ان کی پیشانی اور پہلو داغے جائیں گے، ممکن ہے یہ اُس طرز عمل کی وجہ سے ہو جو انہوں نے محروم اور ستم دیدہ لوگوں سے روا رکھا تھا، پہلے اُن کے چہروں اور پیشانیوں پر بل پڑ جاتے تھے، پھر وہ بے اعتنائی برتتے ہوئے ان سے گریز کرتے تھے، ان سے منہ موڑ لیتے تھے، لہٰذا اسی ترتیب سے ان کی پیشانی، پہلو اور اُن کی پیٹھیں انہی سکوں سے داغی جائیں گی جن سے انہوں نے محرومیوں کے دل جلائے تھے۔

۱۳۔ جہاد سے فرار

ہم جانتے ہیں کہ اسلامی نکتہ نگاہ سے عظیم گناہوں میں سے ایک گناہ یہی ہے یہ ایک ایسا گناہ ہے جو مسلمانوں کی شکست، ذلت، خواری اور بدبختی کا سرچشمہ ہے اور اس کی سزا بھی سخت ترین سزاؤں میں سے ایک ہے، قرآن کہتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ ﴿۱۵﴾
وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَىِٕذٍ دُبُرَهٗۤ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ

---

[۱] اسی طرح کا مفہوم سورہ ہمزہ کی آیت ۲ سے ۶ تک، سورہ حاقہ کی آیت ۲۸ سے ۳۱ تک اور سورہ تبت کی آیت ۲ اور ۳ میں بیان ہوا ہے۔
[۲] زیادہ تشریح کے لئے تفسیر نمونہ کی جلد نمبر ۷ صفحہ ۳۹۴ (فارسی) کے بعد والے حصے کی طرف رجوع فرمائیے۔

بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۶﴾

اے ایمان لانے والو! جب میدان جنگ میں کافروں کی عظیم جماعت کا سامنا کرو تو ان کی طرف پیٹھ نہ کرو۔ جو بھی اس وقت ان کی طرف پیٹھ کرے گا سوائے اس کے کہ اس کے میدان سے باہر نکلنے کا مقصد دوبارہ حملے کی تیاری یا (مجاہدین کی) کسی جماعت سے جاملنا ہو، الٰہی غضب میں مبتلا ہوگا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا اور وہ کتنا برا ٹھکانا ہے! (انفال۔۱۵،۱۶)

ارباب لغت [۱] کے بقول ''زحف'' کا مطلب زمین پر پاؤں کھینچتے ہوئے حرکت کرنا ہے جیسا کہ بچے اپنے چلنے کے آغاز میں حرکت کرتے ہیں، یا اونٹ انتہائی تھکن کے عالم میں جس طرح حرکت کرتا ہے، پھر یہ لفظ ایک بڑی جماعت کی حرکت کے معنی میں استعمال ہوا کیونکہ لوگوں کی کثرت کی وجہ سے ایسا لگتا ہے کہ گویا وہ زمین پر گھسٹتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہوں۔

بہر حال یہ جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دشمنوں کی تعداد خواہ کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو، باعث نہیں بن سکتی کہ مسلمان اپنے لشکر کے کمانڈر کے حکم کے بغیر پسپائی اختیار کریں یا دشمن کا مقابلہ کرنے کے بجائے فرار کریں۔

واضح ہے کہ یہ اسلام کا ایک کلی حکم ہے اس لئے بعض مفسرین کا اس حکم کو جنگ بدر سے مختص کرنا بالکل بغیر دلیل کے ہے جیسا کہ تفسیر المیزان میں بھی اس کی طرف اشارہ ہوا ہے [۲]، خصوصاً جب کہ یہ آیت جنگ بدر کے بعد نازل ہوئی ہے۔ [۳] لہٰذا جہاد سے فرار جہنم میں سقوط کے اسباب میں سے ہے۔

۱۴۔ بے گناہوں کا خون بہانا

اسلام میں انسانی خون کا احترام اس حد تک ہے کہ ایک انسان کے خون کو تمام انسانوں کے قتل کے برابر گردانا گیا ہے۔

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَاۤ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ (مائدہ:۳۲) [۴]

نیز مومن کا خون بہانا ابدی عذاب کا سبب، غضب الٰہی اور عذاب عظیم کا موجب گردانا گیا ہے، لہٰذا فرمایا گیا ہے:

---

[۱] مقاییس اللغه۔ مفردات راغب اور التحقیق فی کلمات القرآن کریم۔

[۲] تفسیر المیزان جلد ۹، ص ۳۷۔

[۳] بعض پہلوؤں سے اس آیت سے مشابہ مفہوم سورہ توبہ کی آیت ۸۱ میں مذکور ہے۔

[۴] جس شخص نے کسی نفس کو بغیر کسی نفس کے یا فساد فی الارض کے ارتکاب کے قتل کر دیا تو گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا۔

وَمَنۡ يَّقۡتُلۡ مُؤۡمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيۡهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيۡمًا۝۹۳ [۴:۹۳]

جو بھی کسی مومن کو عمداً قتل کردے اس کی سزا جہنم ہے، وہ ہمیشہ اس میں رہے گا اور خدا اس پر غضب کرے گا اور اس کو اپنی رحمت سے دور کردے گا، اور اس نے ایک بڑا عذاب اس کے لئے تیار کر رکھا ہے۔ (نساء:۹۳)

اس طرح سے مومن کے قاتل کو چار بڑی اخروی سزاؤں کی دھمکی دی گئی ہے:

۱۔ جہنم میں ہمیشہ رہنا۔

۲۔ غضب الٰہی۔

۳۔ خدا کی لعنت۔

۴۔ عظیم عذاب۔

اس سے اسلام کے نزدیک مومن کے خون کے احترام کا انتہا کا اظہار ہوتا ہے کیونکہ قرآن مجید میں کسی بھی مقام پر ایسی سزا کا ذکر نہیں ہوا ہے۔[1]

۱۵۔ ترک نماز

نماز کے عظیم فریضے کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ اس کی اہمیت کے بارے میں معروف اسلامی کتب میں بے شمار آیتیں اور احادیث وارد ہوئی ہیں، قرآن مجید نے صراحت کے ساتھ اس فریضے کے ترک کرنے کو جہنم میں جانے کے اسباب میں سے قرار دیا ہے، جیسا کہ فرماتا ہے: بہشتیوں کا ایک گروہ (اصحاب الیمین) جب اپنے مقام سے جہنمیوں سے رابطہ قائم کرے گا تو ان سے پوچھے گا "ما سلککم فی سقر" "کس چیز نے تمہیں جہنم بھیجا؟ وہ جواب دیں گے: ہم نمازیوں میں سے نہیں تھے اور مسکینوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے اور ہمیشہ اہل باطل کے ساتھ ہمنشین ہوتے تھے اور دائماً قیامت کا انکار کرتے تھے۔

قَالُوۡا لَمۡ نَكُ مِنَ الۡمُصَلِّيۡنَۙ۝۴۳ [۷۴:۴۳] وَلَمۡ نَكُ نُطۡعِمُ الۡمِسۡكِيۡنَۙ۝۴۴ [۷۴:۴۴]
وَكُنَّا نَخُوۡضُ مَعَ الۡخَآٮِٕضِيۡنَۙ۝۴۵ [۷۴:۴۵] وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوۡمِ الدِّيۡنِۙ۝۴۶ [۷۴:۴۶]

(سورہ مدثر)

اگرچہ اس آیت میں ترک نماز کے علاوہ تین دوسرے گناہوں کی طرف بھی اشارہ ہوا ہے لیکن ترک نماز کو پہلے گناہ کے عنوان سے

---

[1] یہی مفہوم ایک دوسری سورت میں آل عمران کی آیت ۲۱ میں بیان ہوا ہے۔

بیان کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس الٰہی فریضے کا ترک کر دینا کتنا خطرناک ہے، اس کے علاوہ ان چار امور میں سے ہر ایک مستقلاً دوزخ میں جانے کے اسباب میں سے قرار پا سکتا ہے، (غریبوں کو کھانا نہ کھلانا ظاہراً واجب حقوق کو ادا نہ کرنے کی طرف اشارہ ہے)۔

اسلامی نکتہ نگاہ سے نماز کا مسئلہ اتنا اہم ہے کہ بعض مشہور روایات کے مطابق نامہ اعمال میں سے پہلی چیز جو دیکھی جائے گی وہ نماز ہو گی، اگر نامہ اعمال میں (صحیح طور پر) نماز موجود ہو تو دوسرے اعمال کی طرف نیک نگاہ سے دیکھا جائے گا ورنہ باقی اعمال کی طرف نہیں دیکھا جائے گا، اور ایسے فرد کو دوزخ کی طرف روانہ کیا جائے گا، یہ شاید اس لئے ہو کہ نماز ایمان کا سرچشمہ اور اس کی بقاء کی ضامن ہے اور اس کے ترک سے ایمان کی جڑیں تزلزل کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اور ہم جانتے ہیں کہ اعمال کی قبولیت کی شرائط میں سے ایک شرط ''ایمان'' ہے اور ایمان کے بغیر کوئی چیز قابل قبول نہیں ہوتی۔

۱۶۔ زکوٰۃ نہ دینا

زکوٰۃ اسلام کے اہم ارکان میں سے ایک ہے اور اس کا ترک کرنا گناہان کبیرہ میں محسوب ہوتا ہے اور چونکہ قرآن مجید میں اس کو شرک اور تکذیب معاد کے ساتھ بیان کیا گیا ہے لہٰذا یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ عمل دوزخ میں جانے کا ایک سبب ہے فرمایا گیا ہے:

وویل للمشرکین الذین لا یوتون الزکوٰۃ وھم بالاخرۃ ھم کافرون

افسوس ہے مشرکوں پر، وہی لوگ جو زکوٰۃ ادا نہیں کرتے اور آخرت کا انکار کرتے ہیں۔ (حٰم سجدہ: ۶، ۷)

اس آیت سے مفسرین کے درمیان بحث کا ایک سلسلہ چل نکلا ہے اور اس کی تفسیر میں مختلف احتمالات کا ذکر کیا گیا ہے، بات یہ ہے کہ زکات فروع دین میں سے ایک ہے پھر کیسے اس کا ترک کر دینا کفر و شرک کی دلیل بن سکتا ہے؟ بعض مفسرین نے آیت کے ظہور کو معیار قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ زکوٰۃ کا ترک کرنا ہی کفر کی علامت ہے اگر چہ کوئی اس کے حکم ہونے کا انکار نہ کرتا ہو، بعض نے حکم کا انکار کرتے ہوئے زکوٰۃ نہ دینے کو کفر کی دلیل قرار دیا ہے کیونکہ زکوٰۃ کا وجوب ضروریات اسلام میں سے ہے اور اس کا منکر کافر ہے، اس آیت کی تفسیر کی زیادہ وضاحت اس نکتے سے ہوتی ہے کہ زکوٰۃ کو اسلامی احکامات میں ایک خاص مقام حاصل ہے کیونکہ اس کی ادائیگی اسلامی حکومت کو قبول کر لینے کی علامت اور اس کا ترک کر دینا حکومت اسلامی کے مقابلے میں قیام اطغیان اور سرکشی کے مترادف ہے اور ہم جانتے ہیں کہ حکومت اسلامی کے مقابلہ میں قیام کفر کا موجب ہے۔ (زیادہ وضاحت کے لئے تفسیر نمونہ کی جلد ۲۰ (فارسی) صفحہ ۲۱۴ سے ۲۲۰ تک کا مطالعہ فرمائیے۔

آیت کنز (توبہ۔ ۳۵) بھی جس کی طرف پہلے اشارہ ہو چکا ہے، اس بات کی دلیل بن سکتی ہے کہ زکوٰۃ کا ترک کر دینا دوزخ میں چلے جانے کے اسباب میں سے ہے۔

۱۷۔ یتیم کا مال کھانا:

کسی بھی شخص کا مال شرعی جواز کے بغیر کھانا حرام ہے، لیکن یتیموں کے معاملے اس حکم کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے کیونکہ ایک طرف

ان کی شدید ضرورت اور دوسری طرف کسی سرپرست کا نہ ہونا اور پھر اپنا دفاع کرنے کی طاقت نہ رکھنا باعث بنتا ہے کہ یہ مسئلہ بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہو جائے، اس لئے قرآن نے یتیموں کا مال ناحق کھانے والوں کو صراحت کے ساتھ دوزخ کی آگ کی دھمکی دی ہے اور فرمایا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ۭ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ۝ [۴:۱۰]

جو لوگ یتیموں کا مال ظلم سے کھاتے ہیں وہ صرف جہنم کی آگ ہی کھاتے ہیں اور بہت جلد (جہنم کی) سوزاں آگ میں جلیں گے۔ (نساء:۱۰)

اسلامی روایات میں پیغمبر اسلامؐ سے مروی ہے:

شر الما کل اکل مال الیتیم ظلما۔

بدترین خوراک یتیم کا مال ظلم سے کھانا ہے۔[1]

کیا قرآن کا یہ کہنا کہ یتیم کا مال کھانے والے لوگ جہنم کی آگ کھاتے ہیں مجازی ہے جیسا کہ کچھ مفسرین نے کہا ہے یا اس کو حقیقی معنی پر محمول کیا جا سکتا ہے؟ کیونکہ یہ عبارت ہمیں بتاتی ہے کہ ہمارے اعمال کے ظاہری چہرے کے علاوہ ایک باطنی چہرہ بھی ہے جو اس دنیا میں ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے اور قیامت کے دن ظاہر ہوگا اور تجسم اعمال کے مسئلے کی بنیاد بھی یہی چیز ہے۔ بنابریں آیت کو حقیقی مفہوم پر محمول کرنا بعید نہیں ہے۔ (توجہ کیجئے گا)

۱۸۔ سُود خوری

یہ کام بھی ان امور میں سے ہے جن کے مرتکبوں کو قرآن نے صراحتہً جہنم کے عذاب کی دھمکی دی ہے اور فرمایا ہے:

فَمَنْ جَاۗءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ۭ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ [۲:۲۷۵]

جب کبھی کسی (سود خور) تک خدا کی طرف سے موعظہ پہنچے اور وہ روگردانی کرے، جو فائدے وہ (ربا کی حرمت کے حکم سے) پہلے حاصل کر چکا ہے وہ اسی کا ہے اور اس کا معاملہ خدا کے سپرد ہوگا لیکن جو لوگ پلٹ جائیں (اور اس گناہ کے مرتکب ہوں) اہل آتش ہوں گے اور وہ ہمیشہ وہیں رہیں گے۔ (بقرہ:۲۷۵)

---

[1] بحار الانوار جلد ۷۶ صفحہ ۲۶۷ حدیث ا۔

اسی سے ملتا جلتا مفہوم سورہ آل عمران کی آیت ۱۳۰ اور ۱۳۱ میں بھی آیا ہے جس میں سود خوروں کو آتش جہنم کی تہدید کی گئی ہے، اہم بات یہ ہے کہ آیت کہتی ہے یہ وہی آگ اور عذاب ہے جو کافروں کے انتظار میں ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۠ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۱۳۰ [۳:۱۳۰] وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۝۱۳۱ [۳:۱۳۱]

جب سود خوروں نے خدا سے جنگ کا اعلان کیا یا خدا نے ان سے جنگ کا اعلان کیا تو وہ کافروں کے درجے تک جا گرے، اس عظیم گناہ کے بارے میں یہ بہت ہلا کر رکھ دینے والی عبارت ہے۔

بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سود خوری تمام آسمانی کتب اور تمام انبیاء الٰہی کی شریعتوں میں حرام تھا جیسا کہ فقہ الرضا میں منقول ہے: وهو محرم علی لسان کل نبی وفی کل کتاب۔ [۱]

۱۹۔ نعمات الٰہی کا کفران

نعمات الٰہی کا کفران بھی ان گناہان کبیرہ میں سے ہے جن کے بارے میں قرآن نے دوزخ کی وعید کرتے ہوئے کہا ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ۝ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۭ وَبِئْسَ الْقَرَارُ ۝۲۹ [۱۴:۲۹]

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھوں نے الٰہی نعمت کو کفران میں تبدیل کیا اور جو اپنی قوم کو دار البوار کی طرف کھینچ لے گئے جو جہنم ہے وہ لوگ اس کی آگ میں جلیں گے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔ (سورہ ابراہیم: ۲۸، ۲۹)

اس آیت میں نعمت خدا سے مراد کیا ہے؟ کچھ بزرگ مفسرین نے اسلامی منابع میں موجود بعض روایات کی پیروی کرتے ہوئے اس نعمت سے پیغمبر اکرمؐ کی ذات گرامی مراد لی ہے، امام جعفر صادق علیہ السلام سے بھی ایک روایت منقول ہے:

نحن والله نعمت الله التی انعم بها علی عباده وبنا یفوز من فاز۔

خدا کی قسم ہم ہی خدا کی نعمت ہیں جو خدا نے اپنے بندوں کو عطا کی ہے اور ہمارے ہی وسیلے سے کامیابی لوگوں کے قدم چومتی ہے۔ [۲]

---

[۱] فقہ الرضا علیہ السلام ج ۱۳ ص ۳۳۱ حدیث ۷۔ مستدرک الوسائل جدید کے مطابق اسے ہر نبی نے اور ہر کتاب نے حرام قرار دیا۔

[۲] تفسیر علی بن ابراہیم جلد ۱ ص ۳۷۱۔

لفظ"نحن"(ہم) رسول اکرمؐ کے تمام خاندان کی طرف اشارہ ہے اور جب معصومین کی طرف اشارہ ہوگا تو بطریق اولیٰ پیغمبر اسلامؐ بھی اس میں شامل ہوں گے اور روایت ثقلین کی طرف توجہ دینے سے اس نعمت کی اہمیت زیادہ واضح ہوجاتی ہے۔

بہر حال پیغمبر اسلامؐ اور آئمہ معصومینؑ کا وجود اگرچہ عظیم ترین الٰہی نعمتوں میں سے ہے لیکن آیت کے مفہوم کو محدود نہیں کیا جا سکتا اور اس کا ظہور یہی ہے کہ خدا کی تمام بزرگ نعمتیں اس میں شامل ہوتی ہیں۔

مفسرین نے اس نعمت کا کفران کرنے والوں سے کبھی بنی امیہ اور کبھی بنی مغیرہ اور بنی امیہ یا عصر رسالت کے تمام کفار و مراد لیا ہے، یہ مصداق کے ذکر کے اعتبار سے تو صحیح ہے لیکن مفہوم آیت ان لوگوں میں منحصر نہیں ہے، بہرصورت خدا کی عظیم نعمتوں پر شکر گزار ہونا چاہیے اور ان سے بہتر طور پر استفادہ کرنا چاہیے اور اگر یہ شکر کفران میں تبدیل ہوجائے تو اس کی سزا دوزخ ہے۔ [1]

۲۰۔کم فروشی

قرآن نے اس گناہ عظیم کے عذاب پر بھی خصوصی تاکید کی ہے اور اسے بہت زیادہ اہمیت دی ہے، قرآن کی ایک سورۃ کا نام ہی مطففین (کم فروش لوگ) ہے، اس سورۃ کے آغاز میں یوں بیان ہوتا ہے:

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۝ اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۝ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ كَلَّآ اِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ ۝

افسوس ہے کم فروشوں پر۔۔۔۔۔کیا وہ لوگ گمان نہیں رکھتے کہ ایک عظیم دن اٹھائے جائیں گے۔۔۔۔۔۔ایسا نہیں ہے جیسا وہ سوچتے ہیں، مسلماً فاجروں کے نامہ اعمال سجین میں ہیں۔ (مطففین۔۱،۴،۵،۷)

بعض مفسرین نے ویل سے مراد قیامت کے عذاب کی شدت لی ہے اور بعض نے مطابق ویل جہنم کی ایک خاص وادی کا نام ہے۔ [2]

ایک حدیث میں امام جعفر الصادق علیہ السلام نے فرمایا: خدا نے قرآن میں کلمہ"ویل" کو کسی کے بارے میں استعمال نہیں کیا مگر یہ کہ اُسے کافر قرار دیا ہو، لہٰذا فرمایا ہے:

فویل للذین کفروا ....

---

[1] تفسیر المیزان میں آیا ہے کہ اس آیت میں ایک لفظ تقدیر میں ہے اور وہ یوں ہے:"بدلو اشکر نعمۃ اللہ کفرا"

[2] تفسیر قرطبی جلد ۱۰ صفحہ ۷۰۴۱۔

ویل کافروں کے لئے ہے۔[1]

ایک اور حدیث میں پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا "ویل" جہنم کی ایک خاص وادی ہے جس میں کفار جا گریں گے۔[2]

ان تعبیرات سے استفادہ ہوتا ہے کہ کم فروشی کفر کے درجے میں ہے یا کفر کی ایک قسم شمار ہوتی ہے۔

البتہ لغت میں "ویل" ایک وسیع مفہوم میں استعمال ہوا ہے اور اس کا مفہوم شر، غم و اندوہ، ہلاکت یا دردناک عذاب کے مساوی ہے اور جو کچھ اوپر کہا گیا ہے وہ اس مفہوم کا ایک مصداق ہوسکتا ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اگرچہ آیت کے الفاظ مخصوصاً کم فروشوں اور ان اموال پر دلالت کرتے ہیں جو وزن اور پیمائش کے ذریعے قابل خرید و فروخت ہیں لیکن بعید نہیں کہ آیت کا مفہوم زیادہ وسعت رکھتا ہو اور وہ تمام افراد جو اپنی الٰہی، اجتماعی اور اخلاقی ذمہ داریاں انجام دینے میں کوتاہی کرتے ہیں آیت کے مصادیق میں شامل ہوں، چونکہ جو شخص بھی اپنے امور میں کوتاہی کرے اور اپنی ذمہ داریوں کے انجام میں تساہل برتے، حقیقت میں کم فروش ہی ہے لہٰذا معروف صحابی عبداللہ ابن مسعودؓ سے منقول ہے کہ جو شخص اپنی نماز میں کوتاہی کرے اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے گا جس کا وعدہ خدا نے کم فروشوں "مطففین" کے بارے میں کیا ہے۔[3]

۲۱۔ عیب جوئی اور غیبت

یہ دونوں بھی گناہان کبیرہ میں سے ہیں کیونکہ یہ باایمان افراد کی آبرو اور عزت کی بربادی کا سبب ہیں یہ وہی سرمایہ ہے جو انسانی خون کے برابر اور کبھی اس سے بھی زیادہ قیمتی ہے، لہٰذا قرآن نے اس کے بارے میں دوزخ کے عذاب کی وعید کی ہے اور فرمایا ہے:

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ ۙ﴿۱﴾ [۱۰۴:۱] الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۙ﴿۲﴾ [۱۰۴:۲] يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ ۚ﴿۳﴾ [۱۰۴:۳] كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۡ﴿۴﴾ [۱۰۴:۴]

افسوس ہے ہر غیبت کرنے والے عیب پر جو اُس شخص پر جو اموال کو جمع کرتا ہے، (حلال اور حرام کا حساب کئے بغیر) گنتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اس کو جاوداں رکھے گا، ایسا نہیں ہے، بہت جلد وہ ایک جلا ڈالنے والی آگ میں پھینکا جائے گا۔

(ہمزہ: ۱ تا ۴)

---

[1] اصول کافی ج ۲ ص ۳۲ حدیث ۱۔

[2] روح المعانی جلد ۳۰، ص ۶۸۔

[3] تفسیر مجمع البیان جلد ۱۰، ص ۴۵۲۔

مفسرین نے ''ھمزة'' اور ''لمزة'' کی تفسیر میں تفصیلی گفتگو کی ہے، یہ دونوں مبالغے کے صیغے ہیں، جوھمز اور لمز کے مادے سے (رمز کے وزن پر) لئے گئے ہیں، بعض نے دونوں کو ایک ہی معنی میں سمجھا ہے اور ان کی غیبت اور عیب جوئی سے تفسیر کی ہے جب کہ بعض مفسرین نے پہلے کلمہ کی برملا عیب جوئی سے اور دوسرے کلمہ کی چھپا کر اور آنکھ، آبرو اور دوسری مشابہ اشیاء کے اشارے سے عیب جوئی کرنے سے تفسیر کی ہے، بعض نے پہلے کلمہ کو غیبت کے معنی میں اور دوسرے کو سامنے عیب جوئی کرنے کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

بہرحال لگتا ہے کہ اس ایت کے مفہوم میں وہ تمام لوگ شامل ہوں گے جو دوسروں کی عزت و آبرو برباد کرنے کے لئے اُن کا مذاق اڑاتے ہیں اور طعن و تشنیع اور آنکھ اور ابرو کے اشاروں سے پیٹھ پیچھے، سامنے دوسروں کے عیب ڈھونڈتے اور اُن پر چھپے ہوئے عیوب کو آشکار کرنا چاہتے ہیں۔

جس طرح یہ لوگ دوسروں کی حیثیت سے کھیلتے ہیں جہنم کی آگ جو حطمہ (پیسنے والی) ہے، قیامت کے دن ان کے تمام وجود کو پیس ڈالے گی۔

حقیقت میں یہ افراد خدا کی شریر ترین مخلوقات میں سے ہیں، جیسا کہ پیغمبر اسلامؐ نے ایک حدیث میں فرمایا: (کیا) تمہیں تم میں سے شریر ترین افرد کی خبر دوں؟ عرض کیا ''ہاں'' یا رسول اللہؐ، فرمایا:

المشآئون بالنمیمة۔ المفرقون بین الا حیة الباغون للبرئآء المعایب۔

وہ لوگ جو زیادہ چغلی کھاتے ہیں اور دوستوں کے مابین تفرقہ ڈالتے ہیں اور بے گناہ اور پاک افراد کے مابین عیب جوئی کرتے ہیں۔[1]

۲۲۔ اسراف اور فضول خرچی

اسراف اور فضول خرچی بھی اپنے وسیع مفہوم کے لحاظ سے گناہان کبیرہ میں سے شمار ہوتے ہیں اور قرآن نے نہایت اہمیت کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے، اسراف کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

وَاَنَّ الْمُسْرِفِيْنَ هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ۴۳﴿غافر: ۴۳﴾

مسرفین اہل آتش میں سے ہیں۔ (مومن۔۴۳)

اگرچہ یہ بات سورہ مومن میں آل فرعون کے مومن کی زبانی نقل ہوئی ہے لیکن قرآن نے اس کی توثیق کردی ہے اور تبذیر کے بارے

---

[1] اصول کافی جلد ۲ باب النمیمہ حدیث ا تفسیر قرطبی جلد ۱۰ ص ۷۱ و ۷۲۔

میں فرمایا ہے:

اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ كَانُوْۤا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ

تبذیر کرنے والے ہمیشہ سے شیاطین کے بھائی ہیں۔ (بنی اسرائیل:۲۷)

یہ بات واضح ہے کہ شیاطین اوران کے بھائیوں کا انجام خدا کے غضب وقہر یعنی دوزخ کا شکار ہونے کے علاوہ کچھ اور نہیں ہوسکتا، اسراف اور سرف (''ہدف'' کے وزن پر) بعض ارباب لغت کے بقول کسی بھی کام میں حد سے بڑھ جانے کے معنی میں ہے، اگرچہ یہ لفظ اخراجات میں حد سے تجاوز کرنے پر اطلاق ہوتا ہے۔[1]

اسی بناء پر الٰہی حدود سے تجاوز کرنے والے مشرکین اور گناہگاروں کو قرآن کی آیتوں میں مسرف کہا گیا ہے، حتیٰ کہ بے گناہ افراد کا قتل بھی اسراف ہی کی ایک قسم میں شمار ہوا ہے۔

''تبذیر'' ''بزر'' کے مادے سے ہے اور اصل میں بکھیرے جانے کے معنی میں ہے اور عام طور پر ان موارد پر اس کا اطلاق ہوتا ہے، جہاں بغیر ہدف کے اس طرح مال کو بکھیر دیا جائے کہ مال کے تلف اور ضائع ہونے کا باعث بنے، اگر ہم آج کی دنیا کے بارے میں سوچیں جس پر اسراف اور تبذیر اس طرح حاکم ہے کہ نہ صرف غذا اور مادی وسائل زندگی بلکہ ہر چیز میں حد سے تجاوز کیا جاتا ہے، ہم دیکھیں گے کہ یہ اسراف اور تبذیر قبل از اینکہ آخرت کے جہنم کا باعث بنے اسی دنیا میں ایک دہکتا ہوا جہنم فراہم کر رہا ہے جس کی آگ میں ہر چھوٹا بڑا جلتا ہے اور ان کی چیخوں کی کہیں شنوائی نہیں، پھر ہم تصدیق کریں گے کہ اسراف اور تبذیر کی سزا جہنم کی آگ ہی ہونی چاہیے۔

۲۳۔ جرم اور گناہ

قرآن مجید میں جہنمیوں کے اوصاف کے بارے میں جامع اور کلی تعبیریں دیکھنے کو ملتی ہیں جن میں ایک جرم اور گناہ ہے، فرماتا ہے:

وتسوق المجرمین الیٰ جھنم وردا۔

قیامت کے دن ہم مجرموں کو (ان پیاسے اونٹوں کی طرح جو پانی کی طرف لے جائے جاتے ہیں) جہنم کی طرف لے جائیں گے۔ (مریم:۸۶)

''مجرم'' ''جرم'' کے مادے سے اصل میں کاٹنے کے معنی ہے، لہٰذا درخت سے پھل کو جدا کرنے اور درخت کو کاٹنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، چونکہ گناہگار لوگ اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے اپنے آپ کو خدا سے اور نجات وسعادت سے محروم کر دیتے ہیں اس لئے یہ کلمہ ان کے بارے میں استعمال ہوا ہے، کیا آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ہر گناہ ضرور دوزخ میں جانے کا سبب ہوگا؟ یا آیت کچھ خاص مجرموں سے متعلق

---

[1] مفردات راغب کلمہ سرف

ہے؟ آیت کا ظہور اگرچہ اطلاق رکھتا ہے لیکن دوسری آیتوں سے ممکن ہے استفادہ کیا جائے کہ آیت سے مراد وہ جرم ہے جو کفر اور بے ایمانی کے ساتھ ہو، زخرف کی آیت ۷۴ میں یوں بیان ہوتا ہے۔

اِنَّ الْمُجْرِمِیْنَ فِیْ عَذَابِ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ۷۴﴿الزخرف: ۷۴﴾

مجرمین جہنم کے عذاب میں ہمیشہ رہیں گے۔

مسلما کفار ہی جہنم میں ہمیشہ رہیں گے نہ کہ ہر گناہگار۔ مدثر کی آیت ۴۰ تا ۴۲ میں یوں بیان ہوا ہے:

فِیْ جَنّٰتٍ ۛ یَتَسَآءَلُوْنَ ﴿۴۰﴾ [۷۴:۴۰] عَنِ الْمُجْرِمِیْنَ ﴿۴۱﴾ [۷۴:۴۱] مَا سَلَكَكُمْ فِیْ سَقَرَ ﴿۴۲﴾ [۷۴:۴۲]

اہل بہشت مجرموں سے پوچھیں گے کہ کون سی چیز تمہارے جہنمی ہونے کا باعث بنی؟

تب وہ لوگ کچھ گناہوں کا نام لیں گے جن میں قیامت کے دن کی تکذیب بھی ہوگی جو کفر کے مساوی ہے، کفر سے آمیختہ جرم کی بات اور مقامات پر بھی ہوئی ہے، قرآن کی متعدد دوسری آیتوں میں مذکور ہے [1]۔ یہ بھی احتمال ہے کہ اس آیت میں گنہگاروں سے مراد وہ لوگ ہوں جو پوری طرح گناہ میں ایسے غرق ہو چکے ہوں کہ شفاعت کے سزاوار ہوں نہ عفو خداوندی کے قابل، یہ لوگ عام طور پر دوزخ ہی میں جائیں گے۔

۱۲۴ الٰہی حدود سے تجاوز

یہ عنوان بھی ان کلی عناوین میں سے ہے جن کے بارے میں قرآن نے دوزخ کی وعید کی ہے فرماتا ہے:

وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَیَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ یُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِیْهَا ۠ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ ﴿۱۴﴾ [۴:۱۴]

اور وہ شخص خدا اور اس کے نبی کی مخالفت کرے اور حدود الٰہی سے تجاوز کرے اس کو ایسی آگ میں ڈال دیا جائے گا جہاں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لئے رسوا کن عذاب ہے (نساء: ۱۴)

حدود الٰہی سے مراد اللہ کے احکام اور قوانین ہیں، اگرچہ ارباب لغت نے ''حد'' کے لئے تین مختلف معانی نقل کئے ہیں، منع کرنا، کسی

---

[1] اعراف کی آیت ۴۰، ۸۴، ۱۳۳۔ حجر کی آیت ۱۲، ۵۸۔ فرقان کی آیت ۳۱ اور نمل کی آیت ۶۹ وغیرہ جو مختلف اقوام مثلاً قوم لوط، قوم فرعون اور انبیاء کے دشمنوں کے بارے میں ہے جو سب کافر تھے اور مجرم کا کلمہ ان کے بارے میں استعمال ہوا ہے۔

بھی چیز کی انتہا اور شدت۔[1] لیکن ظاہراً تینوں معانی ''منع'' کے مفہوم کی طرف لوٹتے ہیں کیونکہ کسی چیز کی انتہاء دوسری چیزوں کے ساتھ اس کے خلط ملط ہونے سے مانع ہوتا ہے جس طرح کسی مکان، زمین اور ملک کی حدود دوسرے مکان، زمین یا ملک سے ملنے سے مانع ہوتی ہیں چونکہ ''منع'' کے مفہوم میں ایک طرح کی شدت پائی جاتی ہے لہٰذا یہ لفظ شدت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

الٰہی احکامات کو اس لئے الٰہی حدود کہا گیا ہے کہ وہ انسان کے لئے ایک ''ممنوعہ علاقہ'' بنا دیتی ہیں جس میں اس کے داخلے پر پابندی ہوتی ہے، مخصوص شرعی سزاؤں کو بھی اس لئے ''حد'' سے تعبیر کیا گیا ہے، کہ اکثر اوقات یہ سزائیں اس جرم کی تکرار سے مانع ہوتی ہیں، بہرحال ''تلک حدود اللہ'' کی عبارت قرآن میں متعدد مقامات پر بعض الٰہی احکام کے ذکر کے بعد استعمال ہوئی ہے۔

زیر بحث آیت میں ارث کے احکام اور بقرہ کی آیت ۲۲۹، ۲۳۰ اور سورہ طلاق کی آیت ۱ میں طلاق کے کچھ احکام اور سورہ بقرہ آیت ۱۸۷ میں اعتکاف کے حالت میں مباشرت سے ممنوعیت اور روزہ کے بعض احکام اور سورہ بقرہ آیت ۱۸۷ میں اعتکاف کی حالت میں مباشرت سے ممنوعیت اور روزہ کے بعض احکام اور سورہ مجادلہ آیت ۴ میں ظہار کے کفارہ کے بیان کے بعد یہ عبارت آئی ہے، ان تمام آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ''الٰہی حدود'' کا ایک وسیع مفہوم ہے جس میں اس قسم کے تمام احکام شامل ہیں۔

دوسری طرف ہم جانتے ہیں کہ ہر گناہ کا ارتکاب جہنم میں ہمیشہ جلنے کا باعث نہیں بن سکتا، بنا برایں ممکن ہے مندرجہ بالا آیت سے مراد ایسے لوگ ہوں جو طغیان و سرکشی، دشمنی اور آیات الٰہی کے انکار کی بناء پر الٰہی حدود کو پامال کرتے ہیں یا ایسے لوگ جو ان تمام الٰہی حدود کو نظر انداز کرتے ہیں اور اس طرح گناہ میں غرق ہو جاتے ہیں کہ نتیجۃً دنیا سے بے ایمانی کی حالت میں چلے جاتے ہیں، ورنہ یہ ہم جانتے ہیں کہ کچھ گنہگار لوگ خدا کی عفو کے مستحق اور کچھ شفاعت کے لائق قرار پائیں گے اور کچھ دوسرے گنہگار جو گناہ صغیرہ کے مرتکب ہوئے ہوں گے بخش دیئے جائیں گے، اسی طرح کچھ توبہ کرنے والے بھی بخشے جائیں گے۔[2]

وعیدیہ میں سے ایک گروہ نے مندرجہ بالا آیات سے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ گناہ کبیرہ کے مرتکب افراد ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے لیکن ہمارے مذکورہ بیان سے ان کا جواب واضح ہو جاتا ہے۔ زیادہ وضاحت انشاء اللہ اپنے مقام پر کی جائے گی۔

نتیجہ

قرآن مجید کے بقول جہنم میں جانے والوں کی اکثریت ان ۲۴ گروہوں میں سے ہوگی، بعض لوگ محدود اور معین وقت کے لیے جائیں گے اور بعض ہمیشہ اس میں رہیں گے، ان تمام آیات سے یہ اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ اجتماعی اور حقوقی مسائل اور مختلف اخلاقی

---

[1] مقائیس اللغہ و مفردات راغب و التحقیق فی کلمات القرآن الکریم (مادہ حد)۔

[2] علامہ مجلسی مرحوم نے بحار الانوار کی جلد ۸ ص ۳۵۱ میں اہل ایمان کے جہنم میں ہمیشہ نہ رہنے کے بارے میں تفصیلی بحث کی ہے، اگر چاہیں تو باب ۲۷ (باب من یخلد فی النار و من یخرج منھا) کی طرف رجوع فرمائیے۔

انحرافات میں اسلامی نکتہ نظر کیا ہے اور کن امور کو اسلام بہت زیادہ اہمیت دیتا ہے اس طرح کی آیات میں تربیت کا ایک قوی پیغام پایا جاتا ہے، جو تمام انسان کو ان گناہوں کے نتائج سے آگاہ اور بیدار کرتا ہے اور اصل مقصد بھی یہی ہے۔

(۲) جہنم کی ماہیت

اشارہ

مسلماً جہنم الٰہی قہر وغضب کا مرکز ہے اور قرآن کی آیتوں کے ظہور یا صراحت کے مطابق جسمانی اور روحانی عذاب پر مشتمل ہے، جو لوگ اُسے صرف معنوی اور روحی سزاؤں میں منحصر قرار دیتے ہیں انہیں قرآنی آیتوں کے ایک بڑے حصے کو نظر انداز کرنا پڑے گا یا ان آیات کا انکار کرنا پڑے گا یا پھر بغیر کسی دلیل کے مجازی معنی پر محمول کرنا ہوگا۔

اب سوال یہ ہے کہ دوزخ کی ماہیت کیا ہے؟ اس کے عذاب اور سزا کی کیفیت کیا ہوگی؟ یہ جاننے کے لئے بہترین طریقہ یہ ہے کہ قرآن کی مختلف آیتوں میں اس کے لئے جو نام اور اوصاف ذکر ہوئے ہیں اُن سے مدد لیں تا کہ غضب اور قہر الٰہی کے اس مرکز کے اسرار سے پردہ اٹھا سکیں۔

اگر چہ ہم بارہا یہ کہہ چکے ہیں کہ دوسری دنیا کے مسائل کے بارے میں ہماری معلومات جتنی بھی زیادہ ہوں پھر بھی محدود ہی ہیں۔ میں اور ہم دور سے ایک دھندلا سا چہرہ ہی دیکھ پاتے ہیں لیکن اس کی خصوصیات اور جزئیات ہمارے لئے واضح نہیں ہیں، کیونکہ آخرت کلی طور پر اس عالم سے بالاتر ایک دنیا ہے، بالکل ایسے جیسے جنین کے لئے شکم مادر سے باہر کی دنیا ہے۔

بنابرایں اس کے تمام اسرار پر کامل طور پر عبور حاصل کرنا دنیا کے لوگوں کے لئے ناممکن ہے لیکن یہ چیز اجمالی معرفت اور شناخت سے مانع نہیں ہوسکتی، بہر حال دوزخ کی ماہیت جاننے کے لئے ہمیں اس کے بارے میں واردشدہ قرآنی اشارات، نام اور

اوصاف کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ لہٰذا ہم مندرجہ ذیل آیات پر ایک نظر ڈالتے ہیں جو جہنم کے اسماء اور اوصاف کے بعض نمونے بیان کرتی ہیں:

۱۔ وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٤٣﴾ لَهَا سَبْعَةُ أَبْوَابٍ (حجر: ۴۴،۴۳)

۲۔ سَأُصْلِيهِ سَقَرَ ﴿٢٦﴾ وَمَا أَدْرَاكَ مَا سَقَرُ ﴿٢٧﴾ لَا تُبْقِي وَلَا تَذَرُ ﴿٢٨﴾ لَوَّاحَةٌ لِلْبَشَرِ ﴿٢٩﴾ (مدثر: ۲۶ تا ۲۹)

۳۔ فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ﴿٢٤﴾ [۲:۲۴]

(بقرۃ: ۲۴)

۴۔ فَرِيْقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِي السَّعِيْرِ ۝ [۴۲:۷] (شوریٰ: ۷)

۵۔ فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ۝ وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى ۝

(النزعت: ۳۷، ۳۸، ۳۹)

۶۔ كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحُطَمَةُ ۝ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ۝ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ ۝ [۱۰۴:۷] (ھمزۃ)

۷۔ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا هِيَهْ ۝ نَارٌ حَامِيَةٌ ۝ [۱۰۱:۱۱] (قارعۃ: ۸ تا ۱۱)

۸۔ كَلَّا ؕ اِنَّهَا لَظٰى ۝ نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ۝ تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى ۝

(معارج: ۱۵ تا ۱۷)

ترجمہ

۱۔ اور جہنم ان سب کی میعادگاہ ہے جس کے سات دروازے ہیں۔

۲۔ (لیکن بہت جلد ہم اُسے جہنم میں داخل کر دیں گے اور تمہیں کیا معلوم دوزخ کیا ہے؟ (ایک ایسی آگ ہے جو) کسی چیز کو باقی نہیں رکھتی اور کسی چیز کو نہیں چھوڑتی، جسم کی کھال کو پوری طرح تبدیل کر دیتی ہے۔

۳۔ اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن (گنہگار) لوگوں کے جسم اور پتھر ہیں اور کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

۴۔ ایک گروہ بہشت میں ہے اور ایک گروہ سعیر میں (جہنم میں)۔

۵۔ لیکن جس نے سرکشی کی اور دنیا کی زندگی کو مقدم سمجھا ضرور اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔

۶۔ اس طرح نہیں جس طرح وہ سوچتا ہے، جلد ہی وہ حطمہ میں پھینکا جائے گا اور تو کیا جانتا ہے کہ حطمہ کیا ہے؟ اللہ کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے، ایسی آگ جو دلوں تک پہنچ جائے گی۔

۷۔ اور جس کے (اعمال کے) پلڑے ہلکے ہوں گے اس کی پناہ گاہ ہاویہ ہوگی، تو کیا جانے ہاویہ کیا ہے؟ بھڑکتی ہوئی آگ ہے۔

۸۔ لیکن ہر گز ایسا نہیں ہے (جیسے وہ سمجھتے ہیں) وہ بھڑکتی ہوئی آگ ہے جو ہاتھ، پاؤں اور سر کی کھال کو ادھیڑ کر رکھ دے گی اور ان لوگوں کو اپنی طرف بلاتی ہوگی جنہوں نے خدا کے فرمان کی طرف پشت کی ہے۔

تفسیر

جہنم کے بارے میں قرآن کی مختلف تعبیریں

پہلی آیت میں دوزخ کے ایک ایسے معروف نام یعنی جہنم کا ذکر ہے جو قرآن مجید میں ۷۷ بار آیا ہے، یہ آیت ابلیس کے پیرکاروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہے: جہنم! ان سب کی میعادگاہ ہے اور اس کے سات دروازے ہیں "وان جھنم لموعدھم اجمعین لھا سبعۃ ابواب"

کلمہ "جھنم" کے معنی میں ارباب لغت اور مفسرین کے مابین بہت گفتگو ہوئی ہے، بعض نے اسے "آگ" کے معنی میں اور بعض نے "عمیق" اور گہرے کے معنی میں سمجھا ہے، لسان العرب میں آیا ہے: "جھنام" کے معنی زیادہ گہرائی کے ہیں، لہٰذا "بئر، جھنم و جھنام" گہرے اور عمیق کنویں کے معنی میں ہے، اسی کتاب میں بعض ارباب لغت سے نقل کیا گیا ہے کہ یہ لفظ اصل میں عبرانی ہے اور اس کا اصل "کہنام" تھا، اس کی عربی صورت جہنم بنی۔ (اسی لئے یہ ان الفاظ میں سے ہے جو "مالاینصرف" ہیں کیونکہ یہ معرفہ بھی ہے اور عجمی بھی)، بعض نے اُسے اصل میں عبرانی لفظ "جھنیون" سے جانا ہے [۱]، اور کچھ اسے عربی لفظ سمجھتے ہیں (اور اس کی تانیث اور معرفہ ہونے کو "مالا ینصرف" ہونے کی دلیل قرار دیتے ہیں)، بعض نے اُسے اصل میں فارسی قرار دیا ہے، زمین کے نیچے بنائے جانے والے اس کمرے کو بھی جہنم کہا گیا ہے جہاں حرارت پیدا کی جاتی ہے تا کہ اس کے اوپر موجود حمام کی زمین گرم ہو سکے۔ [۲]

بہر حال اس کی اصلیت کچھ بھی ہو (عربی، فارسی، عبرانی) یہ کلمہ قرآن مجید میں ایسی جگہ کے نام کے طور پر آیا ہے جو مختلف عذابوں سے بھری ہوئی ہے اور خدا کے قہر و غضب کا مرکز ہے، جس کے مختلف درجات اور مراتب ہیں، ضمنی طور پر عرض ہے کہ آیت میں ذکر ہوا تھا کہ قرآن کے ساتھ دروازے ہیں، انشاءاللہ ہم بھی بعد میں اس کے بارے میں بحث کریں گے۔

دوسری آیت میں دوزخ کا ایک اور نام نظر آتا ہے اور وہ "سقر" ہے، مشرکین میں سے ایک ہٹ دھرم اور سرکش فرد (ولید بن مغیرہ) کی داستان کی طرف اشارہ کرنے کے بعد خدا تعالیٰ فرماتا ہے: جلد ہی ہم اسے "سقر" میں داخل کریں گے اور تو نہیں جانتا کہ سقر کیا ہے، ایسی آگ ہے جو کسی شے کو اس کی اپنی حالت میں باقی نہیں رہنے دیتی اور نہ ہی کسی چیز کو چھوڑتی ہے جسم کی کھال کو پوری طرح ادھیڑ کر رکھ دیتی ہے "ساصلیہ سقر وما ادرك ما سقر لا تبقی ولا تذر لواحۃ للبشر"۔

---

[۱] لغت نامہ دھخدا مادہ "جہنم"۔

[۲] لغت نامہ دھمذا، مادہ جہنم۔ التحقیق، لسان العرب، المنجد اور اقرب الموارد۔

بہر حال سقر دوزخ کے ناموں میں ہے جو اصل میں مادہ سقر سے (فقر کے وزن پر) لیا گیا ہے جو تبدیل ہونے اور سورج کی روشنی کے اثر میں پگھلنے اور حل ہو جانے کے معنی میں ہے۔ [1]

بعض اسے دوزخ کے ہولناک طبقات میں سے ایک طبقے کا نام سمجھتے ہیں جیسا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث میں آیا ہے: سقر کے نام سے ایک درہ ہے جو متکبروں کا ٹھکانا ہے اور جب کبھی وہ سانس لیتا ہے جہنم کو بھڑکا تا ہے۔ [2]

صحاح اللغہ میں آیا ہے کہ سقرات الشّمس سورج کی تیز دھوپ کو کہتے ہیں اور ''**یوم مسقر**'' گرم اور جلانے والے دن کے معنی میں ہے، التحقیق میں آیا ہے کہ یہ مادہ اصل میں شدید حرارت کے معنی میں ہے جس سے اشیاء کا رنگ یا اُن کی صفت تبدیل ہو جاتی ہے، لیکن بعد میں اس لفظ نے تدریجاً درزخ کے ناموں میں سے ایک نام کی صورت اختیار کر لی، ایسی جلانے والی بھڑکتی ہوئی آگ جو ہر چیز کو بدل کے رکھ دیتی ہے، جو اوصاف اس آیت میں ذکر ہوئے ہیں وہ بھی ہمارے مدعا پر شاہد ہیں، کیونکہ آیت ایک طرف کہتی ہے کہ (یہ آگ) جسم کی کھال کو جھلسا دے گی، دوسری طرف کہتی ہے کہ ''کسی شے کو اس کی حالت پر باقی نہیں رہنے دے گی''۔

قرآن میں کثرت سے استعمال ہونے والا جہنم کا دوسرا نام ''نار'' ہے، یہ لفظ قرآن مجید میں ۱۴۵ مرتبہ آیا ہے اور اکثر موارد میں جہنم کی آگ کے لئے ہی استعمال ہوا ہے، البتہ بعض موارد میں دنیا کی آگ کے لئے آیا ہے، قرآن کے معارضین کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے: اگر تم لوگ قرآن کی سورتوں کی طرح کوئی سورہ نہیں لاتے اور ہرگز لا بھی نہ سکو گے تو اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن (گنہگار) لوگ اور پتھر ہیں اور جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے، ''نار'' کا کلمہ ہر قسم کی آگ کے لئے استعمال ہوتا ہے، راغب مفردات میں کہتا ہے کہ ''نار'' اس شعلے کے معنی میں ہے جو انسانی حس کے سامنے ظاہر ہوتا ہے اور صرف حرارت کو بھی ''نار'' کہا جاتا ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ''نار'' اور ''نور'' ایک ہی مادہ سے لئے گئے ہیں، اور دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہیں، بہر حال قرآنی آیات میں دوزخ کی آگ کے لئے یہ کلمہ اس کثرت سے استعمال ہوا ہے کہ دوزخ کے ناموں میں سے ایک نام کی صورت اختیار کر گیا ہے۔

قرآن مجید سورہ آل عمران آیت ۱۰ میں مجرموں کے ایک گروہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: ''**و اُولٰئک هم و قود النار**'' وہ آگ کا ایندھن ہیں، یعنی دوزخ کا ایندھن ہیں، متعدد آیات میں ''**اصحب النار**'' کی عبارت بھی دوزخیوں کے لئے استعمال ہوئی ہے، اسی لئے ''**اصحاب النار**'' کو ''**اصحب الجنة**'' کے مقابلے میں قرار دیا گیا ہے۔[3] ضمناً اس آیت میں جہنم کی آگ کے لئے گنے جانے والے اوصاف میں سے یہ بھی ہے کہ اس کا ایندھن اور آتش گیر مادہ خود انسان اور پتھر (بت) ہیں، بنا بر ایں دوزخ کی آگ اس لحاظ سے دنیا کی آگ سے کوئی شباہت نہیں رکھتی۔

---

[1] مقائیس اللغہ، مفردات راغب۔

[2] تفسیر صافی، سورہ قمر کی آیت ۴۸ کے ذیل میں۔

[3] اعراف ۴۴ اور حشر ۲۰۔

چوتھی آیت میں غضب الٰہی کے اس مرکز کے لئے ''سعیر'' کی صفت استعمال ہوئی ہے، نزول قرآن کے ہدف کی طرف اشارہ کرنے کے بعد جس میں لوگوں کو روز قیامت سے خوف دلایا گیا ہے، فرماتا ہے: (اس دن) ایک گروہ بہشت میں ہوگا اور ایک گروہ ''سعیر''۔ (فریق فی الجنۃ وفریق فی السعیر)۔

''سعیر'' کا لفظ قرآن میں سولہ بار اور اس کی جمع ''سعر'' دو بار استعمال ہوئی ہے، یہ لفظ اصل میں (قعر کے وزن پر) ''سعر'' کے مادہ سے لیا گیا ہے جس کا مطلب آگ بھڑکانا ہے اور آگ کے زیادہ اور شدید بھڑکنے کو بھی کہا گیا ہے، لہذا سعیر سے مراد وہ آگ ہے جو شعلہ ور اور سوزاں ہو، کبھی یہ لفظ جنون کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے کیونکہ اس حالت میں انسان شعلہ ور ہو جاتا ہے اور ہیجان کا شکار ہو جاتا ہے، پاگل اونٹ کو بھی ''ناقہ'' ''مسعورہ'' کہا جاتا ہے۔ [1]

مندرجہ بالا آیت میں ''سعر'' جنت کے مقابلے میں قرار پایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی جہنم کے ناموں میں سے ایک نام ہے، اس کا ایک اور قرینہ یہ ہے کہ قرآن کی چند آیتوں میں اصحاب السعیر کی عبارت استعمال ہوئی ہے۔ [2] لیکن اس بات کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ لفظ قرآن کی بعض آیتوں میں وصفی معنی میں استعمال ہوا ہے جو جہنم کی آگ کے بھڑکنے کی طرف اشارہ ہے۔

پانچویں تعبیر ''جحیم'' ہے جو قرآن مجید میں ۲۵ مرتبہ استعمال ہوئی ہے، زیر بحث آیت میں فرمایا گیا ہے: لیکن جو سرکشی کرے اور دنیوی زندگی کو اخروی زندگی پر فوقیت دے اس کا ٹھکانا جحیم ہے۔ ''فاما من طغیٰ واثر الحیوۃ الدنیا فان الجحیم ھی الماوی'' قرآن کی عبارات سے استفادہ ہوتا ہے کہ ''جحیم'' کا لفظ دوزخ کے ناموں میں سے ہے جو ''جحم'' کے مادہ سے ''آگ کے شدید طور پر بھڑکنے'' کے معنی میں ہے۔

مقائیس اللغۃ میں بھی اس معنی پر تاکید کی گئی ہے، لیکن صحاح اللغۃ نے اس کی ایسی عظیم آگ سے تعبیر کی ہے کہ جس میں عام طور پر حرارت کی بہت شدت ہو اور جو بہت بھڑکتی ہو، لیکن قرآن میں ایک جگہ دنیا کی سوزاں آگ کے معنی میں بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے، حضرت ابراہیمؑ کے ہم عصر مشرکوں کی زبانی نقل کیا گیا ہے:

قَالُوا ابۡنُوۡا لَہٗ بُنۡیَانًا فَاَلۡقُوۡہُ فِی الۡجَحِیۡمِ ۹۷ ﴿الصافات: ۹۷﴾

انہوں نے کہا کہ ایک اونچی عمارت اس (ابراہیمؑ) کے لئے بنائیں اور اُسے جحیم میں پھینک دیں۔ (صافات۔۹۷)

لیکن یہ تعبیر اس سے مانع نہیں ہے کہ مذکورہ لفظ جہنم کے اسماء میں سے ایک ہو۔

---

[1] مقائیس، صحاح اللغہ، التحقیق، مفردات راغب۔

[2] ملک، ۱۰، ۱۱۔ فاطر، ۶۔

چھٹی عبارت میں کلمہ ''حطمة'' کا ذکر ہے جس کا سورہ ہمزہ میں دوبار تکرار ہوا ہے، دوسروں کی عیب جوئی اور غیبت کرنے والوں اور جمع مال کی حرص رکھنے والوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس ضمن میں فرمایا گیا ہے: ایسا نہیں جیسا وہ سمجھتا ہے، جلد ہی وہ حطمہ میں پھینکا جائے گا، تم کیا جانو حطمہ کیا ہے؟ خدا کی بھڑکائی ہوئی ایسی آگ ہے جو دلوں تک پہنچ جاتی ہے۔ ''**کلا لینبذن فی الحطمة وما ادرك ما الحطمة نار الله الموقدة التی تطلع علی الافئدة**''۔

لفظ ''**حطمة**'' جو صحاح اللغہ اور مجمع البحرین کے بقول دوزخ کے اسماء میں سے ہے ''**حطم**'' کے مادہ سے صیغہ مبالغہ اور توڑنے کے معنی میں ہے، بعض نے اسے خشک اشیاء توڑنے کے معنی میں استعمال کیا ہے، لہٰذا قحط کے سالوں کو ''**حطمة**'' (لقمہ کے وزن پر) کہا جاتا ہے، چونکہ اس طرح کے سال ہر چیز کو گویا توڑ کر رکھ دیتے ہیں، اور انسانوں کو اجاڑ دیتے ہیں، کعبہ میں ایک جگہ جو حجر الاسود اور خانہ کعبہ کے دروازہ کے مابین ہے ''**حطیم**'' کہلاتی ہے کیونکہ لوگوں کا وہاں بہت اژدھام ہوتا ہے اور ایسا لگتا ہے جیسے دباؤ کی شدت سے ہڈیاں چیخ رہی ہوں، لہٰذا دوزخ کو حطمہ کے نام سے موسوم کرنا اس وجہ سے ہوسکتا ہے کہ اس کی سوزاں آگ ہر شے کو توڑ کر فنا کر دے گی، زیر بحث آیت کی قرآن نے خود جو تفسیر کی ہے اور کہا ہے کہ ''وہ خدا کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے جو دلوں تک پہنچ جائے گی'' وہ ہمارے مدعا کی گواہی دیتی ہے، لیکن بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جہنم کے تمام نام من جملہ حطمہ دوزخ کے مخصوص حصوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ [1]

ساتویں تعبیر میں ''ھاویہ'' کا تذکرہ ہے جو قرآن میں صرف ایک بار آیا ہے، فرماتا ہے:

وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ﴿٨﴾ [١٠١:٨] فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ﴿٩﴾ [١٠١:٩] وَمَآ اَدْرٰىكَ مَاهِيَهْ ﴿١٠﴾ [١٠١:١٠] نَارٌ حَامِيَةٌ ﴿١١﴾ [١٠١:١١] (قارعة: ٨ تا ١١)

لیکن جس کے ترازو کے پلڑے (اعمال) ہلکے ہیں اس کا ٹھکانا ہاویہ ہے اور تو کیا جانے ہاویہ کیا ہے؟ جلتی ہوئی گرم آگ ہے۔ (قارعہ۔ ۷ تا ۱۱)

لسان العرب میں ابن منظور کے مطابق ہاویہ جہنم کے ناموں میں سے ہے، اس بنا پر ''**امه هاوية**'' کا مفہوم یہ ہے کہ اس کا ٹھکانا دوزخ ہوگا۔ [2] ''**مقائیس اللغه**'' اور ''**مفردات راغب**'' میں اس کی طرف اشارہ ہوا ہے، یہ کلمہ اصل میں ''**هوی**'' کے مادہ سے گرنے کے معنی میں ہے کیونکہ کفار اور مجرمین اس میں جا گریں گے، ضمناً دوزخ کی گہرائی کی طرف بھی اشارہ ہے۔

''ام'' کا لفظ یہاں پر مکان اور ٹھکانے کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور کبھی ماں کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، یعنی جس طرح ماں بچے کو آغوش میں لے لیتی ہے دوزخ بھی افراد کو اپنی آغوش میں کھینچ لیتی ہے، بعض نے اس مقام پر ''ام'' کی تفسیر ''سر کے مغز'' سے کی ہے اور کہا

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۳ صفحہ ۱۷ اور ۱۹ حدیث ۶۰، ۶۴ سے رجوع فرمائیے۔

[2] لسان العرب۔ مادہ ھوی۔

ہے کہ ہاویہ دوزخیوں کی ایک صفت ہے کیونکہ وہ سر کے بل اس میں جا گرتے ہیں لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح لگتی ہے۔

آٹھویں اور آخری تعبیر کلمہ ''لظیٰ'' ہے جو ایک ہی بار قرآن مجید میں آیا ہے، سورہ معارج میں ان مجرموں کی حالت کی طرف اشارہ کرنے کے بعد جو قیامت کے دن اپنی نجات کے لئے بیوی، بھائی اور اپنے بچوں کو قربان کرنا چاہتے ہیں، فرمایا گیا ہے:

كلا انها لظى۔ نزاعة للشوى۔ تدعوا من ادبر وتولىٰ

ہر گز ایسا نہیں ہے جیسا وہ سوچتے ہیں (بلکہ) وہ لظیٰ (سوزاں آگ) ہے جو ہاتھ، پاؤں اور سر کی کھال ادھیڑ دیتی ہے اور جنہوں نے خدا کے فرامین کی طرف سے پیٹھ پھیری ہے اُن کو بلاتی ہے۔ (معارج۔ ۱۵ تا ۱۷)

''لظیٰ'' اصل میں آگ یا آگ کے شعلے کے معنی میں ہے، لیکن ''لسان العرب'' اور ''مفردات راغب'' کے بقول یہ لفظ جہنم کے اسماء میں سے ہے لہٰذا مونث ہونے اور علم ہونے کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔

''نزاعة'' کا مطلب وہ شے ہے جو پے در پے جدا کرتی ہے اور ''شوی'' سے مراد ہاتھ پاؤں اور بدن کے اطراف ہیں (اگر چہ کبھی بھوننے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، لیکن یہاں مناسب پہلا معنی ہی ہے کیونکہ جب کوئی چیز آگ میں ڈالی جاتی ہے تو پہلے اس کے باہر کا حصہ ہی جلتا ہے) بعض نے ''شوی'' سے بدن کی کھال یا سر کی کھال مراد لی ہے۔

اس آگ کی عجیب خصوصیت یہ ہے کہ جہنمیوں کو اپنی طرف بلاتی ہے، کیا جہنم حقیقت میں کسی قسم کی حیات، شعور اور ادراک رکھتا ہے؟ یا جہنم میں کوئی خفیہ قوت جاذبہ ہے جو مستحقین کو اپنی طرف جذب کرتی ہے؟

دونوں احتمالات ممکن ہیں، لیکن آیت کا ظہور پہلے معنی میں ہے، یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ اسلامی روایات میں کہیں پر بھی ''نار'' دوزخ کے نام کے طور پر استعمال نہیں ہوا بلکہ سات اور نام آئے ہیں اور ہر نام دوزخ کے ایک طبقے کی نشاندہی کرتا ہے، ایسا نہیں ہے کہ ان سات ناموں میں سے ہر ایک تمام تر دوزخ کے لئے ہو۔

ایک حدیث میں امیر المومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں: جہنم کے سات دروازے ہیں اور یہ دروازے وہی طبقات ہیں جن میں ہر ایک دوسرے کے اوپر ہے، اس کے بعد حضرتؑ نے اپنا ایک ہاتھ دوسرے کے اوپر رکھا اور فرمایا: اس طرح ------ سب سے نچلا طبقہ ''جہنم'' ہے اس کے اوپر ''لظی'' اس سے اوپر ''حطمہ'' اس پر ''سقر'' اور اس سے اوپر ''جحیم'' اس پر ''سعیر'' اور سعیر'' کے اوپر ''ہاویہ'' ہے (لیکن بعض روایات میں آیا ہے کہ سب سے نچلا طبقہ ''ہاویہ'' اور سب سے اوپر کا طبقہ ''جہنم'' ہے)۔ [1]

کوئی مانع نہیں ہے کہ مندرجہ بالا سات نام کبھی تمام جہنم پر اطلاق ہوں اور کبھی جہنم کے ایک حصے پر، جس طرح دنیا

---

[1] مجمع البیان ج ۵ اور ۶ صفحہ ۳۳۸، نور الثقلین جلد ۳ صفحہ ۱۹ حدیث ۶۴۔ حدیث ۶۰۔ میں بھی اس بارے میں امام محمد باقر علیہ السلام سے ایک تفصیلی حدیث نقل ہوئی ہے۔

کے ناموں میں نظر آتا ہے کہ کبھی ایک نام ایک پورے صوبے کے لئے استعمال ہوتا ہے اور کبھی صرف ایک شہر کے لئے جو اسی صوبے کا ایک حصہ ہے۔

جہنم کے اوصاف

دوزخ سے مربوط آیات، ان کے نام اور اوصاف سے مجموعی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ دوزخ ہولناک سزاؤں کا مرکز ہے، اور سوزاں آگ سے بھری ہوئی ہے جس کے مختلف دروازے اور طبقات ہیں، لیکن یہ آگ دنیا کی آگ کی طرح ہرگز نہیں بلکہ ایسی آگ ہے جس کی یہ خصوصیات ہیں:

۱۔ اس کا ایندھن اور آتش گیر مادہ انسان اور پتھر ہیں۔

۲۔ ایسی آگ ہے جو دلوں سے نکلتی ہے اور جس کی پہلی چنگاری قلوب میں ظاہر ہو جاتی ہے۔

۳۔ ایسی آگ ہے جو توڑتی ہے اور پیس ڈالتی ہے۔

۴۔ ایسی آگ ہے جس کے مختلف طبقات ہیں اور گناہگاروں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔

۵۔ یہ آگ جب اپنے مستحقوں کو دور سے دیکھتی ہے تو اس کی غضیلی اور ہولناک آواز اس کی سانسوں کے ساتھ سنائی دیتی ہے 'اِذَا رَاَتْهُمْ مِّنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ سَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا وَّزَفِيْرًا ۱۲ ﴿الفرقان: ۱۲﴾ '

۶۔ یہ ایک متحرک آگ ہے، چنانچہ فرمایا گیا ہے: ''اس دن جہنم کو حاضر کیا جائے گا اس دن انسان چونک اٹھے گا، لیکن یہ چونکنا اُسے کوئی فائدہ نہیں دے گا وَجِایْٓءَ يَوْمَىٕذٍۭ بِجَهَنَّمَ ۙ يَوْمَىٕذٍ يَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى ۲۳ ﴿الفجر: ۲۳﴾

۷۔ یہ سوزاں آگ ابھی سے کافروں کو گھیرے ہوئے ہے اگرچہ پردے اس کے مشاہدے سے مانع ہیں۔ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ۴۹ ﴿التوبة: ۴۹﴾

شاید یہ تمام صفات باعث ہوئی ہوں گی کہ بعض مفسرین نے جہنم کے روحانی ہونے کی تفسیر کی ہے اور اس کی آگ کو معنوی سوزاں آگ جانا ہے، لیکن بے شک یہ تفسیر قرآن کی آیتوں کے ظاہر سے مطابقت نہیں رکھتی، جو روایتیں اُن کے ذیل میں نقل ہوئی ہیں اُن سے بھی مطابقت نہیں رکھتی، بنابریں ہمیں یہ کہنا پڑے گا کہ جہنم ایسی آگ کا مرکز ہے جو دنیا کی آگ سے اس طرح مختلف ہے جس طرح بہشت کی نعمتیں دینا کی نعمتوں سے پہلے مختلف ہیں۔

چند وضاحتیں

دوزخ کے وجود کا فلسفہ

بہت سے لوگ پوچھتے ہیں کہ جہنم کی ضرورت ہی کیا ہے؟ خدا تو انتقام کے درپے نہیں ہے کیونکہ عموماً سزائیں اس لئے ہوتی ہیں کہ افراد دوسری بار اس خطا کے مرتکب نہ ہوں یا وہ دوسروں کے لئے درس عبرت بنیں، جب کہ ہم جانتے ہیں کہ اس دنیا کے بعد دوبارہ اس دنیا کی طرف برگشت نہیں ہوگی اور دوسری دنیا میں فرائض، اطاعت اور گناہ کا تصور نہیں ہے، بنابرایں دوزخ کی سخت سزائیں کیا مفہوم رکھتی ہیں؟

دوسری طرف تمام دینی تعلیمات کا ہدف انسان کی تعلیم وتربیت اور اس کا تکامل ہے اور اگر کوئی شخص اُسے نہیں مانتا تو اس کے لئے یہی سزا کافی ہے کہ وہ ان عالی درجات تک پہنچنے سے محروم ہوجائے، بنابرایں سزاؤں اور قہر الٰہی کے مرکز دوزخ کے وجود کی کیا ضرورت ہوسکتی ہے؟ اس کے جواب کے لئے مندرجہ ذیل نکات ملاحظہ کریں:

ا۔ہم بارہا کہہ چکے ہیں کہ بہت سی الٰہی سزائیں حقیقت میں انسان اپنے اعمال کا نتیجہ ہیں چاہے اس دنیا میں ہوں یا دوسری دنیا میں، لیکن خدا کے مسبب الاسباب ہونے کی وجہ سے اُن کی اس کی طرف نسبت دی جاتی ہے، بہشت کی بہت سی نعمتیں انسان کے اپنے نیک اعمال کا تجسم اور بہت سی دوزخی سزائیں بھی اس کے برے اعمال کا تجسم ہیں، ہم جانتے ہیں کہ عمل کے آثار اور نتائج پر اعتراض کرنا معقول نہیں ہے، مثلا جو شخص نشہ آور اشیاء اور شراب استعمال کرتا ہے تاکہ اپنی دانست میں ان دو تباہ کن اشیاء کے ذریعے کچھ لحظات سکون اور اطمینان سے گذار لے اور ان تباہ کن عوامل سے حاصل ہونے والی بے خبری کی لذت سے استفادہ کرسکے، اسے خبردار کیا جاتا ہے کہ یہ دو عوامل آخرالامر تمہارے وجود کو تباہ کردیں گے، شراب کا استعمال، دل، اعصاب، پھیپھڑوں اور عروق کی بیماریوں کا باعث بنتا ہے، اور نشہ آور اشیاء انسان کے تمام اعصاب بلکہ تمام وجود کو برباد کردیتی ہیں، اب اگر کوئی شخص اس نصیحت کو نہ سنے اور ان اشیاء کو استعمال کرتا ہے تو اس کے عواقب ونتائج اور عذاب میں ضرور مبتلا ہوگا، قانون علیت کے علاوہ اس کی کوئی اور دلیل نہیں ہوسکتی اور یہ انسان کے اپنے عمل کا قہری نتیجہ ہے اور اس سے فرار ممکن نہیں ہے۔

بیشتر گناہ بھی اسی طرح ہیں اور اس دنیا کی زندگی اور دوسری دنیا کی زندگی میں اُن کے نتائج برآمد ہوتے ہیں جو دوزخ کے عذاب کی صورت میں نمایاں ہوتے ہیں، لہٰذا قرآن کی بہت سی آیتوں میں ہے کہ تمہاری سزا تمہارے اپنے اعمال ہی ہیں، سورہ نمل کی آیت ۹۰ میں ہے" ومن جآء بالسیئة فکبت وجوههم فی النار هل تجزون الا ما کنتم تعملون" یعنی جو لوگ اپنے ہمراہ برے اعمال لے کر آئیں گے منہ کے بل جہنم میں گرادیے جائیں گے، تم نے جو اعمال انجام دیئے کیا تمہیں اس کے علاوہ کوئی سزا مل سکتی ہے؟ یعنی یہ تمہارے ہی اعمال ہیں جنھوں نے تمہیں جکڑ لیا ہے، کوئی اور شے نہیں، سورہ تحریم کی آیت ۷ میں یوں ہے:

یا یها الذین کفروا لا تعتذروا الیوم انما تجزون ما کنتم تعملون

اے کافر ہو جانے والو! آج معذرت کا اظہار مت کرنا کیونکہ تمہاری سزا وہ اعمال ہی ہیں جن کا تم نے ارتکاب کیا ہے۔

عذر خواہی کا فائدہ وہاں متصور ہے جہاں علت ومعلول اور اعمال کے طبیعی نتیجے کا مسئلہ متصور نہ ہو، وہ آیتیں جو تجسم اعمال کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں، مثلاً یتیم کا مال کھانے کو آگ کھانے کے عنوان سے پیش کرتی ہیں، اس بات پر گواہ ہیں، اسی طرح وہ روایتیں جو کہتی ہیں کہ انسانوں کی حیوانی صفات قیامت کے دن ان کے اندر سے باہر نکالی جائیں گی، اور اشخاص کے چہرے ان حیوانات کی طرح ہو جائیں گے جن میں وہ صفات موجود ہیں۔

مختصر یہ کہ یہ دنیا کھیتی ہے اور آخرت فصل کاٹنے کی جگہ ہے، اگر انسان پھول کا بیج بوئے تو اس کا حاصل خوبصورت اور خوشبودار پھولوں کی شاخیں ہوں گی، اور اگر کانٹے بوئے گا تو کانٹے کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں کاٹ سکتا، گویا جو بوئے گا سو کاٹے گا۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص پیغمبر اسلامؐ کی خدمت میں آیا اور تقاضا کیا کہ اُسے کوئی نصیحت فرمائیں، فرمایا: ''احفظ لسانک'' اپنی زبان کی حفاظت کرو، اس نے اس مسئلے کو زیادہ اہمیت نہیں دی اور دوبارہ اپنا مدعا دہرایا، دوسری اور تیسری مرتبہ بھی پیغمبر اکرمؐ سے وہی جواب سنا، بعد ازاں آپؐ نے اس مسئلے کی اہمیت بیان کرنے کے لئے تیسری مرتبہ اضافہ فرمایا: ''ویحك وهل یکب الناس علی مناخرهم فی النار الا حصآئد السنتهم'' کیا اس کے علاوہ کچھ ہے کہ زبان کی کاٹی ہوئی فصل ہی لوگوں کو منہ کے بل دوزخ میں پھینک دے گی؟[1]

۲۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انذار اور بشارت تربیتی امور کے اجراء کیلئے موثر ضامن ہیں۔

جس طرح بہشت کی عظیم نعمتوں کی بشارت خدا کی اطاعت اور گناہ کے ترک کرنے کی دعوت میں بہت موثر ہے، اسی طرح دوزخ کے دردناک عذاب کی وعید بھی بہت موثر ہے بلکہ تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ سزائیں زیادہ قوی اثر رکھتی ہیں، اس بناء پر دنیا میں قانون ساز اداروں کے بنائے ہوئے تمام قوانین میں مجرموں کے لیے سزاؤں کا بھی تعین ہوتا ہے جسے وکلا کی اصلاح میں اجرا کی ضمانت سے تعبیر کیا جاتا ہے، اجراء کی ضمانت کا مسئلہ اس حد تک اہم ہے کہ قانون کی تشکیل کے اصلی عناصر میں سے محسوب ہوتا ہے، وہ یوں کہ اگر کوئی قانون بنایا جائے اور مجرموں کے لئے کسی قسم کی بھی سزا (جیل، کوڑے، جرمانہ اور معاشرتی پابندی) معین نہ ہو تو اُسے قانون نہیں کہا جا سکتا، پھر کیسے ممکن ہے کہ الٰہی قوانین کے اجراء کی کوئی ضمانت نہ ہو؟ کیونکہ اس صورت میں اس کی قانونی قدر و اہمیت ختم ہو کر رہ جائے گی، اور مجرموں کو اطاعت کرنے کی کوئی دلیل نظر نہیں آئے گی اور قانون سازی کا مقصد فوت ہو جائے گا۔

یہ صحیح ہے کہ الٰہی قوانین کی مخالفت کی طبیعی اور وضعی آثار مخالفت سے روکنے کا عامل بن سکتے ہیں، لیکن صرف یہی کافی نہیں ہے، لہٰذا خدا نے ان آثار کے علاوہ بھی کچھ سزائیں مجرموں کے لئے معین کی ہیں اور جس طرح بعض قوموں کو دنیا ہی میں سزا دینے کی تہدید کی ہے (اور

---

[1] اصول کافی جلد ۲ صفحہ ۱۱۵ حدیث ۱۴۔

اس کے بہت سارے نمونے دنیا میں واقع ہو چکے ہیں جو گذشتہ اقوام کی حالت کے ذکر میں قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں) اسی طرح دوسری دنیا میں بھی مجرموں کے لئے سزائیں مقرر کی گئی ہیں، یہ نکتہ بھی واضح ہے کہ جس قدر تہدید اور حوصلہ افزائی زیادہ قوی اور شدید ہوگی اس کا اثر بھی زیادہ ہوگا۔

یہ بات بہشت اور دوزخ کے وجود کا ایک مقصد ظاہر کرتی ہے، ممکن ہے یہاں پر کہا جائے کہ مذکورہ تمام آثار سزاؤں کے وعدے پر مترتب ہوتے ہیں، لیکن کیا مانع ہے کہ یہ انذار اور تہدیدات خدا کی طرف سے بیان تو ہوں لیکن قیامت میں تحقق نہ پائیں چونکہ وہاں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی، کیونکہ نہ دوسروں کے لئے عبرت کا مسئلہ ہے اور نہ ہی گناہگاروں کی طرف سے گناہ کے عدم تکرار کا مسئلہ۔

لیکن اسکا لازمہ یہ ہوگا کہ خداوند حکیم عمل قبیح کا مرتکب ہو اور العیاذ باللہ جھوٹی بات کہے اور اپنے ہی وعدے کی مخالفت کرے، بدکاروں کو سزا دینے کی بات کرے اور اس کے انجام کی قسم بھی کھائے لیکن عملاً مخالفت کرے، مسلماً یہ ایک قبیح عمل ہے اور نہ صرف یہ کہ خدائے پاک کی ذات کے لائق نہیں بلکہ کوئی بھی مہذب اور حکیم شخص اس کا ارتکاب نہیں کرسکتا۔

نتیجہ یہ کہ ایک طرف سے سزاؤں کی دھمکی اور انذار اجراء کی ضمانت کے عنوان سے ضروری ہے اور دوسری طرف ان وعدوں پر عمل پیرا ہونا خدا کی ذات سے ہر قسم کی قباحت کی نفی کے لئے ضروری ہے۔

یہی دوزخ اور اس کی سزاؤں کے تحقق کا فلسفہ ہے۔

لہٰذا سورہ ابراہیم کی آیت ۴۷ میں بیان ہوا ہے:

فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۴۷﴾ [۱۴:۴۷]

یہ نہ سمجھنا کہ خدا اپنے پیغمبروں سے کئے ہوئے وعدوں کی مخالفت کریگا، کیونکہ خدا قادر اور انتقام والا ہے۔

(اس آیت کے بعد روز قیامت کے بعض عذابوں کے بارے میں تشریح فرماتا ہے)۔

(۳) دوزخ کے دروازے اور طبقات

اشارہ

قرآن مجید کی متعدد آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جہنم کے متعدد دروازے ہیں، ایک آیت میں سات دروازوں کی تصریح ہوئی ہے، کیا یہ دروازے ان اعمال کی طرف اشارہ ہیں جو انسان کو جہنم کی طرف لے جاتے ہیں اور جو حقیقت میں انسانوں کے جہنم میں داخل ہونے کا راستہ ہیں جیسا کہ جنت کے دروازوں کے بارے میں بیان ہوا ہے؟

یا جہنم کے مختلف طبقات اور درجات کی طرف اشارہ ہے جن کی طرف مختلف روایات میں اشارہ ہوا ہے، یا دونوں معنی ان آیتوں کے مفہوم میں جمع ہوئے ہیں؟

بہتر ہے ہم پہلے اس بحث سے مربوط آیتوں کی تفسیر کریں تا کہ مندرجہ بالا سوالوں کے جوابات پا سکیں، لہٰذا مندرجہ ذیل آیات میں غور کرتے ہیں:

۱۔ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ ۴۴ ﴿الحجر: ۴۴﴾

۲۔ فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ۲۹

النحل: ۲۹

۳۔ وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا ﴿الزمر: ۷۳﴾

۴۔ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِى الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ۱۴۵

(النسائ)

ترجمہ

۱۔ اور جہنم ان سب کی میعادگاہ ہے جس کے سات دروازے ہیں اور ہر دروازے کے لئے ان میں سے ایک معین گروہ کو تقسیم کر دیا گیا ہے۔

۲۔ اب جہنم کے دروازوں سے داخل ہو جاؤ، تم وہاں ہمیشہ کے لئے رہو گے، مستکبرین کے لئے کتنا برا ٹھکانا ہے۔

۳۔ اور جو لوگ کافر ہو گئے ہیں مختلف گروہوں کی شکل میں جہنم کی طرف بھیجے جائیں گے، جب وہ دوزخ تک پہنچیں گے تو اس کے دروازے کھل جائیں گے۔

۴۔ منافقین دوزخ کے سب سے نچلے طبقے میں قرار پائیں گے اور تم ہرگز اُن کا کوئی مددگار نہیں پاؤ گے۔

تفسیر

جہنم کے دروازوں سے کیا مراد ہے؟

پہلی آیت میں شیطان کے پیروکاروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، جن کے بارے میں اس سے پہلے کی آیتوں میں گفتگو کی گئی ہے، فرماتا ہے: جہنم ان سب کی وعدہ گاہ ہے جس کے سات دروازے ہیں اور ہر دروازہ کے لئے ان میں سے ایک معین گروہ کو تقسیم کیا گیا ہے۔ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ ﴿الحجر: ۴۴﴾

جہنم کے دروازوں سے کیا مراد ہے، اس بارے میں مفسرین نے مختلف احتمالات کا ذکر کیا ہے۔

پہلا احتمال یہ ہے کہ یہ دوزخ میں داخل ہونے کے دروازوں کی طرف اشارہ ہے جو سب کے سب ایک ہی مرکز میں کھلتے ہیں، جیسے اس دنیا میں کسی عمارت کے چند دروازے ہوتے ہیں، اور حقیقت میں یہ اس قہر الٰہی کے مرکز میں داخل ہونے والوں کی کثرت کی طرف اشارہ ہے لیکن اس آیت کی تفسیر میں بیان ہونے والی متعدد روایتوں کے پیش نظر یہ احتمال بعید نظر آتا ہے۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ یہاں پر جہنم کے مختلف طبقات مراد ہیں جو عذاب کی شدت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں، بنا بر ایں حقیقت میں جہنم کا ہر دروازہ ان طبقات میں سے ایک طبقے میں کھلتا ہے، اہل بیت کرامؑ اور اہل سنت کی طرف سے مروی متعدد روایات اس تفسیر پر شاہد ہیں۔

در المنثور میں امام علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ فرمایا:

اتدرون کیف ابواب جهنم؟ قلنا کنحو هذه الابواب! قال لا ولکنها هکذا ووضع یده فوق یده وبسط یده علی یده۔

کیا تم جانتے ہو کہ جہنم کے دروازے کیسے ہیں؟ ہم نے جواب دیا انہی دروازوں کی طرح، فرمایا: نہیں، بلکہ اس

طرح ہیں، پھر امامؑ نے اپنا ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ پر رکھ دیا اور اسے کھول دیا۔

(یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے اوپر مختلف طبقوں کی صورت میں ہیں)[1]

ایک اور حدیث میں اُن سے نقل ہوا ہے کہ فرمایا:

سبعة ابواب النار متطابقات

دوزخ کے سات دروازے ہیں جو ایکدوسرے کے اوپر قرار دیئے گئے ہیں۔[2]

ایک اور حدیث میں امیرالمومنینؑ سے دوزخ کے سات دروازوں کی ایک تفسیر دوسرے کے اوپر قرار دیئے گئے طبقوں کی صورت میں کرنے کے بعد ان طبقات کے نام اس طرح گنوائے گئے ہیں:

سب سے نیچے ''جہنم''، اس کے اوپر ''لظی'' اس کے اوپر ''حطمہ'' اس کے اوپر ''سقر'' اس کے اوپر ''جحیم'' اور اس کے اوپر ''سعیر'' اس کے اوپر ''ہاویہ'' ہوگا (لیکن بعض روایات میں سب سے نیچے ہاویہ اور سب سے اوپر جہنم کو قرار دیا گیا ہے)[3]

تیسرا احتمال یہ ہے کہ یہ متعدد دروازے ان مختلف اور متعدد اقوام کی وجہ سے ہوں گے جو ان دروازوں سے داخل ہوں گی، تفسیر روح المعانی میں احادیث کے کچھ منابع سے نقل کیا گیا ہے کہ پہلا دروازہ یکتا پرست مسلمان گنا ہگاروں کے لئے ہے، دوسرا دروازہ یہودیوں کے لئے، تیسرا دروازہ عیسائیوں کے لئے، چوتھا ردوازہ ستارہ پرستوں کے لئے مخصوص ہے اور پانچواں دروازہ مجوسیوں کے لئے، چھٹا دروازہ مشرکین کے لئے اور ساتواں اور آخری دروازہ منافقین کے لئے مخصوص ہے۔[4]

چوتھا احتمال یہ ہے کہ ان دروازوں سے مراد وہ گناہ اور اعمال ہیں جو دوزخ میں داخل ہونے کا باعث بنتے ہیں، اس بات پر شاہد اولا وہ مقابلہ ہے جو بہشت کے دروازوں سے کیا گیا ہے، جنت کے دروازوں کے بارے میں بعض روایات میں صراحت سے بیان ہوا ہے کہ ''جہاد'' جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے، یا یہ کہ جنت کے دروازوں میں ایک کا نام ''باب'' المجاہدین'' ہے[5] ایک اور روایت میں کچھ اور دروازوں کی طرف اشارہ ہوا ہے جو ''صبر'' اور ''شکر'' کی طرح کے اعمال انسانی سے مربوط ہیں۔

ثانیا وہ روایتیں ہیں جو نشاندہی کرتی ہیں کہ جہنم کے بعض دروازوں سے فرعون، ہامان اور قارون اور بعض دروازوں سے مشرکین اور

---

[1] الدرالمنثور۔ جلد ۴ صفحہ ۹۹۔

[2] نورالثقلین۔ جلد ۳ صفحہ ۱۸ حدیث ۶۲۔

[3] نورالثقلین۔ جلد ۳ صفحہ ۱۹ حدیث ۶۴۔

[4] روح المعانی۔ جلد ۱۴ صفحہ ۴۸۔ تفسیر قرطبی۔ جلد ۵ ص ۳۶۴۶۔

[5] کافی۔ جلد ۵ صفحہ حدیث ۲۔

بعض سے پیغمبر اسلامؐ کے اہل بیتؑ کے دشمن داخل ہوں گے [1] یہ بھی جہنم کے دروازوں کی مختلف گناہوں سے رابطے کی دلیل ہے،لیکن آخری تینوں تفسیریں آپس میں جمع ہوسکتی ہیں کیونکہ جہنم کے طبقات ایک دوسرے سے زیادہ دردناک اور اس میں داخل ہونے والے گروہ ایک دوسرے سے زیادہ گنہگار ہوں گے اور ان کے انجام دیئے ہوئے اعمال ایک دوسرے سے بدتر ہوں گے، اس لئے یہ تینوں تفسیریں ایک ہی مفہوم میں جمع ہونے کے قابل ہیں اور نتیجے کے طور پر جہنم کے دروازے ہمیں اس حقیقت کا پیغام دیتے ہیں کہ جس طرح انسان کے اعمال اور مجرمین و کفار آپس میں مختلف ہیں اُن کی سزائیں بھی آخرت میں ایک جیسی نہیں ہوں گی بلکہ اُن میں بہت فرق ہوگا۔

دوسری آیت میں ان کفار کو مخاطب کیا گیا ہے جنہوں نے اس غلط راستے کو انتخاب کر کے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:''اب (قیامت میں) جہنم کے دروازوں سے داخل ہو جاؤ جب کہ تم کو ہمیشہ وہاں رہنا ہے اور متکبروں کا ٹھکانہ کتنا برا ہے''**فادخلوا ابواب جھنم خلدین فیھا فلبئس مثوی المتکبرین**''۔

یہاں پر یہ بات قابل توجہ ہے کہ ''ابواب جہنم'' جمع کی صورت میں ذکر ہوا ہے جب کہ ہر گروہ ایک دروازے سے داخل ہوگا، متعدد دروازوں سے نہیں (توجہ کیجئے گا)۔

ممکن ہے یہ تعبیر اس لئے ہو کہ اس آیت کے مخاطبین جمع کی صورت میں ہیں اور طبعی طور پر جب ایک جماعت کسی ایسی جگہ داخل ہونا چاہیے جس کے متعدد دروازے ہوں تو ہر گروہ کسی ایک دروازے سے داخل ہوگا، پس مجموعی طور پر وہ متعدد دروازوں ہی سے داخل ہوں گے یا یہ کہ ہر گروہ ایک خاص عنوان کے تحت اُن میں سے کسی ایک دروازے سے داخل ہوگا جو اسی گروہ کے لئے مخصوص ہوگا، یہ بھی احتمال ہے کہ اس آیت کے مخاطبین دوزخ کے نچلے طبقہ میں قرار پائیں اور واضح ہے کہ انہیں اس کے لئے مختلف دروازوں اور طبقات سے گزرنا پڑے گا۔

بہرحال اس آیت میں صرف جہنم کے دروازوں کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے لیکن ان کی تعداد کے بارے میں کوئی وضاحت نہیں کی گئی دوسرے لفظوں میں جہنم اس ہولناک جیل کی مانند ہے جس کی مختلف بیرکیں اس طرح ہوں کہ ایک بیرک سے گذر کر دوسری میں جانا پڑتا ہو، جو لوگ بہت ہی زیادہ گمراہ ہوں گے اور جن کا ٹھکانا سب سے پست یا جہنم کی تہ یا اس کے نزدیک ہوگا، انہیں یقیناً ان تمام بیرکوں میں سے گزرنا پڑے گا۔

تیسر آیت میں یہی بات ایک اور انداز میں بیان کی ہے، ارشاد ہوتا ہے''اور جو لوگ کافر ہو گئے ہیں گروہوں کی صورت میں جہنم کی طرف دھکیل دیئے جائیں گے، جب وہ اس تک پہنچیں گے تو اس کے دروازے کھول دیئے جائیں گے''۔**وَسِيۡقَ الَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا رَبَّهُمۡ اِلَى الۡجَنَّةِ زُمَرًا‌ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوۡهَا وَفُتِحَتۡ اَبۡوَابُهَا** ﴿الزمر: ۷۳﴾ ۔

گویا یہ تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جہنم اُن کی آمد کو جان لے گا، جب وہ نزدیک پہنچیں گے تو اچانک دروازے کھل جائیں گے، یہ ناگہانی منظر ان میں زیادہ خوف پیدا کردے گا، جب کہ یہی مفہوم بہشتیوں کے بارے میں بھی آیا ہے اور یہ ان کی مزید خوشی اور سرور کا

---

[1] بحار، ج ۸ صفحہ ۲۵۸ حدیث ۱۱۔

باعث بنے گا، ایک بار پھر ہم یہاں جہنم کے دروازوں کی تعداد کا ذکر پاتے ہیں جب کہ ان کی تعداد بیان نہیں ہوئی، یہاں پھر جہنم کے تمام دروازوں کے کھلنے کے بارے میں گفتگو ہورہی ہے، جب کہ ہر گروہ ایک دروازے سے داخل ہوگا، ممکن ہے اس تعبیر کا انتخاب ان دلیلوں کی بنا پر ہو جن کی طرف اس سے پہلے کی آیت میں اشارہ ہوا ہے۔

چوتھی آیت میں دروازوں سے متعلق گفتگو نہیں ہورہی بلکہ صرف جہنم کے نچلے طبقے کے بارے میں بات ہورہی ہے جو ہمیں بتاتی ہے کہ جہنم کے مختلف طبقے ہیں، فرمایا گیا ہے: منافقین جہنم کے نچلے طبقے میں قرار پائیں گے اور تم ہرگز ان کا کوئی مددگار نہیں پاؤ گے۔ ''ان المنافقین فی الدرك الاسفل من النار ولن تجد لهم نصیرا'' عربی زبان میں اوپر کی طرف جانے والی سیڑھیوں کو 'درجہ' اور نیچے کی طرف جانے والی سیڑھیوں (تہ خانے کی سیڑھیوں کی طرح) کو 'درکہ' کہتے ہیں، یہ کلمہ ''درک'' کے مادہ سے (''مرگ'' کے وزن پر) کسی چیز تک پہنچنے کے معنی میں ہے، لہٰذا سمندر یا کنوئیں کی تہہ میں اترنے کے لئے استعمال ہونے والی ایک دوسرے سے متصل کی گئی رسی کو درک (فلک کے وزن پر) کہا جاتا ہے، سمندر کی سب سے گہری تہہ کو یا کسی بھی جگہ کی گہرائی کو درک (''مرگ'' کے وزن پر) کہا جاتا ہے، بنا بریں آیت شریفہ میں لا درک کی الاسفل سے توصیف، تاکید اور قید توضیحی کے معنی میں ہے۔

فخر رازی اپنی تفسیر میں ''درک'' کی تفسیر کسی چیز کی گہرائی کے دورترین نقطے کے معنی میں کرنے کے بعد کہتا ہے: اس قرآنی تعبیر کا ظاہر یہ ہے کہ جہنم کے کچھ طبقات ہیں اور ظاہرا جہنم کے طبقوں میں سخت ترین طبقہ سب سے نچلہ طبقہ ہی ہے۔ [۱]

یہ امر قابل توجہ ہے کہ اس میں جہنم کی اتھاہ گہرائی کا ذکر منافقوں کے لئے ہوا ہے اور یہ بات ہمیں واضح طور پر بتاتی ہے کہ نفاق بد ترین گناہ اور جہنم کا پست ترین طبقہ ہے، اس کی دلیل واضح ہے اور وہ یہ کہ منافقوں کی جانب سے جو خطرہ اسلامی معاشرے کو لاحق ہوتا ہے ان کفار اور دشمنوں کے خطرے سے کہیں زیادہ ہے جو صراحت کے ساتھ اپنی دشمنی اور کفر کا اظہار کرتے ہیں۔

ایک حدیث میں فاسد علماء کے بارے میں ہے:

ان من العلمآء من یحب ان یخزن علمه، ولا یوخذ عنه، فذاك فی الدرك الاسفل من النار۔

بعض علماء ایسے ہیں جو اپنے علم کا اس طرح ذخیرہ کرنا چاہتے ہیں کہ اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے یہ لوگ آگ کے درک اسفل میں ہوں گے۔ [۲]

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں بعض روایتوں سے بھی یہ استفادہ ہوتا ہے کہ جہنم کے سات دروازوں میں ہر ایک کے لئے خاص لوگ ہیں،

---

[۱] تفسیر فخر رازی۔ جلد ۱۱، صفحہ ۸۷۔

[۲] بحار الانوار۔ جلد ۸ صفحہ ۳۱ حدیث ۱۱۔

مثلاً ایک دروازے سے فرعون، ہامان اور قارون داخل ہوں گے، دوسرے دروازے سے بنی امیہ، ایک اور دروازے سے مشرکین اور اسی طرح۔۔۔۔۔[1]

واضح ہو کہ فرعون، ہامان اور قارون یا بنی امیہ کا ان دروازوں سے داخل ہونا ان کے اعمال اور عقائد کی وجہ سے ہوگا، اسی دلیل کی بنا پر جو لوگ ان کے راستے پر اور ان کے علمی اور عقیدتی مکتب کے پیروکار ہوں گے قاعدے کے مطابق وہ بھی انہی دروازوں سے داخل ہوں گے، لہٰذا ''دروازوں'' اور انسان کے عقائد و اعمال کے درمیان رابطہ واضح ہو جاتا ہے۔

(۴) دوزخیوں کے جسمانی عذاب

اشارہ:

جس طرح الٰہی جزاؤں اور بہشتی نعمتوں کو روحانی اور جسمانی دو قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے جس کی تفصیل گزر چکی، اسی طرح عذاب دوزخ کو بھی روحانی اور جسمانی دو قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے، چونکہ ہم جانتے ہیں کہ معاد کے دو رخ ہیں اور ہر رخ اپنے تناسب سے سزا اور جزا کا متقاضی ہے۔

علاوہ ازیں اس دنیا میں انسانی اعمال بھی دو طرح کے ہیں (قلبی اور روحانی اعمال) اور (مادی اور جسمانی اعمال)، بنابرایں یہ ممکن نہیں کہ وہاں پر ایک طرح کی سزا یا جزا موجود ہو۔

قرآن کی مختلف آیتیں اور اسلامی روایات بھی اس مدعا پر روشن دلیل ہیں، اس اشارے کے ساتھ ہم پہلے دوزخیوں کی جسمانی سزاؤں کا ذکر کرتے ہیں اور اس بارے میں نازل شدہ قرآنی آیتوں کا مندرجہ ذیل عناوین کے تحت مطالعہ کرتے ہیں:

الف۔ دوزخ میں عذاب کی شدت

ب۔ جہنمیوں کی غذا اور مشروبات

ج۔ جہنمیوں کے لباس

د۔ جہنمیوں کے دیگر جسمانی عذاب

دوزخ میں عذاب کی شدت

۱۔ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِىِٕذٍۢ بِبَنِيْهِ ۝١١ وَصَاحِبَتِهٖ

[1] بحار الانوار۔ جلد ۸ صفحہ ۲۸۵ حدیث ۱۱۔

وَاَخِيْهِ۝۱۲ وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُـْٔوِيْهِ۝۱۳ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ ثُمَّ يُنْجِيْهِ۝۱۴

(المعارج)

۲۔ فَيَوْمَىِٕذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهٗٓ اَحَدٌ۝۲۵ وَّلَا يُوْثِقُ وَثَاقَهٗٓ اَحَدٌ۝۲۶ (الفجر)

۳۔ فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ۝۲۴ (الغاشية)

۴۔ اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِيْ ثَلٰثِ شُعَبٍ۝۳۰ لَّا ظَلِيْلٍ وَّلَا يُغْنِيْ مِنَ اللَّهَبِ۝۳۱ اِنَّهَا تَرْمِيْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ۝۳۲ كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ۝۳۳ (المرسلات)

۵۔ وَيَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى۝۱۱ الَّذِيْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى۝۱۲ ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى۝۱۳ (الاعلیٰ)

ترجمہ:

۱۔ گناہگار چاہے گا اپنے بچوں کو اس دن کے عذاب کے بدلے میں قربان کردے، اپنی بیوی اور بھائی کو اور اپنے اس کنبے کو جو ہمیشہ اس کی حمایت کرتا تھا، اور روئے زمین کے تمام لوگوں کو تاکہ اس کی نجات کا باعث بن سکیں۔

۲۔ اس روز کوئی شخص اس کی طرح عذاب نہیں کرے گا اور کوئی بھی اس کی طرح کسی کو نہیں جکڑے گا۔

۳۔ خدا اس کو بہت بڑا عذاب دے گا۔

۴۔ چلے جاؤ تین حصوں والے سائے کی طرف (آگ کے گلوگیر دھوئیں) کی طرف جو نہ آرام بخش ہے اور نہ ہی آگ کے شعلوں کو روکے گا، اتنے بڑے انگارے برسائے گا جیسے محل، گویا (سرعت اور کثرت میں) زرد رنگ کے اونٹوں کی طرح ہوں گے جو ادھر اُدھر بکھر جاتے ہیں۔

۵۔ لیکن بدبخت ترین لوگ اس (الٰہی تذکر) سے دوری اختیار کریں گے، وہی شخص جو عظیم آگ میں داخل ہوگا، پھر اس آگ میں نہ مرے گا نہ جائے گا۔

تفسیر

قیامت میں دوزخ کے عذاب کی شدت اتنی زیادہ ہوگی کہ قرآن پہلی زیر بحث آیت میں فرماتا ہے کہ گنہگار چاہے گا کہ اس دن کے عذاب کے بدلے میں اپنی اولاد کو قربان کر دے، یہاں تک کہ اپنی بیوی، بھائی اور قبیلے کو بھی جس نے ہمیشہ اس کی حمایت کی ہے اور زمین کے تمام لوگوں کو بھی تاکہ اس کی نجات کا باعث ہو سکے۔"یود المجرم لو یفتدی من عذاب یومئذ ببنیه۔ وصاحبته واخیه۔ وفصیلته التی تویه۔ ومن فی الارض جمیعا ثم ینجیه"۔[1]

دوسری آیت میں مجرموں کی قیامت میں بیداری اور الٰہی ذمہ داریوں کی انجام دہی میں کوتاہی پر شدید افسوس کی طرف اشارہ کرنے کے بعد فرمایا ہے: اس دن خدا اُسے ایسی سزا دے گا کہ کوئی بھی اس طرح کی سزا نہیں سے گا اور اُسے اس طرح جکڑے گا کہ کسی نے بھی کسی اور کو اس طرح نہیں جکڑا ہوگا "فیومئذ لا یعذب عذابه احد۔ ولا یوثق وثاقه احد"۔[2]

اس لحاظ سے اس کی سزا بے مثال اور اس کا جکڑنا بے سابقہ ہے۔

یہ تعبیریں عموماً تربیتی ثمرہ رکھتی ہیں اور اس لئے ہیں کہ انسان الٰہی سزاؤں کو اہمیت دے، چونکہ غالبا لوگوں کے ذہن میں یہ ہوتا ہے کہ خدا "ارحم الراحمین" ہے، اپنے بندوں کو ہرگز سزا نہیں دے گا یا پھر اس کی سزائیں بہت نرم ہوں گی اور یہی سوچ سبب بنتی ہے کہ وہ گناہوں پر جری ہوں اور مختلف معاصی میں آلودہ ہوجائیں، لہٰذا قرآن پوری صراحت سے ان دردناک سزاؤں کے بارے میں گفتگو کرتا ہے تاکہ لوگ خام خیالیوں کو ذہنوں سے نکال دیں اور اپنے اعمال کا خیال رکھیں۔

یہی معنی کسی اور تعبیر کے ساتھ تیسری آیت میں بیان ہوا ہے، حق کی طرف پیٹھ پھیرنے والے کافروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: خدا اس کو بہت بڑے عذاب کی صورت میں سزا دے گا، "فیعذبه الله العذاب الاکبر"۔

عذاب اکبر (سخت ترین عذاب) قیامت کے عذاب کی طرف اشارہ ہے جو دنیا کے عذاب کے مقابلہ میں ہے اور جسے ادنی سے تعبیر کیا گیا ہے، جیسا کہ سورہ الم سجدہ کی آیت ۲۱ میں ہے: "ولنذیقنهم من العذاب الادنی دون العذاب الاکبر"۔

ہم انہیں عذاب اکبر سے پہلے عذاب ادنیٰ چکھائیں گے۔

یہاں یہ امر قابل غور ہے کہ دنیا میں بعض اوقات گناہگار اقوام کے لئے الٰہی سزائیں (مثل قوم لوط کے لئے) اتنی شدید ہوتی تھیں کہ

---

[1] "فصیله"، "فصل" کے مادہ سے جدا ہونے کے معنی میں ہے اور یہاں پر ایسے قبیلے اور کنبے کے معنی میں ہے جس سے انسان وجود میں آیا ہے۔

[2] "عذابه" اور "ثاقه" میں ضمیر خدا کی طرف پلٹتی ہے، بعض مفسروں نے (مثلاً آلوسی نے روح المعانی میں اور برسوئی نے روح البیان میں) اس احتمال کا اظہار کیا ہے کہ یہ ضمیر انسان کی طرف پلٹتی ہے لیکن یہ احتمال بہت بعید نظر آتا ہے۔

ان کی تمام آبادی، شہر، زندگی اور اجساد درہم برہم ہو جاتے تھے، لیکن پھر بھی یہ تمام سزائیں قیامت کے عذاب کے مقابلے میں ”عذاب اصغر“ ہیں اور یہ امر قیامت کے عذاب فوق العادہ کی شدت کی خبر دیتا ہے۔

چوتھی آیت میں جہنمیوں کے عذاب کا ایک اور نمونہ بیان ہوا ہے، قیامت اور الٰہی عدالت کے منکروں سے کہا جائے گا: چلے جاؤ تین حصوں والے سائے (آگ کے حبس پیدا کرنے والے دھوئیں) کی طرف جس سے نہ چین آتا ہے اور نہ ہی وہ آگ کے شعلوں کو روک سکتا ہے (بلکہ اس کے ہولناک آثار میں اضافہ کرتا ہے) اتنے بڑے انگارے برساتا ہے جتنے بڑے محل ہوتے ہیں، گویا زرد رنگ کے اونٹ ہیں (جو تیزی سے ہر طرف پھیلتے ہیں) ”انطلقوا الی ظل ذی ثلث شعب۔ لا ظلیل ولا یغنی من اللھب۔ انھا تمی بشرر کالقصر۔ کانہ جمالۃ صفر“۔

اس آیت میں جہنم کی آگ کی شدت کے بارے میں عجیب نکتے بیان ہوئے ہیں۔

پہلا نکتہ یہ کہ اس عظیم عدالت کے منکروں اور مختلف گناہوں سے آلودہ لوگوں سے کہا جائے گا کہ سائے کی طرف چلے جاؤ، لیکن کون سا سایہ؟ حبس کرنے والے دھوئیں سے بننے والا سایہ جس کے تین حصے ہوں گے، سر کی طرف ایک حصہ اور دو حصے دائیں اور بائیں طرف مختصراً یہ کہ ایسا ہولناک سایہ جو ہر طرف سے ان کا احاطہ کئے ہوگا، نہ ایسا سایہ جو بہشت کے باطراوت اور آرام بخش درختوں اور محل اور چھت کا ہوتا ہے بلکہ گرم اور جلانے والا سایہ۔

اس سائے کے متعدد حصے ہوں گے، ہر ایک آگ کے انگاروں سے بھرا ہوگا محلوں کی طرح کے عظیم انگارے یا زرد رنگ کے اونٹوں کی طرح جو بہت تیزی سے ادھر اُدھر دوڑتے ہیں، جہاں سایہ اس طرح کا ہو وہاں آگ کس طرح کی ہوگی؟ کیسی دقیق اور بیدار کنندہ تعبیر ہے، لوگ ہمیشہ گرمی سے نجات کے لئے سائے کی طرف جاتے ہیں جب کہ یہاں آگ کے دھوئیں کے سائے کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ہے، اگر آیت کے نزول کے زمانے میں اس کا تصور مشکل تھا تو آج کے ہولناک جنگی میدان جہاں ٹنوں وزنی بم پھنکے جاتے ہیں اور ہر چیز دھوئیں اور آگ کی لپیٹ میں آجاتی ہے اس سے اُس عظیم عذاب کی ایک ہلکی سی تصویر ذہن میں آسکتی ہے جس میں آگ کی عظیم چنگاریاں اور آتش انگارے اپنے اردگرد کے ایک وسیع حصے کو شراروں سے بھر دیتے ہیں، یہ تو ابھی اس آگ کا سایہ ہے۔[1]

”قصر“ کی تعبیر ممکن ہے ستمگروں کے محلوں کی طرف اشارہ ہو، آتش جہنم کی چنگاریوں کی ان محلوں سے تشبیہ بہت معنی خیز ہے جب کہ یہ محل ہمیشہ محروموں کے دلوں کو آگ لگاتے تھے، اسی طرح ایک طرح کے زرد رنگ کے اونٹوں سے تشبیہ جو مستکبروں کی بے حساب دولت کی علامت ہے اس مورد میں ایک اور پرمعنی تعبیر ہے، ممکن ہے بعض لوگ یہ سمجھیں کہ ان شراروں کی کبھی محلوں سے تشبیہ اور کبھی زرد اونٹوں سے

---

[1] بعض مفسرین معتقد ہیں کہ (انھا) کی ضمیر آگ (النار) کی طرف پلٹتی ہے جو مونث مجازی ہے! گرچہ ”نار“ کا آیہ میں ذکر نہیں ہوا تاہم دھوئیں کے سائے کے قرینے سے ہم یہ بات سمجھ سکتے ہیں، لیکن بہتر یہ ہے کہ ضمیر اس حبس کرنے والے سائے کے تینوں حصوں کی طرف پلٹے کیونکہ مقصد یہ ہے کہ اس سائے کے ہولناک آثار معلوم ہوں تاکہ بطریق اولیٰ آگ کی کیفیت واضح ہو جائے۔

تشبیہ کے درمیان کوئی ہم آہنگی نہیں ہے کیونکہ ایک چیز بہت بڑی اور دوسری نسبتاً چھوٹی ہے،لیکن توجہ دینی چاہیے کہ ان دونوں میں سے ہر تشبیہ ایک خاص جہت کی طرف اشارہ ہے،پہلی تشبیہ ان شراروں کی بڑائی کے لئے ہے اور دوسری تشبیہہ کثرت،سرعت اور ہر طرف پھیلنے کے لئے ہے جس طرح اونٹ بیابانوں میں بکھر جاتے ہیں یا پھر ان چنگاریوں کے بابین تفاوت کے لئے ہے،اس کے بڑے انگارے ستمگروں کے محلوں کی مانند اور چھوٹی چنگاریاں زرد رنگ کے اونٹوں کی طرح۔

جمالة"جمل'' کی جمع ہے جو اونٹ کے معنی میں ہے حجر اور حجارہ کی مانند اور صفر (قفل کے وزن پر) اصفر کی جمع ہے جس کا معنی زرد رنگ ہے اور کبھی کبھی گہرے سیاہی مائل رنگ پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے لیکن یہاں پہلا معنی ہی مناسب ہے۔

پانچویں اور آخری آیت میں ایک اور تعبیر نظر آتی ہے جو جہنم کے شدید عذاب کی حکایت کرتی ہے،ارشاد ہوتا ہے: بدترین لوگ اس (خدا کے بیدار کنندہ تذکر) سے دوری اختیار کریں گے پھر جو شخص اس عظیم آگ میں داخل ہوگا وہ نہ اس میں جئے گا اور نہ مرے گا۔

ویتجنبها الا شقى الذى يصلى النار الكبرى ثم لا يموت فيها ولا يحيى۔

یہ عذاب جہنم کی شدت کی ایک تصویر ہے جس میں جہنمی ہمیشہ موت اور زندگی کی درمیانی حالت میں گرفتار ہوں گے، (نہ اُن کو موت آئے گی تا کہ وہ کوئی چیز درک نہ کریں اور ان کو آرام ہو اور نہ اس حالت کو زندگی کا نام دیا جا سکتا ہے) اسی طرح جیسے دنیا کے شدید عذاب میں ہوتا ہے کہ انسان زندگی اور موت کی کشمکش میں ہوتا ہے اور اس طرح ہمیشہ موت اور زندگی کے درمیان ہاتھ اور پاؤں مارتا ہے۔

عظیم آگ (النارالکبری) کی تعبیر چھوٹی آگ کے مقابلہ میں ہے جو اس دنیا کے عذاب کی طرف اشارہ ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث میں ہے:

ان ناركم هذه جزء من سبعين جزء ا من نارجهنم وقد اطفئت سبعين مرة بالمآء ثم التهبت! ولو لا ذلك ما ستطاع ادمى ان يطيقها۔

تمہاری یہ آگ جہنم کی ستر اجزاء والی آگ کا ایک جز ہے جسے ستر بار پانی ڈال کر بجھایا گیا لیکن یہ پھر شعلہ ور ہوگئی، اگر ایسا نہ ہوتا تو کوئی انسان اس کو برداشت کرنے کی طاقت نہ رکھتا یعنی اس کے قریب نہیں جا سکتا تھا، [1] یہی مفہوم علی علیہ السلام نے پیغمبر اکرمؐ سے بھی نقل کیا ہے۔

بعض مفسرین نے اس احتمال کا بھی اظہار کیا ہے کہ ''نار کبریٰ'' جہنم کے ایک حصے کی طرف اشارہ ہے جس کا عذاب زیادہ شدید ہے

---

[1] تفسیر امام حسن عسکریؑ، بحارالانوار جلد ۸ صفحہ ۲۸۸ حدیث ۲۱ کی نقل کے مطابق۔

(یعنی جہنم کا سب سے نچلا طبقہ)[1]، لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب لگتی ہے، یہ سب جہنم کی آگ کے وسیع وعریض پہلوؤں اوراس کے دردناک عذاب کی شدت کا گوشہ تھا۔

ب: جہنمیوں کی غذا اور مشروبات

اشارہ:

بارہا ہم کہہ چکے ہیں کہ معاد کے جسمانی اور روحانی دو پہلو ہیں، اس لئے جزا اور سزا بھی دو طرح کی ہیں، اس مورد میں جو امور جسمانی لذت کا سبب یا عذاب کا باعث بن سکتے ہیں، غذا اور مشروبات ہیں ایک نامناسب بدبودار، بدمزہ، ناگوار گرم اور سوزاں اور گلے میں اٹکنے والی غذا، ایک دردناک عذاب ہے، اس کے مقابلے میں ایک لذیز اور پسندیدہ مشروب یا غذا جسم کی لذت کا باعث اور بدن کی راحت کا سبب ہے حتی کہ یہ انسان کی روح پر بھی اثر انداز ہوتی ہے اور اس کا سرور اور نشاط بخشتی ہے جب کہ اس کے برعکس ایک ناگوار اور بدمزہ کھانا یا مشروب روح کی ناراحتی کا سبب بھی ہے اور جسم کے عذاب کا باعث بھی۔

قرآن مجید نے جہنم کے تربیتی پہلو کو شدت بخشنے، مجرموں اور بدکرداروں کو شدت سے خبردار کرنے اور اُن کو برے اعمال سے روکنے کے لئے جہنمیوں کی غذاؤں اور مشروبات کی کیفیت سے پردہ اٹھایا اور اس کے ایک گوشے کی تصویر کشی کی ہے۔

اس مورد میں وارد ہونے والی تعبیریں اتنی خوفناک اور بیدارکنندہ ہیں کہ ہر انسان کو متاثر کرسکتی ہیں، اس اشارے کے ساتھ ہم قرآن کی طرف لوٹ آتے ہیں اور مندرجہ ذیل آیات کو جان ودل سے پڑھتے ہیں:

۱۔ اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ طَعَامُ الْاَثِيْمِ كَالْمُهْلِ ۚ يَغْلِيْ فِي الْبُطُوْنِ كَغَلْيِ الْحَمِيْمِ

۲۔ اَذٰلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا اَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ اِنَّا جَعَلْنٰهَا فِتْنَةً لِّلظّٰلِمِيْنَ اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْٓ اَصْلِ الْجَحِيْمِ طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ فَاِنَّهُمْ لَاٰكِلُوْنَ مِنْهَا فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ

۳۔ فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيْمٌ وَّلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ لَّا يَاْكُلُهٗٓ اِلَّا

---

[1] المیزان جلد ۲۰ اسی آیت کے ذیل میں۔

الْخَاطِئُونَ

۴۔ تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ

۵۔ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوْهَ بِئْسَ الشَّرَابُ وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا ۲۹

۲ الکھف:۲۹

۶۔ اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا لِّلطَّاغِيْنَ مَاٰبًا لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا اِلَّا حَمِيْمًا وَّغَسَّاقًا

۷۔ وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ مِّنْ وَّرَآئِهٖ جَهَنَّمُ وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ يَّتَجَرَّعُهٗ وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ وَمِنْ وَّرَآئِهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ

ترجمہ:

۱۔ زقوم کا درخت گناہگاروں کی غذا ہے جو پگھلے ہوئے تانبے کی طرح پیٹ میں ابلتا ہے، اس کا اُبلنا کھولتے ہوئے پانی کی طرح ہے۔

۲۔ کیا یہ (بہشت کی جاوداں نعمتیں) بہتر ہیں یا زقوم کا (نفرت انگیز) درخت؟ ہم نے اس کو ظالموں کی دردوالم کا باعث قرار دیا ہے۔ یہ ایسا درخت ہے جو جہنم کی تہہ سے اُگتا ہے، اس کے شگوفے شیاطین کے سروں کی طرح ہیں، وہ (مجرم) اس میں سے کھائیں گے اور اسی سے اپنا پیٹ بھریں گے۔

۳۔ آج یہاں اس کا کوئی مہربان دوست نہیں ہے اور نہ ہی پیپ کے علاوہ کوئی کھانا، یہ ایسی غذا ہے جسے گناہگاروں کے علاوہ کوئی نہیں کھائے گا۔

۴۔ اور وہ دہکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے اور انہیں ایک کھولتے ہوئے چشمے کا پانی پلایا جائے گا، ان کا کھانا ضریع (ایک خشک اور تلخ و بدبودار جھاڑی) کے علاوہ کچھ نہیں ہوگا جو نہ ان کو تنومند کرے گا اور نہ ہی بھوک مٹائے گا۔

۵۔ ہم نے ستم گروں کے لئے ایسی آگ تیار کر رکھی ہے جس کی قناتیں ان کو ہر طرف سے گھیرے ہوں گی اور اگر وہ پانی طلب کریں گے تو پگھلے ہوئے تانبے کی طرح کھولتا پانی انہیں دیا جائے گا جو چہروں کو جھلسا دے گا، کیا برا پانی ہے اور کتنا برا ٹھکانا ہے!

۶۔ جہنم ایک بڑی کمین گاہ ہے اور سرکشوں کی واپسی کی جگہ، اس میں مدتوں رہیں گے، وہاں پر نہ ٹھنڈی چکھیں گے اور نہ ہی مشروب دل پسند، سوائے کھولتے ہوئے پانی اور بہتی ہوئی پیپ کے۔

۷۔ انہوں نے (خدا سے) فتح اور کامرانی کی دعا مانگی اور ہر سرکش اور منحرف ہلاک اور بابود ہوا، اور جہنم اس کے پیچھے ہے اور اُسے بدبودار متعفن پانی پلایا جائے گا، اُسے زحمت سے گھونٹ گھونٹ کر کے پینا پڑے گا، وہ اپنی مرضی سے اس کے پینے پر کبھی راضی نہ ہو گا اور موت ہر جگہ سے اس کی جانب لپکے گی، لیکن اس کے باوجود وہ نہیں مرے گا، اس کے پیچھے ایک شدید عذاب ہوگا۔

تفسیر:

زقوم۔حمیم۔غسلین۔ضریع۔غساق۔صدید:

پہلی آیت میں جہنمیوں کی غذا کے بارے میں پہلی تعبیر دکھائی دیتی ہے، اور وہ ہے زقوم کا درخت۔ فرمایا گیا ہے: زقوم ضرور گناہگاروں کی غذا ہے جو پگھلے ہوئے تانبے کی طرح پیٹوں میں ابلتا ہے اور یہ یوں ابلتا ہے جیسے کھولتا ہوا پانی "ان شجرت الزقوم۔ طعام الاثیم۔ کالمھل یغلی فی البطون۔ کغلی الحمیم"۔

ارباب لغت اور مفسرین نے (زقوم) کے کلمہ اور اس کے معنی کے بارے میں کافی گفتگو کی ہے، یہ لفظ قرآن مجید میں تین بار آیا ہے [۱]۔ بعض نے اسے عربی کلمہ "زقم" کے مادہ سے نکلنے کے معنی میں سمجھا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ کلمہ عربی میں نہیں تھا اور افریقی علاقے حبشہ سے عربی معاشرے میں آیا ہے کچھ مفسرین اور اہل لغت نے اسے ایک تلخ اور بدبودار جڑی بوٹی کا نام قرار دیا ہے، جس کے چھوٹے چھوٹے پتے ہوتے ہیں اور یہ جزیرہ نمائے عرب کی سرزمین "تہامہ" میں اُگتی تھی اور مشرکین اس سے آشنا تھے، ایسی جڑی بوٹی جس کا رس انتہائی تلخ اور کھٹا ہے اس طرح کی اگر بدن کے کسی حصے سے لگ جائے تو وہ جگہ سوچ جائے گی۔ [۲]

راغب مفردات میں کہتا ہے کہ زقوم دوزخیوں کی ہر تنفر آمیز غذا کو کہتے ہیں، بعض مفسرین نے کہا ہے کہ جب یہ کلمہ قرآن مجید میں نازل ہوا تو کچھ قریش کے کفار نے کہا کہ ہم نے اپنی زمینوں میں زقوم نام کا کوئی پودا نہیں دیکھا، افریقہ کی سرزمین سے ایک شخص ان سے ملا انہوں نے اس سے پوچھا کہ کیا تم زقوم کو پہچانتے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ یہ لغت ہمارے نزدیک مکھن اور کھجوروں کے معنی میں ہے! (اس نے مذاق اڑاتے ہوئے یہ بات کہی یا یہ کلمہ ان کے درمیان واقعاً اسی معنی میں استعمال ہوتا تھا، یہ نہیں معلوم، بہتر حال مسلم طور پر قرآن میں یہ ایک درخت یا پودے کے معنی میں بیان ہوا ہے)۔

جب یہ بات ابوجہل نے سنی تو اس نے مذاق اُڑاتے ہوئے اپنی کنیز سے کہا "زقمینا" ہمارے لئے زقوم لے آؤ اور اس کی مراد مکھن

---

[۱] صافات، ۶۲ دخان، ۴۳ واقعہ ۵۲۔

[۲] تفسیر مجمع البیان، روح البیان، روح المعانی۔

اور کھجوریں تھیں، اور اپنے دوستوں سے کہا کرتا تھا کہ تم بھی زقوم کھایا کرو، یہ وہی چیز ہے جس سے محمدؐ ہمیں ڈراتا ہے اور سمجھتا ہے آگ سے درخت اُگیں گے جب کہ آگ درختوں کو جلاتی ہے۔[1]

یہ امر باعث بنا کر بعض ارباب لغت اور مفسرین نے اسے زقوم کا ایک معنی قرار دیا اور سمجھے کہ مذکورہ تفسیر ایک حقیقی تفسیر ہے جیسا کہ لسان العرب میں جوہری سے نقل ہوا ہے کہ ''**الزقوم اسم طعام لهم فيه تمر و زبد**'' زقوم عربوں کی ایک ایسی غذا کا نام ہے جس میں کھجور اور مکھن ہوتا ہے۔

دوسری آیتیں جہنمیوں کی ناپسندیدہ غذا ''زقوم'' کی صفات کو زیادہ وضاحت سے بیان کرتی ہیں، ارشاد ہوتا ہے کیا وہ (بہشت کی جاوداں نعمتیں) پذیرائی کے لئے بہتر ہیں یا زقوم کا (نفرت انگیز) درخت؟۔۔۔۔۔۔۔ وہ ایسا درخت ہے جو جہنم کی تہہ سے اگتا ہے جس ے شگوفے شیاطین کے سروں کی طرح ہیں، وہ (مجرم) لوگ اس سے کھائیں گے اور اپنا پیٹ بھریں گے۔'' **اذلك خير نزلا ام شجرة الزقوم۔ انا جعلنها فتنة للظلمين۔ انها شجرة تخرج في اصل الجحيم۔ طلعها كانه رئوس الشيطين۔ فانهم لا كلون منها فما لون منها البطون**''۔

یہاں پر ہمیں سب سے پہلے ابوجہل کا اعتراض نظر آتا ہے جو اس نے تمسخرانہ انداز میں کیا کہ کیا کبھی کوئی درخت بھی آگ میں اُگا ہے؟ آگ تو درخت کی دشمن ہے اور اُسے جلا دیتی ہے، لیکن یہ مغرور ظالم اور مفسد لوگ اس نکتے سے غافل تھے کہ اُس دنیا کی زندگی پر حکم فرما اصول اس دنیا پر حاکم اصولوں سے بہت مختلف ہیں، کوئی پودا یا درخت اگر جہنم کی تہہ سے اُگے تو جہنم ہی کے رنگ کا ہوگا اور وہ جہنمی ماحول میں پرورش پائے گا، وہ ہمارے باغوں میں اُگنے والے پودوں کی طرح نہیں ہوگا، حتیٰ کہ ہماری دنیوی زندگی میں بھی اس طرح کے عجائبات نظر آتے ہیں مثلاً برف کے اندر جاندار پرورش پاتے ہیں، اس سے اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ زندہ موجودات کی حیات کے ماحول کا ہمیشہ ہمارے اطراف کی زندہ چیزوں کے ماحول کے مطابق ہونا ضروری نہیں ہے، اصولی طور پر کیا جہنمی انسان کا جہنم میں زندہ رہنا عجیب نہیں؟ پھر انسان اور کسی پودے کے مابین کیا فرق ہے؟!

لیکن اس درخت کے شگوفوں کو شیاطین کے سروں سے تشبیہہ دی گئی ہے جب کہ ان آیات کے مخاطبین نے نہ شیطانوں کا دیکھا تھا اور نہ ہی ان کے سروں کو، یہ شاید اس لئے ہو کہ ہر ناپسندیدہ اور وحشت ناک چیز کو شیطان سے تشبیہہ دی جاتی ہے جس طرح ہر خوبصورت چیز کو فرشتے سے تشبیہہ دی جاتی ہے باوجود اس کے کہ کسی نے فرشتہ کو نہیں دیکھا، مصر کی خواتین نے یوسفؑ کی صورت کے بارے میں کہا:

اس کی صورت تو بالکل فرشتے کی طرح ہے۔

اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيۡمٌ (يوسف:٣١)

ہم اپنی روزمرہ کی گفتگو میں کہتے ہیں کہ فلاں شخص کی صورت ''دیو'' کی طرح ہے جب کہ کسی نے دیو کو دیکھا نہیں، بلکہ اصولاً دیو ایک

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۸ صفحہ ۵۵۲۹ صافات کی آیت ۶۲ کے ذیل میں۔

وہی چیز ہے۔

یہ سب ایسی تشبیہات ہیں جو کلمہ شیطان اور فرشتہ کے مفہوم کے بارے میں ہماری تصویر ذہن کی اساس پر وجود میں آئی ہیں اور یہ عموماً خوبصورت، گویا اور رسا تشبیہات ہیں۔

اس لحاظ سے زقوم نہ صرف بدبودار، بدمزہ اور ناپسندیدہ غذا ہے بلکہ ظاہری لحاظ سے بھی بہت بدنما ہے، دنیا کے بہت سے زہریلے پودوں کے برعکس جو ظاہرا خوبصورت ہوتے ہیں۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ شیطان کا ایک معنی بدصورت سانپ ہے اور زقوم کے شگوفے کو اس سے تشبیہہ دی گئی ہے لیکن یہ تفسیر بعید لگتی ہے کیونکہ شیطان کا اس طرح کے مفاہیم میں استعمال بہت ہی نادر ہے۔

ان آیات کے تیسرے حصے میں جہنمیوں کی ایک غذا ''غسلین'' کا نام لیا گیا ہے، فرماتا ہے (اپنے اعمال کی وجہ سے) آج یہاں پر ان کا کوئی مہربان دوست نہیں ہے اور نہ ہی غسلین کے علاوہ کوئی غذا، ایسی غذا جسے گناہگاروں کے علاوہ کوئی نہیں کھائے گا۔'' فلیس له الیوم ههنا حمیم۔ ولا طعام الا من غسلین۔ لا یاکله الا الخاطون''۔

لفظ ''غسلین'' جو ایک ہی بار قرآن مجید میں آیا ہے غسل کے مادہ سے (نسل کے وزن پر) دھونے کے معنی میں ہے، راغب مفردات میں کہتا ہے غسلین ایسا پانی ہے جو کفار کے جسم دھونے سے دوزخ میں گرتا ہے، لیکن مفسرین اور ارباب لغت کے نزدیک یہ ایسی پیپ ہے جو جہنمیوں کے جسم سے بہتی ہے اور چونکہ اس پانی سے ملتی جلتی ہے جس سے انسان نہانے دھونے کا کام لیتا ہے، اس لئے اس کو غسلین کا نام دیا گیا ہے اور ہوسکتا ہے راغب کی مراد بھی مفردات میں یہی معنی ہو، لیکن بعض نے (زقوم) اور غسلین کو ایک معنی میں جانا ہے، جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے، وہ ایک بدمزہ اور بدبودار پودا ہے جو جہنم والوں کی غذا ہے، لیکن پہلا معنی زیادہ مشہور ہے۔

چوتھی آیت میں پھر جہنمیوں کی غذا کے بارے میں ایک نئی تعبیر (ضریع) پیش ہوئی ہے، مجرموں کے ایک گروہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ لوگ بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے اور انہیں ایک کھولتے ہوئے چشمہ کا پانی پلایا جائے گا، اُن کی غذا ضریع کے علاوہ کچھ نہ ہوگی، ایسی غذا جو نہ ان کو تنومند کرے گی اور نہ ہی بھوک مٹائے گی'' تصلی نارا حامیة۔ تسقی من عین انیة۔ لیس لهم طعام الا من ضریع۔ لا یسمن ولا یغنی من جوع''۔

ضریع کے بارے میں مختلف تعبیریں اور تفسیریں ذکر ہوئی ہیں جو قریب المعنی ہیں بعض نے کہا ہے ایک سبز رنگ کا بدبودار پودا ہے جو سمندر سے باہر نکل آتا ہے۔ [1]

کچھ اور نے کہا ہے کہ ضریع ایک قسم کا کانٹا ہے جو زمین سے چپکتا ہے، جب وہ گیلا ہوتا تو قریش اس کو ''شبرق'' کہتے اور جب خشک

---

[1] خلیل ابن احمد نے کتاب العین میں۔

ہوتا تو ''ضریع'' کہتے تھے، ایک ایسا زہریلا پودا جس کے نزدیک کوئی حیوان اور چوپایا نہیں جاتا۔ [۱]

بعض نے اس کو ضرع کے مادہ سے جانا ہے جس کا معنی ضعف اور ذلت ہے اور کہتے ہیں کہ یہ ایک ذلت آمیز کھانا ہے جس سے نجات کے لئے جہنمی خدا کی بارگاہ میں زاری کریں گے۔ [۲]

پیغمبر اسلامؐ سے ایک روایت میں یوں بیان ہوا ہے:

الضريع شيئى يكون من النار يشبه الشوك اشدمرارة من الصبر وانتن من الجيفة واحر من النار۔ سماه الله ضريعا۔

ضریع ایک ایسی چیز ہے جو جہنم کی آگ میں اُگتی ہے، کانٹوں سے مشابہ ہے، [۳] صبر سے زیادہ تلخ، مردار سے زیادہ بدبودار اور آگ سے زیادہ سوزاں کہ جس کا نام خدا نے ضریع رکھا ہے۔ [۴]

''لا یسمن و لا یغنی من جوع'' سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ اس طرح کی غذا نہ جسم کو قوت دے سکتی ہے اور نہ ہی بھوک کی حالت میں آرام پہنچا سکتی ہے یہ گلے میں پھنسنے والی ایک ایسی غذا ہے جو خود ایک طرح کا عذاب ہے جیسا کہ سورہ مزمل کی آیت ۱۳ میں فرمایا گیا ہے:

وطعاما ذاغصة وعذابا اليما۔

ہمارے پاس گلے میں پھنسنے والا کھانا اور دردناک عذاب ہے۔

البتہ تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ یہ دردناک اور شدید عذاب کیونکر بعض مجرموں کے انتظار میں ہے، وہ لوگ جنہوں نے اس دنیا میں اپنا پیٹ ایسے مختلف رنگ برنگے لذیذ اور مرغن وشیریں کھانوں سے بھرا جو انہوں نے دوسروں کے حقوق پر تجاوز اور مختلف قسم کے مظالم سے حاصل کئے تھے جب کہ ان کے اردگرد ایسے بھوکے لوگ تھے جنہوں نے عمر بھر میں ایک دفعہ بھی پیٹ بھر کے کھانا نہیں کھایا تھا، ہر سال لاکھوں انسان ان کے اردگرد یا دوسرے ممالک میں بھوک کی شدت سے مرتے تھے لیکن وہ اپنا اضافی کھانا کوڑے دانوں میں پھینکتے تھے، ان کو اس دنیا میں ایسی غذا ملنی چاہیے جو ان کے لئے دردوالم اور عذاب کا باعث بنے۔

یہاں پر ہم ایک بار پھر ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ بات جو ہم بار بار کہہ چکے ہیں دوبارہ کہیں کہ یہ تمام تعبیریں دوسری دنیا کے دردناک عذاب کی طرف ایک اشارہ ہیں ورنہ اس دنیا کے زندان میں محبوس ہم جیسے لوگوں کے لئے بہشت کی نعمتیں صحیح طور پر قابل فہم ہیں اور نہ دوزخ کے

---

[۱] تفسیر قرطبی جلد ۱۰ صفحہ ۷۱۱۹۔

[۲] تفسیر قرطبی، جلد ۱۰ صفحہ ۷۱۲۔

[۳] ''صبر'' ایک ایسا پودا ہے جس کے زرد رنگ کے پھول ہوتے ہیں جو نہایت تلخ ہوتے ہیں۔

[۴] مجمع البیان جلد ۹، ۱۰ صفحہ ۷۹ ۱۴۷ اسی آیت کے ذیل میں۔

عذاب، بلکہ ہم دور سے صرف ایک ہیولا ہی دیکھتے ہیں۔

یہاں پر ایک معروف اعتراض پیش کیا جاتا ہے، وہ یہ کہ سورہ غاشیہ کی آیت ٦ سے معلوم ہوتا ہے کہ جہنمیوں کی غذا صرف ''ضریع'' ہے (لیس لھم طعام الا من ضریع) جب کہ اوپر کی آیتوں میں دو اور چیزوں کا جہنمیوں کی غذا کے عنوان سے نام لیا گیا ہے، ایک ''زقوم'' اور دوسری ''غسلین''، حتیٰ کہ غسلین کا سورہ حاقہ کی آیت ٣٦ میں بھی جہنمیوں کی واحد غذا کے عنوان سے ذکر ہوا ہے۔

اس سوال کے مختلف جوابات دیئے گئے ہیں جن میں سے یہ دو جواب اہم ہیں:

١۔ ضریع، زقوم اور غسلین کے تینوں کلمات ایک ہی معنی میں ہیں اور وہ ہے ایک خشک اور ناپسندیدہ، بدبودار اور بدمزہ پودا جو جہنم میں اُگتا ہے لیکن یہ تفسیر غسلین کے بارے میں تفسیر اور لغت کی بہت سے کتب میں بیان شدہ مفہوم سے مطابقت نہیں رکھتی۔

٢۔ بعض نے زقوم اور ضریع کو ایک معنی میں جانا ہے جس کی طرف اوپر اشارہ ہوا اور وہ ہے جہنمیوں کی غذا، لیکن غسلین اُن کا مشروب ہے اور مشروبات کے لئے لفظ طعام کے استعمال کی مثالیں عرب زبان میں موجود ہیں۔

مندرجہ بالا تین قسم کی غذاؤں میں سے ہر ایک جہنمیوں کے ایک گروہ سے مخصوص ہے جو جہنم کے کسی ایک طبقے میں رہتے ہیں اور یہ جواب سب سے زیادہ مناسب ہے۔

پانچویں آیت میں پھر جہنمیوں کے ناپسندیدہ مشروبات کے بارے میں گفتگو ہے، ارشاد ہوتا ہے، ہم نے ستم گروں کے لئے ایسی آگ تیار کر رکھی ہے جس کی قناتیں ان کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں اور اگر وہ پانی طلب کریں تو پگھلے ہوئے تانبے کی طرح کھولتا پانی ان کو دیا جایا گا جو چہروں کو جھلس ڈالے گا، کیا برا مشروب ہے اور کتنا برا ٹھکانا ہے 'انا اعتدنا للظلمین نارا احاط بھم سرادقھا وان یستغیثوا یغاثوا بمآء کالمھل یشوی الوجوہ بئس الشراب وسآءت مرتفقا۔'

قابل توجہ امر یہ ہے کہ یہ دردناک سزائیں ظالموں کے لئے معین کی گئی ہیں، ایسے ظالم جو اس دنیا میں اپنے زرق و برق رئیسانہ خیموں میں مےخواری میں طرح طرح کے مشروبات پینے میں مگن تھے اور ماہ رو ساقی ان کی رونق محفل تھے، لیکن یہ لوگ جہنم میں آگ کے پردوں میں رہیں گے اور جب وہ پانی چاہیں گے تو ساقی دوزخ انہیں پگھلے ہوئے تانبے، یتیموں کے اشک سوزاں اور مستضعفوں کے گرم آہوں کی طرح کا پانی دیں گے کیونکہ وہاں جو کچھ بھی ہوگا یہاں کی چیزوں کا تجسم ہوگا۔

کیا وہ پانی جو چہروں کو جھلسا دے، پینے کے قبل ہے؟ یہ چیز ہمیں بتاتی ہے کہ اس دنیا میں انسان کے وجود کی تشکیل اُس دنیا سے بہت مختلف ہوگی اور اس طرح ہوگی کہ ایسے امور میں سے گذر سکے اور موت آئے بغیر وہ اپنے عذاب کا درد چکھ سکے یا پھر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب اسے پانی کا مشاہدہ کرے گا تو پانی پینے سے گریز کرے گا اور اُسی طرح پیاس کی آگ میں جلتا رہے گا۔

مھل (قفل کے وزن پر) کچھ مفسرین اور ارباب لغت کے مطابق ایسا کچرا ہے جو گھی کے برتن کی تہہ میں بیٹھ گیا ہو جو عموماً گندا اور بدمزہ ہوتا ہے۔

طبرسی مرحوم نے مجمع البیان میں اس کی پگھلے ہوئے تانبے سے تفسیر کی ہے جب کہ بعض نے اس کو پگھلے ہوئے مس سے مخصوص کیا ہے

اور بعض نے کہا ہے کہ سیاہ رنگ کے پانی کے معنی میں ہے، چونکہ جہنم خود بھی سیاہ ہے اور بلکہ اس کا پانی، درخت اور باسی بھی سیاہ ہیں۔[1]

بعض نے اس کی تارکول کی ایک قسم سے یا ایک زہرلے مادے سے تفسیر کی ہے۔[2]

اگر چہ یہ معانی مختلف ہیں لیکن ان کا نتیجہ یکساں ہے جو جہنمیوں کا غیر معمولی اور بے مثال درد ہے۔

ان آیات کے چھٹے حصے میں اُن کے مشروبات کے بارے میں دو اور تعبیریں نظر آتی ہیں، ایک ''حمیم'' اور دوسری ''غساق'' جو ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ آئی ہیں، فرمایا گیا ہے: وہ وہاں پر نہ ٹھنڈی چیز پائیں گے نہ ہی پسندیدہ مشروب سوائے حمیم اور غساق کے۔''ان جهنم كانت مرصادا ۔ للطاغين مابا۔ لبثين فيها احقابا۔ لا يذوقون فيها بردا ولا شرابا ۔ الا حميما و غساقا۔''

اکثر مفسرین اور اربان لغت نے حمیم کی تفسیر گرم اور کھولتے ہوئے پانی سے کی ہے جو ''حم'' کے مادہ سے حرارت کے معنی میں ہے۔ ''غساق'' کو ''غسق'' کے مادے سے لیا گیا ہے جو کبھی تاریکی اور کبھی سیلان اور بہنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور یہاں پر اکثر نے جہنمیوں کے بدن سے بہنے والی پیپ سے اس کی تفسیر کی ہے۔

یہ روشن کی طرح عیاں ہے کہ جو آگ کے قریب یا آگ کے اندر ہو، شدت سے پیاسا ہوگا، گرمیوں کے گرم موسم میں انسان پر پیاس کا ایسا شدید غلبہ ہوگا کہ ایک ٹھنڈے اور دلنشین مشروب کے علاوہ کوئی اور چیز اس کی پیاس نہیں بجھا سکتی لیکن جہنمیوں کے لئے کوئی ٹھنڈا مشروب نہیں ہوگا بلکہ اس کے برعکس ان کا مشروب ہی گرم اور کھولتا ہوا ہوگا اور ان کی پیاس کی شدت میں برابر اضافہ کرے گا۔

کیا اس بات کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اس طرح کا مشروب دیکھ کر اس کے پینے سے گریز کریں گے اور پیاس کی آگ میں جلیں گے؟ یا وہ پینے پر مجبور ہوں گے اور پہلے سے زیادہ پیاس میں مبتلا ہوں گے؟ ذوق (چکھنا) کی تعبیر دوسری تفسیر سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔

بعض (مفسرین) جہنمیوں کے بارے میں ان تمام تعبیروں اور دھمکیوں کو معنوی اور روحانی عذاب سے تفسیر کرنا چاہتے ہیں جو خدا سے دوری اور شیطانوں سے قربت کا نتیجہ ہے، لیکن جیسا کہ ہم بارہا کہہ چکے ہیں ہمیں حق حاصل نہیں ہے کہ ہم واضح قرینے کے بغیر الفاظ کو ان کے ظاہر کے خلاف معانی پر محمول کریں۔

ان آیات کے ساتویں اور آخری حصے میں ایک بار پھر جہنمیوں کے مشروب کی طرف ایک اور تعبیر سے اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ہر سرکش اور حق سے منحرف گمراہ نا اُمید ہوا اور جہنم اس کے پیچھے ہے اور اس کو ''صدید'' میں سے پلایا جائے گا، اس کو زحمت سے گھونٹ گھونٹ کر کے پینا پڑے گا، وہ اس کے پینے پر تیار نہیں ہوگا (اسے مجبور کر کے پلایا جائے گا) اور ہر طرف سے موت اس کی طرف آئے گی، لیکن وہ اس کے باوجود نہیں مرے گا اور ایک شدید عذاب اس کے پیچھے ہوگا۔

---

[1] مجمع البیان، جلد ۵ صفحہ ۴۲۶ اور تفسیر قرطبی، جلد ۶ صفحہ ۴۰۱۱۔

[2] تفسیر قطرطبی، جلد ۶ صفحہ ۴۰۱۱۔

" وخاب کل جبار عنید۔ من ورآئه جهنم ویسقی من مآء صدید۔ یتجرعه ولا یکاد یسیغه ویأتیه الموت من کل مکان وما هو بمیت ومن ورآئه عذاب غلیظ"۔

صدید (صد) کے مادہ سے اصل میں کسی چیز کی طرف پشت کرنے، عدول کرنے اور منہ پھیرنے کے معنی میں ہے، بعد ازاں زخمی حالت میں جسم کے گوشت اور کھال کے درمیان جمع ہونے والی پیپ پر اس کا اطلاق ہونے لگا، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ یہ مزاج کی سلامتی سے بیماری کی طرف عدول اور برگشت کی علامت ہے، راغب مفردات میں کہتا ہے: یہ تعبیر جہنمیوں کے مشروب (بدمزہ، بدبودار اور ناپسندیدہ) کے لئے مثال کے طور پر ذکر ہوئی ہے۔

اس کراہت پر گواہ بات یہ ہے کہ جہنمی ہرگز اپنی رضامندی سے اُسے نہ پئیں گے بلکہ مجبور ہو کر کراہت سے گھونٹ گھونٹ کر کے پئیں گے، ان کی حالت اس قدر دردناک ہوگی گویا موت ہر طرف سے ان کی جانب آرہی ہو، لیکن ان کی تخلیق ایسی ہوگی کہ انہیں موت نہیں آئے گی، تاکہ اپنی سزائیں پاسکیں۔

عجیب یہ کہ اس دردناک عذاب کا زیر بحث آیت اور متعدد دوسری آیتوں میں ظالموں، ستمگروں، جباروں اور سرکشوں کے لئے ذکر ہوا ہے (کبھی ''طاغین'' کی تعبیر سے کبھی ''جبار'' اور کبھی ''ظالمین'')، ظلم و جور اور بے اعتدالیوں کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے اور یہ حقیقت میں ان مظالم کا تجسیم عمل ہے جو اس دنیا میں انہوں نے بے گناہوں پر کئے تھے، کبھی اپنے زندانوں میں سالہا سال تک بدترین غذاؤں اور بدترین پانی سے انہیں زندہ رکھتے اور ان پر ظلم کرتے تھے، حتی کہ کچھ مدت بعد ان قیدیوں کے چہرے اتنے بدل جاتے تھے کہ ماں اپنے بیٹے کو نہیں پہچان سکتی تھی (ایسے ہی جیسے حجاج کے قیدیوں کی وحشت ناک داستانوں میں آیا ہے اور اس زمانے میں بھی ہم نے ایسے نمونے ہم عصر سرکشوں کے قیدیوں میں دیکھے اور سنے ہیں، کیا ایسے افراد اس طرح کے عذاب کے مستحق نہیں ہیں؟)

ان آیات کے مجموعی مطالعے سے بخوبی واضح ہوجاتا ہے کہ جہنمیوں کی سزاؤں میں ایک بدترین سزا ان کی غذا اور پینے کا پانی ہے، یعنی عین وہی چیز جس سے انسان کو لذت حاصل ہونی چاہیے اس کے شدید درد و رنج کا باعث بن جائے گی، غذاؤں کے بارے میں کبھی ''زقوم'' کبھی ''ضریع'' اور کبھی ''غسلین'' کی تعبیر آئی ہے اور مشروبات کے بارے میں کبھی ''حمیم'' کبھی ''مهل'' کبھی ''صدید'' اور بعض موارد میں غساق کی تعبیریں آئی ہیں، جن کا اشارہ عموماً گرم، کھولتا ہوا، ناپسندیدہ، بدبودار، بدمزہ اور تنفر آمیز غذاؤں کی طرف ہے اور جب بھی ہم ان مفسد عناصر کے دنیا میں کئے ہوئے اعمال ملاحظہ کریں کہ انہوں نے دنیا کے مظلوموں کے ساتھ کیا کیا ہے تو ان شدید سزاؤں پر تعجب نہیں ہوگا۔

خدا ہم سب کو اپنے لطف و کرم کے صدقے ایسے گناہوں میں آلودہ ہونے سے بچائے جن کا انجام ایسا ہوتا ہے۔

ج: جہنمیوں کالباس

اشارہ:

جہنم میں ہر چیز عذاب اور سزا کا رنگ رکھتی ہے، حتیٰ کہ ''لباس'' جو عموماً سردی اور گرمی سے انسان کو بچانے والا ایک پہناوا اور بدن کو پہنچنے والے ممکنہ مختلف نقصانات کے مقابلے میں ایک مانع اور زیب وزینت کا ایک وسیلہ ہے، جی ہاں یہ بھی وہاں پر درد ورنج اور سزا وعذاب کے اسباب میں سے ایک ہوگا۔

اس اشارے کے ساتھ ہم قرآن کی طرف لوٹتے ہیں اوران دو آیتوں کی طرف توجہ دیتے ہیں:

۱۔ فالذین کفروا قطعت لھم ثیاب من نار یصب من فوق رء وسھم الحمیم۔ یصھر بہ ما فی بطونھم والجلود۔ ولھم مقامع من حدید۔ کلما ارادوا ان یخرجوا منھا من غم اعیدوافیھا وذوقوا عذاب الحریق۔

۲۔ وتری المجرمین یومئذ مقرنین فی لاصفاد۔ سرابیلھم من قطران وتغشی وجوھھم النار۔

ترجمہ:

۱۔ جولوگ کافر ہوچکے ہیں آگ سے ان کے لئے لباس کاٹا جائے گا اور ایک جلانے والا کھولتا ہوا مائع ان کے سروں پر انڈیلا جائے گا اس طرح کہ ان کے اندر اور باہر دونوں کو جلا ڈالے گا اوران کے لئے لوہے کے کچھ گرز ہیں، جب وہ جہنم کے غم واندوہ سے نکلنا چاہیں گے تو اُن کو ان (گرزوں) کے ذریعے سے واپس لوٹا یا جائے گا اور (ان سے کہا جائے گا) جلانے والے عذاب کو چکھو۔

۲۔ اور اس دن تم مجرموں کو ایک دوسرے کے ہمراہ آہنی زنجیروں میں جکڑے پاؤ گے (ایسی زنجیر جس میں ان کے ہاتھ اور گردن بندھے ہوں گے)، ان کا لباس قطران ہوگا (ایک بدبودار، آتش گیر اور چپکنے والا مادہ) ان کی صورتوں کو آگ چھپا لے گی۔

تفسیر:

پہلی آیت میں کفار کے ایک گروہ کی طرف جو ہمیشہ پروردگار کے بارے میں جدال اور دشمنی میں مشغول تھے، اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: جولوگ کافر ہوئے ہیں ان کے لئے آگ سے لباس کاٹا جائے گا ''فالذین کفروا قطعت لھم ثیاب من نار'' آیا اس بات کا مفہوم

یہ ہے کہ آگ لباس کی طرح ہر طرف سے اُن کا احاطہ کرے گی یا پھر حقیقت میں آگ کے کچھ قطعے اُن کے لباس کی صورت میں کاٹے اور سیئے جائیں گے؟ آیت کا ظاہر دوسرا معنی ہے، اس سے زیادہ دردناک بات یہ ہے کہ ایک جلانے والا کھولتا ہوا مائع ان کے سروں پر انڈیلا جائے گا'' **یصب من فوق رءوسھم الحمیم**''۔

اس کے بعد اضافہ فرماتا ہے: یہ جلانے والا پانی ان کے اندر اتنا اثر کرے گا کہ ان کے اندر کو بھی اور باہر کو بھی گلا دے گا'' **یصھر بہ ما فی بطونھم والجلود**''۔

''**یصھر**''''**صھر**'' کے مادہ سے (قہر کے وزن پر) چربی وغیرہ کے پگھلانے کے معنی میں آیا ہے، نیز سورج کی تپش سے گرم اور متغیر ہونے والی ہر چیز ا پر اس کا اطلاق ہوتا ہے، پھر اُن کی دوسری سزاؤں کی خبر دیتا ہے اور فرماتا ہے: ان کے لئے تازیانے یا (آگ کے) گرز ہیں۔'' **ولھم مقامع من حدید**''۔

مقامع ''**مقمع**'' کی جمع (منبر کے وزن پر) کبھی تازیانہ کے معنی میں اور کبھی ایسی لکڑی کے معنی میں آتا ہے جس سے کسی کو مارا جاتا ہے۔

آخر میں اُن کی غیر معمولی دردناک مجموعی کیفیت کی اس طرح ترسیم فرماتا ہے: جب وہ جہنم اور اس کے غم واندوہ سے نکلنا چاہیں گے تو فورا ان کو واپس پلٹا دیا جائے گا اور ان سے کہا جائے گا: جلانے والے عذاب کو چکھو'' **کلما ارادوا ان یخرجوا منھا من غم اعیدوا فیھا وذوقوا عذاب الحریق**''۔

بے شک اس طرح کی دردناک سزائیں بلکہ اس سے کم تر سزائیں بھی دنیا میں انسان کی موت کا باعث بن جاتی ہیں، لیکن مجرموں کی جسمانی ساخت وہاں پر اس طرح ہوگی کہ یہ سزائیں ان کی موت کا باعث نہیں بن سکیں گی تاکہ وہ اپنے برے اعمال کی بھاری سزائیں بھگت سکیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ اس دنیا کی زندگی پر حاکم قوانین اُس دنیا سے بہت متفاوت ہیں (غور کیجئے گا)۔

دوسری آیت میں جہنمیوں کے لباس کے بارے میں ایک نئی تعبیر بیان ہوئی ہے، ارشاد ہوتا ہے ان کا لباس'' **قطران**'' سے ہوگا اور آگ ان کے چہرے ڈھانپ لے گی'' **سرابیلھم من قطران و تغشی وجوھھم النار**''۔

سرابیل ''**سربال**'' کی جمع مثقال کے وزن پر، مفردات میں راغب کے بقول، قمیص کے معنی میں ہے چاہے اس کی جنس جو بھی ہو۔

یہی معنی لسان العرب اور صحاح اللغہ میں بھی آیا ہے، بعض نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ قطران کسی بھی طرح کے لباس کو کہتے ہیں، کتاب التحقیق میں آیا ہے کہ سربال اس لباس کو کہتے ہیں جو بدن کے اوپر کے حصے کو ڈھانپتا ہے اور'' **سروال**'' سے مراد وہ شئے ہے جس سے بدن کا نچلا حصہ ڈھانپا جاتا ہے، اس لفظ (سربال) کا بدن کو اوڑھنے والے بغیر سلے کپڑے اور جنت میں پہنی جانے والی زرہ پر بھی اطلاق ہوا ہے۔

لیکن'' قطران''(لغت میں کبھی قطران اور کبھی قطِران پڑھا جاتا ہے) ایسے بدبودار، سیاہ رنگ، آتش گیر مادے کو کہا جاتا ہے جو

''ابھل'' نام کے ایک درخت سے نکلتا تھا اور اس کو اُبالا جاتا تھا تا کہ وہ سخت ہو جائے، پھر جرَب [1] کی بیماری کو ختم کر دیتا ہے۔[2] یہ قطران ایک طرح کا پودا ہے، قطران کی ایک اور قسم بھی ہے جو گیس بنانے کے لئے پتھر کے کوئلے کو جلا کر حاصل کیا جاتا ہے، بعض کتب سے استفادہ ہوتا ہے کہ قطران جو کہ تیل کی طرح کا مائع ہے اور چپکتا ہے درختوں کی گوند والی لکڑی سے بھی حاصل کیا جاتا ہے، بعض تصانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ قطران جو تیل کی طرح کا ایک چپک جانے والا مائع ہے اسے بعض دیگر درختوں کی لیس دار لکڑیوں سے بھی حاصل کیا جاتا ہے، اسے طب حیوانات میں جراثیم کشی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، بہر حال مندرجہ بالا آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جہنمیوں کے بدن کو لباس کے بجائے سیاہ رنگ کے آتش گیر مادے کی ایک قسم سے ڈھانپا جائیگا جس کی تمام چیزیں انسان کے لباس سے حاصل ہونے والے فوائد کے برعکس ہیں، لباس زینت ہے اور انسان کو گرمی، سردی اور خطرات سے بچاتا ہے، لیکن یہ جہنمی لباس بہت بدصورت، کریہہ منظر اور بدبودار ہے اور ایسا مادہ ہے جو جہنم کی آگ میں بھڑک اٹھتا ہے۔

یہ ہے ان لوگوں کی سزا جو یتیم بچوں اور بے لباس مستضعفوں کے سامنے طرح طرح کی آرائش اور زینت والے زریں لباس سے استفادہ کرتے تھے اور اس پر غرور کرتے تھے اور ان کے دلوں کو جلاتے تھے، لہٰذا روز قیامت ان مجرموں اور ظالموں کے حصے میں ایسا آتشیں لباس ہی آئے گا۔

---

[1] کھال کی ایک بیماری (مترجم)۔

[2] تفسیر فخر الدین رازی، ج۱۹، ص۱۴۸۔

د۔ جہنمیوں کے دوسرے جسمانی عذاب

اشارہ:

اصولاً جہنم الٰہی قہر وغضب کا مرکز ہے اور وہاں ہر چیز عذاب اور سزا کا رنگ رکھتی ہے اور اس کی مختلف شکلیں اور رنگ ہیں، چاہے ان سزاؤں کا تصور کیا جا سکے یا نہ کیا جا سکے، مجرموں، ستم گروں اور ظالمون کے لئے مقرر ہو چکی ہیں، قرآن مجید نے جگہ جگہ ان سزاؤں کے بعض گوشوں کی طرف اشارہ کیا ہے جس کے بعض نمونے تو ذکر ہو چکے اور بعض کا ہم یہاں پر تذکرہ کرتے ہیں:۔

۱۔ وَاَصۡحٰبُ الشِّمَالِ ۙ مَاۤ اَصۡحٰبُ الشِّمَالِ فِیۡ سَمُوۡمٍ وَّحَمِیۡمٍ وَّظِلٍّ مِّنۡ یَّحۡمُوۡمٍ لَّا بَارِدٍ وَّلَا کَرِیۡمٍ

۲۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِاٰیٰتِنَا سَوۡفَ نُصۡلِیۡہِمۡ نَارًا ؕ کُلَّمَا نَضِجَتۡ جُلُوۡدُہُمۡ بَدَّلۡنٰہُمۡ جُلُوۡدًا غَیۡرَہَا لِیَذُوۡقُوا الۡعَذَابَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَزِیۡزًا حَکِیۡمًا ۵۶

۲ النساء:۵۶

۳۔ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّ کَثِیۡرًا مِّنَ الۡاَحۡبَارِ وَالرُّہۡبَانِ لَیَاۡکُلُوۡنَ اَمۡوَالَ النَّاسِ بِالۡبَاطِلِ وَیَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ؕ وَالَّذِیۡنَ یَکۡنِزُوۡنَ الذَّہَبَ وَالۡفِضَّۃَ وَلَا یُنۡفِقُوۡنَہَا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ۙ فَبَشِّرۡہُمۡ بِعَذَابٍ اَلِیۡمٍ یَّوۡمَ یُحۡمٰی عَلَیۡہَا فِیۡ نَارِ جَہَنَّمَ فَتُکۡوٰی بِہَا جِبَاہُہُمۡ وَجُنُوۡبُہُمۡ وَظُہُوۡرُہُمۡ ؕ ہٰذَا مَا کَنَزۡتُمۡ لِاَنۡفُسِکُمۡ فَذُوۡقُوۡا مَا کُنۡتُمۡ تَکۡنِزُوۡنَ

۴۔ وَاِذَاۤ اُلۡقُوۡا مِنۡہَا مَکَانًا ضَیِّقًا مُّقَرَّنِیۡنَ دَعَوۡا ہُنَالِکَ ثُبُوۡرًا ۱۳ؕ لَا تَدۡعُوا الۡیَوۡمَ ثُبُوۡرًا وَّاحِدًا وَّادۡعُوۡا ثُبُوۡرًا کَثِیۡرًا

۵۔ تَلۡفَحُ وُجُوۡہَہُمُ النَّارُ وَہُمۡ فِیۡہَا کٰلِحُوۡنَ

۶۔ اِذِ الۡاَغۡلٰلُ فِیۡۤ اَعۡنَاقِہِمۡ وَالسَّلٰسِلُ ؕ یُسۡحَبُوۡنَ فِی الۡحَمِیۡمِ ۙ ثُمَّ فِی النَّارِ

يُسْجَرُوْنَ

۷۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ فِي النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوْا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ قَالُوْٓا اَوَلَمْ تَكُ تَاْتِيْكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۭ قَالُوْا بَلٰى ۭ قَالُوْا فَادْعُوْا ۚ وَمَا دُعٰۗؤُا الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ؀

ترجمہ:

۱۔ اور اصحاب شمال کیسے اصحاب شمال؟ (جن کا نامہ عمل ان کے جرم کی علامت کے طور پر اُن کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا) وہ لوگ جلا دینے والی لو اور کھولتے ہوئے پانی کے درمیان ہوں گے، اور کالے سیاہ آگ پیدا کرنے والے دھوئیں کے سائے میں ہوں گے، ایسا سایہ جو نہ ٹھنڈا ہوگا اور نہ مفید۔

۲۔ جن لوگوں نے ہماری آیتوں کا انکار کیا ہم بہت جلد انہیں آگ میں جھونک دیں گے جب بھی ان کے بدن کی کھالیں (اس میں) جل جائیں گی ہم اُن کی جگہ نئی کھالیں لے آئیں گے تاکہ وہ عذاب کا مزہ چکھیں، خداوند غالب اور حکیم ہے (اور حساب وکتاب سے سزا دیتا ہے)۔

۳۔ اے ایمان لانے والو! (اہل کتاب) علماء اور رہبان لوگوں کے اموال کو حرام طریقے سے کھاتے ہیں اور اُن کو خدا کی راہ سے روکتے ہیں وہ لوگ جو سونے اور چاندی کا خزانہ (جمع کرتے اور) چھپاتے ہیں اور خدا کی راہ میں انفاق نہیں کرتے، ایسے لوگوں کو دردناک سزاؤں کی بشارت دیجئے، اس دن جب ان (سونے اور چاندی) کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا اور ان سے اُن کے چہروں، پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا (اور اُن سے کہا جائے گا) کہ یہ وہی چیز ہے جس کا تم نے ذخیرہ کیا تھا، پس چکھو اس چیز کو جسے تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا۔

۴۔ اور جب انہیں زنجیروں میں جکڑ کر جہنم کی کسی تنگ جگہ میں جھونک دیا جائے گا تو اُن کی چیخ وپکار بلند ہوگی! آج ایک بار واویلا مت کرو بلکہ بار بار واویلا کرو۔

۵۔ آگ کے سوزاں شعلے تلوار کی طرح ان کے چہروں پر مارے جائیں گے اور دوزخ میں اُن کے منہ بنے ہوئے ہوں گے۔

۶۔ جس وقت اُن کی گردنوں پر طوق اور زنجیریں ہوں گی اور ان کو گھسیٹا جائے گا اور کھولتے ہوئے پانی میں ڈال دیا جائے گا پھر وہ جہنم کی آگ میں داخل کئے جائیں گے۔

۷۔ اور جو لوگ آگ میں ہوں گے جہنم کے داروغوں سے کہیں گے کہ اپنے پروردگار سے درخواست کرو کہ ہمارے عذاب میں ایک دن کی تخفیف کردے، وہ کہیں گے کیا تمہارے انبیاء تمہارے پاس واضح دلائل لے کر نہیں آئے تھے؟ وہ کہیں گے ہاں۔ تب وہ کہیں

گے جتنا چاہو پکارو، لیکن کافروں کی پکار کی کہیں شنوائی نہیں۔

تفسیر

مہلک ہوائیں اور آتشیں سائے:

ان آیات کے پہلے حصے میں لوگوں کو قیامت میں تین قسموں "مقربین"، "اصحاب الیمین"، "اصحاب الشمال" میں تقسیم کرنے کے بعد اصحاب الشمال (ایسے لوگ جن کے نامہ اعمال مجرم ہونے کی علامت کے طور پر ان کے بائیں ہاتھ میں دے دیئے جائیں گے) کے بارے میں فرماتا ہے: وہ لوگ جلانے والی لو اور آب سوزاں کے درمیان ہوں گے "فی سموم و حمیم"

"اور آگ پیدا کرنے والے دھوئیں کے سائے میں" (وظل من یحموم)۔

"ایسا سایہ جو ٹھنڈا ہوگا نہ آرام دہ" (لا بارد ولا کریم)۔

حقیقت میں جہنم میں بھی جنت کی طرح پانی، ہوا، نسیم اور سایہ ہوگا لیکن کیسی بادِ نسیم! ایسی کہ جسے قرآن نے "سموم" کا نام دیا ہے۔

سموم سم کے مادے سے اس سوزاں ہوا کے معنی میں ہے جو مقام (بدن کے بہت ہی چھوٹے سوراخ) میں داخل ہوتا ہے اور اس کو ہلاک کر دیتا ہے، بنیادی طور پر "سم" کو اس لئے سم کہا گیا ہے کہ بدن کے تمام سوراخوں اور ذرات میں داخل ہو جاتا ہے کیونکہ سم اور سُم راغب کے بقول ہر اس باریک سوراخ کو کہتے ہیں جو سوئی یا کان اور ناک کے سوراخ کی طرح ہو۔[1]

ان کے پاس پانی ضرور ہے لیکن مار ڈالنے والا اور سوزاں، سایہ بھی ہے لیکن سیاہ اور گاڑھے دھوئیں کا اور گرم۔

اس جہان میں جب انسان گرمی کا شکار ہوتا ہے تو کبھی ہوا سے استفادہ کرتا ہے، کبھی پانی کے اندر چلا جاتا ہے اور کبھی سائے کی پناہ لیتا ہے، لیکن یہ تینوں چیزیں وہاں پر گرم اور مہلک ہوں گی، جنت کے برعکس جہاں ان میں سے ہر ایک دوسرے سے خنک تر اور زیادہ روح پرور ہوگی۔

دوسری آیت میں کافروں کی ایک اور دردناک سزا کے بارے میں فرماتا ہے:

جن لوگوں نے ہماری آیتوں کا انکار کیا بہت جلد ہم انہیں (ہولناک) آگ میں جھونک دیں گے "ان الذین کفروا بآیتنا سوف تصلیھم نارا"[2] پھر اضافہ فرماتا ہے: جب بھی ان کے کھالیں جھلس جائیں گی ہم اُن کو نئی کھالوں میں تبدیل کر دیں گے تا کہ وہ

---

[1] قاموس اللغۃ میں آیا ہے کہ سموم دن میں چلنے والی گرم لو کو کہا جاتا ہے، اس کے مقابلے میں "حرور" ہے جو رات کو چلنے والی گرم ہواؤں کو کہا جاتا ہے، تفسیر فخر رازی میں آیا ہے کہ سموم ایسی متعفن ہوا ہے کہ جن انسان اس میں سانس لیتا ہے تو اس کا قلب متعفن ہوتا ہے اور وہ انسان کو ہلاک کر دیتی ہے۔ (تفسیر کبیر، جلد ۲۹، صفحہ ۱۹۸)۔

[2] یہاں پر نارًا کا نکرہ ہونا آگ کی بڑائی کے بیان کے لئے ہے۔

(الہٰی) عذاب چکھ لیں، خدا غالب وحکیم ہے (ان تمام امور پر قادر ہے تاہم جرم کے مطابق سزا دیتا ہے)'' **كلما نضجت جلودهم بدلناهم جلودا غيرها ليذوقوا العذاب ان الله كان عزيزا حكيما**''۔

آخری جملہ حقیقتاً اس سوال کا جواب ہے کہ کیا ایسا عذاب ممکن ہے؟ اگر ممکن ہے تو کیا عادلانہ ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ یہ کام خدا کی قدرت کے سامنے آسان ہے اور اس کی حکمت کے مطابق بھی ہے۔

یہاں پر مفسرین کے درمیان ایک معروف سوال پایا جاتا ہے، وہ یہ کہ اگر وہ کھالیں نئی کھالوں میں تبدیل ہوجاتی ہیں تو نئی کھالوں کا کیا جرم ہے کہ وہ بھی جل جائیں؟

بزرگ مفسرین نے اس سوال کے متعدد جوابات دیے ہیں اور سب سے بہتر امام جعفر صادق علیہ السلام کی حدیث میں مذکور جواب ہے جو انہوں نے اس وقت ارشاد فرمایا جب ایک مادہ پرست ابن ابی العوجا نے مندرجہ ذیل آیت کے حوالے سے سوال کیا کہ ''ما ذنب الغیر'' دوسری کھالوں کا کیا گناہ ہے؟

امامؑ نے ایک مختصر اور پُرمعنی جواب فرمایا کہ ''**هي هي وهي غيرها**'' نئی کھالیں وہی پرانی کھالیں ہی ہیں اور درعین حال دوسری بھی ہیں۔

ابن ابی العوجاء جب اس بات کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکا تو درخواست کی کہ مثال کے ساتھ مزید وضاحت فرمائیں۔ امامؑ نے فرمایا: یہ ایسے ہے جیسے کسی نے اینٹ توڑی ہو اور دوبارہ اس کو قالب میں ڈال کر نئی اینٹ بنائے، یہ دوسری اینٹ وہی پہلی اینٹ ہی ہے، اور درعین حال دوسری بھی ہے۔[1]

اس روایت کے مطابق نئی کھال پرانی کھال کے مواد سے ہی بنے گی، نئی اور جدید شکل میں پرانا مادہ ہی محفوظ ہے۔

کچھ نے کہا ہے: اگر مادہ اور صورت دونوں پرانی کھال کی صورت اور مادے سے مختلف بھی ہوں تب بھی کوئی اشکال پیش نہیں آتا کیونکہ قیامت کے دن انسان کی روح عذاب چکھے گی نہ بدن کی کھالیں، انہوں نے لیذوقوا العذاب (تاکہ وہ یعنی کفار عذاب چکھیں) کی تعبیر کو بھی اس مدعا پر شاہد جانا ہے اسی وجہ سے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان اپنے ایک عضو سے کوئی گناہ انجام دیتا ہے اور سزا کسی دوسرے عضو کو دی جاتی ہے، مثلاً وہ شراب پیتا ہے اور ۸۰ کوڑے اس کی پیٹھ پر مارے جاتے ہیں، یہ اس لئے ہے کہ جسم کو تکلیف دینا روح کی آزار کا ایک وسیلہ ہے۔

تیسری آیت میں کچھ ایسے بدکاروں کی سزا کا ذکر ہے جو سونا چاندی اور درہم ودینار کا ذخیرہ کرتے تھے اور اس کا حق ادا نہیں کرتے تھے، ارشاد فرمایا گیا ہے: جو لوگ سونے اور چاندی کا خزانہ جمع کرتے اور چھپاتے ہیں اور خدا کی راہ میں انفاق نہیں کرتے ایسے لوگوں کو دردناک سزاؤں کی بشارت دیجئے (والذين يكنزون الذهب والفضة ولا ينفقونها في سبيل الله فبشرهم بعذاب

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد اول صفحہ ۴۹۴ حدیث ۳۱۴۔

الیم)۔

اس کے بعد اس ''عذاب الیم'' کے ایک گوشے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: اس دن جب ان (سونے اور چاندی کے سکوں) کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا اور ان سے ان کے چہروں، پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا ''یوم یحمی علیھا فی نار جھنم فتکوی بھا جبا ھھم وجنوبھم وظھورھم'' اور ان سے کہا جائے گا (یہ وہی چیز ہے جس کا تم نے ذخیرہ کیا تھا،) پس چکھو اس چیز کو جسے تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا ''ھذا ما کنزتم لا نفسکم فذوقوا ما کنتم تکنزون''۔

یہ عبارت قیامت کے دن شدید الٰہی عذاب سے مربوط تمام آیتوں کے بارے میں پیش آنے والے اہم سوال کا جواب دے رہی ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ تمام سزائیں لوگوں کے اپنے اعمال اور کاموں کا نتیجہ ہیں جو اس دن اس صورت میں مجسم ہوں گے اور حقیقت میں وہ اپنے اعمال ہی کو چکھیں گے۔

یہ بالکل ایسے ہے جیسے کوئی شخص کچھ دن شراب نوشی میں افراط کے نتیجے میں شدید اور دردناک بیماریوں میں مبتلا ہو اور ایک عرصے تک تکلیف اٹھائے۔

چونکہ مندرجہ بالا آیت کے بارے میں اس سے پہلے کافی وضاحت ہو چکی ہے، لہٰذا اب ہم تکرار نہیں کرتے۔

جہنم کی انفرادی بیرکیں:

چوتھی آیت میں ایک بار پھر جہنمیوں کے مختلف طرح کے عذاب کے ایک اور نمونے کا ذکر ہے، ارشاد ہوتا ہے: جب انہیں زنجیروں میں جکڑ کر جہنم کی کسی تنگ جگہ میں جھونک دیا جائے گا تو ان کی چیخ و پکار بلند ہوگی ''واذا القوا منھا مکانا ضیقا مقرنین دعوا ھنالك ثبورا''۔

ایسی حالت میں ان سے کہا جائے گا کہ یہ چیخ و پکار بے فائدہ ہے اور کسی بھی مشکل کا حل نہیں ہے (آج ایک بار نہیں بار بار چیخ و پکار کرو) کیونکہ تمہارے مصائب ہی اتنے زیادہ ہیں کہ تمہیں بہت زیادہ واویلا کرنا چاہیے ''ولا تدعوا الیوم ثبورا وحدا وادعوا ثبورا کثیرا''

اس تعبیر سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ وہ لوگ جہنم میں بھی آزاد نہیں ہوں گے بلکہ وہاں ان کی جگہ جیل کی انفرادی بیرکوں کی طرح ہوگی اور اس میں بھی طوق و زنجیر میں بندھے ہوں گے اس طرح کہ ان کی چیخیں بلند ہوں گی، ایسی چیخ جو کسی مشکل کا حل نہیں ہے۔

''مقرنین'' قرن کے مادے سے (قدر کے وزن پر) مفردات میں راغب کے بقول اصل میں کسی ایک جہت کی طرف دو یا دو سے زیادہ چیزوں کے اجتماع کو کہتے ہیں، اسی لئے اس رسی کو بھی قرن (نظر کے وزن پر) کہتے ہیں جس سے اشیاء کو باندھا جاتا ہے ٭قرن ایسی قوم اور جمعیت کو کہا جاتا ہے جو ایک زمانے میں زندگی گذار رہی ہو اور کبھی خود اس زمانے پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے اور جب اس لفظ کو باب تفعیل میں لے جایا جائے تو کثرت اور شدت پر دلالت کرتا ہے۔

لہٰذا زیر بحث آیت میں ''مقرنین'' کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ جہنمیوں کے ہاتھ پاؤں باندھے جائیں گے، بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس دن جہنمیوں کو گروہ در گروہ طوق وزنجیر کے ایک طولانی سلسلے میں باندھ دیا جائے گا، اور یہ گناہگاروں کی فکری اور عملی ہم آہنگی کا تجسم ہی ہے جو اس دنیا میں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے مظلوموں کے حقوق پر تجاوز کرتے اور ظلم وفساد کا ارتکاب کرتے اور اُن کے خلاف سازشیں کیا کرتے تھے۔

لیکن ''مکانا ضیقا'' کی تعبیر کے پیش نظر پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب ہے، یہ بھی اُن کے اعمال کا ایک تجسم ہی ہے جو وہ اس دنیا میں بے گناہوں کو انفرادی بیرکوں میں قید کر دیتے اور انہیں زنجیروں سے باندھ دیتے تھے، یا اُن کی اجتماعی زندگی میں ایسی محدودیتیں پیدا کر دیتے تھے کہ زنجیروں میں بندھے ہوئے قیدیوں کی طرح حرکت کی طاقت ان سے سلب ہوجاتی تھی۔

''ثبور''اصل میں ہلاکت کے معنی میں ہے اگر چہ مقائیس اللغتہ نے اس کے تین اصلی معانی بیان کئے ہیں، پہلا ہلاکت، دوسرا نگہداشت اور تیسرا سہولت، لہٰذا ایسی زمین کو جس کی مٹی چونے کی طرح ڈھیر کی صورت میں ہو'' ثبرة'' کہا جاتا ہے۔

لیکن ممکن ہے یہ تمام معانی ہلاکت کے معنی کی طرف برگشت کریں کیونکہ ایسی زمینوں سے گذرنا خطرے سے خالی نہیں ہے، اور چونکہ خطرے کے مواقع میں انسان اپنی اور اپنے اموال کی نگہداشت کرتا ہے لہٰذا یہ لفظ نگہداشت کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے، بہر حال جب کسی عرب کو کسی خطرناک چیز کا سامنا ہوتا تو وہ ''واثبورا'' کہہ کر چیختا یعنی ہائے میں مر گیا، یہ چیز اُن کی ناراحتی کی شدت اور درد والم کے احساس کو بیان کرتی ہے۔

ممکن ہے لا تدعوا الیوم ثبورا واحدا وادعوا ثبورا کثیرا کی عبارت ہلاکت یا شدت کے متعدد عوامل یا دوزخ میں ان عوامل کی طولانی مدت کی طرف اشارہ ہو، اور بہر حال یہ بھی ان کے اعمال کا تجسم ہی ہے کہ وہ اس دنیا میں مختلف گناہوں کا ارتکاب کرتے رہے اور مخلوقات پر مختلف مظالم ڈھاتے رہے اور ہر طرف سے ان کے لئے ہلاکت کے دروازے کھولتے رہے۔

پانچویں آیت میں ان کے دردناک عذاب کا ایک اور چہرہ ہمیں نظر آتا ہے، فرمایا گیا ہے: ان کے چہروں پر آگ کے سوزاں شعلوں کے تھپیڑے پڑیں گے ''**تلفح وجوههم النار**'' اس بناء پر قیامت کے دن ان کے منہ بنے ہوئے ہوں گے ''**وهم فيها كالحون**''۔

''تلفح''لفح کے مادے سے (فتح کے وزن پر) بہت سے ارباب لغت وتفسیر کے بقول اصل میں چہرے پر دھوپ آگ اور بادسموم کی تاثیر اور اس کے متغیر ہونے کے معنی میں ہے، اور کبھی تلوار کے وار پر بھی اطلاق ہوتا ہے جو آفتاب کی تابش، آگ کے شعلے اور بادسموم کے تھپیڑوں کی مانند ہے۔

کبھی لفح کی جگہ نفح کہا جاتا ہے لیکن بعض کے خیال میں لفح کا زیادہ شدید مرحلے پر اور نفح کا خفیف مرحلے پر اطلاق ہوتا ہے۔

''کالحون'' کلوح کے مادے سے (کلوخ کے وزن پر) بہت سے ارباب لغت وتفسیر کے بقول ترش روئی اور اس طرح منہ بسورنے کے معنی میں ہے کہ دونوں لب کھل جائیں اور یہ وہی حالت ہے جو دوزخیوں کے چہرے پر آگ کے شعلوں کی شدید تپش کی وجہ سے پیدا ہوگی، مجموعی طور پر اُن کے چہروں پر آگ کے شعلوں کے تھپیڑوں کی تاثیر کی ترسیم ہے جو بہت دردناک ہے، وہی چہرے جو جو اس دنیا میں

مستضعفون کے سامنے بن جاتے تھے اور وہی ہونٹ جواُن پر طنز اور تمسخر کے لئے کھلے رہتے تھے، یہ دردناک اور برے اعمال آخر کار قیامت میں انہی کے لئے ان دردناک عذابوں میں تبدیل ہوں گے۔

ان آیات کے چھٹے حصے میں ان کے دردناک عذاب کی ایک اور صورت کا ذکر ہو رہا ہے، ارشاد ہوتا ہے وہ بہت جلد اپنے اعمال کے نتیجے سے باخبر ہوں گے ''جب طوق اور زنجیریں ان کی گردنوں میں ڈال دی جائیں گی'' (اذا الاغلال فی اعناقھم والسلاسل)۔

بعد ازاں فرماتا ہے: ان کو کھولتے پانی میں گھسیٹا جائے گا، پھر جہنم کی آگ میں جلایا جائے گا (یسحبون فی الحمیم ثم فی النار یسجرون)۔

''اغلال'' غل کی جمع اور ''سلاسل'' سلسلہ کی جمع ہے اور ان کے مابین فرق یہ ہے کہ غل ایسا طوق ہے جو قیدیوں کے ہاتھ پاؤں یا گردن میں ڈال دیا جاتا ہے اور سلسلہ ایسی زنجیر ہے جس سے انہیں باندھا جاتا ہے یا ان کی گردن اور ہاتھ پاؤں میں ڈال دی جاتی ہے۔

''یسحبون''، ''سحب'' کے مادے سے (سھل کے وزن پر) کھینچنے کے معنی میں ہے، بادلوں کو بھی اسی لئے سحاب کہتے ہیں کہ انہیں وسیع طور پر صفحہ آسمان پر کھنچا اور پھیلا دیا جاتا ہے۔[1]

بعض نے اس لفظ کی زمین پر کھینچے جانے سے تفسیر کی ہے[2] جب کہ یہ تفسیر نہ زیر بحث آیت سے مناسبت رکھتی ہے اور نہ ہی اسے اس لفظ کے سحاب کی طرح کے بعض مشتقات سے کوئی مناسبت ہے۔

''یسجرون'' سجر کے مادے سے (زجر کے وزن پر) مقائیس اللغتہ میں اس کے لئے تین معنی بیان ہوئے ہیں، ایک بھرنا، دوسرا ملانا، تیسرا جلانا، لیکن بعض نے ان تین اصولی معانی کو ایک ہی بنیاد کی طرف پلٹایا ہے اور کہا ہے اصل معنی کسی شے کا ظرف میں لبریز ہونے کے بعد گرنا ہے، اس لئے بھڑکتی ہوئی آگ، بحر امواج اور جذبوں سے معمور پر ہیجان محبت کرنے والے قریبی دوستوں کو ''مسجور'' اور ''سجیر'' کہا جاتا ہے۔

اس بنا پر پہلے انہیں طوق و زنجیر میں باندھا جائے گا پھر آپ سوزاں میں ڈالا جائے گا اور بعد ازاں آگ میں جلایا جائے گا، اور یہ واضح ہے کہ گرم اور جلانے والے پانی میں ڈالنے کے بعد آگ میں ڈال دینا زیادہ دردناک ہوگا۔

یہ ان کے ایسے اعمال کا تجسم ہے جو انہوں نے بے گناہ افراد سے اس دنیا میں روا رکھے تھے اور انہیں مختلف مظالم کا نشانہ بناتے تھے، ان سے آزادی سلب کر کے انہیں طوق و زنجیر میں کھینچتے تھے۔

ان آیات سے مجموعی طور پر اس نکتے کا بخوبی پتہ چلتا ہے کہ جہنمیوں کی سزائیں ناقابل بیان ہیں اور طاقت ور ترین افراد بھی انہیں تحمل نہیں کر سکتے، بلکہ بہت دردناک اور شدید سزائیں ہیں۔

---

[1] مقائیس اللغتہ، مصباح اللغتہ اور مفردات راغب۔

[2] التحقیق فی کلمات القرآن الکریم والمیزان زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

وضاحتیں:

الٰہی عذاب کیوں اتنا شدید ہے؟

ان دردناک سزاؤں کی مختلف قسموں اور شدت اور طولانی مدت کی وجہ سے بہت سے افراد کو یہ سوال پیش آتا ہے کہ یہ شدید عذاب لطف الٰہی سے کیونکر ہم آہنگ ہے اور دوسری طرف جہنمیوں کے اعمال سے ان کا کیا تناسب ہے، شاید اس اشکال کا لاینحل رہنا ہی باعث بنا ہو کہ کچھ نے اس کو مجازی معنی یا روحانی سزاؤں پر محمول کیا ہے۔

لیکن اس نکتے کی طرف توجہ دینے سے یہ معما حل ہو جاتا ہے جو ایسے مسائل کے حل کی کلید ہے اور بارہا اس کی طرف توجہ دی جا چکی ہے، وہ یہ کہ یہ عذاب زیادہ تر انسان کے اپنے اعمال کا تجسم اور ان کا نتیجہ اور ثمر ہیں اور اس کے نمونے ہم اسی جہان میں دیکھتے ہیں۔

ایسے افراد موجود ہیں جو چند دنوں کی خیالی لذتوں کے لئے خطرناک نشوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور یہ نشے ان کی تمام قوتوں کو ختم کر دیتے ہیں اور وہ بہت جلد اس قدر ضعیف و کمزور ہو جاتے ہیں کہ مختلف جانگداز بیماریوں میں ایک عمر تک ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں۔

یا پھر جنسی انحرافات کی بدولت ''ایڈز'' کی طرح کی لاعلاج بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں، یہ وہی بیماری ہے جس میں مبتلا افراد کو دیکھ کر انسان کا دل سچ مچ جلنے لگتا ہے اور اسے سخت افسوس ہوتا ہے۔

کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ نشے یا جنسی انحراف کا نتیجہ اتنا شدید دردناک اور طولانی کیوں ہے؟ اور ان کے درمیان کوئی منطقی تناسب نہیں ہے؟

آگر کوئی اس طرح کی بات کرے تو اس سے فوراً یہ کہا جاتا ہے کہ یہ ان کے اعمال کی خاصیت ہی ہے اور پہلے انہیں خبردار کر دیا گیا تھا۔

یہی معنی جہنمیوں کے عذاب پر بھی منطبق ہوتا ہے۔

بہت دیکھا گیا ہے کہ بعض افراد ڈرائیونگ میں سہل انگاری کی وجہ سے خطرناک حادثے سے دوچار ہو کر اپنے ہاتھ پاؤں یا ریڑھ کی ہڈی تڑوا بیٹھتے ہیں اور ایک عمر تک تکلیف سہتے ہیں جب کہ وہ قوانین کی صحیح پیروی کر کے اس سے بچ سکتے تھے، جب اعمال کے طبعی آثار کی بات آتی ہے تو مندرجہ بالا سوالات کی گنجائش باقی نہیں رہتی، اس کے علاوہ جہنمیوں میں ایسے بھی افراد ہوں گے جنہوں نے دوسروں کو اس طرح کے مظالم میں مبتلا کر دیا تھا، اگر انسان گذشتہ تاریخ میں ثبت شدہ واقعات قطع نظر آج کی دنیا میں ہونے والے مظالم کے بارے میں خبروں کی تحقیق کرے تو اس کو یقین ہو جائے گا کہ بعض افراد واقعی ایسی شدید سزاؤں کے حقدار ہیں۔

بلکہ کبھی ظالموں کے مظالم اتنے زیادہ ہوتے ہیں اور ان کے جرائم اتنے مختلف اور بے حساب ہوتے ہیں کہ انسان سوچتا ہے ان کے جرائم کے مقابلے میں تو کوئی بھی سزا نہیں ہے۔

(۵) روحانی عذاب

اشارہ:

جس طرح بہشت کے بارے میں فوق العادہ جسمانی اور روحانی دونوں طرح کی لذت بخش نعمتیں موجود ہیں اور یہ دونوں اصولاً ایک دوسرے کی کامل کنندہ ہیں اور جسمانی و روحانی معاد کے ساتھ ساتھ ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتیں، اسی طرح جہنم کے بارے میں بھی دونوں طرح کی سزائیں دیکھنے میں آتی ہیں، اس سے متعلق آیتیں بھی اس بات پر گواہ ہیں۔

اس سلسلے میں ان آیات کی طرف توجہ کیجئے:

۱۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ

۲۔ رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ

۳۔ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا ۤ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ

۴۔ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ قَالَ اخْسَئُوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ

۵۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ فِي النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوْا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ) قَالُوْٓا اَوَلَمْ تَكُ تَاْتِيْكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۭ قَالُوْا بَلٰى ۭ قَالُوْا فَادْعُوْا ۚ وَمَا دُعٰۗؤُا الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ

۶۔ اِذَا رَاَتْهُمْ مِّنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ سَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا وَّزَفِيْرًا

۷۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰۗئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ

مَا يُؤْمَرُونَ[1]

۸۔ ونادی اصحب الجنة اصحب النار ان قد وجدنا ما وعدنا ربنا حقا فهل وجدتم ما وعد ربکم حقا قالو نعم فاذن موذن بینهم ان لعنة الله علی الظلمین۔

ترجمہ:

۱۔ اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیتوں کی تکذیب کی ان کے لئے ایک رسوا کن عذاب ہوگا۔

۲۔ خدایا! جس کو تو (اس کے اعمال کی وجہ سے) آگ میں ڈال دے اس کو تو نے خوار اور رسوا کر دیا، ایسے ستم گر افراد کا کوئی بھی مدد گار نہیں ہے۔

۳۔ جب وہ جہنم کے غم واندوہ سے نکلنا چاہیں گے تو ان کو اس میں پلٹا دیا جائے گا (اور ان سے کہا جائے گا) عذاب سوزاں کو چکھو۔

۴۔ خدایا! ہمیں اس سے باہر نکال دے، اگر ہم پھر ایسا کریں تو ضرور ستم گر ہوں گے (اور عذاب کے مستحق) وہ کہے گا: جہنم میں دور ہو جاؤ اور مجھ سے بات نہ کرو۔

۵۔ اور جو لوگ جہنم میں ہوں گے جہنم کے داروغوں سے کہیں گے اپنے پروردگار سے درخواست کریں کے ہمارے عذاب میں ایک دن کی تخفیف کر دے، وہ کہیں گے کیا تمہارے انبیاء واضح دلائل لے کر تمہارے پاس نہیں آئے تھے؟ وہ جواب دیں گے، جی ہاں! تب وہ کہیں گے پھر جتنا چاہو پکارو لیکن کافروں کی پکار کی کہیں شنوائی نہیں۔

۶۔ جب آگ دور سے انہیں دیکھے گی تو وہ اس کی وحشت ناک اور غصیلی آواز جو شدید تنفس کے ساتھ ہوگی، سنیں گے۔

۷۔ اے ایمان والو! خود کو اور اپنے خاندان والوں کو اس آگ سے روکو جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے، وہ آگ کہ جس پر نہایت سخت گیر فرشتے مقرر ہیں، وہ ہرگز خدا کے فرمان کی مخالفت نہیں کرتے اور اس کے فرامین پر پوری طرح عمل کرتے ہیں۔

۸۔ اور بہشت والے جہنمیوں کو پکاریں گے کہ ہمارے پروردگار نے ہم سے جو وعدہ کیا تھا ہم نے اُسے حق پایا، کیا تم نے بھی اس وعدے کو سچا پایا جو خدا نے تم سے کیا تھا؟ وہ کہیں گے جی ہاں! تب ایک منادی ان کے درمیان ندا دے گا کہ ظالموں پر خدا کی لعنت ہے۔

تفسیر:

جاں کاہ غم واندوہ اور بے پایاں حسرتیں:

روحانی غم اور سزاؤں سے مراد وہ امور ہیں جو انسان کی جان اور روح پر اثر ڈالتے ہیں اگر چہ ظاہری طور پر اس کے جسم پر کوئی اثر نہ

[1] کچھ اور آیتیں بھی انہی مفاہیم کو بیان کرتی ہیں مثلاً مجادلہ ۵، سجدہ ۲۰، اعراف ۵۰، حاقہ ۳۵۔

رکھتے ہوں یا یہ کہ ان کے دو اثر ہیں اور وہ جسم کو بھی بلا واسطہ طور پر آزار دیتے ہیں اور روح کو بھی۔

پہلی آیت میں دوسری قسم کا ایک نمونہ نظر آتا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

اور جن لوگوں نے الکار کیا اور ہماری آیتوں کی تکذیب کی ان کے لئے ایک رسوا کن عذاب ہوگا" والذین کفروا و کذبوا بایتنا فاولٓئك لهم عذاب مهین"۔

قرآن یہاں پر وضاحت نہیں کرتا کہ یہ عذاب کیسے جہنمیوں کو ذلت وخواری میں مبتلا کرتے گا، پس ایک کلی اشارہ کرتا ہے جہنم کے عذاب کی بہت سی تحقیر آمیز جہتیں اس ایک اشارے میں پنہاں ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغروروں اور خود پرستوں کو ذلت کی اتھاہ گہرائیوں میں گرایا جائے گا، بعض مفسروں نے جن میں قرطبی بھی شامل ہے اس احتمال کا ذکر کیا ہے کہ یہ رسوا کُن عذاب یہاں اس انجام کی طرف اشارہ ہے کہ جس کا میدان بدر میں مشرکوں کو سامنا کرنا پڑا، لیکن اس سے پہلی آیت کہ جن مومنوں کو جنات نعیم کی بشارت دی گئی ہے، کی طرف توجہ دی جائے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس آیت کا اشارہ دوزخ کے رسوا کن عذاب کی طرف ہے۔

بہرحال قرآن کی متعدد آیتوں میں آنے والی یہ عبارت ہمیں بتاتی ہے کہ دوزخ کا عذاب طرح طرح کی رسوائیوں سے آمیختہ ہے جو روح کے لئے بھی آزار کا باعث ہے اور یہ ان تحقیروں اور اہانتوں کا تجسم ہے جو وہ انبیاء الٰہی، پاک دل مومنین اور بایمان مستضعفین کے لئے روار رکھتے تھے، اس روز انہیں اپنے اعمال کے نتیجے کو اس صورت میں دیکھنا ہوگا۔

دوسری آیت میں جہنمیوں کی رسوائی کی بات ہو رہی ہے جو خود ایک دردناک اور معنوی عذاب ہے، بایمان (اولو الالباب) کی زبان سے یہ بات نقل کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وہ کہتے ہیں: خدایا جس کو تو (اس کے اعمال کی وجہ سے) آگ میں ڈال دے اس کو تو نے خوار اور رسوا کر دیا اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں "ربنا انك من تدخل النار فقد اخزیته وما للظلمین من انصار"۔

اخزیته خزی کے مادے سے ہے اور لغت کی کتابوں میں اس کے بہت سے معانی بیان ہوئے ہیں، مثلاً بدحالی، دور ہونا، ذلت، رسوائی، تحقیر اور یہی معانی مفسرین نے بھی بیان کئے ہیں۔[1]

اس آیت کے لہجے سے پتہ چلتا ہے کہ قیامت کی روحانی سزائیں زیادہ دردناک ہیں کیونکہ اولوالالباب خدا کی بارگاہ میں عرض کریں گے کہ جن کو تو نے جہنم میں ڈال دیا انہیں رسوا کر دیا، یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ رسوائی جہنم کی آگ سے زیادہ شدید ہے، یہ بات بالکل اس طرح ہے جیسے بعض لوگوں کو جیل خانے سے زیادہ پریشانی نہیں ہوتی لیکن اس مسئلے کے فاش نہ ہونے پر بہت زور دیتے ہیں کیونکہ اس کا فاش ہونا معاشرے میں ان کی رسوائی کا باعث بن جاتا ہے اور یہ جیل سے زیادہ دردناک بات ہے۔

---

[1] مقائیس اللغه۔ مصباح اللغه۔ صحاح اللغه۔ لسان العرب اور التحقیق فی کلمات القرآن الکریم۔ تفسیر مجمع البیان میں خزی کے دو اور معانی بھی بیان ہوئے ہیں، ایک ہلاکت اور دوسرا انخجالت آور مقام پر ہونا۔

"وما للظلمین من انصار" اس حقیقت کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ وہ جو بھی سہیں گے ان کے ظلم وستم ہی کی وجہ سے ہو گا، اور ایسا ہی ہونا چاہیے کہ وہاں پر ان کا کوئی یار و مددگار نہ ہو، البتہ یہ عبارت قابل شفاعت افراد کی شفاعت کے مسئلے کے منافی نہیں ہے کیونکہ یہاں پر مراد ان مددگاروں کی نفی ہے جو اپنی طاقت کے بل بوتے پر ظالموں کی مدد کریں نہ یہ کہ الٰہی قدرت سے مدد کرنے والوں کی نفی ہوتی ہو۔

تیسری آیت میں جہنمیوں کے جاوداں غم واندوہ کا تذکرہ ہو رہا ہے جو اُن کے روحانی مصائب وآلام کی حکایت کرتا ہے، ارشاد ہوتا ہے: جب بھی وہ جہنم کے غم واندوہ سے نکلنا چاہیں گے انہیں اس میں واپس پلٹا دیا جائے گا (اور اُن سے کہا جائے گا) عذاب سوزاں کو چکھو۔' کلما ارادوا ان یخرجوا منہا من غم اعیدوا فیہا و ذوقوا عذاب الحریق"۔

بہت سے مفسروں نے کہا ہے کہ جب وہ اس جانکاہ غم واندوہ سے نجات چاہیں گے اور دوزخ کے کناروں کے نزدیک ہوں گے تو جہنم کے داروغے انہیں اپنے تازیانوں یا آتشیں گرزوں سے واپس دھکیل دیں گے، کیونکہ اس سے پہلی' ولھم مقامع من حدید" میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے"ذوقوا عذاب الحریق" (عذاب سوزاں کو چکھو) جو بھی اُن کی تحقیر اور سرزنش کے طور پر ان سے کہا جائے گا، اس روحانی عذاب کا ایک اور نمونہ ہے۔[1]

انتہائی تحقیر اور سرزنش:

چوتھی آیت میں جہنمیوں کی توہین اور تحقیر کے بارے میں جو خود ایک روحانی عذاب الیم ہے، ایک اور انداز سے گفتگو ہو رہی ہے، ارشاد ہوتا ہے: (جہنمی کہیں گے) خدایا ہمیں جہنم سے باہر نکا دے، اگر ہم اپنے سابقہ اعمال کی طرف پلٹیں تو یقینا ظالم ہوں گے (اور عذاب کے مستحق بھی)"ربنا اخرجنا منہا فان عدنا فانا ظلمون'۔

لیکن پروردگار عالم کی طرف سے اُن سے کہا جائے گا (جہنم میں دور ہو جاؤ اور مجھ سے بات نہ کرو" قال اخسوا فیھا و لا تکلمون"۔

تقریبا تمام ارباب لغت اور تفسیر نے تصریح کی ہے کہ"اخسائ" وہ کلمہ ہے جو کتوں کو دھتکارتے وقت استعمال کیا جاتا ہے، اس کلمہ کا یہاں پر استعمال گناہگار اور متکبر ظالموں کی تحقیر کے لئے ہے۔

بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ"لا تکلمون" (مجھ سے بات نہ کرو) اس سے زیادہ دردناک اور غم انگیز ہے کہ رحیم وکریم مولا ایک بندے کو اپنے پاس سے اس طرح دور کر دے اور اس سے یہ کہے کہ مجھ سے ہرگز بات نہ کرو، یہ وہی چیز ہے جس کی طرف دعائے کمیل میں بہت ہی لطیف عبارت میں اشارہ ہوا ہے:"فھبنی یا الھی وسیدی ومولای وربی صبرت علی عذابك فکیف اصبر علی فراقك' اے

---

[1] حریق اگرچہ اسم مصدر ہے لیکن یہاں فاعلی معنی رکھتا ہے لیکن بعض کے قول کے مطابق صیغہ مبالغہ (یا صفت مشبہ ہے اور مفردات کے مطابق حریق آگ کے معنی میں ہے، عذاب کے حریق کی طرف اضافے کے پیش نظر یہ تفسیر یہاں زیادہ مناسب لگتی ہے۔

میرا خدا، آقا، مولا اور پروردگار! عذاب پر اگر میں صبر بھی کرلوں تو بھی تیرے فراق اور جدائی کو کیسے برداشت کر پاؤں گا۔

وہ لوگ وہاں پر ایسے دردناک روحانی عذاب میں کیوں مبتلا ہوں گے؟ بعد والی آیتیں اس کا جواب دیتی ہیں اور کہتی ہیں: یہ اس لئے ہوگا کہ میرے بندوں میں ایک جماعت یہ کہتی تھی کہ خدایا ہم ایمان لائے ہیں، ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما اور تو بہترین رحم کرنے والا ہے۔ لیکن تم لوگوں نے اُن کا مذاق اڑایا یہاں تک کہ اس طرز عمل کے باعث تم میری یاد سے غافل ہو گئے اور ہمیشہ ان پر ہنستے رہے۔" انه كان فريق من عبادي يقولون ربنا امنا فاغفر لنا وارحمنا وانت خير الراحمين فاتخذ تموهم سخريا حتى انسو كم ذكري و كنتم منهم تضحكون" [1]

اس استہزاء تمسخر اور باایمان افراد کے ساتھ ٹھٹھے کا نتیجہ یہی ہے کہ آج تم لوگوں کی توہین اور تحقیر کی جائے اور حقیقت میں یہ تمہارے ہی اعمال کا تجسم ہے۔

پانچویں آیت کے مطابق جہنم کے داروغے اور عذاب وسزا کے مامور جہنمیوں کی ملامت سرزنش اور تحقیر کریں گے، ارشاد ہوتا ہے: جو لوگ جہنم کی آگ میں ہیں جہنم کے داروغوں سے درخواست کریں گے کہ اپنے خدا سے عرض کرو کہ ہمارے عذاب میں (کم از کم) ایک دن کی تخفیف کردے، وہ کہیں گے: کیا تمہارے انبیاء تمہارے پاس واضح دلائل لے کر نہیں آئے تھے؟ وہ جواب دیں گے جی ہاں (آئے تھے)، تب وہ کہیں گے پھر جتنا چاہو پکارو لیکن جان لو کہ کافروں کی دعا بیکار ہی ہے (اور ہرگز قبول نہیں ہوگی)" وقال الذين فى النار لخزنة جهنم ادعوا ربكم يخفف عنا يوم من العذاب. قالوا اولم تك تأتيكم رسلكم بالبينت قالوا بلى قالو فادعوا وما دعوا الكفرين الا فى ضلل'۔

یہ جواب ان کی روح کے لئے تازیانہ ثابت ہوگا اور انہیں اذیت دے گا، انہوں نے عذاب سے صرف ایک دن نجات کی درخواست کی تھی، لیکن قبول نہ ہوئی، انہوں نے داروغوں سے کہا کہ تم ہمارے لئے دعا کرو لیکن داروغوں نے جواب دیا کہ تم خود دعا کرو کیونکہ وہ اس قابل نہ تھے کہ اُن کے لئے دعا کی جاتی اور یہ بھی ایک طرح کی توہین ہے یا ان کے لئے دعا بھی خدا کی اجازت ہی سے کی جاسکتی ہے جب کہ خدا نے ہرگز اس طرح کی کوئی اجازت نہیں دی یا چونکہ یہ مستجاب ہونے والی دعا نہیں، لہٰذا بے فائدہ ہے، اس لئے وہ دعا تک نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ تم خود ہی دعا کرو (اور جان لو کہ کہیں سُنی نہیں جائے گی) اور یہ بھی ایک تکلیف دہ بات ہے۔

چھٹی آیت میں جہنمیوں کے ایک اور روحانی عذاب کی نشاندہی ہوتی ہے، ارشاد ہوتا ہے: جب جہنم انہیں دور سے دیکھے گا تو وہ اس کی وحشت ناک اور غصیلی آواز جو شدید تنفس کے ساتھ ہوگی، سنیں گے" اذا راتهم من مكان بعيد سمعوا لها تغيظا وزفيرا"۔

یہاں پر جہنم کے لئے ایک ایسے وحشی درندے کی تمام صفتیں بیان ہوتی ہیں جو اپنے شکار کو دیکھ کر اپنی غصیلی اور وحشت ناک آواز بلند کرتا ہے جو شدید تنفس کے ساتھ ہوتی ہے، یہ گویا ایک ایسا وحشت ناک منظر ہوگا جو اس کے پورے وجود پر وحشت طاری کردے گا اور اُسے ہلا

---

[1] سورہ مومنون۔ ۱۰۹، ۱۱۰۔

کر رکھ دے گا۔

''تغیظ'' غیظ کے مادے سے مفردات میں راغب کے بقول ''غضب کی شدت'' کے معنی میں ہے اور تغیظ اس کے اظہار کے معنی میں ہے، غصے کی حالت اگر چہ سنی نہیں جاسکتی لیکن خوفناک صداؤں جیسی بعض صفتیں اس کے ساتھ ہوتی ہیں جو سنی جاسکتی ہیں۔

''زفیر'' پھیپھڑوں میں اس طرح سانس کی آمد و رفت کے معنی میں ہے کہ جس سے سینہ اُوپر کو اٹھ جائے اور اس کے ساتھ اکثر ایسی وحشت ناک صدائیں ہوتی ہیں کہ جو سنی جاسکتی ہیں۔

بعض ایسے مفسرین جو یقین نہ کرسکے کہ جہنم ایک زندہ وجود ہے، دیکھتا ہے اور ادراک رکھتا ہے اور مجرموں کو پہچانتا ہے، وہ مجبور ہوئے ہیں کہ یہاں کچھ تقدیر میں فرض کریں، انہوں نے کہا ہے کہ جہنم کے دیکھنے سے مراد داروغوں کا دیکھنا ہے جب کہ ہم جانتے ہیں کہ تقدیر میں لینا قاعدے کے خلاف ہے اور یہاں اس کی ضرورت نہیں ہے کیا مانع ہے کہ ہم کہیں جہنم اور جنت میں بھی روح ہے اور میں پیش آنے والے واقعات کو وہ سمجھتا ہے، بعض روایتوں سے یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ جہنم کی آنکھ، کان اور زبان ہوگی اور ہوہ مجرموں کو بخوبی پہچان لے گا اور انہیں پکڑے لے گا، پرندے جس طرح اپنے دانے کو پہچانتے ہیں، دوزخ کی یہ شناخت اس سے بہتر ہوگی۔[1]

آج ہم اس مسئلے کے بعض چھوٹے نمونے دنیا میں دیکھتے ہیں کہ کمپیوٹر کی مدد سے مختلف عمارتوں میں لگائی گئی الیکٹرونک کان اور آنکھیں بہت سے مسائل کو دیکھتی اور سنتی ہیں اور ان کا مناسب ردعمل دکھاتی ہیں اگر چہ وہ عمارت ادراک نہیں رکھتی، ممکن ہے مجرموں کے بارے میں جہنم کا ردعمل اسی طرح کا یا اس سے بالاتر یعنی ادراک کے ساتھ ہو۔

ساتویں آیت میں دوزخیوں کی روحانی سختیوں کا ایک اور چہرہ دکھایا جارہا ہے، اس آیت میں خدا مومنوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے: اے ایمان لانے والو خود کو اور اپنے خاندان والوں کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھروں گے۔ ''یایها الذین امنو اقوا انفسکم واهلیکم نارا وقودها الناس والحجارة''

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ جہنم کی آگ اس دنیا کی آگ سے بہت مختلف ہوگی، حجارہ سے مراد خواہ پتھر کے بت ہوں یا اس سے اعم ہوں اور خواہ مراد وہ آگ ہو جو ان پتھروں کے ایٹموں کے اندر سے باہر نکلتی ہے یا کوئی اور چیز، جیسا بھی ہے اس کا کچھ حصہ انسانوں ہی کے وجود کے اندر سے یعنی ان کے اعتقادات اور باطنی بری نیتوں سے، اور ان کے گناہوں میں آلودہ اعضاء سے شعلہ ور ہوگا یا پھر ان پتھروں سے جنہیں انہوں نے اپنا معبود بنالیا تھا یا ان پتھروں سے جو محل اور اس طرح کی چیزیں بنانے میں ان کے غرور اور تکبر کا ذریعہ تھے۔

پھر مزید ارشاد ہوتا ہے: ''اس آگ پر نہایت سخت گیر فرشتے مقرر کئے گئے ہیں جو ہرگز اللہ کے فرمان کی مخالفت نہیں کرتے اور اس کے فرامین کا پوری طرح اجرا کرتے ہیں'' علیها ملئکة غلاظ شدادلا یعصون الله ما امرهم ویفعلون ما یومرون''۔

ان نہایت سخت گیر فرشتوں کا وجود اہل دوزخ کی روحانی مصیبتوں میں مزید اضافہ کرے گا اور نجات کی رائیں ہر طرف سے ان پر

---

[1] تفسیر قرطبی وروح المعانی زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

مسدود کر دے گا۔

یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے اپنی زندگی میں ہمیشہ اپنے زیر دستوں پر سختی کی تھی، ان کے سخت گیر ماموروعوام پر سختیاں کرتے تھے اور بے رحمی، سخت گیری اور شفقت کا نہ ہونا ان کی رفتارِ زندگی کا حصہ تھا، آج وہ خود بھی ایسے انجام میں مبتلا ہوں گے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ بعد والی آیت میں کافروں سے خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے: ''آج معذرت نہ چاہو، تمہاری سزا تمہارے اعمال ہی ہیں''، ''لا تعتذروا الیوم انما تجزون ما کنتم تعملون'۔

بعض مفسرین جب پتھر کے اندر سے آگ کے باہر نکلنے کا تصور نہیں کر سکے تو انہوں نے یوں کہا ان پتھروں سے مراد گندھک کا پتھر ہی ہے جو لوہے سے ٹکرا کر بھڑک اٹھتا ہے، جب کہ آج ہم جانتے ہیں کہ ہر مادی وجود کے اندر پنہاں ایٹمی قوت میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ آگ کے عظیم شعلوں میں تبدیل ہو۔

''غلاظ' غلیظ کی جمع ہے ''شداد' شدید کی جمع ہے اور دونوں کا ایک ہی معنی ہے، ممکن ہے ان دونوں کا اکٹھا ذکر تاکید کے لئے ہو لیکن بعض نے کہا ہے کہ ''غلاظ'' قول میں سختی کی طرف اشارہ ہے اور ''شداد'' عمل میں سختی کی طرف یا پہلا کلمہ خشونت خلق کی طرف اشارہ ہے اور دوسرا خشونت خلق کی طرف، بہر حال وہ فرشتے خدا کے فرامین کے سامنے سر تسلیم خم ہیں اور اس کے اوامر سے منحرف نہیں ہوتے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اصولی طور پر انسان کو لکڑی اور پتھروں کے ساتھ قرار دینا خود اُن کے لئے ایک طرح کی روحانی اور معنوی تحقیر ہے۔[1]

آٹھویں اور آخری عبارت میں بہشتیوں اور جہنمیوں کے مابین ہونے والی دلخراش اور جانکاہ گفتگو کے بارے میں بات ہو رہی ہے جس سے دوزخیوں کی روح کو بہت تکلیف ہوگی، ارشاد ہوتا ہے: جنتی جہنمیوں کو بلائیں گے اور (ان کی تنبیہ کے طور پر) کہیں گے کہ ہمارے پروردگار نے جو وعدے ہم سے کئے تھے وہ ہم نے سچ پائے، کیا تم نے بھی اپنے پروردگار کے وعدے سچ پائے؟''و نادی اصحب الجنة اصحب النار ان قد وجدنا ما وعدنا ربنا حقا فهل وجدتم ما وعد ربكم حقا''۔

اور وہ انتہائی شرمندگی اور سرافگندگی سے جواب دیں گے: جی ہاں! (سب سچ تھا لیکن افسوس کہ ہم غرور و غفلت میں مبتلا تھے)'' قالوا نعم'۔

اس وقت ان کے درمیان سے ایک منادی پکارے گا کہ ظالموں پر خدا کی لعنت ہو''فاذن موذن بینهم ان لعنة الله على الظلمين''۔

یہ باتیں جہنمیوں کے زخمیوں پر نمک چھڑکیں گی اور آگ کے شعلے اُن کے باطن کو مزید جلائیں گے۔

ہاں وہ (جیسا کہ بعد والی آیت میں آیا ہے) ایسے لوگ ہوں گے جو لوگوں کو خدا کے راستے سے روکتے تھے، لہٰذا اس دن خدا کی

---

[1] فی ظلال القرآن جلد ۸ صفحہ ۱۹۸۔

رحمت سے دور ہوں گے (لعنت رحمت سے دوری ہی ہے)۔

یہ منادی کون ہے جو بہشت وجہنم پر محیط ہے اور سب اس کی آواز سنیں گے اور وہ خدا کی طرف سے بات کرے گا؟ اس بارے میں شیعہ اور اہل سنت سے مروی بہت سی روایتوں میں ہے کہ وہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام ہوں گے جنہوں نے اپنی پوری عمر ظالموں اور ستم گروں سے لڑنے میں گزار دی۔

یہ عجیب ہے کہ بعض متعصب افراد نے اس فضیلت کا مرتبہ گھٹانے کی کوشش کی ہے اور کہا ہے کہ یہ کام علیؑ کی فضیلت کا باعث نہیں بن سکتا، جب کہ یہ واضح ہے کہ ایسے الٰہی مادی کو بہت بلند مرتبہ اور عالی ہونا چاہیے جو بہشت اور جہنم پر مسلط ہوگا اور اس روز خدا کا پیغام تمام لوگوں تک پہنچائے گا۔

مختصر یہ کہ انسان جسم اور روح کا مرکب ہے اور معاد بھی دو پہلوؤں سے متحقق ہوگا اور سزائیں اور جزائیں بھی دو طرح کی ہیں، بنا برایں جہنمیوں کو نہ صرف جسمانی تکالیف کا سامنا ہوگا بلکہ شاید روحانی اور معنوی عذاب اور تکالیف ان کے لئے زیادہ دردناک ہوں، بے پایاں غم اور اندوہ، بڑی رسوائی، گذشتہ پر افسوس اور ندامت، بہشتیوں سے اپنی حالت کا موازنہ، سخت گیر داروغے، مختلف سرزنشیں، تحقیریں اور ڈانٹ ڈپٹ ایسے امور ہوں گے جو اُن کی روح کو بہت تکلیف پہنچائیں گے اور انہیں عذاب الیم میں مبتلا کر دیں گے۔

مسلماً یہ سزائیں اُن کے دنیا میں کئے ہوئے اعمال سے ہم آہنگ ہوں گی جب وہ دنیا میں مظلوموں پر طرح طرح کی مظالم ڈھاتے تھے، الٰہی آیتوں کا کتنا مذاق اُڑاتے تھے اور خدا کے بندوں کا تمسخر اڑاتے تھے اور مومنوں کی تحقیر کرتے تھے، دوسروں کے سامنے مغرور بنتے تھے، اگر وہ اپنے اعمال کا تجسم وہاں دیکھیں اور اُن کے نتائج میں مبتلا ہوں اور دنیا کی کھیتی میں بوئی ہوئی فصل وہاں کاٹیں، تو مقام تعجب نہ ہوگا۔

(٦) سزاؤں کا دوام

اشارہ:

بے شک ہمیشہ جرم اور جرمانے کے مابین ایک تناسب برقرار رہا ہے، جتنا جرم بھاری ہوگا اس کی سزا اور جرمانہ بھی اتنا ہی زیادہ ہوگا، سزاؤں میں یہ ایک اصول ہے۔

لیکن انسانی اعمال کے طبیعی اور وضعی آثار میں یہ مسئلہ اور طرح سے ہے، کبھی انسان ایک لمحے کی غفلت اور سستی سے ایسے انجام کو پہنچتا ہے کہ جس کی کبھی تلافی نہیں ہوسکتی، کیونکہ جہل اور سستی کا وار اتنا سخت اور بھاری ہوتا ہے کہ کبھی انسان کے ایک عضو کو ہمیشہ کے لئے ناکارہ بنا دیتا ہے اور اُسے آخر عمر تک اس کا کفارہ اور جرمانہ ادا کرنا پڑتا ہے جب کہ وہ صرف ایک لمحہ کے لئے خطا کا ارتکاب کرتا ہے۔

قرآنی آیات سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ ایک گروہ ہمیشہ عذاب میں مبتلا رہے گا، دوسرے لفظوں میں دائماً جہنم میں رہے گا، ''خلود'' کا یہ مسئلہ بہت سے سوالات کا موجب بنا ہے اور ان کے مختلف جوابات دیئے گئے ہیں جن کی تفصیل انشاءاللہ آگے آئے گی۔

پہلے ہم قرآن کی طرف لوٹتے ہیں اور ان آیات میں غور وفکر کرتے ہیں جن میں سے ہر ایک میں عذاب کی ہمیشگی کے بارے میں ایک نئے انداز سے بات ہوئی ہے:

١۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ

٢۔ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنْهَا ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ٣٧ ﴿المائدۃ: ٣٧﴾

٣۔ فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ

٤۔ وَنَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ ۭ قَالَ اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ''

٥۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ۭ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ۭ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ

ترجمہ:

۱۔ اور جو لوگ کافر ہوئے اور انہوں نے ہماری آیتوں کا انکار کیا وہ اہل دوزخ ہیں اور ہمیشہ وہاں رہیں گے۔

۲۔ وہ ہمیشہ آگ سے نکلنا چاہیں گے لیکن نکل نہ سکیں گے اور اُن کے لئے پائیدار عذاب ہوگا۔

۳۔ لیکن جو لوگ شقی ہوں گے وہ آگ میں ہوں گے اور اُن کے لئے زفیر اور شہیق (طولانی آہیں اور نالے) ہوں گے اور وہ ہمیشہ اس میں رہی گے جب تک زمین و آسمان قائم ہیں، مگر وہ جو خدا چاہے، پروردگار جس چیز کا ارادہ کرتا ہے انجام دیتا ہے۔

۴۔ وہ لوگ چیخیں گے کہ اے دوزخ کے مالک! ہماری آرزو ہے کہ تمہارا پروردگار ہمیں مار ڈالے (تا کہ ہم آرام پا سکیں)، وہ کہے گا: تم یہیں رہو گے۔

۵۔ اور (اس وقت) پیروکار کہیں گے: کاش ہم ایک بار پھر دُنیا میں پلٹ جاتے تا کہ ان گمراہ رہبروں سے بیزاری کا اظہار کر سکتے جیسے (آج) وہ ہم سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں، (جی ہاں) خدا انہیں اس طرح حسرت کی صورت میں ان کے اعمال دکھائے گا اور وہ ہرگز (جہنم کی) آگ سے نکل نہ سکیں گے۔

تفسیر:

عذاب جاوداں:

پہلی آیت میں مشہور کلمہ ''خلود'' (جاودانی) کا ذکر ہے، فرمایا گیا ہے جو لوگ کافر ہوئے اور انہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اہل آتش ہیں، اور ہمیشہ وہاں رہیں گے ''والذین کفروا و کذبوا بایتنا اولٓئک اصحب النار ھم فیھا خلدون''۔ جب کہ بعض دوسری قرآنی آیتوں میں ''خلود'' کے لفظ کے بعد ''ابدیت'' کا لفظ بھی آیا ہے جو اس کی زیادہ تاکید کے لئے ہے، اسی طرح فرماتا ہے: جس نے خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کی اس کے لئے آتش دوزخ ہے، وہ جاوداں طور پر ابد تک وہاں رہے گا ''ومن یعص اللہ ورسولہ فان لہ نار جھنم خلدین فیھا ابدا''۔ (سورہ جن ۲۳)

یہی مفہوم سورہ احزاب کی آیت ۶۵ میں بھی ہے اور ''خلود'' کا ابدیت کے ساتھ ذکر ہوا ہے۔

آگ کے بارے میں ''خلود'' کی عبارت قرآن مجید کی بہت سی آیتوں میں آئی ہے، کبھی وصف کی صورت میں ''خلدون، خلدین'' اور کبھی فعل کی صورت میں جیسا کہ سورہ فرقان کی آیت ۶۹ میں مشرکوں، قاتلوں اور زنا کاروں کے قیامت میں کئی گنا عذاب کی طرف اشارہ کرنے کے بعد ان کے بارے میں فرماتا ہے:

''ویخلد فیہ مھانا''

ہمیشہ رسوائی سے وہاں رہے گا۔

کبھی یہ عنوان عذاب کے لئے قید کے طور پر بیان ہوا ہے جیسا کہ سورہ یونس کی آیت ۵۲ میں ہے:

"ثم قیلاللذین ظلموا ذوقوا عذاب الخلد"

پھر ظالموں سے کہا جائے گا، چکھو ہمیشہ عذاب۔

جہنم کے عذاب کے بارے میں خلود کی تعبیر مختلف عبارتوں (فعلی، مصدری، وصفی) میں تیس بار سے زیادہ قرآنی آیات میں آئی ہے اور اس عنوان پر قرآن کی اس قدر تاکید کا ایک خاص مفہوم ہے جس کی دلیل آئندہ کی بحثوں میں انشاء اللہ واضح ہوگی، البتہ بہشتی نعمتوں کے بارے میں بھی بہت سی قرآنی آیتوں میں یہ لفظ آیا ہے جس کی طرف بہشتی نعمتوں کی بحث میں اشارہ ہو چکا ہے،

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ لغت اور مفسرین کے کلام میں ''خلود'' کس معنی میں آیا ہے؟ لسان العرب میں ''خلد'' کی تفسیر ایسی سرائے سے کی گئی ہے جہاں انسان کا قیام دائمی ہے اور وہ وہاں سے نکل نہیں سکتا، مزید کہا گیا ہے کہ آخرت کو ''دار الخلد'' اس لئے کہا گیا ہے کہ لوگ ہمیشہ وہاں رہیں گے۔

مقائیس اللغہ میں اس لفظ کی اصل کے لئے ایک ہی معنی ذکر کیا گیا ہے اور وہ ہے ثبات، بقا، اور ملازمہ (لازم وملزوم ہونا)، یہی معنی ''صحاح اللغۃ'' اور دوسری کتابوں میں بھی آیا ہے۔

لیکن راغب نے مفردات میں اس کی اصل کو کسی چیز کے خراب ہونے سے محفوظ رہنے اور اپنی اصلی حالت پر باقی رہنے کے معنی میں قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ ہر وہ چیز جو جلد متغیر نہ ہو اور خراب نہ ہو جائے عرب اس کی خلود سے توصیف کرتے ہیں، اسی لئے طول عمر اور لمبی مدت تک بقاء کے معنی میں بھی آیا ہے۔

''راغب'' اپنے کلام میں ایک اور جگہ کہتا ہے کہ ''رجل مخلد'' (جاوداں مرد) دیر سے بوڑھا ہونے والے مرد کو کہتے ہیں۔

بہر حال ارباب لغت کی عبارت سے مجموعی طور پر دو مختلف اقوال سامنے آتے ہیں، پہلا قول یہ کہ اس کا اصلی معنی جاودانی، ہمیشگی اور ابدیت ہے اور اگر طول عمر پر اس کا اطلاق ہوتا ہے تو تشبیہ کے باب سے ہے، دوسرا قول یہ کہ اس کا اصلی معنی طول عمر ہے اور اگر جاودانگی اور ابدیت کو بھی خلد کہا جاتا ہے تو اس وجہ سے ہے کہ یہ اس کا واضح اور روشن مصداق ہے۔

اس بارے میں مفسرین نے بھی مختلف باتیں کی ہیں۔

بعض مفسرین نے تصریح کی ہے کہ یہاں پر ''خلود'' دوام کے معنی میں ہے جس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔[1]

بعض دوسروں نے کہا ہے کہ اس کا اصلی معنی دوام اور مجازی معنی طولانی مدت ہے اور جب قرآن میں استعمال ہوتا ہے تو پہلے معنی یعنی

---

[1] مجمع البیان میں طبرسی نے۔

دوام کے معنی میں ہے۔[۱]

بعض نے اسی مفہوم کو ایک اور عبارات میں یوں بیان کیا ہے کہ خلود الغت میں طولانی مدت تک ٹھہرنے کے معنی میں ہے جیسا کہ طویل المدت قید کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ''خلد فلان فی السجن''لیکن شریعت کی زبان میں دوام اور ابدیت کے معنی میں ہے۔[۲]

تفسیر المنار میں آیت ہے کہ عصر حاضر کے فکری استقلال کے بعض مدعی خلود کے بارے میں گذشتہ علماء کے بعض کلام میں استعمال ہونے والی تاویلوں سے استفادہ کرتے ہوئے جرات سے یہ کہنے لگے ہیں کہ کافروں کے عذاب میں خلود کا معنی یہ ہے کہ وہ طولانی مدت تک وہاں رہیں گے کیونکہ خداوند رحمن ورحیم، جس کی رحمت اس کے غضب پر مقدم ہے، ہرگز اپنے بندوں میں سے کسی کو لامتناہی عذاب میں مبتلا نہیں کرتا۔[۳]

بعض کہتے ہیں: اگر چہ سرکشی کرنے والے کافروں اور سرکش جنوں کا پورا وجود گناہوں میں گھرا ہوا ہے ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے، لیکن دوزخ ہمیشہ ایک حالت پر باقی نہ رہے گی بلکہ ایک وقت وہ بھی آئے گا جب اس کی آگ بجھ جائے گی اور جہنمیوں کو آرام میسر آئے گا۔

اس احتمال کا بھی ذکر کیا گیا ہے کہ لمبی مدت گزرنے اور بہت زیادہ سزائیں برداشت کرنے کے بعد ان کے اور جہنم کے ماحول کے مابین ایک طرح کی ہم آہنگی پیدا ہو جائے گی اور وہ آہستہ آہستہ آگ کے عادی ہو جائیں گے جس سے تکلیف کا احساس جاتا رہے گا۔

البتہ علمائے اسلام اور مفسرین قرآن نے اس طرح کے احتمالات کو رد کر دیا ہے چونکہ یہ قرآن کی صریح آیتوں کے خلاف ہیں کیونکہ جیسا کہ زیر بحث آیتوں میں ہم نے دیکھا ہے صرف خلود کی تعبیر نہیں آئی جس کی اس طرح سے تفسیر کی جائے بلکہ قرآن مجید میں اس بارے میں دوسرے الفاظ بھی آئے ہیں جن کی اس طرح توجیہ نہیں کی جا سکتی۔ (توجہ کیجئے گا)

المختصر یوں لگتا ہے کہ بعض لوگ عذاب کی جاودانی اور خلود کا مسئلہ حل کرنے میں جب ناکام ہوئے تو اس طرح کی توجیہات کرنے لگے ہیں ورنہ مجرموں کی ایک جماعت پر عذاب کی ہمیشگی کے بارے میں قرآنی آیات اور اسلامی روایات کی دلالت قابل بحث نہیں ہے۔

دوسری تعبیر میں لفظ ''اقامت'' کا ذکر ہوا ہے، فرمایا گیا ہے: کافروں کی خواہش ہوگی کہ وہ آگ سے نکل سکیں لیکن ہرگز نکل نہ سکیں گے اور ان کے لئے عذاب ''مقیم'' اور پائیدار عذاب ہوگا ''یریدون ان یخرجوا من النار وما ھم بخرجین منہا ولھم عذاب مقیم''۔

عذاب کی ''مقیم'' سے توصیف یہ ظاہر کرتی ہے کہ اُن کے لئے یہ سزائیں پائیدار اور برقرار ہوں گی۔

---

[۱] تفسیر قرطبی جلد ا صفحہ ۲۰۷۔

[۲] تفسیر مراغی، جلد ا صفحہ ۶۹۔

[۳] تفسیر المنار، جلد ا صفحہ ۳۶۴،

عذاب کی ابدیت:

تیسری آیت میں دوزخیوں کی ایک جماعت کے لئے عذاب دوزخ کی ابدیت ایک اور عبارت میں زیادہ صراحت کے ساتھ بیان ہوئی ہے، ارشاد ہوتا ہے: لیکن جولوگ شقاوت والے ہوں گے جہنم کی آگ میں ہوں گے اور ان کے لئے زفیر اور شھیق (طولانی گریہ وزاری) ہے، ہمیشہ وہاں رہیں گے جب تک زمین وآسمان قائم ہیں''فاما الذین شقوا ففی النار فیھا زفیر و شھیق۔ خلدین فیھا ما دامت السموت والارض''۔

اور آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: مگر جو تمہارا پروردگار چاہے، مسلماً تمہارا پروردگار جو چاہتا ہے انجام دیتا ہے''الا ما شآء ربک ان ربک فعال لما یرید''۔

(مسلماً اس روز آسمان اور زمین ہوں گے اور وہ ایسی زمین اور ایسا آسمان ہوگا جو قرآنی آیات کے مطابق دنیا کے آسمان اور زمین کی بربادی کے بعد قائم ہوا ہوگا اور یہ زمین وآسمان جاوداں اور ابدی ہوں گے)۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ عبارت عربی زبان میں ابدیت کے لئے کنایہ ہے کیونکہ عربی گرائمر میں بہت سی ایسی تعبیریں ہیں جو ابدیت کے معنی میں استعمال ہوتی ہیں مثلاً''مالاح کوکب''(جب شب وروز بے در بے گذر جائیں) اور ان عبارتوں کی طرح جو امیرالمومنین علی علیہ السلام کے کلام میں آئی ہیں، جب جاہل منتقدوں نے بیت المال کی مساوی تقسیم پر آنحضرتؑ پر اعتراض کیا جب کہ انہیں توقع تھی کہ خلیفہ سوم کے زمانے کی طرح وہ بھی افراد کے مابین تبعیض برتیں تاکہ اس طرح سے ان کی حکومت کی بنیادیں مضبوط ہوں تو امام نے فرمایا:''اتا مرنی ان اطلب النصر بالجور فیمن ولیت علیہ واللہ لا اطور بہ ما سمر سمیر وما امر نجم فی السمآء''[1] (کیا تم مجھے حکم دیتے ہو کہ میں اپنی کامیابی کے لئے ان لوگوں پر ظلم کروں جو میری حکومت کے سائے میں ہیں؟ خدا کی قسم میں ایسا نہیں کروں گا جب تک لوگ راتوں کو بحث کیا کرتے ہیں اور آسمان کے ستارے ایک دوسرے کے بعد طلوع اور غروب ہوتے ہیں)۔

دوسری زبانوں کی گرائمر میں بھی اس سے مشابہ تعبیریں نظر آتی ہیں جو دوام، استمرار اور ابدیت کے لئے کنایہ ہیں۔

یہاں پر جو واحد سوال باقی ہے وہ یہ ہے کہ اگر مندرجہ بالا آیت سزاؤں کی ابدیت کی طرف اشارہ ہے تو آیت کے آخر میں مذکورہ استثناء کا کیا مفہوم ہوسکتا ہے''الا ما شاء ربک''''مگر جو تمہارا پروردگار چاہے'' کیونکہ اس استثناء کا کم از کم ظہور یہ ہے کہ ان میں سے ایک گروہ کا عذاب ابدی اور دائمی نہ ہوگا بلکہ یہ احتمال بھی ہے کہ اس استثناء میں وہ سب شامل ہوں، تب اس کا نتیجہ بالکل برعکس ہوگا۔

عظیم مفسر علامہ طبرسی مرحوم نے مجمع البیان میں اور بعض دوسرے مفسرین نے اس استثناء کے لئے بزرگ مفسروں سے دس صورتیں نقل کی ہیں، لیکن چونکہ ان میں سے بہت سی صورتیں غیر معتبر ہیں لہٰذا ہم اُن کا ذکر نہیں کریں گے، (طبرسی مرحوم نے بھی ظاہراً تمام اقوال ذکر کئے

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۲۶۔

ہیں نہ یہ کہ انہیں قبول کیا ہے) ہم ان دلائل پر قناعت کریں گے جو قابل ذکر ہیں۔

پہلی صورت یہ کہ اس استثناء کے ذکر کا مقصد خدا کی قدرت مطلقہ، حاکمیت اور مشیت کاملہ کا بیان ہے وہ یہ کہ تم لوگ یہ نہ سوچنا کہ یہ خلود اور ابدیت اس کے ارادے کے بغیر وجود میں آئی ہے، اگر وہ چاہے تو ہر چیز کو تبدیل کر سکتا ہے لیکن اس کا ارادہ ہے کہ دوزخیوں کا یہ گروہ ابد تک اسی میں رہے، لہٰذا بہشتیوں کے بارے میں یہی عبارت اس سے پہلی آیت میں بھی آئی ہے اور اس کے بعد فرماتا ہے: ''عطآء غیر مجذوذ'' (یہ ایسی عطا ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگی)۔

اس جملے سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ استثناء سے مراد نعمت یا عذاب کا ختم ہونا نہیں ہے بلکہ صرف خدا کی طاقت کا بیان مقصود ہے۔

دوسری یہ کہ استثناء سے مراد وہ لوگ ہیں جو جاودانہ عذاب کے مستحق نہیں ہیں، ان گنہ گار مومنوں کی طرح جو کچھ عرصے تک جہنم میں رہ کر پاک ہوں گے پھر بہشت میں چلے جائیں گے اور ''الا ماشاء ربک'' کا جملہ اس گروہ کی طرف اشارہ ہے، لیکن بے ایمان کافر اسی طرح دوزخ میں باقی رہیں گے (اور عربی ادب کی اصطلاح کے مطابق وہ لوگ مستثنٰی میں سے نہیں بلکہ مستثنٰی منہ میں سے ہیں)۔

اسی سے مشابہ مفہوم بہشتیوں کے بارے میں بھی بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ہمیشہ بہشت میں ہوں گے سوائے گنہگار مومنوں کےجو پہلے دوزخ میں جائیں گے اور بعد میں بہشت میں چلے جائیں گے، بہرحال اس استثناء سے عذاب کی ابدیت پر آیت کی دلالت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

چوتھی آیت میں مسئلہ خلود اور مجرموں کے عذاب میں عدم تخفیف پر تصریح کرتے ہوئے صراحت سے بیان فرماتا ہے کہ خدا نے ان پر کوئی ظلم روا نہیں رکھا بلکہ انہوں نے خود ہی اپنے آپ پر ظلم کیا ہے، پھر ارشاد ہوتا ہے: وہ چیخیں گے کہ اے (جہنم کے) مالک! کاش تمہارا پروردگار ہمیں موت دے دیتا (تاکہ ہمیں آرام ملتا) لیکن وہ کہے گا: تم لوگ یہیں پر مکث کرتے ہوئے رہو گے ''ونادو ایملك لیقض علینا ربك قال انکم ماکثون''۔

کلمہ ''مکث'' مطلق اور غیر محدود طور پر ان کے عذاب کے دوام پر ایک اور دلیل ہے،[1] اس لئے طبرسی مرحوم نے مجمع البیان میں تصریح کی ہے کہ یہاں پر ''ماکثون'' دائمون کے معنی میں ہے۔

اگرچہ مندرجہ بالا آیت میں یہ بیان نہیں ہوا کہ دوزخ کا مالک یہ بات فوراً کہہ اُٹھے گا یا کچھ مدت کے بعد لیکن کچھ مفسرین نے کہا ہے کہ یہ جواب کچھ تاخیر کے ساتھ، بے اعتنائی کے لئے ساتھ اور تحقیرانہ انداز میں دیا جائے گا، بعض نے کہا ہے کہ یہ جواب چالیس سال بعد انہیں دیا جائے گا اور بعض نے کہا ہے سو سال کے بعد جواب دیا جائے گا، اور ابن عباسؓ سے نقل ہوا ہے کہ ہزار سال کے بعد ان کو یہ جواب دیا

---

[1] مکث کا معنی انتظار کی حالت میں باقی رہنا ہے (جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے) البتہ عارضی طور پر ٹھہرنے کو بھی مکث کہا جاتا ہے، لیکن جب یہ لفظ مطلق طور پر کسی قید اور شرط کے بغیر ذکر ہوتا ہے تو دائمی طور پر ٹھہرنے اور باقی رہنے کے معنی میں ہوتا ہے۔

جائے گا[1]، تا کہ وہ زیادہ انتظار کی حالت میں رہیں اور انہیں اذیت پہنچے اور ان کی زیادہ تحقیر کی جائے۔

اس آیت س بخوبی پتہ چلتا ہے کہ وہاں پر موت نہیں ہوگی بلکہ وہاں وہ ہمیشہ زندہ اور تکلیف اور عذاب میں ہوں گے۔

پانچویں اور آخری آیت میں مطلق طور پر ''دوزخ سے عدم خروج'' کا تذکرہ ہوا ہے جو دوسرے الفاظ میں دوام ہی ہے، اس آیت میں ''گمراہ کرنے والے رہبروں کی اپنے گمراہ پیروکاروں سے بیزاری اور دنیا میں لوٹ آنے کی صورت میں ان پیروکاروں کی اپنے قائدین سے بیزاری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: خدا انہیں اس طرح حسرت میں مبتلا کر کے ان کے اعمال دکھائے گا اور وہ آگ سے ہرگز نکل نہ سکیں گے'' کذلك یریھم الله اعمالھم حسرت علیھم وما ھم بخرجین من النار ''۔

جی ہاں! وہ اپنی گذشتہ زندگی پر حسرت کرنے کے علاوہ کربھی کیا سکتے ہیں، گمراہ راہنماؤں کی اندھی تقلید اور آنکھ اور کان بند کر کے ان کی پیروی کرنے پر حسرت، اپنی فضول گزاری ہوئی زندگی پر حسرت، حرام سے دولت جمع کر کے آخر میں دوسروں کے لئے چھوڑ آنے پر حسرت اور توبہ و بازگشت کے مواقع گنوا دینے پر حسرت، لیکن ایسی حسرت جو فضول اور بے فائدہ ہے کیونکہ تلافی اور برگشت کے راستے اب باقی نہیں رہے۔

علامہ طباطبائی مرحوم نے المیزان میں اس آیت کے ذکر کے بعد فرمایا ہے کہ یہ ان لوگوں کے خلاف ایک دلیل ہے جو دوزخ کے عذاب کے بند ہونے کے معتقد ہیں۔

نتیجہ:

مندرجہ بالا پانچ آیات س بخوبی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ دوزخ کا عذاب جاوداں ہے جیسے بہشت کی نعمتیں جاوداں ہیں اور جن لوگوں نے خود سے پہلے فیصلہ کرتے ہوئے عذاب کے انقطاع کا عقیدہ اختیار کر لیا ہے ان کے سامنے ان آیات اور (ان سے مشابہ دوسری آیتوں) کے خلاف بولنے اور تفسیر بالرائے کے علاوہ کوئی راستہ باقی نہیں بچتا۔

یہ صحیح ہے کہ عذاب کی جاودانی پر اعتقاد رکھنے میں کچھ مشکلات اور پیچیدگیاں ہیں، اگرچہ دوزخیوں کے کسی خاص گروہ کے بارے میں ہوں لیکن اس بارے میں آیات کے ظہور یا ان کی صراحت کے پیش نظر ان پیچیدگیوں کو منطق اور استدلال کے راستے سے حل کرنا چاہیے نہ کہ اصل موضوع ہی کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کا انکار کر دینا چاہیے۔

---

[1] تفسیر فخر رازی جلد ۲۷ صفحہ ۲۲۷، تفسیر قرطبی جلد ۹ صفحہ ۵۹۳۷، تفسیر مجمع البیان میں بھی چالیس سال اور ہزار سال والی بات نقل کی گئی ہے۔

چندوضاحتیں:

کون لوگ جہنم میں ہمیشہ رہیں گے:

قرآن مجید میں کچھ افراد یا اقوام کا خصوصی طور پر نام لیا گیا ہے کہ وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔

ا۔کافرین:

چاہے مبداء اور معاد کے منکر ہوں یا مشرک ہوں یا آیات الٰہی کو جھٹلانے والے ہوں یا خدا اور پیغمبر کے دشمن ہوں یا مرتد ہوں جن کا قرآن کی مختلف آیتوں میں ''جہنم میں ہمیشہ رہنے والے افراد'' کی حیثیت سے ذکر آیا ہے، مثلا سورہ آل عمران کی آیت ۱۱۶ میں یوں آیا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۝۱۱۶

جولوگ کافر ہوئے ہیں انہیں ان کے اموال اور بچے ہرگز خدا سے بے نیاز نہیں کر سکتے، وہ اہل آتش میں سے ہیں اور وہاں ہمیشہ رہیں ہے۔[1]

۲۔منافقین:

اگر چہ ظاہری طور پر اہل ایمان کی صفوں میں اور مومنین کے زمرے میں ہوں لیکن وہ بھی ہمیشہ جہنم کی آگ میں رہیں گے جیسا کہ سورہ مجادلہ کی آیت ۱۷ میں انکے بعض اعمال اور کردار کی طرف اشارہ کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے:

لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۝۱۷

اُن کی اولاد اور اموال ہرگز انہیں الٰہی عذاب سے نہیں بچا سکتے وہ اہل دوزخ میں سے ہیں اور ہمیشہ وہیں

---

[1] قرآن میں بہت زیادہ آیتیں اسی مفہوم کی ہیں مثلاً سورہ اعراف کی آیت ۳۶ جس میں آیات الٰہی کو جھٹلانے والوں کے بارے میں گفتگو ہے، سورہ بینہ کی آیت ۶ میں مشرکوں اور اہل کتاب کو مخلد قرار دیا گیا ہے، سورہ توبہ آیت ۱۷ میں مشرکوں کے خلود کے بارے میں گفتگو ہے، سورہ بقرہ کی آیت ۲۱۷ اور سورہ آل عمران کی آیت ۸۸ میں خاص طور پر مرتد افراد کے بارے میں بات کی گئی ہے اور سورہ فصلت آیت ۲۸ میں خدا کے دشمنوں کے جہنم کی آگ میں ہمیشہ رہنے کی طرف اشارہ ہے۔

رہیں گے۔

سورہ نساء کی آیت ۱۴۰ میں فرمایا گیا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعًا ۝۱۴۰

خدا تمام منافقوں اور کافروں کو جہنم میں جمع کرے گا۔

۳۔ جو لوگ گناہوں میں غرق ہوں گے:

سورہ بقرہ کی آیت ۸۱ میں گنہگاروں کی ایک جماعت کے بارے میں ایک بہت پر معنی عبارت آئی ہے، فرمایا گیا ہے:

بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـــَٔتُهٗ فَاُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۸۱ ﴿البقرة: ۸۱﴾

جی ہاں! جو لوگ گناہ انجام دیں اور گناہ کے آثار اُن کے تمام وجود پر چھا جائیں وہ لوگ اہل آتش ہیں اور ہمیشہ اس میں رہیں گے۔

اسی سے ملتا جلتا مفہوم سورہ یونس کی آیت ۲۷ میں بیان ہوا ہے ارشاد ہوتا ہے:

وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَاۗءُ سَيِّئَةٍۢ بِمِثْلِهَا ۙ وَتَرْهَقُھُمْ ذِلَّةٌ ۭ مَا لَھُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُھُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۲۷ ﴿یونس: ۲۷﴾

جو لوگ گناہوں کے مرتکب ہوئے ہیں اسی مقدار میں سزا کے مستحق ہیں اور انہیں ذلت و رسوائی دبوچ لے گی اور کوئی چیز انہیں الٰہی سزاؤں سے نہیں روک سکتی، گویا ان کے چہروں کو ظلمانی رات کے تھوڑے سے حصے نے چھپا لیا ہے وہ اہل آتش میں سے ہیں اور ہمیشہ وہاں رہیں گے۔

کیا باایمان افراد گناہان کبیرہ کی وجہ سے عذاب الٰہی میں ہمیشہ رہیں گے یا نہیں؟ اس بارے میں ایک تفصیلی بحث ہے جو انشاء اللہ ان آیات کی تفسیر کے بعد بیان کی جائے گی۔

۴۔قاتلین:

قرآن کی آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عمداً قتل کا ارتکاب کرنے والے بھی جاوداں عذاب کا شکار ہوں گے جیسا کہ سورہ نساء کی آیت ۹۳ میں بیان ہوا ہے:

وَمَنۡ يَّقۡتُلۡ مُؤۡمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيۡهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيۡمًا ﴿۹۳﴾ (النساء: ۹۳)

جو بھی کسی مومن فرد کو عمداً قتل کر ڈالے اس کی سزا جہنم ہے، وہ ہمیشہ وہاں رہے گا اور خدا اُسے عذاب کرے گا اور اس کو اپنی رحمت سے دور کردے گا اور اس کے لئے خدا نے عذاب عظیم تیار کر رکھا ہے۔

یہاں پر عمداً قتل کرنے والوں کے لئے چار قسم کی سزائیں بیان ہوئی ہیں، جہنم میں خلود، غضب الٰہی، لعنت اور خدا کی رحمت سے دور اور ان کے لئے عذاب عظیم کا آمادہ کرنا۔

کیا یہ سزائیں صرف اس صورت میں ہیں جب وہ توبہ اور تلافی نہ کریں یا ہر صورت میں وہ ان میں مبتلا ہوں گے؟ دوسرا احتمال بہت بعید معلوم ہوتا ہے کیونکہ جب شرک جیسے بزرگ ترین گناہ توبہ سے برطرف ہو سکتے ہیں اور مشرکین اسلام قبول کرنے کے بعد بخش دیئے جا سکتے ہیں تو ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ قتل نفس اس سے بھی بڑا گناہ ہے؟

اس کے علاوہ تاریخ اسلام میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ حضرت حمزہ ابن عبدالمطلب کے قاتل ''وحشی'' کو پیغمبر اکرمؐ نے معاف کر دیا تھا اور اس کی توبہ قبول کر لی تھی، بہت سے دوسرے مسلمانوں نے بھی اپنے بیٹوں، بھائیوں اور والدین کے قاتلوں کو ان کے اسلام قبول کرنے اور توبہ کرنے کے بعد معاف کر دیا تھا، البتہ یہ مسلم ہے کہ ایسے عظیم گناہوں سے توبہ کرنا آسان کام نہیں ہے اور صرف استغفر اللہ کہنے سے تمام امور حل نہیں ہو جاتے بلکہ اسے اپنے آپ کو قصاص کے لئے پیش کرنا پڑے گا یا مقتول کے وارثوں کو دیت وغیرہ کے ذریعے راضی کرنا پڑے گا اور اپنے آئندہ کے اعمال سے اپنے ماضی کے اعمال کی تلافی کرنا ہوگی۔

پیغمبر اکرمؐ سے مروی ایک روایت میں ہے:

لزوال الدنیا وما فیھا اھون علی اللہ من قتل مومن ولو ان اھل سماواتہ واھل ارضہ اشترکوا فی دم مومن لا دخلھم اللہ تعالی النار۔

کسی مومن کے قتل سے دنیا و مافیہا کی نابودی خدا کے نزدیک زیادہ آسان ہے اور اگر اہل زمین و آسمان کسی مومن کا

خون بہانے میں شریک ہوں تو خدا ان سب کو آگ میں داخل کردے گا۔[1]

یہ کیسے ممکن ہے کہ عمداً قتل کرنے والا ہمیشہ دوزخ میں رہے جب کہ آئندہ کی ابحاث میں یہ واضح ہوگا کہ صرف کافر ہمیشہ جہنم میں رہیں گے، اس بارے میں مفسرین نے مختلف جوابات دیئے ہیں۔

کبھی یہ کہا گیا ہے کہ ایسے افراد توبہ کرنے کی توفیق ہی نہیں پا سکتے یا بہت کم انہیں توبہ کرنے کی توفیق ملتی ہے، وہ اپنی عمر کے آخری حصے میں بے ایمانی کی حالت میں دنیا سے چلے جاتے ہیں، اسی لئے وہ ہمیشہ جہنم میں رہنے کے مستحق قرار پاتے ہیں۔

کبھی کہا گیا ہے کہ یہ ایسے لوگوں کی سزا ہے جو عمداً قتل کرنے کے حرام ہونے کا انکار کرتے ہوئے اس کا ارتکاب کریں اور یہ امر خود کفر کا موجب ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں خلود سے مراد عذاب کی جاودانی نہیں ہے بلکہ طولانی مدت ہے، لیکن پہلی اور دوسری تفسیر زیادہ مناسب لگتی ہیں۔

۵۔سود خور:

قرآنی آیتوں میں سود خوروں کو بھی ہمیشہ کے عذاب کی تہدید کی گئی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَاَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۲۷۵ ﴿البقرة: ۲۷۵﴾

جس شخص تک خدا کا موعظہ پہنچ جائے اور وہ (سود خوری سے) بچے، جو فائدہ وہ (تحریم کے حکم کے نزول سے) پہلے حاصل کر چکا تھا وہ اسی کا ہے اور اس کا معاملہ خدا کے سپرد ہوگا لیکن جو لوگ لوٹ جائیں اور اس گناہ کا ارتکاب کریں وہ اہل آتش ہوں گے اور ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ (بقرہ:۲۷۵)

یہاں پھر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ یہ جماعت کیسے، ہمیشہ آگ میں رہے گی جب کہ صرف گناہ کبیرہ ہی عذاب جاوداں کا موجب نہیں ہے۔

اس سوال کا جواب یہاں پر زیادہ آسان ہے کیونکہ آیت کے تین میں (پہلے کے جملوں میں) سود کی حرمت کے منکرین کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے جو لوگ کہتے تھے کہ سود اور فروخت میں کیا فرق ہے؟ اور خدا نے کیسے ایک کو حلال اور دوسرے کو حرام قرار دیا ہے؟ جب کہ ان دونوں کے مابین فرق واضح تھا کیونکہ خرید و فروخت تجارت اور اس سے مشابہ امور معاشرے کے فائدے میں ہیں اور صحیح اقتصادی فعالیت

---

[1] تفسیر روح المعانی، جلد ۵ صفحہ ۱۰۴۔

محسوب ہوتے ہیں، لیکن سودخوری معاشرے کے لئے نقصان کے علاوہ کچھ نہیں جس کے بارے میں تفصیلی بحث ہے اور ہم نے اس کے اپنے مقام پر اس بارے میں گفتگو کی ہے۔

٦۔ظالمین:

ایک اور گروہ جسے قرآن مجید نے جاوداں عذاب کا مستحق قرار دیا ہے وہ ظالموں کا گروہ ہے، جیسا کہ سورہ شوریٰ کی آیت ۴۵ میں ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اَلَآ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ فِيْ عَذَابٍ مُّقِيْمٍ ۴۵﴿الشوری: ۴۵﴾

جو لوگ ایمان والے ہوں گے وہ کہیں گے: واقعاً نقصان اٹھانے والے لوگ وہ ہوں گے جو اپنے آپ سے اور اپنے خاندان والوں سے محروم ہو جائیں گے، آگاہ رہو ظالم ہمیشہ کے عذاب میں رہیں گے۔

اس عبارت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ظلم کا انجام جہنم کی آگ میں ہمیشہ کے لئے رہنا ہے اس سے پہلے کی آیتوں میں بھی بار ہا ظالموں کے عذاب الیم کی طرف (شوری، ۴۲ میں) اور آتش دوزخ میں ان کی دردناک پشیمانی پر (شوری، ۴۴ میں) اشارہ کیا گیا ہے۔

کیا یہاں پر ظلم سے مراد خدا کے بندوں اور مستضعفوں پر ظلم ہے؟ یا مراد اپنے آپ پر ظلم اور شرک کی طرف مائل ہونا ہے کیونکہ سورہ لقمان کی آیت ۱۳ کے مطابق شرک ''ظلم عظیم'' ہے اور سورہ بقرہ کی آیت ۲۵۴ میں ہے:

والکفرین هم الظالمون۔

کفار ظالم ہی ہیں۔

کچھ مفسرین نے دوسرے معنیٰ کو ترجیح دی ہے اور شاید ''قال الذین امنوا'' بھی اسی بات پر گواہ ہو کہ کفار کے ہاتھوں بہت زیادہ ظلم سہنے والے مظلوم مومن قیامت کے دن اس طرح کی بات کریں گے۔

سورہ حشر کی آیت ۱۷ میں بھی شیطان اور اس کے ساتھیوں کے ہمیشہ جہنم میں رہنے کی طرف اشارہ کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے:

و ذلك جزآئو الظلمین

یہ ہے ستمگروں کی سزا۔

لیکن اس بات کے پیش نظر کہ یہاں پر شیطان اور اس کے کافر پیروکاروں کے بارے میں بات ہو رہی ہے اور اس سے پہلے والی آیت سے بھی یہ مفہوم واضح ہو چکا ہے ''کمثل الشیطان اذا قال للانسان اکفر فلما کفر قال انی بری منک'' (ان کا کام شیطان کی

طرح ہے جس نے انسان سے کہا: کافر ہو جاؤ تا کہ تمہاری مشکلات حل کروں لیکن جب وہ کافر ہو گیا تو اس نے کہا: میں تم سے بیزار ہوں) یہاں پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس آیت میں ظلم سے مراد اس کا کامل ترین مصداق یعنی کفر ہے۔

۷۔ ہلکے اعمال والے:

قرآن کی بعض آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن میزان عمل کا بھاری ہونا نجات وسعادت کی علامت ہے اور میزان عمل کا ہلکا ہونا جس کا مطلب اعمال کا بے قیمت ہونا ہے جہنم کی آگ میں خلود کا باعث ہے، سورہ مومنون کی آیت ۱۰۲ اور ۱۰۳ میں ہے:

فَمَنۡ ثَقُلَتۡ مَوَازِيۡنُهٗ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴿۱۰۲﴾ [۲۳:۱۰۲] وَمَنۡ خَفَّتۡ مَوَازِيۡنُهٗ فَاُولٰٓـئِكَ الَّذِيۡنَ خَسِرُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ فِىۡ جَهَنَّمَ خٰلِدُوۡنَ‌ ۚ﴿۱۰۳﴾ [۲۳:۱۰

وہ لوگ جن کے (اعمال کے) پلڑے بھاری ہوں گے وہ کامیاب ہیں اور جن لوگوں کے اعمال کے پلڑے ہلکے ہوں گے وہ ایسے لوگ ہوں گے جنہوں نے اپنے وجود کا سرمانہ ضائع کر دیا اور وہ جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔

''خسروا انفسھم'' (اپنے وجود کا سرمایہ ضائع کر دیا ہے) کی عبارت اس حقیقت کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ انسان کا سب سے بڑا سرمایہ اس کی ہستی، عمر اور اس کی حیات ہے اور اس جماعت نے دنیا کے بازار تجارت میں اُسے ضائع کر دیا ہے اور اس کے مقابلے میں کوئی قابل قدر چیز حاصل نہیں کی، ممکن یہ عبارت بھی کافروں کی طرف اشارہ ہو کیونکہ اگر کوئی باایمان ہو چاہے جتنا بھی گناہ کرے پھر بھی اس کے میزان عمل میں کچھ باقی ہوگا اور وہ بالکل بے وزن نہیں ہوگا، کیونکہ صرف ایمان اور عقائد حقہ کا بھی اچھا خاصہ وزن ہوتا ہے، بنابریں اس جماعت کے میزان عمل کا ہلکا ہونا اور کسی بھی قسم کے حسنہ سے خالی ہونا ان کے کفر کی دلیل ہے جیسا کہ سورہ کہف کی آیت ۱۰۵ میں ہے:

اُولٰٓـئِكَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمۡ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ فَلَا نُقِيۡمُ لَهُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ وَزۡنًا ۱۰۵﴿الکھف:۱۰۵﴾

وہ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار کی آیتوں اور اس سے لقاء کا انکار کیا ہے، اس لئے اُن کے اعمال ضائع ہو گئے، لہذا ہم قیامت کے دن ان کے لئے کوئی میزان برپا نہیں کریں گے۔

۸۔ عام گنہگار لوگ:

کچھ آیتوں سے پتہ چلتا ہے کہ مطلقاً گنہگار لوگ ہمیشہ کے لئے جہنم میں رہیں گے جیسا کہ سورہ جن کی آیت ۲۳ میں ہے۔

وَمَنۡ يَّعۡصِ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَاۤ اَبَدًا ؕ ۲۳

۲ الجن: ۲۳

جو بھی خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا مسلماً جہنم کی آگ اس کے لئے ہے وہ ہمیشہ اس میں رہے گا۔

یہی مفہوم کچھ اضافات کے ساتھ سورہ نساء کی آیت ۱۴ میں بھی ہے:

وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۠ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۱۴ ﴿النساء: ۱۴﴾

تجاوز کرے گا اس کو ایسی آگ میں ڈالا جائے گا جس میں وہ ہمیشہ کے لئے رہے گا اور اس کے لئے رسوا کن عذاب ہے۔

اسی سے مشابہ عبارت سورہ زخرف کی آیت ۷۴ میں بھی آئی ہے، فرمایا گیا ہے:

اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ عَذَابِ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ۷۴ ﴿الزخرف: ۷۴﴾

مجرم لوگ جہنم کے عذاب میں ہمیشہ رہیں گے۔

لیکن اس بات کے پیش نظر کہ سابقہ آیات (سورہ جن آیہ ۲۰) میں پیغمبر اکرمؐ کی توحید کی طرف دعوت اور شرک کے خلاف جہاد کی دعوت تھی اور اس کے بعد کی آیت (سورہ جن آیت ۲۴) میں مکہ کے مشرکوں کی باتیں نقل ہوئی ہیں جب انہوں نے پیغمبر اکرمؐ کے مددگاروں کے نہ ہونے کی بناء پر اُن کی سرزنش کی تھی لگتا ہے کہ یہاں پر عصیاں سے مراد عورت توحید کا ترک کر دینا اور شرک وکفر کی طرف مائل ہونا ہے، بنا بریں تمام گناہ گاروں کے ہمیشہ آتش دوزخ میں رہنے پر کسی طرح کی دلالت نہیں پائی جاتی۔

سورہ زخرف کی آیت ۷۴ میں بھی اسی مطلب پر قرینہ پایا جاتا ہے کیونکہ وہاں پر ان لوگوں کے بارے میں گفتگو ہے جو حق سے دشمنی رکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ خدا اُن کی ڈھکی چھپی گفتگو اور رازوں کے بارے نہیں نہیں جانتا یہ خود کفر کی علامت ہے (توجہ کیجئے گا)۔

لہٰذا بہت سے مفسرین نے زیر بحث آیت کی تفسیر میں تصریح کی ہے کہ مراد توحید میں عصیان کرنا ہے۔[1]

لیکن یہ احتمال بہت بعید معلوم ہوتا ہے کہ خلود سے مراد طولانی عذاب ہو، کیونکہ ''خلود'' کی ''ابدا'' کے ساتھ تاکید اس بات کی دلیل ہے کہ مراد عذاب الٰہی کی جاودانی ہے۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان، جلد ۹، ۱۰ صفحہ ۳۷۳۔ المیزان جلد ۲۰ صفحہ ۵۲۔ روح البیان جلد ۱۰ صفحہ ۲۰۰۔ روح المعانی جلد ۲۹ صفحہ ۹۴ سے رجوع کیجئے۔

نتیجہ:

مندرجہ بالا آٹھ موارد سے ہم جہنم کی آگ میں ہمیشہ رہنے والوں کے بارے میں قرآن کی رائے جان چکے، لیکن اُن آیات پر ایک اجمالی نگاہ ڈالنے سے یہ نکتہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ مسلم امر یہ ہے کہ کفار اور بے ایمان افراد دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے لیکن تمام گنہگاروں کے بارے میں یہ امر مسلم نہیں ہے، مگر یہ کہ عصیان اور گناہ اتنا عظیم اور زیادہ ہو کہ انسان کو کفر اور ترک ایمان پر مجبور کردے یا وہ دنیا سے بے ایمانی کی حالت میں چلا جائے، مزید تفصیل عنقریب آئے گی۔

ایک سوال اور اس کا جواب:

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا گناہ کبیرہ کے مرتکبین ہمیشہ جہنم میں رہیں گے؟

مسلمانوں کی ایک جماعت جو ''وعیدیہ''[1] کے نام سے مشہور ہے، سمجھتی ہے کہ ہر گناہ کبیرہ کفر کا موجب ہوتا ہے یہ لوگ کہتے ہیں کہ گناہ کبیرہ آگ میں ہمیشہ رہنے کا باعث ہوگا، ان کے برعکس ''مرجئہ'' سمجھتے ہیں کہ اگر انسان ایمان دار ہو تو کوئی گناہ اس کو نقصان نہیں پہنچا سکتا، (ایک جماعت افراط کررہی ہے اور دوسری تفریط)۔

علامہ حلی مرحوم ''شرح تجرید'' میں کفار کے عذاب کے ابدی ہونے پر مسلمانوں کے اجماع اور اتفاق کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں: مسلمانوں میں گناہ کبیرہ کے مرتکبین کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے ''وعیدیہ'' ان کو کفار کی مانند سمجھتے ہیں، لیکن امامیہ و معتزلہ و اشاعرہ کی ایک بڑی جماعت کا خیال ہے کہ اُن کا عذاب آخر کار ختم ہوجائے گا، پھر اس مطلب پر چند دلیلیں پیش کرتے ہیں۔

شیخ مفید ''اوائل المقالات'' میں فرماتے ہیں کہ تمام علمائے امامیہ میں اتفاق نظر پایا جاتا ہے کہ صرف کفار کو جاوداں کی آگ کی تہدید کی گئی ہے لیکن نمازیوں میں سے جو لوگ ایمان دار ہیں اور فرائض الٰہی کا اقرار کرتے ہیں اگر کسی گناہ کا ارتکاب کریں تو اس تہدید میں شامل نہیں ہوں گے، ''مرجبہ'' اور محدثوں کی تمام جماعتیں اس امر پر متفق ہیں جب کہ معتزلہ نے اس قول کے خلاف اتفاق کیا ہے اور سمجھتے ہیں کہ آگ میں ہمیشہ رہنے کی تہدید میں تمام کفار اور تمام فاسقین شامل ہیں۔[2]

اس جماعت نے اپنے مقصور کو ثابت کرنے کے لئے استدلال کرتے ہوئے بعض گذشتہ آیات کا سہارا لیا ہے، خصوصاً وہ آیتیں جو قتل عمد کے مرتکبین اور رباخوروں وغیرہ کے ہمیشہ جہنم میں رہنے کے بارے میں نازل ہوئی ہیں، ان تمام آیتوں میں زیادہ سے زیادہ وسیع سورہ جن کی آیت ۲۳ ہے جس کی تفسیر گزر چکی ہے: ''ومن یعص اللہ ورسولہ فان لہ نار جھنم خلدین فیھا ابدا'' جو لوگ خدا اور اس کے رسول کی معصیت کریں گے اُن کے لئے جہنم کی آگ ہے اور وہاں وہ ابد تک رہیں گے لیکن خود ان آیتوں اور قرآن کی دوسری آیتوں میں بہت سے

---

[1] وعیدیہ'' خوارج کے ایک گروہ کا نام ہے۔

[2] اوائل المقالات، صفحہ ۵۳۔ پبلشر مطبوعاتی داوری۔

قرینے ایسے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان آیات سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے گناہ کا انجام کفر اور معاد، مبداء یا دین کی ضروریات میں سے کسی چیز کا انکار ہو، من جملہ آیات میں سے ایک یہ ہے:

كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا

گویا اُن کے چہرے شب دیجور کے ٹکڑے سے ڈھک دئے گئے ہیں۔ (یونس، ۲۷)

اس بات کے پیش نظر کہ یہ عبارت قرآن میں کفار کے لئے آئی ہے جہاں فرمایا گیا ہے:

وَوُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۴۰ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ۴۱ اُولٰۤىِٕكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ۴۲

بہت سے چہروں پر اس روز گرد پڑی ہوگی، ان پر دھواں اور تاریکی چھائی ہوگی، وہ لوگ وہی فاجر کفار ہوں گے۔ (عبس، ۴۰ تا ۴۱)

معلوم ہوتا ہے کہ زیر بحث آیت میں بھی مقصود کفار ہی ہیں، لہٰذا امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے:

یہ آیت اہل بدعت، اہل شہبات اور اہل شہوت کی طرف اشارہ ہے جن کے چہرے قیامت کے روز خدا سیاہ کر دے گا اور ذلت وحقارت کا لباس انہیں پہنائے گا، لہٰذا ان کے بارے میں فرماتا ہے کہ وہ اہل آتش میں سے ہیں اور وہاں ہمیشہ کے لئے رہیں گے۔[۱]

احاطت به خطیئته (جو گناہ انجام دے اور گناہ کے آثار اس کے تمام وجود کو ڈھک دیں) کی عبارت جو سورہ بقرہ کی آیت ۸۸ میں آئی ہے، ہمیں بتاتی ہے کہ صرف گناہ کبیرہ کا ارتکاب ہی ہمیشہ کے لئے جہنم کی آگ میں رہنے کا باعث نہیں ہے، بلکہ گناہوں کا انسان کے تمام وجود پر احاطہ جو اس کو کفر کی طرف دھکیلتا ہے، اس کا باعث ہے کیونکہ جیسے روایات سے معلوم ہوتا ہے، ایمان ایک روشن نقطے کی صورت میں انسان کے دل میں ظاہر ہو جاتا ہے، جتنا وہ اعمال خیر بجالاتا ہے وہ نور اتنا ہی پھیلتا جاتا ہے جب تک اس کے پورے دل پر نہ چھا جائے اور جب بھی وہ گناہ اور برے اعمال کا ارتکاب کرتا ہے تاریکی اس کے دل کو گھیر لیتی ہے جب تک اس کے پورے قلب پر چھا نہ جائے (اور ایمان کی روشنی بجھ جاتی ہے) خصوصا ان روایات کے بعض حصوں میں آیت "كلا بل ران على قلوبهم ما كانو يكسبون" (ایسا نہیں جیسا وہ سوچتے ہیں بلکہ ان کے اعمال نے (سیاہ) زنگ ان کے دلوں پر ثبت کیا ہے۔[۲]) (مطففین ۱۴) ان میں سے بعض آیتوں میں "گناہ عمدی" کی عبارت آئی ہے جیسے آیہ قتل ہے، ممکن ہے اس سے مراد خدا کے فرمان کی عمدی مخالفت اور حق کے مقابلے میں عناد اور ہٹ دھرمی ہو جو کفر کے واضح ترین مصادیق میں سے ہے۔

---

[۱] تفسیر علی ابن ابراہیم جلد ا صفحہ ۳۱۱۔

[۲] اصول کافی، جلد ۲ صفحہ ۲۷۳ باب الذنوب، حدیث ۲۰۔

اس پر شاہد سورہ روم کی آیت ۱۰ ہے جس میں فرمایا گیا ہے:

ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِينَ اَسَاءُوا السُّوْآى اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَكَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ ۱۰ ﴿الروم: ۱۰﴾

پھر برے اعمال کا ارتکاب کرنے والوں کا انجام یہ ہوا کہ انہوں نے خدا کی آیتوں کا انکار کیا اور ان کا تمسخر اڑایا۔

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ گناہ پر اصرار اور انہیں جاری رکھنے کا انجام کبھی کفر اور آیات الٰہی کی تکذیب (اور جہنم میں خلود) بھی ہوسکتا ہے، مزید برایں آیت:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ

خدا شرک کے گناہ کو نہیں بخشتا لیکن اسے چھوٹے گناہوں میں سے جسے چاہے بخش دیتا ہے۔

دوبار سورہ نسائ (آیہ ۴۸ و ۱۱۶) میں آئی ہے۔

یہ اس حقیقت پر روشن دلیل ہے کہ صرف مشرکین قابل بخشش نہیں ہیں (کفر کی تمام قسمیں شرک سے ملحق ہیں) اور وہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے، لیکن دوسرے گناہگار قابل بخشش ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا حساب کتاب کافروں سے جدا ہے اور سب کو ایک صف میں قرار نہیں دیا جاسکتا۔

یہاں پر غلط فہمی پیدا نہ ہو، یہ آیت گناہگاروں کو گناہ کی ترغیب نہیں دلاتی کیونکہ یہ آیت ان سے معافی کا قطعی وعدہ نہیں کرتی بلکہ احتمالی طور پر وعدہ کرتے ہے کیونکہ یہ چیز مشیت الٰہی پر موقوف ہے اور چونکہ مشیت الٰہی اور رضائے الٰہی اس کی حکمت سے آمیختہ ہے اور حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ اس معافی کا معیار ''قالبیت اور لیاقت'' قرار پائے۔ یہ چیز باعث بنتی ہے کہ گناہگار لوگ اپنے تمام رابطے خدا اور اس کے اولیا سے منقطع نہ کریں اور اپنی ساری کشتیاں نہ جلا بیٹھیں۔

روایات میں ہے کہ قرآن مجید کی یہ آیت اُمید بخش ترین آیات میں سے ہے جیسا کہ امیر المومنین علی علیہ السلام سے مروی ہے:

ما فی القرآن ایه ارجی عندی من هذه لایة

قرآن میں اس آیت سے زیادہ اُمید بخش کوئی اور نہیں ہے۔

زیادہ وضاحت کے لئے اس نکتے کی طرف توجہ دینا ہوگی کہ مسلما مندرجہ بالا آیت گناہ صغیرہ کے ارتکاب کی طرف اشارہ نہیں ہے کیونکہ قرآن میں گناہ کبیرہ سے اجتناب کرنے والوں سے گناہ صغیرہ کی معافی کا وعدہ کیا گیا ہے، اسی طرح توبہ کے بعد گناہ کبیرہ کی طرف بھی اشارہ نہیں ہے کیونکہ توبہ گناہوں کی بخشش حتی کہ شرک کے گناہ کی بخشش کا بھی سبب ہے، اس بناء پر آیت کا یہی مفہوم باقی رہ جاتا ہے کہ شرد اور (بغیر توبہ کئے) گناہ کبیرہ کے ارتکاب کے مابین فرق رکھا جائے، پہلا گناہ قابل معافی نہیں ہے کیونکہ شرک کی صورت میں معافی کی کوئی راہ باقی

نہیں رہتی لیکن دوسرا گناہ قابل بخشش ہے لیکن نہ بغیر کسی شرط کے، بلکہ ان شرائط کے ساتھ جن کیطرف **لمن یشآء** جس کو بھی چاہے کے جملے میں اشارہ کیا گیا ہے۔

ہمارے اس مدعا پر قرآن مجید کی متعدد آیتیں بھی گواہ ہیں مثلاً فرمایا گیا ہے:

''جو بھی نیک اعمال بجالائے اور ایمان دار ہو اس کو اپنے عمل کا پھل ملے گا''۔

اگر گناہ کبیرہ کا ارتکاب ہی جہنم کی آگ میں داخل ہونے کا باعث ہوتا تو اعمال صالحہ کا انہیں کوئی نتیجہ نہ ملتا[1]۔ایک اور دلیل شفاعت کے بارے میں نازل شدہ آیتیں ہیں، گناہان کبیرہ سے اجتناب کی وجہ سے گناہان صغیرہ بخش دیئے جاتے ہیں اور گناہان کبیرہ توبہ کرنے سے بخش دئے جاتے ہیں، لہٰذا شفاعت گناہ کبیرہ کے مرتکب ایسے افراد کے لئے جو توبہ نہیں کر سکے، یہ ایسے لوگ ہوں گے جن میں شفاعت کی قالبیت اگر پائی گئی تو بخش دیئے جائیں گے، اس صورت میں گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والے افراد کو ہم کیسے مشرکوں کی صف میں قرار دے سکتے ہیں اور کیسے انہیں جہنم کی آگ میں ہمیشہ جلنے والوں میں شمار کر سکتے ہیں؟ حکمت الٰہی میں یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک فرد عمر بھر ایمان کی حالت میں رہے اور تمام اعمال صالحہ بجالاتا رہے لیکن کسی وقت ایک گناہ کبیرہ انجام دے بیٹھے اور اپنی عمر کے ایام میں مثلاً کسی دن جھوٹ بول دے تو نتیجہ کے طور پر ہمیشہ جہنم میں رہے، البتہ ہم یہ نہیں کہتے کہ وہ اس جھوٹ کی سزا نہیں پائے گا بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ایسے شخص کے بارے میں جاوداں عذاب کوئی معنیٰ نہیں رکھتا، معصومینؑ سے بہت سے ایسی روایتیں مروی ہیں جو ''وعیدیہ'' کے اس دعویٰ کی نفی کرتی ہیں جس میں وہ گناہ کبیرہ کے مرتکبین کو جہنم میں ہمیشہ رہنے کا مستحق سمجھتے ہیں۔[2] حقیقت یہ ہے کہ خوارج کی یہ افراطی جماعت اپنے شدید تعصب اور ہٹ دھرمی اور آیات قرآن، احادیث نبوی و معصومین پر عبور حاصل نہ ہونے اور عقلی دلائل سے عدم توجہ کی بناء پر اس ہولناک گڑھے میں گر گئی ہے۔

حقیقت میں تمام خوارج اپنے تعصب اور نادانی کے برے نتائج کا شکار تھے جس پر بہترین گواہ تاریخ اسلام میں خوارج کی سر گذشت ہے۔

چند وضاحتیں:

عذاب کی ہمیشگی سے مربوط اعتراضات:

مجرموں کی ایک خاص جماعت کے لئے ابدی سزاؤں کے بارے میں مختلف سوالات پیش آتے ہیں جن کے بارے میں یہاں پر

---

[1] سورہ مومن، آیہ ۴۴ اور زلزال، آیہ ۷۔

[2] اس بارے میں زیادہ وضاحت کے لئے بحار الانوار، جلد ۸ صفحہ ۳۵۱ سے ۳۷۶ باب ۲۷ تک اور تفسیر فخر رازی جلد ۳ صفحہ ۱۴۴ سے رجوع فرمائیے۔

گفتگو کرنا ضروری ہے۔

۱۔ مادہ فنا پذیر ہے:

مادہ جاوداں نہیں ہوسکتا، لہٰذا ابدی جزاؤں یا ابدی سزاؤں کی پذیرش کی صلاحیت بھی نہیں رکھتا، دوسرے لفظوں میں عذاب اور جزاء کی ابدیت، جسمانی مادہ کی فنا پذیری سے مطابقت نہیں رکھتی۔

اس سوال کا جواب پیچیدہ نہیں ہے، عالم میں خدا کی پاک ذات کے علاوہ کوئی چیز ذاتاً ابدی نہیں ہے بلکہ خداوندسبحان کے علاوہ سب ذاتاً فانی ہیں، بقاء صرف اس کی پاک ذات سے مختص ہے لیکن یہ چیز اس سے مانع نہیں ہوسکتی کہ امکانی موجودات اپنے غیر کی وجہ سے ابدی ہو جائیں، یعنی خدا انہیں دائمی طور پر ''ہستی'' کی امداد دے اور جب بھی وہ فرسودہ ہوجائیں دوبارہ ان کی تعمیر کرے اور فلسفی عبارت میں ''امکان بالذات'' ''وجوب بالغیر'' کے ساتھ تنافی نہیں رکھتا۔ (توجہ کیجئے گا)

بنابریں جس طرح خدا ہمیشہ دوزخ اور بہشت کو وجودی امداد دیتا رہتا ہے اور انہیں باقی اور برقرار رکھتا ہے اسی طرح بہشتیوں اور جہنمیوں کے جسم بھی اس قانون کے تحت ہیں وہ بھی خدا کی امداد کے بل بوتے پر ہمیشہ باقی رہیں گے تاکہ اپنی ابدی جزائیں اور سزائیں پاسکیں، المختصر فنا اس صورت میں ہے جب باہر سے امداد نہ پہنچے اور تعمیر تو نہ ہو۔

۲۔ کیا عرضی امور دائمی ہوسکتے ہیں؟

بعض فلاسفروں کے کلام میں یہ دیکھا گیا ہے کہ ''فلسفہ'' میں پہچانے گئے اصول اس پر دلالت کرتے ہیں کہ قسری امور (ایسے امور جو کسی چیز کی طبع اور فطرت کے خلاف ہوں) دائمی نہیں ہوسکتے، اور طبیعی موجودات میں سے ہر ایک غایت اور ہدف رکھتا ہے جس میں اس کی صلاح ہے اور اس موجود کو اسی ہدف تک پہنچنا چاہیے، دوسری طرف خداوندتعالیٰ نے تمام موجودات کو اس طرح خلق فرمایا کہ وہ اپنی ذاتی فطرت کی بناء پر اپنے اندر موجود ''خیر'' کی حفاظت کریں اور اپنے اندر نا موجود کمال کو طلب کریں مگر یہ کہ کوئی مانع اس کو روکے، یہ بھی واضح ہے کہ موانع دائمی نہیں ہوتے ورنہ آفرینش کا نظام برباد ہوجاتا، ان تمام مقدمات سے مجموعی طور پر یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ تمام اشیاء ذاتاً اس سے ملاقات کی طالب اور مشتاق ہیں اور حق سے مخالفت عارضی پہلو ہے، جو فرد لقاء اللہ کا ذاتاً طالب ہوتا ہے خدا بھی اس سے ملاقات کا طالب ہوتا ہے اور جو بھی خدا سے ملاقات کو عارضی طور پر کسی بیماری کی وجہ سے ناپسند کرتا ہے خدا بھی اس سے ملاقات کو عارضی طور پر ناپسند کرتا ہے، لہٰذا ایک مدت کے لئے اس کو سزا دیتا ہے تاکہ اس کو اپنی بیماری سے نجات ملے اور وہ اپنی پہلی فطرت کی طرف لوٹ آئے۔[۱]

ان بوتوں کا جواب بھی زیادہ مشکل نہیں ہے کیونکہ کبھی انحرافات اور خطائیں انسان کے وجود میں اس طرح رسوخ کرجاتی ہیں کہ

---

[۱] اسفار جلد ۹ صفحہ ۲۴۶ (اختصار کے ساتھ) البتہ صدرالمتالہین نے اس مطلب کو ایک رائے کے طور پر نقل کیا ہے اور ان کی عبارتوں سے پتہ نہیں چلتا کہ وہ قطعی طور پر اس سے متفق ہوں۔

اس کی فطرت ثانیہ کی صورت اختیار کرلیتی ہیں جس طرح اس دنیا میں بعض مجرم انحراف کے ایسے مرحلے تک پہنچ جاتے ہیں کہ اپنے جرائم سے انہیں لذت ملتی ہے اور جن امور سے انسان فطرتاً نفرت رکھتا ہے ان کے لئے وہ امور پسندیدہ واقع ہوتے ہیں جیسا کہ بعض برے، پست اور نیچ اعمال کے عادی افراد کے زندگی کے حالات میں نظر آتا ہے، جب انسان فطرت ثانیہ کے ایسے مرحلے پر پہنچ جائے تو پھر واپسی کا کوئی راستہ اس کے لئے باقی نہیں رہتا اور یہی وہ چیز ہے جس کے لئے گذشتہ آیات میں ''خطاؤں کا محیط ہونا'' کی تعبیر استعمال ہوئی ہے جو فطرت کی تبدیلی کا موجب بنتی ہے۔

۳۔ کیا جہنمی عذاب سے مانوس نہیں ہوں گے؟

بعض نے یہ کہا ہے کہ دوزخی جہنم کی آگ میں داخل ہونے کے بعد اتنی مدت تک معذب ہوں گے جتنی مدت انہوں نے دنیا میں شرک کی حالت میں گزاری تھی لیکن اس مدت کے ختم ہونے کے بعد دوزخ کے عذاب ان کے لئے نعمت کی صورت اختیار کرلیں گے کیونکہ ان کی طبیعت کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ ہوجائیں گے کہ اگر انہیں بہشت میں بھیج دیا جائے تو وہ پریشان ہوجائیں گے کیونکہ بہشت اُن کی طبیعت کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہوگی، وہ دوزخ کی آگ، سانپوں اور بچھوؤں کے ڈنک سے اس طرح لذت حاصل کریں گے جس طرح بہشتی لوگ جنت کے درختوں کے سائے، حور وقصور، طوبیٰ اور کوثر سے لذت حاصل کریں گے، اس دنیا میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اگر بلبل پھول کی خوشبو سے مست ہوتا ہے تو بعض حشرات غلاظت کی بدبو سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔[1]

یہ نظریہ جو گذشتہ نظریئے کے مقابلے میں اور اس کے متضاد پیش کیا گیا ہے جہنم میں خلود اور عذاب کی جاودانی کے بارے میں نازل شدہ کسی بھی آیت سے مطابقت نہیں رکھتا، خصوصاً بعض روایات میں تصریح کی گئی ہے کہ جب بھی اُن کے بدن کی کھال جل جائے گی خدا انہیں نئی کھال دے دے گا تا کہ وہ عذاب الٰہی کو چکھ سکیں، اصولی طور پر آگ میں ہمیشہ جلانے کی تہدید دائمی عذاب کی تہدید ہے اور اگر جاوداں نعمتوں میں تبدیل ہوجائے تو تہدید آمیز نہیں رہے گی۔

خلود کے بارے میں اس طرح کی تفسیریں اس بات پر دلیل ہیں کہ ان کے قائلین نے قرآنی آیات میں گہری تحقیق ہی نہیں کی بلکہ اجمالی طور پر بھی تحقیقات نہیں کی ہیں، اگر گذشتہ آیتوں کو ایک بار پھر پڑھیں تو اس طرح کی پست اور بے اساس باتوں اور ان آیتوں کے مابین موجود تضاد زیادہ ہوجاتا ہے۔

اس کے علاوہ ہمیں توجہ دینی چاہیے کہ انسان کا کسی تکلیف کا عادی ہوجانا ایک حد رکھتا ہے، بعض تکالیف اور پریشانیاں جزئی ہوتی ہیں اور انسان وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُن سے مانوس ہوجاتا ہے لیکن مثلاً جب انسان کے بدن کا پانی کم ہوجاتا ہے تو اسے پیاس کی وجہ

---

[1] یہ باتیں جو اختصار سے اوپر نقل ہوئی ہیں ''اسفار'' میں محی الدین ابن عربی سے نقل کی گئی ہیں جو انہوں نے ''فتوحات مکیہ'' میں لکھی ہیں۔ اسفار جلد ۹ صفحہ ۳۴۹۔

سے تکلیف ہونے لگتی ہے اور یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص اس طرح عادت ڈالے کہ اس کا بدن پانی کا محتاج نہ ہو اور اُسے ہر گز پیاس نہ لگے۔

۴۔کیا خلود نوعی ہے یا شخصی؟

بعض کتابوں میں دیکھا گیا ہے کہ کچھ لوگ خلود کو "نوعی" سمجھتے ہیں نہ کہ شخصی، یعنی یہ کہ کافر انسانوں کی نوع ابد تک جہنم میں رہے گی لیکن اشخاص تبدیل ہوتے رہیں گے، اس طرح سے کہ ان میں سے ہر ایک ایک معین مدت تک دوزخ میں رہے گا لیکن چونکہ اپنی جگہ دوسرے کو دیتے رہیں گے لہٰذا دوزخ میں نوع انسانی کی بقاء ابدی ہوگی۔

اس بات کا مفہوم یہ ہے کہ آئیندہ بھی دنیا میں ایک اور مخلوق آئے گی، اُن میں سے بھی کچھ لوگ انحراف کا راستہ اپنائیں گے اور جہنم کی آگ کا شکار ہوں گے، لیکن اس وقت جہنم میں داخل ہوں گے جب ان سے پہلے کی مخلوق جہنم سے نجات پا چکی ہوگی۔[1]

یہ بات بھی کفار کے بارے میں جاوداں عذاب اور خلود کی آیتوں سے ہم آہنگ نہیں ہے اور گذشتہ آیتوں میں کچھ غور اس عدم ہم آہنگی کو سمجھنے کے لئے کافی ہے کیونکہ ان آیات کا ظاہر اور ان کی صراحت شخصی خلود کی طرف اشارہ کرتی ہے اور اس طرح کی توجہیات کی علت پہلے بیان ہو چکی ہے، یعنی وہ خلود کی بحث میں موجود مشکلات کو حل نہ کر پائے تو اس طرح کی توجیہات کا سہارا لینے لگے۔ چون ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

جب وہ حقیقت کو نہ دیکھ سکے تو افسانوں کی راہ اپنالی۔

۵۔کیا خلود عدل الٰہی سے ہم آہنگ ہے؟

خلود کے مسئلے میں پیش آنے والا اہم اشکال، جو حقیقت میں اصلی اشکال ہے، گناہ اور سزا کے مابین عدم تناسب کا مسلہ ہے کہا جاتا ہے کہ ہم یہ کیسے قبول کر سکتے ہیں کہ ایک انسان جس کی عمر زیادہ سے زیادہ سو سال ہوتی ہے، اس تمام عمر میں وہ برے کام کرتا رہے اور گناہ اور کفر میں غوطہ ور رہے اور پھر اس سو سال گناہ کے نتیجے میں وہ اربوں سال تک عذاب سہتا رہے؟

البتہ اس مسئلے سے جنت کی جاوداں نعمتوں کے بارے میں کوئی اعتراض پیدا نہیں ہوتا کیونکہ ایک مہربان اور رحمت کرنے والی ہستی سے جس کی رحمت تمام عالم ہستی پر محیط ہے، زیادہ تفضّل اور جزاء ملنا مقام تعجب نہیں ہے، لیکن سزا اور عقوبت میں جرم کا تناسب لازمی امر ہے، اگر یہ تعادل ختم ہو جائے تو عدل الٰہی سے مطابقت نہیں رہتی مختصراً یہ کہ سو سال گناہ اور کفر کا انجام سو سال کی سزا ہے نہ کہ زیادہ۔

اس اشکال کی پیچیدگی باعث بنی کہ بعض لوگ اس کی توجیہہ کرنے لگے اور اس کی توجیہہ وہ کبھی طولانی مدت سے کرتے اور کبھی شخصی خلود کے بجائے نوعی خلود سے اور کبھی کہتے کہ وہ ماحول کے ساتھ ایک طرح سے مانوس ہو جائیں گے، اور اسی طرح کی دوسری تاویلات کا سہارا لیتے جس کی مثالیں اوپر گذر چکی ہیں، لیکن جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے یہ توجیہات بہت کمزور اور ناقابل قبول ہیں اور خلود کی آیتوں سے کسی طرح

---

[1] یہ تفسیر اسفار جلد ۹ صفحہ ۳۴۸ کے حاشیے میں ذکر ہوئی ہے۔

بھی ہم آہنگ نہیں۔

جواب:

جو لوگ یہ اشکال کرتے ہیں وہ ایک بنیادی نکتے سے غافل ہیں اور وہ اساسی نکتہ قراردادی سزاؤں اور تکوینی سزاؤں کے مابین فرق کا ہے جو اعمال کا طبیعی نتیجہ یا خود انہی اعمال کے ساتھ زندگی گذارنا ہے۔

اس کی یوں وضاحت ہوگی کہ کبھی قانون ساز افراد ایک قانون بناتے ہیں کہ جو شخص فلاں جرم کا ارتکاب کرے گا اسے اس قدر جرمانہ ادا کرنا پڑے گا یا فلاں مدت تک جیل میں رہنا ہوگا۔

ایسے موارد میں مسلما جرم اور سزا کے مابین تناسب کا لحاظ رکھا جائے گا، کسی چھوٹے سے کام کے لئے ہرگز پھانسی یا عمر قید کی سزا نہیں ہو سکتی، اس کے برعکس ایک اہم کام مثلاً قتل نفس کے لئے صرف ایک دن کی قید بے معنی بات ہے، حکمت اور عدالت کا تقاضا ہے کہ ان دونوں کے مابین کامل طور پر تناسب ہو۔

لیکن جو سزائیں عمل کا طبیعی اثر ہیں اور اس کی تکوینی خاصیت شمار ہوتی ہیں یا انسان کے سامنے خود عمل کا حضور ہیں یہ بات اُن میں نہیں چل سکتی چاہے اس دنیا میں عمل کے آثار کے بارے میں ہو یا اُس دنیا میں، مثلاً اگر کہا جائے کہ جو شخص ڈرائیونگ کے قوانین کی خلاف ورزی کرے اور غیر قانونی رفتار سے بغیر دلیل کے اوورٹیک کرتے ہوئے ممنوعہ علاقے میں ڈرائیونگ کرے تو ممکن ہے انہی چند لحظات کی خلاف ورزی کے نتیجے میں اس طرح حادثے کا شکار ہو کہ اس کے ہاتھ پاؤں ٹوٹ جائیں اور ایک عمر تک اپنی جگہ سے ہل نہ سکے، یہاں پر کوئی یہ نہیں کہتا کہ اس چھوٹی سی خلاف ورزی کا اتنا تلخ نتیجہ عادلانہ نہیں ہے کیونکہ مسلم ہے کہ یہ ٹریفک پولیس کی قراردادی سزاؤں اور جرمانوں کی طرح نہیں ہے کہ جس میں جرم اور جرمانے کے مابین تناسب اور ہم آہنگی کا مسئلہ پیش نظر ہو، یہ عمل کا طبیعی اثر ہے جس کی طرف انسان جان بوجھ کر گیا ہے اور اس میں مبتلا ہوا ہے۔

اسی طرح اگر کہا جائے کہ نشہ آور اشیاء اور شراب استعمال نہ کریں کیونکہ بہت کم مدت میں آپ کے دل، معدہ، مغز اور اعصاب کو تباہ کر دیتی ہیں، اب اگر کوئی شخص ان کا استعمال کرے اور اعصاب کے ضعف، دل کی بیماری اور السر کا شکار ہو جائے اور چند دن کی نفس پرستی کے نتیجہ میں آخر تک عذاب الیم اور شدید درد میں مبتلا ہو تو کوئی بھی شخص جرم اور سزا کے مابین عدم تناسب کے مسئلے کو نہیں اٹھاتا۔

اب آپ فرض کیجئے کہ ایسا آدمی سو سال کی جگہ ہزار سال تک زندہ رہے یا ایک ملین سال تک دنیا میں رہے تو مسلم طور پر اس طولانی مدت میں صرف چند دن کی ہوس پرستی کی وجہ سے اس شدید درد اور عذاب سے دوچار ہوگا۔

اخروی عذاب اور سزاؤں کے مسئلے میں بات اس سے بھی زیادہ اہم ہے ممکن ہے اس کے تکوینی آثار اور تباہ کن نتائج ہمیشہ کے لئے انسان کو مبتلا کر دیں، بلکہ خود اعمال انسان کے مقابلے میں مجسم ہوں گے (جیسا کہ تجسم عمل کی بحث میں ہم کہہ چکے ہیں) اور چونکہ وہ دنیا جاودان ہے انسان کے نیک اور برے اعمال میں ہمیشہ اس کے ساتھ ہوں گے اور اس کی تسکین یا سزا کا باعث بنیں گے۔

پہلے ہم کہہ چکے ہیں کہ قیامت کی سزاؤں اور عقاب میں زیادہ تر تکوینی اثر ہے اور عمل کی خاصیت کا پہلو زیادہ نمایاں ہے جیسا کہ قرآن مجید کا فرمان ہے:

وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ

اُن کے برے اعمال ان کے سامنے آشکار ہو جائیں گے اور جس چیز کا وہ مذاق اڑاتے تھے وہی چیزیں ان پر وارد ہوگی۔ (جاثیہ ۳۳)

سورہ یٰسٓ کی آیت ۵۴ میں ہے:

وَمَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۳۹ ﴿الصافات: ۳۹﴾

تمہارے اپنے اعمال کے علاوہ تمہارے لئے کوئی جزا نہیں ہے۔

یہی مفہوم کچھ اختلاف کے ساتھ دوسری متعدد آیتوں میں آیا ہے۔

اس طرح سے اس سوال کی کوئی گنجائش نہیں کہ جرم اور سزا کے مابین کیوں تناسب کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔

انسان کو چاہیے کہ ایمان اور عمل صالح کے دو پروں کے ساتھ سعادت کے آسمان کی بلندیوں پر پرواز کرے اور بہشت کی ابدی نعمتوں اور قرب خدا کی لذتوں سے بہرہ مند ہو، اب اگر ایک لحظے یا سو سالہ عمر کی ہوس پرستی کے نتیجے میں اپنے دونوں پر گنوا ڈالے تو اسے ہمیشہ کے لئے ذلت اور بدبختی میں رہنا ہوگا، یہاں پر زمان و مکان اور جرم کی مقدار کا مسئلہ درپیش نہیں ہے بلکہ علت اور معلول کا مسئلہ اور اس کے لئے مختصر اور طویل مدت کے لئے اثرات کا مسئلہ درپیش ہے، ماچس کی ایک تیلی سے ممکن ہے ایک شہر جل جائے اور ایک گرام کانٹوں کے بیج سے ممکن ہے ایک مدت بعد ایک وسیع صحرا کانٹوں سے بھر جائے جو ہمیشہ انسان کے لئے تکلیف دہ ہو، ایسے ہی پھول کے چند گرام بیج سے ایک صحرا چند سال بعد خوبصورت اور معطر پھولوں کے ایک باغ میں تبدیل ہو جائے جس کی خوشبو روح کو معطر کردے اور آنکھ کی ٹھنڈک اور دل کے سرور کا باعث بنے۔

اب اگر کوئی شخص کہے کہ ماچس کی ایک تیلی اور ایک شہر کے جلنے کے مابین کیا تناسب ہے یا چند چھوٹے چھوٹے بیجوں اور پھولوں یا کانٹوں سے بھرے صحرا کے مابین کیا تناسب ہو سکتا ہے تو کیا یہ سوال منطقی ہوگا؟ مسلماً نہیں۔

ہمارے نیک اور برے اعمال بھی اسی طرح سے ہیں اور ممکن ہے بہت وسیع اور جاوداں آثار کا موجب بنیں (توجہ کیجئے گا)

اہم مسئلہ یہ ہے کہ الٰہی رہبر، عظیم انبیاء اور ان کے اوصیاء ہمیشہ ہمیں خبردار کرتے رہے کہ ایسے گناہوں کا نتیجہ ابدی عذاب ہوگا اور اس طرح کے اعمال صالحہ کا نتیجہ ہمیشہ کی ابدی نعمتیں ہوں گی، بالکل اسی طرح جیسے ایک آگاہ اور بیدار مالی پھول اور کانٹوں کے بیجوں کے اس وسیع اثر سے ہمیں پہلے ہی مطلع کردیتا ہے اور ہم اپنا راستہ آگاہانہ طور پر خود ہی انتخاب کرتے ہیں، یہاں اپنے علاوہ ہم کس پر اعتراض کرسکتے ہیں اور کس چیز کے بارے میں نکتہ چینی کرسکتے ہیں اور کس قانون پر اشکال کرسکتے ہیں؟

یہاں پر جزاء و سزاء اور ان کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں بحث کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

قرآن اور شفاعت کا اہم مسئلہ

اشارہ:

بے شک قیامت کے دن الٰہی سزائیں انتقامی پہلو نہیں رکھتیں چاہے وہ سزائیں زودگزر ہوں یا طولانی اور ابدی، چاہے جسمانی لحاظ سے ہوں یا روحانی، چاہے ہم انہیں اعمال کا طبیعی اثر قرار دیں یا قراردادی، یہ تمام سزائیں انسان کی تربیت کے لئے ہیں اور ان الٰہی قوانین کے اجراء کی ضامن ہیں جو انسانوں کی ترقی وکمال کے لئے معین شدہ ہیں۔

اس بناء پر باوجود اس کے کہ قرآن مجید میں قیامت کے عذاب کی شدت بیان ہوئی ہے ہر طرف سے نجات کے راستے بھی انسان پر کھول دئے گئے ہیں اور گنہ گاروں کو مہلت دی گئی ہے کہ گناہ کے راستہ سے لوٹ آئیں اور اپنی اصلاح کریں اور خدا تک پہنچنے کا راستہ پائیں۔

شفاعت انہی میں سے ایک راستہ ہے کیونکہ اس کلمہ کے صحیح مفہوم کے مطابق شفاعت گنہگار لوگوں کو خبردار کرتی ہے کہ اپنی تمام کشتیاں نہ جلا ڈالیں اور اولیاء الٰہی سے ارتباط کے تمام راستے مسدود نہ کردیں اور اگر کسی گناہ میں آلودہ ہو چکے ہیں تو مایوس نہ ہوں اور جہاں کہیں بھی ہوں واپسی کا راستہ اپنائیں اور خدا کی وسیع رحمت کے استقبال کے لئے دوڑیں۔

شفاعت کی بحث اپنی تمام ریزہ کاریوں اور خوبصورت تربیتی نکات کے ساتھ اسی مقصد کے لئے ہے جس کا قرآن مجید کی بہت سی آیتوں میں ذکر ہے۔

ہم اسی اشارے پر اکتفا کرتے ہوئے مفہوم شفاعت کے ادراک اور حقیقت کو سمجھنے اور اس سے مربوط تمام مسائل کا جواب جاننے کے لئے قرآن مجید کی طرف لوٹتے ہیں اور مندرجہ ذیل آیات پر توجہ دیتے ہیں جو چند حصوں میں تقسیم ہوتی ہیں:

۱۔ فَمَا تَنۡفَعُهُمۡ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيۡنَ

۲۔ وَاتَّقُوۡا يَوۡمًا لَّا تَجۡزِىۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَيۡـًٔـا وَّلَا يُقۡبَلُ مِنۡهَا عَدۡلٌ وَّلَا تَنۡفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمۡ يُنۡصَرُوۡنَ[۱]

۳۔ مَا لَكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِهٖ مِنۡ وَّلِىٍّ وَّلَا شَفِيۡعٍ‌ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوۡنَ[۲]

۴۔ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيۡعًا‌ؕ لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ‌ؕ ثُمَّ اِلَيۡهِ

---

[۱] یہی مفہوم مختصر فرق کے ساتھ بقرہ آیت ۲۵۴ میں بھی آیا ہے۔

[۲] یہی مطلب سورہ انعام کی آیت ۵۱ اور ۷۰ میں بھی آیا ہے۔

تُرْجَعُوْنَ۴۴

۵۔ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ

۶۔ یَوْمَىٕذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَ رَضِیَ لَهٗ قَوْلًا

۷۔ مَا مِنْ شَفِیْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ

۸۔ وَ كَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِی السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِیْ شَفَاعَتُهُمْ شَیْــٴًـا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ یَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یَرْضٰى۲۶

۹۔ وَ لَا یَمْلِكُ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَ هُمْ یَعْلَمُوْنَ۸۶

۱۰۔ وَ لَا یَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى

۱۱۔ لَا یَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا

۱۲۔ مَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ حَمِیْمٍ وَّ لَا شَفِیْعٍ یُّطَاعُ

ترجمہ:

۱۔ شفاعت کرنے والوں کی شفاعت انہیں کوئی فائدہ نہیں دے سکتی۔

۲۔ اور اس دن سے ڈرو جب کوئی شخص کسی اور کی جگہ سزا نہیں پائے گا اور نہ ہی شفاعت قبول ہوگی، نہ ہی معاوضہ قبول کیا جائے گا۔

۳۔ تمہارے لئے اس کے علاوہ کوئی ولی اور شفاعت کرنے والا نہیں ہوگا۔

۴۔ کہہ دو تمام شفاعتیں خدا کے لئے ہیں کیونکہ زمین اور آسمان کی حاکمیت اسی کی ہے اور پھر تم سب اسی کی طرف لوٹ جاؤ گے۔

۵۔ کون ہے جو اس کے سامنے اس کی اجازت کے بغیر شفاعت کر سکے۔

۶۔ اس دن (کسی کی) شفاعت سود مند نہیں ہوگی مگر اس کی جسے خداوند رحمن نے اجازت دی ہوگی اور اس کی گفتار سے راضی ہوگا۔

۷۔ اس کی اجازت کے بغیر کوئی شفاعت کرنے والا نہیں ہوگا۔

۸۔ اور کتنے فرشتے آسمانوں میں ہیں جن کی شفاعت فائدہ مند نہیں ہے مگر یہ کہ خدا جسے چاہے اور (شفاعت کی) اجازت دے۔

۹۔ اس کے علاوہ جنہیں تم بلاتے ہو وہ شفاعت پر قادر نہیں ہیں مگر وہ لوگ جنہوں نے حق پر گواہی دی ہے اور اچھی طرح علم رکھتے ہیں۔

۱۰۔ وہ لوگ اس کے علاوہ کسی کی شفاعت نہیں کریں گے جس سے خدا خوشنود ہوگا (اور اس کی شفاعت کی اجازت دی ہوگی)۔

۱۱۔ وہ ہرگز شفاعت کے مالک نہیں ہیں مگر وہ جو خدا کے نزدیک عہد کر چکا ہے۔

۱۲۔ ظالموں کا کوئی دوست موجود نہیں ہوگا اور نہ ہی شفاعت کرنے والا جس کی شفاعت قبول کی جائے۔

تفسیر:

آیات شفاعت کی پانچ قسمیں:

اگر مندرجہ بالا ۱۲ آیتیں اور ان سے مشابہ چار آیتیں جن کی طرف حاشیے میں اشارہ ہوا ہے ایک دوسرے کے ساتھ رکھی جائیں اور ان کی تفسیر کی جائے تو شفاعت کی بحث میں موجود تمام مسائل بخوبی حل ہو جاتے ہیں اور اس ضمن میں پیش آنے والے ہر سوال کا جواب مل جاتا ہے، لیکن شفاعت کی بحث کے کلی مطالعات میں ان آیات کی موضوعی تفسیر کی طرف عدم توجہ اور بعض کا مطالعہ کر کے باقی کو چھوڑ دینا بہت سارے اشکالات کا باعث بنا ہے اور بعض اوقات کچھ لوگوں کی اپنی گمراہی اور دوسروں کو گمراہ کرنے کا باعث بنا ہے، اور یہ ان لوگوں کی غلطی ہے جو آگاہانہ یا ناآگاہانہ طور پر موضوعی تفسیر کو نظر انداز کر کے چاہتے تھے ایسے مسائل کو ایک یا چند آیتوں کا سہارا لے کر حل کریں کہ جو اس طرح سے قابل حل نہیں ہیں یا پھر اس طرح بعض آیات کے انتخاب سے اپنے مدعا کو ثابت کرنے میں ان کی بدنیتی کا دخل تھا۔

بہر حال مندرجہ بالا آیات حقیقت میں پانچ قسموں میں تقسیم ہوتی ہیں جن میں سے ہر ایک کا ایک خاص ہدف ہے۔

پہلی قسم:

اس میں وہ آیتیں ہیں جو شفاعت کی کلی طور پر نفی کرتی ہیں جیسا کہ پہلی اور دوسری آیت ہے، پہلی آیت میں بے ایمان مجرموں کی جہنم میں بعض حالتوں اور بہشتیوں کی ان سے گفتگو بیان کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے: شفاعت کرنے والوں کی شفاعت انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی ”فما تنفعھم شفاعة الشافعین“۔

اگر چہ یہ آیت اس جماعت کے بارے میں ہر طرح کی شفاعت کی کلی طور پر نفی کرتی ہے (جس میں انبیاء، اوصیائ، فرشتوں، صدیقین، شہداء اور صالحین سب کی شفاعت شامل ہے) لیکن شافعین کی عبارت سے جو فعلیت میں ظہور رکھتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس دن کچھ لوگ شفاعت کرنے والے اور کچھ لوگ شفاعت پانے والے ہوں گے لیکن ان کی شفاعت ان لوگوں کے لئے نہیں ہوگی جو ہمیشہ قیامت کی تکذیب کرتے تھے اور نماز کو بھی بالکل چھوڑ بیٹھے تھے اور مسکین کو بھی ہرگز کھانا نہ کھلاتے تھے ”فما تنفعھم“ کی عبارت (یعنی اس بناء پر شفاعت انہیں کوئی فائدہ نہیں دے سکتی) سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان اعمال وعقائد اور ان کی حالت ہی اس طرح کی محرومیت کا باعث بنی ہے، اس بنا پر اگر چہ یہ آیت نفی شفاعت کی آیتوں میں سے ہے لیکن اس کے متن میں اور ضمنی طور پر شفاعت کا اجمالی اثبات کیا گیا ہے۔

دوسری آیت میں بھی شفاعت کی نفی ہوئی ہے، فرمایا گیا ہے: اس دن سے ڈرو جب کوئی شخص دوسری کی سزا نہیں کاٹے گا اور اس کی شفاعت بھی قبول نہیں ہوگی (اور عذاب سے آزادی کے لئے اس سے) معاوضہ بھی نہیں لیا جائے گا اور کوئی اس کی مدد کو نہیں اٹھے گا'' واتقوا یوما لا تجزی نفس عن نفس شیئا ولا یقبل منها شفاعة ولا یوخذ منها عدل ولا هم ینصرون'۔

اگر چہ اس آیت میں مخاطب (سابقہ آیت کے قرینے کی بنا پر) یہودی قوم ہے لیکن آیت کا حکم عمومی پہلو رکھتا ہے اور مجرموں پر نجات کے تمام دروازے بند کر دیتا ہے اور ان میں سے چار راستوں کی طرف اشارہ ہوا ہے جو اس دنیا میں بہت سے مجرموں کی نجات کا وسیلہ بن جاتے ہیں۔

پہلا یہ کہ کوئی شخص کسی دوسرے کا جرمانہ اپنے ذمے لے، دوسرا یہ کہ کوئی باعزت شخص اس کی شفاعت کرے، تیسرا یہ کہ سزاؤں کا جرمانہ معاف کر دیا جائے، چوتھا یہ کہ کچھ لوگ اس کی مدد کو اٹھیں اور اُسے سزاؤں کے چنگل سے نجات دلائیں، قیامت کے دن ان میں سے کوئی ایک مفہوم نہیں رکھتا۔

گفتگو اس بارے میں ہے کہ یہاں پر شفاعت کی کلی طور پر نفی ہوئی ہے لیکن کیا یہ صرف یہود قوم سے مخصوص ہے جنہوں نے کفر وعناد اور حق سے دشمنی کا راستہ اختیار کیا تھا اور جو انبیاء الٰہی کو بھی قتل کرتے تھے؟ اس بناء پر یہ چیز آیات شفاعت اور ان روایات متواترہ کے منافی نہیں ہے جو کہتی ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ اور باقی معصومین اس امت کے گناہ گاروں کی شفاعت کریں گے۔

یا پھر یہ آیت یہودیوں کے طرز فکر کی طرف اشارہ کرتی ہے جو یہ سمجھتے تھے کہ ان کے آباء ان کی شفاعت کریں گے، کیا یہ آیت اس طرز تفکر پر خط بطلان کھینچتی ہے اور انہیں مایوس کرتی ہے یا آیت کے ظاہر میں اطلاق ہے اور کسی بھی فرد کے بارے میں کسی بھی طرح کی شفاعت کی نفی کرتی ہے؟

ذیل میں آنے والی دوسری آیتیں اور اجماع امت وروایات متواترہ کو اس آیت کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو یہ آیت کفار اور ایسے گناہ گار افراد سے مختص قرار پاتی ہے جو عظیم گناہوں کی وجہ سے شفاعت سے محروم ہو گئے ہیں، لہٰذا اس آیت کی عمومیت کی دوسری آیتیں تخصیص کرتی ہیں اور اس مورد میں ہر قسم کے ابہام کو برطرف کرتی ہیں، اس کی مزید تشریح جلد آئے گی۔

دوسری قسم:

ان آیتوں کی ہے جو'' شفاعت کو خدا سے مختص قرار دیتی ہیں، تیسری زیر بحث آیت ان میں سے ہے جس میں آسمانوں اور زمین کی خلقت اور خدا کی ہر شے پر حاکمیت کی طرف اشارہ کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے، اس کے علاوہ تمہارے لئے کوئی ولی اور شفاعت کرنے والا نہیں ہے، خالق وہ ہے (عالم کا مدبر بھی اس کی پاک ذات ہے بنابرایں شفاعت اور ولایت کا مقام بھی اس کی مقدس ذات کے لئے مخصوص ہے)'' ما لکم من دونه من ولی ولا شفیع''۔

اس بناء پر بالذات اور علی الاطلاق شفیع عالم ہستی کا خالق اور مدبر ہے کیونکہ شفاعت بھی ایک طرح کی تدبیر، ربوبیت اور تربیت ہے،

لہٰذا بتوں کا دامن نہیں پکڑنا چاہیے اور اس کی پاک ذات کے علاوہ کسی کی پناہ نہیں لینی چاہیے، اگر انبیاء و اولیاء میں سے کوئی شفاعت کا مقام پا سکتا ہے تو وہ ضرور اس کی طرف سے ہے جس طرح حاکمیت ہدایت اور مربی ہونے کا مقام بھی انہیں خدا کی طرف سے عطا ہوتا ہے۔

یہی مطلب چوتھی زیر بحث آیت میں ایک اور طرح سے آیا ہے، جن بت پرستوں نے بتوں کو اپنے شفیع کے طور پر اپنایا تھا ان کے جواب میں خدا فرماتا ہے: ان سے کہہ دو کہ تمام شفاعتیں خدا کے لئے ہیں "قل للہ الشفاعة جمیعا"۔

پھر اس کی دلیل یوں بیان کرتا ہے: زمین اور آسمانوں پر حاکمیت سرف اس کی ہے پھر تم سب اسی کی طرف لوٹ جاؤ گے "له ملك السموت ولارض ثم الیه ترجعون"۔

یہ واضح ہے کہ گناہگاروں کی بخشش اور عفو کا حق وہ رکھتا ہے جو تمام موجودات کا خالق اور مالک ہے اور آغاز میں موجودات اسی کی طرف سے وجود میں آئے ہیں اور آخر کار اُسی کی طرف لوٹ جائیں گے اور وہی شفاعت کر سکتا ہے اور شفاعت کو قبول کر سکتا ہے۔

اس لحاظ سے اصل میں شفاعت کا مالک خدا ہے اور کوئی بھی اس کا ہمسر و ہمتا نہیں ہے بلکہ دوسرے اپنی شفاعت کی اجازت اسی سے لیتے ہیں اور یہ بھی واضح ہے کہ شفاعت کا ذاتا اور مستقلا خدا کے وجود میں منحصر ہونا اس بات کے منافی نہیں ہے کہ خدا کی اجازت سے دوسروں کی شفاعت جائز ہو، جس طرح حاکمیت اور مالکیت ذاتا خدا کی ہے لیکن دوسرے لوگ اس کی اجازت اور حکم پر ایک خاص حد کے اندر مالک اور حاکم ہو سکتے ہیں۔

عجیب یہ ہے کہ اس سے پہلی آیت میں جب بتوں کی شفاعت کی نفی کرتا ہے تو فرماتا ہے:

"کہہ دو کیسے اُن سے شفاعت طلب کرتے ہیں جب کہ وہ کسی چیز کے مالک نہیں ہیں اور کسی طرح کی عقل و شعور نہیں رکھتے"

قل اولو کانوا الا یملکون شیئا ولا یعقلون۔

یہ عبارت اس بات پر روشن دلیل ہے کہ شفاعت، حاکمیت اور مالکیت کی طرح ہے اور اس کا خدا سے مختص ہونا بھی اسی وجہ سے ہے کیونکہ عالم ہستی میں اصل حاکم اور مالک وہی ہے اور دوسرے اس کے دستر خوان نعمت پر سے کھانے والے ہیں۔

تیسری قسم:

اُن آیتوں کی ہے جو "شفاعت" کو خدا کے اذن پر منحصر سمجھتی ہیں" اور حقیقت میں یہ آیات دوسری قسم کی آیات کی تکمیل کرتی ہیں، لہٰذا پانچویں زیر بحث آیت میں استفہام انکاری کے ساتھ فرماتا ہے: کون خدا کے حضور شفاعت کر سکتا ہے اس کی اجازت کے بغیر "من ذالذی یشفع عندہ الا باذنه"۔

بنابرایں قیامت کے دن تمام شفاعت کرنے والے، تمام پیغمبر اور اولیاء اللہ اپنی شفاعت کی مشروعیت خدا سے لیں گے اور صرف اس

کی اجازت سے شفاعت کریں گے اور مسلما اس کی اجازت کا سرچشمہ اس کی حکمت ہے یعنی حساب و کتاب سے ہے اور جب تک کوئی شخص شفاعت کے لائق نہیں ہوگا اس کی شفاعت کرنے کی اجازت بھی نہیں دی جائے گی (اس گفتگو کو اپنے مدنظر رکھیں تا کہ مناسب موقع پر اس بارے میں زیادہ تشریح ہو سکے)۔

قابل غور بات یہ ہے کہ ((آیۃ الکرسی کی) مندرجہ بالا آیت میں پہلے زمین اور آسمان میں موجود تمام اشیاء کی قیومیت اور مالکیت کا منصب خدا کے لئے ثابت کیا گیا ہے، پھر یہ جلمہ ہے اس بناء پر شفاعت کا سرچشمہ خدا کی حاکمیت، مالکیت اور قیومیت ہے اور اس طرح بت پرستوں کے عقاید پر خط بطلان کھنچا گیا ہے جو بتوں کی پرستش کو خدا کی درگاہ میں ان کی شفاعت کا بہانہ سمجھتے تھے۔

یہی مطلب چھٹی آیت میں ایک اور طرح سے آیا ہے، فرماتا ہے: اس (قیامت کے) دن شفاعت کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا مگر اس کے لئے جسے خداوند رحمن نے اجازت دی ہوگی اور اس کی گفتار سے راضی ہوگا ''یومئذ لا تنفع الشفاعة الا من اذن له الرحمن ورضی له قولا''۔

''من اذن له الرحمن' سے مراد کون ہے؟ اس میں دو احتمال پائے جاتے ہیں پہلا یہ کہ مراد شفاعت کرنے والے ہیں جو خدا کی اجازت سے اس عہدے پر فائز ہوں گے، دوسرا یہ کہ شفاعت پانے والے مراد ہیں جو خدا کی اجازت سے شفاعت میں شامل ہوں گے، لیکن پہلا احتمال زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ گذشتہ آیت (آیت الکرسی) سے ہم آہنگ ہے، وہاں پر بھی شفیعوں کے لئے اجازت کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی، ہمارے اس مدعا پر ایک اور دلیل آئندہ آنے والی ایک آیت ہے، اس لئے اس مقام پر بہت سے مفسرین نے اس معنی کا انتخاب کیا ہے۔

''ورضی له قولا'' سے بھی دو معانی اخذ کئے جا سکتے ہیں، یہ پہلا یہ کہ شفیع مراد ہوں یعنی ان افراد کی شفاعت قابل قبول ہوگی جن کی گفتار اور شفاعت سے خدا راضی ہوگا، اس طرح سے دونوں جملے ایک دوسرے کی تاکید کریں گے، دوم یہ کہ مارد وہ شفاعت پانے والے ہوں جن کے قول سے خدا راضی ہوگا، دوسری عبارت میں وہ لوگ صالح اعتقاد، عمل یا بات کے مالک ہوں گے جس کی وجہ سے شفاعت کی اجازت پر خدا کی رضامندی پائیں گے لیکن اس بات کے پیش نظر کہ پہلا جملہ شفعیوں کے کام کی طرف اشارہ ہے، مناسب یہ ہے کہ دوسرا جملہ بھی اسی کی طرف اشارہ ہوتا کہ ضمیروں کا مرجع یکساں ہو سکے۔

بہر صورت یہ آیت خدا کی اجازت سے گناہگاروں کی ایک جماعت کی شفاعت کے وجود پر روشن دلیل ہے، ساتویں آیت میں بھی یہی مطلب ایک اور طرح سے بیان ہوا ہے، فرماتا ہے: اس کی اجازت کے بغیر کوئی شفاعت کرنے والا موجود نہیں ہے ''ما من شفیع الا من بعد اذنه''۔

بنابریں شفاعت کے لئے کیوں بتوں کی عبادت کرتے ہو صرف اپنے پروردگار کی عبادت کرو، نہ اس کے غیر کی، کیوں تم سمجھتے نہیں ہو؟ ''ذلکم الله ربکم فاعبدوه افلا تذکرون''۔

یہی مطلب آٹھویں آیت میں فرشتوں کی شفاعت کے بارے میں آیا ہے جو تاکید کرتا ہے کہ ان کی شفاعت بھی خدا کی اجازت سے

ہے، فرماتا ہے: کتنے زیادہ آسمانی فرشتے ہیں جن کی شفاعت کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی مگر اس وقت جب خدا کسی پر راضی ہو اور جسے چاہے اجازت دے ”ولکم من ملك في السموت لا تغني شفاعتهم شيئا الا من بعد ان يأذن الله لمن يشآء ويرضى“۔

جب آسمانی فرشتے اتنی عظمتوں کے باوجود خدا کی اجازت کے بغیر شفاعت پر قادر نہ ہوں تو بے شعور اور بے قیمت بتوں سے کیا اُمید رکھی جاسکتی ہے؟ کیا یہ شرم آور بات نہیں ہے کہ وہ کہیں کہ ہم بتوں کی پوجا اس لئے کرتے ہیں کہ وہ درگاہ الٰہی میں ہماری شفاعت کریں گے۔

عجیب یہ ہے کہ اس مطلب کی اہمیت کے بیان کے لئے ”کم“ کی تعبیر آئی ہے جو عموماً کثرت کا معنی دیتی ہے، نیز فی السموات (آسمانوں میں) کی تعبیر جمع کی صورت میں آئی ہے تاکہ معلوم ہو کہ ان سب کی شفاعت بھی خدا کی رضا اور اذن الٰہی کے بغیر بے سود ہے، تمام شفاعت کرنے والوں میں صرف فرشتوں کا ذکر کرنا ممکن ہے اس لئے ہو کہ عرب بت پرستوں کی ایک جماعت ان کی پرستش کرتی تھی، یا اس لئے ہو کہ جب خدا کے فرمان کے بغیر ان کی شفاعت مفید نہ ہو تو بے شعور بتوں سے ہرگز کوئی اُمید نہ ہونی چاہیے۔

رضا اور اذن کے مابین اس نظر سے تفاوت ہے کہ اذن کا استعمال اس جگہ ہوتا ہے جہاں فرد اپنی رضامندی کا اظہار کرے، لیکن رضایت باطن سے متعلق ہے اور چونکہ کبھی ممکن ہے رضایت کا اظہار جبر کی وجہ سے ہو اور اس میں باطنی رضایت نہ پائی جائے اس لئے یہاں پر دونوں الفاظ ساتھ ساتھ آئے ہیں تاکہ مقصود پر تاکید ہو، اگرچہ خدا کے بارے میں جبر کا تصور نہیں ہوسکتا اور اس کی رضایت اور اذن دونوں ہم آہنگ ہیں (توجہ کیجئے گا)۔

کیا یہ اذن شفاعت کرنے والوں کی شفاعت سے مربوط ہے یا شفاعت پانے والوں سے؟ زیر بحث آیت میں دونوں معانی ہوسکتے ہیں، اگرچہ مجموعی طور پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شفاعت کرنے والوں کی طرف اشارہ ہو یعنی خدا انہیں شفاعت کی اجازت دے اور ان کی شفاعت سے راضی ہو۔

چوتھی قسم:

ان آیتوں کی ہے جو شفاعت کرنے والوں اور شفاعت پانے والوں کے لئے کچھ شرائط کا ذکر کرتی ہیں، من جملہ نویں زیر بحث آیت میں بتوں کی شفاعت کی نفی کے ضمن میں فرمایا گیا ہے: اس (خدا) کے علاوہ جن لوگوں کو وہ بلاتے ہیں شفاعت پر قادر نہیں ہیں ”ولا يملك الذين يدعون من دونه الشفاعة الا من شهد بالحق وهم يعلمون“۔

ظاہر یہ ہے کہ یہ وصف شفیعوں کے لئے ہے اور حق کی شہادت سے مراد جو ان کی پہلی صفت ہے یہ ہے کہ موحد اور یکتا پرست ہوں یعنی توحید کے سائے میں بتوں کی نفی اور الٰہی عنایت کے استمرار کے بغیر شفاعت ممکن نہیں ہے۔

بعض مفسروں نے کہا ہے کہ یہ توصیف شفاعت پانے والوں کے لئے ہے یعنی شفاعت صرف ان افراد کے شامل حال ہوگی جو خدا کی حقانیت اور یکتائی پر شہادت دیتے ہیں اور مشرکین ہرگز شفاعت میں شامل نہ ہوں گے لیکن آیت کا ظاہر پہلی تفسیر ہی ہے کیونکہ دوسری تفسیر

میں تقدیر میں کوئی چیز لینے کی ضرورت ہے [1] اور تقدیر ظاہر کے خلاف ہے۔

دوسری توصیف ”وھم یعلمون“ کے بارے میں بھی یہی دو تفسیریں نقل ہوئی ہیں کہ اگر شفاعت کرنے والوں کے لئے وصف ہو تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو حق کی شہادت از روئے علم و آ گاہی دیتے ہیں یا یہ ہے کہ شفاعت پانے والوں کو بخوبی پہچانتے ہیں اور جانتے ہیں کہ کن لوگوں کی شفاعت کرنے کا حق رکھتے ہیں۔

اور اگر شفاعت پانے والوں کی توصیف ہو تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ ایسے لوگ شفاعت میں شامل ہوں گے جو حق کی شہادت اور کلمہ توحید از روئے علم و آ گاہی ادا کریں اور دلیل و برہان کے ساتھ ہو، صرف زبان کے ذریعے نہ ہو۔

یہی مطلب (دسویں زیر بحث آیت میں ایک اور طرح سے آیا ہے، بت پرستوں کے اس قول کی نفی کے بعد کہ فرشتے خدا کی اولاد ہیں، فرمایا گیا ہے: وہ خدا کے شائستہ بندے ہیں اور وہ اُن کے علاوہ کسی اور کی شفاعت نہیں کرتے جن سے خدا راضی ہے ”ولا یشفعون الا لمن ارتضی“ اور وہ اس کے خوف سے خوف زدہ ہیں ”وھم من خشیته مشفقون“۔

بنا بر ایں شفاعت کی خاطر فرشتوں کی پرستش (جو مشرکوں کا عقیدہ تھا) بیہودہ ہے کیونکہ وہ خدا کے فرمان پر سر تسلیم خم کئے ہیں اور صرف اُن کی شفاعت کرتے ہیں جن سے خدا راضی ہے یعنی صرف مخلص موحدوں کی شفاعت کرتے ہیں۔

لہٰذا ”لمن ارتضیٰ“ (یعنی ان کے لئے جن سے خدا راضی ہو) ان کے دین و ایمان اور توحید سے رضا مندی کی طرف اشارہ ہے یا ان کے لئے شفاعت سے رضامندی کی طرف اور دونوں کی برگشت ایک ہی معنی کی طرف ہوتی ہے۔

اس طرح سے غیر خدا کی شفاعت صرف اسی کی اجازت سے ہوسکتی ہے اور اس کی اجازت ان افراد سے مخصوص ہے جو مومن اور موحد ہوں۔

نویں آیت میں اس بارے میں نئی عبارت نظر آتی ہے جس میں قیامت کے دن مجرموں کے جہنم کی طرف دھکیلے جانے کی طرف اشارہ کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے: وہ شفاعت کے مالک اور صاحب نہیں ہیں مگر وہ جو خدا کے حضور عہد کر چکا ہے ”لا یملکون الشفاعة الا من اتخذ عند الرحمن عهدا“۔

یہ شفاعت پانے والوں کی ایک توصیف ہے (جس پر قرینہ مجرموں کے بارے میں نازل شدہ اس سے پہلی آیت ہے) اور مسلما عہد و پیمان سے مراد یہاں پر خدا پر ایمان، اس کی وحدانیت کا اقرار، پیغمبروں کی تصدیق اور ان کے اوصیاء کی ولایت کے قبول کے علاوہ کوئی اور نہیں ہوسکتی اور بعض نے اس میں عمل صالح کا بھی اضافہ کیا ہے، مفسرین نے اگرچہ یہاں پر عہد کی تفسیر میں متعدد احتمالات کا ذکر کیا ہے تاہم ان کے اقوال میں غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ سب کی برگشت ایک قدر جامع کی طرف ہوتی ہے جس کی طرف پہلے اشارہ ہو چکا ہے۔

بعض بزرگ مفسرین نے اس احتمال کا بھی اظہار کیا ہے کہ یہ شفاعت کرنے والوں کی صفت ہے اور یہاں پر ”عھد“ سے مراد وہی

---

[1] ان آیت میں تقدیر اس طرح سے ہوگی۔ الا لمن شهد بالحق

ہے جو سورہ زخرف کی آیت ۸۶ میں آیا ہے یعنی ''شہادت بالحق'' [۱]

لیکن اس بات کے پیش نظر کہ ''لا یملکون'' میں ضمیر کی برگشت اس مرجع کی طرف ہونی چاہیے جس کا ذکر پہلی آیت میں ہے اور وہاں پر گفتگو مجرموں کے بارے میں ہورہی تھی یہ احتمال بعید لگتا ہے اور ظاہر یہی ہے کہ یہ شفاعت کرنے والوں کا وصف ہے۔

اس طرح سے شفاعت پانے والوں اور شفاعت کرنے والوں کے مابین ایمان اور عمل صالح کا ایک رابطہ ہونا چاہیے کیونکہ وہاں پر شفاعت حساب وکتاب کے ساتھ ہے اور ہرگز نااہل افراد کی طرف داری کے معنی میں نہیں ہے، پیغمبر اکرمؐ سے ایک حدیث مروی ہے:

من ادخل علی مومن سرورا فقد سرنی ومن فقدا تخذ عند الله عهدا۔

جس نے کسی مومن کے دل میں سرور اور خوشی پیدا کی اس نے مجھے مسرور کیا اور جس نے مجھے مسرور کیا اس نے خدا کے حضور (شفاعت کا) عہد حاصل کیا۔

یقینا جو بھی کسی مومن کو اس کے ایمان کی وجہ سے شاد کرتا ہے وہ بایمان اور ایک طرح کے عمل صالح کا مالک ہے جو شفاعت کے لئے اس کے اور خدا کے مابین رابطے کو مضبوط کرتا ہے۔

پانچویں قسم:

میں زیر بحث آخری آیات میں اشارہ بعض ایسے افراد کی طرف ہے جو اپنے ارتکاب کردہ اعمال کی وجہ سے شفاعت کی قابلیت نہیں رکھتی، اس کا مفہوم یہ ہے کہ شفاعت کچھ دوسرے لوگوں کے شامل حال ہوگی، فرماتا ہے: ظالموں کا (اس سخت دن۔۔۔۔۔روز قیامت) کوئی دوست نہیں ہوگا اور نہ ہی کوئی ایسا شفاعت کرنے والا جس کی شفاعت قبول کی جائے ''ما للظلمین من حمیم ولا شفیع یطاع''پس ظالموں کے علاوہ لوگ اجمالا شفاعت کی شائستگی رکھتے ہیں۔

''ظالموں'' سے مراد کون ہے؟ اس میں بعض مفسرین نے مشرکوں اور کافروں کو مراد لیا ہے جیسا کہ محقق طبرسی نے مجمع البیان میں فرمایا ہے: کیونکہ سب سے بڑا ظلم شرک اور نفاق ہی ہے۔ [۲]

فخر الدین رازی نے بھی تصریح کی ہے کہ یہاں پر ظالموں سے مراد کفار ہیں۔ [۳]

جو آیتیں اس سے پہلے وارد ہوئی ہیں اور اسی آیت کا آغاز جہاں انہیں قیامت کے دن سے ڈرایا گیا ہے اور اس کے بعد آنے والی آیتیں جو عذاب الٰہی میں گرفتار ہونے والے گذشتہ زمانے کے کفار کی سرنوشت کو ان کے لئے درس عبرت کے عنوان سے ذکر کرتی ہیں، اس

---

[۱] المیزان جلد ۱۴ سورہ مریم آیہ ۸۶ کے ذیل میں۔

[۲] مجمع البیان جلد ۷، ۸ صفحہ ۵۱۹۔

[۳] تفسیر فخر الدین رازی، جلد ۲۷ صفحہ ۵۰۔

مطلب پر شاہد اور گواہ ہیں۔

تفسیر روح البیان، روح المعانی اور تفسیر مراغی میں بھی اسی تفسیر کا انتخاب کیا گیا ہے، بہر حال ظالموں کی جماعت کے پیش نظر شفاعت کی نفی (چاہے اس کی کسی بھی معنی میں تفسیر کریں) دوسری اقوام کے لئے شفاعت کے اثبات پر دلیل ہے اور یہ وہی چیز ہے جس کا تذکرہ ہم نے بارہا کیا ہے کہ شفاعت بغیر حساب کے نہیں ہے، بلکہ ایک قسم کی شائستگی اور قابلیت کی ضرورت ہے یعنی گنہگاروں کے دو گروہ ہیں، ایک شفاعت کے لائق ہے اور دوسرا نا قابل شفاعت۔

نتیجہ:

مندرجہ بالا آیات کے تنوع اور پانچ قسموں کے پیش نظر جن میں سے ہر قسم شفاعت کے بعض مسائل بیان کرتی ہے اور ان آیتوں کی جمع بندی اور ایک دوسری کی مدد سے کی جانے والی تفسیر کو دیکھتے ہوئے جس کی طرف اوپر اشارہ ہو چکا ہے شفاعت کا حقیقی مفہوم بھی واضح ہو جاتا ہے اور اس کا فلسفہ، اس کی شرائط، اس کی اہمیت اور اس کا تربیتی کردار بھی، اس سے بے خبروں کے شفاعت سے مربوط تمام آیات پر عدم احاطہ کی وجہ سے اس مورد میں کئے جانے والے مختلف اشکالات کا جواب بھی واضح ہو جاتا ہے، بعض قرآنی آیتیں تمام سوالات کا جواب دیتی ہیں۔

تاہم اس مسئلے کی اہمیت کا تقاضا یہ ہے کہ ان مباحث میں سے ہر ایک کو جدا گانہ طور پر وضاحت سے بیان کیا جائے تا کہ قرآن کی آیتوں اور منطقی تحلیل کی مدد سے اس آئینے سے ہر طرح کے زنگ کو صاف کیا جائے اور اس کے چہرے سے گرد و غبار برطرف ہو جائے، اب شفاعت کے اہم مسائل کے بارے میں وضاحتیں ملاحظہ فرمائیے:

چند وضاحتیں:

ا۔ شفاعت کا مفہوم:

اگر ہم شفاعت کے لغوی معنی پر صحیح طور پر غور کریں تو اس کے اسلامی مفہوم تک پہنچ سکتے ہیں کیونکہ شفاعت ''شفع'' کے مادے سے کسی چیز کو اس جیسی چیز کسی چیز کے ساتھ ضم کرنے کے معنی میں ہے ''ضم الشیئی الی مثله'' اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان دونوں کے مابین ایک طرح کی شباہت اور یکسانیت ہونی چاہیے اگر چہ ان دونوں کے مابین کچھ اختلاف بھی ہو۔

اس دلیل کی بناء پر شفاعت کا قرآنی مفہوم یہ ہے کہ گناہگار شخص اپنے بعض مثبت (ایمان، یا اعمال صالحہ کے) پہلوؤں سے اولیاء اللہ سے شباہت اختیار کرلے اور وہ اُسے اپنی عنایتوں اور مدد سے کمال کی طرف لے جائیں اور خدا کے حضور سے عفو کا تقاضا کریں۔

دوسری عبارت میں شفاعت کی حقیقت کسی قوی اور برتر موجود کا کسی ضعیف تر موجود کے کنارے قرار پانا اور کمال کے مراتب طے کرنے کے لئے اس کی مدد کرنا ہے۔

انسانی معاشروں میں گناہگاروں کی شفاعت کا سلسلہ ہمیشہ سے رہا ہے اور شاید قرآن کے نزول سے ہزاروں سال پہلے صاحب حیثیت افراد ارباب اقتدار کے حضور گناہگاروں کی شفاعت کرتے تھے، البتہ لوگوں کے درمیان رائج شفاعت اور آسمانی ادیان اور منطق قرآن میں موجود شفاعت کے مابین ایک اہم اور واضح فرق موجود ہے، وہ یہ کہ:

انسانی معاشروں میں شفاعت (شفارش) غالباً اس طرح سے ہوتی تھی کہ شفاعت کرنے والا معاشرے میں اثر ورسوخ والا شخص ہوتا تھا اور شفاعت پانے والا کسی بھی جہت سے اس کا محتاج ہوتا تھا، لہٰذا گناہگار کے لئے اس کی شفاعت قبول کی جاتی تھی تا کہ ضرورت کے موقع پر شفاعت کرنے والے کے اثر ورسوخ سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔

مثلاً بادشاہ اپنے اردگرد کے افراد اور حکومتی عہدہ داروں کی شفاعت بعض موارد میں قبول کر لیتے تھے تا کہ ان کی قدر وعظمت میں اضافہ ہو اور ضرورت کے موقع پر ان سے اپنے امور میں استفادہ کیا جا سکے، اسی طرح شفاعت کرنے والے بھی شفاعت پانے والوں سے اپنے ذاتی تعلقات کو پیش نظر رکھتے تھے نہ کہ افراد کی قابلیت واہلیت کو۔

خدا چونکہ غنی بالذات اور بے نیاز علی الاطلاق ہے لہٰذا اس کے حضور شفاعت ایک اور شکل میں ہے، وہ یہ ہے کہ اس کی بارگاہ میں شفاعت کرنے والے دیکھتے ہیں کہ گناہگاروں کے مابین کون ایسے افراد ہیں جو اپنے بعض مثبت پہلوؤں مثلاً ایمان اور بعض اعمال صالحہ کی وجہ سے خدا کی رضا پاتے ہیں اور انہی مثبت پہلوؤں کی وجہ سے خدا کے حضور ان کی شفاعت کرتے ہیں، اور یہی ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن خدا ''عالم'' اور ''عابد'' کو مبعوث فرمائے گا جب وہ خدا کی عدالت میں حاضر ہوں گے۔

قیل للعابد انطلق الی الجنة وقیل للعالم قف تشفع للناس بحسن تادیبك لهم۔

تب عابد سے کہا جائے گا، بہشت کی طرف روانہ ہو جاؤ اور عالم سے کہا جائے گا ٹھہرو اور لوگوں کی شفاعت کرو اس لئے کہ تم نے اُن کی اچھی تربیت کی تھی۔[1]

یہ تعبیریں خصوصاً آخری روایت میں مذکور عبارت ہمیں بخوبی بتاتی ہے کہ شفاعت نیک و پاک افراد مومنین اور علماء سے ایک طرح کے معنوی پیوند کا نتیجہ ہے۔

شہیدوں کے بارے میں پیغمبر اکرمؐ سے نقل ہوا ہے، فرمایا:

ویشفع الرجل منهم فی سبعین الفا من اهل بیته وجیرانه۔

---

[1] بحار الانوار، جلد ۸ صفحہ ۵۶ حدیث ۶۶۔

ان میں سے ہر فرد اپنے خاندان اور ہمسایوں (وغیرہ) میں سے ستر ہزار افراد کی شفاعت کرے گا۔[1]

یہاں تک کہ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے:

شافع الخلق: العمل بالحق والزوم الصدق

انسان کا شفیع خدا کی اطاعت اور حق پر عمل ہے۔[2]

مختصر یہ کہ ان تمام روایات اور اسلامی منابع میں وارد دوسری بہت سی روایتوں سے یہ واضح نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ شفاعت اسلام کے اہم ترین تربیتی مسائل میں سے ایک ہے جو شفاعت کرنے والوں کی نوعیت کے پیش نظر اسلام کی بالاترین اقدار کی نشاندہی کرتا ہے اور ان اقدار اور شفاعت کرنے والوں کی صفات اور ان سے ارتباط کی طرف تمام مسلمانوں کو ترغیب اہم فرق لوگوں کے درمیان مروج شفاعت کو خدا کی بارگاہ میں اولیاءاللہ کی شفاعت سے جدا کرتا ہے کیونکہ پہلی شفاعت کی بنیاد رابطے ہیں اور دوسری شفاعت کی بنیاد ضابطے۔

یہاں پر بعض ایسے بے خبر معترضین کے سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے جو شفاعت کو گناہگاروں کی طرف داری یا انہیں سبز چراغ دکھانے سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کا موازنہ جبار سلاطین کے حواریوں کی شفاعت سے کرتے ہیں۔شرعی مفہوم میں شفاعت کے بنیادی عوامل تعمیری اور تربیتی ہیں اور لیاقت واہلیت کی اساس پر ہیں جب کہ لوگوں کے درمیان رائج شفاعت کا سرچشمہ بہت سے موارد میں ''طرفین کی احتیاج اور غیر منطقی اور ذاتی تعلقات'' ہیں۔

شفاعت الٰہی تربیت کنندہ ہے جب کہ مروج شفاعت کبھی گناہ کی جرات کا باعث بھی بنتی ہے۔

اوپر مذکورہ آیتیں اس مطلب پر زندہ گواہ ہیں کیونکہ ہر شفاعت پانے والے کے لئے بعض ایسے اوصاف کا ذکر کرتی ہیں جو مثبت پہلوؤں اور لیاقت واہلیت کے ترجمان ہیں اگرچہ یہ اہلیت بعض اعمال صالحہ کی وجہ سے ہی کیوں نہ ہو۔

۲۔شفاعت تکوینی اور تشریعی:

ہم وسیع نظر سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ مصداق خارجی کے اعتبار سے شفاعت اتنی وسیع ہے کہ تمام عالم ہستی اور علت ومعلول کی بنیاد پر محیط ہے کیونکہ ضعیف موجودات کی پرورش اور ان کی نجات میں قوی موجودات کی مدد کا اہم جہان تکوینی میں جگہ جگہ مشاہدہ کرتے ہیں۔

جب کسی پودے کا بیج شگفتہ ہوتا ہے اور اس میں سے ایک نازک کونپل سر اٹھاتی ہے تو زمین اپنا غذائی مواد اُسے فراہم کرتی ہے، سورج اپنی حرارت وگرمی اور خفیہ قوتیں اس پر نچھاور کرتا ہے اور بادل اپنے حیات بخش قطرے اس پر برساتے ہیں تا کہ یہ نازک اور ناتواں موجود قوت پائے اور ان تمام رکاوٹوں سے گزر کر ایک تنومند درخت میں تبدیل ہو جائے جس کی ٹہنیاں پھلوں سے لدی ہوں یہ شفاعت تکوینی کی

---

[1] مجمع البیان جلد ۶ صفحہ ۵۳۸ (آل عمران کی آیت ۱۷۱ کے ذیل میں)۔

[2] غرر الحکم۔

ایک واضح مثال ہے۔

ایک ضعیف نومولود کے ساتھ والدین کا ہونا، پودوں کے پاس مالی کا ہونا اور حروف ابجد سے ناواقف بچے کے ہمراہ ایک معلم کا ہونا سب ہی شفاعت تکوینی کی مثالیں ہیں اس طرح سے علت ومعلول اور تمام عالم اسباب کو ہم اس شفاعت کی مختلف مثالیں قرار دے سکتے ہیں۔

مسلم طور پر دھوپ، ہوا، بارش اور زمین کبھی کسی خشک لکڑی کی مدد نہیں کرتیں کیونکہ وہ لکڑی ہے اور اس کی قسمت میں جلنا ہی لکھا ہے، بلکہ یہ چیزیں تازہ پھوٹی ہوئی کونپلوں اور کمزور پودوں اور ایک ایسے موجود کی مدد کرتی ہیں جس میں اپنے کمال کے لئے کچھ اہلیت پائی جاتی ہے۔

جب ہم عالم تکوین سے اس واضح نمونے کو عالم تشریع یعنی گناہگاروں کے بارے میں انبیاء اور اولیاء کی شفاعت کے باب میں لے جاتے ہیں تو شفاعت قرآنی کا حقیقی مفہوم واضح ہوجاتا ہے اور بے خبروں کے تمام اعتراضات کا جواب بھی مل جاتا ہے اور اس طرح سے شفاعت کا تربیتی مفہوم کاملا واضح ہوجاتا ہے۔

قابل توجہ یہ ہے کہ امیر المومنین علی علیہ السلام کا نہج البلاغہ کے کلمات قصار میں ایک جملہ ملتا ہے جو اس مطلب کو ایک بہت خوبصورت عبارت میں بیان کرتا ہے:

الشفیع جناح الطالب

شفاعت کرنے والا طلب کرنے والے کا پر ہوتا ہے۔[1]

جس طرح چھوٹے اور نومولود پرندے جو پرواز کی طاقت نہیں رکھتے اور اپنے والدین کی مدد سے پرواز کرتے ہیں اور والدین ان کے اپنے پروں کی طرح ہوتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں تاکہ وہ ایک مکمل پرندے کی صورت اختیار کرلیں، الٰہی شفاعت کنندہ افراد بھی شفاعت پانے والے ضعیف افراد کی مدد کرتے ہیں تاکہ وہ سعادت اور کمال کے آسمانوں پر پرواز کرسکیں۔ (غور کیجئے گا)۔

۳۔ فلسفہ شفاعت:

شفاعت کے مفہوم کی تفسیر میں جو کچھ کہا گیا اور ان آیات کی تفسیر میں جو متعدد اشارات ہم نے دیئے ان سے شفاعت کا فلسفہ مکمل طور پر واضح ہوجاتا ہے۔

شفاعت گناہ کی تشویق ہے نہ گنہاہوں کے لئے سبز چراغ، پیچھے رہ جانے کا عامل ہے نہ ہی آج کی دنیا کے معاشروں میں موجود پارٹی سے مشابہ کوئی چیز، بلکہ ایک اہم تربیتی مسلہ ہے جس کے مختلف جہات سے مثبت اور تعمیری سازندہ آثار ہیں۔ مثلا:

---

[1] نہج البلاغہ کلمات قصار کلمہ ۶۳۔

الف: اُمید پیدا کرنا اور مایوسی کا سدباب:

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہوائے نفس کا غلبہ اہم گناہوں کے ارتکاب کا باعث بنتا ہے اور بعدازاں اس گناہ کے مرتکب افراد پر مایوسی کا غلبہ ہوجاتا ہے اور یہی مایوسی انہیں زیادہ آلودہ اور گناہوں میں غوطہ ور کرتی ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں اب سر سے پانی گذر چکا ہے، لہٰذا چاہے ایک گناہ چاہے سو گناہ۔

لیکن اولیاء اللہ کی شفاعت کی امید انہیں نوید دیتی ہے کہ اگر وہ یہیں پر رک جائیں اور اپنی اصلاح کر لیں تو ممکن ہے نیک اور پاک افراد کی شفاعت سے اُن کے ماضی کی تلافی ہو جائے، بناء بر ایں شفاعت کی اُمید گناہ سے رکنے اور اصلاح وتقویٰ کی طرف لوٹ آنے میں مدد کرتی ہے۔

ب: اولیاء اللہ سے روحانی تعلق:

مفہوم شفاعت کی تفسیر میں اوپر کہے گئے مطالب سے یہ نتیجہ نکالنا آسان ہے کہ شفاعت شفیع اور شفاعت پانے والے کے مابین ایک طرح کے تعلق پر منحصر ہے جو ایمان کے لحاظ سے اور بعض صفات فاضلہ اور حسنات کے انجام کے لحاظ سے ایک روحانی رابطہ ہے۔

مسلم امر ہے کہ جو بھی شفاعت کی امید رکھتا ہے کوشش کرتا ہے کہ کسی طرح سے یہ رابطہ برقرار ہو سکے اور ایسا کام کرے جو شفیع کی رضا مندی کا موجب بنے اور اپنے پیچھے کی سب کشتیاں نہ جلا ڈالے اور دوستیوں اور محبتوں کے پیوند کو کبھی نہ توڑے۔

یہ تمام امور مل کر اس کی تربیت کے لئے موثر عامل ہوں گے اور اس چیز کا باعث بنیں گے کہ وہ تدریجاً آلودہ لوگوں کی صف سے باہر نکل آئے یا کم از کم کچھ آلودگیوں کے ساتھ نیک اعمال کا رخ اختیار کر لے اور شیطان کی آغوش میں زیادہ گمراہ ہونے سے بچ جائے۔

ج۔ شفاعت کی شرائط کا حصول:

جن آیتوں کی تفسیر آپ اوپر پڑھ چکے ہیں ان میں شفاعت کی مختلف شرائط ذکر ہوئی ہیں جن میں سب سے اہم شرط خدا کی اجازت اور اس کا اذن ہے جسے شفاعت کی امید اور اس کا انتظار ہوگا کسی طرح اس اجازت کو حاصل کرے گا یعنی اُسے ایسا کام انجام دینا ہوگا جو خدا کے حضور مطلوب اور محبوب ہوگا۔

گذشتہ بعض آیتوں میں ذکر ہوا ہے کہ قیامت کے دن شفاعت صرف ان کے لئے مفید ہوگی جن کی شفاعت کی اجازت خداوند رحمن نے دی ہوگی اور وہ جس کی گفتار سے راضی ہوگا، (طہ۔۱۰۹)۔ سورہ انبیاء کی آیت ۲۸ میں بیان ہوا تھا کہ ایسے لوگ شفاعت کے ذریعے بخشش کے حقدار ہوں گے جو مقام ارتضاء (خدا کی خوشنودی) تک پہنچیں گے اور سورہ مریم کی آیت ۸۷ کے مطابق عہد الٰہی کے حامل ہوں گے اور جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں یہ تمام مناصب خدا اور اس کے عدل پر ایمان کے سائے میں اور حسنات وسیئات (نیک اعمال کی نیکی اور برے اعمال کی

بدی) کے اعتراف اور خدا کی طرف سے نازل شدہ تمام قوانین کی صحت پر گواہی سے حاصل ہو سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ بعض گذشتہ آیات میں یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ ظالمین شفاعت میں شامل نہیں ہوں گے اس کے لئے شفاعت کی امید رکھنے والوں کو ظالموں کی صف سے خارج ہونا پڑے گا (چاہے ظلم کی کسی بھی معنی میں تفسیر کی جائے)۔

یہ سب پہلو سبب بنتے ہیں کہ شفاعت کی امید رکھنے والے اپنے گذشتہ اعمال میں تجدید نظر کر لیں اور مستقبل کے بارے میں بہتر فیصلے کریں، یہ بھی ایک مثبت نقطہ اور تربیت کا موثر عامل ہے۔

د۔ شفیعوں کے سلسلے پر توجہ:

قرآنی آیات میں شفیعوں کے بارے میں وارد ہونے والے اشارات کی طرف توجہ اور روایات میں وارده شده تصریحات مسئلہ شفاعت کے تربیتی پہلوؤں پر ایک اور دلیل ہے۔

پیغمبر اسلامؐ سے ایک حدیث مروی ہے آپؐ فرماتے ہیں:

الشفاء خمسة القرآن والرحیم والامانة ونبیکم واهل بیت نبیکم

شفیعوں کی قیامت میں پانچ قسمیں ہوں گی، قرآن، صلہ رحم، امانت، تمہارے پیغمبرؐ اور تمہارے نبیؐ کے اہل بیتؑ۔[1]

مسند حنبل میں پیغمبر اسلامؐ سے ایک اور روایت نقل ہوئی ہے، فرماتے ہیں: ''تعلموا القرآن فانه شافع یوم القیامة'' قرآن سیکھو، وہ قیامت میں شفاعت کنندہ ہے۔[2]

یہی مطلب نہج البلاغہ میں امیر المومنین علی علیہ السلام کے کلام میں آیا ہے، فرماتے ہیں ''فانه شافع مشفع'' قرآن ایسا شفیع ہے جس کی شفاعت قبول ہوتی ہے۔[3]

دوسری متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ شفاعت کرنے والی بہترین چیز ''توبہ'' ہے علی علیہ السلام فرماتے ہیں ''لا شفیع انجح من التوبة'' توبہ سے زیادہ کوئی بھی شفیع کامیاب نہیں ہے۔[4]

بعض دوسری روایات میں انبیاء اوصیاء مومنین اور ملائکہ کی شفاعت کے بارے میں تصریح ہوئی ہے پیغمبر اکرمؐ فرماتے ہیں:

---

[1] میزان الحکمۃ ج ۵ صفحہ ۱۲۲۔

[2] مسند احمد جلد ۵ صفحہ ۲۵۱ (طبع بیروت دار صادر)

[3] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۷۶۔

[4] نہج البلاغہ، کلمات قصار، کلمہ ۳۷۱۔

الشفاعة لل نبیآء والا وصیاء والمومنین والملائکة وفی المومنین من یشفع مثل ربیعة ومضر! واقل المومنین شفاعة من یشفع ثلاچین انسانا۔

شفاعت انبیاء، اوصیائ، مومنین اور فرشتوں کے لئے ہے اور مومنین کے درمیان ایسے بھی لوگ ہیں جو قبیلہ مضر یا قبیلہ ربیعہ کے برابر افراد کی شفاعت کریں گے اور مومن کی کم سے کم شفاعت یہ ہے کہ وہ تیس افراد کی شفاعت کرے۔[۱]

اور تشویق کرتا ہے اور شفاعت کے مسئلے سے کسی بھی طرح کی غلط تفسیر اور باطل تحریف کی نفی کرتا ہے۔[۲][۳]

۴۔شفاعت کا وقت:

جن اوقات میں شفاعت ہوسکتی ہے ان میں سے ایک بے شک قیامت کا دن ہے کیونکہ شفاعت کی بہت سی آیتیں اس دن کے بیان میں ہیں لیکن کیا عالم برزخ یا اسی عالم میں بھی شفاعت ہوسکتی ہے اور کیا آخرت میں بھی حساب سے پہلے شفاعت ہوسکتی ہے یا نہیں، یہ امور قابل بحث ہیں۔

علامہ طباطبائی مرحوم نے اس ضمن میں ایک تفصیلی بحث کی ہے اور آخر میں یوں نتیجہ اخذ کیا ہے کہ شفاعت کا مسئلہ قیامت کے مراحل میں سے آخری مرحلے میں انجام پائے گا، ایسے مقام پر شفیع شفاعت پانے والے کی مغفرت کا تقاضا کرے گا تا کہ وہ جہنم میں داخل نہ ہو یا پھر اس کی شفاعت کے ذریعے بعض جہنم جانے والے لوگ باہر نکل سکیں۔

انہوں نے عالم برزخ کی طرف اشارہ کیا ہے اور موت کی وقت اور قبر میں سوال کے موقع پر پیغمبر اکرمؐ اکرمؐ اور آئمہ (علیہم السلام) کے وہاں تشریف لانے اور مومنوں کی مدد کرنے پر دلالت کرنے والی روایات پر توجہ کی ہے اور فرمایا ہے کہ یہ شفاعت کی قسموں میں سے نہیں

---

[۱] بحارالانوار، جلد ۸ صفحہ ۵۸، حدیث ۷۵۔

[۲] تفسیر المیزان میں شفاعت کی تفسیر مسبات میں اسباب کی تاثیر سے کرنے کے بعد شفیعوں کو دو قسموں عالم تکوین اور عالم تشریع میں تقسیم کیا گیا ہے اور تشریعی شفیعوں میں توبہ، ایمان، عمل صالح، قرآن، انبیائ، فرشتوں اور مومنوں کا ذکر کیا گیا ہے اور اس سلسلے میں ان آیات سے استدلال کیا گیا ہے جو ان امور یا ان اشخاص کو گناہوں کی بخشش میں موثر قرار دیتی ہیں، اگرچہ شفاعت کا عنوان ان آیات میں نہیں ہے) مثلا زمر ۵۴، حدید ۲۸، مائدہ ۹، مائدہ ۱۶، نساء ۶۴، مومن ۷، بقرہ ۲۸۶۔

[۳] تفسیر المیزان جلد ۱ صفحہ ۴۷ سورہ بقرہ آیت ۴۸ کے ذیل ہیں۔

ہے بلکہ تصرف اور حکومت الہیہ میں سے ہے جو خدا نے انہیں عطا فرمائی ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ جب وہ شفاعت کی حقیقت کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں تو اسے اتنی وسعت دیتے ہیں کہ عالم تکوین اور تشریع میں اسباب کی ہر طرح کی تاثیر کو شفاعت میں سے قرار دیتے ہیں لیکن یہاں اولیاء اللہ کی بعض مومنوں کو برزخ اور قبر کی مشکلات سے نجات کے لئے مدد اور اعانت کی شفاعت مصداق نہیں سمجھتے۔

بہرحال جو کچھ آیات اور روایات سے مجموعی طور پر حاصل ہوتا ہے یہ ہے کہ شفاعت اپنے وسیع مفہوم کے مطابق تینوں عالموں (دنیا، برزخ، آخرت) میں واقع ہوگی اگرچہ اس کا اصلی مقام قیامت ہے اور اس کے اہم آثار میں سے دوزخ کے عذاب سے نجات ہے۔

سورہ نساء کی آیت ۶۴ میں بیان ہوتا ہے:

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَاۗءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَھُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِـيْمًا ۶۴

جب وہ اپنے آپ پر ستم ڈھاتے تھے (اور گناہ کا ارتکاب کرتے تھے) تو تمہارے پاس آجاتے اور خدا سے معافی مانگتے اور پیغمبر بھی اُن کے لئے استغفار کرتے تو وہ خدا کو توبہ قبول کرنے والا اور مہربان پاتے۔

کیا پیغمبر اکرمؐ کی طرف سے مومن خطا کاروں کی مغفرت کا تقاضا شفاعت کے علاوہ کوئی اور چیز ہو سکتی ہے؟

یہی مطلب قرآن میں حضرت یعقوبؑ اور ان کے فرزندوں کی داستان میں بھی آیا ہے کہ انہوں نے اپنے والد سے درخواست کی کہ خدا کے حضور ان کے لئے استغفار کریں اور انہوں نے بھی مان لیا (یوسف: ۹۷) اسی دنیا میں بہت دفعہ ایسا ہوا ہے کہ افراد یا اقوام پیغمبروں اور اولیاء اللہ کی شفاعت کے باعث دنیا کے عذاب سے نجات پا گئے اور یہ شفاعت کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے۔

بہت سی رایتیں ملتی ہیں جو کہتی ہیں کہ برزخ میں انسان کے نیک اعمال مثلاً نماز، روزہ، ولایت اور ایسی دوسری چیزیں یا اولیا اللہ کا حاضر ہونا سزاؤں اور مصیبتوں میں تخفیف کا باعث بنتے ہیں یا کسی ایسے صالح، پاک دامن فرد کا جس کی نیکیاں بہت ہوں کسی قبرستان میں دفن کر دینا اس قبرستان کے گناہگار مردوں کی سزاؤں میں کمی کا باعث بنتا ہے۔

یہ ساری چیزیں عالم برزخ میں ہونے والی شفاعت کی طرف اشارہ ہیں۔

حتی کہ نماز جنازہ اور اس کے ضمن میں مردوں کے لئے کیا جانے والا مغفرت کا تقاضا مسلماً بے اثر نہیں ہے، یہ بھی ایک طرح کی شفاعت ہے۔

اس بناء پر شفاعت کسی ایک خاص عالم سے مخصوص نہیں ہے بلکہ تینوں عالموں میں ہوتی ہے، البتہ اس کا اہم ترین اور اصلی مقام قیامت ہے اور وہ وقت ہے جب عذاب الٰہی کے مرکز کا سامنا ہوتا ہے۔

ایک سوال اوراس کا جواب:

ممکن ہے کہا جائے کہ متعدد روایات آئمہ سے اس مضمون میں مروی ہیں کہ برزخ کے مورد میں ہم ہم تمہارے لئے خوف زدہ ہیں، جیسا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ فرمایا:

والله ما اخاف علیکم الا البر زخ. فاذا صار لامر الینا فنحن اولی بکم۔

خدا کی قسم تمہارے لئے صرف برزخ سے ڈرتا ہوں لیکن جب امور ہمارے ہاتھ آ جائیں گے (قیامت کی طرف اشارہ ہے) تو ہم تمہاری نسبت اولیٰ ہیں۔[1]

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق گناہگار مومنین سے وعدہ شفاعت کے ضمن میں فرماتے ہیں:

ولکنی والله انحوف علیکم فی البرزخ۔

لیکن خدا کی قسم میں تمہارے لئے برزخ کے دور سے ڈرتا ہوں۔

راوی کہتا ہے میں نے عرض کیا: ''وما البرزخ؟ (برزخ کیا ہے؟) امامؑ نے فرمایا:

"القبر منذ حین موته الی یوم القیامة"

برزخ قبر ہے، موت کے وقت سے قیامت کے دن تک۔[2]

لیکن ممکن ہے کہ یہ روایتیں برزخ کے کسی خاص مرحلے کے بارے میں ہوں یا پھر ہوسکتا ہے، جنہیں اولیاء اللہ کی، ہمسائیگی کی وجہ سے نجات ملتی ہے وہ محدود اور مستثنٰی افراد ہوں اور تمام شفاعت کے لائق افراد کے لئے نہ ہو۔

۵۔شفاعت کے مسئلے پر اہم اعتراضات:

جیسا کہ ہم اسلام اور قرآن کی نظر شفاعت کے معنی کی تحلیل میں کہہ چکے ہیں کہ اسلام میں شفاعت کا مفہوم عوام الناس کے درمیان رائج مفہوم شفاعت سے بالکل جدا ہے اور ان دونوں میں امتیاز میں غلطی بہت سے اشکالات اور اشتباہات کا اصلی سرچشمہ ہے جو اس مسئلے میں پیدا ہوئے، درحقیقت ایسے اکثر اشکالات کا جواب شفاعت اسلامی کے حقیقی مفہوم کی تحلیل میں چھپا ہوا ہے اس اجمالی اشارے کے ساتھ ہم

---

[1] بحارالانوار جلد ۶، صفحہ ۲۱۴ حدیث ۲۔

[2] بحارالانوار جلد ۶، صفحہ ۲۶۷ حدیث ۱۱۶۔

ان اشکالات اوران کے جواب کی وضاحت کی طرف آتے ہیں:

الف۔کیا شفاعت گناہ کی تشویق نہیں ہے؟

کیا فشاعت کی امید اوراس کا سہارا اس چیز کا سبب نہیں ہوتا کہ کچھ لوگ گناہوں کے ارتکاب کے لئے اُسے چراغ سبز سمجھیں اوراس امید پر کہ یوم جزا کے شافعین انہیں عذاب الٰہی نے نجات دلا دیں گے،مختلف گناہان کبیرہ کا ارتکاب کریں اور عذاب کی الٰہی تہدیدات سے مطمئن ہو جائیں، دوسری عبارت میں قیامت کی سزائیں قوانین الٰہی کی مخالفت ترک کرنے کی اجرائی ضمانت ہیں کیا شفاعت اس اجرائی ضمانت کو ختم نہیں کر دیتی؟

جواب:

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے قرآنی مفہوم میں شفاعت گناہوں پر انسان کی تشویق نہیں کرتی بلکہ ان سے انسان کو روکنے والے قوی عوامل میں سے ایک ہے کیونکہ یہ باعث بنتی ہے کہ آلودہ افراد چاہے جس مرحلے میں ہوں توقف کرلیں اور گناہوں کے راستے میں آگے نہ بڑھیں بلکہ تدریجاً لوٹ آئیں گے۔

دوسری عبارت میں اسلامی شفاعت، شفاعت کرنے والوں (اولیاء اللہ، قرآن یا ایسی دوسری چیزوں)اور شفاعت پانے والوں کے مابین ایک تعلق کا نتیجہ ہے اور خدا کی اجازت پر متوقف ہے جو خود الٰہی مقدمات کی محتاج ہے، بنابرایں شفاعت کی امید انسان سے کہتی ہے کہ اپنے اور اولیاء اللہ کے مابین ایمان اور عمل کے حوالے سے تعلق قائم کرو اور رضائے الٰہی کے اسباب فراہم کرو تاکہ اس سخت دن میں اُن کے ہاں شفاعت کے لئے تمہاری کچھ عزت ہو۔

لہٰذا شفاعت کی امید ایک طرف تو گناہوں سے روکنے کا ایک عامل ہے دوسری طرف اپنے تاریک ماضی میں تجدید نظر کی دعوت ہے۔

یہ نکتہ بھی ضروری ہے کہ کسی شخص نے بھی کسی بھی ولی اللہ سے شفاعت کرنے کی ضمانت نہیں لی ہے اور کوئی گناہگار شفاعت کی امید پر مطمئن نہیں ہو سکتا بلکہ یہ مسئلہ صرف ایک امید اوار اور احتمال کی صورت میں ہے، وہ بھی ان شرائط کے ساتھ جو اوپر بیان ہوئی ہیں اس لئے یہ گناہوں کی جرات کا باعث ہرگز نہیں ہو سکتی۔

ب۔شفاعت کس لئے ہے؟

کیا یہ اپنے گناہوں پر نادم اور پشیمان افراد کے لئے ہے جب کہ ان کو تو شفاعت کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ توبہ ہی ندامت ہے اور اُن کی نجات کا باعث اور جب کوئی توبہ کرلے تو شفاعت کی ضرورت کیا ہے؟ اگر شفاعت ان کے لئے ہے جو اپنے گناہوں پر پشیمان نہیں ہیں

بلکہ زیادہ جرات منداور بے پرواہ ہیں تو ایسے افراد شفاعت کے قابل ہی نہیں ہیں اور سوہ انبیاء کی آیت ۲۷ کے جملے ''من ارتضی '' کا مصداق نہیں ہیں۔

جواب:

اولاتو بہ کی شرائط ہیں، بسا اوقات انسان ان شرائط کی تکمیل میں کامیاب نہیں ہوتا کیونکہ قرآن کی بہت سی آیات میں توبہ کی شرائط میں سے ایک ماضی کے اعمال کی اصلاح بیان ہوئی ہے یعنی جوشخص سالہا سال تک گناہوں کا ارتکاب کرتا رہے اور بعد میں نادم ہوجائے اورتو بہ کرلے، اسے اپنے گذشتہ اعمال کی نیک اعمال سے تلافی کرنی پڑے گی اگر حقوق اللہ میں سے ہو، اوراگر حق الناس میں سے ہوتو تمام حقوق ادا کرنے ہوں گے بنابرایں تو بہ صرف ندامت کا نام نہیں ہے جیسا کہ تصور کیا جاتا ہے۔

بسا اوقات گناہ گارلوگ اپنی اصلاح اور تلافی میں کامیاب نہیں ہوتے جب کہ ان کا پورا وجود ندامت اور پشیمانی میں گھرا ہوتا ہے اب اگر وہ شفاعت پر امید نہ رکھیں تو خدا کی بخشش سے مایوسی کا شکار ہوجائیں گے اور یہی مایوسی انہیں گناہوں میں زیادہ غرق کردے گی۔

ثانیاً ممکن ہے کوئی شخص کسی گناہ میں آلودہ ہوا اور ابھی توبہ اور ندامت کی توفیق اُسے حاصل نہ ہوئی ہو اگر وہ محسوس کرلے کہ قیامت کے دن شافعین اسے اس شرط پر نجات دلا سکتے ہیں کہ وہ آئندہ گناہوں گناہوں کوترک کردے یا نیک اور مثبت کام انجام دے تو یہی احساس اسے گناہوں کے ترک اور نیکیوں کے انجام کی ترغیب دے سکتا ہے۔

ج۔کیا شفاعت عدل الٰہی سے ہم آہنگ ہے؟

یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ کچھ گنہگار ایک جیسے ہوں، ان میں سے بعض شفاعت کی وجہ سے الٰہی سزاؤں سے نجات پالیں اور بعض سزاؤں میں مبتلا ہوجائیں؟ کیا یہ تبعیض خدا کی عدالت کے خلاف نہیں ہے؟

کبھی یہ مطلب ایک اور طرح سے بیان کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اگر گناہگاروں کے لئے الٰہی سزائیں عین عدالت ہیں تو اولیاء اللہ سے شفاعت کی درخواست، عدالت کے اجراء کو روکنے کی درخواست ہے اور اگر یہ سزائیں عدالت کے اصول کے مطابق نہیں ہیں تو آغاز ہی سے اس طرح کی سزائیں نہیں ہونی چاہیں۔

جواب:

گذشتہ ابحاث سے اس سوال کا جواب بھی واضح ہوجاتا ہے کیونکہ اولا شفاعت مناسب ماحول کے بغیر انجام نہیں پاتی، جو بھی شفاعت کے لائق ہوتا ہے وہ اس میں شامل ہوسکتا ہے اور جو لیاقت نہیں رکھتا شفاعت اُسے میسر نہیں آتی، اس بناء پر کسی طرح کی تبعیض یہاں نہیں ہے، ثانیاً گناہگار کی سزا عین عدالت ہے لیکن شفاعت کا قبول کیا جانا ایک طرح کا تفضّل ہے، ایسا فضل جو ایک طرف سے شفاعت پانے والے

میں موجود مناسب قابلیت کی وجہ سے ہےاور دوسری طرف شفاعت کرنے والے کی عزت، احترام اوراس کے اعمال صالحہ کی وجہ سے ہے۔

د۔کیا شفاعت خدا کی خواہش سے تضاد نہیں رکھتی؟

کبھی یہ تصور کیا جاتا ہے کہ شفاعت کرنے والا حقیقت میں عادل حاکم کے ارادے کو روکتا ہے اور وہ جسے سزا دینے کا ارادہ کرتا ہے اسے سزا سے نجات دلاتا ہے اور یہ چیز خدا کے بارے میں قابل قبول نہیں ہوسکتی، لیکن اس غلط فہمی کا سرچشمہ بھی یہی ہے کہ قرآن میں زیر بحث شفاعت اور جبار اور ستم گر حاکموں کے ہاں ہونے والی شفاعت کو یکساں سمجھا گیا ہے، وہاں پر بااثر لوگ کوشش کرتے ہیں کہ جن مجرموں سے ان کے تعلقات ہوتے ہیں انہیں قانون کے برخلاف سزاؤں سے بچائیں، بادشاہ، سلطان اور امیر کو بھی چونکہ ان بااثر افراد کی ضرورت ہوتی ہے لہٰذا ان کی سفارش ماننے پر مجبور ہوجاتا ہے اور کبھی اپنی خواہش کے برخلاف ان گنہگاروں کی سزائیں معاف کردیتا ہے۔

لیکن خدا کے بارے میں یہ مسائل اور اس کی بارگاہ میں ایسی شفاعت صحیح نہیں ہے (جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے)، یہاں پر شفاعت کی صورت بدل جاتی ہے، اولیا اللہ خدا کی اجازت سے ایسے افراد کی شفاعت کرتے ہیں جن کے گناہ زیادہ بھاری نہیں ہوتے اور ان گناہوں کے مقابلے میں اچھے اور نیک اعمال کے بھی مالک ہوتے ہیں، یہ درحقیقت نفوس کی تربیت اور روح کی طہارت کے لئے بنایا گیا پروگرام ہے۔

ھ۔سزائیں اعمال کا تکوینی اثر ہیں تو پھر شفاعت سے ختم کیسے ہوسکتی ہیں؟

یہ ایک اور اعتراض ہے جو اس بحث میں کیا جاسکتا ہے کہ شفاعت صرف قراردادی اور تشریعی سزاؤں میں کام آسکتی ہے اور شفاعت کرنے والا شفاعت پانے والے پر اجراء ہونے والے حکم کے روک دیئے جانے کا باعث بنتا ہے لیکن جب ہم مان لیں کہ قیامت کی سزائیں زیادہ تر اعمال کا وضعی اور طبعی اثر ہیں جیسا کہ انسان کے قتل میں زہر کا اثر ہوتا ہے، یہ اثر ایسی چیز نہیں ہے جو شفاعت سے قابل تغیر ہو۔

جواب:

جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں شفاعت کی دو قسمیں ہیں، تکوینی اور تشریعی، اس سے مندرجہ بالا سوال کا جواب بھی واضح ہوجاتا ہے کیونکہ اگر سزائیں تکوینی پہلو رکھتی ہوں تو اولیا اللہ ایک طاقت ور اور برتر وجود کی حیثیت سے "شفاعت پانے والے" کے ہمراہ ہوجاتے ہیں اور اُن کی ناقص استعدادات کو اپنی روحانی امداد کے ذریعے کمال تک پہنچاتے ہیں اور اس کے نتیجے میں گناہ کے تکوینی آثار پر ان کا غلبہ ہوجاتا ہے بالکل اسی طرح جیسے سورج قابل پودوں کی پرورش کرتا ہے اور مختلف آفتوں سے ان کی حفاظت کرتا ہے، اگر یہ چیز قراردادی ہو تو شفاعت کی قابلیت رکھنے والے افراد کے لئے خدا کے حضور شفاعت کی درخواست کے ساتھ ان کی مغفرت اور بخشش کا سوال کرتے ہیں اور دونوں صورتوں میں ان کے روحانی مقامات خدا کے فرمان سے ان شفاعتوں کے موثر ہونے کا باعث بنتے ہیں۔

یہی گفتگو تجسم اعمال کے مسئلے میں بھی کی جاسکتی ہے کیونکہ وہ بھی عمل کے وضعی اور تکوینی آثار سے مشابہت رکھتا ہے۔(غور کیجئے گا)

و۔کیا شفاعت پر اعتقاد پس ماندگی کا عامل نہیں؟

کچھ لوگ اس تو ہم کا شکار ہیں کہ شفاعت کا عقیدہ باعث بنتا ہے کہ افراد اپنے عمل کا سہارا نہ لیں اور اپنی لیاقت اور استعداد کو ظہور کے مرحلے تک نہ پہنچائیں۔

جواب:

یہ عبارت ہمیں بتاتی ہے کہ ایسے اعتراضات کرنے والے کی فکر وہی ہے جو دنیوی سفارش اور اس کے مفہوم کے بارے میں عام افراد رکھتے ہیں جب کہ ہم اس بحث کے آغاز میں یہ بات دلائل کے ساتھ کہہ چکے ہیں کہ اسلامی اور قرآنی شفاعت کا مفہوم نہ صرف یہ کہ پس ماندگی کا عامل نہیں بلکہ گناہوں کے ترک، اصلاح، ماضی کی تلافی، آئندہ کی امید اور نیکیوں اور پاکیوں کی طرف حرکت کی موثر دعوت بھی ہے چونکہ پہلے یہ موضوع تفصیل سے بیان ہو چکا ہے لہٰذا اب ہم تکرار کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

ز۔کیا توحید شفاعت سے تضاد رکھتی ہے؟

توحید کا شفاعت سے تضاد کا نظریہ معروف اعتراضات میں سے ایک ہے اور وہابیوں نے اس بارے میں بہت پروپگنڈے کئے ہیں، لہٰذا اس مسئلہ پر دقیق طور پر توجہ دینی چاہیے۔

وہابیوں کے عقائد چند محوروں کے گرد گھومتے ہیں جن میں سب سے زیادہ واضح توحید افعالی اور توحید عبادت کا مسئلہ ہے، وہ توحید کی ان شاخوں کی ایسی تفسیر کرتے ہیں جو مسئلہ شفاعت، توسل، انبیاء و اولیاء کی ارواح سے استمداد اور خدا کے حضور اُن کی شفاعت سے تضاد رکھتی ہے، اسی لئے وہ ان تمام اسلامی فرقوں کو جو ان پر اعتقاد رکھتے ہیں مشرک قرار دیتے ہیں اور اگر آپ کو تعجب نہ ہوتا ہو تو یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ ان کے جان و مال اور ناموس کو عرب جاہلیت کے مشرکوں کی طرح مباح سمجھتے ہیں۔

اسی عقیدے کی وجہ سے انہوں نے عراق اور حجاز کے بہت سے مسلمانوں کا خون بہایا اور ان کے اموال لوٹ لئے اور ایسے مظالم کئے جن کی اسلامی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔

محمد ابن عبدالوہاب نے جو اس فرقے کا بانی ہے(متوفی ۱۲۰۶)ایک کتاب میں جو''رسالہ اربع قواعد'' کے نام سے مشہور ہے، اس بارے میں کچھ باتیں کی ہیں جن کا خلاصہ یوں ہے:

شرک سے نجات ''چار قاعدوں'' کی شناخت ہی سے ممکن ہے:

(ا) پیغمبر اکرمؐ نے جن مشرکوں سے جنگ لڑی وہ سب یہ مانتے تھے کہ خدا جہان ہستی کا خالق، رازق اور تدبیر کرنے والا ہے جیسا کہ

قرآن نے سورہ یونس کی آیت ۳۱ میں فرمایا ہے:

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ. فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ. فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ

کہو: کون تمہیں آسمان اور زمین سے روزی دیتا ہے اور یا کون کان اور آنکھوں کا مالک (اور خالق) ہے، کون زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور کون مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے اور کون ہے جو (دنیا کے) امور کی تدبیر کرتا ہے؟ بہت جلد (تمہارے جواب میں وہ) کہیں گے: اللہ۔ کہو: پس کیوں تقویٰ اختیار نہیں کرتے ہو (اور خدا سے نہیں ڈرتے ہو)؟

اس طرح سے وہ توحید رزاقیت، توحید خالقیت، توحید مالکیت اور توحید تدبر کے معتقد تھے۔

(۲)۔ مشرک کہتے تھے کہ بتوں کی طرف ہماری توجہ اس لئے ہے اور اُن کی عبادت ہم اس لئے کرتے ہیں کہ ہم چاہتے ہیں وہ خدا کے حضور ہماری شفاعت کریں اور ہمیں مقرب بنائیں:

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ

وہ لوگ خدا کے علاوہ ایسے موجودات کی پرستش کرتے ہیں جو نہ انہیں نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ ہی فائدہ دے سکتے ہیں، اور وہ کہتے ہیں کہ یہ خدا کے حضور ہمارے شفیع ہیں۔ (یونس؛ ۱۸)

(۳)۔ پیغمبر اکرمؐ نے ان تمام افراد سے جنگ لڑی جو غیر خدا کی عبادت کرتے تھے چاہے وہ درختوں، پتھروں، سورج اور چاند کی عبادت کرتے رہے ہوں یا فرشتوں، انبیا اور صالحین کی عبادت کرتے رہے ہوں، اور ان کے مابین پیغمبر اکرمؐ نے کوئی فرق روا نہیں رکھا۔

(۴)۔ ہمارے زمانے کے مشرکین (مراد وہابیوں کے علاوہ تمام اسلامی فرقے ہیں) عصر جاہلیت کے مشرکوں سے بدتر ہیں کیونکہ وہ اطمینان اور سکون کے موقع پر بتوں کی عبادت کرتے تھے لیکن سختیوں اور مصیبت کے موقع پر صرف خدا کی پرستش کرتے تھے، جیسا کہ عنکبوت کی آیت ۶۵ میں ہے:

فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۚ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُمْ يُشْرِكُونَ ٦٥ ﴿العنکبوت: ٦٥﴾

جب وہ کشتی پر سوار ہوتے تھے تو خدا کو خلوص سے یاد کرتے تھے (اور غیر خدا کو بھول جاتے تھے) لیکن جب خدا نہیں خشکی تک پہنچا دیتا اور نجات بخش دیتا تو وہ دوبارہ مشرک ہوجاتے تھے۔[1]

عجیب بات یہ ہے کہ وہ ان باتوں پر جو سفسطہ کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں اتنے پابند ہیں کہ بہت آسانی سے اپنے مخالفوں کی جان و مال کو مباح قرار دیتے ہیں اور ان کے قتل کو جائز قرار دیتے ہیں جیسا کہ اس گمراہ ٹولے کے ایک سربراہ شیخ سلیمان نے اپنی کتاب الھدیۃ السنیۃ میں لکھا ہے کہ کتاب وسنت اس مطلب کی گواہی دیتے ہیں کہ جو بھی فرشتوں اور انبیاء یا (مثلاً) ابن عباس اور ابو طالب اور ان کی طرح دوسرے افراد کو اپنے اور خدا کے مابین واسطہ قرار دیتے ہیں تا کہ خدا سے اپنی منزلت کی بناء پر وہ ان کی شفاعت کریں جیسے سلاطین کے مقربین ان کے ہاں سفارش کرتے ہیں، ایسے افراد مشرک اور کافر ہیں اور ان کا خون اور ان کا مال مباح ہے اگر چہ شہادتین کہیں، نماز پڑھیں اور روزہ رکھیں۔[2]

انہوں نے مختلف تاریخی حوادث میں اس شرم آور اور پست حکم یعنی مسلمانوں کے خون اور مال کو مباح جاننے پر پابند ہونے کو ثابت کر دیا ہے مثلاً حجاز میں طائف کے لوگوں کا (صفر سال ۱۳۴۳) مشہور قتل عام، عراق میں کربلا کے لوگوں کا (۱۸ ذی الحجہ ۱۲۱۶) کے دن مشہور قتل عام جو بہت سی تاریخی کتابوں میں مذکور ہے۔

اس استدلال کے انحرافی نقاط:

(۱)۔ اس بحث کے آغاز میں مذکورہ شفاعت کی ۱۲ آیات کی تفسیر کے بعد یہ حقیقت بخوبی واضح ہوگئی ہے کہ شفاعت قرآن اور اسلام کا ایک مسلمہ اصول ہے البتہ شفاعت کرنے والے اور شفاعت پانے والے کے لئے کچھ شرطیں بیان کی گئی ہیں، لہٰذا یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی قرآن اور اسلام کی پیروی کا دعوی تو کرے لیکن اس اصول کا اتنے واضح دلائل کے باوجود انکار کرے، ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ یہ لوگ کیسے اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے ہیں جب کہ اس اصول کا انکار کرتے ہیں جو اسلام اور قرآن کی ضروریات میں سے ہے، کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی مسلمان اسلام کی ضروریات اور قرآن کے حقائق کا انکار کرے؟

(۲)۔ جس شفاعت کا قرآن ذکر کرتا ہے اور اس کا دفاع کرتا ہے ایسی شفاعت ہے جس کی اصلی راہ کی برگشت ''اذن خدا'' کی طرف ہوتی ہے اور جب تک وہ شفاعت کی اجازت نہ دے کوئی بھی شفاعت کا حق نہیں رکھتا، دوسری عبارت میں یہ ایسی شفاعت ہے جو اوپر کی جانب سے اور پروردگار کی اجازت سے ہے نہ کہ ایسی شفاعت جیسی سلاطین جور کے درباروالوں کی ہوتی ہے جو نیچے سے ہوتی ہے

---

[1] رسالہ ''اربع قواعد'' (تصنیف محمد بن عبدالوہابیت) صفحہ ۲۴ تا ۲۷ (کشف الارتیات صفحہ ۱۶۳ کے مطابق)۔

[2] الہدیۃ السنیۃ صفحہ ٦٦۔

اورجس کی اساس ذاتی تعلقات ہیں۔

اسطرح کی شفاعت توحید پرتاکید ہے کیونکہ اس کا اصل راستہ خدا کی جانب سے لیا جاتا ہے، ایسی توحید جو ہرطرح کے شرک سے پاک ہے لیکن وہابی جنھوں نے قرآنی شفاعت کو شیطانی اور سلاطین کے دربار کی سفارش سے خلط کیا ہے، اس کا انکار کرتے ہیں اور اسے توحید کے متضاد سمجھتے ہیں اورحقیقت میں انہوں نے اس مسئلے میں اپنے طرز تفکر پر ہی اعتراض کیا ہے نہ کہ شفاعت قرآنی پر۔

(۳)۔ شفاعت درحقیقت ایک طرح کا سبب نجات ہے جس طرح عالم آفرینش اورتکوین میں اسباب کے وجود پر اعتقاد اصول توحید کے منافی نہیں (مثلاً پودوں کی پرورش میں سورج کی تابش اور بارش کا اثر) کیونکہ ان اسباب کی تمام تاثیر خدا کے فرمان اوراجازت سے ہے اور دراصل ان کا یہ کام ایک طرح کی تکوینی شفاعت ہے، اسی طرح عالم تشریع میں اور شریعت میں بھی ایسے اسباب کا اُن کی مغفرت، بخشش اورنجات کے لئے موجود ہونا خدا کی اجازت سے ہے اور نہ صرف یہ کہ توحید کے منافی نہیں بلکہ اس کی تاکید بھی ہے اور یہی وہ چیز ہے جسے ہم شفاعت تشریعی کا نام دیتے ہیں۔

(۴)۔ قرآن بتوں کے بارے میں جس شفاعت کی نفی کرتا ہے وہ ایک طرف تو اس لئے ہے کہ بت پرست ایسے موجودات کو خدا کی بارگاہ میں شفیع قرار دیتے تھے جو ہر جہت سے بے خاصیت تھے لہٰذا سورہ یونس کی آیت ۱۸ کے آغاز میں جوخصوصاً وہابیوں کے لئے مورد استناد قرار پائی ہے خدا صراحت کے ساتھ فرماتا ہے:

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَاۗءِ شُفَعَاۗؤُنَا عِنْدَ اللهِ

وہ خدا کے علاوہ ایسے معبودوں کی پرستش کرتے ہیں جو نقصان پہنچا سکتے ہیں اور نہ فائدہ اور کہتے ہیں کہ خدا کے حضور یہ ہمارے شفیع ہیں۔

مسلماً یہ چیز شفاعت انبیاء اوراولیاء سے کوئی ربط نہیں رکھتی، یہ ان بتوں سے مخصوص ہے جو پتھروں اور بے شعور و بے عقل دھات کے بنے ہوتے ہیں۔

دوسری طرف قرآن ایسی شفاعت کی مذمت کرتا ہے جو اس اعتقاد کی بناء پر ہو کہ شفاعت کرنے والا ذاتاً مستقل شفیع ہے اور انسانوں کی سرنوشت میں اس کی تاثیر خدا کی اجازت کے بغیر ہے، لہٰذا سورہ زمر کی آیت ۳ میں جو ان کے لئے خصوصا مورد استناد قرار پائی ہے، بیان ہوتا ہے:

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَاۗءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللهِ زُلْفٰى ۭ اِنَّ اللهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ

جولوگ غیر خدا کو اپنے اولیاء قرار دیتے تھے اور کہتے تھے ان کی ہم عبادت نہیں کرتے مگر اس لئے کہ ہمیں خدا کے قریب کر دیں، خدا قیامت کے دن جس چیز میں وہ اختلاف کرتے تھے اس میں ان کے مابین فیصلہ کرے گا۔

اس آیت کے مطابق وہ اپنے معبودوں کو اپنا ولی، سرپرست، حامی اور حافظ سمجھتے اوران کی پرستش کرتے تھے اور اُن کے یہ دونوں کام غلط تھے (انہیں اپنا ولی ماننا اوران کی عبادت کرنا)۔

لیکن اگر کوئی انبیاء اور اولیاء اللہ اور فرشتوں کی ہرگز پرستش نہ کرے بلکہ انہیں عزیز اور قابل قدر اور خدا کی بارگاہ میں اُسی کی اجازت سے شفیع سمجھے تو پھر وہ ان آیتوں کا مصداق نہیں ہوسکتا۔

شفاعت، مسئلہ کفر وایمان اور شفاعت کرنے والوں اور شفاعت پانے والوں کے لئے خدا کی طرف سے ذکر شدہ شرائط کے بارے میں آیات قرآنی پر عدم احاطہ کی وجہ سے وہابیوں نے اس مسئلے اور بت پرستوں کے بتوں پر جو اعتقادات تھے اس میں خلط کیا ہے اور اس طرح سے۔

چوں ندید ند حقیقت رہ افسانہ زوند

جب حقیقت کی راہ انہیں سجھائی نہ دی تو افسانوں کا راستہ اختیار کرلیا۔

(۵)۔ وہابیوں نے جو یہ کہا ہے کہ جاہلیت کے بت پرست عرب خالقیت، مالکیت، رازقیت اور تمام چیزوں کو خدا کے لئے مخصوص قرار دیتے تھے اوران کی گمراہی صرف بتوں کو واسطہ اور شفیع قرار دینے میں تھی، ان کی ایک اور غلطی ہے جس کا سرچشمہ ان کی علمی بے بضاعتی اور آیات قرآنی پر ان کا عدم احاطہ ہے کیونکہ متعدد آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان میں سے بعض صفات کی بتوں سے نسبت دیتے تھے، مثلاً سورہ عنکبوت کی آیت ۶۵ میں ہے:

فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُمْ يُشْرِكُونَ

جب وہ کشتی پر سوار ہوجاتے ہیں تو خدا کو خلوص سے بلاتے ہیں (اور مشکلات کا حل صرف اسی سے مانگتے ہیں) لیکن جب وہ انہیں نجات دیتا ہے اور خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو مشرک ہو جاتے ہیں (یعنی اپنی مشکلات کا حل دوسروں سے چاہتے ہیں)۔

یہ عبارت بخوبی بتاتی ہے کہ وہ عام حالات میں اپنے بتوں کے پاس ہی اپنی مشکلات کے حل کے لئے جاتے تھے اگرچہ سختیوں اور مصیبتوں میں خدا کے لطف کا دامن پکڑتے تھے۔

سورہ فاطر کی آیت ۴۰ میں پیغمبر خداؐ کو حکم دیا گیا ہے:

قُلۡ اَرَءَیۡتُمۡ شُرَكَآءَكُمُ الَّذِیۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ‌ؕ اَرُوۡنِیۡ مَاذَا خَلَقُوۡا مِنَ الۡاَرۡضِ اَمۡ لَهُمۡ شِرۡكٌ فِی السَّمٰوٰتِ

کہو: مجھے بتاؤ جن لوگوں کی تم خدا کے سوا عبادت کرتے تھے اور انہیں خدا کے برابر سمجھتے تھے انہوں نے زمین سے کون سے چیزیں پیدا کیں یا کیا وہ آسمانوں کی آفرینش میں شریک ہیں؟

اگر مشرکین خالق صرف خدا کو سمجھتے اور بتوں کو شفیع کی حیثیت سے دیکھتے تو یہ سوال کوئی معنی نہیں رکھتا کیونکہ انہوں نے جواب میں کہنا تھا کہ ہم انہیں خالق نہیں سمجھتے اور خدا اور مخلوق کے مابین صرف ایک واسطہ سمجھتے ہیں، کیا واسطہ خالق یا خلقت میں شریک ہوسکتا ہے؟

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان بتوں کو خلقت میں ایک طرح کا شریک سمجھتے تھے اور پیغمبر اکرمؐ کو امر کیا جاتا ہے کہ ان کے کذب کو برملا کرنے کے لئے ان سے سوال کریں کہ انہوں نے کون سی چیز خلق کی ہے، سورہ بنی اسرائیل آیت ۱۱۱ ہمیں بتاتی ہے کہ وہ بتوں کو عالم کی حاکمیت اور مالکیت میں خدا کا ہمتا سمجھتے تھے بلکہ ان کا عقیدہ تھا کہ بت مشکلات میں خدا کی مدد کرتے ہیں:

وَقُلِ الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِیۡ لَمۡ یَتَّخِذۡ وَلَدًا وَّلَمۡ یَكُنۡ لَّهٗ شَرِیۡكٌ فِی الۡمُلۡكِ وَلَمۡ یَكُنۡ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرۡهُ تَكۡبِیۡرًا۱۱۱ ﴿الإسراء: ۱۱۱﴾

اور کہو: حمد اس خدا کے لئے ہے جس نے نہ اپنے لئے فرزند انتخاب کیا ہے اور نہ ہی اس کی حکومت میں کوئی اس کا شریک ہے اور نہ ضعف وذلت کے وقت کوئی اس کا حامی ہے اور تم اسے بہت عظیم اور بڑا جانو۔

ان جملوں میں سے ہر ایک بتوں کے ایک عقیدے کی نفی کے لئے ہے، وہ ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں سمجھتے تھے (یہ توجہ رکھئے کہ ولد بیٹے اور بیٹی دونوں کو کہا جاتا ہے [1]) اور انہیں خلقت میں شریک اور خدا کا مددگار سمجھتے تھے۔

واضح ہے کہ اگر اس طرح کے عقیدے کا اس ماحول میں وجود نہ ہوتا تو قرآن کی اس طرح کی عبارتوں کا مفہوم بھی نا ہوتا۔

یہ بات قابل غور ہے کہ قرآن نے ہر جگہ بت پرستوں کو مشرکین کے عنوان سے اور ان کے عمل کو شرک کے طور پر بیان کیا ہے اگر وہ لوگ بتوں اور خدا کے مابین کسی طرح کی شرکت کے قائل نہ ہوتے اور بتوں کو صرف بارگاہ الٰہی میں شفیع سمجھتے تو یہ عبارت درست نہ ہوتی کیونکہ شرک اور مشرک کا مفہوم یہی ہے کہ وہ لوگ بتوں کو ربوبیت، خلقت، مشکلات کے حل اور دوسری چیزوں میں خدا کا شریک سمجھتے تھے (البتہ ان کی نگاہ میں پتھر اور لکڑی کے یہ بت صالحین اور فرشتوں کا نمونہ اور مظہر تھے)۔

دوسری عبارت میں وہ عالم کے امور کی تدبیر میں بتوں کے ایک طرح کے استقلال کے قائل تھے اور اصطلاحاً انہیں خدا کا ہمسر سمجھتے

---

[1] ''ولد'' ''مولود'' کے معنی میں ہے جس کا چھوٹے بڑے، لڑکی لڑکے اور مفرد وجمع پر اطلاق ہوتا ہے۔ (مفردات راغب)۔

تھے، ایسا نہیں کہ وہ انہیں اس کی بارگاہ کے لئے فقط واسطہ سمجھتے ہوں، خصوصاً قرآن کی مختلف آیات میں متعدد تعبیرات آئی ہیں جو اس مطلب کو مکمل طور پر واضح کرتی ہیں، مثلاً سورہ عنکبوت کی آیت ۲۲ میں ہے:

وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۲۲

تمہارا خدا کے علاوہ کوئی ولی اور مددگار نہیں ہے۔

یہ بت پرستوں کے عقیدے کی طرف اشارہ ہے جو بتوں کو (خدا کے علاوہ) اپنا ولی اور یاور سمجھتے تھے جیسا کہ جاثیہ کی آیت ۱۰ میں فرمایا گیا ہے:

وَلَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ مَّا كَسَبُوْا شَيْئًا وَّلَا مَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ

جو چیزیں مشرکین حاصل کر چکے ہیں وہ انہیں عذاب الٰہی سے ہرگز نجات نہیں بخش سکتیں اور نہ ہی وہ اولیاء جنہیں خدا کو چھوڑ کر انہوں نے اپنے لئے منتخب کیا ہے۔ (توجہ کیجئے گا)

''من دون اللہ'' کی عبارت جو مشرکوں کے بارے میں قرآن میں مکرر آئی ہے بتاتی ہے کہ وہ خدا کے علاوہ کچھ اور موجودات کو مورد توجہ قرار دیتے تھے تاکہ وہ ان کے ولی، ناصر اور حامی بنیں اور یہ شرک در ربوبیت ہے نہ کہ شفاعت کا مسئلہ۔

مختصر یہ کہ قرآن نے متعدد آیات میں دو بڑے اعتراضات مشرکین پر کئے ہیں، پہلا یہ کہ وہ بے شعور اور آنکھ اور کان سے محروم موجودات کو مبداء اثر سمجھتے تھے اور دوسرا یہ کہ تدبیر الٰہی کے ساتھ ساتھ ان کے لئے بھی ایک قسم کی ربوبیت کے قائل تھے۔

البتہ عصر جاہلیت کے بت پرست ضد و نقیض باتیں بھی کرتے تھے، ایسا نہ تھا کہ ایک باخبر اور منطقی انسان کی طرح بغیر تناقض کے اپنی باتیں بیان کریں، لہٰذا عین اس وقت جب بتوں کو مشکلات کے حل میں خدا کا شریک سمجھتے تھے اور انہیں ''من دون اللہ'' اور جدا طور پر اپنا ولی اور حامی قرار دیتے تھے کبھی خدا کے حضور شفاعت کا مسئلہ بھی اٹھاتے تھے اور یہ افعال میں شرک پر عدم اعتقاد کی ہرگز دلیل نہ تھی۔

یہ ایسی چیز ہے جو آیات اور ان کے مجموعی حالات کے مطالعے کے بعد معلوم ہوتی ہے اور عجیب ہے کہ وہ شفاعت کو ہرگز خدا کی اجازت پر متوقف نہیں سمجھتے تھے۔

بنابرایں ہم بخوبی یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ اگر انسان صرف اولیاء اللہ کا سہارا لے (نہ کہ پتھر اور لکڑی کے بتوں کا) اور صرف انہیں خدا کے حضور شفیع سمجھے (نہ کہ تدبیر و ولایت اور حمایت میں شریک) اور ان کی شفاعت کو بھی خدا کی اجازت پر موقوف سمجھے (نہ کہ اس سے مستقل) تو اس صورت میں اس پر کوئی اعتراض صحیح نہیں ہے۔

اعتراض اس وقت کیا جا سکتا ہے جب انسان ان تین اصولوں کو یا ان میں سے کسی ایک کو نظر انداز کر کے غلط راستہ اپنائے۔

اعراج کہاں ہے

اور

اعرافی کون ہیں؟

اشارہ:

قرآن مجید میں ایک سورہ اعراف کے نام سے ہے جس کی چار آیتیں ''اعراف'' کے مسئلے سے متعلق ہیں، ان آیتوں سے اجمالی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ بہشت و دوزخ کے درمیان ایک جگہ کا نام اعراف ہے اور الٰہی انسانوں میں سے کچھ لوگ جو بہشتوں اور دوزخیوں کو خوب پہچانتے ہیں وہاں رہتے ہیں۔

لیکن ان الٰہی انسانوں کو ذمہ داریاں کیا ہیں اور ان کا مقصد کیا ہے اور اصولا میدان قیامت میں اعراف کی حیثیت کیا ہے اور ان الٰہی انسانوں کے علاوہ جو اعراف میں ایک خاص ذمہ داری کے حامل ہیں، ضعیف مومنین اور دوسرے افراد میں سے کوئی اور بھی وہاں پر ہے یا نہیں؟

یہ ایسے مسائل ہیں جو سورہ اعراف کی چار آیات اور ان کی تشریح میں اہم اسلامی منابع میں وارد شدہ روایات کے سائے میں واضح ہوں گے، اس اشارے کے ساتھ ہم قرآن کا رخ کرتے ہیں اور ان آیات پر غور کرتے ہیں:

۱۔ وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَعَلَى الْأَعْرَافِ رِجَالٌ يَعْرِفُونَ كُلًّا بِسِيمَاهُمْ ۚ وَنَادَوْا أَصْحَابَ الْجَنَّةِ أَنْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ ۚ لَمْ يَدْخُلُوهَا وَهُمْ يَطْمَعُونَ ۴۶

۲ الأعراف: ۴۶

۲۔ وَإِذَا صُرِفَتْ أَبْصَارُهُمْ تِلْقَاءَ أَصْحَابِ النَّارِ ۚ قَالُوا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ

۳۔ وَنَادَىٰ أَصْحَابُ الْأَعْرَافِ رِجَالًا يَعْرِفُونَهُمْ بِسِيمَاهُمْ قَالُوا مَا أَغْنَىٰ عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ ۴۸

۴۔ اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ ۭ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ۴۹

ترجمہ:

۱۔ ان دونوں (جہنم اور جنت) کے درمیان ایک حجاب ہے اور اعراف پر کچھ مرد ہیں جو دونوں میں سے ہر ایک کو چہروں سے پہچانتے ہیں اور بہشتیوں کو آواز دیتے ہیں کہ تم پر سلام ہو، لیکن بہشت میں داخل نہیں ہوتے جب کہ اس کی امید رکھتے ہیں۔

۲۔ جب اُن کی نظریں دوزخیوں پر پڑتی ہیں تو کہتے ہیں: پروردگار! ہمیں ستم گروں کی جماعت کے ساتھ قرار نہ دے۔

۳۔ اور اصحاب اعراف (جہنم کے کچھ) مردوں کو جنہیں چہروں سے پہچانتے ہیں اور آواز دیں گے اور کہیں گے کہ تم نے دیکھا کہ تمہاری (مال و دولت اور بیوی بچوں کی) جمع آوری اور تمہارا تکبر تمہیں کوئی فائدہ نہ دے سکے؟

۴۔ کیا یہ وہی نہیں ہیں جن کے بارے میں تم لوگوں نے قسم کھائی تھی کہ خدا کی رحمت ہرگز ان کے شامل حال نہیں ہوگی؟ (لیکن ایمان اور بعض اعمال خیر کی وجہ سے خدا نے انہیں بھی اپنی رحمت سے نوازا اور اب ان سے کہا جائے گا کہ) بہشت میں داخل ہو جاؤ ایسی حالت میں کہ تمہیں کوئی خوف ہوگا نہ تم غمگین ہو گے۔

تفسیر:

دوزخ اور بہشت کے درمیان ایک جگہ:

پہلی آیت میں اس سے قبل والی آیتوں کی طرف اشارہ اور بہشت و دوزخ اور بہشتیوں اور دوزخیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اور ان دونوں (اہل بہشت اور اہل دوزخ) کے درمیان ایک حجاب ہے" و بینھما حجاب " یہ حجاب ان دونوں کے ایک دوسرے تک پہنچنے میں مانع ہے لیکن ایک دوسرے کی آوازیں سننے سے مانع نہیں ہے، کیونکہ اس سے پہلے کی آیتوں میں بہشتیوں اور دوزخیوں کے آپس میں گفتگو کا ذکر ہے کہ بہشتی دوزخیوں کو آواز دیں گے اور کہیں گے ہم نے وہ سب حق پایا جس کا وعدہ پروردگار نے ہم سے کیا تھا، کیا تم نے بھی اپنے پروردگار کا وعدہ حق پایا ہے؟ جواب دیں گے کہ "ہاں"۔ یہ مقام تعجب نہیں کیونکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ دو ہمسائے دیوار کے پیچھے سے ایک دوسرے سے باتیں کر لیتے ہیں اور ایک دوسرے کا حال پوچھتے ہیں جب کہ ایک دوسرے کو نہیں دیکھ پاتے یا ایک دوسرے تک نہیں پہنچ سکتے، اس سے ملتا جلتا مفہوم سورہ حدید میں آیا ہے کہ قیامت میں جب منافقین مومنین سے کہیں گے کہ ہمیں مہلت دو (یا ہماری طرف دیکھو) تاکہ ہم تمہارے نور سے بہرہ مند ہوں تو وہ جواب دیں گے کہ پیچھے لوٹ جاؤ (عالم دنیا کی طرف) اور وہاں نور کسب کرو، اس وقت ان کے درمیان ایک دیوار بنائی جائے گی جس کا ایک دروازہ ہوگا جس کے اندر کی طرف رحمت ہوگی اور باہر کی طرف عذاب منافقین آواز دیں گے کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟ مومنین کہیں گے "ہاں" لیکن تم لوگوں نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا۔"

فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ؕ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ﴿۱۳﴾ يُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ (حدید ۱۳ و ۱۴)

کیا یہ بلند دیوار (اور قرآنی تعبیر میں سور) وہی اعراف ہے یا کوئی اور چیز؟ اس کا جواب ہم بعد میں پائیں گے۔

بہرحال اس کے بعد فرمایا گیا ہے: اعراف پر ایسے مرد ہیں جو ہر ایک بہشتی اور دوزخی کو (اپنی ہی جگہ سے دیکھتے ہیں اور انہیں) ان کے چہروں سے پہچانتے ہیں ''وعلی الاعراف رجال یعرفون کلا بسیماھم''۔

چونکہ اعراف کا لغوی معنی بلند جگہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ با حیثیت ہوں گے جو اس بلندی سے دونوں گروہوں پر ناظر ہوں گے اور چہروں سے انہیں پہچانیں گے۔

یہ شناسائی کس لئے ہے؟

ان زیر بحث آیات میں موجود قرینوں سے جن کے بارے میں زیادہ وضاحت آئندہ آئے گی اور اسی طرح اسلامی منابع میں اعراف کے متعلق وارد شدہ بہت سی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اعراف میں دو جماعتیں ہوں گی، ایک جماعت الٰہی انسانوں کی بزرگ شخصیات اور خدا کی درگاہ کے مقربین کی اور دوسری جماعت مستضعفین کی اور ان لوگوں کی جنہوں نے صالح اور غیر صالح اعمال کو آپس میں ملا دیا ہے، بعض کی نیکیاں ان کی بدیوں پر حاوی ہیں اور بعض کی برائیاں ان کی نیکیوں پر حاوی، درحقیقت وہ بہشت اور دوزخ کے درمیان سرگرداں ہیں۔ یہاں پر وہ الٰہی انسان ان تمام افراد کو ان کے چہروں سے پہچانیں گے جو لوگ شفاعت اور مغفرت کے قابل ہوں گے اور اولیاء اللہ کی ولایت کے گوہر سے بہرہ مند ہوں گے ان سے کہیں گے کہ بہشت میں داخل ہو جاؤ اور باقی افراد کو دوزخ کی جانب روانہ کر دیں گے۔ یہ مناسب ترین توجیہ اور تفسیر ہے جو اعراف سے متعلق تمام تر آیات اور قبل و بعد کی آیات کی وضاحت کرتی ہے اور ہمیں ہر طرح کی فضول باتوں سے نجات دیتی ہے، نیز یہ تفسیر بہت سے اقوال اور مفسرین کی تفسیروں کی مابین حلقۂ اتصال اور وجہ جمع قرار پا سکتی ہے۔

مثلاً علامہ طباطبائی مرحوم نے اعراف پر موجود افراد کے بارے میں ۱۲ اقوال نقل فرمائے ہیں (بعض نے صرف ۱۰ قول یا سات قول نقل کئے ہیں مثلاً تفسیر قرطبی اور تفسیر اثنا عشری) ان کی ترتیب یوں ہے:

۱۔ وہ ممتاز شخصیات اور بزرگان ہیں۔

۲۔ وہ ایسے لوگ ہیں جن کی نیکیاں اور بدیاں یکساں ہیں اور کوئی ایک دوسرے سے زیادہ نہیں ہے۔

۳۔ وہ اہل فترت ہیں (وہ لوگ جو دو پیغمبروں کی بعثت کے مابین قرار پائے اور ان تک حجت کافی نہ پہنچی)۔

۴۔ وہ مومن جن ہیں۔

۵۔ وہ کفار کی نابالغ اولاد ہیں۔

۶۔ وہ ناجائز بچے ہیں۔

۷۔ وہ اپنے آپ کو دوسروں سے برتر سمجھنے والے لوگ ہیں۔

۸۔ وہ فرشتے ہیں (انہیں اس لئے مرد کہا گیا ہے کہ وہ انسانوں کی شکل میں آئیں گے)۔

۹۔ وہ پیغمبر ہیں۔

۱۰۔ وہ امت کے عادل مرد ہیں جو امت کے افراد کی شہادت اور گواہی دینے کے لئے وہاں ٹھہریں گے۔

۱۱۔ وہ صالح، باخبر اور عالم افراد کی ایک جماعت ہے۔

۱۲۔ وہ علیؑ، عباسؑ، حمزہؓ اور جعفرؑ ہیں۔[۱]

اہل بیتؑ کے منابع میں منقول بہت سی روایات میں ان مردوں کی تفسیر محمد وآل محمدؐ سے کی گئی ہے اور یہ مندرجہ بالا اقوال کے علاوہ ہے۔[۲] لیکن حقیقت میں یہ تمام اقوال (۱۲ یا ۱۳) مندرجہ بالا تفسیر میں جمع ہیں اور وہ یہ تھی ہ اعراف میں دو جماعتیں ہیں، ایک جماعت پاک و نیک افراد اور اولیاء اللہ کی ہے جن میں سب سے پہلے محمدؐ وآل محمد (علیہم السلام) ہیں، ان کے بعد انبیاء و فرشتے اور صالحین، علماء اور بزرگان کی ایک جماعت ہے، پھر مستضعفین اور ان افراد کا ایک گروہ ہے جن کی زندگی میں مثبت اور منفی نقاط تھے یا وہ منفی اور مثبت نقاط سے عاری تھے (جیسے کفار کے نابالغ بچے، قاصر، جاہل اور اہل فترت)۔

جن روایات کی طرف اوپر اشارہ ہوا وہ بھی صراحت کے ساتھ اعراف میں ان دو جماعتوں کے وجود کی تائید کرتی ہیں لہٰذا پہلی آیت کے ضمن میں دوسری جماعت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا: (مستضعفون کی جماعت) بہشتیوں کو آواز دے گی کہ تم پر سلام ہو لیکن جنت میں داخل نہیں ہوگی جب کہ انہیں جنت کی امید ہوگی" ونا دوا اصحاب الجنة ان سلام علیکم لم ید خلوھا وھم یطمعون"۔

اس طرح سے آیت کے آغاز اور درمیان میں ان دو مختلف جماعتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جن کا اوپر ذکر آچکا ہے، دوسری آیت میں فرمایا گیا ہے: اور جب اُن کی نظریں دوزخیوں پر پڑیں گی تو کہیں گے: خدایا! ہمیں ستمگروں کی جماعت کے ساتھ قرار نہ دے"واذا صرفت ابصارھم تلقاء اصحٰت النار قالوا ربنا لا تجعلنا مع القوم الظلمین"۔ اس آیت میں ضمائر (ابصارھم ور قالوا میں) قبل والی آیت ے وسط کی طرح ہیں اور دوسری جماعت کی طرف برگشت کرتی ہیں، جب کہ پہلی آیت کے آغاز

---

[۱] المیزان جلد ۸ صفحہ ۱۲۶ زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[۲] علامہ مجلسی مرحوم نے یہ روایت بحار کی جلد ۸ صفحہ ۳۳۶ اور ۳۳۷ پر نقل کی ہے اور کلینی مرحوم نے اصول کافی جلد ۲ صفحہ ۴۰۸ پر نقل کی ہے۔

میں گفتگو پہلی جماعت کے بارے میں ہورہی ہے۔

ان آیات کی تفسیر میں صرف یہ خلاف ظاہر ہے جس کے ہم قائل ہیں، یعنی ہم ان ضمائر کے مرجع کو ایک دوسرے سے جدا کرتے ہیں لیکن اس خلاف ظاہر پر متعدد قرائن پہلی آیت میں ہیں اور بعد والی آیت میں بھی، کیونکہ جو رجال اعراف پر ہیں اور سب کو چہروں سے پہچانتے ہیں اور وہاں امرونہی کرتے ہیں اور دوزخیوں کی ملامت اور سرزنش کرتے ہیں، اور جو لوگ خدا کے فضل سے بہشت کی لیاقت رکھتے ہیں وہ انہیں بہشت میں بھیج دیتے ہیں، وہ ان افراد میں سے نہیں ہیں جو "لم ید خلوھا وھم یطمعون" (بہشت میں داخل نہیں ہوں گے جب کہ اس میں داخل ہونے کی طمع رکھتے ہوں گے) کے جملے میں شامل ہوں۔ (توجہ کیجئے گا)

مختصر یہ کہ ان آیتوں میں بعض ایسے الفاظ ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بلند مرتبہ افراد اعراف پر ہیں جو امرونہی کے مالک اور بہشتیوں اور دوزخیوں کی شناخت میں معرفت کے اونچے مقام پر فائز ہیں (بہشت یا دوزخ میں داخل ہونے سے پہلے بھی)، نیز ایسے الفاظ بھی ہیں جو بتاتے ہیں کہ اعراف میں پس ماندہ افراد کی ایک جماعت بھی ہے جو اپنی سرنوشت کے بارے میں سخت وحشت اور اضطراب کا شکار ہے، یہ لوگ بہشت کی طمع رکھتے ہیں اور دوزخ کا خوف، یہ تمام تر قرینے مجموعی طور پر ہمیں اعراف پر ان دو جماعتوں کے وجود کی خبر دیتے ہیں، اس تفسیر کے سائے میں ان آیتوں کی تفسیر میں موجود تمام سوالات کا جواب مل جائے گا۔ تیسری آیت میں ایک بار پھر پہلی جماعت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اصحاب اعراف کچھ (جہنمی) لوگوں کو آواز دیں گے جنہیں وہ چہروں سے پہچانتے ہوں گے اور کہیں گے جو کچھ (مال ودولت اور بیوی بچوں کے حوالے سے) تم نے جمع کیا تھا اور جن چیزوں کو تم نے دوسروں پر اپنی برتری کا ذریعہ قرار دیا تھا اس نے تمہیں بے نیاز نہیں کیا (اور تم عذاب الٰہی میں گرفتار ہوئے)۔

ونادی اصحب الاعراف رجالا یعرفونھم بسیماھم قالو ا ما اغنی عنکم جمعکم وما کنتم تستکبرون۔

اصحاب اعراف کی طرف سے کچھ جہنمیوں کی اس طرح شدید سرزنش ان کے بلند مقام کی واضح علامتیں ہیں جو وہ الٰہی فرشتوں کی طرف ملامت اور سرزنش کے ان دروں سے ان کو سزا دیتے ہیں،۔

چوتھی اور آخری آیت میں بھی یہی بلند مقام کے حامل اعراف کے ساکنین ایک طرف اعراف میں موجود ضعیف مومنین کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور دوسری طرف دوزخی مستکبرین کو مخاطب کرتے ہیں اور ملامت آمیز انداز میں ان سے کہتے ہیں: کیا یہ وہی لوگ نہیں جن کے بارے میں تم نے قسم کھائی تھی کہ ہرگز خدا کی رحمت ان کے شامل حال نہیں ہوگی؟ "اھو الآء الذین اقسمتم لا ینالھم اللہ برحمة"۔ پھر اسی حالت میں ضعیف مومنین کی طرف اشارہ کرکے اظہار کریں گے: جاؤ او بہشت میں داخل ہو جاؤ نہ تم کو کوئی خوف ہے اور نہ ہی تمہیں کوئی غم ہوگا" ادخلوا الجنة لا خوف علیکم ولا انتم تحزنون"۔ یہ عبارت بھی بخوبی بیان کرتی ہے کہ وہاں پر دو جماعتیں ہوں گی، ایک بلند مرتبہ افراد کی جماعت اور دوسری ضعیف مومنین کی عقب ماندہ جماعت اور آخرکار رحمت الٰہی ان کے بھی شامل حال ہوگی اور وہ ان باحیثیت اصحاب اعراف کے حکم پر بہشت کی طرف روانہ ہوں گے۔

چندوضاحتیں:

ا۔اعراف لغت اورتفسیر میں:

اعراف (عرف) (بروزن ''قفل'') کی جمع بلند اور مرتفع جگہ کے معنی میں ہے اور اصل میں 'عرف الفرس' اور ''عرف الدیک'' سے لیا گیا ہے جو گھوڑے کے پر اور مرغ کے تاج کے معنی میں ہیں، کبھی کہا جاتا ہے کہ لفظ معرفت اور عرفان کے ریشے سے لیا گیا ہے جو اشیاء سے آگاہی اور ان کی خصوصیات کے بارے میں علم کے معنی میں ہے اس لئے کہ بلند زمینیں پشت اور نیچی زمینوں سے زیادہ واضح اور جلد پہچانی جاتی ہیں، (اوران کی بلندیوں سے تمام جگہوں کو پہچانا جاسکتا ہے)۔

کبھی کہا جاتا ہے کہ بلند مرتبہ اور والا مقام افراد کی منزلت ہے۔[1]

اعراف کہاں ہے اور کیسا ہے؟ اس بارے میں اقوال متعدد ہیں، المیز ان میں ان اقوال میں سے چھ اقوال بیان کئے گئے ہیں:

۱۔ ایسی جگہ ہے جو بہشتیوں اور دوزخیوں پر حاوی اور محیط ہے۔

۲۔ ایسی دیوار ہے جس پر مرغ کے تاج کی طرح ایک مخصوص تاج ہے۔

۳۔ بہشت اور دوزخ کے درمیان ایک ٹیلہ ہے۔

۴۔ وہ دیوار ہے جس کی طرف قرآن میں اشارہ ہوا ہے کہ مومنین اور منافقین کے درمیان قرار پائے گی اور سورہ حدید کی آیت ۱۳ میں اس بارے میں فرمایا گیا ہے:

فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ۭ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ۝۱۳ ﴿الحدید: ۱۳﴾

مومنوں اور منافقوں کے درمیان ایک دیوار بنائی جائے گی جس کے اندر کی طرف رحمت اور باہر کی طرف عذاب ہوگا۔

۵۔ اعراف اس صراط اور پل کے معنی میں ہے جو دوزخ کے اوپر تنا ہوا ہے۔

۶۔ اعراف لوگوں کی حالت سے آگاہی کے معنی میں ہے۔

لیکن ہمارے خیال میں اگر اعراف سے متعلق چار آیتوں میں غور کیا جائے تو اعراف کے معنی میں کوئی ابہام نہیں رہ جاتا اور اُن سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ اعراف ایسی جگہ ہے جو بہشت اور دوزخ پر ناظر ہے اور اولیاء اللہ میں سے بلند مرتبہ افراد کی ایک جماعت وہاں رہتی ہے

---

[1] التحقیق، مجمع البیان اور دوسری تفسیریں اور لغات۔

اور ضعیف الایمان عقب ماندہ افراد کی ایک جماعت بھی اور یہ اس وقت ہوگا جب خالص مومنین بہشت میں جا چکے ہیں اور بے ایمان گنہ گار دوزخ میں، لیکن وہ لوگ جن کے برے اور نیک دونوں طرح کے اعمال تھے اور بعض جہات سے مثبت نقاط اور بعض جہات سے منفی نقاط کے حامل تھے، اعراف میں باقی رہ گئے ہیں اور اس انتظار میں ہی کہ دیکھیں اعراف کے بلند مرتبہ الٰہی لوگ ان کے بارے میں کیا فیصلہ کرتے ہیں۔

اعراف میں موجود ان دو جماعتوں کے بارے میں اور اس بارے میں کہ ان میں سے ہر ایک کون کون سے لوگ ہیں آیات کی تفسیر کے ضمن میں تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے۔ اس طرح سے یہاں پر واضح ہو جاتا ہے کہ اعراف کے الٰہی لوگوں کا کام حقیقت میں ایسے افراد کی ایک طرح سے شفاعت کرنا ہے جو ''خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا'' [1] نیک اور بے اعمال کو آپس میں خلط کر چکے ہیں اور ہمیشہ اضطراب اور پریشانی کے عالم میں ہیں، جب وہ اعراف کی بلندیوں سے بہشتیوں کو دیکھتے ہیں تو اُن کے ساتھ رہنے کی آروز و کرتے ہیں اور جب اُن کی نظریں دوزخیوں پر پڑتی ہیں تو مضطرب ہو جاتے ہیں اور آرزو کرتے ہیں کہ ہرگز ان کے ساتھ نہ رہیں۔ یہاں ضمنی طور پر اعراف کے وجود کا فلسفہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس کا مقصد اولیاء اللہ کے بلند مرتبے کو دکھانا اور عقب ماندہ افراد کے لئے ان کی دست گیری اور گنہگاروں کی ایک جماعت کی سرنوشت کا پیش کرنا ہے جو آخر کار ان عظیم افراد کی شفاعت پائیں گے۔

۲۔ اعراف منطق اور عقل کی روشنی میں:

واضح ہے کہ اعراف کے وجود کو ثابت کرنے کے لئے ہمارے پاس کوئی عقلی دلیل نہیں ہے کیونکہ عقل صرف حساب و کتاب اور جزاء و سزا سے متعلق کلیات کو ثابت کر سکتی ہے کیونکہ ان چیزوں کا نہ ہونا خدا کی عدالت اور حکمت کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا۔

لیکن قیامت کے مواقف، جزا و سزا کے مراحل، بہشتیوں کے بہشت میں داخل ہونے کی کیفیت اور دوزخیوں کے دوزخ میں داخل ہونے کا طریقہ، صراط، اعراف اور اس طرح کی دوسری چیزیں جو قیامت کی جزئیات میں سے ہیں، ایسے مسائل ہیں جو نقلی روش کے بغیر اثبات کے قابل نہیں ہیں۔ لیکن چونکہ شفاعت کا سرچشمہ بھی خدا کی حکمت ہے (جیسا کہ شفاعت کی بحث میں یہ بات آئی ہے) اور طبیعی طور پر شفیعوں کا بلند مرتبہ اور والا مقام ہونا چاہیے تا کہ وہ ضعیفوں کی دستگیری کر سکیں، اس لئے حکم عقل کی گہرائیوں میں اعراف کے مسئلے کی طرف ایک ہلکا سا اشارہ پایا جاتا ہے (توجہ کیجئے گا)۔

۳۔ اعراف۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔روایات میں:

شیعہ و سنی اسلامی منابع میں اعراف اور اعراف والوں کے بارے میں بہت سی روایتیں وارد ہوئی ہیں اگر ہم انہیں دقیق طور پر ایک دوسرے کے ساتھ قرار دیں تو وہی نتیجہ نکل سکتا ہے جو ہم مندرجہ بالا آیات کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں۔

---

[1] توبہ، ۱۰۲۔

یہ روایتیں بہت زیادہ ہیں، بعض نے ان کی تعداد ۲۸ بتائی ہے [۱]۔ان میں سے بعض احادیث اعراف ہی کے بارے میں ہیں اور بعض اُن مردان الٰہی کے بارے میں بتاتی ہیں جو اعراف میں ہیں اور بعض روایتوں کا اشارہ ضعیف الایمان عقب ماندہ افراد کی طرف ہے جو وہاں پر ہیں ہم انہی چند نمونوں پر قناعت کرتے ہیں:

(۱)۔امام جعفر صادق علیہ السلام نے ایک روایت میں آیہ شریفہ "وبینهما حجاب وعلى الاعراف رجال' کے بارے میں سوال کے جواب میں فرمایا:

سور بين الجنة والنار

اعراف بہشت اور دوزخ کے درمیان ایک دیوار ہے۔[۲]

تفسیر طبری میں یہی مطلب امام محمد باقرؑ سے نقل ہوا ہے۔[۳]

(۲)۔"وعلى الاعراف رجال۔۔" کی تفسیر میں امام باقر علیہ السلام نے فرمایا:

نزلت فى هذه الا مة والرجال هم الائمة من ال محمد۔ قلت: فالا عراف؟ قال صراط بين الجنة والنار، فمن شفع له الامام منا من المومنين المذنبين نجا، ومن لم يشفع له هوى۔

یہ آیت اس امت کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور رجال سے مراد آل محمدؐ کے امام ہیں۔

راوی کہتا ہے: میں نے پوچھا:

پس اعراف کیا ہے؟

فرمایا:

بہشت اور دوزخ کے درمیان ایک راستہ ہے، گنہگار مومنین میں سے جس کسی کی شفاعت ہم آئمہ میں سے کوئی ایک کرے گا وہ رہائی پائے گا اور جس کی شفاعت نہ کرے وہ سقوط کر جائے گا۔[۴]

اس روایت میں اعراف کا معنی بھی بیان ہوا ہے اور اس میں موجود دونوں جماعتوں کا ذکر بھی ہے۔

---

[۱] تفسیر اثناعشری جلد ۴ صفحہ ۵۷۔

[۲] تفسیر برہان، جلد ۲ صفحہ ۱۸ حدیث ۱۰۔

[۳] تفسیر طبری جلد ۸ صفحہ ۲ ۱۳، طبع بیروت۔

[۴] تفسیر برہان، جلد ۲ صفحہ ۱۸ حدیث ۸۔

(۳)۔مجمع البیان میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک روایت طبرسی مرحوم نے یوں نقل کی ہے:

الا عراف کثبان بین الجنة والنار فیقف علیها کل نبی وکل خلیفة نبی۔ مع المذنبین من اهل الزمان کما یقف صاحب الجیش مع الضعفاء من جنده۔

اعراف بہشت اور دوزخ کے درمیان ایک ٹیلہ ہے جہاں ہر پیغمبر اور اس کا جانشین اپنے زمانے کے گنہگاروں کے ساتھ کھڑا رہتا ہے جس طرح لشکر کا کمانڈر اپنے لشکر کے کمزور افراد کے ساتھ (مشکل راستوں پر) توقف کرتا ہے۔[1]

اسی حدیث کے ذیل میں مکمل وضاحت کی گئی ہے کہ نیک کام کرنے والے لوگ پہلے بہشت میں چلے جائیں گے اور الٰہی افراد اپنے پاس والے گنہگاروں سے کہیں گے کہ اپنے نیک کام کرنے والے بھائیوں کی طرف دیکھو جو تم سے آگے نکل گئے ہیں اور بہشت میں چلے گئے ہیں یہاں گنہگار لوگ ان کی طرف دیکھیں گے اور ان پر سلام بھیجیں گے اور اسی کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

ونادوا اصحب الجنة ان سلام علیکم لم یدخلوها وهم یطمعون۔

یہ گنہگار لوگ بہشت میں داخل نہیں ہوئے اور امید رکھتے ہیں کہ (پیغمبر اور امام کی شفاعت کی برکت سے) بہشت میں چلے جائیں۔۔۔۔۔

پھر اسی طرح سے باقی آیتوں کی یوں تفسیر فرماتے ہیں کہ اعراف اور اس میں موجود دونوں جماعتوں کے بارے میں کوئی ابہام باقی نہیں رہتا، اعراف کے بارے میں چار آیتوں اور ان آیتوں کے آپس میں تعلق کے بارے میں جو تفسیر ہم نے بیان کی تھی، عیناً وہی تفسیر اس روایت سے بھی معلوم ہوتی ہے۔

(۴)۔درالمنثور میں رسول اکرمؐ سے ایک روایت نقل ہوئی ہے، فرماتے ہیں:

یجمع الناس یوم القیامة فیومر باهل اجنة الی الجنة ویومر باهل النار الی النار، ثم یقال لا صحب الاعراف ما تنظرون؟ قالو! اننتظر امرك فیقال لهم ان حسنا تکم تجاوزت بکم النار ان تدخلوها، وحالت

[1] مجمع البیان جلد ۳و۴، صفحہ ۴۲۳۔

بينكم وبين الجنة خطايا كم فادخلوا الجنة بمغفرتي ورحمتي۔

خدا قیامت کے دن تمام لوگوں کو جمع کرے گا، بہشتیوں سے کہا جائے گا کہ بہشت کی طرف چلے جاؤ، دوزخیوں سے کہا جائے گا کہ دوزخ کی طرف چلے جاؤ، پھر اصحاب اعراف سے کہا جائے گا کہ تمہیں کس چیز کا انتظار ہے عرض کریں گے: (پروردگار) تیرے فرمان کا انتظار ہے، ان سے کہا جائے گا! تمہاری نیکیوں نے تمہیں جہنم جانے سے بچالیا ہے، لیکن تمہارے گناہ بہشت جانے میں مانع ہو رہے ہیں اب میری رحمت اور مغفرت کے طفیل بہشت میں داخل ہو جاؤ۔[1]

البتہ بہشت میں داخل ہونے کا سبب یہاں پر اعراف کے مردان الٰہی اور شفعاء کی اذن خدا سے شفاعت ہی ہوسکتی ہے۔

(۵)۔ درالمنثور میں ابوسعید خدری سے ایک اور روایت نقل ہوئی ہے کہ رسول خدا سے اصحاب اعراف کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا:

هم رجال قتلوا في سبيل الله وهم عصاة لا ابائهم فمنعتهم الشهادة ان يدخلوا النار ومنعتهم المعصية ان يدخلوا الجنة وهم على سور بين الجنة والنار...... فاذا فرغ من حساب خلقه فلم يبق غير هم تغمدهم منه برحمة فادخلهم الجنة برحمته۔

وہ ایسے لوگ ہیں جو خدا کی راہ میں شہید ہوئے ہیں جب کہ انہوں نے اپنے والدین کی نافرمانی کی ہے۔ شہادت اُن کے دوزخ جانے میں مانع ہوئی ہے اور والدین کی نافرمانی اُن کے بہشت جانے میں رکاوٹ بنی ہے، وہ لوگ جہنم اور جنت کے درمیان ایک دیوار پر ہوں گے۔۔۔۔۔ جب خدا اپنے بندوں کے حساب کتاب سے فارغ ہوگا اور ان کے علاوہ کوئی باقی نہیں بچے گا تو ان پر اپنی رحمت کرے گا اور اپنی رحمت کے طفیل بہشت میں داخل کردے گا۔[2]

جیسا کہ پہلے بیان ہوا کوئی مانع نہیں ہے کہ خدا کی رحمت انبیاء اور اولیاء کی شفاعت کے سائے میں ان کے شامل حال ہو۔

بحث معاد کا اختتام:

---

[1] درالمنثور جلد ۳ صفحہ ۸۷۔

[2] درالمنثور جلد ۳ صفحہ ۸۸۔

یہاں پر اعراف اور شفاعت کے مسئلے کے اختتام کے ساتھ معاد کی بحث بھی اختتام پذیر ہوئی جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا ارادہ یہ تھا کہ معاد کی تمام بحثیں ایک ہی جلد میں آ جائیں لیکن اس مورد میں قرآنی ابحاث کی وسعت کی وجہ سے ہم نے اسے دو جلدوں میں پیش کیا ہے، البتہ یہ سب معاد کی بنیادی بحثیں تھیں ورنہ ان مباحث کے اطراف میں اور بہت سے مباحث موجود ہیں جن کی طوالت کے باعث ان سے احتراز کیا گیا ہے، امید ہے کسی اور وقت اس کی توفیق ملے۔

خدایا! ہمیں اس خوفناک اور خطرناک لیکن پر برکت و پر رحمت سفر میں تنہا نہ چھوڑ، ہمارا ہاتھ پکڑ لے اور خطرناک جگہوں اور عذاب کے مقامات سے نجات دے اور اپنی جوار رحمت تک پہنچا۔

بار الہا! ہمارے ہاتھ خالی، اعمال ناچیز، گناہ بہت زیادہ، اعمال نامے ہلکے ہیں، ہارے کندھوں پر بار مسئولیت کی سنگینی اور ہماری امیدیں تجھ سے وابستہ ہیں۔

پروردگار!

تیری رحمت وسیع، تیرے الطاف بیکراں، تیرا کرم بے انتہا اور تیری محبت ولطف ہمہ گیر ہے، تجھے تیرے اولیائے کرام کی قسم ہے کہ اس دن اپنی عنایات ہمارے شامل حال کر دے اور اپنی لقاء کے شراب سے مرمست اور اپنے دیدار کے عشق سے بہرہ مند فرمادے۔

امین یا رب العالمین

قرآن میں معاد کے بحث

اور چھٹی جلد کا اختتام

۲۷ر ذیقعدہ ۱۴۱۱ ہجری۔

تفسیر موضوعی

جلد ہشتم

زیرِ نظر

آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی

پیامِ قرآن

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن کی نظر میں

نگارش

اہل قلم کی ایک جماعت

ترجمہ

حجۃ الاسلام مولانا سید رمیز الحسن موسوی

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اُردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311

نام کتاب۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تفسیر موضوعی: پیامِ قرآن

جلد۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ہشتم

مؤلف۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔آیۃ اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

مترجم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔حجۃ الاسلام مولانا سید رمیز الحسن

نظر ثانی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔حجۃ الاسلام ڈاکٹر شیخ محمد حسنین

سیٹنگ وگرافکس۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔قلب علی سیال

سال اشاعت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔2013ء

ناشر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

ہدیہ (پیامِ قرآن جلد 8،9،10)۔۔۔۔۔۔۔1000 روپے

ملنے کا پتہ

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اُردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311

www.misbahulqurantrust.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرضِ ناشر

قارئین کرام!-------------------------------السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ ! مصباح القرآن ٹرسٹ-----عرصہ دراز سے دورِ حاضر کی بعض عظیم ترین تفاسیر وتالیفات کی نشر واشاعت کے سلسلہ میں ایک عظیم اور پُروقار مرکز کی حیثیت سے اُمت مسلمہ کیلئے اپنی عاجزانہ خدمات انجام دے رہا ہے۔

دورِحاضر میں جب تفسیر قرآن کی بات ہو تو ذہن میں انہی کتب کا تصور آتا ہے جو عموماً صدرِ اوّل سے لے کر آج تک لکھی جا رہی ہیں کہ جن میں سورتوں اور آیتوں کی ترتیب کے مطابق نوبت بہ نوبت ان کی تفسیر کی جاتی ہے۔مگر تفسیر قرآن کا یہی ایک طریقہ نہیں ہے بلکہ اس کتابِ الٰہی کی تفسیر کے پانچ طریقے ہیں۔۱۔تفسیرِ مفرداتی ۲۔تفسیر ترتیبی ۳۔تفسیرِ موضوعی ۴۔تفسیر ارتباطی ۵۔تفسیر کلی۔

تفسیر کے پہلے دو طریقے عام طور پر متعارف ہیں۔بلاشبہ تفسیر قرآن کا قدیمی طریقہ یہ رہا ہے کہ بالترتیب ایک کے بعد دوسری سورۃ کی تفسیر کرتے ہوئے پورے قرآن کی تفسیر مکمل کی جاتی ہے۔لیکن آیت اللہ جعفر سبحانی اور آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی نے تفسیر کی ایک نئی روش اپنائی ہے کہ جس میں کسی اصل وفرع یا مضمون وعنوان سے تعلق رکھنے والی آیاتِ قرآنی کو ایک مقام پر لا کر ان کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔چونکہ اس میں ہر عنوان اور موضوع کی جملہ آیات اور ان کی تفسیر یکجا کر دی گئی ہے،لہٰذا اس کو تفسیر موضوعی کا نام دیا گیا ہے۔ادارہ ہذا کے ذریعے تفسیرِ موضوعی کا 12 جلدوں پر مشتمل پہلا سلسلہ (قرآن کا دائمی منشور) منظر عام پر آ چکا ہے۔تفسیر موضوعی کا زیرِ نظر سلسلہ (پیام قرآن) جو کہ آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی کی سعیٔ جمیل کا نتیجہ ہے،اس کی سات جلدیں پہلے سے قارئین کے ہاتھوں میں موجود ہیں۔جلد ہشتم تا دہم قارئین کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہیں۔

زیرِ نظر کتاب ''پیامِ قرآن جلد ہشتم'' کا اردو ترجمہ ادارہ ہذا کے تعاون سے حجۃ الاسلام مولانا سید رمیز الحسن نے کیا ہے۔ادارہ مولانا موصوف کا اس سعیٔ جمیل پر دل کی اتھاہ گہرائیوں سے شکر گزار ہے۔بلاشبہ مولانا موصوف اگر ادارہ ہذا کے ساتھ طے شدہ ضوابط کے تحت تکمیل معاہدہ فرماتے تو زیرِ نظر کتاب 8 ماہ قبل قارئین کے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہوتی،لیکن غفلت کی ستم ظریفی!---کتاب ہذا کی تکمیل میں 6 ماہ کی بجائے 15 ماہ کا طویل عرصہ لگا دیا گیا۔

اس وقت تفسیر موضوعی (پیام قرآن) کی جلد نمبر 8 کا اردو ترجمہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ہمیں اُمید ہے کہ صاحبانِ علم وتحقیق حسبِ سابق ''مصباح القرآن ٹرسٹ'' کی اس کوشش کو بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے اور اس گوہر نایاب سے بھرپور علمی وعملی استفادہ فرمائیں گے۔اور ادارہ کو اپنی قیمتی تجاویز وآراء سے ضرور مستفید فرمائیں گے۔----------والسلام

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

فہرست مضامین

پیش لفظ

موضوعی تفسیر کیا ہے؟ اور کن مشکلات کو حل کرتی ہے؟

ان دو اہم سوالوں کا جواب موجودہ کتاب جیسی کتابوں کو صحیح مضمون میں سمجھنے میں گہرا اثر رکھتا ہے۔ جب تک ان دو سوالوں کا جواب واضح نہیں ہوتا، اس وقت ہم اس قسم کی کتابوں کے مقصد کو نہیں سمجھ سکتے۔

پہلے سوال کے جواب میں، ہم یاد دہانی کراتے ہیں کہ قرآن مجید وہ کتاب ہے جو ۲۳ سال کے لمبے عرصے میں مختلف معاشرتی حالات اور تقاضوں اور گوناگوں واقعات کو مدنظر رکھتے ہوئے نازل ہوئی ہے اور اسلامی معاشرے کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس (کی تعلیمات میں) میں بھی پیشرفت ہوتی رہی ہے۔

جن سورتوں کی آیات مکہ میں نازل ہوئی ہیں، وہ زیادہ تر توحید و معاد پر ایمان و اعتقاد کو محکم کرنے خصوصاً شرک اور بت پرستی کے خلاف شدید جد و جہد کی عکاسی کرتی ہیں جبکہ مدینہ میں نازل ہونے والی سورتوں کی آیات قدرتی طور پر اسلامی حکومت کے تشکیل پانے کے بعد نازل ہوئی ہیں، لہذا معاشرتی، عبادی، سیاسی احکام اور بیت المال کی تشکیل اور اسلام کے قضائی نظام کی طرف ناظر ہیں اور پھر منافقین وغیرہ کے ساتھ جنگ و صلح پر مبنی مسائل سے تعلق رکھتی ہیں کہ جن میں اس وقت اسلام مبتلا تھا۔

واضح ہے کہ ان میں سے کوئی بھی مسئلہ ایک رسالۂ عملیہ (توضیح المسائل) یا قدیم نصابی اور درسی کتاب کی شکل میں پیش نہیں کیا گیا۔ بلکہ یہ آیات مختلف مناسبتوں، تقاضوں اور ضرورتوں کے مطابق نازل ہوتی رہی ہیں۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ جہاد، جنگی احکامات، عہدناموں، اسیروں، جنگی تاوانوں وغیرہ سے متعلق احکام ہر غزوہ کی مناسبت سے پراکندہ صورت میں نازل ہوئے ہیں یہ بالکل ایک ماہر طبیب کے نسخے کی طرح ہیں کہ جو ہر روز بیمار کے حال کے مطابق نسخہ لکھتا ہے اور اسے مکمل صحت عطا کرتا ہے۔

اب اگر ہم قرآنی آیات کی نازل شدہ سورتوں میں ہر سورت میں آیات کے مطابق، ترتیب کے ساتھ تفسیر کریں تو یہ ''ترتیبی تفسیر'' ہوگی اور اگر ایک ''موضوع'' سے متعلق آیات پورے قرآن سے جمع کر کے ایک ساتھ رکھیں اور پھر ان کی فصل بندی کر کے تفسیر کریں تو یہ ''موضوعی تفسیر'' ہوگی۔

مثلاً جب بھی جہاد سے متعلق تمام آیات کہ جو دس سال کے دوران، مدنی سوروں میں نازل ہوئی ہیں یا اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات سے متعلق آیات جو ۲۳ رسال کے دوران پورے قرآن میں نازل ہوئی ہیں، ایک ساتھ رکھی جائیں اور پھر ان کی ایک دوسرے کے ساتھ تعلق کی بنا پر تفسیر کی جائے تو یہ موضوعی تفسیر کہلائے گی۔

دونوں قسم کی تفسیر کی اپنی اپنی خصوصیات اور اثرات ہیں کہ جو ہمیں ایک دوسرے سے بے نیاز نہیں کرتیں اور ''ہر چیز اپنی جگہ پر اچھی ہوتی ہے'' کے مصداق دونوں قسم کی تفسیریں قرآن کے محققین کے لئے ضروری ہیں (البتہ پہلے ترتیبی تفسیر ہے اور پھر موضوعی تفسیر)۔

ترتیبی تفسیر کی خصوصیات

اس طرح کی تفسیر میں آیات کے نازل ہونے کے زمان ومکان، پہلے اور بعد میں آنے والی آیات اور داخلی اور بیرونی قرائن کے لحاظ ہر آیت کا مقام واضح ہوجاتا ہے، اس کے بغیر آیت کا صحیح معنی سمجھنا ممکن نہیں ہے۔ دوسرے الفاظ میں ترتیبی تفسیر ہر آیت کو اس کے اپنے مقام پر دیکھتی ہے اور اسلامی معاشرے کی روح کے ساتھ اس کے تعلق اور اس کی پیشرفت وتکامل کو مدنظر رکھتی ہے اور اس تعلق سے بہت سے مسائل واضح ہوجاتے ہیں۔

جبکہ موضوعی تفسیر میں آیات عینی اور جزئی واقعات کی شکل سے نکل کر ایک مجموعی وکلی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور اپنے مقام سے کسی حد تک دور ہوجاتے ہیں۔ اس کے برعکس موضوعی تفسیر کی اہم خصوصیات یہ ہیں:

موضوعی تفسیر کی خصوصیات

ا۔ ایک ہی موضوع کی مختلف آیات میں پیش ہونے والے گونا گوں پہلوؤں کو ایک ساتھ قرار دیتے ہوئے تمام موضوعات کو جامع انداز میں چند پہلوؤں سے دیکھا جاتا ہے جس سے قدرتی طور پر جدید حقائق سامنے آتے ہیں۔

۲۔ قرآن کی بعض آیات میں پہلی نظر میں (انسان کو) ابہامات نظر آتے ہیں لیکن ''القرآنُ یفسر بعضہ بعضاً'' (قرآنی آیات ایک دوسرے کی تفسیر کرتی ہیں) کے اصول کے مطابق یہ ابہامات (موضوعی تفسیر) کی وجہ سے دور ہوجاتے ہیں۔

۳۔ موضوعی تفسیر بطور کلی ہر مسئلے اور ہر موضوع کے بارے میں اسلامی نظریۂ کائنات کو واضح کر دیتی ہے۔

۴۔ قرآن کے بہت سے چھپے ہوئے اسرار کو فقط موضوعی تفسیر کی روش پر ہی واضح کیا جاسکتا ہے اور انسانی استعداد کی حد تک آیات کی گہرائیوں تک پہنچا جاسکتا ہے۔

بنابرایں گہری سوچ اور آگاہی رکھنے والا کوئی بھی مسلمان اس دونوں قسم کی تفاسیر سے بے نیاز نہیں ہوسکتا اگرچہ زمانۂ قدیم حتیٰ ائمہ ہدیٰؑ کے زمانے سے موضوعی تفسیر کی طرف توجہ دی جاتی رہی ہے اور علمائے اسلام نے اس سلسلے میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں جس کی واضح مثال ''آیات الاحکام'' کے نام سے لکھی جانے والی کتابیں ہیں، لیکن ہمیں اس بات کا اعتراف کرنا چاہیے کہ موضوعی تفسیر میں جس طرح ترقی ہونی چاہیے تھی وہ نہیں ہوسکی اور ابھی تک یہ اپنے ابتدائی مراحل طے کر رہی ہے۔ لہٰذا علمائے کرام کی زحمات کے نتیجے میں اسے اپنے حقیقی مقام تک پہنچنا چاہیے۔

اس کتاب ''پیام قرآن'' میں کاملاً ایک جدید روش کے مطابق قرآن کی موضوعی تفسیر کے موضوع پر جدید قدم اٹھائے گئے ہیں اور الحمدللہ اس کا بہت زیادہ استقبال ہوا ہے اور ہر روز معاشرے کے مختلف طبقات کی طرف سے اسے پذیرائی مل رہی ہے پھر بھی یہ کام ابتدائی مراحل سے گذر رہا ہے اور اسے علمائے اسلام اور مفسرین عالی مقام کی زیادہ سے زیادہ توجہ اور تعاون کی ضرورت ہے تاکہ یہ اپنے

انتہائی مقصد تک پہنچ سکے۔ ہم ہمیشہ اہل نظر اور ارباب معرفت سے اس کام کو مکمل کرنے والے نظریات و آراء کی توقع رکھتے ہیں۔

ہم اس کام میں خداوند بزرگ و برتر سے زیادہ سے زیادہ توفیق و ہدایت طلب کرتے ہیں!

حجج الاسلام عالی جناب محمد رضا آشتیانی، محمد جعفر امامی، عبد الرسول حسنی، محمد اسدی، حسین طوسی، سید شمس الدین روحانی اور محمد محمدی کے تعاون سے!

ناصر مکارم شیرازی
حوزہ علمیہ قم

☆☆☆☆

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن کی نظر میں

سب سے پہلے ہمیں از روئے قرآن مجید، اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معرفت حاصل کرنی چاہیے اور مختلف آیات میں اس بارے میں جو وسیع مفاہیم پر مبنی اشارے ملتے ہیں؛ اُن کے متعلق مطالعہ و تحقیق کرنی چاہیے۔ چونکہ ان مختلف آیات کے نکات اور اشاروں سے آگاہ ہونے کے لئے تاریخ اسلام سے متعلق اجمالی معلومات ضروری ہیں، لہٰذا یہاں پر ہم آئندہ موضوعات کے لئے تمہید کے طور پر اختصار کے ساتھ تاریخ اسلام پر ظہور اسلام اور اُس کی تیز رفتار ترقی کے بارے میں ایک نظر دوڑائیں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اسلام کا ظہور اور اسکی تیز رفتار ترقی

اسلام کا ظہور چودہ صدیاں پہلے مکہ مکرمہ میں ہوا ہے، اور ۲۳ سال کے عرصے میں (کہ جو دعوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا زمانہ ہے) اس نے حجاز کے انتہائی جنوبی علاقے یمن سے لیکر جزیرۃ العرب کے شمال شامات تک کے علاقے کو اپنی قلمرو میں شامل کرلیا ہے۔ یہاں تک کہ افریقہ کا کچھ حصہ کہ جو اس زمانے میں حبشہ کہلاتا تھا، بھی اسلام کی جانب راغب ہو گیا تھا اور آج پوری دنیا کو اسلام نے اپنی جانب متوجہ کیا ہوا ہے اور اس وقت اس کے ایک ارب سے زیادہ پیروکار موجود ہیں۔

اس تحریر میں جس چیز کے بارے میں تحقیق کی جائے گی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ اور اسلام کی سریع پیشرفت اور اس کے علل واسباب کے بارے میں مختصر اشارہ ہوگا۔

البتہ ہم جانتے ہیں کہ یہ کام آسان نہیں ہے چونکہ جو کچھ ہوا اور اس کے نتیجے میں اسلام یہاں تک پہنچا، اس کے مقابلے میں جو تاریخ میں آیا ہے؛ وہ اس قدر وسیع ہے کہ اُسے ہم سمندر کے مقابلے میں قطرہ ہی کہہ سکتے ہیں اور جو کچھ ہم یہاں پیش کررہے ہیں؛ وہ اسی تاریخ سے ہی لیا گیا ہے لہٰذا واضح ہے کہ یہ کس قدر کم ہوگا۔ ابتداء میں اسلام ایک فرد یعنی؛ رسول اکرمؐ سے شروع ہوا ہے جو چالیس سال کی عمر میں رسالت کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔ اُن کے بعد حضرت خدیجہؑ اور پھر حضرت علیؑ ایمان لائے ہیں۔ اسلام کی خفیہ تبلیغ کا کام یہیں سے شروع ہوجاتا ہے۔

تین سال تک پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فقط اُنہی لوگوں کو دعوت دیتے رہے جن پر آپؐ کو مکمل اطمینان تھا کہ وہ اُن کا راز فاش نہیں کریں گے۔

"وَكَانَ قَبْلَ ذٰلِكَ فِي السِّنِيْنِ الثَّلَاثِ مُسْتَتِرًا بِدَعْوَتِهٖ لَا يُظْهِرُهَا اِلَّا لِمَنْ يَثِقُ بِهٖ"

لیکن تین سال کے بعد آیہ مجیدہ

"وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ"

کے نزول کے ساتھ آپؐ کو اسلام کی آشکارا دعوت دینے کا فریضہ سونپا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی دعوت کا اعلان کوہ صفا پر

کرنے کے بعد اپنے رشتہ داروں کو دعوت دینے کے ساتھ اپنے کام کا آغاز فرمایا۔ اس دن تک مسلمانوں کی تعداد بہت ہی کم تھی جو انگلیوں پر گنی جاتی تھی۔[1]

کھانے کی جو دو دعوتیں دی گئیں تھیں اُن میں سے ایک میں تو ابولہب نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بولنے کا موقع ہی نہ دیا اور دوسری میں آپؐ کی باتیں سننے کے بعد اُنہوں نے مذاق اُڑاتے ہوئے حضرت ابوطالبؑ سے کہا:

"قَدْ اَمَرَكَ اَنْ تَسْمَعَ لِاِبْنِكَ وَتُطِيعَ"

یعنی: "تمہیں فرمان دیا ہے کہ اپنے بیٹے کی سنو اور اس کی اطاعت کرو۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر میں اسلام کی پیشرفت اس قدر مسلّم تھی کہ آپؐ نے اسی دعوت میں اپنے وارث اور خلیفہ کا تعین بھی کر دیا تھا۔[2]

کم ہی عرصے میں مکہ کے سرداروں نے دیکھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کے افکار کو روشن کر کے بت پرستی کا غلط ہونا اور خالق کائنات پر ایمان کو ضروری ثابت کر دیا ہے اور اس طرح وہ آہستہ آہستہ پیشرفت کر رہے ہیں؛ اس وقت اُنہیں خطرہ محسوس ہونے لگا۔ چونکہ اُن کا تمام تر مقام و مرتبہ اور مادی مفادات انہیں موجودہ رسم و رواج اور افکار سے وابستہ تھے۔ لہٰذا اُنہوں نے حضرت ابوطالبؑ کی طرف رُخ کیا اور اُن سے کہا کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حمایت سے ہاتھ اُٹھا لیں یا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اُن (کفار قریش) کے درمیان سے ہٹ جائیں یا خود اُن کی اصلاح کریں۔ اُنہوں نے اسطرح کہا:

"يَا اَبَاطَالِبٍ اِنَّ ابْنَ اَخِيكَ قَدْ سَبَّ آلِهَتَنَا وَ عَابَ دِينَنَا وَسَفَّهَ اَحْلَامَنَا وَضَلَّلَ آبَائَنَا فَاِمَّا اَنْ تَكُفَّهُ عَنَّا وَاِمَّا اَنْ تُخَلِّيَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُ" یعنی:

"اے ابوطالب! تمہارا بھتیجا ہمارے خداؤں کو بُرا بھلا کہتا ہے، ہمارے مذہب میں نقص نکالتا ہے، ہمارے بڑوں (عقلا) کو بے وقوف کہتا ہے، ہمارے آباؤ اجداد کو گمراہ کہتا ہے یا تو خود اسے منع کر و یا ہمارے درمیان سے ہٹ جاؤ تا کہ ہم خود اسے اس کے اعمال کی سزا دیں۔"[3]

اس بار بھی حضرت ابوطالبؑ نے اُنہیں کسی طرح سے جواب دے دیا۔ لیکن اسلام اُسی طرح اپنی ترقی کا راستہ طے کرتا رہا۔ کفر کے سردار اپنے مذہب اور اپنے اردگرد کے ماحول کو خطرے میں دیکھنے لگے، ایک بار پھر اُنہوں نے حضرت ابوطالبؑ کی طرف رُخ کیا:

---

[1] کامل ابن اثیر جلد ا، صفحہ ۴۸۶، طبع دار الاحیاء التراث العربی و تاریخ طبری، جلد ۲، صفحہ ۶۱

[2] طبری، جلد ۲، صفحہ ۶۳

[3] سیرۂ ابن ہشام، جزء ا، صفحہ ۲۸۳، طبع مصر، کامل ابن اثیر، جلد ا، صفحہ ۴۸۸ اور طبری جلد ۲، صفحہ ۶۵

"فَقالُوا یا اَبا طالِبٍ اِنَّ لَکَ سِنّاً وَ شَرَفاً وَ اِنّا قَدِ اسْتَنْهَیْناکَ اَنْ تَنْهَی ابْنَ اَخیکَ فَلَمْ تَفْعَلْ وَ اِنّا وَ اللهِ لا نَصْبِرُ عَلی شَتْمِ آلِهَتِنا وَ آبائِنا وَ تَسْفیهِ اَحْلامِنا حَتّٰی تَکُفَّهُ عَنّا اَوْ نُنازِلَهُ وَ اِیّاکَ حَتّٰی یَهْلِکَ اَحَدُ الْفَریقَیْنِ"

''اُنہوں نے کہا: اے ابوطالب! آپ بزرگ، باشرف اور عمر رسیدہ آدمی ہیں، ہم نے آپ سے کہا کہ اپنے بھتیجے کو روک دیجیے، لیکن آپ نے کچھ نہیں کیا، خدا کی قسم! اب ہم اپنے خداؤں اور آباء واجداد پر اس سب وشتم اور تمسخر واستہزا اور اپنے عقلا کو بے وقوف کہنے پر صبر نہیں کر سکتے۔ لہٰذا یا تو آپ روک دیں یا پھر ہم سے مقابلے پر آمادہ ہو جائیں تاکہ ہم میں سے کوئی ایک ختم ہو جائے''

اس بار حضرت ابوطالبؑ نے اس واقعہ کی خبر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دی اور اُن سے کہا کہ وہ اس بار بہت زیادہ مصمم نظر آتے ہیں۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سمجھا کہ شاید حضرت ابوطالبؑ اُن کی حمایت کرنے میں کچھ سست پڑ گئے ہیں۔ لہٰذا اس وقت آپؐ نے اپنے وہ معروف جملات اپنے چچا کے سامنے کہے اور کہا:

"یا عَمّاهُ لَوْ وَضَعُوا الشَّمْسَ فی یَمینی وَ الْقَمَرَ فی شِمالی عَلی اَنْ اَتْرُکَ هٰذَا الْاَمْرَ، حَتّٰی یُظْهِرَهُ اللهُ اَوْ أَهْلَکَ فیهِ ما تَرَکْتُهُ ثُمَّ بَکی وَ قامَ فَلَمّا وَلّی ناداهُ اَبُو طالِبٍ فَاَقْبَلَ عَلَیْهِ وَ قالَ اذْهَبْ یَابْنَ اَخی فَقُلْ ما اَحْبَبْتَ فَوَاللهِ لا اُسَلِّمُکَ لِشَیْءٍ اَبَداً۔" [1]

''اے چچا جان! اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ دیں کہ میں اس کام سے ہاتھ کھینچ لوں تو بھی اس پیغام کو ترک نہیں کروں گا، اب یا میں ہلاک ہو جاؤں گا یا پیغام الٰہی غالب آ جائے گا۔ اس کے بعد آپؐ رو دیئے اور اُٹھ کر جانے لگے تو اس وقت ابوطالبؑ نے آواز دی اور اُن سے مخاطب ہو کر کہا: بیٹا جو چاہو کہو، خدا کی قسم میں تمہیں تنہا نہیں چھوڑ سکتا اور نہ ان کے حوالے کر سکتا ہوں۔''

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب دوبارہ اپنے چچا کی حمایت دیکھی تو مزید دلچسپی کے ساتھ اپنا کام جاری رکھا اور قریش نے بھی سمجھ لیا کہ حضرت ابوطالبؑ، محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حمایت سے ہاتھ کھینچنے والے نہیں ہیں۔ لہٰذا وہ ایک بار پھر حضرت ابوطالبؑ کے پاس آئے اور کہا کہ ہم تمہیں تمہارے بھتیجے کی جگہ قریش کا خوبصورت ترین جوان دیتے ہیں، جس کو تم اپنا فرزند بنا لو اور محمدؐ کو ہمارے حوالے کر دو۔ اس وقت حضرت ابوطالبؑ نے اُنہیں ایک بہت ہی دلچسپ اور دنداں شکن جواب دیا۔ [2]

لہٰذا اس کے بعد اُنہوں نے ہر قبیلے کے مسلمانوں کو اذیتیں دینا شروع کر دیں۔ اُنہوں نے ایک بار پھر حضرت ابوطالبؑ سے

---

[1] کامل ابن اثیر جلد ۱، صفحہ ۴۸۹، سیرۂ ابن ہشام، جزء ۱، صفحہ ۲۸۴۔۲۸۵ وطبری جلد ۲، صفحہ ۶۵

[2] سیرۂ ابن ہشام، جزء ۱، صفحہ ۲۸۵، کامل ابن اثیر جلد ۱، صفحہ ۴۸۹، طبری جلد ۲، صفحہ ۶۶

اپنے بھتیجے کی حمایت سے ہاتھ اُٹھانے کو کہا۔ حضرت ابوطالبؑ نے اُن کا پیغام پہنچایا تو حضرت محمدؐ نے یہ جواب دیا:

"اَیْ عَمٌّ اَوَلاٰ اَدْعُوهُمْ اِلیٰ مٰا هُوَ خَيْرٌ لَهُمْ مِنْهَا. كَلِمَةٌ يَقُولُونَهَا تَدِينُ لَهُمْ بِهَا الْعَرَبُ وَيَمْلِكُونَ رِقَابَ الْعَجَمِ" فَقَالَ اَبُوجَهْلٍ: مٰا هِيَ وَاَبِيكَ لَنُعْطِيَنَّكَهَا وَ عَشْرَ اَمْثَالِهَا۔ قَالَ: "تَقُولُونَ لاٰ اِلٰهَ اِلاَّ اللهُ..." وَقَالُوا: "لَوْ جِئْتُمُونِي بِالشَّمْسِ حَتّٰى تَضَعُوهَا فِي يَدِي مٰا سَاَلْتُكُمْ غَيْرَهَا"۔

''اے چچا جان! کیا میں اُنہیں ایسی چیز کی طرف دعوت نہ دوں کہ جو اُن کے لئے فائدہ مند ہے اور وہ فقط ایک ہی کلمہ ہے، اگر وہ یہ ایک کلمہ کہہ دیں تو تمام عرب اُن کے سامنے جھک جائیں گے اور وہ عجم پر بھی حکومت کرنے لگیں گے۔'' ابوجہل نے کہا وہ کونسا کلمہ ہے۔ تمہیں اپنے والد کی قسم کہو وہ کلمہ کیا ہے، ہم اس جیسے دس کلمے کہہ دیں گے۔ آپؐ نے فرمایا: کہو ''لا الہ الا اللہ۔۔۔ اُنہوں نے کہا: اس کے علاوہ کچھ اور ہم سے چاہو۔ آپؐ نے فرمایا: اگر خورشید لا کر میرے ہاتھ میں رکھ دو تو بھی اس کے علاوہ اور کچھ تم سے نہیں چاہوں گا۔''[1]

اسی دوران متکبر اور مغرور مالداروں کے علاوہ کچھ آگاہ قسم کے لوگ جو مکہ کے ظالموں کے زیر تسلط دباؤ کی زندگی گذار رہے تھے، اسلام کی طرف مائل ہوگئے اور اُن کے اسی رجحان نے مکہ کے سرداروں کو خطرہ میں ڈال دیا جس کے بعد اُنہوں نے ابوطالب کی طرف رجوع کرنے کے بجائے، اس خطرے سے نجات کا دوسرا راستہ اختیار کر لیا۔ اس وقت حضرت محمد ﷺ نے ''ارقم'' کے گھر کو اپنے بیانات اور مشوروں کے لئے مرکز بنا لیا تھا۔

تازہ مسلمانوں پر دباؤ

جب مکہ کے سردار حضرت ابوطالبؑ اور رسول خدا ﷺ پر اثر انداز ہونے سے مایوس ہوگئے تو اُنہوں نے جدید مسلمانوں اور مستضعفین پر دباؤ ڈالنے کا ارادہ کر لیا تاکہ وہ اسلام سے پھر جائیں اور پیغمبر ﷺ کی طاقت میں کمی آجائے اور آپؐ مجبوراً اسلام کی تبلیغ سے ہاتھ کھینچ لیں۔ اس دوران بلال، عمار، یاسر، سمیہ، حباب ابن ارت صہیب، عامر بن فھیرہ، ابوفکیھہ، لبیبہ، زبیدہ، نھدیہ اور اُم عبیس (رضی اللہ تعالیٰ عنھم) وغیرہ پر اُنہوں نے ناقابل برداشت دباؤ ڈالا یہاں تک کہ یاسر اور سمیہ اسی راستے میں شہید ہوگئے۔ پیغمبر اسلام ﷺ جب اُن کے قریب سے گذرے تو فرمایا:

"صَبْراً آلَ يَاسِرٍ فَاِنَّ مَوْعِدَكُمُ الْجَنَّةُ"

---

[1] کامل ابن اثیر، جلد ۱، صفحہ ۴۹۰ و طبری جلد ۲، صفحہ

یعنی: ''اے خاندان یاسر صبر و استقامت کرو کہ تمہاری وعدہ گاہ بہشت ہے۔''[1]

تاریخ کے مطابق اُن کو کس طرح اذیتیں دی جاتی تھیں اور وہ آگے سے کیا جواب دیتے تھے، دلچسپ، عبرت انگیز اور پڑھنے کے قابل ہے

تہمت اور استہزاء

جب مؤمنین پر دباؤ، اذیت و آزار اور شہادت کا حربہ بھی کامیاب نہ ہوا تو انہوں نے خود پیغمبر اکرم ﷺ پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا اور آپ ؐ کے حامیوں کا مذاق اُڑانا، استہزاء کرنا اور جادوگر، کاہن، شاعر اور مجنون جیسی تہمتیں لگانی شروع کر دیں تاکہ پیغمبر ؐ میدان چھوڑ دیں۔[2]

اس دوران آپ ؐ پر سخت دباؤ ڈالا گیا۔ ابولہب، اسود بن عبد یغوث، حارث بن قیس، ولید بن مغیرہ، ابی روامیۃ بن خلف، ابوقیس، عاص بن وائل، نصر بن حارث اور کچھ دوسرے لوگ تھے کہ جنہوں نے پیغمبر ﷺ اور مسلمانوں پر بہت سخت دباؤ ڈالا اور تہمت واستہزاء کے ذریعے اذیتیں دیں۔ سیرۂ ابن ہشام میں ہے:

"اِنَّهُ خَرَجَ يَوْماً فَلَمْ يَلْقَهُ اَحَدٌ مِنَ النَّاسِ اِلاَّ كَذَّبَهُ وَ اٰذَاهُ لاٰ حُرٌّ وَلاٰ عَبْدٌ فَرَجَعَ رَسُولُ اللّٰهِ اِلىٰ مَنْزِلِهِ فَتَدَثَّرَ مِنْ شِدَّةِ مٰا اَصٰابَهُ"۔

یعنی: ''ایک دن آپ ؐ گھر سے نکلے تو آپ ؐ کو کوئی ایسا شخص خواہ وہ غلام ہو یا آزاد نہیں ملا جس نے آپ ؐ کی تکذیب اور آپ کو اذیت نہ پہنچائی ہو۔ پیغمبر ﷺ گھر واپس لوٹ آئے اور اذیت و آزار کی شدت سے ایک کپڑا اپنے اوپر ڈال لیا''[3]

تاریخ کا کہنا ہے:

"اَبُولَهَبٍ كٰانَ شَدِيداً عَلَيْهِ وَ عَلَى الْمُسْلِمِينَ عَظِيمَ التَّكْذِيبِ لَهُ، دٰائِمَ الْاَذىٰ، فَكٰانَ يَطْرَحُ الْعَذَرَةَ وَ النَّتِنَ عِنْدَ بٰابِ النَّبِيِّ وَ كٰانَ جٰارَهُ فَكٰانَ رَسُولُ اللّٰهِ يَقُولُ اَیُّ

---

[1] کامل ابن اثیر، جلد ۱، صفحہ ۴۹۱

[2] طبری جلد ۲ صفحہ ۱۷ و سیرۂ ابن ہشام، جزء ۱، صفحہ ۳۰۸ و کامل جلد ۱، صفحہ ۴۹۳۔ ابن ہشام کا متن یہ ہے: ''ثم ان قریشاً اشتدّ امرھم للشفاء الذی اصابھم فی عداۃ رسول اللہ ومن اسلم معہ منھم فاعروا برسول اللہ سفھاءھم فکذّبوہ وآذوہ ورموہ بالشعر والسحر والکھانۃ والجنون ورسول اللہ مظھر لامر اللہ لایستخفی بہ۔''

[3] سیرۃ ابن ہشام جزء ۱، صفحہ ۳۱۰۔

جِوٰارِ هٰذٰا يٰا بَنِي عَبْدِالْمُطَّلِبِ"۔

''ابولہب، آپؐ اور مسلمانوں کے بارے میں زیادہ سختی دکھاتا تھا، آپ کی بہت زیادہ تکذیب کرتا اور ہمیشہ آپؐ کو اذیت پہنچاتا، گندی چیزیں آپؐ کے گھر میں پھینک دیتا چونکہ وہ حضرت کا ہمسایہ تھا۔ رسول خداؐ فرماتے: اے عبدالمطلب کی اولاد! تم کیسے ہمسائے ہو؟''

اسود جب نادار مسلمانوں کو دیکھتا تھا تو اُن کا مذاق اُڑاتے ہوئے کہتا:

"هٰؤُلاٰءِ مُلُوكُ الْأَرْضِ"

یعنی: ''یہ زمین کے بادشاہ ہیں''

اور عاص بن وائل کہتا تھا:

"اِنَّ مُحَمَّداً اَبْتَرُ لاٰ يَعِيشُ لَهُ وَلَدٌ ذَكَرٌ..."

یعنی: 'محمد باقی نہیں رہے گا، ابتر ہے چونکہ اس کا کوئی بیٹا نہیں ہے۔''[1]

حبشہ کی طرف ہجرت

دباؤ زیادہ ہوجانے کی وجہ سے آنحضرت ﷺ پر ضروری ہوگیا کہ آپ مستضعف اور بے چارے مسلمانوں کی اس حالت کے بارے میں کچھ سوچیں اور کوئی فیصلہ کریں۔ پیغمبر اکرم ﷺ نے مشرکین کے دباؤ سے مسلمانوں کو نجات دلانے کے لئے اُنہیں سرزمین ''حبشہ'' کی طرف ہجرت کرنے کے لئے تیار کیا۔ بعثت کے پانچویں سال یعنی؛ اعلانیہ دعوت کے دوسال بعد ماہ رجب میں اُن میں سے کچھ لوگوں کو حبشہ کی جانب بھیج دیا گیا۔[2]

اس ہجرت کے ساتھ اسلام ایک جدید سمت میں چل پڑا اور نئی پیش رفت کی۔ کیونکہ قریش نے مہاجرین کو حبشہ سے واپس لانے کا ارادہ کیا تاکہ اُن پر دباؤ جاری رکھ سکیں۔ اُنہوں نے قیمتی اور گرانقدر ہدایا کے ساتھ حبشہ کے بادشاہ ''نجاشی'' کے سامنے یہ مسئلہ رکھا۔ اُنہوں نے اپنے ہدایا اور تحائف کے ذریعے نجاشی کے تمام ساتھیوں کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا، لیکن اس کے باوجود نجاشی نے کہا: جو لوگ میرے ہاں پناہ لئے ہوئے، جب تک میں اُن کی بات نہ سن لوں، اُنہیں تمہارے حوالے نہیں کروں گا، اُس نے مسلمانوں کو بلایا اور اُن سے پناہ لینے کی وجہ پوچھی۔

جعفر بن ابی طالبؓ نے کہ جو پہلے سے ہی اُن کے ترجمان کے عنوان سے منتخب ہوچکے تھے، نجاشی کے سوالات کا جواب دیا اور

---

[1] کامل ابن اثیر، جلد ۱، صفحہ ۴۹۳ وطبری جلد ۲، صفحہ ۷۰۔

[2] سیرۃ ابن ہشام، جزء ۱، صفحہ ۳۴۴، کامل جلد ۱، صفحہ ۴۹۸۔

اسکی درخواست پراس کے سامنے ''سورۂ مریم'' کی چند آیات کی تلاوت کی، ان آیات میں حضرت مریم اور حضرت عیسی علیہما السلام کے بارے میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عقیدہ واضح ہو گیا تھا۔ نجاشی نے مسلمانوں سے کہا: تم لوگ میری امان میں ہو اور قریش کی طرف سے آئے ہوئے لوگوں کو واپس بھیج دیا۔ تاریخ میں ہے کہ نجاشی نے پوچھا: تم لوگوں نے جو دین اختیار کیا ہے، وہ کیا ہے؟

فَقٰالَ جَعْفَرُ: أَيُّهَا الْمَلِكُ كُنّا اَهْلَ جاهِلِيَّةٍ نَعْبُدُ الْاَصْنامَ وَنَأْكُلُ الْمَيْتَةَ وَ نَأْتِي الْفَواحِشَ وَ نَقْطَعُ الْاَرْحامَ وَ نُسِيئُ الْجِوارَ، وَيَأْكُلُ الْقَوِيُّ مِنَّا الضَّعِيف حَتّٰى بَعَثَ اللهُ اِلَيْنا رَسُولاً مِنّا نَعْرِفُ نَسَبَهُ، وَ صِدْقَهُ وَ اَمانَتَهُ وَ عِفافَهُ فَدَعانا لِتَوْحِيدِ اللهِ وَ اَنْ لا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئاً وَ نَخْلَعَ ما كُنّا نَعْبُدُ مِنَ الْاَصْنامِ وَ اَمَرَنا بِصِدْقِ الْحَدِيثِ وَ اَداءِ الْاَمانَةِ وَ صِلَةِ الرَّحِمِ وَ حُسْنِ الْجِوارِ وَالْكَفِّ عَنِ الْمَحارِمِ وَ الدِّماءِ وَ نَهانا عَنِ الْفَواحِشِ وَ قَوْلِ الزُّورِ وَاَكْلِ مالِ الْيَتيمِ وَ اَمَرَنا بِالصَّلاةِ وَ الصِّيامِ...

فَاَمَنّا بِهِ وَ صَدَّقْناهُ وَ حَرَّمْنا ما حَرَّمَ عَلَيْنا وَ حَلَّلْنا ما اَحَلَّ لَنا فَتَعَدّٰى عَلَيْنا قَوْمُنا فَعَذَّبُونا وَ فَتَنُونا عَنْ دِينِنا لِيَرُدُّونا اِلٰى عِبادَةِ الْاَوْثانِ فَلَمّا قَهَرُونا وَ ظَلَمُونا وَ حالُوا بَيْنَنا وَ بَيْنَ دِينِنا خَرَجْنا اِلٰى بِلادِكَ وَ اخْتَرْناكَ عَلٰى مَنْ سِواكَ وَ رَجَوْنا اَنْ لا نُظْلَمَ عِنْدَكَ اَيُّهَا الْمَلِكُ:

''اے بادشاہ! ہم جاہلیت میں زندگی گذار رہے تھے، بتوں کی پوجا کرتے تھے، مردار کھاتے تھے، فحش کام کرتے تھے، قطع رحم کرتے، ہمسایوں کے ساتھ بُرا سلوک کرتے، طاقتور کمزوروں کا مال کھا جاتے تھے، یہاں تک کہ خدا نے ایک پیغمبرؐ ہمارے درمیان مبعوث فرمایا کہ جس کا حسب ونسب ہم جانتے تھے، اس کی صداقت، امانت اور عفت سے آشنا تھے، اُس نے ہمیں توحید اور یکتائی کی طرف دعوت دی اور ہم سے چاہا کہ ہم خدا کے ساتھ کسی کو شریک قرار نہ دیں، بتوں کی پرستش سے ہاتھ کھینچ لیں، اُس نے ہمیں سچ بولنے، امانت ادا کرنے صلہ رحم کرنے اچھا ہمسایہ بننے، حرام کاموں سے بچنے اور خون خرابہ نہ کرنے کا حکم دیا، اُس نے ہمیں فحش کاموں، جھوٹ اور مال یتیم کھانے سے منع کیا اور ہمیں حکم دیا کہ ہم نماز پڑھیں اور روزہ رکھیں۔

ہم بھی اس پر ایمان لے آئے اور اس کی تصدیق کی، اُس نے جو کچھ ہم پر حرام کیا، اُسے حرام جانا اور جس چیز کو حلال قرار دیا اسے حلال سمجھا۔ اسی لئے ہماری قوم اور قبیلے نے ہم پر تجاوز کرنا جائز سمجھا اور ہمیں سخت

اذیتیں دیں اور آزار پہنچایا تا کہ ہمیں بتوں کی پرستش کی طرف پلٹا دیں۔ جب وہ ہمارے اوپر مسلط ہو گئے اور ہمارے اوپر ظلم وستم ڈھانے شروع کئے اور ہمارے اور ہمارے دینی فرائض کے درمیان حائل ہونا شروع ہوئے تو ہم نے آپ کی سرزمین کی طرف ہجرت کی اور تمام حکمرانوں میں سے آپ کا انتخاب کیا اور ہمیں اُمید ہے کہ آپ کی پناہ میں ہم پر ظلم وستم نہیں ہوگا۔"

نجاشی نے قرآن کی آیات سننے کے بعد حضرت مریم -اور حضرت عیسیٰ - کے بارے میں کچھ باتیں کیں اور کہا:

"اِذْهَبُوا فَاَنْتُمْ اٰمِنُونَ مٰا اُحِبُّ اَنَّ لِي جَبَلاً مِنْ ذَهَبٍ وَ اِنِّي اٰذَيْتُ رَجُلاً مِنْكُمْ"

یعنی: "جاؤ تم امان میں ہو، میں ہرگز ایک پہاڑ کے برابر سونے کے بدلے بھی تم میں سے کسی ایک کو اذیت نہیں دونگا۔" [۱]

قریش کا بھیجا ہوا وفد سرنیچے کئے ہوئے واپس لوٹ آیا۔ انہی دنوں ایک اور واقعہ رونما ہوا، اور وہ قبیلہ بنی ہاشم سے حضرت حمزہ ؓ جیسے بہادر اور طاقتور انسان کا اسلام قبول کرنا تھا جس سے اسلام کی پیش رفت میں ایک بار پھر اضافہ ہو گیا۔ [۲]

اب اسلام ترقی کر رہا تھا اور اس کی سب سے بڑی وجہ مسلمانوں میں جرات کا پیدا ہو جانا تھا۔ مسلمانوں نے مکہ میں ملکر علی الاعلان قرآن کی تلاوت کا ارادہ کیا، اس کے لئے رضا کارانہ طور پر ابن مسعود تیار ہوئے اُن سے کہا گیا: مار پیٹ کا نشانہ بنو گے۔ اس سلسلے میں تاریخ کہتی ہے:

فَغَدٰا عَلَيْهِمْ فِي الضُّحىٰ حَتّٰى اَتَى الْمَقٰامَ وَ قُرَيْشٌ فِي اَنْدِيَتِهٰا ثُمَّ رَفَعَ صَوْتَهُ وَقَرَاَ سُورَةَ (الرحمان) فَلَمّٰا عَلِمَت قُرَيْشٌ اَنَّهُ يَقْرَءُ الْقُرْاٰنَ قٰامُوا اِلَيْهِ يَضْرِبُونَهُ وَ هُوَ يَقْرَأُ ثُمَّ انْصَرَفَ اِلىٰ اَصْحٰابِهِ وَ قَدْ اَثَّرُوا فِي وَجْهِهِ فَقٰالُوا هٰذَا الَّذِي خَشِيْنٰا عَلَيْكَ فَقٰالَ مٰا كٰانَ اَعْدٰاءُ اللهِ اَهْوَنُ عَلَيَّ مِنْهُمُ الْيَوْمَ وَلَئِنْ شِئْتُمْ لَاُغٰادِيَنَّهُمْ. قٰالُوا حَسْبُكَ:

"دوسری صبح دن چڑھے جب قریش مقام ابراہیم کے نزدیک ایک مجلس مشورت میں بیٹھے ہوئے تھے، وہ (ابن مسعود) ان کے نزدیک آئے اور اُونچی آواز سے سورۂ "رحمن" کی تلاوت شروع کر دی، قریش نے جب سنا کہ وہ قرآن پڑھ رہے ہیں تو اُٹھ کر اُن پر حملہ کر دیا اور اُنہیں بہت زیادہ مارا پیٹا، لیکن وہ اسی طرح قرآن پڑھتے رہے۔ اس کے بعد وہ اپنے ساتھیوں کے پاس آئے جبکہ اُن کے سر وصورت پر مار پیٹ کے

---

[۱] ابن ہشام، جزء ۱، صفحہ ۳۵۸، کامل جلد ۱، صفحہ ۴۹۹ وطبری جلد ۲، صفحہ ۷۳۔

[۲] ابن ہشام، جزء ۱، صفحہ ۳۱۱، کامل جلد ۱، صفحہ ۵۰۱ وطبری جلد ۲، صفحہ ۷۴۔

آثار نمایاں تھے۔ اُنہوں نے کہا ہمیں یہی ڈر تھا، اُنہوں نے کہا کوئی بات نہیں یہ دشمنان خدا میرے نزدیک بہت معمولی ہیں، اگر تم چاہو توکل پھر جا کر اُن کے نزدیک قرآن پڑھوں گا۔"[۱]

یہاں سے پتا چلتا ہے کہ مسلمان اپنی عبادات کعبہ کے پاس ہی انجام دیتے تھے جبکہ اُن کی تعداد (۶۰) افراد سے زیادہ ہو چکی تھی اور قرآن کی تعلیم کے لئے وہ ایک دوسرے کے گھروں میں آتے جاتے تھے۔

اقتصادی بائیکاٹ

جب مکہ کے ظالموں نے دیکھا کہ اُن کا سابقہ کوئی بھی حربہ موثر واقع نہیں ہو رہا اور اسلام اُسی طرح ترقی کر رہا ہے تو اُنہوں اپنے درمیان ایک معاہدہ کرنے کا ارادہ کیا جس میں لکھا کہ بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب میں سے کسی کے ساتھ بھی معاشی اور معاشرتی تعلق نہیں رکھا جائے گا تا کہ یہ (اقتصادی) دباؤ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے راستے سے روک دے:

"وَلَمَّا رَاَتْ قُرَيْشٌ الْإِسْلَامَ يَفْشُو وَيَزِيدُ وَ اَنَّ الْمُسْلِمِينَ قَوُوا... وَعَادَ اِلَيْهِمْ عَمْرُو بْنُ عَاصٍ وَ عَبْدُاللهِ بْنُ اَبِي اُمَيَّةَ مِنَ النَّجَاشِي بِمَا يَكْرَهُونَ مِنْ وَضْعِ الْمُسْلِمِينَ عَنْهُمْ وَاَمَّنَهُمْ، اِئْتَمَرُوا فِي اَنْ يَكْتُبُوا بَيْنَهُمْ كِتَاباً يَتَعَاقَدُونَ فِيهِ عَلىٰ اَنْ لاٰ يَنْكِحُوا بَنِي هَاشِمٍ وَ بَنِي الْمُطَّلِبِ وَ لاٰ يَنْكِحُوا اِلَيْهِمْ وَ الاٰ يَبِيعُوهُمْ وَ لاٰ يَبْتَاعُوا مِنْهُمْ شَيْئاً فَكَتَبُوا بِذٰلِكَ صَحِيفَةً وَتَعَاهَدُوا عَلىٰ ذٰلِكَ ثُمَّ عَلَّقُوا الصَّحِيفَةَ فِي جَوْفِ الْكَعْبَةِ تَوْكِيداً لِذٰلِكَ الْاَمْرِ عَلىٰ اَنْفُسِهِمْ"

"قریش نے جب دیکھا کہ اسلام تو آگے بڑھ رہا ہے، مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے اور وہ طاقتور ہو رہے ہیں۔ اور عمر بن عاص اور عبداللہ بن ابی اُمیہ بھی حبشہ کے سفر سے واپس آ چکے ہیں اور نجاشی کی جانب سے کوئی خوشی کی خبر نہیں لائے، بلکہ نجاشی نے اُلٹا اُنہیں پناہ فراہم کی ہے تو اُنہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اپنے درمیان ایک معاہدہ لکھا جائے کہ اس کے بعد بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب کو نہ تو رشتہ دیا جائے اور نہ اُن سے کوئی رشتہ لیا جائے، اسی طرح نہ انہیں کوئی چیز فروخت کی جائے نہ اُن سے کوئی چیز خریدی جائے، یہ معاہدہ لکھا گیا اور اس پر دستخط کر دیئے گئے اور مزید تاکید کے لئے اس معاہدے کو خانہ کعبہ کے اندر لٹکا دیا گیا تا کہ کوئی اس معاہدے کی خلاف ورزی نہ کرے۔"[۲]

---

[۱] کامل جلد ا، صفحہ ۵۰۲، سیرۂ ابن ہشام، جزء ا، صفحہ ۳۳۶ و طبری جلد ۲، صفحہ ۷۳۔

[۲] کامل جلد ا، صفحہ ۵۰۴، سیرۂ ابن ہشام، جزء ا، صفحہ ۳۷۵ و طبری جلد ۲، صفحہ ۷۴۔

یہاں اُنہوں نے یہ معاشی دباؤ تمام بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب پر ڈالا تا کہ اس قبیلے کے اندر دباؤ اور اختلاف پیدا کیا جائے اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلیم ہو جانے پر مجبور کیا جائے۔ تین سال تک ان لوگوں کو مکمل محاصرے میں رکھا گیا اور وہ فقط خفیہ طور پر ہی کچھ نہ کچھ لے جا سکتے تھے۔ اس طرح وہ ہر چیز سے محروم ہو چکے تھے۔[1]

لیکن اس کے باوجود یہ سازش بھی ناکام ہو گئی اور اُن کے معاہدے کو چیونٹی نے کھا لیا اور اُن میں سے کچھ لوگ اس غیر انسانی عمل سے تنگ آ کر معاہدہ ختم کرنے پر تیار ہو گئے تھے۔[2]

اور آخر کار رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اُن کا قبیلہ مکہ کے معاشرے میں دوبارہ لوٹ آئے۔ اسلام اسی طرح ترقی کرتا رہا اور رسول اکرمؐ نے اپنا کام جاری رکھا، لیکن اس دوران دو واقعات ایسے رونما ہوئے کہ جن کی وجہ سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مزید دباؤ بڑھ گیا اور وہ حضرت ابو طالبؑ اور حضرت خدیجہ × کی وفات کا واقعہ تھا کہ جو ہجرت سے تین سال پہلے رونما ہوا ہے۔[3]

کہتے ہیں کہ اس وقت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اس قدر سختیاں آئیں کہ:

"حَتّٰی یَنْثُرَ بَعْضُھُمُ التُّرَابَ عَلٰی رَأْسِہٖ وَ حَتّٰی اَنَّ بَعْضَھُمْ یَطْرَحُ رَحِمَ الشَّاۃِ وَ ھُوَ یُصَلِّیْ..."

یعنی: ''بعض آپؐ کے سر پر خاک ڈالتے تھے اور بعض نماز کی حالت میں بکری کا رحم آپؐ کے بدن مبارک پر ڈال دیتے تھے۔''

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے طائف میں ''طایفہ ثقیف'' کے کچھ لوگوں سے رابطہ کرنے کا ارادہ کیا اور رکاوٹوں کو دور کرنے اور اسلام کی پیش رفت کے لئے اُن سے مدد لینی چاہی لیکن اُنہوں نے بھی آپؐ کو جھٹلا دیا اور اپنے آپ سے دور کر دیا، اس وقت آپؐ پر بہت سخت وقت آ گیا تھا آپؐ نے اپنی معروف دعا پڑھی۔ تاریخ میں آیا ہے:

"فَقَامَ رَسُوْلَ اللّٰہِ وَقَدْ یَئِسَ مِنْ خَیْرِ ثَقِیفٍ... وَاَغْرَوْا بِہٖ سُفَھَاءَھُمْ فَاجْتَمَعُوْا اِلَیْہِ وَاَلْجَؤُوْہُ اِلٰی حَائِطِ الْعُتْبَۃِ وَ شَیْبَۃِ ابْنَیْ رَبِیعَۃٍ... وَرَجَعَ السُّفَھَاءُ عَنْہُ وَ جَلَسَ اِلٰی ظِلِّ حِبْلَۃٍ وَ قَالَ: اَللّٰھُمَّ اِلَیْکَ اَشْکُو ضَعْفَ قُوَّتِیْ وَ قِلَّۃَ حِیلَتِیْ وَ ھَوَانِیْ عَلَی النَّاسِ۔
اَللّٰھُمَّ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ اَنْتَ رَبُّ الْمُسْتَضْعَفِیْنَ وَ اَنْتَ رَبِّیْ اِلٰی مَنْ تَکِلُنِیْ اِلٰی بَعِیْدٍ یَتَجَھَّمُنِیْ اَوْ اِلٰی عَدُوٍّ مَلَّکْتَہُ اَمْرِیْ اِنْ لَمْ یَکُنْ بِکَ عَلَیَّ غَضَبٌ فَلَا اُبَالِیْ وَلٰکِنْ

---

[1] سیرۃ ابن ہشام، جزء ۱، صفحہ ۳۷۹۔

[2] کامل جلد ۱، صفحہ ۵۰۵، سیرۃ ابن ہشام، جزء ۲، صفحہ ۱۴ و طبری جلد ۲، صفحہ ۷۸۔

[3] کامل جلد ۱، صفحہ ۵۰۷، سیرۃ ابن ہشام، جزء ۲، صفحہ ۵۷ و طبری جلد ۲، صفحہ ۸۰۔

عافِيَتُكَ هِيَ اَوسَعُ اِنّي اَعُوذُ بِنُورِ وَجهِكَ الَّذي اَشرَقَت بِهِ الظُّلُماتُ وَ صَلُحَ عَلَيهِ اَمرُ الدُّنيا وَالآخِرَةِ مِن اَن تَنزِلَ بي غَضَبُكَ اَو تَحُلَّ بي سَخَطُكَ"

''پیغمبر اکرم ﷺ طایفہ ثقیف کی طرف سے بھلائی اور مدد سے مایوس ہو گئے تو جانے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اُنہوں نے اپنے کم عقل اور دیوانوں کو آپؐ پر حملہ کرنے کا اشارہ کیا، وہ سب آپؐ پر ٹوٹ پڑے اور اس قدر اذیت و آزار پہنچایا کہ آپؐ نے مجبوراً ربیعہ کے بیٹوں عتبہ و شیبہ کے باغ کی دیوار کے زیر سایہ پناہ لی۔ جب وہ لوگ واپس پلٹ گئے تو ایک انگور کے درخت کے نیچے بیٹھ کر آپؐ نے یوں فرمایا: اے پروردگار! اپنی کمزوری و ناتوانی، کمی تدبیر، اور لوگوں کی عدم توجہ کی تیری بارگاہ میں شکایت کرتا ہوں۔ اے مہربانوں کے مہربان تُو ہی کمزوروں کا پروردگار ہے، میرا بھی مالک اور پروردگار ہے۔''[1]

ربیعہ کے بیٹوں نے تھوڑے سے انگور اپنے نصرانی غلام ''عداس'' کو دیے کہ وہ یہ انگور آنحضرتؐ کو دے۔ جب انگور آپؐ کے سامنے رکھے گئے تو پیغمبر اکرم ﷺ نے ہاتھ بڑھایا اور فرمایا: بسم اللہ اور اس کے بعد وہ انگور تناول فرمائے۔ ''عداس'' نے کہا: یہ کلمہ تو اس علاقے کے لوگ نہیں کہتے، پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا: تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ اس نے جواب دیا: نینوا کا رہنے والا ہوں، فرمایا: تمہارا مذہب کیا ہے؟ اس نے جواب دیا۔ آخر کار وہ پیغمبر اسلام ﷺ کے دست مبارک پر اسلام لے آیا اور آنحضرتؐ کا ہاتھ چوما اور چلا گیا۔ اسطرح رسول خدا ﷺ اس سفر سے ناکام واپس نہیں لوٹے۔[2]

جدید تبلیغ کا آغاز

ان سب مشکلات کے باوجود پیغمبر اکرم ﷺ نے اپنا مشن نہیں چھوڑا۔ زمانہ حج میں آپؐ مختلف قبائل سے ملتے اور اُنہیں اسلام کی دعوت دیتے، قبیلہ ''کندہ'' سے قبیلہ ''کلب'' اور ''بنی حنیفہ'' غرضیکہ جو بھی خانہ خدا کی زیارت کے لئے آیا ہوا ہوتا، اور جو بھی مکہ میں داخل ہوتا اس کے سامنے اپنی دعوت کا اعلان فرماتے، ابولہب ہر جگہ آپؐ کے پیچھے پیچھے رہتا اور آپؐ کی باتوں کو جھٹلاتا رہتا۔[3]

رسول اللہ ﷺ کی مدینہ کے لوگوں سے ملاقات

---

[1] کامل جلد ۱، صفحہ ۵۰۸ و طبری جلد ۲، صفحہ ۸۱۔

[2] کامل جلد ۱، صفحہ ۵۰۸، سیرۂ ابن ہشام، جزء ۲، صفحہ ۶۱، ۶۲ و طبری جلد ۲، صفحہ ۸۳، ۸۴۔

[3] کامل، صفحہ ۵۰۹، سیرۂ ابن ہشام، جزء ۲، صفحہ ۶۳ و طبری جلد ۲، صفحہ ۸۳، ۸۴۔

مدینہ کے قبیلہ اوس سے ''سوید بن صامت'' حج کے لئے مکہ آیا ہوا تھا۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس سے ملاقات کر کے اُسے اسلام کی دعوت دی اور اسکے لئے قرآن کی تلاوت فرمائی اور اُس نے اسے ایک اچھا کلام قرار دیا اور مدینہ واپس لوٹ گیا اور مسلمان ہی دنیا سے کوچ کر گیا۔ اس کے بعد ''ابوحیسر'' نام کا ایک شخص ''بنی عبدالاشھل'' کے کچھ جوانوں کے ہمراہ مکہ میں داخل ہوا۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے بھی ملاقات کی اور اُنہیں اسلام کی دعوت دی اور اُن کے لئے بھی قرآن کی تلاوت فرمائی۔ اُن میں سے ایک شخص ''ایاس بن معاذ'' نے ابوحیسر سے کہا: ہم مکہ ''ہم پیمان'' کی تلاش میں آئے ہیں، اور یہ وہی ہے جس کی ہمیں تلاش ہے، لیکن ابوحیسر نے اُسے مثبت جواب نہیں دیا۔ کچھ عرصے بعد ایاس اس دنیا سے کوچ کر گیا لیکن اس کے رشتہ داروں کا کہنا تھا کہ وہ اسی طرح ''لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ'' اور تکبیر کہتا ہوا اس دنیا سے رخصت ہوا ہے۔[1]

پہلی بیعت عقبہ

دوسرے سال مراسم حج کے دوران، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ کے بعض لوگوں سے ملاقات کی جو کہ بعد میں انصار کے نام سے مشہور ہوئے ہیں، یہ ملاقات عقبہ میں تھی، یہ قبیلہ خزرج کے لوگ تھے۔ آپؐ نے اُنہیں خدا اور اسلام کی طرف دعوت دی۔ چونکہ ان لوگوں نے سنا ہوا تھا کہ یہودی کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ اسی زمانے میں ایک پیغمبر مبعوث فرمائے گا اور ہم اُس کی مدد سے، تم اہل خزرج کو ختم کر ڈالیں گے۔ اُنہوں ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کہا یہ وہی پیغمبر ہے۔

لہٰذا اُنہوں نے آپؐ کو مثبت جواب دیا، اور آپؐ کی تصدیق کرتے ہوئے کہا: ہمارے لوگوں کے درمیان شدید اختلاف ہے، اُمید ہے اللہ تعالیٰ آپؐ کے وسیلے سے ہمارے درمیان اتحاد قائم کر دے گا۔ یہ سات لوگ تھے: اسعد بن زرارہ، عوف بن حارث، رافع بن مالک، عامر بن عبد حادثہ، قطبہ بن عامر، عقبۃ بن عامر اور جابر بن عبداللہ۔[2]

حج کے مراسم ختم ہو جانے کے بعد یہ لوگ مدینہ واپس آ گئے اور لوگوں کے سامنے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں بات چیت کی اور اُنہیں اسلام کی دعوت دی یہاں تک کہ مدینہ کے لوگوں میں بھی اسلام کا نام روشن ہو گیا۔ اگلے سال حج کے دنوں میں ۱۲ افراد نے عقبہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات (اور بیعت کی اور اسے بیعت عقبہ اول کہا جانے لگا) واپسی کے وقت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلام اور قرآن کی تعلیم دینے کے لئے مصعب بن عمیر کو اُن کے ہمراہ بھیجا۔

مصعب، اسعد بن زرارہ کے گھر ٹھہرے تو جو لوگ مسلمان ہو چکے تھے، اُن کے اردگرد جمع ہو گئے، اس طرح اُنہوں نے اسلام کی تبلیغ شروع کر دی۔ مصعب نے اپنے خاص طریقے سے مدینہ کے لوگوں کو اسلام کی دعوت دی یہاں تک کہ قبیلہ عبدالاشھل کا ایسا کوئی گھر باقی نہیں بچا کہ جس سے کوئی مرد یا عورت مسلمان نہ ہو گیا ہو۔ اُنہوں نے اپنی دعوت کو جاری رکھا اور اس طرح مدینہ میں بہت زیادہ لوگ

---

[1] کامل جلد ۱، صفحہ ۵۱۰، سیرۂ ابن ہشام، جزء ۲، صفحہ ۶۹ وطبری جلد ۲، صفحہ ۸۵۔

[2] کامل جلد ۱، صفحہ ۵۱۰، سیرۂ ابن ہشام، جزء ۲، صفحہ ۷۰ وطبری جلد ۲، صفحہ ۸۶، ۸۸۔

اسلام کے پیرو کار بن گئے۔[1]

دوسری بیعت عقبہ

مدینہ میں انصار کے درمیان اسلام کے پھیلاؤ کی وجہ سے کچھ لوگوں نے سفر حج کے دوران پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خفیہ ملاقات کرنے اور اپنے مسائل اور مدینہ میں آنحضرتؐ کی دعوت کے بارے میں گفتگو کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان لوگوں کی تعداد ۷۲ تھی جن میں ۷۰ مرد اور ۲ عورتیں تھیں جو انتہائی خفیہ طریقے سے آدھی رات گذرنے کے بعد ایک ایک کر کے معین شدہ مقام پر آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ بھی آپؐ کے ساتھ تھے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دفاع کے بارے میں اُنہوں نے بہت زیادہ باتیں کیں اور تعاون کا وعدہ کیا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی عہد پورا کرنے کا وعدہ دیا۔[2]

اس مجلس میں جو باتیں ہوئیں وہ بہت ہی دلچسپ اور بامعنیٰ ہیں، حضرت عباسؓ نے بات کا آغاز کرتے ہوئے کہا:

"اِنَّ مُحَمَّداً مِنّا حَيْثُ قَدْ عَلِمْتُمْ فِي عِزٍّ وَ مَنَعَةٍ وَ اِنَّهُ قَدْ اَبىٰ اِلاَّ الْاِنْقِطاعَ اِلَيْكُمْ فَاِنْ كُنْتُمْ تَرَوْنَ اَنَّكُمْ وافُونَ لَهُ بِما دَعَوْتُمُوهُ اِلَيْهِ وَ مانِعُوهُ وَ اَنْتُمْ ذٰلِكَ وَ اِنْ كُنْتُمْ تَرَوْنَ اَنَّكُمْ مُسْلِمُوهُ فَمِنَ الْآنِ فَدَعُوهُ فَاِنَّهُ فِي عِزٍّ وَمَنَعَةٍ"

''تم جانتے ہو کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقام و مرتبہ بہت عزت والا ہے اور اُن کا اچھی طرح دفاع کیا جاتا ہے۔ لیکن اب اُنہوں نے تم لوگوں کے درمیان رہنے کا پکا فیصلہ کرلیا ہے، اگر تم جانتے ہو کہ جس چیز کی طرف اُنہیں دعوت دے رہے ہو اس میں وفادار رہو گے اور اُن کا دفاع کرو گے تو بہت اچھا ہے اور اگر اُنہیں دشمن کے حوالے کرنا ہے تو ابھی ہی اُنہیں چھوڑ دیں چونکہ وہ عزت و قدرت میں رہیں گے۔''

انصار نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کی: آپؐ ہم سے جو چاہتے ہیں، بیان فرمائیں:

"فَتَكَلَّمَ وَتَلاَ الْقُرْآنَ وَرَغَبَ فِي الْاِسْلامِ ثُمَّ قالَ تَمْنَعُونِي مِمّا تَمْنَعُونَ مِنْهُ نِسائَكُمْ وَ اَبْنائَكُمْ"

یعنی: ''آپؐ نے گفتگو فرمائی، قرآن کی تلاوت کی اور اُنہیں اسلام کی ترغیب دلائی پھر فرمایا: میرا دفاع اسی طرح کرو جس طرح اپنی عورتوں اور اولاد کا دفاع کرتے ہو''

''براء بن معرور'' نے آپ کا ہاتھ تھام کر کہا:

---

[1] کامل جلد ۱، صفحہ ۵۱۰، سیرۂ ابن ہشام، جزء ۲، صفحہ ۷۰، طبری جلد ۲، صفحہ ۸۶/۸۸

[2] کامل جلد ۱، صفحہ ۵۱۱، سیرۂ ابن ہشام، جزء ۲، صفحہ ۷۳

"وَالَّذِي بَعَثَكَ بِالْحَقِّ لَنَمْنَعَنَّكَ مِمَّا نَمْنَعُ مِنْهُ أُزُرَنَا فَبَايِعْنَا يَا رَسُولَ اللهِ فَنَحْنُ وَاللهِ أَهْلُ الْحَرْبِ"

یعنی: ''اس ذات کی قسم کہ جس نے آپ ؐ کو برحق مبعوث کیا ہے؛ ہم آپ ؐ کا دفاع اسی طرح کریں گے جس طرح اپنے بچوں اور خاندان کا کرتے ہیں، اے رسول خدا ؐ! ہم سے بیعت کیجئے کہ ہم میدان جنگ کے مرد ہیں۔''

اَبُو الْہَیْثَم ابْنِ یَتِّہَا نے کہا:

"يَا رَسُولَ اللهِ إِنَّ بَيْنَنَا وَبَيْنَ النَّاسِ حِبَالاً وَإِنَّا قَاطِعُوهَا يَعْنِي الْيَهُودَ فَهَلْ عَسَيْتَ إِنْ أَظْهَرَكَ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ أَنْ تَرْجِعَ إِلَى قَوْمِكَ وَتَدَعَنَا؟"

یعنی: ''اے رسول خدا ؐ! ہمارے اور لوگوں (یہود) کے درمیان ایک تعلق قائم تھا جو ہم نے توڑ ڈالا ہے، ایسا نہ ہو کہ جب اللہ تعالیٰ آپ ؐ کو اپنے دشمنوں پر فتح دیدے تو آپ ؐ اپنی قوم و قبیلے کی طرف لوٹ جائیں اور ہمیں تنہا چھوڑ دیں؟''

"فَتَبَسَّمَ رَسُولُ اللهِ (ص) وَقَالَ: بَلِ الدَّمَ الدَّمَ وَالْهَدْمَ الْهَدْمَ أَنْتُمْ مِنِّي وَأَنَا مِنْكُمْ أُسَالِمُ مَنْ سَالَمْتُمْ وَأُحَارِبُ مَنْ حَارَبْتُمْ وَقَالَ رَسُولُ اللهِ أَخْرِجُوا إِلَيَّ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيباً يَكُونُونَ عَلَى قَوْمِهِمْ فَأَخْرَجُوهُمْ تِسْعَةٌ مِنَ الْخَزْرَجِ وَثَلَاثَةٌ مِنَ الْأَوْسِ۔"

''رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسکرائے اور فرمایا: نہیں، خون کے بدلے خون اور خرابی کے بدلے خرابی ہوگی (جو کچھ تمہارے ساتھ ہوگا وہی ہمارے ساتھ بھی ہوگا) آپ لوگ مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں، جس کے ساتھ بھی صلح کرو گے، میری بھی اس سے صلح ہوگی اور جس کے ساتھ جنگ کرو گے، میں بھی اس سے جنگ کرونگا، اب بارہ لوگوں کو سرپرست اور مسئول کے عنوان سے انتخاب کر کے مجھے بتاؤ کہ اُن میں سے ہر ایک اپنے قبیلے کی ذمہ داری قبول کرے، اُنہوں نے نو افراد خزرج سے اور تین افراد اوس سے انتخاب کئے۔''

یہاں پر عباس بن عبادہ نے دور اندیشی کرتے ہوئے ایک دلچسپ نکتے کی طرف اشارہ کیا اور کہا:

"يَا مَعْشَرَ الْخَزْرَجِ هَلْ تَدْرُونَ عَلَامَ تُبَايِعُونَ هَذَا الرَّجُلَ تُبَايِعُونَهُ عَلَى حَرْبِ الْأَحْمَرِ وَالْأَسْوَدِ فَإِنْ كُنْتُمْ تَرَوْنَ أَنَّكُمْ إِذَا نَهَكَتْ أَمْوَالُكُمْ مُصِيبَةً وَأَشْرَافُكُمْ

قَتْلاً اَسْلَمْتُمُوهُ فَمِنَ الْآنِ، فَهُوَ وَاللهِ خِزْیُ الدُّنْیا وَالْآخِرَةِ وَاِنْ كُنْتُمْ تَرَوْنَ وَاُخُونَ لَهُ فَخُذُوهُ فَهُوَ وَاللهِ خَیْرُ الدُّنْیا وَالْآخِرَةِ، قالُوا:
فَاِنّا نَأْخُذُهُ عَلىٰ مُصیبَةِ الْاَمْوالِ وَقَتْلِ الْاَشْرافِ فَمالَنا بِذٰلِكَ یا رَسُولَ اللهِ قالَ: اَلْجَنَّةُ قالُوا اَبْسِطْ یَدَكَ فَبایَعُوهُ۔"

''اے اہل خزرج، تمہیں خبر ہے کہ اس ہستی کے ساتھ کس چیز پر عہد و پیمان کر رہے ہو؟! میں جو دیکھ رہا ہوں یہ عرب و عجم اور سیاہ و سفید سے اعلان جنگ ہے، اگر تم جانتے ہو کہ جب تمہارا مال تباہ ہو گیا تو اسے اپنے لئے مصیبت سمجھو گے اور اگر تمہارے اشراف میں سے کوئی قتل ہو گیا تو اُسے چھوڑ دو گئے تو ابھی سے ہی اُسے چھوڑ دو اور اس سے بیعت نہ کرو ورنہ دنیا و آخرت کی رسوائی اُٹھانے پڑے گی، لیکن اگر جانتے ہو کہ اپنے اپنے عہد و پیمان کا پاس کرلو گے تو اس کے ارد گرد جمع ہو جاؤ کیونکہ اسی میں دنیا و آخرت کی بھلائی ہے۔

اُنہوں نے کہا: ہم اسی پر بیعت کر رہے ہیں، خواہ اس کی خاطر ہمارا مال تباہ ہو جائے اور ہمارے اشراف اور اکابر مارے جائیں۔ البتہ رسول خدا ﷺ سے ہمارا سوال یہ ہے کہ اس جان نثاری کے عوض ہمیں کیا ملے گا؟ آپؐ نے فرمایا: جنت! اُنہوں کہا: اپنا دست مبارک دراز کیجئے تا کہ ہم آپؐ کی بیعت کریں۔''[۱]

اس عظیم کامیابی کی وجہ سے مکہ کے لوگوں نے مسلمانوں پر بہت ہی سخت دباؤ ڈالنا شروع کر دیا، اس وقت پیغمبر اسلامؐ نے مکہ کے مسلمانوں کو مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم دیا۔[۲]

ہجرت؛ تاریخ اسلام کا جدید دور

مسلمانوں کی مدینے سے ہجرت کے بعد پیغمبر اسلام ﷺ مکہ میں حکم خدا کے منتظر تھے، دوسری جانب قریش مدینہ کے مسلمانوں کے اسلام قبول کرنے اور مکہ کے مسلمانوں کی ہجرت سے سخت خطرہ محسوس کر رہے تھے۔ اس بار اُنہوں نے تحریک اسلام کے اصلی قائد یعنی؛ پیغمبر اکرم ﷺ کا کام تمام کرنے کا فیصلہ کرلیا، بہت زیادہ مشوروں کے بعد یہ طے پایا کہ قریش کے تمام قبائل آپؐ کے قتل میں شریک ہوں گے، اسی موقع پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہجرت کا حکم آ گیا۔[۳]

ماہ ربیع الاول کے شروع میں پیغمبر اسلام ﷺ معجزانہ طور پر دشمن کے گھیرے سے نجات پا کر مدینہ کی جانب روانہ ہو گئے اور

---

[۱] کامل جلد ۱، صفحہ ۵۱۳، سیرۂ ابن ہشام، جزء ۲، صفحہ ۸۸۔
[۲] سیرۂ ابن ہشام، جزء ۲، صفحہ ۱۱۲، کامل جلد ۱، صفحہ ۵۱۵، وطبری جلد ۲، صفحہ ۹۷۔
[۳] سیرۂ ابن ہشام، جزء ۲، صفحہ ۱۲۳، کامل جلد ۲، صفحہ ۵۱۵۔

بارہویں دن جو کہ پیر کا دن تھا آپ محلہ قبا میں داخل ہوئے۔[1]

پیغمبرؐ جمعرات کے دن تک وہیں قیام فرما رہے اور وہاں مسجد قبا کی بنیاد رکھی اور جمعہ کی نماز قبا کے نزدیک قبیلہ بنی سالم کے درمیان ادا کی اور یہ مدینے میں جمعہ کا پہلا خطبہ اور پہلی نماز جمعہ تھی کہ جو خود رسول اللہ ﷺ نے پڑھائی۔

اس کے بعد وہاں سے آپؐ مدینہ کی جانب روانہ ہو گئے۔ مدینہ میں داخل ہوتے ہی لوگوں نے پیغمبر اکرم ﷺ کا پُرجوش استقبال کیا، جس سے اسلام کی پیشرفت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ یہاں آنحضرت ﷺ نے جو پہلا کام کیا ہے وہ مسجد کی تعمیر تھی جو کہ مسلمانوں کی عبادت، مشورے اور اجتماع کا بنیادی مقام تھا۔[2]

لیکن اسی دوران مدینے میں بھی مسلمانوں اور اسلام کے خلاف سازشیں اور مخالفتیں شروع ہو گئیں۔ لہٰذا پیغمبر ﷺ کے لئے ان سازشوں کو ختم کرنے لئے اسلحہ اُٹھانے اور مدینے کے مسلمانوں کی عظیم طاقت سے استفادہ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا۔ مدینہ میں آنے کے سات ماہ بعد قریش کے تجارتی قافلے کو روکنے کے لئے اپنے چچا ''حضرت حمزہ ؓ'' کی سرپرستی میں پہلا گروہ تیار کیا، اس کے بعد دوسرا گروہ ''سعد بن وقاص'' کی سرگردگی میں ''ابواء'' کی جانب روانہ کیا۔

اس کے بعد قریش کے قافلے کی تعاقب کے لئے ''بواط'' کی لڑائی اور غزوہ ''العشیرہ'' ترتیب دیا۔ دوسرے سال مکہ و طائف کے درمیان قریش کے ساتھ لڑائی کے لئے سریہ ''عبداللہ بن جحش'' اور اسی سال جنگ بدر کا واقعہ رونما ہوا کہ جس میں شیطان صفت کفر کے سردار جہنم واصل ہوئے اور بہت زیادہ تعداد میں اہل مکہ اسیر بھی ہوئے۔ اس کامیابی کے بعد مسلمانوں کے حوصلے بلند ہونے لگے اور اُن کے خوف سے دشمن کے دل لرزنے لگے۔

اس کے بعد غزوہ ''بنی قینقاع'' مدینہ کے یہودیوں کی عہد شکنی کی وجہ سے وقوع پذیر ہوا۔ اسی طرح ابوسفیان کے حملے کے مقابلے میں قبیلہ بنی سلیم اور ''سویق'' کے خلاف غزوہ ''کدر'' واقع ہوا۔ ہجرت کے تیسرے سال جب ''بنی ثعلبہ'' نے مسلمانوں پر حملہ کرنا چاہا تو جنگ ''غطفان'' اور غزوہ ''بنی سلیم'' انجام پایا۔

اس میں اسلام کے خلاف ہمیشہ سازش کرنے والے دو شیطان صفت شخص یعنی: ''کعب بن اشرف'' اور ''ابورافع'' اسلام کے شجاع جوانوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ اس کے بعد جنگ ''اُحد'' واقع ہوئی اور پھر غزوہ ''حمراء الاسد'' ہوا۔ اگر چہ اُحد میں مسلمانوں کو وقتی شکست ہو گئی تھی، لیکن اسکی وجہ سے مسلمانوں کا غرور ختم ہوا اور وہ ایک سنجیدہ جنگ کرنے کے لئے آمادہ ہو گئے تھے چونکہ غفلت، غرور اور مادیات کی طرف توجہ کا نتیجہ شکست ہی ہوتا ہے۔

ہجرت کے چوتھے سال قبیلہ ''عضل'' کی سرکوبی لے لئے غزوہ ''رجیع'' واقعہ ہوا جو کہ مبلغین اسلام کو اغواء کر کے لے گئے تھے اور اُنہیں دشمنوں کے حوالے کر دیا تھا۔ اسی طرح ''بئر معونہ'' کا واقعہ ہوا کہ جس میں ۷۰ افراد کہ جو لوگوں کو اسلام کی دعوت دینا چاہتے تھے،

---

[1] سیرۃ ابن ہشام، جزء ۲، صفحہ ۱۳۸، کامل جلد ۲، صفحہ ۵۱۸، وطبری جلد ۲، صفحہ ۱۰۰۔

[2] سیرۃ ابن ہشام، جزء ۲، صفحہ ۱۴۳، کامل جلد ۲، صفحہ ۵۲۱، وطبری جلد ۲، صفحہ ۱۱۶/۱۰۶۔

قتل کردیئے گئے تھے اور ''اجلاء بنی نصیر'' جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل کا ارادہ رکھتے تھے اور جن سب کو پیغمبرؐ نے مدینہ سے باہر نکال دیا تھا۔ اسی طرح قبیلہ غطفان کے بنی ثعلبہ اور بنی محارب قبائل کے مقابلے میں غزوہ ''ذات الرقاع'' وقوع پذیر ہوا اور اسی سال ابوسفیان کے تعاقب میں ''بدر ثانی'' کا واقعہ ہوا۔ بہرحال ان جنگوں کی وجہ سے جزیرۃ العرب میں اسلام کی طاقت اور پیشرفت سب پر واضح ہوگئی تھی۔

ہجرت کے پانچویں سال، جب کہ تمام عرب قبائل اس جدید طاقت کے مقابلے میں خطرے کا احساس کر رہے تھے، ایک دوسرے کے ساتھ اس بات پر متفق ہوگئے کہ اس طاقت کو ختم کر دیا جائے تاکہ علاقے میں ظلم وشرک کے خلاف ایک طاقت اپنی بنیادیں مضبوط نہ کرسکے۔ اس مقصد کی خاطر اُنہوں نے جنگ ''احزاب'' شروع کی، لیکن اس میں بھی شکست کے بعد اُن کو یقین ہوگیا کہ اب مسلمانوں پر حملے اور انہیں ختم کرنے کا خیال دروازے کے ساتھ سر ٹکرانا ہے۔

اسی سال غزوہ ''بنی قریظہ'' وقوع پذیر ہوا جس کی وجہ سے مسلمانوں کے ہمسائے میں سے ایک سازشی گروہ کا خاتمہ ہوگیا۔

ہجرت کے چھٹے سال، مسلمانوں اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اموال کو لوٹنے والے گروہ کے خلاف غزوہ ''ذی قرد'' واقع ہوا، اسی طرح اسلام کے خلاف جمع ہونے والے بنی مصطلق کے اجتماع کو شکست سے دوچار ہونا پڑا کہ جو ''غزوۂ بنی مصطلق'' کے نام سے مشہور ہے اور یہ سب (واقعات) اسلام کی طاقت کی علامت تھے۔

حدیبیہ؛ ایک عظیم واضح کامیابی

چھٹی ہجری میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دلچسپ اور فاتحانہ اقدام کیا اور اعلان کیا کہ مسلمان عمرہ کرنے کی تیاری کریں اور قربانی کے لئے اُونٹ بھی اپنے ہمراہ لے لیں تاکہ اہل مکہ جان لیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنگ کا ارادہ نہیں رکھتے۔ بطور اطمینان اس واقعہ کے دو بڑے اثرات مترتب ہونے تھے، ایک یہ کہ مسلمان جزیرۃ العرب میں کسی سے خوفزدہ نہیں ہیں، دوسرا یہ کہ مکہ میں داخل ہونے سے اسلام کی بت پرستی کے مرکز کے ساتھ مقابلہ کرنے کی طاقت کا مظاہرہ ہونا تھا جس سے اسلام کی پیشرفت اور ترقی ظاہر ہوتی ہے۔

کیونکہ مکہ اس وقت اسلام کے خلاف سازش اور طاقت کا سب سے اہم مرکز تھا۔ جب اہل مکہ کو اس بات کا پتا چلا تو اُنہوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا راستہ روکنا چاہا۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب کے ساتھ ایک محکم بیعت کی کہ جو ''بیعت رضوان'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ قریش نے جب یہ خبر سنی تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ صلح کرنے پر آمادہ ہوگئے۔ صلح کا معاہدہ انجام پانے کے بعد طے یہ پایا کہ گلے سال مشرکین مکہ کو خالی کردیں گے تاکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عمرہ کے لئے وہاں جاسکیں۔[1]

درحقیقت اس پیمان پر دستخط ہونے سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے اپنے دوسرے چھوٹے بڑے دشمنوں کو بھی ختم کرنے یا انہیں اپنے آگے تسلیم کرنے کا راستہ ہموار ہوگیا کہ جو کبھی کبھار سازش یا مسلمانوں کے لئے مسئلہ کھڑا کرسکتے تھے۔ لہٰذا حدیبیہ سے واپس آنے کے فوراً بعد آپؐ نے ان دشمنوں کی سرکوبی کے لئے عسکری قوتیں جمع کرنا شروع کردیں۔

---

[1] کامل جلد ۱، صفحہ ۵۸۲، سیرۂ ابن ہشام، جزء ۳، صفحہ ۳۲۱ و طبری جلد ۲، صفحہ ۲۷۰

''بنی اسد'' کے مقابلے میں سریہ ''عکاشہ'' اور بنی ثعلبہ کے لئے سریہ ''محمد بن مسلمہ''، ذی القصد کی جانب سریہ ''ابوعبیدہ جراح''، ''زید بن حارثہ''[1] کے چھ قسم کے سرایا، ''جموع'' کے مقابلے کے لئے اور ''عیص''، ''طرف''، ''حسمی''، ''وادی القری'' اور ''ام قرفہ'' کی طرف بھیجے گئے۔

اسی طرح ''دومۃ الجندل'' کی طرف ''عبد الرحمان بن عوف'' کے لشکر اور ''فدک'' کی طرف ''علی بن ابی طالب لشکر'' اور ''عرینین'' کی جانب ''کرز بن جابر'' لشکر[2] ایسی جنگیں تھیں کہ جو صلح حدیبیہ کے فوراً بعد انجام پائی ہیں۔[3]

اس طرح بہت سے ایسے قبائل کہ جو اسلام کا مقابلہ کرنے کی تیاری کر رہے تھے، کوئی موثر کاروائی کرنے سے پہلے ہی شکست کھا گئے تھے۔ اب اسلام طاقتور ہو چکا تھا، قبائل نے بھی مسلمانوں پر حملہ کرنے کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا تھا اور اہل مکہ نے اپنی کمزوری کا احساس کرتے ہوئے معاہدہ کر کے اسلامی حکومت کو قبول کر لیا تھا۔

حکومتی سربراہوں کو خطوط

اب جبکہ اسلام طاقور ہو چکا تھا، لہٰذا اس کا جزیرۃ العرب سے باہر نکلنا ضروری ہو چکا تھا اور اسلام کی شعاعیں اس علاقے سے باہر بھی پڑنی چاہیں تھیں۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے اللہ کے فرمان کی انجام دہی کے لئے کسریٰ (شاہ ایران)، قیصر (بادشاہ روم)[4] نجاشی (حبشہ کے حکمران) اور مقوقس (مصری بادشاہ) اور چند دوسرے حکمرانوں کی طرف کچھ پیام رسانوں کو خطوط کے ہمراہ بھیجا اور اُنہیں اسلام کی دعوت دی، سوائے ایران کے بادشاہ خسرو پرویز کے۔

بعض نے مثبت جواب دیا اور بعض نے خاموشی اختیار کر لی تھی اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یا تو اُن تک اسلام کی صحیح تبلیغات پہنچ چکی تھیں اور وہ اسلام کے حقائق سے آگاہ ہو چکے تھے یا وہ اسلام کی طاقت کا احساس کر چکے تھے اور اُن تک اس کی رپورٹ پہنچ چکی تھی اور اُنہوں نے اسلام کے خلاف عسکری قوت استعمال نہ کرنے میں ہی مصلحت سمجھی۔[5]

باقی بچ جانے والے سازشی مراکز میں سے ایک یہودیوں کا مرکز ''خیبر'' تھا۔[6]

جس کو شکست دینا ضروری ہو چکا تھا۔ لہٰذا ساتویں ہجری میں پیغمبر اکرم ﷺ نے اس کے علاوہ سرزمین فدک کے ایک اور

---

[1] سیرۂ ابن ہشام، جزء ۳، صفحہ ۵۳۔

[2] ابن ہشام، جزء ۴، صفحہ ۲۹۰۔

[3] کامل جلد ۱، صفحہ ۵۸۸۔۵۹۰۔

[4] طبری، جلد ۲، صفحہ ۲۸۸

[5] کامل، جلد ۱، صفحہ ۵۹۱

[6] طبری، جلد ۲، صفحہ ۲۹۸، سیرۃ ابن ہشام، جلد ۳، صفحہ ۳۴۲

یہودی قبیلے کو اپنا مطیع بنانے کا فیصلہ کرلیا۔اس کے بعد بہت سے اور سرایا بھی رونما ہوئے جن میں اسلام نے پہلے کی طرح فتح حاصل کی۔اور اب جزیرۃ العرب میں اسلام ایک بڑی طاقت کے عنوان پہچانا جانے لگا تھا اور حدیبیہ میں ہونے معاہدے والے سے استفادہ کرنے اور مسلمانوں کے خانہ خدا کی زیارت اور عمرہ کرنے کا وقت آپہنچا تھا۔

پیغمبر ﷺ نے ماہ ذی الحجہ میں خیبر سے واپس آنے کے بعد اُن تمام مسلمانوں جو چھٹے سال عمرہ کے لئے آنحضرتؐ کے ساتھ تھے، سے فرمایا کہ ہم سفر مکہ کے لئے تیار ہورہے ہیں۔[1]

مکہ کے لوگوں نے یہ خبر سننے کے بعد (معاہدے کے مطابق) اپنے اپنے گھروں کو چھوڑ کر پہاڑوں کی طرف چلے گئے، مسلمان مکہ میں داخل ہوئے تو اس وقت پیغمبر اسلام ﷺ نے اعلان فرمایا:

"رَحِمَ اللهُ امْرَءاً اَرَاهُمُ الْيَوْمَ مِنْ نَفْسِهِ قُوَّةً"

یعنی: ''خدا اس شخص پر رحمت کرے کہ جو آج کفار کے سامنے اپنی طاقت دکھائے۔''

اور اس طرح مسلمانوں کی خانہ خدا کی زیارت کرنے کی آرزو بھی پوری ہوگئی اور اہل مکہ کے سامنے اسلام کی طاقت کی نمائش بھی انجام پاگئی۔[2]

آٹھویں ہجری شروع ہوگئی تو پیغمبر اسلام ﷺ نے اسلامی طاقت کا دائرہ مزید وسیع کردیا۔''بنی الملوح'' کے خلاف ''سریہ غالب بن عبداللہ لیثی''، ''علاء بن حضرمی''، ''بحرین'' کے خلاف، ایک قول کے مطابق سریہ ''شجاع بن وھب'' بنی عامر، سریہ ''عمرو بن کعب غفاری'' (شام کے نواح میں) ''ذات الاطلاح'' کے خلاف واقعہ ہوا۔اسی سال عمرو بن عاص اسلام کی دعوت دینے کے لئے سرزمین ''بلی وعذرہ'' کی جانب روانہ ہوئے کہ جو ''غزوۂ'' ''ذات السلاسل'' کے نام سے مشہور ہوا۔[3]

اسی طرح اسی سال آپؐ نے عمرو بن عاص کو عمان میں جلندی کی اولاد ''جیفر وعیاذ'' کی جانب بھیجا کہ جو ایمان لے آئے اور مجوسیوں سے جزیہ بھی لیا گیا۔پھر اسی سال ''ابوعبیدہ جراح'' کی سرگردگی میں غزوۂ ''خبط'' رونما ہوا اور جن لوگوں نے رسول خداؐ کے خلاف جنگ کے لئے فوج کو جمع کیا تھا، ان کے مقابلے میں سریہ ''ابوقتادہ'' واقع ہوا اور اسی سال شام کے علاقے میں سرزمین موتہ پر تین ہزار افراد کے ساتھ غزوۂ ''موتہ'' واقع ہوا۔[4]

جنگ موتہ میں سپاہ اسلام کے چند کمانڈروں کی شہادت سے ممکن تھا مسلمانوں میں کمزوری کا احساس پیدا ہوجاتا اور دشمن کے لئے یہ جنگ ایک بڑی کامیابی سمجھی جاتی، لیکن اسی دروان فتح مکہ کے مقدمات بھی فراہم ہوگئے تھے، چونکہ قبیلہ ''خزاعہ'' رسول خدا

---

[1] طبری، جلد ۲، صفحہ ۳۹۰، ابن ہشام، جلد ۴، صفحہ ۱۲

[2] کامل، جلد ا، صفحہ ۶۰۲

[3] ابن ہشام، جلد ۴، صفحہ ۲۷۲

[4] سیرۂ ابن ہشام، جلد ۴، صفحہ ۱۵، طبری جلد ۲، صفحہ ۳۱۸

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہم پیمان تھا جبکہ قبیلہ ''بنی بکر'' قریش کا ہم پیمان تھا، بنی بکر نے، بنی خزاعہ پر حملہ کر دیا اور قریش نے اُس کی حمایت کرنی شروع کر دی جس کی وجہ سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی اپنے ہم پیمان قبیلے کی مدد کرنا پڑی۔

پیغمبر اکرمؐ نے جنگ مکہ کا حکم جاری کر دیا اور انتہائی دقیق منصوبہ بندی کرتے ہوئے دس ہزار سپاہیوں کے ساتھ اس طرح مکہ پر مسلط ہو گئے کہ بغیر کسی جنگ اور لڑائی کے حرم امن الٰہی میں اپنے اصلی مقصد تک جا پہنچے اور اس طرح اسلام کے مخالف اصلی مرکز شرک کا صفایا ہو گیا۔[۱]

جب ''ابوسفیان'' نے اسلامی طاقت وقدرت کو دیکھا تو اس نے عظمت اسلام کا اعتراف کرتے ہوئے حضرت عباسؓ سے کہا:

"لَقَدْ اَصْبَحَ مُلْكُ بْنِ اَخِيكَ عَظِيماً"

یعنی: ''تیرا بھتیجا ایک بڑی سلطنت پر فائز ہو گیا ہے۔''

حضرت عباسؓ نے اُس کو جواب دیا:

"وَيْحَكَ اِنَّهُ النُّبُوَّةُ"

یعنی: ''وائے ہو تم پر یہ سلطنت نہیں بلکہ نبوت ہے۔''[۲]

وہ معروف نعرے کہ جو حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خانہ کعبہ کے دروازے کے سامنے دعا کی صورت میں بلند کیے تھے اور کچھ جاہلی آداب ورسوم کے باطل ہونے کا اعلان فرمایا، لہٰذا جب آپؐ مکہ میں داخل ہوئے تو ایک سیاہ عمامہ سر مبارک پر رکھا ہوا تھا۔ آپؐ نے کعبہ کے دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر فرمایا:

"لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ صَدَقَ وَعْدَهُ وَنَصَرَ عَبْدَهُ وَهَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَهُ۔"

یعنی: ''خدائے واحد و یکتا کے سوا کوئی خدا نہیں جس نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا، اپنے بندے کی نصرت فرمائی اور اکیلے تمام احزاب (گروہوں) کو شکست دے کر بھگا دیا۔''

اس کے بعد مزید فرمایا:

"اَلَا كُلُّ دَمٍ (فی الجاهلیة) اَوْ مَاْثَرَةٍ اَوْ مَالٍ يُدَّعىٰ فَهُوَ تَحْتَ قَدَمَيَّ هَاتَيْنِ اِلَّا سُدَانَةَ الْبَيْتِ وَسِقَايَةَ الْحَاجِّ ثُمَّ قَالَ يَامَعْشَرَ قُرَيْشٍ مَاتَرَوْنَ اِنِّي فَاعِلٌ بِكُمْ قَالُوا خَيْراً اَخٌ كَرِيمٌ وَابْنُ اَخٍ كَرِيمٍ قَالَ: اِذْهَبُوا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ۔"

سن لو زمانہ جاہلیت کے تمام خون اور دعوے (باطل) اور میرے پاؤں کے نیچے ہیں، سوائے کعبہ کی خدمت

---

[۱] کامل جلد ۱، صفحہ ۶۰۹، سیرہ ابن ہشام، جلد ۴، صفحہ ۳۱، طبری جلد ۲، صفحہ ۳۲۳

[۲] کامل جلد ۱، صفحہ ۶۱۴

اور حجاج کو پانی پلانے کے۔ پھر فرمایا: اے قریش! جانتے ہو میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں گا؟ اُنہوں نے کہا آپ اچھا ہی سلوک کریں گے کیونکہ آپ شریف بھائی اور کریم و بزرگوار بھائی کے بیٹے ہیں! آپ نے فرمایا: جاؤ تم سب آزاد ہو۔[۱]

اس کے بعد پیغمبر اسلامؐ نے کچھ فوجی دستوں کو قبائلی فتنوں کی آگ بجھانے کے لئے مکہ کے گرد ونواح کی طرف روانہ کیا۔[۲]

اور قبیلہ ہوازن جو کہ اسلامی لشکر سے لڑنے کی تیاری کر رہا تھا؛ سے ''حنین'' میں شدید لڑائی ہوئی اور اُنہیں شکست سے دوچار ہونا پڑا۔[۳]

اس کے ساتھ ہی طائف کا بھی محاصرہ کر لیا گیا جس کے نتیجے میں وہ بہت جلد اُن کے سامنے تسلیم ہو گئے۔[۴]

جب نویں ہجری کا سال شروع ہوا تو اس وقت مشرکین اور یہود و نصاریٰ کی سازشوں کے مراکز شکست کھا چکے تھے اور مسلمان اُن کی جانب سے مکمل طور پر مطمئن ہو چکے تھے۔ اس سرزمین پر ایک نئی طاقت تشکیل پا چکی تھی اور اس علاقے کے تمام قبائل اور سردار یا تو مسلمان ہو چکے تھے یا اُن کے سامنے تسلیم ہو گئے تھے۔ اسی دوران خبر ملی کہ ''روم'' کی سلطنت کا بادشاہ ''ہرقل'' اور کچھ عرب جو دین نصرانیت کو قبول کر چکے تھے، اسلامی مملکت پر حملے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب کو روم کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے تیار ہونے کا حکم دے دیا۔

مورخین کا کہنا ہے کہ آنحضرتؐ کی سیرت کے برعکس کہ جس میں آپؐ میدان جنگ کو مخفی رکھتے تھے، جنگی علاقے کا اعلان، راستے کے دور ہونے وغیرہ کی وجہ سے تھا، لیکن بظاہر یہ دشمن پر رعب ڈالنے کے لئے تھا۔ بہت مشکل اور انتہائی قلیل وسائل کے ساتھ فوج تیار ہو کر تبوک کی جانب چل پڑی اور تبوک جا پہنچی[۵]

جس کی وجہ سے اُسے ''جیش العسرۃ'' کا نام دیا گیا ہے جب یہ فوج ''ایلہ کی بندرگاہ'' پہنچی تو وہاں کا حاکم صلح کرنے اور جزیہ ادا کرنے پر تیار ہو گیا، لہٰذا ان کے درمیان مصالحت برقرار ہو گئی۔[۶]

آپؐ نے خالد بن ولید کو ''دومۃ الجندل'' کے حاکم کی جانب بھیجا، اُس نے بھی جزیہ دینا قبول کر لیا۔[۷]

---

[۱] کامل جلد ۱، صفحہ ۶۲۰

[۲] کامل جلد ۱، صفحہ ۶۱۸، سیرہ ابن ہشام، جلد ۴، صفحہ ۷۰

[۳] کامل جلد ۱، صفحہ ۶۲۴، شیرہ ابن ہشام، جلد ۴، صفحہ ۸۰، طبری جلد ۲، ص ۳۴۴۔

[۴] ایضاً، صفحہ ۶۲۸، سیرۂ ابن ہشام، جلد ۴، صفحہ ۱۲۲۔

[۵] کامل، صفحہ ۵۳۵، سیرۂ ابن ہشام جلد ۴، صفحہ ۱۵۹، طبری جلد ۲، صفحہ ۳۷۳۔

[۶] ایضاً صفحہ ۲۶۷، سیرۂ ابن ہشام جلد ۴، صفحہ ۱۲۲

[۷] ایضاً صفحہ ۸۳۶

رسول خدا ﷺ تبوک میں تقریباً ۱۵ دن قیام فرما رہے، لیکن رومی فوج کی کوئی خبر نہ ملی لہٰذا آپؐ واپس لوٹ آئے۔[۱] اس سال قبیلۂ ثقیف کا ایک وفد پیغمبر اکرم ﷺ کے پاس آیا اور مسلمان ہو گیا۔[۲]

اسی وقت قبیلہ ''طی'' کو بتوں سے پاک کرنے کے لئے حضرت علی علیہ السلام کو مامور کیا گیا جس کے دوران لڑائی میں حاتم طائی کی بیٹی قید ہو گئی جس کے نتیجے میں ''عدی بن حاتم'' وغیرہ نے اسلام قبول کر لیا۔[۳]

فتح مکہ، قبیلۂ ثقیف اور تبوک کی جنگ سے فراغت نے اسلام کی عظمت اور حقانیت کو مزید ثابت کر دیا اور دوسرے قبائل بھی تدریجاً اسلامی تعلیمات سے آگاہ ہونے لگے اور پیغمبر اسلام ﷺ کی خدمت میں پہنچ کر اسلام قبول کرنے یا کم از کم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ دشمنی اور عداوت ترک کرنے کا وعدہ کرنے لگے تھے۔ اس کے بعد مختلف قبائل کی جانب سے نمائندہ وفد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آنے لگے لہٰذا اس سال کو ''عام الوفود'' کا نام دیا گیا ہے۔[۴]

بنی اسد کا وفد آپؐ کی خدمت پہنچا تو اس نے کہا:

''اَتَیْنَاكَ قَبْلَ اَنْ تُرْسِلَ اِلَیْنَا رَسُولًا''

یعنی: ''اس سے پہلے کہ آپؐ ہماری طرف کسی کو بھیجتے ہم خود آپؐ کے پاس آ گئے ہیں۔''

اسی طرح ''بلی''، ''زاریین''، اور ''بنی تمیم'' کا وفد بھی آپؐ کی خدمت حاضر ہوا۔[۵]

اسی طرح ''حِمیَر'' کے بادشاہوں اور سلاطین کی جانب سے اسلامی حکومت کی طاقت وقدرت کو قبول کرنے پر دلالت کرنے والے خطوط بھی آپؐ کے پاس آئے۔[۶]

اسی طرح ''بھراء''، ''بنی البکاء''، ''بنی فزارہ''، ''ثعلبۃ بن منقذ'' اور ''سعد بن بکر'' کے وفود بھی مدینہ آئے۔[۷]

شرک اور بت پرستی سے بیزاری اور سورۂ برائت کی آیات میں مشرکین کے لئے مراسم (حج) میں شرکت کی ممانعت کا حضرت علی علیہ السلام کے ذریعے اعلان بھی اسی سال ہوا تھا:

''فَاَقَامَ النَّاسُ الْحَجَّ وَ حَجَّتِ الْعَرَبُ الْكُفَّارُ عَلٰی عَادَتِهِمْ فِی الْجَاهِلِیَّةِ وَ عَلِیٌّ یُؤَذِّنُ

---

[۱] ایضاً صفحہ ۸۳۶

[۲] ایضاً جلد ا صفحہ ۸۳۶

[۳] ایضاً صفحہ ۰۴۶

[۴] ایضاً صفحہ ۱۴۶، سیرۂ ابن ہشام جلد ۴، ص ۲۰۵

[۵] کامل جلد ا، صفحہ ۶۴۲

[۶] سیرۂ ابن ہشام جلد ۴، صفحہ ۲۳۵۔

[۷] کامل جلد ا، صفحہ ۶۴۴

بِبَرَائَةٍ فَنَادٰی یَوْمَ الْاَضْحیٰ: لاٰ یَحُجَّنَّ بَعْدَ الْعَامِ مُشْرِكٌ وَ لاٰ یَطُوفَنَّ بِالْبَیْتِ عُرْیَانٌ وَ مَنْ کَانَ بَیْنَہُ وَبَیْنَ رَسُولِ اللهِ عَھْدٌ فَاَجَلُہُ اِلیٰ مُدَّتِہِ"

''لوگ حج کر رہے تھے اور عرب بھی دوران جاہلیت کی عادت کے مطابق مراسم حج میں شریک تھے، اس وقت حضرت علیؑ نے اعلان برائت کیا اور عید قربان کے دن اعلان فرمایا: سب جان لیں کہ اس کے بعد کوئی بھی مشرک حج کے مراسم میں شریک نہیں ہوگا، اور کوئی بھی خانہ خدا کا برہنہ طواف نہیں کرے گا۔ اور سب لوگ جان لیں کہ جس نے بھی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کوئی عہد و پیمان کیا ہوا ہے تو وہ اپنی مدت ختم ہونے تک باقی رہے گا۔''[1]

جب دسویں ہجری کا سال شروع ہوا تو اسلام کی آواز ہر جگہ تک پہنچ چکی تھی اور اس وقت نجران کے عیسائی مباہلہ کرنے کے لئے آئے اور مباہلہ کیئے بغیر واپس لوٹ گئے۔

"وَصَالَحُوہُ عَلیٰ الْفَيْ حُلَّةٍ ثَمَنُ کُلِّ حُلَّةٍ اَرْبَعُونَ دِرْھَماً وَ عَلیٰ اَنْ یُضَیِّفُوا رُسُلَ رَسُولَ اللهِ وَجَعَلَ لَھُمْ ذِمَّةَ اللهِ تعالیٰ وعَھْدَہُ اَلاَّ یُفْتِنُوا عَنْ دِینِھِمْ وَ لاٰ یُعْشِرُوا وَ شَرَطَ عَلَیْھِمْ اَنْ لاٰ یَاْکُلُوا الرِّبٰا وَ لاٰ یَتَعٰامَلُو بِہِ"

''دو ہزار حُلّہ کے بدلے اُنہوں نے آپؐ سے مصالحت کر لی، ہر حُلّہ کی قیمت چالیس درہم تھی نیز آپؐ نے اُن سے عہد لیا کہ وہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بھیجے ہوئے افراد کی پذیرائی کریں گے اور اُن کے لئے پیمان الٰہی قرار دیا کہ کوئی بھی نجران کے عیسائیوں کو اپنا مذہب چھوڑنے پر مجبور نہیں کرے گا اور اُن سے عشر (زکات) نہیں لے گا اور اُن کے ساتھ شرط کی گئی کہ وہ سود (ربا) نہیں کھائیں گے اور سودی معاملہ نہیں کریں گے۔''[2]

اسی سال کچھ دوسرے وفود مثلاً ''سلامان'' ''غبشان''، وفد ''عامر''، وفد ''ازد''، وفد ''مراد''، وفد ''زبید''، ''عمرو بن معدی کرب'' کے ساتھ اور وفد ''عبد بن قیس'' وفد ''بنی حنیفہ'' وفد ''کندہ'' وفد ''محارب''، وفد ''رھاویین'' وفد ''عبس'' وفد ''صدف''، وفد ''خولان''، وفد

---

[1] کامل جلد ۱، صفحہ ۶۴۴، سیرۂ ابن ہشام جلد ۴، صفحہ ۱۹۰۔

[2] کامل جلد ۱، صفحہ ۶۴۶

''بنی عامر''اور وفد''طی''وغیرہ سب اسلام اور پیغمبر ﷺ سے اعلان وفاداری کرنے کے لئے مدینہ میں حاضر ہوئے۔[1]

اسلام کی ترقی اور قدرت کا مظاہرہ ہم''حجۃ الوداع''میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔بعض روایات کے مطابق خانہ خدا کی زیارت کے لئے پیغمبر اسلام ﷺ کے ہمراہ ایک لاکھ سے زیادہ افراد چل پڑے تھے اور یہ اُس زمانے میں سب سے بڑا روحانی اجتماع تھا اسی طرح اس سفر کے دوران آپؑ نے جو خطبات دیئے خواہ وہ مکہ میں ہوں یا عرفات میں، منیٰ میں ہوں یا حجۃ الوداع کے راستے میں سب تاریخ میں موجود ہیں۔غدیر خم کے مقام پر اپنے جانشین کے تقرر کے با قاعدہ اعلان کے موقع پر جو خطبہ ارشاد فرمایا اُسے تاریخ نے یوں بیان کیا ہے:

"فَاَرٰاهُمْ مَنٰاسِكَهُمْ وَ عَلَّمَهُمْ سُنَنَ حَجِّهِمْ وَ خَطَبَ خُطْبَةَ الَّتِي بَيَّنَ فِيهٰا لِلنّٰاسِ مٰا بَيَّنَ وَ كٰانَ الَّذِي يَبْلُغُ عَنْهُ بِعَرَفَةَ رَبِيعَةُ بْن خَلَفٍ لِكَثْرَةِ النّٰاسِ فَقٰالَ بَعْدَ حَمْدِ اللهِ: اَيُّهَا النّٰاسُ اسْمَعُوا قَوْلِي فَلَعَلِّي لاٰ اَلْقٰاكُمْ بَعْدَ عٰامِي هٰذٰا بِهٰذٰا الْمَوْقِفِ اَبَداً
اَيُّهَا النّٰاسُ اِنَ دِمٰائَكُمْ وَ اَمْوٰالَكُمْ عَلَيْكُمْ حَرٰامٌ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هَذٰا، وَ كُلُّ رِباً مَوضُوعٌ لَكُمْ رُؤُسُ اَمْوٰالِكُمْ وَ اِنَّ رِبٰا عَبّٰاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَلِّبِ مَوْضُوعٌ كُلُّهُ وَ كُلُّ دَمٍ كٰانَ فِي الْجٰاهِلِيَّةِ مَوْضُوعٌ...
اَيُّهَا النّٰاسُ اِنَّ الشَّيطٰانَ قَدْ يَئِسَ اَنْ يُعْبَدَ بِاَرْضِكُمْ هٰذِهِ اَبَداً وَلٰكِنَّهُ يُطٰاعُ فِيمَا سِوٰى ذٰلِكَ وَ قَدْ رَضِيَ بِمٰا تُحَقِّرُونَ مِنْ اَعْمٰالِكُمْ..."

''اُنہیں مناسک حج دکھائے اور حج کے آداب و رسوم کی تعلیم دی، ایک خطبہ پڑھا اور اس میں جو کچھ لوگوں کے لئے ضروری تھا بیان کیا، سب چیزوں کی وضاحت کی اور عرفہ میں جو شخص آپؑ کی آواز لوگوں تک پہنچاتا تھا، وہ ربیعۃ بن امیۃ بن خلف تھا، کیونکہ بہت زیادہ لوگ تھے اور رسول اللہ ﷺ کی آواز سب تک نہیں پہنچ رہی تھی۔خدا کی حمد وستائش کے بعد آپؑ نے فرمایا: اے لوگو! میری باتوں کو سنو شاید اس سال کے بعد پھر کبھی تم سے میں ملاقات نہ کرسکوں۔

اے لوگو! آج کی حرمت واحترام کی مانند تمہارا خون اور مال، ایک دوسرے پر حرام ہیں، ہر قسم کا ربا (سودی معاملہ) باطل قرار دیا جاتا ہے (اور کسی کو مطالبے کا حق نہیں ہے) آپ لوگ فقط اپنے راس المال کے حق دار

---

[1] کامل جلد۱، صفحہ ۶۴۹۔آنحضرتؐ کے غزوات اور سرایا کے بارے میں مزید معلومات کیلئے سیرۃ ابن ہشام جلد ۴، صفحہ ۲۵۶، کامل جلد۱، صفحہ ۲۵۲ اور طبری جلد ۲، صفحہ ۴۰۴ کی طرف رجوع کریں۔

ہوعباس بن عبدالمطلب کے بھی تمام سودی مطالبات بھی تم سے اُٹھالئے گئے ہیں، جوخون بھی زمانہ جاہلیت میں بہایا گیاہے وہ باطل اور ہدر سمجھا جائے (اور کسی کوبھی اس کے بدلے قصاص کا حق حاصل نہیں ہے) اے لوگو! اس کے بعد اس سرزمین پر شیطان کی پرستش نہیں ہوگی جس کی وجہ سے وہ مایوس ہو چکا ہے، لیکن دوسرے کاموں میں اُس کی اطاعت کی جائے گی اور وہ بھی اسی پر راضی ہے''۔[۱]

حجۃ الوداع کی تاریخ میں صراحت کے ساتھ آیا ہے حج کے لیے روانگی کے موقع پر مدینہ میں بہت سے لوگ جمع تھے یا اُنہی ایام میں ایک بیماری پھیلی ہوئی تھی جس کی وجہ سے بہت سے لوگ حج سے رہ گئے تھے۔ لہٰذا ہم پڑھتے ہیں کہ

" وَمَعَ ذٰلِكَ كَانَ مَعَهُ جُمُوعٌ لاٰ يَعْلَمُهٰا اِلاَّ اللهُ وَ قَدْ يُقٰالُ: خَرَجَ مَعَهُ تِسْعُونَ اَلْفاً وَيُقٰالُ مِأَةُ اَلْفٍ وَ اَرْبَعَةَ عَشَرَ اَلْفاً وَقيلَ مِأَةُ اَلْفٍ وَ عِشْرُونَ اَلْفاً وَ قيلَ مِأَةُ اَلْفٍ وَ اَرْبَعَةٌ وَ عِشْرُونَ اَلْفاً وَ يُقٰالُ اَكْثَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَ هٰذِهِ عِدَّةُ مَنْ خَرَجَ مَعَهُ وَ اَمَّا الّذينَ حَجُّوا مَعَهُ فَاَكْثَرُ مِنْ ذٰلِكَ كَالْمُقيمِينَ بِمَكَّةَ وَالَّذينَ اَتَوْا مِنَ الْيَمَنِ مَعَ عَلِيٍّ (ع) وَ اَبِي مُوسىٰ۔"

'' آپؐ کے ہمراہ حج کے مراسم کے لئے بہت زیادہ لوگ تھے، کہ اُن کی تعداد سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا۔ کہا جاتا ہے نوے ہزار لوگوں نے آپؐ کے ساتھ ہم سفر تھے اور کبھی کہا جاتا ہے ایک لاکھ چودہ ہزار اور ایک قول کے مطابق ایک لاکھ بیس ہزار لوگ تھے اور دوسرے قول کے مطابق، ایک لاکھ چوبیس ہزار افراد تھے، یہ اُن لوگوں کی تعداد ہے کہ جنہوں نے آپؐ کے ساتھ سفر کیا ہے، لیکن جو لوگ مراسم حج کے دوران آپؐ کے ہمراہ تھے اُن کی تعداد بہت ہی زیادہ ہے مثلاً مکہ کے لوگ یا وہ جو حضرت علی علیہ السلام اور ابوموسیٰ کے ساتھ یمن سے آئے تھے۔''[۲]

آپ اس سے اُن باقی مسلمانوں کی تعداد کا اندازہ بھی لگا سکتے ہیں کہ جو حج کی طاقت نہیں رکھتے تھے، اس سے آپ اسلام کی طاقت وقدرت کو ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ اور پھر آپ جان لیں گے کہ رسول خدا ﷺ نے اپنی وفات کے وقت سپاہ ''اسامہ'' کو شامات (بصریٰ) کے علاقے کے ساتھ جنگ کے لئے آمادہ کیا تھا کہ جس کی اطاعت نہیں کی گئی۔

---

[۱] کامل جلد ا، صفحہ ۶۵۲

[۲] سیرہ حلبی جلد ۳، صفحہ ۲۸۳، اور دوسری کتب تاریخ بحوالہ الغدیر جلد ا، صفحہ ۹، برائے مہربانی اس سفر سے متعلق دوسرے مسائل کیلئے اسی کتاب کی طرف رجوع کریں گے۔ چونکہ یہ ایک جامع ترین کتاب ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن کی نظر میں

اشارہ

گذشتہ حصے میں ہم نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ کو اختصار کے ساتھ مورخین کی نظر سے دیکھا ہے۔ اب ہم پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بچپن سے آخر عمر تک کے حالات کا مختصر اور دقیق مطالعہ نبوت خاصہ کی بحث کے مقدمے کے طور پر قرآن مجید کی نظر سے کرتے ہیں۔ اس قسم کے موضوع کے بارے میں خصوصاً اس نقطہ نظر سے آیات قرآن کی تحقیق بہت ہی اہمیت رکھتی ہے۔ چونکہ یہ موضوع مخالفین اور معاندین کے سامنے پیش کیا گیا ہے، اگر یہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ کی حقیقی زندگی کے مطابق نہ ہوتا تو یقیناً اس پر وہ لوگ اعتراضات کرتے اور اُن کے اعتراضات تاریخ میں محفوظ ہو جاتے جیسا کہ دوسرے موضوعات میں پائے جاتے ہیں۔

دوسرے الفاظ میں، اس بات کے قطع نظر کہ قرآن مجید، کلام خدا ہے اور اس کی تمام آیات حقیقت رکھتی ہیں، بالفرض ایسا نہ بھی ہوتا تو پھر بھی حیات پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تعلق رکھنے والی آیات خلاف واقع نہیں ہو سکتی تھیں، چونکہ اس صورت میں یہ دشمنوں کی مخالفت اور تکذیب کے لئے ایک اچھا بہانہ بن سکتی تھیں۔ اسی اشارے کے ساتھ ہم قرآن کی طرف پلٹتے ہیں اور قرآن مجید میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ کے مختلف ادوار کے بارے میں موجود نکات کے متعلق ایک تحقیق پیش کرتے ہیں۔

دعوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ماحول

قرآن مجید دو سورتوں میں درج ذیل الفاظ میں اس دور کے لوگوں کی حالت کو بیان کرتا ہے:

وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ﴿۱۶۴﴾

یعنی: ''یقیناً وہ (پیغمبرؐ کے دور کے جاہل عرب) واضح و آشکارا گمراہی میں تھے'' [1]

ان دو آیات میں ''ضلال مبین'' (آشکارا گمراہی) جیسے الفاظ عرب قوم کے سابقے کے عنوان سے بیان ہوئے ہیں اور یہ الفاظ عصر جاہلیت کے بارے میں ایک مخفی اشارے کی حیثیت رکھتے ہیں، چونکہ اُن کے پورے معاشرے پر ضلالت اور گمراہی چھائی ہوئی تھی۔

عقائد میں اُن کی گمراہی ''شرک'' کی شکل میں مجسم ہو چکی تھی اور معاشرتی مسائل میں گمراہی کا یہ حال تھا کہ وہ اپنی بیٹیوں کو اپنے ہاتھوں سے قبروں میں زندہ دفن کر دیتے تھے اور پھر اس بات پر فخر بھی کرتے تھے، ان کی عورتیں اور مرد مادر زاد ننگے ہو کر کعبہ کے گرد طواف کرتے تھے، اور اسے عبادت شمار کیا جاتا تھا! اُن کے معاشرے میں جنگ اور خون خرابے کو قدر و منزلت کی حیثیت دی جاتی تھی، یہاں تک

---

[1] آل عمران، ۱۶۴، جمعہ، ۲

کہ آباء واجداد کی دشمنی اور عداوت بطور وراثت اُن کی اولاد کو منتقل ہوجاتی تھی۔

اُن کے نزدیک عورت ایک بے قدر و قیمت قسم کی چیز تھی اور اُس پر قمار اور جوئے کی بازی لگائی جاتی تھی! ''ضلال مبین'' کی بہترین تصویر کشی اُنہی الفاظ سے ہوتی ہے کہ جو''جعفر بن ابی طالبؓ'' نے''نجاشی'' کے سامنے عرب جاہلیت کے حالات کی وضاحت کرتے ہوئے بیان کیے تھے، اُنہوں نے یوں کہا تھا:

''أَيُّهَا الْمَلِكُ كُنَّا اَهْلَ جَاهِلِيَّةٍ نَعْبُدُ الْاَصْنَامَ وَنَأْكُلُ الْمَيْتَةَ ......''

''اے بادشاہ! ہم جاہلیت میں زندگی گذار رہے تھے، بتوں کی پوجا کرتے تھے، مردار کھاتے تھے، فحش کام کرتے تھے، قطع رحم کرتے، ہمسایوں کے ساتھ بُرا سلوک کرتے، طاقت ور، کمزوروں کا مال کھاجاتے تھے، یہاں تک کہ خدا نے ایک پیغمبرؐ ہمارے درمیان مبعوث فرمایا کہ جس کا حسب ونسب ہم جانتے تھے، اس کی صداقت، امانت اور پاکیزگی سے آشنا تھے، اُس نے ہمیں توحید اور یکتائی کی طرف دعوت دی اور ہم سے چاہا کہ ہم خدا کے ساتھ کسی کو شریک قرار نہ دیں، بتوں کی پرستش سے ہاتھ کھینچ لیں، اُس نے ہمیں سچ بولنے، امانت ادا کرنے، صلہ رحم کرنے، اچھا ہمسایہ بننے، حرام کاموں سے بچنے اور خون خرابہ نہ کرنے کا حکم دیا۔۔۔'' [1]

مندرجہ بالا دو آیات میں آنے والے اس مختصر اور مخفی اشارے کے بعد ہم کچھ مزید وضاحت کرنا چاہیں کہ جو دوسری آیات میں بیان ہوئی ہیں:

ا۔ عربوں کے عقائد میں بتوں کی حیثیت

ہر قوم وملت کے عقائد، اُن کی تہذیب وثقافت کا ایک بڑا حصہ سمجھے جاتے ہیں، عقائد میں پستی اور انحطاط درحقیقت اُن کی تہذیب وتمدن میں انحطاط وپستی کی علامت ہوتی ہے۔ بنابریں ایام جاہلیت کے عرب سب سے پست ترین تہذیب وثقافت رکھتے تھے۔ وہ شدت کے ساتھ بتوں کی پرستش کرتے تھے، اور جو کچھ اپنے ہاتھوں سے بناتے تھے اُسے ہی اپنی تقدیر بلکہ آسمان وزمین کی تقدیر کا مالک سمجھتے تھے۔ قرآن مجید اس سلسلے میں، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ؕ وَاللّٰهُ هُوَالسَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿٧٦﴾

''آپ کہہ دیجئے کہ تم اللہ کے سوا ان کی عبادت کرتے ہو جو نہ تمہارے کسی نقصان کے مالک ہیں نہ کسی نفع

---

[1] کامل جلد ۲، صفحہ ۸۰، تفسیر فی ظلال جلد ۸، صفحہ ۹۵

کے، اللہ ہی خوب سننے اور پوری طرح جاننے والا ہے۔'' [1]

اُن کے عام بتوں کے علاوہ تین بڑے مشہور بت بھی تھے، جن کو خاصی شہرت حاصل تھی جن کو وہ خدا کی بیٹیوں کی تصویریں اور اُس سے تقرب کا وسیلہ سمجھتے تھے۔، ایک بت کا نام ''منات'' تھا جسے مدینہ اور مکہ کے درمیان بحر احمر کے مقام پر نصب کیا گیا تھا۔ تمام عرب اس کے لئے ایک خاص مقام و منزلت کے قائل تھے اور اُس کے قریب قربانی کی جاتی تھی۔

لیکن سب سے زیادہ اس بت کو قبیلہ ''اوس'' اور ''خزرج'' کے لوگ اہمیت دیتے تھے۔ ''لات'' نام کا ایک اور بت بھی بہت مشہور تھا جو سرزمین طائف میں رکھا ہوا تھا۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں آج کل ایک مسجد ہے، اس بت کے اکثر خادم ''قبیلہ ثقیف'' سے تھے ۔ تیسرا بت ''عُزیٰ'' تھا جو مکہ سے عراق کی طرف جانے والے راستے میں ''ذات عرق'' نامی مقام پر رکھا ہوا تھا۔ قریش اس بت سے خاص لگاؤ رکھتے تھے۔

اس کے علاوہ، خاندانی، قبائلی، اور گھریلو بت بھی تھے، بنیادی طور پر ایام جاہلیت کے عربوں کی زندگی، بغیر بتوں کے بے معنیٰ سمجھی جاتی تھی۔ حتیٰ سفر پر جانے کے وقت بھی بتوں سے سفر کی اجازت لی جاتی تھی اور سفر کے دوران بھی بت اُن کے ہمراہ ہوتے تھے۔ قرآن مجید نے سورۂ نجم میں اس مسئلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ﴿١٩﴾ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ﴿٢٠﴾ اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ﴿٢١﴾

یعنی: ''کیا تم نے لات اور عزیٰ کو دیکھا۔ اور منات تیسرے پچھلے کو (اور کیا یہ نفع و نقصان کا سرچشمہ ہیں) کیا تمہارے لئے لڑکے اور اللہ کے لئے لڑکیاں ہیں''۔ [2]

دلچسپ بات یہ کہ وہ بیٹیوں سے اس قدر متنفر تھے کہ کبھی تو اُنہیں اپنے ہاتھوں سے زندہ دفن کر دیتے تھے جبکہ ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں وران بتوں کو اُن کی تصویریں قرار دیتے تھے۔ قرآن خود اُن کی اپنی منطق کے مطابق اُنہیں جواب دیتا ہے اور کہتا ہے: تم کیسے خدا کے لئے بیٹیاں قرار دیتے ہو جبکہ تم خود بیٹیوں سے متنفر ہو؟! قرآن ایک دوسری جگہ خرافات پر مبنی ان پست افکار کی شدید مذمت کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ؕ اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ ؕ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْـَٔلُوْنَ ﴿١٩﴾

یعنی: ''اور انہوں نے فرشتوں کو جو رحمٰن کے عبادت گزار ہیں عورتیں قرار دے لیا (اور اُنہیں خدا کی بیٹیاں سمجھ بیٹھے)۔ کیا ان کی خلقت و پیدائش کے موقع پر یہ موجود تھے؟ ان کی یہ گواہی لکھ لی جائے گی اور ان

---

[1] (مائدہ/٧٦)

[2] (النجم/١٩، ٢٠، ٢١)

سے قیامت میں اس چیز کی) باز پرس کی جائے گی''۔[1]

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان پست افکار کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے اور انہیں بے بنیاد خیالات اور ہوائے نفس کا نتیجہ قرار دیا۔ جیسا کہ قرآن سورۂ نجم کی آیات کے ضمن میں تین مشہور بتوں کے بارے میں اشارے کے بعد فرماتا ہے:

اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ ۚ

یعنی: ''دراصل یہ صرف نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے ان کے لئے رکھ لئے ہیں (بے معنیٰ اور بے مسمیٰ نام!) اللہ نے ہرگز ان کی کوئی دلیل نہیں اتاری۔ یہ لوگ صرف بے بنیاد خیالات اور اپنی نفسانی خواہشوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔''[2]

یہ درست ہے کہ مشرکین بت پرستی پر بے بنیاد دلیلیں دیتے تھے منجملہ یہ کہ ''اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے کہیں زیادہ بلند و بالا ہے کہ ہماری عقل و فکر اس تک رسائی حاصل کرسکے، اور وہ اس بات سے منزہ ہے کہ ہم براہ راست اس کی عبادت کرسکیں، لہٰذا ہمیں اُن چیزوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے کہ جن کو خدا کی طرف اس کائنات کی تدبیر اور ربوبیت کا عہدہ سونپا گیا ہے اور اُنہیں اپنے اور خدا کے درمیان واسطہ قرار دیں۔''

اور وہ یہی فرشتے اور جنّ ہیں کہ جو اس کائنات کی مقدس ترین ہستیاں ہیں، ہمیں ان کو ارباب اور خدا کے عنوان سے قبول کر کے ان کی عبادت کرنی چاہیے تاکہ یہ ہمیں خدا کے نزدیک کریں:

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ۭ

یعنی: ''چونکہ ہماری ان مقدسات تک دسترس نہیں ہے لہٰذا ہم ان کے مجسمے اور تصاویر بنا کر ان کی پرستش کرتے ہیں!''[3]

یہ مجسمے اور تصاویر وہی بت تھے اور وہ اپنے زعم میں ان مقدسات اور ان بتوں کے درمیان ایک قسم کی وحدت کے قائل تھے لہٰذا وہ ان بتوں کو بھی اپنا خدا اور ارباب کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ انہی خیالات اور خرافات کے ذریعے، اس خدا کو اپنے آپ سے دور سمجھتے تھے کہ جس کا وجود خود انسان کے اپنے وجود سے زیادہ اس کے نزدیک ہے۔

وہ ایسے خدا کی طرف رجوع کرنے کے بجائے جو ہر قسم کے فیض و قدرت کا سرچشمہ اور ہر جگہ حاضر و ناظر ہے، ممکن الوجود

---

[1] (سورہ زخرف/ ۱۹)

[2] (النجم/ ۲۳)

[3] (سورہ زمر/ ۳)

مخلوقات کی طرف رجوع کرتے تھے کہ جو نہ شعور رکھتی ہیں اور نہ کسی قسم کی طاقت وقدرت کی مالک ہیں بلکہ خود اپنی عبادت کرنے والوں ہی کی بنائی ہوئی ہیں۔ آخر کار اُنہوں نے ان بے قدر و قیمت اور پست چیزوں کو ربوبیت والوہیت کے درجے تک پہنچا دیا تھا، اور اللہ تعالیٰ کی ذات کے بحر بے کراں کو چھوڑ کر سراب کے پیچھے دوڑنے لگے تھے۔

۲۔ عام عوام پر مسلط شدید فقر وفاقہ

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس زمانے میں قیام فرمایا تھا کہ جب جاہل عرب بہت شدید فقر وفاقے سے دوچار تھے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی اولاد اور بیٹوں کو بھی قتل کر دیتے تھے کہ جو اُن کی مادی اور اقتصادی زندگی کا سرمایہ سمجھے جاتے تھے تاکہ کھانے والوں میں سے ایک کی کمی ہو جائے۔ جیسا کہ سورۂ بنی اسرائیل کی اکتیسویں آیت میں آیا ہے:

"وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ۔"

یعنی: "اور مفلسی اور تنگدستی کے خوف سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو، انہیں اور تمہیں ہم ہی روزی دیتے ہیں۔ [1]

حضرت امیر المومنین علیؑ نے اسی مطلب کا ایک جامع تحلیل وتجزیہ کرتے ہوئے مسلمانوں سے مخاطب ہو کر فرمایا ہے:

"إِنَّ اللهَ بَعَثَ مُحَمَّداً (صلی الله علیه وآله وسلم) نَذِيراً لِلْعَالَمِينَ، وَأَمِيناً عَلَى التَّنْزِيلِ، وَأَنْتُمْ مَعْشَرَ الْعَرَبِ عَلَى شَرِّ دِينٍ وَفِي شَرِّ دَارٍ مُنِيخُونَ بَيْنَ حِجَارَةٍ خُشْنٍ وَحَيَّاتٍ صُمٍّ، تَشْرَبُونَ الْكَدِرَ، وَتَأْكُلُونَ الْجَشِبَ۔"

"اللہ تعالیٰ نے حضرت محمدؐ کو تمام لوگوں کے لئے ڈرانے والا اور قرآن کا امین بنا کر بھیجا ہے۔ جب رسولؐ مبعوث ہوئے تو تم اے اہل عرب بدترین دین پر تھے اور بدترین گھروں میں رہتے تھے۔ تمہارا حال یہ تھا کہ سخت پتھروں اور بہرے سانپوں (جو خطرناک ترین سانپ ہیں) کے درمیان تمہارا مسکن تھا، تم لوگ گندہ، ٹھہرا ہوا اور آلودہ پانی پیتے تھے اور سخت اور کھردری خوراک کھاتے تھے۔" [2]

---

[1] اگرچہ بعض نے احتمال دیا ہے کہ یہ آیت لڑکیوں کے قتل کی طرف اشارہ ہے جنہیں حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور انہیں ایک گھٹیا مخلوق شمار کیا جاتا تھا، جو صرف مصرف کرنے کے لیے ہی تھیں۔ لیکن یہ احتمال، آیت میں آنے والی جمع مذکر کی ضمیر کی وجہ سے ہے کہ جس میں فرمایا 'اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا' "ان کو قتل کرنا ایک بڑی غلطی تھی" یہ ضمیر آیت کے اول میں ذکر ہونے والی "اولاد" کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے خصوصاً بیٹے مراد ہیں یا کم از کم بیٹے اور بیٹیاں دونوں مراد ہیں۔ یہاں ان کے بارے میں بعنوان "تغلیب"، جمع مذکر کی ضمیر استعمال ہوئی ہے۔

[2] (نہج البلاغۃ: خطبہ ۲۶)

۳۔عربوں کی عجیب وغریب عبادتیں

اُن کی عبادت بھی بہت عجیب وغریب تھی۔مشرکین کہتے تھے کہ اگر محمدؐ عبادات لائے ہیں تو ہمارے پاس پہلے سے عبادات ہیں اورہم کعبہ کے پاس نماز پڑھتے ہیں؛ان کے جواب میں قرآن مجید فرماتا ہے:

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَتَصْدِيَةً ط [۱]

یعنی:''اوران کی نماز (جو نماز پڑھنے کے دعوی دار تھے) کعبہ کے پاس صرف سیٹیاں بجانا اور تالیاں بجانا تھی۔''

احمقوں کی طرح نعرے لگانے اور بے وقوفوں کی طرح تالیاں بجانے کو وہ نماز کہتے تھے۔''مکاء'' دراصل پرندوں کی آواز کو کہتے ہیں، خانہ خدا کے اردگرد جاہل عربوں کی آواز کو پرندوں کی آواز سے تشبیہ دینا شاید اس وجہ سے ہے کہ اُن کی اس آواز کا کوئی معنیٰ ومفہوم نہیں تھا اور پرندوں کی آواز کی طرح ایک بے معنیٰ آواز تھی یا یہ کہ اُن کی تمام تر کوشش گانا گانے تک محدود تھی۔''تَصْدِيَةً'' کا مطلب تالی بجانا ہے یا ایسی آواز ہے جو تالی بجاتے وقت پیدا ہوتی ہے،اسی لئے پہاڑ سے ٹکرا کر واپس آنے والی آواز کو''صدی'' کہتے ہیں۔

یہ بات یہاں ہی ختم نہیں ہوتی بلکہ بعض عربی بدو جیسا کہ کہا گیا ہے مادرزاد ننگے ہو کر خانہ خدا کے گرد طواف کرتے تھے،اور یہ وہی چیز ہے کہ جس کے بارے میں سورۂ برائت کی ابتدائی آیات کے نزول اور ان آیات کو حج کے دوران ابلاغ کرنے کے سلسلے میں حضرت علی -کی ماموریت کے وقت اشارہ کیا گیا ہے،جس میں فرمایا ہے:

''لَا يَطُوفَنَّ بِالْبَيْتِ عُرْيَانٌ وَلَا يَحُجَّنَّ الْبَيْتَ مُشْرِكٌ ......:''

یعنی:''اس کے بعد کوئی شخص ننگا ہو کر خانہ خدا کے طواف کے لئے نہیں آئے گا اور نہ کوئی مشرک حج کے مراسم میں شرکت کرے گا۔''[۲]

کہتے ہیں (ننگے ہو کر طواف کرنے جیسے) عمل کا اصل محرک یہ تھا کہ کچھ عرب اپنے آپ کو''حُمس''[۳] کہتے تھے،اُن کے خیال میں مخصوص لباس میں ہی طواف انجام دینا چاہیے، اگر کسی کے پاس ایسا لباس نہ ہوتا تو وہ دوسرے لباس سے استفادہ کرتا تھا،لہٰذا طواف ختم ہو جانے کے بعد اس لباس کو دور پھینک دینا ضروری تھا،یعنی؛ نہ وہ خود اس کو استعمال کرے اور نہ کوئی دوسرا شخص اس لباس کو پہنے۔

---

[۱] (انفال/۳۵)

[۲] تفسیر مجمع البیان،جلد ۵،صفحہ ۳ (سورہ بقرہ کی ابتدائی آیات کی تفسیر کے تحت)

[۳] حُمس (بروزن خُمس) یہ اَحْمَس کی جمع ہے۔وہ شخص جو اپنے آپ کو کسی آئین ومذہب میں متعصب اور متصلب دیکھے،چونکہ قریش آئین شرک پر قائم تھے۔ لہٰذا وہ اپنے آپ کو حُمس کہتے تھے۔

اسی لئے ان کپڑوں کو ''لقاء'' کہتے تھے یعنی: دور پھینک دیئے جانے والے کپڑے۔ کیونکہ اُن میں سے اکثر لوگ فقیر تھے اور اُن کے پاس ایک ہی لباس ہوتا تھا لہٰذا وہ مجبوراً ننگے ہو کر طواف کرتے تھے تا کہ اُنہیں اپنا لباس پھینکنا نہ پڑے!

بعض اوقات یہ خرافات ہوس باز قسم کے لوگوں کے لئے بہانہ بن جاتی تھیں اور جوان مرد اور عورتیں، اسی بہانے سے اپنے ننگے بدن ایک دوسرے کو دکھاتے تھے۔ [۱]

سیرۂ ابن ہشام میں آیا ہے کہ مرد مکمل طور پر برہنہ ہو جاتے تھے، لیکن عورتیں ایک چاک دار قمیض کہ جس سے اُن کا بدن نمایاں ہوتا تھا، کے سوا اپنا سب لباس اُتار دیتی تھیں اور پھر طواف کرتی تھیں۔ ایک دن ایک عرب عورت اسی حالت میں بُری نظر ڈالنے والے مردوں کے سامنے طواف کر رہی تھی، تو اس نے یہ شعر پڑھا جو تاریخ میں محفوظ ہو گیا ہے:

اَلیوم یَبدُو بعضُہُ اَو کُلُّہُ
فَمَا بَدَا مِنہُ فَلاَ اُحِلُّہُ

یعنی: آج سب کچھ یا اس کا کچھ حصہ آشکار ہو جاتا ہے، اور جو کچھ اس میں سے آشکار ہوتا ہے، میں اُسے حلال نہیں کرتی! [۲]

بتوں کے لئے اُن کے قربانی کرنے کی داستان بھی بہت طولانی ہے۔ منجملہ ''دومۃ الجندل'' [۳] کے لوگ ہر سال ایک شخص کو پورے اہتمام کے ساتھ انتخاب کر کے اپنے بتوں کے سامنے قربان کر دیتے تھے، پھر اُس کے خون آلود بدن کو قربان گاہ کے قریب دفن کر دیتے تھے۔ حتیٰ بعض نے لکھا ہے کہ مصری اپنے خوبصورت بیٹے اور بیٹیوں کو ''الھہ نیل'' کے آگے تقدیم کر دیتے تھے اور یہ کام بعض عرب قبائل کے لئے ایک سنت اور رسم کی حیثیت اختیار کر گیا تھا، بعض اوقات باپ اپنی اولاد میں سے کسی ایک بچے کی قربانی کرنے کی نذر کرتا تھا! [۴]

۴۔ ایام جاہلیت میں عربوں کی بعض دوسری خرافات

منجملہ چیزوں کے ایک حلال و حرام گوشت کا مسئلہ تھا، اُنہوں نے اپنے لئے کچھ انتہائی بُرے اور بے بنیاد قوانین اور احکام وضع کئے ہوئے تھے، جیسا کہ قرآن مجید کا فرمانا ہے:

وَقَالُوْا هٰذِهٖۤ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ ۖ لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ

---

[۱] اسلام وعقائد وآراء بشری، صفحہ ۲۸۸

[۲] سیرۂ ابن ہشام، ج ۱ ص ۲۱۵

[۳] ''نجد'' کے شمال مغرب میں ایک شہر ہے جو جزیرۃ العرب کے پہاڑی علاقوں کی طرف ہے یہی وہ جگہ ہے جہاں جنگ صفین کا واقعہ (ثالثی) رونما ہوا تھا۔

[۴] اسلام وعقائد وآراء بشری، ص ۲۷۸

ظُهُوْرُهَا

''اور اُنہوں نے کہا کہ چوپایوں اور زراعت کا یہ حصہ (جو بتوں کے ساتھ مخصوص ہے یہ سب کے لئے) ممنوع ہے اور سوائے اُن لوگوں کے جنہیں ہم چاہیں اور ان کے گمان کے مطابق اُس سے کسی کو نہیں کھانا چاہیے (اور وہ یہ کہتے تھے کہ یہ) ایسے چوپائے ہیں کہ جن پر سوار ہونا حرام قرار دے دیا گیا ہے بظاہر یہ اس لئے تھا کہ اُنہوں نے اُسے بتوں کے لئے مخصوص کیا ہوا تھا۔''[۱]

اس کے بعد والی آیت میں ہم پڑھتے ہیں:

وَقَالُوْا مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰٓى اَزْوَاجِنَا ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ ؕ

یعنی: ''اور اُنہوں نے کہا کہ جو کچھ ان حیوانات کے شکم میں (جنین اور بچہ) موجود ہے وہ ہمارے مردوں کے ساتھ مخصوص ہے اور ہماری بیویوں پر حرام ہے، لیکن اگر وہ مردہ ہو (یعنی؛ مردہ پیدا ہو) تو پھر سب اس میں شریک ہیں۔''[۲]

قرآن انہی آیات کے ذیل میں اُن کو ان بدترین بدعتوں کی وجہ سے عذاب الٰہی کی دھمکی دیتے ہوئے فرماتا ہے:

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ ؕ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا

یعنی: ''یقیناً جنہوں نے اپنی اولاد کو حماقت و نادانی کی بناء پر قتل کر دیا، اُنہوں نے نقصان اُٹھایا اور جو کچھ خدا نے انہیں رزق دے رکھا تھا اُسے اپنے اوپر حرام قرار دے لیا اور خدا پر اُنہوں نے افترا باندھا ہے، وہ گمراہ ہو گئے ہیں اور (وہ ہرگز) ہدایت نہیں پائیں گے۔''[۳]

حتیٰ وہ انبیائے کرام ÷ کی بعض سابقہ سنن اور احکام کی اس طرح تحریف کر دیتے تھے کہ وہ عملی طور پر غیر موثر ہو جاتی تھیں، مثلاً حرمت والے مہینوں (ذی القعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب) میں جنگ کے ممنوع ہونے کا حکم کہ جو اُن کو بے حد و حساب قتل و غارت سے روکنے کا ایک اہم سبب تھا، اسے وہ خرافات پر مبنی ایک رسم ''نسیئ'' کے ذریعے غیر موثر بنا دیتے تھے۔

---

[۱] سورۂ انعام/ ۱۳۸

[۲] سورۂ انعام/ ۱۱۳۹

[۳] سورۂ انعام/ ۱۴۰

یعنی؛ جب بھی وہ حرام مہینوں کی حرمت کو توڑنا چاہتے تھے تو کہہ دیتے تھے: ''کوئی بات نہیں ایک اور مہینہ اس مہینے کی جگہ رکھ دیتے ہیں''۔قرآن نے اُن کے اس بدترین فعل کی سخت مذمت کرتے ہوئے فرمایا ہے:

اِنَّمَا النَّسِیٓءُ زِیَادَۃٌ فِی الۡکُفۡرِ "نسیئی"

یعنی: ''(مہینوں کا آگے پیچھے کر دینا) مشرکین کے کفر میں زیادتی ہے۔''[1]

خانہ خدا کا حج اور زیارت حضرت ابراہیم -کی سنت تھی اور وحدت اور تقرب خدا کا سبب تھا، جو اس قدر خرافات کا شکار ہو چکا تھا کہ اب وہ تقرب خدا کا ذریعہ نہیں رہا تھا بلکہ لوگوں کو خدا سے دور اور ایک دوسرے سے بھی متفرق کرنے کا سبب بن چکا تھا چونکہ اس پر قومی مسائل کے علاوہ شرک و بت پرستی حاکم ہو چکی تھی۔

۵۔اخلاقی مسائل میں سخت خرابیاں

عربوں کے درمیان اخلاقی مسائل اپنی پستی کی حدوں تک پہنچ چکے تھے، شدید عداوت اور اسلاف سے آئندہ نسلوں کو منتقل ہونے والا کینہ اور دشمنی بھی اُن پر حاکم تھی، نہ فقط اخلاق بلکہ معاشرے کی ہر چیز انہی مسائل پر قربان ہو رہی تھی۔قرآن مجید اس سلسلے میں اس قسم کے مسائل سے نجات پانے والے مسلمانوں سے مخاطب ہو کر فرماتا ہے:

وَاذۡکُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ اِذۡ کُنۡتُمۡ اَعۡدَآءً فَاَلَّفَ بَیۡنَ قُلُوۡبِکُمۡ فَاَصۡبَحۡتُمۡ بِنِعۡمَتِہٖۤ اِخۡوَانًا ۚ وَ کُنۡتُمۡ عَلٰی شَفَا حُفۡرَۃٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنۡقَذَکُمۡ مِّنۡہَا ؕ

ترجمہ: ''اللہ نے جو نعمت تمہیں عطا فرمائی ہے اس کی یاد سے غافل نہ ہو جانا، تمہارا حال یہ تھا کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، لیکن خدا نے تمہارے دلوں میں اُلفت پیدا کر دی اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے اور تم لوگ تو آگ کے ایک گڑھے کے کنارے پر تھے، پس اس نے تمہیں بچا لیا۔''[2]

''مقاییس اللُّغَة'' کے بقول اصل میں ''شَفا'' کا معنی کسی چیز کے اوپر مسلط ہونا ہے، چونکہ ہر چیز کا کنارہ انسان کو اس پر مسلط کر دیتا ہے اور وہ اُسے بلندی سے دیکھتا ہے لہٰذا اُسے شَفا کہا جاتا ہے۔مثلاً گہرے گڑھوں کے کنارے یا بلند و بالا چٹانوں یا ٹیلوں یا نہروں اور دریاؤں کے کنارے وغیرہ، اسی طرح انسان کے لبوں کو بھی شَفا کہتے ہیں کہ جو منہ کے دھانے پر واقع ہوتے ہیں۔اسی لئے جب کوئی بیمار صحت یاب ہوتا ہے تو اسکو بھی شفا کہتے ہیں چونکہ وہ بیماری پر غلبہ اور تسلط حاصل کر لیتا ہے۔

بہرحال، قرآن مجید نے ایام جاہلیت کے عربوں کی حالت کو اُن لوگوں سے تشبیہ دی ہے کہ جو آگ کے گڑھے کے کنارے پر

---

[1] سورہ توبہ۔۳۷۔

[2] سورہ آل عمران، ۱۰۳

کھڑے ہوں اور بہت جلد اس میں گرنے والے ہوں، ایسی آگ جو اُن کی ہر چیز کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔ وہ اس قدر عداوت، نفاق اور اختلاف میں مبتلا تھے کہ جس کے بارے میں قرآن مجید صراحت کے ساتھ فرماتا ہے کہ اُن کے درمیان معمولی طریقے سے وحدت اور اتحاد قائم کرنا ہرگز ممکن نہیں تھا، بلکہ یہ ایک الٰہی معجزہ تھا جس کے ذریعے پیغمبر اکرم ﷺ اتحاد قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے:

لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَهُمْ ؕ

یعنی: ''اور اگر تم دلوں میں الفت پیدا کرنے کے لئے روئے زمین کی تمام چیزوں کو صرف کر دیتے تو ایسا نہ کر سکتے، لیکن اللہ نے ان کے درمیان الفت پیدا کر دی''[1]

اُن کے اندر شراب، قمار (جوا) اور ازلام (ایک قسم کی قسمت آزمائی) اس قدر رائج تھے کہ ان سے ایک ہی مرحلہ میں روکنا ناممکن تھا، لہٰذا شراب کو چند مرحلوں میں حرام قرار دیا گیا۔[2]

ایک اور عظیم اخلاقی اور معاشرتی بُرائی جو ایام جاہلیت کے عربوں کے درمیان رائج تھی؛ وہ ''عورت کے حقوق'' کا پائمال ہونا تھا۔ یہاں تک کہ بعض مفسرین کے بقول زمانہ جاہلیت میں جب عورت کے وضع حمل کا وقت نزدیک ہوتا تو زمین کے اندر ایک گڑھا کھودا جاتا تھا اور اُس کے اوپر عورت بیٹھ جاتی تھی، اگر نومولود بیٹی ہوتی تو اُسے گڑھے میں پھینک دیا جاتا تھا اور اگر بیٹا ہوتا تو اُسے محفوظ رکھا جاتا تھا! اُن کے ایک شاعر نے اسی سلسلے میں بہت فخریہ انداز میں یہ شعر کہا ہے:

سَمَّیتُهَا اِذْ وُلِدَتْ تَمُوتُ
وَالقَبْرُ صِهْرٌ ضَامِن ذِمِّیتُ

''اُس نومولود بچی کا نام میں نے ''تَمُوتُ'' رکھا ہے (اس خیال سے کہ وہ بہت جلد مر جائے گی اس کے برعکس میں بیٹے کا نام رکھ دیتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ باقی رہے گا) اور اس طرح قبر میرا داماد ہے کہ جس نے اس بچی کو مجھ سے لیکر خاموش کر دیا ہے۔''[3]

یہ کام خواہ بہت زیادہ فقر و تنگدستی اور بیٹیوں کے معاشی فائدہ نہ ہونے کی وجہ سے انجام پاتا تھا یا بیٹیوں کے بارے میں حد سے زیادہ تعصب کی وجہ سے کیا جاتا تھا کہ کہیں جنگوں میں قیدی بن کر دشمن کے ہاتھ نہ لگ جائیں۔ ہر دو صورت میں یہ زمانہ جاہلیت کے وحشت ناک اور افسوسناک ترین کاموں میں سے ایک کام تھا، جس کے بارے میں قرآن مجید نے بارہا اشارہ کیا ہے۔ ایک جگہ قرآن مجید فرماتا ہے:

---

[1] سورہ انفال، ۶۳

[2] اس کی مزید تفصیل تفسیر نمونہ میں سورہ مائدہ کی آیت ۹۰ کے تحت ذکر ہوئی ہے۔

[3] مجمع البیان، ج ۱۰ ص ۴۴۴۔

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ۝ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ۭ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰي هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ ۭ اَلَا سَاۗءَ مَا

ترجمہ: ''جب ان میں سے کسی کو خبر دی جاتی کہ تمہارے ہاں بیٹی ہوئی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ زہر کے گھونٹ پی کر رہ جاتا، اس بُری خبر پر اپنے قبیلے سے منہ چھپائے پھرتا اور اس فکر میں ہوتا کہ ذلت اُٹھا کر اسے (بیٹی کو) زندہ رہنے دے یا اُسے زندہ در گور کر دے، یہ لوگ کیسا بُرا فیصلہ کرتے ہیں۔''[۱]

کبھی تو یہ کام عزت و ناموس کے بارے میں ایک احمقانہ تعصب کا نتیجہ ہوتا ہے اور (ایک اپنی بے یار و مددگار اولاد کے قتل جیسے) عظیم ترین جرم کی حد تک جا پہنچتا ہے۔ جو اُس جاہلانہ معاشرے میں انسانی جذبات اور اخلاق کی پستی اور عورت کے مقام و منزلت کے بارے میں مکمل بے احترامی کی واضح دلیل ہے۔

''اَيُمْسِكُهٗ عَلٰي هُوْنٍ'' کی تعبیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بیٹی کے وجود کو اپنے لئے ایک ننگ اور عار سمجھتے تھے اور اس چیز کی بُرائی کی وجہ سے اپنے قوم و قبیلے سے بھاگتے تھے۔ لیکن وہ اس بات سے غافل تھے کہ اگر بیٹیاں نہ ہوتیں تو مائیں بھی نہ ہوتیں اور اگر مائیں نہ ہوتیں تو وہ خود بھی نہ ہوتے، اُنہی میں سے ایک شاعر اس سلسلے میں کہتا ہے:

لِكُلِّ اَبِي بِنْتٍ يُرَاعِي عيشُئونَها
ثَلاثٌ اَصْهار اِذَا حُمِدَ الصِّهْرُ
فَبَعل يُرَاعِيهَا وَخِدْرٌ يُكِنُّهَا
وَقَبْرٌ يُوَارِيهَا وَخَيْرُهُمُ الْقَبْرُ

''ہر وہ شخص جو بیٹی کا باپ بنتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کے حالات کا احترام کرے؛ تو اس کے تین داماد ہوتے ہیں ایک اُس بیٹی کا شوہر کہ جو اسکی شان کے مطابق ہو اور اس کا خیال رکھے۔ دوسرا وہ پردہ کہ جو اسے محفوظ رکھے اور تیسرا وہ قبر کہ جو اُسے اپنے اندر چھپا لے، ان میں سب سے بہتر یہی قبر ہے۔''[۲]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بچپن

قرآن مجید میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بچپن کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں ملتا، فقط سورۂ ضُحیٰ کی آیت نمبر ۶، ۷، ۸ میں ہم پڑھتے ہیں:

---

[۱] سورہ نحل، ۵۸۔۵۹۔

[۲] تفسیر قرطبی، ج۶، ص ۳۷۳۴

اَلَمۡ یَجِدۡكَ یَتِیۡمًا فَاٰوٰی ۞ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰی ۞ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغۡنٰی ۞

یعنی: ''کیا اس نے تمہیں یتیم پا کر پناہ نہیں دی۔ اور تجھے راہ بھولا پا کر ہدایت نہیں دی۔ اور تجھے نادار پا کر تونگر نہیں بنا دیا۔''

پہلی آیت میں پیغمبرؐ کی یتیمی کی طرف اشارہ ہوا ہے کہ جو تاریخ میں بھی آیا ہے، جب آپؐ ماں کے پیٹ میں تھے، آپؐ اپنے والد گرامی حضرت ''عبداللہ'' سے محروم ہو گئے تھے۔ اور جب چھ سال کے تھے تو ماں کا سایہ بھی سر سے اُٹھ گیا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اُنہیں اُن کے دادا ''عبدالمطلب'' کی آغوش میں دیدیا۔ آٹھ سال کی عمر میں دادا بھی دنیا سے چلے گئے تو خدا نے آپؐ کو اُن کے چچا ''ابوطالب'' کے لطف ومحبت سے بھرے دامن میں جگہ دے دی جو آپؐ کی ہمیشہ جان سے زیادہ حفاظت کرتے تھے۔ تیسری آیت میں زندگی کے ابتدائی حصے میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تنگدستی اور غربت کی طرف اشارہ کیا ہے، لیکن بعد میں حضرت ''خدیجہ'' کے دل میں آپؐ کی مہر ومحبت ڈال دی اور اُنہوں آپ سے شادی کر لی اور آپؐ کے قدموں میں مال ودولت کا ڈھیر لگا دیا۔

لیکن دوسری آیت میں میں فرمایا ہے: تجھے گمشدہ اور راہ بھولا پایا تو ہدایت کی، بعض مفسرین نے ''ضالاً'' سے حق کی عدم شناخت کا معنی مراد لیا ہے اور کہا ہے کہ آیت سے مراد یہ ہے کہ آپؐ گمراہ تھے اور حق کی پہچان نہیں رکھتے تھے لہٰذا ہم نے تیری حق کی جانب ہدایت کی ہے جبکہ بعض دوسرے مفسرین نے اس سے ''غافل'' ہونے کا معنی لیا ہے یعنی؛ تو خدا اور آسمانی کتاب کے احکام سے غافل تھا، لیکن بعض کا کہنا ہے کہ اس سے ظاہری ضلالت مراد ہے یعنی؛ بچپن کے زمانے میں آپؐ ایک یا چند بار مکہ یا دوسرے علاقوں کے درّوں اور پہاڑی گھاٹیوں میں گم ہو گئے تھے تو خدا نے آپؐ کی ہدایت کی اور آپؐ کو ''عبدالمطلب'' ''ابوطالب'' اور ''حلیمہ سعدیہ'' کی آغوش مہر ومحبت میں واپس لوٹا دیا۔

ہم نے اس آیہ مجیدہ کی تشریح ''پیام قرآن'' کی جلد نمبر ۷ میں ''تنزیہ انبیاء'' کی بحث میں بیان کی ہے اور تفسیر نمونہ کی جلد نمبر ۲۷ میں بھی اسی آیت کے ذیل میں مختلف اقوال اور ان میں سے بہترین تفسیر بیان کی ہے۔

بہرحال یہ آیات، حیات پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بچپن کا ایک نقشہ پیش کرتی ہیں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے حصے کی اہم خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ آپؐ نے کسی بھی اُستاد سے درس حاصل نہیں کیا۔ اگرچہ یہ بات کسی شخصیت کے بارے میں ایک نقص سمجھا جاتا ہے؛ لیکن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں یہ ایک انتہائی اہم اور قوی نکتہ شمار ہوتا ہے۔ چونکہ نزول قرآن کے بعد اس قدر اعلیٰ مطالب اور تعلیمات کو دیکھ کر کوئی بھی شک نہیں کر سکتا ہے کہ یہ خدا کی جانب سے ہے نہ کہ ایک ایسے شخص کی جانب سے جس نے کسی انسان سے تعلیم حاصل نہیں کی ہے، جیسا کہ سورۂ عنکبوت کی آیت نمبر ۴۸ میں آیا ہے:

وَمَا كُنۡتَ تَتۡلُوۡا مِنۡ قَبۡلِهٖ مِنۡ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِیَمِیۡنِكَ اِذًا لَّارۡتَابَ الۡمُبۡطِلُوۡنَ ۞

یعنی: ''اس سے پہلے تو آپ کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے، نہ کسی کتاب کو اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے کہ کہیں یہ

باطل پرست لوگ جو تجھے جھٹلانا چاہتے ہیں شک وشبہ نہ پڑ جائیں۔''

بلا شک وشبہ اگر پیغمبر اکرم ﷺ اُس چھوٹے سے ماحول میں کہ جہاں پڑھے لکھے لوگ بہت ہی کم تھے، کسی اُستاد کے درس میں شریک ہو جاتے تو ہرگز اس قسم کا کلام سب کے سامنے پیش نہ کر سکتے چونکہ جو لوگ اس بات سے اچھی طرح آگاہ تھے وہ آپ کے مقابلے پر اُتر آتے اور اس بات (یعنی؛ پیغمبر کے پڑھا لکھا ہونے) کو پیغمبر ﷺ کے ساتھ جھوٹ کی نسبت دینے کے لئے ایک اچھا بہانہ بنا لیتے۔[1]

بالفرض پیغمبر اکرم ﷺ تعلیم یافتہ ہوتے اور لکھنا جانتے تو پھر بھی قرآن کے انسانی ذہن کی پیداوار نہ ہونا مسلّم تھا، لیکن آپؑ کا پڑھا لکھا نہ ہونا اس بات کی حقانیت پر ایک واضح اور قوی دلیل ہے۔ قرآن کی دو آیات میں بہت صراحت کے ساتھ پیغمبر اکرم ﷺ پر کلمہ ''اُمّیّ'' کا اطلاق ہوا ہے۔ اور اسے ''النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ'' سے تعبیر کیا ہے۔

اور ایک آیت میں توضمناً آپؐ کو اسی عنوان سے پکارا گیا ہے:

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ

یعنی: ''وہ وہی ہے جس نے اُمی لوگوں میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا۔[2]

اور ہم جانتے ہیں کہ ''اُمّیّ'' کی مشہور ترین تفسیر پڑھا لکھا نہ ہونا ہے۔ چونکہ ''اُم'' کا معنیٰ ''ماں'' ہے اور ''اُمی'' سے مراد وہ شخص ہے جو اُسی حالت پر باقی رہے جس حالت میں ماں سے پیدا ہوا ہے، یعنی؛ اُس نے نہ کوئی مدرسہ دیکھا ہو اور نہ کوئی اُستاد۔ اگرچہ بعض نے اس سے وہ شخص مراد لیا ہے جو اُمت اور عوام کے درمیان سے اُٹھا ہو، نہ کہ امیروں اور جبار لوگوں کے درمیان سے۔ اور بعض نے اس کا معنیٰ وہ شخص لیا ہے جو ''مکہ'' میں پیدا ہوا ہو یا مکہ سے اُٹھا ہو، چونکہ مکہ کے ناموں میں سے ایک نام ''اُم القریٰ'' بھی ہے، اس سلسلے میں روایات بھی مختلف ہیں، لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ہم ''اُمّیّ'' کے ہر تین معانی مراد لیں یعنی؛ اَن پڑھ، اُمت کے درمیان سے اُٹھنے والا اور مکہ میں پیدا ہونے والا۔

اگرچہ بعض دشمن مستشرقین نے کوشش کی ہے کہ وہ پیغمبر اکرم ﷺ کی اس فضیلت اور خصوصیت کی نفی کریں اور آپؐ کا تعلیم وتربیت حاصل کرنا ثابت کریں، لیکن اس بات کا اُن کے پاس کوئی جواب نہیں ہے کہ اگر آپؐ پڑھے لکھے ہوتے تو اُس زمانے میں کسی پر یہ بات ڈھکی چھپی نہ ہوتی اور آپؐ میں اس قدر صراحت کے ساتھ اس کے انکار کی گنجائش باقی نہ رہتی۔

زمانہ بعثت کا آغاز

یہ وہ انتہائی مختصر اشارے ہیں کہ جو پیغمبر اکرم ﷺ کی بعثت سے پہلے کی حیات مبارکہ کے بارے میں قرآن میں آئے

---

[1] سورہ اعراف۔ ۱۵۷۔ ۱۵۸

[2] سورہ جمعہ۔ ۲

ہیں۔لیکن جب ہم بعثت سے متعلق موضوعات شروع کرتے ہیں تو بہت مفصل ابحاث شروع ہو جاتی ہیں۔ بعثت پیغمبرؐ کے بارے میں قرآن نے مختلف اشارے کئے ہیں، منجملہ یہ کہ سورۂ علق کی پہلی پانچ آیات تمام مفسرین کے مطابق وحی کے آغاز کے وقت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی ہیں۔ [۱]

"اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۔ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ ۔"

قول مشہور کے مطابق یہ آیات کوہ حرا میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی ہیں، جن میں آپؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ خدا کے نام سے قرآن کی تلاوت کرو، وہی خدا کہ جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا جی ہاں! وہ خدا اس بات کی قدرت رکھتا ہے کہ وہ اس عظیم آسمانی کتاب کو عام سے حروف ''الف با'' کے ذریعے (اپنے بندے کو) سیکھائے کہ جو عالی ترین معارف اور تربیتی قوانین وتعلیمات پر مشتمل ہے۔ایک بار پھر قرائت قرآن کی تاکید کی جاتی ہے، یعنی؛ خداوند بزرگ کے نام سے شروع ہونے والی قرائت۔

اس کے بعد پڑھنے کے علاوہ لکھنے کی طرف بھی اشارہ کیا جاتا ہے۔خدا کو لکھنا سیکھانے والا قرار دیا جاتا ہے، وہ خدا جو انسان کا پہلا معلم ہے اور جو کچھ وہ نہیں جانتا تھا، اُسی نے اُسے سیکھایا ہے (کچھ علم تو بطور فطرت اُس کی سرشت میں رکھے ہیں اور کچھ علوم ومعارف کائنات میں عقل اور تدبر کے ذریعے اور کچھ انبیائے کرام کے ذریعے انسانوں کو سیکھائے ہیں) ان آیات کے مضامین سے پتا چلتا ہے کہ بعثت کا آغاز بہت ہی معنوی، روحانی اور علم ودانش سے بھرپور فضا میں ہوا ہے۔ [۲]

وحی الٰہی کا بھاری بوجھ ایک طرف اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دوش مبارک پر رکھی جانے والی عظیم رسالت ونبوت دوسری جانب اور تیسری جانب سے ہٹ دھرم اور متعصب مشرکین کے ساتھ قاطعانہ مقابلہ کرنے کے پُر رعب تصور کے سبب پیغمبر اکرمؐ اولین وحی کے بعد ایک غیر معمولی تھکاوٹ کا احساس کرنے لگے، گھر واپس لوٹے اور بستر پر استراحت فرمانے لگے تو اچانک قرآنی آیات کا دوسرا حصہ نازل ہونے لگا اور آواز بلند ہوئی: ''اے کپڑا اوڑھنے والے (اور بستر میں لیٹے ہوئے!) ہو اور آگاہ کر اور اپنے پروردگار کو بزرگ قرار دے'' اٹھو اور ڈارو اور اپنے رب کی بڑائی بزرگی کو بیان کرو۔

يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝۱ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝۲ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝۳ [۳]

اگرچہ ان آیات کے اسباب نزول کے بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، بعض ان کو اُس زمانے سے متعلق سمجھتے ہیں جب مشرکین عرب، موسم حج کے موقع پر جمع ہوئے تھے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مقابلے کرنے کے لئے باہمی مشورہ کر رہے

---

[۱] اگرچہ قرطبی جیسے بعض مفسرین نے ایک ضعیف قول نقل کیا ہے کہ پیغمبر پر سب سے پہلے نازل ہونے والی اایت سورہ حمد یا مدثر تھی، لیکن تفسیر روح البیان کے بقول اگر کوئی اختلاف ہے تو پوری سورہ علق میں ہے لیکن پہلی پانچ آیتوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ یہ پہلی نازل شدہ آیات ہے۔(جلد ۱۰، صفحہ ۴۷۰)

[۲] آل عمران کی آیات ۱۶۴ اور سورہ جمعہ کی آیت ۲ میں بھی پہلی آیات کے ذکر کے بغیر اصل بعثت کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

[۳] سورہ مدثر، ۱۔ ۲۔ ۳۔

تھے۔ لیکن متعدد روایات میں آیا ہے کہ کم از کم اس سورۂ کی ابتدائی آیات واقعہ "حرا" اور بعثت کے بعد نازل ہوئی ہیں اگرچہ بعد والی آیات اس کے بعد کے سالوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ [1]

انہی آیات کی طرح سورۂ مزمل کے شروع کی آیات بھی ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ شدت غم سے چادر اوڑھ کر بستر پر لیٹے ہوئے تھے کہ یہ آیات نازل ہوئیں اور آپ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

يَا أَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ﴿١﴾ قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿٢﴾ نِصْفَهُ أَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا ﴿٣﴾ أَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا ﴿٤﴾ إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا ﴿٥﴾

یعنی: "اے کپڑا لپٹنے والے! رات (کے وقت نماز) میں کھڑے ہو جاؤ مگر کم، آدھی رات یا اس سے بھی کچھ کم کر لے یا اس پر بڑھا دے اور قرآن ٹھہر ٹھہر کر (صاف) پڑھا کرو، یقینا ہم تجھ پر عنقریب بہت بھاری کلام نازل کریں گے۔"

ان آیات کا لہجہ بتا رہا ہے کہ یہ پیغمبر اکرم ﷺ کی دعوت کے شروع میں نازل ہوئی ہیں، چونکہ "قول ثقیل" (بھاری کلام) کا القاء، قرآن مجید کی طرف اشارہ ہے جو پیغمبر ﷺ پر اس وقت نازل کیا گیا ہے کہ جب بہت ہی قلیل تعداد میں لوگ آپ پر ایمان لائے تھے اور آپ اُن کو رات کے وقت اپنے پاس بلانے پر مجبور تھے اور دشمنوں کی آنکھوں سے چھپ کر اُن پر قرآن کی آیات اور اُس کے تعلیمات وقوانین کی تلاوت فرماتے تھے۔

البتہ بظاہر اس سورۂ کی کچھ آیات بعد کے سالوں میں نازل ہوئی ہیں، حتیٰ احتمال ہے کہ سورۂ کی آخری طولانی آیت مدینہ کے دور یا مکہ کے آخری دور سے تعلق رکھتی ہے کہ جس میں راہ خدا میں جہاد کا حکم آیا ہے (چونکہ اس میں مستقبل قریب کی خبر دی گئی ہے)۔ بہر حال یہ بات پہلی آیات کے آغاز دعوت میں نازل ہونے کے مانع نہیں بنتی، خصوصاً جب بہت سے مفسرین نے بھی اسی مطلب کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے بعثت کے شروع شروع میں اپنی دعوت کو خفیہ رکھا ہوا تھا اور فقط اُن لوگوں کے ساتھ رابطہ کرتے تھے اور اسلام کی دعوت دیتے تھے کہ جن پر اطمینان تھا اور جو دوسروں کی نسبت کہیں زیادہ اسلام قبول کرنے کے لئے آمادہ تھے۔ اس دوران فقط چند محدود لوگ ہی آپ پر ایمان لائے تھے۔

یوم الدار کا واقعہ

نبوت کے تیسرے سال آپ کو اپنی دعوت اعلانیہ کا حکم ہوا، اور آیہ مجیدہ میں ارشاد ہوا:

---

[1] مفسرین نے "مدثر" کی پانچ تفسیر ذکر کی ہیں کہ جن کی تفصیل تفسیر نمونہ کی جلد ۲۵ میں انہی آیات کے تحت ذکر ہوئی ہے۔ ان میں سے سب سے زیادہ مناسب یہ ہے کہ پیغمبر پریشان تھے اور بستر پر آرام فرما رہے تھے تو اس وقت یہ آیات نازل ہوئی ہے۔

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴿۲۱۴﴾

یعنی: ''اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈراؤ! نازل ہوئی۔''[۱]

اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۹۴﴾

یعنی: ''آپ کو جس بات پر مامور کیا گیا ہے اس کو کھل کر بیان کریں اور مشرکین سے منہ موڑ لیں اور اُن کی ذرا بھی پروانہ کریں۔''[۲]

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی الاعلان دعوت دینی شروع کر دی اور اس کام کا آغاز اپنے قریبی رشتہ داروں سے کیا جس کا قصہ بہت مشہور ہے اور گذشتہ حصے میں بیان ہو چکا ہے۔ اس دوران پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر انواع واقسام کی مشکلات شروع ہو گئیں اور دشمن ہر طرف سے متحرک ہو گئے۔ قابل توجہ بات یہ کہ دشمنوں کا پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مقابلہ چند مرحلوں میں چند مختلف صورتوں میں ہوا (اور بظاہر یہ مراحل تمام الٰہی انقلابات میں اسی طرح پیش آتے ہیں)

پہلا مرحلہ، مذاق اُڑانے اور استہزاء کرنے کا مرحلہ تھا۔ یہ اس زمانے میں پیش آیا کہ جب وہ اس نئے مذہب کو سنجیدگی کے ساتھ نہیں لے رہے تھے، اور نہ اُس سے خطرہ محسوس کر رہے تھے۔ اُن کا خیال یہ تھا کہ مذاق اُڑانے اور استہزاء کرنے سے یہ کام ختم ہو جائے گا اور اس سے زیادہ کی ضرورت پیش نہیں آئے گی، سورۂ انبیاء کی آیت نمبر ۳۶ اسی مرحلے کو بیان کر رہی ہے:

وَاِذَا رَاٰكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ۭ اَھٰذَا الَّذِيْ يَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ ۚ وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۶﴾

یعنی: ''یہ منکرین جب تجھے دیکھتے ہیں تو تمہارا مذاق ہی اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں: کیا یہی وہ ہے جو تمہارے معبودوں کا ذکر برائی سے کرتا، درحالانکہ وہ خود خدائے رحمٰن کی یاد کے بالکل ہی منکر ہیں۔''[۳]

یہ بات فقط پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی سے مخصوص نہیں تھی بلکہ قرآن پوری صراحت کے ساتھ فرماتا ہے:

''جو بھی پیغمبر اور نبی کسی قوم کی طرف مبعوث ہوتا تھا تو دل کے اندھے دشمنوں کی جانب سے مذاق اور تمسخر کا نشانہ بنتا تھا'':

---

[۱] سورہ شعراء۔ ۲۱۴

[۲] سورہ حجر۔ ۹۴

[۳] یہی بات سورہ فرقان کی آیت ۴۱ میں بھی آئی ہے۔ وَاِذَا رَاَوْكَ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ۭ اَھٰذَا الَّذِيْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا ﴿۴۱﴾

وَمَا يَأْتِيهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ⑪ [1]

لیکن جب مذاق اور تمسخر سے کوئی اثر نہ ہوا اور اسلام نے پہلے کی طرح اپنی پیشرفت جاری رکھی تو اُنہوں نے ''دوسرے مرحلے'' کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر دیوانگی، جنون، ساحر اور شاعر ہونے اور ادھر اُدھر کی مارنے والے یا سابقہ لوگوں کے افسانے گھڑنے والے شخص جیسی تہمتیں لگا کر میدان سے بھگانے کی کوششیں کرنے لگے۔

کبھی کہا جاتا:

يَا أَيُّهَا الَّذِي نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ إِنَّكَ لَمَجْنُونٌ ⑥

یعنی: ''اے وہ شخص (جس کے خیال میں) اُس پر قرآن اتارا گیا ہے یقیناً تُو تو کوئی دیوانہ ہے۔'' [2]

اور کبھی ایک دوسرے سے کہتے تھے:

أَئِنَّا لَتَارِكُوا آلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَجْنُونٍ ㊱

یعنی: ''کیا ہم اپنے معبودوں (بتوں) کو ایک دیوانے شاعر کی بات پر چھوڑ دیں۔'' [3]

اور کبھی کہتے:

هَٰذَا سِحْرٌ وَإِنَّا بِهِ كَافِرُونَ ㉚

یعنی: ''یہ جادو ہے اور ہم اس کے منکر ہیں۔'' [4]

یہاں قرآن اضافہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ فقط مشرکین ہی نہیں تھے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر تہمت لگاتے تھے، بلکہ پوری تاریخ میں تمام انبیاء کرامؑ اس مشکل کا شکار رہے ہیں۔ قرآن فرماتا ہے:

كَذَٰلِكَ مَا أَتَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا قَالُوا سَاحِرٌ أَوْ مَجْنُونٌ ㊾

یعنی: ''اسی طرح جو لوگ ان سے پہلے گزرے ہیں ان کے پاس جو بھی رسول آیا انہوں نے کہہ دیا کہ یہ جادوگر ہے یا دیوانہ ہے۔'' [5]

سورہ نحل آیت نمبر ۱۰۳ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

---

[1] سورہ حجر۔ ۱۱

[2] سورہ حجر۔ ۶

[3] سورہ صافات۔ ۳۶

[4] سورہ زخرف۔ ۳۰

[5] ذاریات۔ ۵۲۔

وَلَقَدۡ نَعۡلَمُ اَنَّهُمۡ يَقُوۡلُوۡنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِىۡ يُلۡحِدُوۡنَ اِلَيۡهِ اَعۡجَمِىٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِىٌّ مُّبِيۡنٌ﴿۱۰۳﴾

یعنی: ''ہمیں بخوبی علم ہے کہ یہ کافر کہتے ہیں کہ اسے تو ایک آدمی سکھاتا ہے، حالانکہ اس کی زبان جس کی طرف یہ نسبت دے رہے ہیں عجمی ہے اور یہ قرآن تو صاف (فصیح وبلیغ) عربی زبان میں ہے۔''[۱]

اور کبھی کہتے تھے:

یہ تو اگلوں کے جھوٹے افسانے ہیں جو اس نے لکھ رکھے ہیں بس وہی صبح وشام اس کے سامنے پڑھے جاتے ہیں۔[۲]

وَقَالُوۡۤا اَسَاطِيۡرُ الۡاَوَّلِيۡنَ اكۡتَتَبَهَا فَهِىَ تُمۡلٰى عَلَيۡهِ بُكۡرَةً وَّاَصِيۡلًا﴿۵﴾

جیسا کہ آپ جانتے ہیں: ''اساطیر''، ''اُسطورہ'' کی جمع ہے جس کا معنی جھوٹے افسانے اور قصے کہانیاں ہیں۔ اس طرح وہ اپنے ذہن میں آنی والی انواع واقسام کی تہمتیں پیغمبر اکرم ﷺ پر لگاتے تھے، لیکن ان میں سے کوئی بھی تہمت موثر واقع نہیں ہوئی اور اسلام ہمیشہ کی طرح سرعت کے ساتھ تمام طبقات میں پھیلتا رہا۔

پھر تیسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے، یہ مختلف قسم کے معاشرتی اور معاشی محاصرے کا مرحلہ ہے چونکہ اب وہ اس خطرے کے بارے میں سنجیدگی کے ساتھ سوچنے لگے تھے تاکہ وہ اس طریقے سے پیغمبر اکرم ﷺ اور آپؐ پر ایمان لانے والے چھوٹے سے گروہ کو جھکنے پر مجبور کردیں۔ بعثت کے چھٹے سال ''شعب ابی طالب'' کا واقعہ اور مسلمانوں کا اُس خشک اور گرم درّے میں تین سال تک محصور ہونا جس کے نتیجے میں مسلمان بچوں اور بعض بوڑھے افراد کا موت کے منہ میں چلا جانا، اسی طرح بعثت کے پانچویں سال مشرکین کے اذیت وآزار اور غیر معمولی دباؤ کی وجہ سے ایک گروہ کا حبشہ ہجرت کرنا، اس مرحلے کے مشہور واقعات ہیں حیرت ناک بات تو یہ ہے کہ اُنہوں نے نہ صرف مسلمانوں کے اوپر دباؤ ڈالا تھا۔

بلکہ تاریخ کے مطابق اُنہوں نے آپس میں عہد کیا کہ وہ تمام بنی ہاشم اور بنی عبد المطلب سے بائیکاٹ کریں گے خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلمان، نہ اُن سے کوئی رشتہ لیں گے اور نہ اُنہیں کوئی رشتہ دیں گے، نہ اُنہیں کوئی چیز بیچیں گے نہ کوئی چیز خریدیں گے تاکہ مسلمانوں پر شدید دباؤ ڈالا جاسکے۔

اگرچہ قرآن کی آیات میں اس مسئلے کے بارے میں کوئی واضح اشارہ نہیں ملتا، لیکن مدینہ میں کفار ومشرکین اور منافقین ایک

---

[۱] تفاسیر میں آیا ہے کہ مکہ میں ''بلعام'' نام کا ایک شخص تھا جو دراصل قبیلہ بنی حضرم کا ایک رومی غلام تھا۔ مشرکین کہتے تھے ''محمدؐ'' اس سے قرآن حاسل کرتے ہیں۔ بعض نے یسار وجبر نام کے دو عیسائی غلاموں یا سلیمان فاری کا ذکر کیا ہے کہ جن میں سے کوئی بھی عرب نہیں تھا جبکہ قرآن فصاحت وبلاغ میں معجزہ ہے۔

[۲] سورہ فرقان۔ ۵

دوسرے کو جو نصیحتیں کرر ہے تھے، اُس سے مکہ کے حالات کو سمجھا جا سکتا ہے:

هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى

یعنی: یہی وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ جو لوگ رسول اللہ کے پاس ہیں ان پر کچھ خرچ نہ کرو یہاں تک کہ وہ بکھر جائیں۔[۱]

اس دباؤ کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا، بلکہ اس کی وجہ سے سب کی توجہ مسلمانوں کی طرف ہونے لگی اور اسلام کی شہرت زبان زد عام وخاص ہوگئی۔ اسی کے ساتھ مسلمانوں پر ایک قسم کی مظلومیت چھا گئی اور اُنہوں نے لوگوں کے ایک بڑے گروہ کے جذبات کو اپنی جانب کھینچ لیا۔ دشمنوں کی جانب سے یہ مسئلہ مزید گرم ہوگیا اور دشمن کی طرف سے ظالمانہ مقابلہ چوتھے مرحلے میں داخل ہوگیا۔ یعنی؛ اُنہوں نے پیغمبر اکرم ﷺ کو قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا تا کہ ہمیشہ کے لئے اپنے آپ کو اس مشکل سے نجات دے کر مطمئن ہو جائیں۔

یا کم از کم آپؐ کو سرزمین مکہ سے جلاوطن کر دیں۔ وہ سب ''دارالندوہ'' میں جو اُن کے اُٹھنے بیٹھنے اور مشاورت کا مقام تھا، اکٹھے ہو گئے اور اس کام کے لئے ایک انتہائی منظم شیطانی منصوبہ بنانے لگے۔ جیسا کہ قرآن مجید فرماتا ہے:

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ؕ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝۳۰

یعنی: ''اور اس واقعہ کو بھی یاد کیجئے! جب کافر لوگ آپ کی نسبت تدبیر سوچ رہے تھے کہ آپ کو قید کر لیں یا آپ کو قتل کر ڈالیں یا آپ کو جلاوطن کر دیں اور وہ تو اپنی تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ اپنی تدبیر کر رہا تھا اور سب سے زیادہ مستحکم اور بہترین تدبیر والا اللہ ہے۔[۲]

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے شیطانی منصوبوں کو عجیب طریقے سے نقش بر آب کر دیا تھا اور کس طرح پیغمبر اکرم ﷺ ننگی تلواروں کے محاصرے سے صحیح وسالم نکل کر مدینہ کی جانب چل پڑے تھے اور اس طرح آپؐ نے اپنی وہ عظیم ہجرت شروع کی کہ جو اسلام اور دنیائے انسانیت میں ایک بڑے انقلاب کا آغاز سمجھی جاتی ہے۔ اسی سلسلے میں ہم ایک بار پھر قرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں، ارشاد ہوتا ہے:

اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ؕ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ

[۱] سورہ منافقون/۷

[۲] سورۂ انفال/۳۰

حَكِيمٌ ﴿٤٠﴾

''اگر تم اس (نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مدد نہیں کرو گے تو اللہ اس کی مدد کرے گا (جیسا کہ اس نے مشکل ترین لمحات میں اسے تنہا نہیں چھوڑا)، اس وقت جبکہ کافروں نے انہیں (مکہ سے) نکال دیا تھا، جبکہ وہ دو میں سے دوسرے تھے (اور ان کے ساتھ صرف ایک شخص اور تھا) جب وہ دونوں غار میں تھے تو وہ اپنے ہمسفر سے کہہ رہے تھے کہ غم نہ کر اللہ ہمارے ساتھ ہے، پس اس موقع پر اللہ نے اپنا سکینہ (اور اطمینان) آپ پر نازل فرما کر ان لشکروں سے اس کی مدد کی جنہیں تم نے دیکھا ہی نہیں اور کافروں کی بات پست کر دی (اور انہیں شکست سے دوچار کر دیا) اور اللہ کی بات (اور اس کا دین) بلند (اور کامیاب) ہوا اور اللہ عزیز و حکیم ہے۔''[1]

اور اس طرح پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم سے اپنے گرد پیدا ہونے والے انواع واقسام کے خطروں سے بچتے رہے، اور پورے اطمینان اور سکون کے ساتھ اپنی ہجرت کا آغاز کیا جس سے اسلام ایک نئے تقدیر ساز مرحلے میں داخل ہو گیا اور دشمنوں کو اس مرحلے میں بھی شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ اسلام مدینہ میں سرعت کے ساتھ پھیل رہا تھا اور اُسکے بہت سے پیروکار پیدا ہو چکے تھے، اس کے ساتھ ہی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب سے اسلامی حکومت کی بنیاد بھی رکھ دی گئی تھی اور مسلمان فوج، بیت المال اور حکومتی ضرورت کے تمام ادارے وجود میں آ گئے تھے۔

اسلام کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ دشمن نے بھی اس کے خطرات کو اور زیادہ سنجیدگی کے ساتھ دیکھتے ہوئے اپنی جدوجہد میں اضافہ کر دیا اور ''پانچویں مرحلے'' میں اسلام کے خلاف مسلح جنگ شروع کر دی گئی اور اس طرح اسلامی غزوات ''بدر کبریٰ'' و''صغریٰ''، ''احد''، ''خیبر'' اور ''حنین'' وغیرہ جیسی جنگیں یکے بعد دیگرے واقع ہونے لگیں اور سوائے ایک موقعہ کے تمام جنگوں میں مسلمانوں نے پے در پے اور واضح کامیابیاں حاصل کیں۔

قرآن مجید نے بہت سی آیات میں مسلمانوں کے لئے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ کے اس مرحلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، تاریخ اسلام کے اس حصے کی طرف زیادہ توجہ دی ہے۔ سورۂ توبہ کی آیت نمبر ۲۵ میں ان غزوات کی طرف ایک اجمالی اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ

یعنی: ''یقینا اللہ تعالیٰ نے بہت سے میدانوں میں تمہیں فتح دی ہے اور حنین کی لڑائی والے دن بھی آپ کو

---

[1] سورہ توبہ/۴۰

دشمن پر کامیابی ہوئی ہے۔" [1]

"مَوَاطِن"، "مَوطِن" کی جمع ہے جو کبھی تو وطن اور دائمی سکونت کے معنیٰ میں آتا ہے اور کبھی میدان جنگ کے معنیٰ میں، یہاں پر "مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ" سے مراد اسلامی جنگوں کے متعدد میدان ہیں کہ جن کی تعداد "اسی" سے زیادہ ذکر کی گئی ہے۔ لہٰذا ایک حدیث میں آیا ہے کہ جب عباسی خلفا میں سے کسی نے نذر کی تھی کہ اگر وہ زہر کی مسمومیت سے شفا پا جائے گا تو ایک کثیر مال فقراء کو دے گا۔ جب وہ شفایاب ہو گیا تو اس کے ارد گرد بیٹھنے والے فقہا میں سے کوئی بھی "مال کثیر" کی مقدار کا تعین نہ کر سکا، اس وقت نویں امام حضرت محمد بن علی تقی علیہ السلام نے اس کی تفسیر "اَسی" سے کی تھی (شاید اسی ہزار درہم مراد تھی) چونکہ مذکورہ بالا آیت میں مواطن کثیرہ کا اطلاق اسلامی غزوات پر ہوا ہے کہ جو "اسی" کی تعداد میں تھے۔ [2]

آخر کار فتح المبین اور "فتح مکہ" کا موقعہ آن پہنچا اور مسلمانوں نے دشمن کی آخری رہی سہی طاقت بھی ختم کر ڈالی اور اسلام جزیرۃ العرب پر مکمل طور پر حاکم ہو گیا۔ لیکن شکست خوردہ دشمن پھر بھی خاموش نہیں بیٹھا اور اس نے مجبوراً ایک خفیہ گروہ (منافقین) کی شکل اختیار کر لی (جو بظاہر تو اسلام کا اظہار کرتے تھے، لیکن اندر سے قسم قسم کی سازشوں میں مشغول رہتے تھے) اور اس طرح "چھٹا مرحلہ" (دشمن کی طرف سے مقابلے کا آخری مرحلہ) آن پہنچا۔ البتہ منافقین اسلام کی ابتدائی کامیابیوں کے ساتھ ہی پیدا ہو گئے تھے جو آہستہ آہستہ پھیلتے رہے ہیں اور ان کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے!

وہ اس مرحلے میں بھی یقینی شکست سے دوچار ہوئے اور اُن کی سازشیں یکے بعد دیگرے آشکار ہوتی گئیں اور اُن کے منصوبے نقش بر آب ثابت ہوتے گئے۔ اگرچہ ان کی کچھ چنگاریاں، خاکستر کے نیچے باقی رہیں اور رحلت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد انہوں نے اپنی سرگرمیاں شروع کر دی تھیں۔ قرآن مجید کی بہت سی آیات اس مرحلے کی طرف بھی اشارہ کرتی ہیں جو قرآن کا بہت ہی سبق آموز حصہ سمجھا جاتا ہے۔

سورۂ احزاب، سورۂ توبہ اور سورۂ منافقین میں ان کے بارے میں بہت ہی سخت باتیں اور ان کی مذمت ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ جن سے منافقین کی گہری سازشوں کا پتہ چلتا ہے۔ جیسا کہ سورۂ توبہ کی آیت نمبر ۴۸ میں (اللہ تعالیٰ) اس گروہ کے بارے میں بہت زیادہ بحث و گفتگو کے بعد ان کی عہد شکنی، فتنہ انگیزی اور جاسوسی کے بارے میں فرماتا ہے:

لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ﴿٤٨﴾

یعنی: "یہ تو اس سے پہلے بھی (مثلاً جنگ تبوک اور منافقین کی عہد شکنی) فتنے کی تلاش کرتے رہے ہیں اور

---

[1] سورہ توبہ۔ ۲۵

[2] نور الثقلین، ج ۲، ص ۱۹۷

تیرے لئے مختلف کاموں کو الٹ پلٹ کرتے رہے ہیں یہاں تک کہ حق آن پہنچا اور اللہ کا حکم غالب آ گیا، (اور آپ کامیاب ہو گئے) باوجود یکہ وہ (منافقین) اس سے ناخوش ہی رہے ہیں۔"[1]

یہ چھ مرحلے فقط پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسلامی انقلاب نے ہی طے نہیں کئے گئے، بلکہ بہت سے الٰہی انقلابات کو ان کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ جو اپنی جگہ پر ایک مفصل اور سبق آموز داستان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن ان تمام کوششوں کا کوئی فائدہ نہیں ہوا، اس کے برعکس اسلام کا درخت پھلتا پھولتا رہا اور پورے جزیرہ نمائے عرب میں اپنی شاخیں اور پتے پھیلاتا رہا اور اس بارے میں قرآن ارشاد فرماتا ہے:

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝

یعنی: "اللہ کی مدد اور فتح کا وقت آ پہنچا اور تو نے لوگوں کو اللہ کے دین میں جوق در جوق داخل ہوتا دیکھ لیا۔"[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ کے آخری مہینے

آخرکار پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے آخری ایام آن پہنچے، اسی سال آپؐ نے "حجۃ الوداع" بجالایا اور قرآن کے آخری سورہ یعنی؛ سورۂ مائدہ، آخری پیغامات کے ساتھ نازل ہوا، اور اسی سورۂ میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے جانشین اور وصی "حضرت علی علیہ السلام" کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے حکم کو ابلاغ کرنے پر مامور کیا گیا جیسا کہ اس سورۂ کی آیت ۶۷ میں آیا ہے:

"يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۚ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ۚ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۔"

"اے رسول جو کچھ بھی آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے اُسے بطور کامل پہنچا دیجئے۔ اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے اللہ کی رسالت ادا نہیں کی اور آپ کو اللہ تعالیٰ لوگوں (کے احتمالی خطرات) سے بچالے گا۔ بے شک اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔"[3]

اور یہ کام "غدیر خم" میں انجام دیا گیا کہ جہاں ایک بڑا راستہ گذرتا ہے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جو مختلف گروہ حج میں شریک تھے، وہ یہاں سے ایک دوسرے سے جدا ہوئے تھے۔ اس طرح ایک بہت بڑے مجمع میں ایک عظیم اجتماع کے سامنے اس الٰہی ذمہ داری کا حق ادا کر دیا گیا۔ (اس کی تفصیل آپ تفسیر نمونہ کی جلد پانچ کے شروع میں پڑھ سکتے ہیں)

آخرکار وہ عظیم افسوسناک واقعہ رونما ہو گیا، یعنی؛ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کا وقت آ پہنچا، لیکن یہ سب اُس وقت ہوا جب

---

[1] توبہ/ ۴۸

[2] سورۂ نصر/ ۱، ۲

[3] سورہ مائدہ/ ۶۷

اسلام کی بنیادیں ہر لحاظ سے مستحکم ہوچکی تھیں، اور دنیا کے اطراف واکناف میں اس کی ترقی وپیشرفت کا راستہ ہموار ہو چکا تھا۔ لہٰذا دشمنوں کی تمام آرزوئیں بر باد ہوگئیں جو رحلت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ آپؐ کے دین کے ختم ہوجانے کا سوچ رہے تھے، ارشاد الٰہی ہے:

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ۖ اَفَاۡئِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ۝٣٤

یعنی: ''آپ سے پہلے کسی انسان کو بھی ہم نے زندگی جاوید نہیں دی، کیا اگر آپ مر گئے تو وہ (جو آپؐ کی موت کا انتظار کررہے ہیں) ہمیشہ کے لئے رہیں گے؟''[1]

قرآن پھر فرماتا ہے:

اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ۝٣٠

یعنی: ''یقیناً خود آپ کو بھی موت آئے گی اور یہ سب بھی مرنے والے ہیں۔''[2]

مزید ارشاد ہوا:

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۗ

یعنی: ''ہر انسان موت کا مزہ چکھنے والا ہے۔''[3]

آخرکار عالم خلقت کا یہ عمومی قانون پورا ہوا اور درج ذیل آیت کے مصداق کے طور پر ارشاد ہوا:

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝٣٢

یعنی: ''وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منہ سے پھونک کر بجھا دیں اور اللہ تعالیٰ نہیں چاہتا مگر یہ کہ اپنا نور پورا کرے خواہ کافر ناخوش ہی رہیں۔''[4]

یہ نور الٰہی روز بروز درخشندہ تر ہوتا گیا اور آج دنیا کا ایک بڑا حصہ اس کے زیر سایہ آچکا ہے اور ہر سال نئے علاقے فتح کررہا ہے۔ یہ تھا قرآن مجید میں حیات پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مختلف حصوں کا پس منظر جس میں سے ہر مرحلے میں نازل ہونے والی آیات کو ذکر کرنے اور ہر ایک کی تشریح کے لئے ایک الگ کتاب کی ضرورت ہے۔

---

[1] سورۂ انبیاء/ ۳۴

[2] سورۂ زمر/ ۳۰

[3] سورۂ انبیاء/ ۳۵

[4] سورۂ توبہ/ ۳۲

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دعویٰ کی سچائی پر دلائل

اعجاز قرآن

اشارہ:

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ کسی بھی موضوع کے بارے میں کسی بھی دعویدار کی بات کو بغیر دلیل کے قبول نہیں کیا جا سکتا، چہ جائیکہ انبیاء کی نبوت، وحی الٰہی، خدا سے ارتباط اور لوگوں کو اپنی پیروی کرنے کی دعوت جیسے انتہائی اہم موضوع کے بارے میں بغیر دلیل کے کسی کی بات مان لی جائے۔ بنابریں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں جو مسئلہ سب سے پہلے پیش آتا ہے، وہ نبوت کے دلائل کا مسئلہ ہے۔ جیسا کہ ہم اجمالاً جانتے ہیں کہ یہ دلائل انواع واقسام کے ہیں؛ جن کو ہم یہاں چار عناوین کے تحت ذکر کرتے ہیں:

۱۔ معجزات

۲۔ دعوت کا موضوع

۳۔ سابقہ انبیاء اور آسمانی کتابوں کی خبریں

۴۔ مختلف قرینے: جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے سابقہ حالات، اُس کے اردگرد رہنے والے اصحاب، مقصد تک رسائی کے وسائل، اپنے ماحول پر موثر واقع ہونے کی قدرت، اپنے مقصد پر ایمان اور اس کی خاطر اُس میں قربانی دینے کی ہمت وطاقت اور دوسری صفات وخصوصیات جو ہمیں اُس کے اپنے دعویٰ میں سچا ہونے کا یقین دلائیں۔

اس اشارے کے ساتھ اب ہم پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات کا مطالعہ کرتے ہیں اور سب سے پہلے آپؐ کے سب سے بلند مرتبہ اور محکم ترین معجزے یعنی؛ ''قرآن'' کے بارے میں تحقیق کرتے ہیں اور اس کے لئے پہلے خود قرآن کے بارے میں قرآن کی بات سنتے ہیں:

۱۔ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ﴿۸۸﴾ (سورہ بنی اسرائیل/ ۸۸)

۲۔ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۳﴾ (سورہ ہود/ ۱۳)

۳۔ وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۠ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۳﴾ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا

النَّارَ الَّتِیۡ وَقُوۡدُهَا النَّاسُ وَالۡحِجَارَةُ ۖۚ اُعِدَّتۡ لِلۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۲۴﴾ (سورہ بقرہ/ ۲۳، ۲۴)

۴۔ اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰىهُ ؕ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّثۡلِهٖ وَادۡعُوۡا مَنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۳۸﴾ (سورہ یونس/ ۳۸)

۵۔ اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلۡ لَّا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿ۚ۳۳﴾ فَلۡیَاۡتُوۡا بِحَدِیۡثٍ مِّثۡلِهٖۤ اِنۡ کَانُوۡا صٰدِقِیۡنَ ﴿ؕ۳۴﴾

(سورہ طور/ ۳۳، ۳۴)

۶۔ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِکِتٰبٍ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ هُوَ اَهۡدٰی مِنۡهُمَاۤ اَتَّبِعۡهُ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۴۹﴾ فَاِنۡ لَّمۡ یَسۡتَجِیۡبُوۡا لَكَ فَاعۡلَمۡ اَنَّمَا یَتَّبِعُوۡنَ اَهۡوَآءَهُمۡ ؕ وَمَنۡ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَیۡرِ هُدًی مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿ؒ۵۰﴾ (سورہ قصص/ ۴۹، ۵۰)

۷۔ وَقَالُوۡا لَوۡلَاۤ اُنۡزِلَ عَلَیۡهِ اٰیٰتٌ مِّنۡ رَّبِّهٖ ؕ قُلۡ اِنَّمَا الۡاٰیٰتُ عِنۡدَ اللّٰهِ ؕ وَاِنَّمَاۤ اَنَا نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۵۰﴾ اَوَلَمۡ یَکۡفِهِمۡ اَنَّاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡكَ الۡکِتٰبَ یُتۡلٰی عَلَیۡهِمۡ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَرَحۡمَةً وَّذِکۡرٰی لِقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿ؒ۵۱﴾ (سورہ عنکبوت/ ۵۰، ۵۱)

ترجمہ:

۱۔ کہہ دیجئے کہ اگر تمام انس و جن مل کر اس قرآن کی مثل لانا چاہیں تو وہ اس کی مثل نہیں لا سکیں گے اگر چہ وہ (اس کام کے لئے آپس میں) ایک دوسرے کے مددگار بھی بن جائیں۔

۲۔ کیا یہ کہتے ہیں کہ اس قرآن کو اُس نے (خود سے) گھڑا ہے۔ جواب دیجئے کہ پھر تم بھی اسی کے مثل دس سورتیں گھڑی ہوئی لے آؤ اور (اس کام کے لئے) اللہ کے سوا جسے چاہو اپنے ساتھ بلا لو اگر تم سچے ہو۔

۳۔ ہم نے اپنے بندے (پیغمبرؐ) پر جو کچھ اتارا ہے، اس میں اگر تمہیں شک ہو اور تم سچے ہو تو (کم از کم) اس جیسی ایک سورت تو بنا لاؤ، تمہیں اختیار ہے کہ (اس کام کے لئے) اللہ تعالیٰ کے سوا اپنے گواہوں کو بھی بلا لو۔ پس اگر تم نے ایسا نہ کیا۔ تم ہرگز نہیں کر سکتے (اسے سچا مان کر) اس آگ سے بچو جس کا ایندھن (گنہگار) انسان اور پتھر (بت) ہیں جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

۴۔ کیا یہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ اُس نے اس (قرآن) کو گھڑ لیا ہے؟ آپ کہہ دیجئے کہ پھر تم اس کے مثل ایک ہی سورت بنا لاؤ اور جن جن غیر اللہ کو بلا سکو، بلا لو اگر تم سچے ہو۔

۵۔کیا یہ کہتے ہیں: اس نبی نے (قرآن) خود گھڑ لیا ہے، واقعیت یہ ہے کہ وہ ایمان نہیں لاتے اچھا اگر یہ سچے ہیں تو اس جیسا ایک کلام یہ (بھی) تو لے آئیں۔

٦۔کہہ دیجئے کہ اگر سچے ہو (کہ تورات اور قرآن خدا کی طرف سے نہیں ہیں) تو تم بھی اللہ کے پاس سے کوئی ایسی کتاب لے آؤ جو ان دونوں سے زیادہ ہدایت والی ہو میں اسی کی پیروی کرونگا۔ پھر اگر وہ تیری یہ بات نہ مانیں تو یقین کر لے کہ یہ صرف اپنی خواہش کی پیروی کر رہے ہیں اور اس سے بڑھ کر بہکا ہوا کون ہے؟ جو اپنی خواہش کے پیچھے پڑا ہوا ہو اور اللہ کی کسی ہدایت و رہنمائی کو قبول نہیں کرتا، بیشک اللہ تعالیٰ ظالم لوگوں کی ہدایت نہیں کرتا۔

٧۔انہوں نے کہا کہ اس پر کچھ معجزات اس کے رب کی طرف سے کیوں نہیں اتارے گئے۔آپ کہہ دیجئے کہ معجزات تو سب اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں (جو اُسی کے حکم سے نازل ہوتے ہیں نہ میری خواہش سے) میں تو صرف کھلم کھلا ڈرانے (آگاہ) کرنے والا ہوں۔کیا ان کے لئے یہ کافی نہیں؟ کہ ہم نے آپ پر کتاب نازل فرمائی جو ان پر پڑھی جا رہی ہے، اس میں رحمت (بھی) ہے اور نصیحت (بھی) ہے ان لوگوں کے لئے جو ایمان دار ہیں (اور یہ بہت ہی واضح معجزہ ہے)

تفسیر اور خلاصہ

درحقیقت میں ان سات آیات میں قرآن مجید نے چیلنج (مقابلے کی دعوت) پر انحصار کیا ہے کہ جو اعجاز کے ارکان میں سے ایک ہے؛ کبھی تو بہت ہی صراحت کے ساتھ اور کبھی التزامی دلالت کے ساتھ فرماتا ہے: یہ آسمانی کتاب خدا کی طرف سے ہے اگر تمہیں اس میں کوئی شک اور شبہ ہے تو تم سب اکٹھے ہو کر اور اپنی تمام قوتیں لگا کر اس جیسی کوئی چیز یا اس کا کچھ حصہ لے آؤ۔ کیونکہ یہ اگر انسانی فکر کا نتیجہ ہوتا تو تم بھی انسان ہو اور فکر اور ذہانت کے مالک ہو؛ درحقیقت اس طرح ایک واضح عقلی منطق کے ذریعے اجمالی طور پر اعجاز قرآن کو ثابت کیا گیا ہے۔

پہلی آیت میں فرمایا ہے: ہٹ دھرم بہانے بنانے والوں کے سامنے" کہو: اگر تمام انس و جن جمع ہو کر قرآن جیسی کتاب لانا چاہیں تو ہرگز نہیں لاسکیں گے خواہ اس کام میں ایک دوسرے کے مددگار ہی کیوں نہ بن جائیں

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ﴿٨٨﴾

یہ آیت جہاں ایک طرف تمام انسانوں کے لئے دعوت عام ہے، وہاں دعوت قرآن کے دائمی ہونے کی وجہ سے اُن تمام

انسانوں کو بھی شامل ہے جو زمانہ حاضر اور دوسرے زمانوں میں رہنے والے ہیں اور پھر ''اِجْتَمَعَت '' کی تعبیر اور ''بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا '' کے جملے کے ساتھ ایک دوسرے کی مدد ہم آہنگی، باہمی تعاون اور مقابلہ بمثل کی دعوت دیتا ہے، پھر اس مقابلے کے لیے ساتھ مختلف انداز میں جوش دلانا باالفاظ دیگر مدّ مقابل کو غیرت دلانا بھی ہے اور اس طرح یہ ایک قوی ترین ''چیلنج'' کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اور جب پورے یقین کے ساتھ کہا جاتا ہے: ''لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ''(اس جیسا ہرگز نہیں لا سکتے) تو اس سے اس کا انسانی دنیا کے ماوراء کے ساتھ تعلق واضح ہو جاتا ہے۔

اگرچہ یہ قابل سماعت پکار عمومی پہلو رکھتی تھی اور پھر عصر نبوت اور دوسرے ادوار اور زمانوں میں اسلام کے دشمنوں کے لئے اس (الٰہی کتاب) کا مقابلہ کرنے اور اس کی آواز کو دبانے کا محرک بھی بہت قوی تھا، لہٰذا اگر اُن میں اس کام کی طاقت ہوتی تو کبھی بھی اس سے چشم پوشی نہ کرتے جبکہ نہ تو دنیا کی تاریخ سے اور نہ اسلام کی تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ کسی شخص یا کسی گروہ نے اس قسم کا کوئی کام انجام دیا ہو اور یہی بات اُن کے عجز و ناتوانی اور قرآن کی حقانیت کی (سب سے بڑی) دلیل ہے۔

اس کے علاوہ اس آیت سے یہ بھی استفادہ ہوتا ہے کہ (اس کام کے لئے) فقط اکٹھے ہونے کا کوئی فائدہ نہیں ہے بلکہ ''ظَهِير'' ہونا، یعنی؛ ایک دوسرے کی مدد اور نصرت کرنا بھی مشکلات کو حل کرتی ہے۔ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن فقط ''بلاغت'' بیان کے رسا اور شرین ہونے کے لحاظ سے ہی چیلنج نہیں کر رہا بلکہ ''مثله''(اس جیسے) کے الفاظ کے ساتھ عبارات، مضامین، تعلیمات، احکام و قوانین اور تمام پہلوؤں سے شباہت کو پیش کر رہا ہے۔ دوسری آیت میں تحدی اور مقابلے کی دعوت کی سطح کم کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے:

''وہ یعنی؛ اسلام کے مخالفین کہتے ہیں: اس قرآن کو اُس نے (خود سے) گھڑا ہے۔ جواب دیجئے کہ پھر تم بھی اسی کے مثل دس سورتیں گھڑی ہوئی لے آؤ۔''

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ

قرآن اسی پر قناعت نہیں کرتا بلکہ مزید کہتا ہے:

''اور (اس کام کے لئے) اللہ کے سوا جسے چاہو اپنے ساتھ بلا لو اگر تم سچے ہو''

وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۳﴾

درحقیقت قرآن مجید اپنے چیلنج کو دس سوروں تک جو کہ کل قرآن کا دسواں حصہ ہے، نیچے لے آیا ہے۔ تیسری آیت میں ایک فیصد سے بھی کم سطح پر آتے ہوئے قرآن مجید فرماتا ہے:

''ہم نے اپنے بندے (محمدؐ) پر جو کچھ اتارا ہے، اس میں اگر تمہیں شک ہے اور تم سچے ہو تو (کم از کم) اس جیسی ایک سورت تو بنا لاؤ''

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ

پھر مزید فرماتا ہے:

''اگر تم سچے ہوتو، تمہیں اختیار ہے کہ (اس کام کے لئے) اللہ تعالیٰ کے سوا اپنے تمام گواہوں (مددگاروں) کو بھی بلالو''

وَادْعُوا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۝۲۳

واضح ہے کہ ''اللہ تعالیٰ کے سوا اپنے گواہوں'' سے مراد اُن کے ہم فکر اور مددگار ہیں، کیونکہ یہی وہ لوگ ہیں کہ جو پیغمبرؐ کی رسالت کا انکار کرنے میں اُن کے حق میں گواہی دیتے تھے۔ لہٰذا اُنہیں یہاں بھی اُن کی مدد کرنی چاہیے تاکہ وہ قرآن جیسا ایک سورۂ لاسکیں۔ ورنہ اگر اُس سورۂ کے ہم مثل ہونے پر گواہی دینے سے مراد قرآن ہوتو ہر شخص سے پہلے خدا سے گواہی کا تقاضا کرنا چاہیے۔

لہٰذا علامہ طبرسی مرحوم مجمع البیان میں اس حوالے سے سب سے پہلی جو تفسیر ابن عباس سے نقل کرتے ہیں، وہ یہ ہے کہ: یہاں اُن کے ''اعوان'' و ''انصار'' مراد ہیں، اور وہ کہتے ہیں اس لئے اعوان وانصار کو شہداء کہا گیا ہے چونکہ وہ مدد کرتے وقت حاضر اور شاہد ہوتے ہیں۔ فخر رازی نے بھی اپنی تفسیر میں شہداء کے لئے دو معنیٰ (بت اور اعوان وانصار) ذکر نے کے بعد دوسرے معنیٰ کو ترجیح دی ہے۔[1]

دوسرے بہت سے مفسرین نے بھی یہی معانی قبول کئے ہیں۔ ''سورۂ'' کا معنیٰ قرآن کی کچھ آیات ہیں کہ جو ''بسم اللہ'' کے ساتھ شروع ہوتی ہیں اور دوسری ''بسم اللہ'' سے پہلے ختم ہوجاتی ہیں۔ سوائے ایک سورۂ قرآن کے کہ جو سورۂ برائت ہے (جس میں ''بسم اللہ'' سے آیات شروع نہیں ہوتیں) کہا گیا ہے کہ ''سورۂ'' کو ''سور مدینہ'' سے لیا گیا ہے جس کے معنیٰ شہر کی دیوار کے ہیں۔ گویا قرآن بطور مجموعہ ایک عظیم اور وسیع مملکت کی مانند ہے اور اس کی سورتیں اس کے شہروں کی طرح ہیں اسی لئے ہمارا نظریہ ہے کہ ایک سورۂ کی آیات کے درمیان ہمیشہ رابطہ اور تعلق پایا جاتا ہے۔

اگرچہ بعض اوقات یہ تعلق اور رابطہ اتنا واضح نہیں ہوتا جیسا کہ ہر شہر کے گھروں، عمارتوں اور سڑکوں کے درمیان ایک قسم کی ہم آہنگی اور ربط وتعلق پایا جاتا ہے اور مساجد، مدارس، بازار اور رہائشی علاقے اپنی اپنی جگہ پر قائم ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس تعبیر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض ناآگاہ لوگوں کے خیال کے برعکس نزول قرآن کے وقت سورتیں اسی شکل میں تھیں (اگرچہ کبھی کبھار جب کوئی آیت نازل ہوتی تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے اُسے کسی خاص سورت میں جگہ دے دی جاتی تھی) ''مِنْ مِّثْلِهٖ'' کے الفاظ سے مراد وہ چیز ہے جو تمام خصوصیات میں قرآن کی مانند ہو خواہ وہ ''فصاحت'' و ''بلاغت'' ہو یا اس کے مضامین اور اعلیٰ وارفع تعلیمات ہوں۔[2]

اس بات کی گواہ سورۂ یونس کی آیت نمبر ۳۸ ہے کہ جس میں فرمایا ہے:

---

[1] تفسیر فخر رازی، جلد ۲، صفحہ ۱۱۹

[2] بنابریں ''مِن'' یا تو زائد ہے یا بیانیہ

فَأْتُوا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ

یعنی: ''قرآن جیسا ایک سورہ ہی لے آؤ''

اور سورہ طور کی آیت نمبر ۳۴ میں آیا ہے:

فَلْيَأْتُوا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ

یعنی: ''قرآن جیسا کوئی کلام لے آؤ''

بنا بریں ''مِثْلِهٖ'' کی ضمیر کے پیغمبر کی طرف لوٹنے کا احتمال بہت ہی بعید ہے کہ جس کا مطلب یہ ہے اگر ان آسمانی آیات کی اصلی ہونے میں تمہیں شک ہے تو ''حضرت محمدؐ'' جیسے کسی شخص کو لے آؤ کہ جس نے کبھی بھی درس نہ پڑھا ہو اور وہ اس جیسی آیات لے کر آئے، اگرچہ بعض مفسرین نے اسے ایک احتمال یا قابل قبول تفسیر کے طور پر ذکر کیا ہے۔ یہ احتمال بھی موجود ہے کہ یہ دونوں مطلب اسی معنیٰ میں جمع ہو جائیں جس کا مفہوم یہ ہو جائے: ''قرآنی سوروں جیسی کوئی سورت، حضرت محمدؐ جیسے اَن پڑھ (اُستاد نہ دیکھے ہوئے) شخص کی طرف سے لا کر دکھاؤ''، تفسیر برہان میں نقل ہونے والی ایک حدیث میں یہ دونوں معانی جمع ہو گئے ہیں۔[1]

بہر حال اس آیت کے بعد مزید فرمایا ہے: ''پس اگر تم نے ایسا نہ کیا اور تم ہرگز ایسا کر بھی نہیں سکتے (اسے سچا مان کر) اس آگ سے بچو جس کا ایندھن (گنہگار) انسان اور پتھر (بت) ہیں جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔ ڈرو اور اس قرآن کی مخالفت نہ کرو۔''

فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۚ أُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۴﴾

چوتھی آیت میں بھی قرآن جیسی کوئی سورت لانے کا چیلنج کیا گیا ہے اور فرمایا ہے:

''کیا یہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ اُس نے اس (قرآن) کو گھڑ لیا ہے؟ آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم سچے ہو تو پھر تم اس کے مثل ایک ہی سورت بنا لاؤ اور اللہ کے سوا جس جس کو بلا سکتے ہو، بلا لو''

أَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ فَأْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۸﴾

کلمہ ''سُوْرَة'' قرآن کے چھوٹے بڑے سب سوروں کو شامل ہے۔ اور ''مثلہ'' کی تعبیر ہر لحاظ سے اس جیسا ہونے کی طرف اشارہ ہے، اور جملہ ''وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ'' اللہ کے سوا تمام چیزوں کو شامل ہوتا ہے۔

بنا بریں اگر قرآن انسانی ذہن کی تخلیق ہوتا، تو کوئی دوسرا انسان بھی اس کی تخلیق کر سکتا تھا جبکہ یہاں کہا جا رہا ہے کہ سب انسان مل کر بھی چاہیں (تو ایسا نہیں کر سکتے) بالخصوص ایام جاہلیت کے عربوں میں فصیح و بلیغ افراد کی کمی بھی نہ تھی۔ اس کے علاوہ اس

---

[1] تفسیر برہان، جلد ا، صفحہ ۶۷ حدیث ا

آیت اور اس سے پہلے والی آیات سے اچھی طرح استفادہ ہوتا ہے کہ ایک اہم مقصد کو حاصل کرنے کا بہترین طریقہ، ایک گروہ کے افکار سے استفادہ کرنا ہے۔

قرآن نے یہ بات اس وقت کہی ہے کہ جب اہم ترین مسائل کے حقائق تک پہنچنے کے لئے سیمیناروں اور کانفرنسوں کا رواج نہیں تھا اور علما و دانشوروں کی علمی کاوشیں بھی انفرادی اور ذاتی حیثیت رکھتی تھیں۔

پانچویں آیت میں یہ مطلب کسی اور شکل میں ذکر ہوا ہے۔ اس میں فرمایا ہے: وہ کہتے ہیں: اس (محمدؐ) نے (قرآن) خود سے گھڑ لیا ہے، واقعیت یہ ہے کہ وہ ایمان نہیں لاتے اچھا اگر یہ سچے ہیں تو اس جیسا ایک کلام یہ (بھی) تو لے آئیں۔

أَمْ يَقُولُونَ تَقَوَّلَهُ ۚ بَل لَّا يُؤْمِنُونَ ﴿٣٣﴾ فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ إِن كَانُوا صَادِقِينَ ﴿٣٤﴾

مجمع البیان میں علامہ طبرسی مرحوم کے بقول "تَقَوُّل" سے" تَقَوَّلَ " کا مطلب ہے ایک ایسی بات جو بہت زحمت اور تکلف کے ساتھ بنائی جائے اور یہ عام طور پر جھوٹ اور کذب کے وقت استعمال ہوتا ہے چونکہ اس کی کوئی واقعیت نہیں ہوتی لہٰذا اس میں تکلف و زحمت کی ضرورت پڑتی ہے۔[1]

'بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ'' (اسی جیسا کلام) کی تعبیر ہو سکتا ہے تمام قرآن کی طرف یا چند سوروں یا ایک سورے کی طرف یا ایک سے بھی کم کی طرف اشارہ ہو۔ کیونکہ ''حدیث'' (کلام) کا ان سب پر اطلاق ہوتا ہے۔ راغب، مفردات میں کہتے ہیں: ہر وہ بات جو انسان تک بیداری یا نیند کی حالت میں کان یا وحی کے ذریعے منتقل ہو، اُسے حدیث کہتے ہیں۔

چھٹی آیت میں بھی جو سورۂ قصص میں ہے، اس کتاب جیسا کلام لانے کی بات ہو رہی ہے اور اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے: ''اگر تم سچ کہتے ہو کہ (یہ کتاب خدا کی طرف سے نہیں کہہ دیجئے کہ اگر تم سچے ہو (کہ تورات اور قرآن خدا کی طرف سے نہیں ہیں) تو تم بھی اللہ کے پاس سے کوئی ایسی کتاب لے آؤ جو ان دونوں سے زیادہ ہدایت والی ہو، میں اسی کی پیروی کرونگا۔

قُلْ فَأْتُوا بِكِتَابٍ مِّنْ عِندِ اللَّهِ هُوَ أَهْدَىٰ مِنْهُمَا أَتَّبِعْهُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿٤٩﴾

اس کے بعد اُن کے کثیف باطن کا راز فاش اور قرآن مجید کا اعجاز بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: ''پھر اگر وہ تیری یہ بات نہ مانیں تو یقین کر لے کہ یہ صرف اپنی خواہش کی پیروی کر رہے ہیں''۔ اور جانتے ہیں کہ یہ قرآن ایک الٰہی معجزہ ہے لیکن پھر بھی اسے قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں، کیونکہ یہ اُن کے ناجائز مفادات اور خواہشات نفسانی کے خلاف ہے۔

فَإِن لَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكَ فَاعْلَمْ أَنَّمَا يَتَّبِعُونَ أَهْوَاءَهُمْ ۚ

یعنی؛ اگر وہ اس جیسی کتاب لانے سے عاجز ہو گئے ہیں تو اس سے پتا چلتا ہے کہ یہ کتاب انسانی ذہن کی تخلیق نہیں ورنہ اس قدر کوشش اور سعی جو ان کے فصیح اور بلیغ ترین لوگوں نے کی ہے، کے باوجود وہ ایسا نہیں کر سکے۔ کلمہ ''کتاب'' ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو ''مکتوب''

[1] مجمع البیان، جلد ۹، صفحہ ۱۶۸

اور ''لکھی ہوئی''ہو، لہٰذا یہ پورے قرآن اور اس کے مختلف حصوں کو شامل ہوتا ہے، خصوصاً یہ (کلمہ کتاب) سورۂ قصص میں ہے اور سورۂ قصص مکہ میں نازل ہوئی ہے اور یہ بات مسلّم ہے کہ اس وقت تک پورا قرآن نازل نہیں ہوا تھا۔ پس واضح ہو گیا کہ قرآن مجید تمام کا تمام معجزہ ہے اور اس کے مختلف حصے بھی معجزہ ہیں۔

ساتویں اور ہمارے موضوع سے متعلق آخری آیت، اُن بہانہ بنانے والے افراد کے جواب میں ہے کہ جو'' کہتے تھے، پیغمبرؐ کے پاس معجزہ کیوں نہیں ہے اور پروردگار کی جانب سے اُس پر آیات کیوں نازل نہیں ہوتیں''

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ

ان کے جواب میں فرمایا ہے:' ۔آپ کہہ دیجئے کہ آیات (معجزات) تو سب اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں (جو اُسی کے حکم سے نازل ہوتے ہیں نہ میری خواہش سے) میں تو صرف کھلم کھلا ڈرانے (آگاہ) کرنے والا ہوں۔''

قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝

پھر فرماتا ہے:''کیا ان کے لئے یہ کافی نہیں؟ کہ ہم نے آپ پر آسمانی کتاب نازل فرمائی جو ان پر مسلسل پڑھی جا رہی ہے''

اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ۭ

یعنی؛ اس عظیم اور بے مثال الٰہی معجزے کے ہوتے ہوئے وہ دوسرے معجزات کا کیوں انتظار کر رہے ہیں؟ اس طرح پوری صراحت کے ساتھ اعجاز قرآن کی خبر دی جا رہی ہے اور التزامی دلالت کے ذریعے''تحدی'' (چیلنج) کرتے ہوئے مخالفین کو مقابلے کی دعوت دی جاتی ہے۔

عظیم مفسر علامہ طبرسی مرحوم نے مجمع البیان میں لکھا ہے کہ اس آیت میں اس بات پر بہت واضح دلالت موجود ہے کہ قرآن مجید خود معجزے کے لئے کافی ہے اور اعجاز کے اعلیٰ ترین درجے پر فائز ہے۔ چونکہ خود اللہ تعالیٰ نے اسے تمام معجزات کے لئے کافی قرار دیا ہے اور کفایت سے مراد اس حد تک پہنچ جانا ہے کہ جہاں اس کے علاوہ کسی اور چیز کی ضرورت نہیں رہتی۔[1]

تفسیر قرطبی اور فی ظلال میں ذکر ہونے والے دو نکتوں کو دیکھا جائے تو اس بات کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے، پہلا نکتہ یہ کہ 'خارق العادت جسمانی اعمال، زیادہ تر ان لوگوں کے لیے ہوتے ہیں جو حواس خمسہ تک ہی محدود ہوتے ہیں اور یہ انسان کے ابتدائی فکری دور سے متعلق ہیں۔لیکن اس قسم کا روحانی معجزہ کہ جو معنوی پہلو رکھتا ہے، انسانی علوم و معرفت کے عروج سے ہم آہنگ ہے۔ دوسرا یہ کہ''انبیاء کے غیر معمولی کام'' (مثلاً حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے معجزات) اکثر سحر و جادو کی تہمت کے ساتھ مخالفت کا نشانہ بن گئے ہیں جبکہ جو معجزہ، کلام کی حیثیت رکھتا ہے اور ایسے الفاظ سے تشکیل پایا ہے کہ اس زبان کے جاننے والے تمام افراد اُس

---

[1] مجمع البیان، جلد ۷، ۸ صفحہ ۲۸۹ (مذکورہ آیت کے ذیل میں)

پر قدرت رکھتے ہیں۔[1]

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن مجید نے کم از کم سات مختلف آیات میں، قرآن کو ایک عظیم الٰہی معجزہ قرار دیا ہے۔اور منکرین کو مختلف طریقوں سے چیلنج کیا ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ جب بھی کوئی شخص کوئی غیر معمولی کام انجام دیتا ہے تو سب کو مقابلے کی دعوت دیتا ہے اور جب وہ اس کے سامنے عاجز ہو جاتے ہیں تو یہ اس کے اعجاز کی دلیل ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر قرآن نے اپنے ان الفاظ میں، اُن کو بتایا ہے کہ اگر تمہارا خیال ہے کہ یہ آیات انسانی ذہن کی تخلیق ہیں، تو تم بھی انسان ہو، ذہن رکھتے ہو، فکر وسوچ کے مالک ہو اور پھر تمہارے درمیان اہل سخن اور نکتہ سنج افراد بھی کم نہیں ہیں، اگر اس دعویٰ میں سچے ہو تو تم بھی انہی آیات جیسی کچھ آیات لے آؤ۔

اس طرح انواع واقسام کی تحریک آمیز عبارات کے ساتھ اُنہیں اس مقابلے میں شرکت کی دعوت دیتا ہے۔ دوسری جانب اگر وہ اس قسم کے مقابلے میں کامیاب ہو سکتے تو یقیناً اپنی تمام قوتیں اکٹھی کر لیتے کیونکہ اس مقابلے میں شکست ہر چیز سے ہاتھ دھونے کے مترادف تھی۔قرآن مجید اُن کی ثقافتی بنیادوں کے خلاف اعلان جنگ کئے ہوئے تھا کہ جو شرک وبت پرستی اور بت خانوں کی ثقافت تھی اور جو اُن کی زندگی کے تمام امور میں دخیل تھی۔ اور یہ جنگ یہیں ختم نہیں ہوتی تھی بلکہ اُن کے بڑوں، سرداروں اور ظالم ومغرور مالداروں کو طاقت وقدرت کی بلندیوں سے گرانا اور اُن کے تمام خیالی اور بناوٹی افتخارات اُن سے لینا چاہتا تھا۔

بنا بریں تاریخی شواہد سے قطع نظر کہ جن کی جانب ہم اشارہ کریں گے، مقابلہ بمثل کے بہت سے محرکات موجود تھے، اور اگر وہ حضرت محمد ﷺ کو اس طریقے سے مات دے سکتے تو پھر اُنہیں اسقدر خون خرابے اور سخت جنگ ومقابلے کی کیا ضرورت تھی، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اُنہوں نے ہر چیز کو قبول کر لیا تھا سوائے قرآن جیسی چند آیات لانے کے۔ اور یہ اُن کے اس مقابلے میں شکست کی بہترین دلیل ہے۔

تشریحات

۱۔قرآن کی بے نظیر جاذبیت اور نفوذ

پوری تاریخ (اسلام) کے دوران ہمیں کچھ ایسے حیرت انگیز اور مستند واقعات نظر آتے ہیں کہ جو ایک طرف قرآن سننے والوں اور اسلام وقرآن سے بیگانہ افراد کے دلوں میں گہرے اثر ونفوذ کی حکایت کرتے ہیں اور دوسری جانب مخالفین (قرآن واسلام) کے مقابلہ بمثل کرنے سے عاجز ہونے پر ایک واضح دلیل ہیں۔ان تاریخی واقعات کی تحقیق سے انسان بہت سے مسائل سیکھتا ہے اور ہمیں زیادہ سے زیادہ اس آسمانی کتاب کی عظمت اور جو کچھ سابقہ آیات میں آیا ہے، اُس کی صداقت سے آگاہ کرتا ہے جس کے زندہ نمونے ہم آئندہ صفحات میں پیش کر رہے ہیں:

---

[1] تفسیر فی ظلال، جلد ۶، صفحہ ۴۲۲ اور تفسیر قرطبی، جلد ۸، صفحہ ۵۰۷۱ (مذکورہ آیت کے ذیل میں)

ا۔ولید بن مغیرہ مخزومی کا واقعہ

سورۂ ''مُدَّثِّر'' کی آیات سے بخوبی پتا چلتا ہے کہ یہ اُس شخص کی بات ہورہی ہے کہ جو قرآن کے ساتھ مقابلہ کرنے کی سوچ رہا تھا، اور پھر جسے ایک عبرتناک انجام سے دوچار ہونا پڑا، یہ واقعہ ان آیات کے شان نزول میں یوں بیان ہوا جسے طبرسی، قرطبی، مراغی اور فخر رازی جیسے بہت سے مفسرین نے نقل کیا ہے: جب سورۂ مومن کی آیات نازل ہورہی تھیں پیغمبر اکرم ؐ مسجد الحرام میں نماز کی حالت میں قیام فرما تھے۔ ولید بن مغیرہ مخزومی (مکہ کا ایک مشہور اور جانا پہچانا شخص تھا، جس کی عقل اور سمجھ کے مشرکین قائل تھے اور اہم مسائل میں اس سے مشورہ لیا کرتے تھے) حضرت کے قریب تھا اور آپؐ کی تلاوت سن رہا تھا، جب پیغمبرؐ اس بات کی طرف متوجہ ہوئے تو آپؐ نے ان آیات کی تلاوت کو دہرایا (ان آیات نے ''ولید بن مغیرہ'' کو سخت ہلا کر رکھ دیا) جب ولید اپنی قوم (قبیلہ بنو مخزوم) کی مجلس میں آیا تو کہا: خدا کی قسم ! ابھی میں نے محمدؐ سے ایسا کلام سنا ہے جو نہ انسانوں کے کلام کے مشابہ ہے اور نہ جنوں کی باتوں کے۔

''وَاِنَّ لَهُ لَحَلَاوَةً وَاِنَّ عَلَيْهِ لَطَلَاوَةً وَاِنَّ اَعْلَاهُ لَمُثْمِرٌ وَاِنَّ اَسْفَلَهُ لَمُغْدِقٌ وَاِنَّهُ لَيَعْلُوا وَمَا يُعْلٰى''

یعنی: ''اس کی گفتگو میں ایک خاص شرینی ہے اور اس میں ایک خاص زیبائی اور طراوت ہے، اس کی شاخیں پھلوں سے پُر ہیں اور اس کی جڑیں قوی اور طاقتور ہیں، وہ ایک ایسا کلام ہے جو دوسرے ہر کلام سے برتر ہے، اور کوئی کلام اس پر برتری حاصل نہیں کرسکتا۔''

وہ یہ کہہ کر اپنے گھر کی طرف پلٹ گیا، قریش نے ایک دوسرے سے کہا: خدا کی قسم ! وہ محمدؐ کے دین کا فریفتہ ہوگیا ہے، اور ہمارے دین سے نکل گیا ہے اور وہ تمام قریش کو منحرف کردے گا اور وہ ولید کو ''ریحانۂ قریش'' (قریش کا پھول) کہتے تھے۔ ابو جہل نے کہا: میں اس بات کا کوئی علاج کرتا ہوں، وہ اُٹھ کر چل پڑا۔ اور غمگین چہرے کے ساتھ ولید کے قریب آکر بیٹھ گیا ولید نے کہا: اے بھتیجے ! تو کس لئے غمگین ہے؟ اس نے کہا: قریش اس سن و سال کے باوجود تجھ پر تہمت لگاتے ہیں اور وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ تُو نے محمدؐ کی بات کو زینت بخشی ہے۔

وہ ابو جہل کے ساتھ اُٹھا اور اپنے قبیلے کی مجلس میں آیا اور کہا: کیا تمہارا گمان ہے کہ محمدؐ دیوانہ ہے؟ کیا تم نے کبھی جنون کے آثار اس میں دیکھے ہیں؟ انھوں نے کہا: نہیں اس نے کہا: کیا تمہارا خیال یہ ہے کہ وہ کاہن ہے؟ کیا تم نے اس میں کبھی کہانت کے آثار دیکھے ہیں؟ اُنھوں نے کہا نہیں! کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ وہ شاعر ہے، کیا تم نے کبھی اسے شعر کہتے ہوئے دیکھا ہے؟ اُنھوں نے کہا: نہیں؛ اس نے کہا: پھر کیا تمہارا خیال یہ ہے کہ وہ جھوٹا ہے؟ کیا تم نے اسے ماضی میں کبھی جھوٹ بولتے ہوئے دیکھا ہے؟

اُنھوں نے کہا: نہیں! وہ دعوائے نبوت سے پہلے بھی ہمارے ہاں ہمیشہ ''صادق و امین'' کے عنوان سے پہچانا جاتا تھا۔ اس مرحلے پر قریش نے ''ولید'' سے کہا: تیرے نظریئے کے مطابق ہم اسے کیا کہیں؟ ولید سوچ میں پڑ گیا، نگاہ کی اور منہ چڑا کر بولا: وہ صرف

ایک جادوگر ہے، کیا تم نے دیکھا نہیں کہ وہ مرد اور عورت، اولاد اور دوستوں کے درمیان جدائی ڈال دیتا ہے؟ اس بنا پر وہ جادوگر ہے اور جو کچھ کہتا ہے ایک عمدہ جادو ہے۔[۱]

۲۔قریش کے سرداروں کا قرآن سننا

سیرۂ ابن ہشام میں لکھا ہے کہ قریش کے سرداروں میں سے تین شخص، ''ابوسفیان''، ''ابوجہل'' اور ''اخنس بن شریق'' ایک رات قرآن کی آیات سننے کے لئے مخفیانہ طور پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر کے پاس آئے۔ اس وقت آنحضرتؐ نماز پڑھ رہے تھے اور قرآنی آیات کی تلاوت فرما رہے تھے۔ ان میں ہر شخص ایک دوسرے سے چھپ کر کسی نہ کسی کونے میں بیٹھ گیا، اور صبح تک قرآن کی تلاوت سنتا رہا، جب طلوع فجر کا وقت ہوا تو سب وہاں سے چلے گئے، لیکن جلد ہی راستے میں ایک دوسرے کو دیکھ لیا اور ایک دوسرے کو سرزنش کرنے لگے اور کہنے لگے اس کے بعد ایسا نہیں کریں گے۔

چونکہ اگر بعض ناسمجھ لوگوں نے یہ منظر دیکھ لیا تو اُن کے دلوں میں شبہات پیدا ہو جائیں گے، لیکن دوسری رات پھر اُنھوں نے یہی کام کیا اور صبح جب ایک دوسرے کو دیکھا تو وہی گذشتہ رات والی باتیں کرنے لگے اور ایک دوسرے کو سرزنش کی اور پھر ایسا کام نہ کرنے کا وعدہ کیا اور اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ اتفاقاً تیسری رات کو بھی اُن سے بعینہ یہی کام دوبارہ انجام پا گیا اور جب صبح کے وقت اُنھوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو اُن میں سے ایک نے کہا: ہم اس وقت تک اس جگہ سے نہیں ہلیں گے جب تک ہمیشہ اس کام کو ترک کرنے کا عہد و پیمان نہ باندھ لیں۔ آخرکار اُنھوں نے آپس میں عہد و پیمان باندھا اور ایک دوسرے سے جُدا ہو گئے۔[۲]

جی ہاں! قرآن کی جاذبیت اس قدر زیادہ تھی کہ حتیٰ سخت ترین دشمن بھی اس کے مقابلے میں گھٹنے ٹیکنے پر مجبور تھے، اگر تعصب اور ہٹ دھرمی کے پردے اور ذاتی مفادات نہ ہوتے تو وہ یقیناً اس پر ایمان لے آتے۔

۳۔ابن ابی العوجاء اور اس کے ساتھیوں کا واقعہ

علامہ طبرسی نے ''احتجاج'' میں امام جعفر صادق - کے مشہور عالم و دانشور شاگرد ہشام بن حکم سے نقل کیا ہے: ''ابن ابی العوجاء''، ''ابوشاکر دیصانی''، ''عبدالملک بصری'' اور ''ابن مقفع'' کہ جو سب کے سب ملحدین اور بے ایمان افراد میں سے تھے، خانہ کعبہ کے پاس اکٹھے تھے اور حجاج کرام کے اعمال کا مذاق اُڑاتے ہوئے قرآن پر طعنہ زنی کر رہے تھے۔ ''ابن ابی العوجاء'' نے کہا:

''آؤ ہم میں سے ہر ایک قرآن کے ایک چوتھائی حصے کا توڑ کرے (اور اُس جیسی کوئی چیز بنا کر لائے) اور ہم آئندہ سال اسی

---

[۱] مجمع البیان، جلد ۱۰، صفحہ ۳۸۶، بہت دوسرے مفسرین مثلاً فخر رازی، مراغی، قرطبی، المیزان اور فی ظلال وغیرہ - نے بھی یہ حدیث تھوڑے سے فرق کے ساتھ نقل کی ہے۔

[۲] سیرہ ابن ہشام جلد ۱، صفحہ ۳۳۷۔

مقام پر ملیں گے کہ جب ہم پورے قرآن کو توڑ کر لیں گے۔ کیونکہ قرآن کا توڑ نبوت محمدؐ کے باطل ہونے کا سبب بن جائے گا اور اُس کی نبوت کا باطل ہونا اسلام کا باطل ہونا ہے، جس سے ہماری حقانیت ثابت ہو جائے گی۔''

اُنھوں نے اس مسئلے پر آپس میں عہد و پیمان باندھا اور ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ اگلے سال اسی دن وہ خانہ کعبہ کے پاس جمع ہوئے، ''ابن ابی العوجاء'' نے بات کا آغاز کیا اور کہا: اُس دن جب میں تم لوگوں سے جدا ہوا تو اس آیت کے بارے میں سوچ رہا تھا:

"فَلَمَّا اسْتَيْـَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا"

یعنی: ''کہ جب (یوسف کے بھائی) اس سے مایوس ہو گئے تو ایک طرف گئے اور آپس میں سرگوشی کی۔''[1]

میں نے دیکھا کہ یہ آیت اس قدر فصیح اور بامعنیٰ ہے کہ میں اُس میں کوئی بھی چیز اضافہ نہیں کر سکتا اور ہمیشہ اس آیت نے میری سوچ کو اپنی طرف مشغول رکھا ہے۔ عبدالملک نے کہا: میں بھی جب آپ لوگوں سے الگ ہوا ہوں، اس آیت کے بارے میں غور و فکر کر رہا ہوں۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ﴿۷۳﴾

''اے لوگو! بیان کی جانے والی ایک مثال غور سے سنو! اللہ کو چھوڑ کر تم جنہیں پکارتے ہو وہ سب ملکر ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے، بلکہ مکھی اگر کچھ لے لے تو اس سے واپس نہیں لے سکتے اور طالب و مطلوب (عابد و معبود) دونوں ہی بڑے کمزور ہیں۔''[2]

میں نے خود کو اس جیسی آیت لانے میں عاجز دیکھا۔ ابوشاکر نے کہا: جس وقت سے میں تم سے الگ ہوا ہوں تو اس آیت میں غور و فکر کر رہا ہوں:

لَوْ كَانَ فِيْهِمَاۤ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ

یعنی: ''اگر آسمان و زمین میں سوائے اللہ تعالیٰ کے اور بھی معبود ہوتے تو یہ دونوں درہم برہم ہو جاتے۔''[3]

اور میں نے بھی اپنے آپ میں اس جیسی چیز لانے کی قدرت نہیں دیکھی! اور ابن مقفع نے کہا: ''اے قوم! یہ قرآن انسان کے کلام کی طرح نہیں، چونکہ جب سے میں تم سے جُدا ہوا ہوں، اس آیت کے بارے میں سوچ رہا ہوں:

وَقِيْلَ يٰۤاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَغِيْضَ الْمَآءُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى

---

[1] سورہ یوسف، آیت ۸۰

[2] سورہ حج، آیت۔ ۷۳

[3] سورہ انبیاء آیت ۲۲۔

الْجُوْدِیِّ وَقِیْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ﴿۴۴﴾

یعنی: ''اور فرمایا گیا کہ اے زمین اپنے پانی کو نگل جا، اور اے آسمان بس کر تھم جا، اسی وقت پانی سکھا دیا گیا اور کام پورا کر دیا گیا اور کشتی جودی (نامی پہاڑ) پر جا لگی اور فرما دیا گیا کہ ظالم لوگوں پر لعنت نازل ہو۔'' [۱]

اور میں اپنے آپ کو اس جیسی (آیت) لانے میں عاجز دیکھ رہا ہوں۔ ہشام بن حکم کہتے ہیں: اسی دوران حضرت امام جعفر صادق -اُن کے پاس سے گزرے اور اس آیت کی تلاوت فرمائی:

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا﴿۸۸﴾

یعنی: ''کہہ دیجئے کہ اگر تمام جن وانس مل کر اس قرآن کے مثل لانا چاہیں تو ان سب سے اس کے مثل لانا ممکن نہیں ہے۔ اگر چہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بھی بن جائیں۔ [۲]

اس وقت ان چاروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کہا: ''اگر اسلام کی کوئی حقیقت ہے تو جعفر بن محمد -کے سوا کوئی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہیں ہوگا، خدا کی قسم ہم اُسے ہرگز نہیں دیکھتے مگر یہ کہ اُس کی شان وشوکت ہم پر چھا جاتی ہے اور اُس کی ہیبت سے ہمارے بدن پر بال کھڑے ہو جاتے، یہ کہتے ہی وہ اپنی عاجزی اور ناتوانی کا اعتراف کرتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔

۴۔ عثمان بن مظعون کا واقعہ

یہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشہور صحابی ہیں، وہ کہتے ہیں: میں نے آغاز اسلام میں ظاہری طور پر اسلام قبول کیا ہوا تھا، نہ کہ دل سے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کئی بار مجھے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی، لہٰذا میں نے شرم کے مارے اُن کی بات مان لی تھی۔ میری یہی حالت جاری تھی یہاں تک کہ ایک دن میں آپؐ کی خدمت میں حاضر تھا، میں نے دیکھا آپؐ بہت زیادہ فکر مند ہیں، اچانک آپؐ نے اپنی مبارک آنکھیں آسمان کی طرف لگا دیں گویا کوئی پیام دریافت فرمارہے ہیں، جب آپؐ معمولی حالت پر واپس آئے تو میں نے اس واقعہ کے بارے میں پوچھا، آپؐ نے فرمایا: جب میں آپ لوگوں سے بات کر رہا تھا اچانک جبرائیل مجھ پر نازل ہو گئے اور یہ آیت میرے لئے لائے ہیں:

اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰى وَیَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ﴿۹۰﴾

---

[۱] سورہ ہود۔ آیت۔ ۴۴

[۲] سورہ اسرائیل آیت۔ ۸۸

یعنی: ''اللہ تعالیٰ عدل، بھلائی اور قرابت داروں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی کے کاموں، ناشایستہ حرکتوں اور ظلم و زیادتی سے روکتا ہے، وہ خود تمہیں نصیحتیں کر رہا ہے کہ شاید تم نصیحت حاصل کرو۔'' [۱]

جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت آخر تک میرے سامنے پڑھی تو اس کے اعلیٰ مطالب نے اس طرح میرے دل پر اثر کیا کہ اُسی وقت اسلام میرے دل کی گہرائیوں میں اُتر گیا، اور میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حضرت ابو طالبؑ کی طرف چلا گیا، اور اس واقعے کی اُنہیں اطلاع دی تو اُنھوں نے کہا: ''اے قبیلہ قریش! محمدؐ کی پیروی کرو ہدایت یافتہ ہو جاؤ گے، کیونکہ وہ تمہیں سوائے اخلاقی فضائل کے کسی اور چیز کی دعوت نہیں دیتے''۔ اس کے بعد میں ولید بن مغیرہ (مشہور عرب دانشور اور سردار قریش) کے پاس گیا اور یہی آیت اُس کے سامنے پڑھی تو اس نے کہا: ''اگر یہ کلام خود محمدؐ کا ہے تو بہت اچھا کہا ہے اور اگر اُس کے پروردگار کی جانب سے ہے تو بھی بہت اچھا ہے۔ [۲]

۵۔ اسعد بن زرارہ کا واقعہ

کتاب ''اَعْلَامُ الوَرٰی'' اور ''بِحارُالاَنوار'' میں سننے والوں کے نفوس میں آیات قرآن کی غیر معمولی جاذبیت اور اثر و نفوذ کا ایک اور واقعہ نقل ہوا ہے۔ ''بحار الانوار'' کے مطابق یہ واقعہ کچھ یوں ہے: قبیلہ خزرج کے دو آدمی اسعد بن زرارہ اور ذکوان بن عبد القیس ایک دفعہ مکہ آئے جبکہ اوس اور خزرج کے درمیان ایسی طولانی جنگ چھڑی ہوئی تھی کہ شب و روز میں کسی بھی وقت وہ لوگ اپنے ہتھیار کمر سے نہیں کھولتے تھے، ان کا آخری معرکہ ''یوم بعاث'' کے نام سے ہوا تھا۔ اس میں قبیلہ اوس نے قبیلہ خزرج پر غلبہ حاصل کر لیا تھا۔ اسی بنا پر اسعد اور ذکوان مکہ آئے تھے تا کہ مکہ والوں سے قبیلہ اوس کے خلاف ایک معائدہ کریں، جس وقت یہ دونوں عتبہ بن ربیعہ کے گھر پہنچے اور اس سے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا تو عتبہ نے ان کے جواب میں کہا: ہمارا شہر تمہارے شہر (مدینہ) سے کافی دور واقع ہے اس لئے تمہاری مدد کرنا ہمارے لئے مشکل ہے، خصوصاً ہمارے لئے ایک نیا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے جس نے ہمیں بُری طرح اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے۔

اسعد نے پوچھا: وہ کونسا مسئلہ ہے؟ تم تو حرم کعبہ میں زندگی بسر کر رہے ہو جو ایک امن و امان کی جگہ ہے!

عتبہ نے جواب دیا: ایک انسان ہم میں ظاہر ہوا ہے جو کہتا ہے: میں خدا کا فرستادہ ہوں، وہ ہماری عقلوں کو ناچیز سمجھتا ہے اور ہمارے خداؤں کو بُرا کہتا ہے، اس نے ہمارے جوانوں کو بگاڑ دیا ہے اور ہمارے اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔

اسعد نے دریافت کیا: اس شخص کی تم سے کیا نسبت ہے؟

اس نے کہا: یہ عبداللہ بن عبدالمطلب کا فرزند ہے اور ہمارے شریف خاندانوں کا ایک ممتاز فرد ہے۔ یہ سن کر اسعد اور ذکوان کچھ سوچ میں پڑ گئے اور انہیں یاد آیا کہ وہ مدینہ کے یہودیوں سے سنتے آئے ہیں کہ عنقریب ایک نبی مکہ سے ظہور کرنے والا ہے اور وہ مدینہ کی

---

[۱] سورہ نحل آیت۔ ۹۰

[۲] مجمع البیان جلد ۵، ۶، صفحہ ۳۸۱، سورہ نحل کی آیت ۹۰ دیکھئے۔

طرف ہجرت کرے گا، اسعد نے اپنے دل میں کہا کہ ایسا نہ ہو کہ یہ وہی نبی ہو جس کی پیشین گوئی یہودیوں نے کی تھی۔ اس کے بعد اس نے پوچھا: وہ ہے کہاں؟

عتبہ نے کہا: وہ اس وقت خانہ خدا کے پاس حجر اسماعیل میں بیٹھا ہے۔ آج کل اس کی جماعت کے لوگ پہاڑ کے ایک درّہ میں محصور ہیں۔ انہیں صرف ماہ رجب میں جو حج و عمرہ کا زمانہ ہے، آزادی دی گئی ہے تا کہ عمرہ بجالا سکیں اور لوگوں کے درمیان آ جاسکیں، لیکن میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہیں تم اس کی باتوں میں نہ آنا اور اس سے بالکل بات نہ کرنا کیونکہ وہ ایک عجیب جادوگر ہے۔ (یہ اس وقت کی بات ہے کہ جب مسلمان شعب ابی طالب میں محاصرے میں تھے)

اسعد نے عتبہ سے کہا: اب میں کیا کروں کیونکہ میں نے تو خانہ کعبہ کا طواف کرنے کے لئے احرام باندھ لیا ہے لہٰذا طواف کرنا ضروری ہے اور تم کہتے ہو کہ اس کے نزدیک بھی نہ جانا، پس میں کیا کروں؟

عتبہ نے جواب دیا: تھوڑی سی روئی لیکر اس سے اپنے کان بند کر لو تا کہ اس شخص کی کوئی بات نہ سن سکو۔ اسعد مسجد الحرام میں پہنچا، اس نے روئی سے اپنے دونوں کانوں کو بند کر رکھا تھا۔ اس حالت میں اس نے خانہ کعبہ کا طواف کرنا شروع کیا۔ اس وقت پیغمبر اکرم ﷺ بنی ہاشم کے لوگوں کے درمیان حجر اسماعیل میں خانہ کعبہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اسعد نے ایک نگاہ پیغمبرؐ پر ڈالی اور ان کے پاس سے جلدی کے ساتھ گذر گیا۔

جب طواف کے دوسرے دور میں پہنچا تو اس نے اپنے آپ سے کہا: مجھ سے بھی زیادہ کوئی احمق نہ ہوگا کیا یہ ممکن ہے کہ مکہ میں اتنا بڑا واقعہ رونما ہو جائے جو اہل مکہ کے زبان زد عام ہو اور میں اس سے بے خبر رہوں اور جب مدینہ واپس جاؤں تو اپنی قوم کو اس کے متعلق کچھ بھی نہ بتا سکوں۔ یہ خیال آتے ہی اس نے روئی اپنے کان سے نکال کر دور پھینک دی اور جا کر رسول اللہ ﷺ کے سامنے کھڑا ہو گیا، پھر اس نے پوچھا: آپ ہمیں کس چیز کی طرف دعوت دیتے ہیں؟

پیغمبر ﷺ نے نہایت آرام سے فرمایا: میں اس بات کی طرف دعوت دیتا ہوں کہ خدا وحدہٗ لاشریک ہے اور میں اس کا رسول ہوں نیز میں تم لوگوں کو ان باتوں کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ اس کے بعد آپؐ نے سورۂ انعام کی ۱۵۱ سے لیکر ۱۵۳ تک:

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۔۔۔

آیات کی تلاوت فرمائی کہ جو اسلام کے معاشرتی احکام کی اعلیٰ وارفع تعلیمات اور اخلاقی مسائل کا مجموعہ ہے (بطور کلی یہ دس احکام ہیں) جب اسعد نے یہ پُر معنی اور روح پرور کلام سنا جو اس کے جان و دل سے ہم آہنگ تھا تو وہ بالکل دگرگوں ہو گیا، اس کی زبان پر بے ساختہ جاری ہوا:

"اشهد ان لا اله الّا الله و اشهد انّ محمداً رسول الله"

اس کے بعد اس نے کہا: یا رسول اللہؐ! میرے ماں باپ آپؐ پر قربان، میں یثرب کا رہنے والا ہوں، قبیلہ "خزرج" سے میرا تعلق ہے، ہمارا تعلق ہمارے بھائیوں "قبیلہ اوس" سے طولانی جنگوں کی وجہ سے ٹوٹ گیا ہے، شاید خداوند کریم آپ کی برکت سے اس

ٹوٹے ہوئے بندھن کو دوبارہ جوڑ دے۔ ہم نے آپ کے اوصاف قوم یہود سے سنے تھے۔ وہ ہمیشہ آپ کے ظہور کی خبر دیا کرتے تھے۔ ہماری تمنا ہے کہ ہمارا شہر ''مدینہ'' آپ کی ہجرت گاہ بنے کیونکہ یہودیوں نے اپنی آسمانی کتابوں میں دیکھ کر ہمیں یہی بتایا ہے۔ میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے آپ کی خدمت میں آنے کا موقع دیا۔

خدا کی قسم! میں تو یہ قصد لے کر آیا تھا کہ اہل مکہ سے اپنے بھائیوں کے خلاف جنگ میں مدد حاصل کرسکوں لیکن خدائے کریم نے مجھے اس سے بڑی کامیابی عطا کی۔ اس کے بعد اس کا ساتھی ذکوان بھی مسلمان ہوگیا اور دونوں نے رسول اللہؐ سے درخواست کی کہ کسی شخص کو انکے ہمراہ مدینہ روانہ کریں تاکہ وہ لوگوں کو قرآن کی تعلیم دے اور انہیں اسلام کی طرف دعوت دے شاید اس طرح یہ جنگ کی بھڑکتی ہوئی آگ خاموش ہوجائے چنانچہ آنحضرتؐ نے مصعب بن عمیر کو انکے ہمراہ مدینہ بھیجا اور اس وقت سے مدینہ میں اسلام کی داغ بیل پڑی جس سے مدینہ کی صورت بدل گئی۔ [1]

٦۔ اصمعی کا ہلا دینے والا واقعہ

''زمخشری''، تفسیر کشاف میں اصمعی [2] سے نقل کرتا ہے کہ میں بصرہ کی مسجد سے باہر آیا کہ اچانک میری نگاہ ایک عربی بدو پر پڑی جو اپنی سواری پر سوار تھا، وہ میرے سامنے آیا تو مجھ سے پوچھا: تم کس قبیلے سے ہو؟ میں نے کہا ''بنی اصمع'' سے اس نے کہا: کہاں سے آرہے ہو؟ میں نے کہا وہاں سے جہاں خداوند رحمان کا کلام پڑھتے ہیں، اس نے کہا میرے لیے بھی پڑھو! میں نے اس کے لیے سورہ ''الذاریات'' کی کچھ آیات پڑھیں، یہاں تک کہ میں آیہ ''وفی السماء رزقکم وما توعدون'' (سورۂ الذاریات، آیت/ ٢٢) تک پہنچا، اس نے کہا، بس کافی ہے، وہ اٹھ کھڑا ہوا اور وہ اونٹ جو اس کے ساتھ تھا اُسے نحر کر ڈالا، اور اس کا گوشت ان ضرورت مندوں میں جو آرہے تھے، تقسیم کردیا، اس نے اپنی تلوار اور کمان بھی توڑ ڈالی اور ایک طرف پھینک دی اور پشت پھیر کر چلتا بنا، یہ واقعہ گزر گیا۔

جس وقت میں ہارون الرشید کے ساتھ خانہ خدا کی زیارت کے لیے گیا تو میں طواف میں مشغول ہوگیا، اچانک میں نے دیکھا کہ کوئی آہستہ آواز کے ساتھ مجھے پکار رہا ہے، میں نے نگاہ کی تو دیکھا کہ وہی بدو ہے، لاغر اور کمزور ہوچکا ہے، اس کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا ہے، (صاف ظاہر تھا کہ اس پر آتش عشق کا غلبہ ہوگیا ہے جس نے اس کو بے قرار کردیا ہے) اس نے مجھے پر سلام کیا، اور دوبارہ خواہش کی کہ اس سورہ ''الذاریات'' کو اس کے لیے پڑھوں، جب میں اس آیت پر پہنچا تو اس نے چلا کر کہا، ہم نے اپنے خدا کے وعدہ کو اچھی طرح پالیا ہے، اس کے بعد اس نے کہا کیا اس کے بعد بھی کوئی آیت ہے تو میں نے بعد والی آیت کو پڑھا:

''فورب السماء والارض انہ لحق''

---

[1] بحار الانوار جلد ١٩، صفحہ ٨ تا ١٠

[2] اس کا نام ''عبدالملک بن قریب'' تھا اور ''ہارون الرشید'' کے زمانے میں ہوگزرا ہے، اس کا حافظ عجیب وغریب تھا اور اسے تاریخ اور عربی ادب کی بت زیادہ معلومات تھی۔ وہ ٢١٦ھ، میں فوت ہوا ہے۔ (الکنی والالقاب، جلد ٢، صفحہ ٣٧)

تو اس نے دوبارہ چیخ مار کر کہا:

"یا سبحان اللہ من ذا الّذی اغضب الجلیل حتی الجئوہ الی الیمین؟!"

یعنی: "یہ کتنی عجیب بات ہے، کون تھا وہ جس نے خداوند جلیل کو غضبناک کیا، اور اسے اس طرح قسم کھانی پڑی، کیا انہوں نے اس کی باتوں پر یقین نہیں کیا، کہ وہ قسم کھانے کے لیے مجبور ہوا؟!"

اس نے اس جملہ کو تین مرتبہ دہرایا، اور زمین پر گر پڑا، اور اسکی روح آسمان کی طرف پرواز کر گئی۔ [1]

۷۔ قرآن کی ایک آیت کے سامنے ایک بدو کا ردعمل

مختلف اسلامی کتابوں میں آیا ہے کہ ایک اعرابی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آیا اور عرض کرنے لگا:

"عَلِّمنی مِمّا عَلَّمَکَ اللہُ"

یعنی: "خدا نے تجھے جو کچھ سکھایا ہے وہ مجھے بھی سکھاؤ"۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُسے ایک صحابی کے سپرد کیا تا کہ وہ اسے آیات کی تعلیم دے، اُس نے سورۂ "اذا زُلزِلَتِ الارضُ" کی اُسے آخر تک تعلیم دی۔ وہ شخص اپنی جگہ سے بلند ہوا اور کہنے لگا: میرے لئے یہی کافی ہے! ایک دوسری روایت میں آیا ہے کہ اُس نے کہا: "تَکفِینی هٰذِهِ الآیَةُ": یعنی: یہی سورۂ کی آخری آیت "فَمَن یَعمَل مِثقالَ ذَرَّةٍ خَیراً یَرَہُ" میرے لئے کافی ہے۔ (اُس عرب نے خدا حافظ کہا اور چلا گیا) پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اُسے اپنے حال پر چھوڑ دو کہ وہ ایک مرد فقیہ ہو گیا ہے، ایک اور روایت میں آیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا: "اِنصرفَ الرَّجُلُ وَهُوَ فَقیهٌ" "وہ فقیہ ہو کر واپس لوٹا ہے"! [2]

۸۔ سید قطب کا دلچسپ واقعہ

سید قطب تفسیر "فی ظلال" میں سورۂ یونس کی آیہ مجیدہ ۳۸ "ام یقولون افتریه قل فاتوا بسورة مثله" کے ضمن اپنی زندگی کا ایک عجیب واقعہ نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

میں ان حوادث وواقعات کے بارے میں بات نہیں کرتا جو دوسروں کو پیش آئے صرف وہ واقعہ بیان کرتا ہوں جو خود مجھے پیش آیا اور میرے علاوہ اسے دیکھنے والے پانچ افراد اور تھے ہم چھ مسلمان ایک مصری بحری جہاز میں سوار تھے، بحری جہاز نیو یارک جانے کے لیے اقیانوس اطلس کو عبور کر رہا تھا جہاز میں کل ۱۲۰ مسافر تھے جن میں عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی تھے اور ہمارے علاوہ مسافروں میں کوئی اور مسلمان نہ تھا۔ جمعہ کے روز ہم نے سوچا کہ نماز جمعہ سمندر کے درمیان میں جہاز کے اوپر ادا کی جائے ہم چاہتے تھے کہ مذہبی فریضہ کی

---

[1] تفسیر کشاف، جلد ۴، صفحہ ۴۰

[2] تفسیر روح البیان، جلد ۱۰، صفحہ ۴۹۴ اور نور الثقلین، جلد ۵، صفحہ ۶۵۰، اور سفینۃ البحار مادہ قرء جلد ۲، صفحہ ۴۱۴ اور تفسیر نمونہ جلد ۲۷ صفحہ ۲۳۱ (دیکھئے سورہ الزال)

ادائیگی کے علاوہ ایک عیسائی مبلغ کے سامنے اسلامی جرأت کا مظاہرہ کیا جائے جس نے کشتی میں بھی اپنا تبلیغی پروگرام ترک نہیں کیا تھا اور پھر خصوصاً جبکہ وہ ہمیں بھی مسیحیت کی تبلیغ کرنا چاہتا تھا۔

جہاز کا کیپٹن ایک انگریز تھا اس نے جہاز کے اوپر نماز با جماعت کی ہمیں اجازت دے دی نیز جہاز پر کام کرنے والوں کو بھی ہمارے ساتھ نماز پڑھنے کی اجازت دے دی جو سب افریقی مسلمان تھے۔ وہ بھی اس واقعے سے بڑے خوش ہوئے کیونکہ یہ پہلا موقع تھا کہ جہاز پر نماز جمعہ انجام پا رہی تھی۔ میں نماز جمعہ کا خطبہ پڑھنے لگا اور امامت کے لیے تیار ہوا۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ تمام غیر مسلم مسافر ہمارے گرد حلقہ باندھ کر کھڑے ہو گئے اور بڑے غور سے اس اسلامی فریضے کی انجام دہی دیکھتے رہے۔ نماز کے اختتام پر ان میں سے بہت سے لوگ ہمارے پاس آئے اور ہمارے اس کام کی تعریف کی۔ ان میں سے ایک خاتون تھی جس کے بارے میں مجھے بعد میں معلوم ہو کہ وہ یوگوسلاویہ کی ایک عیسائی عورت تھی جو ٹیٹو اور اس کے کمیونزم کے جہنم سے فرار کیے ہوئے تھی۔ وہ ہماری نماز سے بے حد متاثر ہوئی اس حد تک کہ اس کے آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ اپنے پر کنٹرول نہیں کر پا رہی تھی۔

وہ اپنی عام انگریزی زبان میں جس میں عاجزی وانکساری اور اثر ونفوذ کے ملے جلے جذبات تھے، گفتگو کر رہی تھی۔ اس کی گفتگو کے کچھ الفاظ یہ تھے: بتاؤ کہ میں دیکھوں کی تمہارا کشیش کس زبان میں باتیں کرتا تھا (اس کا خیال تھا کہ یقیناً ایسی نماز فقط کشیش یا کوئی عالم ہی قائم کر سکتا ہے جیسا کہ عیسائیوں کے ہاں نماز ہوتی ہے لیکن ہم نے اسے جلد ہی سمجھا دیا کہ اس اسلامی پروگرام کو ہر صاحبِ ایمان مسلمان انجام دے سکتا ہے۔)

آخر میں ہم نے اس سے کہا: ہم تو عربی زبان میں بول رہے تھے۔ وہ کہنے لگی: میں اگرچہ تمہاری باتوں میں سے ایک لفظ بھی سمجھ نہ پائی تاہم میں نے صراحت سے دیکھا کہ تمہارے الفاظ عجیب وغریب طرز کے تھے۔ اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا: جس بات نے مجھے بہت زیادہ متوجہ کیا وہ یہ تھی، کہ تمہارے پیش نماز کے خطبے کے دوران کچھ جملے ایسے تھے جو باقی جملوں سے ممتاز تھے وہ بہت زیادہ موثر تھے اور گہرے معلوم ہوتے تھے یہاں تک کہ انہوں نے مجھے لرزہ براندام کر دیا۔ یقیناً ان جملوں میں کچھ اور مطالب تھے مجھے یوں لگتا تھا کہ تمہارا پیش نماز جب ان جملوں کو ادا کرتا ہے تو وہ روح القدس سے ملا ہوتا ہے۔ اس کی یہ بات بہت زیادہ اہم ہے۔

ہم نے تھوڑا سا غور وفکر کیا تو متوجہ ہوئے کہ یہ جملے آیات قرآن ہی تھیں جو میں نے خطبے کے دوران اور نماز میں پڑھی تھیں۔ اس بات نے ہمیں ہلا کے رکھ دیا اور اس نکتے کی طرف متوجہ کیا کہ قرآن کی مخصوص طرز اس قدر موثر ہے کہ حتیٰ ایک ایسی خاتون جو اس کے ایک لفظ کا معنی نہیں سمجھتی وہ بھی اس سے شدید طور پر متاثر ہو جاتی ہے۔ [1]

۹۔ نجاشی اور حبشہ کے عیسائی علماء کا واقعہ

مسلمانوں نے پہلی ہجرت حبشہ کی جانب کی تھی، اور یہ اُس وقت کی تھی کہ جب مشرکین مکہ نے مسلمانوں پر حد سے زیادہ دباؤ

---

[1] تفسیر فی ظلال جلد ۴، صفحہ ۴۲۲

ڈال دیا تھا اور اُنہیں بہت زیادہ اذیت و آزار پہنچانے لگے تھے، مجبوراً اُن میں سے بہت سے لوگوں نے پیغمبر اکرمؐ کی اجازت سے حبشہ کا رُخ کیا اور حبشہ کے بادشاہ نے اُنہیں اپنے ہاں پناہ دی اور وہ بہت امن و امان کے ساتھ وہاں رہنے لگے تھے۔ جس کی وجہ سے اسلام حبشہ میں تدریجاً پھیلنے لگا تھا اور پھر مکہ میں بھی اسلام کا اثر و نفوذ زیادہ ہونے لگا۔ چونکہ اس طرح دوسرے لوگ بھی ایمان لانے اور مشرکین کے دباؤ کی صورت میں حبشہ کی طرف جانے لگے تھے۔

ابن ہشام نے اپنی مشہور تاریخ میں لکھا ہے: جب قریش نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھی تو حبشہ میں امن و امان کی زندگی گذار رہے ہیں تو اُنھوں نے اسے اپنے مستقبل کے لئے ایک خطرہ سمجھا۔ لہٰذا، ایک دوسرے کے ساتھ مشورہ کرنے لگے جس کے بعد یہ طے پایا کہ دو چالاک اور فعال افراد کا انتخاب کر کے اُنہیں نجاشی کے پاس بھیجا جائے تا کہ وہ مسلمانوں کو حبشہ سے واپس لے آئیں او روہاں اُن پر مزید دباؤ ڈالا جا سکے۔ ''عبید اللہ بن ابی ربیعہ'' اور ''عمرو بن عاص'' کو نجاشی اور اس کے لشکر کے افسروں کے لئے کچھ ہدیئے اور تحائف دے کر بھیجا گیا اور حکم دیا گیا کہ نجاشی سے بات کرنے سے پہلے اُس کے افسروں کے تحفہ و تحائف اُن تک پہنچا دیئے جائیں، اس کے بعد مخصوص ہدایا کے ساتھ نجاشی کے پاس جائیں اور اُس سے درخواست کی جائے کہ وہ بغیر کسی سوال و جواب کے اُن کو سپرد کر دے۔

اُنھوں نے ایسا ہی کیا اور پہلے سے ہی نجاشی کے سپہ سالاروں کا ذہن اس مسئلے کے بارے میں اس طرح بھر دیا کہ چند بے وقوف جوانوں کے ایک گروہ نے تمہارے ملک میں پناہ لے لی ہے، اُنھوں نے اپنا دین و آئین ترک کر دیا ہے اور تمہارے دین میں بھی داخل نہیں ہوئے، انھوں نے ایک نئے دین کو بدعت کے طور پر جاری کیا ہے، جو ہمارے اور تمہارے لئے غیر معروف ہے۔ قریش کے اشراف نے ہمیں تمہارے پاس بھیجا ہے تا کہ ہم ان کے شر کو اس ملک سے کم کر دیں اور انہیں ان کی قوم کی طرف لوٹا دیں، انھوں نے منصب داروں سے یہ وعدہ لیا کہ جس وقت نجاشی اُن سے مشورہ کرے تو وہ اس نظریے کی تائید کریں گے کہ مسلمانوں کے بات کرنے سے پہلے وہ اُنہیں ہمارے سپرد کر دے اور اُس سے یہ کہیں گے کہ ان کی قوم ان کے حالات سے زیادہ بہتر طور پر آگاہ ہے۔ نجاشی کے لشکر کے سپہ سالاروں نے یہ رائے قبول کر لی۔ اس کے بعد اُن دونوں نے نجاشی کے دربار میں باریابی حاصل کی اور وہی پُر فریب باتیں اُس سے بھی کہیں۔

نجاشی کے سپہ سالاروں نے بھی ان کی تائید و تصدیق کر دی اور کہا: یہ سچ کہتے ہیں، یہ اپنے لوگوں کو ہم سے زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ نجاشی سخت غضبناک ہو گیا اور کہنے لگا: ممکن نہیں ہے کہ ایسا گروہ جس نے میری پناہ لی ہے اور انھوں نے میرے ملک کو اس کے امن و امان کی وجہ سے دوسرے ملکوں ترجیح دی ہے، اُنہیں دشمنوں کے سپرد کر دوں، اگر واقعاً معاملہ اسی طرح ہوا جیسے یہ دونوں کہتے ہیں تو پھر میں انہیں ان دو افراد کے حوالے کر دونگا اور انہیں اپنے ملک سے نکال دونگا۔ ورنہ میری پناہ میں خیر و خوبی کے ساتھ زندگی بسر کریں۔ اُس نے مسلمانوں کو دعوت دینے کا حکم دیا، نجاشی نے عیسائی علماء اور بزرگوں کو بھی عیسائی کتابوں کے ہمراہ اس مجلس میں بُلا لیا۔ اس عظیم مجلس میں نجاشی نے مسلمانوں سے پوچھا:

یہ کونسا دین ہے کہ تم اپنی قوم سے بھی الگ ہو گئے ہو اور ہمارے دین میں بھی داخل نہیں ہو؟

جناب جعفر بن ابی طالبؑ نے سلسلہ کلام شروع کیا اور کہا: اے بادشاہ! ہم ایک ایسا گروہ تھے جو جاہلیت میں زندگی گذار رہے

تھے، بتوں کی پوجا کرتے تھے، مردار کھاتے تھے، فحش کام کرتے تھے، قطع رحم کرتے، ہمسایوں کے ساتھ بُرا سلوک کرتے، طاقتور، کمزوروں کا مال کھا جاتے تھے، یہاں تک کہ خدا نے ایک پیغمبرؐ ہمارے درمیان مبعوث فرمایا کہ جس کا حسب ونسب ہم اچھی طرح جانتے تھے، اس کی صداقت، امانت اور عفت سے آگاہ تھے۔

اُس نے ہمیں توحید اور یکتائی کی طرف دعوت دی اور ہم سے چاہا کہ ہم خدا کے ساتھ کسی کو شریک قرار نہ دیں، بتوں کی پرستش سے ہاتھ کھینچ لیں جو ہمارے اجداد کا مذہب تھا، اُس نے ہمیں سچ بولنے، امانت ادا کرنے، صلہ رحم کرنے اچھا ہمسایہ بننے، حرام کاموں سے بچنے اور خون خرابہ نہ کرنے کا حکم دیا، اُس نے ہمیں فحش کاموں، جھوٹ اور مال یتیم کھانے سے منع کیا اور ہمیں حکم دیا کہ ہم نماز پڑھیں اور روزہ رکھیں۔۔۔(اسی طرح تمام احکام اسلام ذکر کئے) ہم بھی اُس پر ایمان لے آئے اور اس کی تصدیق کی، اُس نے جو کچھ ہم پر حرام کیا، اُسے حرام جانا اور جس چیز کو حلال قرار دیا اسے حلال سمجھا۔

اسی لئے ہماری قوم اور قبیلے نے ہم پر تجاوز کرنا جائز سمجھا اور ہمیں سخت اذیتیں دیں اور آزار پہنچایا تا کہ ہمیں بتوں کی پرستش کی طرف پلٹا دیں۔ جب وہ ہمارے اوپر مسلط ہو گئے اور ہمارے اوپر ظلم وستم ڈھانے شروع کئے اور ہمارے اور ہمارے دینی فرائض کے درمیان حائل ہونا شروع ہوئے تو ہم نے آپ کی سرزمین کی طرف ہجرت کی اور تمام حکمرانوں میں سے آپ کا انتخاب کیا اور ہمیں اُمید ہے کہ آپ کی پناہ میں ہم پر ظلم وستم نہیں ہوگا'' نجاشی نے اُنہیں کہا: کیا اس شخص کی آسمانی کتاب کی کوئی چیز تمہارے پاس ہے؟ جعفر نے کہا جی ہاں! نجاشی نے کہا مجھے سناؤ۔ جناب جعفر نے سورۂ مریم کی ابتدائی آیات کی تلاوت کی:

"كٓهٰيٰعٓصٓ ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا۔۔"

یہ آیات ایک خاص فصاحت وبلاغت کے ساتھ حضرت مریم کے واقعے اور حضرت عیسیٰ -کی ولادت جو نجاشی اور اہل حبشہ کے لئے دلچسپ تھا، کو بہت خوبصورت انداز میں پیش کررہی تھیں، اس نے نجاشی کے دل پر بہت زیادہ اثر کیا اور وہ گریہ کرنے لگا یہاں تک کے اس کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی عیسائی پادری اور علماء بھی اس قدر رونے لگے کہ اُن کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی آسمانی کتابیں بھی اُنکی آنکھوں کے آنسوؤں سے تر ہو گئیں۔ نجاشی نے حاضرین کی جانب مخاطب ہو کر کہا: خدا کی قسم! یہ وہی چیز ہے جو حضرت عیسیٰ - پر نازل ہوئی ہے، یہ دونوں ایک ہی نور سے ہیں'' اس کے بعد نجاشی نے (قریش کے بھیجے ہوئے) دونوں نمائندوں سے کہا: ''خدا کی قسم اُنہیں ہرگز تمہارے سپرد نہیں کرونگا''۔ اس طرح قریش کے نمائندے اپنے تمام شیطانی منصوبوں اور اُن پر سرمایہ کاری کے بعد شکست خوردہ ناکام اور نامراد واپس لوٹ آئے۔ [1]

۱۰۔غیر مسلم دانشوروں کے لئے قرآن کی کشش

قرآن کی جاذبیت اور کشش فقط عربوں اور گذشتہ زمانوں میں منحصر نہیں تھی، بلکہ ہمارے اپنے زمانے میں حتیٰ اُن لوگوں کے

---

[1] سیرہ ابن ہشام جلد ا، صفحہ ۳۵۶ تا ۳۶۰ (تلخیص)

لئے بھی کہ جو عربی ادب کے رموز سے ذرا بھی اطلاع نہیں رکھتے، اس کی کشش عجیب وغریب اور غیر معمولی حیثیت رکھتی ہے، اسی لئے بعض مغربی دانشوروں نے بے ساختہ طور پر قرآن کی مدح وستائش میں اپنی زبان کھولی ہے اور کچھ ایسے حقائق کا اعتراف کیا ہے کہ جو ہمارے لئے بہت ہی دلچسپ ہے۔

منجملہ ڈاکٹر مسز لورا واکیسا گلیری ہیں: یہ ناٹل یونیورسٹی کی پروفیسر ہیں، اپنی مشہور کتاب''اسلام کی تیز رفتار ترقی'' میں لکھتی ہیں: ''اسلام کی آسمانی کتاب، اعجاز کا ایک نمونہ ہے، قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس کی تقلید نہیں کی جا سکتی، کس طرح ممکن ہے کہ یہ اعجاز آمیز کتاب، خود محمدؐ کی خود ساختہ ہو، جب کہ وہ ایک ایسا عرب تھا، جس نے تعلیم حاصل نہیں کی۔ ہمیں اس کتاب میں علوم کے خزینے اور ذخیرے نظر آتے ہیں جو نہایت ہوش منداشخاص، بزرگ ترین فلاسفہ اور قوی ترین سیاست دان اور قانون دان لوگوں کی استعداد اور ذہنی سطح سے بلند ہیں''[1]

''کارلائل'' مشہور انگریز دانشور قرآن کے بارے میں یوں کہتا ہے: ''اگر اس مقدس کتاب پر ایک نظر ڈالیں تو برجستہ حقائق اور وجود کے اسرار وخصائص نے اس کے جوہر دار مضامین میں ایسے پرورش پائی ہے جس سے قرآن کی عظمت وحقیقت وضاحت سے نمایاں ہوتی ہے یہ خود ایک ایسی خوبی ہے جو صرف قرآن سے مخصوص ہے اور کسی دوسری علمی، سیاسی اور اقتصادی کتاب میں نہیں دیکھی جا سکتی۔ یقینا بعض کتابیں ایسی ہیں جن کا مطالعہ ذہن انسانی پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے لیکن ان کا قرآن سے کبھی موازنہ نہیں کیا جا سکتا''

''جان ڈیون پورٹ'': کتاب''عذر تقصیر بہ پیش گاہ محمدی وقرآن'' میں لکھتا ہے: ''قرآن نقائص سے اس قدر مبرا ومنزہ ہے کہ چھوٹی سی چھوٹی تصحیح اور اصلاح کا بھی محتاج نہیں۔ اس کے بعد مزید لکھتا ہے: خدا سے بے خبر پادریوں نے سالہا سال تک ہمیں قرآن مقدس اور اس کے لانے والے (حضرت) محمدؐ کی عظمت کے حقائق کو سمجھنے سے دور رکھا ہے، مگر علم ودانش کی شاہراہ پر جتنا ہم نے قدم آگے بڑھایا جہالت وتعصب کے ناروا پردے ہٹتے گئے اور بہت جلد اس کتاب نے جس کی تعریف وتوصیف نہیں ہو سکتی دنیا کو اپنی طرف کھینچ لیا ہے اور اس نے دنیا کے علم ودانش پر گہرا اثر کیا ہے اور آخر کار یہ کتاب دنیا بھر کے لوگوں کے افکار کا محور قرار پائے گی''۔[2]

''گوئٹے'': ''ہم ابتدا میں قرآن سے روگردان تھے، لیکن زیادہ وقت نہیں گزرا کہ اس کتاب نے ہماری توجہ اپنی طرف کھینچ لی اور ہمیں حیران کر دیا یہاں تک کہ اس کے اصول اور عظیم علمی قوانین کے سامنے ہم نے سر تسلیم خم کر دیا''!

''زول لابوم'': ایک فرانسیسی مفکر، اپنی کتاب''تفصیل الآیات'' میں کہتا ہے: ''دنیا نے علم ودانش مسلمانوں سے لی ہے اور مسلمانوں نے یہ علوم اس قرآن سے لئے ہیں جو علم ومعرفت کا سمندر ہے اور اس سے عالم بشریت کے لئے کئی دریا جاری ہوئے ہیں''[3]

---

[1] کتاب''پیش رفت سریع اسلام''ترجمہ مرحوم سعیدی، صفحہ ۴۹۰ (تھوڑی سی تلخیص کے ساتھ)

[2] عذر تقصیر بہ پیش گاہ محمد وقرآن، فارسی ترجمہ (صفحہ ۱۱۱)

[3] المعجزہ الخالدۃ

''دینورٹ'': ایک اور مستشرق، لکھتا ہے: ''ضروری ہے کہ ہم اعتراف کرلیں کہ علوم طبیعی وفلکی اور فلسفہ وریاضیات جو یورپ میں رائج ہیں زیادہ تر قرآن کی تعلیمات کی برکت سے ہیں اور ہم مسلمانوں کے مقروض ہیں بلکہ اس لحاظ سے یورپ ایک اسلامی شہر ہے'' [۱]

مشہور مستشرق ''نولدکی'' کہتا ہے: قرآن ہمیشہ اُن لوگوں کے دلوں پر مسلط ہوجاتا ہے اور اُنہیں اپنے ساتھ منسلک کرلیتا ہے کہ جو دُور سے اس کی مخالفت کرتے رہے ہیں'' [۲]

۲۔ جنہوں نے قرآن سے مقابلے کی کوشش کی

جیسا کہ ہم نے کہا ہے معجزہ وہ ہے جو دوسروں کو مقابلے کی دعوت دے اور سب اُس کے سامنے عاجز ہوجائیں۔ کیونکہ قرآن نے تمام دنیا والوں کو مقابلے کی دعوت دی ہے، اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسے معلوم ہوا کہ پوری تاریخ میں قرآن کی مثل نہیں لائی جاسکی؟! اس سوال کا جواب واضح ہے، چونکہ یہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں ہے کہ تاریخ اُسے فراموش کردے، یہ ایک عظیم مذہب کی سرنوشت اور اس کے اُن رقیبوں کی سرنوشت کا مسئلہ ہے کہ جو دنیا کے طاقتور ترین لوگ ہیں اور جنہوں نے اسلام کے ساتھ مقابلہ اور معارضہ کرنے پر سالانہ ایک کثیر سرمایہ خرچ کیا ہے اور کر رہے ہیں۔

اگر ایسا کوئی واقعہ رونما ہوتا تو پوری دنیا میں ہر جگہ اس کا ڈھنڈورا پیٹا جاتا اور اس (کامیابی) پر نعرے بلند کئے جاتے اور اس کے لئے بہت زیادہ پروپیگنڈہ مہم چلائی جاتی۔ بنابریں ایک مشہور ضرب المثل ''لَو کَانَ لَبَانَ'': یعنی: ''اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو چھپی نہ رہتی'' کے مصداق اس سلسلے میں ہر قسم کا مقابلہ اور معارضہ آشکار ہوجانا چاہیے تھا۔

اسی لیے بعض ایسے افراد پر یہ الزام لگایا جاتا ہے جو خود قرآن سے مقابلے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ انہوں نے قرآن کا مقابلہ کیا اور یوں اس مسلے کے بارے میں بھرپور پروپیگنڈا کیا جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بہرحال (قرآن) کے مخالفین کو اس مسئلے پر بہت زیادہ اصرار رہتا ہے جس کی وجہ سے وہ ہر ممکنہ وسیلے سے اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ تاریخ میں جس کا نام اس حوالے سے ثبت ہوا ہے وہ فقط ''مسیلمہ'' نامی شخص ہے کہ جو ''کذاب'' کے نام سے مشہور ہے اور زمانہ پیغمبرؐ میں (مشرقی حجاز کے نواح میں) سرزمین یمامہ سے اُٹھا ہے۔

اُس کا اصلی نام ''مسیلمہ بن حبیب'' تھا، اس نے حضرت پیغمبرؐ کے آخری سالوں (دسویں ہجری) میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ وہ ہر چیز میں رسول اللہ ﷺ کی نقل کرنے کی کوشش کرتا تھا، اُس کا دعویٰ تھا کہ ''رحمن'' نامی ایک فرشتہ اُس پر نازل ہوتا ہے اور قرآن جیسی آیات اُس پر لاتا ہے۔ کہتے ہیں: اُس نے پیغمبر اسلامؐ سے درخواست کی کہ وہ اُسے بھی نبوت میں شریک کرلیں اور وصیت کریں کہ آپؐ کی رحلت کے بعد وہ آپؐ کا جانشین ہوجائے، اس طرح وہ آپؐ کی مخالفت چھوڑ دے گا۔

---

[۱] المعجزہ الخالدۃ

[۲] مذکورہ بالا کلام کتاب ''ابعاد زندگانی اسوۂ بشریت''، ناشر، انتشارات رسول اکرمؐ کے صفحہ ۱۳۹ سے نقل کیا گیا ہے۔

قرائن سے پتا چلتا ہے کہ مسیلمہ کے پیچھے "قبائلی تعصب" کارفرما تھا، جو اس کی اس سلسلے میں تائید کر رہا تھا، یمامہ کے لوگ بھی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقام نبوت کے سائے میں قریش اور مکہ و مدینہ کے لوگوں کو جو سیادت و برتری مل گئی تھی، اُسے اس طریقے سے ختم کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے وہ ایک ایسے مہم جو، جاہ طلب اور مادہ پرست شخص کی تلاش میں تھے اور اُنہیں یہ صفات مسیلمہ میں نظر آ گئی تھیں۔ لیکن قرآن کے ساتھ مقابلے کے عنوان سے اس سے جو باتیں نقل ہوئی ہیں، اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک بے عقل انسان تھا، اور اپنی باتوں میں اعلیٰ مضمون کے بارے میں سوچنے کے بجائے فقط کلمات میں "سجع" کی تلاش میں رہتا تھا۔ منجملہ اُس سے جو مضحکہ خیز عبارات نقل ہوئی ہیں اور بالفاظ دیگر اُس نے قرآن کی جو نقل کرنے کی کوشش کی ہے، وہ کچھ اس طرح ہے:

" وَالْمُبَذِّرَاتِ بَذْراً وَالحَاصِدَاتِ حَصْداً وَالذَّارِيَاتِ قَمْحاً وَالطَّاحِنَاتِ طَحْنًا، وَالْعَاجِنَاتِ عَجْنًا وَالْخَابِزَاتِ خَبْزاً وَالثَّارِدَاتِ ثَرْدًا، وَاللَّاقِمَاتِ لَقْمًا إِهَالَةً وَسَمْنًا۔"

"قسم ہے کسانوں کی۔۔۔ قسم ہے بیج ڈالنے والوں کی اور قسم ہے گھاس کو گندم سے جدا کرنے والوں کی اور قسم ہے گندم کو گھاس سے الگ کرنے والوں کی قسم ہے آٹا گوندھنے والیوں کی اور قسم ہے روٹی پکانے والوں کی اور قسم ہے ثرید بنانے والوں کی اور قسم ہے ان کی جو چرب و نرم لقمہ اٹھاتے ہیں"![1]

گویا وہ ایک مضحکہ خیز جملات کے ذریعے سورۂ عادیات یا ذاریات کی آیات کا مقابلہ کرنا چاہتا تھا، قرآن فرماتا ہے:

" وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا۔ فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا۔ فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا۔ فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا۔ فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ۔۔۔"

"ان فراٹے بھرتے ہوئے سرپٹ دوڑنے والے گھوڑوں کی قسم، اور ان کی قسم جو آگ کی چنگاریاں نکالتے ہیں اور صبح ہوتے ہی دشمن پر یلغار کر دیتے ہیں پھر اس سے ہر طرف گرد و غبار چھا جاتا ہے، بیشک انسان اپنے پروردگار کی نعمتوں کے سامنے ناشکرا اور بخیل ہے" اور اُن سے خوش بختی کے راستے میں استفادہ کے بجائے، اُن سے اپنی بدبختی کے اسباب فراہم کرتا ہے"

آپ خود دیکھ سکتے ہیں، ان دونوں (کلاموں) کے درمیان کس قدر فرق ہے! ایک دوسری عبارت اس سے نقل کرتے ہیں جو اس کے بقول اُس نے یہ آیات اپنے اوپر نازل کی ہیں!:

"يَا ضِفْدِعُ بِنْتَ ضِفْدِعَيْنِ، نَقِّي مَا تَنَقِّيْنَ اعلاكِ فِي الْمَاءِ واسفلكِ فِي الطِّيْنِ لَا الْمَاءَ تُكَدِّرِيْنَ وَلَا الشَّارِبَ تَمْنَعِيْنَ"۔

---

[1] سفینۃ البحار، مادہ سلم (مختصر فرق کے ساتھ) تاریخ ابن اثیر جلد ۲، صفحہ ۳۶۲۔ اعجاز القرآن رافعی (ترجمہ) ۱۲۷۔

یعنی: ''ای مینڈک! مینڈک کی بیٹی! جتنا چاہتی ہے آواز نکال تیرا اوپر والا آدھا حصہ پانی میں ہے اور نیچے والا آدھا کیچڑ میں ہے تو نہ پانی کو گدلا کرتی ہے اور نہ کسی کو پینے سے روکتی ہے۔'' [1]

اس کے علاوہ اس سے جتنی بھی باتیں اور آیات نقل ہوئی ہیں، اسی طرح کی ہیں بلکہ بعض تو اس سے بھی بدتر اور گھٹیا کہ جن کو ذکر نہ کرنا ہی بہتر ہے۔ اس سے جو عبارات نقل ہوئی ہیں، اُن سے بخوبی معلوم ہوتا کہ وہ فقط عبارات کی سجع (خوبصورتی) کو اہمیت دیتا تھا، اور عبارت کے مسجع ہونے کو کافی سمجھتا تھا، جیسا کہ ہمارے زمانے میں بچوں کے لئے اشعار لکھے جاتے ہیں، جن میں معمولی بیہودہ اور بعض اوقات بے معنیٰ الفاظ کسی شعر میں ڈھال دیئے جاتے ہیں اور فقط اُن کے قافیہ پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ مئورخین نے لکھا ہے کہ اُس کے زمانے میں ''سَجاح'' (بروزن تباہ!) نامی ایک عورت بھی تھی جو جھوٹ بولنے میں ضرب المثل تھی، اور عربوں کا مقولہ تھا: فَلَانٌ اَکْذَبُ مِنۡ سَجَاح ''یعنی: ''فلاں شخص سجاح سے بھی زیادہ جھوٹا ہے''۔

وہ قبیلہ بنی تمیم سے تھی اور اُس نے بھی نبوت اور نزول وحی کا دعویٰ کیا ہوا تھا۔ کچھ لوگ اس کی پیروی کررہے تھے اور وہ بھی ''مسیلمہ'' کی مانند مسجع الفاظ جوڑتی رہتی تھی۔ کہتے ہیں، ان دونوں کے پیروکار ایک دوسرے کے نزدیک رہتے تھے ایک موقع پر وہ ایک دوسرے سے جنگ پر تیار ہوگئے، اس وقت مسیلمہ نے مکروفریب سے کام لیتے ہوئے سجاح کے ساتھ تنہائی میں بات چیت کی اور اُس سے کہا: اگر تم چاہو تو میں تم سے شادی کر لیتا ہوں۔

اس طرح تیرے اور میرے قبیلے والے ایک دوسرے کے قریب ہو جائیں گے، اور ہم عربوں کو کھالیں گے! وہ اس تجویز پر راضی ہوگئی اور وہ تین دن تک اس کے پاس رہی اور جب واپس لوٹی تو اُس کے قبیلہ والوں نے کہا: اس شادی میں مہر کیا تھا؟ وہ مسیلمہ کے پاس آئی اور مہر کا مطالبہ کرنی لگی، مسیلمہ نے کسی شخص سے کہا کہ وہ دونوں قبیلوں میں جا کر یہ اعلان کرے کہ سجاح کا مہر، دین محمدؐ میں واجب ہونے والی صبح وشام کی نمازوں کا بخشا جانا ہے۔ جب مسیلمہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد جنگ یمامہ میں حضرت حمزہؓ کے قاتل وحشی کے ہاتھوں مارا گیا تو اس عورت نے اسلام قبول کرلیا۔ [2]

اور یہ دونوں جھوٹ بولنے میں اس قدر مشہور تھے کہ ایک شاعر نے اُن کے بارے میں کہا:

وَالَتۡ سَجَاح وَوَالاٰھَا مسَیۡلَمَۃٌ
کَذّٰابَۃٌ مِنۡ بَنِی الدُّنۡیَاٰ وَ کَذّٰابٌ

''سجاح، مسیلمہ کو پسند کرتی تھی اور وہ سجاح کو، دنیا کی اولاد میں سے ایک جھوٹی عورت ایک جھوٹے مرد کے ساتھ مل گئی ہے''! [3]

---

[1] سفینۃ البحار، مادہ سلم (مختصر فرق کے ساتھ) تاریخ ابن اثیر جلد ۲، صفحہ ۳۶۲ ۔ اعجاز القرآن رافعی (ترجمہ) ۱۲۸۔

[2] دائرۃ المعارف قرن بیستم، فرید وجدی، طبق نقل تنزیہ التنزیل مرحوم شہرستانی، صفحہ ۱۷۶،

[3] دایرۃ المعارف دھخدا مادہ سجاح

۲۔"اسود عنسی"اُن اشخاص میں تھا کہ جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر کے آخری دور میں قرآن کے ساتھ مقابلے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے خیال میں بھی قرآن کے ساتھ معارضے کے لئے مسجع عبارات ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ لینا کافی ہے خواہ اُن کا کوئی معنیٰ ومفہوم ہو یا نہ ہو۔ "اسود عنسی" قبیلہ بنی مذحج سے تھا اور اُس نے حجۃ الوداع کے ایام (پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ کے آخری ایام) میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا، اور اس کے دعویٰ نبوت کا زمانہ چار مہینوں سے زیادہ نہیں تھا، اُس نے "بحرین"، "نجران" اور "یمن" کے کچھ حصے اور "خلیج فارس" کے ساحلی علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا، لیکن آخر کار یمن میں اپنی بیوی کی مدد سے "فیروز" نامی ایک ایرانی کے ہاتھوں مارا گیا اور اس کے قتل کی خوشخبری، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات میں ہی مدینہ تک پہنچ گئی تھی۔ [1]

کہا جاتا ہے وہ ایسے علاقوں میں رہتا تھا جن میں فکری انحطاط اور اخلاقی پستی کی وجہ سے چند اوباش قسم کے لوگوں نے اس کی پیروی شروع کر دی تھی، وہ قرآن کے ساتھ معارضہ کرنے کے لئے فقط مسجع کلمات سے استفادہ کرتا تھا جیسا کہ مسیلمہ سے نقل کیا گیا ہے، لیکن اس کے پیروکار بہت جلد اس کے فاسد عقیدہ کو سمجھ گئے اور اس کی پیروی سے ہاتھ کھینچ لیا۔

۳۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد بھی کچھ افراد سے قرآن کے ساتھ مقابلہ کرنے کی نسبت دی گئی ہے اگرچہ اُن کے ساتھ یہ نسبت تاریخی لحاظ سے مسلّم نہیں ہے۔ شاید بعض عرب ادباء سے کچھ مسجع عبارات کو دیکھ کر بعض نا آگاہ لوگوں نے اُن کے ساتھ اس طرح کی نسبت دی ہے۔ یا کچھ چالاک دشمنوں نے اس طرح کے احتمالات کے ذریعے غلط فائدہ حاصل کرنے کی سعی کی ہے۔ منجملہ دوسری ہجری صدی کے مشہور لکھاریوں اور ادیبوں میں سے ایک "عبداللہ بن مقفع" ہے۔

یہ امام جعفر صادقؑ کے زمانے میں گذرا ہے، کہتے ہیں وہ پہلے عیسائی تھا، بعد میں اسلام لے آیا تھا، اُسے فارسی زبان پر تسلط حاصل تھا جس کی وجہ سے اُس نے بعض فارسی کتابیں عربی میں ترجمہ کی تھیں جن میں سے ایک مشہور کتاب "کلیلہ ودمنہ" ہے۔ اس نے اس کتاب پر جو مقدمہ لکھا ہے، اُس میں وہ صراحت کے ساتھ اسلام کا اظہار کرتا ہے، لیکن کہتے ہیں: بعض اوقات اس سے کچھ بُرے کلمات بھی سُنے گئے ہیں، آخر کار انہی کلمات کی وجہ سے وہ بصرہ کے حکمران "سفیان بن معاویہ مُھلّبی" کے ہاتھوں قتل ہوا ہے کہ بظاہر وہ اس کے ساتھ کچھ اختلافات رکھتا تھا، اور کہا جاتا ہے کہ جب سفیان اُسے آگ کے تنور میں پھینکنا چاہتا تھا، تو اُس نے اس سے کہا: میں تجھے قتل کر رہا ہوں، اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے کیونکہ تُو ایک زندیق ہے اور لوگوں کے عقائد خراب کر رہا ہے!

بہر حال اس کے عقائد ہمارے اوپر پوری طرح واضح نہیں ہیں، لیکن جو چیز مسلّم ہے وہ یہ کہ اُس نے قرآن کے ساتھ مقابلے کا دعویٰ نہیں کیا تھا، لیکن بعض کا کہنا ہے: اس نے اسی مقصد کے لئے کتاب الدرۃ الیتیمۃ" تصنیف کی تھی۔ یہ کتاب ابھی موجود ہے اور کئی مرتبہ طبع ہو چکی ہے اس کتاب میں اس بات کا چھوٹے سے چھوٹا بھی اشارہ نہیں کہ یہ قرآن کے مقابلہ میں لکھی گئی ہے اسکے باوجود ہم نہیں جانتے کہ اس کی طرف یہ نسبت کیوں دی گئی ہے۔ بہر حال اس کے قرآن کے ساتھ مقابلہ کرنے کے متعلق کوئی تاریخی سند موجود نہیں ہے اور مذکورہ کتاب اگرچہ ادبی انداز میں لکھی گئی ہے، لیکن اس میں قرآن کے ساتھ معارضہ کرنے والی کوئی چیز نہیں ملتی۔

---

[1] دایرۃ المعارف بستانی، بنا بر نقل تنزیہ التنزیل مرحوم شہرستانی، صفحہ ۱۸۶،

۴۔ ''ابوالعلای معری'': اس کا نام بھی اس امر میں داخل ہے کہ جس کے ساتھ اس قسم کی نسبت دی گئی ہے، وہ پانچویں صدی ہجری کے مشہور شعراء اور لکھاریوں میں سے تھا، وہ ایک ملحد انسان تھا اور اس سے بہت سی فاسد باتیں نقل ہوئی ہیں، حتیٰ کہ اس کی حالت ''عبداللہ بن مقفع'' کے ساتھ موازنے کے قابل بھی نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود ہمیں کوئی ایسی تاریخی سند نہیں ملتی جس سے پتا چلتا ہو کہ وہ قرآن کے ساتھ مقابلے کا ارادہ رکھتا تھا۔ بظاہر اس کے ساتھ اس قسم کی نسبت، اُس کے الحاد اور بے دین ہونے کی وجہ سے دی گئی ہے اور پھر وہ ایک ادیب، لکھاری اور شاعر بھی تھا۔

حتیٰ اُس نے کتاب ''التاج'' میں ''ابن راوندی'' کی مسجع پردازیوں کا بھی مذاق اُڑایا ہے، اور ''التاج'' کے جواب میں ''الغفران'' نامی ایک کتابچہ لکھا ہے، اس میں وہ بہت صراحت کے ساتھ کہتا ہے: ابن راوندی کی قافیہ پردازیاں اور مسجع عبارتیں، اُن کاہنوں کی عبارتوں جیسی ہیں کہ جو کہتے تھے: **اُفٍّ وَتُفٍّ وَجَوْرَبٍ وَخُفٍّ**۔ اس طرح وہ بھی اس نکتے کی طرف متوجہ کراتا ہے کہ بے معنیٰ مسجع عبارات جوڑنا کسی قسم کی اہمیت نہیں رکھتا۔

قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ وہ اسی ''الغفران'' نامی کتابچے میں ''قرآن'' کے بارے میں ایک بہت ہی دلچسپ بات لکھتا ہے کہ جس میں قرآن اور اس کے مضامین کی عظمت کا اعتراف کرتا ہے (اگرچہ وہ اسے آسمانی وحی نہیں جانتا) پھر بھی صراحت کے ساتھ کہتا ہے: ''جب قرآن کی ایک آیت کسی دوسرے کلام کے درمیان رکھی جائے تو وہ تاریک رات میں چمکنے والے روشن ستارے کی طرح چمکتی ہوئی نظر آتی ہے''!

۵۔ ''احمد بن حسین کوفی: یہ شاعر تھا اور ''متنبی'' کے نام سے مشہور تھا جیسا کہ اسکے لقب سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ وہ چوتھی صدی ہجری کے ادیبوں میں سے تھا اور شاعری کا بہت عمدہ ذوق رکھتا تھا، پہلے پہل اس نے اسلام قبول کر لیا تھا، لیکن کہا جاتا ہے: بعد میں اس نے دعویٰ نبوت کیا، اور دلچسپ یہ کہ اس نے یہ دعویٰ سترہ سال کی عمر میں کیا تھا۔ کتاب ''اعجاز القرآن'' رافعی کے حواشی میں آیا ہے کہ وہ ۳۲۰ھ میں مدعی نبوت ہو گیا تھا، کچھ ''بنی کلب'' اس کے پیروکار ہو گئے تھے، ''حمص'' کے حکمران نے اُسے جیل میں بند کر دیا تھا۔

جس کے بعد اسکے پیروکار متفرق ہو گئے، اس کے بعد اس نے توبہ کر لی اور آزاد ہو گیا، لیکن بعد میں اس بات سے بالکل منکر ہو گیا۔ وہ کچھ عرصے تک ''سیف الدولہ'' کا مقرب رہا اور جب بھی اس کی محفل میں دعویٰ نبوت کی بات چھڑتی تو اس کا انکار کر دیتا تھا۔ آخر کار ''عضدالدولہ دیلمی'' کے ساتھیوں کے ساتھ اختلاف کی وجہ سے ۳۵۴ھ میں ''فاتک بن ابی جہل'' کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔[1]

۶۔ ایک دوسرا شخص جو قرآن کے ساتھ مقابلہ کرنے کی سوچ رہا تھا ''احمد بن یحیی'' المشہور ''ابن راوندی'' ہے۔ جو معتزلہ کے متکلمین میں سے تھا۔ وہ ہمیشہ اسلام کے مخالف ملحدین کے ساتھ رہتا تھا اور جب اسے اس وجہ سے ملامت کی جاتی تو کہتا: میں اُن کے عقائد سے آگاہ ہونا چاہتا ہوں، کہتے ہیں: اُس کا باپ یہودی تھا جس نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ لہٰذا بعض یہودی، بعض مسلمانوں سے کہتے تھے:

---

[1] اعجاز القرآن رافعی (ترجمہ) صفحہ ۱۳۷

ابن راوندی آپ لوگوں کی کتاب کوتباہ کردے گا جس طرح اس کے باپ نے یہودیوں کی کتاب کوتباہ کیا ہے۔

بعض نے لکھا ہے کہ وہ کسی ایک مذہب پر قائم نہیں رہتا تھا، اس نے یہودیوں کے لئے اسلام کے رد میں ''البصیرہ'' نامی کتاب چارسو درہم میں لکھی، اُسے مکمل کرنے کے بعد اُس کا جواب لکھنے پر آ گیا اور ایک سو درہم لیکر اس کام سے ہاتھ کھینچ لیا۔ کہتے ہیں: اُس نے قرآن کے ساتھ معارضہ کرنے کے لئے ''التاج'' نام کی ایک کتاب لکھی، لیکن ابھی تک اس کتاب کا کوئی نمونہ نہیں مل سکا۔ اور یہ وہی کتاب ہے کہ جس کے بارے میں ابوالعلاء معری نے کہا ہے:

''اَمّا تاجُهُ فَلَيْسَ نَعْلاً! وَهَلْ تاجُهُ اِلاّ كَما قالَتِ الكَهَنَةُ: اُفٍّ، وَتُفٍّ وَجَوْرَبٍ وَخُفٍّ''

''اس نے جو کتاب تاج لکھی ہے، ایک جوتے جتنی قیمت بھی نہیں رکھتی، کیا ابن راوندی کی قافیہ پردازیاں اور مسجع عبارتیں کاہنوں کی باتوں کے سوا کچھ اور ہیں جو کہتے ہیں: اُف وتف وجورب اور خف''؟۔[1]

جو کچھ ذکر ہوا ہے، اس سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے بھی قرآن کی طرف سے مقابلے کے چیلنج کا مثبت جواب نہیں دیا ہے۔ حالانکہ اس دعویٰ کو بہت زیادہ نقل کیا گیا ہے، یعنی؛ ایام جاہلیت کے مشرک عربوں کے زمانے سے لیکر آج تک جب کہ جدید استکباری نظام، اسلام وقرآن کوختم کرنے کے لئے بڑا سے بڑا سرمایہ لگا رہے ہیں جو اگر عرب وغیرعرب ادیبوں کو قرآن جیسی کوئی چیز لانے پر جمع کر سکتے تو یقیناً اس سے دریغ نہ کرتے۔

اور ہم دیکھتے ہیں کہ پوری تاریخ میں مسیلمہ وسجاح جیسے رسوا اور ذلیل افراد کے سوا کسی اور نے اس میدان میں قدم نہیں رکھا، اس سے اچھی طرح واضح ہوجاتا ہے کہ یہ کام کسی کے لئے بھی ممکن نہیں تھا، ورنہ یہ اسلام وقرآن کے سخت ترین دشمنوں کے لئے بہترین ذریعہ بن سکتا تھا اور اس کے بارے میں بہت زیادہ پروپیگنڈہ کیا جاتا، لیکن یہی وہ چیز ہے کہ جس کو قرآن کے مقابلے میں عجز وناتوانی کہا جاتا ہے۔

---

[1] اعجاز القرآن افعی پر ابن الدین کے ترجمے اور حاشیے سے اقتباس، صفحہ ۱۳۳ تا ۱۳۷۔

اعجاز قرآن کے مختلف پہلو

اشارہ:

بعض لوگوں کا خیال ہے قرآن کا اعجاز فقط فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے ہے، یعنی؛ الفاظ کا خوبصورت اور رسا ہونا ہے حالانکہ آج کے محققین اور علماء کی اکثریت اس بات کو درست نہیں سمجھتی اور قرآن کے اعجازی پہلو بہت زیادہ اور متنوع ہیں حتیٰ الممکن ہے وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اعجاز قرآن کے کچھ اور پہلو بھی سامنے آجائیں کہ جو پہلے ہمارے لئے واضح نہیں تھے۔ فی الحال، اعجاز قرآن کے سلسلے میں درج ذیل پہلوؤں کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ جن کے بارے میں شواہد خود قرآن میں موجود ہیں:

۱۔ فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے قرآن کا اعجاز۔ یعنی؛ ظاہری خوبصورتی، عمیق باطن اور بیان کی متانت وعفت، اسی طرح مفاہیم کی وسعت، قاطعیت اور صراحت نیز معنیٰ و الفاظ میں ہم آہنگی۔

۲۔ معارف اور اعتقادی مسائل بیان کرنے میں قرآن کا معجزہ ہونا۔

۳۔ تاریخی مسائل کے لحاظ سے قرآن کا معجزہ ہونا۔

۴۔ قوانین کے وضع کرنے کے لحاظ سے اعجاز قرآن۔

۵۔ جدید علوم وفنون اور عصر قرآن میں بعض نا معلوم (سائنسی) علوم میں قرآن کا اعجاز۔

۶۔ پیشین گوئی اور غیبی خبروں میں اعجاز قرآن۔

۷۔ تیئیس سال کے طولانی عرصے میں اور تمام تر زمانی ومکانی تبدیلیوں کے باوجود آیات قرآن میں اختلاف نہ ہونے کے لحاظ سے قرآن کا معجزہ ہونا۔

انہی اشاروں کے ساتھ اب ہم قرآن کی طرف واپس پلٹتے ہیں اور اعجاز قرآن کی ان تمام اقسام کے بارے میں علیحدہ علیحدہ بحث وگفتگو کرتے ہیں۔

۱۔ فصاحت و بلاغت کی نظر سے قرآنی اعجاز

علم معانی کے علماء فصاحت و بلاغت کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں: فصاحت کبھی تو کلمہ کی توصیف میں ہوتی ہے اور کبھی کلام کی توصیف میں، اور اس سے مراد کلام کا غیر مانوس، بھاری بھرکم ثقیل حروف اور کلمات اور بے وزن اور غیر مربوط الفاظ سے پاک ہونا ہے۔ اسی طرح ہلکے، گھٹیا، قابل نفرت اور کان پھاڑنے والے بے ڈھنگے اور پیچیدہ اور مبہم الفاظ سے مبرا ہونا ہے۔ اور بلاغت سے مراد کلام کا مقتضائے حال کے مطابق ہونا اور جس مقصد کی خاطر کلام جاری کیا گیا ہے اُس کے ساتھ مکمل طور پر مطابقت رکھنا ہے۔ بالفاظ دیگر فصاحت

کی بازگشت، الفاظ کی کیفیت کی طرف ہوتی ہے جبکہ بلاغت معنیٰ ومطالب کی کیفیت پر مشتمل ہے۔ اسی طرح یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ فصاحت کلام کے ظاہری پہلوؤں کی طرف اور بلاغت اس کے معنویت اور مضامین کی طرف ناظر ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان دونوں کا علمی اور قواعدی پہلو سے زیادہ، ذوق اور صلاحیتوں سے تعلق ہے۔ لیکن ذوق واستعداد بھی تعلیم وتربیت اور اُن قواعد کی طرف توجہ دینے سے پھلتی پھولتی ہے۔ جو اکثر فصحا اور بلغا کے کلام سے لئے جاتے ہیں۔ یہ بالکل شعری ذوق اور خوش خطی کی صلاحیت کی طرح ہے۔ جو اُستاد اور تعلیم کے ذریعے تکامل حاصل کرتی ہے۔ بہر حال بعض کا خیال ہے کہ اعجاز قرآن اور مختلف آیات میں مقابلے کی دعوت بنیادی طور پر اسی مطلب کی طرف اشارہ کرتی ہے اور ممکن ہے درج ذیل مسائل اسی مطلب پر گواہ ہوں:

۱۔ اُس زمانے میں عربوں کی خصوصیت اور ہنرمندی فقط فصاحت وبلاغت میں ہی تھی یہاں تک کہ زمانہ جاہلیت کے اشعار فصاحت کی بلندیوں پر سمجھے جاتے تھے اور ہر سال طائف کے نزدیک تشکیل پانے والے ایک اقتصادی اجتماع میں کہ جسے ''بازار عکاظ'' کہا جاتا تھا، جس کا ایک اہم ترین پروگرام اُس سال کے بہترین اور خوبصورت ترین اشعار پڑھے جانا تھا۔ جب اُن میں سے بہترین شعر کو انتخاب کیا جاتا تھا تو اُسے ایک بلند مرتبہ ادبی شہ پارے کے طور پر خانہ کعبہ کی دیوار کے ساتھ لٹکا دیا جاتا تھا اور اس طرح سالہا سال کے بعد سات مشہور ادبی شہ پارے جمع کئے گئے تھے کہ جنہیں ''معلقات سبع'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بنابریں اگر قرآن اُنہیں چیلنج کرتا ہے اور معارضے ومقابلے کی دعوت دیتا ہے تو اُسے اسی پہلو سے یہ دعوت دینی چاہیے۔

۲۔ مشرکین عرب قرآن اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں جو الفاظ استعمال کرتے تھے، اُس کے مطابق وہ قرآن کو ''جادو'' اور پیغمبرؐ کو'' جادوگر'' کہتے تھے، ممکن ہے یہ قرآن کی غیر معمولی جاذبیت اور کشش کی طرف اشارہ ہو جو کہ یقینا کلام کی خوبصورتی اور فصاحت کے پہلوؤں پر مشتمل ہوتی ہے۔

۳۔ امام علی بن موسیٰ الرضا -سے انبیاء -کے معجزات کا ان کے دور کے علوم وفنون کے مطابق ہونے کے متعلق ایک حدیث میں آیا ہے: ''جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ -کو مبعوث فرمایا تو اس وقت سحر اور جادوگری کا رواج عام تھا، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اپنی جانب سے ایک ایسی چیز اُن لوگوں کی طرف بھیجی کہ جو اُن کی طاقت سے باہر تھی اور اُن کے جادو کو باطل کر کے اُن پر اتمام حجت کر دیتی تھی، اور جب حضرت عیسیٰ -کو مبعوث فرمایا تو اس وقت ناقابل علاج بیماریاں عام تھیں اور لوگوں کو اُن کے علاج کے لئے طب کی ضرورت تھی، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے ایک ایسی چیز بھیجی کہ جو اُن کے پاس نہیں تھی، جس سے اُن کے مردے زندہ ہو جاتے تھے اور مادر زاد نابینا لوگ اور پیسی میں مبتلا بیمار اللہ تعالیٰ کے حکم سے (حضرت عیسیٰؑ کے ہاتھوں) صحت یاب ہو جاتے تھے، اور اس طرح اُن پر ان چیزوں کے ذریعے اتمام حجت ہو جاتی تھی۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت محمدؐ کو اس وقت مبعوث فرمایا کہ جب اُس زمانے کے لوگوں پر (دلنشین اور فصیح وبلیغ) خطبات اور کلام کا غلبہ تھا (راوی کا کہنا ہے کہ میرے خیال میں امامؑ نے شعر کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے) اس وقت اللہ تعالیٰ نے اپنی جانب سے (فصاحت وبلاغت کے لحاظ سے بلند ترین) مواعظ اور حکمت آمیز کلمات بھیجے جو اُن (مشرکین) کے کلام کو باطل کر دیتے اور اُن پر حجت تمام کر دیتے تھے''۔

ان تمام قرائن سے پتا چلتا ہے کہ فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے قرآن ایک معجزہ تھا اور اب بھی ہے، لیکن انصاف تو یہ ہے کہ یہ قرائن صرف اسی چیز کو ثابت کرتے ہیں کہ قرآن فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے معجزہ تھا نہ کہ اس کا اعجاز اسی میں منحصر تھا، حالانکہ قرآن مجید کے معجزہ ہونے کے دوسرے پہلو بھی بہت نمایاں ہیں۔ مزید توجہ اور معلومات کے لئے قرآن کے معجزہ ہونے کے بارے میں درج ذیل نکات کی طرف توجہ ضروری ہے:

۱۔ جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ ایام جاہلیت کے عرب فصاحت و بلاغت میں اس حد تک پہنچ چکے تھے کہ اس زمانے کے اشعار منجملہ ''معلقات سبع'' ابھی تک عربوں کے منتخب اشعار کے طور پر پہنچانے جاتے ہیں، لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ نزول قرآن کے بعد اُنھوں نے وہ سب اشعار (خانہ کعبہ سے) اُتار لئے تھے اور قرآن کی بے مثال فصاحت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے تھے، اور قرآن کا مقابلہ کرنے کے تمام محرکات کے باوجود، اس کے مقابلے میں کوئی بھی چیز پیش نہ کر سکے۔ گذشتہ صفحات میں قرآنی جاذبیت کے موضوع کے بارے میں قرآنی اثرات کے سلسلے میں کچھ زندہ اور واضح مثالیں پیش کی گئی ہیں۔

۲۔ پوری تاریخ میں ہمیشہ مردان حق کے مقابلے میں کچھ ایسے گروہ کھڑے ہو جاتے تھے کہ جن کا ناجائز مفاد خطرے میں پڑ جاتا تھا اور یہ لوگ ان مردان حق پر تہمتیں لگاتے تھے اور یہ تہمتیں جھوٹی اور بے بنیاد ہونے کے باوجود کچھ ایسی حقیقتوں کی حکایت بھی کرتی تھیں جو اُن کے اردگرد موجود ہوتی تھیں۔ مثلاً پیغمبر اکرم ﷺ پر ایک تہمت جو لگائی گئی تھی وہ ساحر اور جادوگر ہونے کی تھی اور جس کی بہت بڑے پیمانے پر تشہیر کی گئی تھی۔ سورہ مدثر کی آیت نمبر ۲۴، ۲۵ میں ہم دیکھتے ہیں:

فَقَالَ إِنْ هَٰذَآ إِلَّا سِحْرٌ يُؤْثَرُ ﴿٢٤﴾ إِنْ هَٰذَآ إِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ﴿٢٥﴾

آخرکار (مشرکین کے سردار ولید نے) کہا:

یعنی: ''یہ قرآن (گذشتہ لوگوں کے جادو کی طرح) ایک پُرتاثیر جادو کے سوا کچھ نہیں، یہ سوائے کلام بشر کے اور کچھ بھی نہیں۔'' [1]

پیغمبر ﷺ پر اس بے بنیاد تہمت کی اصل وجہ آیات قرآن کا حیرت انگیز اور غیر معمولی طور پر موثر ہونا تھا، جو اپنی عجیب وغریب فصاحت و بلاغت کے ساتھ دلوں کو اپنی جانب کھینچ رہی تھیں، جس کی وجہ سے وہ اس کے اثرات کو غیر معمولی نہیں سمجھتے تھے اور اس کے لئے سوائے جادو و سحر کے اور کوئی الفاظ انتخاب نہیں کر سکتے تھے۔ چونکہ لغت میں ہر وہ غیر معمولی کام دعویٰ جس کا سرچشمہ اور سبب معلوم نہ، جادو اور سحر کہلاتا ہے۔ اگرچہ وہ اس تہمت کے ذریعے ایک واضح حقیقت پر پردہ ڈال کر اعجاز الٰہی کا انکار کرنا چاہتے تھے، لیکن اپنے اس دعویٰ سے وہ ندانستہ طور پر قرآن کی عظمت کا اعتراف کر رہے تھے کہ جو جادو و سحر جیسی کشش رکھتا ہے!

۳۔ اہل قلم اور ادباء کی کتابوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر اُن کے دو واضح گروہ ہوتے ہیں:

---

[1] ولید بن مغیرہ کے دلچسپ واقعے اور قرآن کی جاذبیت کے بارے میں اس کی گفتگو گذشتہ صفحات میں تفصیل کے ساتھ گذر چکی ہے۔

کچھ الفاظ کی خوبصورتی کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور کبھی تو معانی کو الفاظ پر قربان کردیتے ہیں، اس کے برعکس ایک گروہ الفاظ کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا بلکہ اپنی پورا زور اور صلاحیت معانی کی گہرائی پر صرف کردیتا ہے۔ اسی وجہ سے ہمارے ادب کی تاریخ لکھنے والوں نے سابقہ بزرگ شعراء کی نگارشات کو (ایک لحاظ سے) دو مختلف سبک میں تقسیم کیا ہے: سبک عراقی اور سبک ہندی۔ جن بزرگ شعراء نے پہلے سبک و اسلوب کے مطابق شعر کہے ہیں، اُنھوں نے اپنا ذوق اور صلاحیت زیادہ تر الفاظ کی خوبصورتی میں صرف کی ہے جبکہ دوسرے اسلوب کے حامیوں نے اکثر اوقات دقیق معانی اور اس کی مخصوص ظرافتوں کو مدنظر رکھا ہے۔ اس بات کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بہت کم لوگ ایسے ملیں گے جنہوں نے ہر دو اسلوب کو اہمیت دی ہو اور اپنے بعد دلچسپ نگارشات چھوڑی ہوں، لیکن وہ اپنے کام میں کس حد تک کامیاب رہے ہیں، یہ بات تفصیل طلب ہے۔

چونکہ ہمیشہ مدنظر معنیٰ و مفہوم کو خوبصورت اور ہم آہنگ و دلچسپ الفاظ میں نہیں ڈھالا جاسکتا اور اس کی تمام باریکیاں منعکس نہیں ہوسکتیں، لہٰذا اکثر شاعر، اہل سخن اور خطباء الفاظ کی زیبائی اور معانی کی خوبصورتی کے دوراہے پر کھڑے نظر آتے ہیں اور مجبوراً کسی ایک راستے کو اختیار کرلیتے ہیں۔ لہٰذا بہت سی منظومات اور نثروں میں معانی، سجع اور قافیہ کی نذر ہو جاتے ہیں۔

لیکن جو لوگ عربی ادب سے آگاہ ہیں اور پھر قرآن سے آگاہ ہوتے ہیں تو وہ دیکھتے ہیں کہ اس عظیم الٰہی کتاب نے اس اہم خصوصیت کی معجزانہ حد تک حفاظت کی ہے اور اس میں الفاظ انتہائی شیرین ولذیذ، اس کے جملات بہت ظریف و زیبا اور کلمات موزوں اور ہم آہنگ انداز میں ادا ہوئے ہیں، اور یہ فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے اعجاز قرآن کے پہلوؤں میں سے ایک پہلو ہے۔ قرآن اپنے معانی و مطالب کی ادائیگی میں کسی قسم کے تکلف سے کام نہیں لیتا اور اپنا مقصود بہت ہی وضاحت کے ساتھ بیان کردیتا ہے اس کے باوجود اس کے معانی کو ایسے الفاظ کا لباس پہنایا گیا ہے جو خوبصورتی کی بلندیوں تک پہنچا ہوا ہے۔

۴۔ شعراء اور اہل سخن کے درمیان یہ بات مشہور ہے کہ بعض مواقع پر بیان کی خوبصورتی کے لئے جھوٹے مبالغے سے کام لینا چاہیے، مثلاً بیابانوں میں لشکر کے گھوڑوں کے سموں سے اُٹھنے والے گرد و غبار سے زمین کے سات طبقات کو چھ اور آسمان کے سات طبقات کو آٹھ کیا جاسکتا ہے! یا فلک کی نو کرسیوں کو اپنے پاؤں کے نیچے بچھا جاسکتا ہے تاکہ "قزل ارسلان" کی بلندیوں کی برابری کی جاسکے! دل کو خون کا دریا اور آنکھوں کے آنسوؤں سے دریائے جیحون بنایا جاسکتا ہے! حتیٰ یہاں تک کہا گیا ہے:

در شعر مپیچ و در فن او
کہ از اکذب اوست احسن او!

اس لحاظ سے خوبصورت ترین شعر وہی ہے۔ جو سب سے زیادہ جھوٹ پر مبنی ہو۔

یہ جو قرآن مجید نے شعراء کے بارے میں فرمایا:

اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِیْ كُلِّ وَادٍ یَّهِیْمُوْنَ ﴿۲۲۵﴾

یعنی: ''کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔''[۱]

بظاہر اسی مطلب کی طرف اشارہ ہے چونکہ اکثر شعراء خیالات وشاعرانہ تشبیہات میں غرق ہوتے ہیں۔لیکن جب ہم قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے ہیں تو اس میں کسی بھی جگہ جھوٹ پر مبنی مبالغہ نہیں دیکھتے اور اس کے الفاظ ومعانی میں جس قدر خوبصورتی اور ظرافت پائی جاتی ہے، وہ سب کی سب حقائق کو بیان کر رہی ہوتی ہے۔اسی لئے ہم قرآن کی متعدد آیات میں پیغمبر اسلام ﷺ پر شاعر ہونے کی تہمت اور قرآن مجید کے شعر ہونے کے اعتراض کی نفی دیکھتے ہیں۔[۲]

یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن شاعرانہ تخیلات سے عاری، شاعرانہ حقیقت سے دور اغراق ومبالغات اور خیالی تشبیہات واستعارات سے خالی ہے اور سوائے یقینی اور قطعی حقائق بیان کرنے کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔اس کے باوجود اس قدر شیرین اور دلچسپ ہے کہ اسلام سے کوسوں دور رہنے اور پیغمبر اسلام ﷺ کی مخالفت کرنے والوں کو بھی اپنی جانب کھینچ رہا ہے جس کی چند مثالیں ''قرآن کی جذابیت'' کے عنوان سے پیش کی جا چکی ہیں۔

دلچسپ بات یہ کہ تاریخ کے مطابق، عرب کے بہت سے مشہور شعراء جب اپنے آپ کو قرآن مجید کی فصاحت کے مقابلے میں دیکھتے تو دل وجان سے اسلام کے گرویدہ ہو جاتے تھے۔قدرت مند شعراء میں سے جو لوگ قرآن کی جاذبیت کی وجہ سے مسلمان ہوئے ہیں، اُن میں سے ایک: ''لبید'' نامی شاعر تھا، جس کے شعر ایام جاہلیت میں معلقات سبع میں شمار ہوتے تھے (معلقات سبع سے مراد وہ سات معروف شعر ہیں کہ جو عربوں کے منتخب اشعار کے عنوان سے کعبہ کی دیوار پر آویزاں کئے گئے تھے) ''حسان بن ثابت'' بھی اُن ثروت مند شعراء میں سے ہے، جو قرآن کی جاذبیت کی وجہ سے مسلمان ہو گئے تھے۔''خنساء'' بھی ایک عرب شاعرہ اور نقاد تھی اور ''اعشی'' بھی ایسے شعراء میں سے ہے جس کی مثال بہت کم ملتی ہے، یہ دونوں بھی اسلام کی گرویدہ ہو گئیں تھیں اور قرآن کی جاذبیت سے بہرہ مند ہوئی تھیں۔[۳]

۵۔قرآن کی فصاحت وبلاغت کے مظاہر میں سے ایک اور چیز اس میں موجود ایک ''مخصوص آہنگ'' ہے۔ادبیوں کا کلام یا تو شعر کی صورت میں ہوتا ہے یا نثر میں، قرآن نہ تو شعر ہے، نہ ایک عام اور معمولی نثر ہے۔قرآن ایک مخصوص آہنگ کی حامل نثر ہے جو خود اسی سے مختص ہے، ایسی نثر جو قرآن کی قرائت کرنے والوں میں ایک مکمل آہنگ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔اگرچہ ہم قرآن کے بارے میں ''موسیقی'' کی تعبیر استعمال نہیں کر سکتے، چونکہ موسیقی عرف عام میں منفی مفاہیم سے آلودہ چیز سمجھی جاتی ہے، لیکن ''مصطفی رافعی'' جیسے بعض مشہور عرب اہل قلم نے اپنی کتاب ''اعجاز القرآن'' میں لکھا ہے: ''قرآن کے اسلوب اور روش سے ایسے آہنگ اور لہجے وجود

---

[۱] سورہ شعراء۔۲۲۵

[۲] قرآن کی تین آیات میں مشرکین کی طرف سے یہ تہمت نقل ہوئی ہے: (سورۂ انبیاء۔۵، سورۂ صافات، سورۂ طور۔۳۰) اور دو آیات میں تو اللہ تعالیٰ واضح طور پر اپنے رسولؐ سے اس نسبت کی نفی فرما رہا ہے (سورۂ یس۔۶۹ اور سورۂ حاقہ۔۴۱)

[۳] شیوہ ھای اعجاز قرآن، صفحہ ۷۷۔

میں آتے ہیں جو ہر سننے والے کو اُسے سننے پر اُبھارتے ہیں اور یہ خود ایک قسم کی مخصوص موسیقی ہے جس کی اس زمانے میں اس طرح کے موزوں کلمات میں مثال نہیں ملتی۔ قرآن کی یہی نظم و ترتیب تھی جس کی وجہ سے عرب طبع کو صفا ملتی تھی اور اُسے جدید طرز کے نظم و اسلوب سے متعارف کراتی تھی، جس کی مثال اس سے پہلے کہیں بھی نہیں ملتی''۔

اس سلسلے میں ایک مغربی دانشور ''بولا تیتلر'' کہتا ہے: ''یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ انسانی فصاحت، قرآن جیسی تاثیر رکھتی ہے، خصوصاً جب وہ مسلسل اپنے عروج پر ہو اور اُس میں کوئی کمزوری بھی دکھائی نہ دے اور ہر زمانے میں وہ ایک جدید قلعے کو فتح کر رہی ہو، جی ہاں! یہ ایک ایسا معجزہ ہے جس کے سامنے روئے زمین پر بسنے والے لوگ اور آسمان کے فرشتے بھی عاجز ہیں''۔[1]

ایک دوسرا دانشور ''کانٹ ہنری دی کستری'' کہتا ہے: ''اگر قرآن میں معانی کی بلندی اور بنیادوں کی خوبصورتی نہ بھی ہوتی تو افکار کو فتح کرنے اور تمام دلوں کو اپنی طرف جذب کرنے کے لئے کافی تھا''۔[2]

۶۔ یہ نکتہ بھی اہمیت رکھتا ہے کہ عام طور پر ہر کلام تکرار کی وجہ سے انسان کو تھکا دیتا ہے، لیکن قرآن اس قدر شیرین ہے کہ کئی سو دفعہ پڑھنے کے باوجود باعث ملال نہیں ہوتا، اس کی جاذبیت اور مٹھاس باقی رہتی ہے یہ بات نہ فقط قرآن کے پرعقیدہ رکھنے والوں میں مشہور ہے بلکہ دوسرے لوگوں نے بھی بارہا اس چیز کو دیکھا ہے۔ یہ وہی چیز ہے جو امام علی بن موسیٰ الرضا -کی ایک مشہور حدیث میں ذکر ہوئی ہے کہ ایک شخص نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا:

"مَا بَالُ الْقُرآنِ لَا يَزْدَادُ عَلَى النَّشْرِ وَالدَّرْسِ اِلَّا غَضَاضَةً؟"

یعنی: ''آخر قرآن اس قدر زیادہ پڑھے جانے اور درس و بحث کے باوجود پرانا نہیں ہوتا؟''

امام علیہ السلام نے فرمایا:

"لِاَنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰى لَمْ يَجْعَلْهُ لِزَمَانٍ دُونَ زَمَانٍ وَلَا لِنَاسٍ دُونَ نَاسٍ هُوَ فِي كُلِّ زَمَانٍ جَدِيدٌ، وَ عِنْدَ كُلِّ قَوْمٍ غَضٌّ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ"

یعنی: ''کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو کسی خاص زمانے یا کسی خاص گروہ کے لئے قرار نہیں دیا۔ لہٰذا وہ ہر زمانے میں تازہ ہے اور ہر قوم و گروہ کے لئے قیامت تک کے لئے طراوت و تازگی رکھتا ہے۔''[3]

امام علی علیہ السلام بھی ایک مختصر مگر جامع جملے میں فرماتے ہیں:

"لَا تُخْلِقُهُ كَثْرَةُ الرَّدِّ وَوُلُوجُ السَّمْعِ"

---

[1] ثبات الھداۃ، جلد ۱، ص ۲۲۳، کے حواشی۔

[2] ایضاً صفحہ ۲۲۲۔

[3] میزان الحکمۃ، جلد ۸، ص ۷۰

یعنی: ''قرآن کو بار بار پڑھنا اور سننا، اُسے پرانا نہیں کرتا۔ [1]

۷۔فصاحت وبلاغت کی ظرافتوں میں سے ایک الفاظ کی زیادتی سے پرہیز اور اختصار کا لحاظ رکھنے کے باوجود مفہوم اور مراد کا مکمل رہنا ہے۔ جسے اصطلاح میں ''ایجاز مُخل ''اور''اطناب مُمل'' سے بچنا کہتے ہیں۔قرآن مجید میں اس بات کا انتہائی لحاظ رکھا گیا ہے،بعض اوقات تو ایک بڑے سے بڑے قصے کو ایک ہی آیت میں بیان کر دیا گیا ہے جس کا ہر جملہ اس قصے کے ایک بڑے حصے کی حکایت کر رہا ہوتا ہے،جس کے قرآن میں بہت زیادہ نمونے دیکھے جاسکتے ہیں۔اس کا واضح نمونہ قرآن کی یہ مشہور آیت ہے۔

وَقِيْلَ يٰٓاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَغِيْضَ الْمَآءُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَقِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ۝۴۴

ترجمہ:اور کہا گیا:اے زمین!اپنا پانی نگل جا،اے آسمان رک جا،پانی نیچے چلا گیا اور معاملہ ختم ہو گیا۔وہ (کشتی) جودی (پہاڑ کے دامن) میں ٹھہر گئی۔(اس وقت) کہا گیا کہ ظالم لوگوں کے لئے (خدا کی رحمت سے) دوری ہے۔ [2]

یہی وہ آیت ہے کہ جس کے سامنے مشہور عرب ادیب ''ابن مقفع'' نے گھٹنے ٹیک دیئے تھے کہ جب اس نے اپنے دوستوں کے ساتھ وعدہ کے مطابق قرآن کے چوتھائی حصے کا توڑ پیش کرنا تھا،لیکن جب وہ اس آیت پر پہنچا اس کا ہاتھ رُک گیا اور اس نے اپنے آپ کو اس کے مقابلے میں بالکل عاجز اور ناتوان پایا،کیونکہ اس آیت میں پورے اختصار کے باوجود طوفان نوح کے واقعے کو تمام جزئیات کے ساتھ اور چھوٹے چھوٹے بامعنی الفاظ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور بعض محققین کے بقول اس میں ادبی صنایع کے ۲۳ نکات (استعارہ، طباق،مجاز،حذف،اشارہ،موازنہ،جناس،تسهیم یا ارسال،تقسیم،تمثیل اور ارداف وغیرہ) جمع ہیں۔ [3]

۸۔ادبی لحاظ سے قرآن کی دوسری خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ قرآنی عبارتوں میں ظرافت اور لطافت کے باوجود غیر معمولی ''صراحت وقاطعیت'' پائی جاتی ہے۔سب جانتے ہیں کہ بولنے والے کے لہجے کی صراحت سے سبھی لوگ لذت محسوس کرتے ہیں، چونکہ وہ بغیر کسی لگی لپٹی کے حقائق کو بیان کر دیتا ہے اور ایک انسان کے لئے حقیقت سے زیادہ کوئی چیز لذیذ نہیں ہوتی۔کلمات کو چبا چبا کر اور چند پہلوؤں کے ساتھ ادا کرنا (اگرچہ بعض خاص حالات میں ایسا کرنا ضروری ہو جاتا ہے) بولنے والے کے اپنے اوپر اور اپنے کلام پر عدم اعتماد کی علامت ہے،یا ایسا سننے والوں کے ڈر وخوف کی وجہ سے ہوتا ہے۔

بہر حال یہ چیز بولنے والے کی کمزوری اور ناتوانی کی حکایت کر رہی ہوتی ہے۔صراحت اور قاطعیت اکثر اوقات غصے اور

---

[1] نہج البلاغہ،خطبہ،۱۵۶

[2] سورۂ ہود،۴۴

[3] شیوہ ہای اعجاز قرآن،صفحہ ۵۲

ناراضگی کے ہمراہ ہوتی ہے، لیکن اہم چیز یہ ہے کہ صراحت اور قاطعیت کے ساتھ ساتھ بیان میں لطافت بھی ہونی چاہیے اور یہ چیز قرآن کی آیات میں بخوبی دیکھی جاسکتی ہے۔ اسلام کے خلاف سب سے اہم محاذ، توحید و شرک کا محاذ تھا۔ لہٰذا قرآن نے اسی میدان میں زیادہ سے زیادہ صراحت و قاطعیت دکھائی ہے، ایک جگہ قرآن فرماتا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ﴿۷۳﴾

''اللہ کو چھوڑ کر تم جنھیں پکارتے ہو وہ سب مل کر ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے بلکہ مکھی اگر کچھ لے لے تو اس سے واپس نہیں لے سکتے اور طالب و مطلوب (عابد و معبود) دونوں ہی بڑے کمزور ہیں۔''[۱]

جب بت پرست قرآن کی ناقابل شکست منطق سے فرار کرتے ہوئے اپنے آباؤاجداد کے سائے میں پناہ لیتے تھے اور کہتے تھے:

"بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَائَنَا"

یعنی: ''ہم تو اس کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے آباؤاجداد کو پایا۔''

تو اس وقت قرآن بڑے واشگاف الفاظ کے ساتھ جواب دیتا ہے:

اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ﴿۱۷۰﴾

یعنی: ''کیا ایسا نہیں کہ ان کے آباؤاجداد نہ کسی چیز کو سمجھتے ہوں اور نہ ہدایت یافتہ ہوں۔''[۲]

ایک دوسری جگہ، اس سے بھی زیادہ قاطعیت کے ساتھ آباؤاجداد کے آداب و رسوم پر اعتماد کرنے والوں کے جواب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبانی قرآن فرماتا ہے:

لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴿۵۴﴾

یعنی: ''یقیناً تم اور تمہارے آباؤاجداد کھلی گمراہی میں پڑے تھے۔''[۳]

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان کے سلسلے میں فرمایا:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا﴿۶۵﴾

ترجمہ: ''تیرے پروردگار کی قسم! وہ مومن نہیں ہو سکتے مگر یہ کہ وہ اپنے اختلافات میں آپ کو ثالث اور فیصلہ

---

[۱] سورۂ حج / ۷۳

[۲] سورۂ بقرہ / ۱۷۰

[۳] سورۂ انبیاء / ۵۴

کرنے والا مانیں اور پھر آپ کے فیصلہ پر اپنے دل میں کوئی ناراضی محسوس نہ کریں اور اسے مکمل طور پر تسلیم کر لیں''۔ [1]

اس طرح فرمان پیغمبرؐ کے ساتھ ظاہر و باطن اور پنہاں و آشکار، حتیٰ دل اور خواہشات کی ہم آہنگی کو سچے ایمان کی شرط قرار دیا اور اس کے ساتھ اس قدر صراحت اور قاطعیت کے ہوتے ہوئے ان الفاظ کی لطافت بھی بالکل واضح ہے۔ دوسرے موضوعات میں بھی خواہ وہ توحید اور قیامت سے متعلق ہوں یا معاشرتی قوانین اور جنگ و صلح سے متعلق مسائل ہوں یا اخلاقی ابحاث ہوں، یہی قاطعیت واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے، جس کی مکمل تفصیل کے لئے ایک جدا کتاب کی ضرورت ہے۔

بیان کی پاکیزگی اور متانت

معمولاً اَن پڑھ لوگ اپنے الفاظ اور کلمات کی طرف متوجہ نہیں ہوتے، اور اکثر اوقات اپنا مدعا بیان کرتے وقت نزاکت اور ادب سے عاری کلمات استعمال کر جاتے ہیں۔ اگرچہ قرآن ایسے ہی لوگوں کے درمیان نازل ہوا ہے، لیکن اُس نے ہرگز اس ماحول کا رنگ نہیں اپنایا اور اپنے الفاظ اور جملات میں انتہائی متانت اور بیان کی پاکیزگی کا خیال رکھا ہے، اس کی وجہ سے قرآن کی فصاحت و بلاغت کو ایک خاص اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔

بڑے بڑے خطباء اور اہل قلم جب عاشقی یا اسی قسم کے مسائل کا سامنا کرتے ہیں تو مجبوراً داستان کے اصلی ہیرو کے حقیقی چہرے کی عکاسی کرنے کے لئے اپنی زبان اور قلم کو آزاد چھوڑ دیتے ہیں اور اصطلاحاً کلام کا حق ادا کر دیتے ہیں اور اس طرح ہزار قسم کے گندے اور شہوت انگیز الفاظ استعمال ہو جاتے ہیں۔ یا وہ مجبوراً بیان کی نزاکت اور عفت کلام کی خاطر بعض مناظر کو ابہام کے پردوں میں چھپا دیتے ہیں اور اپنے حریفوں کے ساتھ اشارے کنائے میں باتیں کرنے لگتے ہیں۔ اور ان دونوں چیزوں یعنی؛ مکمل طور پر حقیقت کو بیان کرنا اور قلم و بیان کو گندے اور غلیظ الفاظ سے اور نزاکت کلام سے آلودہ ہونے سے بچانا، ایک بہت ہی مشکل کام ہے جسے کم ہی لوگ انجام دے سکتے ہیں۔

یہ بات کیسے قبول کی جا سکتی ہے کہ ایک اَن پڑھ اور انتہائی پس ماندہ اور نیم وحشی ماحول سے اُٹھنے والا شخص، مسائل کو مکمل طور پر بیان کرنے کے ساتھ ساتھ بیان کی نزاکتوں اور پاکیزگی کا بھی پورا خیال رکھے۔ مثال کے طور پر جب قرآن مجید حضرت یوسف- کے حقیقی واقعے کے بعض حساس مناظر کی منظر کشی کرتے ہوئے ایک ہوس ران خوبصورت عورت کے عشق سوزان کو بیان کرتا ہے تو واقعات کے ذکر کرنے سے چشم پوشی کئے بغیر، ان مطالب کو ابہام و اجمال کے پردے میں بیان کرتے ہوئے عفت و اخلاق کے تمام اُصولوں کی رعایت کرتا ہے اور کہے جانے والے تمام مطالب کو بیان کر دیتا ہے، لیکن عفت بیان کے اصول سے ذرہ بھر بھی انحراف نہیں کرتا۔ مثلاً عشق ''زلیخا'' کی خلوت گاہ کا ماجرا، اس طرح بیان کرتا ہے:

---

[1] سورۂ نساء/ ٦٥

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِيْ هُوَ فِيْ بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ؕ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾

''اور جس عورت کے گھر میں یوسفؑ رہتا تھا اس نے اس سے اپنے مطلب کے حصول کی خواہش کی اور دروازے بند کر دیئے اور کہا کہ اس چیز کی طرف جلدی آؤ جو تمہارے لئے مہیا ہے۔ (یوسفؑ نے) کہا: میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں وہ (عزیز مصر) میرا صاحب نعمت ہے اور اس نے مجھے محترم جانا ہے (اور میں اس سے خیانت کروں؟) یقیناً ظالم فلاح نہیں پائیں گے۔''[1]

دلچسپ بات یہ کہ قرآن نے یہاں پر ''رَاوَدَ'' استعمال کیا ہے اور یہ کلمہ اس جگہ کہا جاتا ہے کہ جہاں کوئی نرمی اور ملائمت سے اصرار کے ساتھ کسی چیز کا انسان سے تقاضا کرے، یہ ایک ایسا کلمہ ہے جو اپنا مقصد بیان کرنے کے ساتھ مکمل ہم آہنگ ہے۔ دوسری جانب زلیخا یا عزیز مصر کی بیوی کا نام تک نہیں لیا جاتا، بلکہ کہا جاتا ہے: ''الَّتِی هُوَ فِی بَیْتِهَا'' یعنی: (جس عورت کے گھر میں یوسفؑ رہتا تھا) تا کہ یوسفؑ کی حق شناسی کے نکتے کو مجسم کیا جا سکے اور اس کے ساتھ اس قسم کی (عورت) کے مقابلے میں اُن کے مقام تقویٰ کو بھی بیان کیا جائے کہ جس کے پنجہ (قدرت) میں اُن کی زندگی تھی، لیکن پھر بھی اُنھوں نے استقامت و پائیداری دکھائی۔ تیسرا یہ کہ جملہ ''غَلَّقَتْ الْاَبْوَابَ'' یعنی: (تمام دروازے محکم بند کر دیئے) باب تفعیل کے مصدر کے حکم میں مبالغہ کا معنیٰ دے رہا ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ یہ واقعہ کن سخت ترین حالات میں وقوع پذیر ہوا ہے۔

چوتھا نکتہ یہ کہ جملہ ''قَالَتْ هَیْتَ لَکَ'' (اس چیز کی طرف جلدی آؤ جو تمہارے لئے مہیا ہے) ان آخری کلمات کی حکایت کر رہا ہے جو زلیخا نے یوسفؑ کے وصال کے لئے کہے ہیں، لیکن یہ جملے کس قدر بھاری بھرکم، متانت اور عفت بیان کے حامل ہیں اور کسی قسم کے بُرے اثرات نہیں چھوڑ رہے۔

پانچویں اہم بات یہ کہ حضرت یوسفؑ کے اس فرمان ''مَعَاذَ اللهِ إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَایَ'' جو اُنھوں نے زلیخا کے جواب میں کہا، میں زلیخا کے لئے ایک تنبیہ اور نصیحت ہے کہ میں تو اس گھر میں چند دن ہی رہا ہوں، لیکن اس گھر کے مالک کے ساتھ کسی قسم کی خیانت نہیں کر رہا کہ جس کا میں نے نمک اور رزق کھایا ہے جبکہ تو اس گھر میں پوری عمر رہی ہے، تو کیوں خیانت کر رہی ہے؟ اس کے بعد والی آیات کہ جن کی تفصیل بہت طولانی ہو جائے گی، بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ اس قصے کی تفصیل بیان کرتی ہیں اور اس میں خواہشات و ہوس کی موجوں کے سامنے ثابت قدمی دکھانے اور اس موقع پر اپنے آپ کو خدا کے سپرد کرنے کے نیک انجام کی بہت ہی دلچسپ منظر کشی کرتی ہیں۔

ایک دوسری آیت میں جب اپنے آپ کو اس تہمت سے بری ذمہ قرار دینے کے لئے زلیخا نے ایک دعوت کا اہتمام کیا اور اس وقت

---

[1] سورۂ یوسف/ ۲۳

اس دعوت میں آنے والی مہمان مصری عورتوں کے احساسات وجذبات کو ایک مختصر جملے میں بیان کرنا چاہا تو فرمایا:

فَلَمَّا رَاَيۡنَهٗۤ اَكۡبَرۡنَهٗ وَقَطَّعۡنَ اَيۡدِيَهُنَّ وَقُلۡنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ؕ اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيۡمٌ ﴿۳۱﴾

یعنی: ''جب ان کی نگاہ اس (یوسفؑ کے خوبصورت چہرے) پر پڑی تو وہ دنگ رہ گئیں اور (بے اختیار) انھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے اور کہا: حاشا اللہ یہ بشر نہیں ہے، یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے۔''[۱]

''مَلَكٌ كَرِيۡمٌ''(بزرگ فرشتے) کی تعبیر حضرت یوسفؑ کی غیر معمولی خوبصورتی کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اُن کی اعلیٰ درجے کی پاکدامنی کو بھی ظاہر کررہی ہے۔

جیسا کہ عام طور پر ایسے جملوں کے ذریعے کسی فرد کی تعریف کرتے ہوئے کہا جاتا ہے: یہ تو فرشتہ ہے۔ اور پھر اس کے بعد بہت ہی خوبصورت اور گویا جملوں میں حضرت یوسف علیہ السلام، یعنی؛ عفت و پاکدامنی کے اس مجسمے کے مقام ومرتبے کو اس واقعے میں مکمل طور پر ظاہر کیا جاتا ہے۔[۲]

قرآنی مثالیں

قرآن مجید نے حقائق بیان کرنے کے لئے بہت سی ''مثالوں'' سے استفادہ کیا ہے۔ جن کا مجموعہ اس عظیم الٰہی کتاب کی فصاحت وبلاغت کے واضح مظاہر میں سے ہے۔ ان مثالوں میں جس باریکی بینی سے کام لیا گیا ہے اور اُن میں سے ہر مثال میں جو ظریف ودقیق اور دلنشین نکات استعمال ہوئے ہیں، وہ انسان کو حیرت زدہ کردیتے ہیں۔ بنیادی طور پر (علمی) مباحث کی تشریح وتفسیر میں مثال کا کردار ناقابل انکار ہے۔

اسی لئے کسی بھی اہم علمی موضوع میں ہمارے لئے حقائق کی وضاحت کرنے اور اُنہیں ذہن کے نزدیک کرنے کے لئے مثال کا ذکر کرنا ناگزیر ہوتا ہے۔ چونکہ بعض اوقات مقصد ومراد سے مناسبت رکھنے والی ہم آہنگ مثال پیچیدہ ترین مطلب کو آسمان سے زمین پر لے آتی ہے اور وہ مطلب سب کے لئے قابل فہم بن جاتا ہے۔

لہٰذا دنیا کے فصیح وبلیغ اور ادیب وشاعر لوگوں کا ایک بڑا فن وہنر یہی تمثیل گوئی سے کام لینا ہے۔ ''زمخشری'' اپنی تفسیر ''کشاف'' میں ''مَثَل'' کے بارے میں کہتا ہے: عرب زبان میں مَثَل درحقیقت مِثْل، یعنی؛ نظیر کے معنی میں ہے۔ اُن کے نزدیک ضرب امثال اور علماء کا امثال میں بات کرنا ایک بلند شان رکھتا ہے۔ چونکہ اس سے مخفی معانی سے پردہ اُٹھ جاتا ہے، تاریک نکات روشن ہوجاتے ہیں یہاں تک کہ ایک مُخَیَّل (خیال شدہ) چیز مسلّم وثابت ہوجاتی ہے، مشکوک شیٔ، یقینی بن جاتی ہے اور غائب، شاہد میں جلوہ گر ہوجاتا ہے۔ اسی لئے

---

[۱] سورۂ یوسف/۳۱

[۲] ان نکات سے مزید آگاہ ہونے کے لئے تفسیر نمونہ کی جلد ۹، ۱۰ کی طرف رجوع کیجئے۔

''کتاب قرآن مبین''اور دوسری تمام الٰہی کتب میں اللہ تعالیٰ نے بہت زیادہ مثالیں ذکر کی ہیں۔[1]

مثالوں کے چند فائدے ہوتے ہیں، یہ عقلی مسائل کو حسی بنا دیتی ہیں، دور کے راستوں کو نزدیک کر دیتی ہیں، ان سے مطالب سب کے لئے قابل فہم ہو جاتے ہیں، مثال مسائل کو زیادہ قابل اطمینان بنا دیتی ہے اور ایک مناسب و اچھی مثال ضدی سے ضدی انسانوں کو بھی خاموش کر دیتی ہے۔ بعض محققین نے قرآنی مثالوں کو ایک کتاب کی شکل میں جمع کیا ہے اور ایک سو سے زیادہ قرآنی مثالوں کے بارے میں تحلیل و تجزیہ کیا ہے۔ درحقیقت قرآنی مثالیں ایک معجزہ ہیں۔ اس حقیقت کے ادراک کے لئے ان میں سے کچھ مثالوں کے بارے میں ایک دقیق تحقیق پیش کی جا رہی ہے۔

قرآن کی معجزانہ مثالوں کے چند نمونے

جب قرآن حق و باطل کی باریک بینی سے منظر کشی کرنا چاہتا ہے تو فرماتا ہے:

اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتۡ اَوۡدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحۡتَمَلَ السَّيۡلُ زَبَدًا رَّابِيًا ؕ وَمِمَّا يُوۡقِدُوۡنَ عَلَيۡهِ فِى النَّارِ ابۡتِغَآءَ حِلۡيَةٍ اَوۡ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثۡلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ يَضۡرِبُ اللّٰهُ الۡحَـقَّ وَالۡبَاطِلَ ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذۡهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنۡفَعُ النَّاسَ فَيَمۡكُثُ فِى الۡاَرۡضِ ؕ كَذٰلِكَ يَضۡرِبُ اللّٰهُ الۡاَمۡثَالَ

''اللہ نے آسمان سے پانی برسایا اور ہر درہ اور دریا سے ان کی مقدار کے مطابق سیلاب اُمڈ پڑا پھر پانی کے ریلوں پر جھاگ پیدا ہو گئی۔ اور جن (بھٹیوں) میں زیورات یا روزمرہ کے استعمال کے آلات تیار کرنے کے لئے آگ روشن کرتے ہیں، ان سے جھاگ نکلے گی۔ اس طرح اللہ حق و باطل کی مثال بیان کرتا ہے، لیکن جھاگ ایک طرف ہو جاتی ہے (اور بہت جلد ختم ہو جائے گی) اور لوگوں کے لئے فائدہ رساں چیز (پانی یا خالص دھات) زمین میں باقی رہ جاتی ہے۔ اللہ اسی طرح مثال بیان کرتا ہے''۔ (سورہ رعد/۱۷)

معانی سے پُر اس مثال میں جو بہت موزوں الفاظ و عبارات کے ساتھ بیان کی گئی ہے، حق و باطل کی منظر کشی بہترین شکل میں کی گئی ہے اور اس میں بہت ہی اہم حقائق پوشیدہ ہیں، جن میں سے کچھ کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے:

۱۔ حق و باطل کی شناخت بعض اوقات اس قدر پیچیدہ ہو جاتی ہے، جس کے لئے علامتوں کی طرف جانا ضروری ہو جاتا ہے۔

۲۔ حق ہمیشہ مفید اور فائدہ مند ہوتا ہے۔ گویا صاف و شفاف پانی کی طرح حیات و زندگی کا سرمایہ ہے یا خالص دھاتوں کی طرح

---

[1] امثال القرآن، صفحہ/۱۲۰

ہے جو یا تو زینت کے لئے یا اسباب زندگی کے لئے استعمال ہوتی ہیں۔

۳۔حق، ہمیشہ اپنے اوپر بھروسہ کرتا ہے، لیکن باطل، حق کی آبرو سے مدد لیتے ہوئے اپنے آپ کو اس کے لباس میں پیش کرنے کی سعی کرتا ہے اور اس کی حیثیت و آبرو سے اُسی طرح فائدہ اُٹھاتا ہے، جس طرح ہر جھوٹ، سچائی سے روشنی حاصل کرتا ہے۔ اگر دنیا میں سچائی نہ ہوتی تو کوئی بھی جھوٹ پر یقین نہ کرتا۔ اسی طرح اگر حق نہ ہوتا تو باطل کے لئے بھی کوئی گنجائش نہ ہوتی۔

۴۔ ہمیشہ ہر موجود اپنی ظرفیت کے مطابق بہرہ مند ہوتا ہے، جس طرح ہر درے سے اُس کی گنجائش کے مطابق بارش کا پانی بہتا ہے۔

۵۔باطل ہمیشہ پریشانیاں پیدا کرنے کی سعی کرتا ہے۔ جیسا کہ سیلاب جب پہاڑوں سے جوش وخروش کے ساتھ بہنا شروع کرتا ہے تو جھاگ بھی اپنے ساتھ لاتا ہے، لیکن جب وسیع وعریض میدانوں میں پہنچتا ہے تو اس کا جوش وخروش ختم ہو جاتا ہے اور جھاگ بھی ختم ہو جاتی ہے۔

٦۔باطل فقط ایک لباس میں ظاہر نہیں ہوتا، بلکہ وہ ہر لحظہ اپنا رنگ ولباس بدلتا رہتا ہے۔ جس طرح جھاگ پانی پر پیدا ہوتی ہے، اسی طرح بھٹیوں میں دھاتوں کے (پگھلنے سے) بھی جھاگ پیدا ہوتی ہے۔ بنا بریں ان کی رنگا رنگی سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیے۔ حق وباطل کی پہچان رکھنے والی آنکھوں کو اُنہیں ہر رنگ ولباس میں پہچان لینا چاہیے۔

۷۔حق وباطل کی جنگ دائمی ہے۔ ''یہ میٹھے اور کھارے پانی رگ رگ ہوتا ہے اور تا قیامت خلائق میں یہ جنگ رہتی ہے۔'' جس طرح آسمانوں سے بارش برستی رہتی ہے اور بھٹیوں میں دھاتیں پگھلتی رہتی ہیں، اسی طرح (حق وباطل کی جنگ بھی) ہمیشہ جاری رہتی ہے۔

۸۔باطل ظاہر اور آنکھوں میں آنے والا، لیکن اندر سے خالی ہوتا ہے۔ مگر حق متواضع، خاموش اور کارگر ہوتا ہے۔ اس آیت میں غور وفکر سے اس مثال میں بہت سے دوسرے نکات بھی مل سکتے ہیں۔ یہ قرآنی مثالوں کا ایک نمونہ تھا۔ بہت سی دوسری مثالیں بھی ہیں، مثلاً: ''اللہ کی راہ میں انفاق اور اس کی (گندم کے) دانوں اور خوشوں سے تشبیہ۔'' (سورۂ بقرہ/۲٦۱) خالی پتھر ریاکارانہ اعمال کی اس بارش سے تشبیہ جو خالی پتھر پر برستی ہے جس پر پڑی ہوئی تھوڑی بہت گرد وغبار کو صاف کر دیتی ہے اور ختم ہو جاتی ہے۔

جبکہ خالصانہ عمل اس بارش کی طرح ہے جو سورج کی کرنوں اور صاف وشفاف ہوا کے سامنے پھیلی ہوئی زرخیز زمین پر برستی ہے۔ (سورۂ بقرہ/ ۲٦۴، ۲٦۵) کفار کے اعمال کو ہوا کے سامنے خاکستر سے تشبیہ دینا (سورۂ ابراہیم/ ۱۸) یا سراب سے تشبیہ دینا (سورۂ نور/ ۳۹) یا آسمان پر بادلوں کے پھیل جانے سے سمندر میں یا رات کے وقت پھیلی ہوئی ظلمت وتاریکی سے تشبیہ دنیا (سورۂ نور/ ۴۰) منافقین کے اعمال کو ایک ایسے شخص سے تشبیہ دینا جو تاریک رات میں، کسی بیابان میں راستہ گم کر بیٹھتا ہے، اور گرج چمک سے لرزنے لگتا ہے۔

ایک لحظے کے لئے چمکتی ہوئی بجلی کی روشنی میں چلنے کی سعی کرتا ہے، لیکن ایک بار پھر تاریکی چھا جاتی ہے اور اس کی نظروں میں

سب کچھ تاریک ہو جاتا ہے۔ (سورۂ بقرہ/۱۹، ۲۰) بت پرستوں کے شعور اور طاقت سے خالی بتوں پر بھروسہ کرنے کو (خانہ عنکبوت) مکڑی کے جالے سے تشبیہ دینا۔ (سورۂ عنکبوت/۴۱)

غیبت کرنے والوں کو اس شخص سے تشبیہ دینا جو اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھاتا۔ (سورۂ حجرات/۱۲) اور پھر اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کو آسمانوں اور زمین کے نور اور پھر اس نور کو خاص خصوصیات کے حامل چراغ سے تشبیہ دینا، اپنے اندر انواع و اقسام کے نکات کا حامل ہے (سورۂ نور/۳۵)

اسی طرح بہت سی دوسری مثالیں جنہیں یہاں ذکر کرنا طولانی ہونے کا باعث بنے گا، یہ سب قرآن کی فصاحت و بلاغت کو ظاہر کرتی ہیں اور ہمیں اُن اقدار اور اقدار کے مخالف چیزوں سے تعارف کراتی ہیں جن کا سامنا ہمیں اپنی زندگی میں کرنا پڑتا ہے۔ اور اس طرح خوبصورت مثالوں کی شکل میں علم و دانش کی ایک دنیا ہم پر کھل جاتی ہے۔

۲۔الٰہی معارف کی نظر سے قرآنی اعجاز

فصاحت و بلاغت کے مسئلے کے بعد مضامین اور مطالب کی باری آتی ہے، اس حصے میں سب سے پہلے معارف، مبداء و معاد اور مذہبی عقائد سے متعلق مسائل پیش کئے جائیں گے۔ اصولاً ادیان حق و باطل کی آزمائش کی ایک کسوٹی اُن کی وہ توضیح و تفسیر ہے جو اُنھوں نے مبداء و معاد اور نبوت و امامت کے بارے میں کی ہے، کیونکہ اس قسم کے مسائل خصوصاً جن کی بازگشت اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کی طرف ہوتی ہے، بہت ہی دقیق، ظریف اور پیچیدہ ہیں۔ بعض اوقات شرک و توحید کے درمیان ایک بال سے کم فاصلہ رہ جاتا ہے۔ قرآنی آیات کا یہ حصہ اس قدر دلچسپ، عمیق اور دقیق ہے کہ اگر اعجاز قرآن کی کوئی اور دلیل نہ ہوتی سوائے ان دقیق توضیحات کے جو ان اہم مسائل میں بیان ہوئی ہیں تو اس کو سمجھنے کے لئے کافی تھیں۔

خصوصاً قرآن ایک ایسے ماحول میں نازل ہوا ہے جو بتوں اور بتکدوں سے بھرا ہوا تھا، گھریلو بتوں سے لیکر قبائیلی بتوں اور بڑے بڑے بتوں تک جو عمومی حیثیت رکھتے تھے اور ہر شہر و دیار کے لئے قابل احترام تھے۔ کچھ بت تو لکڑی یا پتھر یا دھات کے ایک ٹکڑے سے خود اپنے ہاتھوں سے بنا لئے جاتے تھے اور یہ جانتے ہوئے کہ یہ بت معمولی سا احساس، شعور، حرکت اور بصیرت بھی نہیں رکھتے، لیکن وہ لوگ اپنے خیالات میں اُنہیں عظیم قدرت کا مالک سمجھتے تھے اور اپنے مقدرات اُن کے ہاتھ میں دے کر اُن کے سامنے عاجزی کے ساتھ گھٹنے ٹیک کر راز و نیاز کرنے لگتے یا سجدہ کرتے اور ان کے سامنے قربانی دیتے۔ تاکہ وہ اُن کے لئے بارگاہ خدا میں واسطہ فیض اور شفیع بن جائیں۔

حتیٰ بعض اوقات کھجور سے بت بنا لیتے تھے۔ اتفاق سے جب ایک سال قحط پڑ گیا تو غذا کا ذخیرہ ختم ہو گیا تو انھوں نے (کھجور سے بنے ہوئے) ان بتوں پر حملہ کر دیا اور ''ان خداؤں کے بندوں'' نے ''اپنے خداؤں کو بڑی جسارت کے ساتھ ہڑپ کر لیا''۔ اب بھی یہ شعر عربوں کے زمانہ جاہلیت کے اشعار میں دیکھا جاتا ہے جو اسی واقعے کی یاد دلاتا ہے:

اَكَلَتْ حَنِيفَةُ رَبَّهَا عَامَ التَّقَحُّمِ وَالْمَجَاعَةِ
لَمْ يَحْذَرُوا مِنْ رَبِّهِمْ سُوءَ الْعَوَاقِبِ وَ التِّبَاعَةِ

''بنی حنیفہ قبیلے نے قحط اور بھوک کے سال میں اپنے خدا کو کھا لیا اور اس عمل کے بُرے نتائج کے بارے میں اپنے خدا کا خوف تک نہیں کیا۔''

یہ خرافات پر مبنی مضحکہ خیز اور پست ترین فکر وسوچ ہے جو کسی انسان کے ذہن میں پیدا ہوسکتی ہے۔ فارسی کی یہ معروف ضرب المثل ''یا خدارا بخواہ یا خرما را'' (یعنی؛ یا خدا کو چاہو یا کھجور کو) شاید اسی قصے کی طرف اشارہ ہو کہ وہ بے ہودہ قوم یا تو اپنے خدا سے صرف نظر کر لیتی یا خرما کھانے سے پرہیز کرتی۔ ایام جاہلیت کے بہت سے عرب، فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں جانتے تھے، جبکہ خود بیٹی کا نام تک سننے کے لئے تیار نہیں تھے اور اس ماحول میں عورت کو شدید حقارت کی وجہ سے نفرت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

جیسا کہ سورۂ زخرف کی آیت نمبر ۱۷ میں ہم پڑھتے ہیں:

وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمَٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ ﴿١٧﴾

''حالانکہ جب ان میں سے کسی کو بھی اس چیز (بیٹی کی پیدائش) کی جسے انہوں نے رحمن کی طرف نسبت دے رکھی تھی کی خوشخبری دی جاتی تو اس کا چہرہ سیاہ ہوجاتا ہے اور وہ غصہ سے بھر جاتا ہے۔''

اسی طرح بہت سے دوسرے خرافات بھی ہیں خواہ وہ معرفت خدا کے بارے میں ہوں یا معاد وغیرہ کے متعلق، ان سب کی تفصیل بہت لمبی ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ اس قسم کے ماحول سے ایک شخص اُٹھتا ہے اور خالص توحید پر مبنی خالص تعلیمات اس قدر دقیق انداز میں پیش کرتا کہ بڑے بڑے فلاسفہ اس کے مقابلے میں گھٹنے ٹیک دیتے ہیں تو ہمیں اس بات میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں رہتا کہ ایسی تعلیمات فقط خدا ہی کی طرف سے ہوسکتی ہیں۔ اس بات میں معمولی سا بھی مبالغہ نہیں اور اس حقیقت تک پہنچنے کے لئے کسی دور دراز راستے کو طے کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

اگر اسی کتاب ''پیام قرآن'' کی دوسری اور تیسری جلد پر ایک نظر دوڑائیں کہ جس میں پہلی جلد قرآن، میں خدا کی جستجو اور دوسری جلد خدا شناسی کے بارے میں ہے تو ہمیں قرآن کی تعلیمات کی گہرائی کا اندازہ ہوجائے گا۔

اسی طرح قرآن مجید میں معاد کے بارے میں ''پیام قرآن'' کی پانچویں اور چھٹی جلد میں تفصیل کے ساتھ تحقیق پیش کی گئی ہے۔ لہٰذا یہاں پر چند اشاروں میں مختصر سی بحث پر اکتفا کرتے ہوئے قارئین محترم کو ''پیام قرآن'' کی انہی جلدوں کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دی جاتی ہے۔ اُس ماحول پر بت پرستی کا مسئلہ اس قدر زیادہ مسلط تھا کہ کوئی بھی شخص اس عقیدے کی مذمت میں ذرا سی بات بھی نہیں کرتا تھا۔ لیکن قرآن نے ایک بے مثال قاطعیت کے ساتھ اس بے ہودہ عقیدے کو دباتے ہوئے حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ کی زبان سے اس طرح کے کلمات نقل کئے ہیں:

قَالَ اَفَتَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنۡفَعُكُمۡ شَيۡـًٔا وَّلَا يَضُرُّكُمۡ ؕ﴿۶۶﴾ اُفٍّ لَّـكُمۡ وَلِمَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ ‌ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ [1]

یعنی: ''(ابراہیمؑ نے) کہا: کیا تم اللہ کو چھوڑ کر اس کی پرستش کرتے ہو جو نہ تو تمہیں کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان؟ تف ہے تم پر بھی اور اس پر بھی جسے اللہ کو چھوڑ کر پوجتے ہو؟ کیا تم سوچتے نہیں (اور کیا تمہارے پاس عقل نہیں ہے)؟

ایک دوسری جگہ بچھڑے کی پرستش کے بارے میں جس کے کچھ بنی اسرائیل کے جاہل افراد سخت گرویدہ ہو چکے تھے، فرمایا:

اَفَلَا يَرَوۡنَ اَلَّا يَرۡجِعُ اِلَيۡهِمۡ قَوۡلًا ۙ وَّلَا يَمۡلِكُ لَهُمۡ ضَرًّا وَّلَا نَفۡعًا ﴿۸۹﴾

یعنی: ''کیا وہ یہ نہیں دیکھتے کہ وہ (سونے کا بچھڑا) ان کا جواب تک نہیں دیتا اور نہ وہ انھیں کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ ہی کوئی نفع؟ [2]

مختصر یہ کہ قرآن مجید نے شرک و بت پرستی کی اس قدر مذمت کی ہے کہ اس کے نزدیک تمام گناہ بخشش اور مغفرت کے قابل ہیں، سوائے شرک کے۔ اس سلسلے میں قرآن فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغۡفِرُ اَنۡ يُّشۡرَكَ بِهٖ وَيَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰ لِكَ لِمَنۡ يَّشَآءُ‌ ۚ وَمَنۡ يُّشۡرِكۡ بِاللّٰهِ فَقَدِ افۡتَـرٰۤى اِثۡمًا عَظِيۡمًا ﴿۴۸﴾

یعنی: ''خدا کبھی مشرک کو نہیں بخشے گا اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ جسے چاہے (بشرطیکہ وہ اہلیت رکھتا ہو) بخش دے گا اور جو کسی کو اللہ کا شریک بنائے گا تو وہ گناہ عظیم کا مرتکب ہوا ہے'' [3]

اس پورے ماحول پر بت پرستی جیسی جانی پہچانی ثقافت غالب ہونا اور آباء واجداد کی سیرت کہ جس کے علاوہ کسی بھی دوسرے طریقے کو اختیار کرنا باعث تعجب تھا اور اس کی سخت مذمت کی جاتی تھی۔ لہٰذا اس کے مقابلے میں اس قسم کا شدید اور قاطع رویہ واقعاً حیرت انگیز تھا۔ آج ہم اپنے ماحول میں ان آیات کو دیکھتے ہیں اور اسے ایک عام سی بات سمجھتے ہیں جبکہ اس زمانے کا ماحول اور حالات اور تھے۔ یہ تو ایک بات، دوسری طرف جب ہم توحید کی بحث شروع کرتے ہیں تو (قرآن مجید) اس طرح کے فطری و منطقی دلائل اور ''برہان نظم'' اور ''برہان صدیقین'' جیسی ادلہ پیش کرتا ہے جن سے زیادہ خوبصورت گفتگو کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

توحید فطری جیسی بحث کے وقت ایک ایسا مسئلے کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے کہ جو اُن سب کی زندگی میں مختلف شکلوں میں پیش آیا

---

[1] سورۂ انبیاء/ ٦٦/ ٦٧

[2] سورۂ طٰہٰ/ ٨٩

[3] سورۂ نساء/ ٤٨

ہے، چنانچہ فرماتا ہے:

فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿٦٥﴾

یعنی: ''جب یہ لوگ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو خلوص کے ساتھ اللہ کو پکارتے ہیں (اور اس کے غیر کو بھول جاتے ہیں) مگر جب اللہ انھیں نجات دے کر خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو وہ پھر شرک کرنے لگتے ہیں''۔[1]

اس طرح بتایا گیا ہے کہ کس طرح ان کے وجود کی گہرائیوں میں نور توحید پایا جاتا ہے اور کس طرح حوادث کا طوفان، جہالت اور جاہلیت کی خاکستر کے نیچے چھپی آگ کو ظاہر کر دیتا ہے۔ اور جب استدلالی توحید کی بات شروع ہوتی ہے تو ایک مختصر سے جملے میں کہا جاتا ہے:

اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ

یعنی: ''کیا اللہ کے بارے میں شک ہے، وہ اللہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا''[2]

اس کلی گفتگو کے بعد، انسانوں کا ہاتھ پکڑ کر اُنہیں اس وسیع و عریض کائنات کے گوشے گوشے میں میں پھیلی ہوئی آیات آفاقی وانفسی سے روشناس کرایا جاتا ہے۔کبھی فرماتا ہے:

وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ﴿٢٠﴾ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿٢١﴾

یعنی: ''اور زمین میں طالبان حق کے لئے نشانیاں ہیں اور خود تمہارے وجود کے اندر (بھی نشانیاں ہیں) کیا تم دیکھتے نہیں؟[3]

اور اس کے بعد دوسری آیات میں آسمان، ستاروں، زمین، پودوں، پرندوں، دن رات اور ہواؤں اور بارشوں میں موجود خدا کی عظمت، قدرت اور حکمت کو مفصل طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ جس سے انسان لذت میں ڈوب کر وجد و سرور میں آ جاتا ہے۔[4]

اور جب صفات خدا جیسی پیچیدہ ترین نظریاتی گفتگو شروع کی جاتی ہے کہ جس میں بہت سے دانشوروں کے لئے اہم ترین نظریاتی اور فکری لغزشیں سرزد ہوتی ہیں، تو اس میں بھی (قرآن) داد سخن دیتا ہے۔ ایک مقام پر ایک مختصر سے جملے میں اللہ تعالیٰ کو ہر قسم کی محدود امکانی اور نقص سے مملو صفات سے منزہ و پاک قرار دیتے ہوئے فرماتا ہے:

---

[1] سورۂ عنکبوت/۶۵

[2] سورۂ ابراہیم/۱۰

[3] سورۂ ذاریات/۲۰/۲۱

[4] ہم نے ان آیات کی تفصیل بیس عناوین کے تحت اسی کتاب ''پیام قرآن'' کی جلد دوم میں پیش کی ہے۔

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ

یعنی: "اس کی مثل کوئی چیز نہیں ہے۔" [1]

اور اس طرح اُس کی ذات پاک سے تمام امکانی اوصاف کی نفی کر دی جاتی ہے اور اس کی صفات جمال وکمال کا بے نظیر ہونا ثابت کر دیا جاتا ہے۔ اور کبھی تفصیل کے ساتھ فرماتا ہے:

هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۲۲﴾ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۲۳﴾ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۭ يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۴﴾

"اللہ وہی ہے جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔ وہ غیب (پوشیدہ) وآشکار سے آگاہ ہے۔ اور وہ رحمن ورحیم ہے۔ اللہ وہی ہے جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، اصلی مالک وہی ہے، ہر عیب سے منزہ ہے، کسی پر ظلم نہیں کرتا، مومنین کو سلامتی بخشتا ہے، ہر چیز کا نگہبان ہے، صاحب قدرت ہے، طاقتور ہے، عظمت کے لائق ہے اور اس سے منزہ ہے جسے اس کا شریک قرار دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی خالق اور بے سابقہ پیدا کرنے والا ہے، وہ (بے نظیر) تصویریں بنانے والا ہے، اس کے لئے اچھے اچھے نام ہیں، جو چیز کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اس کی تسبیح کرتا ہے اور وہ عزیز وحکیم ہے"۔ [2]

درحقیقت قرآن نے ان چند آیات میں خالق کائنات کی جو توصیف کی ہے، اگر اس کا اُس توصیف کے ساتھ موازنہ کیا جائے کہ جو بطور کلی نزول قرآن کے ماحول میں بت پرست خدا کے بارے میں کر رہے تھے تو ہم کسی بھی صورت اس بات کا احتمال تک نہیں دے سکتے کہ یہ غیر معمولی نورانی بیان، اُس تاریک اور پست ماحول کی پیداوار ہے۔ ایک دوسری جگہ (قرآن مجید) اللہ تعالیٰ کے علم اور اس کے بے انتہا ہونے کی اس طرح منظر کشی کر رہا ہے کہ جس سے زیادہ اعلیٰ بیان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، چنانچہ قرآن فرماتا ہے:

وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ

یعنی: "اور اگر روئے زمین پر تمام درخت قلم بن جائیں، سمندر ان کے لئے روشنائی بن جائے اور ان میں

---

[1] سورہ شوریٰ/۱۱

[2] سورہ حشر/ ۲۲، ۲۴

سات دیگر سمندروں کا اضافہ کیا جائے (تا کہ کلمات خدا کو لکھیں) تو یہ سب کے سب ختم ہو جائیں گے لیکن کلمات الٰہی ختم نہیں ہوں گے۔''[1]

درحقیقت یہ ایک لامتناہی اور لامحدود (ہستی) کی تصویر کشی ہے۔ لیکن ایک زندہ تصویر، چونکہ لامتناہی عدد کبھی مردہ صورت میں ادا ہوتا ہے اور اس کے لئے ریاضی کی علامتوں اور فلسفی بیانات سے استفادہ کیا جاتا ہے اور کبھی زندہ صورت میں اُسی منظر کشی کی طرح جو مذکورہ آیت میں کی گئی ہے، جو انسان کی فکر کو اپنے ساتھ بلندیوں کی طرف لا کر لامتناہی حد تک لے آتی ہے۔ ہم اس وقت توحید اور اسماء وصفات جیسے باریک ترین مسائل کے بارے میں معارف اسلام کی گہرائی تک پہنچ سکتے ہیں، جب ہم پورے قرآن مجید کا اسی نقطہ نظر سے مطالعہ کریں اور اس سلسلے میں تحقیق کریں۔[2]

جب (قرآن مجید) قیامت اور موت کے بعد کی زندگی کے بارے میں بحث شروع کرتا ہے تو کبھی مخالفین کے تمام دلائل اور غیر ممکنات کو ایک مختصر سے جملے کے ذریعے بالکل رد کر دیتا ہے اور کہتا ہے:

كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ ﴿٢٩﴾

یعنی: ''جس طرح اس نے تمہیں آغاز میں پیدا کیا ہے (اسی طرح) تم حشر کے روز اس کی طرف پلٹو گے۔''[3]

اور کبھی ایک بہت ہی تفصیلی بیان کے ساتھ فرماتا ہے:

اَوَلَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ۭ بَلٰى ۤ وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ﴿٨١﴾ اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَـيْـــًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿٨٢﴾

یعنی: ''کیا وہ ذات جس نے آسمانوں اور زمین کو خلق کیا ہے اس بات پر قادر نہیں ہے کہ ان کے مانند (خاک شدہ انسانوں) کو پیدا کرے؟ ہاں وہ آگاہ و دانا خلق کرنے والا ہے۔ اس کا امر تو صرف یہ ہے کہ جس وقت وہ کسی چیز کے کرنے کا ارادہ فرماتا ہے تو کہتا ہے ہو جا! پس وہ ہو جاتی ہے۔''[4]

اور کبھی معاد اور قیامت کے منظر کو ایک زندہ تصویر کی شکل میں مجسم کرتے ہوئے اُن کے افکار پر استدلال کی زحمت ڈالے بغیر اُن کے سامنے پیش کر دیتا ہے اور فرماتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ

---

[1] سورۂ لقمان/۲۷

[2] ''پیام قرآن'' کی جلد سوم کی طرف رجوع کر کے آپ اس سلسلے میں منظم اطلاعات حاصل کر سکتے ہیں۔

[3] سورۂ اعراف/۲۹

[4] سورۂ یس/۸۱،۸۲

مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ؕ وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا ؕ وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَاَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ﴿٥﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّهٗ يُحْيِ الْمَوْتٰى وَاَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٦﴾

''اے لوگو! کیا تمہیں قیامت کے آنے میں کوئی شک ہے؟ (تو اس نکتے پر ذرا غور کرلو کہ) ہم نے تمہیں مٹی سے، پھر نطفہ سے، پھر جمے ہوئے خون سے، پھر مضغہ (گوشت کے لوتھڑے سے) جو کبھی تو کسی شکل وصورت کا حامل ہوتا ہے اور کبھی نہیں، پیدا کیا ہے تا کہ تم جان لو (کہ ہم ہر چیز پر قادر ہیں) پھر ان جنین میں سے جن کو ہم چاہتے ہیں کہ وہ اپنی خلقت کی مدت مکمل کرلیں، ان کو ماؤں کے رحم میں ایک خاص مدت تک رکھتے ہیں پھر ہم تم کو بچے کی صورت میں پیدا کر دیتے ہیں تا کہ تم جسمانی اور عقلی اعتبار سے کمال تک جا پہنچو۔ البتہ اس دوران تم میں سے بعض مر جاتے ہیں اور بعض انتہائی بڑھاپے کو پہنچ جاتے ہیں اور (اس مرحلہ میں) اپنی تمام تر معلومات کھو بیٹھتے ہیں۔ اور (دوسری طرف) تو دیکھے گا کہ زمین خشک اور مردہ ہوتی ہے، مگر جونہی ہم اس پر بارش برساتے ہیں تو اس میں زندگی پیدا ہو جاتی ہے اور طرح طرح کی ہری بھری لہلہاتی کھیتیاں اگاتی ہے۔ یہ اس لئے کہ تمہیں پتہ چل جائے کہ اللہ برحق ہے اور وہ مردوں کو زندہ کرتا ہے، اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔''[1]

اس طرح قیامت اور حشر کی نمائش کو انسان کے جنین کے مختلف مرحلوں سے شروع ہونے والی حرکت میں ظاہر کرتا ہے کہ جو خود حشر وقیامت کی ایک عظیم مثال ہے۔ اسی طرح پودوں کی دنیا کہ جسے ہر سال سرما اور بہار کے موسم میں نباتات کی موت وحیات اور قیامت وحشر کے مناظر کو ہم خود اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ جو آیات موت کے بعد کی زندگی اور اس کے مختلف دلائل کے بارے میں ہیں، اسی طرح آخرت کے گوناں گوں منازل ومناظر اور وہاں واقع ہونے والے واقعات کی منظر کشی کرتی ہیں اور تجسم اعمال، حساب کتاب، میزان اور قیامت کے دن شہود کے بارے میں نکات اور باریکیاں بیان کرتی ہیں، ان سب کا مطالعہ اور تحقیق ہر انسان کو تعجب وحیرت میں غرق کر دیتی ہے۔ آپ اسی کتاب ''پیام قرآن'' کی جلد پنجم میں اس قسم کے مسائل کے بارے میں تفصیلی مطالعہ کر سکتے ہیں۔

---

[1] سورۂ حج / ۵، ۶

۳۔جدید علوم اور سائنسی ایجادات کی نظر سے قرآنی اعجاز

اس بحث کو شروع کرنے سے پہلے اس موضوع سے ہر قسم کی غلط فہمی کو ختم کرنے کے لئے دو نکات ذکر کرنا ضروری ہیں:

ا۔قرآن مجید سے تمام طبیعی علوم کے مسائل اور تمام اشیاء کے خواص بیان کرنے کی ہرگز توقع نہیں رکھنی چاہیے، چونکہ قرآن اس مقصد کے لئے نازل نہیں ہوا ہے۔قرآن ایک دائرۃ المعارف یا علم طبقات الارض (جیالوجی) علم نباتات (باٹنی) اور فزیالوجی کی کتاب نہیں ہے۔ بلکہ قرآن تربیت اور ہدایت کی کتاب ہے اور انسانوں کو ایک پاکیزہ سعادت اور فضیلت پر مبنی زندگی کی طرف رہنمائی کرنے والی کتاب ہے تاکہ اس پر سچائی، وامانتداری اور نظم ورحمت کی حکمرانی ہو اور آخر کار وہ قرب خدا تک پہنچ سکے۔اگر ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قرآن کے متعلق فرماتا ہے:

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ

یعنی:''اور یہ ایسی کتاب (قرآن) ہم نے تم پر اتاری ہے جو ہر چیز کو واضح کرتی ہے''۔[1]

اس سے مراد وہ تمام چیزیں ہیں جو بنی نوع انسان کی نجات،سعادت اور تربیت سے تعلق رکھتی ہیں۔لہٰذا اسی جملے کے بعد فرماتا ہے:

وَهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ﴿۸۹﴾

یعنی:''اور مسلمانوں کے لئے ہدایت،رحمت اور بشارت ہے''۔[2]

لیکن جہاں پر کچھ آیات الٰہی، پوری کائنات اور خود انسان کی خلقت کے اسرار،معرفت خدا کی مدد کرنے والی اور عالم خلقت کی عظمت کی پہچان کرانے والی آیات ذکر کرتا ہے،بعض اوقات ان آیات قرآن کے اندر کہیں کہیں ان اسرار کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے اور اُن مسائل سے پردہ ہٹایا گیا ہے جو اس زمانے تک دنیا کے تمام علماء سے مخفی اور پنہان تھے۔مختصر یہ کہ اگر قرآن مجید میں کچھ علوم اور کائنات کے اسرار کا تذکرہ ہوا بھی ہے تو یہ علوم طبیعات وغیرہ کو پیش کرنے کے لئے نہیں ہے اور نہ یہ ایک انسائیکلو پیڈیا کی طرح کی کوئی چیز ہے۔ بلکہ اس کے تربیتی اور اخلاقی مقاصد ہیں اور توحید،معرفت خدا،اور اسماء وصفات یا معاد وغیرہ کے بعض اسرار کو سمجھانے کے لئے ہے۔

۲۔کیا اُصولی طور پر ان موضوعات پر بات کرنا اور قرآن کی آیات کو سائنسی ایجادات وغیرہ پر منطبق کرنا درست ہے؟ کیا ہمیں مختلف علوم طبیعات کو قرآنی آیات پر یا آیات کو اُن پر منطبق کرنے کا حق حاصل ہے؟ جبکہ سائنسدانوں کے نظریات مسلسل تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔لہٰذا ہماری نظر میں ایک محکم اور پائیدار چیز کو ایک متغیر اور تبدیل ہونے والی چیز پر منطبق کرنا کوئی منطقی وعقلی کام نہیں ہے۔

---

[1] سورہ نحل۔۸۹

[2] نحل۔۸۹

اس سوال کے جواب میں یہی کہنا چاہیے: یہاں پر تین مختلف نظریات ہیں: بعض نے اس سلسلے میں افراط پر مبنی راستہ اختیار کیا ہے اور قرآنی آیات کو معمولی سی نسبت کے ساتھ سائنسی مفروضوں نہ کہ مسلّم ویقینی حقائق پر تطبیق کر کے اپنے خیال میں قرآن شناسی کے سلسلے میں بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔

جبکہ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہ کام بہت بڑی غلطی ہے۔ یہ کام نہ فقط قرآن کی خدمت نہیں بلکہ قرآن کو غیر معتبر کرنے کا باعث بنا ہے۔ کیونکہ سائنسی مفروضات نہ کہ اس کے مسلّمہ قوانین، ہمیشہ تغیر وتبدل کی حالت سے گذر رہے ہیں جس کی وجہ سے ہمیشہ مشکوک ومظنون ہیں۔ لہٰذا یہ کام نہ تو عقلی ہے اور نہ سائنس وعلم کی اور نہ ہی مذہب کی خدمت ہے۔ دوسرے گروہ میں وہ لوگ ہیں جو تفریط کے راستے پر چل رہے ہیں۔ اُن کا عقیدہ ہے کسی بھی چیز میں حتیٰ سائنسی مسلّمات میں بھی خواہ یہ قرآن کی واضح نص کے موافق ہی کیوں نہ ہو، اس قسم کی تطبیق نہیں کی جانی چاہیے۔ لیکن اس قسم کا تعصب اور جمود بھی منطق ودلیل سے خالی ہے۔

یہاں پر ان دونوں منحرف راستوں کا درمیانہ راستہ ہی صحیح ہے۔ اگر ہم مفروضات کی دنیا سے باہر قدم رکھیں اور اُن سائنسی قوانین کو دیکھیں کہ جو یقینی دلائل اور مسلّمہ مشاہدات سے ثابت ہو چکے ہیں اور پھر قرآنی آیات کی دلالت بھی اس سلسلے میں واضح اور روشن ہو تو پھر ہم آیات قرآن پر ان مسائل کو منطبق کرنے سے کیوں پہلوتہی کریں؟ اور کس طرح اس مطابقت سے وحشت زدہ ہوں جو اس آسمانی کتاب کی عظمت کی دلیل ہے؟ آخر اس میں کیا مانع ہے کہ قرآن مجید توحیدی، خداشناسی اور تربیتی مسائل میں کچھ ایسے علمی حقائق کے چہرے سے پردہ اُٹھاتا ہے اور اپنے پیروکاروں کو ان سے آگاہ کرتا ہے جن سے اُس زمانے میں لوگ بالکل اجنبی تھے۔ یہ مسائل توحیدی اور اخلاقی نتائج کے علاوہ قرآن کی حقانیت کی دلیل بھی ہیں اور ان سے علم ودانش کے لئے ترقی کے دروازے بھی کھلتے ہیں؟ بنابریں جس موضوع کو اب ہم شروع کرنا چاہتے ہیں، اس میں دو نکات بطور خاص ہمارے مدنظر رہیں گے۔

ا۔ یہاں ہم علم طبیعات کے کچھ ایسے موضوعات کو انتخاب کریں گے جو سوفی صد مسلّم اور ثابت شدہ ہیں۔ مثلاً قانون جاذبہ، نباتات میں زوجیت، زمین کی حرکت، منظومہ شمسی کی حرکت وغیرہ کہ جو آج تجربات کے ذریعے ثابت ہو چکے ہیں۔

۲۔ اس سلسلے میں اُن آیات کو انتخاب کیا جائے گا جو کسی تکلف اور بناوٹی توجیہات کے بغیر موجودہ سائنسی قوانین اور قواعد پر منطبق ہوتی ہیں۔ یا دوسرے الفاظ میں جملوں اور کلمات کے معانی سے استفادہ کرنے میں ادبی قواعد کے مطابق جن آیات کی دلالت قابل قبول ہے۔

ا۔ قرآن اور کشش ثقل

سورۂ رعد کی دوسری آیت میں ہم پڑھتے ہیں:

اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ط

''اللہ وہی تو ہے جس نے آسمان کو قابل مشاہدہ ستون کے بغیر پیدا کیا پھر عرش پر قرار فرمایا (اور تدبیر عالم کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی) اور آفتاب و ماہتاب کو مسخر فرمایا''۔

توجہ رہے کہ قرآن مجید یہ نہیں فرما رہا کہ آسمان بغیر ستون کے ہے، بلکہ فرما رہا ہے: ''ایسے ستون کے بغیر ہے جو تمہارے لئے قابل مشاہدہ ہو اور جسے تم دیکھ رہے ہو''۔ ان الفاظ سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی مرئی ستون نہیں ہے بلکہ نامرئی ستونوں نے آسمانوں کو اُٹھا یا ہوا ہے۔[1]

امام علی بن موسیٰ الرضا - سے منقول ایک حدیث میں آیا ہے کہ آپؑ کے ایک صحابی ''حسین بن خالد'' نے سوال کیا کہ یہ جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''والسَّمَاءِ ذَاتِ الْحُبُكِ''، یعنی: ''اور آسمان کی قسم جو راستوں والا ہے'' اس کا کیا مطلب ہے؟'' (سورۂ ذاریات / ۷) امام - نے فرمایا: اس آسمان کے زمین کی طرف راستے ہیں۔ راوی نے عرض کی: آسمان کا زمین کے ساتھ رابطے کا ذریعہ کیسے ہوسکتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: آسمان بے ستون ہیں؟ امام - نے فرمایا:

''سُبْحَانَ اللّٰهِ اَلَيْسَ اللّٰه يَقُولُ "بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا" قُلْتُ: بَلٰى فَقَالَ ثَمَّ عَمَدٌ وَلٰكِنْ لَا تَرَوْنَهَا''

یعنی: ''سبحان اللہ! کیا خدا نہیں فرماتا بغیر ستونوں کے جنہیں تم مشاہدہ کرو''؟ راوی کہتا ہے میں نے عرض کیا: جی ہاں! تو فرمایا: پس ستون ہیں لیکن تم انہیں نہیں دیکھ پاتے''۔[2]

کیا اس بات کی توجیہ و تفسیر اس ستون کے علاوہ ہوسکتی ہے کہ آج جسے ہم ''قوۂ جاذبہ و دافعہ کے توازن'' کے نام سے یاد کرتے ہیں؟ اس کی وضاحت یہ ہے کہ قرآنی آیات کے نزول کے دور میں جو مفروضہ اُس زمانے اور اس کے بعد اور پہلے کے علماء کے افکار و نظریات پر مسلط تھا وہ بطلیموس کی ہیئت کا مفروضہ تھا جو پوری طاقت کے ساتھ دنیا کے سائنسی موضوعات اور لوگوں کے افکار و نظریات پر چھایا ہوا تھا اور اس کے مطابق آسمان ایک دوسرے پر پیاز کے چھلکوں کی طرح کرات کی شکل میں تھا اور زمین اُن کے درمیان تھی۔

ظاہر ہے اس طرح کوئی بھی آسمان معلق اور ستون کے بغیر نہ تھا بلکہ ہر ایک دوسرے کا سہارا لئے ہوئے تھا، لیکن ان آیات کے نزول کے تقریباً ایک ہزار سال بعد اس نظریے کا باطل ہونا قطعی دلائل کے ساتھ ثابت ہو گیا۔ اس طرح پیاز کے چھلکوں والے افلاک کا نظریہ بالکل ختم ہو گیا اور یہ بات مسلّم ہو گئی کہ آسمانی کرات میں سے ہر ایک اپنے مدار اور جگہ پر بغیر کسی سہارے کے ثابت و معلق ہے اور وہ

---

[1] اس آیت کا ظاہر یہ ہے کہ ''تَرَوْنَهَا''، ''عَمَدٍ'' کے لئے صفت ہے۔ اور یہ جو بعض نے کہا ہے کہ آیت کا مفہوم یہ ہے: ''تَرَوْنَهَا بِغَيْرِ عَمَدٍ'' یعنی: تم آسمانوں کو بغیر ستون کے دیکھتے ہو (بنابریں بغیر عمد، جار و مجرور اور مضاف الیہ ہے جو ترونھا سے متعلق ہے) پہلی بات تو یہ کہ یہ ظاہر کے خلاف ہے، دوم اس جملے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ تم آسمانوں کو بغیر ستون کے دیکھتے ہو جبکہ وہ ستون رکھتے ہیں۔

[2] تفسیر برہان، جلد ۲، صفحہ ۲۷۸۔ یہ حدیث اس تفسیر میں دو طریقوں سے نقل ہوئی ہے: تفسیر علی بن ابراہیم کے طریقے سے اور تفسیر عیاشی سے۔

واحد چیز جوانہیں اپنی جگہ پر قائم رکھے ہوئے ہے، وہ قوت جاذبہ اور دافعہ کا توازن ہے۔

قوت جاذبہ جس کے مطابق بطور مستقیم جِرم کی نسبت اور بطور معکوس ان کے درمیان فاصلوں کے مجذور کی نسبت ہر دو جسم ایک دوسرے کو جذب کرتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے یہ سب آسمانی کرات سرعت کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف حرکت کرتے ہیں اور ایک ہی مرکز میں جمع ہوتے ہیں۔ لیکن سیارات اور منظوموں کے درمیان ہونے والی حرکت دوری ہونے کے سبب یہ کرات اور منظومے تیزی کے ساتھ ایک دوسرے سے دور ہوجاتے ہیں چونکہ ہم جانتے ہیں مرکز سے گریز، دوری حرکت کی خصوصیت ہے۔

یہ بالکل اُسی طرح ہے کہ جب ہم کسی چیز میں آگ کے انگاروں کو رکھ کر گھماتے ہیں تو اس وقت اگر اس کی رسی ٹوٹ جائے تو آگ کے انگارے دور دور تک جا گرتے ہیں۔ اب اگر قوت جاذبہ بالکل قوت دافعہ کے مساوی ہو یعنی؛ نہ کم نہ زیادہ تو اس صورت میں ایک طاقت ور غیر مرئی ستون کی شکل میں وہ اُنہیں اپنی جگہ قائم رکھتی ہے۔ جیسا کہ کرۂ ارض کڑوروں سال سے ایک معین مدار میں سورج کے گرد حرکت کر رہا ہے۔ نہ تو اس میں جذب ہوتا ہے اور نہ اس سے دور ہوتا ہے۔ اور یہ عظمت خدا اور اعجاز قرآن کی نشانیوں میں سے ایک ہے۔

دلچسپ بات یہ کہ گزشتہ مفسرین اجمالاً اس نکتے کی طرف متوجہ تھے، لیکن اس کے بارے میں اُن کے پاس سوائے قدرت خدا کے اور کوئی الفاظ نہیں تھے۔ جیسا کہ ''مجمع البیان'' میں طبرسی اور ''روح المعانی'' میں آلوسی کے بقول ابن عباس کہتے ہیں: اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ آسمان کسی مرئی ستون کے بغیر ہے بنابریں اس کا ستون اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے۔[1]

۲۔ قرآن اور کائنات کی تخلیق

قرآن مجید کائنات اور اس دنیا کی خلقت و پیدائش کے بارے میں مختلف الفاظ استعمال کرتا ہے: ایک جگہ فرماتا ہے۔

ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَاۗءِ وَهِىَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ۭ قَالَتَآ اَتَيْنَا طَاۗىِٕعِيْنَ ⑪

یعنی: ''پھر آسمان کی تخلیق کا ارادہ فرمایا جبکہ وہ دھوئیں کی صورت میں تھا پس آسمان اور زمین کو حکم دیا کہ وجود میں آئیں اور صورت اختیار کریں، خواہ از روئے اطاعت خواہ مجبور ہو کر تو انھوں نے کہا ہم اطاعت کرتے ہوئے وجود میں آتے ہیں۔ (وجود میں آتے ہیں اور شکل اختیار کرتے ہیں)[2]

ایک دوسری جگہ فرمایا:

اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ۭ وَجَعَلْنَا مِنَ

---

[1] مجمع البیان، جلد ۵، صفحہ ۲۷۴ اور روح المعانی، جلد ۱۳، صفحہ ۷۸

[2] سورۂ حم سجدہ/۱۱

الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ؕ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ۝۳۰

یعنی: ''کیا کافروں نے یہ نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے اور ہم نے انھیں ایک دوسرے سے جدا کر دیا؟ اور ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی سے پیدا کیا۔ کیا ان نشانیوں کے باوجود بھی وہ ایمان نہیں لاتے؟''[1]

ان دونوں آیات میں کائنات اور زندہ موجودات کی خلقت کے بارے میں تین اہم نکتوں کی طرف اشارہ ہوا ہے:

۱۔ابتدا میں یہ کائنات ایک گیس اور دھویں کی شکل میں تھی۔

۲۔شروع میں یہ کائنات ہم پیوستہ تھی، بعد میں آسمانی کرات ایک دوسرے سے جدا ہوئے ہیں۔

۳۔زندہ مخلوقات کی خلقت کا آغاز پانی سے ہوا ہے۔

اور یہ وہی نکات ہیں جو آج مسلّمہ سائنسی نظریات کے طور پر پہچانے جاتے ہیں۔اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگرچہ کائنات کی تخلیق کی کیفیت کے بارے میں مختلف مفروضے موجود ہیں جو ایک فرضیہ کی حد سے آگے نہیں بڑھے، لیکن اگر ان مطالعات کو دیکھا جائے جو کہکشاؤں اور ان سے پیدا ہونے والے منظوموں کے بارے میں کئے گئے ہیں، تو یہ بات مسلّم ہے کہ یہ کائنات شروع میں ایک ابر کی مانند گیس کے مجموعے کی شکل میں تھی جو اپنے محور کے گرد گھومنے کے سبب کچھ ٹکڑے اس سے جدا ہو کر ارد گرد پھیل گئے تھے، اور یہ ٹکڑے تدریجاً ٹھنڈے ہوتے گئے اور ایک مائع کی شکل اختیار کر گئے اور زیادہ تر تو جامد صورت میں آ گئے اور اس طرح مسکونی اور غیر مسکونی کرات بن گئے۔

دوسرے الفاظ میں ماہرین فلکیات کے ''بادلوں'' اور دور دراز جہانوں کے بارے میں مشاہدات ابھی تکمیل کے مرحلے میں ہیں، یہ مسئلہ کہ یہ دنیا ابتداء میں دھویں کی مانند ایک گیس کا مجموعہ تھی، اب کوئی فرضیہ نہیں رہا بلکہ ایک قطعی اور حتمی نظریئے کے طور پر پہنچایا جاتا ہے۔یہی وہ چیز ہے جسے دنیا کی علمی محافل نے قبول کر لیا ہے۔

مذکورہ بالا پہلی آیت میں ہم صراحت کے ساتھ دیکھتے ہیں کہ: ''آسمان (آسمانی کرات) شروع میں دھویں کی (مانند) تھے۔'' اس آیت کا دانشوروں کے اُن انکشافات کے ساتھ ہم آہنگ ہونا کہ جن کی عمر کچھ زیادہ بھی نہیں گذری، قرآن کے سائنسی اعجاز کی علامت ہے، جس میں ایسے علوم سے پردہ اُٹھایا گیا ہے جو نزول قرآن کے زمانے میں بالکل متعارف نہیں تھے۔

دوسری آیت میں بھی شروع شروع میں دنیا کی ہم پیوستگی اور بعد میں اُس کے اجزا کے ایک دوسرے سے جدا ہونے کی بات کی گئی ہے۔ یہ بھی آج علمی محافل میں ایک اصل وقاعدے کے طور پر قبول شدہ ہے۔ زندہ مخلوقات خواہ وہ نباتات ہوں یا حیوانات، کی پانی سے پیدائش کا مسئلہ بھی ایک مشہور و معروف علمی نظریہ بن چکا ہے، اگر چہ مختلف نباتات اور حیوانات کی انواع کی پیدائش میں تغیر وارتقاء کے بارے میں دانشوروں کے درمیان اختلاف نظر پایا جاتا ہے۔

قرآن مجید بھی مذکورہ بالا دوسری آیت میں تمام زندہ موجودات کی پیدائش کو پانی کی طرف نسبت دے رہا ہے۔ حتیٰ وہ آیات کہ

---

[1] سورۂ انبیاء/ ۳۰

جن میں انسان کی خلقت کو مٹی کے ساتھ نسبت دی گئی ہے، یہی تصریح کر رہی ہیں کہ مٹی پانی کے ساتھ مخلوط تھی اور ''طین'' کیچڑ کی شکل میں تھی۔ سورۂ نور کی آیت ۴۵ میں ہم پڑھتے ہیں: ''وَاللهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِنْ مَاءٍ ''یعنی: ''اللہ تعالیٰ نے ہر چلنے والی مخلوق کو پانی سے پیدا کیا ہے'' دوسری آیت میں استعمال ہونے والے کلمات ''رتق''، ''فتق'' کے بارے میں کہ جو پیوستگی وجدائی کے معنیٰ میں ہے، مفسرین کے بہت سے قول ہیں:

بعض نے یہی اوپر والا معنیٰ انتخاب کیا ہے کہ آغاز خلقت میں زمین وآسمان، حرارت سے پیدا شدہ بھاپ کے ایک عظیم مجموعے کی شکل میں تھے، جس میں اندرونی تغیرات اور حرکت کی وجہ سے آہستہ آہستہ اور بتدریج اجزاء بکھرتے رہے اور نظام شمسی کے تمام سیارے، ستارے اور کرۂ زمین وجود میں آئے۔ بعض دوسروں نے اُسے جہان کے ایک ہی طرح کے مادہ ہونے کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔ اس طرح کہ ایک مادہ واحد کی صورت میں سب کا سب آپس میں ملا ہوا تھا، لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ یہ مادے ایک دوسرے سے جدا ہونے لگے اور ان میں نئی نئی ترکیبیں پیدا ہونے لگیں۔

کچھ دوسرے لوگ اسے زمین سے بارش نہ ہونے اور نباتات نہ اُگنے کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں۔ یعنی؛ شروع میں آسمان باہم جڑا ہوا تھا اور اس سے کوئی بارش نہیں برستی تھی اور زمین بھی بند اور جڑی ہوئی تھی اور اس سے بھی کوئی نباتات نہیں اُگتی تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ کے فرمان سے یہ دونوں کھل گئے اور آسمان سے بارش برسنے لگی اور زمین سے پودے ونباتات اُگنے لگے۔

اہل بیت اطہار ؑ سے منقول متعدد روایات میں اور اسی طرح اہل سنّت سے نقل ہونے والی بعض روایات میں اسی آخری مطلب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔[1] جبکہ بعض دوسری روایات میں پہلی تفسیر کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔[2] نہج البلاغہ کے پہلے خطبے میں بھی اسی پیوستگی کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

بہرحال، آیت کا ظاہری معنیٰ پہلی تفسیر کے ساتھ موافق ہے، اگرچہ مذکورہ تینوں مطالب کو جمع کرنے میں کوئی مشکل نہیں ہے۔ لہٰذا ممکن ہے ہر تینوں معانی، آیت کے جامع مفہوم میں اکٹھے پائے جائیں۔ اور پھر یہ توجہ بھی رہے کہ سورۂ نازعات کی آیت نمبر ۲۷ تا ۳۲ میں آیا ہے:

ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰىهَا ﴿۲۷﴾ ...وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ﴿۳۰﴾ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰىهَا ﴿۳۱﴾ وَالْجِبَالَ اَرْسٰىهَا ﴿۳۲﴾

یعنی: ''کیا (موت کے بعد) تمہاری تخلیق مشکل ہے یا آسمان کی تخلیق جس کی اللہ نے بنیاد رکھی؟۔۔۔ اس کے بعد زمین کو بچھایا۔ خدا نے زمین میں سے اس کا پانی نکالا، اس کی چراگاہ کو تیار کیا اور پہاڑوں کو ثابت ومحکم بنایا''

[1] نور الثقلین، جلد ۳، صفحہ ۴۲۴، حدیث: ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵ اور الدر المنثور، جلد ۴، صفحہ ۳۱۷ کی طرف رجوع کیجئے۔

[2] نور الثقلین، جلد ۳، صفحہ ۴۲۴، حدیث: ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵ اور الدر المنثور، جلد ۴، صفحہ ۳۱۷ کی طرف رجوع کیجئے۔

ان آیات سے بھی بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ آسمان کی خلقت، زمین سے پہلے تھی اور پانی، نباتات اور پہاڑوں کی پیدائش، زمین کی خلقت کے بعد ہوئی ہے۔اس طرح یہ وہی چیز ہے جس کی موجودہ دور کا علم تاکید کررہا ہے اور زمین کی پیدائش کو سورج کے بعد اور پھر سطح زمین پر پانی کی پیدائش پھر نباتات اور اسی طرح پہاڑوں کی پیدائش کو زمین کی خلقت کے بعد سمجھتا ہے۔

۳۔قرآن اور زمین کی حرکت

سورۂ نمل کی آیت ۸۸ میں آیا ہے:

وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ۭ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ۭ اِنَّهٗ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ ⁨۸۸⁩

یعنی:''تم پہاڑوں کو دیکھتے ہو تو سمجھتے ہو کہ ساکن وجامد ہیں، حالانکہ وہ بادل کی مانند چل رہے ہیں، یہ خداوند عالم کی صنعت وتخلیق ہے جس نے ہر چیز کو پختہ بنایا ہے۔وہ تمہارے ان کاموں سے بھی باخبر جنہیں تم انجام دیتے ہو''۔

اس آیت میں چند نکات اہم ہیں: سب سے پہلے یہ کہ پہاڑ تمہاری نظر میں جامد وساکن ہیں اور بادلوں جیسی تیزی کے ساتھ حرکت کررہے ہیں۔(توجہ کیجیے کہ بہت زیادہ رفتار کو بادل کی تیزی سے تشبیہ دی گئی ہے اور پھر بادلوں کی سریع حرکت ہر قسم کے تزلزل اور شور شرابے سے خالی ہے) دوسرا یہ کہ یہ اللہ تعالی کی تخلیق ہے کہ جس نے ہر چیز کو ایک حساب کے مطابق پیدا کیا ہے اور تیسرا یہ کہ وہ تمہارے اعمال سے آگاہ ہے۔

ان تینوں جملوں میں غور وفکر سے واضح ہوتا ہے کہ بعض مفسرین کے خیال کے برعکس اس آیت کا قیامت کے واقعات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔بلکہ یہ آیت اسی دنیا کے بارے میں ہے۔لہٰذا اس میں کہا گیا ہے:''تم اُنہیں اس طرح دیکھتے ہو اور اس طرح خیال کرتے ہو جبکہ ایسا نہیں ہے'' اور پھر قیامت کے وقت پہاڑوں کی حرکت کوئی ایسی چیز نہیں جو مخفی اور پوشیدہ رہے، بلکہ وہ اس قدر وحشت ناک ہوگی کہ کسی میں اُسے دیکھنے اور برداشت کرنے کی ہمت نہیں ہوگی۔

اس کے علاوہ نظام خلقت کا استحکام اور اس پر حاکم نظم، اُس کی موجودہ حالت کی طرف اشارہ ہے نہ قیامت کے وقت کی طرف کہ جب اس کائنات کا نظام ختم ہو جائے گا اور اس درہم برہم نظام پر ایک نئے نظام کی بنیاد رکھی جائے گی۔اس کے علاوہ ہمارے اعمال سے خدا کا آگاہ ہونا اسی دنیا میں انجام دینے والے اعمال سے تعلق رکھتا ہے، ورنہ قیامت تو حساب وکتاب کا دن ہے نہ عمل کا دن۔ان تینوں قرائن سے بخوبی روشن ہو جاتا ہے کہ یہ آیت کسی بھی طرح اس دنیا کے اختتام پر قیامت کے دن پہاڑوں کی حرکت سے تعلق نہیں رکھتی۔البتہ بہت سے مفسرین اس آیت کہ گہرائی تک نہیں پہنچ سکے لہٰذا ظاہر آیت کے خلاف مطلب کو قبول کرنے اور اس کی مسئلہ قیامت کے ساتھ تفسیر کرنے کے سوا اُن کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔

یہ مسئلہ بھی واضح ہے کہ پہاڑوں کی حرکت، زمین کی حرکت سے جدا نہیں ہے، سب ایک دوسرے کے ساتھ پیوستہ حرکت کرتے ہیں، اگر پہاڑ حرکت کرتے ہیں تو اس کا مطلب ہے زمین حرکت کررہی ہے۔ البتہ ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس آیت میں فقط پہاڑوں ہی کو کیوں پیش کیا گیا ہے اور یہ نہیں کہا گیا کہ تم زمین کو دیکھتے ہو اور خیال کرتے ہو کہ وہ جامد و ساکن ہے جبکہ وہ تیزی کے ساتھ حرکت کررہی ہے؟ اس سوال کا جواب واضح ہے: پہاڑ زمین پر موجود چیزوں میں سے سب سے زیادہ عظمت رکھتے ہیں اور سختی واستحکام اور مضبوطی کا مظہر سمجھے جاتے ہیں۔ (ایک ضرب المثل بھی ہے کہ فلاں شخص پہاڑ کی طرح پائیدار وقائم ہے) لہٰذا پہاڑوں کی حرکت اپنے تمام تر صلابت واستحکام اور پائیداری کے ساتھ حق تعالیٰ کی لامتناہی قدرت کی بہترین نشانی بن سکتی ہے۔ لیکن یہ بات مسلّم ہے کہ پہاڑوں کی حرکت، زمین ہی کی حرکت ہے۔

بہرحال مندرجہ بالا آیت قرآن کے اہم سائنسی معجزات میں سے ایک ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ نزول قرآن کے زمانے اور اس کے تقریباً ایک ہزار سال بعد تک زمین کے ثابت ہونے اور اس کے گرد کرات کی حرکت کا عقیدہ ''بطلیموس'' کی ہیت سے اخذ کیا گیا تھا جو اس زمانے کی تمام علمی محافل پر حکمرانی کررہا تھا۔ اور تقریباً ایک ہزار سال بعد سب سے پہلے دانشور کہ جنہوں نے زمین کی حرکت کا انکشاف کیا وہ اٹلی کے ''گیلیو'' اور پولینڈ کے ''کوپرنک'' تھے۔

انھوں نے سولہویں صدی کے آخر اور سترہویں صدی کے آغاز میں اس نظریئے کا اظہار کیا تھا۔ جس پر ارباب کلیسا نے ان کی زبردست مذمت کی اور اُنہیں موت کی حد تک آگے جانا پڑا، جبکہ قرآن مجید نے ایک ہزار سال پہلے ہی اس حقیقت سے پردہ اُٹھا دیا تھا اور زمین کی حرکت کو انہی خوبصورت الفاظ کے ساتھ توحید اور عظمت خدا کی علامتوں میں سے ایک علامت کے طور پر پیش کیا۔

بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ آیت اسی دنیا میں پہاڑوں کی حرکت (باالفاظ دیگر زمین کی حرکت) کو بیان کررہی ہے۔ کیونکہ قیامت کے وقت پہاڑوں کی حرکت زمین پر ایک ایسا زلزلہ برپا کردے گی کہ جس سے حاملہ عورتیں اپنا حمل گرا دیں گی اور دودھ پلانے والی عورتیں اپنے بچوں کو فراموش کردیں گی اور اُن کے ہوش وحواس ختم ہو جائیں گے۔ اور یہ بات ہرگز ''تَحْسَبُهَا جَامِدَةً '' یعنی: ''تم اُنہیں ساکن وجامد خیال کرتے ہو'' کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اُن لمحات (قیامت) میں اچھے بُرے اعمال کا موقع ہی نہیں ہوگا تاکہ کہا جاسکے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری طرف سے انجام پانے والے اعمال سے آگاہ ہے۔

پھر مندرجہ بالا آیت سے پہلے اور بعد میں قیامت سے متعلق آیات کا ہونا اس آیت کے قیامت سے مربوط ہونے کی کوئی قطعی دلیل نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن میں اس طرح کی مثالیں کم نہیں ہیں کہ جہاں ایک آیت کسی ایک مطلب کو بیان کرتی ہے اور اس سے پہلے اور بعد کی آیات کسی اور مطلب کو بیان کررہی ہوتی ہیں۔ باالفاظ دیگر خود آیت کا مضمون اور اُس میں موجود دوسرے قرائن دوسری باتوں سے کہیں زیادہ اہم ہوتے ہیں۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ بادلوں کے ساتھ تشبیہ بطور اشارہ اُس کی غیر معمولی رفتار کو بیان کررہی ہے جو اس سوال کا جواب ہے کہ اگر زمین حرکت میں ہے تو اس کا احساس ہمیں کیوں نہیں ہوتا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ اس قدر آرام سے اور بغیر کسی شور وغل کے حرکت کر

رہی ہے کہ جسے تشخیص نہیں دیا جا سکتا۔ مثلاً جس طرح اگر کوئی انسان بادلوں پر سوار ہو تو وہ اُن کی حرکت کو محسوس نہیں کر سکتا۔ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن سورۂ مرسلات کی آیت نمبر ۲۵/۲۶ میں کہتا ہے:

اَلَمۡ نَجۡعَلِ الۡاَرۡضَ كِفَاتًا ۝ اَحۡيَآءً وَّاَمۡوَاتًا ۝

یعنی: ''کیا ہم نے زمین کو انسانوں کے رہنے کا مرکز نہیں بنایا، اُن کی زندگی کی حالت میں بھی اور موت کی حالت میں بھی''

لغت کی کتابوں منجملہ ''مفردات'' راغب اور کتاب ''العین'' میں آیا ہے کہ ''کفات'' مادہ ''کَفۡت'' (بروزن رفت) سے ہے جس کے دو معنیٰ ذکر ہوئے ہیں: جمع کرنا اور تیزی رفتاری سے پرواز کرنا۔ اگر پہلا معنیٰ مراد لیا جائے تو آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ ہم نے زمین کو انسانوں کی زندگی میں اُن کے اجتماع کا ذریعہ ہے اور زمین کے اندرونی حصہ کو اُن کی موت کے بعد اُن کے اجتماع کا مرکز قرار دیا ہے۔ اور اگر دوسرا معنیٰ مراد ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا زمین تیز رفتار پرواز کی حامل ہے اور یہ بات سورج کے گرد زمین کی انتقالی حرکت کی سرعت کو بیان کر رہی ہے، چونکہ زمین اپنے مدار میں ہر سیکنڈ میں ۲۰ اور ہر منٹ میں ۱۲۰۰ کلومیٹر سورج کے گرد گھومتی ہے اور اس طرح اپنے ساتھ مردہ اور زندہ انسانوں کو بھی سورج کے گرد گھوماتی ہے۔

بظاہر کلمہ ''کَفۡت'' کا سریع پرواز پر اطلاق اس لئے ہے، چونکہ جب پرندے آسمان میں بہت زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ پرواز کرنا چاہتے ہیں بطور معمول اپنے پروں کو سمیٹ لیتے ہیں اور اُن کی فضا میں اس طرح پرواز کرنے کو اصطلاحاً غوطہ خوری پرواز کہتے ہیں۔ جہاں تک کلمہ ''کفت'' اور ''کفات'' ہیں، یہ دونوں معانی کے متحمل ہو سکتے ہیں لہٰذا ہم نے اس آیت کو زمین کی گردش کے بارے میں ایک قطعی دلیل کے طور پر پیش نہیں کیا۔

۴۔ قرآن اور منظومہ شمسی کی حرکت

قرآن مجید سورۂ یٰس کی آیت نمبر ۳۸ تا ۴۰ میں فرماتا ہے:

وَالشَّمۡسُ تَجۡرِیۡ لِمُسۡتَقَرٍّ لَّهَا ؕ ذٰلِكَ تَقۡدِیۡرُ الۡعَزِیۡزِ الۡعَلِیۡمِ ۝ وَالۡقَمَرَ قَدَّرۡنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰی عَادَ كَالۡعُرۡجُوۡنِ الۡقَدِیۡمِ ۝ لَا الشَّمۡسُ یَنۡۢبَغِیۡ لَهَاۤ اَنۡ تُدۡرِكَ الۡقَمَرَ وَلَا الَّیۡلُ سَابِقُ النَّهَارِ ؕ وَكُلٌّ فِیۡ فَلَكٍ یَّسۡبَحُوۡنَ ۝

یعنی: ''اور سورج (بھی نشانی ہے) جو ہمیشہ اپنے ٹھکانے کی طرف حرکت میں ہے۔ یہ خدائے قادر و دانا کی تقدیر ہے۔ اور چاند کے لئے ہم نے منزلیں قرار دی ہیں، جو آخرکار کھجور کی پرانی شاخ (زرد کمان) کے مانند ہو جاتا ہے۔ نہ تو سورج چاند تک پہنچ سکتا ہے اور نہ ہی رات دن پر سبقت لے جا سکتی ہے۔ ان میں

سے ہر ایک اپنے اپنے مدار میں تیر رہا ہے''(یٰس / ۳۸، ۴۰)

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ نزول قرآن کے زمانے اور اُس سے پہلے اور بعد میں صدیوں تک آسمان و زمین کے بارے میں جو نظریہ علمی محافل میں بطور مسلم رائج تھا وہ ''بطلیموس'' کی ہیت کا نظریہ تھا۔ جس کے مطابق زمین دنیا کا مرکز تھی اور ستاروں اور سورج کو شیشہ نما افلاک میں گڑھا ہوا سمجھا جاتا تھا جبکہ یہ افلاک زمین کے ارد گرد حالت گردش میں تھے۔

قرآن مذکورہ بالا آیات میں بالکل اس کے برعکس نظریہ پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: ''پہلی بات تو یہ کہ سورج اپنے ٹھکانے کی طرف حرکت میں ہے (یا سورج اپنی قرارگاہ میں حرکت کر رہا ہے) نہ کہ زمین کے گرد حرکت کر رہا ہے، وہ بھی خود نہیں بلکہ اپنے نیلے فلک کے پیچھے حرکت کر رہا ہے۔ دوسری بات یہ کہ سورج اور چاند ہر دو اپنے مدار میں تیر رہے ہیں۔ ہیت ''بطلیموس'' کے مفروضے کی بنیادیں اُکھڑ جانے کے بعد موجودہ صدی کے سائنسی انکشافات کے سائے میں اور پھر آسمانی اجرام کے بیرونی افلاک کی قید و بند سے آزاد ہو جانے کے بعد یہ نظریہ مزید قوی ہو گیا کہ سورج منظومۂ شمسی کے مرکز میں ثابت و ساکن ہے اور دوسرا پورا منظومہ شمسی اس کے گرد پروانوں کی طرح گھوم رہا ہے۔

یہاں بھی سورج کی ایک معین سمت کی طرف یا اپنے گرد حرکت کرنے کے بارے میں کوئی خبر نہیں تھی۔ اس کے بعد سائنس مزید پیش رفت کرتی ہے اور اہل نجوم کے مشاہدات بہت ہی طاقت ور دور بینوں کے ذریعے انجام پاتے ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ سورج کم از کم دو قسم کی گردش رکھتا ہے؛ ایک وضعی گردش جو وہ اپنے محور کے گرد انجام دیتا ہے اور دوسری پورے منظومہ شمسی کے ہمراہ آسمان کے ایک مخصوص نقطے کی طرف انتقالی گردش، یا دوسرے الفاظ میں ''وگا'' نامی ستارے کی طرف کہ جو فلکی صورت ستاروں میں سے ''الجاثی عَلیٰ رُکبَتَیہِ'' کہلاتا ہے۔[1]

ایک دائرۃ المعارف میں لکھا ہے کہ سورج ''ظاہری'' حرکات (یومیہ اور سالانہ حرکت) کے علاوہ ''واقعی'' حرکات بھی رکھتا ہے۔ (ان ظاہری حرکات کے علاوہ) کہکشاں کی حرکت دورانی سورج کو تقریباً گیارہ لاکھ تیس ہزار کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار کے ساتھ فضا میں گردش دیتی ہے، لیکن کہکشاں کے اندر بھی سورج ثابت و ساکن نہیں ہے بلکہ تقریباً بہتر ہزار چار سو کلومیٹر کی رفتار سے صورت فلکی ''الجاثی'' کی جانب حرکت کرتا ہے۔ اور یہ جو ہم فضا میں سورج کی اس تیز رفتاری سے بے خبر ہیں، یہ تو اجرام فلکی کے دَوری ہونے کی وجہ سے ہے۔ اس کے بعد وہ مزید لکھتے ہیں: سورج اپنے گرد وضعی دورانی حرکت بھی کرتا ہے (سورج کی حرکت وضعی اس کے استواء میں تقریباً پچیس دن میں ہوتی ہے)[2]

جملہ ''کُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُون''(ان (سورج اور چاند) میں سے ہر ایک اپنے اپنے مدار میں تیر رہا ہے) بطلیموس کے نیلے

---

[1] ''الجاثی عَلیٰ رُکبَتَیہِ'' ستاروں کا ایک مجموعہ ہے کہ جو ایک فلکی صورت تشکیل دیتا ہے، یہ اس شخص سے مشابہ ہے کہ جو گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا اور کھڑا ہونے کے لئے تیار ہو اور یہ تعبیر اسی معنیٰ سے لی گئی ہے۔ اور ستارہ ''وگا'' اسی مجموعے کا جز ہے کہ جس کی طرف پورا منظومہ شمسی، سورج کے سمیت حرکت میں ہے۔

[2] دائرۃ المعارف ''دھخدا'' مادۂ خورشید

افلاک کے (مفروضے کے) ساتھ ساز گار نہیں جو کرات میں سے ہر ایک کو اپنی اپنی جگہ میخوں کی طرح گاڑھے ہوئے تھا۔ بلکہ یہ جملہ بالکل اُسی چیز کے ساتھ ہم آہنگ ہے جس کا انکشاف موجودہ دور کے سائنسی علم نے کیا ہے۔

اسی طرح ''مستقر'' (قرارگاہ) کی طرف حرکت بھی ایک دوسری حرکت کی طرف اشارہ ہے کہ جس میں سورج کہکشاں کے ساتھ یکسوئی رکھتا ہے اوراس مطلب کو بیاں کرنا درحقیقت ایک معجزہ ہے۔

۵۔قرآن اورکائنات کی وسعت

سورۂ ذاریات کی آیت ۴۷ میں ہم پڑھتے ہیں:

وَالسَّمَآءَ بَنَیۡنٰهَا بِاَیۡىدٍ وَّاِنَّا لَمُوۡسِعُوۡنَ﴿۴۷﴾

یعنی: ''ہم نے آسمان کواپنی قدرت سے بنایااور ہمیشہ اس کو وسعت دیتے رہتے ہیں''

''أَیۡد ''(بروزن صید) کامعنیٰ قدرت وطاقت ہے جیسا قرآن مجید کی دوسری آیات میں بھی یہی مطلب ذکر ہوا ہے۔بعض مفسرین نے ''أَید'' کے لئے مذکورہ معنیٰ کے علاوہ نعمت کامعنیٰ بھی ذکر کیا ہے، حالانکہ ''ید'' جب نعمت کے معنیٰ میں بھی آتا ہے،توجس کی جمع ''اَیدی''اوراس کی جمع کی جمع ''ایادی'' ہے۔

بہرحال جملہ ''إِنَّا لَمُوسِعُون ''یعنی: ''ہم ہمیشہ اس کو وسعت دیتے رہتے ہیں'' واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کواپنی قدرت کاملہ سے خلق کیا ہے اوراُنھیں مسلسل وسعت دے رہا ہے۔کیونکہ گزشتہ زمانے میں یہ مطلب علماء اورمفسرین پر واضح نہیں تھا لہٰذا بہت سے علماء نے اسے اللہ تعالیٰ کی جانب سے اپنے بندوں پر بارشیں برسا کر یا دوسرے طریقوں سے رزق میں وسعت دینے کے معنیٰ میں لیا ہے۔

بعض نے اس سے اللہ تعالیٰ کے غنی اور بے نیاز ہونے کامعنیٰ لیا گیا ہے کہ وہ جس قدر بخشش اورعطا کرے،اُس کے خزانوں میں کمی نہیں ہوتی۔لیکن آج دوربینوں کے ذریعے نجومی مشاہدات نے واضح کردیا ہے کہ آسمانی کرات اور کہکشائیں سرعت کے ساتھ ایک دوسرے سے دور ہورہی ہیں اور یہ کائنات وسیع ہورہی ہے،جس سے اس جملے کامفہوم ہمارے لئے مکمل طور پر روشن ہوگیا ہے۔

''جان الدر'' کی کتاب ''آغاز وانجام'' میں لکھا ہے: ''ستاروں سے جوموجیں نکلتی ہیں، وہ جدید ترین اور دقیق ترین اندازوں کے مطابق ایک عجیب اورحیرت انگیز حقیقت کے رخ سے پردہ اٹھاتی ہیں،یعنی اس سے اس بات کی نشاندھی ہوتی ہے کہ ستاروں کا وہ مجموعہ جس سے مل کر یہ جہاں بنا ہے، ہمیشہ زیادہ سرعت اور تیزی کے ساتھ اس مرکز سے دور ہوتا جارہا ہے،اوران کا فاصلہ اس مرکز سے جتنا دور ہوتا جاتا ہے اتنا ہی انکی رفتار کی تیزی بڑھتی جارہی ہے،اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک وقت یہ سب ستارے اس مرکز میں جمع تھے۔اوراس کے بعد وہ ایک دوسرے سے الگ اور جدا ہوگئے،اور بڑے ستاروں کا مجموعہ ان سے الگ ہوکر تیزی اورسرعت کے ساتھ ہرطرف کو روانہ ہو

گیا۔اسی طرح ماہرین نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ جہان ایک نقطہ آغاز کا حامل تھا''[1]

اُسی کتاب میں ''ژرژگاموف'' سے کتابِ ''آفرینش جہان'' میں اس بارے میں اس طرح نقل ہوا ہے:''عالم کی فضا جواربوں کہکشاؤں سے مل کر بنی ہے ایک ایسی حالت میں ہے جو تیزی کے ساتھ پھیل رہی ہے، حقیقت یہ ہے کہ ہمارا یہ جہان حالت سکون میں نہیں ہے، بلکہ اس کا پھیلتے جانا ایک مسلمہ حقیقت ہے۔اس بات کی حقیقت کو معلوم کرنے، اوراس کی تہ تک پہنچنے سے: کہ ہمارا جہان مسلسل پھیل رہا ہے، اور حالت انبساط میں ہے، جہان شناسی کے معموں کے خزانوں کی اصلی کلید معلوم ہوجاتی ہے، کیونکہ اگر جہان حالت انبساط میں ہوتو یہ بات لازم آتی ہے کہ وہ کسی وقت بہت شدید حالت انقباض میں تھا''[2]

کتاب ''مرزہای نجوم'' تالیف ''فردھویل'' میں کائنات کے پھیلنے اور وسیع ہونے کے بارے آیا ہے:''کروں کی پھیلنے کی زیادہ سے زیادہ سرعت کا اب تک جو اندازہ لگایا گیا ہے وہ تقریبا٦٦ ہزار کلومیٹر فی سیکنڈ ہے! زیادہ دوری پر واقع کہکشائیں ہماری نگاہ کے آگے اتنی کم نور ہیں کہ کافی روشنی نہ ہونے کی وجہ سے ان کی سرعت کا اندازہ لگانا دشوار ہے۔آسمان سے جو تصویریں حاصل کی گئی ہیں، وہ اس اہم انکشاف کی واضح طور پر نشاندہی کرتی ہیں، کہ:ان کہکشاؤں کا فاصلہ نزدیک کی کہکشاؤں کی نسبت بہت سرعت کہ ساتھ بڑھ رہا ہے''۔[3]

اس طرح ہم مذکورہ بالا آیت کی بہت ہی واضح تفسیر دیکھتے ہیں اور آسمانوں کے پھیلنے کا پتا لگاتے ہیں کہ جس سے قرآن کے سائنسی معجزات کے اسرار میں سے ایک راز سے پردہ اُٹھتا ہوا نظر آتا ہے۔قابل توجہ بات یہ ہے کہ ''اِنّالموسعُون''(ہم وسعت دینے والے ہیں) کی تعبیر میں جملہ اسمیہ اور اسم فاعل کے جملہ سے استفادہ ہوتا ہے جو اس موضوع کے دائمی ہونے کی دلیل ہے جو اس بات کی نشاندھی کرتی ہے کہ (کائنات کا اس طرح وسیع ہونا) ہمیشہ سے تھا اور اسی طرح جاری رہے گا۔

٦۔قرآن اوردوسرے کرات پرزندگی

سورۂ شوریٰ کی آیت ٢٩ میں آیا ہے:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ ۭ وَهُوَعَلٰي جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَاۗءُ قَدِيْرٌ ۝

یعنی:''اوراس کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں اورزمین کی خلقت اوران کے اندر چلنے والی مخلوق بھی کہ

---

[1] آغاز وانجام جہان، صفحہ ٤٧ تا ٧٧ (ملخص)

[2] آغاز وانجام جہان، صفحہ ٤٧ تا ٧٧ (ملخص)

[3] مرزہای نجوم ترجمہ رضا اقصی، صفحہ ٣٣٨

جسے اس نے پھیلایا ہے اور جب بھی وہ چاہے انھیں اکٹھا کرنے پر قادر ہے۔"[۱]

کیا حیات اور زندگی اسی کرۂ ارض سے مخصوص ہے اور دوسرے کرات پر بالکل کوئی سکونت نہیں؟ گزشتہ دور کے ماہرین اس مسئلے کو ہمیشہ شک کی نگاہ سے دیکھتے رہے ہیں۔لیکن ماہرین کی حالیہ تحقیقات سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ حیات اور زندگی فقط کرۂ ارض سے ہی مختص نہیں ہے۔

مجلہ "لائف" کی شائع کردہ کتاب "حیات در جہان" میں یوں لکھا ہے: "جیسا کہ ماہرین کے اعداد وشمار میں آیا ہے کہ فقط ہماری کہکشاں میں ممکن ہے لاکھوں ستارے موجود ہوں کہ جن کے تابع سیارے قابل سکونت ہوں" بعض نے اس سے بھی آگے قدم رکھا ہے اور اس بات کے قائل ہوئے ہیں کہ بعض آسمانی کرات میں انسان سے بھی زیادہ پیش رفتہ زندہ موجودات رہتی ہیں جو فضا میں لاسلکی پیغامات پھیلاتی ہیں اور جس کی مثل لانے پر ہم بالکل قادر نہیں ہیں، ہمارے ریسیور اُسے مکمل طور پر وصول کر سکتے ہیں اگرچہ ہم اُن کی زبان نہیں سمجھتے۔

بہر حال مذکورہ بالا آیت صراحت کے ساتھ کہتی ہے: اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان میں کچھ زندہ موجودات کو پھیلایا ہوا ہے۔ جس سے ہم دوسری موجودات کی زندگی کے بارے میں بخوبی باخبر ہوتے ہیں۔ اور اگر ہم یہ خیال کریں کہ آسمانوں میں زندہ موجودات سے مراد فرشتے ہیں تو کاملاً غلط فہمی ہوگی، چونکہ کلمہ "دَابَة" (چلنے والا) فقط جسمانی مخلوقات کے بارے میں استعمال ہوتا ہے اور اس کا فرشتوں پر اطلاق نہیں ہوتا۔ لہٰذا قرآن مجید جہاں فرشتوں کا نام لینا چاہتا ہے، وہاں "دَابَة" ذکر کرنے کے بعد الگ سے ملائکہ کی بات کرتا ہے۔ جیسا کہ سورۂ نحل کی آیت ۴۹ میں فرمایا ہے:

"وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مِنْ دَابَّةٍ وَالْمَلَائِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ"

یعنی: "آسمانوں اور زمین میں چلنے والے تمام انسان اور ملائکہ اللہ کے حضور سجدہ کرتے ہیں اور ان میں کسی قسم کا تکبر نہیں ہے۔"[۲]

جیسا کہ ہم نے دیکھا "ملائکہ" کو "دَابَّة" کے مقابل میں لایا گیا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں "دَابَة" میں فرشتے شامل نہیں ہوتے۔ قابل توجہ یہ کہ "فخر رازی" نے بھی مذکورہ آیت کی تفسیر میں کہا ہے کہ "یہ کہنا بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں میں موجودات کی کچھ ایسی اقسام خلق کی ہوئی ہوں جو اسی طرح راستہ چلتی ہوں جس طرح زمین پر انسان راستہ چلتے ہیں"۔[۳]

حضرت امیر المومنین علی -کی ایک دلچسپ حدیث میں آیا ہے:

"هذه النجوم التی فی السماء مدائن مثل المدائن التی فی الارض مربوطة کل

---

[۱] شوریٰ / ۲۹

[۲] نحل / ۴۹

[۳] تفسیر فخر رازی، جلد ۲۷، صفحہ ۱۷۱

مدینۃ الی عمود من نورٍ"

یعنی: ''آسمان میں جو ستارے ہیں، یہ زمین پر شہروں جیسے شہر ہیں۔ ہر شہر دوسرے شہر کے ساتھ (ہر ستارہ دوسرے ستارے کے ساتھ) ایک نورانی ستون کے ذریعے مربوط ہے''[1]

اس سلسلے میں اور بھی روایات ہیں جو اسلامی کتابوں میں نقل ہوئی ہیں۔[2] واضح ہے کہ یہ معلومات اُسی سرچشمے سے حاصل ہو سکتی ہیں جس سے قرآن مجید حاصل ہوا ہے۔ ورنہ اُس زمانے میں کوئی بھی شخص ان معلومات سے آگاہ نہیں تھا۔

۷۔ قرآن اور پہاڑوں کی خلقت

قرآن میں پہاڑوں کی خلقت کے بارے میں مختلف اور بامعنی تعبیرات دیکھی جاتی ہیں، ایک جگہ قرآن نے فرمایا:

وَاَلْقٰى فِى الْاَرْضِ رَوَاسِىَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَاَنْهٰرًا وَّسُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵﴾

یعنی: ''اور اس نے زمین میں محکم اور مضبوط پہاڑوں کو گاڑ دیا ہے تاکہ تمہیں اس کی حرکت اور لرزنے سے محفوظ رکھے اور اس نے دریا پیدا کئے اور راستے بنائے تاکہ تمہیں ہدایت حاصل ہو۔''[3]

ایک دوسری جگہ فرمایا:

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ﴿۶﴾ وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا ﴿۷﴾

یعنی: ''کیا ہم نے زمین کو (تمہارے) آرام و سکون کی جگہ قرار نہیں دیا، پہاڑوں کو زمین کی میخیں (نہیں بنایا)۔''[4]

ایک دوسری آیت میں ہم پڑھتے ہیں:

وَّجَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِىَ شٰمِخٰتٍ وَّاَسْقَيْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا ﴿۲۷﴾

یعنی: ''اور ہم نے اس میں استوار و بلند پہاڑ قرار دیئے اور تمہیں ہم نے خوشگوار پانی پلایا۔[5]

نیز فرمایا:

---

[1] سفینۃ البحار، مادۂ نجم (جلد ۲، صفحہ ۵۷۴)

[2] مزید معلومات کے لئے کتاب ''الھیئۃ والاسلام'' کی جانب رجوع کیجئے۔

[3] (نحل/۵۱)

[4] نباء/ ۶، ۷

[5] مرسلات/ ۲۷

وَاَلۡقٰى فِى الۡاَرۡضِ رَوَاسِىَ اَنۡ تَمِيۡدَ بِكُمۡ وَبَثَّ فِيۡهَا مِنۡ كُلِّ دَآبَّةٍ ؕ

یعنی: ''اور زمین میں پہاڑ نصب کئے تاکہ زمین تمہیں مضطرب ومتزلزل نہ کرے اور روئے زمین پر ہر چلنے والے کو پھیلا دیا'' [1]

قرآن میں اسی مضمون کی یا اس سے نزدیک معنی کی دوسری آیات بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔ سب سے پہلی چیز جس کا ان آیات میں ہمیں سامنا ہوتا ہے، وہ زمین کے سکون وقرار میں پہاڑوں کا اثر ہے، کبھی تو اسے ''أَوْتَادًا'' (میخوں) سے تعبیر کیا گیا ہے کہ جنہیں عام طور پر دروازوں، صندوقوں، کشتیوں وغیرہ کے مختلف حصوں کو مضبوط بنانے یا خیموں کو ہواؤں کے مقابلے میں محکم بنانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اور کبھی ''أَنْ تَمِيدَ بِكُم'' سے تعبیر کیا گیا ہے کہ جو ''مَيَدان'' کے مادے سے ہلنے اور لرزنے کے معنی میں ہے۔ یعنی؛ پہاڑ زمین کو لرزنے اور مضطرب ہونے سے بچاتے ہیں۔ یہ وہ چیز ہے جو اُس زمانے میں کسی کو بھی معلوم نہیں تھی اور آج ہم اچھی طرح جانتے ہیں اس لحاظ سے پہاڑ کیا کردار ادا کرتے ہیں۔ کیونکہ:

اول یہ کہ پہاڑ درحقیقت ایک فولادی زرہ کی حیثیت رکھتے ہیں کہ جو زمین کے اردگرد پھیلے ہوئے ہیں اور زمین کی گہرائی میں ایک دوسرے کے ساتھ جو رابطہ اور تعلق رکھتے ہیں، اس کی وجہ سے ایک مکمل اور طاقتور سلسلہ تشکیل دیتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو سطح زمین جس کو نرم مٹی نے ڈھانپا ہوا ہے، بہت آسانی کے ساتھ چاند کے طاقتور جاذبہ سے متاثر ہوجاتی اور خشکی پر بھی سمندروں جیسے عظیم مدوجزر پیدا ہوجاتے جن سے ہر چیز لرز اُٹھتی اور دن رات زمین کی سطح پر اضطراب وحرکت اور لرزش ہوتی رہتی اور ہوسکتا تھا ہر عمارت تباہ ہوجاتی۔ لیکن محکم زرہ کا وجود، اس مدوجزر کو بہت حد تک کم کردیتا ہے۔

اس وقت بھی زمین کی محکم جلد ہر دن رات میں ۳۰ سینٹی میٹر اوپر نیچے ہوتی ہے، سمندروں کے برعکس جو کبھی تو مدوجزر کے نتیجے میں چند میٹر تک اوپر نیچے ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح سورج کی کشش کی وجہ سے بھی ہلکا سا مدوجزر پیدا ہوتا ہے۔ اگر سورج اور چاند اپنے راستے میں ایک ہی سمت پر واقع ہوجائیں اور یہ کشش ایک ہی سمت ہوجائے تو یہ حرکات مزید قوی اور شدید ہوجاتی ہیں۔ لیکن قرآن فرماتا ہے: پہاڑ زمین کی میخیں ہیں جو اُسے لرزنے سے بچاتی ہیں۔

دوم یہ کہ زمین کی اندر غیر معمولی مرکزی حرارت سے پیدا ہونے والا دباؤ مسلسل طبقات زمین پر پڑتا رہتا ہے، اگر یہ پہاڑ نہ ہوتے تو یہ (دباؤ) زمین کے مسلسل اضطراب کا سرچشمہ بن جاتا۔ اب آپ ذرا غور کریں کہ اگر مدوجزر کی حرکت کا یہ اُتراؤ چڑھاؤ اور اندرونی دباؤ زمین کی نرم جلد کی وجہ سے شدید ہوجاتا تو کیا ہم اس ثبات وسکون کا احساس کرسکتے تھے جس کا احساس اس وقت کررہے ہیں؟ کیا کوئی بھی گھر، سکونت اور ٹھکانہ استراحت وآرام کے ساتھ باقی رہتا۔

سوم یہ کہ آج یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ پہاڑ اپنے قوی پنجوں کے ذریعے زمین کے اردگرد کی ہوا کو اپنے ساتھ گھوماتے ہیں۔

---

[1] لقمان/۱۰

آپ فرض کیجئے کہ اگر کرۂ زمین اسی سرعت کے ساتھ کہ جس میں وہ ہر منٹ میں تقریباً تیس کلومیٹر اپنے گرد گھومتی ہے، حرکت کرے اور یہ پہاڑ نہ ہوں اور زمین کے گرد کی ہوا اس طرح حرکت نہ کرتی تو ہوا کے مالیکیول شدت کے ساتھ سطح زمین سے ٹکراتے، جس کے نتیجے میں مسلسل شدید طوفان آتے اور گرد و غبار اُٹھتا رہتا۔

اس کے علاوہ ایسی شدید حرارت پیدا ہوتی جو ہر چیز کو جلا کر رکھ دیتی (جیسے تیز رفتار ہوائی جہاز اگر فضا کے نچلے طبقات میں پرواز کرے تو اس کے پَر اس قدر گرم ہو جائیں کہ جس سے شدید ترین خطرہ پیدا ہو جائے۔ لہٰذا ہوائی جہاز مجبوراً بلندی پر جا کر حرکت کرتا ہے چونکہ فضا کے بالائی طبقات میں ہوا بہت زیادہ رقیق ہوتی ہے اور وہاں اُس کا ہوا کے ساتھ رابطہ کم ہو جاتا ہے جو حرارت کا باعث بنتی ہے۔)

جی ہاں! زمین پر پہاڑوں کی پستی و بلندی نے اس مشکل کو حل کر دیا ہے جو زمین کے عظیم فضائی حصے کو زمین کی گردش کے ساتھ ساتھ گھوماتے رہتے ہیں۔ اس کی مثال بالکل دندانے دار پہیہ جیسی ہے جو اپنے ساتھ دوسری اشیاء کو بھی گھوماتا رہتا ہے۔ بنابریں پہاڑ سورج و چاند کی کشش، اندرونی دباؤ، مسلسل شدید طوفانوں اور ناقابل برداشت حرارت کے مقابلے میں زمین اور اس پر ساکن لوگوں کے ثبات و سکون کا باعث ہیں۔

دوسری جانب مذکورہ بالا آیات میں پہاڑوں اور بارشوں کے بَرسنے اور زمینوں کے سیراب ہونے کے درمیان ایک گہرے تعلق کی طرف بھی اشارہ ہوا ہے۔ جن کے ذریعے ''ماءفرات'' (خوش گوار پانی) حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا قرآن مجید فرماتا ہے: ''اور ہم نے اس میں استوار و بلند پہاڑ قرار دیئے اور تمہیں ہم نے خوشگوار پانی پلایا''

یقیناً گزشتہ زمانے میں ان دونوں کے درمیان اس گہرے تعلق کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ لیکن آج ہم جانتے ہیں کہ ایک تو یہ پہاڑ پانی کے بخارات کے جمع ہونے کا سبب ہیں یعنی بادلوں کے پھیلنے کا باعث بنتے ہیں۔ دوسرا یہ اس کے ساتھ موجود ہوا کے سرد ہونے کا سبب بنتے ہیں۔ تیسرا یہ پہاڑ آسمان سے نازل ہونے والے بہت سے پانی کو برف کی شکل میں اپنے اندر محفوظ رکھتے ہیں اور زمین کی سطح پر پانی جاری ہونے کا ایک ایسا دائمی منبع ہیں جو آسمانی برکات کو ضائع ہونے سے بچاتا ہے۔ اس کے علاوہ پہاڑوں کے دامن اپنی ناہموار سطح کی بدولت پانی کی امواج کو اوپر نیچے کرنے کے بعد صحیح و سالم ہوا کے حوالے کرتے ہوئے اُسے صاف کر دیتے ہیں۔ جس سے ''ماءفرات'' (خوش گوار پانی) ہمیں نصیب ہوتا ہے۔

ان سب باتوں کے علاوہ ایک اور دلچسپ نکتہ جو زمین پر پہاڑوں کے بارے میں بعض ماہرین کی توجہ کا باعث بنا ہے، وہ یہ کہ پہاڑ زمینی دباؤ کے نشیب و فراز کے مقابلے میں (لنگر کا پہیہ) ''پانی کو کھینچنے والی چرخی'' کی حیثیت رکھتے ہیں جو سرعت اور تیزی میں تغیر و تبدل کو روکتی ہے۔ وضاحت: (لنگر کا پہیہ) ''پانی کو کھینچنے والی چرخی'' سے مراد وہ چیز ہے جو تمام وسائل اور مشینوں میں گھومنے والی حرکت کے مشابہ ہوتے ہیں۔ جو ایک بھاری پہیے کی شکل میں ایک محور پر نصب کی جاتی ہے تاکہ اس کی سرعت کو قابو میں رکھا جا سکے۔ مثلاً اگر گھومنے والی چیز پر باہر سے کوئی دباؤ پڑے اور پھر اچانک وہ دباؤ ختم ہو جائے تو وہ چیز اُچھل کر آگے کی طرف چلی جاتی ہے اور اُس مشین پر ایک بھاری ضرب لگتی ہے، لیکن اگر اس پر ایک چرخی لگی ہو تو وہ اُس دباؤ کو قابو میں رکھتی ہے اور بغیر کسی جھٹکے کے تدریجاً وہ دباؤ آگے بڑھتا ہے۔ (غور کیجئے)

دوسری طرف وحشت ناک طوفان کبھی زمین کے مخالف سمت اور کبھی موافق سمت میں چلنے لگتے ہیں جو اس کی حرکت اور گردش کو متاثر کر سکتے ہیں۔ جب طوفان کا دباؤ کم ہونے لگتا ہے تو ایک جھٹکے میں تبدیل ہو کر زمین پر موجود تمام چیزوں کو ایک سخت جھٹکا لگا تا ہے جس سے تمام چیزیں تباہ ہو سکتی ہیں۔لیکن پہاڑوں کی وجہ سے کہ جو ''کنویں پر لگی چرخی'' کی حیثیت رکھتے ہیں اس قسم کا کوئی جھٹکا نہیں لگتا چونکہ پہاڑ ہر قسم کا منفی و مثبت دباؤ اپنے اندر سہہ لیتے ہیں اور جھٹکوں سے بچا لیتے ہیں اور زمین کی متوازن حرکت کی حفاظت کرتے ہیں۔اور قرآنی الفاظ کے مطابق لرزنے (اور سکون وثبات کو ختم کرنے) کو روکتے ہیں۔

ان آیات کے نزول کی تاریخ کے دوران اُس دور کی دنیا میں ''لنگر کی چرخی'' اور اس کے اثرات کے بارے میں کچھ معلومات ہوتیں تو ان آیات کے یہ مفاہیم کسی قسم کے تعجب کا باعث نہ بنتے۔لیکن چونکہ اس زمانے میں ایسے مسائل کے بارے میں بالکل کوئی معلومات نہیں تھیں خاص کر ''جزیرۃ العرب'' میں فزکس وغیرہ کا نام ونشان تک نہیں تھا تو اس کے بعد ہمیں اس بات کا اقرار کرنا چاہیے کہ اس قسم کی آیات، قرآن مجید کا سائنسی معجزہ شمار ہوتی ہیں۔[1]

ایک دوسرا نکتہ یہ کہ قرآن پہاڑوں کی پیدائش کے بارے میں کبھی کہتا ہے:

وَاَلْقٰى فِى الْاَرْضِ رَوَاسِىَ

یعنی: ''اور اس نے زمین میں محکم اور مضبوط پہاڑوں کو گاڑ دیا ہے''۔[2]

ایک دوسری جگہ فرماتا ہے:

اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا ...وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِىَ

یعنی: ''یا وہ جس نے زمین کو آرام وقرار کی جگہ بنایا۔۔۔اور زمین کے لئے ثابت ومحکم پہاڑ بنائے''۔[3]

اس قسم کی الفاظ قرآن مجید میں بارہا آئے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ پہاڑوں کی خلقت، زمین کی تخلیق کے بعد ہوئی ہے۔ موجودہ سائنس نے بھی یہ بات ثابت کر دی ہے کہ بہت سے پہاڑ زمین پر پڑی ہوئی جھریوں (نشیب وفراز) کا نتیجہ ہیں اور کچھ پگھلے ہوئے آتش فشاں مواد کی وجہ سے اور کچھ بارشوں کی وجہ سے زمین کے سخت حصوں کے ساتھ نرم حصوں کے ڈھل (بہہ) جانے کے سبب وجود میں آئے ہیں۔اور یہ سب زمین کی خلقت کے بعد ہی ہوا ہے۔ یقیناً جب قرآن مجید کی یہ آیات نازل ہوئی ہیں تو ان مسائل میں سے کسی بھی چیز کے بارے میں معلومات موجود نہیں تھیں۔

---

[1] جو کچھ اوپر ذکر ہوا ہے یہ ایک تحقیقی مقالے کا خلاصہ ہے جو ''اثر کوہ ھادر آرامش زمین'' (مسئلہ چرخ لنگر در قرآن) کے عنوان سے دینی وعلمی مجلّے ''مکتب اسلام'' کے شمارہ: ۸، جلد ۱۳ (صفحہ ۶۸ تا ۷۳) میں شائع ہوا تھا مزید تفصیل کے لئے مذکورہ مقالے کی طرف رجوع کیجئے۔

[2] سورۂ نحل / ۱۵

[3] سورۂ نمل / ۶۱

۸۔قرآن میں پودوں کی زوجیت (نراور مادہ ہونا)

قرآن مجید کی پانچ آیتوں میں نباتات میں نراور مادہ کی طرف اشارہ ملتا ہے۔سورۂ لقمان کی آیت نمبر ۱۰ میں آیا ہے۔

وَاَنۡزَلۡنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنۡۢبَتۡنَا فِيۡهَا مِنۡ كُلِّ زَوۡجٍ كَرِيۡمٍ

یعنی: ''ہم نے آسمان سے پانی نازل فرمایا اوراس کے ذریعہ ہم نے روئے زمین پر مختلف قسم کے قیمتی نباتات کے جوڑے جوڑے اگائے''[1]

یہی مضمون سورۂ شعراء کی آیت ۷ اورسورۂ ق کی آیت ۷ میں بھی آیا ہے۔

سورۂ حج کی آیت نمبر ۵ میں فرمایا:

وَتَرَى الۡاَرۡضَ هَامِدَةً فَاِذَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡهَا الۡمَآءَ اهۡتَزَّتۡ وَرَبَتۡ وَاَنۡۢبَتَتۡ مِنۡ كُلِّ زَوۡجٍۢ بَهِيۡجٍ ۝۵

یعنی: ''تو دیکھے گا کہ زمین خشک اورمردہ ہوتی ہے مگر جونہی ہم اس پر بارش برساتے ہیں تواس میں زندگی پیدا ہوجاتی ہےاورطرح طرح کی ہری بھری لہلہاتی کھیتیاں اگاتی ہے''۔

سورۂ طہٰ کی آیت نمبر ۵۳ میں بھی آیا ہے:

وَّاَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ؕ فَاَخۡرَجۡنَا بِهٖۤ اَزۡوَاجًا مِّنۡ نَّبَاتٍ شَتّٰى ۝۵۳

یعنی: '' اورآسمان سے پانی برسایا جس کے ذریعے انواع واقسام کے نباتات (اندھیری خاک سے) نکالے''۔

گزشتہ اکثر مفسرین جب ان آیات پر پہنچے توانھوں نے''زوج'' کونباتات کی نوع اورصنف کے معنیٰ میں لیا ہے اور''ازواج'' کا معنیٰ''انواع''اور''اصناف'' کیا ہے۔چونکہ اُس زمانے میں نباتات کے بارے میں جوڑے ہونے کی بات اپنے مشہور معنیٰ میں پوری طرح متعارف نہیں ہوئی تھی۔یہ درست ہے کہ گزشتہ زمانے میں لوگوں نے کم وبیش اس حدتک سمجھ رکھا تھا کہ نباتات کی بعض قسمیں نرومادہ پر مشتمل ہیں اورنباتات کوثمرآور بنانے کے لئے تلقیح سے استفادہ کیا جاتا تھا۔

مخصوصاً کھجور کے درخت کہ جس میں نرومادہ کے بارے میں قدیم ایام سے لوگ جانتے تھے،لہٰذا اُسے تلقیح کے ذریعے ثمرآور کیا جاتا تھا۔لیکن باقاعدہ طور پرسب سے پہلے سویڈن کامشہور ماہرنباتات مسٹر''لینے''اٹھارویں صدی عیسوی میں یہ حقیقت دریافت کرنے میں کامیاب ہوگیا کہ نباتات کی دنیامیں تقریباً یہ ایک عام قانون ہے اورعام حیوانات کی طرح نباتات بھی نرومادہ کے نطفے کی آمیزش سے

---

[1] سورہ لقمان/۱۰

ثمر آور ہوتے ہیں (اوران کی نسل بڑھتی ہے) اور یہ پھل دیتے ہیں۔

لیکن ہم نے دیکھا کہ قرآن مجید نے اس سائنسدان سے بارہ صدیاں پہلے اس راز سے پردہ اُٹھا دیا تھا اور بہت سے مواقع پر نباتات میں زوجیت کے بارے میں اشارہ کیا ہے، لیکن جو لوگ اس حقیقت کو ظاہر کرنے کی جرائت نہیں رکھتے تھے، وہ زوجیت کی اس کے ظاہری کے معنی برخلاف تفسیر کرتے رہے ہیں۔ دلچسپ بات یہ کہ اس لحاظ سے نباتات میں فرق ہوتا ہے، اُن میں سے بہت سے نر و مادہ ایک ہی جانب ہوتے ہیں اور بعض میں نر درخت، مادہ درخت سے جدا ہوتے ہیں۔

آپ ایک پھول کو ہاتھ میں لیں، اُس کی پنکھڑیوں کو ایک طرف کریں اور پھول کے درمیان غور سے دیکھیں تو وہاں ایک ہنگامہ خیز دنیا ہے۔ درحقیقت وہاں ایک عالی شان بزم برپا ہے لیکن اس بزم میں کسی قسم کا شور وغل نہیں، مکمل خاموشی ہے اور خلاف قانون عمل نہیں ہو رہا۔ بہت ہی باریک اور لطیف ڈنڈیاں جو زرگل کی تھیلیوں کو اپنے ساتھ اُٹھائے ہوئے ہے ایک طرف لگی ہوئی ہیں اور ہوا چلنے سے ملنے لگتی ہیں اور زرگل کے ذرات کو پھول کے طبق پر چھڑکنے لگتی ہیں۔

اس زرگل کے دانے کہ جن میں سے ہر ایک دانہ ایک چھوٹا سا پودا شمار ہوتا ہے، بہت تیزی سے اپنی جڑیں پھیلا دیتا ہے اور طبق گل سے عبور کرنے کے بعد پھول کی تہہ میں خلوت گزین ہو کر مادہ نطفے کے ساتھ آمیزش کر کے پھول یا پھل کا بیج بنا دیتا ہے گویا پھول کی خوبصورت پنکھڑیاں اس عجیب وغریب بزم وصلت کی آرائش ہیں یا اس حجلہ گاہ کے پردے ہیں۔ اس بزم میں خوبصورت پروانوں اور شہد کی مکھیوں کو بھی دعوت دی جاتی ہے جو پھول کی تہہ میں پہلے سے تیار خاص شرینی کو تناول کرتی ہیں۔ یہ کتنی سہولت ہے کہ وہ ہمارا حصہ بھی لے آتی ہیں۔ یہ جو مختلف برتنوں میں شہد پڑا ہوتا ہے یہ وہی حصہ ہے جو شہد کی مکھیاں ہمارے لئے اس بزم سے لائی ہیں۔

بہرحال مختلف آیات میں نباتات میں زوجیت کے عمومی مسئلے کے بارے قرآن مجید کی تصریح میں اگر کوئی استثناء بھی ہے تو بہت کم اور ناچیز ہے (چونکہ ہر قانون کلی میں مستثنیٰ بھی ہوتا ہے) قرآن مجید نے اس اہم راز سے پردہ اُٹھایا ہے کہ جو اُس زمانے میں بھی اور اس کے بعد صدیوں تک علماء کی تیز بین آنکھوں سے پوشیدہ رہا ہے اور یہ خود ایک دلچسپ علمی معجزہ ہے۔

۹۔ قرآن اور عمومی زوجیت

سورۂ ذاریات کی آیت ۴۹ میں آیا ہے:

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿٤٩﴾

یعنی: ''اور ہم نے ہر چیز کے جوڑے خلق کئے ہیں تا کہ تم غور کرو اور سمجھو''

اور سورۂ یس کی آیت نمبر ۳۶ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

سُبْحٰنَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٣٦﴾

یعنی: ''منزہ ہے وہ ذات جس نے سے اگنے والی چیزوں کے اور خود انہی لوگوں کے اوران چیزوں کے جنھیں

یہ نہیں جانتے، سب کے جوڑے پیدا کئے ہیں“

یہ آیت بہت وضاحت کے ساتھ نباتات، انسانوں اور اُن چیزوں میں زوجیت کے مسئلہ کی وسعت کو بیان کر رہی ہے کہ جو علم بشر کی قلمرو سے باہر ہیں۔ بہت سے مفسرین کو یہاں پر زوجیت کا (جنسی لحاظ سے نر و مادہ کی شکل میں) حقیقی معنیٰ نہیں ملا تو اس کی دنیا کی مختلف مخلوقات کی اصناف کے معنیٰ میں تفسیر کی ہے کہ جو جفت جفت کی شکل میں ہیں۔ مثلاً دن رات، نور و ظلمت، دریا و صحرا، سورج و چاند، جنگ و صلح وغیرہ۔

لیکن آج ان دونوں آیتوں کی ایک بالکل صحیح تفسیر کی جا سکتی ہے، چونکہ سائنسی و علمی تحقیقات سے یہ حقیقت بخوبی ثابت ہو چکی ہے کہ دنیا کی تمام مخلوقات ”ایٹم“ نام کے ایک انتہائی چھوٹے سے جز سے تشکیل پائی ہیں اور گزشتہ زمانے میں ان اجزاء کو نا قابل تجزیہ چیز (اجزاء لا تتجزی) کے عنوان سے پہچانا جاتا تھا۔ اسی لئے ان کے لئے ایٹم (جو چیز توڑی نہ جا سکے) کا نام انتخاب کیا گیا ہے، لیکن آج یہی چیز انسانی علم و دانش کے ہاتھوں ٹوٹ چکی ہے اور اسی سے ایٹمی توانائی اور اس سے تعلق رکھنے والی صنعتیں وجود میں آ چکی ہیں۔

جب ایٹم کو توڑا گیا تو اُسے چند اجزاء سے مرکب پایا گیا جن میں سب سے اہم الکٹرونز (وہ ذرات کہ جو ایٹم کو گھوماتے ہیں اور منفی برقی بار کے حامل ہیں) اور ”پروٹونز“ ہیں (جو ایٹم کا مرکز اور مثبت برقی بار کا حامل ہے) اس طرح پوری کائنات کے ذرات میں زوجیت کا ایک حقیقی معنیٰ مل گیا۔ یعنی؛ دو ”نر“ و ”مادہ“، ”مثبت“ و ”منفی“ اور ”فاعل“ و ”قابل“ اشیاء ہیں۔ جن میں سے کسی چیز کو مستثنیٰ نہیں کیا جا سکتا۔ جبکہ (ان آیات کی) جو تفسیر سابقہ علماء نے کی ہے وہ نہ فقط مفہوم زوجیت کے مطابق نہیں بلکہ اس میں بہت سی چیزیں مستثنیٰ بھی ہو سکتی ہیں۔

بہر حال حقیقی جوڑے کے درمیان ایک طاقتور جاذبیت پائی جاتی ہے، اسی طرح دو اجسام میں دو مثبت و منفی برقی جاذبیت پائی جاتی ہے جو بہت حد تک جنسی کشش کے مشابہ ہے۔ حالانکہ دن و رات، نور و ظلمت، دریا و صحراء وغیرہ کے درمیان کسی قسم کی کشش نہیں پائی جاتی۔ دلچسپ بات یہ کہ بہت سے قدیم مفسرین نے بھی انہی آیات سے متاثر ہو کر صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ مذکورہ بالا آیات میں زوجین سے مراد نر و مادہ کی جنس ہی ہے اگرچہ اُنھوں نے اس کی زیادہ تفصیل ذکر نہیں کی [۱]۔

۱۰۔ قرآن جنین کے ارتقاء سے پردہ اُٹھاتا ہے

قرآن مجید میں توحید اور قیامت کے دلائل سے متعلق آیات میں بہت بامعنیٰ اشارے ملتے ہیں، جو انسان کی نطفہ سے تخلیق اور پھر جنین کے ارتقاء کے بارے میں ذکر ہوئے ہیں۔ جن میں سے بعض کو قرآن مجید کے سائنسی معجزات میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ منجملہ سورۂ

---

[۱] مجمع البیان میں ایک قدیم مفسر (ابن زید) سے نقل ہوا ہے کہ اُس نے آیہ مجیدہ ”خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ“ کی تفسیر میں کہا ہے: الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرُ وَالأُنثَى (مجمع البیان، ج۹، ص۱۶۰) یہ مطلب قتادہ سے آیہ مجیدہ: ”سُبْحَانَ الَّذِى خَلَقَ الْأَزْوَاجَ كُلَّهَا...“ کی تفسیر میں نقل ہوا ہے۔ (تفسیر قرطبی، ج۸، ص۵۴۷۰)

انسان (دھر) کی دوسری آیت ہے کہ جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ②

یعنی: ''ہم نے انسان کو ملے جلے نطفے سے پیدا کیا، ہم اس کو آزمائیں گے (اس لئے) ہم نے اس کو سننے والا اور دیکھنے والا قرار دیا ہے''

''نُطْفَة'' لغت میں صاف پانی یا کم پانی کے معنی میں ہے۔[1]

اور ''أَمْشَاج''، ''مشج'' (بروزن نسج یا بروزن سبَب) کی جمع ہے۔ جس کا معنی ''مخلوط شئی'' ہے۔ یہ نطفہ کسی چیز سے مخلوط ہے، اس بارے میں مفسرین نے بہت سے احتمالات ذکر کئے ہیں، کبھی تو انسان کے نطفے کو ''اسپرم'' اور ''اوول'' کی ترکیب کی طرف اشارہ جانا ہے اور کبھی انسان کی مختلف جسمانی یا روحانی صلاحیتوں (مثلاً خوبصورتی، بدصورتی، ذہانت، کم عقل ہونا وغیرہ) کی ترکیب کی طرف اشارہ ذکر کیا ہے اور کبھی انسان کے نطفے کو مختلف دھاتوں اور ان کی طرح کی چیزوں سے مرکب چیز کی طرف اشارہ کیا ہے۔

البتہ یہ سب کچھ ٹھیک ہے اور شاید اپنے زمانے کے لحاظ سے بہترین تفسیر تھی، لیکن یہ آیت کے مفہوم پر بطور صحیح منطبق نہیں ہوتا۔ کیونکہ سب سے پہلی بات تو یہ کہ ''امشاج'' جمع ہے اور اس کا دو چیزوں (اسپرم serm اور اوول ovum) پر اطلاق کرنا ظاہر کے خلاف ہے۔ دوسرا، جدا جدا انسانوں میں مختلف استعدادوں کا پایا جانا، امشاج کے معنی کے مطابق نہیں۔ اسی طرح نطفہ کا انواع واقسام کی دھاتوں سے ترکیب پانا بھی مناسب نظر نہیں آتا۔

کیونکہ یہ مرحلہ فقط نطفہ ہی میں منحصر نہیں ہے بلکہ تمام نامیاتی مخلوقات خواہ وہ انسان ہوں یا نباتات اور انواع واقسام کی غذائیں ہوں سب اسی مادے سے ترکیب شدہ ہیں۔ اس کے علاوہ کلمہ ''نطفہ'' کا اطلاق قرآن کی متعدد آیات میں بطور خصوص مرد کے نطفے پر ہوا ہے۔ مثلاً سورۂ قیامت کی آیت ۳۷ میں آیا ہے:

اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ۝۳۷

یعنی: ''کیا وہ اس منی کا نطفہ نہیں تھا جو رحم میں ڈالا جاتا ہے؟''

لیکن علم وسائنس کی ترقی اور علماء کی وسیع تحقیقات کے ذریعے آج یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ منی کے یہ ناچیز قطرے جنہیں دوسرے الفاظ میں ''نطفہ'' کہتے ہیں، جو بدن کے مختلف غدود سے خارج ہونے والے متعدد پانیوں سے ترکیب شدہ ہے۔ خاص طور پر پانچ غدود سے نکلنے والا پانی ایک دوسرے سے ملکر منی بناتا ہے اور وہ یہ ہیں: دو غدود وہ ہیں جن کا نام ''بیضہ'' ہے جو ''پروستات'' غدود کے نزدیک انڈوں کی تھیلی میں ہوتے ہیں۔ اور دوسرا خود ''پروستات'' غدود ہے۔ اسی طرح ''کوپر'' اور ''لیترہ'' نام کے دو غدود ہیں کہ جو

[1] معجم مقاییس اور مفردات میں پہلے معنی اور لسان العرب میں دوسرے معنی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

پیشاب کی نالی کے ساتھ ہوتے ہیں۔[1]

یہ پانچ قسم کے پانی ایک گہرے حساب وکتاب کے مطابق ایک دوسرے سے ملتے ہیں جس سے حیات بخش مادہ تشکیل پاتا ہے جسے ''نطفہ'' کہا جاتا ہے۔اس فرانسیسی سائنسدان کا خیال ہے کہ قرآن میں استعمال ہونے والی تعبیر ''امشاج'' اسی باریک نکتے کی طرف اشارہ ہے۔ جو نزول قرآن کے زمانے میں اُس زمانے کے علماء پر مخفی اور پوشیدہ تھا۔قابل توجہ یہ کہ اسی آیت کے ذیل میں فرمایا:

فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًاۢ بَصِيْرًا ۝۲

یعنی: ''ہم نے اس کو سننے والا اور دیکھنے والا قرار دیا ہے''

کانوں کی نعمت، آنکھ کی نعمت سے پہلے ذکر ہوئی ہے یہ شاید اس لئے ہو کہ ماہرین کے بقول نومولود کی جو حس سب سے پہلے کام کرنا شروع کرتی ہے وہ یہی سننے کی حس ہے۔ جو پیدائش کے شروع ہی میں آوازیں سننے کے لئے آمادہ ہو جاتی ہے بلکہ اس سے بھی پہلے جنین کی صورت میں بھی تھوڑی بہت فعال ہوتی ہے۔لیکن آنکھ ایک مدت بعد (شاید دو ہفتوں کے بعد) دیکھنے کے لئے آمادہ ہوتی ہے۔ چونکہ رحم مادر کے تاریک ماحول میں بند آنکھیں کسی قسم کے نورانی شعاعوں کو دیکھنے کے لئے تیار نہیں ہوتیں۔ یہی وجہ ہے نومولود کی آنکھیں پیدائش کے بعد بھی بند ہوتی ہیں اور آہستہ آہستہ روشنی کی عادی بنتی ہیں۔

دوسری طرف سورۂ مرسلات کی آیت نمبر ۲۰ تا ۲۳ میں قرآن مجید فرماتا ہے:

اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۝۲۰ فَجَعَلْنٰهُ فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝۲۱ اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ۝۲۲ فَقَدَرْنَا ۖ فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ ۝۲۳

یعنی: ''کیا ہم نے تمہیں پست وحقیر پانی سے پیدا نہیں کیا؟ پھر ہم نے اسے ایک محفوظ اور آمادہ قرار گاہ میں ٹھہرایا، ایک معین مدت تک کے لئے، ہم اس پر قدرت رکھتے تھے، پس ہم کیسے اچھے قدرت والے ہیں''

آج جنین کے ماہرین نے جنین کے مختلف مراحل اور تبدیلیوں کے بارے میں بنائی جانے والی حقیقی فلموں کے ذریعے اپنے گہرے مطالعات اور مشاہدات انجام دیئے ہیں، جس سے وہ اس نکتے تک پہنچے ہیں کہ سپرم اور اوول کی ترکیب ماں کے رحم سے باہر اُس تک پہنچنے والے راستوں میں انجام پاتی ہے۔اس کے بعد نطفہ منعقد ہو کر اپنے اصلی ٹھکانے یعنی؛ رحم مادر کی طرف بڑھ جاتا ہے اور اس کی دیواروں سے چپک جاتا ہے۔

---

[1] ''ڈاکٹر بوکائی'' کی تالیف ''مقایسہ ای میان تورات وانجیل وقرآن وعلم'' ترجمہ ''مہندس ذبیح اللہ دبیر'' صفحہ ۲۷۱ سے اقتباس۔ یاد رہے کہ یہ فرانسیسی ڈاکٹر جب ان کتابوں کے درمیان موازنہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو قرآن سے بہت زیادہ متاثر ہو جاتا ہے اور جب قرآن کے ترجے اس کی پیاس نہیں بجھا سکتے تو عربی ادب سیکھنا شروع کر دیتا ہے اور جب عربی زبان میں مہارت حاصل کر لیتا تو پھر ترجموں کی مدد کے بغیر ضروری مطالب براہ راست قرآن سے حاصل کرتا ہے۔

مذکورہ بالا آیت میں بھی بہت واضح طور پر یہی مطلب دیکھا جاسکتا ہے۔سب سے پہلے انسان کی خلقت کی بات کی گئی ہے پھر اُس کے رحم مادر جیسے ٹھکانے میں قرار پانے کی بات ہوئی ہے (توجہ رہے کہ عربی زبان میں ''ثُمَّ'' عام طور پر کچھ فاصلے کے ساتھ ترتیب کے لئے استعمال ہوتا ہے)اس طرح جو چیز اُس زمانے اور اس کے صدیوں بعد تک مخفی رہی ہے وہ قرآن میں (۱۴ سو سال پہلے) ذکر ہوچکی ہے۔

''قَرَارٍ مَكِينٍ'' (محفوظ ترین مقام) بھی ایک بہت ہی با معنی تعبیر ہے کہ یقیناً اُس زمانے میں اس کے مختلف پہلو پوشیدہ رہے ہوں گے اور آج ہم جانتے ہیں کہ ''رحم'' کی خلقت میں کتنے اہم نکات سے استفادہ کیا گیا ہے کہ جنہوں نے اُسے جنین کے لئے ایک محفوظ ترین مقام کی شکل دے دی ہے۔اُن تین پردوں کے علاوہ کہ جو جنین کو ہر طرف سے گھیرے ہوتے ہیں (یعنی؛ ماں کا پیٹ، رحم مادر اور وہ مخصوص تھیلی جس میں جنین ہوتا ہے) ہر وہ جنین کہ جو ایک ایسی تھیلی میں تیر رہا ہوتا ہے کہ جس میں چپچپا سا پانی بھرا ہوتا ہے جہاں بغیر کسی چیز پر تکیہ کئے بے وزنی کی کیفیت میں ہوتا ہے اور بہت سی ایسی ضرباں کو برداشت کرلیتا ہے کہ جو ماں کے بدن پر پڑتی ہیں۔

چونکہ وہ ضربیں درحقیقت اُسی ''پانی کی تھیلی'' پر پڑتی ہیں نہ کہ خود جنین پر، اور دوسرے الفاظ میں اُس تھیلی اور اس میں بھرے ہوئے پانی کو ضربات سے محفوظ رکھنے والا آلہ کہیں کہ جو موٹر کار کے نرم اسپرنگ کی طرح ہوا کی سنگیں ضربوں اور ناہموار راستوں کے جھٹکوں کو غیر مؤثر بنا دیتا ہے۔اس کے علاوہ جنین کے اعضائے بدن کو ہر قسم کے دباؤ سے بچاتا ہے جو اس نرم و لطیف جسم کے لئے یقیناً نقصان دہ ثابت ہوسکتے ہیں۔

اس کے علاوہ اسی نظام کی وجہ سے باہر کی سردی و گرمی بھی جنین تک نہیں پہنچ سکتی چونکہ اُسے اسی پانی سے بھری تھیلی سے ہی گزرنا ہوتا ہے جو اسے معتدل بنا دیتی ہے جس کے بعد وہ جنین تک پہنچتی ہے۔ورنہ ممکن تھا ماں جب غسل کرتی تو سرد یا گرم پانی کی وجہ سے جنین کی حالت مکمل طور پر خراب ہوجاتی۔

ان سب باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ''قَرَارٍ مَكِينٍ'' (محفوظ ترین مقام) کا مفہوم ہمارے لئے مکمل طور پر واضح ہوجاتا ہے۔اس کی وجہ سے نہ صرف جنین رحم مادر میں ایک محفوظ ترین مقام سے بہرہ مند ہوتا ہے بلکہ یہی امن و سکون اور حفاظت اُس کی پیدائش کے مراحل میں بھی جاری رہتی ہے۔جدید مفسرین کے بقول جس مخصوص سیال مادے میں جنین تیر رہا ہوتا ہے، وہ پیدائش کے وقت رحم کے منہ کے پھیلنے اور جنین کے عبور کرنے والے راستے کو بیماریوں سے محفوظ رکھنے کا باعث بنتا ہے۔جس کی وجہ سے جنین انتہائی آسانی اور حفاظت کے ساتھ وہاں سے گذر کر دنیا میں آجاتا ہے اور انواع و اقسام کے جراثیموں سے محفوظ رہتا ہے۔[1]

یہ نکتہ بھی قابل اہمیت ہے کہ قرآن مجید جب جنین کے ارتقاء کے مراحل کو بیان کرتا ہے تو سورۂ مومنون کی آیت نمبر ۱۴ میں فرماتا ہے:

ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ

---

[1] اقتباس از تفسیر مراغی، ج ۱۸، ص ۱۱

لَحۡمًا ٭ ثُمَّ اَنۡشَاۡنٰهُ خَلۡقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِيۡنَ ؕ﴿۱۴﴾

یعنی: ''پھر ہم نے نطفہ کو علقہ (جمے ہوئے خون) کی صورت دی اور علقہ کو مضغہ (گوشت کے لوتھڑے جیسی چیز) کی شکل بخشی اور پھر ہم نے اس لوتھڑے کو ہڈیوں کی شکل دی، پھر ہم نے ہڈیوں پر گوشت چڑھایا۔ اس کے بعد ہم نے اس کو ایک نئی صورت میں پیدا کیا، وہ خدائے عظیم ہے جو خلق کرنے والوں میں سب سے بہتر ہے''

دلچسپ بات یہ کہ ''علم جنین'' نے آج ثابت کر دیا ہے کہ جب جنین، علقہ اور مضغہ کا مرحلہ طے کر لیتا ہے تو اس کے تمام خلیے (Cell) ہڈیوں کے خلیوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور اس کے بعد تدریجاً ہڈیوں پر گوشت اور عضلات کا غلاف چڑھتا ہے۔ (یہ بات بہت ہی اہم اور قیمتی فلموں کے ذریعے بھی ثابت ہو چکی ہے۔ جن میں جنین کے ارتقاء کے تمام مراحل کی فلم بندی کی گئی ہے) یہ بالکل وہی چیز ہے جو مذکورہ بالا آیت میں ذکر ہوئی ہے جس میں فرمایا گیا ہے: ''پھر ہم نے اس لوتھڑے کو ہڈیوں کی شکل دی، پھر ہم نے ہڈیوں پر گوشت (کا لباس) چڑھایا'' اور یہ قرآن مجید کے سائنسی معجزات میں سے ایک ہے چونکہ اُس زمانے میں ''تشریح جنین'' نام کے علم کا کوئی وجود نہیں تھا خاص کر جزیرۂ عرب میں معمولی ترین سائنسی مسائل کے بارے میں بھی کوئی معلومات نہیں تھیں۔ [۱]

۱۱۔ قرآن میں زمینی فضا کے اہم اثرات کا ذکر

سورۂ انبیاء کی آیت نمبر ۳۲ میں آیا ہے:

وَجَعَلۡنَا السَّمَآءَ سَقۡفًا مَّحۡفُوۡظًا ۖۚ وَّهُمۡ عَنۡ اٰيٰتِهَا مُعۡرِضُوۡنَ ﴿۳۲﴾

یعنی: ''ہم نے آسمان کو محفوظ چھت قرار دیا، لیکن وہ اس (وسیع آسمان میں موجود توحید) کی نشانیوں سے روگرداں ہیں''

یہ کہ آسمان کیسے محفوظ چھت ہے، اس بارے میں گزشتہ مفسرین نے مختلف نظریات ذکر کئے ہیں۔ کبھی کہا ہے: شیاطین کے نفوذ سے محفوظ ہے یا زمین پر گرنے سے محفوظ ہے یا زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ نابود و ختم ہونے سے محفوظ ہے۔ [۲]

ان مبہم تفاسیر کی وجہ یہ ہے کہ اُس زمانے میں انسان آسمان کے بارے میں گہری معلومات نہیں رکھتا تھا۔ جب جدید ہیئت (علم نجوم) پیدا ہوا اور ثابت ہو گیا کہ تمام کُرات اس بیکراں فضا میں تیر رہے ہیں اور کسی چھت کا وجود نہیں ہے تو اس وقت بعض جدید مفسرین پر اس آیت کا مفہوم مزید پیچیدہ ہو گیا، یہاں تک کہ بعض نے کہا اس سے مراد یہ ہے کہ آسمان وہی محفوظ چھت ہے جو نظام خلقت میں ہر قسم

---

[۱] سید قطب نے ''فی ظلال'' کی جلد ۶، ص ۱۶ میں میں بھی اسی مطلب کی طرف اشارہ کیا ہے اور حال ہی میں جنین کے مختلف مراحل کے بارے میں بننے والی ایک عجیب مستند فلم میں بھی ہم نے اس مطلب کا مشاہدہ کیا ہے۔

[۲] مجمع البیان، جلد ۷، صفحہ ۴۶، تفسیر کبیر فخر رازی، جلد ۲۲، صفحہ ۱۶۵، اور دوسری تفاسیر۔

کے خلل کو روکتا ہے۔

اس طرح چھت (سقف) نے ایک مجازی معنیٰ اختیار کرلیا اور یہ ایک تشبیہ اور کنائے کی صورت میں استعمال ہونے لگا۔لیکن انسانی علم و دانش میں اسی طرح ترقی ہوتی رہی اور پھر جب پوری زمین کی جوّ (فضا) کے بارے میں ماہرین کو جدید معلومات حاصل ہوئیں تو اس وقت آیت کا مفہوم بہت زیادہ واضح ہو گیا اور پتا چل گیا کہ واقعاً یہاں ایک محفوظ چھت بھی ہے، جو اپنے حقیقی معنوں میں چھت تھا اور حقیقی معنوں میں محفوظ بھی ہے۔

وضاحت: ہوا کے ایک عظیم حصے اور تہہ نے اس کرۂ زمین کو چار طرف سے گھیرا ہوا ہے جسے ''زمین کی فضا'' کہا جاتا ہے۔اس کی موٹائی کئی سو کلومیٹر تک ہے۔یہ تہہ بظاہر لطیف ہے جو ہوا اور بعض دوسری گیسوں سے تشکیل پائی ہے اور اپنی موٹائی کی وجہ سے اس قدر محکم اور پائیدار ہے کہ بعض ماہرین کے بقول ایک فولادی چھت کی مانند دس میٹر کی موٹائی رکھتا ہے۔یہی محفوظ چھت (آسمان) کرۂ زمین کو انواع واقسام کے خطرات سے محفوظ رکھتا ہے۔

ایک جانب سے دن رات میں ہونے والے سنگِ ''شہاب'' کی بمباری سے روکتا ہے جو بے حد تیز رفتاری کے ساتھ زمین کی طرف آتے ہیں اور جہاں بھی ٹکرائیں بہت زیادہ خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔اس مسئلے کی اہمیت اس لئے مزید بڑھ جاتی ہے کہ بعض ماہرین کے بقول ہر شب وروز میں لاکھوں ''شہاب'' زمین کی طرف آتے ہیں۔یہ شہاب پوری سرعت کے ساتھ آتے ہیں لیکن اُنہیں ''جو زمین'' کی پائیداری کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس کی وجہ سے وہ جلا دینے والی گرمی سے مشتعل ہو کر خاکستر میں تبدیل ہو جاتے ہیں، یہ خاکستر بہت آہستگی سے زمین پر بکھر جاتی ہے اور بعض اوقات یہ پتھر اس قدر بڑے ہوتے ہیں کہ (کچھ حصہ جل جانے کے بعد) جوِ زمین سے عبور کر کے زمین کے کسی نقطے سے جا ٹکراتے ہیں، جس سے خوفناک تباہی وجود میں آتی ہے۔اس قسم کے واقعات تاریخ میں واقع ہو چکے ہیں۔ یہ (واقعات) گویا غافل انسانوں کے لئے ایک تنبیہ کی حیثیت رکھتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ اس محفوظ چھت (آسمان) کو خلق نہ کرتا تو آپ سب لوگ دن رات اس خطرناک بمباری کی زد میں ہوتے اور تمہاری زندگی میں آرام وسکون نام کی کوئی چیز نہ ہوتی۔

دوسری طرف ہم جانتے ہیں سورج سے ہمیشہ ماورائے بنفش نام کی شعاعیں نکلتی رہتی ہیں (یہ وہی شعاعیں ہیں کہ جو تجزیہ نور کے وقت بنفشی رنگ کے اوپر ہوتی ہیں اور ہماری آنکھ سے دیکھی نہیں جاسکتیں) اس شعاع کی کم مقدار نہ صرف نقصان دہ نہیں ہوتی بلکہ بہت ہی مفید بھی ہے۔خاص کر جراثیم کو مارنے میں بہت زیادہ گہری تاثیر رکھتی ہے، لیکن اگر ضرورت سے زیادہ ہو جائے تو انسان کو احساس ہوئے بغیر بدن کو جلا دیتی ہے۔(اسی وجہ سے موسم گرما میں خط استوا کے قریبی علاقوں میں جلد، سر، چہرے اور بدن پر چھالوں اور جلن کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔

چونکہ یہاں سورج سیدھا چمکتا ہے اور ہوا کے بہت کم تہہ سے عبور کرتا ہے جس کی وجہ سے مکمل طور پر اُس کا تصفیہ نہیں ہو پاتا) اب اگر یہ محفوظ چھت یعنی؛ ''زمین کی فضا'' نہ ہوتی تو کوئی بھی انسان حتیٰ ایک لحظے کے لئے بھی سورج کی روشنی کے سامنے کھڑا نہ ہوسکتا۔ایک اور طرف سے دیکھیں تو ''کیہانی شعاعوں'' کے نام کے کچھ مہلک قسم کے سایے ماورائے منظومہ شمسی سے نکل کر زمین کی طرف رواں دواں

ہیں۔ ''زمین کی فضا'' کا کچھ حصہ جو''اوزن (Ozone)''[1] کی تہہ کہلاتا ہے۔

ان مہلک شعاعوں کو روکتا ہے اور ایک محفوظ چھت کی مانند اس کے مقابلے میں پائیداری دکھاتا ہے۔ حال ہی میں کچھ مشینوں سے اُٹھنے والی زہریلی گیسوں کے سبب ''اوزن'' کی تہہ میں سوراخ ہوجانے کی وجہ سے ماہرین بہت زیادہ پریشان ہوچکے ہیں۔ چونکہ یہ گیسیں اس کو بہت زیادہ نقصان پہنچاسکتی ہیں۔ یہ پریشانی اس قدر زیادہ ہے کہ دنیا کے تمام دانشور اور حکمران اس قسم کی آفات سے بچنے کے لئے بین الاقوامی سطح پر قانون بنانے کی سوچ رہے ہیں۔

آج ہم اس ''محفوظ چھت''، یعنی؛ ہوا کی اس عظیم تہہ کے عجیب وغریب اثرات کو جانتے ہیں لیکن ہوسکتا ہے مستقبل میں اس سلسلے میں مزید اہم حقائق سامنے آجائیں۔ یہاں پر ہوسکتا ہے یہ سوال پیدا ہو کہ کیا ہم ''زمین'' کی فضا کو آسمان کہہ سکتے ہیں اور کیا کلمہ ''سماء'' کا اطلاق اس پر ہوسکتا ہے؟ کیا ''سماء'' آسمانی کرات، منظوموں اور کہکشاؤں کے معنیٰ میں نہیں ہے؟

اس سوال کے جواب میں عرض ہے کہ اتفاق سے قرآن مجید نے بارہا اس کلمے کا اطلاق ''زمین کی فضا'' کے علاقے پر کیا ہے۔

منجملہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۲ میں آیا ہے:

وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ

یعنی: ''اور آسمان سے پانی برسایا پھر (خدا نے) پانی کے ذریعے پھلوں کو پیدا کیا تاکہ وہ تمہاری روزی بن جائیں''

یہی مضمون سورۂ بقرہ کی آیت ۱۶۴، سورۂ انعام کی آیت ۹۹، سورۂ اعراف کی آیت ۹۶، سورۂ یونس کی آیت ۲۴، سورۂ ہود کی آیت ۴۴، سورۂ رعد کی آیت ۱۷ اور بہت سی دوسری آیات میں بھی آیا ہے۔ سورۂ نحل کی آیت ۷۹ میں اس معنیٰ سے متعلق ایک اور واضح نمونہ دیکھا جاسکتا ہے جس میں فرمایا:

اَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِيْ جَوِّ السَّمَآءِ ؕ

یعنی: ''کیا انہوں نے ان پرندوں پر نظر نہیں ڈالی جو فضائے آسمانی میں مسخر ہیں (اور بغیر گرے پرواز کرتے ہیں؟)''

۱۲۔ قرآن اور زمین کی فضا

سورۂ انعام کی آیت ۱۲۵ میں آیا ہے:

[1] اوزن: ایک آسمانی رنگ کی متحرک اور گہری بُو رکھنے والی گیس ہے، جو شدید ترین آکسیجن کے اثرات رکھتی ہے۔ جب بجلی چمکتی ہے تو آکسیجن بناتی ہے اور رنگ صاف کرنے کے لحاظ سے پانی اور ہوا کو صاف کرنے کے لئے استعمال ہوتی ہے (دائرۃ المعارف دھخدا)

فَمَنۡ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنۡ يَّهۡدِيَهٗ يَشۡرَحۡ صَدۡرَهٗ لِلۡاِسۡلَامِ‌ۚ وَمَنۡ يُّرِدۡ اَنۡ يُّضِلَّهٗ يَجۡعَلۡ صَدۡرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِى السَّمَآءِ‌ؕ كَذٰلِكَ يَجۡعَلُ اللّٰهُ الرِّجۡسَ عَلَى الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ﴿۱۲۵﴾

یعنی: ''جس شخص کے لئے خدا چاہتا ہے کہ ہدایت کرے اس کے سینہ کو (اسلام قبول کرنے کے لئے) کشادہ کردیتا ہے اور جس شخص کو (اس کے برے اعمال کی وجہ سے) گمراہ کرنا چاہے اس کے سینہ کو اس طرح تنگ کردیتا ہے گویا وہ آسمان پر چڑھ رہا ہے، اس طرح خدا ایسے افراد کے لئے پلیدہ قرار دیتا ہے جو ایمان نہیں لاتے''

آسمان پر چڑھنے سے سینہ کی تنگی کا کیا تعلق ہے؟ یہ وہ سوال ہے کہ جس کا سابقہ مفسرین نے کوئی صحیح جواب نہیں دیا۔ بہت سے مفسرین کا کہنا ہے: اس سے مراد یہ ہے کہ جس طرح آسمان پر چڑھنا مشکل یا ناممکن ہے، اسی طرح ہٹ دھرم، جاہل اور متعصب کافروں کا ایمان لانا بھی مشکل ہے۔[1]

جبکہ زمین پر بہت سے مشکل اور محال کام ہیں جن کو کسی تشبیہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اس تفسیر کے لئے تقدیر میں کسی جملے کی ضرورت ہے، وہ یہ کہ ایمان لانا۔ آسمان پر چڑھنے کی مانند ہے جبکہ قرآن فرمارہا ہے: ''اس کے سینہ کو اس طرح تنگ کردیتا ہے گویا وہ آسمان پر چڑھ رہا ہے'' کبھی کہا گیا ہے: اس سے مراد یہ ہے کہ کفار کا یہ گروہ ایمان سے اس شخص کی طرح دور ہوجاتا ہے جو کرۂ زمین سے دور ہوکر آسمان کی طرف چلا جاتا ہے۔[2]

اس تفسیر کا بھی آیت کے مضمون سے عدم تناسب بہت زیادہ واضح ہے۔ لیکن عصر حاضر کے سائنسی انکشافات کو دیکھیں تو اس آیت کی تفسیر کچھ اس طرح کی جاسکتی ہے کہ جو ہر لحاظ سے مناسب ہے، جس کی وضاحت یہ ہے کہ آج یہ ثابت ہوچکا ہے کہ کرۂ زمین کے اطراف کی ہوا اس زمین کے قرب جوار میں تو بالکل نتھری ہوئی اور انسانی تنفس کے لئے آمادہ ہے

چونکہ اس میں کافی آکسیجن موجود ہے، لیکن ہم جتنا اوپر کی طرف چڑھتے چلے جائیں ہوا اتنی ہی زیادہ رقیق اور کم ہوجاتی ہے اور اس کی آکسیجن کی مقدار کم سے کم تر ہوتی چلی جاتی ہے، اس حد تک کہ اگر ہم (آکسیجن کے ماسک کے بغیر) زمین کی سطح سے دس کلو میٹر اوپر کی طرف چلے جائیں تو ہمارے لئے سانس لینا ہر لحظہ مشکل سے مشکل تر ہوتا چلا جائے گا اور اگر ہم برابر اوپر کی طرف بڑھتے رہیں تو تنگی نفس اور آکسیجن کی کمی ہماری بے ہوشی کا سبب بن جائے گی، بنابریں سینے کی تنگی اور آسمان کی طرف صعود (چڑھنے) میں ایک

---

[1] مذکورہ آیت کے ذیل میں دیکھئے: مجمع البیان، روح البیان، قرطبی اور دوسری تفاسیر

[2] روح البیان، جلد ۳، صفحہ ا

قریبی تعلق پایا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جو اُس زمانے میں کسی کے لئے ثابت نہیں تھی۔ [۱]

لیکن آج یہ سب کے لئے واضح ہو چکا ہے اور بارہا ہم نے ہوائی جہاز پر سوار ہوتے وقت ہوائی جہاز کی ایئر ہوسٹس سے یہ اعلان سنا ہے کہ ہوائی جہاز کے اندر کی ہوا ایک خاص سسٹم کے مطابق ہے، اگر اُس میں کوئی خلل واقع ہو تو جب تک ہوائی جہاز فضا کے نچلے حصے کی طرف نہیں پہنچتا، آکسیجن کے ماسک سے استفادہ کرنا چاہیے۔

اس کے علاوہ اس آیت کے اس معنیٰ اور آیت کی تفسیر میں تعلق بھی بالکل واضح ہے جو درحقیقت معقول کو محسوس سے تشبیہ دینے کے مترادف ہے، کیونکہ یہاں اسلام کو قبول کرنے میں ضدی وہٹ دھرم قسم کے گمراہ افراد کی تنگ نظری، ہٹ دھرمی، تعصب اور فکری جمود کو آکسیجن کی کمی سے پیدا ہونے والی سانس کی تنگی سے تشبیہ دی گئی ہے جو آسمان کی طرف صعود کرنے والے شخص کے لئے پیدا ہو جاتی ہے۔

ہم اس موضوع کو، اس آیت کی تفسیر میں (مشہور مفسر قرآن) مراغی کے بیان پر ختم کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں: ''اے خدایا! تو پاک ومنزہ ہے، تیرے قرآن کریم میں ایک مسئلہ بیان ہوا ہے کہ جس کے راز سے انسان ناواقف تھا، اور اُس کی حقیقت تک نہیں پہنچا تھا یہاں تک کہ چودہ صدیاں گذر گئیں اور آسمان پر پرواز کے فن میں ترقی ہونے لگی اور ہوائی جہاز کے پائلٹ نے جو کچھ تیری کتاب میں نازل ہوا ہے، اس کی سچائی کو دریافت کر لیا اور سائنسی علوم نے ثابت کر دیا کہ فضا کے مختلف حصوں میں ''ہوا کا دباؤ'' بھی مختلف ہوتا ہے۔ اور یہ واضح ہو گیا ہے کہ فضا کے بالائی حصوں میں ہوا بہت زیادہ رقیق ہوتی ہے اور انسان جس قدر اوپر کی طرف جاتا ہے اُس کو ہوا (آکسیجن) کی زیادہ ضرورت محسوس ہوتی ہے اور وہ سانس لینے میں تنگی کا احساس کرتا ہے۔

چونکہ وہاں پر اُس کی ضرورت کے مطابق آکسیجن نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ بعض اوقات اُسے سانس لینے کے لئے مصنوعی وسیلے کی ضرورت پڑ جاتی ہے تاکہ اُسے فضا کے اُن طبقات کی طرف پرواز کے لئے مدد مل سکے۔ ان آیات اور انہی جیسی دوسری آیات کی تفسیر سابقہ مفسرین کے بس سے باہر تھی چونکہ وہ اس کے اسرار سے آگاہ نہیں تھے۔

لیکن اب جدید سائنسی انکشافات اور علوم وفنون کی پیش رفت کی وجہ سے اس کی حقیقت ہمارے لئے ثابت ہو چکی ہے۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ دین وعلم دو مخلص بھائی ہیں جنھوں نے ایک ہی جڑ سے نشوونما حاصل کی ہے۔ جی ہاں! جس قدر علم وسائنس ترقی کرے گی، اُسی قدر مسائل ہمارے لئے واضح ہوتے جائیں گے جو گذشتہ علماء پر مخفی تھے۔ [۲]

۱۳۔ قرآن میں بارش اور اولے برسانے کا سبب

---

[۱] یہ درست ہے کہ پہاڑ پر چڑھتے وقت بعض اوقات انسان کو سینے میں سانس کی تنگی کا احساس ہونے لگتا ہے اور یہ بات زمانہ قدیم سے واضح تھی لیکن یہ سب بدن کی شدید محنت ومشقت کی وجہ سے ہوتا ہے لہٰذا، ہموار راستے پر دوڑتے وقت بھی یہ حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ قرآن مجید کا کہنا ہے: سینے کی تنگی آسمان پر صعود (چڑھنے) کی وجہ سے ہوتی ہے نہ کہ شدید جسمانی محنت ومشقت سے۔

[۲] تفسیر مراغی، جلد ۸، صفحہ ۲۵

سورۂ نور کی آیت ۴۳ میں آیا ہے:

اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزۡجِىۡ سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيۡنَهٗ ثُمَّ يَجۡعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَى الۡوَدۡقَ يَخۡرُجُ مِنۡ خِلٰلِهٖ ۚ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ جِبَالٍ فِيۡهَا مِنۡۢ بَرَدٍ فَيُصِيۡبُ بِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ وَيَصۡرِفُهٗ عَنۡ مَّنۡ يَّشَآءُ ؕ يَكَادُ سَنَا بَرۡقِهٖ يَذۡهَبُ بِالۡاَبۡصَارِ ﴿۴۳﴾

''کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ بادلوں کو آہستہ آہستہ چلاتا ہے۔ پھر انھیں باہم جوڑ دیتا ہے، پھر انھیں تہہ دار بنا دیتا ہے، پھر تو دیکھتا ہے کہ اُس سے بارش کے قطرے ٹپکنے لگتے ہیں اور آسمانوں میں جو پہاڑ ہیں، خدا ان سے اولے نازل کرتا ہے، وہ جسے چاہتا ہے اُن کے ذریعے نقصان پہنچاتا ہے اور جسے چاہتا ہے اُن کے نقصان سے بچا لیتا ہے، قریب ہے کہ ان (بادلوں کی) بجلی کی چمک آنکھوں (کی بینائی ہی) کو لے جائے''[۱]

اس آیت میں مختلف الفاظ استعمال ہوئے ہیں کہ جن کے متعلق سابقہ زمانے میں زیادہ گہری معلومات نہیں تھیں۔ ''یُزجی'' مادۂ ''اِزجاء'' سے ہے جو اصل میں آہستہ آہستہ اور نرمی کے ساتھ منتشر چیزوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر چلانے کے معنیٰ میں ہے۔ راغب ''مفردات'' میں لکھتے ہیں ''تَزجِیہ'' مرتب کرنے اور ایک ساتھ کرنے کے لئے چلانے کے معنیٰ میں ہے۔ اور قرآن مجید نے سمندری ہواؤں کے ذریعے کشتیوں کے چلنے کے لئے یہ کلمہ استعمال کیا ہے۔ ''رُکام'' (بروزن ''گلام'') ایسی چیزوں کے معنیٰ میں ہے کہ جو ایک دوسرے کے اوپر چڑھی ہوئی اور تہہ در تہہ ہوں۔ ''وَدق''، (بروزن ''شرق'') بہت سے مفسرین کے مطابق یہ بارش کے قطروں کے معنیٰ میں ہے اور بعض کے نزدیک یہ برق کے معنیٰ میں ہے۔ ''بَرَد'' (بروزن ''سبد'') اولوں اور بارش کے جمے ہوئے دانوں کے معنیٰ میں ہے جو اصل میں بَرد کے مادے سے ہے جس کا معنیٰ سردی اور ٹھنڈک ہے۔ چونکہ اولے خود بھی سرد ہوتے ہیں اور سردی و ٹھنڈک کا سبب بھی بنتے ہیں اس لئے ان پر اس کلمے کا اطلاق ہوتا ہے۔[۲]

''جِبال''، جبل کی جمع ہے ''معجم مقایس اللغة'' کے مطابق کسی شئ کے بلندی پر جمع ہو جانے کے معنیٰ میں ہے۔ یہی معنیٰ ''التحقیق'' میں بھی ذکر ہوا ہے۔ بنا بریں جبل سے مراد فقط پتھر اور ریت کے پہاڑ ہی نہیں، بلکہ ہر عظیم تودے اور بلند مجموعے کا نام عربی زبان میں ''جبل'' ہے۔ جو کچھ اوپر ذکر ہوا ہے اس کو دیکھتے ہوئے اب ہم آیت کی طرف پلٹتے ہیں: مذکورہ بالا آیت کے مطابق: اللہ تعالیٰ آسمان میں موجود پہاڑوں سے اولے نازل کرتا ہے۔

اُس زمانے میں کوئی بھی یہ بات نہیں جانتا تھا کہ آسمان میں مختلف بلندیوں کے ساتھ بادل پہاڑوں کی شکل میں ہیں، جنہیں

---

[۱] سورۂ اسراء/ ٦٦

[۲] کتاب ''التحقیق'' میں آیا ہے ''اَلۡبُرُودَةُ فِی الۡمَاءِ اَنۡ يُبۡرُدَ اِلٰی اَنۡ يُصِلَ حَدِّ الۡاِنۡجِمَادِ فَيُقَالُ لَهُ الۡبَرَدُ'' یعنی: 'پانی میں ٹھنڈک یہ ہے کہ وہ اس قدر ٹھنڈا ہو جائے کہ نقطۂ انجماد تک جا پہنچے تو اس وقت اسے ''برد'' کہتے ہیں''

ہم با قاعدہ طور پر دیکھتے ہیں۔ کیونکہ ہم آسمان پر تمام بادلوں کو ایک پھیلے ہوئے صفحے کی شکل میں دیکھتے ہیں۔لیکن جب ہم ہوائی جہاز کے ذریعے بادلوں سے بھی بلند ہو جاتے ہیں تو اُنہیں بالکل اُسی طرح نشیب وفراز کی شکل میں دیکھتے ہیں، جس طرح زمین پر پہاڑوں اور درّوں اور بلندیوں اور پستیوں کو دیکھتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں بادلوں کے اوپر والا حصہ سطح کے ہموار نہیں ہوتا بلکہ سطح زمین کی طرح بہت سی بلندیاں اور پستیاں رکھتا ہے اور زیادہ تر بہت بڑے بڑے پہاڑوں کی صورت میں نظر آتا ہے۔

نیز یہ اہم نکتہ بھی اس کے ساتھ اضافہ کیا جائے کہ جو سائنسی ترقی کی وجہ سے ثابت ہو چکا ہے تا کہ جبال (پہاڑوں) کا مفہوم مزید واضح ہو جائے۔ایک دانشور نے اپنے تحلیل وتجزیئے میں یہ بات کہی ہے کہ جس کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے: زیر بحث آیت میں بلند بادلوں کو برف کے پہاڑوں سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کیونکہ سائنسدانوں نے اپنی ہوائی پروازوں کے دوران ایسے بادل دیکھے ہیں کہ جو برف کی سوئیوں سے بنے ہوئے ہیں کہ جن پر ''برف کے پہاڑوں'' کا عنوان بالکل صحیح صادق آتا ہے۔عجیب بات یہ کہ ایک روسی سائنسدان نے بعض ''موسلا دھار بادلوں'' کی تشریح میں چند بار ''برف کے پہاڑوں'' یا ''بادلوں کے پہاڑوں'' کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔

یہ سب ایک طرف، دوسری طرف موجودہ دور کے سائنسدانوں نے آسمان میں ''اولوں'' کے بننے کے بارے میں یوں کہا ہے: بادل سے بارش کے قطرے جدا ہو جاتے ہیں جو فضا کے اوپر والے حصے میں ٹھنڈ سے دو چار ہو کر منجمد ہو جاتے ہیں،لیکن اُس حالت میں وہ بہت ہی چھوٹے ہوتے ہیں۔ پھر اُس حصے پر حکم فرما شدید طوفان ان منجمد دانوں کو دوبارہ اوپر کی طرف پھینک دیتے ہیں اور پھر یہ گولے بادلوں میں داخل ہو جاتے ہیں اور پانی کی ایک دوسرے تہہ ان پر جم جاتی ہے جو بادل سے جدا ہوتے وقت دوبارہ منجمد ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات یہ عمل کئی بار انجام پاتا ہے۔

یہاں تک کے اولے بہت حد تک موٹے ہو جاتے ہیں جس کے بعد طوفان اُنھیں دوبارہ اوپر نہیں پھینک سکتا۔ یا طوفان وقتی طور پر تھم جاتا ہے۔اس وقت یہ زمین کا رُخ کر لیتے ہیں اور بغیر کسی رکاوٹ کے زمین کی جانب حرکت کرنے لگتے ہیں۔کبھی کبھار یہ اولے اس قدر بڑے اور موٹے ہوتے ہیں کہ جن کی وجہ سے کھیتوں، باغات اور حیوانات حتیٰ انسانوں تک کو نقصان پہنچا دیتے ہیں۔[1]

یہاں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بھاری اور موٹے اولے اُسی وقت وجود میں آ سکتے ہیں جب بلندیوں پر بادلوں کے پہاڑ پھیلے ہوئے ہوں تا کہ جب شدید ہوائیں اولوں کے منجمد دانوں کو اُن کے درمیان پھینکیں تو وہ پانی کی زیادہ مقدار اپنے اندر جذب کر کے بھاری ہو جائیں۔ اس طرح بادلوں کے پہاڑ موٹے موٹے اولوں کی پیدائش میں قابل ذکر منبع سمجھے جاتے ہیں جس کی طرف اس آیت

---

[1] فرھنگ نامہ (ایک فارسی دائرۃ المعارف کا نام) مادۂ تگرگ

میں اشارہ ہوا ہے۔ اور اگر یہ پہاڑ وہی برف کی گولیوں کے عظیم تودے ہیں تو مسئلہ مزید واضح ہوجاتا ہے۔[۱]

یہاں فقط ایک سوال باقی رہ جاتا ہے، وہ یہ کہ: یہاں قرآن مجید نے اس کلام کا مخاطب فقط رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کو کیوں قرار دیا ہے اور فرمایا ہے: ''أَلَمْ تَرَی'' (کیا تو نے نہیں دیکھا؟) جبکہ ہم جانتے ہیں کہ یہ بات اُس زمانے میں کسی بھی طرح قابل مشاہدہ نہیں تھی، بلکہ فقط ہمارے زمانے میں وہ بھی ہوائی جہاز کے ذریعے ہی دیکھی جاسکتی ہے۔

اس سوال کا جواب واضح ہے کیونکہ ''أَلَمْ تَرَ'' اور اس جیسے اور جملے ''أَلَمْ تَعْلَمْ'' (کیا تم نہیں جانتے؟) کے معنیٰ میں ہیں۔ لہٰذا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت عام الفیل (جس سال ابرھہ نے مکہ پر لشکر کشی کی تھی) میں ہوئی تھی، اور آپ اس وقت موجود نہیں تھے، لیکن پھر بھی قرآن فرماتا ہے:

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۝۱

''کیا تم نے نہیں دیکھا تیرے پروردگار نے اصحاب فیل کے ساتھ کیا کیا''؟ [۲]

۱۴۔ قرآن اور رعد و برق اور بارش کا باہمی تعلق

قرآن مجید میں بارہا ''رعد'' و ''برق'' کا تذکرہ ہوا ہے اور اُس کے بعد فوراً بارشوں کے برسنے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ سورۂ روم کی آیت ۲۴ میں آیا ہے:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝۲۴

یعنی: ''اور اُس کی آیات میں یہ بھی ہے کہ وہ تم کو بجلی دکھاتا ہے جو خوف کا باعث بھی ہے اور (بارش) کی اُمید کا بھی اور وہ آسمان سے پانی برساتا ہے جس سے وہ زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کردیتا ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں''

---

[۱] مفسرین جملہ ''وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَاۗءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْ بَرَدٍ'' کے لئے دو تفسیروں کے قائل ہوئے ہیں جو آیت کے طریقہ ترکیب سے اخذ ہوتی ہیں۔ کبھی تو کہا جاتا ہے: ''مِنْ بَرَدٍ'' میں جار و مجرور ''يُنَزِّل'' سے متعلق ہے جو مفعول کے حکم میں ہے۔ یعنی؛ اللہ تعالیٰ اولوں کو آسمان میں موجود پہاڑوں سے نازل کرتا ہے۔ (یہاں پر پہاڑ بطور مطلق ذکر ہوئے ہیں) کبھی کہتے ہیں کہ یہ جار و مجرور ایک فعل محذوف سے متعلق ہے جو ''جبال'' کی صفت ہے۔ بنا بریں آیت کا معنیٰ اس طرح ہوجائے گا: اللہ تعالیٰ آسمان میں موجود برف کے پہاڑوں سے اولے نازل کرتا ہے۔ (اس تفسیر کے مطابق ''يُنَزِّل'' کا مفعول محذوف ہے جو خود کلام سے سمجھ آجاتا ہے) دونوں تفسیروں میں مذکورہ وضاحت کے مطابق قرآن کا علمی اعجاز روشن ہوجاتا ہے۔ چونکہ ایک تفسیر کے مطابق برف کے پہاڑوں کی بات ہو رہی ہے اور دوسری تفسیر میں بادل کے پہاڑوں کی بات ہے اور ان دونوں چیزوں سے اُس زمانے کے لوگ ناآگاہ تھے۔

[۲] سورۂ فیل/۱

اور سورۂ رعد کی آیت ۱۲ میں آیا ہے:

هُوَ الَّذِیْ یُرِیْکُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّیُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ ﴿۱۲﴾

یعنی: ''وہ وہی ہے جو تمہیں بجلی دکھاتا ہے جو خوف کا باعث بھی ہے اور اُمید کا بھی۔ نیز وہ (پانی سے بھرے) بوجھل بادلوں کو پیدا کرتا ہے''

گذشتہ زمانے میں کوئی بھی شخص یہ بات نہیں جانتا تھا کہ ''رعد'' و''برق'' کہاں سے پیدا ہوتی ہے لہٰذا ہر ایک نے اپنی طرف سے ایک مفروضہ قائم کیا ہوا تھا۔کبھی تو یہ مفروضات، افسانوی شکل اختیار کر لیتے تھے،لیکن آج یہ بات مسلّم ہو چکی ہے بجلی اور اس کی کڑک وگرج کا تعلق الیکٹرک ڈسچارج سے ہے کہ جب بادل کے دو ٹکڑے مختلف بجلی کے لحاظ سے (مثبت و منفی پول کی صورت میں) ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں اور ان سے بالکل اس طرح کرنٹ پیدا ہوتا ہے جیسے بجلی کے دو تار جن میں مختلف (مثبت اور منفی فیز) کی بجلی آ رہی ہوتی ہے، جب ایک دوسرے کے نزدیک ہوتے ہیں تو بہت زیادہ کرنٹ پیدا ہوتا ہے۔جس میں آواز بھی ہوتی ہے اور حرارت بھی، یہی کچھ بادلوں میں بھی ہوتا۔''بجلی'' اُس کا شدید کرنٹ ہے اور ''کڑک وگرج'' اُسی کرنٹ کی آواز ہے۔

بعض اوقات یہ الیکٹرک ڈسچارج بادلوں کے اُن ٹکڑے کے درمیان رونما ہوتا ہے جو مثبت رو ہوتی ہے، جب یہ زمین کے نزدیک ہو جائے کہ جس میں منفی رو ہوتی ہے تو زمین اور بادل کے درمیان کرنٹ پیدا ہوتا ہے جسے ''صاعقہ'' کہتے ہیں۔جو بیابانوں، جنگلوں اور بعض اوقات عمارتوں میں خطرناک آگ لگنے کا باعث بنتی ہے، ممکن ہے اس سے بھیڑ بکریوں کا ایک بڑا ریوڑ ایک لمحے میں جل کر خاکستر ہو جائے یا وہ کسی پہاڑ سے ٹکرائے تو وہ ریزہ ریزہ ہو جائے یا اگر وہ سمندر کی سطح پر پڑے تو ایک علاقے کے سمندری جاندار ختم ہو جائیں۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوتا ہے کہ اس کرنٹ سے پیدا ہونے والی حرارت بہت شدید ہوتی ہے (جو تقریباً ۱۵ ہزار سنٹی گریڈ تک ہوتی ہے، یعنی؛ سطح سورج کی حرات کے دوگنا) یہ ایک ایسی حرارت ہے جو ہر چیز کو دھویں اور خاکستر میں بدل دیتی ہے۔

بنابریں اگرچہ یہ بجلی اور کڑک وگرج عالم طبیعت کے ہولناک مناظر میں سے ہے، لیکن اس کے باوجود بہت سی برکات وفوائد بھی رکھتی ہے۔اس کے اہم ترین اثرات میں سے ایک سنگین بارشوں کا برسنا ہے، کیونکہ اس بجلی سے پیدا ہونے والی حرارت اطراف کی زیادہ تر ہوا کو جلا دیتی ہے جس کی وجہ سے فوراً ہوا کا دباؤ کم ہو جاتا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ کم دباؤ کی صورت میں ہی بادل برستے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ عام طور پر بجلی چمکنے اور گرنے کے بعد ہی موسلا دھار بارش شروع ہو جاتی ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ جب گہرے بادل زمین کی نزدیکیوں تک پھیلے ہوتے ہیں اور فضا تاریک ہو جاتی ہے اور بجلی وکڑک کے گرجنے کی آوازیں سنی اور دیکھی جاتی ہیں تو اوپر اُٹھنے والی تند و تیز ہواؤں کے سبب بادل بہت زیادہ تعداد میں موٹے موٹے سنگین اور بھاری دانوں (اولوں) کی شکل میں بدل جاتے ہیں۔[1]

---

[1] کتاب ''بادوباران'' سے اقتباس، صفحہ ۱۳۸

یہی وہ چیز ہے کہ جو ہم نے مذکورہ بالا آیت میں پڑھی ہے کہ جس میں بجلی کی طرف اشارہ کرنے کے بعد بھاری بادلوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ بجلی کی شدید حرارت کے سبب بارش کے قطرے اضافی آکسیجن کی مقدار میں ترکیب پاتے ہیں، جس سے یہ آکسیجن والا پانی جسے بھاری پانی (ہائیڈروجن پر آکسائید H2o2) بھی کہتے ہیں، حاصل ہوتا ہے۔اور یہ بھاری پانی بہت سے جراثیم اور نباتاتی آفات کوختم کرنے میں غیر معمولی طور پر موثر واقع ہوتا ہے۔

لہٰذا سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ جس سال رعد و برق کم ہو نباتاتی آفات اور بیماریاں زیادہ ہو جاتی ہیں۔(یہ بھی بھاری بادلوں کے بارے میں ایک طرح کی تفسیر ہے)اس کے علاوہ بارش کے قطرے جو ہوا کی کاربن کے ساتھ شدید حرارت اور کیمیائی ترکیب سے کاربانک ایسڈ کی حالت اختیار کر لیتے ہیں۔جب یہ زمینوں پر چھڑکتے ہیں تو کیمیائی اثرات کی بدولت نباتات کی پرورش کے لئے ایک موثر کھاد کا کام دیتے ہیں۔

یہاں تک کہ بعض ماہرین کا کہنا ہے کہ آسمانی بجلیوں کے ذریعے کرۂ زمین کو سال بھر میں ملنے والی کھاد سینکڑوں لاکھ ٹن کے برابر ہے اور یہ ایک بہت بڑی تعداد ہے۔جب ہم سائنسی انکشافات کا موازنہ مذکورہ بالا قرآنی آیات کے ساتھ کرتے ہیں، خصوصاً اُس زمانے کے عرب ماحول میں کہ جہاں ان علوم و دانش کا معمولی سا بھی نام و نشان نہیں ملتا تو قرآن کی علمی عظمت ہمارے لئے مزید اجاگر ہو جاتی ہے۔

۱۵۔قرآن اور انسانی شخصیت کی تشخیص

سورۂ قیامت کی آیت نمبر ۳، ۴ میں آیا ہے:

اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَلَّنۡ نَّجۡمَعَ عِظَامَہٗ ؕ﴿۳﴾ بَلٰی قٰدِرِیۡنَ عَلٰۤی اَنۡ نُّسَوِّیَ بَنَانَہٗ ﴿۴﴾

یعنی:''کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہیں کریں گے؟ ہاں! ہم اس بات پر قادر ہیں کہ ہم اس کی انگلیوں (کے سروں کی لکیروں) کو بھی ٹھیک اسی طرح بنا دیں گے''

روایات میں آیا ہے کہ عدی بن ابی ربیعہ نام کا ایک عرب مشرک جو بہت ہی متعصب اور ہٹ دھرم انسان تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور آپؐ سے قیامت کے دن اور اُس وقت کی کیفیت کے بارے میں پوچھنے لگا۔

اُس نے کہا: اگر میں اُس دن کو اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لوں تب بھی تیری تصدیق نہیں کروں گا اور تجھ پر ایمان نہیں لاؤں گا۔ یہ کیسے مانا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان (بوسیدہ) ہڈیوں کو جمع کرے گا، یہ کسی بھی صورت قابل یقین نہیں۔[1]

لغت میں ''بَنان''انگلیوں کے معنیٰ میں آیا ہے اور انگلیوں کے سروں (پوروں) کے معنیٰ میں بھی۔یہ ''بَنَ'' کے مادے سے ہے جس کا مطلب ''اقامت'' لیا گیا ہے اہے چونکہ انسان کی انگلیاں دنیا میں اقامت انسان کے حالات کی اصلاح کا باعث بنتی ہیں لہٰذا ان کو

[1] تفسیر کبیر، جلد ۳، صفحہ ۲۱۷، قرطبی، جلد ۱۰، صفحہ ۶۸۸۵

اس نام سے پکارا جاتا ہے۔[1]

انسان کی زندگی میں انگلیوں کا کردار بہت اہم ہے، یہ خلقت کے عجائب میں شمار ہوتی ہیں۔ کیونکہ یہ ہر وقت ہمارے اختیار میں ہوتی ہیں لہٰذا ہم ان کے اسرار سے غافل ہیں۔ اگر کسی کے ہاتھ کی انگلیاں کٹ جائیں تو وہ کسی قسم کا باریک کام انجام نہیں دے سکتا، لکھنا، ورق پلٹنا، آسانی سے غذا کھانا، ٹیلی فون ملانا، چابیوں کے ذریعے تالے کھولنا اور اسی طرح کے انواع واقسام کے دوسرے باریک کام اُس کے لئے مشکل ہوجاتے ہیں۔ حتیٰ دوسرے صنعتی کام، مشینوں سے متعلق کام اور ہاتھوں سے بھاری چیزوں کا پکڑنا بھی اس کے لئے ناممکن ہو جاتا ہے۔

بلکہ انگلیوں میں سے کسی ایک انگلی کا کم ہوجانا بھی انسان کے روزمرہ کاموں کو شدید متاثر کرسکتا ہے۔ اسی لئے چوپائے انگلیاں نہ ہونے کی وجہ سے بہت سے کام اپنے منہ یا سر سے انجام دیتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں: انسان میں انگلیوں کا وجود، اُس کی تہذیب وتمدن کی ترقی کا سب سے اہم عامل ہے۔ اقامت اور دوام کے معنیٰ میں ''بَنان'' کی تعبیر اسی حقیقت کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے۔ چونکہ ان کے بغیر دنیا میں رہائش اور زندگی گزارنا انسان کے لئے مشکل ہوجاتا ہے۔

مذکورہ بالا آیت کہتی ہے: ہم نہ فقط اُس کی بڑی بڑی ہڈیاں بلکہ اس کی چھوٹی چھوٹی ہڈیاں بھی قیامت کے دن اسی طرح ٹھیک سے بنادیں گے۔ بہت سے مفسرین نے یہ احتمال دیا ہے کہ ''تسویہ بنان'' سے مراد اُن کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑنا ہے یعنی؛ چوپایوں کے سمّوں کی شکل میں لانا ہے۔ لیکن یہ تفسیر سورہ کی دیگر آیات کے ساتھ کسی قسم کی مناسبت نہیں رکھتی۔

بہرحال اس آیت سے جو نکات اخذ ہوتے ہیں، شاید وہ ہمارے زمانے کے اُس اہم انکشاف کی طرف اشارہ ہوں کہ جو انگلیوں کے سروں (پوروں) کے بارے میں ہے۔ کیونکہ یہ بات مسلّم ہوچکی ہے کہ ہر شخص کی انگلیوں کے سروں کی لکیریں، اُس کی شخصیت کی پہچان ہیں اور (اُسے پہچاننے کے لئے) ہر قسم کے دستخط سے زیادہ دقیق اور اطمینان بخش ذریعہ ہیں۔ یہ ایک ایسا دستخط ہیں کہ جس کی کوئی بھی نقل نہیں کرسکتا، جبکہ پیچیدہ ترین دستخطوں کی بھی نقل کی جاسکتی ہے۔

اسی لئے ہمارے زمانے میں ''انگشت نگاری'' (پوروں کی لکیروں کے آثار کو ضبط کرنے کا) کا شعبہ ایک مستقل علم کی صورت اختیار کرگیا ہے اور پولیس کے مراکز میں اس کے لئے ایک مخصوص شعبہ موجود ہوتا ہے۔ جس کے ذریعے بہت سے مجرموں کو پہچان لیا جاتا ہے۔ بس اس کے لئے کافی ہے کہ جب ایک چور کسی کمرے یا گھر میں داخل ہوتا ہے تو اپنا ہاتھ دروازے کے قبضہ یا کمرے کے شیشے یا تالے وصندوق پر رکھتا ہے تو اس کی انگلی کی لکیریں اس پر رہ جاتی ہیں۔ یا کسی قتل کے واقعے میں جو اسلحہ استعمال ہوتا ہے اور وہ پکڑا جاتا ہے تو اس پر کسی نہ کسی کی انگلیوں کے نشان ہوتے ہیں تو فوراً اُس کا نمونہ حاصل کرکے چوروں اور مجرموں یا جن لوگوں پر شک ہوتا ہے ان کے سابقہ ریکارڈ کے ساتھ مطابقت کرکے مجرم کو ڈھونڈ لیا جاتا ہے۔

بنابریں، اس آیت کی تفسیر کے مطابق: ہم نہ صرف بڑی، چھوٹی ہڈیوں کو جمع کرتے ہیں بلکہ اس بات کی قدرت بھی رکھتے ہیں

---

[1] مفردات راغب، مجمع البیان، معجم مقاییس اللغۃ، مادہ ''بَنَ''۔

کہ ہر شخص کی انگلیوں اور اُن کے سروں کو اُن کی تمام خصوصیات کے ساتھ جو اس کے بدن کی باریک ترین خصوصیات ہیں، دوبارہ مرتب کر کے اصلی حالت میں پلٹا دیں۔ دوسرے الفاظ میں ''بنان'' (انگلیوں کے سروں) کو دوبارہ لوٹانا اور اُنہیں منظم کرنا (یاد رہے کہ ''تسویہ'' سے مراد منظم کرنا اور مرتب کرنا ہے) تمام خصوصیات و جزئیات منجملہ انگلیوں کے سروں کو بھی شامل ہے۔ اس مطلب کی مسئلہ قیامت کے ساتھ مناسبت بہت ہی دلچسپ ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی عدالت ہے، اور جس میں مجرموں اور گناہگاروں کا مؤاخذہ کیا جائے گا۔ چونکہ دنیا میں بھی ہر عدالت میں اس مسئلہ سے سب سے زیادہ استفادہ کیا جاتا ہے۔

۱۶۔ قرآن آسمانوں کی خلقت کی عظمت سے پردہ اُٹھاتا ہے

سورۂ مومن کی آیت ۵۷ میں آیا ہے:

لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۷﴾

یعنی: ''آسمانوں اور زمین کی تخلیق انسانوں کی تخلیق سے زیادہ اہم ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے''

درست ہے کہ اکثر مفسرین نے اس آیہ مجیدہ کو ''معاد'' کے بارے میں مشرکین کے مجادلے کا جواب قرار دیا ہے۔ یعنی؛ تم لوگ انسان کے دوبارہ لوٹ جانے کے بارے میں شک و تردید کرتے ہو، جبکہ انسانوں کی تخلیق، آسمانوں اور زمین کی تخلیق سے زیادہ افضل نہیں، بلکہ آسمانوں اور زمین کی خلقت، اُس سے زیادہ افضل ہے۔ لیکن جملہ ''وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ'' اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ آسمانوں کی عظمت، لوگوں کی اکثریت کے لئے نامعلوم رہی ہے۔

یہ درست ہے کہ موجودہ علم و دانش نے انسانوں کے وجود کے بارے میں غیر معمولی اور بہت ہی اہم اسرار و رموز کا انکشاف کیا ہے کہ گزشتہ زمانے میں جس کے ایک ہزارویں حصے سے بھی لوگ آگاہ نہیں تھے۔ اس کے باوجود آسمانوں کی عظمت کے بارے میں جو انکشافات ہوئے ہیں، اُن سے پتا چلتا ہے آسمانوں اور زمین کی خلقت، اپنے تمام عجائبات کے باوجود انسانوں کی خلقت سے کئی درجے زیادہ افضل و برتر ہے۔

آسمانوں بالخصوص کہکشاؤں کے بارے میں ماہرین کی جدید ترین معلومات سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک بڑی بڑی نجومی دوربینوں کے ذریعے آسمانوں میں ایک ارب سے زیادہ کہکشاؤں کا انکشاف ہو چکا ہے۔ جن میں سے ایک کہکشاں کا نام ''راہ شیری'' ہے کہ ہمارا منظومہ شمسی اُس کا ایک معمولی سا جز و شمار ہوتا ہے۔ کیونکہ فقط اسی ایک کہکشاں میں ایک سو ارب سے زیادہ ستارے موجود ہیں۔

سورج اپنی تمام تر عظمت کے باوجود ستاروں کے اس عظیم ترین قافلے میں سے ایک درمیانے درجے کے ستارے کے برابر ہے۔ آسمانوں کی وسعت اس قدر ہے کہ اُن کی پیمائش انسانی ہاتھ کے بنائے ہوئے وسائل سے نہ صرف ممکن نہیں ہے، بلکہ اگر ہم روشنی کے پروں جس کی سرعت ایک سیکنڈ میں تین لاکھ کلومیٹر تک پہنچتی ہے، پر بھی سوار ہو کر آسمانوں کی سیر کریں تو پھر بھی اربوں نوری سال کا وقت درکار ہے تب جا کر ہم اس کائنات کے معلوم شدہ حصے کی سیر کر سکتے ہیں۔

پھراس زمانے میں نجومی دوربینیں اور ٹیلی سکوپیں جس قدر بھی جدید ہو جائیں تو نئی سے نئی دنیائیں ہمارے لئے کشف ہوں گی لیکن اس کے باوجود ہمیں معلوم نہیں کہ جو کچھ ہم دیکھتے ہیں اور جن چیزوں کی ہم پہچان رکھتے ہیں، اُن کے ماوراء کتنے عوالم موجود ہیں اور پھر ہوسکتا ہے جو کچھ ان عظیم تریں دوربینوں سے دیکھا جاتا ہے وہ شاید اس وسیع اور عظیم ترین کائنات کا ایک چھوٹا سا حصہ ہی ہو۔ایک سائنسدان کے بقول ہم جس عظیم کائنات کو دیکھ رہے ہیں، وہ اس عظیم ترین کائنات کے ایک چھوٹے سے ذرّہ کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔[1]

یہاں سے ہم مذکورہ بالا آیت کی گہرائی تک پہنچتے ہیں کہ جس کے مطابق: ''آسمانوں اور زمین کی تخلیق انسانوں کی تخلیق سے زیادہ عظیم ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے'' کیا نزول قرآن کے زمانے میں، وہ بھی دنیا کے عقب ماندہ ترین حصے میں ایک اَن پڑھ انسان کے ذریعے اس قسم کے مطالب کا بیان کیا جانا معجزہ نہیں ہے؟اس طرح ہم قرآن کے سائنسی اعجاز کے موضوع کے اختتام تک پہنچ گئے ہیں اگرچہ ابھی بھی بہت سے قابل ذکر نکات باقی رہ گئے ہیں۔ہمارے خیال میں مذکورہ بالا ۱۶ مثالوں کی منصفانہ تحقیق سے ہر غیر جانبدار انسان پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ محال ہے یہ عظیم کتاب یعنی: قرآن مجید کسی انسانی فکر و مغز کی پیداوار ہو۔

[1] مجلہ ''فضا'' شمارہ ۵۶، فروردین ۱۳۵۱

۴۔ تاریخ کی نظر سے قرآنی اعجاز

تربیتی مسائل میں تاریخ کا کردار

یقیناً قرآن مجید تاریخی کتاب نہیں ہے، لیکن مختلف وجوہات کی بنا پر اس میں بہت سے تاریخی موضوعات بھی ملتے ہیں چونکہ تربیتی مسائل خصوصاً اجتماعی سطح پر ''سابقہ لوگوں کی تاریخ'' سے متعلق موضوعات سے جدا نہیں ہوسکتے۔ چونکہ تاریخ زندگی کی سب سے بڑی تجربہ گاہ ہے اور معاشرتی، معاشی، سیاسی مکاتب فکر کی اقدار کو واضح کرنے اور حقائق اور اوہام اور اقدار مخالف چیزوں میں فرق کرنے کی سب سے بڑی کسوٹی ہے۔ تاریخ کا سب سے بڑا ہنر یہ ہے کہ وہ عقلی اور نظریاتی مسائل کو محسوس انداز میں پیش کرتی ہے اور انسانی مسائل کو صحیح طور پر سمجھنے میں بہت زیادہ مددگار ثابت ہوتی ہے۔

ظلم وستم اور آمریت کا نتیجہ کیا نکلتا ہے، اختلاف وتفرقے، تعصب وہٹ دھرمی اور تنہائی پسندی حقائق سے بے اعتنائی کا انجام کیا ہوتا ہے؛ یہ سب کچھ تاریخ ہی کے ذریعے معلوم ہوتا ہے۔ اسی لئے ہم کہہ سکتے ہیں: تاریخ وہی آب حیات ہے جو انسان کو ایک طولانی عمر دے سکتا ہے۔ کیونکہ گذشتہ لوگوں کی تاریخ کا مطالعہ، گذشتہ انسانوں کے ہزاروں سالوں کے تجربات کے نچوڑ کو چند صفحات کی شکل میں موجودہ اور آئندہ نسلوں تک پہنچا دیتا ہے۔ قرآن مجید ایک مختصر سے جملے میں اس اہم حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

لَقَدۡ كَانَ فِىۡ قَصَصِهِمۡ عِبۡرَةٌ لِّاُولِى الۡاَلۡبَابِ‌ؕ مَا كَانَ حَدِيۡثًا يُّفۡتَرٰى وَلٰـكِنۡ تَصۡدِيۡقَ الَّذِىۡ بَيۡنَ يَدَيۡهِ وَتَفۡصِيۡلَ كُلِّ شَىۡءٍ وَّهُدًى وَّرَحۡمَةً لِّقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ۝۱۱۱

''ان کے قصوں میں صاحبان فکر کے لئے درس عبرت ہے یہ واقعات جھوٹی باتیں نہیں تھے بلکہ (یہ آسمانی وحی ہے اور) گزشتہ آسمانی کتب کی تصدیق کرتے ہیں جو اس کے سامنے ہیں اور اس میں ہر چیز کی تشریح اور ہدایت ورحمت ہے، ایسے گروہ کے لئے جو ایمان لایا''[1]

اہم بات یہ کہ قرآن مجید یہ بات حضرت یوسف -کے واقعات سے بھرے ایک انتہائی عبرت انگیز قصے کو نقل کرنے کے بعد ذکر کرتا ہے کہ جس سے تربیتی مسائل کے مختلف پہلوؤں سے نتیجہ بخش استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ قرآن مجید ایک اور مقام پر گزشتہ لوگوں کے قصوں کو اذہان اور افکار کی بیداری کا سبب قرار دیتے ہوئے فرماتا ہے:

فَاقۡصُصِ الۡقَصَصَ لَعَلَّهُمۡ يَتَفَكَّرُوۡنَ۝۱۷۶

---

[1] یوسف/۱۱۱

یعنی: ''یہ قصے (ان کے لئے) بیان کرو شاید کہ وہ غور کریں (اور ہوش میں آجائیں)'' [1]

ایک اور جگہ گزشتہ انبیاء کے واقعات کے بیان کرنے کو پیغمبر اسلام ﷺ کے ''دل کی مضبوطی''، ارادے میں تقویت اور مؤمنین کی بیداری اور آگاہی کا ذریعہ قرار دیتے ہوئے فرماتا ہے:

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَجَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۰﴾

یعنی: ''ہم نے پیغمبروں میں سے ہر ایک کی داستان تم سے بیان کر دی تا کہ تمہارا دل آرام و سکون پائے (اور تمہارا ارادہ قوی ہو) ان واقعات میں مؤمنین کے لئے حق، نصیحت اور یاددہانی ہے''۔ [2]

اور حضرت نوح - کے قصے کے بارے میں فرمایا:

وَلَقَدْ تَّرَكْنٰهَآ اٰيَةً فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۱۵﴾

یعنی: ''ہم نے یہ واقعہ نشانی کے عنوان سے اُمتوں کے درمیان باقی رکھا تو کیا کوئی ہے جو نصیحت حاصل کرے'' [3]

اور آخرکار سابقہ لوگوں کے باقی رہ جانے والے آثار کے بارے میں ایک انتہائی خوبصورت اور گویا الفاظ استعمال کرتے ہوئے فرمایا:

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ﴿۴۶﴾

''کیا وہ زمین پر چلتے پھرتے نہیں (اور سیر و سیاحت نہیں کرتے) کہ ان کے دل ادراک حقیقت کر سکتے اور کان صدائے حق سننے والے ہوتے، کیونکہ ظاہری آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ سینوں کے اندر دل اندھے ہو جاتے ہیں'' [4]

اس طرح نہ فقط تاریخ کی تفصیل بلکہ گزشتہ لوگوں کے باقی رہ جانے والے خاموش تاریخی آثار بھی دل کی آنکھیں کھولنے اور نفس کے کانوں کو سننے کے قابل بنا دیتے ہیں۔ گزشتہ لوگوں کی تاریخ کے آثار اور فلسفے کی طرف اس اشارے کے بعد، اب ہم قرآن مجید کی

---

[1] اعراف/۱۷۶

[2] ہود/ ۱۲۰

[3] قمر۔۵۱

[4] حج/۴۶

طرف رجوع کرتے ہوئے اُس کے تاریخی لحاظ سے معجزہ ہونے کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

قرآن میں تاریخی وسعتیں

جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ قرآن کے تربیت، واعظ و نصیحت، انذار و بشارت اور اُمید خوف سے متعلق بہت سے اہم مباحث تاریخی مسائل کی شکل میں ذکر ہوئے ہیں۔ یہ مسائل اس قدر خوبصورت، واضح، مؤثر انداز میں پیش کئے گئے ہیں کہ ہر سننے والے کو بے اختیار اپنے اعلیٰ مقاصد کی جانب کھینچ لیتے ہیں۔ جب تک انسان یوسف، انبیاء، طہٰ، قصص، مریم، آل عمران اور بقرہ جیسے سورتوں کا مطالعہ نہ کرلے اُس وقت تک قرآن کے تاریخی بحثوں کی عظمت کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔ اصولاً دیکھا جائے تو قرآن مجید کی تاریخی بحثوں میں درج ذیل خصوصیات بہت واضح طور پر نظر آتی ہیں:

۱۔ (قرآن کے تاریخی ابحاث میں) سب سے زیادہ زور حساس موضوعات پر دیا گیا ہے اور اہم کردار ادا کرنے والے تربیتی مسائل کو گہری نظر سے دیکھا گیا ہے۔

۲۔ (یہ مسائل ہر قسم کے) بیہودہ اور زائد کلام سے پاک ہیں۔

۳۔ یہ تمام مسائل تناقض، تضاد اور ناموزوں گفتگو سے خالی ہیں۔

۴۔ اُس زمانے (اور کئی صدیوں بعد) کی تاریخ نگاری کے برعکس جب تاریخ ایک سر وقت گزارنے اور تفریح کے طور پر یا کم از کم گزشتہ لوگوں کے حالات سے معلومات حاصل کرنے کی حد تک ہی پڑھی اور لکھی جاتی تھی اور جس میں کسی قسم کا تجزیہ و تحلیل نہیں ہوتا تھا اور نہ جس میں تاریخ کا فلسفہ اور گزشتہ لوگوں کے حالات سے سبق حاصل کرنے کا پہلو ہوتا تھا، قرآن کی ذکر کردہ تاریخ میں بنیادی مسائل کے علاوہ اُن کے نتائج کو اس طرح ذکر کیا گیا ہے کہ جس سے اسے سننے اور پڑھنے والے کے اندر جستجو کی حس اور سوچنے اور فکر کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک اور اہم بات یہ کہ قرآن مجید میں تمام ایسے غیر ضروری واقعات کو حذف کر دیا گیا ہے کہ جن سے سوائے وقت ضائع کرنے اور کلام کو طولانی کرنے کے نہ تو کوئی سبق حاصل ہو سکتا ہے اور نہ کوئی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔

۵۔ قرآن مجید میں تاریخی حقائق کو افسانوں سے جُدا کرنے پر بہت زیادہ توجہ دی گئی ہے کہ جو بعض اوقات بہت ہی پیچیدہ و مشکل کام ہے۔ اس کی وضاحت کچھ طرح ہے کہ ہمیشہ کچھ عوامل ایسے رہے ہیں کہ جو تاریخ کو جھوٹے افسانوں اور (خیالی قصے کہانیوں) سے ملا دیتے ہیں۔ منجملہ اسباب میں ایک انسانوں کو مشغول رکھنا، بچگانہ احساسات کی تسکین، تخیلات کو اُبھارنا اور جھوٹی دلچسپیاں پیدا کرنا ہے۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ گزشتہ لوگوں کی تاریخ کا ایک بڑا حصہ افسانوں اور دیو مالائی کہانیوں پر مشتمل ہوتا ہے اور یہی اُن کا بنیادی رکن شمار ہوتا ہے۔

اس طرح اگر ہم اپنے آپ کو قرآن مجید کے زمانہ نزول اور پیغمبر اسلام ﷺ کی حیات مبارکہ کے زمانے کے ماحول میں قرار دیں تو ہم دیکھیں گے کہ اس زمانے کی تاریخ اس قدر غلط اور بے بنیاد سے بھری پڑی تھی کہ بہت سی توہمات اور غیر واقعی باتیں سینہ بہ سینہ

ہوتی ہوئی مسلمہ واقعیت کا روپ دھار چکی تھیں۔جن کی چھان بین چہ جائیکہ ایک اَن پڑھ شخص یہ کام انجام دیتا، ایک پڑھے لکھے شخص کے لئے بھی ناممکن تھی۔اُس زمانے میں یہود و نصاریٰ کے علماء کہ جو ''ربانیون'' اور ''احبار'' کے نام سے مشہور تھے، ان کے علاوہ مشرکین عرب کے ''کاہن'' بھی ان دیو مالائی کہانیوں، افسانوں اور خرافات کے محافظ تھے۔

یقیناً جو شخص ایسے ماحول میں زندگی گزار رہا ہو اور پھر چالیس سال کی عمر کو پہنچ جائے اور اس کی سوچ و فکر انہی افسانوں اور دیو مالائی کہانیوں کو سن سن کر پروان چڑھی ہو جن سے معمولاً چھٹکارا حاصل کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔کیا ایسا شخص اُس تاریک ماحول میں رہ کر تاریخ کو اس طرح کے افسانوں سے پاک اور حقائق کو خیالات و خرافات سے جدا کر سکتا ہے۔آج تاریخ کا ایک پڑھا لکھا محقق بھی بہت محنت و مشقت کے بعد کہیں جا کر اس طرح کا کام انجام دیتا ہے تو ہم ایک ایسے شخص سے جس نے کسی اُستاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا، کس طرح اس قسم کی توقع رکھ سکتے ہیں۔اب ہم تاریخ قرآن کے چند نمونوں کی طرف رجوع کرتے ہیں اور جو کچھ اوپر ذکر ہوا ہے اُسے ان کی روشنی میں دیکھتے ہیں:

ا۔ ''قرآن'' اور ''کتب عہدین'' میں تخلیق آدمؑ کی کیفیت

قرآن مجید سورۂ بقرہ کی آیات ۳۰ تا ۳۷ میں انسان کی خلقت کے مسئلے کی تفصیل یوں ذکر کرتا ہے: ''جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے کہا کہ میں روئے زمین پر ایک جانشین اور حاکم مقرر کرنے لگا ہوں تو فرشتوں نے کہا (پروردگارا) کیا ایسے شخص کو مقرر کرے گا جو زمین پر فساد اور خونریزی کرے گا، ہم تیری تسبیح اور حمد بجالاتے ہیں (اس پر پروردگار عالم نے فرمایا: میں حق کو جانتا ہوں تم نہیں جانتے (پھر آدمؑ کو خلق کیا) پھر علم اسماء (علم اسرار خلقت اور موجودات کے نام رکھنے کا علم) سب کا سب آدم کو سکھایا پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا: اگر سچ کہتے ہو تو بتاؤ ان کے نام کیا ہیں۔

فرشتوں نے کہا تو پاک و منزہ ہے جو تو نے ہمیں تعلیم دی ہے ہم اس کے علاوہ کچھ نہیں جانتے تو حکیم و دانا ہے۔فرمایا: اے آدم -انہیں ان (موجودات) کے ناموں اور اسرار) سے آگاہ کر دے جب اس نے انہیں آگاہ کر دیا تو خدا نے فرمایا: میں نہ کہتا تھا کہ میں آسمان اور زمین کا غیب جانتا ہوں اور تم جن چیزوں کو ظاہر کرتے اور چھپاتے ہو اُسے بھی جانتا ہوں۔اور جب ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کے لئے سجدہ و خضوع کرو تو شیطان کے علاوہ سب نے سجدہ کیا۔اس نے انکار کر دیا اور تکبر کر کے (نافرمانی کی وجہ سے) کافروں میں سے ہو گیا۔اور ہم نے کہا آدم! تم اپنی بیوی کے ساتھ جنت میں سکونت اختیار کر لو اور (اس کی نعمتوں میں سے) جو چاہو کھاؤ (لیکن) اس درخت کے پاس نہ جانا ورنہ ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔

پس شیطان ان کی لغزش کا سبب بنا اور جس (بہشت) میں وہ رہتے تھے انہیں وہاں سے نکال دیا اور (اس وقت) ہم نے ان سے کہا سب کے سب (زمین کی طرف) چلے جاؤ اس حالت میں کہ تم میں سے بعض دوسروں کے دشمن ہو گے زمین تمہاری ایک مدت معین کے لئے قرار گاہ ہے اور فائدہ اٹھانے کا وسیلہ ہے۔پھر آدم نے اپنے پرودگار سے کچھ کلمات حاصل کئے اور (ان کے ذریعہ) توبہ کی اور اللہ

تعالیٰ نے ان توبہ قبول کر لی، اللہ عالم تواب اور رحیم ہے''

قرآن مجید کی دوسری صورتوں (سورۂ اعراف اور طہ) میں بھی اسی مطلب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ سورۂ طہ کی آیت نمبر ۱۲۰ سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ شیطان نے حضرت آدمؑ کو اس طرح فریب دیا اور کہا: یہ درخت، ابدی زندگی کا درخت ہے۔ حالانکہ پہلے آدمؑ کو اس بات سے آگاہ کر دیا گیا تھا کہ شیطان تمہارا دشمن ہے، اس کے فریب میں نہ آنا۔ نیز سورۂ اعراف کی آیت نمبر ۲۶، ۲۷ اور سورۂ طہ کی آیت ۱۲۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدمؑ اور اُن کی بیوی جنت میں اپنے بدن پر لباس پہنے ہوئے تھے، لیکن جب اُنھوں نے ممنوعہ درخت سے کھایا تو اُن کا جنتی لباس اُن کے بدن سے اُتر گیا تو اس وقت اُنھوں نے بہشتی درختوں کے پتوں سے اپنے لئے لباس بنایا۔

مندرجہ بالا آیات کے مطابق سب سے پہلے: آدم کے وجود میں سب سے بڑا افتخار اور قوی نقطہ جس کی وجہ سے وہ مخلوق میں منتخب ہے اور جس کی وجہ سے وہ مسجود ملائکہ بنا وہی ''علم الاسماء'' سے آگاہی اور حقائق اسرار خلقت و جہان ہستی سے واقفیت ہے۔ دوسرا حضرت آدم -ایک ایسے درخت سے کھانے کی وجہ سے بہشت سے نکلے ہیں جس سے اُنہیں پہلے سے منع کیا گیا تھا۔ اگر چہ قرآن نے اُس درخت کا نام ذکر نہیں کیا لیکن بظاہر وہ ایک دلچسپ پھل تھا اور اُس سے منع کرنے کا مقصد حضرت آدم -کی آزمائش اور امتحان کرنا تھا۔ تا کہ نفس اور شیطان کے وسوسوں کے مقابلے میں اُن کی ایمانی قوت اور ارادے کو آزمایا جائے۔

"اَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ"

یعنی: ''شیطان نے آدمؑ اور اُن کی بیوی کو لغزش پر اُبھارا''

کی تعبیر سے واضح ہوتا ہے کہ ممنوعہ درخت سے کھانا فقط ایک لغزش تھی نہ کہ ارتکاب گناہ اور خدا کے سامنے طغیان اور حریم عبودیت کو توڑنے کا ارادہ تھا۔ اب ہم موجودہ ''تورات'' میں دیکھتے ہیں کہ اس میں اس تاریخی واقعے کو کس طرح قسم قسم کی خرافات اور غیر منطقی بلکہ بچگانہ باتوں سے ملا دیا گیا ہے۔ تورات فصل دوم ''سفر تکوین'' شمارہ: ۷ تا ۲۵ میں یوں آیا ہے:

۷۔ پس خداوندے عالم نے آدم کو خاکِ زمین سے صورت دی اور نسیم حیات اس کے دماغ میں پھونکی اور آدم زندہ جان ہو گیا، ۸۔ اور خداوند خدا نے عدن میں شرقی جانب ایک باغ لگایا اور جس انسان کی تصور بنائی تھی، اُسے وہاں رکھ دیا، ۹۔ اور خداوند خدا نے ہر خوبصورت درخت اور جو کھانے کے لئے اچھا تھا، زمین سے اُگایا نیز شجر حیات کو وسطِ باغ میں لگایا اور نیک و بد جاننے کے درخت کو۔۔۔، ۱۵۔ اور خداوند خدا نے آدم کو پکڑ کر باغ عدن میں چھوڑ دیا یہاں تک کہ اُس کی دیکھ اور حفاظت کرے، ۱۶۔ اور خداوند خدا نے آدم کو حکم دیا کہ تمہیں باغ کے تمام درختوں سے کھانے کا اختیار ہے، ۱۷۔ لیکن ''نیک و بد جاننے'' کے درخت سے نہ کھانا جس دن تو اسے کھائے گا موت کا مستحق ہو جائے گا، ۲۵۔ اور آدم اور اس کی بیوی ہر دو برہنہ تھے اور اُنہیں کوئی شرمندگی نہ تھی۔ آگے چل کر ''سفر تکوین'' کی فصل سوم میں یہ واقعہ یوں آیا ہے:

۱۔ اور سانپ (شیطان) صحراء کے تمام جانوروں میں سے زیادہ حیلہ باز تھا کہ جو اللہ تعالیٰ نے خلق کئے ہیں، اور (سانپ) نے عورت کو کہا: کیا خدا نے واقعاً کہا ہے کہ تم نے باغ کے تمام درختوں سے نہیں کھانا، ۲ اور عورت نے سانپ کو کہا کہ ہم باغ کے درختوں کے

پھل سے کھائیں گے، ۳۔لیکن اُس درخت کے پھل سے جو باغ کے درمیان میں ہے، خدا نے فرمایا ہے کہ اُس سے نہ کھانا اور اُس کو مس نہ کرنا کہ کہیں مر نہ جاؤ، ۴۔سانپ نے عورت سے کہا: البتہ تم نہیں مرو گے۔

۵۔اور اب جبکہ خدا جانتا ہے کہ تم جس دن اس سے کھاؤ گے تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی، تم اُن خداؤں (فرشتوں) کی مانند ہو جاؤ گے کہ جو نیک و بد کو جانتے ہیں، ۶۔پس عورت نے درخت کو دیکھا کہ جو کھانے کے لئے اچھا ہے اور یہ کہ دیکھنے میں بھی خوبصورت ہے اور ایسا درخت ہے کہ جو سمجھدار مرد کے لئے پسندیدہ ہے، پس اس نے اس کا پھل کھا لیا اور اپنے شوہر کو بھی دیا تا کہ وہ بھی کھائے، ۷۔ اُس وقت اُن دونوں کی آنکھیں کھل گئیں اور اُنھوں نے دیکھا کہ وہ برہنہ ہیں اور اُنھوں نے انجیر کے درخت کے پتوں کو سی کر اپنے لئے فوطہ (لنگ کی طرح کا لباس) بنایا۔

۸۔اور اللہ تعالیٰ کی آواز کو سنا جو صبح کے وقت باغ میں خراماں خراماں چلتا تھا آدم اور اس کی بیوی اپنے آپ کو خداوند سے باغ کے درختوں کے پیچھے چھپاتے تھے۔۹۔اور خداوند نے آدم کو آواز دی۔ اُسے کہا کہ تو کہاں ہے؟ ۱۰۔اس نے جواب میں کہا کہ میں نے تیری آواز سنی اور میں ڈر گیا کیونکہ میں برہنہ ہوں اس وجہ سے چھپا بیٹھا ہوں، ۱۱۔اور خدا نے اس سے کہا: تجھے کس نے کہا کہ تو برہنہ ہے کیا جس درخت سے تمہیں نہ کھانے کے لئے کہا تھا تم نے کچھ کھایا؟ ۱۲۔آدم نے کہا جو عورت تو نے مجھے میرے ساتھ رہنے کے لئے دی ہے اس نے اس درخت سے مجھے دیا ہے جسے میں نے کھا لیا ہے، ۱۳۔اور خداوند خدا نے عورت سے کہا: یہ جو تو نے کیا ہے، یہ کیا ہے؟ عورت نے کہا کہ مجھے سانپ نے ورغلایا ہے اور میں نے کھا لیا ہے، ۱۴۔اور اللہ تعالیٰ نے سانپ سے کہا: چونکہ تم نے ایسا کیا ہے لہٰذا صحراء کے تمام درندوں اور تمام حیوانات سے زیادہ ملعون ہو، اپنے پیٹ کے بل چلو گے اور پوری عمر مٹی چاٹتے رہو گے۔

۲۲۔اور اللہ تعالیٰ نے کہا آدم تم تو ''نیک و بد جاننے'' کی وجہ سے چونکہ ہم میں سے ایک ہو گیا ہے لہٰذا اب ایسا نہ ہو کہ اپنا ہاتھ دراز کرے اور ''درخت حیات'' سے بھی کچھ لے لے اور کھا لے اور کھا کر ہمیشہ کے لئے زندہ رہے، ۲۳۔پس اس سبب سے خداوند خدا نے باغ عدن سے نکال دیا تا کہ اس زمین میں جو اس سے لے لی گئی تھی زراعت کرے، ۲۴۔اور آدم کو نکال دیا اور ''باغ عدن'' کی مشرقی سمت کروبیان (فرشتے) کو آتش بازی کی شمشیر جو شجرۂ حیات کی نگہبانی کی خاطر گھوم پھیر رہے تھے، جگہ دے دی''۔[1]

حضرت آدم -کی خلقت اور اُن کے بہشت سے نکلنے کی تاریخ کے بارے میں تورات کے بیان کا خلاصہ ہماری اپنی سادہ زبان میں یوں ہوگا: اللہ تعالیٰ نے آدم کو خلق کیا، اور شرق عدن کے ایک باغ میں اُنہیں سکونت عطا کی تا کہ وہ وہاں باغبانی کریں۔ اُس باغ کے درختوں میں دو درخت ایسے تھے کہ جن میں سے ایک ''نیک و بد جاننے کا درخت'' تھا یعنی؛ ایسا درخت کہ اگر کوئی اُس کا پھل کھا لیتا تو اس میں عقل و ذہانت پیدا ہو جاتی۔ چونکہ آدمؑ نے اس درخت کے پھل کو نہیں کھایا تھا؛ لہٰذا اچھے بُرے کی پہچان نہیں رکھتے تھے، اسی لئے اپنے اور اپنی بیوی کے برہنہ ہو جانے سے کبھی شرم نہیں کی۔

دوسرا درخت ''درخت حیات'' تھا۔ جو کوئی بھی اس کا پھل کھا لیتا تو دائمی عمر حاصل کر لیتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم -کو منع

[1] تورات، سفر تکوین فصل دوم وسوم۔

کیا تھا کہ وہ علم ودانش اور نیک وبد کے درخت سے ہرگز نہ کھائیں اور کہا ہوا تھا اگر اس درخت سے کھاؤ گے تو مرجاؤ گے۔لیکن کچھ ہی مدت بعد شیطان نے حضرت آدمؑ کی بیوی (حوا) کو وسوسہ میں ڈال دیا اور کہا: تم ''علم ودانش کے درخت'' سے کیوں نہیں کھاتے، اگر کھاؤ گے تو تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی اور اس طرح تم فرشتوں کی طرح اچھائی وبرائی سے آگاہ ہوجاؤ گے۔ وہ درخت ظاہری طور پر بھی خوبصورت اور دلچسپ تھا۔

آخر کار ''حوا'' نے اس درخت سے کھالیا اور حضرت آدمؑ کو بھی کھانے کو دیا۔اُن کی آنکھیں کھل گئیں اور وہ اچھائی وبرائی سے آگاہ ہوگئے اور برہنہ ہونے کی برائی کو اُنھوں نے پالیا اور پھر درخت انجیر کے بڑے بڑے پتوں سے اُنھوں نے اپنے لئے لباس تیار کر کے اُسے اپنے گرد لپیٹ لیا۔صبح کے وقت کہ جب خداوند باغ میں چہل قدمی کررہا تھا تو آدم نے اپنے آپ کو درختوں کی اوٹ میں چھپا لیا، خدا نے جب اُسے نہیں دیکھا تو آواز دی، تم کہاں ہو؟ اُس نے اپنے آپ کو درختوں کے پیچھے سے آواز دی کہ میں یہاں ہوں اور اپنے آپ کو ننگا دیکھا ہے اس لئے یہاں چھپا ہوا ہوں۔

خداوند نے اُس سے پوچھا: تونے کہاں سے جانا ہے کہ تو برہنہ ہے؟ کہیں تو نے نیکی وبدی (علم ودانش) کے درخت سے تو نہیں کھالیا۔اُس نے اس گناہ کو اپنی بیوی کی گردن پر ڈال دیا اور جب حوا سے پوچھ گچھ ہوئی تو اس نے گناہ کو سانپ (شیطان) کی گردن پر ڈال دیا، اس وقت خداوند نے سانپ کو سزا دی اور اس کی سزا یہ تھی کہ وہ اپنے پیٹ کے بل چلنے لگا اور پوری عمر مٹی کو غذا کے طور پر کھانے لگا۔

دوسری جانب چونکہ آدم نے ''علم ودانش کے درخت'' سے کھالیا تھا اور خداؤں میں سے ایک خدا کی مانند بن چکا تھا، اس لئے خداوند خوف زدہ ہوگیا کہ وہ کہیں ''زندگی وحیات کے درخت'' سے بھی نہ کھالے اور اس کی عمر دائمی ہوجائے۔ یہاں پر خداوند نے اُس کے بہشت سے نکل جانے کا حکم صادر کردیا اور فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ آتش بازی کی تلوار لیکر درخت حیات کی حفاظت کریں کہ کہیں آدمؑ اس کے نزدیک نہ ہوجائے۔ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ وہی تورات ہے جو آج دنیا بھر کے تمام یہودیوں اور عیسائیوں کے نزدیک ''کتاب مقدس'' کے عنوان سے پہنچانی جاتی ہے اور وہ سب اس کے مضامین پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہی کتاب نزول قرآن کے زمانے میں بھی یہودیوں اور عیسائیوں کے ہاتھ میں تھی۔

البتہ ہمارا ہرگز یہ عقیدہ نہیں کہ اس قسم کے بچگانہ اور بیہودہ افسانے حضرت موسیٰ -اور اُن کے بعد والے انبیائے کرام ÷ کی آسمانی کتابوں میں موجود تھے اور اُنھوں نے اس قسم کی چیزوں کی حمایت کی ہے۔ بہرحال اس عجیب وغریب افسانے میں اللہ تعالیٰ کے بارے میں انتہائی گھٹیا باتیں ملتی ہیں کہ جن میں سے ہر بات دوسری سے زیادہ گھٹیا اور بُری ہے، مثلاً:

۱۔اللہ کی طرف ''جھوٹ'' کی نسبت دینا جیسا کہ خداوند خدا نے کہا کہ اس درخت سے مت کھانا ورنہ مرجاؤ گے۔

۲۔خداوند عالم کی طرف بخل کی نسبت دینا کہ جس کے مطابق خدا نہیں چاہتا تھا کہ آدم اور حوا علم وحیات کے درخت سے کھائیں اور دانا وعقل مند ہوجائیں بلکہ خدا چاہتا تھا وہ جہالت ونادانی میں ہی رہیں۔

۳۔خدا نے ان دونوں کو اس قدر بھی عقل ودانش نہیں دی ہوئی تھی کہ وہ اپنے برہنہ ہونے کی بُرائی کو جان سکتے اور وہ ان کی اس

حالت پر راضی تھا۔

۴۔اللہ تعالیٰ کی طرف جسم کی نسبت (جیسا کہ فصل سوم میں ہے) خداوند (صبح کے وقت) باغ میں خراماں خراماں چل رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے اردگرد سے بے خبر تھا گویا حضرت آدم اور حوا دونوں اُس کی نظروں سے غائب ہو گئے تھے۔ان میں سے ہر ایک بات کفر ہے اور اللہ تعالیٰ کے مقام و مرتبے کے خلاف ہے۔

۵۔(نعوذ باللہ) شیطان، حضرت آدم اور حوا کے ساتھ خدا سے زیادہ ہمدرد تھا چونکہ اُسی نے اُنہیں نیک و بد کے راستے سے آگاہ کیا ہے اور اُس نے نہ صرف کوئی شیطنت نہیں کی بلکہ اُنہیں رُشد و تکامل کے راستے کی دعوت دی۔(نتیجتاً) ہم جس قدر علم و دانش رکھتے ہیں، اس میں ہمیں شیطان کا ممنون احسان ہونا چاہیے!

۶۔خدا نے آدم و حوا کو عالم ہو جانے کے جُرم میں بہشت سے نکال دیا، پس بہشت جاہلوں اور نادانوں کی جگہ ہے۔

۷۔شیطان آدم کی خیر خواہی کے جرم میں، بارگاہ الٰہی میں ملعون اور راندہ درگاہ قرار پاتا ہے اور اس طرح بغیر کسی جرم کے سزا کا مستحق قرار دیا جاتا ہے۔

اسی طرح بہت سی دوسری خرافات مثلاً علم و دانش اور زندگی و حیات، باغ کے درختوں کا پھل ہیں یا سانپ کی غذا ہمیشہ مٹی و خاک ہے وغیرہ۔اب ہم ایک چھوٹا سا موازنہ کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں جو کچھ قرآن نے حضرت آدم - کی خلقت اور اُن کے خلاف شیطان کی جدوجہد کے بارے میں بیان کیا ہے اور جو کچھ مذکورہ بالا عبارات میں ذکر ہوا ہے، اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان میں سے کون سی کتاب آسمانی ہے اور کونسی ایک جاہل انسان کے دماغ کی پیداوار ہے۔

۲۔حضرت ابراہیمؑ کی فرشتوں سے ملاقات

قرآن مجید سورۂ ہود (آیت ۶۹ تا ۷۶) میں فرشتوں کے ''قوم لوط'' کی طرف آتے وقت اپنے راستے میں حضرت ابراہیم - سے ملنے کا واقعہ یوں بیان کرتا ہے: ''ہمارے بھیجے ہوئے بشارت لے کر ابراہیم کے پاس آئے، کہا: سلام، (اس نے بھی) کہا: سلام اور زیادہ دیر نہ لگی کہ (ان کے لئے) بھنا ہوا گوسالہ لے آیا (لیکن) جب اس نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ اس کی طرف نہیں بڑھتے (اور وہ اسے نہیں کھاتے) تو انھیں بڑا سمجھا اور دل میں احساس خوف کیا (مگر) انھوں نے اس سے (جلد ہی) کہا: ڈریئے نہیں ہم قوم لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں۔اور اس کی بیوی (سارا بھی وہاں) کھڑی تھی وہ (یہ خبر سن کر) ہنسی (کیونکہ اس کا خوف ختم ہو چکا تھا) تو ہم نے اسے (فرشتوں کے ذریعے) اسحاق کی اور اس کے بعد یعقوب کی بشارت دی۔

اس نے کہا: وائے ہو مجھ پر، کیا میں بچہ جنوں گی جب کہ میں بوڑھی عورت ہوں اور میرا یہ شوہر بھی بوڑھا ہے، یہ تو واقعاً عجیب بات ہے۔انھوں نے کہا کیا حکم خدا پر تعجب کرتی ہو، یہ خدا کی رحمت اور اس کی برکتیں ہیں جو تم اہل بیت پر ہیں کیونکہ خدا حمید اور مجید ہے۔ جب ابراہیم کا خوف جاتا رہا اور اسے بشارت مل گئی تو ہمارے فرشتوں کے ساتھ قوم لوطؑ کے بارے میں جھگڑنے لگا کیونکہ ابراہیمؑ بردبار،

ہمدرد اور (اللہ کی طرف) بازگشت کرنے والا تھا۔ (اُنھوں نے کہا) اے ابراہیم! اس سے صرف نظر کر لے کہ تیرے پروردگار کا فرمان آن پہنچا اور (اللہ کا) عذاب قطعی طور پر آئے گا اور وہ پلٹ نہیں سکتا''

ان تاریخی جملات میں ہم عجیب و پیچیدہ اور غیر مانوس یا عقل و منطق کے خلاف کوئی چیز نہیں دیکھتے، یہ ایک واضح واقعہ ہے۔ کچھ فرشتے حضرت لوطؑ کی قوم کو سزا دینے پر مامور ہوتے ہیں، اس سے پہلے وہ حضرت ابراہیمؑ کو اُن کے فرزند کی بشارت دینے کے لئے، اُن کے پاس آتے ہیں، وہ اُن کی خاطر تواضع کرنا چاہتے ہیں، لیکن بہت جلد اصل حقیقت جان لیتے ہیں اور (قوم لوط) کی شفاعت کرنا چاہتے ہیں، لیکن بہت جلد اُنہیں پتا چل جاتا ہے کہ اس کا وقت گزر چکا ہے۔ اسی دوران اُن کو اور اُن کی بیوی کو فرزند کی ولادت ہونے کی خوشخبری دی جاتی ہے اور اس طرح یہ واقعہ ختم ہو جاتا ہے۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ پوری دنیا کے ''یہودیوں'' اور ''عیسائیوں'' ایک مشہور مقدس کتاب اس سلسلے میں کیسے کیسے قصے گھڑتی ہے اور کس قدر خلاف عقل باتیں بیان کرتی ہے۔ ہم (کتاب تورات کے) ''سفر پیدائش'' کی اٹھارویں فصل میں پڑھتے ہیں: ''پھر خداوند ممرے کے بلوطوں میں اسے نظر آیا اور وہ دن کو گرمی کے وقت اپنے خیمہ کے دروازہ پر بیٹھا تھا اور اس نے اپنی آنکھیں اٹھا کر نظر کی اور کیا دیکھتا ہے کہ تین مرد اس کے سامنے کھڑے ہیں وہ ان کو دیکھ کر خیمہ کے دروازہ سے ان سے ملنے کو دوڑا اور زمین تک جھکا اور کہنے لگا کہ اے میرے خداوندا اگر مجھ پر آپ نے کرم کی نظر کی ہے تو اپنے خادم کے پاس سے چلے نہ جائیں بلکہ تھوڑا سا پانی لایا جائے اور آپ اپنے پاؤں دھو کر اس درخت کے نیچے آرام کریں میں کچھ روٹی لاتا ہوں آپ تازہ دم ہو جائیں تب آگے بڑھیں۔

کیونکہ آپ اسی لئے اپنے خادم کے ہاں آئے ہیں انھوں نے کہا جیسا تو نے کہا ہے ویسا ہی کر اور ابراہیم ڈیرے میں سارہ کے پاس دوڑا گیا اور کہا کہ تین پیمانہ باریک آٹا جلد لے اور اسے گوندھ کر روٹی بنا اور ابراہیم گلہ کی طرف دوڑا اور ایک موٹا تازہ بچھڑا لا کر ایک جوان کو دیا اور اس نے جلدی جلدی اسے تیار کیا پھر اس نے مکھن اور دودھ اور اس بچھڑے کو جو اس نے پکوایا تھا لے کر ان کے سامنے رکھا اور خود ان کے پاس درخت کے نیچے کھڑا رہا اور انھوں نے کھایا پھر انھوں نے اس سے پوچھا کہ تیری بیوی سارہ کہاں ہے؟ اس نے کہا وہ ڈیرے میں ہے۔

تب اس نے کہا میں پھر موسم بہار میں تیرے پاس آؤنگا اور دیکھ تیری بیوی سارہ کے بیٹا ہوگا اس کے پیچھے ڈیرے کا دروازہ تھا سارہ وہاں سے سن رہی تھی اور ابراہیم اور سارہ ضعیف اور بڑی عمر کے تھے اور سارہ کی وہ حالت نہیں رہی تھی جو عورتوں کی ہوتی ہے تب سارہ نے اپنے دل میں ہنس کر کہا کیا اس قدر عمر رسیدہ ہونے پر بھی میرے لئے شادمانی ہو سکتی ہے حالانکہ میرا خاوند بھی ضعیف ہے پھر خداوند نے ابراہیم سے کہا کہ سارہ کیوں یہ کہہ کر ہنسی کہ کیا میرے جو ایسی بڑھیا ہو گئی ہوں واقعی بیٹا ہوگا؟ کیا خداوند کے نزدیک کوئی بات مشکل ہے؟ موسم بہار میں معین وقت پر میں تیرے پاس پھر آؤں گا اور سارہ کے بیٹا ہوگا تب سارہ انکار کر گئی کہ میں نہیں ہنسی کیونکہ وہ ڈرتی تھی پر اس نے کہا نہیں تو ضرور ہنسی تھی۔

تب وہ مرد وہاں سے اٹھے اور انھوں نے سدوم کا رخ کیا اور ابراہیم ان کو رخصت کرنے کو ان کے ساتھ ہو لیا اور خداوند

نے کہا کہ جو کچھ میں کرنے آیا ہوں کیا اسے ابراہیم سے پوشیدہ رکھوں؟ ابراہیم سے تو یقیناً ایک بڑی اور زبردست قوم پیدا ہوگی اور زمین کی سب قومیں اس کے وسیلہ سے برکت پائیں گی .... پھر خداوند نے فرمایا چونکہ سدوم اور عمورہ کا شور بڑھ گیا اور ان کا جرم نہایت سنگین ہوگیا ہے اس لئے میں اب جا کر دیکھوں گا کہ کیا انھوں نے سراسر ویسا ہی کیا ہے جیسا شور میرے کان تک پہنچا ہے اور اگر نہیں کیا تو میں معلوم کروں گا۔

سو وہ مرد وہاں سے مڑے اور سدوم کی طرف چلے ابراہیم خداوند کے حضور کھڑا ہی رہا تب ابراہیم نے نزدیک جا کر کہا کیا تو نیک کو بد کے ساتھ ہلاک کرے گا؟ شاید اس شہر میں پچاس نیک وصالح ہوں کیا تو اسے ہلاک کرے گا اور ان پچاس نیک وصالح کی خاطر جو اس میں ہوں اس مقام کو نہ چھوڑے گا؟ ایسا کرنا تجھ سے بعید ہے کہ نیک کو بد کے ساتھ مار ڈالے اور نیک بد کے برابر ہو جائیں۔

یہ تجھ سے بعید ہے کیا تمام دنیا کا انصاف کرنے والا انصاف نہ کرے گا؟ اور خداوند نے فرمایا کہ اگر مجھے سدوم میں شہر کے اندر پچاس نیک وصالح ملیں تو میں ان کی خاطر اس مقام کو چھوڑ دوں گا۔ تب ابراہیم نے جواب دیا اور کہا کہ دیکھئے! میں نے خداوند سے بات کرنے کی جرأت کی اگر چہ میں خاک اور راکھ ہوں۔ شاید پچاس نیک وصالح میں پانچ کم ہوں کیا ان پانچ کی کمی کے سبب سے تو تمام شہر کو نیست کرے گا؟ اس نے کہا اگر مجھے وہاں پینتالیس ملیں تو میں اسے نیست ونابود نہیں کروں گا۔

پھر اس نے کہا خداوند ناراض نہ ہوں تو میں کچھ اور عرض کروں۔ شاید وہاں تیس ملیں۔ اس نے کہا اگر مجھے وہاں تیس بھی ملیں تو بھی ایسا نہیں کروں گا پھر اس نے کہا دیکھئے! میں نے خداوند سے بات کرنے کی جرأت کی شاید وہاں بیس ملیں اس نے کہا میں بیس کی خاطر بھی اسے نیست ونابود نہیں کروں گا۔ تب اس نے کہا خداوند ناراض نہ ہو تو میں ایک بار اور کچھ عرض کروں شاید وہاں دس ملیں اس نے کہا میں دس کی خاطر بھی اسے نیست نہیں کروں گا۔ جب خداوند ابراہیم سے باتیں کر چکا تو چلا گیا اور ابراہیم اپنے مکان کو لوٹا''۔[1]

تورات کی اس تحریر کے مطابق خداوند اور تین فرشتے ممرے کے بلوطوں میں گرمی کے ایک دن ابراہیم کے پاس آئے۔ ابراہیم نے اُن تین فرشتوں کی بہت زیادہ پذیرائی کی اور اُنھوں نے اس کے ہاں کھانا کھایا (بعضوں نے ان عبارتوں سے یہ سمجھ لیا ہے کہ خدا نے بھی اُن کا کھانا کھایا ہے! یا وہ تین افراد عقیدہ تثلیث کے مطابق تین خداؤں کا مظہر تھے) بہر حال خدا نے سارہ کو بیٹے کی بشارت دی، لیکن سارہ اس بشارت پر ہنسنے لگیں۔ خدا نے ہنسنے پر سارہ کا مؤاخذہ کیا کہ وہ کیوں ہنسی ہیں؟ سارہ نے انکار کیا کہ وہ تو نہیں ہنسیں، لیکن خدا نے زور دیکر کہا تم ہنسی ہو۔ اس کے بعد وہ چلے گئے اور ابراہیم اُنہیں الوادع کرنے کے لئے اُن کے ساتھ چند قدم چلے، راستے میں خداوند نے سوچا کہ وہ ابراہیم کو اپنے اُس اقدام سے کیوں بے خبر رکھے کہ جو وہ قوم لوط کے بارے میں کرنے والا ہے۔

لہٰذا خداوند نے ابراہیم سے کہا: میں نے قوم لوط کے شہروں سے بہت زیادہ شور وغل سُنا ہے اور اُن کے بہت سے گناہ نقل کئے جاتے ہیں، لہٰذا میں آسمان سے اُترا ہوں تا کہ دیکھوں اور تحقیق کروں کہ جو کچھ مجھے کہا گیا ہے وہ درست بھی ہے یا نہیں، اگر درست ہوا تو میں اُنہیں ہلاک کردوں گا۔

---

[1] کتاب پیدائش، فصل/۱۸

پھر وہ تین افراد ''سدوم'' کی طرف روانہ ہو گئے، لیکن ابراہیم اُسی طرح خداوند کے حضور کھڑے رہے اور اُس سے بحث و تکرار شروع کر دی، دوسرے الفاظ میں ''بھاؤ تاؤ'' کرنے لگے اور کہنے لگے کہ اگر ان شہروں میں ۵۰ نیک افراد ہوں تو تم اُنہیں ہلاک کر دو گے تو یہ بات عدل و انصاف کے خلاف ہو گی۔ خداوند نے اطمینان دلایا کہ اگر وہاں ۵۰ نیک افراد ہوئے تو اُنہیں ہلاک نہیں کرے گا۔ ابراہیمؑ نے انتہائی احتیاط کے ساتھ تعداد میں مزید کمی کر دی، ہر بار ابراہیم انتہائی معذرت اور خوش آمد یدکرنے کے بعد اپنی بات شروع کرتے کہ کہیں خدا کو غصہ نہ آ جائے، حتیٰ دوبار تو بہت واضح طور پر کہہ دیا ''میں التماس کرتا ہوں، آپ غصہ میں نہ آئیں'' یہاں تک کہ دس کے عدد تک خدا کو لے آئے۔ گویا اب ابراہیم کو مزید عدد نیچے لانے کی جرائت نہیں ہو رہی تھی۔ لہٰذا یہاں پر مزید بات کو آگے بڑھانے سے خاموشی کو بہتر سمجھا۔ جب بحث یہاں تک پہنچ گئی تو ابراہیم کے ساتھ خدا کی بات چیت ختم ہو گئی اور خداوند ''سدوم'' کی طرف روانہ ہو گیا اور ابراہیم اپنے گھر کی طرف لوٹ آئے۔ توجہ رہے کہ یقیناً یہاں ان آیات (یا صحیح معنوں میں ان جملوں) میں خداوند سے مراد وہی اللہ ہے جو کائنات کا رب ہے۔ اس ساری بحث سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں:

۱۔ خدا کی طرف جسم ہونے کی نسبت! ان عبارتوں میں یہ بات چند مقامات پر دیکھی جا سکتی ہے۔

۲۔ خدا کی طرف بے خبر ہونے کی نسبت! چونکہ اس عبارت کے مطابق خدا قوم لوط کے بارے میں تحقیق کرنے کے لئے زمین پر اُترا ہے۔

۳۔ خدا کا غصہ کرنا اور سختی دکھانا! یہاں تک کہ ابراہیم کو درخواست کرنی پڑتی ہے کہ وہ غصہ نہ کرے اور حیلے بہانے سے اُس سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنے بندوں کے بارے میں اپنے غضب و غصے کو کم کریں!

۴۔ فرشتوں کا غذا کھانا!

۵۔ ''سارہ'' جیسی ایمان دار اور با معرفت عورت خدا کی طرف سے دی جانے والی بشارت پر ہنستی ہیں اور پھر اس کی منکر بھی ہو جاتی ہیں!

یہ ہیں اس جھوٹے افسانے کے واضح اور کمزور نکات جو تحریف شدہ ''تورات'' میں خدا کی طرف منسوب کئے گئے ہیں۔ لیکن جب ہم اصل واقعہ کا قرآن کریم میں مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں اس قسم کی کوئی غلط اور ناروا تہمت نہیں دیکھتے اور اس موازنے کے بعد حقائق کافی حد تک روشن ہو جاتے ہیں۔

۳۔ زبانوں میں اختلاف کا سبب

دنیا بھر کے لوگوں کی زبانوں کے مختلف ہونے کا مسئلہ حیرت انگیز مسائل میں سے ہے حالانکہ سب لوگ ایک ہی ماں باپ (آدم وحوا) سے پیدا ہوئے ہیں۔ یہ مسئلہ ہمیشہ سے توجہ کا مرکز رہا ہے قرآن مجید اس بارے میں فرماتا ہے:

وَمِنۡ اٰيٰتِهٖ خَلۡقُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافُ اَلۡسِنَتِكُمۡ وَاَلۡوَانِكُمۡ ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ

لَاٰیٰتٍ لِّلۡعٰلِمِیۡنَ﴿۲۲﴾

یعنی: ''میں آسمانوں اور زمین کو پیدائش اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا مختلف ہونا اس کی نشانیوں میں سے ہے۔ بے شک اہل علم کے لئے اسی میں بہت سی نشانیاں ہیں۔[1]

آج ہم جانتے ہیں کہ زبان میں فرق کا سر چشمہ درحقیقت دو چیزیں ہیں ایک انسان میں ''جدت'' اور تخلیق کی فکری قوت ہے جس وہ الفاظ اور جملے بنا تا رہتا ہے۔ دوسری: اقوام وملل کا ایک دوسرے سے دور رہنا ہے کیونکہ گذشتہ زمانے میں موجودہ دور کی طرح باہمی روابط کے وسائل نہ ہونے کے برابر تھے۔ گذشتہ زمانوں میں جب ایک قوم وقبیلہ دوسرے سے دور ہوتا تھا تو تدریجاً ان کے الفاظ اور عبارات میں تغییرات اور تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی تھیں۔ یہ تبدیلیاں ہزاروں سال کے دوران پھیلتی رہی ہیں اور اس طرح زبانیں اور الفاظ وکلمات کے معانی بھی ایک دوسرے سے دور ہوتے رہے ہیں اور مختلف زبانوں کے وجود میں آنے کا باعث بنتے رہے ہیں۔

اور پھر زبانوں کا یہی اختلاف اقوام وملل کی شناخت و پہچان کا باعث بھی بنتا ہے جس سے انسانی معاشرے کی شناخت و پہچان میں مدد ملتی ہے۔ اگر قرآن مجید رنگوں کے مختلف ہونے کے ساتھ ساتھ زبانوں کے مختلف ہونے کو بھی خدا کی آیات اور نشانیاں شمار کرتا ہے تو یہ اسی فلسفے کی طرف اشارہ ہے۔ چونکہ جہاں رنگوں کا اختلاف شناخت کا ذریعہ ہے وہاں زبانوں کا اختلاف بھی (اقوام وقبائل کی شناخت کا وسیلہ ہے) فقط فرق یہ ہے کہ پہلا اختلاف (رنگوں کا مختلف ہونا) انسان کے اختیار سے باہر ہے جبکہ دوسرا انسان کی جدت پسندی اور قوت تخلیق کے ساتھ گہرا تعلق رکھتا ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ موجودہ تحریف شدہ ''تورات'' زبانوں کے مختلف ہونے کے بارے میں کیا کہتی ہے۔ سفر تکوین (پیدائش) کی گیارہویں فصل میں یوں آیا ہے:

''اور تمام زمین پر ایک ہی زبان بولی جاتی تھی۔ اور ایسا ہوا کہ مشرق کی طرف سفر کرتے کرتے اُن کو مُلکِ شنعار میں ایک میدان ملا اور وہ وہاں بس گئے۔ اور اُنھوں نے آپس میں کہا آؤ ہم اینٹیں بنائیں اور اُن کو آگ میں خوب پکائیں۔ سو اُنھوں نے پتھر کی جگہ اینٹ سے اور چونے کی جگہ گارے سے کام لیا۔ پھر وہ کہنے لگے آؤ ہم اپنے واسطے ایک شہر اور ایک بُرج جس کی چوٹی آسمان تک پہنچے بنائیں اور یہاں اپنا نام کریں۔

اَیسا نہ ہو کہ ہم تمام روئے زمین پر پراگندہ ہو جائیں۔ اور خداوند اس شہر اور بُرج کو جسے بنی آدم بنانے لگے دیکھنے اُترا۔ اور خداوند نے کہا دیکھو یہ سب لوگ ایک ہیں اور ان سبھوں کی ایک ہی زبان ہے۔ وہ جو یہ کرنے لگے ہیں تو اب کُچھ بھی جس کا ارادہ کریں اُن سے باقی نہ چھوٹے گا۔ سو آؤ ہم وہاں جا کر اُن کی زبان میں اختلاف ڈالیں تا کہ وہ ایک دوسرے کی بات نہ سمجھ سکیں۔ پس خداوند نے اُن کو وہاں سے تمام روی زمین پر پراگندہ کیا سو وہ اُس شہر کے بنانے سے باز آئے۔ اس لئے اُس کا نام بابل ہوا کیونکہ خداوند نے وہاں ساری

[1] سورۂ روم، ۲۲

زمین کی زبان میں اختلاف ڈالا اور وہاں سے خداوند نے اُن کو تمام روئے زمین پر پھیلا دیا"۔[1]

توراۃ کی اس روایت کے مطابق شروع میں تمام لوگوں کی زبان ایک ہی تھی یہاں تک کہ حضرت نوح - کی اولاد اور ان کے قبائل "شنعار" (بابل) میں جمع ہوئے اور ایک اہم کام کرنے کا ارادہ کیا اور وہ ایک بڑا شہر اور بلند برج بنانے کا ارادہ تھا۔ خدا کو ان کا یہ ارادہ پسند نہیں آیا اور وہ ان کے اس جوش وخروش سے پریشان تھا۔

لہٰذا اس نے اپنے بعض فرشتوں سے کہا: آؤ زمین پر جائیں اور ان کی زبان کو مخلوط کردیں تا کہ وہ منتشر ہو جائیں (یعنی تفرقہ ڈالیں اور ان پر خدائی کریں) لہٰذا یہ کام انجام پا گیا۔ چونکہ وہ لوگ ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھتے تھے لہٰذا زمین کے مختلف حصوں میں پھیل گئے اور اس طرح ایک بلند ترین برج بنانے کا کام وہیں ہی دھرا کا دھرا رہ گیا! کتاب "اعلام قرآن" بابل شہر کی وجہ تسمیہ کے بارے میں یوں آیا ہے:

"قصے گو حضرات نے لفظ بابل کو "بَلبَل" سے ماخوذ سمجھا ہے اور کہا ہے کہ طوفان نوح کے بعد لوگ اس شہر میں جمع ہو گئے تھے اور انھوں نے اس شہر کی مرکزیت کی علامت کے طور پر ایک برج بنایا اور اسی شہر میں انھوں نے اپنے سرکاری مراکز بھی تشکیل دیئے لیکن جب وہ رات کو سوئے اور صبح بیدار ہوئے تو ان کی زبانیں مختلف ہوگئی تھی اور ان میں سے ہر کوئی کسی ایک زبان میں گفتگو کرنے لگا جس کے نتیجے میں دنیا کے مختلف حصوں میں افہام وتفہیم کا مسئلہ پیدا ہوگیا اور ہر ایک (زبان) سے ایک قوم پیدا ہوگئی۔[2]

یہ کہانی بھی بالکل اسی مطلب کی طرح ہے جو ہم نے اوپر "توراۃ" سے نقل کی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ زبان میں اختلاف خداوند متعال کی جانب سے تھا اور یہ سب بابل کے لوگوں کی طاقت وقدرت کا مقابلہ کرنے کے لئے کیا گیا ہے! لیکن قاموس مقدس کے مؤلف "مسٹر ہاکس" نے مادہ زبان کے تحت توراۃ کی تحریر کے بارے میں توجیہ کرتے ہوئے ایک اور بات لکھی ہے اس کا کہنا ہے: "تقریباً دو ہزار سال تک پوری دنیا ایک ہی زبان اور لہجے کی مالک تھی......لیکن طوفان (نوح) کے ایک سو سال بعد یعنی بابل کے کوشیوں[3] کی بغاوت کے دوران خداوند متعال نے خلاف معمول زبانوں کو درہم برہم کردیا اور روئے زمین پر مختلف خاندانوں اور مختلف زبانوں سے بھر دیا۔"[4]

وہ دوسرے مقام پر لکھتا ہے: "یہ بات (یعنی بلند ترین برج بنانا) چونکہ خدا کے ارادے کے مطابق نہیں تھا لہٰذا خدا نے ان کی زبانوں کو مختلف کردیا تا کہ ان میں سے کوئی بھی دوسرے کی زبان کو نہ سمجھ سکے۔ اور اس طرح وہ پوری دنیا کے کونے کونے میں پھیل گئے......

---

[1] کتاب پیدائش، فصل ۱۱، جملات: ۱ تا ۹

[2] اعلام قرآن، صفحہ/ ۲۳۸

[3] کوش، نمرود کے باپ کا نام تھا

[4] قاموس مقدس، مادہ (زبان)

اس طرح خدا کا ارادہ پورا ہوا اور زمین آباد ہوگئی۔''[1]

ان عبادتوں سے یہ پتا چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ متعال کا بابل کے لوگوں کے درمیان پراگندگی ایجاد کرنے کا مقصد اس دنیا کو آباد کرنا تھا جبکہ تورات سے ہم نے جو عبارت نقل کی ہے، اس میں صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ خدا کا مقصد بابل کے لوگوں کو کمزور کرنا اور ان کی قدرت، وحدت اور عظمت وشوکت کو توڑنا تھا۔ بہرحال ہم جانتے ہیں کہ زبانوں میں اختلاف کا سبب ہرگز یہ نہیں تھا بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ اقوام وملل کے ایک دوسرے سے دور ہوجانا ہی اس کا اصلی سبب ہے اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔

۴۔ بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی

قرآن مجید میں سورۂ طہٰ (آیت ۸۵ تا ۹۶) میں سامری کے بچھڑے کے واقعے کی طرف ایک اشارہ ہوا ہے جس میں (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا: جب حضرت موسیٰ -وحی حاصل کرنے کے لئے اپنے پروردگار کی طے شدہ (کوہ طور) کی طرف آئے تو: ''اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ -سے فرمایا:) ہم نے تیری قوم کو تیرے بعد آزمائش میں ڈال دیا ہے اور سامری نے انھیں گمراہ کر دیا ہے۔ موسیٰ -اپنی قوم کی طرف غصہ میں بھرے ہوئے اور افسوس کرتے ہوئے پلٹے، (اور ان سے کہا): اے میری قوم! کیا تمہارے ساتھ اچھا وعدہ نہیں کیا تھا؟ کیا تم سے میری جدائی کی مدت زیادہ ہوگئی تھی یا تم یہ چاہتے تھے کہ تم پر تمہارے پروردگار کا غضب ٹوٹ پڑے اس لیے تم نے میرے وعدہ کی مخالفت کی؟ انہوں نے کہا: ہم نے اپنے ارادہ واختیار سے تو تیرے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کی بلکہ (ہوا یہ کہ) ہم (فرعون کی) قوم کے کچھ زیورات اٹھا لائے تھے۔

ہم نے ان کو آگ میں ڈال دیا اور سامری نے بھی اسی طرح (زیور آگ میں) ڈال دیئے پھر اس نے (انہی پگھلے ہوئے زیورات سے) ان کے لئے ایک بچھڑا بنا ڈالا۔ وہ ایک ایسی صورت تھی جس میں سے گائے کی سی آواز آتی تھی [2] اور لوگوں سے کہا کہ یہ تمہارا خدا ہے اور موسیٰ کا خدا بھی یہی ہے (مگر) اس (سامری) نے اپنا عہد فراموش کر دیا۔

کیا وہ یہ نہیں دیکھتے کہ وہ ان کا جواب تک نہیں دیتا اور نہ وہ انھیں کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ ہی کوئی نفع؟ اور ہارون -نے ان سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اے (میری) قوم! تمہاری اس بچھڑے کے ذریعے آزمائش کی گئی ہے۔ اور بلاشبہ تمہارا پروردگار تو خدائے رحمن ہی ہے۔ پس تم میری پیروی کرو اور میرے فرمان کی اطاعت کرو۔ اس پر انھوں نے یہ کہا تھا کہ ہم تو (عبادت کے لئے) اسی کے گرد گھومتے رہیں گے جب تک کہ موسیٰ -خود پلٹ کر ہمارے پاس نہ آئے۔

---

[1] ایضاً: مادہ (بابل)

[2] بعض نے گوسالہ (بچھڑے) سے آواز نکلنے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ وہ مجسمہ اس انداز سے بنایا گیا تھا کہ اُس کے اندرونی حصوں میں جب ہوا چلتی تھی تو اس سے آوازیں بلند ہونے لگتی تھیں، بعض کا کہنا ہے: اُس کے منہ سے لیکر اُس کی پشت تک ایک سوراخ تھا اور اُسے ایک دیوار کے سہارے کھڑا کیا گیا تھا اور ایک شخص دیوار کے پیچھے سے اُس میں پھونک پارتا تھا جس کی وجہ سے اُس میں سے آواز نکلنے لگتی تھی۔

موسیٰ -نے (واپسی کے بعد ہارونؑ سے) کہا: اے ہارون -جس وقت تونے دیکھا کہ وہ گمراہ ہوگئے ہیں تو تجھے کس چیز نے روکا کہ تونے میری پیروی نہ کی؟ کیا تونے میرے حکم کی نافرمانی کی ہے؟ (ہارون -نے کہا) اے میرے ماں جائے! میری ڈاڑھی اور سرنہ پکڑو۔ میں تواس بات سے ڈرا کہ تو یہ کہنے لگے کہ تونے بنی اسرائیل کے درمیان تفرقہ ڈال دیا اور میری نصیحت پرعمل نہ کیا۔

(پھر موسیٰ -نے سامری کی طرف رخ کیا اور) کہا: اے سامری! تونے یہ کام کیوں کیا؟ (سامری نے) کہا: میں نے ایسی چیز دیکھی جو انھوں نے نہیں دیکھی۔ میں نے (خدا کے بھیجے ہوئے) رسول کے آثار میں سے کچھ حصہ اٹھالیا اس کے بعد میں نے اس کو ڈال دیا (دین موسیٰ کے کچھ حصے کو قبول کرلیا اور پھر انہیں چھوڑ دیا) اور میرے نفس نے اس مطلب کو اسی طرح خوبصورت بنایا (کہ میں ایک بت بناؤں اور بت پرستی کی دعوت دوں) ان تمام آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ -کی عدم موجودگی میں ''سامری'' نام کے ایک گمراہ شخص کی باتوں میں آکر کہ جو زرگری کے کام میں ماہر تھا، اپنے پاس موجود زیورات سے ایک سونے کا بچھڑا بنایا، حضرت ہارون -نے اُن کا مقابلہ کرنا چاہا جیسا کہ قرآن مجید کا فرمانا ہے: ہارونؑ نے موسیٰ -سے معذرت کرتے ہوئے کہا:

اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِیْ وَكَادُوْا یَقْتُلُوْنَنِیْ

یعنی: ''اس قوم نے مجھے کمزور کردیا اور قریب تھا کہ مجھے قتل کردیں'' [1]

آخرکار حضرت موسیٰ -اس کام کی وجہ سے بہت ناراض ہوئے اور اپنے بھائیوں کی ملامت کی، سامری کو سزا دی اور اس کے بنائے ہوئے بت کو جلادیا اور اس کی خاکستر کو دریا میں ڈال کر بنی اسرائیل کو سخت سزا دی۔ [2]

اب ہم دیکھتے ہیں اس بارے میں ''تورات'' میں کیا لکھا ہے۔ چنانچہ توریت کے سفر خروج کی فصل ۳۲ میں یہ عبارت ملتی ہے:

''جس وقت قوم موسیٰ نے دیکھا کہ موسیٰ کے پہاڑ سے نیچے اترنے میں دیر ہوئی تو وہ ہارون کے پاس اکٹھا ہوئے اور ان سے کہا کہ اٹھو اور ہمارے لئے ایسا خدا بناؤ جو ہمارے آگے آگے چلے اور کیونکہ یہ شخص موسیٰ جو ہم کو مصر سے نکال کر یہاں لایا ہے نہیں معلوم اس پر کیا گذری، ہارون نے ان سے کہا: طلائی بُندے (گوشوارے) جو تمھاری عورتوں اور بچوں کے کانوں میں ہیں انھیں ان کے کانوں سے اتار کر میرے پاس لاؤ، پس پوری قوم ان گوشواروں کو کانوں سے جدا کرکے ہارون کے پاس لائی، ہارون نے ان گوشواروں کو ان لوگوں کے ہاتھوں سے لیکر ایک ڈھالا ہوا بچھڑا بنایا جس کی صورت چھینی سے ٹھیک کی۔

تب وہ کہنے لگے: اے بنی اسرائیل! یہ تمھارا خدا ہے جو تمھیں سرزمین مصر سے باہر لایا ہے۔ یہ دیکھ کر ہارون نے اس کے آگے ایک قربانگاہ بنائی اور اس نے اعلان کردیا کہ کل خداوند کے لئے عید ہوگی اور دوسرے دن صبح سویرے اٹھ کر انھوں نے قربانیاں چڑھائیں اور سلامتی کے لیے ہدیے پیش کیے۔ پھر ان لوگوں نے بیٹھ کر کھایا پیا اور اٹھ کر کھیل کود میں لگ گئے۔

تب خداوند نے موسیٰ کو کہا نیچے جاؤ کیونکہ تیرے لوگ جن کو تو ملک مصر سے نکال لایا ہے وہ بگڑ گئے ہیں۔ وہ اس راہ سے جس کا

---

[1] اعراف / ۱۵۰

[2] سورۂ طٰہٰ آیات ۸۵ تا ۹۷ اور سورۂ بقرہ، آیہ: ۵۴

میں نے ان کو حکم دیا تھا بہت جلد پھر گئے ہیں انھوں نے اپنے لئے ڈھالا ہوا بچھڑا بنایا اور اسے پوجا اور اس کے لئے قربانی چڑھا کر یہ بھی کہا کہ اے اسرائیل یہ تیرا وہ دیوتا ہے جو تجھ کو ملک مصر سے نکال لایا۔ تب موسیٰ نے اپنے خدا کے آگے منت کر کے کہا اے خداوند کیوں تیرا غضب اپنے لوگوں پر بھڑکتا ہے جن کو تو قوت عظیم اور دست قوی سے ملک مصر سے نکال کر لایا ہے؟ مصری لوگ یہ کیوں کہنے پائیں کہ وہ ان کو برائی کے لئے نکال لے گیا تا کہ ان کو پہاڑوں میں مار ڈالے اور ان کو روئے زمین پر سے فنا کر دے؟

سو تو اپنے قہر و غضب سے باز رہ اور اپنے لوگوں سے اس برائی کرنے کے خیال کو چھوڑ دے۔ تو اپنے بندوں ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب کو یاد کر جن سے تو نے اپنی ہی قسم کھا کر یہ کہا تھا کہ میں تمہاری نسل کو آسمان کے تاروں کی مانند بڑھاؤں گا۔ اور مجمع کے نزدیک آ کر وہ بچھڑا اور ان کا ناچنا دیکھا تب موسیٰ کا غضب بھڑکا اور اس نے ان لوحوں کو اپنے ہاتھوں میں سے پٹک دیا اور ان کو پہاڑ کے نیچے توڑ ڈالا اور اس نے اس بچھڑے کو جسے انھوں نے بنایا تھا لیا اور اس کو آگ میں جلایا اور اسے باریک پیس کر پانی پر چھڑکا اور اسی میں سے بنی اسرائیل کو پلوا دیا۔ اور موسیٰ نے ہارون سے کہا کہ ان لوگوں نے تیرے ساتھ کیا کیا تھا جو تو نے ان کو اتنے بڑے گناہ میں پھنسا دیا؟ ہارون نے کہا کہ میرے مالک کا غضب نہ بھڑکے تو ان لوگوں کو جانتا ہے کہ بدی پر تلے رہتے ہیں۔

چنانچہ انہی نے مجھ سے کہا کہ ہمارے لئے دیوتا بنا دے جو ہمارے آگے آگے چلے کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ اس آدمی موسیٰ کو جو ہم کو ملک مصر سے نکال کر لایا کیا ہو گیا۔ تب میں نے ان سے کہا کہ جس جس کے ہاں سونا ہو وہ اسے اتار لائے۔ پس انھوں نے اسے مجھ کو دیا اور میں نے اسے آگ میں ڈالا تو یہ بچھڑا نکل پڑا۔ اور موسیٰ خداوند کے پاس لوٹ کر گیا اور کہنے لگا ہائے ان لوگوں نے بڑا گناہ کیا کہ اپنے لئے سونے کا دیوتا بنایا اور اب اگر تو ان کا گناہ معاف کر دے تو خیر ورنہ میرا نام اس کتاب میں سے جو تو نے لکھی ہے مٹا دے اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ جس نے میرا گناہ کیا ہے میں اسی کے نام کو اپنی کتاب میں سے مٹا دوں گا۔ اب تو روانہ ہو اور لوگوں کو اس جگہ لے جا جو میں نے تجھے بتائی ہے''۔[۱]

مذکورہ بالا عبارت بعینہ عہدنامہ قدیم سے نقل ہوئی ہے جس سے چند نکات اخذ ہوتے ہیں:

ا۔ بت سازی اور بت پرستی کا حکم حضرت ہارون - نے دیا تھا اور اُنہی کی مدد سے اس حکم پر عمل کیا گیا ہے۔ اُنھوں نے نہ صرف اس کام کی ممانعت نہیں کی بلکہ خود اس کام کے مروج اور بانی بن گئے تھے۔ اس حصے میں سامری کے بارے میں بالکل کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔ کیا ایسا کام کسی ایسے شخص سے ممکن ہو سکتا ہے جو حضرت موسیٰ - کا جانشین، وزیر اور بنی اسرائیل کے کاہنوں (مذہبی رہنماؤں) کا سردار تھا۔ ہماری عقل کیسے ایسی ناروا اور شرمناک تہمت ہارون جیسی شخصیت پر لگانے کی اجازت دے سکتی ہے؟[۲]

---

[۱] تورات (سفر خروج باب ۳۲)

[۲] کتاب ''قاموس مقدس'' کا مؤلف (مسٹر ہاکس امریکائی) اس داستان کی ایک مضحکہ خیز تاویل کرتے ہوئے لکھتا ہے: ہارون نے یہ کام قوم کو خاموش کرنے کے لئے کیا تھا! یہ بات ''گناہ کا عذر پیش کرنا گناہ سے زیادہ قبیح'' ہونے کے مترادف ہے۔ چونکہ یہ بات مذبح خانہ بنانے اور قربانی کرنے کا حکم دینے اور اس دن کو عید قرار دینے کے ساتھ کسی بھی طرح سازگار نہیں ہو سکتی۔

۲۔اللہ تعالیٰ اس واقعے سے اس قدر غضب ناک ہوا کہ اُس نے قوم موسیٰ کو ختم کرنے کا ارادہ کرلیا،لیکن حضرت موسیٰ ؑ نے اللہ تعالیٰ کے سامنے دو نکتے پیش کیئے (خصوصاً ایک جملے میں تو وہ خدا سے کہتے ہیں: یاد کرو!) اور اس طرح موسیٰ ؑ نے اللہ کا غصہ ٹھنڈا کیا: وہ دو نکتے یہ ہیں: اگر تم یہ کام کروگے تو مصر کے لوگ باتیں بنائیں گے اور کہیں گے: کیا تم بنی اسرائیل کو اسی خاطر مصر سے نکال کر لے گے ہو کہ اُنہیں پہاڑوں کے درمیان لے جا کر قتل کرڈالو اور روئے زمین سے اُن کی نسل کو ختم کرڈالو۔

دوم یہ کہ تم نے ابراہیم،اسحاق،اسرائیل اور یعقوب سے وعدہ کیا ہوا ہے کہ میں تمہاری اولاد کو آسمان کے ستاروں کی طرح زیادہ کروں گا،اور تمہارا یہ عمل اس وعدے کی خلاف ورزی ہوگا۔اللہ تعالیٰ نے بھی حضرت موسیٰ -کی اس یاد دہانی کے بعد (تورات کی تصریح کے مطابق) ''اپنا ارادہ بدل دیا''

۳۔حضرت موسیٰ - نے بچھڑے کو آگ میں جلانے کے بعد اس کی راکھ کو پانی میں ڈال دیا اور وہ پانی بنی اسرائیل کو پینے کے لئے دیا۔کیا جلائے ہوئے بچھڑے کی راکھ کوئی تبرک تھی کہ جس کے پانی کو پیا جاتا؟!

۴۔جب حضرت موسیٰ - نے ہارون پر اعتراض کیا تو ہارون نے بہت ہی بے اعتنائی سے جواب دیا: تم جانتے ہو کہ یہ قوم بُرائی کی طرف مائل ہے،اُنھوں نے مجھ سے درخواست کی اور میں نے بھی ان کی درخواست عمل کیا ہے (کیا عجیب بہانہ ہے؟!۔۔) اور پھر حضرت موسیٰ نے بھی اُن پر کوئی اور اعتراض نہیں کیا (یہ بھی عجیب ٹھنڈے مزاج کے مرّبی تھے)

۵۔آخر کار حضرت موسیٰ - بارگاہ خدا میں جاتے ہیں اور خدا کو مقام نبوت سے ''استعفیٰ'' دینے کی دھمکی دیتے ہیں اور کہتے ہیں: اگر ان گناہگاروں کو بخشتے تو ٹھیک ورنہ میرا نام اس کتاب میں سے نکال دو جو تم نے خود لکھی ہے! (اور یہ مشکل وسخت کام کسی اور کے سپرد کردو۔۔)

اب آپ دیکھیں کہ ''تورات'' کی اس داستان میں اللہ تعالیٰ،اُس کے نبی اور جانشین نبی کا چہرہ کس طرح پیش کیا گیا ہے۔اب آپ (تورات میں نقل ہونے والے) اس تاریخی واقعے کا موازنہ اُن باتوں سے کریں کہ جو اس بارے میں قرآن میں آئی ہیں!

۵۔حضرت داؤد -اور اوریاہ کی بیوی کا واقعہ

قرآن مجید کے تاریخی حصوں میں سے ایک اور مسئلہ اللہ تعالیٰ کے ایک عظیم پیغمبر ''حضرت داؤد -کے فیصلے'' کا واقعہ ہے جو دو بھائیوں کے درمیان جھگڑا کو ختم کرنے کے لئے کیا گیا تھا۔قرآن مجید سورہ ص کی آیات نمبر ۲۱ تا ۲۵ میں اس واقعے کی تفصیل اس طرح ذکر کرتا ہے: ''کیا تجھ تک شکایت کرنے والوں کی داستان پہنچی ہے کہ جو (داؤد کے) محراب سے اوپر گئے تھے؟ جس وقت (بغیر کسی اطلاع کے) وہ اس کے پاس آپہنچے اور وہ انھیں دیکھ کر گھبرا گیا تو انھوں نے کہا: ڈرو نہیں،ہم دونوں شکایت لے کر آئے ہیں کہ ہم میں سے ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے۔اب تو ہمارے درمیان حق فیصلہ کردے اور کوئی زیادتی نہ ہونے دے اور راہ راست کی طرف ہماری ہدایت کر۔

یہ میرا بھائی ہے اس کے پاس ننانوے بھیڑیں ہیں اور میرے پاس ایک سے زیادہ نہیں ہے لیکن اس کا اصرار ہے کہ وہ (ایک) بھی مجھے دے دے اور گفتگو میں مجھے دبا تا بھی ہے۔ (داؤد -نے) کہا: تیری ایک بھیڑ کا تقاضا کر کے اپنی بھیڑوں میں اضافہ کرنے کے لئے اس نے مسلماً تجھ پر ظلم کیا ہے اور بہت سے دوست ایک دوسرے پر ظلم کرتے ہیں سوائے ان کے جو ایمان لائے ہیں اور نیک اعمال کرتے ہیں، مگر ان کی تعداد تھوڑی ہے۔ داؤد -نے خیال کیا کہ ہم نے اسے (اس واقعہ سے) آزمایا ہے پس اس نے اپنے رب سے بخشش چاہی اور سجدے میں گر پڑا اور توبہ کی۔ ہم نے اس کو اس کام میں بخش دیا، اور وہ ہمارے ہاں مقام بلند اور نیک انجام کا حامل ہے''

یہ قرآن مجید سے سورۂ ص کی آیات ۲۱ تا ۲۵ کا ترجمہ ہے جو حضرت داؤد -اور شکایت کرنے والوں کے قصے کے بارے میں ہے۔ حضرت داؤد -کی زندگی کی تاریخ کے اس حصے میں کوئی خلاف (عقل وشرع) بات نظر نہیں آتی سوائے یہ کہ اُنھوں نے فیصلہ کرنے میں تھوڑی جلدی کی تھی اور جب اُن دونوں بھائیوں میں سے ایک نے اپنا مقدمہ پیش کیا تو دوسرے بھائی کی وضاحت سنے بغیر یہ کہہ دیا کہ تمہارے بھائی نے تم پر ظلم کیا ہے، اُسے اس قدر مال ودولت رکھنے کے باوجود تمہاری ایک بھیڑ پر نظر نہیں رکھنی چاہیے۔

اگر چہ یہ حضرت داؤد -کی طرف سے حتمی فیصلہ نہیں تھا، لیکن عام طور پر فیصلہ اور انصاف کرنے میں اتنی جلدی بھی ایک عادلانہ فیصلہ کے ساتھ سازگار نہیں ہوسکتی چہ جائیکہ وہ حضرت داؤد -جیسا ایک نبی فیصلہ کرے اور اس میں اتنی جلد بازی سے کام لے۔ شاید یہی بات اُن کی توبہ واستغفار کا باعث بنی ہے اور اللہ تعالیٰ نے بھی فیصلے کے معاملے میں اس قدر دقت وباریکی بینی کی وجہ سے، اس لغزش پر مغفرت ومعافی مانگنے پر اُنہیں بلند مقام ومرتبہ عطا کیا ہے۔

مذکورہ بالا آیات کی اس تفسیر پر شاہد وہ آیت ہے جو ان آیات کے فوراً بعد نازل ہوئی ہے، جس میں فرمایا گیا ہے:

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ

یعنی: ''اے داؤد! ہم نے تجھے زمین پر اپنا جانشین اور نمائندہ قرار دیا ہے (لہٰذا) لوگوں کے درمیان حق کے مطابق فیصلہ کر اور ہوائے نفس کی پیروی نہ کر کیونکہ یہ تجھے راہ حق سے بھٹکا دے گی''[1]

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت داؤدؑ سے فقط یہی (فیصلے میں جلدی کرنے کی) غلطی یا صحیح الفاظ کے مطابق ترک اولیٰ سرزد ہوا ہے، نہ کہ اس واقعے میں عشق وعاشقی جیسے مسائل یا اپنے لشکر کے ایک کمانڈر ''اوریا'' کی بیوی سے لگاؤ وغیرہ کا مسئلہ تھا جیسا کہ تورات کی پیروی میں بعض افسانہ پرداز لوگوں نے کچھ باتیں گھڑی ہیں۔

اب ہم موجود تحریف شدہ تورات کی طرف رجوع کرتے ہیں تا کہ دیکھیں یہ اس بارے میں کیا کہتی ہے: تورات کی دوسری کتاب اشموئیل (کی فصل ۱۱ میں جملہ ۲ تا ۲۷) میں یوں بیان کیا گیا ہے: ''ہوا یہ کہ وقت غروب داؤد اپنے بستر سے اٹھا اور بادشاہ کے گھر

---

[1] سورۂ ص / ۲۶

کی چھت پر گردش کی۔ پشت بام سے ایک عورت کو دیکھا کہ جو غسل کر رہی ہے وہ عورت بہت ہی خوبصورت اور جاذب نظر تھی۔ داؤد نے کسی کو بھیجا اور اس عورت کے بارے میں استفسار کیا۔ کسی نے کہا کہ کیا وہ ''اوریّاہ حتّی''[1] کی بیوی ''بث شبع''[2] بنت ''الیعام''[3] تو نہیں؟

داؤد نے ایلچی بھیج کر اسے منگوالیا وہ اس کے پاس آئی داؤد اس کے ساتھ سویا وہ اس کی نجاست سے پاک ہونے کے بعد اپنے گھر واپس چلی گئی۔ وہ عورت حاملہ ہوگی اس نے کسی کو بھیج کر داؤد کو خبر کی کہ میں حاملہ ہوں۔ داؤد نے یوآب[4] کو کہلا بھیجا کہ اوریاہ حتی کو میرے پاس بھیج دے۔ یوآب نے اوریاہ حتی کو اس کے پاس بھیجا۔ اور یاہ حتی اس کے پاس آیا۔ داؤد نے یوآب کی سلامتی اور جنگ میں اچھا وقت گذارنے کے بارے میں پوچھا۔ پھر داؤد نے اوریاہ سے کہا: اپنے گھر میں جا اور اپنے پاؤں دھو، اوریاہ بادشاہ کے گھر سے باہر آیا۔ اس کے پیچھے بادشاہ کی طرف سے کچھ کھانا باہر گیا لیکن اوریاہ بادشاہ کے گھر کے آگے اپنے آقا کے سارے بندوں کے ہمراہ سو گیا اور اپنے گھر میں نہ گیا۔ جب داؤد کو خبر دی گئی کہ اوریاہ اپنے گھر میں نہیں گیا تو داؤد نے اوریاہ سے کہا: کیا تو سفر سے نہیں لوٹا؟ اپنے گھر میں کیوں نہیں گیا؟

اوریاہ نے داؤد سے عرض کی: صندوق، اسرائیل اور یہودا سائبانوں میں قیام پذیر ہیں میرا آقا یوآب اور میرے آقا کے غلام صحرا میں خیمہ نشین ہیں، کیا ہوسکتا ہے کہ میں کھانے پینے اور اپنی بیوی کے ساتھ سونے کے لئے اپنے گھر جاؤں؟ آپ کی جان کی قسم میں یہ کام نہیں کروں گا...... ہوا یہ کہ داؤد نے صبح ایک خط یوآب کو لکھا اور اوریاہ کے ہاتھ بھیجا۔ خط میں لکھا تھا کہ اوریاہ کو شدید جنگ میں دھکیل دو اور خود اس کے پیچھے سے ہٹ جاؤ تاکہ یہ مارا جائے اور مر جائے۔ اسی طرح ہوا؛ یوآب نے شہر کا جائزہ لینے کے بعد اوریاہ کو ایسی جگہ پر رکھا جہاں اسے علم تھا کہ بہادروں کی ضرورت ہے۔ شہر کے مردوں نے باہر آکر یوآب سے جنگ کی۔ داؤد کے غلاموں کی قوم میں سے بعض گرے اور یاہ حتی بھی مر گیا...... اوریاہ کی بیوی نے اپنے شوہر کی موت کا سنا تو خصوصیت سے اپنے شوہر کا سوگ منایا۔ جب یہ سوگ ختم ہوا تو داؤد نے اسے بلوا بھیجا اور اسے اپنے گھر لایا کہ وہ اس کی بیوی ہوگئی...... لیکن جو کام داؤد نے کیا تھا خدا کو پسند نہیں آیا۔[5]

اس داستان کا خلاصہ کچھ یوں ہے کہ ایک روز حضرت داؤد اپنے محل کی چھت پر جاتے ہیں، ساتھ والے گھر میں ان کی نظر پڑتی ہے تو انھیں ایک عورت غسل کرتے ہوئے برہنہ دکھائی دیتی ہے۔ وہ اس کے عشق میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ پھر جیسے بن پڑتا ہے اسے اپنے

---

[1] اوریّاہ حضرت داؤد کی فوج کے اہم افسروں میں سے تھے اور حتّی، حت بن کنعان کی طرف نسبت ہے کہ جس کے قبیلے کو بنی حت کہتے ہیں۔

[2] بت شبع اس عورت کا نام ہے (تورات کے بقول) حضرت داؤد نے چھت سے اسے برہنہ دیکھا اور اس کے عشق کی آگ آپ کے دل میں بھڑک اٹھی یہ عورت ایک صاحب منصب عبرانی شخص ''الیعام'' کی بیٹی تھی۔

[3] بت شبع اس عورت کا نام ہے (تورات کے بقول) حضرت داؤد نے چھت سے اسے برہنہ دیکھا اور اس کے عشق کی آگ آپ کے دل میں بھڑک اٹھی یہ عورت ایک صاحب منصب عبرانی شخص ''الیعام'' کی بیٹی تھی۔

[4] ''یوآب'' حضرت داؤد کی فوج کا کمانڈر تھا۔

[5] کتاب اشموئیل، فصل ۱۱، جملہ ۲ تا ۲۷۔

گھر لے آئے ہیں اور وہ داؤد سے حاملہ ہوجاتی ہے۔اس عورت کا شوہر لشکر داؤد کا ایک اہم افسر تھا۔وہ ایک پاک طینت اور باصفا شخص تھا۔ وہ جنگ سے واپسی پر اپنے گھر جانے پر آمادہ نہ ہوا تا کہ اپنی بیوی سے ہمبستر ہوتا اور اچھی اچھی غذاؤں سے استفادہ کرتا چونکہ اُس کے مجاہد ساتھی ابھی تک میدان جنگ میں لگے خیموں میں رہ رہے تھے۔

اس کے باوجود حضرت داؤدؑ نے ایک انتہائی بزدلانہ حکم جاری کیا اور اپنی فوج کے کمانڈر ''یوآب'' کو ایک خط لکھا اور اپنے ہاتھ سے ''اوریا'' کو دیا کہ وہ یہ خط لشکر کے کمانڈر تک پہنچا دے۔اس خط میں لکھا تھا کہ اوریا کو محاذ جنگ کے خطرناک مقام پر بھیج دو اور پھر اُسے تنہا چھوڑ دو تا کہ وہ دشمن کی تلواروں مارا جائے۔اس انتہائی شرم ناک اور مجرمانہ حکم پر عمل درآمد کر دیا گیا اور اس طرح پاک دل، باصفا اور شجاع اوریا قتل ہو گیا اور داؤد نے اس کی بیوی پر قبضہ کر لیا!۔۔فقط اس جملے کے آخر میں لکھا ہے: ''خدا کو یہ کام پسند نہیں آیا''!

اب آپ داستان کا باقی حصہ موجودہ تورات کی زبانی سنیں۔اسی کتاب دوم اشموئیل کی ۱۲ویں فصل میں ہے: ''خداوند نے ناتن [۱] کو داؤد کے پاس بھیجا اور کہا: ایک شہر میں دو آدمی رہتے تھے۔ایک امیر تھا دوسرا غریب۔امیر آدمی کے پاس بہت سی بھیڑیں اور گائیں تھیں۔غریب کے پاس بھیڑ کے ایک بچے کے سوا کچھ نہ تھا کہ جسے اس نے خرید کر پرورش کی تھی اور وہ اُس کے اور اُس کے بال بچوں کے ساتھ بڑھی تھی، وہ اُسی کے نوالہ سے کھاتی اور اُسی کے پیالہ سے پیتی تھی اور اُس کی گود میں سوتی تھی اور اس کے لئے بطور بیٹی کے تھی۔

ایک روز ایک مسافر امیر آدمی کے ہاں آیا۔اس نے اپنی بھیڑوں میں سے مہمان کے لئے غذا تیار کرنے میں پس و پیش کیا۔ بلکہ اُس غریب کی بھیڑ لے لی اور اس شخص کے لئے جو اس کے ہاں آیا تھا پکائی۔تب داؤد کا غضب اس شخص پر بشدت بھڑکا اور اس نے ناتن سے کہا کہ خداوند کی حیات کی قسم کہ وہ شخص جس نے یہ کیا واجب القتل ہے۔سو اُس شخص کو اس بھیڑ کا چوگنا بھرنا پڑیگا کیونکہ اس نے ایسا کام کیا اور اُسے ترس نہ آیا۔

تب ناتن نے داؤد سے کہا کہ وہ شخص تُو ہی ہے۔خداوند اسرائیل کا خدا یوں فرماتا ہے کہ میں نے تجھے مسح کر کے اسرائیل کا بادشاہ بنایا اور میں نے تجھے ''ساؤل'' [۲] کے ہاتھ سے چھڑایا۔۔۔سو تُو نے کیوں خداوند کی بات کی تحقیر کر کے اُس کے حضور بدی کی؟ تُو نے ''حِتی اوریاہ'' کو تلوار سے مارا اور اس کی بیوی لے لی تا کہ وہ تیری بیوی بنے اور اُس کو ''بنی عُمون'' [۳] کی تلوار سے قتل کروایا۔سو اب تیرے گھر سے تلوار کبھی الگ نہ ہوگی کیونکہ تُو نے مجھے حقیر جانا اور ''حِتی اوریاہ'' کی بیوی لے لی تا کہ وہ تیری بیوی ہو۔

سو خداوند یُوں فرماتا ہے کہ دیکھ میں شر کو تیرے ہی گھر سے تیرے خلاف اُٹھاؤں گا اور میں تیری بیویوں کو لیکر تیری آنکھوں کے سامنے تیرے ہمسائے کو دُونگا اور وہ دن دہاڑے تیری بیویوں سے مباشرت کرے گا، کیونکہ تُو نے تو چھپ کر یہ کیا، پرُ میں سارے اسرائیل کے رُوبرو دن دہاڑے یہ کروں گا۔تب داؤد نے ناتن سے کہا میں نے خداوند کا گناہ کیا۔ناتن نے بھی داؤد سے کہا: خداوند نے بھی تیرا گناہ

---

[۱] ناتن: بنی اسرائیل کے ایک نبی اور حضرت داؤد کے مشیر تھے۔

[۲] بنی اسرائیل کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ۔

[۳] ''بنی عوم'' جنگجو قسم کے لوگ تھے، جو ''بحر المیت'' کے مشرقی حصے میں رہتے تھے۔حضرت داؤد نے ان کے ساتھ جنگ کی۔

بخش دیا،تُو مرے گا نہیں۔۔۔‘‘ ’’پھر داؤد نے اپنی بیوی ’’بت سبع‘‘ کو تسلی دی اور اُس کے پاس گیا اور اُس سے مباشرت کی اور اُس کے ہاں ایک بیٹا ہوا اور داؤد نے اس کا نام سُلیمان رکھا اور وہ خداوند کا پیارا ہوا‘‘[1]

تورات کی داستان کے اس حصے میں بعض نکات خصوصیت کے ساتھ قابل غور ہیں: مثلاً

۱۔حضرت داؤد کے پاس کوئی شخص فیصلہ کے لئے نہیں آیا بلکہ ان کے ایک مشیر جو نبی تھے انھوں نے نصیحت کے طور پر ان سے ایک داستان بیان کی۔اس میں دو بھائیوں کا واقعہ اور ان میں سے ایک کا دوسرے سے تقاضا کرنا مذکور نہیں ہے بلکہ ایک امیر اور ایک غریب آدمی کا ذکر ہے جن میں سے ایک کے پاس بہت سی بھیڑیں اور گائیں تھیں جبکہ دوسرے کے پاس بھیڑ کا صرف ایک بچہ تھا،اس مقام پر بھی پہلے شخص کے دوسرے شخص سے تقاضے کا ذکر نہیں ہے،لیکن امیر آدمی نے اپنے مہمان کے لئے غریب آدمی کی بھیڑ کا بچہ ذبح کر دیا اور اس کے لئے کھانا تیار کیا۔

۲۔داؤد نے اس ظالم امیر شخص کو قتل کا مستحق سمجھا۔سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک بھیڑ کے لئے آخر قتل کیوں؟

۳۔ساتھ ہی انھوں نے اس حکم کے خلاف حکم صادر کیا اور کہا کہ ایک بھیڑ کے بدلے اسے چار بھیڑیں دینی چاہیں، آخر کس بنا پر؟

۴۔داؤد نے اوریاہ کی بیوی کے بارے میں خیانت سے متعلق اپنے گناہ کا اعتراف کیا۔

۵۔خدا نے داؤد کو معاف کر دیا(اتنی آسانی سے،کس بنا پر؟)

۶۔خدا نے داؤد کے لئے فقط ایک دنیوی سزا تجویز کی اور اُن کے مقدر میں لکھ دیا کہ اُن کی عورتیں اُن کے دوستوں کے ہاتھ لگ جائیں اور وہ اُن کے ساتھ سورج کی روشنی میں (دن دہاڑے) اور بنی اسرائیل کی آنکھوں کے سامنے اُن کے ساتھ بھی اُسی عمل کا ارتکاب کریں!

۷۔انہی عورتوں میں سے ایک عورت سلیمان کی ماں بنی اور وہ سلیمان اُس سے پیدا ہوئے جنہیں خدا دوست رکھتا تھا۔!

اگر ہم داؤد کو خدا کا نبی مانتے ہیں جیسا کہ تمام مسلمانوں کا یہی عقیدہ ہے اور تورات کی کچھ عبارتوں سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔لہٰذا ان اعمال کے مقام نبوت کے منافی ہونے میں کسی قسم کی بحث کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔یہ باتیں نہ فقط مقام نبوت کے منافی ہیں بلکہ یہ کام انتہائی مجرمانہ ہے جس کا ارتکاب ایک عام انسان سے بھی باعث حیرت وتعجب ہے اور جو انسان کو ہر قسم کی سزا کا مستحق بنا سکتا ہے۔

ہم کس طرح یقین کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایک ایسے قاتل کو انتہائی سادگی سے معاف کر دیتا ہے کہ جو اپنے ماتحت افسر کو جان بوجھ کر موت کے منہ میں ڈالتا ہے اور محصنہ زنا کا مرتکب ہوتا ہے؟!اور اگر اُنہیں فقط بنی اسرائیل کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ جانیں جیسا کہ ’’تورات‘‘ کی کتاب سلاطین میں اُن کے حالات میں آیا ہے،تو بھی یہ بات ہرگز قابل قبول نہیں۔کیونکہ اول تو وہ ایک عام بادشاہ نہیں تھے،تورات نے خود اپنی مختلف فصلوں میں داؤد - کے لئے بہت زیادہ احترام اور عظمت کا اظہار کیا ہے۔

---

[1] سموئیل کی کتاب دوم فصل بارہ اور جملات: ایک تا چوبیس۔

وہی بنی اسرائیل کی سب سے بڑی عبادت گاہ کے بانی تھے، جو اُن زمانے میں بہت جنگیں ہونے کی وجہ سے پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکی تھی، لیکن حضرت سلیمان - کے بیٹے نے اُسے تکمیل کیا تھا۔ کیا ایسا عمل ایک ایسے حکمران سے انجام پا سکتا ہے کہ جس کا معنوی اور روحانی مقام و مرتبہ خدا کے نزدیک بہت زیادہ تھا اور خدا اُس پر بہت زیادہ مہربان تھا؟!

دوم یہ کہ ''تورات'' کی مشہور کتب میں سے ایک ''مزامیر داؤد'' ہے جس میں حضرت داؤد کی مناجات ہیں۔ کیا ایک قاتل اور پاک دامن عورت سے زنا کے مرتکب شخص کی مناجات اور باتیں کتب آسمانی کا حصہ قرار دی جاسکتی ہیں؟ لیکن جب ہم قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اس میں نہ تو حضرت داؤد - کے عشق، جرم اور گناہ کا کوئی ذکر آیا ہے اور نہ اس جھوٹی داستان کے دوسرے کلمات اس میں ذکر ہوئے ہیں، بلکہ ایک عبرت انگیز عدالتی فیصلے کا تذکرہ ملتا ہے کہ جو مثال کے طور پر نہیں بلکہ سنجیدہ انداز میں ذکر ہوا ہے، جس کی تفصیل بیان کی جاچکی ہے۔

قرآن مجید کا ان تمام باتوں سے خالی ہونا بہت ہی قابل توجہ ہے۔ یہاں ایک نکتہ ذکر کرنا بھی بہت ضروری ہے، وہ یہ کہ افسوس کے ساتھ بعض مسلمان مورخین یا مفسرین نے بھی ''تورات'' کے جھوٹے افسانوں سے متأثر ہو کر اُنہیں اپنی کتابوں میں نقل کر دیا، واضح ہے کہ اس قسم کی چیزیں نقل کرنے والوں بات کی نہ تو علمی حیثیت رکھتی ہے اور نہ تاریخی و تفسیری قدر و قیمت کی حامل ہے۔ چونکہ معتبر اسلامی کتب سے اُن کی باتوں پر چھوٹی سی بھی دلیل نہیں لائی جاسکتی۔ [۱]

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ حضرت علی - نے اس سلسلے میں فرمایا ہے: ''جو شخص یہ کہے کہ داؤد نے اوریاہ کی بیوی سے شادی کی، تو میں اس پر دو حدیں جاری کروں گا ''حداً للنبوة وحداً للاسلام ''، یعنی: ''ایک حد (اُن کے) مقام نبوت کے لئے اور دوسری حد (اُن کے) اسلام اور مقام ایمان کے لئے۔'' یعنی؛ وہ ایک ایماندار انسان تھے لہٰذا اس ناروا تہمت کی وجہ سے سزا وعذاب کے طور پر حد جاری ہونی چاہیے اور پھر اُن کے مقام نبوت کی توہین کی وجہ سے بھی سزا دی جانی چاہیے۔ [۲]

۶۔ کیا حضرت سلیمان - نے بت خانہ بنایا تھا؟

قرآن مجید نے حضرت سلیمان - کا ایک بڑے نبی اور مقتدر حکمران کے عنوان سے تعارف کرایا ہے کہ جس کی حکومت کی مثال نہ پہلے ملتی ہے اور نہ بعد میں۔ مختلف سورتوں میں منجملہ سورہ بقرہ، سورۂ نساء، سورۂ انبیاء، سورۂ نمل، سورۂ سبا اور سورۂ ص میں اُن کو عظمت اور نیکی کے ساتھ یاد کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۂ ص کی آیت ۳۰ میں آیا ہے:

وَوَهَبْنَا لِدَاوُدَ سُلَيْمٰنَ ؕ نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ﴿۳۰﴾

---

[۱] سموئیل کی کتاب دوم، فصل ۲۱ کے پہلے جملے میں یوں آیا ہے: ''اور داؤد کے ایام میں پے در پے تین سال قحط پڑا اور داؤد نے خداوند سے دریافت کیا۔ خداوند نے فرمایا کہ یہ ساؤل اور اُسکے خونریز گھرانے کے سبب سے ہے۔'' واضح ہے کہ خدا سے گفتگو کرنا انبیاء کے خصائص میں سے ہے۔

[۲] مجمع البیان، جلد ۸، ص ۴۷۲

یعنی: ''ہم نے داؤد -کو سلیمان -عطا کیا، (اور سلیمان -) کیا ہی اچھا بندہ تھا''

کیونکہ وہ ہمیشہ اللہ کی طرف رجوع کرتا تھا (اور اسی کی یاد میں رہتا تھا) مذکورہ بالا سوروں میں قرآن مجید نے (دوسرے انبیاء کی نسبت) اس عظیم پیغمبر کی تاریخ کو بطور مفصل ذکر کیا ہے، جس میں اُن کی طرف بت پرستی اور بت سازی کی کسی قسم کی نسبت نہیں دی جاتی بلکہ اُن کی پوری زندگی کو ہر قسم کے شرک اور گناہ سے پاک قرار دیا جاتا ہے۔

اس سلسلے میں سورۂ انبیاء (آیات ۷۸ تا ۸۲) سورۂ نمل (آیہ مجیدہ ۱۵ تا ۴۴) اور سورۂ ص (آیہ مجیدہ ۳۰ تا ۴۰) کو ہی دیکھ لینا کافی ہے۔ خصوصاً ''ملکۂ سبا'' کی ہدایت، اُس کے شرک جیسے گناہ سے نجات پانے اور اُسے توحید خالص کی جانب دعوت دینے والے قصے کی طرف رجوع کیجئے۔ بالخصوص جب اُس کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا:

وَصَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴿۴۳﴾

یعنی: ''اس طرح (سلیمان نے) اُسے غیر خدا کی عبادت سے روک دیا کیونکہ وہ کافروں میں سے تھی''[۱]

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت ملکۂ سبا کے واقعے میں حضرت سلیمان -کا اصلی مقصد بت پرستی کے خلاف جدوجہد کرنا اور اُس (ملکہ سبا) کی سرزمین کو اس گمراہی کی دلدل سے نجات دلانا تھا۔ اب ہم موجودہ تحریف شدہ تورات کی طرف رجوع کرتے ہیں تاکہ دیکھیں کہ یہ کتاب حضرت سلیمان -کے بارے میں کیا کہتی ہے اور اس نبی کے چہرے کو کس طرح بگاڑ کر پیش کرتی ہے۔ اس کے مطابق اس نبی کا چہرہ ایک بہت ہی ہوس باز شخص کا چہرہ ہے کہ جو اپنی ہوس رانی کی خاطر شرک، بت پرستی حتیٰ بت خانہ بنانے کی حد تک آگے چلا جاتا ہے!

کتاب اول ملوک و پادشاہان میں اس طرح لکھا ہے: اور سلیمان بادشاہ فرعون کی بیٹی کے علاوہ ''موآبیوں''، ''عمونیوں''، ''ادومیوں''، ''صیدونیوں'' اور ''حتیوں'' میں سے بہت سی بیگانہ، اجنبی اور غیر عورتوں سے محبت کیا کرتا تھا، (یہ عورتیں) ان امتوں سے تعلق رکھتی تھیں کہ جن کے بارے میں کدا کا بنی اسرائیل کو یہ حکم تھا کہ تم ان میں داخل نہ ہونا (اور ان سے شادی بیاہ نہ کرنا) اور وہ تم میں داخل نہ ہوں کیونکہ وہ تمہارے دلوں کو اپنے خداؤں کی طرف مائل کر دیں گی، اور سلیمان ان سے عشق و محبت کرتے ہوئے چمٹ گیا۔

اور اس کے لئے سات سو بیویاں (عقد دائمی والی) اور تین سو متعہ والی (موقت) تھیں اور انھوں نے سلیمان کے دل کو پھیر لیا تھا اور یہ سلیمان کے بڑھاپے کے وقت واقع ہوا کہ اس کی بیویوں نے ان کا دل اپنے عجیب و غریب خداؤں کی طرف موڑ لیا اور اس کا دل اس کے باپ داؤد کی طرح اپنے خدا کے ساتھ کامل نہ تھا، اور سلیمان ''صیدونیوں'' کے خدا ''عشتر وں اور عمونیوں'' کے مکروہ ''ملکوم'' (عمونیوں کے بت) کے پیچھے لگ گیا اور سلیمان نے خدا کی نگاہ میں بدی کی اور اپنے باپ داؤد کی طرح مکمل طور پر خدا کی راہ پر نہ چلا۔

اس وقت سلیمان نے اس پہاڑ پر کہ جو ''یروشلم'' کے سامنے تھا، عمون کی مکروہ اولاد ''کموش'' کے لئے خصوصیت کے ساتھ ایک

---

[۱] سورۂ نمل / ۴۳

بلند مقام بنایا، پس خدا سلیمان پر غضبناک ہوا کیونکہ اس نے اسرائیل کے خدا سے کہ جو اس کو دو مرتبہ دکھائی دیا تھا، اپنا دل پھیر لیا تھا۔ اور خدا نے سلیمان سے کہا کہ چونکہ تجھ سے یہ عمل صادر ہو گیا ہے اور میرے عہد اور ان فرائض کی جن کے بجالانے کا میں نے تجھے حکم دیا تھا، تو نے تعمیل نہیں کی اس لئے میں تیری سلطنت تجھ سے چھین کر تیرے غلام کو دے دوں گا، زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ میں تیری زندگی میں ایسا نہ کروں گا، تیرے باپ داؤد کے سبب سے، اور تیرے بیٹے کے ہاتھ سے اسے لوں گا...... البتہ اس کے ہاتھ (سلیمان) سے تمام سلطنت نہیں لوں گا، بلکہ اپنے بندے داؤد کا لحاظ کرتے ہوئے کہ جسے میں نے اس لئے برگزیدہ بنایا تھا کہ اس نے میرے اوامر و فرائض کی حفاظت کی تھی، اس کو اس کی زندگی کے تمام دنوں میں بادشاہ رہنے دوں گا

توارت کی اس ساری جھوٹی داستان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ:

۱۔ سلیمانؑ بت پرست قبیلوں کی عورتوں سے بہت زیادہ لگاؤ رکھتے تھے اور خدا کے حکم کی مخالفت کرتے ہوئے ان میں سے بہت زیادہ تعداد میں (عورتیں) رکھی ہوئی تھیں، اور وہ آہستہ آہستہ انہی کے مذہب کی طرف مائل ہو گیا تھا اور باوجود اس کے کہ "وہ ایسا شخص نہیں تھا کہ جس نے عورت کو نہ دیکھا ہو" بلکہ سات سو عورتیں عقد دائم اور تین سو عورتیں متعہ والی اس کے پاس تھیں، عورتوں کے ساتھ شدید لگاؤ نے انھیں راہ خدا سے باہر نکال دیا تھا۔ (نعوذ باللہ)

۲۔ سلیمانؑ نے کھلم کھلا بت خانہ تعمیر کرنے کا حکم دیا اور اس پہاڑ کے اوپر جو اسرائیل کے مقدس مرکز "یروشلم" کے سامنے واقع تھا، ایک بت کدہ قبیلۂ موآبیان کے معروف بت "کموش" کے لئے اور قبیلہ بنی عمون کے خاص بت "مولک" کے لئے تعمیر کرایا اور صیدونیوں کے بت عشترون کے ساتھ بھی خاص لگاؤ پیدا کر لیا تھا اور یہ سب باتیں بڑھاپے کی حالت میں واقع ہوئیں۔

۳۔ خدا نے اس انحراف اور بڑے گناہ کی وجہ سے اس کے لئے ایک سزا تجویز کی اور وہ سزا یہ تھی کہ اس کا ملک اس سے چھین لے گا لیکن خود اس کے ہاتھ سے نہیں بلکہ اس کے بیٹے "رحبعام" کے ہاتھ سے (چھینے گا) اور خود اس کو مہلت دے گا وہ جتنا چاہے حکومت کرے اور یہ بات بھی خدا کے خاص بندے داؤد (سلیمان کے باپ) کی وجہ سے تھی، خدا کا وہی خاص بندہ جو توارت کی تصریح کے مطابق (العیاذ باللہ) قتل نفس اور محصنہ کے زنا اور اپنے رشید اور خدمت گزار افسر کی بیوی کے ساتھ ہمبستری کرنے کا مرتکب ہوا تھا، کیا کوئی بھی شخص اس قسم کی ناروا تہمتیں سلیمان جیسے آدمی کی مقدس ذات پر لگا سکتا ہے!

اگر ہم سلیمانؑ کو (جیسا کہ قرآن کہتا ہے) پیغمبر سمجھیں تو پھر تو بات بالکل صاف اور واضح ہے، اور اگر ہم انھیں بنی اسرائیل کے بادشاہوں کے سلسلے میں سے جانیں تو پھر بھی اس قسم کی تہمتیں اور نسبتیں ان کے بارے میں صادق نہیں آسکتیں۔ کیونکہ اگر ہم اس کو پیغمبر نہ بھی سمجھیں تو پھر بھی مسلمہ طور پر وہ پیغمبر کے بعد ان کا قائم مقام نائب و جانشین تو تھا، کیونکہ عہد قدیم کی کتب میں سے دو کتابیں ایک "مواعظ سلیمان" یا "حکمتہائے سلیمان" اور دوسری "سرود سلیمان" کے نام سے اس عظیم مرد الٰہی کے اقوال و فرامین پر مشتمل ہیں۔

اس کے علاوہ توارت کی کتاب اول تاریخ ملوک کی تیسری فصل میں (جملہ: ۵ سے لیکر آخر تک کے جملوں میں) صریحاً لکھا ہوا ہے: "اللہ تعالی رات کے وقت سُلیمان کو خواب میں دکھائی دیا اور خدا نے کہا مانگ میں تُجھے کیا دوں۔ چونکہ سلیمان جوان اور کم تجربہ تھے،

اس لئے اُنھوں نے خدا سے حکمت (فہم وعقل) طلب کی۔خداوند نے اُن کی دعا مستجاب کی اور اُنہیں حکمت وفہم دے دی اور کہا: تجھے میں نے ایسی حکمت وفہم عطا کی ہے جو نہ تیرے سے پہلے اور نہ تیرے بعد کسی کو دی ہے''۔

جو شخص جوانی میں ہی اللہ تعالیٰ سے اس طرح علم وحکمت حاصل کرتا ہے جس کی مثال نہیں ملتی،کون سی عقل اس بات کو قبول کر سکتی ہے کہ ایسا شخص بڑھاپے میں وہ بھی عورتوں کی خاطر بت خانہ بنانے کا ارتکاب کرتا ہے؟!بطور مسلّم یہ جھوٹے افسانے کسی کمزور اور ناتوان دماغ ہی کی پیداوار ہو سکتے ہیں اور افسوس کہ بعد میں کچھ جاہل ونادان لوگوں نے انہیں آسمانی کتابوں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے اور اب یہ ''نامقدس'' باتیں ''کتاب مقدس'' کے عنوان سے پہنچائی جاتی ہیں۔لیکن کیا قرآن مجید کی بیان کی ہوئی تاریخ میں اس قسم کی کوئی ناروا تہمت دیکھی جا سکتی ہے؟تحقیق اور غور وفکر کیا جائے تو جواب یقیناً نفی میں ہی ہوگا۔

۷۔حضرت یعقوب -اور اُن کے بھائی عیسو کی عجیب رقابت

قرآن مجید حضرت ابراہیم -،اُن کے فرزند حضرت اسحاق -اور اُن کے پوتے حضرت یعقوب -کے لئے غیر معمولی احترام کا قائل ہے۔اور اس میں بہت سے مواقع پر اُنہیں عظمت ونیکی کے ساتھ یاد کیا گیا ہے۔جیسا کہ سورۂ ص/ ۴۵ تا ۴۷ میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاذْكُرْ عِبٰدَنَآ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اُولِي الْاَيْدِيْ وَالْاَبْصَارِ ﴿۴۵﴾ اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ ﴿۴۶﴾ وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ ﴿۴۷﴾

''اور ہمارے بندوں ابراہیمؑ،اسحاقؑ اور یعقوبؑ کو یاد کرو جو (طاقتور) ہاتھوں والے اور (بینا) آنکھوں والے تھے۔ہم نے انھیں خاص خلوص کے ساتھ خالص کیا تھا اور یہ آخرت کی یاد آوری تھی،اور وہ ہمارے نزدیک برگزیدہ اور نیک افراد میں سے ہیں''

ایک دوسری جگہ (سورۂ انبیاء/ ۷۲، ۷۳) میں اس خاندان کے بارے میں یوں ارشاد ہوتا ہے:

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ ؕ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً ؕ وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ﴿۷۲﴾ وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ﴿۷۳﴾

''اور ہم نے اسے اسحاقؑ اور (اس کے بعد) یعقوبؑ بھی عطا فرمایا،اور ہم نے ان سب کو صالح افراد قرار دیا۔اور ہم نے انھیں ایسے امام (اور پیشوا) قرار دیا جو ہمارے حکم سے (لوگوں کو) ہدایت کرتے تھے اور ہم نے انھیں نیک کام انجام دینے،نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کی وحی کی اور وہ صرف میری ہی عبادت کیا کرتے تھے''

ان جملوں سے معلوم ہوتا ہے یہ الٰہی انسان، ایمان دار، نیک سیرت، عالم وآگاہ، انسانیت کی قیادت کے قابل اور ہر قسم کی آلودگی وگناہ سے پاک وپاکیزہ شخصیات تھیں۔لیکن جب ان ہستیوں کی تاریخ اوہام پرست لوگوں کے ہاتھ چڑھتی ہے تو وہ ان ہستیوں کا چہرہ اس طرح بگاڑ پیش کرتے ہیں کہ گویا یہ لوگ (نعوذ باللہ) مفاد پرست، جھوٹے، عیاش اور اپنے ناجائز مقاصد تک پہنچنے میں کسی قسم کے کام سے نہیں ٹلتے تھے، اور اس طرح ان ہستیوں کو اس حد تک پست کر دیا جاتا ہے۔

اس بات کی گواہی کے لئے ہم تحریف شدہ تورات کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ اس کتاب میں حضرت اسحاقؑ، یعقوبؑ اور ''عیسو'' نام کے ان کے بڑے بھائی کا چہرہ کس قدر وخوفناک بنا کر پیش کیا گیا ہے: ''جب اسحاق ضعیف ہو گیا اور اسکی آنکھیں ایسی دھندلا گئیں کہ اسے دکھائی نہ دیتا تھا تو اس نے اپنے بڑے بیٹے عیسو کو بلایا اور کہا اے میرے بیٹے! اس نے کہا میں حاضر ہوں۔تب اس نے کہا دیکھ! میں تو ضعیف ہو گیا اور مجھے اپنی موت کا دن معلوم نہیں۔سو اب تو ذرا اپنا ہتھیار اپنا تیر اور اپنی کمان لیکر جنگل کو نکل جا اور میرے لیے شکار کر کے لا۔اور میری حسب پسند لذیذ کھانا میرے لئے تیار کر کے میرے آگے لے آ تا کہ میں کھاؤں اور اپنے مرنے سے پہلے دل سے تجھے دعا دوں۔

اور جب اسحاق اپنے بیٹے سے باتیں کر رہا تھا تو ''ربقہ''[1] سن رہی تھی اور عیسو جنگل کو نکل گیا کہ شکار مار کر لائے۔تب ربقہ نے اپنے بیٹے یعقوب سے کہا کہ دیکھ میں نے تیرے باپ کو تیرے بھائی عیسو سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ میرے لئے شکار مار کر لذیذ کھانا میرے واسطے تیار کر تا کہ میں کھاؤں اور اپنے مرنے سے پیشتر خداوند کے آگے تجھے دعا دوں۔

پس میرے بیٹے اس حکم کے مطابق جو میں تجھے دیتی ہوں میری بات کو مان اور جا کر ریوڑ میں سے بکری کے دو اچھے اچھے بچے مجھے لا دے اور میں ان کو لیکر تیرے باپ کے لئے اسکی حسب پسند لذیذ کھانا تیار کر دوں گی اور تو اسے اپنے باپ کے آگے لیجانا تا کہ وہ کھائے اور اپنے مرنے سے پیشتر تجھے دعا دے۔تب یعقوب نے اپنی ماں ربقہ سے کہا دیکھ میرے بھائی عیسو کے جسم پر بال ہیں اور میرا جسم صاف ہے۔

شاید میرا باپ مجھے ٹٹولے تو میں اسکی نظر میں دغاباز ٹھہروں گا اور برکت نہیں بلکہ لعنت کماؤں گا۔اسکی ماں نے اسے کہا اے میرے بیٹے! تیری لعنت مجھ پر آئے۔اور ربقہ نے اپنے بڑے بیٹے عیسو کے نفیس لباس جو اس کے پاس گھر میں تھے لیکر انکو اپنے چھوٹے بیٹے یعقوب کو پہنایا اور بکری کے بچوں کی کھالیں اسکے ہاتھوں اور اس کی گردن پر جہاں بال نہ تھے لپیٹ دیں۔اور وہ لذیذ کھانا اور روٹی جو اس نے تیار کی تھی اپنے بیٹے یعقوب کے ہاتھ میں دیدی۔

تب اس نے باپ کے پاس آکر کہا اے میرے باپ! اس نے کہا میں حاضر ہوں۔تو کون ہے میرے بیٹے۔یعقوب نے اپنے باپ سے کہا میں تیرا پہلوٹھا بیٹا عیسو ہوں۔میں نے تیرے کہنے کے مطابق کیا ہے۔سو ذرا اُٹھ اور بیٹھ کر میرے شکار کا گوشت کھا تا کہ تو دل سے مجھے دعا دے۔تب اسحاق نے اپنے بیٹے سے کہا: بیٹا! تُجھے یہ اس قدر جلد کیسے مل گیا؟ اُس نے کہا: اس لئے کہ خداوند تیرے خدا نے

---

[1] ربقہ حضرت یعقوب اور عیسو کی ماں اور حضرت اسحاقؑ کی بیوی تھیں، حالانکہ یہ دونوں اسی کے بیٹے تھے، لیکن وہ جناب یعقوبؑ سے خاص لگاؤ رکھتی تھیں۔

میرا کام بنا دیا۔

تب اسحاق نے یعقوب کہا: اے میرے بیٹے ذرا نزدیک آ کہ میں تجھے ٹٹولوں کہ تو میرا ہی بیٹا عیسو ہے یا نہیں۔ اور یعقوب اپنے باپ اسحاق کے نزدیک گیا اور اس نے اسے ٹٹول کر کہا کہ آواز تو یعقوب کی ہے پر ہاتھ عیسو کے ہیں۔ اور اس نے اسے نہ پہچانا اس لئے کہ اس کے ہاتھوں پر اسکے بھائی عیسو کے ہاتھوں کی طرح بال تھے۔ سو اس نے اسے دعا دی اور اس نے پوچھا کہ کیا تو میرا بیٹا عیسو ہی ہے۔ اس نے کہا میں وہی ہوں۔ تب اس نے کہا کھانا میرے آگے لے آ اور میں اپنے بیٹے کے شکار کا گوشت کھاؤں گا تا کہ دل سے تجھے دعا دوں۔

سو وہ اسے اسکے نزدیک لے آیا اور اس نے کھایا اور وہ اس کے لیے مے (شراب) لایا اور اس نے پی۔ پھر اس کے باپ اسحاق نے اس سے کہا اے میرے بیٹے! اب پاس آ کر مجھے چوم اُس نے پاس آ کر اسے چوما۔ تب اس نے اس کے لباس کی خوشبو پائی اور اسے دعا دیکر کہا: دیکھو! میرے بیٹے کی مہک، اس کھیت کی مہک کی مانند ہے، جسے خدا نے برکت دی ہو، خدا آسمان کی اوس اور زمین کی موٹائی، اور بہت سا اناج تجھے بخشے! قومیں تیری خدمت کریں، اور قبیلے تیرے سامنے جھکیں! تو اپنے بھائیوں کا سردار ہو، اور تیری ماں کے بیٹے تیرے آگے جھکیں! جو تجھ پر لعنت کرے وہ خود لعنتی ہو اور جو مجھے دعا دے وہ برکت پائے!

جب اسحاق یعقوب کو دعا دے چکا اور یعقوب اپنے باپ اسحاق کے پاس سے نکلا ہی تھا کہ اسکا بھائی عیسو اپنے شکار سے لوٹا۔ وہ بھی لذیذ کھانا پکا کر اپنے باپ کے پاس لایا اور اس نے اپنے باپ سے کہا میرا باپ اٹھ کر اپنے بیٹے کے شکار کا گوشت کھائے تا کہ دل سے مجھے دعا دے۔ اس کے باپ اسحاق نے اس سے پوچھا کہ تو کون ہے؟ اس نے کہا میں تیرا پہلوٹھا بیٹا عیسو ہوں۔ تب اسحاق شدید کانپنے لگا اور اس نے کہا پھر وہ کون تھا جو شکار مار کر میرے پاس لے آیا اور میں نے تیرے آنے سے پہلے سب میں سے تھوڑا تھوڑا کھایا اور اسے دعا دی؟ اور مبارک بھی وہی ہوگا۔ عیسو اپنے باپ کی باتیں سنتے ہی بڑی بلند اور حسرتناک آواز سے چلا اٹھا اور اپنے باپ سے کہا مجھ کو بھی دعا دے۔ اے میرے باپ! مجھ کو بھی۔ اس نے کہا تیرا بھائی دغا سے آیا اور تیری برکت لے گیا''۔ [۱]

اس کے بعد والی فصل میں یوں آیا ہے: ''تب اسحاق نے یعقوب کو بلایا اور اسے دعا دی اور اسے تاکید کی کہ تو کنعانی لڑکیوں میں سے کسی سے بیاہ نہ کرنا، اور قادر مطلق خدا تجھے برکت بخشے اور تجھے برومند کرے اور بڑھائے کہ تجھ سے قوموں کے جتھے پیدا ہوں۔ اور وہ ابراہیم کی برکت تجھے اور تیرے ساتھ تیری نسل کو دے کہ تیری مسافرت کی یہ سرزمین جو خدا نے ابراہیم کو دی تیری میراث ہو جائے''۔ [۲]

اس قصے کا خلاصہ

حضرت اسحاق - کے دو بیٹے تھے بڑے کا نام ''عیسو'' اور چھوٹے کا نام ''یعقوب'' تھا۔ عمر کے آخری حصے میں وہ نابینا ہو گئے

[۱] سفر پیدائش فصل ۲۷، جملات ۱ تا ۳۵

[۲] سفر پیدائش، فصل ۲۸، جملات ۱ تا ۴

تھے اس وقت اُنھوں نے اپنے بڑے بیٹے کو اپنا وصی اور جانشین بنانا اور اُسے دعا اور برکت دینا چاہی۔ (قرائن سے پتا چلتا ہے کہ اس برکت سے مراد مقام نبوت، رسالت کی معنویت اور قوم کی قیادت تھی) لیکن یعقوب نے ایک حیلے سے کام لیا اور اپنی ماں کے حکم پر جو اُسے اسحاق کا جانشین دیکھنا چاہتی تھی، اپنے بڑے بھائی کا لباس پہن لیا اور ایک بھیڑ کی کھال کو اپنے ہاتھوں اور گردن پر باندھ لیا، چونکہ اُن کے بھائی کے جسم پر بال تھے، لہٰذا ممکن تھا اُس کا راز اُس کے باپ پر فاش ہو جاتا۔

البتہ ایسا انسان کہ جس کے بدن کے بال بھیڑ کی طرح اس قدر زیادہ ہوں، اپنی جگہ خود تعجب وحیرت کا باعث ہے! آخر کار اُس نے حیلے وبہانے اور چالاکی سے اپنے آپ کو اپنے بڑے بھائی کی جگہ پیش کر دیا اور اُس کے بوڑھے باپ حالانکہ اُن کی آواز کو پہچان گئے تھے، لیکن پھر بھی اُس کے بالوں والے ہاتھ کو لمس کرنے پر اکتفا کر لیا اور اس کے حق میں دُعا کر دی اور اُسے برکت عطا کر کے اپنا وصی وجانشین اور خاندان کا سرپرست بنا دیا۔ بڑا بھائی جب اس ماجرے سے آگاہ ہوا تو اس نے بہت تلخ گریہ کیا، لیکن جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اور جب اُس نے باپ سے برکت ودعا دینے کا تقاضا کیا تو باپ نے جواب دیا اب تیرے لئے برکت باقی نہیں بچی، جتنی برکت تھی وہ تیرا بھائی یعقوب لے گیا ہے اور یہ اب دوبارہ نہیں دی جا سکتی!

عجیب بات یہ کہ اسحاق کے خدا نے بھی، اُس کی اس بات کی تائید کر دی اور نبوت جیسا مقام ومرتبہ ایک حیلے باز، جھوٹے اور دھوکہ باز انسان کو دیدیا۔ تورات کے بقول: اُسے بہت زیادہ برکت دی اور اس کی قوم وقبیلے کو بہت زیادہ کر دیا اور اپنے عظیم نبی "حضرت ابراہیم" کے مُلک وافتخارات کا وارث بنا دیا۔ اس طرح نہ صرف خاندان اسحاق بلکہ تمام لوگ اس کی پیروی کرنے اور اس کے سامنے جھکنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اس جھوٹے اور مضحکہ خیز افسانے کو کس طرح آسمانی وحی کے طور پر پہچانا جا سکتا ہے؟! اگر ایک عام اور معمولی سے مقام وعہدے کو کوئی شخص جھوٹ اور حیلے سے ہتھیا لیتا ہے۔

مثلاً کوئی کسی پولیس افسر کا لباس پہن لیتا ہے تو حقیقت ظاہر ہونے پر نہ صرف وہ لباس اس سے واپس لے لیا جاتا ہے بلکہ اُسے اس غیر قانونی کام کی وجہ سے سزا بھی دی جاتی ہے۔ لیکن نبوت، الٰہی برکت اور قوم وملت کی قیادت کو کس طرح دھوکے اور فریب سے حاصل کیا جا سکتا ہے؟ اور پھر حقیقت واضح ہو جانے کے بعد اُسے کس طرح جاری رکھا جا سکتا ہے؟!

۸۔ حضرت عیسیٰ - پر شراب سازی کی تہمت

قرآن مجید حضرت عیسیٰ - کے لئے غیر معمولی احترام کا قائل ہے، بہت سی سورتوں (مثلاً سورۂ بقرہ، سورۂ آل عمران، سورۂ مائدہ وغیرہ) میں اُن کے متعلق باتیں ذکر ہوئی ہیں اور اُنہیں اولوالعزم (آسمانی کتاب اور شریعت کے حامل) انبیاء میں سے ایک ایسے نبی کے عنوان سے یاد کیا ہے کہ جس کے بہت سے معجزات تھے۔ اُن کے متعلق سورۂ آل عمران کی ۴۸ اور ۴۹ آیت میں یوں ارشاد ہوا ہے:

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝ وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۬ اَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّيْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ

طَيۡرًۢا بِاِذۡنِ اللّٰهِ‌ۚ وَاُبۡرِئُ الۡاَكۡمَهَ وَالۡاَبۡرَصَ وَاُحۡىِ الۡمَوۡتٰى بِاِذۡنِ اللّٰهِ‌ۚ وَاُنَبِّئُكُمۡ بِمَا تَاۡكُلُوۡنَ وَمَا تَدَّخِرُوۡنَ ۙ فِىۡ بُيُوۡتِكُمۡ‌ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ۚ‏ ﴿۴۹﴾

''اور اسے کتاب وحکمت اور توریت وانجیل کی تعلیم دے گا۔ اور اسے رسول کی حیثیت سے بنی اسرائیل کی طرف بھیجے گا (جو ان سے کہے گا) میں پروردگار کی طرف سے تمہارے لئے نشانی لایا ہوں۔ میں گیلی مٹی سے پرندے جیسی مورت بناتا ہوں پھر اس میں پھونکتا ہوں تو وہ حکم خدا سے پرندہ بن جاتا ہے۔ نیز مادرزاد اندھے کو اور برص میں مبتلا لوگوں کو شفا دیتا ہوں، مردوں کو حکم خدا سے زندہ کرتا ہوں جو کچھ تم کھاتے ہو اور گھروں میں ذخیرہ کرتے ہو اس کی تمھیں خبر دیتا ہوں۔ بے شک اس میں تمہارے لئے نشانی ہے، اگر تم ایمان رکھتے ہو''

اس طرح قرآن بیان کے مطابق اُن کے یہ چار معجزات یعنی؛ ''پرندے کو خلق کرنا''، ''ناقابل علاج بیماروں کو شفا دینا'' ''مردوں کو زندہ کرنا'' اور ''خفیہ امور کی خبر دینا'' تھے (کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے اذن سے انجام پاتا تھا) ایک دوسری جگہ آسمانی مائدے (یعنی؛ بہشتی غذا) کا نازل ہونا بھی حضرت عیسیٰ - کے معجزات میں سے شمار ہوا ہے (سورۂ مائدہ/ ۱۱۵) جیسا کہ عام طور پر معقول اور قابل قبول مسئلہ کو معجزہ کا عنوان دیا جاتا ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ موجودہ ''اناجیل'' اس مسئلے میں کیا کہتی ہیں: 'چار انجیلوں میں سے ایک 'انجیل یوحنا'' ہے، اس کے دوسرے باب میں یوں آیا ہے:

''پھر تیسرے دن (بیت المقدس کے شہروں میں سے ایک شہر) قانای گلیل میں ایک شادی ہوئی اور یسوع کی ماں وہاں تھی اور یسوع اور اس کے شاگردوں کی بھی وہاں دعوت تھی۔ اور جب مَے (شراب) کم ہوگئی تو یسوع کی ماں نے اس سے کہا کہ ان کے پاس مَے (شراب) نہیں رہی۔ یسوع نے اس سے کہا اے عورت مجھے تجھ سے کیا کام ہے؟ ابھی میرا وقت نہیں آیا۔ اسکی ماں نے خادموں سے کہا جو کچھ یہ تم سے کہے وہ کرو۔ وہاں یہودیوں کی طہارت کے موافق پتھر کے چھ مٹکے رکھے تھے اور ان میں دو دو تین تین من کی گنجائش تھی۔ یسوع نے ان سے کہا مٹکوں میں پانی بھر دو۔ پس انہوں نے اس کو لبالب بھر دیا۔ پھر اس نے ان سے کہا آب نکال کر میر مجلس کے پاس لے جاؤ۔ پس وہ لے گئے۔ جب میر مجلس نے وہ پانی چکھا جو مَے (شراب) بن گیا تھا اور جانتا نہ تھا کہ وہ کہاں سے آئی ہے (مگر خادم جنہوں نے بھرا تھا جانتے تھے) تو میر مجلس نے دُلہا کو بلا کر اس سے کہا۔ ہر شخص پہلے اچھی مَے پیش کرتا ہے اور ناقص اس وقت جب پی کر چھک گئے مگر تو نے اچھی مَے اب تک رکھ چھوڑی ہے؟! اس کے بعد لکھا ہے: ''یہ پہلا معجزہ یسوع نے قانائے گلیل میں دکھا کر اپنا جلال ظاہر کیا اور اسکے شاگرد اس پر ایمان لائے''۔[1]

اس داستان سے یہ نکات اخذ ہوتے ہیں:

---

[1] ۔انجیل یوحنا، باب دوم، جملات: ۱ تا ۱۲

۱۔ جب حضرت عیسیٰ -اپنی ماں حضرت مریم × کے ساتھ ایک شادی کی محفل میں داخل ہوئے تو وہاں شراب ختم ہو چکی تھی لہٰذا اُنھوں نے اپنی ماں کی درخواست پر معجزہ دکھایا اور پانی سے بھرے ہوئے چھ مٹکوں کو اصل شراب میں تبدیل کر دیا اور اس طرح محفل کے حاضرین اُس خوش ذائقہ شراب سے لطف اندوز ہوئے۔

۲۔ یہ معجزہ! حضرت عیسیٰ -کا پہلا معجزہ تھا جو اُن کی ماں کی درخواست پر انجام دیا گیا تھا۔

۳۔ حضرت عیسیٰ - نے (پانی کو شراب میں تبدیل کرنے والے) اس معجزہ کے ذریعے اپنے رُعب وجلال کو ظاہر کیا اور اپنے شاگردوں کے ایمان کا باعث بنے۔

دلچسپ بات یہ کہ اب بھی شہر ''قانائے جلیل'' کے مکین حضرت عیسیٰ -کے اعجاز سے بننے والی شراب کی یاد میں مٹکے بناتے ہیں اور سیاحوں اور زواروں کو یہ مٹکے فروخت کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک گھڑا ہوا جھوٹا افسانہ ہے جو اس عظیم الشان پیغمبر کے ساتھ منسوب کیا گیا ہے۔

آج شراب کی برائی اور اس کے نقصانات کسی پر بھی پوشیدہ نہیں ہیں اور یہ چیز تمام آسمانی مذاہب میں حرام اور ممنوع رہی ہے۔ حتیٰ یہود ونصاریٰ کی انہی کتب مقدسہ میں اس بات کی تصریح کی گئی ہے جیسا کہ کتاب ''امثال سلیمان'' میں سخت ترین لہجے میں شراب کی مذمت کی گئی ہے اور یہاں تک کہا گیا ہے: ''کون افسوس کرتا ہے؟ کون غمزدہ ہے؟ کون جھگڑالو ہے؟ کون شاکی ہے؟ کون بے سبب گھایل ہے؟ اور کس کی آنکھوں میں سرخی ہے؟ وہی جو دیر تک مے نوشی کرتے ہیں۔ وہی جو ملائی ہوئی مے (شراب) کی تلاش میں رہتے ہیں۔ جب مے لال لال ہو۔ جب اس کا عکس جام پر پڑے اور جب وہ روانی کے ساتھ نیچے اُترے تو اس پر نظر نہ کر کیونکہ انجام کار وہ سانپ کی طرح کاٹتی اور افعی کی طرح ڈس جاتی ہے۔

تیری آنکھیں عجیب چیزیں دیکھیں گی اور تیرے منہ سے اُلٹی سیدھی باتیں نکلیں گی۔ بلکہ تُو اس کی مانند ہوگا جو سمندر کے درمیان لیٹ جائے یا اُس کی مانند ہوگا جو مستول کے سرے پر سو جائے۔ تُو کہے گا اُنہوں نے مجھے مارا ہے پر مجھ کو چھوٹ نہیں لگی۔ اُنہوں نے مجھے پیٹا ہے پر مجھے معلوم نہیں ہوا۔ میں کب بیدار ہوں گا؟ میں پھر اُس کا طالب ہوں گا''۔[1]

اس عبارت سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ شراب کی بُرائیاں بہت زیادہ ہیں، جو جسم کی ناراحتی، روح وفکر کی پریشانی، لڑائی، جھگڑے اور معاشرتی جنگ وجدال اور انسان کی بدبختی کا باعث بنتی ہے۔ اس کا اثر انسانوں کے اندر سانپ کے زہر جیسا ہوتا ہے اور یہ بے حیائی اور جنسی گناہوں اور انواع واقسام کے خیالات اور برائیوں میں مبتلا ہونے کا باعث بنتی ہے۔ یہ سب اس عبارت میں بہت ہی واضح طور پر پیش کیا گیا ہے۔

کتاب ''امثال سلیمان'' میں ایک اور مقام پر آیا ہے: مے (شراب) مسخرہ اور شراب ہنگامہ کرنے والی ہے (چونکہ انسان میں ایسی حرکتیں اور باتیں کرنے کا باعث بنتی ہے جس کی وجہ سے وہ تمسخر کا نشانہ بنتا ہے، اسی طرح اس شور وشرابہ اور ہنگامہ کھڑا ہو جاتا ہے) اور

[1] عہد عتیق، کتاب امثال سلیمان، فصل ۲۳

جو کوئی ان سے فریب کھاتا ہے دانا و حکیم نہیں"۔ [1]

نیز کتاب اشعیاء کی فصل ۲۸ میں آیا ہے: "لیکن یہ لوگ (گمراہ لوگوں کی طرف اشارہ ہے) بھی شراب کی وجہ سے ضال اور مسکرات کی وجہ سے گمراہ ہو گئے ہیں" [2]

اسی کتاب میں ایک اور مقام پر آیا ہے: وائے ہو اُن پر جو شراب پینے میں پہلوان اور مسکرات (نشہ آور چیزوں) میں قوت رکھتے ہیں"۔ [3] یعنی؛ شراب پینے سے اُن کی قوتیں جھگڑے کے لئے تیار ہو جاتی ہیں۔

تورات کی کتاب "ہوشیع" میں آیا ہے: "بدکاری اور مے اور نئی مے (انگور کے شیرے) سے بصیرت جاتی رہتی ہے"۔ [4]

ان الفاظ سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ شراب پینے کی عام چیز کے معنیٰ میں ہرگز حلال نہیں ہے، بلکہ یہ ایک مست کرنے والا مائع ہے جو انسان کے جسم اور روح کو نقصان پہنچاتا ہے اور اس کی گمراہی و بدبختی کا سبب بنتا ہے۔ بہر حال کیا یہ شرم ناک بات نہیں کہ ہم کہیں کہ شہر قانائے جلیل میں حضرت عیسیٰ - سے سب سے پہلے جو معجزہ ظاہر ہوا وہ یہ تھا کہ اُن کی برکت سے پانی سے بھرے ہوئے بڑے بڑے برتن اصلی شراب میں تبدیل ہو گئے تھے۔ اور جب ہم ان باتوں کا قرآن مجید میں ذکر ہونے والے حضرت عیسیٰ - کے معجزات سے موازنہ کرتے ہیں تو انسانی ذہن کی تراشی ہوئی تاریخ اور وحی الٰہی سے اخذ شدہ حقیقی تاریخ میں فرق واضح ہو جاتا ہے۔

۹۔ حضرت عیسیٰ - اور الوہیت کی دعوت

قرآن مجید پوری صراحت کے ساتھ حضرت عیسیٰ - کے دامن کو ہر قسم کے الوہیت کے ناروا دعویٰ سے پاک جانتا ہے اور واضح طور پر فرماتا ہے:

وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ ۤ بِحَقٍّ ڲ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ۭ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۝۱۱۶ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ۭ وَاَنْتَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝۱۱۷

---

[1] عہد عتیق، امثال سلیمان، فصل ۲۰، جملہ ۱

[2] کتاب اشعیاء، فصل ۲۸، جملہ ۷

[3] ایضاً فصل ۵، جملہ ۲۲

[4] کتاب ہوشیع فصل ۴، جملہ ۱۱

''وہ وقت یاد کرو جب اللہ تعالیٰ عیسیٰ بن مریم سے کہے گا کہ (اے عیسیٰ) کیا تو نے لوگوں سے یہ کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے علاوہ معبود بنا لو وہ جواب دیں گے تیری ذات پاک ہے، مجھے کوئی حق نہیں کہ ایسی بات کہوں جو میرے لائق نہیں ہے۔ اگر میں نے ایسی کوئی بات کہی ہوگی تو اس کا تجھے ضرور علم ہوگا تو ان سب باتوں کو جانتا ہے کہ جو میرے نفس و روح میں ہیں، لیکن میں جو کچھ تیری ذات پاک میں ہے، اسے نہیں جانتا کیونکہ تو تمام غیب اور پوشیدہ چیزوں سے باخبر ہے۔ مجھے تو نے جس کام پر مأمور فرمایا تھا میں نے اس کے سوا ان سے کوئی بات نہیں کہی تھی، میں نے تو ان سے یہی کہا تھا کہ اس خدا کی پرستش کرو جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی پروردگار ہے اور میں تو اس وقت تک ہی ان کا نگران اور گواہ تھا جب تک کہ میں ان کے درمیان تھا اور جب تو نے مجھے ان کے درمیان سے اُٹھا لیا تو پھر تو ہی ان کا نگران تھا اور تو ہی ہر چیز پر گواہ ہے۔'' (سورۂ مائدہ/۱۱۶، ۱۱۷)

اب ہم دیکھتے ہیں حضرت عیسیٰ -کے بارے میں اناجیل کیا کہتی ہیں۔ انجیل یوحنا میں یوں آیا ہے: ''یہودیوں نے اسے سنگسار کرنے کے لئے پتھر اٹھائے۔ عیسیٰ نے انھیں جواب دیا کہ میں نے تم کو باپ کی طرف سے بُہتیرے اچھے کام دکھائے ہیں ان میں سے کس کام کے سبب مجھے سنگسار کرتے ہو؟ یہودیوں نے اسے جواب دیا کہ اچھے کام کے سبب سے نہیں بلکہ کفر کے سبب تجھے سنگسار کرتے ہیں اور اسلئے کہ تو آدمی ہو کر اپنے آپ کو خدا بناتا ہے۔ عیسیٰ نے انہیں جواب دیا۔ آیا تم اس شخص سے جسے باپ نے مقدس کر کے دنیا میں بھیجا کہتے ہو کہ تو کفر بکتا ہے اسلئے کہ میں نے کہا میں خدا کا بیٹا ہوں۔ اگر میں اپنے باپ کے کام نہیں کرتا تو میرا یقین نہ کرو لیکن اگر میں کرتا ہوں تو گو میرا یقین نہ کرو مگر ان کاموں کا تو یقین کرو تا کہ تم جانو اور سمجھو کہ باپ مجھ میں ہے اور میں باپ میں'' [۱]

اس عبارت سے چند نکات واضح ہوتے ہیں:

۱۔ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ -پر تہمت لگائی کہ اُنھوں نے خدائی کا دعویٰ کیا ہے اور اُن کو کافر قرار دیتے ہوئے اُنہیں سنگسار کرنے کا حکم دیا ہے۔

۲۔ حضرت عیسیٰ -اپنا دفاع کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''میں نے کہا ہے کہ میں خدا کا بیٹا ہوں اور خدا میرا باپ ہے، اور کبھی کہا ہے: میں خدائی کام انجام دیتا ہوں، اگر میں ایسے کام انجام نہ دوں تو میری بات کا یقین نہ کرنا اور انجام دیئے تو میرا یقین کر لینا کہ خدا میرے اندر ہے اور میں خدا کے اندر ہوں۔ باپ اور بیٹے کا عقیدہ اور خدائی کاموں کے انجام دینے اور انسان کے خدا میں حلول اور خدا کے انسان میں حلول کرنے جیسے الفاظ سب کے سب کفر آمیز جملے ہیں جو کسی بھی عقلی و منطقی معیار کے مطابق نہیں ہیں۔ اُصولی طور پر یہ کسی بھی طرح درست نہیں کہ ایک (سچا) نبی اپنے اور خدا کے بارے میں حتیٰ مجاز گوئی کے عنوان سے ہی ایسی تعبیرات استعمال کرے اور جاہل

---

[۱] انجیل یوحنا/ باب ۱۰/ جملات/ ۳۱/ ۳۸

لوگوں کو غلط فہمی میں ڈالتے ہوئے دشمنوں کے ہاتھ میں بہانہ دیدے اور وہ اسی بہانے سے اُسے سنگسار کرنے پر تُل جائیں۔

جبکہ دوسری طرف قرآن مجید مذکورہ بالا آیات میں پوری صراحت کے ساتھ فرماتا ہے کہ حضرت عیسیٰ - نے خدا کی بندگی اور اس کی جانب سے نبوت و رسالت کے علاوہ اور کسی قسم کا دعویٰ نہیں کیا، نیز وہ مقام عبودیت اور فرمان خدا کے سامنے تسلیم ہونے کے علاوہ انتہائی خاضع ترین انسان تھے۔ بعض دوسری آیات میں بھی آیا ہے: اُنھوں نے جتنے بھی معجزات دکھائے ہیں وہ سب کے سب خدا کے اذن اور فرمان سے انجام دیئے ہیں۔ چنانچہ سورۂ مائدہ کی آیت ۱۱۰ میں آیا ہے:

وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِيْ وَتُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِيْ

''اور جب تو میرے حکم سے مٹی سے پرندے کی شکل بناتا اور اس میں پھونکتا اور وہ میرے حکم سے پرندہ بن جاتا، اور مادرزاد اندھے اور برص کی بیماری والے کو تو میرے حکم سے شفا دیتا اور مردوں کو (بھی) تو میرے حکم سے زندہ کرتا''

قرآن مجید میں اس قسم کے تاریخی مسائل کا جب انجیل کے ساتھ موازنہ کیا جاتا ہے تو واضح ہو جاتا ہے کہ کون سی بات خدا کی جانب سے ہے اور کون سی بات تحریف شدہ اور انسانی ذہن کی پیداوار ہے۔

۱۰۔ حضرت عیسیٰ - کے حضور بدکار عورت

قرآن مجید کی مختلف آیات میں حضرت عیسیٰ - کے بارے میں جو کچھ آیا ہے اس میں حتیٰ معمولی سا ترک اولیٰ بھی ذکر نہیں ہوا اور سورہ مریم میں جو آیات ان کی والدہ ماجدہ حضرت مریم × کے بارے میں نازل ہوئی ہیں وہ ان کی اس قدر بلند مرتبہ قداست کو بیان کرتی ہیں کہ جب وحی لانے والا فرشتہ انھیں خدا کی طرف سے فرزند عطا کرنے کے لئے آیا تو وہ یہ دیکھ کر بہت سخت وحشت زدہ ہوگئیں تھیں اور اس سے خدا کی پناہ طلب کی (چونکہ وہ فرشتہ ایک اجنبی خوبصورت جوان کی شکل میں ان کے سامنے ظاہر ہوا تھا) حتیٰ سب ان کے وضع حمل کا وقت آیا تو انھوں نے اپنی زندگی کے مستقبل کا تصور کرتے ہوئے کہ ممکن ہے دشمن اور جاہل لوگ ان کی طرف ناروا باتیں منسوب نہ کردیں، یہ فرمایا:

يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ﴿۲۳﴾

یعنی: ''اس نے کہا: اے کاش میں اس سے پہلے ہی مرگئی ہوتی اور بالکل فراموش ہوگئی ہوتی''[1]

بہر حال اس قدر مقدس نبی جو گہوارے میں خدا کے فرمان سے اپنی زبان کھولتا ہے اور عملاً اپنی والدہ کی پاکیزگی کی گواہی دیتا

[1] مریم / ۲۳

ہے اور اسی وقت سے نماز، زکوٰۃ اور تقویٰ و پرہیزگاری کی باتیں کرتا ہے اسی ہستی کا بعض اناجیل میں ایسا چہرہ پیش کیا جاتا ہے کہ جسے دیکھ کر ہر انسان حیرت وتعجب میں ڈوب جاتا ہے۔ اب ہم ''انجیل لوقا'' کو دیکھتے ہیں کہ جس میں شہر کی ایک بدنام عورت حضرت عیسیٰ -کے پاس آ کر توبہ کرتی ہے وہ اس واقعہ کو کس طرح بیان کرتی ہے:

''تو دیکھو ایک بدچلن عورت جو اس شہر کی تھی یہ جان کر کہ وہ اس فریسی کے گھر میں کھانا کھانے بیٹھا ہے (فریسی، یہودیوں کا ایک فرقہ تھا، فریس کا اصلی معنیٰ گوشہ نشین ہے) وہ سنگ مرمر کے عطردان میں عطر لائی۔ اور اس کے پاؤں کے پاس روتی ہوئی پیچھے کھڑی ہو کر اس کے پاؤں آنسوؤں سے بھگونے لگی اور اپنے سر کے بالوں سے ان کو پونچھا اور اس کے پاؤں بہت چومے اور ان پر عطر ڈالا۔ اس کی دعوت کرنے والا فریسی یہ دیکھ کر اپنے جی میں کہنے لگا کہ اگر یہ شخص نبی ہوتا تو جانتا کہ جو اسے چھوتی ہے وہ کون ہے اور کیسی عورت ہے کیونکہ بدچلن ہے۔ یسوع نے جواب میں اس سے کہا: اے شمعون [1] مجھے تجھ سے کچھ کہنا ہے۔ اس نے کہا: اے استاد کہہ؛ کسی ساہوکار کے دو قرضدار تھے، ایک پانسو دینار کا دوسرا پچاس کا، جب ان کے پاس ادا کرنے کو کچھ نہ رہا تو اس نے دونوں کو بخش دیا۔ پس ان میں سے کون اس سے زیادہ محبت رکھے گا؟

شمعون نے جواب میں کہا میری دانست میں وہ جسے اس نے زیادہ بخشا۔ اس نے اس سے کہا تو نے ٹھیک فیصلہ کیا۔ اور اس عورت کی طرف پھر کر اس نے شمعون سے کہا کیا تو اس عورت کو دیکھتا ہے؟ میں تیرے گھر میں آیا۔ تو نے میرے پاؤں دھونے کو پانی نہ دیا مگر اس نے میرے پاؤں آنسوؤں سے بھگو دیئے اور اپنے بالوں سے پونچھے۔ تو نے مجھے بوسہ نہ دیا مگر اس نے جب سے میں آیا ہوں میرے پاؤں چومنا نہ چھوڑا۔ تو نے میرے سر میں تیل نہ ڈالا مگر اس نے میرے پاؤں پر عطر ڈالا ہے۔ اس لئے میں تجھ سے کہتا ہوں کہ اس کے گناہ جو بہت تھے معاف ہوئے کیونکہ اس نے بہت محبت کی مگر جس کے تھوڑے گناہ معاف ہوئے وہ تھوڑی محبت کرتا ہے۔ اور اس عورت سے کہا تیرے گناہ معاف ہوئے۔'' [2]

اس قصہ کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ -فریسی نامی یہودیوں کے قبیلہ کے ایک گھر میں آتے ہیں، گھر کا مالک ان کا زیادہ احترام نہیں کرتا لیکن اسی شہر میں موجود ایک گناہ گار اور گمراہ عورت کو جب ان کے آنے کی اطلاع ملتی ہے تو وہ یہودی کے گھر آ جاتی ہے۔ [3]

اس زمانے میں مہمانوں کے پاؤں دھونے کا رواج تھا اور بعض اوقات اس کے بالوں میں تیل بھی لگایا جاتا تھا شاید یہ سب کچھ اس لئے کیا جاتا تھا کہ اس وقت اکثر لوگ ننگے پاؤں چلتے تھے اور سفر کے دوران ڈھانپنے کے کوئی وسائل نہیں ہوتے تھے جس کی وجہ سے

---

[1] ''شمعون'' کا اصل مطلب سننے والا ہے اور ''قاموس کتاب مقدس'' کے مؤلف کے بقول یہ اُن دس افراد کا نام ہے کہ جن کی طرف عیسائیوں کی کتاب مقدس میں اشارہ ہوا ہے، اُن میں سے ایک یہی شمعون فریسی ہے جو اس واقعے میں حضرت عیسیٰ -کا مخاطب تھا۔

[2] انجیل لوقا، باب ہفتم، جملات ۳۷ تا ۴۸

[3] احتمالاً یہ وہی زناکار اور مالدار عورت ہے جس کا نام ''مریم مجدلینہ'' تھا۔ اس کے بعد والے باب (باب ہشتم) میں انجیل لوقا کے بقول اس نے حضرت عیسیٰ -کے ہاتھ پر توبہ کر لی تھی اور اُن کے ساتھیوں میں سے ہو گئی تھی۔

ان کے بال اور بدن کی جلد ہوا چلنے کی وجہ سے خشک ہوجاتی تھی۔(اس جھوٹی داستان کے مطابق) اُس گناہگار عورت نے پانی کے بجائے اپنے آنسوؤں سے حضرت عیسیٰ - کے پاؤں دُھولائے اور تولیے کے بجائے اپنے لمبے بالوں سے اُن کے پاؤں کو خشک کیا اور اپنے گرم ہونٹوں سے اُن کے پاؤں کو بوسہ دیا۔ یہ اس قدر بُرا منظر تھا، اُس گھر کا مالک یہودی اپنے آپ سے کہنے لگا: اگر یہ مرد پیغمبر ہوتا تو جان لیتا کہ یہ عورت کیسی ہے اور کم از کم اس کو یہ کام نہ کرنے دیتا۔

حضرت عیسیٰ - نے اپنی فراست سے جان لیا اور دو قرض داروں کے بارے میں مثال دیکر اُسے جواب دینے کی کوشش کی اور اُسے بتایا کہ میں تو تیرا مہمان تھا، جو پذیرائی اس عورت نے میری کی ہے، وہ تو نے کرنی تھی، تو نے میرے پاؤں پانی سے نہیں دھوئے اور اس نے اپنے آنسوؤں سے دھوئے ہیں، تو نے میرا بوسہ نہیں لیا، لیکن اس نے مسلسل میرے پاؤں کے بوسے لیئے ہیں، تو نے میرے سر میں تیل نہیں ملا، لیکن اس نے میرے پاؤں پر عطر ملا ہے۔اب ہم اس قصے کے بارے میں تھوڑا سا تجزیہ کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کیا ایک عظیم پیغمبر بلکہ ایک عام پرہیزگار شخص کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنے آپ کو گناہوں سے آلودہ عورت کے حوالے کردے جو اس کے ساتھ اس طرح کا سلوک کرے؟

سب سے پہلی بات تو یہ کہ حضرت عیسیٰ -اس وقت جوان تھے اور تقریباً اُن کی عمر تیس سال تھی، اور اصولاً وہ عورت بھی جوان اور خوبصورت ہی تھی چونکہ شہر کی مشہور بدکار عورت بدصورت اور بوڑھی تو نہیں ہوسکتی تھی۔ یہ کیسے یقین کیا جاسکتا ہے کہ ایک ایسا عظیم نبی کہ جو تہذیب واخلاق اور تقویٰ و پرہیزگاری کی ترویج کے لئے مبعوث ہوا ہے، خود کسی بدکارہ عورت کو اجازت دے کہ وہ اس کے پاؤں کو اس قدر ملے یا آنسوؤں سے دھوئے اور اپنے بالوں سے خشک کرے اور اپنے نرم و نازک ہاتھوں سے اس کو تیل لگائے اور اپنے گرم گرم ہونٹوں سے مسلسل اُس کے بوسے لے، کیا یہ سب کچھ قابلِ یقین ہے؟

بالفرض وہ توبہ ہی کرنا چاہتی تھی تو اس کا بھی کوئی اصول وقاعدہ تھا، کیا ابھی تک کسی نے ایک روحانی اور پادری کے ساتھ اس طرح کیا ہے؟ چہ جائیکہ ایک پیغمبر کے ساتھ ایسا کیا جاتا۔ بہر حال اس جھوٹی کہانی کا خرافات پر مبنی ہونا بالکل واضح ہے۔اس کے علاوہ حضرت عیسیٰ - نے (اس قصے کے مطابق) جو مثال دی ہے، اُس کے ذریعے اس یہودی کا جواب نہیں دے سکے، یہودی کا اعتراض یہ نہیں تھا کہ یہ عورت اس قدر محبت کیوں کررہی ہے تا کہ اس کے جواب میں کہا جائے کہ یہ اپنے گناہوں کی زیادتی کی وجہ سے اس قدر محبت کررہی ہے، بلکہ یہودی کا اعتراض یہ تھا کہ خدا کا پیغمبر، گناہوں سے آلودہ اور بدنام عورت کو اپنے پاؤں مس کرنے، اپنے آنسوؤں سے اُنہیں دھونے، اپنے بالوں سے اُنہیں خشک کرنے اور اُن پر عطر ملنے کی کیوں اجازت دے رہا ہے۔ واضح ہے کہ گناہ کے زیادہ یا کم ہونے کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بہر حال قرآن کی تاریخ میں حضرت عیسیٰ - کے بارے میں جو واقعات نقل ہوئے ہیں، اُن میں اُنہیں اس قسم کی ناروا باتوں سے منزہ و پاک قرار دیا گیا ہے۔

نتیجہ

جو کچھ اوپر دس عناوین کے تحت ذکر ہوا ہے، اس سے کتب عہدین (یہودیوں اور عیسائیوں کی مقدس کتابوں) یعنی؛ وہی کتابیں کہ جو نزول قرآن کے زمانے میں تاریخ ادیان کا سب سے اہم منبع شمار ہوتی تھیں، کے بارے میں ایک واضح موازنے سے پتا چلتا ہے کہ قرآن مجید جیسی کتاب ہرگز انسانی فکر وسوچ کی پیداوار نہیں ہوسکتی، چونکہ (اگر یہ عام کتاب ہوتی تو) ضرور ان سے متاثر ہوتی اور اس قسم کے قصوں کو نقل کرنے میں ضرور اُن سے اثر قبول کرتی۔ لیکن قرآنی تاریخ کا خصوصاً انبیائے الٰہی کے واقعات کے سلسلے میں ہر قسم کی خرافات اور نازیبا تہمتوں سے پاک ہونا، اس بات کا شاہد ہے کہ اس کتاب کا سرچشمہ علم پروردگار ہے اور یہ ایک دائمی معجزہ ہے۔

۵۔ وضع قوانین کی نظر سے قرآنی اعجاز

ہم جانتے ہیں کہ قرآن مجید میں توحید اور قیامت سے متعلق معارف وتعلیمات، اخلاقی وتاریخی مسائل، عبادات سے متعلق احکام کے علاوہ کچھ اجتماعی قوانین بھی آئے ہیں، جو درحقیقت اسلام کے بنیادی قانون کا ایک نقشہ پیش کرتے ہیں اور اس کے مدنی، حقوقی اور جزائی وسیاسی قوانین کا ایک حصہ سمجھے جاتے ہیں۔ فقط قرآن کے اسی حصے میں غور وفکر کرنے سے اس کا معجزہ ہونا ثابت ہوسکتا ہے۔ چونکہ ان حکیمانہ قوانین کے سامنے کہ جن کے چند نمونے آگے چل کر پیش کئے جائیں گے، ہر مصنف مزاج انسان تسلیم ہوجاتا ہے۔

جبکہ یہ قوانین ایک ایسے ماحول میں ظاہر ہوئے ہیں جس پر جنگل کا قانون حاکم تھا یا دوسرے الفاظ میں اس معاشرے میں لاقانونیت کی حکمرانی تھی۔ بنابریں ہم مجبور نہیں ہیں کہ اس آسمانی کتاب کی عظمت اور اس کے معجزہ ہونے کو فقط فصاحت وبلاغت یا علوم ومعارف اور تاریخی پہلوؤں سے ثابت کریں، بلکہ فقط قرآنی قوانین کے بارے میں تحقیق ہی اس عظیم دنیا کی جانب ایک دریچے کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہاں پر ضروری ہے کہ سب سے پہلے بطور مقدمہ ہم اس بات کو سمجھ لیں کہ کون سا قانون، ایک اچھا قانون ہوسکتا ہے، تاکہ اس بحث کی بنیاد بن جائے۔

کونسا قانون؛ بہترین قانون؟

اس سوال کا جواب دینا کوئی آسان کام نہیں ہے، لیکن اگر انسانی معاشروں میں قوانین وضع کرنے کے اصلی مقصد کو دیکھیں تو یہ کام واضح ہوجاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ انسان ایک اجتماعی اور معاشرتی زندگی کا مالک ہے۔ اُس کی تمام ترقی اور پیش رفت اسی اجتماعی زندگی کی وجہ سے ہے۔ اسی اجتماعی زندگی کی وجہ سے مفکرین کے افکار، علماء کے علوم، تخلیقات اور نئے کام پورے انسانی معاشرے میں باہمی تعاون کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں اور ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتے ہیں۔ اسی لئے انسانی تمدن میں، انسانی علوم کے بارے میں ہم آئے دن ایک سے ایک بڑی ترقی اور پیشرفت کا مشاہدہ کررہے ہیں۔

اس اجتماعی زندگی کے استقبال کا محرک جو بھی ہو وہ ایک الگ موضوع ہے، لیکن یہ بات یقینی ہے کہ اگر انسانوں کی زندگی بھی بہت سے دوسرے جانداروں کی طرح پراگندہ ہوتی تو آج کے انسان اور ماقبل تاریخ کے انسان میں ذرہ بھر فرق نہ ہوتا۔ نہ کوئی علم ہوتا نہ تہذیب وتمدن، نہ کوئی چیز ایجاد ہوتی نہ جدید علوم کشف ہوتے، نہ صنعت ہوتی نہ ہنر وفن ہوتا، نہ زبان ہوتی نہ ادب، بلکہ کچھ بھی نہ ہوتا۔ لیکن اس اجتماعی زندگی کی کچھ مشکلات اور آفات بھی ہیں، اگر اُن سے صحیح طریقے سے نپٹا نہ جائے تو نہ فقط تکامل وترقی کا پہیہ بالکل رک جائے گا، بلکہ ممکن ہے کچھ ایسے خطرناک حوادث رونما ہونے لگیں جن سے پوری انسانی نسل ہی ختم ہوجائے۔ یہ اہم مشکلات کچھ اس طرح سے ہیں: ایسی لڑائیاں اور جنگیں جو مفادات کے ٹکراؤ، حقوق کے تزاحم، برتری جوئی، خود پسندی، سب کچھ اپنے لئے چاہنے اور خود خواہی کے نتیجے میں وجود میں آسکتی ہیں۔ یہی چیز نہ فقط دو یا چند افراد میں لڑائی بلکہ علاقائی اور عالمی جنگوں اور کشمکشوں کا باعث بن سکتی

ہے۔اسی وجہ سے انسانی معاشرے شروع ہی سے اس بات کی طرف متوجہ ہو گئے تھے کہ اگر اختیارات اور لوگوں کے حقوق کے تعین، تنازعات و اختلافات کے حل کے لئے کوئی قوانین وحدود مقرر نہ کی گئیں تو انسان کی اجتماعی زندگی کا اُلٹا نتیجہ نکلے گا اور جس سے ایک بڑا المیہ پیدا ہو جائے گا۔

بنیادی طور پر حقیقی معنوں میں ایک اجتماع اور معاشرہ اس وقت بن سکتا ہے کہ جب معاشرے کے افراد کے درمیان، ہم آہنگی، باہمی تعاون اور ہم فکری موجود ہو، اور ایسی چیز قوانین اور حدود مقرر کئے بغیر ممکن نہیں ہے۔اصولاً تعاون اور ہمکاری بغیر ذمہ داری کے کوئی معنی نہیں رکھتی۔خود ذمہ داری کا احساس، قانون کی پیدائش کا سبب بنتا ہے۔اس کے علاوہ یہ بھی ایک بڑی غلط فہمی ہوگی کہ اگر ہم قانون کو فقط ظلم وستم اور جھگڑوں اور تنازعات کو ختم کرنے میں منحصر کر دیں، اگر چہ بہت سے قوانین اسی مقصد کے لئے وضع کئے جاتے ہیں۔ بلکہ قانون اس کام سے پہلے اجتماعی تعلقات کو مستحکم کرنے، عہد و پیمان کے سلسلے میں طرفین کے درمیان اعتماد قائم کرنے، صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کے لئے آزادی کی ضمانت فراہم کرنے اور طاقت وقدرت کو متمرکز اور زیادہ سے زیادہ ترقی وتکامل کے لئے وسائل کو ایک معین سمت کی طرف موڑنے کا ذمہ دار ہے۔

درحقیقت قانون معاشرے کی رگوں میں خون کی حیثیت رکھتا ہے۔لہٰذا ہمیں صراحت سے کہنا چاہیے کہ اگر کوئی قانون نہ ہوتا تو کوئی معاشرہ بھی نہ ہوتا اور نہ کوئی ترقی اور پیش رفت ہوتی۔اب مذکورہ بالا سوال کا جواب دینا زیادہ مشکل نہیں ہے، بہترین قانون وہ ہے کہ جو زیادہ سے زیادہ درج ذیل امور کو پورا کرنے کی طاقت رکھتا ہو:

۱۔انسانی معاشرے کی تمام پراگندہ قوتوں کو ایک طاقتور مرکز کے زیر سایہ جمع کر سکے۔اور رنگ ونسل اور لسانی اختلافات جیسی رکاوٹوں کو برطرف کر سکے۔

۲۔پوشیدہ صلاحیتوں اور تخلیقی قوتوں کی پرورش کے ذرائع فراہم کرے۔

۳۔حقیقی معنوں میں آزادی فراہم کرے تاکہ سب لوگ اس کے سائے میں اپنی صلاحیتوں کو نکھار سکیں۔

۴۔ہر شخص اور ہر طبقے کے حق کو واضح کرے تاکہ باہمی ٹکراؤ اور ایک دوسرے پر تجاوز کی روک تھام ہو سکے۔

۵۔ایک صحیح اجرائی نظام کی ضمانت فراہم کرتے ہوئے اعتماد واطمینان کی فضا ہموار کرے۔

۶۔بعض لوگوں کے خیال کے برعکس، ایک اچھا قانون وہ نہیں کہ جو بہت لمبے چوڑے قوانین کو ایک بڑے عدالتی نظام اور پولیس وقید خانوں کی فراوانی کے ساتھ چلائے، بلکہ یہ اس قانون اور معاشرے کی ناتوانی، بے چارگی اور کمزوری کی علامت ہے۔ایک اچھا قانون وہ ہے کہ جو ثقافت، تعلیم اور درست قوانین کے ذریعے، پہلے سے جرائم کی روک تھام کرے تاکہ اس قسم کے مسائل کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔عدالتی نظام، سزائیں اور قید خانے درحقیقت علاج معالجے یا بیمار کے لئے ایک جراح کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن صحیح قوانین اور مناسب اصول وضوابط ایک مرکز صحت کی حیثیت سے کم خرچ بھی ہیں اور سب کے قابل قبول بھی اور ہر قسم کی مشکلات اور پریشانیوں سے بھی خالی ہوتے ہیں۔اس مقدمے کے ساتھ ہم قرآن کی طرف رجوع کرتے ہوئے، اس کے قوانین کا مطالعہ اور تحقیق کرتے ہیں:

قرآنی قوانین کی خصوصیات

سب سے پہلے یہ نکتہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ یہ تمام قوانین حجاز کے علاقے میں ظہور پذیر ہوئے ہیں، جس میں قانون کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ اس کے قبائل میں خرافات سے مملو چند آداب ورسوم، رائج تھے۔ جو قانون کی شکل میں اس پر حکومت کر رہے تھے۔ ایسے ماحول میں اسلامی قوانین کا ظہور پذیر ہونا، درحقیقت ایک حیرت انگیز واقعہ تھا، جس کی کوئی معمولی اور طبیعی توجیہ نہیں کی جاسکتی، سوائے یہ قبول کرنے کے کہ یہ سب خدا کی جانب سے تھا۔

اول: جامعیت اور وُسعت

قرآن مجید ایک ایسے ماحول میں نازل ہوا ہے جو مختلف پہلوؤں سے ایک بند ماحول تھا، جسکا رابطہ جزیرہ (نمائے عرب) سے باہر بہت محدود تھا۔ ہر جگہ نژاد و قومیت کا مسئلہ اور قبائلی زندگی حاکم تھی۔ ایسے ماحول کا نتیجہ قومیت پرستی بلکہ قبائلی تعصب ہی ہونا چاہیے تھا۔ لیکن دلچسپ بات یہ کہ قرآن کے قوانین میں کہیں بھی اس طرح کے مسائل نظر نہیں آتے۔ حتیٰ قرآن مجید میں ایک بار بھی آپ کو "یا اَیُّهَا الْعَرَبُ" کا کہہ کر مخاطب نہیں کیا گیا۔ ہر مقام پر عام انسانوں کی بات ہو رہی ہے، تمام خطاب: "یابنی آدم"[1] (اے اولاد آدم) "یا اَیُّهَا النَّاسُ"[2] (اے لوگو) "یا اَیُّهَا الذین اٰمنوا"[3] (اے ایمان لانے والو) "یا عِبَادِی"[4] (اے میرے بندوں) "یا اَیُّهَا الانسانُ"[5] (اے انسان) کے عنوان سے ہیں۔ اس طرح قرآن کے مخاطبین تمام دنیا والے ہیں اور اس کے قوانین بھی تمام انسانوں کے لئے ہیں۔ آیہ مجیدہ:

وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ۝۱۰۷

یعنی: "اور (اے رسولؐ) ہم نے تجھے عالمین کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔"[6]

اور آیہ مجیدہ:

---

[1] پانچ مقام پر

[2] ۲۰ مقامات سے زیادہ

[3] ۸۰ مقامات سے زیادہ

[4] چار مقامات پر

[5] دو مقام پر

[6] انبیاء/۱۰۷

تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرَاۙ﴿۱﴾ [۱]

یعنی: ''لازوال اور بابرکت ہے وہ ذات جس نے قرآن اپنے بندہ پرنازل فرمایا تاکہ وہ عالمین کو (عذاب خدا سے) ڈرائے۔''

اور آیہ مجیدہ:

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ﴿۱۰۴﴾ [۲]

یعنی: ''یہ نہیں ہے مگر یہ کہ عالمین کے لئے یاددہانی۔''

اور اسی جیسی دوسری آیات ہمارے اس مدعا پر گواہ ہیں۔قرآن نے اُسی نژاد پرست ماحول میں، اپنی خوبصورت منطق کے ساتھ کہ ''تم سب آدم کی اولاد ہو اور ایک ماں باپ سے پیدا ہوئے ہو'' نسلی امتیازات کو بالکل ختم کر دیا تھا۔ بنابریں تم سب بھائی ہو ایک ہی گھرانے سے تعلق رکھتے ہو۔اس طرح تمام انسانوں کے رشتے کو اُخوت کی حد تک محفوظ کر دیا اور فرمایا:

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ [۳]

اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا پھر تمہارے قبیلے اور کنبے بنا دیئے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو لیکن تم میں سے اللہ کے نزدیک زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ متقی ہے۔''

ایک دوسری جگہ تمام محدود رشتوں کی نفی کرتے ہوئے ہر نسل و زبان اور ہر زمان و مکان کے ایماندار افراد کے رشتے کو فقط اُخوت و برادری کے رشتے میں پرو دیا کہ جو مساوات اور برابری کی بنیاد پر قائم ہونے والا رشتہ و تعلق ہے۔ چنانچہ فرمایا:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ [۴]

یعنی: ''مومنین ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔''

یاد رہے کہ ''اِنَّمَا'' حصر کے لئے ہے۔ یہ سب ایک طرف، دوسری جانب ان قوانین کی جامعیت انسانوں کی پوری زندگی پر چھائی ہوئی ہے، جو (توحید جیسے) اہم ترین مسائل سے لیکر (سلام کا جواب دینے اور ہر قسم کی خوش آمدید اور جیسے) سادہ ترین اخلاقی و معاشرتی مسائل تک کو شامل ہے۔مثلاً ایک جگہ قرآن فرماتا ہے:

---

[۱] فرقان/۱

[۲] یوسف/۱۰۴

[۳] حجرات/۱۳

[۴] حجرات/۱۰

وَاِذَا حُيِّيۡتُمۡ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوۡا بِاَحۡسَنَ مِنۡهَاۤ اَوۡ رُدُّوۡهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ حَسِيۡبًا ﴿۸۶﴾

یعنی: ''جس وقت کوئی شخص تمہیں ہدیہ دے (اور سلام) کہے تو اس کا جواب بہتر انداز سے دو یا (کم از کم) اسی طرح جواب دو، خدا ہر چیز کا حساب رکھتا ہے''۔[1]

قرآن مجید میں ایک آیت، قرض وغیرہ کو لکھنے کے بارے میں ہے جو قرآن کی سب سے لمبی آیات میں سے ہے، جس میں اسی مسئلے کے متعلق تقریباً بیس حکم الٰہی بیان ہوئے ہیں۔ (سورۂ بقرہ / ۲۸۲) اس سے پتا چلتا ہے قرآن کا عقائد اور توحید اور قیامت جیسی اسلامی تعلیمات سے متعلق مسائل کو بیان کرنا، اُسے ضرورت کے عملی احکام بیان کرنے سے مانع نہیں بنا۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ قرآنی آیات کے ظواہر میں تمام احکام وقوانین کی جزئیات بیان ہوئی ہیں۔ کیونکہ اُن کا حجم یقینا قرآن سے کئی گنا زیادہ ہے۔ بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ قرآن نے (زندگی کے) ہر حصے میں ضروری اصول بیان فرمادیئے ہیں۔ یہاں پر انہی اُصولوں کے کچھ حصوں کی طرف مختصر سا اشارہ کیا جاتا ہے:

ا۔ ہر چیز کی بنیاد توحید

قرآن کے اعتقادی مسائل میں سب سے زیادہ زور توحید پر دیا گیا ہے اور قرآن کی آیات میں سینکڑوں بار اس مسئلے کی طرف اشارہ ہوا ہے اور توحید کے عمیق مفاہیم کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں فرمایا ہے:

لَيۡسَ كَمِثۡلِهٖ شَىۡءٌ ۚ

''اس کی مثل کوئی چیز نہیں ہے''[2]

اسی طرح اُس کے اوصاف جلال و جمال کی سینکڑوں آیات میں وضاحت کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں آپ اسی کتاب (پیام قرآن) کی تیسری جلد کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

قرآن نہ فقط اللہ تعالیٰ کو ہر لحاظ سے یگانہ و یکتا قرار دیتا ہے، بلکہ انبیائے کرام ÷ کی نبوت کو بھی، دعوت واحد جانتا ہے اور اُن کے درمیان جدائی ڈالنے کو غلط سمجھتا ہے:

لَا نُفَرِّقُ بَيۡنَ اَحَدٍ مِّنۡ رُّسُلِهٖ ۚ

---

[1] نساء / ۸۶

[2] شوریٰ / ۱۱

(اور وہ کہتے ہیں) کہ ہم خدا کے بھیجے ہوئے افراد میں کوئی فرق نہیں رکھتے۔[1]

اگر چہ اُن میں سے ہر نبی اپنے زمانے کی ضروریات کے مطابق خصوصی احکام لیکر آئے ہیں، لیکن ہر جگہ اُن کا اُصول دعوت ایک ہی تھا۔ انسانی معاشرے پر بھی مسئلہ توحید کی حاکمیت ہے اور جیسا کہ ہم نے کہا ہے وہ تمام انسانوں کو ایک ہی خاندان کا عضو جانتا ہے۔ اور اُنہیں ایسے بھائیوں کے نام سے پکارتا ہے جو ایک ماں باپ سے پیدا ہوئے ہیں۔

۲۔ اجتماعی عدالت معاشرتی عدل وانصاف

قرآن معاشرتی عدل وانصاف کو انبیائے کرام ؑ کی اہم ترین تعلیمات میں سے شمار کرتے ہوئے فرماتا ہے:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ

یعنی: ''ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل دے کر بھیجا ہے اور ان پر اپنی (آسمانی) کتاب اور میزان نازل فرمائے تا کہ لوگ عدل وانصاف قائم کریں۔''[2]

اسی مقصد کی تکمیل کے لئے ہر نسل ورنگ اور زبان کے چھوٹے بڑے اور پیر وجوان ایمان دار انسانوں کو اس چیز کی طرف دعوت دیتے ہوئے فرماتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ

یعنی: ''اے ایمان والو! مکمل طور پر عدل وانصاف قیام کرو، خدا کے لئے گواہی دو اگر چہ یہ خود تمہارے لئے یا تمہارے والدین کے لئے یا تمہارے اقربا کے لئے نقصان دہ ہی کیوں نہ ہو۔''[3]

۳۔ معاشرتی تعلقات

اس سلسلے میں بھی سب لوگوں کو تمام معاہدوں اور ہر قسم کے عہد وپیمان کی پابندی کرنے کی دعوت دیتے ہوئے فرماتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ۗ

---

[1] بقرہ/ ۲۸۵

[2] حدید/ ۲۵

[3] نساء/ ۱۳۵

یعنی: اُ"ے ایمان والو! اپنے عہد و پیمان (اور قول وقرار) پورے کرو۔"[1]

ایک دوسری جگہ فرماتا ہے:

وَاَوۡفُوۡا بِالۡعَهۡدِ‌ۚ اِنَّ الۡعَهۡدَ كَانَ مَسۡـُٔوۡلًا ۝۳۴

یعنی: "اپنے عہد و پیمان کو پورا کرو چونکہ عہد کے بارے میں پوچھا جائے گا"[2]

ان آیات کا دائرہ کار اس قدر وسیع ہے کہ حتیٰ غیر مسلمین کے ساتھ کئے گئے عہد و پیمان کو بھی شامل ہے اور عمومی و خصوصی تعلقات کے علاوہ بین الاقوامی معاہدوں کو بھی اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔

۴۔ ہر قسم کے ظلم وزیادتی کو دور کرنا

ہر قسم کے ظلم وزیادتی کو دور کرنے اور ہر قسم کے نقصان کی تلافی کرنے کو ایک مختصر سی عبارت میں مکمل طور پر بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

فَمَنِ اعۡتَدٰى عَلَيۡكُمۡ فَاعۡتَدُوۡا عَلَيۡهِ بِمِثۡلِ مَا اعۡتَدٰى عَلَيۡكُمۡ‌ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعۡلَمُوۡٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الۡمُتَّقِيۡنَ ۝۱۹۴

یعنی: "جو شخص بھی تم پر زیادتی کرے تو اس کی طرح تم بھی اس پر زیادتی کر سکتے ہو اور خدا سے ڈرتے رہنا (اور زیادہ روی نہ کرنا) اور جان لو کہ خدا پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔"[3]

۵۔ دفاعی معاملات

دفاعی معاملات کے سلسلے میں ایک انتہائی متین کلی اُصول بیان کرتے ہوئے فرمایا:

وَاَعِدُّوۡا لَهُمۡ مَّا اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ قُوَّةٍ وَّمِنۡ رِّبَاطِ الۡخَيۡلِ تُرۡهِبُوۡنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمۡ

یعنی: "اور ان دشمنوں کے مقابلہ کے لئے جتنی "قوت"، ممکن ہو سکے مہیا اور تیار رکھو۔ اسی طرح (میدان جنگ کے لئے) طاقتور اور تجربہ کار گھوڑے (بھی تیار رکھو) تا کہ اس سے اللہ کے اور اپنے دشمن کو ڈرا سکو"[4]

---

[1] مائدہ/۱

[2] بنی اسرائیل/۳۴

[3] بقرہ/۱۹۴

[4] انفال/۶۰

یہاں پر قوتوں کی تعداد اور فوجوں کی تقویت کو بطور عام جبکہ اس زمانے میں جنگی گھوڑوں کو تیار رکھنے کو (بعنوان مصداق) بطور خاص ذکر کیا گیا ہے تاکہ جنگ سے بچتے ہوئے دشمن پر رعب اور خوف طاری رہے۔اور یہ فوجی طاقت کی تقویت کے لئے سب سے زیادہ منطقی طریقہ ہے۔

۶۔لڑائی جھگڑے

رہی بات ہم مسلک لوگوں اور دوسرے معاشرتی رقیبوں کے درمیان ہونے والے لڑائی جھگڑوں کی تو یہاں ایک اور حکم دیتے ہوئے کہا گیا ہے: مقابلہ بمثل اور قوتوں میں اضافے کے بجائے اس کے برعکس قدم اُٹھائیں اور بدی کا جواب نیکی سے دیں تاکہ نفاق وعداوت کی جڑ ہی ختم ہوجائے،لہٰذا فرماتے ہیں:

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ﴿۳۴﴾ وَمَا یُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا یُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ ﴿۳۵﴾

یعنی:''بُرائی کو اچھائی کے ذریعے دُور کرنا کہ تیرے زبردست دشمن بھی تیرے سچے اور پکے دوست بن جائیں،لیکن اس مرحلے تک وہی لوگ پہنچ سکیں گے جو صبر واستقامت کے حامل ہوں گے اور وہی لوگ پہنچ پائیں گے جو ایمان وتقویٰ سے خوب بہرہ مند ہوں ہیں'' [۱]

۷۔انسان کی تقدیر

اس کے بارے میں انتہائی صراحت کے ساتھ کہا گیا ہے: ہر شخص کی تقدیر وسرنوشت خود اس کے اپنے ہاتھ میں ہے اور اسی کی سعی وکوشش سے تعلق رکھتی ہے۔

كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِیْنَةٌ ﴿۳۸﴾

یعنی:''ہر شخص اپنے اعمال کا گروی ہے''۔ [۲]

وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ﴿۳۹﴾ وَاَنَّ سَعْیَهٗ سَوْفَ یُرٰی ﴿۴۰﴾

یعنی:''انسان کے لئے اس کی اپنی سعی وکوشش کے علاوہ اور کوئی حصہ نہیں ہے اور یہ کہ اس کی سعی وکوشش

---

[۱] حم سجدہ/ ۳۴/ ۳۵

[۲] مدثر/۳۸

عنقریب دیکھی جائے گی'' [1]

۸۔عقیدے کی آزادی

سوائے استدلال اور دین کے بیان کرنے کے کسی کی بھی نظریاتی حدود میں نفوذ نہیں کیا جا سکتا، اس سلسلے میں فرمایا:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣڐ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ (بقرہ/۲۵۶)

یعنی: ''دین قبول کرنے میں کوئی جبر واکراہ نہیں ہے۔ کیونکہ صحیح راستہ ٹیڑھے راستے سے جدا اور آشکار ہو چکا ہے۔''

انسانوں کی آزادی کے بارے میں کہا گیا ہے: پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے مقاصد میں سے ایک مقصد انسانوں کو قید وبند سے آزاد کرانا تھا:

وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ (اعراف/۱۵۷)

یعنی: ''اور وہ ان کے کاندھوں سے بوجھ ہٹاتا ہے اور ان تمام طوق وسلاسل کو ان سے الگ کرتا ہے۔''

اسارت کی یہ زنجیریں ایک وسیع مفہوم رکھتی ہیں، جو انسانوں کی ہر قسم کی آزادی کو سلب کرنے سے عبارت ہیں۔

۹۔دوسروں کی ذاتی زندگی میں عدم مداخلت

دوسروں کی ذاتی زندگی میں عدم مداخلت اور اُن کی شخصیت کے احترام اور اُن کی ہتک نہ کرنے کے بارے میں فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۡ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ۭ (حجرات/۱۲)

یعنی: ''اے ایمان لانے والو! بہت سے گمانوں سے پرہیز کرو کیونکہ بعض گمان گناہ ہیں، ہرگز (دوسروں کے کاموں میں) تجسس نہ کرو تم میں سے کوئی دوسرے کی (ہرگز) غیبت نہ کرے۔''

۱۰۔صُلح آمیز معاشرت

ہر اُس شخص سے صلح آمیز معاشرت رکھنا کہ جو آپ سے جنگ ونزاع نہیں کرتا اور مشترکہ مقاصد میں تفاہم کے قابل ہے یا کم از کم غیر جانبدارانہ زندگی گذارتا ہے۔ یہ اُن اصولوں میں سے ہے جن کی قرآن نے بہت زیادہ تاکید فرمائی ہے:

---

[1] نجم/۳۹، ۴۰

"لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ"

یعنی: ''اللہ نے تمہیں ان لوگوں سے، جنھوں نے امر دین میں تم سے جنگ نہیں کی اور تمہیں تمہارے شہر و دیار سے باہر نہیں نکالا، نیکی کرنے اور عدل و انصاف کرنے سے منع نہیں فرماتا کیونکہ اللہ عدالت کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے''۔

پھر فرمایا:

إِنَّمَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿٩﴾

یعنی: ''اللہ تو تمہیں صرف ان لوگوں سے دوستی کرنے سے منع فرماتا ہے جنھوں نے امر دین میں تم سے جنگ کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے باہر نکالا، یا تمہارے باہر نکالنے میں (دشمنوں کی) مدد کی ہے اور جو لوگ ان سے دوستی کریں گے وہی تو ظالم ہیں''۔ [۱]

دوم: معاشرتی تعلقات کو مضبوط کرنا

انسانی معاشرہ جو ہر قسم کی علمی و اجتماعی کامیابی اور ترقی کا اصلی سرچشمہ ہے، اُسی صورت میں اپنے مطلوبہ مقصد تک پہنچ سکتا ہے کہ جب اس کے درمیان باہمی رشتے محکم ہوں، ورنہ ایک ایسی دردناک جہنم میں بدل جائے گا کہ جس سے معاشرے کو اس کی برکات سے بہرہ مند ہونے کے بجائے بہت زیادہ زحمتیں اور مشکلات اُٹھانی پڑیں گی۔ قرآن مجید جہاں ایک طرف پوری انسانیت کو ایک ہی خاندان کے افراد اور ایسے بھائیوں کی حیثیت سے عمومی وحدت کی تاکید کرتا ہے جو ایک ہی ماں باپ سے پیدا ہوئے ہیں۔ جیسا کہ سورۂ حجرات کی آیت ۱۳ کی طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے۔ وہاں ہر قسم کے لسانی اور نسلی اختلاف سے قطع نظر مومنین کو ایک ہی جسد کا عضو شمار کرتے ہوئے فرماتا ہے:

بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ

یعنی: ''تم سب ایک ہی نوع میں سے ہو اور ایک ہی جسم کے عضو ہو۔'' [۲]

ایک دوسری جگہ فرمایا:

---

[۱] ممتحنہ / ۸ / ۹

[۲] آل عمران / ۱۹۵

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ

یعنی: ''ایماندار مرد اور ایماندار عورتیں ایک دوسرے کے ولی (اور مددگار) ہیں'' [۱]

اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا اور انسانی رشتے اور ایمانی تعلق کے علاوہ رشتہ داری کے تعلق جو ایک نزدیکی اور محدود تعلق ہے کی بھی تاکید کی جاتی ہے۔ لہٰذا اس عہد و پیمان کو توڑنے کو ایک بڑا گناہ شمار کرتے ہوئے فرمایا:

الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝۲۷

یعنی: ''(فاسق وہ ہیں) جو خدا سے محکم عہد و پیمان کرنے کے بعد اسے توڑ دیتے ہیں۔ وہ پیوند جنھیں خدا نے برقرار رکھنے کا حکم دیا ہے انھیں توڑتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں یہی لوگ خسارے میں ہیں۔'' [۲]

اور پھر سورۂ محمدؐ کی آیت ۲۲، ۲۳ میں فرمایا:

فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ ۝۲۲ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاَصَمَّهُمْ وَاَعْمٰٓى اَبْصَارَهُمْ ۝۲۳

یعنی: ''لیکن اگر تم روگردانی اختیار کرو تو تم سے سوائے زمین میں فساد اور قطع رحمی کے اور کیا توقع رکھی جاسکتی ہے؟ یہ ایسے لوگ ہیں جنھیں اللہ نے اپنی رحمت سے دور کردیا ہے، ان کے کانوں کو بہرہ اور ان کی آنکھوں کو اندھا کردیا ہے'' [۳]

اور اس طرح ان رشتوں کو توڑنے والوں کو زمین پر فساد کرنے والوں کی صف میں لا کر اُنہیں آنکھوں سے اندھا اور کانوں سے، بہرہ قرار دیا جاتا ہے۔ اسلام میں ان رشتوں کی اہمیت اس قدر ہے کہ جو چیز بھی اجتماعی تعلقات کو مضبوط کرنے میں مدد دے، اُسے پسندیدہ سمجھا گیا ہے۔ حتیٰ جھوٹ جو بدترین گناہ شمار ہوتا ہے، دو افراد کے درمیان صلح کے لئے جائز سمجھا جاتا ہے۔ اس کے برعکس جو چیز بھی رشتوں اور تعلقات کے درمیان دوری کا باعث بنے قابل نفرت سمجھی گئی ہے خواہ وہ کسی بھی عنوان سے ہو۔

---

[۱] توبہ/۷۱

[۲] بقرہ/۲۷

[۳] محمد/۲۲/۲۳

سوم: انسانی حقوق کا احترام

ایک قیمتی اور اعلیٰ قانون وہ ہے جو دوسری خصوصیات کے علاوہ ''انسانی حقوق'' کے سلسلے میں ایک جامع اور عمیق لائحہ عمل پیش کرے، اس حقیقت کو دیکھا جائے تو جب بھی ہم اس سلسلے میں قرآنی آیات کو دیکھتے ہیں تو اس کے قوانین کی عظمت اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔قرآن مجید انسانوں کی جان ومال اور عزت وآبرو کی حفاظت کے سلسلے میں ایک انسان کی جان کو تمام انسانوں کی جان قرار دیتے ہوئے اس کی قدر ومنزلت کے بارے میں فرماتا ہے:

"مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۔ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا"

یعنی: ''جو شخص کسی انسان کو بغیر اس کے کہ وہ ارتکاب قتل کرے اور روئے زمین پر فساد پھیلائے قتل کر دے، تو یہ اس طرح ہے گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کیا اور جو کسی ایک انسان کو قتل سے بچائے تو گویا اس نے تمام انسانوں کو زندگی بخشی ہے۔''[۱]

آپ دنیا کے کسی دوسرے قانون میں اس جیسی تعبیر نہیں دیکھیں گے۔قرآن مجید انسانوں کے حقوق کے مسئلے میں اس حد تک آگے گیا ہے کہ حقوق کو عملی جامعہ پہنانے میں اصل ''عدالت'' کو ہر چیز پر مقدم سمجھتے ہوئے خبردار کیا ہے کہ کہیں تمہاری ذاتی دشمنیاں یا دوستانہ تعلقات عدالت کے اجرا میں رکاوٹ نہ بن جائیں۔

لہٰذا ایک جگہ فرمایا ہے:

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا

یعنی: ''اور کسی گروہ کی دشمنی تمہیں ترک عدالت کی طرف نہ لے جائے، عدل کرو کہ وہ پرہیزگاری کے زیادہ قریب ہے۔''[۲]

اس کے مقابلے میں عدل وانصاف پر دوستی کے اثر انداز ہونے کے سلسلے میں یوں خبردار کرتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاۗءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓي اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۣ

یعنی: ''اے ایمان والو! مکمل طور پر عدالت کے ساتھ قیام کرو، خدا کے لئے گواہی دو اگرچہ یہ خود تمہارے

---

[۱] مائدہ/ ۳۲

[۲] مائدہ/ ۸

لئے یا تمہارے والدین کے لئے یا تمہارے اقرباء کے لئے نقصان دہ ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ اگر وہ غنی یا فقیر ہوں تو خدا حق رکھتا ہے کہ ان کی حمایت کرے۔"[1]

یتیموں کی حمایت، اُن کیں معاملات پر گہری نظارت اور جب تک وہ بڑے نہیں ہو جاتے اُن کی سرپرستی اور اُن کے اموال کی دیکھ بھال کے بارے میں قرآن کی مکرر تاکید سے بھی یہ مسئلہ مزید واضح ہو جاتا ہے۔لہٰذا ایک مقام پر فرمایا:

وَاَنۡ تَقُوۡمُوۡا لِلۡيَتٰمٰى بِالۡقِسۡطِ ؕ

یعنی:"اور یتیموں کے ساتھ عادلانہ برتاؤ کرو۔"[2]

اس سے بھی اہم بات یہ کہ ایک دوسرے مقام پر یتیموں کی حفاظت وحمایت کو توحید اور دوسرے انسانی مسائل کی صف میں قرار دیتے ہوئے فرمایا:

لَا تَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا وَّذِى الۡقُرۡبٰى وَالۡيَتٰمٰى وَالۡمَسٰكِيۡنِ وَقُوۡلُوۡا لِلنَّاسِ حُسۡنًا وَّاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ

یعنی:"(اور وہ وقت یاد کرو کہ ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ) تم خدائے یگانہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرو گے اور ماں باپ، رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ نیکی کرو گے، اور لوگوں سے اچھے پیرائے میں بات کرو گے نیز نماز قائم کرو گے اور زکوٰۃ ادا کرو گے۔"[3]

قابل ذکر یہ کہ یہاں انسانی حقوق سے تعلق رکھنے والے پانچ انسانی احکام کو اسلام کے اہم ترین دو لائحہ عمل کے درمیان رکھا ہے کہ جو اعتقادی اور عملی لائحہ عمل، یعنی؛ توحید و نماز کہلاتے ہیں۔

چہارم: امن وامان اور آزادی کا اہتمام

ہر پہلو سے عقیدے کی آزادی اور انسان کی آزادی اور امن وامان اُن اہم ترین مسائل میں سے ہے کہ جس کو قرآنی قوانین میں مدنظر رکھا گیا ہے، لہٰذا ایک مشہور آیہ مجیدہ میں فرمایا:

لَاۤ اِكۡرَاهَ فِى الدِّيۡنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشۡدُ مِنَ الۡغَىِّ ۚ

یعنی:"دین قبول کرنے میں کوئی جبر واکراہ نہیں ہے (کیونکہ) صحیح راستہ ٹیڑھے راستے سے جدا اور آشکار ہو چکا

---

[1] نساء/ ۱۳۵

[2] نساء/ ۱۲۷

[3] بقرہ/ ۸۳

ہے۔"[۱]

ایک دوسری جگہ انسانی قید و بند کی زنجیریں توڑنے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے اہم ترین مقاصد میں سے شمار کرتے ہوئے فرمایا:

وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَٰلَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۚ

یعنی: "اور وہ ان کے کاندھوں سے بوجھ ہٹاتا ہے اور ان تمام طوق و سلاسل کو ان سے الگ کرتا ہے۔"[۲]

ایک دوسری جگہ ایماندار لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

يَٰعِبَادِيَ الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ أَرْضِي وَاسِعَةٌ فَإِيَّايَ فَاعْبُدُونِ ﴿٥٦﴾

یعنی: "اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو! میری زمین وسیع ہے تم میری ہی عبادت کرو (اور دشمن کے دباؤ میں ہرگز نہ آؤ)"[۳]

قرآن مجید میں "اصحاب اخدود" کے بارے میں ایک عجیب واقعہ آیا ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں جو نیک و صالح اور ایماندار لوگوں کو اُن کے عقیدے کی وجہ سے اذیت و آزار پہنچاتے ہوئے آگ سے پُر گڑھوں میں پھینک دیتے تھے۔ ان کے بارے میں قرآن مجید فرماتا ہے: اذیت و آزار پہنچانے والے یہ لوگ عقیدے و ایمان کی آزادی سلب کرنے کے لئے ایسے کام کرتے تھے، اس کے بعد ان کے لئے شدید ترین عذاب الٰہی بیان کرتا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوبُوا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيقِ ﴿١٠﴾

یعنی: "وہ لوگ جنھوں نے صاحب ایمان مردوں اور عورتوں پر تشدد کیا اور پھر توبہ نہیں کی، ان کے لئے دوزخ کا عذاب ہے اور آگ کا جلانے والا عذاب ہے۔"[۴]

قرآن مجید "امن وامان" کو اس قدر بڑی نعمت شمار کرتا ہے کہ اُسے ہر چیز پر مقدم جانتا ہے۔ اسی لئے جب حضرت ابراہیم خلیل - مکہ جیسی خشک و گرم اور بے آب و گیاہ سرزمین میں داخل ہو کر خانہ کعبہ کی بنیاد رکھتے ہیں، تو قرآن کہتا ہے: اُنھوں نے اللہ تعالیٰ سے اس سرزمین کے ساکنین کے لئے جو چیز سب سے پہلے طلب کی وہ امن وامان کی نعمت تھی۔

---

[۱] بقرہ/۲۵۶

[۲] اعراف/۱۵۷

[۳] عنکبوت/۵۶

[۴] بروج/۱۰

رَبِّ اجۡعَلۡ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارۡزُقۡ اَهۡلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ

یعنی: ''پروردگار اس سرزمین کو شہر امن قرار دے اور اس کے رہنے والوں کو جو خدا اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں (قسم قسم) کے میووں سے روزی دے۔''[1]

ایک دوسری جگہ یہی مطلب دوسرے الفاظ میں نقل ہوا ہے:

رَبِّ اجۡعَلۡ هٰذَا الۡبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجۡنُبۡنِیۡ وَبَنِیَّ اَنۡ نَّعۡبُدَ الۡاَصۡنَامَ ﴿۳۵﴾

یعنی: ''پروردگارا! اس شہر (مکہ) کو شہر امن قرار دے اور مجھے اور میری اولاد کو بتوں کی پرستش سے دور رکھ۔''[2]

پہلی آیت میں امن وامان کی نعمت کو معاشی مسائل سے پہلے جبکہ دوسری آیت میں توحید سے پہلے ذکر کیا ہے۔ گویا یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بغیر امن وامان کے بغیر نہ ناامنی دین پر عمل ہوسکتا ہے اور نہ دنیا پر۔ حتیٰ قرآن مجید ناامن وامان کو قتل وغارت سے بھی بدتر سمجھتا ہے اور کہتا ہے: ''وَالۡفِتۡنَةُ أَشَدُّ مِنَ الۡقَتۡلِ'' یعنی: ''اور فتنہ (ناامن وامان) قتل سے بھی بدتر ہے۔'' (بقرہ/۱۹۱) اگرچہ فتنے کے بہت سے معانی ہیں (مثلاً شرک، اذیت وآزار اور فساد وغیرہ) لیکن بعید نہیں کہ مذکورہ بالا آیت کا مفہوم اس قدر وسیع ہو کہ جو ان تمام معانی کو شامل ہو جائے، بنابریں معاشرے میں ناامنی اور فساد پیدا کرنا خون خرابے سے کم نہیں ہے چونکہ یہی چیز جہاں خون خرابے کی بنیاد ہے وہاں دوسری خرابیوں کی بھی جڑ ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ اسلام میں ایک ایسا امن وامان مدنظر رکھا گیا ہے جو دنیا کے کسی بھی قانون میں نہیں ہے اور وہ لوگوں کی عزت وآبرو کا امان میں ہونا ہے۔ یہاں تک دوسروں کے افکار کے حوالے سے بھی اس کی رعایت کی گئی ہے۔ واضح الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کبھی بھی اجازت نہیں دیتا کہ کوئی مسلمان دوسروں کے بارے میں بدگمانی اور سوءظن رکھے اور اپنے ذہن اور سوچ میں بھی دوسروں کی آبرو وحیثیت کو خراب کرنے کی سعی کرے۔ سورۂ حجرات کی آیت نمبر ۱۲ میں ہم پڑھتے ہیں:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اجۡتَنِبُوۡا کَثِیۡرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعۡضَ الظَّنِّ اِثۡمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوۡا

''اے ایمان لانے والو! بہت سے گمانوں سے پرہیز کرو کیونکہ بعض گمان گناہ ہیں، ہرگز (دوسروں کے کاموں میں) تجسس نہ کرو۔'' (حجرات/۱۲)

اسلام چاہتا ہے اسلامی معاشرے میں مکمل طور پر امن وامان برقرار رہے، نہ فقط لوگ ایک دوسرے کے اوپر حملہ نہ کریں بلکہ زبان سے اور اس سے بھی بڑھ کر سوچ وفکر کے لحاظ سے بھی مکمل امن میں رہیں۔ ہر شخص کو اس بات کا احساس ہو کہ کوئی بھی اپنے اذہان

---

[1] بقرہ/۱۲۶

[2] ابراہیم/۳۵

اور سوچوں میں بھی کسی طرف تہمت کے تیر نہیں پھینک رہا۔ اس قسم کی کا امن وامان ایک مومن معاشرے اور اسلامی قوانین کے علاوہ کہیں اور ممکن نہیں ہے۔

قابل توجہ بات یہ کہ بہت سے گمانوں سے نہی کی گئی ہے، لیکن اس کی علت بیان کرتے وقت کہا گیا ہے: صرف بعض گمان گناہ ہیں۔ الفاظ میں یہ فرق اس وجہ سے ہوسکتا ہے کہ دوسروں کے بارے میں بُرے گمان کبھی واقعیت رکھتے ہیں اور کبھی خلاف واقع ہوتے ہیں۔ چونکہ گمان کی دوسری قسم گناہ ہے، لہٰذا ہر قسم کے بُرے گمان سے پرہیز کیا جائے۔ اسی لئے اس کو "کَثِیۡرًا مِّنَ الظَّنِّ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جس سے دوری کرنا ضروری ہے۔

آخری نکتہ یہ کہ اسلام نے اس حد تک اسلامی معاشروں کے اندر امن وامان کو اہمیت دی ہے کہ اگر داخلی لڑائی جھگڑوں میں صلح پسندانہ طریقے کارگر ثابت نہ ہوں تو ایسے مواقع پر طاقت اور انتظامی قوتوں سے کام لینے کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ اسی سورۂ حجرات کہ جو درحقیقت سورۂ امن وامان ہے، کی آیت نمبر ۹ میں آیا ہے:

وَاِنۡ طَآٮِٕفَتٰنِ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اقۡتَتَلُوۡا فَاَصۡلِحُوۡا بَيۡنَهُمَا ۚ فَاِنۡۢ بَغَتۡ اِحۡدٰٮهُمَا عَلَى الۡاُخۡرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِىۡ تَبۡغِىۡ حَتّٰى تَفِىۡٓءَ اِلٰٓى اَمۡرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنۡ فَآءَتۡ فَاَصۡلِحُوۡا بَيۡنَهُمَا بِالۡعَدۡلِ وَاَقۡسِطُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُقۡسِطِيۡنَ ۝۹

"اور جس وقت مومنین کے دو گروہ آپس میں نزاع اور جنگ کریں تو ان کے درمیان صلح کرا دیا کرو پھر اگر ان میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو جس نے زیادتی کی ہے تم بھی اس کے ساتھ جنگ کرو یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی طرف پلٹ آئے پھر جب وہ لوٹ آئے تو ان دونوں کے درمیان عدل کے مطابق صلح کرا دو اور انصاف سے کام لو کیونکہ اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے"۔ (حجرات/ ۹)

اس کے الفاظ میں غور وفکر کیا جائے تو اس کا ہر فقرہ، بہترین صلح آمیز طریقوں اور اُن کے کارگر نہ ہونے کی صورت میں طاقت اور قوت سے ہر قسم کی ناامنی کو ختم کرنے کے لئے ایک عمیق لائحہ عمل دے رہا ہے۔ واضح ہے کہ اس آیت کا مخاطب پورا اسلامی معاشرہ یا دوسرے الفاظ میں اسلامی حکومت ہے۔

پنجم: مختلف قُویٰ کے نفاذ کی ضمانت

دنیا کے قوانین فقط کاغذ کے صفحات پر سیاہی کی لکیریں ہی ہیں، اُن کی اگر کوئی ذاتی حیثیت ہے بھی تو صرف پند ونصیحت سے زیادہ نہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ قوانین فقط ذہنی اور فکری پہلو رکھتے ہیں اور اپنی اجتماعی قدر وقیمت حاصل کرنے کے لئے انہیں ایک ایسی پشت پناہی کی ضرورت ہے جو معاشرے کے افراد کی طرف سے ان کی پیروی کرنے کی صورت میں ہی فراہم ہوسکتی ہے۔ یہ پشت پناہی وہی چیز ہے جسے "ضامن اجرا" یا "ضمانت اجرائی" کہتے ہیں۔ اس تمہید سے اچھی طرح واضح ہوگیا ہوگا کہ ایک قانون کی قدر وقیمت، اُس

کے نفاذ کی ضمانت کی قوت وطاقت پر موقوف ہے۔

جس قدر کسی قانون کی اجرائی ضمانت قوی اور عادلانہ ہوگی، اسی قدر اس قانون کی اجتماعی قدرومنزلت بھی زیادہ ہوگی۔ بہت سے قوانین کی اجرائی ضمانت کی وجہ سے معاشرے میں کچھ نقصانات پیدا ہوجاتے ہیں اور اس کے نافذ کرنے میں مشکلات ہوتی ہیں۔ بعض اوقات کسی قانون کو اجرا کرنے سے نزاع، بدگمانی اور بے اعتمادی پیدا ہوجاتی ہے یا قانون کو سختی کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے جو خود ایک بڑا نقصان ہے۔

اگر قانون کے اجراء کی ضمانت، معاشرے کی ثقافتی، اخلاقی اور جذباتی بنیادوں پر استوار ہوتو اس میں مذکورہ عیوب میں سے کوئی بھی عیب نہیں ہوگا۔ آج دنیا اپنے قوانین کو اجرا کرنے کے سلسلے میں بہت سخت مشکلات کا سامنا کر رہی ہے۔ ان مشکلات کے پیدا ہونے کی بڑی وجہ ان قوانین کے اجراء کی ضمانت ایک طرف جسمانی اور نقدی سزاؤں کے سوا اور کچھ نہیں اور دوسری جانب المناک جرائم اور قتل وغارت کے مقابلے میں بھی پھانسی جیسی سخت سزائیں نہیں دی جاتیں۔

اندرونی اور جذباتی طور پر قوانین کے اجراء کی ضمانت سے محروم ہونا اور عملی طور پر قوانین کے اجراء میں کمزوری وضعف دکھانے کے سبب روز بروز قانون شکنی، خلاف ورزی اور قوانین سے بے اعتنائی پوری دنیا میں عام ہورہی ہے۔ جس کی سب سے بڑی علامت مختلف مما لک میں دن بدن عدالتی نظام میں وسعت اور قید خانوں میں اضافہ ہے۔ ان حالات کو ہم ''اجرائے قوانین کی ضمانت کے بحران'' کا نام دے سکتے ہیں، اس کے بہت ہی خطرناک نتائج نکل سکتے ہیں اور انسانی معاشروں کو اس کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے۔ جس کے شواہد ترقی یافتہ ترین صنعتی مما لک میں بھی دیکھے جارہے ہیں۔

موجودہ دنیا میں قوانین کے اجراء کی ضمانت کا ایک دوسرا بڑا نقص فقط سزاؤں پر انحصار کرنا اور قانون کے مثبت طریقہ سے نفاذ سے یعنی؛ اجر وثواب سے محروم ہونا ہے۔ انسان ''جاذبہ ودافعہ'' پر مبنی قوتوں کا ایک معجون ہے یا دوسرے الفاظ میں منافع کو پسند کرنا اور نقصان سے بچنا انسان (کی فطرت) میں ہے۔ قوانین کے نفاذ کے لئے ان دونوں پہلوؤں سے مدد لینی چاہیے، جبکہ آج کی دنیا میں فقط نقصان سے بچنے ہی کو اہمیت دی جاتی ہے، وہ بھی بہت محدود سطح پر۔ کیونکہ مادی دنیا کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو قانون پر عمل کرنے والے شخص کو بعنوان اجر وثواب ادا کی جاسکے۔

اسی تمہید کے ساتھ ہم ''قرآن کے قوانین میں نفاذ کی ضمانت'' کے مسئلے کی طرف لوٹتے ہیں۔ جس میں ہم دیکھتے ہیں کہ یہ قوانین قوی ترین اور جامع ترین ضمانت اجرائی کے حامل ہیں اور یہ امتیاز فقط انہی (قرآنی) قوانین کو ہی حاصل ہے۔ قرآن میں قوانین کے اجراء کی تین طرح کی ضمانتیں دی گئی ہیں:

۱۔ اسلامی حکومت کے ذریعے قوانین کے نفاذ کی ضمانت۔

۲۔ عمومی نظارت کے ذریعے قوانین کے نفاذ کی ضمانت۔

۳۔ اندرونی اور ذاتی ضمانت یا دوسرے الفاظ میں، اسلام کے اخلاقی وجذباتی بنیادوں پر اعتقاد اور ایمان۔

پہلے نمبر پر اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہر قسم کی قانون شکنی اور خلاف ورزی کے مقابلے میں قاطعانہ رویہ اختیار کرے۔ پیغمبر اکرم ﷺ نے مدینہ کی طرف ہجرت اور رکاوٹوں کے ختم ہو جانے کے بعد سب سے پہلا جو کام کیا، وہ اسلامی حکومت کی تشکیل اور قوانین اسلام کی تشریح کا کام تھا، جس کی خلاف ورزی کو گناہ اور قابل مؤاخذہ سمجھا جاتا تھا۔ آپؐ نے قرآن کے قوانین کو الٰہی حدود قرار دیا اور جو بھی ان حدود سے تجاوز کرتا، اس کے لئے سزائیں مقرر کر دی گئیں تھیں۔ ایک جانب سے خلاف ورزی کرنے والوں کو ظالم قرار دیتے ہوئے فرمایا:

"وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ"

یعنی: "یہ حدود (اور خدائی سرحدیں) ہیں ان سے تجاوز نہ کرو اور جو شخص ان سے تجاوز کرے تو وہ ظالم ہے۔"[1]

دوسری جانب سے ظالموں کے خلاف جدوجہد کی تاکید فرمائی۔ جب قرآن فرماتا ہے: "ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل دے کر بھیجا ہے اور ان پر اپنی (آسمانی) کتاب اور میزان نازل فرمائے تاکہ لوگ عدل وانصاف قائم کریں"۔ (حدید/ ۲۵) اس کا مطلب یہ ہے کہ خود پیغمبر اسلام ﷺ پر کہ جو خاتم انبیاء ہیں، دوسروں کی نسبت یہ ذمہ داری زیادہ عائد ہوتی ہے۔ یہ سب باتیں ایک طرف اور دوسری جانب اُمت اسلام کے ہر شخص کو الٰہی قوانین پر نگرانی کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ اور سب لوگوں پر "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" کا فریضہ عائد کیا گیا ہے تاکہ وہ قوانین الٰہی کی خلاف ورزی کے مقابلے میں بے اعتنائی نہ دکھائیں۔ ایک جگہ فرمایا ہے:

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَيُطِيعُونَ اللهَ وَرَسُولَهُ ۚ

"ایماندار مرد اور ایماندار عورتیں ایک دوسرے کے ولی (اور مددگار) ہیں۔ وہ اچھے کاموں کا حکم دیتے ہیں اور برے کاموں سے روکتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور زکوۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔"[2]

ان دو فرائض کی اہمیت اس قدر ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں ان دونوں (امر بالمعروف اور نہی عن المنکر) کو نماز، زکوۃ اور خدا ورسول کی اطاعت پر مقدم کیا گیا ہے۔ کیونکہ جب تک قوانین کے نفاذ پر یہ نظارت نہیں ہوگی، نماز وزکوۃ اور اطاعت کی بنیادیں بھی لرزتی رہیں گی۔ ایک اور مقام پر راہ خدا کے مجاہدین کی صفات بیان کی جاتی ہیں، وہ مجاہدین جو اپنی جان و مال کو راہ خدا میں فروخت کر دیتے ہیں اور اس کے عوض جنت خریدتے ہیں۔ ان سے مختص چھ صفات بیان کرنے کے بعد قرآن مجید فرماتا ہے:

الْآمِرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّاهُونَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحَافِظُونَ لِحُدُودِ اللهِ ۗ

---

[1] بقرہ/ ۲۲۹

[2] توبہ/ ۷۱

یعنی: ''نیکی کا حکم دینے والے، برائی سے روکنے والے اور اللہ کی حدود (اور سرحدوں) کی حفاظت کرنے والے ہیں۔'' [1]

قابل توجہ یہ کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مختلف مراحل ہیں جو نصیحت اور دوستانہ واعظ و ارشاد سے شروع ہو کر شدت عمل کے مرحلے تک جا پہنچتے ہیں۔ ان کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک حصہ سب کے لئے ہے جبکہ دوسرا حصہ الٰہی حکومت کی زیر نگرانی ایک خاص گروہ کے سپرد کیا گیا ہے۔ اسی تقسیم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

وَلۡتَكُنۡ مِّنۡكُمۡ اُمَّةٌ يَّدۡعُوۡنَ اِلَى الۡخَيۡرِ وَيَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَيَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ‌ؕ وَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ۝۱۰۴

یعنی: ''تم میں سے ایک جماعت ایسی ہو جو بھلائی کی باتوں کی طرف دعوت دینے والی ہو، وہ نیکی کا حکم دے اور برائی سے روکے، بلاشبہ ایسے ہی لوگ کامیابی حاصل کرنے والے ہیں'' [2]

واضح ہے کہ جو اُمت قوانین پر نگرانی کو ایک عمومی فریضہ سمجھے اور معاشرے کے تمام افراد اس سلسلے میں ذمہ داری کا احساس کریں تو اُن کے درمیان قانون کا ایک خاص احترام ہو گا اور وہ اپنے موقع پر نفاذ ہو سکے گا۔ عمومی نگرانی کے مرحلے کے بعد احسن طریقے سے قوانین کے نفاذ پر اندرونی، نفسیاتی، نظریاتی اور ضمیر کی نظارت کا مرحلہ پیش آئے گا کہ جس کی قدرت اور قوت سب سے زیادہ ہو گی۔

مبداء پر ایمان

جو اللہ ہر حال میں حاضر و ناظر ہے اور خود انسان سے زیادہ اُس کے نزدیک ہے: ''وَنَحۡنُ أَقۡرَبُ إِلَيۡهِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِيدِ'' یعنی: ''اور ہم تو اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں'' (ق/۱۶) وہ اللہ کہ جو خیانت کار آنکھ کی ہر حرکت کو دیکھ رہا ہے اور سینوں کے اندر چھپے رازوں سے آگاہ ہے:

''يَعۡلَمُ خَائِنَةَ الۡأَعۡيُنِ وَمَا تُخۡفِي الصُّدُورُ''

یعنی: ''وہ ان کی آنکھوں کو بھی جانتا ہے جو خیانت کرتی ہیں اور جو کچھ دل چھپاتے ہیں ان سے بھی باخبر ہے'' [3]

وہ خدا جس نے زمین، زمان اور یہاں تک کہ انسان کے اعضائے بدن کو اُس کے اوپر نگران بنایا ہے جو اس کے شاہد و گواہ ہیں۔ [4]

---

[1] توبہ/ ۱۱۲

[2] آل عمران/ ۱۰۴

[3] غافر/ ۱۹

[4] سورۂ زلزلہ: ۴، یس: ۶۵، نور: ۲۴

قیامت جیسی عظیم عدالت پر ایمان

اگر انسان کے نامہ اعمال میں ایک ذرے کے برابر بھی نیک یا بُرا کام ہوگا، وہ اس کے سامنے حاضر ہو جائے گا اور وہ اس کا اجر وثواب اور سزا وعذاب دیکھ لے گا:

فَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَيۡرًا يَّرَهٗ ۞ وَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۞

یعنی: ''پس جس شخص نے ایک ذرہ بھر بھی اچھا کام انجام دیا ہوگا وہ اسے دیکھے گا اور جس نے ایک ذرہ کے برابر برا کام کیا ہوگا، وہ اسے دیکھے گا۔[1]

توحید وقیامت پر ایمان کے اثرات کو منعکس کرنے والے نمونے فقط یہی نہیں ہیں، بلکہ قرآن مجید کی آیات میں اس قسم کے سینکڑوں نمونے موجود ہیں۔ جن پر عقیدہ اور ایمان قوانین الٰہی کے نفاذ کا بہترین ضامن ہے۔ کتنا فرق ہے اس شخص میں کہ جو فقط فوجی اور انتظامی قوتوں کے زیر نظر ہوتا ہے کہ جن کی تعداد ایک ہزار سے بھی کم ہے اور دوسروں کے اعمال پر نگرانی کے سلسلے میں بہت زیادہ محدودیت رکھتی ہیں اور پھر جن کے لئے عمومی مقامات اور گھروں میں داخل ہونے کے لئے خصوصی اہتمام کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس کے مقابلے میں وہ شخص ہے جو ہر جگہ اور ہر حال میں بغیر کسی استثناء کے اپنے آپ کو علم خدا اور اس کے فرشتوں کی دائمی نگرانی میں دیکھتا ہے اور اس بات کا معتقد ہے کہ اس کے اردگرد رہنے والی تمام مخلوق، حتیٰ اس کے بدن کی کھال بھی اُس کے اعمال کو اپنے اندر محفوظ کر رہی ہے اور ایک مناسب موقع پر اُنہیں آشکار کر دے گی۔ قوانین کے اجراء کی یہ ضمانت ایک ایسی چیز ہے جو مادی دنیا میں ہرگز پیدا نہیں ہوسکتی۔

اسی لئے قوانین کی دوسری اجرائی ضمانتیں کبھی بھی قانونی خلاف ورزیوں کی روک تھام نہیں کر سکیں۔ جبکہ پیغمبر اسلامؐ کی حیات مبارکہ کے زمانے جیسے حقیقی مذہبی ماحول میں قانون کے اجراء کا یہ ضامن بہت زیادہ فعال تھا اور اس دور میں قانونی خلاف ورزیاں بہت ہی کم تھیں۔ اس زمانے میں کوئی بھی قید خانہ نہیں تھا، بہت کم عدالت لگائی جاتی تھی، فقط بعض اوقات کچھ افراد مسجد میں پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں آتے اور اپنے جھگڑے کو پیش کرتے تھے اور اُسی جگہ وہ اپنے دعویٰ کا جواب سن لیتے تھے۔ اس دور میں بھی مذہبی معاشروں میں خصوصاً مذہبی ایام میں (مثلاً ہمارے ملک میں ماہ رمضان میں) جرائم اور قانونی خلاف ورزیوں کی تعداد بہت کم ہو جاتی ہے۔

ششم: معنوی قدروں کا احیاء

چونکہ انسان مادیت اور معنویت اور جسم وروح سے مرکب ہے۔ لہٰذا اس کی زندگی بھی دو حصوں پر مشتمل ہے: مادی زندگی اور معنوی زندگی۔ لیکن مادی دنیا کے تمام قوانین میں فقط مادی قدروں ہی کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔ اُن کے نزدیک جو کام بھی معاشرے کے مادی

---

[1] زلزلہ / ۷ / ۸

امور کے لئے مضر نہیں، وہ جائز ہے۔اسی لئے اُن کی جانب سے بہت سے ایسے شرمناک قوانین کی منظوری دی گئی ہے کہ جن کو یہاں ذکر کرنا بھی نفرت انگیز ہے۔

حالانکہ (مادیت ومعنویت) کو جدا کرنا نہ صرف انسان کی بلند مرتبہ شخصیت کو خراب کرتا ہے، بلکہ اس کی مادی قدروں کو بھی خطرے میں ڈال دیتا ہے چونکہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنا عملاً ناممکن ہے۔لیکن قرآن چونکہ انسان کی خلقت وفطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہے لہٰذا اُس کی مادی قدروں کو بھی مدنظر رکھے ہوئے ہے اوراس کی معنوی قدروں کو بھی۔

جب رفیق حیات کے انتخاب کی بات ہوتی ہے تو قرآن فرماتا ہے:

اَلزَّانِیۡ لَا یَنۡکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً اَوۡ مُشۡرِکَۃً ۫ وَّ الزَّانِیَۃُ لَا یَنۡکِحُہَاۤ اِلَّا زَانٍ اَوۡ مُشۡرِکٌ ۚ وَ حُرِّمَ ذٰلِکَ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۳﴾

یعنی: ''زانی مرد صرف زانی یا مشرک عورت سے نکاح کرتا ہے اور زانی عورت صرف زانی یا مشرک مرد سے نکاح کرتی ہے،اور یہ کام مومنین پر حرام کیا گیا ہے'' [۱]

نیز یہ بھی فرماتا ہے:

قُلۡ لَّا یَسۡتَوِی الۡخَبِیۡثُ وَ الطَّیِّبُ وَ لَوۡ اَعۡجَبَکَ کَثۡرَۃُ الۡخَبِیۡثِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰہَ یٰۤاُولِی الۡاَلۡبَابِ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ﴿۱۰۰﴾

یعنی: ''کہہ دو کہ پاک وناپاک (کبھی) برابر نہیں ہوسکتے اگر چہ ناپاکوں کی کثرت تجھے بھلی معلوم ہو، اللہ (کی مخالفت) سے پرہیز کرو،اے صاحبان عقل وخرد تاکہ تم نجات پاؤ'' [۲]

واضح ہے کہ اس آیت میں خبیث وطیب یا تو معنوی پاکی وناپاکی کو ظاہر کرتا ہے یا پھر کم از کم عام ہے،اور مادی ومعنوی ہر دو کو شامل ہے۔

بنابریں آلودگیوں کی زیادتی اور ناپاکیوں کی فراوانی اُن کی مشروعیت وحقانیت کی دلیل نہیں بن سکتی۔یہ مسئلہ خصوصاً عورتوں کے ساتھ ازدواج سے متعلق قوانین واحکام میں بہتر انداز میں مشخص ہوتا ہے کیونکہ بہت دفعہ ایسا ہوا ہے کہ ظاہری اور معنوی خوبیاں دو متضاد پہلوؤں سے سامنے آجاتی ہیں۔ظاہری خوبصورتی، باطنی آلودگی کے ساتھ اور باطنی حُسن، ظاہری بدصورتی کے ساتھ جمع ہوجاتا ہے، یہاں پر قرآن باطنی جمال اور روح ونفس اور اخلاق وایمان کی خوبصورتی کے پلڑے کو بھاری سمجھتے ہوئے فرماتا ہے:

وَ لَا تَنۡکِحُوا الۡمُشۡرِکٰتِ حَتّٰی یُؤۡمِنَّ ؕ وَ لَاَمَۃٌ مُّؤۡمِنَۃٌ خَیۡرٌ مِّنۡ مُّشۡرِکَۃٍ وَّ لَوۡ اَعۡجَبَتۡکُمۡ ۚ

---

[۱] نور/ ۳

[۲] مائدہ/ ۱۰۰

وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ؕ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۖۚ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ

''مشرک اور بت پرست عورتیں جب تک ایمان نہ لے آئیں ان سے نکاح نہ کرو ایماندار کنیزیں آزاد بت پرست عورتوں سے بہتر ہیں اگرچہ ان کی زیبائی تمہیں بھلی معلوم ہوتی ہو اور اپنی عورتیں بت پرست مردوں سے نہ بیاہو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں ایک صاحب ایمان غلام ایک بت پرست مرد سے بہتر ہے اگرچہ وہ تمہیں اچھا ہی لگے وہ لوگ تو آپ کو (جہنم کی) آگ کی دعوت دیتے ہیں جبکہ خدا جنت اور اپنے حکم کے ذریعے بخشش کی دعوت دیتا ہے'' [1]

افسوس کے ساتھ آج کی دنیا میں معاشرتی قوانین اور قواعد وضوابط بنانے میں معنوی قدروں کو نظر انداز کرنا بہت سی بے اعتدالیوں کا سبب ہے، لیکن اُن لوگوں کے پاس اس قسم کی معنوی قدروں کا کوئی ذریعہ بھی نہیں ہے۔ چونکہ ان قدروں کے احترام پر مبنی ایک معنوی نظریہ حیات قبول کئے بغیر ان قدروں کو قبول کرنا ناممکن ہے اور جس تک آج کی مادی دنیا کی رسائی مشکل ہے۔

لہٰذا اتفاقاً موجودہ دنیا کے قانونی متون میں حقوق انسانی جیسی بعض معنوی قدریں اگر نظر آتی بھی ہیں تو وہ بھی مسلسل مختلف تبصروں کی زد میں رہتی ہیں اور غلط مادی استفادوں کی تاویل کے لئے ایک ہتھیار اور انسانی فطرت کے موافق اصولوں سے فائدہ اُٹھانے والے ناجائز مقاصد پر پردہ ڈالنے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ہفتم: ثابت ومتغیر اُصول

ہم سب جانتے ہیں کہ پوری دنیا کے مسلمان قرآن اور مسلّمہ اسلامی احادیث کی روشنی میں پیغمبر اسلام ﷺ کو خاتم الانبیاء اور دین اسلام کو ایک ابدی دین جانتے ہیں۔ اور اس عقیدے کو قبول کرتے ہوئے ایک اہم مسئلہ پیش آتا ہے۔ وہ یہ کہ انسانوں کی اجتماعی زندگی میں تبدیلی واقع ہونے کی وجہ سے یہ کیسے ممکن ہے اس کے احکام وقوانین ہمیشہ ثابت اور دائمی حیثیت سے رہیں۔ لہٰذا تبدیل ہونے والی ضروریات کس طرح ثابت ودائمی قوانین کے ساتھ پوری ہو سکتی ہیں۔

قرآنی قوانین نے اس بڑی مشکل کو اس طرح حل کیا ہے کہ ہم ان قوانین میں دو اہم حصے دیکھتے ہیں: ایک کلی قوانین کہ جن کی بنیاد ثابت وہمیشہ باقی رہتی ہے، لیکن اُن کا مصداق اور موضوع زمانہ گذرنے کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔

دوسرا خاص قوانین جنہیں اصطلاحاً جزئی قوانین کہتے ہیں، جن میں کسی قسم کی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ مزید وضاحت یہ کہ سورۂ مائدہ کے شروع میں ایک آیت میں مومنین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

---

[1]

"يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ"

یعنی: ''اے ایمان والو! اپنے عہد و پیمان (اور قول وقرار) پورے کرو'

یہ ایک کلی اصول اور قاعدہ ہے جو تمام زمانوں اور صدیوں میں کارفرما رہا ہے، اگرچہ اس کا موضوع اور مصداق تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً زمانہ گذرنے کے ساتھ ساتھ انسانوں کے درمیان جدید قانونی تعلقات اور نئے معاہدے ہوتے رہتے ہیں جو نزول قرآن کے زمانے میں نہیں تھے۔ مثلاً اُس زمانے میں ''بیمہ'' (انشورنس) نام کی کوئی چیز نہیں تھی یا مختلف قسم کی شراکتی کمپنیاں بھی نہیں تھیں کہ جو آئے دن ضرورت کے مطابق اس زمانے میں پیدا ہو رہی ہیں۔

لیکن ایک کلی قانون اور قاعدہ پوری طرح ان کو بھی شامل ہے اور اس دنیا کے خاتمے تک ضرورت کے مطابق ہر قسم کے جدید معاہدے، قسم قسم کے معاملات، بین الاقوامی عہد و پیمان جو اسلامی معاہدوں کے کلی اصول وقواعد کے مطابق ہیں، اسی اصول پر مشتمل ہوں گے۔ اسلام میں بطور کلی اور قرآن میں بالخصوص اس قسم کے قوانین بہت زیادہ ہیں۔ سورۂ حج کی آیت نمبر ۷۸ میں آیا ہے:

"وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ"

یعنی: ''اور وہ دین میں تم پر مشقت طلب بوجھ نہیں ڈالتا''

بنابریں اگر کوئی اسلامی حکم اور فریضہ خاص حالات میں غیر معمولی طور پر باعث مشقت ہوجائے تو خود بخود اس کا واجب اور ضروری ہونا ختم ہوجاتا ہے۔ سخت حالات میں وضو کرنا، تیمم میں تبدیل ہوجاتا ہے، مجبوری کی صورت میں نماز کھڑے ہوکر پڑھنے کے بجائے بیٹھ کر پڑھی جاسکتی ہے، اسی طرح بیٹھ کر پڑھی جانے والی نماز، لیٹ کر پڑھی جاسکتی ہے، روزہ کو قضا کی صورت میں تبدیل کیا جاسکتا ہے اور ایسے ہی حالات میں حج ساقط ہوسکتا ہے۔

قرآن کی بہت سی آیات میں بعض خاص مواقع پر ''قاعدۂ لاضرر'' کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جس سے پتا چلتا ہے کہ جو چیز ضرر وزیان کا سبب بنتی ہے، اس سے منع کیا گیا ہے۔ اسی طرح وہ تمام اسلامی احکام وقوانین جو حکم عام کی شکل میں بیان ہوئے ہیں، ضرر اور نقصان کی صورت میں محدود ہوجاتے ہیں۔ قرآن مطلّقہ عورتوں کے بارے میں فرماتا ہے:

"وَلَا تُضَارُّوهُنَّ"

یعنی: اور انھیں ضرر نہ پہنچاؤ۔''[1]

ایک دوسری جگہ کہتا ہے:

"وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا"

یعنی: ''اور (عدت کے دوران) انھیں کسی طرح بھی نقصان پہنچانے اور ان سے زیادتی کرنے کے لئے ان

---

[1] طلاق/۶

سے رجوع (صلح) نہ کرو۔"[1]

وصیت کے بارے میں فرماتا ہے:

"مِنۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ يُوصَىٰ بِهَآ أَوۡ دَيۡنٍ غَيۡرَ مُضَآرٍّ"

یعنی: "بشرطیکہ وصیت کا طریقہ اور قرض کا اقرار انھیں نقصان نہ پہنچائے۔"[2]

اسناد اور معاہدوں کو لکھنے والوں اور ان پر گواہ افراد کے بارے میں فرمایا:

"وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ"

یعنی: "اور کاتب اور گواہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔[3]

اس قاعدے کے بارے میں بہت ساری اسلامی روایات نقل ہوئی ہیں اور یہ اُن اہم قواعد میں سے ہے کہ جو اسلامی احکام کو (موضوعات کی تبدیلی کے ذریعے) ہر زمانے کی حقیقی ضروریات وتقاضوں پر منطبق کرتا ہے۔ اس کی تفصیل "فقھی قواعد" سے متعلق کتابوں میں دی گئی ہے۔ بہر حال جرائم وقصاص اور مالی نقصانات سے متعلق مسائل میں "عدل وانصاف"، "عدم تکلیف مالا یطاق" اور "مقابلہ بہ مثل" جیسے قواعد قرآنی بنیاد پر ہی استوار ہیں جو اس دعویٰ پر گواہ ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ (سورۂ احزاب کی آیت ۴۰ کے مطابق) پیغمبر اسلام ﷺ کی خاتمیت اور قرآن مجید کے ابدی ہونے کی وجہ سے جو قوانین قرآن مجید میں آئے ہیں، اس طرح گہرے انداز میں پیش کئے گئے ہیں کہ زمانہ گذرنے اور انسانی ضروریات کے تبدیل ہو جانے کے باوجود اُن پر پُرانے اور قدیمی ہونے کی گرد وغبار نہیں پڑ سکتی۔ اسی طرح (یہ قوانین) عصر نزول قرآن اور زمانہ پیغمبرؐ کی ضروریات کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ بعد میں آنے والے زمانوں کی ضروریات کو بھی پورا کرتے ہیں۔ اس کی ایک دلچسپ مثال اسلام و مسلمین کی حفاظت کے لئے نازل ہونے والی آیہ مجیدہ "اعدادقوا" میں دیکھی جاسکتی ہے:

وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ

"اور ان دشمنوں کے مقابلہ کے لئے جتنی "قوت" ممکن ہو سکے مہیا اور تیار رکھو۔ اسی طرح (میدان جنگ کے لئے) طاقتور اور تجربہ کار گھوڑے (بھی تیار رکھو) تا کہ اس سے اللہ کے اور اپنے دشمن کو ڈرا سکو"[4]

اس آیت میں ایک جانب اُس زمانے میں ضرورت کی سواری کی نشاندہی اور آمادہ اور تجربہ کار گھوڑوں کی بات کی گئی ہے اور

---

[1] بقرہ/۲۳۲

[2] نساء/ ۱۲

[3] بقرہ/۲۸۲

[4] انفال/۶۰

دوسری جانب ایک کلی اُصول بتایا گیا ہے جو تا قیامت ہر زمانے کے لئے قابل قبول ہے۔ اور وہ انواع واقسام کی (فوجی وعسکری) طاقت فراہم کرنا ہے جو گذشتہ اور موجودہ زمانے کے تمام وسائل کو شامل ہے۔ اس سے بھی دلچسپ بات یہ کہ یہ سب وسائل دشمن کو ڈرانے اور جنگ جدال سے روکنے کے لئے ہیں نہ کہ خون خرابے کو زیادہ کرنے کے لئے۔

☆☆☆☆

٦۔ غیبی خبروں کے لحاظ سے قرآنی اعجاز

اشارہ:

یہ درست ہے کہ مستقبل کے واقعات زمانہ حال اور ماضی سے ہی تعلق رکھتے ہیں اور کوئی بھی شخص بطور صحیح مستقبل کے واقعات کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا اور پھر انسان کی ہمیشہ یہ خواہش بھی رہی ہے کہ وہ مستقبل کے بارے میں باخبر رہے اور اس کی خاطر اس نے بہت زیادہ کوششیں کی ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ اپنے اور مستقبل کے درمیان اس ضخیم پردے کو ہٹانے کے لئے کوئی مطمئن ذریعہ تلاش نہیں کرسکا۔

مستقبل کے واقعات سے آگاہی حاصل کرنے کے بارے میں انسان کے اس شدید اشتیاق نے پوری تاریخ کے دوران ہمیشہ اوھام پرست کاہنوں، نجومیوں بلکہ فال نکالنے والوں اور سمت کا حال بتانے والوں کے بازار کو گرم کئے رکھا ہے اور اُنہوں نے بھی اپنی خاص مہارت سے لوگوں کی اس شدید پیاس سے بخوبی فائدہ اُٹھاتے ہوئے کچھ مبہم عبارتوں یا ایسے کلی بیانات کے ذریعے کہ جنہیں ہر شخص اپنے مقصد کے ساتھ تطبیق دے سکے، لوگوں کو سرگرم کئے رکھا ہے۔ اور اس طرح وہ اپنے بہت سے مفادات پورے کرتے رہیں ہیں۔

آج بھی بعض خاص مقاصد کے تحت سیاسی اور غیر سیاسی بازار میں بہت زیادہ پیشگوئیاں کی جاتی ہیں اور یہ چیز حکومتوں کے سیاسی منصوبوں میں سے ایک منصوبہ شمار ہوتی ہے۔ لیکن ان میں سے بہت سی پیش گوئیاں خلاف واقع ثابت ہوجاتی ہیں۔ لیکن دلچسپ بات یہ کہ اس کے باوجود یہ جھوٹی پیشگوئیاں پھر بھی جاری رہتی ہیں لیکن یہ حقیقت کسی بھی طرح مخفی نہیں رہ سکتی اگر کوئی مستقبل کے مسائل کو انتہائی باریک بینی اور تمام جزئیات کے ساتھ بیان کرے (اور اس میں کسی قسم کے کلی بیانات اور مبہم عبارات سے کام نہ لے) تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ شخص کسی حد تک غیب کے اسرار سے باخبر ہے اور اگر اس قسم کی پیشگوئیاں بار بار بیان کی جائیں اور نبوت یا امامت کے دعویٰ کے ساتھ ہم آہنگ بھی ہوں تو ایک دلیل اور نشانی کے طور پر ان پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔

اسی اشارے کے ساتھ ہم قرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اس موضوع سے متعلق قرآن مجید میں موجود بہت سی مثالیں پیش کرتے ہوئے ان کے بارے میں وضاحت کرتے ہیں:

١۔ الٓمّٓ ۟ غُلِبَتِ الرُّوۡمُ ۙ۟ فِیۡۤ اَدۡنَی الۡاَرۡضِ وَ ہُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ غَلَبِہِمۡ سَیَغۡلِبُوۡنَ ۙ۟ فِیۡ بِضۡعِ سِنِیۡنَ ۬ؕ لِلّٰہِ الۡاَمۡرُ مِنۡ قَبۡلُ وَ مِنۡۢ بَعۡدُ ؕ وَ یَوۡمَئِذٍ یَّفۡرَحُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۙ۟ بِنَصۡرِ اللّٰہِ ؕ یَنۡصُرُ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الرَّحِیۡمُ ۙ۟ وَعۡدَ اللّٰہِ ؕ لَا یُخۡلِفُ اللّٰہُ وَعۡدَہٗ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ۟ (سورہ روم/١ تا٦)

٢۔ لَقَدۡ صَدَقَ اللّٰہُ رَسُوۡلَہُ الرُّءۡیَا بِالۡحَقِّ ۚ لَتَدۡخُلُنَّ الۡمَسۡجِدَ الۡحَرَامَ اِنۡ شَآءَ اللّٰہُ اٰمِنِیۡنَ ۙ

مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ لَا تَخَافُوْنَ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿٢٧﴾ (سورہ فتح/ ۲۷)

۳۔وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿٢٠﴾ وَّاُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ﴿٢١﴾ (سورہ فتح/ ۲۰، ۲۱)

۴۔اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ ﴿٤٤﴾ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ (سورہ قمر/ ۴۴، ۴۵)

۵۔وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٧﴾ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿٨﴾ (سورہ انفال/ ۷، ۸)

۶۔اِنَّ الَّذِيْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ ... (سورہ قصص/ ۸۵)

۷۔ تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ﴿١﴾ مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ﴿٢﴾ سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ﴿٣﴾ (سورہ تبت/ ۱ تا ۳)

۸۔اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ﴿١﴾ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ﴿٢﴾ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ﴿٣﴾

(سورہ کوثر/ ۱ تا ۳)

۹۔لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿١١١﴾

(سورہ آل عمران/ ۱۱۱)

۱۰۔ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ ..

(سورہ آلعمران/ ۱۱۲)

ترجمہ

۱۔الم؛ اہل روم مغلوب ہو گئے؛ (اور یہ شکست) نزدیک کے ملک میں واقع ہوئی لیکن وہ مغلوب ہونے کے بعد عنقریب پھر غالب آجائیں گے۔

چند ہی سال میں، اور سب کام اللہ کے حکم سے ہوتے ہیں (اس شکست و کامیابی سے) قبل ہوں یا بعد میں

اور اس روز مومنین خوش ہو جائیں گے۔

(یہ خوشی) اللہ کی مدد سے (ہوگی) اللہ جسے چاہتا ہے فتح و نصرت سے عطا فرماتا ہے اور وہ عزیز و رحیم ہے۔

یہ اللہ کا وعدہ ہے اور وہ کبھی اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

۲۔ اللہ نے جو کچھ اپنے رسول کو خواب کے عالم میں دکھایا وہ سچ تھا۔ انشاء اللہ تم سب کے سب قطعی طور پر انتہائی امن و امان کے ساتھ، اس حالت میں کہ تم اپنے سروں کو منڈوائے ہوئے ہوں گے یا اپنے ناخنوں کو کٹوائے ہوئے ہوگے، مسجد الحرام میں داخل ہوگے اور کسی شخص سے تمہیں کوئی خوف و وحشت نہ ہوگی لیکن اللہ کچھ ایسی چیزوں کو جانتا ہے جنھیں تم نہیں جانتے اس سے پہلے اس نے (تمہارے لئے) ایک قریب کی فتح قرار دی۔

۳۔ اللہ نے بہت سے غنائم کا تم سے وعدہ فرمایا ہے جو تم حاصل کرو گے لیکن ان میں سے یہ ایک تمہارے لئے جلدی فراہم کر دی ہے اور لوگوں (دشمنوں) کے دست ظلم کو تم سے روک دیا تا کہ یہ مومنین کے لئے ایک نشانی ہو اور تمہیں سیدھے راستے کی طرف ہدایت کرے۔

علاوہ ازیں دوسرے غنائم و فتوحات، جن پر تمہیں قدرت نہیں ہے، لیکن اللہ کی قدرت ان پر احاطہ رکھتی ہے، اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

۴۔ یا یہ کہ وہ کہتے ہیں ہم ایک ایسی جماعت ہیں جو متحد، طاقتور اور کامیاب ہے؟

لیکن (وہ جان لیں کہ) ان کی جماعت عنقریب شکست کھا جائیگی اور وہ فرار کی راہ اختیار کرلیں گے۔

۵۔ اور وہ وقت (یاد کرو) جب اللہ نے تم سے وعدہ کیا کہ دو گروہوں میں سے ایک (قریش کا تجارتی قافلہ یا لشکر قریش) تمہارے قبضہ میں دے گا لیکن تم (جنگ کے ڈر سے) چاہتے تھے کہ قافلہ تمہارے قبضہ میں آ جائے (نہ لشکر قریش)۔ لیکن اللہ چاہتا ہے کہ اپنے کلمات سے حق کو تقویت دے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے تا کہ حق ثابت ہو جائے اور باطل ختم ہو جائے، اگرچہ مجرم اسے ناپسند کرتے ہوں۔

۶۔ وہ ذات جس نے تجھ پر قرآن (کی تبلیغ کو) فرض (و واجب) فرمایا ہے وہی تجھے تیرے وطن واپس پہنچا دے گی۔

۷۔ ابولہب کے دونوں ہاتھ کٹ جائیں (اور وہ ہلاک ہو جائے)

اس کے مال و دولت نے اور جو کچھ اس نے کمایا ہے، اسے کوئی فائدہ نہ دیا۔

وہ جلد ہی اس آگ میں داخل ہو جائے گا جسے کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔

۸۔ ہم نے تجھے کوثر (بہت زیادہ خیر و برکت) عطا فرمائی،

اب جبکہ یہ بات ہے تو اپنے پروردگار کے لئے نماز پڑھ اور قربانی دے،

یقینا تیرا دشمن ہی ابتر (بلا عقب و مقطوع النسل) ہے۔

۹۔ اور وہ (اہل کتاب خصوصاً یہودی) تمہیں ہرگز نقصان نہیں پہنچا سکتے سوائے تھوڑی سی آزار و اذیت کے اور اگر وہ تم سے جنگ کریں تو تمہیں پیٹھ دکھا کر (بھاگ) جائیں گے اس کے بعد کوئی بھی ان کی مدد کو نہیں آئے گا۔

۱۰۔ وہ جہاں کہیں بھی ہوں گے ان پر ذلت و رسوائی کی مہر لگی ہوئی ہے مگر یہ کہ خدا سے رابطہ قائم کریں یا لوگوں سے وابستگی کے ذریعے (ادھر ادھر سے مدد حاصل کریں)

پہلی آیت میں قرآن مجید رومیوں کی شکست کے متعلق پیشگوئی کرتے ہوئے فرماتا ہے: ''غُلِبَتِ الرُّومُ ''یعنی: ''اہل روم مغلوب ہو گئے'' اس کے بعد اس واقعہ کے مقام سے آگاہ کرتے فرماتا ہے: ''(اور یہ شکست) نزدیک کے ملک میں واقع ہوئی'' (فِي أَدْنَى الْأَرْضِ) اس سے مراد سرزمین شام کا علاقہ ہے (یعنی؛ بَصرٰی اور اَذْرُعٰات کے درمیان کا علاقہ) جو مشرقی روم کی قلمرو میں تھا اور یہ جزیرۂ نمائے عرب کے ساکنین کے قریبی علاقوں میں شمار ہوتا ہے۔

آج کے مؤرخین کے بقول یہ جنگ ''خسرو پرویز'' کے زمانے میں واقع ہوئی ہے اور یہ ایرانیوں اور رومیوں کے درمیان ایک طویل جنگ تھی۔ تقریباً ۶۱۷ء میں ''شہر بُراز'' اور ''شاہین'' نام کے دو مشہور ایرانی سپہ سالاروں نے روم کے مشرقی علاقے پر حملہ کیا اور اُنہیں شکست دے کر شامات، مصر اور ایشائے کوچک کو فتح کر لیا اور روم کی مشرقی حکومت جس نے شدید شکست کھائی تھی تباہی کے کنارے جا پہنچی اور ایرانیوں نے اُس کے تمام ایشائی مقبوضات بشمول مصر کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ یہ واقعہ مکہ میں نبوت پیغمبرؐ کے تقریباً ساتویں سال پیش آیا۔

مشرکین اور دشمنان اسلام اس واقعے سے بہت خوش ہوئے۔ مشرکین مکہ نے اس واقعے کو نیک شگون سمجھا اور اسے اپنے مشرکانہ مذہب کی حقانیت کی دلیل قرار دیتے ہوئے کہا: ایرانی مجوسی اور مشرک (دوگانہ پرست) ہیں، جبکہ رومی عیسائی اور اہل کتاب ہیں، جس طرح ایرانیوں نے رومیوں پر غلبہ حاصل کر لیا ہے اسی طرح آخری فتح ہم مشرکین کی ہو گی اور محمدؐ کی زندگی کا بہت جلد خاتمہ ہو جائے گا اور ہمارا مذہب فتح مند ہو گا۔ اگر چہ اس قسم کی توقعات اور فال لینا کی کوئی عقلی بنیاد نہیں تھی، لیکن اُس ماحول میں رہنے والے جاہل لوگ اس قسم کے پروپیگنڈے سے بہت جلد متاثر ہو جاتے تھے۔

لہٰذا اس بات سے مسلمان بہت پریشان ہوئے۔ قرآن مجید آگے چل کر اس آیت میں مزید فرماتا ہے: ''لیکن جان لو یہ غلبہ

زیادہ مدت تک باقی نہیں رہے گا اور وہ مغلوب ہونے کے بعد عنقریب پھر غالب آجائیں گے'': ''وَهُمْ مِنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُونَ ''

پھر مزید جزئیات کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: چند ہی سال سے زیادہ عرصہ نہیں گزرے گا، اور سب کام اللہ کے حکم سے ہوتے ہیں (اس شکست وکامیابی سے) قبل ہوں یا بعد میں اور اس روز مومنین خوش ہوجائیں گے۔

''فِي بِضْعِ سِنِينَ لِلَّهِ الْأَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ وَيَوْمَئِذٍ يَفْرَحُ الْمُؤْمِنُونَ''۔

لیکن یہ خوشی شرک پر اسلام کے غلبے کے بارے میں کسی نیک شگون کی وجہ سے نہیں بلکہ اُن کی ''(یہ خوشی) اللہ کی مدد سے (ہوگی) اللہ جسے چاہتا ہے فتح ونصرت عطا فرماتا ہے اور وہ عزیز ورحیم ہے۔

''بِنَصْرِ اللَّهِ يَنْصُرُ مَنْ يَشَاءُ وَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ''

پھر مزید تاکید کرتے ہوئے اور ہر قسم کا شک وشبہ دور کرتے ہوئے فرماتا ہے: ''یہ اللہ کا وعدہ ہے اور وہ کبھی اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

''وَعْدَ اللَّهِ لَا يُخْلِفُ اللَّهُ وَعْدَهُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ''

پھر اس عجیب پیشگوئی کے ساتھ کچھ جزئیات بھی ذکر ہوئی ہیں۔لہٰذا ایک اہم سیاسی اور عسکری مسئلے کے بارے میں اس طرح کی پیشگوئی غیبی اسرار سے آگاہی کے بغیر کس طرح ممکن تھی۔ایک طرف فتح وکامیابی کی خبر دی جارہی ہے، وہ بھی شکست خوردہ رومیوں کے بارے میں جو تباہی کے کنارے تک پہنچ چکے ہیں اور اپنی مملکت کا ایک بڑا حصہ ہاتھ سے کھو چکے ہیں، جن کے بارے میں دوبارہ سر اُٹھانے کی کوئی اُمید بھی نہیں۔دوسری طرف صراحت کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ یہ واقعہ چند سال کے اندر رونما ہوجائے گا۔اور پھر مزید یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کے ساتھ کفار پر مسلمانوں کو ایک اور فتح بھی حاصل ہوگی۔اس کے علاوہ مزید تاکید کی جاتی ہے کہ یہ اللہ کا وعدہ ہے اور اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ یہ وعدہ پورا ہوکر رہتا ہے اور قیصر روم ''ہرقل'' نے ٦٢٦ء عیسوی میں یعنی؛ تقریباً ۹ سال بعد ''خسرو پرویز'' کی سپاہ کو پے درپے شکست دی اور یہ جنگیں ٦٢٧ء تک رومیوں کے مفاد میں جاری رہیں اس طرح ان کو مکمل فتح حاصل ہوگئی خسرو پرویز کو شدید شکست کا سامنا کرنا پڑا جس کے نتیجے میں ایرانیوں نے اسے حکمرانی سے معزول کرکے اس کے بیٹے ''شیرویہ'' کو مسند حکومت پر بٹھا دیا۔

مختصر یہ کہ رومیوں کو ٦١٧ء میں شکست ہوئی جو نبوت پیغمبرؐ کا ساتواں سال تھا اور رومیوں کو دوبارہ ٦٢٦ء میں فتح حاصل ہوگی چونکہ اس وقت ساسانیوں کی فوج نے ان سے شکست کھائی اور اس کے اگلے سال (٦٢٧ء) میں یہ شکست اپنے عروج کو جا پہنچی چونکہ ''ہرقل'' ایران کے دارالسلطنت اور خسرو پرویز کی اقامت گاہ ''مسفون'' سے بیس فرسخ پر موجود ''دستگرد'' تک جا پہنچا۔خسرو پرویز کو

شکست کھانی پڑی جس کے نتیجے میں اُسے سلطنت سے معزول ہونا پڑا پھر وہ قتل ہوگیا۔[1]

ملاحظہ کیجیے کہ ان دونوں واقعات کے درمیان ۹ سال سے زیادہ کا عرصہ نہیں گذرا تھا جس کا اطلاق ''بضع سنین'' پر پوری طرح ہوتا ہے چونکہ مفردات میں بقول راغب ''بضع'' کا لغوی معنی عدد دس کا کچھ حصہ ہے یعنی دس اور تین کے درمیان جو بھی عدد ہو اسے بضع کہتے ہیں بعض کا کہنا ہے: بضع پانچ سے زیادہ اور دس سے کم عدد کو کہتے ہیں۔ معجم مقالیس اللغۃ میں بھی آیا ہے کہ بضع تین اور دس کے درمیان عدد کو کہتے ہیں۔

دلچسپ بات یہ کہ یہ پیشگوئی مسلمانوں کے درمیان اس قدر یقینی حیثیت اختیار کر گئی تھی کہ بعض لوگ اس پر مشرکین کے ساتھ شرط لگانے پر تیار ہو گئے تھے اور اس قسم کی شرط لگائی بھی گئی تھی سب سے پہلے پانچ سال پر شرط لگائی گئی لیکن جب کوئی واقعہ رونما نہ ہوا تو وہ لوگ پیغمبر اکرمؐ کے پاس آئے اور اصل واقعہ ذکر کیا، آپؐ نے فرمایا: آپ لوگ دس سال سے کم مدت کے بارے میں ان سے بات کرتے اور پھر ایسا ہی ہوا اور شکست کے بعد یہ فتح دس سال سے بھی کم مدت میں حاصل ہوگئی۔

ایک اور اہم نکتہ یہ کہ رومیوں کی فتح مسلمانوں کی جنگ بدر میں فتح کے ہمراہ تھی چونکہ جنگ بدر دوسری ہجری میں واقع ہوئی تھی اور اگر ہم خود ساتویں سال کو مدنظر رکھیں تو نبوت کے ساتویں سال سے لے کر دوسری ہجری تک کا فاصلہ نو سال ہی بنتا ہے اور اس کے بغیر آٹھ سال بنتے ہیں اس طرح رومیوں کی فتح اور مسلمانوں کی فتح ایک ہی زمانے میں قرار پائی ہے درحقیقت مسلمان دو وجوہات کی بناء پر خوش تھے ایک اہل کتاب یعنی رومیوں کی مجوسیوں پر فتح سے جس سے شرک پر خدا پرستی کا غلبہ ہوگیا تھا جب کہ اس پہلے ان کی (رومیوں) شکست مشرکین مکہ کی خوشی کا باعث بن گئی تھی دوسرا خود مسلمانوں کی جنگ بدر میں مشرکین پر واضح فتح سے مسلمان خوش تھے۔ بہر حال یہ قرآن مجید میں وضاحت کے ساتھ آنے والی واضح ترین پیشگوئیوں میں سے ایک پیشگوئی تھی اس کے بارے میں پہلے سے جس طرح خبر دی گئی تھی یہ اسی طرح رونما ہوئی ہے لہٰذا یہ بھی قرآن و اسلام کی عظمت کی واضح دلیل ہے۔

۲۔ دوسری دو اہم کامیابیوں کے بارے میں پیشگوئی

ہمارے موضوع سے متعلق دوسری آیت مسلمانوں سے متعلق مستقبل کے دو مزید اہم واقعات کے چہرے سے پردہ اُٹھاتی ہے۔ پہلا واقعہ مستقبل قریب میں مسلمانوں کا حج اور عمرہ کے مناسک کے انجام دینے کے لئے مکہ اور مسجد الحرام میں داخل ہونے سے تعلق رکھتا ہے۔ جس کی مشرکین شدید مخالفت کر رہے تھے، لیکن اس مخالفت کے باوجود (اللہ تعالیٰ فرماتا ہے) تم مسجد الحرام میں داخل ہوگے اور (حج کے) یہ عظیم الشان مناسک پورے امن اور سکون کے ساتھ انجام دو گے۔ اس کے علاوہ اس سے پہلے ایک واضح کامیابی بھی تمہیں نصیب ہوگی۔ لہٰذا اس سلسلے میں قرآن مجید فرماتا ہے:

''اللہ نے جو کچھ اپنے رسول کو خواب کے عالم میں دکھایا وہ سچ تھا۔ انشاء اللہ تم سب کے سب قطعی طور پر انتہائی امن و امان کے

---

[1] کتاب تاریخ ایران قدیم

ساتھ، اس حالت میں کہ تم اپنے سروں کو منڈوائے ہوئے ہوگے یا اپنے ناخنوں کو کٹوائے ہوئے ہوگے، مسجد الحرام میں داخل ہوگے اور کسی شخص سے تمہیں کوئی خوف و وحشت نہ ہوگی لیکن اللہ کچھ ایسی چیزوں کو جانتا ہے جنھیں تم نہیں جانتے اس سے پہلے اس نے (تمہارے لئے) ایک قریب کی فتح قرار دی'':

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۙ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ ۙ لَا تَخَافُوْنَ ؕ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿۲۷﴾

اس آیت سے پتا چلتا ہے کہ حضرت رسول اکرم صلى الله عليه وآله وسلم نے ایک خواب دیکھا تھا جس کے مطابق مسلمان خانۂ خدا کی زیارت یعنی؛ حج کے مناسک کی ادائیگی کے لئے ''مسجد الحرام'' میں داخل ہوں گے۔ بعض لوگوں کے خیال کے مطابق زیادہ مدت بھی نہیں گذری تھی کہ یہ خواب اُسی سال پورا ہوگیا تھا۔ جب مسلمان خانۂ خدا کی زیارت کے لئے مکہ کی طرف جارہے تھے تو مشرکین مکہ نے اُنہیں ''حدیبیہ'' کے مقام پر روک لیا۔ (حدیبیہ مکہ سے ۲۰ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک دیہات ہے، وہاں موجود ایک درخت یا کنویں کی مناسبت سے اسے اس نام سے یاد کیا جاتا ہے)۔ آخرکار اسی مقام پر ایک مشہور صلح انجام پائی کہ جسے ''صلح حدیبیہ'' کہا جاتا ہے۔ بعض لوگ شک وتردید میں پڑ گئے تھے کہ شاید یہ خواب سچا نہ ہو۔ حتیٰ بعض لوگوں نے اس سلسلے میں پیغمبر اکرم صلى الله عليه وآله وسلم سے پوچھا کہ آپ کا یہ رحمانی خواب پورا کیوں نہیں ہوتا؟ پیغمبر اکرم صلى الله عليه وآله وسلم نے جواب میں فرمایا: ''میں نہیں کہا کہ یہ اسی سال بلکہ مستقبل قریب میں پورا ہوجائے گا''۔ [1]

اس وقت مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی جس میں سب سے پہلے اس خواب کی صداقت کی تصدیق کی گئی اور پھر اس کی جزئیات بیان کی گئیں کہ آپ بہت جلد مسجد الحرام میں داخل ہوجائیں گے اور حج کے مناسک انتہائی امن وامان کے ساتھ بجالائیں گے۔ اس کے علاوہ ان مراسم سے پہلے آپ کو ایک واضح کامیابی نصیب ہوگی۔

---

[1] یہ سوال رسول اکرم صلى الله عليه وآله وسلم سے کس نے پوچھا تھا، اس بارے میں آلوسی نے روح المعانی میں ایک روایت نقل کی ہے کہ سب سے پہلے عبداللہ بن اُبی، عبداللہ بن نفیل، اور رفاعۃ بن حرث نے بعنوان اعتراض کہا: ''خدا کی قسم! نہ تو ہم نے عمرہ کے مناسک کے طور پر سر منڈوائے ہیں اور نہ اپنے بال چھوٹے کئے ہیں اور نہ ہماری آنکھوں نے مسجد الحرام کو دیکھا ہے'' اس وقت مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی جس میں اس خواب کی سچائی اور اس کے پورا ہونے کی تاکید کی گئی ہے۔ دوسرے قول کے مطابق یہ سوال کرنے والے عمر بن خطاب تھے۔ (روح المعانی، ج ۲۶، ص ۱۰۹)۔

البتہ طبرسی نے مجمع البیان میں ایک اور روایت نقل کی ہے جس کے مطابق عمر بن خطاب نے کہا: ''خدا کی قسم! جب سے میں نے اسلام قبول کیا ہے مجھے کبھی بھی شک وشبہ نہیں ہوا سوائے اس دن کے کہ جب مشرکین (چھٹی ہجری کو حدیبیہ کے موقع پر) عمرہ کے مناسک ادا کرنے کے میں رکاوٹ بنے ہیں۔ میں پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا: کیا ہم حق پر نہیں ہیں، کیا آپؐ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ مستقل قریب میں ہم خانہ خدا کا طواف کریں گے، پس اب کیا ہوگیا ہے؟ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: ''ہم حق پر ہیں، کیا میں نے تجھے خبر نہیں دی کہ اس سال، یہ سب کچھ ہوکر رہے گا''(تلخیص از مجمع البیان، ج ۹، ص ۱۱۹)

یہی حدیث صحیح بخاری، صحیح مسلم میں بھی تھوڑے بہت فرق کے ساتھ نقل ہوئی ہے۔

تمام مؤرخین نے لکھا ہے کہ یہ پیشگوئی پوری ہوگئی تھی اور واقعہ حدیبیہ کے ایک سال بعد (یعنی: ساتویں ہجری کو) مسلمانوں کا ایک عظیم گروہ ''عمرہ'' کے مناسک ادا کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا جنہیں سب لوگ گزشتہ سال بجالانا چاہتے تھے۔ جو کچھ کہا گیا ہے اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ آیات کے اس حصے میں ایک ایسے مسئلہ سے پردہ اُٹھایا گیا ہے کہ جس کے بارے میں پیشگوئی کرنا ناممکن تھی۔ وہ مسئلہ مشرکین مکہ اور مسلمانوں کے درمیان شدید اختلاف کا باعث بنا ہوا تھا، حتیٰ ان آیات میں اس کی جزئیات کی طرف بھی اشارہ کردیا گیا تھا۔

اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کے لئے ایک اور کامیابی کی بھی پیشگوئی کی گئی ہے اور یہ خود اس اہم پیشگوئی کے بارے میں تاکید مزید کی حیثیت رکھتا ہے۔ ''فتح قریب'' سے کیا مُراد ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا ہے، چونکہ اس واقعہ کے ساتھ دو اہم کامیابیاں مسلمانوں کو حاصل ہوئی ہیں: ایک ''صلح حدیبیہ'' تھی جو بہت سے پہلوؤں سے مسلمانوں کے لئے آرام وسکون کا باعث بنی یہاں تک کہ اُسے ''فتح مبین'' کہا جانے لگا۔[1]

اور پھر واقعہ حدیبیہ کے چند ماہ بعد ہی ساتویں ہجری کے شروع میں ''فتح خیبر'' ہوئی تھی اور بظاہر ''فتح قریب'' اسی دوسرے واقعے کی طرف اشارہ ہے، جس کے بارے میں بہت سے محققین نے تاکید کی ہے، کیونکہ سورۂ فتح کی آیت نمبر ۱۹ میں فرمایا ہے:

وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۹﴾

یعنی: ''اور خدا نے مؤمنین کے لئے ایک اور جزا کے طور پر بہت سے غنائم رکھیں ہیں، جنہیں وہی حاصل کریں گے اور خدا عزیز وحکیم ہے''

یہ صحیح ہے کہ غنیمت کا مفہوم بہت وسیع ہے اور ہر قسم کی معنوی اور مادی غنیمت کو شامل ہوتا ہے، لیکن اس قسم کے مواقع پر زیادہ تر ظاہری غنائم ہی مدنظر ہوتے ہیں۔ اور ہم جانتے ہیں کہ ظاہری غنائم ''فتح خیبر'' ہی میں تھے نہ کہ صلح حدیبیہ میں۔ بنابریں اس سے ہم بخوبی اس نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ اس قسم کی بالکل درست اور پورے یقین کے ساتھ کی جانے والی پیشگوئیاں کہ جن میں اگر اور شاید وغیرہ کے احتمال کی گنجائش نہیں ہوتی، سوائے عالم غیب کے ساتھ رابطے کے بغیر ممکن نہیں ہوسکتیں۔

۳۔ مستقبل میں بہت زیادہ غنائم کی پیشگوئی

قرآن مجید تیسری آیت میں ''صلح حدیبیہ'' کے واقعے کے بعد ''عمرۃ القضاء'' اور ''فتح خیبر'' کی پیشگوئی کرتے ہوئے بہت سے غنائم کے ساتھ بعض دوسری فتوحات کی خبر دیتے ہوئے فرماتا ہے: ''اللہ نے بہت سے غنائم کا تم سے وعدہ فرمایا ہے جو تم حاصل کروگے، لیکن ان میں سے یہ ایک (فتح خیبر) تمہارے لئے جلدی فراہم کردی ہے اور لوگوں (دشمنوں) کے دست ظلم کو تم سے روک دیا تاکہ یہ مومنین کے لئے (پیغمبر اسلامؐ کے دعویٰ نبوت کی) ایک نشانی ہو اور تمہیں سیدھے راستے کی طرف ہدایت کرے''۔

---

[1] ''صلح حدیبیہ'' کی اہمیت اور مسلمانوں کے لئے اس کے نتائج جاننے کے لئے تفسیر نمونہ کی سورۂ فتح کی آیات ۱ تا ۳ کی طرف رجوع کیجئے۔

وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ ۚ وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿٢٠﴾

پھر مزید فرماتا ہے: ''علاوہ ازیں دوسرے غنائم وفتوحات (بھی عطا فرمائے کہ)، جن پر تمہیں قدرت نہیں ہے، لیکن اللہ کی قدرت ان پر احاطہ رکھتی ہے، اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے'':

وَّاُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ﴿٢١﴾

ان آیات میں دشمنوں پر دو اہم کامیابیوں کے ساتھ ساتھ بہت زیادہ غنائم کے حصول کی خبر دی گئی ہے۔ ایک فتح تو مختصر عرصے میں اور دوسری ایک طولانی عرصے بعد حاصل ہونا تھی۔ ایسی غنائم اور فتوحات جنہیں حاصل کرنے کی مسلمانوں میں ہرگز توانائی نہیں تھی، لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ سے یہ سب کچھ اُنہیں حاصل ہو گیا تھا۔

یہ کون سی فتوحات اور غنائم کی طرف اشارہ تھا، اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا ہے، بہت سے مفسرین کا کہنا ہے: اس سے مُراد وہ مال غنیمت ہے جو مختصر عرصے میں مسلمانوں کے ہاتھ لگا ہے اور یہ جنگ خیبر کا مال غنیمت تھا۔ اگرچہ بعض نے احتمال دیا ہے کہ یہ صلح حدیبیہ کے ''معنوی غنائم'' کی طرف اشارہ ہے، لیکن جیسا کہ ہم نے کہا ہے یہ بہت ہی کمزور احتمال ہے۔ طولانی مدت میں حاصل ہونے والے مال غنیمت کے بارے میں مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ جنگ ''حنین'' اور قبیلہ ''ہوازن'' کے غنائم کی طرف اشارہ ہے۔[1] [2]

بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ یہ بعد میں حاصل ہونے والی فتوحات کی طرف اشارہ ہے جن سے مراد ایران، روم اور یمن کی فتوحات ہیں۔ چونکہ فتح حُنین اور قبیلہ ہوازن کا مال غنیمت مسلمانوں کے لئے کوئی زیادہ بعید نہیں تھا۔ لیکن جس چیز کا حاصل کرنا بظاہر مسلمانوں کے لئے ناممکن تھا، وہ ''روم اور ایران کی فتح'' وغیرہ کا مسئلہ تھا۔ لہٰذا ایک مشہور روایت کے مطابق جب ''جنگ خندق'' میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایران، روم اور یمن کی فتح کی بشارت دی تو منافقین نے اس بات کا مذاق اُڑانا شروع کر دیا، چونکہ ظاہری علل واسباب کے لحاظ سے یہ بات ناممکن نظر آتی تھی۔ چونکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت وتوانائی رکھتا ہے، جس کی وجہ سے اُس نے ان فتوحات اور غنائم کو مسلمانوں کے لئے ممکن بنا دیا تھا اور کئی سال پہلے اس کامیابی کی خبر دے دی تھی اور اسے مذکورہ بالا آیات میں ایک یقینی پیشگوئی کی صورت میں بیان فرما دیا تھا۔ کیا اس قسم کی پیشگوئیاں، عالم غیب کے ساتھ رابطے کے بغیر ممکن ہیں؟

۴۔ دشمنوں کی یقینی شکست کے متعلق پیشگوئی

مذکورہ آیات کے چوتھے حصے میں ہم ایک اور پیشگوئی ملاحظہ کرتے ہیں۔ یہ آیات مکہ میں نازل ہوئی ہیں، جب اسلام کے

---

[1] تفسیر مجمع البیان، تفسیر فخر رازی، روح المعانی اور المیزان میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

[2] جنگ حُنین کے مال غنیمت کی مقدار بہت زیادہ لکھی گئی ہے۔ بعض نے ۲۴ ہزار اُونٹ اور ۴۰ ہزار بھیڑیں اور بہت زیادہ مقدار میں چاندی کا تخمینہ لگایا ہے۔ (تفسیر روح البیان، ج۹، ص ۴۲، منتہی الآمال، ج۱، ص ۶۵)

دشمنوں کی طاقت اپنے عروج پر تھی اور مسلمان اقلیت میں تھے۔ چنانچہ دشمن اپنی طاقت اور توانائی پر فخر کرتے ہوئے: ''کہتے ہیں ہم ایک ایسی جماعت ہیں جو متحد، طاقتور اور کامیاب ہے'' اور مخالفین سے انتقام لیں گے اور اُن پر کامیابی حاصل کریں گے ''أَمْ يَقُولُونَ نَحْنُ جَمِيعٌ مُنْتَصِرٌ'' لیکن، قرآن مجید فوراً فرماتا ہے: ''لیکن (وہ جان لیں کہ) ان کی جماعت عنقریب شکست کھا جائیگی اور وہ فرار کی راہ اختیار کرلیں گے'': ''سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ'' یقیناً اُس وقت دشمنان اسلام کی قوت وطاقت کے ختم ہو جانے اور مسلمانوں کی اتنی جلدی کامیابی کی پیشگوئی ایک ناممکن بات تھی، لیکن چند سال سے زیادہ عرصہ بھی نہیں گذرا کہ مسلمانوں نے ہجرت کرکے اس قدر طاقت اور توانائی حاصل کرلی تھی کہ جس کے نتیجے میں میدان بدر میں پہلی ہی مسلحانہ جنگ میں دشمن پر ایک ایسی کاری ضرب لگائی کہ جس کی اُسے بالکل توقع نہیں تھی۔

دلچسپ بات یہ کہ ابن عباسؓ سے منقول ایک حدیث کے مطابق پیغمبر اکرم ﷺ نے بدر کے دن سب سے پہلے اپنے خیمے میں دعا کرتے ہوئے بارگاہ خدا میں عرض کی: ''اے پروردگار! میں تجھے اُس عہد و پیمان کے واسطے سے پکارتا ہوں کہ جو تُو نے ہمارے ساتھ کررکھا ہے'' پھر جب آپ جنگی لباس کے ساتھ خیمے سے باہر نکلے اور میدان جنگ کی طرف جانے لگے تو اس آیت کی تلاوت فرمائی:

''سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرُ''

یعنی؛ آج اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ پورا ہوگا۔[1]

البتہ دشمنوں کی یہی شکست اور فرار پھر بھی جاری رہا اور وہ کئی بار شکست کھاتے رہے اور پھر چند سال بعد نہ فقط کفار مکہ مسلمانوں کے سامنے تسلیم ہو گئے تھے بلکہ پورے ''جزیرۂ عرب'' نے اُن کے سامنے سر تسلیم خم کردیا تھا۔ تفسیر قرطبی میں بعض مفسرین کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے کہ یہ آیت جنگ بدر کے میدان میں نازل ہوئی ہے، حالانکہ مشہور یہ ہے کہ پوری سورۂ قمر مکہ میں نازل ہوئی ہے۔ بظاہر اس غلط فہمی کا سبب وہی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے جنگ بدر میں اس آیت کی تلاوت فرمائی تھی جو اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ یہ الٰہی وعدہ آج پورا ہوگا، لہٰذا بعض نے خیال کیا ہے کہ یہ آیت وہیں نازل ہوئی ہے۔ بہرحال یہ قرآن مجید کی ایک اور یقینی پیشگوئی تھی کہ جو خلاف توقع انتہائی کم عرصے میں پوری ہوگئی تھی۔

۵۔ میدان بدر میں فتح کے متعلق ایک اور پیشگوئی

پانچویں آیت میں ایک واضح کامیابی کی بات کی گئی ہے جس کا مؤمنین سے وعدہ کیا گیا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''اور وہ وقت (یاد کرو) جب اللہ نے تم سے وعدہ کیا کہ دو گروہوں میں سے ایک (قریش کا تجارتی قافلہ یا لشکر قریش) تمہارے قبضہ میں دے گا لیکن تم (جنگ کے ڈر سے) چاہتے تھے کہ قافلہ تمہارے قبضہ میں آجائے (نہ لشکر قریش) لیکن اللہ چاہتا ہے کہ اپنے کلمات سے حق کو تقویت دے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے''

---

[1] تفسیر ''فی ظلال''، ج ۷، ص ۶۵۷ میں یہ حدیث صحیح بخاری کے حوالے سے ابن عباس سے نقل کی گئی ہے۔

وَاِذۡ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحۡدَى الطَّآئِفَتَيۡنِ اَنَّهَا لَـكُمۡ وَتَوَدُّوۡنَ اَنَّ غَيۡرَ ذَاتِ الشَّوۡكَةِ تَكُوۡنُ لَـكُمۡ وَيُرِيۡدُ اللّٰهُ اَنۡ يُّحِقَّ الۡحَـقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقۡطَعَ دَابِرَ الۡكٰفِرِيۡنَ ۙ‏﴿۷﴾

پھر مزید فرمایا:

''خدا چاہتا ہے حق ثابت ہو جائے اور باطل کو اپنے کلمات کے ذریعے ختم کر دے، اگر چہ مجرم اسے ناپسند کرتے ہوں''

لِيُحِقَّ الۡحَـقَّ وَيُبۡطِلَ الۡبَاطِلَ وَلَوۡ كَرِهَ الۡمُجۡرِمُوۡنَ‌ۚ‏ ﴿۸﴾

مؤرخین کے مطابق اس کی وضاحت یہ ہے کہ مکہ کے مشرکین کا ایک بڑا سردار ''ابوسفیان'' اپنے اور مکہ کے کچھ سرداروں کے تجارتی مال پر مشتمل ایک بڑا قافلہ لیکر شام سے واپس لوٹ رہا تھا جس کی مالیت تقریباً پچاس ہزار دینار تھی۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب کو حکم دیا کہ وہ قافلے پر حملہ کرنے کے لئے تیار ہو جائیں تاکہ ایک ایسے دشمن کے مال کو ضبط کر کے اُس کی اقتصادی طاقت کو ختم کر دیا جائے کہ جو ایک لمحے کے لئے بھی مخالفت اور دشمنی سے ہاتھ کھینچنے کے لئے تیار نہیں۔

ابوسفیان کے ساتھیوں کو جب مدینہ میں اس بات کی خبر ملی تو اُنھوں نے یہ خبر ابوسفیان تک پہنچا دی۔ اُس نے جلدی سے ایک قاصد مکہ بھیجا اور اُنہیں اپنے سرمائے اور مال کے خطرے میں پڑ جانے سے آگاہ کیا۔ بہت کم عرصے میں قریش کے ۹۵۰ سردار اور سپاہی سات سو اُونٹوں اور ایک سو گھوڑوں کے ہمراہ وہاں سے چل پڑے۔ اس لشکر کا کمانڈر ''ابوجہل'' تھا۔

یہ مسئلہ اُن کے لئے اس قدر اہمیت اختیار کر چکا تھا کہ مکہ کے سرداروں نے خبردار کیا کہ اگر کوئی شخص میدان کی طرف جا سکنے کے باوجود میدان میں جانے کے لئے تیار نہ ہو تو اس کے گھر کو تباہ کر دیا جائے۔ دوسری جانب ''ابوسفیان'' نے بھی مسلمانوں کے چنگل سے بچنے کے لئے اپنا راستہ تبدیل کر کے متبادل راستے پر چلنا شروع کر دیا تا کہ خطرناک علاقے سے دور ہو جائے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ۳۱۳ اصحاب کے ہمراہ مختصر سے جنگی ساز و سامان لیکن ایمان وعزم اور پختہ ارادے کے ساتھ مکہ و مدینہ کے درمیان سرزمین بدر کے نزدیک ایک مقام پر جا پہنچے۔ یہیں پر آپؐ کو قریش کے طاقت ورلشکر کی مکہ سے مدینہ کی طرف نکلنے کی خبر ملی۔ یہاں پر آپؐ نے اپنے اصحاب سے مشورہ کیا کہ کیا ہمیں تجارتی قافلے کا تعاقب کرنا چاہیے یا لشکر دشمن کے مقابلے کے لئے کھڑا ہو جانا چاہیے؟ بعض نے دشمن کا مقابلہ کرنے کا مشورہ دیا، لیکن بعض لوگ تجارتی قافلے کا پیچھا کرنے کی طرف مائل تھے۔ چونکہ وہ خود کو دشمن کی طاقت ور فوج کا مقابلہ کرنے کی لئے پوری طرح آمادہ نہیں پا رہے تھے۔

اس وقت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحیح راستے کا انتخاب کرتے ہوئے دشمن کی طرف بڑھنے کا حکم دیا اور اس طرح اسلام کا یہ چھوٹا سا لشکر سرزمین بدر میں داخل ہو گیا۔ (بدر اُس سرزمین میں ایک کنویں کا نام ہے کہ جس کا نام اس سرزمین کے اصلی مالک کے نام پر رکھا گیا ہے، پھر اُس پورے علاقے کو بدر کہا جانے لگا ہے)

مذکورہ بالا آیت میں اسی واقعے کی طرف اشارہ کرتے قرآن مجید فرماتا ہے: ''اللہ نے تم سے وعدہ کیا کہ دو گروہوں میں سے

ایک (قریش کا تجارتی قافلہ یا لشکر قریش) تمہارے قبضہ میں دے گا لیکن تم چاہتے تھے کہ قافلہ تمہارے قبضہ میں آجائے (نہ لشکر قریش) لیکن اللہ چاہتا ہے کہ (اپنے کلمات سے) حق کو تقویت دے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے''۔ بہر حال پیغمبر اسلام ﷺ نے یہاں پر مسلمانوں سے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ ان دونوں گروہوں میں سے ایک پر ہمیں کامیابی حاصل ہوگی (لہٰذا ہم دشمن کے لشکر کی طرف جاتے ہیں) اُس پر ہم فتح حاصل کر لیں گے، گویا ''ابوجہل'' وغیرہ کی قتل گاہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ سے جس طرح وعدہ کیا تھا، اُسی طرح یہ وعدہ پورا ہو گیا اور جب دونوں لشکروں کا آمنا سامنا ہوا تو ان کے درمیان ایک زبردست اور پُرجوش جنگ ہوئی جس میں بہت زیادہ نقصان ہوا۔ اس کی تفصیل تاریخ اسلام (سے متعلق کتابوں میں) آئی ہے، اس جنگ میں مسلمانوں کو کامیابی حاصل ہوئی اور مشرکین مکہ کو سخت قسم کی شکست کھانی پڑی اور اُن کے ستر لوگ مارے گئے اور ستر ہی لوگ گرفتار ہو گئے، جبکہ باقی سب بھاگ گئے تھے۔

یہ جنگ دوسری ہجری میں ۱۷ رمضان المبارک کے دن ہوئی واقع تھی جس نے تاریخ اسلام پر گہرے اثرات مرتب کئے یہاں تک کہ مجاہدین بدر اس واقعے کو ہمیشہ اپنے لئے ایک عظیم افتخار شمار کرتے تھے۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اُس وقت عام حالات میں اس قسم کی کامیابی کی مسلمانوں کے لئے پیش گوئی کی جا سکتی تھی؟ اس کا جواب یقیناً نہ میں ہے، کیونکہ سب سے پہلی بات یہ کہ اُس وقت مسلمان جنگ کی نیت سے نہیں نکلے تھے، لہٰذا قدرتی بات ہے کہ اُن کے ہمراہ کافی تعداد میں فوج بھی نہیں تھی۔ وہ تو صرف قافلے پر قبضہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے کہ اچانک اُنہیں (اُس زمانے کے مطابق) قریش کے اسلحے سے لیس ایک بڑے لشکر کا سامنا کرنا پڑ گیا۔

دوسری بات یہ کہ دشمن کے مقابلے میں بظاہر مسلمانوں کی عسکری حالت بہت ہی خراب تھی، دشمن کے سپاہیوں کی تعداد مسلمانوں سے تقریباً تین گنا زیادہ تھی۔ اُن کے پاس بہت زیادہ گھوڑے، اُونٹ اور دوسرا فوجی ساز وسامان تھا جبکہ مسلمانوں کے درمیان فقط دو افراد کے پاس سواری کے لئے گھوڑے تھے اور ستر اُونٹ سواری کے لئے تھے۔ لہٰذا اس لحاظ سے اُن میں سے چند افراد کے لئے ایک سواری تھی۔

تیسری بات یہ کہ قریش کے لشکر میں جنگجو افراد کی تعداد زیادہ تھی اور اُن میں جنگ کا محرک بھی بہت قوی تھا چونکہ وہ نہ صرف اپنے مال و دولت کو خطرے میں دیکھ رہے تھے بلکہ اُن کا سب کچھ خطرے میں پڑ چکا تھا۔ لیکن ان سب باتوں کے برعکس مذکورہ بالا آیت کے مطابق اُنہیں فتح کا وعدہ دیا گیا تھا اور پیغمبر اکرم ﷺ بھی اس کی بہت زیادہ تاکید فرما رہے تھے۔

دلچسپ بات یہ کہ اسی کے ساتھ اردگرد کچھ ایسے واقعات بھی رونما ہو رہے تھے جو ''اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیبی امداد'' کی علامت تھے۔ منجملہ یہ کہ بدر کی رات مسلمان ایک پُرسکون نیند سو گئے تھے جس کی وجہ سے وہ دوسرے دن جنگ کے لئے تازہ دم ہو گئے۔ آسمان سے بارش بھی برسنے لگی تھی تاکہ وہ غسل کر لیں اور پھر اُس ریگ زار سرزمین پر چلنا بہت ہی دشوار تھا، لیکن بارش کی وجہ سے وہ زمین دب کر مضبوط ہو گئی تھی جس پر اب جنگ کرنا آسان تھی۔ چنانچہ بعد کی آیات میں بھی اسی بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اُن آیات میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِذۡ يُغَشِّيۡكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنۡهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيۡكُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمۡ بِهٖ وَيُذۡهِبَ عَنۡكُمۡ رِجۡزَ الشَّيۡطٰنِ وَلِيَرۡبِطَ عَلٰى قُلُوۡبِكُمۡ وَيُثَبِّتَ بِهِ الۡاَقۡدَامَ ؕ﴿۱۱﴾

''وہ وقت یاد کرو جب اونگھ نے جو کہ آرام اور سکون کا سبب تھی، خدا کی طرف سے تمھیں گھیر لیا اور آسمان کی طرف سے تم پر پانی نازل کیا تا کہ اس سے وہ تمھیں پاک کرے اور شیطانی پلیدی تم سے دُور کرے اور تمھارے دلوں کو مضبوط کرے اور تمھیں ثابت قدم بنا دے''۔[1]

مختصر یہ کہ قرآن مجید میں جنگ بدر سے متعلق تمام آیات سے دشمن کی سپاہ اور جنگی ساز و سامان کی زیادتی اور اُس کی مسلمانوں پر برتری کے سبب بعض مسلمانوں کا نفسیاتی اضطراب بخوبی واضح ہوتا ہے۔ اس کو دیکھا جائے تو بظاہر قدرتی طور پر مسلمانوں کی شکست کا اندیشہ بہت زیادہ تھا۔ لیکن ان سب قرائن کے برخلاف قرآن مجید فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح و کامیابی کا وعدہ دیا ہوا تھا۔ آخر کار وہ اس وعدے کے مطابق فتح مند ہو گئے تھے۔ ممکن ہے یہاں کہا جائے کہ یہ آیات تو جنگ بدر کی فتح کے بعد نازل ہوئی ہیں جیسا کہ ان کے لب و لہجے سے معلوم ہوتا ہے۔

لہٰذا ہم انہیں قرآن کی پیشگوئیوں میں سے شمار نہیں کر سکتے۔ لیکن اس اعتراض کا جواب انہی آیات میں غور و فکر سے واضح ہو جاتا ہے چونکہ قرآن مجید پوری صراحت کے ساتھ فرماتا ہے کہ فتح و کامیابی کا وعدہ تمہیں پہلے دیا گیا ہے اور یہ وعدہ بعد میں پورا ہوا ہے۔

٦۔ واپسی کا وعدہ

چھٹی آیت (سورۂ قصص کی آیت نمبر ۸۵) میں اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر ﷺ کو ایک وعدہ دیتا ہے اور وہ حرم امن الٰہی کی طرف واپسی کا وعدہ ہے۔ یہ وعدہ پیغمبر اکرم ﷺ کی زندگی کے ایک سخت ترین دن دیا گیا تھا، یعنی جب آپؐ کینہ پرور دشمنوں کے محاصرے کو توڑ کر اُن کے تلواروں سے باہر نکل کر مکہ سے مدینہ کی طرف ''ہجرت'' کرنا چاہ رہے تھے۔ آپؐ نے اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم سے یہی کام کیا اور مدینہ کی طرف چل پڑے۔

جب آپؐ جعفہ کی سرزمین جو مکہ سے زیادہ دور نہیں تھا، پر پہنچے تو آپؐ کو اپنے وطن یعنی؛ حرم الٰہی کی یاد آنے لگی۔ آپؐ کافی غمگین ہو گئے، اس اشتیاق کے آثار اور تاثرات آپؐ کے چہرۂ مبارک سے نمایاں تھے۔ اس وقت یہ آیہ مجیدہ نازل ہوئی اور اللہ کا پیغام اس صورت میں آپؐ تک پہنچا: ''وہ ذات جس نے تجھ پر قرآن (کی تبلیغ کو) فرض (وواجب) فرمایا ہے وہی تجھے تیرے وطن واپس پہنچا دے گی''

اِنَّ الَّذِیۡ فَرَضَ عَلَیۡکَ الۡقُرۡاٰنَ لَرَآدُّکَ اِلٰی مَعَادٍ ؕ

اُن سخت ترین حالات میں پیغمبر اسلام ﷺ کے مکہ واپس آنے کی یقینی اور واضح پیشگوئی، خصوصاً اس کا نزول قرآن کے ساتھ تعلق جوڑتے ہوئے کہ قرآن نازل کرنے والا خدا حتماً یہ کام کرے کے رہے گا، معمولاً ایک ناممکن کام تھا۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ یہ عظیم

---

[1] سورہ انفال آیت۔ ۱۱

وعدہ آخر کار پورا ہو کر رہا اور چند ہی سال بعد پیغمبر اکرم ﷺ ایک طاقت ور لشکر کے ساتھ فاتحانہ انداز میں مکہ مکرمہ کی طرف لوٹ کر حرم امن الٰہی کو بغیر کسی خون خرابے کے اسلام کے زیر تسلط لے آئے۔

یہ قرآن کی معجزانہ پیشگوئیوں میں سے ایک ہے میں قرآن مجید نے ایسی خبر بغیر قید وشرط کے قاطعانہ انداز میں دی، وہ بھی ایک ایسے وقت کہ جب فتح وکامیابی کوئی علامت نظر نہیں آتی تھی اور پھر یہ پیشگوئی بہت کم عرصے میں پوری بھی ہوگئی تھی۔

علامہ طبرسی مجمع البیان میں لکھتے ہیں: یہ آیت پیغمبر اکرم ﷺ کی نبوت کی صداقت پر ایک واضح ترین دلیل ہے کیونکہ اس میں یہ پیشگوئی بغیر کسی قید وشرط اور استثناء کے ذکر ہوئی ہے اور جو بعینہ پوری بھی ہوگئی تھی۔ (مجمع البیان، ج ۷، ۸ ص ۲۶۹) فخر رازی نے بھی اپنی تفسیر میں لکھا ہے: یہ آیت اُن چیزوں میں سے ہے جو پیغمبر اسلام ﷺ کی نبوت پر دلالت کرتی ہے کیونکہ اس میں غیب کی خبر دی گئی ہے اور جس چیز کی خبر دی گئی تھی وہ پوری بھی ہوگئی ہے۔

لہٰذا یہ ایک واضح معجزہ ہے۔ (تفسیر فخر رازی، ج ۲۵، ص ۲۱) یہاں بعض نے یہ احتمال دیا ہے کہ ''معاد'' سے مراد روز قیامت کا معاد ہے۔ جیسا کہ مفسرین میں سے بعض محققین نے کہا ہے کہ یہ احتمال بہت ہی ضعیف ہے، چونکہ ''معاد'' فقط پیغمبر اکرم ﷺ سے ہی مخصوص نہیں تا کہ فقط آپؐ کو ہی مخاطب قرار دیا جائے۔ اس کے علاوہ کلمہ ''لَرَادُّک'' قیامت کے دن والے معاد سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا، کیونکہ ایک جگہ واپس جانا، وہاں سے خارج ہونے کی علامت ہے (یعنی: کسی جگہ سے نکلیں گے تو وہاں واپس جائیں گے)۔

اس کے علاوہ جملہ ''اِنَّ الَّذِی فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْآن '' میں نزول قرآن پر تکیہ کرنا کہ جو اس سے پہلے آیا ہے، اسی طرح جملہ

قُلْ رَّبِّیْٓ اَعْلَمُ مَنْ جَآءَ بِالْهُدٰی وَمَنْ هُوَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ﴿۸۵﴾

یعنی: ''کہہ دے میرا رب اُسے بھی خوب جانتا ہے جو ہدایت لیکر آیا اور اُسے بھی جو کھلی گمراہی میں ہے''

جو اس کے بعد آیا ہے۔ یہ سب اس بات پر قرینہ ہے کہ یہاں پیغمبر اسلام ﷺ اور قرآن کی حقانیت کی بات ہو رہی ہے نہ کہ روز قیامت سے متعلق مسئلہ معاد کی۔ ان سب باتوں کے علاوہ یہ تفسیر، آیت کے شان نزول کے ساتھ بھی موافق نہیں ہے۔ علاوہ ازیں جیسا کہ علامہ طبرسی نے قتیبی سے نقل کیا ہے کہ کلمہ ''معاذ'' کا معنیٰ انسان کا وطن اور شہر ہے (مَعَاذُ الرَّجُلِ بَلَدُہٗ) چونکہ وہ جہاں بھی جاتا ہے پھر واپس آجاتا ہے۔ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید میں کلمہ ''معاذ'' فقط ایک بار آیا ہے اور وہ بھی اسی مقام پر کہ جس کا معنیٰ مانوس وطن ہے۔

۷۔ وہ ہرگز ایمان نہیں لائے گا

ساتویں آیت میں مشرکین مکہ میں سے ایک مشہور مشرک ''ابولہب'' کے بارے میں بات کی گئی ہے کہ جس کا شمار رسول اللہ ﷺ کے چچاؤں اور عبدالمطلب کے بیٹوں میں سے ہوتا تھا۔ وہ مشرکین مکہ میں سے واحد شخص ہے جس کا نام قرآن مجید میں آیا ہے اور

اُس کے یقینی طور پر دوزخیوں میں سے ہونے کی تاکید کی گئی ہے۔ جو اس بات کا واضح اشارہ ہے کہ وہ ہرگز ایمان نہیں لائے گا۔ لہٰذا قرآن مجید فرماتا ہے:

تَبَّتۡ یَدَاۤ اَبِیۡ لَهَبٍ وَّ تَبَّ ؕ﴿۱﴾ مَاۤ اَغۡنٰی عَنۡهُ مَالُهٗ وَ مَا کَسَبَ ؕ﴿۲﴾ سَیَصۡلٰی نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ﴿۳﴾

''ابولہب کے دونوں ہاتھ کٹ جائیں (اور وہ ہلاک ہو جائے) اس کے مال و دولت نے اور جو کچھ اس نے کمایا ہے، اسے کوئی فائدہ نہ دیا۔ وہ جلد ہی اس آگ میں داخل ہو جائے گا جسکے شعلے بھڑک رہے ہیں''

اگرچہ ابوسفیان ایک خطرناک ترین دشمن تھا، لیکن اس کے باوجود وہ ظاہری طور پر ایمان لے آیا تھا۔ اسی طرح حضرت حمزہؓ کے قاتل ''وحشی''، جیسے لوگ بھی ظاہری ایمان لے آئے تھے۔ بنابریں ''ابولھب'' جیسے شخص کے بارے میں اس قسم کی یقینی پیشگوئی کرنا قرآن مجید کے معجزانہ طریقے کے علاوہ، عام طریقے سے ممکن نہیں تھی۔ بہت سے مشرکین مکہ حقیقی معنوں میں ایمان لے آئے تھے اور بعض نے ظاہری طور پر اسلام قبول کر لیا تھا۔ لیکن جو نہ ظاہراً اور نہ واقعاً ایمان نہیں لائے وہ ابولھب اور اس کی بیوی اور ابوسفیان کی بہن ''اُم جمیل''، تھی۔

قرآن مجید نے اس سورۂ میں واضح انداز میں خبر دی ہے کہ یہ دونوں ہرگز ایمان نہیں لائیں گے اور یہ قرآن مجید کی غیبی خبروں میں سے ایک ہے۔ اگر قرآن، خدا کی طرف سے نہ ہوتا تو کسی شخص کے دوزخی ہونے کے بارے میں اس قدر صراحت کے ساتھ خبر دینا کیسے ممکن تھا۔ ہو سکتا تھا کہ وہ آخر میں مسلمانوں کی صف میں شامل ہو جاتا یا کم از کم ظاہری طور پر مسلمان ہو جاتا۔

ابولھب کا نام ''عَبۡدُ العُزّٰی'' (عزی عربوں کے ایک بڑے بت کا نام ہے) اور اس کی کنیت ابولھب تھی۔ اس نے یہ کنیت شاید اس لئے انتخاب کی تھی کہ اس کا چہرہ سرخ اور روشن تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ آیات ابولھب کی زندگی میں ہی نازل ہوئی ہیں۔ لہٰذا کہا گیا ہے: ''ابولہب کے دونوں ہاتھ کٹ جائیں (اور وہ ہلاک ہو جائے)'' (تَبَّتۡ یَدَاۤ اَبِیۡ لَهَبٍ) اکثر مفسرین نے جو شان نزول بیان کئے ہیں اُن سے بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ واقعہ اُس کی زندگی میں ہی رونما ہوا ہے۔

جب پیغمبر اکرم ﷺ اپنے قریبی رشتہ داروں کو اسلام کی دعوت دینے اور اُنہیں شرک و کفر سے ڈرانے پر مأمور ہوئے، تو اس وقت پیغمبر اکرم ﷺ مکہ کے ایک پہاڑ (کوہ صفا) پر چلے گئے اور وہاں سے بلند آواز سے پکار کر فرمایا: ''یا صباحا'' (یہ ایک ایسا جملہ تھا کہ جو کسی دشمن پر غافلانہ حملے کے وقت کہا جاتا تھا مکہ والے نے خیال کیا کہ کسی دشمن نے باہر سے مکہ پر حملہ کر دیا ہے، لیکن جب وہ پیغمبر اسلام ﷺ کے گرد جمع ہوئے تو آپؐ نے فرمایا:

''اِنِّیۡ نَذِیۡرٌ لَّکُمۡ بَیۡنَ یَدَیۡ عَذَابٌ شَدِیۡدٌ''

یعنی: ''میں تمہیں اللہ کے شدید عذاب سے ڈراتا ہوں''

اور بتوں کی پرستش سے منع کرتا ہوں اور توحید کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ اس بات پر ابولھب بہت زیادہ غصہ میں آ گیا اور کہنے لگا:

"تَبًّا لَكَ اَمَا جَمَعْتَنَا اِلَّا لِهٰذَا"

یعنی: "تجھ پر موت آئے کیا تو نے ہمیں اسی لئے یہاں جمع کیا ہے؟"

اس وقت مذکورہ بالا آیات نازل ہوئیں، جن میں کہا گیا: اُس پر موت آئے جو آخر کار دوزخ کا لقمہ بنے گا۔[1]

۸۔ ہم نے تمہیں خیر کثیر عطا کی ہے

ان آیات میں سے آٹھویں آیت یعنی؛ سورۂ کوثر میں تین اہم پیشگوئیاں دیکھی جا سکتی ہیں، چونکہ اس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:" ہم نے تجھے کوثر (بہت زیادہ خیر و برکت) عطا فرمائی، اب جبکہ یہ بات ہے تو اپنے پروردگار کے لئے نماز پڑھ اور قربانی دے، یقیناً تیرا دشمن ہی ابتر (بلا عقب و مقطوع النسل) ہے"

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ ① فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ② اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ ③

بہت سے مفسرین نے ان آیات کا کوئی نہ کوئی شان نزول ذکر کیا ہے جو بہت حد تک ایک دوسرے سے ملتا ہے۔ منجملہ "اسماعیل بروسوی" نے تفسیر "روح البیان" میں لکھا ہے: "جب مکہ میں رسول اللہ ﷺ کے بیٹے "قاسم" اور "عبداللہ" اور مدینہ میں "ابراہیم" فوت ہو گئے تو مشرکین مکہ نے کہنا شروع کر دیا: محمدؐ کی وفات کے بعد اُن کا نام یادوں سے محو ہو جائے گا چونکہ اُن کی نسل ہی باقی نہیں رہی۔

اس سورۂ مجیدہ میں اللہ تعالیٰ خبر دے رہا ہے کہ جس کا نام و نشان باقی نہیں رہے گا وہ آپؐ کا دشمن ہے۔ آپؐ کا نام اور شہرت دن بدن بلند سے بلند تر ہوتی رہے گی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا نے اُنہیں ایک ایسی نسل عطا فرمائی ہے جو رہتی دنیا تک باقی رہے گی۔ آپ دیکھیں کہ کس قدر اہل بیت ؑ کو قتل اور شہید کیا گیا ہے، لیکن پھر بھی پوری دنیا اُن سے بھری پڑی ہے" (روح البیان، ج ۱۰، ص ۵۲۵)

"طبرسی"، "مجمع البیان" میں لکھتے ہیں: "یہ سورۂ "عاص بن وائل" کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ جب رسول اللہ ؐ مسجد الحرام سے نکل رہے تھے تو اُس کی نظر آپؐ پر پڑی تو اُس نے آنحضرتؐ سے کچھ باتیں کیں، قریش کے کچھ سرداروں نے جب یہ منظر دیکھا تو اُس سے پوچھا کس کے ساتھ باتیں کر رہے تھے؟ تو اس نے (گستاخی سے جواب دیا) اس ابتر (مقطوع النسل) کے ساتھ۔۔۔۔۔ چونکہ جس شخص کا بیٹا نہیں ہوتا تھا اُسے عرب "ابتر" کہتے تھے۔ لہٰذا (اس وقت) مذکورہ بالا سورۂ نازل ہوئی اور اُن لوگوں کو جواب دیا گیا" (مجمع البیان، ج ۱۰، ص ۵۴۹) "فخر رازی" نے اس آیت کی شان نزول میں چھ قول نقل کئے ہیں کہ مختلف لوگ پیغمبر اکرم ﷺ کو "ابتر" کہتے تھے (اس وقت) یہ سورۂ مبارکہ انہی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ (تفسیر فخر رازی، ج ۳۲، ص ۱۳۲)

اگرچہ مختلف افراد کا نام لیا گیا ہے لیکن سب کا مضمون اور مطلب ایک ہی ہے کہ وہ سب پیغمبر اسلام ﷺ کو کینے اور عداوت

---

[1] یہ شان نزول بہت سے مفسرین اور مؤرخین نے معمولی سے فرق کے ساتھ نقل کیا ہے (دیکھئے: اسی آیت کے تفسیر میں، تفسیر مجمع البیان، قرطبی، مراغی، فخر رازی، درالمنثور، فی ظلال۔ اسی طرح کامل ابن اثیر، ج ۲، ص ۶۰)

کی وجہ سے ''ابتر'' کے نام سے پکارتے تھے لہٰذا قرآن مجید نے اُن سب کو جواب دیا ہے۔ کیونکہ یہ چھ اقوال ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں، ممکن یہ الفاظ اُن سب نے استعمال کیے ہوں اور قرآن نے بھی اُن سب کو جواب دیا ہو۔ بہرحال کلمہ ''ابتر'' سے مراد کسی حیوان کے بدن کے کسی عضو کا قطع ہوجانا ہے جسے عام طور پر ''دُم کٹا'' کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ کلمہ ''مقطوع النسل'' انسانوں کے بارے میں استعمال ہونے لگا۔

اسی طرح جن لوگوں کا نیک نام باقی نہیں رہتا یا جن کا نام یادوں سے محو ہوجاتا ہے، اُن کے لئے بھی یہ کلمہ استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح ''**خطبہ بَتراء**'' اُس خطبے کو کہتے ہیں کہ جو نام خدا کے بغیر شروع ہوتا ہے (یا اُس میں خدا کا نام نہیں ہوتا) ''مقاییس اللغۃ'' میں بھی آیا ہے کہ ''بتر'' کا معنیٰ قطع ہے۔ ''**سَیۡفٌ بَاتِرٌ**'' یعنی؛ کاٹنے والی تلوار۔ جس کی نسل نہ ہو تو اُسے ''ابتر'' کہتے ہیں۔ لیکن ''کوثر'' مادۂ ''کثرت'' سے لیا گیا ہے۔[1] اور اسی معنیٰ میں ہے اور یہاں اس کا ایک وسیع معنیٰ مراد ہے جو عبارت ہے: خیر کثیر اور بہت زیادہ برکت سے۔ اس کے واضح ترین مصادیق میں سے ایک خاتون اسلام ''سیدۂ نساء العالمین من الاولین والآخرین'' حضرت فاطمہ زہراء × اور اُن کی بابرکت نسل سے اُن کی اولاد ہے۔ مفسرین نے ''کوثر'' کے معنیٰ کے بارے میں بہت زیادہ احتمالات ذکر کئے ہیں۔

یہاں تک کہ فخر رازی نے پندرہ قول اور تفسیر روح المعانی میں بعض مفسرین سے چھبیس قول بھی نقل کئے گئے ہیں جس کی طرف علامہ طباطبائیؒ نے ''تفسیر المیزان'' میں بھی اشارہ کیا ہے۔ منجملہ اس کی مشہور ترین تفسیر ''حوض کوثر'' ہے جو پیغمبر اکرمؐ سے متعلق ہے اور جس سے مومنین جنت میں داخل ہونے کے وقت سیراب ہوں گے۔ (مجمع البیان، ج ۱۰، ص ۵۴۹) بعض نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ اس سے مراد مقام نبوت یا قرآن، یا بہشت کی ایک نہر یا شفاعت ہے۔ جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ یہ کلمہ ایک وسیع معنیٰ رکھتا ہے جو ان سب کو شامل ہوسکتا ہے۔ اس مفہوم کے مصادیق کی زیادتی اس مفہوم کی جامعیت کے مانع نہیں بنتی، اور پھر ان متعدد تفاسیر میں کوئی تضاد بھی نہیں ہے۔

بہرحال اس سورہ میں تین اہم پیشین گوئیاں، دیکھی جاسکتی ہیں: سب سے پہلے فرمایا: ''ہم نے تمہیں خیر کثیر عطا کی ہے'': اگرچہ ''اِنَّآ اَعۡطَیۡنٰكَ''، فعل ماضی کی صورت میں ہے لیکن ممکن ہے کہ یہ مضارع مسلّم کی قسم سے ہو، جو ماضی کی صورت میں بیان ہوا ہے۔ اور یہ خیر کثیر ان تمام فتوحات، کامیابیوں اور توفیقات کو شامل ہے جو پیغمبر اکرم ﷺ کو بعد میں نصیب ہوئیں ہے اگرچہ وہ مکہ میں اس سورہ کے نزول کے وقت پیش بینی کے قابل نہیں تھیں۔

مخصوصاً اگر اس کے متعدد شان نزول کو دیکھا جائے اور پھر کلمہ ''ابتر'' کہ جسکا اطلاق دشمن آپؐ پر کرتے تھے، اس ''خیر کثیر'' کا ایک واضح ترین مصداق وہی آپؐ کی اولاد ہے کہ جو سب کی سب آپؐ کی اکلوتی بیٹی ''فاطمہ زُہرا ×'' سے پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے اور بعض کے بقول آج پوری دنیا بھری ان سے ہوئی ہے اور اس چیز کی اُس دور میں پیش گوئی نہیں کی جاسکتی تھی۔

---

[1] آلوسی روح المعانی میں لکھتے ہیں: کوثر صیغہ مُبالغہ ہے جو حد سے بڑھی ہوئی کثرت کے معنیٰ میں ہے۔ (ج ۳۰، ص ۲۴۵) اور لسان العرب میں ہم پڑھتے ہیں: ''اَلۡکَثِیۡرُ مِنۡ کُلِّ شَیۡئٍ''

کچھ اہل سنت مفسرین نے بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ منجملہ فخر رازی نے ''کوثر'' کی تفسیر میں جو تیسرا قول نقل کیا ہے، وہ یہی آپؐ کی اولاد اور فرزند ہیں۔ وہ لکھتے ہیں: ''چونکہ یہ سورۂ اُن لوگوں کے جواب میں نازل ہوا ہے کہ جو بیٹا نہ ہونے کی وجہ سے آپؐ کی مذمت کرتے تھے، پس اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ایک ایسی نسل عطا کی ہے جو صدیوں اور زمانوں تک باقی رہے گی۔

درحالانکہ ''بنی اُمیہ'' سے کوئی بھی قابل ذکر شخص باقی نہیں رہا۔ اور آپؐ کی اولاد میں سے حضرت باقر، حضرت صادق، حضرت کاظم، حضرت رضا(ؑ)اور محمد نفسہ زکیہ وغیرہ جیسے کتنے ہی بزرگ علماء دیکھے جا سکتے ہیں''(تفسیر فخر رازی، ج ۳۲ ص ۱۲۴) تفسیر روح المعانی میں بھی آیا ہے: ''بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ''کوثر'' سے مراد آنحضرتؐ کی اولاد ہے اور فرزند ہیں چونکہ یہ سورۂ اُن لوگوں کے جواب میں ہے جو آنحضرتؐ کی عیب جوئی کرتے تھے اور آپؐ کو ''ابتر'' کہتے تھے۔ الحمدللہ! آج آپؐ کی اولاد اس قدر زیادہ ہو چکی ہے کہ جس سے پورا کرۂ ارض بھرا ہوا ہے''۔(روح المعانی، ج ۳۰، ص ۲۴۵، طبع دار احیاء التراث العربی لبنان)

دوسری جانب یہ سورۂ اس بات کی خبر دیتا ہے کہ آپؐ کے دشمن ''ابتر''، بلا عقب اور مقطوع النسل ہو جائیں گے یہ پیش گوئی بھی پوری ہوگئی ہے اور آپؐ کے دشمن اس طرح تتر بتر اور تباہ و برباد ہوئے کہ آج ان کا نام و نشان تک باقی نہیں ہے حالانکہ ''ابو سفیان'' اور اس کی اولاد ''بنی اُمیہ'' جو اسلام کے سخت ترین دشمن تھے پیغمبر اسلامؐ کے مقابلے میں اور آپؐ کی بعض اولاد کے مقابلہ میں کھڑے ہوئے ایک وقت اتنی تعداد اور کثرت رکھتے تھے کہ ان کی اولاد شمار میں نہ آتی تھی، لیکن آج اگر اُن میں سے کوئی باقی رہ بھی گیا ہو تو وہ بالکل پہچانا نہیں جاتا۔

آلوسی نے روح المعانی میں لکھا ہے: ''اَبْتَر'' کا معنیٰ یہ ہے کہ جس کے پسماندگان میں سے کوئی باقی نہ رہے، نہ کوئی بیٹا ہو اور نہ ہی اسے کوئی نیک نامی سے یاد کرے اور یہ بات پیغمبر اسلام ﷺ کے دشمنوں پر صادق آتی ہے، لیکن آپؐ کی اولاد، آپ کی نیک نامی اور فضائل کے اثرات قیامت تک باقی ہیں بلکہ خود قیامت میں بھی باقی رہیں گے''(ایضاً، ص ۲۴۷) اگرچہ مشہور روایت کے مطابق اس سورۂ کے شان نزول سے پتہ چلتا ہے کہ اس قسم کی بات کہنے والا پیغمبر اسلامؐ کے دشمنوں میں سے ایک سخت ترین دشمن ''عاص بن وائل'' ہی تھا۔

لیکن واضح ہے کہ یہ سورۂ فقط اُسی کی طرف اشارہ نہیں کر رہی بلکہ کلمہ ''شانئ'' کہ جو مادۂ ''شَنْئان'' سے بغض و عداوت کے معنیٰ میں ہے، جس کا بہت وسیع مفہوم ہے اور تمام دشمنوں کو شامل ہے۔ اور یہ پیشگوئی بھی اُن سب پر صادق آتی ہے، چونکہ نہ تو اُن کا نام و نشان باقی رہا ہے اور نہ اُن کی قابل شناخت اولاد باقی ہے۔ اس مطلب کی پیش گوئی اُس زمانے میں ناممکن تھی کہ جب پیغمبر اکرم ﷺ مکہ میں تھے اور مسلمانوں کی تعداد بھی بہت کم تھی۔

۹،۱۰۔ وہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے

نویں اور دسویں آیت میں چند اور قابل توجہ پیشگوئیاں دیکھی جا سکتی ہیں:

۱۔ ''اور وہ اہل کتاب (خصوصاً یہودی) تمہیں ہرگز نقصان نہیں پہنچا سکتے سوائے تھوڑی سی آزار واذیت کے'' ''لَنْ یَضُرُّوْكُمْ إِلَّآ أَذًى'' اگرچہ ''مفردات'' میں راغب کے بقول کلمہ ''اَذًى'' ہر اُس زیان اور ضرر کو شامل ہوتا ہے کہ جو انسان کی روح یا جسم یا اُس سے متعلق چیزوں کو پہنچتا ہے، لیکن چونکہ یہ کلمہ جملہ ''لَنْ یَضُرُّوْكُمْ'' (تمہیں ہرگز نقصان نہیں پہنچا سکتا) سے استثناء کی صورت میں اور پھر ''اَذًى'' نکرہ کی صورت میں آیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ضرر و نقصان جزئی ہے۔ خواہ زبانی زخم کی صورت میں ہو یا ہلکی پھلکی ایذا پہنچانے والی حرکتوں کی صورت میں۔ چونکہ اہل کتاب خصوصاً یہودیوں کی طاقت بہت زیادہ تھی اور مسلمان بظاہر کمزور تھے لہٰذا یہ پیشگوئی مستقبل کے لئے یقینی طور وحی الٰہی کے سوا کسی اور طریقے سے ممکن نہیں تھی۔

۲۔ ''اور اگر وہ تم سے جنگ کریں تو تمہیں پیٹھ دکھا کر (بھاگ) جائیں گے اس کے بعد کوئی بھی ان کی مدد کو نہیں آئے گا''

وَإِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ۚ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿١١١﴾

یہ پیشگوئی کہ جب بھی اصحاب پیغمبرؐ اور یہودیوں اور دوسرے تمام اہل کتاب کے درمیان جنگ چھڑے گی تو یہودیوں اور تمام اہل کتاب کی تقدیر میں شکست ہی ہوگی، ایک ایسی بات نہیں تھی جو عام ذریعے سے معلوم ہو سکتی تھی۔

۳۔ ''وہ جہاں کہیں بھی ہوں گے ان پر ذلت و رسوائی کی مہر لگی ہوئی ہے مگر یہ کہ خدا سے رابطہ قائم کریں (اور اپنے ناپسندیدہ عمل پر تجدید نظر کریں) یا لوگوں سے وابستگی کے ذریعے، یعنی: ادھر ادھر سے مدد حاصل کریں''

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ

جیسا کہ تاریخ اسلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تینوں وعدے پیغمبر اسلام ﷺ کے زمانے میں ہی پورے ہو گئے تھے خصوصاً حجاز کے یہودی خواہ وہ ''بنی قریظہ'' ہوں یا ''بنی نضیر'' اور ''بنی قینقاع'' یا ''خیبر کے یہودی'' ہوں یا ''بنی المصطلق'' سب کے سب اسلام کے خلاف بہت زیادہ کوشش و سعی کرنے اور ایذا رسانی کے بعد آخرکار شکست سے دوچار ہو جاتے ہیں اور اُن کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔

اگرچہ مذکورہ بالا آیات میں یہودیوں کا نام واضح طور پر بیان نہیں ہوا، لیکن اس آیت اور اسی جیسی دوسری آیات (مثلاً سورۂ بقرہ کی آیت ۶۱ میں واضح طور پر یہودیوں کا نام لیا گیا ہے) سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں آیتوں میں بھی یہودیوں ہی کی طرف اشارہ ہے۔ خصوصاً آخری آیت میں فرمایا گیا ہے کہ فقط دو صورتوں میں وہ اپنی پیشانی سے ذلت و خواری کو مٹا سکتے ہیں: پہلے وہ ''خدا کی طرف پلٹیں اور روئے زمین سے عصیان و فساد کرنے سے باز آ جائیں'' ''اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ'' اور دوسرا وہ ''لوگوں سے وابستگی کے ذریعے'' ''وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ''

یہ وہی بات ہے جو آج تک یہودیوں کی زندگی میں دیکھی جا رہی ہے۔ اُن کی تاریخ بھی اُن کی دربدری اور ذلت و خواری یا دوسری طاقتوں سے وابستگی کی حکایت کر رہی ہے اور وہ دوسروں کے ہاتھوں میں کھلونا بنے ہوئے ہیں۔ (عصر حاضر میں جرمنی کے نازیوں کے دور میں اُن کی پہلی صورت دیکھی جا سکتی ہے اور آج کے حالات اُن کی دوسری صورت کی عکاسی کر رہے ہیں) اگرچہ مفسرین نے ''بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ'' کی تفسیر میں بہت سے احتمالات ذکر کئے ہیں، لیکن ہم نے جو کچھ اوپر بیان کیا ہے وہی زیادہ

مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے اُن کی بعض تفاسیر میں ہم نے جو کلی مفہوم بیان کیا ہے، وہ ایک مصداق کے عنوان سے قابل قبول ہو۔[1]

۷۔ قرآن کا عدم تضاد اور اختلاف کے لحاظ سے معجزہ ہونا

قرآن مجید کے معجزہ ہونے اور خدا کی جانب سے نازل ہونے کی نشانیوں میں سے ایک اور نشانی یہ ہے کہ اس میں کہیں بھی تضاد اور اختلاف نظر نہیں آتا حالانکہ قرآن کے نزول اور قرآن کو لے کر آنے والے کی شرائط اس طرح ہیں کہ اگر یہ خدا کی طرف سے نہ ہوتا تو اس میں اختلاف وتضاد بلکہ بہت سے اختلافات اور تضادات دیکھنے میں آتے۔ قرآن مجید سورہ نساء کی آیت نمبر ۸۲ میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا ﴿۸۲﴾

یعنی: ''آیا تم قرآن کے بارے میں غور وفکر نہیں کرتے کہ اگر وہ غیر خدا کی طرف سے ہوتا تو کم اس میں بہت سے اختلافات پاتے''

اس مسئلہ کا بنیادی نکتہ تحلیل وتجزیے کے ذریعے واضح طور پر اخذ کیا جا سکتا ہے:

''ہر شخص کی کیفیات اور نظریات ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں بعض استثنائی حالات چھوڑ کر عام حالات میں تکامل وارتقاء کا قاعدہ انسان اور اس کے افکار ونظریات پر بھی موثر وحاوی ہے ہمیشہ دن مہینے اور سال بدلنے سے لوگوں کی زبان، فکر اور گفتار بھی بدلتی رہتی ہے، اگر غور سے دیکھیں تو ایک لکھنے والے شخص کی تحریریں کبھی بھی ایک جیسی نہیں ہوتیں، بلکہ ایک ہی کتاب کی ابتدا اور انتہاء میں فرق ہوتا ہے خصوصاً اگر کوئی شخص عظیم حوادث سے گزرے اور حوادث بھی ایسے جو ایک فکری، معاشرتی، نظریاتی واعتقادی انقلاب کی بنیاد بن جائیں تو وہ جتنا بھی کہ اپنی گفتار کو ایک جیسا اور ایک طرز پر رکھنے اور اسے اپنی گذشتہ باتوں سے مربوط کرے کی کوشش کرے تو وہ ایسا نہیں کر سکتا، خصوصاً اگر وہ ان پڑھ اور پس ماندہ ماحول میں پروان چڑھا ہو''۔

لیکن قرآن جو ۲۳ سال کی مدت میں لوگوں کے تربیتی تقاضوں اور ضروریات کے مطابق بالکل مختلف حالات اور مواقع پر نازل ہوا، ایسی کتاب ہے جو مکمل طور پر مختلف موضوعات کو چھیڑتی ہے اور عام کتب کی طرح اس میں صرف معاشرتی، سیاسی، فلسفی، انسانی حقوق یا تاریخی موضوع سے بحث نہیں ہے، بلکہ قرآن کبھی توحید اور اسرار آفرینش کے بارے میں اور کبھی احکام وقوانین اور آداب وسنن کے متعلق اور اسی طرح گزشتہ عبادت اور بندوں کے خدا سے رابطے کے بارے میں گفتگو کرتا ہے، ڈاکٹر گوستاولبون کے بقول قرآن جو کہ مسلمانوں کی آسمانی کتاب ہے صرف تعلیمات اور مذہبی احکام پر مشتمل نہیں بلکہ مسلمانوں کے لئے سیاسی، اجتماعی اور معاشرتی احکام بھی بیان کرتی ہے۔

ایسی خصوصیات کی حامل کتاب کے لئے عام طور پر یہ ممکن نہیں کہ وہ تضاد، تناقض اور تضاد بیانی سے مبّرا ہو، لیکن جب ہم دیکھتے

---

[1] جو کچھ ہم نے کہا ہے، اُس سے واضح ہوتا ہے کہ آیت میں استثناء متصل صورت میں ہے۔

ہیں کہ ان تمام جہات کے باوجود اس کی تمام آیات ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں اور ہر قسم کے تضاد، اختلافات، سے خالی ہے تو ہم بہت بہتر اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ کتاب کسی انسانی فکر کی تخلیق نہیں ہو سکتی، بلکہ خدا کی طرف سے ہے۔ جیسا کہ قرآن خود اسکی حقیقت کو مذکورہ بالا آیت میں بیان کرتا ہے۔

بالفاظ دیگر تمام مادی موجودات جن میں سے ایک انسان بھی ہے ایک لحاظ سے مادی پہلو رکھتے ہیں اور ہمیشہ تبدیلی کی حالت میں ہیں اور اپنی تبدیلی کو اپنے ارد گرد موجود مخلوقات کی طرف بھی منتقل کرتے ہیں، لہٰذا اثر انداز ہونا اور اثر قبول کرنا انسان اور ہر مادی مخلوق کی طبیعت میں موجود ہے۔ اسی دلیل کے تحت انسان کے افکار وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ خصوصاً مختلف مسائل میں تجربات زیادہ ہونے اور انسانی مہارت کی سطح بلند ہونے سے اس تبدیلی و تغیر میں مدد ملتی ہے اور یہ چیز سبب بنتی ہے کہ اگر ہم ایک فرد کی زندگی کے واقعات کو جمع کریں تو حتماً اُس میں تضاد دو نا ہماہنگی اور بدنظمی وجود رکھتی ہوگی۔

صرف اللہ تعالیٰ جیسی قادر مطلق ذات ہے جو ہر طرح کی تبدیلی اور تاثیر و تاثر پذیری سے محفوظ ہے اور اس کے کلام میں کسی قسم کا تضاد نہیں اور یہ حق اور ناحق کلام کو پہنچاننے کے طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے۔ حتیٰ بعض مفسرین نے وضاحت کی ہے کہ نہ صرف قرآن میں کوئی تضاد نہیں ہے بلکہ اس کی فصاحت و بلاغت کے درجات میں بھی کوئی فرق نہیں۔ یہ بات درست ہے کہ ہم نے قرآن کی بعض آیات کو دوسری آیات سے زیادہ فصیح پایا ہے۔ جیسا کہ شاعر کا کہنا ہے:

"کی بود تَبَّتْ یَدٰا" مانند "یاآرْضُ ابْلَعِی" [1]

لیکن یہ تبدیلی مقامات کی وجہ سے واقع ہوئی، یعنی؛ ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ مناسب اور بہتر تعبیر ہے اس لحاظ سے اس میں کوئی فرق نہیں ہے۔

سوال: یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر قرآن مجید میں تضاد اور اختلاف نہیں ہے تو پھر ''ناسخ ومنسوخ'' آیات کس لئے ہیں؟

جواب: جیسا کہ ہم قرآن میں ناسخ و منسوخ کی بحث میں بیان کر چکے ہیں کہ منسوخ آیات کچھ ایسے قرائن کے ساتھ ہیں کہ جن سے پتا چلتا ہے ان میں بیان کئے گئے مطالب کی مدت کم ہے اور ایک دن اُن کی ضرورت نہیں رہے گی۔ یعنی؛ خود اُن آیات میں نسخ کی علامت موجود ہے۔ اس نکتہ پر غور کیا جائے تو ان آیات میں نہ فقط کوئی تضاد نہیں بلکہ اُن کے درمیان ہمیشہ ایک قسم کی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

---

[1] یہ مصرع اس معروف شعر سے لیا گیا ہے:

در بیان ودر فصاحت کی بود یکسان سخن
گرچہ گوینده بود چون جاحظ وچون اصمعی
درکلام ایزد بیچون کہ وحی منزل است
کی بودت "تَبَّتْ یَدٰا" مانند "یاآرْضُ ابْلَعِی"

مثلاً اگر ہم مختلف سطح کے طلباء کے لئے ایک نصاب بنانا چاہیں تا کہ تعلیم و تربیت حاصل کرنے والے افراد کو مختلف مراحل سے گزار کر آخری مرحلے تک پہنچا ئیں تو نصاب میں موجود قرائن کے مطابق مختلف کلاسوں کے لئے نصاب میں تبدیلی کو ہم ہرگز تضاد و تناقص نہیں کہیں گے۔ بلکہ اس کے برعکس یہ اُس نصاب میں ایک قسم کی ہم آہنگی کہلائے گی۔ جو کچھ ہم نے اوپر کہا ہے، اس سے ''عام و خاص'' یا ''مطلق و مقید'' پر دلالت کرنی والی آیات کے بارے میں پیدا ہونے والے سوال کا جواب بھی واضح ہو جاتا ہے۔

کیونکہ تخصیص کے ذریعے عام و خاص میں اور مطلق و مقید میں ہم آہنگی برقرار کرنا عام لوگوں میں ایک معروف چیز ہے اور اُسے ہرگز تناقض نہیں کہا جاتا۔ مثلاً اگر کسی ملک میں کوئی حکومت اعلان کرے کہ برآمدات بالکل آزاد ہیں لیکن بعد میں کچھ چیزوں کو مستثنیٰ قرار دے تو یہ استثناء اُس قانون میں تضاد کی وجہ سے نہیں ہے، بالخصوص جب یہ کام ایک روایت و رسم کی حیثیت اختیار کر لے اور ایک عام حکم بیان کر کے بعد میں اُس سے بعض چیزوں کو مستثنیٰ کر دیا جائے تو اس میں کوئی عیب نہیں۔ ویسے بھی ہمیشہ ہر حکم اور قانون میں کچھ چیزیں مستثنیٰ ہوتی ہیں۔ یہاں ہم قرآن میں اعجاز اور اُس کے مختلف پہلوؤں کا موضوع ختم ہو جاتا ہے۔

بعض دوسرے خارق عادات اعمال

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ پیغمبر اسلام قرآن کے علاوہ اور بھی بہت سے معجزات لے کر آئے ہیں اور اس بات پر پوری دنیا کے مسلمانوں کا اتفاق ہے اور متواتر روایات بھی اس بات کی دلالت کرتی ہیں۔ قرآن مجید میں بھی ان مسئلے کی طرف بارہا اجمالاً اور تفصیلاً اور کبھی خاص معجزات کی نشاندہی کر کے اشارہ کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے یہ آیت ملاحظہ کیجئے:

۱۔ ''وَاِذَا ذُكِّرُوا لَا يَذْكُرُونَ وَاِذَا رَاَوْا اٰيَةً يَّسْتَسْخِرُوْنَ وَقَالُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ''

قرآن یہاں پر کفار کی مذمت کرتے ہوئے فرماتا ہے:

''جب ان کو تنبیہ کے طور پر تذکر دیا جائے تو اس کو قبول نہیں کرتے اور جب معجزے کو دیکھتے ہیں تو مذاق اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو واضح اور روشن جادو ہے۔ [1]

آیت میں ''رَاَوْا اٰيَةً'' کی الفاظ واضح کرتی ہے کہ انھوں نے پیغمبر اکرم ﷺ سے کوئی ایک معجزہ یا کچھ معجزات ضرور مشاہدہ کئے ہیں۔ بجائے اس کے کہ وہ (معجزہ دیکھ کر) پیغمبرؐ پر ایمان لے آتے، اس کے برعکس اُنھوں نے دو بہت ہی منفی ردعمل ظاہر کئے: ایک وہ اس کا مذاق اُڑانے لگے اور دوسرا اسے واضح جادو کہنے لگے۔ یہ بات واضح ہے کہ قرآن کی آیات سنی جاسکتی ہیں نہ کہ دیکھی جاسکتی ہیں۔ اس بنا پر لفظ ''اٰيَةً'' یہاں پر آیات قرآن دیکھنے کے معنیٰ میں نہیں ہوسکتا۔

اس کے علاوہ ''واضح جادو'' کے الفاظ معجزات اور خارق عادات چیزوں سے تناسب رکھتی ہے۔ اُصولاً اُن کا پیغمبر اکرم ﷺ کو جادوگر کہنا اور اس بات کا بہت زیادہ پروپیگنڈا کرنا، ظاہر کرتا ہے، اُنھوں نے آپؐ سے کچھ خارق عادات چیز یا کوئی معجزہ ضرور دیکھا تھا۔

---

[1] سورۂ صافات/ ۱۳ تا ۱۵

اس کے علاوہ یہ کیسے ممکن ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی آسمانی کتاب میں دوسرے انبیائے کرام ÷ کے اس قدر محسوس معجزات : مثلاً حضرت موسیٰ -کا ''ید بیضا'' اور ''عصائے موسیٰ'' اور اُن سے صادر ہونے والے دوسرے نو معجزات (سورۂ نمل ر ۱۲) یا حضرت عیسیٰ - کے ''مردوں کو زندہ کرنے''، ''پیدائشی اندھوں کو بینا کرنے'' اور ''نا قابل علاج بیماروں کو شفا دینے'' اور اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام کے معجزات جو سب کے سب قرآن میں ذکر ہوئے ہیں، نقل کریں اور خود کسی قسم کا محسوس معجزہ لیکر نہ آئے ہوں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کیسے مطمئن کر سکتے ہیں کہ تمام دوسرے انبیائے کرام ÷ تو معجزہ رکھتے ہیں لیکن آپؐ خود کوئی معجزہ نہیں رکھتے۔اس کے باوجود آپؐ کہیں کہ میری نبوت سب سے برتر نبوت اور میرا دین سب سے افضل ترین دین ہے۔مذکورہ بالا آیت کے علاوہ ان سب قرائن سے ظاہر ہوتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے (قرآن مجید کے علاوہ) کچھ اور معجزات بھی تھے۔مذکورہ بالا آیت کے علاوہ قرآن مجید میں بہت سی دوسری آیات بھی ہیں۔اگرچہ صرف ان آیات سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات کی تصریح نہیں ہوتی، لیکن اگر ان کے ہمراہ ائمہ دین ÷ سے منقول روایات یا کتب تاریخ میں نقل ہونے والے ان کے شان نزول اور تفسیر میں منقول روایات کو دیکھا جائے تو ان سے پیغمبر اسلامؐ کے بہت دوسرے معجزات کی بھی حکایت ہوتی ہے۔جن کے چند نمونے یہاں ذکر کئے جاتے ہیں:

۱۔سورہ بنی اسرائیل کی پہلی آیت میں آیا ہے:

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ ﴿۱﴾

یعنی: ''پاک ومنزہ ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد الحرام سے مسجد الاقصیٰ کی طرف لے گئی جس کا ماحول پر برکت ہے تاکہ ہم اسے اپنی نشانیاں دکھائیں یقیناوہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔''

بلا شک وشبہ ''مسجد الحرام'' سے ''مسجد اقصیٰ'' کی طرف جانا اور آسمانوں سے بھی آگے سفر کرنا، اُس زمانے میں ایک غیر معمولی کام تھا لیکن جب تک لوگ اس قسم کے واقعے کا مشاہدہ نہ کرلیں، اُس وقت تک نہ تو معجزانہ پہلو رکھ سکتا ہے اور نہ دعویٰ نبوت کو ثابت کر سکتا ہے۔لیکن اسلامی روایات سے پتا چلتا ہے کہ لوگوں نے اس واقعے کا اُن خبروں کے ذریعے مشاہدہ کیا تھا جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ وشام کے راستے میں رفت وآمد کرنے والے قافلوں کے بارے میں دی تھیں۔[1]

۲۔سورہ حجر کی آیت ۹۵:

[1] کتاب ''اثباۃ الھداۃ'' کی جلد ا ص ۲۴۷ میں امام جعفر صادق - سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُنہیں خبر دی کہ آپؐ نے فلاں قبیلے کے کنویں کے پاس ابوسفیان کو دیکھا کہ اُس نے اپنے اُونٹوں میں سے ایک سرخ بالوں والے اُونٹ کو گم کردیا تھا۔اسی طرح بازار شام کی علامتیں بھی بتائیں کہ جہاں آپؐ کبھی بھی نہیں گئے تھے'' (مجمع البیان، ج ٦، ص ۳۹۵، سیرۂ ابن ہشام ج ۲، ص ۴۴، ۴۳)

اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ

یعنی: (ہم مذاق اڑانے والوں کے شر کو تم سے رکھیں گے)

کے تحت آیا ہے کہ چھ (یا اس سے کم) گروہوں میں ہر ایک گروہ پیغمبر اسلامؐ کا مذاق اڑاتا تھا۔ جب بھی آپؐ ان کو اسلام کی تبلیغ کرنے لگتے تو یہ لوگ اپنی باتوں کے ذریعے آپؐ کے ارد گرد سے لوگوں کو منتشر کر دیتے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اُن میں سے ہر ایک کو کسی نہ کسی مصیبت میں مبتلا کر دیا تھا اور وہ اس طرح اپنی مصیبتوں میں پھنس گئے تھے کہ جس کی وجہ سے وہ آپؐ کو بالکل ہی بھول گئے۔[1]

۳۔ سورہ مائدہ کی آیت ۱۱ میں فرمایا گیا ہے:

"اے ایمان والو وہ نعمت یاد کرو جو اللہ نے تمہیں بخشی جب کہ (دشمن کی) ایک جماعت نے ارادہ کر رکھا تھا کہ تم پر ہاتھ اٹھائے (اور تمہیں ختم کر دے) لیکن اللہ نے ان کا ہاتھ تم سے روک دیا۔"

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ۚ

بعض روایات میں آیا ہے کہ یہ 'بنی نضیر کے یہودیوں' کی طرف اشارہ ہے کیونکہ انہوں نے پیغمبر اکرمؐ کے قتل کے بارے میں سازش کی تھی۔ جب پیغمبر اکرمؐ اپنے بعض اصحاب کے ساتھ ان لوگوں کے پیچھے گئے تا کہ اُن کے ساتھ مقتولین کی دیت کے بارے میں جو معاہدہ کیا گیا ہے، اُس کے متعلق بات چیت کریں۔ اُن لوگوں نے کہا: ٹھیک ہے بیٹھیں اور کھانا کھائیں تا کہ آپ کے ساتھ بات چیت کی جائے، اس وقت وہ آپ کو غافل کر کے میں آپؐ پر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے اور پیغمبر اکرمؐ اور آپ کے ساتھیوں کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اُن کی اس سازش سے آگاہ کر دیا اور آپؐ نے اپنے اصحاب کو اس بات سے آگاہ کر دیا جس کے بعد آپؐ اپنے ساتھیوں سمیت جلدی سے واپس لوٹ آئے[2] اور

"یہ بھی پیغمبر اکرمؐ کے معجزات میں سے ایک معجزہ تھا"

"وَكَانَ ذٰلِكَ اِحْدٰى مُعْجِزٰاتِه"[3]

۴۔ سورہ اسراء کی آیت ۴۵ میں آیا ہے:

---

[1] اس دلچسپ واقعے کی تفصیل علامہ طبرسی مرحوم نے مجمع البیان کی ج ۵،۶، ص ۳۴۶ اور علامہ مجلسی مرحوم نے بحار الانوار کی ج ۱۸، ص ۴۸ پر اور ابن ہشام نے سیرۂ ابن ہشام کی ج ۲، ص ۵۰ پر ذکر کی ہے، اسی طرح دوسرے محدثین، مفسرین اور مؤرخین نے بھی اس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے۔

[2] اس دلچسپ واقعے کی تفصیل علامہ طبرسی مرحوم نے مجمع البیان کی ج ۵،۶، ص ۳۴۶ اور علامہ مجلسی مرحوم نے بحار الانوار کی ج ۱۸، ص ۴۸ پر اور ابن ہشام نے سیرۂ ابن ہشام کی ج ۲، ص ۵۰ پر ذکر کی ہے، اسی طرح دوسرے محدثین، مفسرین اور مؤرخین نے بھی اس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے۔

[3] مجمع البیان، ج ۳، ص ۱۶۵

وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ﴿۴۵﴾

یعنی: ''اور جب تو قرآن پڑھتا ہے تو ہم تیرے اور آخرت پر ایمان نہ رکھنے والوں کے درمیان ایک غیر محسوس حجاب پیدا کر دیتے ہیں۔''

ایک دفعہ پیغمبر اکرمؐ تلاوت قرآن میں مشغول تھے تو بعض دشمنوں نے آپ کے قتل کا ارادہ کیا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اکرمؐ اور آپؐ کے دشمنوں کے درمیان ایک نامرئی پردہ قرار دے دیا۔ چنانچہ ایک حدیث میں طبرسی مرحوم نے اپنی کتاب احتجاج میں حضرت علیؑ سے نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اُن کے دشمنوں سے پانچ پردوں چھپائے رکھا، جو آپؐ کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ان پانچ پردوں کے بارے میں قرآن مجید کی آیات میں اشارہ کیا گیا ہے: ایک جگہ سورۂ یٰس کی آیت ۹ میں فرمایا:

وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا

یعنی: ''اور ہم نے ان کے سامنے بھی ایک دیوار بنا دی۔''

یہ پہلا پردہ ہے۔ پھر فرمایا:

وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا

یعنی: ا''ور ہم نے ان کے پیچھے بھی ایک دیوار بنا دی''

اس کے بعد فرمایا:

فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۹﴾

یعنی: ''ان کی آنکھوں کو ہم نے ڈھانپ دیا ہے۔ اس لئے وہ کچھ نہیں دیکھ سکتے یہ تیسرا پردہ ہے''

اس کے بعد سورۂ اسرائیل کی آیت ۴۵ میں فرمایا:

وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ﴿۴۵﴾

اور یہ چوتھا حجاب ہے۔ اس کے بعد فرمایا:

اِنَّا جَعَلْنَا فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِيَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ ﴿۸﴾

یعنی: ''ہم نے ان کے گردنوں میں طوق ڈال دیئے ہیں جو ٹھوڑیوں تک پہنچے ہوئے ہیں اور اس لئے انھوں نے اپنے سروں کو اوپر اٹھا رکھا ہے۔'' (یٰس/۸)

اور یہ پانچواں حجاب ہے۔ اور یہ پردے خواہ معنوی پہلو رکھتے ہوں یا مادی پہلو جس طرح بھی تھے، مختلف طریقوں سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف ہونے والی سازشوں کی راہ میں رکاوٹ بنے رہے اور یہ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات کی ایک بڑی مثال ہے۔

۵۔سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۱۳۷ میں آیا ہے:

فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿۱۳۷﴾

یعنی: ''اور خدا تم سے ان کے شر کو دور کرے گا وہ سننے والا اور دانا ہے''

اور اُن کی سازشوں سے آگاہ ہے۔ جو لوگ تاریخ اسلام سے آگاہ ہیں صرف وہی اس آیت کے مفہوم کی گہرائی کو سمجھ سکتے ہیں، کیونکہ عرب بہت ضدی اور متعصب تھے مخصوصاً مکہ کے بت پرست جن کے تمام ناجائز مفادات اسلام کے ظہور کے ساتھ خطرے میں پڑ گئے تھے۔ایسے لوگ اسلام اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ختم کرنے کی خاطر کسی قسم کی سازش سے دریغ نہیں کرتے تھے۔اس کے باوجود مذکورہ بالا آیت پوری صراحت کے ساتھ مسلمانوں سے وعدہ کر رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے شر کو دور کرے گا اور اُن کے تمام منصوبوں کو ناکام اور تمام سازشوں کو غیر موثر بنا دے گا اور یہ ایک معجزانہ پیشگوئی تھی۔

۶۔سورہ احزاب کی آیت نمبر ۹ میں ایک اور معجزے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو جنگ احزاب میں رونما ہوا ہے۔لہٰذا فرمایا: ''اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو یاد کرو، اس وقت جب (عظیم) لشکر تمہاری طرف آئے، ہم نے سخت آندھی اور طوفان ان پر بھیجا اور ایسے لشکر جنہیں تم نہیں دیکھ سکے اور (اس طرح سے انہیں درہم برہم کر دیا) اور جسے تم انجام دیتے ہو خدا اسے دیکھ رہا ہے''

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا

اگر کوئی شخص ''جنگ احزاب'' کا قرآن مجید، روایات اور تاریخ میں مطالعہ کرے تو وہ اچھی طرح جان لے گا کہ اس میدان میں طاقت اور وسائل کے لحاظ سے مسلمانوں اور دشمن کے درمیان بہت زیادہ فرق تھا۔دشمنوں نے اس طرح مدینہ کا محاصرہ کیا ہوا تھا کہ بظاہر مدینہ کا سقوط یقینی ہو چکا تھا اور مسلمانوں کے لئے بہت زیادہ مشکل بن گئی تھی جس کے بارے میں قرآن مجید نے یہ الفاظ استعمال کئے ہیں:

''وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ...وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا''

یعنی: ''اس وقت کو یاد کرو کہ جب آنکھیں شدت وحشت سے خیرہ ہو گئیں تھیں اور جان لبوں تک پہنچ گئی تھی۔اور وہ سختی سے ہل کر رہ گئے تھے''

اس دوران اچانک رحمت الٰہی کی ہوا چلنے لگی اور وہ ایک ایسے طوفان میں تبدیل ہوگئی جس نے ہر چیز کو الٹ پلٹ کر دیا، کفار کے خیمے اور مسکن درہم برہم ہو گئے اور اُن کے دلوں پر شدید خوف و وحشت چھا گئی اور ''اللہ تعالیٰ کی غیبی مدد'' مسلمانوں کے لئے آ پہنچی۔اس وقت مشرکین اس قدر زحمت اُٹھانے کے باوجود بغیر کوئی کارنامہ انجام دیئے پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئے اور مکہ کی طرف واپس لوٹ آئے۔

اصولی طور پر گزشتہ صفحات میں ہم نے قرآن کی جن غیبی خبروں کے بارے میں تفصیل ذکر کی ہے، وہ اس موضوع کی بہترین

دلیل بن سکتی ہیں چونکہ اُن میں سے ہر ایک واقعہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معجزہ شمار ہوتا ہے اور آپؐ کی صداقت وحقانیت کی دلیل بن سکتا ہے۔غیبی خبروں کے لحاظ سے قرآن مجید کے معجزہ ہونے کے بارے میں ہم نے جو دس عناوین ذکر کئے ہیں، اُن کا ایک دفعہ پھر مطالعہ کیجئے، اُن میں سے ہر ایک عنوان اس فصل کے موضوعات کی ایک دلیل بن سکتا ہے۔رہی بات اُن خاص معجزات کی کہ جن کی قرآن مجید نے نشاندہی کی ہے، اُن میں سے ایک اہم واقعہ ''شق القمر'' ہے جو سورۂ قمر کی آیت ۱ تا ۳ میں ذکر ہوا ہے جس میں فرمایا گیا ہے:

اِقۡتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانۡشَقَّ الۡقَمَرُ ۝۱ وَاِنۡ يَّرَوۡا اٰيَةً يُّعۡرِضُوۡا وَيَقُوۡلُوۡا سِحۡرٌ مُّسۡتَمِرٌّ ۝۲ وَكَذَّبُوۡا وَاتَّبَعُوۡۤا اَهۡوَآءَهُمۡ وَكُلُّ اَمۡرٍ مُّسۡتَقِرٌّ ۝۳

ترجمہ: ''قیامت نزدیک ہوئی اور چاند شق ہوگیا اور جب بھی کوئی نشانی (معجزہ) کو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ جادو مستمر ہے۔انھوں نے (خدا کی آیات) کو جھٹلایا اور اپنی ہوا وہوس کی پیروی کی اور ہر امر کی ایک قرارگاہ ہے۔'' کیا یہاں چاند کے دوٹکڑے ہونے سے مراد ایک ایسا معجزہ ہے کہ جو اس دنیا میں رونما ہوا ہے یا مستقبل میں اور دنیا کے خاتمے پر چاند کے دوٹکڑے ہونے کی طرف اشارہ ہے جو قیامت کی ابتدا کی علامت ہے۔مسلمانوں کے درمیان پہلا احتمال مشہور ہے اور بقول فخر رازی ''تمام مفسرین کا عقیدہ ہے کہ چاند (معجزہ کے طور پر) دوٹکڑے ہوگیا تھا اور اس واقعے کی دلیل روایات ہیں جیسا کہ کتب ''صحاح'' میں ایک مشہور روایت اسی سلسلے میں دیکھی جاسکتی ہے کہ جسے بہت سے صحابہ نے نقل کیا ہے''۔[۱]

علامہ طبرسی مرحوم نے بھی ''مجمع البیان'' میں شق القمر کی حدیث صحابہ کرام کی ایک بڑی تعداد اور بعض مفسرین کے حوالے سے نقل کی ہے اور اس مسئلے کی مخالفت میں فقط تین افراد (عثمان بن عطاء، حسن اور بلخی) کے نام لئے ہیں۔اس کے بعد وہ لکھتے ہیں: اُن (تینوں مخالفین) کی بات صحیح نہیں اور قابل قبول نہیں چونکہ مسلمانوں کا اس مسئلے پر اجماع اور اتفاق ہے، لہٰذا قول مخالف کی اعتناء نہیں کی جاسکتی اور صحابہ کے درمیان اس کے مشہور ہونے سے مخالف قول رد ہوجاتا ہے۔[۲]

چند دوسرے مفسرین سے بھی ''طبرسی'' اور ''رازی'' جیسی عبارات نقل ہوئی ہیں۔اس کے علاوہ خود ان آیات میں بھی اس واقعہ پر واضح قرائن موجود ہیں منجملہ یہ کہ:

۱۔جملہ ''وَانۡشَقَّ الۡقَمَرُ'' فعل ماضی کی صورت میں ذکر ہوا ہے جو اس واقعہ کے واقع ہونے کی دلیل ہے۔اور یہ بات فعل ماضی، مضارع کے معنی میں ہو تو اگرچہ یہ چیز قرآن میں بعض جگہوں پر آئی ہے، لیکن ایک مجازی استعمال ہے جس کے لئے قرینے کی ضرورت ہے اور یہاں پر کوئی قرینہ موجود نہیں ہے۔

---

[۱] تفسیر کبیر فخر رازی، ج۲۹ص۲۸

[۲] مجمع البیان، ج۹، ۱۰، ص۱۸۶

۲۔آیہ دوم کہ جس میں فرمایا ہے: ''وَاِنۡ یَّرَوۡا اٰیَۃً یُّعۡرِضُوۡا وَیَقُوۡلُوۡا سِحۡرٌ مُّسۡتَمِرٌّ ''اس مطلب پر بہترین گواہ ہے کیونکہ ''آیت'' کو دیکھ کر اس سے ''اعراض'' کرنے (منہ موڑنے) اور پیغمبر کی طرف ''جادو'' کی نسبت دینے سے پتا چلتا ہے کہ یہاں کوئی معجزہ تھا (جس کی اس قدر مخالفت کی جارہی ہے)

۳۔جملہ: ''وَ کَذَّبُوۡا وَ اتَّبَعُوۡۤا اَہۡوَآءَہُمۡ ''جو تیسری آیت میں تھا۔ یہ اُن کی طرف سے اس معجزہ کو دیکھنے کے بعد بھی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جھٹلانے کی خبر دے رہا ہے۔ اگر یہاں کسی قسم کا معجزہ نہ ہوتا تو اس قسم کے الفاظ اور تعبیرات اختیار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

۴۔اس کے علاوہ اسلامی حدیث کی کتابوں میں اس واقعہ کے بارے میں بہت زیادہ روایات نقل ہوئی ہیں جو تواتر اور شہرت کی حد تک پہنچی ہوئی ہیں۔ بہت سے مفسرین منجملہ طبرسی، فخر رازی، سید قطب اور بروسوی نے روح البیان میں شق القمر کی روایات کے متواتر ہونے کو قبول کیا ہے۔ لہٰذا بعض وسواس اور شبہات کی وجہ سے ان روایات و آیات سے ہرگز ہاتھ نہیں اُٹھایا جاسکتا۔ ممکن ہے شق القمر کے ساتھ قیامت کا تذکرہ اس بات کا قرینہ سمجھا جائے کہ یہ واقعہ مستقبل میں رونما ہوگا جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

اِقۡتَرَبَتِ السَّاعَۃُ وَ انۡشَقَّ الۡقَمَرُ

خصوصاً یہ دونوں جملے فعل ماضی کی صورت میں ذکر ہوئے ہیں۔ لیکن جیسا کہ بہت سے مفسرین نے کہا ہے کہ قیامت کا نزدیک ہونا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہور کے ساتھ ہی حاصل ہوگیا تھا چونکہ ایک معروف حدیث میں آیا ہے:

"بُعِثۡتُ اَنَا وَالسَّاعَۃُ کَھَاتَیۡنِ"

یعنی: ''میرا مبعوث ہونا اور قیامت مثل ان دو کے ہے''

یہ آپ کی دو انگلیوں کی طرف اشارہ ہے جو اس وقت ایک دوسرے سے ملی ہوئی تھیں۔[1]

لہٰذا ہم سورہ انبیاء میں پڑھتے ہیں:

"اِقۡتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُہُمۡ وَ ہُمۡ فِیۡ غَفۡلَۃٍ مُّعۡرِضُوۡنَ"

یعنی: ''لوگوں کا حساب نزدیک ہوگیا ہے حالانکہ یہ لوگ غفلت میں اور روگرداں ہیں۔''

آیہ ۶۳ سورہ احزاب میں ہم پڑھتے ہیں:

قُلۡ اِنَّمَا عِلۡمُہَا عِنۡدَ اللّٰہِ ؕ وَ مَا یُدۡرِیۡکَ لَعَلَّ السَّاعَۃَ تَکُوۡنُ قَرِیۡبًا ﴿۶۳﴾

''جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا کہ قیامت کب آئے گی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''کہہ دیجئے! اس کا علم صرف اللہ کے پاس ہے، اور آپ کو کیا معلوم کہ شاید قیامت نزدیک ہو''۔

---

[1] تفسیر فخر رازی، ج ۲۹ ص ۲۹، مجمع البیان سورۂ محمد کی آیت ۱۸ کے ذیل میں۔

مشہور روایات کے مطابق مشرکین نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے اور کہا: اگر آپؐ سچ کہتے ہیں اور خدا کے رسول ہیں تو ہمیں چاند کے دو ٹکڑے کر کے دکھائیں۔ آپؐ نے فرمایا: اگر میں یہ کام کر کے دکھا دوں تو کیا تم ایمان لے آؤ گے؟ اُنھوں نے کہا: جی ہاں! وہ چودھویں کی رات تھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بارگاہ الٰہی میں دعا کی کہ جو کچھ یہ چاہتے ہیں تو کر دے۔ چاند اچانک دو ٹکڑے ہو گیا۔ رسول اللہؐ ایک ایک کو آواز دیتے تھے اور فرماتے تھے: یہ معجزہ دیکھ لو'' [1]

تھوڑی دیر بھی نہیں گذری تھی کہ چاند کے دونوں ٹکڑے دوبارہ آپس میں مل کر پہلی حالت پر آ گئے۔ حذیفہ یمانی جو مشہور صحابی تھے اُنھوں نے شق القمر کا واقعہ مسجد میں ایک کثیر جماعت کے سامنے بیان کیا، وہاں اُن پر کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا حالانکہ ان میں سے بہت سے حاضرین ایسے تھے جنہوں نے پیغمبر اسلامؐ کا زمانہ دیکھا ہوا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ اُن کے نزدیک مسلّم تھا۔ [2]

شق القمر کے بارے میں مختلف سوالات

جو آیات اوپر بیان ہوئیں اور مختلف شیعہ اور اہل سنت کی مشہور و معروف کتب حدیث و تفسیر میں جو اسلامی روایات ذکر ہوئی ہیں۔ ان کے بارے میں بعض افراد مختلف اعتراضات کے بہانے ان آیات کے ظاہری معنیٰ سے دست بردار ہونا چاہتے ہیں اور ان کو آغاز قیامت کے حوادث اور اصطلاحاً ''اشراط الساعۃ'' (قیامت کی شرائط) سے متعلق جانتے ہیں۔ منجملہ اعتراضات میں سے چند ایک یہ ہیں:

ا۔ ''شق القمر'' تاریخی اعتبار سے

ایک اعتراض جو بے خبر افراد شق القمر پر کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ اگر یہ شق القمر کا واقعہ اپنی اس اہمیت کے ساتھ جو وہ رکھتا ہے حقیقت پر مبنی ہوتا تو دنیا کی تاریخوں میں اس کا ذکر ملتا جب کہ ایسا نہیں ہے اور ہمیں تاریخ کی کتابوں میں اس کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔ یہ واضح کرنے کے لیے کہ اس اعتراض کی اہمیت کیا ہے اس مسئلے کا مختلف لحاظ سے تجزیہ و تحلیل کیا جاتا ہے۔

(الف) یہ بات قابل توجہ ہے کہ چاند صرف آدھے کرہ ارض سے نظر آتا ہے اور سارے کرہ ارض سے بیک وقت نظر نہیں آتا اسی وجہ سے زمین کے آدھے حصہ کے لوگ تو اس حساب سے خارج ہیں یعنی ان کے اس واقعہ کو دیکھنے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔

(ب) اس نیم کرہ کے آدھے لوگ ہیں ان میں، اکثریت کا سویا ہوا ہونا ممکن ہے، چونکہ معاملہ آدھی رات کے بعد کا ہے اس لیے ساری دنیا کے چوتھائی افراد اس واقعہ سے باخبر ہو سکتے ہیں۔

(ج) قابل رویت حصہ میں بھی عین ممکن ہے کہ آسمان کا کوئی حصہ ابر آلود ہو اور چاند کا چہرہ بادلوں میں پوشیدہ ہو۔

(د) آسمانی حوادث افراد کی توجہ اس صورت میں اپنی طرف مبذول کرتے ہیں جب بجلیوں کی سی شدید کڑک اپنے اندر رکھتے

---

[1] مجمع البیان اور دوسری کتب میں مذکورہ آیت کی تفسیر ملاحظہ کیجئے۔
[2] اس حدیث کو سیوطی نے درّ المنثور میں اور قرطبی نے اسی آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے۔

ہوں یا مکمل گرہن کی صورت میں جب چاند بالکل ہی غائب ہو جائے اور وہ بھی ایک طویل وقفہ کے لیے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر نجومیوں کی طرف سے اعلان نہ ہو تو چھوٹے موٹے گرہن کی بہت کم لوگوں کو خبر ہوتی ہے۔ بہت سے افراد تو مکمل چاند گرہن سے بھی بے خبر رہتے ہیں۔ صرف وہ لوگ جو اجرام فلکی یعنی چاند وغیرہ کا رصد گاہوں میں مشاہدہ کرتے رہتے ہیں یا وہ لوگ جن کی نگاہ اتفاق سے آسمان پر پڑ جائے تو ان کے لیے ممکن ہے کہ وہ ایسے واقعہ سے باخبر ہوں اور کچھ اور لوگوں کو بھی باخبر کر دیں۔ یہی وجہ ہے کہ چاند کا مختصر وقت کے لیے رونما ہونے والا واقعہ جیسا کہ ابتدا میں سمجھا جاتا تھا، پوری دنیا کے لوگوں کی توجہ تو جذب کرنے کا سبب نہیں بن سکتا۔ علی بالخصوص اس زمانے کے لوگ جو اجرام آسمانی کی اہمیت کے اصولی طور پر بہت کم قائل تھے۔

(ھ) علاوہ ازیں تاریخ میں مذکور مطالب اور انکی نشر و اشاعت کے وسائل اس زمانے میں محدود تھے، یہاں تک کہ پڑھے لکھے افراد بہت کم تھے اور کتابیں صرف ہاتھ سے لکھی ہوئی ہوتی تھیں۔ اس وقت موجودہ دور کی کیفیت نہیں تھی کہ اہم واقعات بجلی کی سرعت کے ساتھ ریڈیو، ٹیلی وژن اور اخبارات کے ذریعے تمام دنیا میں پھیل جاتے ہوں۔ ان پہلوؤں کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو اس واقعہ کے غیر اسلامی تاریخوں میں درج نہ ہونے پر تعجب نہیں کرنا چاہیئے اور اس صورت حال کو واقعہ کے نہ ہوے پر ثبوت نہیں سمجھنا چاہیے۔

۲۔ علمی نقطۂ نظر

کبھی ہیئت ''بطلیموس'' کے نظریہ کے مطابق زمین کو دنیا کا مرکز اور نو آسمانوں کو اس کے گرد پیاز کے تہہ بہ تہہ چھلکوں کی طرح جانا جاتا تھا اور اُن کے خیال میں یہ افلاک ایک بلوریں جسم کی طرح ہیں کہ جو سب ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اور دوسرے ستارے اور اجرام فلکی ان افلاک کے دل میں جمے ہوئے ہیں اور انہی افلاک کے ساتھ ساتھ گھومتے رہتے ہیں اور ان میں ہر قسم ٹوٹنا اور پھر آپس میں ملنا محال تھا۔ اسی لئے اس نظریئے کے حامل افراد معراج آسمانی کے بھی منکر تھے اور شق القمر کے بھی۔

چونکہ ان دونوں سے افلاک میں جدائی اور باہم ملنے کا عمل ہوتا ہے! لیکن اب جبکہ ہیئت بطلیموس کا مفروضہ خیالی افسانوں اور کہانیوں کی حیثیت اختیار کر چکا ہے اور نو آسمانوں کا بطلان سائنسی اور حسی طریقے سے ثابت ہو چکا ہے لہٰذا اب ان باتوں کی کوئی حیثیت نہیں رہی۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ موجودہ علوم کی رو سے چاند کا دو ٹکڑے ہونا کوئی معمولی کام نہیں، اگر چہ یہ کرۂ (چاند) کرۂ ارض کا پچاسواں حصہ ہے لیکن پھر بھی ایک بہت بڑا کرۂ ہے کہ جس کے دو ٹکڑے ہونے اور پھٹنے کے لئے بہت زیادہ قوی عامل کی ضرورت ہے۔ اس کا جواب خدا پرستوں کی نظر میں تو بہت واضح ہے۔

چونکہ کسی نے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ ''شق القمر'' کا واقعہ ایک عام طبیعی عامل کے زیر اثر رونما ہوا ہے بلکہ یہ اعجاز نمائی کا نتیجہ تھا اور اس کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی لامتناہی قدرت کارفرما تھی اور ہم سب جانتے ہیں کہ نہ صرف چاند کو دو ٹکڑے کرنا اُس ذات کے لئے مشکل نہیں بلکہ ایک منظومہ شمسی یا اس جیسے کئی منظومے اور کہکشائیں پیدا کرنا اُس کی مشیت اور ارادے کے لئے انتہائی آسان ہے۔

وہی خدا جس نے سب سے پہلے سورج کے اندر انشقاق پیدا کیا ہے جس کے نتیجے میں منظومہ شمسی کے عظیم الشان سیاروں میں

سے ہر سیارہ اُس سے جدا ہو کر دور جا پڑا اور اپنے اپنے مدار میں حرکت کرنے لگا، جی ہاں! وہی خدا چاند میں جو اُن سے کئی درجے چھوٹا ہے، اپنے نبی کی نبوت کو ثابت کرنے کے لئے ایک خاص حطے میں اس قسم کا انشقاق پیدا کر کے اُسے دوبارہ جوڑ سکتا ہے۔ فقط وہی شخص اس قسم کے مسائل میں اعتراض کرتا ہے جو ''نعوذ باللہ'' اللہ تعالیٰ کی قدرت کو ناچیز سمجھتا ہے یا اُسے عظیم الشان آسمانی منظوموں کے پے در پے دھاکوں کے نتیجے میں پیدا ہونے کا علم نہیں ہے۔

۳۔ شق القمر آیات کی نظر سے

بعض کا کہنا ہے کہ قرآن مجید میں کچھ ایسی آیات بھی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے نبی اکرم ﷺ کا سوائے قرآن مجید کے اور کوئی معجزہ نہیں تھا۔ وہ اپنے اس خیال کے ثبوت میں سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۵۹ سے استدلال کرتے ہیں جس میں اللہ نے فرمایا:

وَمَا مَنَعَنَآ اَنۡ نُّرۡسِلَ بِالۡاٰيٰتِ اِلَّاۤ اَنۡ كَذَّبَ بِهَا الۡاَوَّلُوۡنَ ؕ

یعنی: ''ہمارے لئے کوئی امر مانع نہیں کہ ہم (بہانہ ساز لوگوں کے تقاضوں پر) یہ معجزات بھیجتے سوائے اس کے کہ گزرے ہوئے لوگوں نے اس کی تکذیب کی''

اسی طرح اُنھوں نے سورۂ بنی اسرائیل کی آیات: ۹۰ سے لیکر ۹۳ سے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ بعض لوگوں نے پیغمبر اکرم ﷺ سے مختلف تقاضے کئے تھے کبھی کہا تھا: ہم ایمان نہیں لائیں گے جب تک ہمارے لئے اس (خشک اور بنجر) زمین سے چشمہ نہیں نکالتے، اور کبھی کہا: تمہارے پاس انگور اور کھجور کا ایک بڑا باغ ہونا چاہیے جس میں نہریں جاری ہوں۔ یا جیسا کہ تیرا دعویٰ ہے تو آسمان سے پتھروں کے ٹکڑے ہمارے سروں پر گرا دے یا اللہ اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لے آئے یا تیرے لئے سونے کا ایک مزین گھر ہو یا تو آسمان پر چڑھ جائے۔ اس پر بھی ہم قناعت نہیں کریں گے جب تک تو ہمارے لئے (اللہ کی طرف سے) ایسا خط نہ لے آئے جسے ہم پڑھیں۔

نبی اکرم ﷺ نے اس قسم کے تقاضوں کے جواب میں فقط یہ فرمایا:

''سُبۡحَانَ رَبِّىۡ هَلۡ كُنۡتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوۡلًا''

یعنی: ''میرا پروردگار ان بے فضول باتوں سے منزہ ہے جبکہ میں اس کے ایک بھیجے ہوئے انسان کے سوا کچھ بھی نہیں''

اس کے جواب میں وہ کہتے تھے: اس کا مطلب یہ ہے کہ آپؐ ایک بھی معجزہ نہیں لائے۔

جواب

بہت سے بڑے بڑے مفسرین کے کلام میں ایک جملے کی طرف توجہ سے اس اعتراض کا جواب روشن ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ

معجزات دو طرح کے ہیں:

وہ معجزات کہ جو نبی کے دعویٰ نبوت کی صداقت کو ثابت کرنے، لوگوں کی ایمان کی طرف تشویق کرنے اور منکرین کو ڈرانے کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ یعنی؛ حق طلب اور حقیقت پسند لوگوں کے لئے منطقی و عقلی معجزات، جن کے بارے میں پہلی آیت میں قرآن مجید یوں فرماتا ہے:

"وَمَا نُرْسِلُ بِالْآيَاتِ إِلَّا تَخْوِيفًا"

''ہم معجزات صرف ڈرانے (اور اتمام حجت) کے لئے بھیجتے ہیں'' (سورۂ بنی اسرائیل/۵۹)

معجزات کی دوسری قسم وہ ہے جن کو ''اقتراحی'' (من مانے) معجزات کہا جاتا ہے۔ یعنی؛ وہ معجزات جن کا مطالبہ بہانہ ساز لوگ کرتے ہیں۔ وہ یہ مطالبہ حق طلبی اور دعویٰ نبوت کی صداقت پر یقین حاصل کرنے کے لئے نہیں کرتے تاکہ ان کو دیکھ کر ایمان لے آئیں۔ بلکہ وہ اپنے خیال میں مدمقابل کو عاجز کرنے کے لئے اور اگر وہ اس کی قدرت رکھتا بھی ہو تو اُس پر جادو اور جادوگری کی تہمت لگانے کے لئے ایسا مطالبہ کرتے ہیں۔

انبیائے کرام ÷ صرف پہلی قسم کے معجزات لاتے تھے اور کبھی بھی بہانہ جو لوگوں کے اقتراحی (من مانے) معجزات اور مطالبات کے سامنے سر نہیں جھکاتے تھے۔ سورۂ بنی اسرائیل کی آیات ۹۰ تا ۹۳ کے لہجے سے بخوبی پتا چلتا ہے کہ مشرکین عرب کے یہ عجیب وغریب اور متضاد کبھی بھی حقیقت طلبی کی بنا پر نہیں ہوتے تھے بلکہ اُن کا مقصد فقط بہانے بنانا اور نبی اکرم ؐ کی نبوت میں شک وتردید ایجاد کرنے کے علاوہ شرک اور بت پرستی کی بنیادوں کو مضبوط کرنا تھا۔

لہٰذا وہ لوگ اپنی باتوں کا درست مفہوم بھی نہیں سمجھتے تھے۔ کبھی وہ ایک ایسے معجزے کا مطالبہ کردیتے تھے جو خود اُن کی اپنی تباہی کا باعث بن سکتا تھا (مثلاً آسمان سے اپنے سروں پر پتھر برسنے کا مطالبہ کرنا) اور کبھی ایک (انوکھے) معجزے کا مطالبہ (مثلاً آسمان کے اوپر چڑھنے کا مطالبہ) کرنے کے بعد فوراً اس کی نفی بھی کردیتے تھے اور کہتے: ہم اس پر ایمان نہیں لائیں گے جب تک خدا کی طرف سے ہمارے لئے خط نہیں آجاتا۔

کبھی محال چیزوں کا مطالبہ کرتے تھے مثلاً خدا اور فرشتوں کو ہمارے پاس لے آؤ۔ حالانکہ خدا نہ مکان رکھتا ہے اور نہ جسم وجسمانیت کا حامل ہے۔ اگر اُن کا مقصد پیغمبر اکرم ﷺ کی حقانیت کا پتا ہی لگانا تھا تو پھر چھ قسم کے مختلف مطالبات کرنے کا کیا مقصد تھا، کیا ایک مطالبہ کافی نہیں تھا؟ اس لئے کوئی بھی نبی اور پیغمبر اُن کے اس قسم کے بیہودہ مطالبات پورے کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ ان سب باتوں کے علاوہ معجزہ دکھانا پیغمبر کا کام نہیں، بلکہ یہ اللہ کا کام ہے اور پیغمبر کے اختیار میں بھی نہیں بلکہ خود اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔

فقط نبی، اللہ تعالیٰ سے معجزہ دکھانے کا تقاضا اور دعا کرسکتا ہے اور اللہ تعالیٰ بھی جب صلاح جانے تو اپنے نبی کو معجزہ دکھانے کی اجازت دے سکتا ہے، اسی لئے ہم سورۂ بنی اسرائیل کی آیات ۹۰ تا ۹۳ میں پڑھتے ہیں:

"قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنتُ إِلَّا بَشَرًا رَسُولًا"

یعنی: ''میرا پروردگار ان فضول باتوں سے منزہ ہے جبکہ میں اس کے ایک فرستادہ انسان کے سوا کچھ بھی نہیں''
کہ جو کام چاہوں انجام دے سکوں۔ لہٰذا سورۂ رعد کی آیت ۳۸ میں آیا ہے:

''وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَنْ يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ''

یعنی: ''کوئی بھی نبی اذن خدا کے بغیر کوئی معجزہ نہیں لا سکتا''

اور یہ جو کہا ہے کہ اگر ہم تمہارے مطالبات پورے نہیں کرتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ گزشتہ لوگوں نے ان کی تکذیب کی ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ گزشتہ لوگوں نے تکذیب کی ہے، موجودہ لوگوں نے تو تکذیب نہیں کی۔ لہٰذا بعد میں آنے والی نسلوں کا کیا قصور ہے کہ وہ معجزات سے محروم رہ جائیں؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ ایک رائج تعبیر ہے جس کے مطابق ہم کسی کے اصرار کے سامنے کہتے ہیں: ہم تمہاری بہانہ تراشیوں کے مقابلے میں سر نہیں جھکا سکتے۔ اگر وہ شخص پوچھے کیوں نہیں؟ تو کہیں گے، اس طرح کے کام پہلے بھی ہوتے رہے ہیں۔ دوسرے لوگوں نے بھی اس طرح کے تقاضے کئے ہیں، لیکن اُنھوں نے کبھی بھی حق کے سامنے سر نہیں جھکایا، تم بھی اُنہی جیسے ہو۔

دوسرے الفاظ میں جن معجزات کا وہ تقاضا کرتے ہیں، اُن میں حقیقت پسندی کا پہلو نہیں ہوتا بلکہ وہ بہانے بناتے ہوئے اپنے من مانے معجزات طلب کرتے ہیں، ہمیں یقین ہے کہ اگر تمہارا تقاضا پورا بھی کر دیا جائے تب بھی تم ایمان نہیں لاؤ گے۔ جیسا کہ سابقہ اُمتوں میں تم ہی جیسے لوگ معجزات کا تقاضا کرتے تھے اور پھر اُن کو جھٹلا دیتے تھے۔

خلاصہ

یہ صحیح ہے کہ تنہا قرآن مجید بھی ایک واضح اور ابدی معجزہ ہے۔ اگر اس کے علاوہ پیغمبر اسلام ﷺ کا کوئی اور معجزہ نہ بھی ہوتا تو بھی یہ آپؐ کی صداقت کی گواہی کے لئے کافی تھا، لیکن یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ نبی اکرم ﷺ کا اس کے علاوہ اور کوئی روحانی و معنوی اور مادی و جسمانی معجزہ نہیں تھا۔ بلکہ آیات و روایات اور کتب سیرت و تاریخ کے مطابق (قرآن کے علاوہ) آپؐ کے اور بھی معجزات تھے۔ اور اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ (قرآن جیسے) اس عظیم معنوی معجزے کے ساتھ بعض محسوس اور مادی معجزات کے مل جانے سے نبی اکرم ﷺ کی دعوت کی حقانیت مزید واضح اور روشن ہو جاتی ہے۔

قرائن کی جمع آوری: ایک اطمینان بخش راستہ

بعض لوگوں کے خیال کے برخلاف دعویٰ نبوت کی سچائی کو ثابت کرنے کے لئے فقط معجزات ہی کافی نہیں۔ بلکہ کبھی اُس نبی کی زندگی اور دوسری اخلاقی اور عملی صفات و خصوصیات کے بارے میں اور اُس کی دعوت کے مطالب اور اُس نے جو لائحہ عمل اختیار کیا ہے، اس کے متعلق قرینوں کو جمع کر کے جو سند تیار کی جا سکتی ہے، وہ بڑے سے بڑے معجزات کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ بلکہ کبھی تو یہ معجزات سے بھی زیادہ

مطمئن ثابت ہوسکتی ہے۔اس قسم کا استدلال بعض اوقات سابقہ لوگوں کے کلام میں بھی دیکھا گیا ہے اسی لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے اس سلسلے میں کچھ وضاحت کی جائے۔

قرائن کی جمع آوری تمام علوم میں رائج دلیل

آج مختلف علوم میں حقائق تک رسائی حاصل کرنے کے لئے اس طریقے سے بہت زیادہ فائدہ اُٹھایا جارہا ہے۔ جرائم کو کشف کرنے، انواع واقسام کی بیماریوں کا پتالگانے، تاریخی لوگوں کی شخصیت سے آگاہ ہونے اور دنیائے خلقت، زمین وآسمان اور حیوانات ونباتات سے متعلق مسائل کو سمجھنے کے لئے اسی طریقہ کار پر عمل کیا جارہا ہے۔اس طریقے اوراستقرائی طریقے میں کہ جو برہانی طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے،فرق یہ ہے کہ استقراء میں فرد فرد پر تحقیق کے سبب انسان ایک کلی حکم سے آگاہ ہوجاتا ہے۔

مثلاً ہم بہت سے انسانوں کی پسلیاں گنتے ہیں اوراس کے بعد ایک کلی قاعدے اور قانون کے طور پر کتابوں میں لکھ دیتے ہیں کہ ہرانسان کی اتنی پسلیاں ہوتی ہیں۔لیکن قرائن کی جمع آوری کے طریقے میں ایک خاص موضوع یا اصطلاحاً جزئی حقیقی کے اثرات پر تحقیق کی جاتی ہے اوران اثرات سے ہم مؤثر کا پتالگالیتے ہیں۔

مثال کے طور پر جب بھی کسی علاقے میں کوئی جرم واقع ہوتا ہے توکسی نہ کسی شخص کوملزم کے طور پر عدالت میں لایا جاتا ہے۔وہ شخص بالکل جرم کا انکار کردیتا ہے اوراس جرم کوکوئی شاہد وگواہ بھی نہیں ہوتا تو اس وقت ایک ذہین قاضی ملزم کے عدم اعتراف اور گواہ نہ ہونے کی وجہ سے کیس کوختم نہیں کردیتا، بلکہ وہ پوچھ گچھ کر کے قرائن جمع کرنا شروع کردیتا ہے اوراُن قرائن کی روشنی میں بہت سی باتوں کی تحقیق کرتا ہے:

الف: ملزم کا سابقہ ریکارڈ

ب: جرم کا نشانہ بننے والے کے ساتھ ملزم کا تعلق کیا تھا اور کیا اُن کے درمیان کسی قسم کی دشمنی تھی یا نہیں؟

ج: وقوعہ کا موقع ومحل دیکھا جائے گا اور کیا ملزم بتا سکتا ہے کہ وہ اُس وقت کہاں تھا؟

د: کیا اس واقعہ میں استعمال ہونے والا اسلحے کوکبھی ملزم نے استعمال کیا ہے یا نہیں؟

ھ: ملزم اور جرم کا نشانہ بننے والے شخص کے بدن کو ملاحظہ کیا جائے گا کہ کیا اُن کے بدن پر لڑائی جھگڑے کے کوئی اثرات تو موجود نہیں ہیں اگر ہیں تو کیا ملزم اس کے بارے میں کوئی وضاحت کرسکتا ہے یا نہیں؟

و: مقتول کے لباس کو دیکھ کر اور جرم کے اثرات کو ملاحظہ کر کے ملزم کے احساسات کیا ہیں؟ کیا وہ یہ سب دیکھ کر گھبرا جاتا ہے یا مکمل طور پر مطمئن رہتا ہے؟

ز: ملزم کی نفسیاتی حالت کیسی ہے؟ کیا اس کی موجودہ اور سابقہ حالت ایک جیسی ہے یا وہ پریشان نظر آرہا ہے؟

ح: کیا وہ تفتیشی افسر یا قاضی کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے گھبرایا ہوا ہے اور متضاد جواب دے رہا ہے؟

اسی طرح دوسرے بہت سے سوالات، اگرچہ ان میں سے ہر ایک سوال کا جواب کسی بات کو ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں ہے، لیکن بعض اوقات اُن کے بارے میں تحقیق سے ہر قسم کا شک وشبہ ختم ہو جاتا ہے اور انسان پر ثابت ہو جاتا ہے کہ جرم اسی ملزم نے کیا ہے۔ یہی بات قاضی کو حوصلہ دیتی ہے اور وہ اس کیس کو مزید ہمت وحوصلے کے ساتھ آگے بڑھاتا ہے اور بعض اوقات ملزم سے اعتراف بھی لے لیتا ہے۔ بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اعتراف کرنا ایک ظنی دلیل ہے اور اس سے فقط گمان حاصل ہوسکتا ہے۔ چونکہ کئی دفعہ دیکھا گیا ہے کچھ لوگ سزا سے بچنے کے لئے کسی دوسرے شخص کو بے پناہ مال ودولت دے کر اور اُسے نجات کی اُمید دلا کر، ناکردہ گناہ کا اعتراف کرنے پر راضی کر لیتے ہیں۔

اسی طرح گواہوں کی گواہی بھی ایک ظنی دلیل ہے چونکہ اس میں غلط فہمی یا سازش کا احتمال دیا جاسکتا ہے۔ (اس میں کوئی شک نہیں گواہوں کی شہادت اور ملزم کا اقرار قبول کیا جاتا ہے، لیکن اس سے مراد یہ ہے یہ کہ یہ دونوں قبول شدہ ظنی دلائل میں سے ہیں جبکہ قرائن کی جمع آوری اس وقت قبول کی جاتی ہے کہ جب وہ یقینی اور قطعی مرحلے تک پہنچ جائے) اسلامی فیصلوں میں بھی اس کی بہت سی مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں اور بعض اوقات ایک معمولی سے قرینے سے حکم ثابت ہو جاتا تھا۔

مثلاً: امیر المؤمنین علی علیہ السلام کے زمانے میں ایک غلام اور اُس کے مالک کا واقعہ مشہور ہے کہ جس میں حضرت علیؑ نے ظاہری طور پر غلام کی گردن اُڑانے کا حکم دیا تھا اور (حقیقی) غلام نے فوراً اپنا سر پیچھے کھینچ لیا تھا جس سے ثابت ہو گیا تھا کہ وہی غلام ہے (اور جس نے سر پیچھے نہیں کیا تھا وہ مالک ہے) اسی طرح دو عورتوں کے درمیان ایک بچے پر جھگڑے کا واقعہ کہ جس میں حضرت علیؑ نے بچے کے دو حصے کرنے کا ظاہری حکم صادر کر دیا تھا جس پر حقیقی ماں نے اپنے دعویٰ سے ہاتھ کھینچ لیا جس سے اُس کی سچائی ثابت ہو گئی تھی، اسی طرح (حضرت علیؑ کے) بہت سے دوسرے واقعات بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔

بہر حال کسی یقینی نتیجے تک پہنچنے کے لئے اس طریقے سے استفادہ نہ صرف علم قضاوت میں بلکہ بہت سے دوسرے معاشرتی، سیاسی علوم میں بھی ایک عام معمول ہے۔ ہم انبیاء کی نبوت کو ثابت کرنے کے لیے اس طریقے سے بخوبی استفادہ کر سکتے ہیں۔ کبھی تو یقین اور اطمینان پیدا کرنے میں اس کا اثر عام معجزات سے زیادہ ہوتا ہے۔ اسی اشارے کے ساتھ اب ہم اُن قرآنی آیات کو دیکھتے ہیں جن میں بطور کلی اس مسئلے کو بیان کیا گیا ہے اور پھر پیغمبر اکرم ﷺ کی حیات طیبہ سے مختلف قرائن جمع کر کے اُنہیں قارئین محترم کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ پہلے حصے میں قرآن کی بہت سی آیات میں اس دلیل کے بارے میں بہت ہی بامعنیٰ اشارے ملتے ہیں، جن میں سے چند ایک یہ ہیں:

۱۔ وہ آیات جن میں حضرت پیغمبر اسلام ﷺ کو شاہد و سراج منیر (روشن چراغ) اور برہان اور شمس کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۂ احزاب کی آیت نمبر ۴۵، ۴۶ میں آیا ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ۝

یعنی: ''اے پیغمبر! ہم نے تجھے گواہ، خوشخبری دینے والا اور انذار کرنے والا بنا کر بھیجا ہے اور تجھے اللہ کے حکم سے اسی کی طرف دعوت دینے والا اور روشنی عطا کرنے والا چراغ قرار دیا ہے''۔

ان دونوں آیتوں میں ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شاہد اور گواہ کے عنوان سے متعارف کرایا گیا ہے، چونکہ ایک تفسیر کے مطابق آپؐ اپنی حقانیت کے گواہ اور شاہد ہیں کیونکہ آپؐ کے اوصاف حمیدہ، اخلاق حسنہ، تعمیری تعلیمات، درخشاں ماضی اور عملی سیرت آپؐ کے مکتب اور دعوت کی صداقت و حقانیت پر شاہد ہیں۔[1]

دوسری طرف ہم پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو روشنیاں پھیلانے والے چراغ کے عنوان سے پہنچانتے ہیں اور سب جانتے ہیں کہ چراغ اپنے آپ پر دلالت کرتا ہے اور اُسے کسی تعارف کرانے والے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بقول مشہور ''آفتاب آمد دلیل آفتاب''۔ سورۂ نساء کی آیت ۱۷۴ میں برہان کی تعبیر آئی ہے:

يَآيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ﴿۱۷۴﴾

یعنی: ''اے لوگو! تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے لئے واضح دلیل آئی اور ہم نے واضح نور (آسمانی کتاب) تمہاری طرف بھیجا''۔

یہ اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ چونکہ ''برہان''۔ ''برہ'' (بروزن ''فرح'') کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے سفید ہونا اور چونکہ واضح استدلال سننے والے کے لیے حق کے چہرے کو آشکار، نورانی اور سفید کر دیتا ہے لہٰذا سے برہان کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ بعض مفسّرین کہتے ہیں: زیر نظر آیت میں برہان سے مراد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ بابرکت ہے اور نور سے مراد قرآن مجید ہے۔ بنابریں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کا تعارف برہان کے عنوان سے کرایا گیا ہے۔[2]

چونکہ آپؐ کی ذات میں معجزات کے علاوہ کچھ ایسے قرائن و آثار بھی پائے جاتے ہیں جن سے آپؐ کی حقانیت ظاہر ہوتی ہے۔ اسی طرح ''وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا'': ''سورج اور (صبح کے وقت) اس کی روشنی کے پھیلنے کی قسم'' کی تفسیر میں بہت سی روایات ذکر ہوئی ہیں کہ ''شمس'' پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات مبارک کی طرف اشارہ ہے اور ''قمر'' آپؐ کے برحق وصی حضرت علیؑ کی طرف اشارہ ہے۔[3]

واضح ہے کہ سورج کو ثابت کرنے کے لئے خود سورج کا وجود ہی کافی ہے، چونکہ جب ایک روشن اور چمکتا ہوا سورج جونہی اُفق

---

[1] مذکورہ بالا آیت کی ایک اور تفسیر میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تعارف سابقہ انبیاء پر شاہد و گواہ یا قیامت کے دن اُمت کے اعمال پر شاہد و گواہ کے طور پر کرایا گیا ہے۔ حالانکہ ان تینوں تفسیروں میں کوئی منافات نہیں اور یہ آیت تینوں معنوں پر مشتمل ہو سکتی ہے۔

[2] جن لوگوں نے اس بات کو قبول کیا ہے یا ایک تفسیر کے طور پر نقل کیا ہے، اُن میں سے ایک مجمع البیان کے مؤلف علامہ طبرسی مرحوم، المیزان کے مؤلف علامہ طباطبائی مرحوم اور مراغی اور قرطبی ہیں جنہوں نے اپنی تفاسیر میں اسی آیت کے ذیل میں یہ معنی لکھا ہے۔

[3] تفسیر برہان ج ۴، صفحہ ۴۶۶ میں اس سلسلے میں پانچ حدیث نقل ہوئی ہیں۔ البتہ یہ تفسیر شمس کے بارے میں نقل ہونے والی دوسری تفاسیر کے منافی نہیں ہے، ممکن سب اس آیت کے معنی کو بیان کر رہی ہوں۔

سے طلوع ہوتا ہے تو سب کو اپنے وجود سے آگاہ کر دیتا ہے۔ ان تعبیرات کے علاوہ، قرآن مجید نے دوسری آیات میں بھی اس مسئلے کی وضاحت کی ہے اور حقانیت پیغمبر ﷺ کے دلائل کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جن میں سے ایک آپؐ کے ''اُمی'' ہونے (کسی سے تعلیم حاصل نہ کرنے) کا مسئلہ ہے جو ایک اہم قرینہ ہے۔ مثلاً سورۂ عنکبوت کی آیت ۴۸ میں فرمایا ہے:

''وَمَا كُنتَ تَتْلُو مِن قَبْلِهِ مِن كِتَابٍ وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكَ إِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُونَ''

یعنی: ''اور تم نے اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھی اور اپنے ہاتھ سے کچھ نہیں لکھا۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ لوگ ضرور شک کرتے کہ جو تمہاری باتوں کو باطل کرنے کے درپے ہیں''

یہاں پر قرآن بتا رہا ہے کہ اگر پیغمبر اکرم ﷺ درس پڑھے ہوتے تو کوئی نہ کوئی شخص شک میں پڑ جاتا کہ کیا یہ قرآن خود اُس کا اپنا کلام ہے یا اللہ کی طرف سے ہے؟ لیکن آپؐ کا پڑھا لکھا نہ ہونے کی وجہ سے اور قرآن مجید کے ہر پہلو سے غیر معمولی ہونے کے سبب کسی کے لئے اس بات میں شک وتردید کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ یہ کتاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ البتہ یہ دوسری بہت سی علامتوں کے ساتھ یہ بھی ایک علامت ہے جو آپؐ کی ذات مبارک میں دیکھی جاسکتی ہے اور آپؐ کی صداقت کی دلیل ہے۔ لہٰذا جب بھی ان سب علامتوں اور قرینوں کو ہم ایک ساتھ رکھیں تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔

''مُبْطِلُون'' (جو تمہاری باتوں کو باطل کرنے کے درپے ہیں) سے ظاہر ہوتا ہے کہ حتیٰ اگر آپ ﷺ پڑھے لکھے ہوتے بھی تو یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ یہ کتاب آپؐ کی اپنی فکر وسوچ کا نتیجہ ہے۔ چونکہ یہ کتاب انسان کی فکر وسوچ سے کہیں زیادہ بلند ہے، فقط یہ بات بدخواہ اور باطل کے درپے رہنے والوں کے لئے ایک بہانہ بن سکتی تھی۔ اسی طرح سورۂ یونس کی آیت ۱۶ میں آیا ہے:

قُل لَّوْ شَاءَ اللَّهُ مَا تَلَوْتُهُ عَلَيْكُمْ وَلَا أَدْرَاكُم بِهِ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ⑯

یعنی: ''کہہ دو اگر خدا چاہتا تو میں تم پر آیات تلاوت نہ کرتا اور تمہیں ان سے آگاہ نہ کرتا کیونکہ میں نے مدتوں اس سے پہلے تمہارے درمیان زندگی گزاری ہے۔ کیا تم سمجھتے نہیں؟!''

درحقیقت پیغمبر اکرم ﷺ اسی قرینے کی بنیاد پر فرماتے ہیں: میں سالہا سال سے تمہارے درمیان رہ رہا ہوں اور تم نے کبھی بھی اس قسم کا کلام (آیات قرآن) مجھ سے نہیں سُنا، اگر یہ آیات میری اپنی جانب سے ہوتیں تو ان چالیس سالوں کے دوران ضرور یہ میری زبان پر جاری ہو جاتیں یا کم از کم تم مجھ سے اس کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور سن لیتے۔

بہت سے ماہرین نفسیات کے بقول انسان میں عام طور پر فکری نبوغ اور جدید مسائل میں جدت ونوآوری بیس سال کی عمر سے شروع ہو جاتی ہے اور زیادہ سے زیادہ تیس سے چالیس سال تک باقی رہتی ہے۔ یعنی؛ انسان اگر اس مدت کے دوران کوئی جدّت ونوآوری نہ دکھا سکے تو اس کے بعد اس کا امکان تقریباً ختم ہو جاتا۔

یہ مسئلہ آج علم نفسیات میں ایک نئے انکشاف کی حیثیت رکھتا ہے اور یقیناً گزشتہ زمانے میں اس حد تک واضح نہیں تھا۔لیکن اکثر لوگ اپنی فطرت کی وجہ سے اس مسئلے کی طرف متوجہ تھے۔معمولاً ایسا نہیں ہوسکتا کہ انسان خاص افکار ونظریات اور جدید مکتب فکر کا حامل ہو اور چالیس سال تک کسی قوم ومعاشرے کے درمیان زندگی بھی گزارے لیکن اپنے ان افکار ونظریات کو ظاہر نہ ہونے دے۔لہٰذا قرآن مجید فرماتا ہے: کیا تم سمجھتے نہیں کہ یہ چیز ناممکن ہے۔

قرآن کا بہت سی آیات میں پیغمبر اکرمؐ کے ''اُمی'' ہونے پر زور دینا بھی اسی قسم کے بامعنی قرینے کی طرف اشارہ ہے کہ ایک ''اَن پڑھ'' انسان کس طرح ایسی کتاب لاسکتا ہے کہ جو اپنی بے نظیر اور غیر معمولی جامعیت وحقائق کے ساتھ ہزار سال گزرنے کے باوجود اُسی طرح اپنی جدت ونوآوری کو محفوظ رکھے ہوئے ہے اور انسان کی زندگی میں مختلف معنوی ومادی مشکلات کو حل کرنے کے لئے ایک بلند ترین نسخے کی حیثیت رکھتی ہے۔

ان سب باتوں سے ہم اس نتیجے تک پہنچے ہیں کہ قرآن مجید نے اس دلیل (قرائن کی جمع آوری) کی طرف خاص توجہ دی ہے۔اب ہم پیغمبر اکرم ﷺ کے بارے میں ان قرائن اور علامتوں کی طرف پلٹتے ہیں اور درج ذیل مسائل کے بارے میں گہرا مطالعہ پیش کرتے ہیں:

☆ پیغمبر اکرمؐ کی دعوت کے زمانے کی شرائط اور حالات۔

☆ پیغمبر اسلام ﷺ کی نفسیاتی واخلاقی خصوصیات اور درخشاں ماضی

☆ دنیا کی عمومی حالت خصوصاً ظہور پیغمبرؐ کے علاقے کے لحاظ سے عصر دعوت کی خصوصیات۔

☆ دعوت پیغمبرؐ کی تعلیمات اور اُن مسائل کے اُصول اور بنیادیں جن کی آپؐ لوگوں کو دعوت دیتے تھے۔

☆ جن وسائل سے آپؐ نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے استفادہ کیا ہے۔

☆ آپؐ پر ایمان لانے والوں کی حالت اور یہ کہ وہ کس طبقے اور کس حیثیت کے لوگ تھے۔

☆ جس چیز کی طرف آپؐ لوگوں کو دعوت دے رہے تھے، اُس پر آپؐ کا اپنا ایمان کس قدر تھا۔

☆ خرافات کے مقابلے میں آپؐ کا مؤقف اور اپنے اردگرد کے ماحول کے تقاضوں کے ساتھ آپؐ کی مسالمت یا عدم مسالمت۔

☆ آپؐ کی دعوت میں پیشرفت کی رفتار اور معاشرے پر آپؐ کے قوانین واحکامات کے اثرات کتنے تھے اور اسی طرح دوسری علامتیں۔

ا۔پیغمبر اکرم ﷺ کی دعوت کے زمانے کی شرائط اور حالات

یہ مسئلہ تمام بڑے مورخین کے نزدیک متفقہ علیہ ہے کہ ''عرب'' رسول اللہ ﷺ کی نبوت سے پہلے خرافات پر مبنی عقائد،

پست ترین اخلاق، تفرقے اور تباہ کن داخلی جنگ وجدال کے علاوہ بدترین اقتصادی حالات سے دوچار تھے۔ اُس ماحول کو علم و دانش کی ہوا تک نہیں لگی تھی اور کہیں بھی انسانی تہذیب وتمدن کے اثرات نظر نہیں آتے تھے۔ اسی لئے اُنہیں نیم وحشی قوم کے عنوان سے پہچانا جاتا تھا اور اُس زمانے کو ''عصر جاہلیت'' کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ قرآن مجید نے اُس زمانے کے بارے میں بہت ہی واضح اور روشن تعبیرات اختیار کی ہیں (بالفرض اگر کوئی قرآن مجید کو وحی الٰہی کے عنوان سے نہ بھی دیکھے تو بھی وہ اس حقیقت کا انکار نہیں کرسکتا، کہ قرآن مجید میں اُس زمانے کے بارے میں اس قسم کی خصوصیات کا تذکرہ اس کے حقیقت پر مبنی ہونے کی دلیل ہے، ورنہ ہر طرف سے اس کا انکار کیا جاتا)

قرآن ایک مقام پر فرماتا ہے:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴿۱۶۴﴾

ترجمہ: ''خدا نے مومنین پر احسان کیا (انھیں ایک عظیم نعمت بخشی) جبکہ ان میں انہی میں سے ایک پیغمبر مبعوث کیا جو ان کے سامنے اس کی آیات پڑھتا ہے اور ان کا تزکیۂ نفس کرتا ہے اور کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے اگرچہ اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں تھے۔'' (آل عمران ر ۱۶۴)

اس آیت میں اور اسی طرح سورۂ جمعہ کی آیت نمبر ۲ میں بھی ''ضَلٰلٍ مُّبِيْن'' کے الفاظ آئے ہیں، جو زمانہ جاہلیت کے حالات کی طرف ایک معنی خیز اشارہ ہے کہ اس دور میں ہر جگہ واضح گمراہی پھیلی ہوئی تھی۔ اس سے واضح گمراہی کیا ہوگی کہ وہ لوگ اپنے ہاتھوں سے پتھر اور لکڑی کے بت بنا کر اُن کی پوجا کرتے تھے۔ اس سے بھی بدتر یہ کہ وہ کھجور کے بت بنا کر اُن کی پرستش کرتے تھے اور جبکہ قحط پڑتا تو (کھجور کے) اُنہی بتوں کو کھا بھی جاتے تھے۔ اپنی بیٹیوں کو اپنے ہاتھوں سے زندہ دفن کر دیتے تھے اور پھر اپنے اس فعل پر فخر ومباہات بھی کرتے تھے کہ ہم نے اپنی عزت وناموس کو باقی نہیں چھوڑا تا کہ وہ اغیار کے ہاتھ نہ لگ جائے۔ اس سلسلے میں سورۂ نحل کی آیت ۵۸، ۵۹ میں آیا ہے:

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ﴿۵۸﴾ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ﴿۵۹﴾

''اور جب ان میں سے کسی کو خبر دی جائے کہ تمہارے یہاں بیٹی ہوئی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ زہر کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے اس بری خبر پر اپنے قبیلہ سے منہ چھپائے پھرتا ہے اور اس فکر میں ہوتا ہے کہ ذلت اٹھا کر اسے (بیٹی کو) زندہ رہنے دے یا اسے زندہ درگور کر دے۔ یہ لوگ کیسا بُرا فیصلہ کرتے ہیں۔''

اس سے زیادہ واضح کون سی گمراہی ہوگی کہ اُن پر انواع واقسام کی خرافات اور توہمات مسلط تھیں جس کے نتیجے میں وہ فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں سمجھتے تھے:

وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ؕ

یعنی: ''ان لوگوں نے فرشتوں کو جو خدا کے بندے ہیں، مؤنث سمجھتے تھے۔''[1]

ایک اور مقام پر فرمایا:

وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَهٗ ۙ

یعنی: ''وہ اللہ کے لئے بیٹیوں کے قائل تھے اللہ (اس سے) منزہ ہے (کہ اُس کی کوئی اولاد ہو)''[2]

پھر اس سے بھی واضح گمراہی کیا ہوگی کہ اُن کے درمیان سوائے حرمت والے مہینوں کے پورا سال جنگ اور خون خرابے کا ماحول رہتا تھا اور قبائلی دشمنی اور کینہ باپ سے اولاد میں منتقل ہوتا رہتا تھا اور یہ سلسلہ سالہا سال تک جاری رہتا، جیسا کہ قرآن مجید نے اس کے بارے میں فرمایا ہے:

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ

''اللہ نے جو نعمت تمہیں عطا فرمائی ہے اس کی یاد سے غافل نہ ہو جانا تمہارا حال یہ تھا کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے لیکن اس کے فضل وکرم سے ایسا ہوا کہ بھائی بھائی بن گئے اور تم لوگ تو آگ کے ایک گڑھے کے کنارے پر تھے پس اس نے تمہیں بچا لیا۔''[3]

اس سے بھی بڑھ اُن کی ایک اور بڑی گمراہی یہ تھی کہ وہ دعا اور نماز جیسی عبادت کو انتہائی مضحکہ خیز اور نفرت انگیز انداز میں انجام دیتے تھے، کبھی تو عورتیں مادر زاد برہنہ حالت میں خانہ کعبہ کے گرد طواف کرتی تھیں اور اپنے اس فعل کو وہ عبادت شمار کرتیں اور کبھی تالیاں اور سیٹیاں بجاتے ہوئے نماز کے مراسم بجا لاتے تھے:

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً ؕ

یعنی: ''(جو مشرکین نماز قائم کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں) ان کی نماز (اللہ کے) اس گھر کے پاس سیٹیاں اور تالیاں بجانے کے سوا کچھ نہ تھی۔''[4]

اُس معاشرے پر انواع واقسام کی خرافات اور توہمات حاکم تھیں، ہر قبیلے کی اپنے قبیلے کو بڑا ظاہر کرنے کو کوشش ہوتی تھی اور اسی

---

[1] زخرف/۱۹
[2] نحل/۵۷
[3] آل عمران/۱۰۳
[4] انفال/۳۵

برتری کی خاطر اُن کے درمیان کینہ وحسد اور بعض اوقات خون خرابہ شروع ہوجاتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے قبیلے کی کثرت ظاہر کرنے کے لئے اپنے مردوں کی قبروں کو بھی شمار کرنا شروع کر دیتے تھے اور اپنے آباواجداد کی بوسیدہ ہڈیوں کو زمین سے نکال لاتے تھے: اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن مجید فرماتا ہے:

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۙ﴿۱﴾ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ؕ﴿۲﴾

یعنی: ''تفاخر وتکاثر نے تمہیں اپنے حال میں مشغول رکھا یہاں تک کہ تم قبروں کی زیارت کے لئے گئے اور اپنے مردوں کی قبور کو شمار کیا۔'' (تکاثر/۱، ۲)

اسی طرح کی اُن میں دیگر توہمات اور بُرائیوں بھی تھیں۔ اُس معاشرے کا انحطاط اور مادی ومعنوی پستی اس قدر زیادہ تھی کہ اُس زمانے میں اُسے دنیا کا پس ماندہ ترین علاقہ سمجھا جاتا تھا۔ ایک مغربی مؤرخ عصر جاہلیت میں حجاز کے ماحول کے بارے میں بعض مؤرخین سے نقل کرتے ہوئے لکھتا ہے: ''اُس زمانے میں یونان کا ایک عظیم سپہ سالار ''ڈیمٹروس'' عربستان پر قبضے کی نیت سے (حجاز کے ایک قدیم شہر) ''پترا'' میں داخل ہوا تو وہاں کے لوگوں نے اُس سے کہا:

''اے ''ڈیمٹروس'' بادشاہ! تم ہمارے ساتھ کیوں جنگ کرتے ہو ہم ایک ریگستان میں رہتے ہیں جو زندگی کے تمام وسائل سے خالی ہے اور ہم اُن تمام نعمتوں سے محروم ہیں جن سے شہروں اور قصبوں کے رہنے والے بہرہ مند ہیں۔ ہم اس خشک صحراء میں سکونت اس لئے اختیار کی ہے تاکہ کسی کے غلام بن کر نہ رہیں۔ لہٰذا ہم سے یہ تحفے تحایف قبول کرلو اور اپنے لشکر کو یہاں سے واپس لے جاؤ۔۔۔''

''ڈیمٹروس'' نے اُن کی طرف سے صلح کے پیغام کو غنیمت سمجھا اور اُن کے تحفے وتحائف قبول کر لئے اور مشکلات ومصائب کی حامل یہ جنگ نہ کرنے میں ہی عافیت سمجھی'' (تاریخ تمدن اسلام وعرب، تالیف ڈاکٹر گوستاولبون، ص ۸۸) دیکھا جائے تو پوری تاریخ کے دوران ''حجاز'' کسی بھی وقت کشور کشائی کرنے والی طاقتوں کے زیر تسلط نہیں رہا اور ہمیشہ اپنی آزادی کی حفاظت کرتا رہا ہے۔ تاریخی تجزیہ کرنے والے کے مطابق اس کی بڑی وجہ اس قسم کی بنجر اور خشک زمین پر قبضہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا، اور اس کی اتنی قدر وقیمت نہیں تھی جس کے لئے جنگ کی مشکلات اور زحمتیں اُٹھائی جاتیں۔

اسی لئے ایران اور روم جیسے قدیم ممالک کی تہذیب وتمدن کے اثرات جو جزیرہ نمائے عرب کے دیگر مختلف علاقوں پر نظر آتے ہیں، وہ حجاز کے علاقے میں نظر نہیں آتے۔ اب ہمیں سوچنا چاہیے کہ ایک معمولی انسان اپنے ارادے اور تفکر کے لحاظ سے جتنا بھی مضبوط ہو (بالخصوص اُس نے کسی سے پڑھا لکھا بھی نہ ہو)، اگر اُسے ایسے ماحول میں رہنا پڑے تو وہ وہاں کیسے زندگی گزارے گا۔ جو شخص جہالت اور بُرائیوں کے ماحول میں پلا بڑھا ہو کیا وہ علم ودانش اور اخلاقی فضائل کا بانی بن سکتا ہے۔ کیا آپ نے کبھی سُنا ہے کہ وحشی یا نیم وحشی اقوام میں عظیم دانشور، فلسفی اور نابغہ شخصیات پیدا ہوئی ہیں؟

اگر کسی زرخیز زمین پر خوبصورت پھول اور تروتازہ پودے اُگتے ہیں تو اس میں کوئی تعجب نہیں ہے، لیکن اگر کسی بنجر اور شورزدہ زمین پر گلستان نظر آئے تو انسان کو تعجب کرنا چاہیے۔ بہر حال ہوسکتا ہے فقط یہ باتیں رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت اور حقانیت کو ثابت

کرنے کے لئے کافی نہ ہوں، لیکن بلا شک یہ اُن قرائن میں سے ایک قرینہ ضرور ہیں جنہیں دوسرے قرینوں سے جوڑا جائے تو یہ ایک مضبوط اور دندان شکن دلیل بن سکتی ہے۔ اس بحث کو ہم امیر المؤمنین حضرت علی - کے اس کلام کے ذریعے ختم کرتے ہیں کہ جنھوں نے عصر اسلام اور جاہلیت کو ایک ساتھ دیکھا ہے۔ حضرت علی - اس دور کا نقشہ کھینچتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اَرْسَلَهُ عَلَى حِينِ فَتْرَةٍ مِنَ الرُّسُلِ، وَطُولِ هَجْعَةٍ مِنَ الْاُمَمِ، وَاعْتِزَامٍ مِنَ الْفِتَنِ، وَانْتِشَارٍ مِنَ الْاُمُورِ، وَتَلَظٍّ مِنَ الْحُرُوبِ، وَالدُّنْيَا كَاسِفَةُ النُّورِ، ظَاهِرَةُ الْغُرُورِ، عَلَى حِينِ اصْفِرَارٍ مِنْ وَرَقِهَا، وَاِيَاسٍ مِنْ ثَمَرِهَا، وَاغْوِرَارٍ مِنْ مَائِهَا، قَدْ دَرَسَتْ مَنَارُ الْهُدَى، وَظَهَرَتْ اَعْلَامُ الرَّدَى، فَهِيَ مُتَجَهِّمَةٌ لِاَهْلِهَا، عَابِسَةٌ فِي وَجْهِ طَالِبِهَا، ثَمَرُهَا الْفِتْنَةُ، وَطَعَامُهَا الْجِيفَةُ، وَشِعَارُهَا الْخَوْفُ، وَدِثَارُهَا السَّيْفُ"۔

''خدا تعالیٰ نے رسول اکرمؐ کو اس وقت مبعوث فرمایا جب مدتوں سے رسولوں کا سلسلہ منقطع تھا۔ اور قومیں ایک طویل خواب (نیند) میں ڈوبی ہوئی تھیں اور فتنہ پورے جہان پر چھا چکا تھا اور امور پریشانی اور انتشار کا شکار تھے اور آتش جنگ بھڑک رہی تھی۔ دنیا کا نور غائب اور اس کا فریب آشکار ہو گیا تھا اس کے پتے زرد، پھل بے کار اور پانی خشک ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں ہدایت کے مینار ٹوٹ چکے تھے اور ہلاکت اور بدبختی کے پرچم آشکار تھے۔ دنیا اہل دنیا کو کریہ نظروں سے دیکھ رہی تھی اور اپنے چاہنے والوں کے لئے چیں بجبیں تھی۔ اس دنیا کا پھل اس وقت فتنہ، اس کا طعام مردار کا گوشت اس کا باطن خوف اور اس کا ظاہر تلوار تھا'' (خطبہ ۸۹ نہج البلاغہ)

اسی سلسلے میں حضرت علیؑ ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

"اِنَّ اللهَ بَعَثَ مُحَمَّداً صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ نَذِيراً لِلْعَالَمِينَ، وَاَمِيناً عَلَى التَّنْزِيلِ، وَاَنْتُمْ مَعْشَرَ الْعَرَبِ عَلَى شَرِّ دِينٍ وَ فِي شَرِّ دَارٍ، مُنِيخُونَ بَيْنَ حِجَارَةٍ خُشْنٍ وَحَيَّاتٍ صُمٍّ، تَشْرَبُونَ الْكَدِرَ، وَتَاْكُلُونَ الْجَشِبَ وَتَسْفِكُونَ دِمَائَكُمْ، وَ تَقْطَعُونَ اَرْحَامَكُمْ الْاَصْنَامُ فِيكُمْ مَنْصُوبَةٌ، وَالْآثَامُ بِكُمْ مَعْصُوبَةٌ"

''اللہ تبارک وتعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تمام جہانوں کو (ان کی بداعمالیوں سے) متنبہ کرنے والا اور اپنی وحی کا امین بنا کر بھیجا۔ اے گروہ عرب اس وقت تم بدترین دین پر اور بدترین گھروں میں تھے۔ کھردرے پتھروں اور زہریلے سانپوں میں تم بود و باش رکھتے تھے۔ بت تمہارے درمیان گڑے ہوئے تھے اور گناہ تم سے چمٹے ہوئے تھے۔'' (خطبہ ۲۶ نہج البلاغہ)

مختصر یہ کہ زمانۂ جاہلیت کے بارے میں شرق وغرب میں لکھی جانے والی تاریخی کتابوں اور قرآن مجید کی آیات اور اسلامی کتب میں منقول روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ سب لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ جس معاشرے اور ماحول میں رسول اکرم ؐ نے دعوت اسلام کا آغاز فرمایا تھا وہ سب سے زیادہ پس ماندہ اور جاہل معاشرہ تھا۔ ایسا معاشرہ جو مختلف جہات سے کسی بھی طرح اس قسم کے دین اور پیشرفتہ مذہب کے ظہور کے ساتھ ہم آہنگ نہیں تھا۔

۲۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اخلاقی خصوصیات اور درخشاں ماضی

سچے اور جھوٹے دعویداروں کی پہچان کا ایک بہترین طریقہ ان کی اخلاقی خصوصیات ہیں۔ ان خصوصیات سے داعی کی حقانیت کے اثبات یا نفی کے لیے واضح قرائن اور علائم کے طور پر استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ جب کسی داعی میں تقویٰ اور پرہیز گاری، ایثار و بزرگی، مہربانی اور محبت، زہد و پارسائی، شجاعت اور شہامت اور معاشرتی طور پر بہترین ماضی دیکھا جائے تو بہت مشکل ہے کہ اس کو سچا نہ سمجھا جائے اور اگر اسکے برعکس اس میں، دنیا پرستی، مادہ پرستی، مال ومقام اور جاہ طلبی کے ساتھ ساتھ بے تقوی ہونا، جھوٹا، کینہ توز اور انتقام جوئی جیسے اخلاقی رزائل دیکھے جائیں وہ ہرگز نبوت کا سچا داعی نہیں ہوسکتا۔

خوش قسمتی کے ساتھ اپنی نبوت سے پہلے چالیس سال کے لمبے عرصے تک معاشرے کے درمیان زندگی گزارنے کی وجہ سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ماضی بہت ہی درخشاں رہا ہے چونکہ آپؐ کی تاریخ سے بھی جسے کو دوست و دشمن نے لکھا ہے، اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے۔ تمام تاریخی کتابوں میں پیغمبر اکرمؐ کی پاکیزگی اور امانتداری کو سب نے متفقہ کے طور پر قبول کیا ہے اور آپؐ کے بارے میں لقب ''امین'' کو سب سے سنا ہے۔ دلچسپ بات یہ کہ دعوت اسلام کے شروع ہو جانے کے بعد بھی لوگ تمام تر مخالفت کے باوجود اپنی امانتیں آپ کے پاس رکھتے تھے۔ لہٰذا مدینہ کی طرف ہجرت کے وقت یعنی تیرہ سال بعد، ہجرت کے وقت پیغمبرؐ نے حضرت علیؑ کو حکم دیا کہ وہ مکہ میں ہی رہ جائیں اور لوگوں تک ان کی امانتیں پہنچا دینے کے بعد مدینہ کی طرف ہجرت کریں۔

پیغمبرؐ کا حسن خلق، شجاعت اور وہ تمام صفات جو ایک عظیم الٰہی رہبر میں ہونی چاہئیں وہ سب حیات طیبہ کے مختلف مراحل میں آپؐ کے اندر اچھی طرح دیکھی جا سکتی ہیں۔ خصوصاً فتح مکہ، جنگ احد اسی طرح جنگی قیدیوں، غلاموں اور معاشرے کے مختلف نادار طبقات کے ساتھ آپؐ کے طرز عمل کو دیکھا جا سکتا ہے۔ یہاں تک کہ آپؐ کی ان خصوصیات کو (آپؐ کے دشمن) آپ کا ایک کمزور پہلو سمجھتے تھے۔ اور آپؐ کے دین کو غلاموں، غریبوں کا دین قرار دیتے تھے۔ اور آپؐ سے تقاضا کرتے تھے کہ وہ آپؐ کی حمایت صرف اسی صورت میں کریں جب تک آپ فقیر اور نادار لوگوں کو اپنے آپ سے دور نہیں کر لیتے۔ اس بات کی طرف واضح اشارہ سورۂ کہف کی آیت ۲۸ میں ہوا ہے:

وَاصۡبِرۡ نَفۡسَكَ مَعَ الَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ رَبَّهُمۡ بِالۡغَدٰوةِ وَالۡعَشِىِّ يُرِيۡدُوۡنَ وَجۡهَهٗ وَلَا تَعۡدُ عَيۡنٰكَ عَنۡهُمۡ ۚ تُرِيۡدُ زِيۡنَةَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۚ وَلَا تُطِعۡ مَنۡ اَغۡفَلۡنَا قَلۡبَهٗ عَنۡ ذِكۡرِنَا وَاتَّبَعَ

هَوٰىهُ وَكَانَ اَمۡرُهٗ فُرُطًا﴿۲۸﴾

''(اے پیغمبرؐ متکبر دشمنوں کے مقابلے میں) صبر و استقامت اختیار کرو (اور) ان لوگوں کے ساتھ کہ جو صبح وشام اپنے رب کو پکارتے ہیں اور صرف اس کی ذات کے خواہاں ہیں حیات دنیا کی آرائش کی وجہ سے ہرگز اپنی آنکھیں ان سے نہ اٹھا اور ان لوگوں کی اطاعت نہ کر جن کے دلوں کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر رکھا ہے وہ جنھوں نے ہوائے نفس کی پیروی کی ہے اور جن کے کام تجاوز پر مبنی ہیں۔''[1]

آپؐ ہی تھے کہ جنہوں نے اپنے سب سے بڑے دشمن ''ابوسفیان''یعنی، اسلام کے خلاف خطرناک ترین جنگوں کی آگ بھڑکانے والے کو بخش دیا تھا اور فتح مکہ کے موقع پر اس کے گھر کو مکہ کے لوگوں کے لیے جائے پناہ قرار دیا تھا۔ اسی طرح تمام اہل مکہ کو معاف کر دیا جنہوں نے آپؐ اور آپؐ کے پیروکاروں کے خلاف بڑے بڑے جرائم کا ارتکاب کیا تھا۔ آپؐ کے اسی حسن خلق اور ایثار و بزرگواری کی وجہ سے سب لوگ آپؐ کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ ''جنگ احد'' میں بھی بعض تازہ مسلمان ہونے والے افراد آپؐ کو تنہا چھوڑ کر میدان جنگ سے بھاگ گئے تھے جس کی وجہ سے آپؐ کی ذات مبارک کو شدید زخم برداشت کرنے پڑیں لیکن آپؐ نے انھیں بھی معاف کر دیا اور اسی سلسلے میں یہ آیات نازل ہوئیں:

فَبِمَا رَحۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنۡتَ لَهُمۡ ۚ وَلَوۡ كُنۡتَ فَظًّا غَلِيۡظَ الۡقَلۡبِ لَانۡفَضُّوۡا مِنۡ حَوۡلِكَ ۖ فَاعۡفُ عَنۡهُمۡ وَاسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ وَشَاوِرۡهُمۡ فِى الۡاَمۡرِ ۚ

ترجمہ: ''رحمت الٰہی کے سبب تم ان کے سامنے نرم (اور مہربان) ہو اور اگر تم سخت خو ہوتے تو وہ تم سے دور ہو جاتے ہیں لہٰذا انھیں معاف کر دو اور ان کے لئے مغفرت طلب کرو اور کاموں میں ان سے مشورہ کیا کرو۔''
[2]

اس آیت میں بھی پیغمبرؐ کی دل کی نرمی اور اندرونی حالت کے علاوہ آپؐ کی زبان کی نرمی اور صبر و محبت کی توصیف کی گئی ہے۔ آپؐ نہ فقط لوگوں کی خطائیں معاف کرنے پر مامور ہیں بلکہ آپؐ کو انکے لئے خدا سے مغفرت کی دعا کرنے کا بھی حکم دیا گیا ہے تا کہ ان کو شخصیت و عزت عطا کرتے ہوئے ان سے مشورہ بھی کریں۔ آنحضرتؐ مومنین اور غیر مومنین کے ساتھ اس قدر ہمدرد تھے بعض لوگوں کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے بہت رنجیدہ رہتے تھے اور اس رنج و غم کی وجہ سے اپنے آپ کو ہلاکت کی حد تک لے جاتے تھے۔ چنانچہ سورہ کہف کی آیت ۶ میں آیا ہے:

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفۡسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمۡ اِنۡ لَّمۡ يُؤۡمِنُوۡا بِهٰذَا الۡحَدِيۡثِ اَسَفًا﴿۶﴾

---

[1] (کہف/۲۸)

[2] آل عمران/۱۵۹

یعنی: ''اگر یہ لوگ اس بات پر ایمان نہ لائیں تو شاید تم غم کے مارے اپنی جان دے بیٹھو۔'' [1]

اسی قسم کا مضمون سورہ شعراء کی آیت ۳ میں آیا ہے:

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۞ [2]

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جب تک اس قسم کا قائد و رہبر نہیں ہوگا اس وقت تک رہبری کا حقیقی حق بھی ادا نہیں ہوگا۔ سورہ توبہ آیت ۱۲۸ میں آیا ہے:

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۞

یعنی: ''تم ہی میں سے تمہاری طرف رسول آیا جسے تمہاری تکالیف اور رنج والم ناگوار ہیں، جو تمہاری ہدایت پر اصرار کرتا ہے اور مومنوں پر رؤف و مہربان ہے۔''

یقینا پیغمبر اکرمؐ کے اخلاقی خصائل اور خصوصیات کا موضوع اس قدر وسیع ہے جسے اس مختصر سی بحث میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں ہمارا مقصد فقط اس مسئلے کے مختلف قرائن کی طرف اشارہ کرنا تھا۔

۳۔ داعی کی دعوت کے اہم نکات

داعی کے سچے اور جھوٹے ہونے کا پتا لگانے کے لئے اُس کی دعوت کے اہم نکات کی تحقیق ہی کافی حد تک انسان کو مطمئن کر دیتی ہے۔ ایک ایسا آسمانی دین کہ جس کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کا بیکراں علم ہو اور جو وحی کے ذریعے نازل ہو تو وہ اپنی منحصر بفرد خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ جبکہ ایک جھوٹا مکتب جو اپنے مادی اور شیطانی مقاصد کی تکمیل کے لئے کسی ایک فرد یا چند افراد کی طرف سے وجود میں آتا ہے، کچھ اور خصوصیات رکھتا ہے۔ پہلے مکتب فکر کا مقصد انسانوں کی ہدایت، انسانی نفوس کی تقویت، عدل وانصاف کا نفاذ، (معاشرے میں) صلح وآشتی اور مختلف مادی ومعنوی پہلوؤں کے لحاظ سے تکامل انسان ہے۔

جبکہ دوسرے مکتب فکر میں انسانوں کو احمق بنانے، ان کے افکار کو سلانے اور ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے، ان کا استحصال کرنے اور سامراجیت پھیلانے کے لئے کوشش کرنا ہے۔ اس قسم کے مقاصد کی تکمیل کے لئے یقینا کچھ اور قسم کے لائحہ عمل کی ضرورت ہے۔ جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے ان کو مدنظر رکھتے ہوئے اسلامی قوانین ومعارف اور تعلیمات پر ایک نظر دوڑاتے ہیں خصوصاً قرآن مجید میں جن چیز کی تاکید کی گئی ہے:

---

[1] کہف/۶

[2] شعراء/۳۔ ''باخع'' کا مادہ ''بخع'' (بروزن تخت) ہے جس کا معنی غم واندوہ سے ہلاک ہونا ہے یا دوسرے الفاظ میں غم سے مرجانا ہے۔

۱۔اس سلسلے میں جو چیز سب سے پہلے نظر آتی ہے اور جن سے تمام اسلامی معارف وقوانین کی اصلی بنیاد فراہم ہوتی ہے وہ مسئلہ ''توحید'' اور ہر قسم کے شرک کے خلاف جدوجہد کرنا ہے۔پیغمبر اکرمؐ نے اسی اصل کی بنیاد پر انسان کو خداوند یکتا کی پرستش کے علاوہ ہر قسم کی پرستش سے آزاد کرایا ہے اور اس خداوند یکتا کی طرف دعوت دی ہے جو آسمان وزمین کا خالق،تمام صفات کمال کا حامل اور انسانوں کے ظاہر و باطن سے آگاہ ہے۔اور جو خرافات اور توہمات کی زنجیروں کو کھول دیتا ہے اور انسانوں یا پتھر و لکڑی اور ہر قسم کے بتوں کی پرستش سے نجات دلاتا ہے۔

وہ یہود و نصاریٰ کی انسان پرستی کی مذمت کرتے ہوئے فرماتا ہے:

اِتَّخَذُوٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ

یعنی:''وہ اللہ کے مقابلے میں علما اور راہبوں (تارکین دنیا) کو ہی معبود قرار دیتے ہیں۔''[۱]

اور اللہ تعالیٰ کے عظیم نبی حضرت یوسف کی زبان سے ایک دلچسپ موازنہ کرتا ہے جو اپنے ساتھی قیدیوں کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۳۹﴾

یعنی:''کیا متفرق خدا بہتر ہیں یا واحد وقہار اللہ؟''[۲]

۲۔اسلام انسان کی تقدیر میں سوائے خدا کے اور کسی چیز کو موثر نہیں سمجھتا اور وہ سب کو اسی کی ذات پر توکل کرنے کی دعوت دیتے ہوئے فرماتا ہے:

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ ؕ

یعنی:''کیا اللہ اپنے بندے (کی نجات اور حفاظت) کے لئے کافی نہیں ہے؟''[۳]

۳۔یہ تو ایک طرف ہے جبکہ دوسری جانب انسان کو اپنے اعمال کا گروی سمجھتا ہے اور نجات اور کامیابی کا واحد راستہ زیادہ سے زیادہ سعی و کوشش کو قرار دیتا ہے اور فرماتا ہے:

"وَأَنْ لَيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ"

''اور یہ کہ انسان کے لئے اس کی اپنی سعی و کوشش کے علاوہ اور کوئی حصہ نہیں ہے۔''[۴]

---

[۱] توبہ/۳۱

[۲] یوسف/۳۹

[۳] زمر/۳۶

[۴] نجم/۳۹

"کُلُّ نَفۡسٍۭ بِمَا کَسَبَتۡ رَهِیۡنَۃٌ"

یعنی: "ہر شخص اپنے اعمال کا گروی ہے۔"[1]

۴۔اسلام میں انسان جس نسل ونژاد سے ہوں انھیں ہر وقت مساوی سمجھا جاتا ہے اور اس لحاظ سے ان میں کسی قسم کا فرق نہیں ہے سوائے تقویٰ اور پرہیزگاری کے۔(حجرات/۱۳)

۵۔وہ تمام مومنین کو ایک دوسرے کا "بھائی" کہہ کر خطاب کرتا ہے اور اس طرح دو انسانوں کے درمیان سب سے قریبی رشتہ، برابری اور مساوات کی بنیاد پر استوار ہے جس کے بارے میں فرماتا ہے: تمام مومنین ایک دوسرے کے بھائی ہیں (جب بھی ان کے درمیان اختلاف پیدا ہو جائے تو تمہارا فرض ہے کہ) بھائیوں کے درمیان صلح وآشتی برقرار کرو۔(حجرات/۱۰)

۶۔"اجتماعی عدالت" کو انسانی معاشروں پر حاکم بنیادی اصل قرار دیتا ہے اور تمام مومنین کو عدل وانصاف قائم کرنے کی دعوت دیتے ہوئے فرماتا ہے: ذاتی اور قبائلی دشمنیاں عدالت کے نفاذ کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنی چاہییں۔(مائدہ/۸) اسی طرح قریبی رشتہ داروں کا تعلق اور باپ بیٹے جیسے تعلقات عدالت کے نفاذ میں رکاوٹ نہیں بنیں چاہیں اور نہ ہی بغیر کسی وجہ کے قضاوت کا پلہ ان کے نفع میں بھاری نہیں ہونا چاہیں۔(نساء/۱۳۵)

۷۔انسانوں کے باہمی تعلقات پر "انفاق" کے اصول کو غالب قرار دیا گیا ہے اور سب کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ جو نعمتیں خدا نے انھیں عطا کی ہیں (مثلاً علم، مال، اور معاشرتی عہدہ ومنصب کی نعمت) ان سے دوسروں پر بھی خرچ کریں۔(بقرہ/۳)

۸۔"صلہ رحم" اور رشتہ داری کے تعلق کا خیال رکھنے کی تاکید کی گئی ہے۔(بقرہ/۲۷) خصوصاً ماں باپ کے لئے غیر معمولی احترام کا حکم دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ اگر وہ مسلمان نہ بھی ہوں تب بھی ان کے ساتھ نیک سلوک کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ (لقمان/۱۴،۱۵)

۹۔دنیا کے مشرق ومغرب میں "مظلوموں کی حمایت بھی ان مسائل میں سے ہے کہ جس کی اسلام بہت زیادہ تاکید کرتا ہے حتیٰ قرآنی آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس مسئلے میں مسلمان اور غیر مسلمان کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے جیسا کہ سورہ نساء کی آیت ۷۵ میں آیا ہے:

وَمَا لَکُمۡ لَا تُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَالۡمُسۡتَضۡعَفِیۡنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالۡوِلۡدَانِ

یعنی: "کیوں تم خدا کی راہ میں ان مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے (ستمگروں) کے ہاتھوں کمزور کر دیئے گئے ہیں، جنگ نہیں کرتے۔"

بنابرایں جنگ اور جہاد کی حد تک ان کے حمایت کرنا ضروری سمجھا گیا ہے۔

---

[1] مدثر/۳۸

۱۰۔''عورتوں کے حقوق کا احترام''، خصوصاً اس ماحول میں جو جہاں اس کے حقوق کو بالکل پائمال کر دیا گیا تھا عورتوں کو جینے تک کا حق نہیں دیا جاتا تھا اور لڑکیوں کو بلا جھجک زمین کے اندر دفن کر دیا جاتا تھا۔ اس وقت اسلام اس کی تاکید کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ (بقرہ ۲۲۸)

۱۱۔ دوسرے ادیان اور آسمانی کتابوں کے پیروکاروں کے ساتھ معاشرت اور ان سب کو مشترکہ نکات کی طرف دعوت دینا، جیسا کہ سورۂ آل عمران کی آیت ۶۴ میں فرمایا ہے:

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ

یعنی: ''کہئے: اے اہل کتاب! آؤ ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے اور وہ یہ کہ خدائے واحد کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک قرار نہ دیں اور خدا کو چھوڑ کر ہم میں سے بعض اپنے میں سے دوسروں کو اپنا خدا نہ بنالیں۔''

۱۲۔ اسلام میں ''علم'' و دانش کو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے اور قرآن کی سینکڑوں آیات اس کی حکایت کرتی ہیں جس ماحول میں قرآن نازل ہوا ہے وہ ناخواندگی اور جہالت کا مرکز تھا، اُسے دیکھا جائے تو یہ بات بہت ہی دلچسپ لگتی ہے کہ پیغمبر اکرمؐ پر پہلی نازل ہونی والی آیات میں ہی علم و دانش کی تاکید کی جاتی ہے (قلم/۱) اور پھر آدم (بنی نوع انسان) کی فضیلت و برتری کا معیار بھی علم و دانش کی فضیلت ہی قرار پاتا ہے۔ (بقرہ/۳۱، ۳۳)

۱۳۔''امر بالمعروف و نہی عن المنکر'' کا مسئلہ بھی اس دین مبین کا درخشندہ پہلو ہے جو معاشرے پر پورے معاشرے کے ذریعے عمومی نگرانی کی دعوت ہے اور تمام لوگوں کو ہر قسم کی معاشرتی برائیوں یا فرائض کی ادائیگی سے پہلوتہی کے مقابلے میں ذمہ داری کا احساس دلاتا ہے۔ (آل عمران/ ۱۰۴ و ۱۱۰/ اور دیگر آیات)

۱۴۔ بہت سی برائیوں اور جرائم کا اصل سرچشمہ مادیات اور تجملات کی طرف شدید رجحان اور زرق برق پر مبنی زندگی سے محبت ہے۔ اسلام اس مسئلہ کی روک تھام کرنے کے لئے ''سادہ زندگی'' اور ''تجملات'' سے پرہیز کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ (زخرف/ ۳۳ تا ۳۵) درحالانکہ اسلام مادی نعمتوں حتیٰ زینتوں سے معقول اور منطقی استفادہ کرنے کو مباح قرار دیتا ہے۔ (اعراف/ ۳۲)

۱۵۔ دوسروں کے ساتھ حسن سلوک اور ''ادب کا لحاظ'' رکھنا اور تمام مسائل میں اخلاقیات کو مدنظر رکھنا چنانچہ سورہ لقمان کی آیات ۱۸ و ۱۹ میں اس طرح سورۂ حجرات کی آیات ۱۱ و ۱۲ اور سورۂ فرقان کی آیت ۷۲ اور دوسری آیات میں اس مسئلہ کے اہم ترین نکات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ نیز سورۂ اعراف کی آیت ۱۹۹ میں آیا ہے:

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ ﴿١٩٩﴾

یعنی: ''ان سے نرمی برتو، ان کا عذر قبول کرلو، انھیں نیکیوں کی طرف دعوت دو اور جاہلوں سے رخ موڑ لو اور ان سے جھگڑا نہ کرو۔''[۱]

۱۶۔ دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کے ساتھ اندھے تعصب کے بجائے منطقی و عقلی گفتگو اور بحث و مباحثہ (بھی اسلام کے اصولوں میں سے ہے)۔ قرآن مجید فرماتا ہے:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ

یعنی: ''اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ دعوت دو اور ان سے بہترین انداز میں استدلال و مباحثہ کرو۔'' (نحل/۱۲۵)

۱۷۔ ''حق کے سامنے خضوع'' اور حق جہاں سے بھی ملے اسے قبول کرنا بھی اسلام کے روشن ترین نکات میں سے ہے۔ چنانچہ قرآن فرماتا ہے:

فَبَشِّرْ عِبَادِ ۝ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُوا

یعنی: ''بشارت اور خوشخبری انھیں لوگوں کے لئے ہے۔ اس بناء پر میرے ان بندوں کو بشارت دے دو، وہ لوگ جو باتوں کو (غور سے) سنتے ہیں اور ان میں سے بہترین کی پیروی کرتے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جن کی اللہ نے ہدایت کی ہے اور یہی لوگ عقلمند ہیں۔''[۲]

۱۸۔ ''غیر الٰہی محرکات سے اپنی نیت کو خالص کرنا'' بھی ان اصولوں میں سے ہے کہ جس کے بارے میں قرآن مجید اور اسلامی روایات میں بارہا تاکید کی گئی ہے اسلام ان اعمال کو پاک، خدا کی بارگاہ میں مقبول اور سعادت و نجات کا باعث سمجھتا ہے کہ جو خودنمائی ریاکاری اور تظاہر کی نیت سے انجام نہ دیئے گئے ہوں بلکہ ان میں بلند انسانی و الٰہی اخلاق کو مدنظر رکھا گیا ہو اس چیز پر ان کی بنیاد استوار ہو چنانچہ قرآن کی سات آیات میں ''مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ'' کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔[۳]

ایک طرف سے مؤمنین کے خالصانہ صدقات کو ایک ثمر آور اور پھلوں سے لدے ہوئے باغ سے تشبیہ دی گئی ہے جس کا پھل رحمت الٰہی کی بارش سے دوگنا ہو جاتا ہے۔ (بقرہ/۲۶۵) اور دوسری طرف غیر مؤمن ریاکاروں کے اعمال کو ان بیجوں سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جو کسی پتھر پر پڑی گرد اور مٹی میں بوئے گئے ہوں، جن کو بارش اپنے ساتھ بہا کر لے جاتی ہے۔ (بقرہ/۲۶۴)

---

[۱] اعراف/۱۹۹۔ امام جعفر صادق -سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ یہ قرآن مجید کی اخلاقی آیات میں سے سب سے جامع آیت ہے۔ (مجمع البیان)

[۲] زمر/۱۷، ۱۸

[۳] دیکھئے: سورتیں: اعراف/۲۹، یونس/۲۲، عنکبوت/۶۵، لقمان/۳۲، غافر/۱۴، ۶۵، بینہ/۵

۱۹۔اسلام میں ''اسراف وتبذیر'' کی شدید مذمت کی گئی ہے اور تبذیر (فضول خرچی) کرنے والوں کو شیطان کا بھائی کہا گیا ہے۔

اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ [۱]

۲۰۔''لاوارث اور یتیم بچوں'' کی سرپرستی ونگہبانی بھی اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے ہے بہت سی آیات وروایات میں اس کے بارے میں تاکید کی گئی ہے یہاں تک کہ یتیم کا مال کھانے کو آگ کھانے کے مترادف قرار دیا گیا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ [۲]

ان کے کاموں کی اصلاح کرنے کی وصیت کرتے ہوئے فرمایا ہے:

وَيَسْــَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ؕ

یعنی:''اور تم سے یتیموں کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہہ دو کہ ان کے کام کی اصلاح کرنا بہتر ہے۔'' [۳]

۲۱۔اسلام میں قیدی اور اسیر کو محترم قرار دیا گیا ہے اور ان کے ساتھ نیک سلوک کی تاکید کی گئی ہے قرآن مجید میں قیدیوں کی مدد کرنے کو نیک وصالح لوگوں کی صفات میں شمار کیا گیا ہے۔

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝۸ [۴]

حضرت علی ؑ سے منقول ایک حدیث میں آیا ہے:

''اِطْعَامُ الْاَسِيْرِ وَالْاِحْسانُ اِلَيْهِ حَقٌّ وَاجِبٌ''

''اسیر کو کھانا کھلانا اس کے ساتھ نیکی ایک واجب حق ہے۔'' [۵]

۲۲۔اپنے ''امور میں مشورہ کرنا'' بھی ان اہم ترین مسائل میں سے جس کے بارے میں قرآن مجید اور اسلامی روایات میں تاکید کی گئی ہے، حتیٰ پیغمبر اکرمؐ کو جو اپنی ''عقل کامل'' کے باوجود مشورہ کرنے پر مامور ہیں:

''وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ'' [۶]

---

[۱] اسراء/۲۷

[۲] نساء/۱۰

[۳] بقرہ/۲۲۰

[۴] دہر/۸

[۵] وسائل الشیعہ، ج۱۱ص۶۹، ابواب جہاد العدو، باب ۳۲، حدیث ۳۔

[۶] آل عمران/۱۵۹

اصولی طور پر اہم معاشرتی مسائل میں مشاورت کو ایمان کی علامتوں میں سے سمجھا جاتا ہے:

"وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ" [۱]

۲۳۔"خرافات کا مقابلہ کرنا" بھی پیغمبر اکرمؐ کے قاطعانہ لائحہ عمل میں سے تھا، حالانکہ جھوٹے نبی ہمیشہ خرافات پھیلانے کی سعی کرتے ہیں اور اس طرح لوگوں کے افکار کو خوف میں مبتلا کرتے ہیں اور عوام کو اپنی طرف مائل کرنے کے لئے ان کی خرافات کے ساتھ ہم آہنگ رہتے ہیں لیکن پیغمبر اکرمؐ نے اس بند کو توڑ ڈالا اور جہاں خرافات پر عمل خود آپؐ کے مفاد میں بھی تھا، پھر آپؐ نے بھی اس کے خلاف جدوجہد کی۔

بت پرستی سے بڑی خرافات کیا ہوسکتی ہے کہ جس نے پوری عرب دنیا کو گھیرا ہوا تھا کہ اس کی مخالفت کرنا بہت ہی مشکل اور عجیب تھی۔ اور اسی طرح بعض اوقات پاگل بن کی علامت سمجھی جاتی تھی، جب پیغمبر اسلامؐ نے انھیں خداوند یکتا کی طرف دعوت دی تو انھوں نے کہا:

اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ ۝۵

یعنی: "کیا اس نے اتنے خداؤں کے بجائے ایک ہی خدا قرار دے لیا ہے؟ یہ تو واقعاً ایک عجیب چیز ہے" [۲]

بظاہر پیغمبر اسلامؐ کی طرف جنون اور پاگل پن کی نسبت دینے کا سبب یہی تھا کہ آپؐ اس معاشرے کے مسلّمہ ترین عقیدے یعنی؛ بت پرستی کے خلاف جدوجہد کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ بطور کلی ایام جاہلیت کے عرب بہت زیادہ خرافات میں مبتلا تھے جس کی تفصیل بہت طولانی ہے، لیکن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سب کا مقابلہ کیا۔

۲۴۔ انسان کو ہوا و ہوس کی قید اور دوسرے انسانوں کے چنگل سے آزاد کرانا یا غلط رسم و رواج کی قید سے نجات دلانا بھی ایسے موضوعات میں سے ہے جس کو اسلام نے بہت زیادہ اہمیت دی ہے یہاں تک کہ اسے پیغمبر اکرمؐ کی خصوصی صفات قرار دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

"وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ" [۳]

ایک مشہور حدیث نبویؐ میں آیا ہے کہ تین گناہوں کو خدا ہرگز نہیں بخشتا جس میں ایک یہ ہے کہ انسان کسی آزاد انسان کی آزادی کو

---

[۱] شوریٰ/۳۸

[۲] ص/۵

[۳] اعراف/۱۵۷

سلب کرے اور اسے اپنا غلام بنا کر فروخت کردے۔[1]

۲۵۔ ''تکاثر کی ممانعت''، یعنی مادیات میں زیادہ طلبی، حرص اور لالچ کی ممانعت بھی اس دین کا بنیادی لائحہ عمل شمار ہوتا ہے قرآن مجید کی بہت سی آیات اور اسلامی روایات میں اس کی طرف اشارہ ملتا ہے یہاں تک کہ اسے دنیوی زندگی کی مذموم ترین صفت شمار کرتے ہوئے اسے لہوولعب اور فخر ومباہات کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔(حدید/۲۰) اور اسے خدا سے لاپروائی کا سبب سمجھا گیا ہے اور جو لوگ اپنے قوم وقبیلہ کی اکثریت کو ثابت کرنے کے لئے قبرستان کا رخ کرتے ہیں تا کہ اس مقصد کے لئے اپنے مردوں کی قبروں کو بھی شمار کریں، ایسے لوگوں کی سخت مذمت کرتے ہوئے فرمایا ہے:

''أَلْهَاكُمُ التَّكَاثُرُ حَتَّىٰ زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ'' [2]

اسی طرح متکبر، مستکثر (لالچی) اور گھمنڈ کرنے والے قارون کے قصے کو تفصیل کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے کہ جو آخر کار اپنے مال متاع کے ساتھ ہی زمین کی گہرائیوں میں دفن ہو جاتا ہے اور اس طرح اس جیسی صفات رکھنے والے (لالچی) لوگوں کو خبردار کرتے ہوئے: نبی اکرمؐ کو مادی وسائل پر آنکھیں لگانے اور اسے فضیلت و برتری کی علامت قرار دینے سے نہی کی جاتی ہے۔(طٰہٰ/۱۳۱ اور قصص/۷۶)

۲۶۔ ''اتحاد اور یکجہتی کی دعوت'' کو بھی ہم ان احکامات میں سے قرار دے سکتے ہیں کہ جو اسلامی لائحہ عمل میں سرفہرست نظر آتے ہیں قرآن مجید میں اس کی بہت زیادہ تاکید کی گئی اور سب کو اتحاد کی دعوت دیتے ہوئے تفرقے سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اسی طرح ایام جاہلیت کے نفاق اور تفرقے کی طرف پلٹنے کے بارے میں خبردار کرتے ہوئے پراکندہ اور متفرق فرد ومعاشرے کو ایسے فرد سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جو آگ کے دھانے پر کھڑا ہو۔(آل عمران/۱۰۳) اسی طرح باہمی جھگڑوں اور اختلاف کو معاشرے کے کمزور اور اس کی شان وشوکت کے ختم ہونے کا سب سے بڑا سبب قرار دیا گیا ہے۔(انفال/۴۶)

۲۷۔ ''قانون کا احترام'' بھی احکام اسلام میں سے ایک اہم ترین حکم ہے اور یہاں تک کہا گیا ہے کہ اگر قانون آپ کے اپنے خلاف بھی ہو تو اس کا احترام کرو جیسا کہ قرآن میں آیا ہے:

''عدل وقسط قائم کرو اور اللہ کے لئے گواہی دو خواہ وہ تمہارے اور تمہارے ماں باپ اور رشتہ داروں کے نقصان میں ہی کیوں نہ ہو۔''[3]

كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ

اسلام، قوانین کی حدود کو توڑنے کو حرام جانتا ہے اور ''اللہ کی حدود'' سے تجاوز کو ظلم وستم شمار کرتا ہے:

---

[1] عن النبی (ص) ان اللہ تعالیٰ غافر کل ذنب الا من جحَدَ مہراً او اغتصب اجیداً اجرہ اوباع رجلاً حُراً (سفینۃ البحار، مادۂ اجر)

[2] تکاثر/۱ اور ۲

[3] ۔نساء/۱۳۵

وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ [1]

اسی طرح قانون حق کے مقابلے میں مطلقاً تسلیم ہو جانے اور اسی پر اعتراض نہ کرنے کو عقل وفکر کے نزدیک ایمان کی نشانی سمجھتا ہے۔(نساء/٦٥)

٢٨۔انتقام لینے سے پرہیز نہ فقط پیغمبر اسلامؐ کی سیرت کا دائمی اصول تھا جسے اسلامی جنگوں اور خصوصاً فتح مکہ کے واقعات میں واضح طور پر دیکھا گیا ہے بلکہ آپؐ نے اپنے پیروکاروں کو بھی بارہا اس کی وصیت فرمائی ہے۔آپؐ ایک جگہ سب لوگوں کو عفو و درگزر اور دوسروں کی لغزشوں سے چشم پوشی کرنے کی دعوت دیتے ہوئے انھیں اس عفو الٰہی کی طرف متوجہ کرتے ہیں جس کی سب کو توقع ہے:

وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ۭ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ۭ [2]

بلکہ اس سے بھی بڑھ کر فرماتے ہیں: بدیوں کے مقابلے میں انتقام جوئی سے کام نہ لیں بلکہ ''بدی'' کا جواب ''نیکی'' سے دیں تا کہ یہ محبت والفت کا سرچشمہ بن جائے:

اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ [3]

لیکن اس کے باوجود آپ کینہ پرور دشمن کو اسلامی رحمت ورأفت سے غلط فائدہ اٹھانے کی ہرگز اجازت نہیں دیتے تھے بلکہ آپؐ کا حکم تھا کہ جس طرح دوستوں یا فریب خوردہ دشمنوں سے نرم ومہربان رہے اسی طرح ہٹ دھرم اور متعصب دشمنوں کے ساتھ بھی سخت اور شدید طرز عمل اختیار کریں۔یہاں تک کہ آپؐ کے سچے اور حقیقی صحابہ اکرام کو ان اوصاف کے ساتھ یاد کیا جانے لگا:

''وہ کفار کے مقابلے میں سرسخت اور اپنوں کے ساتھ مہربان ہیں۔''[4]

اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ

٢٩۔تمام مسائل میں ''تقویٰ کی دعوت'' بھی ایک ایسی چیز ہے کہ اسلام نے ہر مناسبت سے اس کا خیال رکھا ہے اور اس کی طرف توجہ دلائی ہے اور اسے انسان کی نجات کا واحد راستہ اور آخرت کا زادراہ قرار دیا ہے۔[5] اور یہی مسئلہ، انسانوں کی شخصیت کا معیار ٢۔دنیا کی برکات [6] آخرت کی سعادت [7] اور بصیرت اور آگاہی کا سبب شمار ہوتا ہے۔

---

[1] بقرہ/٢٢٩

[2] نور/ ٢٢

[3] فصلت/ ٣٤

[4] فتح/٢٩

[5] سورۂ بقرہ/ ١٩٧

[6] سورۂ حجرات/ ١٣

[7] سورۂ اعراف/ ٩٦

۳۰۔"حُبّ فِي الله وبُغض فِي الله" بھی اسلام کے اصولوں میں سے ہے۔ دوسرے الفاظ میں اللہ کے لئے کسی کو دوست رکھنا اور اللہ ہی کی خاطر کسی سے دشمنی کرنا، اس سے بھی واضح الفاظ میں جو کوئی بھی ایمان، حق، عدالت، تقویٰ اور پاکیزگی کے راستے پر قدم رکھے اُسے اپنا دوست رکھو اور اُس کے ساتھ دوستی ومحبت کا مضبوط رشتہ قائم کرو اور اس کے برعکس ناپاک، بُرے، گناہگار اور ظالم لوگوں سے دوری اختیار کرو کہ یہ چیز قرآن میں: "حزب الله" کی اصلی علامت کے طور ذکر ہوئی ہے اور اسلامی احادیث میں بھی اسے ایمان واسلام کا مضبوط ترین دستہ:

(اَوْثَقُ عُرَی الْاِیمانِ الْحُبُّ فِی اللّٰہِ وَالْبُغْضُ فِی اللّٰہِ)[1] اور افضل ترین عمل[2] شمار کیا گیا ہے۔

یہ اصول اور فروع کے بارے میں اسلامی تعلیمات کا ایک خلاصہ تھا۔ کیا یقین کیا جا سکتا ہے کہ ایک ان پڑھ (امی) اور جاہلیت کے تاریک ماحول میں پرورش پانے والا انسان کفر وشرک، بے انصافی اور برائی اور تعصب کے مرکز میں اپنے ساتھ اس قسم کی اعلیٰ تعلیمات لائے۔ یہ سب آسمانی وحی اور الٰہی الہام وتائید کے بغیر ہرگز نہیں ہوسکتا۔ اصولی طور پر ہر دین ومذہب کے داعی کی سچائی اور کذب کو ثابت کرنے کے لئے اہل علم ودانش کے لئے اس کی دعوت اور تعلیمات بہترین دلیل ہیں اور یہ چیزیں کبھی تو بہت سے معجزات سے بھی زیادہ اہم ثابت ہوتی ہیں۔

چونکہ معجزات کے بارے میں بعض ضدی اور ہٹ دھرم قسم کے مخالفین کی طرف سے جو شکوک وشبہات (مثلاً سحر وجادو وغیرہ جیسے اتہامات) پیدا کئے جاتے ہیں وہ اس کی دعوت وتعلیمات کے بارے میں پیش نہیں کئے جا سکتے۔ حتیٰ اس بارے میں ایک ضخیم کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ مخصوصاً اسلام کی تمام نظریاتی اخلاقی، معاشرتی نیز انفرادی واجتماعی، مادی ومعنوی مسائل کے بارے میں تعلیمات کا میدان بہت وسیع ہے۔

یقیناً تعلیمات کا یہ مجموعہ ایک صحرا نشین، ان پڑھ (اُمّی) اور پسماندہ ترین ماحول میں پرورش پانے والے عربی سے ایک معمولی مسئلہ نہیں ہوسکتا اور ہمارے نظریئے کے مطابق اس سے بڑھ کر اور کوئی معجزہ نہیں ہوسکتا اور یہ ایک ایسا قرینہ وعلامت ہے جو دوسرے قرائن وعلائم کے ساتھ مل کر ایک اطمینان بخش دلیل بن سکتا ہے۔

۴۔ آپؐ کے اپنے ماحول پر گہرے اثرات

یہ بات صحیح ہے کہ فقط کسی ماحول پر ایک مکتبۂ فکر کا اثر انداز ہونا ہی اس کے صحیح ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا چونکہ ہم بہت سے ایسے باطل ادیان کو جانتے ہیں جنھوں نے ایک عرصے تک ایک بڑے حلقے کو اپنے متاثر کئے رکھا ہے ان میں سے بعض تو آخر کار ختم ہو گئے اور بعض ابھی تک باقی ہیں لیکن ان کے اثرات کی کیفیت کو ہم دیگر قرائن کے ساتھ ایک زندہ قرینہ کے طور پر دیکھ سکتے ہیں۔

---

[1] اصول کافی، ج ۲، ص ۱۲۵

[2] سفینۃ البحار، ج ۱، ص ۲۰۱

جب یہ اثرات ایک جوش کی صورت میں مثبت پہلوؤں اور انتہائی کم نقصان کے ساتھ ظاہر ہوں تو یقیناً اس مکتب فکر کی گہری بنیادوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ کونسا ایسا شخص ہے کہ جو اسلام اور عربوں کی تاریخ سے معمولی سی آگاہی رکھنے کے باوجود پیغمبر اسلامؐ کی دعوت کے ۲۳ سال جیسے مختصر عرصے میں جو عظیم فاصلہ پیدا ہوا ہے، اس کا انکار کر سکے ایسا فاصلہ کہ جو ایک انقلاب سے زیادہ ''فلسفی گریز'' سے شباہت رکھتا ہے۔

ایک فراموش شدہ اور متروکہ قوم جس کا تاریخ میں نام ونشان بھی نہیں تھا اور جس میں علم عمرانیات کے لحاظ سے چند صدیوں بعد تک کسی قسم کی ترقی و پیشرفت کی آمادگی نظر نہیں آتی تھی اچانک منقلب ہو جاتی ہے اور عظیم تہذیب وتمدن کے ایک جدید مرحلے میں داخل ہو جاتی ہے۔ وہ قوم نہ فقط خود تبدیل ہوتی ہے بلکہ اپنے حور کی دنیا میں بھی انقلاب برپا کر دیتی ہے پھر اس تبدیلی اور انقلاب کے اثرات آئندہ صدیوں اور لامحدود زمانوں تک نظر آتے ہیں۔

ایسی تہذیب جو تاریخ انسانیت کا رخ ہی بدل دیتی ہے اور اپنے زمانے کی عظیم پانچ تہذیبوں یعنی ''روم، ایران، مصر، بابل اور یمن'' کو اپنے زیر اثر قرار دے دیتی ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ جس کی مقررہ معیارات کے مطابق وضاحت کرنے سے تمام مورخین اور ماہرین عمرانیات عاجز ہیں اگرچہ تاریخ تمدن اسلام یا اسی جیسے دوسرے ناموں کے ساتھ بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن اس بات کا بھی اعتراف کیا گیا کہ اب بھی دنیا میں اسلام کے ظہور اور نفوذ کے بارے میں بہت سے نکات واضح نہیں ہو سکے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ تمام انقلابات کے برعکس یہ انقلاب اور تبدیلی فقط ایک ہی پہلو سے قابل ملاحظہ نہیں اس کا صرف سیاسی اور معاشی پہلو ہی نہیں تھا بلکہ اس نے معاشرے کے تمام ارکان یعنی معاشرتی، ثقافتی، اخلاقی، معاشی اور آداب ورسوم کے تمام پہلوؤں کو بدل کر رکھ دیا۔ مختصر یہ کہ پوری تاریخ کے دوران عرب معاشرے میں اور پھر پوری دنیا میں عبور اسلام کے اثرات گہرے غور وفکر کے متقاضی ہیں جو اس کی حقانیت کے قرائن میں سے ایک واضح قرینہ بن سکتا ہے جس کی وضاحت کے لئے ایک جدا کتاب کی ضرورت ہے۔

۵۔ مقصد تک پہنچنے کا طریقہ اور وسائل

ہر شخص اور گروہ کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے کچھ وسائل کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ کن وسائل کو انتخاب کرتا ہے اور انہیں کس طرح حاصل کرتا ہے، یہ بات کسی حد تک اُس کے مکتب کی حقانیت اور اصالت یا اس کے جھوٹے پن کو پہچاننے کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ جو لوگ اپنے مقصد تک پہنچنے کے لئے ہر ذریعے کو جائز سمجھتے ہیں اور مقصد وہدف ہی کے ذریعے وہ اپنے وسائل کی توجیہ کرتے ہیں اور (اَلْغَایَاتُ تُبَرِّرُ الْوَسَائِطَ) کو ہی اپنا بنیادی لائحہ عمل قرار دیتے ہیں تو یقیناً ایسے لوگ کسی قسم کی اصلیت نہیں رکھتے، لیکن جو لوگ اپنے مقدس اہداف کی تکمیل کے لئے پاکیزہ وسائل ہی سے استفادہ کرتے ہیں تو اس طرح وہ اپنی حقانیت کو ظاہر کر دیتے ہیں۔

لہٰذا سچے اور جھوٹے انبیاء کو بھی اسی طریقے سے پہچانا جا سکتا ہے۔ جو لوگ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے کسی قسم کی قید وشرط کے قائل نہیں ہوتے اور ہر قسم کے جائز وناجائز ذرائع سے استفادہ کرنا مباح سمجھتے ہیں اور عدالت وانصاف، امانت، سچائی، انسانی قدروں کے

احترام جیسی باتوں کا فقط اسی وقت احترام کرتے ہیں کہ جب وہ اُن کے مقاصد کی تکمیل میں مدد دیتی ہیں اور جب بھی یہ باتیں اُن کے مقاصد کے خلاف قرار پاتی ہیں تو اُن سب قدروں کو الوداع کہہ دیتے ہیں، ایسے لوگوں کا شمار جھوٹے انبیاء میں ہوتا ہے۔

سچے انبیاء وہ ہیں جو اپنی جنگوں کے دوران بھی انسانی اصولوں کا احترام کرتے تھے اور دشمن کے بارے میں بھی عدالت، عفو و درگزر جیسے اصولوں کو فراموش نہیں کرتے تھے اور خطرات اور ممکنہ شکست کی صورت میں غیر انسانی اعمال سے پرہیز کرتے تھے۔ اگر اسی کلی اصول پر پیغمبر اکرمؐ کی حیات طیبہ کو پرکھیں اور فتح و شکست اور سختی و آسانی کے موقع پر آپؐ کے دوستوں اور دشمنوں کے ساتھ طرزِ عمل کو دیکھیں تو ہم جان لیں گے کہ آپؐ کی ذات مبارک مقصد تک رسائی کے لئے وسائل کے انتخاب میں بہت سخت، متجسس اور خاص قدروں کی پابند تھی۔ آپؐ کبھی بھی خطرے کے وقت غیر انسانی طریقے نہیں اپناتے تھے اور میدان جنگ میں بھی باریک ترین اخلاقی مسائل کا خیال رکھتے تھے۔

لہٰذا آپؐ فتح و کامیابی کے وقت یعنی ''فتح مکہ'' میں اپنے خطرناک ترین دشمنوں کے لئے عام معافی کا اعلان کر دیتے ہیں، حتیٰ جنگی مجرموں اور قاتلوں کو بھی بخش دیتے ہیں۔ جب آپؐ نے سنا کہ ایک سپہ سالار نے انتقامی نعرے بلند کرتے ہوئے کہا ہے:

''اَلْيَوْمَ يَوْمُ الْمَلْحَمَةِ اَلْيَوْمَ تُسْتَحَلُّ الْحُرْمَةُ، اَلْيَوْمَ اَذَلَّ اللّٰهُ قُرَيْشاً:''

یعنی: '' آج جنگ و خون خرابہ اور انتقام کا دن ہے اور آج لوگوں کا احترام پائمال ہوگا اور آج وہ دن ہے جب اللہ نے قریش کو ذلیل کر دیا ہے۔''

تو آپؐ نے فوراً اس شخص کو برطرف کرنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا: اس (ناروا اور نفرت انگیز) نعرے کی بجائے یہ آواز بلند کریں:

''اَلْيَوْمَ يَوْمُ الْمَرْحَمَةِ... اَلْيَوْمَ اَعَزَّ اللّٰهُ قُرَيْشاً:''

یعنی: '' آج بخشش اور معافی کا دن ہے آج خدا نے قریش کو معزز بنا دیا ہے۔''[1]

حتیٰ جب مکہ کے سردار صف بنائے دیکھ رہے تھے کہ اب پیغمبر اسلامؐ ان کے بارے میں کیا حکم صادر فرماتے ہیں (اور بہت سے لوگوں کو ان کینہ توز دشمنوں کے بارے میں سخت ترین حکم کی توقع تھی) تو اس وقت آپؐ نے ان کو مخاطب کر کے فرمایا: تم اپنے بارے میں مجھ سے کیا توقع رکھتے ہو اور کیا کہتے ہو؟ مکہ کے سرداروں نے کہا: ہم آپؐ سے نیکی کے سوا کوئی توقع نہیں رکھتے.....''۔ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: میں تمہیں وہی کچھ کہوں گا جو یوسفؑ نے اپنے جفا کار بھائیوں سے کہا تھا:

لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ؕ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ۫ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۹۲﴾ اِذْهَبُوْا وَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ

---

[1] یہی بات مختلف عبارتوں کے ساتھ بحار الانوار، ۲۱، ص ۱۰۵، ۱۳۰، حبیب السیر، ج ۱، ص ۲۸۸، طبری، ج ۲، ص ۳۳۴ اور کامل ابن اثیر، ج ۲، ص ۲۴۶ میں بھی آئی ہے۔

یعنی: ''آج تم پر کوئی ملامت و سرزنش نہیں ہے، اللہ تمہیں بخشے وہ سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے جائیں آپ سب آزاد ہیں۔''[1]

اور جب ''خالد بن ولید'' نے بلاوجہ قبیلہ بنی خزیمہ کے قیدیوں کو قتل کر دیا، اور یہ خبر جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچی تو آپؐ بہت زیادہ رنجیدہ ہوئے اور دو تین بار فرمایا:

''اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَبْرَءُ اِلَیْکَ مِمَّا صَنَعَ خَالِدٌ''

یعنی:: ''خدایا! جو کچھ خالد نے کیا ہے، تیری بارگاہ میں اس سے بیزاری کا اظہار کرتا ہوں''۔

پھر آپؐ نے حضرت علی سے فرمایا: کچھ رقم لیکر اُس قبیلے کے پاس جاؤ اور اُن کے مقتولین کی دیت ادا کرو اور اُن کا جو مال ضائع ہوا ہے، اُس کی قیمت ادا کرتے ہوئے اُن کی رضایت حاصل کرنے کی کوشش کرو''[2]

یہ باتیں تو آج کل کے تہذیب و تمدن کا گہوارہ کہلانے والے صنعتی ممالک میں بھی نظر نہیں آتیں۔ جیسا کہ ''پہلی اور دوسری عالمی جنگ'' کے خاتمے پر دنیا نے فاتح فوجوں کی طرف سے بے شمار جرائم اور الم ناک ترین انتقامی کاروائیاں کو دیکھا، اب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک نیم وحشی قوم میں رہتے ہوئے اس قدر عفو و درگزر اور رحم و کرم کی توفیق کیسے حاصل کی، اس سوال کا جواب اہل فراست ہی دے سکتے ہیں۔ آپؐ غیر انسانی اور خرافاتی کاموں سے اس قدر زیادہ اجتناب فرماتے تھے کہ اگر قدرتی طور پر اس قسم کے کاموں کے مواقع آ بھی جاتے تو آپؐ ان سے اجتناب فرماتے خواہ اس میں آپؐ کو نقصان ہی کیوں نہ اُٹھانا پڑتا۔

آپؐ کے فرزند ارجمند ابراہیم جب فوت ہوتے ہیں تو اسی واقعہ کے ساتھ چاند گرہن کا واقعہ بھی رونما ہو جاتا ہے۔ کچھ لوگوں نے اسے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کرامت اور معجزہ سمجھتے ہوئے کہنا شروع کر دیا: یہ چاند گرہن ابرہیم کی وفات کی وجہ سے ہوا ہے۔ یہ باتیں سن کر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فوراً منبر پر گئے اور فرمایا:

اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ آیَتَانِ مِنْ آیَاتِ اللہِ یَجْرِیَانِ بِاَمْرِہٖ مُطِیْعَانِ لَہٗ، لَا یَنْکَسِفَانِ لِمَوْتِ اَحَدٍ وَلَا لِحَیَاتِہٖ. فَاِذَا انْکَسَفَا اَوْ اَحَدُھُمَا صَلُّوا ثُمَّ نَزَلَ مِنَ الْمَنْبَرِ فَصَلّٰی بِالنَّاسِ صَلَاۃَ الْکُسُوفِ فَلَمَّا سَلَّمَ قَالَ یَا عَلِیُّ قُمْ فَجَھِّزْ اِبْنِی۔

''اے لوگو! سورج اور چاند خدا کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں جو خدا کے فرمان سے جاری ہوئی ہیں اور اس کے فرمان کی مطیع ہیں۔ یہ نہ تو کسی کی موت کی وجہ سے تاریک ہوتی ہیں اور نہ کسی کی زندگی کی وجہ سے، جب خسوف (سورج گرہن یا چاند گرہن) رونما ہو تو نماز پڑھو۔ اس کے بعد آپؐ منبر سے نیچے اُتر آئے اور

---

[1] (سورۂ یوسف/ ۹۲

[2] حبیب السیر، ج۱، ص ۳۸۹

لوگوں کے ساتھ نماز آیات ادا کی اور پھر نماز کے سلام کے بعد فرمایا: اے علیؑ! اُٹھو اور میرے فرزند ابراہیم کے کفن دفن کا انتظام کرو"[1]

اس واقعہ سے پتا چلتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حتیٰ اپنے فرزند کی تدفین کا بھی انتظار نہیں کیا اور اس سے پہلے جلدی سے اس کی روک تھام کی تا کہ اس قسم کی غلط سوچ پیدا ہوتے ہی ختم کردی جائے۔ اگر چہ بظاہر یہ سوچ آپؐ کے مفاد میں تھی، لیکن آپؐ اپنے مقاصد واہداف کی تکمیل اس طرح غلط اور ناجائز طریقے سے نہیں کرنا چاہتے تھے۔

اگر چہ اس سلسلے میں بات بہت لمبی ہوگئی ہے، لیکن یہ نکتہ ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ پیغمبر اسلام نے جنگ کے آداب کے بارے میں بہت زیادہ احتیاط کی تاکید فرمائی ہے اور عملی طور پر خود اس کی پابندی کی ہے اور اس سے بھی مذکورہ بالا بات ثابت ہوتی ہے۔ جب سپاہ اسلام کسی میدان جہاد کی طرف جانے کے لئے تیار ہو رہی تھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُسے ان کلمات کے ساتھ اپنے فرائض کی طرف متوجہ کرتے ہوئے فرمایا: "اللہ کا نام لیکر جاؤ اور اُسی سے مدد طلب کرو اور اپنے پیغمبرؐ کے دین کے مطابق جہاد کرو"۔

اے لوگو! کبھی بھی مکر وفریب کے قریب نہ جانا اور غنائم میں خیانت نہ کرنا، دشمن کے مقتولین کی توہین نہ کرنا، ان کی آنکھیں، کان، ناک اور دوسرے اعضائے بدن نہ کاٹنا۔ بوڑھے مردوں، بوڑھی عورتوں اور بچوں کو قتل نہ کرنا، غاروں اور عبادت گاہوں میں بیٹھے ہوئے راہبوں کو کچھ نہ کہنا، مجبوری کے بغیر درختوں کو جڑوں سے نہ اکھاڑنا، نخلستانوں کو نہ جلانا اور پانی میں غرق نہ کرنا، پھل دار درختوں کو نہ کاٹنا اور فصلوں کو آگ نہ لگانا" حلال گوشت حیوانات کو اپنی غذا کے علاوہ ہلاک نہ کرنا اور کسی بھی صورت دشمن کے پانی کو زہر آلود نہ کرنا اور شب خون مارنے کے حیلے سے پرہیز کرنا۔[2]

خود پیغمبر اکرمؐ ان سب باتوں کے پابند تھے یہاں تک کہ جنگ خیبر میں کئی دنوں تک دشمن کے قلعے مسلمانوں کے قبضہ میں رہے اور انھیں آسانی کے ساتھ فتح نہیں کیا جا سکا۔ اس وقت کسی شخص نے مشورہ دیا کہ میں قلعہ میں جانے والے پانی کا راستہ جانتا ہوں آپؐ کو بتاتا ہوں تا کہ اسے بند کردیا جائے۔ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: "میں ہرگز ان پر پانی بند نہیں کروں گا۔" جب ایک چرواہے نے کہ جس کے پاس یہودیوں کے جانور تھے، کہا: میں یہ سب جانور آپؐ کو دینے کے لئے تیار ہوں۔ تو پیغمبر اکرمؐ اس بات پر راضی نہیں ہوئے کہ وہ شخص اس امانت میں خیانت کرے کہ جو انھوں نے اس کے سپرد کی ہے۔[3]

---

[1] بحار الانوار، ج ۲۲ ص ۱۵۵، حدیث: ۱۳، "باب عدد اولاد النبی"

[2] یہ حدیث مختلف عبارتوں کے ساتھ گوناں گوں کتابوں میں نقل ہوئی ہے، منجملہ "وسائل الشیعہ" ج ۱۱ ص ۴۳، باب آداب اُمراء السرایا واصحابھم، حدیث ۲، ۳

[3] سیرۂ ابن ہشام، ج ۳ ص ۳۴۴

٦۔آپ صکا اپنے مقصد پر ایمان اور ایثار

جھوٹے اور سچے دعویداروں کی شناخت کے لئے ایک اہم قرینہ یہ ہے کہ وہ خود اپنے دعویٰ پر کس قدر ایمان رکھتے ہیں اور اس کے لئے کس قدر ایثار و قربانی دے سکتے ہیں۔ جھوٹے داعی اپنی حقیقت سے آگاہ ہوتے ہیں لہٰذا قدرتی طور پر اپنے ہدف ومقصد کی خاطر زیادہ ایثار سے کام نہیں لیتے۔ اس کے علاوہ بہت آسانی کے ساتھ سودا بازی کرنے اور اپنے دعویٰ میں ردوبدل کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں جبکہ ایک سچا اور حقیقی داعی کبھی بھی اس طرح کے کام نہیں کرتا اور اسے اپنے لئے جائز نہیں سمجھتا۔ درست ہے کہ فقط یہی چیز کافی نہیں ہے، لیکن اس کے ساتھ دوسرے قرائن جوڑنے سے ایک اچھا قرینہ بن سکتا ہے۔

کسی بھی تاریخی کتاب میں نہیں ملتا کہ پیغمبر اسلامؐ نے کسی بھی مقام پر اپنے نظریات سے ہاتھ اٹھایا ہو یا میدان جہاد سے فرار کیا ہو حتیٰ میدان ''احد'' میں جب بہت شدید جنگ ہو رہی تھی اور انتہائی سخت حالات پیدا ہو چکے تھے اور (سب کے سب سوائے امیر المؤمنین علی ـ کے) اکثر اہل لشکر میدان سے بھاگ کر ایک کونے میں پناہ لے چکے تھے لیکن رسول اللہؐ اسی طرح میدان جنگ میں کھڑے رہے اور ان کی پیشانی مبارک اور دندان مبارک زخمی ہو چکے تھے اور بظاہر آپ کے بچنے کی کوئی امید نہیں تھی لیکن اس کے باوجود آپؐ نے استقامت دکھائی۔ جیسا کہ کتاب کے شروع میں گذر چکا ہے کہ حضرت ابو طالبؑ کی بیماری کے دوران جب قریش ان کے پاس آئے اور انھوں نے اللہ تعالیٰ کی توحید سے ہاتھ اٹھانے اور بت پرستی کے خلاف جدوجہد سے صرف نظر کرنے کا مشورہ دیا تو اس کے جواب میں آپؐ نے فرمایا:

"لَوْ وَضَعُوا الشَّمْسَ فِي يَمِينِي وَالْقَمَرَ فِي يَسَارِي عَلَى اَنْ اَتْرُكَ هٰذَا الْاَمْرَ حَتّٰى يُظْهِرَهُ اللّٰهُ اَوْ اُهْلَكَ فِيهِ مَا تَرَكْتُهُ"

''اگر سورج کو میرے دائیں ہاتھ پر اور چاند کو بائیں ہاتھ پر رکھ دیں تا کہ میں اس دعوت سے ہاتھ کھینچ تو میں اس وقت تک ہرگز ایسا نہیں کروں گا جب تک اللہ تعالیٰ اس دین کو ہر جگہ پھیلا نہیں دیتا یا میں اس راستے میں موت کو گلے نہیں لگا لیتا۔''[1]

ایک اور واقعہ میں آیا ہے کہ قریش پیغمبر اکرمؐ کے پاس آئے اور آپؐ کو وعدہ دیا کہ آپؐ کو اس قدر مال و دولت دیں گے کہ آپؐ مکہ کے امیر ترین انسان بن جائیں گے اور جس عورت سے چاہیں گے اس سے آپؐ کی شادی کر دیں گے اور آپؐ کے پیچھے چلیں گے بشرطیکہ آپؐ بتوں کو برا بھلا کہنا چھوڑ دیں اور اگر آپؐ ایسا نہیں کرتے تو ایک اور رائے دینے میں جو آپؐ کے مفاد میں بھی ہے اور ہماری مصلحت بھی اس میں ہے اور یہ وہ کہ ایک سال آپؐ ہمارے خداؤں یعنی ''لات'' و''عزیٰ'' کی پرستش کریں اور ایک سال ہم آپؐ کے خدا کی عبادت کرتے ہیں، پھر دیکھتے ہیں آخر کار کیا ہوتا ہے۔

---

[1] طبری، ج۲،ص ٦٧

اس وقت سورۂ کافرون ''قُلْ يَآأَيُّهَا الْكَافِرُونَ'' نازل ہوئی اور پوری صراحت کے ساتھ پیغمبر اکرمؐ نے انھیں نفی میں جواب دے دیا۔(ایضاً،ص ۷۰)

سورۂ طٰہٰ آیت ۲ کی تفسیر میں آیا ہے:''جب وحی اور قرآن کے نزول کے بعد نبی اکرمؐ نے اس قدر عبادت کی کہ آپؐ کے پاؤں مبارک پرورم آگیا، اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اور آپؐ کواس کام سے منع کرتے ہوئے فرمایا:''ہم نے قرآن تم پر اس لئے نازل نہیں کیا کہ آپ اپنے آپ کو زحمت ومشقت میں ڈال دیں۔'' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپؐ کس حد تک اپنے نظریات اور احکام پر ایمان رکھتے تھے۔ واقعہ مباہلہ میں جب پیغمبر اکرمؐ نے اپنے دشمنوں کو دعوت دی کہ اگر وہ سچ کہتے ہیں تو آئیں میرے ساتھ مباہلہ کریں، اور ہم میں سے ہر ایک خدا سے دعا کرے کہ ہم میں سے جو جھوٹا ہے اس پر عذاب نازل کر کے اسے رسوا کرے۔

یہ واقعہ اپنے مکتب پر آپؐ کے یقین وایمان کی ایک اور بڑی علامت ہے۔ چونکہ پیغمبر اکرمؐ نے اس میں اپنے مقصد کی خاطر قربانی دینے کے لئے مکمل آمادگی کا اعلان کر دیا تھا لیکن دشمن نے یہ کام نہ کرنے میں ہی اپنی عافیت سمجھی چونکہ اسے اپنے مذہب کی بنیادوں کے مضبوط ہونے کا اطمینان نہیں تھا۔

مشرق ومغرب کے مورخین نے مشکلات ومصائب کے مقابلے میں حضرت محمدؐ کی استقامت کا بہت زیادہ تذکرہ کیا ہے جو ایک معمولی انسان کے بس کی بات نہیں تھی۔ مشہور فرانسیسی مستشرق ''گوستاولبن'' لکھتا ہے:''آپؐ کسی بھی قسم کے خطرے سے نہیں ڈرتے تھے اور اس کے باوجود اپنے آپ کو بلاوجہ خطرے میں بھی نہیں ڈالتے تھے۔(تمدن اسلام وعرب، ص ۱۱۹) آنحضرتؐ کے مکتب کے عظیم شاگرد حضرت امیر المؤمنین علی -جنگ کے میدان میں آپؐ کی حالت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

'' كُنَّا اِذَا احْمَرَّ الْبَأْسُ وَلَقِيَ الْقَوْمُ الْقَوْمَ اتَّقَيْنَا بِرَسُولِ اللّٰهِ(ص) فَمَا يَكُونَ اَحَدٌ اَقْرَبَ اِلَى الْعَدُوِّ مِنْهُ''

یعنی:''جب جنگ کی آگ بھڑک جاتی اور دو گروہ ایک دوسرے کے مقابلے میں آجاتے تو ہم رسول اللہؐ کی پناہ میں آجاتے تھے اور ہم میں سے آپؐ سے زیادہ کوئی بھی دشمن کے نزدیک نہیں ہوتا تھا۔''[1]

۷۔ آپؐ پر ایمان لانے والے کن طبقات سے تھے

بُرے لوگ عام طور پر اپنے جیسوں کو ہی اپنے گرد اکٹھا کر لیتے ہیں۔ اگر چہ ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا، لیکن اکثر اوقات یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ:

ذرہ ذرہ کاندر این ارض وسماست
جنس خود را ہمچو کاہ وکھرباست

[1] (بحار الانوار، ج ۱۶، ص ۲۳۲۔ یہی بات تھوڑے سے فرق کے ساتھ نہج البلاغہ کے کلمات قصار، کلمہ نمبر ۹ میں بھی ذکر ہوئی ہے)

جیسا کہ ایک مشہور ضرب المثل سے واضح ہوتا ہے کہ ''جیسی روح ویسے فرشتے''۔ اس کی وجہ بھی واضح ہے چونکہ مفاد پرست اور موقع پرست لوگ ہمیشہ اُنہی کے پیچھے چلتے ہیں جو اُن کے ساتھ سودا بازی کرنے، اُنہیں اہمیت دینے اور اہمیت حاصل کرنے کے لئے تیار ہوتے ہیں تا کہ اپنے ناجائز مفادات حاصل کر سکیں۔ یہ مسئلہ اُس شخص کے نزدیکی، خاص اور رازدار لوگوں کے سلسلے میں تو واضح ہے۔

اگر ہم دیکھتے ہیں کہ اُس کے شخص کے خاص، رازدار اور قابل اعتماد لوگ پاکیزہ اور ایماندار ہیں تو یہ اس مکتب کے پیشوا کی صداقت کی علامت ہے۔ اس کے برعکس اگر بے غیرت، خراب اور بیہودہ قسم کے لوگوں نے اُس کو گھیرے ہوئے ہے تو ہم سمجھ جائیں گے کہ پانی اپنے سرچشمے سے ہی گدلا ہے۔

اب ہم پیغمبر اکرم ﷺ کے مکتب کے اصلی شاگردوں اور آپؐ کے رازداروں اور خواص پر ایک نظر دوڑاتے ہیں۔ سب سے پہلے تو حضرت علی -جیسی ہستی اور اس کے بعد ''سلمان''، ''ابوذر''، ''مقداد''، ''عمار یاسر''، ''صہیب'' اور ''بلال'' (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) وغیرہ جیسے لوگوں کو دیکھتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک تقویٰ وفضیلت، علم وایمان اور زہد و پارسائی کا نمونہ ہے۔ انہی افراد کا ایک اور نمونہ ہمیں ''اصحاب صُفہ'' جیسے پاکیزہ مہاجرین کی صورت میں نظر آتا ہے کہ جو مکہ میں اپنی پوری زندگی سے ہاتھ کھینچ کر اصحاب پیغمبر کی صف میں شامل ہو گئے تھے۔

جبکہ اس دوران وہ معاشی لحاظ سے سخت ترین حالات سے گزر رہے تھے۔ اسی طرح ستر افراد پر مشتمل ایک جماعت اسلام کی تبلیغ کے لئے سرزمین ''نجد'' کی طرف جاتی ہے اور سب کے سب اسی راستے میں جام شہادت نوش کر لیتے ہیں۔ یہ وہ لوگ تھے جو راتوں کو عبادت میں مصروف رہتے تھے اور دنوں کو ایندھن جمع کر کے اپنے ہاتھ کی کمائی اصحاب صُفہ کی خدمت میں پیش کر دیتے تھے۔[1]

آپؐ کے خاص اصحاب میں ایسے لوگ بھی تھے جو معاشرتی مقام ومنزلت اور مادی وظاہری لحاظ سے انتہائی نچلی سطح پر تھے، لیکن اُن کی معنوی اور روحانی خصوصیات کی وجہ سے پیغمبر اسلام ﷺ اُن کا خاص احترام کرتے تھے اور اُنہیں دوسروں پر فوقیت دیتے تھے۔ یہاں تک کہ مخالفین نے اس بات پر سخت اعتراض کرنا شروع کر دیا تھا۔

ایک دن اُن کے بڑے سرداروں میں سے کچھ لوگ آنحضرتؐ کے پاس آئے تو اس وقت سلمان، صہیب، ابوذر، عمار اور خباب (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) جیسے فقیر ونادار لوگ آپؐ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ جب اُنہوں نے یہ منظر دیکھا تو ایک خاص غرور وتکبر کے انداز میں کہا:

''لَوْ نَحَّيْتَ عَنَّا هٰؤُلَاءِ (وَ) رَوَائِحَ صِنَانِهِمْ... جَلَسْنَا نَحْنُ إِلَيْكَ وَأَخَذْنَا عَنْكَ فَلَا يَمْنَعُنَا مِنَ الدُّخُولِ عَلَيْكَ إِلَّا هٰؤُلَاءِ۔''

یعنی: ''اگر آپؐ ان لوگوں اور ان کی ناپسندیدہ بُو کو ہم سے دور کر دیتے تو ہم آپ کے پاس بیٹھتے اور آپ کی

---

[1] منتہی الآمال، چوتھی صدی ہجری کے واقعات۔ یہی بات تھوڑے سے فرق کے ساتھ ابن اثیر کی تاریخ کامل، ج ۲ ص ۱۷۱ میں بھی نقل ہوئی ہے۔

تعلیمات کو سُنتے۔ جو ہمیں آپ کے پاس آنے سے روکتی ہے وہ صرف یہی لوگ ہیں‘‘
تو اس وقت یہ آیہ مجیدہ نازل ہوئی:

"وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ"

یعنی: ’’اور اس طرح پیغمبر اکرم ﷺ کو حکم دیا گیا کہ آپؐ ہمیشہ انہی پاکیزہ دل اور نادار لوگوں کے ساتھ رہیں اور اپنی آنکھیں خود پسند مالداروں کے مال و دولت کی ظاہری زرق و برق پر نہ لگائیں۔‘‘[1]

اس کے بعد والی آیت میں متکبروں کے انہی مطالبات کے جواب میں انتہائی سخت لہجے میں فرمایا:

"وَقُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ إِنَّا أَعْتَدْنَا لِلظَّالِمِينَ نَارًا أَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا"

’’اور کہہ دے کہ یہ تیرے رب کی طرف سے حق ہے جو چاہے ایمان لے آئے (اور اس حقیقت کو مان لے) اور جو چاہے کافر ہو جائے ظالموں کے لئے ہم نے ایسی آگ تیار کر رکھی ہے جس کی قناتیں انھیں ہر طرف سے گھیر لیں گی۔‘‘

اس واضح اور یقینی بیان سے اچھی طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ اسلام کس طبقے کی حمایت کرتا ہے اور کس قسم کے لوگ پر ایمان لانے والوں کی پہلی صف میں شامل تھے۔ قرآن مجید نے پیغمبر اکرم ﷺ کے اردگرد جمع ہونے والے مومن، پاک دل اور نیک افراد کی موجودگی کو آپؐ کی حقانیت کی دلیل قرار دیا ہے اور فرمایا ہے:

"أَفَمَن كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ وَيَتْلُوهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ..."

یعنی: ’’کیا وہ شخص جو اپنے پروردگار کی طرف سے واضح دلیل رکھتا ہے اس کے پیچھے اس کی طرف سے شاہد ہے‘‘ اس شخص کی مانند ہے کہ جس کو یہ فضیلت حاصل نہیں ہے۔ (ہود/۱۷) بہت سے مفسرین کا خیال ہے کہ ’’بَيِّنَة‘‘ سے مراد قرآن یا معجزات ہیں اور ’’شاہد‘‘ سے مراد آپؐ کے مخلص مومنین اور جانثار پیروکار ہیں۔

درحقیقت حضرت علی -جیسی ہستی کا اپنے تمام علمی، معنوی اور اخلاقی مقام و مرتبے کے ساتھ ایمان لانا آپؑ کے نہج البلاغہ سے ہی واضح ہو جاتا ہے۔ اور یہ چیز پیغمبر اکرمؐ کی حقانیت پر سب سے واضح گواہ بن سکتی ہے۔

۸۔ اسلام کا تیزی سے پھیلنا

کسی دین کا تیزی کے ساتھ پھیلنا اور وسیع پیمانے پر عظیم تبدیلیاں لانا بھی اس کی حقانیت اور اس کے اصلی ہونے کی ایک

[1] کہف/۲۸/ اس واقعے کو بہت سے مفسرین اور مورخین نے مختلف عبارتوں کی شکل میں نقل کیا ہے۔ دیکھئے: تفسیر مجمع البیان، تفسیر قرطبی، سورۂ کہف، آیت ۲۸۔

علامت بن سکتا ہے۔ چونکہ اس طرح اثر انداز ا ہونا اسی وقت ممکن ہے جب اس دین اور مکتب کی بنیادیں زندگی کی حقیقتوں اور نظریات اور ایسے قوانین خلقت پر استوار ہوں جن پر انسانوں کی زندگی موقوف ہوتی ہے۔ انسان کی روح و بدن کے ساتھ ہم آہنگی نہ رکھنے والا غیر فطری قانون بہت ہی مشکل سے پیشرفت کرتا ہے اور اگر وہ پیشرفت کر بھی لے تو اس اسے دباؤ اور آمریت سے کام لینا پڑتا ہے مثلاً کیمونزم نے اپنے پروپیگنڈے کے ساتھ ہی واضح ترقی اور پیشرفت شروع کر دی تھی لیکن سب لوگ جانتے ہیں کہ یہ سب کچھ زور وطاقت، بے شمار انسانوں کے خون خرابے اور آمریت کے بل بوتے پر انجام پایا ہے۔

لہٰذا اگر کوئی مکتب فکر گہرائی اور سرعت کے ساتھ خصوصاً معاشرے کے افکار و نظریات کی گہرائیوں میں جا کر پیشرفت کرتا ہے تو یہ اس کی حقیقت اصالت کی علامت ہے سب لوگ جانتے ہیں کہ اسلام نے ابتدائی صدیوں میں ہی بغیر کسی اسلامی فوج کے بہت سے وسیع وعریض علاقوں کو فتح کر لیا تھا۔

بہر حال ایک مختصر سی مدت میں دنیا کے وسیع وعریض علاقوں میں انسانی معاشرے کے ظاہر و باطن میں اسلام کا سرعت کے ساتھ پھیلنا کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں اور پھر دلچسپ یہ کہ اس دین نے ایک انتہائی پسماندہ اور نیم وحشی علاقے میں ظہور کرتے ہوئے اس زمانے کی مہذب ومتمدن دنیا کو اپنے زیر اثر کر لیا۔ اسلام کا وسیع پیمانے پر اس طرح بہت جلد پھیل جانا ابھی تک بڑے بڑے غیر مسلم مؤرخین کے لئے ایک معمہ بنا ہوا ہے یہاں اس کی چند مثالیں پیش کی جا رہی ہیں:

ا۔ مغرب کے تین مشہور دانشور اور کتاب ''تمدن غرب ومبانی آن در شرق'' کے مولف، جب ''پیدائش وگسترش اسلام'' کی فصل تک پہنچتے ہیں تو صراحت کے ساتھ اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''جیسا کہ اسلام ایک صدی سے بھی کم عرصے میں مہذب دنیا کے ایک وسیع حصے پر سایہ افگن ہو گیا تھا، اسلام کے اس طرح سرعت کے ساتھ پھیلاؤ کو سمجھنے کے لئے جتنی بھی کوششیں ہوئیں ہیں اور تاریخ کے اس حصے کے بارے میں جتنا بھی تجزیہ وتحلیل کیا گیا ہے، اس کے باوجود یہ مسئلہ ابھی تک ایک معمے کی شکل اختیار کئے ہوئے ہے۔ (تمدن غرب ومبانی آن در شرق، فصل پیدائش وگسترش اسلام) اس اعتراف سے پتا چلتا ہے کہ سرعت کے ساتھ وسیع پیمانے پر ہونے والی یہ پیش رفت کوئی معمولی چیز نہیں تھی۔

۲۔ مشہور یورپی دانشور خاتون گلیری نے ''پیش رفت سریع اسلام'' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے کہ جو اس مسئلے کے بارے میں ایک اور گواہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ اسلام کے سرعت کے ساتھ پھیلاؤ کو اُسی طرح ایک عام معجزہ شمار کرتی ہیں جس طرح قرآن کو ایک اعجاز آمیز کتاب سمجھتی ہے جو کسی بھی صورت میں حضرت محمدؐ کی خود ساختہ نہیں ہو سکتی چونکہ وہ ایک غیر تعلیم یافتہ عرب تھے۔

۳۔ ایک اطالوی محقق تاریخ ریاضیات کے بارے میں لکھی جانے والی کتاب کی ایک فصل میں ''مسلمانوں کی ریاضیات'' کو ایک عربی معجزے کا عنوان دیتا ہے اور جو کچھ اسلام میں رونما ہوا ہے، اُسے اس قدر سریع اور حیرت انگیز سمجھتا ہے کہ جس کی وضاحت عام منطق اور تعبیرات کے ذریعے نہیں ہو سکتی۔ اس کے بعد وہ مزید لکھتا ہے: یہ جو بعض مسلمانوں نے اسلام اور اس کی ثقافت کے ظہور کو اللہ تعالیٰ کی مشیّت اور تقدیر سے منسوب کیا ہے۔ اس سے درحقیقت اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ انسانی تہذیب وتمدن کی یہ پیشرفت اُس

زمانے کے تقاضوں اور وسائل کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ نہیں تھی۔ اس لئے ہم اس کی توجیہ اور وضاحت پروردگار کی مشیت و تقدیر کے سوا کسی اور چیز سے نہیں کر سکتے۔[۱]

۴۔ مشہور انگریز لکھاری "برنارڈ شا" اپنی ایک کتاب میں "پیغمبر اسلامؐ کی عظمت" کے متعلق لکھتا ہے: "میں نے ہمیشہ دین محمدؐ کو انتہائی احترام کی نگاہ سے دیکھا ہے چونکہ اس دین میں حیرت انگیز تر و تازگی اور فعالیت پائی جاتی ہے۔ میری نظر میں صرف اسلام وہ دین ہے کہ جو زندگی کے مختلف ادوار کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے اور ہر زمانے کے ساتھ ہم آہنگ ہے، ہم قرآن کو کتاب محمدؐ کے عنوان سے اُسی عظمت و اطمینان کے ساتھ دیکھتے ہیں، جس طرح مسلمان اسے خدا کی کتاب جانتے ہیں"[۲]

۵۔ یہی انگریز دانشور ایک اور مقالے میں اسلام کی کشش اور ترقی کے بارے میں پیشگوئی کرتا ہے کہ: "اسلام اپنے معنوی اثرات کی وجہ سے ہر سال مسلسل، مخصوصاً یورپی ممالک میں اپنے پیروکاروں میں اضافہ کر رہا ہے"۔[۳]

اگر ہم اس سلسلے میں مسلمان اور غیر مسلمان مورخین کے تاثرات جمع کرنے لگیں تو شاید ایک بڑی کتاب تالیف کرنی پڑے، لہٰذا اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

۱۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دوسری اخلاقی خصوصیات اس بات کی شاہد ہیں کہ آپؐ ایک مقدس ہدف رکھتے تھے اور ایک الٰہی ماءموریت کی پیروی کر رہے تھے اور آپؐ میں جھوٹے داعیوں اور موقع پرست لوگوں جیسی کوئی خصوصیات نہیں تھیں۔ تقریباً تاریخ کی تمام کتابوں میں خواہ وہ مسلمانوں نے لکھی ہوں یا غیر مسلموں نے، آپؐ کی پاکیزگی اور امانت کی طرف خصوصاً اشارہ کیا گیا ہے۔

یہاں تک کہ ایام جاہلیت میں بھی تمام لوگ آپؐ کو انہی صفات کے ساتھ پہچانتے تھے اور اُنھوں نے آپؐ کو "امین" کا لقب دیا ہوا تھا۔ بلکہ ظہور اسلام کے بعد بھی آپؐ کے مخالفین اپنی امانتیں آپؐ ہی کے پاس رکھتے تھے۔ اسی لئے مدینہ کی طرف ہجرت کے وقت یعنی؛ ظہور اسلام کے بعد تیرہ سال گزرنے کے بعد آپؐ نے حضرت علی -کو حکم دیا کہ وہ مکہ میں ہی رہ جائیں اور لوگوں کی امانتیں اُن کو لوٹا کر پھر مدینہ کی طرف ہجرت کریں۔

بہتر ہے یہ خصوصیات بھی دوسروں کی زبان سے سنیں اور دیکھیں کہ وہ بظاہر آپؐ سے کتنے دور ہونے کے باوجود آپؐ کے بارے میں کس قدر واضح شہادتیں دے رہے ہیں۔ کتاب "عذر تقصیر بہ پیشگاہ محمدؐ" میں انگریز دانشور "جان ڈیون پورٹ" سے نقل کیا گیا ہے کہ "بلا شک وشبہ اگر اُنہیں (محمدؐ کو) دنیا کا ایک نادر ترین انسان اور ایسا پاک ترین نابغہ نہ جانیں جس کی آج تک دنیا نے پرورش کی ہے تو اُنہیں ایک عظیم ترین انسان اور واحد شخصیت کے طور پر ضرور جانیں کہ جس پر براعظم ایشا فخر کر سکتا ہے"۔[۴]

---

[۱] فرہنگ اسلام شناسان خارجی، ج ۱ ص ۶۰، تالیف حسین عبد اللّھی خوروش

[۲] ایضاً، ج ۱ ص ۴۷

[۳] (ایضاً، ج ۲، ص ۵۰۵)

[۴] عذر تقصیر بہ پیشگاہ محمدؐ و قرآن، ص ۱۴

۲۔کتاب ''محمد رسول اللہ ؐ''میں ''اسلام از نظر وُلتر'' نامی کتاب سے نقل کیا گیا ہے کہ ''ناپلئون'' نے ''ڈرامہ ولتر'' کہ جس میں پیغمبر اسلام ﷺ کی ذات اقدس کی توہین کی گئی ہے، پر تنقید کرتے ہوئے کہا ہے: ''ولتر نے انسانی تاریخ اور وجدان کے ساتھ خیانت کی ہے، چونکہ اُس نے محمدؐ کے اخلاق عالیہ کا انکار کیا ہے اور ایک ایسے عظیم انسان کا تعارف ایک اور طرح کے انسان کے عنوان سے کرایا ہے جس نے دنیا والوں کے چہرے کو الٰہی نور سے منور کیا ہے''۔[1]

۳۔اتفاق سے اسی ''وُلتر'' نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں اپنے اس توہین آمیز ڈرامے پر نظر ثانی کی ہے اور واضح الفاظ میں اعتراف کیا ہے کہ ''محمدؐ میں ایک ایسی چیز ہے جس کی وجہ سے سب لوگ اُن کا احترام کرتے ہیں، میں نے اُن کے حق میں بہت زیادہ برائی کی ہے''[2]

۴۔''دائرۃ المعارف برطانیۃ'' نامی کتاب میں کلمہ ''قرآن'' کے تحت یوں آیا ہے: ''محمدؐ کا شمار دنیا کی مذہبی اور دینی شخصیات اور رجال میں دنیا کی سب سے زیادہ کامیاب اور فاتح ترین شخصیات میں ہوتا ہے اور اُن کی رسالت کو بہت ہی زیادہ توفیق اور کامیابی حاصل ہوئی ہے''۔(دایرۃ المعارف بریتانیا، گیارہواں ایڈیشن، مادۂ قرآن)

۵۔مشہور کتاب ''تمدن اسلام و عرب'' کے فرانسیسی مؤلف ''گوستاولبن'' کا کہنا ہے: ''اسلامی عقائد کا سادہ اور واضح ہونا ایک طرف اور دوسری طرف اسلامی دین و مذہب کے اوپر لوگوں کے ساتھ نیکی و عادل پر مبنی طرز عمل کا واضح سکہ بیٹھ جانے کی وجہ سے اس نے پورے روئے زمین کو مسخر کر لیا ہے''

۶۔مشہور فرانسیسی شاعر ''لامارتین'' پیغمبر اکرم ﷺ کی مدح وستایش میں تفصیل بیان کرنے کے بعد کہتا ہے: ''یہ ہیں محمدؐ جن کی عظمت کو جس معیار پر بھی پرکھنا چاہیں گے تو مجبوراً یہی کہنا پڑے گا اس دنیا میں محمدؐ سے زیادہ عظیم انسان کوئی نہیں ہے''۔[3]

۷۔لبنان کے ایک مشہور مادہ پرست طبیب اور لکھاری نے پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں انتہائی بلیغ اشعار کہے ہیں جن میں اُس نے آپؐ کا بہترین مدبر، حکیم، دانشمند، سخاوت و کلام کے مالک، مرد عقل و سیاست اور میدان جنگ و جہاد کے ہیرو کے طور پر تعارف کرایا ہے اور اس سلسلے میں آپؐ کے ایسے اوصاف ذکر کئے ہیں جو اپنی نوعیت کے بے نظیر اوصاف ہیں۔[4]

۸۔اگرچہ بعض مفاد پرست اور خودغرض مغربی مورخین نے پیغمبر اسلام ﷺ کا غیر حقیقی چہرہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن اُن کا جواب وہی ہے جو اُنہی میں سے ایک محقق نے دیا ہے۔اس کا نام ''یوحنا واکنبر ت'' ہے جس نے ''محمد و اسلام'' نامی کتاب میں پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں خلاف حقیقت باتیں لکھنے والے بعض متعصب اور خودغرض لکھاریوں پر تنقید کرتے ہوئے یوں لکھا ہے'

---

[1] محمد رسول اللہ ؐ ص ۱۴۲

[2] ایضاً ص ۱۴۳

[3] ۔تاریخ ترکیہ، بحوالہ ''فرہنگ اسلام شناسان خارجی'' ص ۶۱۔

[4] فرہنگ اسلام شناسان خارجی'' ص ۵۳۴۔

'انسان جس قدر حضرت محمدؐ کے حالات اور گفتار ورفتار کے بارے میں حقیقی باتیں لکھنے والے معتبر، تاریخی حقائق اور موثق وصحیح مصادر کی طرف رجوع کرے تو اس پیغمبر خدا کی بدگوئی کرنے والے ''مارکس'' اور ''بریدر'' جیسے تمام افراد، اُس کی نظر میں بہت ہی حقیر اور کمزور نظر آنے لگتے ہیں''[1]

خلاصہ کلام یہ کہ نہ صرف آپؐ کے پیروکاروں اور محبت کرنے والوں بلکہ آپؐ کے مخالفین اور بیگانہ لوگوں نے بھی آپؐ کی صفات، اخلاقی خصوصیات، ملکات فاضلہ اور فردی واجتماعی زندگی کی قیمتی ترین تعلیمات کے بارے میں اتنا کچھ کہا ہے کہ اگر اُسے جمع کیا جائے تو ایک عظیم الشان کتاب بن جائے۔

اگرچہ ان دس قرائن وعلامتوں کے متعلق ہم نے فقط اشارہ ہی کیا ہے لیکن پھر بھی ان سب قرائن کو اکٹھا کیا جائے تو اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ آپؐ ایک پیغمبر صادق، سچے رسول اور خداوند بزرگ وبرتر کی جانب سے مبعوث شدہ نبی تھے۔حتیٰ آپؐ کے تمام معجزات اور خارق عادت واقعات سے صرف نظر بھی کرلیا جائے تو بھی اس سلسلے میں معمولی سا شک وشبہ نہیں کیا جاسکتا۔اس کے لئے فقط یہی ایک دلیل کافی ہے جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا گیا ہے یہ دلیل اہل فکرومعرفت کے لئے عام معجزات سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

---

[1] فرہنگ اسلام شناسان خارجی'' جلد ۱ص ۱۶۴ بحوالہ ''محمد درنظر دیگران''

بشارتیں اور اشارے

اشارہ

پیغمبر اسلام ﷺ کے قول کی سچائی کو ثابت کرنے والی تیسری دلیل، وہ بشارتیں اور اشارے ہیں جو ''سابقہ آسمانی کتابوں '' میں آئے ہیں۔ اگر چہ ان میں سے بہت سی بشارتیں تعصب کے ہالے میں گم ہو چکی ہیں اور پوری تاریخ کے دوران سابقہ آسمانی کتابوں میں ہونے والی تحریفات کی وجہ سے یا تو حذف ہو چکی ہیں یا اُن میں تبدیلی واقع ہو چکی ہے؛ لیکن اس کے باوجود انہی موجودہ مذاہب کی کتابوں میں جو اس وقت ہماری دسترس میں ہیں، اس سلسلے میں بہت سی نشانیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔

بہت سے قرائن سے پتا چلتا ہے کہ آج کی نسبت ظہور اسلام کے شروع میں یہ نشانیاں اور اشارے کہیں زیادہ واضح طور پر موجود تھے اور قرآن مجید نے بھی بارہا انہی کی وجہ سے ''یہود'' و ''نصاریٰ'' کو ان میں غور وفکر کرنے کی دعوت دی ہے۔ بلا شک وشبہ اگر ایسی چیز موجود نہ ہوتی تو قرآن کے لئے اس صراحت کے ساتھ ان نشانیوں پر اصرار کرنا ممکن نہ ہوتا۔

یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ بہت سی تاریخی کتب کی صراحت کے مطابق چند یہودی گروہ، اِنہی بشارتوں کی وجہ سے سرزمین مدینہ کی طرف آئے تھے جو اُنہوں نے پیغمبر اسلام ﷺ کے ظہور کے بارے میں اپنی کتابوں میں پڑھی تھیں اور آپ ؐ کے عشق اور زیارت کی آرزو کی وجہ سے اُنہوں نے اپنا وطن اور دیار چھوڑ کر مدینہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ حالانکہ حجاز کا ماحول بالعموم اور مدینہ بالخصوص مادی زندگی کے لئے کوئی خاص کشش نہیں رکھتا تھا کہ وہ لوگ تجارت، زراعت یا بھیڑ بکریوں کی پرورش کی خاطر اُسے اپنا وطن بناتے۔

وہ دوسروں کی نسبت اپنے آپ کو اس جدید مذہب کو قبول کرنے کا زیادہ حقدار جانتے تھے جس کا وہ انتظار کر رہے تھے؛ لیکن اسلام کے ظہور کے بعد اپنے ناجائز مفادات کو خطرے میں دیکھنے کی وجہ سے اُن میں سے ایک گروہ نے اپنا ارادہ تبدیل کر دیا اور آخر کار وہ پیغمبر اسلام ﷺ کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور یہ بات قابل تعجب بھی نہیں چونکہ بہت سے دوستوں کی دوستی اور بعض محب قسم کے افراد کے محبت آمیز تعلقات میں بھی یہ چیز مشاہدہ کی جاسکتی ہے۔

اسی اشارے کے ساتھ ہی، ہم قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اُن آیات کی طرف آپ کی توجہ مبذول کراتے ہیں جن میں اسی مطلب کی طرف اشارہ ہوا ہے اور جو یہود ونصاریٰ کی اسی بے توجہی کی وجہ سے سرزنش کر رہی ہیں:

۱۔ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ (بقرہ/۱۴۶۔ انعام/۲۰)

۲۔ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ۫ (اعراف/۱۵۷)

۳۔ وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ

يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ؕ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ (صف/٦)

۴۔ وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۡ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝ (بقرہ/٨٩)

۵۔ وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۠ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ۝ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ (بقرہ/۴۱/۴۲)

ترجمہ

۱۔ وہ لوگ جنہیں ہم نے آسمانی کتاب دی ہے، وہ اس (پیغمبر) کو ایسے پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو۔

۲۔ جو لوگ (خدا کے) اس بھیجے ہوئے نبی ''اُمی'' کی پیروی کرتے ہیں، وہ جس کی صفات کو وہ اپنے پاس موجود کتاب تورات وانجیل میں پاتے ہیں۔

۳۔ اور عیسیٰ ابن مریم - نے جب کہا: اے بنی اسرائیل! میں آپ کی طرف خدا کا بھیجا ہوا ہوں، میں اپنے سے پہلے بھیجی ہوئی کتاب یعنی تورات کی تصدیق کرنے والا ہوں اور ایسے رسول کی بشارت دینے والا ہوں کہ جو میرے بعد آئے گا جس کا نام احمد ہے، جب وہ نبی (احمد) معجزات اور روشن دلائل لے کر اُن کے پاس آیا تو اُنھوں نے کہا یہ تو واضح سحر اور جادو ہے۔

۴۔ اور جب خدا کی طرف سے ان کے پاس ایک ایسی کتاب آئی ہے جو ان نشانیوں کے مطابق ہے، جو ان (یہودیوں) کے پاس ہیں۔ اس ماجرے سے پہلے (وہ خود اس پیغمبر اور اس کی کتاب کے ظہور کی بشارت دیتے تھے، اس پیغمبر کے ظہور کے انتظار میں تھے اور مشرکین کی زیادتیوں کے مقابلے میں) فتح کی اُمید رکھتے تھے (سمجھتے تھے کہ اس پیغمبر کی مدد سے اپنے دشمنوں اور مشرکین پر فتحیاب ہوں گے، ان سب امور کے باوجود) جب کتاب اور وہ پیغمبر جسے پہلے پہچان چکے تھے، ان کے پاس آئے تو اس سے کافر ہو گئے۔ پس خدا کی لعنت ہو ان کافروں پر۔

۵۔ اور جو کچھ میں نے نازل کیا ہے (قرآن) اس پر ایمان لے آؤ جب کہ اس کی پیش کردہ نشانیاں جو کچھ

تمہاری کتابوں میں ہے، اس سے مکمل مطابقت رکھتی ہیں اور اب تم اس کے پہلے منکر نہ بنو اور میری آیات کو کم قیمت پر فروخت نہ کرو (تھوڑے سے فائدے کے لئے ان نشانیوں کو نہ چھپاؤ جو قرآن اور پیغمبر اسلامؐ کے متعلق تمہاری کتابوں میں موجود ہیں) اور (لوگوں سے ڈرنے کے بجائے) صرف مجھ سے ڈرو۔ اور حق کو باطل سے نہ ملاؤ اور حقیقت کو جاننے کے باوجود نہ چھپاؤ۔

وہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اچھی طرح پہنچانتے تھے

قرآن کریم کی دو سورتوں میں سب سے پہلی جو آیت آئی ہے، وہ کہتی ہے: ''آسمانی کتابوں کے پیروکار پیغمبر اکرمؐ کو اچھی طرح پہچانتے ہیں، جیسا کہ وہ اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں''

اَلَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰہُمُ الۡکِتٰبَ یَعۡرِفُوۡنَہٗ کَمَا یَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَآءَہُمۡ ؕ

یعنی؛ ''نہ فقط وہ خود آپؐ کے ظہور اور دعوت سے آگاہ ہیں بلکہ اس کی نشانیوں، خصوصیات اور جزئیات کو بھی جانتے ہیں''

سورۂ بقرہ کی ایک آیت کے آخر میں فرماتا ہے: لیکن اُن میں سے کچھ لوگ حق کو چھپاتے ہیں حالانکہ وہ اس سے واقف ہیں''

''وان فریقاً منهم لیکتمون الحق وهم یعلمون''

عبداللہ بن سلام سے جو علمائے یہود میں سے تھا اور بعد میں اس نے اسلام قبول کرلیا، منقول ہے کہ وہ کہتا تھا: ''میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے فرزند سے بہتر پہچانتا ہوں''

''اَنَا اَعلَمُ بِهٖ مِنِّي بِابنِي'' [1]

ایک دوسری روایت میں آیا ہے کہ: جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو ''عمر'' نے ''عبداللہ بن سلام'' سے کہا: اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ پر یہ آیت نازل کی ہے کہ اہل کتاب اُسے اپنی اولاد کی طرح پہچانتے ہیں، یہ کس طرح کی پہچان ہے۔ عبداللہ بن سلام نے کہا: ہم اُسے اُنہی صفات کے ساتھ پہچانتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے بیان کی ہیں اور جب اُسے تمہارے درمیان دیکھتے ہیں تو اُسے اُسی طرح پہچان لیتے ہیں جس طرح ہم میں سے کوئی اپنے بیٹے کو دوسروں بچوں کے درمیان پہچان لیتا ہے۔ [2]

اس آیت کی مشہور تفسیر جو کہ اس کے ظاہر کے مطابق ہے، وہی ہے جو ہم نے بیان کر دی ہے؛ لیکن اس آیت کی تفسیر میں دو اور احتمال بھی دیئے گئے ہیں اور وہ یہ کہ ''یَعۡرِفُوۡنَہٗ'' میں ضمیر ''نبوت سے آگاہی'' یا ''مسئلہ قبلہ'' کی طرف لوٹتی ہے۔

---

[1] تفسیر کبیر فخر رازی اور تفسیر المنار، مذکورہ آیت کے ذیل میں

[2] روح المعانی، جلد ۷، صفحہ ۱۰۳، مجمع البیان، جلد ۳، صفحہ ۲۸۲، روح البیان، جلد ۳، صفحہ ۱۸

لہٰذا پہلے احتمال کی بنا پر اہل کتاب کے مسئلہ ''نبوت'' سے آگاہ ہونے کی طرف اشارہ ہے اور دوسرے احتمال کے مطابق اُن کا مسلمانوں کے بیت المقدس سے کعبہ کی طرف ''قبلہ کی تبدیلی'' سے آگاہ ہونا ہے اور یہ دونوں احتمال بہت ہی ضعیف ہیں۔ دوسری آیت میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوصاف میں سے نو اوصاف کو ذکر کیا گیا ہے کہ جس میں درحقیقت آپؐ کی حقانیت کے دلائل کو مختلف زاویوں سے پیش کیا گیا ہے۔

جن میں سے بعض میں آپؐ کی دعوت کے اعلیٰ مطالب اور لائحہ عمل کی طرف اشارہ ہے، بعض میں دوسرے قرائن مثلاً آپؐ کے ''امی'' یعنی اَن پڑھ ہونے، ہمدرد و مہربان ہونے جیسے مطالب کی طرف اشارہ ہے، نیز انہی دلائل کے ایک حصے میں سابقہ آسمانی کتب (تورات وانجیل) میں آپؐ کی صفات وعلامات کو بیان کیا گیا ہے۔ لہٰذا فرمایا ہے:

''جو لوگ رسول (خداؐ) جو ایک اُمی (اَن پڑھ) پیغمبر ہیں اور جن کی صفات کو تورات وانجیل میں پاتے ہیں، کی پیروی کرتے ہیں۔ وہی فلاح یافتہ ہیں''

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ

اگر چہ اس آیت میں صراحت کے ساتھ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام نہیں لیا گیا، لیکن اس میں جو صفات ذکر کی گئی ہیں اُن سے واضح ہوتا ہے کہ اس آیت سے مراد آنحضرتؐ ہی ہیں۔ یہ بات کیسے قبول کی جا سکتی ہے کہ قرآن مجید اس قدر صراحت کے ساتھ یہود ونصاریٰ کے حوالے سے بات کرے اور اُن کی کتابوں میں پیغمبر اسلامؐ کی نشانیوں اور اُن کے وجود کے بارے میں دلائل کی اطلاع دے اور پھر یہ مسئلہ حقیقت کے مطابق نہ ہو اور وہ خاموشی اختیار کر لیں۔ یقیناً اگر اس قسم کی نشانیاں اُن کی کتابوں میں موجود نہ ہوتیں تو وہ اس کو پیغمبر اسلامؐ کے خلاف ایک اہم دلیل بنا لیتے اور ہر جگہ شور وشرابہ کرتے اور اگر ایسا کوئی واقعہ رونما ہوتا تو اس کو تاریخ ضرور نقل کرتی۔

بنابریں کم از کم اُن کا یہ سکوت ہی، اُن کی کتابوں میں ان قرائن اور علامتوں کے موجود ہونے کی واضح دلیل ہے۔ اس کے علاوہ بقول فخر رازی اگر اس طرح کی کوئی حقیقت نہ ہوتی تو یہ اسلام سے یہود ونصاریٰ کی نفرت کا موجب بن جاتی اور کوئی بھی عاقل انسان ایسا کوئی قدم نہیں اُٹھاتا جو (خصوصاً دعوت کے سلسلے میں) لوگوں کی نفرت کا سبب بنتا ہو۔[1]

جیسا کہ بعد میں ذکر ہوگا حتیٰ اُن کی موجودہ تحریف شدہ کتابوں میں بھی اس قسم کے دلائل اور علامتیں پائی جاتی ہیں۔ اور یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن یہ نہیں کہتا کہ ''يَجِدُونَ عَلَامَتَهُ وَدَلَائِلَهُ'' (وہ اس کے دلائل اور علامتیں پاتے ہیں) بلکہ قرآن فرماتا ہے: ''يَجِدُونَهُ'' یعنی وہ خود اس پیغمبر کو تورات وانجیل میں پاتے ہیں اور یہ تعبیر یعنی اُن کی کتب میں پیغمبرؐ کا پایا جانا اس مطلب پر بہت ہی واضح طور پر تاکید کر رہا ہے۔

---

[1] تفسیر کبیر فخر رازی، جلد ۱۵، صفحہ ۲۳

بعض روایات میں بھی اسی آیت کے ضمن میں آیا ہے کہ بعض مسلمانوں نے تورات کے دو ماہرین سے جُدا گانہ طور پر اس بارے میں سوال کیا ہے اور اُن دونوں نے پیغمبر اسلام ؐ کے بالکل ایک جیسے اوصاف بیان کئے ہیں۔[1]

۳۔ تیسری آیت میں حضرت عیسیٰ ابن مریم - کی زبان سے ہم پڑھتے ہیں کہ اُنھوں نے انتہائی صراحت کے ساتھ بنی اسرائیل کے سامنے یہ بشارت دی کہ میں خدا کا رسول ہوں اور جو تورات میرے سامنے موجود ہے میں اس کی تصدیق کرتا ہوں اور میرے بعد جو پیغمبر آئے گا کہ اس کا نام احمد ہے، کے بارے میں تمہیں بشارت دیتا ہوں۔

وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ؕ

اور پھر آیت کے آخر میں فرمایا: لیکن جب وہ (پیغمبر اسلامؐ) معجزات کے ساتھ اُن کے پاس آئے تو وہ لوگ کہنے لگے یہ واضح جادو ہے:

فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن مجید معجزات کی مخالفت اور اُس کی طرف سحر و جادو کی نسبت دینے کے سلسلے میں اُن کی باتیں تو نقل کرتا ہے لیکن حضرت ''مسیح'' - کی طرف سے ''احمد'' نامی پیغمبر کے آنے کے بارے میں خبر دیئے جانے کی مخالفت کا کوئی تذکرہ نہیں کرتا اور یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ وہ لوگ اس خبر کا انکار نہیں کرتے تھے۔

۴۔ چوتھی آیت میں ہمیں اس سلسلے میں ایک نیا نکتہ ملتا ہے، چنانچہ قرآن فرماتا ہے: ''جب خدا کی طرف سے ان کے پاس ایک ایسی کتاب آئی ہے جو ان نشانیوں کے مطابق ہے۔ جو ان (یہودیوں) کے پاس ہیں۔ اس ماجرے سے پہلے (وہ خود اس پیغمبر اور اس کی کتاب کے ظہور کی بشارت دیتے تھے اس پیغمبر کی مدد سے اپنے دشمنوں اور مشرکین پر فتحیاب ہوں گے ان سب امور کے باوجود) جب کتاب اور وہ پیغمبر جسے پہلے پہچان چکے تھے، ان کے پاس آئے تو اس سے کافر ہو گئے۔ پس خدا کی لعنت ہو ان کافروں پر۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۫ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾

اس آیت میں اس چیز کی طرف اشارہ ہے کہ جو اس کے شان نزول میں آئی ہے کہ یہودیوں نے اپنی کتابوں میں آنحضرتؐ کی نشانیوں کو دیکھ کر اپنے علاقے چھوڑ کر رسول کی ہجرت کی سرزمین ''مدینہ'' کی طرف ہجرت کی چونکہ اُنھوں نے اپنی کتابوں میں پڑھا ہوا تھا کہ پیغمبر اسلام کا مقام ہجرت (عیر) اور احد کی پہاڑیوں کے درمیان ہوگا۔ (یہ دونوں پہاڑ مدینہ کے اردگرد ہیں) لہٰذا وہ آ کر مدینہ میں رہنے لگے اور پھر اُنھوں نے اپنے بھائیوں کو خط لکھا کہ ہم نے وہ زمین موعود تلاش کر لی ہے تم بھی ہماری طرح کوچ کرو۔ وہ ان سے زیادہ

---

[1] تفسیر قرطبی، جلد ۴، صفحہ ۲۷۳۵ (تلخیص کے ساتھ)

دور نہیں تھے، انہوں نے جواب میں لکھا کہ ہم چونکہ یہاں سکونت اختیار کر چکے ہیں۔ گھر بار اور مال ومتاع کا اہتمام کر چکے ہیں اور یہاں سے اس سرزمین کا کوئی زیادہ فاصلہ بھی نہیں۔ جس وقت پیغمبر موعود ہجرت کر کے آئیں گے ہم بھی تمہارے پاس آ جائیں گے۔ اور جب وہ یہاں کے مقامی قبائل ''اوس'' و ''خزرج'' کے ساتھ لڑتے تھے تو کہتے: ''ہم نئے پیغمبر کے پرچم کے نیچے تم پر فتح حاصل کریں گے''۔ [1]

لیکن افسوس کے ساتھ جب نئے پیغمبر کا ظہور ہوا تو انہوں نے اُسے اپنی خواہشات اور ناجائز مقاصد کے مطابق نہ پایا تو یہ لوگ اُن کی مخالفت کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ان سب باتوں سے پتا چلتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کے ظہور کے مسئلے کو اُن کی کتابوں میں کس قدر واضح انداز میں ذکر کیا گیا تھا۔ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ ''**مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَهُم**'' یعنی: ''ایک ایسی چیز پر گواہ ہے کہ جو ان کے ہمراہ ہے'' کی طرح کے الفاظ قرآن مجید میں دسیوں بار استعمال ہو چکے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ پیغمبر اکرمؐ (تحریف ہو جانے کے باوجود) اُن کی آسمانی کتب کی تائید کرتے تھے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کی صفات اُن علامتوں اور نشانیوں پر منطبق ہوتی تھیں کہ جو اُن (یہود ونصاریٰ) کے پاس تھیں۔

بالفاظ دیگر پیغمبر اسلام ﷺ اور اُن کی آسمانی کتاب میں بالکل وہی صفات تھیں کہ جن سے وہ لوگ پہلے سے باخبر تھے۔ درحقیقت یہ اُن کی آسمانی کتب کی اس لحاظ سے تصدیق تھی کہ وہ کتابیں آپؐ کی صفات کے ساتھ مکمل طور پر ہم آہنگ تھیں۔ اس طرح وہ تمام آیات کہ جن میں اس قسم کی تعبیر استعمال ہوئی ہے، اُن آیات کے زمرے میں آتی ہیں کہ جن کے بارے میں ہم بحث کر رہے ہیں۔

۵۔ اور پھر ہماری مدنظر آخری آیت میں یہودیوں کو مخاطب کر کے پیغمبر اسلام ﷺ کی آسمانی کتاب پر ایمان کی تاکید کرتے ہوئے کہ جو اُن کے نزدیک علامتوں کے مطابق ہے، قرآن فرماتا ہے:

''جو کچھ میں نے نازل کیا ہے (قرآن) اس پر ایمان لے آؤ جب کہ اس کی پیش کردہ نشانیاں جو کچھ تمہاری کتابوں میں ہے اس سے مکمل مطابقت رکھتی ہیں اور اب تم اس کے پہلے منکر نہ بنو''

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ

اگر عرب بت پرست اس کے منکر ہوتے ہیں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، تعجب کی بات اس وقت ہے کہ جب تم (یہودی) اس کا انکار کرتے ہو چونکہ تم سے تو یہ توقع کی جارہی تھی کہ تم سب سے پہلے اس پر ایمان لاؤ گے، کیا تم نے اسی کے شوق دیدار اور اس کے حضور میں حاضری دینے کی خاطر اپنے وطن اور دیار کو نہیں چھوڑا اور مدینہ میں آ کر نہیں بسے اور اس کے ظہور کے انتظار میں دن نہیں گن رہے تھے؟ لیکن اب معاملہ اس کے برعکس ہو گیا ہے اور تم نے سب سے پہلے اس کا انکار کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس کے بعد (قرآن مجید) ان کے اندر اس ''تبدیلی'' کی وجوہات کی طرف اشارہ کرتے فرماتا ہے: اپنے مادی مفادات کی خاطر حقائق کو نہ چھپاؤ:

---

[1] یہ اس شان نزول سے اقتباس ہے کہ جو اہل سنت کی تفسیر ''الدر المنثور'' اور تفسیر عیاشی میں امام جعفر صادقؑ سے نقل ہوا ہے (بہت سے شیعہ وسنی مفسرین نے بھی اسے اس آیت کی تفسیر میں ذکر کیا ہے) اگرچہ بعض مفسرین جیسا کہ فخر رازی نے جملہ ''وَ كَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا'' کے بارے میں متعدد احتمال دیئے ہیں لیکن ان میں سے اکثر اسی معنیٰ میں ہیں وا وپر ذکر ہوا ہے۔

''تم میری آیات کو کم قیمت پر فروخت نہ کرو اور میری مخالفت سے پرہیز کرو''

وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس کے مقابلے میں تم جو بھی قیمت لوگے وہ ناچیز ہوگی خواہ وہ پوری دنیا ہی کیوں نہ ہو۔لیکن تم بہت ہی پست ہمت لوگ ہو چونکہ تھوڑے سے مادی مفادات کی خاطر (مثلاً ایک سالانہ دعوت کی خاطر) اُن آیات کو چھپاتے ہو جن میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نشانیاں پائی جاتی ہیں۔اس کے بعد مزید تاکید کرتے ہوئے فرماتا ہے:

''حق کو باطل سے مخلوط نہ کرو اور حق کو نہ چھپاؤ جب کہ تم اسے جانتے اور اس سے آگاہ ہو''

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۝۴۲

درحقیقت یہودیوں نے اس سلسلے میں چند خلاف ورزیاں کی ہیں:

اول یہ کہ: اُنھوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سب سے پہلے ایمان لانے کا عہد کیا ہوا تھا لیکن اُنھوں نے سب سے پہلے اس (حقیقت) کا انکار کیا اور پہلے کافر قرار پائے۔

دوم یہ کہ: اُنھوں نے حق و باطل کو مخلوط کر دیا تا کہ اس کا چہرہ چھپا سکیں اور لوگوں کو اشتباہ میں ڈال دیں۔

سوم یہ کہ: اُنھوں نے جاں نتے بوجھتے ہوئے ''حق'' کو چھپایا اور آیات الٰہی کو بہت کم قیمت پر فروخت کر دیا۔قرآن مجید میں اور بھی بہت سی آیات میں یہی مطلب بیان ہوا ہے یعنی؛ یہودیوں کی طرف سے ''حقائق کا کتمان'' کیا جانا۔بظاہر وہ سب، آیات نبوت کے کتمان کے مسئلے کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

مذکورہ بالا آیات میں جو کچھ آیا ہے اس سے اچھی طرح استفادہ ہوتا ہے کہ سابقہ (آسمانی) کتابوں میں پیغمبر اسلامؐ کی صفات اور نشانیاں حتیٰ آپؐ کا نام مبارک بھی آیا ہے اور اس ظہور کے بارے میں بہت زیادہ اشارے اور بشارتیں دی گئی ہیں۔اب ہم اُن کتب عہدین (تورات وانجیل) کی طرف جاتے ہیں کہ جو ہماری دسترس میں ہیں تا کہ ان نشانیوں اور اشاروں کی مزید تحقیق کی جا سکے۔

سابقہ کتابوں میں ظہور پیغمبرؐ کے بارے میں بشارت

جیسا کہ اشارہ ہوا ہے کہ یہود ونصاریٰ کی موجودہ کتابوں ہم اس عظیم پیغمبر کی نشانیاں دیکھتے ہیں لیکن یقینا آپؐ کے ظہور سے پہلے اس سے زیادہ مسائل تھے جو اندھے تعصّبات کے ساتھ ناساز گار یا اُن کے سرداروں کے مفادات کے خلاف ہونے کی وجہ سے کتمان کی ظلمتوں کا نشانہ بن گئے ہیں۔''بشارات عہدین'' کے بارے میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں، یا بعض کتابوں کا کچھ حصہ اسی موضوع سے مختص ہے کہ جن کے بارے میں زیادہ تفصیل بیان کرنا ہماری اس مختصر کتاب کے شایان شان نہیں۔فقط چند واضح نمونوں پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے:

ا۔انجیل 'یوحنا' کے تین موارد میں لفظ 'فارقلیط' یا 'فارقلیطا' آیا ہے اس کا فارسی نسخوں میں ''تسلی دینے والا'' ترجمہ ہوا ہے منجملہ ایک

جگہ ہم پڑھتے ہیں: ''میں باپ سے درخواست کرونگا تو وہ تمہیں دوسرا ''تسلی دینے والا'' دے گا جو ابد تک تمہارے ساتھ رہے گا''۔[1]

ایک دوسری جگہ آیا ہے: ''اور جب ''تسلی دینے والا'' (فارقلیطا) آئے گا جسے میں باپ کی طرف سے تمہاری طرف بھیجوں گا، یعنی سچائی کی روح جو باپ کی طرف سے آئے گی وہ میرے بارے میں شہادت دے گی۔[2]

پھر اس کے بعد والے باب میں آیا ہے: لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمھارے لئے مفید ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں گا تو وہ تسلی دینے والا'' (فارقلیطا) تمہارے پاس نہیں آئے گا اگر میں چلا جاؤں تو اُسے تمہارے پاس بھیج دونگا۔[3]

قابل توجہ بات یہ ہے کہ فخر رازی نے اپنی تفسیر کی جلد ۲۹ کے صفحہ ۳۱۳ پر اپنے زمانے کی اناجیل میں سے ''انجیل یوحنا'' سے یوں نقل کیا ہے کہ باب ۱۴ میں کہتے ہیں:

''وَاَنَا اَطْلُبُ لَکُمْ اِلٰی اَبِیْ حَتّٰی یَمْنَحَکُمْ وَیُؤْتِیَکُمْ الْفَارْقِلِیْطَ حَتّٰی یَکُوْنَ مَعَکُمْ اِلَی الْاَبَدِ''

یہ بعینہ وہی عبارت ہے جسے ہم نے اوپر ذکر کیا ہے البتہ یہاں کلمہ ''فارقلیط'' کو واضح طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ یہی مطلب باب نمبر ۱۵، ۱۶ میں کلمہ فارقلیط کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔ ''فارقلیط'' کو یونانی زبان میں ''پیرکلتوس'' یا ''پاراکلتوس'' کہا جاتا ہے، بہت سے عیسائیوں نے اس کی ''تسلی دینے والے'' یا روح القدس'' کے معنیٰ میں تفسیر کی ہے، لیکن کچھ نے ''بہت زیادہ لائق تعریف شخص'' کے معنیٰ میں تفسیر کی ہے جو ''اسم احمد'' کے مترادف ہے۔

جیسا کہ سورۂ صف کی آیت ۶ میں آیا ہے ''میں ایک ایسے رسول کی بشارت دیتا ہوں جو میرے بعد آئے گا اور جس کا نام احمد ہے'' اس کلمے کی دقیق لغوی تحقیق سے ظاہر ہوتا ہے کہ فارقلیط ایک یونانی کلمہ ہے، جس کا لغوی مادہ ''پیرکلتوس'' ہے جس کا معنیٰ ''لائق تعریف شخص'' ہے کہ جس کی جگہ غلطی سے ''پاراکلتوس'' بمعنیٰ ''تسلی دینے والا'' لکھ دیا گیا ہے۔

کتاب ''چراغ'' کے مؤلف (آقائے حسینیان) اپنی ایک چھوٹی سی لیکن انتہائی قیمتی کتاب کے شروع میں پیرس میں طبع ہونے والی ''لامنہ'' کی تالیف ''اناجیل'' نامی کتاب سے انجیل یوحنا کے لاتینی متن کو بعینہ نقل کرتے ہوئے بہت وضاحت کے ساتھ لکھتے ہیں کہ کلمہ ''فارقلیط'' وہاں پر ''پیرکلیت'' کی شکل میں آیا ہے (جس کا عربی میں مطلب احمد اور فارسی میں لائق تعریف شخص ہے) نہ کہ ''پاراکیلت'' کے معنی میں جس کا مطلب ''تسلی دینے والا ہے۔[4]

لیکن افسوس کے ساتھ بعد میں اناجیل کے متون میں پہلی تعبیر کو ختم کرکے دوسری تعبیر استعمال کی گئی ہے۔

---

[1] انجیل یوحنا، باب ۱۴، جملہ ۱۶

[2] ایضاً، باب ۱۵، جملہ ۲۶

[3] ایضاً، باب ۱۶، جملہ ۷

[4] کتاب چراغ، صفحہ ۱

نیز وہ مزید لکھتے ہیں: عیسائی قدماء لفظ ''پیرکلیت'' سے ایک خاص شخص کا نام مراد لیتے تھے چونکہ سریانی ترجموں میں بعینہ وہی لفظ یعنی؛ ''فارقلیط'' کو لایا گیا ہے اور جو عبرانی ترجمہ میرے پاس موجود ہے اور جو میں نے بذات خود دیکھا ہے، اس میں ''فَرقَلیط'' لکھا گیا ہے کیونکہ اُس سے ایک معین انسانی نام مراد لیا گیا ہے اور یہ عبرانی اور سریانی ترجمہ عیسائیوں کے نزدیک بہت ہی اہمیت اور اعتبار کا حامل ہے۔

درحقیقت یہ کلمہ، ''محمدؐ''، ''علیؑ''، ''حسنؑ'' اور ''حسینؑ'' کی مانند ہے کہ جو کسی عبارت کا ترجمہ کرتے وقت کبھی بھی ترجمہ نہیں کیا جاتا مثلاً جملہ: ''جَاءَ عَلِی'' کی جگہ کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ بلند مرتبہ شخص آیا ہے بلکہ کہتا: علی آیا ہے۔ لیکن افسوس کے ساتھ عیسائی علماء نے نبوت پیغمبر اکرم ﷺ کی نبوت کی یہ نشانی مٹانے کے لئے سب سے پہلے ''پیرکلیت'' کو ''پاراکلیت'' میں تبدیل کیا ہے اور پھر اس کو اسم خاص سے نکال کر وصف اور معنی کی شکل دے دی ہے اور اس کی جگہ ''تسلی دینے والا'' رکھ دیا ہے۔ (غور کیجئے)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر اصلی کلمہ ''پیرکلتوس'' ہو تو اس کا معنیٰ ''لائق تعریف شخص'' ہے اور اس کی جگہ غلطی سے ''پاراکلتوس'' بمعنیٰ ''تسلی دینے والا'' لکھ دینا بعید نہیں ہے، البتہ جان بوجھ کر اس کی غلط تفسیر کا احتمال بھی بہت زیادہ ہے۔ ''علامہ شعرانی'' مرحوم نے اپنی کتاب ''نثر طوبیٰ'' میں لکھا ہے کہ ''میں نے ایک یونانی لغت کی کتاب میں دیکھا ہے کہ ''فارقلیط'' کا معنیٰ ''لائق تعریف'' اور ایسے شخص کے عنوان سے ترجمہ کیا گیا ہے کہ جسکا نام ہر زبان پر ہے اور اُسے اچھائی کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ مزید لکھتے ہیں: انگلش اور فرانسیسی زبان میں یونانی لغت کی کتابیں ہر جگہ مل جاتی ہیں (آپ اُن کی جانب رجوع کر سکتے ہیں) عیسائی اسے تصحیف کے ساتھ پڑھتے ہیں اور ''تسلی دینے والا'' ترجمہ کرتے ہیں اور ہم نے خود بھی اس سلسلے میں ایک مستقل کتاب لکھی ہے''۔[1]

''ڈاکٹر قریب'' کی تالیف ''فرہنگ لغات قرآن'' میں لکھا ہے: روایات سے پتا چلتا ہے انبیائے عظام میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی کتاب میں آنحضرت (پیغمبر اسلام ﷺ) کی بشارت دی ہے پھر وہ بہت سی اسلامی کتابوں سے نقل کرتے ہیں کہ انجیل میں آنحضرتؐ کا نام ''الفارقلیطا'' آیا ہے کہ جس کا معنیٰ احمد ہے''۔[2]

کتاب ''التحقیق فی کلمات القرآن الکریم'' میں آیا ہے: ''کہ اصل میں یہ کلمہ (فارقلیط) یونانی زبان میں ''پیرکلیت'' میں تحریف ہوا ہے جس کا معنیٰ ''احمد اور پسندیدہ'' ہے، اس کے بعد یہ ''پاراکلیت'' میں تحریف ہو گیا ہے کہ جس کا مطلب ''تسلی دینے والا'' ہے''۔[3]

اس کے علاوہ خود انجیل کی بعض تعبیرات میں کچھ ایسے جملات ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کلمہ کو جس طرح بھی ادا کیا جائے، اس سے ایک ایسا پیغمبر ہی مراد ہے جو بعد میں ظاہر ہوگا اور جس کا دین اور مذہب ہمیشہ رہے گا۔

یہ جملہ کہ ''میں باپ سے درخواست کرونگا تو وہ تمہیں دوسرا ''تسلی دینے والا'' دے گا جو ابد تک تمہارے ساتھ رہے گا'' اس

---

[1] نثر طوبی، جلد ۱، صفحہ ۱۹۷

[2] جلد ۱، صفحہ ۳۵۱

[3] التحقیق، جلد ۲، صفحہ ۳۰۵ (مادہ حمد)

بات کی واضح دلیل ہے کہ ''دوسرے تسلی دینے والے'' سے مراد ایک ایسا نبی ہے کہ جس کا دین اور مذہب ابدی اور جاودانی ہے۔[۱]

اور پھر وہ کہتا ہے: ''لیکن وہ تسلی دینے والا یعنی؛ روح القدس باپ اسے میرے نام پر بھیجے گا، وہی تمہیں ہر چیز سکھائے گا''۔[۲]

ظاہر ہے کہ یہ تسلی دینے والا ایک پیغمبر ہے نہ کہ روح القدس اور اس کی تعلیمات میں تمام حقائق پوشیدہ ہونگے اور کوئی بھی ایسی چیز باقی نہیں رہے گی جو بیان نہ کی گئی ہو۔ بہرحال اس میں کوئی شک وتردید نہیں کہ کلمہ ''احمد'' یا اسی جیسا کوئی لفظ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کی انجیلوں میں موجود تھا، اگر ایسا نہ ہوتا تو سورۂ صف کی آیت نمبر ۶ پر وہ شدید اعتراض کرتے اور یہ بات اسلام کے خلاف ایک اہم دستاویز بن سکتی تھی۔ لیکن تاریخ اسلام میں اس طرح کی کوئی چیز نقل نہیں ہوئی۔

بنابریں اس سے واضح ہو گیا کہ جب بعض عیسائی علماء نے اپنے مقام اور منصب کو خطرے میں دیکھا تو اُنہوں نے اس کلمے کو دوسرے معانی میں تبدیل کرنے کا ارادہ کر لیا، لیکن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہور کے صدیوں بعد بھی بعض علاقوں میں موجود عیسائیوں کی کتابوں میں یہی نام مقدس دیکھا گیا ہے۔

اس بات کا گواہ وہ بیان ہے جو تازہ مسلمان ہونے والے ایک عیسائی دانشور نے اپنی کتاب ''اُنیس الاعلام'' کے مقدمے میں ذکر کیا ہے جو کہ ایک تحقیقی کتاب ہے۔ وہ دانشور خود علمائے نصاریٰ میں سے تھے۔ انہوں نے اپنی تعلیم عیسائی پادریوں اور علمائے نصاریٰ سے مکمل کی تھی اور ان کے ہاں ایک بلند مقام پیدا کیا تھا وہ اس کتاب کے مقدمے میں اپنے مسلمان ہونے کے عجیب وغریب واقعے کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

''بڑی جستجو، زحمتوں اور کئی ایک شہروں میں پھرنے کے بعد میں ایک عظیم پادری کے پاس پہنچا جو زہد وتقویٰ میں ممتاز تھا۔ کیتھولک فرقے کے بادشاہ وغیرہ اپنے مسائل کے لئے اس سے رجوع کرتے تھے۔ ایک مدت تک میں اس کے پاس عیسائیت کے مختلف مذاہب کی تعلیم حاصل کرتا رہا۔ اس کے بہت سے شاگرد تھے لیکن اتفاقاً مجھ سے اسے خاص لگاؤ تھا۔ اس کے گھر کی سب چابیاں میرے ہاتھ میں تھیں صرف ایک سٹور کی چابی اس کے اپنے پاس ہوا کرتی تھی اس دوران میں ایک دن اس پادری کو کوئی بیماری پیش آئی تو مجھ سے کہا کہ شاگردوں سے جا کر کہہ دو کہ آج میں درس نہیں دے سکتا۔

جب میں طالب علموں کے پاس آیا تو دیکھا کہ وہ بحث مباحثہ میں مصروف ہیں یہ بحث سریانی کے لفظ ''فارقلیطا'' اور یونانی زبان کے لفظ ''پیریکلتوس'' کے معنی تک جا پہنچی اور وہ کافی دیر تک جھگڑتے رہے۔ ہر کسی کی الگ رائے تھی۔ واپس آنے پر استاد نے مجھ سے پوچھا آج کیا مباحثہ کرتے رہے ہو تو میں نے لفظ فارقلیطا کا اختلاف اس کے سامنے بیان کیا وہ کہنے لگا: تو نے ان میں کس قول کا انتخاب کیا ہے۔ میں نے کہا فلاں مفسر کے قول کا جس نے اس کا معنی ''مختار'' بیان کیا ہے میں نے پسند کیا۔

استاد پادری کہنے لگا تو نے کوتاہی تو نہیں کی لیکن حق اور واقعہ ان تمام کے خلاف ہے کیونکہ اس کی حقیقت کو راسخون فی العلم کے

---

[۱] انجیل یوحنا، باب ۱۴، جملہ ۱۶

[۲] ایضاً، جملہ ۲۶

علاوہ دوسرے لوگ نہیں جانتے اور ان میں سے بھی بہت کم اس حقیقت سے آشنا ہیں۔ میں نے اصرار کیا کہ اس کے معنی مجھے بتلائیے۔ وہ بہت رویا اور کہنے لگا: میں کوئی چیز تم سے نہیں چھپاتا۔لیکن اس نام کے معنی معلوم ہونے کا نتیجہ تو بہت سخت ہوگا کیونکہ اس کے معلوم ہونے کے ساتھ ہی مجھے اور تمہیں قتل کر دیا جائے گا۔اب اگر تم وعدہ کرو کہ کسی سے نہیں کہو گے تو میں اسے ظاہر کر دیتا ہوں۔

میں نے تمام مقدسات مذہبی کی قسم کھائی کہ اسے فاش نہیں کروں گا تو اس نے کہا کہ مسلمانوں کے پیغمبر کے ناموں میں سے ایک نام ہے اور اس کے معنی ''احمد'' اور ''محمد'' ہیں اس کے بعد اس نے اس چھوٹے کمرے کی چابی مجھے دے دی اور کہا کہ فلاں کا دروازہ کھولو اور فلاں فلاں کتاب لے آؤ۔ میں کتابیں اس کے پاس لے آیا۔ یہ دونوں کتابیں رسول اسلام کے ظہور سے پہلے کی تھیں اور چمڑے پر لکھی ہوئی تھیں۔ دونوں کتب میں ''فارقلیطا'' کا ترجمہ ''احمد'' اور ''محمد'' کیا گیا تھا۔

اس کے بعد استاد نے مزید کہا کہ آنحضرتؐ کے ظہور سے پہلے علمائے نصاریٰ میں کوئی اختلاف نہ تھا کہ فارقلیطا کے معنی احمد اور محمد ہیں لیکن ظہور محمدؐ کے بعد اپنی سرداری اور مادی فوائد کی بقا کے لئے اس کی تاویل کر دی اور اس کے لئے دوسرے معنی گھڑ لئے حالانکہ وہ معنی یقیناً صاحب انجیل کی مراد نہیں۔ میں نے سوال کیا کہ عیسائی دین کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں۔ اس نے کہا دین اسلام کے آنے سے منسوخ ہو گیا ہے اس جملے کا اس نے تین مرتبہ تکرار کیا۔

پس میں نے کہا کہ اس زمانے میں طریق نجات اور صراط مستقیم کون سا ہے۔اس نے کہا منحصر ہے محمد کی پیروی و اتباع میں۔ میں نے کہا کیا اس کی پیروی کرنے والے اہل نجات ہیں۔ اس نے کہا ہاں خدا کی قسم (اور تین مرتبہ قسم کھائی) پھر استاد نے گریہ کیا اور میں بھی بہت رویا اور اس نے کہا آخرت اور نجات چاہتے ہو تو ضرور دین حق قبول کر لو میں ہمیشہ تمہارے لئے دعا کروں گا اس شرط کے ساتھ کہ قیامت کے دن گواہی دو کہ میں باطن میں مسلمان اور حضرت محمد کا پیروکار ہوں اور علمائے نصاریٰ کے ایک گروہ کی باطن میں مجھ جیسی حالت ہے اور میری طرح ظاہراً اپنے دنیاوی مقام سے دست بردار نہیں ہو سکتے ورنہ کوئی شک و شبہ نہیں کہ اس وقت روئے زمین پر دین خدا دین اسلام ہی ہے۔[1]

آپ دیکھیں کہ علمائے اہل کتاب نے پیغمبر اسلامؐ کے ظہور کے بعد اپنے ذاتی مفادات کی خاطر آنحضرتؐ کے نام اور نشانیوں کی اور دیگر تاویلیں کر دی ہیں۔''

سوال: یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کا مشہور نام ''محمد'' ﷺ ہے جبکہ سورۂ صف کی آیت ۶ میں ''احمد'' کے نام سے آپؐ کو یاد کیا گیا ہے۔ یہ دونوں الفاظ اگرچہ معنیٰ و مفہوم (جس کی ستائش کی گئی ہو) کے اعتبار سے آپس میں کچھ زیادہ فرق نہیں رکھتے، لیکن بظاہر دو مختلف نام ہیں۔ بنابریں اگر ''فارقلیطا'' کا معنیٰ بھی ''ستائش کیا گیا'' لیں تو ان ہر دو ناموں کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے لیکن قرآنی تعبیر (احمد) پیغمبر ﷺ کے مشہور نام کے ساتھ سازگار نہیں۔

جواب: اس سوال کے جواب میں ضروری ہے درج ذیل نکات کی طرف توجہ کی جائے:

۱۔ تاریخوں میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ بچپن سے ہی دو نام رکھتے تھے۔ یہاں تک کے لوگ بھی آپ کو دو ناموں سے پکارا کیا

---

[1] کتاب ''انیس الاعلام'' ھدایت دوم مقدمہ کتاب سے تھوڑے سے فرق کے ساتھ اقتباس

کرتے تھے۔آپ کا ایک نام ''محمدؐ'' اور دوسرا نام ''احمدؐ'' تھا۔ پہلا نام آپ کے جدامجد عبد المطلب نے اور دوسرا نام آپ کی والدہ محترمہ جناب آمنہ نے انتخاب کیا تھا۔ یہ بات سیرۂ حلبیہ میں تفصیل کے ساتھ ذکر ہوئی ہے:

۲۔جن لوگوں نے پیغمبر اسلامؐ کو بارہا اس نام سے یاد کیا ہے ان میں سے ایک آپ کے چچا ابوطالب تھے۔آج بھی وہ کتاب جو دیوان ابوطالب کے نام سے ہمارے پاس موجود ہے اس میں بہت سے ایسے اشعار نظر آتے ہیں کہ جن میں پیغمبر گرامی کو ''احمد'' کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔مثلاً:

ارادوا قتلَ "اَحمَدَ" ظَالِمُوهُم
وَلَيسَ بِقَتلِهِم فيهِمُ زَعيمٌ

ان کے اوپر ظلم کرنے والے احمدؐ کے قتل کا ارادہ رکھتے تھے۔لیکن اس کام کے لیے کوئی رہبر انہیں مل نہ سکا۔

وَ اِنْ كَانَ "اَحْمَدُ" قَدْ جاءَهُم
بِحَقٍّ وَ لَم يَأْتِهِم بِالْكَذِبِ

احمدؐ قطعی طور پر ایک دین حق لے کر ان کے پاس آیا ہے۔اور وہ ہرگز جھوٹا دین لے کر ان کے پاس نہیں آیا۔[1]

لَقَدْ اَكْرَمَ اللهُ النَّبِيَّ مُحَمَّداً
فَاَكْرَمُ خَلْقِ اللهِ فِي النّاسِ اَحْمَدُ

خدا نے اپنے پیغمبر محمدؐ کو مکرم ومحترم قرار دیا ہے۔اسی لیے لوگوں کے نزدیک مخلوق خدا میں سب زیادہ گرامی احمدؐ ہے۔[2]

۳۔پیغمبر کے ہم عصر مشہور شاعر ''حسان بن ثابت'' کے اشعار میں بھی یہ تعبیر نظر آتی ہے۔

وَمُفْجَعَةٌ قَدْ شَفَّها فَقْدُ اَحْمَدَ
فَظَلَّتْ لِاٰلاءِ الرَّسُولِ تُعَدِّدُ

وہ مصیبت زدہ جسے احمدؐ کے فقدان نے کمزور کیا تھا۔وہ ہمیشہ رسول خدا کے کرم نوازی اور عنایتوں کو شمار کیا کرتا تھا۔[3]

ابوطالب یا انکے علاوہ دوسرے افراد کے وہ اشعار جن میں (محمدؐ کے بجائے) احمدؐ کا نام آیا ہے اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کو یہاں

---

[1] دیوان ابوطالب صفحہ ۲۵،۲۶

[2] تاریخ ابن عساکر،جلد ا،صفحہ ۲۷۵

[3] دیوان حسان بن ثابت صفحہ ۵۹۔

نقل کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ہم اس بحث کو دوعمدہ اشعار کے ساتھ ختم کرتے ہیں جوابوطالب کے فرزند علیؑ نے کہے ہیں:۔

اَتَأمُرُنی بِالصَّبْرِ فی نَصْرِ "اَحْمَدَ"
وَوَاللہِ ما قُلْتُ الَّذی قُلْتُ جازِعاً

کیاتو مجھ سے یہ کہتا ہے کہ میں احمد کی مدد ونصرت میں صبر سے کام لوں۔خدا کی قسم! میں نے جو کچھ کہا ہے وہ جزع وفزع اور بے صبری کی بنا پرنہیں کہا۔

سَاَسْعٰی لِوَجْہِ اللّٰہِ فی نَصْرِ "اَحْمَدَ"
نَبِیِّ الْھُدیٰ الْمَحْمُودِ طِفْلاً وَ یافِعاً

میں تو خدا کے لئے احمدؐ کی نصرت میں کوشش کرتا ہوں۔وہی پیغمبر ہدایت جو بچپن اور جوانی میں ہمیشہ محمود اور قابل تعریف تھا۔

۴۔جو روایات معراج کے موضوع میں آئی ہیں ان میں کثرت سے آیا ہے کہ خدا نے پیغمبر اسلام کو شب معراج ''احمدؐ'' کے نام سے خطاب کیا۔شاید اسی وجہ سے یہ مشہور ہو گیا ہے کہ آنحضرتؐ کا نام آسمانوں میں احمدؐ اور زمین میں محمدؐ ہے۔ایک حدیث میں امام محمد باقرؑ سے مروی ہے کہ پیغمبر اسلام کے دس نام تھے ان میں سے پانچ قرآن میں آئے ہیں۔''محمد''،''احمد''،''عبداللہ''،''یٰس''و''ن''[۱]

جب پیغمبرؐ نے سورہ صف کی مذکورہ آیات کو مدینہ ومکہ کے لوگوں کے سامنے پڑھا تو یقینی طور پر یہ اہل کتاب کے کانوں تک بھی پہنچیں۔مگر مشرکین اور اہل کتاب میں سے کسی نے یہ اعتراض نہیں کیا کہ انجیل تو احمدؐ کے آنے کی بشارت دیتی ہے اور تمہارا نام محمدؐ ہے۔یہ سکوت خود اس ماحول میں اس نام کے شہرت کی دلیل ہے۔اگر کوئی اعتراض ہوا ہوتا تو وہ ہمارے لیے بھی نقل ہوتا، کیونکہ دشمنوں کے اعتراضات تاریخ میں موجود ہیں یہاں تک کہ ایسے موارد میں بھی جو بہت چبھنے والے ہیں۔اس تمام بحث سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ''احمدؐ''، پیغمبر اسلامؐ کے مشہور ناموں میں سے تھا۔

۲۔ایک دوسری بشارت توریت سفر تکوین و پیدائش، فصل ۷ میں ہے کہ جس کی نشانیاں پیغمبر اسلام ﷺ کے علاوہ کسی اور پر منطبق نہیں ہوتیں لہٰذا ۱۷ تا ۲۰ کے جملات میں یوں آیا ہے:''اور ابراہیم نے خدا سے کہا کاش اسماعیل تیرے حضور میں زندہ رہے۔اسماعیل کے بارے میں تمہاری دعا سن لی، ہم نے اسے برکت دی اور اسے بہت زیادہ پھولنے پھلنے والا قرار دیا چنانچہ اس کی نسل سے بارہ سردار پیدا ہوں گے اور انھیں ہم بہت بڑی امت قرار دیں گے'' کتاب ''انیس الاعلام'' میں تورات کے انہی جملات کا متن نقل کیا گیا ہے کہ جو عبری زبان میں تھا، اس کے ترجمے میں یوں لکھا ہے:''۔۔۔اور اُسے ''ماد ماد'' کے ساتھ پھلنے پھولنے والا اور بزرگوار قرار دیا اور اس کی نسل سے بارہ امام ہوں گے اور اُس کو عظیم اُمت بنائیں گے''اس کے بعد مزید کہتے ہیں:''ماد ماد'' عبرانی زبان میں محمد ﷺ ہی ہیں۔[۲]

---

[۱] الغدیر، جلد ۷، صفحہ ۳۵۸۔

[۲] انیس الاعلام، جلد ۵، صفحہ ۶۹

کیونکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسلماً حضرت اسماعیل -کی نسل سے ہیں اور مذکورہ بشارت میں بھی آیا ہے کہ اُن کی ایک عظیم اُمت ہو گی اور اسی میں بارہ سردار اور امام پیدا ہوں گے۔ اس سے واضح ہوتا ہے اس کا مصداق سوائے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اور کوئی نہیں ہے۔ اور اگر کلمہ ''ماد ماذ'' بھی اسکے ساتھ ضمیمہ کر دیں جو کہ عبری متن میں آیا ہے اگرچہ عربی سے فارسی ترجمے میں اسے نہیں لایا گیا، تو بات مزید روشن ہو جائے گی۔

اور جب بھی کہا جائے کہ ''یہ بارہ سردار اور امام'' اور یہ عظیم اُمت تو ممکن ہے اس سے حضرت موسیٰ -اور بنی اسرائیل کے بارہ اسباط کی طرف اشارہ ہو جو کہ درحقیقت اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم -کو حضرت موسیٰ- کے ظہور کی بشارت دی ہے تو اس کا جواب بھی واضح ہے کیونکہ حضرت موسیٰ -اور بنی اسرائیل کے اسباط حضرت اسحاق -کے خاندان سے ہیں جبکہ مذکورہ بالا عبارت میں خاندان اسماعیل کا تعارف کرایا گیا ہے جس کا مصداق پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

۳۔ ''تورات'' کے سفر پیدائش باب ۱۰، شمارہ ۱۰ میں یوں آیا ہے: ''عصای سلطنت یہودا سے، اور ایک فرمان روا اس کے پیروں کے آگے سے قیام کرے گا تا اینکہ ''شیلوہ'' آجائے کہ اس پر تمام امتیں اکٹھا ہو جائیں گی''۔ اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ''یہودا'' کی حاکمیت اور بنی اسرائیل کی حکومت ''شیلوہ'' کے ظاہر ہونے تک جاری رہے گی اور اُمتیں اس کے اردگرد جمع ہو جائیں گی، لیکن ''شیلوہ'' سے مراد کیا اور کون ہے؟ یہودی اور عیسائی لکھاریوں نے بہت سے احتمالات دیئے ہیں کہ جن میں سے اکثر مذکورہ بالا جملے کے ساتھ سازگار نہیں ہیں۔

منجملہ یہ کہ ''شیلوہ'' استراحت کا مقام یا شمال ''بیت ایل'' میں ایک شہر ہے یا وہ مقام ہے کہ جسے اب ''سیلون'' کہتے ہیں۔ لیکن بطور مسلم آنے اور اس کے گرد اُمتوں کے جمع ہونے کی تعبیر کسی شخص کی طرف اشارہ ہے نہ کسی مقام اور مکان کی طرف۔ کتاب ''قاموس'' کا مئولف مسٹر ہاکس امریکائی اس لفظ کے مختلف معانی بیان کرتے ہوئے اس کا ایک معنیٰ ''فرستادہ'' ذکر کرتا ہے کہ جو کلمہ رسول یا رسول اللہ کے ساتھ سازگار ہے۔

یہاں فقط ممکن ہے ہم کہہ سکیں کہ تورات کی یہ بشارت ''حضرت مسیحؑ'' کے ظہور کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ یہ کہا گیا ہے لیکن ''اُنیس الاعلام'' میں بقول فخر الاسلام کے یہ احتمال صحیح نہیں ہے چونکہ حضرت مسیح -ماں کی طرف سے ''یہودا'' کی اولاد سے ہیں بنا بریں اُن کی حاکمیت، یہودا ہی کی حکمرانی کا جاری رہنا ہے اور اس صورت میں اس کا مصداق سوائے حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کوئی اور نہیں ہے جو رسول خداؐ ہیں اور اُن کے ظہور کے ساتھ ہی ''آل یہود'' کی حکومت کی بساط خصوصاً مدینہ، خیبر، شامات اور دوسرے بہت سے علاقوں سے لپیٹ دی جائے گی۔[1]

البتہ کتب عہدین سے اور بھی بہت سی بشارتیں نقل کی گئی ہیں جن کی تفصیل بہت طولانی ہو جائے گی۔ جن میں سے بعض پر اعتراض ہو سکتا ہے، جو لوگ اس بارے میں مزید تحقیق کرنا چاہتے ہیں وہ کتاب ''انیس الاعلام''، ''بشارات عھدین'' اور ''البشارات والمقارنات'' کا مطالعہ کریں۔

---

[1] انیس الاعلام، جلد ۵، صفحہ ۷۳

قرآن میں خاتمیت

اشارہ

''خاتمیت'' کا موضوع یعنی اور یہ کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے آخری پیغمبر ہیں، اُن موضوعات میں سے ہے جس پر تمام مسلمانوں کا عقیدہ ہے خواہ اُن کا تعلق کسی مذہب اور گروہ سے بھی ہے۔ اس مسئلے سے نہ فقط علماء آگاہ ہیں بلکہ مسلمانوں کا ہر فرد اس کا معتقد ہے اور اسے اصطلاحاً ''ضروریات اسلام'' میں سے شمار کیا جاتا ہے۔ جو شخص بھی مسلمانوں کے ساتھ کچھ عرصہ ہی زندگی گذار لے وہ جان لیتا ہے کہ وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ کا آخری پیغمبر سمجھتے ہیں۔ اس عقیدے کا سرچشمہ خود ''قرآن مجید'' اور ''اسلامی روایات'' ہیں کیونکہ یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں کہ جسے فقط عقلی دلائل سے ثابت کیا جا سکے۔ یقیناً قرآن مجید کو ایک آسمانی کتاب اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ کی طرف سے بھیجے ہوئے رسول کے طور پر قبول کرنے کے بعد، اس سلسلے میں اُن کے قول اور فرمان پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

اسی لئے سب سے پہلے ہم قرآنی آیات کی طرف رجوع کرتے ہیں، پھر تاریخی شواہد اور اسلامی روایات کو پیش کرتے ہیں اور آخر میں اسلام کے مخالفین کی طرف سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاتمیت کے بارے میں کئے جانے والے اعتراضات کا جواب دیتے ہیں۔ جو آیت وضاحت کے ساتھ اس موضوع پر گواہی دیتی ہے وہ سورۂ احزاب کی آیت نمبر ۴۰ ہے:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۴۰﴾

''حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہارے مردوں میں سے کسی کے بھی باپ نہیں، لیکن اللہ کے رسول ہیں اور خاتم النبیین ہیں اور خدا ہر چیز سے اچھی طرح آگاہ ہے''۔

علماء نے اس سلسلے میں بہت سی دوسری آیات بھی ذکر کی ہیں کہ اگر اُن کی قطعی دلالت قبول نہ بھی کی جائے تو بھی کم از کم اُن میں اس بارے میں کچھ اشارے ضرور پائے جاتے ہیں:

۱۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَآءَهُمْ ۚ وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ﴿۴۱﴾ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ؕ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ﴿۴۲﴾ (سورۂ فصلت/ ۴۱، ۴۲)

۲۔ تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرَا ﴿۱﴾ (سورۂ فرقان/ ۱)

۳۔ وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ؕ (سورۂ انعام/ ۱۹)

۴۔ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸﴾

(سورۂ سبا/۲۸)

۵۔ قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (سورۂ اعراف/۱۵۸)

۶۔ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ (سورۂ انعام/۹۰)

۷۔ وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (سورۂ انبیاء/۱۰۷)

ترجمہ

۱۔ جولوگ ذکر (قرآن) کے اپنے پاس آجانے کے بعد اس کے منکر ہو گئے (وہ بھی ہم سے نہیں چھپ سکیں گے) اور یہ ایک ایسی کتاب ہے جو قطعاً نا قابل شکست ہے کوئی باطل نہ تو اس کے سامنے سے آسکتا ہے اور نہ ہی اس کے پیچھے سے کیونکہ یہ صاحب حکمت اور قابل تعریف اللہ کی طرف سے نازل کی گئی ہے۔

۲۔ لازوال اور بابرکت ہے وہ ذات جس نے قرآن اپنے بندے پر نازل فرمایا تا کہ وہ عالمین کو (عذاب خدا سے) ڈرائے۔

۳۔ اس نے یہ قرآن میرے اوپر وحی کیا ہے تا کہ تمہیں اور تمام افراد کو ڈراؤں جن تک یہ قرآن پہنچے۔

۴۔ اور ہم نے تجھے تمام لوگوں کے لئے (ثواب کی) بشارت اور (عذاب سے) ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔

۵۔ کہہ دو: اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا بھیجا ہوا ہوں۔

۶۔ یہ رسالت تو عالمین کے لئے ایک یاددہانی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

۷۔ اور (اے رسول) ہم نے تجھے عالمین کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے

تفسیر

پہلی آیت (احزاب: ۴۰) میں ''زید'' کے قصے کی طرف اشارہ ہے جو پیغمبر اسلام ﷺ کا منہ بولا بیٹا تھا اور پیغمبر اکرم ﷺ نے اس کی مطلقہ بیوی سے شادی کر لی تھی، تا کہ زمانہ جاہلیت کی ''منہ بولا بیٹا'' ہونے کی ایک غلط رسم کو توڑ سکیں اور پھر جو عورت خود پیغمبرؐ ہی کے ذریعے زید کی بیوی بنی تھی، ناچاقی کی وجہ سے (اپنے شوہر سے) جدا ہو کر بے سرپرست ہونے سے بچ گئی تھی۔ لہٰذا قرآن فرماتا ہے:

''حضرت محمد ﷺ تمہارے مردوں میں سے کسی کے بھی باپ نہیں''

بنا بریں زید کی مطلقہ بیوی سے شادی، اپنی اولاد کی بیویوں سے ازدواج کی طرح نہیں ہے

"مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ"

اس کے بعد مزید فرمایا:

"لیکن اللہ کے رسول ہیں اور خاتم النبیین ہیں"

"وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ"

درحقیقت یہ آیت سب سے پہلے کلی طور پر جسمانی و نسبی رابطے کو منقطع کرتی ہے، لیکن بعد والے جملے میں مقام نبوت سے حاصل ہونے والے معنوی رابطے اور خاتمیت کو ثابت کرتی ہے، یعنی؛ آپ تمہارے جسمانی باپ نہیں بلکہ، تمہارے لئے بھی اور آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے روحانی باپ ہیں۔ اگر بعض روایات میں آپ ؐ سے نقل ہوا ہے کہ "انا و علی ابو اھذہ الامۃ"، یعنی: "میں اور علی اس اُمت کے باپ ہیں"

تو یہ بھی اسی روحانی باپ ہونے کی طرف اشارہ ہے جو تعلیم و تربیت کا سرچشمہ اور اُمت کی رہبری ہے۔ البتہ پیغمبر اکرم ؐ کے حقیقی بیٹے بھی تھے، جن کا نام "قاسم"، "طیب"، "طاہر" اور "ابراہیم" تھا لیکن مورخین کے مطابق وہ سب بالغ ہونے سے پہلے ہی دنیا سے چل بسے تھے، لہٰذا "رجال" (مردوں) کا نام ان پر صادق نہیں آتا۔ [1]

اس کے علاوہ مسئلہ ختم نبوت اور اولاد نرینہ نہ ہونے میں ایک اور تعلق بھی پایا جاتا ہے اور وہ یہ کہ بہت سے انبیاء کی اولاد میں سے پیغمبر بھی تھے، چونکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد نرینہ باقی نہیں رہی تھی، اس لئے آپ ؐ کے بعد کسی اور نبی کے ہونے کا خیال ہی باقی نہیں رہتا، بنا بریں آپ ؐ کی اولاد نرینہ نہ ہونا ختم نبوت کی طرف ایک اشارہ بھی ہے اور تاکید بھی ہے۔ آیت کے آخر میں فرمایا: "اور خدا ہر چیز سے اچھی طرح آگاہ ہے" "وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا"

اس آیت کے شروع اور آخر میں تعلق ہونے میں ایک احتمال یہ بھی دیا گیا ہے کہ آیت کے شروع میں اُمت کی نسبت آنحضرت ؐ کے جسمانی و نسبی باپ ہونے کی نفی کی گئی ہے، لہٰذا یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اُمت میں سے کوئی بھی پیغمبر ؐ کا نسبی بیٹا نہیں تو پھر اُمت پیغمبر ؐ کے بعد آپ ؐ کی بیویوں سے شادی کرنے کا حق کیوں نہیں رکھتی؟ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ چونکہ آپ ؐ رسول خدا ہونے کے علاوہ خاتم النبیین اور انبیاء میں سب سے بلند مرتبہ نبی ہیں، اس لئے آپ ؐ کا احترام ضروری ہے لہٰذا آپ ؐ کی وفات کے بعد آپ ؐ کی بیویوں سے شادی نہ کرنا اسی احترام کا ایک حصہ ہے۔ [2]

---

[1] تفسیر قرطبی والمیزان

[2] تفسیر قرطبی ذیل آیہ

خاتم النبیّین کا مفہوم

''خاتم'' کا معنیٰ روشن ہے چونکہ مادہ ''خَتْم'' عربی کی تمام لغت کی کتابوں میں کسی چیز کو ختم کرنے کے معنیٰ میں ہے، لیکن بعض گمراہ لوگوں کے وسوسوں کا جواب دینے کے لئے کچھ وضاحت ضروری ہے۔ چوتھی صدی ہجری کے ایک مشہور لغوی ''ابن فارس'' اپنی کتاب ''معجم مقائیس اللغۃ'' میں کہتے ہیں: ''ختم کا اصلی معنیٰ ایک سے زیادہ نہیں ہے، اور وہ کسی چیز کا آخر تک پہنچنا ہے، اسی لئے مہر لگانے کو ختم کہا جاتا ہے کیونکہ ہمیشہ کسی چیز کو ختم کرنے کے بعد اس پر مہر لگائی جاتی ہے''

''خلیل بن احمد'' بھی عربی لغت کا سب سے پرانا مولف اور محقق ہے اور دوسری صدی ہجری یعنی؛ ائمہ معصومینؑ کے دور میں ہو گذرا ہے، وہ خاتم اور خاتِم کے معنیٰ میں کہتا ہے:

''ہر چیز کا خاتم اس کا اختتام اور آخر ہے اور خاتَم سے مراد وہ مہر ہے کہ جو مٹی پر لگائی جاتی ہے'' جب کوئی خط ختم ہو جاتا ہے اور اُسے بند کر دیا جاتا ہے تو جہاں سے اُسے بند کیا جاتا تھا وہاں نرم مٹی کا کچھ حصہ لگا کر اُسے مہر بند کر دیا جاتا تھا تاکہ کوئی غیر شخص اس خط کو نہ کھول سکے۔ کیونکہ اسے کھولنے کے لئے اسکی مہر کو توڑنا ضروری ہوتا ہے۔

دوسرے تمام علمائے لغت نے بھی یہی معنیٰ بیان کیا ہے اور خاتم سے مراد وہ چیز لی ہے جو کسی شئے کا اختتام بنے یا وہ مہر جو آخر میں لگائی جاتی ہے۔ کتاب ''التحقیق''، جو عربی لغت کی ایک جامع کتاب ہے، اس میں عربی لغت کے بزرگان کے اقوال نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: ''تحقیق یہ ہے کہ اس مادے کی ایک ہی اصل ہے، جو آغاز کے مدمقابل ہے یعنی؛ کسی چیز کا مکمل ہو جانا اور آخر و انتہا تک پہنچ جانا''۔ [۱]

زمانہ قدیم سے لیکر عصر حاضر کے مفسرین اسلام نے بھی مذکورہ بالا آیت سے اس کے علاوہ اور کوئی معنیٰ مراد نہیں لیا، یعنی؛ خاتم النبیّین سے مراد آخری نبی ہیں۔ تیسری صدی ہجری کے مشہور مفسر ''محمد بن جریر طبری'' کی تفسیر سب سے قدیم تفسیر، وہ اس آیت کے تحت لکھتے ہیں:

"وَ"خَاتَمَ النَّبِيِّينَ" الَّذِي خَتَمَ النُّبُوَّةَ فَخَتَمَ عَلَيهَا فَلاَ تُفْتَحُ لِاَحدٍ بَعْدَهُ إِلَىٰ قِيَامِ السَّاعَةِ"

''خاتم النبیین وہ ہے، کہ جس پر خدا نے نبوت کو ختم کر دیا ہے اور اس پر مہر لگا دی ہے جو کسی کے لئے تا قیام قیامت نہیں کھولی جائے گی۔'' [۲]

شیخ طوسیؒ بھی فقہ اور تفسیر کے بزرگ علماء میں سے ہیں جو پانچویں صدی ہجری کے ابتدائی سالوں میں ہو گذرے ہیں، وہ اپنی مشہور کتاب ''تبیان'' میں میں ''خاتَمَ النَبِیّین'' کے ذکر کے بعد لکھتے ہیں:

---

[۱] التحقیق، مادۂ ختم

[۲] تفسیر طبری، جلد ۲۲، صفحہ ۱۲۔

"اَیْ آخِرُھُمْ لِاَنَّہُ لَا نَبِیَّ بَعْدَہُ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ"۔[1]

یعنی: ''پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انبیاء میں سے آخری نبی ہیں کیونکہ ان کے بعد قیامت تک کوئی اور نبی نہیں آئے گا''

شیخ طوسیؒ کے نصف صدی بعد عظیم مفسر ''طبرسیؒ'' آئے ہیں، اُنھوں نے بھی اس آیت کے ذیل میں اسی صراحت کے ساتھ مذکورہ معنیٰ بیان کرتے ہوئے اس کی وضاحت کی۔[2]

چھٹی صدی ہجری کے ایک اور مفسر ''ابوالفتوح رازیؒ'' اپنی فارسی زبان میں لکھے جانے والی تفسیر میں ''خاتَمَ النَبِیین'' کے بارے میں ایک بہت ہی دلچسپ تعبیر اختیار کرتے ہوئے لکھتے ہیں: انبیاء میں سے آخری نبی کہ جسے تم مہر نبوت سمجھو، اُس کی نبوت کے ذریعے بعثت انبیاء کے دروازے کو مہر (بند) کر دیا گیا ہے''۔[3]

اسی طرح چھٹی صدی ہجری میں اہل سنت کے مشہور مفسر ''فخر رازی'' کلمہ ''خاتَمَ النَّبِيّين'' کے بعد لکھتے ہیں: اس کا مطلب یہ ہے کہ ''لَا نَبِیَّ بَعْدَہُ'' (اس کے بعد کوئی بھی نبی نہیں ہے) اور اس کی شریعت اس طرح مکمل ہوگئی ہے کہ جس کے بعد بیان کے قابل کوئی چیز باقی نہیں رہی''۔[4]

اسی طرح ہر صدی کے باقی مفسرین سے لیکر معاصرین تک سب نے بھی یہی معنیٰ ذکر کیا ہے۔ قابل توجہ بات یہ کہ قرآن مجید میں مادہ ''خَتَمَ'' اور اس کے مشتقات، مذکورہ بالا آیت کے علاوہ سات جگہ پر استعمال ہوئے ہیں جن میں بغیر کسی استثناء کے کسی چیز کے ختم ہو جانے یا اس مہر کے معنیٰ میں ذکر ہوئے ہیں جو آخر میں لگائی جاتی ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مذکورہ آیت کا اس کے علاوہ اور کوئی مفہوم نہیں ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی پر سلسلہ انبیاء ختم ہوتا ہے اور آپؐ ہی وہ مہر ہیں جس سے دفتر رسالت کو ختم کیا گیا ہے۔ ''نہج البلاغہ'' اور دیگر اسلامی روایات میں بھی ''خاتَم'' اسی معنیٰ میں آیا ہے، جس کی طرف اس بحث کے آخر میں اشارہ کیا جائے گا۔

چند سوالوں کا جواب

۱۔ کبھی کہا جاتا ہے ''خاتم'' کا معنیٰ زینت ہے۔ بنابریں آیت کا مفہوم یہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام انبیاء کی زینت تھے نہ کہ اُن کے سلسلے کو ختم کرنے والے۔ لیکن متوجہ رہنا چاہیے کہ خاتَم کسی بھی وقت زینت کے معنیٰ میں استعمال نہیں ہوا بلکہ ''انگشتر'' (انگوٹھی) کے معنیٰ میں ہے اور یہ بہت ہی غلط تعبیر ہے کہ ہم کہیں پیغمبر اسلامؐ انبیاء کی انگشتر ہیں، اس کے علاوہ ہم نے کہا ہے کہ ''خاتم'' کا اصلی مطلب

---

[1] تفسیر التبیان، جلد ۸، صفحہ ۳۱۴

[2] مجمع البیان، جلد ۷، ۸ صفحہ ۳۶۲

[3] تفسیر ابولفتوح رازی، جلد ۹، صفحہ ۱۶۲

[4] تفسیر فخر رازی، جلد ۲۵، صفحہ ۲۱۴

انگشتر نہیں ہے بلکہ وہ مہر ہے جو خطوط، معاہدوں اور کتابوں کے آخر میں لگا کر اُنہیں لاک اور بند کر دیا جاتا ہے اور پھر مہر ''خاتمے'' اور اختتام پر لگائی جاتی ہے، اس لئے جس چیز سے خط کو ختم کرتے تھے، اُسے خاتم کہا جانے لگا (یہ بھی یاد رہے کہ ''خاتم'' ت کی فتح کے ساتھ کا مطلب ''مَا يُخْتِمُ بِهِ'' ہے یعنی؛ وہ چیز جس سے کسی کام کو ختم کیا جائے)

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ نزول قرآن کے زمانے میں اور اُس کے صدیوں بعد بھی لوگوں کی اصلی مہر، اُن کی انگوٹھیوں پر نقش ہوتی تھی اور وہ اپنی انگوٹھی کے ذریعے وہ خطوط وغیرہ پر مہر لگاتے تھے۔ اسی لئے پیغمبر اسلام ﷺ کے حالات میں آیا ہے:

''اِنَّ خَاتَمَ رَسُولِ اللهِ كَانَ مِنْ فِضَّةٍ نَقْشُهُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللهِ(ص)''

یعنی: ''رسول اللہ ﷺ کی انگوٹھی چاندی کی تھی، جس کا نقش ''محمد رسول اللہ'' تھا۔ [1]

بعض تواریخ میں آیا ہے کہ چھٹی ہجری کے واقعات میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے اپنے لئے نقش والی انگوٹھی بنوائی اور یہ اس لئے تھا کہ آپؐ کے صحابہ ؓ نے عرض کیا کہ بادشاہ ایسے خطوط کو نہیں پڑھتے جو مہر کے بغیر ہوتے ہیں۔ [2]

کتاب ''طبقات'' میں بھی آیا ہے جس وقت پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی دعوت کو وسعت دینے اور دنیا کے مختلف حکمرانوں کو خط لکھنے کا ارادہ کیا تو حکم دیا کہ آپؐ کے لئے انگوٹھی تیار کی جائے، جس پر ''محمد رسول اللہ'' کندہ ہو۔ چنانچہ آپؐ اپنے خطوط پر اسی سے مہر لگاتے تھے۔ [3]

اس بیان سے اچھی طرح واضح ہوتا ہے کہ لفظ خاتم کا موجودہ زمانے میں اگرچہ زینت وزیور کے طور انگوٹھی پر بھی اطلاق ہوتا ہے لیکن اس کی اصل ''ختم'' سے لی گئی ہے جو ''انتہا'' کے معنی میں ہے اور نزول قرآن کے اور اس کے بعد کے زمانے میں ان انگوٹھیوں کو کہا جاتا تھا، جن سے خطوط کو ختم کر کے اُن پر مہر لگاتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ مادہ قرآن مجید میں بھی متعدد مواقع پر استعمال ہوا ہے، لہٰذا قرآن بعض کفار کے بارے میں فرماتا ہے:

''خَتَمَ اللهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ''

یعنی: اللہ تعالیٰ نے اُن (منافقین) کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے اور حق کے بارے میں اُن کے سمجھنے اور سننے کی طاقت ختم ہوگئی ہے۔ [4]

قیامت کے بارے میں فرمایا:

---

[1] سنن بیہقی، جلد ۱۰، صفحہ ۱۲۸ اور فروغ کافی، جلد ۶، صفحہ ۴۷۳، باب نقش الخَوَاتیم حدیث اول (کانَ نَقشُ خاتَمِ النبی محمد رسول اللہ ﷺ)

[2] سفینۃ البحار، جلد ۱، صفحہ ۳۷۶

[3] طبقات کبریٰ، جلد ۱، صفحہ ۲۵۸

[4] بقرہ/۷

"اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰى اَفْوَاهِهِمْ"

یعنی: "آج ہم ان کے منہ پر مہر لگا دیتے ہیں اور اُن کی باتوں کو ختم کر دیتے ہیں۔"[1]

بہر حال عربی زبان اور ادب میں اس کلمے کے مادہ اور معانی اور اس کی لغت و مشتقات کے استعمال سے معمولی سی آگاہی سے یہ بات واضح طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ کلمہ "خَاتَمِ النَّبِيّٖنَ" کا سوائے ختم کر دینے والے کے اور کوئی نہیں معنی نہیں ہو سکتا۔

دوسرا سوال:

یہاں بعض جاہل افراد کی طرف سے ایک اور انتہائی کمزور اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ قرآن کا کہنا ہے: پیغمبر اسلامؐ "خَاتَمِ النَّبِيّٖنَ"، یعنی؛ نبیوں کے ختم کرنے والے ہیں نہ کہ "رسولوں کے ختم کرنے والے ہیں، ممکن ہے انبیاء کا سلسلہ آپؐ کے ظہور کے ساتھ ختم ہو جائے لیکن رسولوں کا سلسلہ ختم نہ ہو۔

جواب:

یہ درست ہے "نبی" کا مطلب ہر وہ پیغمبر ہے کہ جس کی طرف اللہ کی طرف سے وحی ہوتی ہے، خواہ وہ تبلیغ پر مامور ہے یا نہیں، آسمانی کتاب کا حامل ہے یا نہیں؟ لیکن "رسول" سے مراد وہ پیغمبر ہے جو تبلیغ پر مامور ہوتا ہے، دوسرے الفاظ میں ہر نبی، رسول ہوتا ہے لیکن ہر رسول نبی نہیں ہوتا۔

اس وضاحت کے ساتھ مذکورہ بالا سوال کا جواب بالکل واضح ہو جاتا ہے، چونکہ اگر کوئی خاتم انبیاء ہے تو وہ بدرجہ اولیٰ خاتم الرسل بھی ہے جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے ہر رسول، نبی بھی ہے چونکہ رسالت کا مرحلہ، نبوت سے کے مرحلے سے بلند ہوتا ہے۔ یہ بات بالکل ویسے ہی ہے جیسا کہ فلاں شخص سرزمین حجاز سے باہر نکل جاتا ہے تو یقیناً وہ مکہ سے بھی باہر نکل جاتا ہے، لیکن اگر ہم کہیں کہ فلاں شخص مکہ میں نہیں تو ممکن ہے وہ حجاز کے کسی اور علاقے میں ہو، بنا بریں اگر پیغمبر اکرم ﷺ خاتم المرسلین ہوتے تو ممکن تھا وہ خاتم الانبیاء نہ ہوتے، لیکن جب آیت کہہ رہی ہے کہ آپؐ خاتم انبیاء ہیں تو یقیناً آپؐ خاتم مرسلین بھی ہوں گے۔

مذکورہ بالا آیات کے ایک حصے میں کچھ ایسی تعبیرات استعمال ہوئی ہیں کہ جن کو بہت سے علماء مسئلہ خاتمیت کی واضح دلیل سمجھتے ہیں۔ بالفرض ہم ان کی دلالت کو اتنا واضح نہیں بھی جانتے، لیکن کم از کم اُنہیں اس مسئلے پر قرائن و شواہد کے طور پر تو قبول کر سکتے ہیں:

ا۔ اس قسم کی پہلی آیت میں آیا ہے:

"جو لوگ ذکر (قرآن) کے اپنے پاس آجانے کے بعد اس کے منکر ہو گئے (وہ بھی ہم سے نہیں چھپ سکیں گے) اور یہ ایک ایسی کتاب ہے جو قطعاً ناقابل شکست ہے کہ کوئی باطل نہ تو اس کے سامنے سے آ سکتا ہے اور

---

[1] یس/ ۶۵

نہ ہی اس کے پیچھے سے کیونکہ یہ صاحب حکمت اور قابل تعریف اللہ کی طرف سے نازل کی گئی ہے"

"إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَاءَهُمْ وَإِنَّهُ لَكِتَابٌ عَزِيزٌ ۔ لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ"

اس آیت میں "باطل" سے مراد وہ چیز ہے کہ جسے باطل کیا جائے یا منسوخ کیا جائے، بنابریں ایسی کتاب ابدی اور دائمی ہوگی اور یہ خود اس دین کی خاتمیت کی دلیل ہے کہ جس سے یہ کتاب تعلق رکھتی ہے، یہی آیت عدم تحریف قرآن پر بھی دلالت کررہی ہے۔ ممکن ہے یہ کہا جائے کہ "باطل" لغت میں مبطل "(باطل کرنے والا) کے معنیٰ میں نہیں ہے، لہٰذا آپ اس آیت کی یہ تفسیر کس طرح کرسکتے ہیں؟ اس کے جواب میں یہ کہا جائے گا کہ یہاں بہت سے مفسرین نے باطل کے معانی میں سے ایک معنیٰ مبطل ہی ذکر کیا ہے۔[۱]

اصولاً جب یہ فرمایا ہے کہ باطل اس کے پیچھے نہیں آسکتا تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ باطل اسے بے کار نہیں بناسکتا، بالخصوص جب اس سے پہلے فرمادیا ہے کہ "یہ کتاب عزیز اور ناقابل شکست ہے" جو اس کی بقاء اور دوام پر واضح دلیل ہے۔

اس کے بعد دوسری آیت میں فرمایا:

"لازوال اور بابرکت ہے وہ ذات جس نے قرآن اپنے بندے پر نازل فرمایا تاکہ وہ عالمین کو (عذاب خدا سے) ڈرائے"

"تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَىٰ عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا"

"عالمین" کے کلمے میں تمام جہان شامل ہیں، کیونکہ اس کے ساتھ کسی قسم کی قید نہیں لہٰذا یہ اس دنیا کے ختم ہوجانے تک ہر زمانے کے لوگوں کو شامل ہے، نہ فقط از نظر مکان محدود نہیں بلکہ از نظر زمان بھی لامحدود ہے اور آئندہ آنے والوں کو بھی شامل ہے، اسی لئے بہت سے مفسرین نے اس سے اسلام کا عالمی دین ہونا بھی اور اس کا ابدی اور دائمی ہونا بھی مراد لیا ہے۔[۲]

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ "عالمین" مادہ "علم" سے لیا گیا ہے جو انسان کے علم کی وسعتوں میں آنے والی تمام اشیاء کو شامل ہے حتیٰ آسمان وزمین بھی اس میں آتے ہیں، لیکن آیت میں آنے والے کلمہ "انذار" کی وجہ سے اس کا مفہوم فقط اس کائنات کی مکلف مخلوقات تک محدود ہوجاتا ہے۔ بہرحال تیسری آیت سے استدلال بھی اسی طرح ہے کیونکہ اس آیت کے مطابق پیغمبر اسلام فرماتے ہیں:

"یہ قرآن مجھ پر وحی کیا گیا ہے تاکہ میں تمہیں اور اُن تمام لوگوں کو ڈراؤں جن کے کانوں تک قرآن پہنچا ہے"

---

[۱] جیسا کہ شیخ طوسیؒ نے "تبیان" میں، علامہ طبرسیؒ نے "مجمع البیان" میں، علامہ طباطبائیؒ نے "المیزان" میں اور آلوسی نے "روح المعانی" میں اور پھر دوسرے بہت سے مفسرین نے اس آیت کے نیچے میں یہی معنیٰ ذکر کیا ہے۔

[۲] ۔تفسیر فخر رازی جلد ۲۴، صفحہ ۴۵۔ تفسیر قرطبی، جلد ۷، صفحہ ۴۱۸۷۔ روح البیان، جلد ۶ صفحہ ۱۸۸

"اُوحِيَ إِلَيَّ هٰذَا الْقُرْآنُ لِأُنْذِرَكُمْ بِهِ وَمَنْ بَلَغَ" جملہ "وَمَنْ بَلَغَ"

(وہ تمام لوگ جن کے کانوں تک قرآن پہنچا ہو) کے مفہوم کی وسعت کسی پر چھپی ہوئی نہیں اور اس دنیا کے ختم ہونے تک تمام انسانوں کو شامل ہے اور اسلام کے عالمی اور ابدی ہونے پر ایک دلیل ہے۔

علامہ طبرسیؒ ''مجمع البیان'' میں اس آیت کے ذیل میں وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں اس سے مراد یہ ہے کہ

"وَمَنْ بَلَغَهُ الْقُرْآنُ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ"

یعنی: ''وہ تمام لوگ جن تک قیامت تک قرآن پہنچتا رہے گا'' اس آیت میں شامل ہیں۔ [1]

بہت سے قدیم اور جدید مفسرین نے بھی اس آیت کے تحت بحث کرتے ہوئے اسکی مسئلہ ''خاتمیت'' پر دلالت کو واضح طور پر بیان کیا ہے منجملہ تیسری صدی کے علماء میں سے ایک ''ابوالفتوح رازی'' ہیں جنھوں نے اپنی تفسیر ''روح البیان'' میں اور پھر علامہ طباطبائیؒ نے ''المیزان'' میں اسے بیان کیا ہے۔ مذکورہ بحث کی آیات نمبر ۴، ۵، ۶، ۷ میں بھی (مسئلہ خاتمیت پر) اسی طرح کی دلالت ہے۔

کیونکہ آیت نمبر ۴ میں ''كَافَّةً لِلنَّاس'' کے الفاظ آئے ہیں جو عام لوگوں کو شامل ہوتے ہیں اور آیت نمبر ۵ میں ''إِنِّي رَسُولُ اللهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا'' ''میں آپ سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا رسول ہوں'' جیسے کلمات آئے ہیں، آیت نمبر ۶، ۷ میں بھی عالمین اور جہانوں کا ذکر ہوا ہے کہ جو زمان ومکان کے لحاظ سے ایک وسیع مفہوم کا حامل ہے۔ یہ آیات مجموعاً ''قرآن کی جاودانگی'' اور ''پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاتمیت'' کے مسئلے پر تائید وتاکید کر رہی ہیں۔ بعض اہل قلم نے اس سلسلے میں کچھ دوسری آیات بھی ذکر کی ہیں، چونکہ ان کی دلالت کافی نہیں سمجھی جاتی، اس لئے اُنہیں یہاں ذکر نہیں کیا گیا۔

اسلامی روایات کی روشنی میں خاتمیت

جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ اسلام کے ابدی ہونے کا عقیدہ تمام مسلمان علماء کے نزدیک متفق علیہ ہے، بلکہ یہ دین کی ضروریات میں شمار ہوتا ہے، اس عقیدے کا سرچشمہ قرآنی آیات کے علاوہ بے شمار ایسی روایات بھی ہیں کہ جو خود پیغمبر گرامی اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ دیگر ائمہ معصومین ÷ سے بھی منقول ہیں جو مجموعاً ایک کتاب کی شکل اختیار کر سکتی ہیں، اس مختصر باب میں بطور نمونہ ہم ان کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

۱۔ متعدد روایات میں سلسلہ انبیاء کے ختم ہونے کا مسئلہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے نقل ہوا ہے۔ یہ روایات ایک وسیع باب کی صورت اختیار کرتی ہیں، منجملہ چند روایات یہ ہیں:

۱۔ ایک مشہور حدیث میں ہے کہ جو بہت سی حدیث وتفسیر کی کتابوں میں نقل ہوئی ہے، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"مَثَلِي وَمَثَلُ الْأَنْبِيَاءِ كَمَثَلِ رَجُلٍ بَنىٰ دَاراً فَأَتَمَّهَا وَأَكْمَلَهَا إِلَّا مَوْضِعَ لَبِنَةٍ فَجَعَلَ

[1] مجمع البیان، جلد ۳ اور ۴، صفحہ ۲۸۲

النَّاسَ يَدْخُلُونَهَا وَيَتَعَجَّبُونَ مِنْهَا وَيَقُولُونَ: لَوْلَا مَوْضِعُ اللَّبِنَةِ قَالَ رَسُولُ اللهِ(ص) فَأَنَا مَوْضِعُ اللَّبِنَةِ جِئْتُ فَخَتَمْتُ الْأَنْبِيَاءَ۔

گذشتہ انبیاء کے مقابلے میں میری مثال اس شخص کی سی ہے کہ جو بہت ہی خوبصورت اور دلکش مکان تعمیر کرے، لوگ اس کے گرد چکر لگائیں اور کہیں کہ اس سے بہتر کوئی عمارت نہیں، لیکن اس کی صرف ایک اینٹ کی جگہ خالی ہے اور پھر آپؐ نے فرمایا: میں وہی آخری اینٹ ہوں، میں انبیاء کے سلسلے کو ختم کرنے کے لئے آیا ہوں''۔[1]

یہی حدیث ایک دوسرے طریقے سے بھی نقل ہوئی ہے جس کے آخر میں آیا ہے:

"فَأَنَا اللَّبِنَةُ وَأَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّينَ"

یعنی: ''میں وہ آخری اینٹ ہوں، میں ہی خاتم النّبیین ہوں''۔[2]

یہی مطلب بہت سے دوسرے طریقوں سے بھی نقل ہوا ہے۔[3]

نیز تفسیر ''مجمع البیان'' میں یہ حدیث اس شکل میں نقل ہوئی ہے، اُس کے مطابق: ایک صحیح حدیث میں جابر بن عبداللہ انصاریؓ نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"إِنَّمَا مَثَلِي فِي الْأَنْبِيَاءِ كَمَثَلِ رَجُلٍ بَنَى دَاراً فَأَكْمَلَهَا وَحَسَّنَهَا إِلَّا مَوْضِعَ لَبِنَةٍ فَكَانَ مَنْ دَخَلَهَا فَنَظَرَ إِلَيْهَا قَالَ مَا أَحْسَنَهَا إِلَّا مَوْضِعَ هٰذِهِ اللَّبِنَةِ، قَالَ(ص): فَأَنَا مَوْضِعُ اللَّبِنَةِ خُتِمَ بِيَ الْأَنْبِيَاءُ۔"

یعنی: ''انبیاء کے درمیان میری مثال اس شخص کی سی ہے جو ایک مکان تعمیر کرے اور اسے مکمل کرے اور خوبصورت بنائے لیکن اس کی صرف ایک اینٹ کی جگہ خالی ہے،، لوگ اس کے اندر داخل ہوں اور کہیں کہ اس سے بہتر کوئی عمارت نہیں، صرف ایک اینٹ کی جگہ خالی ہے اور پھر آپؐ نے فرمایا: میں وہی آخری اینٹ ہوں، میں انبیاء کے سلسلے کو ختم کرنے کے لئے آیا ہوں''۔

---

[1] صحیح مسلم، ج ۴، ص ۱۷۹۱، حدیث ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰

[2] صحیح مسلم، ج ۴، ص ۱۷۹۱، حدیث ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰

[3] صحیح مسلم، ج ۴، ص ۱۷۹۱، حدیث ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰

اس کے بعد وہ کہتے ہیں یہ حدیث ''صحیح بخاری'' اور ''صحیح مسلم'' میں بھی نقل ہوئی ہے۔[1]
نیز یہ حدیث ''مسند احمد حنبل''، ''ترمذی''، ''نسائی'' اور حدیث وتفسیر کی دوسری بہت سی کتابوں میں بھی نقل ہوئی ہے اور بہت ہی مشہور احادیث میں شمار ہوتی ہے۔ علامہ طباطبائی ؒ اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں: یہی مطلب بخاری ومسلم کے علاوہ ترمذی ،نسائی، احمد اور ابن مردویہ نے جناب جابر کے علاوہ دوسروں سے بھی نقل کیا ہے۔[2]

۲۔ ''نہج البلاغہ'' میں بھی متعدد خطبوں میں ''پیغمبر اسلام ﷺ کی خاتمیت'' کے مسئلے کے بارے میں صراحت کی گئی ہے، خطبہ نمبر ۱۷۳ میں ہم دیکھتے ہیں:

''اَمِینُ وَحیِہٖ وَخَاتَمُ رُسُلِہٖ''

یعنی: ''حضرت محمد ﷺ وحی الٰہی کے امین اور خاتم الرسل تھے''

خطبہ نمبر ۱۳۳ میں آیا ہے

''خَتَمَ بِہِ الْوَحیَ''

یعنی: ''اللہ تعالیٰ نے وحی کو اُن کے ذریعے ختم کیا''

خطبہ نمبر ۷۲ میں حضرت علی - پیغمبر ﷺ پر درود بھیجنے کے بعد آپ ؐ کی اس طرح تعریف کرتے ہیں:

''اَلْخَاتِمُ لِمَا سَبَقَ وَالْفَاتِحُ لِمَا انْغَلَقَ''

وہ جو گذشتہ انبیاء کی نبوت کو ختم کرنے والا اور بند امور کو کھولنے والے تھے'' خطبہ نمبر ۸۷ میں لوگوں کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:

''اَیُّھَا النَّاسُ خُذُوھَا عَنْ خَاتَمِ النَّبِیّیِن:''

یعنی: ''اے لوگو! اس حقیقت کو خاتم النّبیین سے حاصل کرو''

نہج البلاغہ کے پہلے خطبے میں فرماتے ہیں:

''بَعَثَ اللہُ سُبْحَانَہُ مُحَمَّداً (ص) لِاِنْجَازِ عِدَتِہٖ وَاِتْمَامِ نُبُوَّتِہٖ''

یعنی: ''اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو اپنے عہد کو پورا کرنے اور اپنی نبوت کو کامل وتمام کرنے کے لئے مبعوث فرمایا ہے''

یاد رہے کہ ''بحار الانوار'' کی ۱۱۰ جلدوں پر کمپیوٹر کے ذریعے ایک وسیع تحقیق انجام دینے کے بعد معلوم ہوا ہے کہ کلمہ ''خَاتَمُ

---

[1] مجمع البیان، ج ۷ اور ۸، صفحہ ۳۶۲

[2] المیزان، جلد ۱۶، صفحہ ۳۲۷

النَّبِيِّينَ ''یا''خَاتَمُ الرُّسُل ''اور''خَاتَمُ الْاَنْبِيَاءِ ''بحارالانوار(کی جلد نمبر ۲ تا ۱۱۰) میں تین سو سے زیادہ مرتبہ آیا ہے۔جن میں سے زیادہ تر حصہ معصومین ÷ کی روایات میں اور کچھ علامہ مجلسیؒ کی توضیحات میں ذکر ہوا ہے۔اس سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے مسئلہ ختم نبوت مسلمانوں کے درمیان اور پھر ہر دور اور ہر مقام پر کس قدر شہرت کا حامل رہا ہے۔[۱]

اہل سنت کی کتابوں میں بھی بارہا کلمہ ''خَاتَمُ النَّبِيِين''یا''خاتم الانبياء ''آیا ہے۔[۲]

۳۔مشہور و معروف ''حدیث منزلت''جو بہت سی شیعہ و سنی کتب میں حضرت علی - کے بارے میں نقل ہوئی ہے اور یہ مشہور اور متواتر احادیث نبوی میں شمار ہوتی ہے، یہ حدیث بھی اس مسئلہ پر ایک واضح دلیل کی حیثیت رکھتی ہے، کیونکہ پیغمبر اکرمؐ اپنی سپاہ کے ساتھ ''جنگ تبوک''کی طرف جانے لگے تو حضرت علی -کو اپنی جگہ مقرر فرماتے ہوئے فرمایا:

''اَنْتَ مِنِّي بِمَنْزِلَةِ هٰرُونَ مِنْ مُوسٰى اِلَّا اَنَّهُ لَا نَبِيَّ بَعْدِي''

یعنی:''تمہاری نسبت میرے ساتھ وہی ہے جو ہارون کی نسبت موسیٰ کے ساتھ تھی سوائے یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے''[۳]

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ یہ جملہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فقط واقعہ ''جنگ تبوک''کے دوران ہی نہیں فرمایا، بلکہ بہت سے دوسرے موقعوں پر بھی اس کی تصریح فرمائی ہے، واقعہ تبوک کے علاوہ کم از کم چھ مواقع پر یہ جملہ آنحضرتؐ کی زبان مبارک سے سُنا گیا ہے:

۱۔''مواخات اول''کے دن۔

۲۔''مواخات دوم''کے دن۔

۳۔جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے''اُم سلیم''کو اُس کے باپ اور بھائی کی شہادت پر تسلی دی۔

۴۔وہ حدیث جو اسی سلسلے میں ابن عباس نے عمر سے نقل کی ہے۔

۵۔وہ حدیث کہ جو''حضرت حمزۂ سید الشہداء''کے بچے کی سرپرستی کے بارے میں گفتگو کے وقت نقل ہوئی ہے۔

۶۔اُس حدیث میں جو امام علیؑ اور پیغمبر اکرمؐ کے گھر کے دروازوں کے علاوہ مسجد میں کھلنے والے تمام دروازوں کو بند کرنے کے بارے میں نقل ہوئی ہے۔[۴]

---

[۱] حوزہ علمیہ قم کے مرکز کمپیوٹر کے شکریہ کے ساتھ کہ جنھوں نے یہ ۲۲ صفحات پر مشتمل مجموعہ''پیام قرآن''کے دفتر کے سپرد کیا۔

[۲] ''المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی''مادۂ''ختم''کی جانب رجوع کیجئے۔

[۳] اہم بات یہ کہ اس حدیث کو اہل سنت کے طریقے سے ۱۷۰ اسناد کے ساتھ اور اہل بیت ÷ کے طریقے سے ۷۰ اسناد کے ساتھ نقل کیا گیا ہے منجملہ کتب جن میں یہ حدیث نقل ہوئی ہے، یہ ہیں: صحیح مسلم، صحیح بخاری، سنن ابن ماجہ، مستدرک حاکم، مسند احمد حنبل، ذخائر العقبیٰ، الصواعق المُحرقہ، کنز العمال، ینابیع المودۃ وغیرہ۔مزید وضاحت کے لئے''المراجعات''مکتوب نمبر ۲۸ کی طرف رجوع کیجئے۔

[۴] مزید وضاحت کے لئے تفسیر نمونہ، جلد ۶، صفحہ ۳۴۷ (آیہ: ۱۴۲ سورۂ اعراف) اور المراجعات، مکتوب ۳۲ کی طرف رجوع کیجئے۔

اس حدیث سے بہت واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کوئی بھی نبی نہیں آئے گا، اور یہ مسئلہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہور کے زمانے سے ہی واضحات میں سے شمار ہوتا ہے۔

۴۔ بہت سی احادیث میں آیا ہے اسلامی احکام اس دنیا کے اختتام تک باقی اور جاری رہیں گے اور یہ چیز سوائے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاتمیت کے کسی اور چیز سے سازگار نہیں، کیونکہ ایک نئے پیغمبر کے آنے کے ساتھ سابقہ پیغمبر کے کم از کم احکام تو منسوخ ہو جائیں گے۔ اسی سلسلے میں ہم اصول کافی میں دیکھتے ہیں:

"حَلاٰلُ مُحَمَّدٍ حَلاٰلٌ اَبَداً اِلیٰ یَوْمِ الْقِیٰامَۃِ وَ حَرٰامُہُ حَرٰامٌ اَبَداً اِلیٰ یَوْمِ الْقِیٰامَۃِ لاٰ یَکُونُ غَیْرُہُ وَلاٰ یَجِیئُ غَیْرُہُ"

یعنی: "حلال محمدؐ، قیامت کے دن تک حلال ہے اور حرام محمدؐ تا قیامت حرام ہے اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہوگا اور نہ ہی اس کے علاوہ کوئی آئے گا"۔[1]

یہی مطلب ایک دوسری جگہ بھی آیا ہے: انبیاء کا ذکر کرنے کے بعد امام جعفر صادق - نے فرمایا:

"حَتّٰی جٰاءَ مُحَمَّدٌ(ص) فَجٰاءَ بِالْقُرْآنِ وَ بِشَرِیعَتِہِ وَ مِنْہٰاجِہِ فَحَلاٰلُہُ حَلاٰلٌ اِلیٰ یَوْمِ الْقِیٰامَۃِ وَ حَرٰامُہُ حَرٰامٌ اِلیٰ یَوْمِ الْقِیٰامَۃِ"

یعنی: "پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن، شریعت اور اپنا طریقہ لیکر آئے ہیں، پس آپؐ کا حلال تا روز قیامت حلال ہے اور آپؐ کا حرام بھی تا روز قیامت حرام ہے"۔[2]

اس کے علاوہ اس مشہور روایت سے واضح ہو جاتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ فقط "خٰاتَمُ الْاَنْبِیٰاءِ" ہیں، بلکہ آپؐ کا دین اور احکام و دستورات بھی جاودانی ہیں اور اُن میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوگی اور جن لوگوں کا خیال ہے کہ وہ مسئلہ خاتمیت کو قبول کر کے اپنے زعم میں اسلام کے احکام و تعلیمات میں کچھ تبدیلیاں لے آئیں گے، وہ سخت غلط فہمی کا شکار ہیں۔ چونکہ مذکورہ بالا احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبوت کی جاودانگی، اُس کی تعلیمات و احکام کی جاودانگی کے ساتھ ہے۔ علامہ مجلسیؒ نے بھی بحار الانوار کی بہت سی جلدوں میں یہ حدیث نقل کی ہے۔[3]

۵۔ معروف خطبہ "حَجَّۃُ الْوِدٰاع" جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی حیات مبارکہ کے آخری سال اور آخری حج کے دوران لوگوں کے لئے ایک جامع وصیت نامے کے طور پر بیان فرمایا تھا، اس خطبے کے آخر میں آپؐ نے مسئلہ "خاتمیت" کے بارے میں صراحت

---

[1] اُصول کافی، جلد ۱، صفحہ ۵۸، حدیث ۱۹۔

[2] اُصول کافی، جلد ۲، صفحہ ۱۷، حدیث۔

[3] بحار، جلد ۲، صفحہ ۲۶۰، حدیث ۱۷

کے ساتھ فرمایا:

"اَلاٰ فَلْیُبَلِّغْ شاهِدُ کُمْ غائِبَکُمْ لاٰ نَبِیَّ بَعْدِی وَلاٰ اُمَّةَ بَعْدَ کُمْ"

یعنی: ''آگاہ ہو جاؤ اور حاضرین، غائبین تک پہنچا دیں کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے اور نہ تمہارے بعد کوئی اور اُمت ہوگی''۔ اس کے بعد آپ ؐ نے اپنے دست مبارک آسمان کی طرف بلند کیئے اور فرمایا: ''اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ اِنِّی قَدْ بَلَّغْتُ''یعنی: ''خدایا، گواہ رہنا کہ میں نے جو کچھ پہنچانا تھا پہنچا دیا ہے''۔[۱]

۶۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہونے والی ایک اور مشہور حدیث میں آیا ہے:

"اِنَّ الرِّسالَةَ وَالنُّبُوَّةَ قَدِ انْقَطَعَتْ فَلاٰ رَسُولَ بَعْدِی وَلاٰ نَبِیَّ"

یعنی: ''رسالت اور نبوت کا سلسلہ منقطع ہو گیا ہے میرے بعد نہ کوئی رسول آئے گا نہ کوئی نبی''۔[۲]

یہ حدیث اس لحاظ سے بہت ہی اہم ہے کہ اس نے اُن بہانہ ساز افراد کے بہانوں کا راستہ بند کر دیا ہے، جو کہتے ہیں، آپ ؐ ''خاتم الانبیاء'' ہیں نہ کہ ''خاتم الرسل''

۷۔ روایات کے اس سلسلے کو ہم ایک اور حدیث نبویؐ کے ساتھ ختم کرتے ہیں: کتاب ''اُسد الغابة'' میں آیا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا ''عباس بن عبد المطلب'' ؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مکہ سے مدینہ ہجرت کرنے کی اجازت چاہی تا کہ آپ ؐ کے ساتھ آملیں، (بعض روایات کے مطابق حضرت عباس ؓ کا شمار اُن مؤمنین میں ہوتا تھا جنہوں نے اپنا ایمان پوشیدہ رکھا ہوا تھا، اور پیغمبر ؐ کی اجازت سے مکہ میں ہی رہ گئے تھے اور مشرکین کی خبریں آنحضرت ؐ تک پہنچاتے تھے اور مکہ کے مسلمان بھی اُن کی وجہ سے مطمئن تھے، لیکن جب اسلام نے کافی ترقی کر لی تو حضرت عباس ؓ نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہجرت کی اجازت مانگی، لیکن پیغمبر ؐ نے اُن سے فرمایا: اس کام میں جلدی نہ کیجئے، روایت کا متن اس طرح ہے:

"یا عَمُّ اَقِمْ مَکانَکَ الَّذِی اَنْتَ بِهِ فَاِنَّ اللهَ تَعالیٰ یَخْتِمُ بِکَ الْهِجْرَةَ کَما خَتَمَ بِیَ النُّبُوَّةَ"

یعنی: ''اے چچا جان! (جلدی نہ کیجئے) جہاں ہیں وہی بیٹھے رہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ آپ کی ہجرت کے ساتھ ہجرت (کے سلسلے) کو ختم کر دے گا، جس طرح میرے ذریعے نبوت (کا سلسلہ) ختم کر دیا ہے''۔

اس کے بعد وہ ''فتح مکہ'' سے پہلے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب مدینہ آئے اور ہجرت کی، فتح مکہ کے دوران آپ ؐ کے ساتھ مکہ ہی میں تھے اور فتح مکہ کے ساتھ ہی ہجرت کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا چونکہ فتح مکہ کے بعد وہ شہر ''بلد اسلام'' بن گیا تھا نہ ''بلد کفر'' کہ جہاں سے مدینہ کی طرف

---

[۱] بحار الانوار، جلد ۲۱، صفحہ ۳۸۱، نقل از خصال، جلد ۲، صفحہ ۸۴

[۲] سنن ترمذی، جلد ۳، صفحہ ۳۶۴

ہجرت کرتے۔[1]

بنابریں سب سے آخر میں مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کرنے والے حضرت عباس ؓ ہی تھے، اس کے بعد مکہ فتح ہو گیا تھا اور ہجرت بھی ختم ہو گئی تھی۔ بعض نے لکھا ہے کہ حضرت عباس ؓ نے اپنی اہل وعیال کے ساتھ مدینہ کی طرف ہجرت کرتے وقت آدھے راستے میں ایک مقام پر حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات کی کہ جو "فتح مکہ" کے ارادے سے آرہے تھے، اسی وقت وہ آپ ؐ کے ساتھ مل گئے تو پیغمبر ؐ نے فرمایا: "تیری ہجرت آخری ہجرت ہے جیسا کہ میری نبوت، آخری نبوت ہے"۔[2]

اوپر جو احادیث کے سات عناوین ذکر ہوئے ہیں، ان کی تعداد صدہا احادیث سے بھی زیادہ ہے، جو سب کی سب واضح طور پر اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ "پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاتمیت" کا مسئلہ اسلام کے آغاز ہی سے واضح اور مسلّم موضوعات میں سے تھا۔ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ تمام ائمہ اور چہاردہ معصومین ÷ سے ایک یا چند احادیث "خاتمیت" کے بارے میں نقل ہوئی ہیں۔[3] اور بعض اہل قلم نے ان احادیث کو بیس عناوین کے تحت جمع کی ہیں۔[4]

---

[1] اُسد الغابہ، جلد ۳، صفحہ ۱۱۰۔

[2] بحار، جلد ۲۱

[3] مزید آگاہی کے لئے کتاب "خاتمیت از نظر قرآن وحدیث وعقل" کی طرف رجوع رجوع کریں۔

[4] مزید وضاحت کے لئے کتاب "خاتمیت آخرین پیامبر (ص)"، صفحہ ۳۹ تا ۴۱ کی طرف رجوع کیجئے۔

خاتمیت کے بارے میں چند سوالات

ا۔کیاانسان کی تکاملی حرکت مسئلہ خاتمیت کے ساتھ سازگار ہے؟

اس موضوع کے بارے میں پہلا جواہم سوال پیش کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ کیاانسانی معاشرے کوروکا جاسکتا ہے؟ کیا''انسان کی تکاملی حرکت'' کی کوئی حدود بھی ہیں یانہیں؟ کیا ہم اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ رہے کہ ماضی کی نسبت عصر حاضر کے انسان علم ودانش او رتہذیب وثقافت کے بلند ترین مرحلے تک پہنچ چکے ہیں؟ان حالات میں کیا نبوت کا سلسلہ مکمل طور پر بند کیا جاسکتا ہےاورانسان اپنی اس ارتقائی حرکت میں نئے انبیاء کی رہبری سے محروم ہوسکتا ہے۔

جواب:

اس سوال کا جواب ایک نکتے سے واضح ہوتا ہےاوروہ یہ کہ کبھی انسان فکری اورثقافتی بلوغ کے ایک ایسے مرحلے تک جا پہنچتا ہے کہ جہاں نبی خاتم نے جودائمی اصول اورتعلیمات اس کودی ہیں اُن کے ذریعے وہ کسی نئی شریعت کی ضرورت کے بغیراپناراستہ جاری رکھ سکے۔

یہ ایسے ہی ہے کہ انسان اپنی تعلیم کے مختلف مرحلوں کے دوران ہر مرحلے میں ایک نئے معلم اورمربی کا محتاج ہوتا ہے تاکہ وہ اپنی تعلیم کے مختلف مرحلوں کو طے کرسکے۔لیکن جب وہ''ڈاکٹریٹ'' کی منزل پر پہنچتا ہے اورایک علم یا مختلف علوم میں ''مجتھد''اورصاحب نظر بن جاتا ہےتو اسوقت وہ اپنی تعلیم کسی نئے اُستاد کے پاس جاری نہیں رکھتا بلکہ جوکچھ اس نے اپنے پرانے اساتذہ خصوصاً آخری اُستاد سے حاصل کیا ہوتا ہےاسی کی بنیاد پراپنی تعلیم کوجاری رکھتا ہےاور بحث وتحقیق اورمطالعات کرتا ہےاور اپنی تکاملی حرکت کوجاری رکھتا ہے۔

دوسرے الفاظ میں اپنی ضروریات اورراستہ کی مشکلات کواُنہی کلی اصولوں کی روشنی میں حل کرتا ہے جواس نے اپنے آخری استاد سے حاصل کئے ہوتے ہیں۔ بنابریں ضروری نہیں کہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ایک نیامذہب اوردین میدان عمل میں آتا رہے۔(غور کیجئے)

باالفاظ دیگر گذشتہ انبیائے کرام ÷ نے انسان کے لئے تکامل کے وقت نشیب وفراز سے بھرے راستے کوکامیابی سے طے کرنے کے لیے اس راستے کچھ حصے کانقشہ پیش کیا ہے تاکہ اس کے اندرآخری نبی کے ذریعے خدا تک پہنچنے کے راستے کے پورے اور جامع نقشے کوحاصل کرنے کی صلاحیت پیدا ہوجائے۔واضح ہے کہ ایک جامع اورمکمل نقشہ حاصل کرلینے کے بعداسے کسی اور نقشے کی ضرورت نہیں ہوگی اور یہ درحقیقت اُسی تعبیر کی وضاحت ہے جو''خاتمیت'' سے متعلق روایات میں آئی ہے جن میں پیغمبراسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو

قصر رسالت کی آخری اینٹ یا اس آخری اینٹ کا رکھنے والا بتایا گیا ہے۔

یہ سب تو نئے دین اور مذہب کی ضرورت نہ ہونے کے بارے میں تھا؛ لیکن رہبری اور امامت کا مسئلہ جو اس کلی قانون اور اُصول کے نفاذ پر کلی نظارت اور راستے میں پیچھے رہ جانے والوں کی دستگیری ہے، ایک جدا مسئلہ ہے جس سے انسان کسی بھی وقت اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتا، اسی لئے سلسلہ نبوت کے خاتمے کا مطلب سلسلہ امامت کا خاتمہ نہیں ہے۔ چونکہ اس کلی اُصول کی وضاحت اور تشریح اور اسے دنیا میں عملی شکل دینا ایک الٰہی معصوم رہبر کے وجود کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

۲۔ کیا دائمی قوانین انسان کی متغیر ضروریات کے ساتھ سازگار ہیں؟

انسان کے نظریہ ارتقاء کے مسئلے کے علاوہ جو کہ پہلے سوال میں پیش کیا گیا ہے، ایک دوسرا سوال بھی یہاں پر پیش آتا ہے اور وہ یہ کہ زمان و مکان کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں انسانی ضروریات مسلسل بدلتی رہتی ہیں، جبکہ شریعت خاتم، دائمی قوانین پر مشتمل ہے، کیا یہ ''دائمی قوانین'' زمانہ گذرنے کے ساتھ ساتھ ''انسان کی متغیر ضروریات'' کا جواب دے سکتے ہیں؟

اس سوال کا جواب بھی درج ذیل نکتہ کو مدنظر رکھتے ہوئے بخوبی دیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ اگر تمام اسلامی قوانین ''جزئی'' پہلو رکھتے اور ہر موضوع کے لئے حکم مکمل طور پر مشخص ہوتا اور جزئیات کو متعین کر دیا جاتا تو یہ سوال بجا تھا، لیکن جب اسلامی احکامات ایک ''کلی اصولوں'' کا سلسلہ ہیں جو بہت وسیع اور عریض ہے جن کو متغیر ضروریات پر منطبق کیا جا سکتا ہے جو اس کا جواب دیں تو پھر اس اعتراض کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

مثال کے طور پر وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ انسانوں کے درمیان کچھ جدید معاہدے اور قانونی تعلقات قائم ہوتے رہتے ہیں جو نزول قرآن کے دور میں قائم نہیں تھے۔ مثلاً اُس زمانے میں ''بیمہ'' (انشورنس) نام کی کوئی چیز اپنی انواع و اقسام کے ساتھ موجود نہیں تھی۔ [1]

اسی طرح جو کمپنیاں ہمارے زمانے میں ضرورت کے مطابق ہر روز وجود میں آ رہی ہیں، لیکن اس کے باوجود ہمارے پاس اسلام کا ایک کلی اصول موجود ہے جو سورہ مائدہ کے شروع میں عہد اور ماہدہ کو پورا کرنے کے عنوان سے آیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

''یاایُّھا الّذِین آمَنُو اَوْفُوا بِالعقودِ''

یعنی: ''اے ایمان والو! اپنے معاہدوں اور وعدوں کی پابندی کرو''

یہ آیت تمام ان قراردادوں اور معائدوں کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔ البتہ اس کلی اصول کے لئے اسلام نے کچھ شرائط بھی مقرر کی ہیں جنہیں مدنظر رکھنا ہوگا۔ اس بنا پر اس سلسلے میں ایک ثابت اور پائیدار کلیہ موجود ہے۔ اگر چہ اس کے مصادیق بدلتے رہتے

---

[1] یہ اصول تمام معاہدوں کو شامل ہو سکتا ہے۔ مثلاً ''ضمان جریرہ''، ''خطائے محض کی صورت میں دیت کا عاقلہ سے متعلق ہونا''، لیکن جیسا کہ ہم نے کہا ہے یہ فقط اس مسئلے سے شباہت رکھتے ہیں۔

ہیں اور ہوسکتا ہے کہ ہر روز اس کا ایک نیا مصداق مل جائے۔ دوسری مثال اسلام میں ''قانون لاضرر'' کے نام سے ایک مسلم قانون موجود ہے اور اسلامی معاشرہ میں جو حکم بھی کسی کے لیے ضرر اور نقصان کا سبب بن رہا ہو اس قانون کے ذریعے اس کا سدباب کیا جا سکتا ہے اور اس طرح سے بہت سے مسائل کا حل نکالا جا سکتا ہے۔

ان سب سے قطع نظر معاشرتی نظام کی حفاظت اور واجب کا مقدمہ بھی واجب ہوتا ہے اور اہم ترین کو اہم پر مقدم کیا جائے؛ یہ چند ایک مسائل ایسے ہیں جو بہت سے مشکل ترین مسائل کو حل کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ تمام وسیع اختیارات جو ''ولایت فقیہ'' کے ذریعے اسلامی حکومت کو حاصل ہیں ان کے ذریعے اسلام کے کلی اصولوں کے اندر رہ کر ان مشکلات کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے۔

البتہ ان امور میں سے ہر ایک کو تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت ہے خصوصاً جبکہ اجتہاد کا دروازہ بھی کھلا ہوا ہے (اجتہاد کا معنی ہے اسلامی ماخذ سے اسلامی احکام کا استنباط) لیکن ہم یہاں اس تفصیل میں نہیں جاتے کیونکہ اس طرح ہم اپنے مقصد سے دور ہو جائیں گے، لیکن پھر بھی ہم نے اشارہ کر دیا ہے جو مذکورہ بالا اعتراض کا جواب ہو سکتا ہے۔

۳۔ کیا انسانوں کو عالم غیب کے ساتھ رابطے کے فیض سے محروم ہو جانا چاہیے؟

ایک اور سوال یہ ہے وحی کا نزول ہو یا عالم غیب اور ماورائے طبیعت سے ارتباط، عالم بشریت کے لیے خدا کی طرف سے ایک بہت بڑا احسان اور اعزاز ہے اور تمام مومنین کے لیے امید کا دریچہ ہے۔ تو کیا اس رابطہ کا منقطع ہو جانا اور امید کے اس دریچے کا بند ہو جانا پیغمبر خاتمؐ کے بعد آنے والے انسانوں کے لیے ایک عظیم محرومی نہ ہو گی؟ اس سوال کا جواب بھی ذیل کے نکتے کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ ہے:

پہلی بات تو یہ ہے کہ وحی اور عالم غیب سے رابطہ درحقیقت حقائق کے ادراک کے لیے ہے اور جب کہنے کی باتیں کہی جا چکی ہوں اور روز قیامت تک کی ضروریات کے تمام کلی اور جامع اصول پیغمبر اسلام علیہ وآلہ وسلم کے فرامین کی روشنی میں بیان کیے جا چکے ہوں تو پھر اس رابطہ کے منقطع ہو جانے سے کوئی مسئلہ پیدا نہ ہو گا۔

دوسری بات یہ ہے کہ جو کچھ نبوت کے خاتمے کے بعد منقطع ہو گیا ہے، وہ ہے ''نئی شریعت کے لیے وحی'' یا ''سابق شریعت کی تکمیل''، نہ کہ عالم طبیعت کے ماوراء ہر قسم کے رابطے کا انقطاع، کیونکہ ائمہ علیہم السلام بھی عالم غیب سے رابطہ رکھتے ہیں اور وہ سچے مومنین بھی جو تہذیب نفس کے ذریعے اپنے دلوں سے حجابوں کو دور کر کے کشف و شہود کے منصب پر فائز ہو چکے ہیں۔

مشہور فیلسوف صدر المتالہین شیرازی ''مفاتیح الغیب'' میں یوں رقم طراز ہیں: ''وحی'' اس معنی کے لحاظ سے کہ فرشتہ ماموریت اور رسالت کے لیے کان اور دل پر نازل ہوتا ہے، تو یہ سلسلہ اگرچہ منقطع ہو چکا ہے اور کسی پر فرشتہ نازل نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی کو کسی قسم کے فرمان کے نفاذ پر مامور کرتا ہے کیونکہ ''اکملت لکم دینکم'' کے حکم کے مطابق جو کچھ اس راستے سے انسان تک پہنچنا چاہیے تھا، وہ پہنچ چکا ہے، لیکن الہام و اشراق کا دروازہ ہرگز بند نہیں ہوا اور نہ ہی ہو گا کیونکہ اس دروازے کا بند

ہونا ممکن نہیں ۔[1]

اصولی طور پر یہ رابطہ نفس کے ارتقا، روح کی جلاء اور باطن کے صفا کا نتیجہ ہوتا ہے اور یہ چیز صرف نبوت اور رسالت کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہوتی بلکہ جس وقت بھی اس کے مقدمات اور شرائط پوری ہو جائیں یہ معنوی رابطہ قائم ہو جاتا ہے اور بنی نوع انسان اس فیض سے نہ کبھی محروم تھی اور نہ ہوگی ۔ (غور کیجئے گا)

کیا ان آیات کا مسئلہ خاتمیت کے ساتھ تعلق ہے؟

ہمارے زمانے کے کچھ ''دین ساز'' گروہ، نبوت کے سلسلے میں اپنے دعویٰ کے لئے راہ ہموار کرنا چاہتے ہیں، لہٰذا اُن کے لئے سب سے پہلے ''خاتمیت'' کا مسئلہ چھیڑے کے بغیر کوئی اور چارہ نہیں تھا۔

لہٰذا اُنھوں نے مسلمانوں کے اس ضروری اور بدیہی ترین مسئلے کے پر سوالات اُٹھانے شروع کر دیئے اور بیمار دل لوگوں کی طرح بعض آیات کے پیچھے پڑ گئے جو اُن کے مطلب پر تطبیق اور تحریف کے قابل تھیں، لہٰذا خاتمیت کی نفی کرنے کے لئے ان آیات کو پیش کرنا شروع کر دیا۔ ان میں سے بعض آیات تو مسئلہ ''خاتمیت'' سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں، جس کی وجہ سے وہ یہاں پیش کرنے کے قابل بھی نہیں، فقط دو قسم کی آیات جن پر زیادہ زور دیا جاتا ہے، کسی حد تک پیش کرنے کے قابل ہیں، انہیں یہاں بیان کیا جا رہا ہے:

ا۔ کہتے ہیں: سورۂ اعراف کی آیت ۳۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ دوسرے انبیاء کے ظہور کا بھی امکان ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

" يَابَنِي آدَمَ إِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِنْكُمْ يَقُصُّونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِي فَمَنِ اتَّقَى وَأَصْلَحَ فَلاَخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَهُمْ يَحْزَنُونَ"

یعنی: ''اے بنی آدم! اگر تمہارے پاس تم میں سے رسول آئیں اور وہ میری آیتیں پڑھیں (تو ان کی پیروی کرنا) جو لوگ تقویٰ اختیار کریں اور عمل صالح بجالائیں تو ان کے لئے نہ تو کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے''۔

وہ کہتے ہیں: اس آیت میں لفظ ''يَأْتِيَنَّكُمْ'' اور ''يَقُصُّونَ عَلَيْكُم'' جیسے جملے جو فعل مضارع ہیں (اور جس کے معنی ہیں ''تمھارے پاس آئیں گے اور وہ پڑھیں گے) اس بات پر دلالت کرت ہیں کہ آئندہ بھی کچھ پیغمبر آ سکتے ہیں (ان کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا ہے) اس وجہ سے ان کی پیروی ضروری ہے۔

لیکن ایک نکتے کی طرف توجہ سے، اس بات کا جواب واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ اگر ہم تھوڑا پلٹ کر دیکھیں اور اسی سورۂ کی آیات ۱۱ تا ۳۴ پر نظر کریں تو ہم دیکھیں گے کہ ان آیات میں مٹی سے ''خلقتِ آدم''، فرشتوں کو آدم کے سامنے سجدہ کرنے کے حکم اور پھر ان کی بہشت میں سکونت، پھر ترک اولیٰ انجام دینے کی وجہ سے بہشت سے ان کا اور ان کی زوجہ کا نکالا جانا اور اُن کا زمین پر آنا اور آدم کی

---

[1] مفاتیح الغیب، صفحہ ۱۳۔

عام اولاد کے لئے اللہ تعالیٰ کے احکامات بیان کیے گئے ہیں۔

دوسرے الفاظ میں ان آیات کے مخاطب مسلمان نہیں ہیں بلکہ پورا انسانی معاشرہ اور آدم کی تمام اولاد مخاطب ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت آدم کی پوری اولاد کے لئے بہت سے انبیاء اور رسول آئے ہیں جن میں سے بعض کے نام قرآن مجید میں آئے ہیں اور بعض دوسروں کے نام تاریخی کتب میں مذکور ہیں۔

لیکن جو لوگ اس آیت سے اپنا مقصد حاصل کرنا اور خاتمیت کا انکار کرنا چاہتے ہیں اور اپنے جھوٹے مدعیان نبوت کے لئے راستہ ہموار کرنا چاہتے ہیں، اُنھوں نے پچھلی آیات کو نظر انداز کر دیا ہے اور اس آیت کا مخاطب صرف مسلمانوں کو قرار دیا ہے اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ مسلمانوں کو دوسرے رسولوں کے آنے کا بھی انتظار کرنا چاہیے۔ یہ بات بھی یاد رہنی چاہیے کہ مذکورہ آیت سے پہلے بھی انہی آیات میں ''یَابَنِی آدَمَ '' کے خطاب کا تکرار ہوا ہے، آیات نمبر ۲۶، ۲۷ اور ۳۱ کہ آیت نمبر ۲۶، ہبوط آدم کے قصے کے فوراً بعد آتی ہے اور پھر بلا فاصلہ آیت نمبر ۲۷ ذکر ہوتی ہے، اس کے بعد آیت نمبر ۳۱ آجاتی ہے اور پھر چوتھے مرحلے پر مذکورہ آیت (نمبر ۳۵) ہے۔

نیز یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ ان چار آیات کے علاوہ قرآن کی کسی آیت میں ''یابنی آدم'' کا خطاب نہیں دیکھا گیا مسلمانوں کو عام طور پر'' یا ایها الذین آمنوا '' کے ذریعے مخاطب کیا گیا ہے۔ لہٰذا قرآن مجید میں ۸۰ سے زیادہ دفعہ مسلمانوں کو اسی انداز میں خطاب کیا گیا ہے اور کبھی ایک عمومی خطاب میں ''یا ایها الناس '' کے عنوان سے مخاطب کیا گیا ہے۔ اس مدعا پر ایک اور شاہد کے طور پر سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۳۸ کو پیش کرتے ہیں، جس میں یہی مطلب زمین پر ہبوط آدمؑ کے مسئلے کے بعد لایا گیا ہے چنانچہ قرآن نے فرمایا:

" قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ"

''ہم نے کہا سب کے سب (زمین کی طرف) اُتر جاؤ، جس وقت میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آئے گی، اس وقت جو لوگ اسکی پیروی کریں گے، ان کے لئے نہ تو خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے ''۔ یہاں پر ''ہدایت آنے'' سے مراد پروردگار کی جانب سے ''انبیاء کا آنا'' ہے۔

بالکل یہی مطلب سورۂ طٰہٰ کی آیت ۱۲۳ میں بھی آیا ہے، خصوصاً وہاں یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ شروع میں مخاطب ''آدم وحوا'' ہیں (جو جملہ ''اِهْبِطا'' تثنیہ کی صورت میں ہے) لیکن جملہ ''فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى'' میں سب مخاطب ہیں، جو بلا شک وشبہ اولاد آدم کو بھی شامل ہے کیونکہ شیطان تو ہرگز ہدایت الٰہی سے بہرہ مند نہیں ہوسکتا۔

بنا بریں وہ اس آیت میں مخاطبین کا حصہ نہیں بن سکتا، کیونکہ

"وَإِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِي إِلَىٰ يَوْمِ الدِّينِ"

(یعنی: ''قیامت کے دن تک میری لعنت تجھ پر ہوگی'' (سورۂ ص / ۷۸)

کا خطاب کہ جو اس کی شدید ضد اور ہٹ دھرمی کے بعد صادر ہوا ہے، اس کے لئے ہدایت کی کوئی اُمید باقی نہیں رہی، اور یہ بھی

واضح ہے کہ وہاں دو افراد ''آدم اور حوا'' سے زیادہ نہیں، پس اس آیت کے مخاطب وہ اور اُن کی اولا د ہی تھی۔ (غور کیجئے!)

یہاں ''پیام قرآن'' کی آٹھویں جلد (نبوت خاصہ کی بحث) ختم ہوتی ہے۔ الحمد للہ رب العالمین۔ اے پروردگار! ہمارے دلوں کو ہمیشہ قرآن اور سنت رسول ﷺ اور اُن کی آلؑ کے نور سے منور فرما! خداوندا! ان حیات بخش تعلیمات کے سائے میں ہمیں خودسازی کی توفیق عطا فرما! اے پروردگار! اپنی راہ کی رکاوٹوں کو دور فرما اور جو کچھ تیری رضا ہے اس کی طرف ہماری ہدایت فرما!

☆☆☆☆

تفسیر موضوعی
جلد نہم
زیرِ نظر
آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی
پیامِ قرآن
قرآن مجید میں امامت اور ولایت
نگارش
اہلِ قلم کی ایک جماعت
ترجمہ
حجۃ الاسلام سید حسنین عباس گردیزی
ناشر
مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان
قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اُردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311

نام کتاب ---------------- تفسیر موضوعی: پیامِ قرآن

جلد --------------- نہم

مؤلف --------------- آیۃ اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

مترجم ---------------- حجۃ الاسلام مولانا سید حسنین گردیزی

نظر ثانی ---------------- حجۃ الاسلام ڈاکٹر شیخ محمد حسنین

سیٹنگ و گرافکس ---------------- قلب علی سیال

سال اشاعت ---------------- 2013ء

ناشر ------------------ مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

ہدیہ (پیامِ قرآن جلد 8، 9، 10) ------ 1000 روپے

ملنے کا پتہ

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اُردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311

www.misbahulqurantrust.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرضِ ناشر

قارئین کرام!۔۔السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ ! مصباح القرآن ٹرسٹ۔۔۔۔۔عرصہ دراز سے دورِ حاضر کی بعض عظیم ترین تفاسیر وتالیفات کی نشرواشاعت کے سلسلہ میں ایک عظیم اور پُروقار مرکز کی حیثیت سے اُمت مسلمہ کیلئے اپنی عاجزانہ خدمات انجام دے رہا ہے۔

دورِحاضر میں جب تفسیر قرآن کی بات ہوتو ذہن میں انہی کتب کا تصور آتا ہے جوعموماً صدرِاوّل سے لے کرآج تک لکھی جارہی ہیں کہ جن میں سورتوں اور آیتوں کی ترتیب کے مطابق نوبت بہ نوبت ان کی تفسیر کی جاتی ہے۔مگرتفسیر قرآن کا یہی ایک طریقہ نہیں ہے بلکہ اس کتابِ الٰہی کی تفسیر کے پانچ طریقے ہیں۔۱۔تفسیرِ مفرداتی ۲۔تفسیر ترتیبی ۳۔تفسیرِ موضوعی ۴۔تفسیر ارتباطی ۵۔تفسیر کلی۔

تفسیر کے پہلے دوطریقے عام طور پر متعارف ہیں۔بلاشبہ تفسیر قرآن کا قدیمی طریقہ یہ رہا ہے کہ بالترتیب ایک کے بعد دوسری سورۃ کی تفسیر کرتے ہوئے پورے قرآن کی تفسیر مکمل کی جاتی ہے۔لیکن آیت اللہ جعفر سبحانی اورآیت اللہ ناصر مکارم شیرازی نے تفسیر کی ایک نئی روش اپنائی ہے کہ جس میں کسی اصل وفرع یا مضمون وعنوان سے تعلق رکھنے والی آیاتِ قرآنی کوایک مقام پر لاکران کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔چونکہ اس میں ہر عنوان اور موضوع کی جملہ آیات اوران کی تفسیر یکجا کردی گئی ہے،لہٰذااس کوتفسیر موضوعی کا نام دیا گیا ہے۔ادارہ ہذا کے ذریعے تفسیرِ موضوعی کا 12 جلدوں پر مشتمل پہلا سلسلہ(قرآن کا دائمی منشور)منظرعام پرآچکا ہے۔تفسیر موضوعی کا زیرِنظر سلسلہ(پیام قرآن)جوکہ آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی کی سعیِ جمیل کا نتیجہ ہے،اس کی سات جلدیں پہلے سے قارئین کے ہاتھوں میں موجود ہیں۔جلد ہشتم تا دہم قارئین کی خدمت میں پیش کی جارہی ہیں۔

زیرِنظر کتاب''پیامِ قرآن جلد نہم'' کا اردو ترجمہ ادارہ ہذا کے تعاون سے حجۃ الاسلام مولانا سید حسنین عباس گردیزی نے کیا ہے۔ادارہ مولانا موصوف کااس سعیٔ جمیل پر دل کی اتھاہ گہرائیوں سے شکرگزار ہے۔بلاشبہ مولانا موصوف اگرادارہ ہذا کے ساتھ طے شدہ ضوابط کے تحت تکمیل معاہدہ فرماتے تو زیرنظر کتاب 8 ماہ قبل قارئین کے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہوتی،لیکن غفلت کی ستم ظریفی!۔۔۔ کتاب ہذا کی تکمیل میں 6 ماہ کی بجائے 15 ماہ کا طویل عرصہ لگا دیا گیا۔اس وقت تفسیر موضوعی (پیام قرآن) کی جلدنمبر 9 کا اردو ترجمہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ہمیں اُمید ہے کہ صاحبانِ علم وتحقیق حسبِ سابق''مصباح القرآن ٹرسٹ'' کی اس کوشش کوبھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے اوراس گوہر نایاب سے بھرپور علمی وعملی استفادہ فرمائیں گے۔اورادارہ کواپنی قیمتی تجاویز وآراء سے ضرور مستفید فرمائیں گےمزید برآں مصباح القرآن ٹرسٹ کی ویب سائٹ تیاری کے آخری مراحل میں ہے۔جون 2012ءتک آپ ہماری تمام کتب ہماری ویب سائٹ www.misbahulqurantrust.com کے ذریعے گھر بیٹھے پڑھ سکتے ہیں۔۔والسلام

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

فہرست مضامین

پیش لفظ

موضوعی تفسیر کیا ہے؟ اور کن مشکلات کو حل کرتی ہے؟

ان دو اہم سوالوں کا جواب موجودہ کتاب جیسی کتابوں کو صحیح مضمون میں سمجھنے میں گہرا اثر رکھتا ہے۔ جب تک ان دو سوالوں کا جواب واضح نہیں ہوتا، اس وقت ہم اس قسم کی کتابوں کے مقصد کو نہیں سمجھ سکتے۔

پہلے سوال کے جواب میں ہم یاد دہانی کراتے ہیں کہ قرآن مجید وہ کتاب ہے جو ۲۳ سال کے لمبے عرصے میں مختلف معاشرتی حالات اور تقاضوں اور گوناگوں واقعات کو مدنظر رکھتے ہوئے نازل ہوئی ہے اور اسلامی معاشرے کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس (کی تعلیمات میں) میں بھی پیشرفت ہوتی رہی ہے۔

جن سورتوں کی آیات مکہ میں نازل ہوئی ہیں، وہ زیادہ تر توحید ومعاد پر ایمان واعتقاد کو محکم کرنے خصوصاً شرک اور بت پرستی کے خلاف شدید جدوجہد کی عکاسی کرتی ہیں جبکہ مدینہ میں نازل ہونے والی سورتوں کی آیات قدرتی طور پر اسلامی حکومت کے تشکیل پانے کے بعد نازل ہوئی ہیں ،لہذا معاشرتی، عبادی، سیاسی احکام اور بیت المال کی تشکیل اور اسلام کے قضائی نظام کی طرف ناظر ہیں اور پھر منافقین وغیرہ کے ساتھ جنگ وصلح پر مبنی مسائل سے تعلق رکھتی ہیں کہ جن میں اس وقت اسلام مبتلا تھا۔

واضح ہے کہ ان میں سے کوئی بھی مسئلہ ایک رسالۂ عملیہ (توضیح المسائل) یا قدیم نصابی اور درسی کتاب کی شکل میں پیش نہیں کیا گیا۔ بلکہ یہ آیات مختلف مناسبتوں، تقاضوں اور ضرورتوں کے مطابق نازل ہوتی رہی ہیں۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ جہاد، جنگی احکامات، عہد ناموں، اسیروں، جنگی تاوانوں وغیرہ سے متعلق احکام ہر غزوہ کی مناسبت سے پراکندہ صورت میں نازل ہوئے ہیں یہ بالکل ایک ماہر طبیب کے نسخے کی طرح ہیں کہ جو ہر روز بیمار کے حال کے مطابق نسخہ لکھتا ہے اور اسے مکمل صحت عطا کرتا ہے۔

اب اگر ہم قرآنی آیات کی نازل شدہ سورتوں میں ہر سورت میں آیات کے مطابق، ترتیب کے ساتھ تفسیر کریں تو یہ ''ترتیبی تفسیر'' ہوگی اور اگر ایک ''موضوع'' سے متعلق آیات پورے قرآن سے جمع کر کے ایک ساتھ رکھیں اور پھر ان کی فصل بندی کر کے تفسیر کریں تو یہ ''موضوعی تفسیر'' ہوگی۔

مثلاً جب بھی جہاد سے متعلق تمام آیات کہ جو دس سال کے دوران، مدنی سوروں میں نازل ہوئی ہیں یا اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات سے متعلق آیات جو ۲۳ رسال کے دوران پورے قرآن میں نازل ہوئی ہیں، ایک ساتھ رکھی جائیں اور پھر ان کی ایک دوسرے کے ساتھ تعلق کی بنا پر تفسیر کی جائے تو یہ موضوعی تفسیر کہلائے گی۔

دونوں قسم کی تفسیر کی اپنی اپنی خصوصیات اور اثرات میں کہ جو ہمیں ایک دوسرے سے بے نیاز نہیں کرتیں

اور ''ہر چیز اپنی جگہ پر اچھی ہوتی ہے'' کے مصداق دونوں قسم کی تفسیریں قرآن کے محققین کے لئے ضروری ہیں (البتہ پہلے ترتیبی تفسیر ہے اور پھر موضوعی تفسیر)۔

ترتیبی تفسیر کی خصوصیات

اس طرح کی تفسیر میں آیات کے نازل ہونے کے زمان ومکان، پہلے اور بعد میں آنے والی آیات اور داخلی اور بیرونی قرائن کے لحاظ ہر آیت کا مقام واضح ہوجاتا ہے، اس کے بغیر آیت کا صحیح معنی سمجھنا ممکن نہیں ہے۔ دوسرے الفاظ میں ترتیبی تفسیر ہر آیت کو اس کے اپنے مقام پر دیکھتی ہے اور اسلامی معاشرے کی روح کے ساتھ اس کے تعلق اور اس کی پیشرفت وتکامل کو مدنظر رکھتی ہے اور اس تعلق سے بہت سے مسائل واضح ہوجاتے ہیں۔

جبکہ موضوعی تفسیر میں آیات عینی اور جزئی واقعات کی شکل سے نکل کر ایک مجموعی وکلی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور اپنے مقام سے کسی حد تک دور ہوجاتے ہیں۔ اس کے برعکس موضوعی تفسیر کی اہم خصوصیات یہ ہیں:

موضوعی تفسیر کی خصوصیات

۱۔ ایک ہی موضوع کی مختلف آیات میں پیش ہونے والے گونا گوں پہلوؤں کو ایک ساتھ قرار دیتے ہوئے تمام موضوعات کو جامع انداز میں چند پہلوؤں سے دیکھا جاتا ہے جس سے قدرتی طور پر جدید حقائق سامنے آتے ہیں۔

۲۔ قرآن کی بعض آیات میں پہلی نظر میں (انسان کو) ابہامات نظر آتے ہیں لیکن'' **القرآنُ یفسر بعضه بعضاً**'' (قرآنی آیات ایک دوسرے کی تفسیر کرتی ہیں) کے اصول کے مطابق یہ ابہامات (موضوعی تفسیر) کی وجہ سے دور ہوجاتے ہیں۔

۳۔ موضوعی تفسیر بطور کلی ہر مسئلے اور ہر موضوع کے بارے میں اسلامی نظریۂ کائنات کو واضح کر دیتی ہے۔

۴۔ قرآن کے بہت سے چھپے ہوئے اسرار کو فقط موضوعی تفسیر کی روش پر ہی واضح کیا جاسکتا ہے اور انسانی استعداد کی حد تک آیات کی گہرائیوں تک پہنچا جاسکتا ہے۔

بنابرایں گہری سوچ اور آگاہی رکھنے والا کوئی بھی مسلمان اس دونوں قسم کی تفاسیر سے بے نیاز نہیں ہوسکتا اگرچہ زمانۂ قدیم حتیٰ ائمہ ہدیٰؑ کے زمانے سے موضوعی تفسیر کی طرف توجہ دی جاتی رہی ہے اور علمائے اسلام نے اس سلسلے میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں جس کی واضح مثال'' آیات الاحکام'' کے نام سے لکھی جانے والی کتابیں ہیں، لیکن ہمیں اس بات کا اعتراف کرنا چاہیے کہ موضوعی تفسیر میں جس طرح ترقی ہونی چاہیے تھی وہ نہیں ہوسکی اور ابھی تک یہ اپنے ابتدائی مراحل طے کر رہی ہے۔ لہٰذا علمائے

کرام کی زحمات کے نتیجے میں اسے اپنے حقیقی مقام تک پہنچنا چاہیے۔

اس کتاب ''پیام قرآن'' میں کاملاً ایک جدید روش کے مطابق قرآن کی موضوعی تفسیر کے موضوع پر جدید قدم اٹھائے گئے ہیں اورالحمدللہ اس کا بہت زیادہ استقبال ہوا ہے اور ہر روز معاشرے کے مختلف طبقات کی طرف سے اسے پذیرائی مل رہی ہے پھر بھی یہ کام ابتدائی مراحل سے گذر رہا ہے اور اسے علمائے اسلام اور مفسرین عالی مقام کی زیادہ سے زیادہ توجہ اور تعاون کی ضرورت ہے تاکہ یہ اپنے انتہائی مقصد تک پہنچ سکے۔ ہم ہمیشہ اہل نظر اور ارباب معرفت سے اس کام کو مکمل کرنے والے نظریات وآراء کی توقع رکھتے ہیں۔

ہم اس کام میں خداوند بزرگ وبرتر سے زیادہ سے زیادہ توفیق وہدایت طلب کرتے ہیں!

حجج الاسلام عالی جناب محمد رضا آشتیانی، محمد جعفر امامی، عبدالرسول حسنی، محمد اسدی، حسین طوسی، سید شمس الدین روحانی اور محمد محمدی کے تعاون سے!

ناصر مکارم شیرازی
حوزہ علمیہ قم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اشارہ

اسلامی تاریخ میں علم کلام، تفسیر اور حدیث کی مباحث میں سے ایک اہم ترین بحث، ولایت اور امامت کا موضوع ہے اور کلی طور پر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خلافت کے معنوں میں ''امامت'' کا موضوع ان علوم میں خصوصی طور پر زیر بحث رہا ہے اور اسلام کی پوری تاریخ میں کسی موضوع پر اتنی بحث نہیں ہوئی جتنی اس موضوع پر ہوئی ہے۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بعض اوقات یہ موضوع، بحث و گفتگو اور استدلال کے میدان سے نکل کر جنگ وجدال کے میدان میں پہنچ گیا اور کئی خونی جنگوں کا سبب بنا اور بعض متکلمین کے بقول:

"ما سُلَّ فِی الاسلامِ سَیْفٌ کما سُلَّ فِی الاِمامَۃِ"

''جتنی تلوار اسلام میں امامت کے مسئلے پر اٹھائی گئی ہے اتنی کسی اور مسئلے پر نہیں اٹھائی گئی۔''

یہی وجہ ہے کہ اسلامی عقائد کے اس موضوع پر بحث نے دیگر موضوعات کی نسبت سب سے زیادہ ترقی اور نشوونما پائی ہے اور سب سے زیادہ کتابیں اسی موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ تحقیق اور دقیق مطالعے کا ذوق رکھنے والے افراد کے لیے اس موضوع پر تمام زاویوں اور پہلوؤں سے گفتگو کی گئی ہے؛ اگرچہ ان میں غیر منطقی، فرقہ وارانہ اور متعصّبانہ بحثیں بھی بکثرت پائی جاتی ہیں۔ لہٰذا اس اہم ترین، حساس اور وسیع موضوع پر بحث کے حوالے سے ہماری ذمہ داری درج ذیل امور کو انجام دینا ہے:

۱۔ منطقی اور اصولی گفتگو کو غیر منطقی گفتگو سے جدا کرنا، مدلل اور تحقیق پر مبنی بحث کو تعصب آمیز بیان سے جدا کرنا اور قرآن، سنت قطعی اور عقلی دلائل کو گفتگو کی بنیاد قرار دینا اور پھر انہیں ترتیب دے کر منظم کرنا۔

۲۔ امامت سے مربوط مسائل اور عنوانات کو ولایت اور رہبریت پر منطبق کرنا جو کہ معصومینؑ کی ولایت الٰہیہ کی فروعات اور شاخیں ہیں۔

۳۔ اس تفسیری بحث میں اس موضوع پر قرآن کی رو سے روشنی ڈالنا ہمارا اصلی مقصود ہے۔

اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے ضروری ہے کہ امامت کے موضوع سے مربوط آیات پر بہت زیادہ تحقیق کی جائے اور ان کی دقیق تفسیر بیان کی جائے۔ بعض محققین کے بقول امامت کا مسئلہ صرف ماضی کا مسئلہ نہیں بلکہ یہ عالم اسلام کے آج کا مسئلہ ہے۔ یہ امامت کی قیادت اور رہبری کا مسئلہ ہے جو کہ نبوت کی بقاء اور استمرار کا عامل اور اسلام کی تقدیر کا مسئلہ ہے۔[1]

بنابرایں، ہم اس مسئلہ کے بیان میں سب سے پہلے پورے عالم ہستی کی قیادت و رہبری کو بیان کریں گے۔ پھر عالم انسانیت کی رہبری کا مسئلہ اٹھائیں گے اور اس کے بعد معصوم اماموں کی رہبری اور آخر میں ان کے نائبین کی حکومت اور قیادت پر گفتگو کریں گے۔ لیکن سب سے پہلے چند باتوں کا ذکر ضروری ہے:

---

[1] امامت و رہبری، تالیف آیۃ اللہ شہید مطہری، ص ۱۳۔

ا۔امامت کیا ہے؟

امامت کی تعریف میں بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے اور یہ اختلاف ہونا بھی چاہیے کیونکہ ایک گروہ (مکتب اہل بیتؑ کے پیروکاروں اور شیعوں) کے نزدیک امامت اصول دین اور عقیدے کی بنیادوں میں سے ہے جب کہ دوسرے گروہ (اہل سنت) کے نزدیک یہ فروعات دین اور عملی احکامات میں سے شمار ہوتی ہے۔واضح ہے کہ امامت کے مسئلہ کے بارے میں ان دو گروہوں کا نکتہ نظر ایک نہیں ہوسکتا اور نہ ہی امامت کی تعریف میں دونوں متحد ہوسکتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ایک سنی عالم امامت کی اس طرح تعریف کرتے ہیں:

"الْإِمَامَةُ رِئَاسَةٌ عامةٌ فِي أُمورِ الدِّينِ وَالدُّنيا ،خَلافَةً عَنِ النبّي (ص)"

''امامت، نبی اکرمؐ کے جانشین کے طور پر دین اور دنیا کے امور میں ایک عمومی سرپرستی اور سربراہی ہے۔''[1]

اس تعریف کے مطابق امامت،حکومت کی سربراہی کی حد تک ایک ظاہری ذمہ داری ہے البتہ ایک ایسی حکومت جو اسلامی ہے اور رسول اکرمؐ کی جانشینی (حکومت کے مسئلہ میں رسول خداؐ کی نیابت) کے عنوان سے ہے۔طبیعی طور پر ایسا امام لوگوں کی طرف سے منتخب ہوسکتا ہے۔

بعض افراد نے امامت کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ امامت کسی شخص کا رسول اللہ ﷺ کے جانشین اور نائب کی حیثیت سے احکام شریعت کو نافذ کرنا اور دین کے امور کی حفاظت کرنا ہے؛اس طرح سے کہ اس کی اطاعت اور فرمانبرداری تمام امت پر واجب ہو[2] یہ تعریف اول الذکر تعریف سے زیادہ مختلف نہیں ہے، بلکہ اسی مفہوم اور مطلب اور اثرات کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ابن خلدون نے بھی اپنے مشہور مقدمہ تاریخ میں مذکورہ معنی کو ہی بیان کیا ہے۔[3] شیخ مفید اپنی کتاب ''اوائل المقالات'' میں عصمت کی بحث میں یوں بیان کرتے ہیں:

"ان الا ئمة القائمين مقام الا نبيا ء فی تنفيذ الا حكام و اقامة الحدود و حفظ الشرايع و تاديب الانام معصومون كعصمة الانبياء"

''وہ آئمہ جو احکام کے نفاذ،حدود کے اجرا،شریعت کی حفاظت اور لوگوں کی تربیت میں انبیاؑ کے قائم مقام اور جانشین ہیں وہ انبیاء ہی کی طرح معصوم (گناہ اور خطا سے پاک) ہیں۔''[4]

---

[1] شرح تجرید قوشچی ،ص ۳۷۴۔

[2] (شرح تجرید قدیم) شمس الدین اصفہانی اشعری (بنا بر نقل توضیح المراد تعلیقہ بر شرح تجرید عقائد: تالیف، سید ہاشم حسینی تہرانی ،ص ۶۷۲

[3] مقدمہ ابن خلدون ،ص ۱۹۱

[4] اوائل المقالات ،ص ۷۴، چھاپ ،کتبہ الداوری۔

اس تعریف کے مطابق جو کہ مکتب اہل بیتؑ کے پیروکاروں کے عقیدے سے سازگار ہے، امامت لوگوں کی سربراہی اور حکومت سے بالاتر ہے بلکہ (وحی وغیرہ وصول کرنے کے علاوہ) انبیاء کی دیگر تمام ذمہ داریاں، اماموں کے لیے (بھی) ثابت ہیں اور اسی دلیل کی بنیاد پر جس طرح انبیاء کے لیے معصوم ہونا ضروری ہے اسی طرح امام کے لیے بھی معصوم ہونا ضروری ہے۔ (غور کیجیے گا) لہٰذا احقاق الحق کی شرح میں شیعوں کے نزدیک امامت کی تعریف یوں بیان کی گئی ہے:

"هِيَ مَنْصَبٌ اِلَهِي حَائِزٍ لِجَمِيْع الشؤون الكريمه والفضائل اِلَّا النبوّة و ما يُلازِمِ تِلْكَ المَرْتَبَةَ السَامِيَةَ"

''امامت ایک الٰہی اور خدا داد منصب ہے اس میں نبوت اور اس کے لوازمات کے علاوہ تمام اعلیٰ اور بلند امور اور فضائل شامل ہیں۔'' [1]

اس تعریف کی رو سے امام، اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ رسولؐ مقرر ہوتا ہے اور (مقام نبوت کے علاوہ) رسولؐ کے تمام فضائل اور خصوصیات کا حامل ہوتا ہے اور اس کا کام صرف اسلامی حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے میں منحصر نہیں ہے۔ اس دلیل کی بنا پر امامت اصول دین کا جزء ہے، فروعات دین اور عملی احکام میں سے کوئی ایک فرع یا حکم نہیں ہے۔

۲۔ امامت اصول میں سے ہے یا فروع میں سے؟

گزشتہ بحث کی روشنی میں اس سوال کا جواب واضح ہے۔ کیونکہ امامت کے موضوع میں آراء ونظریات مختلف ہیں، اہل سنت کے متعصب عالم فضل بن روز بھان، جو کہ ''نہج الحق'' کے مصنف ہیں کہ جس کے جواب میں ''احقاق الحق''، لکھی گئی ہے، یوں لکھتے ہیں:

"اِنَّ مَبْحث الامأمة عِنْدَ الاشاعرة ليس من اصول الديانات و العقايد بل هى عند الاشاعرة من الفروع المتعلقةِ بِأَفْعال المكَلّفِيْنَ۔"

''اشاعرہ کے نزدیک امامت کی بحث عقائد اور دین کے اصولوں میں سے نہیں ہے بلکہ ان کے نزدیک اس کا تعلق فروع اور مکلفین کے افعال سے ہے۔'' [2]

اہل سنت کے دیگر فرقوں کا اس نکتہ نگاہ سے اشاعرہ کے ساتھ کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ سب نے اسے عملی ذمہ داریوں میں شمار کیا ہے جسے لوگوں پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ صرف مکتب اہل بیتؑ کے پیروکار شیعوں نے اور اہل سنت کے چند افراد جیسے قاضی بیضاوی اور ان کے

---

[1] احقاق الحق، ج ۲، ص ۳۰۰

[2] احقاق الحق، ج ۲ ص ۲۹۴، دلائل الصدق، ج ۲، ص ۴۔

بعض پیروکاروں نے امامت کو اصول دین میں سے قرار دیا ہے۔[1]

اس کی دلیل انتہائی واضح ہے کیونکہ شیعوں کے نزدیک امامت ایک منصب الٰہی ہے جس کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے معین ہونا ضروری ہے اوراس کی بنیادی ترین شرائط میں سے ایک شرط امام کا معصوم ہونا ہے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے سوا کوئی بھی کسی کی عصمت سے با خبر نہیں ہے۔

بانی شریعت حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان کی طرح اماموں پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ البتہ اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ امامیہ، امامت میں اپنے مخالفین کو کافر سمجھتے ہیں بلکہ وہ تمام اسلامی فرقوں کو مسلمان سمجھتے ہیں اور انہیں مسلمان بھائی کے طور پر دیکھتے ہیں؛ اگر چہ وہ امامت کے متعلق ان کے عقیدے کو قبول نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے پانچ اصول دین کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے پہلے تین اصولوں، یعنی توحید، نبوت اور قیامت کو اصول دین قرار دیتے ہیں اور آئمہ ÷ کی امامت کے عقیدے اور عدل الٰہی کو اصول مذہب قرار دیتے ہیں۔ ہم اپنی بات کو امام علی بن موسیٰ رضا - کی مکتب اہل بیتؑ کے پیروکاروں کے لیے مسئلہ امامت میں ایک الہام بخش حدیث پر ختم کرتے ہیں:

"اِنَّ الأَمِامَةَ زَمامُ الدّینِ وَنَظامُ المُسْلِمینَ وَ صَلاحُ الدُّنیا وَ عِزُّ المؤمنینَ، اِنَّ الأَمامَةَ اُسُّ الاِسْلامِ النّامی وَ فَرعُهُ السّامِ، بِالأِمامِ تَمامُ الصَّلاۃِ وَ الزَّکاتِ وَ الصِّیامِ وَ الحَجِّ وَ الجِهادِ وتوفیرُ الفَیْئِ وَ الصَّدَقاتِ وَاِمضاءُ الحُدودِ وَ الاَحکامِ وَ مَنْعُ الثُّغُورِ وَ الأَطرف۔ اَلاِمامُ یَحِلُّ حَلالَ اللہِ و یُحَرِّمُ حَرامَ اللہِ وَ یُقیمُ حُدُودَ اللہِ وَ یَذُبُّ عَنْ دینِ اللہِ وَ یَدْعو اِلی سَبیلِ رِبِّهِ بِالحِکْمَةِ وَ المَوْعِظَةِ الحَسَنَةِ وَ الحُجَّةِ البالِغَةِ"[2]

"امامت دین کی باگ دوڑ، مسلمانوں کے لیے نظام، دنیا کی اصلاح اور مومنین کی عزت ہے۔ بے شک امامت، رشد ونمو پاتے اسلام کی اساس اور اس کی بلند شاخ ہے۔ امام کے ذریعے نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج اور جہاد کامل ہوتے ہیں؛ بیت المال کے اموال میں اضافہ ہوتا ہے اور ضرورت مندوں پر انفاق اور خرچ فراوان ہوتا ہے۔ احکام کا نفاذ، حدود کا اجراء، اسلامی سرحدوں اور سرحدی علاقوں کی حفاظت، امام ہی کے توسط سے انجام پاتی ہے۔ امام حلال الٰہی کو حلال اور حرام الٰہی کو حرام قرار دیتے ہوئے (ان کا نفاذ کرتا ہے) اور حدود الٰہی کو قائم کرتا ہے، اللہ کے دین کا دفاع کرتا ہے اور اپنے رب کی طرف علم ودانش، بہترین موعظہ اور محکم اور رسا دلیل کے ذریعے دعوت دیتا ہے۔"

---

[1] دلائل الصدق، ج ۲، ص ۸۔

[2] اصول کافی، جلد اول، ص ۳۰۰۔

۳۔ امامت کی بحث کب چھڑی؟

پیغمبر اکرم ﷺ کے بعد آنحضرتؐ کی خلافت پر بحث کا آغاز ہوا۔ ایک گروہ کا نظریہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنا جانشین اور خلیفہ مقرر نہیں فرمایا اور اس کی ذمہ داری امت کے سپرد کی ہے کہ وہ مل بیٹھ کر اپنے درمیان سے کسی کو اپنا رہبر اور راہنما چن لیں؛ ایسا رہبر جو حکومت کی باگ ڈور سنبھالے اور عوام کے نمائندے کے طور پر لوگوں پر حکمرانی کرے۔ اگر چہ اس طرح کی نمائندگی ہرگز وقوع پذیر نہ ہوئی۔ البتہ اس کے پہلے مرحلے میں صحابہ کے ایک چھوٹے سے گروہ نے خلیفہ کا انتخاب کیا، دوسرے مرحلے میں خلیفہ کو نامزد کیا گیا اور تیسرے مرحلے میں خلیفہ بنانے کی ذمہ داری ایک چھ رکنی شوریٰ (کمیٹی) کے سپرد کی گئی جو سب کے سب نامزد ارکان تھے۔ اس نظریے کے حامل افراد کو اہل سنت کہا جاتا ہے۔

دوسرے گروہ کا نظریہ تھا کہ امام اور خلیفہ رسول ﷺ کا تعین اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونا چاہیے، کیونکہ اُسے رسول خدا کی طرح گناہ اور غلطی سے پاک اور غیر معمولی علم کا حامل ہونا چاہیے تاکہ وہ امت کی مادی اور معنوی لحاظ سے راہنمائی کا فریضہ انجام دے سکے، اسلام کی بنیادوں کی حفاظت کر سکے، اسلام کے پیچیدہ مسائل کو واضح طور پر بیان کر سکے، قرآن کے دقائق کی تشریح کر سکے اور اسلام کو دوام عطا کر سکے۔

اس نظریے کے حامیوں کو امامیہ یا شیعہ کہا جاتا ہے اور اس لفظ کو پیغمبر اکرم ﷺ کی مشہور احادیث سے لیا گیا ہے۔ تفسیر ''الدر المنثور''، جو کہ اہل سنت کے مشہور مآخذ میں سے ہے، اس میں قرآن کریم کی آیت ''**اُولٰئِكَ هُمْ خيرُ الْبَرِيّه**'' کی تفسیر میں جابر بن عبد اللہ انصاری سے یوں نقل ہوا ہے کہ وہ بیان کرتے ہیں:

كُنَّا عِنْدَ النَّبِیّ فَاَقْبَلَ عَلیؑ فَقَالَ النَّبِیُّ: وَ الَّذِی نفسی بِيَدِهِ اِنَّ هٰذا و شيعَتَهُ لَهُمُ الفائِزُونَ يَوْمَ الِقيامةِ و نَزَلَتْ: "اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُو و عَمِلُو الصَالِحاتِ اُولٰئِكَ هُمْ خَيْرُ البَرِيَّةِ." فكانَ اَصْحَابُ النَّبِیّ ﷺ اِذَا اَقْبَلَ عَلیٌّ قالُو: "جاءَ خَيْرُ البَرِيَّه."

''ہم نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں موجود تھے کہ اتنے میں علیؑ ہمارے پاس تشریف لائے۔ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: بے شک یہ اور ان کے شیعہ قیامت کے دن کامیاب ہوں گے۔'' اس موقعہ پر یہ آیت نازل ہوئی: ''بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے عمل صالح انجام دیے، وہ خدا کی بہترین مخلوق ہیں۔'' اس کے بعد جب بھی نبی اکرم ﷺ کے اصحاب کی محفل میں علیؑ تشریف لاتے تو صحابہ کہتے: ''خدا کی بہترین مخلوق آ گئی۔''[1]

---

[1] الدر المنثور، جلد ۶، صفحہ ۳۷۹۔

اس بات کو پانچویں صدی ہجری کے اہل سنت کے ایک مشہور عالم حاکم نیشاپوری نے اپنی شہرت یافتہ کتاب ''شواہد التنزیل'' میں مختلف حوالوں سے نبی اکرم ﷺ سے نقل کیا ہے اور اس کی احادیث کی تعداد بیس سے زیادہ ہے۔ ان میں سے ایک روایت انہوں نے ابن عباس سے بیان کی ہے کہ جب آیت: ''اِنَّ الّذِینَ آمَنُو وعَمِلُو الصَّالِحاتِ اُولئِكَ هُم خیر البَرِیَّة'' نازل ہوئی تو رسول خدا ﷺ نے علیؑ سے فرمایا: ''هُوَ اَنْتَ وَشِيْعَتُكَ...'' یعنی: ''اس سے مراد آپ اور آپ کے شیعہ ہیں۔''[1] ایک اور حدیث میں ابو برزہ سے منقول ہے کہ جب آنحضرتؐ نے اس آیت کی تلاوت کی تو فرمایا: ''هُمْ اَنْتَ وشِيْعَتُكَ یاعلیؑ'' یعنی: ''یا علی! وہ آپ اور آپ کے شیعہ ہیں۔''[2] بہت سے دیگر علمائے اسلام اور علمائے اہل سنت جیسے ابن حجر نے اپنی کتاب صواعق میں اور محمد شبلنجی نے نور الابصار میں مذکورہ حدیث کو ذکر کیا ہے۔[3]

ان احادیث سے یہ ثابت ہوا کہ حضرت علیؑ کے پیروکاروں اور طرف داروں کے لیے شیعہ کا نام اور عنوان، خود رسول اللہؐ نے انتخاب کیا ہے، اس کے باوجود کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ بعض افراد اس نام اور عنوان سے چڑھتے ہیں اور برا سمجھتے ہیں اور اس لفظ کے شروع میں حرف ''شین'' سے شر جیسے غلط معنی مراد لیتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس قسم کے الفاظ ایک ایسے محقق کے لیے حیران کن ہیں جو ہمیشہ منطقی دلائل کی روشنی میں سفر کرتا ہے جب کہ معلوم ہے کہ حروف تہجی میں سے ہر حرف بلا استثنا اچھے اور بُرے سب معانی اور کلمات کیلئے انتخاب کیا جا سکتا ہے۔

پس شیعہ کے وجود میں آنے کی تاریخ کا آغاز رسول اکرم ﷺ کی رحلت کے بعد نہیں، بلکہ ایک معنی میں خود آنحضرتؐ کی زندگی میں ہوا ہے اور اس لفظ کو خود رسول اکرم ﷺ نے حضرت علیؑ کے پیروکاروں اور دوستوں کے لیے استعمال کیا ہے اور جو شخص بھی رسول خدا ﷺ کی نبوت پر ایمان رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ اپنی مرضی اور خواہشات کو بنیاد بنا کر کچھ نہیں بولتے تھے: ''وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوىٰ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُوحیٰ''۔ پس اگر انہوں نے یہ فرمایا ہے کہ اے علیؑ آپ اور آپ کے شیعہ قیامت کے دن کامیاب اور سعادت مند ہوں گے تو یہ ایک حقیقت ہے۔

۴۔ امام کا لفظ لغت اور قرآن میں

جیسا کہ اہل لغت نے کہا ہے ''امام'' کا لفظ ''کتاب'' کے وزن پر ہے اور یہ اسم مصدر ہے اور ہر اُس چیز کے لیے استعمال ہوتا ہے جس کی طرف انسان توجہ کرے اور وہ اس کا ہدف قرار پائے۔ یہ لفظ اپنے مختلف استعمالات، مختلف پہلوؤں اور کیفیات کے اعتبار سے

---

[1] شواہد التنزیل، ج ۲۸، ص ۳۵۷

[2] شواہد التنزیل، ج ۲۸، ص ۳۵۷

[3] الصواعق، ص ۹۶، نور الابصار، ص ۷۰، ۱۰۱۔ اس حدیث کے راویوں اور جن کتابوں میں یہ حدیث نقل ہوئی ہے ان کے بارے میں مزید معلومات کیلئے دیکھیں: احقاق الحق، ج ۳، صفحہ ۲۸۷ کے بعد اور ج ۱۴، صفحہ ۲۵۸۔

مختلف معانی دیتا ہے۔امام جمعہ، امام جماعت، ہدایت کا امام اور گمراہی وضلالت کا امام وغیرہ، اس لفظ کے مختلف استعمالات ہیں۔[1]

یہ لفظ اصل میں ''اَمّ'' کے مادہ سے ہے اور ارادہ اور قصد کرنے کے معنی میں آیا ہے۔''مقاییس اللغۃ'' میں لکھا ہے کہ ''اُمّ'' کا معنی جڑ، سرچشمہ، جماعت اور دین ہے اور امام ہر اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کی اقتداء اور پیروی کی جائے اور وہ اعمال وافعال میں پیشوا ہو۔ امام ''آگے'' کے معنی میں بھی آیا ہے۔

''لسان العرب'' میں امام کے لفظ کے کئی معانی ذکر ہوئے ہیں۔جیسے پیشوا، معلم، شاقول (معماری کا وہ آلہ جس کے ذریعے معمار دیوار کی سیدھ دیکھتے ہیں)، راستہ اور اگلا حصہ وغیرہ۔لیکن ہماری دانست کے مطابق، جیسا کہ ''التحقیق'' کے مصنف نے بھی قبول کیا ہے، ان تمام معانی کی بنیاد، وہی خاص توجہ کے ساتھ کسی چیز کا قصد کرنا ہے۔اور اگر ماں کو اُمّ کہتے ہیں یا ہر چیز کی اصل اور بنیاد پر اُمّ کا لفظ اطلاق ہوتا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ انسان ان چیزوں کا قصد کرتا ہے اور یہ چیزیں انسان کا مقصود ہوتی ہیں اور اس کی توجہ کا باعث بنتی ہیں۔اسی طرح امام کو اس لیے امام کہا جاتا ہے کہ لوگ اس کی اقتداء کرتے ہیں اور اس کے پاس خاص توجہ اور قصد وارادے کے ساتھ آتے ہیں۔

یہاں اس نکتہ کو یاد دلانا بھی ضروری ہے کہ امام کا لفظ اور اس کی جمع ''آئمہ'' ٹھیک بارہ مرتبہ قرآن مجید میں آیا ہے! (سات مرتبہ مفرد صورت میں اور پانچ مرتبہ جمع کی صورت میں) ایک مقام پر یہ لفظ لوح محفوظ کے معنی میں آیا ہے۔چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ مُبِينٍ ﴿١٢﴾

''ہم نے ہر چیز کو امام مبین (لوح محفوظ) میں جمع کر دیا ہے'' (یٰس ر ۱۲)

یہاں لوح محفوظ کو ''امام'' قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ لوح محفوظ قیامت کے دن انسانوں کے اعمال کی قدر وقیمت پرکھنے کے لیے فرشتوں کے لیے رہبر اور رہنما ہے اور سب اس سے الہام اور رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔امام کا لفظ ایک اور جگہ پر قرآن میں راستے اور جادہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَإِنَّهُمَا لَبِإِمَامٍ مُبِينٍ ﴿٧٩﴾

''قوم لوط اور قوم شعیب کے دونوں تباہ شدہ شہر تمہارے (شام کی طرف) راستے پر واضح ہیں'' (حجر ر ۷۹)

اس آیت میں راستے کو ''امام'' قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ لوگ اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے راستوں کو مدنظر رکھتے ہیں۔

امام کا لفظ دو مرتبہ تورات کے لیے استعمال ہوا ہے جو کہ یہودیوں کے لیے رہنما اور پیشوا تھی۔چنانچہ ارشاد فرمایا:

وَمِنْ قَبْلِهِ كِتَابُ مُوسَىٰ إِمَامًا وَرَحْمَةً ۚ

''اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب ان کے لیے پیشوا اور رحمت تھی'' (احقاف ر ۱۲؛ ہود ر ۱۷)

پانچ جگہوں پر امام کا لفظ صالح اور الٰہی پیشواؤں اور راہنماؤں پر بولا گیا ہے۔جیسے:

---

[1] التحقیق، مادہ اُمّ

قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ

اللہ تعالیٰ نے (ابراہیم سے) فرمایا: میں نے تمہیں لوگوں کے لیے امام اور پیشوا قرار دیا ہے۔
(بقرہ / ۱۲۴)

ایک اور مقام پر چند انبیاء ورسل کو امام کہا گیا ہے:

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا

''اور ہم نے انہیں امام اور پیشوا قرار دیا جو ہمارے امر سے (لوگوں کو) ہدایت کرتے تھے'' (انبیاء / ۷۳)

یہی جامع اور کلی مفہوم سورہ فرقان کی آیت / ۷۴، قصص کی آیت / ۵ اور سورہ سجدہ کی آیت / ۲۴ میں بھی آیا ہے۔ ایک جگہ پر یہ لفظ کفر اور ضلالت کے پیشواؤں کے لئے بھی استعمال ہوا ہے:

فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ ۙ

''پس کفر کے اماموں سے جنگ کرو'' (توبہ / ۱۲)

ایک اور مقام پر یہ لفظ ہدایت اور گمراہی دونوں کے اماموں کیلئے جامع معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ارشاد ہوا:

یَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِهِمْ ۚ

''اس دن ہم ہر گروہ کو اس کے پیشوا کے ساتھ بلائیں گے (بنی اسرائیل / ۷۱)

یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید میں امام کا لفظ فقط بارہ مختلف موارد میں استعمال ہوا ہے۔

۵۔ قرآن مجید میں امامت کے مقام کی عظمت

جیسا کہ ہم بعد میں بیان کریں گے امامت اور رہبریت کا موضوع صرف ایک دینی اور تشریعی مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس کی وسعتوں نے تمام کائنات اور عالم تکوین کو اپنے اندر سمویا ہوا ہے۔ خداوند بزرگ و برتر عالم ہستی اور اس کے مختلف مجموعوں کا امام ہے۔ وہ ان سب کی ہدایت و رہنمائی اور تدبیر فرماتا ہے۔ خداوند تعالیٰ قرآن مجید بھی امامت کو خاص اہمیت دیتا ہے اور اسے انسان کے ارتقائی سفر کا آخری مرحلہ قرار دیتا ہے جس پر صرف اولوالعزم پیغمبر فائز ہوئے ہیں۔ چنانچہ سورہ بقرہ کی آیت / ۱۲۴ میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ ؕ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۲۴﴾

''اور اس وقت کو یاد کرو جب ابراہیم کو ان کے رب نے مختلف کلمات سے آزمایا اور وہ ان آزمائشوں پر پورے اترے تو ارشاد ہوا: میں تمہیں لوگوں کا امام اور پیشوا قرار دیتا ہوں۔ ابراہیم نے کہا: میری اولاد سے (بھی امام قرار دے) اللہ نے فرمایا: میرا عہد (یعنی امامت) ہرگز ظالموں کو نہیں پہنچے گا۔ (تیری اولاد سے

صرف وہ افراد اس مقام و منصب کے اہل ہوں گے جو پاکیزہ اور معصوم ہوں گے۔)''

اس آیت میں پہلے تو بطور مجمل ارشاد ہوا کہ ''اس وقت کو یاد کریں جب پروردگار نے ابراہیم کو کلمات سے آزمایا۔'' یہ کلمات کیا تھے اس بارے میں مفسرین کے درمیان بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے اور تفسیر ''روح المعانی'' کے مطابق اس کے متعلق تیرہ اقوال ذکر کیے گئے ہیں۔[1]

لیکن جو بات زیادہ صحیح نظر آتی ہیں وہ یہ ہے کہ ان کلمات سے مراد وہی مختلف ''اوامر اور نواھی'' تھے جو حضرت ابراہیمؑ کے کاندھوں پر بھاری اور مشکل فرائض کی صورت میں عائد ہوئے تھے تاکہ امتحان کی کٹھالی میں ان کی خوب آزمائش ہو اور وہ بت پرستوں کے خلاف جراتمندی کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوں۔ بتوں کو توڑنا، آتش نمرود میں ڈالے جانا اور ان تمام مراحل میں ثابت قدمی دکھانا تھا۔ اسی طرح اپنے لخت جگر کو قربان کرنے کے لیے تیار ہونا، اُسے قربان گاہ تک لے جانا اور اس کے گلے پر چھری رکھنا، نیز اپنے بیٹے اور بیوی کو اپنے سے جدا کر کے مکہ کی خشک اور جلا دینے والی سرزمین پر چھوڑنا اور وہ بھی اس وقت جب کوئی آدم زاد وہاں نہیں رہتا تھا۔ اور آخر کار بت پرستوں کی سرزمین سے ہجرت کرنا، اپنی ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے کاروبار زندگی کو ٹھکرا دینا، سچ تو یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک سخت اور سنگین آزمائش تھی۔ لیکن حضرت ابراہیمؑ ایمان اور صبر و استقامت کی طاقت سے ان تمام امتحانات میں کامیاب اور سرخرو ہوئے۔

بعض مفسرین نے حضرت ابراہیم کے امتحانی نصاب کے تیس سے زائد موضوعات کو شمار کیا ہے اور ان کا کہنا ہے کہ قرآن کی تین سورتوں میں یہ تیس موضوعات ذکر کیے گئے ہیں۔ سورہ توبہ کی آیت / ۱۱۲ میں (دس چیزوں کا ذکر ہوا ہے) سورہ احزاب کی آیت / ۳۵ میں (دس چیزوں کا ذکر ہوا ہے) اور سورہ مومنون کی ایک سے نو تک کی آیات میں بھی دس چیزیں بیان ہوئی ہیں۔ یوں مجموعی طور پر تیس اوصاف یا تیس امتحانی موضوعات بن جاتے ہیں۔[2]

لیکن اس بات کے پیش نظر کہ ان میں سے بہت سے اوصاف یا اشیاء مکرر بیان ہوئی ہیں، اس لحاظ سے ان کی تعداد تیس تک نہیں پہنچتی۔ لہٰذا یہ قول زیادہ قابل قبول نہیں ہے۔ بہرحال عظیم بت شکن مخلص اور ایثار و قربانی کا مجسمہ پیغمبر، حضرت ابراہیمؑ ان تمام سخت اور بھاری امتحانوں میں کامیاب و کامران ہوا تو اس موقعہ پر امامت کا لباس ان کے زیب تن کرنے کے لیے موزوں سمجھا گیا اور اللہ و تبارک و تعالیٰ نے اِس خطاب کے ذریعے یہ افتخار اور اعزاز انہیں بخشا اور فرمایا:

اِنِّیۡ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ

''میں نے تمہیں لوگوں کا امام اور پیشوا بنایا ہے۔''

یہ کون سا مقام اور مرتبہ تھا جو حضرت ابراہیمؑ کو نبوت و رسالت کے مرتبے اور ان تمام کٹھن مراحل سے گزرنے کے بعد آخری عمر

---

[1] روح المعانی، ج اول، ص ۳۷۲

[2] روح المعانی، ج اول، ص ۳۷۵۔ بعض مفسرین نے یہاں سورہ سئل سائل (معارج) کا بھی اضافہ کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ کلمات قرآن بھی چار سورتوں میں بیان ہوئے ہیں۔

میں عطا کیا گیا؟ یقیناً یہ ان تمام مقامات سے اعلیٰ اور بلند ترین مرتبہ تھا! جسے حضرت ابراہیمؑ ان سب امتحانات کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے دریافت کرنے کے قابل ہوئے۔ یہاں سوال یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو امامت کا جو منصب ملا اس سے کونسا منصب مراد ہے؟

تو یہاں امامت کی تفسیر میں مفسرین نے بہت زیادہ بحث کی ہے چونکہ ان میں سے بعض نہ چاہنے اور بعض نہ جاننے کی وجہ سے اس لفظ کے اعلیٰ معنی کی تہہ تک نہ پہنچ سکے، لہٰذا وہ عجیب وغریب سرگردانی میں مبتلا ہو گئے۔ اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ چند مفسرین نے یہاں امامت کی تفسیر نبوت سے کی ہے؛ حالانکہ یقیناً اس وقت حضرت ابراہیمؑ پیغمبر تھے اور ان کی نبوت ورسالت کے کئی سال گزر چکے تھے اور آپ صاحب اولاد ہو چکے تھے اور آیت کے درمیان میں انہوں نے اپنے بیٹوں اور نسل کے لیے امامت کے عہدے کا تقاضا بھی کیا بہت سارے مفسرین کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو جن کلمات کے ذریعے آزمایا وہ ان تعلیمات کا ایک مجموعہ تھا جو انہوں نے خداوند تعالیٰ کی طرف سے دریافت کی تھیں، یا پھر وہ کلمات بت پرستوں کے خلاف قیام، خانہ کعبہ کی تعمیر اور بیٹے کی قربانی تھے۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے امامت کو نبوت کے معنی میں لیا ہے، جب کہ یہ تمام احکامات اور یہ تمام ایثار وقربانی کے واقعات حضرت ابراہیمؑ کے منصب نبوت پر فائز ہونے کے بعد وقوع پذیر ہوئے۔ لہٰذا ان مفسرین کے کلام میں: ''اِنِّی جاعِلُكَ للنّاس اماماً'' کے اس جملے کی یہ تفسیر ناقابل فہم ہے۔

امامت کا ایک اور معنی جو بیان کیا گیا ہے وہ ''واجب الاطاعت'' ہونا ہے، جبکہ ہر پیغمبر اور نبی واجب الاطاعت ہے یعنی اس کی اطاعت واجب ہے اور اُسے (نبوت کے علاوہ) کسی اور منصب پر فائز ہونے کی ضرورت نہیں ہے [1] بعض نے امامت کا ایک تیسرا معنی ذکر کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ اس سے مراد، دین ودنیا کے امور میں سربراہی اور حاکمیت ہے۔ باالفاظ دیگر حکمران ہونا مراد ہے۔ اگرچہ یہ تفسیر پہلی دو سے بہتر ہے لیکن پھر بھی امامت کے معنی کی گہرائی کو واضح نہیں کرتی۔ قرآن مجید کی دیگر آیات جو امامت کے مسئلہ کو بیان کرتی ہیں، ان کی روشنی میں ہمارا نظریہ یہ ہے کہ اس آیت میں امامت سے مراد، وہ سب سے اعلیٰ وارفع اور بلند مقام ہے اور وہ الٰہی پروگرام اور منصوبوں کو عملی جامہ پہنانا ہے جو کہ حکومت، الٰہی احکام کے نفاذ اور نفس انسانی کی ظاہری اور باطنی تربیت اور نشوونما جیسے سب امور کو شامل ہے۔

اس امر کی وضاحت یہ ہے کہ انبیاء کی بعثت اور رسولوں کے بھیجنے کا ہدف انسانی معاشرہ کی ہدایت ہے اور یہ ہدایت دو طرح سے انجام پاتی ہے۔ ایک ''اراءَ طریق''، یعنی راستہ دکھانے کے معنی میں۔ یعنی وہی کام جو انبیاء الٰہی میں سے ہر ایک کا فریضہ اور ذمہ داری تھا۔ اور دوسری ''ایصال به مطلوب''، یعنی مطلوب ومقصود تک پہنچانا۔ کہ ایسی ہدایت کی پھر آگے دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم: ہدایت تشریعی اور دینی تعلیمات اور نظام کو علمی جامہ پہنانا؛ خواہ یہ حکومت تشکیل دینے کے ذریعے، حدود اور احکام الٰہی کے نفاذ اور عدالت اجتماعی کے قائم کرنے سے ہو یا پھر عملی طور پر انسانوں کی تربیت اور پرورش کے ذریعے سے ہو۔ یہ دونوں چیزیں پیغمبروں کے مقاصد اور اہداف کے حصول کے عوامل ہیں۔ ہدایت کا یہ عمل انتہائی مشکل، سخت اور علم وتقویٰ، شجاعت اور انتظامی صلاحیتوں

---

[1] تفسیر روح البیان نے ابراہیم کی دس معروف عادات اور کشاف اور مراغی نے اوامر ونواہی اور قرطبی اور المنار نے ان اوامر کا ایک مجموعہ بیان کیا ہے۔

جیسی بہت زیادہ خصوصیات کے حامل ہونے کا تقاضا کرتا ہے۔

دوسری قسم: ہدایت تکوینی ہے اور اس سے مراد معنوی اور روحانی نفوذ اور اثر ڈالنے کے ذریعے اور آمادگی رکھنے والے انسانوں کے دلوں میں ہدایت کی شمع روشن کر کے اُنہیں منزل مقصود تک پہنچانا ہے۔ یہ ایک باطنی اور معنوی سفر ہے اور یہ اُس سفر سے مختلف ہے جو عظیم پیغمبروں اور الٰہی پیشواؤں کے پیروکاروں کے حوالے سے ظاہری اور بیرونی لحاظ سے تھا۔ یقیناً ہدایت کے اس عمل کے لیے بہت زیادہ صفات اور خصوصیات، نیز بیشتر آمادگی کی ضرورت ہے۔

ہدایت کی ان دونوں اقسام کے میسر ہونے سے مذہب کے مقاصد حاصل ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء کے مقررہ اہداف پورے ہوتے ہیں اور آمادگی رکھنے والے انسان مادی و معنوی اور ظاہری و باطنی کمال تک پہنچتے ہیں اور کمال تک پہنچتے ہیں۔ مذکورہ آیت میں امامت سے مراد یہی ہے۔ جب تک حضرت ابراہیم ؑ کو ان تمام صلاحیتوں اور خصوصی صفات کے حوالے سے آزمانہیں لیا گیا، انہیں اس مقام و منصب کے قابل نہیں سمجھا گیا۔

اس گفتگو سے یہ نتیجہ بھی حاصل ہوتا ہے کہ کئی مقامات پر امامت اور نبوت کا منصب اکٹھے ہو جاتے ہیں اور حضرت ابراہیم جیسے اولوالعزم پیغمبر، منصب امامت پر بھی فائز ہوتے ہیں۔ اور ان سے بڑھ کر خود حضرت رسول اکرم ﷺ کی ذات ہے کہ جن میں نبوت، رسالت اور امامت جمع ہو گئی تھیں۔

یہاں یہ بھی ممکن ہے کہ امامت، نبوت اور رسالت ایک دوسے سے الگ الگ ہوں۔ جیسا کہ بارہ معصومین، امام ہیں جن کا فریضہ فقط امامت تھا لیکن ان پر وحی نازل نہیں ہوتی تھی اور وہ نبی یا رسول نہیں تھے۔ بہرصورت مذکورہ آیت کے ابتدائی جملے ''قَالَ اِنِّیۡ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ'' سے امامت کے مقام و مرتبہ کی عظمت اور امام کا اللہ کی طرف سے منسوب ہونا واضح طور پر ثابت ہوتا ہے۔ اور آیت کا درمیانی جملہ: ''قَالَ وَمِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ ؕ'' مذکورہ مطلب پر اور زیادہ تاکید کرتا ہے۔ کیونکہ جب حضرت ابراہیمؑ اس منصب پر فائز ہوئے تو انہوں نے درخواست کی کہ پروردگار! امامت کو میری نسل میں بھی قرار دے۔

اس وقت خطاب ہوا کہ میرا یہ عہد (امامت و ولایت) ہرگز ظالموں تک نہیں پہنچے گا۔ یعنی تمہاری اولاد میں سے فقط وہ افراد اس منصب کے لائق اور اہل ہوں گے جو ہر قسم کے ظلم سے پاک اور معصوم ہوں گے: ''قَالَ لَا یَنَالُ عَهۡدِی الظّٰلِمِیۡنَ۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس جملے میں ظلم سے مراد، فقط دوسروں پر ستم نہیں، بلکہ یہاں ظلم اپنے وسیع معنوں میں مراد ہے جو کہ عدل کا متضاد ہے۔ عدل کا وسیع معنی ہر چیز کو اس کے اپنے مقام پر رکھنا ہے اور ظلم کسی چیز کو نامناسب جگہ پر رکھنا ہے۔ اس لیے قرآن مجید حضرت لقمان کی زبانی بیان فرماتا ہے کہ وہ اپنے فرزند سے کہتے ہیں:

یٰبُنَیَّ لَا تُشۡرِكۡ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّ الشِّرۡكَ لَظُلۡمٌ عَظِیۡمٌ ﴿۱۳﴾

''اے میرے بیٹے! کسی کو اللہ کے ساتھ شریک قرار نہ دو؛ بے شک شرک بہت بڑا ظلم ہے۔''

(لقمان۔ ۱۳)

یہ بات بھی انتہائی واضح ہے کہ یہاں پر عدل سے مراد ہر لحاظ سے مکمل عادل ہونا یا دوسرے الفاظ میں عصمت کا مرتبہ مراد ہے جو امامت کے ساتھ موزوں اور ہم آہنگ ہے ورنہ وہ عدالت جو برقرار نہ رہے یا گناہ سے مخلوط ہو وہ کبھی بھی امامت کے مذکورہ معنی میں اس مقام و منصب سے سازگار نہیں ہے۔ بنابرایں، مذکورہ آیت سے امام کے معصوم ہونے پر بھی استدلال کیا جاتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا عادل ہونے کا مطلب ساری عمر ہر قسم کے گناہوں کا ترک کرنا ہے یا جب امامت کے منصب پر فائز ہو فقط اس وقت گناہوں کو ترک کرنا کافی ہے؟

علم اصول میں ایک بحث ہے کہ مشتق کا ''مَنْ تَلَبَّسَ بِالْمَبْدَءِ'' میں استعمال حقیقت ہوتا ہے۔ (اس کی وضاحت یہ ہے کہ صفات میں سے ہر صفت کو جب کسی فرد سے نسبت دی جاتی ہے تو ضروری ہے کہ اُس نسبت کی حالت میں وہ صفت اس شخص میں موجود ہو۔ مثلاً قائم (کھڑا) اُسے کہا جاتا ہے جو اس وقت واقعاً کھڑا ہو جب اس کی طرف قائم یا کھڑا ہونے کی نسبت دی جا رہی ہے۔ لہٰذا جو شخص پہلے کھڑا تھا اور اب بیٹھا ہے، اُسے ''قائم'' کہنا حقیقت نہیں ہے۔) اس بحث کے پیش نظر بعض افراد کا نظریہ ہے کہ امامت کے دوران، امام میں ظلم کی صفت نہ ہو؛ نہ وہ مشرک ہو اور نہ گناہگار اور نہ ہی کسی اور معصیت میں مبتلا ہو۔ لہٰذا یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ امام کیلئے اس کی امامت سے پہلے کی زندگی میں عادل ہونا اور عصمت ضروری نہیں ہے۔

لیکن ہم احادیث میں دیکھتے ہیں کہ آئمہ اہل بیتؑ نے رسول اللہ ﷺ کی اتباع میں اس آیت سے امام کے عمر بھر عادل ہونے پر استدلال کیا ہے۔ جناب عبداللہ بن مسعود، رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ سے فرمایا:

''لَا أُعْطِيكَ عَهْداً لِلظَّالِمِ مِنْ ذُرِّيَّتِكَ''

''میں (امامت کا) عہد تیری اولاد میں سے انہیں عطا نہیں کروں گا جو ظالم ہوں گے۔''

''قَالَ يَارَبِّ وَمَنِ الظَّالِمُ مِنْ وُلْدِي الَّذِي لَا يَنَالُ عَهْدَكَ؟''

''حضرت ابراہیم نے عرض کی: اے میرے رب! میری اولاد میں سے کون ہیں وہ ظالم جن تک تیرا یہ عہد (امامت) نہیں پہنچے گا؟''

ارشاد ہوا:

''قَالَ مَنْ سَجَدَ لِصَنَمٍ مِنْ دُونِي لَا أَجْعَلُهُ إِمَاماً أَبَداً وَلَا يَصْلَحُ أَنْ يَكُونَ إِمَاماً''

''(جواب میں) فرمایا: جس کسی نے میرے سوا کسی بت کو سجدہ کیا ہوگا اُسے میں کبھی بھی امام نہیں بناؤں گا اور بت کو سجدہ کرنے والا امام بننے کے لائق نہیں ہے۔''[1]

اس مطلب کو اہل سنت کے جید عالم دین، ابن مغازلی نے اپنی کتاب ''مناقب'' میں تھوڑے سے فرق کے ساتھ ''ابن مسعود'' کے ذریعے پیغمبر اکرم ﷺ سے نقل کیا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا: ''اللہ

---

[1] امالی شیخ مفید (تفسیر برہان جلد ۱، ص ۱۵۱، حدیث ۱۳ کے مطابق)

تعالیٰ نے ابراہیمؑ سے فرمایا: "مَنْ سَجَدَ لِصنمٍ مِنْ دُونی لا اَجْعَلُهُ اِماماً"، یعنی: "جو شخص میرے سوا کسی بت کو سجدہ کرے گا میں اُسے امام نہیں بناؤں گا۔" اس کے بعد آنحضرتؐ نے فرمایا: "آخر کار حضرت ابراہیم کی دعا کا اثر میرے اور میرے بھائی علیؑ پر ہوا اور ہم میں سے کسی نے بھی کسی بت کے سامنے پیشانی نہیں جھکائی۔"[۱]

اس بارے میں اور بھی روایات آئمہ اہل بیتؑ کے سے معتبر کتابوں میں نقل ہوئی ہیں۔ درحقیقت ان تمام روایات میں ایک ہی نکتہ موجود ہے اور وہ یہ کہ حضرت ابراہیمؑ اس بات سے دوسروں سے زیادہ آگاہی اور بصیرت رکھتے تھے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ان افراد کے لیے امامت کی دعا کریں جو مشرک ہوں یا ظلم وستم میں مشغول رہے ہوں۔ اس حالت میں انہیں یہ جواب دینے کی ضرورت نہ تھی کہ یہ عنایت اور عطا ظالموں کو شامل نہیں ہوگی؛ کیونکہ یہ انتہائی واضح بات ہے۔ لہٰذا اگر انہوں نے اللہ تعالیٰ سے اپنی دعا میں امامت طلب کی ہے تو یقیناً ان افراد کے لیے کی ہے جو کسی کچھ عرصہ ظالم یا مشرک رہے، پھر توبہ کر لی اور عادل بن گئے۔ اسی حوالے سے انہوں نے یہ جواب سنا کہ عہدہ امامت ایسے افراد کو نہیں ملے گا۔ یعنی ان میں کسی قسم کا ظلم اور شرک کا سابقہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس حوالے سے مشہور مفسر، علامہ طباطبائی اپنی تفسیر "المیزان فی تفسیر القرآن" میں لکھتے ہیں:

یہ آیت امام کے (تمام عمر) معصوم ہونے کی ضرورت پر کس طرح دلالت کرتی ہے؟ جب یہ سوال ہمارے ایک استاد سے ہوا تو انہوں نے اس کا یوں جواب دیا کہ حضرت ابراہیم- کی اولاد کی ایک عقلی اور منطقی تقسیم کے لحاظ سے چار قسمیں بنتی ہیں:

۱۔ وہ لوگ جو ساری زندگی ظالم اور گناہگار رہے۔

۲۔ وہ لوگ جن کی تمام زندگی ہر قسم کے ظلم اور گناہ سے پاک رہی۔

۳۔ وہ لوگ جو اپنی عمر کے پہلے حصے میں تو ظالم اور گناہگار تھے لیکن آخری حصے میں نہیں۔

۴۔ اوپر کے برعکس، یعنی وہ لوگ جو پہلے تو عادل اور معصوم تھے لیکن بعد میں ظالم اور گناہگار بن گئے۔

یقینا حضرت ابراہیمؑ کا مقام ومرتبہ اس سے بلند وبرتر ہے کہ انہوں نے اپنی اولاد میں سے پہلی اور چوتھی قسم کے لیے امامت کا مطالبہ کیا ہو۔ اس لیے باقی دو قسمیں بچ جاتی ہیں۔ یقینا حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد سے ان دو قسموں کے لوگوں کیلئے امامت کا منصب مانگا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان دو قسموں میں سے ایک قسم (وہ لوگ جو زندگی کے پہلے حصے میں ظالم اور گناہگار تھے پھر نیک اور عادل بن گئے) کیلئے اس منصب کے دیے جانے کی نفی فرمادی۔ لہٰذا حضرت ابراہیم -کی اولاد میں سے امامت کے لائق، صرف ایک ہی قسم باقی رہ جاتی ہے اور وہ ان افراد کی ہے جو ساری زندگی ہر قسم کے ظلم وگناہ (شرک) سے پاک وپاکیزہ رہے ہوں۔[۲] (غور فرمائیے)

فخر رازی اپنی تفسیر میں اس حد تک تو اعتراف کرتے ہیں کہ یہ آیت پیغمبروں کے معصوم ہونے پر دلالت کرتی ہے اور دلچسپ

---

[۱] مناقب ابن المغازلی (تفسیر المیزان ج۱، ص۲۷۸، کے نقل کے مطابق)

[۲] المیزان، جلد ۲، ص۲۷۴۔

بات تو یہ ہے کہ وہ اسی امر کو بنیاد بنا کر یہ ثابت کرتا ہے کہ امام کو لازمی طور پر معصوم ہونا چاہیے اور یہ کہ ہر پیغمبر امام ہوتا ہے۔[1] (غور کیجیے گا)

البتہ اس آیت سے امامت کے متعلق، امام کے معصوم ہونے اور امام کے منصوص من اللہ ہونے کے علاوہ دیگر نکات بھی ثابت ہوتے ہیں جن پر گفتگو کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ بہرحال، اب تک جو کچھ بیان ہوا ہے اس سے قرآن مجید کی روشنی میں امامت کی عظمت و جلالت اجاگر ہو جاتی ہے اور یہاں پر ہمارا مقصد اسی نکتے کو بیان کرنا ہی تھا۔

٦۔ امام کے وجود کا رمز و راز

اگرچہ گزشتہ گفتگو میں حضرت ابراہیمؑ کی امامت سے متعلق آیت سے امام کے وجود کا فلسفہ اجمالی طور پر واضح ہوا ہے لیکن اس موضوع کی اہمیت کی پیش نظر ضروری ہے کہ اسے جداگانہ پر زیر بحث لایا جائے۔ یہاں بطور کلی یہ کہا جا سکتا ہے کہ بہت ساری باتیں جو انبیاء کی بعثت کے مقاصد یا ان کے وجود کی ضرورت کے حوالے سے کہی جاتی ہیں وہ بعینہ امام کے وجود کے لیے بھی ثابت ہیں۔ یا دوسرے الفاظ میں انہی دلائل کی بنیاد پر امام کا وجود بھی ضروری ہے۔

خواجہ نصیرالدین طوسی (قدس سرہ) نے اپنی کتاب ''تجرید الاعتقاد'' میں نبوت کی فصل میں انبیاء کی بعثت کے فلسفہ کو بیان کیا ہے اور علامہ حلّی جیسی بزرگ ہستی نے اس کی شرح میں بعثت کے مجموعاً نو مقاصد کی طرف اشارہ کیا ہے جنہیں ہم یہاں قارئین کی نذر کرتے ہیں۔ ہم دیکھیں گے کہ ان مقاصد میں کافی باتیں امام کے بارے میں بھی درست ہیں۔

۱۔ نقلی بیان کے ذریعے عقلی معرفت کی تقویت، ان معنوں میں کہ انسان عقل کی قوت سے دین کے بہت سارے حقائق، خواہ ان کا تعلق اصول سے ہو یا فروع سے، سمجھ پاتا ہے۔ لیکن گاہے بگاہے اس کے دل میں وسوسے اور شکوک وشبہات پیدا ہوتے ہیں اور یہی شکوک و شبہات، ان حقائق پر اعتماد اور ان پر عمل کرنے میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ لیکن جب ان عقلی باتوں کی تائید اور تصدیق معصوم پیشواؤں کی زبانی ہوتی ہے تو پھر ہر قسم کے وسوسے اور شکوک وشبہات دور ہو جاتے ہیں اور انسان پوری قوت کے ساتھ انہیں انجام دینے لگتا ہے۔

۲۔ کبھی انسان بعض کاموں کو انجام دینے سے ڈرتا ہے، اس لیے کہ کہیں اللہ تعالیٰ کی رضا کے برخلاف اس کی حاکمیت میں دخل اندازی نہ کر بیٹھے، الٰہی پیشواؤں کے بیان سے یہ خوف اور ڈر جاتا رہتا ہے۔

۳۔ انسان کے تمام اعمال ''حسن و قبح عقلی'' کے دائرے میں نہیں آتے، بہت سارے امور ایسے ہیں کہ انسانی عقل ان کے حسن و قبح کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ یہاں پر الٰہی نمائندوں کے دامن سے وابستہ ہونا پڑے گا اور ان اعمال کی اچھائی یا برائی کو سمجھنا ہوگا۔

۴۔ بعض چیزیں مفید ہیں اور بعض نقصان دہ، انسان صرف اپنی عقل وفکر کے ذریعے اور الٰہی ہادیوں کے بغیر ان کے نفع اور نقصان کو نہیں سمجھ سکتا، لہٰذا یہاں پر اُسے انبیاء الٰہی کی ضرورت کا احساس ہوتا ہے۔

۵۔ انسان ایک معاشرتی اور اجتماعی مخلوق ہے، وہ دوسروں کے تعاون اور مدد کے بغیر اپنی زندگی کی مشکلات اور مسائل کو حل نہیں کر سکتا اور یہ

---

[1] تفسیر کبیر فخر رازی، جلد ۴، ص ۴۳۔

بات بھی مسلم ہے کہ کوئی بھی معاشرہ ایسے قوانین کے بغیر قائم اور ترقی نہیں کرسکتا جن میں تمام افراد کے حقوق کی ضمانت نہ ہو اور وہ انہیں صحیح سمت میں نہ لے جائیں۔ ایسے قوانین کی صحیح طور پر تشخیص اور پھر ان پر عمل درآمد آگاہ، معصوم اور پاکیزہ افراد کی رہنمائی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

۶۔ کمالات تک پہنچنے، فضائل کے حصول اور علوم و معارف کے سیکھنے میں انسانوں کی سطح مختلف ہے اور سب برابر نہیں ہیں۔ بعض اس راستے پر چلنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور بعض اس راستے پر چلنے سے عاجز و ناتواں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے نمائندے اور ہادی پہلی قسم کے انسانوں کو تقویت پہنچاتے ہیں اور دوسری قسم کے افراد کی مدد کرتے ہیں تاکہ دونوں قسم کے افراد ممکنہ کمال اور ترقی تک پہنچ سکیں۔

۷۔ بنی نوع انسان کو وسائل و ذرائع، ٹیکنالوجی اور علوم و فنون کی ضرورت ہے۔ ہادیانِ برحق اس ہدف کے حصول میں انسانوں کے لیے محرک اور ان کے موجد اور بانی بن سکتے ہیں۔

۸۔ اخلاقی اعتبار سے انسانوں کے مختلف درجات ہیں۔ ان اخلاقی فضائل کو پروان چڑھانے کے لیے راہ حل صرف ایک ہے اور وہ ہے معصوم، پاک و پاکیزہ اور الٰہی رہبروں کا موجود ہونا اور ان کی راہنمائی۔

۹۔ الٰہی رہبر و رہنما، اطاعت و گناہ کے طور پر الٰہی جزا و سزا اور ثواب و عذاب سے مکمل آگاہی اور علم رکھتے ہیں۔ جب وہ دوسروں کو ان امور سے آگاہ کریں گے تو فرائض و واجبات کی ادائیگی کے لیے ان کے اندر ایک طاقتور محرک پیدا ہو جائے گا۔[1]

اب چونکہ امامت، نبوت ہی کا تسلسل ہے، لہٰذا اوپر بیان شدہ انبیاء کی بعثت کے مقاصد میں سے اکثر مقاصد، آئمہ معصومین ÷ کے لیے بھی ثابت ہیں۔ (لہٰذا اگر انبیاء کی بعثت ضروری ہے تو معصوم اماموں کی موجودگی بھی ضروری ہے۔)

قرآن مجید میں ان امور کو بلکہ ان سے بھی بالاتر چیزوں کو تین موضوعات میں بطور خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔ یہ تین موضوعات عبارت ہیں: تعلیم، تربیت اور عدل و انصاف کے قیام سے۔ بہت سی آیات میں ان تین موضوعات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ایک آیت میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے مقاصد کے طور پر ان تینوں کو یکجا بیان کیا گیا ہے:

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۤ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (جمعہ۔۲)

''وہ وہی ذات ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو انہیں اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور انہیں پاکیزہ کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے؛ جب کہ اس سے پہلے یہ لوگ صریح گمراہی میں تھے۔''

مذکورہ آیت میں انبیا ÷ اور آئمہ معصومینؑ کے وجود کا اہم ترین مقصد ''تعلیم و تربیت'' ذکر کیا گیا ہے۔ قرآن ایک اور آیت میں ارشاد فرماتا ہے:

---

[1] شرح تجرید، صفحہ ۲۷۱ (بطور خلاصہ)

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ

''تحقیق ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل دے کر بھیجا ہے اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب اور میزان (حق اور باطل کے درمیان تمیز اور عادلانہ قوانین) کو نازل کیا تا کہ لوگ عدل قائم کریں۔'' (حدید/ ۲۵)

اس آیت میں معاشرتی عدل وانصاف کے قیام کو بیان کیا گیا ہے جو دراصل صحیح تعلیم اور تربیت کے لیے زمین ہموار کرتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ دنیا کے عام رہبر اور رہنما سب سے پہلے اپنے مقام وحیثیت کے بچانے اور ذاتی مفادات یا اپنے گروہ کے مفادات کو حاصل کرنے کی فکر میں ہوتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے وہ ہمیشہ معاشرے کے مفادات کو اپنے ذاتی مفادات پر قربان کر دیتے ہیں۔ یہ تو صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجے ہوئے پاک اور معصوم رہبر ورہنما اور ان کے حقیقی پیروکار ہی ہیں جو پورے معاشرے کے مفادات اور انسانی حقوق کا مکمل طور پر تحفظ کر سکتے ہیں۔ پھر اگر ہم یہ فرض کر بھی لیں کہ عام رہنما، عدل وانصاف کو قائم کرنا اور انسانی معاشروں کو ترقی وکمال کی طرف لے جانا بھی چاہیں تو بہت سارے مقامات پر ان امور کی تشخیص ان کے لیے ناممکن ہے وہ ان امور کے بارے میں ناقص تشخیص کے حامل ہوں گے جو کسی طور پر بھی مشکل کا حل نہیں ہے۔ یہ امر صرف خداوند تعالی کے ان نمائندگان کے لیے ممکن ہے جو اللہ تعالیٰ کے علم کے بیکراں سمندر سے متصل ہوں۔ اس حقیقت کو زمین پر بسنے والے آدھے انسانوں پر مارکسیزم کی حکومت کے ستر سالہ تجربہ نے بڑے واضح انداز سے ثابت کیا ہے۔

مارکسیزم کی بنیادوں کو مستحکم کرنے کے لیے انہوں نے وسیع پیمانے پر جدید ترین ذرائع ابلاغ اور پروپیگنڈا مشینری کو پورے ستر سال استعمال کیا۔ اس کے متعلق سینکڑوں چھوٹی بڑی کتابیں اور مقالے لکھے اور سینکڑوں تقریریں اور خطابات کیے اور انسانی معاشروں کی مشکلات کے حل، معاشرتی عدل وانصاف کے قیام، نوع انسانی کے تکامل، صحیح تاریخ اور معاشرتی علوم کی تفسیر کے لیے مارکسیزم کو واحد راہ حل کے طور پر پیش کیا اور اپنے مخالفین کو ہر طریقے سے سرکوب کیا۔ لیکن ہم سب نے دیکھا کہ اس کا نتیجہ بدبختی، پس ماندگی، مخالفت ودشمنی اور ڈکیٹر شپ کی صورت میں نکلا۔ آخر کار ان کے مفکرین نے مجبوراً یہ اعتراف کیا کہ جسے وہ سعادت کا اصلی راستہ سمجھ رہے تھے وہ ایک انحراف تھا اور وحشت ناک راستہ کے سوا کچھ نہ تھا۔ شاید پوری تاریخ میں اس واقعہ کی کوئی مثال نہ ہو کہ مفکروں، دانشوروں اور یونیورسیٹوں کی ایک عظیم تعداد ایک مکتب اور نظریے کی حمایت اور پرچار کرے اور آخر میں وہ بے معنی اور لغو صورت میں سامنے آئے۔ کیا اس بات کی کوئی ضمانت دے سکتا ہے کہ مستقبل میں ایسا نہیں ہوگا اور انسانی افکار سے جنم لینے والے نظریاتی اور معاشرتی مکاتب ومذاہب ایسے انجام سے دور چار نہیں ہوں گے۔

اِس مقام پر انبیاء اور ائمہ معصومین ؑ کے مکتب سے استفادہ کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے جس کی ضمانت اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی ہے کہ وہ ہر قسم کی غلطی اور اشتباہ سے پاک ہیں۔ مختصر یہ کہ جب اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو کمال وسعادت تک پہنچنے کے لیے خلق فرمایا ہے تو جہاں اُسے چاہیے کہ انسان کو سعادت کی راہیں دکھانے اور سعادت تک پہنچنے کے لیے وحی اور عصمت کے حامل انبیاء کو مبعوث کرے، وہاں اس کے لیے ضروری ہے کہ پیغمبروں کی رحلت کے بعد اسی راستے کو جاری رکھنے کے لیے ان کے معصوم جانشین مقرر فرمائے جو انسانی معاشرے کو نہ تنہا سعادت کی راہیں دکھائیں بلکہ اس تک پہنچنے میں بھی ان کی مدد کریں اور یقیناً ان کے بغیر یہ ہدف ہرگز پورا نہیں ہوگا۔ کیونکہ پہلی بات

تو یہ ہے کہ انسانی عقلیں اپنے بل بوتے پر ترقی وکمال کے تمام علل واسباب کو جانچنے اور تشخیص دینے کے لیے قطعاً کافی نہیں ہیں اور اس کا عشر عشیر بھی معلوم نہیں کرسکتیں۔ اور دوسری بات یہ کہ انبیاء کی رحلت کے بعد ان کا آئین اور دین تحریفات اور انحرافات کا شکار ہو جانے کا بہت امکان ہوتا لہٰذا اس دین کو انحرافات سے بچانے کیلئے معصوم اور الٰہی پاسداروں اور محافظوں کی ضرورت ہے جو خدا کے دین کو منحرف لوگوں کی تحریفات سے بچائیں اور اسے جاہلوں کی مداخلت اور ہوا وہوس کے پجاریوں کی من گھڑت تشریحات سے بچائیں۔ اور یہ وہی حقیقت ہے جو اصول کافی کی ایک مشہور حدیث میں بیان ہوئی ہے۔ حضرت امام صادق -سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا:

"انّ فینا اهل البیت فی کل خلف عدولا ینفون عنه تحریف الغالین و انتحال المطلین و تاویل الجاهلین۔"

''ہم اہل بیتؑ کے درمیان ہر نسل میں ایسے عادل افراد موجود ہیں جو (دین سے) غالیوں کی تحریف کی نفی کرتے ہیں، بدعتی مذاہب گھڑنے والوں اور اہل باطل کو سرکوب کرتے ہیں اور جاہلوں کی غلط تفسیروں اور تاویلوں کا قلع قمع کرتے ہیں۔'' [1]

اس حدیث میں یقیناً معصوم امام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح حضرت علیؑ نے اپنے پُرمعنی کلام میں اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے۔ آپ نے فرمایا:

"اللّٰهُمَّ بَلٰی لا تَخْلُو الاَرْضَ مِنْ قائِمٍ لِلّٰهِ بِحُجَّةٍ اِمَّا ظاهِرًا مَشْهُوراً، وَ اِمَّا خائِفاً مَغْمُوراً لِئَلَّا تَبْطُلُ حُجَجُ اللهِ وَ بَيِّنَاتِهِ"

''اے اللہ! ہاں، زمین کبھی بھی ایسی ہستی سے خالی نہیں ہوتی جو حجت الٰہی کے ذریعے قیام کرے خواہ وہ ظاہر وآشکار ہو یا مخفی اور خوفزدہ ہو؛ یہ اس لیے تا کہ اللہ تعالیٰ کے واضح دلائل اور نشانیاں مٹنے نہ پائیں۔ [2]

تیسری بات یہ ہے کہ الٰہی حکومت کی تشکیل جو انسان کی تخلیق کے مقاصد تک اُسے پہنچاتی ہے، معصوم ہستیوں کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ تاریخ گواہ ہے عام انسانوں کی حکومتیں ہمیشہ ان کے مادی مفادات یا کسی خاص گروہ کے مفادات کے لیے سرگرم عمل رہی ہیں۔ ان کی تمام کوششوں کا محور ومرکز یہی مادی مفادات تھے۔ اور جیسا کہ ہم نے کئی مرتبہ تجربہ کیا ہے کہ جمہوریت، عوام پر عوام کی حکومت یا انسانی حقوق جیسے نعرے بڑی آسانی سے شیطانی اہداف اور مقاصد تک پہنچنے کے لیے ایک آلہ کے طور پر استعمال ہوئے۔ انسانیت کا استحصال کرنے والوں نے اسی منطق اور انہی نعروں کے ذریعے اپنے مذموم اور خفیہ مقاصد اور اہداف لوگوں پر مسلط کیے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ یہ تین اصول یعنی سعادت کی راہیں دکھانا (اراۂ الطریق) جہاں عقل تشخیص سے عاجز اور ناتواں ہے، انبیاء کی میراث کی حفاظت اور عادلانہ حکومت کا قیام، درحقیقت معصوم

[1] اصول کافی، ج۱ صفحہ ۳۲ (باب صفۃ العلم، حدیث ۲)

[2] نہج البلاغہ، کلمات قصار، جملہ ۱۴۷۔

امام کی ضرورت اور فلسفہ کے بنیادی ستونوں کی تشکیل دیتے ہیں۔ ہم اس گفتگو کو فلسفہ امامت کے متعلق حضرت امام علی بن موسیٰ الرضا -سے منقول جامع ترین بیان اور امیر المومنین علیؑ کے نہج البلاغہ میں ایک کلام پر ختم کرتے ہیں۔ حضرت امام رضا -نے بروز جمعہ ''مرو'' کی جامع مسجد میں لوگوں کے اجتماع میں جو خطاب فرمایا وہ کئی گھتیاں سلجھا تا ہے۔ ہم اس خطاب سے فقط ایک اقتباس یہاں بیان کرتے ہیں:

"اِنَّ الِامَامَةَ هِیَ مَنْزِلَةُ الْاَنْبِیَاءِ وَ اِرْثُ الْاَوْصِیَاءِ. اِنَّ الِامَامَةَ خِلَافَةُ اللهِ و خِلَافَةُ الرَّسولِ ... الِامامُ البَدْرُ الْمِنِیرِ و السِّراجُ الزاهِرُ و النُّورُ السّاطِعُ و النَّجْمُ الهادِی فِی غَیاهِبِ الدُّجیٰ ... الِامَامُ الماءُ العَذْبُ عَلیَ الظَّمَاءِ وَ الدَّالُّ عَلیَ الهُدیٰ و الْمُنْجِی مِنَ الرَّدی... الِامامُ السّحابُ المَاطِرُ وَ الْغَیْثُ الهاطِلُ و الشَّمْسُ الْمُضِیئَةُ... الامامُ اَمِینُ اللهِ فِی خَلْقِهِ و حُجَّتُهُ عَلیٰ عِبَادِهِ وَ خَلِیفَتُه فِی بِلادِهِ... نِظامُ الدِّینِ و عِزُّ المُسلِمِینَ وَ غَیْضُ الْمنَافِقِینَ وَ بوارُ الکافِرِینَ" [۱]

''بے شک امامت، انبیاء کی منزلت اور اوصیاء کی وراثت ہے۔ بے شک امامت اللہ اور رسول کی جانشینی اور خلافت ہے۔۔۔ امام درخشاں مہتاب، روشن آفتاب، تابندہ نور اور ظلمت و تاریکی میں ہدایت کا ستارہ ہوتا ہے۔۔۔ امام پیاس میں گوارا پانی اور ہدایت کا راستہ دکھانے والا اور ہلاکت سے بچانے والا ہوتا ہے۔۔۔ امام بارش برسانے والا بادل اور موسلا دھار بارش اور چمکتا سورج ہوتا ہے۔۔۔ امام اللہ کی مخلوق میں اللہ کا امین، اس کے بندوں پر اس کی حجت اور اس کی سرزمین پر اس کا جانشین ہوتا ہے۔۔۔ امام دین کے استحکام کا سرمایہ، مسلمین کی عزت، منافقین کے لیے باعث غیض وغضب اور کافروں کے لیے باعث ہلاکت ہوتا ہے۔''

حضرت امیر المومنین علیؑ نے اپنے ایک مختصر جملے میں امامت کو مجسم کرتے ہوئے فرمایا:

"وَمَكَانُ الْقِیّمِ بِالْاَمْرِ مَكَانُ النِّظامِ مِنَ الخَرَزِ یَجْمَعُهُ وَ یَضُمُّهُ فَاِذَا انْقَطَعَ النِّظَامُ تَفَرَّقَ الخَرَزُ وَ ذَهَبَ ثُمَّ لَمْ یَجْتَمِعْ بِحَذافِیرِهِ اَبَداً" [۲]

''مسلمانوں کے امور کے ذمہ دار شخص کی حیثیت مہروں کے اجتماع میں دھاگے کی ہوتی ہے کہ وہی سب کو جمع کیے رہتا ہے اور اگر وہ ٹوٹ جائے تو سب مہرے بکھر جاتے ہیں اور پھر کبھی جمع نہیں ہو سکتے۔'' (اسی طرح اگر امام لوگوں کے درمیان نہ ہو تو معاشرے کا شیرازہ بھی بکھر جاتا ہے)

---

[۱] اصول کافی، ج اول، صفحہ ۲۰۰ (باب نادر جامع فی فضل الامام)

[۲] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۴۶۔

قرآن مجید میں عمومی ولایت اور امامت

ولایت کے حوالے سے دو بحثیں جدا جدا ہیں:

ا۔عمومی ولایت

یعنی ہر دور اور ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کے درمیان ایک امام اور پیشوا ہونا ضروری ہے خواہ وہ نبوت ورسالت کے منصب پر فائز ہو یا صرف ولایت کا حامل ہو۔

۲۔خصوصی ولایت اور امامت:

اس سے مراد یہ ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اس منصب الٰہی پر کون فائز ہوا؟

بالفاظ دیگر جس طرح نبوت کی بحث کو دو حصوں نبوت عامہ اور نبوت خاصہ میں تقسیم کیا گیا ہے اس طرح امامت کے بھی یہ دو حصے ہیں۔قرآن مجید میں ولایت عامہ کے بارے میں چند اشارے ہوئے ہیں جن پر یہاں نگاہ ڈالی جارہی ہے۔

۱۔ اِنَّمَآ اَنۡتَ مُنۡذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوۡمٍ هَادٍ۝ (رعد۔۷)

۲۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوۡنُوۡا مَعَ الصّٰدِقِيۡنَ۝۱۱۹ ''(براۃ۔۱۱۹)

۳۔ اَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَاَطِيۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاُولِى الۡاَمۡرِ مِنۡكُمۡ ۚ (نساء۔۵۹)

ترجمہ

۱۔ ''آپ صرف ڈرانے والے ہیں اور ہر قوم کے لیے ایک ہادی ہے''

۲۔ ''اے ایمان لانے والو اللہ (کی مخالفت) سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ''

۳۔ ''اے صاحبان ایمان! اللہ کی اطاعت کرو، رسول کی اور اولی الامر کی اطاعت کرو''

پہلی آیت (آیۂ انداز وہدایت)

پہلی آیت میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب ہو رہا ہے: کہ آپ صرف ڈرانے والے ہیں اور ہر قوم وملت کے لیے ایک ہدایت کرنے والا ہے۔

اِنَّمَآ اَنۡتَ مُنۡذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوۡمٍ هَادٍ۝

اس آیت کی تفسیر میں فخر رازی نے تین قول نقل کیے ہیں:

اول: منذر اور ہادی دونوں کا ایک ہی معنی ہے، اس بنا پر آیت کا مطلب یہ ہے کہ آپ صرف ڈرانے والے اور ہر قوم کی ہدایت کرنے والے ہیں۔

دوم: ڈرانے والے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ہدایت کرنے والا، خدا ہے۔

سوم: ڈرانے والے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ہدایت کرنے والے علیؑ ہیں، کیونکہ ابن عباس نے بیان کیا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے دست مبارک کو اپنے سینے پر رکھ کر فرمایا ''انا المنذر'' اور پھر علیؑ کے کندھے کی طرف اشارہ کر کے فرمایا:

"اَنْتَ الھادِیُ یا علی ! بِكَ یهْتَدِی الْمُهْتَدُونَ مِنْ بَعْدِی!"

''اے علی ! آپ ہدایت کرنے والے ہیں اور میرے بعد تیرے ذریعے ہدایت پانے والے ہدایت پائیں گے''[1]

ان تین اقوال کو بعض دوسرے مفسرین نے بھی ذکر کیا ہے اور بعض اہل سنت کے مفسرین نے اس بات پر زور دیا ہے کہ پہلے دو اقوال میں سے کوئی ایک تفسیر درست ہے۔ کیونکہ تیسری تفسیر ان کے تعصب آمیز طرز فکر سے مطابقت نہیں رکھتی، حالانکہ پہلی تفسیر یقیناً آیت کے ظاہری معنی کے ہرگز مطابق نہیں ہے کیونکہ اگر دونوں صفتیں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے مقصود ہوتیں تو پھر یوں ارشاد ہوتا: 'انما انت منذر وهاد لكل قوم' دوسرے الفاظ میں 'لكل قوم' جو کہ جار و مجرور ہے وہ ''ھادی'' پر ہرگز مقدم نہ ہوتا اور اگر اسے مقدم ہونا ہوتا پھر دونوں صفتوں پر مقدم ہوتا اور کہا جاتا: 'اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ' مختصر یہ کہ 'لِكُلِّ قومٍ' کا ایک وصف پر مقدم ہونے اور دوسرے وصف سے متاخر ہونے کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی یا تو یہ دونوں پر مقدم ہو یا پھر دونوں کے بعد ذکر ہو۔ (غور کیجیے گا)

دوسری تفسیر اور قول بھی انتہائی نامناسب اور غیر معقول ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ہادی ہونے میں کوئی شک و تردید ہی نہیں ہے کہ اس کو بیان کرنے کی ضرورت پیش آئے، علاوہ ازیں جملے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ہر دور اور زمانے میں ایک خاص ہدایت کرنے والا ہے جب کہ خداوند تو یکتا اور یگانہ ہے، یہ یگانگی 'لِكُلِّ قوم هاد'' سے ثابت ہونے والے تعدد (تعداد) کے منافی ہے۔ لہٰذا مذکورہ آیت کے لیے جو تفسیر قابل قبول ہے وہ یہ ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ڈرانے والے ہیں اور ہر قوم کے لیے ہر دور اور زمانے میں ایک ہادی ہے۔

کیا اس ہادی سے مراد ہر قوم کے علماء اور دانشور ہیں؟ اس سوال کا جواب بھی منفی ہے کیونکہ ہر زمانے اور دور میں متعدد علماء اور دانشور موجود ہوتے ہیں نہ ایک ہدایت کرنے والا، جس طرح رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک فرد تھے، اسی مطلب کو یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ڈرانے کے اعتبار سے دین کے بانی ہیں اور امام ہدایت کے ذریعے ان کے مشن کو جاری رکھنے والا ہے۔

یہ نکات وہ ہیں جو خود اس آیت سے ثابت ہوتے ہیں اگر ہم اس بارے میں شیعہ اور سنی روایات کا مطالعہ کریں تو مطلب اور

---

[1] تفسیر کبیر فخر رازی، جلد ۱۹، صفحہ ۱۴۔

زیادہ واضح ہوجائے گا۔ اہل سنت کی مشہور ترین تفسیر الدر المنثور (اس کے مصنف جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۰ ہجری ہیں جس میں آیات کی تفسیر روایات کی روشنی میں لکھی گئی ہے) میں اس آیت کی تفسیر میں متعدد احادیث نبوی ﷺ نقل کی گئی ہیں۔

۱۔ ابن جریر، ابن مردویہ، ابونعیم، دیلمی، ابن عساکر اور ابن نجار سے نقل کرتے ہیں۔

"لَمَّا نَزَلَتْ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَلِكُلِّ قوم هادٍ. وَضَعَ رَسُولُ اللّٰهُ (ص) يَدَهُ عَلٰى صَدْرِهٖ فَقَالَ اَنَا الْمُنْذِرُ وَ اَوْمَأَ بِيَدِهٖ اِلٰى مَنْكَبِ عَلِّيٍ فَقَالَ: اَنْتَ الهادِیُ يا عَلِیّ بِكَ يَهْتَدِي الْمُهْتَدُونَ مِنْ بَعْدِی۔"[1]

"جب (انما انت منذر ولکل قوم ھاد) والی آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہاتھ کو اپنے سینے پر رکھ کر فرمایا: "میں ہوں منذر اور اپنے ہاتھ سے علیؑ کے کاندھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ہادی تم ہو اے علیؑ! میرے بعد ہدایت پانے والے تیرے ذریعے ہدایت پائیں گے۔"

۲۔ ابو برزہ اسلمی بیان کرتے ہیں کہ میں نے پیغمبر اکرم ﷺ کو اس آیت کے بارے میں (اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر) فرماتے ہوئے سنا "اِنَّمَا اَنْتَ مُنْذِرٌ" اور علی کے سینے پر ہاتھ رکھ کر فرماتے ہوئے سنا: "لِكُلِّ قوم هادٍ"[2]

۳۔ عبداللہ بن احمد، ابن ابی حاتم، طبرانی، حاکم، ابن مردویہ اور ابن عساکر نے علیؑ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے آیت "انما انت منذر ولکل قوم ھاد" کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرمایا: "رسولُ الله المنذرُ وَ اَنَا الهادی" یعنی: "رسول خدا منذر ہیں اور میں ہوں ہادی"[3]

۴۔ ایک اور حدیث میں ابن عباس رسول خدا ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا!

"اَنَا المنذرُ و عَلِیٌّ الهادی و بِكَ يا عَلِیُّ يَهْتَدِی الْمُهْتَدُونَ"

"منذر میں ہوں اور ہادی علی ہیں اور اے علی! تیرے ذریعے سے ہدایت پانے والے ہدایت پائیں گے۔"

اس حدیث کو اہل سنت کے مشہور معروف حفاظ اور مفسرین نے اپنی اپنی کتب میں ذکر کیا ہے۔ ان میں سے حاکم نے مستدرک میں، ذہبی نے تلخیص میں، فخر رازی اور ابن کثیر نے اپنی تفسیروں میں، ابن صباغ مالکی نے الفصول المھمہ میں، گنجی شافعی نے کفایۃ الطالب میں، علامہ طبری نے اپنی تفسیر میں، ابن حیان اندلسی نے بحر المحیط میں، نیشاپوری نے اپنی تفسیر میں حموینی نے فرائد السمطین میں اور چند دیگر

---

[1] الدار المنثور، ج ۴، ص ۴۵

[2] الدار المنثور، ج ۴، ص ۴۵

[3] الدار المنثور، ج ۴، ص ۴۵

علماء نے اپنی تفاسیر میں مذکورہ حدیث کو نقل کیا ہے [1]

۵۔کتاب ''حبیب السّیر'' کے مصنف ''میر غیاث الدین'' یوں لکھتے ہیں:

"قَدْ ثَبَتَ بِطُرُقٍ مُتَعَدِّدَةٍ اَنَّهُ لَمَّا نَزَلَ قَوْلُهُ تَعالٰى اِنَّما اَنْتَ مُنْذِرٌ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هادٍ قالَ: يا عَلِيّ اَنَا الْمنذرُ وَ اَنْتَ الهادِيُ بِكَ يا عَلِيُّ يَهْتَدِي الْمُهْتَدُونَ مِنْ بَعْدِي." [2]

ترجمہ: ''کئی حوالوں سے یہ حدیث نقل ہوئی ہے کہ جب یہ آیت ''انما انت منذر ولکل قوم ھاد'' نازل ہوئی تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علیؑ سے فرمایا: اے علی! میں منذر ہوں اور تم ہادی ہو۔ میرے بعد ہدایت پانے والے تمہارے ذریعے سے ہدایت یافتہ ہوں گے۔''

۶۔اس حدیث کو حموینی نے بھی ابو ہریرہ کے ذریعے علیؑ سے نقل کیا ہے۔ [3]

۷۔مستدرک حاکم میں یہ حدیث ابو بریدہ اسلمی سے قدرے تفصیل سے بیان ہوئی ہے۔ چنانچہ منقول ہے:

"دَعَا رسولُ اللهِ بِالطَّهُور و عِنْدَهُ عَلِيُّ ابن ابی طالبٍ فَاَخَذَ رسولُ اللهِ بِيَدِ عَلِيٍّ بَعْدَ ما تَطَهَّرَ فَاَلْعَقَها بِصَدْرِهِ ثُمَّ قالَ: "اِنَّما اَنْتَ مُنْذِرٌ" يعني نَفْسَهُ ثُمَّ رَدَّها اِلٰى صَدْرِ عَلِيٍّ ثُمَّ قال ولِكُلِّ قَوْمٍ هادٍ. ثُمَّ قالَ لَهُ اَنْتَ مَنارُ الْاَنامِ و غايَةُ الهدى وَ اَمِيرُ الْقُرّاءِ اَشْهَدُ عَلٰى ذٰلِكَ اِنَّكَ كَذٰلِكَ." [4]

''علیؑ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس تھے کہ آپؐ نے وضو کے لیے پانی طلب فرمایا۔ وضو کرنے کے بعد آپؐ نے علیؑ کا ہاتھ پکڑا اور اپنے سینے سے لگا کر فرمایا: 'انّما انت منذرٌ' مراد آپ کی اپنی ذات اقدس تھی۔ پھر علیؑ کے ہاتھ کو اُن کے سینے پر رکھ کر فرمایا: ''ولکل قوم ھاد'' (یعنی علیؑ) پھر اُن سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''لوگوں کے لیے درخشاں چراغ، ہدایت کی انتہا اور قرآن کے قاریوں (اس آسمانی کتاب سے آگاہ افراد) کے امیر آپ ہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ تم ان صفات اور شان و منزلت کے مالک ہو۔''

---

[1] اس حدیث کے منابع اور مدارک سے مزید آگاہی کیلئے کتاب احقاق الحق، جلد ۴، صد ۸۸ تا ۹۲ پر رجوع کریں۔

[2] حبیب السّیر، جلد نمبر ۲، ص ۱۲

[3] احقاق الحق، جلد ۳، ص ۹۲۔

[4] تفسیر المیزان، جلد ۱۱، ص ۳۲۷

یہاں بعید نہیں ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بات کو متعدد مقامات پر مختلف انداز سے بیان فرمایا ہو اور مندرجہ بالا احادیث کے مختلف الفاظ اسی مطلب پر دلالت کرتے ہیں۔ مکتب اہل بیتؑ کے پیروکاروں کی کتب میں بھی اس بارے میں متعدد احادیث نقل ہوئی ہیں، یہاں پر ان سب کو ذکر کرنے کی گنجائش نہیں ہے فقط ان کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ تفسیر نور الثقلین میں اس بارے میں پندرہ احادیث مذکورہ ہیں [1]

ان میں سے ایک یہ ہے کہ حضرت امام محمد باقر -اور حضرت امام جعفر صادق -سے نقل ہوا ہے کہ انہوں نے فرمایا: "کُلُّ اِمامٍ هادٍ لِکُلِّ قَوْمٍ فِی زَمانِهِ" یعنی: "ہر امام اپنے زمانے میں ہر قوم کا ہادی ہوتا ہے۔" دیگر الفاظ یوں بیان ہوئے ہیں: "کُلُّ اِمامٍ هادٍ لِلْقَرْنِ الّذِی هُوَ فِیهِ" یعنی: "ہر امام اس صدی کا ہادی ہوتا ہے جس میں وہ ہوتا ہے۔" [2]

یہاں حیرت اس بات پر ہے کہ بعض مفسرین نے ان تمام احادیث کو نظر انداز کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقولہ بعض صحابہ کے اقوال پر اعتماد کرتے ہوئے مذکورہ آیت کے اور معانی بیان کیے ہیں۔ ان میں سے ایک مجاہد سے منقولہ قول ہے۔ وہ کہتے ہیں: منذر سے مراد محمدؐ ہیں اور لِکُلِّ قَومٍ هادٍ سے مراد یہ ہے کہ ہر قوم کا ایک نبی ہوتا ہے جو انہیں خدا کی طرف دعوت دیتا ہے۔ یہ تفسیر بہت بعید دکھائی دیتی ہے۔ ایک اور تفسیر سعید بن جبیر سے نقل ہوئی ہے وہ بیان کرتے ہیں: "منذر محمدؐ ہیں اور ھادی خدا ہے" حالانکہ آیت سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ ہر قوم کا اپنا اپنا الگ ہادی ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ تو تمام قوموں کا ایک ہی ہادی ہے۔ اسی طرح کی دیگر نامناسب تفسیریں بھی بیان ہوئی ہیں۔ لیکن کیا یہ درست ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کثیر احادیث کو محض اس لیے نظر انداز کر دیا جائے کہ مبادا یہ احادیث شیعہ کے لیے دلیل بن جائیں اور ان سے ہٹ کر غیر صحیح تفسیروں کا سہارا لیا جائے!؟

۲۔ دوسری آیت (آیۂ صادقین)

دوسری آیت میں مومنین کو مخاطب قرار دے کر انہیں تقویٰ اختیار کرنے کی دعوت دینے کے بعد انہیں حکم دیا گیا ہے کہ ہمیشہ سچوں کے ساتھ رہیں (تاکہ انحراف کا شکار نہ ہوں)۔ چنانچہ ارشاد ہوا: "یٰاَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ کُونُوا مَعَ الصَّادِقِینَ" یعنی: "اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔ اب یہاں دیکھنا یہ ہے کہ صادقین (سچوں) سے مراد کون ہیں؟ اس کے متعلق بھی مختلف تفسیریں بیان کی گئی ہیں۔

بعض افراد کے خیال میں صادقین سے مراد، خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی ہے اور یہ آیت فقط آپؐ کے دور کے ساتھ مختص ہے۔ حالانکہ انتہائی واضح ہے کہ قرآن کے دیگر فرامین کی طرح یہ فرمان بھی عام ہے اور ہر دور اور ہر علاقے کے مومنین کو شامل ہے۔ بعض دوسرے افراد کا کہنا ہے کہ یہاں پر "مع" وہی معنی دے رہا ہے جو "من" دیتا ہے۔ یعنی "تم سچوں میں سے ہو جاؤ" سے مراد یہ ہے

---

[1] نور الثقلین، جلد ۲، صد ۴۸۲ تا ۴۸۵

[2] نور الثقلین، جلد ۲، صد ۴۸۳، حدیث ۱۹، ۲۰۔

کہ: ''تم بھی سچے بن جاؤ۔'' حالانکہ اس قسم کی تأویلوں اور توجیہات کی ہرگز ضرورت نہیں ہے اور یہ بھی معلوم نہیں کہ عربی ادب اور ادباء کی عبارتوں میں ''مَع''من کے معنی میں استعمال ہوا ہے یا نہیں۔

ظاہری طور پر آیت یہ بتا رہی ہے کہ مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ وہ ہر دور اور ہر زمانے میں سچوں کے راستے پر اور ان کے ساتھ رہیں اور اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہر دور اور ہر زمانے میں ایسے صادقین اور سچے موجود ہیں جن کے ساتھ لوگوں کو تقویٰ کے راستے پر چلنے کے لیے ہمیشہ رہنا چاہیے۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ صادقین کے معنی کو سمجھنے کے لیے خود قرآن کی طرف رجوع کیا جائے اور دیکھا جائے کہ قرآن نے صادقین کے کون سے اوصاف بیان کیے ہیں۔ ایک جگہ پر قرآن فرماتا ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ (حجرات/۱۵)

''مومنین وہ افراد ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور اس کے بعد وہ شک و شبہ میں کبھی مبتلا نہیں ہوئے اور انہوں نے اپنی جانوں اور اموال کے ذریعے خدا کی راہ میں جہاد کیا؛ یہ لوگ صادق (سچے) ہیں۔''

اس آیت میں صدق و سچائی کو ایسے مجموعہ کے طور پر متعارف کرایا گیا ہے جو ایمان اور عمل پر مشتمل ہے اور ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر اور پاک ہے۔ سورہ بقرہ کی آیت ۱۷۷ میں، نیکی کی حقیقت بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ اللہ سبحانہ، روز آخرت، فرشتوں، آسمانی کتابوں اور انبیاء پر ایمان، اسی طرح اللہ کے راستے میں اور کمزور افراد اور غلاموں کو نجات دلانے کے لیے اموال کو خرچ کرنا، نیز نماز قائم کرنا، زکوۃ ادا کرنا، عہد کو نبھانا، مشکلات اور مصائب میں صبر کرنا اور جہاد کے وقت ثابت قدم رہنا، نیکی ہے۔ اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے: ''اُولٰئکَ الّذِین صَدَقُوا'' یعنی: ''ان صفات کے حامل افراد صادق اور سچے ہیں۔''

یوں صادقین کی اصلی نشانی تمام مقدسات پر ایمان کامل اور زندگی کے تمام میدانوں میں اطاعت الٰہی خصوصاً نماز، زکوۃ، انفاق اور جہاد اور سختیوں میں استقامت دکھانا ہے۔ اسی طرح کا مطلب سورہ حشر کی آیت ۸ میں بھی بیان ہوا ہے، ان تمام آیات سے اور زیر بحث آیت کے اطلاق یعنی بغیر کسی قید و شرط کے صادقین کے ساتھ ہو جانے کے حکم سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مسلمانوں کا فرض ہے کہ ایسے افراد کے ساتھ ہو جائیں جو ایمان اور تقویٰ کے اعلیٰ مرتبے پر فائز ہوں اور علم و عمل کے لحاظ سے اور استقامت اور جہاد کے اعتبار سے بلند ترین سطح پر ہوں۔

(غور فرمائیں کہ آیت یہ نہیں کہہ رہی کہ صادقین میں سے ہو جاؤ بلکہ یہ کہہ رہی ہے کہ ان کے ہمراہ ہو جاؤ۔ لیکن جہاں پرہیز گاری کی بات ہوئی ہے وہاں قرآن یہ فرماتا ہے کہ پرہیزگاروں میں سے ہو جاؤ۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ صادقین کا مرتبہ ان مراتب سے بلند و بالا ہے جس مرتبے اور درجے پر لوگ پہنچتے ہیں اور اس معنی کا واضح ترین مصداق وہی معصوم ہستیاں ہیں)

اس کے علاوہ سچوں کے ساتھ ہو جانے کے حکم کا بلا قید و شرط ہونا اور ان سے کسی صورت میں بھی جدا نہ ہونے کا حکم، ان کے معصوم ہونے کی ایک اور دلیل ہے۔ کیونکہ معصوم کے سوا کسی اور کسی کی قید و شرط کے بغیر پیروی کرنے کا حکم نا قابل تصور ہے۔ (غور فرمائیں)

فخر رازی اس آیت کے بارے میں چند مقدمات کا ذکر کرنے کے بعد اس نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ آیت یہ کہہ رہی ہے کہ جو شخص جائز الخطا ہے اس پر واجب ہے کہ وہ اس کی اقتداء اور پیروی کرے جو معصوم ہے، اور معصومین وہ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے صادقین شمار کیا ہے، پس یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ جائز الخطاء افراد پر واجب اور ضروری ہے کہ وہ خطا سے معصوم ہستیوں کے ساتھ ہو جائیں تا کہ خطاء سے پاک افراد جائز الخطاء کی خطاؤں میں رکاوٹ بن جائیں اور یہ بات ہر زمانے میں ثابت ہے۔ لہذا ہر زمانے میں ایک معصوم کا ہونا ضروری ہے۔ یہاں دلچسپ بات تو یہ ہے کہ اس نکتے کو بیان کرنے کے بعد وہ کہتے ہیں: ''ہم مانتے ہیں کہ ہر زمانے میں ایک معصوم کا ہونا ضروری ہے لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ معصوم تمام امت ہے، جبکہ تم شیعہ یہ کہتے ہو کہ معصوم فقط ایک ہے۔''[1]

فخر رازی آیت کا مطلب واضح ہونے کی بنا پر ہر زمانے میں ایک معصوم ہستی کے پائے جانے پر اس کی دلالت سے تو انکار نہ کر سکے لیکن مذہب اہل بیتؑ کے پیروکاروں کے عقیدے کو بھی قبول کرنا ان کے لیے مشکل تھا۔ لہذا انہیں تمام امت کے معصوم ہونے یا امت کے اجماع کی بات درمیان میں لانا پڑی۔ حالانکہ ایسے اجماعی مسائل جن پر تمام اُمت کا اتفاق ہے، وہ محدود ہیں، جب کہ سچوں کے ساتھ ہونے کا فریضہ عمومی ہے ہر جگہ اور ہر چیز میں یہ فریضہ ہے۔ (غور کریں)

دوسری بات یہ ہے کہ اس آیت کے نزول کے وقت کسی اہل عرب نے لفظ صادقین سے تمام امت کا معنی مراد نہیں لیا۔ پس کیسے یہاں پر اس کا معنی یہ لیا جا سکتا ہے۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ ہم یہ اعتراف کر لیں کہ ہر دور اور ہر زمانے میں ایک ایسا صادق موجود ہوتا ہے جس کی باتوں میں نہ کوئی غلطی ہے نہ خطاء اور نہ کوئی خلاف حقیقت چیز ہے اور ہمیں اس کی پیروی کرنی چاہیے۔

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ 'صادقین' جمع کا لفظ ہے پس ہر زمانے اور دور میں ایک سے زیادہ معصوم موجود ہونے چاہیں، یہ چیز تو مکتب اہل بیتؑ کے پیروکاروں کے عقیدے کے بھی منافی ہے۔ اس سوال کا جواب ایک نکتہ کے پیش نظر نہایت واضح ہے اور وہ یہ کہ اس جمع سے مقصود تمام ادوار اور زمانوں کا مجموعہ ہو، کیونکہ صادقین ایک ایسا گروہ ہے جو مجموعی طور پر تمام زمانوں پر مشتمل ہے۔ بالکل اسی طرح جب یہ کہا جائے کہ ہر زمانے کے لوگوں کو انبیاء الٰہی کی پیروی کرنا چاہیے تو اس بات کا ہر گز یہ مطلب نہیں کہ ہر دور میں کئی انبیاء موجود ہیں؛ بلکہ مراد یہ ہے کہ ہر دور کے لوگ اپنے دور کے پیغمبر کی اتباع اور پیروی کریں۔ یا جب یہ کہا جاتا ہے کہ لوگ اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کے تعین کے لیے علماء کی طرف رجوع کریں تو اس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ ہر شخص اپنے دور کے عالم اور مرجع تقلید کی پیروی کرے۔

اس بات کا منہ بولتا ثبوت یہ ہے کہ خود پیغمبر اکرم ﷺ کے دور میں ان کے علاوہ کوئی اور واجب الا طاعت موجود نہ تھا حالانکہ مذکورہ آیت قطعی طور پر آپ کے زمانے کو بھی شامل ہے۔ لہذا ثابت ہوا کہ اس جمع سے ایک ہی وقت اور ایک دور کے صادقین مراد نہیں ہیں بلکہ ان کا مجموعہ ہے جو مختلف ادوار اور زمانوں میں موجود رہے ہیں، یہ تو خود آیت کا تجزیہ و تحلیل تھا۔

جہاں تک اسلامی راویات کا تعلق ہے تو اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اہل سنت کے بہت سارے مفسرین اور محدثین نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ مذکورہ آیت علی ابن ابی طالب- کے بارے میں نازل ہوئی۔ جیسا کہ علامہ ثعلبی نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ ابن

---

[1] تفسیر فخر رازی، جلد ۱۶، صفحہ ۲۲۱۔

عباس نے اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے کہ: ''مَعَ الصَّادِقِیۡنَ یَعنِی عَلِی بنِ اَبِی طالبٍ وَ اَصحَابِہ'' (صادقین کے ساتھ سے مراد یہ ہے کہ علی بن ابی طالب اوران کے اصحاب کے ساتھ۔)[1]

اسی طرح علامہ گنجی نے ''کفایۃ الطالب'' میں اورعلامہ سبط بن الجوزی نے ''تذکرہ'' میں چند علماء سے یوں بیان کیا ہے: ''قال علماء السیر معناہ کونوا مع علی و اھل بیتہ۔ قال ابن عباس علی سید الصادقین۔'' یعنی: ''سیرت نگاری کے علماء نے کہا ہے کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ علیؑ اوران کے خاندان کے ساتھ ہوجاؤ۔ابن عباس مزید کہتے ہیں: علی سچوں کے سیدوسردار ہیں۔''[2]

اہل بیتؑ سے نقل ہونے والی متعدد روایات بھی اسی مطلب پر تاکید کرتی ہیں۔ان میں ایک روایت جابر بن عبداللہ انصاری کی ہے جو انہوں نے حضرت امام محمد باقر - سے بیان کی ہے۔انہوں نے ''کُونُوا مَعَ الصَّادِقِین'' کی تفسیر میں فرمایا: ''ای آل محمد'' یعنی: ''اس سے مراد، آل محمد ہیں۔''[3] ایک اورروایت میں برید بن معاویہ نے حضرت امام محمد باقر - سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا: ''ایّانا عنی'' یعنی: ''خداوند تعالی نے اس سے ہمیں مراد لیا ہے۔''[4] تفسیر برہان میں نہج البلاغہ سے نقل کیا گیا ہے:

"روی ان النبی سئل عن الصادقین۔ فقال: ھم علی و فاطمۃ و الحسن و الحسین وذریتھم الطاھرون الی یوم القیامۃ۔"[5]

''مروی ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ سے سچوں کے بارے میں پوچھا گیا۔آپؐ نے فرمایا: ''علی، فاطمہ، حسن، حسین اورقیامت تک ان کی معصوم اولاد، سچے ہیں۔''

واضح ہے کہ یہ تمام روایات مصداق کو بیان کررہی ہیں اورآیت کے کلی مفہوم سے منافی نہیں ہیں۔کیونکہ سب سے پہلے یہ آیت خودرسول اکرم ﷺ پر صادق آتی ہے۔اس کے بعد ہر دور کے معصوم اماموں کو شامل ہے۔اس لحاظ سے یہ آیت ''ولایت عامہ'' اور ''ولایت خاصہ'' دونوں کو ثابت کرتی ہے۔

---

[1] احقاق الحق، جلد ۳، صفحہ ۲۹۷۔

[2] احقاق الحق، جلد ۳، صفحہ ۲۹۷۔

[3] نورالثقلین، جلد ۲، صفحہ ۲۸۰، حدیث ۳۹۲، ۳۹۳

[4] نورالثقلین، جلد ۲، صفحہ ۲۸۰، حدیث ۳۹۲، ۳۹۳

[5] تفسیر برہان، جلد ۲، صفحہ ۱۷۰

۳۔ تیسری آیت (آیۂ اولی الامر)

تیسری آیت میں اللہ، رسول اور اولی الامر کی اطاعت کی بات کی گئی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ

''اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے میں سے اولی الامر کی اطاعت کرو۔''

یہاں ''اللہ تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کا واجب ہونا تو واضح ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ''اولی الامر'' سے مراد کون ہیں جن کی اطاعت، اللہ اور رسول کی اطاعت کے ہمراہ ذکر کی گئی ہے؟ یہ موضوع مفسرین کے درمیان قابل بحث ہے۔ مکتب اہل بیتؑ کے پیروکار اور شیعہ علماء اور مفسرین سب اس بات پر متفق ہیں کہ ''اولی الامر'' سے مراد آئمہ معصومینؑ ہیں جو زندگی کے تمام شعبوں میں اسلامی معاشرے کے روحانی اور ظاہری قائد و رہبر ہیں۔ ان کے علاوہ کوئی اور اولی الامر میں شامل نہیں ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ آیت میں جس بلا قید و شرط اطاعت کا ذکر ہے اور جسے خدا اور رسول کی اطاعت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے وہ صرف معصومین کے بارے میں ہی قابل تصور ہے۔ دیگر افراد جن کی اطاعت لازمی ہے اُسے ہمیشہ حدود و قیود کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، اطاعت مطلق ان کے بارے میں کسی صورت میں بھی موجود نہیں ہے اور یہ مسئلہ واضح ہے۔

اہل سنت کے علماء اور مفسرین کے درمیان ''اولوالامر'' کے معنی میں بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض مفسرین نے اس سے ''صحابہ'' مراد لیے ہیں۔ بعض نے فوج کے کمانڈر اور بعض دوسروں نے چار خلفاء مراد لیے ہیں۔ البتہ انہوں نے ان کے متعلق کوئی واضح دلیل پیش نہیں کی۔ کچھ دیگر افراد نے 'اولوالامر' کا مطلب علماء او دانشور بیان کیا ہے اور اس کی دلیل کے طور پر سورہ نساء کی آیت / ۸۳ کو پیش کیا ہے:

وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ط وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ط

''اور جب فتح اور شکست کی کوئی خبر ان تک پہنچتی ہے تو وہ (بغیر تحقیق کیے) اُسے پھیلا دیتے ہیں؛ حالانکہ اگر وہ اُسے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اپنے میں سے اولی الامر کی طرف پلٹا دیں تو وہ افراد جو مسائل کی جڑوں سے واقف ہیں، وہ اُسے جان لیں گے۔''

لیکن اس بات کے پیش نظر کہ مذکورہ آیت بلا قید و شرط اطاعت کے متعلق ہے اور سورہ نساء کی ۸۳ نمبر آیت سوال اور تحقیق کے بارے میں ہے اور یہ دو مختلف باتیں ہیں، لہٰذا ان دونوں کو ایک ہی معنی میں نہیں لیا جاسکتا۔ عالم سے پوچھنا اور سوال کرنا ایک معنی اور مطلب ہے جب کہ ''اولوالامر'' کی بلا قید و شرط اطاعت ایک اور معنی ہے اور ثانی الذکر صرف معصومین کے لیے قابل تصور ہے لیکن اول الذکر کا ایک

وسیع معنی اور مفہوم ہے۔

اہل سنت کے بعض مفسرین نے ایک پانچواں احتمال بھی بیان کیا ہے کہ ''اولوالامر'' سے عوام کے نمائندگان، حکمران، صاحبان منصب واقتدار علماء اور زندگی کے مختلف شعبہ جات کے سربراہان مجموعی طور پر مراد ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اہل حل وعقد کا گروہ مراد ہے کہ جب بھی وہ کسی مسئلہ اور امر پر متفقق ہو جائیں تو ان کی بلاچون وچرا اطاعت واجب ہے (شرط یہ ہے کہ وہ ہم میں سے ہوں چونکہ آیت نے 'منکم' کے ذریعے اس شرط کو بیان کیا ہے، وہ سنت رسولؐ کی مخالفت نہ کریں، اپنی ابحاث میں کسی دباؤ کا شکار نہ ہوا اور انہیں مجبور نہ کیا گیا ہو ایک رائے پر متفق ہو جائیں اور مسئلہ بھی عمومی ہو)۔ یہ گروہ اور جماعت ان مسائل میں واجب الاطاعت ہے جن میں شارع مقدس کی طرف سے نص نہ آئی ہو۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ گروہ من حیث المجموع معصوم ہے اس لیے ان کی بلاقید وشرط اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔[1]

اس لحاظ سے بعض مفسرین نے علماء دانشوروں اور اہل حل وعقد کے مجموعے کو جس میں پانچ شرائط موجود ہوں، اولی الامر شمار کیا ہے:

۱۔ مسلمان ہونا ۲۔ سنت کے مخالفت نہ کرنا ۳۔ رائے کے اظہار میں مجبور نہ ہونا

۴۔ ''مالانص فیہ'' کے بارے میں رائے کا اظہار کرنا ۵۔ آراء کا متفق ہونا

ان مفسرین کی نظر میں ایسے مجموعے کو معصوم شمار کیا جائے گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا واقعی آیت میں اولوالامر کا مطلب یہی ہے؟ کیا واقعی، جب اصحاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل عرف نے اس آیت کو سُنا تو انہوں نے یہی معنی سمجھا؟ یا یہ کہ اس معنی کو بہت زیادہ تکلف کے ساتھ آیت پر مسلط کیا گیا ہے تا کہ آیت کی وہ تفسیر سامنے نہ آئے جو شیعوں کا عقیدہ ہے کہ اولی الامر، آئمہ معصومین ہیں؟!

ظاہر یہ ہوتا کہ 'المنار' کے بیان کی بنیاد فخر رازی کا کلام ہے چنانچہ فخر رازی کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک یہ آیت (تعبیر اُولی الامر منکم) دلالت کرتی ہے کہ اجماع امت حجت ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اولوالامر کی اطاعت کا حکم قطعی طور پر (بلاقید وشرط) دیا ہے۔ اور جس کی اطاعت کا اللہ تعالیٰ یوں حکم دے اُسے معصوم از خطاء ہونا چاہیے، کیونکہ اگر معصوم نہیں ہوگا تو کبھی کبھار خطا اور غلطی کا مرتکب ہوگا، ایک طرف اس کے فرمان پر عمل کرنا واجب ہے تو دوسری طرف غلط اور خطا ہونے کی وجہ سے اس پر عمل کرنا حرام ہے جو کہ محال ہے، پس اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اولوالامر کی مطلق اطاعت کا حکم اس کے معصوم ہونے کی دلیل ہے۔ وہ مزید لکھتے ہیں:

یہ معصوم یا تمام امت اسلامی ہے یا امت اسلامی کے بعض افراد دوسرا احتمال قابل قبول نہیں ہے کیونکہ ہمیں ان بعض افراد کے بارے میں علم ہونا چاہیے کہ وہ کون ہیں وہ ہماری دسترس میں ہوں اور ہم ان سے استفادہ کر سکیں جب کہ اس دور میں ہم معصوم امام کی پہچان، اس تک پہنچنے اور استفادہ کرنے سے عاجز ہیں، لہٰذا وہ معصوم جس کی بلاقید وشرط اطاعت کا حکم دیا گیا ہے وہ کوئی خاص فرد یا گروہ نہیں ہے۔ اس بنا پر اس سے مقصود اجماع امت ہی ہو سکتا ہے۔[2]

---

[1] تفسیر المنار، جلد ۵ ص ۱۸۱

[2] تفسیر فخر رازی، جلد ۱۰، صد ۱۴۴۔

جس چیز نے فخر رازی، المنار کے مصنف اور ان کی طرح کے دیگر افراد کو ایسی تفسیر کرنے پر مجبور کیا جو یقیناً حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یار واصحاب میں سے کسی نے بھی آیت کے نزول کے وقت نہ سمجھا، وہ وہی پہلے سے ذہنوں میں موجود نظریات اور افکار ہیں جو رکاوٹ بن جاتے ہیں کہ آیت کے مفہوم کو اہل بیتؑ کے معصوم اماموں میں تلاش کیا جائے، ایک طرف تو اولوالامر کے معصوم ہونے پر آیت کی دلالت معلوم اور واضح ہے جب کہ دوسری طرف کسی شخص کو بعنوان معصوم ماننے کے لیے بھی تیار نہیں تو اس کا نتیجہ یہی نکلے گا کہ آیت کی ایسی تفسیر بیان کی جائے گی جو آیت کے نزول کے وقت کسی صحابی رسولؐ کے ذہن میں نہ آئی ہوگی اور نہ انہوں نے اس سے یہ بات سمجھی ہوگی۔

اور ان سب سے زیادہ عجیب وغریب تفسیر وہ ہے جو اہل سنت کے بعض مفسرین نے بیان کی ہے۔ان کی رائے کے مطابق اولو الامر، حکمران، بادشاہ اور سربراہان مملکت ہیں، مسلمانوں پر حکومت کرنے والے ہر حکمران کی اطاعت اور پیروی واجب ہے، وہ عادل یا ظالم، صحیح راستہ پر ہو یا منحرف ہو، اللہ کی اطاعت کا حکم دے یا اس کی مخالفت اور نافرمانی کا ہر صورت میں اس کی بات ماننی چاہیے۔ چنانچہ تفسیر المنار نے اجمالی طور پر اس قول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے:

"وبَعْضُهُم اَطْلَقَ فِی الحُکام فَاَجبُوا اطاعَةَ کُلِّ حاکِمٍ۔"

''بعض افراد نے تمام حکمرانوں کی اطاعت پر اس کی تطبیق کی ہے اور انہوں نے ہر حاکم کی اطاعت کو واجب قرار دیا ہے۔''[1]

اس سے بھی زیادہ حیران کن امر وہ جعلی اور مشکوک روایات ہیں جو اس تفسیر کو ثابت کرنے کے لیے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب کی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ حدیث کہ یزید جعفی نے آنحضرتؐ سے سوال کیا: ''یا نبی الله اَرَاَیتَ اِنْ قامَتْ عَلَیْنَا اُمَرَاءُ یَسْئَلُونا حَقَّهُم و یَمْنَعُونَا حَقَّنا فَمَا تَأْمُرُنا؟'' یعنی: ''اے اللہ کے نبی! اگر ہم پر ایسے حکمران مسلط ہو جائیں جو ہم سے اپنا حق تو وصول کریں لیکن ہمارا حق ہمیں نہ دیں تو اس صورت میں ہم کیا کریں؟'' پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب دیا: ''اِسْمَعُوا و اَطِیْعُوا۔'' یعنی: ''ان کی بات سنو اور ان کی اطاعت کرو۔''[2]

اسی کتاب میں ایک اور حدیث حضرت ابوذر سے منقول ہے کہ انہوں نے کہا: ''اِنَّ خَلِیلِی اَوْصَانی اَنْ اَسْمَعَ وَ اُطِیْعَ وَ اِنْ کانَ عَبْداً مُجَدِّعُ الاَطرافِ۔'' یعنی: ''میرے دوست (رسول خدا) نے مجھے وصیت فرمائی ہے کہ میں (حکمرانوں) کے حکم کو سنوں اور اطاعت کروں؛ اگرچہ وہ لولہ لنگڑا غلام ہی کیوں نہ ہو۔'' (بعض نے کہا ہے کہ مجدع الاطراف اُسے کہتے ہیں جو گندے اور گھٹیا

---

[1] تفسیر المنار، جلد ۵ ص ۱۸۱

[2] صحیح مسلم، جلد ۳، کتاب الامارہ، باب طاعۃ الامراء وان منعوا الحقوق، صفحہ ۴۷۴

گھرانے میں پیدا ہوا ہو)[1]

یقیناً رسول اللہؐ کی ذات اقدس اس سے بلند و بالا ہے کہ وہ عقل و منطق اور شریعت کے برخلاف اس طرح کا کوئی حکم دیں جب کہ خود آنحضرتؐ سے منقول ہے کہ ''خالق کی معصیت اور نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت جائز نہیں ہے۔'' اِس قسم کی احادیث کے جعلی ہونے کا بہترین ثبوت یہ ہے کہ حضرت ابوذر جس سے حدیث نقل کی گئی ہے اُس نے اپنی زندگی میں ایسا ہرگز نہیں کیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ انہوں نے وقت کے حکمرانوں اور حاکموں کے انحراف کے خلاف کلمہ حق ادا کیا اور اسی راستے میں اپنی جان دے دی۔

بہرحال یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ کی ذات اسی طرح کی باتوں سے پاک اور مبرا ہے۔ کوئی بھی عقلمند انسان یہ بات اپنی زبان پر نہیں لاسکتا کہ حکمران کی اطاعت ہر صورت میں ضروری ہے وہ جو کام چاہے کرے، جو حکم چاہے صادر کرے اور جو کوئی بھی ہو۔ بالخصوص اس حدیث کی موجودگی میں جو شیعہ اور سنی تمام علماء کے درمیان مشہور ہے کہ:

''لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِی مَعْصِیَةِ الخَالِق''

''خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت جائز نہیں ہے۔''[2]

''وَلَا طَاعَةَ لِبَشَرٍ فِی مَعْصِیَةِ اللهِ''

''اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں کسی انسان کی اطاعت جائز نہیں ہے۔''[3]

پس نتیجہ یہ حاصل ہوا کہ اس آیت کی بہترین تفسیر معصوم اماموں کی اطاعت ہے۔ ہاں! یہاں درج ذیل دو سوالوں پر گفتگو کی ضرورت باقی ہے:

ا۔ اگر اولی الامر کا معنی معصوم امام ہے تو یہ لفظ 'اولی' کے مطابق نہیں ہے؛ کیونکہ اُولی کا مطلب جمع ہے اور شیعہ عقیدے کے لحاظ سے ہر دور میں ایک ہی معصوم امام ہوتا ہے۔

گذشتہ بحث کی روشنی میں اس سوال کا جواب انتہائی واضح ہے یہ بات درست ہے کہ ہر زمانے میں امام معصوم ایک فرد ہے لیکن چونکہ آیت میں زمانے کے اعتبار سے عمومیت ہے یعنی تمام زمانوں کو شامل ہے، لہٰذا تمام ادوار میں موجود معصوم امام مجموعی طور پر ایک گروہ کو تشکیل دیتے ہیں۔ اس کی مثالیں عربی زبان میں بکثرت موجود ہیں۔ مثلاً جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ''السَّلامُ عَلَیْکُمْ وَعَلٰی اَرْوَاحِکُمْ وَاَجْسَادِکُمْ: یعنی، آپ پر سلام ہو آپ کی روحوں اور جسموں پر سلام ہو۔'' تو اس سلام پر ہرگز یہ اعتراض نہیں کیا جا سکتا کہ ہر انسان کی روح اور جسم ایک سے زیادہ نہیں ہے تو پھر کیوں ارواح اور اجسام کو جمع کی صورت میں لایا گیا ہے، کیونکہ اس کے جواب میں

---

[1] صحیح مسلم، جلد ۳، کتاب الامارہ، باب وجوب طاعة الامراء وان منعوا الحقوق، صفحہ ۱۴۸

[2] نہج البلاغہ کلمات قصار، جملہ ۱۶۵

[3] الدر المنثور، جلد ۳، صفحہ ۱۷۷

کہا جا سکتا ہے کہ جمع سے مراد مجموعہ ہے۔ اس بنا پر اگر چہ ہر زمانے میں پیغمبر اکرم ﷺ کا ایک ہی معصوم جانشین تھا۔ لیکن مجموعی طور پر مختلف زمانوں میں وہ متعدد افراد تھے لہٰذا ان کے لیے جمع کا لفظ ہی استعمال ہونا چاہیے۔

۲۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ کے دور میں امام معصوم تو موجود ہی نہیں تھا پھر کس طرح اس کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے؟

اس سوال کا جواب تقریباً وہی ہے جو پہلے بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ اگر یہ آیت صرف رسول خدا ﷺ کے دور اور زمانے کی بات کر رہی ہوتی تو یہ اعتراض بجا تھا جب کہ آیت تمام مسلمانوں کے لیے، قیامت تک کے لیے ایک کلی حکم بیان کر رہی ہے اس لیے کوئی مشکل در پیش نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے دور میں خود آنحضرت ولی الامر تھے اور آپؐ کے بعد دیگر ادوار میں دیگر معصوم امام تھے، جیسے یوں کہا جائے کہ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ رسول خدا اور ان کے جانشینوں کی اطاعت کریں۔ اس بات کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ان کے جانشین ان کے دور میں موجود بھی ہوں۔

آخر میں ہم اس آیت کے متعلق شیعہ و سنی کتب میں نقل ہونے والی ان احادیث کی طرف ایک مختصر سا اشارہ کرتے ہیں جو بتاتی ہیں کہ اس سے مراد علیؑ اور باقی آئمہ معصومینؑ ہیں۔ شیخ سلیمان قندوزی حنفی اپنی کتاب ''ینابیع المودة'' میں مجاہد کا قول نقل کرتے ہیں کہ: '' اَطِيْعُوْ اللهَ و اَطِيْعُوا الرَّسُولَ وَ اُوْلَى الْاَمْرِ مِنْكُمْ '' کی آیت اس موقع پر علیؑ کی شان میں نازل ہوئی جب رسول خدا ﷺ نے انہیں (جنگ تبوک پر جانے سے پہلے) مدینے میں اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ نیز وہ بیان کرتے ہیں کہ مہاجرین و انصار سے بحث کرتے ہوئے علیؑ نے اسی آیت سے استدلال کیا اور انصار و مہاجرین نے پھر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ [۱]

شواہد التنزیل میں ''اطیعو اللہ و اطیعو الرسول و اُولی الامر منکم'' کی آیت کے حوالے سے حاکم حسکانی سے نقل کیا گیا ہے کہ علیؑ نے فرمایا: میں نے پیغمبر اکرم ﷺ سے پوچھا: ''يَا نَبِيَّ اللهِ مَنْ هُمْ ؟ قَالَ اَنْتَ اَوَّلُهُمْ '' یعنی: ''اے اللہ کے نبی! یہ کون ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ''تم ان میں سے پہلے فرد ہو۔'' [۲] آئمہ اہل بیتؑ کے حوالوں سے بھی کافی روایات نقل ہوئی ہیں جن میں اس آیت کی تفسیر آئمہ معصومین سے کی گئی ہے۔ اُن روایات کی تعداد دس سے زیادہ ہے جن میں بیان ہوا ہے کہ اولوالامر سے مراد، آئمہ معصومینؑ ہیں۔ [۳]

---

[۱] ینابیع المودة، صفحہ ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶۔

[۲] شواہد التنزیل، جلد ۱، صفحہ ۱۴۸، طبع بیروت

[۳] مزید آگاہی کے حصول کیلئے تفسیر برہان جلد ۱ صفحہ ۳۸۱ تا ۳۸۷ اور تفسیر کنز الدقائق جلد ۳ صفحہ ۴۳۷ تا ۴۵۲ کا مطالعہ فرمائیں۔

ولایت وامامت عامہ،سنت کی روشنی میں

احادیث نبوی اورسنت پیغمبر اکرم ﷺ کا یہ حصہ بہت ہی وسیع ہے۔اس بارے میں رسول خدا ﷺ سے بہت ساری احادیث مشہورومعروف اسلامی کتب میں نقل ہوئی ہیں جن کا باریک بینی،انتہائی توجہ اورغیر جانبدارنہ مطالعہ کرنا ضروری ہے تا کہ اس مسئلے پر سالہاسال سے پڑے پردے علم واخلاص کے نور کے پرتو میں اورانصاف پر مبنی گفتگو کے ذریعے ہٹ جائیں اورتعصب سے پاک اس علمی مسئلہ کا حقیقی چہرہ آشکار ہوجائے اوراس اہم ترین اسلامی امر کے حوالے سے ہمارا الٰہی افریضہ واضح ہوجائے۔

یہاں پرصرف ان چنداحادیث کوذکر کیاجائے گا جوامامت وولایت کے بارے میں بطورعام گفتگو کرتی ہیں اورہم ان کے معنی ومفہوم کی مختصرتشریح پراکتفا کریں گے اورہم تمام قارئین سے مخلصانہ عرض کریں گے کہ وہ ان احادیث،ان کے منابع اورحوالوں کا دوبارہ مطالعہ کریں اورپھران کے مفہوم پربھی غورکریں۔وہ ان سے کیا نتیجہ اخذ کرتے ہیں،یہ ہم خودان پرچھوڑتے ہیں۔ہمارانظریہ ہے کہ ان تمام حدیثوں کے باوجودکسی نتیجہ تک نہ پہنچنا،ان سے سرسری طورپرگزرجانا،یاحقائق سے چشم پوشی کرلینے سے ہماری ذمہ داری میں کمی نہیں ہوتی بلکہ اس میں اضافہ ہوجاتاہے۔

ا۔حدیث ثقلین

اس حدیث کوحدیث ثقلین اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث میں فرمایا:"**اِنّی تارکٌ فیکم الثقلین...**"[1]

رسولخدا ﷺ سے یہ حدیث بڑے وسیع پیمانے پرشیعہ اورسنی کی مشہوراوردرجہ اول کی کتابوں میں نقل ہوئی ہے اس طرح سے کہ پیغمبر اکرم ﷺ سے صدورمیں کسی شک وشبہہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔مجموعی طورپراس حدیث سے جوبات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے صرف ایک مرتبہ بیان نہیں فرمایا کہ حدیث ایک ہواوراس کے روای بہت زیادہ ہوں بلکہ اسے مختلف مقامات پرارشادفرمایااوریہ بالکل متعدد روایات ہیں۔یہاں پراس حدیث کے چندراویوں اورجن مشہوراسلامی کتب میں یہ حدیث نقل ہوئی ہے ان کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

ا۔صحیح مسلم جوکہ اہل سنت کے منابع کی درجہ اول کی کتاب ہے اورصحاح ستہ کی اہم ترین کتاب شمار ہوتی ہے۔اس میں زید بن ارقم سے

---

[1] لفظ"ثقلین"کودوطرح سے پڑھا گیا ہے کبھی"حَرَمَین"کے وزن پرجس کا مفرد"ثَقَل"(بروزن حَرَم)ہے جس کا معنی ہے گرانقدراورقدروقیمت والی چیز۔اورمتاع مسافر کے معنی مین بھی استعمال ہوا ہے(اوردوسرااہم ہے)یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ ثَقَل(بروزن حَرَم)صفت مشبہہ ہے جب کہ ثِقَل(بروزن سِبَط)اسم مصدر ہے۔

منقول ہے کہ انہوں نے بیان کیا ہے۔

قَامَ رَسُولُ اللهِ یَوْماً فِیْنَا خَطِیْباً بِماءٍ یُدْعی خُمّاً بَیْنَ مَکَّةَ و الْمَدِیْنَة فَحَمَدَ اللهَ وَ اَثْنٰی عَلَیْهِ وَ وَعَظَ وَ ذَکَرَ ثُمَّ قَالَ: اَمَا بَعْدُ ألا اَیُّهَا النَّاسُ فَاِنَّما اَنَا بَشَرٌ یُوشَكُ اَنْ یَأْتِیَ رَسُولُ رَبِّی فَاُجِیبُ وَ اِنِّی تارِكٌ فِیْکُمْ ثِقْلَیْنِ: اَوَّلُهُما کِتابُ اللهِ فِیهِ الهُدیٰ و النُّورُ فَخُذُوا بِکتابِ اللهِ وَ اسْتَمْسِکُوا بِهٖ فَحَثَّ عَلٰی کِتابِ اللهِ و رَغَّبَ فِیْهِ ثُمَّ قَالَ و اَهْلِبَیْتی، اُذَکِّرُکُمُ اللهَ فِی اَهْلِبَیْتی، اُذَکِّرُکُمُ اللهَ فِی اَهْلِبَیْتی، اُذَکِّرُکُمُ اللهَ فِی اَهْلِبَیْتی ...“ [1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ اور مدینہ کے درمیان پانی والی جگہ جسے خُم [2] کہا جاتا ہے ہمارے درمیان کھڑے ہوئے اور خطبہ ارشاد فرمایا۔ آپؐ نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بجالانے کے بعد وعظ ونصیحت فرمائی اس کے بعد فرمایا: ”اے لوگو! میں ایک بشر ہوں ممکن ہے بہت جلد اللہ کا بھیجا ہوا میری طرف آئے اور میں اس کی دعوت پر لبیک کہوں، میں تمہارے درمیان دوگرانقدر اور اہم چیزیں چھوڑ کر جارہا ہوں، پہلی اللہ کی کتاب جس میں ہدایت اور روشنی ہے، پس کتاب الٰہی کو پکڑلو اور اس سے متمسک ہوجاؤ“ آپؐ نے قرآن کے بارے میں بہت زیادہ تشویق اور ترغیب دلائی۔ پھر آپؐ نے فرمایا: ”اور میری اہل بیت اور تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ خدا کے لیے میری اہل بیت کو فراموش نہ کرنا، میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ خدا کے لیے میری اہل بیت کو نہ چھوڑنا، میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ خدا کے واسطہ میری اہلبیت کو ترک نہ کرنا۔“

دوگرانقدر چیزوں کے عنوان سے اہل بیت کو قرآن کے ساتھ ذکر کرنا، اور ان کے بارے میں الٰہی ذمہ داری کا یاددلانا اور اس پر تین مرتبہ تاکید کرنا، ظاہر کرتا ہے کہ اس چیز کا مسلمانوں کی تقدیر، ان کی ہدایت اور اسلام کے اصولوں کی حفاظت کے ساتھ تعلق اور ربط ہے اگر یوں نہ ہوتا تو اسے قرآن کے ساتھ بیان نہ کیا جاتا۔

۲۔ مذکورہ کتاب میں اُسی راوی سے تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ایک اور روایت بھی بیان ہوئی ہے۔[3] قابل توجہ بات یہ ہے کہ جب اسی حدیث کے آخر میں زید بن ارقم سے سوال ہوا کہ: ”**کیا اہل بیت سے مراد آنحضرتؐ کی ازواج ہیں؟**“ تو انہوں نے جواب دیا: ”**اہل بیت**

---

[1] صحیح مسلم، جلد ۴، صفحہ ۱۸۷۳

[2] صحیح مسلم کے حاشیہ میں آیا ہے کہ غدیر خم جحفہ سے تین میل کے فاصلے پر ہے۔

[3] صحیح مسلم، جلد ۴، صفحہ ۱۸۷۳

سے مراد آپؐ کے نسبی رشتہ دار ہیں جن پر صدقہ حرام ہے۔"

۳۔سنن ترمذی جو"صحیح ترمذی" کے نام سے بھی مشہور ہے، اس میں "مناقب اہل بیت" کے باب میں جابر بن عبداللہ سے منقول ایک حدیث ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ حج کے موقعہ پر عرفہ کے دن میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے مخصوص اونٹ پر سوار ہو کر خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے سُنا وہ فرما رہے تھے:

"یاایُّها النّاس اِنّی قَدْ تَرَکْتُ فِیْکُمْ ما اِنْ اَخَذْتُمْ بِهٖ لَنْ تَضِلُّو کتابَ اللهِ وعِتْرَتی اَهْلبَیْتِی"[1]

"اے لوگو! میں تمہارے درمیان دو گرانقدر چیزیں چھوڑی ہیں اگر تم نے انہیں پکڑے رکھا (اور ان کے دامن کو تھامے رکھا) تو ہرگز گمراہ نہیں ہوگے، کتاب الٰہی اور میری عترت واہل بیت ؑ"

اس کے بعد امام ترمذی کہتے ہیں کہ اسی مطلب کو حضرت ابوذر، حضرت ابوسعید خدری، حضرت زید بن ارقم اور حضرت حذیفہ نے بھی نقل کیا ہے۔

۴۔اسی کتاب میں کچھ صفحات بعد جناب ابوسعید اور جناب زید بن ارقم سے نقل ہوا ہے کہ ان دونوں نے کہا:

"قَالَ رَسُولُ اللهِ اِنّی تَارِكٌ فِیکُمْ مَا اِنْ تَمَسَّکْتُمْ بِهٖ لَنْ تَضِلُّوا بَعْدِی : اَحَدُ هُمَا اَعْظَمُ مِنَ الاٰخَرِ، کتابُ اللهِ حَبْلُ مَمْدُودٌ مِنَ السَّماءِ اِلَی الارضِ وَعِتْرَتِی اَهْلُبَیْتِی وَلَنْ یَفْتَرِقا حَتّٰی یَرِد عَلَیَّ الحَوْضَ ،فانْظُرُوا کَیْفَ تُخْلِفُونِی فِیهِما"[2]

"رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں تمہارے درمیان ایک چیز یادگار کے طور پر چھوڑ کر جا رہا ہوں اگر تم نے اس سے تمسک رکھا تو میرے بعد کبھی گمراہ نہیں ہوگے، ان میں سے ایک دوسری سے عظیم ہے، کتاب الٰہی ایک ایسی رسی ہے جو آسمان سے زمین تک کھنچتی ہوئی ہے (اور دوسری) میری عترت اہل بیت ؑ ہے، اور یہ دونوں کبھی آپس میں جدا نہیں ہوں گے، یہانتک کہ میرے پاس حوض (کوثر) پر پہنچ جائیں گے، پس دیکھو خیال رکھنا میرے بعد تم ان کے ساتھ کیا سلوک کرو گے۔"

۵۔سنن دارمی، یہ بھی حدیث کی بڑی مشہور کتاب ہے، زید بن ارقم کی حدیث کی طرح کی، حدیث رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کی گئی ہے۔جس میں بڑی صراحت کے ساتھ ثقلین اور کتاب اللہ اور اہل بیت ؑ کا نام ذکر ہوا ہے[3] یاد رہے کہ بعض محققین کے مطابق جناب

---

[1] صحیح ترمذی، جلد ۵، صفحہ ۶۶۳، باب مناقب اہل بیت النبی حدیث ۳۷۸۶

[2] صحیح ترمذی، جلد ۵، صفحہ ۶۶۳، باب مناقب اہل بیت النبی حدیث ۳۷۸۸

[3] سنن دارمی، جلد ۲، صفحہ ۴۳۲ (طبع دارالفکر بیروت)

''دارمی'' امام مسلم، امام ابوداود اور امام ترمذی کے بھی استاد ہیں، کتاب ''سنن دارمی'' اہل سنت کی مشہور صحاح الستہ میں سے ایک ہے (اگرچہ بعض نے اسکی جگہ پر سنن ابن ماجہ کو ذکر کیا ہے)

٦۔ امام احمد، اہل سنت کے چار مشہور اماموں میں سے ایک ہیں ان کی کتاب مسند احمد میں ایک حدیث حضرت زید بن ثابت سے نقل ہوئی ہے، انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"اِنِّی تَارِكٌ فِیكُمْ خَلِیْفَتَیْنِ: كتاب اللهِ حَبْلُ مَمْدُودٌ ما بَیْنَ السَّماءِ اِلَی الارضِ وَ عِتْرَتِی اَهْلُبَیْتِی وَ لَنْ یَفْتَرِقا حَتّٰی یَرِدَ عَلَیَّ الحَوْضَ." [۱]

''میں تمہارے درمیان دو خلیفہ (جانشین) چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ ایک اللہ کی کتاب جو ایسی رسی ہے جو زمین اور آسمان کے درمیان بندھی ہوئی ہے اور دوسری میری عترت اور اہل بیت ÷ ہیں۔ یہ دو آپس میں کبھی جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوض (کوثر) تک پہنچ جائیں گے''

یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ ان میں سے بعض روایات میں ''ثقلین'' کا لفظ ذکر ہوا ہے (جیسے صحیح مسلم کی روایت میں) اور بعض میں ''خلیفتین'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ (جیسے آخری روایت جو مسند احمد سے نقل ہوئی ہے) اور بعض میں ان دو میں سے کوئی لفظ بیان نہیں ہوا لیکن ان دو کا معنی اور مفہوم ضرور بیان ہوا ہے۔ درحقیقت ان سب کی بازگشت ایک ہی چیز کی طرف ہوتی ہے۔

٧۔ احمد بن شعیب نسائی کا شمار اہل سنت کے بزرگان میں ہوتا ہے اور ان کی کتاب سنن نسائی صحاح الستہ میں سے ایک ہے، وہ اپنی کتاب ''خصائص'' میں حضرت زید بن ارقم سے بیان کرتے ہیں، جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حجۃ الوداع سے واپسی پر غدیر خُم کے مقام پر پہنچے تو آپؐ نے ایک سایبان بنانے کا حکم دیا اور اس کے نیچے جگہ کو صاف ستھرا کرنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد آپؐ نے ارشاد فرمایا:

كَاَنِّی دُعِیتُ فَاَجَبْتُ وَاِنِّی تارِكٌ فِیكُمُ الثَّقْلَیْنِ اَحَدُهُما اَكْبَرُ مِنَ الاٰخَرِ كِتابَ اللهِ وَعِتْرَتِی فَانْظُرُوا كَیْفَ تُخْلُفُونِی فِیهما ،فَاِنَّهُما لَنْ یَفْتَرِقا حتی یَرِدا عَلَیَّ الحَوْضَ،ثُمَّ قالَ اِنَّ اللهَ مَوْلایَ وَاَنَا مَوْلی كُلِّ مُؤمِنٍ ثُمَّ اَخَذَ بِیَدِ عَلِیٍ علیه السَّلامُ فَقالَ مَنْ كُنْتُ مَوْلاهُ فَهٰذا وَلِیُّهُ اَللّٰهُمَّ والِ مَنْ وَالاهُ وعادِ مَنْ عاداهُ [۲]

''گویا مجھے (اللہ کی طرف سے) بلایا گیا ہے اور میں نے لبیک کہا ہے (بہت جلدی تمہارے درمیان سے چلا جاؤں گا) میں تمہارے درمیان دو گرانقدر اور قیمتی چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں ان میں سے ایک دوسری سے بڑی ہے، کتاب اللہ، اور میری عترت واہل بیت پس خیال رکھنا میرے بعد ان سے کیا سلوک کرتے

[۱] مسند امام احمد، جلد ۵، صفحہ ۱۹۲، (طبع دار الصادر بیروت)

[۲] خصائص نسائی، صفحہ ۲۰، (طبع التقدم) مصر میں (مطابق نقل فضائل الخمسہ) جلد ۲ صفحہ ۵۴۔

ہو، کیونکہ یہ دونوں آپس میں جدا نہیں ہوں گے یہانتک کہ میرے پاس حوض (کوثر) پر پہنچ جائیں گے، پھر فرمایا: اللہ میرا مولی اور سرپرست ہے اور میں ہر مومن کا ولی اور سرپرست ہوں اس کے بعد آپؐ نے حضرت علیؑ کا ہاتھ پکڑا کر فرمایا: جس کا میں مولا ہوں اس کا علی مولا ہیں، اے اللہ تو اُسے دوست رکھ جو علیؑ کو دوست رکھے اور دشمنی رکھ اُس سے جو اس سے دشمنی کرے۔''

حدیث کے آخر میں مذکور ہے کہ اس حدیث کے دوسرے راوی جناب ابوطفیل کہتے ہیں کہ میں نے زید بن ارقم سے پوچھا کیا تم نے اپنے کانوں سے رسول اللہ ﷺ کی بات سنی ہے؟ اس نے کہا جو کوئی بھی اُس سائبان کے نیچے تھا اُس نے اپنی دونوں آنکھوں سے دیکھا بھی اور دونوں کانوں سے سنا بھی۔ یہ حدیث واضح طور پر بتا رہی ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے اس بات کو مجمع عام میں اور لوگوں کی کثیر تعداد کی موجودگی میں غدیر خم کے میدان میں بیان فرمایا اور سب نے اپنے کانوں سے اسے سُنا۔

۸۔ چوتھی صدی ہجری کے ایک بڑے عالم حاکم نیشاپوری کی ایک کتاب ''مستدرک الصحیحین'' ہے۔ جس میں انہوں نے ان حدیثوں کو نقل کیا ہے جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں بیان نہیں ہوئیں لیکن ان دونوں کے معیار اور اصولوں پر پوری اترتی ہیں۔ یہ کتاب اہل سنت کی اہم ترین کتب میں سے ہے۔ اس میں حاکم نیشاپوری ابن واصلہ سے روایت کرتے ہیں کہ اس نے کہا کہ میں نے زید بن ارقم سے سُنا ہے کہ رسول اکرم ﷺ مکہ اور مدینے کے درمیان ایسے درختوں کے پاس پہنچے جہاں پانچ سایہ دار درخت موجود تھے۔ وہاں پر آپ سواریوں سے اتر پڑے۔ لوگوں نے درختوں کے نیچے صفائی کر دی، اس کے بعد پیغمبرؐ نے عصر کی نماز کے بعد خطبہ ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بجالانے کے بعد بہت زیادہ وعظ و نصیحت کی پھر فرمایا:

"اَیُّهَا النَّاسُ اِنِّی تَارِكٌ فِیْکُمْ اَمْرَیْنِ لَنْ تَضِلُّوا اِنِ اتَّبَعْتُمُوهُمَا وَهُمَا كِتَابُ اللهِ وَاَهْلُبَیْتِی عِتْرَتِی"

''اے لوگو! میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑ رہا ہوں اگر تم نے ان کی پیروی کی تو ہرگز گمراہ نہیں ہوگے ایک اللہ کی کتاب اور دوسری میری عترت و اہل بیت'' [۱]

اس کے بعد حاکم مزید لکھتے ہیں کہ یہ حدیث بخاری اور مسلم کی شرط کے مطابق صحیح ہے۔ [۲]

۹۔ ابن حجر ہیثمی، حجاز کے مفتی اور شیعہ کے سخت مخالف تھے، وہ اپنی کتاب ''الصواعق المحرقۃ'' میں لکھتے ہیں:

---

[۱] مستدرک الصحیحین، جلد ۳، صفحہ ۱۰۹۔

[۲] ان دو افراد کی شرط سے مراد یہ ہے کہ وہ صرف اس حدیث کو نقل کرتے تھے جس کی سند کا سلسلہ پیغمبرؐ سے متصل ہو، اس کے راوی ان کی نظر میں قابل اعتماد اور غیر مہتم ہوں، اس وجہ سے کہ انہوں نے ان تمام احادیث کو نقل نہیں کیا جو ان کی شرائط پر پوری اترتی تھیں، حاکم نیشاپوری نے ان کی شرائط پر پوری اترنے والے احادیث کو اپنی کتاب ''مستدرک'' میں جمع کر دیا ہے۔ اس لحاظ سے ''مستدرک'' کو صحیح مسلم اور صحیح بخاری کے ہم پلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

"فِي رِوايَةٍ صَحيحةٍ كاني قَدْ دُعيتُ فأَجَبْتُ إِنِّي قَدْ تَرَكْتُ فِيكُمُ الثَّقَلَيْنِ اَحَدُهُما آكَدُ مِنَ الآخَرِ كتابَ اللهِ عَزَّوجَلَّ وَعِتْرَتِي فَانْظُرُوا كَيْفَ تُخْلِفُونِي فِيهما فَإِنَّهُما لَنْ يَفْتَرِقا حَتَّى يَرِدا عَلَيَّ الحَوْضَ"

''صحیح روایت میں ہے کہ (رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا) گویا مجھے بلایا گیا ہے اور میں نے لبیک کہا ہے میں دو قیمتی اور وزنی چیزیں تمہارے درمیان چھوڑے جا رہا ہوں ایک اللہ کی کتاب اور دوسری میری عترت ہے پس خیال رکھنا میرے بعد تم ان کا حق کس طرح ادا کرتے ہو، یہ دو آپس میں کبھی جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوض (کوثر) پہنچ جائیں گے۔''

وہ مزید بیان کرتے ہیں: ایک اور روایت میں یہ اضافی بات بھی نقل ہوئی ہے:

"سَئَلْتُ رَبِّي ذَلِكَ لَهُما فَلا تَتَقَدَّمُوهُما فَتَهْلُكُوا وَلَا تَقْصُرُوا عَنْهما فَتَهْلُكُوا وَلَا تُعَلِّمُوهُمْ فَإِنَّهُمْ اَعْلَمُ مِنْكُمْ"

''میں نے اس مقام کو اپنے پروردگار سے ان کے لیے مانگا ہے پس تم ان سے آگے نہ بڑھنا ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے اور ان سے پیچھے بھی نہ رہ جانا پھر بھی ہلاک ہو جاؤ گے، انہیں کوئی چیز سکھانے کی کوشش مت کرنا کیونکہ وہ تم سے زیادہ عالم ہیں''

اس کے بعد وہ مزید لکھتے ہیں کہ اس حدیث کے طرق اور راوی بہت زیادہ ہیں ان کی تعداد بیس (۲۰) تک پہنچ جاتی ہے۔ لہٰذا اس کی تفصیل اور تشریح کی ضرورت نہیں ہے۔[۱] اس حدیث کے وسعت دامن (تواتر کی حد تک) کا واضح اعتراف قابل توجہ ہے اور وہ بھی اُس شخص کی طرف سے جس نے مسئلہ امامت میں شیعہ پر سخت ترین اعتراضات کیے ہوں۔

۱۰۔ ابن اثیر (محمد بن عبد الکریم) مشہور و معروف کتابوں کے مصنف ہیں، ان کی کتاب 'اُسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ' ہے اس میں وہ عبد اللہ بن حنطب کے حالات میں بیان کرتے ہیں کہ اُس نے نقل کیا ہے:

"خَطَبَنَا رَسُولُ اللهِ بِالجُحْفَه فَقَالَ اَلَسْتُ اَوْلَى بِكُمْ مِنْ اَنْفُسِكُمْ؟ قالُو بلى يا رسول اللهِ! قال اِنِّي سائِلُكُمْ عَنْ اِثْنَتَيْنِ عَنِ الْقُرآن، وَعَنْ عِتْرَتِي"[۲]

''رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جحفہ کے مقام (مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک جگہ) پر ہمارے لیے ایک خطبہ دیا

---

[۱] صواعق، صفحہ ۲۲۶، طبع عبد الطیف مصر۔

[۲] اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابہ، جلد ۳، صفحہ ۱۴۷، (طبع مصر و بیروت)

اور فرمایا: کیا میں تم پر تمہارے سے زیادہ حق نہیں رکھتا؟ سب نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ ﷺ! آپؐ نے فرمایا: میں (قیامت کے دن) تم سے دو چیزوں کے بارے میں سوال کروں گا، ایک قرآن اور دوسری میری عترت''

۱۱۔ جلال الدین عبدالرحمن سیوطی، اہل سنت کے بزرگ علما میں سے ہیں اور بہت ساری کتب کے مصنف ہیں [۱] انہوں نے اپنی کتاب ''احیاءا لمیت'' میں اُسی بات کو بیان کیا ہے جو ابن اثیر نے اُسد الغابہ میں ذکر کی ہے۔ [۲]

۱۲۔ ابوبکر احمد بن الحسین بیھقی، وہ شخصیت ہیں کہ جن کے بارے میں زمخشری کہتے ہیں: ''مذہب شافعیہ کے امام شافعی، تمام شافعیوں کی گردن پر حق رکھتے ہیں؛ لیکن بیھقی کا اپنی تصنیفات کی وجہ سے خود امام شافعی اور تمام شافعی مذہب رکھنے والوں پر احسان ہے۔'' [۳] اسی ابوبکر احمد بن الحسین نے بھی اس حدیث کو اپنی اہم ترین کتاب ''السنن الکبری'' میں ذکر کیا ہے۔ (اس نے تقریباً وہ بات کی ہے جو صحیح مسلم میں آئی تھی کہ جس میں خصوصیت کے ساتھ اہل بیت کا ذکر تین بار ہوا ہے) [۴]

۱۳۔ تیسری اور چوتھی صدی ہجری کے حافظ طبرانی اہل سنت کے بہت بڑے محدث ہیں اور بعض افراد کے بقول انہوں نے حدیث میں ایک ہزار سے زیادہ اساتیذ سے استفادہ کیا ہے۔ انہوں نے اپنی مشہور کتاب ''المعجم الکبیر'' میں اپنی سند سے رسول اکرم ﷺ نے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو ثقلین کی پیروی کرنے کی دعوت دی تو ایک شخص کھڑا ہوا اور اُس نے عرض کیا، اے اللہ کے رسول! ثقلین کون ہیں؟ آپؐ نے فرمایا:

''اَلاَ کْبَرُ کِتابُ اللّٰہِ سَبَبٌ طَرَفُہُ بِیَدِ اللّٰہِ وَ طَرَفُہُ بِأَیْدِیْکُمْ فَتَمَسَّکُوا بِہِ لَنْ تَزَالُو وَ لاَتَضِلُّوا، وَ الاَصْغَرُ عِتْرَتِی وَ انَّھُما لَنْ یَفْتَرِقا حَتّیٰ یَرِدا عَلَیَّ الحَوْضَ''

''ثقل اکبر، اللہ کی کتاب ہے، جس کا ایک سرا اللہ کے دست (قدرت) میں ہے اور دوسرا تمہارے ہاتھوں میں ہے، پس اس سے وابستہ رہو تو کبھی نابود نہ ہو گے اور نہ گمراہ ہو گے اور ثقل اصغر میری عترت ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے سے کبھی جدا نہیں ہوں گے۔ یہاں تک کہ میرے پاس حوض پر پہنچ جائیں گے۔''

اس کے بعد آنحضرتؐ نے مزید فرمایا: میں نے اس چیز کو ان دو کے بارے میں اپنے رب سے طلب کیا ہے۔ پس ان سے آگے

---

[۱] کہا گیا ہے کہ اس نے پانچ سو زیادہ کتب تالیف کی ہیں (الکنی والالقاب، جلد ۱۰، صفحہ ۱۱۴)

[۲] احیاء المیت جو کہ الاتحاف کے حاشیہ پر چھپی ہے، ص ۱۶۔

[۳] الکنی والالقاب، جلد ۲، صفحہ ۱۱۴

[۴] سنن بیہقی، جلد ۱۰، صفحہ ۱۱۴۔

نہ بڑھنا ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے اور انہیں کوئی بات سکھانے کی کوشش نہ کرنا کیونکہ یہ تم سے زیادہ جانتے ہیں۔[۱]

۱۴۔ ابن تیمیہ (احمد بن عبدالحلیم حنبلی، جس کی وفات ۷۲۸ھ میں ہوئی) جو کہ وہابی مذہب کے بانی ہیں، انہوں نے اپنی کتاب منھاج السنہ میں اس حدیث کو بالکل اسی طرح بیان کیا ہے جس طرح وہ صحیح مسلم میں نقل ہوئی ہے۔[۲]

اہل سنت کے جانے پہچانے اور مشہور و معروف چند دیگر دانشمندوں نے بھی حدیث کو اپنی کتابوں میں نقل کیا ہیں جن میں سے کچھ درج ذیل ہیں:

۱۵۔ ابن مغازلی (علی بن محمد، شافعی مذہب کے فقہاء میں سے ہیں اور پانچویں صدی ہجری کے علماء میں سے ہیں) نے حدیث ثقلین کو پوری تفصیل کے ساتھ زید بن ارقم سے نقل کیا ہے۔[۳]

۱۶۔ چھٹی صدی ہجری کے مشہور عالم، فقہی، محدث، خطیب اور شاعر خوارزمی نے اس حدیث کو اپنی کتاب ''مناقب'' میں ذکر کیا ہے۔[۴]

۱۷۔ ذھبی (محمد بن احمد بن عثمان دمشقی شافعی) ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری کے علماء میں سے ہیں، اپنے مذہب میں تعصب میں مشہور ہیں۔ ان کے بارے میں تاج الدین سبکی ''طبقات الشافعیۃ'' میں کہتے ہیں: ''وہ اپنے زمانے کے نامور محدث، خاتم حفاظ، مذہب اہل سنت والجماعت کے علمدار اور ہمارے دور کے لوگوں کے پیشوا تھے۔'' انہوں نے بھی اس حدیث کو اپنی کتاب ''تلخیص المستدرک'' میں بیان کیا ہے۔[۵]

۱۸۔ مشہور مؤرخ علی بن برھان حلبی، جن کا شمار گیارہویں صدی ہجری کے علماء میں ہوتا ہے انہوں نے اپنی کتاب ''انسان العیون'' جو کہ سیرہ حلبی کے نام سے معروف ہے، میں حدیث ثقلین کو حدیث غدیر کے بیان کے ضمن میں صریح الفاظ میں اسی طرح نقل کیا ہے جیسے گذشتہ کتب میں بیان ہوئی ہے۔ اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد وہ بڑی صراحت سے کہتے ہیں: یہ حدیث صحیح ہے جو کہ صحیح اور حسن اسناد کے ساتھ نقل ہوئی ہے۔[۶]

۱۹۔ ابن حیان مالکی نے اپنی کتاب ''المقتبس فی احوال الاندلس'' میں صحیح مسلم کی حدیث کے ساتھ ملتی جلتی حدیث بیان کی ہے، لیکن مکہ و مدینہ کے درمیان جس جگہ پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خطبہ ارشاد فرمایا اُسے ''حصائن'' کا نام دیا ہے جس کا معنی قلعے ہوتا ہے۔[۷]

---

[۱] المعجم الکبیر، صفحہ ۱۳۷ (احقاق الحق، ج ۹ ص ۳۲۲ کے مطابق)

[۲] منہاج السنۃ، جلد ۴، صفحہ ۸۳۴، چاپ قاہرہ۔

[۳] احقاق الحق، جلد ۴، صفحہ ۴۳۷ (ان کے خطی نسخے کے مطابق)

[۴] مناقب، صفحہ ۹۳۔

[۵] یہ کتاب مستدرک حاکم کے حاشیہ پر حیدر آباد دکن میں چھپی ہے، جلد ۳، ص ۱۰۹۔

[۶] سیرۃ حلبی، جلد ۳، صفحہ ۲۷۴، طبع قاہرہ۔

[۷] المقتبس، صفحہ ۱۶۷، (طبع پیرس)

۲۰۔علاء الدین علی بن محمد بغدادی المعروف ''خازن'' آٹھویں صدی کے علماء میں سے ہیں۔انہوں نے بھی اپنی تفسیر میں اُسی حدیث کونقل کیا ہے جو صحیح مسلم اور صحیح ترمذی میں منقول ہے۔[۱]

۲۱۔ابن ابی الحدید معتزلی (عزالدین عبدالحمید) کا شمار ساتویں صدی ہجری کے مشہور علماء میں ہوتا ہے، انہوں نے شرح نہج البلاغہ میں اس حدیث کو نقل کرتے ہوئے کہا ہے: ''قَدْ بَیَّنَ رسولُ اللّٰہِ(ص) عِتْرَتَہُ مَنْ ھِیَ؟ لما قال اِنّی تارِکٌ فِیکُمُ الثَّقَلَیْنِ فقال عِتْرَتِی اَھْلُبَیْتِی۔ '' یعنی: ''پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عترت کی تشریح فرمائی ہے آپؐ نے فرمایا ہے کہ میں تمہارے درمیان دو گرانقدر چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں پھر فرمایا: میری عترت یعنی میرے اہل بیتؑ۔''

اس کے بعد وہ مزید لکھتے ہیں کہ ایک اور مقام پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہل بیت کی بھی وضاحت فرمائی ہے جب آپؐ نے ان پر چادر ڈالی اور جب آیت: '' انما یرید اللہ لیذھب۔۔۔۔۔۔۔'' نازل ہوئی، آپؐ نے بارگاہ ایزدی میں عرض کیا: اے اللہ! یہ ہیں میرے اہل بیتؑ پلیدی اور رجس کو ان سے دُور فرما۔[۲]

۲۲۔ذینی دحلان شافعی (سید احمد) مکہ کے مفتی اور تیرھویں صدی کے علماء میں سے ہیں، ان کی تالیفات بہت ساری ہیں، اپنی کتاب ''سیرہ نبویہ'' جو کہ سیرہ حلبی کے حاشیہ پر چھپی ہے، میں انہوں نے بعینہ اُسی طرح اس حدیث کو بیان کیا ہے جس طرح صحیح مسلم میں منقول ہے اور جس طرح مسند احمد حنبل میں ابوسعید خدری سے مروی ہے۔[۳]

خلاصہ کلام

یہ تھے اسلام کی پہلی صدی سے لے کر آخری صدی تک کے نامور اور مشہور علماء جنہوں نے اپنی اہم ترین کتب میں حدیث ثقلین کو صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔لیکن اس بات کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اس حدیث کے ناقلان میں سے یہ ایک معمولی تعداد ہے۔عبقات الانورا کے خلاصہ کے مطابق میر حامد حسین ہندی مرحوم نے ایک سو چھبیس (۱۲۶) مشہور کتابوں کا ذکر کیا ہے اور ان میں سے ہر کتاب کی بعینہ عبارت کو کتاب کی جلد اور صفحہ کے ساتھ بیان کیا ہے۔[۴]

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس حدیث کو نقل کرنے والے صرف جابر بن عبداللہ انصاری یا ابوسعید خدری اور زید بن ارقم نہیں بلکہ اِسے کم از کم تیئس (۲۳) اصحاب رسول نے بلاواسطہ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا ہے۔

جن کے نام درج ذیل ہیں۔

---

[۱] تفسیر خازن جلد ۱، صفحہ ۴ (طبع قاہرہ)

[۲] شرح نہج البلاغہ، جلد ۲، صفحہ ۴۳۷، طبع قاہرہ اور جلد ۶، صفحہ ۳۷۵، طبع حلبی بیروت خطبہ ۸۶

[۳] سیرۃ نبویہ، جلد ۲، صفحہ ۳۰۰، اور سیرۃ حلبی کی جلد ۳، صفحہ ۳۳ پر بھی آئی ہے جو مصر میں چھپی ہے۔

[۴] عنقات الانوار کے خلاسہ کے نقل کے مطابق، ج۲، صفحہ ۱۰۵ تا ۲۴۲، چاپ مؤسسۃ البعثہ۔

۱۔زید بن ارقم
۲۔ابوسعید حذری
۳۔جابر بن عبداللہ انصاری
۴۔حذیفہ بن اُسَید
۵۔خُزیمہ بن ثابت
۶۔زید بن ثابت
۷۔سھل بن سعد
۸۔ضَمُرۃ الاسلمی
۹۔عامر بن لیلی
۱۰۔عبدالرحمن بن عوف
۱۱۔عبداللہ بن عباس
۱۲۔عبداللہ بن عمر
۱۳۔عدی بن حاتم
۱۴۔عقبۃ بن عامر
۱۵۔علی ابن ابی طالب
۱۶۔ابوذری غفاری
۱۷۔ابورافع
۱۸۔ابی شریح خزاعی
۱۹۔ابوقدامہ انصاری
۲۰۔ابوھریرہ
۲۱۔ابی ہیثم بن تیھان
۲۲۔اُمّ سلمہ
۲۳۔اُمّ ھانی

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان پر حدیث ثقلین کا تکرار

یہ بات بھی انتہائی قابل توجہ ہے کہ اس حدیث کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فقط ایک مرتبہ ارشاد نہیں فرمایا (حدیث غدیر کی طرح جسے آپ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا اور بہت زیادہ لوگوں نے اُسے سنا اور نقل کیا) بلکہ حدیث ثقلین کو آپ نے مختلف مواقع پر اور مختلف حوالوں سے بیان فرمایا ہے۔ اہل سنت کی کتب کے مطابق جن مقامات پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس حدیث کو بیان فرمایا ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ غدیر خم پر جب آنحضرت حجۃ الوداع سے واپس آ رہے تھے۔ آپ نے اس مقام پر قیام فرمایا اور اپنے تفصیلی خطبے میں اس حدیث کو بیان فرمایا۔ یہ وہی بات ہے جو ہم نے اس سے قبل صحیح مسلم اور خصائص نسائی سے اسناد اور حوالوں کے ساتھ ذکر کی ہے۔

۲۔ حج کے دوران عرفہ کے دن، جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اونٹ پر سوار تھے اور آپ نے خطبہ دیتے ہوئے اس حدیث کو بیان فرمایا۔ اسی بات کو ترمذی نے صحیح ترمذی میں جابر بن عبداللہ انصاری سے نقل کیا ہے اور سلسلہ حدیث کے نمبر ۲ میں بیان ہوئی۔

۳۔ جحفہ کے مقام پر جو کہ حج کا ایک میقات ہے اور مکہ اور مدینہ کے درمیان واقع ہے آپ نے اس حدیث کو ذکر فرمایا۔ جیسا کہ ابن اثیر نے اسد الغابہ میں عبداللہ بن خطیب کے حالات زندگی میں اِسے بیان کیا ہے اور اس سے پہلے ہم نے اِسے سلسلہ حدیث کے نمبر ۸ میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔

۴۔ جب آنحضرت نے مرض الموت میں اپنی آخری وصیتیں فرمائیں تو اس میں ثقلین کے بارے میں وصیت کرتے ہوئے فرمایا:

اَیُّھا النّاسُ یُوشکُ اَنْ اُقْبَضَ قَبْضًا سَریعاً فَیُنْطَلَقُ بی و قَدْ قَدَّمْتُ اِلَیْکُمْ القَوْلَ مَعْذِرَۃً اِلَیْکُمْ اِلّا اِنّی مُخَلِّفٌ فِیکم کِتابَ رَبِّی عَزَّ و جَلَّ و عِتْرَتی اَھْلَبَیْتِی ثُمَّ اَخَذَ بِیَدِ عَلِیٍّ فَرَفَعَھا، فقالَ ھذا عَلِیٌّ مع القرآن و القرآن مَعَ عَلِیٍّ لایَفْتَرِقانِ حتّی یَرِدا عَلَیَّ الحوضَ فاسْئَلُوھُما ما خَلَّفْتُ فِیھِمَا"۔

"اے لوگو! میں بہت جلد تمہارے درمیان سے جانے والا ہوں اور میں نے تم سب کے لیے حجت تمام کر دی ہے۔ آگاہ رہو میں تمہارے پاس خدائے بزرگ و برتر کی کتاب اور اپنی عترت و اہل بیت چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ پھر آپ نے علی کا ہاتھ پکڑا اور بلند کیا اور فرمایا: "یہ علی قرآن کے ساتھ ہیں اور قرآن علی کے ساتھ ہے اور یہ ایک دوسرے سے کبھی جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوض (کوثر) پر پہنچ جائیں گے ان دونوں سے پوچھو اُس چیز کے بارے میں جو میں نے ان دو میں بطور یادگار چھوڑی ہے۔" [1]

اس حدیث میں دقیق اور ظریف نکات ہیں جو معنی آشنا لوگوں سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

---

[1] الصواعق المحرقہ، ص ۷۵۔

۵۔ حجة الوداع کے موقعہ پر مسجد خیف میں ارشاد فرمایا:

الا و انی سائلکم عن الثقلین، قالو یا رسول الله و ما الثقلین؟ قال کتاب الله الثقل الاکبر، طرف بید الله و طرف بایدیکم، فتمسکوا به لن تضلوا و لن تزلوا و عترتی و اهلبیتی، فانه قد نبأنی اللطیف الخبیر انهما لن یفترقا حتی یردا علی الحوض کاصبعی هاتین۔"

"آگاہ رہو میں تم سے ثقلین کے بارے میں پوچھوں گا! لوگوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ثقلین کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ثقل اکبر قرآن مجید ہے جس کا ایک سرا اللہ تعالیٰ کے دست (قدرت) میں ہے اور دوسرا تمہارے ہاتھوں میں ہے۔ پس اس سے وابستہ رہو، کبھی گمراہ نہیں ہوگے اور ہمیشہ ثابت قدم رہو گے۔ دوسری گرانقدر چیز، میری عترت واہل بیتؑ ہیں۔ تحقیق لطیف وخبیر اللہ نے مجھے آگاہ فرمایا ہے کہ یہ دونوں ہرگز ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے جب تک میرے پاس حوض کوثر پر نہ پہنچ جائیں؛ یہ دونوں میری ان ملی ہوئے دوانگلیوں کی طرح ایک ساتھ رہیں گے۔"[۱]

۶۔ (فتح مکہ کے بعد) طائف سے واپسی پر آپ کھڑے ہوئے اور خطبہ ارشاد فرمایا اور یہ حدیث بیان فرمائی اور انہی نکات کو ذکر کیا۔[۲]

اس حدیث کا بار بار بیان کرنا اور مختلف جگہوں، مدینہ میں، حج کے ایام میں، عرفہ کے دن، مسجد خیف (منی کے دِنوں) میں، مکہ اور مدینہ کے درمیان اور دیگر مقامات پر اس کی اس قدر تاکید اس بات کا بین ثبوت اور واضح دلیل ہے کہ ان دو گرانقدر چیزوں سے تمسک اور وابستگی کا مسئلہ تقدیر ساز اور بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کو ان دو کی اہمیت سے حتی المقدور آگاہ کرنے کی سعی فرمائی تا کہ مسلمان ہدایت پر قائم رہیں اور گمراہ نہ ہوں۔ حیرت کی بات ہوگی اگر ہم اس مکرر بیان اور بار بار تاکید کے باوجود ان کے دامن کو چھوڑ دیں اور اپنے آپ کو گمراہی میں ڈال دیں یا غلط تاویلات کے ذریعے اس کی اہمیت کو کم کریں۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم ایک ایسی حدیث سے سرسری طور پر گزر جائیں جسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیس سے زیادہ اصحاب نے نقل کیا ہو، درجہ اول کی اسلامی کتب میں وہ مذکور ہو، تقریباً دوسو مشہور اسلامی کتب میں اس کا تذکرہ ہو، نہ اس کی سند میں کوئی شک وشبہہ ہو اور نہ اس کی دلالت میں کوئی ابہام موجود ہو، ایسی روایت کو معمولی اور سرسری لینا، قطعاً انسان کے کاندھوں پر ایک بھاری ذمہ داری عائد کر دیتا ہے۔

---

[۱] الصواعق المحرقہ، ص ۷۵۔

[۲] تفسیر علی بن ابراہیم بحار الانوار کے نقل کے مطابق، جلد ۲۳، ص ۱۲۹، حدیث ۶۱۔

جو شخص رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خاتم النبین اور امین وحی کے طور پر پہنچانتا ہے اور ان کی طرف سے ان دو گرانقدر چیزوں سے تمسک اور وابستہ رہنے پر بہت زیادہ تاکید کو واضح طور پر دیکھتا ہو اس طرح کہ آپؐ نے عدم گمراہی کو ان دو کی پیروی میں حساب کیا ہو تو اُسے جان لینا چاہیے اس بات میں اہم ترین راز پوشیدہ ہے اور اسلام کے اصولوں میں سے کوئی اہم اصول یہاں پر موجود ہے۔ (غور کیجیے گا)

حدیث ثقلین سے حاصل ہونے والے اہم ترین نکات

یہ حدیث شریف جن اہم ترین خطوط کی طرف مسلمانوں کی راہنمائی کرتی ہے، ذیل میں ہم اُن میں سے بعض کی طرف اختصار کے ساتھ اشارہ کرتے ہیں:

۱۔ قرآن اور اہل بیتؑ ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ ہیں اور ان میں جدائی نہیں ہوسکتی۔ وہ افراد جو قرآن کے حقائق کے طالب ہیں انہیں چاہیے کہ وہ اہل بیتؑ کے دامن کو تھام لیں۔

۲۔ جس طرح قرآن کی پیروی اور اطاعت بلا قید وشرط مسلمانوں پر لازم اور واجب ہے، اسی طرح اہل بیتؑ کی پیروی اور اطاعت بھی بلا قید وشرط واجب ہے۔

۳۔ اہل بیتؑ معصوم ہیں کیونکہ ایک طرف تو قرآن سے جدائی نہیں ہوسکتی، دوسری طرف بغیر قید وشرط ان کی پیروی لازم ہے۔ یہ ان کی غلطی، خطا اور گناہ سے پاک ہونے اور ان کی عصمت کی دلیل ہے۔ کیونکہ اگر ان میں غلطی یا گناہ کا اندیشہ ہوتا تو وہ قرآن سے جدا ہو جاتے اور ان کی پیروی مسلمانوں کو ضلالت اور گمراہی سے بچانے کی ضمانت نہ بنتی۔ اور یہ جو فرمایا گیا ہے کہ ان کی پیروی سے گمراہیوں سے محفوظ رہو گے، ان کی عصمت کی واضح دلیل ہے۔

۴۔ ان سب سے اہم بات یہ ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ لائحہ عمل قیامت تک آنے والے تمام ادوار کے مسلمانوں کے لیے ترتیب دیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ''یہ دونوں اکھٹے رہیں گے اور حوض کوثر پر ایک ساتھ میرے پاس پہنچیں گے۔'' اس سے اچھی طرح واضح ہوتا ہے کہ اسلام کے تمام ادوار میں اہل بیتؑ میں سے ایک فرد معصوم پیشوا کے طور پر موجود رہے گا، جس طرح قرآن ہمیشہ چراغ ہدایت ہے وہ بھی ہمیشہ چراغ ہدایت ہیں، پس ہمیں ہر زمانے اور ہر دور میں انہیں تلاش کرنا چاہیے۔

۵۔ اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اہل بیتؑ سے جدا ہونا یا ان سے آگے بڑھ جانا، گمراہی کا باعث ہے اور کسی انتخاب کو بھی ان کے انتخاب پر ترجیح نہیں دینی چاہیے۔

۶۔ وہ سب سے افضل، اعلم اور برتر ہیں۔

ہاں! مذکورہ حدیث سے مندرجہ بالا نکات اخذ کرنے میں کوئی ابہام موجود نہیں۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ نویں اور دسویں

ہجری کے عالم ''سمھودی''[1] شافعی جوکہ کتاب ''وفاء الوفا'' کے مصنف ہیں وہ حدیث ثقلین کے متعلق لکھی گئی اپنی کتاب ''جواہر العقدین'' میں لکھتے ہیں:

إِنَّ ذلكَ يُفْهِمُ وُجُودَ مَنْ يَكُونُ اَهْلاً لِلتَّمَسُّكِ بِهِ مِنْ اَهْلِ البَيْتِ و العِتْرَةِ الطّاهِرَةِ فِي كُلِّ زمانٍ وُجِدُوا فِيهِ الى قيام السَّاعَةِ حَتّى يَتَوَجَّهُ الحَثُّ المَذْكُورُ اِلَى التَّمَسُّكِ بِهِ كَمَا اَنَّ الكتابَ العزيز كذٰلِكَ۔

''یہ حدیث ہمیں سمجھاتی ہے کہ قیامت تک ہر زمانے میں اہل بیتؑ میں سے کوئی ایسا فرد موجود ہونا چاہیے جو تمسک اور پیروی کے لائق ہوتا کہ حدیث ثقلین میں جو امر کی ترغیب دی گئی ہے وہ ترغیب بجا قرار پائے؛ جیسا کہ قرآن مجید کے حوالے سے بھی حقیقت حال یہی ہے۔''[2]

ایک سوال

ایک سوال اپنی جگہ پر باقی ہے اور وہ یہ ہے کہ بعض روایات (اگرچہ وہ بہت کم ہیں) میں ''عترتی واہل بیتی'' کی جگہ ''وسنتی'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ سنن بیہقی میں دو جگہوں پر ایسا ہوا ہے، ایک مقام پر ابن عباس رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ حجۃ الوداع کے موقعہ آنحضرتؐ نے خطبہ دیا اور فرمایا کہ میں نے تمہارے درمیان ایسی چیز چھوڑی ہے اگر اس سے وابستہ رہے تو کبھی گمراہ نہیں ہوگے۔ پھر فرمایا: ''کتاب اللهِ وسُنَّة نبيِّهِ۔'' یعنی: ''اللہ کی کتاب اور اس کے نبی کی سنت۔''[3] اور دوسری سند میں ابوھریرہ سے بھی یہی بات منقول ہے۔[4]

لیکن واضح بات ہے کہ یہ حدیث ان تمام حدیثوں کے مقابلے میں قابل اعتناء نہیں ہے جن میں اہل بیت وعترت کا ذکر نہایت صراحت کے ساتھ موجود ہے۔ یہاں تک کہ بعض روایات میں تین مرتبہ اہل بیت کا تکرار ہوا ہے اور ان کے بارے میں تاکید کی گئی ہے۔ بعض احادیث میں صریحاً حضرت علیؑ کا نام ذکر ہوا ہے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کا ہاتھ پکڑ کر ان کا تعارف کرایا ہے۔ لگتا یوں ہے کہ ارباب اقتدار اس حدیث کے حوالے سے لوگوں کے اعتراضات سے بچنے کے لیے اس تبدیلی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ لیکن اسے رائج کرنے میں وہ ناکام رہے ہیں۔

اس سے قطع نظر یہ دو حدیثیں (صحیح حدیث اور سنتی والی حدیث) آپس میں منافی نہیں ہیں، ایک مقام پر اللہ کے رسولؐ نے

---

[1] سمھود، دریائے نیل کے کنارے ایک بہت بڑی بستی ہے۔

[2] خلاصہ عبقات الانوار، جلد ۲ صفحہ ۲۸۵۔

[3] سنن بیہقی، جلد ۱۰، صفحہ ۱۱۴۔

[4] سنن بیہقی، جلد ۱۰، صفحہ ۱۱۴۔

کتاب وسنت کی وصیت کی ہے اور دوسرے مقام پر کتاب اور عترت کی وصیت کی ہے۔ جیسا کہ ہم نے کہا ہے کہ رسول خداؐ نے اس حدیث کو متعدد مقامات پر بیان فرمایا ہے (اہل سنت کی کتابوں میں مختلف روایات کے مطابق) کبھی آنحضرتؐ نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر کبھی مسجد خیف میں عرفہ کے دن اور کبھی جحفہ میں تو کبھی غدیر خم کے مقام پر کہیں طائف سے واپسی پر تو کبھی مدینہ میں منبر پر تو کبھی زندگی کے آخری ایام میں بستر علالت پر۔[1]

اس میں کیا مانع ہے کہ کئی بار آپ ﷺ نے فرمایا ہو''کتاب اللہ وعترتی''اور ایک دفعہ فرمایا ہو''کتاب اللہ وسنتی''۔اصولی طور پر کوئی بھی اس بات کا منکر نہیں ہے کہ سنت رسول بھی ان کی چھوڑی ہوئی اہم چیز ہے۔اس پر عمل کرنا بھی ضروری ہے۔کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی مسلمان ہو اور سنت نبوی کو نظر انداز کردے اور اس سے بے اعتنائی برتے جس کے بارے میں قرآن مجید نے بہت تاکید کی ہے۔ ارشاد رب العزت ہے:''مَاآتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَانَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا۔''یعنی:''جو کچھ پیغمبر تمہیں دے دیں وہ لے لو اور جس سے تمہیں روکیں،اس سے رک جاؤ۔''

لہٰذا کسی طور پر بھی عترت اور اہل بیتؑ کی پیروی اور ان سے تمسک پر زور دینا اور تاکید کرنا، دوسری چیزوں کے منافی نہیں ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ ان دو میں سے کسی ایک روایت کا انتخاب کرنا اس وقت ہے جب ان دو میں تعارض اور تضاد موجود ہو جب کہ ان دو میں بالکل تضاد نہیں ہے۔ اصولی طور پر اہل بیتؑ کی ہدایت سے تمسک کرنا، سنت نبوی ﷺ پر عمل پیرا ہونے کا واضح مصداق ہے۔جس کسی نے اہلبیت ÷ کی اطاعت کی ہے اُس نے سنت رسول ﷺ پر عمل کیا ہے اور جو انہیں قبول نہ کرے اور ان سے منہ پھیر لے اور اپنے انتخاب کو رسول اللہ ﷺ کے انتخاب پر ترجیح دے اُس نے رسول ﷺ کی اطاعت سے سرپیچی کی ہے۔ بہر حال ان حیلوں اور بہانوں سے اُس سنگین ذمہ داری سے ہم نہیں بھاگ سکتے جو حدیث ثقلین ہمارے کاندھوں پر ڈالتی ہے۔ یہ حدیث بلا شک وشبہہ، حدیث متواترہ میں سے ہے اور سند اور دلالت کے اعتبار سے نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے۔

یہاں ہم اس بحث کو امام شافعی کے ان اشعار پر ختم کرتے ہیں جو انہوں نے اس بارے میں کہے ہیں:

وَ لَمَّا رَاَیْتَ النّاسَ قد ذَهَبَتْ بِهِمْ
مَذَاهِبُهُم فِی اَلْبحُرِ الغیِّ وَ الْجَهْلِ
رَکِبْتُ علی اسْمِ اللهِ فِی سُفُنِ النّجاۃ
وَ هُمْ آلُ بَیْتِ الْمُصْطَفٰی خَاتَمِ الرُّسُلِ
وَ اَمْسَکْتُ حَبْلَ اللهِ وَ هُوَ وِلاَ ئُهُمْ
کما قَدْ اُمِرْنا بِالتَّمَسُّكِ فِی الحَبْلِ

''جب میں نے دیکھا کہ لوگوں کو ان کے مذاہب اور طور طریقوں نے گمراہی اور جہالت کے سمندر میں

[1] اس سے پہلے ان مقامات کو ذکر کیا جا چکا ہے، یاد رہے کہ سید شرف الدین مرحوم نے اپنی کتاب المراجعات کے خط نمبر ۸ میں ان مقامات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

غرق کر دیا ہے تو میں اللہ کے نام سے نجات کی کشتیوں پر سوار ہو گیا (اور ان کی پناہ لے لی) اور وہ ختم الرسل حضرت مصطفیٰ کے اہل بیت ہیں۔ میں نے اللہ کی رسی جو کہ ان کی ولایت ہے، مضبوطی سے تھام لی؛ جس طرح ہمیں حبل اللہ (قرآن) کو تھامنے کا حکم ملا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر سب لوگ اہل بیت اطہار ÷ کو تمام امور میں اپنی پناہ گاہ سمجھتے اور حق کو ان سے لیتے۔"[1]

گذشتہ بہت سی روایات میں حوض کوثر پر زور دیا گیا ہے۔ ظاہراً اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ حوض کوثر بہشت کے دروازے پر ہے اور بہشت میں داخل ہونے کے لیے پہلا قدم اس پر ہے اور نیک و صالح افراد وہاں پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل بیتؑ سے ملاقات کریں گے۔

[1] ذخیرۃ المآل (خلاصہ عبقات الانوار ج ۲، صفحہ ۲۷۷، کے نقل کے مطابق)

۲۔حدیث سفینہ نوح

اہل بیتؑ اور آئمہ معصومینؑ کے بارے میں مشہور احادیث میں سے ایک حدیث، ''حدیث سفینہ'' ہے جو وسیع پیمانے پر شیعہ اور سنی کی بڑی بڑی کتب میں بیان ہوئی ہے۔ یہاں پر ہم مختصر انداز میں اس کے متن، اسناد اور مصادر کے بارے میں گفتگو کریں گے:

اس حدیث کو کم از کم آٹھ صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا ہے (ابوذر غفاری، ابوسعید خدری، ابن عباس، انس بن مالک، عبداللہ بن زبیر، عامر بن وائلہ، مسلمہ بن الاکوع اور حضرت علیؑ)۔ [۱]

مذکورہ حدیث، اہل سنت کی دسیوں مشہور و معروف کتب میں نقل ہوئی ہے جن میں سے بعض کا ذکر ہم یہاں کریں گے۔ اس کی تفصیلات کے لیے ''احقاق الحق'' کی جلد/ ۹ اور ''خلاصۃ عبقات الانوار'' کی جلد/ ۴ اور دیگر کتب مطالعہ فرمائیے۔

۱۔حضرت ابوذر غفاریؓ خانہ کعبہ کے دروازے کے کڑا پکڑ کر کہتے تھے: جو مجھے پہچانتا ہے وہ پہچانتا ہے؛ جو نہیں پہچانتا وہ جان لے کہ میں ابوذر غفاریؓ ہوں: سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰہِ یَقُولُ مَثَلُ اَھْلِبَیْتِی فِیکُم کَمَثَلِ سَفِینَۃِ نوحٍ فِی قومِ نُوحٍ مَنْ رَکِبَھَا نَجی وَ مَنْ تَخَلَّفَ عَنْھَا ھَلَکَ۔'' یعنی: میں نے خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ میرے اہل بیت کی تمہارے درمیان مثال، نوح کی قوم کے درمیان ان کی کشتی کی سی ہے۔ تو جو اس کشتی پر سوار ہو گیا وہ نجات پا گیا اور جو اس کشتی سے پیچھے رہ گیا وہ ہلاک ہوا'' ایک اور روایت میں آیا ہے: ''وَ مَنْ تَخَلَّفَ عنھا غَرَقَ'' یعنی: جو اس کشتی سے پیچھے رہ گیا وہ غرق ہوا۔'' [۲]

بناء برایں، اہل بیت اطہار ÷ زندگی کے طوفانوں زدہ سمندر میں نجات کی کشتی ہیں۔

۲۔حضرت ابن عباس اور اسی طرح جناب ''مسلمۃ بن الاکوع'' (ابوالحسن علی بن محمد شافعی المعروف ابن مغازلی کی کتاب مناقب کے بیان کے مطابق) رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

''مَثَلُ اَھْلِ بَیْتِی فِیکُمْ مَثَلُ سَفِینَۃِ نوحٍ مَنْ رَکِبھا نجیٰ و مَنْ تَخَلَّفَ عَنھا ھَلَکَ۔''

''میرے اہل بیت کی تمہارے درمیان مثال، نوح کی کشتی کی سی ہے؛ جو اس کشتی پر سوار ہو گیا وہ نجات پا گیا اور جو اس کشتی سے پیچھے رہ گیا وہ ہلاک ہوا۔''

---

[۱] اسد الغابۃ کے بقول عبداللہ بن زبیر ہجرت کے اوائل میں پیدا ہوئے۔ جب یہ سات یا آٹھ سال کے تھے تو ان کے والد انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لے گئے اور آنحضرتؐ کے ہاتھ پر بیعت کی اور انہوں نے آپ کی کی باقی عمر میں آپ سے روایات سنیں اور نقل کیں۔ (اسد الغابۃ، جلد ۳، صفحہ ۱۶۲)

[۲] اس حدیث کو حافظ طبرانی نے المعجم الکبیر اور المعجم الصغیر (صفحہ ۷۸، طبع دہلی)، پر، ابن قتیبہ دینوری نے عیوان الاخبار (جلد ۱، صفحہ ۲۱۲ طبع مصر) پر، حاکم نیشاپوری نے مستدرک (جلد ۳، صفحہ ۱۵۰) پر، ذہبی نے میزان الاعتدال (جلد ۱، صفحہ ۲۲۴) پر اور سیوطی نے تاریخ الخلفاء (صفحہ ۵۷۳) میں اور بہت سے دیگر افراد نے بھی بیان کیا ہے۔

یہ عبارت ابن عباس سے منقول ہے۔ البتہ ابن الاکوع کی عبارت اس سے مختصر ہے: ''مَثَلُ اَهْلِ بَيْتِي فِيكُمْ مَثَلُ سَفِينَةِ نوحٍ مَنْ رَكِبَهَا نجىٰ ''۔ یعنی: ''میرے اہل بیت کی تمہارے درمیان مثال، نوح کی کشتی کی سی ہے؛ جو اس کشتی پر سوار ہو گیا وہ نجات پا گیا''۔

کتاب ''لماذا اخترت مذهب اهل بيت'' یعنی ''میں نے کیوں مذہب اہل بیت اختیار کیا'' کے مصنف شیخ ''محمد امین انطا کی'' حدیث سفینہ پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں: تمام علمائے اسلام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ حدیث شریف، احادیث صحیحہ مستفیضہ (حد تواتر کے نزدیک) میں سے ہے۔ حفاظ حدیث، ائمہ حدیث، سیرت نگار اور مورخین کی ایک بڑی تعداد نے اس حدیث کو اپنی مجامع حدیث اور کتب میں نقل کیا ہے جن کی تعداد سو سے بھی زیادہ تک پہنچی ہوئی ہے؛ ان سب نے اس حدیث کو مقبول حدیث تسلیم کیا ہے۔ وہ مزید کہتے ہیں: ''غیر مسلموں نے بھی اس حدیث کو ایک اسلامی حدیث کے طور پر نقل کیا ہے''۔ [۱]

عبقات الانور میں اس حدیث کو اہل سنت کے مشہور و معروف ۹۲ علماء کی تالیف شدہ ۹۲ کتب سے پوری تفصیل سے بیان کیا ہے۔ خلاصہ عبقات الانوار کے مصنف نے اس کتاب کے ملحقات میں اس حدیث کے نقل کرنے والے آٹھ صحابہ، آٹھ تابعین دوسری صدی کے تین علما، تیسری صدی کے آٹھ علماء چوتھی صدی کے چودہ علماء اور اسی طرح ایک ایک کر کے موجودہ صدی تک کے علماء کا پوری تفصیل سے تذکرہ کیا ہے۔ [۲]

حدیث سفینہ کا مفہوم

اس حدیث کا صحیح مطلب سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم کشتی نوح -کی اہمیت کا جائزہ لیں۔ قرآن مجید ارشاد فرماتا ہے:

فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ۝۱۱ وَّفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰٓى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ۝۱۲

''ہم نے موسلا دھار پانی سے آسمانوں کے دروازے کھول دیئے اور زمین کو چیر کر بہت سارے چشمے جاری کر دیئے اور جو مقدر ہو چکا تھا اس کے لیے دونوں پانی مل کر ایک ہو گئے۔'' (قمر ۱۱/ ۱۲)

اس عالمی طوفان اور سیلاب نے تمام چیزوں کو درہم برہم کر دیا اور سب کو اپنے اندر ڈبو دیا۔ اس کے مقابلے میں نجات کا صرف ایک نقطہ موجود تھا اور وہ حضرت نوح -کی کشتی تھی جس پر سوار ہونے والوں کو اللہ تعالیٰ نے غرق ہونے سے بچنے کی ضمانت دی تھی، یہاں تک کہ جب حضرت نوح -کے بیٹے نے سرکشی اور غرور سے کہا: ''سَآوِي اِلٰى جَبَلٍ يَعْصِمُنِي مِنَ الْمَاءِ'' یعنی: میں اس پہاڑ پر چڑھ جاؤں گا جو مجھے پانی سے بچا لے گا (کیونکہ کوئی بھی سیلاب پہاڑوں کے اوپر سے نہیں گزرتا)۔'' تو اُسے باپ کی طرف سے بڑا سخت

---

[۱] کتاب، لماذا اخترت مذہب اہل بیت، صفحہ ۱۶۶۔

[۲]

اور قطعی جواب ملا، اس نے کہا: "لا عاصِمَ الیَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰہِ اِلَّا مَنْ رَحِمَ" یعنی: "آج کے دن فرمان الٰہی کے مقابلے میں نہ کوئی پناہ گاہ ہے اور نہ کوئی بچانے والا مگر جس پر وہ رحم کرے"۔ (رحمت کا یہ ذکر، دراصل، ان مومنین کی طرف اشارہ ہے جو کشتی نجات پر سوار ہو گئے تھے) اور فوراً حضرت نوح - کی بات کی سچائی نمایاں ہوگئی کیونکہ: "وَحَالَ بَیْنَھُمَا الْمَوْجُ فَکَانَ مِنَ الْمُغْرَقِیْنَ﴿۴۳﴾" یعنی: "ایک بہت بڑی لہر آئی جوان دونوں کے درمیان حائل ہوگئی اور وہ غرق ہو گیا"۔ (ھود/ ۴۳)

اہل بیتؑ کو ایسی کشتی کے ساتھ ان حالات میں تشبیہ دینا بہت بڑا معنی رکھتا ہے اور اس سے ہمارے لیے بہت سارے حقائق روشن ہو سکتے ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں۔

۱۔ رسول اکرم ﷺ کے بعد امت اسلامی کو طوفان گھیر لیں گے اور بہت سوں کو نگل لیں گے اور اپنی موج میں بہا کر لے جائیں گے۔

۲۔ ایسے خطرات سے رہائی پانے کے لیے جو انسان کے دین وایمان اور روح وجان کے لیے خطرناک ہیں، امید کی صرف ایک کرن ہی موجود ہے جو اہل بیت کی کشتی نجات ہے؛ اس سے بچھڑ جانے اور جدا ہو جانے میں ہلاکت یقینی ہے۔

۳۔ صحرا میں کسی سواری کے بغیر رہ جانا ممکن ہے ہمیشہ موت کا موجب تو نہ بنے لیکن انسان کو سخت مشقت اور زحمت میں ڈال دے۔ لیکن تلاطم خیز سمندر میں کشتی نجات سے بچھڑ جانے کا نتیجہ سوائے ہلاکت اور موت کے کوئی اور نہیں نکلتا۔

۴۔ کشتی میں سوار ہونے کے لیے ایمان اور عمل صالح کی شرط تھی اسی لیے حضرت نوح نے اپنے بیٹے کو تجویز دی کہ وہ ایمان لے آئے اور کافروں سے الگ ہو جائے اور اس کے اور ان کے ساتھیوں کے ہمراہ کشتی میں سوار ہو جائے (ارکب معنا ولا تکن مع الکافرین) بنا برایں، بلاؤں اور انحرافات کے طوفانوں سے اس امت کی نجات کی شرط اس کشتی نجات پر سوار ہونا یا دوسرے الفاظ میں اس پر ایمان و یقین ہے۔

۵۔ جو چیز نجات کا باعث ہے وہ صرف اہل بیتؑ کی محبت اور دوستی نہیں ہے جیسا کہ بعض علمائے اسلام یہ دعوی کرتے ہیں کہ سب مسلمان اہل بیتؑ سے دوستی رکھتے ہیں لہٰذا اہل نجات ہیں۔ لیکن مسئلہ یہ نہیں ہے بلکہ دراصل مسئلہ جو روایات میں آیا ہے وہ اہل بیت اطہار ÷ کی پیروی کرنے یا نہ کرنے کا ہے۔ یوں تو حضرت نوح - کا بیٹا بھی اپنے باپ سے محبت کرتا تھا، لیکن ان کی پیروی نہیں کرتا تھا اور اس کی یہ محض محبت، اس کی نجات کا باعث نہ بن سکی۔ (غور کیجیے گا)

۶۔ جیسا کہ گذشتہ گفتگو میں بیان ہوا ہے، حدیث ثقلین سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اہل بیتؑ کے دامن سے وابستگی اور تمسک قیامت تک جاری ہے اور قرآن واہل بیتؑ ہمیشہ ایک دوسرے کے ہمراہ ہیں تاوقتیکہ بہشت کے دروازے (حوض کوثر کے کنارے) پر رسول خدا ﷺ کی خدمت میں پہنچ جائیں۔ اسی طرح سے "حدیث سفینہ" بھی یہ ثابت کرتی ہے کہ یہ راستہ تا قیامت جاری رہے گا، کیونکہ دنیا ہمیشہ طوفانوں کا مرکز ہے یعنی ہر دور اور زمانے میں شیطان، گمراہیوں کے علمبردار اور وادی حیرت میں گمشدگان موجود رہے ہیں اور رہیں گے۔ یہ طوفان تھمنے والے نہیں، جب تک قیامت برپا نہ ہو جائے اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے درمیان فیصلہ نہ کر لے اور قرآن کے بقول اختلافات کو مٹا نہ

دے۔[1] لہٰذا نجات کی کشتی کا وجود بھی ہمیشہ رہے گا اور اس پر سوار نہ ہونا ہلاکت کا باعث رہے گا۔

۷۔ اہل بیتؑ سے بلا قید و شرط وابستگی اور تمسک (ان کی عدم پیروی کے برخلاف) ہر زمانے میں ایک امام معصوم کے وجود پر بہترین دلیل بن سکتا جس کی پیروی نجات کا باعث اور نافرمانی ہلاکت و نابودی کا سبب ہو۔

۸۔ یہ حدیث اس مشہور حدیث کی ایک تفسیر ہے جس میں فرمایا گیا ہے:

سَتَفْتَرِقُ اُمَّتِی عَلٰی ثلاثٍ وَ سَبْعِیْنَ فِرْقَةً. فِرْقَةٌ ناجیَةٌ و البَاقُونَ فِی النّار [2]

''عنقریب میری امت ۷۳ فرقوں میں بٹ جائے گی؛ ان میں سے فقط ایک فرقہ نجات پانے والا اور باقی سب جہنم کی آگ میں ڈالے جائیں گے۔''

یہ حدیث بتا رہی ہے کہ فرقہ ناجیہ (اہل نجات گروہ) وہ لوگ ہیں جو مکتب اہل بیتؑ کا دامن تھامے ہوئے ہوں اور ان سے وابستہ ہوں اور اسلام کے اصول و فروع میں انہی کے نور ہدایت سے روشنی حاصل کریں۔ مجموعی طور پر گزشتہ باتوں سے یہ نکتہ بھی اس مشہور حدیث سے اخذ کیا جا سکتا ہے کہ امت اسلامی میں اہل بیتؑ کا مسئلہ بنیادی ترین مسائل میں ایک بنیادی مسئلہ ہے نہ کہ ایک معمولی مسئلہ اور نہ ہی یہ کہ مسلمان سب چیزیں عقائد، احکام، دینی تعلیمات تو غیروں سے لیں اور اہل بیتؑ کے بارے میں صرف قلبی لگاؤ پر اکتفاء کر لیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

---

[1] قرآن مجید اپنی متعدد آیات میں وضاحت فرماتا ہے کہ قیامت وہ دن ہے جب اختلافات ختم ہو جائیں گے اور اللہ تعالیٰ ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا۔

[2] اس روایت کو بہت سارے شیعہ اور سنی علماء نے نقل کیا ہے اور حدیث کی طرق اور اسناد میں آیا ہے کہ علیؑ نے رسول اکرمؐ سے پوچھا کہ یہ فرقہ ناجیہ کون ہے آنحضرتؐ نے فرمایا: ''اَلْتمسُّك بما انت وشیعتك واصحابك'' وہ چیز جس پر آپ اور آپ کے شیعہ اور اصحاب میں جو اس سے وابستہ رہیں گے) (احقاق الحق، جلد ۷، صفحہ ۱۸۵)

۳۔حدیث نجوم

اہل بیت ÷ کے بارے میں ایک اور حدیث وسیع پیمانے پر اور کثرت سے اسلامی کتب میں بیان ہوئی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ وہ ہر دور اور زمانے میں لوگوں کے ہادی و راہنما ہیں، وہ حدیث نجوم ہے جسے اصحاب رسول ؐ میں سے ایک بڑی تعداد (کم از کم سات صحابہ کرام حضرت علی ؑ، جابر بن عبداللہ، ابوسعید خدری، انس بن مالک منکدر، [1] سلمۃ بن اکوع اور ابن عباس) نے اس حدیث کو آنحضرت ؐ سے نقل کیا ہے اور دسیوں کتب احادیث میں سُنی محدثین اور حفاظ نے اسے ذکر کیا ہے جن میں سے بعض کا تذکرہ ہم ابھی کریں گے اور قارئین کی اطلاع کے لیے باقی کتب پر بھی ایک سرسری نظر ڈالیں گے۔

۱۔ ''مستدرک'' میں حاکم نیشاپوری، ابن عباس سے بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"النجُومُ اَمَانٌ لِاَهْلِ الْاَرضِ مِنَ الغَرْقِ وَاَهْلُ بَيْتِي اَمانُ لِاُمَّتِي مِنَ الاخْتِلافِ فاذا خَالَفَتْهَا قَبيلَةٌ مِنَ العَرَبِ اِخْتَلَفُوا فَصَارُوا حِزْبَ اِبْلِيْسِ"

''اہل زمین کے لیے ستارے امان ہیں اور انہیں غرق ہونے سے بچاتے ہیں (گذشتہ زمانے میں قطب نما ایجاد نہیں ہوئے تھے تو اس وقت سمندروں میں سفر کرنے کے لیے بہترین راہنما یہی آسمان کے ستارے ہوتے تھے) اور میرے اہل بیت میری امت کو اختلاف سے بچانے کے لیے امان اور باعث نجات ہیں پس جب کوئی عرب کا قبیلہ ان کی مخالفت کرے گا تو امت میں اختلافات پیدا ہو جائیں گے اور وہ شیطان کا گروہ بن جائیں گے۔''

اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد حاکم لکھتے ہیں: ''هذا حديث صحيح الاسناد'' اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ [2] علامہ حمزاوی، مشارق الانوار میں لکھتے ہیں: اُس حدیث میں، جسے حاکم نیشاپوری نے صحیح قرار دیا ہے (۳) یوں ذکر ہوا ہے: ''النجوم امان لاهل الارض من الغرق و اهل بيتي امان لامتي من الاختلاف ...'' یعنی: ستارے اہل زمین کیلئے غرق ہونے سے امان ہیں اور میرے اہل بیت میری امت کیلئے اختلاف میں پڑنے سے امان ہیں۔'' [3]

جن افراد نے اس حدیث کو اپنی کتب میں بیان کیا ہے ان کی تفصیل کچھ یوں ہے، ابن حجر نے صواعق میں، علامہ علی متقی نے

---

[1] اسد الغابۃ میں ابن اثیر کے بقول منکدر ابن عبداللہ جو کہ محمد منکدر کے باپ تھے، صحابی رسول ؐ تھے۔

[2] حاکم نیشاپوری: مستدرک، جلد ۳ صفحہ ۱۴۹ (مطبوعہ حیدرآباد دکن، احقاق الحق ج ۹ ص ۲۹۴ کے مطابق)

[3] حمزاوی کے الفاظ یوں ہیں: صححها الحاكم على شرط الشيخين (اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جن اصول اور معیارات پر بخاری مسلم نے احادیث کو صحیح قرار دیا ہے، انہی اصول و معیار پر یہ حدیث صحیح ہے) (مشارق الانوار، صفحہ ۹۰، طبع شرقیہ مصر)

منتخب کنز العمال میں، بدخشی نے مفتاح الجناح میں، شیخ محمد صبان مالکی نے اسعاف الراغبین میں اور علامہ نبھانی نے الشرف المؤید اور جواہر البحار میں۔[۱]

یہ سب اس روایت کے متعلق ہے جسے ابن عباس نے رسول اکرم ﷺ سے نقل کیا ہے، جیسا کہ ہم نے پہلے اشارہ کیا ہے کہ اس روایت کو متعدد راویوں نے پیغمبر اکرم ﷺ سے بیان کیا ہے جن کا تذکرہ شیعہ اور سنی کی مشہور کتب حدیث میں ہوا ہے (البتہ ان روایات کے الفاظ میں تھوڑا بہت فرق موجود ہے جس سے اصلی مطلب اور مفہوم پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔)

مثال کے طور پر ''مسلمہ بن اکوع'' سے منقولہ روایت میں آیا ہے: ''قَالَ رَسولُ اللہِ النُّجومُ امانُ لِاَھْلِ السَّماءِ و اَھلِ بیتی امان لِاُمَّتِی۔'' یعنی: ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ستارے اہل آسمان کے لیے امن و سکون کا باعث ہیں اور میرے اہل بیتؑ میری امت کے لیے امن و امان کا باعث ہیں۔''[۲]

اسی بات اور مطلب کو تھوڑے سے فرق کے ساتھ جابر بن عبداللہ انصاری نے پیغمبر اکرم ﷺ سے بیان کیا ہے اسی طرح منکدر، انس اور ابو سعید خدری نے آنحضرتؐ سے نقل کیا ہے۔ اس بارے میں ایک اور حدیث جو حضرت علیؑ نے رسول خدا ﷺ سے نقل کی ہے، اُس میں یوں بیان ہوا ہے:

النجّومُ اَمان لاھْلِ السَّماءِ فَاِذَا ذَھَبَتِ النُّجومُ ذَھَبَ اَھلُ السَّماءِ وِ اِھْلُ بَیْتِی اَمانُ لِاَھْلِ الْاَرْضِ فَاِذا ذَھَبَ اَھْلُ بَیْتِی ذَھَبَ اَھْلُ الْاَرْضِ۔

''اہل آسمان کے لیے ستارے امن و امان کا باعث ہیں جب ستارے ختم ہو جائیں گے تو آسمان والے بھی رخت سفر باندھ لیں گے اور میرے اہل بیتؑ زمین والوں کے لیے امان اور حفاظت کا سبب ہیں، جب میرے اہل بیتؑ نہ رہیں گے تو اہل زمین کا بھی نام و نشان مٹ جائے گا۔''

اس حدیث کو محب الدین طبری نے ذخائر العقبی میں مناقب احمد حنبل سے نقل کیا ہے۔[۳] بہت سارے دیگر افراد نے بھی اس حدیث کو اپنی کتابوں میں درج کیا ہے، جیسے حموینی نے فرائد السمطین میں، ابن حجر نے صواعق میں، محمد صبان نے اسعاف الراغبین میں، خوارزمی نے مقتل الحسین میں اور نبھانی نے ''الشرف المؤید'' میں اسے نقل کیا ہے۔

---

[۱] مزید اطلاعات کیلئے احقاق الحق ج ۹، صفحہ ۲۹۴ تا ۲۹۶ پر دیکھیں۔

[۲] اس حدیث کو سیوطی نے جامع الصغیر (ص ۵۷۸ طبع مصر) محب الدین طبری نے ذخائر العقبی میں، ابن حجر نے صواعق میں اور دیگر افراد نے اپنی کتب میں اسے بیان کیا ہے۔

[۳] ذخائر العقبی، صفحہ ۷، طبع قدسی قاہرہ۔

حدیث نجوم کا مفہوم

حدیث یا احادیث نجوم سے مختلف نکات حاصل ہوتے ہیں:

۱۔ درحقیقت یہ حدیث قرآن مجید کی ان آیات کی طرف اشارہ ہے جو آسمانی ستاروں کے دو اہم ترین فائدے بیان کرتی ہیں:

پہلے فائدے کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے: **وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ** (نحل/۱۶) یعنی: "ان کی ستاروں کے ذریعے ہدایت کی جاتی ہے۔" اور دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے: **وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ** (انعام/۹۷) یعنی: "اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے ستارے بنائے تاکہ تم ان کے ذریعے خشکی اور سمندر میں راہنمائی اور ہدایت پاؤ۔"

حقیقت میں ستاروں کے اہم ترین فوائد میں سے ایک فائدہ یہاں ذکر ہوا ہے۔ کیونکہ قطب نما کے ایجاد ہونے سے پہلے راستوں کی راہنمائی کے لیے بالخصوص بحری سفر میں، جہاں پہاڑوں، درختوں اور دیگر نشانیوں کا وجود نہیں ہوتا، وہاں ستاروں کے سوا راہنمائی کا ذریعہ کوئی نہ تھا۔ اسی وجہ سے جب آسمان پر بادل چھائے ہوتے تھے تو کشتیاں رک جاتی تھیں اور سفر اختیار نہیں کرتی تھیں۔ اگر وہ اپنے سفر کو جاری رکھتیں تو موت کے خطرے سے دوچار ہوتیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پانچ مشہور ستاروں (عطارد، زہرہ، مریخ، مشتری اور زحل) کے علاوہ باقی تمام ستارے ایک ایسا مجموعہ ہیں جو اپنی جگہ تبدیل نہیں کرتے اور اپنی جگہ پر قائم رہتے ہیں۔ تو گویا یہ ستارے کالے رنگ کی چادر پر جڑے ہوئے موتیوں کی طرح ہیں اور اس چادر کو ایک طرف سے کھینچ کر دوسری طرف لے جایا جاتا ہے۔

اسی لیے ان ستاروں کو "ثوابت" کہا جاتا ہے، اس بات کے پیش نظر لوگ قطبی ستارے (جس کی جگہ کو جانتے تھے اور مختلف نقشوں کی مدد سے جو ان کے پاس ہوتے تھے، اپنی منزل مقصود کے راستوں کو پالیتے تھے۔ ستاروں کا دوسرا فائدہ قرآن کے بقول یہ ہے کہ بعض ستارے شیاطین کے لیے "رجوم" ہیں یعنی وہ ایسے تیروں کی مانند ہیں جو شیطانوں کی طرف پھینکے جاتے ہیں اور انہیں آسمانوں میں داخل ہونے اور وہاں سے معلومات حاصل کرنے سے روکتے ہیں۔ قرآن مجید ارشاد فرماتا ہے:

اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ٍۨ الْكَوَاكِبِ ۝۶ وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ ۝۷ لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَيُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ۝۸ دُحُوْرًا وَّلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ۝۹

(صافات،۶/۹)

"ہم نے آسمان دنیا کو ستاروں سے مزین کیا اور اُسے ہر شیطان خبیث سے محفوظ رکھا وہ ملأ اعلیٰ (کے فرشتوں کی باتیں) نہیں سن سکتے (اور جب وہ ایسا کرنے کی کوشش کریں) تو وہ ہر طرف سے تیروں کا نشانہ بنتے ہیں اور شدت کے ساتھ پیچھے دھکیل دیئے جاتے ہیں اور ان کے لیے دائمی عذاب ہے۔"

اس آیت اور اس طرح کی دیگر قرآنی آیات سے اہل آسمان کے لیے ستاروں کا امان ہونا سمجھا جا سکتا ہے۔ ستارے (یا شہاب) کس طرح سے راستے کو شیطانوں پر بند کرتے ہیں اور انہیں آسمانوں تک رسائی سے روک دیتے ہیں؟ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس

پر الگ سے گفتگو کرنے کی ضرورت ہے اور ہم نے تفسیر نمونہ میں انہی آیات کی تفسیر میں اس مطلب کی تشریح کی ہے۔ یہاں جس بات پر توجہ دینا لازمی ہے وہ ان آیات کا اجمالی مفہوم ہے اور وہ یہ کہ ملأ اعلی، عالم ملکوت اور فرشتوں کے پاکیزہ ماحول سے شیطانوں کو دور رکھنے کا سبب ستارے ہیں اور حدیث نجوم کی تشریح کے لیے اتنا کافی ہے۔

ہاں! ایک طرف سے اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آسمان کے ستاروں کی طرح لوگوں کو کفر وفساد کی تاریکیوں گمراہیوں اور گناہوں سے نجات دیتے ہیں، انہیں مقصد تک پہنچنے کا راستہ بتاتے ہیں اور راہ خدا کے راہیوں کو گمراہی وضلالت کی موجوں میں غرق ہونے سے بچاتے ہیں۔ دوسری طرف سے جب جن وانس کے شیطان اسلام ودین کے دائرے میں نفوذ پیدا کرنے اور قرآن وسنت کے احکام میں تحریف کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ انہیں شہاب ثاقب کی طرح دور بھگا دیتے ہیں ایک غیبی ہاتھ ان نامحرموں کے سینوں پر مار کر انہیں راز چرانے سے روک دیتے ہیں۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ اختلافات کی صورت میں اہل بیت کو بطور مخصوص امت کے لیے امان قرار دیا گیا ہے، ان اختلافات میں کہ اگر وہ جاری رہیں تو لوگ حزب ابلیس میں شمار ہوں (اختلفو فصاروا حِزب اِبْلِیس)

۲۔ اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اہل بیت کا راہ ہدایت، دنیا کے خاتمہ تک جاری وساری ہے جس طرح سے ستاروں کا اہل زمین کے لیے امان ہونا جاری ہے۔

۳۔ اس سے اہل بیت کا غلطی اور گناہ سے پاک اور معصوم ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر ان سے غلطی اور گناہ کے سرزد ہونے کا امکان ہوتو وہ (کلی اور مطلق طور پر) اہل زمین کے لیے گمراہی اور اختلاف کی صورت میں امان نہیں بن سکتے۔ (غور کیجیے گا)

۴۔ جیسا کہ آسمان کے ستاروں میں سے جب کوئی ایک غروب ہوتا ہے تو دوسرا ستارہ طلوع ہوتا ہے، جب ستاروں کا ایک مجموعہ ایک افق سے اوجھل ہوتا ہے تو دوسرے افق سے ایک اور مجموعہ ظاہر ہو جاتا ہے اہل بیت ÷ اور آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اسی طرح ہیں۔ حضرت علیؑ نے اس بات کو صراحت سے نہج البلاغہ میں بیان فرمایا ہے:

اَلا اِنَّ مَثَلَ آلِ محمدٍ کَمَثَلِ نُجُومِ السَّماءِ اذا ھوی نَجْمٌ طَلَعَ نَجْمٌ [1]

''آگاہ رہو کہ آل محمدؐ کی مثال آسمان کے ستاروں جیسی ہے جب ان میں سے کوئی ایک ڈوب جاتا ہے تو دوسرا ستارہ نکل آتا ہے۔''

شاید اس بات کے ذکر کی ضرورت نہ ہو کہ ان روایات میں اہل بیت کی تفسیر ازواج رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے نہیں کی جا سکتی؛ کیونکہ بات ان افراد کی ہو رہی ہے جو ہر دور اور زمانے میں امت کے لیے ذریعہ ہدایت ہیں اور انہیں گمراہی وضلالت میں غرق ہونے سے بچاتے ہیں اور تفرقہ واختلاف میں پڑنے سے محفوظ رکھتے ہیں۔ اور ہمیں معلوم ہے کہ ازواج مطہرات ایک خاص زمانے میں موجود رہی

---

[1] نہج البلاغہ، صفحہ ۱۰۰۔

ہیں۔علاوہ ازیں، امت کو اختلافات سے روکنے میں بھی ازواج رسول ﷺ کا کوئی خاص کردار نہیں تھا۔

سوال

ممکن ہے یہاں یہ کہا جائے کہ مختلف کتابوں میں تو پیغمبر اکرم ﷺ سے یہ حدیث نقل ہوئی ہے: "اصحابی بمنزلۃ النجوم فی السماء فایّما اخذتم بہ اھتدیتم۔"یعنی: "میرے اصحاب آسمان کے ستاروں کی طرح ہیں جس کسی کو پکڑو گے، اسی کے ذریعے ہدایت پاؤ گے۔" [۱] تو کیا اس حدیث میں اور اہل بیتؑ کے بارے میں مذکورہ احادیث میں تضاد نہیں پایا جاتا؟ تو اس سوال کے جواب میں چند نکات کو مدنظر رکھنا ضروری ہے:

۱۔ بالفرض حدیث "اصحابی کالنجوم" ایک معتبر حدیث ہے، اس کے باوجود بھی یہ حدیث اہل بیتؑ کے بارے میں روایات کے ساتھ قطعاً کوئی منافات نہیں رکھتی؛ کیونکہ اسلام کے حقائق کو بیان کرنے والے ایک محور اور مرکز کی موجودگی سے دوسرے مراکز کے موجود ہونے کی نفی نہیں ہوتی۔خصوصاً جب کہ حدیث "اھل بیتی کالنجوم" میں قرآن کریم کی بات بالکل ہی نہیں کی گئی؛ حالانکہ قرآن مجید مسلمانوں کے لیے ہدایت کا اہم ترین منبع اور ماٴخذ ہے۔

۲۔ اہل سنت کے کئی بزرگ علماء کے نزدیک یہ حدیث سند کے اعتبار سے جعلی اور گھڑی ہوئی ہے یا کم ازکم مشکوک ہے۔جن علماء نے اس بات کی تصریح کی ہے اُن میں اہل سنت کے چار اماموں میں امام احمد حنبل، ابن حزم، ابو ابراہیم مزنی (امام شافعی کے ساتھی) حافظ بزاز، دار قطعی، ذھبی اور علماٴ کی ایک جماعت شامل ہیں۔اگر ہم یہاں ان میں سے ہر ایک کی بات کو بیان کریں تو تفسیری اسلوب سے نکل جائیں گے؛البتہ قارئین اس بارے میں مزید معلومات کے لیے "عبقات الانوار" کے خلاصہ کا مطالعہ کرسکتے ہیں۔ [۲]

۳۔ اس حدیث کا مفہوم منطقی اصولوں کے مطابق نہیں ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب (اصحاب اپنے وسیع معنوں میں، یعنی وہ تمام افراد جنہوں نے آنحضرتؐ کا زمانہ پایا اور آپ کے ساتھ رہے) کے درمیان عظیم اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔اور انہی اختلافات کی بنیاد پر بہت زیادہ خون بہایا گیا اور خوفناک جنگیں لڑی گئیں۔کونسی منطق ہمیں کہتی ہے کہ دو مخالف اور ایک دوسرے کے خون پیاسے گروہوں میں سے ہر ایک کو ہدایت کا سرچشمہ قرار دیں اور لوگوں کو اختیار دیں کہ تمہارے لیے فرق نہیں پڑتا چاہے تم امیر المومنین علیؑ کے لشکر میں شامل ہو جاؤ یا معاویہ کے سپاہی بن جاؤ، جنگ جمل میں حضرت علیؑ کے ساتھی بنو یا طلحہ وزبیر ساتھ دینے والوں میں ہو جاؤ، ہر صورت میں ہدایت پاؤ گے اور بہشت میں مقام حاصل کرو گے۔کوئی بھی عقل ومنطق اس بات کو قبول نہیں کرتی اور اللہ کے رسول ﷺ کا مقام ومرتبہ اس سے بلند وبالا ہے کہ اس طرح کی بات ان سے منسوب کی جائے۔

---

[۱] جامع الاصول، جلد ۹، صفحہ ۴۱۰۔

[۲] خلاصہ عبقات جلد ۳، صفحہ ۱۲۴ تا ۱۶۷ (اس کتاب میں اس حدیث کے ضعف سند کو تیس (۳۰) سے زائد اہل سنت کے علماء سے ان کے حالات زندگی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے)

قرائن وشواہد اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ بنی امیہ اور دیگر حکمرانوں نے اپنے نظریات اور موقف کو ثابت کرنے، حدیث نجوم کی اہمیت کو کم کرنے اور اہل بیتؑ کے مقام کو گھٹانے کے لیے اس طرح کی حدیثوں کو گھڑا اور انہیں رسول اللہؐ سے منسوب کر دیا تاکہ وہ شامیوں اور دوسروں کو یہ سمجھائیں کہ اگر علیؑ کی حکومت حق ہے اور اور علیؑ ہدایت کا سرچشمہ ہے تو معاویہ کی حکومت بھی حق ہے اور وہ بھی ہدایت کا باعث ہے کیونکہ وہ بھی صحابی رسول ہے؛ پس کوئی فرق پڑتا کہ علیؑ کا ساتھ دو یا معاویہ کے ساتھ رہو۔

۴۔ بارہ اماموں کی حدیث

ایک اور حدیث جو امامت وولایت کے مسئلہ میں اہل بیت ÷ کی اہمیت کو عمومی طور پر اجاگر کرتی ہے اور اس بارے میں بہت سے سوالات کا جواب دینے کے قابل ہے، وہ حدیث ''ائمہ اثنا عشر'' ہے۔ یہ بڑی مشہور ومعروف حدیث ہے اور صحاح ستہ کی اکثر کتب میں منقول ہے۔ درحقیقت یہ ایک ایسا قول ہے جس پر اکثریت کا اتفاق ہے۔ ہم سب سے پہلے اس حدیث کی اسناد کا خلاصہ پیش کریں گے اور اس کے بعد مختصر طور پر اس کا مطلب بیان کریں گے۔

یہ حدیث بہت سارے صحابہ سے نقل کی گئی ہے اس کی سب سے زیادہ اسناد جابر بن سمرہ تک پہنچتی ہیں۔ اس کے بعد عبد اللہ بن مسعود، عبد اللہ بن عمر، عبد اللہ بن عمرو بن عاص، عبد الملک بن عمیر، ابی الجلد اور ابی جحیفہ تک پہنچتی ہیں (کم از کم تعداد سات ہے)۔ لیکن اس حدیث کے حفاظ اور ناقلین جنہوں نے اسے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے ان کی تعداد دسیوں میں ہے کہ جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

۱۔ صحیح مسلم میں جابر بن سمرہ سے بیان ہوا ہے وہ کہتے ہیں:

سَمِعْتُ رَسُولَ اللہِ یقولُ لَایَزَالُ الاسلامُ عزیزاً اِلَی اثْنَیْ عَشَرَ خلیفَۃً ثُمَّ قَالَ کَلِمَۃً لَمْ اَفْھَمْھا: فَقُلْتُ لِاَبِی ما قالَ؟ فَقَالَ: کُلُّھُمْ مِنْ قُرَیْشٍ۔۔۔

میں نے رسول اکرم ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اسلام ہمیشہ سربلند اور سرفراز رہے گا یہاں تک کہ بارہ خلیفہ مسلمانوں پر حکومت کریں گے۔'' پھر آپؐ نے کچھ فرمایا جو میں نہیں سمجھا سکا۔ پھر میں نے اپنے باپ (جو کہ وہاں موجود تھا اور مجھ سے زیادہ رسول خدا ﷺ کے قریب تھا) سے پوچھا کہ حضور ﷺ نے کیا فرمایا؟ تو اس نے جواب دیا: ''وہ سب قریش سے ہوں گے۔''[۱]

اسی کتاب میں ایک اور سند کے ساتھ جابر سے کچھ اور الفاظ نقل ہوئے ہیں اور اس میں '' لایزال ھذا الدین عزیزا '' کی بجائے ''لایزال ھذا الامر '' آیا ہے ایک اور سند میں: ''لایزال ھذا الدین عزیزاً منیعاً '' کے الفاظ بھی ذکر ہوئے ہیں۔ چوتھی عبارت میں عامہ بن سعد بن ابی وقاص سے نقل ہوا ہے کہ میں نے جابر بن سمرہ کو لکھا کہ وہ روایات جو تم نے خود رسول اکرم ﷺ سے سُنی ہیں وہ مجھے تحریر کر کے بھیجیں۔ تو انہوں نے یوں لکھا کہ میں نے پیغمبر اکرم ﷺ سے سنا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

لَایَزَالُ الدِّینُ قائماً حتیّٰ تَقُومُ السَّاعَۃُ او یَکُونُ عَلَیْکُمْ اِثْنَی عَشَرَ خَلِیفَۃً کُلُّھُمْ

---

[۱] صحیح مسلم، جلد ۳، صفحہ ۱۴۵۳، مطبوعہ بیروت (دراحیاء التراث العربی)

مِنْ قُرَيْشٍ

''دین قیامت تک قائم رہے گا یا یہ کہ تم پر بارہ خلیفہ حکومت کریں گے اور وہ سب قریش سے ہوں گے۔''

نیز میں نے سُنا آپؐ نے فرمایا: ''عُصَيْبَةٌ مِنَ الْمُسْلِمِينَ يَفْتَتِحُونَ بَيْتَ الْأَبْيَضِ بَيْتَ كِسْرَى أَوْ آلِ كِسْرَى۔'' یعنی: ''مسلمانوں کا ایک چھوٹا گروہ کسریٰ یا کسریٰ کی آل کے سفید محل کو فتح کرے گا۔'' میں نے یہ بھی آنحضرتؐ کو فرماتے ہوئے سُنا کہ: ''اِنَّ بَيْنَ يَدَيِ السَّاعَةِ كَذَّابِينَ فَاحْذَرُوهم۔'' یعنی: ''قیامت سے پہلے جھوٹے افراد ظاہر ہو جائیں گے ان سے دوری اختیار کرنا۔''[1]

ایک اور طریق سے صحیح مسلم میں ہی جابر بن سمرہ سے نقل ہوا ہے: ''لَا يَزَالُ هٰذَا الدِّينُ عزيزاً منيعاً إِلَى إِثْنَى عَشَرَ خليفةً۔'' یعنی: ''یہ دین سربلند سرفراز اور ناقابل شکست رہے گا تا اینکہ بارہ خلیفہ حکومت کریں۔'' اور اس حدیث کے آخر میں وہی جملہ ''كُلُّهُمْ مِنْ قُرَيْشٍ'' بھی ذکر ہوا ہے[2]

۲۔ یہی حدیث صحیح بخاری میں ملتے جلتے الفاظ کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ جابر کہتے ہیں میں نے رسول خدا ﷺ کو فرماتے ہوئے سُنا:

يَكُونُ اِثْنَى عَشَرَ اَمِيراً فَقَالَ كَلِمَةً لَمْ اَسْمَعْهَا فَقَالَ اَبِى اِنَّهُ قَالَ كُلُّهُمْ مِنْ قُرَيْشٍ[3]

میرے بعد بارہ حکمران ہوں گے، اسکے بعد والی بات مجھے سُنائی نہ دی، میرے باپ نے بتایا کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: وہ سب قریش سے ہوں گے۔

۳۔ یہی مطلب صحیح ترمذی میں بھی تھوڑے سے فرق کے ساتھ بیان ہوا ہے جناب ترمذی حدیث کو نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں: ''هٰذا حديثٌ حَسَنٌ صحيحٌ۔'' یعنی: یہ حدیث حسن اور صحیح ہے۔[4]

۴۔ صحیح ابی داؤد میں بھی کچھ فرق کے ساتھ یہ حدیث آئی ہے اور حدیث کا لہجہ یہ بتاتا ہے کہ اس حدیث کو آنحضرتؐ نے لوگوں کے مجمع میں بیان فرمایا ہے کیونکہ اس میں مذکورہ ہے کہ جب پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا کہ دین بارہ خلفاء تک ہمیشہ طاقتور اور سربلند رہے گا، تو لوگوں نے با آواز بلند تکبیر کہی۔[5]

۵۔ نیز مسند احمد حنبل میں کئی مقامات پر یہ حدیث بیان ہوئی ہے بعض محققین نے اس کتاب میں جابر تک طرق کی تعداد چونتیس

---

[1] صحیح مسلم، جلد ۳، صفحہ ۱۴۵۳

[2] صحیح مسلم، جلد ۳، صفحہ ۱۴۵۳

[3] صحیح بخاری، جلد ۳ حصہ نہم، صفحہ ۱۰۱ (باب اخراج الخصوم واھل ریب سے پہلے والے باب میں مذکورہ ہے) مطبوعہ درالجیل بیروت

[4] صحیح ترمذی جلد ۴، صفحہ ۵۰۱، باب ماجاء فی الخلفاء حدیث ۲۲۲۳، مطبوعہ دراحیا التراث العربی بیروت

[5] صحیح ابی داؤد، جلد ۴ مطبوعہ بیروت دراحیاء السنة النبویہ (کتاب المهدی)

ذکر کی ہے۔[1]

ان میں سے ایک مقام پر ہم دیکھتے کہ مسروق بیان کرتے ہیں کہ: ہم عبداللہ بن مسعود کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور وہ ہمارے لیے قرآن پڑھ رہے تھے کسی نے ان سے یہ سوال کیا کہ کیا آپ نے کبھی رسول خدا ﷺ سے پوچھا کہ اس امت پر کتنے خلفاء حکمرانی کریں گے؟ عبداللہ بن مسعود نے کہا: جب سے میں عراق آیا ہوں، تم سے پہلے کسی نے مجھ سے یہ سوال نہیں کیا! اس کے بعد انہوں نے کہا: ہاں ہم نے رسول اللہ ﷺ سے یہ سوال پوچھا تھا آپؐ نے فرمایا: ''اثنی عَشَرَ کَعِدَّةِ نُقَبا ءِ بنی اِسْرَائیلَ۔ ''یعنی: ''بنی اسرائیل کے نقیبوں کی تعداد کے برابر بارہ افراد۔''[2]

جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے یہ سب اہل سنت کی معتبر ترین اور مشہور کتب سے تھا جن میں یہ حدیث مختلف طرق سے نقل کی گئی۔ ان کے علاوہ بھی متعدد کتابوں میں یہ حدیث نقل ہوئی ہے۔ کلام کے طولانی ہونے کے خوف سے ان کتب کے ناموں کی طرف فقط اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کی مزید تفصیل کے لیے قارئین ''احقاق الحق'' فضائل الخمسہ، منتخب الاثر اور اس طرح کی دیگر کتب کا مطالعہ کریں۔

بارہ اماموں والی حدیث کا مفہوم

ان روایات میں مذکورہ الفاظ اور عبارتیں مختلف ہیں۔ بعض روایات میں ''اثنی عشر خلیفة '' بارہ جانشین کے الفاظ میں بعض میں ''اثنی عشر امیراً'' کا جملہ ہے اور کچھ روایات میں بارہ مردوں کی حکومت کی بات ہے (ما وُلاھُم اثنی عشر رجلا) لیکن زیادہ تر میں ''خلیفہ'' کا لفظ آیا ہے اور کچھ میں تو صرف عدد کا ذکر ہے جیسے ''اثنی عشر کَعِدَّةِ نُقَباءِ بَنِي اِسْرَائیلَ ''یعنی بارہ بنی اسرائیل کے قبائل کے سرداروں کی طرح اور چند روایات میں ''بارہ نگران'' کی بات ہوئی ہے۔ لیکن واضح ہے کہ یہ سب ایک ہی نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور وہ ہے۔ خلافت اور حکومت کا مسئلہ لہٰذا ان سب کا نتیجہ ایک ہے۔ دوسرے لحاظ سے دیکھیں تو بعض میں ''لا یزا لُ ھذا الدِّین عزیزاً منیعاً'' (ہمیشہ یہ دین شکست ناپذیر رہے گا) کے الفاظ ہیں۔ دوسری چند روایات میں ''لایزال اَمْرُ اُمّتی صالحاً ''یعنی: ''ہمیشہ میری امت کا معاملہ درست رہے گا، کے الفاظ درج ہیں۔''

بعض میں یہ جملہ ذکر ہوا ہے کہ ''لا یزال امر ھذہ الامة ظاھراً'' ہمیشہ اس امت کا معاملہ غالب اور کامیاب رہے گا۔ بعض میں ہے کہ ''ماضیاً'' یعنی جاری رہے گا، بعض میں آیا ہے: ''لایَضُرُّھُمْ خَذَلَھُمْ ''کوئی انہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا اور انہیں ذلیل وخوار نہیں کرسکتا۔ اور اس طرح کے دیگر جملات، یہ سب بھی ایک ہی حقیقت کو بیان کر رہے ہیں اور وہ امت کی اصلاح و درستگی، کامیابی، طاقت وقدرت اور ان کی نجات ہے۔ ایک اور اعتبار سے ملاحظہ کریں تو مختلف طرق سے نقل ہونے والی ان روایات میں: ''کُلُّھم مِنْ

---

[1] منتخب الاثر، صفحہ ۱۲، اور احقاق الحق، جلد ۱۳ کو دیکھیئے۔

[2] مسند احمد، جلد ا، صفحہ ۳۹۸، مطبوعہ درالصادق، بیروت

قُرَيْشٍ ‘‘یعنی: ’’یہ سب قریش سے ہوں گے۔‘‘ کے الفاظ مذکورہ ہیں،صرف چند روایات میں جیسا کہ قندوزی حنفی نے ایک روایت ینابیع المودۃ میں ذکر کی ہے۔ جابر بن سمرہ کی روایت کو المودۃ القربی سے نقل کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا: ’’كُلُّهُم مِنْ بَنِي هَاشِم ‘‘یعنی: ’’یہ سب بنی ہاشم سے ہوں گے۔‘‘[1]

ان احادیث میں اکثر میں یہ بات آئی ہے کہ رسول خدا ﷺ نے آخری جملے کو آہستہ بیان کیا۔ گویا مخفی طور پر اس جملے کو ادا کیا اور اس سے اچھی طرح سمجھ میں آتا ہے کہ اس وقت کچھ ایسے افراد موجود تھے جو رسول خدا ﷺ کے قریش یا بنی ہاشم سے بارہ خلیفے ہونے کے مخالف تھے،لہٰذا آپؐ نے اسے انتہائی آہستہ سے ذکر فرمایا۔

یہ حدیث جو کہ مشہور ماخذ اور پہلے درجے کی کتب میں منقول ہے اور تمام علمائے اسلام اس کے معترف ہیں،اس کی تفسیر مکتب اہل بیتؑ کے پیروکاروں کے لیے واضح ہے اور وہ اس کا مطلب بارہ معصوم امام ہی لیتے ہیں۔لیکن دیگر مذاہب کے پیروکاروں کے لیے اس حدیث کی تفسیر ایک انتہائی پیچیدہ دشوار اور مشکل مسئلہ بنا ہوا ہے۔ یہ بات پورے یقین اور اطمینان سے کہی جاسکتی ہے کہ ان میں سے کسی نے بھی اس حدیث کی واضح اور قابل فہم تفسیر بیان نہیں کی ہے۔اس کی وجہ بھی معلوم ہے؛ کیونکہ پہلے خلفاء چار افراد تھے۔ بنی امیہ کے حکمرانوں کی تعداد چودہ تھی[2] اور بنی عباس کے حکام کی تعداد سینتیس (۳۷) تک پہنچتی ہے اور ان خلفاءٔ میں سے کوئی سلسلہ بھی بارہ اماموں پر منطبق نہیں ہوتا۔

اگر ان خلفاٗ کو ایک دوسرے کے ساتھ جمع تفریق کیا جائے تب بھی مشکل حل نہیں ہوتی؛ مگر یہ کہ ہم بیٹھ کر اپنی مرضی سے بعض حکمرانوں کو خلفائے رسول کی حیثیت سے قبول کر لیں اور بعض کو حذف کر دیں اور یوں کھینچ تان کر بارہ کا عدد پورا کریں جواز خود کسی اصول اور منطق کے تحت بھی درست نہیں ہے۔بہتر ہے کہ یہاں پر گفتگو کی باگ ڈور حافظ سلیمان بن ابراہیم قندوزی حنفی کے سپرد کریں، وہ اپنی مشہور کتاب ’’ینابیع المودۃ‘‘ میں بیان کرتے ہیں:

بعض محققین نے کہا ہے کہ وہ احادیث جو دلالت کرتی ہیں کہ پیغمبر اکرم ﷺ کے بعد بارہ خلفاء ہوں گے، وہ متعدد اور مشہور طرق سے نقل ہوئی ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ یہ بات سمجھ میں آئے گی کہ اس حدیث سے آنحضرتؐ کا مقصود ان کی اہل بیتؑ اور عترت سے بارہ اماموں کا ہونا ہے۔ کیونکہ اس حدیث کو آپؐ کے بعد پہلے خلفاء پر منطبق نہیں جاسکتا کیونکہ ان کی تعداد بارہ سے کم ہے اور اسے بنی امیہ کے حکمرانوں سے بھی تطبیق نہیں دی جاسکتی کیونکہ ایک طرف تو ان کی تعداد بارہ سے زیادہ ہے اور دوسری طرف وہ سب واضح طور پر ظلم وستم کے مرتکب ہوئے ہیں،سوائے عمر بن عبدالعزیز کے،اور تیسری بات یہ بھی ہے کہ وہ بنی ہاشم نہیں تھے (جب کہ بعض احادیث کے طرق

---

[1] ینابیع المودۃ،صفحہ ۴۴۵،باب ۷۷

[2] اور وہ یہ تھے۔ معاویہ اوال ۔۲۔ یزید اول۔۳۔معاویہ دوم۔۴۔مروان اول۔۵۔عبدالملک۔۶۔ولید اول۔۷۔سلیمان بن عبدالملک۔۸۔عمر بن عبدالعزیز۔۹۔ یزید دو۔۱۰۔ہشام بن عبدالملک۔۱۱۔ولید دوم۔۱۲۔یزید سوم۔۱۳۔ابراہیم بن ولید۔۱۴۔مروان دو۔اور اندلسکے امویوں کی تعداد تو اس سے بھی زیادہ ہے (دائرۃ المعارف)

میں آیا ہے کہ وہ سب کے سب بنی ہاشم سے ہوں گے) یہ روایت رسول اللہ ﷺ کے اس جملے کو آہستہ کہنے سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے کیونکہ ایک گروہ بنی ہاشم کی خلافت کو نہیں چاہتا تھا۔

اس طرح اس حدیث کی تفسیر بنی عباس کے بادشاہوں سے بھی نہیں کی جاسکتی کیونکہ ان کی تعداد بارہ افراد سے زیادہ ہے، علاوہ ازیں انہوں نے : " قُل لاَاَسْئَلکُمْ علیه اَجْراً اِلاَّ المَوَدَّةَ فِی القُرْبیٰ " کی آیت اور اسی طرح حدیث کساء کا لحاظ نہ رکھا۔ بنابرایں، اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہا سوائے اس کے کہ ہم اس حدیث کو رسول خدا ﷺ کی اہل بیت اور عترت کے بارہ اماموں پر منطبق سمجھیں، کیونکہ وہ اپنے زمانے کے افراد سے زیادہ عالم ان سے بڑھ کر عظیم اور تقویٰ کے اعتبار سے ان سب سے برتر تھے اور ان کا حسب ونسب بھی سب سے بلند واعلیٰ تھا۔[1]

ڈاکٹر محمد تیجانی سماوی جو کہ پہلے اہل سنت تھے اور پھر شیعیت کو قبول کیا انہوں نے اپنے شیعہ ہونے کی وجوہات پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام "لاَ کُونُ مَعَ الصادقین " رکھا ہے۔ تیجانی نے اس بارے میں چند مختصر مگر جامع جملے ادا کیے ہیں وہ لکھتے ہیں: "ان احادیث (بارہ اماموں والی احادیث) کی کسی صورت میں بھی تصحیح اور تفسیر نہیں کی جاسکتی مگر یہ کہ اس کی ہم وہی تفسیر کریں یعنی اہل بیتؑ کے بارے میں بارہ امام، جن پر شیعہ امامیہ کا عقیدہ ہے، اہل سنت کے اکابرین اور قائدین کو اس معمہ کو حل کرنا چاہیے، اس کی وجہ یہ ہے کہ بارہ اماموں کا عدد جسے انہوں نے صحاح ستہ کی کتب میں خود لکھا ہے، آج تک سوالیہ نشان اور معمہ بنا ہوا ہے اور اس کا ابھی تک وہ کوئی جواب تلاش نہیں کر پائے۔"[2]

تعجب کی بات تو یہ ہے کہ بعض افراد نے اس حدیث کی تفسیر وتشریح بیان کرنے کی کوشش کی ہے جب کہ وہ اہل بیتؑ کے پیروکاروں کے نظریے کو بھی قبول نہیں کرنا چاہتے تھے تو ایسی صورت میں وہ حیران کن تکلفات کا شکار ہوگئے۔ ایک طرف تو وہ یزید اور اس طرح کے دیگر افراد کو ان بارہ افراد میں شامل کرتے ہیں جن کے ذریعے اسلام کو عزت ملی اور وہ سربلند اور کامیاب ہوا اور دوسری طرف خلفاء کی ایک تعداد کو اپنی مرضی سے حذف کردیتے ہیں۔

ہماری رائے کے مطابق کم از کم اگر وہ سکوت اختیار کرتے تو یہ ان غلط تأویلات سے زیادہ آبرومندانہ طریقہ تھا۔ اور ان سب سے زیادہ عجیب وہ تفسیر تھی جو ہم نے حج کے سفر میں بیت اللہ الحرام میں مکے کے ایک عالم سے مسجد الحرام میں سُنی، اس کا کہنا تھا کہ بارہ اماموں میں سے وہی پہلے چار خلفاء ہیں اور باقی آٹھ افراد آئندہ زمانے میں ظاہر ہوں گے۔ حالانکہ جو بھی اس حدیث کو پڑھے تو وہ یہی سمجھتا ہے کہ اس مراد یکے بعد دیگرے بارہ جانشین ہے، اور "لایزال هذا الدین منیعاً عزیزاً" یا "لایزال هذا الدّینُ قائماً حتی تقوم السَّاعَةُ" کے الفاظ اور جملات بہت ہی واضح طور پر یہ سمجھا رہے ہیں کہ حضرت رسول خدا ﷺ کے بارہ خلفاء کا سلسلہ دنیا کے خاتمہ تک جاری رہے گا۔

---

[1] ینابیع المودة، صفحہ ۴۴۵، باب ۷۷

[2] لاکون مع الصادقین، صفحہ ۱۴۶۔

اس گفتگو کا اختتام حلیۃ الاولیاء میں حافظ ابونعیم اصفہانی کی نقل شدہ ایک حدیث پر کرتے ہیں وہ اپنی سند سے ابن عباس سے بیان کرتے ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "مَنْ سَرَّهُ اَنْ یحیی حَیاتی و یموتَ مماتی و یَسْکُنَ جَنّةُ عَدنٍ غَرَسَهَا رَبّی فَلْیُوالِ عَلِیًّا مِنْ بَعْدِی وَ لْیُوالِ وَلِیَّهُ وَ لْیَقْتَدِ بِالاَئِمَّةِ مِنْ بَعْدِی فَاِنَّهُمْ عِتْرَتِی۔" یعنی: "جو شخص چاہتا ہے کہ میری طرح زندگی گزارے میری طرح موت سے ہمکنار ہو اور جنت عدن میں مقام پائے جس کے درختوں کو میرے پروردگار نے اپنے دست قدرت سے کاشت کیا ہے تو اُسے چاہیے کہ میرے بعد علی -کو اپنا مولیٰ بنائے، اور اس کے دوست کو اپنا دوست بنائے اور میرے بعد اماموں کی اقتداء اور پیروی کرے بے شک وہ میری عترت ہیں۔"[1]

یہاں پر ایک اہم نکتے کو سرسری طور پر بیان کیا جاتا ہے اس کی تفصیل آنے والے مباحث پر چھوڑ دیتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ شیعہ اور سنی ذرائع سے منقولہ متعدد روایات میں بارہ آئمہ کے نام آئے ہیں (جس طرح مکتب اہل بیت ÷ کے پیروکاروں کا عقیدہ ہے) ان میں بعض روایات میں ان میں سے سب سے پہلے حضرت علی اور سب سے آخری حضرت مہدی = کے نام ذکر کرنے پر اکتفاء کیا گیا ہے۔ بعض میں ان میں سے صرف تیسرے امام یعنی حضرت حسین -کا نام ذکر ہوا ہے اس طرح سے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیان ہوا ہے انہوں نے امام حسین -کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: "هذا اِبْنِی اِمامٌ ابنُ امامٍ اَخُو امامٍ اَبُو ائمّة تِسْعَةٍ"۔ یعنی: "یہ میرا بیٹا امام ہے، امام کا فرزند ہے، امام کا بھائی ہے اور نو اماموں کا باپ ہے۔"[2] یوں یہاں تمام آئمہ کی طرف اشارہ کر دیا گیا۔

زمین حجت خدا سے خالی نہیں ہوتی

اسلامی روایات میں جن مسائل پر بہت زیادہ توجہ دی گئی ہے ان میں سے اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ زمین الٰہی نمائندے سے خالی نہیں ہوتی۔ اہل بیت ÷ کے ذریعے سے ہم تک پہنچنے والی بہت ساری روایات میں یہ مطلب مکرر بیان ہوا ہے۔ کہ روئے زمین امام (یا پیغمبر) یا کلی طور پر حجت الٰہی سے خالی نہیں ہوتی۔

کافی شریف میں اس بارے میں دو باب باندھے گئے ہیں۔ ایک باب کا عنوان: "اِنَّ الْاَرْضَ لا تَخْلُو مِن حُجَّةٍ" ہے۔ اس میں تیرہ روایات مذکور ہیں جو امام باقر -، امام صادق -، امام علی بن الرضا -اور دیگر اماموں سے منقول ہیں۔ دوسرے باب کا عنوان: "اِنَّه لو لم یَبْقَ فِی الاَرْضِ رَجُلانِ لَکانَ اَحَدُهما الحُجّة" یعنی: "اگر روئے زمین پر صرف دو آدمی بچ جائیں تو ان میں ایک حجت الٰہی ہوگا۔" اس باب میں اس مضمون کی پانچ روایتیں مذکورہ ہیں۔[3] یہاں پر ان دو ابواب میں سے بعض حدیثوں کو ذکر کیا جاتا ہے۔

---

[1] حلیۃ الاولیاء جلد ا صفحہ ۸۶ (فضائل الخمسہ کا الصحاح الستہ سے نقل کے مطابق جلد ۲ ص ۳۴)

[2] علامہ مرحوم کشف المراد (شرح تجرید العقائد) میں کہتے ہیں: یہ حدیث تواتر کے ساتھ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوئی ہے (کشف المراد صفحہ ۳۱۴ مکتبہ المصطفوی، قم)

[3] اصو کافی، جلد اول، صفحہ ۱۷۸، ۱۷۹

ایک روایت کے مطابق حضرت امام صادق - نے فرمایا: "اِنَّ الاَرْضَ لَا تَخْلُو اِلَّا وَ فِيهَا اِمامٌ كَيْمَا اِنْ زَادَ الْمُؤْمِنُونَ شئیا رَدَّهُمْ وَاِنْ نَقَصُو شَئْياً اَتَمَّهُ لهم ۔" یعنی: "زمین کبھی بھی امام کے وجود سے خالی نہیں ہوتی امام کا وجود اس لیے ضروری ہوتا ہے کہ اگر مومنین (غیر دانستہ طور پر تعلیمات الٰہی میں) اضافہ کریں تو وہ انہیں پلٹا دیں اور اگر وہ کسی چیز کو کم کریں تو وہ اُسے مکمل کر دے۔ [۱]

ایک اور حدیث میں امام صادق - نے فرمایا: "اِنَّ اللهَ اَجَلُّ وَاَعْظَمُ مِنْ اَنْ يَتْرُكَ الاَرْضَ بَغَيْرِ امامٍ عادلٍ۔" یعنی: "اللہ تعالیٰ اس سے بزرگ اور برتر ہے کہ وہ زمین کو عادل امام کے بغیر چھوڑ دے۔" [۲]

حتیٰ کہ بعض احادیث میں تو یہاں تک آیا ہے کہ اگر امام اور حجت ایک لمحے کے لیے بھی زمین پر نہ ہوں تو زمین تباہ و برباد ہو جائے اور اپنے اہل کو غرق کر دے۔ [۳]

ایک اور حدیث میں امام صادق - سے منقول ہے: "لَو كَانَ النَّاسُ رَجُلَيْنِ لَكَانَ اَحَدُهُما الاِمَامُ ۔" یعنی: "اگر دنیا میں دو انسان باقی رہ جائیں تو ان میں ضرور ایک امام ہو گا۔" اسی حدیث کے آخر میں آیا ہے: " وَ اِنَّ آخِرُ مَنْ يَمُوتُ الامامُ ۔" یعنی: "اس دنیا میں سب سے آخر میں جانے والا شخص امام ہوگا۔" [۴]

مذکورہ بالا اٹھارہ احادیث کے علاوہ نہج البلاغہ میں بھی واضح طور پر اس مطلب کو بیان کیا گیا ہے، حضرت علیؑ نے کمیل بن زیاد سے جو اہم ترین باتیں فرمائی ہیں ان میں انہوں نے ارشاد فرمایا: "اللھم بلیٰ لا تَخْلُو الاَرْضُ مِنْ قائِمٍ لِلّٰهِ بِحُجَّةٍ اِمَّا ظاهِراً مشهوراً وَ اِمّا خائِفاً مغموراً لِئَلاَّ تَبْطُلُ حُجَجُ اللهِ وَ بَيِّنَاتُهُ۔" یعنی: "ہاں! زمین کبھی بھی ایسی ہستی سے خالی نہیں ہوتی جو حجت الٰہیہ کے ساتھ قیام کرے خواہ وہ ظاہر ہو یا آشکار خوفزدہ یا ہراساں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے دلائل اور واضح نشانیاں مٹ اور ختم نہ ہو جائیں۔" [۵]

اس بارے میں علامہ مجلسی مرحوم نے بھی بحار الانوار کی جلد نمبر ۲۳ میں باب "**الاضطرار الی الحجة** (باب: حجت الٰہی کی ضرورت) میں ۱۱۸، احادیث دوسری کتابوں سے نقل کی ہیں کہ جن احادیث کا ایک حصہ تو وہی اصول کافی والی حدیث پر مشتمل ہے اور دیگر کتابوں سے مزید حصہ بھی نقل ہوا ہے۔ [۶]

---

[۱] اصول کافی، جلد اول، باب اول سے حدیث ۲ اور ۶۔

[۲] اصول کافی، جلد اول، باب اول سے حدیث ۲ اور ۶۔

[۳] اصول کافی، جلد اول، حدیث ۱۱، ۱۲۔ ۱۳۔

[۴] اصول کافی، جلد اول، حدیث، ۳ (باب انه لولم یبق الا رجلین احدهما الامام)

[۵] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۴۷

[۶] بحار الانوار، جلد ۲۳، صفحہ ۱۔۵۶

اس لحاظ سے روئے زمین پر ہر دور اور زمانے میں حجت الٰہی کا موجود ہونا مکتب اہل بیت کے مسلمہ اصولوں میں سے ایک اصول ہے۔ حضرت امام موسیٰ کاظم - سے منقولہ ایک حدیث میں یہاں تک بیان ہوا ہے کہ: "اِنَّ اللهَ لا یُخلِی اَرْضَهُ مِنْ حُجَّةٍ طَرْفَةَ عَيْنٍ اِمّا ظاهِرٌ وَاِمّا باطِنٌ۔" یعنی: "ایک پلک جھپکنے کی حد تک بھی زمین حجت خدا سے خالی نہیں ہوتی وہ حجت ظاہر ہو یا پنہاں۔"[1]

حجت الٰہی کے لازم ہونے پر قرآنی اور منطقی دلائل

مذکورہ بالا روایات میں جو ذکر ہوا ہے وہ عقلی دلائل سے بھی قابل اثبات ہے کیونکہ "برہان لطف" جس کا ذکر بحث کی ابتداء میں امام یا پیغمبر الٰہی کے ہر دور اور زمانے میں موجود ہونے کی ضرورت کے موضوع میں کیا گیا تھا اور اسی طرح وہ خرابیاں جو اس کے نہ ہونے کی صورت میں پیدا ہوں گی یہاں تک کہ اگر کرہ ارض پر صرف دو افراد موجود ہوں، ان کا بھی تذکرہ ہوا تھا، ان تمام صورتوں میں برہان لطف کار فرما ہے۔

قاعدہ لطف یہ کہتا ہے کہ جس نے انسان کو سعادت، ارتقاء اور کمال تک پہنچنے کے لیے خلق فرمایا ہے اور اس کے کاندھوں پر احکامات کا بوجھ ڈالا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ انسان کی ہدایت اور تربیت کے لیے تمام وسائل اور سہولتیں فراہم کرے اور اس ہدف کے حصول کے لیے بقدر ضرورت اس کے لیے وسائل و ذرائع مہیا کرے کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو نقض غرض لازم آتی ہے اور اللہ تعالیٰ جو کہ حکیم ہے وہ کبھی اپنے مقصد کے خلاف کوئی کام نہیں کرتا اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان میں صرف عقل جیسی قوت کا ہونا یا عام رہبروں کا موجود ہونا، اُسے غلطیوں، خطاؤں اور گناہوں سے پاک نہیں رکھ سکتا۔ دوسرے الفاظ میں صرف انسان کا علم اُسے اس کی منزل مقصود یعنی اطاعت خدا اور ابدی سعادت تک نہیں پہنچا سکتا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اُسے کسی ایسے شخص کی بھی ضرورت ہے جو علم الٰہی کے بیکراں چشمے سے متصل ہو اور غلطی، اشتباہ اور گناہوں سے معصوم ہوتا کہ وہ احسن طور پر اتمام حجت کر سکے اور بغیر کسی کمی وبیشی کے راستے کی درست راہنمائی کر سکے۔

یہ دلیل ہر دور ہر زمانے اور ہر چھوٹے بڑے معاشرے یہاں تک کہ دو افراد پر مشتمل معاشرے پر صادق آتی ہے، بنابراین اگر روئے زمین پر دو افراد کے علاوہ کوئی نہ ہو تو ان میں ایک کو پیغمبر خدا یا امام معصوم ہونا چاہیے۔ بہرصورت جیسا کہ ہم نے گزشتہ احادیث میں پڑھا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے بلند وبرتر ہے کہ وہ انسانوں پر سعادت کی منزل مقصود تک پہنچنے کا فریضہ عائد کرے اور پھر درست اور غلطی سے مبرا راستہ کی انہیں نہ دکھائے۔ قرآن مجید کی بعض آیات میں اس مطلب کی طرف اشارے موجود ہیں جیسا کہ سورہ رعد کی آیت ۷ میں ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۝

آپ تو بس ڈرانے والے ہی ہیں اور ہر قوم کیلئے ایک ہادی ہے۔

یہ آیت بتا رہی ہے کہ ہر قوم اور ہر زمانے کے لیے ہادی ہے (ہادی اپنے حقیقی معنی میں یعنی اس کی ہدایت کامل اور ہر قسم کی غلطی سے پاک)

---

[1] بحار الانوار جلد ۷۴، صفحہ ۱۴۱۔

لہٰذا امام باقر -کی ایک حدیث ہم دیکھتے کہ آپ نے اس ہدایت کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا: ”وَفِي كُلِّ زَمانٍ إمامٌ مِنَّا يَهْدِيهِم إِلَى ماجاءَ بِهِ رَسولُ الله۔“ یعنی: ”ہر دور میں ہم میں سے ایک امام ہوتا ہے جو لوگوں کو اس چیز کی طرف ہدایت کرتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لے کر آئے تھے۔“[1]

نہج البلاغہ کی عبارت میں جو جملے تھے وہ اپنے اندر ایک منطقی دلیل کو لیے ہوئے ہیں اور وہ یہ ہے کہ امام کے فرائض میں سے ایک تعلیمات الٰہی اور احادیث نبوی کی ہر قسم کی تحریف سے حفاظت کرنا ہے یا الفاظ دیگر یوں کہا جائے کہ اگر روئے زمین پر تمام لوگ کافر ہو جائیں تو پھر بھی کوئی تو موجود ہو جو نبوت کی تعلیمات اور ہدایات کی حفاظت کرے اور آئندہ آنے والی اور ہدایت چاہنے والی نسلوں تک ان ہدایات اور تعلیمات کو منتقل کرے بصورت دیگر اللہ تعالیٰ کی حجتیں محو ہو جائیں اور نشانیاں اور روشن دلیلیں مٹ جائیں: (لِئَلاَّ تَبْطُلَ حُجَجُ اللهِ وَبَيِّناتُهُ)

یہاں پر ولایت عامہ کی بحث اختتام کو پہنچی ہے، اب ہم اس کی شرائط اور خصوصیات کو بیان کریں گے۔

[1] بحار الانوار، جلد ۳۲ صفحہ ۵، حدیث ۹۔

امام کی شرائط اور خاص صفات

اشارہ

اس بات کے پیش نظر کہ امام اور خلیفہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کاندھوں پر بھاری ذمہ داریوں کا بوجھ ڈالا گیا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے لیے شرائط بھی کڑی اور سخت ہونی چاہیں۔ امام کے لیے بھی وہی شرائط، صفات اور خصوصیات ہیں جو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ہیں کیونکہ دونوں کا راستہ اور ہدف و مقصد ایک ہے اور ایک ہی طرح کی ذمہ داری ان پر عائد ہے، رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہلے مرحلے میں اور امام ان کے پیچھے بعد والے مرحلوں میں ہیں۔ جیسا کہ نبوت کے باب میں بیان ہو چکا ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر عظیم اور اہم فریضہ اور ذمہ داری کے عائد ہونے کے ناطے ان کے پاس بہت زیادہ وسیع علم و حکمت ہونا چاہیے تاکہ وہ انسانوں کو گمراہی کے خطرات سے بچا سکے اور نظریاتی، اخلاقی، معاشرتی اور فقہی مسائل میں ان کی راہنمائی کر سکے اور انہیں کمال و سعادت کی طرف ہدایت کر سکے اور احکام الٰہی کو کس قسم کی کمی بیشی کے بغیر بیان کر سکے۔

اس کے علاوہ اس کے پاس انسان کی روح اور جسم کے متعلق، اس کے نفسیاتی، معاشرتی اور انسانی معاشرے کے تاریخی مسائل کے بارے میں پوری معلومات ہونی چاہیں غرض یہ کہ انسان کی تربیت میں جو بھی انسانی شناخت اس کی مددومعاون ہو اس کے بارے میں اُسے علم ہونا چاہیے۔ علم انبیاء کے موضوع میں وضاحت کی جا چکی ہے کہ انہیں آئندہ کے واقعات و حالات کے متعلق بھی کم و بیش آگاہ ہونا چاہیے تاکہ مستقبل کے لیے صحیح اور دقیق منصوبہ بندی کر سکیں کیونکہ ان کی رسالت عمومی ہے۔ (اس بارے میں مزید وضاحت کے لیے پیام قرآن کی ساتویں جلد میں انبیاء کے علمی مقام صفحہ ۲۰۱ تا ۲۶۶ کا مطالعہ کریں)

یہ تمام باتیں تھوڑے سے فرق کے ساتھ سچے اماموں اور انبیاء کے جانشینوں پر صادق آتی ہیں کیونکہ وہ انبیاء کے مقاصد کو آگے بڑھانے والے اور انہی کے راستے کو جاری رکھنے والے ہیں۔ انبیاء نے جو بنیادیں رکھی ہیں آئمہ انہی کی تکمیل اور حفاظت کرنے والے ہیں انہوں نے اپنے بابرکت اور توانا ہاتھوں سے جن پودوں کو لگایا ہے ان کی آبیاری آئمہ کے طاقتور ہاتھوں سے ہوگی۔ ایک اور لحاظ سے یہ بھی ضروری ہے کہ آئمہ حق، انبیاء الٰہی کی طرح اپنی معلومات کو ہر قسم کی غلطی، بھوک چوک اور انحراف سے پاک و پاکیزہ لوگوں تک پہنچائیں اگر وہ غلطیوں اور خطاؤں سے معصوم نہ ہوں تو ان کے موجود ہونے کے مقاصد اور اہداف پورے نہیں ہو سکیں گے۔

یہ بات بھی اہم ہے کہ چونکہ انبیاء دین اور دنیا میں انسانوں کے رہبر و راہنما ہوتے ہیں اس لیے ان تمام ظاہری اور باطنی عادات و اخلاق اور صفات سے انہیں پاک اور منزہ ہونا چاہیے جو لوگوں میں نفرت اور دوری کا موجب بنیں۔ تاکہ ان کی بعثت کے اہداف کی تکمیل ہو سکے اور نقض غرض پیش نہ آئے۔ بالکل یہی بات آئمہ حق کے متعلق بھی ثابت ہے وہ نہ صرف قابل نفرت اسباب اور صفات سے مبرا ہوں بلکہ ان کے اندر لوگوں کے قلوب اور افکار کو جذب کرنے کے لیے اخلاقی کشش اور جاذبیت کافی زیادہ ہونی چاہیے، اب سب سے پہلے علم امام کے بارے میں بیان کیا جائے گا۔

امام کا علم

قرآن مجید کی متعدد آیات میں اس مسئلے کو بیان کیا گیا ہے۔ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

وَإِذَا جَآءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِۦ ۖ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰٓ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنۢبِطُونَهُۥ مِنْهُمْ ۗ وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُۥ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطَٰنَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿۸۳﴾ (نساء/ ۸۳)

''اور جب ان کے پاس امن یا خوف کی خبر پہنچتی ہے تو وہ (بغیر تحقیق) اُسے خوب پھیلاتے ہیں اور اگر وہ اس خبر کو رسول اور اپنے میں سے صاحبان امر تک پہنچا دیتے تو ان میں اہل تحقیق اس خبر کی حقیقت کو جان لیتے اور اگر تم پر اللہ کا فضل نہ ہوتا اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو چند ایک افراد کے سوا باقی تم سب شیطان کے پیروکار بن جاتے۔''

ایک اور آیت میں ارشاد رب العزت ہے:''فَسْـَٔلُوٓا أَهْلَ الذِّكْرِ إِن كُنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿۷﴾'' یعنی:''اگر تم نہیں جانتے ہو تو اہل علم و دانش سے پوچھ لو۔''(انبیاء/ ۷، نحل/ ۴۳) پہلی آیت یہ بتا رہی ہے کہ مسلمانوں کے درمیان کچھ ایسے نادان موجود ہیں جو ایسی جھوٹی خبریں پھیلانے میں لگے ہوئے ہیں جو اسلام دشمنوں اور منافقین کی طرف سے گھڑی گئی ہوتی ہیں؛ کبھی کامیابی کی جھوٹی خبر، کبھی شکست کی جھوٹی خبر اور کبھی دوسری من گھڑت خبریں۔ اور یہ چیز غفلت، جہالت اور بے خبری کا باعث بنتی ہے۔ نیز مسلمانوں کی ہمت و حوصلہ کو کمزور کرنے کا سبب بنتی ہے۔قرآن فرماتا ہے: اس قسم کے اہم سیاسی اور معاشرتی مسائل میں، جن سے مسلمان آگاہ نہیں ہیں، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا صاحبان امر کی طرف رجوع کریں۔

اولی الامر کا مطلب ہے صاحبان حکم وفرمان یقینا یہاں پر فوجی کمانڈر مراد نہیں ہے کیونکہ آیت میں بعد والا جملہ یہ کہتا ہے کہ وہ جو اہل تحقیق ہیں (یعنی مسئلہ کا اساسی طور پر اور مختلف پہلوؤں سے بغور جائزہ لیتے ہیں) وہ ان معاملات سے آگاہ اور باخبر ہیں۔لہٰذا نادان اور جاہل افراد کو ان کی طرف رجوع کرنا چاہیے (قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ'' یستنبِطونَهُ''''نَبط' سے ہے بروزن فقط ہے اس کا اصلی معنی وہ پانی ہے جو پہلی مرتبہ کنویں سے نکالا جاتا ہے اور زمین کی بنیادوں سے نکلتا ہے اس لیے مختلف دلائل وشواہد کے ذریعے حقیقت کو حاصل کر لینا استنباط کہلاتا ہے)

یہ لفظ فقط علماء پر صادق آتا ہے نہ کہ فوجی کمانڈروں اور حکمرانوں پر اس لیے مسلمانون پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی ہے کہ وہ حساس اور اہم ترین معاملات اور مسائل میں علماء اور صاحبان امر کی طرف رجوع کریں۔ یہاں پر اولی الامر سے مراد کون لوگ ہیں؟ مفسرین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔بعض نے کہا ہے کہ ان سے مراد فوجی کمانڈر ہیں (خصوصاً ان لشکروں کے کمانڈر جس لشکر میں آنحضرتؐ موجود

نہ تھے) بعض نے کہا ہے کہ علما اور فقہا مراد ہیں بعض کے بقول پہلے چار خلفاء ہیں، بعض کے مطابق اہل حل وعقد مراد ہیں اور بعض نے ان سے بارہ معصوم آئمہ مراد لیے ہیں۔

ان پانچ تفسیروں میں سے آخری زیادہ مناسب لگتی ہے، کیونکہ اس آیت کے آخر میں اولی الامر کی دو خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے جو غیر معصوم کے لیے ہرگز متصور نہیں ہوسکتیں۔ پہلے قطعی طور پر فرمایا گیا ہے کہ دوا گر وہ اولی الامر کی طرف رجوع کریں جو کہ مسائل کی تہہ تک جانتے ہیں، وہ ان کی راہنمائی کریں گے۔ اس سے یہی ثابت ہوتا کہ ان کے علم میں جہل، شک اور غلطی کی آمیزش نہیں ہے اور یہ بات غیر معصوم کے متعلق نہیں کہی جاسکتی۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ صاحبان امر کے وجود کو ایک قسم کی رحمت اور فضل واحسان شمار کیا گیا ہے اس طرح سے کہ ان کی اطاعت اور پیروی لوگوں کو شیطان کی پیروی سے بچالیتی ہے:

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۸۳

''اور اگر تم پر خدا کا فضل اور رحمت نہ ہوتی تو تم یقیناً شیطان کی پیروی کرتے؛ مگر قلیل لوگ۔''

واضح ہے کہ صرف معصومین کی اتباع اور پیروی انسان کو شیطان کی پیروی اور گمراہی سے یقینی طور پر بچاسکتی ہے۔ کیونکہ اس کا امکان ہے کہ غیر معصوم افراد خود گمگا جائیں اور غلطی اور اشتباہ کا شکار ہو جائیں اور شیطان کے ہاتھوں کھلونا بن جائیں۔ اسی دلیل کی بنا پر شیعہ وسنی ذرائع سے منقولہ متعدد روایات میں اس آیت میں اولی الامر کی تفسیر آئمہ معصومین سے کی گئی ہے۔ طبرسی مرحوم نے مجمع البیان میں امام باقر -سے یوں حدیث نقل کی ہے: ''هُمُ الائِمّةُ المعصومون۔'' یعنی: ''یہ معصوم امام ہیں۔''[1]

تفسیر عیاشی میں امام علی بن موسی الرضا -سے اس طرح سے حدیث بیان ہوئی ہے: يَعْنِى آلَ محمدٍ وَ هُمُ الّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُونَ مِنَ الْقُرآنِ و يَعْرِفُونَ الحَلالَ و الحَرَامَ وَ هُم حُجّةُ اللّٰهِ على خَلْقِهٖ۔ یعنی: ''مراد آل محمد ہیں اور یہ وہ افراد ہیں جو قرآن سے استنباط کرتے ہیں، حلال وحرام کو بخوبی جانتے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی اس کی مخلوق پر حجت ہیں۔''[2]

شیخ صدوق کی کتاب کمال الدین میں امام باقر -سے منقول ہے: آپ نے فرمایا: ''وَ مَنْ وَضَعَ وِلايَةَ اللّٰهِ وَ اَهْلَ اِسْتِنْبَاطِ عِلْمِ اللّٰهِ فِى غَيْرِ اَهْلِ الصَفْوَةِ مِنْ بُيُوتاتِ الانبياءِ فَقَدْ خالَفَ اَمْرَ اللّٰهِ۔'' یعنی: ''جو شخص اللہ کی ولایت کو اور علم الہٰی کے استنباط کو اہل بیت انبیاء کے منتخب شدہ اور چنے ہوئے افراد کے علاوہ قرار دے اُس نے اوامر الہٰی کی مخالفت کی ہے۔''[3]

دوسری آیت یعنی: ''فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۴۳'' یعنی: ''اگر تم نہیں جانتے ہو تو اہل علم ودانش سے پوچھ لو'' یہ آیت قرآن مجید کی دو سورتوں (نحل/۴۳ اور انبیاء/۷) میں آئی ہے اور سب لوگوں کو حکم دے رہی ہے کہ جن باتوں کو تم نہیں جانتے ہو وہ اہل ذکر سے پوچھ لو۔ بلا شک وشبہہ ذکر سے یہاں مراد آگاہی اور معلومات ہیں اور ''اَهْلَ الذکر'' میں تمام اطلاعات اور

[1] مجمع البیان، ج۳، ص ۸۳
[2] تفسیر کنز الدقائق، ج۳، ص۴۸۶
[3] مجمع البیان، ج۳، ص ۸۳

آ گاہی رکھنے والے افراد کلی طور پر شامل ہیں۔اسی دلیل کی بنا پر تقلید اور جاہل کے عالم کی طرف رجوع کرنے کے مسئلہ میں اس آیت سے استدلال کیا گیا ہے،لیکن اس کے اتم اور اکمل مصداق وہ افراد ہیں جن کے علم کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا علم ہے۔ان کا علم غلطی اور اشتباہ سے پاک ہے،عصمت کی خصوصیت سے موصوف ہے۔

اس بنا پر اس آیت کی تفسیر اہل بیتؑ کے معصوم اماموں سے کی گئی ہے۔اسی حوالے سے ایک حدیث جو امام علی بن موسیٰ الرضا ؑ سے نقل ہوئی ہے،اس میں جب مذکورہ آیت کے بارے میں سوال ہوا تو امامؑ نے فرمایا:"نحنُ اَهْلُ الذِّکرِ وَ نَحْنُ الْمَسْئولان"۔یعنی:"اہل ذکر ہم ہیں اور ہم سے ہی پوچھا جائے۔"[1]

اہم بات تو یہ ہے کہ یہی معنی یا اس سے قریب مطلب اہل سنت کی بارہ تفسیروں میں بیان ہوا ہے،ان تفسیروں کے نام یہ ہیں:تفسیر ابو یوسف،تفسیر ابن حجر،تفسیر مقاتل بن سلیمان،تفسیر وکیع بن جراح،تفسیر یوسف بن موسیٰ القطان،تفسیر قتادہ،تفسیر حرب الطائی،تفسیر سدی،تفسیر مجاہد،تفسیر مقاتل بن حیان،تفسیر ابی صالح اور تفسیر محمد بن موسیٰ شیرازی۔ان تفاسیر میں ابن عباس سے نقل ہوا ہے کہ آیت "فاسئلوا اھل الذکر"سے مراد:"هو محمدُ وعلیٌ وفاطمۃُ والحَسَنُ والحُسَیْنُ علیہم اَلسَّلام هُم اَهْلُ الذِّکر والعِلْم والعقل والبیان وَهُمْ اَهْلُ بَیْتِ النُّبُوَّةِ۔۔۔۔یعنی:"یہ محمدؐ علیؑ،فاطمہؑ،حسنؑ،اور حسینؑ ہیں یہی اہل ذکر،اہل علم اور اہل عقل ہیں اور یہی نبوت کے گھرانے والے ہیں۔"[2]

مختصر یہ کہ آیت کا مفہوم اگرچہ وسیع اور عام ہے لیکن اس کا کامل اور جامع نمونہ آئمہ معصومین میں قابل تصور ہے جن کا علم ہر قسم کے شک وشبہہ اور غلطی سے مبرا ہے،اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سابقہ انبیاء کی نشانیوں،تورات،انجیل،اور یہود ونصاریٰ کے علماء سے سوال کے بارے میں آیت کا نزول،آیت کے مذکورہ معنی اور مطلب کے منافی نہیں ہے۔

یاددہانی

جیسا کہ ہم نے اس تفسیر کی ساتویں جلد میں انبیاء کے علمی مقام ومرتبے کے عنوان میں بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے انبیاء کی ذمہ داری اور فریضہ انسانوں کی تمام مادی اور معنوی پہلوؤں سے ہدایت کرنا ہے اور ان کی ذمہ داری کا دائرہ کار جسم اور روح اور دنیا و آخرت ہے۔اس لیے ضروری ہے کہ ان کے پاس علم ودانش کا بہت بڑا ذخیرہ ہونا چاہیے تاکہ وہ احسن انداز سے اپنی ذمہ داری اور فریضے کو انجام دے سکیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین آئمہ کے لیے بھی یہی حکم ہے ان کے پاس اپنی عظیم ذمہ داری اور فریضے کے مطابق علم کا خزانہ ہونا چاہیے تاکہ لوگ ان پر اعتماد اور بھروسہ کریں اور اپنے دین وایمان کو ان کے سپرد کردیں۔یہ علم ومعرفت ہر قسم کی خطا،غلطی،اشتباہ اور

---

[1] تفسیر برہان،ج۲،ص۳۶۹

[2] احقاق الحق،جلد ۳۔صفحہ ۴۸۲۔

نقص سے پاک ہوں ورنہ اعتماد حاصل نہ ہو سکے گا اور لوگ اپنے بعض نظریات اور افکار کو پیغمبر اور امام کے افکار پر فوقیت دینا جائز سمجھیں گے، اس لحاظ سے کہ پیغمبر اور امام بھی غلطی کر سکتے ہیں لہٰذا سو فی صد ان کی بات نہیں مانی جاسکتی۔ پس ثابت ہوا کہ مکمل اعتماد اس وقت حاصل ہوگا جب وہ مقام عصمت پر فائز ہوں گے۔

قرآن مجید، بنی اسرائیل کے ایک رہبر طالوت کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ؕ (بقرہ/۲۴۷)

''بے شک اللہ نے اُسے تمہارے مقابلے میں منتخب کیا ہے اور اُسے علم اور جسمانی طاقت کی فراوانی سے نوازا ہے۔''

بنی اسرائیل مختلف بہانے بنا رہے تھے وہ کہتے تھے کہ طالوت تو ایک غیر معروف اور غریب گھر کا فرد ہے، مال و دولت بھی نہیں رکھتا ان کے مقابلے میں ارشاد ہوا کہ الٰہی حکمرانی کے اصلی رکن علم اور قدرت ہے اور ان چیزوں سے اللہ تعالیٰ نے اُسے وافر مقدار میں نوازا ہے۔ حضرت یوسف- کے واقعہ میں آیا ہے کہ جب حکومت مصر کی ایک وزارت بیت المال کے لیے اپنے آپ کو لائق اور عہدہ برا ہونے کے لیے پیش کیا تو انہوں نے علم و آ گاہی اور امانت داری پر زور دیا۔

قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ ۝ (یوسف/۵۵)

''یوسف نے کہا مجھے ملک کے خزانوں پر مقرر کریں میں بلاشبہ خوب حفاظت کرنے والا آ گاہ اور مہارت رکھنے والا ہوں۔''

جس طرح ہم نے انبیاء کے علم کے متعلق کہا تھا کہ کم از کم انہیں غیب کا کچھ علم ہونا چاہیے تا کہ وہ اپنی ذمہ داری اور فریضہ کو بخوبی انجام دے سکیں، یہ بات اماموں کے بارے میں بھی ضروری ہے۔ ان کی ذمہ داری بھی عالمی ہے انہیں بھی اس دنیا کے اسرار و رموز سے آ گاہ ہونا چاہیے ان کی ماموریت گزشتہ اور آئندہ دونوں سے جڑی ہوئی پس وہ کس طرح ماضی اور مستقبل سے بے خبر اور لاعلم رہ کر اپنی ذمہ داری کو احسن طریقے سے انجام دے سکتے ہیں اور سب کے لیے منصوبہ بندی اور لائحہ عمل مرتب کر سکتے ہیں۔

ان کے فرائض اور ماموریت کا دائرہ کار معاشرے کی ظاہری اور باطنی حالت اور لوگوں کی اندرونی و بیرونی صورتحال پر مشتمل ہے۔ ان تمام اہم ترین امور کو بجالانا، علم غیب سے آ گاہی کے بغیر ناممکن ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو امام صادق - کی حدیث میں بڑے دلکش الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔ انہوں نے ارشاد فرمایا:

مَنْ زَعَمَ اَنَّ اللّٰهَ يَحْتَجُ بِعَبْدٍ فِي بِلَادِهٖ ثُمَّ يَسْتُرُ عَنْهُ جميعَ مَا يحتاجُ اِلَيْهِ فَقَدْ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ۔

''جو شخص یہ خیال کرے کہ اللہ تعالیٰ کسی بندے کو زمین پر اپنی حجت قرار دے اور پھر جن چیزوں کی اُسے

ضرورت ہے اللہ تعالیٰ اُس سے چھپا دے، تو اس نے اللہ پر جھوٹ باندھا ہے۔"[1]

درحقیقت ماضی، حال اور مستقبل کے اسرار و رموز کا علم، انسانوں کی ہدایت کی اہم ترین ذمہ داری ادا کرنے اور حجت الٰہی ہونے کا ذریعہ ہے۔ مختصر بات یہ ہے کہ امامت کے مقام و منصب پر فائز ہونے کی پہلی شرط علم و معرفت اور دانش ہے، تمام دینی تعلیمات، لوگوں کی ضروریات اور جو کچھ انسان کی تعلیم و تربیت اور ہدایت اور انسانی معاشرے کو چلانے کے لیے ضروری ہے اس کا علم امام کے پاس ہونا لازمی ہے۔ اور ایسے علم کے بغیر ذمہ داری ہرگز ادا نہیں ہو سکتی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

[1] البصائر الدرجات، بحار کے نقل کے مطابق، جلد ۲۶، صفحہ ۱۳۷

آئمہ اطہارؑ کے علم کا سرچشمے

آئمہ معصومین کے علم کے بارے میں اہم ترین قابل توجہ اور قابل غور مسئلہ ان کا علمی سرچشمہ ہے یعنی دین و دنیا کے امور کا وسیع اور عظیم علم انہیں کہاں سے حاصل ہوا ہے جب کہ یہ امر بھی مسلم ہے کہ آسمانی وحی ان پر نازل نہیں ہوتی، خاتم الرسل کی رحلت کے بعد وحی کا دروازہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا ہے، پس شریعت کے احکام، اسلام اور مسلمانوں کی حکمتوں اور مصلحتوں سے، اور امت کی ہدایت کے لیے لازمی امور اور گزشتہ اور آئندہ سے متعلق حقائق سے وہ کس طرح مطلع اور باخبر ہوتے ہیں؟

قرآن کی آیات سے بطور خلاصہ اور اسلامی روایات سے مفصل طور پر ان سرچشموں اور ماخذ کی معلومات واضح انداز سے مل سکتی ہیں۔ یہ ماخذ گوناگوں قسم کے ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

ا۔ کتاب الٰہی یعنی قرآن مجید کا مکمل علم

اس طرح سے کہ وہ تمام قرآن کی تفسیر، تاویل، ظاہر اور باطن اور اس کے محکم و متشابہ سے پوری طرح باخبر ہیں۔ قرآن مجید ارشاد فرماتا ہے: وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَسْتَ مُرْسَلًا ۚ قُلْ كَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ وَمَنْ عِنْدَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ﴿٤٣﴾ (رعد/ ۴۳) یعنی: اور کافر کہتے ہیں کہ آپ رسول نہیں ہیں، کہہ دیں! میرے اور تمہارے درمیان گواہی کے لیے اللہ اور وہ جس کے پاس کتاب کا علم ہے کافی ہیں۔

اس آیت سے یہ بات بڑی واضح طور پر ثابت ہوتی ہے کہ کوئی ہستی موجود ہے جس کے پاس تمام کتاب کا علم ہے۔ (توجہ رہے کہ اس آیت میں "علم کتاب" بطور مطلق آیا ہے اور قرآن مجید سے متعلق تمام علوم کو شامل ہے۔ سورہ نمل کی آیت ۴۰ میں اس کے برخلاف ہے، وہاں ارشاد ہوتا ہے:

قَالَ الَّذِي عِنْدَهُ عِلْمٌ مِنَ الْكِتَابِ أَنَا آتِيكَ بِهِ قَبْلَ أَنْ يَرْتَدَّ إِلَيْكَ طَرْفُكَ ۚ

جس کے پاس کتاب کا کچھ علم تھا اس نے کہا: میں آپ کے پلک جھپکنے سے پہلے اسے (تخت بلقیس کو) آپ کے پاس حاضر کر دیتا ہوں۔

یقیناً اللہ کی کتاب علوم و معرفت کا فیاض سرچشمہ ہے اور اس کا علم تمام امور کے لیے عقدہ کشا ہے، جب حضرت سلیمان کے وزیر جناب آصف بن برخیا، کتاب الٰہی کے کچھ علم کی بدولت اتنا بڑا کام انجام دے سکتے ہیں، اور چشم زدن میں جزیرۃ العرب کے آخری جنوبی حصے (یمن) سے آخری شمالی حصے (شام کا علاقہ حضرت سلیمان کی حکومت کا مرکز) تک پہنچا سکتے ہیں تو مسلم ہے کہ جس کے پاس تمام کتاب کا علم ہے وہ اس سے بھی زیادہ اہم اور بڑے کام انجام دے سکتا ہے رہی یہ بات کہ وہ کون ہے جس کے پاس پوری کتاب کا علم ہے، اس حوالے سے قرآن مجید نے ایک مجمل اشارہ کیا ہے۔ بعض افراد کا کہنا ہے کہ مراد اللہ تعالیٰ ہے۔ (اس لحاظ سے "من عندہ علم

الکتاب ”) کے جملے کا عطف، عطف تفسیری ہوگا جو کہ ظاہر کلام کے برخلاف ہے۔

نیز چند مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد اہل کتاب کے علماء اور سلمان اور عبداللہ بن اسلام جیسے افراد ہیں جنہوں نے پیغمبر اکرم ﷺ کی نشانیوں کو سابقہ آسمانی کتابوں میں دیکھا تھا اور وہ آنحضرتؐ کی حقانیت کے گواہ بن گئے۔ البتہ بہت سارے مفسرین نے اپنی کتب میں بیان کیا ہے کہ یہ آیت علی ابن ابی طالب اور دیگر ائمہ ہدیٰ کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ مشہور مفسر قرطبی نے اس آیت کی تفسیر میں عبداللہ بن عطا سے نقل کیا ہے، کہ میں نے ابو جعفر بن علی بن الحسین سے کہا کہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ ”اَلّذِی عِنۡدَہٗ عِلۡمُ الکتاب“ سے مراد عبداللہ بن سلام ہے، جواب میں انہوں نے فرمایا: اِنَّمَا ذٰلِكَ عَلِيُّ بنُ اَبِيۡ طَالب رضی الله عنه۔ یہ فقط علی بن ابی طالبؑ ہیں، اسی طرح محمد بن حنیفہ نے بھی کہا ہے۔ [1]

دلچسپ امر یہ ہے کہ یہ سورہ (رعد) مکے میں نازل ہوئی ہے جب کہ عبداللہ بن سلام اور سلمان فارسی اور اہل کتاب کے دیگر علماء مدینے میں دائرے اسلام میں داخل ہوئے ہیں۔ سعید بن جبیر سے بھی یہی بات نقل ہوئی ہے جب اُن سے پوچھا گیا کہ کیا ”من عندہ علم الکتاب “ سے مراد عبداللہ بن سلام ہیں؟ جواب دیا وہ کس طرح سے مصداق ہو سکتے ہیں حالانکہ یہ سورہ مکی ہے [2]

شیخ سلیمان قندوزی حنفی [3] ”ینابیع المودۃ“ میں ثعلبی سے اور ابن مغازلی ”عبداللہ بن عطا“ سے نقل کرتے ہیں کہ میں محمد باقر - کے ساتھ مسجد میں تھا، میں نے عبداللہ بن سلام کے بیٹے کو دیکھا تو کہا یہ اس کا بیٹا ہے جس کے پاس کتاب کا علم ہے اس پر انہوں نے (امام محمد باقر -) فرمایا: یہ آیت علی بن ابی طالب - کی شان میں ہے۔ [4]

اسی کتاب میں ایک اور روایت عطیہ عوفی کے ذریعے ابو سعید خدری سے نقل ہوئی ہے کہ میں نے پیغمبر اکرم ﷺ سے (سورہ نمل) کی آیت (نمبر ۴۰) ”الَّذِیۡ عِنۡدَہٗ عِلۡمٌ مِّنَ الۡكِتٰبِ “ کے بارے میں پوچھا، آپؐ نے فرمایا: وہ میرے بھائی سلیمان بن داود کے وزیر تھے۔ پھر میں نے ”قُلۡ کَفٰی بِاللّٰہِ شَہِیۡدًا بَیۡنِیۡ وَبَیۡنَکُمۡ وَمَنۡ عِنۡدَہٗ عِلۡمُ الکتاب“ کے بارے میں سوال کیا تو آپؐ نے فرمایا:

ذاكَ اَخی عَلِیُّ بۡنُ ابی طالبٍ [5]

وہ میرے بھائی علی بن ابی طالب ہیں۔

نیز ایک اور روایت میں ہم دیکھتے ہیں کہ ابن عباس بیان کرتے ہیں:

---

[1] تفسیر قرطبی، جلد ۵، صفحہ ۳۵۶۵

[2] الدر المنثور، جلد ۴، صفحہ ۶۹

[3] قندوز، افغانستان کے شمال میں ایک شہر ہے اور اہل سنت کے یہ عالم وہاں کے رہنے والے تھے۔

[4] ینابیع المودۃ، صفحہ ۱۰۲

[5] ینابیع المودۃ، صفحہ ۱۰۳

مَنْ عِنْدَهُ عِلمُ الكتابِ اِنَّما هُوَ عَلِيٌّ لَقَدْ كان عالماً بالتفسيرِ و التَّأويلِ و النّاسخ وَ الْمَنْسوخ۔

جس کے پاس کتاب کا علم ہے وہ فقط علیؑ ہیں، وہ قرآن کی تفسیر اور تاویل کو جانتے ہیں اور ناسخ ومنسوخ سے بھی آگاہ ہیں۔[1]

مختصر یہ کہ مذکورہ آیت کی تفسیر کسی صورت میں بھی اہل کتاب کے علماء سے نہیں کی جاسکتی کیونکہ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی ہے اور وہ ہجرت کے بعد مدینے میں دائرہ اسلام میں داخل ہوئے ہیں، مذکورہ روایات کے مطابق اس سے مراد علیؑ ہیں (اور ان کے ذریعے دیگر معصوم آئمہ تک پہنچتی ہے) درحقیقت قرآن مجید کا مکمل علم اس کے اسرار اور حقائق اس کے ظاہر اور باطن سے آگاہی آئمہ معصومین کے علم کا اصلی سرچشمہ اور منبع ہے۔[2]

اس مطلب پر گواہ قرآن مجید کی یہ آیت ہے:

وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ ۗ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ (آل عمران/۷)

اس کی حقیقی تاویل تو صرف خدا اور علم میں راسخ مقام رکھنے والے ہی جانتے ہیں

اس کی تشریح کچھ یوں ہے: مفسرین کے درمیان بحث ہے کہ کیا "الرّٰسخون فِي العلم" کا عطف "اللہ پر" ہے؟ اگر اس کا عطف "اللہ" پر ہو تو آیت کا معنی یوں ہوگا کہ تاویل قرآن کو اللہ اور راسخون فی علم کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ دوسری رائے یہ ہے کہ یہ مستقل اور الگ جملہ ہے اس بنا پر آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ قرآن کی تاویل کو صرف "اللہ" جانتا ہے اور علم میں پختہ مقام رکھنے والے کہتے ہیں: اگرچہ ہم آیات متشابہ کی تاویل کو نہیں جانتے مگر ان سب کو تسلیم کرتے ہیں۔ پہلے والا معنی اور رائے چند دلائل سے ثابت ہوتی ہے۔

۱۔ بہت بعید ہے کہ قرآن میں ایسے اسرار موجود ہوں جنہیں سوائے خدا کے اور کوئی نہ جانتا ہو کیونکہ قرآن تو انسانوں کی ہدایت اور تربیت کے لیے نازل ہوا ہے تو پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس میں ایسی آیات اور جملے ہوں جن کا مطلب اللہ تعالی کے سوا کسی کو معلوم نہ ہو۔

۲۔ جیسا کہ عظیم مفسر طبرسی اپنی تفسیر "مجمع البیان" میں لکھتے ہیں: مفسرین قرآن میں کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ قرآن کی فلاں آیت کا معنی سوائے خدا کے اور کوئی جانتا، بلکہ ان سب کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ آیات کے معانیٰ اور اسرار کو ظاہر کرنے کے لیے مختلف ذرائع سے استفادہ کریں من جملہ معصومین کی روایات سے درحقیقت "تاویل قرآن کو صرف اللہ جانتا ہے" والی بات مفسرین کے اجماع کے خلاف ہے۔

۳۔ اگر مراد علم وآگاہی کے بغیر سر تسلیم خم کرنا ہے تو پھر انہیں "ایمان میں راسخ" کہنا چاہیے نہ کہ علم میں راسخ جو کسی چیز کو نہیں جانتا اُسے

---

[1] ینابیع المودة، صفحہ ۱۰۴

[2] اس بارے میں متعدد قابل توجہ احادیث، آئمہ ہدی کے طرق سے نقل ہوئی ہیں، مزید معلومات کیلئے تفسیر کنز الدقائق ج۶، صفحہ ۴۸۰ اور اسی آیت کی تفسیر مین تفسیر البرہان کا مطالعہ کریں۔

''راسخون فی العلم '' کیسے کہا جا سکتا ہے۔

۴۔متعدد روایات میں بیان ہوا ہے کہ قرآن کی آیات کی تاویل کو علم میں راسخ مقام رکھنے والے جانتے ہیں اور یہ دلیل ہے کہ ''الراسخون فی العلم '' کا عطف ''اللہ'' پر ہے۔امام صادق -سے حدیث میں آیا ہے کہ انہوں نے فرمایا:

الرّاسِخُون فِي العِلْم اميرُ المومنينَ و الأئِمَّة مِنْ بَعْدِهٖ [۱]

علم میں راسخ امیر المومنین ؑ اوران کے بعد والے امام ہیں۔

ایک اور حدیث میں امام صادق -نے فرمایا ہے:

نَحْنُ الرّاسخون في العلم وَنَحْنُ نَعْلَمُ تأوِيلَه [۲]

ہم ہی ''راسخون فی العلم'' ہیں اور ہم قرآن کی تاویل کو جانتے ہیں۔

اسی طرح ایک حدیث اور ہے جس میں امام محمد باقر ؑ (یاامام صادق -) نے آیت ''و مايعلَمُ تاويله اِلّا اللهُ و الرَّاسخون فِي العلم '' کی تفسیر میں فرمایا:

فَرَسولُ اللهَ اَفضَلُ الرّاسِخِيْنَ فِي العِلْم ،قَدْ عَلَّمَهُ اللهُ عَزَّ وجَلَّ جَمِيْعَ مَا اَنْزَلَ عَلَيْهِ مِنَ التَّنْزِيلِ و التَّأوِيل وَ مَا كَان اللهُ لِيُنَزِّلَ عيله شَيْئاً لَم يُعَلِّمْهُ تأويلَهُ و اوصيا ئُهُ مِنْ بَعْدِه يَعْلَمُونَهُ كُلِّهٖ۔

رسول خدا ﷺ سب سے افضل راسخون فی العلم تھے، اللہ تعالیٰ نے جو کچھ آنحضرت ؐ پر نازل کیا اس کی تنزیل اور تاویل سے آپ ؐ کو آگاہ کیا، ممکن نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر کوئی چیز نازل کرے لیکن اس کی تفسیر اور تاویل آپ کو نہ سکھائے اور آنحضرت ؐ کے بعد ان کے تمام اوصیاء اس سب کا علم رکھتے ہیں۔ [۳]

اس کے بارے میں اور بھی متعدد روایات موجود ہیں جو اس مطلب اور مفہوم کی تائید کرتی ہیں۔ [۴]

مذکورہ بالا چار دلائل (اگر چہ ان میں ہر ایک مطلب کو ثابت کرنے کے لیے کافی تھا) کی روشنی میں اب کوئی شک وشبہ باقی نہیں رہتا کہ ''و الراسخون فی العلم '' والا جملہ ''اللہ'' پر عطف ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ قرآن کے گہرے اور عمیق مطالب اور اس کی تاویل سے باخبر ہیں۔

---

[۱] اصول کافی، جلد اول، صفحہ ۲۱۳، حدیث نمبر ا

[۲] اصول کافی، جلد اول، صفحہ ۲۱۳، حدیث نمبر ۳

[۳] اصول کافی، جلد اول، صفحہ ۲۱۳، حدیث نمبر ۲

[۴] مزید وضاحت کیلئے جامع الاحادیث: جلد اول، صفحہ ۲۷،تفسیر کنزالدقائق صفحہ ۴۲ تا ۵۴ اور اصول کافی، جلد ا صفحہ ۴۱۵ کا مطالعہ کریں۔

ایک اور قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ ''و الراسخون فی العلم '' کے الفاظ قرآن مجید میں دو مرتبہ آئے ہیں ایک مرتبہ زیر بحث (آل عمران ر۷۷) آیت میں، اور دوسری مرتبہ سورہ نساء کی آیت ۱۶۲ میں، وہاں پر اہل کتاب یہود و نصاری کے برے اور قبیح اعمال میں جملہ سود خوری اور لوگوں کے اموال کو لوٹنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد ہوا۔

لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ

لیکن ان (اہل کتاب) میں سے جو علم میں راسخ ہیں اور اہل ایمان (اصحاب رسول) اس پر ایمان لاتے ہیں جو آپ پر نازل کیا گیا ہے اور جو آپ سے پہلے نازل کیا گیا ہے۔

یعنی دونوں گروہ تمام آسمانی کتب (خواہ قرآن ہو یا سابقہ آسمانی کتب) پر ایمان رکھتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ جنہوں نے عبداللہ بن سلام اور دیگر ایمان لانے والے اہل کتاب کے علماء کو ''و الراسخون فی العلم '' کی تفسیر کے طور پر ذکر کیا ہے وہ سورہ نساء کی اس آیت (۱۶۲) سے مربوط ہے نہ کہ سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۷ سے۔ کیونکہ جو آیت اہل کتاب کے علماء کی بات کر رہی ہے، وہ یہ پہلی آیت ہے، لیکن ہماری زیر بحث آیت (سورہ آل عمران ر۷) کا اہل کتاب کے مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ (غور کیجیے گا)

یہاں پر ایک اور اہم نکتہ بھی واضح ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ نہج البلاغہ کے خطبہ اشباح میں علیؑ نے فرمایا:

وَ اعْلَمْ اَنَّ الرّاسِخينَ فِي العِلْم هُمُ الّذِيْنَ اَغْنَاهُمُ اللهُ عَنِ اقْتِحامِ السُّدَدِ المَضْرُوبَةِ دُون الغُيُوبِ لِاَ قْرارُ بِجُمْلَةِ ما جَهِلُوا تَفْسِيرَهُ مِنَ الغَيْبِ المحجُوبِ۔[1]

یاد رکھو علم میں راسخ اور پختہ افراد وہی ہیں کہ جو غیب کے پردوں میں چھپی ہوئی ساری چیزوں کا اجمالی طور پر اقرار کرتے ہیں اگرچہ ان کی تفسیر تفصیل نہیں جانتے اور یہی اقرار انہیں غیب پر پڑے ہوئے پردوں میں درانہ گھسنے سے بے نیاز بنائے ہوئے ہے۔

ممکن ہے کہ یہ سورہ نساء کی آیت کی طرف اشارہ ہو جس میں اہل کتاب کے کچھ علماء اور مومنین کے قرآن اور دیگر آسمانی کتابوں کے سامنے بلا چون و چرا سر تسلیم خم کرنے کی بات کی گئی ہے، نہ کہ سورہ آل عمران کی زیر بحث آیت کی طرف (غور کیجیے گا)

مختصر بات یہ کہ سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۷ ظاہری طور پر یہ بتاتی ہے کہ قرآن کا معنیٰ اور تاویل اور علم میں راسخ اور پختہ افراد جانتے ہیں یاد رہے کہ علم میں راسخ سے مراد پہلے درجے پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ معصومین ÷ ہیں، پس اس طرح سے ثابت ہوا کہ ان کے علم کا اہم ترین مأخذ اور منبع قرآن مجید، اس کی تفسیر و تاویل اور اس کا ظاہر و باطن ہے۔

اس بات کو قرآن مجید کی چند دیگر آیات کے تذکرے کے ساتھ ختم کرتے ہیں، سورہ عنکبوت کی آیت ۴۹ میں ارشاد ہوتا ہے:

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۹۱ (خطبہ اشباح) اور ترجمہ کے مطابق خطبہ ۸۹ ہے۔

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ؕ یعنی: ''یہ واضح اور روشن نشانیاں ہیں ان کے سینوں میں جنہیں علم دیا گیا ہے۔'' اہل بیتؑ کے ذرائع سے منقولہ بہت ساری روایات میں بیان ہوا ہے کہ ''الّذِین اُوتُو العلم ''سے مراد (حضرت رسولخدا ﷺ کے بعد) معصوم امام ہیں۔

مزید معلومات کے لیے بحارالانوار اور تفسیر برہان کا مطالعہ کریں[1]

۲۔پیغمبر اکرم ﷺ کی وراثت

آئمہ معصومین کے علم کا دوسرا مأخذ اور منبع پیغمبر اکرم ﷺ کی وراثت ہے، اس معنی میں کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے اسلام کی تمام تعلیمات اور شریعت کے تمام احکام علی بن ابی طالب-کو تعلیم دیئے اور بعض روایات کے مطابق علیؑ نے انہیں اپنے ہاتھوں سے ایک کتاب میں لکھا اور یہ علم ودانش یکے بعد دیگرے ان کے فرزندوں یعنی معصوم اماموں تک پہنچا۔ ایک اور انداز سے یوں کہا جائے کہ (جیسا کہ اسلامی روایات میں آیا ہے) رسول اللہ ﷺ نے علم کے ایک ہزار باب علیؑ کو تعلیم فرمائے اور ان میں سے ہر باب سے علم کے ہزار باب اور کھل گئے۔

اصول کافی میں اس بارے میں بہت ساری حدیثیں موجود ہیں ان میں ایک حدیث ابوبصیر نے نقل کی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے امام صادق -سے پوچھا کہ آپ کے پیروکاروں کا کہنا ہے کہ رسول خدا ﷺ نے علیؑ کو علم کا ایک باب تعلیم دیا اور اس سے ہزار باب علم کے کھل گئے۔ امامؑ نے فرمایا: ''عَلَّمَ رسولُ علياً اَلْفَ بابٍ يُفْتَحُ مَنْ كُلِّ بابٍ اَلْفُ بابٍ۔ یعنی: ''رسول اللہ ﷺ نے علیؑ کو ہزار باب علم کے سکھائے (نہ صرف ایک باب) اور ہر ایک باب سے ہزار باب کھل گئے۔

اس کے بعد انہوں نے فرمایا: اے ابوبصیر! اِنَّ عِنْدَنَا الجامعه .... قُلْتُ وَ مَا الجامعَةُ؟ قَالَ صَحِيْفَةٌ طُولُهَا سَبْعُونَ ذراعًا بِذراعِ رَسُولِ اللهِ وَ اِمْلائِه، مِنْ فَلْقِ فِيه وَخَطِّ عَلِيٍّ بِيَمِيْنِه فيها كُلُّ حلالٍ و حرامٍ و كُلُّ شيئٍ يَحْتَاجُ النَّاسُ اِلَيْهِ حَتّٰى الاَرْشِ فِي الخَدْشِ۔ یعنی: جامع ہمارے پاس ہے، میں نے پوچھا! جامع کیا ہے؟ فرمایا: ایک صحیفہ ہے جس کی لمبائی رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ کے برابر ستر ہاتھ ہے، جسے آنحضرتؐ نے اپنی زبان مبارک سے لکھوایا اور علیؑ نے اپنے ہاتھ سے تحریر کیا، اس میں ہر حلال اور حرام موجود ہے (قیامت تک) انسانوں کو جس چیز اور حکم کی ضرورت تھی وہ سب اس میں مذکور ہے، یہاں تک کہ بدن پر ایک خراش کی دیت کا بھی ذکر ہے۔[2]

قابل توجہ امر یہ ہے کہ مشہور حدیث ''مدنیة العلم ''کے متعلق اہل سنت اور شیعہ کی مشہور کتب میں بے شمار روایات موجود ہیں۔ ان روایات کے راویوں میں ابن عباس، جابر بن عبداللہ، عبداللہ بن عمر اور علی ابن ابی طالب- جیسی قابل قدر شخصیات ہیں۔ جن

---

[1] بحارالانوار، جلد ۲۳، صفحہ ۱۸۸ تا ۲۰۸، تفسیر برہان: ج ۳، صفحہ ۲۵۴ تا ۲۵۶۔ (ان دو کتابوں میں تقریباً ۲۰ حدیثیں اس بارے میں نقل ہوئی ہیں)

[2] اصول کافی، جلد ا صفحہ ۲۳۹

محدثین اور مصنفین نے اپنی کتب میں اس حدیث کو جگہ دی ہے ان میں حاکم نیشاپوری نے اپنی کتاب مستدرک میں، ابوبکر نیشاپوری نے تاریخ بغداد میں ابن مغازلی نے مناقب امیرالمومنین -میں، گنجی نے کفایہ الطالب میں، حموینی نے "فرائدالسمطین" میں ذھبی نے میزان الاعتدال میں، قندوزی نے "ینابع المودۃ" میں نبھانی نے الفتح الکبیر میں اور دیگرافراد قابل ذکر ہیں۔ [۱]

متعدد روایات میں نہایت صراحت کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ آئمہ اہل بیتؑ فرمایا کرتے تھے: جو کچھ ہم بیان کرتے ہیں تم لوگ اُسے پیغمبر اکرم ﷺ سے نسبت دے کر نقل کر سکتے ہو کیونکہ یہ سب کچھ نے اپنے آباء اور اجداد کے ذریعے رسول خدا ﷺ سے سُنا ہے۔ امام صادق -کے صحابی نے آپ سے پوچھا: کبھی ہم کوئی حدیث آپ سے سنتے ہیں پھر ہمیں شک ہو جاتا ہے کہ آپؑ سے سنی ہے یا آپ کے والد گرامی سے؟ انہوں نے فرمایا:

ما سَمِعْتَهُ مِنِیّ فَارْوِهِ عَنْ اَبِی وَما سَمِعْتَهُ مِنّی فارْوِهُ عَنْ رَسُولِ الله

جو حدیث تم نے مجھ سے سُنی ہے اُسے میرے والد سے نقل کرو اور جو کچھ مجھ سے سُنا ہے اُسے رسول خدا ﷺ سے بیان کرو: [۲]

ایک اور مقام پر انہوں نے فرمایا:

حَدیثی حَدیثُ اَبِی، وَ حَدِیْثُ اَبِی حَدیثُ جَدّی وَ حَدِیثُ جَدّی حدیث الحُسَیْنِ، وَ حَدِیثُ الحُسَیْنِ حَدِیثُ الحَسَنِ و حَدیثُ الحَسَنِ حَدِیثُ امیرِالمُؤمِنینَ وحَدیثُ امیرِالمومنینَ ،حدیثُ رَسول اللهِ (ص)،وحدیث رسول اللهِ (ص)قَوْلُ الله عَزَّوجَلَّ۔

میری حدیث میرے والد کی حدیث ہے، میرے والد کی حدیث میرے دادا کی حدیث ہے، میرے دادا کی حدیث حسینؑ کی حدیث ہے، حسینؑ کی حدیث حسنؑ کی حدیث ہے، حسنؑ کی حدیث امیرالمومنینؑ کی حدیث ہے، امیرالمومنینؑ کی حدیث رسول اللہؐ کی حدیث ہے اور رسول اللہؐ کی حدیث اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔ [۳]

ایک تیسری حدیث بھی امام صادق -منقول ہے۔ جس میں انہوں نے واضح طور پر فرما دیا:

مَهْما اَجَبْتُكَ فِيه بشَىءٍ فَهُو مِنْ رَسُولِ اللهِ لَسْنا نَقُولُ بِرَأْينا مِنْ شِىءٍ

---

[۱] مزید معلومات کیلئے احقاق الحق، جلد ۵، صفحہ ۴۶۸ سے ۵۰۱ تک مطالعہ کریں اس حدیث کے شیعہ ماخذ کیلئے جامع الاحادیث، پرانی چھاپ، صفحہ ۱۶ کے بعد مطالعہ کریں۔

[۲] جامع الاحادیث جلد ۱، صفحہ ۱۷ باب حجیۃ فتویٰ الائمہ۔

[۳] ایضا، حدیث نمبر ا

جب بھی میں تمہیں کسی سوال کا جواب دوں یہ رسول خدا ﷺ کی طرف سے ہوگا کیونکہ ہم اپنی رائے سے کوئی چیز بیان نہیں کرتے۔[1]

۳۔فرشتوں سے رابطہ

آئمہ معصومین کے علم کا تیسرا سرچشمہ ان کا فرشتوں سے ارتباط ہے۔البتہ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ انبیاء اور پیغمبروں کی صف میں شامل تھے کیونکہ ہمارا ایمان ہے رسول اللہ ﷺ خدا کے آخری نبی اور رسول تھے اور ان کی رحلت کے ساتھ وحی الٰہی کا خاتمہ ہوگیا۔لہٰذا آئمہ کی مثال حضرت خضر، حضرت ذوالقرنین اور حضرت مریم کی سی ہے جن کا قرآن کی آیات کے مطابق فرشتوں سے رابطہ تھا اور عالم غیب سے ان کے دلوں پر حقائق کا الہام ہوتا تھا۔

امام باقر -سے ایک حدیث میں بیان ہوا ہے، انہوں نے فرمایا: اِنَّ علیًّا کانَ مُحَدِّثاً علی محدث تھے (جن سے کلام کیا جاتا ہو) تھے، اور جب ان سے اس کی وضاحت پوچھی گئی کہ کون اُن سے کلام کرتا تھا تو انہوں نے فرمایا: یُحَدِّثُهُ مَلَكٌ ''فرشتہ اُن سے کلام کرتا تھا'' جب یہ پوچھا گیا کہ کیا وہ پیغمبر تھے تو انہوں نے اپنے ہاتھوں کو انکار کے طور پر ہلاتے ہوئے فرمایا:

كَصاحِبِ سُلَيمانَ او كَصاحِبِ موسیٰ اَوْ كَذِی القَرنَيْنِ[2]

وہ سلیمانؑ کے ساتھی (آصف بن برخیا) یا موسیٰؑ کے ساتھی (یوشع یا خضرؑ) یا ذوالقرنین کی طرح تھے۔اس بارے میں اور بھی بہت ساری روایات موجود ہیں۔

۴۔روح القدس کا الہام

آئمہ ہدیٰ کے علم کا چوتھا ماخذ روح القدس کا فیض ہے۔اس کی وضاحت یوں ہے کہ قرآن مجید میں بطور مکرر ''روح القدس'' کی مدد اور تائید کی بات ہوئی ہے ان میں سے تین مقامات پر حضرت عیسیٰؑ[3] کے بارے میں، اور ایک مقام پر حضرت رسول اکرمؐ[4] کے بارے میں ذکر ہوا ہے۔

یہ ''روح القدس'' کون ہیں؟ یا کیا چیز ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے درمیان بہت اختلاف پایا جاتا ہے کچھ مفسرین نے اس سے جبرائیلؑ مراد لیے ہیں اور حضرت عیسیٰؑ کے حوالے سے وہ مقدس اور پاکیزہ روح مراد لی ہے جو ان کے اندر موجود تھی۔یا ان پر نازل

---

[1] جامع الاحادیث جلد ا، صفحہ ۱۷ کے بعد حدیث ۷ (اس بارے میں مذکورہ کتاب میں اور بھی حدیثیں موجود ہیں)

[2] اصول کافی، جلد ا، ص ۲۷۱

[3] بقرہ، ۸۷ اور ۲۵۳، اور مائدہ۔۱۱۰

[4] بقرہ، ۱۱۰

ہونے والی کتاب انجیل مراد لی گئی ہے۔بعض کے بقول یہ اللہ کا اسم اعظم ہے جس کے ذریعے حضرت عیسیٰؑ مردوں کو زندہ کیا کرتے تھے۔[1]

لیکن قرآن مجید کے الفاظ اور مختلف اسلامی روایات سے یوں استفادہ ہوتا ہے کہ روح القدس کے کئی معانی ہیں اور ممکن ہے کہ ہر مقام پر خاص معنی میں استعمال ہوا ہو۔قرآن مجید میں ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

قُلۡ نَزَّلَهٗ رُوۡحُ الۡقُدُسِ مِنۡ رَّبِّكَ بِالۡحَـقِّ (نحل/۱۰۲)

کہہ دیں کہ اسے روح القدس نے تیرے پروردگار کی طرف سے حق کے ساتھ نازل کیا ہے۔

یہاں پر ظاہراً جبرائیل کے معنی میں آیا ہے۔جس نے قرآن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل کیا۔لیکن دیگر تین مقامات پر جو سب حضرت عیسیٰ کے متعلق ہیں دیگر معنوں میں استعمال ہوتا نظر آتا ہے، کیونکہ ''اِذۡ اَيَّدۡتُكَ بِرُوۡحِ الۡقُدُسِ یا وَ اَيَّدۡنٰهُ بِرُوۡحِ الۡقُدُسِ'' کے الفاظ بتاتے ہیں کہ اس سے مراد ایک روح ہے جو ہمیشہ حضرت عیسیٰ کے ساتھ رہتی تھی اور انہیں مدد اور قوت بہم پہنچاتی تھی۔

اہل بیتؑ سے منقولہ روایات سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ روح القدس ایک مقدس روح تھی جو تمام انبیاء ورسل اور معصومین کے ہمراہ تھی اور مختلف مواقع پر ان کو الٰہی امداد بہم پہنچاتی تھی۔اسی طرح اہل سنت کی کتب میں بھی بہت ساری احادیث موجود ہیں، جو یہ بتاتی ہیں کہ جب کبھی کسی سے کوئی بڑا کام انجام پاتا، یا پُرمغز بات یا بہترین شعر صادر ہوتا تو آپؐ فرماتے تھے کہ ''یہ روح القدس کی مدد سے ہوا ہے''

ان میں سے ایک حدیث تفسیر الدرالمنثور میں مذکور ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مشہور اسلامی شاعر حسان بن ثابت کے متعلق فرمایا:

اَللّٰهُمَّ اَيِّدۡ حَسَّاناً بِرُوۡحِ الۡقُدُسِ كَمَا نَافَحَ عَنۡ نَبِيِّهٖ۔

اے اللہ! حسان کی روح القدس کے ذریعے مدد فرما جس طرح اُس نے اپنے نبی کا دفاع کیا ہے۔[2]

اہل بیت ÷ کے مشہور شاعر کمیت بن زید اسدی کے بارے میں ہم پڑھتے ہیں کہ امام باقر - نے اس سے فرمایا: تمہارے لیے وہی دُعا ہے جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حسان بن ثابت کے بارے میں مانگی تھی:

---

[1] یہ چار معانی تفسیر کنزالدقائق جلد ۲ صفحہ ۸۷ پر ذکر ہوئے ہیں لیکن بعض مشہور تفاسیر میں صرف پہلا معنی ذکر ہوا ہے، فخر رازی کی تفسری میں تین معانی بیان ہوئے ہیں، جبرئیل انجیل اور اسم اعظم (تفسیر فخر رازی ج ۳، ص ۱۷۷)

[2] الدرالمنثور، جلد ۱ ص ۸۷ (سورہ بقرہ کی آیت ۸۷ کی تفسیر میں) صحیح مسلم ج ۴، ص ۱۰، اور ۳۲ ''باب فضائل حسان بن ثابت'' میں بھی اسی مضمون کی دو روایتیں نقل ہوئی ہیں۔

لَنْ يَزالَ مَعَكَ رُوحُ الْقُدُسِ ماذَبَبْتَ عَنَّا [۱]

ترجمہ: ہمیشہ روح القدس تمہارے ساتھ ہوگی جب تک تم ہمارا دفاع کرتے رہو گے۔

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ جب معزز شاعر دعبل خزاعی نے اپنے مشہور قصیدے ''مدارس آیات'' کے چند اشعار پڑھے تو امام علی بن موسیٰ الرضا نے شدید گریہ کیا اور پھر فرمایا:

''نَطَقَ رُوحُ الْقُدُسِ عَلٰى لِسانِكَ بِهٰذَيْنِ الْبَيْتَيْنِ

یہ دو شعر روح القدس نے تیری زبان پر جاری کیے ہیں۔ [۲]

اس سے اچھی طرح واضح ہوجاتا ہے کہ ''روح القدس'' ایک مدد کرنے والی روح ہے جو معنوی اور الٰہی کاموں کو انجام دینے میں انسان کی مددگار رہوتی ہے۔ البتہ افراد کے درجات کے اعتبار سے یہ مختلف ہوتی ہے۔ نبیوں اور اماموں کے حوالے سے غیر معمولی طور پر مضبوط اور واضح عمل کرتی ہے اور دوسرے افراد کے حوالے سے اپنے لحاظ سے، اگرچہ اس کی ماہیت اور جزئیات کے متعلق زیادہ معلومات پاس نہیں ہیں۔ ایک حدیث میں امام صادق - نے ''وَ السّابِقُونَ السّابِقُونَ أُولٰئِكَ الْمُقَرَّبُونَ'' کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرمایا:

فَالسَّابِقُونَ هُمْ رُسُلُ اللهِ و خَاصَّةِ اللهِ مِنْ خَلْقِهٖ جَعَلَ فِيهِمْ خَمْسَةُ اَرْواحٍ، اَيَّدَهُمْ بِرُوحِ الْقُدُسِ فيه عَرَفوا الاشياء...

سبقت لے جانے والے، اللہ کے رسول (علیہم السلام) ہیں اور اس کی مخلوقات میں سے خاص افراد ہیں ان میں اس نے پانچ روحیں قرار دی ہیں (ان میں سے ایک) روح القدس کے ذریعے اُس نے ان کی مدد اور حمایت کی ہے، اس کے ذریعے وہ اشیاء کو پہچانتے ہیں۔ [۳]

اس سلسلے میں ایک اور حدیث امام باقر - سے منقول ہے انہوں نے انبیاء اور اوصیاء میں موجود پانچ روحوں کو شمار کرتے ہوئے

---

[۱] سفینۃ البحار، ج ۲، ص ۴۹۵

[۲] کشف الغمہ، جلد ۳، صفحہ ۱۸۸، اعلام الوری، صفحہ ۳۳۱، کے مطابق وہ دو شعر یہ ہیں

خروج الامام لامحالة خارج
بقوم على اسم الله والبركات
يميز فينا كل حق وباطل
ويجزى على النعماء والنقمات

[۳] اصول کافی، جلد ۱، ص ۲۷۱

فرمایا:"فَبِرُوحِ القُدُسِ .....عَرَفُوا ما تَحتَ العَرشِ اِلیٰ ما تَحتَ الثَّریٰ. یعنی:"روح القدس کے ذریعے زمین کی تہوں سے لے کر عرش کے درمیان جو بھی چیزیں ہیں انہیں وہ پہچان لیتے ہیں۔"[۱]

اس بارے میں بہت زیادہ احادیث اصول کافی اور دیگر کتب میں موجود ہیں جن کی تفصیل بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہیں۔پس روح القدس کے ذریعے الٰہی امدایں، آئمہ معصومین کے علم کا ایک اور ماخذ اور منبع ہے۔

۵۔نور الٰہی

آئمہ طاہرین ؑ کے علم کے ماخذ کے طور پر پانچویں چیز جو ذکر کی جاسکتی ہے یہ وہی ہے جو اصول کافی کی متعدد احادیث میں بیان ہوئی ہے۔ان میں ایک روایت میں حسن بن راشد بیان کرتے ہیں کہ میں نے امام صادق ؑ کو فرماتے ہوئے سنا:"فَاِذا مَضیٰ الاِمامُ الّذِی کانَ قَبلَهُ رُفِعَ لِهٰذا مَنار مِنْ نُورٍ یَنظُرُ بِهِ اِلیٰ اَعمالِ الخَلائِقِ فَبِهٰذا یَحتَجُّ اللهُ عَلیٰ خَلقِهِ." یعنی: "جب ایک امام رحلت فرماتا ہے تو اس کے بعد والے امام کے لیے اللہ سبحانہ نور کا ایک مینار کھڑا کرتا ہے اس کے وسیلے سے امام لوگوں کے اعمال دیکھتا ہے اس طرح اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق پر اپنی حجت تمام کرتا ہے۔"[۲]

بعض روایات میں "عَمُود مِنْ نورٍ" (نور کا ستون) کے الفاظ بھی ذکر ہوئے ہیں۔[۳] لیکن زیادہ تر "مَنَار مِنْ نورٍ" کے الفاظ آئے ہیں، البتہ ان دو الفاظ میں زیادہ فرق بھی نہیں ہے۔اس سلسلے میں مزید آگاہی کے لیے بحار الانوار کی جلد ۶ رصفحہ ۱۳۲ کا مطالعہ کریں، علامہ مجلسی مرحوم نے اس حوالے سے ۱۶ حدیثیں نقل کی ہیں اور اسی طرح "عرض اعمال" کے باب میں متعدد روایات مذکور ہیں۔

اس تمام گفتگو سے مجموعی طور پر جو چیز واضح طور پر ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ آئمہ معصومین ؑ کے علم کے ماخذ اور سرچشمے مختلف اور گوناگون قسم کے ہیں پہلے نمبر پر ان کی علم و آگاہی کا محور و مرکز قرآن مجید ہے۔دوسرے نمبر پر وہ علوم ہیں جو ان تک رسول اللہ ﷺ کے ذریعے پہنچتے ہیں، تیسرے نمبر پر الٰہی امدادیں۔قلبی الہامات اور عالم غیب اور فرشتوں سے رابطہ ہے۔

مجموعی طور پر یہ تمام پہلو اور جہات امام معصوم کے علم و دانش میں بے پناہ اضافہ کرتی ہیں تاکہ وہ اپنی ذمہ داریوں اور فرائض سے بخوبی عہدہ برا ہو سکے۔یہ ذمہ داری وہی اسلام قرآن اور سنت رسول ﷺ کی حفاظت، مخلوق کو خالق کی طرف ہدایت دینا، انسانوں کی تربیت، حدود الٰہی کا نفاذ اور امور کی تدبیر اور نظم و نسق ہے۔

ایک اور قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ شب جمعہ کو آئمہ ہدیٰ جدید اور تازہ علم و دانش (جدید مسائل

---

[۱] اصول کافی، جلد۱، ص ۲۷۲

[۲] اصول کافی، جلد۱، ص ۲۸۷، حدیث ۲

[۳] اصول کافی، جلد۱، ص ۲۸۷ حدیث ۴۔

کے لیے) اللہ تعالیٰ کی طرف سے دریافت کرتے ہیں (تاکہ اپنے آپ کو اسلامی امت کی تمام ضروریات کو پورا کرنے کے لیے مکمل آمادہ کر سکیں) ان میں سے ایک حدیث میں امام صادق - نے فرمایا:

اِنَّ لَنَا فِی کُلِّ لَیلَۃِ جُمُعَۃٍ سُروراً۔

ہمارے لیے ہر جمعہ کی رات کو نیا سرور اور خوشی ہوتی ہے۔

روای کہتا ہے میں نے پوچھا:

زادكَ الله وما ذاك

اللہ تعالیٰ آپ کے سرور میں اضافہ فرمائے وہ سرور کیا ہے؟

انہوں نے فرمایا:

اِذَا کَان لَیلَۃُ الجُمُعَۃِ وافِی رَسُولُ اللہِ العَرْشَ وَ وافَی الاَئِمَّۃُ مَعَہُ و مَعَھُمْ فَلاَ تُرَدُّ اَرْواحُنا اِلَی اَبْدانِنَا اِلَّا بِعِلْمٍ مُسْتَفادٍ ولَوْلَا ذٰلِكَ لَاَنْفَدْنا۔

جب جمعہ کی رات ہوتی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (کی مقدس روح) عرش (الٰہی) پر جاتے ہیں اور ائمہ کی ارواح بھی ان کے ہمراہ ہوتی ہیں اور میری روح بھی ان کے ساتھ وہاں جاتی ہے، پھر ہماری روحیں بدن میں واپس نہیں آتیں مگر جدید اور نئے علم ودانش کے ساتھ۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہمارا علم ختم ہو جاتا۔[1]

اسی باب میں اس کے متعلق اور بھی کافی روایات منقول ہیں جن کی تفصیل بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ اس فصل میں جو کچھ بیان ہوا اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آئمہ کے علم کے ماخذ کا معاملہ کوئی معمولی بات نہیں ہے، ان بزرگ ہستیوں کی ودسترس میں علم کے ایسے ماخذ ہیں جو انہیں دوسروں سے ممتاز کر دیتے ہیں اور اسلام اور قرآن کی تعلیمات کی حفاظت اور انسانوں کی ہدایت کی جو اہم ذمہ داری ان پر ہے، اس کی انجام دہی میں یہ علمی ماخذ ان کی مدد کرتے ہیں۔

[1] اصول کافی، جلد ۱، ص ۲۵۴ (باب فی ان الائمۃ یزدادون فی لیلۃ الجمعۃ)

اماموں کی عصمت

اشارہ

آئمہ ہدیٰ کی عام شرائط میں سے ایک اور شرط ان کا خطا، بھول چوک اور گناہ سے پاک ہونا ہے، وہ تمام دلائل جو انبیاء الٰہی کی عصمت پر دلالت کرتے ہیں درحقیقت وہی دلائل آئمہ کی عصمت پر بھی دلالت کرتے ہیں کیونکہ دونوں کی ذمہ داریوں میں بہت حد تک مماثلث اور شباہت پائی جاتی ہے۔

یہ بات درست ہے کہ رسول اکرم ﷺ شریعت کے بانی ہیں اور عالم وحی سے ان کا رابطہ ہے اور آئمہ اس شریعت کے محافظ ہیں، اگرچہ ان پر کسی قسم کی وحی نازل نہیں ہوتی لیکن لوگوں کی ہدایت کرنے میں، اللہ تعالیٰ کے احکام اور حدود کی حفاظت کرنے میں اور قرآنی آیات کی ترویج واشاعت میں یہ رسول اللہ کے نقش قدم پر چلتے ہیں اور اسی وجہ سے بہت ساری صفات میں یہ ان کے ساتھ شریک ہیں اور ان سے مشابہہ ہیں۔ بنابریں، وہ تمام اہم ترین دلائل جو عصمت انبیاء کے باب میں ہم نے بیان کیے ہیں وہ سب آئمہ ہدیٰ کی عصمت کو بھی ثابت کرتے ہیں۔

اس اشارے کے بعد ہم قرآن کریم کی آیات کا جائزہ لیتے ہیں:

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ﴿۳۳﴾

(احزاب/ ۳۳)

اللہ کا ارادہ بس یہی ہے کہ ہر طرح کی ناپاکی اور پلیدی کو آپ! اہل بیت سے دور رکھے اور آپ کو ہر لحاظ سے پاکیزہ رکھے۔"

امامت وولایت کے مقام ومرتبہ کی عظمت کے بارے میں گزشتہ بحث میں سورہ بقرہ کی آیت ۱۲۴ میں حضرت ابراہیمؑ کے واقعے میں بیان ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس عظیم پیغمبر کو بہت سارے امتحانات میں ڈالا اور جب وہ ان تمام امتحانات میں کامیاب اور سرخرو ہوئے تو اللہ سبحانہ نے فرمایا:

"اِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَاماً"

میں نے تمہیں لوگوں کا امام اور پیشوا قرار دیا ہے۔

(امامت کا مطلب، لوگوں کے جسم اور روح پر اور انسانوں کی تربیت کے لیے انسانی معاشروں پر حکومت ہے)

جب حضرت ابراہیمؑ نے اپنی بعض اولاد اور فرزندوں کے لیے اس منصب کو مانگا تو اللہ کی طرف سے مشروط اجابت کی گئی،

ارشاد رب العزت ہوا: لاینال عَهدِی الظّالمین۔ یعنی: ''میرا عہد و پیمان (عہد امامت) ظالموں کو شامل نہیں ہوگا۔'' (تیری اولاد میں سے صرف تیرے وہ فرزند اس عہدے کے لائق ہوں گے جو پاک اور معصوم ہوں گے) وہاں پر واضح ہو گیا تھا کہ آیت کا یہ جملہ کس طرح اماموں اور الٰہی پیشواؤں کی عصمت پر دلالت کرتا ہے۔ جو افراد ساری عمر عقائد کے اعتبار سے شرک اور کفر کے راستے پر چلتے رہے یا اپنے اعمال کے لحاظ سے اپنے آپ پر یا دوسروں پر ظلم و ستم کرتے رہے وہ اس مقام و منصب کے ہرگز لائق نہیں ہیں کیونکہ ظلم اپنے وسیع معنوں میں ظلم، شرک، کفر اور نظریاتی انحراف کو بھی شامل ہے اور دوسروں پر ہر قسم کے ظلم و تعدی اور گناہوں کے ذریعے اپنے پر ظلم کو بھی شامل ہے۔

چونکہ وہاں پر یہ گفتگو بڑی تفصیل اور تشریح کے ساتھ ہو گئی تھی اس لیے اب اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بنابراین اماموں اور الٰہی پیشواؤں کے معصوم ہونے کی اصلی شرط کی بنیاد اسی آیت میں رکھی گئی ہے۔ اب دوبارہ آیت تطہیر کی طرف لوٹتے ہیں اور عصمت کے مسئلہ پر اس آیت کے حوالے سے گفتگو کرتے ہیں:

یہ بات درست ہے کہ یہ آیت ان آیات کے سیاق و سباق میں موجود ہے جو ازواج رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متعلق ہیں لیکن اس سیاق و سباق کے باوجود اس کا لہجہ اور انداز جداگانہ ہے جو یہ بتاتا ہے کہ اس آیت کا مقصد کچھ اور ہے، کیونکہ اس سے پہلے والی اور بعد والی تمام آیات میں جمع مونث کی ضمیریں ہیں لیکن زیر بحث آیت میں جمع مذکر کی ضمیر آئی ہے۔ ان آیات کی ابتداء میں ازواج رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب کیا گیا ہے اور انہیں حکم دیا گیا ہے کہ اپنے گھروں میں مقیم رہیں اور دور جاہلیت کے رسم و رواج کی طرح لوگوں کے سامنے ظاہر نہ ہوں، پاک دامنی کے اصولوں پر کاربند رہیں، نماز قیام کریں، زکوۃ ادا کریں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں: (وَ قَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَ لاتَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الجاهِلِيَّةِ الأُولى وَ اَقِمْنَ الصَّلوةَ وَ آتينَ الزّكاةَ وَ اَطِعْنَ الله و رَسُولَهُ)

اس حصے میں استعمال ہونے والی تمام کی چھ کی چھ ضمیریں جمع مونث کی صورت میں ہیں (غور کیجیے گا) اس کے بعد آیت کا لہجہ بدل جاتا ہے اور ارشاد ہوتا ہے: اللہ تعالیٰ صرف یہ چاہتا ہے رجس اور گناہ کو آپ اہل بیتؑ سے دور کرے اور تمہیں مکمل طور پر پاک کر دے: (اِنَّمَا يُرِيدُ اللهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا) آیت کے اس حصے میں جمع کی دو ضمیریں استعمال ہوئی ہیں اور دونوں جمع مذکر کی ہیں، عام طور پر ایک آیت کا ابتدائی اور آخری حصہ ایک ہی مطلب کو بیان کرتا ہے لیکن یہ بات وہاں پر درست ہے یہاں اس کے برخلاف کوئی قرینہ موجود نہ ہو۔

لہٰذا جن افراد نے آیت کے اس حصے کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج کے متعلق سمجھا ہے انہوں نے ظاہر آیت اور اس میں موجود قرینے ضمیروں کا فرق کے خلاف بات کہی ہے۔ اس سے ہٹ کر اس آیت کے حوالے سے متعدد روایات موجود ہیں جنہیں اسلام کے بڑے بڑے علما، اعم از شیعہ اور سنی نے خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیان کی ہیں اور دونوں فریقوں کی مشہور اور ان کے ہاں معتبر کتب میں مذکورہ ہیں۔ یہ روایات فراوان اور بکثرت ہیں؛ یہ سب روایات یہ بتاتی ہیں کہ آیت کا یہ حصہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، علیؑ، فاطمہ ×، حسن- اور حسین - سے متعلق ہے (نہ کہ ازواج رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اس کی تفصیل بعد میں بیان ہوگی۔ لیکن روایات کی بحث میں داخل ہونے سے

پہلے ضروری ہے کہ آیت کے الفاظ کی تشریح بیان کی جائے:

''اِنّما'' کا لفظ عام طور پر حصر کے لیے آتا ہے اور اردو میں اس کی جگہ پر فقط یا صرف کا لفظ استعمال ہوتا ہے، یہ لفظ اس بات پر دلالت کررہا ہے کہ اس آیت میں مذکورہ لطف وعنایت اہل بیت کے ساتھ مختص ہے اور دوسروں کو شامل نہیں ہے۔

''یرید'' (اللہ کا ارادہ ہے یا وہ چاہتا ہے) یہ اللہ تعالیٰ کے تکوینی ارادے کی طرف اشارہ ہے۔یعنی اللہ سبحانہ نے اپنے ایک تکوینی امر سے ارادہ کیا ہے کہ تمہیں ہر قسم کی پلیدی اور آلودگی سے پاک وصاف رکھے۔اس سے ارادہ تشریعی مراد نہیں ہے کیونکہ ارادہ تشریعی کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی پاکیزگی کی حفاظت کرنے کا حکم دیا ہے، اور ہم جانتے ہیں کہ یہ حکم فقط اہل بیت کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ تو سب مسلمانوں کا فریضہ اور ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے آپ کو گناہوں سے پاک رکھیں۔ممکن ہے کہ کسی کے ذہن میں یہ بات آئے کہ ارادہ تکوینی تو ایک قسم کا جبر ہے اور جبر کی صورت میں معصوم ہونا تو باعث فضلیت اور افتخار نہیں ہوگا۔

اس بات کا جواب ہم ساتویں جلد میں انبیاء کی عصمت کے باب میں تفصیلی طور پر دے چکے ہیں، یہاں پر مختصر طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ معصوم افراد میں دو قسم کی قابلیت اور لیاقت ہوتی ہے ایک ذاتی اور عطا شدہ قابلیت، اور دوسری اکتسابی قابلیت جو اپنے اعمال اور اندرونی ملکات کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔ان دونوں کے مجموعے سے، جن میں ایک یقینا اختیاری پہلو رکھتی ہے، یہ بلند مقام حاصل ہوتا ہے، دوسرے الفاظ میں، ارادہ الٰہی اور عنایت خداوندی اس عظیم مقام تک پہنچنے کے لیے توفیقات کے حصول میں زمین ہموار کر دیتا ہے اور اس توفیق سے فائدہ اٹھانا ان کے اپنے ارادے سے مربوط ہے۔(غور کیجیے گا)

ان کے لیے گناہوں کو ترک کرنا محال عادی ہے نہ کہ محال عقلی، مثال کے طور پر محال عادی یہ ہے کہ ایک باایمان اور عالم شخص مسجد میں اپنے ساتھ شراب لے جائے اور نماز جماعت کی صف میں اُسے پینا شروع کردے، یہ عام طور پر محال ہے لیکن مسلم ہے کہ یہ عقلی طور پر محال نہیں ہے اور اس کے اختیاری ہونے کے منافی نہیں ہے، یا ایک اور مثال میں ایک عقل مند انسان کبھی بھی بالکل برہنہ ہو کر گلی یا سڑکوں پر نہیں آتا، ایسا کرنا اس کے لیے ناممکن نہیں ہے لیکن اس کی سطح فکری، اس کا علم ودانش اُسے اجازت نہیں دیتا کہ وہ اس قسم کا کام انجام دے باوجود اس کے کہ اس کا انجام دینا اور ترک کرنا اس کے اختیار میں ہے۔

انبیاء اور آئمہ کے لیے گناہوں کو انجام دینا بھی اسی طرح کا ہے، یہ بات درست ہے کہ ان کا معصوم ہونا اللہ تعالیٰ کی مدد اور تائید سے ہے لیکن یہ الٰہی مدد اور تائید اندھا دھند اور بغیر حساب وکتاب کے نہیں ہے، جس طرح قرآن حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے بارے میں فرماتا ہے کہ جب تک اللہ کی طرف سے امتحانوں میں کامیاب نہیں ہوئے انہیں امامت کا بلند مرتبہ ومقام اور مخلوقات کے پیشوا ہونے کا عہدہ نہیں ملا۔(بقرہ/۱۲۴)[1]

اور جہاں تک ''رجس'' کے کلمے کا تعلق ہے تو اس کلمے کا لغوی معنی ناپاک چیز ہے خواہ انسانی مزاج کے لحاظ سے آلودہ اور

---

[1] معصومین کی عصمت ان کے اعمال کے اختیاری ہونے سے منافی نہیں ہے، اس بارے میں مزید مطالعہ کیلئے پیام قرآن کی ساتویں جلد، صفحہ ۱۹۳ کے بعد صفحات کو دیکھیں۔

ناپسند ہو یا عقلی اور شرعی حکم کے اعتبار سے ہو، یا ان سب کے لحاظ سے، اسی وجہ سے ''مفردات'' میں راغب رجس کا معنی ''شئی قَذِر'' گندی چیز کرنے کے بعد اس کے لیے چار صورتیں ذکر کرتے ہیں (وہی چار صورتیں جو اوپر بیان کی گئی ہیں، یعنی گندی انسان کے مزاج کے لحاظ سے، عقلی لحاظ سے، شرعی یا ان سب کے اعتبار سے) اگر بزرگوں کی بعض عبارتوں میں رجس کا معنی، گناہ یا شرک یا باطل عقیدے یا بخل وحسد کیا گیا ہے تو یہ درحقیقت اس کے وسیع معنی کے مختلف مصادیق کو بیان کیا گیا ہے۔

بہرحال لفظ الرجس پر جو الف لام داخل ہے یہ جنس کے لیے ہے اور یہاں پر اس کے عام معنی پر دلالت کر رہی ہے، آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا ہے کہ ہر قسم اور ہر طرح کی گندگی اور آلودگی سے انہیں پاک و پاکیزہ رکھے۔

''تطہیر'' کا معنی پاک کرنا ہے، اس کو مدنظر رکھتے ہوئے ''وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا'' کا جملہ سابقہ جملے میں مذکورہ رجس اور ہر قسم کی پلیدی کی نفی پر تاکید مزید ہے، اور تطہیراً کا لفظ جو کہ نحوی اصطلاح میں مفعول مطلق ہے یہ مذکورہ معنی پر ایک اور تاکید ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مختلف قسم کی تاکیدات کے ساتھ ارادہ فرمایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اہل بیتؑ کو ہر قسم کی پلیدی، گندگی سے پاک اور مبرا بنا دے۔ مسلم ہے کہ یہ ارادہ پہلے نمبر پر یہ خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شامل ہے جو کہ اس گھر کے اصلی اور بنیادی فرد ہیں، ان کے بعد باقی گھر کے افراد کو شامل ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے باقی اہل بیت ÷ کون ہیں؟

اہل بیت سے مراد کون ہیں؟

اہل سنت کے کچھ مفسرین نے اہل بیتؑ کا معنی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویاں، بیان کیا ہے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا ہے کہ آیت کے سیاق و سباق میں موجود جمع مونث کی ضمیروں کا جمع مذکر میں تبدیل ہونا اور خود آیت کا اپنا طرز بیان ظاہر کرتا ہے کہ اس جملے کا مطلب پہلے اور بعد والے جملوں سے علیحدہ ہے اور یہ جملہ کسی اور مقصد کو بیان کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ حکیم ہے اور قرآن فصاحت و بلاغت کی اعلیٰ مرتبے پر ہے اور اس کے تمام الفاظ نپے تلے اور حکمت و مقصد کے عین مطابق ہیں۔

چند دیگر مفسرین نے اسے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، علی، فاطمہ، حسن، حسین ÷ سے مخصوص سمجھا ہے۔ اہل سنت اور شیعہ کتب میں بہت ساری روایات اس مطلب پر گواہی دے رہی ہیں، ان میں چند روایات کا یہاں تذکرہ کیا جاتا ہے۔ شاید انہی روایات کی وجہ سے وہ افراد بھی جو اس جملے کو پنجتن پاک سے مخصوص نہیں سمجھتے، اس کے وسیع معنی کے قائل ہوئے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ یہ جملہ ان ہستیوں کو بھی شامل ہے اور ازواج رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی شامل ہے اور یہ اس آیت کی تیسری تفسیر ہے۔

رہی بات ان روایات کی جو آیت کے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، علی مرتضیٰ -، فاطمہ زہراؑ اور ان کے دو بیٹے حسن مجتبیٰ - اور حسین - کے ساتھ مختص ہونے پر دلالت کرتی ہیں ان کی تعداد بہت زیادہ ہے ان میں سے اٹھارہ روایات تو صرف تفسیر ''الدر لمنثور'' میں نقل ہوئی ہیں جن میں سے پانچ حضرت امّ سلمہ سے، تین حضرت ابوسعید خدری، ایک حضرت عائشہ سے ایک روایت حضرت انس سے دو حضرت ابن عباس سے، دو روایتیں ابی الحمراء سے، ایک وائلہ بن اسقع سے ایک روایت سعد سے اور ایک ایک روایت ضحاک بن مزاحم اور زید بن ارقم

سے بیان ہوئی ہے۔[۱]

علامہ طباطبائی مرحوم نے اپنی تفسیر ''المیزان'' میں اس بارے میں منقولہ روایات کی تعداد ستر سے زیادہ بیان کی ہے، اور انہوں نے کہا ہے کہ اس کے متعلق اہل سنت کے ذرائع سے نقل ہونے والی روایات شیعہ ذرائع سے منقولہ روایات سے کہیں زیادہ ہیں، انہوں نے مذکورہ بالا راویوں کے علاوہ دیگر راویوں کا بھی اضافہ کیا ہے۔ (یعنی الدالمنثور میں مذکورہ راویوں کے علاوہ) بعض افراد کے بقول ان روایات اور ان کتابوں کی تعداد جن میں یہ روایات نقل ہوئی ہیں ان کی تعداد سو سے بھی زیادہ ہے، اور بعید بھی نہیں ہے کہ ایسا ہو۔ یہاں پر ہم چند روایات کا ان کی کتب کے ساتھ ذکر کرتے ہیں تا کہ یہ بات واضح ہو جائے کہ واحدی کا ''اسباب النزول'' میں درج ذیل بیان ایک حقیقت ہے:

ان الآیۃ نزلت فی النبی و علی و فاطمۃ و الحسنین (علیہم السلام) خاصۃ لایشارکھم فیھا غیرھم۔

یہ آیت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، علی، فاطمہ، اور حسنین ؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اس میں کوئی دوسرا ان کے ساتھ شریک نہیں ہے۔[۲]

ان احادیث کو چار قسموں میں بطور خلاصہ بیان کیا جا سکتا ہے:

۱۔ وہ احادیث جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعض زوجات سے منقول ہیں اور واضح طور پر بتاتی ہیں جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس آیت کے متعلق گفتگو کر رہے تھے تو ہم نے پوچھا: کیا ہم بھی اس میں شامل ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: تم اچھی اور نیک ہو مگر اس آیت میں شامل نہیں ہو! اسی حوالے سے ثعلبی نے ام المومنین حضرت سلمہ سے حدیث بیان کی ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے گھر میں تھے۔ اتنے میں حضرت فاطمہ ؑ آنحضرتؐ کے لیے کھانا لے کر آئیں۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اپنے شوہر اور دونوں بیٹوں حسنؑ اور حسینؑ کو بلائیں'' وہ سب آ گئے تو سب نے کھانا کھایا اس کے بعد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی عبا ان پر ڈال دی اور فرمایا:

اَللّٰھُمَّ ھٰؤُلاءِ اَھْلُ بَیْتِی وَ عِتْرَتِی فَاَذْھَبْ عَنْھُمُ الرِّجسَ و طَھِّرھُمْ تَطْھِیْراً

اے اللہ! یہ ہیں میرے اہل بیت اور میری عترت، ان سے ہر قسم کی ناپاکی کو دُور فرما اور انہیں ہر لحاظ سے پاک و پاکیزہ فرما۔''

اس موقعہ پر یہ آیت اِنَّمَا یُرِیْدُ اللہ... نازل ہوئی۔۔۔ اس کے بعد میں نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! کیا میں آپ سب

---

[۱] الدالمنثور، جلد ۵، صفحہ ۱۹۶، اور ۱۹۹ ملاحظہ فرمائیے!

[۲] المیزان، جلد ۱۶، صفحہ ۳۱۱۔

کے ساتھ شامل ہوں؟! آنحضرتؐ نے فرمایا: انك الیٰ خیر. تم نیکی پر ہو (لیکن ان افراد میں شامل نہیں ہو)[1]

ثعلبی چوتھی صدی کے آخر اور پانچویں صدی ہجری کے شروع کے اہل سنت کے بڑے مشہور عالم ہیں ان کی تفسیر کبیر بڑی معروف ہے انہوں نے زوجہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت عائشہ سے یوں نقل کیا ہے کہ جب ان سے جنگ جمل کے بارے اور اُس تباہ کن جنگ میں ان کی شرکت کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا: یہ تقدیر کا لکھا ہوا تھا! اور جب ان سے علیؑ کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے یہ کہا:

تَسْأَلُنِی عَنْ اَحَبِّ النَّاسِ کَانَ اِلٰی رَسُولِ اللهِ وَ زَوْجِ اَحَبِّ النَّاسِ کَانَ اِلٰی رَسُولِ اللهِ لَقَدْ رَأَیْتُ عَلِیًّا وَ فَاطِمَۃَ وَ حَسَناً وَ حُسَیْناً وَ جَمَعَ رَسُولُ اللهِ بِثَوْبٍ عَلَیْهِمْ ثُمَّ قَالَ: اللّٰهُمَّ هٰؤُلاءِ اَهْلُ بَیْتِی وَ حَامَتِی فَاذْهِبْ عَنْهُمُ الرِّجْسَ وَ طَهِّرْهُمْ تَطْهِیْراً. قَالَتْ فَقُلْتُ: یَا رَسُولَ اللهِ اَنَا مِنْ اَهْلِكَ قَالَ تَنَحّی فَاِنَّكَ اِلٰی خَیْرٍ

کیا تم مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبوب ترین ہستی کے بارے میں پوچھتے ہو، کیا تم اس کے متعلق سوال کرتے ہو جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبوب ترین ہستی کا شوہر تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی، فاطمہ، حسن اور حسین (÷) کو کپڑے کے نیچے جمع کیا ہوا تھا اور فرمایا: اے اللہ! یہ میرے اہل بیتؑ اور رشتہ دار ہیں، رجس اور پلیدی کو ان سے دور کر دے، اور ہر ہر قسم کی گندگی اور آلودگی سے انہیں پاک کر دے۔ میں نے عرض کیا، اے اللہ کے رسول! کیا میں بھی ان میں شامل ہوں، آپؐ نے فرمایا: ہٹ جا تم نیکی اور خیر پر ہو (لیکن ان افراد میں شامل نہیں ہو)۔[2]

اس طرح کی احادیث واضح طور پر ثابت کر رہی ہیں کہ اس آیت میں ازواج رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اہل بیت میں شامل نہیں ہیں۔

۲۔ حدیث کساء کا واقعہ روایات میں غیر معمولی کثرت کے ساتھ اور مختلف الفاظ کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ ان میں قدر مشترک یہ ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ، اور حسینؑ کو بلایا (یا آپؐ ان کے پاس تشریف لائے) اور ان پر اپنی عبا یا کوئی اور کپڑا اڈال دیا اور فرمایا: اے اللہ! یہ میرے گھر والے ہیں ان سے رجس اور پلیدی کو دور کر دے، اس موقعہ پر یہ آیت: 'اِنَّمَا یُرِیْدُ اللهُ لِیُذْهِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ بیت' نازل ہوئی۔

نہایت قابل توجہ بات یہ ہے کہ صحیح مسلم میں یہ حدیث خود حضرت عائشہ سے بیان ہوئی ہے۔ اسی طرح حاکم نے اپنی کتاب

---

[1] طبرسی نے مذکورہ بالا آیت کے ذیل میں اور حاکم حسکانی نے شواہد التنزیل جلد ۲، صفحہ ۵۶ میں مذکورہ حدیث کو نقل کیا ہے۔

[2] مجمع البیان، اسی آیت کے ضمن میں۔

مستدرک میں بیہقی نے سنن میں ابن جریر نے اپنی تفسیر میں اور سیوطی نے الدر المنثور میں نقل کی ہے۔[1] حاکم حسکانی نے بھی شواہد التنزیل میں اِسے ذکر کیا ہے۔[2] صحیح ترمذی میں یہ حدیث دو بار نقل ہوئی ہے۔ایک جگہ پر عمرو بن ابی سلمہ سے اور دوسری جگہ پر حضرت اُمّ سلمہ سے۔[3]

ایک نکتہ یہ ہے کہ فخر رازی سے آیت مباہلہ (آل عمران، آیت/٦١) کی تفسیر میں کسی مناسبت سے حدیث کساء کو نقل کرنے کے بعد مزید لکھا ہے: ''وَ اعْلَمْ اَنَّ هٰذِهِ الرواية كَالْمتفَقِ عَلٰى صِحَّتِها بَيْنَ اَهْلَ التَّفْسِيرِ و الحَدِيثِ۔'' یعنی: جان لو کہ یہ روایت اس روایت کی طرح ہے جس کے صحیح ہونے پر مفسرین اور محدثین کا اتفاق ہے۔یہ بات بھی اہمیت کی حامل ہے کہ امام احمد حنبل نے اپنی مسند میں اس حدیث کو مختلف طرق سے نقل کیا ہے۔[4]

٣۔روایات کی ایک اور قسم میں جن کی تعداد بہت زیادہ ہے، ہم پڑھتے ہیں کہ آیت تطہیر کے نزول کے بعد رسول خدا ﷺ کئی ماہ (بعض میں چھ مہینے بعض میں ہے کہ آٹھ یا نو مہینے) تک نماز صبح پر جاتے ہوئے جب فاطمہ زہرا کے گھر کے پاس سے گزرتے تو بلند آواز سے فرماتے:

الصّلٰوة! يا اَهْلَ الْبَيْت! اِنَّما يُرِيدُ اللهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ و يُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا۔

اے اہل بیت! نماز کا وقت ہے! اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہے کہ وہ تم اہل بیت کو ہر قسم کے رجس سے دور کردے، اور تمہیں ہر طرح سے پاکیزہ بنادے۔

یہ حدیث مشہور مفسر حاکم حسکانی کی کتاب شواہد التنزیل میں حضرت انس بن مالک سے نقل ہوئی ہے۔[5] اسی کتاب میں ایک اور حدیث ''سات مہنیوں'' کے عنوان سے ابی الحمراء سے بیان ہوئی ہے۔نیز مذکورہ کتاب میں ہی اسی واقعے کو آٹھ ماہ کے عنوان سے ابو سعید خدری سے نقل کیا گیا ہے۔[6]

الفاظ کا یہ فرق فطری ہے کیونکہ ممکن ہے کہ انس نے چھ ماہ تک اس عمل کو دیکھا ہو، ابوسعید خدری نے آٹھ ماہ تک اور ابوالحمرء نے

---

[1] صحیح مسم، جلد ۴، صفحہ ۱۸۸۳، حدیث ۲۴۲۴ (باب فضائل اہل بیت النبیؐ)

[2] شوہدا التنزیل، جلد ۲ صفحہ ۳۳، حدیث ۳۷۶۔

[3] صحیح ترمذی، جلد ۵، صفحہ ۶۹۹، حدیث ۳۸۷۱ (باب فضل فاطمہ) مطبوعہ احیاء التراث۔

[4] تفسیر فخر رازی، جلد ۸ صفحہ ۸۰

[5] مسند احمد، جلد ۱، صفحہ ۳۳۰، جلد ۴، صفحہ ۱۰۷، اور جلد ۶، صفحہ ۲۹۲ (فضائل الخمسہ جلد ۱، صفحہ ۲۷۶۔۔۔سے نقل کرتے ہوئے)

[6] شواہد التنزیل، جلد ۲، صفحہ ۲۸ اور احقاق الحق، جلد ۲، صفحہ ۵۰۳ تا ۵۴۸۔

سات ماہ تک اور ابن عباس نے 9 ماہ تک دیکھا ہو۔[1] جس نے جو دیکھا اس نے وہی نقل کیا ہے جب کہ ان اقوال میں کوئی تضاد بھی موجود نہیں ہے، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اس عمل کو ایک لمبے عرصے تک جاری رکھنا اور اس آیت کی بار بار تلاوت کرنا ایک سوچا سمجھا طرز عمل تھا۔ آنحضرت نہایت صراحت اور بار بار تاکید کے ساتھ واضح کرنا چاہتے تھے کہ اہل بیت سے مراد صرف اور صرف یہ گھر والے ہیں تا کہ مستقبل میں کسی کے لیے شک وشبہہ کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے اور سب کو معلوم ہو جائے کہ یہ آیت صرف اور صرف پنجتن پاک کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ عجیب بات تو یہ ہے کہ ان تمام تاکیدات، اور تکرار کے باوجود یہ مسئلہ بعض افراد کے لیے مبہم رہ گیا۔ واقعاً تعجب کی بات ہے۔ بالخصوص اس صورت میں جب صرف اس گھر کا دروازہ مسجد نبویؐ کی طرف کھلتا تھا، اور وہ رسول خداؐ اور علیؑ کا گھر تھا۔ (کیونکہ رسول خداؐ نے حکم دیا تھا کہ مسجد کی طرف کھلنے والے تمام دروازے بند کر دیئے جائیں سوائے ان دو گھروں کے)

واضح ہے کہ ایسی صورت میں نماز کے وقت کچھ افراد نے ہمیشہ اس مقام پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات سنی ہوگی اس کے باوجود بعض مفسرین اصرار کرتے ہیں کہ اس کا معنی وسیع ہے اور ازواج رسول بھی اس میں شامل ہیں کیا یہ حیرانی کی بات نہیں ہے! جب کہ ہم دیکھتے ہیں اور تاریخ اس کی گواہ ہے کہ زوجہ رسول اکرم حضرت عائشہ اپنے فضائل کو بیان کرنے میں اور رسول خداؐ کے ساتھ اپنے تعلق کی جزئیات کو بیان کرنے میں کوئی کمی نہیں کرتی تھیں، جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے انہوں نے نہ صرف اپنے آپ کو اس آیت میں شامل نہیں سمجھا بلکہ بیان کیا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے فرمایا تم ان میں شامل نہیں ہو۔

۴۔ صحابی رسولؐ جناب ابوسعید خدری سے آیت تطہیر کے حوالے سے منقولہ متعدد روایات میں وہ واضح طور پر کہتے ہیں:

نَزَلَتْ فی خَمْسَةٍ فِی رَسُولِ اللّٰہِ و عَلِیٍّ و فاطِمَةَ و الحَسَنِ و الحُسَیْنِ علیہ السلام [۲]

یہ آیت پانچ ہستیوں یعنی رسول خدا، علی، فاطمہ، حسن اور حسین ÷ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ آیت تطہیر کے متعلق اور اس آیت کے پنجتن پاک یعنی رسول خدا، علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ کے ساتھ مخصوص ہونے کے بارے میں روایات اس قدر زیادہ ہیں کہ انہیں متواترہ روایات کے ہم پلہ قرار دیا جائے اور اس اعتبار سے اس میں کوئی شک و شبہہ باقی نہیں رہ جاتا۔ یہاں تک کہ شرح احقاق الحق میں اس بات کو اہل سنت کی ستر سے زیادہ معتبر کتب سے نقل کیا گیا ہے۔ (یہ کتب مذہب اہل بیت کی کتب کے علاوہ ہیں) اس کے مصنف کہتے ہیں۔ اگر ہم ان سب ماٴخذ اور کتب کو شمار کریں تو ان کی تعداد ہزار سے بڑھ جائے۔[۳]

---

[1] الدر المنثور، جلد ۵، صفحہ ۱۹۹

[۲] شواہد التنزیل مین اس کے متعلق چار حدیثیں آئی ہیں، ج ۲، از صفحہ ۲۴ تا ۲۷ (حدیث ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۴)

[۳] احقاق الحق کی جلد دوم سے اقتباس، صفحہ ۵۰۲ سے ۵۶۳ تک۔

چند سوالوں کے جواب

مذکورہ بالا آیت ائمہ اہل بیت کے لیے ایک بہت بڑی فضلیت شمار ہوتی ہے خصوصاً ان متواتر روایات کی روشنی میں جو اس آیت کی تفسیر میں مشہور ومعروف اسلامی کتب میں آئی ہیں، اس اعتبار سے اس آیت کو ان کے راستے کی حقانیت پر دلیل قرار دیا جاسکتا ہے، اسی وجہ سے بعض اہل علم کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور توقع کے عین مطابق اس پر اعتراضات کرنے لگے اگر چہ ان میں اعتراضات کم اور بہانہ بازی زیادہ نظر آتی ہے، اس کے برعکس دوسرے افراد نے نہایت جرأت مندی سے اس آیت اور روایات کو قبول کیا ہے اگر چہ اصولی لحاظ سے وہ اہل سنت کے طریقہ پر باقی رہے ہیں۔

ان افراد کے بعض اعتراضات یہاں بیان کیے جاتے ہیں:

ا۔ اہل بیت سے مراد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر میں رہنے والے ہیں کیونکہ بیت کا معنی وہ گھر ہے جس میں سکونت اختیار کی جاتی ہے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر میں سکونت پذیر وہی آپ کی ازواج ہیں، لہٰذا دوسرا کوئی اس میں شامل نہیں ہے، اور اگر ضمیریں مذکر آئی ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ لفظ ''اہل'' مذکر ہے اور اگر ''بیت'' جمع کی بجائے مفرد صورت میں آیا ہے، حالانکہ زوجات النبیؐ متعدد مختلف گھروں میں رہتی تھیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ایک شخصیت ہیں لہٰذا ان کا گھر بھی واحد صورت میں ذکر ہوا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ آیت صرف ازواج رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں ہے۔

اس اعتراض یا بہانے کا جواب گزشتہ باتوں سے اچھی طرح واضح ہے۔ اور اس رائے کے دفاع میں تکلف کے اثرات صاف ظاہر ہیں، کیونکہ اگر لفظ ''اھل'' سے مراد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویاں ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ظاہری طور پر یہ لفظ ''مفرد مذکر'' ہے اور اس کا معنی ''جمع مونث'' ہے۔ حالانکہ آیت میں نہ مفرد مذکر کا ذکر ہے اور نہ ہی جمع مونث ہے کا بلکہ ''جمع مذکر'' کی صورت میں مذکور ہے۔

اسی طرح ''بیت'' کا لفظ بھی مفرد ہے جب کہ اسی آیت کے شروع میں یہ لفظ جمع کی صورت میں ہے فرمایا: وَ قَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ۔'' لہٰذا لفظ بیت کا استعمال پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے نہیں ہوسکتا کیونکہ آپ کا کوئی الگ سے گھر نہ تھا آپ کا گھر وہی آپ کی بیویوں کے گھر تھے جہاں آپؐ ان کے ساتھ رہتے تھے۔ بنابرایں، اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم کہیں کہ یہاں پر بیت سے مراد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے رشتہ داری قرابت اور قربت والا گھر ہے نہ کہ رہائشی مکان اور یہ اصطلاح عام اور رائج ہے۔

ان چیزوں کو نظر انداز کرتے ہوئے بالفرض ہم ان اعتراضات کو مان لیتے ہیں، تو ان سب روایات کا کیا کریں گے؟ کیا روایات کی اس کثرت، وسعت اور صراحت کہ اہل بیت فقط پانچ افراد ہیں، سے چشم پوشی کی جاسکتی ہے؟ کیا انہیں ہم ضعیف احادیث شمار کریں؟ اگر یہ احادیث متواتر اور قوی نہ ہوں تو پھر کوئی بھی حدیث متواتر اور صحیح نہیں ہے، اگر یہ روایات صریح اور واضح نہیں ہیں تو پھر کونسی روایات صریح اور واضح ہیں؟! اور حیران کن بات تو ''عکرمہ'' سے نقل ہوئی ہے اس نے کہا ہے:

مَنْ شَاءَ بَاهَلْتُهُ اَنَّهَا نَزَلَتْ فِي نِسَاءِ النَّبِي

میں اس بات پر کہ یہ آیت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج کے بارے میں نازل ہوئی، جو شخص چاہے میں اس سے مباہلہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ [۱]

اِنَّ عَکْرَمَۃَ کَانَ یُنَادِي فِي السُّوقِ اَنَّ قَولَہُ تعالیٰ اِنّما یُرِیدُ اللّٰہُ .... نَزَلَ فِي نساءِ النبّيِ۔ [۲]

عکرمہ بازار میں صدا لگا کر کہتا تھا کہ آیت انما یرید اللہ۔۔۔ازواج النبی کی شان میں نازل ہوئی ہے۔

واقعا حیرانی کی بات ہے، کیا علمی اور استدلالی مسائل کو مباہلے اور بازاروں میں صدائیں لگانے سے ثابت کیا جاتا ہے اور وہ بھی اس بات کو جس پر اتنے دلائل شواہد اور قرائن موجود ہوں۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پانچ افراد پر عبا ڈال کر ان کے اردگرد ایک دائرہ کھینچ دیتے ہیں تا کہ انہیں بالکل واضح کر دیا جائے اور انہیں ہی مخاطب قرار دیا جائے یہاں تک کہ اس دائرے میں حضرت ام سلمہ اور حضرت عائشہ کو بھی داخل نہیں ہونے دیتے اور چھ یا آٹھ یا نو ماہ تک مسلسل حضرت فاطمہؑ کے گھر کے سامنے اس جملے کا تکرار فرماتے ہیں کہ اس آیت سے مراد آپ (اہل بیت) ہیں اور آیت کے شروع میں لفظ انما جو کہ حصر پر دلالت کرتا ہے، انتہائی قابل توجہ ہے۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یکے بعد دیگرے کئی تاکیدوں کے ساتھ ہر قسم کے ابہام اور غلط فہمی کو دور کریں، لیکن عکرمہ اپنے مقصد کے لیے جسے وہ خود بہتر جانتے ہیں مباہلے سے آنحضرتؐ کے خلاف بات کو ثابت کرے اور بازاروں میں آ کر اس کے خلاف آواز بلند کرے۔

اصولی طور پر علمی گفتگو میں عکرمہ کا اس طرح جوش وخروش دکھانا اور مباہلہ کا اعلان کرنا شاذ و نادر ہے۔ اسی طرح علمی مسائل میں بازاروں میں آ کر آوازیں لگانے کی بھی کوئی مثال نہیں ملتی۔ یہ خود ایک واضح دلیل ہے کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ اور اس شور شرابے کے پیچھے کوئی اور مقصد پوشیدہ ہے کیا وہ اس امر پر مامور تھا کہ وقت کے حاکموں کے مفاد کے لیے اس عظیم اور الٰہی فضلیت کا انکار کرے اور احادیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اس ذلت ورسوائی کے ساتھ مقابلے کے لے اٹھ کھڑا ہو؟!

سوال:۲

اگر اہل بیت سے مراد صرف یہ پانچ مقدس نور ہیں تو پھر باقی اماموں کا کیا بنے گا؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اس وقت یہ پانچ ہستیاں موجود تھیں باقی امام بعد میں دنیا میں تشریف لائے ہیں اور یہ تمام صفات انہوں نے رسول خدا اور اپنے آباء سے وراثت میں پائی ہیں۔

---

[۱] تفسیر روح المعانی، ج ۲۲ ص ۱۲

[۲] تفسیر روح المعانی، ج ۲۲ ص ۱۳

سوال: ۳۳

جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا ہے کہ ''اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا''
میں جو ارادہ ہے وہ ارادہ تکوینی ہے نہ کہ تشریعی با الفاظ دیگر مراد یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا ہے کہ گناہوں کے قریب نہ جاؤ؛ کیونکہ یہ حکم خدا تو بلا استثناء تمام مسلمانوں کے لیے ہے اور اصحاب کساء کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ اس بنا پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ مراد اللہ کا ارادہ تکوینی اور اس کی مشیت یہ ہے کہ انہیں پاک رکھے اور ہر قسم کے گناہ سے انہیں بچائے رکھے، شیطان اور ہوائے نفس اور برائی سے انہیں محفوظ رکھے اور ہمیں معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہمیشہ پورا ہوتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔

یہ جو بعض لوگوں نے کہا ہے، کونسی چیز دنیا میں اللہ کے ارادے کے پورا ہونے میں رکاوٹ بن سکتی ہے مگر یہ کہ اللہ کا ارادہ کسی شرط سے مشروط ہو اور شرط پوری نہ ہو، معلوم ہے کہ آیت میں مذکورہ ارادہ مطلق ہے اور کسی شرط وقید سے مشروط نہیں ہے۔ اور بعض افراد کا جو یہ کہنا ہے کہ اس بات کا لازمہ یہ ہے کہ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بالخصوص اہل بدر سب کے سب معصوم ہوں کیونکہ اللہ سبحانہ نے ان کے حق میں فرمایا ہے:

وَلٰكِنْ يُرِيدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تشكرونَ

اللہ تعالیٰ تمہیں پاکیزہ بنانا چاہتا ہے اور اپنی نعمتیں تم پر تمام کرنا چاہتا ہے۔ تاکہ تم اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرو[1]

واقعاً یہ قابل افسوس ہے جب تعصب کی آگ بھڑکتی ہے تو اس کے شعلے سب چیزوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں اور جلا کر راکھ کر دیتے ہیں جنگ بدر کے بارے میں بالکل اس طرح کی کوئی آیت قرآن مجید میں نہیں ہے، جنگ بدر کے حوالے سے جو ہے وہ یہ آیت ہے:

وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ

(انفال/۱۱)

اللہ تعالیٰ نے آسمان سے تم پر پانی برسایا تاکہ تمہیں پاکیزہ کرئے اور شیطان کی پلیدی کو تم سے دور کرئے۔

واضح ہے کہ یہ آیت (بدر کے میدان میں) بارش کے برسنے اور پانی سے فاہدہ اٹھاتے ہوئے مسلمانوں کے اس سے غسل اور وضو کرنے سے متعلق ہے اور اس کا ہماری بحث سے کسی قسم کا کوئی ربط نہیں ہے لیکن اس صاحب نے تعصب میں آکر آیت کے ابتدائی حصے کو حذف کرتے ہوئے صرف ''لِيُطَهِّرَكُمْ'' کے جملے کو ذکر کیا ہے اور اسے تمام اصحاب کی پاکیزگی اور قداست پر دلیل قرار دیا ہے۔

البتہ یہ آیت ''وَلٰكِنْ يُرِيدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ۔ جنگ بدر کے مجاہدین کے

---

[1] تفسیر روح المعانی، ج ۲۲ ص ۱۷ (سورہ احزاب کی آیت ۳۳ کی تفسیر میں) تالیف: آلوسی

بارے میں نہیں بلکہ وضو، غسل، اور تیمم کی آیت کے ساتھ آئی ہے اور انتہائی واضح ہے کہ یہ آیت اس پاکیزگی کو بیان کر رہی ہے جو ان تین طہارتوں سے حاصل ہوتی ہے نجانے کس طرح اتنے مشہور مفسر آیت کو بدر کے میدان میں لے گئے اور وہ چیز جس کا تعلق وضو، غسل اور تیمم سے ہے اُسے عصمت کی بحث میں لے آئے ہمیں اس کی سمجھ نہیں آئی۔

یہاں پر ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اگر یہ آیت ان ہستیوں کی عصمت پر دلیل ہے تو پھر ''یُرِیدُ ''فعل مضارع کی صورت میں کیوں آیا ہے؟ اگر یہ افراد معصوم ہیں تو خدا کیوں فرماتا ہے ''اللہ یہ چاہتا ہے کہ ایسا ہو جائے۔'' کیا یہ تحصیل حاصل نہیں ہے؟ جو کہ ناممکن ہے کیوں یہ نہیں فرمایا گیا ''اَرَادَ الله ''؟ ''اللہ نے چاہا کہ شروع سے ایسا ہو''[1]

یہ سوال کرنے والا اگر لفظ ''یُرِیدُ'' کا قرآن مجید کی آیات میں بغور مطالعہ کرتا تو وہ ہرگز اس قسم کی بات نہ کرتا؛ کیونکہ بہت ساری آیات قرآن میں یہ لفظ ایسے امور کے لیے استعمال ہوا ہے جن میں اللہ کا ارادہ استمراری طور پر یعنی ماضی۔ حال اور مستقبل تینوں زمانوں میں جاری وساری ہے بالفاظ دیگر یہ جملہ زیادہ تر کسی چیز کے ارادے کے ماضی، حال اور مستقبل میں دوام اور استمرار کو ظاہر کرنے کے لیے آتا ہے اس بات کی سچائی درج ذیل آیات میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

وَمَا اللهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ (آل عمران/۱۰۸)

يُرِيْدُ اللهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (بقرہ/۱۸۵)

يُرِيْدُ اللهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ (نساء/۲۸)

بہت واضح ہے کہ ان آیات کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ماضی میں ظلم کا ارادہ کیا ہے۔ اس سے پہلے تمہارے لیے مشکلات اور سختی چاہتا تھا یا یہ کہ اس سے قبل وہ تمہارے بوجھ کو سبک وہلکا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ آج کے بعد اُس نے ایسا کیا ہے۔ بلکہ ان تمام آیات کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہی ارادہ ماضی میں تھا، حال میں ہے اور مستقبل میں رہے گا۔ اسی طرح شیطان کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:

وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًا بَعِيْدًا (نساء/۶۰)

اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ (مائدہ/۹۱)

بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ (قیامت/۵)

واضح ہے کہ ان آیات کا مقصد شیطان کے ماضی، حال اور مستقبل میں انسان کو گمراہ کرنے کے لیے جاری وساری مکروہ ارادے کو بیان کرنا ہے؛ شیطان اپنے ارادے کو ہر زمانے میں شراب اور جوئے کے ذریعے دشمنی اور عداوت پیدا کر کے پورا کرئے گا۔ اسی طرح تیسری آیت کا معنی یہ ہے کہ ناشکرا انسان ہمیشہ بے لگام رہنے کا اور گناہ کرنے کا خواہاں رہا ہے اسی وجہ سے وہ قیامت کا انکار کرتا ہے۔ ان

[1] تفسیر روح المعانی، ج ۲۲ ص ۱۷

چھ آیتوں کے علاوہ اور بہت ساری آیتیں قرآن میں موجود ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ ''یُرِیدُ'' ہر تین زمانوں میں بطور فعل استمراری استعمال ہوا ہے۔پس ثابت ہوا کہ آیت ''اِنَّمَا یُرِیدُ اللهُ لِیُذْهِبَ عَنْکُمُ الرِّجسَ'' کا مطلب یہ ہے کہ اصحاب کساء کی عصمت وطہارت اور قداست و پاکیزگی کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارادہ مستقل اور مستمرّ ہے۔

مسئلہ عصمت پر نکتہ چینی

انبیاء ؑ اور آئمہ ہدیٰ ؑ کی عصمت کے بارے میں بہت سارے سوال اٹھائے گئے ہیں ان میں بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا معصوم ہونے سے جبر لازم نہیں آتا؟ اگر مقام عصمت اللہ کی دین ہے جو صرف اور صرف ان عظیم ہستیوں کے نصیب میں آئی ہے۔اور انبیاء اور آئمہ معصومین گناہ انجام نہیں دے سکتے یا اللہ تعالیٰ گناہ کے اسباب زبردستی روک دیتا ہے تو پھر یہ کون سا کمال اور فضلیت ہے؟ اس سوال کا جواب تفصیل کے ساتھ عصمت انبیاء کے باب میں پیام قرآن کی ساتویں جلد میں دیا جا چکا ہے اس کا نچوڑ اور خلاصہ یہ ہے: اس اعتراض کی وجہ آئمہ ؑ کی عصمت کی بنیادوں کو نہ سمجھنا ہے انہیں اس بات کی سمجھ نہیں آئی کہ اس نا قابل شکست تقویٰ یعنی عصمت کا سرچشمہ مضبوط ایمان اور غیر معمولی علم وآگہی ہے۔ان میں سے ہر دو کا ایک حصہ اکتسابی اور ایک حصہ وہبی (عطا شدہ) ہے اس کی مثال اس اعلیٰ قسم کے ماہر ڈاکٹر کی طرح ہے جو کبھی بھی اس پانی کو منہ نہیں لگاتا جو کئی تجربات کے ذریعے ثابت ہو چکا ہے کہ وہ مہلک اور جان لیوا جراثیم سے پُر ہے۔

حالانکہ ایک جاہل اور ان پڑھ آدمی ایسے پانی کو پی لیتا ہے، اس ڈاکٹر کا گندے پانی سے اجتناب کرنا اگرچہ قطعی اور حتمی ہے، لیکن ایک مکمل اختیاری عمل ہے کیونکہ وہ چاہے تو پانی پی سکتا ہے لیکن اس کے اثرات اور نتیجے سے آگاہی پانی پینے میں رکاوٹ بن جاتا ہے، وہ اس کام کو انجام دینے میں مکمل آزادی کے ساتھ معصوم کی طرح ہے [۱]

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ خود اماموں نے اپنے الفاظ اور کلمات میں گناہوں اور غلطیوں کا اعتراف کیا ہے، اس صورت میں انہیں کیسے معصوم مانا جا سکتا ہے؟ وہ خود اپنی دعاؤں میں اللہ تعالیٰ سے گناہوں سے معافی اور بخشش طلب کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور یہ ان کے معصوم نہ ہونے پر دلیل ہے۔امام علی بن ابی طالب- نہج البلاغہ کے خطبہ ۲۱۶ میں فرماتے ہیں:

اِنِّی لَسْتُ فِی نَفْسِی بِفَوْقِ اَنْ اُخْطِی وَ لَا آمَنُ ذٰلِكَ مِنْ فِعْلِی اِلَّا اَنْ یَکْفِیَ اللهُ مِنْ نَفْسِی مَا هُوَ اَمْلَكُ بِهٖ مِنِّی۔ [۲]

میں (بحیثیت انسان) اپنے آپکو غلطی اور خطا کرنے سے بالاتر نہیں سمجھتا اور نہ ہی لغزشوں سے مبرا سمجھتا ہوں مگر یہ کہ اللہ میرے نفس کو اس سے بچائے رکھے کہ جس پر وہ مجھ سے زیادہ اختیار رکھتا ہے۔

---

[۱] مزید تفصیل کیلئے پیام قرآن کی جلد ۷ صفحہ ۱۹۳ تا ۱۹۷ مطالعہ۔

[۲] تفسیر روح المعانی کے مولف آلوسی نے آیت تطہیر کی تفسیر میں عجیب طرح سے سارا زور لگا کر یہ کوشش کی ہے آیت سے اہل بیت کے معصوم ثابت ہونے سے انکار کرے، اس کیلئے اس نے مذکورہ بالا اعتراضات پیش کیے ہیں، (روح المعانی، ج ۲۲ ص ۱۷)

اسی طرح کا اعتراض قرآن میں انبیاء کے واقعات سے متعلق آیات کے بارے میں بھی ہوسکتا ہے ان سب کا ذکر ہم بڑی تفصیل کے ساتھ اسی تفسیر کی ساتوں جلد میں تنزیہ انبیاء کے موضوع میں کر چکے ہیں، وہاں پر انبیاء کی تاریخ میں سے ہر اس واقعے کی طرف اشارہ کیا گیا جس میں اس قسم کے اعتراضات کی گنجائش تھی۔ پھر ان کا مفصل جواب بھی دیا گیا۔ یہاں پر مختصر طور پر چند نکات کی طرف اشارہ کرنے کی ضرورت ہے:

۱۔ بہت سارے مقامات پر معصومین نے نمونے کے طور پر لوگوں کے لیے گفتگو کی ہے اور ان کی ان باتوں میں ہدایت اور تعلیم کا پہلو موجود تھا، دلچسپ بات یہ ہے کہ تفسیر روح المعانی کے موئف نے امیر المومنین علیؑ کے بارے میں یہی اعتراض کرتے ہوئے یہی جواب دیا ہے اس کے بعد وہ لکھتے ہیں: جس طرح پیغمبر اکرم ﷺ کی بعض دعاؤں میں ہے اس طرح کا ہدایت اور تعلیم کا ارادہ علیؑ کے کلام میں بعید ہے۔[1]

معلوم نہیں، یہ قصد و ارادہ رسول خدا ﷺ کے کلام میں کیوں بعید نہیں اور علیؑ کے کلام میں کیوں بعید ہے؟ یہ بے اصولی کی انتہا ہے اور اس کی وجہ صرف اور صرف مفسر کا گہرا تعصب ہے۔

۲۔ بعض موارد میں معصومین کا ہدف یہ بتانا مقصود تھا کہ ہم عنایت خداوندی اور لطف پروردگار کے بغیر اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں ہیں۔ یہ سب اس کی عنایات، کرم نوازیاں اور اُسی کی دی ہوئی توفیقات ہیں کہ ہم معصوم ہیں۔ ایک جملہ حضرت علیؑ سے نقل ہوا ہے جو نکتہ چینی کرنے والے کے بالکل برعکس لطف خداوندی کی وجہ سے ان کے معصوم ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ کیونکہ امام -فرماتے ہیں میں ذاتی طور پر (اللہ تعالی کے لطف وکرم کے بغیر) غلطی سے محفوظ نہیں ہوں اور یہ فضلیت اللہ کی مدد کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی یا پھر سورہ یوسف کی اصطلاح کے مطابق ''برہان رب'' کے بغیر نہیں ہوسکتی۔

۳۔ بہت سارے مقامات پر جہاں آیات اور دعاؤں میں گناہ کا ذکر ہوا ہے، یہ ترک اولی کے سوا اور کچھ نہیں ہے اور ایک مشہور قول کا مصداق ہے۔ وہ قول یہ ہے: ''حَسَنَاتُ ٱلۡاَبۡرَارِ سَیِئَاتُ الۡمُقَرَّبِیۡنَ'' اس کا مطلب یہ ہے نیک افراد کی نیکیاں مقربین کے گناہ شمار ہوتی ہیں۔

اس نکتہ کو بیان کرنا بھی ضروری ہے کہ ''ترک اولی'' کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ انہوں نے کسی واجب کام کو ترک کیا ہے یا گناہ کا ارتکاب کیا ہے حتی کسی مکروہ کام کو انجام دیا ہے، بلکہ اس سے مراد کسی مباح کام کا انجام دینا ہے بلکہ دو مستحب کاموں میں سے اہم مستحب کو ترک کر کے کمتر مستحب کو انجام دینا ہے۔ واضح ہے کہ ایک بہتر مستحب کو ترک کر کے کم تر مستحب کو انجام دینا کسی لحاظ سے بھی بُرا کام اور گناہ نہیں ہے بلکہ اسے ترک اولی کہتے ہیں اور دوسروں کے لیے یہی کام نہ صرف برا نہیں ہے بلکہ مستحب کو انجام دینا ایک فضلیت شمار ہوتا ہے، جب کہ بارگاہ الٰہی میں مقرب بندوں کے لیے یہی کام عتاب کا باعث بنتا ہے۔

ایک عام آدمی سے جو نماز صحیح اور قابل قبول ہے وہی ایک بڑے عالم کے لیے ترک اولی ہے اور اُس بڑے عالم کی طرح نماز

---

[1] روح المعانی، ج ۲۲، ص ۱۷۔

معصوم کے مقام کے لائق نہیں ہے۔مزید مطالعہ کے لیے پیام قرآن کی ساتویں جلد کو دیکھیں۔[1]

آئمہ کی خصوصیات

جیسا کہ اس مطلب کی طرف کئی بار اشارہ کیا گیا ہے کہ آئمہ معصومین کے فرائض اور ذمہ داریاں کئی جہات اور پہلوؤں سے انبیاء کے فرائض اور ذمہ داریوں کی طرح ہیں۔صرف یہ کہ ان پر وحی نازل نہیں ہوتی اور وہ دین کے بانی نہیں ہیں بلکہ دین کے محافظ اور انبیاء کے مشن کو جاری وساری رکھنے والے ہیں۔اِسی بنا پر ایسی بہت ساری صفات جن کا انبیاء میں ہونا ضروری ہے ان کا ائمہ معصومین میں ہونا ضروری ہے۔ہم نے قرآنی آیات کی روشنی میں ان صفات کو تفصیل کے ساتھ ساتویں جلد میں پیغمبروں کی عمومی صفات کے عنوان سے بیان کر دیا ہے یہاں پر انہیں دوبارہ مفصل بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن یاددہانی کے لیے سرسری طور پر ان کا ایک جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔(یاد رہے کہ یہ تمام خصوصیات قرآن کی آیات میں پیغمبروں کے بارے میں بیان ہوئی ہیں) ہادیان برحق اور معصوم آئمہ میں علم اور عصمت کے ساتھ ساتھ درج ذیل صفات کا ہونا بھی لازمی ہے۔

۱۔سچائی اور صداقت

کیونکہ اگر یہ صفت نہ ہو تو پیشواؤں اور پیروکاروں کے درمیان معنوی اور روحانی تعلق کے لیے جس اعتماد اور اطمینان کی اشد ضرورت ہے وہ حاصل نہیں ہو سکے گا۔

۲۔اپنے وعدوں اور عہد و پیمان کی پابندی کرنا

اس کی دلیل یہ ہے کہ ان کا دعوت کا ایک اہم حصہ ان وعدوں پر مشتمل ہے جو وہ لوگوں کو دیتے ہیں اگر ”صادق الوعد“ (اپنے وعدوں کے سچے) نہ ہوں تو لوگوں میں اپنا اعتماد کھو بیٹھیں گے۔

۳۔احکام الٰہی کی حفاظت اور ان کے پہنچانے میں امانتداری

یہ بھی اعتماد اور اطمینان کا ایک اہم ستون ہے۔

۴۔عوام سے غیر معمولی محبت اور ہمدردی

اگر ان کے اندر یہ خصوصیت موجود نہ ہو تو وہ کبھی بھی لوگوں کی ہدایت اور رہبری کے لیے سخت مشکلات اور جان لیوا مشقتوں میں

---

[1] پیام قرآن: جلد ۷، صفحہ ۱۰۳ تا ۱۷۳۔

نہیں پڑیں گے خصوصاً بیوقوف، ضدی اور ہٹ دھرم افراد کی ہدایت کے لیے۔

۵۔خلوص اور مکمل بے لوث ہونا

ہر قسم کی جزا اور مادی توقع کے بغیر خدمت کرنا کیونکہ اگر یہ نہیں ہوگی تو ان کی دعوت اور رہبری میں جاذبیت اور کشش ختم ہو جائے گی۔

۶۔دوستوں حتیٰ دشمنوں کے حق میں نیکی اور بھلائی

یہ اللہ تعالیٰ کی رحمانیت اور رحیمیت کی صفات کا مظہر ہے اور پیشواؤں اور پیروکاروں کے درمیان معنوی اور روحانی رشتے اور تعلق سبب ہے۔

۷۔غیر معمولی شجاعت

قرآن مجید میں شجاعت اور غیر خدا سے نہ ڈرنا، پیغام الٰہی کے مبلغین کی بنیادی خصوصیت قرار دی گئی ہے، کیونکہ کامیابی کا اصل راز یہی ہے اور اس کے بغیر قیادت ورہبریت کا کوئی کام آگے نہیں بڑھ سکتا۔

۸۔اللہ پر مکمل بھروسہ

اکثر حالات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے رہبر وقائد اکیلا رہ جاتا ہے غیر معمولی فاسد ماحول اُسے سب سے الگ تھلگ کر دیتا ہے، اگر اس کا اللہ پر بھروسہ اور توکل نہ ہو تو وہ اپنے مشن کو جاری نہیں رکھ سکتا۔

۹۔حسن اخلاق اور نرمی

اس خصوصیت کا ذکر قرآن مجید کی آیات میں رسول اکرم ﷺ کے بارے میں ہوا ہے، درحقیقت ہر الٰہی رہبر (خواہ نبی ہو یا امام) میں اس خصوصیت کا ہونا ضروری ہے، بصورت دیگر سخت مزاجی، سختی اور ''فظا غلیظ القلب'' لوگوں کے انتشار اور دُور ہو جانے کا سبب بنے گا اور نتیجے کے طور پر اللہ کے ان نمائندوں کے آنے کا مقصد فوت ہو جائے گا۔

۱۰۔مشکل امتحانات میں کامیابی

قرآن مجید نے اسی امر پر حضرت ابراہیمؑ کو منصب امامت دیئے جانے کی بات ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ معصوم پیشواؤں کو آزمایش کی سخت بھٹیوں سے صحیح وسالم گزرنا چاہیے اور تمام مومنین کی جسمانی، روحانی، ظاہری

اور باطنی راہنمائی کی صلاحیت کو ثابت کرنا چاہیے۔ اس بحث کو مفصل طور پر آیات قرآن کی روشنی میں ساتویں جلد میں انبیاء کی عمومی صفات کے عنوان کے تحت بیان کیا جا چکا ہے۔

امام صرف اللہ کی طرف سے منصوب ہوتا ہے

امام کی خصوصیات اور ان کی صفات انبیاء کے ساتھ بہت سے پہلوؤں سے مشابہت کی ابحاث سے مجموعی طور پر نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ (پیغمبروں کے جانشین) معصوم اماموں کا تعین اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونا چاہیے۔ دوسرے الفاظ میں، اس موضوع میں نہ تو عوام کے انتخاب کا کوئی کردار ہے اور نہ ہی اجماع امت یا عام افراد کی طرف سے نامزدگی کا کردار ہے کیونکہ جن خصوصیات اور صفات کا امام میں ہونا ضروری ہے ان سے خدا کے سوا کوئی آگاہ نہیں ہے۔ ان میں سے اہم ترین صفت عصمت اور خاص علمی مقام ہے۔ امام ان دو بازوؤں اور پروں کے بغیر امامت اور مخلوقات کی راہنمائی اور رہبری کی فضا میں پرواز نہیں کرسکتا۔ کون جان سکتا ہے کہ فلاں شخص گناہ اور خطا سے پاک ہے اور وہ تمام شریعت اور انسانی زندگی کے مسائل کا مکمل علم رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ امام کے لیے مذکورہ بالا دیگر خصوصیات کی تشخیص بہت سارے افراد کے لیے بابعض اوقات تمام افراد کے لیے ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ امام کو معین کرنے کا واحد ذریعہ اللہ تعالیٰ ہے اُسی کی طرف سے امام کا تقرر ہونا چاہیے۔ یہ تقرر تین طریقوں سے ثابت ہوتا ہے:

اول: پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا پہلے والے امام معصوم کے ذریعے سے جو اپنے الٰہی جانشین کو حق تعالیٰ کے فرمان سے تعین کرتا ہے اور تمام لوگوں کو اس کا تعارف کراتا ہے درحقیقت اس مسئلے میں وہ حکم الٰہی کو لوگوں تک پہنچانے کا ذریعہ بنتا ہے۔

دوم: معجزات کے ذریعے جیسا کہ نبوت کے باب میں گزر چکا ہے یعنی امام کا ایسا فوق العادت کام انجام دینا جو بشری قوت کے بس سے باہر ہو اور وہ بھی چیلنج اور دوسروں کو مقابلے کی دعوت کے ساتھ ہو اس طرح سے کہ اگر وہ اس کو نہیں مانتے تو وہ اس جیسا کام کر کے دکھائیں، البتہ نبوت کے حوالے سے چیلنج نبوت کے میدان میں ہوتا ہے اور امامت کے مسئلہ میں چیلنج امامت کے بارے میں ہوتا ہے، عام الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ امامت کا دعویٰ کرنے والا شخص بشری طاقت سے مافوق کام انجام دے گا اور اسے دعویٰ امامت کے ساتھ انجام دے گا۔ مسلم بات ہے کہ اس فوق العادت کام انجام دینے کی قوت اُسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوئی ہے اور اللہ تعالیٰ جو کہ حکیم علیم، آگاہ اور خبیر ہے وہ ہرگز یہ قوت جھوٹے دعویداروں کے ہاتھ میں نہیں دے گا۔

سوم: جس طرح نبوت کی بحث میں بیان ہوا ہے، ایک تیسرا راستہ بھی موجود ہے اور وہ قرآئن اور شواہد کا اکٹھا کرنا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ صفات، اعمال اور خصوصیات کا ایسا اگر مجموعہ کسی میں پایا جائے کہ جسے دیکھ کر انسان یقین حاصل کر لے کہ وہ شخص معصوم امام اور الٰہی پیشوا ہے۔ اس کا علم و دانش، اس کی اعلیٰ انسانی اور اخلاقی صفات، اس کے کارنامے، اعمال، نظریات، اور منصوبے سب مل کر یہ ثابت کرتے ہیں کہ یقیناً وہ معصوم امام ہیں اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے برحق جانشین ہیں، اس بارے میں تفصیل ساتویں جلد کے "نبوت اور قرآن" کے باب کا مطالعہ کریں۔

انبیاء اور آئمہ علیہم السّلام کی ولایت تکوینی

اشارہ

ہم جانتے ہیں کہ ولایت دو قسم کی ہوتی ہے:

۱۔ولایت تشریعی ۲۔ولایت تکوینی

ولایت تشریعی سے مراد شرعی اور قانونی طور پر حاصل ہونے والا اختیار، تسلط اور سرپرستی ہے کبھی اس کا دائرہ محدود ہوتا ہے۔ جیسے نابالغ بچے پر باپ اور دادا کی ولایت، اور کبھی اس کا دائرے انتہائی وسیع اور عام ہوتا ہے جیسے اسلامی حکمران کی حکومت اور اسلامی ملک کو چلانے سے مربوط تمام امور اور مسائل میں ولایت ہے جس کے بارے میں انشااللہ پیام قرآن کی دسویں جلد میں مفصل بات کی جائے گی۔

لیکن ولایت تکوینی کا مطلب یہ ہے کہ کوئی انسان اللہ تعالی کے حکم اور اذن سے عالم خلقت اور کائنات میں ردوبدل کر سکے اور اسباب کی اس دنیا میں عالم طبیعت کے معمول کے برخلاف واقعات اور حالات پیدا کر دے۔ مثلا ناقابل علاج مریض کو اذن الٰہی سے یا اللہ کی دی ہوئی طاقت اور تسلط سے شفا دے دے یا مردوں کو زندہ کر دے اور اسی طرح کے دیگر کام ولایت تکوینی میں شمار ہوتے ہیں، علاوہ ازیں انسانی نفوس اور اجسام اور عالم طبیعت میں ہر قسم کا فوق العادت روحانی تصرف اسی قسم میں شامل ہے۔ ولایت تکوینی کی چار صورتیں ممکن ہیں جن میں سے بعض قابل قبول اور بعض ناقابل قبول ہیں:

۱۔کائنات کی خلقت اور آفرینش میں ولایت

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے کسی بندے یا اپنے فرشتوں میں سے کسی فرشتے کو یہ طاقت وتوانائی عطا کرئے کہ وہ کسی دنیا اور عالم کو خلق کرئے اُسے صفحہ ہستی سے مٹا دے۔ یقینا یہ امر محال نہیں ہے، کیونکہ اللہ سبحانہ ہر چیز پر قادر ہے اور ہر قسم کی قوت وطاقت کسی کو بھی عطا کر سکتا ہے، لیکن قرآنی آیات ہر مقام پر یہ بتاتی ہوئی نظر آتی ہیں کہ یہ کائنات، آسمان وزمین، جن وانس، فرشتے، ملک، پودے، حیوان، پہاڑ اور دریا سب کے سب رب کی قدرت سے پیدا ہوئے ہیں نہ کہ خاص بندوں یا فرشتوں کے ذریعے سے لہٰذا تمام جگہوں پر خلقت کی نسبت اُسی کی طرف دی گئی ہے اور کہیں پر بھی یہ نسبت (وسیع معنوں میں) اس کے غیر کی طرف نہیں دی گئی۔ بنابرایں آسمانوں، زمینوں، پودوں، حیوانوں اور انسانوں کا خالق صرف اور صرف اللہ ہے۔

۲۔ولایت تکوینی، واسطہ فیض ہونے کے معنی میں

اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالی کی طرف سے ہر قسم کی مدد، رحمت، برکت اور طاقت جو بندوں اور کائنات کی دیگر مخلوقات تک پہنچتی ہے وہ اولیاء الٰہی اور اس کے خاص بندوں کے ذریعے سے پہنچتی ہے، اس کی مثال شہر میں سپلائی کیے جانے والے صاف پانی کی طرح

ہے یہ سب پانی گھروں تک پائپ لائن کے ذریعے پہنچتا ہے اور یہ بڑی پائپ لائن پانی کو اصلی منبع سے حاصل کر کے شہر میں ہر جگہ تک پہنچاتی ہے اور اس پائپ لائن کو ''وسیلہ فیض'' کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ معنی بھی عقلی طور پر محال نہیں ہے۔ عالم صغیر (انسانی وجود) میں اس کا نمونہ موجود ہے انسان کے بدن میں غذائی مواد اور آکسیجن کا دِل کی شہہ رگ کے ذریعے جسم کے تمام حصوں تک پہنچنا، اس کی بہترین مثال ہے، جب عالم صغیر میں ایسا ہوسکتا ہے تو عالم کبیر (کائنات) میں ایسا ہونے میں کیا مانع ہے؟ لیکن بلاشک اس کو ثابت کرنے کے لیے کافی دلائل کی ضرورت ہے اور اگر یہ ثابت بھی ہو جائے تو پھر بھی ''باذن اللہ'' ہے۔

۳۔ خاص حدود کے اندر ولایت تکوینی

جیسے مردوں کو زندہ کرنا، لا علاج بیماروں کو شفا دینا وغیرہ اس قسم کی ولایت کی مثالیں قرآن مجید میں بعض انبیاء کے بارے میں واضح طور پر ذکر ہوئی ہیں جن کی طرف بعد میں اشارہ کیا جائے گا۔ اسلامی روایات بھی اس پر گواہی دیتی ہیں۔ اس لحاظ سے ولایت تکوینی کی یہ صورت نہ صرف عقلی اعتبار سے ممکن ہے بلکہ اس پر متعدد نقلی دلائل بھی موجود ہیں۔

۴۔ ولایت تکوینی، مطلوبہ امور کے وقوع پذیر ہونے کی دعا معنی میں

یعنی ان امور کے قدرت الٰہی کے ذریعے سے پورا ہونے اور انجام پانے کی دعا کرنا۔ اس طرح سے کہ نبی یا امام دُعا کریں اور جو انہوں نے خدا سے مانگا ہے وہ واقع ہو جائے۔ یہ صورت بھی عقلی اور نقلی لحاظ سے قابل اعتراض نہیں ہے۔ آیات اور روایات اس قسم کی مثالوں سے بھری پڑی ہیں۔ بلکہ ایک لحاظ سے اِسے ولایت تکوینی ہی نہ کہا جائے کیونکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی دعا کی قبولیت ہے۔

بہت ساری روایات میں ''اسم اعظم'' کے اشارے موجود ہیں جو کہ پیغمبروں، اماموں اور اولیا الٰہی (انبیاء اور آئمہ کے علاوہ) کے اختیار میں تھا اور وہ اس کے ذریعے سے کائنات اور عالم ہستی میں تصرف کرتے رہے۔ اس سے قطع نظر کہ اسم اعظم سے مراد کیا ہے (اس پر ہم نے صفات الٰہی میں سیر حاصل بحث کی ہے) اس قسم کی روایات ولایت تکوینی کی تیسری صورت پر مکمل طور پر منطبق ہوسکتی ہیں اور اس کے لیے دلیل بن سکتی ہیں۔ اب ہم ولایت تکوینی کے بارے میں آیات الٰہی کو بیان کرتے ہیں:

۱۔ وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝ وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ اَنِّىْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّىْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـــَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْىِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِىْ بُيُوْتِكُمْ ۭ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝
(آل عمران ۴۸۔۴۹)

۲۔ فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِىْ بِاَمْرِهٖ رُخَاۗءً حَيْثُ اَصَابَ ۝ (ص/۳۶)

۳۔قَالَ الَّذِیۡ عِنۡدَهٗ عِلۡمٌ مِّنَ الۡكِتٰبِ اَنَا اٰتِیۡكَ بِهٖ قَبۡلَ اَنۡ یَّرۡتَدَّ اِلَیۡكَ طَرۡفُكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسۡتَقِرًّا عِنۡدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنۡ فَضۡلِ رَبِّیۡ ۖ لِیَبۡلُوَنِیۡۤ ءَاَشۡكُرُ اَمۡ اَكۡفُرُ ؕ وَمَنۡ شَكَرَ فَاِنَّمَا یَشۡكُرُ لِنَفۡسِهٖ ۚ وَمَنۡ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّیۡ غَنِیٌّ كَرِیۡمٌ ﴿۴۰﴾ (نمل/۴۰)

ترجمہ

۱۔اور اللہ اُسے کتاب وحکمت اور توریت وانجیل کی تعلیم دے گا۔اور وہ اُسے بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجے گا(اور وہ کہے گا)میں تمہارے پرودگار کی طرف سے نشانی لے کرتمہارے پاس آیا ہوں(وہ یہ کہ) میں تمہارے سامنے مٹی سے پرندے کی شکل کا مجسمہ بناتا ہوں اوراس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ خدا کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے اور میں اللہ کے حکم سے مادرزاد اندھے اور برص کے مریض کو شفا دیتا ہوں اور مردے کوزندہ کرتا ہوں اور میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تم کیا کھاتے ہواوراپنے گھروں میں کیا ذخیرہ کرتے ہو، اگرتم صاحبان ایمان ہوتو اس میں تمہارے لیے نشانی ہے۔

۲۔پھرہم نے ہوا کوان کے لیے مسخر کردیا؛ جدھروہ جانا چاہتے تھےان کے حکم سے نرمی کے ساتھ اسی طرف چل پڑتی تھی۔

۳۔جس کے پاس کتاب کا کچھ علم تھا وہ کہنے لگا: میں آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے اسے آپ کے پاس حاضر کیے دیتا ہوں جب سلیمان نے اُسے اپنے سامنے نصب شدہ دیکھا تو کہا: یہ میرے پروردگار کا فضل ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا کفران اور جو کوئی شکر کرتا ہے وہ اپنے فائدے کے لیے شکر کرتا ہے،اور جو ناشکری کرتا ہےتو میرا رب یقیناً بے نیاز اور صاحب کرم ہے۔

سب سے پہلی آیت میں ابتداء میں حضرت عیسیٰؑ پر اللہ تعالیٰ کی خاص عنایتوں کا ذکر ہےارشاد ہوتا ہے:

''اللہ نے انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دی اور انہیں تورات وانجیل عطا کی''

وَیُعَلِّمُهُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَالتَّوۡرٰىةَ وَالۡاِنۡجِیۡلَ ﴿۴۸﴾

اس کے بعد''اُس نے انہیں رسول کی حیثیت سے بنی اسرائیل کی طرف بھیجا''(وَرَسُولاً اِلٰی بنی اسرائیل)اس کے بعد حضرت عیسیٰؑ نے اپنی حقانیت کوثابت کرنے کے لیے جو کچھ کہا،اُسے اوران کے معجزات کی تفصیل آیت میں بیان کی گئی ہے۔ان کے معجزات کو پانچ حصوں میں ذکر کیا گیا ہے۔سب سے پہلے وہ فرماتے ہیں:

میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے لیے نشانی اور معجزہ لے کرآیا ہوں اور وہ یہ ہے کہ مٹی سے پرندے کی شکل بناتا

ہوں پھر اس میں پھونک مارتا ہوں اور وہ حکم خدا سے پرندہ بن جاتا ہے۔ (اَنِّیْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّیْۤ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّیْنِ كَهَیْـَٔةِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْهِ فَیَكُوْنُ طَیْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ) دوسرا اور تیسرا معجزہ یہ ہے کہ میں مادر زاد اندھے اور برص کے مریض (لاعلاج مرض) کو تندرست کر دیتا ہوں (وَ اُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَ الْاَبْرَصَ) چوتھا یہ کہ: میں مردوں کو اللہ کے اذن سے زندہ کرتا ہوں (وَ اُحْیِی الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰهِ) پانچواں معجزہ یہ کہ جو کچھ کھاتے ہو اور گھروں میں ذخیرہ کرتے ہو میں تمہیں اس کے بارے میں خبر دیتا ہوں (اور آگاہ کرتا ہوں) اگر تم صاحبان ایمان ہو تو اس میں تمہارے لیے نشانی ہے۔

وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِیْ بُیُوْتِكُمْ ۭ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۴۹﴾

اس آیت کے مفہوم اور اس میں استعمال ہونے والے الفاظ میں غور وفکر کرنے سے یہ نکتہ بخوبی واضح ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ ؑ پرندے کی آفرینش کو خدا کی طرف نسبت دیتے ہیں جب کہ دیگر تین معجزات (مادر زاد اندھے اور برص کے مریض کو شفا دینے اور مردوں کو زندہ کرنے) کو اپنی طرف منسوب کرتے ہیں البتہ اللہ کے حکم اور اذن سے، ولایت تکوینی سے مراد یہی ہے کہ کبھی اللہ تعالیٰ انسان کو ایسی قدرت دیتا ہے کہ وہ اس کے حکم سے کائنات اور عالم طبیعت میں تصرف کر سکتا ہے معمول کے اسباب و وجوہات کو درہم برہم کر سکتا ہے، مردے کو زندہ کر سکتا ہے اور ناقابل علاج بیماروں کو شفا دے سکتا ہے۔

یہ تھا ولایت تکوینی کا ایک نمونہ، جو خدا نے اپنے بندے حضرت عیسیٰؑ کو عطا فرمایا اور اس قسم کی چیز دوسرے انبیاء یا اماموں کو عطا کرنے میں کوئی مانع اور رکاوٹ نہیں ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ دعا کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ اُس بیمار کو شفا دے دیتا تھا یا اُس مردے کو زندہ کر دیتا تھا، تو یہ بات آیت کے ظاہری مفہوم کے خلاف ہے کیونکہ آیت بڑی صراحت کے ساتھ کہہ رہی ہے کہ "میں اس کام کو حکم خدا سے انجام دیتا ہوں" یعنی اُسے خود انجام دیتا ہوں البتہ باذن اللہ۔ لہٰذا ہمارے پاس آیت کے آشکار مفہوم کو چھوڑ کر اس کے برخلاف معنیٰ کو اختیار کرنے پر کوئی دلیل نہیں ہے۔

بلکہ پرندے کی پیدائش کے مرحلے میں بھی کوئی مانع نہیں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی پھونک میں خدا نے یہ اثر عطا کر دیا ہو کہ وہ اذن الٰہی سے ایسا کام انجام دے سکتے ہوں۔ اگرچہ بہت سارے مفسرین نے اس معنیٰ کو قبول نہیں کیا اور کہا ہے کہ پرندے کی پیدائش براہ راست اللہ تعالیٰ سے مربوط تھی اور شاید ان الفاظ کو اس لیے لایا گیا ہو کہ جاہل افراد حضرت عیسیٰؑ کی الوہیت اور خدائی کا دعویٰ نہ کریں کیونکہ خلقت کا مسئلہ صرف خدا سے وابستہ ہے۔

اسی طرح کا مطلب سورہ مائدہ کی آیت ۱۱۰ میں بھی بیان ہوا ہے، البتہ خدا کی طرف سے حضرت عیسیٰؑ کو خطاب کی صورت میں نہ حضرت عیسیٰؑ کی اپنی زبان سے، ارشاد رب العزت ہے:

وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّیْنِ كَهَیْـَٔةِ الطَّیْرِ بِاِذْنِیْ فَتَنْفُخُ فِیْهَا فَتَكُوْنُ طَیْرًۢا بِاِذْنِیْ وَتُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِیْ ۚ وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰی بِاِذْنِیْ ۚ

(یاد کرو میری نعمت کو) جب تم میرے حکم سے مٹی سے پرندے کا مجسمہ بناتے تھے پھر تم اس میں پھونک مارتے تھے تو وہ میرے حکم سے پرندہ بن جاتا تھا اور تم مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو میرے حکم سے صحت یاب کرتے تھے اور میرے حکم سے مردوں کو (زندہ کرکے) نکال کھڑا کرتے تھے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ سورہ آل عمران میں جو الفاظ کا اختلاف تھا بالکل وہی اختلاف یہاں بھی نظر آرہا ہے۔ یعنی پرندے کی خلقت اور پیدائش کو حضرت عیسیٰؑ کی طرف نسبت نہیں دی گئی لیکن مردوں کو زندہ کرنے، لاعلاج مریضوں، مادرزاد اندھوں کو شفا دینے کی نسبت حضرت عیسیٰؑ کی طرف دی گئی ہے، اگرچہ ''باذن اللہ'' صریحاً ان سب میں مذکور ہے۔ مختصر یہ ہے کہ یہ آیات واضح طور پر ولایت تکوینی کے مسئلے کو حضرت عیسیٰؑ کے لیے محدود اور خاص دائرے میں ثابت کررہی ہیں، اور اس پر کوئی دلیل نہیں ہے کہ یہ مسئلہ فقط حضرت عیسیٰؑ میں منحصر ہے، اور اس قول ''حُكْمُ الاَمْثَالِ فِي مَا يَجُوزُ و ما لايَجُوزُ واحد'' کی رُو سے دیگر پیغمبروں یا معصوم اماموں کے لیے بھی ہو سکتا ہے۔

دوسری آیت میں حضرت سلیمان کے لیے ہوا کا تابع فرمان ہونے کی بات ہوئی ہے، ارشاد ہوتا ہے: ''ہم نے ہوا کو ان کے لیے مسخر کردیا کہ وہ ان کے حکم سے نرمی سے چلے اور جہاں وہ چاہیں انہیں لے جائے۔'' (فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيحَ تَجْرِي بِأَمْرِهِ رُخَاءً حَيْثُ أَصَابَ) اس آیت اور اس کے بعد والی آیات سے واضح طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس طرح شیاطین حضرت سلیمان کے تابع تھے اور ان کے لیے خشکی اور سمندر میں بڑے بڑے کام انجام دیتے تھے اسی طرح ہوا بھی ان کے تابع تھی وہ جہاں اُسے حکم دیتے وہ ادھر کو چلنے لگتی اور یہ چیز ان مخلوقات میں ولایت تکوینی کا ہی مصداق ہے، اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ اسی طرح کا مطلب سورہ انبیاء کی آیت ۸۱ میں بھی بیان ہوا ہے: ارشاد ہوتا ہے:

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيحَ عَاصِفَةً تَجْرِي بِأَمْرِهِ إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي بٰرَكْنَا فِيهَا ط

اور سلیمان کے لیے تیز ہوا کو مسخر کیا جو ان کے حکم سے اس سرزمین تک چلتی تھی جسے ہم نے بابرکت بنایا تھا۔

یہاں پر بھی تیز ہوا پر حضرت سلیمان کے تسلط اور حکمرانی کی بات ہوئی ہے۔ یہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی احتمال ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے قصے میں بھی ولایت تکوینی کے مصداق موجود ہیں، مثال کے طور پر چٹان پر ان کا عصا مارنا اور اُس سے حکم الٰہی سے بارہ چشموں کا پھوٹنا (بقرہ/ ٦٠) اور ان کا دریا پر عصا کو مارنا جس کے بارے میں قرآن فرماتا ہے: ہم نے موسیٰ کو وحی کی کہ اپنے عصا کو دریا پر ماریں چنانچہ دریا پھٹ گیا۔ (شعراء/ ٦٣) خلاصہ کلام یہ ہے کہ وہ تمام مقامات جہاں اللہ تعالیٰ اپنے کسی خاص بندے کو کائنات اور عالم خلقت میں تصرف کرنے کی قوت و توانائی عطا فرماتا ہے۔ یہ ولایت تکوینی کی ایک قسم ہے جو خدا کے اس خاص بندے کو حاصل ہوتی ہے۔

تیسری آیت میں ان افراد کے لیے ولایت تکوینی کی بات ہورہی ہے جو حضرت سلیمان کے قریبی ساتھی تھے۔ البتہ ان کا نام قرآن میں نہیں آیا ہے بلکہ ان الفاظ ''الّذی عِنْدَہ علم من الکتاب'' میں ان کی توصیف بیان کی گئی ہے کہ ''جس کے پاس کتاب کا کچھ علم تھا'' جب حضرت سلیمان نے اپنے اصحاب اور درباریوں سے فرمایا: تم میں سے کون ہے جو ملکہ سبأ کا تخت میرے پاس لے آئے

قبل اس کے کہ وہ فرمانبردار ہو کہ میرے پاس آئیں۔

قَالَ يَا اَيُّهَا الْمَلَأُ اَيُّكُمْ يَأْتِيْنِي بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَأْتُونِي مُسْلِمِينَ

جنوں میں سے ایک عیار نے کہا میں اسے آپ کے پاس حاضر کر دیتا ہوں قبل اس کے آپ اپنی جگہ سے اٹھیں:

(قَالَ عِفْرِيتٌ مِنَ الْجِنِّ اَنَا آتِيكَ بِهِ قَبْلَ اَنْ تَقُومَ مِنْ مَقَامِكَ)

اس کے بعد فرمایا: جس کے پاس کتاب میں سے کچھ علم تھا، اُس نے کہا میں آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے اِسے آپ کے پاس حاضر کر دیتا ہوں:

(قَالَ الَّذِي عِنْدَهُ عِلْمٌ مِنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيكَ بِهِ قَبْلَ اَنْ يَرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ ؕ)

البتہ یہ صرف دعویٰ نہیں تھا بلکہ اُس نے اسے عملی کر دکھایا کیونکہ آیت مزید کہتی ہے کہ:

فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهُ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ ۖ

اور جب اُس نے تخت کو اپنے سامنے حاضر دیکھا تو کہنے لگے یہ میرے پروردگار کا فضل وکرم ہے (کہ میرے بعض ساتھیوں میں یہ طاقت وتوانائی ہے) یہاں پر بہت ساری بحث وگفتگو ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ جس کے پاس کتاب کا علم تھا وہ کون تھا؟ مشہور ومعروف یہی ہے کہ وہ حضرت سلیمان کے وزیر آصف بن برخیا تھے کہا جاتا ہے کہ وہ ان کے بھانجے تھے۔ تفسیر عیاشی کی ایک روایت میں یحییٰ بن اکثم کے سوال کے جواب میں امام علی بن محمد النقیؑ نے جو فرمایا ہے، اس کے مطابق آصف، حضرت سلیمان کے وصی اور جانشین تھے اور صاحب مقام نبوت تھے، حضرت سلیمان اس عمل کے ذریعے اس کے مقام ومنزلت کا لوگوں سے تعارف کرانا چاہتے تھے، ورنہ خود حضرت سلیمان اس کام کو انجام دینے کی کہیں زیادہ توانائی رکھتے تھے۔[1]

بعض افراد کا یہ بھی خیال ہے کہ یہ خود حضرت سلیمان تھے[2] مگر یہ احتمال آیت کے ظاہری معنی کے خلاف ہے۔ بعض نے یہ خیال کیا ہے کہ یہ شخص بنی اسرائیل کا ایک فرد تھا، معلوم ہے کہ یہ تفسیر اس تفسیر کے قطعاً منافی نہیں ہے جو کہتی ہے کہ یہ آصف بن برخیا تھے۔ کیونکہ ظاہراً تو وہ بھی بنی اسرائیل سے تھے، بہر حال یہاں پر جو چیز ہمارے مدنظر ہے وہ شخص نہیں ہے، ہمارے پیش نظر یہ بات ہے کہ اولیاء الٰہی میں سے ایک فرد علم الکتاب یا اسم اعظم رکھنے یا کسی اور چیز کے ذریعے کائنات اور عالم اسباب میں تصرف کرنے کی طاقت رکھتا تھا اور اس نے چشم زدن میں ملکہ سبا کے تخت کو عرب کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچا دیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ چیز دوسرے

---

[1] تفسیر نور الثقلین، جلد ۴، صفحہ ۹۱، حدیث ۷۷۔ تفسیر الدر المنثور میں بھی یہ مفہوم ابن عباس اور بعض دیگر محدثین سے پوری صراحت کے ساتھ نقل کیا گیا ہے کہ یہ بات کہنے والے آصف بن برخیا تھے کہ جن کا دوسرا نام "تملیخا" ہے۔

[2] المیزان نے یہ احتمال جلد ۱۵، صفحہ ۳۶۳ پر نقل کیا ہے اور اس پر اعتراض کیا ہے۔

اولیاء خدا، پیغمبروں اور اماموں کے لیے بھی ہوسکتی ہے۔

خصوصاً ان روایات کی روشنی میں جو امام محمد باقر – سے بیان ہوئی ہیں: انہوں نے فرمایا ہے: اللہ کے اسم اعظم کے تہتر حرف (۷۳ نام) ہیں۔ آصف کے پاس فقط ایک حرف تھا جس کے ذریعے اس نے بات کی اس کے اور تخت بلقیس کے درمیان زمین سمٹ گئی اور اس نے تخت کو پکڑ لیا اور پھر زمین اپنی اصلی حالت پر آ گئی اور یہ سب کچھ چشم زدن سے بھی کم وقت میں ہوا، اور ہمارے پاس اس اسم کے بہتر (۷۲) حرف ہیں اس کا ایک حرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اور علم غیب میں اُسی ذات کے ساتھ مخصوص ہے اور کوئی قوت و طاقت اذن الٰہی کے بغیر نہیں ہے۔[1]

یہی مطلب امام باقر –، امام صادق – اور دیگر آئمہ اہل بیتؑ سے منقولہ روایات میں بیان ہوا ہے۔ گزشتہ آیات سے مجموعی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قرآن مجید کی نظر میں ولایت تکوینی ایک ممکن اور قابل قبول چیز ہے۔

ولایت تکوینی احادیث میں

اسلامی روایات میں معجزات کے بہت سارے واقعات موجود ہیں جو ولایت تکوینی کی صورت میں رونما ہوئے ہیں۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ معجزات کی انواع و اقسام ہیں، بعض صرف نبی یا امام کی دعا سے واقع ہوئے ہیں بعض لوگوں کے مطالبے کے ساتھ اذن الٰہی سے انجام پائے ہیں اور بعض خود ان کی اپنی طرف سے ان کے عمل سے واقع ہوئے ہیں یعنی ان کے روحانی اور معنوی تصرف اور تسلط کی وجہ سے اور اللہ کے اذن سے انجام پائے ہیں اور یہ امر یہی ولایت تکوینی ہے جس پر ہم گفتگو کر رہے ہیں۔

ایسے واقعات کی تعداد بہت زیادہ ہے یہاں پر ہم نمونے کے طور پر چند کا ذکر کرتے ہیں:

۱۔ اس کا ایک بہترین نمونہ نہج البلاغہ کے خطبہ قاصعہ میں بیان ہوا ہے۔ حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

وَلَقَدْ كُنْتُ مَعَهُ لَمَّا أَتَاهُ الْمَلَأُ مِنْ قُرَيْشٍ فقالُوا له يا مُحَمَّدُ......[2]

میں رسول ﷺ کے ساتھ تھا کہ قریش کی ایک جماعت آپ کے پاس آئی اور انہوں نے آپ سے کہا کہ اے محمدؐ! آپ نے ایک بہت بڑا دعویٰ کیا ہے، ایسا دعویٰ نہ تو آپ کے باپ دادا نے کیا نہ آپ کے خاندان والوں میں سے کسی اور نے کیا ہم آپ سے ایک امر کا مُطالبہ کرتے ہیں اگر آپ نے اُسے پُورا کر کے ہمیں دکھلا دیا تو پھر ہم بھی یقین کر لیں گے کہ آپؐ نبی اور رسول ہیں اور اگر نہ کر سکے تو ہم جان لیں گے کہ (معاذ اللہ) آپ جادُوگر اور جُھوٹے ہیں حضرت نے فرمایا کہ تمہارا مطالبہ کیا ہے؟

---

[1] کافی تفسیر برہان کے نقل کے مطابق، جلد ۳، صفحہ ۲۰۳، حدیث ا۔

[2] نہج البلاغہ، خطبہ قاصعہ۔

انہوں نے کہا کہ آپ ہمارے لیے اس درخت کو پکاریں کہ یہ جڑ سمیت اکھڑ آئے اور آپ کے سامنے آکر ٹھہر جائے آپ نے فرمایا کہ بلاشبہ اللہ ہر شے پر قادر ہے۔ اگر اُس نے تمہارے لیے ایسا کر دکھایا تو کیا تم ایمان لے آؤ گے اور حق کی گواہی دو گے؟ اُنہوں نے کہا کہ ہاں۔ آپؐ نے فرمایا کہ اچھا جو تم چاہتے ہو تمہیں دکھائے دیتا ہوں اور میں یہ اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم بھلائی کی طرف پلٹنے والے نہیں ہو، یقیناً تم میں کچھ لوگ تو وہ ہیں جنہیں چاہ (بدر) میں جھونک دیا جائے گا اور کچھ وہ ہیں جو (جنگ) احزاب میں جتھا بندی کریں گے۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ اے درخت اگر تُو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اور یہ یقین رکھتا ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں، تُو اپنی جڑ سمیت اکھڑ آ یہاں تک کہ تو بحکم خدا میرے سامنے آکر ٹھہر جائے۔ (رسولؐ کا یہ فرمانا تھا کہ) اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا وہ درخت جڑ سمیت اکھڑ آیا اور اس طرح آیا کہ اُس سے سخت کھڑکھڑاہٹ اور پرندوں کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ کی سی آواز آتی تھی یہاں تک کہ وُہ لچکتا جُھومتا ہُوا رسُول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رُوبرُو آکر ٹھہر گیا اور بلند شاخیں اُن پر اور کچھ شاخیں میرے کندھے پر ڈال دیں اور میں آپؐ کی دائیں جانب کھڑا تھا۔ جب قریش نے یہ دیکھا تو نخوت وغرور سے کہنے لگے کہ اسے حکم دیں کہ آدھا آپ کے پاس آئے اور آدھا اپنی جگہ پر رہے۔ چنانچہ آپؐ نے اُسے یہی حکم دیا تو اُس کا آدھا حصہ آپؐ کی طرف بڑھ آیا اس طرح کہ اُس کا آنا (پہلے آنے سے بھی) زیادہ عجیب صُورت سے اور زیادہ تیز آواز کے ساتھ تھا اور اب کہ وُہ قریب تھا کہ وہ رسُولؐ سے لپیٹ جائے۔

اب انہوں نے کفر وسرکشی سے کہا کہ اچھا اب اس آدھے کو حکم دیجیے کہ یہ اپنے دُوسرے حصے کے پاس پلٹ جائے جس طرح پہلے تھا۔ چنانچہ آپؐ نے حکم دیا اور وُہ پلٹ گیا میں نے (یہ دیکھ کر) کہا کہ لا الہ الا اللہ، اے اللہ کے رسُولؐ میں آپ پر سب سے پہلے ایمان لانے والا ہوں، اور سب سے پہلے اِس کا اقرار کرنے والا ہُوں کہ اس کے درخت نے بحکم خدا آپؐ کی نبوت کی تصدیق اور آپ کے کلام کی عظمت وبرتری دِکھانے کے لیے جو کچھ کیا ہے وُہ امر واقعی ہے۔ یہ سُن کر وہ ساری قوم کہنے لگی کہ یہ (نعوذ باللہ) پرلے درجے کے جھوٹے اور جادوگر ہیں، ان کا سحر عجیب وغریب ہے اور ہیں بھی اس میں چابکدست۔ اس امر پر تصدیق ان جیسے ہی کر سکتے ہیں اور اس سے مراد مجھے لیا۔ میں تو اس جماعت میں سے ہوں جن پر اللہ کے بارے میں کوئی ملامت اثر انداز نہیں ہوتی وہ جماعت ایسی ہے جن کے چہرے سچوں کی تصویر اور جن کا کلام نیکوں کے کلام کا آئینہ دار ہے۔ وہ شب زندہ دار دِن کے روشن مینار اور خدا کی رسی سے وابستہ ہیں۔ یہ لوگ اللہ کے فرمانوں اور پیغمبر کی سنتوں کو زندہ کرتے ہیں نہ یہ تکبر اور غرور کرتے ہیں نہ خیانت کرتے ہیں اور نہ فساد پھیلاتے ہیں ان کے دِل جنت میں اٹکے ہوئے اور جسم اعمال میں لگے ہوئے ہیں۔

اس خطبے کے الفاظ پر ذرا غور کریں تو یہ واضح طور پر بتا رہے ہیں کہ یہ فوق العادت امر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عالم تکوین پر تصرف اور تسلط کی وجہ سے وقوع پذیر ہوا ہے۔ اس بنا پر جو کچھ عبارت کے اس جملے: ''اِنَّ الشَّجَرَ فَعَلَتْ بِاَمْرِ اللّٰہِ تعالٰی'' (درخت نے جو کچھ کیا وہ اللہ کے حکم سے تھا) میں آیا ہے یہ اذن اور خدا کی اجازت سے تھا اور اُس قوت وتوانائی سے ہوا جو خدا نے اپنے رسول کو اس قسم کے تصرفات کے لیے عطا کی تھی، جیسا کہ اس عبارت کے شروع میں ''اذن اللہ'' کا لفظ آیا ہے۔ لہٰذا اس قسم کے الفاظ کہ حکم دے، امر کرو یہ اور وہ ہو جائے اسی طرح پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا درخت سے فرمانا: اے درخت ایسے کرو یہ سب اس امر پر دلیل ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو

ولایت تکوینی حاصل تھی۔

۲۔علامہ مجلسی نے بحارالانوار میں سلمان فارسی سے یوں بیان کیا ہے:

جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینے میں تشریف لائے تو لوگوں نے آپؐ کے اونٹ کی مہار پکڑ لی (اور ہر ایک یہی چاہتا تھا کہ پیغمبر اکرمؐ اس کے گھر میں ٹھہریں) آنحضرتؐ نے فرمایا:

اونٹی کو چھوڑ دو، وہ مامور ہے وہ جس کے گھر کے سامنے بیٹھے گی میں اُسی کے گھر میں قیام کروں گا (اور یہ ہر قسم کے اختلاف اور جھگڑوں کے حل کا بہترین طریقہ تھا) انہوں نے ناقہ کو چھوڑ دیا وہ اسی طرح چلتی ہوئی مدینے کی گلیوں میں داخل ہوئی اور حضرت ابوایوب انصاری کے گھر کے دروازے پر بیٹھ گئی اور مدینے میں وہ سب سے زیادہ غریب تھا، قریب تھا کہ لوگوں کے دل حسرت سے پھٹ جائیں کہ آنحضرتؐ ان کے پاس کیوں نہ ٹھہرے (اور یہ عظیم سعادت انہیں نصیب نہ ہوئی) ابوایوب نے آواز دی: اے ماں! دروازہ کھولو:

"فَقَدْ قَدِمَ سَيِّدُ الْبَشَرِ وَ اَكْرَمُ رَبِيعَةِ وَ مُضَرٍ مُحَمَّدُ المصطفٰى وَ الرَّسولِ الْمُجْتَبٰى"

''انسانوں کے سردار، ربیعہ اور مضر قبیلہ کے بزرگ، محمد مصطفٰی اور رسول مجتبٰی تشریف لائے ہیں''

اس کی ماں نے دروازہ کھولا اور باہر آئی وہ نابینا تھی۔ اس نے کہا: کاش! میری آنکھیں ہوتیں اور میں اپنے آقا و مولا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کرتی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوایوب کی والدہ کے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ اس کی آنکھوں نے دیکھنا شروع کر دیا یہ پہلا معجزہ تھا جو آپؐ سے ظاہر ہوا۔ (ممکن ہے چہرے پر ہاتھ رکھنے سے مراد اشارے سے ہاتھ پھیرنا ہو یا کپڑے کے اوپر ہاتھ پھیرنا مقصود ہو)[1]

۳۔ یہ بھی شیعہ و سنی کتب میں مذکور ہے کہ جنگ خیبر میں جب بعض کمانڈروں کے ذریعے فتح نصیب نہ ہوئی تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کل میں اس کو علم دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول کو دوست رکھتا ہوگا اور اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھ پر فتح عطا کرے گا، اس کے بعد آپؐ نے علیؑ کو بلایا، وہ آشوب چشم کے درد میں مبتلا تھے، حضرت علیؑ، آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت شرفیاب ہوئے۔ آنحضرتؐ نے اپنا لعاب دہن ان کی آنکھوں میں پر لگایا اس کے بعد آنکھوں کی تکلیف جاتی رہی اس کے بعد انہوں نے پرچم ان کے حوالے کیا (اور انہوں نے خیبر کو فتح کیا)۔[2]

یہ مشہور حدیث ثابت کرتی ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے تکوینی اثر و نفوذ سے (باذن اللہ) علی کی آنکھوں کو شفا بخشی۔

۴۔حضرت امیر المومنین علیؑ کے حالات زندگی میں بیان ہوا ہے کہ ان کے زمانے میں دریائے فرات میں ایسی طغیانی آئی کہ کوفے کے لوگ خوفزدہ ہو گئے اور ان کی خدمت میں آ کر کہنے لگے ہمیں ڈوبنے کا خطرہ ہے کیونکہ پانی اتنا اونچا آ گیا ہے کہ اس سے پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ ہر طرف پانی ہی پانی ہے، خدا کے لیے ہماری مدد کریں!

امیر المومنین -سواری پر سوار ہوئے لوگ آپ کے دائیں اور بائیں طرف ہو لیے اور فرات کی طرف چلنے لگے۔ جب فرات پر

---

[1] بحارالانوار ج۱۹، صفحہ ۱۲۱۔

[2] اس حدیث کو ابن اثیر نے کامل میں بطور مفصل بیا کیا ہے (جلد ۲ ص ۲۱۹) اسی طرح ابن ہشام نے سیرۃ نبویہ کی جلد ۳، ص ۳۴۹ اور علامہ مجلسی نے بحارالانوار میں جلد ۲۱، صفحہ ۲۹۸، حدیث ۳۰۔

پہنچے تو دیکھا کہ دریا کی موجیں بپھری ہوئی ہیں اور ہر طرف پانی نظر آرہا ہے۔حضرت علیؑ کھڑے ہوگئے لوگ ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے عبرانی زبان میں کچھ کہا: اچانک فرات کا پانی ایک ہاتھ نیچے چلا گیا۔آپ نے لوگوں کی طرف رخ کر کے کہا: کافی ہے؟ لوگ عرض کرنے لگے: اور زیادہ نیچے کریں۔آپ کے ہاتھ میں جو چھڑی تھی اُسے آپ نے پانی پر مارا۔ پانی اور زیادہ نیچے ہوگیا (لوگ خوشی خوشی دریا سے واپس لوٹ گئے) (ا) تو یہاں سوال یہ ہے کہ آیا یہ کام باذن الٰہی سے تکوینی تصرف کے علاوہ کوئی اور چیز ہے؟

۵۔حضرت علیؑ کے حالات زندگی میں یہ بھی ملتا ہے کہ وہ کوفہ کے قریب سے گزر رہے تھے کہ چند یہودی ان کے پاس آئے اور کہنے لگے: کیا آپ امام علی بن ابی طالب- ہیں؟ فرمایا: ہاں میں ہوں! انہوں نے عرض کیا: ہماری کتابوں میں ایک چٹان کا ذکر آیا ہے جس پر چھ انبیاء کے نام لکھے ہوئے ہیں۔ہم نے اُسے بہت تلاش کیا ہے لیکن اُسے نہیں پا سکے۔اگر آپ امام ہیں تو اُسے تلاش کر کے دکھائیں۔ حضرت علیؑ نے فرمایا: میرے پیچھے پیچھے آئیں۔وہ سب لوگ ان کے پیچھے چلنے لگے۔ یہاں تک کہ جب صحرا میں پہنچے وہاں پر ریت کا بڑا ٹیلہ تھا، امام -نے فرمایا:

اَیَّتُهَا الرِّیْحُ اِنْسِفِی الرَّمْلَ عَنِ الصَّخْرَةِ بِحَقِّ اسْمِ اللّٰهِ الْاَعْظَمِ۔ [1]

اے ہوا بحق اسم اعظم خدا، ریت کو اس چٹان سے ہٹا دے۔

چنانچہ ہوا چلنے لگی، ریت ہٹ گئی اور چٹان ظاہر ہوگئی۔یہ عالم خلقت میں اثر ونفوذ اور تصرف کا ایک اور نمونہ تھا۔اس طرح کی اور بہت سی مثالیں اور نمونے، تاریخ، تفسیر، حدیث اور دیگر مختلف کتابوں اعم از شیعہ وسنی میں مذکورہ ہیں ان سب کو بیان کرنے کے لیے ایک الگ کتاب کی ضرورت ہے۔ان آیات اور روایات سے واضح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے خواہ وہ انبیاء ہوں یا امام ان کے پاس حکم اور اذن الٰہی سے ایسی قوت وطاقت تھی کہ جن مقامات پر خدا کی طرف سے اجازت تھی وہاں وہ کائنات کے امور میں تصرف اور مداخلت کر سکتے تھے وہ نہ صرف خدا سے دعا اور درخواست کے ذریعے سے، بلکہ اپنے ذاتی خداداد ی اثر ورسوخ کے ذریعے سے، جو اس قسم کے امور انجام دینے کے لیے انہیں عطا ہوا تھا اور یہ وہی چیز ہے جسے ہم ولایت تکوینی کہتے ہیں۔

البتہ ولایت تکوینی کی اور بھی شاخیں ہیں ان میں سے ایک حق کو قبول کرنے کے لیے آمادہ قلوب پر معنوی اور روحانی امداد کے ذریعے موثر ہونا، لائق اور قابلیت رکھنے والے افراد کی غیر محسوس انداز میں ہدایت اور تربیت کرنا ہے، اس قسم کی مثالوں سے تاریخ اسلام بھری پڑی ہے۔بہت سے افراد تھے جو پیغمبر اکرم ﷺ یا امام معصوم کی خدمت میں آئے اور ایک لحظہ میں ان کے اندر اس طرح سے عجیب تبدیلی آئی اور انقلاب رونما ہوا، جسے عام اصولوں اور معیاروں پر نہیں پرکھا جا سکتا۔اس انقلاب اور تبدیلی کے نتیجے میں ان کی زندگیاں بالکل بدل گئیں۔یہ فوق العادت اور غیر معمولی تبدیلی، ولایت تکوینی کے اثرات میں سے ایک اثر ہے جو قابل اور باصلاحیت افراد میں رونما ہوتا تھا۔

---

[1] بحار الانوار ج ۴۱، صفحہ ۲۳۷ (خلاصہ کے ساتھ)

ولایت وامامت خاصہ

اشارہ

اب ہم امامت کی عمومی بحث، یعنی ''امامت عامہ'' کے اختتام پر ''امامت خاصہ'' پر بحث وگفتگو آغاز کرتے ہیں۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ان کے جانشین اور خلیفہ الٰہی اور امام معصوم کون تھے؟ اس کی شناخت اور پہچان کے بارے میں بات کرتے ہیں۔ اس حوالے سے قرآن وحدیث اور اسلامی ماخذ سے مدد حاصل کریں گے۔

قرائن وشواہد کو اکٹھا کرنا، پیغمبروں اور اماموں کی شناخت اور پہچان کا ایک بہترین ذریعہ ہے، ہم اس ذریعے سے بھی مدد لیں گے، ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ! جو حق وحقیقت ہے وہ ہماری فکر، بیان اور قلم پر جاری فرما اور ہر قسم کے انحراف اور خلاف ورزی سے محفوظ فرما۔ سب سے پہلے ہم امامت خاصہ کے بارے میں موجود آیات پر تحقیق کریں گے۔ ان آیات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ وہ آیات جو براہ راست امامت کے موضوع سے متعلق ہیں اور اس پر واضح انداز میں گفتگو کرتی ہیں۔

۲۔ وہ آیات جو بالواسطہ طور پر امامت کے موضوع کو بیان کرتی ہیں۔ اگر چہ دونوں قسم کی آیات کثرت سے ہیں لیکن ہماری بنا اس پر ہے کہ ان دو قسموں میں سے جو زیادہ واضح ہیں ان کا انتخاب کر کے زیر بحث لایا جائے۔ پہلی قسم میں ہم درج ذیل آیات پر گفتگو کریں:

۱۔ آیت تبلیغ اور واقعہ غدیر
۲۔ آیت ولایت
۳۔ آیت اولی الامر
۴۔ آیت صادقین
۵۔ آیت قربیٰ۔

آیات کی دوسری قسم فضائل پر مشتمل ہے۔ اس حصے میں ہم ان آیات کو بیان کریں گے جو براہ راست امامت اور خلافت کے موضوع سے متعلق نہیں ہیں، البتہ امیر المومنین علیؑ کے فضائل کو ضرور ثابت کرتی ہیں اور انہیں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد امت میں سے اعلیٰ ترین اور بلند ترین شخصیت کے طور پر متعارف کراتی ہیں۔ ان فضائل کے ساتھ ایک بدیہی عقلی مقدمہ (مفضول کو افضل پر ترجیح دینا قبیح ہے) ضمیمہ کرنے سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد امت کی قیادت اور رہبریت کے لیے ان سے زیادہ لائق اور قابل کوئی اور نہیں ہے۔ ایسی آیات کی تعداد بہت زیادہ ہے ان میں سے ہم صرف ۲۵ کا ذکر کریں گے:

۱۔ آیت مباھلہ
۲۔ آیت خیر البریہ
۳۔ آیت لیلۃ المبیت
۴۔ آیت حکمت
۵۔ سورہ ھل اتی کی آیات
۶۔ سورہ برائت کی ابتدائی آیات

۷۔آیت سقایۃ الحاج
۸۔آیت صالح المومنین
۹۔آیت وزارت
۱۰،۱۱۔سورہ احزاب کی آیات
۱۲۔آیت بینہ وشاھد
۱۳۔آیت صدیقون
۱۴۔آیت نور
۱۵۔آیت انذار
۱۶۔آیت مرج البحرین
۱۷۔آیت نجوی
۱۸۔آیت سابقون
۱۹۔آیت اذن واعیہ
۲۰۔آیت مودت
۲۱۔آیت منافقون
۲۲۔آیت ایذاء
۲۳۔آیت انفاق
۲۴۔آیت محبت
۲۵۔آیت مسئولون۔

۱۔ آیت تبلیغ

يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ﴿۶۷﴾ (مائدہ/۶۷)

اے رسول! جو کچھ آپ کے پروردگار کی طرف سے آپ پر نازل کیا گیا ہے اُسے (لوگوں تک) پہنچا دیجیے اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو گویا آپ نے اللہ کا پیغام ہی نہیں پہنچایا اور اللہ آپ کو لوگوں (کے شر) سے محفوظ رکھے گا؛ بے شک اللہ کافروں کی راہنمائی نہیں کرتا۔

شان نزول

اہل سنت کے بہت سے علماء کی کتابوں (اور شیعہ کی تمام معتبر کتب) میں خواہ وہ تاریخ کی کتب ہوں یا حدیث اور تفسیر کی، بیان ہوا ہے کہ مذکورہ آیت حضرت علیؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ ان روایات کو صحابہ کرام کے ایک بڑے گروہ نے نقل کیا ہے جن میں ابو سعید خدری، زید بن ارقم، جابر بن عبداللہ انصاری، ابن عباس، براء بن عازب، حذیفہ، ابو ہریرہ، ابن مسعود اور عامر بن لیلی شامل ہیں۔ ان سے منقولہ روایات میں آیا ہے کہ یہ آیت غدیر کے دن علیؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ ان میں بعض روایات متعدد اسناد سے نقل ہوئی ہیں، جیسے ابو سعید خدری کی حدیث گیارہ حوالوں سے، ابن عباس کی حدیث بھی گیارہ حوالوں سے اور براء بن عازب کی حدیث تین ذرائع سے نقل ہوئی ہے۔ جن مشہور علماء نے اس حدیث کو (تفصیلی یا اجمالی طور پر) اپنی کتب میں نقل کیا ہے ان کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ حافظ ابونعیم اصفہانی نے کتاب ''ما نُزِّلَ مِنَ القرآن فِی علی'' (الخصائص، صفحہ ۲۹ سے نقل کے مطابق)۔

۲۔ ابوالحسن واحدی نیشاپوری نے ''اسباب النزول''، صفحہ ۱۵۰۔

۳۔ ابن عساکر شافعی (الدر المنثور، جلد ۲، صفحہ ۲۹۸ سے نقل کے مطابق)۔

۴۔ فخر رازی نے تفسیر کبیر میں، جلد ۳، صفحہ ۶۳۶۔

۵۔ ابو اسحاق حموینی نے ''فرائد السمطین'' (مخطوطہ) میں۔

۶۔ ابن صباغ مالکی نے ''فصول المھمہ''، صفحہ ۲۷ میں۔

۷۔ جلال الدین سیوطی نے الدر المنثور، جلد ۲، صفحہ ۲۹۸ میں۔

۸۔ قاضی شوکانی نے فتح القدیر، جلد ۳، صفحہ ۵۷ میں۔

۹۔ شہاب الدین آلوسی شافعی نے ''روح المعانی''، جلد ۶، صفحہ ۱۷۲ میں۔

۱۰۔ شیخ سلیمان قندوزی حنفی نے ''ینابیع المودۃ'' صفحہ ۱۲۰ میں۔

۱۱۔ بدرالدین حنفی نے ''عمدۃ القاری فی شرح صحیح البخاری'' جلد ۸، صفحہ ۵۸۴ میں۔

۱۲۔ شیخ محمد عبدہ مصری نے ''تفسیر المنار'' جلد ۶، صفحہ ۴۶۳ میں۔

۱۳۔ حافظ ابن مردویہ (متوفی ۴۱۸ھ ہجری قمری) (الدر المنثور میں سیوطی کے نقل کے مطابق)۔

بہت سارے دیگر افراد نے بھی یہ حدیث نقل کی ہے۔ البتہ یہ بات ذہن نشین رہے کہ ان میں سے بعض علماء روایت اور شان نزول کو نقل کرنے کے باوجود بعض وجوہات کی بنا پر جن کی طرف بعد میں اشارہ کیا جائے گا۔ اس آیت سے نہایت سادگی سے گزر گئے ہیں یا پھر اس پر اعتراضات کیے ہیں۔ اگر اللہ نے چاہا تو آئندہ صفحات میں ان کے اقوال پر بحث و تمحیص کریں گے۔

واقعۂ غدیر

گذشتہ گفتگو سے اجمالی طور پر یہ ثابت ہو گیا ہے کہ بے شمار شواہد اور دلائل کے مطابق یہ آیت حضرت علیؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اور اس کے متعلق صرف اہل سنت کی معتبر کتابوں میں اس قدر روایات نقل ہوئی ہیں کہ کوئی ان کا انکار نہیں کر سکتا۔ (شیعہ کتب اس کے علاوہ ہیں)

مذکورہ بالا روایات کے علاوہ روایات کی ایک بہت بڑی تعداد اور ایسی ہے جو واضح طور پر بیان کرتی ہیں کہ یہ آیت غدیر خم میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خطبہ اور علیؑ کے بطور وصی اور ولی کے اعلان کے واقعے کے متعلق بیان ہوئی ہے۔ ایسی روایات کی تعداد سابقہ روایات سے کئی گنا زیادہ ہے، یہاں تک کہ عظیم محقق علامہ امینی نے اپنی کتاب الغدیر میں حدیث غدیر کو ۱۱۰ صحابہ کرام سے معتبر اسناد اور ماخذ سے نقل کیا ہے۔ اسی طرح ۸۴ تابعین اور ۳۶۰ مشہور اسلامی مصنفین اور مولفین سے اُسے بیان کیا ہے۔

ہر غیر جانب دار شخص جب مجموعی طور پر ان اسناد اور ماخذ پر نظر ڈالتا ہے تو اُسے یقین ہو جاتا ہے کہ حدیث غدیر اسلامی روایات میں سے قطعی ترین حدیث ہے اور حدیث متواتر کا واضح ترین مصداق ہے، سچ تو یہ ہے کہ اگر کوئی اس کے متواتر ہونے میں شک کرے تو پھر وہ کسی حدیث کے متواتر ہونے پر عقیدہ نہ رکھے۔ چونکہ اس موضوع پر تفصیلی بحث ہمیں تفسیر موضوعی کی طرز تحریر سے خارج کر دے گی۔ لہٰذا آیت کے شان نزول اور اس حدیث کی اسناد کے بارے میں اتنی گفتگو کافی ہے۔ اب ہم اس حدیث کے مفہوم پر گفتگو کرتے ہیں اور جو کوئی اس حدیث کی اسناد پر مزید مطالعہ کرنا چاہتا ہے وہ درج ذیل کتب کا مطالعہ کرے۔

۱۔ الغدیر، جلد اول۔

۲۔ احقاق الحق، تالیف علامہ قاضی نور اللہ شوشتری، تفصیلی شرح آیت اللہ نجفی، پہلی، دوسری، تیسری، چودھویں اور بیسویں جلد۔

۳۔ المراجعات: مصنف شرف الدین عاملی۔

۴۔ عبقات الانوار: مصنف عظیم عالم میر حامد حسین ہندی۔ (بہتر یہ ہے کہ عبقات الانوار، جلد ۷، ۸ اور ۹ کو دیکھ لیا جائے)

۵۔ دلائل الصدق: مصنف بزرگ عالم شیخ مظفر، جلد دوم۔

روایات غدیر کا مفہوم

غدیر کے بارے میں منقولہ روایات سے مجموعی طور پر واقعہ غدیر کی جو تصویر سامنے آتی ہے اُسے مختصراً بیان کیا جاتا ہے۔ (البتہ بعض روایات نے اس واقعے کو بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے بعض نے نہایت مختصر انداز میں بیان کیا ہے، بعض نے اس واقعے کے ایک پہلو کو بیان کیا ہے اور بعض نے دوسرے پہلو پر روشنی ڈالی ہے، مجموعی طور پر اِسے یوں بیان کیا جاتا ہے) رسول اکرمؐ کی حیات مبارکہ کے آخری سال میں حجۃ الوداع شان و شوکت اور کامل طریقے سے آنحضرتؐ کی موجودگی میں انجام پایا۔

دل، روحانیت اور معنویت کے جذبوں سے سرشار تھے اور اس عظیم عبادت کی معنوی لذت کا ذائقہ جانوں میں باقی تھا۔ اصحاب رسولؐ جن کی تعداد غیر معمولی طور پر زیادہ تھی [1] اس عظیم سعادت اور فیض کے نصیب ہونے پر خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے۔ اس سفر میں صرف مدینے والے آنحضرتؐ کے ساتھ نہیں تھے بلکہ جزیرۃ العرب کے مختلف علاقوں کے مسلماں اس تاریخی سعادت وافتخار کو پانے کے لیے آنحضرت کے ہمراہ تھے۔ حجاز کا سورج پہاڑوں اور دروں پر اپنی آگ برسا رہا تھا لیکن اس بے مثال روحانی سفر کی لذت اور مٹھاس سب مشکلات کو آسان بنا رہی تھی۔ ظہر کا وقت قریب تھا آہستہ آہستہ جحفہ کی سرزمین اور پھر غدیر خم کا خشک اور تپتا ہوا میدان دور سے دکھائی دینے لگا۔

درحقیقت یہاں پر (اس زمانے میں) ایک چوراہا تھا جہاں سے عرب مختلف علاقوں کے لوگ ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے تھے۔ شمال کی طرف راستہ مدینے کی طرف جاتا تھا، مشرق کی جانب عراق کو اور مغرب میں راستہ مصر کو جاتا تھا اور جنوب کی طرف راستہ یمن کو جاتا تھا، اسی مقام پر اس عظیم سفر کی آخری یادگار چیز کو انجام پانا تھا اور اس کی اہم ترین فصل کو پایہ تکمیل تک پہنچنا تھا اور مسلمانوں کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آخری پیغام اور حکم کو دریافت کر کے ایک دوسرے سے جدا ہونا تھا۔ یہ درحقیقت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کامیاب رسالت کا آخری مرحلہ تھا۔

ہجرت کا دسواں سال اور جمعرات کا دن تھا۔ عید قربان کو گزرے ٹھیک آٹھ دن ہو گئے تھے۔ اچانک پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے سب کو ٹھہرنے کا حکم ملا۔ مسلمانوں نے آگے جانے والوں کو بلند آواز سے پیچھے کی طرف بلایا اور پیچھے رہ جانے والوں کے پہنچنے کا انتظار کیا، جونہی زوال کا وقت ہوا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے موذن نے ''اللہ اکبر'' کی آواز سے لوگوں کو نماز ظہر کی طرف بلایا۔ لوگ جلدی سے نماز کے لیے تیار ہو گئے، لیکن گرمی اتنی شدید تھی کہ بعض افراد نے مجبوراً اپنی عبا کا سرا پاؤں کے نیچے دیا اور دوسرا سرا اپنے سر پر رکھا بصورت دیگر ریت کے انتہائی گرم ذرات اور سورج کی دھوپ ان کے پاؤں اور سروں کو جلا دیتی۔

اس میدان میں نہ کوئی سایبان تھا نہ کوئی سبزہ اور درخت، چند خشک قسم کے صحرائی درخت تھے جن کا کوئی خاص سایہ نہ تھا اور وہ گرمی اور

---

[1] رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ لوگوں کی تعداد، بعض نے نوے ہزار، بعض نے ایک لاکھ بارہ ہزار، بعض نے ایک لاکھ بیس ہزار اور بعض نے ایک لاکھ چوبیس ہزار لکھی ہے

سخت موسم کا مقابلہ کر رہے تھے۔ کچھ لوگ انہی درختوں کے پاس پناہ لیے ہوئے تھے ان درختوں میں سے ایک پر کپڑا ڈال کر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ایک سایبان بنایا گیا مگر گرم لو کے تھپیڑے اس سایے کے نیچے بھی دھوپ کی تپش بکھیر رہے تھے۔

نماز ظہر ختم ہو گئی مسلمان فوراً اپنے ہمراہ لائے ہوئے چھوٹے چھوٹے خیموں میں واپس جانا چاہتے تھے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے انہیں اطلاع دی گئی کہ وہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کے نئے حکم کو سننے کے لیے تیار ہو جائیں جو ایک مفصل خطبے کے دوران سنایا جائے گا، جو لوگ ذرا فاصلے پر تھے۔ وہ لوگوں کی کثرت کی وجہ سے آنحضرتؐ کے نورانی چہرے کو نہیں دیکھ پا رہے تھے لہٰذا اونٹوں کے پلانوں سے ایک منبر تشکیل دیا گیا، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس منبر پر جلوہ افروز ہوئے، سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بجالائے اور اپنے آپ کو اللہ کی پناہ میں دیا پھر لوگوں سے مخاطب ہو کر یوں فرمایا:

''میں بہت جلد دعوت الٰہی پر لبیک کہتے ہوئے تمہارے درمیان سے چلا جاؤں گا، میں بھی ذمہ دار اور مسئول ہوں اور تم بھی ذمہ دار اور مسئول ہو۔ تم میرے بارے میں کس طرح گواہی دیتے ہو؟''

لوگوں نے با آواز بلند پکار کر کہا: ''نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ وَ نَصَحْتَ وَ جَهَدْتَ فَجَزَاكَ اللهُ خيراً۔'' یعنی: ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپؐ نے پیغام دیا، آپؐ نے ہماری خیر خواہی اور نصیحت کا حق ادا کر دیا اور ہماری ہدایت و راہنمائی کے لیے آپؐ نے پوری کوشش اور جہد و جہد کی ہے اللہ تعالیٰ آپ کو جزئے خیر عطا فرمائے۔

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تم اللہ کی وحدانیت، میری رسالت، قیامت کے دن کی حقانیت اور اُس دن مردوں کے اٹھ کھڑے ہونے کی گواہی دیتے ہو؟'' سب نے یک زبان ہو کر کہا: ہاں ہم گواہی دیتے ہیں! آپؐ نے فرمایا: ''اے اللہ! گواہ رہنا!'' دوبارہ آپؐ نے فرمایا: ''اے لوگو! کیا میری آواز تم تک پہنچ رہی ہے؟ ۔۔۔'' انہوں نے ہاں میں جواب دیا۔ اس کے بعد میدان میں سنسناٹا چھا گیا اور ہوا کی سنسناہٹ کے سوا کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''۔۔۔ میں تمہارے درمیان دو گراں نقدر اور قیمتی چیزیں یادگار کے طور پر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ دیکھو ان کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہو؟'' مجمع سے ایک شخص بولا: یا رسول اللہ! کونسی گرانقدر دو چیزیں؟! آپؐ نے فوراً فرمایا: ''پہلی ثقل اکبر، اللہ کی کتاب ہے جس کا ایک سرا اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اور دوسرا تمہارے ہاتھوں میں ہے اسے تھام کے رکھنا تا کہ گمراہ نہ ہو جاؤ، دوسری اہم اور قیمتی چیز میری اہل بیت اور عترت ہے۔ اللہ جو کہ لطیف اور خبیر ہے، نے مجھے خبر دی ہے کہ یہ دو چیزیں ہرگز ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گی۔ یہاں تک کہ جنت میں مجھ سے ملحق ہو جائیں گی۔ ان دو سے آگے نہ بڑھنا ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے اور ان سے پیچھے بھی نہ رہنا ورنہ ہلاک ہو جاؤ گے۔''

اچانک لوگوں نے دیکھا کہ رسول خداؐ اپنے ارد گرد دیکھ رہے ہیں گویا کسی کو تلاش کر رہے ہیں۔ جونہی آپ کی نگاہ مبارک علیؑ پر پڑی۔ آپؐ جھکے اور ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں اٹھایا اور اتنا بلند کیا کہ دونوں کی بغل کی سفیدی نظر آنے لگی اور سب نے انہیں دیکھ لیا اور پہچان لیا کہ یہ تو ہمیشہ فاتح رہنے والا اسلامی کمانڈر ہے۔ اس موقعہ پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آواز پہلے سے زیادہ صاف اور اونچی ہوئی اور ارشاد فرمایا:

اَیُّها النّاسُ مَنْ اَوْلٰی النّاسِ بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ

اے لوگو! مومنین پر ان سے بھی زیادہ کون حق رکھتا ہے؟!

لوگوں نے جواب دیا: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: ''اللہ میرا مولی اور آقا ہے اور میں مومنوں کا ولی اور آقا ہوں، میں ان سے زیادہ ان کی جانوں پر حق رکھتا ہوں۔ (یعنی میرا ارادہ ان کے ارادے پر مقدم ہے)'' اس کے بعد فرمایا:

فَمَنْ کُنْتُ مَوْلاهُ فَعَلِیٌّ مَوْلاهُ

جس کا میں مولا و آقا ہوں اس کا علی مولا اور آقا ہیں۔

اس جملے کو آپؐ نے تین مرتبہ ارشاد فرمایا اور بعض راویوں کے بقول چار مرتبہ بیان فرمایا۔ اس کے بعد آپؐ نے آسمان کی طرف رخ کر کے فرمایا:

اَللّٰهُمَّ وَالِ مَنْ والاهُ وعادِ مَنْ عاداهُ وَاَحِبَّ مَنْ اَحَبَّهُ واَبْغِضْ مَنْ اَبْغَضَهُ وَانْصُرْ مَنْ نَصَرَهُ وَاخْذُلْ مَنْ خَذَلَهُ وَ اَدِرِ الحَقَّ مَعَهُ حَیْثُ دارَ۔

''اے اللہ! تو اُسے دوست رکھ جو ان سے دوستی رکھے، دشمن رکھ اُسے جو ان کا دشمن ہو اُسے محبوب رکھ جو ان سے محبت کرتا ہو اور جو ان سے بغض رکھے تو بھی ان سے بغض رکھ، مدد کر اس کی جو ان کا مددگار ہو، تو بھی اس کی مدد نہ کر جو ان کو چھوڑ دے اور مدد نہ کرے، ان کو حق سے جدا نہ فرما اور جہاں علی ہوں وہاں حق کو پھیر دے۔''

پھر فرمایا:

الا فلیبلغ الشاهد الغائب۔

''آگاہ رہو! حاضرین، غائبین تک اس کی اطلاع پہنچا دیں۔''

حضرت رسول خدا ﷺ کا خطبہ ختم ہوا۔ رسول خدا ﷺ، علیؑ اور لوگ پسینہ سے شرابور تھے۔ ابھی مجمع کی صفیں درہم برہم نہیں ہوئی تھیں کہ جبرئیل امین نازل ہوئے اور اس آیت کو پیغمبر تک پہنچایا:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ .....

آج میں نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور اپنی نعمتوں کو تمام کر دیا۔۔۔۔

پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا:

اَللّٰه اَکْبَرُ اَللّٰه اَکْبَرُ عَلٰی اِکْمالِ الدِّیْنِ وَ اِتْمامِ النِّعْمَةِ وَ رَضَی الرَّبِّ بِرِسَالَتِی وَ الْوَلایَةِ لِعَلِیٍّ مِنْ بَعْدِی

اللہ بڑا ہے، اللہ بڑا ہے، وہ اللہ جس نے اپنے دین کو مکمل اور اپنی نعمتوں کو ہم پر پورا کر دیا، اور میری نبوت و رسالت اور میرے بعد علیؑ کی ولایت سے راضی وخوشنود ہو گیا۔

اس موقعہ پر لوگوں میں شور اٹھا اور وہ علیؑ کو اس منصب پر مبارکباد دینے لگے۔ جن سرکردہ افراد نے حضرت علیؑ کو مبارکباد پیش کی ان میں سے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر سرفہرست تھے اور انہوں نے ان الفاظ کے ساتھ امیر المومنین علیؑ کو مبارکباد پیش کی:

بَخٍّ بَخٍّ لَكَ يَا ابْنَ اَبِي طَالِبٍ اَصْبَحْتَ وَ اَمْسَيْتَ مَوْلَايَ وَ مَوْلَا كُلِّ مُؤْمِنٍ وَ مُؤْمِنَةٍ۔

اے ابوطالب کے بیٹے! مبارک ہو آپ کو، مبارک ہو آپ کو، میرے اور تمام مومن مردوں اور مومن عورتوں کے مولا و آقا بن گئے۔

اس موقعہ پر ابن عباس نے کہا: ''خدا کی قسم یہ عہد و پیمان سب کی گردنوں پر باقی رہے گا۔'' مشہور شاعر حسان بن ثابت نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس موقعہ کی مناسبت سے شعر کہنے کی اجازت چاہی اور چند اشعار اپنی زبان پر جاری کیے:

يُنَادِيهِمْ يَوْمَ الْغَدِيرِ نَبِيُّهُمْ
بِخُمٍّ وَاَسْمِعْ بِالرَّسُولِ مُنَادِياً
فَقَالَ فَمَنْ مَوْلَاكُمْ وَ نَبِيُّكُمْ؟
فَقَالُوا وَ لَمْ يَبْدُوا هُنَاكَ التَّعَامِيَا
اِلٰهُكَ مَوْلَانَا وَ اَنْتَ نَبِيُّنَا
وَ لَمْ تَلْقَ مِنَّا فِي الْوَلَايَةِ عَاصِياً
فَقَالَ لَهُ قُمْ يَا عَلِيُّ فَاِنَّنِي
رَضِيتُكَ مِنْ بَعْدِي اِمَاماً وَ هَادِياً
فَمَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا وَلِيُّهُ
فَكُونُوا لَهُ اَتْبَاعَ صِدْقٍ مُوَالِيَا
هُنَاكَ دَعَا اَللّٰهُمَّ وَالِ وَلِيَّهُ
وَ كُنْ لِلَّذِي عَادَا عَلِيّاً مُعَادِيَا

''ان کے نبی نے غدیر کے دن سرزمین خم پر انہیں پکارا اور وہ بلانے والا کس قدر صاحب عظمت ہے۔ انہوں نے فرمایا: تمہارا مولیٰ اور پیغمبر کون ہے؟ لوگوں نے کسی تأمل اور جھجک کے بغیر واضح جواب دیا: آپ کا خدا ہمارا مولا ہے اور آپ ہمارے نبی ہیں اور ہم آپ کی ولایت و سرپرستی کے قبول کرنے میں ذرا

نافرمانی نہیں کریں گے۔ پیغمبر ﷺ نے علیؑ سے کہا: اٹھ کھڑے ہوں میں نے تمہیں اپنے بعد امام اور ہادی منتخب کیا ہے۔ اس کے بعد فرمایا: جس کا میں مولا اور آقا ہوں یہ شخص اس کا مولا و آقا ہے پس تم سب اس کی صدق دِل کے ساتھ اتباع و پیروی کرو۔ اس موقعہ پر نبی اکرم ﷺ نے دعا کی: بارالہا! اس کے دوست کو دوست رکھ اور اس کے دشمن سے دشمنی رکھ۔" [۱]

یہ تھا مشہور و معروف حدیث غدیر کا خلاصہ، جو اہل سنت اور شیعہ کتابوں میں نقل ہوئی ہے۔

آیت تبلیغ کا ایک اور زاویے سے تجزیہ و تحلیل

اگر ہم ان تمام روایات جو اس آیت کے شان نزول کے متعلق آئی ہیں اور اس طرح واقعہ غدیر کے بارے میں منقولہ تمام روایات سے چشم پوشی کر لیں اور صرف اِس آیت اور اس کے بعد والی آیات کے مفہوم اور معنی میں غور و فکر کریں تو ہم ان آیات کے عمق اور بطن سے مسئلہ خلافت اور جانشینی رسولؐ کو حل کر سکتے ہیں اس حوالے سے اپنی ذمہ داریوں کا تعین کر سکتے ہیں۔ اس بات کی وضاحت میں ہمارا کہنا یہ ہے کہ مذکورہ آیات میں استعمال ہونے والے مختلف الفاظ یہ بتا رہے ہیں کہ یہ آیت ایک ایسے مسئلہ کی نشاندہی کر رہی ہے جو ان تین اہم خصوصیات کا حامل ہے۔

۱۔ یہ مسئلہ اسلام کی نظر میں انتہائی اہمیت کا حامل ہے چونکہ اس کے پہنچانے کا پیغمبر اکرم ﷺ کو حکم دیا گیا اور اسے نہ پہنچایا تو رسالت الٰہی کو نہیں پہنچایا، دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ یہ مسئلہ نبوت کے ہم پلہ تھا، کہ اگر اِسے انجام نہ دیا تو تو رسول خداؐ کی رسالت نامکمل رہتی ہے۔ (وَاِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ) بہت واضح ہے کہ مقصود یہ نہیں ہے کہ یہ کوئی عام اور معمولی فرمان خدا تھا اور ہر حکم الٰہی اگر نہ پہنچے تو رسالت ہی نہیں پہنچی، کیونکہ یہ بات واضح کی توضیح کے مترادف ہے اور اسے بیان کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زیر بحث مسئلہ خاص اہمیت کا حامل ہے جس کا نبوت و رسالت کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔

۲۔ یقیناً یہ مسئلہ نماز، روزہ، حج، جہاد، زکوٰۃ اور اس طرح کے دیگر اسلامی تعلیمات سے مربوط نہیں تھا، کیونکہ یہ آیت سورہ مائدہ کی ہے اور ہمیں معلوم ہے کہ سورہ مائدہ آخری صورت ہے جو آنحضرتؐ پر نازل ہوئی ہے (یا آخری سورتوں میں سے ہے) یعنی آنحضرت ﷺ کی عمر مبارک کے آخری حصے میں نازل ہوئی ہے جب کہ اس وقت تک اسلام کے تمام اہم ارکان بیان ہو چکے تھے۔ [۲]

---

[۱] اہل سنت کے بعض بزرگ دانشوروں نے یہ اشعار نقل کیے ہیں کہ جن میں: حافظ "ابونعیم" اصفہانی، حافظ "ابوسعید سجستانی"، خوارزمی مالکی، حافظ، ابوعبداللہ مرزبانی، گنجی شافعی، جلال الدین "سیوطی" سبط ابن جوزی، اور صدرالدین حموی کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

[۲] فخر رازی اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: اصحاب آثار (راویان حدیث اور سیرت نگاروں) نے لکھا ہے کہ جب مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی تو اس کے بعد رسول خدا ﷺ صرف ۸۱ یا ۸۲ دن زندہ رہے (تفسیر کبیر: جلد ۱۲ صفحہ ۱۳۹) تفسیر المنار اور بعض دوسری کتب میں آیا ہے کہ تمام سورہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر نازل ہوئی۔ (لمنار جلد ۶ ص ۱۱۶) البتہ بعض نے دنوں کی تعداد مذکورہ تعداد سے بھی کم ہے۔

۳۔ آیت کے الفاظ بتاتے ہیں کہ آیت کے پیش نظر جو مسئلہ تھا وہ ایسا تھا کہ بعض افراد کا اس کے خلاف سخت موقف تھا یہاں تک کہ اس کی وجہ سے پیغمبر خدا کی جان کو خطرہ تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کی اس بارے میں خاص حمایت کا اعلان فرماتا ہے اور آپؐ سے ارشاد فرماتا ہے: ''اللہ تعالیٰ آپؐ کو (لوگوں کے ممکنہ خطرات سے) محفوظ رکھے گا۔'' (وَ اللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاس)۔ اس کے بعد آیت کے آخر میں تاکید کرتے ہوئے فرماتا ہے: ''اللہ تعالیٰ کافروں کے گروہ کو ہدایت نہیں کرتا۔'' (اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِيْنَ)۔ یہ الفاظ کچھ مخالفین کے منفی ردعمل اور موقف پر ایک اور دلیل پیش کر رہے ہیں۔

ان تین جہتوں سے مجموعی طور پر یہ واضح نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ اس آیت سے خلافت اور جانشینی پیغمبر اکرم ﷺ مراد ہے اس کے علاوہ کوئی اور چیز مقصود نہیں ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ رسول خدا ﷺ کی عمر کے آخری حصے میں ایسی چیز ہی بڑی اہمیت کی حامل ہو سکتی ہے اور زیر بحث آسکتی ہے نہ کہ دیگر اسلام کے ارکان، جو اس وقت تک پورے طور پر بیان ہو چکے تھے۔ یہ وہ چیز ہے جو نبوت کے ہم پلہ اور برابر ہو سکتی ہے اور یہی وہ مسئلہ ہو سکتا ہے جس کے اظہار سے مخالفتیں جنم لے سکتی تھیں اور خطرات پیدا ہو سکتے تھے۔

مذکورہ آیت کی امامت و ولایت اور خلافت کے موضوع کے علاوہ جو بھی تفسیر کی جائے وہ آیت سے میل نہیں کھاتی۔ آپ ان تمام مفسرین کی آراء کا مطالعہ کریں جو اس آیت کے مفہوم کو دوسرے مسائل کی طرف موڑنا چاہتے تھے۔ آپ دیکھیں گے کہ کوئی بھی آیت کی تاکیدات کے حساب سے ایسا مطلب پیش نہیں کر سکا جو آیت کے مناسب ہو، درحقیقت وہ اس کی تفسیر سے قاصر رہے۔

چند وضاحتیں

۱۔ حدیث غدیر میں ولایت اور مولا کا مطلب:

ہم نے حدیث غدیر جو کہ متواتر ہے کو اجمالی طور پر جان لیا۔ اس حدیث میں رسول خدا ﷺ کا مشہور جملہ (من كنت مولاه فعلي مولاه) جو کہ تمام کتابوں میں بیان ہوا ہے، بہت سارے حقائق کو واضح کرتا ہے، اگرچہ بہت سے اہل سنت مصنفین نے بہت زیادہ زور لگایا ہے کہ یہاں پر ''مولا'' کا معنی دوست، یار، مددگار کیا جائے۔ کیونکہ ''مولیٰ'' کے معانی میں سے ایک مشہور معنی یہی ہے۔ ہم بھی مانتے ہیں کہ ''مولا'' کا ایک معنی دوست، یار اور مددگار ہے لیکن متعدد قرائن اور شواہد یہ ثابت کرتے ہیں کہ مذکورہ بالا حدیث میں مولا کا معنی ولی، راہنما اور سرپرست کے ہیں، ان قرائن کو مختصر طور پر یوں بیان کیا جا رہا ہے۔

۱۔ علیؑ کی تمام مومنین کے ساتھ دوستی کی بات کوئی پوشیدہ، خفیہ یا پیچیدہ مسئلہ نہ تھا کہ اُسے بیان کرنے کے لیے اتنے اہتمام اور تاکیدات کی ضرورت تھی، یہ اس قدر اہم معاملہ نہ تھا جس کے لیے اتنے بڑے قافلے کو سخت گرمی میں خشک و بیابان میدان میں روکا جاتا، خطبہ دیا جاتا اور مجمع سے پے در پے اعترافات لیے جاتے۔ قرآن بڑے واضح انداز میں فرماتا ہے: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ۔ یعنی: تمام مومنین آپس میں بھائی ہیں۔ (حجرات/۱۰) ایک اور مقام پر فرماتا ہے: ''وَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ'' یعنی: ''مومن

مرد اور مومنہ عورتیں ایک دوسرے کے ولی اور مددگار ہیں۔" (توبہ/۷۱)

خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک دوسرے سے برادری اور اخوت اسلامی، اسلام کی بدیہی ترین تعلیمات میں سے ہے جو اسلام کے آغاز سے موجود تھی، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کئی بار اس مسئلہ کی تبلیغ کر چکے تھے اور اس پر تاکید فرما چکے تھے۔ اس کے علاوہ یہ کوئی ایسا مسئلہ بھی نہ تھا کہ آیت میں اتنے سخت لہجہ میں بیان کیا جاتا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے اظہار کرنے میں خطرہ محسوس کرتے (غور کیجیے گا)

۲۔ اَلَسْتُ اَوْلٰی بِکُمْ مِنْ اَنْفُسَکُمْ "

"کیا میں تمہاری نسبت تم سے زیادہ تمہاری جانوں پر حق نہیں رکھتا"

یہ جملہ بہت سی روایات کے متون میں آیا ہے اور کسی لحاظ سے بھی عام اور معمولی دوستی کے بیان کرنے سے مربوط اور ہم آہنگ نہیں ہے، بلکہ یہ کہہ رہا ہے کہ وہی اختیار اور اولویت جو میں تم پر رکھتا ہوں جس طرح میں تمہارا پیشوا اور سرپرست ہوں، یہ سب کچھ علیؑ کے لیے ہے اس جملے کی مذکورہ مطلب کے علاوہ جو بھی تشریح کی گئی ہے وہ حقیقت سے دور اور ناانصافی ہے، خصوصاً "من انفسکم" کے لفظ کو مد نظر رکھتے ہوئے (جس کا مطلب یہ ہے میں تم پر تم سے بھی زیادہ حق رکھتا ہوں)

۳۔ اس تاریخی واقعہ میں حضرت علیؑ کو جو مبارکبادیں گئیں خصوصاً حضرت ابوبکر اور حضرت عمر نے جو مبارک باد دی، یہ ثابت کرتی ہیں یہ مسئلہ خلافت کی تعیینی کے علاوہ کوئی اور نہیں ہوسکتا، جس کے لیے تبریک وتہنیت کو ضروری سمجھا گیا کیونکہ اگر مسئلہ دوستی کو بیان کرنا ہوتا جو کہ تمام مسلمانوں کے لیے عمومی لحاظ سے ثابت ہے، تو مبارکباد دینے کا کوئی تُک نہیں بنتا مسند "امام احمد" میں آیا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیان کے بعد حضرت عمر نے علیؑ سے کہا:

هنیئاً یَابْنَ اَبِی طَالِبٍ اَصْبَحْتَ وَ اَمْسَیْتَ مَولی کُلِّ مُؤمِنٍ و مُؤمِنَةٍ

مبارک ہو تمہیں اے ابوطالب کے بیٹے! آپ ہر مومن مرد اور مومنہ عورت کے مولا بن گئے۔ [1]

امام فخر رازی نے "ایها الرَّسولُ بَلِّغ ما انزل اِلَیْك" کی تفسیر میں جو الفاظ ذکر کیے ہیں، ان کے مطابق حضرت عمر نے کہا: "هنیئاً لك اَصْبَحْتَ مَوْلایَ و مَولی کُلِّ مُؤمِنٍ و مؤمِنَةٍ۔" یعنی: مبارک ہوائے علی! آپ میرے اور ہر مؤمن و مؤمنہ کے مولا بن گئے۔" اس طرح حضرت عمر نے حضرت علیؑ کو اپنا اور تمام مومنین کا مولا تسلیم کیا ہے۔ تاریخ بغداد میں روایت اس طرح آئی ہے:

بَخٍّ بَخٍّ لَكَ یَابْنَ اَبِی طَالِبٍ! اَصْبَحْتَ مَوْلایَ وَمَوْلی کُلِّ مُسْلِمٍ

"واہ واہ اے ابوطالب کے فرزند! آپ میرے اور ہر مسلمان کے مولا ہو گئے۔" [2]

---

[1] مسند احمد، جلد ۴، صفحہ ۲۸۱ (فضائل الخمسہ ج۱، ص ۴۳۲ کے مطابق)

[2] تاریخ بغداد، جلد ۷، صفحہ ۲۹۰۔

فیض القدیر اور الصواعق میں ذکر ہوا ہے کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر دونوں نے علیؑ کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا ہے:" اَمْسَیْتَ یَابْنَ ابی طَالِبٍ مَوْلا کُلِّ مُؤمِنٍ وَمُؤمِنَةٍ۔"[1] معلوم ہے کہ مومنین کے درمیان عام اور سادہ دوستی کے لے اس قسم کے تکلفات کی ضرورت نہیں، اس کا تعلق ولایت بمعنی خلافت کے ساتھ ہے، اس کے علاوہ کوئی اور معنی نہیں ہوسکتا۔

۴۔ حسان بن ثابت کے اشعار جنہیں ہم پہلے نقل کر چکے ہیں، اپنے مفہوم و مطلب کی وضاحت اور صراحت کے ساتھ ہمارے مدعی پر ایک اور دلیل ہیں اور کافی حد تک اس مطلب کو واضح کرتے ہیں۔ (دوبارہ ان اشعار کا مطالعہ کریں)

واقعہ غدیر کی تائید میں قرآن کی دیگر آیات

سورہ معارج کا آغاز ان آیات سے ہوتا ہے:

سَاَلَ سَآىِٕلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍۙ﴿۱﴾ لِّلْكٰفِرِیْنَ لَیْسَ لَهٗ دَافِعٌۙ﴿۲﴾ مِّنَ اللّٰهِ ذِی الْمَعَارِجِؕ﴿۳﴾

ایک مانگنے والے نے واقع ہونے والے عذاب کا تقاضا کیا، کفار کے لیے اُسے کوئی ٹالنے والا نہیں،

بلندیوں کے مالک اللہ کی طرف سے ہے (وہ خدا جس کے ملائکہ آسمانوں کی طرف اوپر چڑھتے ہیں)

ان آیات کی تشریح میں بہت سے مفسرین اور روایان حدیث نے ایک شان نزول بیان کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب غدیر خم میں علیؑ کی خلافت کا اعلان کیا اور ان کے بارے میں فرمایا: "مَنْ كُنْتُ مَوْلاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلاهُ" تھوڑی ہی دیر میں یہ خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ "نعمان بن فہری" (جو کہ منافق تھا)[2] حضور اکرم ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا: آپ نے ہمیں اللہ کی وحدانیت اور اپنی رسالت کی گواہی دینے کا حکم دیا، ہم نے اس کی شہادت دی، اس کے بعد آپ نے ہمیں نماز، زکوٰۃ، حج اور جہاد کا حکم دیا، ہم نے ان سب کو مانا، لیکن آپؐ اس پر راضی نہ ہوئے، یہاں تک کہ اس جوان (علی - کی طرف اشارہ کیا) اپنا جانشین بنا دیا اور آپ نے کہا: "مَنْ كُنْتُ مَوْلاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلاهُ" کیا یہ کام آپ نے اپنی مرضی سے کیا ہے یا خدا کی طرف سے حکم تھا؟ آنحضرتؐ نے فرمایا:

"مجھے اس ذات کی قسم ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، یہ اللہ کی طرف سے حکم تھا۔"

نعمان بن حارث پیچھے مڑا اور اس نے کہا:

"اے اللہ! اگر یہ بات سچ ہے اور تیری طرف سے ہے تو آسمان سے مجھ پر پتھر برسا!"

اچانک آسمان سے ایک پتھر آیا اور اس کے سر پر لگا، اور وہ ہلاک ہوگیا، اس موقعہ پر "سَئَلَ سائل بعذاب واقع" نازل ہوئی۔

---

[1] فیض القدیر، جلد ۶، صفحہ ۲۱۷، صواعق، صفحہ ۱۰۷۔

[2] بعض روایات میں "حارث بن نعمان" اور بعض میں "نضر بن حارث" آیا ہے

مذکورہ بالا مطلب اس روایت کے مطابق ہے جو مجمع البیان میں ابوالقاسم حسکانی سے نقل ہوئی ہے۔[1]

اسی بات کو بہت سارے سنی مفسرین اور روایان حدیث نے تھوڑے سے فرق کے ساتھ بیان کیا ہے، مثال کے طور پر قرطبی نے اپنی مشہور تفسیر[2] میں، آلوسی نے تفسیر روح المعانی[3] اور ابو اسحاق ثعلبی نے اپنی تفسیر[4] میں اسے جگہ دی ہے۔ علامہ امینی، اپنی کتاب الغدیر میں اس روایت کو اہل سنت کے تیس علماء سے (عین عبارت کو حوالے کے ساتھ) نقل کیا ہے ان میں سے سیرہ حلبی، حموینی کی "**فرائد السمطین**"، شیخ محمد زرندی کی درر السمطین، شمس الدین شافعی کی السراج المنیر، سیوطی کی شرح جامع الصغیر، حافظ ابوعبید ھروی کی تفسیر غریب القرآن ابوبکر نقاش موصلی کی تفسیر شفائی الصدور وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

بعض مفسرین یا محدثین جن پر علیؑ کے فضائل ناگوار گزرتے ہیں اور وہ ان کے فضائل آسانی سے قبول نہیں کرتے، انہوں نے اس شان نزول پر مختلف اعتراضات کیے ہیں ان میں سے چار اہم ترین اعتراضات درج ذیل ہیں جنہیں تفسیر المنار کے مصنف اور بعض دوسرے افراد نے مذکورہ روایت کو نقل کرنے کے بعد بیان کیے ہیں۔

پہلا اعتراض: سورہ معارج مکی ہے اور اس کا واقعہ غدیر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

جواب: کسی سورت کا مکی ہونا اس بات کی قطعاً دلیل نہیں ہے کہ اس کی تمام آیات مکہ میں نازل ہوئی ہیں قرآن مجید میں متعدد ایسی سورتیں موجود ہیں جنہیں مکی کہا گیا ہے اور قرآن میں انہیں مکی لکھا گیا ہے لیکن ان کی کچھ آیات مدینے میں نازل ہوئی ہیں اور اس کے برعکس بعض سورتیں قرآن میں مدنی ہیں لیکن ان کی کچھ آیات مکی ہیں۔

مثال کے طور پر سورہ عنکبوت، مکی سورتوں میں سے ہے جب کہ طبری، قرطبی اور دیگر مفسرین کے بقول، اس کی پہلی دس آیات مدینے میں نازل ہوئی ہیں۔[5]

اس طرح سورہ کہف ہے جو کہ مکی ہے جب کہ قرطبی اور سیوطی کی تفسیروں کے مطابق اس کی پہلی سات آیات مدینے میں نازل ہوئی ہیں اور اسی طرح کی اور بہت سی مثالیں[6] سی طرح سے کئی سورتیں مدنی ہیں۔ جب کہ ان کی چند آیات مکی ہیں جیسے معروف قول کے مطابق سورہ مجادلہ مدنی ہے جب کہ بعض مفسرین نے صریحاً کہا ہے کہ اس کی پہلی دس آیات مکے میں نازل ہوئی ہیں۔[7]

---

[1] مجمع البیان، جلد ۹، ۱۰ صفحہ ۳۵۲

[2] مجمع البیان جلد ۱۰ صفحہ ۵۷، ۶۷

[3] مجمع البیان، جلد ۲۹، ۱۰ صفحہ ۵۲

[4] نور الابصار شبلجنی کے نقل کے مطابق ص ۷۱

[5] تفسیر طبری پارہ نمبر ۲۰، صفحہ ۸۶، تفسیر قرطبی، پارہ ۱۳، صفحہ ۳۲۳

[6] اس موضوع پر مزید معلومات کیلئے کتاب الغدیر صفحہ ۲۵۶ اور ۲۵۷ کا مطالعہ کریں۔

[7] ابوالسعود کی تفسیر جو فخر رازی کی تفسیر کے حاشیے پر لکھی ہوئی ہے، پارہ ۸، صفحہ ۱۴۸، اور السراج المنیر، جلد ۴، صفحہ ۳۱۰۔

خلاصہ یہ ہے کہ بہت سارے مقامات پر سورتیں مکی یا مدنی بتائی گئی ہیں اور قرآن اور تفسیروں میں ان کے ساتھ اور صفحات کے اوپر عنوان یہی تحریر کیا جاتا ہے جب کہ ان کی کچھ آیات کسی اور مقام پر نازل ہوئی ہوتی ہیں۔لہٰذا کوئی مانع نہیں ہے کہ سورہ معارج بھی ایسی سورتوں میں سے ایک ہو۔

دوسرا اعتراض: اس حدیث کے حوالے سے بیان ہوا ہے کہ حارث بن نعمان ''ابطح''میں رسول خدا ﷺ کے پاس آیا اور مسلم ہے کہ ''ابطح'' مکہ میں ایک درے کا نام ہے،اس لیے واقعہ غدیر کے بعد،مکہ اور مدینہ کے درمیان اس آیت کے نزول کے ساتھ اس حدیث کا کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔

جواب: پہلی بات تو یہ ہے کہ ''ابطح''کا لفظ بعض روایات میں آیا ہے نہ کہ سب روایات میں،دوسری بات یہ ہے کہ ابطح اور بطحاء ایسی ریتلی زمین کو کہتے ہیں جہاں پر سیلاب جاری ہوتا ہو مدینے اور دیگر علاقوں میں ایسی جگہیں موجود ہیں جنہیں ابطح یا بطحا کہا جاتا ہے اور قابل توجہ بات یہ ہے کہ روایات میں عربی اشعار میں اس کی طرف بار بار اشارہ کیا گیا ہے۔ان میں سے ایک مثال شہاب الدین (**المعروف حیص بیص**) کے مشہور اشعار ہیں جو اُس نے اہل بیت - کے مرثیے کے طور پر کہے ہیں۔ان اشعار میں ان پاکیزہ ہستیوں کی زبانی اپنے قاتلین سے خطاب کو اس نے بیان کیا ہے:

مَلَكْنَا فَكَانَ العَفْوُ مِنَّا سَجِيَّةَ
فَلَمَّا مَلَكْتُمْ سالَ بِالدِّمِ اَبْطَحُ
و حَلَّلْتُمْ قَتْلَ الاسارى و طَالَمَا
غَدَوْنَا عَنِ الاَسْرىٰ نَعْفُوا و نَصْفَحُ

ہم نے حکومت کی (پیغمبر اکرم ﷺ کی فتح مکہ کی طرف اشارہ ہے) معاف کر دینا ہماری عادت اور فطرت تھی (آنحضرتؐ کا عام معافی کا اعلان) لیکن جب تم اقتدار پر آئے ہو ابطح میں خون جاری ہو گیا اور تم نے قیدیوں کے قتل کو حلال سمجھا جب کہ ہم اسیروں کو معاف کر دیتے تھے۔

انتہائی واضح ہے کہ آل رسول ﷺ کے بزرگوں کا قتل زیادہ تر عراق و کربلا،کوفہ اور مدینے میں ہوا ہے اور مکہ میں ابطح کے مقام پر کوئی خون نہیں ہوا ہے،البتہ اہل بیتؑ کے بعض افراد کو فخ کے مقام پر خاک وخون میں غلطان کیا گیا،یہ مقام مکہ سے دو فرسخ (تقریباً ۹ کلومیٹر) کے فاصلے پر ہے جب کہ ابطح مکہ کے پاس ہے۔[1]

سید الشہداُ حضرت امام حسین - کے مرثیے میں ایک اور شاعر یوں کہتے ہیں:

وَ تَاِنُّ نَفسى لَلرُّبُوعِ وَ قَدْ غَدَا

---

[1] الغدیر،جلد۱،صفحہ۲۵۵

بَیْتَ   النَّبِیِّ   مُقَطَّعُ   الاَطْنابِ

بَیتُ   لِآلِ   المُصْطَفٰی   فِی   کَرْبَلا

ضَرَبُوہُ   بَیْنَ   اَبَاطِحٍ   وَ   رَوابی

میرا نفس نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ویران گھروں کے باقی ماندہ آثار پر آہ وفریاد کرتا ہے

بالخصوص آل مصطفی کے وہ گھر جو کربلا تھے جو ابطحا اور ٹیلوں کے درمیان برپا ہوئے تھے

(ابطح کا معنیٰ وہ زمین ہے جہاں ریت اور چھوٹی کنکریاں ہوں اور رابیہ کا معنیٰ اونچے ٹیلے ہیں)

اس طرح کہ دیگر بہت سے اشعار ہیں جن میں ''ابطح'' یا ''اباطح'' کے الفاظ آئے ہیں جن کا مطلب مکہ کا خاص علاقہ قطعاً نہیں ہے۔مختصر یہ کہ ابطح کا ایک معنی، مکہ کا خاص علاقہ ہے لیکن ابطح کا مفہوم اور مصداق اس علاقے میں منحصر نہیں ہے۔

۳۔اِس آیت کا ماقبل اور مابعد کے ساتھ کیا تعلق اور ارتباط ہے؟

بعض مفسرین نے اس آیت میں موجود حقیقت سے پہلوتہی کرنے کے لیے ایک اور بہانہ تلاش کیا ہے اور وہ یہ کہ اس سے پہلے اوراس کے بعد والی آیات اہل کتاب کے بارے میں ہیں لہٰذا اس آیت کا امامت وولایت اور خلافت کے موضوع سے کوئی تعلق نہیں ہے اوراس قسم کی دوگانگی قرآن کی فصاحت وبلاغت کے منافی ہے۔[1]

وہ افراد جو قرآن کی آیات کی جمع آوری کی کیفیت سے مطلع ہیں وہ جانتے ہیں کہ قرآن کی آیات تدریجاً اور مختلف مواقع پر نازل ہوئی ہیں،اس دلیل کی بنا پر ایک سورت مختلف موضوعات پر بات کرتی ہے،اس کی بعض آیات اگر کسی غزوہ کے متعلق ہیں تو بعض آیات کسی اسلامی حکم کو بیان کرتی ہیں،بعض منافقین کی بات کرتی ہیں تو بعض مومنین سے مخاطب ہوتی ہیں،مثال کے طور پر اگر ہم سورہ نور کو مدنظر رکھیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے مختلف حصے ہیں،ان میں سے ہر حصہ ایک مطلب کو بیان کررہا ہے،توحید اور قیامت سے لے کر حدزنا کے اجراء ''واقعہ افک'' منافقین کے متعلق مسائل اور پردے کے متعلق احکام اس میں بیان ہوئے ہیں۔(قرآن کی دیگر سورتوں کی بھی کم وبیش یہی صورتحال ہے) اگرچہ ایک سورت کے مختلف اجزاء کے درمیان کلی طور پر ایک رابطہ اور تعلق ضرور موجود ہوتا ہے۔

سورت کے مطالب اور مفاہیم میں تنوع کی دلیل وہی ہے جو بیان کی جاچکی ہے کہ قرآن تدریجی طور پر،ضرورت اور احتیاج کے مطابق اور مختلف واقعات کے حوالے سے نازل ہوا ہے یہ ایک مروج اور روایتی کتاب ہرگز نہیں ہے جو پہلے سے معین ایک ہی موضوع پر بحث وگفتگو کرے،اس بنا پر کوئی حرج نہیں ہے کہ سورہ مائدہ کا ایک حصہ اہل کتاب کے بارے میں ہو اور کچھ حصہ واقعہ غدیر کے متعلق نازل ہوا ہو،البتہ ایک لحاظ سے بطور کلی ان دو کا آپس میں تعلق بھی ہے،پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین کے تعین سے اہل کتاب کے معاملات پر بھی گہرا اثر پڑتا ہے،کیونکہ یہ مسئلہ ان کے لیے اس بات سے مایوسی کا باعث بنے گا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد اسلام ختم ہوجائے گا۔

[1] تفسیر المنار،جلد ۶،صفحہ ۴۶۶۔

۴۔علی -نے حدیث غدیر سے کیوں استدلال نہ فرمایا: کچھ اور حیلہ گروں کا کہنا ہے کہ اگر حدیث غدیر اتنی عظمت کے ساتھ حقیقت رکھتی ہے تو پھر حضرت علی، اہل بیت ÷ ان کے اصحاب اور چاہنے والوں نے مختلف مقامات پر اس سے استدلال کیوں نہیں کیا؟ کیا یہ بہتر نہ تھا کہ وہ علیؑ کی بلافصل خلافت کو ثابت کرنے کے لیے اس اہم دلیل اور سند کو پیش کرتے؟!

یہ اعتراض بھی دوسرے بہت سارے اعتراضات کی طرح حدیث، تاریخ اور تفسیر کی کتب سے ضروری معلومات نہ ہونے کی بنا پر ہے، کیونکہ اہل سنت کے علماء کی کتابوں میں بہت سی جگہوں پر نقل ہوا ہے کہ خود حضرت علیؑ یا ائمہ اہل بیت ÷ یا ان کے چاہنے والوں نے حدیث غدیر کو بطور دلیل پیش کیا ہے، تعجب اس بات پر ہے کہ اعتراض کرنے والوں کو یہ چیزیں کیوں نظر نہیں آئیں۔

خطیب خوارزمی حنفی اپنی کتاب ''مناقب'' میں عامر بن واثلہ سے نقل کرتے ہیں کہ شوریٰ والے دِن (شوریٰ چھ افراد پر مشتمل تھی جو حضرت عمر کے بعد خلیفہ کے انتخاب کے لیے مقرر کی گئی تھی) میں علی -کے ہمراہ تھا میں سُنا کہ وہ شوریٰ کے باقی ارکان سے کہہ رہے تھے: میں تمہارے سامنے ایسی محکم اور پختہ دلیل پیش کرتا ہوں عرب وعجم میں اس کا جواب دینے کی سکت نہیں ہے۔۔۔۔تمہیں اللہ کی قسم! کیا تمہارے درمیان میرے علاوہ کوئی ایسا شخص ہے جس کے حق میں رسول خدا ﷺ نے فرمایا ہو: ''مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَعَلِیٌّ مَوْلَاہُ اَللّٰھُمَّ وَالِ مَنْ والاہُ وانصر مَنْ نَصَرَہُ لِیُبَلِّغِ الشّاھِدُ الغائِبَ۔'' سب نے جواب دیا: ''نہیں''۔[1]

اس روایت کو حموینی نے فرائد السمطین، باب نمبر ۵۸ میں، ابن حاتم نے ''دُر النظیم'' اور ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغہ میں ذکر کیا ہے، اسی طرح ابن حجر نے صواعق میں دار قطنی سے اسی مطلب کو بیان کیا ہے۔[2] ''الغدیر'' میں مختلف مقامات پر امیر المومنین علیؑ کے ''مناشدہ'' استدلال پر جامع گفتگو کی گئی ہے۔ خاص طور پر حضرت عثمان کے دور میں، اپنے دور خلافت میں، جنگ جمل میں، دوبارہ کوفہ اور جنگ صفین میں ان کے استدلالات کو وسیع اور متعدد اسناد اور حوالوں کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، علاوہ ازیں حضرت فاطمہ زہرا ﷺ، امام حسن مجتبیٰ، امام حسین -سید الشہداء اور چند اصحاب وغیرہ اصحاب سے سولہ مقامات پر استدلال کو ذکر کیا گیا ہے یہ سب ایک لحاظ سے اس عظیم مصنف کی وسیع معلومات اور مطالعے پر دلالت کرتا ہے اور دوسرے لحاظ سے یہ ثابت کرتا ہے کہ جس حدیث سے استدلال مختلف صدیوں سے قابل توجہ رہا ہے اگرچہ ہر دور میں یہ موضوع خاص قسم کی سیاست کا شکار رہا ہے، جس کے تحت حتی المقدور یہ کوشش کی گئی کہ یہ مسئلہ اہمیت اختیار نہ کرنے پائے۔

اس امر کے پیش نظر کہ اس قسم کی وسیع بحثوں میں پڑنا ہمیں مطلوبہ ہدف سے دور کر دے گا لہٰذا اسی پر اکتفا کرتے ہوئے خواہش مند افراد کو اُسی کتاب[3] یا دیگر کتابوں کا مطالعہ کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔

---

[1] مناقب، صفحہ ۲۱۷

[2] الغدیر، جلد ا صفحہ ۱۶۱

[3] الغدیر، جلد ا صفحہ ۱۵۹ تا صفحہ ۲۱۳

۲۔ آیت ولایت

ایک اور آیت جو امامت خاصہ کے موضوع کو بیان کرتی ہے، وہ آیت ولایت ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ۝۵۵ (مائدہ/۵۵)

''تمہارا ولی سرپرست تو صرف اللہ اور اس کا رسول اور وہ اہل ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں۔''

شان نزول

بہت سارے محدثین اور مفسرین نے اس آیت کے شان نزول میں بیان کیا ہے کہ یہ آیت حضرت علیؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ سیوطی نے الدرالمنثور میں اس آیت کی تفسیر میں ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ علیؑ رکوع کی حالت میں تھے ایک سائل نے مدد کا سوال کیا، انہوں نے اپنی انگوٹھی سائل کو صدقے میں عطا کر دی، رسول خدا ﷺ نے پوچھا یہ انگوٹھی تمہیں کس نے صدقہ دی ہے؟ اس نے علیؑ کی اطرف اشارہ کیا اور بتایا کہ اُس رکوع میں کھڑے شخص نے دی ہے، اس موقعہ پر یہ آیت 'انما ولیکم اللہ ورسولہ ۔۔۔۔' نازل ہوئی۔ [۱]

اسی کتاب میں اور بھی متعدد روایات درج ہوئی ہیں جو اسی معنی اور مفہوم کو ابن عباس، سلمۃ بن کھیل اور خود حضرت علیؑ سے نقل کرتی ہیں۔ [۲] یہی مطلب واحدی کی اسباب النزول میں جابر بن عبداللہ اور ابن عباس سے بیان ہوا ہے۔ [۳] مشہور مفسر جاراللہ زمخشری تفسیر کشاف میں لکھتے ہیں: ''یہ آیت علیؑ کے بارے میں اس موقعہ پر نازل ہوئی ہے جب ایک سوالی نے سوال کیا اور وہ رکوع کی حالت میں تھے، انہوں نے اپنی انگوٹھی اس کی طرف بڑھا دی۔'' [۴]

فخر رازی اپنی تفسیر میں عبداللہ بن سلام سے نقل کرتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی، میں نے رسول خدا ﷺ سے عرض کیا کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے حضرت علیؑ نے رکوع کے دوران اپنی انگوٹھی سائل کو بطور صدقہ دی، اسی دلیل کی بنیاد پر ہم اس کی ولایت کو قبول کرتے ہیں۔ نیز وہ حضرت ابوذر سے بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا: ایک دن میں ظہر کی نماز پیغمبر اکرم ﷺ کے

---

[۱] تفسیر الدالمنثور، جلد ۲، صفحہ ۲۹۳

[۲] تفسیر الدالمنثور، جلد ۲، صفحہ ۲۹۳

[۳] اسباب النزول، صفحہ ۱۴۸

[۴] تفسیر کشاف، ج ۱، صفحہ ۶۴۹۔

ساتھ پڑھ رہا تھا کہ مسجد کے دروازے پر کسی سوالی نے آ کر مدد کرنے کا سوال کیا، کسی نے اُسے کوئی چیز نہ دی، سوالی نے ہاتھوں کو آسمان کی طرف اٹھا کر عرض کیا:

اے اللہ! گواہ رہنا میں نے تیرے نبی ﷺ کی مسجد میں سوال کیا ہے کسی نے مجھے کوئی چیز نہیں دی، حضرت علیؑ اس وقت نماز کی حالت میں تھے اپنے دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی کی طرف اشارہ کیا جس میں انگوٹھی تھی، سائل آیا اور اس نے آنحضرتؐ کی آنکھوں کے سامنے انگوٹھی کو اتار لیا۔ اس پر حضرت رسول خدا ﷺ نے بارگاہ ایزدی میں عرض کیا:

''بارالٰہا! میرے بھائی موسیٰ نے تجھ سے مانگا کہ میرا سینہ کھول دے۔۔۔۔ اور میرے بھائی ہارون کو نبوت کے امور میں میرے ساتھ شریک فرما! تو نے ان سے فرمایا: میں جلد ہی تیرے بھائی کے ذریعے تیرے بازو کو مضبوط اور قوی کروں گا اور تمہارے لیے طاقت اور غلبہ قرار دوں گا۔ تو اے اللہ! میں محمد تیرا رسول اور برگزیدہ ہوں، میرے سینے میں وسعت عطا فرما اور میرے لیے میرے کاموں کو آسان فرما اور میرے لیے میرے اہل بیت میں سے وزیر قرار دے اور اس کے ذریعے میری پشت کو مضبوط اور قوی فرما!''

ابوذر کہتے ہیں: خدا کی قسم رسول اللہ ﷺ کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ جبرئیل ؑ نازل ہوئے اور کہا: ''اے محمد! پڑھیں: 'انما ولیکم اللہ ورسولہ۔۔'' [1]۔ البتہ اس شان نزول کو نقل کرنے کے بعد حسب معمول فخر رازی نے اعتراضات کیے ہیں کہ یہ آیت امامت کے مسئلہ پر کیسے دلالت کرتی ہے، انہیں بعد میں ہم ذکر کریں گے۔

طبری نے بھی اپنی تفسیر میں اس آیت کے شان نزول اور تفسیر میں متعدد روایات ذکر کی ہیں جن میں اکثر یہی بیان کرتی ہیں کہ یہ آیت حضرت علیؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ [2] علما کے ایک اور بہت بڑے گروہ نے اسی روایت کو مختلف الفاظ کے ساتھ علیؑ کی شان میں بیان کیا ہے جیسے کنز العمال کی جلد نمبر ۶ صفحہ نمبر ۳۱۹ پر اس روایت کو ابن عباس سے نقل کیا گیا ہے۔

اسی طرح پانچویں صدی ہجری کے معروف عالم حاکم حسکانی حنفی نیشاپوری نے اپنی کتاب شواہد التنزیل میں پانچ ذرائع سے ابن عباس، دو ذرائع سے انس بن مالک، دو ذرائع سے محمد بن حنفیہ ایک ذریعے سے عطا بن السائب اور ایک ذریعے سے عبدالملک بن جریح مکی سے حضرت رسول اکرم ﷺ سے نقل کیا ہے کہ آیت: ''انما ولیّکم اللہ و رسولہ۔۔۔'' حضرت علیؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہے جنہوں نے رکوع کی حالت میں انگوٹھی سائل کو عطا کی ہے۔

علامہ امینی نے مذکورہ حدیث اور اس آیت کے علیؑ کی شان میں نازل ہونے کے متعلق اہل سنت کی بہت ساری کتابوں سے

---

[1] تفسیر الکبیر فخر رازی، جلد ۱۲، صفحہ ۲۶

[2] تفسیر طبری، ج ۶، صفحہ ۱۸۶،

نقل کیا ہے تقریباً بیس کتابوں کے مستند حوالے انہوں نے ذکر کیے ہیں، مزید مطالعے کے خواہش مند افراد ان کی کتاب الغدیر کو دیکھیں [۱] کتاب احقاق الحق میں یہی مطلب اس سے زیادہ کتب سے نقل کیا گیا ہے۔[۲]

قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور کے مشہور شاعر حسان بن ثابت نے اس مطلب کو ایک مسلمہ تاریخی واقعہ کے طور پر اپنے اشعار میں ذکر کیا ہے۔ اپنے مشہور شعر میں علیؑ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

و انت الذی اعطیت اذ کنت راکعا

زکاۃ فدتك النفس یاخیر راکع

فانزل فیك الله خیر ولایة

و بینها فی محکمات الشرایع [۳]

یہ آپ تھے جنہوں نے حالت رکوع میں زکوۃ بخشی۔ جان قربان ہو آپ پر اے بہترین رکوع کرنے والے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کے بارے میں بہترین ولایت نازل کی ہے اور اُسے قرآن مجید میں واضح طور پر بیان کیا ہے۔

ایک اور شعر جسے سبط بن جوزی حنفی نے حسانؓ سے نقل کیا ہے۔ یوں کہا ہے:

مَنۡ ذا بِخاتِمِهِ تَصَدَّقَ راكِعاً

وَ اَسَرَّها فِي نَفۡسِهٖ اِسراراً [۴]

کس نے رکوع میں اپنی انگوٹھی راہ خدا میں عطا کی اور اسے اپنے دل میں چھپایا!؟ (اور خداوند نے اُسے ظاہر کر دیا۔)

خلاصہ یہ ہے کہ: حضرت علیؑ کی شان میں اس آیت کا نزول کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس میں شک وشبہہ کی گنجائش ہو، یہاں تک کہ "منهاج البراعة فی شرح نهج البلاغه" کے مصنف کہتے ہیں: اس بارے میں اہل سنت اور پیروان مکتب اہل بیتؑ کے طرق سے متضافر بلکہ متواتر روایات نقل ہوئی ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ آیت کس طرح ولایت اور خلافت بلافصل پر دلالت کرتی ہے۔ اس کی وضاحت ہونی چاہیے۔

---

[۱] الغدیر، جلد ۲، صفحہ ۵۲، ۵۳

[۲] احقاق الحق، جلد ۲، صفحہ ۳۹۹ تا ۴۰۷

[۳] حسان بن ثابت کے اشعار تھوڑے سے فرق کے ساتھ تفسیر روح المعانی اور گنجی شافعی کی کفایہ الطالب اور دیگر بہت ساری کتب میں نقل ہوئے ہیں۔

[۴] تذکرہ الخواص، صفحہ ۱۰، نیز گنجی شافعی نے کفایۃ الطالب، صفحہ ۱۲۳ میں نقل کیا ہے اور اس کے کہنے والے کو شعراء میں سے شمار کیا ہے۔

آیت ولایت کی مسئلہ خلافت پر دلالت کی کیفیت

مذکورہ آیت میں تمام توجہ ''ولی'' کے لفظ پر مذکورہ ہے۔ حضرت علیؑ کو مسلمانوں کے ولی کے طور پر متعارف کرایا گیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ''ولی'' کے کئی معانی ہیں۔ جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا گیا ہے، اس کا معنی یار اور دوست بھی ہے اور متصرف حاکم اور سر پرست بھی ہے۔ راغب کے بقول اس کا اصلی اور بنیادی معنی یہ ہے کہ دو چیزوں کا ایک دوسرے کے اس قدر قریب ہونا کہ ان کے درمیان ذرا بھی فاصلہ نہ ہو، وہ مزید کہتے ہیں: واو کی زیر کے ساتھ وِلایت کا معنی مدد و نصرت ہے اور واو کی فتح کے ساتھ ولایت کا مطلب کسی چیز پر صاحب اختیار ہونا ہے۔[1] البتہ آیت میں ایک قرینہ موجود ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں پر ولی کا معنی متصرف، سر پرست اور صاحب اختیار ہے کیونکہ اگر اس کا معنیٰ ناصر، دوست اور مددگار ہو تو اس میں تمام مومنین شامل ہیں، جیسا کہ ہم سورہ توبہ کی آیت نمبر ۷۱ میں ہم پڑھتے ہیں:

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ

مومن مرد اور مومنہ عورتیں ایک دوسرے کے دوست اور مددگار ہیں۔

لیکن زیر بحث آیت میں ولایت خاص فرد میں منحصر شمار کی گئی ہے اور وہ شخصیت وہ ہے جس نے رکوع کی حالت میں صدقہ دیا ہے انما کا لفظ جو حصر پر دلالت کرتا ہے اس کے ساتھ آیا ہے۔ (غور کیجیے گا) یہ لفظ ہمارے اس یقین کا باعث بنتا ہے کہ مذکورہ آیت میں ولایت کا معنی، دوستی اور مدد کرنا ہرگز نہیں ہے۔ (اس طرح اس کے قریب اور مشابہہ دیگر معانی) بنابر ایں اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں کہ اس کا معنی سر پرست، متصرف اور صاحب اختیار تسلیم کیا جائے اور اس کی ولایت، اللہ تعالی اور حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولایت کے ساتھ قرار پائے۔ اس کے بعد والی آیت یہ ہے:

وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝۵۶

اور جو اللہ اور اس کے رسول اور ایمان والوں کی ولایت کو اپنائے گا (تو وہ غالب ہے) کیونکہ اللہ کی جماعت ہی غالب آنے والی اور فتح پانے والی ہے۔

درحقیقت یہ آیت سابقہ آیت کے مطلب کو تکمیل کر رہی ہے اور اس میں ولایت کے تصرف اور سر پرستی والے معنی پر ایک اور قرنیہ دکھائی دے رہا ہے کیونکہ حزب اللہ کی اصطلاح اور دشمنوں پر غلبہ حکومت اسلامی کی تشکیل سے مربوط ہے نہ کہ ایک عام دوستی سے۔ یہ امر خود ثابت کرتا ہے کہ سابقہ آیت میں ولی کا مطلب اسلام اور مسلمانوں کے حاکم، سر پرست اور ذمہ دار کے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ''حزب'' میں مشترکہ اہداف کے حصول کے لیے ایک قسم کی تنظیم اور اجتماعی روابط کا معنی پوشیدہ ہے۔

---

[1] مفردات راغب مادہ ''ولی''، بعض بزرگوں نے مولا کے ۲۷ تک معانی بیان کیے ہیں، (الغدیر، جلد ۱ ص ۳۶۲) لیکن ان کی اصل اور بنیاد وہی دو معنی میں باقی سب کی بازگشت انہی دو کی طرف ہے۔

اعتراضات اور بہانہ بازی

جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ امامت وخلافت کے موضوع پر آیت کی ولایت واضح ہے۔اگر یہ آیت دوسروں کے بارے میں نازل ہوتی تو شاید ذرا بھی قیل وقال نہ ہوتی! لیکن چونکہ یہ حضرت علیؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے اور فرقہ ورایت اور تعصب کی بنیاد پر اخذ کیے گئے نتائج سے سازگار نہیں ہے۔لہٰذا ایک گروہ آیت کی ابتداء انتہا، دلالت اور شان نزول غرض یہ کہ ہر طرف سے اعتراض کرنے پر تُلا ہوا ہے۔ان اعتراضات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، بعض اعتراضات ظاہری طور پر علمی ہیں لہٰذا ان کا جواب علمی لحاظ سے دینا چاہیے لیکن بعض اعتراضات واقعاً بہانہ جوئی کی غمازی کرتے ہیں ان کی بھی اجمالی طور پر چھان پھٹک ہونی چاہیے۔

ا۔ پہلے اعتراض کا تعلق پہلی قسم سے ہے اور وہ یہ ہے کہ اس میں ضمیروں اور موصولات جمع کی صورت میں آئی ہیں جیسے ''الّذِین آمَنُو''،''وَ الّذِینَ یقیمون''،''و یُؤتون''،''وھم را کعون'' اس حالت میں یہ کس طرح ایک شخص پر منطبق ہوسکتی ہیں آیت یہ کہہ رہی ہے کہ ان اوصاف کے حامل افراد تمہارے ولی ہیں نہ کہ ایک خاص شخص جو کہ علیؑ ابن ابی طالب ہیں

جواب

اس آیت کے شان نزول کے پیش نظر جو مستفیض بلکہ متواتر طور پر شیعہ اور سنی کے ذرائع سے نقل ہوا ہے، اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ اس آیت کا مطمع نظر ایک ہی شخص ہے، باالفاظ دیگر احادیث اور اسلامی تاریخ گواہی دیتی ہیں کہ رکوع کے دوران سائل کو صدقہ دینا صرف اور صرف علیؑ سے متعلق ہے نہ یہ کہ چند افراد نے یہ کام انجام دیا ہے، بنابریں یہ کہنا درست ہے کہ جمع کے صیغے اور ضمیریں اُس شخصیت کی تعظیم اور احترام کی وجہ سے استعمال ہوئی ہیں۔

عربی ادب میں بارہا مفرد کے لیے جمع کا لفظ استعمال ہوا ہے مثلاً آیت مباہلہ میں نسائنا کا لفظ جمع کی صورت میں آیا ہے حالانکہ متعدد شان نزول کے مطابق اس سے مراد سے صرف فاطمہ زہراؑ ہیں۔نیز اسی آیت میں ''اَنْفُسنا'' کا لفظ بھی جمع ہے حالانکہ سب تسلیم کرتے ہیں کہ مباہلہ میں حضرت رسول خدا ﷺ کے علاوہ باقی مردوں میں سے صرف اور صرف علیؑ نے شرکت کی تھی۔''غزوہ حمراء الاسد'' کے واقعہ میں ارشاد ہوا ہے:

الّذِیۡنَ قَالَ لَهُمُ النّاسُ اِنَّ النّاسُ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ فَاخْشَوْهُم فَزَادَهُمْ اِیماناً۔

وہ لوگ جن سے کچھ افراد نے کہا کہ لوگ تمہارے خلاف اکٹھے ہو چکے ہیں ان سے ڈریں تو (نہ صرف وہ ڈرے نہیں بلکہ) ان کے ایمان میں اضافہ ہوگیا۔

یہاں پر بات کرنے والے کے لیے''ناس'' کا لفظ استعمال ہوا ہے جو کہ جمع کا معنی رکھتا ہے حالانکہ تاریخوں میں آیا ہے کہ یہ بات کرنے والا نُعیم بن مسعودؓ کے علاوہ کوئی نہ تھا۔اسی طرح سورہ مائدہ کی آیت نمبر ۵۲:

فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ؕ

وہ افراد جن کے دِلوں میں نفاق کی بیماری ہے ان (یہودی اور عیسائیوں) کے ساتھ (دوستی کے لیے) ایک دوسرے پر سبقت لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں ڈر ہے کہ ہمارے ساتھ کوئی حادثہ پیش نہ آجائے (اور ہمیں ان کی مدد کی ضرورت پڑ جائے)

اس کے شان نزول میں ہم دیکھتے ہیں کہ یہ آیت عبد اللہ بن ابی کے بارے میں نازل ہوئی ہے جب کہ ضمیریں اس میں بھی جمع کی استعمال ہوئی ہیں۔اسی طرح سورہ ممتحنہ کی پہلی آیت میں بھی خطاب عام ہے جب کہ شان نزول ایک شخص جس کا نام حاطب بن ابی بلتعہ ہے، کے بارے میں ہے،سورہ منافقون کی آیت نمبر ۸ (يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ) میں بھی الفاظ جمع کے آئے ہیں حالانکہ یہ بات کہنے والا عبد اللہ بن اُبی تھا۔سورہ بقرہ کی آیت ۲۷۴: (اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ۔ یعنی: جولوگ اپنے اموال دن رات میں خرچ کرتے ہیں۔'') بہت ساری احادیث کے مطابق حضرت علیؑ کی شان میں نزول ہوئی ہے حالانکہ اس کی تمام ضمیریں جمع کی ہیں۔ نیز سورہ بقرہ کی آیت ۲۱۵ جو کہ چیزوں کے خرچ کرنے کے متعلق سوال سے مربوط ہے۔ (يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ ۔۔۔) میں الفاظ جمع کے ہے حالانکہ سوال کرنے والا عمرو بن جموح نامی ایک شخص تھا۔[1]

ان مقامات پر کس دلیل کی بنا پر کلام جمع کی صورت میں آیا ہے حالانکہ مدنظر ایک فرد ہے؟ ممکن ہے بعض مقامات پر اس کی دلیل احترام ہو اور بعض جگہوں پر اس شخص کے ساتھ دوسروں کی ہم فکری اور ہم آہنگی کی طرف اشارہ ہو۔ مذکورہ موارد میں غور وفکر کرنے سے احترام اور ہم فکری کے مقامات کو ایک دوسرے سے الگ کیا جا سکتا ہے۔

ان سب کو چھوڑتے ہوئے ہمیں معلوم ہے کہ قرآن کی بہت ساری آیات میں جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی بات کی ہے تو جمع متکلم کی ضمیر استعمال کی ہے، جب کہ اس کی ذات اقدس تو وحدہ لاشریک ہے یکتا و یگانہ ہے، وہ ہر لحاظ سے 'واحد' اور 'احد' ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیشہ بڑی شخصیات کے کارندے ہوتے ہیں جو ان کے ارادوں کے مطابق کاموں کو انجام دیتے ہیں اور مطیع وفرمانبردار ہوتے ہیں، اسی کے پیش نظر عین مفرد ہونے کے اللہ تعالیٰ اپنے لیے باوجود ضمیر جمع کا استعمال کرتا ہے دوسرے الفاظ میں جمع کی ضمیر اس کی عظمت و بزرگی اور بلند مقام ومنزلت کی علامت اور نشانی ہے۔

۲۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ حضرت رسول اکرم ﷺ کے زمانے میں حضرت علیؑ ولایت بمعنا حاکمیت اور قیادت مسلمین ہرگز نہیں رکھتے تھے پس آیت کا مذکورہ معنی کیونکر کیا جا سکتا ہے؟

اس کا جواب واضح ہے روزمرہ کے محاورات اور گفتگو میں بہت زیادہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک نام یا عنوان ایسے افراد کے لیے بولا جاتا ہے جو اس مقام ومنصب کے لیے نامزد یا انتخاب ہوئے ہوتے ہیں اگرچہ عملی طور پر انہوں نے وہ منصب اور عہدہ نہیں سنبھالا ہوتا یا دیگر الفاظ

---

[1] ان روایات کے حوالوں کے بارے میں مزید معلومات کیلئے اس آیت کی تفسیر میں تفسیر نمونہ کا مطالعہ کریں۔

میں وہ بالقوہ اس مقام کے حامل ہوتے ہیں نہ کہ بالفعل مثال کے طور پر ایک شخص اپنی زندگی میں کسی کو اپنا ''وصی'' مقرر کرتا ہے باوجود اس کے وہ ابھی زندہ ہوتا ہے، کہا جاتا ہے کہ فلاں اس کا وصی ہے یا اس کے بچوں کا نگران اور سرپرست ہے۔

حضرت علیؑ کا رسول خدا ﷺ کی زندگی میں ان کا وصی، خلیفہ اور جانشین ہونا اسی قبیل سے ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے اپنی زندگی میں اس مقام و منصب کے لیے اذن الٰہی سے انہیں منتخب کیا اور اپنی رحلت کے بعد انہیں اپنا جانشین اور خلیفہ مقرر کیا۔ سورہ مریم کی آیت نمبر ۵ میں بھی یہی مفہوم اور مطلب سامنے آتا ہے کہ حضرت زکریا - خدا سے مانگتے ہوئے کہتے ہیں:

فَهَبْ لِي مِن لَّدُنكَ وَلِيًّا ۝

بارالٰہا! مجھے میرا ولی اور جانشین عطا فرما۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی دُعا قبول فرمائی اور انہیں یحییٰ عطا فرمایا۔ مسلم بات ہے کہ حضرت یحییٰ حضرت زکریا کی زندگی میں تو ان کے جانشین ولی اور وراث نہ تھے بلکہ ان کی زندگی کے بعد کے لیے مقرر اور معین ہوئے تھے۔ اسی قسم کی بات یوم الانذار کے واقعہ میں دکھائی دیتی ہے (جس دن پیغمبر اکرم ﷺ نے اپنے رشتہ داروں کو کھانے پر بلایا اور پہلی مرتبہ انہیں اسلام کی دعوت دی) کیونکہ اسلامی مورخین اعم از شیعہ وسنی کی تحریروں کے مطابق اور بڑے بڑے محدثین کے قول کے مطابق اس دن حضرت رسول خدا ﷺ نے علیؑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

اِنَّ هذا اَخي و وصيّ وَ خَليفَتي فيكُمْ فَاسْمَعُوا لَهُ وَ اَطِيعُوهُ

یہ میرے بھائی، میرے وصی اور تمہارے درمیان میرے جانشین اور خلفیہ ہیں ان کی بات سنو اور اس کے فرمان پر عمل کرو۔[1]

کیا مذکورہ بالا اصطلاح حیات رسول ﷺ میں کسی مشکل کا سبب بنتی ہے؟ قطعاً نہیں بنتی۔ پس زیر بحث آیت میں ''ولی'' کی اصطلاح بھی بالکل اسی طرح کی ہے۔

دوسرے (بہانہ باز) گروہ کے اعتراضات بھی کافی تعداد میں ہیں۔ ان میں چند یہ ہیں:

۱۔ وہ کہتے ہیں علیؑ پر کونسی زکوۃ واجب تھی حالانکہ انہوں نے دنیا کے اموال سے اپنے لیے کچھ جمع نہیں کیا تھا؟ اور اگر مراد مستحب صدقہ ہے تو اُسے زکوٰۃ نہیں کہتے؟

جواب: پہلی بات تو یہ ہے کہ قرآن مجید میں زکوٰۃ مستحب پر زکوٰۃ کا اطلاق بہت زیادہ ہوا ہے چنانچہ بہت ساری مکی سورتوں میں زکوٰۃ کا

---

[1] اس حدیث کو بہت سارے علمائے اہل سنت جیسے ابن ابی جریر، ابن ابی حاتم، ابن مردویہ، ابونعیم، بیہقی، ثعلبی اور طبری نے نقل کیا ہے۔ ابن اثیر نے اپنی کتاب تاریخ الکامل کی دوسری جلد میں اس بات کو بیان کیا ہے۔ اسی طرح ابوالفداء نے اپنی تاریخ کی کتاب کی پہلی جلد میں اور دیگر افراد نے اپنی کتب میں ذکر کیا ہے (مزید وضاحت کیلئے آئندہ ابحاث کا انتظار کریں)

ذکر آیا ہے اوراس سے مراد مستحب زکوٰۃ اور صدقہ ہے کیونکہ زکوٰۃ ہجرت کے بعد مدینے میں واجب ہوئی ہے۔ سورہ نمل کی آیت نمبر ۳، سورہ ہود کی ۳۹، سورہ لقمان کی ۴ حم سجدہ کی آیت ان موارد میں سے ہے جن میں زکوٰۃ کا لفظ آیا ہے اور چونکہ یہ سورتیں مکی ہیں۔ لہٰذا ان سورتوں میں زکوٰۃ سے مراد مستحب زکوٰۃ ہے۔

دوسری بات کہ درست ہے کہ حضرت علیؑ نے مال دنیا سے اپنے لیے کچھ ذخیرہ نہیں کیا ہوا تھا اپنے خون پسینے کی تھوڑی بہت کمائی ضرور تھی۔ مذکورہ انگوٹھی بھی چاندی کی تھی اور ظاہراً کم قیمت تھی۔ اس بنا پر اتنی تھوڑی مقدار میں ان پر زکوٰۃ کا واجب ہونا کوئی بعید بھی نہیں ہے، اس انگوٹھی کی قیمت کے متعلق جو مبالغہ آمیز باتیں کی گئی ہیں ان کی کوئی اساس نہیں ہے۔

۲۔ کیا نماز کی حالت میں سائل کی طرف متوجہ ہونا نماز میں حضور قلب اور مناجات الٰہی میں غرق ہونے کے منافی نہیں ہے (جب کہ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ نماز کی حالت میں پاؤں سے تیر نکالا گیا لیکن انہیں بالکل محسوس نہ ہوا)[1] پس کس طرح ممکن ہے کہ انہوں نے نماز کی حالت میں سوالی کی درخواست پر توجہ کی ہو؟!

جواب: جس کسی نے یہ اعتراض کیا ہے وہ اس نکتے سے غافل ہے کہ سائل کی آواز سننا اور اس کی مدد کرنا غیر خدا یا اپنی طرف یا امور دنیوی میں مشغول ہونا نہیں بلکہ یہ بھی اللہ کی طرف توجہ اور انہماک ہے۔ حضرت علیؑ کا پاکیزہ دل سائلین کی صدا پر حساس تھا ان کی فریاد اور آواز کا جواب دیتے تھے انہوں نے ایک عبادی کام کو دوسری عبادت سے مخلوط کر دیا اور نماز کی حالت میں زکوٰۃ ادا کی اور یہ دونوں خدا کے لیے تھیں اور خدا کی راہ میں تھیں۔

ایک لحاظ سے یہ اعتراض اور نکتہ چینی درحقیقت قرآن پر اعتراض ہے کیونکہ اس آیت میں رکوع کی حالت میں زکوٰۃ دینے کو اللہ تعالیٰ بڑی قدرومنزلت اور عزت کی نگاہ سے دیکھ رہا ہے اگر یہ عمل ذکر خدا سے غفلت اور بے خبری ہوتا تو اس پر ایک عظیم اور غیر معمولی قدر و قیمت کی حاصل صفت کے عنوان سے زور نہ دیا جاتا۔ درحقیقت یہ متعصب افراد، حضرت علیؑ کی فضلیت کا انکار کرنا چاہتے تھے لیکن اعتراض خدا پر کر بیٹھے ہیں۔

یہاں فخر رازی کے بیان پر پوری توجہ کریں وہ کہتے ہیں ''حضرت علیؑ کے حالات سے یہی مناسب اور لائق ہے کہ وہ ذکر خدا میں غرق رہیں اور جس کی یہ حالت ہو وہ کسی اور کے کلام کو کیسے سن اور سمجھ سکتا ہے'' (بنابرایں سائل کی طرف توجہ کرنا آداب نماز کے خلاف ہے)[2]

فخر رازی سے پوچھنا چاہیے کہ اگر یہ کام آداب نماز اور حضور قلب کے برخلاف ہے تو پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی کیوں تعریف کی ہے اور مومنین پر ولایت کے لیے اس جیسے شخص کو لائق سمجھا ہے؟!

---

[1] روایت کا متن یوں ہے: روی انه وقع نصل فی رجله فلم یمکن من اخراجه فقال فاطمة سلام الله اخرجوه فی حال صلاته فانه لایحس بما یجری علیه حنیئذٍ فاخرج فهو فی صلاته (محجۃ البیضاء جلد اول، صفحہ ۳۹۸، احقاق الحق، ج ۲ ص، ۴۱۴۔

[2] تفسیر کبیر، جلد ۱۲، صفحہ ۳۰۔

بہر حال اس میں شک وشبہہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ نماز میں ضرورتمند اور محتاج شخص کی صدا سننا اور اس کی حاجت کو پورا کرنا، دو گنا عبادت ہے جو ایک لمحے میں انجام پائی، ان تعصّبات سے اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگنی چاہیے جو ہمیں حقائق سے دُور کر دیتے ہیں۔

۳۔ ان بہانوں میں سے ایک جو اعتراض کی شکل میں بیان ہوا ہے، یہ ہے کہ سائل کو انگوٹھی دینا فعل کثیر ہے جو نماز کے منافی اور بطلان کا سبب ہے۔

جواب: واقعاً کتنا عجیب ہے جب انسان حقیقت کو قبول نہ کرنا چاہے تو اس کے لیے وہ کن بہانوں کا سہارا لیتا ہے؟! اس اعتراض کے جواب میں پہلی بات یہ ہے کہ ایک اشارے سے انگوٹھی دے دینا کسی فتویٰ کے تحت بھی نہ تو فعل کثیر ہے اور نہ ہی نماز کے باطل ہونے کا سبب ہے خصوصاً جب نمازی نے اشارہ کیا ہو اور سوالی نے خود آکر اُسے اتارا ہو۔

دوسری بات یہ ہے کہ فقہا نے بڑی صراحت سے کہا ہے کہ چند صورتوں سے نماز پر بالکل اثر نہیں پڑتا جیسے نماز میں موذی جانور مثلاً بچھو وغیرہ کو مارنا، چھوٹے بچے کو اٹھانا، یا بٹھانا نماز کی رکعتوں کو کنکریوں سے شمار کرنا، یہاںتک کہ اگر نماز کی حالت میں لباس کا کنارہ نجس ہو جائے تو اُسے پاک کرنا، ان سے کاموں کی وجہ سے نماز باطل نہیں ہوتی جب کہ سائل کو انگوٹھی دینا یا اُسے اتارنا ان سب سے معمولی کام ہے۔

۴۔ بہانے تراشنے والے کہتے ہیں وہ غیر معمولی انگوٹھی حضرت علیؑ نے کہاں سے لی تھی؟ کیا اس طرح کی انگوٹھی پہننا فضول خرچی نہیں ہے؟

جواب: کس نے کہا ہے کہ اس انگوٹھی کی قیمت غیر معمولی تھی؟ ہم اس قسم کی بے بنیاد اور فضول باتوں پر کیوں توجہ دیں اور بتدریج ایک قرآنی آیات کے انکار تک جا پہنچیں۔ صرف ایک ضعیف مرسلہ روایت میں آیا ہے کہ اس انگوٹھی کی قیمت شام کے خراج کے برابر تھی، یہ بات حقیقت سے زیادہ افسانہ لگتی ہے شاید اس عظیم فضلیت کی اہمیت کو ختم کرنے کے لیے جعل سازوں کے ذریعے اس حدیث کو گھڑا گیا ہو۔

اس طرح کے مقامات پر گراں قیمت مال کا خرچ کرنا اہم نہیں بلکہ اہم یہ ہے کہ جو خود کسی چیز کا محتاج ہو وہ اُسے راہ خدا میں خرچ کرے اور اپنی ضرورت سے چشم پوشی کر لے اور یہ کام انتہائی خلوص کے ساتھ انجام پائے۔ جہاں خدا کی خاطر مسکین، یتیم اور اسیر کو چند روٹیاں دینے پر (البتہ بھوک اور شدید ضرورت کے وقت) قرآن مجید کی ایک پوری سورہ (اھل اتی) نازل ہو سکتی ہے تو کیا نماز کی حالت میں فقیر کو ایک انگوٹھی دینے پر ایک آیت نازل نہیں ہو سکتی؟ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

اس طرح کے دیگر اعتراضات بھی ہیں ان سب کا ذکر کرنا اور جواب دینا وقت کے ضیاع کا باعث ہوگا۔

۳۔ آیت اولی الامر

سورہ نساء کی آیت نمبر ۵۹ میں ارشاد ہوتا ہے:

یَاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِیۡعُوا اللّٰهَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡكُمۡ ۚ

اے ایمان والو اللہ کی اطاعت کرو، رسول کی اور تم میں سے جو صاحبان امر ہیں ان کی اطاعت کرو۔

ولایت عامہ کی بحث میں اس آیت اور اس سے مراد کون افراد ہیں، کے بارے میں مفصل گفتگو ہوئی ہے۔ جیسا کہ اشارہ ہوا کہ اولی الامر کی مطلق (بلا قید وشرط) اطاعت کا حکم اور وہ بھی حضرت رسول خدا ﷺ کی اطاعت کے ساتھ، اس بات کی دلیل ہے کہ ''اولی الامر'' میں وہی افراد شامل ہو سکتے ہیں جو رسول خدا ﷺ کی طرح ہوں یعنی ان کے معصوم جانشین ہوں، کیونکہ مطلق اطاعت غیر معصومین کے لیے ممکن ہی نہیں ہے۔ (غور کیجیے گا)

مذکورہ مقام پر ''اولی الامر'' کی تفسیر اور تشریح میں جتنے مشہور احتمالات تھے ان کا ذکر ہوا اور ان پر بحث وتمحیص کی گئی اور نتیجہ یہی نکلا تھا کہ ''اولی الامر'' کا صحیح معنی اور مفہوم معصوم امام ہی ہے۔

یہاں (ولایت خاصہ اور حضرت علیؑ کی بلافصل خلافت کی بحث میں) جس چیز کا اضافہ کرنے کی ضرورت ہے، وہ اُس مشہور حدیث کی تشریح اور وضاحت ہے جو مشہور اسلامی ماخذ (بالخصوص اہل سنت کے مشہور ماخذ) میں اس آیت کی حضرت علی۔ پر تطبیق کے سلسلے میں نقل ہوئی ہے۔ قابل قدر مفسر حاکم حسکانی حنفی نیشاپوری نے اس آیت کے حوالے سے پانچ حدیثیں نقل کی ہیں۔ ان سب میں (ایک واضح اور روشن مصداق کے طور پر) اولی الامر کا عنوان حضرت علیؑ پر منطبق کیا گیا ہے۔

پہلی حدیث انہوں نے خود حضرت علیؑ سے بیان کی ہے کہ جب حضرت رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میرے ساتھ شریک وہ افراد ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنا اور میرا نزدیکی قرار دیا ہے، اور ان کے بارے میں آیت 'یاایھا الذین آمَنوُ اطعیو الله... کو نازل فرمایا ہے۔ میں نے آنحضرتؐ سے پوچھا:

یا نبی الله من هم؟

اے اللہ کے نبی وہ کون ہیں؟

قال: انت اوّلهم

آپؐ نے فرمایا: آپ ان میں سے پہلے ہیں۔

دوسری حدیث مشہور مفسر مجاہد سے نقل کرتے ہیں کہ یہ آیت امیر المومنین علیؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہے اس وقت جب آنحضرتؐ نے انہیں مدینے میں اپنا جانشین بنایا تھا (اور خود غزوہ تبوک کی طرف روانہ ہونے والے تھے)۔ تیسری حدیث میں اسی مطلب

کو وہ ابوجعفر امام باقر -سے نقل کرتے ہیں۔ چوتھی حدیث میں سعد بن ابی وقاص سے بیان کرتے ہیں کہ جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تبوک جانے کے لیے (مدینے کے نزدیک مقام) جُرف پر پہنچے۔ حضرت علیؑ آپؐ کے پیچھے اسلحہ اٹھائے ہوئے موجود تھے، انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! مجھے اپنی جگہ پر چھوڑ کر جا رہے ہیں (مجھے اپنے سے جدا کر دیا) جب کہ میں کسی غزوہ میں بھی آپؐ سے جدا نہیں ہوا ہوں، منافقین نے میرے بارے میں افواہیں پھیلا دی ہیں کہ چونکہ آپؐ مجھے ساتھ نہیں لینا چاہتے، اس لیے مجھے مدینے میں چھوڑ کر جا رہے ہیں، حضرت سعد کہتے ہیں میں نے خود اپنے کانوں سے سُنا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

یا علی: اَلاَ تَرْضٰی اَنْ تَکُونَ مِنّی بِمَنْزَلَةِ هَارُونَ مِنْ مُوسیٰ اِلاَّ اَنَّه لاَ نَبِیّ بَعْدِی فَارْجِعْ فَاخْلُفْنِی فِی اَهْلِی وَاَهْلِكَ۔

اے علی! کیا آپ اس پر راضی نہیں ہے کہ آپ کو میرے سے وہی نسبت ہے جو ہارون کو موسیٰ کے ساتھ تھی مگر یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے (تمہارے پاس ہارون کے تمام عہدے ہیں سوائے نبوت کے) لہٰذا واپس جائیں اور میرے گھر والوں اور اپنے گھر والوں میں میرے جانشین اور نائب بنو (اور مدینے کو منافقین کے شر سے محفوظ رکھو)

اسی طرح کی بات پانچویں حدیث میں خود حضرت علیؑ سے نقل ہوئی ہے۔[1]

''ابوحیان اندلسی کی تفسیر ''البحر المحیط'' میں ''اولی الامر'' کے معنی کے بارے میں جو اقوال بیان کیے گئے ہیں ان میں سے مقاتل، میمون اور کلبی (تینوں مفسرین) سے وہ نقل کرتے ہیں کہ ان سے مراد سرایا (جن جنگوں میں آنحضرتؐ خود شریک نہیں ہوئے) کے کمانڈر یا آئمہ اہل بیتؑ ہیں۔[2] اس کے بعد مذکورہ شخص نے علیؑ کے بارے میں اس آیت کے نزول کے حوالے سے دو اعتراض کیے ہیں۔

پہلا اعتراض: علیؑ ایک فرد تھے جب کہ ''اولی الامر'' جمع کا صیغہ ہے۔

دوسرا اعتراض: آیت ظاہر کر رہی ہے کہ لوگوں پر اولی الامر کی اطاعت، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں ضروری تھی جب کہ حضرت علی -رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں امام نہ تھے۔[3] اسی طرح کے اعتراضات اور بہانے بازی کی مثالیں آیت ولایت میں بھی گزر چکی ہیں جن کا وہاں پر بڑی تفصیل کے ساتھ جواب دیا جا چکا ہے۔ ہم نے کہا تھا کہ کئی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ اشخاص اپنی زندگی میں ہی اپنے وصی مقرر کر دیتے ہیں اور اپنی گفتگو اور تحریروں میں کہتے ہیں کہ فلاں میرا وصی ہے اُسے ایسا کرنا چاہیے ویسا کرنا چاہیے یا مثلاً میری اولاد کو اس کی پیروی کرنا چاہیے وغیرہ اور ان سب کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میری وفات کے بعد اُسے ان کاموں کو انجام دینا چاہیے۔

---

[1] ان پانچ حدیثوں کو شواہد التنزیل جلد ۱، صفحہ ۱۴۸ تا ۱۵۱ میں ذکر کیا ہے۔

[2] بحر المحیط جلد ۳، ص ۲۷۸

[3] بحر المحیط جلد ۳، ص ۲۷۸

جیسا کہ ہم نے کہا کہ جمع کے صیغے کی بھی کوئی مشکل نہیں ہے کیونکہ قرآن اور قرآن کے علاوہ شعر وادب اور عربی نثر میں جمع کا استعمال مفرد کے لیے بہت زیادہ ہے، علاوہ ازیں یہاں پر اولوالامر کا مفہوم واقعاً جمع کا ہے اور یہ تمام معصوم اماموں کو شامل ہے، اگرچہ ہر دور میں امام معصوم ایک ہی ہوتا ہے، لیکن مجموعی طور پر یہ ایک جماعت اور گروہ ہوں گے۔ ان دو اعتراضات کے جواب کی مزید تفصیل آیت ولایت کے بارے میں گفتگو کا مطالعہ کریں۔

قابل توجہ امر یہ ہے کہ شواہد التنزیل میں حاکم حسکانی کے علاوہ اور افراد نے بھی اپنی کتب میں اس آیت کی شان نزول کے حوالے سے کچھ روایات نقل کی ہیں وہ یہی کہتی ہیں کہ یہ آیت حضرت علیؑ کی خلافت کے متعلق ہے۔ ان افراد میں سے ایک بڑے عالم ابوبکر بن مومن شیرازی ہیں جو اپنے رسالہ اعتقاد (مناقب کاشی کے نقل کے مطابق) میں ابن عباس سے نقل کرتے ہیں کہ مذکورہ آیت حضرت علیؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جب حضرت رسول اکرم ﷺ (تبوک کی طرف جاتے وقت) انہیں مدینے میں چھوڑا تو حضرت علیؑ نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا آپ مجھے عورتوں اور بچوں کی طرح مدینے میں چھوڑ کر جا رہے ہیں؟ آنحضرتؐ نے فرمایا:

اَمَا تَرْضٰی اَنْ تَکُونَ مِنِّی بِمَنْزَلَةِ هَارُونَ مِنْ موسیٰ حینَ قال: اُخْلُفْنِی فِی قومی وَ اصلح، فقال عَزَّوَجَلَّ وَ اُوْلِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ۔ [1]

کیا آپ خوش نہیں ہیں کہ آپ کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارون کو موسیٰ کے ساتھ تھی، اس وقت جب موسیٰ نے اس سے کہا تھا بنی اسرائیل میں میرے جانشین بن کر رہو اور اصلاح کرو اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا: "وَ اُوْلِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ۔"

"ینابیع المودۃ" کے مصنف شیخ سلیمان حنفی قندوزی، اپنی کتاب میں سلیم بن قیس ہلالی کی کتاب "مناقب" سے نقل کرتے ہیں کہ ایک دن ایک شخص حضرت علیؑ کے خدمت میں آیا اور پوچھا: سب سے چھوٹی چیز کونسی ہے جس کی وجہ سے انسان مومنین میں شمار ہوگا، نیز سب سے چھوٹی چیز کونسی ہے جس کی بنا پر وہ کافروں اور گمراہوں میں سے ہو جائے گا؟ امام نے فرمایا:

"سب سے کمتر چیز جس کی وجہ سے انسان گمراہوں میں شامل ہو جائے گا وہ اللہ کے نمائندے اور حجت (جس کی اطاعت اور ولایت کو تسلیم کرنا واجب ہے) اور اس کے گواہ اور شاہد کو نہ پہچاننا ہے۔"

اس شخص نے کہا: یا امیر المومنین! انکا مجھے تعارف کرائیں۔ حضرت علیؑ نے فرمایا:

"وہی ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ اپنے اور رسول ﷺ کے ساتھ کیا ہے اور فرمایا ہے: "یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُو اَطِیعُو اللهَ وَاَطِیعُو الرَّسُولَ وَاُولِی الاَمْرِ مِنْکُمْ۔" [2]

---

[1] احقاق الحق، جلد سوم صفحہ ۴۲۵

[2] ینابیع المودۃ، صفحہ ۱۱۶) طبع دار الکتب العراقیہ)

یہ حدیث ثابت کرتی ہے کہ اولی الامر اللہ کا نمائندہ اور حجت ہے نہ کہ لوگوں کی رائے سے انتخاب ہوا ہے۔

تفسیر برہان میں اہل بیتؑ کے حوالوں سے اس آیت کے متعلق دسیوں ایسی روایات نقل ہوئی ہیں جو بیان کرتی ہیں کہ مذکورہ آیت حضرت علیؑ یا آپ اور دیگر ائمہ اہل بیتؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ ان میں سے بعض روایات میں بارہ اماموں میں سے ایک ایک کے نام بھی ذکر ہوئے ہیں۔[1]

☆☆☆☆

[1] تفسیر برہان جلد ۱، صفحہ ۳۸۱۔۳۷۸

۴۔آیت صادقین

سورہ توبہ کی آیت ر ۱۱۹ میں ارشاد ہوتا ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

اے ایمان لانے والو، تقوی الٰہی اختیار کرو اور (ہمیشہ) سچوں کے ساتھ رہو۔

اس آیت کی تفسیر ولایت عامہ کی بحث میں بطور مفصل گزر چکی ہے۔ یہاں پر جس چیز کی زیادہ وضاحت کی ضرورت ہے وہ ان روایات کی تشریح ہے جو اس آیت کو علیؑ یا تمام اہل بیتؑ پر منطبق کرتی ہیں:

۱۔معروف مفسر جلال الدین سیوطی "الدر المنثور" میں حضرت ابن عباس سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے آیت "اِتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُونُوا مَعَ الصَّادقين" کی تفسیر میں کہا: "مع علی بن ابی طالب۔" یعنی علی ابن ابی طالب کے ساتھ رہو۔ اسی طرح کی بات خوارزمی نے "مناقب" میں "زرندی" نے "درر السمطین" میں، عبد اللہ الشافعی نے "مناقب" میں اور حاکم حسکانی نے "شواہد التنزیل" میں بیان کی ہے البتہ اس فرق کے ساتھ بعض کے الفاظ یہ ہیں "هو علی بن ابی طالب" اور بعض میں یہ الفاظ آئے ہیں "نَزَلَتْ فِي علی ابن ابی طالب خاصّةً" اور بعض میں "مع علی و اصحاب علیٍّ" کے الفاظ ذکر ہوئے ہیں۔[۱]

۲۔حافظ سلیمان قندوزی حنفی نے ینابیع المودة میں حضرت سلمان فارسی سے نقل کیا ہے کہ جب یہ آیت (يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ) نازل ہوئی تو حضرت سلمان نے عرض کیا: "یا رسول الله! هذا عامّة اَمْ خاصّه" یعنی: اے اللہ کے رسول! آیت کا مفہوم عام ہے یا خاص؟ حضرت رسول خدا ﷺ نے فرمایا:

"اَمَّا المامورون فَعَامَّةَ الْمؤمِنينَ، وَ اَمَّا الصَّادِقُونَ فخاصَّة، اَخِي عَلِيّ وَ اَوْصِيائَه مِنْ بَعْدِهٖ اِلٰی يَوْمِ الْقِيامَةِ۔"

ترجمہ: جن افراد کو اس کا حکم دیا گیا ہے وہ عام مومنین ہیں البتہ صادقوں خاص افراد ہیں اور وہ میرے بھائی علیؑ اور ان کے بعد قیامت تک ان کے اوصیاء ہیں۔[۲]

۳۔حاکم حسکانی نے شواہد التنزیل میں عبد اللہ بن عمر سے "کونوا مع الصادقین" کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا ہے: یعنی "محمّداً وَ اَهْل بيتهٖ۔" یعنی: "صادقین سے مراد محمدؐ اور ان کے اہل بیت ہیں۔"[۳]

---

[۱] مناقب، صفحہ ۸۹، درر السمطین، صفحہ ۹۱، مناقب عبد اللہ الشافعی، صفحہ ۱۵۴، شواہد التنزیل جلد ۱، صفحہ ۲۵۹۔

[۲] ینابیع المودة، صفحہ ۱۵۵

[۳] شواہد التنزیل، جلد ۱، صفحہ ۲۶۲

۴۔اہل سنت کے بعض بزرگ علماء جیسے علامہ حموینی نے فرائد السمطین میں اور شیخ ابوالحسن کازرونی نے ''شرف النبی'' میں حضرت امام محمد باقر - سے مذکورہ آیت کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ: ''مَعَ آلِ محمد'' یا ''مع محمد و آلِہٖ'' یا ''مَعَ محمد و علی''۔سب کا معنی تقریباً ایک جیسا ہے یعنی: ''محمد وآل محمد کے ساتھ ہو جاؤ۔''[1]

ایسے علماء جنہوں نے مذکورہ بالا روایات کو زیر بحث آیت کی تفسیر میں بیان کیا ہے وہ فقط مذکورہ دو افراد میں منحصر نہیں ہیں۔

یہاں یہ نکتہ بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کہ مومنین سچوں کے ساتھ رہیں، ایک مطلق اور قید و شرط کے بغیر ہے اور یہ امر معصومین کے علاوہ کسی اور کے لیے ممکن نہیں ہے کیونکہ غیر معصوم کے لیے امکان خطا ہے لہٰذا خطا کے وقت اس سے جدا ہونا چاہیے، جن کے ساتھ ہر وقت ساتھ رہا جائے اور پیروی کی جائے وہ معصومین کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتے۔اس بنا پر اس آیت میں صادقین سے مراد ہر سچا آدمی نہیں ہے بلکہ وہ سچے مراد ہیں، جو نہ ہی جان بوجھ کر اور نہ ہی بھول کر غلط بات کرتے ہیں۔

اس کے باوجود بعض بڑے مفسرین پر تعجب ہوتا ہے جیسے آلوسی روح البیان میں چندان روایات جو صادقین سے علیؑ کو ثابت کرتی ہیں کو ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ شیعوں نے علیؑ کی حقانیت پر اس آیت سے استدلال کیا ہے اس کے بعد وہ لکھتے ہیں یہ استدلال باطل ہے اور اپنے دعویٰ پر دلیل کے طور پر ایک لفظ کہے بغیر اس سے گزر جاتے ہیں۔اس طرح کا طرز عمل ثابت کرتا ہے کہ تعصب کے دبیز پردے سوچ اور فکر کے نور کے چمکنے میں رکاوٹ بن جاتے ہیں اور حریت فکر کو علماء سے بھی سلب کر دیتے ہیں۔

اس کے مقابلے میں ڈاکٹر محمد تیجانی جیسے حریت فکر رکھنے والے افراد سامنے آتے ہیں جو اسی آیت اور اس سے مربوط روایات کی روشنی میں اپنا راستہ تلاش کر لیتے ہیں اور بڑی بہادری سے علیؑ اور باقی ائمہ اہل بیتؑ پر اپنے ایمان کا واضح طور پر اعلان کر دیتے ہیں۔ انہوں نے اس بارے میں بڑی نفیس کتاب بعنوان ''لاکون مع الصادقین'' (میں سچوں کے ساتھ ہو جاؤں) تحریر کی ہے، بہت سارے مسلمانوں پر اس کا عجیب اثر ہوا ہے۔

[1] مزید معلومات کیلئے دیکھیں، احقاق الحق، جلد ۱۴، صفحہ ۲۷۴، ۲۷۵، الغدیر، جلد ۲، صفحہ ۲۷۷، احقاق الحق: جلد ۳ صفحہ ۲۹۶ کے بعد اور جلد ۱۴ صفحہ ۲۷۰ تا ۲۷۷۔

۵۔ آیت قربیٰ

سورہ شوریٰ آیت ر ۲۳ میں حضرت رسول اکرم ﷺ سے خطاب ہوتا ہے:

قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ط

کہہ دیں میں تم سے کوئی بھی اجر رسالت نہیں مانگتا مگر یہ کہ میرے قریبوں سے مودّت رکھو۔

اس آیت میں ''ذوی القربیٰ'' سے کیا مراد ہے؟ تمام شیعہ مفسرین اور بعض سنی مفسرین نے کہا کہ ذوی القربیٰ سے مراد حضرت رسول خدا ﷺ کے قریبی یعنی رشتہ دار ہیں۔ اس تفسیر کے مقابلے میں دیگر احتمالات اور تفسیریں ذکر کی گئی ہیں لگتا یوں ہے کہ ان کا اصلی محرک امامت اور خلافت رسولؐ کے مسئلہ کی اہمیت کو کم کرنا اور اہل بیتؑ کے مقام کو گھٹانا ہے، ان میں سے تین تفسیریں یہ ہیں۔

۱۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ رسالت کا اجر اور جزا ایسے امور سے محبت کرنا ہے جو تمہیں قرب الٰہی کی دعوت دیں، بنابر ایں ''القربیٰ'' وہ امور میں جو خدا کے قرب کا باعث ہیں۔ واضح ہے کہ یہ تفسیر آیت کے مفہوم سے ہم آہنگ نہیں ہے کیونکہ قرب الٰہی کے اسباب یعنی نماز، روزہ جہاد اور اس طرح کے دیگر امور کے لیے جو چیز اہم ہے وہ ان پر عمل کرنا ہے نہ کہ ان سے محبت اور مودت لہٰذا اس موضوع سے محبت کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور کیا رسول اکرم ﷺ کے سامعین کے درمیان کوئی ایسا تھا جو ان چیزوں سے محبت نہ کرتا ہو بلکہ وہ افراد جو ان پر عمل کرنے میں کوتاہی کرتے تھے وہ بھی اللہ اور قرآن پر ایمان کی رو سے ان چیزوں سے محبت کرتے تھے اگرچہ عمل نہیں کرتے تھے۔

ان سب سے ہٹ کر ''القربیٰ'' کا معنی قریب اور نزدیک ہے نہ کہ نزدیک کرنے والا، لہٰذا وہ تمام مقامات جہاں قرآن مجید میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے (اس آیت کے علاوہ ۱۶ دفعہ) ان افراد کے معنی میں یہ آیا ہے جو قربت اور نزدیکی رکھتے ہیں (اور زیادہ تر رشتہ داری کی قربت) کیوں اور کس دلیل کی بنا پر زیر بحث آیت میں قرآن کے تمام موارد استعمال اور لغوی معنی کے برخلاف اس کی تفسیر کی گئی ہے، کیا اس کا محرک وہی ہے جس کی طرف پہلے اشارہ کیا گیا ہے؟

یہ بات قابل توجہ ہے کہ بہت سارے ارباب لغت نے تصریح کی ہے کہ قربی یا ذی القربی، نسب میں قرابت اور نزدیکی کے معنی میں ہے۔ مقائیس اللغۃ کا کہنا ہے: **فلان ذوقرابتی، هو مَنْ يَقْرُبُ مِنْكَ رَحِماً** وہ مزید کہتا ہے: القربی، القرابۃ یعنی دونوں کا ایک ہی معنی ہے اور لسان العرب میں آیا ہے: **و القربة و القرابى: الدَّنُوُّ فِي النَّسَبِ**، قرابت اور قربی نسبی طور پر قریب اور نزدیک ہونا ہے۔

۲۔ کچھ اور افراد کا کہنا ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم مسلمان اجر رسالت کے طور پر اپنے رشتہ داروں سے محبت کرو! حالانکہ اپنے رشتہ داروں سے محبت اور دوستی کا اجر رسالت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مزید حیران کن بات ہے کہ یہاں پر بہترین معنی رسول خدا ﷺ کے ذوالقربیٰ سے محبت ہے اس کو چھوڑ کر اپنے رشتہ داروں کی محبت کو اجر رسالت کے عنوان سے پیش کیا جا رہا ہے!

۳۔ کچھ مفسرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ میری (یعنی رسول) کی رشتہ داری کا تم اجر و رسالت کے عنوان سے لحاظ اور خیال رکھو۔ تم میں سے بہت سے قبائل کے ساتھ میری سببی (سسرالی) یا نسبی رشتہ داری ہے اس حوالے سے تم مجھے اذیت نہ پہنچانا۔

آیت کی تفسیر میں یہ بدترین معنی ہے جو کیا گیا ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ اجر رسالت صرف ان سے طلب کیا جارہا ہے جو رسالت پر ایمان لا چکے ہیں پھر ان لوگوں کی طرف سے پیغمبر اکرم ﷺ کو تکلیف اور آزار پہنچانے کا کیا مطلب! یعنی ان کے بارے میں یہ تصور نہیں کیا جاسکتا، لیکن اگر مراد ان کے دشمن ہیں جو انہیں ایذائیں اور تکلیفیں پہنچاتے تھے۔ ان کا اجر رسالت ادا کرنا تو درکنار یہ افراد تو سرے سے آپ کی نبوت کو تسلیم ہی نہیں کرتے تھے، پس یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ ان افراد سے کہیں کہ میری رسالت کا صلہ یہ ہے کہ میری جو تم سے رشتہ داری ہے اس کی وجہ سے مجھے اذیت و آزار مت پہنچانا۔

زیر بحث آیت میں بنیادی نکتہ یہ ہے کہ ایک طرف قرآن مجید، بہت سے انبیاء الٰہی سے نقل کرتا ہے کہ انہوں نے واضح طور پر یہ کہا کہ ہم تم سے ذرا بھی اجر اور صلہ نہیں چاہتے ہمارا صلہ اور اجر تو عالمین کے پروردگار پر ہے: ''وَمَا اَسْئَلُکُم علیہ من اجر اِن اجریَ اِلاَّ علٰی رَبِّ العالمین۔'' مذکورہ جملہ صرف سورہ شعراء میں انبیاء الٰہی میں سے پانچ افراد (حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت لوط اور حضرت شعیب) کے بارے میں ذکر ہوا ہے۔[1] دوسری طرف زیر بحث آیت میں خود آنحضرتؐ کے بارے میں ارشاد ہو رہا ہے میں تم سے کوئی اجر اور صلہ نہیں مانگتا مگر یہ کہ میرے رشتہ داروں سے دوستی اور محبت رکھو۔ تیسری جانب سورہ فرقان کی آیت ۵۷ میں رسول اکرم ﷺ کے متعلق ارشاد ہوا ہے:

قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ۝۵۷

کہہ دو میں تم سے رسالت کی تبلیغ پر کسی معاوضہ کا مطالبہ نہیں کرتا مگر یہ کہ جو شخص چاہے وہ اپنے رب کا راستہ اختیار کر لے۔

چوتھی جانب سورہ سباء کی آیت ۴۷ میں رسول اللہ ﷺ کے متعلق ہی فرمایا گیا ہے:

قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۚ

کہہ دیں! میں نے جو صلہ مانگا ہے وہ تمہارے ہی فائدے کے لیے ہے، میرا اجر تو صرف اور صرف اللہ پر ہے۔

ان چار قسم کی آیات کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر دیکھنے سے یہ نتیجہ بخوبی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے بھی دیگر انبیاء کی طرح اپنی ذات کے لیے لوگوں سے کوئی اجر اور صلہ نہیں مانگا بلکہ آپ کی ذوی القربی کی مودت خدا کی طرف راستہ ہے اور یہ بات سو فی صد ان کے فائدہ کے لیے ہے کیونکہ یہ امامت و خلافت اور رسول خدا ﷺ کی جانشینی کے مسئلے، امت میں آنحضرتؐ کے رہبریت کے طریقہ کار کا تسلسل اور اس کے سایے میں لوگوں کی ہدایت کا ایک دریچہ ہے۔ (غور کیجیے گا)

جب ہم ان چار قسم کی آیات کی اس طرح تفسیر کریں گے تو پھر ان کے مفہوم میں کسی قسم کا ابہام، پیچیدگی اور مشکل باقی نہیں

---

[1] سورہ شعراء بالترتیب آیات، ۱۰۹، ۱۲۷، ۱۴۵، ۱۶۴، ۱۸۰۔

رہے گی بصورت دیگر ایک طرف تو ان میں تضاد نظر آئے گا اور دوسری طرف ہمیں ایسی تشریحات کا سہارا لینا پڑے گا جو کسی بھی لحاظ سے آیات کے ظاہر سے میل نہیں کھاتیں۔

چونکہ مذکورہ تفسیر بعض مفسرین کے مزاج اور طبیعت کے موافق نہیں ہے، کیونکہ ان کی پہلے سے طے شدہ آراء اور افکار سے یہ متصادم ہے اس لیے انہوں نے اس تفسیر کو نظر انداز کرتے ہوئے کبھی کہا اجر کا مطالبہ کرنا پیغمبر ﷺ کی شان کے منافی ہے۔ لہٰذا ''اِلاَّ المودّۃ فی القربیٰ'' کو استثناء منقطع شمار کرنا چاہیے۔ کبھی کہا یہ آیت ''قُلۡ مَاۤ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُتَكَلِّفِيۡنَ'' کی آیت کے منافی ہے اور کبھی دیگر غیر معقول توجیہات کے شکار ہوئے۔

یہ حقیقت اس وقت اور زیادہ آشکار ہو جاتی ہے جب ہم اس آیت کی شرح اور تفسیر میں منقولہ احادیث نبوی ﷺ کا مطالعہ کرتے ہیں اور انہیں آیت کے ساتھ ملا کر نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔ اس آیت کی تفسیر میں بیان ہونے والی روایات سے مجموعی طور پر یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ بلا شک و تردید زیر بحث آیت مسئلہ امامت وخلافت پر ناظر ہے جو کہ اجر رسالت کا عنوان ہو سکتا ہے، ایسا اجر جو لوگوں کو اللہ تعالیٰ سے قریب کرتا ہے اور اس کا فائدہ خود انہی کی طرف لوٹتا ہے۔

جو کچھ اوپر بیان ہوا ہے اس سے ان چند مفسرین کو واضح جواب مل جاتا ہے جو ہمیشہ امامت سے مربوط آیات کے بارے میں متعصب رویہ اختیار کرتے ہیں۔ ''روح المعانی'' میں اس آیت کی تفسیر میں ''آلوسی'' کہتے ہیں: شیعہ اس آیت کے صغریٰ اور کبریٰ ملانے کے بعد اسے حضرت علیؑ کی امامت پر دلیل قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں: ان کی محبت (آیت کے مطابق) واجب ہے اور جس کی محبت واجب ہو، وہ واجب الاطاعۃ ہے اور جس کی اطاعت واجب ہو وہ امام ہوتا ہے پس حضرت علیؑ امام ہیں۔ اس کے بعد وہ اس صغریٰ اور کبریٰ پر اعتراضات کرتے ہیں۔[1]

لیکن جیسا کہ مذکورہ بالا گفتگو سے ثابت ہوا ہے کہ ہم کبھی بھی اس طرح کی کمزور دلیلیوں سے استفادہ نہیں کرتے۔ آیت میں اہم نکتہ کوئی اور چیز ہے اور وہ یہ کہ آیت میں ذوی القربیٰ کی محبت، اجر رسالت کے طور پر بیان ہوئی ہے اور دیگر آیات میں مذکورہ اجر، قرب الٰہی کا وسیلہ اور لوگوں کے لیے مفید قرار دیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر مندرجہ بالا تشریح کے مطابق اس سے امامت وخلافت کا مسئلہ اجاگر ہوتا ہے اور رسول خدا ﷺ کی احادیث جن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، وہ اس استدلال کو مضبوط اور محکم کرتی ہیں۔

آیت قربیٰ، احادیث کی روشنی میں

آیت ''قُلۡ لَّاۤ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ اَجۡرًا اِلَّا الۡمَوَدَّةَ فِى الۡقُرۡبٰى'' کے متعلق شیعہ وسنی کتب میں بہت ساری روایات نقل ہوئی ہیں جو اس آیت کے مفہوم کی تفسیر اور تشریح میں بہت زیادہ موثر ہیں۔ ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

۱۔ پانچویں صدی ہجری کے مشہور عالم حاکم حسکانی شواہد التنزیل میں سعید بن جبیر اور ابن عباس سے یوں نقل کرتے ہیں:

---

[1] روح المعانی، جلد ۲۵، صفحہ ۳۰۔

لمّا نزلت قُلْ لَا اَسئَلُکُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلاَّ الْمَودَّةَ فِي الْقُرْبی، قالُوا: يا رَسُولَ اللهِ مَنْ هؤُلاءِ الّذِيْنَ اَمَرَنَا اللهُ بِمَوَدَّتِهِمْ؟ قال: عَلِیٌ وَ فَاطِمَةُ وَ وُلدُهُما۔

جب آیت "قُلْ لا اَسئَلُکُمْ" نازل ہوئی تو اصحاب نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! یہ کون افراد ہیں جن سے محبت کا اللہ نے ہمیں حکم دیا ہے؟ آنحضرتؐ نے فرمایا: علیؑ، فاطمہؑ اور ان کے دو بیٹے ہیں۔[۱] اسی کتاب میں اسی مضمون پر مشتمل چند دیگر روایات مختلف طرق سے ابن عباس سے بیان ہوئی ہیں۔[۲]

۲۔ مذکورہ کتاب میں ابوامامہ باھلی سے ایک اور حدیث منقول ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ الاَ نبياءَ مِنْ اَشْجارٍ شَتّی وَ خُلِقْتُ وَ علیٌ مِنْ شَجَرَةٍ واحدَةٍ فَانا اَصْلُها وَ عَلِیٌّ فَرعُها، (وَ فاطِمَةُ لُقاحُها) وَ الْحَسَنُ وَ الْحُسَيْنُ ثِمارُها وَ اَشْياعُنا اَورقُها، فَمَنْ تَعَلَّقَ بِغُصْنٍ مِنْ اَغْصانِها نَجی وَ مَنْ زاغَ هَوی وَ لَو اَنَّ عَبْداً عَبَدَ اللّٰهَ بَيْنَ الصَّفا وَ الْمَروَةِ اَلْفَ عامٍ ثُمَّ اَلْفَ عامٍ، ثُمَّ اَلْفَ عامٍ، حَتّی يَصِيرُ كَالشَّنِّ البالس، ثُمَّ لَمْ يُدرِكْ مَحَبَّتَنا اَكبَّهُ اللّٰهُ عَلی مِنْخَرَيْهِ فِی النّارِ ثُمَّ قَرَءَ: قُلْ لا اَسْئَلُکُمْ عَلَيهِ اَجراً اِلاَّ الْمَودَّةَ فِی الْقُربی۔"

"اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو مختلف درختوں سے خلق کیا ہے لیکن مجھے اور علیؑ کو ایک ہی درخت سے خلق فرمایا ہے۔ میں اس کی جڑ ہوں اور علیؑ اس کی شاخ ہیں (اور فاطمہ اس کا پھول ہیں) حسن -اور حسین -اس کا پھل ہیں اور ہمارے شیعہ اس کے پتے ہیں۔ پس جو شخص بھی اس کی شاخوں میں سے کسی شاخ کو تھام لے گا وہ نجات پائے گا اور جو ان سے روگردانی کرے گا وہ ہلاک ہوگا۔ اگر کوئی بندہ صفا اور مروہ کے درمیان ایک ہزار سال اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے، پھر ایک ہزار سال، اس کے بعد پھر ایک ہزار سال اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے اور خشک اور کہنہ مشک کی طرح ہو جائے لیکن ہماری محبت اس کے دِل میں نہ ہو تو اللہ تعالیٰ اسے اوندھے منہ جہنم میں ڈالے گا۔ اس کے بعد آنحضرتؐ نے (دلیل کے طور پر) اس آیت کی تلاوت فرمائی:

"قُلْ لَا اَسْئَلُکُمْ عَلَيهِ اَجراً اِلاَّ الْمَودَّةَ فِی الْقُربی۔"[۳]

---

[۱] شواہد التنزیل، جلد ۲، صفحہ ۱۳۰

[۲] شواہد التنزیل، جلد ۲، صفحہ ۱۳۱ تا ۱۳۵

[۳] شواہد التنزیل، جلد ۲، صفحہ ۱۴۱

۳۔ اہل سنت کے مشہور مفسر سیوطی الدر المنثور میں زیر بحث آیت کے حوالے سے مجاہد کے ذریعے ابن عباس سے بیان کرتے ہیں کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آیت ''قُلْ لا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ اَجراً'' کی تشریح میں فرمایا:

اَنْ تَحْفَظُونِی فِی اَهْلِ بیتی وَ تُوَدُّوهُمْ بی۔ [۱]

''مقصود یہ ہے کہ میرے اہل بیت کے بارے میں میرے حق کی حفاظت کرو اور ان سے میری خاطر محبت کرو۔''

۴۔ احمد بن حنبل ''فضائل الصحابہ'' میں سعید بن جبیر کے ذریعے عامر سے نقل کرتے ہیں کہ جب یہ آیت ''قُلْ لَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ اَجراً اِلاَّ المَودَّةَ فِی القُربیٰ'' نازل ہوئی تو لوگوں نے آنحضرتؐ سے پوچھا: یا رسول اللہؐ آپ کے ذوی القربیٰ، جن کی مودت اور محبت ہم پر واجب ہے کون ہیں؟ تو آپؐ نے فرمایا:

''علی و فاطمة وَ ابناهما و قالها ثلاثاً''

''علی، فاطمہ، اور ان کے دو بیٹے۔ اور اس بات کو آپؐ نے تین بار دہرایا۔'' [۲]

اسی مطلب کو تھوڑے سے فرق کے ساتھ قرطبی نے اسی آیت کی تفسیر میں سعید بن جبیر کے ذریعے ابن عباس سے بیان کیا ہے۔

۵۔ حافظ ابونعیم اصفہانی، حلیۃ الاولیاء میں جابر سے نقل کرتے ہیں کہ ایک عربی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آیا اور عرض کیا: اے محمدؐ! ''میرے سامنے اسلام پیش کرو'' آپؐ نے فرمایا: کیا تم گواہی دیتے ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ یکتا ہے اس کا کوئی شریک نہیں، اور یہ کہ محمدؐ اس کے بندے اور رسول ہیں؟ اس نے عرض کی: کیا اس کے مقابلے میں مجھ سے اجر اور جزا کا بھی مطالبہ کرتے ہو؟ آپؐ نے فرمایا: لا، اِلَّا المودّة فی القربیٰ۔ یعنی: ''نہیں! صرف ذوی القربیٰ کی محبت چاہتا ہوں۔'' میں نے پوچھا: آپؐ کے ذوی القربیٰ یا میرے رشتہ دار؟ آپؐ نے فرمایا: میرے قریبی اور رشتہ دار اس نے کہا: آپ اپنا ہاتھ بڑھائیں تاکہ میں تمہاری بیعت کروں: فعلی مَنْ لایُحِبُّكَ وَ لایُحِبُّ قُرْباكَ لَعنَةُ اللهِ۔ یعنی: ''پس جو شخص آپ سے محبت نہ رکھے اور آپ کے قربیوں سے محبت نہ رکھے اس پر اللہ کی لعنت ہو'' پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: آمین! [۳]

۶۔ ابن جریر طبری نے مذکورہ آیت کے ضمن میں ابن جبیر سے بیان کیا ہے کہ انہوں نے کہا:

هِیَ قُربیٰ رَسُولِ اللهِ

ان سے مراد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریبی ہیں۔

---

[۱] الدر المنثور جلد ۶، صفحہ ۷
[۲] احقاق الحق، جلد ۳، صفحہ ۲
[۳] حلیۃ الاولیاء جلد ۳، صفحہ ۲۰۱

۷۔حاکم نے ''مستدرک الصحیحین''میں علی بن الحسین ÷ سے نقل کرتے ہیں: جب علیؑ کی شہادت ہوئی تو امام حسن- نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا۔(خطبے میں اپنا تعارف کراتے ہوئے اس جملے پر پہنچے)

اَنَا مِنۡ اَهۡلِ الۡبَيۡتِ الَّذِيۡنَ اِفۡتَرَضَ اللّٰهُ مَوَدَّتَهُمۡ عَلٰى كُلِّ مُسۡلِمٍ فَقَالَ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰى لِنَبِيِّهٖ قُلۡ لَّاۤ اَسۡـئَلُكُمۡ عَلَيۡهِ اَجۡرًا اِلَّا الۡمَوَدَّةَ فِى الۡقُرۡبٰى۔

میں اس خاندان کا فرد ہوں جس کی محبت اللہ تعالیٰ نے ہر مسلمان پر فرض کی ہے۔خداوند تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا ہے: کہہ دیں تم سے رسالت کا کوئی اجر نہیں مانگتا مگر یہ کہ میرے اہل بیت ÷ سے محبت کرو۔[1]

اہل سنت کے جن اکابرین نے اس حدیث کو نقل کیا ہے: ان میں سے کچھ یہ ہیں: محب الدین طبری نے ذخائر میں (صفحہ ۱۳۸)،ابن حجر نے صواعق (صفحہ ۱۰۱) میں اور سیوطی نے الدرالمنثور میں مذکورہ آیت کی تفسیر میں۔

۸۔بہت بڑے مفسر ابوجعفر محمد بن جریر طبری جامع البیان میں ابوالدیلم سے بیان کرتے ہیں:

جب علی ابن الحسین -کو قید کر کے (شام) لایا گیا اور انہیں دمشق کے دروازے کی سیڑھیوں پر بٹھایا گیا،ایک شامی اٹھا اور اس نے کہا: اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے تمہیں قتل کیا اور تمہارا قلع قمع کیا۔علی بن الحسین -نے فرمایا: کیا تم نے قرآن پڑھا ہے؟ اس نے کہا: ہاں! انہوں نے فرمایا: کیا آل حامیم کو پڑھا ہے؟ اس نے جواب دیا: میں نے قرآن مجید تو پڑھا ہے لیکن آل حامیم کو نہیں پڑھا،انہوں نے کہا: کیا تم نے:

قُلۡ لَّاۤ اَسۡـئَلُكُمۡ عَلَيۡهِ اَجۡرًا اِلَّا الۡمَوَدَّةَ فِى الۡقُرۡبٰى۔

نہیں پڑھا؟ اس نے عرض کیا: کیا آپ وہی ہیں؟ فرمایا: ہاں![2]

۹۔ابن حجر ''الصواعق المحرقہ''میں حضرت علیؑ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا:

فِينَا آلِ حٰمٓ آيَةٌ، لَا يَحۡفَظُ مَوَدَّتَنَا اِلَّا كُلُّ مُؤۡمِنٍ ثُمَّ قَرَءَ قُلۡ لَّاۤ اَسۡـئَلُكُمۡ عَلَيۡهِ اَجۡرًا اِلَّا الۡمَوَدَّةَ فِى الۡقُرۡبٰى۔

ہمارے بارے میں آیت آل حم اتری ہے اور وہ یہ کہ ہماری مودت کو صرف مومن ہی اپنے دل میں محفوظ رکھیں گے اس کے بعد: قل لا اسئلکم ... کی تلاوت فرمائی۔[3] اسی طرح کی روایت کنز العمال

---

[1] مستدرک الصحیحین جلد ۳،صفحہ ۱۷۲۔

[2] جامع البیان طبری،جلد ۲۵،صفحہ ۱۶

[3] صواعق المحرقہ،صفحہ ۱۰۱

میں بھی آئی ہے۔[1]

اس حدیث سے اچھی طرح ثابت ہوتا ہے کہ زیر بحث آیت میں ''قربیٰ'' سے مراد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذوی القربیٰ ہیں۔

''آل حم'' سے مراد وہ تمام سورتیں ہیں جن کے شروع حم آیا ہے اور وہ یہ سات سورتیں ہیں، مومن، فصلت (حم سجدہ) شوریٰ، زخرف دخان، جاثیہ اور احقاف زیر بحث آیت انہی میں سے ایک سورہ میں ہے۔[2]

۱۰۔ جناب زمخشری نے تفسیر کشاف میں، اسی طرح سے فخر رازی نے تفسیر الکبیر میں اور قرطبی نے اپنے تفسیر میں زیر بحث آیت کے حوالے سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک حدیث نقل کی ہے جو آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مودت اور محبت کی اہمیت کو عجیب انداز سے آشکار کرتی ہے۔ یہاں پر حدیث کی عین عبارت کو تفسیر کشاف سے نقل کرتے ہیں۔ اس نے کہا رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اَلا وَ مَنْ ماتَ علی حُبِّ آلِ مُحَمَّدٍ فُتِحَ لَهُ فی قَبْرِهِ بابانِ اِلَی الْجَنَّة اَلا وَ مَنْ ماتَ علی حُبِّ آلِ مُحَمَّدٍ (ص) جَعَلَ اللّٰهُ قَبْرَهُ مَزارَ مَلائِكة الرَّحْمَةِ اَلا وَ مَنْ ماتَ عَلی حُبِّ آلِ مُحَمّدٍ(ص) ماتَ عَلَی السُّنَّةِ وَ الْجماعَةِ۔

اَلا وَ مَنْ ماتَ عَلی بُغْضِ آلِ مُحَمَّدٍ(ص) جاءَ يَوْمَ الْقِيامَة مَكْتُوب بَيْنَ عَينيهِ آيِسٌ مِنْ رَحْمَة الله اَلا وَ مَنْ ماتَ عَلی بُغْضِ آلِ مُحَمَّدٍ ماتَ كافِرا، اَلا وَمَنْ ماتَ عَلی بُغْضِ آلِ مُحَمَّدٍ(ص) لَمْ يَشُمَّ رائِحَةَ الْجَنَّةِ۔

جو بھی محمد وآل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کے ساتھ مرا وہ شہید مرا ہے، آگاہ رہو! جو بھی محمد وآل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت پر مرا وہ بخشا ہوا مرا ہے، آگاہ رہو! جو شخص بھی محمد وآل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت مرا وہ توبہ کے ساتھ دنیا سے گیا ہے۔ آگاہ رہو! جو بھی محمد وآل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت پر مرا وہ اس دنیا سے کامل الایمان رخصت ہوا ہے۔ آگاہ رہو! جو بھی آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت پر مرے گا، موت کا فرشتہ اُسے بہشت کی خوشخبری سنائے گا، اس کے بعد منکر اور نکیر اُسے بشارت دیں گے (برزخ میں سوال و جواب پر مامور فرشتے)

آگاہ رہو! جو شخص آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت پر مرے گا اُسے اس طرح احترام کے ساتھ بہشت لے جایا جائے گا جس طرح دولہن کو دولہا کے گھر لایا جاتا ہے۔ آگاہ رہو! جو بھی آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کے ساتھ اس دنیا سے جائے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی قبر کو رحمت کے فرشتوں کی زیارت گاہ قرار دے گا۔ آگاہ رہو! جو بھی

---

[1] کنز العمال، جلد ا، صفحہ ۱۱۸

[2] تفسیر مجمع البیان، سورہ مومن کی ابتداء میں اس کے حاشیہ کو دیکھیں (جلد ۷، اور ۸، صفحہ ۵۱۲

آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت پر مرا وہ سنت و جماعت پر مرا ہے۔

آگاہ رہو! جو بھی آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عداوت اور دشمنی کی حالت میں مرے گا، قیامت کے دن وہ اس حالت میں محشر میں داخل ہوگا کہ اس کی پیشانی پر لکھا ہوگا، رحمت الٰہی سے مایوس۔ آگاہ رہو! جو بھی آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بُغض اور دشمنی کے ساتھ دنیا سے گیا وہ کافر ہو کر مرا ہے۔ آگاہ رہو! جو بھی آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عداوت پر مرے گا وہ جنت کی خوشبو نہیں سونگھ سکے گا۔ [1]

تعجب ہے کہ تفسیر کشاف کے بعض حاشیوں پر جو کہ متعصب افراد کی طرف سے تحریر ہوئے ہیں، اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: ''و آثار الوضع علیه لائحة''یعنی اس کے جعلی ہونے کی اثرات آشکار ہیں۔ لیکن ہمارا سوال یہ ہے کہ کس دلیل کی بنا پر یہ حدیث جعلی ہے اور اس کے جعلی ہونے کے حدیث میں کہاں اثرات آشکار ہیں؟ اور یہ کبھی بھی واضح نہیں ہوں گے، سوائے اس کے کہ اس میں آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت اور ان کی شان و منزلت اجاگر ہوئی ہے، کیا یہی اس کے جعلی ہونے کا ثبوت ہے یا سابقہ عقیدے اور افکار سے یہ حدیث متصادم ہے، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ انہوں نے پہلی دفعہ آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت اس حد تک حدیث شریف نبوی میں ملاحظہ کیا ہو اور وہ بھی ان کے اکابرین اور ہم عقیدہ افراد میں سے تین مفسروں نے اُسے نقل کیا ہو، اُسے صحیح تسلیم کیا ہوا اور اس پر کوئی اعتراض بھی نہ کیا ہو۔

صورتحال یہ ہے کہ فخر رازی اسی حدیث کے نیچے لکھتے ہیں: اگرچہ ''آل'' کے معنی میں اختلاف اور بحث و تمحیص ہے، لیکن:

لا شَكَّ اَنَّ فاطمةَ و عَلِيًّا وَ الْحَسَنَ وَ الْحُسَيْنَ كَانَ التَّعَلُّقَ بَيْنَهُمْ وَ بَيْنَ رَسولِ اللهِ اَشَدَّ التَّعَلُّقاتِ وَ هَذا كَالمَعلُومِ بِالنَّقلِ المُتَواتِرِ فَوَجَبَ اَنْ يَكونُوا هُمُ الآلُ۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ فاطمہ، علیؑ، حسنؑ اور حسینؑ کا رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ گہرا اور زبردست تعلق تھا اور یہ بات متواتر احادیث سے ثابت ہے۔ اس بنا پر (سب کے عقیدے کے مطابق) فقط یہی ہستیاں ہی آل رسول ہیں۔

فخر رازی اس مطلب پر بہت زیادہ شواہد اور قرائن بھی پیش کرتے ہیں کہ علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ، حسینؑ یقیناً اِس آیت میں شامل ہیں [2]

مذکورہ بالا گفتگو سے واضح ہو گیا ہے کہ اس آیت کے حوالے سے جو بعض روایات نقل ہوئی ہیں اور وہ یہ بیان کرتی ہیں کہ اس آیت میں مخاطب کفار قریش ہیں اور معنی یہ ہے کہ ''میری تمہارے سے جو رشتہ داری اور قرابت ہے اسے نظر انداز نہ کریں اور اس قرابت کی وجہ سے تکلیف اور اذیت نہ پہنچائیں'' وہ ناقابل قبول ہیں۔ اور یہ احتمال ہے کہ جعلی حدیثیں بنانے والوں نے اہل بیت ÷ کے مقام کے

---

[1] تفسیر کشاف: جلد ۴، صفحہ ۲۲۰ م ۲۲۱ تفسیر فخر رازی، جلد ۲۷ صفحہ ۱۶۶۔۱۶۵ تفسیر قرطبی جلد ۸، صفحہ ۵۸۴۳۔

[2] مزید معلومات کیلئے دیکھیں: تفسیر الکبیر فخر رازی، جلد ۲۷، صفحہ ۱۶۷۔۱۶۶۔

بارے میں کثیر روایات کی اہمیت کو گھٹانے کے لیے اس قسم کی روایات کو نقل کر دیا ہو، کیونکہ کفار مکہ سے اس قسم کا خطاب آیت کے مفہوم سے پورے طور پر متصادم ہے، اس لیے کہ یہ امر ممکن ہی نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کفار سے کہیں کہ میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا مگر یہ کہ میری تم سے جو قرابت اور رشتہ داری ہے اُسے فراموش نہ کریں۔ وہ تو آنحضرتؐ کی رسالت کو سرے سے قبول نہیں کرتے تھے کہ تا اینکہ وہ آپؐ کے لیے کسی اجر اور جزا کے قائل ہوں۔

خلاصہ یہ ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے اس قسم کی روایات کا سہارا لے کر یہ چاہا ہے کہ آیت سے اہل بیتؑ کا رابطہ کاٹ دیا جائے درحقیقت انہوں نے آیت کے معنی و مفہوم سے انکار کیا ہے، کیونکہ منکران رسالت سے رسالت پر اجر مانگنا بالکل غیر معقول ہے۔ اس بحث کا اختتام ان اشعار پر کرتے ہیں جو فخر رازی نے تفسیر الکبیر میں اور آلوسی نے تفسیر روح المعانی میں مذکورہ آیت کے حوالے سے نقل کیے ہیں تا کہ ''ختامہ مسک'' کے عنوان سے اس بحث کا اختتام بابرکت ہو جائے۔

یہ اشعار امام شافعی کے ہیں جن کے بارے میں مشہور ہے کہ اہل بیت ÷ کی محبت کا پختہ عقیدہ رکھتے تھے وہ کہتے ہیں:

يَا رَاكِباً قِفْ بِالْمُحَصَّبِ مِنْ مِنىٰ

وَ اهتِفْ بِسَاكِنِ خَيفِهَا وَ النَّاهِضِ

سَحَراً، إِذَا فَاضَ الحَجِيجُ إِلَى مِنىٰ

فَيضاً كَمُلْتَطِمِ الفُرَاتِ الفَائِضِ

إِنْ كَانَ رَفْضاً حُبُّ آلِ مُحَمَّدٍ

فَلْيَشْهَدِ الثَّقَلَانُ إِنِّي رَافِضِي

اے خانہ کعبہ کی زیارت کے لیے جانے والی سواری! منیٰ کے نزدیک جہاں رمی جمرات کے لیے کنکریاں جمع کرتے ہیں (جو حاجیوں کے اجتماع کا بہت بڑا مرکز ہے) وہاں رک جا! اور ان افراد سے جو مسجد خیف میں (عبادت میں مشغول) ہیں یا (بیت اللہ کی جانب) رواں دواں ہیں، پکار کر کہو: ''اگر آل محمد ﷺ کی محبت سے انسان رافضی ہوتا ہے تو تمام جن وانس گواہی دیں کہ میں رافضی ہوں۔''[1]

(آخر میں ہماری دعا ہے کہ) اے اللہ! ہم سب کو آل محمد ﷺ کے محبوں میں قرار دے، انہی کا محب جن پر ہم نماز میں درود بھیجتے ہیں اور اس کے بغیر ہماری نماز، نماز نہیں ہے۔ اے اللہ! اس محبت اور دوستی کو ان کے ''مقام ولایت'' کی معرفت حاصل کرنے کا مقدمہ اور وسیلہ قرار دے اور ہم یہ تصور بھی نہ کریں کہ اس طرح کا اہم ترین مسئلہ صرف ایک معمولی دوستی اور سادہ سی محبت کے عنوان سے بیان ہوا ہے، اس کے بعد اس معرفت کو ان کے مکتب کی پیروی کے لیے ذریعہ قرار دے۔

---

[1] تفسیر فخر رازی، جلد ۲۷، صفحہ ۱۶۶؛ تفسیر روح المعانی، جلد ۲۵، صفحہ ۳۲۔

حصہ دوم

فضائل کی آیات

اشارہ

جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا ہے کہ اس حصے میں ہم قرآن مجید کی ان آیات کو ذکر کریں گے جو بلا واسطہ تو امامت وخلافت کے موضوع کو بیان نہیں کرتیں، لیکن حضرت علیؑ کے بڑے بڑے فضائل کو ثابت کرتی ہیں اور مجموعی طور پر یہ آیات اس موضوع کو تمام زاویوں سے ان اشخاص کے لیے واضح کرتی ہیں جو اصل واقعات سے آگاہ نہیں ہیں۔ ان آیات سے کلی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت علیؑ کا معاملہ، دیگر افراد واصحاب سے جدا ہے۔ اور امت میں ان کی طرح کی شخصیت کی موجودگی میں امامت وخلافت کے لیے کوئی اور اہل نہیں ہوسکتا۔

دوسرے الفاظ میں ایک واضح عقلی مقدمہ ضمیمہ کرنے سے ان سے امامت وخلافت کے مسئلے کا نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو کہ حکیم ہے وہ کبھی بھی مفضول کو افضل پر حاکم اور اس کا رہبر نہیں بنائے گا۔ یہاں تک دنیا کے عقلاء میں سے اگر کوئی اس کام کو انجام دے تو اس کی سرزنش اور مذمت کی جاتی ہے اور اس کے کام کو اس کی انتظامی صلاحتیوں کی کمزوری اور عدم تدبیر سمجھا جاتا ہے کہ اس نے کیوں ایک اعلیٰ اور برتر شخص کو ایک پست شخص کے تابع کردیا۔

ان آیات کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ بعض علماء نے ان کے بارے میں علیحدہ کتابیں لکھی ہیں، لیکن ہم نے ان میں سے ان چند آیات کا انتخاب کیا ہے جن کا مطلب اور مفہوم واضح ہے اور اس کتاب کے اختصار کے ساتھ بھی مناسب ہیں۔ یہاں پر پھر ہم اہل سنت کے ماخذ اور کتب کو پیش کریں گے اور جو باتیں صرف شیعہ کتب میں نقل ہوئی ہیں ان کے بارے میں کم گفتگو کریں گے تاکہ کوئی یہ نہ سوچے کہ مکتب اہل بیت کے پیروکاروں نے کوئی بات تعصب کی وجہ سے کی ہے۔ بہرحال یہ آیات زیادہ ہیں ہم نے ان میں سے ۲۴ آیات کا انتخاب کیا ہے۔

۱۔ آیت مباہلہ

سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۶۱ میں ارشاد ہوا ہے:

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ۣ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ﴿۶۱﴾

آپ کے پاس علم آجانے کے بعد بھی اگر یہ لوگ (حضرت عیسیٰ کے بارے میں) آپ سے جھگڑا کریں تو آپ کہہ دیں: آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلاتے ہیں اور تم اپنے بیٹوں کو بلاؤ، ہم اپنی عورتوں کو بلاتے ہیں اور تم اپنی عورتوں کو بلاؤ، ہم اپنے نفسوں کو بلاتے ہیں اور تم اپنے نفسوں کو بلاؤ، پھر دونوں فریق اللہ سے دعا کریں کہ جو جھوٹا ہو اس پر اللہ کی لعنت ہو۔

یہاں پر چند نکات کی وضاحت کی ضرورت ہے:

اوّل: آیت کا مفہوم اور مطلب۔

دوم: اس آیت کی تفسیر میں جو روایات اسلامی کتب میں مذکورہ ہیں وہ کن افراد کا تعارف کراتی ہیں؟

سوم: اس آیت سے علیؑ، فاطمہ صلی اللہ علیہا وآلہ وسلم اور حسن وحسین ÷ کی فضلیت اور برتری پر کس طرح استدلال کیا جا سکتا ہے۔

چہارم: اس آیت کے حوالے سے بعض اعتراضات اور نکتہ چینی کا جواب۔

آیت مباہلہ کا مطلب ومفہوم

مذکورہ آیت اپنے سیاق وسباق کے ساتھ یہ بتا رہی کہ عیسائیوں کے اپنے باطل عقائد پر اصرار بالخصوص حضرت مسیح کے خدا ہونے کا دعوی اور ان کی ضد اور ہٹ دھرمی کے مقابلے میں منطق اور استدلال کی ناکامی کے بعد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ مباہلہ کا طریقہ کار اپنائیں اور اپنی باتوں کی سچائی کو اس خاص روحانی ذریعے سے منوائیں اور ثابت کریں یعنی ان کے ساتھ مباہلہ کریں تاکہ سچے اور جھوٹے کی پہچان ہو جائے۔

مباہلہ اصل میں بَہْل (بروزن اَھْل) سے نکلا ہے جس کا معنی چھوٹ دینا ہے۔ اسی وجہ سے جب مادہ حیوان کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور اس کے پستان پر (اس کے بچے کو دودھ پینے سے روکنے کے لیے) تھیلی نہ چڑھائی جائے تو اسے ''باھل'' کہتے ہیں اور دعا میں ''ابتھال'' کا مطلب تضرع وزاری اور کام کو خدا پر چھوڑ دینا ہے۔

کبھی اس لفظ کا ہلاکت، لعنت اور خدا سے دوری کا معنی کیا جاتا ہے اور وہ اس لحاظ سے کہ جب بندے کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جاتا ہے تو وہ لطف الٰہی اور رحمت الٰہی کے سایے سے خارج ہو جاتا ہے۔ یہ تو تھا اس کا لغوی معنی، مروجہ مفہوم کے اعتبار سے جس کی طرف آیت میں بتایا گیا ہے، مباہلہ دو افراد کا ایک دوسرے پر نفرین اور لعنت کرنا ہے، اس طرح کہ جب منطقی دلائل بے سود ثابت ہوں وہ تمام افراد جو کسی اہم دینی مسئلے پر بحث کر رہے ہوں وہ ایک جگہ جمع ہو جائیں اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تضرع وزاری کریں اور اس سے دعا کریں کہ وہ جھوٹے کو رسوا کرئے اور اُسے سزا و عذاب دے، جیسا کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے نجران کے عیسائیوں کے مقابلے پر کیا تھا، جس کی نشاندہی آیت کر رہی ہے۔

آیت کہہ رہی ہے، جب بھی علم و دانش کے آپ تک پہنچنے کے بعد (حضرت عیسیٰ کی الوھیت کی نفی اور انحرافی نظریہ تثلیت اور دیگر اسی طرح کے مسائل) پر (عیسائی) آپ سے بحث وتکرار کریں تو ان سے کہیں کہ ہم اپنے بیٹے لے کر آئے ہیں تم اپنے بیٹوں کو لے آؤ: "فَقُلْ تَعَالَوا نَدْعُ اَبْنَائَنا وَاَبْنَائَکُمْ۔" یعنی: کہہ دیجئے! ہم اپنی عورتیں لے آتے ہیں تم اپنی عورتوں کو لاؤ (وَنِسَائَنا وَنِسَاءَ لَکُمْ) ہم اپنے نفسوں کو لاتے ہیں تم اپنے نفسوں کو بلاؤ (وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَکُمْ)۔ پھر مباہلہ کریں (تا کہ اس طرح جھوٹے اور سچے کی پہچان ہو جائے) پس اللہ کی لعنت، جھوٹوں پر کریں گے (ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَعْنَةَ اللهِ عَلَى الكاذبِينَ)

تاریخی اعتبار سے اس واقعے کے وقوع پذیر ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے، یعنی پیغمبر اکرم ﷺ نے چند افراد کا انتخاب کیا اور انہیں مباہلہ کے لیے اپنے ساتھ لے گئے۔ اسلامی روایات جنہیں مفسرین اور محدثین نے بیان کیا ہے، میں آیا ہے کہ جب مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی تو پیغمبر اکرمؐ نے نجران کے عیسائیوں کو مباہلہ کی تجویز دی، ان کے بزرگوں نے ایک دِن کی مہلت طلب کی تا کہ اس بارے میں آپس میں مشورہ کر لیں ان کے بڑے پادری نے ان سے کہا: دیکھو اگر کل محمد ﷺ اپنے بیٹوں اور گھر والوں کے ساتھ مباہلہ کے لیے آئیں تو ان سے مباہلہ نہ کرنا اور اگر اپنے یار واصحاب کے ساتھ آئیں تو ان سے مباہلہ کر لینا کیونکہ اس صورت، میں ان کی بنیاد اور اساس نہ ہوگی۔

جب دوسرا دن شروع ہوا تو رسول اکرم ﷺ علیؑ کا ہاتھ پکڑے ہوئے تشریف لائے اس طرح سے کہ حسن -اور حسین - آپ کے آگے چل رہے تھے اور فاطمہ زہرا ×ان کے پیچھے تھیں، عیسائی اپنے خیموں سے باہر آئے ان کی قیادت ان کے بڑے پادری کر رہے تھے جب اُس نے رسول اکرم ﷺ کو ان کے ہمرائیوں کے ساتھ دیکھا تو پوچھا: یہ کون افراد ہیں؟ جواب دیا گیا کہ ایک ان کے چچا زاد اور داماد ہیں، دو ان کے نواسے ہیں اور خاتون ان کی بیٹی ہیں جو ان کے نزدیک سب سے زیادہ معزز ہیں، بڑے پادری نے دیکھا اور کہا: میں ایک ایسے شخص کو دیکھ رہا ہوں جو جرات مندی کے ساتھ مباہلہ کے لیے مصمم ہے، مجھے اندیشہ ہے کہ وہ سچا ہو اور اگر وہ سچا ہو تو ہم پر عظیم مصیبت آئے گی اس کے بعد اس نے کہا: اے ابوالقاسم (محمد)! ہم آپ سے مباہلہ نہیں کرتے، آیئے ہم آپ سے صلح کرتے ہیں!''

بعض روایات میں منقول ہے کہ بڑے پادری نے کہا: میں ایسے چہروں کو دیکھ رہا ہوں کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ سے چاہیں کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائے تو وہ ہٹ جائے گا! پس ان کے ساتھ مباہلہ نہ کرو ورنہ تباہ و برباد ہو جاؤ گے۔ [1] یہی مطلب کچھ فرق کے ساتھ جس

---

[1] مجمع البیان، جلد اول اور دوم، صفحہ ۴۵۲، یہاں پر اس کا خلاصہ بیان ہوا ہے۔

سے اصل واقعے پر اثر نہیں پڑتا بہت ساری دیگر تفسیروں میں بھی بیان ہوا ہے جیسے تفسیر فخر رازی (جلد ۸، صفحہ ۱۰) تفسیر قرطبی (جلد ۲، صفحہ ۱۳۴۶) روح البیان (جلد ۲، صفحہ ۴۴) روح المعانی جلد ۳، صفحہ ۱۸۸) بحر المحیط (جلد ۲، صفحہ ۴۷۲) تفسیر بیضاوی (زیر بحث آیت کے ساتھ)اور دیگر تفاسیر۔اب ہم احادیث کی کتابوں کا رخ کرتے ہیں:

مباہلہ محدثین کی زبانوں پر

مکتب اہل بیت اور اہل سنت کی مشہور اور درجہ اول کی کتب میں بہت ساری روایات نقل ہوئی ہیں جو بالکل واضح طور پر بیان کرتی ہیں کہ آیت مباہلہ، حضرت علیؑ، حضرت فاطمہ ×، حضرت حسن -اور حضرت حسین- کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ان میں سے چند ایک یہ ہیں۔

۱۔صحیح مسلم میں کتاب ''فضائل الصحابہ'' میں باب فضائل علی ابن ابی طالب -میں سعد بن ابی وقاص سے نقل ہوا ہے کہ معاویہ نے سعد سے کہا: تم کیوں ابوتراب (علیؑ) پر سب وشتم نہیں کرتے؟ اس نے جواب دیا: مجھے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تین باتیں یاد ہیں ان کی وجہ سے میں علیؑ پر سب وشتم نہیں کرسکتا، اگر ان میں سے ایک بھی میرے لیے ہوتی تو میرے لیے سرخ بالوں والے کئی اونٹوں سے بہتر تھی (یہ عربوں کے لیے بہت ہی قیمتی جانور سمجھا جاتا ہے) اس کے بعد وہ حدیث منزلت (جنگ تبوک کے موقعہ پر) اور جنگ خیبر میں علیؑ کو علَم دینے کے واقعات کا ذکر کرتے ہیں۔اس نے مزید کہا:

و لما نَزَلَتْ هذِهِ الآيةُ (قُلْ تَعَالَوا نَدْعُ اَبْنَا ئَنا وَ اَبْنَائَكُمْ) دَعَا رَسُولُ اللهِ عَلِيًّا و فَاطِمَةَ و حَسَناً و حُسَيْناً فَقَالَ اللّٰهُمَّ هؤُلاءِ اَهْلِي۔

جب آیت مباہلہ نازل ہوئی، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علیؑ، فاطمہ × اور حسن- وحسین- کو بلایا پھر بارگاہ خداوندی میں عرض کیا: اے اللہ! یہ ہیں میرے گھر والے (اور اس آیت کے مصداق ہیں)[۱]

اس حدیث کو اہل سنت کے بڑے بڑے علماء کے ایک اور گروہ نے بھی نقل کیا ہے، جیسے جناب ترمذی نے اپنی صحیح میں[۲] وہ حدیث کو نقل کرنے کے بعد مزید لکھتے ہیں کہ ابوعیسی کہتے ہیں یہ حدیث حسن، صحیح اور غریب ہے (شاید اس کے غریب ہونے کی وجہ پہلے سے طے شدہ متعصب آراء سے عدم مطابقت ہو) احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں[۳] بیہقی نے سنن الکبری[۴] اور سیوطی نے درالمشور[۵] میں

---

[۱] صحیح مسلم، جلد ۴ صفحہ ۱۸۷۱، حدیث نمبر ۳۲ باب ۴۔

[۲] صحیح ترمذی، جلد ۵، صفحہ ۶۳۸، حدیث ۳۷۲۴ (باب ۲۱، باب مناقب علیؑ)

[۳] مسند احمد، جلد ۱، صفحہ ۱۸۵۔

[۴] السنن الکبری، فضائل الخمسہ کے نقل کے مطابق، جلد ۱، صفحہ ۲۹۱۔

[۵] الدر المنثور، آل عمران کی آیت ۶۱۔

اِسے ذکر کیا ہے۔

۲۔صحیح ترمذی میں ایک اور مقام پر بھی سعد بن ابی وقاص سے حدیث بیان ہوئی ہے کہ جب آیت مباہلہ نازل ہوئی تو حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علیؑ، فاطمہ ×، حسن-، حسین -کو اپنے پاس بلایا اور بارگاہ خداوندی میں عرض کیا: "اللّٰھُمَّ ھٰؤُلاءِ اَھْلِی" یعنی: اے اللہ! "یہ ہیں میرے اہل بیت" [1]۔ اِسی حدیث کو حاکم نے "مستدرك الصحيحين" میں نقل کرتے ہوئے آخر میں کہا ہے: یہ حدیث صحیح ہے اور شیخین یعنی بخاری اور مسلم کے حدیث کی صحت کے اصول کے عین مطابق ہے اور ان کی صحت کی شرائط پر پوری اترتی ہے۔ [2] نیز بیہقی نے سنن الکبری میں اسے نقل کیا ہے [3]

۳۔سیوطی نے "درالمنثور" میں حاکم اور ابن مردویہ سے اور ابونعیم نے "دلائل" میں جابر بن عبداللہ انصاری سے نقل کیا ہے "جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عیسائیوں کے ساتھ مباہلہ کرنے کا فیصلہ کیا تو دوسرے دن آپؐ نے علیؑ، فاطمہؑ، حسینؑ اور حسینؑ کے ہاتھوں کو پکڑا اور انہیں مباھلے کے لیے لے گے لیکن وہ لوگ مباہلہ کے لیے آمادہ نہ ہوئے، جابر مزید کہتے ہیں: آیت: (تَعالَو نَدْعُ اَبْنَائَنا وَاَبْنَائَکُمْ...) انہی کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ [4] سیوطی کہتے ہیں: حاکم نے اس حدیث کو صحیح شمار کیا ہے۔

۴۔درالمنثور میں ہی سیوطی ابن عباس سے نقل کرتے ہیں کہ نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت آیا (مباہلہ کے واقعہ کی تفصیل اور عیسائیوں کے مباہلہ سے انکار کے بعد) وہ مزید لکھتے ہیں اس وقت صورت حال یہ تھی کی آنحضرتؐ اس حالت میں باہر آئے کہ ان کے ساتھ علیؑ، فاطمہ ×، حسن-اور حسین - تھے آنحضرتؐ نے ان سے فرمایا میں دعا کروں گا اور تم امین کہنا، لیکن نجران کے عیسائی مباہلہ کے لیے تیار نہ ہوئے اور انہوں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے صلح کر لی اور جزیہ دینے پر آمادہ ہو گئے۔ [5]

۵۔اُسی کتاب میں وہ ابن جریر کے ذریعے علباء بن احمر الیشکری سے نقل کرتے ہیں کہ جب آیت: (قُلْ تَعَالَو اندْعُ اَبْنَائنا...) نازل ہوئی تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علیؑ، فاطمہ ×، حسن-، اور حسین -کو بلانے کے لیے بھیجا اور مدمقابل سے کہا کہ مباہلہ کے لیے تیار ہو جاؤ (اور وہ مباہلہ کے لیے آمادہ نہ ہوئے) [6]

۶۔علامہ طبری اپنی تفسیر میں اپنی سند سے زید بن علی سے اس آیت کی تفسیر میں بیان کرتے ہیں کہ: کان النبیّ و علی و فاطمَۃَ وَالحَسَنْ

---

[1] صحیح ترمذی، جلد ۵، صفحہ ۲۲۵ (باب ۴، حدیث ۲۹۹۹ طبع بروت، داراحیاء التراث العربی)

[2] مستدرک الصحیحین: جلد ۳، صفحہ ۱۵۰۔

[3] السنن الکبری: جلد ۷، صفحہ ۶۳۔

[4] الدر المنثور، جلد ۲، صفحہ ۳۸ زیر بحث آیت کے بارے میں (تھوڑے سے اختصار کے ساتھ)

[5] الدر المنثور، جلد ۲، صفحہ ۳۹

[6] الدر المنثور، جلد ۲، صفحہ ۳۹

و الحُسَینُ [1] ۔یعنی: وہاں پر نبی اکرمؐ علیؑ، و فاطمہؑ، حسنؑ، اور حسینؑ تھے۔

۷۔موصوف مذکورہ کتاب میں اپنی سند سے سدّی سے یوں نقل کرتے ہیں کہ: اَخَذَ النَّبِیُّ بِیَدِ الحَسَنِ وَ الحُسَینِ و فاطِمَۃَ و قالَ لِعلِیٍّ اَتبِعْنا [2] یعنی: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حسنؑ، حسینؑ اور فاطمہؑ کا ہاتھ پکڑا اور علیؑ سے فرمایا ہمارے پیچھے آئیں۔

۸۔علامہ ابوبکر جصّاص چوتھی صدی ہجری کے علماء میں سے ہیں وہ اپنی کتاب ''احکام القرآن'' میں بڑے واضح الفاظ میں مباہلہ کے بارے میں کہتے ہیں: اِنَّ رُواۃَ السِیَّرِ و نَقَلَۃَ الاَثَرِ لَمْ یَخْتَلِفُوا فِی اَنَّ النَّبِیَ (ص) اَخَذَ بِیَدِ الحَسَنِ و الحُسَینِ و عَلِیٍّ و فاطِمَۃَ (رَضِیَ اللهُ عنهم) وَ دَعیٰ النَّصاری الّذِیْنَ حاجُّوہُ اِلَی المباھَلَۃِ۔ [3] یعنی: سیرت نگاروں اور روایانِ حدیث کا اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ، اور حسینؑ کو اپنے ساتھ لیا اور عیسائیوں کو مباھلہ کی دعوت دی جو آنحضرتؐ سے بحث ومناظرہ کر رہے تھے۔جصاص کے بقول اس مسئلہ میں تمام علماء حدیث اور تاریخ کا اتفاق اور اجماع ہے۔

۹۔جصاص ہی اپنی ایک اور کتاب ''معرفۃ علوم الحدیث'' میں مباہلہ کے واقعہ کو ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں:

> قالَ الحاکمُ وَقَدْ تَوَاتَرَتِ الاَخْبارُ فِی التَّفاسیرِ عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عبّاس وَغَیْرِہ اَنَّ رَسُولَ اللهِ (ص) اَخَذَ یَوْمَ المُباھَلَۃِ بِیَدِ عَلِیٍ وحَسَنٍ وَحُسَینٍ وَجَعَلُوا فاطمۃَ وراءَھُمْ ثُمَّ قالَ ھٰؤلاءِ اَبْنَائَنَا وَ اَنْفُسَنا و نِسائَنا۔ [4]
>
> حاکم کا بیان ہے کہ تفسیر کی کتابوں میں عبد اللہ ابن عباس اور دوسروں سے متواتر روایات نقل ہوئی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مباہلہ کے دن علیؑ فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ کا ہاتھ پکڑا اور فاطمہ کو اپنے پیچھے قرار دیا پھر فرمایا: یہ ہیں ہمارے بیٹے، ہماری عورتیں اور ہمارے نفوس اور تم اپنے بیٹے، اپنی عورتوں اور اپنے ہم جیسوں کو لے آو تا کہ مباہلہ کریں۔

واقعہ مباحلہ اور اس آیت کے پنجتن پاک کی شان میں نازل ہونے کے بارے میں یہ روایات کا صرف ایک حصہ تھا۔ان روایات میں جزوی فرق اصل مسئلہ پر اثر انداز نہیں ہوتا مثلا یہ کہ فاطمہؑ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ تھیں یا ان کے پیچھے تھیں یا حضرت علیؑ آنحضرتؐ ساتھ چل رہے تھے یا آپؐ کے پیچھے تھے وغیرہ وغیرہ۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ بہت سارے مسلم تاریخی واقعات جیسے جنگ بدر، خیبر، احزاب اور فتح مکہ کے بارے میں جزئیات میں اختلاف

---

[1] تفسیر طبری، جلد ۳، صفحہ ۱۹۲ (احقاق الحق کے نقلے کے مطابق، جلد ۳ صفحہ ۴۷)

[2] تفسیر طبری، جلد ۳، صفحہ ۱۹۲ (احقاق الحق کے نقلے کے مطابق، جلد ۳ صفحہ ۴۷)

[3] احکام القرآن جصاص، جلد ۳، صفحہ ۱۴۔

[4] معرفۃ علوم الحدیث صفحہ ۵۰، طبع مصر (احقاق الحق، جلد ۳، صفحہ ۴۸ سے نقل کیا بناپ)

ضرور پایا جاتا ہے اور اہم ترین تاریخی واقعات میں سے ایسا واقعہ بہت کم ہی ملے گا جس میں اس طرح کے جزئی اختلاف موجود نہ ہو۔

بہر حال مذکورہ بالا روایات، اہل سنت کے بزرگ علماء کی تائید اور گواہی کے ساتھ اتنی بڑی تعداد میں ہیں کہ حد تواتر کو پہنچ رہی ہیں، اس کے باوجود حیرانی کی بات ہے کہ تفسیر المنار کے مصنف زیر بحث آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

قالَ الاستاذُ الِامامُ: الرّوایات مُتَّفِقَه، عَلی اَنَّ النَّبِیّ (ص) اِخْتَارَ لِلْمُباهَلَةِ عَلِیّاً وَ فاطِمَةَ وَ وَلَدَیهِمَا وَ یَحْمِلُونَ کَلِمَةَ نِسائَنا عَلی فاطِمَةَ و کَلِمَةَ اَنْفُسَنَا عَلی عَلِیٍّ فقط، مَصَادِرُ هٰذِهِ الرَّوایاتِ الشّیْعَه وَ مَقْصَدُهُمْ مِنْها مَعْرُوف۔

تمام روایات بالاتفاق بتا رہی ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے مباہلہ کے لیے علیؑ، فاطمہؑ اور ان کے دو بیٹوں کو اپنے ساتھ لیا، اور نِسائنا کے لفظ کو فقط فاطمہؑ پر اور اَنْفُسَنَا کے لفظ کو فقط علیؑ پر انہوں نے منطبق کیا ہے۔

ان سب روایات کا ماخذ اور منبع شیعہ ہیں اور ان کا ان روایات سے مقصد معلوم ہے۔ [1]

واقعاً عجیب ہے جب پہلے سے طے شدہ افکار اور فرقہ وارانہ تعصب درمیان میں ہو تو المنار کے مصنف جیسے مشہور عالم اور دانشور بھی ایسی کمزور اور غیر معقول بات کر جاتے ہیں جس کی کمزوری سب پر عیاں ہوتی ہے کیا صحیح مسلم، صحیح ترمذی اور مسند احمد، شیعہ کی مشہور کتب ہیں؟ کیا سنن بیہقی، سیوطی کی در المنثور، جصاص کی احکام القرآن، تفسیر طبری اور مستدرک حاکم، شیعہ علماء کی لکھی ہوئی ہیں؟

اس طرح کی بڑی غلطی تعصب کے پردے کا اثر ہو سکتی ہے اس کے علاوہ کوئی اور وجہ نہیں ہو سکتی ایک طرف تو موصوف یہ کہتے ہیں کہ روایات متفقہ طور پر یہ بات نقل کر رہی ہیں اور دوسری طرف سب کو مشکوک قرار دے رہے ہیں۔ اگر صحیح مسلم صحیح ترمذی، مسند احمد اور اس طرح کی دیگر بڑی بڑی کتب کی یہ حالت ہو کہ شیعہ جعلی روایات کو ان کے اندر داخل کر سکیں اور اس حد تک کہ وہ حدیث متواتر کی صورت اختیار کر لے تو پھر ان کتب کا کیا اعتبار رہ جاتا ہے؟ ان پر کیونکر اعتماد کیا جا سکتا ہے؟ اس طرح تو ان کی ایک حدیث بھی قابل قبول نہیں ہو سکتی۔

درحقیقت اپنی اس بات سے المنار کے مصنف نے اہل سنت کے تمام مشہور کتب کو غیر معتبر کر دیا ہے اور ان کی اہمیت کو بالکل ختم کر دیا ہے، البتہ وہ چاہتے تھے کہ علیؑ، فاطمہؑ اور ان کے فرزندوں کی فضلیت کا انکار کریں لیکن اس سے اہل سنت کے مذہب کی بنیادوں کو ہلا دیا ہے۔ یہاں پر صرف ایک اعتراض کا جواب دینا باقی رہ جاتا ہے جو کہ صاحب المنار اور بعض دوسروں نے آیت میں موجود ''جمع کی ضمائر'' کے بارے میں کیا ہے، اس کا جواب ہم بعد میں تفصیل سے دیں گے۔

مباہلہ کی اہمیت

---

[1] تفسیر المنار، جلد ۳، صفحہ ۳۲۲۔

اس آیت میں پہلا قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ مباہلہ کے مسئلہ کو دعوی رسالت میں رسول خدا ﷺ کی حقانیت اور صداقت پر روشن اور واضح دلیل قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ یہ امر ممکن نہیں ہے کہ جو اپنے پروردگار سے اپنے رابطہ اور تعلق پر قطعی ایمان نہ رکھتا ہو وہ اس قسم کے میدان میں وارد ہو، یعنی اپنے مخالفین کو دعوت دے کہ آ ؤمل کر خدا کی بارگاہ میں جائیں اور اس سے جھوٹے کو رسوا کرنے کی دعا مانگیں، اور میرا وعدہ ہے کہ میری نفرین مخالفین پر عملی جامعہ پہنے گی، اور اس کا نتیجہ سب دیکھیں گے۔ یقینا اس قسم کے میدان میں اترنا انتہائی خطرناک ہے کیونکہ اگر نفرین قبول نہ ہوئی اور اس کا اثر مخالفین پر مترتب نہ ہوا تو اس کا نتیجہ دعوت دینے والے کی رسوائی کے سوا کچھ نہ نکلے گا اور کوئی بھی سمجھ دار انسان نتیجہ کے اطمینان کے بغیر ایسے خطرناک میدان میں قدم نہیں رکھتا۔

اسی دلیل کی بنا پر اسلامی روایات میں ہم دیکھتے ہیں کہ جب بات مباہلہ تک پہنچی تو نجران کے عیسائیوں نے رسول خدا ﷺ سے مہلت مانگی تاکہ وہ اس کے متعلق غور وفکر کرلیں اور جب انہوں نے دیکھا کہ پیغمبر اکرم ﷺ فقط ان افراد کو مباہلہ کے لیے لائے ہیں جن کی دُعا مستجاب ہوسکتی ہے اور آپؐ ہر طرح کہ شور شرابے، رعب و دبدبے کے بغیر میدان مباہلہ میں اترے ہیں تو اس چیز کو انہوں نے آپ کے دعوی کی صداقت کی دلیل سمجھا اور مباہلہ سے راہ فرار اختیار کی مبادا عذاب الٰہی میں مبتلا نہ ہوجائیں۔ انہوں نے جب دیکھا کہ رسول خدا ﷺ اپنے چند خاص قریبی افراد، اپنے کمسن بچوں اور اپنی بیٹی فاطمہ زہراؑ کے ساتھ میدان میں آئے ہیں تو وہ سخت وحشت زدہ ہوگئے اور صلح پر آمادہ ہوگئے۔

دوسرے پہلو سے یہ آیت اہل بیت رسول یعنی علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ کے اعلیٰ مقام و منزلت پر واضح اور روشن دلیل ہے۔ کیونکہ آیت میں تین الفاظ آئے ہیں ''اَنْفُسَنا''، ''نِسائَنا'' اور ''اَبْنَائَنا''۔ بے شک ''اَبْنَائَنا'' سے مراد امام حسن اور امام حسین علیہما السلام تھے اور اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہے ''نِسائنا'' جناب فاطمہ ﷺ کے علاوہ کسی پر منطبق نہیں ہوتا، رہی بات ''اَنْفُسَنا'' کی تو یقینا رسول خدا ﷺ تو اس سے مراد نہیں ہوسکتے، کیونکہ آیت کہہ رہی ہے نَدْعُ...... اَنْفُسَنا 'ہم بلائیں اپنے جیسوں'' کو پس اگر مراد خود پیغمبر اکرم ﷺ ہوں تو اپنے آپ کو بلانا کوئی معنی نہیں رکھتا لہٰذا اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے کہ ہم کہیں اس سے مراد صرف اور صرف علیؑ ہیں۔

یہ بات اہم ہے کہ فخر رازی نے اس آیت کی تفسیر میں ایک شیعہ عالم ''محمود بن الحسن الحمصی'' کے بیان کو نقل کیا ہے، اس نے مذکورہ آیت سے ثابت کیا ہے کہ علیؑ رسول اللہ ﷺ کے بعد تمام انبیاء اور سب اصحابہ سے افضل ہیں، اس کا کہنا ہے کہ ممکن نہیں ہے کہ انسان اپنے آپ کو بلائے اور خود کو کسی کام کی دعوت دے پس اَنْفُسَنا سے مقصود آنحضرتؐ کے علاوہ کوئی اور ہے اور علماء متفق ہیں کہ آنحضرتؐ کے ہمراہ علیؑ کے علاوہ کوئی اور نہ تھا، اس بنا پر آیت کہہ رہی ہے کہ علیؑ پیغمبر اکرم ﷺ کی جگہ پر اور آپ جیسے میں یقینا علی بعینہ پیغمبر ﷺ نہیں لیکن مقام نبوت اور آنحضرتؐ کی سب پر افضلیت کے علاوہ دیگر تمام جہات اور پہلوؤں میں آپ جیسے ہیں۔

دوسری طرف ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ پیغمبر اکرم ﷺ تمام انبیاء سے افضل ہیں پس علیؑ کو بھی افضل ہونا چاہیے، اس کے بعد اس نے ایسی حدیث کو (اپنے کلام کی تکمیل کے لیے) بطور دلیل پیش کیا ہے۔ جسے دوست و دشمن سب تسلیم کرتے ہیں۔

رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

مَنْ اَرادَ اَنْ یَرَی آدَمَ فِی عِلْمِہٖ وَ نُوحاً فِی طاعَتِہٖ وَ اِبْرَاھِیْمَ فِی خُلَّتِہٖ و موسیٰ فِی ھَیْبَتِہٖ وَ عیسیٰ فِی صَفْوَتِہٖ، فَلْیَنْظُرْ اِلی عَلِیِّ بن ابی طالب۔ (ع)

جو شخص آدم کو مقام علم میں، نوح کو اطاعت میں، (اپنے پروردگار کی نسبت) ابراہیمؑ کو دوستی اور خلیل الٰہی ہونے میں، موسیٰ کو ھیبت میں اور عیسیٰ کو ان کی برگذیدگی میں دیکھنا چاہتا ہے تو وہ علی بن ابی طالب۔ کی طرف دیکھے۔

یہ حدیث کہہ رہی ہے آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری۔ یعنی اچھے لوگوں میں جو صفات الگ الگ پائی جاتی ہیں وہ تمام ان کی ذات میں یکجا تھیں۔ اس بیان کو نقل کرنے کے بعد فخر رازی لکھتے ہیں: دوسرے شیعہ بھی ماضی اور حال میں اس آیت سے استدلال کرتے ہیں کہ علیؑ، حضرت محمد ﷺ کے نفس اور جان کی مانند ہیں مگر ان خصوصیات میں نہیں جو دلیل صرف رسول خدا ﷺ کے لیے ثابت کرتی ہیں۔ اور یہ بات مسلم ہے کہ آنحضرتؐ تمام اصحاب سے افضل تھے پس علیؑ کو بھی تمام اصحاب سے افضل ہونا چاہیے۔[1]

فخر رازی اس دلیل کو ذکر کرنے کے بعد انتہائی سادگی سے اس سے گزر جاتے ہیں اور صرف اس جواب پر قناعت کرتے ہیں جیسا کہ مسلمانوں کا اجماع ہے کہ حضرت محمد ﷺ علی بن ابی طالب۔ سے افضل ہیں اسی طرح مسلمانوں کا اجماع ہے کہ ہر نبی ان تمام افراد سے افضل ہے جو نبی نہیں ہیں اور یقینا علیؑ نبی نہیں تھے؛ پس نتیجہ یہ نکلے گا کہ دیگر انبیاء الٰہی علیؑ سے افضل تھے۔[2]

اگر فخر رازی کی گفتگو میں خوب غور و فکر کریں تو آپ دیکھیں گے کہ ان کے پاس اس محکم اور قوی استدلال کا جواب نہیں ہے گویا اس نے چاہا ہے کہ بات بالکل جواب کے بغیر نہ رہے ورنہ یہ بات کہ ہر نبی غیر نبی سے افضل ہے، مکمل طور پر قابل بحث ہے کیونکہ انبیاء اور پیغمبروں کی دیگر افراد پر فضلیت اور برتری صرف وحی کے حوالے سے مسلم اور مورد اتفاق ہے لیکن وحی کے علاوہ ممکن ہے ایسی بزرگ ہستیاں ہوں جو رسول اللہ ﷺ کے علاوہ باقی تمام انبیاء سے افضل ہوں۔ علاوہ ازیں بات تو علیؑ کی تمام امت پر فضلیت کی ہے اور یہ امر ان کی تمام انبیاء پر برتری کے ثابت ہونے کا محتاج نہیں ہے۔ (غور کیجیے گا)

بہر حال اس آیت اور اس کی تفسیر میں منقولہ متواتر احادیث سے جو فضلیت ثابت ہوتی ہے وہ پیغمبر اکرم ﷺ کی جانشینی اور خلافت کے مسئلہ کو واضح کرتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کبھی بھی راضی نہیں ہوگا کہ ایک افضل اور برتر شخص ماموم ہو اور غیر افضل امام ہو، وہ شخص جو پیغمبر اکرم ﷺ کے نفس اور جان کی طرح ہو وہ پیروکار ہو اور اس سے کمتر درجے والے اس کے پیشوا ہوں۔!

---

[1] تفسیر کبیر فخر رازی جلد ۸، صفحہ ۱۸

[2] تفسیر کبیر فخر رازی جلد ۸، صفحہ ۱۸

اس مسئلہ میں فرق نہیں پڑتا چاہے ہم امامت کو منصوص من اللہ سمجھیں (جیسا کہ ہمارا عقیدہ ہے) یا عوامی انتخاب کے ذریعے قرار دیں جس طرح اہل سنت کا عقیدہ ہے، کیونکہ پہلی صورت میں اللہ تعالیٰ کبھی مفضول کو افضل پر مقدم نہیں کرئے گا اور دوسری صورت میں بھی لوگوں کو حکمت کے خلاف کوئی کام انجام نہیں دینا چاہیے اور اگر وہ ایسا کریں تو وہ کام ناپسندیدہ اور غیر معقول ہوگا۔

آیت مباہلہ سے استدلال پر نکتہ چینی

یہاں پر ایک مشہور اعتراض ہے جسے المنار کے مصنف اور بعض دوسروں نے اس آیت کے اہل بیت کے حق میں نازل ہونے پر ذکر کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ''ابنائنا'' (ہمارے بیٹے) سے مراد حسن- اور حسین -کس طرح سے ہو سکتے ہیں حالانکہ ''ابنائنا'' جمع کا صیغہ ہے اور عربی زبان میں جمع کا اطلاق دو افراد پر نہیں ہوتا؟ اس طرح یہ بھی کیسے ممکن ہے کہ ''نسائنا'' (ہماری عورتیں) جو کہ جمع کا صیغہ ہے صرف خاتون جنت حضرت فاطمہ زہرا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اس کا اطلاق ہو؟ نیز یہ بھی کیسے ہو سکتا ہے کہ انفسنا سے مراد صرف علیؑ ہوں؟ کیونکہ یہ بھی جمع کا صیغہ ہے اور علیؑ ایک فرد ہیں۔

جواب

اس سوال کے جواب میں آپ کی توجہ چند نکات کی طرف مبذول کراتے ہیں۔

۱۔ جیسا کہ پہلے بھی تفصیل سے ذکر ہو چکا ہے کہ اس آیت کے اہل بیتؑ کے بارے میں نازل ہونے کے متعلق روایات کی ایک کثیر تعداد اسلام کی مشہور اور معتبر کتابوں اعم از شیعہ وسنی میں نقل ہوئی ہے ان روایات میں واضح طور پر مذکورہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ علی،- فاطمہؑ، حسن -اور حسین -کے علاوہ کسی کو اپنے ساتھ مباہلے میں نہیں لے گئے اور یہ بات آیت کی تفسیر میں خود ایک بڑا واضح قرینہ ہوگی، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ آیات قرآن کی تفسیر کرنے والے جملہ قرائن میں سے ایک ''سنت اور قطعی شان نزول بھی ہے۔ بنابرایں یہ اعتراض فقط شیعہ پر نہیں ہے بلکہ تمام علمائے اسلام کو اس کا جواب دینا ہوگا۔

۲۔ صیغہ جمع کا واحد یا تثنیہ پر اطلاق کوئی نئی بات نہیں ہے قرآن اور غیر قرآن عربی ادب بلکہ غیر عربی ادب اس طرح کی مثالوں سے بھرا پڑا ہے اس کی وضاحت یوں ہے کہ بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ جب کوئی قانون بیان کیا جاتا ہے یا کسی معاہدہ کو تحریر کیا جاتا ہے تو حکم کو بطور کلی اور صیغہ جمع کی صورت میں لایا جاتا ہے، مثلاً معاہدہ میں یوں لکھا جاتا ہے کہ اس پر دستخط کرنے والے اور ان کے فرزندان معاہدے پر علمدرآمد کرنے کے پابند ہوں گے، جب کہ یہ ممکن ہے کہ معاہدے کے فریقین میں سے کسی کے ایک یا دو فرزند ہوں، لہٰذا یہ بات قانون سازی یا عہد نامے کا جمع کی صورت میں لکھنے سے قطعاً منافی نہیں ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ہمارے پاس دو مرحلے میں ایک مرحلہ تدوین کا اور دوسرا عملدرآمد کا تدوین کے مرحلے میں ممکن ہے کئی دفعہ الفاظ جمع کی صورت میں تحریر کیے جاتے ہیں تا کہ تمام مصادیق پر اس کا اطلاق ہو لیکن عمل درآمد اور نفاذ کے مرحلے میں مصداق فرد واحد

میں منحصر ہوا ور مصداق میں انحصار مسئلہ کے کلی ہونے کے منافی نہیں ہے۔

دوسرے الفاظ میں پیغمبرا کرم ﷺ نجران کے عیسائیوں سے کیے گئے وعدے کے مطابق پابند تھے کہ آپؐ اپنے تمام بیٹوں، اپنے خاندان کی تمام خاص عورتوں اور ان سب کو اپنے ساتھ مباہلہ میں لے آتے جو آپ کی جان اور نفس کے مقام پر تھے، مگر اس کے مصداق، دو بیٹوں، ایک خاتون اور ایک مرد کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ (غور کیجیے گا) قرآن کی آیات میں ایسے متعدد موارد موجود ہیں جہاں الفاظ اور عبارت جمع کے صیغے میں آئی ہے لیکن اس کا مصداق مختلف وجوہات میں سے کسی وجہ سے ایک فرد میں منحصر ہے۔ مثلاً سورہ آل عمران کی آیت ۱۷۳ میں ہم ملاحظہ کرتے ہیں:

اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ

''وہ لوگ جنہوں نے ان سے کہا دشمن (تم پر حملے کے لیے) اکٹھے ہو چکے ہیں ان سے ڈریں''

اس آیت سے الناس سے مراد بہت سارے مفسرین کے بقول نعیم بن مسعود ہے جس نے ابوسفیان سے پیسے لیے تھے تا کہ مسلمانوں کو مشرکین کی طاقت سے ڈرائے اور خوفزدہ کرے۔ اسی طرح سورہ آل عمران کی آیت ۱۸۱ میں ہے:

لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ ؂

اللہ تعالیٰ نے ان کی بات سن لی ہے جنہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ محتاج وفقیر ہے اور ہم بے نیاز ہیں۔ اس لیے وہ ہم سے زکوٰۃ مانگتا ہے۔

اس آیت میں بہت سارے مفسرین کے مطابق الذین سے مقصود ''حی بن اخطب'' یا ''فنحاص'' ہے کبھی لفظ جمع کا مفرد پر اطلاق بزرگی اور عظمت کے عنوان سے بھی ہوتا ہے جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں آیا ہے۔

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ

''ابراہیم اللہ کی بارگاہ میں ایک خاضع امت تھا'' (نحل/۱۲۰)

یہاں پر لفظ ''امت'' اسم جمع ہے جس کا اطلاق ایک فرد پر ہوا ہے (اس سے پہلے بھی اس بارے میں تفصیلاً بحث ہو چکی ہے)۔

۳۔ آیت مباہلہ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بیٹی کے بیٹوں کو بھی حقیقت میں ''ابن'' کہا جاتا ہے برخلاف اس کے جو دور جاہلیت میں مرسوم تھا کہ صرف بیٹوں کے بیٹوں کو اپنا بیٹا سمجھا جاتا تھا اور وہ کہتے تھے۔

بَنُوْنَا بَنُو اَبْنَائِنا وَ بَناتِنَا

بُنُوهُنَّ اَبْنَاءُ الرِّجالِ اَباعِدِ

یعنی: ہمارے بیٹے صرف ہمارے پوتے ہیں۔ ہمارے نواسے غیروں کے بیٹے ہیں نہ کہ ہمارے

یہ طرز تفکر اُسی غلط جاہلی سنت کی پیداوار تھا کہ جو بیٹیوں اور عورتوں کو انسانی معاشرہ کا اصلی جز نہیں سمجھتے تھے اور انہیں بیٹوں کی

حفاظت اور پرورش کے لیے ظروف کے طور پر سمجھتے تھے۔ جیسا کہ ان کا شاعر کہتا ہے:

وَ اِنَّمَا اُمَّهَاتُ النَّاسِ اَوْعِيَة
مُسْتَودَعَاتُ و لِلَانْسَابِ آبَاء

لوگوں کی مائیں صرف ان کی پرورش کے لیے ظروف کا حکم رکھتی ہیں اور نسب کے لیے صرف باپ پہچانے جاتے ہیں۔

لیکن اسلام نے اس طرز فکر کی سختی سے مخالفت کی اور اسے ختم کرتے ہوئے بیٹوں کے احکام کو پوتوں اور نواسوں پر یکساں طور پر جاری کیے۔ قرآن مجید کی سورہ انعام کی آیت ۸۵ میں حضرت ابراہیمؑ کے فرزندوں کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۸۴﴾ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۵﴾

ابراہیم کے فرزندوں میں سے داود، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ ھارون تھے اور اسی طرح ہم نیک افراد کو جزا دیتے ہیں نیز زکریا، یحییٰ، عیسی اور الیاس بھی ان کے بیٹے تھے جو سب کے سب صالحین تھے:

اس آیت میں حضرت عیسیٰ حضرت ابراہیمؑ کے بیٹوں میں شمار کیے گئے ہیں حالانکہ وہ ان کی بیٹی کے بیٹے تھے۔ شیعہ وسنی ذرائع سے امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے بارے میں منقولہ روایات میں ''ابن رسول اللہ'' (رسول خدا کے بیٹے) کا اطلاق مکرر سامنے آیا ہے۔

جن عورتوں سے نکاح حرام ہے ان آیات میں آیا ہے: ''وحلائل ابنائکُمْ'' (یعنی تمہارے بیٹوں کی بیویاں) فقہائے اسلام کے درمیان یہ مسئلہ مسلم ہے کہ بیٹوں کی بیویاں اور پوتوں اور نواسوں کی بیویاں حرام ہیں اور مذکورہ آیت کے حکم میں پوتوں اور نواسوں دونوں کی بیویاں ہیں۔

آیت مباہلہ کے حوالے سے قابل توجہ نکات میں سے ایک یہ ہے کہ ایک مشہور حدیث میں آیا ہے کہ مامون عباسی نے امام علی بن موسی الرضاؑ سے سوال پوچھا کہ آپ کے جد علی بن ابی طالبؑ کی بلافصل خلافت پر کونسی دلیل ہے؟ انہوں نے جواب دیا آیت ''اَنْفُسَنَا'' مامون نے کہا اگر ''نسائنا'' کا لفظ نہ ہوتا تو! امام - نے جواب میں فرمایا: اگر ''ابنائنا'' نہ ہوتو!

علامہ طباطبائی ان پر معنی اور مختصر جملات کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں:

امام - کا آیت ''انفسنا'' سے استدلال اس پہلو سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت علیؑ کو پیغمبر اکرم ﷺ جیسا اور ان کے نفس اور جان کی منزلت پر قرار دیا ہے، (اس بنا پر وہ سب سے افضل اور امامت کے لیے لائق اور قابل ترین شخص تھے اور رسالت و نبوت کے مقام کے علاوہ باقی تمام امور میں آپؐ جیسے تھے)

مامون کا جواب دراصل اس استدلال پر اعتراض تھا اُس نے کہا کہ نسائنا (ہماری عورتیں) کا لفظ یہ دلیل ہوسکتا ہے کہ

"انفسنا" کا معنی "رجالنا" (ہمارے مرد) ہونہ کہ جان اور نفس نبی ؐ ہونے کے معنی میں، امام -کا دوبارہ جواب اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر "انفسنا" "رجالنا" کے معنی میں ہوتا تو پھر "ابنائنا" لانے کی قطعاً ضرورت نہ تھی کیونکہ یہ افراد بھی رجال اور نساء کے الفاظ میں داخل ہیں۔ (اگر اولاد مونث ہوتو نساء میں اور اگر مذکر ہوتو رجال میں داخل ہے) پس "انفسنا" "رجالنا" کے معنی میں نہیں ہے۔[1] (غور کیجیے گا)

بحارالانوار میں مأمون والا واقعہ ایک اور طرح سے بیان ہوا ہے ظاہر یہ ہوتا ہے کہ امام رضا -سے کسی اور مقام پر سوال و جواب ہوا ہے، یہ روایت کہتی ہے: ایک دن مامون نے امام علی بن موسی الرضا -سے عرض کیا کہ امیر المومنین علی بن ابی طالبؑ کی سب سے بڑی فضلیت جو قرآن نے بتائی ہے بیان کریں۔ امام -نے فرمایا آیت مباہلہ ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ **فَمَنْ حاجّك فيه** ..... جب یہ آیت نازل ہوئی رسول اللہ ﷺ نے حسن اور حسین ÷ کو بلایا، پس یہ دو افراد "ابنائنا" کے مصداق ٹھہرے، آپؐ نے فاطمہؑ کو بھی بلایا اس بنا پر "نسائنا" کی مصداق وہ ٹھہریں اور امیر المومنین -کو بھی ساتھ لیا، اور وہ حکم الٰہی سے رسول اللہ کے نفس اور جان تھے اور جب مخلوق خدا میں سے کوئی بھی رسول خدا ﷺ سے افضل اور بالاتر نہیں ہے تو ثابت ہوتا ہے کہ کوئی بھی نفس رسول اللہ، یعنی علیؑ سے کوئی بھی افضل نہیں ہے۔

مامون نے کہا: ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ "انفسنا" کا مصداق خود حضور ﷺ کی ذات اقدس ہیں نہ کوئی اور۔ امام -نے جواب میں فرمایا: کیا کوئی اپنے آپ کو بھی بلاتا اور دعوت دیتا ہے؟ اور چونکہ پیغمبر اکرم ﷺ نے فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ کے علاوہ علیؑ کو بھی بلایا ہے پس معلوم ہوا کہ علیؑ نفس رسول اور جان رسول ہیں۔[2]

---

[1] تفسیر المیزان، جلد ۳، صفحہ ۲۳۰۔

[2] بحارالانوار جلد ۱۰، صفحہ ۳۵۰ (اختصار کے ساتھ)

۲۔ آیت خیر البریہ

سورہ بینہ کی آیت ۷ اور ۸ میں ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰٓىِٕكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۝ جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ۝

جو لوگ ایمان لائے اور اعمال صالح انجام دیئے یہی بہترین مخلوق ہیں ان کا صلہ ان کے رب کے پاس دائمی باغات میں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور جن میں وہ ابد تک ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہے اور وہ اللہ سے راضی ہیں اور یہ (بلند و بالا مقام) ان کے لیے جو اپنے رب (کے عذاب) سے ڈرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں اور اس سے پہلے والی آیات میں بہترین اور بدترین مخلوق کا تعارف کرایا ہے اہل کتاب میں سے کافر اور مشرک مختلف قسم کے حیلوں اور سازشوں کے ذریعے نور حق کو بجھانے کی فکر میں ہیں یہ لوگ خود بھی گمراہ ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں ان کا تعارف اللہ تعالیٰ نے شر البَرِيّة[1] (بدترین مخلوق) کے طور پر کرایا ہے۔ ان کے برعکس مومن افراد ہیں جو اپنے ایمان کے سایے میں راہ حق کو پا چکے ہیں یہ لوگ اعمال صالح کا منبع تھے اور ہیں یہ خود بھی ہدایت یافتہ ہیں اور دوسروں کے لیے چراغ ہدایت ہیں ان کا تعارف اللہ تعالیٰ نے خیر البریہ (بہترین مخلوق) کے عنوان سے کرایا ہے۔

یہ درست ہے کہ آیت کا معنی و مفہوم وسیع ہے اور کسی ایک خاص فرد یا خاص افراد میں منحصر نہیں ہے لیکن شیعہ و سنی احادیث کی کتابوں میں متعدد روایات میں خاص اشخاص پر انگلی رکھی گئی ہے کہ خیر البریہ کے درجات میں سے اول درجے کے افراد یہ ہیں۔ ان احادیث کے معنی میں غور و خوض کرنے سے بہت سارے ایسے حقائق روشن ہو سکتے ہیں جو کچھ افراد کے لیے ابھی تک مبہم تھے، اور اس سے بہت سارے نادانستہ طور پر لگائے گئے الزامات کا بھی واضح جواب مل سکتا ہے۔ یہاں پر ہم قارئین کی توجہ ان میں سے بعض روایات کی طرف مبذول کراتے ہیں۔

ا۔ مشہور معروف مفسر سیوطی اپنی کتاب الدر المنثور میں مذکورہ آیت کے حوالے سے ابن عساکر کے ذریعے جابر بن عبد اللہ انصاری سے

---

[1] بریہ کا مصدر ''برء'' ہے جس کا معنی خلق ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کو باری یعنی خالق اور مخلوقات کو بریہ کہا جاتا ہے بعض افراد کا کہنا ہے کہ ''بریہ''، ''بَرَی'' (بروزن برگ) سے ہے جس کا معنی خاک مٹی ہے اور چونکہ مخلوقات کو خاک سے خلق کیا گیا ہے، اس لئے انہیں ''بریہ'' کہا گیا ہے۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ بریہ ''بَرَیْتُ الْقَلَمَ'' (''میں نے قلم تراشا'') سے اخذ کیا گیا ہے۔ اور چونکہ مخلوقات اپنی شکل و قامت کے لحاظ سے حکم الٰہی سے مختلف صورتوں میں بنی ہیں گویا یہ قلم ہی جو قدرت کے خار کانے میں تارشے جاتے ہیں اس لئے انہیں بریہ کہتے ہیں۔ دیکھیں: تفسیر قرطبی، جلد ۱۰، صفحہ ۷۲۳۵، مفردات راغب اور دیگر لغت کی کتابیں۔

بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے کہ اتنے میں علیؑ ہماری طرف تشریف لائے۔ جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر ان پر پڑی تو فرمایا:

وَ الَّذِی نَفْسِی بِیَدِہٖ اِنَّ ھذا وَ شِیْعَتَہُ لَھُمُ الفَائِزُونَ یَوْمَ القِیَامَۃِ و نَزَلَتْ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوا و عملوا الصالحات اولئك ھم خیر البریۃ فکان اصحاب النبی اذا اقبل عَلِیٌّ قالوا جاء خیر البریۃ۔

مجھے اس ذات کی قسم ہے جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے یہ اور اس کے شیعہ قیامت کے دن کامیاب وکامران ہوں گے اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ اسی وجہ سے جب علیؑ تشریف لاتے تو اصحاب رسول کہتے تھے خیر البریہ (بہترین مخلوق) تشریف لائے ہیں۔[1]

یہی روایت اسی مضمون اور الفاظ کے ساتھ حاکم حسکانی کی شواہد التنزیل میں بھی ذکر ہوئی ہے۔[2]

۲۔ ایک روایت میں ابن عباس نے بیان کیا ہے کہ جب آیت: "اِنَّ الّذِین آمَنُو و عملو الصالحات اُولئكَ ھُمْ خَیْرُ البریّۃ" نازل ہوئی تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علیؑ سے فرمایا: ھُوَ اَنْتَ وَشِیْعَتّكَ تَاتی اَنْتَ وَشِیْعَتُكَ یَوْمَ القَیامَۃِ راضینَ مَرْضِیینَ ویَأتِی عَدُوكَ غضباناً مُقْمِحینَ۔ یعنی: یہ تم اور تمہارے شیعہ ہیں، تم اور تمہارے شیعہ قیامت کے دن اس طرح سے آ ہیں کہ اللہ تم سے راضی ہوگا اور تم اللہ سے راضی ہوگے جب کہ تمہارا دشمن ناراحت اور زحمت (اور عذاب) میں ہوگا[3]

(بعض حدیث کے نسخوں میں مقمحین کا لفظ آیا ہے جس کا مطلب ہے زنجیروں میں جکڑا کر الٹا لٹکانا ہے)

۳۔ ایک حدیث ابو برزہ سے منقول ہے کہ جب آنحضرتؐ اس آیت کی تلاوت فرماتے تھے تو علیؑ کی طرف رخ کر کے فرماتے تھے: ھُمْ اَنْتَ و شِیعَتُكَ یا علی و مِعَیادُ ما بَیْنی وَبَیْنَكَ الحوض۔ یعنی: اے علی! خیر البریۃ آپ اور آپ کے شیعہ ہیں، میری اور آپ کی وعدہ گاہ حوض کوثر ہے۔[4]

۴۔ تفسیر الدر المنثور میں بیان ہوا ہے کہ ابن مردویہ نے علیؑ سے نقل کیا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے فرمایا:

اَلَمْ تَسمَعْ قَوْلَ اللہِ اِنَّ الّذِیْنَ آمَنَوا و عَمِلُوا الصالحاتِ اُولئكَ ھُمُ البَرِیَّۃ اَنْتَ وَ شِیْعَتُكَ و مَوْعِدی و مَوْعِدُ کم الحَوْضُ اِذَا جِئْتُ الاُمَمَ لِلحِساب تُدْعَوْنَ غُراً

---

[1] الدر المنثور، جلد ۶۔ صفحہ ۳۷۹

[2] شواہد التنزیل

[3] شواہد التنزیل، جلد ۲، صفحہ ۳۵۷، حدیث ۱۱۲۶، اسی مطلب کو ابن حجر نے صواعق ص ۹۶ پر اور شبلنجی نے نور الابصار ص ۷۰ اور ۱۰۱ پر ذکر کیا ہے۔

[4] شواہد التنزیل، جلد ۲ صفحہ ۳۵۹، حدیث ۱۱۳۰۔

مُحَجَلِيْنَ

کیا آپ نے اللہ تعالیٰ کا فرمان نہیں سُنا کہ جولوگ ایمان لائے اور عمل صالح انجام دیئے وہ بہترین مخلوق ہیں، اور وہ آپ اور آپ کے شیعہ میں میری اور تمہاری وعدہ گاہ حوض کوثر ہے جب میں امتوں کے حساب و کتاب کے لیے آؤں گا تمہیں پکارا جائے گا اس حالت میں کہ آپ کی پیشانی سفید اور جانی پہچانی ہوگی۔ [۱]

۵۔ اسی طرح سے شواہد التنزیل میں مذکورہ ہے کہ عطیہ عوفی کا بیان ہے کہ ہم جابر بن عبداللہ انصاری کے پاس پہنچے اس وقت بڑھاپے اور کبر سنی کی وجہ سے ان کے ابروان کی آنکھوں پر پڑ چکے تھے، ہم نے کہا: ''اخبرنا عن عَلِيٍّ'' یعنی: ہمیں حضرت علیؑ کے بارے میں بتاؤ۔ جابر نے اپنے ہاتھوں سے اپنے ابروں کو اوپر کیا اور کہا: ذالك مِنْ خَيْرِ البَرِيّه۔ یعنی: وہ اللہ کی بہترین مخلوق سے ہے۔ [۲]

٦۔ گنجی شافعی نے کفایہ المطالب میں عطا سے نقل کیا ہے کہ میں نے حضرت عائشہ سے علیؑ کے متعلق پوچھا انہوں نے جواب میں کہا: ذاك خَيْرُ البشرِ لا يَشُكُّ فِيهِ اِلَّا كافِرًا۔ یعنی: وہ بہترین بشر ہے اس میں کافر کے سوا کوئی شک نہیں کرتا۔ [۳]

اسی کتاب میں حذیفہ یمانی سے نقل ہوا ہے کہ میں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ: عَلِيٌّ خَيْرُ البَشَرِ مَنْ اَبَى فَقَدْ كَفَر۔ یعنی: علی بہترین انسان ہے جو اس سے انکار کرے وہ کافر ہے۔ [۴]

بڑی واضح سی بات ہے کہ یہ تمام الفاظ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد علیؑ کی شخصیت کو اجاگر کر رہے ہیں۔ یعنی حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد وہ خیر البشر ہیں۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ اہلسنت کے بڑے مفسر آلوسی جو کہ علیؑ کے فضائل کی احادیث کے بارے میں خاص طور پر بڑا سخت رویہ رکھتے ہیں (اس کتاب میں کئی مرتبہ اس کے نمونے پیش کیے گئے ہیں) اس نے اس آیت کے ضمن میں احادیث نبوی قابل توجہ تعداد نقل کرنے کے بعد بیان کیا ہے کہ ان روایات کا مطلب یہ نہیں کہ یہ آیت علیؑ اور ان کے شیعوں اور پیروکاروں کے لیے مخصوص ہے اگرچہ بلا شک وشبہہ وہ اس آیت میں داخل ہیں اور اول درجے پر فائز ہیں۔

اس کے بعد وہ وضاحت کرتے ہیں کہ اگرچہ امامیہ علیؑ کو انبیاء اور فرشتوں سے افضل سمجھتے ہیں لیکن رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان سے افضل جانتے ہیں۔ مختصر یہ کہ خیر البریۃ سے مربوط احادیث کو بہت سارے افراد نے مشہور اسلامی کتب میں نقل کیا ہے، اور یہ علیؑ کی تمام مسلمانوں اور اصحاب پر رسول خداؐ کے بعد برتری اور افضلیت پر بہترین ادلہ ہیں۔

اس بات کو ان حالات کے پس منظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے جب علیؑ کے دشمنوں نے ان سے عداوت اور دشمنی کی بنا پر بنی

---

[۱] الدر المنثور، جلد ٦۔ صفحہ ۳۷۹

[۲] شواہد التنزیل، جلد ۲، صفحہ ۳٦٤، حدیث ۱۱٤۲۔

[۳] کفایۃ الطالب، صفحہ ۱۱۸ (احقاق الحق، جلد ۳، صفحہ ۲۸۸ کے نقل کے مطابق)

[۴] کفایۃ الطالب، صفحہ ۱۱۸ (احقاق الحق، جلد ۳، صفحہ ۲۸۸ کے نقل کے مطابق)

امیہ کے تاریک اور ظالمانہ دور میں فضائل علیؑ کو چھپانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور علیؑ کے دوستوں نے ان ظالموں سے خوف کی بنا پر فضائل علیؑ کو کتمان کیا اور چھپایا۔لیکن پھر بھی یہ تمام بڑے فضائل ان تاریک اور ظالمانہ ادوار کو عبور کر کے سالوں اور صدیوں کا سفر طے کر کے ہم تک پہنچ گئے ہیں اور یہی حیرانی کی بات ہے۔اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر نہیں ہوسکتا۔اس آیت سے احادیث کی مدد سے دو نکات اچھی طرح سے ثابت ہوتے ہیں۔

ا۔تمام اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے علیؑ کا افضل ہونا

چونکہ غیر افضل کو افضل پر مقدم کرنا اور اُسے ترجیح دینا ایک ناپسندیدہ اور بُرا کام ہے، لہٰذا کسی بھی صورت میں علیؑ پر اس کے غیر کو مقدم نہیں کیا جا سکتا، اس بنا پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پہلا خلیفہ اور جانشین انہیں ہونا چاہیے تھا خواہ خلافت کا تقرر اللہ کی جانب سے ہو (جیسا کہ ہمارا عقیدہ ہے) یا لوگوں کی طرف سے ہو جس طرح دوسروں کا عقیدہ ہے۔

۲۔پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان پر حضرت علیؑ کے پیروکاروں کا نام "شیعہ"

دوسرا نکتہ ان متعدد احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ علیؑ کے پیروکاروں کا شیعہ نام ہونا خود رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے کئی مرتبہ جاری ہوا ہے، جو لوگ اس عنوان سے دشمنی رکھتے ہیں اور اس سے نفرت کرتے ہیں اور کبھی اس کی شین کو شوم (بدبخت) اور شر جیسے الفاظ سے یاد کرتے ہیں وہ درحقیقت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت کرتے ہیں اور نعوذ باللہ وہ ان کے قول سے نفرت کرتے ہیں۔

یقیناً اگر وہ دانستہ طور پر ایسی باتیں کریں تو ان کا کام انتہائی دشوار ہے۔کیا ہی اچھا ہے کہ ہم یہ کہیں کہ وہ ان احادیث نبوی سے آگاہ نہیں ہیں۔سچ یہ ہے کہ لقب شیعہ، نفرت کا موجب نہیں ہے بلکہ ان متعدد اور معتبر روایات کے مطابق ایسا افتخار کا تاج ہے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکتب علی- کے پیروکاروں کے سر پر سجایا ہے، ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہم سب کو اس افتخار کے لائق اور قابل بنا دے۔

۳۔آیت شب ہجرت (لیلۃ المبیت)

سورہ بقرہ کی آیت ۲۰۷ میں ارشاد رب العزت ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّشۡرِىۡ نَفۡسَهُ ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ اللّٰهِ‌ؕ وَاللّٰهُ رَءُوۡفٌ ۢ بِالۡعِبَادِ﴿۲۰۷﴾

ورلوگوں میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو اللہ کی مرضی کی خاطر اپنی جان کو بیچ ڈالتا ہے اور اللہ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے۔

اس آیت کے شان نزول میں بہت ساری روایات اہم ترین اسلامی کتب میں نقل ہوئی ہیں جن میں سے چند ایک یہ ہیں:

۱۔اہل سنت کے مشہور مفسر ثعلبی اپنی تفسیر میں اس آیت کا شان نزول یوں بیان کرتے ہیں: جب رسول خدا ﷺ نے مکے سے مدینے کی طرف ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا تو قرض اور امانتیں جو لوگوں نے آنحضرتؐ کے سپرد کی تھیں، واپس لوٹانے کے لیے آپؐ نے علی ابن ابی طالبؑ کو ذمہ داری سونپی ہجرت کی رات جب آنحضرتؐ غار کی طرف روانہ ہوئے تو آپؐ کے گھر کو کفار نے گھیرے میں لے رکھا تھا اس حالت میں آپؐ نے علیؑ کو اپنے بستر پر سونے کا حکم دیا، اور فرمایا میرے سبز رنگ کی جو چادر ہے (جسے میں سوتے وقت اوڑھ لیتا ہوں) وہ اپنے اوپر اوڑھ لیں اور میرے بستر پر سو جائیں انشا اللہ تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

علی – نے حکم کی تعمیل کی اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے جبرائیل اور مکائیل کو وحی فرمائی کہ میں نے تم دونوں کو ایک دوسرے کا بھائی بنایا ہے ایک کی عمر دوسرے سے زیادہ لمبی قرار دی ہے تم میں سے کون اپنی زندگی کو دوسرے پر قربان کرسکتا ہے (اور زیادہ عمر دوسرے کے لیے چاہے) دونوں میں سے ہر ایک نے اپنے لیے لمبی زندگی کا تقاضا کیا۔

اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا تم دونوں نے علیؑ کا طرز عمل کیوں اختیار نہ کیا میں نے علیؑ اور محمد ﷺ کو ایک دوسرے کا بھائی بنایا ہے اور علیؑ پیغمبر اکرم ﷺ کے بستر پر سو گئے اور اپنی جان کو ان پر قربانی کے لیے پیش کر دیا اب تم دونوں زمین پر جاؤ اور دشمنوں سے ان کی حفاظت کرو، وہ دونوں زمین پر اترے، جبرئیل سرہانے کھڑے ہو گئے اور میکائیل پائنتی کی طرف کھڑے ہو گئے۔ جبرئیل کہنے لگے واہ واہ! اے علی! تیری کیا بات ہے! تیرے جیسا کون ہوسکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ تیری وجہ سے فرشتوں کے درمیان فخر ومباہات فرما رہا ہے۔اس موقع پر جب پیغمبر اکرم ﷺ مدینے کی طرف رواں دواں تھے تو یہ آیت (وَ مِنَ النّاسِ مَنۡ یَشۡرِی نَفۡسَهُ ابۡتِغاءَ مَرۡضاةِ اللهِ) علیؑ کی شان میں نازل ہوئی:

ثعلبی کی اس حدیث کو اسی تفصیل کے ساتھ امام غزالی نے احیا العلوم (جلد ۳، صفحہ ۲۳۸) میں گنجی نے کفایۃ الطالب (صفحہ ۱۱۴) میں۔۔ابن صباغ مالکی نے الفصول المھمہ (۳۳) میں سبط بن جوزی حنفی نے تذکرۃ الخواص (صفحہ ۲۱) میں اور

شبلنجی نے نور الابصار (صفحہ ۸۲) میں بیان کیا ہے۔[1]

۲۔ حاکم حسکانی نے "شواہد التنزیل" میں ابوسعید حذری سے تھوڑے سے فرق کے ساتھ اُسی مطلب کو ذکر کیا ہے۔[2]

۳۔ مذکورہ کتاب میں ہی ابن عباس سے منقول ہے کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حضرت خدیجہ کے بعد سب سے پہلے ایمان لانے والے آپ کا لباس زیب تن کرنے والے اور آپ کے بستر پر سونے والے علیؑ تھے (لیکن اس نے اس بیان میں آیت کی طرف اشارہ نہیں کیا۔)[3]

۴۔ نیز مذکورہ کتاب میں عبد اللہ بن سلیمان (کسی اور نسخے میں عبد اللہ بن عباس) سے یہی مطلب بیان ہوا ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس رات غار کی طرف چلے گئے اور اپنے بستر پر علیؑ کو سُلایا، حضرت ابوبکر، آپؐ کے پیچھے گئے، کفار مکہ ساری رات حضرت علیؑ کو دیکھتے رہے اور پہرہ دیتے رہے (اور وہ سمجھتے رہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سو رہے ہیں) جب صبح ہوئی تو اچانک انہوں نے دیکھا یہ تو علیؑ ہیں، انہوں نے پوچھا: محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہاں ہیں؟

علی -نے جواب دیا مجھے معلوم نہیں، انہوں نے کہا: ہم حیران ہو رہے تھے کہ جب ہم تم پر پتھر پھینکتے تھے تو تم پیچ و تاب کھاتے اور پہلو بدلتے تھے جب کہ ہم جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف پتھر پھینکتے تھے تو وہ بالکل نہیں ہلتے تھے۔ اور یہ آیت اسی واقعہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّشۡرِىۡ نَفۡسَهُ ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ اللّٰهِ[4]

۵۔ حاکم نیشاپوری اپنی مشہور کتاب "مستدرک الصحیحین" میں ابن عباس سے یوں نقل کرتے ہیں: علیؑ نے اپنی جان اللہ تعالیٰ کو بیچ دی، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لباس کو پہنا اور پھر ان کے بستر پر سو گئے۔۔۔ اس حدیث کے آخر میں وہ کہتے ہیں: هذا حديث صحيحُ الاَسنَادِ وَلَمْ يُخرِ جاه۔ یعنی: یہ حدیث معتبر اور صحیح السند ہے اگرچہ بخاری اور مسلم نے اسے اپنی کتاب میں ذکر نہیں کیا۔

۶۔ مذکورہ کتاب میں ہی حکیم بن جبیر کے ذریعے علی بن الحسین -سے منقول ہے کہ :اِنَّ اَوَّلَ مَنۡ شَرَىٰ نَفۡسَهُ ابتغاء مرضاةِ اللهِ عَلِيّ ابن ابی طالبٍ۔ یعنی: سب سے پہلے جس نے اپنی جان اللہ کی رضا و خوشنودی کے عوض فروخت کی ہے وہ علی بن ابی طالب ہیں[5] اس کے بعد وہ مزید لکھتے ہیں کہ جب علیؑ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بستر پر سونے کی تیاری کر رہے تھے تو اپنی زبان پر یہ اشعار گنگنا رہے تھے:

وَقَيۡتُ بِنَفۡسى خَيۡرَ مَنۡ وَطَئَ الۡحَصَى
وَ مَنۡ طافَ بِالۡبَيۡتِ الۡعَتِيۡقِ وَ بِالۡحِجۡرِ

---

[1] الغدیر، جلد۲، صفحہ ۴۸۔

[2] شواہد التنزیل جلد۱، صفحہ ۹۸

[3] شواہد التنزیل جلد۱، صفحہ ۱۰۰

[4] مستدرک الصحیحین، جلد ۳، صفحہ ۴، (دار المعرفہ، بیروت)

[5] مستدرک الصحیحین، جلد ۳، صفحہ ۴، (دار المعرفہ، بیروت)

رَسُولَ اللّٰهِ خافَ اَنْ يَمْكُروا بِهِ
فَنَجّاهُ ذُو الطَّولِ الِالٰهِ مِنَ الْمَكْرِ
و بَاتَ رَسُولُ اللّٰهِ فى الْغار آمِناً
مُوَقّىً وفى حِفْظِ الالِهِ وَ فى سَتْرِ
وَ بِتُّ ارائيهمْ وَ لَمْ يَتّهَمُونَنى
و قَدْ وَطَنْتُ نَفْسى عَلَى الْقَتْلِ وَ الاَسْر

میں نے اپنی جان پر کھیل کر اس ہستی حفاظت کی ہے جو روئے زمین پر سب سے اعلیٰ اور اشرف انسان ہے وہی جس نے خانہ کعبہ اور حجر اسود کا طواف کیا۔ وہی رسول خدا کی ذات جو دشمنوں کی سازشوں کی وجہ سے پریشان تھے اور قادر مطلق نے انہیں دشمن کی مکروہ چالوں سے بچالیا۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غار میں امن وامان سے رات گزاری وہ اللہ کی حفاظت اور پناہ میں تھے۔ اور میں دشمنوں کا خیال رکھے ہوئے تھا انہیں یہ یقین نہیں تھا کہ میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جگہ پر سویا ہوا ہوں جب کہ وہ قتل کرنے اور اسیر کرنے کی غرض سے آئے تھے۔ [1]

مندرجہ بالا اشعار دیگر کتب میں بھی ذکر ہوئے ہیں، یہ اشعار جہاں علیؑ کے انتہائی ایثار اور جذبہ قربانی کی غمازی کررہے ہیں وہاں ان کے افتخار اور سربلندی کو بھی بیان کررہے ہیں۔

۷۔ مشہور مورخ طبری ہجرت کے واقعے کو یوں لکھتے ہیں: ''علی - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بستر پر سوئے ہوئے تھے دشمن نگرانی کررہے تھے اور ان کو سوتے ہوئے دیکھ رہے تھے جب کہ انہوں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چادر اپنے اوپر اوڑھ رکھی تھی وہ کہتے تھے! خدا کی قسم یہ وہی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں! یہاں تک کہ صبح ہوگئی، علیؑ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بستر سے اٹھے! طبری نے اس واقعے کو اس آیت: **''وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُثْبِتُوكَ''** (آیت نمبر ۲۰ سورہ انفال) کے ساتھ ذکر کیا ہے یہ آیت بھی واقعہ ہجرت سے متعلق ہے۔'' [2]

۸۔ ابن اثیر ''اسد الغابہ'' میں علیؑ کے فضائل کے باب میں ذکر کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجرت کا ارادہ فرمایا اور اپنے پاس موجود امانتوں کو لوٹانے اور قرض کی ادائیگی کے لیے آپؐ نے علیؑ کو مکہ میں ٹھہرایا، جس رات آنحضرتؐ مکے سے غار کی طرف گئے جبکہ کفار نے آپؐ کے گھر کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے تھا۔ آپؐ نے علیؑ کو اپنے بستر پر سونے کا حکم دیا، علیؑ نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چادر اپنے اوپر تان لی (اس کے بعد اس نے شب ہجرت کا قصہ اور جبرئیل اور میکائیل کو وحی الٰہی کو نقل کیا) آخر میں وہ لکھتے ہیں: اس کے

[1] مستدرک الصحیحین، جلد ۳، صفحہ ۴

[2] تاریخ طبری، جلد ۲، صفحہ ۱۰۰

بعد اللہ تعالیٰ نے اس آیت: "وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ" کو اپنے رسول پر نازل کیا اور آپ اُس وقت مدینے کی طرف رواں دواں تھے۔[1]

۹۔ احمد بن حنبل، اہل سنت کے چار مشہور اماموں میں سے ایک ہیں ان کی کتاب مسند بڑی مشہور کتاب ہے اس میں وہ اس آیت: "وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ ...." جس کا ترجمہ یہ ہے کہ یاد کریں جب کفار نے یہ منصوبہ بنایا تمہیں قید کریں یا قتل کردیں یا جلاوطن کردیں۔ وہ اپنی مکروہ چالیں چل رہے تھے اور اللہ تعالیٰ اپنی تدبیر کر رہا تھا اور اللہ تعالیٰ بہترین تدبیر کرنے والا ہے) کی تفسیر میں ابن عباس سے نقل کرتے ہیں کہ کفار مکہ نے آپس میں مشاورت کی بعض نے کہا انہیں صبح کے وقت دیکھیں گے اور قید کر کے زندان میں ڈال دیں گے (ان کی مراد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے) بعض نے کہا انہیں قتل کردیں اور بعض نے کہا انہیں شہر بدر کردیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس سازش سے آگاہ فرمایا۔ اس موقعہ پر علیؑ بستر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سوئے۔ (اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکے سے نکل گئے)[2]

امام احمد آیت "وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ" کی طرف کوئی اشارہ نہیں کرتے لیکن "و اذ یمکر بك الذین" پر جو کہ ہجرت کے واقعے کے متعلق ہے، بات کرتے ہیں۔

جو کچھ ذکر ہوا ہے روایات فقط اسی میں منحصر نہیں ہیں دیگر اہم ترین کتب میں بہت ساری روایات اس بارے میں منقول ہیں، مزید مطالعہ کے لیے ان کتب کو پڑھا جا سکتا ہے:

احقاق الحق[3] شواہد التنزیل[4] فضائل الخمسہ[5] الغدیر[6] اور تفسیر برھان[7]

☆☆☆☆

---

[1] اسد الغابہ، جلد ۴، ص ۲۵

[2] مسند احمد، جلد ۱، صفحہ ۳۴۸ (طبع دار صادق، بیروت)

[3] احقاق الحق، جلد ۳، صفحہ ۲۳ تا ۴۵، جلد ۶، صفحہ ۴۷۹ تا ۴۸۱، اور جلد ۸، صفحہ ۳۳۵، تا ۳۴۸، اور جلد ۱۴، صفحہ ۱۱۶ تا ۱۳۰

[4] شواہد التنزیل، جلد ۱، صفحہ ۹۶ کے بعد

[5] فضائل الخمسہ، جلد ۲، صفحہ ۳۴۵ کے بعد

[6] الغدیر، جلد ۲، صفحہ ۴۹ کے بعد

[7] تفسیر برھان، جلد ۱، صفحہ ۲۰۶ اور ۲۰۷

۴۔ آیت حکمت

سورہ بقرہ کی آیت ۲۶۹ میں ارشاد الٰہی ہے:

يُّؤْتِى الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِىَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ

اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے (جو اُس لائق ہوتا ہے) اُسے حکمت و دانائی عطا کرتا ہے اور جسے بھی حکمت و دانائی دی جائے اُسے کثیر خیر عطا کی گئی ہے۔

حاکم حسکانی شواہد التنزیل میں ربیع بن خیثم سے نقل کرتے ہیں کہ علیؑ کا نام اس کے سامنے لیا گیا تو اس نے کہا:

لَمْ اَرهُم يَجِدُونَ عَلَيْهِ فِي حُكْمِهِ وَ اللهُ تعالىٰ يَقُولُ وَ مَنْ يُؤتَ الحكمة فَقَدْ اُوتِىَ خَيْراً كثيراً

میں نے کسی کو نہیں پایا جو ان کے فیصلوں اور احکام پر اعتراض کرے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جس کو علم و دانائی دی گئی ہو اُسے خیر کثیر دی گئی ہے۔[1]

اسی کتاب میں بالکل اسی معنی و مفہوم یا اس سے قریب معنی کی چند احادیث اور بھی بیان ہوئی ہیں۔ وہ ابن عباس سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **مَنْ ارادَ اَنْ يَنْظُرَ اِلى ابراهيمَ فِي حِلْمِهِ وَ اِلى نوح فى حِكْمَتِهِ وَ اِلىٰ يُوسف فِي اِجْتِماعِهِ فَلْيَنْظُرِ اِلى عَلِيِّ بن ابى طالِبٍ**۔ یعنی: جو شخص ابراہیم کا حلم، نوح کی حکمت و دانائی اور یوسف کی انتظامی صلاحیتوں کو دیکھنا چاہتا ہے تو وہ علی ابن ابی طالب کو دیکھے۔[2]

ایک اور مقام پر ابوالحمراء سے نقل ہوا ہے کہ ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے کہ اتنے میں علیؑ ہماری طرف تشریف لائے، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "**مَنْ سَرَّهُ اَنْ يَنْظُرَ اِلى آدَمَ فِي عِلْمِهِ وَنُوحٍ فِي فَهْمِهِ وَاِبراهِيْمَ فى خُلَّتِهِ فَلْيَنْظُرْ اِلى عَلِيِّ بن ابى طالب**۔" یعنی: جو شخص اس بات پر خوش ہوتا ہے کہ وہ آدم کے علم کو، نوح کی فہم و فراست کو اور ابراہیم کو خلیل الٰہی ہونے میں دیکھے تو اُسے چاہیے کہ علی ابن ابی طالب کی طرف دیکھے (کیونکہ ان میں یہ تمام صفات اکٹھی ہوگئی ہیں)[3]

نیز عبداللہ ابن عباس سے ہی انہوں نے ایک اور حدیث نقل کی ہے کہ میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس تھا، کسی نے حضرت علیؑ کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **قُسِّمَتِ الحِكْمَةُ عَشَرَةَ اَجْزاءٍ فَاُعْطِىَ عَلِيٌّ تِسعَةَ اَجْزاءٍ**

---

[1] شواہد التنزیل، جلد ا، صفحہ ۱۰۷، حدیث ۱۵۰

[2] شواہد التنزیل، جلد ا، صفحہ ۱۰۶، حدیث ۱۴۷

[3] شواہد التنزیل، جلد ا، صفحہ ۷۹، حدیث ۱۱۶

وَ اُعۡطِیَ النَّاسُ جُزۡءً واحِدًا۔ یعنی: حکمت ودانائی کودس حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے،اس میں سے نو حصے علیؑ کو دیئے گئے ہیں اور ایک حصہ باقی تمام لوگوں کو دیا گیا ہے۔[1]

یہ الفاظ اچھی طرح واضح کرتے ہیں کہ امت اسلامی میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کوئی بھی علم و دانش اور حکمت ودانائی میں علیؑ کے پایے کا نہیں ہے۔ اور چونکہ امامت کا اہم ترین رکن علم وحکمت ہے لہٰذا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد امامت وخلافت کے لیے لائق ترین اور قابل ترین شخصیت علی ابن علی ابی طالب - تھے۔ صحیح ترمذی میں بھی منقول ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اَنَا دَارُ الۡحِکۡمَةِ وَعَلِیٌّ بَابُهَا

میں علم وحکمت کا گھر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہیں۔[2]

مسلم بات ہے کہ جو بھی گھر میں داخل ہونا چاہتا ہے تو اُسے دروازے سے ہی آنا پڑے گا، جس طرح قرآن مجید نے ہمیں حکم دیا ہے: ''وَ اْتُوا الۡبُیُوتَ مِنۡ اَبۡوَابِهَا یعنی: گھروں میں ان کے دروازوں سے آو۔'' (بقرہ/۱۸۹) بنابرایں جو شخص یہ چاہتا ہے کہ وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم وحکمت کے خزانوں تک رسائی حاصل کرے تو اُسے علیؑ کی خدمت میں آنا پڑے گا اور ان خزانوں کی چابی ان سے مانگنی پڑے گی۔

☆☆☆☆

---

[1] شواہد التنزیل، صفحہ ۱۰۵، حدیث ۱۴۶

[2] صحیح ترمذی، ج۵، ص ۶۳۷ (کتاب المناقب، بان مناقب علی بن ابی طالب، حدیث ۳۷۲۳)

۵۔سورہ ھل اَتی

سورہ ھل اَتی یادہرعلیؑ اوراہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فضلیت پرایک اوراہم دلیل اورسند ہے،اس سورت کے مفاہیم میں اور الفاظ میں غوروفکراوراس کےشان نزول میں تدبر بہت سارے حقائق سے پردہ اٹھادیتا ہے۔

یہ بات درست ہے کہ اس سورت کی آیات ایک کلی موضوع کو بیان کررہی ہیں لیکن اس کی سترہ آیات جو''اِنَّ الابرار یشرَبون مِنۡ کأسٍ کان مزاجھا کافورا'' سے شروع ہوتی ہیں اور بائیسویں آیت پرختم ہوتی ہیں،''ابرار'' (نیک افراد) کے بارے میں ہیں۔اس حوالے سے جوشان نزول بیان ہوئے ہیں، نیز اسلامی کتب میں متعدد روایات موجود ہیں،ان سب کے مطابق اس آیت میں ابرار کےاتم اوراکمل مصداق،حضرت علیؑ حضرت فاطمہؑ،حضرت حسن-اورحضرت حسین -ہیں۔

قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ ان سترہ آیات میں بہشت کی نعمتوں کی انواع واقسام،اس کی بہترین اوراعلیٰ ترین نعمتوں (خواہ وہ مادی ہوں یامعنوی) کا تذکرہ کیا گیاہے۔جنت کے باغات،شراب طہور کےبہشتی چشمے،لباس،زینتیں،غذائیں،پلنگ اورمسہریاں،نوکراورغلام اورعظیم نعمات اورعظیم سلطنت کی باتیں کی گئی ہیں۔ان نعمتوں کے درمیان صرف بہشتی بیویاں اورحوروں کا تذکرہ نہیں کیا گیا۔قران کے اسرارورموز سے واقف بعض افراد کا کہنا ہے کہ ایسا خاتون جنت حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کےاحترام کوملحوظ خاطررکھتے ہوئے کیا گیاہے۔

قرآن مجید کی بہت کم ایسی سورتیں ہیں جن میں اعلیٰ قسم کی ان تمام بہشتی نعمتوں کا ایک ساتھ ذکر ہوا ہو۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں''ابرار'' سے مراد عام افرادنہیں ہیں بلکہ اس سے مرادعظمت کی بلندیوں اورقرب الٰہی کی اعلیٰ منزل پرفائزنیک اور پاکیزہ افراد ہیں۔یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ اس سورہ کی آیت نمبر ۷ سے ۱۰ تک میں ان ابراراورنیک افراد کی صفات اورنشانیاں بیان کی گئی ہیں جن سے ان کی صورت حال اوربھی زیادہ واضح ہوجاتی ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

يُوفُونَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُونَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيرًا ۞ وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ۞ إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا ۞ إِنَّا نَخَافُ مِن رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوسًا قَمْطَرِيرًا ۞

نیکی کے مرتبے پرفائزافراد(ابرار)ایسامشروب پئیں گےجس میں کافورکی آمیزش ہوگی۔یہ ایسا چشمہ ہے جس سےاللہ کےخاص بندے پئیں گےاورخوداسے جہاں چاہیں گےجاری کردیں گے۔یہ لوگ نذرپوری کرتے ہیں اوراس دِن سے ڈرتے ہیں جس کی برائی ہرطرف پھیلی ہوگی اوراپنی خواہش اورضرورت کے باوجوداپنا کھانامسکین،یتیم اوراسیرکوکھلادیتے ہیں۔(اوروہ ان سے کہتے ہیں) ہم تمہیں صرف اللہ کے لیے کھاناکھلارہے ہیں؛ ہم تم سے نہ کوئی معاوضہ چاہتے ہیں اورنہ ہی شکرگزاری۔ہمیں تواپنے رب سے اس

دِن کا خوف ہے جو بڑا سخت اور شدید بدنظر ہوگا۔

شان نزول

زمخشری اپنی مشہور تفسیر کشاف میں ابن عباس سے یوں نقل کرتے ہیں کہ حسنؑ اور حسینؑ مریض تھے۔ رسول اکرمؐ اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ اصحاب نے حضرت علیؑ سے کہا: اے ابوالحسن! اگر اپنے بیٹوں کی شفایابی کے لیے نذر کر لیتے تو اچھا ہوتا، علیؑ، فاطمہؑ اور ان کی خادمہ فضہ نے نذر کی کہ اگر یہ شفا پا گئے تو ہم تین دن روزے رکھیں گے۔ (بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ امام حسن- اور امام حسین- نے بھی نذر کی تھی) [1]

دونوں بہت جلد شفایاب ہو گئے، چونکہ ان کے گھر میں خوراک نہیں تھی اس لیے علیؑ نے تین سیر جو قرضہ لیا۔ جناب فاطمہؑ نے ایک سیر کا آٹا گوندھا اور گھر والوں کی تعداد کے مطابق پہلے دن افطار کے لیے پانچ روٹیاں بنائیں، افطار کے موقعہ پر دروازے پر ایک فقیر نے آکر صدا لگائی اور کہا: السَّلامُ عَلَيْكُمْ اَهْلَ بَيْتِ مُحَمَّدٍ: میں ایک مسلمان مسکین ہوں مجھے کھانا کھلائیں اور اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ تمہیں بہشتی کھانے عطا کرے گا۔ انہوں نے مسکین کو اپنے پر ترجیح دی اور اپنا کھانا اٹھا کر مسکین کو دے دیا۔ اس رات پانی ہی سے روزہ افطار کیا، دوسرے دِن پھر روزہ رکھا، غروب کے وقت پہلے دِن کی طرح جب افطاری کے لیے کھانا آمادہ ہوا تو یتیم دروازے پر آ گیا، ان سب نے یتیم کو ترجیح دیتے ہوئے اپنا تمام کھانا یتیم کو دے دیا، تیسرے دِن ایک قیدی آ گیا اور انہوں نے سابقہ طرزِ عمل اپنایا، اگلی صبح کو حضرت علیؑ نے امام حسن -اور امام حسینؑ کو ساتھ لے کر حضور اکرم ﷺ کی خدمت آئے۔

رسول خدا ﷺ نے دیکھا کہ وہ بھوک کی شدت سے لرز رہے تھے آپؐ نے فرمایا: میرے لیے تمہیں اس حالت میں دیکھ کر کتنا تکلیف دہ امر ہے، آنحضرتؐ کھڑے ہوئے اور ان کے ساتھ فاطمہ زہرا ﷺ کے گھر تشریف لائے دیکھا کہ فاطمہؑ محراب عبادت میں مشغول عبادت ہیں لیکن بھوک کے آثار ان کے چہرے سے نمایاں ہیں۔ پیغمبر اکرم ﷺ سخت پریشان ہوئے۔ اتنے میں جبرئیل نازل ہوئے اور کہا: اے محمد ﷺ یہ سورت لے لو! اللہ تعالیٰ اس قسم کے تمہارے اہل بیت ہونے پر تمہیں مبارک باد دے رہا ہے پھر اُس نے سورہ اہل اتی آپؐ پر تلاوت کی۔ [2]

اسی بات کو تھوڑے سے فرق کے ساتھ قرطبی نے بھی اپنی تفسیر میں زیر بحث آیات کی تشریح کرتے ہوئے بیان کیا ہے، یہاں پر اس واقعے کے حوالے سے اُس نے سائلین اور خاتون جنت کے چند اشعار کا بھی ذکر کیا ہے۔ [3]

نیز فخر رازی نے اپنی تفسیر میں واحدی کتاب الوسیط سے اور زمخشری نے کشاف میں اس واقعہ کو من وعن نقل کیا ہے۔ آیت کی تفسیر کرتے ہوئے انہوں نے مزید لکھا ہے کہ ''اِنَّ الابرار یشربون۔۔۔'' کا جملہ جمع کی صورت میں آیا ہے اور تمام نیکیوں کو شامل ہے۔ لہٰذا

---

[1] امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی نذر کا تذکرہ قرطبی کے نقل کے مطابق جعفی کی روایت میں ہوا ہے۔ تفسیر قرطبی، جلد ۱۰، صفحہ ۶۹۲۲۔

[2] تفسیر کشاف، جلد ۴، صفحہ ۶۷۰، اس سورت کی آیات کی تفسیر میں۔

[3] تفسیر قرطبی، جلد ۱۰، صفحہ ۶۹۲۲۔

اس ایک فرد (علی ابن ابی طالب-) سے مختص نہیں کیا جاسکتا، البتہ اس بات سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا کہ علیؑ آیات کے عمومی مفہوم میں داخل ہیں لیکن یہ ان سے مختص نہیں کیا جاسکتا البتہ اس بات سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا کہ علیؑ ان آیات کے عمومی مفہوم میں داخل ہیں لیکن یہ ان سے مختص نہیں ہیں؛ مگر یہ کہا جائے گا کہ یہ سورہ علیؑ کی طرف سے مخصوص اطاعت انجام دینے کے موقعہ پر نازل ہوئی ہے۔لیکن اصول فقہ میں یہ بات ثابت شدہ ہے کہ معیار لفظ کا عام ہونا ہے نہ کہ سبب کا مخصوص ہونا۔[1]

شاید فخر رازی اس بات کو بھول گئے کہ شان نزول یہ بتا رہا ہے کہ یہ آیات علیؑ، فاطمہؑ، حسن-، حسین- کے بارے میں نازل ہوئی ہیں نہ کہ صرف علی ابن ابی طالب- کے لیے تا اینکہ صیغہ جمع کی مشکل پیش آئے۔علاوہ ازیں شان نزول سے مراد، آیت کے معنی کی عمومیت کو محدود کرنا ہرگز نہیں، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ پہلی بار یہ آیات اس وقت نازل ہوئیں جب اس خاندان کی طرف سے خصوصی عبادت، اطاعت اور ایثار انجام پایا اور یہ بذات خود بہت بڑا انعام اور عظیم فضلیت ہے کہ ان کے عمل انجام پانے کے بعد ان آیات کا نزول ہوا دوسرے الفاظ میں علیؑ اور ان کے گھر والے ان آیات کے اعلیٰ مصداق ہیں بلکہ ان کا کامل ترین نمونہ شمار ہوتے ہیں، کیونکہ ان کا پاکیزہ عمل ان آیات کے نزول کا موجب بنا ہے اگر کوئی اس عظیم فضلیت کا انکار کرنا چاہے تو اس نے اپنے آپ کو دھوکا دیا ہے۔

آلوسی نے بھی روح المعانی میں اس واقعے کو مکمل طور پر ابن عباسؓ سے بیان کیا ہے آخر میں اس نے اضافہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ واقعہ لوگوں کے درمیان مشہور ہے۔اس کے بعد جو اس کا طریقہ ہے اس نے کوشش کی ہے کہ اس کی اہمیت کو کم کرے اور اسے معمولی واقعہ ثابت کرئے۔ اس مقصد کے لیے کچھ مطالب کو بیان کرنے کے بعد وہ اس حدیث کی اسناد کے متعلق اپنی رائے بیان کرتا ہے۔ کہ اس بات کا احتمال ہے کہ یہ آیات علیؑ اور فاطمہؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہوں لیکن اس کا اثبات اور نفی کوئی بھی قطعی نہیں ہے کیونکہ اس بارے میں متضاد اور مختلف روائیتں موجود ہیں۔

بالفرض اگر ہم اس کے بھی قائل ہونا چاہیں کہ یہ آیات ان ہستیوں کی شان میں نازل نہیں ہوئیں تو پھر بھی ان کی فضلیت اور عظمت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی کیونکہ ان کا ابرار کے عنوان میں داخل ہونا بڑی واضح بات ہے، بلکہ دوسروں سے اولیٰ اور بہتر ہیں، انسان ان دو بڑی شخصیتوں کے متعلق کیا کہہ سکتا ہے سوائے اس کے کہ علیؑ مومنین کے مولا اور وصی رسول ہیں اور فاطمہؑ رسول اکرمؐ کا ٹکڑا اور محمد ﷺ کے وجود کا حصہ ہیں۔ حسنین ؑ جنت کے روح و ریحان اور جوانان جنت کے سردار ہیں لیکن اس کا معنی یہ نہیں کہ دوسروں کو چھوڑ دیا جائے۔[2]

لیکن ہمارا کہنا یہ ہے کہ اگر ہم اتنی مشہور اور معروف فضلیت کو نظر انداز کر دیں تو باقی فضائل بھی آہستہ آہستہ اسی صورتحال کا شکار ہو جائیں گے اور ایک دن ایسا آئے گا کہ علیؑ، خاتون جنت فاطمہ زہراؑ، امام حسین -اور امام حسین -کی فضلیت بھی سوال چلی جائے گی۔ ہم کیوں اس مشہور روایت کو نظر انداز کریں جسے بڑے بڑے محدثین اور مفسرین نے نقل کیا ہے جب کہ اس سے معارض اور متصادم ایسی

---

[1] تفسیر فخر رازی جلد ۳، صفحہ ۲۴۴

[2] روح المعانی، جلد ۲۹، صفحہ ۱۵۸۔

روایت بھی کوئی نہ ہو جو قابل توجہ ہو، اور اس طرح سے ہم اپنے او پر اسلام کی ان بزرگ ترین ہستیوں کی معرفت اور پہچان کا دروازہ کیوں بند کردیں؟!

اہل سنت کے ایک بڑے عالم سیوطی نے بھی تفسیر الدر المنثور میں ابن مردویہ کے ذریعے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ آیت ''ویُطْعِمُونَ الطَّعامَ علی حُبِہٖ.....'' علیؑ اور فاطمہ زہراؑ کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ شبلنجی [۱] نے اپنی کتاب نور البصار میں شان نزول کے واقعے کو پورے طور پر بیان کیا ہے اور اسی طرح دیگر بہت سارے مفسرین اور محدثین نے بھی اس واقعے کو اپنی کتب میں ذکر کیا ہے۔

سورہ ھل اَتیٰ اور شعراء

سورہ ھل اَتی (دھر) کا اہل بیتؑ کی شان میں نازل ہونا اس قدر واضح اور آشکار ہے کہ بہت سارے نامور اور مشہور شعراء نے اپنے اشعار میں اس بات کو بیان کیا ہے، ان میں سرفہرست امام محمد بن ادریس شافعی ہیں جن کے اشعار متعدد کتابوں میں مذکورہ ہیں وہ کہتے ہیں:

اِلیٰ مَ، اِلیٰ مَ وَ حَتّٰی مَتیٰ
اُعاتَبُ فی حُبِّ ھٰذا الفتیٰ
وَ ھَلْ زُوِّجَتْ فاطِمُ غَیْرَہُ
و فِی غَیْرِہ ھَل اَتیٰ ھَلْ اَتیٰ؟

کب تک، کب تک، اور کب تک مجھے اس جوان کی محبت پر ملامت کی جاتی رہی گی؟ کیا فاطمہ زہراؑ کی شادی حضرت علیؑ کے علاوہ کسی اور ہوئی اور کیا سورہ ھل اَتی کسی اور کی شان میں اتری؟[۲]

ابن بطریق جس کا تعلق چھٹی صدی ہجری کے علماٗ میں سے ہے وہ ''عمدۃ عیون صحاح الاخبار'' میں ابو ثعلبی سے نقل کرتے ہیں:

اَنَا مَولی لِفتیٰ
اُنْزِلَ فِیہ ھَل اَتی [۳]

میں تو اس جوانمرد کا غلام ہوں جس کی شان میں سورہ ھل اَتی نازل ہوئی ہے۔

---

[۱] نور الابصار، صفحہ ۶۲

[۲] احقاق الحق، جلد ۳، صفحہ ۱۵۸ و علی من الکتاب والسنہ، جلد ۱، صفحہ ۴۴۷

[۳] عمدۃ عیون صحاح الاخبار، صفحہ ۳۴۹ (طبع جامعۃ المدرسین)

نیز محمد بن طلحہ شافعی (ساتویں صدی ہجری کے عالم) اپنی کتاب مطالب السؤال میں اہل بیت کی مدح سرائی کرتے ہوئے کہتے ہیں:

هُمُ العُرْوَةُ الْوُثْقٰى لِمُعْتَصِمٍ بِهَا
مُنَاقِبُهُمْ جَائَتْ بِوَحْيٍ وَ اِنْزَالِ
مَنَاقِبُ فِى الشُورىٰ وَ سُورَةُ هَلْ اَتیٰ
وَ فِي سُوَرَةِ الاحزابِ يَعْرِفُهَا التالى

(اہل بیت) مضبوط اور محکم سہارا ہیں ہر اس شخص کے لیے جو ان کے دامن کو تھام لے ان کے فضائل قرآنی وحی میں آئے ہیں ان کے مناقب اور فضائل سورہ شوریٰ، سورہ ھل اتی میں مذکورہ ہیں اور سورہ احزاب میں بھی ان کے فضائل موجود ہیں ہر قاری قرآن ان سے آگاہ ہے۔[1]

اس خاندان عترت وطہارت کے سورہ شوریٰ میں فضائل سے مقصود وہی آیت ''قُلْ لا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْراً اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى'' (آیت نمبر ۲۲) ہے۔ اور سورہ احزاب میں مقصود اس کی آیت نمبر ۳۳ ہے یعنی ''اِنَّمَا يُرِيدُ اللهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ'' اور سورہ ھل اتی کی بات تو معلوم ہے۔ نیز اس بارے میں بہت سارے دیگر اشعار بھی ہیں جو طلائع ابن، رزیک (ابوالغارات) سے نقل ہوئے ہیں۔[2]

سورہ دھر (ھل اتی) کے حوالے سے اعتراضات

اہل سنت برادران کی تفسیر حدیث اور تاریخ کی کتب سے ہر آگاہ شخص اچھی طرح سے جانتا ہے کہ جہاں بھی علی ابن ابیطالب۔ اور اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فضلیت کی بات آتی ہے تو بعض متعصب افراد ہر طرف سے اس پر اعتراضات کی بوچھاڑ کر دیتے ہیں۔ حتی المقدور ان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ اس حدیث کی سند، متن اور دلالت پر اعتراض کر کے اُسے مشکوک بنا دیں اور اس کی اہمیت کو گھٹا دیں اگر چہ وہ اعتراض بے بنیاد اور غیر معقول ہی کیوں نہ ہو۔ گویا انہوں نے ان فضائل کو قبول نہ کرنے کا پختہ عہد کر رکھا ہے اگر وہ انہیں تسلیم کریں تو پھر ان کے پہلے سے طے شدہ افکار کے منافی ہے۔

تفسیر روح المعانی، تفسیر کبیر اور المنار جیسی کتب کا مطالعہ اس بات پر گواہی دیتا ہے کہ ان کے اعتقادات ہر مقام پر ان احادیث کے قبول اور تسلیم کرنے میں رکاوٹ اور مانع ہیں حتی کہ بعض اوقات انسان ان احادیث پر کیے گئے اعتراضات کی کمزوری اور نا معقولیت سے حیران ہو جاتا ہے۔

---

[1] مطالب السؤال، صفحہ ۸ (الغدیر جلد ۳، صفحہ ۱۰۹ کے مطابق)

[2] کتاب علی فی الکتاب والسنۃ، جلد ۱، صفحہ ۲۴۷، کا مطالعہ کریں۔

جب کہ دوسروں کے فضائل کے حوالے ان کا رویہ یہ رہتا ہے کہ جو بھی نقل ہوا اُسے آنکھیں بند کر کے قبول کر لیتے ہیں اگر چہ ان کے نقائص اور خامیوں روز روشن کی طرح عیاں ہی کیوں نہ ہوں، لیکن اس سب کچھ کے باوجود بہت سے فضائل تنقید اور اعتراضات کے خنجر سے بچ گئے ہیں اور وہی حقیقت کو سمجھنے کے لیے کافی ہیں۔ یہاں ضروری ہے کہ ان اعتراضات میں سے بعض کو ضبط تحریر میں لایا جائے:

ا۔ یہ فضلیت اس صورت میں درست ہے جب یہ سورہ مدینے میں اور امام حسن -اور امام حسین -کی ولادت کے بعد نازل ہوئی ہو (مشہور یہ ہے کہ امام حسن -ہجرت کے تیسرے سال اور امام حسین -ہجرت کے چوتھے سال دنیا میں تشریف لائے) جب کہ بہت سے افراد کا نظریہ ہے کہ یہ سورہ مکی ہے پس یہ سورہ اپنے شان نزول سے مربوط نہیں ہے۔ لیکن اہل سنت کے مشہور مفسر اور عالم قرطبی کی رائے کے مطابق یہ سورت مدینے میں نازل ہوئی ہے: (وقال الجمهور مدنية)[1]

نیز اکابرین کے ایک بڑے گروہ کا یہی نظریہ ہے، جیسے: حاکم حسکانی نے اس سورت کو مدنی سورتوں میں شمار کیا ہے جو کہ سورہ رحمن کے بعد اور سورہ طلاق سے پہلے نازل ہوئی ہے۔ قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ موصوف نے اس بارے میں آٹھ روایات نقل کی ہیں جن میں تصریح کی گئی ہے کہ سورہ ''هل اتى'' مدنی سورت ہے، ان روایات میں سے بعض ابن عباس سے، بعض عکرمہ اور حسن سے اور کچھ دوسرے افراد سے منقول ہیں۔ وہ اپنے بعض جملات میں لکھتے ہیں کہ بعض دشمنان اہل بیتؑ نے اس واقعہ (سورہ دھر کے شان نزول) پر اعتراض کیا ہے کہ تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی ہے حالانکہ اس واقعہ کا تعلق مدینہ سے ہے۔ وہ مزید لکھتے ہیں یہ لوگ کس طرح تمام علمائے تفسیر کے اتفاق کا دعویٰ کرتے ہیں حالانکہ ان کی اکثریت اس کے برعکس نظریہ رکھتی ہے اور سورت کو مدنی سمجھتی ہے۔[2]

ابوعبداللہ زنجانی نے ''تاریخ القرآن'' میں دو کتابوں ''نظم الدرر'' اور ''تناسخ الایات والسور'' میں سے اہل سنت کے اکابرین کے اقوال نقل کیے ہیں جن کے مطابق سورہ دھر (هل اتی) مدنی سورتوں میں سے ہے۔[3] الدر المنثور کے مؤلف جلال الدین سیوطی نے بھی اسی بات کو ابن عباس سے مختلف طرق سے بیان کیا ہے۔ سیوطی نے ہی اپنی ایک اور کتاب ''الاتقان'' میں بیہقی کی دلائل النبوۃ سے نقل کیا ہے کہ سورہ ''هل اَتی'' مدینے میں نازل ہوئی ہے اور بیہقی نے اسے عکرمہ سے بیان کیا ہے۔[4]

اس کے علاوہ وہ تمام علماء جن کے مطابق اس سورت کا شان نزول علیؑ، فاطمہؑ حسن-، حسین- ہیں (ان کی تعداد کافی زیادہ ہے پچھلے صفحات میں ان کا تذکرہ ہو چکا ہے) ان سب کا نظریہ یہی ہے کہ یہ سورہ مدنی ہے۔ بالفرض اگر ہم مان بھی لیں کہ یہ اس سورت کی کچھ آیات مکہ میں نازل ہوئی ہوں لیکن علیؑ اور ان کے گھر والوں کی نذر سے مربوط آیات مدینہ میں نازل ہوئی ہوں اور اس میں کوئی مانع نہیں ہے کہ سورہ کا ایک حصہ مکی اور کچھ آیات مدنی ہوں۔ اسی وجہ سے تفسیر روح البیان کے مصنف (بُرسوئی حنفی) بعض اکابر علماء کے اقوال کہ

---

[1] تفسیر قرطبی، جلد ۱۰، صفحہ ۶۹۰۹

[2] شواہد التنزیل، جلد ۲، صفحہ ۳۱۵-۳۱۰

[3] تاریخ القرآن، صفحہ ۵۵

[4] تفسیر المیزان، جلد ۲۰، صفحہ ۲۲۱۔

سورہ ''ھل اتٰی'' مدنی ہے، نقل کرنے کے بعد ان علماء کے اقوال کو بیان کرتے ہیں جن کے بقول اس سورہ کی بعض آیات مکی اور کچھ آیات مدنی ہیں۔اس کے بعد وہ کہتے ہیں: اس بنا پر آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ سورہ مکی ہے اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ مدنی ہے لیکن بہرصورت اس میں مدنی آیات کی تعداد مکی آیات سے زیادہ ہے۔لہٰذا ظاہر یہی ہوتا ہے کہ ہمیں اس سورہ کو مدنی کا نام دینا چاہیے، اور کوئی بھی صورت ہو ہمیں اس سورہ کے شان نزول کے حوالے سے نقل ہونے والے واقعے کی صحت میں کوئی شک نہیں ہے۔[1]

مذکورہ مفسر اور دیگر علماء نے اس سورہ کے مدنی ہونے پر جو دلائل اور نکات بیان کیے ہیں ان میں ایک لفظ ''اسیر'' ہے جو اس سورہ میں استعمال ہوا ہے، ہمیں معلوم ہے کہ مکہ میں ''اسیر'' کا تصور ہی نہیں تھا کیونکہ اسیر اور اسارت کے مسائل تو مدینے میں حکم جہاد کے نزول کے بعد پیش آئے تھے۔روح البیان کے مصنف اس بارے میں یوں لکھتے ہیں:

دلّ علیٰ ذٰلِكَ اِنَّ الاَسِيْرَ اِنَّمَا كَانَ فِي المدِينَةِ بَعْدَ آيَةَ القِتَالِ و الاَمْرِ بِالجِهَادِ

ان آیات کے مدنی ہونے کی دلیل لفظ ''اسیر'' ہے کیونکہ مدینے میں اسیر، آیت جنگ اور حکم جہاد کے بعد پائے جاتے تھے۔[2]

تعجب تو اس بات پر ہوتا ہے کہ اپنی ضد پر اڑے ہوئے متعصب افراد جو کسی صورت میں ولایت وخلافت کے متعلق اپنے نظریے کو چھوڑنے کو تیار نہیں ہیں، انہوں نے لفظ ''اسیر'' کی کیسی مضحکہ خیز تشریحات کی ہیں جو حقیقت کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوسکتی ہیں۔کبھی انہوں نے کہا اسیر سے مراد وہ ہے جو اپنی بیوی کا اسیر ہو یا وہ ہے جو قرضے کے بوجھ تلے دبا ہوا ہو یعنی قرضے کا اسیر وغیرہ وغیرہ۔[3] ان سے پوچھا جائے کہ جب اسیر کا حقیقی معنی یہاں پر لیا جاسکتا ہے تو پھر مجازی اور غیر حقیقی معنوں کے پیچھے جانے کی کیا ضرورت ہے؟ اور کیوں؟

۲۔آیت کے الفاظ عام ہیں انہیں خاص افراد میں منحصر کیسے کیا جاسکتا ہے؟

جیسا کہ کئی بار یہ بات کہی گئی ہے کہ آیات کے مفہوم اور معنی کی عمومیت ہرگز کسی خاص شان نزول کے منافی نہیں ہے اور یہ چیز قرآن مجید کی اور بہت سی آیات میں دکھائی دیتی ہے کہ آیت کا معنی اور مفہوم تو عام ہے لیکن اس کا شان نزول جو کہ اس کا اتم اور اکمل مصداق ہے وہ ایک خاص مورد ہے۔حیرانی کی بات تو یہ ہے کہ دیگر آیات قرآنی اور ان کے شان نزول کے بارے میں آیت میں مفہوم کی عمومیت کو اس کے شان نزول کی نفی پر کوئی دلیل نہیں بناتا لیکن یہاں پر مسئلہ الٹ ہوجاتا ہے۔

۳۔ایک اور بہانہ اور اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ انسان تین دن بھوکا رہے اور صرف پانی سے افطار کرے؟

یہ بھی عجیب وغریب بہانہ ہے (فضلیت سے انکار کا) وہ اس لیے کہ ہم نے اپنی زندگی میں ایسے بہت سے افراد کو دیکھا ہے کہ

---

[1] روح البیان، جلد ۱۰، صفحہ ۲۶۹۔

[2] روح البیان، جلد ۱۰، صفحہ ۲۶۹۔

[3] بحر المحیط، جلد ۸، صفحہ ۳۹۵ پر یہ اقوال بعض مفسرین سے بیان ہوئے ہیں، لیکن اس کتاب کے مصنف ابوحیان اندلسی نے خود اسیر کا معنی کفار کو جو قیدی بنایا جاتا تھا، وہ اسیر مراد لیا ہے۔

اپنے طبی علاج کے لیے تین دن تو کیا، دس دن بیس دن بلکہ کبھی چالیس دن تک بھوکے رہتے ہیں یعنی چالیس دن صرف پانی پیتے ہیں اور کچھ نہیں کھاتے (جوس اور چائے وغیرہ بھی نہیں پیتے) بعض اطباء جو بیماریوں کا علاج پرہیز اور بھوک کے ذریعے کرتے ہیں۔ان کے نظریے کے مطابق بھوکا رہنا بہت ساری بیماریوں کا علاج ہے۔یہاں تک کہ ایک غیر مسلم ڈاکٹر، بنام''آلکسی سوفورین'' نے چالیس دِن بھوک سے علاج پر ایک کتاب لکھی ہے جس میں اس سے اس کے فوایداور اس کا مفصل طریقہ کار بتایا ہے۔[1]

اسی تفسیر پیام قرآن کے بعض مصنفین نے بعض بیماریوں کے علاج کے لیے مذکورہ طریقے سے بھوکے رہنے کو بیس دن سے زیادہ تک جاری رکھا ہے اور عملی طور پر انجام دیا ہے۔موجودہ دور میں بھوک ہڑتال جو کہ ایک طرح کا ''پانی کا روزہ'' ہے، رائج ہے اور کبھی چالیس دن سے بھی بڑھ جاتی ہے۔تو پھر کیا مشکل ہے کہ یہ بہانہ تراش لوگ تین دن کے روزے اور پانی سے افطار کرنے پر اظہار تعجب کرتے ہیں؟ اس سے تو یہ لگتا ہے کہ ان کا صرف ایک ہی ہدف ہے کہ جیسے بھی ممکن ہو اس عظیم فضلیت کو خراب کر دیں۔

[1] اس کتاب کا عربی میں ترجمہ ہو چکا ہے اور اس کا نام ''التطیب بالصوم'' ہے اس کا فارسی میں بھی ترجمہ ہوا ہے، جس کا نام ہے: ''بیماریوں کے علاج کا جدید طریقہ، روزہ''

٦۔آیات برأت

سورہ توبہ میں دومقامات پر چند آیات نازل ہوئی ہیں ان کے شأن نزول اوران روایات کے پیش نظر جواکثر مفسرین، محدثین اورمورخین نےنقل کی ہیں، ان میں علیؑ کے لیے بہت بڑی فضیلتیں موجود ہیں۔ان دومقامات میں سے پہلا مقام اس سورت کی ابتدائی آیات ہیں جن میں عہد شکن مشرکین کے ساتھ اعلان جنگ کیا گیاہے۔

تقریباً تمام مفسرین اورمورخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ہجرت کے نویں سال جب یہ آیات نازل ہوئیں اورمشرکین کے ایک گروہ نے مسلمانوں کے ساتھ کیے گئے معاہدوں کوتوڑ دیا تو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکر کواس فرمان کو پہچانے کے لیے منتخب کیا تاکہ وہ حج کے موقعہ پر مکہ میں عام لوگوں کے درمیان اس کا اعلان کردیں۔لیکن ابھی وہ راستے میں ہی تھے کہ یہ آیات ان سے واپس لے کرعلیؑ کے حوالے کی گئیں اوران کے پہنچانے کی ذمہ داری انہیں سونپ دی گئی اورانہوں نے حج کے دوران تمام لوگوں تک یہ پیغام پہنچا دیا۔اگرچہ اس کی جزئیات اورفرعی باتوں میں محدثین، مفسرین اورمورخین کے درمیان اختلاف نظر پایا جاتا ہے۔(لیکن اصل واقعہ میں اتفاق نظر موجود ہے)

یہاں پراس واقعے کےعنوان سے چندروایات کا تذکرہ کیا جاتا ہے:

ا۔اہل سنت کے بہت بڑے امام احمد بن حنبل اپنی کتاب ''مسند'' جوکہ حدیث کی اہم ترین کتاب ہے، میں یوں کہتے ہیں:''رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکر کوسورہ برائت دے کر مکہ مکرمہ کی طرف روانہ کیا تاکہ وہ یہ اعلان کریں کہ اس سال کے بعد کسی مشرک کوحج کرنے کا حق نہیں ہے،کوئی بھی عریاں اور برہنہ حالت میں طواف خانہ خدانہ کرئے۔پھر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علیؑ کوحکم دیا تم ابوبکر کے پاس (مکہ ومدینے کے درمیان راستے میں) جاؤ اورانہیں میرے پاس واپس بھیج دو اورسورہ برائت کوتم جا کر پہنچاؤ۔'' علیؑ نے حکم کی تعمیل کی۔حدیث کے آخر میں آیا ہے کہ جب ابوبکر نے پوچھا کہ کیا میرے خلاف کوئی حکم تو نازل نہیں ہوا کہ میں سورۃ برائت کوابلاغ نہ کروں تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اُمِرْتُ اَنْ لَایُبَلِّغَهُ اِلَّا اَنَا اَوْ رَجُلٌ مِنِّی

''مجھے حکم دیا گیاہے کہ اس سورت کومیں خود پہنچاؤں یا جو مجھ سے ہووہ ابلاغ کرئے۔''[1]

ترمذی نے اپنی کتاب سنن جس کا تعلق صحاح الستہ سے ہے، میں اسی حدیث کودوسرے الفاظ میں تفسیر القرآن کی بحث میں انس بن مالک سے نقل کیا ہے کہ آنحضرتؐ نے ابوبکر کوسورہ برائت دے کر بھیجا پھران کوواپس بلالیا اورفرمایا:

لَایَنْبَغِی لِاَحَدٍ اَنْ یَبَلِّغَ هذا اِلاَّ رَجُلٌ مِنْ اَهْلِی فَدَعا عَلِیًّا فَاَعْطاهُ اِیَّاه

---

[1] مسند احمد، جلداول۔صفحہ ۳(مطبوعہ دارالصادق)

کسی کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اس سورت کو پہنچائے؛ مگر وہ شخص جو میرے خاندان سے ہو۔ پھر آپؐ نے علیؑ کو بلایا اور سورت ان کے سپرد کی۔"[1]

اس کے بعد ترمذی ایک اور حدیث ابن عباس سے اسی موضوع پر بیان کرتے ہیں اور پہلی حدیث سے زیادہ مفصل اور مشروح بیان کرتے ہیں۔[2] اور قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ دونوں حدیثوں کے اختتام پر اپنا یا دوسروں کا قول ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں: "ھذا حدیث حسن غریب۔" یعنی: یہ حدیث حسن اور غریب ہے۔ لیکن اس قسم کے الفاظ نہ وہ اس سے پہلے والی حدیث کے بارے میں کہتے ہیں اور نہ ہی ان کے بعد والی حدیث کے بارے میں اور بذات خود یہ عجیب بات ہے گویا ان کی نظروں میں ہر وہ حدیث غریب ہے جو علیؑ کی غیر معمولی فضلیت کو بیان کرے۔

۲۔ جلال الدین سیوطی الدر المنثور میں عبداللہ بن احمد بن حنبل اور ابن مردویہ کے ذریعے علیؑ سے بیان کرتے ہیں کہ جب سورہ برائت کی ابتدائی دس آیات پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئیں تو آنحضرتؐ نے حضرت ابوبکر بلایا اور انہیں اہل مکہ تک پہنچانے کے لیے ان آیات کو ان کے سپرد کیا۔ اس کے بعد آنحضرتؐ نے مجھے بلایا اور حکم دیا کہ جلدی سے ابوبکر سے جا ملو، جہاں بھی اُن سے ملاقات کرو، پیغام کو ان سے لے لو۔ (اور آپ ان آیات کو لوگوں کے سامنے جا کر پڑھو) ابوبکر واپس آ گئے اور پوچھنے لگے: اے اللہ کے رسول! کیا میرے بارے میں کوئی حکم نازل ہوا ہے؟ (کہ جس کی وجہ سے میں اس ذمہ داری کو انجام دینے کے قابل نہیں رہا؟) پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: نہیں! لیکن جبرئیل امین میرے پاس آئے اور کہا کہ اس پیغام کو آپ میں سے کسی مرد کے سوا کوئی نہیں پہنچائے گا۔[3]

۳۔ مذکورہ کتاب میں احمد سے، ترمذی سے اور نیز ابن مردویہ کے ذریعے "انس" سے منقول ہے کہ آنحضرتؐ نے برائت والی آیات حضرت ابوبکر کو دے کر بھیجا پھر انہیں واپس بلوا لیا اور فرمایا:

لاینبغی لِاَحدٍ ان یُبَلِّغَ ھذا اِلَّا رَجُلٌ مِنْ اَھْلِی، فَدَعا عَلِیاً فَاَعطاہُ اِیّاہ

اعلان برائت کی ذمہ داری میرے یا میرے خاندان میں سے کسی شخص کے علاوہ کسی اور کے لیے انجام دینا سزاوار نہیں ہے، اس کے بعد آنحضرتؐ نے علیؑ کو بلوایا اور آیات برایت ان کے سپرد کیں۔[4]

۴۔ درمنثور میں ہی سعد بن ابی وقاص نقل کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوبکر کو برائت والی آیات دے کر مکہ روانہ کیا۔ پھر علی-کو ان کے پیچھے بھیجا تا کہ ان سے یہ آیات واپس لیں۔ ابوبکر اس کی وجہ سے دل میں ناراض ہو گئے اور اس کا اظہار حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے

---

[1] سنن ترمذی جلد ۵، صفحہ ۲۷۵ (حدیث نمبر ۳۰۹۰)

[2] سنن ترمذی جلد ۵، صفحہ ۲۷۵ (حدیث نمبر ۳۰۹۱)

[3] الدر المنثور جلد ۳، صفحہ ۲۰۹

[4] الدر المنثور جلد ۳، صفحہ ۲۰۹

کیا۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اِنَّہُ لا یُؤَدِّی عَنِّی اِلَّا اَنَا اَوْ رَجُلٌ مِنِّی

اعلان برائت کی ذمہ داری یا تو میں بذات خود انجام دوں یا ایسا شخص جو مجھ سے ہو۔[1]

۵۔ نیز اسی کتاب میں مشہور صحابی ابوسعید خدری بیان کرتے ہیں کہ پہلے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوبکر کو بھیجا کہ وہ ان کی طرف سے آیات برائت کا اعلان کریں جب انہیں روانہ کر چکے تو علیؑ کو ان کے پیچھے بھیجا اور ان سے فرمایا کہ ان آیات کی تبلیغ کی ذمہ داری یا میں بذات خود انجام دوں یا پھر تم، اس کے بعد انہیں اپنے مخصوص اونٹ پر سوار کیا، علیؑ روانہ ہوئے اور ابوبکر سے جا ملے اور ان سے آیات برائت لے لیں۔ حضرت ابوبکر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں ڈرتے ہوئے آئے کہ مبادا کوئی چیز ان کی مذمت میں نازل ہوئی ہو اور جب انہوں نے پوچھا تو وہی سابقہ جواب سنا۔[2]

۶۔ درمنثور میں ہی صحابی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابورافع، آنحضرتؐ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوبکر کو سورہ برائت کی آیات دے کر حج کے لیے روانہ کیا، جبرئیل تشریف لائے اور کہا: ''اِنَّہُ لَنْ یُؤَدِّیَھَا عَنْکَ اِلَّا اَنْتَ اَوْ رَجُلٌ مِنْکَ۔'' یعنی: ''اعلان برائت کی اس ذمہ داری کو یا تو آپ خود بنفس نفیس انجام دیں یا ایسا شخص جو آپ سے ہو۔'' چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علیؑ کو ان کے پیچھے بھیجا۔ علیؑ مکہ اور مدینے کے درمیان ان سے جا ملے، ان سے آیات لے کر حج کے ایام میں لوگوں کے درمیان ان کا اعلان کر دیا۔[3]

۷۔ ۱۸: حاکم حسکانی نے اسی موضوع پر شواہد التنزیل میں بارہ احادیث نقل کی ہیں جو اس نے انس بن مالک، ابن عباس، ابوسعید خدری اور ابوھریرہ وغیرہ سے بیان کی ہیں، ان سب کا ذکر کرنا بحث کے طویل ہونے کا باعث بنے گا لہٰذا مزید تحقیق کا شوق رکھنے والے افراد مذکورہ کتاب جو کہ عام لوگوں کی دسترس میں ہے، کا مطالعہ کریں۔[4]

ان کے علاوہ دیگر بہت سارے محدثین نے اس حدیث کو مختلف حوالوں سے بیان کیا ہے۔ اس حدیث کے راویوں کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ علامہ امینی مرحوم کہتے ہیں کہ یہ حدیث متواتر ہے بلکہ بعض کے نزدیک تو حد تواتر سے بھی بڑھ کر ہے، اس کے بعد انہوں نے اہل سنت کے ۳۷ علماء کے نام ذکر کیے ہیں جنہوں نے اس حدیث کو اپنی اپنی کتابوں میں اسناد کے ساتھ مفصل طور پر نقل کیا ہے۔[5]

وہ مزید لکھتے ہیں ان احادیث کی اسناد جن راویوں پر جا کر ختم ہوتیں ہیں وہ سب کے سب صحابہ کرام ہیں جن میں یہ شخصیات قابل ذکر ہیں، علیؑ، ابوبکر، ابن عباس، جابر بن عبداللہ انصاری، انس بن مالک، ابوسعید خدری، سعد بن ابی وقاص، ابوھریرہ،

---

[1] الدرالمنثور جلد ۳، صفحہ ۲۰۹

[2] الدرالمنثور جلد ۳، صفحہ ۲۳۰ (کچھ اختصار کے ساتھ)

[3] الدرالمنثور جلد ۳، صفحہ ۲۰۹

[4] شواہد التنزیل، جلد ۱ صفحہ ۲۳۲ تا ۲۴۳ (حدیث نمبر ۳۰۹ تا ۳۱۲، ۳۱۴، ۳۱۸ تا ۳۱۸، ۳۲۳ تا ۳۲۵)

[5] ان افراد کے نام جاننے کیلئے دیکھیے، الغدیر جلد ۶ صفحہ ۳۴۱ تا ۳۸۸۔

عبداللہ بن عمر، حبش بن جنادہ، عمران بن حصین، اور ابوذر غفاری۔[1]

اس گفتگو کو آٹھویں صدی ہجری کے نامور شاعر شمس الدین مالکی کے اشعار پر ختم کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے:

وَ اَرۡسَلَهُ عَنۡهُ الرَّ سُولُ مُبَلِّغًا
و خَصَّ بِهٰذَا الۡاَمۡرِ تخصيصَ مُفۡرَدِ
و قَالَ هَلِ التَّبليغُ عَنِّیۡ يَنۡبَغی
لِمَنۡ لَيۡسَ بَيۡتی مِنَ الۡقَومِ فاقۡتَدِی

''رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں مبلغ بنا کے بھیجا اور فقط انہیں اس ذمہ داری کے لیے مختص کیا اور فرمایا: کیا میری طرف سے اس کی تبلیغ کے لیے میرے خاندان کے علاوہ کوئی اور لیاقت رکھتا ہے کہ میں اس کی پیروی کروں؟''[2]

نتیجہ

یہ حدیث اپنے ماخذ اور اسناد کے لحاظ سے اس قدر وسعت اور پھیلاؤ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد تمام لوگوں سے علیؑ کی برتری اور فضلیت پر واضح اور بین دلیل ہے اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ کو علیؑ پر مکمل اعتماد تھا اور انہیں بارگاہ الٰہی میں قرب کا اعلیٰ مقام حاصل تھا کیونکہ حدیث واشگاف الفاظ میں کہہ رہی ہے کہ جبرئیل امین خدا کی طرف سے یہ پیغام اور حکم لے کر آئے تھے کہ ان آیات کی تبلیغ کی ذمہ داری علیؑ کے ذریعے انجام پائے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''یہ میرا کام ہے یا اس شخص کا کام ہے جو مجھ سے ہو، اور صرف علیؑ اس کام کو انجام دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔''

یہ بات بڑی قابل توجہ ہے کہ مشرکین سے عہد و پیمان کے خاتمے کا اعلان اسلام کی تاریخ کا حساس ترین مرحلہ تھا اور مخالفین کی طرف سے حج کے مراسم میں سخت قسم کے ردعمل کا امکان بھی تھا، ایسی صورت حال غیر معمولی بصیرت، تدبیر اور اعلیٰ شجاعت کا تقاضا کر رہی تھی اس اہم امر کے لیے علیؑ کا انتخاب اس بات پر بہترین دلیل ہے کہ امت میں سے وہ سب سے زیادہ آگاہ بصیر، مدبر اور شجاع فرد تھے، جس کا انتخاب اس اہم ذمہ داری کے لیے کیا گیا یقیناً وہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانشینی اور خلافت کے لیے امت کے تمام افراد سے زیادہ قابل لائق اور مناسب شخص تھے۔

اس میں ایک اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ خود حضرت ابوبکر نے بھی اس چیز کو محسوس کیا اور جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں واپس آئے تو پریشان ہو کر پوچھا کیا میرے بارے میں کوئی چیز نازل ہوئی ہے؟ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب میں فرمایا: ''یہ ذمہ داری میرے

---

[1] الغدیر، جلد ۶، صفحات ۳۴۱، ۳۴۸۔

[2] الغدیر جلد ۶ صفحہ ۳۳۸۔

قریبی ترین افراد میں سے کسی کو انجام دینی چاہیے تھی' یہاں پر بھی بہانے تلاش کرنے والے افراد اپنے طے شدہ عقیدے اور فکر کی بنا پر اس فضلیت کو گھٹانے اور اِسے معمولی چیز ثابت کرنے کے لیے پوری کوشش کرتے ہوئے نظر آئے ہیں اور کمزور قسم کی تاویلیں کرتے ہوئے نہایت سادگی سے اس مسئلہ سے گزر گئے ہیں۔

مثال کے طور پر روح المعانی میں جب آلوسی اس حدیث کو ذکر کرتے ہیں تو لکھتے ہیں کہ یہ روایت بطور خلاصہ علیؑ کی فضلیت اوران کے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ قرب پر دلالت کرتی ہے اور کوئی بھی مومن اس کا انکار نہیں کرتا لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ خلافت کے مسئلہ میں ابوبکر سے زیادہ اہل اور لائق تھے، وہ مزید لکھتے ہیں:

اس حوالے سے بعض اہل سنت نے یہ نکتہ ذکر کیا ہے کہ اس موقعہ پر حضرت ابوبکر کو امیر الحاج مقرر کیا گیا تھا اور علیؑ کو مشرکین کے ساتھ عہد و پیمان کے ختم ہونے کے بارے میں آیات برائت کے اعلان کی ذمہ داری دی گئی تھی، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ابوبکر رحمت اور جمال کی صفات کے مظہر تھے۔لہٰذا آنحضرتؐ نے مسلمانوں کے امور میں رحمت والے امر کو ان کے سپرد کیا تھا،لیکن چونکہ علی اسد اللہ اور خدا کے جلال کے مظہر تھے اس لیے کافروں سے عہد و پیمان کو توڑنے کا اعلان جو اللہ کے جلال اور صفات قہر کا نمونہ تھا،ان کے حوالے کیا گیا اور یہ دونوں شخصیت ابلتے ہوئے چشموں کی طرح تھیں ایک سے صفت جمال پھوٹ رہی تھی اور دوسرے سے صفت جلال۔اس بات کو ذکر کرنے کے بعد وہ کہتے ہیں: یہ تحلیل بہت اچھی ہے اگر وہ وجہ نہ ہوتی جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان فرمائی تھی (کہ میں یا میرا خاص الخاص فرد اس کام کو انجام دے) [1]

جس طرح آلوسی نے آخر میں بات کہی ہے کہ یہ تشریح اور تحلیل (شاعرانہ) جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان سے ہم آہنگ اور مناسبت نہیں رکھتی کیونکہ آنحضرتؐ نے واضح طور پر کہا ہے کہ جبرئیل اللہ کی طرف سے میرے لیے حکم لے کر آئے ہیں کہ اس کام کو میں خود انجام دوں یا وہ انجام دے جو مجھ سے ہے، یعنی وہ فرد آپ کا قریبی ترین ہو اور آپ کی طرح خصوصیات اور صفات کا حامل ہو اور ہم جانتے ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات جامع صفات جمال اور جلال تھی۔ یہ برادران اس عظیم فضلیت کو نظر انداز کرنے پر کیوں اس قدر زور دیتے ہیں؟ یا اس کا رخ شاعرانہ تاویلات کے ذریعے موڑنا چاہتے ہیں شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ کہیں شیعہ اِسے اپنی دلیل بنا کر اپنے مذہب کو ثابت نہ کریں؟ اپنی بات ایک حدیث پر ختم کرتے ہیں، یہ حدیث ''مطالب السؤال'' میں ابوذر غفاری سے بیان ہوئی ہے۔ان کے بقول پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

عَلِيٌّ مِنِّي وَاَنَا مِنْ عَلِيٍّ وَلَا يُؤَدِّي اِلَّا اَنَا وَعَلِيٌّ

علی مجھ سے ہیں اور میں علی سے، اور اس ذمہ داری کو میرے یا علیؑ کے سوا کوئی انجام نہیں دے سکتا۔ [2]

---

[1] روح المعانی: جلد ۱۰، صفحہ ۴۷

[2] مطالب السؤال صفحہ ۱۸ (الغدیر جلد ۶ صفحہ ۳۴۸ کے مطابق)

۷۔ آیت سقایہ الحاج

سورہ برائت کی آیت ۱۹ میں ارشاد الٰہی ہے:

اَجَعَلۡتُمۡ سِقَایَۃَ الۡحَآجِّ وَعِمَارَۃَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ کَمَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ؕ لَا یَسۡتَوٗنَ عِنۡدَ اللّٰہِ ؕ وَاللّٰہُ لَا یَهۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۱۹﴾

کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد الحرام کی آبادکاری کو اس شخص کے برابر قرار دیا ہے جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان لایا ہے اور راہ خدا میں جہاد کیا ہے؟ اللہ کے نزدیک یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے اور اللہ ظالم قوم کی ہدایت نہیں کرتا۔

''شواہد التنزیل'' میں حاکم حسکانی حنفی نے اسی آیت کے ضمن میں دس سے زیادہ روایات مختلف طرق سے نقل کی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ آیت علیؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ ان میں سے ایک روایت انس بن مالک سے مروی ہے کہ عباس بن عبدالمطلب اور (خانہ کعبہ کے کلید بردار) شیبہ ایک دوسرے پر فخر ومباہات کر رہے تھے کہ اتنے میں علیؑ وہاں پہنچ گئے حضرت عباس نے کہا میرے بھتیجے ذرا ٹھہر میں نے تم سے کچھ کہنا ہے۔ علی - کھڑے ہو گئے، حضرت عباس نے کہا: شیبہ میرے مقابلہ پر فخر کر رہا تھا اس کا خیال ہے کہ وہ میرے سے زیادہ معزز اور برتری رکھتا ہے۔ علیؑ نے فرمایا: چچا جان آپ نے اِسے کیا جواب دیا ہے؟

حضرت عباس نے بتایا کہ میں نے کہا ہے ''میں اللہ کے رسول کا چچا ہوں، ان کے باپ کا وصی اور حاجیوں کو پانی پلانے والا ہوں لہٰذا میری شان ومنزلت تیرے سے زیادہ ہے۔ علی - نے شیبہ سے پوچھا: تم نے اس کے مقابلے میں کیا کہا ہے؟ اس نے بتایا کہ میں نے کہا ہے میرا مقام تم سے بلند ہے کیونکہ میں اللہ کے گھر کا امین اور کلید بردار ہوں، اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنے گھر کا امین کیوں نہیں بنایا جس طرح اُس نے مجھے بنایا ہے؟ علی - نے فرمایا: میرے لیے فخر کی بات یہ ہے کہ میں وہ ہوں جس نے اس امت کے مردوں میں سے سب سے پہلے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لایا ہوں، میں نے ہجرت کی ہے اور راہ خدا جہاد کیا ہے۔

اس کے بعد یہ تینوں افراد رسالتماب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آئے اور ہر ایک نے اپنی اپنی بات کہی، آنحضرتؐ ان کے جواب میں خاموش رہے، وہ سب واپس چلے گئے چند دن کے بعد ان کے بارے میں وحی نازل ہوئی، آنحضرتؐ نے ان تینوں کی طرف پیغام بھیجا وہ سب آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ آپؐ نے ''اَجَعَلۡتُمۡ سِقَایَۃَ الۡحَآجِّ ۔۔۔ والی آیت ان کے سامنے تلاوت کی[1]

یہی مطلب دیگر روایات میں بھی تھوڑے سے فرق کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ ان میں سے بعض روایات میں آیا ہے کہ جب عباس نے آیت کے نزول کا سُنا تو تین مرتبہ کہا: انّا قد رضینا: ہم راضی ہو گئے۔ حاکم حسکانی کے علاوہ بہت سارے محدثین نے ان

[1] شواہد التنزیل، جلد اصفحہ ۲۴۹۔

احادیث کو اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے، بعض نے تفصیل کے ساتھ اور بعض نے مختصر طور پر بیان کیا ہے، ان افراد میں سے ناموراور قابل ذکر شخصیات درج ذیل ہیں:

طبری نے اپنی تفسیر میں انس بن مالک سے [۱]، واحدی نے اسباب النزول میں [۲]، قرطبی نے اپنی تفسیر میں [۳] فخر رازی نے تفسیر کبیر میں [۴]، خازن نے اپنی تفسیر خازن میں [۵]، ابوالبرکات نسفی نے اپنی تفسیر میں [۶]، ابن صباغ مالکی نے الفصول المھمہ میں۔ [۷]

الدر المنثور ایک ایسی تفسیر ہے جس میں احادیث اہل سنت کی بنیاد پر آیات قرآنی کی تفسیر کی گئی ہے۔ اس میں بہت ساری روایات بیان کی گئی ہیں جن کے مطابق یہ آیت علیؑ اور مذکورہ واقعے کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ [۸]

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اصولی طور پر کیا ایک دوسرے پر فخر ومباہات کرنا اسلام میں قابل مذمت نہیں ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر امیر المومنین علیؑ نے ایسا کام کیوں کیا؟ ایک نکتہ کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ہوجائے گا اور وہ یہ ہے کہ کئی دفعہ لوگ اقدار اور فضائل کی پہچان میں غلط فہمی کا شکار ہوجاتے ہیں، حقیقی قدروں اور فضیلتوں کو چھوڑ کر ثانوی حیثیت کے مسائل اور معاملات میں الجھ جاتے ہیں، ایسے مقامات پر بیان حقیقت کے لیے نہ صرف فخر ومباہات مذموم نہیں ہے بلکہ کبھی تو یہ فریضہ بن جاتا ہے، مثال کے طور پر اگر کسی محفل میں ایک شخص فخر کرتے ہوئے کہے میرا اتنا مال و دولت ہے، دوسرا کہے فلاں محل اور بنگلہ میرا ہے، تیسرا کہے میرے لیے یہی کافی ہے کہ میں اس شہر کا حاکم ہوں، اس محفل میں موجود کوئی شخص حقیقی اقدار اور عظمتوں کی نشاندہی کے لیے یہ کہے کہ اگرچہ میرے پاس مقام ومنصب، شہرت اور مال و دولت نہیں مگر میرے فخر کے لیے یہی کافی ہے کہ میں حافظ قرآن ہوں، یہ بات نہ فقط مذموم نہیں ہے بلکہ ایک اہم اور قیمتی سبق ہے۔

---

[۱] تفسیر طبری: جلد ۱۰، صفحہ ۵۹

[۲] اسباب النزول، صفحہ ۱۸۲

[۳] تفسیر قرطبی، جلد ۸، صفحہ ۹۱

[۴] تفسیر فخر رازی، جلد ۴، صفحہ ۴۲۲

[۵] خازن، جلد ۲، صفحہ ۲۲۱

[۶] ابوالبرکات، جلد ۲، صفحہ ۲۲۱

[۷] الفصول المھمہ، صفحہ ۱۲۳

[۸] الدر المنثور، جلد ۳، صفحہ ۲۱۸، ۲۱۹

۸۔ صالح مؤمنین کی آیت

حضرت رسول خدا ﷺ کی بعض ایسی بیویوں سے خطاب کرتے ہوئے جنہوں نے حکم عدولی کی تھی، اللہ تعالیٰ سورہ تحریم میں ارشاد فرماتا ہے: وَ اِنۡ تَظَاهَرَا عَلَيۡهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوۡلَاهُ وَ جِبۡرِيۡلُ وَ صَالِحُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَ الۡمَلٰٓئِكَةُ بَعۡدَ ذٰلِكَ ظَهِيۡرٌ۔ یعنی: ''اور اگر تم نبی کے خلاف ایک دوسرے کی پشت پناہی کرو گی (تو تم اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتیں) کیونکہ اللہ، جبرئیل (اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا فرشتہ) اور صالح مومنین اس کے مولا اور مددگار ہیں اور فرشتے ان کے بعد اس کے پشت پناہ ہیں۔''

''صالح المومنین'' میں تمام صاحبان ایمان، نیک اور صالح افراد شامل ہیں یہ سب نبی اکرم ﷺ کے دوست اور مددگار ہیں، اس میں نہ فقط آپؐ کے دور کے صالح افراد اور اصحاب کرام شامل ہیں بلکہ ایک لحاظ سے دیگر زمانوں اور ادوار کے صالح مومنین بھی شامل ہیں، جن میں سے ہر ایک اسلام، پیغمبر اکرم ﷺ اور اپنے مکتب کی ایک قسم کی مدد و نصرت کے لیے اقدام کرتا ہے۔

لیکن اہم بات یہ ہے کہ متعدد روایات میں ''صالح المومنین'' کی تفسیر علیؑ سے کی گئی ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ اس آیت کے اعلیٰ ترین اور کامل ترین مصداق ہیں، اور اس نکتے کے پیش نظر ان کا ذکر جبرئیل کے ساتھ آیا ہے اس سے ان کی اس فضلیت کی اور ان کے مقام کی عظمت اچھی طرح اجاگر ہوتی ہے۔

یہ سچ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور جبرائیل امین کے بعد پیغمبر اسلام ﷺ کی پوری زندگی میں بہترین یار و مددگار علیؑ تھے۔ لہٰذا ان کے علاوہ اور ان سے بڑھ کر کون رسول خدا ﷺ کی خلافت اور جانشینی کا حقدار ہوسکتا ہے؟ کیا یہ روایات اس بات کی دلیل نہیں ہیں کہ وہ رسول ﷺ کے بعد امت میں سے افضل اور سب سے برتر شخصیت تھے۔ اب ہم ان روایات کی اسناد اور طرق کو بیان کرتے ہیں جن میں سے ایک حصہ عمومی طور پر اہل سنت کے ماخذ اور کتب سے لیا گیا ہے۔

حاکم حسکانی حنفی اس آیت کے متعلق اٹھارہ احادیث مختلف طرق سے نقل کرتے ہیں، ان سب کے مطابق ''صالح المومنین'' سے مراد علی ابن ابی طالبؑ ہیں، ان میں ایک حدیث میں اسماء بنت عمیس روایت کرتی ہیں کہ میں نے حضرت رسول خدا ﷺ کو فرماتے ہوئے سُنا کہ: ''صالح المومنین عَلِيّ بنَ ابی طالب۔'' یعنی: صالح المومنین علی بن ابی طالب – ہیں [1]

مذکورہ کتاب میں ابن عباس سے منقول ہے کہ رسول خدا ﷺ نے علی بن ابی طالب کے متعلق فرمایا: '' هُوَ صالح الْمُؤْمِنین۔'' یعنی: وہ صالح المومنین ہیں [2] نیز عمار بن یاسر سے روایت کی گئی ہے کہ میں نے علیؑ سے سُنا وہ فرماتے تھے پیغمبر اکرم ﷺ نے مجھے بلایا اور فرمایا: ''الا اُبَشِّرُكَ: قُلْتُ بلىٰ یا رَسُول الله! وَ مَا زِلتُ مُبَشِّراً بِالْخَيْرِ: قالَ قَدْ اَنْزَلَ الله فِيكَ

[1] شواہد التنزیل، جلد ۲، صفحہ ۲۵۶، روایت نمبر ۹۸۲

[2] شواہد التنزیل، جلد ۲، صفحہ ۲۵۶، روایت نمبر ۹۸۷

قُرآنًا، قُلْتُ و ما هُوَ یارَسولَ اللهِ؟ قالَ قُرِنْتَ بِجَبْرَئیل ثُمَّ قَرَءَ: وَ جبرئیل و صالح المومنین۔ ''یعنی: کیا میں تمہیں خوشخبری نہ سناؤں؟ میں نے عرض کیا: کیوں نہیں! اے اللہ کے رسول! آپ تو ہمیشہ خیر و بھلائی کی بشارت دینے والے ہیں، آپؐ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تیرے لیے آیت نازل کی ہے میں نے پوچھا کونسی آیت؟ فرمایا: تمہیں جبرئیل کے ساتھ قرار دیا گیا ہے (یعنی اللہ نے تمہیں اس کا ساتھی بنایا ہے) آپؐ نے اس آیت کا یہ جملہ وجبرئیل وصالح المومنین تلاوت کیا۔ [1]

اسی مفہوم پر مشتمل ایک اور حدیث حذیفہ سے بیان ہوئی ہے: ابن سیرین سے مروی ایک حدیث میں اور خود علی بن ابی طالب سے منقول ایک حدیث میں وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یوں فرمایا ہے کہ صالح المومنین علی بن ابی طالب ہیں۔ [2]

بہت سارے مفسرین نے اس حدیث کو اپنی تفسیروں میں نقل کیا ہے، مثال کے طور پر سیوطی نے الدرالمنثور میں اسی آیت کی تفسیر میں ابن عباس اور اسماء بنت عمیس سے نقل کیا ہے۔ برسوئی نے تفسیر روح البیان میں آیت کے حوالے سے اقوال ذکر کرنے کے بعد مجاہد کے قول کہ صالح المومنین سے مقصود علیؑ ہیں، کو بیان کرتے ہوئے کہا ہے: یُؤَیِّدُهُ قَولُهُ عَلَیْهِ السَّلام یا عَلِیّ اَنْتَ مِنّی بِمَنْزِلَةِ هارونَ مِنْ موسی۔ یعنی: ''اس بات کی تائید پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک اور ارشاد ہوتی ہے جس میں آپؐ نے فرمایا: اے علی! آپ کو میرے سے وہی نسبت ہے جو ہارون کو موسیٰ کے ساتھ تھی۔'' اس کے بعد وہ ایسی متعدد آیات کو پیش کرتے ہیں، جن میں صالحین کا لفظ بزرگ اور بڑے انبیاء کے لیے استعمال ہوا ہے، آخر میں وہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ جب علیؑ اللہ کے نبی ہارون کے مقام اور منزلت پر ہیں تو پھر ''صالح المومنین'' کے عنوان کے بھی قابل اور لائق ہیں۔ [3]

ان کے علاوہ دیگر علماء جیسے عسقلانی نے فتح الباری، ابن حجر نے صواعق المحرقہ اور علاء الدین متقی نے کنز العمال میں اس حدیث کو ذکر کیا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ یہ بہت بڑی فضلیت ہے اور اس کی مثال نہیں ملتی کہ اللہ تعالیٰ نے صالح المومنین کو جبرئیل کا ساتھی اور ہم ردیف قرار دیا ہے، اور مندرجہ بالا احادیث کے مطابق اس کے اکمل اور اتم مصداق علیؑ تھے۔ حقیقت یہی ہے کہ علیؑ رسول خداؐ کی پوری زندگی میں تمام مواقع پر آپؐ کے شانہ بشانہ رہے، ہر مقام پر آپ کی مدد و نصرت کی اور ہر جگہ آپؐ کے یار و مددگار ثابت ہوئے اور آپؐ کی خلافت اور جانشینی کے حق دار بھی علیؑ ہی تھے۔

---

[1] ایضا، صفحہ ۲۵۸، حدیث ۹۸۷

[2] ایضا صفحہ ۲۵۹، حدیث ۹۸۹

[3] روح البیان جلد ۱۰، صفحہ ۵۳

۹۔آیت وزارت

سورہ طہٰ کی ۲۹ سے کر ۳۲ آیات میں حضرت موسیٰ کی زبانی قرآن فرماتا ہے:

وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ﴿۲۹﴾ هٰرُوْنَ اَخِي ﴿۳۰﴾ اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ ﴿۳۱﴾ وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ ﴿۳۲﴾

یہ آیات بعثت کے آغاز میں حضرت موسیٰ کی خواہشات کو بیان کررہی ہیں کہ انہوں نے دُعا کی: ''بارالہا! میرے خاندان سے میرا وزیر بنا، میرے بھائی ہارون کو، اوراس کے ذریعے میری پشت مضبوط فرما، اوراُسے میرے کام میں شریک قراردے۔''

ان آیات کی تفسیر میں بھی متعدد روایات اہل سنت کی کتب میں موجود ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی رسالت کے اہداف کے حصول کے لیے اللہ تعالیٰ سے انہی خواہشات کا اظہار فرمایا اس فرق کے ساتھ کہ ہارون کی جگہ پر علیؑ کا نام لیا، ان میں سے چند روایات مطالعے کے لیے یہاں پیش کی جاتی ہیں:

۱۔شواہد التنزیل میں حذیفہ بن اُسید سے یوں منقول ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علیؑ کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا:

اَبْشِرْ، و اَبْشِرْ، اِنَّ موسى دَعَا رَبَّهُ اَنْ يَجْعَلَ لَهُ وزيرًا مِنْ اَهْلِهٖ هارُون، وَاِنِّي اَدْعُو رَبِّي اَنْ يَجْعَلَ لِي وزيرًا مِنْ اَهْلِي عَلِيَّ اَخي، اُشْدُدبِهٖ ظَهْرِي وَ اَشْرِكْهُ فِي امري

(اے علی!) تمہیں بشارت ہو، تمہیں بشارت ہو! موسیٰ نے اپنے رب سے دعا کی تھی کہ میرے خاندان سے ہارون کو میرا وزیر بنادے، میں نے بھی اپنے پروردگار سے دعا کی ہے کہ میرے خاندان سے میرے بھائی علیؑ کو میرا وزیر بنادے، اوراس کے ذریعے سے میری پشت کو مضبوط فرما (یعنی میری قوت میں اضافہ فرما) اورانہیں میرے کام میں شریک قراردے۔ [1]

۲۔دوسری حدیث وہ اسماء بنت عمیس سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سُنا انہوں نے فرمایا:

اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَقُولُ كما قَالَ اَخي مُوسى، اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ لِي وزيرًا مِنْ اَهْلِي عَلِيّاً اَخِي اُشْدُدبِهٖ اَزري، وَ اَشْرِكْهُ فِي اَمْرِي، كَيْ نُسَبِّحُكَ كَثِيْرًا، و نَذْكُرَكَ كَثِيْراً اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا

اے اللہ! میں تم سے وہی مانگتا ہوں جو بھائی موسیٰ نے تم سے مانگا تھا، اے اللہ! میرے خاندان سے میرے بھائی علیؑ کو میرا وزیر بنا، اس کے ذریعے میری پشت مضبوط فرما اُسے میرے کام میں شریک قرار

[1] شواہد التنزیل، جلد اصفحہ ۳۶۸، حدیث ۵۱۰

دے تاکہ ہم تیری بہت زیادہ تسبیح کریں اور تیرا ذکر کثرت سے کریں بے شک تیری ذات ہمارے حالات سے آگاہ ہے۔[۱]

واضح سی بات ہے کہ نبی کے کاموں میں شریک ہونے سے مراد نبوت میں شریک ہونا قطعاً نہیں ہے بلکہ اس سے مراد لوگوں کی ہدایت وراہنمائی کے کام میں شریک ہونا ہے۔

۳۔تیسری حدیث وہ ''انس بن مالک'' سے بیان کرتے ہیں، جس میں حضرت موسیٰؑ کے واقعہ کی طرف بالکل اشارہ نہیں ہے لیکن اس میں خلافت اور وزارت کے موضوع کا ذکر ہے۔وہ ذکر کرتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا: ان خلیلی و وزیری وخلیفتی فی اھلی وخیرمن اترك بعدی ینجزموعودی ویقضی دینی علی بن ابی طالب یعنی ''بیشک میرا دوست میرا وزیر اور خاندان میں میرا جانشین علیؑ ہے، میرے بعد بہترین ہستی جسے میں چھوڑ جاؤں گا جو میرا وعدہ پورا کرئے گا اور میرا قرض ادا کرے گا وہ علی ابن ابی طالبؑ ہے۔''[۲]

۴۔یہی حدیث تھوڑے سے فرق کے ساتھ سلمان فارسی سے بھی منقول ہے۔[۳]

۵۔پانچویں صدی ہجری کے عالم حافظ ابونعیم اصفہانی نے اپنی کتاب ''ما نزل من القرآن فی علی''میں اسماء بنت عمیس کی حدیث کا مضمون اور مطلب ابن عباس سے بیان کیا ہے۔حدیث کے آخر میں ابن عباس کہتے ہیں:

رسول خدا ﷺ کی دعا کے بعد میں نے منادی کی آواز سنی جو کہہ رہا تھا:

یَا اَحمَدُ قَدْ اُوتِیتَ مَا سَاَلْتَ

اے احمد! جو کچھ آپؐ نے اپنے رب سے مانگا ہے وہ آپؐ کو عطا کر دیا گیا ہے۔[۴]

۶۔تفسیر کبیر میں فخر رازی نے اس حدیث کو مفصل طور پر ابوذر غفاری کے ذریعے ذکر کیا ہے حدیث بیان کرتے کرتے وہ یہاں تک پہنچتے ہیں کہ جب علیؑ نے اپنی انگوٹھی (رکوع کی حالت میں) سائل کو دی، رسول خدا ﷺ اس منظر کو دیکھ رہے تھے، آپؐ نے اس وقت دعا کی: ''اے اللہ! بھائی موسیٰ نے تجھ سے دعا کی کہ میرا سینہ کشادہ فرما۔۔۔ اور میرے خاندان سے میرا وزیر مقرر فرما۔۔۔۔اور اُسے میرے کام میں شریک قرار دے تو نے قرآن ناطق نازل فرمایا جو ان کی دعا کی قبولیت کو بیان کر رہا ہے۔اے اللہ! میں محمد تیرا برگزیدہ اور تیرا رسول ہوں، میرے سینے کو کشادہ فرما اور میرے امر کو آسان فرما اور میرے اہل سے میرے بھائی علیؑ کو میرا وزیر مقرر فرما ان کے ذریعے میری طاقت میں اضافہ فرما!''

---

[۱] شواہد التنزیل، جلد ۱صفحہ ۳۷۰، حدیث ۵۱۱

[۲] شواہد التنزیل، جلد ۱صفحہ ۳۷۳، حدیث ۵۱۶

[۳] شواہد التنزیل، جلد ۱صفحہ ۷۷، حدیث ۱۱۵

[۴] ملحقات احقاق الحق، جلد ۲۰، صفحہ ۱۲۸

حضرت ابوذر کا بیان ہے کہ ابھی نبی اکرم ﷺ کی دعا ختم نہیں ہوئی تھی کی جبرئیل نازل ہوئے اور آیت ''انما ولیکم اللہ و رسولہ ۔۔۔'' کو آنحضرتؐ پر وحی کی۔[۱]

اس حدیث کی اسناد اور حوالے اور جن کتب میں یہ موجود ہے، ان کی تعداد بہت زیادہ ہے ان سب کو اس مختصر کتاب میں ذکر کرنے کی گنجائش نہیں ہے، یہاں پر ان میں سے صرف چند کو ذکر کیا گیا ہے۔

آیت اور احادیث وزارت کا مفہوم

مذکورہ احادیث واضح طور پر بتا رہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دعا فرمائی اور اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کی دعا کی طرح آنحضرتؐ کی دعا کو قبول فرمایا، آپؐ کی دعا یہ تھی کہ میرے خاندان سے میرا وزیر بنا دے جو میرا شریک کار رہو اور اس کے ذریعے اللہ کے نبی کی پشت قوی اور محکم ہو بالکل اسی طرح جیسے ہارون موسیٰ کے لیے تھے۔ جیسا کہ اشارہ کیا گیا ہے کہ مسلم بات ہے کہ اس سے نبوت کے امر میں شریک ہونا قطعاً مراد نہیں ہے کیونکہ آنحضرتؐ خاتم الانبیاء ہیں، آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ نیز یہ بھی معلوم ہے کہ اس سے ''امر بالمعروف، نہی عن المنکر، دین کی تبلیغ اور اس کی نشر و اشاعت بھی مراد نہیں ہے، کیونکہ یہ تو تمام مسلمانوں کا فریضہ ہے، ہر مسلمان کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا چاہیے، سب کو اپنی اپنی بساط کے مطابق جاہلوں کو دین کی تبلیغ کا فریضہ انجام دینا چاہیے۔

بنا بر ایں شریک کار سے مقام خاص مراد ہے جو نبوت اور عمومی فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے علاوہ ہے، کیا اس سے مراد اللہ کی طرف سے رہبر و راہنما اور وزیر ہونے کے علاوہ کوئی اور مسئلہ ہو سکتا ہے؟ اس بات کا واضح طور پر یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ علیؑ رسول خدا ﷺ کے بعد ان کے بلافصل جانشین اور خلیفہ ہیں۔ اس بات کو دوسرے الفاظ میں یوں بیان کیا جاتا ہے کہ بہت سارے امور اور ذمہ داریاں ایسی ہوتی ہیں جنہیں ہر کوئی انجام نہیں دے سکتا، اور وہ دین الٰہی کی ہر قسم کی تحریف اور انحراف سے حفاظت ہے، اسی طرح شریعت میں مجملات کی تشریح اور مبہمات کی تفسیر، رسول خدا ﷺ کی عدم موجودگی اور ان کے بعد امت کی ہدایت اور راہنمائی اور ان کے اہداف کے حصول میں ان کی مدد و نصرت جیسے امور ہیں، ان تمام فرائض اور امور کا خلاصہ لفظ ''وزیر'' میں ہوتا ہے۔[۲]

اور یہ وہ چیز تھی جو رسول اللہ ﷺ نے علیؑ کے لیے اللہ تعالیٰ سے مانگی تھی۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا مستجاب فرمائی۔ اسی بات سے ان بعض مفسرین کے وسوسوں کا جواب بھی مل جاتا ہے جو علیؑ کی شان میں اس قسم کے فضائل برداشت نہیں کرتے۔ ان کی یہ کوشش رہی ہے کہ کارِ پیغمبر ﷺ میں شریک ہونے کا مطلب امر بالمعروف اور دعوت و تبلیغ ہی بیان کیا جائے اور اسی پر زور دیا جائے۔[۳] حالانکہ سب کو معلوم ہے کہ یہ تو تمام مسلمانوں کی ذمہ داری ہے اور اس کے لیے اللہ کی طرف سے کسی وزیر کو متعین کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔

---

[۱] تفسیر الکبیر فخر رازی، جلد ۱۲ صفحہ ۲۶ (سورہ مائدہ کی آیت ۵۵ کی تفسیر میں)

[۲] وزیر کا مصدر ''وزر'' جس کا معنی بھاری بوجھ ہے اور چونکہ وزیر مختلف ذمہ داریوں کا بھاری بوجھ اٹھاتا ہے اس لئے اس پر لفظ وزیر کا اطلاق ہوا ہے

[۳] روح المعانی، جلد ۱۶، صفحہ ۱۸۵

سورہ احزاب کی آیات نمبر ۱۰ اور ۱۱

سورہ احزاب کی بعض آیات کے بارے میں کچھ مفسرین کی رائے ہے کہ یہ علیؑ کی شان میں نازل ہوئی ہیں یا پھر ان کی بے مثال ایثار و قربانی کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔اس سورۃ کی آیت نمبر ۲۳ میں ہم پڑھتے ہیں:

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴿۲۳﴾

مومنین میں ایسے مرد موجود ہیں جنہوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا ان میں سے بعض نے اپنے عہد کو پورا کیا (اور اس راہ میں جام شہادت نوش کیا) اور بعض انتظار کر رہے ہیں اور انہوں نے ذرا بھی (اپنے عہد میں) تغیر و تبدل نہیں کیا۔

دو آیتوں کے بعد یعنی آیت نمبر ۲۵ میں ارشاد رب العزت ہے:

وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا ۭ وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا ﴿۲۵﴾

اللہ تعالیٰ نے کفار کو اس حال میں واپس پھیر دیا کہ وہ غصے میں (جل رہے) تھے وہ کوئی فائدہ بھی حاصل نہ کر سکے، لڑائی میں مومنین کے لیے اللہ ہی کافی ہے اور اللہ بڑا طاقت والا، غالب آنے والا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ اسلامی غزووں میں سے جنگ احزاب ایک اہم ترین غزوہ تھا جیسا کہ اس کے نام سے ہی معلوم ہے کہ یہ تمام دشمنان اسلام کی طرف سے تمام اطراف سے مسلمانوں کے خلاف جنگ اور مقابلہ تھا ان تمام گروہوں نے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کا کام تمام کرنے کے لیے (نعوذ باللہ) اور ہمیشہ کے لیے اس پریشانی سے جان چھڑانے کے لیے ایک کر لیا تھا جن کے مفادات اسلام کی ترقی اور پیش رفت سے خطرے میں پڑ گئے تھے۔

سورہ احزاب کی سترہ آیات اس جنگ کی صورت حال کو وضاحت کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔ان میں بہت سے دقیق نکات اور گہرے مطالب بیان ہوئے ہیں، ادھر مسلمانوں کے مختلف گروہوں کے کیا حالات تھے یہ آیات بڑی باریک بینی اور ظرافت سے اس تمام صورت حال کی تشریح کرتی ہیں۔

اس میدان جنگ میں مسلمانوں پر بڑے سخت اور خطرناک لمحات گزرے ہیں، دشمن کی تعداد کثیر اور بہت بڑا لشکر تھا اس کے مقابلے پر لشکر اسلام کی تعداد کم تھی (مورخین نے احزاب کے لشکر کی تعداد دس ہزار اور اسلام کے لشکر کی تعداد تین ہزار بتائی ہے) اس کے علاوہ دشمن ہر لحاظ سے لیس تھا اور جنگ کی مکمل تیاری کے ساتھ تھا جب کہ مسلمانوں کو وسائل کی کمی کا سامنا تھا جو ان کی مشکلات میں کئی گنا

اضافے کا باعث تھا۔ مذکورہ بالا دو آیتوں کا تعلق انہی سترہ آیات سے ہے۔

شواہد التنزیل میں پہلی آیت کے حوالے سے وہ اپنی سند سے علیؑ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: ''فینا نَزَلَتْ رِجال صَدَقُوا ما عاهَدُوا الله عَلَيْهِ۔ یعنی: رجال صدقوا۔۔۔ والی آیت ہمارے بارے میں نازل ہوئی ہے پھر فرمایا: فانا واللہ المنتظر۔ یعنی: وہ جو شہادت کی انتظار کر رہا ہے قسم بخدا وہ میں ہوں۔ [1]

نیز وہ عبداللہ بن عباس سے نقل کرتے ہیں کہ آیت ''مِنَ المومنین رِجال صدقوا ما عاهَدُوا اللهِ عَلَيْهِ'' علیؑ، حمزہؓ، جعفرؓ کی شان میں ہے اور مِنهُمْ مَنْ يَنتَظِرُ کا اشارہ علیؑ کی طرف ہے جو راہ خدا میں شہادت کے منتظر تھے: ''فَوَاللهِ لَقَدْ رُزِقَ الشَّهادَةُ۔ یعنی: اللہ کی قسم شہادت انہیں نصیب ہوئی ہے۔ [2] یہی مطلب ابن حجر کی کتاب صواعق میں ابن صباغ مالکی کی کتاب فصول المهمه اور نیشاپوری کی الکشف والبیان میں بھی بیان ہوا ہے۔ [3]

دوسری آیت کے حوالے سے بحث اس سے بھی وسیع ہے، کیونکہ بہت سے مفسرین کا کہنا ہے کہ ''کفی اللہ المومنین القتال''، یعنی: ''اللہ تعالیٰ نے مومنین کو جنگ سے بے نیاز کر دیا'' علیؑ کی طرف اشارہ ہے جنہوں نے عمر بن عبدود کے جسم پر کاری ضرب لگائی اور مسلمانوں کو کافروں سے جنگ سے بے نیاز کر دیا۔ جنہوں نے یہ بات کہی ہے ان میں ایک عبداللہ بن مسعود ہیں جب وہ اس آیت کو پڑھتے تھے تو اس کی تشریح میں کہتے تھے: و كَفَى اللهُ الْمُؤمِنِينَ الْقِتَالَ بِعَلِيِّ بنِ اَبِي طالِبٍ [4] حاکم حسکانی نے بھی اسی معنی اور مفہوم پر مشتمل متعدد احادیث عبداللہ بن مسعود سے نقل کی ہیں۔ [5]

نیز وہ ابن عباس سے نقل کرتے ہیں کہ جب انہوں نے آیت: ''و كَفَى اللهُ الْمُؤمِنِينَ الْقِتَالَ'' کو پڑھا تو کہا: كَفَاهُمُ اللهُ الْقِتالَ يَوْمَ الْخَنْدَقِ بِعَلِيِّ بْنِ اَبِي طالِبٍ حين قَتَلَ عَمْرَو بن عَبْدَوَدَ۔ یعنی: اللہ تعالیٰ نے خندق والے دن مومنین کو علی ابن ابی طالب کے ذریعے بے نیاز کر دیا جب انہوں نے عمرو بن عبدود کو قتل کیا [6] نیز اُس نے مشہور صحابی حذیفہ سے حضرت علیؑ کی عمرو بن عبدود سے لڑائی اور اُسے قتل کرنے کے واقعے کو ایک مفصل حدیث میں بیان کرنے کے بعد کہا ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

بَشِّرْ يا عَلِيُّ: فَلَو وُزِنَ اَلْيَومُ عَمَلُكَ بِعَمَلِ اُمَّةِ مُحَمَّدٍ لَرَجَحَ عَمَلُكَ بِعَمَلِهِمْ وَ ذٰلِكَ اَنَّهُ لَمْ يَبْقَ بَيْتٌ مِنْ بُيُوتِ الْمُسْلِمِيْنَ اِلاَّ و قَدْ دَخَلَهُ عِزٌّ بِقَتْلِ عَمْرو

---

[1] شواہد التنزیل جلد ۲، صفحہ ۲ حدیث ۶۲۷

[2] شواہد التنزیل جلد ۲، صفحہ ۲ حدیث ۶۲۷

[3] علی فی الکتاب والسنۃ۔ ۲۱۸

[4] شواہد التنزیل جلد ۲، صفحہ ۳ حدیث ۶۲۹

[5] شواہد التنزیل جلد ۲، صفحہ ۲ حدیث ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲۔

[6] شواہد التنزیل جلد ۲، صفحہ ۵ حدیث ۶۳۳

ترجمہ: اے علی! تمہیں بشارت ہو! اگر تمہارے آج کے کارنامے کا امت محمدؐ کے عمل کے ساتھ موازنہ کیا جائے تو تمہارا یہ عمل ان کے اعمال سے برتر اور بھاری ہوگا کیونکہ مسلمانوں کے گھروں میں سے کوئی گھر بھی ایسا نہ تھا جس میں عمرو بن عبدود کے قتل ہونے سے عزت اور سربلندی نے قدم نہ رکھا ہو۔[1]

اسی مطلب کو ابن حکیم نے اپنے دادا کے ذریعے سے رسول خدا ﷺ سے بیان کیا ہے۔ الدر المنثور میں سیوطی نے ابن ابی حاتم، ابن مردویہ اور ابن عساکر کے ذریعے ابن مسعود سے روایت کی ہے جب وہ مذکورہ آیت کو پڑھتے تھے تو (اس کی تشریح میں) یوں کہتے تھے: "و کفی اللہُ المؤمنینَ القتالَ بِعَلِیِّ بنِ أبی طالِب"[2] اسی مفہوم کو علامہ شیخ سلیمان قندوزی سے ینابیع المودۃ میں بھی بیان کیا ہے۔[3]

اور بھی بہت سارے افراد نے جن کے نام اور کتب کی ایک طویل فہرست ہے، اس حدیث کو نقل کیا ہے۔ اہم اور قابل توجہ بات یہ ہے مندرجہ بالا تشریح کے ساتھ ان آیات کا مفہوم اور مطلب یہ ہے کہ جنگ احزاب کے خطرناک ترین میدان، جو اسلام دشمنوں کے ترکش کا آخری تیر تھا اور اسلام کے خلاف بہت بڑی سازش تھی، اس میں علی - حکم الہی سے مسلمانوں کی فتح کا موجب بنے ہاں وہ ارادہ الہی کے جاری ہونے کا مقام اور اس جنگ میں مسلمانوں کی فتح کا اہم سبب تھے۔ یہ ایک ایسی فضلیت ہے جو امت محمدیہ کے کسی فرد کو سوائے علیؑ کے نصیب نہیں ہوئی ہے۔ کیا رسول اللہ ﷺ کی جانشینی اور خلافت کا حقدار وہ فرد ہے جس کا ایک عمل امت کے تمام افراد کے عمل سے بھاری ہے یا کوئی اور افراد؟

سوال

ممکن ہے یہاں پر یہ کہا جائے کہ اس سورۃ کی آیت ۱۹ جنگ خندق کے واقعے کی طرف اجمالی طور پر اشارہ کرتی ہے، اس میں آیا ہے کہ:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَاءَتْكُمْ جُنُودٌ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا وَجُنُودًا لَمْ تَرَوْهَا ۚ وَكَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا ﴿٩﴾

اے ایمان لانے والو اپنے پر اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو جب عظیم لشکر تمہارے مقابلے کے لیے آیا تھا ہم نے ان پر دو بڑے سخت طوفان بھیجے اور نامرئی لشکر بھیجے (اور انہیں درہم برہم کر دیا) اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے

---

[1] شواہد التنزیل جلد ۲، صفحہ ۷ حدیث ۶۳۴

[2] الدر المنثور، جلد ۵ صفحہ ۱۹۲

[3] ینابیع المودۃ، صفحہ ۹۴

آگاہ ہے۔(احزاب/۹)

اس آیت کے مطابق کفار کے مختلف گروہوں کے اس لشکر کی شکست کے عوامل میں سے ایک عامل شدید آندھی کا چلنا تھا جو ان پر حاوی ہوگئی تھی۔ دوسرا عامل اللہ کا نامرئی لشکر تھا (اللہ کے فرشتے) اس بنا پر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ فتح کا سبب علی بن ابی طالب تھے؟

جواب

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ایک جنگ میں فتح و کامیابی کے کئی اسباب اور عوامل ہو سکتے ہیں فوجی عوامل، طبیعی اور معنوی عوامل وغیرہ، اس میدان میں تین اسباب اور عوامل یکجا ہو گئے تھے اور ان میں سے ہر ایک موثر واقع ہوا اس سے کسی کو انکار نہیں ہے، احزاب کے عظیم لشکر کے سب سے بڑے سردار عمرو بن عبدود کا علی بن ابی طالبؑ کے طاقتور ہاتھوں سے قتل، آندھی کا چلنا اور فرشتوں کا لشکر، یہ سب موثر تھے، تمام مقامات پر جب کسی واقعہ کے وقوع پذیر ہونے میں چند اسباب اکٹھے اور یکجا ہوں تو اس واقعے کی نسبت اُن میں سے ہر ایک کی طرف یا سب کی طرف دی جاسکتی ہے۔

۱۲۔آیت بینہ اور شاہد

سورہ ہود کی آیت نمبر ۱۷ میں ارشاد ربانی ہے:

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ

کیا وہ شخص جو اپنے رب کی طرف سے واضح دلیل رکھتا ہو اور اس کے پیچھے اس کے رب کی طرف سے ایک شاہد بھی آیا ہو اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب (دلیل ہو جو) راہنما اور رحمت بن کر آئی ہو (بھلا اس کی طرح ہو سکتا ہے جو یوں نہ ہو) یہی (حق کے طالب) اس پر ایمان لائیں گے۔

اس آیت کے متعلق حاکم حسکانی نے شواہد التنزیل میں متعدد روایات ذکر کی ہیں جن کی تعداد سولہ تک ہے، وہ گواہی دیتا ہے کہ آیت میں ''شاہد'' سے مراد علیؑ ہیں۔ وہ انس بن مالک سے بیان کرتا ہے کہ: ''اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِنْ رَبِّهٖ'' کیا وہ شخص جو اپنے رب کی طرف سے واضح دلیل رکھتا ہو کے جملے سے مراد حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور ''وَ يَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِنْهُ'' سے مراد علی بن ابی طالبؑ ہیں۔ یہ علیؑ تھے جو عہد و پیمان کے ختم کرنے پر اہل مکہ کے سامنے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان بنے تھے۔[۱]

ایک اور حدیث میں وہ ''ابن عباس'' سے روایت کرتے ہیں اُس نے ''وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِنْهُ'' تفسیر بیان کرتے کہا ہے ''هُوَ عَلِيٌّ خاصّة'' وہ صرف اور صرف علیؑ ہیں۔[۲] نیز اس نے اذان (علیؑ کے خاص اصحاب میں سے ایک) کے ذریعے سے علیؑ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: اگر میرے لیے قضا کی مسند بچھا دی جائے میں اس پر بیٹھ کر اہل تورات کے درمیان تورات سے، انجیل والوں کے لیے انجیل سے، اہل زبور کے لیے زبور سے اور قرآن پر عقیدہ رکھنے والوں کے لیے قرآن سے فیصلے کروں گا ایسے فیصلے اور انصاف کہ وہ اللہ کی طرف اوپر جائے۔ اللہ کی قسم! دن یا رات میں، بیابان میں یا پہاڑ پر صحرا میں یا دریا کے اندر کوئی آیت نازل نہیں ہوئی مگر میں جانتا ہوں کہ وہ کس وقت نازل ہوئی ہے؟ اور کس کے بارے میں نازل ہوئی ہے؟

کسی نے سوال کیا کہ آپ کے بارے میں کونسی آیت نازل ہوئی ہے، اے مومنو کے امیر! تو انہوں نے فرمایا: ''اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِنْ رَبِّهٖ وَ يَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِنْهُ۔ یعنی: محمدؐ اپنے رب کی طرف سے بینہ پر تھے اور میں ان کا شاہد اور گواہ تھا جو ان کے نقش قدم پر چلتا ہوں۔[۳]

---

[۱] شواہد التنزیل جلد ۱، صفحہ ۲۸۰ حدیث ۳۸۳

[۲] شواہد التنزیل جلد ۱، صفحہ ۲۸۲ حدیث ۲۸۷

[۳] شواہد التنزیل جلد ۱، صفحہ ۲۸۰ حدیث ۳۸۴

الدر المنثور میں سیوطی نے بھی اس موضوع کے متعلق متعدد روایات پیش کی ہیں، ان میں ایک روایت یہ ہے جو اس نے ابن ابی حاتم، ابن مردویہ اور ابونعیم کے ذریعے علی بن ابی طالب - سے نقل کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: مامِنْ رَجُلٍ مِنْ قُرَیْشٍ اِلاَّ نَزَلَ فِیْہِ طائِفۃٌ مِنَ القرآن یعنی: قریش کا کوئی مرد ایسا نہیں ہے مگر یہ کہ قرآن کا کچھ حصہ اس کے بارے میں نازل ہوا ہے۔ کسی نے خود ان سے پوچھ لیا کہ آپؑ کے بارے میں کیا نازل ہوا ہے؟ انہوں نے فرمایا: کیا تم سورہ ہود نہیں پڑھتے ہو جو فرماتی ہے: اَفَمَنْ کَانَ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِنْ رَبِّہٖ وَیَتْلُوْہُ شَاھِدٌ مِنْہُ یعنی: رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے رب کی طرف سے واضح دلیل پر تھے اور میں ان کا شاہد اور گواہ ہوں۔[۱] اسکے بعد وہ چند اور احادیث بیان کرتے ہیں جو مذکورہ مطلب کو ذکر کرتی ہیں۔[۲]

تفسیر ''روح المعانی'' میں آلوسی نے پہلے تو اس آیت کے متعلق علیؑ کی حدیث کو ابن ابی حاتم اور ابن مرور یہ سے نقل کیا ہے اس کے بعد اس نے اسی معنی پر مشتمل ایک اور حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیان کی ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: ''افمن کان علی بینۃ'' میں ہوں اور ''یتلو شاھد'' علیؑ ہیں۔ اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ بعض شیعیوں نے اس احادیث سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد علیؑ کی خلافت پر استدلال کیا ہے، کیونکہ اس آیت میں علیؑ کو شاہد کہا گیا ہے اور آیت اِنَّا اَرْسَلْنَاكَ شَاھِدًا وَ مُبَشِّرًا وَنَذِیْرًا'' میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تعارف شاہد کے طور پر کرایا گیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ علیؑ کا مقام امت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طرح ہے۔

کیونکہ خداوند فرماتا ہے ''وَیَتْلُوْہُ'' یعنی علیؑ ان کے پیچھے آئیں گے، یہ اس طرف اشارہ ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد خلیفہ ہیں۔ آخر میں وہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے، اس کے بعد وہ ایک روایت نقل کرتے ہیں جس کے مطابق شاہد سے مراد رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا زمانہ ہے۔[۳]

تفسیر المنار کے مفسر جو شیعیوں کے حوالے سے اور امامت سے مربوط مسائل میں تعصب میں آلوسی سے کمتر نہیں ہیں، وہ آیت کی تفسیر میں مشکل کا شکار ہوئے ہیں ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے عجیب قسم کے تکلفات میں مبتلا ہوئے ہیں۔ من جملہ وہ یہ کہتے ہیں: آیت کا ظاہر ترین معنی یہ ہے کہ بینہ سے مراد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اپنی نبوت کے متعلق علم یقینی ہے، اور شاہد وہی قرآن ہے، وہ سعید بن جبیر سے نقل کرتے ہیں کہ بینہ قرآن اور شاہد جبرئیل ہیں اور ''یتلوہ' مطلب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قرآن کی تلاوت کرنا ہے۔

اس کے بعد وہ کہتے ہیں: ایک ضعیف روایت میں آیا ہے کہ شاہد رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان ہے جو قرآن کی لوگوں کے سامنے تلاوت کرتی تھی، ایک اور ضعیف روایت میں ہے جسے شیعہ نقل کرتے ہیں کہ شاہد علیؑ ہیں۔[۴]

نہایت افسوس سے کہنا پڑھتا ہے کہ اپنے سے قائم کیے ہوئے مفروضے اور آراء قرآن کی آیات اور اسلامی روایات کو سمجھنے میں

---

[۱] الدر المنثور ج ۳، صفحہ ۳۲۴

[۲] الدر المنثور ج ۳، صفحہ ۳۲۴

[۳] روح المعانی جلد ۱۲، صفحہ ۲۸

[۴] المنار، جلد ۱۲، صفحہ ۵۳

بہت بڑی رکاوٹ ہیں۔ یہاں پر چند نکات اہمیت کے حامل ہیں:

۱۔ تعجب کی بات ہے کہ ایسی حدیث جو اتنے زیادہ طرق سے مختلف مشہور اسلامی کتب میں منقول ہو، اس کے بارے میں یہ کہا جائے کہ ایک روایت ہے جسے شیعہ نقل کرتے ہیں، کیا المنار کے مفسر نے ان سب روایات کو نہیں دیکھا جو الدر المنثور، شواہد التنزیل اور حتی روح المعانی میں درج ہیں اور بتاتی ہیں کہ شاہد سے مراد علیؑ ہیں، پھر وہ کیوں یہ کہہ رہے ہیں کہ اس روایت مکتب شیعہ کے فائدہ میں ہو وہ شیعہ روایت ہے اگرچہ اُسے دسیوں اہل سنت کے راویوں نے ہی کیوں نہ بیان کیا ہو؟!

۲۔ بہت سارے سُنی مفسرین اس تفسیر کو مانتے ہیں کہ شاہد سے مراد پیغمبر اکرم ﷺ کی ''زبان'' ہے (یہ معنی قرآن میں کہیں بھی نہیں ملتا) جب کہ المنار کے مصنف اُسے ایک ضعیف روایت شمار کرتے ہیں، شاید وہ بھی اس حقیقت کو سمجھ گئے کہ شاہد کی زبان پیغمبرؐ سے اور اس طرح ''یتلوہ'' کی قرآن کی تلاوت سے تفسیر کرنا بہت بڑا تکلف ہے۔

۳۔ اور یہ جو کہا گیا ہے ''شاہد'' سے مراد جبرئیل ہیں جب کہ لوگوں میں کوئی بھی اس شاہد کو نہیں دیکھ پاتا اور اس کے موجود ہونے کا اُسے کوئی پتہ نہیں ہے پس ایسی صورت میں گواہی کا مفہوم اس بات سے میل نہیں کھاتا۔ کیا ہم ایسا شعر کہنے پر مجبور ہیں جس کے قافیہ کی مشکل میں پڑ جائیں

۴۔ اس سے بھی بڑھ کر تعجب کی بات وہ ہے جو آلوسی نے ''روح المعانی'' میں کی ہے وہ کہتے ہیں کہ بینہ سے مراد قرآن مجید ہے اور ''شاہد'' سے مراد قرآن کا اعجاز ہے۔ حالانکہ قرآن کا بینہ ہونا صرف اس کے اعجاز کی وجہ سے ہے قرآن اپنے اعجاز کے پہلوؤں کے بغیر بینہ شمار نہیں ہوسکتا، اس بنا پر بینہ اور شاہد ایک ہوں گے اور یہ مطلب آیت کے مفہوم سے متصادم ہے۔

۵۔ بینہ کی تفسیر رسول خدا ﷺ کے اپنی نبوت کے بارے میں علم یقینی سے کرنا اور پھر شاہد سے قرآن مجید مراد لینا اور بھی عجیب وغریب بات ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ بینہ کا معنی اور مطلب کیا ہے، سب سے پہلے ہمیں قرآن سے معلوم کرنا چاہیے قرآن مجید میں لفظ بینہ ۱۹ مرتبہ اور اس کی جمع ''بینات'' ۵۲ مرتبہ استعمال ہوا ہے، عام طور پر یہ معجزہ یا آسمانی کتب اور قرآن مجید کے معنوں میں آیا ہے نہ کہ فطری، باطنی اور ضروری علم کے معنی میں۔

بنابرایں اگر ہم تکلفات کو برطرف کر کے دیکھیں تو مذکورہ بالا آیت میں بینہ قرآن کے معنی میں ہے جو کہ آنحضرتؐ کا معجزہ جاوید ہے، اور شاہد سے مراد پیغمبر اکرم ﷺ کے علاوہ کوئی اور شخص ہے جو ان کی حقانیت پر گواہی دے۔ لیکن وہ افراد جو ایسی تفسیروں سے خوفزدہ ہیں جو مذہب شیعہ کے حق میں تمام ہوں وہ ہر قسم کے تکلفات کو بروئے کار لاتے ہیں تاکہ کسی طرح اس حقیقی تفسیر سے جان چھڑائی جائے۔ اور یوں پہلے طے شدہ افکار اور نظریات پر کوئی زد نہ پڑنے پائے۔

☆☆☆☆

۱۳۔ آیت صدیقون

سورہ حدید کی آیت ۱۹ میں ارشاد الٰہی ہے:

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖۤ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّیْقُوْنَ ۖ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ ؕ

وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے وہ صدیق (بہت زیادہ سچے اور تصدیق کرنے والے) اور اپنے رب کے ہاں گواہ ہیں ان کے لیے ان کا اجر اور نور ہے۔

شواہد التنزیل میں ابن ابی لیلی سے ایک روایت ہے جو اس نے اپنے باپ سے نقل کی ہے وہ یوں بیان کرتے ہیں:

قَالَ رَسُولُ اللهِ (ص) الصّدّيقونَ ثَلَاثَةٌ حَبيبُ النَّجارِ مُؤمِنُ آلِ ياسِيْنَ وَ حِزبِيل (حزقيل) مُؤمِنُ آلِ فِرعُونَ و عَلِيُّ بْنُ ابى طالِبٍ الثالِثُ وَ هُوَ اَفْضَلُهُمْ۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: صدیق تین افراد ہیں: مومن آل یاسین حبیب نجار، مومن آل فرعون، حزقیل اور علی بن ابی طالب ان میں سے تیسرے میں اور ان سب سے افضل اور برتر ہیں۔ [۱]

یہ حدیث احمد بن حنبل کی کتاب ''فضائل'' میں ابو نعیم کی ''معرفۃ الصحابہ'' میں اور ابن مغازلی کی ''مناقب'' میں بھی بیان ہوئی ہے۔ [۲] کتاب شواہد التنزیل میں اس مضمون کی حامل چار اور احادیث بھی دیگر اسناد سے مذکورہ ہیں۔ [۳]

ینابیع المودۃ میں شیخ سلیمان قندوزی سے مندرجہ بالا حدیث کو مسند احمد، ابو نعیم، ابن مغازلی اور موفق خوارزمی کے ذریعے ابو لیلی اور ابو ایوب انصاری سے نقل کیا ہے، کہ ان دونوں راویوں کا بیان ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **الصِّدّيقُونَ ثلاثةٌ: حَبيبُ النَّجار... وَ حِزقِيلُ مُؤمِنُ آلِ فِرْعُونَ و عَلِيُّ بنُ ابى طالِبٍ وَ هُوَ اَفْضَلُهُمْ** [۴] کنز العمال میں بھی یہی بات ابن عباس سے منقول ہے۔ [۵] نیز احقاق الحق نے اس حدیث کو مختلف کتب اور مختلف حوالوں سے بیان کیا ہے۔ [۶]

---

[۱] شواہد التنزیل جلد ۲، صفحہ ۲۲۳ حدیث ۹۳۸

[۲] تعلیقات وحواشی محمودی بر شواہد التنزیل جلد ۲ صفحہ ۲۲۴۔

[۳] ایضا، حدیث ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲

[۴] ینابیع المودۃ، صفحہ ۱۲۴، باب ۴۲

[۵] کنزل العمال، جلد ۱۱، صفحہ ۶۰۱، حدیث ۳۲۸۹۷۔

[۶] احقاق الحق جلد ۳، صفحہ ۲۴۳۔

اگر چہ مذکورہ بالا احادیث مسئلہ خلافت کی بات بلا واسطہ تو نہیں کرتیں لیکن علیؑ کے لیے صدیق امت کا ثابت ہونا ایک بہت بڑی فضلیت ہے کہ جب بھی اس کو دوسروں کے مقابلے میں ان کے پلڑے میں ڈالا جائے تو علیؑ کی برتری واضح طور پر نظر آتی ہے جو اچھی طرح سے ثابت کرتی ہے کہ خلافت رسول کے لیے وہ قابل ترین اور اہل ترین فرد ہیں۔ان کثیر روایات کی روشنی میں اس امت کے صدیق علیؑ ہیں لیکن تعجب سے کہنا پڑتا ہے کہ بعض افراد نے یہ لقب اوروں کو دیا ہے۔درست ہے انہوں نے اس آیت کے ضمن میں روایت نقل کی ہے جس کے مطابق صدیقون آٹھ اشخاص ہیں:ان میں ایک حضرت ابوبکر اور دوسرے علیؑ ہیں،لیکن توجہ رہے کہ یہ روایت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول نہیں ہے جو روایت آنحضرت سے نقل ہوئی ہے اُس کے مطابق اس امت کے صدیق علیؑ ہیں۔

اس نکتے کی یاددہانی بھی ضروری ہے کہ آیت کا عمومی مفہوم مذکورہ روایات سے کوئی تضاد نہیں رکھتا کیونکہ کئی مرتبہ ہم نے یہ کہا ہے کہ اس قسم کی روایات اکمل فرد کی نشاندہی کررہی ہوتی ہیں یعنی وہ کہہ رہی ہیں کہ صدیق کا امت اسلامی میں مکمل اور اکمل مصداق علیؑ ہیں جو بہت زیادہ سچے اور صادق تھے،جس نے امت کے تمام مردوں سے پہلے ایمان لایا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصدیق کی اور آنحضرتؐ نے انہیں امت مسلمہ میں صدیق کا خطاب دیا ہے۔اس آیت کے بعد والی آیت کی تفسیر میں بھی اس بارے میں بہت سارے نکات کا آپ مطالعہ کرسکتے ہیں۔

۱۴۔آیت نور

سورہ حدید کی آیت ۲۸ میں ارشاد رب العزت ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ؕ۲۸

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ تا کہ اللہ تمہیں اپنی رحمت کے دو حصے عطا کرے اور تمہارے لیے نور قرار دے جس کی روشنی میں تم راستہ چل سکو اور تمہارے گناہوں کو بخش دے اللہ غفور اور رحیم ہے۔

شواہد التنزیل میں اس آیت کی تفسیر میں وہ ابن عباس سے نقل کرتے ہیں کہ ''يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَحْمَتِهٖ'' سے مراد حسنؑ اور حسینؑ ہیں (جو اللہ نے علیؑ کو مرحمت فرمائے) اور ''يَجْعَلْ لكم نُورًا تمشون بِهٖ'' سے مراد علی بن ابی طالبؑ ہیں (جو امت مسلمہ کا نور اور ان کی ہدایت کا سرمایہ ہیں) [۱]

ابن عباس نے یہ بات خود نہیں کہی ہے کیونکہ صاحب کتاب نے ایک اور حدیث میں اپنی سند سے جابر بن عبداللہ انصاری سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ ''يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَحْمَتِهٖ'' کا مطلب حسنؑ اور حسین ہیں اور آنحضرتؐ نے ''وَيَجْعَلْ لَكُمْ نُورًا تَمْشُونَ بِهٖ'' کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا، اس سے مراد حضرت علی بن ابی طالب- ہیں۔[۲]

مذکورہ کتاب میں اسی آیت کی تفسیر میں ابوجعفر الباقر -کا قول نقل ہوا ہے، کہ انہوں نے فرمایا: مَنْ تَمَسَّكَ بِوَلايَةِ عَلِيٍّ فَلَهُ نورٌ یعنی: جو شخص ولایت علی کے دامن کو تھام لے اس کے لیے نور اور روشنی ہے۔[۳] (غور کیجیے گا)

اسی مطلب کی تائید میں ابوسعید حذری سے وہ نقل کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اَمَا واللهِ لا يُحِبُّ اَهْلُ بَيْتِي عَبْدٌ اِلاَّ اعطاهُ اللهُ عَزَّوجَلَّ نورًا حتىّٰ يَرِدَ عَلَيَّ الحَوْضَ یعنی: خدا کی قسم جو بھی میرے اہل بیت سے محبت رکھے گا اللہ تعالیٰ (قیامت کے دن) اُسے نور عطا فرمائے گا یہاں تک کہ وہ مجھ تک حوض کوثر پر پہنچ جائے گا۔[۴]

کنز العمال میں علیؑ سے مروی ہے، انہوں نے فرمایا: اَنَا عَبْدُ اللهِ وَ اَخُو رَسُولِهٖ وَ اَنَا الصِّدِّيق الاَ كْبَرُ لا يَقُولُها

---

[۱] شواہد التنزیل، جلد ۲، صفحہ ۲۲۷، حدیث ۹۴۳

[۲] ایضا صفحہ ۲۲۸، حدیث ۹۴۴

[۳] ایضا صفحہ ۲۲۸، حدیث ۹۴۶

[۴] ایضا صفحہ ۲۲۸، حدیث ۹۴۷

بَعْدِی اِلَّا کذّابُ مُفْتَرٍ وَ لَقَدْ صَلَّیْتُ قَبْلَ النّاسِ سَبْعَ سِنِینَ ۔ یعنی: میں ہوں اللہ کا بندہ، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بھائی، میں ہوں صدیق اکبراور میرے بعد جوبھی یہ دعویٰ کرے گا وہ جھوٹا افترا باندھنے والا ہوگا میں نے لوگوں سے سات سال پہلے (رسول خدا کے ساتھ) نماز پڑھی ہے۔[1] یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جس نے سب سے پہلے (مردوں میں سے) اللہ کے رسول کی تصدیق کی ہے وہ میں تھا،لہٰذا صدیق اکبر کے خطاب کا حقدار میں ہوں۔

اسی کتاب میں معاذ عدویہ سے منقول ہے کہ میں نے بصرہ کے منبر پر علی سے یہ سنا ہے، انہوں نے فرمایا: اَنَا الصّدّیق الاَکبَرُ آمَنْتُ قَبْلَ اَنْ یُؤمِنَ اَبو بَکْرٍ وَ اَسْلَمْتُ قَبْلَ اَنْ یُسْلِمَ ۔ یعنی: میں صدیق اکبر ہوں (کیونکہ میں وہ ہوں جس نے) ابوبکر سے پہلے ایمان لانے والا میں تھا اس کے اسلام لانے سے پہلے میں اسلام لایا تھا[2] یہ فضلیت تمام فضائل سے بڑی ہے اس فضلیت کا حامل سب سے زیادہ خلافت رسول کے اہل اور شائستہ ہے۔

حضرت علیؑ کے آنحضرتؐ پر مردوں میں سے سب سے پہلے ایمان لانے کے موضوع پر علامہ امینی نے الغدیر کی تیسری جلد میں بڑی تفصیل سے بحث کی ہے، اس کی اسناد کو اہل سنت علماء کی مشہور اور معتبر ترین کتب سے بڑی کثرت سے بیان کی ہیں، اس کے ساتھ اسلامی شعراء کے بہت زیادہ اشعار بھی گواہ کے طور پر ذکر کیے ہیں۔[3] اس کتاب میں ایک فصل بعنوان ''سب سے پہلا مسلمان'' ہم نے ذکر کی ہے جس میں بہت ساری کہنے کی باتیں بیان کی گئی ہیں وہاں پر آپ ان کا مطالعہ کریں گے۔ انشااللہ

[1] کنزالعمال، جلد ۱۳، صفحہ ۱۲۲، حدیث ۳۶۳۸۹ (موسسۃ الرسالہ۔ بیروت)

[2] ایضا، صفحہ ۱۶۴، حدیث ۳۶۴۹۷

[3] الغدیر، جلد ۳، صفحہ ۲۲۱۔۲۴۱

۱۵۔آیت انداز

سورہ شعراء کی آیت نمبر ۲۱۴ اور ۲۱۵ میں ارشاد رب العزت ہے:

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ﴿۲۱۴﴾ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴿۲۱۵﴾

اور اپنے قریبی ترین رشتہ داروں کو ڈرائیں اور مومنین میں سے جو آپ کی پیروی کریں ان سے تواضع سے پیش آئیں۔

یہ آیات تاریخ اسلام کے مشہور واقعہ کو بیان کر رہی ہیں جسے تقریباً تمام اسلامی مورخین نے لکھا ہے، اس آیت کی تفسیر میں ایک روایت موجود ہے جو مجمع البیان میں طبرسی کے بقول عام وخاص کے نزدیک مشہور ہے، نیز شواہد التنزیل میں حاکم حسکانی کے مطابق براء بن عازب بیان کرتے ہیں کہ جب آیت۔''وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ''نازل ہوئی تو آنحضرتؐ نے بنی عبدالمطلب جن کی تعداد چالیس تھی، انہیں جمع کیا اور ان کے لیے کھانے کا اہتمام کیا اور فرمایا: اللہ کا نام لے کر قریب ہوں اور کھانا شروع کریں، اس کے بعد دودھ کا برتن لایا گیا آپؐ نے فرمایا: اللہ کا نام لے کر پئیں دوسرے دن پھر ان کی دعوت کی کھانا اور دودھ فراہم کیا پھر انہیں خوش خبری سنائی اور ڈرایا بھی، آپؐ نے فرمایا: میں تمہارے لیے دنیا اور آخرت لے کر آیا ہوں، اسلام لے آئیں اور اطاعت کریں تاکہ ہدایت پائیں، پھر فرمایا:

وَ مَنْ يُوَاخِينِي (مِنْكُمْ) و يُوَازِرُنِي يَكُونُ وَلِيِّي وَ وَصِيِّي بعدي و خَلِيفَتِي فِي اَهْلِي و يَقْضِي دَيْنِي

تم میں سے کون میرا برادر بننے کے لیے تیار ہے؟ کون میرا ساتھ دینے کے لیے آمادہ ہے؟ (جو ایسا کرے گا) وہ میرا دوست، میرے بعد میرا وصی اور میرے خاندان میں میرا جانشین ہوگا، وہ میرا قرض ادا کرے گا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس استفسار پر سب خاموش ہوگئے۔آپؐ نے تین بار اپنی بات کو دہرایا سب اسی طرح خاموش رہے لیکن علیؑ نے کہا: میں یہ کام کروں گا۔پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم ہی یہ ہوگے۔لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور حضرت ابوطالب سے کہنے لگے کہ اب اپنے بیٹے علیؑ کی اطاعت کرو کیونکہ محمدؐ نے اسے تمہارا امیر بنا دیا ہے۔[1]

شواہد التنزیل کے حاشیے پر یہ حدیث عبد اللہ بن عباس اور اسی طرح ابو رافع سے بھی نقل ہوئی ہے۔شواہد التنزیل میں ''خصائص نسائی'' سے نقل ہوا ہے کہ ربیعہ بن ناجذ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے علیؑ سے پوچھا کس دلیل کی بنا پر آپ (اپنے چچا زاد رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے) وارث بنے ہیں؟ نہ کہ تمہارے چچا (اصولی طور پر تو وہ حقدار تھے؟) علیؑ نے اس کے جواب میں یوم الانذار کا واقعہ بیان کرتے ہوئے یہاں تک فرمایا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] شواہد التنزیل جلد ۱، صفحہ ۴۲۰ (خلاصہ کے ساتھ) مجمع البیان، جلد ۷ اور ۸، صفحہ ۲۰۶۔

اَیُّکُمْ یُبایعُنِی عَلٰی اَنْ یَکُونَ اَخی و صاحِبی وَ وَارِثی

تم میں سے کون اس بات پر میری بیعت کرتا ہے کہ وہ میرا بھائی، میرا دوست اور میرا وارث ہوگا۔

کسی نے بھی حامی نہیں بھری، میں کھڑا ہوا حالانکہ ان سب سے میں چھوٹا تھا آنحضرتؐ نے فرمایا: جاؤ، تیسری مرتبہ ہوا جب (میرے علاوہ کسی نے آپؐ کا جواب نہ دیا) تو رسول خدا ﷺ نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر مارا اور پھر فرمایا: اس بنا پر میں نے چچازاد بھائی کو اپنا وراث بنایا ہے نہ اپنے چچا کو"[۱]

نامور مورخ طبری نے بھی اسی حدیث کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اس کے نیچے وہ بیان کرتا ہے کہ پیغمبرؐ نے علیؑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: اِنَّ هذا اَخی و وصیّی وَخَلِیفَتِی فِیکم فَاسْمَعُو لَهُ وَاَطِیْعُوهُ۔ یعنی: یہ میرا بھائی، میرا وصی اور تمہارے درمیان میرا خلیفہ ہے اس کی بات سنو اور اس کی اطاعت کرو۔" یہ سن کر لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور ہنسنے لگے اور ساتھ حضرت ابو طالب سے کہنے لگے: محمدؐ نے حکم دیا ہے کہ اپنے بیٹے کے فرمان سنو اور اس کی اطاعت کرو۔[۲]

اس کے بعد اس واقعہ کو طبری نے اور ذرائع سے بھی نقل کیا ہے۔ قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ اسی طبری جو اہل سنت کے بڑے مفسر اور مورخ ہیں، نے اپنی "تاریخ" میں یوم الانذار کے واقعے کو اس طرح سے بیان کیا ہے لیکن جب تفسیر لکھتے ہیں (توجہ رہے کہ تاریخ کے علاوہ طبری کی ایک ۳۰ جلدوں پر مشتمل مفصل تفسیر کی کتاب ہے) اور اس آیت پر پہنچتے ہیں اور مذکورہ داستان کو نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: اَیُّکُمْ یُوازِرُنی عَلیٰ هذا الاَمْرِ عَلٰی اَنْ یَکُونَ اَخی و کذا و کذا ... یعنی: علیؑ نے عرض کیا: اَنَا یا نبِیَّ اللهِ اَکُونُ وَزِیْرَکَ ... پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا: اِنَّ هذا اَخِی و کذا و کذا۔[۳]

جیسا کہ آپ نے دیکھا اس نامور مفسر نے "وَصیّی و خلیفتی فِیکم" (علی میرا وصی اور تمہارے درمیان میرا خلیفہ ہے) کے الفاظ کی بجائے کذا و کذا (ایسا ایسا ہے) کو استعمال کیا ہے اور اس عمل کو دو مرتبہ دہرایا ہے مبادا "وصی و خلیفہ" کے الفاظ مکتب اہل بیت کے پیروان کے ہاتھوں لگ جائیں اور اسے وہ علیؑ کی خلافت پر بطور دلیل پیش کریں اور طبری اور اس طرح کے افراد کے متعصب افکار اور نظریات مشکوک ہو جائیں۔ کیا تحریر میں امانت داری کا یہی مطلب ہے؟ احادیث نبویؐ کو بیان کرنے کا یہی طریقہ ہے؟

کیا انہیں یہ خیال نہیں آیا کہ ایک دِن ان کی تاریخ کی کتاب کی عبارت کو ان کی تفسیر کے سامنے رکھا جائے گا اور ان کا موازنہ کیا جائے گا اور فیصلہ کیا جائے گا؟ یہ بات ضرور مدنظر رہے کہ اس کام میں طبری اکیلا نہیں ہے اس طرح کے کام بہت سے افراد نے کیے ہیں، اور کر رہے ہیں۔ روح المعانی میں آلوسی نے بھی اس روایت کو ناقص اور نامکمل نقل کیا ہے، اس کے بعد وہ لکھتے ہیں: ان میں سے بعض روایات سے شیعوں نے اپنے مطالب یعنی خلافت کے مسئلہ پر استدلال کیا ہے۔ لیکن ان روایات کی تاویل اور توجیہہ کرنی چاہیے یا پھر یہ کہا جائے

---

[۱] تعلیقات شواہد التنزیل جلد ۱، صفحہ ۴۲۳

[۲] تاریخ طبری، جلد ۲، صفحہ ۶۳ (مطبوعہ بیروت)

[۳] تفسیر جامع البیان، طبری، جلد ۱۹، صفحہ ۷۵ (سورہ شعراء آیت ۲۱۴ کی تفسیر میں)

کہ یہ جعلی اور ضعیف روایات ہیں۔[1]

اس مفسر کی سوچ کتنی عجیب ہے؟ کہتے ہیں کہ چونکہ ان روایات کا فائدہ شیعہ کو ہوتا ہے اس لیے ان کی تاویل کی جائے یا پھر انہیں ضعیف قرار دیا جائے یا جعلی سمجھا جائے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ فیصلے کی بنیاد تاریخی واقعات، قرآن اور حدیث نہیں ہے بلکہ بنیاد پہلے سے طے شدہ افکار ہیں اور جو بھی مطلب اس کے خلاف ہو آنکھیں بند کر کے اُسے ضعیف قرار دے دیا جائے یا اس کی توجیہہ کر دی جائے۔ بدیہی ہے کہ ایسی صورت حال میں اگر تمام انبیاء اور آسمانی کتب اکٹھی ہو جائیں وہ اس قسم کی سوچ اور طرز فکر رکھنے والے افراد کی سوچ میں تبدیلی نہیں لا سکتے اور اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔

اہل سنت کے آئمہ اربعہ میں سے ایک احمد بن حنبل ہیں ان کی مشہور کتاب ''مسند احمد'' ہے اس میں انہوں نے یوم الانذار کے واقعہ کو درج کیا ہے وہ بیان کرتے ہوئے یہانتک پہنچتے ہیں کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا: کون ضمانت دیتا ہے کہ میرا قرض ادا کرے گا اور میرا وعدہ پورا کرے گا اور وہ میرے ساتھ بہشت میں ہوگا اور میرے خاندان میں میرا جانشین ہوگا، آخر کار علیؑ نے اسے قبول کیا اور عرض کیا میں اس ذمہ داری کو انجام دوں گا۔[2]

ابن ابی الحدید معتزلی (اسی حدیث کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو علیؑ کے وزیر ہونے کو ثابت کرتی ہے) کہتے ہیں کہ وزارت والی روایت کو طبری نے اپنی تاریخ میں عبد اللہ بن عباس کے ذریعے علی بن ابی طالبؑ سے بیان کی ہے کہ جب آیت: '' وَ اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ... نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے علیؑ کو بلایا۔۔۔اس کے بعد وہ تفصیل سے واقعے کو بیان کرتے ہوئے تک یہاں پہنچتے ہیں کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا: قَدْ اَمَرَنِيَ اللهُ اَنْ اَدْعُوكُمْ اِلَيْهِ، فَاَيُّكُمْ يُوَازِرُنِي عَلٰى هٰذَا الْاَمْرِ عَلٰى اَنْ يَكُوْنَ اَخِيْ وَ وَصِيِّيْ وَ خَلِيفَتِي فِيكُمْ۔ یعنی: ''اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں اس (کے دین) کی طرف دعوت دوں تم میں سے کون اس کام میری مدد کرے گا تا کہ وہ میرا بھائی، وصی اور تمہارے درمیان میرا جانشین قرار پائے۔'' علیؑ نے عرض کیا: اَنَا يَا رَسُوْلَ اللهِ اَكُوْنُ وَزِيْرَكَ عَلَيْهِ۔ یعنی: ''اے رسول خدا! میں اس کام میں آپ کا ہاتھ بٹاؤں گا اور مدد کروں گا'' اس پر پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا: ''هٰذَا اَخِيْ وَوَصِيِّيْ وَخَلِيْفَتِيْ فِيْكُمْ۔ یعنی: ''یہ میرے بھائی، وصی اور تمہارے درمیان میرے خلیفہ ہیں۔''[3]

قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ اس روایت اور بعض گزشتہ روایات میں ''خليفتي فيكم '' (تمہارے درمیان میرا خلیفہ) کے الفاظ آئے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسری روایات میں جو 'اَھل' (میرے خاندان) کے لفظ آیا ہے اُس کا بھی یہی معنی (تمہارے درمیان) ہے (غور کیجیے گا) ابن اثیر[4] نے اپنی کتاب کامل میں اس واقعے کو بطور مفصل ذکر کیا ہے (بہت سارے محدثین اور مورخین سے زیادہ

---

[1] روح المعانی، جلد ۱۹، صفحہ ۱۳۶ (مذکورہ آیت کی تفسیر)

[2] مسند احمد، جلد ۱، صفحہ ۱۱۱ (کچھ اختصار کے ساتھ)

[3] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید: جلد ۱۳، صفحہ ۲۱۰۔

[4] ابن ایثر ساتویں صدی ہجری کے مشہور مورخ ہیں ان کی تاریخ کی کتاب ۱۳ جلدوں پر مشتمل ہے۔

تفصیل کے ساتھ) لکھتے ہوئے وہ یہاں پہنچتے ہوئے کہتے ہیں:

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اَیُّکُمْ یُوازِرُنی عَلٰی هذا الْاَمرِ عَلٰی اَنْ یَّکُونَ اَخِی وَوَصِیِّی وَخَلِیْفتی فِیْکُمْ۔ یعنی: تم میں سے کون اس کام میں میری مدد کرے گا تا کہ وہ میرا بھائی، میرا وصی اور تمہارے درمیان میرا جانشین قرار پائے۔ جب تمام افراد نے نفی میں جواب دیا یا خاموش رہے تو علیؑ نے عرض کیا: اَنَا یانبیّ الله ا کونُ وزیرك عَلَیْهِ۔ اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اِنَّ هذا اَخی ووصِیتی وخَلِیْفتی فِیْکُمْ فاسْمعُوا لَهُ واَطیعوُا[1]

دلچسپ نکتہ یہ ہے کہ اس حدیث میں بھی "خلیفتی فِیکم" (تمہارے درمیان میرا خلیفہ) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

درحقیقت یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات میں سے ایک معجزہ ہے کہ اس دِن جب علیؑ صرف تیرہ سال کے تھے آنحضرتؐ نے قاطعیت کے ساتھ ان سے یہ جملہ ارشاد فرمایا۔ اس امر کی کون پیشگوئی کر سکتا تھا کہ آج کا تیرہ سالہ بچہ کل کو عالم انسانیت کی بہت بڑی شخصیت بنے گا اور رسول خداؐ کی خلافت اور جانشینی کا حقدار اور لائق ہوگا، اور سب لوگوں کو ان کے احکامات سننا پڑیں گے۔ اور ان کی اطاعت کرنا پڑے گی۔ اس سے بھی اہم نکتہ یہ ہے کہ اس بات کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی دعوت کے اوائل میں بھی یوم الانذار، میں ارشاد فرمایا اور اپنی حیات مبارکہ کے آخری مہینوں میں غدیر خم کے میدان میں بھی بیان فرمایا۔ کیا یہ بات علیؑ کی امامت پر بہترین دلیل نہیں ہے۔

[1] کامل: جلد ۲ صفحہ ۶۳ (مطبوعہ دار الصادر، بیروت)

۱۶۔آیت مرج البحرین

سورہ رحمن کی آیت نمبر ۱۹ تا ۲۲ میں ارشاد الٰہی ہے:

مَرَجَ الۡبَحۡرَیۡنِ یَلۡتَقِیٰنِ ﴿۱۹﴾ بَیۡنَہُمَا بَرۡزَخٌ لَّا یَبۡغِیٰنِ ﴿۲۰﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ﴿۲۱﴾ یَخۡرُجُ مِنۡہُمَا اللُّؤۡلُؤُ وَ الۡمَرۡجَانُ ﴿۲۲﴾

''اللہ نے دوسمندروں کو جاری کیا کہ آپس میں مل جائیں تاہم ان دونوں کے درمیان ایک آڑ ہے جس سے وہ ایک دوسرے پر غالب نہیں آتے پس تم اپنے رب کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے۔ان سمندروں سے موتی اور مونگا نکلتے ہیں۔''

ان آیات کی تفسیر میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔تفسیر نمونہ میں اس بارے میں ہم نے بہت ساری ابحاث کی ہیں۔کبھی اس کے متعلق کہا گیا ہے کہ دوسمندروں سے مراد میٹھے اور نمکین پانی کے دوسمندر ہیں جو کہ بہت سے علاقوں میں ایک دوسرے کے ساتھ ہیں لیکن آپس میں مخلوط نہیں ہوتے اور یہ منظر ہراس جگہ پر دیکھا جاسکتا ہے جہاں میٹھے پانی کے دریا سمندر میں گرتے ہیں۔

ان دوسمندروں کے لیے ایک اور دلچسپ تفسیر بیان کی گئی ہے۔یعنی گلف اسٹریم اور سمندری دریا۔جو کہ عالمی سمندروں میں جاری وساری ہیں۔یہ استوائی علاقوں کے گرم پانی کو قطبی علاقوں کے طرف لے جاتے ہیں ان کا رنگ اردگرد کے پانی سے مختلف ہوتا ہے۔کبھی کبھی ان کا عرض ایک سو پچاس کلومیٹر اور گہرائی چند سو کلومیٹر تک ہوتی ہے کبھی کبھار ان کی رفتار ایک دن میں ۱۶۰ کلومیٹر تک پہنچ جاتی ہے ان کا اردگرد کے پانیوں سے ۱۰/۱۵ درجے تک درجہ حرارت کا فرق ہوتا ہے۔

گرم پانیوں کا یہ بہاؤ گرم ہواؤں کو جنم دیتا ہے اور اپنی حرارت اردگرد میں تقسیم کرتا ہے اور اس کے راستے میں آنے والے زمین کے شمالی ممالک کی آب وہوا کو قابل برداشت بنادیتا ہے اگر سمندری دریاؤں کا یہ بہاؤ اور سلسلہ نہ ہوتا تو قطب شمالی کے نزدیک ان ممالک میں زندگی گزارنا ناقابل برداشت یا انتہائی سخت ہوتا۔البتہ ''گلف اسٹریم'' ان میں ایک سمندری دریا اور بہاؤ کا نام ہے، اور دیگر پانچ براعظموں کے سمندروں میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔اس بہاؤ کا اصلی سبب خط استوائی پر موجود علاقوں کا قطبی علاقوں کے درمیان درجہ حرارت کا فرق ہے۔

مذکورہ آیات کی تفسیر اور مذکورہ موضوع کے بارے میں مزید تفصیل جاننے کے لیے تفسیر نمونہ رجلد ۲۳ اور صفحہ ۱۳۱ کا مطالعہ کریں۔جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ قرآن کا ایک ظاہر ہوتا ہے اور ایک باطن ہوتا ہے اس لیے کبھی اس کی تفسیر مادی چیزوں سے کی جاتی ہے اور کبھی معنوی تفسیر کی جاتی ہے۔اسلامی روایات میں ان دو بحروں کی معنوی تفسیر علیؑ اور فاطمہ زہراؑ اور لوءلوء ومرجان کی معنوی تفسیر حسنؑ اور حسینؑ سے کی گئی ہے۔

شواہدالتنزیل میں جناب سلمان فارسی سے ''مَرَجَ البحرین یلتقیان'' کی تفسیر کے متعلق یوں نقل ہوا ہے: اس سے مراد علیؑ اور فاطمہ زہراؑ ہیں۔ وہ مزید بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''یَخْرُجُ مِنْهُمَا اللّؤلُؤ وَالمَرْجان'' سے مقصود حسنؑ اور حسینؑ ہیں۔[1] یہی بات ابن عباس اور ضحاک سے ایک اور سند سے بھی بیان ہوئی ہے۔[2]

ایک اور حدیث میں سعید بن جبیرہ کے ذریعے ابن عباس سے نقل ہوا ہے کہ ''مَرَجَ البَحْرَیْنِ یلتقیان'' سے مراد علیؑ اور فاطمہ زہراؑ ہیں اور ''بینهما برزخ لایبغیان، حُبٌّ دائِمٌ لایَنْقَطِعُ وَ لایَنْفَدُ'' سے مراد ایسی دائمی محبت ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتی اور نہ ہی ٹوٹتی ہے۔ اور ''یَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤلُؤ وَ المَرْجَان'' سے مقصود حسنؑ اور حسینؑ ہیں۔[3]

ابن عباس سے منقول ایک دوسری حدیث میں ''بَیْنَهُما برزخ لایبغیان'' کے بارے میں بڑے واضح الفاظ آئے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ وُدًّا لا یتباغضانِ۔ یعنی ان دو ہستیوں کے درمیان ایسی محبت ہے جو ہر قسم کے بغض و کینہ کو دور کر دیتی ہے۔[4]

''الدر المنثور'' جو کہ روائی تفسیر ہے اس میں جلال الدین سیوطی نے اس آیت کی ظاہری تفسیر کے بارے میں روایات نقل کرنے کے بعد مذکورہ بالا احادیث کے مفہوم کو ابن عباس کے ذریعے آنحضرتؐ سے بیان کیا ہے۔ وہ نقل کرتے ہیں کہ ابن مردویہ نے ابن عباس سے آیت مَرَجَ البَحْرَیْنِ یلتقیان کی تفسیر بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس سے مراد علیؑ اور فاطمہ زہراؑ ہیں۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ: ''یَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُؤلُؤ وَ المَرْجان'' سے مراد حسنؑ اور حسینؑ ہیں۔[5] انہوں نے اسی مطلب کو انس بن مالک سے بھی بیان کیا ہے۔[6]

قابل توجہ بات یہ ہے کہ نامور مفسر آلوسی نے تفسیر ''روح المعانی'' میں مذکورہ بالا روایت کو ابن عباس اور انس بن مالک سے اور اسی طرح طبرسی کی سند سلمان فارسی، سعید بن جبیر اور سفیان ثوری سے نقل کرنے کے بعد یوں لکھا ہے: جو میں سوچتا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر یہ روایات صحیح بھی ہوں تو ان کا تفسیر سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ بہت ساری آیات کے بارے میں صوفیوں کی تاویلات کی طرح ایک تاویل ہے البتہ میرے نزدیک علی اور فاطمہ (رضی اللہ عنہما) علم و فضل کے اعتبار سے دنیا کے ہر بڑے سمندر سے بڑے ہیں اسی طرح حسین (رضی اللہ عنہما) میں سے ہر ایک لوءلوء مرجان سے کئی گنا زیادہ خوبصورت، زیبا اور دلکش ہیں۔[7]

---

[1] شواہدالتنزیل جلد ۲، صفحہ ۲۰۹ (حدیث ۹۱۹)

[2] ایضا صفحہ ۲۰۸

[3] ایضا صفحہ ۲۱۰

[4] ایضا صفحہ ۲۳۰

[5] الدر المنثور جلد ۶، صفحہ ۱۴۳

[6] ایضا صفحہ ۱۴۳

[7] روح المعانی، جلد ۲۷، صفحہ ۹۳ (مذکورہ)

ان عظیم ہستیوں کے مقام و مرتبے کے بارے میں ان کا سچا اعتراف قابل تحسین ہے۔اس شرط کے ساتھ کہ مقصد مذکورہ بالا روایات کی اہمیت اور قدر و قیمت کم کرنا نہ ہو۔شاہد آلوسی بھول گئے ہیں کہ یہ حدیث متعدد طرق سے رسالتمآبؐ سے نقل ہوئی ہے اور آنحضرتؐ کو آیات کی تاویل بیان کرنے کا پورا اختیار اور حق حاصل ہے۔اس کا صوفیوں کے منحرف افکار اور بے بنیاد تاویلوں کے ساتھ موازنہ کرنا سراسر ظلم اور ناانصافی ہے اور ایک عالم سے ایسی بات بعید ہے۔

بہرحال یہ آیت بھی دیگر آیات کی طرح علیؑ ان کی زوجہ اور ان کے بیٹوں حسنؑ اور حسینؑ کی غیر معمولی فضیلت اور عظیم مقام و منزلت پر دلالت کرتی ہے۔کیونکہ اس آیت میں علیؑ اور فاطمہؑ کو دو عظیم سمندروں سے تشبیہ دی گئی یہ ایسے بحر عظیم جو اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلالت کی نشانی، برکات کا سرچشمہ، علوم و حکمت کا منبع، کریمانہ اخلاق کا واضح نمونہ، پیکر جود و سخا اور عصمت و طہارت کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔آیت ان کے فرزندوں کو ایسے قیمتی اور بے مثل جواہر سے تشبیہ دے رہی ہے جو سمندر کی تہہ میں پروان چڑھے ہیں اور پھر باہر آئے ہیں، حسن و زیبائی، ظاہری اور باطنی جمال، علم و تقویٰ، فضیلت، عصمت و طہارت غرضیکہ ہر خوبی ان میں موجود ہے۔

اسلام میں یہ تمام فضائل اور کمالات کس شخص میں پائے جاتے ہیں، اور رسول خداؐ کی جانشینی کے لیے علیؑ اور ان کے بیٹوں سے زیادہ کون حقدار اور لائق ہے۔اور کتنی سادگی اور آسانی کے ساتھ ان تمام فضائل کو لوگ نظر انداز کر گئے۔

۱۷۔ آیت نجویٰ

سورہ مجادلہ کی آیت ۱۲ اور ۱۳ میں ارشاد رب العزت ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَاجَیْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ؕ ذٰلِكَ خَیْرٌ لَّكُمْ وَ اَطْهَرُ ؕ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۲﴾ ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ ؕ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَ تَابَ اللّٰهُ عَلَیْكُمْ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳﴾

کیا تم سرگوشیوں سے پہلے صدقہ دینے سے ڈر گئے (کہ غریب ہو جاؤ گے) اب جب تم نے ایسا نہیں کیا اور اللہ نے تمہیں معاف کر دیا ہے تو تم نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیا کرو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کیا کرو اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے خوب آگاہ ہے۔

ان دو آیات میں موجودہ قرائن اور اسی طرح جو شان نزول ان کے بڑے بڑے مفسرین نے نقل کیے ہیں جیسے طبرسی مرحوم نے مجمع البیان میں، فخر رازی نے تفسیر کبیر میں، قرطبی نے تفسیر الجامع الاحکام القرآن میں، آلوسی نے روح المعانی میں، اور دیگر علماء، ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بعض مسلمان (بعض مفسرین کے بقول بعض مالدار اور دولتمند افراد) لوگوں کے درمیان اپنی اہمیت جتانے اور بڑھانے کے لیے ہر چھوٹی بڑی بات کو آنحضرتؐ کے ساتھ سرگوشی اور راز داری کے انداز میں کرتے تھے۔ اس حقیقت سے بالکل بے خبر کہ رسول اللہ کا وقت اس سے زیادہ قیمتی ہے کہ اس طرح کی معمولی اور فضول مسائل میں ضائع ہو اور صرف ایک شخص اس سے استفادہ کرے۔ علاوہ ازیں یہ بات غریب افراد کے لیے تکلیف کا باعث بھی تھی اور مالداروں کے لیے باعث فخر بھی تھی اور بعض اوقات سوءِ ظن کا موجب بن جاتی تھی۔

مندرجہ بالا دو آیات میں سے پہلی آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ اگر تم پیغمبر اکرمؐ سے سرگوشی کرنا چاہتے ہو تو پہلے اللہ کی راہ میں صدقہ دو پھر آپؐ سے راز داری سے گفتگو کرو۔ یہ حکم ان کے لیے دلچسپ آزمائش ثابت ہوا اور پیغمبر اکرمؐ سے قربت اور نزدیکی کے دعویداروں کے لیے کسوٹی اور پیمانہ آزمائش بن گیا۔ ایک شخص کے علاوہ باقی تمام افراد نے صدقہ دینے اور سرگوشی کرنے سے احتراز کیا۔ اور وہ ایک علی ابن ابی طالبؑ کے علاوہ کوئی اور نہ تھا۔

یہاں پر جس چیز کا واضح ہونا ضروری تھا وہ روشن ہو گئی، جو چیز مسلمانوں کو سمجھنا چاہیے تھی اور اس سے نصیحت پکڑنا تھی وہ بھی واضح ہو گئی یوں مسلمانوں نے ایک ضروری سبق سیکھ لیا۔ کچھ عرصے بعد دوسری آیت نازل ہوئی اور اس نے اس حکم کو ختم کر دیا اور اس سے معلوم ہوا کہ بعض دلوں میں حضور اکرمؐ سے سرگوشی کرنے سے زیادہ مال کی محبت موجود ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ زیادہ تر یہ سرگوشیاں غیر ضروری مسائل کے متعلق تھیں اور معاشرتی طور پر مقام و حیثیت کو حاصل کرنے کے لیے تھیں۔

یہاں پر متعدد روایات نقل ہوئی ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی اس آیت پر صرف اور صرف علی ابن ابی طالبؑ نے عمل کیا ہے۔ شواہد التنزیل میں مجاہد کے ذریعے علی علیہ السلام سے یوں نقل ہوا ہے کہ انہوں نے فرمایا:

اِنَّ فِی الْقُرآنِ لاٰیَةً ما عَمِلَ بِھا اَحَدٌ قَبْلِی و لا بَعْدِی و ھیَ آیَةُ النّجویٰ قَالَ کَانَ لِی دِیْنارٌ فَبِعْتُہُ بِعَشْرَةِ دَراھِمَ فَکُلَّما اَرَدْتُ اَنْ اُناجِیَ النَّبِی(ص) تَصَدَّقْتُ بِدِرْھَمٍ مِّنْہُ ثُمَّ نُسِخَتْ۔

ترجمہ: قرآن مجید میں ایک آیت ایسی ہے کہ نہ کسی نے مجھ سے پہلے اس پر عمل کیا اور نہ میرے بعد کسی نے عمل کیا اور نہ کرے گا اور وہ آیت نجوی ہے۔ میرے پاس ایک دینار تھا میں نے اس کے بدلے میں دس درہم حاصل کیے جب بھی میں پیغمبر اکرمؐ سے سرگوشی کرنا چاہتا تھا ایک درہم صدقہ دیتا تھا۔ پھر یہ آیت منسوخ ہوگئی۔ [۱]

ایک اور روایت میں ابو یوب انصاری سے نقل ہوا ہے کہ یہ آیت علی علیہ السلام کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور علیؑ نے دس مرتبہ رسول خداؐ سے سرگوشی کی اور ہر دفعہ ایک دینار صدقہ دیا۔ [۲] مذکورہ کتاب میں ہی ایک اور حدیث مجاہد سے بیان ہوئی ہے کہ قرآن میں ایک آیت ہے اس پر علیؑ کے علاوہ کسی نے عمل نہیں کیا ہے یہاں تک کہ وہ آیت منسوخ ہوگئی۔ اور وہ آیت "یاایھا الذین امنو اذا ناجیتم الرسول۔۔۔ ہے۔ انہوں نے رسول خداؐ کے ساتھ سرگوشی کی اور ایک دینار بطور صدقہ دیا۔ [۳] مذکورہ کتاب میں اس کے متعلق متعدد روایات نقل ہوئی ہیں جن کی تعداد دس سے زیادہ ہے۔

نیز جلال الدین سیوطی اپنی روائی تفسیر الدرالمنثور میں اس روایت کو متعدد (سات سے زیادہ) اسناد سے بیان کرتے ہیں، خصوصاً اس نے حاکم نیشاپوری سے ان کے اس اعتراف کے ساتھ کہ یہ حدیث صحیح ہے، علی علیہ السلام سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا ہے کہ قرآن مجید کی ایک آیت ایسی ہے جس پر کسی نے مجھ سے پہلے نہ میرے بعد عمل کیا ہے اور نہ کرے گا۔ اس کے بعد حدیث کے مضمون کو اسی طرح بیان کیا ہے۔ جس طرح شواہد التنزیل سے ہم نے ذکر کیا ہے۔ [۴]

اسی کتاب میں مذکور ہے کہ بہت سے راویان حدیث نے علیؑ سے روایت کی ہے کہ (رسول خداؐ نے اس صدقہ کی مقدار کو مقرر کرنے میں علیؑ سے مشورہ کیا) آنحضرتؐ نے فرمایا: دینار کیسا رہے گا؟ انہوں نے عرض کیا: لوگوں میں اس کی طاقت نہیں۔ آپؐ نے فرمایا:

---

[۱] شواہد التنزیل جلد ۲، صفحہ ۲۳۱، حدیث ۹۵۱

[۲] ایضا، صفحہ ۲۴۰ حدیث ۹۴۶

[۳] ایضا، صفحہ ۲۴۰ حدیث ۹۴۶

[۴] الدرالمنثور جلد ۶ صفحہ ۱۸۵

آدھا دینار کیسا ہے؟ عرض کیا: لوگ اس کی طاقت بھی نہیں رکھتے۔ پھر فرمایا: پس کتنی مقدار مناسب ہوگی۔ انہوں نے عرض کیا: "شَعِیرَة" (ایک جو وزن کے برابر سونا) پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: "اَنَّكَ لَزَهِيدٌ" یعنی: یعنی آپ نے کم مقدار بتائی ہے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ آیت: ءَاَشْفَقْتُمْ... نازل ہوئی اور اس نے سابقہ حکم کو منسوخ کر دیا۔ علیؑ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعے سے اس امت کو رعایت دی اور ان کے بوجھ کو ہلکا کر دیا۔[1]

یہاں پر قابل توجہ حدیث ہے جسے برسوئی نے تفسیر روح البیان میں عبداللہ بن عمر بن خطاب سے نقل کیا ہے کہ اس نے کہا ہے: كَانَ لِعَلِيٍّ عَلَيْهِ السَّلامُ ثَلاثٌ لو كَانَتْ لِي واحِدةٌ مِنْهُنَّ كَانَ اَحَبَّ اِلَيَّ مِنْ حُمُرِ النَّعَمِ تُزْوِيجُهُ فاطمَةَ (سلام الله علیها) وَ اِعْطَاؤُهُ الرَّايَةَ يَوْمَ خَيْبر وَ آيَةُ النَّجْوىٰ۔ یعنی: علی علیہ السلام کے پاس تین فضیلتیں ایسی ہیں اگر ان میں ایک بھی میرے پاس ہوتی تو سرخ بالوں والے کئی اونٹوں سے بہتر ہوتی (عربوں کے درمیان یہ الفاظ اور محاورہ بہت زیادہ قیمتی اور گرانبہا چیزوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اور قیمتی اشیاء کے بیان کرتے وقت بطور ضرب المثل استعمال ہوتا ہے) پہلی فضیلت فاطمہ زہراؑ سے ان کی شادی، دوسری خیبر کے دن پرچم ان کے سپرد اور تیسری آیت نجویٰ۔[2]

نیز زمخشری نے اس حدیث کو تفسیر کشاف میں ذکر کیا ہے۔[3] اسی طرح قرطبی نے تفسیر الجامع لاحکام القرآن، میں اس کو نقل کیا ہے۔[4] طبرسی نے اسے مجمع البیان میں بیان کیا ہے۔[5] درحقیقت عبداللہ بن عمر نے تین حساس مسئلوں پر انگلی رکھی ہے۔ چنانچہ فاطمہ زہراؑ رسول خدا ﷺ کے بقول: سيّدة نِساءِ العالَمِيْنَ مِنَ الاوَّلِيْنَ وَ الآخِرِيْنَ (اوّل سے لے کر آخر تک تمام عالمین کی عورتوں کی سردار) کا علیؑ کے سوا کوئی کفو اور ہمسر نہ تھا علیؑ آنحضرتؐ کے بعد تاریخ انسانیت کے سرِ مین تھے۔ جنگ خیبر کے دن علیؑ کو پرچم دینا اور انہیں کرار غیر فرار کے لقب سے سرفراز کرنا ایک بے مثل فضیلت ہے خصوصا ان حالات میں جب دوسرے افراد جنگ کے لیے گئے لیکن ناکام واپس آئے اور اس عظیم فتح کا سہرا علیؑ کے سر پر سجا۔

اور اسی طرح قرآن مجید میں ایسی آیت کا ہونا جس پر صرف علی علیہ السلام نے عمل کیا ہو، ایسا کمال ہے جس کی دنیا میں نظیر نہیں ملتی۔ عجیب ہے کہ بعض لوگ اس فضیلت کو کم کرنے پر تلے ہوئے ہیں بلکہ اس کے بافضیلت ہونے سے بھی انکار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور اس مقصد کے لیے معمول کے مطابق مختلف حیلوں بہانوں اور بے بنیاد اور کمزور دلائل کا سہارا لیتے ہیں۔

انکا کہنا یہ ہے کہ اگر بڑے بڑے اصحاب کرام نے اس عمل کو انجام نہیں دیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس کام کو ضروری اور اہم نہیں

---

[1] الدر المنثور جلد ۶ صفحہ ۱۸۵

[2] تفسیر روح البیان، جلد ۹، صفحہ ۴۰۶

[3] تفسیر کشاف، جلد ۴، صفحہ ۴۹۴

[4] قرطبی، جلد ۹، صفحہ ۶۴،۷۲

[5] مجمع البیان، جلد ۹، اور ۱۰، صفحہ ۲۵۲

سمجھتے تھے۔ کبھی وہ یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ ان کے عمل کے لیے وقت کافی نہ تھا کیونکہ بہت جلد ہی آیت منسوخ ہوگئی اور کبھی ان کا بہانہ یہ ہوتا کہ دوسرے افراد کی سوچ یہ تھی کہ اگر وہ صدقہ اور سرگوشی کے لیے اقدام کریں تو یہ بات غریبوں کے لیے تکلیف اور امیروں کے لیے پریشانی کا باعث بنے گی، غریب لوگ اس کے انجام پر قادر نہیں ہیں اور مالدار جو صدقہ دینے کی طاقت رکھتے ہیں اگر اس عمل کو انجام نہ دیں تو مورد ملامت قرار پاتے ہیں۔ لہٰذا دوسروں کا عمل نہ کرنا، ان سے کسی فضیلت کے سلب ہونے کا سبب نہیں بنتا۔[1]

لیکن لگتا یوں ہے کہ ان عذر تراشیوں اور حیلوں کو بناتے وقت ان بڑے مفسرین نے دوسری آیت کو فراموش کر دیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید ان سابقہ سرگوشیاں کرنے والوں کی ملامت اور سرزنش کر رہا ہے جنہوں نے صدقے والے حکم کے نزول کے بعد سرگوشی کو ترک کر دیا تھا۔ قرآن فرماتا ہے: ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ یعنی: کیا تمہیں غریب ہونے کا خوف لاحق ہوگیا تھا کہ نجویٰ سے پہلے صدقہ دینے سے تم نے اجتناب کیا۔ اس کے بعد قرآن اسے گناہ کی طرح شمار کرتے ہوئے "وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ" کے جملے کے ساتھ انہیں توبہ الٰہی کا مشمول قرار دیا ہے اور اس برے عمل کے ازالے کے لیے نماز قائم کرنے، زکوٰۃ ادا کرنے اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کا فرمان جاری کرتا ہے۔

اگر وقت تنگ اور ناکافی تھا تو پھر یہ ملامت اور سرزنش کرنے کا مقام نہیں ہے اور نہ ہی اس کے لیے توبہ الٰہی کی ضرورت ہے۔ اگر ان کا مقصد غریبوں کی دلجوئی اور امراء کی پریشانی کو دور کرنا تھا تو یہ اقدام تو قابل قدر اور قابل تشویق تھا پھر کیوں اللہ تعالیٰ نے ان کی سرزنش اور ملامت کی ہے اور توبہ کی بات کی ہے۔ پس اس آیت پر غور و فکر کرنے سے اچھی طرح روشن ہوتا ہے کہ انکا عمل ناپسندیدہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب ایسے معاملات پیش آتے ہیں جو ان برادران کے پہلے سے طے شدہ افکار کے منافی ہوتے ہیں تو تمام باتوں کی یہاں تک کہ آیات قرآنی کو بھی بھلا دیتے ہیں جبکہ وہ ان کی آنکھوں کے سامنے ہوتی ہیں۔

یہاں پر پھر اس فضیلت کی اہمیت کو گھٹانے کے لیے بعض افراد کہتے ہیں کہ آیت اور اس کے منسوخی کے درمیان صرف ایک گھنٹے کا وقفہ تھا اسی وجہ سے بڑے بڑے صحابہ اس پر عمل نہ کر سکے۔ یہ بھی انہیں بھلانے والوں میں شامل ہیں جنہوں نے ناسخ آیت کے لحن اور لب ولہجہ پر غور نہیں کیا ہے کیونکہ ایسی آیت جو ایسے افراد کی ملامت کر رہی ہے جنہوں نے غربت اور فقر کے ڈر سے صدقہ نہیں دیا اور سرگوشی سے چشم پوشی کر لی ہے۔ اور اب اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ کو قبول فرمایا ہے۔ اگر ان دو آیتوں کے درمیان وقفہ صرف ایک گھنٹے کا ہوتا تو اس قسم کی باتوں کی قطعاً کوئی گنجائش نہ تھی بنا برایں مناسب یہی لگتا ہے کہ وہ روایت صحیح ہے جو کہہ رہی ہے کہ ان دو آیتوں کے درمیان دس دن کا فاصلہ تھا۔[2]

---

[1] کبیر فخر رازی، جلد ۲۹، صفحہ ۲۷۲ اور تفسیر روح المعانی، جلد ۲۸، ص ۲۸

[2] تفسیر روح المعانی میں یہ قول مقاتل سے نقل ہوا ہے جو منصور دوانیقی کا ہم عصر اور تابعین کا شاگرد ہے۔

سوال

یہاں پر صرف ایک سوال باقی رہ جاتا ہے یہ کام کس طرح فضیلت شمار ہوتا ہے؟ کیا ایسا ہے جیسا کہ بعض متعصب مفسرین نے کہا ہے کہا اس عمل کو انجام دینا نہ کوئی فضیلت تھی اور نہ ہی انجام نہ دینا کوئی نقص یا کمی تھی یا یہ پھر بات درست ہے جیسا کہ اسلامی روایات میں آیا ہے کہ علی علیہ السلام اسے اپنے لیے بہت بڑا افتخار سمجھتے تھے اور عبداللہ بن عمر نے اس کو فاطمہ زہراؑ سے شادی اور فتح خیبر کے برابر تصور کیا ہے؟

جواب

اس سوال کا جواب گذشتہ باتوں سے واضح ہو چکا ہے۔ یہاں پر ہم صرف ایک بات کا اضافہ کریں گے اور وہ یہ ہے کہ اس سوال کا جواب حاصل کرنے کا بہترین طریقہ خود قرآن کی طرف رجوع کرنا اور آیت ناسخ (دوسری آیت) میں غور وفکر کرنا ہے۔ یہ آیت بتارہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اس حکم کے ذریعے مسلمانوں کا امتحان لینا چاہتا تھا کہ وہ پیغمبر اسلام سے نجوی (سرگوشی) کے لیے کوئی چیز خرچ کرنے کے لیے اور راہ خدا میں صدقہ دینے کے لیے تیار ہیں؟ نجوی جس کے بارے میں ان کا دعویٰ تھا کہ وہ مسلمانوں کے مفاد کے لیے ہوتا تھا۔ یہاں پر صرف ایک شخص امتحان الٰہی میں کامیاب ہوا اور وہ علی بن ابی طالبؑ تھے کیا یہ بڑے فخر کی بات نہیں ہے؟ دوسرے الفاظ میں آیت میں موجود ملامت وسرزنش اور توبہ دیگر افراد کے شامل حال ہوئی اس ملامت، سرزنش اور توبہ سے صرف ایک شخص علیؑ مستثنیٰ ہوئے۔ نہیں معلوم کیوں بعض علماء روز روشن کی طرح ظاہر حقائق کا انکار کرتے ہیں۔ شاید آپ بتا سکیں اس کی وجہ کیا ہے؟

۱۸۔آیت سابقون

سورہ واقعہ کی آیات نمبر ۱۰ تا ۱۴ میں ارشاد ہوتا ہے:

وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ﴿۱۰﴾ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿۱۱﴾ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۱۲﴾ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۳﴾ وَقَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۴﴾

اور سبقت لے جانے والے تو آگے بڑھنے والے ہی ہیں۔ یہی وہ مقرب لوگ ہیں نعمتوں سے مالا مال جنتوں میں ہوں گے ایک جماعت سابقہ امتوں میں سے ہے اور تھوڑے لوگ آخری امت میں سے ہوں گے۔

شواہد التنزیل میں حاکم حسکانی نے ابن عباس سے یوں نقل کیا ہے:

السُّبَّاقُ ثلاثه، سَبَقَ يُوشَعُ بْنُ نَونٍ اِلٰی مُوسٰی، و سَبَقَ صَاحِبُ يٰاسِين اِلٰی عِيسٰی وَ سَبَقَ عَلِيٌّ اِلٰی النَّبِيِّ۔

(ایمان میں) سبقت لے جانے والے تین ہیں: یوشع نے موسیٰؑ پر ایمان لانے میں سبقت کی صاحب یاسین (حبیب نجار) نے عیسیٰؑ کے متعلق اور علیؑ نے رسول خداؐ کے متعلق (ایمان لانے میں) سبقت دکھائی۔ [1]

مذکورہ کتاب میں ابن عباس ہی سے بیان ہوا ہے کہ میں نے اس آیت کی تفسیر کے بارے میں آنحضرتؐ سے پوچھا: آپؐ نے فرمایا: حَدَّثَنِي جَبْرَئِيلُ بِتَفْسِيرِهَا. قال ذاك عَلِيٌّ وَ شِيعَتُهُ اِلَى الْجَنَّةِ۔ یعنی: اس آیت کی تفسیر جبرئیل نے مجھے بیان کی ہے اور کہا ہے کہ یہ علیؑ اور ان کے شیعوں کی طرف اشارہ ہے جو جنت میں جانے میں سبقت لینے والے ہیں۔ [2] ان دو تعبیروں کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے کیونکہ علیؑ پیغمبر اکرمؐ پر ایمان لانے میں بھی سبقت لینے والے اور بہشت جانے میں بھی آگے آگے ہوں گے۔ درحقیقت ان دو چیزوں میں گہرا اور نہ ٹوٹنے والا تعلق ہے۔ اسی کتاب میں اس بارے میں چند اور حدیثیں بھی ذکر ہوئی ہیں۔

تفسیر الدر المنثور میں بھی دو روایتیں ابن عباس سے نقل ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک میں ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ، ابن عباس سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کرتے ہیں کہ یوشع بن نون جو (سب سے پہلے) حضرت موسیٰؑ پر ایمان لائے اور مومن آل یٰسین

---

[1] شواہد التنزیل، جلد ۲، صفحہ ۲۱۳، حدیث ۹۲۳

[2] ایضا، جلد ۲، ۵۱۲، ۶۱۲، حدیث ۷۲۹

(سب سے پہلے) حضرت عیسیٰ ؑ پر اور علیؑ بن ابی طالب ؑ سب سے پہلے رسول خداؐ پر ایمان لائے۔[۱] اسی کتاب میں اس مضمون پر مشتمل اور حدیث بھی بیان ہوئی ہے۔[۲]

ان کے علاوہ جن افراد نے اس روایت کو نقل کیا ہے ان میں سے ابن مغازلی (ابن بطریق کے نقل کے مطابق) نے کتاب "العمدہ" میں، سبط بن جوزی نے تذکرہ میں، ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں، ابن حجر نے صواعق میں، علامہ شوکانی نے فتح القدیر میں اور شیخ سلیمان قندوزی نے ینابیع المودۃ میں، قابل ذکر نام ہیں۔[۳]

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ قاضی روزبھان جو کہ امامت وخلافت کے مسائل میں خاص تعصب رکھتے ہیں اور ان کی کتاب ''ابطال نہج الحق'' اس مطلب پر گواہ ہے۔ (علامہ حلّی اپنی کتاب میں اہل سنت کے ذرائع سے ابن عباس سے نقل کرتے ہیں: سابِقُ هٰذِهِ الاُمَّةِ عِلِیّ بن ابی طالِبِ۔ یعنی: (اس امت میں سابق الایمان علی بن ابی طالب ؑ ہیں) جب وہ اس آیت کے بارے میں علامہ حلّیؒ کا جواب دینے لگتے ہیں تو وہ اپنی کتاب ''ابطال نہج الحق'' میں یوں لکھتے ہیں: یہ حدیث اہل سنت کی روایات میں آئی ہے لیکن ان الفاظ کے ساتھ: سُبَّاقُ الاُمَّةِ ثلاثةٌ: مُومِنُ آلِ فِرْعُونَ وَ حَبیبُ النَّجّارِ وَ عَلِیُّ بن ابی طالبِ۔ یعنی: امت کے سبقت لینے والے تین ہیں: ''ایک مؤمن آل فرعون، دوسرے حبیب نجار اور تیسرے علی ابن ابی طالب۔'' وہ مزید لکھتے ہیں: اسمیں کوئی شک نہیں کہ علیؑ اسلام میں پہل کرنے والے ہیں اور ان کے کارنامے اور فضائل بے شمار ہیں لیکن یہ چیزیں انکی (بلافصل) امامت کی نص پر دلیل نہیں بن سکتیں۔[۴]

یہ بات پیش نظر رہے کہ کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ صرف اور صرف یہ احادیث علی بن ابی طالب ؑ کی بلافصل امامت پر نص ہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ جب ان آیات اور روایات کو ایک ساتھ ملا کر دیکھیں گے تو یہ مطلب سامنے آتا ہے کہ علی بن ابی طالب ؑ، امت اسلامی کے اعلیٰ ترین اور اہم ترین فرد ہوتے ہوئے اس مقام ومنصب کے قابل ٹھہرے ہیں اور اس میدان میں کوئی بھی ان کا ثانی اور برابری کرنے والا نہیں ہے۔ کیا ان تمام ناقابل انکار فضائل کے ہوتے ہوئے دوسروں کو ان پر مقدم کرنا جائز ہے اور کیا انکی موجودگی میں کسی دوسرے کو ترجیح دینا مناسب ہے؟ اس گفتگو کو دس نکات ذکر کرکے پایہ تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔

۱۔ ''قلیل من الاخرین'' سے مراد کون؟

گزشتہ آیات کے تسلسل میں قرآن سابقون کے بلند واعلیٰ مقام ومنزلت کرنے کہ وہ دربار الٰہی کے مقربان ہیں اور ان کا ٹھکانہ نعمتوں سے مالا مال جنت ہے کو بیان کرنے کے بعد مزید فرماتا ہے: ثُلَّةٌ مِنَ الاوّلِیْنَ وَقلیل مِنَ الاخِرِیْنَ (واقعہ ۱۳ اور ۱۴)

---

[۱] الدر المنثور جلد ۶، صفحہ ۱۵۴

[۲] ایضا

[۳] احقاق الحق، جلد ۳، صفحہ ۱۱۴ تا ۱۲۰۔

[۴] اس کی عبارت کو احقاق الحق نے بعینہ تیسری جلد کے صفحہ ۱۲ پر نقل کیا ہے۔

یعنی: ایک جماعت گزشتہ امتوں میں سے ہے اور بہت کم آخری زمانے (اسلامی امت) میں سے ہیں۔ حاکم حسکانی شواہد التنزیل میں کئی احادیث محمد بن فرات، محمد بن سہل اور علی بن عباس کے ذریعے جعفر بن محمد سے نقل کرتے ہیں کہ ''قلیلٌ مِنَ الا خرین'' سے مراد علی بن ابی طالبؑ ہیں۔[1]

اس آیت کا بدیہی مفہوم یہ نہیں ہے کہ اس امت کے جنتی صرف وہی ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان میں سبقت لینا ایک اعلیٰ وارفع مقام ہے جو بہشت میں اور جوار الٰہی میں بھی بلند ترین مقام کا تقاضا کرتا ہے ان میں خصوصی فرد (پیغمبر اسلام کے بعد) علی بن ابی طالبؑ ہیں۔ اسی دلیل کی بنا پر اس سورت کی بعد والی آیات میں جنتیوں کی ایک اور جماعت (اصحاب الیمین) کے مقامات اور نعمات کا تذکرہ کرتے ہوئے آخر میں ارشاد ہوتا ہے: ثُلَّةٌ مِنَ الاوّلِیْنَ و ثُلَّةٌ مِنَ الاخِرِیْنِ یعنی: ایک جماعت سابقہ امتوں میں سے اور ایک جماعت آخری (امت محمدیؐ) میں سے ہے۔ واضح سی بات ہے کہ اصحاب یمین اگر چہ بہشتی ہیں لیکن سابقین جو کہ مقربین ہیں کے درجے تک نہیں پہنچتے۔

۲۔ پہلا مسلمان کون تھا؟

اہم بحث یہ ہے کہ ''اَوَّلُ مَنْ آمَنَ'' (سب سے پہلے رسول اللہؐ پر ایمان لانے والا اور آپؐ کے دست مبارک پر بیت کرنے والا) کون تھا؟ ساری اسلامی امت اس بات پر متفق ہے کہ عورتوں میں سے حضرت خدیجہ (س) پہلی شخصیت ہیں جو آنحضرتؐ پر ایمان لائیں مردوں میں سے کس نے پہل کی، اگر چہ بہت سے افراد اس مسئلے کو پیچیدہ اور قابل بحث بنانے پر زور دیتے ہیں، لیکن احادیث اور تاریخ کے مطالعے سے مجموعی طور پر ایک غیر جانبدار شخص کے لیے کوئی شک وشبہہ باقی نہیں رہ جاتا کہ مردوں میں سب سے اولین شخص علی بن ابی طالبؑ تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے پیغمبر اکرم ﷺ کی تصدیق کی، سب سے پہلے آنحضرتؐ کی بیعت کی سب سے پہلے آپؐ کے ساتھ نماز پڑھی اور رکوع و سجود بجالائے۔

اس موضوع پر تمام اسلامی ماخذ اور منابع میں شواہد و دلائل موجود ہیں، یہاں پر ہم ان میں سے چند ایک کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ کم از کم اٹھارہ صحابہ نے مختلف طرق سے اس حدیث کو رسول خدا ﷺ سے نقل کیا ہے کہ علیؑ سب سے پہلے مرد تھے جنہوں نے اسلام قبول کیا اور پیغمبر اکرم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی:

۱۔ ابو سعید خدری جن کا شمار کبار صحابہ میں ہوتا ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے اپنا ہاتھ علیؑ کی پیٹھ پر مارا اور فرمایا: یا عَلِیُّ لكَ سَبْعُ خِصالٍ لایُحاجُّكَ فِیْهِنَّ اَحَدٌ یَوْمَ القیامةِ اَنْتَ اَوَّلُ الْمُؤمِنِینَ اِیماناً بِاللهِ... یعنی: اے علیؑ! تیرے لیے سات ایسی خصوصیات ہیں قیامت کے دن تیرے ساتھ کوئی بھی ان میں سے کسی کا بھی مقابلہ نہیں کرسکتا، ان میں سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ تم

---

[1] شواہد التنزیل جلد ۲، صفحہ ۲۱۸ (احادیث ۹۳۲ تا ۹۳۵)

نے سب سے پہلے اللہ پر ایمان لا یا ہے (اور اسلام کو قبول کیا ہے)[۱]

۲۔حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ رسول خدا ﷺ کی بیٹی فاطمہؑ نے اس حدیث کو مجھ سے بیان کیا ہے کہ آنحضرتؐ نے ان سے فرمایا: زَوَّجْتُكَ اَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ عِلْمًا وَ اَقْدَمَهُمْ سِلْمًا وَ اَفْضَلَهُمْ حِلْماً یعنی: میں نے تمہاری شادی ایسے مرد سے کی ہے جو علم میں تمام مومنین سے زیادہ عالم ہے، اسلام لانے میں ان سب سے پہلا ہے اور حلم میں ان سب سے زیادہ حلیم ہے۔[۲]

۳۔ابن عباس بیان کرتے ہیں کہ میں نے عمر بن خطاب کو یہ کہتے ہوئے سُنا ہے کہ علیؑ کو بُرے الفاظ سے یاد مت کرو کیونکہ میں نے رسولخدا ﷺ سے ایسی باتیں سنی ہے اگر ان میں ایک بھی خطاب کے خاندان میں ہوتی تو میرے لیے ان تمام چیزوں سے زیادہ پسندیدہ ہوتی جن پر سورج طلوع ہوتا ہے، میں ابوبکر، ابوعبیدہ اور چند دیگر اصحاب رسول ﷺ کے ساتھ حضرت ام سلمہ کے دروازے پر پہنچے، علیؑ دروازے پر کھڑے تھے، ہم نے کہا رسول خدا ﷺ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں انہوں نے کہا آپ تھوڑی دیر میں باہر تشریف لائیں گے۔اتنے میں آنحضرتؐ باہر تشریف لائے ہم ان کی جانب آگے بڑھے۔

آنحضرتؐ نے علی بن ابی طالبؑ کا سہارا لیا اور اپنا ہاتھ ان کے کندھے پر مارا اور فرمایا:

اِنَّكَ مُخاصَمٌ، اَنْتَ اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ايماناً وَ اَعْلَمُهُمْ بِاَيَّامِ اللهِ وَ اَوْفاهُمْ بِعَهْدِهِ وَ اَقْسَمُهُمْ بِالسَّوِيَّةِ وَ اَرَافُهُمْ بِالرَّعِيَّةِ وَ اَعْظَمُهُمُ الرَّزِيَّةِ۔[۳]

"تجھ سے جھگڑا کیا جائے گا (جبکہ تیری شان یہ ہے کہ) تم سب سے پہلے ایمان لانے والے ہو، ایام اللہ کے بارے میں سب سے زیادہ عالم ہو، اللہ کے عہد کی سب سے زیادہ پاسداری کرنے والے ہو، سب سے بڑھ کر عادلانہ تقسیم کرنے والے ہو، رعایا کے ساتھ سب سے زیادہ مہربان ہو اور تیری مصیبت بھی سب سے بڑی مصیبت ہے۔"

یہ حدیث بہت ساری باتوں کو کھول رہی ہے جن کی تفصیل بیان کرنا اس گفتگو کے دائرے سے خارج ہے۔

۴۔معاذ بن جبل نبی اکرمؐ سے بیان کرتے ہیں کہ آپؐ نے علیؑ سے فرمایا:

تَخْصِمُ النَّاسَ بِسَبْعٍ وَ لَا يُحاجُّكَ فِيْهِ اَحَدٌ مِنْ قُرَيْشٍ اَنْتَ اَوَّلُهُمْ اِيْمَاناً بِاللهِ۔۔

ترجمہ: آپ سے لوگوں سات چیزوں میں جھگڑیں گے اور ان میں قریش میں سے کوئی بھی تیرے خلاف دلیل پیش نہیں کر سکے گا (تیرا مقابلہ نہیں کر سکے گا) آپ ہی وہ پہلے فرد ہیں جو اللہ پر ایمان لائے

---

[۱] اس حدیث کو ابونعیم اصفہانی نے "حلیۃ الاولیاء" جلد ۱، صفحہ ۶۶ پر درج کیا ہے۔

[۲] اس حدیث کو ابن عساکر نے "تاریخ دمشق" میں حضرت علیؑ کے حالات زندگی میں ذکر کیا ہے (جلد ۱، صفحہ ۲۴۴، مطبوعہ بیروت)

[۳] کنز العمال جلد ۱۳، صفحہ ۱۱۷ (مطبوعہ بیروت موسسہ الرسالۃ)

ہیں۔۔۔۔[1]

۵۔جعفر بن ابی طالب کی زوجہ اسماء بنت عمیس بیان کرتی ہیں کہ اللہ کے رسولؐ نے اپنی بیٹی فاطمہؑ سے فرمایا:

زَوَّجْتُكِ اَقْدَمَهُمْ سِلْماً وَ اَعْظَمُهُمْ حِلْماً وَ اَكْثَرَهُمْ عِلْماً۔

میں نے تیری شادی ایسے شخص سے کی ہے جو اسلام لانے میں سب سے پہلے، حلم کے لحاظ سے سب سے بڑا اور علم کے اعتبار سے ان سب سے زیادہ عالم ہے۔[2]

٦۔سلمان فارسی کہتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا:

اَوَّلُكُمْ وُرُوْدَا عَلَيَّ الحَوْضَ اَوَّلُكُمْ اِسْلاماً عَلِيُّ بْنُ ابی طالب علیہ السلام۔

تم میں سے سب سے پہلے حوض کوثر پر وہی مجھ سے ملاقات کرے گا جو سب سے پہلے اسلام لایا ہے یعنی علی بن ابی طالبؑ۔[3]

۷۔ابوسخیلہ کہتے ہیں کہ میں اور سلمان حج بجالانے کے بعد ابوذر کے پاس آئے جب تک اللہ نے چاہا ہم ان کے پاس رہے جب ہمارے کوچ کا وقت قریب آیا تو میں نے کہا اے ابوذر! میں چند امور کو لوگوں کے درمیان واقع ہوتا دیکھ رہا ہوں مجھے ڈر ہے کہ کہیں لوگوں کے درمیان اختلاف پیدا نہ ہو جائے اگر ایسا ہو جائے تو آپ مجھے کیا حکم دیں گے؟ اس نے کہا:

اَلْزِمْ كِتابَ اللهِ عَزَّوَجَلَّ وَ عَلِيَّ بْنَ اَبی طالِبٍ۔ فَاَشْهَدُ اِنّی سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ يَقُوْلُ: عَلِيٌّ اَوَّلُ مَنْ آمَنَ بی وَ اَوَّلُ مَنْ يُصافِحُنِي يَوْمَ القِيامَةِ وَ هُوَ الصِّدِّيْقُ الْاَكْبَرُ، وَ هُوَ الفارُوقُ يُفَرِّقُ بَيْنَ الحَقِّ و الباطِلِ۔

اللہ کی کتاب اور علی بن ابی طالبؑ سے جدا نہ ہونا، میں گواہی دیتا ہوں کہ میں رسول خداؐ سے سنا کہ وہ فرمایا کرتے تھے علیؑ پہلے شخص ہیں جو مجھ پر ایمان لایا، قیامت کے دن علیؑ سب سے پہلے مجھ سے مصافحہ کریں گے۔ علیؑ صدیق اکبر اور فاروق یعنی حق کو باطل سے جدا کرنے والا ہے۔[4]

---

[1] اس حدیث کو شہاب الدین شافعی نے کتاب توضیح الدلائل، صفحہ ۱۷۱ پر درج کیا ہے۔ (بمطابق، احقاق الحق، جلد ۲۰ صفحہ ۴۵۵)

[2] تاریخ ابن عساکر، جلد ۱، صفحہ ۲۴۵ مطبوعہ بیروت۔

[3] اس روایت کو محمد بن ابی بکر نے اپنی کتاب "الجوہرہ"، صفحہ ۸ (مطبوعہ دمشق پر درج کیا ہے۔ کنزالعمال کے مصنف نے بھ سند کے بغیر اسے ذکر کیا ہے (جلد ۱۱، صفحہ ٦١٦، مطبوعہ موسئسہ الرسالۃ۔ بیروت)

[4] مختصر تاریخ دمشق، جلد ۱۷، صفحہ ۳۰٦ (مطبوعہ دمشق دار الفکر) (بمطابق احقاق الحق، جلد ۲۰ صفحہ ۴۷۲) اس حدیث کو کنز العمال نے اِنّ ھذا اوّل من آمن بی تا آخر ذکر کیا ہے۔ جلد ۱۱، صفحہ ٦١٦، حدیث ۳۲۹۹۰۔

۸۔عبدالرحمن عوف آیت السَّابقون الاوّلون کے بارے میں حدیث بیان کرتے ہیں کہ یہ قریش کے دس افراد تھے:

كَانَ اَوَّلَهُمْ اِسْلاماً عَلِيُّ بْنُ اَبِي طالِبٍ

جن افراد نے اوائل میں اسلام قبول کیا ان میں علی بن ابی طالب پہلے نمبر پر ہیں۔[1]

۹۔جمال الدین ابوالحجاج اپنی کتاب ''تہذیب الکمال'' میں ابورافع (صحابی رسولؐ) سے نقل کرتے ہیں کہ:

اَوَّلُ مَنْ اَسْلَمَ مِنَ الرِّجالِ عَلِيٌّ۔

مردوں میں سب سے پہلے علیؑ اسلام لائے۔[2]

۱۰۔رسول خداؐ کے خادم انس بن مالک، آنحضرتؐ سے نقل کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

اَوَّلُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ وُرُوداً عَلَيَّ الْحَوْضَ اَوَّلُها اِسْلاماً عَلِي بْنُ اَبِي طالِبٍ۔

اس امت میں سب سے پہلے جو شخص حوض کوثر پر مجھ تک پہنچیں گے وہ وہی ہوں گے جو سب سے پہلے اسلام لائے ہیں یعنی علی ابن ابی طالبؑ۔[3]

۱۱۔ابن عباس کہتے ہیں: علی علیہ السلام کی چار خصوصیات ایسی ہیں جو کسی میں نہیں پائی جاتیں:

هُوَ اَوَّلُ عَرَبِيٍّ وَعَجَمِيٍّ صَلّٰى مَعَ رَسُولِ اللهِ ....

عرب و عجم میں سے وہ پہلے فرد ہیں جنہوں نے پیغمبر اکرمؐ کے ساتھ نماز پڑھی ہے۔[4]

ایک اور مقام پر وہ کہتے ہیں کہ:

اَوَّلُ مَنْ اَسْلَمَ بَعْدَ خَدِيجَةِ عَلِيُّ بْنُ اَبِي طالِبٍ۔

حضرت خدیجہ کے بعد سب سے پہلے اسلام لانے والے علی ابن ابی طالبؑ تھے۔[5]

۱۲۔مشہور محدث نسائی اپنی کتاب ''السنن'' میں زید بن ارقم سے بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا:

اَوَّلُ مَنْ اَسْلَمَ مَعَ رَسُولِ اللهِ عَلِيُّ بْنُ اَبِي طالِبٍ

---

[1] مختصر تاریخ دمشق، جلد ۱۷صفحہ ۳۰۷ (مصنف امام محمد بن مکرا المعروف ابن منظور)

[2] تہذیب الکمال، جلد ۳،صفحہ ۸۵ (احقاق الحق، جلد ۲۰،صفحہ ۳۶۷ کے نقل کے مطابق)

[3] اس حدیث کو ساتویں صدی ہجری کے عالم ابن عدیم نے اپنی کتاب تاریخ حلب، صفحہ ۲۹۵ پر نقل کیا ہے۔

[4] المختار فی مناقب الابرار، صفحہ ۱۶ (احقاق الحق، جلد ۲۰، صفحہ ۵۴۷ کے مطابق)

[5] یہ حدیث حسام الدین حنفی سے کتاب آل محمد، صفحہ ۱۷۴ میں بھی آئی ہے۔

رسول اللہؐ پر سب سے پہلے علی ابن ابی طالبؑ اسلام لائے۔ [۱]

۱۳۔ابواحمد جرجانی شافعی، کتاب الکامل فی الرجال میں مالک بن الحوریث سے بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا ہے:

كَانَ عَلِيٌّ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ مِنَ الرِّجالِ و خَديجَة اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ مِنَ النِّساءِ:

مردوں میں سے علی علیہ السلام سب سے پہلے اسلام لائے اور عورتوں میں سے حضرت خدیجہؑ سب سے پہلے اسلام لے آئیں۔ [۲]

۱۴۔لیلی الغفاریہ ایسی خاتون تھیں جو آنحضرتؐ کے دور میں جنگ میں زخمی ہو جانے والوں کا علاج اور دیکھ بھال کرتی تھیں، وہ کہتی ہیں: میں علی علیہ السلام کے ساتھ جنگ جمل کے میدان میں آئی جب میں نے بی بی عائشہ کو ان کے مقابلے پر دیکھا تو میں شک وشبہ میں مبتلا ہوگئی میں انکے پاس گئی اور پوچھا کیا تم نے علیؑ کے بارے میں رسول خداؐ سے کوئی فضیلت سُنی ہے؟ اس نے ہاں میں جواب دیا۔ پھر بی بی عائشہ نے ایک واقعہ بیان کیا اور اس واقعے کے ضمن میں رسول اکرمؐ سے نقل کیا کہ آنحضرتؐ نے فرمایا:

اِنّہ اَوَّلُ النّاسِ بی اِسلاماً

علیؑ وہ پہلے شخص ہیں جو مجھ پر ایمان لائے۔ [۳]

۱۵۔اہلسنت کے چار ائمہ میں ایک امام احمد بن حنبل اپنی کتاب مسند میں ایک حدیث نقل کرتے ہیں کہ مَعقل بن یسار (مشہور صحابی) بیان کرتے ہیں کہ ایک دن میں پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں تھا آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا۔ چلو فاطمہ (جو کہ بیمار تھیں) کی عیادت کرنے چلیں۔ جب ہم فاطمہؑ کے گھر پہنچے پیغمبر اکرمؐ نے ان کی مزاج پرسی کی فاطمہ سلام اللہ علیہا نے عرض کیا: میرا غم زیادہ ہے، فقر وغربت شدید ہے اور میری بیماری طول پکڑ گئی ۔۔۔ان مشکلات اور سختیوں پر ان کی دلجوئی کے لیے آنحضرتؐ نے فرمایا:

اَوَ ما تَرْضِيْنَ اَنِّي زَوَّجْتُكِ اَقْدَمَ اُمَّتي سِلْماً وَ اَكْثَرَهُمْ عِلْماً وَ اَعْظَمَهُمْ حِلْماً

کیا آپ اس پر راضی نہیں ہیں کہ میں نے آپ کی شادی ایسے مرد سے کی ہے جو تمام امت میں سب سے پہلے اسلام لایا، جس کا علم سب سے زیادہ اور حلم میں سب سے بڑا ہے۔ [۴]

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اسی حدیث کو ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغہ (جلد ۳، صفحہ ۲۵۷) میں ابن عساکر نے تاریخ دمشق (جلد ۱، صفحہ ۲۳۲) میں **الھیثمی** نے مجمع الزوائد (جلد ۹، صفحہ ۱۰۱) میں، متقی ہندی نے کنز العمال (جلد ۱۲، صفحہ ۲۰۵) میں اور دیگر

---

[۱] احقاق الحق، جلد ۲۰، صفحہ ۴۵۷۔

[۲] الکامل فی الرجال، جلد ۶، صفحہ ۲۳۸۷، مطبوعہ دار الفکر بیروت۔

[۳] کتاب مختصر تاریخ دمشق میں اس حدیث کو محمد بن مکرم انصاری نے نقل کیا ہے (جلد ۱۷، صفحہ ۱۱۹)

[۴] مسند احمد جلد ۵، صفحہ ۲۶ (مطبوعہ دار الصادر)

اہلسنت کے علماء نے اپنی کتب میں ذکر کیا ہے۔

۱۶۔ رسول خداؐ کے صحابی عبداللہ بن صامت (ثابت) کہتے ہیں کہ ایک دن ہم آنحضرتؐ کی خدمت میں شرفیاب ہوئے اور پوچھا: مَنْ اَحَبُّ اَصْحَابِكَ اِلَيْكَ؟ فَاِنْ كَانَ اَمْرٌ كُنَّا مَعَهُ وَاِنْ كَانَتْ نَاسِئَةٌ كُنَّا دُوْنَهُ قَالَ هٰذَا عَلِيٌّ اَقْدَمُكُمْ سِلْماً وَ اِسْلاماً۔ یعنی: اصحاب میں سب سے زیادہ آپ کا محبوب اور پیارا کون ہے؟ کہ اگر کوئی حادثہ (آپ کے لیے) پیش آئے تو ہم اس کے ساتھ ہوں اور جب کوئی خطرہ لاحق ہو تو اس پر جان نثار کریں؟ آنحضرتؐ نے فرمایا: میرا محبوب یہی علیؑ ہیں جس کا اسلام اور تسلیم تم سب سے پہلے ہے۔[1]

اس حدیث سے اچھی طرح واضح ہوتا ہے کہ عبداللہ بن ثابت اور ان کے ساتھی ایسے شخص کی تلاش اور جستجو میں تھے جو رسول خداؐ کے بعد امامت، ولایت کے لائق اور قابل ہو اور آنحضرتؐ نے اسی خاطر علیؑ کا تعارف کرایا۔

۱۷۔ ایک اور صحابی رسول بریدہ نے بھی معقل بن یسار کی طرح کا واقعہ بیان کیا ہے اس کے آخر میں ذکر ہوا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے جناب سیدہ زہراؑ کی دلجوئی کے لیے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایسا شوہر دیا ہے جو اسلام قبول کرنے میں سب سے اوّل، علم میں سب سے زیادہ اور حلم میں سب سے بڑا ہے۔ وہ مزید بیان کرتے ہیں کہ رسول خداؐ نے فرمایا:

وَاللهِ اِنَّ اِبْنَيْكِ سَيِّدَا شَبَابِ اَهْلِ الْجَنَّةِ۔

خدا کی قسم! تیرے دو بیٹے جوانان جنت کے سردار ہیں۔[2]

۱۸۔ حضرت علی بن ابی طالبؑ نے اسی مطلب کو اپنی گفتگو میں بھی بیان کیا ہے جسے تمام لوگ قبول کرتے ہیں۔ محمد بن ابی بکر انصاری کی کتاب الجوھر میں مذکور ہے کہ علیؑ نے بصرہ کے منبر پر فرمایا: اَنَا الصِّدِّيقُ الاَكْبَرُ آمَنْتُ قَبْلَ اَنْ يُؤمِنَ اَبُوبَكْرٍ وَ اَسْلَمْتُ قَبْلَ اَنْ يُسْلِمَ۔ یعنی: صدیق اکبر میں ہوں، میں ابوبکر سے پہلے ایمان لایا ہوں اور اس کے اسلام لانے سے پہلے میں اسلام لایا ہوں۔[3] نیز شیخ محمد بن مکرم انصاری نے اپنی کتاب "مختصر تاریخ دمشق" میں حضرت امیرالمومنینؑ سے یوں نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: اَنَا اَوَّلُ مَنْ اَسْلَمَ۔ یعنی: میں وہ ہوں جس نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا۔[4]

نہج البلاغہ میں بھی متعدد مقامات پر اسی مطلب کا سہارا لیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک مقام پر جملہ ۱۳۱ میں وہ فرماتے

---

[1] اس حدیث کو احمد بن مردویہ نے مناقب کی کتاب میں نقل کیا ہے۔ (احقاق الحق۔ جلد ۱۵، صفحہ ۳۳۶)

[2] اس حدیث کو ابن عساکری تاریخ دمشق (جلد ا صفحہ ۲۴۲ مطبوعہ بیروت) میں بیان کیا ہے۔ لیکن (صفحہ ۱۰۷، ۳۹۶) اس کے آخری جملے جو امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے بارے میں ہے اسے فقط ارج المطالب کے منصف امرتسری نے درج کیا ہے۔

[3] الجوہرۃ، صفحہ ۸ (مطبوعہ دمشق) اسی مطلب کو ایک اور جماعت نے بھی نقل کیا ہے۔ جسے ابو احمد جرجانی نے کتاب الکامل فی الرجال (جلد ۳، صفحہ ۱۱۲۳) میں توضیح الدلائل (صفحہ ۱۷۱، اور مختصر تاریخ دمشق وغیرہ میں۔

[4] مختصر تاریخ دمشق جلد ۱۷ صفحہ ۱۱۸۔

ہیں: اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَوَّلُ مَنْ اَنَابَ وَ سَمِعَ وَ اَجَابَ لَمْ یَسْبِقْنِی اِلاَّ رَسُوْلُ اللهِ بِالصَّلاۃِ یعنی: اے اللہ! میں سب سے پہلے تیری طرف لوٹا ہوں میں نے تیرا پیغام سنا اور اسے قبول کیا۔ رسول خداؐ کے علاوہ کسی نے بھی نماز پڑھنے میں مجھ سے سبقت نہیں لی۔[1]

لگتا یوں ہے کہ ہم اپنی تفسیری روش سے دور ہو گئے ہیں اور بات لمبی ہو گئی لیکن مسئلہ کی اہمیت کا تقاضا تھا کہ ہم اس سے بھی زیادہ تفصیل سے گفتگو کرتے۔ بہرحال روایات کے اس سلسلے کو ابن ہشام کی روایت پر ختم کرتے ہیں جو اس نے اپنی کتاب سیرہ نبویہ میں بیان کی ہے البتہ اس اعتراف کے ساتھ کہ ابھی بہت سی باتیں رہ گئی ہیں جن کا بیان کرنا ضروری تھا۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ اسلام کے آغاز میں جب نماز کا وقت ہوتا تھا تو آنحضرتؐ نماز کی ادائیگی کے لیے مکہ کے دروں میں سے کسی ایک کی طرف چلے جاتے تھے صرف علی ابن ابی طالبؑ خفیہ طور پر ان کے ساتھ ہوتے تھے۔۔۔ ایک دن ان کے والد ابوطالب نے پوچھا: بیٹا یہ کونسا دین ہے جسے تم نے اختیار کر رکھا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: بابا جان میں اللہ اس کے رسولؐ اور جو کچھ وہ خدا کی طرف سے لائے ہیں اس پر ایمان لایا ہوں، اور ان کیساتھ نماز پڑھی ہے۔۔۔ ابوطالب نے کہا: آگاہ رہو! انہوں نے تمہیں خیر و نیکی کے علاوہ کوئی دعوت نہیں دی ہے۔ ان سے ہرگز جدا نہ ہونا۔[2]

حضرت علیؑ کا سب سے پہلے اسلام قبول کرنا اس قدر واضح ہے کہ بعض نامور شعراء نے اپنے اشعار میں اسے علیؑ کے امتیازات اور افتخارات کے عنوان سے ذکر کیا ہے۔ اس بارے میں ایک شاعر کہتا ہے:

اَلَیْسَ اَوَّلَ مَنْ صَلّٰی لِقِبْلَتِکُمْ
وَاَعْلَمَ النَّاسِ بِالقرآنَ والسُّنَنِ؟

کیا وہ پہلا شخص نہیں ہے جس نے تمہارے قبلہ کی طرف نماز پڑھی ہے اور وہ قرآن وسنت کا تمام لوگوں سے زیادہ عالم نہیں ہے؟

ایک اور شاعر کہتا ہے:

فھذا و فی الاِسْلاَمِ اَوَّلُ مُسْلِم
وَ اَوَّلُ مَنْ صلّی وَ صامَ و ھَلَّلاَ

وہ اسلام میں سب سے پہلا مسلمان ہے۔ اور وہی پہلا شخص ہے جس نے نماز پڑھی اور روزہ رکھا اور تہلیل (لا الہ الا اللہ) کہی۔

علامہ امینی مرحوم نے ''الغدیر'' میں دس سے زیادہ شعراء کا تذکرہ کیا ہے جنہوں نے اپنے کلام میں اس مطلب کو ذکر کیا ہے۔ قابل توجہ نکتہ یہ بھی ہے کہ علامہ امینی نے مذکورہ کتاب میں ایک سو زائد احادیث پیغمبر اکرم ﷺ، امیر المومنین -، اصحاب

[1] یہ مطلب خطبہ ۱۷۱، صفحہ ۱۹۲ میں بھی آیا ہے۔
[2] سیرۃ ابن ہشام، جلد ۱، صفحہ ۲۶۳ (مطبوعہ داراحیاء التراث العربی)

کرام، تابعین، مؤرخین اور محدثین سے نقل کی ہیں جو سب گواہی دیتی ہیں کہ علیؑ مردوں میں سے سب سے پہلے فرد ہیں جو رسول اللہؐ پر ایمان لائے۔

ایک سوال

یہاں پر ایک سوال مشہور ہے جو اسلام کے ابتدائی دور سے بعض بہانہ باز افراد کے درمیان موجود تھا کہ یہ بات درست ہے کہ علیؑ نے مردوں میں سب سے پہلے اسلام قبول کیا، لیکن کیا اسلام میں نابالغ اور دس سالہ بچے کا اسلام قابل قبول ہے؟ اور اگر ان کے بلوغت کے وقت کو مدنظر رکھیں تو ان سے پہلے بہت سے افراد اسلام قبول کر چکے تھے۔

جواب

اس سوال کے جواب میں بہتر یہ ہے کہ ہم عباسی خلیفہ مامون اور اس کے دور کے ایک اسحاق نامی اہلسنت عالم کے درمیان ہونے والی گفتگو کو نقل کریں۔ (اس واقعہ کو ابن عبدربہ نے عقد الفرید میں ذکر کیا ہے)۔ مامون نے اس سے پوچھا جس وقت رسول خداؐ مبعوث ہوئے اس وقت تمام اعمال میں سے کونسا عمل افضل ہے؟ اسحاق نے جواب دیا: توحید اور رسالت محمدؐ کی خلوص کے ساتھ شہادت دینا۔ مامون نے کہا: کیا تم کسی کو جانتے ہو جس نے علیؑ سے اسلام لانے میں سبقت کی ہو؟ اسحاق نے کہا: علیؑ کم سنی اور چھوٹی عمر میں اسلام لائے اور احکام الٰہی ان پر لاگو نہیں تھے۔ مامون نے پوچھا: کیا علیؑ کا ایمان لانا پیغمبر اکرمؐ کی دعوت پر نہ تھا؟ کیا پیغمبرؐ نے ان کے اسلام کو مسترد کر دیا؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ رسول خداؐ کسی ایسے فرد کو اسلام کی دعوت دیں جس کا اسلام قابل قبول ہی نہیں ہے؟ اسحاق کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔[1]

علامہ امینی مرحوم عقد الفرید سے اس واقعے کو نقل کرنے کے بعد مزید لکھتے ہیں۔ ابو جعفر اسکافی معتزلی (متوفی ۲۴۰ ہجری) اپنے رسالے میں لکھتے ہیں کہ سب لوگ جانتے ہیں کہ علی علیہ السلام کو یہ افتخار حاصل ہے کہ انہوں نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا۔ پیغمبر اکرمؐ سوموار کو مبعوث ہوئے اور علی علیہ السلام منگل کو ایمان لائے اور وہ فرمایا کرتے تھے کہ میں وہ ہوں جو سب سے پہلے ایمان لایا۔ اور یہ بات سب باتوں سے زیادہ مشہور ہے اور ہم نے ماضی میں کسی کو نہیں پایا جو علی علیہ السلام کے اسلام کو سبک سمجھے یا یہ کہے کہ وہ بچپن میں اسلام لائے۔ عجیب بات یہ ہے کہ حضرت عباس اور حضرت حمزہ جیسے افراد اسلام لانے کے لیے حضرت ابوطالب کے ردعمل کے منتظر تھے لیکن ان کے بیٹے نے اسلام لانے میں اپنے باپ کا انتظار نہیں کیا اور ایمان قبول کر لیا۔[2]

مختصر یہ کہ اولاً رسول اکرمؐ نے علیؑ کے اسلام کو قبول کیا اور جو شخص انکی اس عمر میں اسلام کو معتبر نہ جانے تو اس نے حقیقت میں

---

[1] عقد الفرید، جلد۳، صفحہ ۴۳ (خلاصہ)

[2] الغدیر، جلد۳، صفحہ ۲۳۷

آنحضرتؐ پر اعتراض کیا ہے۔ ثانیاً مشہور روایات جن کا تذکرہ ہو چکا ہے میں دعوت ذوالعشیرہ کے واقعے میں آیا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے کھانا تیار کیا اور رشتہ داروں کو دعوت پر بلایا اور انہیں اسلام لانے کی دعوت دی اور ارشاد فرمایا: جو شخص سب سے پہلے اسلام کی حمایت کے لیے میری دعوت کو قبول کرے گا وہ میرا بھائی، وصی اور جانشین ہوگا۔ علی ابن ابی طالبؑ کے سوا کسی نے آنحضرتؐ کی دعوت کا مثبت جواب نہ دیا۔ علیؑ نے کہا میں آپ کی مدد کروں گا اور آپ کی بیعت کرتا ہوں اور آنحضرتؐ نے فرمایا: تو میرا بھائی، میرا وصی اور میرا جانشین ہے۔[1]

کون اس بات کو مانتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ اس شخص کو اس دن بھائی، وصی اور جانشین کے طور پر متعارف کرائیں اور دوسروں کو ان کی پیروی کی طرف بلائیں۔ یہاں تک کہ مشرک سرداراس دن ابوطالب سے تمسخر کے طور پر کہیں کہ تم اپنے بیٹے کی اطاعت کرو۔ جبکہ وہ حد بلوغ کو نہ پہنچے ہوں اور ہٹ دھرم افراد کے بقول انکا اسلام بھی قابل قبول نہ ہو۔ بلا شک وشبہہ اسلام قبول کرنے میں بلوغ کی شرط نہیں ہے ہر بچہ جو سمجھدار کافی حد تک ممیز ہو اور اسلام قبول کرے بالفرض اس کا باپ مسلمان نہ ہو تو وہ اس سے جدا ہو جاتا ہے اور مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہو جاتا ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ قرآن مجید سے ثابت ہوتا ہے کہ بلوغ نبوت کے لیے شرط نہیں ہے لہٰذا قرآن کی رو سے بعض انبیاء عہد طفولیت میں مقام نبوت تک پہنچے۔ چنانچہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَ آتَیْنَاهُ الْحُکْمَ صَبِیًّا۔

ہم نے انہیں بچپن میں فرمان نبوت دیا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قصے میں آیا ہے کہ انہوں نے ماں کی گود میں واضح طور پر کہا:

اٰتٰىنِیَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا ﴿۳۰﴾

میں اللہ کا بندہ ہوں، آسمانی کتاب مجھے دی گئی ہے اور مجھے نبی بنایا گیا ہے۔ (مریم/۳۰)

ان سے سب سے بالاتر بات یہ ہے کہ علیؑ کے اسلام کو آنحضرتؐ نے تسلیم کیا ہے اور انہیں دعوت ذوالعشیرہ کے موقعہ پر اپنا بھائی، وصی، وزیر اور جانشین بیان کیا ہے۔ بہرحال وہ روایت جو بتاتی ہے کہ علیؑ نے سب سے پہلے رسول اللہؐ کی دعوت کو قبول کیا ہے وہ انکی بے مثال فضیلت کی حامل ہے ایسی فضیلت جس میں کوئی بھی ان کا ثانی اور برابری کرنے والا نہیں۔ اسی دلیل کی بنیاد پر وہ رسول خداؐ کی جانشینی اور خلافت کے لیے تمام امت سے زیادہ لائق اور حقدار ہیں۔

[1] ان احادیث کی اسناد کو ہم تفصیلاً دعوت ذوالعشیرہ والی حدیث کے نیچے ذکر کیا ہے۔

آیت اُذُن واعیۃ

سورہ حاقہ کی آیت ۱۲ میں ارشادِ رب العزت ہوتا ہے:

لِنَجۡعَلَهَا لَكُمۡ تَذۡكِرَةً وَّتَعِيَهَآ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ ﴿۱۲﴾

''تا کہ ہم اسے تمہارے لیے یادگار بنا دیں اور سمجھدار کان ہی اسے محفوظ کر لیتا ہے۔''

مقصد یہ تھا کہ کشتی نوح کے ذریعے مومنین کی نجات اور طوفان کے ذریعے کفار کے غرق ہونے کو (تمہارے لیے) یاددہانی کا ذریعہ قرار دیں اور سمجھدار کان اس یاددہانی (اور اس طرح کے واقعات) کو محفوظ رکھتے ہیں (تا کہ دوسروں تک پہنچائیں اور سب نصیحت حاصل کریں)

جلال الدین سیوطی نے تفسیر الدر المنثور میں چھ حوالوں سے مشہور صحابی بریدہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؑ سے فرمایا:

اِنَّ اللهَ اَمَرَنی اَنْ اُدْنِیَكَ وَ لا اُقصِیَكَ، وَ اَنْ اُعَلِّمَكَ وَ اَنْ تَعِیَ، وَ حَقٌّ لَكَ اَنْ تَعِیَ فَنزلَتْ هٰذِهِ الآیَةُ: "و تَعیَها اُذُنٌ واعِیَةٌ [۱]

اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں اپنے نزدیک کروں اور تمہیں تعلیم دوں اور تو اسے محفوظ رکھے اور ایسا ہونا تمہیں زیب دیتا ہے، اس موقعہ پر یہ آیت نازل ہوئی (وتَعیَها اُذُنٌ وَاعِیَةٌ) محفوظ رکھنے والے کان اسے محفوظ رکھیں گے۔

مذکورہ کتاب میں ابونعیم اصفہانی کی کتاب ''حلیۃ الاولیاء'' سے حضرت علیؑ سے بیان ہوا ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے انہیں فرمایا: ۔۔۔۔ (پھر وہ بریدہ والی حدیث کے مضمون کو ذکر کرتے ہوئے آخر میں مزید فرماتے ہیں:) ''فَاَنْتَ اُذُنٌ وَاعِیَة بِعِلْمِی۔ یعنی: تم میرے علم و دانش کو محفوظ رکھنے والے ہو۔ [۲]

اسی کتاب میں پانچ حوالوں سے ''مَکْحُول'' (حضرت پیغمبر اکرم ﷺ کے خادموں میں سے ایک خادم) سے منقول ہے کہ جب آیت: ''و تَعیَها اُذُنُ وَاعِیَةُ'' نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: میں نے اپنے رب سے دعا کی ہے کہ اس سمجھدار اور سننے والے کان کو علیؑ کا کان قرار دے۔ مکحول کہتے ہیں: اس کے بعد علیؑ کہتے تھے ''میں نے رسول اللہ ﷺ سے جو بھی بات سنی اُسے کبھی بھی نہیں

---

[۱] الدر المنثور جلد ۶ صفحہ ۲۶۰

[۲] ایضا

بُھلایا۔[1] زمخشری نے بھی تفسیر کشاف میں اس آخری حدیث کو بغیر کوئی اعتراض کیے نقل کیا ہے۔[2]

چند دیگر مفسرین جیسے فخر رازی نے تفسیر کبیر[3] میں، آلوسی نے ''روح المعانی''[4] میں برسوئی نے روح البیان[5] میں، قرطبی نے تفسیر جامع[6] میں مذکورہ آیت کی تفسیر میں آخری حدیث کو بیان کیا ہے۔طبری نے بھی اس موضوع پر اپنی تفسیر میں اس حدیث کو اور بعض دیگر حدیثوں کو ذکر کیا ہے۔[7]

حاکم حسکانی نے شواہد التنزیل میں اس حوالے سے تیرہ احادیث کو مختلف راویوں سے نقل کیا ہے جن کا سلسلہ سند رسول خدا ﷺ پر ختم ہوتا ہے۔ان میں کچھ رسول خدا ﷺ کے خادم مکحول سے، کچھ جناب بریدہ سے اور چند ایک خود حضرت علی بن ابی طالب - سے اور بعض جابر بن عبداللہ انصاری سے منقول ہیں ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

''ابوالدنیا''علیؑ سے بیان کرتے ہیں کہ جب آیت ''وَتَعِيَهَا أُذُنٌ وَاعِيَةٌ'' نازل ہوئی تو پیغمبر اکرمؐ نے مجھے فرمایا: اے علی! میں نے اللہ سے دعا کی ہے کہ اس کان کا مصداق تجھے قرار دے (جو کچھ آپ سنیں اُسے ذہن نشین کر لیں اور اُسے بروے کار لائیں اور پھیلائیں)[8]

ایک اور حدیث میں مکحول بیان کرتے ہیں جب پیغمبر اسلام ﷺ نے آیت ''وَتَعِيَهَا أُذُنٌ وَاعِيَةٌ'' کی تلاوت فرمائی تو علیؑ کی طرف رخ کر کے فرمایا: ''سَأَلْتُ اللهَ أَنْ يَجْعَلَهَا أُذُنَكَ''یعنی: ''میں نے خدا سے چاہا ہے کہ اس سمجھدار کان کو تمہارا کان قرار دے۔''علیؑ کہتے ہیں: اس کے بعد جو کچھ پیغمبر اکرم ﷺ سے میں نے سُنا اُسے کبھی نہیں بُھلایا۔[9] پھر بریدہ اسلمی کی حدیث جسے ہم نے شروع میں ذکر کیا ہے، نقل کی ہے۔[10] [1]

آخر میں وہ جابر بن عبداللہ انصاری سے نقل کرتے ہیں کہ جب مذکورہ آیت نازل ہوئی تو پیغمبر اکرم ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے

---

[1] ایضا

[2] کشاف، جلد ۴، صفحہ ۶۰۰

[3] تفسیر کبیر جلد ۳۰، صفحہ ۱۰۷

[4] روح المعانی، جلد ۲۹، صفحہ ۴۳

[5] روح البیان، جلد ۱۰، صفحہ ۱۳۶۔

[6] قرطبی، جلد ۱۰، صفحہ ۴۳ تا ۶۷۔

[7] طبری جلد ۲۹، صفحہ ۳۵

[8] شواہد التنزیل، جلد ۲، صفحہ ۲۷۱۔

[9] ایضا، صفحہ ۲۷۷ (حدیث ۱۰۱۵)

[10] [1] ایضا، صفحہ ۲۸۲ (حدیث ۱۰۲۲)

دُعا کی کہ (اس کا کامل مصداق) علیؑ کے کان کو قرار دے اور آنحضرتؐ کی یہ دعا پوری ہوئی۔[١] فضائل الخمسہ کے مصنف نے اس حدیث کو مذکورہ بالا کتب کے علاوہ، کنز العمال، نورالابصار، الھیثمی کی مجمع الزوائد اور واحدی کی اسباب النزول سے بھی نقل کیا ہے۔[٢]

نتیجہ

گزشتہ بحث میں امامت و ولایت اور خلافت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق جن شرائط کو ہم نے بیان کیا ہے ان میں ایک یہ ہے کہ الٰہی رہبروں کے لیے ضروری ہے کہ ان کے پاس علم و دانش کا عظیم خزانہ ہونا چاہیے تاکہ وہ امت کی رہبری اور راہنمائی کی ذمہ داری کو انجام دے سکیں اور مخلوق خدا کی دین و دنیا کے امور میں ہدایت کر سکیں۔ اسلام کی تعلیمات اور قوانین الٰہی کی حفاظت کر سکیں اور قرآن و سنت کی پاسداری کر سکیں۔ ادھر مذکورہ آیت کی تفسیر میں منقولہ روایات کے مطابق امت میں سے صرف حضرت علیؑ ایسے فرد ہیں جو یہ مقام و مرتبہ رکھتے ہیں۔ پس ان دو باتوں کے پیش نظر اچھی طرح سے ثابت ہوتا ہے کہ امامت و خلافت کے منصب کے لیے ان سے زیادہ حقدار اور ان سے بڑھ کر لائق اور کوئی نہ تھا۔

---

[١] ایضا، صفحہ ۰۸۲ (حدیث ۱۰۲۲)

[٢] فضائل الخمسہ، جلد ا، صفحہ ۲۳۰، ۳۲۱

۲۰۔ آیت محبت

سورہ مریم کی آیت ۹۶ میں ارشاد الٰہی ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ﴿۹۶﴾

بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور عمل صالح انجام دیے تو رحمن ان کے لیے (مومنین کے دلوں میں) محبت پیدا کردے گا۔

یہ آیت اچھی طرح دلالت کررہی ہے کہ ایمان اور عمل صالح لوگوں کے درمیان محبوبیت کا سرچشمہ ہے۔ سچ یہ ہے کہ ایمان اور عمل صالح میں عجیب کشش پائی جاتی ہے دلوں کو مقناطیس کی طرح اپنی جانب کھینچ لیتے ہیں یہاں تک کہ ناپاک اور گندے افراد کو بھی پاکیزہ اور صالح افراد بھلے لگتے ہیں۔

اس آیت مجیدہ کی تفسیر میں حضرت رسول اکرم ﷺ سے متعدد راویوں سے بہت ساری روایات اہلسنت کی کتب میں منقول ہیں کہ یہ آیت علی بن ابی طالبؑ کے بارے میں ہے ہم نے کئی مرتبہ کہا ہے کہ کسی کی شان میں آیت کے نازل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا کامل و اکمل مصداق وہ ہے، اور یہ بات آیت کے وسیع مفہوم کے قطعاً منافی نہیں ہے۔ اس مقام پر ہم اسلامی کتب کا رخ کرتے ہیں اور اس بارے میں کچھ روایات کا جائزہ لیتے ہیں۔

شواہد التنزیل میں براء بن عازب، ابورافع، جابر بن عبداللہ انصاری، ابن عباس، ابوسعید خدری، اور محمد بن حنیفہ سے مختلف اسناد سے کئی روایات نقل کی گئی ہیں کہ جو یہ بیان کرتی ہیں کہ یہ آیت علی ابن ابی طالب۔ کے بارے میں ہے، جس نے ان کی محبت کو ہر صاحب ایمان کے دل میں اجاگر کیا ہے۔ ایک حدیث میں ابوسعید خدری نے بیان کیا ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے علیؑ سے فرمایا:

يَا اَبَا الْحَسَن! قُلْ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ لِي عِنْدَكَ عَهْدًا وَ اجْعَلْ لِي فِي صُدُوْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ مَوَدَّةً

اے ابوالحسن! کہو اے اللہ! اپنی جانب سے میرے لیے عہد و پیمان [1] مقرر فرما اور میری محبت کو مومنین کے دلوں میں ڈال دے۔

اس موقعہ پر آیت: "اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا" نازل ہوئی ہے۔ اس کے بعد وہ مزید کہتے ہیں: لَا تَلْقٰى رَجُلاً مُؤْمِناً اِلاَّ فِي قَلْبِهٖ حُبٌّ لِعَلِيٍّ بن ابی طالبٍ (یعنی آپ کوئی بھی مومن انسان ایسا نہیں پائیں گے کہ جس کے دل میں علی ابن ابی طالب۔ کی محبت نہ پائی جاتی ہو۔) یہی وجہ سے ہم جس مومن سے بھی ملتے ہیں اس کے دل میں علی بن

---

[1] یہ الفاظ اسی سورہ کی آیت نمبر ۸۷ کی طرف اشارہ کررہے ہیں جو مسئلہ شفاعت کے بارے میں فرماتی ہے کہ یہ لوگ شفاعت کے مالک نہیں ہیں مگر وہ جو اس کے ہاں عہد و پیمان رکھتے ہیں۔

ابی طالبؑ کی محبت موجود ہوتی ہے۔[1]

ایک اور حدیث میں تھوڑے سے فرق کے ساتھ یہی بات جابر بن عبداللہ نے بیان کی ہے۔[2] یہی مطلب براء بن عازب نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا ہے۔[3] نیز یہی مفہوم (چند ذرائع سے) محمد بن حنیفہ سے بھی بیان ہوا ہے البتہ اس فرق کے ساتھ کہ ان احادیث میں علیؑ کی محبت کے ساتھ ان کی ذریت اور اہل بیت کی محبت کا بھی ذکر ہے۔[4] مذکورہ کتاب میں کلی طور پر بیس روایات مختلف طرق سے منقول ہیں اور وہ سب اسی مطلب پر تاکید کر رہی ہیں۔

جلال الدین سیوطی اپنی کتاب الدر المنثور میں اپنی اسناد سے اس حدیث کو براء بن عازب اور ابن عباس سے نقل کرتے ہیں۔[5] زمخشری نے اپنی تفسیر کشاف میں اس روایت کو اس آیت کی تفسیر کے ضمن میں بیان کیا ہے کہ آنحضرتؐ نے علیؑ سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ وہ تمہارے لیے (شفاعت کے لیے) بارگاہ میں عہد و پیمان مقرر فرمائے اور تمہاری محبت اور مودت کو مومنین کے سینوں میں ڈال دئے۔ اس موقعہ پر مذکورہ آیت نازل ہوئی۔[6] اسی مطلب کو بعینہ نامور مفسر قرطبی نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے اور اسی طرح کشاف نے؛ اور اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں کیا ہے۔[7]

دیگر مشہور شخصیات جنہوں نے اس حدیث کو مذکورہ آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے۔ ان میں درج ذیل افراد قابل ذکر ہیں، سبط ابن جوزی نے تذکرہ[8] میں، محب الدین طبری[9] اور ابن صباغ مالکی نے الفصول المهمه[10] [11] میں، هیثمی نے الصواعق [11] [11] میں، ابن صباغ نے اصعاف الراغبین [12] [11] میں۔ ان کتب کا ذکر امامت وولایت کے موضوع پر مفصل کتب میں موجود ہے۔

---

[1] شواہد التنزیل، جلد ا، صفحہ ۳۶۵، حدیث ۵۰۴

[2] ایضا صفحہ ۳۵۹، حدیث ۴۰۹، ۴۹۰

[3] ایضا صفحہ ۳۵۹، حدیث ۴۰۹، ۴۹۰

[4] ایضا صفحہ ۶۷۔۳۶۶، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۷، ۵۰۹

[5] الدر المنثور، جلد ۴، صفحہ ۲۸۷

[6] کشاف جلد ۳، صفحہ ۴۷

[7] تفسیر قرطبی، جلد صفحہ ۴۲۰۰ (زیر بحث آیت کی تفسیر میں)

[8] تذکرہ، صفحہ ۲۰

[9] ذخائز العقبیٰ، صفحہ ۸۹

[10] [11] فصول المهمه، صفحہ ۱۰۶

[11] [11] صواعق المحرقہ، صفحہ ۱۷۰

[12] [11] اصعاف الراغبین، جو کہ نور الابصار کے حاشیہ پر چھپی ہے، صفحہ ۱۱۸۔

مفسرین میں سے صرف آلوسی نے روح المعانی میں اس حدیث کے بارے میں منفی رویہ اور موقف اختیار کیا ہے۔معمول کے مطابق پہلے اس نے حدیث کو بیان کیا ہے پھر اس کو مخدوش ظاہر کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔اس نے مذکورہ حدیث کو براء بن عازب سے نقل کرنے کے بعد اور محمد بن حنیفہ کی حدیث سے اس کی تائید کرنے کے بعد کہا ہے کہ آیت کی تفسیر میں معیار لفظ کا عموم ہے نہ کہ مخصوص سبب نزول۔[1]

ہم نے بارہا کہا ہے اور ایک بار پھر کہتے ہیں کہ کوئی بھی نہیں کہتا کہ شان نزول آیات کے وسیع مفہوم کو محدود کر دیتا ہے بلکہ شان نزول آیت کا اتم اور اکمل مصداق ہے۔دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ جو کچھ ان روایات میں علیؑ کے متعلق بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی محبت کو تمام مومنین کے دلوں میں قرار دیا ہے۔یہ بات امت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سے کسی فرد کے متعلق نہیں ہے اور امیر المومنین علیؑ کے لیے یہ ایک بہت بڑی فضلیت ہے جس میں کوئی بھی ان کی برابری نہیں کر سکتا۔کیا یہ ہستی جس کی محبت اور مودت کو اللہ تعالیٰ نے تمام مومنین کے دلوں میں آمیختہ کیا ہے، منصب امامت اور خلافت رسول خداؐ کے لیے تمام افراد سے زیادہ لائق اور حقدار نہیں ہے۔؟

[1] روح المعانی، جلد ۱۶، صفحہ ۱۳۰۔

۲۱۔آیت منافقین

سورہ محمدؐ کی آیت ۳۰ میں ارشاد الٰہی ہے:

وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ؕ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ ؕ . . .

اگر ہم چاہتے تو ہم آپ کو ان (منافقین) کی نشاندہی کر دیتے پھر آپ انہیں ان کی شکلوں سے پہچان لیتے اور آپ انداز کلام سے ہی انہیں ضرور پہچان لیں گے۔

درحقیقت اس آیت میں پچھلی آیت کے مقابل کا نکتہ بیان ہوا ہے۔ یہ آیت منافقین اوران کی نشانیوں کی بابت بتا رہی ہے۔ آیت کہتی ہے اگر ہم چاہتے تو آپ کو ان کی شناخت کرا دیتے، یہاں تک کہ ان کے چہروں پر نشانی لگا دیتے تا کہ اُسے دیکھ کر آپ انہیں پہچان لیں۔اس کے بعد آیت مزید کہتی ہے کہ اگرچہ موجودہ حالت میں آپ انہیں طرز گفتگو سے ہی پہچان سکتے ہیں کیونکہ جب بھی جہاد کی بات ہوتی ہے ان کی کوشش ہوتی ہے کہ اس سے جان چھڑائیں اور لوگوں کے حوصلوں کو پست کریں اور جب نیک اور صالح افراد نیز اسلام میں سبقت لے جانے والوں کی بات ہوتی ہے تو ان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ ان پر کوئی الزام یا تہمت لگائی جائے اور انہیں داغدار بنایا جائے۔

یہاں پر ابوسعید خدری کی مشہور حدیث یاد آتی ہے جو انہوں نے ''وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فی لحن القول'' کے جملے کی تفسیر میں ذکر کی ہے وہ اس جملے کی تفسیر میں کہتے ہیں: بِبُغْضِهِمْ عَلِيَ ابنَ ابی طالب۔ یعنی: انہیں علی ابن ابی طالبؑ کی عداوت ودشمنی کے طریقے (ان کے بارے میں ان کی بغض وکینہ سے بھری باتوں) سے پہچانا جا سکتا ہے۔اس حدیث کو حاکم حسکانی نے تین سندوں سے شواہد التنزیل میں نقل کیا ہے۔[۱] نیز سیوطی نے الدر المنثور میں اسے ''ابن مردویہ'' اور ابن عساکر نے ابوسعید خدری سے نقل کیا ہے۔[۲]

ایک اور روایت میں وہ ابن مسعود سے بیان کرتے ہیں کہ اس نے کہا: ''ما كُنَّا نَعْرِفُ المنافقينَ عَلٰى عَهْدِ رَسُولِ اللهِ (ص) اِلَّا بِبُغْضِهِمْ عَلِيَّ ابن ابيطالِبٍ [۳] یعنی: رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں منافقوں کو علی ابن ابی طالب سے بغض اور عداوت کے ذریعے پہچانتے تھے۔[۴]

اس حدیث کے راوی اور کتب صرف مذکورہ بالا افراد اور کتابوں میں منحصر نہیں ہیں، جابر بن عبداللہ انصاری اور ابوذر غفاری نے

---

[۱] شواہد التنزیل، جلد ۲، صفحہ ۱۷۸ (حدیث ۸۸۳۔۸۸۵)

[۲] الدر المنثور، جلد ۶، صفحہ ۶۶

[۳] الدر المنثور، جلد ۶، صفحہ ۶۶

[۴] استیعاب، جلد ۲، صفحہ ۴۶۴۔

بھی اس حدیث کونقل کیا ہے۔جیسا کہ ابن عبدالبر نے اپنی کتاب استیعاب میں اس حدیث کو جابر بن عبداللہ انصاری سے نقل کیا ہے۔محب الدین طبری، الرّیاض النّضرۃ میں ابوذر غفاری سے یوں بیان کرتے ہیں:

مَا کُنَّا نَعْرِفُ الْمُنَافِقِینَ عَلٰی عَهْدِ رَسُولِ اللّٰهِ (ص) إِلَّا بِثلاثٍ : بتکذِیبِهِمُ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَالَّتخلُّفِ عَنِ الصَّلاةِ وَبُغْضِهِمْ عَلِیّ بن ابیطالِبٍ

رسول اللہؐ کے دور میں ہم منافقین کوصرف تین نشانیوں سے پہنچانتے تھے۔اللہ اور اس کے رسولؐ کی تکذیب،نماز(جماعت) کی خلاف ورزی اور علی بن ابی طالب سے بغض وعداوت۔[1]

صحیح ترمذی جوکہ اہلسنت کی درجہ اول کی کتاب ہے،اس میں بھی یہ حدیث دوطریقوں سے ابوسعید خدری اور جناب اُمّ سلمہ سے نقل ہوئی ہے(ام سلمہ کی حدیث اور مذکورہ حدیث) میں تھوڑا سا فرق ہے۔[2] ابن عساکر نے بھی تاریخ دمشق اسی مطلب کو یا اس کے مشابہہ مفہوم کوابوسعید خدری، جابر بن اللہ انصاری،عبادۃ بن صامت اور محبوب بن ابی الزناد سے نقل کیا ہے۔[3]

عبادہ ابن صامت کی حدیث میں آیا ہے:

کُنَّا نُوِّرُ اَوْلادَنَا بِحُبِّ عَلِیِّ بْنِ اَبِیطالبؑ فَإِذا رَاَیْنَا اَحَدا لایُحِبُّ عَلِیَّ ابْنَ ابی طالِبؑ عَلِمْنَا اَنَّهُ لَیْسَ مِنَّا وَ اَنَّهُ لَغَیْرِ رُشْدِهِ۔

ہم اپنی اولاد کی صورتحال کوعلی بن ابی طالب-کی محبت سے واضح کرتے تھے جب ہم کسی میں ہم علی ابن ابی طالب-کی محبت کو نہ پاتے تو ہم جان لیتے کہ یہ ہم میں سے نہیں ہے،اورمحبوب بن ابی الزناد کی حدیث میں انصار کی جماعت کی زبانی آیا ہے:

اِنْ کُنَّا لَنَصْرِفُ الرَّجُلَ اِلٰی غَیْرِ اَبِیْهِ بِبغُضِهِ علیَّ ابن ابی طالبٍؑ

جب کسی میں ہم بغض علی بن ابی طالبؑ کا مشاہدہ کرتے تو ہم سمجھ جاتے تھے کہ یہ اپنے باپ کا نہیں ہے۔[4]

ان روایات کی تعداد بہت زیادہ ہے ہم اس سلسلے کو ایک ایسی حدیث پر ختم کرتے ہیں جوخود رسول اکرم ﷺ سے نقل ہوئی ہے۔خیبر کے دن پیغمبر اکرم ﷺ نے علیؑ کے بارے میں مفصل بیان ارشاد فرمایا اس کے ضمن میں یہ بھی فرمایا: یَا اَیُّهَا النَّاسُ اِمْتَحِنُو اَوْلادَ کم بِحُبّهِ،فَإِنَّ عَلِیًّا لَایَدْعُو اِلٰی ضلالَةٍ و لایُبْعِدُ عَنْ هُدیً، فَمَنْ اَحَبَّهُ فَهُوَ مِنْکُمْ وَ مَنْ اَبْغَضَهُ

---

[1] الریاض النضرۃ صفحہ ۲۱۴۔

[2] صحیح ترمذی،جلد ۵،صفحہ ۶۳۵ (حدیث نمبر ۳۷۱۷)

[3] مختصر تاریخ دمشق،جلد ۱۷،صفحہ ۳۷۰،۳۷۱،مطبوعہ دارالفکر (دمشق)

[4] مختصر تاریخ دمشق،جلد ۱۷،صفحہ ۳۷۰،۳۷۱،مطبوعہ دارالفکر (دمشق)

فَلَيْسَ مِنْكُمْ ۔ یعنی: اے لوگو! اپنی اولاد کو علیؑ کی محبت سے آزماؤ، بے شک علیؑ گمراہی کی طرف دعوت نہیں دیتا اور ہدایت سے دُور نہیں کرتا، جو اس سے محبت کرے وہ تمہارا ہے اور جو ان سے بغض وعداوت رکھے وہ تمہارا نہیں ہے (کسی اور کا ہے)[1]

جب انسان ان تمام مذکورہ روایات کا جائزہ لیتا ہے اور ان میں غور وفکر کرتا ہے تو اس کے سامنے ایک ایسی شخصیت آتی ہے جس سے عقیدت اور محبت ایمان کی نشانی ہے اور اس سے عدوات اور دشمنی کفر اور نفاق کی علامت ہے، اور یہ سب کچھ ہم تک ان سخت ترین ادوار سے گذر کر پہنچا ہے جب بنی امیہ جیسی حکومتوں نے علیؑ کے دوستوں پر گھیرا تنگ کر رکھا تھا اور ان کے دشمن تمام امور پر مسلط تھے یہاں تک کہ ان پر سب وشتم اور وہ بھی عمومی محافل میں، حکومت اور صاحبان اقتدار کی قربت کا باعث تھا۔ انسان جب دیکھتا ہے کہ یہ تمام بے نظیر فضائل اور کمالات جو مشرق اور مغرب میں پھیلے ہوئے ہیں اور جن سے تاریخ، تفسیر اور احادیث کی کتابیں بھری پڑی ہیں، کس طرح سے سخت ترین دشمنوں کے چنگل سے نکل کر ہم تک پہنچے ہیں۔ تو وہ حیرت میں غرق ہو جاتا ہے۔

یہ سب کچھ نور حق کو تمام ادوار اور قرون میں تابندہ رکھنے اور علیؑ کی ولایت اور خلافت کے بارے میں تمام نسلوں پر حجت تمام کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی مدد اور اس کی مشیت سے ہوا ہے۔

---

[1] مختصر تاریخ عساکر: جلد ۱۷، صفحہ ۳۷۱

۲۲۔آیت ایذاء

سورہ احزاب کی آیت ۵۷ میں ارشاد الہی ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِیْنًا﴿۵۷﴾

وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول کو اذیت پہنچاتے ہیں اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں انہیں اپنی رحمت سے دور کرتا ہے اور ان کے لیے ذلیل و رسوا کرنے والا عذاب تیار کیا ہے۔

بدیہی بات ہے کہ کوئی بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا نہ اُسے اذیت پہنچا سکتا ہے۔اس بنا پر اللہ تعالیٰ کو اذیت پہنچانے سے مراد (جیسا کہ مفسرین نے کہا ہے) کفر اور الحاد ہے جو اللہ تعالیٰ کو غضبناک کرتا ہے اور ان افراد کے عقاب پر تاکید ہے جو رسول اور مومنین کو اذیت دیتے ہیں کیونکہ انہیں اذیت پہنچانا خدا کو اذیت پہنچانے کے مترادف ہے۔

اس حوالے سے اہل سنت اور اہل بیت کے حوالوں سے کئی روایات بیان ہوئی ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا: ''اے علیؑ! جو تمہیں اذیت اور تکلیف پہنچائے اس نے مجھے اذیت دی ہے۔'' اس لحاظ سے انہیں اذیت دینا حضرت رسول خدا ﷺ کو اذیت پہنچانے کے برابر ہے۔

حاکم حسکانی اپنی کتاب شواہد التنزیل میں جابر بن عبداللہ سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے رسول خدا ﷺ سے سُنا ہے کہ آپؐ نے علیؑ سے فرمایا: مَنْ آذاكَ فَقَدْ آذاني۔ یعنی: جس نے تمہیں تکلیف پہنچائی اُس نے مجھے تکلیف پہنچائی ہے۔[۱] ایک اور حدیث میں وہ ابن ابی سلمہ کے ذریعے سے زوجہ رسولؐ بی بی اُمّ سلّمہ سے روایت کرتے ہیں کہ اس نے بیان کیا ہے کہ میں نے رسول اکرم ﷺ کو علیؑ سے فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ: اَنْتَ اَخي و حبيبي مَنْ آذاكَ فَقَدْ آذاني۔ یعنی: تم میرے بھائی اور حبیب ہو جس نے تمہیں ستایا اُس نے مجھے ستایا ہے۔[۲] اس کے بعد وہ مزید لکھتے ہیں کہ اسی مطلب کو ایک اور جماعت جس میں حضرت عمر، سعد بن ابی وقاص ابوھریرہ، ابن عباس اور ابوسعید خدری شامل، نے بھی نقل کیا ہے۔[۳]

نیز موصوف ایک اور حدیث حضرت علی بن ابی طالب سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے بالوں کو ہاتھوں میں لیتے ہوئے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: اس حدیث کو اللہ کے رسولؐ نے میرے لیے بیان فرمایا ہے جب کہ آپؐ نے

---

[۱] شواہد التنزیل، جلد ۲، صفحہ ۹۸ (حدیث ۷۷۷)

[۲] شواہد التنزیل، جلد ۲، صفحہ ۹۸ (حدیث ۷۷۸)

[۳] شواہد التنزیل، جلد ۲، صفحہ ۹۸ (حدیث ۷۷۸)

اپنے بالوں کو پکڑا ہوا تھا، فرمایا:

مَنْ آذی شَعرَۃً مِنْکَ فَقَدْ آذانی وَمَنْ آذانی فَقَدْ آذی اللهَ وَمَنْ آذی اللهَ فَعَلَیْہِ لعنۃ اللهِ

جو شخص تمہارے ایک بال کو بھی تکلیف پہنچائے اُس نے مجھے تکلیف پہنچائی ہے اور جو مجھے اذیت پہنچائے اُس نے خدا کو اذیت دی ہے اور جو خدا کو اذیت پہنچائے اس پر اللہ کی لعنت ہے۔[1]

مذکورہ بالا احادیث میں صرف اس بات کا ذکر ہے علیؑ کو اذیت دینا، رسول خداؐ کو اذیت پہنچانا ہے، لیکن ان میں مذکورہ آیت سے استدلال نہیں کیا گیا ہے۔ حالانکہ بعض دیگر روایات میں اس سے استدلال بڑی صراحت سے کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک روایت حاکم نیشاپوری نے ''مستدرک الصحیحین'' میں نقل کی ہے جس کے بارے میں اس نے کہا کہ یہ حدیث صحیح اور معتبر ہے۔ وہ ابن عباس سے بیان کرتے ہیں کہ ایک شامی نے اس کے سامنے علیؑ کی ذات مقدس پر سب وشتم کیا تو ابن عباس نے اس سے کہا:

یا عَدُوَّ اللهِ آذَیْتَ رَسُولَ اللهِ (ص) اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللهَ وَرَسُوْلَہٗ لَعَنَہُمُ اللهُ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ وَاَعَدَّ لَہُمْ عَذَابًا مُّہِیْنًا لو کانَ رَسُولُ اللهِ حَیًّا لَآذَیْتَہٗ[2]

اے خدا کے دشمن! تم نے اپنی بات سے رسول خدا کو اذیت پہنچائی ہے (قرآن ارشاد فرماتا ہے) جو لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ کو اذیت پہنچاتے ہیں اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں ان پر لعنت کرتا ہے (اپنی رحمت ان سے دور کرتا ہے) اور ان کے لیے اس نے ذلیل کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اگر پیغمبرؐ زندہ ہوتے تم نے انہیں اذیت دی ہوتی۔

اس حدیث کو ذہبی نے ''تلخیص المستدرک'' میں نقل کیا ہے اور واضح طور پر کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔[3] سیوطی نے بھی الدر المنثور میں ابن عباس سے مذکورہ آیت سے استدلال کرتے ہوئے نقل کیا ہے۔[4]

نیز مستدرک الصحیحین میں عمر بن شاس سے ایک مفصل حدیث منقول ہے اس کے آخر میں مذکورہ ہے: عمرو بن شاس بیان کرتے ہیں کہ میں نے مسجد نبوی میں علیؑ کے میرے ساتھ یمن کے سفر میں رویے کی شکایت کی۔ یہ بات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کانوں تک پہنچی، صبح سویرے جب میں چند اصحاب کے ساتھ مسجد میں داخل ہوا تو آنحضرتؐ نے میری طرف سخت نظروں سے دیکھا اور فرمایا: اللہ کی قسم اے عمر! تو نے مجھے تکلیف پہنچائی ہے۔ میں نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ میں آپ کو تکلیف

---

[1] شواہد التنزیل، جلد ۲، صفحہ ۹۷ (حدیث ۷۷۶)

[2] مستدرک الصحیحین، جلد ۳، صفحہ ۱۲۱ (مطبوعہ دار المعرفۃ بیروت)

[3] تلخیص المستدرک جو کہ مستدرک الصحیحین کے حاشیہ پر چھپی ہے (جلد ۳ صفحہ ۱۲۲)

[4] الدر المنثور، ج ۵، صفحہ ۲۲۰

پہنچاؤں۔'' آپؐ نے فرمایا: ہاں! جس نے علیؑ کو تکلیف پہنچائی اس نے مجھے تکلیف پہنچائی۔'' (مَنْ آذی علیّاً فَقَدْ آذانی) اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد حاکم نیشاپوری واضح طور پر کہتے ہیں یہ حدیث صحیح اور معتبر ہے۔[۱]

قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ مختصر تاریخ دمشق کے مصنف نے مذکورہ حدیث کو چند اور احادیث کے ساتھ 'جابر' سعد بن ابی وقاص، عمرو بن شاس سے نقل کر کے اپنی کتاب میں تحریر کیا ہے۔ ان تمام روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ علیؑ کو تکلیف پہنچانا رسول اللہ کو تکلیف پہنچانا ہے۔[۲]

احادیث کی یہ کثرت جن میں ایسی روایات بھی شامل ہیں جن کے صحیح اور معتبر ہونے کی گواہی اہل سنت کے علمانے صراحت کے ساتھ دی ہے، بڑے واضح طور پر یہ ثابت کرتی ہے کہ علیؑ جان رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے ان سے عقیدت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عقیدت ہے ان سے محبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت ہے، ان کو اذیت پہنچانا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اذیت دینا ہے انہیں ستانا رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ستانے کے مترادف ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود کیا اس بات میں کوئی شک وتردید باقی رہ جاتا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد علیؑ تمام امت میں سب سے افضل اور برتر ہیں اور وہی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خلافت اور امامت وولایت کے بہترین حقدار ہیں؟

[۱] مستدرک الصحیحین، جلد ۳، صفحہ ۱۲۲ (ذہبی کی تلخیص میں حدیث بعینہ ذکر ہوئی ہے)

[۲] مختصر تاریخ دمشق: جلد ۱۷، صفحہ ۳۵۲

۲۳۔آیت انفاق

سورہ مبارکۂ بقرہ کی آیت ۲۷۴ میں ارشاد پروردگار ہے:

اَلَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَہُمۡ بِالَّیۡلِ وَالنَّہَارِ سِرًّا وَّعَلَانِیَۃً فَلَہُمۡ اَجۡرُہُمۡ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ ۚ وَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَلَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۲۷۴﴾

''جو لوگ اپنا مال شب و روز، پوشیدہ اور اعلانیہ طور پر خرچ کرتے ہیں ان کا اجران کے رب کے پاس ہے اور انہیں نہ کوئی خوف لاحق ہوگا اور نہ وہ محزون ہوں گے۔''

بلا شک وشبہ اس آیت کا مفہوم کلی اور جامع ہے۔اس آیت میں مختلف طریقوں سے راہ خدا میں خرچ کرنے کی ترغیب دلائی گئی ہے۔یعنی رات ہو یا دن، چھپ کر ہو یا ظاہر۔اور جو افراد خرچ کرتے ہیں ان کیلئے عظیم خوشخبری ہے کہ ان کا اجر وثواب ان کے رب کے پاس محفوظ ہے اور انہیں گذشتہ پر کوئی غم اور افسوس نہیں ہوگا اور نہ اپنے مستقبل کا انہیں کوئی خوف لاحق ہوگا۔

لیکن اسلامی روایات واحادیث یہ بتاتی ہیں کہ جن لوگوں کی اس آیت میں توصیف بیان ہوئی ہے ان کا کامل مصداق اور نمونہ حضرت علیؑ کی ذات ہے۔کیونکہ اس آیت کی شان نزول میں کئی ایسی روایات بیان ہوئی ہیں کہ جن کے مطابق یہ آیت حضرت علیؑ کی شان میں نازل ہوئی۔مثال کے طور پر ابن عباس کہتے ہیں: یہ آیت علی ابن ابی طالب (علیہما السلام) کے بارے میں نازل ہوئی کہ آپ کے پاس چار درہم تھے۔آپ نے ایک درہم رات کو خدا کی راہ میں خرچ کیا اور ایک درہم دن کو۔ایک درہم ظاہری طور پر اور ایک چھپ کر۔

رسولخدا ﷺ نے آپ سے پوچھا: ''مَا حَمَلَكَ عَلٰی هٰذَا''؟ یعنی (اے علی!) آپ کو کس چیز نے اس عمل پر آمادہ کیا؟ آپ نے جواب دیا: حَمَلَنِیۡ عَلَیۡهَا رَجَاءُ اَنۡ اَسۡتَوۡجِبَ عَلَی اللّٰهِ مَا وَعَدَنِیۡ'' یعنی: یہ عمل میں نے اس لیے انجام دیا تا کہ اللہ تعالی نے مجھے جو وعدہ دیا ہے اس کا مستحق بن جاؤں۔'' رسولخدا ﷺ نے فرمایا: ''اَلَا ذٰلِكَ لَكَ'' یعنی: ''آگاہ رہو کہ تمہارے حق میں یہ وعدہ پورا ہو چکا ہے۔اس موقعہ پر مذکورہ آیت نازل ہوئی۔

حاکم حسکانی نے شواہد التنزیل میں اس حدیث کو، اسی مضمون کی دیگر سات احادیث کے ہمراہ مختلف حوالوں سے نقل کیا ہے۔[1] سیوطی نے اپنی تفسیر ''الدرّ المنثور''میں متعدد حوالوں سے اسی مطلب کو ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت حضرت علیؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ان کے پاس چار درہم تھے، انہوں نے ایک درہم رات کو، ایک درہم دن کو، ایک درہم چھپ کر اور ایک درہم اعلانیہ طور پر راہ خدا میں خرچ کیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔[2]

---

[1] شواہد التنزیل، جلد ۱، ص ۱۰۹ تا ۱۱۵

[2] الدر المنثور جلد ۱، ص ۳۶۳

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ انفاق کے حوالے سے حضرت علیؑ نے اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے ہر وسیلہ استعمال کیا۔ ان کے پاس جو کچھ تھا وہ خدا کی راہ میں خرچ کر دیا۔ رات کو مختلف حالتوں میں (چھپ کر اور آشکارا) اور دن کو مختلف حالتوں میں (چھپ کر اور آشکارا) انفاق کیا۔ یہ ایثار اور انفاق جو اللہ تعالی کی رضا اور خوشنودی کو ہر طریقے سے حاصل کرنے کے شدید شوق سے مخلوط تھا، بارگاہ الٰہی میں قبول ہو گیا اور مذکورہ بالا آیت مجیدہ نازل ہو گئی۔

دیگر جن افراد نے مذکورہ بالا حدیث کو نقل کیا ہے ان میں سے محب الدین طبری نے ''ذخائر العقبیٰ'' میں [1]، سبط بن جوزی نے ''تذکرہ'' [2] میں، علامہ گنجی نے کفایۃ الطالب [3] میں، اور مشہور مفسر قرطبی نے اپنی تفسیر [4] میں اور ان کے علاوہ دیگر چند قابل ذکر افراد نے بھی اس حدیث کو نقل کیا ہے۔ انہوں نے مذکورہ عبارت بعینہ یا معمولی اختلاف کے ساتھ ذکر کی ہے۔

شبلنجی نے ''نور الابصار'' [5] میں اور شیخ سلیمان قندوزی نے بھی ''ینابیع المودۃ'' [6] میں اس حدیث کو نقل کیا ہے۔ ''فضائل الخمسہ'' کے مصنف نے اس حدیث کو چند دیگر افراد سے نقل کیا ہے۔ جن میں یہ افراد شامل ہیں: اسد الغابہ [7] میں ابن اثیر، الصواعق المحرقہ [8] میں ابن حجر اور اسباب النزول [9] میں واحدی۔

ہم اس حدیث کو ابن ابی الحدید معتزلی کے ایک جملے پر ختم کرتے ہیں۔ وہ حضرت علیؑ کی اعلی صفات بیان کرتے ہوئے جب ان کے جود و سخا پر پہنچتا ہے تو سورہ ھل اتی کا ذکر کرنے کے بعد کہتا ہے: ''وَرَوَى الْمُفَسِّرُونَ اَنَّهُ لَمْ يَمْلِكْ اِلَّا اَرْبَعَةَ دَرَاهِمَ، فَتَصَدَّقَ بِدِرْهَمٍ ...'' یعنی: ''مفسرین نے نقل کیا ہے کہ علیؑ کے پاس صرف چار درہم تھے۔ ان میں سے ایک درہم انہوں نے رات کو راہ خدا میں دے دیا، ایک دن میں خرچ کیا، ایک چھپ کر اور ایک اعلانیہ خرچ کیا۔ اس پر اللہ تعالی نے اس آیت کو ان کی فضیلت میں نازل کیا'' [10] [1] یہ عبارت بتاتی ہے کہ یہ مسئلہ مفسرین کے درمیان متفق علیہ یا کم از کم مشہور تھا۔

---

[1] ذخائر العقبیٰ، ص ۸۸

[2] تذکرۃ الخواص، ص ۱۷

[3] کفایۃ الطالب، ص ۱۰۸

[4] تفسیر قرطبی جلد ۲، ص ۱۱۱۵ (اسی آیت کے ذیل میں)

[5] نور الابصار، ص ۱۰۵

[6] ینابیع المودۃ، ص ۹۲

[7] اسد الغابہ، جلد ۴، ص ۲۵

[8] الصواعق المحرقۃ، ص ۷۸

[9] اسباب النزول، ص ۶۴ (فضائل الخمسہ، جلد ۱، ص ۲۱۳ اور ۳۲۲ کے نقل کے مطابق)

[10] [1] شرح ابن ابی الحدید، جلد ۱، ص ۲۱ (ایک مقدمہ کے ضمن میں جو انہوں نے مولا علیؑ کی شرح حال میں لکھا ہے)

۲۴۔آیت محبت

سورہ مائدہ کی آیت نمبر ۵۴ میں ارشاد ربانی ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۡ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ۭ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۴﴾

اے ایمان والوتم میں سے جو بھی اپنے دین سے پلٹ جائے گا (وہ خدا کا کچھ نہیں بگاڑتا) تو عنقریب اللہ ایک قوم کو لے آئے گا جو اس کی محبوب اور وہ اس سے محبت کرنے والی ہوگی مومنین کے سامنے خاکسار اور کفار کے سامنے صاحب عزت راہ خدا میں جہاد کرنے والی اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروانہ کرنے والی ہوگی یہ فضل خدا ہے وہ جیسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور وہ صاحب وسعت اور علیم ودانا ہے۔

یہ آیت واضح طور پر کہہ رہی ہے کہ تازہ مسلمانوں کی ایک جماعت کا اسلام سے پلٹ جانا، اسلام کی بنیاد کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تا اللہ تعالی نے اہل ایمان کے ایک گروہ کو جو چند خصوصیات کا حامل ہے، دین مقدس کے دفاع کی ذمہ داری سونپی ہے وہ افراد جو خدا سے محبت کرتے ہیں اور خدا ان سے محبت کرتا ہے، وہ افراد جو مومنین کے سامنے متواضع اور عاجزی کرنے والے ہیں اور کافروں اور اسلام کے دشمنوں کے مقابلے میں سخت اور شجاع ہیں۔ یہ افراد ہمیشہ راہ خدا میں برسر پیکار ہیں اور سرزنش کرنے والوں کی سرزنش سے ذرا برابر پریشان اور خوف زدہ نہیں ہوتے۔ یہ حقیقت ہے کہ ان صفات کا کسی فرد یا افراد میں موجود ہونا فضل الٰہی ہے اور ہر شخص اسکا اہل نہیں ہے۔

بلا شک وشبہ اس آیت کا مفہوم بھی گذشتہ بہت ساری آیات کی طرح وسیع ہے لیکن اہلسنت اور شیعہ حوالوں سے منقولہ روایات سے اچھی طرح سے ثابت ہوتا ہے کہ اس آیت کے اعلیٰ اور بہترین مصداق علیؑ ہیں۔ فخر رازی جب اس آیت کی تفسیر پر پہنچتے ہیں اور اس آیت پر تطبیق کے لیے مفسرین کے اقوال نقل کرتے ہوئے بحث کے آخر میں کہتے ہیں: ''ایک جماعت کا کہنا ہے کہ یہ آیت علی علیہ السلام کے بارے میں نازل ہوئی ہے'' اور اپنے قول کے حق میں دو دلیلوں سے استدلال کرتے ہیں۔ ان کی پہلی دلیل یہ ہے کہ جب خیبر کے دن رسول خداؐ نے علم علیؑ کو دیا تو فرمایا:

لَاَدْفَعَنَّ الرَّايَةَ غَدًا اِلٰى رَجُلٍ يُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيُحِبُّهُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ

''کل میں علم اس مرد کو دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہوگا اور اللہ اور اسکے رسول بھی اس سے محبت کرتے ہوں گے۔''

اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ یہ وہی صفت ہے جس کا مذکورہ بالا آیت میں ذکر ہوا ہے۔ اور ان کی دوسری دلیل یہ ہے کہ اسکے بعد والی آیت

انّمَا وَلِیُّکُمُ اللهُ وَرَسُولُهُ .... ہے جو کہ علیؑ کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ لہٰذا حق یہی بنتا ہے کہ ہم کہیں کہ پہلے والی آیت بھی علیؑ کی شان میں اتری ہے۔ (فخر رازی کی بات ختم ہوئی) [1]

فتح خیبر کے دن رسول خداؐ کے کلام سے فخر رازی کا استدلال کرنا اس مشہور حدیث کی طرف اشارہ ہے جو بہت ساری مشہور کتب میں حضرت علیؑ کے متعلق منقول ہے اور ان کے بہت بڑے فضائل میں شمار ہوتی ہے کیونکہ اس حدیث کے مطابق جب اسلامی لشکر کے کمانڈروں کو خیبر کو فتح کرنے میں پے در پے ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا تو رات کو پیغمبر اکرمؐ نے لشکر اسلام کے مرکز میں انہیں خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

لَأُعْطِيَنَّ الرايَةَ غداً رجُلاً يُحِبُّ اللهَ وَ رَسُولَهُ وَ يُحِبُّهُ اللهَ و رَسُولُهُ كرّاراً غَيْرَ فَرارٍ، لايرجعُ حَتىّٰ يَفْتَحَ اللهُ عَلىٰ يَدِهِ

خدا کی قسم کل میں علم اس مرد کے سپرد کروں گا جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہوگا اور اللہ اور اس کے رسول بھی اسے چاہتے ہوں گے میدان میں جم کر لڑنے والا ہوگا اور ہرگز بھاگنے والا نہ ہوگا وہ اس وقت تک واپس نہیں آئے گا جب تک اللہ اس کے ہاتھوں پر فتح نصیب نہیں کرے گا۔

اس کے بعد آنحضرتؐ نے پوچھا: علیؑ کہاں ہیں۔ جواب دیا گیا وہ بیمار ہیں اور انہیں آشوب چشم لاحق ہے (اور جنگ نہیں کر سکتے) فرمایا: انہیں بلایا جائے۔ علیؑ تشریف لائے تو پیغمبر اکرمؐ نے ان کی آنکھوں پر دم کیا اور دوسرے دن انہوں نے برق رفتاری سے حملہ کر کے خیبر فتح کر لیا (اور پیغمبر اکرمؐ کی ان کے بارے میں یہ عجیب پیش گوئی سچی ثابت ہوئی) اس حدیث کو فخر رازی کے علاوہ دیگر بہت سارے محدثین اور مورخین نے (تھوڑے بہت فرق کے ساتھ) اپنی کتابوں میں بیان کیا ہے جیسے حاکم نیشاپوری نے اپنی کتاب المستدرک الصحیحین میں تین مقامات پر اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

پہلے وہ ابن عباس سے ایک حدیث نقل کرتے ہیں کہ چند افراد نے اسکے سامنے علیؑ کے بارے میں نازیبا کلمات کہے وہ سخت غصے میں آئے اور کہا: تف ہے ان لوگوں پر جو اس شخص کے بارے میں اس قسم کے الفاظ استعمال کرتے ہیں جس میں بارہ سے زیادہ ایسی فضیلتیں موجود ہیں جو کسی اور میں نہیں ہیں پھر وہ علیؑ کے ایک ایک کر کے فضائل بیان کرتے ہیں اور ان میں سے سب سے پہلے یہی جنگ خیبر کا واقعہ تھا۔ [2]

دوسری حدیث وہ سعد بن ابی وقاص کے بیٹے عامر سے نقل کرتے ہیں کہ ایک دن معاویہ نے میرے والد سے کہا: تم علی ابن ابی طالبؑ پر سب وشتم کیوں نہیں کرتے ہو؟ میرے والد نے جواب دیا: میں جب بھی ان کے بارے میں رسول خداؐ کی تین باتوں کو یاد

---

[1] تفسیر کبیر، جلد ۱۲، صفحہ ۲۰

[2] المستدرک جلد ۳، صفحہ ۱۳۲۔

کرتا ہوں تو ان پر سب وشتم سے گریز کرتا ہوں ۔ یہ تین باتیں ایسی ہیں کہ اگر ان میں سے ایک بھی میرے لیے ہوتی تو سرخ قیمتی اونٹوں سے زیادہ مجھے محبوب ہوتی۔معاویہ نے ان سے ان تین باتوں کے بارے میں پوچھا: سعد بن ابی وقاص نے سب سے پہلے حدیث کساء کے واقعے کو ذکر کیا۔ پھر حدیث منزلت کو بیان کیا جو جنگ تبوک کے موقعہ پر بیان ہوئی تھی جس میں آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا تھا: ''اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَةِ ھارون مِنْ مُوْسی''۔اور آخر میں اس نے جنگ خیبر کا حوالہ دیا جس میں رسول اکرمؐ نے ارشاد فرمایا:

اُعْطِيَنّ الرايَةَ غداً رجلاً يُحِبُّ اللهَ و يَفْتَحَ اللهُ عَلىٰ يَدِهِ۔

میں پرچم اس شخص کے سپرد کروں گا جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت و دوستی رکھتا ہو گا اور اللہ اس کے ہاتھوں پر فتح نصیب فرمائے گا۔

پھر آنحضرتؐ نے علیؑ کے متعلق پوچھا کہ وہ کہاں ہیں اس کے بعد اپنے مبارک لعاب دہن سے انکی آنکھوں کو شفا دی اور پرچم ان کے حوالے کیا۔ میں جب بھی ان تین میں سے کسی حدیث کو یاد کرتا ہوں تو میں انہیں سب وشتم نہیں کرسکتا۔ خدا کی قسم معاویہ، چپ ہو گیا اور پھر ان سے کوئی بات نہ کی۔ یہاں تک کہ وہ مدینے سے واپس چلا گیا۔[1]

تیسری حدیث وہ عبداللہ بن بریدہ اسلمی سے نقل کرتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ نے خیبر میں یہ جملہ فرمایا۔۔۔اس کے بعد مذکورہ واقعہ کو اضافے کیساتھ بیان کرتے ہیں۔[2] جن افراد نے واضح طور پر کہا ہے کہ مذکورہ آیت علیؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے ان میں سے ایک ثعلبی ہیں وہ اپنی تفسیر میں (مناقب عبداللہ الشافعی میں جو کچھ آیا ہے اس کی بنا پر) مذکورہ آیت کی تفسیر میں کہتے ہیں: ''اِنَّھا نَزَلَتْ فی عَلِی''۔ یہ آیت علیؑ کے متعلق نازل ہوئی ہے۔[3]

اسی طرح علامہ ثعلبی (کتاب العمدة میں ابن بطریق کے نقل کی بنا پر) اسی آیت کے ضمن میں تصریح کرتے ہیں کہ یہ علی بن ابی طالبؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔[4] کنز العمال کے مصنف بھی اپنی کتاب میں سعد ابن ابی وقاص سے اسی حدیث کو نقل کرتے ہیں اور دوسری حدیث میں عامر بن سعد سے اسی مطلب کو کچھ اضافے کے ساتھ بیان کیا ہے۔[5]

یہ اور اس طرح کی دیگر احادیث جو کتب اہلسنت اور اہلسنت کی مشہور کتابوں میں منقول ہیں، ایک ایسی فضیلت کو بیان کرتی ہیں جو سعد بن ابی وقاص کے بقول بے مثل اور بے نظیر ہے اگر کسی کے پاس صرف یہی ایک فضیلت ہوتی تو اس کے فخر کے لیے یہی کافی تھی۔ اگر اس قسم کی بافضیلت شخصیت امت میں موجود ہو تو کیا اسکے ہوتے ہوئے رسول اللہؐ کے جانشینی اور خلافت کو کسی اور کے سپرد کرنا جائز ہے؟ کیا

---

[1] تلخیص المستدرک جو کہ مستدرک الصحیحین کے حاشیہ پر چھپی ہے (جلد ۳ صفحہ ۱۰۸، ۱۰۹)

[2] المستدرک جلد ۳، صفحہ ۴۳۷

[3] مناقب، صفحہ ۱۶۰، مخطوطہ (احقاق الحق، جلد ۱۴، صفحہ ۲۴۸ کی نقل کی بنا پر)

[4] العمدة، صفحہ ۱۵۱ (احقاق الحق، جلد ۱۴، صفحہ ۲۴۸ کی نقل کی بنا پر)

[5] کنز العمال، جلد ۱۳، صفحہ ۱۶۲، ۱۶۳ (حدیث ۳۶۴۹۵، ۳۶۴۹۶) مطبوعہ موسسہ الرسالة بیروت)

ایسا تصور کرنا ممکن ہے؟ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے جو مشہور کتب میں منقولہ روایات سے استفادہ ہوتا ہے اور جس کی تائید آیت مودت کرتی ہے کہ علیؑ نہ صرف اللہ اور اسکے رسول کے محبوب تھے بلکہ تمام مخلوقات میں سے ان کے نزدیک محبوب ترین فرد تھے۔

اس بات کی دلیل وہ حدیث ہے جو حدیث طیر کے نام سے مشہور ہے۔''**المستدرک علی الصحیحین**''میں ہم یوں پڑھتے ہیں کہ آنحضرتؐ کے خادم حضرت انس آپؐ کے بعد لمبی عمر کرنے کے بعد بیمار پڑ گئے۔ محمد بن حجاج دیگر چند افراد کے ساتھ ان کی عیادت کے لیے گئے ہر قسم کی باتیں ہونے لگیں، اتنے میں علیؑ کا اسم مبارک لیا گیا، حجاج کے بیٹے نے ان کے متعلق توہین آمیز جملے کہے۔ انس غصے میں آ گئے اور پوچھا یہ کون شخص ہے؟ اس نے کہا مجھے بٹھاؤ۔ اسے بٹھایا گیا۔ اس نے کہا:

''اے حجاج کے بیٹے! علی بن ابی طالبؑ کی کیوں برائی اور توہین کرتے ہو؟ مجھے اس ذات کی قسم ہے جس نے محمدؐ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا: میں آنحضرتؐ کا خادم تھا (ہر روز انصار میں سے ایک جوان آنحضرتؐ کی خدمت کیا کرتا تھا) اس دن میری باری تھی ''ام ایمن'' آنحضرتؐ کے لیے ایک بھنا ہوا پرندہ لے کر آئیں اور آپؐ کے سامنے رکھ دیا۔ آنحضرتؐ نے پوچھا: ام ایمن اس پرندے کو کہاں سے لائی ہو؟ اس نے کہا میں نے خود اس پرندے کو شکار کیا ہے اور اسے آپؐ کے لیے بھون کر لائی ہوں۔ اس موقعہ پر رسول خداؐ نے دست دعا بلند کیے اور فرمایا:

اَللّٰھُمَّ جِئْنِی بِاَحَبِّ خَلْقِکَ اِلَیکَ وَاِلَیَّ یَاکُلُ مَعِی مِنْ ھذَا الطَّیْرِ۔

اے اللہ! اپنی مخلوق میں سے اپنے اور میرے نزدیک سب سے زیادہ محبوب شخص کو میرے پاس بھیج جو میرے ساتھ اس پرندے کو تناول کرے۔

اسی وقت گھر کا دروازہ کھٹکھایا گیا۔ رسول خداؐ نے فرمایا! انس دیکھو دروازے پر کون ہے، میں نے دل میں کہا اے اللہ یہ انصار میں سے کوئی ہو (تاکہ یہ اعزاز انصار کے حصے میں آئے) لیکن جب نے دروازہ کھولا تو علی علیہ السلام دروازے پر موجود تھے، میں نے ان سے عرض کیا اس وقت رسول اللہؐ کسی کام میں مصروف ہیں۔ میں واپس آ گیا اور اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا تھوڑی دیر بعد دوبارہ دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی، رسول خداؐ نے فرمایا: انس جاؤ اور جو بھی دروازے پر ہو اسے اندر لے آؤ۔ اپنی قوم سے محبت کرنے والے تم پہلے فرد نہیں ہو، آنے والا انصاری نہیں ہے۔ میں گیا اور دروازہ کھولا انہیں اندر لے آیا۔ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: اے انس! پرندے کو ان کے نزدیک کرو، میں نے اسے پیغمبر اکرمؐ اور علی علیہ السلام کے درمیان رکھا۔ دونوں نے اس پرندے کو تناول فرمایا۔''

حجاج کے بیٹے نے پوچھا۔ اے انس! تم خود موجود تھے اور تم نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے؟ انس نے جواب دیا: ہاں۔ حجاج کے فرزند نے کہا میں اللہ تعالیٰ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی علیؑ پر اعتراض نہیں کروں گا اور اگر کسی اور کو ان کی برائی کرتے ہوئے دیکھا تو اس کا چہرہ بدصورت بنا دوں گا (اسے بے عزت کروں گا) [1]

[1] المستدرک علی الصحیحین، جلد ۳، صفحہ ۱۳۱ (مطبوعہ دار المعرفہ بیروت)

اسی حدیث کو ذھبی نے تلخیص المستدرک میں بیان کیا ہے جو مستدرک کے حاشیے پر لکھی گئی ہے۔ مذکورہ باتوں کے علاوہ یہ حدیث ''حدیث طیر'' کے عنوان سے تمام بڑی اسلامی کتب میں ذکر ہوئی ہے ان کتابوں کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ علامہ امینی مرحوم کہتے ہیں کہ حدیث طیر متواتر اور صحیح ہے اس کے تواتر اور صحت کے سامنے آئمہ حدیث خاضع ہیں۔ موفق بن احمد ایک بڑے فقیہ، محدث، قوی خطیب، ادیب اور شاعر تھے، اس نے اپنی کتاب میں اس حدیث کو بیان کیا ہے۔[۱]

اس سے اہم محدث بزرگ ترمذی نے اپنی کتاب جو کہ صحیح ترمذی کے نام سے مشہور ہے، میں انس بن مالک سے نقل کیا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کے پاس ایک بھنا ہوا پرندہ تھا آپؐ نے دعا کی:

اللّٰھمّ ائتِنِی بِاَحبِّ خلقِکَ اِلَیکَ یاکُلُ مَعِیَ ھٰذا الطّیرُ فَجاءَ عَلِیٌّ فَاَکَلَ معہُ۔

اے اللہ! میرے پاس اپنی محبوب ترین ہستی کو بھیج جو میرے ساتھ اس پرندے کے کھانے میں شریک ہو پس علیؑ تشریف لائے اور انہوں نے آنحضرتؐ کے ہمراہ پرندہ تناول کیا۔[۲]

''کفایۃ الطالب'' میں علامہ گنجی شافعی اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں: اس حدیث میں اس بات پر واضح دلالت موجود ہے کہ علیؑ خلق خدا میں سے محبوب ترین ہستی میں (پیغمبر اسلامؐ کے بعد) اور اس مطلب پر بہترین دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اکرمؐ کی دعا کو قبول فرمایا۔ بنابرایں درگاہ الٰہی میں تقرب کا بہترین وسیلہ علی بن ابی طالبؑ کی محبت ہے اور ان کی محبت ہے جو انہیں دوست رکھتے ہیں۔[۳]

تیسری صدی ہجری کے عالم علامہ نسائی اپنی معروف کتاب خصائص میں اس حدیث کو کچھ اضافے کے ساتھ نقل کرتے ہیں۔[۴]

دیگر علمائے کرام جنہوں نے اس حدیث کو اپنی کتب میں نقل کیا ہے، ان میں سبط بن جوزی نے تذکرہ میں، ابن اثیر نے اسد الغابہ میں، ابن مسعود شافعی نے مصابیح السنہ میں محب الدین طبری نے ذخائر العقبی میں، شیخ سلیمان بلخی قندوزی نے ینابیع المودۃ میں اور دیگر افراد نے جن کا ذکر طول پکڑ جائے گا، اس حدیث کو بیان کیا ہے۔

ایک نکتہ شاید بعض افراد کے لیے حیرانی کا باعث ہو وہ یہ ہے کہ ابن اثیر حدیث طیر کو جب اپنی کتاب اسد الغابہمیں چند حوالوں سے نقل کرتے ہیں تو ان میں سے ایک حوالے سے انس بن مالک سے حدیث بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ سب سے پہلے حضرت ابوبکر آئے۔ انس نے انہیں واپس کر دیا پھر حضرت عثمان آئے۔ انس نے انہیں بھی واپس بھیج دیا (خصائص نسائی میں منقول ایک اور حدیث میں حضرت عثمان کی جگہ پر حضرت عمر کا نام ہے) اس کے بعد حضرت علیؑ آئے اور انہیں اس نے اندر آنے دیا۔ حدیث کے آخر میں ابن

---

[۱] مناقب، صفحہ ۶۷

[۲] صحیح ترمذی، جلد ۱۳، صفحہ ۱۷۰ (مطبوعہ الصادی معر)

[۳] کفایۃ الطالب، صفحہ ۵۹ (بحوالہ احقاق الحق، جلد ۵، صفحہ ۳۱۹)

[۴] الخصائص، صفحہ ۵ (مطبوعہ تقدم مصر)

اثیر کہتے ہیں حضرت ابوبکر اور حضرت عثمان کا اس حدیث میں نام لینا واقعاً عجیب ہے۔[۱]

اس سے بھی حیران کن بات تو یہ ہے کہ اہلسنت کے بہت سارے محدثین نے حضرت علیؑ کی اس بے نظیر فضیلت سے بڑی سادگی کے ساتھ گذرنا چاہا ہے اور حقائق سے چشم پوشی کی ہے۔ انہوں نے اس حدیث کی سند میں شک و تردید کا اظہار کیا ہے جیسا کہ البدایۃ والنھایۃ کے مصنف ابن کثیر دمشقی نے کیا ہے۔ اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد وہ کہتے ہیں: "وَ فِي الْقَلْبِ مِنْ صِحَّةِ هٰذا الحديثِ نَظَرٌ وَ اِنْ كَثُرَتْ طُرُقُهُ" یعنی: "میرے دل میں اس حدیث کے صحیح ہونے کے بارے میں شک ہے اگرچہ اس حدیث کے حوالے کثیر اور فراوان ہیں۔[۲]

حالانکہ یہ حدیث بہت ساری مشہور کتب میں بطور متواتر اور وسیع پیمانے پر بیان ہوئی ہے اور سند اور دلالت کے لحاظ سے اس میں کوئی مشکل نہیں ہے مگر یہ کہ پہلے سے بنائے ہوئے عقیدے کے برخلاف ہے۔ علامہ امینی مرحوم کا اس عبارت کو نقل کرنے کے بعد ایک قابل توجہ جملہ ہے وہ کہتے ہیں اس حدیث میں صحت کی تمام شرائط کے پائے جانے کے باوجود کسی کے دل میں شک ہو تو اعتراض اس کے دل پر ہے نہ کہ اس حدیث پر۔

[۱] اسد الغابہ، جلد ۴، صفحہ ۳۰ (مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

[۲] البدایۃ والنھایۃ، صفحہ ۳۵۳)

۲۵۔آیت مسئولون

سورہ صافات کی آیت ۲۴ میں ظالموں کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے کہ قیامت کے دن عذاب کے فرشتوں سے خطاب ہوگا کہ انہیں (ظالمین کو) روکو، ان سے باز پرس کی جانی ہے(وَ قِفُوهم اِنَّهُم مَسْئُولُون) لیکن سوال یہ ہے کہ ان سے کس چیز کا سوال کیا جائے گا؟ اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔بعض نے کہا ہے کہ جو بدعتیں انہوں نے ایجاد کی ہوں گی، ان کے بارے میں ان سے پوچھا جائے گا، بعض نے کہا ہے کہ ان کے برے اعمال اور خطاؤں کے متعلق پوچھا جائے گا اور بعض نے اضافہ کیا ہے کہ توحیداور''لا الہ الا اللہ'' کے بارے میں سوال ہوگا۔[۱]

اوراس بات میں کوئی مضائقہ نہیں کہ یہ تمام باتیں آیت کے مفہوم میں موجود ہوں۔لیکن متعدد روایات میں آیا ہے کہ اس سے مراد علی بن ابی طالبؑ کی ولایت کا سوال ہے۔یہ روایات معروف اسلامی منابع میں منقول ہیں۔شواہد التنزیل میں دو حوالوں سے ابوسعید خدری پیغمبر اکرمؐ سے نقل کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا:

عن وَلايَةِ عَلِيّ بْنِ اَبي طالِبٍ۔

علی بن ابی طالبؑ کی ولایت کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔[۲]

دوسری حدیث میں سعید بن جبیر ابن عباس سے نقل کرتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا:

اِذا كانَ يَوْمُ القِيامَةِ اُوقَفُ اَنا و عَلِيٌّ عَلَى الصِّراطِ فَما يَمُرُّ بِنا اَحَدٌ اِلاَّ سَئَلْناهُ عَنْ وَلايَةِ عَلِيّ، فَمَنْ كانَتْ مَعَهُ، وَ اِلاَّ القَيْناهُ فِي النّارِ! وَ ذٰلِكَ قَوْلُهُ: "وَقِفُوهُمْ اِنَّهُمْ مَسْئُولُونَ"۔

جب قیامت کا دن ہوگا، میں اور علیؑ صراط پر کھڑے ہوجائیں گے جو بھی ہمارے پاس سے گزرے گا اس سے ولایت علیؑ کے بارے میں پوچھیں گے، جو ولایت رکھتا ہوگا (وہ پل صراط سے گزر جائیگا) ورنہ اسے جہنم میں ڈال دیں گے اور یہ ہے آیت:وَقِفُوهم اِنَّهُمْ مَسْئُولُون، کا مطلب۔[۳]

حاکم حسکانی نے مذکورہ کتاب میں اس حدیث کو دوسرے ذریعے سے بھی نقل کیا ہے۔نیز ابن حجر نے اپنی کتاب صواعق میں

---

[۱] مجمع البیان، جلد ۷، صفحہ ۴۴۱ (مذکورہ آیت کی تفسیر میں)

[۲] شواہد التنزیل، جلد ۲، صفحہ ۱۰۶، ۱۰۷ (حدیث ۷۸۶، ۷۸۷)

[۳] ایضا، حدیث ۷۸۸

اس حدیث کو ابوسعید خدری کے ذریعے پیغمبر اکرمؐ سے نقل کیا ہے۔[1]

مذکورہ حدیث کو نقل کرنے والوں میں (اہلسنت کے چار اماموں میں ایک) احمد بن حنبل ہیں انہوں نے اپنی مسند میں اس حدیث کو ابوسعید خدری سے بیان کیا ہے کہ قیامت کے دن علی بن ابی طالبؑ کی ولایت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔عزّالدین حنبلی نے کشف الغمہّ میں [2] آلوسی نے اپنی تفسیر میں [3] سبط بن جوزی نے تذکرہ میں [4] ابونعیم اصفہانی نے کفایۃ الخصام [5] میں، شیخ سلیمان قندوزی نے ینابیع المودۃ [6] میں اور دیگر بہت سے افراد نے اسے اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے۔اور قابل توجہ امر یہ ہے کہ ان میں سے بعض روایات میں علیؑ کی ولایت کے علاوہ اہلبیت کی ولایت کا ذکر بھی آیا ہے۔[7]

یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ مندرجہ بالا تمام روایات اہلسنت کی معتبر اور مشہور کتب سے اور ان کے قابل اعتماد راویوں کے ذریعے نقل ہوئی ہیں اس کے باوجود آلوسی جب اس روایت کو نقل کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ:"روی بعض الاماٰمیۃِ عَنِ ابْنِ جُبَیْرٍ عَنِ ابن عَباس یُسْئَلُونَ عَنْ ولایۃِ عَلِیٍّ"۔یعنی: بعض امامیہ نے ابن جبیر کے ذریعے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ علیؑ کی ولایت کے متعلق سوال ہوگا۔اسی طرح اس ولایت کو (امامیہ نے) ابوسعید خدری سے بھی بیان کیا ہے۔[8]

انتہائی تعجب کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ اس نے دوسرے خلفاء کا اضافہ اپنی طرف سے کر دیا گیا ہے۔یہ متعصب مفسر یہ خیال کرتا ہے کہ جو بھی حدیث علیؑ کے فضائل کے بارے میں ہو وہ قطعی طور پر شیعہ اور امامیہ راویوں کی ہوگی گویا مذہبی تعصب کی عینک سے اسے دکھائی نہیں دیتا یہ حدیث کس قدر وسیع پیمانے پر اہلسنت کی مشہور کتابوں میں نقل ہوئی ہے۔گویا اسے یقین نہیں تھا کہ آئندہ آنے والے اس کے الفاظ کو پڑھیں گے اور اس پر اعتراض کریں گے کہ اس حدیث کے راوی امامیہ نہیں ہیں بلکہ ان کی اکثریت اہل سنت کے بڑے افراد ہیں۔

بہرصورت ان احادیث اور اسی طرح مذکورہ آیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ قیامت کے دن صرف علی بن ابی طالب کی ولایت کا سوال ہوگا۔کیونکہ قیامت کا دن تو تمام کاموں، تمام نعمتوں اور تمام ذمہ داریوں کے بارے میں پوچھا جائے گا۔اس سے مراد یہ ہے کہ اہم ترین چیزیں جن کے متعلق سوال ہوگا ان میں ایک ان کی ولایت ہے۔بلا شک یہاں پر ولایت کا مطلب عام اور معمولی دوستی

---

[1] الصواعق المحرقۃ، صفحہ ۸۹

[2] کشاف الغمہ، صفحہ ۹۲

[3] روح المعانی مذکورہ آیت کی تفسیر میں

[4] تذکرہ، صفحہ ۲۱۔

[5] کفایۃ الخصام، صفحہ ۳۶۱

[6] ینابیع المودۃ، صفحہ ۲۵۷۔

[7] علی فی الکتاب والسنۃ، جلد۱، صفحہ ۲۲۹۔

[8] روح المعانی، جلد ۲۳، صفحہ ۷۴۔

نہیں جسے ہر صاحب ایمان کو دوسروں کے بارے میں رکھنی چاہیے کیونکہ یہ چیز دین کے عام فروعات میں سے ہے اس سے مراد اس مسئلہ سے بڑھ کر کوئی اور چیز ہے ایسی چیز جو ارکان اسلام کے ہم پلہ اور برابر ہے۔

کیا یہ موضوع پیغمبر اکرمؐ کے بعد الٰہی رہبریت اور خلافت کے علاوہ کوئی اور ہو سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ علی بن ابی طالبؑ وہ ذات ہیں جس کی ولایت اسلام کے اہم ترین ارکان اور ایمان کی اہم ترین شرائط میں سے ہے۔ یہ ان درجہ اوّل کے امور میں سے ہے جن کے متعلق قیامت کے دن پوچھا جائیگا۔ ایسا کیوں نہ ہو جبکہ دشمنوں کی تمام تر عداوتوں کے باوجود جو انہوں نے ان کے حق میں روا رکھیں اور ان کے فضائل کو چھپایا (اور ابھی تک چھپا رہے ہیں) اور دوستوں نے خوف و ہراس سے ان کے فضائل کو مخفی رکھا، ان کے فضائل اور اعزازت سے احادیث کی کتابیں بھری پڑی ہیں اور قرآن مجید کی آیات میں ان کی شخصیت درخشندہ ہے۔

اس گفتگو کا اختتام اس مشہور حدیث سے کرتے ہیں جو معتبر کتب میں ابن عباس سے نقل ہوئی ہے وہ کہتے ہیں:

ما نَزَلَ القُرانُ: "یآاَیُّھا الّذِینَ آمَنُوا" اِلاَّ عَلِیٌّ سَیِّدُّھا و شَرِیْفُھاَ وَ اَمِیْرُھا وَ ما اَحَدٌ مِنْ اَصحابِ رَسُولِ اللہِ اِلاَّ قَدْ عاتَبَہُ اللہُ فِی القُرآن ما خَلاَ عِلِیٌّ بن اَبی طالِبِ فَاِنَّہُ لَمْ یُعاتِبَہُ بِشَیْءٍ وَ ما نَزَلَ فِیْ اَحَدٍ مِنْ کِتابِ اللہِ ما نَزَلَ فِیْ عَلِیٍّ ..... نَزَلَتْ فِیْ عَلِیٍّ ثَلاَثَمِاۃُ آیۃٍ

قرآن مجید میں جہاں بھی "یاایھا الذین آمنوا" کے الفاظ آئے ہیں، علیؑ ان کے سرداران سب سے شریف اور ان کے امیر ہیں (یعنی اتم اور اکمل مصداق علیؑ ہیں) رسول خداؐ کا کوئی صحابی ایسا نہیں ہے جس کی قرآن نے سرزنش نہ کی ہو سوائے علی بن ابی طالبؑ کے، اللہ تعالیٰ نے کسی چیز میں بھی ان کی سرزنش نہیں فرمائی ہے۔۔۔قرآن مجید میں جتنے فضائل اور مدائح علیؑ کے بیان ہوئے ہیں اتنے کسی اور کے نازل نہیں ہوئے۔۔۔ قرآن مجید کی تین سو آیات علیؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔[۱]

اس حدیث (بالخصوص اس کا پہلا حصہ) کو بہت سارے راویوں نے نقل کیا ہے۔ جیسے حافظ ابونعیم اصفہانی نے اسے حلیۃ الاولیاء میں، محب الدین طبری نے ذخائر العقبیٰ میں، علامہ گنجی شافعی نے کفایۃ الطالب میں، سبط بن جوزی نے تذکرہ میں، شبلنجی نے نور الابصار میں، ھیثمی نے صواعق میں، سیوطی نے تاریخ الخلفاء اور قندوزی نے ینابیع المودۃ میں ذکر کیا ہے۔[۲]

یہ تھیں قرآن کی بعض آیات جو علیؑ کے بارے میں قرآن مجید میں نازل ہوئی ہیں ہم نے ان میں سے بعض کا انتخاب کر کے گلدستہ کی صورت میں پیش کیا ہے۔

---

[۱] مختصر تاریخ دمشق: جلد ۱۸، صفحہ ۱۱، مطبوعی دارالفکر

[۲] مزید معلومات کے لیے احقاق الحق: جلد ۳، صفحہ ۴۷۶ کا مطالعہ کریں

بارہ امام

اشارہ

اگر چہ مذہب شیعہ ''امامیہ اثنا عشریہ'' میں منحصر نہیں ہے بلکہ اس کے دوسرے فرقے بھی موجود ہیں جیسے زیدیہ جو صرف چار اماموں کو مانتے ہیں اور اسماعیلیہ جو کہ سات اماموں پر عقیدہ رکھتے ہیں۔لیکن ان میں سے مشہور و معروف بارہ امامی شیعہ ہیں جو پوری دنیا کے مسلمانوں کا ایک حصہ ہیں بعض ممالک جیسے ایران، عراق اور بحرین میں ان کی بھاری اکثریت ہے۔ان کے علاوہ دیگر اسلامی ملکوں میں بھی ان کی بڑی تعداد موجود ہے۔شیعہ اثنا عشریہ کے بڑے بڑے علمی مراکز ہیں جن میں ہزاروں علماء اور طلباء تحقیق، تدریس اور اسلامی علوم کے حصول میں مصروف ہیں۔شیعہ علماء کی طرف سے ہزاروں کتابیں عقائد اسلامی، فقہ اصول، تفسیر، حدیث، فلسفہ، رجال، درایہ اور تاریخ اسلام کے بارے میں تالیف و تصنیف ہو کر طباعت کے بعد منظر عام پر آئی ہیں۔

عالیقدر محقق مرحوم ''شیخ آقا بزرگ تہرانی'' کی کتاب ''الذریعۃ الی تصانیف الشیعہ'' جو حال میں ۲۶ جلدوں میں چھپی ہے، اس کتاب میں انہوں نے شیعہ علماء کی ہزاروں کتب کے نام، ان کے مصنفین کے نام کے ساتھ ذکر کیے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے بارے میں تھوڑی سی تفصیل بیان کی ہے۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شیعہ علماء اور دانشوروں نے اسلامی علوم کی کس قدر خدمت کی ہے اور کس طرح تمام فنون اسلامی اور بشری علوم میں اہم اور گرانمایہ کتب یادگار کے طور پر چھوڑی ہیں۔

بہتر یہ ہے کہ وہ افراد جو ان حقائق کو نہیں مانتے وہ دنیا کے مختلف علاقوں میں شیعوں کے علمی مراکز کا دورہ کریں ان کے علماء وفضلا اور طلاب کو قریب سے دیکھیں جو مختلف اسلامی علوم میں مہارت رکھتے ہیں ان کے کتابخانوں اور لائبیریوں کا مطالعاتی دورہ کریں جو شیعہ علماء کی علمی کتب اور اسی طرح اہلسنت کے علماء کی علمی کتب سے بھری پڑی ہیں۔ان کے فقہاء، متکلمین، مفسرین قرآن، توانا ادباء، اہل بیت قوی خطباء اور قرآن کے حافظوں جن کی تعداد بہت زیادہ ہے، کا نزدیک سے مشاہدہ کریں۔

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اسلامی خبر رساں ذرائع پر سخت سنسر اور اکثر اسلامی کتابخانوں پر پابندیوں کی وجہ ابھی تک اہلسنت کے غیر جانبدار محققین کو موقعہ نہیں ملا کہ وہ مکتب اہلبیت کے پیروکاروں، ان کے علماء اور ان کی علمی کتب سے آگاہ ہوسکیں۔ ہمارے ہاں لائبیریاں اور کتابخانے شیعہ علماء کی کتب کے ساتھ ساتھ سنی علماء کی کتابوں سے بھرے پڑے ہیں اور کتابوں کی موجودگی کے حوالے سے شیعہ اور سنی کی کوئی تمیز اور فرق نہیں ہے اور اس لحاظ سے کوئی بھی اپنے مذہب کے بارے میں خطرہ محسوس نہیں کرتا لیکن برادران اہلسنت کے کتابخانوں اور لائبیریریوں کی صورتحال کچھ اور منظر پیش کرتی ہے وہاں شیعہ علماء کی ہزاروں مشہور علمی کتب کا نام ونشان نہیں ہے اگر ہیں تو بہت ہی تھوڑی تعداد میں۔

بہر حال ہم امید کرتے ہیں کہ ایک دن ایسا آئے جب محققین تمام تعصّبات سے بالاتر ہو کر، غیر جانبداری کے ساتھ مذکورہ

مطالب کی تحقیق اور چھان بین کریں اور شیعوں کو اس طرح پہچانیں جس طرح وہ ہیں نہ کہ اسطرح جو ان کے دشمن کہتے ہیں اور نہ ہی استعماری پروپیگنڈے کی روشنی میں، یقیناً اس دن اسلامی دنیا کا رویہ مکتب اہلبیت کے پیروکاروں کے ساتھ تبدیل ہو جائے گا، اسلامی دنیا میں سمجھنے سمجھانے کی نئی فضا قائم ہوگی، فکر و نظر کے نئے دریچے کھلیں گے اور ہم آہنگی کا بہتر ماحول وجود میں آئے گا۔

ہم اصل موضوع سے ہٹ نہ جائیں، قرآن کی آیات میں اہلبیت کے معصوم اماموں کی طرف اشارے موجود ہیں۔ معتبر اسلامی کتب میں ان آیات کی تفسیر میں منقولہ روایات کی مدد سے یہ اشارے آشکار اور زیادہ واضح ہو جاتے ہیں۔

ایسی آیات متعدد میں یہاں پر بعض آیات کا تذکرہ کیا جاتا ہے البتہ ان میں سے بعض آیات کا ذکر علی علیہ السلام کی امامت و ولایت کے موضوع میں گزر چکا ہے۔ مثلاً

۱۔ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ (احزاب/ ۳۳)

اس آیت کا مفہوم عام ہونے پر شاہد ہے اسی طرح اس کی تفسیر و تشریح میں رسول اکرمؐ سے جو احادیث بیان ہوئی ہیں ان کے مطابق بھی اس آیت کا مفہوم عمومی ہے۔ یعنی یہ آیت حضرت علیؑ کے علاوہ باقی اماموں کو بھی شامل ہے بالخصوص امام حسنؑ اور امام حسینؑ جن کا نام ان روایات میں واضح طور پر موجود ہے۔

۲۔ قُلْ لَّاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ؕ (شوریٰ/ ۲۳)

یہ آیت بھی اجمالی طور پر تمام اماموں کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ سعید بن جبیر اور ابن عباس کے ذریعے رسول خداؐ سے منقولہ متعدد روایات میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ اس آیت میں "قربیٰ" سے مراد علیؑ فاطمہؑ اور ان کے بیٹے ہیں اور بعض میں امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے ناموں کی تصریح موجود ہے۔ مزید وضاحت کے لیے شواہد التنزیل اور دیگر کتب کا مطالعہ کیا جائے جن کا تذکرہ اس آیت کی تشریح کے موقع پر کیا گیا ہے۔[1]

۳۔ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ (نساء/ ۵۹)

یہ بھی اسی طرح ہے کیونکہ اس آیت کا مفہوم بھی عام ہے اور ہر دور کو شامل ہے بناء برایں ہر دور اور ہر عصر میں "اولوالامر" کا مصداق ہونا چاہیے ایک ایسا فرد جو گناہ سے پاک اور معصوم ہو (کیونکہ بلا قید و شرط اور مطلق اطاعت معصوم کے علاوہ کسی کے لیے جائز نہیں ہے) علاوہ ازیں اہلسنت کی کتب میں مذکورہ بعض روایات میں امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے نام ذکر ہوئے ہیں۔

۴۔ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ (توبہ/ ۱۱۹)

جیسا کہ گزر چکا ہے کہ اس آیت کا مفہوم بھی عام ہے اور ہر دور اور زمانے کو شامل ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہر دور اور زمانے میں ایک صادق معصوم موجود ہے۔ (کیونکہ بلا قید و شرط اور مطلق پیروی اور ہمراہی کا حکم معصومین کے علاوہ کسی اور کیلئے نہیں ہوسکتا)

---

[1] شواہد التنزیل میں مختلف طرق سے چھ روایتیں اس بارے میں بیان ہوتی ہیں (جلد ۲، صفحہ ۱۳۰ سے ۱۳۴ تک)

علاوہ ازیں اس آیت کی تشریح میں منقولہ روایات میں صادقین کی تفسیر محمدؐ اور اہلبیت محمدؐ سے کی گئی ہے۔[1]
چونکہ یہ آیات اور ان سے متعلق روایات کا ذکر ان ابحاث کے آغاز میں تفصیل سے ہو چکا ہے لہٰذا ان کا دوبارہ ذکر نہیں کرتے بلکہ فضیلت والی آیات کو بیان کرتے ہیں۔ ہم دوبارہ تاکید کرتے ہیں کہ آیات فضیلت کو ہم اس عنوان سے بیان نہیں کر رہے کہ یہ آئمہ اہلبیت کی امامت وولایت پر براہ راست دلالت کرتی ہیں۔ بلکہ ان کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ واضح کیا جائے کہ ان میں سے ہر فرد اپنے زمانے کے بہترین اور اعلیٰ ترین افراد تھے۔ اور چونکہ گزشتہ آیات کے مطابق ہر دور اور زمانے میں اولوالامر اور امام معصوم کا ہونا ضروری ہے، لہٰذا یہ معصوم ہستیاں اس مطلب کا مصداق ہیں۔

ا۔ آیت صلوٰات ودرود

سورہ احزاب کی آیت نمبر ۵۶ میں ارشاد ربانی ہے:

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ۭ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝۵۶

بے شک اللہ اور اس کے فرشتے نبیؐ پر درود بھیجتے ہیں اے ایمان والو! تم بھی درود وسلام بھیجو اور اس کے حکم پر سر تسلیم خم کر دو۔

اس آیت میں پیغمبر اسلام کے مقام ومرتبے کو اعلیٰ ترین صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ بھی اور اس کے مقرب فرشتے بھی نبی اکرمؐ پر درود بھیجتے ہیں اور بلا استثناء تمام مومنین کو بھی حکم دیا گیا ہے وہ بھی ان پر سلام ودرود اور رحمت بھیجیں۔ اس سے بڑھ کر اور مرتبہ کیا ہوگا؟ اور اس سے زیادہ اور عظمت کیا ہوگی؟ یہ بات صحیح ہے کہ اس آیت میں آل رسولؐ کا ذکر نہیں ہوا لیکن بہت ساری روایات میں ہم پڑھتے ہیں کہ جب اصحاب نے آنحضرتؐ سے سوال کیا کہ آپ پر ہم کس طرح درود وسلام بھیجیں تو نبی اکرمؐ نے اپنے ساتھ ''آل'' کا بھی ذکر کیا اور تمام درود اور رحمت جو آپ پر بھیجی جاتی ہے وہ آپؐ کی آل پر بھی بھیجی جائے۔

یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں کا درود وسلام بھی عمومیت رکھتا ہے۔ پیغمبر اکرم کو بھی شامل ہے اور آپ کی آل کو بھی شامل ہے۔ یہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کے بعد ان کا ہی مقام ومرتبہ ہے اور پیغمبر اکرمؐ کی ذمہ داریوں کی طرح ان کی بھی ذمہ داریاں ہیں بصورت دیگر یہ اعلیٰ مقام ومرتبہ صرف رشتہ داری کی وجہ سے ممکن نہیں۔

اب ہم ان میں سے بعض روایات کا ذکر کرتے ہیں جو اہلسنت کی کتب میں نقل ہوئی ہیں:

ا۔ صحیح بخاری میں ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ ہم نے عرض کیا ہے کہ اے رسول خدا! آپؐ پر سلام ہمیں معلوم ہے آپ پر کس طرح صلوات بھیجیں یہ ہمیں بتائیں؟ آنحضرتؐ نے فرمایا:

قُوْلُوا اللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ عَبْدِكَ وَ رَسُوْلِكَ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَ آلِ

---

[1] شواہد التنزیل، جلد ا، صفحہ ۲۶۲۔

اِبْرَاهِيْمَ و بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَ عَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ كما بَارَكْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ۔ [1]

کہواے اللہ اپنے بندے اور رسول محمدؐ پر درود بھیج جس طرح تو نے ابراہیم اور آل ابراہیم پر درود بھیجا ہے، محمد و آل محمد پر برکتیں نازل فرما جس طرح تو نے ابراہیم پر برکتیں نازل فرمائیں۔

مذکورہ کتاب کے اسی صفحہ پر یہ حدیث مکمل طور پر کعب بن عجرہ (صحابی رسولؐ) سے نقل ہوئی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول خداؐ سے عرض کیا گیا کہ ہم آپ پر سلام کرنا تو جانتے ہیں لیکن آپ پر صلوات بھیجنا نہیں جانتے ہم کس طرح آپ پر درود بھیجیں؟ آنحضرتؐ نے فرمایا: کہو!

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَ آلِ اِبْرَاهِيْمَ و بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَ عَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ كما بَارَكْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ فِى العالمين اِنَّكَ حميدٌ مَجِيْدٌ۔ [2]

توجہ رہے کہ امام بخاری نے ان احادیث کو آیت مجیدہ ''ان اللہ وملائکتہ ...'' کے ضمن میں ذکر کیا ہے۔

۲۔ صحیح مسلم، برادران اہلسنت کا حدیث کا دوسرا بڑا منبع ہے، اس میں ابومسعود انصاری سے منقول ہے کہ پیغمبر اکرمؐ ہمارے پاس تشریف لائے اس وقت ہم سعد بن عبادہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، سعد کے بیٹے بشیر نے عرض کیا، اے اللہ کے رسول! اللہ تعالیٰ نے ہمیں آپ پر درود بھیجنے کا حکم دیا ہے ہم کس طرح آپؐ پر صلوات بھیجیں؟ رسول خداؐ پہلے تو خاموش رہے پھر فرمایا: اس طرح کہو

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَ عَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى آلِ اِبْرَاهِيْمَ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَ عَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى آلِ اِبْرَاهِيْمَ فِى العَالَمِيْنَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَجِيْدٌ۔ [3]

۳۔ تفسیر الدر المنثور، روائی تفسیروں میں سے مشہور ترین تفسیر ہے۔ اس میں ابوسعید خدری والی حدیث کو بخاری، نسائی، ابن ماجہ اور ابن مردویہ کے ذریعے سے رسول خداؐ سے نقل کیا ہے۔ [4] اسی کتاب میں ابومسعود انصاری کے الفاظ کو ترمذی، نسائی اور ابن مردویہ سے نقل کیا ہے۔ [5] بالکل اسی مطلب کو تھوڑے سے فرق کے ساتھ سیوطی نے مالک، احمد، بخاری مسلم، ابوداود، نسائی، ابن ماجہ اور ابن مردویہ کے ذریعے ابواحمد ساعدی سے بھی بیان کیا ہے۔ [6]

---

[1] صحیح بخاری، جلد ۶، صفحہ ۱۵۱ (مطبوعہ دار الجیل بیروت

[2] ایضا

[3] صحیح مسلم، جلد ۱، صفحہ ۳۰۵، حدیث ۶۵ (مطبوعہ احیاء تراث العربی، بیروت)

[4] الدر المنثور، جلد ۵، صفحہ ۲۱۷

[5] ایضا۔

[6] ایضا۔

حاکم نیشاپوری"المستدرک علی الصحیحین" میں ابن ابی لیلی سے نقل کرتے ہیں کہ "کعب بن عجرؓ" نے مجھ سے ملاقات کی اور کہا: کیا میں تمہیں تحفہ نہ دوں جو میں نے رسول خداؐ سے سنا ہے؟ میں نے جواب میں کہا تحفہ دو! اس نے کہا ہم نے رسول خداؐ سے پوچھا: ہم کس طرح آپ اہلبیت پر صلوات بھیجیں؟ آپ نے فرمایا: یوں کہو:

اللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَ عَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَ عَلٰی آلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَجِیْدٌ: اللّٰھُم بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَ عَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَ عَلٰی آلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَجِیْدٌ۔

حاکم نیشاری کا طریقہ کار یہ ہے کہ وہ ان احادیث کو ذکر کرتے ہیں جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں نہیں ہیں۔ مذکورہ حدیث کو ذکر کرنے کے بعد وہ کہتے ہیں: اس حدیث کو اسی سند اور انہی الفاظ کے ساتھ امام بخاری نے اپنی کتاب میں "موسیٰ بن اسماعیل" سے بیان کیا ہے۔ اگر یہاں پر میں نے اسے مکرر نقل کیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ معلوم ہو جائے کہ "اہل بیت" اور "آل" سب ایک ہی ہیں۔ (توجہ رہے کہ حاکم نے اس حدیث کو حدیث کساء کے بعد نقل کیا ہے جس میں تصریح ہوئی ہے کہ میرے اہلبیت علیؑ، فاطمہؑ حسنؑ اور حسینؑ ہیں۔ [1]

یہ الفاظ پر معنی ہیں۔ اس کے بعد حاکم حدیث ثقلین اور اس کے بعد ابوھریرہ کی یہ حدیث بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرمؐ نے علیؑ، حسنؑ اور حسینؑ کی طرف دیکھا اور فرمایا: "اَنَا حَرْبٌ لِمَنْ حَارَبَکُمْ وَ سِلْمٌ لِمَنْ سَالَمَکُمْ۔" یعنی: جو تمہارے ساتھ جنگ کرے میرا بھی اس سے اعلان جنگ ہے اور جو تمہارے ساتھ صلح کرئے میری بھی اس سے صلح ہے۔ [2]

نیز "محمد بن جریر طبری" نے اپنی تفسیر میں اسی آیت کی تشریح میں مذکورہ بالا روایت کو تھوڑے سے فرق کے ساتھ "موسیٰ بن طلحہ" کے ذریعے ان کے باپ سے نقل کیا ہے، ایک اور روایت میں اسی بات کو ابن عباس سے بیان کیا ہے۔ تیسری روایت کو "زیاد" کے ذریعے ابراہیم سے بیان کیا ہے اور چوتھی روایت کو عبدالرحمن بن بشر بن مسعود انصاری سے نقل کیا ہے۔ [3]

نیز بیہقی نے اپنی مشہور کتاب "سنن" میں اس موضوع پر متعدد روایات نقل کی ہیں ان میں بعض نماز اور تشہد کے موقعہ پر مسلمانوں کے فریضے کو واضح کرتی ہیں۔ انہی میں ایک حدیث ابی مسعود، عقبہ بن عمرو سے منقول ہے کہ ایک شخص رسول خداؐ کی خدمت میں آیا اور بیٹھ گیا، ہم بھی اس کے پاس تھے، اس نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! ہم آپؐ پر سلام بھیجنے کی کیفیت کو جانتے ہیں، لیکن نماز کے دوران آپؐ پر کس طرح صلوات پڑھیں؟ پیغمبر اکرمؐ نے سکوت اختیار کیا یہاں تک کہ ہم نے سوچا کہ کاش یہ شخص سوال ہی نہ کرتا۔ پھر آپؐ نے فرمایا:

---

[1] المستدرک علی الصحیحین، جلد ۳، صفحہ ۱۴۸۔

[2] ایضا، صفحہ ۱۴۹۔

[3] تفسیر جامع البیان (طبری) جلد ۲۲، صفحہ ۳۲ (مطبوعہ دارالمعرفہ، بیروت)

اِذا اَنْتُمْ صَلّیْتُم عَلَیَّ فَقُولُوا اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلی مُحَمَّدٍ النَّبِیِّ الاُمِیِّ وَ عَلی آلِ مُحَمَّدٍ کما صَلَّیْتَ عَلی اِبْراھِیْمَ وَ عَلی آلِ اِبْرَاھِیْمَ و بَارِکْ عَلی مُحَمَّدٍ النبِیِّ الاُمِیِّ و عَلی آلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلی اِبْرَاھِیْمَ و عَلی آلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حمیدٌ مَجِیْدٌ

اس کے بعد وہ ابوعبداللہ شافعی سے نقل کرتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے جو نماز میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر صلوات بھیجنے کی بات کرتی ہے۔[۱]

بیہقی نے دیگر متعدد احادیث رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر صلوات بھیجنے کے متعلق خواہ نماز میں یا نماز کے علاوہ بیان کی ہیں، خصوصاً وہ ایک حدیث میں کعب بن عجرہ سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ: اِنَّہ کَانَ یَقُولُ فِی الصَّلٰوۃِ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلی مُحَمَّدٍ و آلِ مُحَمَّدٍ کما صَلَّیْتَ عَلی اِبْراھِیْمَ وَ آلِ اِبْرَاھِیْمَ، و بَارِکْ عَلی مُحَمَّدٍ و آلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلی اِبْرَاھِیْمَ و آلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حمیدٌ مَجِیْدٌ۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی نماز میں یوں فرماتے تھے: اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلی مُحَمَّدٍ وآلِ مُحَمَّدٍ، کما صَلَّیْتَ.....[۲]

اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی نمازوں میں یہی صلوات پڑھتے تھے انہی روایات میں سے کسی ایک کے ضمن میں، جس میں نماز کا ذکر نہیں آیا ہے۔ بیہقی کہتے ہیں: یہ روایات بھی حالت نماز کی طرف اشارہ کرتی ہیں، کیونکہ ''قَدْ عَلِمْنَا کَیْفَ نُسَلِّمُ '' (ہم جانتے ہیں کس طرح آپ پر سلام بھیجیں) کا جملہ تشہد میں سلام کی طرف اشارہ ہے۔ السَّلام علیك اَیُّھا النَّبِیُّ و رحمۃ اللہ وَ بَرَکَاتُہ، اس بنا پر صلوات سے مراد بھی تشہد میں صلوات بھیجنا ہے۔

اس لحاظ سے تمام مسلمانوں پر فرض ہے کہ جس تمام مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق نماز کے پیغمبر اکرمؐ پر ''السلام علیك ایھا النبی و رحمۃ اللہ'' کی شکل میں سلام بھیجیں اسی طرح ان پر فرض ہے کہ نماز کے تشہد میں نبی اکرمؐ پر صلوات بھی بھیجیں۔ اگر چہ یہاں پر اہلسنت کے چار مذاہب کے درمیان کچھ فرق دکھائی دیتا ہے شافعیوں اور حنبلیوں کا کہنا ہے کہ رسول اللہؐ پر صلوات دوسرے تشہد میں بھیجنا واجب ہے جبکہ مالکی اور حنفی اسے سنت سمجھتے ہیں۔[۳]

البتہ مندرجہ بالا روایات کے مطابق تو سب پر واجب ہے۔ محمد وآل محمد پر صلوات سے (بطور مطلق یا خصوصا نماز کی تشہد میں) سے متعلق منقولہ روایات پر مشتمل کتابوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے جو یہاں پر بطور مختصر بیان ہوئی ہیں مذکورہ بالا روایات اور کتب تو اس کا ایک نمونہ ہے ان روایات کو صحابہ کی جماعت نے نقل کیا ہے جن میں ابن عباس، طلحہ، ابوسعید خدری، ابوہریرہ، ابومسعود انصاری، بریدہ، ابن مسعود، کعب بن عجرہ اور خود علیؑ جیسی شخصیات شامل ہیں۔

---

[۱] سنن بیہقی، جلد ۲، صفحہ ۱۴۶، ۱۴۷

[۲] ایضاً۔

[۳] الفقہ علی المذاھب الاربعہ، جلد ا، صفحہ ۲۶۶ (مطبوعہ دار الفکر)

قابل تعجب نکتہ یہ ہے کہ اہلسنت کے علماء ان تمام تاکیدات کے باوجود جو احادیث نبویؐ میں آل محمدؐ کے اضافے کرنے کے بارے میں آئی ہیں، ہمیشہ (نادر مواقع کے علاوہ) آل محمد کو درود سے حذف کر دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں صلّی اللہ علیہ و سلّم اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ حدیث کی کتب میں ان ابواب میں جہاں درود میں آل محمدؐ کا اضافہ کرنے کی روایات نقل ہوئی ہیں جب پیغمبر اکرمؐ کا اسم مبارک انہی احادیث کے ضمن میں ذکر کرتے ہیں تو کہتے ہیں صلّی اللہ عَلَیْہِ وَسَلّم ۔ (یعنی آل کے بغیر) ہم نہیں جانتے کہ رسول اللہؐ کی بارگاہ میں آنحضرتؐ کے اس حکم کی واضح مخالفت پر ان کے پاس کیا عذر ہے؟

مثال کے طور پر بیہقی اسی باب کے عنوان میں لکھتے ہیں ."باب الصّلوۃِ عَلَی النّبیّ صلّی اللہ علیہ وَسَلّم فِي التشھدِ" ۔ اور اسی طرح بعض دوسری مشہور کتب حدیث میں ہے۔ اس عنوان کو خواہ مولفین نے اختیار کیا ہو یا بعد والے محققین نے، اس باب میں جو مذکورہ ہے اس سے بہت سا تضاد رکھتا ہے اور بہت ہی عجیب ہے۔ آخر میں دو احادیث اور بیان کی جاتی ہیں:

۱۔ ابن حجر اپنی کتاب صواعق میں یوں نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

لا تُصَلُّوا عَلَیَّ الصَّلاۃَ اَلْبَتْرَاءُ قالُو وما الصَّلاۃُ البَتْرُ قالَ: تقولُون: اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلی مُحَمَّدٍ و تُمسِکُونَ، بل قُولُوا اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلی مُحَمّدٍ و آلِ مُحَمّدٍ ۔

مجھ پر ناقص اور دم بریدہ صلوات مت بھیجو۔ پوچھا گیا: ناقص اور دم بریدہ صلوات کونسی ہے؟ فرمایا: یوں کہو: ''اللّٰھُمَّ صَلِّ عَلی مُحَمَّدٍ' اور پھر رک جاؤ اور آگے نہ بڑھو۔ بلکہ صلوات اس طرح پڑھو: '' اللّٰھُمَّ صَلِّ عَلی مُحَمَّدٍ وَ آلِ مُحَمّدٍ ''[۱]

اس حدیث سے ثابت ہوتا کہ لفظ علیٰ بھی محمد اور آل محمد کے درمیان فاصلہ نہ بنے۔ اور یوں کہا جائے: اللّٰھُمَّ صَلِّ عَلی مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمّدٍ

۲۔ سمھودی اپنی کتاب ''الاشرافُ علی فَضْلِ الاَشْرَافِ'' میں ابن مسعود انصاری سے نقل کرتے ہیں کہ رسول خداؐ نے فرمایا: ''مَنْ صَلّی صَلاۃً لَمْ یُصَلِّ فِیْھا عَلَیَّ و عَلی اَھْلَ بَیْتِی لَمْ تُقْبَل'' یعنی: جو شخص نماز پڑھے لیکن اس میں مجھ پر اور میرے اہل بیت پر صلوات نہ بھیجے تو اس کی نماز قبول نہیں ہے۔[۲]

ظاہر یہ ہوتا ہے کہ امام شافعی نے اپنے مشہور شعر اسی روایت کو سامنے رکھ کر کہتے ہیں جس میں وہ کہتے ہیں:

یا اَھْلَ بَیْتَ رَسُوْلِ اللہِ حُبُّکُمْ
فَرْضٌ مِنَ اللہِ فِي القُرآنِ اَنْزَلَہُ

---

[۱] صواعق، صفحہ ۱۴۴۔

[۲] سمہودی درالاشراف صفحہ ۲۸ (احقاق الحق، جلد ۱۸، صفحہ ۳۱۰ کے مطابق)

كَفاكُمْ مِنْ عظيم القَدْرِ اَنَّكُمْ
مَنْ لَمْ يُصَلِّ عَلَيْكُمْ لا صَلاةَ لَهُ

اے رسول اللہ کے اہلبیت تمہاری محبت قرآن میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے واجب قرار دی گئی ہے۔
تمہارے عظیم مقام ومنزلت کیلئے اتنا کافی ہے کہ جو آپ پر درود نہ بھیجے اس کی نماز باطل ہے۔[1]

کیا وہ شخصیات جن کا مقام ومرتبہ یہ ہو کہ ان کا نام نماز میں پیغمبر اکرمؐ کے نام کے ساتھ لینا واجب ہو، انہیں دوسروں کے ہم پلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان کی موجودگی میں امامت وولایت اور رسول خداؐ کی خلافت اور جانشینی کے لیے کوئی اور اہل ہو سکتا ہے یا اس کی جگہ بنتی ہے؟ کون منصف اس مقام ومرتبے اور فضیلت کے ہوتے ہوئے دوسروں کو ان پر ترجیح دے گا؟ کیا یہ تمام دلائل مسئلہ ولایت اور خلافت کو بلاواسطہ ثابت نہیں کرتے؟ فیصلہ ہم آپ پر چھوڑتے ہیں۔

۲۔ آیت نور اور بیوت

سورہ نور میں آیت "اللہ نور السماوات والارض" کے بعد ۳۶ سے ۳۸ آیات میں ارشاد الٰہی ہے:

فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ ۙ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴿۳۶﴾ رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۠ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ﴿۳۷﴾ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۭ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۸﴾

یہ نور الٰہی ان گھروں میں ہے جن کے بارے میں خدا کا حکم ہے کہ ان کی دیواروں کو اونچا کیا جائے (تاکہ وہ شیاطین کی مداخلت سے محفوظ رہیں) اور ان میں اس کے نام کا ذکر کیا جائے کہ ان گھروں میں صبح وشام اس کی تسبیح کرنے والے ہیں۔ وہ مرد جنہیں کاروبار یا دیگر خرید وفروخت ذکر خدا، قیام نماز اور ادائے زکوٰۃ سے غافل نہیں کر سکتی؛ یہ اس دن سے ڈرتے ہیں جس دن کے ہول سے دل اور نگائیں سب الٹ جائیں گی۔ تاکہ اللہ تعالیٰ انہیں ان کے بہترین اعمال کی جزا دے سکے اور اپنے فضل سے مزید اضافہ کرے اور خدا جسے چاہتا ہے رزق بے حساب عطا کرتا ہے۔ (اور اپنے بے انتہا نعمتوں سے بہرہ مند کرتا ہے۔)

اس سورت کی آیت نمبر ۳۵ میں نور الٰہی کی اللہ تعالیٰ نے بڑی خوبصورت، دقیق اور ظریف مثال کے ساتھ وضاحت کرنے کے بعد، مذکورہ آیات میں اس نور کی جگہ اور مقام کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا: یہ نور درج ذیل خصوصیات کے حامل گھروں میں ہے۔

[1] کتاب الغدیر میں امام شافعی سے ان اشعار کے انتساب کو "شرح المواہب رزقانی" جلد ۷، صفحہ ۷ اور کچھ افراد سے نقل کیا ہے۔

۱۔اونچی اور غیر قابل نفوذ دیواریں تا کہ شیطانوں اور ہوا و ہوس کے بچاریوں کی دسترس سے محفوظ رہیں۔

۲۔ان کی حفاظت اور پاسداری ایسے مرد کرتے ہیں جن کا وطیرہ یاد الٰہی اور صبح وشام اس کی تسبیح ہے۔ دنیا کی رنگینیاں اور زرق برق مادی اشیاء انہیں یاد خدا سے غافل نہیں کرتیں، وہ ایسے افراد ہیں جن کا اپنے رب سے دائمی رابطہ بذریعہ نماز اور مخلوق خدا سے دائمی رابطہ بذریعہ زکوٰۃ برقرار ہے۔ وہ ایسے مرد ہیں جو قیامت اور اعمال کے حساب وکتاب سے ڈرتے ہیں اور یہ امید سے آمیختہ خوف ہمیشہ انہیں حق کے راستے پر ثابت قدم رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ ایسے افراد کو بے حساب اجر عطا فرماتا ہے۔

مندرجہ بالا الفاظ میں غور وفکر کریں اور دیکھیں کہ ان آیات الٰہی میں ان خدائی گھروں اور ان کے محافظین کی کیا عظمت ومقام بیان کیا گیا ہے۔اس کے بعد مندرجہ ذیل روایات میں غور وفکر کریں۔تفسیر الدرالمنثور میں جلال الدین سیوطی، دو اصحاب رسولؐ انس بن مالک اور بریدہ سے نقل کرتے ہیں کہ جب نبی اکرمؐ نے اس آیت کو تلاوت فرمایا تو ایک شخص کھڑا ہوا اور اس نے پوچھا: ''اَیُّ بُیُوْتٍ هٰذِهٖ یا رسول الله؟'' یعنی: ''اے اللہ کے رسولؐ اس آیت میں جن گھروں کی توصیف کی گئی ہے وہ کون سے گھر ہیں؟'' رسول خداؐ نے فرمایا: "بُیُوت الاَنْبِیاء!" یعنی: ''انبیاء کے گھر''۔حضرت ابوبکر کھڑے ہوئے اور عرض کیا: ''هٰذَا الْبَیْتُ مِنْهاَ لَبَیْتُ عَلِیٍّ وَ فاَطِمَةَ؟ یعنی: ''کیا یہ علیؑ وفاطمہؑ کا گھر انہی گھروں میں سے ہے؟'' آنحضرتؐ نے جواب دیا: ''نَعَمْ مِنْ افاضِلِها'' یعنی: ''ہاں! یہ تو ان میں سے بہترین گھروں میں سے ہے۔''[1]

اسی طرح کی بات حاکم حسکانی نے شواہد التنزیل میں صحابی رسولؐ ابو برزہ کے ذریعے رسول خداؐ سے بیان کی ہے۔اس روایت میں کسی کا نام لیے بغیر یوں کہا گیا ہے: قِیْلَ یا رَسُول اللهِ اَبَیْتُ عَلِیٍّ و فاطِمَةَ مِنْهاَ؟ قاَلَ: ''مِنْ اَفْضَلِها'' یعنی: پوچھا گیا: اے اللہ کے رسول کیا علیؑ اور فاطمہؑ کا گھر انہی میں سے ہے؟ آنحضرتؐ نے فرمایا: ''یہ ان میں سے اعلیٰ ترین گھر ہے۔''[2]

اس روایت کو ذکر کرنے کے بعد پہلی روایت کو دو حوالوں سے انس بن مالک اور بریدہ سے بھی نقل کیا ہے۔[3]

دلچسپ امر یہ ہے کہ آلوسی تفسیر روح المعانی میں عام طور پر اہل بیتؑ کے تمام فضائل کو سرد مہری اور بے رغبتی کے ساتھ ذکر کرتا ہے۔اس کے برعکس یہاں پر پہلی روایت کو انس بن مالک اور بریدہ سے نقل کرنے کے بعد لکھتا ہے: 'و هذا اِنْ صَحَّ لایَنْبَغی العُدُول عَنْه'' یعنی: ''اگر یہ روایت صحیح ہو تو پھر (آیت کی تفسیر میں) اس سے عدول اور انحراف جائز نہیں ہے۔'' (دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ آیت کی تفسیر میں بہترین بات یہ ہے کہ اس سے مراد انبیاء کے گھر ہیں اور ان میں سے بہترین علیؑ اور فاطمہؑ کا گھر ہے۔[4]

اہلسنت کے بڑے علماء کی ایک جماعت نے اس روایت کو اپنی کتب میں درج کیا ہے۔یقینا یہ روایات علیؑ، فاطمہؑ اور ان کے

---

[1] الدرالمنثور، جلد ۵، صفحہ ۵۰

[2] شواہد التنزیل، جلد ۱، صفحہ ۴۱۰، حدیث ۵۶۶۔

[3] ایضا، حدیث ۵۶۷، ۵۶۸۔

[4] روح المعانی جلد ۱۸، صفحہ ۱۵۷، مذکورہ آیت کے ضمن میں۔

بیٹوں حسنؑ اور حسینؑ کو شامل ہیں اسی طرح فاطمہ زہراؑ کے فرزندان جو امام حسینؑ کی نسل سے ہیں یعنی معصوم امام، ان کو بھی آیت شامل ہے کیونکہ یہ بھی اسی راستے اور اسی دین کو جاری وساری رکھنے والے ہیں۔ ہاں! ان کے گھر انبیاء کے گھروں کی طرح ہیں۔ ایسے گھر ہیں جہاں ہمیشہ نورالٰہی چمکتا ہے اور شیطانوں کی دسترس سے محفوظ ہیں بلکہ ان میں سے یہ برتر شمار ہوتے ہیں۔ یقیناً ان گھروں کے مکین بھی تمام انسانوں سے بہتر اور برتر ہیں اور فضائل میں انبیاء کی مانند ہیں یہ وہ باتیں ہیں جنہیں مذکورہ بالا روایات سے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے کیا اس کے باوجود دوسروں کو ان پر ترجیح دینا ظلم نہیں ہے؟

۳۔ صراط مستقیم

سورہ حمد کی پانچویں آیت جسے ہم صبح وشام اپنی نمازوں میں پڑھتے ہیں، اس میں ہم دعا کرتے ہیں:

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝۵

اے اللہ! ہمیں سیدھے راستے پر قائم رکھ۔

ایسا راستہ جو ہمیں تجھ تک اور جو تیری رضا و خوشنودی کا موجب ہے، اس تک پہنچا دے ایسا راستہ جو ان لوگوں کے راستے سے جدا ہے جن پر تیرا غضب ہوا ہے اور اسی طرح گمراہوں کے راستے سے بھی جدا ہے۔ اے اللہ! ہمیں ایسے راستے کی ہدایت فرما اور اس پر ہمیں ثابت قدم اور قائم ودائم فرما۔

بے شک ''صراط مستقیم'' کا ایک وسیع مفہوم ہے۔ اس لیے بعض نے اس کا معنی اسلام اور بعض نے قرآن کیا ہے۔ بعض دوسروں نے اس سے مراد پیغمبر اکرمؐ اور آئمہ معصومینؑ لیا ہے۔ بعض نے اسے ''آئین للہ'' کہا ہے اور کچھ افراد نے اس کی تفسیر، انبیاء کی روش اور راستے سے کی ہے ان میں سے ہر ایک آیت کے وسیع مفہوم کا حصہ ہو سکتا ہے۔ لیکن مختلف حوالوں سے نبی اکرمؐ سے منقولہ روایات میں اس کے ظاہر ترین مصداق کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ان میں صراط مستقیم کی تفسیر علی بن ابی طالب یا محمدؐ و آل محمدؐ کی روش اور سیرت سے کی گئی ہے۔

حاکم حسکانی اپنی کتاب شواہد التنزیل میں جابر بن عبداللہ انصاری کے ذریعے رسول خداؐ سے بیان کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

اِنّ اللهَ جَعَلَ عَلِياًؑ و زَوْجَتَهُ وَ اَبْنَآئَهُ حُجَجَ اللهِ عَلی خَلْقِهِ وَ هُمْ اَبْوَابُ العِلْمِ فِي اُمَّتِي، مَنْ اِهْتَدىٰ بِهِمْ هُدِيَ اِلىٰ صِراطٍ مُسْتَقِيمٍ۔

اللہ تعالیٰ نے علیؑ ان کی زوجہ (فاطمہ زہراؑ) اور ان کے فرزندوں کو اپنی مخلوق پر اپنی حجتیں قرار دیا ہے وہ میری امت میں علم کے دروازے ہیں جو بھی ان کے ذریعے سے ہدایت پائے گا اس نے صراط مستقیم کی طرف

ہدایت پائی ہے۔[۱]

ایک اور حدیث میں وہ ابن عباس کے ذریعے رسول خدا سے یوں نقل کرتے ہیں کہ آپؐ نے علی بن ابی طالبؑ سے فرمایا:

اَنْتَ الطّریقُ الواضحُ وَ اَنْتہ الصّراطُ المُستَقِیمِ وَ اَنْتَ یَعْسُوبُ المُؤمِنِیْنَ

آپ واضح راستہ، صراط مستقیم اور مومنین کے رہبر و راہنما ہیں۔[۲]

تیسری حدیث بھی وہ ابن عباس سے نقل کرتے ہیں کہ وہ ''اھدنا الصراط المستقیم'' کی تفسیر میں کہتے تھے:

قُولُوا (مَعَاشِرَ العبادِ) اِھْدِنا اِلٰی حُبِّ النّبِیّ وَ اَھْلِ بَیْتِہٖ

اے اللہ کے بندو! کہو اے اللہ ہمیں نبی اکرمؐ اور ان کے اہلبیت کی محبت کی طرف ہدایت فرما۔[۳]

اسی آیت کی تفسیر میں وہ چوتھی حدیث میں ''ابو بریدہ'' سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا: ''اس سے مراد محمد وآل محمد (علیہم السلام) ہیں۔[۴]

اس حدیث کو علامہ ثعلبی نے بھی اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے۔[۵] شیخ عبد اللہ حنفی نے بھی اپنی کتاب ''ارجح المطالب'' میں اس حدیث کو ابو ھریرہ سے نقل کیا ہے۔[۶] شواہد التنزیل میں پانچویں حدیث میں مذکورہ ہے کہ عبد الرحمن بن زید نے اپنے والد سے ''صِراط الّذین اَنْعَمْتَ علیھم'' کی تفسیر کے بارے میں نقل کیا ہے کہ اس نے کہا: ھُوَ النّبِیُّ وَ مَنْ مَعَہُ وَ عَلِیُّ بْنُ اَبی طالِبٍ وَ شِیْعَتُہُ یعنی: جن لوگوں پر خدا کا انعام ہوا، وہ نبی اکرم اور آپ ﷺ کے ساتھ علی بن ابی طالب -اور ان کے شیعہ ہیں۔[۷]

مکتب اہل بیت کے پیروکاروں اور شیعہ کتب میں بھی اس کے متعلق متعدد روایات بیان ہوئی ہیں ایک روایت میں امام صادقؑ سے ''صِراط الّذِین انعمت علیھم'' کی تفسیر کے بارے میں نقل ہوا ہے کہ انہوں نے فرمایا: یعنی مُحَمَّداً وَ ذُرِّیَّتَہُ علیھم السلام ''اس سے مراد محمدؐ اور ان کی ذریت ہے۔[۸]

اس لحاظ سے صراط مستقیم کے واضح ترین اور ظاہر ترین مصادیق، رسول خداؐ، علیؑ اور نسل فاطمہؑ سے ان کے معصوم بیٹوں کا راستہ

---

[۱] شواہد التنزیل، جلد ۱، صفحہ ۸۸، حدیث ۸۹

[۲] ایضا، حدیث ۸۸

[۳] ایضا، حدیث ۸۷

[۴] ایضا، حدیث ۸۸

[۵] تفسیر ثعلبی بمطابق، کفایہ الخصام، ص ۳۴۵۔

[۶] جمع المطالب، صفحہ ۸۵، مطبوعہ لاہور

[۷] شواہد التنزیل جلد ۱، صفحہ ۶۶، حدیث ۱۰۵۔

[۸] ان احادیث کے بارے میں مزید معلومات کی لئے تفسیر نور الثقلین اور برہان کا مطالعہ کریں، نور الثقلین، جلد ۱، صفحہ ۲۳، حدیث ۱۰۱۔

ہے، جو بھی ان کی ولایت کے دامن سے متمسک ہو جائے اور ان کے نقش قدم پر چلے اس نے صراط مستقیم پر قدم رکھا ہے جو اُسے خدا کے مقام قرب تک لے جائے گا اور یہ گمراہی اور انحراف سے دور ہے۔

۴۔ آدمؑ کی توبہ کی قبولیت کا وسیلہ

سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۳۷ میں آیا ہے کہ ترک اولی کے بعد حضرت آدمؑ نے اپنے پروردگار کی طرف سے کلمات حاصل کیے اور ان کے ذریعے توبہ کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ کو قبول کیا کیونکہ اللہ تواب اور رحیم ہے۔

فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنۡ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيۡهِ‌ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيۡمُ ﴿۳۷﴾

پھر آدم نے اپنے پروردگار سے چند کلمات سیکھ لیے تو خدا نے ان کی توبہ قبول فرمائی؛ بے شک وہ بہت بڑا توبہ قبول کرنے والا اور مہربان ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ کلمات کیا تھے جو اللہ تعالیٰ نے توبہ کے لیے حضرت آدمؑ کو سکھائے؟ اس حوالے سے مفسرین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض کی رائے ہے کہ یہ وہی کلمات ہیں جو سورہ اعراف کی آیت نمبر ۲۳ میں آئے ہیں: قَالَا رَبَّنَا ظَلَمۡنَاۤ اَنۡفُسَنَا وَاِنۡ لَّمۡ تَغۡفِرۡ لَنَا وَتَرۡحَمۡنَا لَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ یعنی: ''ان دونوں (آدم اور حوا) نے کہا: پروردگارا! ہم نے اپنے آپ پر ظلم وستم کیا ہے، اگر تو نے ہمیں نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ کھایا تو ہم گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔''

بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ اس سے مراد ایک اور دعا اور راز و نیاز الٰہی ہے۔ ان میں سے ایک حضرت یونسؑ کی دعا ہے جب وہ مچھلی کے شکم میں قیدی تھے۔ یعنی ''سُبۡحٰنَكَ اِنِّىۡ كُنۡتُ مِنَ الظّٰلِمِيۡنَ'' لیکن متعدد روایات جو رسول اکرمؐ یا اصحاب کرام سے نقل ہوئی ہے بتاتی ہیں کہ یہ کلمات، اللہ تعالیٰ کو محمدؐ، علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ کے حق کا واسطہ دینا تھے۔

الدرالمنثور میں مذکورہ آیت کی تفسیر میں سیوطی ابن عباس سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا: وہ کلمات اور الفاظ کون سے تھے جو حضرت آدمؑ نے اپنے رب سے حاصل کیے اور ان کے ذریعے توبہ کی؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''سَئَلَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ وعَلِيٍّ و فاطِمَةَ وَ الۡحَسَنِ وَ الۡحُسَيۡنِ اِلَّا تُبۡتَ عَلَيَّ فَتَابَ عَلَيۡهِ'' یعنی: ''اُس نے محمد، علی، فاطمہ، حسن اور حسین (علیہم السلام) کے حق کا واسطہ دے کر دعا کی کہ مجھے بخش دے اور اللہ تعالیٰ نے اس کی توبہ قبول فرمائی۔''[1]

نیز اسی کتاب میں وہ حضرت علیؑ سے بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس آیت کے بارے میں سوال کیا تو آپؐ نے فرمایا: ۔۔۔ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو حکم دیا کہ کہو:

اَللّٰهُمَّ اِنِّىۡ اَسۡئَلُكَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ وَ اٰلِ مُحَمَّدٍ سُبۡحَانَكَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنۡتَ عَمِلۡتُ سُوۡءً وَ ظَلَمۡتُ

---

[1] الدرالمنثور، جلد۱، صفحہ ۶۰

نَفْسِی فَاغْفِرْلِی اِنَّكَ اَنْتَ الغَفُورُ الرَّحِیم اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْئَلُكَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ وَ آلِ مُحَمَّدٍ سُبْحَانَكَ لا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ عَمِلْتُ سُوءً و ظَلَمْتُ نَفْسِی فَتُبْ عَلَیَّ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوابُ الرَّحِیْمُ فَھٰؤلاءِ الكَلِماتُ الّتی تَلَقّی آدَمُ

اے اللہ! میں تجھے محمد وآل محمد کے حق کا واسطہ دیتا ہوں تو پاک ومنزہ ہے، تیرے سوا کوئی معبود نہیں، میں نے بُرا کیا اور اپنے پر ظلم کیا ہے مجھے بخش دے، بے شک تو غفور اور رحیم ہے، اے اللہ! بحق محمد وآل محمد سوال کرتا ہوں تو پاک ومنزہ ہے تیرے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے، میں نے بُرا کیا ہے، اپنے پر ستم کیا ہے۔ میری توبہ کو قبول فرما، بے شک تو بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔[۱]

اس روایت سے اچھی طرح واضح ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا تین تفسیروں کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے اور یہ سب الفاظ حضرت آدمؑ کی دعا میں جمع تھے۔ ابن مغازلی اپنی کتاب مناقب میں اسی مطلب کو سعید بن جبیر کے ذریعے ابن عباس سے نقل کرتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ سے سوال کیا گیا کہ وہ کون سے الفاظ تھے جو حضرت آدمؑ نے اپنے رب حاصل کیے اور اللہ تعالیٰ نے اِن کی توبہ قبول فرمائی۔ آنحضرتؐ نے فرمایا:

سَئَلَہُ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ وَ عَلِیٍّ وَ فاطِمَةَ وَ الْحَسَنِ وَ الْحُسَیْنِ اِلَّا ما تُبْتَ عَلَیَّ فَتَابَ عَلَیْہِ[۲]

اس نے بحق محمد، علی، فاطمہ، حسن اور حسین ÷ دعا کی کہ میری توبہ قبول فرما اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی۔

اسی طرح علامہ قندوزی نے ینابیع المودة، بیہقی نے دلائل النبوة میں بدخشی نے مفتاح النجاح میں اور عبداللہ شافعی نے مناقب میں مذکورہ حدیث کو نقل کیا ہے۔ اگرچہ بہت ساری کتب میں اس حدیث کی سند ابن عباس پر ختم ہوتی ہے لیکن اس کے راوی فقط ابن عباس میں منحصر نہیں ہیں۔ کیونکہ الدر المنثور میں دیلمی کی مسند الفردوس سے جو حدیث منقول ہے اس کی سند حضرت علیؑ تک پہنچتی ہے، اس میں یہی بات بیان ہوئی ہے کہ حضرت علیؑ نے فرمایا: میں نے پیغمبر اکرمؐ سے اس آیت کے بارے میں سوال کیا اور پھر آنحضرتؐ نے فرمایا۔۔۔اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو تعلیم دی کہ وہ اس سے محمد وآل محمد کا واسطہ دے کر دعا کرے تا کہ وہ اس کی توبہ قبول فرمائے۔[۳]

یہی مطلب اہل سنت کی کتب اور اہل بیت کی روایات میں امام صادقؑ سے بھی بیان ہوا ہے، اس بارے میں روایات متعدد ہیں

---

[۱] الدر المنثور، جلد۱، صفحہ ۶۰

[۲] مناقب ابن مغازلی (احقاق الحق، جلد۹، صفحہ ۱۰۲ کے مطابق)

[۳] الدر المنثور، جلد۱، صفحہ ۶۰ (تلخیص کے ساتھ)

اور اس کی اسناد مختلف قسم کی ہیں۔[1]

اس حدیث کو ایک معمولی اور عام فضلیت نہیں سمجھنا چاہیے اور سادگی سے اس سے نہیں گزر جانا چاہیے۔ جب حضرت آدمؑ اپنے ترک اولی سے توبہ کرنا چاہتے ہیں (اور یہ ان کا پہلا ترک اولی تھا جو ان سے سرزد ہوا) تو انہیں خداوند کی طرف سے حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے بحق محمد وآل محمد یا بحق محمد، علی، فاطمہ، حسن اور حسین ÷ دعا مانگے تا کہ اس کی توبہ قبول کی جائے۔ ان کے علاوہ یہ بات کسی اور کے بارے میں ذکر نہیں ہوئی ہے یہ ایک بلند مقام و منزلت ہے جو انہی سے مخصوص ہے۔ اور یہ پنجتن پاک، رسولؐ اور ان کی اہل بیت اور معصومہ آئمہ کی غیر معمولی عظمت کا نشان ہے۔ ایسی صورت حال میں خلافت رسولؐ اور امامت کے لیے ان سے زیادہ اہل اور قابل کس کو سمجھا جا سکتا ہے اور کس کو ان پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔ کیا ان دلائل کی موجودگی میں حیران ہونے کی بات ہے کہ امامت قیامت تک نسل رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آل محمدؐ میں باقی رہے؟

۵۔ بہترین نیکیاں

سورہ نمل کی آیت ۸۹ میں ارشاد الٰہی ہے:

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَىٕذٍ اٰمِنُوْنَ ﴿۸۹﴾

جو کوئی نیکی انجام دے اس کے لیے اس سے بہتر اجر ہوگا اور وہ اس دن (روز قیامت) کے خوف و وحشت سے امان میں ہوگا۔

یہاں پر ''حسنہ'' کا معنی بہت وسیع ہے اور تمام نیکیوں کو شامل ہے، اس میں بشارت دی جا رہی ہے کہ جو نیکی بجالائے اللہ تعالیٰ اس نیکی سے بہتر اُسے جزا دے گا اور اس کے اہم ترین اثرات میں سے ایک روز محشر کے خوف اور ڈر سے امان ہے جو کہ بہت بڑی خوف و وحشت کی فضا ہوگی۔ لیکن بعض روایات میں اس آیت میں حسنہ کا اہم ترین اور واضح ترین مصداق محبت اہل بیتؑ رسول بیان کیا گیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ قیامت کے دن امن وامان کے لیے یہ محبت بہترین وسیلہ ہے۔

شواہد التنزیل میں اس آیت کے ضمن میں کئی روایات نقل ہوئی ہیں جو اس مطلب کو بیان کرتی ہیں کہ مذکورہ آیت میں حسنہ سے مراد محبت اہل بیتؑ ہے۔ ان میں سے ایک روایت میں ابو عبداللہ جدلی، علیؑ سے بیان کرتے ہیں کہ امامؑ نے مجھے فرمایا: کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمہارے لیے آیت 'مَنْ جاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ خَيْرٌ مِنْها ' کی تفسیر بیان کروں؟ میں نے عرض کیا: ہاں! قربان جاؤں۔ امامؑ نے فرمایا:

وَ الْحَسَنَة حُبُّنا اَهْلَ البَيْتِ و السَّيِئَةُ بُغْضُنا

---

[1] تفسیر برہان، جلد ۱، صفحہ ۸۶، نور الثقلین، جلد ۱، صفحہ ۶۷ کے بعد، بحار الانوار، جلد ۲۶، صفحہ ۳۱۹ کے بعد

حسنہ (نیکی) ہم اہل بیت کی محبت ہے اور برائی ہمارا بغض اور دشمنی ہے۔

پھرانہوں نے آیت کی تلاوت فرمائی۔[1]

اسی مطلب کو حاکم حسکانی نے حدیث ۵۸۲ اور ۵۸۷ میں بھی بیان کیا ہے۔ البتہ اس فرق کے ساتھ کہ تیسری حدیث میں آیا ہے کہ:

اَلاَ اُخْبِرُكَ بِالسَّيِئَةِ الّتى مَنْ جاءَ بِها اَكَبَّهُ اللهُ عَلىٰ وَجْهِهِ فِي نَارِ جَهَنَّمَ بُغْضُنا اَهْلَ الْبَيْتِ

کیا میں تمہیں ایسی برائی کے بارے میں نہ بتاؤں جس کے انجام دینے والے کو اللہ تعالیٰ اوندھے منہ آتش جہنم میں ڈالے گا، وہ برائی ہم اہل بیت کی دشمنی اور بغض ہے۔

پھرامیرالمومنینؑ نے دوسری آیت تلاوت فرمائی:

وَمَنْ جاءَ بِالسَّيِئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوهُهُم فِي النَّارِ[2]

ایک اور حدیث ابوامامہ باھلی[3] سے نقل کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اِنَّ اللهَ خَلَقَ الاَنْبِياءَ مِنْ شَجَرٍ شَتّٰى و خَلَقَنِي وَ عَلِيّاً مِنْ شَجَرَةٍ واحِدةٍ فَاَنَا اَصْلُها وَ عَلِيٌّ فَرْعُها، وَ الحَسَنُ وَ الْحُسَيْنُ ثِمارُها، وَ اَشْيَا عُنَا اَوْرَاقُها، فَمَنْ تَعَلَّقَ بِغُصْنٍ مِنْ اَغْصانِها نجا ومَنْ زاغ هَوى وَلَوْ اَنَّ عابِدًا عَبَدَ اللهَ اَلْفَ عامٍ ثُمَّ اَلْفَ عامٍ ثُمَّ لَمْ يُدْرِكْ مَحَبَّتَنا اَكَبَّهُ اللهُ عَلى مِنْخَرَيْهِ فِي النَّار

اللہ تعالیٰ نے انبیاء کومختلف درختوں سے خلق فرمایا ہے، مجھے اور علیؑ کو ایک ہی درخت سے خلق کیا ہے میں اس کی بنیاد (جڑ) ہوں اور علیؑ اس کی شاخیں ہے، حسنؑ اور حسینؑ اس درخت کے پھل ہیں اور ہمارے شیعہ اس کے پتوں کی مانند ہیں پس جوان شاخوں میں سے کسی شاخ کو پکڑ لے وہ نجات پائے گا جو اس سے منحرف ہو گا وہ ہلاک ہوگا اور اگر کوئی خدا کی عبادت کرنے والا ایک ہزار سال عبادت کرے پھر ایک ہزار سال

---

[1] شواہد التنزیل، جلد ا، صفحہ ۴۲۵، حدیث ۵۸۱۔

[2] ایضاً۔

[3] ابوامامہ باھلی، رسول خدا کے صحابی تھے اس کی وفات ۸۱ھ میں بتائی گئی ہے وہ آخری صحابی تھے جس نے شام میں وفات پائی ہے۔ (اسد الغابۃ، صدیہ کے لفظ میں) لیکن الکنی والالقاب میں اس کی وفات ۸۶ ہجری لکھی ہے اور ان کا نام صدی یعنی رُجیل کے وزن پر ہے ان پر معاویہ نے جاسوس مقرر کیے تھے کہ وہ علیؑ کی طرف نہ جائے۔

عبادت کرے اس کے بعد پھر ہزار سال عبادت کرے لیکن اس کے پاس ہماری محبت نہ ہوتو اللہ تعالیٰ اُسے منہ کے بل دوزخ میں ڈالے گا۔[1]

نیز علامہ قندوزی نے پہلی حدیث کے مضمون کو علیؑ سے نقل کیا ہے اور حدیث کو یہاں ختم کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا:

اَلْحَسَنَةُ حُبُّنَا و السَّيِّئَةُ بُغْضُنَا

حسنہ ہماری محبت ہے اور برائی ہماری دشمنی وعداوت ہے۔[2]

اسی کتاب میں بنی کثیر سے امام صادق - سے نقل ہوا ہے کہ انہوں نے فرمایا: **مَنْ جاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ اَمْثَالِهَا** (جو کوئی نیکی انجام دے اُسے دس برابر اجر ملے گا) کی آیت تمام مسلمانوں کے لیے ہے لیکن وہ حسنہ اور نیکی جس کے انجام دینے پر اس سے بہتر جزا ملے گی اور قیامت کے دِن خوف ووحشت سے امان کا باعث ہوگی وہ ہم اہل بیت کی محبت اور ولایت ہے۔

مفسرین اور ارباب حدیث کی ایک جماعت نے اگرچہ زیر بحث آیت کے حوالے سے مودت اہل بیت کو بڑی نیکی کے عنوان سے ذکر نہیں کیا ہے لیکن سورہ شوریٰ کی آیت ۲۳: "**وَمَنْ يَقْتَرِفْ حَسَنَةً نَزِدْ لَهُ فِيهَا حُسْنًا**" (جو نیکی کمائے ہم اس کے لیے اس کے حسن اور اچھائی میں اضافے کریں گے) کی تفسیر میں انہوں نے اسی مفہوم پر مشتمل روایات نقل کی ہیں۔ جیسے جلال الدین سیوطی الدر المنثور میں ابن ابی حاتم کے ذریعے ابن عباس سے نقل کرتے ہیں کہ اس نے آیت کی تفسیر میں کہا ہے کہ '**اَلْمَوَدَّةُ لِآلِ مُحَمَّدٍ** (ص)' اس سے مراد آل محمد سے محبت ودوستی ہے۔[3]

تفسیر روح المعانی میں آلوسی اسی آیت (شوریٰ / ۲۳) کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ بعض مفسروں کا کہنا ہے کہ "حسنہ" سے مراد رسول اللہ ﷺ کی ذوی القرباء کی محبت ہے اس کے بعد وہ کہتے ہیں: یہ بات ابن عباس اور سدی سے نقل ہوئی ہے پھر وہ مزید لکھتے ہیں۔ آل رسول ﷺ کی محبت سب سے بڑی حسنات میں سے ہے اور اس آیت میں حسنہ کے عنوان کے تحت درجہ اول میں قرار پاتی ہے۔[4]

مذکورہ بالا احادیث کی طرح اور بہت سی حدیثیں دیگر کتب میں بھی ذکر ہوئی ہیں ان سب کو بیان کرنے سے بات طول پکڑ جائے گی۔ ہم اس بحث کو محبت اہل بیت کے بارے میں ایک حدیث کو بیان کر کے ختم کرتے ہیں (اگرچہ یہ حدیث مذکورہ آیت کی تفسیر میں نہیں آئی ہے) شبلنجی نے نورالابصار میں ایک حدیث پیغمبر اکرم ﷺ سے نقل کرتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے اور

---

[1] شواہد التنزیل، جلد ۱، صفحہ ۴۲۸، حدیث ۵۸۸

[2] ینابیع المودۃ، صفحہ ۹۸

[3] الدر المنثور جلد ۶، صفحہ ۷

[4] روح المعانی، جلد ۲۵، صفحہ ۳۱۔

اس کے ضمن میں آیا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

وَ اللهِ لا یَدْخُلُ قَلْبَ رَجُلٍ الِایمانُ حتیٰ یُحِبَّهُمْ (اَهْلَبَیْتِی) لِقَرابَتِهِمْ مِنِّی۔

اللہ کی قسم کسی شخص کے دل میں اس وقت تک ایمان داخل نہیں ہوگا جب تک میرے اہل بیت سے میری قرابت کی وجہ سے محبت و دوستی نہ کرے۔[1]

یہ نکتہ بھی قابل اہمیت ہے کہ ایک معمولی اور عام محبت کبھی بھی قیامت کے دن کے خوف و وحشت سے نجات کا ذریعہ نہیں بن سکتی اور نہ ہی ایمان کی شرائط میں سے قرار پاسکتی ہے۔ یہ عبارتیں اچھی طرح سے ثابت کرتی ہیں کہ اہل بیتؑ کی محبت مسئلہ ولایت وامامت کی بنیاد ہے جو کہ دین کی بقاء کا سبب، نبوت کے راستے کا دوام اور ایمان کی حفاظت کا باعث ہے۔

مندرجہ بالا آیات میں جو کچھ اجمالی طور پر بیان ہوا ہے اور ان کی تفسیر میں منقولہ روایات میں جو کچھ واضح طور پر بیان ہوا ہے۔ ان سے مجموعی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ آل محمدؐ اور اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بالخصوص علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ کا بہت بلند مقام ومرتبہ ہے کیونکہ:

یہ وہ شخصیات ہیں جن کی مودت رسالت کا اجرا اور جزا ہے

ان پر درود اور صلوات کے بغیر نماز باطل ہے

ان کی حیثیت صراط مستقیم کے طور پر پہنچانی جاتی ہے

حضرت آدمؑ جو ترک اولی کی وجہ سے اللہ کی ناراضگی کا شکار ہوئے تھے انہوں نے اللہ تعالی کو ان کا واسطہ دے کر توبہ کی تو ان کی توبہ قبول ہوگئی۔

ان کی محبت و دوستی ایسی نیکی ہے جو ہر صاحب ایمان کو قیامت کے دن کے خوف اور وحشت سے نجات دیتی ہے۔

واقعاً جو ہستیاں ان غیر معمولی ممتاز صفات کی حامل ہوں، جن کا بلند مقام ومرتبہ اہل سنت اور اہل بیت کی روایات اور کتب میں بیان ہوا ہو، ان کا دوسروں سے کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ کوئی دوسرا ان کی برابری نہیں کرسکتا۔ نتیجے کے طور پر ان کے ہوتے ہوئے کسی اور کی ضرورت نہیں رہتی، یقیناً یہ محبت اور مودت، ولایت اور رہبریت کے لیے پیش خیمہ ہے۔ جو کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے راستے کا تسلسل ہے۔ نیز وہ افراد جن کا ذکر جو متواتر روایات ثقلین میں قرآن کے ساتھ آیا ہے اور ان دو کا گمراہی سے نجات کے وسیلے کے طور پر تعارف کرایا گیا ہے۔ یہ دو چیزیں (قرآن اور اہل بیت ÷) امت مسلمہ میں تا قیامت باقی رہیں گی اور مسلمانوں کو ان کے دامن میں پناہ لینی چاہیے۔ وہ شخصیات جنہیں کشتی نجات اور ہدایت کے چمکدار ستاروں کے عنوان سے متعارف کرایا گیا ہے وہ ان تمام اوصاف میں دوسروں سے افضل اور برتر ہیں جن کا تذکرہ فریقین کے اکثر مشہور ماخذ اور اہم کتب میں ہوا ہے۔

---

[1] نور الابصار، ص ۱۲۶۔

ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اس بارے میں قرآن مجید کی آیات میں جو اشارے کیے گئے ہیں ان کے متعلق پیغمبر اکرم ﷺ نے اپنے کلام میں وضاحت کر کے تمام مسلمانوں پر حجت تمام کر دی ہے۔ اب یہ مسلمانوں کا فرض ہے کہ ہر قسم کے تعصّبات اور فرقہ پرستی سے بالاتر ہو کر اپنے لیے راہ نجات کا انتخاب کریں یعنی آل محمدؑ کے دامن سے وابستہ ہو جائیں اور ان کی قیادت اور راہنمائی میں سعادت اور خوش بختی کی منزل پا لیں اور جو افراد ان تمام دلائل، قرائن، شواہد، اسناد اور تصریحات کو نظر انداز کرتے ہوئے توجیہ، تاویل اور تفسیر بالرائے کریں انہیں خود جوابدہ ہونا ہوگا۔

آئمہ اہل بیت کے ناموں کی صراحت

یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ اہل سنت کی بعض روایات میں تمام بارہ اماموں کے نام مکمل طور پر بیان ہوئے ہیں یعنی امام علیؑ کے بعد امام حسنؑ ان کے بعد امام حسینؑ، ان کے بعد امام علی بن الحسینؑ، پھر امام محمد بن علی الباقرؑ، ان کے بعد جعفر بن محمد الصادقؑ ان کے بعد موسی بن جعفر الکاظمؑ ان کے بعد علی بن موسی الرضاؑ، ان کے بعد محمد بن علی النقیؑ پھر حسن بن علی العسکری اور ان کے بعد آخر میں محمد بن الحسن المہدیؑ کے نام مذکورہ ہیں۔

اس حوالے سے سلیمان بن ابراہیم قندوزی حنفی نے اپنی کتاب ینابیع المودۃ میں دو حدیثیں ذکر کی ہیں۔ پہلی حدیث وہ فرائد السمطین سے بیان کرتے ہیں جس کی سند ابن عباس تک پہنچتی ہے وہ نقل کرتے ہیں کہ ایک یہودی رسول خدا ﷺ کی خدمت میں آیا اور اس نے اسلام اور اس کی تعلیمات کے بارے میں مختلف سوالات کیے ان میں سے ایک سوال اُس نے وصی رسول کے متعلق بھی پوچھا:

رسول خدا ﷺ نے اپنے پہلے وصی کے طور پر علی بن ابی طالب - کا نام لیا اور پھر ان کے فرزندان حسنؑ اور حسینؑ اور پھر ان کے بعد دیگر نو اماموں کے ایک ایک کر کے نام بتائے۔ یہودی ایمان لے آیا اور اُس نے واشگاف الفاظ میں اظہار کیا کہ میں نے سابقہ انبیاء کی کتابوں اور حضرت موسی - کی کتاب میں دیکھا ہے کہ آخری نبیؐ کا سب سے پہلا جانشین ان کا داماد ہوگا، دوسرا اور تیسرا جانشین دونوں بھائی اور ان کے بیٹے ہوں گے اور دیگر نو امام تیسرے امام کی اولاد سے ہوں گے [1]

دوسری حدیث: مناقب سے جابر بن عبد اللہ انصاری کے ذریعے سے اسی طرح کا واقعہ بیان کرتی ہے جس میں بارہ اماموں کے نام ذکر کیے گئے ہیں کیونکہ یہ دونوں حدیثیں لمبی تھیں لہذا ہم نے ان کا خلاصہ پیش کر دیا ہے۔ [2]

یاد رہے کہ گزشتہ صفحات میں ہم نے بہت ساری ایسی روایات بیان کی ہیں جن میں اجمالی طور پر بارہ اماموں کا ذکر تھا، جب بھی آپ دوبارہ ان معتبر اور مشہور احادیث کا مطالعہ کریں گے جو شیعہ و سنی طرق سے نقل ہوئی ہیں اور ان میں غور و فکر کریں گے تو آپ دیکھیں

---

[1] ینابیع المودۃ، صفحہ ۴۴۰، باب ۷۶

[2] ایضا صفحہ ۴۴۲، باب ۷۶

گے کہ بارہ اماموں (بارہ خلفاء یا اُمراء) کی صحیح اور معقول تفسیر اور تاویل پیش نہیں کی گئی مگر یہ کہ جو شیعہ نے بیان کی ہے۔سب حضرات رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارہ خلفاء کی تفسیر اور تشریح میں حیران و سرگرداں ہیں۔

یہ روایات جو حدیث کی معتبر ترین کتب میں نقل ہوئی ہیں اس قدر قوی ہیں کہ ان کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔اس کی صرف ایک تفسیر اور تشریح صحیح اور درست ہے اوہ وہ وہی ہے جو امامیہ نے ذکر کی ہے۔اس دن کی امید کے ساتھ جب فرقہ پرستی سے ہٹ کر امامت اور خلافت رسولؐ کے بارے میں آیات اور روایات کی تحقیق کریں گے اور ہر قسم کے تعصّبات کو بالائے طاق رکھ کر ان کا جائزہ لیں گے تو سب پر فکر و نظر کے نئے دریچے کھلنے کی توقع ہے۔

الامام المہدی علیہ السلام

بعض ناسمجھ اور آگاہی نہ رکھنے والے افراد کے خیال کے برعکس، امام مہدیؑ کے انقلاب اور ان کی عالمی حکومت کا عقیدہ شیعہ اور مکتب اہل بیت ÷ کے پیروکاروں سے مخصوص نہیں ہے بلکہ بغیر کسی اسسہأ کے تمام اسلامی فرقوں کا یہ نظریہ ہے کہ آخری زمانے میں پیغمبر اکرم ﷺ کی اولاد میں سے ایک مہدی نام کی شخصیت دنیا کو عدل وانصاف سے پُر کرے گی اور انہوں نے اس موضوع کے بارے میں احادیث نبوی کو اپنی کتابوں میں درج کیا ہے۔ اس بارے میں اہل سنت اور شیعہ علماء کی طرف سے بہت ساری کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں سے بعض کا آئندہ صفات میں ذکر کیا جائے گا۔

یہ روایات متواترہ اور قطعی ہیں جنہیں تمام اسلامی محققین (اپنے خاص فرقے سے قطع نظر) نے قبول کیا ہے صرف ابن خلدون اور احمد امین مصری جیسے چند محدود افراد نے ان روایات کے رسول خدا ﷺ سے صادر ہونے میں شک وتردید کا اظہار کیا ہے اور ہمارے پاس ایسے شواہد موجود ہیں کہ ان کا محرک روایات کا ضعف نہ تھا بلکہ شاید ان کا خیال یہ تھا کہ انقلاب مہدیؑ کے متعلق روایات خارق عادت کاموں پر مشتمل ہیں جس پر وہ آسانی سے یقین نہیں کر سکتے تھے۔ حالانکہ متعصب ترین اسلامی فرقہ وہابیوں نے بھی انہیں قبول کیا ہے۔ اور ان احادیث کے متواتر ہونے کا بھی انہوں نے اعتراف کیا ہے۔

اس مدعا کی دلیل وہ بیان ہے جو چند سال پہلے حضرت مہدیؑ کے ظہور کے بارے میں رابطہ العالم الاسلامی سے سوال کے جواب میں صادر ہوا۔ حالانکہ رابطہ العالم الاسلامی پر وہابیوں اور سعودی حکومت کا بہت زیادہ اثر ونفوذ ہے۔ یہ بیان کینیا کے ابو محمد نامی باشندے کے سوال کے جواب میں رابطہ العالم الاسلامی کے جنرل سیکرٹری محمد صالح القزاز کے دستخط کے ساتھ جاری ہوا۔ اس بیان میں آیا ہے کہ ''ابن یتمیہ وہابی مذہب کے بانی نے بھی مہدی (علیہ السلام) کے متعلق احادیث کو قبول کیا ہے۔ اس کے بعد وہ اس موضوع پر سعودی عرب کے پانچ بڑے علماء کے تحریر کردہ رسالہ کے بارے میں بحث کرتا ہے۔ اس رسالے کا ایک اقتباس یہ ہے:

''جب دنیا میں ظلم اور فساد چھا جائے گا، کفر پھیل جائے گا تو اللہ تعالیٰ مہدی = کے ذریعے دنیا کو عدل وانصاف سے ایسے پُر کر دے گا جیسے وہ ظلم وجور سے بھری ہوگی۔ وہ بارہ خلفاء راشدین میں سے آخری ہوگا جن کے بارے میں کتب صحاح کے مطابق رسول خدا ﷺ نے خبر دی ہے۔ مہدی = سے متعلق احادیث بہت سارے اصحاب رسولؐ سے نقل ہوئی ہیں جن میں عثمان بن عفان، علی بن ابی طالب۔ طلحۃ بن عبداللہ، عبدالرحمن بن عوف، عبداللہ بن عباس، عمار بن یاسر، عبداللہ بن مسعود، ابوسعید خدری، ثوبان، قرۃ بن ایاس مزنی، عبداللہ بن حارث، ابوھریرہ، حذیفہ بن یمان، جابر بن عبداللہ، ابوامامہ، جابر بن ماجد، عبداللہ بن عمر، انس بن مالک، عمران بن حصین اور ام سلمہ شامل ہیں۔

یہ بیس افراد وہ ہیں جنہوں نے روایات مہدی کو نقل کیا ہے ان کے علاوہ اور بھی بہت سے افراد موجود ہیں۔ خود صحابہ کرام سے بھی ظہور مہدی کے متعلق بہت ساری باتیں بیان ہوئی ہیں۔ صحابہ کے اقوال کو حدیث نبوی کے بعد مقام حاصل ہے۔ کیونکہ یہ ایک ایسا مسئلہ

نہیں ہے جس کے بارے میں اجتہاد کی بنیاد پر رائے دی جاسکے (بنابرایں ان باتوں کو اصحاب نے خود رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے)

اس کے بعد وہ مزید لکھتے ہیں:

یہ دو مطلب (احادیث نبوی اور اصحاب کی روایات جو یہاں پر حدیث کے حکم میں ہیں) بہت سارے اسلامی متون اور احادیث کی بنیادی کتب اعم از سنن، معاجم اور مسانید میں آئی ہیں۔ ان میں سنن ابی داود، سنن ترمذی، سنن ابن ماجہ، ابن عمرو، مسند احمد، اور مسند ابن لیلی اور بزاز، صحیح حاکم، معاجم طبرانی، معاجم دارقطنی اور ابونعیم، خطیب بغدادی اور ابن عساکر اور دیگر کتب شامل ہیں۔

مزید لکھتے ہیں کہ:

یہ موضوع اس قدر اہمیت کا حامل ہے کہ بعض علمائے اسلام نے روایات مہدی کے نام سے خاص کتابیں تالیف کی ہیں، جیسے ابو نعیم اصفہانی کی کتاب ''اخبار المهدی'، ابن حجر ہیثمی کی ''القول المختصر فی علامات المهدی المنتظر ''علامہ شوکانی کی ''التوضیح فی تواتر، جاء فی المنتظر والرجال والمسیح ''اسی طرح ادریس عراقی مغربی کی کتاب ''المہدی' 'اورابوالعباس ابن عبدالمومن المغربی کی کتاب ''الوهم المکنون فی الرد علی بن خلدون'

پھر مزید لکھتے ہیں:

اسلام کے قدیم اور متاخر بڑے علماء کی ایک جماعت نے اپنی تحریروں میں واضح طور پر لکھا ہے کہ مہدیؑ کے بارے میں احادیث تواتر کی حد تک ہیں (اور اسی وجہ سے ناقابل انکار ہیں) ان علماء میں نمایاں طور پر سخاوی نے اپنی کتاب ''فتح المغیث'' میں محمد بن احمد سفاوینی نے اپنی کتاب ''شرح العقیدہ'' میں ابوالحسن الابری نے ''مناقب الشافعی'' میں، ابن تیمیہ نے فتاویٰ کی کتاب میں، جلال الدین سیوطی نے ''الحاوی'' ادریس عراقی نے اپنی کتاب، شوکانی نے ''التوضیح'' میں اور محمد جعفر کتانی نے ''نظم التناثر'' میں واضح طور پر روایات مہدی کے تواتر کا اعتراف کیا ہے۔

آخر میں وہ کہتے ہیں:

صرف ابن خلدون نے احادیث مہدی پر اعتراض کرنے کی کوشش کی ہے لیکن بزرگان دین اور علمائے اسلام نے اس کی باتوں کو رد کیا ہے اور بعض نے تو جیسے ابن عبدالمومن نے اس پر خصوصی کتاب تحریر کی ہے۔ مختصر یہ کہ حافظان حدیث اور بزرگان دین نے تصریح کی ہے کہ مہدیؑ کے بارے میں احادیث، صحیح اور حسن احادیث ہیں اور مجموعاً متواتر ہیں۔

آخر میں وہ یوں نتیجہ اخذ کرتے ہیں: بنابرایں ظہور مہدی کا عقیدہ رکھنا ہر مسلمان پر واجب ہے اور یہ اہل سنت و جماعت کے عقائد میں سے ہے اور نادان، جاہل یا بدعتیوں کے علاوہ کوئی بھی اس عقیدے کا انکار نہیں کرتا۔[1]

---

[1] یہ خطب ۲۱ یو ما ۱۹۷٦ کو مجمع فقہی اسلامی کے سیکرٹری محمد منتظر کنانی کے دستخط کے ساتھ پہنچا، یہ مقالہ مذکورہ شخص اور سعودی عرب کے چار دیگر مشہور علماء کی علمی کاوش تھی، جن کے نام یہ ہیں۔ شیخ صالح بن عثیمین، شیخ احمد محمد جمال، شیخ احمد علی، شیخ عبداللہ خیاط۔

اس نکتے کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری ہے کہ بعض محققین کے نزدیک مہدویت کا نظریہ صرف مسلمانوں کا نظریہ نہیں ہے بلکہ دیگر ادیان کے ماننے والے بھی ہمیشہ سے ایک بڑے عالمی مصلح کے منتظر ہیں اور ان کی کتب میں اس بات کا تذکرہ موجود ہے۔اس بارے میں تفصیل جاننے کے لیے ان کتب کا مطالعہ کیا جائے جو ظہور مہدی کے بارے میں لکھی گئی ہیں۔[1]

ذیل میں ہم موجودہ کتاب کے اسلوب کے مطابق جس کا محور تفسیر موضوعی ہے،ان آیات کا مطالعہ کرتے ہیں جو اس عظیم ظہور کو اجمالی طور پر بیان کرتی ہیں۔

ا۔زمین پر صالحین کی حکومت

سورہ مبارکہ انبیاء میں ارشاد پروردگار ہے:

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ۝۱۰۵ اِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ ۝۱۰۶

ہم نے ذکر(تورات)کے بعد زبور میں لکھ دیا ہے(حتمی کر دیا ہے)کہ میرے صالح بندے زمین (کی حکومت)کے وارث ہوں گے۔اور عبادت گزاروں کے لیے اس بات میں واضح پیغام ہے۔ (انبیاء۱۰۵/۱۰۶)

یہ آیات ان آیات کے بعد آئی ہیں جن میں صالحین کے لیے اخروی جزا اور اجر کا تذکرہ ہوا ہے اور یہاں پر درحقیقت ان کے دنیاوی اجر کو بیان کیا جارہا ہے اور یہ جزا بہت ہی اہم ہے جو انسانی معاشرے کی سعادت،احکام الٰہی کے اجراء اور انسانی معاشرے کی فلاح اور نجات کا باعث ہے۔اس بات کے پیش نظر کہ ''ارض'' کا اطلاق تمام کرہ زمین اور پوری دنیا پر ہوتا ہے۔(مگر یہ کہ کوئی خاص قرینہ موجود ہو)یہ آیت ''صالحین کی عالمی حکومت'' کے بارے میں بشارت ہے اور چونکہ یہ مطلب ماضی میں وقوع پذیر نہیں ہوا ہے لہٰذا مستقبل میں اس کا منتظر رہنا چاہیے اور یہ وہی چیز ہے جسے ہم ''مہدی کی عالمی حکومت'' کے عنوان سے یاد کرتے ہیں۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے جو آیت کہہ رہی ہے کہ ہم نے اس وعدے کو سابقہ انبیاء کی کتابوں میں بھی لکھا ہے،گویا آیت بتارہی ہے کہ یہ کوئی نیا اور تازہ وعدہ نہیں ہے بلکہ یہ بنیادی امر ہے جو دیگر ادیان میں موجود ہیں۔

قوی احتمال یہ ہے کہ ''زبور'' سے مراد وہی ''زبور داود'' ہے جو حضرت داود کی مناجات راز و نیاز،دعاؤں اور نصیحتوں کا مجموعہ ہے جو عہد قدیم(تورات سے متعلق کتب)میں مزامیر داود کے عنوان سے یاد کی جاتی ہے۔قابل ملاحظہ نکتہ یہ ہے کہ اسی کتاب مزامیر داود میں (ان تمام تحریفوں کے باوجود جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عہد قدیم کی کتب میں رونما ہوئیں)یہ عظیم بشارت دیکھی جاسکتی ہے۔مزمور

---

[1] اس بارے میں کتاب ''انقلاب جہانی مہدی'' کا معالعہ کرسکتے ہیں

۳۷/ میں جملہ ۹/ میں ہم پڑھتے ہیں:

''۔۔۔کیونکہ بُرے اور شریر لوگ ختم ہو جائیں گے اور خدا پر بھروسہ کرنے والے زمین کے وارث ہوں گے اور بہت جلد شریر نیست و نابود ہوں گے اگر چہ اس کے مقام کا پتہ پوچھیں گے تو وہ ناپید ہوگا۔''

اسی مزمور کے گیارہویں جملے میں آیا ہے:

''پھر تواضع کرنے والے زمین کے وراث اور امن وسلامتی کی کثرت سے لطف اندوز ہوں گے۔''

نیز اسی مزمور کے جملے ۲۷ میں یہی بات ان الفاظ کے ساتھ بیان ہوئی ہے:

''چنانچہ خدا سے برکت حاصل کرنے والے زمین کے وراث ہوں گے اور رحمت خدا سے دور (معلون) ختم ہو جائیں گے۔''

جملہ ۲۹/ میں آیا ہے:

''صدیق زمین کے وارث ہوں اور ہمیشہ اس میں سکونت اختیار کریں گے۔''

صدیق؛ متوکل (بھروسہ کرنے والے) متبرک اور متواضع کے الفاظ واضح طور پر مومنین صالحین کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن کا ذکر قرآن میں ہوا ہے۔ مذکورہ آیت میں بہت سارے مفسرین کی رائے کے مطابق ذکر سے مراد تورات ہے، اور اسی سورہ انبیاء کی آیت ۴۸؛ اس بات کی گواہی دے رہی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِيَآءً وَّذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۸﴾

ہم نے موسیٰ اور ہارون کو ایسی چیز عطا کی جو حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والی اور متقین کے لیے روشنی اور یاد آوری تھی۔

بعض افراد نے یہ بھی خیال ظاہر کیا ہے کہ ذکر سے مراد قرآن اور زبور سے مراد تمام سابقہ انبیاء کی کتابیں ہیں۔ (اس بنا پر آیت کا معنی یوں ہوگا کہ ہم نے قرآن کے علاوہ سابقہ انبیاء کی تمام کتابوں میں یہ بشارت دی ہے۔) بہر حال یہ بشارت اور خوشخبری تورات کے بعض ملحقات جیسے کتاب ''اشعیاء نبی'' میں بھی آئی ہے چنانچہ اس کتاب کی گیارہویں فصل میں ہم پڑھتے ہیں: کہ ذلیلوں کو عدالت کا حکم اور زمین کے مسکینوں کو سچائی کی تنبیہ (بیداری کا سبب) ہوگی۔

اس کا کمر بند عدالت ہوگا

ان کے درمیان وفاداری شعار ہوگا

شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی پئیں گے

چھوٹا بچہ ان کا رکھوالا ہوگا

کیونکہ اس وقت زمین علم الٰہی سے ایسی پُر ہوگی جس طرح پانی سے سمندر پُر ہوتا ہے۔

خود تورات میں اس مطلب کی طرف اشارے موجود ہیں فصل نمبر ۱۳ میں جملہ ۱۵ میں آیا ہے:

ہم زمین کو اولاد ابراہیم میں سے ایک شخص کو دیں گے اور اس کی اولاد کوئی وہی شمار کر سکے گا جو زمین کے ذرات کو گن سکے گا (یعنی ان کی اولاد کی کثرت کی طرف اشارہ ہے کہ انہیں کوئی گن سکے گا)

فصل ۱۷ جملہ ۲۰ میں آیا ہے: اُسے (اسماعیل کو) ہم نے برکت دی ہے اور اس کی نسل کو خوب بڑھایا ہے آخر میں ان کی تعداد بہت زیادہ ہوگی، بارہ سردار پیدا ہوں گے اور اسے عظیم امت عطا ہوگی۔

''بارہ سردار پیدا ہوں گے'' کا جملہ بتا رہا ہے کہ بارہ امام اور راہنما، سب کے سب ان کی اولاد سے ہوں گے۔ یہ جملہ انتہائی قابل توجہ ہے۔ فصل ۱۸ جملہ ۱۸ میں آیا ہے: ''دنیا کی تمام اقوام اس سے برکت حاصل کریں گی''۔ اسی طرح دیگر جملے اور الفاظ میں جن کو ذکر کرنے سے بات بہت لمبی ہو جائے گی۔

مذکورہ آیت میں قیام مہدی کی طرف واضح اشارے کے علاوہ، اسلامی روایتیں بھی یہ موضوع بڑے واضح انداز میں بیان ہوا ہے۔ طبرسی مرحوم، مجمع البیان میں مذکورہ آیت کی تفسیر میں امام محمد — سے یوں نقل کرتے ہیں:

هُمْ اَصْحَابُ الْمَهْدِيِّ فِي آخِرِ الزَّمَانِ

یہ (صالح بندے جن کا آیت میں زمین کے وارثوں کے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے) آخری زمانے میں مہدیؑ کے یار و انصار ہیں۔

تفسیر قمی میں آیت کی تفسیر میں یوں آیا ہے:

"قَالَ: الْقَائِمُ وَ اَصْحَابُهُ"

فرمایا: اس آیت سے مراد مہدیؑ (قائم) کے اصحاب ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ کے صالح بندے روئے زمین کے بعض حصے پر حکومت حاصل کر لیں گے جیسا کہ رسول اللہ کے زمانے میں اور دیگر ادوار میں ہوا ہے۔ لیکن پوری دنیا پر صالحین کی حکومت صرف حضرت مہدیؑ کے دور میں واقع ہوگی۔ اس موضوع پر شیعہ اور سنی ذرائع سے منقولہ روایات تواتر کی حد تک پائی جاتی ہیں۔

کتاب ''التاج الجامع للاصول'' (اس کتاب میں اہلسنت کے مشہور پانچ اصول جمع کیے گئے ہیں اور اس پر الازھر کے علماء نے اہم تقریظات لکھی ہیں) کے مصنف ''شیخ منصور علی ناصف'' مذکورہ کتاب میں یوں تحریر کرتے ہیں:

اِشْتَهَرَ بَيْنَ الْعُلَمَاءِ سَلَفًا وَ خَلَفًا اَنَّهُ فِي آخِرِ الزَّمَانِ لَا بُدَّ مِنْ ظُهُورِ رَجُلٍ مِنْ اَهْلِ الْبَيْتِ مُسَمَّى الْمَهْدِي يَسْتَوْلِي عَلَى الْمَمَالِكِ الْاِسْلَامِيَّةِ وَ يَتَّبِعُهُ الْمُسْلِمُونَ وَ يَعْدِلُ بَيْنَهُمْ وَ يُؤَيِّدُ الدِّيْنَ

گزشتہ اور موجود تمام علماء کے درمیان مشہور ہے کہ یقینا آخری زمانے میں اہل بیت (علیہم السلام) سے ایک شخص ظاہر ہوگا جو تمام اسلامی ممالک پر تسلط حاصل کرلے گا اور تمام مسلمان اس کی پیروی کریں گے اور وہ ان کے درمیان عدل و انصاف کو جاری کرے گا اور دین کو مستحکم اور قوی کرے گا۔

وہ مزید لکھتے ہیں:

و قَدْ رَوی اَحادیثُ المَهْدِیِّ جَماعَة مِنْ خیار الصَّحابَة وَ اَخرَجَها اَکَابِرُ المُحَدِّثِیْنَ کَابِی داود، و ترمذی و ابن ماجه و الطبرنی و ابی یعلی و البزاز و الامام احمد و الحاکم (رض)

احادیث مہدیؑ کو اصحاب رسولؐ کی ایک بہترین جماعت نے نقل کیا ہے اور انہیں ابوداود، ترمذی، ابن ماجہ، طبرانی، ابویعلی، بزاز، امام احمد اور حاکم (رض) جیسے اکابر محدثین نے اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے۔[1]

یہاں تک کہ ابن خلدون جس کا شمار احادیث مہدیؑ کے مخالفوں میں سے ہوتا ہے، وہ بھی علمائے اسلام کے درمیان ان احادیث کی شہرت سے انکار نہیں کرسکا ہے۔[2] جن افراد نے ان اخبار و روایات کے تواتر کا تذکرہ اپنی کتب میں کیا ہے ان میں ایک مشہور مصری عالم اور دانشور محمد شبلنجی ہیں وہ اپنی کتاب ''نور الابصار'' میں لکھتے ہیں: **تَواتُرُ الاَخْبار عَنِ النَّبِی (ص) عَلی اَنَّ المَهْدی مِنْ اَهْلِ بَیْتِهِ وَاَنَّهُ یَمْلَاءُ الاَرضَ عَدْلاً** یعنی: نبی اکرم ﷺ سے احادیث متواترہ ہم تک پہنچی ہیں کہ مہدی = آنحضرت کے اہل بیت ÷ میں سے ہیں اور پوری دنیا کو عدل و انصاف سے پُر کردیں گے۔

یہ الفاظ بہت ساری دوسری کتب میں بھی آئے ہیں، یہاں تک کہ اہلسنت کے مشہور عالم شوکانی جنہوں نے حضرت مہدیؑ کے انقلاب، دجال کے خروج اور حضرت مسیحؑ کی بازگشت کے متعلق احادیث کے تواتر کے بارے میں کتاب لکھی ہے، اس نے حضرت مہدیؑ کے بارے میں احادیث کے تواتر کے حوالے سے مفصل گفتگو کرنے کے بعد لکھا ہے: ''**هٰذا یَکْفِی لِمَنْ کانَ عِنْدَہُ ذرَّۃٌ مِنَ الایمانِ وَ قَلیل مِنْ انصاف**۔ یعنی: جو کچھ کہا گیا ہے اس شخص کے لیے کافی ہے جس کے پاس ذرا برابر بھی ایمان اور تھوڑا سا بھی انصاف ہو۔[3]

بہتر ہے یہاں پر نمونے کے طور پر چند اہم روایات کو بیان کیا جائے جو مشہور اسلامی کتب میں نقل ہوئی ہیں۔

۱۔ اہل سنت کے چار اماموں میں سے ایک امام احمد بن حنبل اپنی کتاب مسند میں ابوسعید خدری سے بیان کیا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا:

---

[1] التاالا جامع اللاصول، جلد ۵، صفحہ ۳۴۱ (یہ بات اس کتاب کے حاشیہ پر اسی صفحہ پر آئی ہے)

[2] ابن خلدون، صفحہ ۳۱۱ (مطبوعہ بیروت)

[3] کتاب التاج جلد ۵، صفحہ ۳۶۰ (مطبوعہ دار احیاء تراث العربی) سے نقل شدہ۔

لاتقوم السّاعۃُ حتّیٰ تمتلأ الارضُ ظُلْمًا و عُدواناً۔ قال: ثُمَّ یَخْرُجُ رَجُل مِنْ عِتْرَتِی اَوْ مِنْ اَھْلِ بَیْتِی یَمْلاھا قِسطاً و عَدْلاً کما مُلِئَتْ ظُلْماً و عُدواناً

قیامت اس وقت تک بر پا نہیں ہوگی جب تک زمین ظلم وستم سے پُر نہیں ہو جائے گی اس وقت میری عترت یا اہل بیت میں سے ایک شخص قیام کرے گا اور وہ زمین کو عدل وانصاف سے اس طرح بھر دے گا جس طرح وہ ظلم وجور سے بھری ہوگی۔[1]

۲۔اسی مطلب کو تھوڑے سے فرق کے ساتھ حافظ ابوداود سجستانی نے اپنی کتاب سنن میں ذکر کیا ہے۔[2]

۳۔مشہور ومعروف محدث ترمذی، صحیح سند (منصور علی ناصف کی کتاب التاج میں تصریح کے مطابق) کے ساتھ عبداللہ کے ذریعے رسول خداؐ سے نقل کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

لَوْ لَمْ یَبْقَ مِنَ الدُّنیا اِلاَّ یَوْمُ لَطَوَّلَ اللہُ ذٰلِکَ الْیَوْمَ حَتّٰی یَبْعَثَ رَجُلاً مِنّی اَوْ مِنْ اَھْلِ بَیْتِی یُواطِئُ اِسْمُہُ اِسْمِی وَ اِسْمُ اَبِیہِ اِسْمَ اَبِی یَمْلأُ الاَرْضَ قِسطاً و عَدْلًا کما مُلِئَتْ ظُلْمًا وَ جَوْراً

اگر دنیا کا ایک دن بھی باقی ہو تو اللہ تعالیٰ اس ایک دن کو اتنا لمبا کر دے گا اور اس ایک دن میں مجھ سے یا میرے اہل بیت (یہ شک وتردید راوی کی طرف سے ہے البتہ اس کا معنی اور مفہوم ایک ہے) میں سے اللہ تعالیٰ ایک مرد کو بھیجے گا (جس کا نام میرے نام پر ہوگا اور جس کے باپ کا نام میرے باپ کے نام پر ہوگا[3] وہ زمین کو عدل وانصاف سے ایسے بھر دے گا جس طرح وہ ظلم وجور سے بھری ہوگی)[4]

اسی طرح کی حدیث تھوڑے سے فرق کے ساتھ حاکم نیشاپوری نے بھی مستدرک میں بیان کی ہے اور اس کے آخر میں کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے اگرچہ بخاری اور مسلم نے اسے نقل نہیں کیا ہے۔[5]

۴۔اسی طرح صحیح داود میں اُمّ سلمہ سے منقول ہے کہ میں نے رسول خداؐ سے سنا کہ آپ نے یوں فرمایا ہے:

---

[1] مسند احمد، جملہ ۳، صفحہ ۳۶

[2] سنن ابی داود، جلد ۴، صفحہ ۱۶۲۔

[3] بعض بزرگ علماء نے وضاحت کی ہے کہ یہاں پر "اسم ابیہ اسم ابنی" (اس کے باپ کا نام میرے بیٹے کا نام ہوگا) درست ہے اس لحاظ سے حضرت امام مہدیؑ کا نام مبارک (محمد بن الحسن العسکری) شیعہ عقیدے کے بالکل مطابق ہے۔

[4] التاج، جلد ۵، صفحہ ۳۴۳۔

[5] المستدرک جلد ۴، صفحہ ۵۵۸۔

اَلْمَهْدِیُّ مِنْ عِتْرَتِی مِنْ وُلْدِ فاطِمَةَ:

مہدی میرے خاندان میں سے فاطمہ زہراؑ کی نسل سے ہوں گے۔[1]

۵۔اس بارے میں مستدرک میں حاکم نیشاپوری نے ایک تفصیلی حدیث ابوسعید خدری کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

یَنْزِلُ بِاُمَّتِی فِی آخِرِ الزّمانِ بلاءٌ شدِیدٌ مِنْ سُلْطانِہِمْ لَمْ یُسْمَعْ بَلاءٌ اَشَدُّ مِنهُ حتیّ تَضِیقَ عَنْهُمُ الْاَرْضُ الرَّحبَةُ وَ حتیّ یَمْلاُ الاَرْضَ جَوْراً و ظُلْمًا لایَجِدُ المُؤمِنُ مَلْجَأً یَلْتَجِأُ اِلَیْہِ مِنَ الظُّلْمِ فیَبْعَثُ اللہُ عَزَّ وَ جَلَّ رَجُلاً مِنْ عِتْرَتِی فَیَمْلَأُ الْاَرْضَ قِسْطًا و عَدْلًا کماَ مُلِئَتْ ظُلْمًا وجُورًا یَرْضَی عَنْہُ ساکِنُ السَّماءِ و ساکِنُ الاَرْضِ لَاتَدَّخِرُ الْاَرْضُ مِنْ بَذْرِها شَیئاً اِلَّا اَخْرَجَتْہُ وَ لَا السَّماءُ مِنْ قَطْرِ ها شَیئًا اِلَّا صَبَّہُ اللہُ عَلَیْہِمْ مِدْراراً

آخری زمانے میں میری امت پران کے حکمرانوں کی طرف سے سخت مشکلات اور مصائب ٹوٹیں گے ایسی مصیبتیں اور بلائیں جن سے زیادہ شدید پہلے نہ سنی ہوں گی، یہاںتک کہ زمین اپنی تمام تر وسعتوں کے باوجود ان پر تنگ ہوجائے گی، زمین ظلم وستم سے بھر جائے گی مومن کوظلم وستم سے کوئی پناہ گاہ میسر نہ ہوگی اس وقت اللہ تعالیٰ میری عترت سے ایک مرد مبعوث کرے گا جو زمین کو عدل وانصاف سے ایسے بھر دے گا جس طرح وہ ظلم وجور سے بھری ہوگی آسمان ان پر تمام بارش کے قطروں کو نازل کرے گا (یعنی پوری زمین کو سیراب اور بابرکت کردے گا)[2]

اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد حاکم کہتے ہیں: یہ حدیث صحیح ہے اگرچہ بخاری اور مسلم نے اسے اپنی کتب میں نقل نہیں کیا ہے۔
مشہور کتب میں اسی طرح کی احادیث مختلف راویوں سے بہت زیادہ ہیں، جو یہ بتاتی ہیں کہ آخرکار امام مہدیؑ کے بابرکت ہاتھوں سے عالمی حکومت قائم ہوگی جو تمام جگہوں کو عدل وانصاف سے پر کردے گی۔اور مذکورہ آیت اِنَّ الاَرْضَ یَرِثُها عِبادِیَ الصّالِحونَ کا معنی اور مفہوم عملی جامعہ پہنے گا۔

---

[1] صحیح ابی داود، جلد ۲، صفحہ ۲۰۷۔

[2] المستدرک علی الصحیحین، جلد ۴، صفحہ ۴۶۵ (مطبوعہ حیدرآباد دکن)

۲۔سورہ نور کی آیت

اس سورہ کی آیت ۵۵ میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـــًٔا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝۵۵

تم سے ایمان لانے والوں اور عمل صالح انجام دینے والوں سے اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ وہ یقیناانہیں زمین پر خلیفہ قرار دے گا جس طرح اُس نے ان سے پہلے والوں کو (زمین پر) خلافت بخشی ہے اور جس دین کو اس نے ان کے لیے پسند اور انتخاب کیا ہے اُسے محکم اور پا برجا کرے گا ان کے خوف اور ڈر کو امن وسلامتی میں تبدیل کر دے گا، میری عبادت کرو اور کسی کو میرا شریک قرار نہ دو اور جو اس کے بعد کافر ہو جائیں یہی لوگ فاسق ہیں۔

اس آیت میں واضح طور پر صالح مومنین کو بشارت دی گئی ہے کہ آخر کار روئے زمین پر ان کی حکومت ہوگی، دین اسلام پوری دنیا میں پھیل جائے گا بدامنی اور خوب ودہشت امن وامان اور آرام وسکون میں بدل جائیں گے پورے عالم سے شرک کی بساط لپیٹ دی جائے گی خدا کے بندے پوری آزادی کے ساتھ اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت و پرستش کو انجام دیں گے، سب کے لیے اتمام حجت ہو جائے گی اس طرح سے کہ اس کے بعد اگر کوئی کفر کے راستے کو اختیار کرے گا تو وہ قصوروار اور فاسق ہوگا۔ (آیت کے آخری حصے میں خاص طور پر غور وفکر کیجیے گا)

اگرچہ یہ اہم امور جن کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ دیا ہے رسول اکرم ﷺ اور اُن کے بعد کے ادوار میں نسبتاً بڑے وسیع پیمانے پر اسلامی دنیا کے لیے وقوع پذیر ہوئے ہیں۔ اسلام جو کہ ایک زمانے میں دشمنوں کے نرغے میں گھیرا ہوا تھا اور وہ ذرا برابر بھی اس کی تبلیغ اور اظہار کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے اور مسلمان مسلسل خوف و ہراس کی حالت میں تھے لیکن کچھ عرصہ کے بعد نہ صرف جزیرۃ العرب بلکہ دنیا کے ایک بہت بڑے حصے پر اسلام کی حکمرانی قائم ہوگئی اور اس کے دشمن تمام محاذوں پر شکست کھا گئے لیکن اس کے باوجود اسلام کی عالمی حکومت جو پوری دنیا پر قائم ہو، جو شرک و بت پرستی کا مکمل طور پر خاتمہ کر دے، امن وامان، آزادی اور توحید خالص کو تمام جگہوں پر پھیلا دے، ایسی حکومت ابھی تک وجود میں نہیں آئی ہے۔ پس اس کے وقوع پذیر ہونے کا انتظار کرنا چاہیے۔

روایت متواترہ جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اس کے مطابق یہ امر امام مہدیؑ کے انقلاب کے زمانے میں حقیقت کا روپ دھارے

گا۔ بنابرایں، اس آیت کا ایک مصداق رسول اللہ ﷺ اور ان کے بعد کے ادوار میں حاصل ہوا ہے لیکن وسیع پیمانے پر اس کا وقوع امام مہدیؑ کے انقلاب کے زمانے میں ہوگا اور ان دو باتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے، اور یہ وعدہ الٰہی دونوں مرحلوں میں انجام پانا چاہیے۔

مذکورہ بالا آیت میں جس جانشینی اور خلافت کی بات ہوئی ہے، اس سے مراد سابقہ کافر اقوام کی حکومت کا خاتمہ اور اس کی جگہ حق کی حکومت کی جاگزینی ہے۔ جیسا کہ سورہ یونس کی آیت ۱۴ میں آیا ہے: ثُمَّ جَعَلْنَا كُمْ خلائِفَ فِي الارضِ مِنۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كيف تَعْلَمُونَ۔ یعنی: پھر ہم نے تمہیں ان (ظالم قوموں) کا روئے زمین پر جانشین بنایا تا کہ ہم دیکھیں تم کس طرح عمل کرتے ہو۔ اسی طرح کا مطلب سورہ اعراف کی آیت ۶۹ اور ۷۴ میں بھی بیان ہوا ہے۔

اس بنا پر (فخر رازی جیسے) جن افراد کا یہ خیال ہے کہ یہ آیت پہلے چار خلفاء کی خلافت کی صحت پر واضح دلیل ہے کیونکہ وہ تھے جو پیغمبر اکرمؐ کے جانشین اور خلیفہ بنے اور ان کے دور میں یہ وعدہ الٰہی پورا ہوا، یہ افراد غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں کیونکہ مندرجہ بالا آیت خلافت رسولؐ کی طرف ناظر نہیں ہے بلکہ وہ گزشتہ اقوام کی خلافت اور جانشینی کو بیان کر رہی ہے جس طرح مذکورہ تین آیات میں موجود ہے اور جس طرح سورہ اعراف کی آیت ۱۳۷ میں آیا ہے:

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ بِمَا صَبَرُوْا ؕ

ہم نے ان لوگوں کو جو کمزور کر دیئے گئے تھے اس سرزمین کے مشرق ومغرب کا وارث بنایا جسے ہم نے برکتوں سے نوازا تھا اور بنی اسرائیل کے ساتھ آپ کے رب کا نیک وعدہ پورا ہو گیا کیونکہ انہوں نے صبر کیا تھا۔

واضح ہے کہ بنی اسرائیل فرعونیوں کے وراث بنے تھے اور اس وسیع وعریض اور پر برکت ملک (مصر اور اس کے اطراف) کے وہ حکمران بنے تھے۔ بہر حال آیت پوری دنیا پر صالح مومنین کی حکومت کی نوید اور بشارت دے رہی ہے جس کا ایک بڑا حصہ پیغمبر اسلامؐ اور ان کے بعد کے زمانے میں وقوع پذیر ہوا اگر چہ وہ پورے عالم تک نہ پھیل سکا۔ البتہ اس وعدہ الٰہی کے پورا ہونے کا ایک نمونہ تھا لیکن تمام روئے زمین پر عالمی حکومت کی صورت میں ابھی تک یہ وعدہ پورا نہیں ہوا اس کا کامل مصداق لوازمات فراہم ہونے کی صورت میں مشیت الٰہی سے حضرت امام مہدیؑ کی حکومت میں وجود میں آئے گا جب وہ احادیث نبویؐ اور معصومین کی روایات کے مطابق دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے جس طرح وہ ظلم وجور سے بھری ہوگی اور ہم اس قرآنی وعدے کے منتظر ہیں۔

اس آیت کی تفسیر میں مختلف ماخذ میں جو روایات نقل ہوئی ہیں وہ اس حقیقت کی تائید کرتی ہیں۔ مشہور مفسر قرطبی اپنی تفسیر ''الجامع الاحکام القرآن'' میں اسی آیت کے حوالے سے سلیم بن عامر کے ذریعے مقداد بن اسود سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے رسول خداؐ سے سنا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

مَا عَلٰى ظَهْرِ الْاَرْضِ بَيْتُ حَجَرٍ وَلا مَدَرٍ اِلاَّ اَدْخَلَهُ اللّٰهُ كَلِمَةَ الاسلام

صفحہ زمین پر کوئی بھی مٹی یا پتھر کا گھر باقی نہیں رہے گا مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اس میں اسلام کو داخل کر دے گا۔[1]

تفسیر روح المعانی میں امام علی بن حسین۔ سے نقل ہوا ہے کہ انہوں نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا:

هُم و اللهِ شِيْعَتُنَا اَهْلَ الْبَيْتِ يُفْعَلُ ذٰلِكَ بِهِمْ عَلٰى يَدِ رَجُلٍ مِنَّا وَ هُوَ مَهْدِيٌّ هذه الاُمَّةِ وَ هُوَ الَّذِى قالَ رَسُولُ اللهِ (ص) فِيه لَوْ لَمْ يَبْقَ مِنَ الدُّنيا اِلاَّ يَوْمٌ واحِدٌ لَطَوَّلَ اللهُ تعالى ذٰلِكَ الْيَوْمَ حَتّٰى يَلِيَ رَجُلٌ مِنْ عِتْرَتِي اِسْمُهُ اِسْمِي يَمْلاُ الارْضَ عَدْلًا و قِسْطًا كم مُلِئَتْ ظُلْماً و جَوْرًا

خدا کی قسم وہ ہم اہل بیت کے شیعہ ہیں اللہ تعالیٰ یہ کام ہم میں سے ایک مرد کے ہاتھوں انجام دے گا وہ اس امت کے مہدیؑ ہوں گے یہ وہی ہیں جن کے بارے میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اگر دنیا کی عمر میں سے ایک دن بھی باقی ہوگا تو اللہ تعالیٰ اس ایک دن کو اتنا طولانی کر دے گا یہاں تک کہ میری عترت سے ایک مرد جس کا نام میرے نام پر ہوگا اس زمین پر حکمران ہوگا اور وہ زمین کو عدل وانصاف سے اس طرح پُر کر دے گا جس طرح وہ ظلم وجور سے بھری ہوگی۔

اس حدیث کو تھوڑے سے فرق کے ساتھ اہل بیت کے ماخذ میں بھی دیکھا جا سکتا ہے اگر چہ آلوسی نے روح المعانی میں اس حدیث کو مثبت نظر سے نہیں دیکھا ہے لیکن اس کے نیچے وہ لکھتے ہیں کہ ہمارے ذرائع سے بعض روایات نقل ہوئی ہیں جو اس مطلب کی تائید کرتی ہیں اگر چہ ہم ان پر بھروسہ نہیں کرتے) جیسے عطیہ نے پیغمبر اکرمؐ سے نقل کیا ہے کہ آپؐ نے مذکورہ آیت کی تلاوت کے بعد فرمایا: اهل البیت هیهنا۔ یعنی: ''اہل بیتؑ یہاں پر ہیں'' اور قبلہ کی طرف اشارہ کیا۔[2]

قرطبی نے اس بارے میں ایک اور حدیث بھی بیان کی ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا:

زُوِيَتْ لِيَ اَلاَرْضُ فَرَأَيْتُ مشارِقَها و مَغَارِبَهَا وَ سَيَبْلُغُ مِلْكُ اُمّتى ما زُوِيَ لِي مِنْها

زمین میرے لیے سمیٹ دی گئی اور میں نے اس کے مشرق اور مغرب کو دیکھا ہے بہت جلدی میری امت کی حکومت اس تمام پر قائم ہوگی جو میرے سامنے سمٹ گئی (یعنی تمام روئے زمین)[3]

جو کچھ ہم نے کہا ہے اس سے مذکورہ آیت کی تفسیر کے حوالے سے اہل بیت کے پیروکاروں پر مخالفین کے بہت سے اعتراضات کا جواب مل جاتا ہے۔ اس کی وضاحت یوں ہے کہ جس طرح ہم نے کہا ہے کہ اس وعدہ الٰہی کے پورا ہونے کے مراحل ہیں، اس کا ایک مرحلہ

---

[1] تفسیر قرطبی، جلد ۷، صفحہ ۴۶۹۲
[2] روح البیان، مذکورہ آیت کی تفسیر میں۔
[3] تفسیر قرطبی، مذکورہ آیت کی تفسیر میں۔

پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں صالح مومنین کے بارے میں وقوع پذیر ہوا۔ جب فتح مکہ اور جزیرۃ العرب پر اسلام کے تسلط کے بعد مسلمان پیغمبر اکرم ﷺ اور اسلام کے زیر سایہ امن وامان کی زندگی گزارنے لگے اور علاقے کے بہت بڑے حصے پر حکومت کرنے لگے اس طرح اس آیت کے شان نزول نے عملی صورت اختیار کی۔

(اس آیت کے شان نزول کے بارے میں بہت سی تفسیروں جیسے اسباب النزول، مجمع البیان، فی ظلال القرآن اور تفسیر قرطبی (کچھ فرق کے ساتھ) میں بیان ہوا ہے کہ جب رسول خداؐ اور مسلمانوں نے مدینے کی طرف ہجرت کی اور انصار نے خندہ پیشانی اور کھلے دل سے ان کا استقبال کیا تو تمام عرب ان کے خلاف کمر بستہ ہو گئے۔ اور حالت یہ ہو گئی کہ مسلمان ہر وقت اسلحہ اپنے ساتھ رکھنے پر مجبور ہو گئے، رات کو سوتے وقت اور صبح اٹھتے وقت اسلحہ اپنے ساتھ رکھنے لگے، اس صورت حال کا جاری رہنا مسلمانوں کے لیے بہت مشکل بن گیا۔ بعض افراد پوچھتے تھے کہ یہ حالت کب تک جاری رہے گی؟ ایسا وقت کب آئے گا جب ہم رات کو سکون سے سوئیں گے اور اللہ کے سوا کسی کا ہمیں ڈر نہیں ہوگا؟ اس موقعہ پر مذکورہ آیت نازل ہوئی اور اس نے خوش خبری سنائی کہ یہ وقت جلد آنے والا ہے)

اس کا دوسرا مرحلہ خلفاء کے دور میں پورا ہوا جب دنیا کے ایک بڑے حصے پر اسلام کی حکومت قائم ہوئی اور مسلمان زیادہ امن و سکون سے رہنے لگے۔ لیکن اس کا تیسرا اور آخری مرحلہ یعنی اسلام کا ہمہ گیر ہونا، پوری دنیا پر اس کی حکمرانی مکمل امن وامان اور آرام وسکون کے ساتھ اور لشکر توحید کی لشکر شرک پر فتح و کامیابی ابھی تک وقوع پذیر نہیں ہوا ہے۔ اور یہ صرف حضرت مھدی - کے انقلاب کے دور میں واقع ہوگا۔ اور یہ تین باتیں جو ایک ہی حقیقت کے تین درجے ہیں، ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں۔

ضمنی طور پر اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ الٰہی وعدہ، صاحبان ایمان اور عمل صالح رکھنے والے افراد کے ساتھ مختص ہے۔ یقیناً جس دور اور زمانے میں یہ دونوں شرطیں پوری ہو جائیں تو اللہ کی حاکمیت وحکمرانی کا یہ مرحلہ بھی مسلمانوں کے لیے پایہ تکمیل کو پہنچ جائے گا۔ اس کے برعکس جب بھی مسلمان شکست کھا جائیں اور مسلمان دشمن کے چنگل میں ذلیل وخوار ہوں تو سمجھ لینا چاہیے کہ وعدہ الٰہی کی یہ شرائط اور بنیادی اصولوں کو فراموش کر دیا گیا ہے، ایمان کمزور ہو گیا ہے اور اعمال فاسد اور گندے ہو گئے ہیں۔

۳۔ آیت ظہور حق

سورہ توبہ کی آیت ۳۳ میں ارشاد الٰہی ہے:

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝۳۳

وہ وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تا کہ اُسے تمام ادیان پر غالب کر دے اگرچہ مشرکین کو ناگوار ہی کیوں نہ ہو؟

قابل توجہ بات یہ ہے کہ یہ آیت اس آیت کے بعد آئی ہے جس میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ۝۳۲

وہ اللہ کے نور کو پھونکوں سے بجھانا چاہتے ہیں لیکن اللہ اپنے نور کو ہر صورت میں مکمل کرنا چاہتا ہے اگر چہ کافروں کو ناگوار ہی کیوں نہ ہو۔

گزشتہ آیت کی طرح ان آیات میں بھی اللہ تعالیٰ نے تمام ادیان پر اسلام کے غلبے اور فتح کا وعدہ دیا ہے۔ تمام ادیان پر اسلام کی فتح و کامیابی سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں مفسرین نے بہت احتمال ذکر کیے ہیں۔ فخر رازی نے یہاں پر پانچ تفسیری احتمالات بیان کیے ہیں جو درحقیقت اس غلبے اور کامیابی کی کیفیت کے بارے میں سوالات کا جواب ہیں:

۱۔ غلبے اور کامیابی سے مراد نسبی (جزوی) اور علاقائی کامیابی ہے کیونکہ ہر علاقے میں اسلام ہر دین اور مذہب پر کامیاب اور غالب ہوا ہے۔

۲۔ اس سے مراد جزیزۃ العرب کے ادیان پر غلبہ اور کامیابی ہے۔

۳۔ اس سے مراد تمام ادیان الٰہی سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آگاہ کرنا ہے۔ (یہاں پر لفظ "لِيُظْهِرَ" کا معنی آگاہ کرنا کیا گیا ہے)

۴۔ اس سے مراد دلائل اور منطق کے اعتبار سے کامیابی اور غلبہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے اسلام کے دلائل کو دیگر ادیان پر کامیاب اور غالب کرے گا۔

۵۔ اس سے مراد حضرت عیسیٰؑ کے آسمان سے نزول اور قیام مہدیؑ کے موقع پر اسلام کی تمام ادیان اور مذاہب پر مکمل کامیابی اور غلبہ ہے جب اسلام پوری دنیا پر چھا جائے گا۔

بلاشک آیت کی منطقی دلائل کے لحاظ سے کامیابی سے تفسیر کرنا اور وہ بھی مستقبل میں وعدہ الٰہی کے طور پر ایک غیر معقول تفسیر ہے کیونکہ اس لحاظ سے یعنی منطق دلائل کے اعتبار سے اسلام پہلے دن سے غالب اور کامیاب تھا۔ علاوہ ازیں "ظہور" اور "اظہار" (لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّه) کے الفاظ کا معنی عینی اور واقعی غلبہ ہے جیسا کہ ان الفاظ کے قرآن مجید میں استعمال کے مقامات سے ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ اصحاب کہف کے واقعے میں قرآن فرماتا ہے:

اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ (کہف/۲۰)

اگر وہ تم پر غلبہ پالیں تو تمہیں سنگسار کر دیں گے۔

سورہ توبہ کی آیت نمبر ۸ میں آیا ہے:

كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ؕ

(ان عہد و پیمان کی اہمیت) کیونکر ہو سکتی ہے جب کہ یہ تم پر غالب آجائیں تو نہ کسی قرابت اور ہمسائیگی کا خیال کریں گے اور نہ کسی عہد و پیمان کو دیکھیں گے۔

واضح ہے کہ نہ تو اصحاب کہف کی قوم کے بت پرست اور نہ ہی مکہ کے بت پرست خدا پرستوں پر منطقی دلائل کے اعتبار سے ہر گز غلبہ نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کا غلبہ مادی اور واقعی تھا بنابرایں دیگر تمام ادیان پر اسلام کے غلبے سے مراد بھی مادی، واقعی اور عینی غلبہ ہے نہ کہ منطقی اور ذہنی۔ جیسا کہ اس کی مثال پہلے گزر چکی ہے کہ اس غلبے کے مختلف مراحل ہیں:

اس کا ایک مرحلہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں مکمل ہوا اس سے وسیع سطح پر مرحلہ آپ کے بعد والے ادوار میں پایہ تکمیل کو پہنچا اور اس کا آخری مرحلہ امام مہدیؑ کے انقلاب کے موقعہ پر حاصل ہوگا کیونکہ آیت شریفہ اسلام کے تمام ادیان پر غلبے کی بات بلا قید وشرط کے کر رہی ہے اور بلا قید وشرط اور مطلق غلبہ مکمل طور پر اس صورت میں واقع ہوتا ہے جب تمام روئے زمین پر چھا جائے جیسا کہ رسول اکرمؐ کی روایت میں آیا ہے جس میں آپ نے فرمایا:

لَا یَبْقٰی عَلٰی ظَهْرِ الْاَرْضِ بَیْتُ مَدَرٍ وَلَا وَبَرٍ اِلَّا اَدْخَلَهُ اللهُ کَلِمَةَ الاسلام

روئے زمین پر کوئی گھر نہ پتھر کا اور نہ مٹی کا، نہ کوئی اون اور بالوں سے بنا ہوا خیمہ، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ کلمہ اسلام اس میں داخل کر دے گا۔[1]

اس طرح کا مطلب تفسیر الدر المنثور میں، سعید بن منصور، ابن منذر سے اور بیہقی نے سنن میں جابر بن عبداللہ انصاری سے نقل کیا ہے کہ اس آیت کی تفسیر میں کہا: ''لَا یَکُوْنُ ذٰلِكَ حَتّٰی لَا یَبْقٰی یَهُوْدِیٌّ وَلَا نَصْرَانِیٌّ صَاحِبُ مِلَّةٍ اِلَّا الْاِسْلَامُ۔ یعنی: ''یہ معنی اس وقت واقع ہوگا جب کوئی بھی یہودی اور عیسائی اپنے مذہب پر قائم نہیں رہے گا۔ بلکہ اسلام قبول کر لے گا۔'' (یعنی یہ سب اسلام کے سایے میں آ جائیں گے اور ہر جگہ اسلام، کلمہ توحید اور خداوند کی عظمت و بزرگی کی بات ہوگی)[2]

سچ ہے کہ اس عظیم دن میں یہ عظیم وعدہ الٰہی وقوع پذیر ہوگا:

همه جا نغمه قرآن و دعا خواهد بود
همه جا غلغل تسبیح و ثنا خواهد بود
بانگ تکبیر زهر بام و دری برخیزد
عیش دجال مبدل به عزا خواهد شد
عالم آن گونه که از ظلم و ستم پر گشته
پر ز انوار عدالت همه جا خواهد شد
اهرمن خیمه ز اطراف جهاں برچیند

[1] مجمع البیان مذکورہ آیت کی تفسیر میں۔
[2] الدر المنثور جلد ۳، صفحہ ۲۳۱

ھمہ جا مظہر انوار خدا خواھد شد!

ہر جگہ پر قرآن اور دعا کے نغمے ہوں گے اور ہر طرف تسبیح و حمد وثنا کا شور وغل ہوگا، تکبیر کی آواز ہر در و دیوار سے بلند ہوگی دجال کی زندگی اجیرن اور غم زدہ ہو جائے گی دنیا جس طرح ظلم و ستم سے بھری ہوگی اسی طرح عدل و انصاف سے بھر جائے گی۔ شر اور برائی اپنی بساط دنیا سے لپیٹ لیں گے اور ہر جگہ انوار الٰہی کا مظہر بن جائے گی۔

مذکورہ آیت کی تفسیر میں یہی بات امام صادق - سے بھی نقل ہوئی ہے کہ آپ نے فرمایا:

وَ اللهِ ما نَزَلَ تأويلها بعدُ وَ لَا يَنْزِلُ تأويلها، حتىّ يَخْرُجَ القائِم فاذا خَرَجَ القائِمُ لَمْ يَبْقَ كافِرٌ بِاللهِ العظيم

اللہ کی قسم ابھی تک اس آیت کا مطلب عملی (آخری مرحلہ تک) نہیں ہوا ہے اور صرف یہ اس وقت واقع ہوگا جب حضرت قائم خروج کریں گے اور ان کے قیام کے وقت خدا کا انکار کرنے والا کوئی بھی دنیا میں باقی نہیں رہے گا۔[1]

یہ نکتہ بھی اہمیت کا حامل ہے کہ جملہ "هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَ دِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ" قرآن کی تین سورتوں میں ہے۔ پہلی سورہ توبہ آیت ۳۳ (جس کا ذکر گذر چکا ہے) دوسری سورہ فتح آیت نمبر ۲۸، تیسری سورہ صف آیت ۹۔ اس مطلب کا تکرار بتاتا ہے کہ قرآن مجید نے زیادہ سے زیادہ اصرار کے ساتھ اس مسئلے کو بیان کیا ہے۔ اہل سنت کی کتب میں ایک اور حدیث ابوھریرہ سے منقول ہے اس میں ہے کہ "ليظهره على الدين كله" کے جملے سے مراد حضرت عیسیٰ - کا خروج ہے۔ (اور ہمیں معلوم ہے کہ اسلامی روایات کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کا خروج حضرت مہدیؑ کے انقلاب کے موقع پر ہوگا) (۱)

اس موضوع کو ایک اور حدیث کے بیان کرنے پر ختم کرتے ہیں جسے مشہور مفسر قرآن جناب قتادہ سے نقل کیا گیا ہے وہ اس آیت کی تفسیر میں کہتے ہیں: اَلْاَدْيانُ سِتَّةٌ الّذِينَ آمَنُوا، و الّذِينَ هَادُوا، الصّائِبِيْنٌ، و النَّصارىٰ، و المَجُوسُ الّذِيْنَ اَشْرَكُوا، فالاَدْيَانُ كُلُّها تَدْخُلُ فِي دِينِ الاسلام۔ یعنی: دنیا میں کل دین چھ ہیں: الذین آمنو (مسلمان) یہودی، ستارہ پرست، عیسائی مجوسی اور مشرکین، یہ سب ادیان اسلام میں داخل ہو جائیں گے۔

واضح ہے کہ یہ بات ابھی وقوع پذیر نہیں ہوئی ہے یہ امر صرف اور صرف امام مہدی - کے قیام کے وقت وقوع پذیر ہوگا۔ یہ نکتہ بھی قابل ملاحظہ ہے کہ دین یہود اور مسیحیت کے خاتمہ کا مطلب مکمل خاتمہ نہیں بلکہ اس سے مراد اسلام کی ساری دنیا پر حاکمیت ہے۔ (غور کیجیے گا)

---

[1] نور الثقلین، جلد ۲، صفحہ ۲۱۲۔

ظہور مہدیؑ کے انتظار کے اثرات

بعض نادان لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ مذکورہ آیات اور روایات کی بنیاد پر ظہور مہدیؑ کا انتظار، جمود، پسماندگی یا ذمہ داریوں اور مسئولیت سے فرار اور ظلم وستم سے آگے سر تسلیم خم کرنے کا موجب بن سکتا ہے کیونکہ اس عظیم ظہور کے نظریے کا معنیٰ یہ ہے کہ اس سے پہلے دنیا کی اصلاح اور بہتری سے ناامید ہونا ہے بلکہ ظلم وفساد کے پھیلاؤ میں مدد کرنا ہے تاکہ ان کے ظہور کی راہ ہموار ہو سکے۔

یہ وہ اعتراض ہے جو سالوں سے قیام مہدیؑ کے منکروں اور مخالفوں کی زبانوں پر جاری ہے۔ابن خلدون نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے حالانکہ مطلب بالکل برعکس ہے۔اس عظیم ظہور کا انتظار بہت زیادہ مفید اور تعمیری ہے اس کے بارے میں مختصر طور پر ہم روشنی ڈالیں گے تاکہ معلوم ہو جائے کہ اس قسم کی رائے قائم کرنا جلد بازی ہے اور معقول نہیں کہ ایسے موضوع کے بارے میں بغیر سوچے سمجھے کوئی نظریہ قائم کرلیا جائے جس کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہو اور شیعہ اور سنی کی مشہور اور اہم ترین کتب میں مذکورہ احادیث متواترہ میں بھی واضح طور پر موجود ہو۔

انتظار کی حقیقت اور اس کے مفید اثرات

بحث یہ تھی کہ کیا ظہور مہدی - پر ان کے دنیا کو عدل وانصاف سے بھر دینے اور ظلم وستم کو جڑ سے اکھاڑ دینے کے عالمی منصوبے کے ساتھ ایمان کے مثبت اور مفید تربیتی اثرات ہیں یا اس کے منفی اثرات ہیں؟ کیا اس قسم کے ظہور پر ایمان انسان کو اس طرح سے خیالی افکار میں غرق کر دیتا ہے کہ وہ اپنی موجودہ حالت سے غافل ہو جاتا ہے اور ہر قسم کے حالات کو قبول کرلیتا ہے اور سر تسلیم خم کر دیتا ہے؟ یا یہ کہ واقعاً یہ عقیدہ ایک طرح کے قیام اور افراد سازی اور معاشرہ سازی کی دعوت ہے؟ کیا یہ عقیدہ اور نظریہ انسانوں میں تحرک پیدا کرتا ہے یا جمود؟ کیا یہ احساس ذمہ داری کا باعث بنتا ہے یا پھر ذمہ داریوں سے بھاگنے کا بہانہ بنتا ہے؟ کیا یہ سلانے والا ہے یا بیدار کرنے والا ہے؟

ان سوالات پر تحقیق اور ان کے جوابات دینے سے پہلے ایک نکتہ کی طرف توجہ کرنا نہایت ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ بہترین تعلیمات اور بہت زیادہ تعمیری افکار جب بھی نااہل، ناتجربہ کار اور مفاد پرست افراد کے ہاتھوں میں آئیں گے ممکن ہے وہ انہیں اس طرح مسخ کر دیں کہ وہ اصلی ہدف کے بالکل برخلاف نتیجہ دیں اور بنیادی مقصد کی مخالف سمت میں حرکت کریں اس قسم کی مثالیں بہت زیادہ ہیں اور انتظار کا موضوع بھی اسی قبیل سے ہے جیسا کہ آپ اس کا ملاحظہ کریں گے۔

لہٰذا اس قسم کے موضوعات کے بارے میں رائے قائم کرتے ہوئے ہر قسم کی غلط فہمی سے بچنے کے لیے بقول کسے آب را از سر چشمہ گرفت، پانی کو سرچشمہ سے لینا چاہیے۔تاکہ نہروں اور نالوں اور بیچ کے ذریعوں کی آلودگی اس میں شامل نہ ہو۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم انتظار کے موضوع کے حوالے سے اسلامی بنیاد اور اصل کی طرف رجوع کریں اور ان گوناگوں روایات کی تحقیق کریں جو مسئلہ انتظار پر بہت تاکید کرتی ہیں تاکہ ہم اصلی مقصد سے آگاہ ہو جائیں۔

چند روایات میں غور وفکر کریں

کسی نے امام صادق -سے پوچھا کہ اس کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں جو اماموں کی ولایت پر ایمان رکھتا ہے اور حق کی حکومت کا انتظار کر رہا ہے اور اس حالت میں دنیا سے چلا جاتا ہے؟ امام -نے جواب میں فرمایا:

هُوَ بِمَنْزِلَةِ مَنْ كَانَ مَعَ القائِمِ فِي فُسْطَاطِهِ۔ ثُمَّ سَكَتَ هُنَيْئَةً۔ ثُمَّ قَالَ: هُوَ كَمَنْ كَانَ مَعَ رَسُولِ اللهِ

وہ اس شخص کی طرح ہے جو قائد انقلاب (قائم) کے خیمے (فوجی کیمپ) میں اس کے ساتھ ہو پھر تھوڑی سی خاموشی اختیار کی پھر فرمایا وہ اس شخص کی مانند ہے جو رسول اللہؐ کے ساتھ جہاد میں شریک رہا ہو۔[۱]

بالکل یہی بات بہت ساری روایات میں مختلف الفاظ کے ساتھ نقل ہوئی ہے۔

۲۔ بعض روایات میں 'بِمَنْزِلَةِ الضّارِبِ بِسَيْفِهِ فِي سَبِيلِ اللهِ' کے الفاظ آئے ہیں جن کا معنی ہے راہ خدا میں تلوار چلانے والے جیسا۔

۳۔ بعض میں آیا ہے: 'كَمَنْ قَارَعَ مَعَ رَسُولِ اللهِ بِسَيْفِهِ' یعنی اس شخص کی طرح ہے جس نے رسول اللہ کی ہمراہی میں تلوار سے دشمن کے سر پر وار کیا ہو۔

۴۔ چند روایات میں یہ جملہ ہے: 'بِمَنْزِلَةِ مَنْ كَانَ قاعِدًا تَحْتَ لِواءِ القائِمِ' یعنی وہ اس کی طرح ہے جو قائم کے پرچم کے نیچے ہو۔

۵۔ بعض میں یہ الفاظ ذکر ہوئے ہیں: 'بِمَنْزِلَةِ المُجاهِدِ بَيْنَ يَدَيْ رَسُولِ اللهِ (ص)' اس شخص کی طرح ہے جس نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے جہاد کیا ہو۔

۶۔ بعض میں ہے کہ: ''بِمَنْزِلَةِ مَنِ اسْتَشْهَدَ مَعَ رَسُولِ اللهِ'' وہ اس شخص کی طرح ہے جو رسول اللہ کے ہمراہ شہید ہوا ہو۔

ان چھ روایات میں انتظار ظہور مہدیؑ کے بارے میں یہ سات تشبیہات ذکر ہوئی ہیں جو اس حقیقت کو بیان کر رہی ہیں کہ انتظار کے مسئلہ کا اور جہاد اور دشمن سے آخری شکل میں جنگ کے درمیان ایک قسم کا رابطہ اور شباہت موجود ہے (غور کیجیے گا)

۷۔ متعدد روایات میں ایسی حکومت کا انتظار کرنا افضل ترین عبادت بیان کیا گیا ہے۔ یہ بات رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقولہ بعض احادیث میں اور بعض امیر المومنینؑ سے منقولہ احادیث میں بیان ہوئی ہے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ایک حدیث میں آپؐ نے فرمایا: ''اَفْضَلُ اَعْمالِ اُمَّتِي اِنْتِظَارُ الفَرَجِ مِنَ اللهِ عَزَّ وجَلَّ یعنی: ''میری امت کا اعلیٰ ترین عمل اللہ تعالیٰ کی طرف سے گشائش کا انتظار کرنا ہے۔''[۲]

---

[۱] محاسن برقی، بحار الانوار (طباعت قدیم) جلد ۱۳، صفحہ ۱۳۶ سے نقل کے مطابق

[۲] کافی، بحار الانور، ج ۱۳، ص ۱۳۷ سے نقل کے مطابق۔

ایک اور حدیث نبویؐ میں آیا ہے: اَفضَلُ العبادۃِ اِنتِظارُ الفَرَجِ[1] یعنی: ''گشائش کا انتظار اعلیٰ ترین عبادت ہے۔''

یہ حدیث ہمارے زیر بحث موضوع انتظار کی اہمیت کو واضح کرتی ہے خواہ ہم انتظار 'فرج' کا عام معنی مراد لیں یا خاص معنی یعنی عالمی مصلح کے ظہور کا انتظار۔ یہ تمام کلمات اور الفاظ اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ اس طرح کا انقلابی انتظار کرنا ہمیشہ ایک وسیع اور مختلف پہلوؤں سے جہاد کے ساتھ ہے۔ یہ مطلب آپ کے ذہن میں رہے، اب ہم انتظار کے مفہوم کو بیان کریں گے اور پھر مجموعی طور پر نتیجہ اخذ کریں گے۔

انتظار کا مفہوم

انتظار عام طور پر ایسی حالت کو کہا جاتا ہے جب انسان موجودہ حالت سے بیزار ہو اور اس کو بہتر کرنے کے لیے کوشش کرے۔ مثال کے طور پر بیمار جو صحت مند ہونے کے انتظار میں ہوتا ہے یا باپ جو بیٹے کے سفر سے واپسی کا انتظار کر رہا ہے۔ بیمار اپنی بیماری اور باپ اپنے بیٹے کی جدائی پر پریشان اور ناراحت ہے اور بہتر صورت حال کے لیے کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح وہ تاجر جو کساد بازاری سے تنگ اور پریشان ہے وہ اقتصادی بحران کے ختم ہونے کا انتظار کرتا ہے اس میں دو حالتیں ''موجودہ حالت سے بیزاری'' اور ''اسے بہتر بنانے کے لیے سعی و کوشش'' موجود ہوتی ہیں۔

لہٰذا امام مہدیؑ کی حق و عدالت کی حکومت اور عالمی مصلح کے قیام کے انتظار کا مسئلہ درحقیقت دو عنصر سے مرکب ہے ایک عنصر منفی اور دوسرا عنصر مثبت ہے منفی عنصر وہی موجودہ حالت سے بیزاری اور مثبت عنصر حالات کی بہتری کی خواہش ہے۔ اگر یہ پہلو انسان کی روح میں جڑ پکڑ لیں تو پھر دو قسم کے اعمال کا سرچشمہ بن جائیں گے۔ اعمال کی یہ دو قسمیں یہ ہیں، ایک ظلم و فساد کے عوامل سے ہر طرح کے تعاون اور ہم آہنگی کو ترک کرنا بلکہ ان سے مقابلے اور لڑائی کرنا ہے۔ دوسری اپنی اصلاح اور خودسازی اور اس یگانہ عالمی اور عوامی حکومت کے قیام کے لیے جسمانی، روحانی، مادی اور معنوی طور پر آمادہ اور تیار ہونا ہے۔

اچھی طرح غور کریں تو ہم دیکھیں گے کہ یہ دونوں قسمیں تعمیری ہیں اور انسان کے اندر تحرک، آگہی اور بیداری کا موجب ہیں۔ انتظار کے اصلی معنی اور مفہوم کو مدنظر رکھتے ہوئے مذکورہ بالا متعدد روایات کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے جو منتظرین کے کام کے نتیجے اور اجر و ثواب کو بیان کرتی ہیں، اب ہم سمجھ سکتے ہیں کہ کیوں حقیقی منتظرین کا شمار ان افراد میں کیا گیا ہے جو امام مہدیؑ کے خیمہ میں یا ان کے پرچم کے نیچے ہوں گے یا وہ اس کی طرح ہیں جس نے راہ خدا میں تلوار چلائی ہو یا اپنے خون میں غلطاں ہوا ہو یا شہید ہوا ہو۔ کیا یہ حق و عدالت کے راستے میں جہاد و کوشش کے مختلف درجات اور مراحل کی طرف اشارہ نہیں ہے جو افراد کی آمادگی کے لحاظ اور انتظار کے درجے کے اعتبار سے ہیں؟

یعنی جس طرح سے مجاہدین کی خدا کے راستے میں جانثاری اور کردار مختلف ہے اسی طرح انتظار خودسازی اور آمادگی کے بھی بالکل مختلف درجات ہیں اور ان میں ہر ایک مقدمات اور نتیجے کے لحاظ سے اول الذکر درجات سے مشابہہ ہیں۔ دونوں جہاد ہیں۔ دونوں کے

---

[1] ایضا، ج ۱۴، ص ۶۳۱ سے نقل کے مطابق۔

لیے آمادگی اور تیاری لازم ہے اور دونوں کے لیے خودسازی کی ضرورت ہے جو شخص اس قسم کی حکومت کے قائد ورا ہنما کے خیمے میں ہو یعنی وہ ایک بین الاقوامی حکومت کے احکام کے صدور کے مرکز میں ہے وہ ایک غافل، بے خبر اور لاتعلق فرد نہیں ہوسکتا۔ وہ جگہ ہر کسی کے لیے نہیں ہے یہ ان افراد کا مقام ہے جو واقعاً اس صلاحیت اور حیثیت کے لائق اور اہل ہیں۔

اسی طرح جس کے ہاتھ میں اسلحہ ہے وہ اس انقلاب کے قائد ورہبر کے سامنے عدل وانصاف اور امن وآشتی کی اس حکومت کے مخالفین کے ساتھ جنگ کرتا ہے اس کے لیے فکری، روحانی اور جنگی لحاظ سے بہت زیادہ تیاری اور آمادگی کی ضرورت ہے۔ظہور امام مہدیؑ کے انتظار کے حقیقی اثرات سے مزید معلومات کے لیے درج ذیل وضاحت پر غور کریں۔

اگر میں خود ظالم اور ستم گر ہوں تو میں اس کا منتظر کیسے ہوسکتا ہوں جس کی تلوار ستم گروں کے خون کی پیاسی ہے؟ اگر میں خود فاسق و فاجر ہوں تو میں اس کا انقلاب کیسے انتظار کرسکتا ہوں جس کا پہلا شعلہ ہی فاسقوں اور فاجروں کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا؟ وہ فوج جو ایک بڑے جہاد اور جنگ کی منتظر ہے وہ اپنی جنگی قوت اور افراد کو بڑھاتی ہے ان کے اندر روح انقلاب پھونکتی ہے اور ہر قسم کی کمزوری اور خامی کی اصلاح کرتی ہے۔ کیونکہ انتظار کی کیفیت ہمیشہ اس ہدف اور مقصد کے مطابق اور متناسب ہوتی ہے جس کے انتظار میں ہم ہوتے ہیں۔

ایک عام سفر سے مسافر کے آنے کا انتظار

ایک قریبی دوست کی واپسی کا انتظار

درخت سے پھل چننے اور فصل کے کاٹنے کے موسم کا انتظار

ان میں سے ہر ایک انتظار ایک طرح کی آمادگی اور تیاری سے آمیختہ ہے۔ ایک میں گھر کو تیار کرنا چاہیے اور مہمان نوازی کے لوازمات پورے کرنے چاہیں اور دوسرے میں ضروری اوزار درانتی، تھریشر وغیرہ کو تیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

اب غور وفکر کریں کہ وہ لوگ جو ایک عظیم عالمی مصلح کے قیام کا انتظار کر رہے ہیں درحقیقت وہ ایسے انقلاب، تبدیلی اور تغیر کے منتظر ہیں جو پوری تاریخ انسانیت میں بنیادی ترین اور وسیع ترین انسانی انقلاب ہے۔ ایک ایسا انقلاب جو سابقہ انقلابوں کے برخلاف علاقائی نہیں بلکہ بین الاقوامی بھی ہے اور ہمہ گیر بھی، انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں اور جوانب کو شامل ہے خواہ وہ سیاسی ہوں یا ثقافتی، اقتصادی ہوں یا اخلاقی۔

پہلا فلسفہ: خودسازی

اس قسم کا تغیر وتبدل ہر چیز سے پہلے آمادگی رکھنے والے، باقدر وقیمت اور قابل اہمیت انسانوں کا محتاج ہے جو پوری دنیا میں اس قسم کی وسیع اصلاحات کے سنگین بوجھ کو اپنے کندھوں پر اٹھا سکیں۔ اس کے لیے سب سے پہلے فکر وآگہی کی سطح کو بلند کرنے کی ضرورت ہے اور اس عظیم پروگرام علمی جامعہ پہنانے کے لیے تعاون اور ساتھ دینے کے لیے روحانی اور فکری آمادگی کی ضرورت ہے تنگ نظری، کوتاہ بینی، کج فکری، حسد، بچگانہ اور جاہلانہ اختلافات اور کلی طور پر ہر قسم کی منافقت اور انتشار، حقیقی منتظرین، کے شایان شان قطعاً نہیں ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ ایسے اہم انقلاب کے حقیقی منتظر کا کردار کبھی تماشا دیکھنے والے کا نہیں ہوسکتا ہے اُسے ابھی سے انقلابیوں کی صف میں ہونا چاہیے۔اس انقلاب اورتبدیلی کے اثرات اورنتائج پرایمان ہرگز اُسے اجازت نہیں دیتا کہ وہ مخالفین کی صف میں شامل ہو۔ حامیوں کی صف اور زمرے میں شامل ہونے کے لیے نیز پاکیزہ اعمال کی ضرورت ہے اسی طرح پاکیزہ روح، اخلاقی جرات اور کافی آگاہی کا ہونا بھی ضروری ہے۔

میں اگر غلط اور بُرا ہوں تو پھر کس طرح ایسے نظام کا انتظار کروں گا جس میں بُرے اور غلط افراد کا نہ صرف کوئی کردار نہیں ہے بلکہ اس میں وہ قابل نفرت اور مردود ہوں گے۔کیا یہ انتظار روح اور فکر کے تصفیہ کے لیے اور جسم وجان کو گندگی اور آلودگیوں سے پاک کرنے کے لیے کافی نہیں ہے؟

وہ فوج جو آزادی دلانے کے لیے جہاد کی خواہاں ہے وہ مکمل آمادہ اور تیار ہوگی ایسے میدان جنگ کے لیے جس قسم کے اسلحہ کی ضرورت ہے وہ اِسے حاصل کرے گی، جہاں مورچے بنانے ضروری ہیں وہ بنائے گی اپنے افراد کی جنگی تیاریوں کو عروج پر لے جائے گی اپنے سپاہیوں کی ہمت اور جذبے بڑھائی گی ان میں سے ہر فرد کے دل میں اس قسم کی جنگ کو شوق اور جذبے کو زندہ رکھے گی۔جس فوج میں اس طرح کی تیاری اور آمادگی نہ ہووہ ہرگز منتظر نہیں ہے اگر وہ کہتی ہے تو جھوٹ بولتی ہے۔

ایک عالمی مصلح کے انتظار کا مطلب پوری دنیا کی اصلاح کے لیے فکری، اخلاقی، مادی اور معنوی لحاظ سے مکمل آمادگی ہے آپ سوچیں یہ آمادگی اور تیاری کس قدر تعمیری اور سودمند ہے تمام روئے زمین کی اصلاح اور تمام مظالم اور ناانصافیوں کا خاتمہ کرنا کوئی مذاق اور معمولی بات نہیں ہے اس طرح کے عظیم مقصد اور ہدف کے لیے آمادگی اور تیاری بھی اسی وسعت گہرائی اور گیرائی کے ساتھ ہونی چاہیے۔

اس قسم کے انقلاب کے لانے کے لیے بڑے بڑے عظیم پُرعزم، بہت طاقتور، ناقابل شکست، غیر معمولی طور پر پاکیزہ، مکمل تیار، بابصیرت، دوراندیش اور نگاہ بلند رکھنے والے مردوں کا ہونا ضروری ہے۔ایسے ہدف اور مقصد کے لیے خودسازی کا لازمہ یہ ہے کہ دقیق اور عمیق اخلاقی، فکری اور معاشرتی پروگراموں کا اجراء کیا جائے۔یہ ہے حقیقی انتظار کا مطلب۔کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس قسم کا انتظار تعمیری نہیں ہے؟

دوسرا فلسفہ: معاشرہ سازی

حقیقی منتظرین کا صرف یہ فریضہ نہیں ہے کہ اپنی اصلاح اور تزکیہ کریں بلکہ ان کا یہ بھی فرض ہے کہ دوسروں کا بھی خیال رکھیں اپنی خودسازی کے ساتھ دوسروں کی بھی اصلاح کی کوشش کریں کیونکہ جس عظیم اور بھاری پروگرام کے وہ منتظر ہیں وہ کوئی انفرادی پروگرام نہیں ہے وہ ایک ایسا پروگرام ہے جس میں انقلاب کے تمام عناصر شریک ہوں، کام کو اجتماعی طور پر اور سب مل کر انجام دیں تمام کوشش اور سرگرمیاں آپس میں ہم آہنگ ہوں اس ہم آہنگی کی وسعت اور گہرائی اُسی عالمی اور بین الاقوامی انقلاب کی عظمت اور بزرگی کے مطابق ہو جس کا وہ انتظار کررہے ہیں۔

ایک وسیع اور اجتماعی میدان جنگ میں کوئی بھی فرد دوسرں کے حال سے غافل اور بے خبر نہیں رہ سکتا بلکہ اس کا یہ فرض ہے کہ وہ جہاں بھی کوئی خامی دیکھے اس کی اصلاح کرئے اور ہر نقصان پہنچانے والے سوراخ کو بند کر دے، جہاں کوئی کمزوری اور ضعف دکھائی دے اُسے قوی کر دے کیونکہ تمام جنگ کرنے والوں کی فعال، ہم آہنگ اور باہم مربوط شرکت کے بغیر اس پروگرام کو عملی جامعہ نہیں پہنایا جا سکتا۔ بنابرایں حقیقی منتظرین اپنی اصلاح اور خودسازی کے ساتھ ساتھ دوسروں کی اصلاح کو بھی اپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔ایک عالمی مصلح کے قیام کے انتظار کا یہ ایک اور مفید اثر ہے اور یہ ہے ان تمام فضلیتوں کا فلسفہ جو حقیقی منتظرین کے لیے بیان کی گئی ہیں۔

تیسرا فلسفہ: حقیقی منتظر کبھی فاسد ماحول کے رنگ میں رنگے نہیں جاتے

انتظار مہدیؑ کا ایک اور اہم ترین فائدہ اور اثر فاسد ماحول میں نہ ڈھلنا اور گناہوں اور پلیدیوں کے سامنے نہ جھکنا ہے۔اس کی وضاحت یہ ہے کہ جب فساد اور خرابیاں ہر طرف پھیل جاتی ہیں جو لوگوں کی بہت بڑی تعداد یا اکثریت کو اپنی طرف جذب کر لیتی ہیں اور کبھی پاکیزہ افراد نفسیاتی لحاظ سے بند گلی میں پہنچ جاتے ہیں۔اس بند گلی کا سرچشمہ اصلاح سے مایوسی ہوتا ہے۔

بعض اوقات وہ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ پانی سر سے گزر گیا ہے اب بہتری اور اصلاح کی کوئی امید نہیں ہے لہٰذا اپنے آپ کو پاکیزہ رکھنا فضول ہے۔یہ مایوسی اور نا اُمیدی ممکن ہے انہیں بتدریج برائی اور ماحول کے ساتھ ہم رنگ ہونے کی طرف کھینچ لے جائے اور یہ ایک صالح اقلیت کے طور پر فاسد اور بری اکثریت کے مقابلے پر اپنی حفاظت نہ کر سکیں اور ہم رنگ جماعت نہ ہونے کو اپنے لیے ذلت و رسوائی کا موجب سمجھیں۔

صرف ایک چیز ان کے اندر اُمید کی کرن جگا سکتی ہے اور انہیں ڈٹ جانے اور اپنی حفاظت پر آمادہ کر سکتی ہے اور انہیں بُرے اور فاسد ماحول میں ڈھلنے سے بچا سکتی ہے اور وہ ہے قطعی اور آخری اصلاح کی امید صرف اس صورت میں وہ اپنی پاکیزگی کی حفاظت اور دوسروں کی اصلاح کی کوششوں سے دستبردار نہیں ہوں گے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی تعلیمات میں بخشش و آمرزش سے مایوسی کو گناہان کبیرہ میں شمار کیا گیا ممکن ہے کہ بعض جاہل افراد تعجب کا اظہار کریں کہ کیوں اللہ کی رحمت سے مایوسی کو اتنی اہمیت دی گئی ہے، بہت سے گناہوں سے زیادہ اہم؛ درحقیقت اس کی وجہ اور فلسفہ یہی ہے کہ رحمت سے مایوس گناہگار کے پاس اپنے گناہوں کے ازالے یا کم از کم گناہوں سے ہاتھ اٹھانے کی کوئی وجہ یا دلیل نہیں ہوتی، اس کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ اب پانی میرے سر سے گذر چکا ہے کیا ایک فٹ اور کیا دس فٹ! اب جب کہ میں بدنام ہو ہی گیا تو پھر کسی کی مجھے کیا پروا! کالے رنگ سے اوپر تو کوئی کالک نہیں ہے۔میرا انجام جہنم ہے اب جب کہ میں نے دوزخ خرید لی ہے اب مجھے کس کا ڈر ہے؟ اور اس طرح کی باتیں۔

لیکن جب اس کے لیے امید کا دریچہ کھل جائے، رب کی عفو و درگذر کی امید، اپنی حالت میں تبدیلی کی امید، تو یہ اس کی زندگی میں تبدیلی کا نقطہ آغاز ہوگا اور اُسے گناہوں کے راستے پر کھڑے رہنے سے روکے گا اور اُسے پاکیزگی اور اصلاح کی طرف لوٹنے کی دعوت

دے گا۔ اسی وجہ سے ہمیشہ بُرے لوگوں میں امید کو ایک موثر تربیتی عامل کے طور پر سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح وہ صالح افراد جو بُرے اور فاسد ماحول میں پھنسے ہوئے ہیں وہ امید کے بغیر اپنے آپ کو نہیں بچا سکتے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک ایسے مصلح کے ظہور کے انتظار کا نفسیاتی اثر اس پر عقیدہ رکھنے والے افراد میں بہت زیادہ ہوتا ہے۔

دنیا جس قدر فاسد اور خراب ہوتی جاتی ہے۔ اس کے ظہور کی امید اتنی زیادہ بڑھتی جاتی ہے۔ یہی روز افزوں امید برائی کی تیز وتند اور طاقت ور موجوں کے مقابلے پر ان کا بیمہ کر دیتی ہے۔ یہ لوگ نہ صرف ماحول میں برائی اور گناہوں کے پھیلنے سے مایوس نہیں ہوتے بلکہ ''وعدہ وصل چون شود نزدیک۔ آتش عشق تیز تر گردد'' (جوں جوں وصل کا وعدہ نزدیک ہوتا ہے عشق کی آگ تیز ہوتی جاتی ہے) کے مطابق جب وہ ہدف کے حصول کو وہ اپنے سامنے دیکھتے ہیں تو برائی اور فساد سے مقابلے اور اپنی حفاظت کی کوششیں اور زیادہ شوق اور عشق سے انجام پاتی ہیں۔

گذشتہ بحث سے مجموعی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انتظار کا تخریبی اثر صرف اس صورت میں ہوسکتا ہے جب اس کا مفہوم مسخ ہو یا اس میں تحریف کی جائے۔ جس طرح اس کے بعض مخالفین نے تحریف کی ہے اور بعض حامیوں نے اسے مسخ کیا ہے۔ لیکن اگر اس کا حقیقی معنی اور مفہوم فرد اور معاشرے میں لاگو ہو تو یہ تربیت، خودسازی، تحرک اور امید کا اہم ترین سبب بن جاتا ہے۔ ان واضح دلائل میں سے جو اس مطلب کی تائید کرتے ہیں یہ آیت ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الارضِ....

اللہ کا ان لوگوں کے ساتھ وعدہ ہے جو تم میں سے ایمان لائے اور عمل صالح انجام دیئے کہ روئے زمین پر حکومت ان کے حوالے کرے گا۔

اور اسلام کے عظیم پیشواؤں سے نقل ہوا ہے کہ اس آیت سے مراد امام مہدیؑ اور ان کے اصحاب ہیں: ''هُوَ القَائِمُ وَ اَصْحَابُهُ''[1] ایک اور حدیث میں ہے کہ: ''نَزَلَتْ فِي المَهْدِي'' یعنی: ''یہ آیت حضرت مہدی = کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔'' اس آیت میں حضرت امام مہدی - اور ان کے اصحاب وانصار (الّذِين آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصالحات۔ یعنی: ''جو تم میں سے ایمان لائے اور عمل صالح انجام دیئے) کا تعارف کرایا گیا ہے۔

لہٰذا یہ بین الاقوامی انقلاب، ایمان کامل اور محکم یقین کے بغیر واقع نہیں ہوسکتا، ایسا محکم ایمان جو ہر قسم کی کمزوری، ناتوانی اور ضعف کو دور کردے۔ اسی طرح یہ انقلاب ایسے صالح اعمال کے بغیر بھی ممکن نہیں جو دنیا کی اصلاح کا راستہ ہموار کردیں۔ اور وہ لوگ جو اس قسم کے انقلاب کے منتظر ہیں انہیں چاہیے کہ وہ اپنے ایمان اور علم وآگہی کی سطح کو بلند کریں اور اپنے اعمال کی اصلاح کے لیے بھی کوشاں رہیں۔

---

[1] بحارالانورا (پرانی چھاپ (جلد ۱۳، صفحہ ۱۴)

ایسے افراد ہی ان کی حکومت میں شمولیت اور شرکت کی نوید اپنے آپ کو دے سکتے ہیں نہ کہ وہ جو ظلم وستم کے ساتھ سروکار اور تعاون کرتے ہیں نہ وہ جو ایمان اور عمل صالح سے بے بہرہ ہیں اور نہ ہی بزدل کمزور اور بدحال افراد جو ایمان کی کمزوری کی وجہ سے اپنے سایے سے بھی ڈرتے ہیں۔اسی طرح نہ ہی سست، کاہل اور بے کار افراد جو ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں انہوں نے خراب اور برے ماحول اور فاسد معاشرے کے مقابلے پر خاموشی اختیار کی ہوئی ہے اور برائی اور فساد کو ختم کرنے کے لیے ذرا برابر بھی سعی و کوشش نہیں کرتے۔یہ ہے اسلامی معاشرہ میں قیام مہدیؑ کا تعمیری اور مفید کردار اور اثر۔

اے اللہ! ہماری آنکھوں کو ان کی زیارت سے منور فرما اور ہمیں ان کے وفادار اصحاب اور جانثار سپاہیوں میں شمار فرما!

پیام قرآن کی نویں جلد کے ترجمے کا اختتام
۳رشوال المکرم ر ۱۴۳۲ ہجری
بمطابق یکم رستمبر ر ۲۰۱۱
شب جمعہ، رات ۱۱ بج کر ۲۰ منٹ پر ہوا۔
سید حسنین عباس گردیزی عفی عنہ

تفسیر موضوعی

جلد دہم

زیرِ نظر

آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی

پیامِ قرآن

قرآن مجید میں اسلامی حکومت

نگارش

اہل قلم کی ایک جماعت

ترجمہ

حجۃ الاسلام مولانا شیخ افتخار حسین جعفری

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اُردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311

نام کتاب ---------------- تفسیر موضوعی: پیامِ قرآن

جلد ---------------- دہم

مؤلف ---------------- آیۃ اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

مترجم ---------------- حجۃ الاسلام مولانا شیخ افتخار حسین جعفری

نظر ثانی ---------------- حجۃ الاسلام ڈاکٹر شیخ محمد حسنین

سیٹنگ و گرافکس ---------------- قلب علی سیال

سال اشاعت ---------------- 2013ء

ناشر ---------------- مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

ہدیہ (پیامِ قرآن جلد 8، 9، 10) ------ 1000 روپے

ملنے کا پتہ

قرآن سینٹر 24 الفضل مارکیٹ اُردو بازار لاہور۔ 0321-4481214,042-37314311

www.misbahulqurantrust.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرضِ ناشر

قارئین کرام!۔۔۔السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ! مصباح القرآن ٹرسٹ۔۔۔۔۔عرصہ دراز سے دورِ حاضر کی بعض عظیم ترین تفاسیر وتالیفات کی نشر واشاعت کے سلسلہ میں ایک عظیم اور پُروقار مرکز کی حیثیت سے اُمت مسلمہ کیلئے اپنی عاجزانہ خدمات انجام دے رہا ہے۔

دورِ حاضر میں جب تفسیر قرآن کی بات ہوتو ذہن میں انہی کتب کا تصور آتا ہے جو عموماً صدرِ اوّل سے لے کر آج تک لکھی جا رہی ہیں کہ جن میں سورتوں اور آیتوں کی ترتیب کے مطابق نوبت بہ نوبت ان کی تفسیر کی جاتی ہے۔مگر تفسیر قرآن کا یہی ایک طریقہ نہیں ہے بلکہ اس کتابِ الٰہی کی تفسیر کے پانچ طریقے ہیں۔۱۔تفسیرِ مفرداتی ۲۔تفسیر ترتیبی ۳۔تفسیرِ موضوعی ۴۔تفسیر ارتباطی ۵۔تفسیر کلی۔

تفسیر کے پہلے دو طریقے عام طور پر متعارف ہیں۔بلاشبہ تفسیر قرآن کا قدیمی طریقہ یہ رہا ہے کہ بالترتیب ایک کے بعد دوسری سورۃ کی تفسیر کرتے ہوئے پورے قرآن کی تفسیر مکمل کی جاتی ہے۔لیکن آیت اللہ جعفر سبحانی اور آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی نے تفسیر کی ایک نئی روش اپنائی ہے کہ جس میں کسی اصل وفرع یا مضمون وعنوان سے تعلق رکھنے والی آیاتِ قرآنی کو ایک مقام پر لاکر ان کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔چونکہ اس میں ہر عنوان اور موضوع کی جملہ آیات اور ان کی تفسیر یکجا کردی گئی ہے،لہٰذا اس کو تفسیر موضوعی کا نام دیا گیا ہے۔ادارہ ہذا کے ذریعے تفسیرِ موضوعی کا 12 جلدوں پر مشتمل پہلا سلسلہ (قرآن کا دائمی منشور) منظر عام پر آچکا ہے۔تفسیر موضوعی کا زیرِ نظر سلسلہ (پیام قرآن) جو کہ آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی کی سعیٔ جمیل کا نتیجہ ہے،اس کی سات جلدیں پہلے سے قارئین کے ہاتھوں میں موجود ہیں۔جلد ہشتم تا دہم قارئین کی خدمت میں پیش کی جارہی ہیں۔

زیرِ نظر کتاب ''پیامِ قرآن جلد دہم'' کا اردو ترجمہ ادارہ ہذا کے تعاون سے حجۃ الاسلام مولانا شیخ افتخار حسین جعفری نے کیا ہے۔ادارہ مولانا موصوف کا اس سعیٔ جمیل پر دل کی اتھاہ گہرائیوں سے شکر گزار ہے۔بلاشبہ مولانا موصوف اگر ادارہ ہذا کے ساتھ طے شدہ ضوابط کے تحت تکمیل معاہدہ فرماتے تو زیر نظر کتاب 8 ماہ قبل قارئین کے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہوتی،لیکن غفلت کی ستم ظریفی!۔۔۔کتاب ہذا کی تکمیل میں 6 ماہ کی بجائے 15 ماہ کا طویل عرصہ لگا دیا گیا۔

اس وقت تفسیر موضوعی (پیام قرآن) کی جلد نمبر 10 کا اردو ترجمہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ہمیں اُمید ہے کہ صاحبانِ علم وتحقیق حسبِ سابق ''مصباح القرآن ٹرسٹ'' کی اس کوشش کو بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے اور اس گوہر نایاب سے بھرپور علمی وعملی استفادہ فرمائیں گے۔اور ادارہ کو اپنی قیمتی تجاویز وآراء سے ضرور مستفید فرمائیں گے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔والسلام

اراکین

فہرست مضامین

پیش لفظ

موضوعی تفسیر کیا ہے؟ اور کن مشکلات کو حل کرتی ہے؟

ان دو اہم سوالوں کا جواب موجودہ کتاب جیسی کتابوں کو صحیح مضمون میں سمجھنے میں گہرا اثر رکھتا ہے۔ جب تک ان دو سوالوں کا جواب واضح نہیں ہوتا، اس وقت ہم اس قسم کی کتابوں کے مقصد کو نہیں سمجھ سکتے۔

پہلے سوال کے جواب میں ہم یاد دہانی کراتے ہیں کہ قرآن مجید وہ کتاب ہے جو ۲۳ سال کے لمبے عرصے میں مختلف معاشرتی حالات اور تقاضوں اور گوناگوں واقعات کو مدنظر رکھتے ہوئے نازل ہوئی ہے اور اسلامی معاشرے کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس (کی تعلیمات میں) میں بھی پیشرفت ہوتی رہی ہے۔

جن سورتوں کی آیات مکہ میں نازل ہوئی ہیں، وہ زیادہ تر توحید و معاد پر ایمان و اعتقاد کو محکم کرنے خصوصاً شرک اور بت پرستی کے خلاف شدید جدوجہد کی عکاسی کرتی ہیں جبکہ مدینہ میں نازل ہونے والی سورتوں کی آیات قدرتی طور پر اسلامی حکومت کے تشکیل پانے کے بعد نازل ہوئی ہیں، لہذا معاشرتی، عبادی، سیاسی احکام اور بیت المال کی تشکیل اور اسلام کے قضائی نظام کی طرف ناظر ہیں اور پھر منافقین وغیرہ کے ساتھ جنگ وصلح پر مبنی مسائل سے تعلق رکھتی ہیں کہ جن میں اس وقت اسلام مبتلا تھا۔

واضح ہے کہ ان میں سے کوئی بھی مسئلہ ایک رسالۂ عملیہ (توضیح المسائل) یا قدیم نصابی اور درسی کتاب کی شکل میں پیش نہیں کیا گیا۔ بلکہ یہ آیات مختلف مناسبتوں، تقاضوں اور ضرورتوں کے مطابق نازل ہوتی رہی ہیں۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ جہاد، جنگی احکامات، عہدناموں، اسیروں، جنگی تاوانوں وغیرہ سے متعلق احکام ہر غزوہ کی مناسبت سے پراکندہ صورت میں نازل ہوئے ہیں یہ بالکل ایک ماہر طبیب کے نسخے کی طرح ہیں کہ جو ہر روز بیمار کے حال کے مطابق نسخہ لکھتا ہے اور اسے مکمل صحت عطا کرتا ہے۔

اب اگر ہم قرآنی آیات کی نازل شدہ سورتوں میں ہر سورت میں آیات کے مطابق، ترتیب کے ساتھ تفسیر کریں تو یہ ''ترتیبی تفسیر'' ہوگی اور اگر ایک ''موضوع'' سے متعلق آیات پورے قرآن سے جمع کر کے ایک ساتھ رکھیں اور پھر ان کی فصل بندی کر کے تفسیر کریں تو یہ ''موضوعی تفسیر'' ہوگی۔

مثلاً جب بھی جہاد سے متعلق تمام آیات کہ جو دس سال کے دوران، مدنی سوروں میں نازل ہوئی ہیں یا اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات سے متعلق آیات جو ۲۳ رسال کے دوران پورے قرآن میں نازل ہوئی ہیں، ایک ساتھ رکھی جائیں اور پھر ان کی ایک دوسرے کے ساتھ تعلق کی بنا پر تفسیر کی جائے تو یہ موضوعی تفسیر کہلائے گی۔

دونوں قسم کی تفسیر کی اپنی اپنی خصوصیات اور اثرات میں کہ جو ہمیں ایک دوسرے سے بے نیاز نہیں کرتیں اور ''ہر چیز اپنی جگہ پر اچھی ہوتی ہے'' کے مصداق دونوں قسم کی تفسیریں قرآن کے محققین کے لئے ضروری ہیں (البتہ پہلے ترتیبی

تفسیر ہے اور پھر موضوعی تفسیر)۔

ترتیبی تفسیر کی خصوصیات

اس طرح کی تفسیر میں آیات کے نازل ہونے کے زمان ومکان، پہلے اور بعد میں آنے والی آیات اور داخلی اور بیرونی قرائن کے لحاظ ہر آیت کا مقام واضح ہوجاتا ہے، اس کے بغیر آیت کا صحیح معنی سمجھنا ممکن نہیں ہے۔ دوسرے الفاظ میں ترتیبی تفسیر ہر آیت کو اس کے اپنے مقام پر دیکھتی ہے اور اسلامی معاشرے کی روح کے ساتھ اس کے تعلق اور اس کی پیشرفت وتکامل کو مدنظر رکھتی ہے اور اس تعلق سے بہت سے مسائل واضح ہوجاتے ہیں۔

جبکہ موضوعی تفسیر میں آیات عینی اور جزئی واقعات کی شکل سے نکل کر ایک مجموعی وکلی صورت اختیار کرلیتے ہیں اور اپنے مقام سے کسی حد تک دور ہوجاتے ہیں۔ اس کے برعکس موضوعی تفسیر کی اہم خصوصیات یہ ہیں:

موضوعی تفسیر کی خصوصیات

۱۔ ایک ہی موضوع کی مختلف آیات میں پیش ہونے والے گوناگوں پہلوؤں کو ایک ساتھ قرار دیتے ہوئے تمام موضوعات کو جامع انداز میں چند پہلوؤں سے دیکھا جاتا ہے جس سے قدرتی طور پر جدید حقائق سامنے آتے ہیں۔

۲۔ قرآن کی بعض آیات میں پہلی نظر میں (انسان کو) ابہامات نظر آتے ہیں لیکن ''القرآنُ یفسر بعضہ بعضاً'' (قرآنی آیات ایک دوسرے کی تفسیر کرتی ہیں) کے اصول کے مطابق یہ ابہامات (موضوعی تفسیر) کی وجہ سے دور ہوجاتے ہیں۔

۳۔ موضوعی تفسیر بطور کلی ہر مسئلے اور ہر موضوع کے بارے میں اسلامی نظریہ کائنات کو واضح کردیتی ہے۔

۴۔ قرآن کے بہت سے چھپے ہوئے اسرار کو فقط موضوعی تفسیر کی روش پر ہی واضح کیا جاسکتا ہے اور انسانی استعداد کی حد تک آیات کی گہرائیوں تک پہنچا جاسکتا ہے۔

بنابرایں گہری سوچ اور آگاہی رکھنے والا کوئی بھی مسلمان اس دونوں قسم کی تفاسیر سے بے نیاز نہیں ہوسکتا اگرچہ زمانۂ قدیم حتیٰ ائمہ ہدیٰؑ کے زمانے سے موضوعی تفسیر کی طرف توجہ دی جاتی رہی ہے اور علمائے اسلام نے اس سلسلے میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں جس کی واضح مثال ''آیات الاحکام'' کے نام سے لکھی جانے والی کتابیں ہیں، لیکن ہمیں اس بات کا اعتراف کرنا چاہیے کہ موضوعی تفسیر میں جس طرح ترقی ہونی چاہیے تھی وہ نہیں ہوسکی اور ابھی تک یہ اپنے ابتدائی مراحل طے کررہی ہے۔ لہٰذا علمائے کرام کی زحمات کے نتیجے میں اسے اپنے حقیقی مقام تک پہنچنا چاہیے۔

اس کتاب ''پیام قرآن'' میں کاملاً ایک جدید روش کے مطابق قرآن کی موضوعی تفسیر کے موضوع پر جدید قدم اٹھائے گئے ہیں اور الحمدللہ اس کا بہت زیادہ استقبال ہوا ہے اور ہر روز معاشرے کے مختلف طبقات کی طرف سے اسے پذیرائی مل رہی ہے پھر بھی یہ کام

ابتدائی مراحل سے گذر رہا ہے اور اسے علمائے اسلام اور مفسرین عالی مقام کی زیادہ سے زیادہ توجہ اور تعاون کی ضرورت ہے تا کہ یہ اپنے انتہائی مقصد تک پہنچ سکے۔ ہم ہمیشہ اہل نظر اور ارباب معرفت سے اس کام کو مکمل کرنے والے نظریات و آراء کی توقع رکھتے ہیں۔

ہم اس کام میں خداوند بزرگ و برتر سے زیادہ سے زیادہ توفیق وہدایت طلب کرتے ہیں!

حجج الاسلام عالی جناب محمد رضا آشتیانی، محمد جعفر امامی، عبدالرسول حسنی، محمد اسدی، حسین طوسی، سید شمس الدین روحانی اور محمد محمدی کے تعاون سے!

ناصر مکارم شیرازی
حوزہ علمیہ قم

☆☆☆☆

حکومت اور امامت کا باہمی تعلق

پیام قرآن کی سابقہ جلد یعنی جلد نہم میں قرآن مجید کے نقطۂ نظر سے امامت اور ولایت کے بارے میں گفتگو تھی اور چونکہ مسئلہ امامت اور مسئلہ حکومت ایک دوسرے سے جدا نہیں بلکہ ایک نظر سے روح امامت وولایت' نفوس وابدان پر حکومت' صراط مستقیم کی طرف ان کی راہنمائی اور کمال وسعادت کے راستے پر انھیں گامزن کرنا ہی ہے۔ اسی وجہ سے بحث امامت کے بعد حکومت اسلامی کی بحث اور اس کا درست تجزیہ وتحلیل ضروری تھا، چونکہ کہ اس کے بغیر امامت وولایت کی بحث مکمل نہیں ہوتی۔

کیا ہم حضرت مہدی = کی ایک اہم خصوصیت اُن کی طرف سے عدل پر مبنی ایک عالمی حکومت کا قائم کرنا قرار نہیں دیتے؟ یعنی وہی چیز جس کے رسول اکرمؐ اور دیگر ائمہ معصومین ÷ خواہاں تھے، لیکن زمان ومکان کے مخصوص حالات نے انھیں اس تک رسائی کی اجازت نہ دی، اگر چہ اس مقصد کے لئے ضروری مقدمات واسباب فراہم کر دیئے گئے اور اس کی بنیادیں رکھ دیں گئیں، جی ہاں! سبھی عدل پر مبنی حکومت الٰہی کے طلبگار تھے۔

ایسی حالت میں حکومت کی بحث کو بحث امامت سے کیسے جدا کیا جا سکتا ہے؟ اس سے قطع نظر رسول اکرمؐ نے ابتدائی کامیابیوں کے بعد جو پہلا کام کیا وہ حکومت اسلامی کی تشکیل ہی تھا، اور اسے نہ صرف اسلام کے اہم ارکان میں سے ایک بلکہ تمام قوانین کے نفاذ کا ضامن سمجھا جاتا تھا۔ رسول اکرمؐ کے برحق جانشین ہوں یا مسند خلافت پر متمکن ہونے والے ناحق جانشیں ہوں، سب اپنے آپ کو حکومت اسلامی کی تشکیل یا اسے جاری رکھنے کا ذمہ دار سمجھتے تھے۔

کوفہ کے لوگوں نے حضرت امام حسینؑ کو حکومت اسلامی کی تشکیل اور غاصبوں کے خلاف جنگ کے لئے کوفہ آنے کی دعوت دی تھی، اگر امام عالی مقامؑ کو ان کی بے وفائی، عہد شکنی اور سستی کا سامنا نہ کرنا پڑتا تو عادلانہ حکومت اسلامی کا پرچم آپؑ کے دست مبارک سے لہرایا جاتا۔ ائمہ معصومینؑ کی روایات اور نہج البلاغہ کی عبارات میں بکثرت ایسی باتیں ملتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے دشمنوں نے ان کا حق غصب کر لیا، یہ حق ''عدل پر مبنی اسلامی حکومت'' کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں تھا۔ ان کے علاوہ اور دیگر بے شمار دلائل وشواہد سے پتا چلتا ہے کہ مسئلہ ''امامت''، ''خلافت وحکومت'' سے کوئی جدا مسئلہ نہیں۔ ایک معروف روایت کے مطابق ''ہارون الرشید'' جو اپنے خیال میں چاہتا تھا کہ ''فدک'' امام موسیٰ کاظمؑ کو واپس کر دے، اس روایت میں ایک دلچسپ نکتہ موجود ہے جو ہمارے دعویٰ کو واضح تر کر دیتا ہے۔

''فدک'' جیسا کہ معلوم ہے خیبر کے نزدیک ایک سرسبز وشاداب دیہات تھا، جسے رسول اکرمؐ نے اپنی زندگی میں اپنی بیٹی فاطمہ زہراء × کو بخش دیا تھا۔ اور آپؐ کی رحلت کے فوراً بعد ہی اسے غصب کر لیا گیا اور فدک کا غصب ہمیشہ محبان اہل بیتؑ کی نظر میں قابل اعتراض رہا، لہٰذا عمومی افکار کے دباؤ کے زیر اثر ہارون الرشید فدک کو دوبارہ اولاد فاطمہؑ کی طرف پلٹانے کے بارے میں سوچنے لگا، جس وقت اس نے امام موسیٰ کاظمؑ کی خدمت میں عرض کیا: ''حُدَّ فَدَكاً حَتّٰى اَرُدَّهَا اِلَيْكَ'' یعنی: ''فدک کی حدود معین کریں تا کہ میں اسے آپؑ کو واپس کر دوں۔'' امامؑ نے جواب دینے سے انکار کیا، ہارون مسلسل اصرار کرتا رہا، امامؑ نے فرمایا: میں اسے اس

کی صحیح حدود کے ساتھ نہیں لوں گا! ہارون نے کہا: اس کی واقعی حدود کون سی ہیں؟ امامؑ نے فرمایا: اگر میں اس کی حدود واقعی کو بیان کردوں تو تم بطور مسلم موافقت نہیں کرو گے! ہارون نے کہا: آپؑ کو اپنے جد رسول اکرمؐ کی قسم اور واسطہ دیتا ہوں کہ اس کی حدود بیان کریں، (میں اسے آپؑ کے حوالے کردوں گا)۔

امامؑ نے فرمایا: اس کی پہلی حد ''عدن'' کی سرزمین ہے! جب ہارون نے یہ بات سنی تو اس کا چہرہ بگڑ گیا اور کہنے لگا: عجیب ہے عجیب!

امامؑ نے فرمایا: اور اس کی دوسری حد ''سمرقند'' ہے!

ہارون کے چہرے پر ناراضگی کے آثار اور نمایاں ہو گئے۔

امامؑ نے فرمایا: اس کی تیسری حد ''افریقہ'' ہے!

اس مقام پر ہارون کا چہرہ شدید ناراضگی کے باعث تاریک پڑ گیا اور اس نے کہا: عجیب!

امامؑ نے فرمایا: اور اس کی چوتھی حد دریائے خزر اور آرمینیا کے سواحل ہیں!

ہارون نے کہا: پس ہمارے لئے کوئی جگہ باقی نہیں بچتی، اٹھیے اور میری جگہ یعنی تخت پر بیٹھ جائیے اور لوگوں پر حکومت کیجئے! (یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ جو کچھ آپؑ نے کہا ہے یہ تو مملکت اسلامی کی سرحدیں ہیں)۔

امامؑ نے فرمایا: میں نے تم سے کہا تھا کہ اگر میں اس (فدک) کی واقعی حدود بیان کردوں تو ہرگز اسے واپس نہیں کرو گے (جی فدک کا ایک مطلب تمام اسلامی حکومت ہے)۔ اس وقت سے ہارون نے امامؑ کو شہید کرنے کا فیصلہ کرلیا۔[1]

یہ بامعنی حدیث مسئلہ فدک اور مسئلہ خلافت میں گہرے تعلق پر دلالت کرتی ہے اور واضح کرتی ہے کہ جو چیز غصب ہوئی ہے وہ رسول اکرمؐ کا مقام خلافت تھا کہ فدک کا دیہات اس کا ایک جزء شمار ہوتا تھا اور اگر ہارون فدک کو واپس کرنے کا خواہشمند تھا تو اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ خلافت سے دستبردار ہو جائے اور اس چیز نے اسے اس بات کی طرف متوجہ کیا کہ امام موسیٰ کاظم ؑ جب بھی طاقت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو اسے تخت سے اتار پھینکیں گے، لہٰذا اس نے حضرتؑ کے قتل کا فیصلہ کرلیا۔[2]

خلاصہ یہ کہ مسائل امامت اور بحث حکومت اور قیادت مسلمین آپس میں شیر و شکر کی طرح مخلوط ہیں، جس میں شک وشبہے کی کوئی گنجائش نہیں۔ چونکہ ان کی باہمی تعلق کے اثرات ہر جگہ نظر آتے ہیں، یہ بات آیات و روایات اور رسول اکرمؐ اور دینی پیشواؤں کی زندگی کی تاریخ اور احکام اسلام کے مزاج میں واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔ فقہ اسلامی کے مباحث کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے: ''عبادات''، ''معاملات'' اور ''سیاسیات''۔

''سیاسیات'' جو فقہ کے اہم ابواب مثلاً جہاد، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، قضاوت و شہادت، حدود، دیات اور قصاص پر مشتمل

---

[1] بحارالانوار۔ چاپ قدیم، ج۸، ص۱۰۶ (نقل از کتاب اخبار الخلفاء)

[2] زہرا برترین بانوی جہان، ص۱۳۰

ہے، یہ ایک ایسا حصہ ہے جو حکومت کے ساتھ مربوط مسائل کے بارے میں بحث کرتا ہے، اس لئے کہ جہاد اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے بعض مراحل اور اسی طرح قضاوت، شہادت، اجرائے حدود اور قصاص ایسی چیزیں ہیں جو حکومت کے بغیر نافذ العمل نہیں ہو سکتیں۔

انفال، خمس، زکات اور خراج سے متعلق زمین سے بیت المال کی بنیاد فراہم ہوتی ہیں، اس سے متعلق مسائل کے لئے بھی حکومت ضروری ہے۔ اس لحاظ سے فقہ اسلامی، سیاسی اور حکومتی مسائل کے ساتھ اس قدر مخلوط و مزوج ہے کہ ان (مسائل) کا مکمل نفاذ حکومت تشکیل دیئے بغیر ممکن نہیں۔

یہ اس بات کے واضح شواہد اور دلائل ہیں کہ اسلام، سیاست اور حکومت سے جدا نہیں اور حکومت و سیاست یعنی معاشرے کے نظام کی تدبیر اسلامی تعلیمات کے تار و پود (تانے بانے) میں اس قدر سرایت کر چکی ہے کہ اگر انھیں ایک دوسرے سے جدا کرنے کی کوشش کی جائے تو اسلام اپنا مفہوم کھو دے گا۔ درحقیقت یہ اسلام کو اسلام سے جدا کرنے کی کوشش ہو گی جس کا محال اور ناممکن ہونا روز روشن کی طرح واضح ہے۔ اس مجموعی گفتگو سے واضح ہو جاتا ہے کہ ہم مباحث امامت و ولایت، (جس کی بحث گذشتہ جلد میں ہو چکی ہے) سے ''مسلمین کی قیادت اور حکومت'' کے مسائل تک کیوں کر پہنچے ہیں۔

لوگوں کے لئے حکومت کی ضرورت

اشارہ

امامت وحکومت کے باہمی تعلق کو ملاحظہ کرنے کے بعد ہم ایک اور اہم مسئلے یعنی انسانی معاشرے کے لئے حکومت کے ضروری ہونے کی بات کرتے ہیں۔ جہاں تک تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے تمام انسانی معاشروں میں حکومت کی کوئی نہ کوئی قسم موجود رہی ہے: قبیلہ جاتی حکومت، بادشاہوں اور سلاطین کی حکومت اور وہ حکومتیں جو آج کل رائج ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان علم ودانش کے کسی بھی مرحلے میں ہو وہ حکومت کے وجود کی ضرورت کو محسوس کرتا ہے اور جانتا ہے کہ اجتماعی زندگی، نظم وضبط اور قانون کی حاکمیت کے بغیر ایک دن بھی ممکن نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جب بعض حکومتیں متزلزل ہوجاتی ہیں اور نئی حکومت تشکیل نہیں پاتی تو معاشرہ افراتفری کا شکار ہوجاتا ہے۔ اس لحاظ سے کوئی بھی عقلمند انسان، انسانی معاشرے کے لئے حکومت کی ضرورت کے بارے میں ذرا سا شک بھی نہیں کرتا، اسی وجہ سے آیات وروایات میں اس مطلب کے بارے میں واضح بیانات اور اشارات موجود ہیں جنھیں اختصار کے ساتھ درج ذیل سطور میں بیان کیا جاتا ہے:

۱۔ بنی اسرائیل کے واقعات میں آیا ہے کہ جب افراتفری اور مضبوط ولائق حکومت نہ ہونے کی وجہ سے وہ کمزوری اور پژمردگی سے دچار ہوئے اور دشمن ان پر غالب آگئے تو وہ اپنے زمانے کے نبی کے پاس آئے اور ان سے کہا: ہم پر ایک حکمران مقرر کردیں تاکہ اس کی زیر قیادت ہم دشمن کے ساتھ جنگ کریں۔ ان کے نبیؑ نے کہا: ''شاید تمہیں اگر جنگ کا حکم دیا جائے تو تم لوگ روگردانی کرو اور راہ خدا میں جنگ نہ کرو۔'' یہ سن کر انھوں نے کہا: ''یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم راہ خدا میں جہاد نہ کریں جبکہ حال یہ ہے کہ ہمیں ہمارے فرزندوں سے دور اور گھروں سے نکال دیا گیا ہے؟'' (دشمن نے ہمارے شہروں پر قبضہ اور ہماری اولاد کو قیدی بنالیا ہے)۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ۭ قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَاۗىِٕنَا ۭ [1]

اگرچہ اس آیت شریفہ میں ایک قوم کے لئے فرمانروا کی ضرورت کے ایک رخ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ دشمن کے خلاف جنگ، شہروں سے اغیار کا صفایا اور دشمن سے آزادی حاصل کرنا ہے، لیکن یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ دوسرے پہلوؤں کے لحاظ سے بھی یہ

[1] سورہ بقرہ۔ ۲۴۶۔

مطلب صادق ہے۔

قرآن اس عبارت کے ذریعے واضح کرتا ہے کہ ایک مضبوط حاکمیت کے ساتھ حکومت تشکیل دیئے بغیر آزادی، اجتماعی آرام وسکون کا حصول ممکن نہیں۔ممکن ہے یہ خیال کیا جائے کہ بنی اسرائیل کا مطالبہ یہاں ایک حکمران کی بجائے سپہ سالار معین کرنے کا تھا،لیکن توجہ طلب امر یہ ہے کہ ملک کے ساتھ تعبیر کرنے کا مطلب ہے تمام احوال کا سرپرست اور ذمہ دار حکمران اگرچہ اس کا بظاہر لائحہ عمل بیرونی دشمن کے خلاف جنگ کرنا ہی تھا۔درحقیقت اس زمانے کے نبی حضرت ''اشموئیل '' کا کردار ایک رہبرو راہنما کی طرح تھا جبکہ طالوت ان کے انتخاب شدہ حکمران اور سپہ سالار تھے۔

۲۔قرآن مجید اسی ماجرا کے ذیل میں بعد والی چند آیات میں بنی اسرائیل کے مقابلے میں ''جالوت'' کی شکست کا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۙ۬ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۵۱﴾

''(بنی اسرائیل نے طالوت کی زیر قیادت) خدا تعالیٰ کے اذن وفرمان سے دشمن کے لشکر کو شکست دی اور (طالوت کے لشکر میں موجود کمسن اور بہادر) داوٗدؑ نے (دشمن حکمران) جالوت کو قتل کردیا اور خدا تعالیٰ نے اسے (داوٗدؑ کو) حکومت اور حکمت عطا کی اور جو وہ چاہتے تھے انھیں اس چیز کے علم سے مستفید فرمایا اور اگر خدا تعالیٰ بعض لوگوں (کے شر) کو بعض دوسروں کے ذریعے برطرف نہ کرے تو فساد زمین پر پھیل جائے لیکن خدا تعالیٰ عالمین پر فضل واحسان کرنے والا ہے۔''[1]

آخری جملہ واضح طور پر ظاہر کرتا ہے کہ اگر حکومت صاحب قدرت اور طاقتور نہ ہو اور سرکشوں کا سر نہ کچل سکے تو زمین فتنہ وفساد سے بھر جائے،پس عادلانہ حکومت،خدا کا عظیم عطیہ ہے جو دینی اور معاشرتی فسادات کی راہ روکتی ہے۔

۳۔اسی سے ملتا جلتا مطلب سورۂ حج کی آیت ۴۰ میں بھی آیا ہے،جس میں دشمن کے خلاف مسلمانوں کو جہاد کی اجازت کے بعد فرمایا گیا ہے:

الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ؕ

ان لوگوں کو جنگ کی اجازت دے دی گئی ہے،جنھیں بلاوجہ اور ناحق طور پر ان کے گھروں سے نکال دیا گیا

---

[1] سورہ بقرہ۔۲۵۱

ہے، سوائے اس کے کہ وہ کہتے ہیں ہمارا رب خدا ہے اور اگر خدا بعض لوگوں (کے شر) کو بعض دوسرے لوگوں کے ذریعے برطرف نہ کرے تو کلیسا، خانقاہیں، یہود و نصاریٰ کی عبادت گاہیں اور مساجد کہ جن میں کثرت کے ساتھ ذکر خدا ہوتا ہے، ویران ہو جائیں!''

یہاں بھی حکومت کا کردار جہاد کی خاطر ذکر کیا گیا ہے لیکن مسلّم ہے کہ ایک منظم سیاسی، اجتماعی اور اقتصادی نظام کے بغیر جہاد امکان پذیر نہیں اور وہ اس لئے کہ مجاہدین عموماً دو قسموں پر مشتمل ہوتے ہیں؛ عسکری طاقت اور عوامی طاقت، وہ اجتماعی اور عوامی طاقت جو محاذ جنگ میں موجود عسکری طاقت کی پشت پناہی کرتی ہے اور درحقیقت سارے معاشرے کو سنبھالے ہوتی ہے۔

۴۔ اس کے بعد وہ آیت یعنی سورۂ حج کی آیت ۴۱ میں سچے اہل ایمان کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ

''وہ ایسے لوگ ہیں کہ اگر ہم زمین پر انھیں قدرت و اقتدار عطا کریں تو وہ نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری انجام دیں گے۔''

یہ آیت بھی اشارتاً اس مطلب کی ترجمانی کرتی ہے کہ نماز قائم کرنا، ادائیگی زکوٰۃ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری ایک وسیع اور عمومی طریقے سے اسی وقت میسر ہے جب ایک مضبوط حکومت قائم ہو، لہٰذا سچے اہل ایمان کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ اگر حکومت و اقتدار حاصل کریں تو خدا کے ان عظیم فرائض کو برپا اور نافذ کریں گے یہیں سے اسلامی نقطۂ نظر سے اصلاح معاشرہ کے لئے حکومت کا کردار روشن اور واضح ہو جاتا ہے۔

۵۔ سورۂ یوسف کی آیات (۴۳ سے ۵۶) میں ایک واقعے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس کے مضمون میں حکومت کی ضرورت کو بخوبی بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ مصر کے بادشاہ نے ایک خواب دیکھا اور یوسف -اس وقت قید خانے میں تھے اور خواب کی صحیح تعبیر بتانے کے سلسلے میں ایک حد تک مشہور ہو چکے تھے، آپؑ نے اس کے خواب کی یہ تعبیر بتائی کہ ملک مصر آئندہ سات سالوں میں سخت قحط کا سامنا کرے گا، اس کے بعد قحط سالی کی اس مدت میں لائحہ عمل سے آگاہ کیا کہ کس طرح درست راشن بندی اور کفایت شعاری کے ذریعے اس بحران کا سامنا کیا جا سکتا ہے، سلطان مصر نے انھیں زندان سے رہا کر کے مصر کے خزانے کا سرپرست مقرر کر دیا اور اس طرح یوسف -کی تدبیر اور بہترین انتظام کی بدولت مصر کے تمام لوگوں نے موت سے نجات پائی۔ یہ داستان حکومت اور حکومت کا نظام چلانے والے مدبر اور آگاہ راہنما کے وجود کی ضرورت کو بخوبی واضح کرتی ہے (خاص طور پر ایک بحرانی حالت میں) اگر معاشرہ ایسی حکومت سے محروم ہو جائے تو ایسے نقصانات اس کے دامن گیر ہوتے ہیں جن کی تلافی ممکن نہیں ہوتی۔

۶۔ قرآن مجید کی کئی ایک آیات اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ حکومت الٰہی ایک نہایت عظیم نعمت خدا ہے اور یہ اس وجہ سے

ہے کہ انسانی معاشرے میں نظم وضبط کا قائم ہونا، ظلم وستم کی روک تھام اور انسانی کمالات کی شرائط کی فراہمی وغیرہ حکومت ہی کے زیرسایہ ممکن ہیں۔ سورۂ انبیاء کی آیت ۷۹ میں حضرت داؤدؑ اور ان کے بیٹے حضرت سلیمانؑ کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ «وَ كُلًّا آتَيْنَا حُكْمًا وَ عِلْمًا» یعنی: «اور ان میں سے ہر ایک کو ہم نے حکومت اور علم عطا کیا۔'' سورۂ مائدہ کی آیت ۲۰ میں بنی اسرائیل کو عطا کی گئی نعمتوں کو شمار کرنے کے ضمن میں فرمایا:

وَاِذۡ قَالَ مُوۡسٰى لِقَوۡمِهٖ يٰقَوۡمِ اذۡكُرُوۡا نِعۡمَةَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ اِذۡ جَعَلَ فِيۡكُمۡ اَنۡۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمۡ مُّلُوۡكًا ‌ۖ وَّاٰتٰٮكُمۡ مَّا لَمۡ يُؤۡتِ اَحَدًا مِّنَ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۲۰﴾

''(یاد کیجئے) اس وقت کو جب موسیٰ - نے اپنی قوم سے کہا: اے میری قوم! اپنی نسبت خدا کی نعمتوں کو یاد کرو، جب اس نے تم میں انبیاء مقرر کئے (تاکہ تمہیں قید و بند سے چھڑائیں) اور اس نے تمہیں تمہارا حاکم اور صاحب اختیار بنایا اور تمہیں وہ کچھ عطا کیا جو اس نے عالمین میں سے کسی کو عطا نہیں کیا۔''

البتہ تمام بنی اسرائیل حاکم وسلطان نہ تھے، لیکن جب ان ہی میں سے حاکم چنے گئے تو ایک قوم اور ملت کے عنوان سے انھیں اس طرح مخاطب کیا گیا کہ خدا تعالیٰ نے تمہیں حاکم اور بادشاہ قرار دیا۔ سورۂ ص کی آیت ۳۵ میں حضرت سلیمانؑ کی زبان سے فرمایا:

قَالَ رَبِّ اغۡفِرۡ لِىۡ وَهَبۡ لِىۡ مُلۡكًا لَّا يَنۡۢبَغِىۡ لِاَحَدٍ مِّنۡۢ بَعۡدِىۡ‌ ۚ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡوَهَّابُ ﴿۳۵﴾

''(حضرت سلیمانؑ نے) کہا: میرے پروردگار! مجھے بخش دے اور مجھے ایک ایسی حکومت عطا کر کہ میرے بعد کسی کو ایسی حکومت نہ ملے، بے شک تو بہت بخشنے والا ہے۔''

بعد میں مذکورہ آیات ظاہر کرتی ہیں کہ ان کی دعا خدا کے حضور میں قبول ہوئی اور ایک عظیم حکومت اور بکثرت نعمتیں انھیں عطا ہوئیں جو بے مثال تھیں اور سورۂ نساء کی آیت ۵۴ میں فرمایا گیا ہے:

اَمۡ يَحۡسُدُوۡنَ النَّاسَ عَلٰى مَاۤ اٰتٰٮهُمُ اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ‌ ۚ فَقَدۡ اٰتَيۡنَاۤ اٰلَ اِبۡرٰهِيۡمَ الۡـكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَاٰتَيۡنٰهُمۡ مُّلۡكًا عَظِيۡمًا ﴿۵۴﴾

''کیا وہ لوگوں (یعنی رسول اکرمؐ اور ان کے خاندان) سے خدا کے عطا کردہ فضل کی وجہ سے حسد کرتے ہیں، اس کے باوجود کہ ہم نے آل ابراہیمؑ کو کتاب وحکمت عطا کی اور ایک عظیم حکومت کو ان کے اختیار میں دے دیا۔''

یہ مسئلہ اس قدر اہم ہے کہ خدا تعالیٰ نے حکومت عطا کرنے کو عزت اور اسے واپس لے کر اس سے محروم کرنے کو ذلت کے مترادف قرار دیا۔ سورۂ آل عمران کی آیت ۲۶ میں فرماتا ہے:

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الۡمُلۡكِ تُؤۡتِى الۡمُلۡكَ مَنۡ تَشَآءُ وَتَنۡزِعُ الۡمُلۡكَ مِمَّنۡ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنۡ

تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنۡ تَشَآءُ ؕ بِیَدِکَ الۡخَیۡرُ ؕ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۲۶﴾

''کہہ دو بار الٰہا! حکومتوں کا مالک تو ہی ہے تو جسے چاہے حکومت عطا کرتا ہے اور جس سے چاہتا ہے حکومت واپس لے لیتا ہے! تو جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت سے ہمکنار کرے، تمام خوبیاں تیرے قبضۂ قدرت میں ہیں اور بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔''

مذکورہ بالا آیات سے مجموعی طور پر قرآن کے نقطۂ نظر سے معاشرۂ انسانی کے لئے حکومت کی اہمیت روشن ہو جاتی ہے اور درحقیقت یہ آیات انسانی معاشروں میں حکومت کی بہت وسیع دنیا کی طرف کھلنے والا ایک دریچہ ہے۔

احادیث وروایات اور حکومت کی ضرورت

احادیث وروایات میں بھی ضرورتِ حکومت کا مسئلہ ایک وسیع صورت میں منعکس ہوا ہے اور ان میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ لوگ حکومت کے بغیر زندگی نہیں گذار سکتے، یہاں تک کہ کسی حکومت کے نہ ہونے اور افراتفری کی نسبت ظالم اور ستمگر حکومت ہی بہتر ہے!

۱۔ نہج البلاغہ میں امیر المؤمنین علیؑ نے خوارج جو یہ کہتے تھے:

''لَا حُکۡمَ اِلَّا لِلّٰہِ''

''حکومت حاکمیت اور قضاوت صرف اللہ ہی کے لئے ہے''

کے جواب میں فرمایا:

''کَلِمَۃُ حَقٍّ یُرَادُ بِهَا الۡبَاطِلُ''

یعنی: ''یہ بات حق ہے، جس سے باطل مراد لیا گیا ہے۔''

اس کے بعد آپؑ نے فرمایا:

''نَعَمۡ اِنَّهُ لَا حُکۡمَ اِلَّا لِلّٰہِ وَلٰکِنَّ هٰؤُلَاءِ یَقُوۡلُوۡنَ لَا اِمۡرَةَ اِلَّا لِلّٰہِ''

یعنی: ''ہاں، درست ہے کہ خدا کے حکم کے بغیر کسی کا کوئی حکم نہیں؛ لیکن ان لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ حکومت اور فرمانروائی خدا کے لئے مخصوص ہے۔''

بعد ازاں فرمایا:

''وَ اِنَّهُ لَا بُدَّ لِلنَّاسِ مِنۡ اَمِیرٍ بَرٍّ اَوۡ فَاجِرٍ یَعۡمَلُ فِی اِمۡرَتِهِ الۡمُؤۡمِنُ، وَیَسۡتَمۡتِعُ فِیهَا الۡکَافِرُ، وَ یُبَلِّغُ اللّٰهُ فِیهَا الۡاَجَلَ، وَیُجۡمَعُ بِهِ الۡفَیۡءُ، وَیُقَاتَلُ بِهِ الۡعَدُوُّ، وَتَأۡمَنُ بِهِ السُّبُلُ،

وَيُؤْخَذُ بِهِ لِلضَّعِيفِ مِنَ الْقَوِيِّ حَتَّى يَسْتَرِيحَ بَرٌّ وَيُسْتَرَاحَ مِنْ فَاجِرٍ"
یعنی: ''لوگ بہر حال کسی حاکم اور فرمانروا کے محتاج ہیں چاہے وہ نیکو کار ہو یا بدکار! تاکہ اہل ایمان اس کی حکومت کے زیر سایہ اپنے امور کی انجام دہی میں مشغول رہیں اور کافر بھی اس (حکومت) سے مستفید ہوں اور لوگ اس کی حکومت کے دوران آرام وسکون کے ساتھ زندگی گذار سکیں، اس کے ذریعے بیت المال کے اموال اکٹھے کئے جائیں اور اس کی مدد کے ساتھ دشمن کے خلاف جنگ کی جا سکے، راستے پر امن ہوں اور کمزوروں کے حقوق طاقتوروں سے واپس لئے جائیں، نیکو کار لوگ آسودہ حال اور بدکاروں کے شر سے محفوظ ہوں۔ [1]

یہ جو آپؑ نے فرمایا ہے کہ حاکم ضروری ہے چاہے نیکو کار ہو یا بدکار، اس کا مطلب یہ نہیں کہ دونوں یکساں اور برابر ہیں، بلکہ مراد یہ ہے کہ پہلے عادل اور نیکو کار کا سراغ لگایا جائے گا اور اگر کوشش کے باوجود ایسا شخص نہ ملے تو ظالم حکمران کی حکمرانی افراتفری اور شورش کی کیفیت سے بہتر ہے اور یہ بات بہر حال پوری دنیا اور کائنات پر خدا کی حاکمیت کے منافی اور مخالف نہیں، اس لئے کہ نبوت اور قضاوت کی طرح حاکمیت کا سرچشمہ بھی وہی ذات پاک ہے۔ اس عبارت میں ضمنی طور پر حکومت کے مقاصد کے مختلف پہلوؤں اور ضرورت حکومت کے دلائل کو نہایت واضح طور پر بیان کیا گیا ہے، جس کی وضاحت آئندہ ابحاث میں کی جائے گی۔

۲۔ امام علی الرضا - سے ''فضل بن شاذان'' کی منقولہ معروف روایات میں ''اولوالامر'' کے تصور اور معاشرے پر حکومت کے دلائل کے بیان میں تین اہم نکات کی طرف اشارہ کرکے فرمایا ہے: ''اگر کوئی اعتراض کرے کہ کیوں ''اولوالامر'' مقرر کئے گئے ہیں اور کیوں لوگ حاکم الٰہی کی اطاعت کرنے پر مامور ہیں؟ تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ ساری دلیلوں کی وجہ سے جن میں سے ایک دلیل یہ ہے کہ جب لوگوں کی حدود معین ہو جائیں اور ان کو حکم دیا جائے کہ ان حدود سے انھوں نے تجاوز نہیں کرنا کیونکہ یہ ان کے فساد اور بگاڑ کا باعث ہے اس صورتحال میں ایک امین حکمران ہی حدود سے تجاوز اور ممنوعہ امور میں داخل ہونے سے انھیں روکنے کے اسباب فراہم کرسکتا ہے۔

چونکہ اگر اس عمل کی روک تھام نہ ہو تو کوئی شخص اپنے فوائد ولذات کو دوسروں کے فساد (میں مبتلا ہونے) کی خاطر ترک نہیں کرے گا لہٰذا، لوگوں پر ایک سرپرست مقرر کیا گیا ہے جو انھیں فساد سے منع کرتے ہوئے خدا کے احکام اور اس کی حدود کو لوگوں پر نافذ کرے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ دنیا کا کوئی فرقہ اور کوئی قوم ایسی نہیں جو کسی سربراہ اور سرپرست کے بغیر رہی ہو، ایسا سرپرست اور سربراہ جو ان کے دینی اور دنیوی امور کو منظم کرے، پس خدا کی حکمت کی رو سے جائز نہیں کہ وہ مخلوق کے لئے جن امور کو ضروری اور لازمی سمجھتا ہو

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۴۰

انھیں ترک کردے اوران کے لئے ایک ایسا سرپرست معین نہ کرے جس کی مدد سے وہ دشمن کا مقابلہ اوراس کے ذریعے بیت المال کے اموال کوتقسیم کرسکیں، جوان کی خاطر جمعہ وجماعت کوقائم کرے اورظالم کومظلوم پرستم ڈھانے سے روکے رکھے۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ اگرلوگوں کوایک باکرداراورامین راہنماوسرپرست نہ ملے تواس کے نتیجے میں دین خدابرباد ہوجاتا ہے اور سنت اوراحکام الٰہی تبدیل کردیئے جاتے ہیں اوراہل بدعت کوان میں اپنی طرف سے اضافہ کرنے کا موقع مل جاتا ہے جبکہ مخالفین انھیں کم کرنے کی کوشش کرتے اورمختلف مسائل وامورکومسلمانوں کے لئے مشتبہ بنادیتے ہیں۔“[1]

۳۔تفسیر نعمانی میں امیرالمؤمنین علیؑ قرآن مجید کی چندآیتوں مثلاً

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اسۡتَجِيۡبُوۡا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوۡلِ اِذَا دَعَاكُمۡ لِمَا يُحۡيِيۡكُمۡ ۚ

یعنی: ”اے ایمان والو!جب خدااوررسول تمھیں اس چیز کی طرف بلائیں جوتمہاری زندگی کا سبب ہے توان کی دعوت پرلبیک کہو۔“[2]

اوریہ آیت

وَلَكُمۡ فِي الۡقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰۤاُولِي الۡاَلۡبَابِ[3]

کے بارے میں فرماتے ہیں:

”وَ فی هذا اَوۡضَحُ دَليلٍ عَلَى اَنَّهُ لابُدَّ لِلاُمَّةِ مِنۡ اِمامٍ يَقُومُهُ بِاَمۡرِهِمۡ فَيَأۡمُرُهُمۡ وَيَنۡهاهُمۡ، وَيُقيمُ فيهِمُ الۡحُدُودَ وَيُجاهِدُ الۡعَدُوَّ، وَيُقَسِّمُ الۡغَنائِمَ وَيُفۡرِضُ الۡفَرائضَ وَ يُعَرِّفُهُمۡ اَبۡوابَ مافيهِ صَلاحُهُمۡ وَيُحَذِّرُهُمۡ مافيهِ مَضارُّهُمۡ. اِذۡكانَ الاَمۡرُ وَالنَّهۡيُ اَحَدَ اَسۡبابِ بِقاءِ الۡخَلۡقِ، وَاِلاّ سَقَطَتِ الرَّغۡبَةُ وَالرَّهۡبَةُ، وَلَمۡ يُرۡتَدَعۡ، وَلَفَسَدِ التَّدۡبيرُ وَكانَ ذٰلِكَ سَبَباً لِهَلاكِ الۡعِبادِ.“[4]

”ان آیات میں اس بات پر بہت واضح اورروشن دلیل موجود ہے کہ امت کے لئے کسی ہادی اورامام کی ضرورت ہے جواس سے متعلق امورومسائل کوانجام دے، جولوگوں کوامرونہی کرے اوران میں حدود الٰہی کو

---

[1] بحارالانوار، ج۶،ص۶۰(البتہ روایت طولانی ہےاورہم نے فقط اس کاایک حصہ نقل کیا ہے)

[2] سورۂ انفال/۲۴

[3] سورۂ بقرہ/۱۷۹

[4] بحارالانوار، ج۹۰،ص۴۱

قائم کرے، دشمن کے سامنے جنگ اور مال غنیمت کی منصفانہ تقسیم کو بجالائے، واجبات کو زندہ رکھے اور لوگوں کی اصلاح کے طریقوں سے انھیں آشنا کرے اور جو چیزیں ان کے ضرر وزیان کا باعث ہیں ان سے انھیں بچنے کی تاکید کرے کیونکہ امر ونہی مخلوق کی بقاء وحیات کا سبب ہے ورنہ حوصلہ افزائی وترغیب اور خوف ختم ہوجاتا ہے اور کوئی بھی گناہ کے ارتکاب سے باز نہیں آتا، نظام معاشرہ بگڑ جاتا اور فساد کا شکار ہوجاتا ہے اور یہ بندگان خدا کی ہلاکت اور تباہی وبربادی کا باعث بنتا ہے۔''

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:

" لَایَسْتَغْنی اَهْلُ کُلِّ بَلَدٍ عَنْ ثَلاثَةٍ یُفْزَعُ اِلَیْهِ فی اَمْرِ دُنْیاهُمْ وَ آخِرَتِهِمْ، فَاِنْ عُدِمُوا ذٰلِكَ کَانُوا هَمَجاً فَقِیهٌ عالِمٌ وَرِعٌ، وَآمِیرٌ خَیِّرٌ مَطاعٌ، وَطَبِیبٌ بَصِیرٌ ثِقَةٌ: "

''ہر شہر کے رہنے والے تین چیزوں سے بے نیاز نہیں تاکہ دینی ودنیوی امور میں ان کی پناہ حاصل کریں اور اگر ان (تین چیزوں) سے محروم ہوجائیں تو تباہ ہوجائیں گے؛ (وہ تین چیزیں) فقیہ باعلم وتقویٰ، اچھا اور قابل اطاعت حکمران اور بابصیرت اور قابل اعتماد طبیب ہیں۔''[۱]

بار بار کہا جاچکا ہے کہ یہ مسئلہ اسلام اور روایات میں اس قدر اہم ہے کہ فتنہ وفساد اور افراتفری کی کیفیت پر ظالم شخص کی حکومت کو ترجیح دی گئی ہے، چنانچہ امیر المؤمنین علیؑ فرماتے ہیں:

"والٍ ظَلُومٌ غَشُومٌ خَیْرٌ مِنْ فِتْنَةٍ تَدُومُ"

یعنی: ظالم اور ستمگر حکمران فتنہ وفساد اور بحرانی کیفیت کی نسبت بہتر ہے۔''[۲]

یہ اس وجہ سے ہے کہ اگر عادلانہ حکومت تک دسترسی نہ ہو تو کم از کم ظالم حکومت کو ہی ہونا چاہیے جو لوگوں کے لئے نہ سہی اپنی برقراری کے لئے امن وامان کے قیام اور دشمنوں سے اپنی سرحدوں کی حفاظت کی کوشش کرتی ہے جبکہ اگر حکومت کی طرف سے عائد پابندیاں اٹھالینے کی صورت میں ہر چیز برباد ہوسکتی ہے اور فاسد اور مفسد افراد لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کردیتے ہیں، بے گناہوں کا خون بہایا جاتا ہے اور دشمن آسانی کے ساتھ مملکت پر اثر انداز ہوکر اس پر قبضہ کرسکتے ہیں۔

عقل کی روشنی میں حکومت کی ضرورت

مذکورہ گفتگو قرآن اور احادیث کے نقطۂ نظر سے حکومت کی ضرورت کے بارے میں تھی جو انسانی معاشرے کے لئے حکومت

[۱] بحار الانوار، ج ۷۵، ص ۲۳۵

[۲] غرر الحکم، ج ۲، ص ۷۸۴، حدیث ۵۰، باب واؤ

کے لازمی اور ضروری ہونے کو بیان کرتے ہیں، اگر ہم اس کے ساتھ ساتھ عقل و منطق کے دلائل کی طرف بھی رجوع کریں تو صورتحال مزید واضح ہوجاتی ہے۔ یہ دلائل خدا پرست افراد کے نقطۂ نظر سے بھی پیش کئے جاتے ہیں اور الحادی و مادی سوچ کے عامل افراد کی طرف سے بھی کیونکہ دونوں کا ضرورت حکومت سے متعلق نقطۂ نظر مشترک ہے۔ اگر چہ ان کے دلائل بعض جہات کے اعتبار سے قدرے مختلف ہو سکتے ہیں۔ عمومی نقطۂ نگاہ سے اس موضوع کے بارے میں پیش کئے گئے دلائل کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

اوّلاً: انسان کی زندگی ایک معاشرتی زندگی ہے۔ اس طرح کہ اگر انسانی زندگی اس خصوصیت یعنی؛ اجتماعیت سے خالی ہو تو یہ جاہلیت اور حیوانیت کے پست ترین درجے کو چھوتی نظر آتی ہے، چونکہ انسانی زندگی میں تمام منافع اور مفید نتائج، ثقافتیں، پیش رفت، کمالات کا حصول، علوم وفنون، ہر قسم کی صنعتیں اور مصنوعات، مختلف جہات میں باہمی تعاون اور اجتماعی زندگی کی ہی برکت سے ہیں۔ جب تک چھوٹی چھوٹی افرادی قوتیں اور سوچیں باہم جمع نہ ہوں کسی قسم کی عظیم تبدیلیاں اور انقلابات معرض وجود میں نہیں آسکتے۔

واضح الفاظ میں: انسان اگر معاشرے اور اجتماعی زندگی سے الگ تھلگ ہوجائے تو انسانوں کی بجائے اس کا شمار حیوانوں میں ہو گا، اور یہ اس کا باطنی میلان، قلبی خواہش اور معاشرتی زندگی ہی ہے جس نے اُسے اِس قدر پیشرفت اور برتری کی قدرت بخشی ہے۔

یہ ایک طرف سے اور دوسری طرف سے واضح ہے کہ انسان کی معاشرتی اور اجتماعی زندگی ان اہم فوائد و برکات کے باوجود باہمی کشمکش اور تنازعات سے خالی نہیں یہ تنازعات نہ فقط دوسروں پر غلبہ پانے اور خود غرضی کی وجہ سے جنم لیتے ہیں بلکہ ان کا سبب یہ بھی ہے کہ معاشرے کے افراد اکثر اوقات اپنے حقوق اور حدود کی تشخیص میں غلطی و اشتباہ کے مرتکب ہوجاتے ہیں۔ یہیں سے ایسے قوانین کی ضرورت پڑتی ہے جو ہر فرد کے حقوق کو معین کریں اور دوسروں پر تجاوز و تعدی اور تنازعوں کی راہ روکیں۔

تیسری طرف سے یہ بات مسلم ہے کہ یہ قوانین خود بخود تجاوز اور تنازعہ کی روک تھام نہیں کر سکتے بلکہ یہ اسی صورت میں مؤثر اور مفید ہوتے ہیں جب انھیں صحیح معنوں میں نافذ العمل قرار دیا جائے، دوسرے الفاظ میں فقط حکومت ہی ہے جو معاشرے میں نظم وضبط برقرار رکھ سکتی اور فساد، خونریزی اور حقوق کے غصب کا راستہ روک سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی معاشروں میں زمانہ قدیم سے حکومت رہی ہے۔

ثانیاً: بالفرض اگر لوگ حکومت کے بغیر بھی صحیح وسالم زندگی گذار سکتے ہوں (جو ناممکن ہے) لیکن علوم وفنون، صنعتوں اور مختلف اجتماعی امور میں کمال اور ترقی فقط ایک محتاط لائحہ عمل کی تشکیل اور ایک مدبر کی تدبیر کے ذریعے ہی ممکن ہے اور اسی کا دوسرا نام حکومت قائم کرنا اور اس کی تشکیل ہے۔

اسی وجہ سے دنیا کے تمام عقلاء انسانی معاشروں میں تشکیل حکومت کی ضرورت پر زور دیتے ہیں سوائے کمیونزم کے طرفدار افراد کی باتوں کے جو بعض اوقات یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ اگر ایک مکمل کمیونٹی انسان کو میسر آجائے اور طبقاتی نظام کا خاتمہ ہوجائے تو پھر حکومت کی ضرورت نہیں رہے گی چونکہ ان کے عقیدے کے مطابق حکومتیں ہمیشہ سرمایہ دار طبقہ کے منافع اور فوائد کی محافظ رہی ہیں۔ اس لئے جب طبقاتی نظام کی بساط الٹ جائے تو حکومت کے ضروری ہونے کی کوئی دلیل باقی نہیں رہے گی! لیکن واضح ہے کہ یہ محض وہم وخیال ہے جس کی

عقل ومنطق کے نزدیک کوئی قدر و قیمت نہیں، چونکہ طبقاتی نظام کا خاتمہ اور موجودہ حالات میں لوگوں کا ایک ہی سطح پر آجانا ایک خواب وخیال سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔

بالفرض اگر ایسے معاشرے تک ہماری رسائی بھی ہوجائے اور طبقاتی جنگ اور اس کی محافظ حکومت کا خاتمہ ہوجائے پھر بھی علوم وصنایع کی ترقی، لوگوں کی سلامتی کی حفاظت، نظم وضبط اور آزادی کی برقراری اور ان کی غذائی و رہائشی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ایک مدبرانہ لائحۂ عمل کی ضرورت ہے۔ کیا نوجوان نسل کی تعلیم وتربیت کے لئے وزارت تعلیم کی ضرورت نہیں جو اس مقصد کے لئے ایک جامع پروگرام سے روشناس کرائے؟ کیا وزارت صنعت کے بغیر صنعتی مسائل کو حل کیا جاسکتا ہے؟ کیا وزارت دفاع کے بغیر ایک منظم اور طاقتور فوج کی تشکیل ممکن ہے جس کے ذمے ملک وقوم کے دفاع کا معاملہ ہے؟ بالفرض اگر دنیا میں کوئی جنگ واقع نہیں ہوتی پھر بھی کیا ممکن ہے کہ انتظامیہ کے بغیر مطلوبہ نظم وضبط کو معاشرے کے حوالے کیا جائے۔

بہرحال یہ نکتہ کسی دلیل کا محتاج نہیں کہ انسانی معاشرہ ایک دن بھی حکومت کے بغیر سالم نہیں رہ سکتا اور حکومت کے وجود سے انکار کرنے والے بھی اس امر تک نہیں پہنچ سکے اور پریشانی اور شرم کے مارے راستے ہی سے واپس آگئے!

ٹھیک ہے کہ خودغرض، ظالم اور ستمگر حکومتیں کئی بُرائیوں کا باعث بنتی ہیں اور پوری تاریخ میں انسان کی بہت ساری بدبختیوں کا سرچشمہ رہی ہیں، لیکن اگر ہم چند لحظہ اس بات کا تصور کریں کہ یہی حکومت اگر ٹوٹ جائے اور اس کی جگہ کسی عبور حکومت کے برسراقتدار آنے سے پہلے جو فتنہ وفساد برپا ہوتا ہے اور جس شکست وریخت کا سامنا سارے معاشرے کو کرنا پڑتا ہے تو ہم دیکھیں گے کہ اس بے حکومتی کی نسبت وہ ظالم حکومت بدرجہا بہتر تھی۔ رہی بات خداپرستوں کے نقطۂ نظر کی جو ارسال رسل اور آسمانی کتب کے نازل ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں تو ان کے نزدیک حکومت کے ضروری ہونے کا مسئلہ زیادہ واضح ہے:

کیونکہ ایک طرف سے دینی کتب میں بعثت انبیاء کے جو اہداف ومقاصد بیان کئے گئے ہیں اور عقلی دلائل بھی ان کی تائید کرتے ہیں ان کا حصول تشکیل حکومت کے بغیر ناممکن ہے؛ مثلاً صحیح تعلیم وتربیت اور تزکیۂ نفوس حکومت تشکیل دیئے بغیر بہت مشکل یا ناممکن ہیں۔

غور کریں کہ اگر تمام سکول وکالج اور یونیورسٹیاں جو ہمارے زمانہ میں ہیں ان سب کو کسی غیر مذہبی یا سیکولر حکومت کے سپرد کردیا جائے اور ذرائع ابلاغ یعنی ریڈیو، ٹیلیویژن وغیرہ بھی اسی انداز سے اپنی کارکردگی ظاہر کریں اور ہم یہ چاہیں کہ صرف لوگوں کو وعظ ونصیحت کریں اور مساجد اور منبروں سے استفادہ کرکے انھیں انبیاءؑ کے مقاصد اور تعلیم وتربیت سے آگاہ کریں تو یقینی طور پر ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوں گے اور صرف ایمان وتقویٰ کی ہلکی سی چنگاری تھوڑے سے افراد کے دلوں میں برقرار کی جاسکے گی، لیکن اگر کوئی حکومت ایمان وتوحید اور خدا اور مقدسات اسلامی کی بنیاد پر قائم کی جائے اور ابلاغ ونشریات کے تمام ذرائع اس کے اختیار میں ہوں تو اس صورت میں ہمیں اس مسئلے کی بالکل برعکس تصویر نظر آئے گی۔

عدالت اجتماعی اور لوگوں کا قیام عدل، جو ایک اور مقصد ہے اس کی صورتحال بھی یہی ہے۔ ایک ظالم اور بے دین حکومت جو مستکبرین کی آلۂ کار کیسے ہو، عدل وقسط کو قائم کرسکتی ہے؟ مختصر یہ کہ انبیاء خدا کے مقاصد میں سے کوئی ایک مقصد بھی تشکیل حکومت کے بغیر

پورا نہیں ہوسکتا، یہی وجہ ہے کہ جب تک رسول اکرمؐ نے حکومت تشکیل نہ دے لی اپنے اعلیٰ مقاصد تک نہ پہنچ پائے، باقی انبیاء میں سے بھی جو حکومت الٰہی کی تشکیل میں کامیاب ہوئے، وہ ایک واضح کامیابی سے ہمکنار ہوئے لیکن وہ انبیاء کرامؑ جنھیں یہ توفیق نصیب نہیں ہوئی فاسد اور مفسد لوگوں کے طرح طرح کے مظالم کا شکار بنتے رہے۔

اسی دلیل کے پیش نظر آخری زمانے میں توحید وعدل کی وسعت اور اشاعت بھی امام مہدیؑ کی عالمی حکومت کے ذریعے انجام پائے گی، یہ سب ایک طرف سے۔ اور دوسری طرف سے احکام اسلام صرف عبادات ہی سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ بہت سارے احکام کا تعلق مسلمانوں کے اجتماعی اور سیاسی مسائل کے ساتھ ہے، جیسے حدود، دیات، خمس وزکات اور انفال وغیرہ کے احکام۔

کیا حکومت کی تشکیل کے بغیر یہ ممکن ہے کہ محتاجوں کے حقوق بعنوان زکات دولتمند افراد سے لئے جاسکیں؟ یا اسلامی قضاوت کو ہر جگہ اور ہر سطح پر نافذ کیا جاسکے؟ ہمارے پاس حدود کو جاری کرنے اور فاسد افراد کا راستہ روکنے کی کیا ضمانت ہے؟ اگر مملکت اسلامی پر دشمن حملہ کردے تو تشکیل حکومت اور مختلف اسلحوں اور تجربہ کار لشکر کے بغیر کس طرح اسلامی حکومت کا دفاع ممکن ہے؟!

مختصر یہ کہ جب تک الٰہی اور عدالت پر مبنی عوامی (جمہوری) حکومت قائم نہیں ہوتی احکام اسلامی کی ایک بڑی مقدار نافذ نہیں ہو سکتی ہے، کیونکہ احکام کی تین اقسام ہیں یعنی ''سیاست'' حکومتی لائحہ عمل ہے اور سیاست حکومت کے متن میں داخل ہے اور ''معاملات'' صالح حکومت کی پشت پناہی کے بغیر صورت پذیر نہیں ہوتے یہاں تک کہ جیسے حج ونماز جمعہ وجماعت جیسی عبادات بھی حکومت الٰہی کے زیر سایہ ہی شان وشوکت کے ساتھ بجالائی جاسکتی ہیں۔

اسلامی حکومت کے مقاصد

حکومت کے ضروری ہونے کے بارے میں جو کچھ اختصار کے ساتھ بیان ہوا ہے اس سے حکومت اسلامی کے مقاصد بھی کسی حد تک واضح ہو گئے ہیں مزید وضاحت کے لئے درج ذیل آیات کی طرف رجوع کرتے ہیں: سورۂ حج کی آیت ۴۱ میں فرمایا گیا ہے:

اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّکَّنّٰهُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوۡا بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ نَهَوۡا عَنِ الۡمُنۡکَرِ ؕ

یعنی: ''وہ ایسے لوگ ہیں کہ جنھیں اگر ہم زمین پر صاحب قدرت قرار دیں تو وہ نماز قائم اور زکات ادا کرتے ہیں اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔''

مَّکَّنّٰهُمۡ فِی الۡاَرۡضِ کا مطلب روئے زمین پر قدرت عطا کرنا ہے، لیکن یہ تعبیر قرآن مجید کی بہت ساری آیات میں خصوصی طور پر حکومت کی قدرت کے معنی میں استعمال ہوئی ہے؛ چنانچہ سورۂ یوسف میں دو آیتوں میں فرمایا گیا ہے:

"وَ کَذٰلِکَ مَکَّنَّا لِیُوۡسُفَ فِی الۡاَرۡضِ" [۱]

اور ذوالقرنین کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

"اِنَّا مَکَّنَّا لَهٗ فِی الۡاَرۡضِ وَ اٰتَیۡنٰهُ مِنۡ کُلِّ شَیۡءٍ سَبَبًا"

''ہم نے اسے زمین پر قدرت اور حکومت عطا کی اور ہر چیز کے اسباب اس کے اختیار میں قرار دیئے۔'' [۲]

اس لحاظ سے آیۂ شریفہ کا مفہوم کچھ یوں ہو جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے دوست جب حکومت حاصل کرتے ہیں تو وہ قرب خدا تک رسائی کی راہ ہموار کرتے ہیں جس کی بہترین جلوہ گاہ نماز ہے اور دوسری طرف سے اجتماعی عدالت قائم کرنے کی راہ گشائی کرتے ہیں جس کا واضح نمونہ زکات ہے اور تیسری طرف سے ہر قسم کے اجتماعی فساد کے خلاف جہاد کر کے معاشرے میں نیکی اور خوبی کے عوامل و اسباب کو رواج دیتے ہیں کہ جس کا اہم ذریعہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔ اگر ہم فرض کریں کہ مَکَّنَّا سے ہر قسم کی قدرت عطا کرنا ہے تو اس کے باوجود آیۂ شریفہ کی دلالت ہمارے مقصود پر واضح ہے کیونکہ حکومت قدرت کا واضح ترین نمونہ ہے۔

علامہ طباطبائیؒ اس آیت کے ذیل میں فرماتے ہیں: زمین پر تمکین سے مراد انھیں قدرت عطا کرنا ہے تاکہ وہ زندگی سے متعلق

---

[۱] سورۂ یوسف/۲۱ اور ۵۶

[۲] سورۂ کہف/ ۸۴

تمام امور جن کا وہ ارادہ کریں بغیر کسی روک ٹوک کے انجام دے سکیں۔[1]

کیا ایسی قدرت حکومت حاصل کئے بغیر ممکن ہے؟ تفسیر قرطبی میں یہ مطلب زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان ہوا ہے کیونکہ اس میں جملہ "اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ" کی تفسیر میں امراء وصاحبان حکومت مراد لئے گئے ہیں۔[2]

اصولی طور پر مذکورہ بالا آیت میں جو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا ذکر ہوا ہے جیسا کہ فقہی مباحث میں بھی اس کا ذکر ہے، وہ مختلف مراحل پر مشتمل ہے، جس کا ایک مرحلہ حکومت کا صاحب اختیار ہونا ہے۔ سورۂ نور کی آیت ۵۵ میں صالحین کی حکومت کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـــًٔا ۭ

اس آیت میں خدا تعالیٰ صالح مؤمنین کے ساتھ خلافت اور حکومت کا وعدہ کرنے کے بعد چند اور جملے بیان کرتا ہے جو حقیقت میں اس حکومت کے مقاصد پر مشتمل ہیں: پہلا مقصد دین الہٰی کو معاشرے میں قدرت اور حاکمیت عطا کرنا ہے اور دوسرا مقصد یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ حکومت عدم امن وامان کو اجتماعی امن وامان میں تبدیل کردے گی اور عبادت میں ہر قسم کے شرک کو ختم کرنے کا باعث ہوگی۔ اس طرح اس بیان کے مطابق حکومت کے تین مقاصد ہیں:

۱۔ پورے معاشرے پر دین اور قوانین الہٰی کی حاکمیت۔

۲۔ ہر جگہ امن وامان کی برقراری۔

۳۔ خدا کی خالصانہ عبادت اور شرک وبت پرستی کے آثار کا خاتمہ۔

درحقیقت انتہائی مقصد انسانی کمالات حاصل کرنا اور اللہ تعالیٰ کی جانب سیر وسلوک سفر ہے اور امن وامان کی برقراری اور قوانین الہٰی کی حاکمیت اس مقصد تک رسائی کے مقدمات اور شرائط ہیں۔ سورۂ ص کی آیت ۲۶ میں داؤدؑ سے خطاب کرکے فرمایا گیا ہے:

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ

یعنی: "اے داؤدؑ! ہم نے تمہیں زمین پر خلیفہ مقرر کیا ہے پس لوگوں پر حق کے ساتھ حکومت اور قضاوت کرو۔"

اس آیت کریمہ میں واضح طور پر خلافت وحکومت کا نتیجہ اثبات حقوق کو قرار دیا گیا ہے، دوسرے الفاظ میں ہر قسم کے تجاوز وتعدی کی روک

---

[1] تفسیر المیزان، ج ۱۴، ص ۳۸۶

[2] تفسیر قرطبی، ج ۷، ص ۴۴۶۵

تھام اور ضعیف ومحروم افراد کے حقوق کو طاقتور افراد سے واپس لینا مراد ہے۔

واضح ہے کہ یہ حضرت داؤدؑ یا بنی اسرائیل کے دوسرے انبیاء کی حکومت کا ہی مقصد نہیں تھا بلکہ یہ ہر زمانے اور ہر جگہ قائم ہونے والی حکومت الٰہی کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد ہے۔

درست ہے کہ لفظ ''حکم'' بہت ساری آیات میں قضاوت اور فیصلہ کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے، لیکن اس بات کے پیش نظر کہ اس آیت شریفہ کے آغاز میں گفتگو روئے زمین پر خلافت کے بارے میں ہے، لہٰذا واضح ہو جاتا ہے کہ ہر قسم کی عادلانہ حکومت وحاکمیت آیت کے جامع مفہوم میں داخل ہے۔ اس سے ملتا جلتا مطلب سورۂ نساء کی آیت ۵۸ میں بھی آیا ہے چنانچہ ارشاد الٰہی ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ۭ

یعنی: ''خدا تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو ان کے صاحبان تک پہنچاؤ اور جب لوگوں کے درمیان قضاوت اور حکومت کرو تو اسے عدل وانصاف پر مبنی ہونا چاہیے۔''

اس آیت کی تفسیر میں بیان شدہ متعدد روایات میں واضح طور پر ذکر کیا گیا ہے کہ اس امانت سے مراد مقام ولایت ہے جسے ہر امامؑ اپنے بعد والے امامؑ کے سپرد کرتے ہیں اگر چہ یہ حکم باقی امانات کے بارے میں بھی جاری ہے۔ [۱]

خاص طور پر یہ کہ ان روایات میں سے بعض میں آیا ہے کہ آیت کا خطاب حکام (سربراہان حکومت) سے ہے [۲]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذکورہ آیت میں عدالت پر مبنی حکومت سے فقط قضاوت اور فیصلہ مراد نہیں بلکہ اس کے دائرے میں ہر قسم کی عادلانہ حکومت داخل ہے۔

اصولی طور پر وہ تمام آیات وروایات جو انبیاء کرام کی بعثت کا مقصد تعلیم وتربیت، تزکیۂ نفوس، لوگوں کے درمیان عدالت قائم کرنا اور غلامی کی زنجیروں سے نجات قرار دیتی ہیں، وہ حقیقت میں تشکیل حکومت کے مقاصد کو بھی بیان کرتی ہیں اس لئے کہ الٰہی حکومتیں بعثت انبیاء کے مقاصد پورا کرنے کے مقدمات اور آلات ہیں، اس طرح ایک الٰہی حکومت کے مقاصد کو مندرجہ ذیل امور میں خلاصہ کر کے پیش کیا جا سکتا ہے:

۱۔ تعلیم وتربیت اور علمی واخلاقی لحاظ سے معاشرتی نشوونما۔

۲۔ انسانی آزادی کی ضمانت کی فراہمی، اور ہر قسم کی قید وبند سے رہائی اور انسانوں کے انسانوں ہی کے ذریعے استحصال کی نفی چاہے یہ استحصال فکری ہو یا سیاسی، عسکری اور اقتصادی۔

---

[۱] نور الثقلین، ج۱ص ۴۹۵۔ تفسیر عیاشی، ج۱ص ۲۴۹۔ بحار الانوار، ج ۲۳ص ۲۷۴ کے بعد

[۲] تفسیر برہان، ج۱ص ۳۸۰ (انہ خاطب بھا الحکام)

۳۔معاشرے کے تمام طبقوں میں عدل وانصاف قائم کرنا اور اجتماعی عدالت کی ضمانت دینا۔

۴۔دوسرے مقاصد تک رسائی کے لئے مقدمہ کے طور پر اجتماعی امن وامان کی فراہمی۔

۵۔خدا کی بندگی وسیر الی اللہ اور کمالات انسانی سے مستفید ہونے کے مقدمات کی فراہمی تاکہ اس طرح قرب الٰہی کی منزل تک رسائی حاصل ہو سکے جو غَایَۃُ الْغایاتِ وَمُنْتَہی الرَّغَباتِ ہے (یعنی وہ مقام جو تمام مقاصد کی منزل مقصود اور تمام رغبات کا انتہائی اور مطلوب نقطہ ہے)

اس بحث کو ہم امیر المؤمنین علی -کے مالک اشتر کے نام فرمان کے ابتدائی کلمات کے بیان کے ساتھ ختم کرتے ہیں جس میں حکومت اسلامی کے اغراض ومقاصد کا ایک واضح نقشہ کھینچا گیا ہے؛ آپؑ نے فرمایا:

"ھذا ما اَمَرَ بِہِ عَبْدُ اللّٰہِ عَلِیٌّ اَمیرِ الْمُؤمِنینَ، مالِکَ بْنَ الْحارِثِ الأشْتَرَ فی عَھْدِہِ اِلَیْہِ حینَ وَلاہُ مِصْرَ، جَبایَۃَ خَراجِھا، وَجِھادِعَدُوِّھا وَاسْتِصْلاحَ اَھْلِھا وَعِمارَۃَبِلادِھا"

یعنی: ''یہ وہ حکم ہے جو بندۂ خدا علی امیر المؤمنین نے مالک بن حارث اشتر کو اس کے نام اپنے فرمان میں دیا ہے، جب آپؑ نے انھیں مصر کا حاکم بنایا تاکہ وہ اس سرزمین کے مالیات جمع کریں اور اس ملک کے دشمنوں کے خلاف لڑیں اور اہل مصر کی اصلاح کو ہمت وحوصلہ کے ساتھ انجام دیں اور اس سرزمین کے شہروں کو آباد کریں۔'' [1]

اس ترتیب سے شہروں کی آبادکاری، لوگوں کے حال کی اصلاح ودرستگی، دشمنوں کے خلاف جہاد اور بیت المال کی تقویت جو مذکورہ مقاصد کو پورا کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے، اس حکومت کے جملہ مقاصد شمار کئے گئے ہیں لیکن جیسا کہ اشارہ کیا گیا ہے یہ ایسے اغراض ومقاصد ہیں جو پہلے مرحلے میں قرار پاتے ہیں۔اصلی اور انتہائی مقصد تعلیم وتربیت، تہذیب نفوس اور سیر الی اللہ ہی ہیں۔

☆☆☆☆☆

---

[1] نہج البلاغہ، مکتوب ۵۳

حکومت کی اقسام

پوری تاریخ میں حکومت مختلف شکلوں میں جلوہ کررہی ہے اور شاید دنیا کے ممالک کی تعداد کے مطابق حکومتوں کی بھی تعداد رہی ہے، لیکن حکومت بنیادی طور پر تین اقسام پر مشتمل ہے:

ا۔خودسَر اور استبدادی حکومتیں

جوایک فرد یا گروہ خاص کی حاکمیت پر استوار ہوتی ہیں اور فرد یا گروہ کے محور پر گردش کرتی ہیں جس کے نتیجے میں معاشرہ غلامی اور سیاہ بختی کا شکار ہوجاتا ہے۔طبعی بات ہے ایسی حکومت انھیں لوگوں کے منافع کا دفاع کرتی ہے، پوری تاریخ میں سب سے زیادہ جرائم کے مرتکب ایسے ہی استبدادی حکمران اور سلاطین ہوئے ہیں جوخود کومحفوظ کرنے کے لئے کسی حد کونہیں پہچانتے تھے یہاں تک کہ مزاحمت یا امکان مزاحمت کی صورت میں اپنے بھائیوں اور فرزندوں تک کو خاک وخون میں غلطاں کرنے سے ذرا نہیں ہچکچاتے۔

حکومت کی اس قسم میں لوگوں کے ارادے کا کوئی کردار نہیں ہوتا اور ان کی مصلحتوں کو خاطر میں نہیں لایا جاتا اور ہر چیز طاقت کے محور پر گردش کرتی ہے اور کبھی جزئی استبداد جو چھوٹی سی اقلیتی پارٹی پر مشتمل ہوتا ہے طاقت کے ذریعے لوگوں پر مسلط ہوجاتا ہے اور اپنے افکار کو ان پر زبردستی ٹھونستا ہے، یہ وہی چیز ہے جس کے کارل مارکس کے پیروکار طرفدار تھے اور جسے ''محنت کش طبقے کی ڈکٹیٹر شپ'' سے یاد کرتے تھے (محنت کش افراد میں سے ایک چھوٹا سا گروہ جس کا وفادار اور کارآمد ہونا ثابت ہوجاتا تھا اس کا نام کمیونسٹ پارٹی میں شامل کرلیا جاتا تھا اور اس چھوٹے سے گروہ کی عوام کی بھاری اکثریت پر حکومت ہوتی تھی، یہ ایک ایسی پارٹی تھی جو نہ ہمہ گیر تھی اور نہ ہی اس میں آزادانہ انتخابات ہوتے تھے اور نہ ہر شخص کو حق حاصل تھا کہ اس پارٹی کا رکن بن سکے، نہ ہی جمہوریت کا اس میں کوئی شائبہ ہوتا تھا)۔

۲۔جمہوری نظام یا جمہوری حکومت

جو آج کل دنیا میں حکومت کی بہترین اور کامل ترین صورت کے عنوان سے معروف ہے۔اس نظام حکومت میں اصل واساس یہ ہے کہ ہر طبقے کے افراد کامل آزادی کے ساتھ اپنے ووٹ کے ذریعے اپنے نمائندے منتخب کرکے اپنی قوم کی تقدیر کو چند معین سالوں کے لئے ان کے حوالے کردیں، وہ نمائندگان بھی تبادلۂ خیالات اور باہمی مشورے سے، جو بظاہر آزادی کے ساتھ انجام پاتے ہیں۔ایسے قوانین وضع کرتے ہیں جو ان کے خیال میں لوگوں کے فائدے کے لئے ہوتے ہیں اور ان قوانین کے نفاذ کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی جاتی ہے کہ اس کمیٹی کا سربراہ کبھی ان نمائندوں اور گاہے براہ راست لوگوں کے ذریعے وزیر اعظم یا صدر کے طور پر منتخب ہوتا ہے، اس قسم کی حکومت کو جمہوری یا عوام کی عوام پر حکومت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس حکومت کی بھی دو قسمیں ہیں: ایک قسم یہ ہے کہ ظاہری اور واقعی طور پر عوامی ہوتی ہے اور آج اور گذشتہ دنیا میں اس کا وجود

بے حد کم رہا ہے یا شاید موجود ہی نہیں رہی۔ دوسری قسم یہ ہے کہ یہ جمہوری حکومت بظاہر عوامی رنگ و بو رکھتی ہے، لیکن حقیقت میں ایسے نہیں، اس کی روح ''استبدادی'' اور ظاہر ''جمہوری'' ہوتا ہے! اس ظاہری اور باطنی تفاوت اور فرق کی بھی دو قسمیں ہیں۔

بعض اوقات ایک فرد یا کئی خود غرض افراد واضح اور اعلانیہ طور پر انتخابات کے عمل میں دخل اندازی کرتے اور لوگوں سے زبردستی ووٹ ڈلواتے ہیں یا جعلی ووٹوں سے صندوقوں کو بھر لیتے ہیں تا کہ ان کے منظور نظر افراد جیت سکیں اور کبھی یہ دخل اندازی مخفیانہ انداز میں انجام پاتی ہے، جبکہ ایسا ہوتا نہیں کیونکہ ایک چھوٹا سا بے حد دولتمند طبقہ نہایت ظرافت کے ساتھ لوگوں کی نفسیات کا مطالعہ کر کے ان کے درمیان اپنے منظور نظر افراد کے بارے میں اس قدر پروپیگنڈہ کرتا ہے کہ اکثر لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ انتخاب میں شرکت کرنے والے افراد عالم فاضل، ہمدرد، مدبر و منظم اور آسمانی فرشتوں کی مانند پاک صاف اور معصوم ہیں جبکہ یہ اسی دولتمند طبقے کے ایجنٹ اور انہی کی حکومت کا حق ادا کرتے ہیں۔

اس قسم کے معاشرے کی مثال کے طور پر یورپ کے اکثر ممالک اور امریکہ کو پیش کیا جا سکتا ہے جہاں حکومت درحقیقت استبدادی اور ظالمانہ ہے جو لوگوں کے سامنے جمہوری حکومت کے لباس میں جلوہ گر ہوتی ہے۔

۳۔ حکومت الٰہی

یہ ایک ایسی حکومت ہے جو نہ کسی ایک فرد اور نہ کئی افراد کے ارادے کے مطابق چلتی ہے اور نہ لوگوں کی خواہش کے گرد گھومتی ہے بلکہ یہ اللہ کے ارادے کی پر قائم ہوتی ہے اور یقینی بات ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے بندوں کی مصلحت کو پورا کرنے کے علاوہ کوئی اور ارادہ نہیں رکھتا، اس قسم کی حکومت انبیاء کرام اور ان کے برحق جانشینوں اور ان کی راہ پر گامزن رہنے والوں کی حاکمیت میں ہی دیکھی جا سکتی ہے اور دنیا میں ایسی حکومتوں کا وجود بے حد کم ہے۔ قرآن مجید میں تینوں اقسام کی حکومت کے نمونوں کو پیش کیا گیا ہے:

ا۔ قرآن مجید فرعون کی جابرانہ اور خودسرانہ حکومت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: ''اس نے زمین پر برتری حاصل کرنے کی کوشش کی اور اس سرزمین کے رہنے والوں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کیا، ایک گروہ کے افراد کو کمزور اور ناتوانی کی طرف کھینچ لے گیا، ان کے بیٹوں کے سر تن سے جدا کر دیئے اور ان کی بیٹیوں کو (کنیزی اور خدمت کے لئے) زندہ رکھا وہ یقینا فساد برپا کرنے والا تھا۔

''اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلا فِي الاَرْضِ وَ جَعَلَ اَهْلَها شِيَعاً يَسْتَضْعِفُ طائِفَةً مِنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْناءَهُمْ وَ يَسْتَحْيِي نِساءَهُمْ اِنَّهُ كانَ مِنَ الْمُفْسِدينَ''

فرعون سارے مصر کی سرزمین کو اپنی ملکیت خیال کرتا تھا اور اس کے عظیم دریاؤں اور نہروں کا فقط اپنے آپ کو ہی مالک تصور کرتا تھا اور یوں کہتا تھا: ''اے میری قوم کیا مصر کا ملک اور حکومت کا میں ہی مالک نہیں ہوں؟ اور یہ بہنے والی نہریں میرے ہی حکم سے جاری نہیں؟ کیا تم لوگ نہیں دیکھتے؟

يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۵۱﴾ [۱]

وہ لوگوں پر حکومت کرنے ہی کو کافی نہیں خیال کرتا تھا بلکہ اس کی توقع یہ تھی کہ سب لوگ اس کی پوجا کریں اور اس کے علاوہ کسی کی پوجا نہ کریں، اسی وجہ سے اس نے موسیٰؑ سے کہا: اگر تم میرے علاوہ کسی کو معبود قرار دوں گے تمہیں سپرد زندان کردوں گا؛

لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ﴿۲۹﴾ [۲]

وہ اس بات کا بھی معتقد تھا کہ اگر کوئی تحقیق کے ذریعے مدعی نبوت کی طرف سے پیش کئے گئے معجزات دیکھ کر اس کی سچائی پر ایمان لے آئے تو بھی اس کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اس کی اجازت کے بغیر اس پر ایمان لائے؛ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے ان جادوگروں کی سخت مذمت کی جو واضح معجزات کی وجہ سے حضرت موسیٰؑ پر ایمان لائے تھے۔

قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ [۳]

اس سے ملتا جلتا مطلب ایک اور خودسر بادشاہ نمرود کے ہاں بھی نظر آتا ہے کہ جس نے واضح انداز میں حضرت ابراہیمؑ سے کہا: جن معجزات کی تم بات کرتے ہو انھیں میں بھی انجام دے سکتا ہوں، میں زندہ بھی کرتا ہوں اور مارتا بھی ہوں؛ ''أَنَا أُحۡيِي وَأُمِيت'' لیکن جب اسے ابراہیمؑ کے دندان شکن استدلال کا سامنا کرنا پڑا کہ خدا تعالیٰ سورج کو مشرق سے طلوع کرتا ہے اگر تم قدرت رکھتے ہو تو ایک دن اسے مغرب سے طلوع کر دکھاؤ تو یہی وہ مقام تھا جس پر وہ ذلیل اور مبہوت ہو کر رہ گیا۔ (سورۂ بقرہ/ ۲۵۸)

اصولی طور پر تمام لوگ یہاں تک کہ جابر و خودسر سلاطین بھی اپنے آپ کو روئے زمین پر انسانی معاشرے میں فساد کا باعث سمجھتے تھے یہی وجہ ہے کہ جب حضرت سلیمان- کا خط ملکۂ سبا کو ملا اس نے اس بات کی تحقیق کے لئے کہ آیا سلیمانؑ ایک خودسر بادشاہ ہیں یا خدا کے نبی، آپؑ کے لئے ہدیہ اور تحائف بھیجے اور اس کے ضمن میں کہا: بادشاہوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ جب وہ کسی شہر میں داخل ہوتے ہیں تو اس میں فساد برپا کرتے اور آبرومند اور معزز لوگوں کو ذلیل کر دیتے ہیں، ان کا کام اور روش ہمیشہ سے یہی رہی ہے:

اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۴﴾ [۴]

بادشاہ لوگ اپنے مخالفین کو بدترین اذیتوں کا نشانہ بناتے اور زندہ حالت میں آگ میں جلا دیتے تھے، جیسا کہ ''اصحاب الاخدود'' کے بارے میں سورۂ بروج میں ذکر ہوا ہے؛ (تاریخ میں مذکور ہے کہ ان کے بادشاہ ''ذونواس'' نے انھیں ایک خندق کھودنے اور اس

---

[۱] سورہ زخرف۔۵۱

[۲] سورہ شعرا۔۲۹

[۳] سوورہ اعراف۔۱۲۳

[۴] سورۂ نمل/ ۳۴

میں بہت سا ایندھن ڈال کر آگ جلانے کا حکم دیا اور دین مسیح کے پابند افراد کو زندہ اس میں ڈال دیا گیا اور حکم دیا کہ بوڑھے اور بچوں پر بھی رحم نہ کیا جائے) ان کا گناہ کیا تھا؟ فقط یہ کہ وہ خدائے واحد، لائق حمد وثنا پر ایمان لائے تھے۔

وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝۸ [1]

تاریخ میں اس قسم کے خودسر اور ظالم حکومتوں کے بارے میں کئی واقعات موجود ہیں اور قرآن مجید میں ان کی طرف متعدد آیات میں اشارے کئے گئے ہیں کہ وہ لوگ (حکمران) اپنی قوم وملت (رعایا) کے ساتھ غلاموں کا سا بلکہ اس سے بدتر سلوک روا رکھتے تھے اور اصولاً انبیاء کرام کی بعثت کے مقاصد میں سے ایک بڑا مقصد ایسے خودغرض وخودسر حکمرانوں کے ساتھ مقابلہ کرنا اور لوگوں کو ان کے چنگل سے رہا کرنا تھا۔

۲۔شوریٰ پر مبنی حکومت یا لوگوں پر حکومت کے بارے میں بھی بعض اشارے قرآن میں نظر آتے ہیں اگرچہ کامل طور پر آج کل کی صورتحال کے مشابہ صورت میں نہیں، سورۂ نمل کی آیت ۳۲ میں حضرت سلیمانؑ اور ملکہ سبا کی داستان کے بارے میں مذکور ہے: جب حضرت سلیمانؑ کا خط ملکہ سبا کو موصول ہوا اس نے اپنے مشیروں کو جمع کیا اور انھیں خط کی تفصیل سے آگاہ کیا اور کہنے لگی: اے بندگان! اس اہم مسئلے میں اپنی رائے بیان کرو کیونکہ میں کوئی اہم کام تمہاری موجودگی کے بغیر انجام نہیں دیتی!

قَالَتْ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِيْ فِيْٓ اَمْرِيْ ۚ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ ۝۳۲

یقیناً اس زمانے میں نہ انتخابات تھے نہ لوگوں کے ووٹ، لیکن اسی قدر کہ وہ اپنے کاموں میں مشاورت کی پابند تھی، شوریٰ پر مبنی حکومت کو ظاہر کرتی تھی اگرچہ اس حکومت کی شورائی حیثیت کچھ خاص واضح نہیں تھی۔

مزید یہ کہ معاشرتی اور حکومتی امور میں شوریٰ اور مشورہ کے بارے میں اسلام نے بہت زیادہ تاکید کی ہے، چنانچہ قرآن سچے اہل ایمان کے بارے میں کہتا ہے:

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ

یعنی: ''ان کے امور باہمی مشورے کی صورت میں ہوتے ہیں۔'' [2]

اور یہاں تک کہ رسول اکرمؐ کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے امور میں مؤمنین کے ساتھ مشورہ کریں۔

''وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ'' (آل عمران/۱۵۹) رسول اکرمؐ کی حکومت اگرچہ حکومت الٰہی تھی، لیکن اس کے باوجود آپؐ کو لوگوں کے ساتھ مشورے کا حکم تھا تاکہ حکومت کی عوامی حیثیت بھی محفوظ رہے۔

۳۔البتہ الٰہی حکومتوں کے بارے میں قرآن مجید میں بہت زیادہ ابحاث نظر آتی ہیں حضرت داوٗدؑ کی عظیم حکومت کے بارے

---

[1] سورۂ بروج/۸

[2] سورۂ شوریٰ/۳۸

میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ۭ [1]

''خدا تعالیٰ نے انھیں حکومت اور حکمت و دانش عطا کی اور جو چاہتا تھا انھیں سکھایا۔''

اور سلیمانؑ کے بارے میں خود ان کی زبانی فرماتا ہے:

قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝۳۵

'' (سلیمانؑ) نے کہا: خدایا! مجھے بخش دے اور مجھے ایک ایسی حکومت عطا کر جس کا میرے بعد کوئی مستحق نہ ہو تو بہت عطا کرنے والا ہے۔'' [2]

اس کے بعد والی آیات سے بخوبی استفادہ ہوتا ہے کہ یہ دعا قبول ہوئی اور خدا نے انھیں ایسی حکومت عطا کی جس کی گذشتہ اور آئندہ میں مثال نہیں ملتی۔ ہوا ان کے تابع تھی اور جن، دیو اور جنگلی جانور بھی ان کے لئے مسخر تھے یہاں تک کہ وہ فضا میں اڑنے والے پرندوں کو بھی اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتے تھے۔

آل ابراہیمؑ کے بارے میں قرآن فرماتا ہے:

فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ۝۵۴

''ہم نے خاندان ابراہیمؑ کو کتاب آسمانی حکمت اور ایک عظیم حکومت عطا کی (آل ابراہیمؑ میں یوسفؑ، داوٗدؑ اور سلیمانؑ وغیرہ سب داخل ہیں)۔'' [3]

قرآن مجید ''طالوت'' (جو بنی اسرائیل کے مشہور بادشاہوں میں تھے) کے بارے میں اس زمانے کے نبی کی زبان سے بیان فرماتا ہے:

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ۭ

''ان کے پیغمبرؑ نے ان سے کہا خدا تعالیٰ نے طالوت کو تمہارا فرمانروا مقرر کیا ہے۔'' [4]

یعنی یہ عطیہ خدا کی طرف سے ہے۔ بنی اسرائیل جو حکومت کے استحقاق کے معیار سے نا آشنا تھے، اس انتخاب پر پریشان ہوئے اور خود کو طالوت سے زیادہ اس منصب کا اہل قرار دیا، کیونکہ طالوت ایک دیہاتی تھے نہ ان کے ہاں مال و دولت کی ریل پیل تھی اور نہ وہ کسی معروف

---

[1] سورۂ بقرہ/ ۲۵۱

[2] سورۂ ص/ ۳۵

[3] سورہ نساء ۵۴

[4] سورۂ بقرہ/ ۲۴۷

خاندان کے چشم و چراغ تھے، لیکن ان کے پیغمبر نے انھیں ان کی اس خطا سے باہر نکالا اور کہا کہ حاکمیت الٰہی کا معیار روحانی اور جسمانی قدرت ہے اور یہ دونوں طالوت میں موجود ہیں اور حکومت الٰہی کا معیار مال و دولت اور بے قدر قیمت ظاہری خصوصیت نہیں جو دنیا پرستوں کے اندر موجود ہے۔

سورۂ نساء کی آیت ۵۴ میں بھی رسول اکرمؐ اور ان کی آل پاک کی الٰہی حکومت کی طرف واضح اشارہ کرتے ہوئے قرآن مجید فرماتا ہے:

اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ﴿۵۴﴾

''کیا وہ لوگ (رسول اکرمؐ اور ان کے خاندانؑ) کے ساتھ جو اللہ تعالیٰ نے انھیں عطا کیا ہے کی وجہ سے حسد کرتے ہیں حالانکہ ہم نے آل ابراہیمؑ کو کتاب و حکمت اور ایک عظیم حکومت عطا کی۔''

یہ تھے قرآن مجید میں حکومت کی اقسام کے چند نمونے اور اب ہم حکومت کی ان تین اقسام کی مزید تحقیق کرتے ہیں۔

انواع حکومت کی تحقیق اور ان پر تنقید

ڈکٹیٹرشپ اور آمرانہ حکومت کے مقاصد کسی پر مخفی نہیں اور پوری تاریخ میں انسانی معاشرے کو ایسی حکومت کی طرف سے سب سے زیادہ نقصان پہنچے ہیں؛ بے گناہوں کو قتل کرنا اور انھیں طرح طرح کی اذیتوں کا نشانہ بنانا، محروم طبقوں کا استحصال، مختلف قسم کی غلط ترجیح اور بے عدالتی، ملکی سرمائے کو اپنی شیطانی خواہشات کے لئے خرچ کرنا وغیرہ آمرانہ حکومت کے سیاہ کارنامے ہیں؛ قرآن مجید ایک آیت میں حق مطلب ادا کرتے ہوئے فرماتا ہے:

اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ

''خودسر بادشاہ جب کسی علاقے میں داخل ہوتے ہیں اسے فساد و تباہی میں مبتلا کر دیتے ہیں اور وہاں کے عزت دار لوگوں کو ذلیل کرنا ہی ان کا وطیرہ ہوتا ہے!''

انفرادی اور معاشرتی استبداد (آمریت) کے درمیان کوئی فرق نہیں بلکہ نتائج کے اعتبار سے گروہی یا معاشرتی آمریت بدتر ہوتی ہے اور اس کی واضح ترین مثال روس کی کمیونسٹ پارٹی تھی اور اس نے جو المناک سیاہ کارنامے انجام دیئے ان کی مثال نہیں ملتی۔ جمہوریت کے لباس میں ملبوس آمرانہ حکومتوں کے نقصانات بھی علانیہ آمریت سے کچھ کم نہیں ہوتے، بلکہ کئی لحاظ سے بدتر اور زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔

کیونکہ لوگوں کو آمریت کے باعث نقصان و ضرر کا احساس ہوتا ہے اور وہ اس انتظار میں ہوتے ہیں کہ کب انھیں موقع ملے تاکہ وہ آمریت کی بساط الٹ دیں، لیکن جمہوریت کے لباس میں پوشیدہ آمریت، جیسے اکثر یورپی حکومتیں جو وسیع پروپیگنڈے اور سرمایہ دار

طبقے کی طرف سے خرچ کئے گئے بے پناہ سرمائے کے بل بوتے پر برسراقتدار آتی ہیں، کوئی ایسی چیز نہیں کہ لوگ ان کے خاتمے کے منتظر ہوں اور ان کے خلاف شورش برپا کریں۔

رہی بات اس جمہوریت کی جو اکثریت کی نمائندہ ہوتی ہے (اگر کسی ایسی حکومت کا دنیا میں وجود ہو) تو اس قسم کی حکومت بھی مقصد تک نہیں پہنچاتی بلکہ کئی لحاظ سے ظلم وستم اور بے عدالتی کی حکومت ہے۔ چونکہ: اولاً اکثر ممالک میں جن میں ظاہری یا واقعی طور پر ایسی حکومت موجود ہے وہاں بہت سارے لوگ عملی طور پر انتخابات میں شریک نہیں ہوتے مثلاً ساٹھ، ستر فیصد یا اس سے کم لوگ انتخابات میں شریک ہوتے ہیں اور اس کے باوجود کچھ لوگ اکثریت حاصل کر لیتے ہیں جن کی معاشرے میں اکثریت نہیں ہوتی مثلاً اکتیس فیصد، انتیس فیصد کے مقابلے میں (جبکہ ساٹھ فیصد افراد نے انتخابات کے عمل میں شرکت کی ہوتی ہے، اور چالیس فیصد نے شرکت نہیں کی ہوتی) ایسی صورتحال میں جس کی کتنی ہی مثالیں موجود ہیں لوگوں کی ایک قلیل تعداد زمام حکومت کو اپنے ہاتھوں میں لے کر اکثریت پر مسلط ہوجاتی ہے۔ واضح ہے کہ یہ قلیل لوگ اپنے اجتماعی منافع کے مطابق سارے قوانین بنائے ہیں اور اپنے من پسند نظام کو لاگو کرتے ہیں اور یہ ایک واضح ظلم ہے۔

ثانیاً فرض کیا کہ تمام وہ لوگ جو الیکشن میں شرکت کا حق رکھتے ہیں، سب کے سب اس میں شریک ہوتے ہیں (البتہ یہ ایک فرض ہی ہے جو واقع نہیں ہوا) پھر بھی ممکن ہے کہ ایک گروہ ذرا سی اکثریت کے ساتھ برسراقتدار آجائے (مثلاً اکاون فیصد، انچاس فیصد یا اس سے کمتر یا پیشتر کے مقابلے میں) یہ بھی درحقیقت اقلیت پر اکثریت کی آمریت اور استبداد کی ایک قسم ہے اور ایک ملک جس کی آبادی مثلاً سوملین ہے ان میں سے انچاس ملین افراد کے لئے ضروری ہے کہ وہ اکاون ملین کے تحت فرمان اور زیر تسلط ہوں اور معاشرے کی ہر چیز سے وہ اکثریت مستفید ہو، چاہے اقلیت کے لئے یہ عمل نقصان دہ ہی کیوں نہ ہو۔ اسی وجہ سے بہت سارے مفکرین کا خیال ہے کہ اکثریت کی حکومت ایک ظالمانہ حکومت ہے، لیکن اس کے سوا چارہ بھی کیا ہے؟ اگر اسے محور قرار نہ دیں تو آخر کیا کریں؟

ثالثاً اس سے قطع نظر اگر فرض کریں کہ جمہوری حکومت میں سے ان دو اعتراضات میں کوئی ایک اعتراض بھی موجود نہیں اور ایک ایسی حکومت ہے جو لوگوں کی اکثریت کے مطابق عمل کرتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات عوام غلط تعلیم وتربیت کے نتیجے میں طرح طرح کے انحرافات میں مبتلا ہوجاتی ہے، اس قسم کے حالات میں صالح اور دانشور حضرات کا فرض ہے کہ وہ آگے بڑھ کر ان انحرافات کا مقابلہ کریں جبکہ صورتحال یہ ہے کہ جمہوری نظام میں اس قسم کے حالات میں نہ فقط ان کا کوئی مقابلہ نہیں کیا جاتا بلکہ یہ انحرافات قانونی صورت اختیار کر لیتے ہیں جیسا کہ انگلستان اور امریکہ میں ہم جنسی کی قانونی طور پر اجازت ہے اور اسقاط حمل اور کئی دیگر برائیاں بہت سارے یورپی ممالک میں قانونی طور پر مجاز ہیں، اس لئے کہ اس قسم کے نظام میں عوامی نمائندوں کا کام عوام کی خواہشات کو نافذ کرنا ہوتا ہے نہ کہ ان کی مصلحتوں کی نگرانی اور حفاظت!

یہی وہ مقام ہے جہاں ہمیں حکومت کی تیسری قسم یعنی صالحین کی حکومت کو تلاش کرنا چاہیے ایسی حکومت جس کی تجویز انبیاء کرام نے پیش کی ہے، اس حکومت میں اگر انتخابات بھی عمل میں آتے ہیں تو وہ بھی امام عادل کی زیرنگرانی اور صالحین کے

انتخاب کی اساس پر ہوتے ہیں۔

اس نوع حکومت میں جمہوریت پر سایہ فگن مذکورہ تین آفات کا نام ونشان موجود نہیں، اس میں نہ سرمایہ دار فاتح ہوتا ہے نہ آدھے لوگوں کی آمریت کی مصیبت درپیش ہوتی ہے اور نہ ماحول کی انحرافی خواہشات کے مطابق عمل کرنا پڑتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ واحد حکومت جسے دل وجان سے قبول کیا جاسکتا ہے۔ یہ الٰہی وخدائی حکومت ہے، رسول اکرمؐ اور ائمہ معصومینؑ اوران لوگوں کی حکومت' جو خاص شرائط کے حامل ہونے کی وجہ سے ان شخصیات کی طرف سے حق حکومت رکھتے ہیں' یقینی طور پر دنیا اس وقت تک عدالت، صلاح، خوشبختی اور سعادت کا چہرہ نہ دیکھ پائے گی جب تک اسے حکومت الٰہی کا سایہ میسر نہیں ہوتا۔

کیا حکومت انتصابی ہے یا انتخابی؟

اس سوال کا جواب مختلف نقطۂ ہائے نظر کی وجہ سے مختلف ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ جو کسی مذہب کے پیرو نہیں یا اگر مذہب کو مانتے بھی ہیں تو اسے ذاتی مسائل (عبادات وغیرہ) میں محدود کرتے ہوئے اسے (اکثر عیسائیوں کی طرح) معاشرتی مسائل سے مکمل طور پر بیگانہ قرار دیتے ہیں، اس سوال کا جواب ان کے نقطۂ نظر سے واضح ہے۔ ان کے کہنے کے مطابق: حکومت کی بہترین صورت یہ ہے کہ وہ جمہوری اور عوامی حکومت ہو، لیکن چونکہ اس معاملے میں اتفاق رائے غالباً ناممکن ہوتا ہے پس لوگوں کی اکثریت کے ذریعے انتخاب شدہ حکام کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔

لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اس نظریے کے طرفدار زبردستی اور عسکری بغاوت اور زور وغلبے کے باعث برسر اقتدار آنے والی حکومتوں کو بھی دل وجان سے قبول کرتے ہیں اور وہی روابط جو یہ ایک عوامی حکومت کے ساتھ رکھتے ہیں اس حکومت کے ساتھ بھی استوار کرتے ہیں اوران کے لئے یہ اہم نہیں ہوتا کہ حکومت نے کیسے اقتدار پر قبضہ کیا ہے؟ ان کی نظر میں اگر اہم ہے تو فقط یہی کہ کون برسر اقتدار ہے اور اپنے اقتدار کو برقرار رکھ سکتا ہے یا نہیں؟

یہی وجہ ہے کہ دنیا میں کہیں بھی معرض وجود میں آنے والی حکومت کے آغاز میں تھوڑا سا صبر کرتے ہیں کہ دیکھیں کیا بغاوت کامیاب ہوتی ہے یا نہیں اگر کامیاب ہوگئی اوراسے قدرے استحکام نصیب ہو گیا تو مادی دنیا کی تمام حکومتیں یکے بعد دیگرے اس حکومت کو سرکاری طور پر تسلیم کر لیتی ہیں۔

اس سے بھی زیادہ عجیب کتاب ''الفقہ الاسلامی وادلتہ'' کے مؤلف کے بقول اہل سنت کے چاروں مذاہب کا یہی عقیدہ ہے کہ امامت وحکومت قہر وغلبے کے ذریعے حاصل ہوسکتی ہے اور جو شخص طاقت اور زبردستی کے ذریعے اقتدار حاصل کرے وہ واجب الاطاعۃ حاکم ہے! اسے لوگوں کی بیعت کی ضرورت نہیں اور نہ ہی سابقہ خلیفہ کی طرف سے بطور جانشین نامزد ہونے کی اسے ضرورت ہے۔ [1]

اہل سنت کے معروف فقیہ امام احمد بن حنبل کے بیان میں یہ مطلب اور بھی واضح الفاظ میں ذکر ہوا ہے، ان کے نزدیک امامت

---

[1] الفقہ الاسلامی وادلتہ، ج۶، ص ۶۸۲

کے لیے، عدالت کی شرط نہیں ہے اور نہ ہی علم وفضل اس کی شرط ہے اور وہ ایک حدیث میں نقل کرتے ہیں:

جس کے مضمون کے مطابق ہر وہ شخص جو تلوار کے بل بوتے پر برسر اقتدار آئے وہ خلیفہ اور امیر المؤمنین ہے اور کسی کے لئے جائز نہیں کہ وہ اس کی امامت کا انکار کرے، چاہے وہ حاکم نیک ہو یا فاسق وفاجر![1]، اسی طرح کا مطلب ''منہاج السنة'' میں بھی ذکر کیا گیا ہے۔[2]

ممکن ہے کہ کوئی کہے کہ ایسے عقیدے کا اظہار بے دین افراد کی طرف سے تو امکان پذیر ہے، لیکن وہ لوگ جو اسلام اور ایمان کا دم بھرتے ہیں اور حکومت کے لئے مخصوص اقدار جیسے ایمان وعدالت کی ضرورت کا اقرار کرتے ہیں وہ ایسا فتویٰ کیوں کر صادر کرتے ہیں۔ لیکن اگر ہمیں یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہیے کہ وہ خلفائے اولین اور خلفائے بنی امیہ و بنی عباس کے کاموں کی توجیہ اور تاویل کرتے ہوئے اور انھیں برحق ثابت کرنے کے لئے ایسا کرتے تھے تو ہمیں تعجب نہیں ہوگا کہ وہ ظالم اور فاسق فاجر حکمرانوں کی کیوں تائید کرتے تھے جو تلوار کے زور پر برسر اقتدار آئے تھے۔

بہر حال اگر ہم اس مسئلے کو قرآن کی نظر سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ حکومت پہلے درجے میں خدا تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے، اس کے بعد ہر اس کے لئے جسے وہ حکومت عطا کرے۔ قرآن مجید کئی ایک آیات میں فرماتا ہے: ''إِنِ الۡحُكۡمُ إِلَّا لِلّٰهِ'' یعنی: ''حاکمیت اور فرمان فقط خدا کا حق ہے۔''[3] یہی مضمون قرآن کی دوسری آیات میں بھی نظر آتا ہے۔

''حکم'' کا اس مقام پر ایک وسیع مطلب ہے جس میں حکومت اور قضاوت دونوں ہی شامل ہیں درحقیقت توحید خالقیت اور توحید حاکمیت ایک دوسرے کے لازم وملزوم ہیں، یعنی جب ہم یہ تسلیم کرلیں کہ پورا عالم خدا کی مخلوق ہے تو ہمارے لئے یہ تسلیم کرنا بھی ضروری ہے کہ تمام مخلوق اس کی مکمل ملکیت ہے۔ طبیعی بات ہے کہ اس قسم کے عالم موجودات پر ہر کسی سے پہلے اسی کی حاکمیت مطلق ثابت ہوگی، اس لحاظ سے ہر حاکمیت کے سلسلے کو اس تک جاکر ختم ہونا چاہیے اور ہر حکومت اس کے فرمان کے مطابق تشکیل پانی چاہیے اور جو کوئی اس کے اذن وفرمان کے بغیر مسند حکومت پر متمکن ہوگا تجاوز گر اور غاصب کہلائے گا! یہ نقطۂ نظر خدا کی توحید افعالی کے سرچشمے سے پھوٹتا ہے جس کی ایک شاخ توحید مالکیت وحاکمیت ہے اور یہ وہ چیز ہے جس سے خدا پرست لوگ مکمل طور پر آگاہ ہیں بالکل جیسے الحادی مکاتب کسی پر پوشیدہ نہیں۔ (غور فرمائیں)

یہی وجہ ہے کہ ہم انبیائے خدا کو خدا کی طرف سے حقیقی حاکم سمجھتے ہیں۔ اسی طرح رسول اکرمؐ نے سب سے پہلی ممکن فرصت میں، یعنی؛ آپؐ نے مدینہ کی طرف ہجرت کے بعد تشکیل حکومت کی زمین ہموار پاکر فوراً ہی حکومت تشکیل دے ڈالی۔ آپؐ کے بعد بھی وہی لوگ حق حکومت رکھتے ہیں جو براہ راست یا آپؐ کے واسطے سے خدا کی طرف سے اس منصب کے لئے معین کئے گئے ہیں۔

---

[1] الاحکام السانیہ، ص ۲۰

[2] منہاج السنہ کتاب البغاۃ، ص ۵۱۸

[3] سورہ انعام۔ ۵۷ اور سورہ یوسف۔ ۴۰ و ۶۷۔

وہ متعدد روایات جو ائمہ اور رسولؐ کے جانشینوں کی تعداد واضح طور پر بارہ بیان کرتی ہیں اور جن کا تذکرہ شیعہ اور اہل سنت کی مشہور کتابوں میں ہوا ہے اور جنھیں ہم نے پیام قرآن کی گذشتہ جلد میں بیان کیا ہے۔

اس حق کو اہل بیت کے بارہ ائمہؑ کے لئے ثابت کرتی ہیں (چونکہ ان روایات کی کوئی بھی ایسی قابل قبول تفسیر نہیں ہے سوائے اس کے جسے بیان کیا گیا ہے)

اسی فکر کی بنیاد پر حضرت امام مہدیؑ کے زمانۂ غیبت میں بھی وہ لوگ حکومت کا حق رکھتے ہیں جنھیں آپؑ کی طرف سے اس ذمہ داری کے لئے خصوصی یا عمومی طور پر منصوب کیا گیا ہو۔ مذکورہ بالا سطور سے مجموعی طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ حکومت کو ایک توحید پرست مسلمان کی نظر میں عالم بالا سے معین ہونا چاہیے، یہاں تک کہ لوگوں کے جس حق کے ہم قائل ہیں اس حق کو بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے معین ہونا چاہیے۔ ایک خدا پرست مؤمن ارادۂ مخلوق کو جب تک وہ ارادۂ خالق پر جا کر ختم نہ ہو حکومت کی اساس کے طور پر ہرگز قبول نہیں کر سکتا۔ (غور فرمائیں)

حقیقت سے ناآگاہ بعض افراد نے لکھا ہے: "اس واضح حقیقت کو سبھی محسوس کرتے ہیں کہ لوگوں کی اکثریت جس کسی کو حکمرانی کے لئے منتخب کرتی اور اس کی پشت پناہی کرتی ہے وہی حاکم بن جاتا ہے، کیونکہ معاشرے کی اصلی طاقت عوام ہوتے ہیں...... یہ عوام ہی ہے جو کسی کو ولایت و امامت عطا کرتی ہے اور اس کی حکومت اور حاکمیت کو وجود بخشتی ہے۔" توحیدی فکر و خیال کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا۔ ہم کہتے ہیں کہ توحیدی فکر اس بیان کے برعکس مطلب کو بیان کرتی ہے اُس کے مطابق: کسی کو ولایت دینا اور اس کی حاکمیت کو وجود عطا کرنا فقط خدا کا کام ہے اور اگر اس سلسلے میں عوام کو کوئی حق حاصل بھی ہے تو اس کے اذن و زمان کی وجہ سے ہے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ توحیدی نظریہ، حکومت کو عالم بالا سے دیکھتی ہے جبکہ الحادی افکار نیچے سے اوپر نگاہ کرتے ہیں!

حکومت اسلامی کی ماہیت

گذشتہ بحث کے پیش نظر حکومت اسلامی کی حقیقت اور ماہیت کے بارے میں تحقیق زیادہ مشکل اور پیچیدہ نہیں کیونکہ توحید حاکمیت جو توحید افعالی کا ایک شعبہ ہے' کو قبول کرنے کے ساتھ ثابت ہو جاتا ہے کہ حکومت کا حق ذاتی طور پر خدا کو حاصل ہے اس کے بعد ہر اس کے لئے ثابت ہے جسے وہ اس منصب کا اہل قرار دے۔ اس لحاظ سے اسلامی حکومت نہ آمرانہ حکومت ہے نہ جمہوری بلکہ حکومت کی ایک اعلیٰ اور برتر قسم، یعنی خدائی اور الٰہی حکومت ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ لوگوں کی آراء اور ان کے مشورے کا حکومت کی تشکیل میں کوئی کردار نہ ہو اور ان کی طرف سرے سے توجہ ہی نہ کی جائے۔

اس لئے کہ خدا جو ''مالِكُ الْمُلوك'' اور ''أَحْكَمُ الحاكِمِين'' ہے جب مشورے اور لوگوں کی آراء پر توجہ دینے کا حکم دے رہا ہے تو ان امور کو بھی مشروعیت اور جواز حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ قرآن مجید کی دو آیتوں میں واضح طور پر شوریٰ کا حکم دیا گیا ہے۔

سورۂ شوریٰ کی آیت ۳۸ میں' کہ اسی آیت کی وجہ سے اس سورے کا نام ''شوریٰ'' رکھا گیا ہے' قرآن مجید اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے والے مومنین کی سات واضح صفات کو بیان کرتے ہوئے جن میں سے ایک اہم امور میں باہمی مشورہ ہے، فرماتا ہے: ''وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ'' ''ان کے اُمور باہمی مشورے سے تشکیل پاتے ہیں۔'' اور سورۂ آل عمران کی آیت ۱۵۹ میں اس سے بھی بڑھ کر مومنین کے بارے میں رسول اکرمؐ کو تین اہم تاکیدات کی گئی ہیں جن میں سے ایک حکم اہم امور میں ان کے ساتھ مشاورت ہے؛ ارشاد حق تعالیٰ ہے: ''وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ'' ''اہم امور میں ان کے ساتھ مشورہ کرو''۔

پس فرمان خدا کے مطابق لوگوں کی آراء کا احترام کرنا شرعی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسری جانب سے رسول اکرمؐ اور ان کے معصوم جانشین اور علماء جو ولی فقیہ کے عنوان سے اپنی شرعی حیثیت کو حاصل کرتے ہیں اس بات پر مامور ہیں کہ وہ بندگان خدا کی مصلحتوں کو ہر جگہ اپنی توجہ کا مرکز قرار دیں اور یہ تسلیم شدہ بات ہے کہ لوگوں کی مصلحت تقاضا کرتی ہے کہ وہ بھی کسی نہ کسی طرح حکومت کے امور میں شریک اور حصہ دار ہوں اور ان کی آراء پر توجہ دی جائے، اس لحاظ سے لوگوں کی آراء پر توجہ دینا ایک الٰہی رخ اختیار کر لیتا ہے۔

دوسرے الفاظ میں حکومت الٰہی اسی وقت متناسب اور ہم آہنگ ہوتی ہے جب وہ عالم بالا سے نافذ العمل ہونے کی صلاحیت رکھتی ہو اور اس صلاحیت کو لوگوں کی امور حکومت میں شرکت کے بغیر حاصل نہیں کیا جا سکتا، درحقیقت احکام الٰہی کا جاری اور نافذ کرنا واجب ہے اور لوگوں کی امور حکومت میں شرکت اس واجب کا مقدمہ شمار ہوتا ہے اور مقدمۂ واجب، واجب ہوتا ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ حکومت اسلامی کا جوہر حکومت الٰہی ہے، لیکن یہ حکومت آخر کار عوامی حکومت کے طور پر ظاہر ہوتی ہے، انبیاء کرامؑ، ائمہ اطہارؑ اور ان کے جانشینوں کی اور نامزدگی الٰہی حکومت کے جوہر کو جبکہ ان حضرات کا لوگوں کے ساتھ مشورہ اور ان کی آراء کا احترام (کہ یہ بھی خدا کے حکم سے ہے)

حکومت الٰہی کے عوامی جوہر کو تشکیل دیتا ہے۔

وہ لوگ جن کا خیال یہ ہے کہ اسلامی حکومت مکمل طور پر لوگوں کی آراء (ووٹ) پر اعتماد کرتی ہے اور وہ اس کے الٰہی عنصر کو فراموش کر دیتے ہیں وہ بھی غلط سوچ رکھتے ہیں، اور وہ لوگ جو فقط الٰہی پہلو کو مدنظر رکھتے ہیں اور عوامی رائے اور مشورے کو نظر انداز کر دیتے ہیں وہ بھی غلط فہمی کا شکار ہیں۔ آنے والی ابحاث یعنی بیعت اور شوریٰ کی ابحاث میں اس بارے میں مزید تفصیلی گفتگو ہوگی۔ بہر حال اس حقیقت سے کس طرح انکار کیا جا سکتا ہے کہ اس حکومت میں عوام کی شرکت حکمرانوں کو طاقت اور قوت بخشتی ہے اور ان کی شرکت کے بغیر ان سے کوئی کام بر نہیں آتا، چنانچہ امیر المؤمنینؑ خطبہ شقشقیہ میں فرماتے ہیں:

اَما وَ الَّذی فَلَقَ الْحَبَّۃَ وَ بَرَءَ النَّسَمَۃَ لَوْلا حُضُورُ الْحاضِرِ وَ قِیامُ الْحُجَّۃِ بِوُجُودِ النّاصِرِ وَ ما اَخَذَاللہُ عَلَی الْعُلَماءِ اَلاّ یُقارُّوا عَلی کِظَّۃِ ظالِمٍ وَلا سَغَبَ مَظْلُومٍ لَاَلْقَیْتُ حَبْلَھا عَلی غارِبِھا:

''آگاہ رہو اس خدا کی قسم جس نے دانے کو پھاڑا اور انسانوں کو پیدا کیا، اگر بہت سارے لوگ میرے گرد جمع نہ ہوئے ہوتے اور وہ میری مدد کے لئے اٹھ کھڑے نہ ہوتے اور اس طرح مجھ پر حجت تمام نہ ہو چکی ہوتی، اگر خدا کا وہ عہد جو اس نے علماء اور اہل دانش سے لیا ہے کہ ظالموں کی پرخوری اور مظلوموں کے فاقوں کی نسبت خاموش نہ رہیں تو میں ناقۂ خلافت کی مہار کو چھوڑ دیتا اور اس سے منہ پھیر لیتا۔'' (نہج البلاغہ، خطبہ ۳)

یہ تعبیر اس بات کی ترجمانی کرتی ہے کہ عوامی حمایت خدا کی طرف سے منصوب ولی کے لئے بھی اتمام حجت کا باعث بن جاتی ہے۔ بلاشبہ آنجنابؑ کی ولایت خدا کی طرف سے رسول اکرمؐ کے ذریعے ثابت شدہ تھی اور یہ ولایت اس وقت بھی موجود تھی۔ اس کے برعکس بعض ناآگاہ افراد کا کہنا یہ ہے کہ آپؑ کی ولایت اس وقت ثابت نہیں تھی لیکن عملی اور نافذ العمل ہونے کے اعتبار سے لوگوں کی حمایت کی محتاج تھی اور اس کے بغیر کوئی چارہ کار نہ تھا۔ فقہاء اسلام کے بارے میں بھی جیسا کہ کہا جائے گا؛ تمام فقہاء کے لئے ولایت ثابت ہے، لیکن اس ولایت کو عملی جامہ پہنانا فقط اس صورت میں میسر ہے جب اس ولایت کو لوگوں کی حمایت اور پشت پناہی حاصل ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ولی فقیہ جو لوگوں کی آراء حاصل کر سکے دوسرے فقہاء کی نسبت ترجیح کا حامل قرار پائے گا کیونکہ وہ دوسروں کی نسبت بہتر طور پر اپنی ولایت کو عملی جامہ پہنا سکتا ہے، جبکہ دوسرے حضرات ایسا کرنے سے قاصر ہوتے ہیں (اس کی مزید تفصیل انشاءاللہ اپنے مقام پر آئے گی)۔

اس لحاظ سے اگر اس قسم کے مقامات پر انتخابات کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو اس کا مفہوم یہ نہیں کہ یہ منصب انھیں لوگوں کی طرف سے ملتا ہے۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ توحیدی نقطۂ نظر سے حق ولایت فقط خدا تعالیٰ کے لئے مخصوص ہے اور یہ منصب ان لوگوں کے لئے ہے جنھیں خدا نے بغیر واسطے کے یا اپنے اولیاء (ائمہ) کے ذریعے معین فرمایا ہے اور لوگوں کی آراء کو اصیل اور حقیقی قرار دینے اور حکومت کے جوہر الٰہی کی نفی کرانے کا سرچشمہ مشرکانہ اور غیر توحیدی نظریات ہیں۔ مراد یہ ہے کہ لوگ فقہاء میں سے کسی ایسے ایک فرد کی

حمایت کرتے ہیں جو دوسروں کی نسبت زیادہ لائق باصلاحیت اور جامع تر ہوتا ہے۔ اگر انتخاب کرنا لوگوں کا کام ہوتا تو لازم نہیں تھا کہ فقہاء ہی میں سے کسی کو انتخاب کریں بلکہ وہ جسے چاہتے انتخاب کر سکتے تھے چاہے وہ فقیہ ہوتا یا غیر فقیہ۔

مختصر یہ کہ لوگ کسی کو مسند حکومت پر نہیں بٹھاتے کیونکہ یہ خدا کا مخصوص حق ہے، لوگ فقط یہ کام کرتے ہیں کہ ان افراد میں سے جن کو خدا نے حق ولایت دیا ہے، کسی ایک کو انتخاب کر کے اس کی حمایت اور پشت پناہی کرتے ہیں اور اگر اسے انتخاب سے تعبیر کیا جاتا ہے، تو اس کا مفہوم وہ نہیں جو مادہ پرست دنیا کے انتخاب کا ہوتا ہے اور قرائن وشواہد اس حقیقت کو ثابت کرتے ہیں کہ یہ دو مختلف قسم کے انتخابات ہیں۔ (غور فرمائیں)

اس بناء پر جیسا کہ امیر المؤمنین علیؑ لوگوں کی بیعت سے قبل ولی خدا تھے جیسا کہ آیت ولایت واضح طور پر دلالت کرتی ہے:

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ۝۵۵ ' (مائدہ/ ۵۵)

کہ یہ ولایت خدا نے علیؑ کو عطا کی اور جملہ "مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا عَلِيٌّ مَوْلَاهُ"، میں رسول اکرمؐ نے خدا تعالیٰ کی طرف سے آپؑ کو اس منصب پر فائز کیا، لیکن لوگوں کا دوسروں کی بیعت کر لینا اس بات کا سبب بنا کہ آپؑ ایک عرصے تک اپنی ولایت کو عملاً نافذ نہ کر سکے اور فقط اس وقت ولایت کے عملی ہونے کا سامان فراہم ہوا جب لوگوں نے آپؑ کی بیعت کر لی، جی ہاں! لوگوں نے اس ولایت کے نفاذ کی راہ ہموار کی نہ یہ کہ انھوں نے آپؑ کو مقام ولایت پر پہنچایا۔

فقہاء سے متعلق بھی صورتحال یہی ہے وہ ان دلائل کے مطابق، جن کا ذکر آئندہ ہوگا، اگر اجتہاد اور عدالت کے علاوہ اچھے منتظم، مدبر اور زمانے کے احوال سے آگاہی کی شرائط کے حامل ہوں تو ان کے لئے خدا کی طرف سے ولایت ثابت ہے، لیکن اس ولایت کی عملی صورت اسی وقت ممکن ہے جس کے لئے مقدمات کی ضرورت ہے جن میں سے ایک اہم مقدمہ عوامی حمایت ہے۔ رسول اکرمؐ بھی جب مکہ میں تھے حکومت الٰہی نہ تشکیل دے سکے، بلکہ جب مدینہ میں داخل ہوئے اور انھیں کافی مقدار میں عمومی حمایت میسر آئی اور رکاوٹیں دور ہوئیں تو پھر آپؐ نے حکومت کی بنیاد رکھی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ رسول اکرمؐ مکہ میں ولایت سے محروم تھے اور مدینہ میں لوگوں کی طرف سے آپؐ کو ولایت حاصل ہوئی۔ (غور فرمائیں)

ولایت خبری اور انشائی؟

بعض لوگوں کی رائے میں جن علماء نے مسئلہ ولایت فقیہ پر گفتگو کی ہے وہ دو مختلف نظریوں کے حامل ہیں۔ بعض نے ولایت کو بمعنی خبری قبول کیا ہے جبکہ بعض اس کے مفہوم انشائی کے قائل ہیں اور یہ دونوں مفہوم اپنی حقیقت میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ چونکہ پہلا مفہوم یہ کہتا ہے: عادل فقہاء خدا تعالیٰ کی طرف سے ولایت پر منصوب ہیں جبکہ دوسرا یہ کہتا ہے کہ لوگ ضروری شرائط کے حامل فقیہ کو ولی فقیہ کے طور پر انتخاب کریں۔ لیکن ہماری رائے میں یہ تقسیم بے بنیاد ہے، کیونکہ جس قسم کی بھی ولایت ہو وہ انشائی ہی ہے، خواہ خدا تعالیٰ

اسے انشاء کرے (وجود بخشے) یا رسول اکرمؐ یا ائمہ طاہرینؑ، مثلاً امامؑ یہ فرمائیں: اِنّي قَدْ جَعَلْتُهُ حاكِماً: میں اس فقیہ کو جو ایمان وتقویٰ کی شرائط کا حامل ہے، ولایت اور حکومت پر منصوب کرتا ہوں یا بالفرض لوگ اسے منتخب کریں اور حکومت وولایت کو اس کے لئے انشاء کریں۔

دونوں قسمیں انشائی ہیں، فرق صرف اس بات میں ہے کہ ایک جگہ انشاء حکومت خدا کی جانب سے ہے اور دوسری جگہ لوگوں کی طرف سے، اور ''خبری ہونا'' اس جگہ اس بات کی علامت ہے کہ اس کلام کا متکلم اخبار (خبر دینے) اور انشاء (وجود بخشنے) کے درمیان فرق کو صحیح طور پر نہیں سمجھ پایا، یا اگر ان دو اصطلاحوں سے آگاہ بھی ہے تو اس نے حقیقت سے چشم پوشی کی ہے۔

صحیح تعبیر اور مفہوم یہ ہے کہ ولایت ہر صورت میں انشائی ہے اور ولایت ان مقامات ومناصب میں سے ہے جو انشاء کے بغیر وجود حاصل نہیں کر سکتے، فرق صرف اس میں ہے کہ اس مقام کو انشاء اور عطا کرنا ممکن ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف ہو یا لوگوں کی طرف سے، توحید پرست مکاتب فکر اس (ولایت کو) خدا کی طرف سے سمجھتے ہیں (اور جس جگہ بھی لوگوں کی طرف سے ہو ضروری ہے کہ پھر بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے ہو) جبکہ الحادی مکاتب اسے بہرحال لوگوں کی طرف سے خیال کرتے ہیں۔

اس لحاظ سے جھگڑا ''اخبار'' و''انشاء'' کا نہیں، نزاع اس بات میں ہے کہ کون (ولایت کو) انشاء کرے، خالق یا مخلوق؟ بالفاظ دیگر حکومت اسلامی کی شرعی حیثیت کی بنیاد آیا حکومت کے سارے سلسلۂ مراتب میں خدا کا اذن اور اس کی اجازت ہے یا لوگوں کی اجازت اور ان کا اذن؟ مسلم ہے کہ الٰہی نقطۂ نظر کے ساتھ جو سازگار ہے وہ پہلی صورت ہے نہ کہ دوسری۔

حکومت اور وکالت

بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ عوامی حکومت ایک قسم کی وکالت ہے نہ کہ کسی منصب کا عطا کرنا، اس لئے کہ مالک الملوک خدا ہے اسی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کس کو یہ منصب بطور ہدیہ عطا کرے۔ دوسرے لفظوں میں جس طرح ذاتی اور نجی امور میں ہر ایک کو حق حاصل ہے کہ وہ کس شخص کو اپنا وکیل مقرر کرے اور یہ عمل قطعاً جائز ہے، اسی طرح اجتماعی اور معاشرتی امور میں بھی ممکن ہے کہ لوگ کس کو اپنا وکیل مقرر کریں جو ان کی طرف سے اجتماعی امور کا انتظام کرے اور جب تک یہ وکالت باقی ہے لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کے نتائج کو قبول کریں۔

لیکن یہ بات کئی وجوہات کی بناء پر صحیح نہیں کیونکہ **اولاً:** معاشرے کا وکیل کیا حق رکھتا ہے کہ وہ اقلیت کے امور میں بھی مداخلت کرے فرض کریں کہ اکاون ملین افراد نے کسی کو اپنا وکیل مقرر کیا ہے اور انچاس ملین افراد نے کسی دوسرے کو، پس کون سی دلیل کی بنیاد پر اکاون ملین افراد کا وکیل انچاس ملین افراد کے امور میں مداخلت کر سکتا ہے۔

ثانیاً: دنیا کے بہت سے انتخابات میں کسی وجہ سے لوگوں کی ایک بڑی تعداد اپنے ووٹ کا استعمال نہیں کرتی اور وہ کسی کو اپنے وکیل کے طور پر منتخب نہیں کرتے کیا لازم ہے کہ وہ دوسروں کے اختیار کردہ وکیل کی پیروی کریں؟!

ثالثاً: کسی عقد اور معاملے کی وکالت جائز ہے اور موکل جب بھی چاہے وکیل کو وکالت سے معزول کرسکتا ہے، جبکہ دنیا کے سیاسی نظام میں لوگ اپنے نمائندوں یا صدارت کے لئے منتخب افراد کو ہرگز معزول نہیں کرسکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ جمہوریت کے مسئلے کو اس قسم کے عنوانات کے تحت جگہ نہیں دی جاسکتی، جمہوریت کی ایک حقیقت و ماہیت ہے جو اسی کے ساتھ مخصوص ہے اور در حقیقت ایک قسم کا اجتماعی معاہدہ ہے جس کا سرچشمہ ضرورت ہے، کیونکہ معاشرہ بہرحال ایک حکومت کا خواہاں اور طلبگار رہتا ہے اور دوسری جانب سے لوگوں کا اتفاق نظر اس مسئلے میں ممکن نہیں، پس بے چارگی اور مجبوری کی حالت میں اکثریت کی رائے کے پیچھے چلنا ضروری ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ اقلیت اکثریت کے سامنے سر تسلیم خم کرے، چونکہ کہ ان کے پاس معاشرے کے انتظام اور تدبیر کی اس کے علاوہ کوئی راہ موجود نہیں اگرچہ یہ عمل مکمل طور پر عدل و انصاف پر مبنی نہیں۔

رہی بات ان لوگوں کی جو حکومت کو خدا کی طرف سے عطیہ قرار دیتے ہیں تو وہ ایک دوسری راہ کی تجویز پیش کرتے ہیں اور وہ یہ کہ دیکھیں کہ خدا تعالیٰ نے حکومت کس کے اختیار میں دی ہے؟ اگرچہ لوگوں کے نقطۂ نظر مختلف ہوں اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب انتخابی امیدوار اسلامی تعلیم، لیاقت اور شائستگی کے اعتبار سے متعدد ہوں۔

ایسے میں لوگوں کی رائے قابل قبول فرد کے تعیین اور انتخاب میں سرنوشت ساز ہوسکتی ہے اور اس امیدوار کو دوسروں پر ترجیح حاصل ہوجاتی ہے جسے اپنی حکومت کے نافذ العمل ہونے کے لئے زیادہ سے زیادہ عوامی حمایت حاصل ہو۔ بیعت سے مربوط مسائل اس مسئلے کو واضح تر کردیتے ہیں، انشاء اللہ حکومت میں بیعت کے کردار اور بیعت کی شرائط اور اس کی ماہیت و حکومت کے بارے میں آئندہ ابحاث میں تفصیل کے ساتھ گفتگو کی جائے گی۔

قرآنی نقطہ نظر سے دین اور حکومت کا تعلق

یورپی ممالک میں سیاست سے دین کی جدائی کا نعرہ بہت رائج ہے، بلکہ شاید ان کے مسلمات میں سے ہے یہی وجہ ہے کہ حکومت اسلامی جس میں دین اور سیاست آپس میں مخلوط ہوتے ہیں، کی تشکیل سے وہ وحشت اور دکھ محسوس کرتے ہیں اور اس کی دو وجوہات ہیں:

ا۔وہ دین وآئین جو مغربی معاشروں میں موجود ہے، دین عیسائیت ہے اور معلوم ہے کہ یہ دین وقت کے ساتھ ساتھ بے پناہ تحریفات کے نتیجے میں مکمل طور پر انفرادی اور خالق ومخلوق کے رابطے کی صورت اختیار کر گیا ہے، جس کی تعلیمات صرف چند ایک اخلاقی نصیحتوں پر مشتمل ہیں اور اس دین کی مذکورہ تعلیمات کا معاشرتی اور سیاسی مسائل کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ان معاشروں میں دیندار اور بے دین افراد میں فرق یہ ہے کہ دیندار چند اخلاقی مسائل کا پابند ہوتا ہے اور ہفتے میں ایک بار چرچ جاتا اور کچھ وقت دعا اور مناجات میں گذارتا ہے، لیکن لادین افراد ان اخلاقی مسائل کے پابند نہیں ہوتے (اگرچہ وہ ان اخلاقی مسائل کی انسانی نہ کہ دینی قدر وقیمت کے عنوان سے احترام کے قائل ہیں) اور ہرگز چرچ کا رخ نہیں کرتے۔

۲۔عیسائیوں کو اہل کلیسا (چرچ) کی حکومت کی طرف سے وہ دردناک واقعات جو قرون وسطیٰ میں ''تفتیش عقائد'' کے دوران پیش آئے اس بات کا سبب بنے کہ وہ دین کو ہمیشہ کے لئے سیاست سے جدا کردیں۔اس کی وضاحت یہ ہے کہ: ارباب کلیسا نے قرون وسطیٰ (درمیانی صدیوں) میں یورپ کے لوگوں کے تمام اجتماعی اور سیاسی امور کی باگ ڈور کو اپنے ہاتھوں میں لے رکھا تھا اور پوپ صاحبان اسی براعظم کے تمام لوگوں پر پوری ٹھاٹھ کے ساتھ حکومت کرتے تھے۔آخرکار یہ حکومت خودغرضی خودسری اور یکسر آمریت میں تبدیل ہوگئی۔

یہاں تک کہ اس نے ہر علمی تحریک کی شدید مخالفت کی اور ہر علمی پیشرفت کو مذہب کے خلاف قرار دے کر دبا دیا اور ''عقائد کی تفتیش'' کے نام سے عدالتیں تشکیل دے کر بے شمار لوگوں کو ان عدالتوں میں پیش کیا اور ان کے خلاف کاروائی انجام دی، بعض لوگوں کا سرتن سے جدا کردیا، بعض کو زندہ حالت میں نذر آتش یا زندان کے سپرد کیا جن میں سے اکثر علماء طبیعیات تھے، تمام بادشاہ ان ارباب کلیسا سے احکام لیتے اور ان کی مکمل اطاعت کرتے تھے! اس کے علاوہ انھوں (اہل کلیسا) نے بے پناہ مال ودولت جمع کر رکھی تھی اور اپنے لئے بڑی عیش وعشرت کے سامان فراہم کر رکھے تھے۔

ان سارے امور نے لوگوں کو ان کے خلاف شورش پر مجبور کیا، خاص طور پر سائنسی علوم کے علماء نے ان کے خلاف سخت موقف اختیار کیا اور دین وسیاست کی جدائی اور سائنس ودین میں تضاد کا نعرہ ہر طرف سے گونجنے لگا، اس کے بعد اس گروہ کی کامیابی کے ساتھ ہی کلیسا اور اس کے حکمرانوں کو معاشرے اور حکومت سے نکال باہر کیا گیا اور فقط ایک ہی ملک جس میں کلیسا کی بادشاہت قائم رہی ''واٹیکان''

ہے جو اس قدر چھوٹا ہے کہ اس کا رقبہ ایک مربع کلومیٹر سے بھی کم ہے یعنی ایک چھوٹے سے گاؤں کے برابر۔[1]

یہ سب وہ تبدیلیاں تھیں جو ان خاص حالات میں یورپ میں رونما ہوئیں۔ بعدازاں جب اسلامی ممالک سے طلباء پڑھنے کے لئے یا تاجر لوگ تجارتی اغراض سے یورپ گئے تو واپسی پر اس طرز فکر کو مشرق کی اسلامی دنیا میں سوغات کے طور پر لائے یعنی وہ اسلام اور تحریف شدہ عیسائیت کے درمیان عظیم تفاوت اور فرق کو سمجھے بغیر اور اسلامی ممالک پر حاکم ثقافت اور کلیسا کی ثقافت کے بارے میں سوچے بغیر دین اور سیاست میں جدائی کا نعرہ بلند کرنے لگے۔

افسوسناک بات یہ ہے کہ بعض اسلامی ممالک نے اس پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر اس سازش کے سامنے اپنے سر خم کر دیئے ہیں اور اسے ایک بنیادی قانون کے طور پر اختیار کر لیا ہے۔ توجہ رہے کہ مغربی حکومتوں نے جو ہمیشہ اسلام کی طاقت سے ہراساں رہی ہیں اور ہیں، اس مسئلے کو بڑی اہمیت دی ہے اور مغرب زدہ ممالک مثلاً ترکی نے اسے اپنے لیے امتیازی عنوان قرار دیا ہے اور ایک سیکولر (غیر مذہبی) حکومت تشکیل دے رکھی ہے۔ یہ سب کچھ اس حال میں رونما ہوا جب بہت سارے اسلامی ممالک اور امت اسلامی کے بیدار، مسلمان افراد اس سازش کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے، وہ سازش جو اس بنیاد پر استوار کی گئی کہ مسلمانوں کو اسلام سے جدا کر کے اسے آج کل کی عیسائیت کی طرح قرار دے۔ جس میں خالق اور مخلوق کا ظاہری تعلق ہو اور جس کا اجتماعی اور معاشرتی مسائل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب ایران میں آنے والا اسلامی انقلاب کامیاب ہوا اور ایک اسلامی انقلابی حکومت کی تشکیل ہوئی تو تمام اہل یورپ حیرت سے انگشت بدنداں رہ گئے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ زمام حکومت مذہب کے ہاتھوں میں ہو؟ کیا ممکن ہے کہ دین ہمارے زمانے کی ضروریات کو پورا کر سکے؟ بعدازاں جب انھوں نے دیکھا کہ اس حکومت کی جڑیں مضبوط اور یہ مزید اور پائیدار ہو چکی ہو تو اسے سرحدی دیواروں میں محدود کرنے کی کوشش کرنے لگے تاکہ یہ دوسرے اسلامی ممالک کے لئے نمونہ اور مثال نہ بن سکے۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے بے تحاشا تخریبی کاروائیاں شروع کر دیں جن کی تفصیل اس موضوع پر لکھی جانے والی کتابوں سے میں دیکھی جا سکتی ہے۔

خوش بختی سے اہل مغرب کی یہ سازشیں ناکام ثابت ہوئیں اور اب حکومت اسلامی کی تاسیس و تشکیل کی فکر اسلامی دنیا کے اکثر ممالک یعنی براعظم ایشیا اور افریقہ میں ایک زندہ و نجات بخش فکر کے طور پر سے رونما ہونے لگی ہے اگرچہ اہل مغرب کا رویہ ان افکار کو روکنے کے لئے نہایت شدت کا حامل رہا ہے اور وہ اس سلسلے میں انواع و اقسام کے الزامات اور جھوٹے پروپیگنڈے سے قطعاً گریز نہیں کرتے۔

البتہ یہ کہ اسلام اصولی، فروعی اور تاریخی اعتبار سے کس طرح مسئلہ حکومت کے ساتھ مخلوط ہے، کوئی پیچیدہ مسئلہ نہیں اور جو شخص قرآن مجید اور سنت رسولؐ و ائمہ معصومینؑ کا مطالعہ کرے اور اسی طرح تاریخ اسلام پر بھی غور کرے تو واضح طور پر اسے اس بات کا علم ہو

---

[1] لغت نامہ دھخدا اور فرہنگ معین میں واٹیکان کا رقبہ ۴۴ ہیکٹر بیان کیا گیا ہے (جو نصف کلومیٹر مربع سے بھی کم ہے) اور ذرائع کے مطابق اس کی آبادی ۵۲۵ اور بعض کے مطابق ۷۰۰ یا ایک ہزار افراد پر مشتمل ہے دراصل یہ ملک کلیسا اور اس کا انتظام چلانے والے اداروں کی عمارات پر مشتمل ہیں، واٹیکان کا اپنا ریلوے سٹیشن، ڈاکخانہ اور ریڈیو سٹیشن ہے۔ یہ مستقل اور علیحدہ حکومت ہے جس کا اپنا قانون ہے او ور پوپ کے دربار میں تقریباً ۵۰ ملکوں کی نمائندگی موجود ہے۔ قابل توجہ یہ کہ یہ ملک اٹلی کے دارالحکومت روم کے کے عین واسط میں واقع ہے (لغت نامہ دھخدا، فرہنگ معین اور المنجد فی الاعلام)۔

جائے گا کہ حکومت اور سیاست کو اسلام سے جدا کرنا ایک ناممکن عمل ہے۔ جس کا مطلب اسلام کو اسلام سے جدا کرنا ہے!

اس بات کی شاہد ہر چیز سے پہلے خود تاریخ اسلام ہے جیسا کہ اس سے قبل بھی اشارہ کیا جاچکا ہے کہ مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کے بعد رسول اکرمؐ نے جو پہلا کام انجام دیا وہ اسلامی حکومت کا قیام تھا، آپؐ بخوبی جانتے تھے کہ انبیاء کرامؑ کی نبوت اور بعثت کے مقاصد یعنی تعلیم و تربیت، عدل و انصاف کا قیام اور انسان کی عظمت و سعادت وغیرہ کو حکومت تشکیل دیئے بغیر حاصل نہیں کیا جاسکتا، یہی سبب ہے کہ آپؐ نے سب سے پہلی ممکنہ فرصت میں خدا کے فرمان کے مطابق حکومت کی بنیاد رکھی۔ آپؐ نے ایک لشکر تشکیل دیا جس میں مہاجرین و انصار شریک تھے اور (عورتوں، بچوں اور اپاہجوں کو چھوڑ کر) ہر عمر کے ہر شخص کے لئے اس میں شریک ہونا لازمی تھا، اس چھوٹے سے لشکر کے لئے اسلحہ، سواری اور راشن کی فراہمی خود لوگوں کی ذمہ داری تھی اور کچھ حصہ حکومت اسلامی کے ذمے تھا، اور جس قدر خود سر دشمنوں کے خلاف جنگ کا دامن وسیع ہوتا اسی قدر اسلامی لشکر کی تنظیم و تشکیل وسیع تر ہوتی چلی جاتی۔

(اسی اثناء میں) زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم نازل ہوا اور پہلی بار جنگی اخراجات اور محروموں کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے بیت المال وجود میں آیا۔ قضاوت اور جرائم کی سزاؤں کے بارے میں (احکام) یکے بعد دیگرے نازل ہوئے اور حکومت اسلامی جدید مراحل میں داخل ہوگئی۔ اگر اسلام میں حکومت نہیں ہے تو فوج، بیت المال، قضاوت اور مجرموں کی سزا کے نظام کا کیا معنی مراد لیا جاسکتا ہے۔ یہی وضع اور صورتحال ابتدائی خلفاء، اموی اور عباسی خلفاء کے ادوار میں بھی جاری رہی اور ان لوگوں نے رسول اکرمؐ کا خلیفہ ہونے کے دعویٰ کے ساتھ لوگوں پر حکومت کی، اگرچہ ان کی حکومت ظالمانہ اور قوانین اسلامی کے دائرے سے خارج تھی، لیکن جو کچھ بھی تھا بہرحال اس بات کی علامت تھا کہ حکومت کی تشکیل اسلام کا ابتدائی اور بنیادی مسئلہ ہے۔

ائمہ طاہرینؑ پر کی جانے والی سختیاں، امام حسینؑ کا ظلم کے خلاف قیام، امام علی بن موسیٰ الرضاؑ کی ولایت عمومی، امام موسیٰ کاظمؑ کی اسیری، امام علی نقیؑ اور امام حسن عسکریؑ کی سامرا میں جلاوطنی اور حکومت کے خلاف قیام کے خوف سے ان کی نظر بندی اور نگرانی یہ سب امور بخوبی ظاہر کرتے ہیں کہ ائمہ معصومینؑ عدل الٰہی پر مبنی حکومت کی تشکیل کو اپنا فرض سمجھتے تھے اور انھوں نے اس کی خاطر ہر مناسب فرصت سے استفادہ کیا اور ان کے دشمن بھی اس واقعیت سے پوری طرح واقف تھے۔ اگر اسلام موجودہ عیسائیت کی طرح چند اخلاقی احکام ہی میں محدود ہوتا تو تاریخ اسلام میں موجود ان واقعات کا کوئی مفہوم نہ ہوتا کیونکہ کوئی بھی ایک سادہ سے معلم اخلاق، گوشہ نشین زاہد یا اس راہنما کی جو فقط با جماعت نماز پڑھانے پر اکتفا کرے اتنی شدید مخالفت نہیں کرتا۔

معارضہ اور مخالفت اسی وقت شروع ہوتی ہے جب حکومت کا معاملہ در پیش ہو، ادھر سے بہت سارے احکام جو قرآن مجید میں ذکر ہوئے ہیں پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ حکومت کا ہونا ضروری ہے جس کی حدود میں رہ کر ان پر عمل کیا جائے، دوسرے لفظوں میں یہ احکام، سیاسی احکام ہیں اور اسلامی معاشرے کی سیاسی روش کو معین کرتے ہیں۔ مسئلہ جہاد مجاہدین کے فرائض اور جنگی مال غنیمت اور شہیدوں اور اسیروں کے بارے میں قرآن کی بہت ساری آیات ہیں، کیا اس قسم کے مسائل کا دائرہ حکومت سے باہر ہونا، قابل توجیہ ہے؟ قرآن کی بہت ساری آیات قاضی کے فرائض، قضاوت کے احکام، حدود کے جاری کرنے اور قصاص وغیرہ کی طرف ناظر ہیں جبکہ بہت ساری آیات

کی نگاہ بیت المال کی طرف ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، زبانی امر ونہی کی صورت میں تمام لوگوں کی ذمہ داری ہے،لیکن امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے وہ مراحل جن میں سختی اور بعض اوقات مسلحانہ کارروائی کی ضرورت پڑتی ہے،حکومت کے بغیر ممکن نہیں ہوتے۔

معاشرتی عدالت،عدل وانصاف اور ساری دنیا میں تبلیغ کی آزادی محض اخلاقی نصیحتوں کے ذریعے انجام نہیں دی جاسکتی، یہ فقط حکومت ہی کا کام ہے کہ وہ میدان میں آئے اور مظلوموں کو ظالموں کے چنگل سے نجات دلائے اور استحصال شدہ افراد کے حقوق،استحصال گروں سے واپس لے اور توحید کی صدا کو ذرائع ابلاغ کے توسط سے پوری دنیائے انسانیت کے کانوں تک پہنچائے۔

اسی مضمون پر مبنی بیانات،سنت رسول اکرمؐ اور روایات ائمہ طاہرینؑ میں وسیع انداز میں ذکر ہوئے ہیں جو فقہ اسلامی اور کتب فقہی کے ایک بڑھے حصے کو تشکیل دیتے ہیں اور اگر ہم چاہیں کہ (حکومت کے متعلق) ان مسائل کو روایات اور فقہی کتابوں سے جدا کردیں تو اسلامی کتابوں میں کوئی قابل ذکر چیز باقی نہیں رہتی۔جیسا کہ پہلے بھی اشارۃً کہا جا چکا ہے کہ فقہی کتابوں یعنی فقہ کو تین حصوں ''عبادات''،''معاملات''اور''سیاسیات''،میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

''عبادات''،مخلوق اور خالق کے درمیان رابطے پر مشتمل ہیں۔

''معاملات''لوگوں کی آپس میں رابطے پر مشتمل ہیں۔

جبکہ''سیاسیات''لوگوں کے حکومت کے ساتھ رابطے کا نام ہے۔

لیکن اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوجائے گا کہ فقط سیاست ہی حکومت تشکیل دیئے بغیر ممکن نہیں بلکہ معاملات بھی حکومت کے بغیر نہیں چل سکتے چونکہ اگران کی انجام دہی پر حکومت کی نگرانی نہ ہوتو بہت زیادہ حرج ومرج پیدا ہوسکتا ہے محروم اور استحصال شدگان کے حقوق پائمال ہوجاتے ہیں اور معاشرہ امیر وغریب دوطبقوں میں بٹ جاتا ہے اور انواع واقسام کی مصنوعی قلت لوگوں کی پریشان حالی کا باعث بنتی ہیں۔یہاں تک کہ عبادات بھی ایک طاقتور اور عادل حکومت کے بغیر بے سروسامانی کا شکار ہوسکتی ہیں ان میں سے ایک اہم عبادات حج ہے جس کا سیاسی پہلو نہایت قوی ہے۔

نماز جمعہ ایک اور اہم عبادت ہے جس میں لوگوں کے تمام طبقوں کی وسیع شرکت کے ساتھ ساتھ اس کے خطبوں میں درپیش اہم سیاسی،اجتماعی(معاشرتی)اور ثقافتی مسائل کو بیان کیا جاتا ہے۔رات دن میں برپا کی جانے والی نماز جماعت بھی اس مضمون سے خالی نہیں اگرچہ اس کا سیاسی پہلو اتنا واضح نہیں۔

سورۂ حج کی آیت ۴۱ ان مسائل کی طرف ایک لطیف اشارہ کرتے ہوئے بیان فرماتی ہے:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ

یعنی:''وہ (مردان خدا) ایسے لوگ ہیں کہ اگر ہم انھیں زمین پر طاقت اور حکومت عطا کریں تو نماز قائم

کرتے ہیں، زکات ادا کرتے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری پوری کرتے ہیں۔''

مذکورہ بیان کے پیش نظر کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ اسلامی تعلیمات کو سیاسی مسائل سے جدا کرنا ممکن نہیں اور مغرب میں لگایا جانے والے اس نعرے کی سیاست مذہب سے جدا ہے، مشرق (اسلامی ممالک) میں بالکل کوئی وقعت نہیں اس بحث کو ہم امیر المؤمنین علیؑ کی ایک جامع اور جاذب نظر حدیث کے ذکر کے ساتھ ختم کرتے ہیں: جب ''ابوالدّرداءؓ'' اور ''ابوہریرہؓ'' حضرت علیؑ کے نام معاویہ کا خط لے کر آئے جس میں آپؑ سے درخواست کی گئی تھی کہ قاتلان عثمان کو ان لوگوں کے سپرد کیا جائے تاکہ وہ (معاویہ) ان قاتلوں کی سزا دے سکے۔ امامؑ نے فرمایا: معاویہ نے جو کچھ کہا ہے تم نے وہ مجھے پہنچا دیا ہے، اب ذرا غور کے ساتھ میری باتیں سنو اور انھیں معاویہ تک پہنچا دو اور اس سے کہو:

اِنَّ عُثْمانَ بْنِ عَفّانَ لایَعْدُوا اَنْ یَکُونَ اَحَدَ رَجُلَیْنِ: اِمّا اِمامُ هُدًی حَرامُ الدَّمِ وَ واجِبُ النُّصْرَةِ لاتَحِلُّ مَعْصِیَتُهُ وَلا یَسَعُ الاُمَّةَ خِذْلانُهُ، اَوْ اِمامُ ضَلالَةٍ حَلالُ الدَّمِ، لاتَحِلُّ وَلایَتُهُ وَلا نُصْرَتُه، فَلا یَخْلُوا مِنْ اِحْدَی الْخَصْلَتَیْنِ وَالْواجِبُ فی حُکْمِ اللّٰهِ وَحُکْمِ الاِسْلامِ عَلَی الْمُسْلِمینَ بَعْدَ ما یَمُوتُ اِمامُهُمْ اَوْیُقْتَلُ، ضالّاً کانَ اَوْ مُهْتَدِیاً، مَظْلُوماً کانَ اَوْ ظالِماً، حَلالَ الدَّمِ اَوْ حرامَ الدَّمِ، اَنْ لایَعْمَلُوا عَمَلاً وَلا یَحدثُوا وَلا یُقَدِّمُوا یَداً وَلا رِجلاً وَلا یَبْدَؤُ بِشَیْئٍ قَبْلَ اَنْ یَخْتارُوا لاَنْفُسِهِمْ اِماماً عَفیفاً عالِماً وَرِعاً بِالْقَضاءِ وَالسُّنَّةِ، یَجْمَعُ اَمْرَهُمْ وَیَحْکُمُ بَیْنَهُمْ وَیَاْخُذُ لِلْمَظلومِ مِنَ الظّالمِ حَقَّه وَ یَحْفَظُ اَطْرافَهُمْ وَ یُجْبِی فَیْئَهُمْ وَیُقیمَ حِجَّتَهُمْ وَ یُجْبِی صَدَقاتِهِمْ، ثُمَّ یَحْتَکِمُونَ اِلَیْهِ فی اِمامِهِمْ الْمَقْتُولِ ظُلْماً لِیَحْکُمْ بَیْنَهُمْ بِالْحَقِّ فَاِنْ کانَ اِمامُهُمْ قُتِلَ مَظْلُوماً حُکِمَ لاَوْلِیائِهِ بِدَمِهِ، فَاِنْ کانَ قُتِلَ ظالِماً نَظَرَ کَیْفَ الْحُکْمُ فی ذٰلِکَ:

''عثمان بن عفان دو حال سے خارج نہیں یا پیشوائے ہدایت تھا کہ اس صورت میں اس کا خون بہانا حرام اور اس کی مدد کرنا واجب اور اس کے فرمان سے روگردانی گناہ تھا اور امت کو اس کی مدد سے گریز نہیں کرنا چاہئے تھا اور یا وہ پیشوائے ضلالت وگمراہی تھا کہ اس صورت میں اس کا خون بہانا جائز اور اس کی حکومت کو قبول کرنا اور اس کی مدد کرنا حرام تھا، بالآخر وہ ان دو حالتوں سے خارج نہیں، لیکن حکم خدا اور حکم اسلام کی رو سے کسی امام وپیشوا کے دنیا سے رخصت یا قتل ہوجانے کی صورت میں چاہے وہ گمراہ ہو یا اہل ہدایت، مظلوم

ہو یا ظالم، اس کا خون مباح ہو یا حرام مسلمان پر واجب ہے کہ وہ کسی قسم کی کاروائی نہ کریں اور کوئی نیا پروگرام تشکیل نہ دیں اور کسی عمل کا آغاز نہ کریں جب تک کہ وہ اپنے لئے کسی پاکدامن عالم، پارسا، قضاوت کے مسائل اور سنت نبوی سے آگاہ امام اور پیشوا کا انتخاب نہیں کر لیتے، جو ان کے امور کا منتظم اور ان کے درمیان حکومت اور قضاوت کرنے والا ہو، جو ظالم سے مظلوم کے حق کو واپس لینے کی سکت رکھتا ہو اور جو سرحدوں کی حفاظت کرے اور بیت المال کی جمع آوری کا بندوبست کرے اور حج کو منظم طور پر برپا کرے، زکات جمع کرے، بعدازاں (جب لوگوں کے امور کے اسباب فراہم ہو جائیں) تو جس پیشوا کے بارے میں وہ معتقد ہیں کہ مظلومانہ طور پر قتل کیا گیا ہے اس کے فیصلے کے لئے اس جدید پیشوا کے پاس جائیں اگر وہ مقتول پیشوا مظلوم ہو تو اس کے بارے میں فیصلہ کیا جائے گا کہ صاحبان اس کے حق کو لیں (قصاص وغیرہ کے ذریعے) اور اگر وہ مقتول ظالم ثابت ہوا تو دیکھے گا کہ اس صورت میں حکم کیا ہے۔'' (اس بناء پر اے معاویہ! تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم قتل عثمان کے مسئلے کو چھیڑنے سے قبل حکومت اسلامی کو تسلیم کرو اور اس کی بیعت کرو جس کی بیعت تمام لوگوں نے کی ہے اور اس بہانے کو آڑ بنا کر لبیک کرنے میں ذراسی تاخیر بھی نہ کرو)۔[1]

دو گروہ اسلامی حکومت کی تشکیل سے خوفزدہ ہیں

مذکورہ سطور میں جو کچھ بیان ہوا ہے کہ مسلم دلائل کے مطابق ''حکومت کے بغیر اسلام'' ایک مسخ شدہ اور معنی ومفہوم سے خالی اسلام ہے اور درحقیقت اسلام سے اسلام کو منفی اور تفریق کرنے سے عبارت ہے، پھر بھی بعض لوگ اسلامی حکومت کی تشکیل کی مخالفت پر کمر بستہ نظر آتے ہیں، حقیقت میں اس مخالفت کا سرچشمہ دو چیزیں ہیں ایک کی حیثیت نفسیاتی اور دوسری کی حیثیت روائی ہے۔

رہی بات نفسیاتی حیثیت کی تو وہ یہ ہے کہ ان لوگوں کے دل ودماغ میں حکومتوں کے بارے میں تلخ یادیں موجود ہیں اور ان کی رائے کے مطابق موجودہ حالات میں کوئی بھی اسلامی حکومت قائم کرنے اور عدل اسلامی کو وجود میں لانے کے قابل نہیں کیونکہ ہمیشہ سخت رویے کے حامل افراد کی طرف سے ملک کے اندر سے حکومت پر دباؤ ڈالا جاتا ہے جو اسلامی قوانین کی چاردیواری کو توڑنے اور عدالت اجتماعی کو پامال کرنے اور کتاب وسنت کے قواعد وضوابط پر اپنے کھوکھلے نعروں کو مقدم کرنے اور ترجیح دینے کے درپے ہوتے ہیں۔

دوسری طرف سے بیرونی دنیا سے بھی دباؤ ڈالا جاتا ہے اور اغیار کی خفیہ سیاست، سازشیں اور ایجنسیاں حرکت میں آجاتی ہیں جو حکومت اسلامی کے اپنی راہ پر گامزن ہونے میں مشکلات پیدا کرتی ہیں اور قطعی طور پر اسے کسی نہ کسی مقام پر سیدھی راہ سے منحرف کردیتی

---

[1] کتاب سلیم بن قیس، ص ۱۸۲۔

ہیں۔اسی وجہ سے ان لوگوں کی نظر میں ایک واقعی اور حقیقی اسلامی حکومت چل ہی نہیں سکتی اور نا قابل عمل ہے۔وہ لوگ داستان ''مشروطہ'' کو اپنے دعویٰ کی دلیل قرار دیتے ہیں جس میں علماء دین اپنی تمام تر قوت کے ساتھ شریک ہوئے تا کہ وہ حکومت اسلامی کا چہرہ یا (اس چیز کو جو چند جہتوں سے اسلامی حکومت کے مشابہ ہے) دنیا کو دکھا سکیں،لیکن تمام کوششوں کے باوجود آخرکار اندرونی اور بیرونی منحرف افراد نے باہمی اتفاق کے ساتھ اسے ایک خودسر،تباہ کن اور ستمگر حکومت میں تبدیل کر دیا۔رہی بات روائی حیثیت کی تو اس ضمن میں وہ ان روایات کا سہارا لیتے ہیں جو یہ کہتی ہیں: ''ہر وہ پرچم جو امام مہدیؑ کے قیام سے پہلے بلند کیا جائے گمراہی کا پرچم ہے!''

مندرجہ ذیل سطور میں ان روایات کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں،یہ روایات حقیقت میں چند گروہوں پر مشتمل ہیں،ہمیں روایات کے ایک گروہ میں یہ ملتا ہے کہ جب تک اہل جور وستم سلاطین اور ظالم حکومتوں کے خلاف خروج اور قیام کا مساعد و مناسب وقت نہ آئے،قیام نہ کرو؛ جیسے:

۱۔''ابوالمرھف'' ایک روایت میں امام محمد باقرؑ سے نقل کرتا ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

"اَلْغُبَرَةُ عَلٰی مَنْ اَثَارَها. هَلَكَ الْمَحاصِيرُ. قُلْتُ جَعِلْتُ فِداكَ وَما الْمَحاصِيرُ؟ قالَ: اَلْمُسْتَعْجِلُونَ..."

یعنی:''گرد و خاک اور غبار کا رخ اسی کی طرف ہوتا ہے جو اسے پراگندہ کرتا ہے (جو شخص غبار اڑاتا ہے وہ اسی کے چہرے اور دامن کو آلودہ کرتا ہے)''محاصیر'' ہلاک ہو جاتے ہیں،راوی کہتا ہے کہ میں نے عرض کیا: آپؑ پر قربان جاؤں ''محاصیر'' کیا ہے؟ تو آپؑ نے فرمایا: وہ لوگ جو جلد بازی کرتے ہیں'' (اور ستمگر حکومت کے خلاف قیام کرنے میں جلدی کرتے ہیں جبکہ قیام کی شرائط ابھی فراہم نہیں ہوتیں)۔[۱]

۲۔ایک اور حدیث میں امام جعفر صادقؑ اپنے آباء کرام سے رسول اکرمؐ کی حضرت علیؑ کو وصیت میں فرماتے ہیں:

"يا عَلِيُّ اِنَّ اِزالَةَ الْجِبالِ الرَّواسِي اَهْوَنُ مِنْ اِزالَةِ مُلْكٍ لَمْ تَنْقَضِ اَيّامُهُ:"

یعنی:''اے علیؑ! ثابت و برقرار پہاڑوں کو اکھاڑنا اس حکومت کے زائل کرنے سے زیادہ آسان ہے جس کی مدت ابھی ختم نہیں ہوئی'' (اور اس کے زوال کی شرائط و اسباب ابھی فراہم نہیں ہوئے)۔[۲]

۳۔ایک حدیث میں جسے عیسیٰ بن قاسم نے نقل کیا ہے،امام جعفر صادقؑ نے فرمایا:''خدا سے ڈرتے رہو اور اپنی مصلحتوں کے بارے میں سوچو اس لئے کہ تم لوگوں سے زیادہ اس بات کے مستحق ہو......اس کے بعد آپؑ نے مزید فرمایا:

"اِنْ اَتاكُمْ مِنّا آتٍ لِيَدْعُوَكُمْ اِلَى الرِّضا مِنّا فَنَحْنُ نُشْهِدُكُمْ اِنّا لا نَرْضى، اِنَّهُ لا

---

[۱] وسائل الشیعہ، ج۱۱،ص۳۶ (ان روایات کو وسائل الشیعہ کے مولف نے جلد ۱۱ کتاب الجہاد باب ۱۳ میں نقل کیا ہے)

[۲] وسائل الشیعہ، ج۱۱،ص۳۸

یُطِیعُنا الیَوْمَ وَهُوَ وَحدَهُ وَ کَیْفَ یُطیعُنا إذا اِرْتَفَعَتِ الرّایاتُ وَالاَعْلامُ"

یعنی: ''اگر ہم میں سے کوئی آکر تمہیں ہماری خوشنودی اور رضا مندی کی دعوت دے (توجہ رہے کہ ''آل محمدؑ کی رضا نام کا ایک پر کشش نعرہ لگایا جاتا رہا ہے اس زمانے میں (حکومت کے خلاف) قیام کرنے والے اکثر لوگ اسی نعرے کا سہارا لیتے تھے) تو ہم تمہیں گواہ بناتے ہیں ہم ایسے قیام سے راضی نہیں، وہ آج ہماری حمایت نہیں کر رہا جبکہ وہ تنہا ہے، جب پرچم بلند کئے جائیں (اور لوگوں کی ایک بڑی جماعت اس کے ساتھ ہو) وہ کیسے ہماری حمایت کرے گا؟!'' [1]

۴۔ نہج البلاغہ میں امیر المؤمنین علیؑ فرماتے ہیں:

" اَلْزِمُوا الاَرْضَ وَ اصْبِرُوا عَلَی الْبلاءِ وَ لاتُحَرِّکُوا بِأَیْدیکُمْ وَ سُیُوفِکُمْ فی هَوی اَلْسِنَتِکُمْ وَ لاتَسْتَعْجِلُوا بِمالَمْ یُعَجِّلْهُ اللهُ لَکُمْ، فَإنَّهُ مَنْ ماتَ مِنْکُمْ عَلی فِراشِهِ وَ هُوَ عَلی مَعْرِفَةِ حَقِّ رَبِّهِ وَ حَقِّ رَسُوْلِهِ وَ اَهْلِ بَیْتِهِ ماتَ شَهیداً، وَ وَقَعَ اَجْرُهُ عَلَی اللهِ، وَاسْتَوْجَبَ ثَوابَ مانَوی مِنْ صالِحِ عَمَلِهِ، وَقامَتِ النِیَّةُ مَقامَ اِصْلاتِهِ لِسَیْفِهِ فَإنَّ لِکُلِّ شَیئٍ مُدَّةً وَاَجَلاً"

ترجمہ: ''اپنی جگہ پر ہی رہو (اور اجازت کے بغیر قیام نہ کرو) اور مصائب و مشکلات کے سامنے استقامت کا مظاہرہ کرو، اپنی تلواروں کو ہوس، خواہش نفس اور بغیر غور و فکر کے زبان سے نکلنے والے الفاظ کی خاطر استعمال نہ کرو اور جس میں خدا تعالیٰ کا حکم نہیں، اس عمل میں جلد بازی نہ کرو، اس لئے کہ تم لوگوں میں سے جو شخص اپنے بستر پر مر جائے لیکن وہ خدا اور رسولؐ اور ان کے اہلبیتؑ کی معرفت سے مستفید ہو، شہید کے طور پر اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے! اور اس کا اجر و ثواب خدا تعالیٰ کے ذمہ ہے اور جن نیک اعمال کو وہ انجام دینے کی نیت رکھتا تھا، ان نیک اعمال کے عمل کا ثواب اسے ملے گا اور اس کی نیت اس کی شمشیر کی ضربوں کی جانشین قرار پائے گی اور (جان لو کہ) ہر چیز کا ایک معین اور مقررہ وقت ہے'' (اگر اس سے پہلے اس کے پیچھے جاؤ گے تو تمہیں ناکام ہونا پڑے گا)۔ [2]

واضح ہے کہ اس قسم کی احادیث امام مہدیؑ کے ظہور سے قبل حکومت اسلامی کی تشکیل سے منع نہیں کرتیں بلکہ ان کا پیغام فقط یہ

---

[1] وسائل الشیعہ، ج۱۱، ص۳۸۔

[2] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹۰ (خطبے کا آخری حصہ)۔

ہے کہ موقعہ اور مناسب فرصت کا انتظار کرو اور مناسب فرصت کی دستیابی اور فراہمی کے بغیر اس عمل سے گریز کرو کیونکہ اگر ایسا نہ کیا تو تمہیں بے پناہ جانی اور مالی نقصان کا سامنا کرنا پڑے گا اور کوئی حسب خواہش نتیجہ نہیں حاصل کر پاؤ گے۔ بلکہ شاید ان کا مفہوم بعض لوگوں کی توقع کے برعکس ہو اور وہ یہ ہے کہ جب قیام کی شرائط اور حکومت اسلامی کی تشکیل کے اسباب فراہم ہوں تو اس کے حصول کا اقدام کرو۔

درحقیقت ان روایات کا اشارہ اسی مطلب کی طرف ہے جسے نہج البلاغہ کے خطبہ ۵ میں بیان فرمایا گیا ہے:

"وَمُجْتَنِی الثَّمَرَةِ لِغَیْرِ وَقْتِ اِیْناعِها کَالزّارِعِ بِغَیْرِ اَرْضِهِ"

ترجمہ: ''جو شخص پھل کو پکے بغیر توڑ لے اس کی مثال اس شخص جیسی ہے جس نے اپنا بیج ایک غیر مناسب اور ناموزوں زمین میں بو دیا ہو (ان میں سے کوئی ایک بھی پھل اور نتیجہ نہیں حاصل کر پاتا)''

دوسرے گروہ کی روایات کا مضمون یہ ہے کہ قیام کو ''اَلرِّضا مِنْ آلِ مُحَمَّدٍ'' (یعنی آل محمدؑ کی طرف سے رضا) اور ان کے اغراض ومقاصد کے عنوان سے ہونا چاہیے اور اس کے بغیر وہ قیام جائز اور مجاز نہیں ان میں سے ایک اور حدیث میں امام جعفر صادقؑ نے فرمایا:

"اِنْ اَتاکُمْ آتٍ مِنّا فَانْظُروا عَلی اَیِّ شَیْئٍ تَخْرُجُونَ؟ وَلا تَقُولُوا خَرَجَ زَیْدٌ فَاِنَّ زَیداً کانَ عالِماً وَ کانَ صَدُوقاً وَلَمْ یَدْعَکُمْ اِلی نَفْسِهِ وَاِنَّما دَعاکُمْ اِلَی الرِّضا مِنْ آلِ مُحَمَّدٍ، وَلَوْ ظَهَرَ لَوَفی بِما دَعاکُمْ اِلَیْهِ. اِنَّما خَرَجَ اِلی سُلطانٍ مُجْتَمِعٍ لِیُنْقِضَهُ، فَالْخارِجُ مِنّا الْیَوْمَ اِلی اَیِّ شَیْئٍ یَدْعُوکُمْ؟ اِلَی الرِّضا مِنْ آلِ مُحَمَّدٍ؟ فَنَحْنُ نُشْهِدُکُمْ اَنّا لَسْنا نَرْضی بِهِ وَ هُوَ یَعْصِینَا الْیَوْمَ وَ لَیْسَ مَعَهُ اَحَدٌ، وَ هُوَ اِذا کانَتِ الرّایاتُ وَ الاَلْوِیَّةُ اَجْدَرُ اَنْ لا یَسْمَعَ مِنّا"

ترجمہ: ''اگر کوئی شخص ہماری طرف سے آئے (اور دعویٰ کرے کہ میں ظالم وجابر حکومت کے خلاف قیام کرنا چاہتا ہوں) تو غور وفکر کرو کہ کس کی خاطر قیام کرنا چاہتے ہو، یہ مت کہو کہ زید نے قیام کیا، زید عالم اور راستگو شخص تھے اور انھوں نے ہرگز تمہیں اپنی طرف دعوت نہیں دی، بلکہ انھوں نے آل محمدؑ کی خوشنودی کی خاطر تمہیں دعوت دی، اگر وہ کامیاب ہو جاتے تو وہ اس چیز کے ساتھ وفا کرتے جس کی طرف انھوں نے تمہیں دعوت دی تھی (یعنی حکومت کو ہمارے سپرد کر دیتے) انھوں نے ایک مضبوط اور متمرکز حکومت کے خلاف قیام کیا تاکہ اسے ختم کر دیں (لیکن کامیاب نہ ہو سکے) اگر آج ہم میں سے کوئی شخص قیام کرتا ہے تو وہ تمہیں کس چیز کی طرف دعوت دیتا ہے؟ آل محمدؑ کی رجا کی طرف؟ ہم تمہیں اس بات پر گواہ بناتے ہیں کہ ہم

اس عمل سے راضی نہیں ہیں! آج جبکہ وہ تنہا ہے نافرمانی کر رہا ہے (اور اجازت کے بغیر اس عمل کو انجام دینے کے درپے ہے) تو مسلم ہے کہ جب پرچم بلند ہوگا اور لوگ اس کے گرد جمع ہوں گے تو وہ بطریق اولیٰ ہماری بات نہیں سنے گا۔"[1]

تسلیم شدہ بات ہے کہ یہ حدیث اور اس جیسی دیگر احادیث حکومت اسلامی کی تشکیل وقیام سے منع نہیں کرتیں، بلکہ یہ کہتی ہیں کہ حکومت تشکیل دینے کا ہدف اور مقصد ائمہ معصومینؑ کی خوشنودی ہونا چاہیے جو رسول اکرمؐ کے حقیقی جانشین ہیں۔

خودسر انداز میں ان کی خوشنودی اور رضامندی حاصل کئے بغیر اس عمل کی انجام دہی کی کوشش جائز نہیں! اس لحاظ سے جب عصر غیبت میں حکومت اسلامی کی تشکیل کے اسباب فراہم ہو جائیں اور یقین کر لیں کہ حضرت مہدیؑ حکومت کی تشکیل سے راضی ہیں اور اس کی تشکیل کا ہدف اسلام اور قرآن کا احیاء (زندہ کرنا) اور آل محمدؐ کی خوشنودی ورضا کو حاصل کرنا ہے تو نہ فقط ایسی حکومت کی تشکیل ممنوع نہیں بلکہ اس کے قیام کے لئے اقدام کرنا ضروری ہے۔ (غور فرمائیں)

روایات کی دوسری قسم ایسی روایات پر مشتمل ہے جو یہ کہتی ہیں: قیام حضرت مہدیؑ سے قبل ہر قیام کو شکست کا سامنا کرنا پڑے گا مثلاً مندرجہ ذیل روایات: ابوبصیر سے منقول امام جعفر صادقؑ کی اس حدیث میں آپؑ نے فرمایا:

"کُلُّ رایَةٍ تُرْفَعُ قَبْلَ قِیامِ الْقائِمِ فَصاحِبُها طاغُوت یَعْبُدُ مِنْ دُونِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ"

ترجمہ: "قیام قائم = سے قبل ہر بلند ہونے والے پرچم کا صاحب پرچم وہ طاغوت ہے جو خدا تعالیٰ کے غیر کی پرستش کرتا ہے (اور ایسا بت ہے جس کی پرستش کی جاتی ہے)۔"[2]

۲۔ حسین بن خالد سے مروی ایک اور حدیث میں راوی کہتا ہے کہ میں نے امام علی بن موسیٰ الرضاؑ کی خدمت میں عرض کیا کہ "عبداللہ بن بکیر" نے "عبید بن زرارہ" سے نقل کیا ہے کہ میں امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں تھا جب "محمد بن عبداللہ بن الحسن - [3] نے خروج کیا اور منصور دوانیقی کے خلاف قیام کیا کہ اسی اثنا میں ہمارے اصحاب میں سے ایک شخص داخل ہوا اور امامؑ کی خدمت میں عرض کیا: میں آپؑ پر قربان جاؤں؛ محمد بن عبداللہ نے قیام کیا ہے آپؑ اس بارے میں کیا حکم فرماتے ہیں؟ کیا ہم ان کے ہمراہ خروج کریں؟! آپؑ نے فرمایا:

---

[1] وسائل الشیعہ، ج۱۱، ص۳۶۔

[2] وسائل الشیعہ، ج۱۱، ص۳۷۔

[3] محمد بن عبداللہ بن حسن، امام حسن مجتبیٰ - کے پوتے تھے۔ جنھوں نے منصور عباسی کے خلاف قیام کیا، بہت سارے لوگوں نے ان کی بیعت کی انھوں نے مکہ مدینہ اور یمن کا کنٹرول سنبھال لیا، لیکن منصور نے ایک عظیم لشکر بھیجا جس نے ان پر فتح حاصل کر کے انہیں شہید کر دیا آپ محمد بن عبداللہ "نفس زکیہ" کے نام سے معروف ہیں، آپؑ کی شہادت رمضان ۱۴۵ ھجری میں واقع ہوئی (تتمۃ المنتھی، ص۱۳۵)۔

"اُسۡکُنُوا ما سَکَنَتِ السَّماءُ وَالاَرۡضُ"

یعنی: ''جب تک آسمان وزمین ساکن ہیں تم لوگ بھی کوئی حرکت نہ کرو!''

عبداللہ بن بکیر نے کہا: اگر مسئلے کی یہی صورتحال ہوتو پھر نہ کسی قیام کرنے والے اور نہ اس کے قیام کا وجود ہوگا (کیونکہ آسمان وزمین ساکن ہیں اوران کی حرکت محسوس اور ظاہر نہیں)۔امام علی رضا - نے فرمایا: امام جعفر صادق ؑ نے ٹھیک فرمایا ہے اور مطلب وہ نہیں جوابن بکیر نے خیال کیا ہے' آسمان کے ساکن ہونے سے مراد اس کا ندا سے ساکن ہونا ہے (وہ مخصوص صدا جو حضرت مہدیؑ کے قیام سے پہلے آسمان سے بلند ہوگی) اور زمین کے ساکن ہونے سے مراد وہ زلزلہ اور زمین میں دھنسنا ہے جو سفیانی کے لشکر کے لئے امام مہدیؑ کے ظہور کے وقت واقع ہوگا۔[۱]

اس حدیث سے بھی یہی معلوم ہوگا ہے کہ امام مہدیؑ کے قیام سے پہلے کسی قیام کو واقع نہیں ہونا چاہیے:

۳۔ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق ؑ نے اپنے ایک صحابی ''سدیر'' سے مخاطب ہوکر فرمایا:

"اَلۡزِمۡ بَیۡتَكَ وَ کُنۡ حلَساً مِنۡ اَحۡلاسِهٖ وَاسۡکُنۡ ما سَکَنَ اللَّیۡلُ وَالنَّهارُ فَاِذا بَلَغَكَ اِنَّ السُّفیانی قَدۡ خَرَجَ فَارۡحَلۡ اِلَیۡنا وَلَوۡاِلَیۡنا وَلَوۡ عَلٰی رِجۡلِكَ"

ترجمہ: ''اپنے گھر میں رہو اور اس کے فرش کی طرح ساکن بن جاؤ! جب تک شب وروز ساکن ہیں تم بھی سکون اختیار کرو، لیکن جب تمہیں یہ خبر ملے کہ ''سفیانی'' نے خروج کیا ہے تو اس وقت ہمارے پاس چلے آؤ اگر چہ تم پیدل ہی ہو!''[۲]

''سفیانی''،قتل وغارت کرنے والے ظالم حکمرانوں میں سے ایک ظالم حکمران ہے جو حضرت مہدیؑ کے قیام سے قبل آکر مختلف علاقوں پر لشکر کشی کرے گا، ایک لشکر کو مدینہ کی جانب بھی روانہ کرے گا جو مدینہ کے نزدیک ایک صحرا میں زلزلے کے سبب پڑنے والے شگاف کے باعث پورا لشکر زمین میں دھنس جائے گا!

اسی مضمون پر مشتمل کئی اور روایات بھی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت مہدیؑ کے ظہور سے قبل قیام کرنا ممنوع ہے، جیسے امام جعفر صادق ؑ سے منقول ''عمر بن حنظلہ'' اور ''معلّٰی بن خنیس'' کی روایتیں اور ''جابر'' کی امام محمد باقر - سے روایت اور دوسری روایات ہیں۔[۳]

---

[۱] وسائل الشیعہ، ج۱۱۔

[۲] وسائل الشیعہ، ج۱۱،ص۳۶۔

[۳] وسائل الشیعہ، ج۱۱،صفحات ۳۵ تا ۴۱۔

بحث وتحقیق

ان روایتوں سے متعلق ہم چند ضروری نکات کی طرف توجہ مبذول کراتے ہیں:

۱۔شریعت اسلامی میں ہمارے پاس کچھ مسلمہ اصول ہیں جنھیں نظر انداز کرنا کسی طرح بھی جائز نہیں، ان میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر وہ مسلّم امور ہیں جن میں کسی قسم کا شک وشبہ جائز نہیں، بہت ساری آیات اور روایات میں ان دو مسلّم قاعدوں یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔

اب اگر ہم کسی ایسے ماحول میں ہوں جس میں احکام الٰہی کو پامال کیا جاتا ہو، نیک کام بھلا دیئے گئے ہوں، ظلم وفساد نے ہر جگہ کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہو اور ہم ایک مؤثر قیام کے ذریعے فاسد حکومت کو برطرف کرنے پر قادر بھی ہوں اور وسیع طور پر منکرات کو ختم کر کے ان کی جگہ نیک کاموں کو رائج کر سکتے ہوں، تو کیا ایسی حالت میں کوئی یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ ایسا عمل حرام ہے؟ کیا درست ہے کہ ہم خاموش تماشائی بنے بُرائی وتباہی کے مناظر، احکام اسلام کی پامالی اور نوجوانوں کے دین اسلام سے خارج ہونے کا تماشا دیکھتے رہیں؟!

ممکن ہے بہانہ باز افراد یہ کہیں کہ ایسی صورتحال کبھی واقع نہیں ہوئی، تو ہمارا جواب یہ ہوگا کہ فرض کریں ایسی صورت پیش آجاتی ہے، یہ فرض کرنا کوئی عقلی طور پر محال اور ناممکن تو نہیں، کیا پھر بھی یہ کہا جائے گا کہ ضروری ہے کہ کوئی اقدام کرنے سے گریز کرو اور ظلم وفساد کے سامنے سر جھکالو اگر چہ احکام اسلامی کا تیاپانچہ ہی کیوں نہ ہوجائے؟! ہمارے خیال میں کسی عالم اور محقق کی زبان پر یہ کلمات جاری نہیں ہوسکتے!

ہماری اس گفتگو کے شواہد میں سے ایک شاہد یہ ہے کہ محمد بن عبداللہ المعروف بہ نفس زکیہ جو امام حسن مجتبیٰ -کی اولاد میں سے ہیں، ان کے حالات زندگی میں آیا ہے کہ جب لوگوں کی ایک نامی گرامی جماعت نے ''مہدی'' کی حیثیت سے ان کی بیعت کرلی اور اس واقعے کی اطلاع امام جعفر صادقؑ کو ملی (یہاں تک کہ انھوں نے امامؑ سے بھی بیعت کرنے کو کہا!) امامؑ نے فرمایا: اس کام کو مت انجام دو، کیونکہ ابھی اس کا وقت نہیں آیا (اور ظہور امام مہدیؑ آئندہ وقوع پذیر ہوگا) اگر تم (یعنی عبداللہ جو محمد کے والد ہیں) اپنے بیٹے کو مہدی موعود سمجھتے ہو تو وہ مہدی نہیں ہے اور ابھی ان کے ظہور کا وقت نہیں آیا اور اگر اسے مائل کرو کہ وہ خدا کی خاطر خروج کرے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دے تو خدا کی قسم ہم اسے اکیلا نہیں چھوڑیں گے، اور اس کی بیعت کریں گے! لیکن عبداللہ کو غصہ آگیا اور اس نے ایک نامناسب جواب دیا۔[1]

بالفرض مذکورہ بالا روایات اس بات کی تصریح بھی کریں کہ حضرت مہدیؑ کے قیام سے پہلے ہر قسم کا قیام گمراہی کا سبب ہے، پھر بھی ہم خبر واحد یا چند خبروں جو خبر واحد کے حکم میں ہے کی خاطر اسلام کے تسلیم شدہ اصولوں سے جو قرآن اور روایات میں بیان کئے گئے ہیں دستبردار نہیں ہوسکتے، لہٰذا جب بھی حکومت اسلامی کی تشکیل اور ظلم وستم ار جرم وفساد کی بساط الٹنے کے مقدمات اور شرائط فراہم ہوں تو اس

---

[1] ارشاد مفید با تلخیص، ج ۲، ص ۱۸۵، (باب ۱۳، امام جعفر صادق - کے حالات)۔

وقت ہمیں اقدام کرنے سے ہچکچانا نہیں چاہیے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، حدود جاری کرنے اور اقامۂ عدل وانصاف کے دلائل کو محض چند مشکوک روایات کو عذر بنا کر پامال نہیں کیا جاسکتا!

۲۔ قیام سے منع کرنے والی ان روایات کے مقابلے میں کئی دوسری روایات بھی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ائمہ ہدیٰ ؑ نے اپنے زمانے میں پیش آنے والے کئی ایک قیاموں کی تعریف کی ہے، اگر چہ یہ قیام اپنے آخری نتیجے تک نہیں پہنچ سکے، ایسی صورت میں کیسے ممکن ہے کہ یہ ممنوع ہوں اور اس کے باوجود قابل تعریف بھی ہوں؟! روایات میں زید بن علیؑ کے قیام کو ایک مقدس قیام کی حیثیت سے یاد کیا گیا ہے: مرحوم شہید کتاب ''قواعد'' میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی بحث میں فرماتے ہیں: ''زید، امام محمد باقر ؑ کے بعد امام سجاد - کے عالی ترین فرزند، عالم، مجاہد، پارسا، سخی اور شجاع تھے، انھوں نے شمشیر کے ساتھ قیام کیا تا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو انجام دیں اور شہداء کربلا کے خون کا بدلہ لیں۔[1]

مرحوم علامہ مامقانی نے زید بن علی کی مدح اور فضیلت میں کافی روایات نقل کی ہیں اور ان کی مذمت میں نقل شدہ روایات، مدح میں ذکر کی گئی روایات کے مقابلے میں ناچیز اور قابل توجیہ قرار دیں ہیں۔[2]

مرحوم علامہ مجلسی ''زید'' اور ان کے قیام کے بارے میں روایات کے اختلاف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''وہ روایات جو بہت زیادہ ہیں جو ان کے بلند مقام اور تعریف وستائش پر دلالت کرتی ہیں اور جن سے پتا چلتا ہے کہ وہ حق کے سوا کسی چیز کے مدعی نہ تھے، اسی طرح اصحاب کی اکثریت ان کے عظیم مقام کی معترف ہے۔''[3]

اگر حضرت مہدیؑ کے قیام سے پہلے ہر قیام گمراہوں اور مشرکوں کا قیام ہو تو کیسے زید بن علیؑ کے قیام کی تعریف وتمجید کی جاسکتی ہے؟! دوسرا نمونہ وہ روایات ہیں جو ''حسین بن علیؑ'' شہید فخّ کی مدح میں نقل ہوئی ہیں جو امام حسن مجتبیٰ - کے پوتے تھے، آپ نے عباسی خلیفہ ''موسیٰ الھادیٰ'' کے خلاف ۱۶۹ ہجری میں قیام کیا، اس کی تفصیل یہ ہے کہ آپ مدینہ سے مکہ کی طرف حج کی ادائیگی کی غرض سے نکلے جب مکہ کے نزدیک فخ کے مقام پر پہنچے تو آپ کے دوستوں اور خلیفہ عباسی کے لشکر کے درمیان شدید جنگ چھڑ گئی۔

اس جنگ میں حسین بن علی نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ جام شہادت نوش کیا، آپ وہی شخصیت ہیں کہ مشہور شاعر دعبل خزاعی نے اپنے معروف اشعار ''مدارس آیات'' میں جنھیں شہداء اہل بیتؑ میں سے ایک عظیم شہید کی حیثیت سے یاد کیا ہے، اور امام رضا - نے یہ اشعار سن کر ان کے بارے میں ایسے الفاظ پر کوئی اعتراض نہ کیا، چنانچہ دعبل کہتے ہیں:

قُبُور بِکرُ فانٍ واُخری بِطَیْبَۃٍ
واُخری بِفَخٍّ نالَھا صَلَواتی

---

[1] تنقیح المقال، (رجال مامقانی) حالات زید۔

[2] تنقیح المقال، (رجال مامقانی) حالات زید۔

[3] بحار الانوار، ج ۴، ص ۲۰۵۔

ایک حدیث میں امام نہم یعنی امام محمد تقی - فرماتے ہیں: رسول اکرمؐ جب فخ کے علاقے سے گذر رہے تھے، تو آپؐ سواری سے اتر پڑے اور نماز پڑھنے لگے، دوسری رکعت میں آپؐ اس قدر روئے کہ آپؐ کے رونے سے سب لوگ رو پڑے، نماز ختم کرنے کے بعد جب آپؐ سے اس گریہ کا سبب پوچھا گیا تو آپؐ نے فرمایا: جبرائیل - مجھ پر نازل ہوئے ہیں اور مجھ سے کہا ہے کہ:

"ای محمّد! اِنَّ رَجُلاً مِنْ وُلْدِكَ يُقْتَلُ فی هذا الْمكانِ، اَجْرُ الشَّهيدِ مَعَهُ، اَجْرُ شَهيدَيْنِ":

''اے محمدؐ! تمہارا ایک فرزند اس زمین پر قتل کیا جائے گا، اس کے ہمراہ شہید ہونے والے کا ثواب دو شہیدوں کے ثواب کے برابر ہے۔''[1]

یہاں تک کہ امام محمد تقی - ہی سے ایک حدیث میں منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

لَمْ يَكُنْ لَنا بَعْدَ الطَّفِّ مَصْرَعٌ اَعْظَمُ مِنْ فَخٍّ

''کربلا کے بعد ہمارے لئے کوئی قتل گاہ فخ کی قتل گاہ سے بڑھ کر نہیں۔''[2]

اور ایک روایت میں خود حسین بن علی (شہید فخ) سے منقول ہے کہ:

"ما خَرَجْنا حَتّى شاوَرْنا مُوسىٰ بنِ جَعْفَرٍ فَأَمَرَنا بِالْخُرُوجِ"

''ہم نے یہ قیام، حضرت امام موسیٰ کاظم ؑ کے ساتھ مشورہ کرنے کے بعد کیا ہے اور انھوں نے ہمیں خروج (قیام) کا حکم دیا ہے۔''[3]

مرحوم علامہ مامقانی آپ کے حالات کے اختتامی کلمات میں فرماتے ہیں: ''ہماری اس گفتار سے واضح ہو گیا ہے کہ آپ قابل اعتماد اور باوثوق شخصیت ہیں، کیونکہ امام موسیٰ کاظم ؑ نے ایک حدیث میں اس بات کی گواہی دی ہے اور حدیث میں ذکر ہوا ہے کہ آپ کے ہمراہ شہید ہونے والا کا اجر وثواب دو شہیدوں کے برابر ہے، اور رسول اکرمؐ نے آپ پر گریہ فرمایا، اور امام جعفر صادق ؑ نے ان کے بارے میں فرمایا ہے کہ ان کی روح ان کے بدن سے پہلے جنت میں داخل ہو گی!'' اس سلسلے میں مزید تفصیل کے لئے تنقیح المقال (جلد اول، صفحہ ۳۳۷ و بحارالانوار، ج ۴۸، صفحہ ۱۶۰) کی طرف رجوع کیا جائے۔

ان سب باتوں سے قطع نظر کئی روایات میں آیا ہے کہ مہدیؑ سے پہلے کئی اقوام قیام کر کے قیام مہدیؑ کی راہ ہموار کریں گی اور روایات میں انھیں نیک الفاظ سے یاد کیا گیا ہے۔ اگر مہدیؑ کے قیام سے قبل کے قیام باطل اور طاغوتی ہوتے تو ان روایات کا کوئی درست

---

[1] تنقیح المقال، ج ۱، ص ۳۳۷ (حالات حسن بن علی شہید فخ)، بحارالانوار، ج ۴۸، ص ۱۷۰۔

[2] تنقیح المقال، ج ۱، ص ۳۳۷ (حالات حسن بن علی شہید فخ)، بحارالانوار، ج ۴۸، ص ۱۷۰۔

[3] تنقیح المقال، ج ۱، ص ۳۳۷ (حالات حسن بن علی شہید فخ)، بحارالانوار، ج ۴۸، ص ۱۷۰۔

مفہوم نہ ہوتا، اس مقام پر ہم شیعہ اور اہل سنت کے طریقوں سے منقول دو روایات کے ذکر پر اکتفا کریں گے اگرچہ روایات کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔امام ابوالحسن الاول (امام موسیٰ کاظم -) کی حدیث میں ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

"رَجُلٌ مِنْ اَهْلِ قُمْ يَدْعُو النّاسَ اِلَى الْحَقِّ يَجْتَمِعُ مَعَهُ قَوْم كَزُبُرِ الْحَدِيدِ لاتَزِلُّهُمُ الرِّياحُ الْعَواصِفُ وَ لايَمِلُّوْنَ مِنَ الْحَرْبِ وَ لايَجْبُنُونَ وَ عَلَى اللهِ يَتَوَكَّلُوْنَ وَ الْعاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ:"

یعنی: "اہل قم میں سے ایک شخص قیام کر کے لوگوں کو حق کی طرف دعوت دے گا جو لوگ اس کے گرد جمع ہوں گے، لوہے کے ٹکڑوں کی مانند سخت ہوں گے سخت طوفان بھی انھیں اپنی جگہ سے ہلا نہیں سکیں گے یہ لوگ جنگ سے تھک ہار کر بیٹھ جانے اور خوف جیسی چیز سے نا آشنا ہوں گے، خدا پر توکل کرنے والے ہوں گے اور نیک انجام پرہیز گاروں ہی کے لئے ہے!"[1]

جن بعض روایات میں اس قسم کے قیام کا اشارہ کیا گیا ہے ان میں واضح طور پر ایسے قیام کو حضرت مہدی = کے قیام کا مقدمہ اور تمہید قرار دیا گیا ہے بہر حال ان سے ظاہر ہوتا ہے امام مہدیؑ کے قیام سے پہلے کچھ مشروع (شرعاً جائز) خونی قیام ہوں گے جن کا مقصد حق کی طرف دعوت دینا ہوگا اور جنھیں کامیابی بھی نصیب ہوگی۔

اہل سنت کی معتبر کتاب "سنن ابن ماجہ" کی ایک حدیث میں آیا ہوا ہے: بنی ہاشم کے کچھ جوان افراد رسول اکرمؐ کی خدمت میں آئے، جب آپؐ نے انھیں دیکھا، تو آپؐ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اور آپ کا رنگ مبارک متغیر ہو گیا، سوال کیا گیا کہ آپؐ کے چہرۂ مبارک پر غم وحزن کے آثار کیوں نظر آرہے ہیں؟ تو جواباً آپؐ نے فرمایا:

"اِنّا اَهْلُ بَيْتٍ اِخْتارَ اللهُ لَنا الآخِرَةَ عَلَى الدُّنيا. اِنَّ اَهْلَ بَيْتِى سَيَلْقَوْنَ بَعْدِى بَلاءً وَ تَشرِيداً حَتّى يَاْتِىَ قَوْم مِنْ قِبَلِ الْمَشْرِقِ مَعَهُمْ رايات سُوء يَيَسْأَلُوْنَ الْخَيْرَ فَلا يَعْطَوْنَه فَيقاتِلُونَ وَ يُنْصَرُونَ فَيُعْطونَ ماسَأَلُوا فَلا يَقْبَلُونَه حَتّى يَدْفَعُوها اِلى رَجُلٍ مِنْ اَهْلِ بَيْتى فَيَملأَها قِسطاً كَما مَلَئُوها جَوْراً فَمَنْ اَدْرَكَ ذلِكَ مِنْكُمْ فَلْيَأْتِهِمْ وَلَوْ حَبْواً عَلَى الثَّلْجِ"

ترجمہ: "ہمارا تعلق ایک ایسے خاندان کے ساتھ ہے جس کے لئے خدا تعالیٰ نے دنیا کی بجائے آخرت کو انتخاب فرمایا ہے اور میرے بعد میرے خاندان کو سخت مصائب، جلا وطنی اور اپنے مقام سے کنارہ کشی کا

[1] سفینۃ البحار، واژہ قم۔

سامنا کرنا پڑے گا، یہاں تک کہ کچھ لوگ سیاہ جھنڈوں کے ساتھ مشرق کی طرف سے آئیں گے جو نیکی کے طلبگار ہوں گے (اور حق وعدالت کے خواہاں ہوں گے) لیکن وہ ان کے حوالے نہیں کریں گے، پس وہ جنگ کریں گے اوران کی نصرت کی جائے گی اور وہ کامیاب ہوں گے اور جو وہ چاہتے ہیں انھیں وہ کچھ دیں گے لیکن وہ اسے قبول نہیں کریں گے یہاں تک کہ وہ اسے میرے اہل بیتؑ میں سے کسی کے سپرد کردیں گے پس وہ زمین کو اسی طرح عدالت سے بھر دے گا جس طرح وہ ظلم سے بھر دی گئی ہوگی، تم میں سے جو شخص اس زمانے کو پائے، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس کے ساتھ ملحق ہوجائے، اگرچہ اسے سینے کے بل برف پر سے گذر کر آنا پڑے!''[1]

اس روایت کے آخری حصہ سے بخوبی استفادہ ہوتا ہے کہ یہ قیام امام مہدیؑ کے قیام سے کچھ پہلے ہوگا اور یہ شرعی طور پر جائز قیام حضرت مہدیؑ کے قیام کی راہ ہموار کرے گا۔ اس پوری فصل سے بخوبی واضح ہوجاتا ہے کہ امام مہدیؑ کے قیام سے پہلے کئی قیام عمل میں آئیں گے جو حق کی خاطر ہوں گے، جن میں سے کچھ کامیاب اور کچھ ناکام ہوں گے، اور ایسا نہیں کہ حضرت مہدیؑ سے قبل ہر بلند کیا جانے والا پرچم طاغوتی اور شیطانی پرچم ہوگا اگرچہ وہ اہل بیتؑ کی اجازت سے اور ان کے مقاصد کے حصول ہی کی خاطر کیوں نہ ہو۔ (غور فرمائیں)

۳۔ آخری بات یہ ہے کہ جو روایات یہ کہتی ہیں کہ ''حضرت مہدیؑ کے قیام سے پہلے انجام پانے والا ہر قیام شرک آلود اور طاغوت (شیطان) کی خاطر ہے، ضروری ہے کہ ان کی ایسی تفسیر وتشریح کی جائے جو فقہی مسلّمات، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے احکام اور فساد کے خلاف جنگ کے ساتھ بھی سازگار ہو اور ان متعدد قیاموں کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہو جو معصومینؑ کے زمانے میں انجام پائے ہیں اور ان حضراتؑ نے ان کی صحت کی تائید فرمائی ہے ان روایات کی تفسیر کے لئے ہمارے سامنے چند راہیں ہیں:

۱۔ ان سے مراد قیام کی وہ اقسام ہیں جو ائمہ معصومینؑ یا حکام شرع اور زمانہ غیبت میں ان کے عمومی نائبین کی اجازت اور اذن کے بغیر ہوں۔

۲۔ اس قسم کے قیام سے مراد وہ قیام ہوں جو محمدؐ وآل محمدؐ کے اہداف ومقاصد کی طرف دعوت کی بجائے ذاتی اغراض ومقاصد کی طرف دعوت پر مشتمل ہوں جن کی طرف روایات میں بار بار اشارہ کیا گیا ہے۔

۳۔ یہاں قیام کی وہ قسمیں مراد ہیں جو مخصوص علاقوں میں برپا ہوئے ہیں اور جن کے لئے کوئی آمادگی اور تیاری نہیں کی گئی اور ائمہ ہدیٰؑ نے اس قسم کے عجولانہ، جلد بازی پر مبنی اور ناپختہ قیام کی روک تھام کے لئے ایسے جملے ارشاد فرمائے اور اس سے روکا ہے، یہاں ہم ایک بار پھر قرآن مجید کی طرف رجوع کر کے اس کی عمومی دعوت پر غور کرتے ہیں، جس میں وہ امت اسلامی کو ظالموں کے خلاف قیام،

---

[1] سنن ابن ماجہ، ج ۲، ص ۱۳۶۶، حدیث ۴۰۸۲۔

مظلومین کی حمایت اور عدل وانصاف قائم کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

سورۂ نساء کی آیت ۷۵ میں ہے:

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصِيرًا ﴿٧٥﴾

''تم لوگ راہ خدا میں اور ان مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر کیوں جنگ نہیں کرتے جو ستمگروں کے ہاتھوں ضعیف اور کمزور ہو گئے (بنا دیئے گئے) ہیں؟! وہی (مظلوم اور ستمدیدہ افراد) جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہمیں اس شہر سے باہر نکال، جس کے رہنے والے ظالم اور ستمگر ہیں، اور ہمارے لئے اپنی طرف سے سرپرست اور اپنی جانب سے ناصر و مددگار مقرر فرما۔''

واضح ہے کہ یہ آیت اور اس کے مشابہ دوسری آیات جو عدل وقسط قائم کرنے یا مظلوموں کے دفاع اور ظالموں کے خلاف جنگ جیسے اہداف سے متعلق گفتگو کرتی ہیں، کسی خاص جگہ یا خاص زمانے تک محدود نہیں اور یہ اہداف و مقاصد اسلام کے بنیادی قوانین میں سے ہیں اور ان مقدس اہداف کے اسباب جہاں اور جب بھی فراہم ہوں تو وقت ضائع کئے بغیر انھیں حاصل کرنے کی سعی کرنی چاہیے۔

اسلامی حکومت کے ارکان

مقدمہ

ہم جانتے ہیں کہ ہر حکومت کو تین بنیادی ارکان کی ضرورت ہوتی ہے جن کے بغیر وہ جاری نہیں رہ سکتی۔

1-رکن قانون سازی (مقننہ)

2-رکن انتظامی (انتظامیہ)

3-رکن قضائی (عدلیہ)

سب سے پہلے مرحلے میں حکومت کے پاس ایسے قوانین ہونے چاہیں جو معاشرے کی مشکلات کو حل کریں، لوگوں کے باہمی تعلقات قوانین کے زیر سایہ واضح ہوں اور معاشرہ ترقی کی منزل کی جانب رواں دواں ہو، اس سے قطع نظر کہ اس قانون سازی کا سرچشمہ کیا ہے؟ کیونکہ کبھی اس کا سرچشمہ وحیٔ الٰہی، کبھی کسی فرد واحد کا ارادہ اور کبھی قانون ساز اسمبلیاں ہوتی ہیں، جن کے بارے میں ہم اس کے بعد گفتگو کریں گے۔ یہاں تک کہ قوانین الٰہی کی بنیاد پر استوار معاشرے جن کے قوانین کا سرچشمہ فقط وحی ہوتا ہے وہ بھی قانون ساز ادارے کے محتاج ہوتے ہیں تاکہ وہ الٰہی قوانین کل اور روزمرہ کی ضروریات کے درمیان مطابقت پیدا کرے اور جزئی اور وقت کے ساتھ ساتھ موافقت اور ہم آہنگی بخشے، یعنی اصولی قوانین کو فروعی مسائل کے ساتھ ہم آہنگ کرے۔

قوانین کے روشن اور نافذ العمل ہونے کے لئے تیار اور آمادہ ہونے کے بعد ضروری ہے کہ ان کے نفاذ کی ذمہ داری کچھ لوگوں کے سپرد ہو جو اسے معاشرے میں نافذ کریں اور اگر آئین دستور العمل لکھنے کی ضرورت ہو تو اسے لکھیں وگرنہ اسے فوراً نافذ کر دیں، اور اسی کو آج کل کی دنیا میں ''انتظامیہ'' یا ''حکومت'' کہا جاتا ہے۔ حکومت کا ایک سربراہ ہوتا ہے جسے صدر، وزیر اعظم یا چانسلر کہا جاتا ہے۔ ان کے ماتحت بھی وزراء، اعلیٰ اور ادنیٰ درجے کے افسران ہوتے ہیں کہ جن کے درمیان ونفاذ کی ذمہ داریاں تقسیم ہوتی ہیں۔ اس طرح سربراہ حکومت ان تمام لوگوں کی مدد کے ذریعے اپنے لائحہ عمل کو نافذ کرتا ہے۔

قوانین کے نفاذ کے سلسلے میں ممکن ہے عوام، حکومتی اداروں یا حکومت اور عوام کے درمیان مختلف حقوقی موضوعات کے بارے میں شدید اختلافات پیدا ہو جائیں، ایسے میں ظالم و مظلوم صاحب حق اور ناقد حق کے درمیان فرق قائم کرنے والے کسی ادارے کا ہونا ضروری ہے، اسی ادارے کا نام ''عدلیہ'' ہے اور بلاشک اسی ادارے کی طرف سے حکم صادر ہونے کے بعد اس حکم کو نافذ کرنے والے ادارے یعنی ''انتظامیہ'' کی ضرورت ہوتی ہے، جو نہایت احتیاط کے ساتھ ان احکام کو جاری اور نافذ کرتا ہے۔ اس سلسلے میں معاشرے کے سسٹم کے اندر کچھ دوسرے ادارے بھی موجود ہوتے ہیں، جن کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ مستقل اور جداگانہ ارکان کو تشکیل دیتے ہیں اور ممکن ہے کہ انھیں رکن چہارم یا پنجم سے یاد کیا جائے، جیسے محکمۂ جاسوسی و سراغ رسانی اور محکمہ تعلیم و تربیت یا ذرائع ابلاغ

ونشریات اور عسکری اور انتظامی ادارے وغیرہ۔

لیکن واضح ہے کہ یہ ادارے انتظامیہ ہی کا حصہ ہیں اور یہ انتظامیہ آلہ وابزار کی حیثیت رکھتے ہیں جس کے ذریعے وہ بہتر اور موٴثر انداز میں قوانین کو نافذ کرسکتی ہے۔ جاسوسی کے مراکز خفیہ سازشوں سے پردہ اٹھاتے ہیں اور ملک کے گوشہ وکنار میں رونما ہونے والے واقعات کی رپورٹ انتظامی اداروں کو دیتے ہیں تاکہ وہ سازشوں کا قلع قمع کرکے معاشرے کی بھلائی اور اس کے حق میں برائی سے آگاہ ہو کر اس کے مقابلے میں ایک مناسب موقف اختیار کریں، اسی طرح تعلیمی اور ابلاغ ونشریات کے ادارے ان کی مدد کرتے ہیں تاکہ وہ اپنی منزل مقصود تک ثقافتی ذرائع سے پہنچ سکیں۔

چونکہ قانون کے نفاذ کا بہترین ذریعہ وہ ثقافت ہوتی ہے جو معاشرے کو اس بات پر ابھارتی ہے کہ وہ خود ان قوانین کو اپنے اوپر لاگو کریں اور لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ یعنی: "تاکہ لوگ خود قیام عدالت کے لئے اٹھ کھڑے ہوں" کا مصداق اور مثال بن جائیں اسی طرح وہ مراکز بھی جن کا ابھی ذکر کیا گیا ہے۔ اس اشارے کے ساتھ ہی ہم قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے ہیں اور قرآنی آیات کی روشنی میں ان ارکان (حکومت) کے کردار کا مطالعہ کرتے ہیں۔

اسلام میں قانون سازی کا نظام

اشارہ

قرآن، حدیث اور علمائے اسلام کے نقطۂ نظر سے قانون بنانا دراصل خدا کا کام ہے، درحقیقت قانون سازی کا موضوع توحید افعالی کے ساتھ تعلق رکھتا ہے، جس طرح خدا تعالیٰ بطور مطلق عالم موجودات اور عالم انسانی پر حاکم ہے، اسی طرح قانون سازی کا حاکم بھی وہی ہے۔ (غور فرمائیں)

یہ موضوع آیات وروایات میں واضح طور پر ذکر ہونے کے علاوہ عقلی دلیل کے بھی مطابق ہے، چونکہ حقیقی قانون ساز وہی ہوسکتا ہے جس میں درج ذیل شرائط موجود ہوں:

1۔ قانون ساز، انسان اور اس کی جسمانی ونفسانی (روحانی) خصوصیات سے مکمل طور پر آگاہ ہو، یعنی وہ مکمل انسان شناس ہو، اس کے وجود کے تمام اسرار، جذبات، میلانات، غرائز، خواہشات، ہوئی وہوس اور فطری مسائل سے مکمل طور پر باخبر ہو، اسی طرح افراد و معاشرے کی پوشیدہ صلاحیتوں سے جن کی وہ استعداد رکھتے ہیں، کامل طور پر آگاہ ہو، مختصر یہ کہ انسان کے جسم وجان میں موجود کسی چیز سے بے خبر نہ ہو۔

2۔ اسے مکمل طور پر اس بات کا علم ہو کہ عالم موجودات کی تمام اشیاء کی خصوصیات کیا ہیں اور وہ انسان کے وجود کے ساتھ کیا مناسبت رکھتی ہیں، اسی طرح اسے اس بات کا بھی کما حقہ علم ہو کہ انفرادی اور اجتماعی امور میں سے کون سے امور مصلحت پر مبنی اور کون سے امور بُرائی کو جڑ ہیں اور ان کے نتائج کیا ہو سکتے ہیں۔

3۔ وہ تمام واقعات وحادثات جو ممکن ہے مستقبل قریب یا بعید میں پیش آئیں ان کا انسان کی سرنوشت کے ساتھ کیا تعلق ہے یہ سب اس کے لئے جاننا ضروری ہے۔

4۔ حقیقی قانون ساز وہ ہے جو ہر قسم کی لغزش، گناہ، خطا اور اشتباہ سے پاک ہو اور اسی طرح مہربان اور مضبوط ارادے کا مالک بھی ہو اور دنیا کی کسی طاقت سے خائف نہ ہو۔

5۔ عالم بشریت میں اس کے ذاتی فوائد ومنافع کا شائبہ موجود نہ ہو، چونکہ کہ اگر وہ ایسا ہو تو قانون سازی کے وقت شعوری یا لاشعوری طور پر وہ قانون میں اپنے منافع وفوائد کا لحاظ رکھے گا اور معاشرے کے فوائد کو اپنے فوائد کی بھینٹ چڑھا دے گا۔ کیا ایسی صفات خدا تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کے اندر موجود ہیں؟ کیا کوئی ایسا ہے جو یہ کہے: میں انسان اور اس کی تمام خصوصیات کو جانتا ہوں؟ جبکہ عظیم ترین صاحبان علم ودانش اس سوال کے جواب میں عاجزی اور ناتوانی کا اظہار کرتے ہیں، بلکہ انھوں نے انسان کو با قاعدہ طور پر ایسی مخلوق کے طور پر متعارف کرایا ہے، جسے پہچانا نہیں گیا، بلکہ انھوں نے اپنی کتابوں کے لئے بھی اسی عنوان کو منتخب کیا ہے (یعنی انسان ایک ایسا موجود

جس کو نہیں پہچانا گیا)۔کیا کوئی ایسا شخص ہے جو انسان کے ماضی اور مستقبل یا اس کے حال کے ساتھ تعلق سے آگاہ ہو؟ کیا کوئی ایسا شخص موجود ہے جو تمام موجودات کے اسرار اور ان کے آثار و خواص کے بارے میں آگاہ ہو اور ہر قسم کی لغزش اور خطا سے پاک ہو؟

یقیناً خدا اور اس کی طرف سے بھیجے گئے افراد کے علاوہ کوئی بھی ان صفات کا حامل نہیں۔اس مختصر اشارے سے بخوبی یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ حقیقی قانون ساز خدا تعالیٰ ہے جس نے انسان کو پیدا کیا ہے اور وہی اس کے وجود کے تمام اسرار سے آگاہ ہے اور سارے موجودات کے اسرار کو بھی جانتا اور گذشتہ و آئندہ کے واقعات سے باخبر ہے اور اُن کے موجودہ حالات سے پیدا ہونے والے تعلقات کو بھی جانتا ہے۔وہ ہر قسم کی لغزش و خطا سے پاک ہے اور کسی سے خائف نہیں اس کی ذات میں کوئی کمی نہیں کہ وہ قانون سازی کے طریقے سے اسے پورا کرے، بلکہ وہ تشکیل قوانین میں فقط بندگان کے فوائد کو ملحوظ رکھتا ہے۔مزید یہ کہ پورے عالم پر اس کی حکومت و حاکمیت ہے اور معقول نہیں کہ کوئی اس کی قلمرو میں اس کے بغیر امر و نہی انجام دے بلکہ دوسروں کے امر و نہی اور قانون کو اس کے قانون کی بجائے قبول کرنا ایک قسم کا شرک اور گمراہی ہے۔اس اشارے کے ساتھ ہی ہم قرآن کی طرف رجوع کر کے ان آیات کا مطالعہ کرتے ہیں جو قانون سازی کو فقط خدا تعالیٰ کے ساتھ مختص قرار دیتی ہیں:

۱۔مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ ۫ وَلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ (کہف/۲۶)

۲۔وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ (شوریٰ/۱۰)

۳۔وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۴﴾ (مائدہ/۴۴)

۴۔وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۵﴾ (مائدہ/۴۵)

۵۔وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۴۷﴾ (مائدہ/۴۷)

۶۔وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ؕ (مائدہ/۴۹)

۷۔اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ؕ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۵۰﴾ (مائدہ/۵۰)

۸۔اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۵۱﴾ (نور/۵۱)

۹۔وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۵۳﴾ (انعام/۱۵۳)

۱۰۔اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ (مائدہ/۳)

ترجمہ:

1۔ان کا اس کے علاوہ کوئی ولی اور سرپرست نہیں! اور وہ کسی کو اپنے حکم میں شریک نہیں کرتے!

2۔جس چیز کے بارے میں بھی تمہیں اختلاف ہو اس کا حکم (فیصلہ) خدا کے پاس ہے۔

3۔اور جو کوئی بھی خدا کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا وہ کافر ہے۔

4۔خدا کی طرف سے نازل شدہ احکام پر عمل نہ کرنے والا، ظالم اور ستمگر ہے۔

5۔جو لوگ خدا کے نازل کردہ احکام کے مطابق عمل نہیں کرتے، فاسق ہیں۔

6۔اور ان (اہل کتاب) کے درمیان خدا کی طرف سے نازل شدہ احکام کے مطابق فیصلہ کرو اور ان کی ہوس کی پیروی نہ کرو اور ان سے ہوشیار رہو کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں ان بعض احکام سے منحرف کردیں جو خدا نے تم پر نازل کئے ہیں!

7۔کیا وہ لوگ (تم سے) حکم جاہلیت کے خواہاں ہیں؟! اہل یقین لوگوں کے لئے خدا تعالیٰ سے بہتر کون فیصلہ کرتا ہے؟

8۔جب اہل ایمان کو خدا اور رسول کی طرف دعوت دی جائے تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے تو وہ فقط یہی کہتے ہیں کہ ''ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی'' اور یہی لوگ حقیقی کامیاب ہیں۔

9۔''یہ میری سیدھی راہ ہے اس کی پیروی کرو!'' اور انحرافی راہ پر مت چلو کیونکہ وہ تمہیں راہ حق سے دور کر دے گی! اور یہ وہ چیز ہے جس کی خدا تمہیں تاکید کرتا ہے، شاید تم لوگ پرہیزگار بن جاؤ!

10۔آج میں نے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور اپنی نعمت کو تم پر تمام کر دیا اور اسلام کو تمہارے لئے میں نے دین کے طور پر پسند کیا۔

آیات کی تفسیر

پہلی سات آیتوں میں گفتگو اس بارے میں ہے کہ حکم فقط خدا کا ہے اور سب کے لئے اس کی پیروی کرنا لازم ہے۔ درست ہے کہ حکم کا معنیٰ ''منع'' کرنا ہے۔[1] لیکن چونکہ امر و نہی اور فرمان، غلط کام سے منع کرنے کا سبب ہوتے ہیں اس لئے انھیں حکم کہا جاتا ہے اور علم و دانش کو حکمت سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ جاہلانہ اور غیر عاقلانہ اعمال سے منع کرتے ہیں۔ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید میں لفظ

---

[1] مصابیح اللّغہ ومصباح اللغۃ اور مفردات راغب کی طرف رجوع کیا جائے۔

''حکم''، فیصلے کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے اور امر ونہی اور فرمان کے معنی میں بھی، جہاں اس سے مراد فیصلہ ہو وہاں بھی ایک قسم کا امر ونہی اور فرمان ہی ہوتا ہے جسے قاضی صادر کرتا ہے۔

مذکورہ بیان پر توجہ کے پیش نظر ہم آیات کی طرف دوبارہ رجوع کرتے ہیں، پہلی آیت حاکمیت، حکومت، امر ونہی اور ولایت کو خدا کے لئے مخصوص قرار دیتے ہوئے فرماتی ہے:

''وہ لوگ اس کے علاوہ کسی کو اپنا ولی اور سرپرست نہیں رکھتے اور خدا نے اپنے حکم میں کسی کو اپنا شریک نہیں بنایا''

مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ ۡ وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖۤ اَحَدًا ۞

حقیقت میں آیت کا پہلا اور آخری حصہ علت ومعلول کی مانند ہے، چونکہ کہ جب ولایت خدا کے لئے خاص ہو تو فطری بات ہے کہ حکم، فرمان اور قانون بھی اسی کا ہوگا۔ واضح ہے کہ ''حکم'' سے یہاں مراد امر ونہی بھی ہے اور حکومت وقضاوت بھی کیونکہ یہ سب ولایت کی فروع (شعبے) ہیں اور چونکہ ولایت اس کے ساتھ خاص ہے لہٰذا حکم بھی اسی کا ہے، بلکہ بعض حضرات کی رائے میں حکم سے مراد خدا تعالیٰ کی عالم تخلیق پر تکوینی حاکمیت بھی ہے کیونکہ اس کی ولایت قانون سازی اور تکوین (تخلیق) دونوں پر ثابت ہے پس اس کی حاکمیت کا دائرہ نہایت وسیع اور عمومی ہے۔

دوسری آیت میں خدا کے فیصلے کے بارے میں ہے۔ ارشاد فرماتا ہے:

''جس چیز کے بارے میں تم اختلاف میں پڑ جاؤ اس کا فیصلہ خدا ہی کے ہاتھ میں ہے''

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ

آیت کے ذیل میں فرمایا گیا ہے:

''یہ ہے اللہ میرا پروردگار، میرا توکل اسی پر ہے اور میں نے اسی کی طرف واپس جانا ہے۔''

"ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبِّيْ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ"

کیونکہ ہر چیز (خاص طور پر حکم وقضاوت) اسی کے لئے ہے، لہٰذا اسی پر توکل کرنا چاہیے اور اسی کی طرف بازگشت بھی ہونی چاہیے۔ اور چونکہ فیصلہ اور قضاوت حکم اور قانون سے جدا نہیں اور اصطلاحی طور پر اکثر اختلافات کا تعلق ''شبۂ حکمیہ'' سے ہے نہ ''شبۂ موضوعیہ'' سے پس معلوم ہوا: حکم وفرمان اور قانون سبھی اس کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔

تیسری، چوتھی اور پانچویں آیت میں ان لوگوں کے بارے میں گفتگو ہے جو خدا کے نازل کئے گئے احکامات پر عمل نہیں کرتے اور انھیں بالکل اہمیت نہیں دیتے، دوسرے الفاظ میں خدا کے احکام کے علاوہ دوسرے احکام کی پیروی کرتے ہیں، ایسے لوگوں کو ایک آیت میں ''کافر'' دوسری میں ''ظالم'' اور تیسری میں ''فاسق'' کہا گیا ہے۔

وَمَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓىٕكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ... فَاُولٰٓىٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ... فَاُولٰٓىٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ

وہ لوگ جو کافر ہیں وہ اس وجہ سے کہ انھوں نے توحید افعالی کی ایک شاخ یعنی؛ اللہ کی حاکمیت کی توحید کو فراموش کر دیا ہے، توحید کی یہ فرع (شاخ) کہتی ہے: خدا کا غیر نہ حکم وفرمان کا حق رکھتا ہے نہ حکومت وقضاوت کا، بطور مسلم جو کوئی بھی اس قانون سے انحراف کرے، وہ ایک طرح کے شرک میں گرفتار ہوجاتا ہے۔

وہ اس وجہ سے ظالم ہیں، کہ خود پر اور دوسروں پر ظلم کرتے ہیں اور وہ احکام جو ان کی خوش بختی کا باعث اور ترقی کا سبب ہیں، انھوں نے ان کو چھوڑ دیا ہے اور ان احکام کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں جو بے قیمت یا کم قیمت ہیں اور جن کے پیش نظر محدود انسانی مصلحتیں ہیں۔ اور وہ اس لیے فاسق ہیں، کہ بندگی اور عبودیت کی سرحدوں سے نکل چکے ہیں، چونکہ ''فسق'' کا مطلب ذمہ داری اور فرمان سے خارج ہونا ہے۔

ان تین آیات میں (کافر، ظالم اور فاسق) کی یہ تین مختلف تعبیرات بہت نپی تلی ہیں اور ممکن ہے کہ ان کا قانون الٰہی کے تین پہلوؤں کی طرف اشارہ ہو، چونکہ قانون ایک طرف سے قانون ساز تک جا کر ختم ہوجاتا ہے کہ اس صورت میں اس کی مخالفت کفر ہے، اور دوسری طرف سے بندگان خدا پر ختم ہوتا ہے کہ اس صورت میں اس کی مخالفت ظلم ہے اور تیسری طرف سے حاکم اور قاضی پر ختم ہوتا ہے کہ اگر ان کا فیصلہ خدا تعالیٰ کے حکم کے خلاف ہو تو ایسی حالت میں یہ فسق ہے۔

چھٹی آیت میں رسول اکرمؐ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان خدا کے نازل کئے احکام کے مطابق فیصلہ کریں اور اس سلسلے میں ان کی خواہشات کی پیروی نہ کریں اور ہوشیار رہیں کہ وہ آپؐ کو خدا کے بعض نازل کردہ احکام سے منحرف نہ کر دیں:

وَاَنِ احْكُمْ بَیْنَهُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ یَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَیْكَ ؕ

جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے اس کے مطابق فیصلہ کرنے اور خواہشات نفس کی پیروی کے درمیان موازنہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو کوئی خدا کے حکم سے سرتابی اور روگردانی کرتا ہے خواہشات نفس کی ہولناک کھائی میں گر جاتا ہے اور ان سے ہوشیار رہنے کا حکم اور یہ کہ وہ تمہیں فریب میں مبتلا نہ کر دیں اسی تاکید کی تجدید ہے کہ احکام الٰہی کی پیروی اور شیطانی وسوسوں کے خلاف استقامت ہونی چاہیے۔ بلاشبہ رسول اکرمؐ عصمت کے باعث ان کے فریب میں مبتلا نہیں ہو سکتے لیکن مذکورہ بالا بیان بقیہ صاحبان ایمان لوگوں کے لئے ایک درس ہے کہ وہ دشمن کی چالوں کا شکار نہ ہوں اور احکام الٰہی سے انحراف نہ کریں۔

مفسرین نے اس آیت کا جو شان نزول بیان کی ہے اس کے پیش نظر مذکورہ آیت اختلافات وتنازعات کے بارے میں ہے اور کلمہ ''بینهم'' (ان کے درمیان) بھی اسی مطلب کا ترجمان ہے لیکن تسلیم شدہ بات ہے کہ قضاوت اور فیصلے کو حکم خدا اور اس کے قانون کے مطابق ہونا چاہیے اور آیت شریفہ کا مفہوم یہ ہے کہ قضاوت کو ان احکام کے مطابق ہونا چاہیے جنھیں خدا تعالیٰ نے نازل کیا ہے۔ بعد

والی آیت جو قرآن مجید میں مذکورہ آیت کے بعد قرار دی گئی ہے، فرماتی ہے: ''کیا وہ لوگ تم سے جاہلیت کا حکم چاہتے ہیں؟ وہ لوگ (جو خدا، روز قیامت اور تمہاری نبوت پر) یقین رکھتے ہیں ان کے لئے خدا سے بڑھ کر کون بہتر فیصلہ کر سکتا ہے؟!

اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ؕ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ۠ ﴿۵۰﴾

یہاں خدا کے غیر کے احکام کو احکام جاہلیت قرار دیا گیا ہے۔ وہ احکام جو جہل و نادانی اور خواہشات نفس سے جنم لیتے ہیں اگر ہم درست انداز میں سوچیں تو پتہ چلے گا کہ یہ مطلب زمانۂ رسول اکرمؐ آپؐ کے جاہلیت کے خلاف قیام کرنے کے ساتھ ہی مخصوص نہیں بلکہ جیسا کہ اشارہ کیا گیا ہے کہ ہر غیر الٰہی جہالت کے ساتھ مخلوط ہوتا ہے، اس لئے کہ یقینی طور پر انسان کا علم محدود ہے، نہ اسے اپنے وجود کی خصوصیات اور اس کے مختلف گوشوں کا پورا علم ہے اور نہ ان حوادث کا کامل علم ہے جو ماضی، حال اور مستقبل میں پیش آتے ہیں جو احکام کی مصلحتوں اور مفسدوں پر اثر انداز ہوتے ہیں، اس کے علاوہ چونکہ معاشرے میں موجود ہر شخص کے ذاتی منافع اور میلانات وجذبات ہوتے ہیں لہٰذا قانون سازی کے وقت وہ اپنے آپ کو ان سے جدا نہیں کر سکتے، فقط خدا ہے جو ہر چیز سے آگاہ اور ہر ایک سے بے نیاز ہے۔ ''برسوئی'' تفسیر روح البیان میں جاہلیت کے مفہوم کے بارے میں کہتا ہے: ''اس سے مراد ہر وہ چیز (حکم) ہے جو وحی اور قرآن کے مطابق نہ ہو'' [۱]

تفسیر فی ظلال القرآن میں ہے: ''جاہلیت سے مراد کوئی خاص زمانہ نہیں بلکہ مراد وہ مخصوص حالات ہیں جو ماضی میں تھے آج بھی ہو سکتے ہیں اور مستقبل میں بھی، جاہلیت جیسا کہ قرآن نے اس کی توصیف کی ہے انسان کے لئے انسان کے حکم سے عبارت ہے، اس لئے کہ انسان کا انسان کی بندگی اور اس کی پیروی کرنا یعنی خدا کی بندگی سے خارج ہو جانا ہے۔'' [۲]

تفسیر مجمع البیان میں بعض قدیمی مفسرین سے منقول ہے کہ: جاہلیت سے مراد اس زمانے کے یہودیوں کے افعال ہیں جو معاشرے کے کمزور افراد کے خلاف تورات کے احکام جاری کرتے تھے لیکن اگر عمائدین اور طاقتور افراد کسی گناہ کا ارتکاب کرتے تو ان کا کوئی مواخذہ نہ کرتے تھے، اسی طرح بعض دوسرے مفسرین سے منقول ہے کہ جاہلیت کے مفہوم میں بت پرست بھی داخل ہیں اور اہل کتاب بھی ہیں۔ [۳]

اس قسم کی غیر منصفانہ ترجیحات جو ہمارے زمانے میں بھی موجود ہیں اور قوانین بھی ملکوں کے اندر اور بین الاقوامی سطح پر صرف کمزوروں پر لاگو ہوتے ہیں اور طاقتور لوگ غالباً ان سے مستثنیٰ ہوتے ہیں یہ سب جاہلی معاشروں کے وجود کی علامت ہیں! قابل توجہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا بہت ساری آیات جو اس بات کی ترجمان ہیں کہ قانون سازی کا حق صرف خدا کو حاصل ہے، ان آیات کا تعلق

---

[۱] تفسیر روح البیان، ج ۲، صفحہ ۴۱۰

[۲] فی ظلال القرآن، ج ۲، ص ۷۵۱۔

[۳] جملہ اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ؕ میں ایک مذوف موجود ہے بعض نے کہا ہے کہ اس کی حقیقت صورت افحکم الامۃ الجاھلیۃ ہے بعض نے نزدیک افحکم حکم الجاھلیۃ ہے (تفسیر قرطبی اور تفسری مجمع البیان، ذیل آیت موضوع بحث) یا حکام الجاھلیۃ

سورہ مائدہ سے ہے جو مشہور قول کے مطابق آخری سورہ ہے یا ان آخری سوروں میں سے ایک ہے جو رسول اکرمؐ پر نازل ہوا، اور اس میں بہت سے اہم اسلامی مسائل اور حکومت جو اہم اسلامی رکن ہے کے بارے میں مسائل پیش کئے گئے ہیں اور اس سورے کی متعدد آیات میں تاکیداً بیان ہوا ہے کہ حکم وفرمان اور قانون سازی صرف خدا تعالیٰ کا حق ہے اور اس سورے میں ان تاکیدات بہت سے معانی اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔

آٹھویں آیت خدا پر ایمان اور اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کہتی ہے: ''جب اہل ایمان کو خدا اور رسول کی طرف دعوت دی جائے تا کہ وہ ان کے درمیان حکم کرے تو وہ یہی کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔'' بعض تفاسیر میں اس کے بعد والی آیات کا یہ شان نزول بیان ہوا ہے کہ کچھ منافقین نے جب اپنی حالت کو متزلزل پایا تو وہ رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگے کہ ہم آپؐ کے ہر فرمان کی اطاعت کرتے ہیں۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ مذکورہ بالا آیت جو منافقین کے مدمقابل اہل ایمان کے بارے میں ہے، اس میں مومنین یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ ہم خدا کے ہر فرمان کو دل وجان سے تسلیم کرتے ہیں اور اس کے فرمان کے علاوہ ہر فرمان کو ناقابل اعتبار سمجھتے ہیں اور اگر اس سے مراد صرف قضاوت اور فیصلہ ہو تو بھی ہمارے مقصود پر اس کی دلالت واضح ہے، چونکہ کہ جیسا ہم کہہ چکے ہیں: قضاوت کو بھی کسی قانون کی اساس پر عملی صورت حاصل ہوتی ہے، لہٰذا خدا اور رسول کی قضاوت کے سامنے سر جھکانا قانون الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے برابر ہے، اسی لئے قاضی حضرات اپنے احکام صادر کرتے وقت ایک یا چند قانونی مآخذ پر اعتماد کرتے ہیں اور اسی کی بنیاد پر حکم صادر کرتے ہیں، اہل ایمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ قوانین الٰہی کے مآخذ پر اعتبار کریں اور انھیں اپنی سند قرار دیں۔

نویں آیت میں پہلی آیت کا مضمون بیان ہوا ہے (یعنی ترک شرک، ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا، اولاد کو ہلاک کرنے سے اجتناب، بطور مجموعی بے گناہوں کا خون بہانے اور برے عمل انجام دینے سے پرہیز کرنا) اور ان سارے امور کے آخر میں آیت فرماتی ہے:

> ''یہ میری سیدھی راہ ہے اس کی پیروی کرو اور مختلف راہوں اور (غلط قوانین) کی پیروی نہ کرو کیونکہ یہ تمھیں صراط مستقیم اور حق کی راہ سے دور کردیں گے یہ وہ چیز ہے جس کی خدا تمھیں تاکید کرتا ہے تا کہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔''

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿١٥٣﴾

اس تعبیر سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ صراط مستقیم سے مُراد قانون، حکم اور فرمان الٰہی ہی ہے اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ غلط اور غیر صحیح راہیں ہیں۔ جو لوگوں کو خدا کی سیدھی راہ سے دور کردیتی ہیں اسی طرح اس بیان سے یہ استفادہ بھی ہوتا ہے کہ دوسری راہوں کو طے کرنا اور ان پر چلنا تفرقے اور انتشار کا سبب ہے۔ اس کی دلیل بھی واضح ہے اور وہ یہ کہ تمام انسانوں بلکہ بڑے بڑے دانشور بھی تمام

کاموں کے مصالح (فوائد) اور مفاسد (نقصانات) کی تشخیص میں مختلف نظر رکھتے ہیں، اور اگر قانون سازی کا فریضہ انسان کے سپرد کر دیا جائے تو انسانی معاشرے پر ایک دائمی اختلاف و انتشار حاکم ہو جائے گا۔ ''ابن مسعود'' رسول اکرمؐ سے ایک حدیث میں نقل کرتے ہیں کہ آپؐ نے ایک خط مستقیم کھینچا، پھر فرمایا: ''یہی راہ درست ہے پھر اس کے دائیں اور بائیں طرف سے مختلف خطوط کھینچے اور فرمایا: یہ راہیں متفرق ہیں ان میں سے ہر ایک پر ایک شیطان بیٹھا ہے جو لوگوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔''[۱]

دسویں اور آخری موضوع بحث آیت میں اگر چہ براہ راست یہ نہیں کہا گیا کہ قانون سازی فقط خدا کا حق ہے، لیکن اس کے مضمون سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ خدا کے علاوہ کسی کے لئے قانون سازی کی کوئی گنجائش نہیں، آیت فرماتی ہے۔

''آج میں نے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور اپنی نعمت کو تم پر تمام کر دیا اور اسلام کو تمہارے لیے ایک جاودانی دین کے طور پر پسند کر لیا ہے۔''

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ؕ

معلوم ہے کہ دین اپنے حقیقی مفہوم کے ساتھ انسان کے تمام احوال کا احاطہ کرتا ہے اور اس بات کے پیش نظر کہ اسلام ادیان کا خاتمہ کرنے والا اور آخر تک باقی رہنے والا دین ہے، آیت شریفہ کا یہ مفہوم ہے کہ دنیا کے اختتام تک جن قوانین کی انسان کو ضرورت ہے، اسلام نے انھیں اپنے پیش نظر رکھا ہے، اس لحاظ سے کسی کے لئے کسی قانون سازی کی ضرورت اور گنجائش باقی نہیں رہتی۔

البتہ ان قوانین میں سے بعض خاص اور جزئی ہیں جبکہ بعض عام اور کلی ہیں اسلامی قانون ساز افراد اور علماء کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ان عام قوانین و قواعد اور ان کے مصادیق کے درمیان مطابقت پیدا کریں اور اس طرح ضروری قوانین کو ان عام اور کلی قواعد سے اخذ کریں۔

روایات میں بھی اس مطلب کی بار بار تاکید کی گئی ہے اور حضرت علیؑ نے بھی ان لوگوں کی مذمت میں تفصیلی طور پر بیان کیا ہے جو اپنے آپ کو اسلامی معاشرے میں قانون سازی کا مجاز سمجھتے تھے اور اپنے اس عمل کو اجتہاد کا نام دیتے تھے، آپؑ کے بیان کا ایک حصہ یہ ہے:

اَمْ اَنْزَلَ اللّٰہُ سُبحانَہُ دیناً ناقِصاً فَاسْتَعانَ بِھِمْ عَلی اِتْمامِہِ اَمْ کانُوا شُرَکاءَ لَہُ فَلَھُمْ اَنْ یَقُولُوا وَعَلَیْہِ اَنْ یَرْضَی"

یعنی: ''کیا خدا نے ناقص دین نازل کیا تھا جو اس نے ان لوگوں سے اسے مکمل کرنے کی خواہش کی ہے؟ یا یہ لوگ خدا کے شریک ہیں جنھیں یہ حق دیا گیا ہے کہ جو چاہیں کہیں اور (قانون بنائیں) اور خدا پر لازم ہے کہ وہ ان کے اس عمل سے راضی ہو اور اسے قبول کرے؟''[۲]

---

[۱] تفسیر فخر رازی ج ۱۴، ص ۳۔

[۲] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۸۔

کئی ایک روایات میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اسلامی امت کے لئے تمام ضروری امور کو اسلامی قوانین میں پیش نظر رکھا گیا ہے، اگر چہ وہ کسی کے بدن پر لگائی جانے والی خراش کی دیت ہی کیوں نہ ہو اور یہ کہ ان احکام کو ان کے اصل افراد سے لیا جائے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام میں قانون بنانا صرف اللہ تعالیٰ کا کام ہے اور دوسروں کے لئے اس سلسلے میں کوئی جگہ نہیں۔

اس بناء پر جو عمل اسلامی قانون ساز اسمبلی میں انجام دیا جاتا ہے وہ کلی اور عام قاعدوں پر خاص اور جزئی مصادیق کی تطبیق کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔امام محمد باقر -نے ایک حدیث میں فرمایا:

"اِنَّ اللّٰہَ تَبارَكَ وَتَعالی لَمْ یَدَعْ شَیْئاً یَحْتاجُ اِلَیْہِ الاُمَّةُ اِلاّ اَنْزَلَہُ فی کِتابِہِ وَ بَیَّنَہُ لِرَسُوْلِہِ"

''خدا تعالیٰ نے امت کی ضرورت کی کسی چیز کو نہیں چھوڑا بلکہ اپنی کتاب میں اس کا ذکر کیا اور اپنے رسول کے لئے اسے واضح طور پر بیان فرمایا ہے۔''[1]

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادقؑ نے فرمایا:

"ما مِنْ شَیْئٍ اِلاّ وَفیہِ کِتاب وَسُنَّة"

''ہر چیز کے بارے میں کتاب وسنت میں حکم بیان ہوا ہے۔''[2]

دوسری روایات میں ذکر ہوا ہے کہ امت اسلامی کے لئے تمام ضروری قوانین واحکام تشکیل دیئے گئے ہیں، ان میں سے ایک حدیث میں امام جعفر صادقؑ نے فرمایا:

"ما تَرَكَ عَلِیّ شَیْئاً اِلاّ کَتَبَہُ حَتّی اَرْشِ الْخَدْشِ"

''علی -نے کسی قانون کو نہ چھوڑا بلکہ رسول اکرمؐ کی املاء سے علیؑ نے ہر حکم کو تحریر کیا یہاں تک کہ خراش کی دیت کو بھی لکھا۔''[3]

اس قسم کی احادیث سے مزید آگاہی کے لئے جامع الاحادیث جلد ۱، مقدمات کے باب ۴ کی طرف رجوع کیا جائے۔

---

[1] اصول کافی، ج ۱، ص ۵۹، حدیث ۲۔

[2] اصول کافی، ج ۱، ص ۵۹، حدیث ۴

[3] جامع احادیث الشیعہ، ج ۱، با ۴، ابواب مقدمات، حدیث ۲۶

کیارسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ علیہم السلام قانون سازی کا حق رکھتے ہیں؟

ولایت تشریعی کا موضوع یا سادہ الفاظ میں رسول اکرمؐ اور ائمہؑ کے لئے قانون سازی کے حق کا ثابت ہونا بہت پیچیدہ موضوع ہے، کہ جس کے بارے میں احادیث میں بہت گفتگو کی گئی ہے۔کیا رسول اکرمؐ کو یہ حق حاصل ہے کہ آپؐ جس چیز کو مصلحت کے مطابق پائیں اسے مسلمانوں کے لئے ایک قانون کی حیثیت دے دیں خواہ خدا کی طرف سے اس کے بارے میں خصوصی طور پر وحی نازل نہ ہوئی ہو؟ بلاشک یہ بات محال اور ناممکن نہیں، البتہ اس شرط کے ساتھ کہ خدا نے انھیں ایسا حق (حق قانون سازی) دے رکھا ہو، بحث اس بارے میں ہے کہ کیا ایسا امر وقوع پذیر ہوا ہے یا نہیں اور دلائل نقلی اس کی گواہی دیتے ہیں یا نہیں؟ ہمارے پاس بکثرت روایات موجود ہیں (جن میں سے کچھ صحیح اور کچھ ضعیف ہیں) جو یہ کہتی ہیں:

خدا تعالیٰ نے رسول اکرمؐ اور ان کے بعد اوصیاء کو "تفویض امر" کیا ہے (تفویض امر سے مراد قانون سازی کا حق ہے)۔مرحوم کلینی نے "تفویض" سے متعلق احادیث کو اصول کافی کی جلد اول کے ایک باب میں جمع کیا ہے اور اس سلسلے میں انھوں نے دس روایات نقل کی ہیں جن میں سے امام محمد باقر -اور امام جعفر صادق -سے مروی حدیث میں فرمایا گیا ہے:

"اِنَّ اللّٰہَ تَبارَکَ وَتَعالی فَوَّضَ اِلی نَبِیِّہِ اَمْرَ خَلْقِہِ لِیَنْظُرَ کَیْفَ طاعَتُھُمْ ثُمَّ تَلی ھٰذِہِ الآیَۃَ وَ ما آتاکُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوْہُ وِ ما نَھا کُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوا"

"خدا تعالیٰ نے لوگوں کے امور کو رسول اکرمؐ کے سپرد (تفویض) کیا تاکہ وہ ملاحظہ کرے کہ لوگ کیسے اطاعت کرتے ہیں، پھر آپؐ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی کہ ہر اس چیز کو جس کا رسول حکم دیں لے لو اور اس پر عمل کرو اور جس چیز سے تمھیں روکیں اس سے رک جاؤ۔"[1]

امام جعفر صادقؑ کی ایک اور حدیث میں ہے کہ:

اِنَّ اللّٰہَ عَزَّوَجَلَّ اَدَّبَ نَبِیَّہُ عَلی مَحَبَّتِہِ فَقالَ وَاِنَّکَ لَعَلی خُلُقٍ عَظیمٍ ثُمَّ فَوَّضَ اِلَیْہِ فَقالَ عَزَّوَجَلَّ وَ ما آتاکُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوہُ وَما نَھاکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوا، وَقالَ عَزَّوَجَلَّ مَنْ یُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ اَطاعَ اللّٰہَ...:

'خدا تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو اپنی محبت سے آشنا کیا اور انھیں پروان چڑھایا پھر فرمایا: تم عظیم اخلاق کے مالک ہو پھر انھیں امر تفویض کیا اور فرمایا: جو کچھ رسول تمہارے لئے لائے اسے لے لو اور جس چیز سے تمھیں منع

---

[1] اصول کافی، ج۱ص۲۶۷، حدیث ۵

کرے اس سے باز آ جاؤ اور فرمایا: جس نے رسول خداؐ کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی ہے'' [1]

مذکورہ بالا عبارت میں ایسے قرائن وشواہد موجود ہیں جو بخوبی ظاہر کرتے ہیں کہ تفویض سے مراد کیا ہے۔ان روایات میں سے بعض میں بیان کیا گیا ہے کہ اللہ کی طرف سے اس تفویض کے بعد رسول اکرمؐ نے چند قوانین وضع کئے ؛ مثلاً خدا نے نماز کو دو رکعت قرار دیا اور رسول اکرمؐ نے (نماز ظہر، عصر اور عشاء میں) دو رکعت کا اضافہ کر دیا اور نماز مغرب میں ایک رکعت کا اور رسول اکرمؐ کی یہ قانون سازی فریضۂ الٰہی کے ہم پلہ اور واجب ہے۔اسی طرح آپؐ نے ۳۴ رکعت (فرائض کے دوگنا) کو نماز نافلہ کے عنوان سے فرائض پر اضافہ کیا، خدا تعالیٰ نے رمضان کے روزے فرض کئے اور رسول اکرمؐ نے ماہ شعبان اور ہر ماہ کے تین روزے مستحب قرار دیئے۔ [2]

دوسری احادیث جو رسول اکرمؐ کو قانون سازی کا حق دینے کے بارے میں وارد ہوئی ہیں ان میں رسول اکرمؐ کی قانون سازی کے اور نمونے بھی ملتے ہیں۔ [3]

تفویض امر (امر کی سپردگی) سے مراد کیا ہے؟ اس بارے میں چند احتمالات ہیں:

۱۔قانون سازی کا رسول اکرمؐ کو مکمل اختیار۔

۲۔محدود مواقع پر میں جزئی طور پر قانون سازی کا اختیار کچھ اس طریقے سے کہ رسول اکرمؐ نے احکام الٰہی کے نزول سے پہلے یا بعد میں کچھ قوانین بنائے ہیں جنھیں خدا تعالیٰ کی تائید حاصل ہوئی ہے۔

۳۔عطا کرنے اور محروم کرنے کی تفویض واختیار (یعنی جسے چاہیں مصلحت کی بناء پر بیت المال سے عطا کریں اور جسے چاہیں عطا نہ کریں)

۴۔امور حکومت، تدبیر وسیاست، حفاظت نظام اور نفوس کی تربیت کی تفویض واختیار۔

۵۔اسرار کے بیان کا اختیار، یعنی احکام واسرار میں سے جنھیں چاہیں بیان کریں اور جن کے اظہار میں مصلحت نہ ہو، بیان نہ کریں۔باب تفویض میں نقل ہونے والی روایات سے احتمال نمبر دو کا مفہوم ہی اخذ ہوتا ہے اور وہ یہ کہ رسول اکرمؐ نے محدود مقامات پر خدا تعالیٰ کے اذن سے قانون سازی کی ہے (شاید ان کی تعداد دس سے زیادہ نہ ہو) اور اس بات کو خدا کی طرف سے تائید حاصل ہوئی ہے، دوسرے الفاظ میں خدا تعالیٰ نے یہ اختیار آپؐ کو دیا ہے کہ آپؐ بعض صورتوں میں قانون تشکیل دیں اور پھر اس کی تائید کر دیں۔

اسی ضمن میں ان روایات سے یہ بھی استفادہ ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے انھیں یہ مقام چند وجوہات کی بناء پر عطا کیا ہے: پہلی وجہ یہ ہے کہ وہ ان کے مقام کی عظمت کو ظاہر کرے کہ ان کی قانون سازی خدا کی قانون سازی کے ہم پلہ ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ لوگوں کا امتحان لے کہ وہ کس قدر رسولؐ کے فرمانبردار ہیں، تیسری یہ کہ خدا نے ان کی تائید وحمایت روح القدس کے ذریعے فرمائی ہے اور اس طرح

---

[1] اصول کافی، ج۱ص ۲۶۵، حدیث ۱

[2] اصول کافی، ج۱ص ۲۶۶، حدیث ۴

[3] روایات تفویض کی تحقیق اور وضاحت کیلئے کتاب انوار الفقاھۃ، جلد اول، صفحہ ۵۵۲ تا ۵۸۵ کا مطالعہ فرمائیں۔

انھیں احکام واسرار الٰہی سے آشنا کیا ہے۔ مذکورہ بالا بیان سے چند نکتے واضح ہوجاتے ہیں:

1۔ روایات تفویض سے مجموعی طور پر یہ پتہ چلتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے رسول اکرمؐ کو اجمالی طور پر ولایت تشریعی عطا کی ہے اور یہ بات ایک طرف سے اطاعت خلق کے امتحان کے لئے اور دوسری طرف سے رسول اکرمؐ کی خدا کے نزدیک عظمت ومنزلت کو ظاہر کرنے کے لئے ہے۔

2۔ یہ تفویض کلیت اور عمومیت نہیں رکھتی بلکہ محدود اور گنے چنے حالات میں واقع ہوئی ہے یہی وجہ ہے کہ غالباً اہم مسائل کے بارے میں جب آپؐ سے پوچھا جاتا تو آپؐ وحی کا انتظار کرتے اور یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ تفویض عمومیت کی حامل نہیں تھی، وگرنہ رسولؐ وحی کا انتظار کئے بغیر خود ہی قانون بنا ڈالتے۔ (غور فرمائیں)

3۔ یہ اعلیٰ مقام رسولؐ کو خدا کے اذن واجازت کے ساتھ عطا ہوا ہے اس کے علاوہ رسولؐ کے ہاتھوں بعض قوانین کی تشکیل کے بعد خدا ان کی تائید کر دیتا تھا، لہٰذا یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ ایک سے زیادہ قانون ساز ہیں بلکہ رسولؐ کی قانون سازی خدا ہی کی قانون سازی کی فرع اور اسی کا جلوہ ہے۔

4۔ یہ اعلیٰ مقام رسولؐ کو خدا کی طرف سے تائید شدہ ہونے کے بعد عطا ہوا اور جب آپؐ کو روح القدس کے ذریعے قوت عطا کر دی گئی لہٰذا آپؐ معصوم تھے اور آپؐ سے کسی خطا ولغزش کے سرزد ہونے کا امکان نہ تھا، اس بناء پر جو لوگ ان صفات کے حامل نہ ہوں یہ سب ان کے لئے ثابت نہیں ہوسکتا۔

5۔ ائمہ معصومینؑ اگرچہ روح القدس کی تائید کے حامل تھے اور ہر لغزش وخطا سے پاک وپاکیزہ، لیکن انھوں نے جدید قانون سازی نہیں کی اس لئے کہ اکمال دین اور اتمام نعمت کے بعد امت کے لئے ضروری تمام احکامات' ان روایات کے مطابق جو حد تواتر کو پہنچتی ہوئی ہیں' قانون کے طور پر وضع کئے جا چکے تھے اور نئی قانون سازی کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی، اس بناء پر ائمہ معصومینؑ کی ذمہ داری ان احکام کی توضیح تھی جو انھیں براہ راست یا بالواسطہ طور پر رسول اکرمؐ سے حاصل ہوئے تھے۔

سوال

ممکن ہے کہا جائے کہ بعض روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ علیؑ نے گھوڑے پر زکات مقرر فرمائی اور یہ ایک جدید قانون سازی تھی۔ روایت اس طرح ہے کہ امام محمد باقر -اور امام جعفر صادقؑ نے فرمایا:

"وَضَعَ اَمیرُ الْمُؤمِنینَ عَلَی الْخَیْلِ الْعِتاقِ الرّاعِیَةِ فی کُلِّ فَرَس فی کلِّ عامٍ دینارینِ وَ عَلی البراذینِ دیناراً"۔

یعنی: "امیر المؤمنین -نے دشت میں چرنے والے اچھے گھوڑوں پر ہر سال فی کس دو دو دینار مقرر کئے اور وزن اٹھانے والے گھوڑے (ٹٹو) پر ایک دینار معین کیا۔"

اسی طرح علی بن مھز یار کی روایت میں ذکر ہوا ہے کہ امام محمد تقی الجواد - جب ۲۴۰ھ میں بغداد میں داخل ہوئے تو آپؑ نے عام طور پر لئے جانے والے واجب خمس کے علاوہ ایک اور خمس کو بہت بڑی مقدار کے مال میں یکبارگی مقرر فرمایا۔[1] دونوں حدیثیں سند کے لحاظ سے قابل اعتبار ہیں لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ائمہ معصومینؑ بھی قانون سازی کا حق رکھتے تھے۔

جواب

اس مقام پر حکومتی احکام اور عمومی احکام کے درمیان خلط ملط کر دیا گیا ہے، عمومی احکام وہ قوانین ہیں جو ہر دور اور ہر جگہ قیامت تک کے لئے ثابت اور برقرار ہوتے ہیں، لیکن حکومتی احکام وہ ہوتے ہیں جو ضرورت کے مطابق وقتی طور پر مقرر کئے جاتے ہیں (جیسے تمبا کو کی حرمت کا حکم جو انگلستان کے اقتصادی سامراج کا مقابلہ کرنے کی خاطر ایک بزرگ فقیہ کی طرف سے صادر ہوا اور پھر جب اس کی ضرورت نہ رہی اور خطرہ ٹل گیا تو اس حکم کو ختم کر دیا گیا)۔

امام محمد تقی الجواد - کی روایت میں موجود قرائن سے بخوبی استفادہ ہوتا ہے کہ جب آپؑ بغداد میں داخل ہوئے اس وقت شیعہ سخت مالی بحران کا شکار تھے اور امامؑ نے اس مشکل کو حل کرنے کے لئے متعدد بار خمس لیا اور حقیقت میں آپؑ نے عنوان ثانی کی اس کے ایک مصداق پر تطبیق فرمائی نہ یہ کہ کوئی جدید قانون سازی کی۔ امیر المؤمنین علیؑ کی روایت میں مذکور حکم زکوٰۃ بھی ممکن ہے اسی طرح کا ہو، لہٰذا یہ حکم اسی زمانے تک محدود تھا اور فقہاء نے اسے ایک عام وضع شدہ قانون کی حیثیت نہیں دی اور نہ ہی اس کے مطابق فتویٰ دیا ہے۔ (غور فرمائیں)

6- نمبر ۵ کے تحت جو کچھ بیان ہوا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے، ائمہ معصومینؑ کے علاوہ کوئی بھی شخص بطریق اولیٰ قوانین عامۂ الٰہی کی تشکیل کا حق نہیں رکھتا کیونکہ ختم نبوت، رسول اکرمؐ کی رحلت اور اکمال دین و اتمام نعمت کی وجہ سے کسی کے لئے قانون سازی کی کوئی گنجائش نہیں رہتی اور قیامت تک لوگوں کو پیش آنے والے مسائل سے متعلق احکام بکثرت روایات کے مطابق واضح طور پر بیان ہو چکے ہیں اور پھر غیر معصومین، روح القدس کی تائید سے بھی مستفید نہیں تا کہ اس قسم کا حق ان کے لئے ثابت ہو سکے، چونکہ گذشتہ روایات میں قانون سازی کی اہلیت کی ایک شرط اسی تائید کو قرار دیا گیا ہے۔

7۔ توجہ رہے کہ بعض روایات کی مراد وضع احکام نہیں، بلکہ ان کی نظر حکومت و ولایت کی تفویض یا بیت المال کی تفویض (سپردگی) کی طرف ہے۔

8۔ بعض اہل سنت فقہا، فقہائے اسلام کو مالانص فیہ میں وضع احکام کی تفویض کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ علمائے اہل سنت مسائل کو دو قسموں میں تقسیم کرتے ہیں: ما فیہ نص (جس چیز کے بارے میں قرآن وسنت میں حکم موجود ہو) ما لا نص فیہٗ (جس چیز کے بارے میں کوئی حکم قرآن وسنت میں موجود نہ ہو)

---

[1] وسائل الشیعہ، ج٦، ابواب مایجب فیہ الخمس، باب ٨ حدیث ٥۔

پہلی قسم یعنی نص کی موجودگی کی صورت میں سب کی رائے یہی ہے کہ نص کے مطابق عمل کیا جائے جبکہ دوسری قسم میں اکثر اہل سنت کی رائے یہ ہے کہ نص نہ ہونے کی صورت میں پہلے ''قیاس'' کی طرف رجوع کیا جائے گا، یعنی اس مسئلے کا موازنہ کسی اور مشابہ مسئلے کے ساتھ کیا جائے گا جس کا حکم موجود ہے اور پھر اس مسئلے کا بھی وہی حکم قرار دیا جائے گا جو اس کے مشابہ مسئلے کا ہے اور اگر ایسا نہ ہو سکے تو علمائے دین کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس عمل کی مصلحت اور مفسدہ کی تحقیق کریں اور پھر مصلحت یا مفسدے (نقصان) میں سے جو بھی قوی ہو اس کے مطابق حکم وقانون وضع کریں اور ان کی تقلید کرنے والوں پر لازم ہے کہ وہ اس حکم کو تسلیم کریں اور اسے حکم خدا سمجھ کر اس کے مطابق عمل کریں۔

یہ وہی چیز ہے جس کو بعض اوقات ''اجتہاد'' اور کبھی ''تصویب'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے (البتہ اجتہاد ایک خاص معنی میں نہ اجتہاد یعنی دلائل شرعیہ سے احکام کو استنباط واخذ کرنا) اور تصویب کے بارے میں وہ کہتے ہیں جس چیز کو فقیہ اس قسم کے حالات میں قانون کے طور پر وضع کرتا ہے خدا بھی اسے صائب اور درست قرار دیتا ہے! اور اگر کئی ایک فقہاء مختلف اور متعدد احکام وضع کریں تو وہ سب کے سب احکام الٰہی کے عنوان سے قابل قبول ہیں! اور اس طرح وہ فقہاء کو ان صورتوں میں قانون سازی کا حق دیتے ہیں جن میں کوئی حکم وارد نہ ہوا ہو۔

لیکن فقہائے شیعہ مکتب اہل بیتؑ کی پیروی میں اس بات کے بنیاد ہی سے مخالف ہیں اور یہ کہتے ہیں: قیامت تک کے لئے وہ قوانین جن کی انسانیت کو ضرورت پڑ سکتی ہے شریعت اسلامی میں انھیں پیش نظر رکھا گیا ہے اور کوئی ایسی چیز باقی نہیں رہی جس کے بارے میں کوئی حکم نہ ہوتا کہ کسی کو حکم وضع کرنے کی ضرورت پڑے۔

البتہ ان احکام میں سے بعض واضح طور پر قرآن وسنت میں بیان ہوئے ہیں اور بعض قواعد کلیہ اور اصول عامہ کی صورت میں یا دوسرے الفاظ میں ''عمومات'' اور ''اطلاقات'' میں دلائل اولیہ اور ثانویہ کی شکل میں نظر آتے ہیں اس طرح کہ موضوعات میں سے ہر موضوع کا حکم موجود ہے اگر چہ یہ حکم کبھی واقعی اور کبھی حکم ظاہری کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔

اس بناء پر کوئی چیز اجتہاد (خاص معنی میں) یا قیاس اور مالانص فیہ کے عنوان سے موجود نہیں اور فقہاء کا کام صرف احکام کلی اور ان کے مصادیق کے درمیان مطابقت پیدا کرنا ہے۔ اس بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مجلس قانون ساز، میں قانون سازی مذہب اہل بیت ÷ کی پیروی کرنے والوں کے نزدیک مبتلا بہ مسائل میں جدید احکام وضع کرنے کے معنیٰ میں نہیں بلکہ مراد اصول کی فروع پر تطبیق یا مختلف موضوعات کی تشخیص ہے جسے مہارت موضوعی بھی کہا جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ مذہب شیعہ کے نزدیک قانون ساز مجالس (اسمبلیاں) احکام اسلام کے مقابلے میں یا ''مالانص فیہ'' میں جدید احکام وقانون کی تشکیل نہیں کرتیں بلکہ یہ سب احکام کی تطبیق ہوتی ہے یا کسی موضوع کی شناخت حاصل کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجلس قانون ساز کے ساتھ شوریٰ نگہبان بھی موجود ہے تاکہ فقہاء کی ایک جماعت اسمبلی (مجلس قانون ساز) کی نگرانی کرے کہ وضع شدہ قوانین، احکام اسلام کے خلاف تو نہیں ہیں۔ یہاں تک کہ مجلس تشخیص مصلحت کہ جسے حال ہی میں آئین میں پیش نظر رکھا گیا ہے، بھی تشخیص موضوع کی

خاطر ہے نہ وضع قانون کے لئے۔

اس کی توضیح یہ ہے کہ عنوانات ثانویہ سے ایک عنوان ہے ''اہم'' اور ''کم اہم'' یعنی جب دو شرعی مسئلوں میں تضاد واقع ہو جائے مثلاً کبھی لوگوں کے مال کی حفاظت اور مالک کی اجازت کے بغیر اس کے مال میں تصرف نہ کرنے اور شہر سے دور تک روڈ بنانے کے مسئلے کا آپس میں تضاد ہو جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف سے معاشرتی نظام کی حفاظت واجب ہے اور جو روڈ بنائے بغیر ناممکن ہے اور دوسری طرف سے لوگ کی زمین اور مال کی حفاظت بھی لازم ہے، اس قسم کی صورتحال میں اہم کو کم یا غیر اہم پر ترجیح دی جائے گی اور لوگوں کو اپنی زمینوں میں سے روڈ گذرنے کی اجازت دینی پڑے گی اور حکومت کی طرف سے ان کی جائیداد کے نقصان کی تلافی ہونی چاہیے۔

اسی طرح مختلف اجناس کے بھاؤ مقرر کرنے سے متعلق اسلام کا اولی اور پہلا حکم آزادئ نرخ ہے، لیکن اگر یہ آزادی منافع خوروں کے سوء استفادہ کا سبب بن جائے اور معاشرہ مشکلات کا شکار ہو جائے اور معاشرے کے اقتصادی نظام کی حفاظت حکومت کی طرف سے نرخ کی تعیین پر متوقف ہو تو اس صورت میں بلاشبہ نظام کی حفاظت مقدم اور قابل ترجیح ہوگی، یہاں اجناس کے نرخ کا تعیین کا قانون وضع کرنا اور اسے نافذ کرنا حکومت اسلامی کی ذمہ داری ہے۔

مجلس تشخیص مصلحت کو چاہیے کہ ایسے حالات میں جو چیز ''اہم'' ہے اس کا نہایت احتیاط کے ساتھ انتخاب کرے تا کہ اسلامی حکومت اسے نافذ کر سکے، یہ ٹھیک اسی طرح ہے جس طرح جان کی حفاظت لازم ہے اور حرام گوشت کا کھانا ممنوع ہے لیکن بعض مخصوص حالات میں حرام گوشت سے استفادہ کرنا جائز ہو جاتا ہے کیونکہ نسل کی حفاظت کی اہمیت اس سے کہیں زیادہ ہے۔

اس بناء پر مجلس تشخیص مصلحت اور اجتہاد واستحسان اور مصالح مرسلہ جن کے اہل سنت قائل ہیں، کے درمیان بے پناہ فرق ہے، تشخیص مصلحت میں دو حکم کا تعارض مدنظر ہوتا ہے اور حکم اہم کی مصلحت کو ترجیح دی جاتی ہے اور اہل سنت کے ہاں وہ موضوع جس کے لئے کوئی حکم وضع نہیں ہوا ہوتا، حکم وضع کیا جاتا ہے۔ (غور فرمائیں)

مذکورہ بالا بیانات سے مجموعی طور پر نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ قانون ساز اسمبلی، حکومت اسلامی کے ارکان میں سے ایک رکن ہے۔ کیونکہ ہر زمانے، ماحول اور حالات میں ضرورتیں اور جدید مسائل جنم لیتے ہیں، جن کے متعلق پہلے سے قانون پیش نظر ہونا چاہیے، لیکن قانون سازی سے مراد ہے لائحہ عمل، اصول کی فروع پر تطبیق، قوانین کلی سے فروعی قوانین کا اخذ واستخراج اور محتاط انداز میں موضوعات کی تشخیص ہے۔

مجلس شوریٰ اور نمائندوں کا انتخاب

یہاں سب سے پہلے اسلام میں مشورے کی اہمیت اور کن صورتوں میں مشورہ ضروری ہے اور کن لوگوں سے مشورہ لیا جائے، کے بارے میں گفتگو ضروری ہے۔

ا۔ مشورے کی ضرورت اور اہمیت

مشورت کا موضوع خاص طور پر اجتماعی امور اور ان مسائل میں جو معاشرے کے لئے تقدیر ساز ہیں' ان اہم موضوعات میں سے ایک ہے جس کو اسلام نے بڑی اہمیت اور احتیاط کے ساتھ پیش کیا ہے اور یہ موضوع قرآنی آیات، احادیث اور اسلام کے عظیم پیشواؤں کی تاریخ وسیرت میں ایک مخصوص مقام رکھتا ہے۔ قرآن مجید کی کئی آیتوں میں مشورے کا حکم دیا گیا ہے۔ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۵۹ میں خدا تعالیٰ رسول اکرمؐ کو مسلمانوں کے ساتھ مختلف امور میں مشورہ کرنے کا حکم دیتا ہے: ''وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ'' اور سورۂ شوریٰ کی آیت ۳۸ میں سچے اہل ایمان کے واضح اوصاف بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

الَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَأَمْرُهُمْ شُورٰى بَيْنَهُمْ

یعنی: ''وہ ایسے لوگ ہیں جو خدا کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے ایمان لاتے ہیں، نماز کو قائم کرتے ہیں اور ان کے امور باہمی مشورے سے طے پاتے ہیں۔''

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا ہے کہ اس آیت میں مسئلہ شوریٰ کو خدا پر ایمان اور نماز کے مترادف قرار دیا گیا ہے جو اس کی غیر معمولی اہمیت کی علامت ہے۔ بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ رسول اکرمؐ لوگوں کے ساتھ مشورے پر اس وجہ سے مامور ہیں کہ اس کی وجہ سے مسلمانوں کی شخصیت کا احترام ملحوظ رہے اور انھیں معاشرتی مسائل میں شریک قرار دیا جائے۔ چونکہ کہ آخری فیصلہ کرنا خود رسول اکرمؐ کا کام ہے نہ کہ شوریٰ کا چنانچہ قرآن مجید مشورت سے متعلق اس آیت کے آخر میں فرماتا ہے:

''فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ''

یعنی ''جب آپؐ فیصلہ کر لیں تو خدا پر توکل کریں۔''

لیکن تسلیم شدہ بات ہے کہ ذیل آیت سے یہ مراد نہیں کہ لوگوں سے مشورہ لو اور پھر ان کی آراء سے چشم پوشی کرتے ہوئے کوئی اور راہ اختیار کر و ایسا کام نہ آیت کے مقصد کے ساتھ کوئی مناسبت رکھتا ہے (اس لئے کہ ایسا کرنا لوگوں کے عمومی افکار کی بے احترامی ہے جو مسلمانوں کے رنج کا باعث بن کر الٹا نتیجہ دے سکتی ہے) اور نہ رسول اکرمؐ کی سیرت کے ساتھ سازگار ہے کیونکہ جب آپؐ لوگوں سے اہم واقعات میں مشورہ لیتے تو لوگوں کی رائے کا احترام بھی کرتے تھے اور کبھی اپنی ذاتی رائے سے صرف نظر کر لیتے تا کہ مشورے کی حیثیت اور حقیقت ان کے درمیان تقویت حاصل کرے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ آیت مشورت اپنے سے پہلی اور بعد والی آیات کے پیش نظر غزوہ احد کی طرف ناظر ہے اور معلوم ہے کہ جنگ احد کے واقعے میں رسول اکرمؐ لشکر کے شہر سے باہر جانے کے موافق نہیں تھے، لیکن جب اکثر لوگوں کی رائے اسی پر ٹھہری تو آپؐ بھی ان کے موافق ہو گئے۔[۱]

بالفرض کہ یہ آیت رسول اکرمؐ کے لئے ایسی خصوصیت کو ثابت کرے کہ لوگوں سے آپؐ کا مشورہ محض ان کی حوصلہ افزائی اور احترام کی خاطر ہوتا تھا، لیکن سورۂ شوریٰ کی آیت جو عام مسلمانوں کا حکم بیان کر رہی ہے مکمل طور پر اس مطلب کی ترجمان ہے کہ اہم امور مسلمانوں کے درمیان باہمی مشورے اور شوریٰ کے ذریعے انجام پائیں اور شوریٰ ایک مقررہ کردار ادا کرتی ہے۔ واضح ہے کہ شوریٰ کا تعلق ایسے امور سے ہوتا ہے جن کے بارے میں خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی خاص حکم نازل نہ ہوا ہو، اور اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ شوریٰ رسول اکرمؐ کی جانشینی کے سلسلے میں بے اختیار ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس بارے میں خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک خاص فرمان صادر ہو چکا تھا اور وحی کے ذریعے رسولؐ کے خلیفہ اور وصی کی تعیین کے بعد شوریٰ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

دوسرے الفاظ میں مشورہ ہمیشہ موضوعات میں ہوتا ہے نہ احکام میں کہ ان کے بارے میں خدا کی طرف سے فرمان صادر ہو چکا ہوتا ہے۔ بہر حال شوریٰ ایک محدود دائرے میں اسلام کا ایک بنیادی قاعدہ ہے جس کی وضاحت کی جا چکی ہے اور یہ لفظ اپنے وسیع مفہوم کی بدولت تمام سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی امور پر حاوی ہے۔ قرآن مجید میں خاندانی نظام سے متعلق امور میں بھی مشورہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے مثلاً پورے دو سال تک پہنچنے سے پہلے بچے کا دودھ چھڑا دینا قاعدۂ مشورت کی طرف اشارہ کرتا ہے، ارشاد قرآنی ہے:

"فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا"

یعنی: ''اگر وہ دو (ماں باپ) ایک دوسرے کی رضا مندی سے اور مشورہ انجام دینے کے بعد چاہیں کہ دو سال پورے ہونے سے پہلے بچے کا دودھ چھڑا دیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں۔''[۲]

یہ اپنے امور میں مشورے کی غیر معمولی اہمیت پر ایک دلیل ہے۔

احادیث میں مشورے کی اہمیت

رسول اکرمؐ اور ائمہ معصومینؑ سے مروی احادیث میں مشورے کی بہت زیادہ اہمیت ذکر کی گئی ہے یہاں تک کہ رسول اکرمؐ نے ایک حدیث میں مشورے کو معاشرے کی حیات کے اسباب میں سے ایک سبب قرار دیا ہے اور ترک مشورے کو معاشرے کی موت کے اسباب میں سے ایک سبب کے طور پر متعارف کرایا ہے، فرماتے ہیں:

اِذا کانَ اُمَرائُکُمْ خِیارَکُمْ وَ اَغْنِیائُکُمْ سُمَحائِکُمْ وَ اَمْرُکُمْ شُوری بَیْنَکُمْ فَظَهْرُ

---

[۱] سید المرسلین، ج ۲، ص ۱۴۲

[۲] سورہ بقرہ۔ ۲۳۳

الاَرْضِ خَیرلَکُمْ مِنْ بَطْنِہا، وَاِذا کانَ اُمَرائِکُمْ شِرارَکُمْ وَ اَغْنیائُکُمْ بُخَلائَکُمْ وَلَمْ یَکُنْ اَمْرُکُمْ شُوری بِیْنَکُمْ فَبَطْنُ الاَرْضِ خَیْرلَکُمْ مِنْ ظَھْرِھا:

ترجمہ:''جب تمہارے حکمران نیک اور دولتمند لوگ سخی ہوں اور تمہارے کام مشورے سے انجام پائیں تو اس صورتحال میں زمین کی اوپر والی سطح اس کی نچلی سطح کی نسبت تمہارے لئے بہتر ہے(یعنی زندہ رہنے کے قابل ہو) لیکن اگر تمہارے حکمران بُرے لوگ اور اہل مال ودولت کنجوس ہوں اور تمہارے کام مشورے سے نہ ہوں تو اس صورت میں زمین کی نچلی سطح (قبر) اس کی اوپر والی سطح سے تمہارے لئے بہتر ہے!''[1]

مشورے کی اہمیت اس حد تک ہے کہ علیؑ نے فرمایا:

اَلاِسْتِشارَۃُ عَیْنُ الْھِدایَۃِ، وَقَدْ خاطَرَ مَنْ اِسْتَغْنی بِرَایِہِ:

یعنی:''مشورہ لینا عین ہدایت ہے اور جو شخص فقط اپنی فکر پر قناعت کرے، اس نے اپنے آپ کو خطرے میں جھونک دیا ہے!''[2]

حضرت علیؑ ایک اور حدیث میں فرماتے ہیں:

لا یَسْتَغْنِی الْعاقِلُ عَنِ الْمُشاوَرَۃِ:

یعنی''عاقل شخص اپنے آپ کو مشورے سے بے نیاز نہیں سمجھتا۔''[3]

اس کی دلیل بھی واضح ہے اور وہ حضرت علیؑ کے بیان کے مطابق کچھ یوں ہے:

حَقّ الْعاقِلِ اَنْ یُضیفَ اِلی رَأیِہِ رَأیَ الْعُقَلاءِ وَیَضُمَّ اِلی عِلْمِہِ عُلُومَ الْحُکَماءِ:

''عاقل شخص یہ حق رکھتا ہے کہ وہ دوسرے عقلاء کی آراء کو اپنی رائے کے ساتھ ملائے اور اہل علم کے علوم کا اپنے علم میں اضافہ کرے (اور ان سب سے باتوں کے بعد اہم کاموں کا فیصلہ کرے)۔''[4]

آپؑ ہی ایک اور حدیث میں فرماتے ہیں:

مَنْ شاوَرَ ذَوِی الْعُقُولِ اِسْتَضاءَ بِاَنْوارِ الْعُقُولِ:

---

[1] تحف العقول، مختصر اقوال رسول کا حصہ، حدیث ۱۳۔

[2] بحار، ج ۷۵، ص ۱۰۴۔

[3] غرر الحکم

[4] غرر الحکم

''ہر وہ شخص جو صاحبانِ عقل سے مشورہ لیتا ہے ان کی عقل کے نور سے نورانیت حاصل کرتا ہے۔''[1]

اس بناء پر مشورہ اپنی عقل وعلم وتجربے کے ساتھ دوسروں کے علوم، عقول اور تجربات کا اضافہ کرنا ہے کہ اس صورت میں انسان سے خطا ولغزش کا احتمال بہت کم ہو جاتا ہے۔ اس ضمن میں احادیث بکثرت موجود ہیں اور اس مختصر بحث کو رسول اکرمؐ اور حضرت علیؑ کی ایک ایک حدیث کے ذکر کے ساتھ ختم کرتے ہیں۔ رسول اکرمؐ نے فرمایا:

''لا مُظاهَرَةَ اَوْثَقُ مِنَ الْمُشاوَرَةِ''

یعنی ''مشورے سے زیادہ مضبوط کوئی پشت پناہ نہیں۔''[2]

اور حضرت علیؑ نے فرمایا:

''شاوِرْ ذَوِی الْعُقُولِ تَأْمَنُ مِنَ الزَّلَلِ وَالنَّدَمِ''

یعنی ''عقلمندوں سے مشورہ لو تاکہ لغزش اور ندامت سے محفوظ رہو۔''[3]

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ ضروری نہیں کہ مشورہ دینے والے انسان سے بالاتر ہوں بسا اوقات عام افراد جو خداداد عقل کے حامل ہوتے ہیں ان کے ساتھ مشورہ کرنے سے راہ حل نکل آتی ہے، چنانچہ امام رضا -سے مروی ایک روایت میں آیا ہے کہ آپؑ کی بارگاہ میں آپؑ کے والد گرامی کا ذکر چل پڑا۔ آپؑ نے فرمایا میرے والد گرامی کی عقل کا دوسروں کے ساتھ موازنہ نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن اس کے باوجود آپؑ سیاہ فام غلاموں سے مشورہ لیتے، آپؑ سے پوچھا گیا کہ کیا آپؑ ان جیسوں سے مشورہ لیتے تھے؟! تو آپؑ نے جواب دیا:

''اِنَّ اللهَ تَبارَكَ وَتَعالی رُبَّما فَتَحَ عَلَی لِسانِهِ:''

ترجمہ: ''بسا اوقات خدا تعالیٰ حق کو اس (جیسوں) کی زبان پر جاری کر دیتا ہے۔''[4]

اہمیت مشورہ کو عربی زبان کے ایک خوبصورت شعر کے ساتھ ختم کرتے ہیں:

اَقْرِنْ بِرَأْیِكَ رَأْیَ غَیْرِكَ وَاسْتَشِرْ
فَالْحَقُّ لایَخْتَفِی عَلَی الاِثْنَیْنِ
لِلْمَرْءِ مِرآةٌ تُرِیهِ وَجْهَهُ
وَیَری قَفاهُ بِجَمْعِ مِرآتَیْنِ:

---

[1] غرر الحکم

[2] بحار الانوار، ج ۷۵، ص ۱۰۰

[3] غرر الحکم

[4] میزان الحکمۃ، ج ۵، ص ۲۱۱

''دوسروں کی فکر ونظر کو اپنی فکر ونظر کے قریب کرو اور مشورہ کرو، اس لئے کہ حق دو افراد پر مخفی نہیں رہتا۔''

کیونکہ ایک آئینہ صرف انسان کے چہرے کو ظاہر کرتا ہے لیکن اگر دو آئینے ایک دوسرے کے بالمقابل قرار دیئے جائیں تو پس پشت منظر بھی دکھائی دیتا ہے!

مشورہ دینے والوں کی شرائط

بلاشبہ اہم امور اور حساس معاشرتی مسائل میں ہر ایک سے مشورہ نہیں لیا جا سکتا، بلکہ مشورہ دینے والا خاص صفات کا حامل ہونا چاہیے جن کی بناء پر وہ اس کام (مشورہ دینے) کی صلاحیت رکھتا ہو یہی وجہ ہے کہ روایات میں بعض لوگوں کو مشورے کے لائق اور بعض کو اس کے لائق نہیں قرار دیا گیا۔ امام جعفر صادق -فرماتے ہیں:

اِنَّ الْمَشْوِرَةَ لاتَكُونُ اِلاّ بِحُدُودِها الاَرْبَعَةِ... فَاَوَّلُها اَنْ يَكُونَ الَّذى تُشاوِرُهُ عاقِلاً، وَالثّانى اَنْ يَكُونَ حُرّاً مُتَدَيِّناً، وَالثّالِثُ اَنْ يَكُونَ صَدِيقاً مُؤاخِياً، وَالرّابِعُ اَنْ تُطْلِعَهُ عَلى سِرِّكَ فَيَكُونَ عِلْمُهُ بِهِ كَعِلْمِكَ...:

''مشورہ صرف چار شرائط کے ساتھ مفید ہے؛ پہلی یہ کہ مشورہ دینے والا عقلمند ہو دوسری یہ کہ آزاد اور مؤمن ہو، تیسری یہ کہ ہمدرد اور اچھا دوست ہو اور چوتھی یہ کہ اسے راز دار بناؤ تاکہ جس چیز کے بارے میں اس سے مشورہ لے رہے ہو اس سے وہ بھی اسی طرح آگاہ ہو جس طرح تم آگاہ ہو۔''[1]

حضرت علیؑ ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

خَيْرُ ما شاوَرْتَ ذَوُوا النُّهى وَالْعِلْمِ وَاُولُوا التَّجارِبِ وَالْحَزْمِ

''جن سے تم مشورہ طلب کرتے ہو انھیں صاحب علم و عقل اور دور اندیشی اور تجربات کا حامل ہونا چاہیے۔''[2]

اس کے برعکس کنجوس، ڈرپوک، لالچی اور احمق شخص سے مشورہ طلب کرنے سے روایات میں شدت کے ساتھ منع کیا گیا ہے۔ رسول اکرمؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا:

يا علی! لاتُشاوِرُ جَباناً فَاِنَّهُ يُضَيِّقُ عَلَيْكَ الْمَخْرَجَ وَلا تُشاوِرِ الْبَخيلَ فَاِنَّهُ يُقَصِّرُ بِكَ عَنْ غايَتِكَ، وَلا تُشاوِرُ حَريصاً فَاِنَّهُ يُزَيِّنُ لَكَ شَرَهاً

''اے علیؑ! بزدل شخص سے مشورہ نہ لو کہ وہ مشکلات سے نکلنے کی راہ تم پر تنگ کر دے گا اور کنجوس شخص سے

---

[1] میزان الحکمۃ ج۵،ص ۳۱۸

[2] غرر الحکم

مشورہ نہ طلب کرو کیونکہ وہ تمہیں جائز اور بجا طور پر خرچ وعطا سے اور مقصد تک پہنچنے سے باز رکھے گا اور حریص اور لالچی شخص سے بھی مشورہ نہ کرو کیونکہ وہ حرص اور لالچ کو تمہاری نظروں میں پر کشش بنا کر پیش کرے گا (اور تمہیں خطا کی طرف کھینچ لے جائے گا)۔" [1] کچھ اور روایات میں احمق، نادان اور جھوٹے شخص سے مشورہ کرنے سے منع فرمایا گیا ہے۔" [2]

مذکورہ بالا بیان سے بخوبی استفادہ ہوتا ہے مشیروں کو خاص طور پر اہم امور میں ذہین، عاقل، خیر خواہ، تجربہ کار، راستگو، امین، شجاع اور سخی ہونا چاہیے اور مذکورہ صفات میں سے کسی ایک کے نہ ہونے کی وجہ سے مشورے کے ارکان متزلزل ہو جاتے ہیں۔ مثلاً اگر مشیر احمق اور جاہل شخص ہو تو وہ حقائق کو تبدیل کر دیتا ہے اور جیسا کہ احادیث میں بیان ہوا کہ وہ تمہیں نیکی پہنچانے کا ارادہ کرتا ہے لیکن اس کی بجائے شر اور برائی کا سبب بن جاتا ہے! اور اگر وہ ڈرپوک ہو تو وہ اقدام کرنے اور مضبوط فیصلہ کرنے کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے۔

اور اگر مشیر جھوٹا شخص ہو تو روایات کے بیان کے مطابق دور کو تمہاری نظر میں نزدیک اور نزدیک کو دور کر دیتا ہے اور وہ اس سراب کی مانند ہوتا ہے جو صحرا میں پیاسوں کو فریب دیتا ہے اور اگر وہ بخیل اور کنجوس ہو تو ہر کار خیر کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے اور انسان کو ہمیشہ تنگدستی اور ناداری سے ڈراتا ہے اور اگر وہ بزدل ہو تو موقع کی مناسبت سے فیصلہ کرنے میں مانع بنتا ہے اور فرصت ہاتھ سے نکل جاتی ہے اور اگر کم تجربہ یا بے تجربہ شخص ہو تو ہر چیز کا ستیاناس کر دیتا ہے۔ جامع اور تقدیر ساز کاموں کو شکست سے دو چار کر دیتا ہے اور اگر وہ حریص شخص ہو تو تمہیں ظلم وستم کی دعوت دے گا یہاں تک کہ اس کی حرص کی آگ ٹھنڈی پڑ جائے۔ [3]

ان نتائج کے پیش نظر مشیروں کے انتخاب میں سخت گیر ہونا چاہیے خاص طور پر اہم معاشرتی مسائل میں جہاں دوسرے لوگوں کے حقوق بھی ہوں، پس مذکورہ بالا معیاروں کا پوری طرح خیال رکھنا چاہیے۔ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ مشورہ ایک قسم کے حق کو جنم دیتا ہے یعنی مشورہ دینے والا یا تو مشورہ دینے کو قبول نہ کرے اور اگر قبول کرے تو حق امانت کی رعایت کرے اور جو چیز باعث خیر وفلاح ہو مشورہ کرنے والے کے اختیار میں وہی قرار دے بصورت دیگر خائن (خیانت کار) شمار ہوگا اور مشورے میں خیانت ایک عظیم گناہ ہے۔

رسول اکرمؐ نے فرمایا:

"مَنِ اسْتَشَارَهُ اَخُوهُ الْمُؤمِنُ فَلَمْ يُمَحِّضْهُ النَّصِيْحَةَ سَلَبَ اللّٰهُ لُبَّهُ"

"وہ شخص جس سے اس کا مومن بھائی مشورہ مانگے اور وہ مخلصانہ خیر خواہی کے ساتھ اس عمل کو انجام نہ دے تو

---

[1] بحار، ج ۷۰، ص ۳۴۔

[2] بحار الانوار ج ۷۵، ص ۲۳۰، حدیث ۱۳۔

[3] مذکورہ بالا مطالب مختلف روایات سے لئے گئے ہیں۔

خدا تعالیٰ اسے اس کی عقل وخرد سے محروم کردے گا۔''[1]

حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

"خِيانَةُ الْمُسْتَسْلِمِ وَالْمُسْتَشيرِ مِنْ اَفْظَعِ الاُمُورِ وَ اَعْظَمِ الشُّرُورِ وَ مُوجِبُ عَذابِ السَّعيرِ"

''اس شخص کے ساتھ خیانت کرنا جس نے تمہارے سامنے سر جھکا لیا اور تم سے مشورہ چاہا ہو، بدترین عمل اور نہایت عظیم برائی اور قیامت کے دن جلا دینے والے عذاب کا باعث ہے!''[2]

مشورے اور اس کی فروع کے بارے میں بحث بہت وسیع ہے، مذکورہ بالا بیان دراصل ان ابحاث کا نچوڑ ہے جو دیگر ابحاث کے لئے راستہ کھولتا ہے۔ اس بحث کو ایک اور دلکش شعر کے ساتھ ختم کرتے ہیں جو مشیروں کی صفات کے بارے میں ہے:

لاتَسْتَشِرْ غَيْرَ نَدْبٍ حازِمٍ فَطِنٍ
قَدْ اسْتَوى مِنْهُ اِسْرار وَاِعْلان
فَلِلتَّدابِيْرِ فُرسان اِذا رَكَضُوا
فيها اَبَرُّوا كَما لِلْحَرْبِ فُرْسانُ

مشورہ صرف ان لوگوں سے لو جو ذہین، با فضیلت اور دور اندیش ہوں اور جن کا ظاہر و باطن یکساں ہو۔ کیونکہ امور کی تدبیر کے لئے کچھ بہادر لوگ ہوتے ہیں جو جب سواری پر سوار ہوتے ہیں اپنے کام کو بخوبی انجام دیتے ہیں، جیسا کہ جنگ کے لئے بھی سوار لازم ہوتے ہیں۔[3]

☆☆☆☆

---

[1] بحار، ج ۷۲، ص ۱۰۴

[2] غرر الحکم

[3] حیوۃ الحیوۃ، دمیری، ج ۱، ص ۱۷۳۔

مجلس شوریٰ کا اسلامی مشاورت کے معیار پر پورا اُترنا

یہاں ایک اہم سوال پیش آتا ہے اور وہ یہ کہ: مان لیا جائے کہ مشاورت کا موضوع اسلام کے بنیادی قوانین میں سے ایک ہے۔ لیکن اپنی موجودہ شکل میں جس کے مطابق لوگوں کی ایک جماعت منتخب ہوکر مجلس شوری اسلامی میں جمع ہوتی ہے اور خاص قواعد وضوابط کے مطابق اس کے جلسے (Meetings) منعقد ہوتی ہیں اور بحث وتحقیق کے بعد اظہار رائے کیا جاتا ہے اور ووٹ ڈالے جاتے ہیں اور اکثریت آراء سے کسی چیز (Bill) کو منظور کرکے اس کے نفاذ کو لازم قرار دیا جاتا ہے، اس کی کیا شرعی دلیل ہوسکتی ہے؟! دوسرے الفاظ میں موجودہ قانون ساز مجالس کے لئے ایسے تکلفات کسی آیت وروایت اور تاریخ میں بیان نہیں کئے گئے، پس ان کے لوازمات کی پابندی کا جواز کس طرح سے ثابت ہوا ہے جبکہ آج حکومت اسلامی کے تین بنیادی ارکان میں سے ایک کو اپنے آئین، قواعد وضوابط اور مخصوص قوانین کے ساتھ ہی مجلس شوریٰ (اسمبلی) تشکیل دیتی ہے۔ یہی مطلب نچلی سطح پر قواعد وضوابط کی منظوری کے سلسلے میں مجالس وزراء، اقتصادی، ثقافتی، سیاسی اور عسکری مسائل کے فیصلے کرنے والوں میں بھی نظر آتا ہے۔ اس اہم سوال کا جواب ایک مختصر جملے میں یہ ہے کہ موجودہ مجالس شوریٰ حقیقت میں ''مشورے کی ترقی یافتہ شکل'' ہے جس کا ذکر اسلام میں ہوا ہے۔

توضیح یہ کہ: اہم اجتماعی اور معاشرتی مسائل جو کسی ملک سے متعلق ہوں ان میں ضروری ہے کہ سارے ملک کے لوگوں سے مشورہ کیا جائے، لیکن چونکہ عملی طور پر ایسی وسیع شوریٰ (مشورہ) ممکن نہیں اور اس کے ساتھ ساتھ تمام لوگ بھی تمام مسائل میں مکمل مہارت نہیں رکھتے، لہٰذا ان دونکتوں کے پیش نظر اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ لوگ کچھ نمائندوں کا انتخاب کریں تاکہ وہ باہم مل کر مشاورتی عمل کو انجام دیں، اور یہ نمائندے جن کی اسمبلی میں موجودگی گویا تمام لوگوں کی موجودگی ہوتی ہے جس چیز کو منتخب اور منظور کریں تو ان کا ایسا کرنا ایک مکمل طور پر اسلامی شوریٰ کا ترجمان ہوتا ہے۔

چونکہ غالب مسائل میں اتفاق آراء غیر ممکن ہوتا ہے لہٰذا اس کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں ہوتا کہ اکثریت کی رائے ہی کو معیار قرار دیا جائے جو واقعیت سے زیادہ نزدیک ہوتی ہے۔ البتہ یہاں اکثریت ایک ایسی اکثریت ہے جسے آگاہ وباایمان افراد نے تشکیل دیا ہوتا ہے اس لئے کہ ہم نے یہ فرض کیا ہے کہ لوگ اپنی شرعی ذمہ داری سمجھ کر ایسے نمائندوں کا انتخاب کرتے ہیں جن میں نمائندگی کی تمام ضروری شرائط موجود ہوتی ہیں۔

اس بناء پر یہ جو کہا جاتا ہے کہ قرآن نے بہت سے مقامات پر اکثریت کی مذمت کی ہے، مسلمہ طور پر ہمارے موضوع سے خارج ہے وہ اکثریت جو آیات ''أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ'' (مائدہ/ ۱۰۳) ''أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ'' (انعام/ ۳۷) ''أَكْثَرُهُمْ فَاسِقُونَ'' (توبہ/ ۸) ''أَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كَارِهُونَ'' (مؤمنون/ ۷۰) اور دوسری آیت میں ذکر ہوئی ہے ایسی اکثریت ہے جس کا تعلق منحرف اور بے تربیت معاشروں سے ہے نہ اس اکثریت سے جسے آگاہ اور باوفا مومنین تشکیل دیتے ہیں۔ یہ ضمائر اپنے سے پہلے مذکورہ کلمات کے قرینے سے مشرک، گناہوں سے آلودہ، نادان، متعصب اور لاابالی افراد کی طرف لوٹتے ہیں، قرآن یہ ہرگز نہیں کہتا کہ

"اکثر مؤمنین یا اکثر المتقین لا یعلمون ولا یفقھون"

اسی دلیل کے پیش نظر علم اصول کے باب ''تعادل وتراجیح'' میں تعارض روایات کی بحث میں فقہاء کے درمیان شہرت، مرجحات میں سے ایک مرجح (ترجیح دینے والے چیز) ہے اور شہرت یعنی اکثر فقہاء کی رائے کے ساتھ تمسک؛ حدیث میں مذکور ہے کہ

"خُذْبِمَا اشْتَهَرَ بَيْنَ اَصْحَابِكَ وَدَعِ الشّاذَّ النَّادِرَ فَاِنَّ الْمُجْمَعَ عَلَيْهِ لارَيْبَ فيه"

''وہ روایت جو تمہارے اصحاب (مومن وآگاہ افراد) کے درمیان مشہور ہے اسے لے لو، اور وہ روایت جس کے طرفدار کم ہوں اسے چھوڑ دو، اس لئے کہ مشہور روایت جس کے ساتھ اکثر فقہاء نے تمسک کیا ہو اطمینان بخش اور شک وشبہے سے پاک ہوتی ہے۔''[۱]

یہاں تک کہ رسول اکرمؐ کی سیرت سے بھی یہ بات مکمل طور پر واضح ہوتی ہے کہ آنحضرتؐ عقلِ کل ہونے کے باوجود مسلمانوں کی اکثریتی رائے کا احترام کرتے تھے۔ مثلاً جب آپؐ نے جنگ احد کے بارے میں مسلمانوں سے مشورہ لیا کہ مدینہ میں رہ کر جنگ کی جائے یا شہر سے باہر نکلا جائے، چونکہ مسلمانوں کی اکثریت اس بات پر متفق تھی کہ مدینہ سے باہر نکلنا چاہیے۔ آپؐ نے ان کی تجویز مان لی اور اسے عملی جامہ پہنایا اور اقلیت پر مبنی اپنی رائے سے چشم پوشی کر لی اور اس طرح مشورے کی اہمیت کے بارے میں مسلمانوں کو ایک عظیم درس دیا۔[۲]

اگرچہ یہ کام' جیسا کہ معلوم ہے اتنا اچھا نہیں ثابت ہوا، لیکن جنگ احد کے ان عظیم نقصانات کے مقابلے میں مشورے کے احترام کے فوائد زیادہ تھے! (غور فرمائیں)

جنگ خندق میں بھی ایسی ہی صورتحال پیش آئی؛ مغازی واقدی میں بیان کیا گیا ہے کہ رسول اکرمؐ جنگی مسائل کے بارے میں اپنے اصحاب سے مشورہ کرتے تھے، چنانچہ جنگ خندق سے پہلے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا: کیا مدینہ سے نکل کر گروہوں پر مشتمل دشمن کا مقابلہ کیا جائے یا مدینہ ہی میں رہیں اور شہر کے اطراف میں خندق کھودی جائے، یا مدینہ کے نزدیک رہ کر پشت پہاڑ کی طرف کر لیں؟ اس جگہ رسولؐ کے اصحاب میں اختلاف پڑ گیا، بعض لوگوں کی رائے یہ تھی کہ مدینہ سے باہر نکلنا بہتر ہے، لیکن جناب سلیمان نے رائے پیش کی کہ ہم لوگ جب دشمن سے خوفزدہ ہوتے تو شہر کے گرد خندق کھودتے تھے، اے رسول خداؐ! کیا آپ اجازت دیتے ہیں کہ مدینہ کے اطراف میں خندق کھودیں؟ سلیمان کی رائے سے اکثر لوگوں نے اتفاق کیا (اور خندق کھودنے کو ترجیح دی اور رسول اکرمؐ نے بھی اسے قبول کر لیا)۔[۳]

ہم پھر کہتے ہیں کہ مشوروں کے سلسلے میں جب کچھ لوگ مشیر ہوں، خاص طور پر اہم اجتماعی مسائل میں، تو ایک رائے پر

---

[۱] وسائل الشیعہ، ج۸،ص۷۵، حدیث ا، باب ۱۹ از صفا القاضی

[۲] سیرہ ابن ہشام، ج۳،ص۶۶

[۳] مغازی واقدی، ج ا،ص ۴۴۴ (بالتلخیص)

اتفاق کم ہی ہوتا ہے اور اگر اکثریت پر توجہ نہ دی جائے تو یہ عمل کسی نتیجے تک نہیں پہنچ سکتا۔اس نکتے کا ذکر بھی لازم ہے کہ شوریٰ اور مشورے کا مسئلہ اسلام کے آنے سے پہلے بھی دنیا کے عقلاء کے درمیان رائج رہا ہے اور اسلام نے چند شرائط کے اضافے کے ساتھ اس کی تائید کی ہے،عقلاء عالم کے نزدیک بھی یہ مطلب اسی طرح سے ہے،یعنی اکثریت کی رائے معیار ہوتی ہے،اس بیان کا تعلق اکثریت کی رائے پر اعتماد سے تھا۔

لیکن وہ قواعد وضوابط جو قانون ساز اسمبلی میں اسمبلی چلانے کے طریقے اور رائے لینے کے لئے معیار قرار پاتے ہیں وہ بھی اسی مجلس (اسمبلی) کی طرف سے منظوری کی بنیاد پر شوریٰ کے طریقے سے تشکیل دیئے جاتے ہیں۔

اس بناء پر اسلامی قانون ساز اسمبلیاں جو انتخابات،منتخب افراد،جلسات کے انعقاد،مسائل کی تحقیق کی روش اور ان کی فوری اور غیر فوری میں تقسیم کی جو کاروائیاں کرتی ہیں سب اصل مشورہ کی ترقی یافتہ صورتیں ہیں جس کو اسلام نے ایک بنیادی قانون وقاعدے کی حیثیت دی ہے اور ان سب کو اس اصل وقاعدے کے مطابق بنایا جاسکتا ہے۔

واضح ہے کہ اگر یہ مجالس (پارلیمنٹز) اسلامی شوریٰ کے سلسلے میں مشیروں یا دوسرے امور کے اعتبار سے انحراف کا شکار ہو جائے اور جاہل یا لاابالی قسم کے لوگ منتخب ہو جائیں یا رائے کا آزادانہ ماحول دباؤ اور گھٹن سے دوچار ہو جائے یا قوانین اسلام کے خلاف امور منظور کئے جانے لگیں تو یقینی طور پر ایسی مجلس،مجلس شوریٰ اسلامی نہ ہوگی اور ہم اس کا دفاع نہیں کرتے۔

اسلامی قانون ساز اسمبلی کی اصل ذمہ داری

مقننہ یا مجلس قانون ساز کہ یہ نام دوسروں سے لئے گئے،ان کے یہ نام سنتے ہی انسان کا ذہن اس مطلب کی طرف چلا جاتا ہے کہ اس مجلس میں موجود عوامی نمائندے وضع قانون یعنی حلال وحرام کا قانون بناتے ہیں جبکہ ایسا نہیں ہوتا اور جس طرح سابقہ بحثوں میں اشارہ کیا گیا ہے کہ ایسی مجالس میں نمائندوں کا اصلی کام کلی احکام کو ان کے جزئی مصادیق پر منطبق کرنا ہوتا ہے۔یعنی وہ مل بیٹھ کر مشورے کے انداز میں ضروری اور پیچیدہ موضوعات کو اسلامی احکام کی تطبیق کے لئے سامنے رکھیں۔

مثلاً اسلامی مملکت کا دفاع اور اغیار کے حملوں کا مقابلہ کرنا ایک ضروری امر ہے جیسا کہ خاص حالات میں ان کے ساتھ صلح کرنا اسلام کی تقویت اور ان کے شر کو دفع کرنے کا باعث بنتا ہے،لیکن اس مطلب کی تشخیص کہ کیا موجودہ حالات میں،جنگ ان کے شر کو دفع کرنے کا باعث ہے یا صلح؟ یہ عمل موضوعی مہارت اور تجربہ کا محتاج ہے،مجلس کی کاروائی ہوتی ہے اور وہ حالات کے تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر جس صورت کو مصلحت پر مبنی سمجھتی ہے اسے اختیار کر لیتی ہے۔یا یہ کہ بیت المال کے مصرف کے مسئلے میں کس قدر بجٹ رکھا جائے تاکہ عادلانہ روش اختیار کی جاسکے اور وہ عدل وانصاف کا مصداق بن جائے اس ضمن میں مجلس (پارلیمنٹ) مشورہ کرتی ہے اور جسے زیادہ مصلحت کا باعث سمجھتی ہے اسے انتخاب کر لیتی ہے۔

البتہ ممکن ہے کہ کبھی احکام اسلامی کی مصادیق پر تطبیق میں مجلس کسی غلطی کا ارتکاب کر بیٹھے،چونکہ اکثر نمائندگان،فقہاء اور مجتہدین نہیں ہوتے۔اسی وجہ سے جمہوری اسلامی کے نظام میں اس قسم کی غلطی سے بچنے کی خاطر ایک ادارہ ''شوریٰ نگہبان'' کے نام سے بنایا گیا

ہے جوفقہاء اور قانون سے آگاہ افراد پر مشتمل ہے تاکہ قوانین کے اسلامی ہونے کے بارے میں مجلس کو اطمینان حاصل ہو۔اس بات سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ اسلامی قانون ساز مجالس (اسمبلیوں) اور دیگر ممالک کی اسمبلیوں میں دو بنیادی فرق ہیں:

۱۔غیر مذہبی اسمبلیوں میں حکم الٰہی کی پابندی کئے بغیر واقعاً حکم وضع ہوتا ہے اور حلال وحرام اور مجاز اور ممنوع کے احکام وضع کئے جاتے ہیں،لیکن اسلامی قانون ساز اسمبلی میں حقیقی کام وہی احکام کلی کی مصادیق پر تطبیق یا موضوعی کارشناسی ہے۔

۲۔اسلامی قانون ساز اسمبلیوں میں مقصد مشکلات کے حل کے لئے ضرورتیں پوری کرنا اور اسلامی تعلیمات کے دائرے میں رہتے ہوئے تمام مثبت صورتوں میں اسلامی معاشرے کی پیش رفت ہوتا ہے جبکہ مغربی اور لا مذہب قانون ساز اسمبلیوں میں مقصد لوگوں کی خواہش کے پیچھے چلنا ہوتا ہے۔چاہے ان کی یہ خواہشات منفی وانحرافی اور معاشرے کے زوال کا باعث ہوں یا مثبت اور تعمیری،یہی وجہ ہے کہ ان اسمبلیوں میں بعض گھناؤنے اور احمقانہ مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں اور نہایت ہی غیر اخلاقی قانون تصویب اور منظور ہوتے نظر آتے ہیں مثلاً ہم جنس پرستی کا جائز ہونا،دو مذکر افراد کے درمیان شادی وغیرہ کا سرکاری اور قانونی طور پر صحیح ہونا! جبکہ اسلامی قانون سازی میں بنیادی محور خدا تعالیٰ کی پسند اور اسلام کے طے شدہ اصول ہوتے ہیں اور لوگوں کی خواہشات کی طرف توجہ بھی اسی دائرے میں محدود ہوتی ہے نہ کہ ان کی ہر خواہش کی پیروی کرنے میں۔

دوسرا رکن: انتظامیہ

عملاً نفاذ کے بغیر قوانین صفحۂ کاغذ پر بکھرے محض الفاظ ہوتے ہیں، ان کی حقیقی قدر و قیمت اسی وقت ظاہر ہوتی ہے جب وہ عملی جامہ پہنیں، بالکل ایک ڈاکٹر کے نسخے کی طرح کہ جو خواہ کتنا ہی ماہرانہ کیوں نہ ہو جب تک اس پر عمل نہ ہو بیمار کے حال پر کسی طرح بھی کوئی اثر قائم نہیں کرتا، بیماری کی پہچان، تمام ٹیسٹوں کی درست اور محتاط انجام دہی ادویات کی مقدار اور کیفیت سے آگاہی وغیرہ دواؤں کے استعمال کے بغیر بالکل بیکار ہوتے ہیں، پس رکن اصلی عمل ہے۔ ایک قانون کتنا ہی اچھا اور قیمتی کیوں نہ ہو جب تک اسے عملی طور پر نافذ نہیں کیا جاتا وہ بالکل بے اثر ہوتا ہے، کسی قانون ساز نظام کی آبرو کی حفاظت انتظامیہ کے ذمے ہوتی ہے۔ اس کے باوجود کہ یہ مسئلہ نہایت واضح ہے پھر بھی اس کے بارے میں کچھ قرآنی اشارات پیش کئے جاتے ہیں:

۱۔ جب حضرت موسیٰ - نے کوہ طور کے کنارے وادی ایمن میں پیام رسالت دریافت کیا اور انھیں بنی اسرائیل کی نجات کے لئے فرعون سے مقابلہ کرنے اور توحید وحق اور عدالت کی دعوت کا حکم ملا تو انھوں نے اسے عملی جامہ پہنانے کی غرض سے خدا تعالیٰ سے مدد چاہی اور عرض کیا:

"وَاجْعَلْ لِي وَزِيرًا [1] مِنْ أَهْلِي هَارُونَ أَخِي اشْدُدْ بِهِ أَزْرِي وَأَشْرِكْهُ فِي أَمْرِي"

حضرت موسیٰ - سے شرح صدر، گرۂ زبان کے کھلنے اور کاموں کے آسان ہونے کی درخواست کے ساتھ عرض کیا:

''اے خدا! میرے خاندان میں سے میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر مقرر فرما اس کے ذریعے میری پشت کو مضبوط کر اور اسے میرے کام میں میرا شریک بنا دے۔''

۲۔ بنی اسرائیل اور طالوت کی داستان میں ہے کہ جب بنی اسرائیل جالوت کے مظالم سے تنگ آ گئے جس نے انھیں در بدر کر دیا اور ان کی اولاد کو اسیر کر لیا تھا، تو انھوں نے اس کے خلاف جنگ کا منصوبہ بنایا لیکن اس منصوبے کو عملی شکل دینے کے لئے کسی طاقتور، آگاہ، مدبر و مدیر کی ضرورت تھی لہٰذا ایسے فرد کے انتخاب کے لئے وہ اپنے زمانے کے نبی حضرت اشموئیل - کے پاس آئے اور عرض کیا:

ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (بقرہ/۲۴۶)

یعنی ''ہمارے لئے ایک بادشاہ کا انتخاب کریں جس کی زیر قیادت راہ خدا میں ہم دشمن کے ساتھ جنگ کریں۔''

انھوں نے بھی خدا کی بارگاہ سے یہ فرمان حاصل کیا کہ ایک باایمان، جوان اور شجاع شخص طالوت کو اس مقصد کے لئے انتخاب کریں، آپؑ

---

[1] (طہ۔۹۲ تا ۲۳) ماوردی نے احکام السطانیہ میں لکھا ہے ''وزیر'' ممکن ہے وزر (بھاری پن) سے مشتق ہو کیونکہ وہ ذمہ داری کے بوجھ کو اپنے کندھوں پر ڈالتا ہے یا ''وَزر'' (پناہ گاہ) سے مشتق ہو کیونکہ وزیر لوگوں کو پناہ گاہ ہوتا ہے) یا ''اَزر'' (پشت) سے مشتق ہو کیونکہ وہ اپنے سربراہ کا پشت پناہ ہوتا ہے (الاحکام السلطانیہ، ص ۲۴)

نے ان سے فرمایا:

إِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا ؕ

یعنی ’’خدا تعالیٰ نے تم پر طالوت کو سربراہ مقرر کیا ہے۔‘‘[1]

۳۔حضرت یوسف -کی داستان میں بھی ہے کہ جب انھوں نے اقتصادی نقطۂ نظر سے اہل مصر کے لئے چند سخت اور خطرناک سالوں کی پیش گوئی کی اور ان سالوں کا ایک عاقلانہ منصوبہ ترتیب دیا تو حضرت یوسف -کی خود اپنی تجویز کے مطابق سلطان مصر نے اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے یہ منصوبہ ان کے حوالے کر دیا۔قرآن فرماتا ہے:

قَالَ اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ ۖ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ ﴿٥٥﴾

یعنی ’’یوسفؑ نے کہا: مجھے اس سرزمین کے خزانوں کا سرپرست بنا دو کہ میں جاننے والا اور حفاظت کرنے والا ہوں۔‘‘[2]

یوسف -مدبرانہ اور مضبوط انتظام کے ساتھ ملک مصر کو بخوبی قحط کے سالوں سے نکال لے گئے۔

۴۔سلیمانؑ کی حکومت بلاشبہ زمین پر قائم ہونے والی وسیع ترین اور بینظیر حکومت تھی،انھوں نے معاشرۂ انسانی کی پیشرفت اور عدالت کی نشر و اشاعت کی خاطر تمام ممکنہ طاقتوں اور قوتوں سے ایک منظم و مضبوط انداز میں استفادہ کیا بالفاظ دیگر خدا تعالیٰ نے ان امور کو عملی شکل دینے کے لئے ہر قسم کے ضروری وسائل کو ان کے اختیار میں دے دیا اور انھوں نے بھی ان وسائل سے استفادہ کیا اور اہم مقاصد حاصل کئے۔قرآن مجید سورۂ نمل میں حضرت داؤدؑ اور ان کے فرزند حضرت سلیمانؑ کی داستان میں ان دونوں کے وسیع علم کی طرف اشارہ کر کے فرماتا ہے:

’’وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُودَ وَسُلَيْمَانَ عِلْمًا‘‘

’’یعنی ہم نے داؤدؑ اور سلیمانؑ کو علم کثیر عنایت فرمایا۔‘‘

پھر مزید فرمایا:

وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُودَ ۖ وَقَالَ يَا أَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنطِقَ الطَّيْرِ وَأُوتِينَا مِن كُلِّ شَيْءٍ ؕ

’’سلیمانؑ، داؤدؑ کے وارث ہوئے اور انھوں نے کہا: اے لوگو! پرندوں کی زبان جاننے تک کا علم ہمیں عطا کیا گیا ہے اور ہر چیز سے ہمیں نوازا گیا ہے۔‘‘[3]

---

[1] بقرہ۔۲۴۷

[2] یوسف۔۵۵۔

[3] نمل۔۱۵۔۱۶۔

قرآن مجید سورۂ سبا میں اس باپ بیٹے کے بارے میں فرماتا ہے:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا ۖ يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ ۚ وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ ﴿١٠﴾ اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرْ فِي السَّرْدِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۖ اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿١١﴾ وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ ۚ وَاَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ ۖ وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۖ وَمَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ ﴿١٢﴾ يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ ۖ اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ۖ وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ﴿١٣﴾

''اور ہم نے داؤدؑ کو اپنی طرف سے ایک عظیم فضیلت عطا کی (ہم نے پہاڑوں اور پرندوں سے کہا) اے پہاڑ اور اے پرندوں داؤدؑ کے ساتھ ہم آواز بن جاؤ اور اس کے ہمراہ خدا کی تسبیح کرو اور لوہے کو ہم نے اس کے لئے نرم کیا (اور ہم نے اس سے کہا) کامل اور فراخ زرہیں بناؤ اور اس کی کڑیوں کو ایک خاص انداز ے سے متناسب بناؤ اور عمل صالح بجالاؤ کہ جو کچھ تم انجام دیتے ہو میں اس سے آگاہ ہوں اور ہوا کو ہم نے سلیمانؑ کے تابع کر دیا کہ جو صبح شام ایک ایک ماہ کی مسافت طے کرتی تھی اور اس کے لئے پگھلے ہوئے تانبے کا ہم نے چشمہ جاری کیا اور جنوں کا ایک گروہ خدا کے اذن کے ساتھ اس کے سامنے کام کرتا تھا اور ان میں جو کوئی ہماری حکم عدولی کرے اسے ہم جلانے والا عذاب چکھائیں گے وہ جو کچھ سلیمانؑ کا تقاضا ہوتا، بنا ڈالتے، معابد، تصویریں، مجسمے، کھانے کے بڑے بڑے برتن، حوض اور ثابت اور اپنی جگہ پر جمی ہوئی دیگیں جو بڑی ہونے کے باعث ادھر ادھر منتقل نہیں کی جا سکتی تھیں! (اور ہم نے ان سے کہا) اے آل داؤدؑ! ان نعمتوں کا شکر بجالاؤ لیکن میرے بندوں میں سے کم ہی شکر گذار ہیں۔'' (سبا/ ۱۰ تا ۱۳)

نظام کو نافذ العمل قرار دینے میں حضرت سلیمانؑ کی انتظامی سرگرمیاں اس قدر نظم وضبط کی حامل تھیں کہ جب انھوں نے جان خدا کے سپرد کی تو اس وقت وہ عصا کا سہارا لئے کھڑے تھے (اسی وجہ سے آپؑ کا جسد مبارک سیدھے کھڑے ہونے کی حالت میں تھا) اور ان کے کارندے محتاط انداز میں اپنے امور انجام دے رہے تھے یہاں تک کہ عصا دیمک خوردہ ہو کر ٹوٹ گیا اور آپؑ زمین پر گر پڑے۔ چنانچہ قرآن مذکورہ بالا آیات کے بعد فرماتا ہے:

فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖٓ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ ۚ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوْا فِي الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ ﴿١٤﴾

ترجمہ:''(سلیمانؑ اس شان وشوکت کے باوجود) جب موت سے ہمکنار ہوئے تو کسی نے ان (کارندوں)
کو ان کی موت سے آگاہ نہیں کیا مگر ایک زمینی کیڑے یعنی دیمک نے ان کے عصا کو چاٹ لیا یہاں تک کہ وہ
اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکے اور ان کا جسم زمین بوس ہوگیا، جب وہ گرے تو اس وقت جنوں کو معلوم ہوا کہ اگر
وہ غیب سے آگاہ ہوتے تو اس باعث ذلت عذاب میں مبتلا نہ رہتے۔''(سبا/۱۴)

یہ ساری باتیں حضرت سلیمانؑ کی مضبوط انتظامی صلاحیتوں کا پتہ دیتی ہیں۔ اصولی طور پر جس طرح نظام تخلیق میں خدا کے انتظامی امور چلانے والے (کارندے) ہیں جنھیں قرآن میں ''فَالْمُدَبِّرَاتِ أَمْرًا''(نازعات/۵) سے تعبیر کیا گیا ہے اور عالم کا نظام چلانے والے فرشتوں کے اعمال کے بارے میں کافی تعداد میں قرآن میں اشارے کئے گئے ہیں اسی طرح دنیائے انسانیت میں بھی نفاذ قانون کے ایک قوی نظام، تقسیم کار اور ذمہ داریوں کی تقسیم، نظم ونسق کی برقراری اور نفاذ قانون بے حد ضروری ہے۔

حضرت علیؑ کے مالک اشتر کے نام فرمان میں یہ مطلب اچھی طرح دیکھا جا سکتا ہے۔ جو امور مملکت کا انتظام چلانے کا ایک مکمل نمونہ ہے۔ اس فرمان میں مالک اشتر کے انتظامی امور میں ان کے مشیروں کا تذکرہ کرنے کے بعد ملک مصر کے حاکم کے عنوان سے حضرت علیؑ انھیں حکم دیتے ہیں کہ: اپنے افراد میں سے ایسے افراد کا بطور وزراء انتخاب کرو جو اچھا ماضی رکھتے ہوں جن کا لہجہ واضح ہو، جو اہل صدق، باتقویٰ اور ہر قسم کی چاپلوسی سے دور ہوں اور ہر کام اور ہر حال میں ملک کی مصلحتوں کی خاطر علماء اور اہل عقل سے مشورے لو۔

اس کے بعد حکومت کا نفاذ کے مختلف شعبوں کا ذکر کرتے ہیں، سب سے پہلے دفاعی طاقت یعنی ایک قوی اسلامی فوج کا تذکرہ کرتے ہیں اس کے بعد اہل تجارت اور صنعتی وتجارتی اور اقتصادی امور کی بات کرتے ہیں اور آخر میں معاشرے کے محروم اور محتاج افراد سے متعلق گفتگو کرتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کی ذمہ داریوں کو ان امور سے متعلق تفصیلی طور پر بیان کرتے ہیں۔

یہ عہد نامہ جو حقیقت میں قرآنی آیات اور احادیث نبوی کا نچوڑ ہے، اس قدر منظم ہے کہ چودہ سو سالوں نے نہ صرف اس کو بوسیدہ نہیں کیا بلکہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اس کی عظمت کو چار چاند لگ گئے ہیں اور یہ حکومت اسلامی میں انتظامی امور پر حاکم اصولوں کے سلسلے میں ایک درست لائحہ عمل کا واضح نمونہ ہے۔

رسول اکرمؐ کی حکومتی انتظامیہ

اگرچہ رسول اکرمؐ کے مبارک دور میں حکومت اسلامی ایک نہایت سادہ شکل میں تھی لیکن جو کچھ ایک طاقتور حکومت کے لئے ضروری تھا وہ سب اس دور کی حکومت میں موجود تھا، مسجد نبویؐ اپنی سادگی کے باوجود حکومت اور قوانین کے نفاذ کا اصلی مرکز تھی۔ ایک طرف سے تو یہ علم ودانش کا مرکز تھی، چونکہ رات دن اس سے تعلیم وتربیت کی نشر واشاعت ہوتی تھی۔ دوسری طرف سے یہ فوجی عملے کا اور فوج کی اعلیٰ قیادت کا مرکز تھی اور پھر عدالت گاہ کا کردار بھی ادا کرتی تھی۔ اور چوتھی جانب سے بیت المال اور صدقات وخیرات اور جنگی غنائم کا مرکز شمار ہوتی تھی اور اپنی تمام تر سادگی کے ساتھ اس میں یہ تمام امور انجام پاتے تھے۔

رسول اکرمؐ نے ان امور میں سے ہر ایک امر کے لئے ایک یا کئی ذمہ دار افراد مقرر کر رکھے تھے اور یہ صورتحال آنحضرتؐ کے بعد بھی جاری رہی خاص طور پر حضرت علیؑ کے دور میں اس نظام نے اسلام کی پیشرفت کے ساتھ ساتھ جدید اور وسیع و منظم شکل وصورت اختیار کر لی تھی جس کے اصول وقواعد کی توضیح عہد نامہ مالک اشتر میں بیان کی گئی ہے۔

یہ ساری چیزیں ظاہر کرتی ہیں کہ مسئلہ شوریٰ کے بعد اہم مسئلہ قانون کے نفاذ اور اجرا کا مسئلہ ہے کیونکہ اس کے بغیر ہر قانون اپنی قیمت و وقعت کھو دیتا ہے۔

قانون نافذ کرنے والے عہدداروں کی شرائط وصفات

قرآن مجید کی تین آیتوں میں بطور صریح اور چند آیتوں میں اشارتاً حکومت کے لائق منتظمین کی صفات اور خصوصیات کو بیان کیا گیا ہے۔ بنی اسرائیل اور طالوت کی داستان میں ہے کہ

''جب بنی اسرائیل نے طالوت کو اپنا حکمران بنانے کی وجہ سے اپنے نبیؑ پر اعتراض کیا اور اسے مال ودولت نہ رکھنے اور بنی اسرائیل کے کسی معروف خاندان سے منسوب نہ ہونے کی وجہ سے اس منصب کا اہل نہ جانا تو ان کے نبیؑ نے ان سے کہا: وہ دو خصوصیات کا مالک ہے؛ کثرت علم اور جسمانی قوت وتوانائی، اور انھیں دو خصوصیات کی وجہ سے خدا نے طالوت کو اس منصب کے لئے منتخب کیا ہے۔''[1]

نتیجے کے طور پر حکومت اسلامی کے سربراہ اور دوسرے مرحلے میں تمام منتظمین کے لئے علم وتوانائی کی دو شرائط کا ہونا ضروری ہے۔ حضرت یوسف -کی داستان میں حکومت کے اعلیٰ پائے کے منتظمین اور کارندوں مثلاً بیت المال کے محافظوں کے لئے بھی ان دو شرائط کا موجود ہونا اشارتاً ذکر کیا گیا ہے:

قَالَ اجۡعَلۡنِیۡ عَلٰی خَزَآئِنِ الۡاَرۡضِ ۚ اِنِّیۡ حَفِیۡظٌ عَلِیۡمٌ ﴿۵۵﴾

یعنی ''یوسفؑ نے کہا: مجھے اس سرزمین کے خزانوں کا سرپرست مقرر کرو کیونکہ میں حفاظت کرنے والا اور آگاہ ہوں (میں ان کی حفاظت کے لئے بھی کوشاں رہوں گا اور اس کے مصرف پر بھی نظر رکھوں گا)''۔[2]

لائق کارکنوں کے مسئلے میں داستان شعیب-وموسیٰؑ میں بھی حضرت شعیب -کی بیٹیوں کی زبانی ان دو شرائط کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

قَالَتۡ اِحۡدٰىہُمَا یٰۤاَبَتِ اسۡتَاۡجِرۡہُ ۫ اِنَّ خَیۡرَ مَنِ اسۡتَاۡجَرۡتَ الۡقَوِیُّ الۡاَمِیۡنُ ﴿۲۶﴾

''ان دو میں سے ایک نے کہا: اے والد بزرگوار! (خطاب شعیبؑ سے ہے) اس شخص کو ملازم رکھ

---

[1] سورہ بقرہ۔ ۲۴۷۔

[2] سورہ یوسف۔ ۵۵

لو (حضرت موسیٰؑ کی طرف اشارہ ہے جو اس وقت ایک طاقتور جوان تھے) چونکہ بہترین ملازم جو آپ رکھ سکیں اُسے توانا اور امین ہونا چاہیے۔''[1]

نتیجہ یہ نکلا کہ علم و عقل، طاقت و قدرت، امانت اور خوش اخلاقی ایک منتظم کی شرائط ہیں، چاہے وہ منتظم سربراہ حکومت ہو یا وزراء اور دیگر ملازمین، البتہ مراتب کے فرق کے ساتھ۔ قرآن مجید کی دوسری آیات میں بھی یہی مطلب دکھائی دیتا ہے یعنی منتظمین کی شرائط بیان کی گئی ہیں جن میں کچھ کا بیان درج ذیل ہے:

۱۔ اسراف کرنے والوں کے ساتھ تعاون سے پرہیز:

وَلَا تُطِيعُوٓا أَمۡرَ ٱلۡمُسۡرِفِينَ ﴿١٥١﴾

یعنی اسراف کرنے والے لوگوں کی اطاعت نہ کرو۔''[2]

۲۔ سفیہ (احمق) اور کم عقل لوگوں کے ساتھ تعاون سے پرہیز:

وَلَا تُؤۡتُوا ٱلسُّفَهَآءَ أَمۡوَٰلَكُمُ ٱلَّتِي جَعَلَ ٱللَّهُ لَكُمۡ قِيَٰمًا

''اپنے اموال کو جنھیں خدا نے تمہاری معاش کا ذریعہ بنایا ہے انھیں سفیہ اور احمق لوگوں کے حوالے نہ کرو۔''
[3]

۳۔ گمراہوں سے تعاون طلب کرنے سے پرہیز:

وَمَا كُنتُ مُتَّخِذَ ٱلۡمُضِلِّينَ عَضُدًا ﴿٥١﴾

یعنی ''میں گمراہوں کو اپنا مددگار بنانے والا نہیں ہوں۔''[4]

۴۔ جھوٹ بولنے والوں سے اجتناب:

فَلَا تُطِعِ ٱلۡمُكَذِّبِينَ ﴿٨﴾ [5]

۵۔ عیب جو، چغلی خور، خیر سے منع کرنے والا، تجاوز کرنے والے، گناہگار، کینہ توز اور بداخلاق لوگوں سے پرہیز:

وَلَا تُطِعۡ كُلَّ حَلَّافٖ مَّهِينٍ ﴿١٠﴾ هَمَّازٖ مَّشَّآءِۭ بِنَمِيمٖ ﴿١١﴾ مَّنَّاعٖ لِّلۡخَيۡرِ مُعۡتَدٍ أَثِيمٍ ﴿١٢﴾

---

[1] قصص۔۲۶
[2] شعراء۔۱۵۱
[3] نساء۔۵
[4] کہف۔۵۱
[5] قلم۔۸

عُتُلٍّۢ بَعۡدَ ذٰلِكَ زَنِيۡمٍ ﴿۱۳﴾ [1]

۶۔خواہش نفس کی پیروی سے پرہیز:

فَلَا تَتَّبِعُوا الۡهَوٰٓى اَنۡ تَعۡدِلُوۡا ۚ

''خواہش نفس وہوس کی پیروی نہ کروکہیں ایسانہ ہوکہ حق سے منحرف ہوجاؤ۔'' [2]

۷۔مومنین کے ساتھ تعاون اور غیر مسلموں کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کے لئے ان کو اعلیٰ عہدوں پر مقرر کرنا، کیونکہ اس وجہ سے وہ مسلمانوں پر مسلط ہوسکتے ہیں:

وَلَنۡ يَّجۡعَلَ اللّٰهُ لِلۡكٰفِرِيۡنَ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ سَبِيۡلًا ﴿۱۴۱﴾

ترجمہ:''خداوند تعالیٰ ہرگز کافروں کو اہل ایمان پر غلبہ اور تسلط عطانہیں کرتا۔'' ا [3]

یہ وہ شرائط ہیں جن کا اسلامی حکومت کے منتظمین میں خیال رکھنا ضروری ہے۔

احادیث میں اسلامی حکومت کے منتظمین کی شرائط

احادیث میں بھی حکومتی عہدیداروں اور منتظمین کی نہایت کڑی اور قابل توجہ شرائط قرار دی گئی ہیں کہ جن کے بغیر کامل طور پر حکومت اسلامی وقوع پذیر نہیں ہوسکتی۔

ا۔علم وآگاہی کی بلندترین سطح پر ہونا

رسول اکرمؐ ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

" مَنۡ اَمَّ قَوۡماً وَ فیھِمۡ مَنۡ هُوَ اَعۡلَمُ مِنۡهُ لَمۡ يَزَلۡ اَمۡرُهُمۡ اِلَى السِّفالِ اِلى يَوۡم الۡقيامَةِ"

''وہ شخص جوکسی قوم کی قیادت اور پیشوائی کی ذمہ داری قبول کرتا ہے حالانکہ لوگوں میں اس سے زیادہ علم والا موجود ہے، وہ لوگ مسلسل قیامت تک زوال اور انحطاط کی کیفیت میں مبتلا رہیں گے۔'' [4]

---

[1] قلم۔۱۰تا۱۳

[2] نساء۱۳۵

[3] نساء۔۱۴۱

[4] وسائل،ج۵،ص۴۱۵،(باب۲۶ازابواب صلوٰۃ الجماعۃ)

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق - نے فرمایا:

"مَنْ دَعَی النّاسَ اِلی نَفْسِهِ وَ فیهِمْ مَنْ هُوَ اَعْلَمُ مِنْهُ فَهُوَ مُبْدِعٌ ضالٌّ"

ترجمہ: "جو شخص لوگوں کو اپنی طرف بلائے حالانکہ لوگوں میں اس سے زیادہ آگاہ افراد موجود ہوں تو ایسا شخص بدعت گذار اور گمراہ ہے۔"[1]

۲۔ وسعت قلبی اور مختلف حوادث کے لئے آمادگی

امیر المؤمنین - اپنے ایک مختصر جملے میں فرماتے ہیں:

"آلَةُ الرِّیاسَةِ سِعَةُ الصَّدْرِ"

یعنی "ریاست اور سربراہی کا آلہ وسعت قلبی و فکری اور کشادگی روح اور بہت زیادہ قوت برداشت ہے۔"[2]

۳۔ اپنے زمانے کے مسائل سے آگاہی

امام جعفر صادق فرماتے ہیں:

"اَلْعالِمُ بِزَمانِهِ لا تَهْجُمُ عَلَیْهِ اللَّوابِسُ"

"جو شخص اپنے زمانے کے حالات سے آگاہ ہو وہ پیچیدہ اور گمراہ کن مسائل کے حملے کا نشانہ نہیں بنتا۔"[3]

۴۔ عدالت کی رعایت اور کسی کو کسی پر ترجیح نہ دینا

ایک حدیث میں ہے کہ امام علیؑ نے عمر بن خطاب سے فرمایا:

"ثَلاثٌ اِنْ حَفِظْتَهُنَّ وَ عَمِلْتَ بِهِنَّ کَفَتْكَ ما سِواهُنَّ، وَ اِنْ تَرَكْتَهُنَّ لَمْ یَنْفَعْكَ شَیْئٌ سِواهُنَّ: قالَ: وَما هُنَّ یا اَبَاالْحَسَنِ؟ قالَ: اِقامَةُ الْحُدودِ عَلَی الْقَریبِ وَالْبَعیدِ، وَالْحُكْمُ بِكِتابِ اللهِ فِی الرِّضا وَالسَّخَطِ، وَالْقِسْمُ بِالْعَدْلِ بَیْنَ الْاَحْمَرِ وَالْاَسْوَدِ: فَقالَ عُمَرُ: لَقَدْ اَوْجَزْتَ وَ اَبْلَغْتَ!"

"تین چیزیں ایسی ہیں جنھیں اگر بخوبی حفظ کرو اور ان پر عمل کرو تو وہ تمہیں دوسرے امور سے بے نیاز کر

---

[1] سفینۃ البحار، ج ۲، (مادہ علم)

[2] نہج البلاغہ، کلمات قصار۔ ۱۷۶

[3] اصول کافی، ج ۱، ص ۲۷

دیں گی اور اگر انھیں ترک کرو تو ان کے علاوہ کوئی چیز تمہیں فائدہ نہیں پہنچا سکتی ۔عمر نے عرض کیا: اے ابوالحسن! وہ کیا چیزیں ہیں؟! آپؑ نے فرمایا: دور ونزدیک کے افراد پر خدا کی حدود جاری کرنا اور خوشی اور غضب کی دونوں حالتوں میں خدا کی کتاب کے مطابق فیصلہ کرنا اور سیاہ وسفید کے درمیان عادلانہ اور منصفانہ انداز میں تقسیم کرنا۔عمر نے عرض کیا: سچی بات تو یہ ہے کہ آپؑ نے مختصر کہا ہے لیکن مطلب کا حق ادا کر دیا ہے!''[۱]

۵۔نیک لوگوں کو اجر دینا اور جن گناہگاروں سے توبہ کی اُمید ہو اُن سے چشم پوشی کرنا

امام جعفر صادقؑ نے ایک حدیث میں فرمایا:

"ثَلاثَةٌ تَجِبُ عَلَى السُّلطانِ لِلْخاصَّةِ وَالعامَّةِ، مُكافَأَةُ الْمُحْسِنَ بِالإِحْسانِ لِيَزْدادُوا رَغْبَةً فيهِ، وَ تَغَمُّدُ ذُنُوبِ الْمُسيءِ لِيَتُوبَ وَيَرْجِعَ عَنْ غَيِّهِ، وَتَأَلُّفُهُمْ جَميعاً بِالإِحْسانِ وَالإِنْصافِ"

''تین کام ایسے ہیں جن کے بارے میں اسلامی حاکم پر لازم ہے کہ وہ انہیں عام وخاص کے متعلق انجام دے، نیکوکار لوگوں کو اچھا بدلہ دے تا کہ مزید نیکی کا ان کے اندر شوق پیدا ہو اور گناہگاروں کی پردہ پوشی کرے یہاں تک کہ وہ اپنے گناہوں سے توبہ کرلیں اور گمراہی سے باز آجائیں اور سب کو اپنے احسان اور انصاف کے سائے میں جمع کرلے۔''[۲]

٦۔لوگوں کے اور اپنے منافع کو یکساں سمجھنا

جب حضرت علیؑ نے محمد بن ابی بکر کو مصر کا والی مقرر کیا تو انھیں کچھ احکامات بھی دیئے ان میں سے ایک حکم یہ تھا:

"أَحِبَّ لِعامَّةِ رَعِيَّتِكَ ما تُحِبُّ لِنَفْسِكَ وَ أَهْلِبَيْتِكَ، وَأَكْرِهْ لَهُمْ ما تَكْرَهُ لِنَفْسِكَ وَأَهْلِبَيْتِكَ فَإِنَّ ذلكَ أَوْجَبُ وَأَصْلَحُ لِلرَّعِيَّةِ"

''عوام الناس کے لئے بھی وہی چیز پسند کرو جسے تم اپنے لئے اور اپنے اہل خانہ کے لئے پسند کرتے ہو اور جس چیز کو اپنے اور اپنے خاندان کے لئے ناپسند سمجھتے ہو اسے عام لوگوں کے لئے بھی ناپسند شمار کرو کیونکہ یہ

[۱] بحارالانوار، ج۲۷،ص۳۴۹، حدیث ۵۳

[۲] بحارالانوار جلد ۷۵،ص ۲۳۳۔

کام تمہاری عقل و منطق کو اور پختہ کرے گا اور لوگوں کو صلاح اور اصلاح کے نزدیک کردے گا۔"[1]

۷۔لوگوں کے ساتھ جذباتی لگاؤ

بعض احادیث میں سلطان عادل کو باپ کی جگہ قرار دیا گیا ہے اور لوگوں کو تاکید کی گئی ہے وہ اپنے باپ کی طرح اس کا احترام کریں، اسے بھی چاہیے کہ وہ انہیں اپنی اولاد کی طرح سمجھے جس کے نتیجے میں ایک قوی جذباتی رشتہ جو ایک باپ اور اس کی اولاد کے درمیان ہوتا ہے، ایسا ہی رشتہ اس کے اور اس کی رعایا کے درمیان برقرار ہونا چاہیے امام موسیٰ کاظم -فرماتے ہیں:

"اِنَّ السُّلْطانَ الْعادِلَ بِمَنْزِلَةِ الْوالِدِ الرَّحیمِ فَأَحِبُّوا لَهُ ما تُحِبُّونَ لاَنْفُسِكُمْ وَاَكْرِهُوا لَهُ ما تَكْرَهُونَ بِاَنْفُسِكُم"

"سلطان عادل ایک مہربان باپ کی طرح ہے پس اس کے لئے وہی پسند کرو جو تم اپنے لئے پسند کرتے ہو اور جس چیز کو تم اپنے لئے ناپسندیدہ قرار دیتے ہو اسے اس کے لئے بھی ناپسندیدہ شمار کرو۔"[2]

۸۔بخل، جہالت اور ظلم و ستم سے دوری

امیر المؤمنین علیؑ اس ضمن میں فرماتے ہیں:

"وَقَدْ عَلِمْتُمْ اَنَّهُ لا يَنْبَغِى اَنْ يَكُونَ الْوالى عَلَى الْفُرُوجِ وَالدِّماءِ وَالْمغانِمِ ء وَالاَحْكامِ وَ اِمامَةِ الْمُسْلِمينَ، اَلْبَخيلُ، فَتَكُونَ فى اَمْوالِهِمْ نَهْمَتُه، وَلا الْجاهِلُ فَيُضِلَّهُمْ بِجَهْلِهِ، وَلا الْجافى فَيَقْطَعهُمْ بِجِفائِهِ، وَلا الخائِفُ لِلدُّوَلِ، فَيَتَّخِذَ قَوماً دُوْنَ قَومٍ، وَلا الْمُرتَشِى فى الْحُكْمِ فَيَذْهَبُ بِالْحُقُوقِ وَيَقِفُ بِها دُوْنَ الْمَقاطِعِ، وَلا الْمَعَطِّلِ لِلْسُنَّةِ فَيُهْلِكَ الاُمَّةَ"

"تم لوگ جانتے ہو کہ جو شخص لوگوں کے خون، غنائم، احکام و راہنمائی اور ناموس پر حکومت کرتا ہے اسے بخیل اور کنجوس نہیں ہونا چاہیے تا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ان کے اموال کی جمع آوری میں اپنے آپ کو حریص نہ بنا لے اور اسے جاہل و نادان نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اپنے جہالت و نادانی کی وجہ سے لوگوں کو گمراہ کردے گا، نہ اسے جفا کار ہونا چاہیے وگرنہ وہ لوگوں کے درمیان تعلق کو ختم کردے گا اور نہ ہی ستمگر ہو ورنہ وہ ایک گروہ کو دوسرے

---

[1] بحار، ج ۷۲، ص ۷۲۔

[2] وسایل الشیعہ، ج ۱۸، ص ۴۹۲، حدیث ۱

پر بلا وجہ ترجیح دے گا اور رشوت خور بھی نہ ہو وگرنہ قضاوت میں لوگوں کے حقوق پامال کر دے گا، اور حقدار تک اس کا حق پہنچانے میں کوتاہی کرے گا اور نہ سنت کو معطل اور بے کار کر دینے والا ہو نہیں تو وہ امت کو ہلاکت میں ڈال دے گا۔'' (ایسے افراد میں سے کوئی شخص بھی حکومت کے لائق نہیں)۔[1]

۹۔اہل باطل کے ساتھ صلح وآتشی اور ہم آہنگی سے پرہیز

امام علیؑ ہی نہج البلاغہ کے کلمات قصار میں فرماتے ہیں:

"لا یُقیمُ اَمْرَ اللّٰہِ سُبْحانَہُ اِلاّ مَنْ لا یُصانِعُ وَلا یُضارِعُ وَلا یَتَّبِعُ الْمَطامِعَ"

''فرمان خدا کو فقط وہی شخص قائم کر سکتا ہے جو ہر بات سے اتفاق کرنے والا نہ ہو اور اہل باطل کی روش پر گامزن نہ ہو اور نہ ہی طمع ولالچ کا پابند ہو۔''[2]

۱۰۔اپنے عہدے اور منصب کو امانت سمجھے

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ متعدد روایات میں عہدوں اور مناصب کو حکومت اسلامی میں امانت کے طور پر متعارف کرایا گیا ہے، نہ ایک برتری طلبی اور ذاتی استفادے کے عنوان سے۔ یہاں تک کہ احادیث سے پہلے قرآن کی بعض آیات میں بھی اس مطلب کو بصورت اشارہ بیان کیا گیا ہے، سورۂ نساء کی آیت ۵۸ میں ہے:

"إِنَّ اللهَ یَأْمُرُکُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ إِلَی أَهْلِهَا وَإِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْکُمُوا بِالْعَدْلِ"

''خدا تعالیٰ تمہیں امانتیں ان کے اہل افراد کے سپرد کرنے کا حکم دیتا ہے، اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو اسے عدالت پر مبنی ہونا چاہیے، خدا تعالیٰ تمہیں اچھی نصیحت کرتا ہے، خدا سمیع وبصیر (سننے اور دیکھنے والا) ہے۔''

اس آیۂ شریفہ کے ذیل میں تفاسیر اور کتب حدیث میں متعدد روایات بیان ہوئی ہیں جن میں امانت سے مراد ولایت وحکومت

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۳۱

[2] کلمات قصار، کلمہ ۱۲۰

اور پہلے مرحلے میں ائمہ معصومینؑ کی ولایت ہے۔[1]

مذکورہ آیت کی تفسیر میں ذکر شدہ چند روایات یہ ہیں

"یَعْنِی الأَمامَةَ، وَالإِمامَةُ اَلاَمانَةُ:

''اس آیت سے مراد امامت ہے اور امامت، امانت کے معنی میں ہے!''

دعائم الاسلام نامی کتاب میں بھی حضرت علیؑ سے ایک حدیث میں منقول ہے کہ آپؑ نے اہواز کے قاضی ''رفاعہ'' کی طرف بھی یہی لکھا:

" اِعْلَمْ یا رُفاعَةَ اِنَّ هٰذِهِ الاَمانَةُ، فَمَنْ جَعَلَها خِیانَةً فَعَلَیْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ اِلی یَوْمِ الْقِیامَةِ، وَمَنْ اِسْتَعْمَلَ خائِناً فَاِنَّ مُحَمَّداً (ص) بَرِیٔ مِنْهُ فِی الدُّنْیا وَالآخِرَةِ"

''اے رفاعہ! جان لو کہ یہ حکومت (اور اس کے مختلف عہدے) (خدا کی) امانت ہیں، جو کوئی ان میں خیانت کرے اس پر قیامت تک خدا کی لعنت ہو اور جو شخص کسی خائن سے کام لے محمدؐ اس سے دنیا و آخرت میں بیزار ہیں۔''[2]

تفسیر درالمنثور میں حضرت علیؑ ہی سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

"حَقّ عَلَی الإِمامِ اَنْ یَحْکُمَ بِما اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاَنْ یُؤَدِّیَ الاَمانَةَ، فَاِذا فَعَلَ ذٰلِكَ فَحَقّ عَلَی النّاسِ اَنْ یَسْمَعُوا لَهُ وَاَنْ یُطِیعُوا وَاَنْ یُجِیبُوا اِذا دُعُوا:"

''امام اور مسلمانوں کے رہبر پر لازم ہے کہ وہ خدا کے نازل کردہ (قرآن) کے مطابق حکومت کرے اور امانت کو ادا کرے، جب وہ یہ عمل انجام دے تو لوگوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس کی باتوں پر توجہ دیں اور اس کی اطاعت کریں اور جب کبھی وہ انھیں بلائے تو وہ اس کی آواز پر لبیک کہیں۔''[3]

نہج البلاغہ میں بھی وہ خط ہے جسے جناب امیرؑ نے آذربائیجان کے حاکم کے نام لکھا:

"وَاِنَّ عَمَلَكَ لَیْسَ بِطُعْمَةٍ وَلٰكِنَّهُ فِی عُنُقِكَ اَمانَة"

''تیرا یہ کام (حکومت) تیری آب و نان (روٹی پانی) کا وسیلہ نہیں بلکہ تیری گردن پر ایک ذمہ داری۔''[4]

---

[1] تفسیر برہان میں کم از کم سات روایات اس ضمن میں کی گئی ہے، بحارالانوار میں بھی جلد ۲۳، ۶۷ اور ۱۰۲ میں صفحات ۲۸۰، قع ۲۵۲ پر اس ضمن میں کئی روایت ملتی ہیں۔

[2] دعائم الاسلام، ج ۲، ص ۵۳۱

[3] در المنثور، ج ۲، ص ۱۷۵

[4] نہج البلاغہ، مکتوب، ۵۔

واضح ہے کہ یہ روایات، آیۂ شریفہ کے وسیع مفہوم کو جو تمام امانتوں کی حفاظت کی تاکید کرتا ہے، محدود نہیں کرتیں بلکہ امانت کے ایک واضح نمونے کو بیان کرتی ہیں جو امانت الٰہی کا مصداق ہے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ جو شخص اس منصب اور مقام کو امانت الٰہی کی نظر سے دیکھتا ہے، ان لوگوں کی نسبت اس کا طرزِ عمل بہت ہی مختلف ہوتا ہے کہ جو اسے اپنا حق سمجھتے ہیں اور اپنی مالکیت سمجھتے ہیں۔

جیسا کہ مال و ثروت کے بارے میں بھی قرآن نے یہی تعبیر اختیار کی ہے اور اسے لوگوں کے ہاتھوں میں اللہ کی امانت قرار دیا ہے اور خدا کو اس کا اصلی مالک قرار دیا ہے کہ یہ امانت فقط چند دن اس کے بندوں کے سپرد کی گئی ہے جیسا کہ اس نے فرمایا:

"آمِنُوا بِاللهِ وَرَسُولِهِ وَأَنْفِقُوا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُسْتَخْلَفِينَ فِيهِ"

اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ اور اس چیز پر جس میں اس نے تمہیں اپنا نمائندہ قرار دیا ہے۔ [1]

یقیناً جو مال انسان کے ہاتھ میں بطور امانت ہے اور اس کے مالک نے اسے خاص موقعوں پر استعمال کرنے کا حکم دیا ہے اسے استعمال کرنے میں کوئی مشکل نہیں ہے جبکہ اگر انسان اسے اپنا اصلی مالک جانے تو اس کا خرچ کرنا اس کے لئے آسان نہیں ہوتا۔

---

[1] حدید۔ ۷

انتظامیہ کی ترکیب

عام طور پر نظام نفاذ (انتظامیہ) ایک وسیع سلسلے پر مشتمل ہوتا ہے جس میں سرفہرست، حکومت کا صدر ہوتا ہے اور اس کے بعد وزراء ہوتے ہیں اور پھر تیسرے درجے پر ڈائریکٹر جنرل، گورنر، چیف کمشنرز اور ڈپٹی کمشنرز قرار پاتے ہیں ہر چھوٹے یا بڑے ملک کو اس طرح کی تقسیم کرنی پڑتی ہے، چاہے انہی ناموں کے ساتھ یا کسی اور نام سے۔ درحقیقت اس وسیع سلسلے کا ایک واضح فلسفہ ہے جس کا سرچشمہ کام میں تقسیم کی ضرورت ہے۔

قوانین کی دنیا اور انسانی معاشرے کے نظاموں میں اس قسم کی ضرورت اور تقسیم درحقیقت تکوینی نظام ہی کی نقل ہے۔ جب ہم انسان کے بدن کو اس کے اندرونی اور بیرونی نظام کے لحاظ سے دیکھتے ہیں تو یہ ''چھوٹی سی دنیا'' کہ جس میں ''ایک بڑی دنیا'' سمائی ہے تقسیم کار کے لحاظ سے انتہائی منظم اور وسیع وعریض سلسلے پر مشتمل ہے۔

اس کی ایک سادہ سی مثال یہ ہے کہ جب انسان کو خطرے کا احساس ہوتا ہے اور وہ مثلاً کسی درندے کے وجود کو اپنی آنکھ اور کان سے اپنے قریب محسوس کرتا ہے (اور وہ اُس درندے کے چہرے کو دیکھتا یا اس کی آواز کو سنتا ہے) اور اگر اس کے پاس دفاع کے لئے کوئی ہتھیار وغیرہ نہ ہو اور وہاں نزدیک کوئی پناہ گاہ ہو تو عقل کی طرف سے اس پناہ گاہ کی طرف فرار کرنے کا حکم جاری ہوجاتا ہے اعصابی وعضلاتی سلسلہ بھی ایک دم متحرک ہوجاتا ہے، دل کی دھڑکنیں عضلات تک خون پہنچانے کے لئے شدت کے ساتھ اوپر نیچے ہونے لگتی ہیں۔

خون کی صفائی اور عضلات کے لئے زیادہ سے زیادہ آکسیجن کی فراہمی کے لئے پھیپھڑے سرعت کے ساتھ کام کرنے لگتے ہیں ہر قسم کی تھکاوٹ، کسالت اور نیند وقتی طور پر ختم ہوجاتی ہے اور انسان پوری ہوشیاری کے ساتھ اپنی حرکات اور حالات کی نگرانی کرنے لگتا ہے اور بقول مشہور اس کی نیند اڑ جاتی ہے۔

اس طرح وہ تمام چیزیں ہیں جو انسان کی سوچ کو مشغول رکھتے ہوئے اُسے اس اہم کام سے روک سکتی ہیں مثلاً بھوک و پیاس اور درد وغیرہ تو وہ سب اچانک فراموش ہوجاتی ہیں!! اسی طرح بدن میں ذخیرہ شدہ قوتیں مکمل طور پر فعال ہو کر سخت ترین کاموں کے لئے تیار ہوجاتی ہیں اور کبھی تو انسان عام حالت میں جس طاقت کا مظاہرہ کرتا ہے اس کے دس گنا زیادہ طاقت ظاہر کرنے لگتا ہے اور یہ سب خود بخود ہوتا ہے اور یہ اتنا صحیح اور باریک بینی کے ساتھ ہوتا ہے کہ فقط اسی چیز کا مطالعہ پروردگار کے علم اور قدرت کو سمجھنے اور توحید کی حقیقت کا ادراک کرنے کے لئے کافی ہے۔

ایک انسانی معاشرہ بھی انسانی بدن کی طرح ہوتا ہے اس لئے اس میں بھی تمام کام صحیح طور پر تقسیم ہونے چاہیں اور معاشرے کے تمام ثقافتی، معاشی، عسکری، معنوی اور مادی تقاضے ایک صحیح منصوبہ بندی کے ساتھ انجام پانے چاہیں لہٰذا ان میں جدائی کے باوجود ان کا ہم آہنگ ہونا اور ہر ایک کام کا دوسرے کام کی تکمیل کا باعث بننا ضروری ہے۔

اسی وجہ سے تمام انسانی معاشروں نے خواہ وہ دیندار ہوں یا بے دین، مشرقی ہوں یا مغربی اور جدید ہوں یا قدیم، اسی اصول کو

اپنی معاشرتی زندگی میں قبول کر رکھا ہے۔ اگرچہ کاموں، عہدوں اور ذمہ داریوں کی تقسیم اور کیفیت میں فرق ہوسکتا ہے۔ بعض بہت ہی ابتدائی مرحلے میں ہوتے ہیں اور بعض پورے حساب وکتاب کے ساتھ منظم انداز میں کام کرتے ہیں۔

عالم خلقت میں نظام نفاذ

اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر اور توانا ہے اور وہ جس چیز کا بھی ارادہ کرے تو وہ فوراً ہو جاتی ہے:

اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـــًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۸۲﴾

''اس کا امر تو صرف یہ ہے کہ جس وقت وہ کسی چیز کے کرنے کا ارادہ فرماتا ہے تو کہتا ہے ''ہوجا'' پس وہ ہو جاتی ہے''[۱]

اس طرح قرآن مجید کی آیات سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ خداوند تبارک وتعالیٰ نے دنیا کے کاموں کو تقسیم کیا ہوا ہے۔ فرشتوں کے بہت سے گروہوں کو خلقت وشریعت کے اہم کاموں میں سے ہر ایک کام پر مامور فرمایا ہوا ہے۔ کبھی تو کلی طور پر اس موضوع کی نشاندہی کرتے ہوئے فرماتا ہے:

جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۭ

''وہی اللہ جس نے فرشتوں کو رسول قرار دیا ہے کہ جو دو دو، تین تین اور چار چار پروں والے ہیں''[۲]

ایک دوسری جگہ فرماتا ہے:

"فَالْمُدَبِّرَاتِ أَمْرًا"

''قسم ہے اُن فرشتوں کی جو امور کی تدبیر کرتے ہیں''[۳]

ایک دوسری جگہ فرشتوں کی زبان سے اس طرح بیان کرتا ہے:

وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ﴿۱۶۴﴾ وَّاِنَّا لَنَحْنُ الصَّاۗفُّوْنَ ﴿۱۶۵﴾ وَاِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ ﴿۱۶۶﴾

یعنی: ''ہم میں سے ہر ایک کے لئے ایک معلوم مقام ہے اور ہم سب کے سب خدا کے حکم کی اطاعت کے لئے صف باندھے کھڑے ہیں اور ہم سب کے سب اس کی تسبیح کرتے ہیں''[۴]

---

[۱] یس۔۸۲

[۲] فاطر۔۱

[۳] نازعات۔۵

[۴] صافات۔۱۶۴،۱۶۶

اور کبھی خاص گروہوں کی نشاندہی کرتے ہوئے اُن کے مخصوص فرائض کا ذکر کرتا ہے۔ بطور مثال چند گروہوں کا نام لیا جا سکتا ہے:

۱۔ وہ فرشتے جو وحی پہنچانے والے اور کتب آسمانی لانے والے تھے:

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ [1]

۲۔ وہ فرشتے جو حاملان عرش ہیں:

اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ [2]

۳۔ وہ فرشتے جو انسانوں کے اعمال ثبت کرنے پر مقرر ہیں:

وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ﴿۱۰﴾ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ﴿۱۱﴾ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۱۲﴾ [3]

۴۔ فرشتوں کا وہ گروہ جو خدا کی طرف سے مؤمن کی جنگ کے سخت حالات میں یا زندگی کے نشیب و فراز میں مدد کرتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ﴿۹﴾ [4]

۵۔ فرشتوں کا وہ گروہ کہ جو بہت سے خطرات اور حادثوں میں انسانوں کی حفاظت کرتا ہے:

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ؕ [5]

۶۔ کچھ فرشتے ارواح قبض کرنے پر مامور ہیں:

قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ [6]

الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ [7]

۷۔ کچھ فرشتے رزق تقسیم کرنے پر مامور ہیں:

---

[1] نحل۔۲

[2] غافر۔۷

[3] انفطار۔۱۰،۱۲

[4] احزاب۔۹

[5] انعام۔۶۱

[6] سجدہ۔۱۱

[7] نحل۔۳۲

فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا ۝۴ [1]

اس آیت کی تفسیر میں بعض نے اسے پہلے والی آیات کی مناسبت سے اُن فرشتوں کی طرف اشارہ قرار دیا ہے جو بندوں کے درمیان رزق تقسیم کرتے ہیں اور بعض نے اِسے اُن فرشتوں کی طرف ناظر قرار دیا ہے جو کائنات میں تمام کام تقسیم کرنے پر مأمور ہیں۔

۸۔ وہ فرشتے جو بادلوں کو پھیلانے اور بارشوں کو برسانے اور اُن کے برسنے کے بعد اُن کو بکھیرنے پر مأمور ہیں:

وَّالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا ۝۳ فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا ۝۴، [2]

۹۔ کچھ فرشتے مؤمنین کے دلوں سے شیطانی وسواس کو ختم کرنے پر مأمور ہیں اور مؤمن بندوں کے دل و دماغ پر حملہ کرنے والے شیاطین کا مقابلہ کرتے ہوئے اُن کے وسوسوں کو بے اثر بناتے ہیں:

فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا ۝۲ (صافات/۲) [3]

۱۰۔ وہ فرشتے جو شب قدر میں نازل ہوتے ہیں اور ایک سال کے دوران الٰہی مقدرات کو پہنچانے پر مأمور ہیں۔ یہ مقدرات ہر انسان کی لیاقت و صلاحیت کے مطابق مقرر ہوتے ہیں نہ کہ بغیر کسی حساب و کتاب اور جبر کے:

تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ۝۴ (قدر/۴)

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا اللہ تعالیٰ ہر کام کے بارے میں جو قدرت و طاقت رکھتا ہے، اُس کے مطابق اُس نے اس کائنات کے کاموں کی تدبیر کا کام فرشتوں میں تقسیم کر دیا ہے اور اُن کے ہر گروہ کو ایک ذمہ داری اور مأموریت دے دی ہے۔ اسلامی روایات میں بھی ذمہ داریوں کی تقسیم کے حوالے سے فرشتوں کی اصناف و اقسام کے بارے میں بہت ہی بامعنی تعبیرات دیکھنے میں آئی ہیں، منجملہ نہج البلاغہ کے خطبۂ اشباح میں آیا ہے:

"مِنْهُمْ مَنْ هُوَ فِي خَلْقِ الْغَمَامِ الدُّلَّحِ، وَفِي عِظَمِ الْجِبَالِ الشُّمَّخِ، وَفِي قَتْرَةِ الظَّلَامِ الْاَبْهَمِ، وَمِنْهُمْ مَنْ خَرَقَتْ اَقْدَامُهُمْ تُخُومَ الْاَرْضِ السُّفْلَى، فَهِيَ كَرَايَاتٍ بِيضٍ قَدْ نَفَذَتْ فِي مَخَارِقِ الْهَوَاءِ، وَتَحْتَهَا رِيحٌ هَفَّافَةٌ تَحْبِسُهَا عَلَى حَيْثُ انْتَهَتْ مِنَ الْحُدُودِ الْمُتَنَاهِيَةِ، قَدِ اسْتَفْرَغَتْهُمْ اَشْغَالُ عِبَادَتِهِ، وَوَصَلَتْ حَقَائِقُ الْاِيمَانِ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَعْرِفَتِهِ، وَقَطَعَهُمُ الْاِيقَانُ بِهِ اِلَى الْوَلَهِ اِلَيْهِ، وَلَمْ تُجَاوِزْ رَغَبَاتُهُمْ مَا عِنْدَهُ اِلَى مَا عِنْدَ غَيْرِهِ، قَدْ ذَاقُوا حَلَاوَةَ مَعْرِفَتِهِ، وَشَرِبُوا بِالْكَأْسِ الرَّوِيَّةِ مِنْ مَحَبَّتِهِ"

---

[1] ذاریات۔۴

[2] مرسلات۔۳،۴

[3] اس کی تفسیر میں مختلف قسم کی باتیں کہی گئی ہیں کہ جن میں سے ایک تو وہی ہے جسے اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

یعنی: ''اُن میں سے کچھ فرشتے ایسے ہیں جو بارش سے پُر بادلوں، بلند پہاڑوں اور تاریکیوں کی خلقت میں لگے ہوئے ہیں۔ اور کچھ فرشتے ایسے ہیں جن کے قدموں نے زمین میں سوراخ کر دیئے اور وہ زمین کے انتہائی پست مقام تک پہنچے ہوئے ہیں۔ پس ملائکہ کے یہ قدم ان سفید پرچموں کی مانند ہیں جنھیں فضا [ہوا] کی پھٹن میں گاڑ دیا گیا ہو اور ان کے قدموں کے نیچے ہوا چل رہی ہے جو انھیں ان کی قرارگاہ میں ٹھہرائے ہوئے ہے۔ خدا کی عبادت نے انھیں ہر کام سے روک رکھا ہے اور حقائق ایمان نے ان کے اور خدا کی معرفت کے درمیان ایک ارتباط اور تعلق پیدا کر دیا ہے۔ اس کی معرفت کی مٹھاس وہ چکھ چکے ہیں اور اس کی محبت اور دوستی سے لبریز اور سیراب کرنے والا جام انھوں نے پی لیا ہے۔''[۱]

فرشتوں کی ذمہ داریوں کے بارے میں اور بھی روایات ہیں کہ جن سب کو یہاں ذکر کرنا ممکن نہیں ہے۔[۲]

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس سے قرآن کا یہ پیغام مل رہا ہے کہ اگر انسان بھی اس کائنات میں پروردگار عالم کی ربوبیت پر مبنی نظام کے ساتھ ہم آہنگ اور ہم قدر ہونا اور عالم تکوین میں اس کے انتظامات کے مطابق عمل کرنا چاہتا ہے تو اسے بھی انسانی معاشرے میں پوری توجہ کے ساتھ کاموں اور ذمہ داریوں کی تقسیم کرنی چاہیے تاکہ اس کی زندگی کامیابی سے ہمکنار ہو سکے۔ دوسرے الفاظ میں ہم جانتے ہیں کہ تکوینی اور قانونی نظام ایک ساتھ چلنے چاہیں اور انسانوں کی زندگی کو خلقت الٰہی سے رہنمائی لینی چاہیے اور الٰہی رنگ اپنانا چاہیے اور جس طرح وہاں پر انجام پا رہا ہے یہاں بھی انجام پانا چاہیے اس حقیقت کی طرف توجہ ہمیں امور کے نفاذ کو منظم کرنے کی دعوت دیتی ہے۔

عصر پیغمبرؐ میں نظام نفاذ

اگرچہ عصر پیغمبرؐ میں اسلامی حکومت انتہائی سادہ انداز میں تھی اس کے باوجود اس حکومت کے نظام نفاذ میں ذمہ داریوں کی تقسیم بالکل واضح اور منظم انداز میں تھی۔ منجملہ جب بھی پیغمبر اکرمؐ کسی جنگ میں بذات خود شرکت نہ فرماتے تو ایک یا چند سپہ سالاروں کو مقرر فرما دیتے تھے اور کبھی کسی ممکنہ حادثے کے امکان کی صورت میں پہلے سپہ سالار کے جانشین کے طور پر ایک اور سپہ سالار کو بھی مقرر کر دیا جاتا تھا۔ مثلاً جنگ موتہ میں لشکر اسلام کا اصلی سپہ سالار جعفر بن ابی طالب کو مقرر کیا گیا تھا پھر مزید فرمایا: اگر جعفر کو کوئی حادثہ پیش آ جائے تو پھر ''زید بن حارثہ''، اور اگر ان کے ساتھ بھی کوئی حادثہ پیش آ یا جائے ''عبداللہ بن رواحہ'' سپہ سالار رہوں گے اور اگر ان کو بھی کوئی حادثہ پیش آ جائے تو مسلمان باہمی مشورے سے اپنے میں سے کسی کو لشکر کی کمانڈ سونپ دیں۔[۳]

اسی طرح تاریخی کتب میں آیا ہے کہ وحی اور دوسرے امور کی کتابت کے لئے رسول اکرمؐ کے کچھ کاتب بھی تھے جن میں

---

[۱] نہج البلاغہ، خطبہ ۹۱ (یہ خطبہ اشباح کے نام سے مشہور ہے)

[۲] فرشتوں کی صناف کے بارے میں تفصیل جاننے کیلئے بحار الانوار، ج ۵۹ ص ۱۷۴، اور صحیفہ سجادیہ، دعائے سوم کی طرف رجوع کیجئے۔

[۳] سید المرسلین، ج ۲ ص ۴۴، بعض مورخین نے تینوں امیروں کی ترتیب کسی اور شکل میں ذکر کی ہے کہ جس کا ہمارے مقصد کے ساتھ کوئی اختلاف نہیں۔

حضرت امیر المؤمنین علی بن ابیطالبؑ وراسی طرح ''زید بن ثابت''، ''علاء بن حضرمی'' اور ''ابی بن کعب'' کا نام لیا جا سکتا ہے۔[1]

زکوٰۃ جمع کرنے کے لئے اور بیت المال کی ذمہ داریوں کے لیے بھی کچھ افراد کو منتخب کیا گیا تھا ان میں ''مہاجر بن ابی امیہ'' کو صنعا میں بیت المال کے اموال کو جمع کرنے کے لیے نگران مقرر کیا گیا تھا اور ''زیاد بن لبید'' کو حضر موت میں اور ''عدی بن حاتم'' کو قبیلہ طی میں، ''مالک بن نویرہ'' کو بنی حنظلہ میں، ''زبرقان بن بدر کو قبیلہ بنی اسد اور ''علاء بن حضرمی'' کو بحرین میں بیت المال کے اموال جمع کرنے کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔[2]

پیغمبر اکرمؐ نے نخلستانوں کی پیداوار کا تخمینہ لگانے اور زکوٰۃ کی مقدار کا تعین کرنے کے لئے بھی کچھ ماہرین مقرر فرمائے ہوئے تھے جن میں ''عبداللہ بن رواحہ'' کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح مختلف علاقوں کے لئے آپؐ نے کچھ سپہ سالار بھی انتخاب کئے ہوئے تھے کہ جن میں یمن کے لئے حضرت علیؑ اور معاذ بن جبل، مکہ کے لئے عتاب بن اُسید اور بنی ثقیف کے علاقے کے لئے عثمان بن ابی العاص کا نام لیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح آنحضرتؐ کے بہت سے سفیر بھی تھے جن میں سے ہر ایک کو دعوت اسلام کی تبلیغ کے لئے ہمسایہ مما لک کے حکمرانوں اور بادشاہوں کی طرف بھیجا جاتا تھا۔ منجملہ آپؐ نے ساسانی بادشاہ کسریٰ کی طرف ''عبداللہ بن حذافہ'' کو، روم کے بادشاہ ''قیصر'' کی طرف ''دحیۂ کلبی'' کو مصر کے بادشاہ ''مقوقس'' کی طرف ''حاطب بن ابی بلتعہ'' کو اور ''حبشہ'' کے حکمران ''نجاشی'' کی جانب ''عمرو بن امیہ'' کو بھیجا تھا۔[3]

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ہر قسم کے تکلفات سے خالی اس حکومت میں نظام نفاذ مکمل طور پر منظم مختلف حصوں پر مشتمل تھا اور ہر حصے کے لئے ایک یا چند نگران مقرر تھے۔ ان سب باتوں سے واضح ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت کے نظام نفاذ کے مختلف حصوں میں انتظامی امور اور ذمہ داریوں کی تقسیم کا مسئلہ ایک مسلمہ اور نا قابل انکار مسئلہ ہے۔

نظام نفاذ (انتظامیہ) کے سربراہ اور دیگر عہدہ داروں کے انتخاب کا طریقہ

اسلامی نظریہ کائنات میں حکومت اللہ تعالیٰ سے مختص ہے اور انسانی معاشروں میں اس کی مشروعیت (جواز) کا سرچشمہ اور اس کی سند اللہ تعالیٰ کی اجازت اور الٰہی تفویض ہے۔ لہٰذا قدرتی طور پر نظام نفاذ پیغمبر اکرمؐ اور پھر ائمہ معصومین × کی جانب سے اور ان کے بعد ان ذوات مقدسہ کے جانشینوں اور نمائندوں یعنی فقہاء عظام کی طرف سے تمام سلسلہ مراتب کے تحت مقرر ہوگا۔ اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں جب پیغمبر اکرمؐ نے ہجرت کے آغاز میں مدینہ میں اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی اور اپنی باقی حیات مبارکہ میں اسے وسیع کیا اور تمام مقامات

---

[1] کامل ابن اثیر، ج ۲، ص ۳۱۳

[2] سیرہ ابن ہشام، ج ۴، ص ۲۴۶

[3] خاندان وحی، ص ۲۶

پر بذات خود گورنر، فوجی سپہ سالار، قاضی اور سفیر مقرر فرمائے اور جہاں ضرورت ہوئی تو اہم موقعوں پر ان عہدہ داروں کو مقرر کرنے کے لئے اپنے اصحاب کے ساتھ مشورہ بھی کیا۔

لیکن یقیناً جب یہ کام جامع الشرائط فقیہ کے سپرد ہوتا ہے خصوصاً ہمارے زمانے میں تو حکومتی مسائل میں عوام کی شرکت ایک واضح چیز ہے، چونکہ عوامی شرکت کے بغیر حکومت کے ساتھ تعاون کا کوئی محرک باقی نہیں رہتا لہٰذا نظام نفاذ کی اعلیٰ سطح کے عہدہ داروں کا انتخاب کرنے کے لئے جو بھی لائحہ عمل بنایا جائے اس میں عوام کے ساتھ مشورہ ضرور ہونا چاہیے۔ دوسرے الفاظ میں عوام کو نظام نفاذ کے سربراہ اور اس نظام کے اعلیٰ سطح کے عہدہ داروں کی پہچان ضروری ہے۔ اگر جامع الشرائط فقیہ اس سلسلے میں بے اعتنائی اور لاپرواہی کرے گا تو یقیناً وہ مسلمانوں کی مصلحتوں کو خطرے میں ڈال دے گا اور اسلامی نظام کو متزلزل کر دے گا۔ جس کی وجہ سے اس کی ولایت کی مشروعیت (جواز) بھی ختم ہو جائے گی۔

ولی فقیہ ہرگز یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں معصومین- کا جانشین ہوں اور اسلامی حکومت میں زمانہ رسول خداؐ کی طرح قانون نافذ کرنے والے تمام منتظمین، وزیر اعظم، وزیروں اور صدر کو خود مقرر کروں گا چونکہ یہ چیز عوامی مصلحت، مسلمانوں کے مفاد اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی شرائط کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے اس لیے اس سے حکومت کے ستون کمزور، بنیادیں متزلزل اور اس کی طاقت کم ہو سکتی ہے بلکہ بہت جلد ایسی حکومت کی بساط لپیٹی جا سکتی ہے۔

ولی فقیہ کو چاہیے کہ وہ اس اہم مسئلے میں "شوریٰ" جیسے قرآنی اصول کا احترام کرتے ہوئے انتخاب میں عوام کو اہمیت دے اور انھیں اس اہم کام میں حصہ دار بنائے اور اس کا بہترین طریقہ وہی ہے کہ جس کو اسلامی جمہوری (ایران) کے آئین میں مدنظر رکھا گیا ہے جس کے مطابق پہلے مرحلے میں صدر کو عوام چنتے ہیں ان ووٹ سے وہ عوامی حمایت حاصل کر لیتا ہے اور آخری مرحلے میں جامع الشرائط فقیہ کی جانب سے اس کے صدارتی عہدے کی توثیق ہو جاتی ہے۔ اس طرح ایک جانب سے اگر اس کا عوامی پہلو ثابت ہوتا ہے تو دوسری جانب سے وہ الٰہی پہلو کا بھی حامل ہوتا ہے جس سے اس کی بنیاد تشکیل پاتی ہے۔ (غور فرمائیں)

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ تجربے سے ثابت ہوا ہے کہ جب بھی ایک مؤمن اور مذہبی معاشرے میں پہلے سے درست طریقے کے مطابق مکمل پہچان و تعلیم کے ساتھ عوامی انتخاب عمل میں آتا ہے تو وہ اکثر صحیح ہوتا ہے۔ اب بعض مواقع پر عمومی تشخیص اور ضمیر سے اگر کوئی غلطی سرزد ہو جائے جبکہ ایسا بہت کم ہوتا ہے، تو اس وقت جامع الشرائط فقیہ اپنے اختیارات سے استفادہ کرتے ہوئے ایسے شخص کے توثیق شدہ حکم کو واپس لے سکتا ہے لیکن چونکہ ولی فقیہ خود عوام کی طرف سے منتخب شدہ ہے (جیسا کہ بعد میں اس کی طرف اشارہ ہوگا) لہٰذا وہ پوری تدبیر و عقلمندی اور دلائل کے ساتھ لوگوں پر واضح کرے اور عمومی افکار کو اس بارے میں مطمئن کرے اور اگر کوئی غلط فہمی پیش آئے تو اس کی روک تھام کرے۔

البتہ ممکن ہے عوامی انتخاب بالواسطہ طریقے سے عمل میں آئے، یعنی؛ اسلامی اسمبلی کے لئے عوام اپنے نمائندوں کو چنیں اور پھر وہ نمائندے وزارت عظمیٰ کے عہدے کے لئے کسی کا نام پیش کریں اور بعد میں کافی مشورے کے بعد اس کی (اس عہدے کے لئے)

صلاحیت کو جانچا پرکھا جائے اور پھر اسے اعتماد کا ووٹ دے کر توثیق کے لئے ولی فقیہ کی طرف بھیج دیا جائے اور ولی فقیہ بھی کبھی تو بلاواسطہ اور کبھی بالواسطہ طریقے سے اس انتخاب کی تائید اور توثیق کر دے (جیسا کہ شوریٰ نگہبان کے فقہاء کے بارے میں ہم دیکھتے ہیں)۔

اگرچہ اسلامی جمہوری (ایران) کے نظام میں فی الحال انتظامیہ کے سربراہ یعنی؛ صدر مملکت کا انتخاب عوام کی طرف سے ہوتا ہے، لیکن اعلیٰ سطح کے عہدے داریعنی؛ وزراء صدر کے مشورے سے اسمبلی میں عوامی نمائندوں کے ذریعے چُنے جاتے ہیں۔ اس طرح عوام دوطرح سے وزیروں کے انتخاب میں شریک ہوتے ہیں: ایک مجلس شوریٰ اسلامی کے نمائندوں کے ذریعے اور دوسرے صدر مملکت کے ذریعے کہ جوخود عوام کا منتخب شدہ ہوتا ہے۔

جامع الشرائط فقیہ بھی شوریٰ نگہبان اور پھر صدر کے حکم کی توثیق کے ذریعے اِس عمل کی نگرانی کرتا ہے۔ یہ طریقہ اتنا پیچیدہ نہیں اور پھر اس میں شرعی معیار کے مطابق جامع الشرائط فقیہ کا عمل دخل بھی واضح ہے اور عوامی شرکت بھی۔ اس طرح اس نظام میں عوامی اور شرعی ہر دو پہلوؤں کا بہت ہی احتیاط کے ساتھ خیال رکھا جاتا ہے۔ (غور کیجئے)

اسلامی حکومت اور اس پر حاکم ثقافت

حکومت اسلامی سے متعلق کا یہ حصہ انتہائی اہم اور تعمیری حیثیت رکھتا ہے، چونکہ ممکن ہے کہ گذشتہ بحث میں حکومت اسلامی کے نظام نفاذ کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے، اس سے یہ تصور کیا جائے کہ حکومت اسلامی میں بھی وہی راہ وروش اختیار کی جاتی ہے جو غیر اسلامی حکمرانوں کی ہے۔ یعنی غیر اسلامی حکومتوں میں جس طرح ذمہ داریوں کی تقسیم، وزارتوں کی تشکیل، وزیروں اور بلند پایہ اور نچلی سطح کے سرکاری افسران اور وزیر اعظم کا انتخاب ہوتا ہے، اسی طرح اسلامی نظام میں بھی، عوامی انتخابات اور لوگوں کی آراء چاہے براہ راست ہوں یا اسمبلی میں ان کے موجود نمائندوں کے ذریعے، پر تکیہ کیا جاتا ہے، بنابریں اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسلامی اور غیر اسلامی حکومتوں کے درمیان فرق محض نام اور عنوان کا ہے!

لیکن یہ تصور نہایت غلط ہے کیونکہ سب سے اہم چیز جو اقوام وملل اور حکومتوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہے وہ ان (اسلامی وغیر اسلامی حکومتوں پر حاکم تہذیب وتمدن ہے) اس لئے کہ کوئی حکومت اپنے اداروں اور حکومتی اعضاء وارکان سمیت فقط جسم کی مانند ہے اور اس کی روح وہی ثقافت ہے جس کی اس پر حکمرانی ہے۔ نظام اسلامی پر حاکم ثقافت اسلامی کا سراغ لگانے کے لئے بہت سی ابحاث ضروری ہیں اور اس مقصد کے لئے ایک جداگانہ کتاب یا کئی کتابیں تحریر کرنے کی ضرورت ہے جبکہ یہاں فقط ایک فہرست پر ہی اکتفا کی جاتی ہے۔

البتہ یہ فہرست قارئین کرام کو اس مسئلے کی اجمالی کیفیت اور اس کے مقاصد واہمیت سے آگاہی بخشنے کے لئے ایک حد تک کفایت کرتی ہے۔ مجموعی طور پر تین بنیادی اور اساسی قوانین ہیں جو اسلامی نظام حکومت پر حکم فرما ہیں اور اسے دوسری حکومتوں سے ممتاز اور جدا کرتے ہیں:

۱۔ قوانین کو نافذ کرنے والے ذمہ دار افراد اپنے آپ کو خدا کی طرف سے امانتدار جانتے ہیں اور حکومت اور اس کے عہدوں کو جو ان کے سپرد کئے گئے ہیں امانت خدا قرار دیتے ہوئے ممکنہ حد تک ان کی حفاظت اور پاسداری کرتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ وہ خدا اور اس کے بندوں کے درمیان رابطے کا ذریعہ بنیں اور خدائی فرمان کو اس کے بندوں پر من وعن نافذ کریں۔ ایسے لوگ ہرگز اپنے عہدے کی حفاظت اور اپنے یا کسی خاص گروہ کے منافع کے حصول کے چکروں میں پڑ ہی نہیں سکتے۔

حالانکہ مادی اور غیر اسلامی حکمرانوں کی نظر میں اپنے عہدے اور منافع کی حفاظت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہوتی، اور گاہے ممکن ہے کہ کسی عہدے کے حصول کے لئے کروڑوں روپے خرچ کر ڈالیں اس یقین کے ساتھ کہ حکومت تک رسائی کے بعد وہ خرچ شدہ رقم کا کئی گناہ حاصل کر لیں گے، یا کم از کم ان کا تعلق کسی خاص طبقے یا کسی خاص پارٹی سے ہوتا ہے جو ایسے افراد کو حکومت میں لانے کے لئے مال ودولت خرچ کرتی ہے تا کہ بعد ازاں اس سرمایہ کاری سے خوب منافع کمائے۔ اس لئے ایسے منتخب افراد پارٹی وغیرہ کے منافع کا بھرپور تحفظ کرتے ہیں۔ اس غیر اسلامی اور اسلامی نقطۂ نظر کا فرق بالکل واضح اور مکمل طور پر عیاں ہے۔

۲۔لوگ اسلامی حکومت کے عہد یداروں کو خدا کی طرف سے مبعوث شدہ جانتے ہیں چونکہ ان کی اطاعت درحقیقت خدا کی اطاعت کا پرتو ہوتی ہے اوران کا فرمان حقیقت میں فرمان خدا ہوتا ہے۔لوگ حکومت اسلامی کے قوانین کو خدا کے قوانین سمجھتے ہیں اور ان کی اطاعت کو آخرت میں نجات کا سبب خیال کرتے ہیں اوران قوانین کی مخالفت کو گناہ اور آخرت میں عذاب کا سبب جانتے ہیں البتہ یہ اس صورت میں ممکن ہے جب حکومت اسلامی صحیح بنیادوں پر استوار ہو۔یہ نقطۂ نظر مادی حکومتوں کے نقطۂ نظر سے بالکل مختلف ہے چونکہ لوگ غیر اسلامی حکمرانوں کو اپنی طرح کا عام انسان خیال کرتے ہیں جو غالباً اپنے یا اپنی پارٹی کے منافع کے حصول کے درپے ہوتے ہیں اور جب کبھی انھیں کوئی قانون پسند نہ آئے اور سزا کا خوف بھی نہ ہو تو ایسے قانون کی خلاف ورزی کرنے میں وہ (لوگ) کسی بات کی پرواہ نہیں کرتے۔

۳۔اصولی طور پر حکومت اسلامی میں معنویت اور اخلاقی قدریں ہر چیز سے زیادہ اہم ہوتی ہیں لہٰذا ہر کام اخلاقی اور انسانی عنوان سے انجام پانا چاہیے، تمام (روحانی) محرکات کو مادی محرکات پر فضیلت اور سبقت حاصل ہونی چاہیے، کیا تشکیل حکومت اور بہتر زندگی کا انتہائی مقصد، سیر الیٰ اللہ، خدا کا قرب ونزدیکی اور روحانی ومعنوی کمالات کے حصول کے مقدمات کی فراہمی نہیں ہے؟ (یعنی تشکیل حکومت کا مقصد، قرب خدا تعالیٰ کا حصول ہے اور اسلامی حکومت کی تشکیل ہوگی تو انسان کے لئے یہ مقصد حاصل کرنا ممکن ہوگا)۔کیا ممکن ہے کہ اسلام میں تشکیل حکومت کے محرکات ایک مادی حکومت میں موجود کارندوں اورعوام کے محرکات کے ساتھ مساوی ہوں؟

البتہ سو فیصد خالص حکومت الٰہی واسلامی تک رسائی حاصل کرنے کے لئے ایک طویل سفر درپیش ہے اورضروری ہے کہ معاشرے کو تعلیم وتربیت کے اسلحے سے لیس کیا جائے لیکن بہرحال حکومت اسلامی کی شکل وصورت ثقافتی اور تمدنی نقطۂ نظر سے مادی حکومتوں کی شکل وصورت سے نہ صرف مختلف ہے بلکہ یہ دونوں ایک دوسرے سے مکمل طور پر جدا ہیں۔اس مختصر سی تحلیل وتوضیح کے بعد ضروری ہے کہ پہلے آیات قرآن اور پھر احادیث کی طرف رجوع کیا جائے تاکہ ان کی روشنی میں اسلامی حکومت کے مختلف محوروں پر حاکم ثقافت کو پرکھا جاسکے۔

۱۔خدا تعالیٰ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۵۹ میں فرماتا ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ۝۱۵۹

''اے رسولؐ! رحمت خداوندی کی برکت سے آپؐ ان لوگوں کے حق میں نرم اورمہربان ہیں اوراگر آپؐ تندخو اورسنگدل ہوتے تو لوگ آپؐ کے اطراف سے پراکندہ ہوجاتے۔پس آپؐ انھیں بخش دیں اوران کے لئے (خدا سے) مغفرت طلب کریں، اورمختلف معاملات میں ان کے ساتھ مشورہ کریں، لیکن جب آپؐ کوئی

فیصلہ کرلیں تو اس پر ڈٹ جائیں اور خدا پر توکل کریں کیونکہ خدا توکل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔"

اسی طرح حاکم اسلامی پختہ فیصلے کے ساتھ ساتھ اس بات پر بھی مامور ہے کہ وہ عفو و درگذر کرے اور اپنے رب کی بارگاہ میں لوگوں کے لئے استغفار کرے جبکہ تمام امور اور سارے کاموں میں اس کا حقیقی سہارا فقط خدا ہوتا ہے اور وہ اسے ہی اپنی حقیقی تکیہ گاہ سمجھتا ہے۔

۲۔خدا تعالیٰ سورۂ فصلت کی آیت ۳۴ میں حکم دیتا ہے کہ باہمی کدورت اور دشمنی کو محبت کے پانی کے ساتھ دھوڈالو اور جہاں تک ممکن ہو دوستوں کے ساتھ انتقامی کاروائی سے گریز کرو۔فرمان الٰہی ہے:

اِدۡفَعۡ بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ فَاِذَا الَّذِیۡ بَیۡنَکَ وَبَیۡنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیۡمٌ ﴿۳۴﴾ [1]

"برائی کو اچھائی کے ذریعے دور کرتا کہ تیرے زبردست دشمن بھی تیرے سچے اور پکے دوست بن جائیں۔

لیکن اس کے بعد بلا فاصلہ یہ اضافہ فرماتا ہے: اس درجے تک صرف وہی لوگ پہنچ پاتے ہیں جو صاحبان صبر و استقامت ہیں اور ایمان و تقویٰ کی دولت سے مالا مال افراد ہی اس مرحلے کو حاصل کر سکتے ہیں۔"

نفاذ اسلام کے نظام پر اس قسم کی ثقافت کی حاکمیت جو ثقافت مادی کی ضد ہے، اسلامی نظام کے نفاذ کو ایک خاص قسم کی نورانیت اور صفا و جلا بخشتی ہے اور اسے ایک خاص معنی و مفہوم سے آشنا کرتی ہے۔

۳۔سورۂ کہف کی آیت ۲۸ میں ان لوگوں کے اصرار کے مقابلے میں جو اس بات کے معتقد تھے کہ رسول اکرمؐ کو چاہیے کہ وہ فقیر و نادار افراد کو خود سے دور رکھیں، اگرچہ یہ نادار افراد مخلص اور باایمان ہی کیوں نہ ہوں اور صاحب اثر اور دولت مند افراد سے نزدیک ہوں، صریح طور پر ارشاد فرماتا ہے:

وَاصۡبِرۡ نَفۡسَکَ مَعَ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ رَبَّہُمۡ بِالۡغَدٰوۃِ وَالۡعَشِیِّ یُرِیۡدُوۡنَ وَجۡہَہٗ وَلَا تَعۡدُ عَیۡنٰکَ عَنۡہُمۡ ۚ تُرِیۡدُ زِیۡنَۃَ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ۚ وَلَا تُطِعۡ مَنۡ اَغۡفَلۡنَا قَلۡبَہٗ عَنۡ ذِکۡرِنَا وَاتَّبَعَ ہَوٰىہُ وَکَانَ اَمۡرُہٗ فُرُطًا ﴿۲۸﴾

"اے رسولؐ! ان لوگوں کے ساتھ رہو جو اپنے رب کو صبح و شام پکارتے ہیں اور وہ فقط اسی کی رضا کے طالب ہیں اور دنیا کی زیب و زینت کی خاطر ہرگز انھیں اپنی نظروں سے دور نہ کرو اور ان لوگوں کی اطاعت نہ کرو جن کے دلوں کو ہم نے (ان کے کرتوتوں کے باعث) اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے، وہی جو اپنی خواہش نفس کے تابع ہیں اور ان کا کام افراط پر مبنی ہے۔

---

[1] سورہ فصلت۔۳۴

کس قدر فرق ہے اس منطق، جو عشق وایمان کو اس قسم کے (نادار) افراد میں بالاترین قدر و قیمت قرار دیتی اور یہ کہ خدا سے غافل دولت مندوں کو خود سے دور کرو نہ ان لوگوں کو جو فقیر ہیں لیکن مخلص و باایمان، اوران لوگوں کی منطق کے درمیان جو آج پورے دنیا میں علی الاعلان کہتے نظر آتے ہیں کہ قدر و قیمت کا اصلی معیار فقط مال و دولت اور منافع ہیں، (نہ ایمان و اخلاص) اور دیگر ہر طرح کی قدر و قیمت کو (مال و دولت اور منافع) پر قربان کرتے ہیں۔

۴۔سورۂ ص کی آیت ۲۶ میں حضرت داؤدؑ سے قاطعانہ اور جارحانہ انداز میں خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلۡنٰكَ خَلِيۡفَةً فِى الۡاَرۡضِ فَاحۡكُمۡ بَيۡنَ النَّاسِ بِالۡحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الۡهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ‌ؕ

اے داؤد! ہم نے تمہیں زمین پر اپنا خلیفہ اور نمائندہ مقرر کیا ہے، پس لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو اور خواہش نفس کی پیروی نہ کرو کیونکہ (اگر نفس کی پیروی کروگے تو) یہ تمہیں راہ خدا سے منحرف کردے گی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ آیت شریفہ میں خدا تعالیٰ اپنے پیغمبر کو بطور نمونہ و مثال تنبیہ کررہا ہے کہ وہ شیطان نفس کے وسوسوں پر کڑی نظر رکھے تاکہ وہ (شیطان نفس) پیغمبر (داؤدؑ) کے جادۂ حق و عدالت سے انحراف کا باعث نہ بنے۔

بنابریں ایک اسلامی حاکم ہمیشہ اس بات کی طرف متوجہ رہتا ہے کہ کہیں وہ اپنی قضاوت اور فیصلے میں حب و بغض اور خواہش نفس کی گرفت میں نہ آجائے اور ایسا نہ ہو کہ کسی بے گناہ کا حق ضائع ہوجائے، کس قدر فرق ہے اس منطق اور ان لوگوں کی منطق کے درمیان جو فقط قاضی کو قانون کے مقابلے میں ذمہ دار جانتے ہیں، قانون بھی ایسا جو ہزار نوع راہ فرار، توجیہات اور تفاسیر کا حامل ہوتا ہے (یعنی قاضی جیسا چاہے فیصلہ کرے چاہے مبنی برحق ہو یا ناحق)۔

۵۔سورۂ نساء کی آیت ۱۳۵ میں تمام مومنین سے خطاب کرکے ایک اور اہم بنیادی قانون کا تذکرہ فرمایا ہے اور وہ یہ کہ اصول وضوابط ہر قسم کے رابطے پر مقدم ہیں، ارشاد خداوندی ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا كُوۡنُوۡا قَوّٰمِيۡنَ بِالۡقِسۡطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوۡ عَلٰٓى اَنۡفُسِكُمۡ اَوِ الۡوَالِدَيۡنِ وَالۡاَقۡرَبِيۡنَ‌ ۚ اِنۡ يَّكُنۡ غَنِيًّا اَوۡ فَقِيۡرًا فَاللّٰهُ اَوۡلٰى بِهِمَا‌ فَلَا تَتَّبِعُوا الۡهَوٰٓى اَنۡ تَعۡدِلُوۡا‌ ۚ وَاِنۡ تَلۡوٗۤا اَوۡ تُعۡرِضُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرًا ﴿۱۳۵﴾

''اے ایمان والو! مکمل طور پر عدالت قائم کرنے والے بنو، اور شہادت دو تو خدا کے لئے اگر چہ یہ شہادت خود تمہارے یا تمہارے والدین یا قرابتداروں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو کیونکہ اگر وہ غنی یا فقیر ہوں تو خدا اس بات کا زیادہ سزاوار ہے کہ ان کی حمایت کرے، پس اپنی خواہش نفس کی پیروی نہ کرو ورنہ حق سے منحرف ہوجاؤ گے اور اگر حق بات میں تحریف (تبدیلی) یا اس کے اظہار سے اعراض و انکار کروگے تو خدا

تمہارے ہراس فعل سے باخبر ہے جسے تم انجام دیتے ہو۔''

نتیجہ یہ کہ نہ صرف اولاد، والدین اور بھائی کا رابطہ ورشتہ نفاذ حق اور قیام عدل وانصاف کی راہ میں مانع نہ بنے بلکہ نفاذ حق کی خاطر انسان اپنے ذاتی منافع اور فوائد کو بھی خاطر میں نہ لائے۔ یہ بات واضح اور ممکن ہے کہ اس قسم کے مسائل کے بارے میں مادی حکومتیں بھی کچھ نہ کچھ کہیں لیکن ان کے پاس نہ صرف حق کو نافذ کرنے کو ضمانت نہیں ہے بلکہ اگر غور کیا جائے تو اس بات کا درست مفہوم بھی ان کے لئے قابل تصور نہیں اسی دلیل کے پیش نظر ان کی بڑی بڑی شخصیات نے ہمیشہ سے عدل وانصاف اور قیام ونفاذ حق پر اپنے ذاتی منافع وفوائد کو ترجیح دی ہے۔

ایسی صورتحال میں یہاں ضوابط کے مقابلے میں روابط کا پلہ بھاری نظر آتا ہے اور بعض اوقات تو علی الاعلان متضاد عمل اور دوغلا پن واضح طور پر نظر آتا ہے مثلاً دو مشابہ صورتوں میں کہ ایک صورت میں ذاتی منافع ہیں اور دوسری صورت ذاتی منافع سے خالی ہے، ایسی صورتحال میں قوانین آسانی کے ساتھ ٹوٹ جاتے ہیں اور یہ بات ثابت اور عیاں ہوجاتی ہے کہ عدل وانصاف کا قیام اور حقوق بشر کی باتیں محض خالی خولی نعرے ہی ہیں اور ان کی عملی حیثیت کچھ بھی نہیں۔ احادیث میں بھی اسلامی حکومت پر حاکم ثقافت اسلامی کے بارے میں نہایت پر کشش اور دلچسپ نکات نظر آتے ہیں، لیکن ان سب کی شرح وتوضیح بہت طولانی ہوجائے گی لیکن پھر بھی یہاں بعض نکات کو اشارتاً ذکر کیا جاتا ہے۔

ا۔ جنگ انسانوں کی باہمی عداوت وخشونت کا نقطۂ عروج ہے، بعض اوقات یہ عداوت اور خشونت ان لوگوں کے مقابلے میں ضروری ہوجاتی ہے جو سوائے طاقت کی زبان کے کوئی دوسری زبان نہیں سمجھتے اس کے باوجود اسلام نے اپنی جنگی حکمت عملی میں انسانی مسائل کو باہمی عداوت کی صورت میں بھی ملحوظ رکھا ہے اور سخت ترین اور ضدی دشمنوں کے مقابلے میں میدان جنگ میں بھی اصول اخلاق کی اہمیت اور حرمت کو پیش نظر رکھا اور انھیں لازم قرار دیا ہے۔ جب اسلام کے سپاہی میدان جنگ کی طرف روانہ ہونے لگتے تو رسول اکرمؐ انھیں اپنے پاس بلا کر جنگی احکام کے بارے میں فرماتے تھے، آپؐ کا فرمان کچھ اس طرح کے کلمات پر مشتمل ہوتا تھا:

''سِيرُوا بِسْمِ اللهِ وَ بِاللهِ وَ فِى سَبِيلِ اللهِ وَ عَلَى مِلَّةِ رَسُولِ الله لاتَغُلُّوا، وَ لا تُمَثِّلُوا وَلا تَغْدِرُوا وَلا تَقْتَلُوا شَيْخاً فانِياً، وَ لا اِمْرَاَةً وَ لا تَقْطَعُوا شَجَراً اِلاَّ اَنْ تَضْطَرُّوا اِلَيها، وَ اَيُّما رَجُلٍ مِنْ اَدْنَى الْمُسْلِمِينَ اَوْ اَفْضَلِهِمْ نَظَرَ اِلى رَجُلٍ مِنَ الْمُشْرِكِينَ فَهُوَ جارٍ حَتّى يَسْمَعَ كَلامَ اللهِ فَاِنْ تَبِعَكُمْ فَاَخُوكُمْ فِى الدِّيْنِ وَ اِنْ اَبى فَاَبْلِغُوهُ مَأْمَنَهُ وَاسْتَعِينُوا بِاللهِ عَلَيْهِ''

''بنام خدا اور اس کی مدد سے اور اسی کی خاطر اور آئین وملت رسولؐ پر (رہتے ہوئے) روانہ ہوجاؤ۔ خیانت نہ کرنا، میدان جنگ کے مقتولین اور مجروحین کے اعضاء نہ کاٹنا، عہد وپیمان نہ توڑنا، بوڑھوں کو قتل نہ کرنا اور اسی طرح بچوں اور عورتوں کو تہہ تیغ کرنے سے پرہیز کرنا، بغیر ضرورت کے کسی درخت کو نہ کاٹنا اور جب کبھی کوئی

مسلمان چاہے وہ بلند مرتبہ ہو یا پست مرتبہ، مشرکین کے لشکر کے کسی فرد کو جان کی امان دے تو وہ مشرک امان میں ہے تا کہ وہ (مشرک) تمہاری زبان سے کلام خدا کو سنے۔ اگر کلام خدا سن کر وہ اسلام قبول کر لیتا ہے تو اس صورت میں وہ تمہارا دینی بھائی ہے اور اگر اسلام قبول نہیں کرتا تو اسے اس جگہ پہنچا دو جو اس کے لئے جائے امن ہو اور خدا سے دعا کرو کہ وہ مسلمان ہو جائے۔"[1]

آنحضرتؐ کا ایک اور فرمان یہ ہے:

"نَهَى رَسُولُ اللهِ اَنْ يُلْقَى السُّمُّ فِى بِلادِ الْمُشْرِكِينَ"

ترجمہ: "رسول اکرمؐ نے مشرکین کے شہروں کو زہر آلود کرنے سے منع فرمایا ہے۔"[2]

اس بناء پر زہریلی گیسوں، زہر آلود ادویات اور کیمیائی اسلحہ کا استعمال ممنوع ہے۔ علاوہ ازیں ایک اور فرمان جو امام جعفر صادقؑ نے رسول اکرمؐ سے نقل فرمایا ہے اور وہ یہ کہ

"ما بَيَّتَ رَسُولُ اللهِ صلى الله عليه وآله وسلم عَدُوّاً قَطُّ"

ترجمہ: "رسول اکرمؐ نے کبھی دشمن کے لشکر پر شبخون نہیں مارا۔"[3]

مزید ایک اور فرمان جو آنحضرتؐ سے صادر ہوا اور جس میں آپؐ کا خطاب حضرت علیؑ سے ہے، یہ تب کی بات ہے جب حضرت علیؑ عازم یمن تھے، آپؐ نے فرمایا:

"لا تُقاتِلَنَّ اَحداً حَتّى تَدْعُوهُ وَ اَيْمُ اللهِ لاَنْ يَهْدِىَ اللهُ عَلى يَدَيْكَ رَجُلاً خَيْرٌ لَكَ مِمّا طَلَعَتِ الشَّمْسُ وَغَرَبَتْ"

ترجمہ: "کسی کے ساتھ جنگ نہ کرو مگر اس وقت جب تم لوگ اس سے پہلے اسے قبول اسلام کی دعوت دے چکے ہو (اور جس قدر ممکن ہو اس (ان لوگوں) کی ہدایت کی خاطر جنگ و جدال سے ہاتھ اٹھائے رکھو) خدا کی قسم اگر خدا تعالیٰ تمہارے ذریعے کسی ایک شخص کو بھی صراط مستقیم کی طرف ہدایت کر دے تو یہ تمہارے لئے ہر اس چیز سے بہتر ہے جس پر سورج طلوع و غروب ہوتا ہے۔"[4]

---

[1] فروع کافی، ج۵ ص ۲۷، ۲۸، حدیث ۱

[2] فروع کافی، ج۵، ۲۸، حدیث ۲

[3] فروع کافی، ج۵، ۲۸، (باب وصیۃ رسول اللہ ۔۔۔۔۔۔ حدیث ۳)

[4] فروع کافی، ج۵، ۲۸، حدیث ۴

۲۔ مالیات کی جمع آوری میں اسلامی آداب

زکات اور بیت المال کے دوسرے اموال کی جمع آوری سے متعلق آداب کے بارے میں ہے کہ حضرت علیؑ جب کسی شخص کو زکات کا مال جمع کرنے کے لئے مامور فرماتے تو ایک تفصیلی فرمان اسے تحریر کر کے دیتے، درج ذیل عبارت اسی فرمان کا ایک حصہ ہے:

"اِنْطَلِقْ عَلٰى تَقْوَى اللهِ وَحْدَهُ لا شَرِيْكَ لَهُ، وَلا تُرَوِّعَنَّ مُسْلِماً، وَلاتَجْتازَنَّ عَلَيْهِ كارِهاً، وَلا تَأْخُذَنَّ مِنْهُ اَكْثَرَ مِنْ حَقِّ اللهِ فِي مالِهِ فَإِذا قَدِمْتَ عَلَى الْحَيِّ فَانْزِلْ بِمائِهِمْ مِنْ غَيْرِ اَنْ تُخالِطَ اَبْياتَهُمْ، ثُمَّ امْضِ اِلَيْهِمْ بِالسَّكِينَةِ وَالْوَقارِ حَتّٰى تَقُومَ بَيْنَهُمْ فَتُسَلِّمَ عَلَيْهِمْ وَلا تُخْدِجْ بِالتَّحِيَّةِ لَهُمْ ثُمَّ تَقُولَ:

عِبادَاللهِ! اَرْسَلَنِي اِلَيْكُمْ وَلِيُّ اللهِ وَخَلِيْفَتُهُ لِآخُذَ مِنْكُمْ حَقَّ اللهِ فِي اَمْوالِكُمْ فَهَلْ لِلّٰهِ فِي اَمْوالِكُمْ مَنْ حَقٍّ فَتُؤَدُّوهُ اِلٰى وَلِيِّهِ. فَاِنْ قالَ قائِلٌ: لا، فَلا تُراجِعْهُ، وَاِنْ اَنْعَمَ لَكَ مُنْعِمٌ فَانْطَلِقْ مَعَهُ مِنْ غَيْرِ اَنْ تُخِيْفَهُ اَوْ تُوَعِّدَهُ اَوْ تَعْسِفَهُ او تُرهقه"

''خداوند واحد کہ جس کا کوئی شریک نہیں اس کے تقوی اور بھروسے پر روانہ ہو جاؤ راستے میں کسی مسلمان کو مت ڈراؤ اور اس کی سرزمین سے ایسی حالت میں مت گذرو کہ وہ تم سے ناراض ہو اس کے اموال میں جو مال زکات ہے اس سے زیادہ اس سے نہ لو، جب تم کسی قبیلے کی آبادی کے قریب پہنچو تو اس آبادی کے اس حصے میں پڑاؤ ڈالو (یعنی قیام کرو) جہاں ان کا پانی کا گھاٹ ہے اور ان کے گھروں میں ہرگز داخل نہ ہو، بعد ازاں سکون و وقار کے ساتھ آبادی کے افراد کی طرف جاؤ یہاں تک کہ ان میں پہنچ جاؤ اور انھیں سلام کرو اور ان کے ساتھ اظہار محبت و سلام میں ہرگز کنجوسی نہ کرو اس کے بعد ان سے یوں کہو:

اے بندگان خدا! مجھے ولی خدا اور اس کے خلیفہ نے تمہاری طرف بھیجا ہے تا کہ میں تمہارے اموال میں سے خدا کا حق حاصل کروں، کیا تمہارے اموال میں کوئی حق موجود ہے کہ اسے تم لوگ اس کے نمائندے کے سپرد کرو؟ اگر کوئی یہ کہے کہ نہیں، تو پھر اس کی طرف دوبارہ رجوع نہ کرو! اور اگر کوئی شخص اثبات میں جواب دے تو اس کے ہمراہ جاؤ لیکن اسے ڈراؤ مت اور کوئی دھمکی وغیرہ نہ دو، اسی طرح اسے کسی مشکل کام کے کرنے کا پابند بھی نہ بناؤ۔''

اسی بیان کو جاری رکھتے ہوئے مزید تاکیدی انداز میں لوگوں کے اموال سے بیت المال کی زکوۃ حاصل کرنے کے عادلانہ

طریقے کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مال زکات کے حصول میں لوگوں کے خوب وبد اور پسندیدہ وغیرہ پسندیدہ مال کا لحاظ کیا جائے اور اس ضمن میں ان کے ساتھ نرمی برتی جائے اس قسم کے مسائل میں لوگوں کے ساتھ اس طرح کا بزرگانہ رویہ اپنانا حکومت اسلامی کی بہترین اقدار کا ایک واضح اور روشن نمونہ ہے۔[1]

ممکن ہے کوئی یہ تصور کرے کہ مالیات اسلامی میں اس قسم کا رویہ اپنانا حکومت کے کمزور ہونے کا باعث ہے اور ایسا رویہ اس چیز کے برعکس ہے جس کا ہم آج کل مشاہدہ کرتے ہیں (یعنی ایسا طرز عمل حکومت کے حق میں نہیں ہے) لیکن اس بات کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اس قسم کا دستور اور طرز عمل فقط اسی معاشرے میں نافذ ہوسکتا ہے جس کی تربیت اسلامی تمدن کے مطابق کی گئی ہو اور لوگوں (اہل معاشرہ) میں حقیقی احساس ذمہ داری بھی موجود ہو۔

آج بھی ہم بعض ایسے معاشروں کو جانتے ہیں جن میں ان پر حاکم ثقافت کے باعث اکثر لوگ رضا کارانہ طور پر مالیات (ٹیکس) ادا کرتے ہیں جبکہ کوئی انھیں مجبور بھی نہیں کرتا اور اس سے بہتر مثال خود ہمارے اپنے اسلامی معاشرے میں موجود ہے اور وہ یہ کہ ہزاروں دیندار افراد مراجع تقلید کے پاس آ کر اپنے اموال کا حساب کر کے اس کا خمس (پانچواں حصہ) رازداری کے ساتھ ان کے حوالے کر دیتے ہیں یہاں تک کہ چند کلو چینی، چائے اور دیگر چیزوں کو بھی حساب کئے بغیر نہیں چھوڑتے۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوتا ہے کہ لوگ اپنے آپ کو ذمہ دار سمجھتے ہیں بالکل ایسے ہی جس طرح لوگ زکات فطرہ کی ادائیگی کو اپنی شرعی ذمہ داری قرار دیتے ہیں جب اس قسم کی اسلامی ثقافت اور تمدن تمام مالیاتی معاملات پر حاکم ہو تو مذکورہ بالا اعتراض کا جواب واضح ہو جاتا ہے۔

۳۔ ہر چیز میں میانہ روی

بیت المال سے متعلق اموال، جو امانت الٰہی ہیں اور بروز قیامت جن کا سخت حساب ہوگا، کے خرچ میں غیر معمولی سختی اور درست حساب وکتاب تمدن اسلامی کی ایک اور خصوصیت ہے اور اس کا واضح مصداق اور روشن مثال حضرت امیر المؤمنینؑ اور ان کے بھائی حضرت عقیل کے درمیان پیش آنے والا ماجرا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آپؑ اپنے بھائی کی ناداری کے باوجود دوسرے مسلمانوں اور اپنے بھائی کے درمیان ذرا سی فوقیت اور امتیاز کے قائل بھی نہ ہوئے یہاں تک کہ آپؑ نے لوہے کی گرم سلاخ کو عقیل کے ہاتھ کے نزدیک کیا اور انھیں اس طرح متنبہ کر کے عذاب آخرت سے ڈرایا، وہ عذاب آخرت جو خلاف انصاف صورت میں لینے اور دینے والے دونوں کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔

اس ضمن میں اسلامی رہنماؤں اور پیشواؤں کی سخت گیری اور دقت کی مثالیں بکثرت موجود ہیں جن کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی، جن میں سے ایک جناب امیر المؤمنینؑ کا وہ فرمان ہے جسے آپؑ نے حکومت اسلامی کے مکتوبات لکھنے والوں کے کو دیا اور فرمایا:

"اَدِقُّوا اَقْلامَکُمْ وَ قارِبُوا بَیْنَ سُطُورِکُمْ وَ احْذِفُوا عَنّی فَضُولَکُمْ، واقْصُدُوا قَصْدَ

---

[1] نہج البلاغہ، حصہ مکتوبات، مکتوب، ۲۵۔

"الْمَعانی، وَاِیّاکُمْ وَالاِکْثارَ، فَاِنَّ اَمْوالَ الْمُسْلِمینَ لا تَحْمِلُ الاِضْرارَ":

اپنے قلم کی نوک تیز رکھو (تا کہ اس طرح تم الفاظ کو باریک سے باریک تر لکھ سکو) اور سطروں کے درمیان فاصلے کو کم رکھو اور اضافی اور غیر ضروری مطالب کو حذف کر کے اصل مطلب کی بات کو تحریر کرو اور لفاظی اور غیر مفید الفاظ زیادہ لکھنے سے پرہیز کرو چونکہ مسلمانوں کے اموال اس ضرر ونقصان کو برداشت نہیں کر سکتے۔[1]

امام جعفر صادق -نے اس مطلب کو کلی طور پر یوں بیان فرمایا ہے:

"اِنَّ الْقَصْدَ اَمْر یُحِبُّهُ اللهُ عَزَّوَجَلَّ وَ اِنَّ السَّرَفَ یُبْغِضُهُ حَتّٰی طَرْحِكَ النَّواةَ فَاِنَّها تَصْلَحُ لِشَیْئٍ وَحَتّٰی صَبِّكَ فَضْلَ شَرابِكَ"

میان روی اور صرفہ جوئی ایسا کام ہے جسے خدا تعالیٰ پسند کرتا ہے اور اسراف وفضول خرچی خدا کے نزدیک ناپسندیدہ ہے یہاں تک کہ کھجور کی گٹھلی کو بھی پھینک دینا درست نہیں اور وہ اس لئے کہ وہ بھی بہر حال کارآمد ہے یہی نہیں بلکہ پی کر بچے ہوئے پانی کو گرا دینا بھی اسراف ہے۔[2]

لہٰذا آج یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ کوئی چیز پھینک دینے کے قابل نہیں ہے یعنی فضول اور ضائع شدہ مصنوعات سے بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، یہاں تک کہ گندے اور ناپاک پانی کو بھی صاف کر کے اسے زراعت میں استعمال کرتے ہیں جس کے نتیجے میں پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے اور کوڑا کرکٹ جمع کر کے اس سے مختلف مصنوعات حاصل کرتے ہیں۔ ہم اس مطلب کو صحیفہ سجادیہ میں موجود امام علی بن الحسین -کی ایک دعا کے ایک نہایت پر مغز ومعنی جملے کے ساتھ ختم کرتے ہیں۔ امام علی بن الحسین- بارگاہ خدا میں عرض کرتے ہیں:

"اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَآلِهٖ وَاحْجُبْنی عَنِ السَّرَفِ وَالاِزْدِیادِ، وَ قَوِّمْنی بِالْبَذْلِ وَالاِقْتِصادِ، وَعَلِّمْنی حُسْنَ التَّقْدیرِ، وَاقْبِضْنی بِلُطْفِكَ عَنِ التَّبْذیرِ"

''خداوندا محمدؐ اور ان کی آل پاکؑ پر درود بھیج، اور مجھے اسراف وفضول خرچی سے باز رکھ اور عطا و بخشش اور میانہ روی پر ثابت قدم رکھ اور مجھے حسن تقدیر (زندگی میں درست اندازہ گیری کے آداب سے) مزین فرما، اور اپنے لطف وکرم کے طفیل مجھے تبذیر اور بے جا خرچ سے روکے رکھ۔''[3]

---

[1] خصال، ج ا (باب الخمسہ) علامہ مجلسی نے بھی بحار الانوار میں اس حدیث کو بحار کی جلد ۷۳، صفحہ ۴۹ اور جلد ۱۰۱، صفحہ ۲۷۵ پر خصال سے نقل کیا ہے۔

[2] بحار الانوار، ج ۶۸ ص ۳۴۶، حدیث ۱۰

[3] صحیفہ سجادیہ دعا ۳۰ (دعائه فی المعونة علی قضاء الدین)

۴۔ بزرگی کا معیار فضیلت ہے نہ سن وسال

عتاب بن اسید جو ایک ذہین اور بہادر جوان تھا، رسول اکرمؐ نے اسے مکہ کی حکمرانی کے لئے منتخب فرمایا، آپؐ نے اسے جو فرمان دیا اس میں چند ایسے جملے تحریر فرمائے جو نفاذ حکومت سے متعلق مسائل میں اسلام کی بلند پایہ ثقافت کر بیان کرتے ہیں۔ اس فرمان کا کچھ حصہ ذکر کیا جاتا ہے:

"فَهُوَ لَنا خادِمٌ وَ فِي اللهِ اَخ وَلاَوْلِيائِنا مُوالٍ، وَلِاَعْدائنا مُعادٍ، وَهُوَلَكُمْ سَماء ظَلِيلَة، وَاَرْض زَكِيعَة، وَشمس مُضِيئَة وَ لايَحْتَجَّ مُحْتَجّ مِنْكُمْ فى مُخالَفتِهِ بِصِغَرِ سِنّه، فَلَيْس الاَ كْبَرُ هوَ الاَفْضَلَ، بَلْ الاَفْضَلُ هُوَ الاَ كْبَرُ!"

ترجمہ: ''وہ ہمارا خدمتگار اور راہ خدا میں ہمارا عزیز بھائی ہے جو ہمارے دوستوں کا دوست اور دشمنوں کا دشمن اور مخالف ہے وہ تمہارے لئے ایک سایہ فگن آسمان اور پرثمر زمین اور چمکتا ہوا سورج ہے، ......تم لوگوں میں سے کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ اس کی کمسنی کے باعث اس سے مخالفت کرو کیونکہ سن رسیدہ افراد ہمیشہ ہی افضل نہیں ہوتے بلکہ وہی شخص باعظمت شمار ہوتا ہے جو افضل ہو!''۔[1]

۵۔ عوام سے شفقت ورأفت کا سلوک

حضرت امیرالمؤمنینؑ کا جناب مالک اشتر کو دیا گیا مشہور ومعروف فرمان جو درحقیقت حکومت کرنے کا بہترین اور اعلیٰ ترین منشور ہے اور گذشت زمان کی کہنگی سے محفوظ اور ہرگز قابل فراموش نہیں اس فرمان میں حضرت امیرؑ مصر کے عام لوگوں کے ساتھ جناب مالک اشتر کو نرمی اور شفقت سے پیش آنے کی یاددہانی کراتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وَ اَشْعِرْ قَلْبِكَ الرَّحْمَةَ لِلرَّعِيَّةُ وَ الْمَحَبَّةَ لَهُمْ وَ الُطفِ بِهِم، وَ لاتَكُونَنَّ عَلَيْهِمْ سَبُعاً ضارِياً تَغْتَنِمُ اَكْلَهُمْ فَاِنَّهُمْ صِنْفان: اِمّا اَخٌ لَكَ فِي الدّيْن اَوْ نَظيرٌ لَكَ فى الْخَلْقِ"

''اپنے دل کو اپنی رعایا اور ملت کی نسبت رحم ولطف اور محبت سے بھر لینا اور ان کی نسبت حیوان درندہ ہرگز نہ بننا جو انھیں چٹ کر جانے کو غنیمت خیال کرتا ہو، اس لئے کہ تمہاری رعایا دو گروہوں پر مشتمل ہے یا تمہارے دینی بھائی ہیں یا تمہاری طرح کے انسان!''[2]

---

[1] بحارالانوار، ج۲۱، ص ۱۲۳

[2] نہج البلاغہ، مکتوب، ۵۳

درحقیقت ان چند مختصر جملوں میں اس ثقافت کی ترجمانی کی گئی ہے جو مسلمانوں اور غیر مسلموں کے ساتھ برقرار کئے جانے والے روابط پر حاکم ہے۔

٦۔عوام الناس پر بھروسہ اور اعتماد

جناب امیرؑ اس فرمان کے ایک اور حصے میں انھیں (مالک اشتر کو) حکم دیتے ہیں کہ وہ ہر حال اور ہر مسئلے میں معاشرے کے محنت کش عوام پر بھروسہ کریں اور خود غرض اور چند مالدار افراد جن کی حکومت سے توقعات وابستہ ہوتی ہیں، پر ہرگز اعتماد نہ کریں اور ہمیشہ پہلے گروہ (غریب و نادار افراد) کی رضائے خاطر کا احساس کریں نہ کہ امراء اور اہل ثروت افراد کی مرضی کا۔آپؑ فرماتے ہیں:

"وَلْيَكُنْ اَحَبَّ الاُمُورِ اِلَيْكَ اَوْسَطُها فِى الْحَقِّ وَ اَعَمُّها فِى الْعَدْلِ وَ اَجْمَعُها لِرِضَى الرَّعِيَّةِ، فَاِنَّ سُخْطَ الْعامَّةِ يُجْحِفُ بِرِضَى الْخاصَّةِ، وَ اِنَّ سُخْطَ الْخاصَّةِ يُغْتَفَرُ مَعَ رِضَى الْعامَّةِ، وَلَيْسَ اَحَدٌ مِنَ الرَّعِيَّةِ اَثْقَلُ عَلَى الْوالِى مَؤُونَةً فِى الرَّخاءِ وَ اَقَلُّ مَعُونَةً لَهُ فِى الْبَلاءِ وَ اَكْرَهُ لِلاِنْصافِ وَ اَسْأَلُ بِالاِلْحافِ وَ اَقَلُّ شُكْراً عِنْدَ الاِعْطاءِ وَ اَبْطَأُ عُذْراً عِنْدَ الْمَنْعِ، وَ اَضْعَفُ صَبْراً عِنْدَ مُلِمّاتِ الدَّهْرِ
مِنْ اَهْلِ الْخاصَّةِ، وَ اِنَّما عِمادُ الدّينِ وَ جِماعُ الْمُسْلِمينَ وَ الْعُدَّةُ لِلاَعْداءِ، اَلْعامَّةُ مِنَ الاُمَّةِ، فَلْيَكُنْ صِغْوُكَ لَهُمْ وَ مَيْلُكَ مَعَهُمْ":

"تمہارے نزدیک محبوب ترین کام وہ ہونے چاہئیں جو حق وعدالت اور عوام کی فلاح اور رضائے خاطر کے مطابق ہوں، چونکہ عوام کا غضب خواص (دولتمندوں) کی اقلیت کی رضائے خاطر اور خوشنودی کو بے اثر بنا دیتا ہے، لیکن خواص کی ناراضگی کی عوام کی رضایت اور خوشنودی کے ذریعے تلافی ممکن ہے (یہ بھی جان لو کہ) رعایا میں سے خواص سے زیادہ، خوشحالی اور صلح کے زمانے میں کوئی ایسا نہیں جو حاکم پر بوجھ بننے والا، مصیبت کے وقت امداد سے کنی کترانے والا، انصاف کو ناپسند کرنے والا، طلب کے وقت پیچھے پڑ جانے والا، بخشش اور عطا پر کم شکر کرنے والا، محروم ہو جانے کی صورت میں مشکل سے عذر سننے والا اور مصائب زمانہ پر بےصبری کا مظاہرہ کرنے والا ہو!

درنتیجہ خواص کے اخراجات اور توقعات عوام کی نسبت کہیں زیادہ جبکہ ان کی خدمات اور امداد بہت کم ہوتی ہیں چونکہ دین اور اجتماع مسلمین کا مضبوط سہارا اور دشمن کے مقابلے میں سامان دفاع یہی عوام ہوتے ہیں۔ لہٰذا تمہاری توجہ کا مرکز انھیں کی ضروریات اور خواہشات کو ہونا چاہیے اسی طرح ضروری ہے کہ تمہارا میلان

بھی ان ہی لوگوں کی طرف ہو۔''[۱]

اسی طرح اس فرمان کے ایک اور حصے میں حکم دیتے ہیں کہ ہمیشہ عیب جو اور حاسد لوگوں کو جن کا کام ہی لوگوں کے عیوب تلاش کرنا ہوتا ہے، اپنے آپ سے دور رکھو! اس ضمن میں آپؑ یوں فرماتے ہیں:

"وَلْيَكُنْ اَبْعَدُ رَعِيَّتِكَ مِنْكَ وَ اَشْنأُهُمْ عِنْدَكَ، اَطْلَبُهُمْ لِمَعايِبِ النّاسِ، فَإِنَّ فِي النّاسِ عُيُوباً اَلْوالِي اَحَقُّ مَنْ سَتَرها، فَلا تَكْشِفَنَّ عَمّا غابَ عَنْكَ مِنْها، فَإِنَّما عَلَيْكَ تَطْهيرَ ما ظَهَرَ لَكَ وَاللهُ يَحْكُمُ عَلى ما غابَ عَنْكَ!"

''ان لوگوں کو جو لوگوں کے عیوب کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں انھیں تم سے دور رہنا چاہیے اس لئے کہ لوگوں میں موجود عیوب کی پردہ پوشی کا سب سے زیادہ حقدار ان کا حاکم ہی ہوتا ہے، لوگوں کے مخفی عیوب سے آگاہ ہونے کی ہرگز کوشش نہ کرنا، تمہاری ذمہ داری فقط یہی ہے کہ تم ان کے ظاہر کی اصلاح کرو اور جو کچھ تم سے مخفی ہے خدا تعالیٰ اس کے بارے میں حکم (اور اس کی باز پرس) کرے گا۔[۲]

۷۔ اہل تجربہ و دانش کے ساتھ دائمی مشاورت

دانشوروں اور ہر شعبے کے تجربہ کار افراد کے ساتھ تعاون کرنا اور ان سے مشورہ لینا، ہر حکومتی نظام پر حاکم اسلامی ثقافت کا ایک اور اہم نکتہ ہے۔ جناب مالک اشتر کو دیئے گئے اسی فرمان میں یہ جملات بھی بیان کئے گئے ہیں:

"وَ اَكْثِرْ مُدارَسَةَ الْعُلَماءِ وَ مُناقَشَةَ الْحُكَماءِ فِي تَثْبيتِ ما صَلَحَ عَلَيْهِ اَمْرُ بِلادِكَ وَ اِقامَةِ ما اسْتَقامَ بِهِ النّاسُ قَبْلَكَ."

ترجمہ: اہل علم و دانش کے ساتھ زیادہ سے زیادہ گفت و شنید کرو اور اہل عقل و حکمت کے ساتھ اپنے شہروں اور ملک کے اصلاحی معاملات کو مستحکم کرنے اور ان چیزوں کے قائم کرنے میں کہ جن کے باعث سابقہ لوگوں کے احوال مضبوط رہے تھے، بات چیت کرتے رہو۔[۳]

اس بیان سے واضح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی حاکموں اور فرمانرواؤں کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہمیشہ مشیروں یا مختلف سیاسی اور معاشرتی مسائل کے لئے مشیروں کے مختلف گروہوں کے ساتھ باہمی رابطہ استوار رکھیں اور ان کے ساتھ مشورے کے بغیر اہم

---

[۱] نہج البلاغہ، مکتوب، ۵۳

[۲] نہج البلاغہ، مکتوب، ۵۳

[۳] نہج البلاغہ، مکتوب، ۵۳

امور کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہ کریں۔

۸۔عدالتی نظام (عدلیہ) پرحکم فرما ثقافت

عہد نامہ مالک اشتر میں قضات (قاضی صاحبان اور جج حضرات) کے جو اوصاف بیان کئے گئے ہیں ان سے نہایت اہم نکات ملتے ہیں یقیناً کسی (غیر اسلامی) مکتب میں اس حد تک باریک بینی سے کام نہیں لایا گیا۔ یہ بیان عدالتی نظام پر حاکم تمدن کو واضح اور روشن کرتا ہے۔ حضرت جناب امیر المؤمنینؑ اس ضمن میں یوں فرماتے ہیں:

"ثُمَّ اخْتَرْ لِلْحُكْمِ بَيْنَ النّاسِ اَفْضَلَ رَعِيَّتِكَ فِى نَفْسِكَ مِمَّنْ لا تَضِيقُ بِهِ الأُمُورُ، وَ لا تُمَحِّكُهُ الْخُصُومُ وَلا يَتَمادى فِى الزَّلَّةِ، وَلا يَحصَرُ مِنَ الْفَىْ ءِ اِلَى الْحَقِّ اِذا عَرَفَهُ، وَلا تُشْرِفُ نَفْسَهُ عَلى طَمَعٍ وَلا يَكْتَفِى بِاَدْنىٰ فَهْمٍ دُونَ اَقْصاهُ، وَ اَوْقَفَهُمْ فِى الشُّبَهاتِ وَ آخَذَهُمْ بِالْحُجَجِ، وَ اَقَلَّهُمْ تَبَرُّماً بِمُراجَعَةِ الْخَصْمِ، وَ اَصْبَرَهُمْ عَلى تَكَشُّفِ الأُمُورِ وَ اَصْرَمَهُمْ عِنْدَ اِتِّضاحِ الْحُكْمِ، مِمَّنْ لا يَزْدَهِيهِ اِطْراءٌ، وَلا يَسْتَمِيلُهُ اِغْراءٌ وَ اُولئِكَ قَلِيلٌ!"

بعد ازاں لوگوں میں سے افضل اور بہترین شخص کو لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے لئے انتخاب کرو (غور فرمائیں کہ یہاں قاضی، جج کے لئے بارہ صفات بیان کی گئی ہیں اور ان صفات کا حامل شخص ہی مثالی قاضی ہے۔ قضاوت کے منصب پر ایسے شخص کو فائز ہونا چاہیے کہ لوگوں کا پے درپے اس کے پاس آنا اس کے رنج وملال اور دل تنگی کا باعث نہ ہو اور منافق افراد سے ملنا اس کے غضب اور بداخلاقی کا سبب نہ بنے وہ ایسا شخص ہو جو اپنی غلطیاں تسلیم کرنے کی بجائے ان کے درست ہونے پر ڈٹ جانے والا نہ ہو اور جب کسی معاملے میں حق اس پر ظاہر اور آشکارا ہو جائے تو اس کے مطابق فیصلہ صادر کرنا اس کے لئے آسان ہو۔ اس کا دل حرص وطمع (لالچ) سے پاک ہونا چاہیے، اسے معاملہ فہمی میں تھوڑی سی تحقیق کو کافی نہیں قرار دینا چاہیے (بلکہ پوری تحقیق اس کے لئے ضروری ہے)۔ قاضی کو ان افراد میں سے ہونا چاہیے جو شبہات پیش آنے کی صورت میں سب سے زیادہ محتاط اور سب سے بڑھ کر دلیل اور حجت کے تابع ہوتے ہیں۔ شکایت کرنے والوں کے بار بار آنے سے وہ کبیدہ خاطر اور ملول نہیں ہوتا اور حقائق وواقعیات کی تہہ تک پہنچنے میں ہر ایک سے زیادہ صابر ہوتا ہے، لیکن کشف حقیقت ہونے کی صورت میں فیصلہ صادر کرنے اور ٹال مٹول نہیں کرتا، شکایت کرنے والوں کی باہمی خصومت اور ناچاقی کو برطرف کرنے میں ہر ایک سے بڑھ کر قاطع اور اٹل (فیصلہ کرنے والا ہوتا ہے) وہ ان افراد میں سے ہوتا ہے جو تعریف کرنے والوں کی تعریف سے متاثر نہیں ہوتے اور نہ ہی لوگوں کا حد سے زیادہ احترام اسے احترام کرنے والوں کی طرف مائل کر سکتا ہے، لیکن جان لو کہ ان تمام صفات کے حامل افراد بہت ہی کم ہیں۔ (نہج البلاغہ، مکتوب ۵۳)

عوام کے ساتھ براہ راست رابطہ

لوگوں کے ساتھ براہ راست رابطہ اور رابطہ بھی ایسا جو واقعی اور حقیقی ہو نہ کہ تکلفات پر مبنی اور ظاہری، ایک اور اہم نکتہ ہے جس کی اساس پر یہ فرمان جاری ہوا ہے۔ اسی فرمان میں حضرت امیر المؤمنینؑ ثقافت وتمدن اسلامی سے آشنا مالک اشتر کو بعنوان حاکم مصر اس طرح حکم دیتے ہیں:

"وَاجْعَلْ لِذَوِی الْحاجاتِ مِنْكَ قِسماً تُفَرِّغُ لَهُمْ فيه شَخْصَكَ وَ تَجْلِسُ لَهُمْ مَجْلِساً عامّاً فَتَتَواضَعُ فيه لِلّٰهِ الَّذی خَلَقَكَ و ـ تُقْعِدَ عَنْهُمْ جُنْدَكَ وَ اَعْوانَكَ مِنْ اَحْراسِكَ وَ شُرَطِكَ حَتّٰی يُكَلِّمَكَ مُتَكَلِّمُهُمْ غَيْرَ مُتَتَعْتِعٍ فَاِنّی سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صلی الله علیه وآله وسلم يَقُولُ فی غَيْرِ مَوْطِنٍ: "لَنْ تُقَدَّسَ اُمَّة لايُؤخَذُ لِلضَّعيفِ فيها حَقُّهُ مِنَ الْقَوِیِّ غَيْرَ مُتَتَعْتِعٍ":

''ضرورت مند افراد کے لئے ایک وقت معین کرو تا کہ بذات خود ان کی ضروریات پوری کرسکو، ان کے لئے ایک عمومی اور اجتماعی نشست کا انتظام کر کے ان کے ساتھ بیٹھو اور وہ خدا جو تمہارا خالق ہے اس کی رضا کی خاطر ان کے ساتھ تواضع وانکساری کے ساتھ پیش آؤ، (اُن کے اوپر گھر کے دروازے کھول دو) اور افراد حکومت، محافظین اور سپاہیوں کو اپنے اطراف سے دور کرو تا کہ ہر کوئی خوف ولکنت کے بغیر تمہیں اپنے مافی الضمیر سے آگاہ کر سکے۔ کیونکہ میں نے کئی بار رسول اکرمؐ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ آپؐ فرماتے تھے: ہر وہ ملت جو کمزوروں کے حقوق کو طاقتور افراد سے علی الاعلان نہیں لے پاتی ایسی ملت ہرگز پاک و پاکیزہ نہیں ہوسکتی۔''[1]

یہ بات تجربے سے بھی ثابت ہے کہ اگر حکمرانوں اور ان کی رعایا کے درمیان براہ راست تعلق اور ربط نہ ہو تو یہ بات حکمرانوں کی ماحول سے ناآگاہی کا سبب بنتی ہے اور عوام بھی اپنے حقوق حاصل کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ علاوہ ازیں لوگوں کے ساتھ براہ راست رابطہ حکمرانوں اور عوام کے درمیان محبت اور الفت کو روز افزوں ترقی دیتا ہے اور ان کے درمیان محبت کے رشتے کو مضبوط ومحکم بناتا ہے۔

---

[1] نہج البلاغہ، مکتوب، ۵۳

۱۰۔محروم لوگوں کے حال پر بھرپور توجہ

ایک اور اہم نکتہ (جس پر حکومت اسلامی کے پر حاکم ثقافت وتمدن کی بحث کو یہاں ہم ختم کریں گے اگر چہ جن مطالب کو ذکر نہیں کیا گیا ان کی تعداد بہت زیادہ ہے) وہ غیر معمولی اہمیت ہے جو ثقافت اسلامی میں معاشرے کے محروم طبقوں کو دی گئی ہے۔ مالک اشتر کو دیئے گئے اس فرمان میں، جب حضرت امیرالمؤمنینؑ اس مقام پر پہنچتے ہیں تو آپؑ کا لہجہ یکدم مکمل طور پر تبدیل ہو جاتا ہے، آپ فرماتے ہیں:

"ثُمَّ اللهَ اللهَ فِي الطَّبَقَةِ السُّفْلى مِنَ الَّذينَ لا حيلَةَ لَهُمْ مِنَ الْمَساكينِ وَالْمُحتاجينَ وَ اَهْلِ الْبُؤْسى وَالزَّمْنى فَاِنَّ فی هذِهِ الطَّبَقَةِ قانِعاً وَمُعْتَراً وَاحْفَظْ لِلّٰهِ ما اسْتَحْفَظَكَ مِنَ حَقِّهِ فيهِمْ، وَاجْعَلْ لَهُمْ قِسْماً مِنْ بَيْتِ مالِكَ، وَ قِسْماً مِنْ غَلّاتِ صَوافی الأسلامِ فی كُلِّ بَلَدٍ، فَاِنَّ لَلأَقْصی مِنْهُمْ مِثْلَ الَّذی لِلأدنی، وَكُلٌّ قَدِ اسْتُرْعيتَ حَقَّهُ فَلا يَشْغَلَنَّكَ عَنْهُمْ بَطَر، فَاِنَّكَ لا تُعْذَرُ بِتَضْييعِكَ التّافِهَ، لِاِحْكامِكَ الْكَثيرَ الْمُهِمَّ فَلا تُشْخِصْ هَمَّكَ عَنْهُمْ وَلا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لَهُمْ":

"پھر اللہ سے ڈرتے رہو، اللہ سے ڈرتے رہو، عوام کے پسماندہ طبقے کے بارے میں جن کا کوئی سہارا اور آسرا نہیں، یہ طبقہ ان لوگوں کا ہے جو فقراء، مساکین، محتاج اور معذور ہیں ان میں سے کچھ تو ہاتھ پھیلا کر مانگنے والے ہوتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی سوال کے بغیر تم نے مدد کرنی ہے، خدا تعالیٰ نے ان کے بارے میں جو حکم دیا ہے تمہیں چاہیے کہ اس پر عمل کرو، ان کے لئے بیت المال سے ایک حصہ مقرر کرو اور انھیں ایک حصہ ہر شہر کے اس غلے میں سے دو جو اسلامی غنیمت کی زمینوں سے حاصل شدہ ہو۔ دور والوں کا بھی وہی حصہ ہے جو نزدیک والوں کا ان سب کے حقوق کی رعایت کرنا لازم ہے، تم ان سب کے حقوق کی حفاظت کے ذمہ دار بنائے گئے ہو۔ لہٰذا حکومت اور دولت کا نشہ کہیں تمہیں ان سے غافل نہ کر دے اور جان لو کہ وہ بہت سارے اہم کام جنھیں تم انجام دیتے ہو ان کی وجہ سے اگر ان لوگوں کے چھوٹے چھوٹے امور کو نپٹا نہ سکو اور ان پر توجہ نہ دے سکو تو قطعاً تمہارا عذر قابل قبول نہیں، اپنے دل کو ان لوگوں سے ہرگز نہ ہٹاؤ اور انھیں دیکھ کر تمہاری تیوری نہ چڑھ جائے۔"[1]

---

[1] نہج البلاغہ، مکتوب، ۵۳

اس گروہ کے بارے میں حضرت امیر المؤمنینؑ کی بے حد و بے نظیر تاکید اسلام کی اجتماعی عدالت اور انسانی حقوق کی حفاظت اور پاسداری کی بہترین علامت ہے، خاص طور پر محروم طبقے کو مرکز توجہ بنانا اسلام ہی کا خاصہ ہے اور اپنے زمانۂ خلافت میں آپؑ کا یہ عمل اس دعویٰ کی بہترین دلیل ہے۔

خلاصہ

مذکورہ بالا بیان سے اسلام کے نظام نفاذ پر حاکم اسلامی ثقافت کے بہت سے گوشوں میں سے صرف ایک گوشہ کو ظاہر کرتا ہے جو اس ثقافت کی کئی جہات میں سے مرکز بحث و تحقیق بننے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اگر اس میں غور و فکر کیا جائے تو یہ جہت عوامی اور الٰہی حکومت کے کئی اور گوشوں اور جہات سے پردہ اٹھاتی ہے، اسی طرح اس جہت کے مطالعے سے اس حقیقت کا سراغ بھی لگایا جا سکتا ہے کہ آج جو حکومت، حکومت اسلامی کے عنوان سے معروف ہے ابھی تک اصلی اور حقیقی اسلامی حکومت سے کافی دور ہے، اگرچہ وہ اسی مقصد اور ہدف (واقعی اسلامی حکومت) کی طرف گامزن ہے۔

انتظامیہ کے سربراہ کے انتخاب کا طریقہ

آج کی دنیا میں انتظامی سربراہ اور دوسرے اعلیٰ سطح کے ذمہ دار افراد کے انتخاب کے کئی ایک طریقے ہیں، کبھی تو انھیں بلاواسطہ اور کبھی بالواسطہ انتخاب کیا جاتا ہے اور کبھی اعلیٰ درجے کے مسؤل انھیں اس ذمہ داری کے لئے منصوب کرتے ہیں۔ رسول اکرمؐ کی مبارک زندگی میں اس منصب کے لئے تقرری خدا تعالیٰ کی طرف سے تشکیل پاتی نظر آتی ہے اور کبھی اسے خود رسول اکرمؐ انجام دیتے تھے۔ خدا تعالیٰ کی طرف سے رسول اکرمؐ کا اس منصب کے لئے منصوب ومقرر ہونا درج ذیل آیات سے بخوبی واضح ہے۔ مثلاً:

اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ

یعنی: ''رسول اکرمؐ مومنین کی نسبت ان سے زیادہ ان (کے نفوس) پر حق رکھتے ہیں۔''[۱]

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ

یعنی: ''اے ایمان لانے والو! اللہ کی اطاعت اور رسولؐ اور اولی الامر کی اطاعت کرو۔''[۲]

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۝۶۵

یعنی: ''تمہارے پروردگار کی قسم! یہ لوگ اس وقت تک ایمان والے نہیں ہوں گے جب تک تمہیں اپنے اختلافات ونزاعات میں اپنا حَکَم (فیصلہ کرنے والا) قرار نہیں دیتے اور پھر تمہاری داوری اور حکمیت (فیصلے) سے دلی رنجش بھی محسوس نہیں کرتے (یعنی خوشی خوشی تمہارے فیصلے کو قبول کر لیتے ہیں) اور مکمل طور پر سر تسلیم خم کر لیتے ہیں۔''[۳]

''فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ''

یعنی: ''وہ لوگ جو اس (رسول اکرمؐ) کے فرمان کی مخالفت کرتے ہیں، انھیں اس بات سے ڈرنا چاہیے کہ وہ

---

[۱] احزاب۔۶

[۲] نساء۔۹۵

[۳] نساء۔۶۵

کسی فتنے یا دردناک عذاب میں مبتلا نہ ہو جائیں۔" [1]

واضح ہے کہ اطاعت مطلق، جیسا کہ مذکورہ بالا آیات میں بیان ہوا ہے اور آنحضرتؐ کی اسلامی معاشرے پر حاکم کی حیثیت سے تقرری آپس میں لازم وملزوم ہیں (یعنی اطاعت مطلق حاکمیت کے بغیر ممکن نہیں) قرآن مجید کی بعض دوسری آیات بھی اسی مطلب کی تائید کرتی ہیں۔ پیشوایان معصوم اور ائمہ ھدیٰ علیھم السلام کے بارے میں بھی شیعی عقیدہ یہی ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے بذریعۂ رسول اکرمؐ منتخب اور منصوب کئے گئے ہیں۔

سورۂ مائدہ کی آیت

"يَاأَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ..." (مائدہ/٦٧)

جو واقعۂ غدیر کے بارے میں نازل ہوئی اور ہم نے تفسیر نمونہ میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے اور متعدد روایات جو تمام اسلامی مذاہب کے طرق سے منقول ہیں اور جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ یہ آیت حضرت علیؑ کو بحیثیت خلیفہ وجانشین رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معین ومنصوب کرنے کے بارے میں نازل ہوئی (اس کی شرح وتوضیح پیام قرآن کی جلد نہم میں ذکر کی گئی ہے)۔

اسی طرح رسول اکرمؐ سے ان کے بارہ خلفاء کے بارے میں منقول روایات اور وہ روایات جو ائمہ معصومین - سے وارد ہوئی ہیں (یعنی وہ روایات جن میں ہر امام نے اپنے بعد والے امام کا تعارف کرایا ہے)، اور اس کی وضاحت بھی پیام قرآن جلد نہم میں ہو چکی ہے سب اس دعویٰ کی واضح دلیل ہیں اور انھیں یہاں دوبارہ ذکر کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

یہ سب کچھ رسول اکرمؐ اور ائمہ معصومین - سے متعلق ہے لیکن وہ لوگ جن کا تعلق اس زمانے کے بعد سے ہے ان کا تقرر ممکن ہے کہ ولی فقیہ یا مجتہد جامع الشرائط کی صوابدید پر ہو چونکہ ولایت فقیہ کی بحث کے مطابق، کہ بعد ازاں اس کی طرف اشارہ کیا جائے گا، ائمہ معصومینؑ کے جانشین صالح اور ضروری شرائط کے حامل فقہاء ہیں، البتہ حاکم شرع اور فقیہ جامع الشرائط اس بات کے ذمہ دار ہیں کہ وہ ملت اسلامیہ سے متعلق تمام سیاسی اور اجتماعی مسائل میں (اُمت اسلام کی) مصلحت کو پیش نظر رکھیں اور ملت اسلامیہ کی مصلحت بلا شک وتردید اس چیز میں ہے کہ نظام حکومت کے اعلیٰ عہدیداروں کو عوام کی شرکت ومشورت اور ان کی رائے کے ذریعے منتخب ہونا چاہیے تاکہ وہ ایک دوسرے کا نہایت دوستانہ انداز میں ہاتھ بٹا سکیں اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب عوام انھیں بالواسطہ یا بلاواسطہ منتخب کرنے میں شریک ہوں، بالخصوص جیسا کہ ہمارے زمانے میں عوام کی حکومتوں میں شرکت تمام یا اکثر معاشروں کی تقریباً مشترکہ ثقافت ہے۔

بنابریں سب سے پہلے اس اہم منصب کی صلاحیت رکھنے والے والے افراد کا تعارف عوام سے کراتے ہیں دیندار وصالح اہل نظر افراد ان کی تصدیق کرتے ہیں جن میں اس ذمہ داری کو پورا کرنے کی لازمی شرائط پائی جاتی ہیں اور پھر اس کے بعد ایک صحیح وسالم انتخابی لائحہ عمل کے مطابق لوگ ایک بہتر امیدوار کے چناؤ کے لئے ووٹ ڈالتے ہیں اور یقینی طور پر وہی شخص منتخب ہوتا ہے جسے عوام کی

---

[1] نور، ٦٣۔ امرہمیں ضمیر بعض مفسرین کی رائے میں رسول اکرمؐ کی طرف لوٹتی ہے جبکہ بعض دوسرے مفسرین کی رائے میں ضمیر کا مرجع خدا تعالیٰ ہے لیکن پہلا معنی آیت کے مضمون کے زیادہ مناسب ہے تفسیر المیزان میں بھی یہی پہلا معنی مراد لیا گیا ہے۔ المیزان ج ١٥ ص ١٦٧

حمایت حاصل ہوتی ہے اور چونکہ اسے عوامی مدد اور حمایت حاصل ہوتی ہے۔

لہٰذا یہی شخص اس منصب پر فائز ہونے کی بہتر صلاحیت رکھتا ہے۔اس کے بعد اس کی حکومت کے نافذ العمل کی توثیق فقیہ جامع الشرائط کرتا ہے یہاں تک کہ یہ سلسلہ مراتب امام معصومؑ، رسول اکرمؐ اور منصوبین الٰہی تک بلکہ درواقع خدا تعالیٰ کے اذن ورضا تک جا پہنچتا ہے چونکہ فقیہ جامع الشرائط دراصل امام معصومؑ کا نائب ہوتا ہے)۔

بلاشک وتردید ایسا شخص جسے عوام کی محکم حمایت حاصل ہوتی ہے اور جس کے حق میں اکثر لوگوں کی آراء (ووٹ) ہوتی ہے یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس کا انتخاب لوگوں کی مصلحت کے مطابق ہے، لہٰذا ولی فقیہ جس کی ذمہ داری ہے کہ وہ معاشرے کی مصلحتوں کی رعایت کرے، ایسے شخص کی حکومت کے نافذ العمل ہونے کی مخالفت نہیں کرتا۔

نتیجہ یہ کہ اسلامی حکومت جس کا آغاز اللہ تعالیٰ سے لوگوں کی طرف ہوتا ہے اس بات کی صلاحیت رکھتی ہے کہ وہ مکمل طور پر ایک وقتی عوامی حکومت کے معیار کے مطابق ہو، ایک عام عوامی (جمہوری) حکومت اور اسلامی جمہوری حکومت کے درمیان فرق صرف یہ ہے کہ حکومت اسلامی کو چلانے والے امیدواروں کو اسلام وایمان اور تقویٰ وامانت کے زیور سے مزین ہونا چاہیے جبکہ اس کے برعکس غیر اسلامی نظام حکومت کو چلانے والوں میں اس قسم کی شرائط نہیں ہوتیں اور یہی وہ اہم فرق ہے جو اسلامی اور الٰہی حکومتوں کو غیر اسلامی اور مادی حکومتوں سے جدا کرتا ہے، اگرچہ ممکن ہے کہ دونوں قسموں کی حکومتیں بظاہر جمہوری اور عوامی حکومتیں ہوں۔

مذکورہ بیان نظام حکومت چلانے والے اصلی اور اعلیٰ ترین مسؤل اور ذمہ دار شخص کے بارے میں تھا، حالانکہ اس درجے کے بعد کے مسؤلین کے حق میں بھی یہ بات ممکن ہے کہ ان کا انتخاب بھی عوام کی بالواسطہ یا بلاواسطہ شرکت سے انجام پائے، مثلاً یہ کہ وزراء بھی لوگوں کے ووٹ کے ذریعے منتخب کئے جائیں، یا یہ کہ وزراء کا مجلس شورائے اسلامی (اسمبلی) میں موجود عوامی نمائندوں کے ذریعے انتخاب عمل میں لایا جائے۔

دونوں صورتوں میں ان کے انتخاب میں عوام شریک ہیں، پھر اس مرحلے میں بھی ایمان، تقویٰ اور دیانتداری کی شرائط کو مدنظر رکھنا لازمی ہے، انھیں اس لئے منتخب کیا جاتا ہے کہ وہ اسلامی ثقافت انسانی فضائل معاشرتی عدالت اور احکام اسلامی کو نافذ کرنے کی ذمہ داری کو پورا کریں۔ چونکہ جو ہستی بخش ذات سے وجود حاصل نہیں کرتا وہ دوسروں کو کیسے خلعتِ وجود سے آراستہ کر سکتا ہے۔

رکن سوم: اسلامی حکومت کا عدالتی نظام

انسانی معاشرے میں اختلافات اور تنازعات کے حل وفصل کے لئے زمانۂ قدیم سے قضاوت رائج رہی ہے، یہاں تک کہ صحرا نشین بدو بھی اپنے اختلافات کو حل کرانے کے لئے قبیلے کے سردار، یا اس کے رشتہ داروں یا فیصلے کے لئے منصوب شخص کی طرف رجوع کرتے تھے، درحقیقت ہم مسئلہ قضاوت کی تاریخ کو ضبط کرنے سے قاصر ہیں۔ ہم فقط اتنا کہہ سکتے ہیں کہ انسانی معاشرہ اور مسئلہ قضاوت دونوں کی عمر ایک ہے۔

اس کی دلیل بھی واضح ہے کیونکہ انسان طبعاً طور پر اجتماعی زندگی کا حامل ہے اور بلاشبہ یہ زندگی اپنی تمام خصوصیات کے ہمراہ باہمی ٹکراؤ اور تزاحم کا میدان بھی ہے بالفاظ دیگر یہ اجتماعی اور سماجی زندگی اگرچہ انسانی معاشرے کے لئے منافع اور برکات کا سرچشمہ اور تمام مادی ومعنوی جہات میں ترقی اور پیشرفت کا باعث ہے لیکن بہرحال یہ زندگی مشکلات اور منفی نقاط کی بھی حامل ہے اور وہ (نقاط منفی) ایسے اختلافات اور تنازعات ہیں جو ہمیشہ لوگوں کے حقوق کے اثبات اور ظلم وتجاوز کو ختم کرنے کے متقاضی ہوتے ہیں اگر اس قسم کے اختلافات کا درست فیصلہ نہ ہو پائے تو یہ انسانی معاشرہ کو تباہی وبربادی اور ماردھاڑ کے میدان اور سرچشمہ فساد میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

اس نکتے کی طرف توجہ کرنا بھی لازم ہے کہ یہ اختلافات ونزاع جو کبھی دو یا چند افراد کے درمیان اور کبھی دو قبیلوں یا دو ملکوں کے درمیان ظہور پذیر ہوتا ہے، (اس کشمکش کے لئے) لازم نہیں کہ ہمیشہ اس کا سرچشمہ دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنا، خودغرضی اور خواہش نفس ہی ہو، بلکہ اگر ہم فرض کریں کہ کوئی ایسا معاشرہ ظہور پذیر ہو جائے جو ''مدینۂ فاضلہ'' کا مکمل نمونہ ہو اور تمام افراد معاشرہ ایمان، تقویٰ، اخلاق اور تمدن انسانی کے اعتبار سے بلند ترین سطح پر ہوں۔ اس کے باوجود تشخیص وفہم، میں فرق غلط فہمی اور وضع شدہ قوانین اور اجتماعی ومعاشرتی حقوق کی جزئیات سے عدم آگاہی ممکن ہے کہ افراد کے واقعی حقوق کی تشخیص کے لئے اختلاف اور کشمکش کا سبب بن جائے۔

اس بناء پر عدالتی نظام انسانی معاشروں کی نہایت اہم ضرورت ہے، اگرچہ وہ معاشرے تمدنی اور فکری اعتبار سے ادنیٰ یا اعلیٰ سطح پر ہی کیوں نہ ہوں، عدالتی نظام کے بغیر ان کے لئے زندگی گذارنا ممکن نہیں۔ واضح بات ہے کہ انسانی معاشروں کے پھیلنے کے ساتھ ساتھ عدالتی نظام بھی وسعت اور پیچیدگی اختیار کرتا چلا جاتا ہے، چونکہ کہ بیشتر اور نزدیک تر روابط کی وجہ سے ان معاشروں میں نہ صرف تصادم وتزاحم کی مقدار (کمیت) اور تعداد میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ کیفیت کے اعتبار سے بھی تزاحم اور تصادم بے حد پیچیدہ اور مشکل ہو جاتے ہیں اور اگر عدالتی نظام ان معاشروں کے ساتھ قدم ملا کر آگے نہ بڑھے تو اس صورت میں معاشرتی نظام خطرناک کشمکش کے باعث دن بدن تاریک سے تاریک تر ہوتا چلا جائے گا۔

مختصر یہ کہ اجتماعی وعدالت کو عام کرنے ظلم وفساد کو روکنے اور اختلافات وتنازعات کو ختم کرنے، قوانین کے صحیح نفاذ اور اسی طرح انتظامیہ پر کڑی نظر رکھنے اور مختلف درجوں کے ذمہ دار افراد کو اپنی ذمہ داریوں سے آگاہ کرنے کے لئے ایک ایسے طاقتور اور مؤثر عدالتی نظام کا وجود ناگزیر ہے جو پوری قوت کے ساتھ قوانین کو نافذ کرے۔ اسی دلیل کی بناء پر آیت شریفہ

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۚ [1]

کے مضمون کی رو سے دین ہی انسانوں کی حقیقی زندگی ہے، اسلام نے اس مسئلے کو غیر معمولی اہمیت دی ہے اور اس مسئلے کی اصل وفرع کے لئے بکثرت قوانین وضع کئے ہیں۔

اس اشارہ کے ساتھ ہی ہم دوبارہ قرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں؛ قرآن کی متعدد آیات میں اس موضوع کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جن میں سے بعض کو یہاں پر بیان کیا جاتا ہے:

1-ایک مقام پر اللہ تعالیٰ رسول اکرمؐ سے مخاطب ہو کر فرماتا ہے:

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ۭ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَاۗىِٕنِيْنَ خَصِيْمًا ۱۰۵

''بے شک ہم نے یہ کتاب تمہاری طرف حق کے ساتھ نازل کی ہے تاکہ خدا نے جو کچھ تم پر نازل کیا ہے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو اور ایسے لوگوں میں سے نہ ہونا جو خیانت کاروں کی حمایت کرتے ہیں۔'' [2]

2-ایک اور جگہ غیر مسلموں کے درمیان قضاوت اور فیصلے کے بارے میں بھی خدا تعالیٰ رسول اکرمؐ کو یہی حکم دیتا اور یوں فرماتا ہے:

وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۴۲

''اور اگر ان لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو وہ عدالت پر مبنی ہونا چاہیے بے شک خدا صاحبان عدالت وانصاف کو پسند کرتا ہے۔'' [3]

3-ایک اور مقام پر تمام اہل ایمان کو مخاطب کر کے انھیں بھی یہی حکم دیتے ہوئے فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَھْلِھَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ۵۸ [4]

''خداوند متعال تم لوگوں کو یہ حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے صاحبان کو پہنچا دو اور جب کبھی لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدالت کے ساتھ، خدا تمہیں اچھی نصیحت کرتا ہے بے شک خدا تعالیٰ سننے اور

---

[1] سورہ انفال، ۲۴

[2] سورہ نساء۔ ۱۰۵

[3] سورہ مائدہ۔ ۴۲

[4] سورہ نساء۔ ۸۵

دیکھنے والا ہے۔''

4- دوسری طرف سے اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو رسول اکرمؐ کے عادلانہ فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کا حکم دیتا ہے اور انھیں یہ تاکید کرتا ہے کہ وہ اس فیصلے سے نہ فقط ظاہری طور پر بلکہ اپنے باطن میں بھی کسی رنج وملال کو راہ نہ دیں اور حق وعدالت اگرچہ تلخ اور ان کے خلاف ہو، کو دل وجان سے قبول کریں، خدا تعالیٰ کا فرمان ہے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا﴿٦٥﴾

''نہیں، تمہارے رب کی قسم یہ لوگ اہل ایمان نہیں ہو سکتے مگر یہ کہ تمہیں اپنے اختلافات میں فیصلہ کرنے والا بنائیں اور بعد ازاں تمہارے فیصلے سے اپنے دل میں رنج وملال کا احساس نہ کریں اور مکمل طور پر سر تسلیم خم کر لیں۔''[1]

5- اس ضمن میں اللہ تعالیٰ مزید فرماتا ہے:

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴿٥١﴾

''ان اہل ایمان کا قول، جنھیں خدا اور اس کے رسولؐ کی طرف دعوت دی جاتی ہے تاکہ رسولؐ ان کے درمیان فیصلہ کریں، فقط یہی ہوتا ہے کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی اور یہی وہ لوگ ہیں جو حقیقت میں اور فی الواقع کامیاب ہیں۔''[2]

6- قرآن مجید نے حق پر مبنی گواہی اور شہادت دینے پر کہ یہ سچی گواہی حق وعدالت کے نہایت ضروری مقدمات میں سے ہے، بہت تاکید کی ہے اور تمام اہل ایمان کو مخاطب کر کے فرماتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَاۗءَ بِالْقِسْطِ ۡ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓي اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ﴿٨﴾

''اے صاحبان ایمان! ہمیشہ خدا تعالیٰ کی خاطر قیام کرنے والے بنو اور حق وعدالت کے مطابق گواہی دو، کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی جماعت کے ساتھ تمہاری دشمنی تمہیں گناہ اور عدالت کو ترک کرنے کی طرف کھینچ لے،

---

[1] سورہ نساء۔ ٦٥

[2] سورہ نور، ٥١

عدالت کو بروئے کار لاؤ کیونکہ یہ پرہیزگاری سے زیادہ قریب ہے اور خدا کی نافرمانی سے اجتناب اور پرہیز کرو کیونکہ خدا تعالیٰ تمہارے ہر اس کام سے آگاہ ہے جسے تم انجام دیتے ہو۔"[1]

اس بناء پر معاشرہ اسلامی میں کوئی چیز حق وعدالت کو پامال نہیں کرسکتی، تمام شہادتوں اور گواہیوں کو عادلانہ ہونا چاہیے، چاہے ان کا تعلق دوست سے ہو یا دشمن سے، اسی طرح قضاوت اور فیصلے بھی عدالت وانصاف کے مطابق انجام پانے چاہئیں اور رشتہ داروں اور غیروں میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے (یعنی عدالت میں اپنوں کو غیروں پر کسی قسم کی ترجیح نہیں دینی چاہیے)۔

---

[1] سورہ مائدہ۔۸

قضاوت اور فیصلہ کرنے کا حق کس کو حاصل ہے؟

اشارہ

جیسا کہ حکومت اور حاکمیت کی بازگشت ''توحید افعالی'' جس میں مسلمہ اصل (قاعدے) کی طرف ہوتی ہے اسی طرح (قضاوت کا حق) بھی انہی لوگوں کے لئے ثابت ہے، جو اس کی طرف سے اس کے مجاز ہیں۔توحید افعالی کے مطابق: تمام امور (کاموں) کی برگشت خدا کی طرف ہے اور توحید خالقیت یہ کہتی ہے کہ اس جہان میں تمام چیزوں کا سرچشمہ خدا تعالیٰ ہے اور توحید حاکمیت، جو توحید خالقیت کا ایک شعبہ ہے، یہ کہتی نظر آتی ہے کہ حکومت کرنے کا حق فقط خدا کے لئے مخصوص ہے اور یہی چیز اس بات کا باعث بنتی ہے کہ حکومت خدا میں قضاوت اور فیصلہ کرنے کا حق بھی فقط خدا اور ان لوگوں کے لئے ثابت ہے جو اس کی طرف سے اس (قضاوت) کے مجاز ہیں۔

دوسری طرف سے توحید اطاعت کا مطلب یہ ہے کہ فقط خدا ہی کا فرمان اور وہ لوگ جن کے فرمان کی بازگشت خدا کی طرف ہے، قابل اطاعت ہے، اس بناء پر وہی عدالتی فیصلے قابل قبول ہیں جو خدا کی مرضی کے مطابق ہوں۔ اگر ہم اس نظر سے انسانی معاشرے کو ملاحظہ کریں تو قضاوت اور فیصلے کا مبداء اور سرچشمہ بہت حد تک واضح ہو جائے گا اور پھر اس سرچشمہ کی تشخیص و تعیین کے لئے ہمیں کسی پریشانی اور سرگردانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا اور وہ چونکہ ہماری نظر اس نقطے پر ہونی چاہیے جو تمام موجودات کے وجود کا سرچشمہ ہے، ہمارا وجود اور ہماری تخلیق بھی اسی کی طرف سے ہے اور ہر جگہ اسی کی فرمان روائی ہے۔

اسی بناء پر ہماری یہ کوشش ہونی چاہیے کہ ہماری عدالتیں اور عدالتی نظام اسی کے فرمان کے تابع ہوں، ہمارے عدالتی نظام کے تمام فرمان اپنی مشروعیت اور جواز کو اسی (خدا تعالیٰ) سے کسب کریں تاکہ وہ خدائی رنگ میں رنگ جائیں۔اس اشارے کے بعد ہم دوبارہ قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے ہیں تاکہ اس بات کا سراغ لگایا جا سکے کہ قضاوت اور فیصلہ کرنے کا معاملہ فقط خدا تعالیٰ کے لئے خاص اور اسی کی ذات میں منحصر ہے۔

۱۔سورۂ انعام کی آیت ۵۷ میں ارشاد ہوتا ہے:

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ يَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَيْرُ الْفٰصِلِيْنَ ﴿۵۷﴾

یعنی: ''فیصلہ کرنا اور فرمان صادر کرنا فقط خدا تعالیٰ کا کام ہے وہی ہے جو حق و باطل کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے اور وہی (حق و باطل کو ایک دوسرے سے) بہترین جدا کرنے والا ہے۔''

یہی جملہ ''إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ''، اپنے بعد کے کلمات کے بغیر سورۂ یوسف آیت ۴۰ میں بھی ذکر کیا گیا ہے۔

البتہ جو کچھ سورۂ یوسف میں ذکر ہوا ہے، ممکن ہے کہ وہ ایک وسیع تر مفہوم کا حامل ہو اور اس کے دائرے میں قضاوت و حکومت

دونوں داخل ہوں لیکن مذکورہ بالا آیت میں جو کچھ ذکر ہوا ہے اس کی اپنے بعد والے کلمات کی وجہ سے خصومت اور نزاع کو ختم کرنے کے باعث دلالت زیادہ تر قضاوت پر ہی ہے۔طبرسی، مجمع البیان اور فخر رازی تفسیر کبیر میں کئی دوسرے مفسرین کی طرح اسی مفہوم یعنی قضاوت پر دلالت کے حق میں ہیں۔[1]

۲۔سورۂ مائدہ کی آیات ۴۴، ۴۵ اور ۴۷ میں فرمایا گیا ہے:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ۝ ...فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۝ ...فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۝

یعنی: ''وہ لوگ جو کچھ خدا تعالیٰ نے نازل کیا ہے اس کے مطابق حکم (فیصلہ) نہیں کرتے، کافر ہیں......ظالم ہیں......فاسق ہیں!''

کافر اس لئے ہیں کہ توحید کے راستے (توحید حاکمیت) سے خارج ہو گئے ہیں اور ظالم اس وجہ سے ہیں کہ اپنے آپ اور دوسروں پر ستم ڈھاتے ہیں، چونکہ وہ احکام الٰہی کی مصلحتوں سے محروم رہتے ہیں اور جاہلانہ احکام کے گرداب (بھنور) میں ڈوب جاتے ہیں اور فاسق اس لئے ہیں کہ دائرہ اطاعت خدا سے نکل چکے ہیں اور حد اطاعت سے خارج ہونا ہی فسق ہے۔

البتہ ان آیات کا ایک وسیع مفہوم ہے جس کی بناء پر احکام الٰہی کے فتاویٰ قضاوت اور مسئلہ حاکمیت سب ان کے دائرے میں داخل ہیں اور ضروری ہے کہ یہ تینوں ابعاد اور جہات حکم خدا اور جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے، کے ساتھ مطابقت اور موافقت رکھتی ہوں۔ (غور فرمائیں)

۳۔سورۂ نساء کی آیت ۶۰ میں قرآن مجید ہر غیر الٰہی حکم وقضاوت کو طاغوت (شیطان) کا حکم اور غیر الٰہی حکم وقضاوت کے درپے ہونے کو راہ شیطان پر چلنے کے مترادف قرار دیتے ہوئے فرماتا ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ۭ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا۝

یعنی: ''کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ ان آسمانی کتابوں پر ایمان لائے ہیں جو تم پر اور تم سے سابق (انبیاء) پر نازل کی گئی ہیں جبکہ حال یہ ہے کہ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ قضاوت اور فیصلہ کرانے کے لئے حکام باطل اور طاغوت (شیطان) کی طرف رجوع کریں؟!''

۴۔قرآن ان تمام احکام وقضاوت کو جو غیر الٰہی مبداء اور سرچشمے سے موجزن ہوں احکام جاہلیت کے ساتھ موسوم کرتا ہے اور ان

---

[1] مجمع البیان، ج ۳، ص ۳۱۰، تفسیر کبیر فخر رازی، ج ۱۳، ص ۷

لوگوں کے مقابلے میں جو غیر الٰہی احکام کے خواہاں ہوتے تھے (مثلاً یہودیوں کا ایک گروہ جو باہمی تنازعے کا تصفیہ کرانے کے لئے رسول اکرمؐ کی بارگاہ کی طرف رجوع کرتا اور آپؐ سے یہ توقع رکھتا تھا کہ آپؐ ان کی خواہش کے مطابق فیصلہ صادر فرمائیں)' قرآن یوں فرماتا ہے:

اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ؕ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۵۰﴾

یعنی: ''(اے رسولؐ) کیا وہ تم سے زمانۂ جاہلیت کے حکم وقضاوت کو چاہتے ہیں اور باایمان افراد کے لئے خدا تعالیٰ سے بہتر کون حکم کرنے والا ہے'' [1]

۵۔ ایک اور مقام پر رسول اکرمؐ کو یاد دہانی کراتے ہوئے فرماتا ہے:

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ؕ

یعنی ''تو کیا میں غیر خدا کو قضاوت اور حکم کے لئے طلب کروں، جبکہ خدا ہی نے اس آسمانی کتاب کو نازل فرمایا ہے جس میں ہر چیز کا بیان ہے؟!'' [2]

۶۔ ایک اور مقام پر پوری صراحت کے ساتھ تمام اختلافات کو خدا کے حکم وقضاوت کے ذریعے حل کرنے کا فرمان صادر کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ

یعنی جس چیز کے بارے میں تم لوگ اختلاف کا شکار ہو جاؤ تو اس کا فیصلہ اللہ کے پاس ہے۔ [3]

مذکورہ اور غیر مذکورہ آیات سے مجموعی طور پر یہ مطلب واضح ہو جاتا ہے کہ قرآنی نقطۂ نظر سے قاضی، حاکم اور فیصلہ کرنے والا خدا اور وہ لوگ ہیں جو اس کی طرف سے فیصلہ کرنے اور قضاوت کے مجاز ہیں اس کے علاوہ ہر فیصلہ، فیصلۂ جاہلیت اور شیطانی قضاوت ہے! اسی وجہ سے حکومت اسلامی میں قضات کے سلسلۂ مراتب کے لئے ضروری ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کے اذن اور فرمان پر جا کر ختم ہو اور ان (قضاۃ) کی قضاوت کا شرعی ہونا اللہ تعالیٰ کے فرمان سے ثابت ہو، مثلاً رسول اکرمؐ نے یہ منصب خدا سے حاصل کیا اور ائمہ معصومینؑ خدا تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ رسول اکرمؐ اس منصب کے لئے منتخب و معین کئے گئے ہیں اسی طرح قضات اسلامی اپنے عمل (قضاوت) کی مشروعیت کو ائمہ اطہارؑ سے حاصل کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سورۂ مومن کی آیت ۲۰ میں اس مطلب کو وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَاللّٰهُ يَقْضِيْ بِالْحَقِّ ؕ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَقْضُوْنَ بِشَيْءٍ ؕ

یعنی: ''خدا تعالیٰ حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے اور لوگ جنہیں خدا کی بجائے معبود کے طور پر پکارتے ہیں وہ کسی

---

[1] سورہ مائدہ۔ ۵۰

[2] سورہ انعام۔ ۱۱۴

[3] سورہ شوریٰ۔ ۱۰

قسم کی (قابل قبول) قضاوت نہیں رکھتے۔''

اس بناء پر فقط خدا تعالیٰ اور اس کے اولیاء (رسول اکرمؐ اور ائمہ اطہارؑ) کی قضاوت اور فیصلہ ہی قابل قبول ہے، اس کے برعکس شرک آلود فیصلے قبولیت کی صلاحیت سے عاری ہیں۔ طیہ مطلب ابواب قضا کی احادیث میں زیادہ واضح طور پر بیان ہوا ہے۔ ان میں سے بعض کو یہاں بیان کیا جاتا ہے:

۱۔ امام جعفر صادق - سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

"اِتَّقُوا الْحُكُومَةَ فَاِنَّ الْحُكُومَةَ اِنَّمَا هِيَ لِلْاِمامِ العالم بِالْقَضاءِ اَلْعادِلِ فِي الْمُسْلِمِينَ، لنَبِيٍّ او وصيّ نبيٍّ"

''قضاوت سے پرہیز کرو کیونکہ قضاوت اور فیصلہ اصول قضاوت سے آگاہ اور مسلمانوں کے درمیان عادل امام کے لئے ثابت ہے (یعنی) رسولؐ یا وصی رسولؐ کے لئے ثابت ہے۔''[1]

۲۔ امام جعفر صادقؑ کی ایک معروف حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ امیر المؤمنین علیؑ نے قاضی شریح سے مخاطب ہو کر فرمایا ہے:

"يَاشُرَيْحُ قَدْ جَلَسْتَ مَجْلِساً لا يَجْلِسُهُ اِلاّ نَبِيّ، اَوْ وَصِيّ نَبِيٍّ اَوْ شَقِيّ!"

''اے شریح! تو اس مقام پر بیٹھا ہے جس پر سوائے نبی، وصی یا شقی (بدبخت) کے کوئی اور نہیں بیٹھتا۔''[2]

۳۔ امام جعفر صادقؑ سے ایک اور حدیث میں مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

"وَالْحُكْمُ لا يَصِحُّ اِلاّ بِاِذْنٍ مِنَ اللهِ وَبُرْهانِهِ"

وہی فیصلہ اور قضاوت درست ہے جو خدا کے اذن، اجازت اور اس کی برہان (دلیل) سے ہو[3]

نتیجہ یہ کہ جو دلائل عقلی توحید افعالی اور توحید حاکمیت و مالکیت پر دلالت کرتے ہیں وہی قضاوت کو اذن الٰہی سے مشروط قرار دیتے ہیں اور آیات قرآنی اور اس سلسلے میں وارد شدہ احادیث و روایات بھی (قضاوت کے لئے اذن خدا کو شرط قرار دیتی ہیں) اور یہ جو کہتے ہیں کہ مجتہد جامع الشرائط (ولی فقیہ) کے لئے تینوں منصب فتویٰ دینا، قضاوت کرنا اور ولایت ثابت ہیں اس سے اسی مطلب کی عکاسی ہوتی ہے۔ اب ہم اسلام میں قاضی کی صفات، آداب قضاوت اور اسلامی اور مغربی قضاوت کے درمیان بنیادی فرق کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کراتے ہیں تاکہ یہ بحث مکمل ہوسکے۔

---

[1] وسائل الشیعہ، ج۱۸، ابواب صفات القاضی، باب ۳، حدیث ۳۔

[2] وسائل الشیعہ، ج۱۸، ابواب صفات القاضی، باب ۳، حدیث ۳۔

[3] مصباح الشریعۃ، ص ۴۱ (اس کتاب کا معتبر ہونا علماء کی نظر میں اختلافی ہے چونکہ اب تک اس کے مولف کی درست شناخت نہیں ہوسکی۔

صفات قاضی

اسلامی منابع اور فقہی کتب میں قاضی کے لئے نہایت سخت شرائط بیان کی گئی ہیں ایسی شرائط جو کسی اور مکتب و مذہب میں نہیں ملتیں اگر چہ علماء اسلام اور شیعہ وسنی فقہاء کے درمیان ان شرائط کی تعداد کے بارے میں اختلاف ہے۔ چونکہ یہ کتاب فقہ استدلالی پر نہیں لکھی گئی لہٰذا ہم فقط اُن ہی شرائط کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کریں گے جو سب فقہاء کے نزدیک متفق علیہ ہیں اور بعد ازاں وہ اختلافی شرائط کو ذکر کریں گے اور ایک گروہ ان کے شرط ہونے اور دوسرا گروہ ان کی عدم شرطیت (شرط نہ ہونے) کا قائل ہے اور ان شرائط کے قاضی کی ذات میں موجود ہونے کو اس کے کمالات میں سے شمار کرتا ہے' کی طرف ایک سرسری سا اشارہ کریں گے۔

البتہ جو کچھ ہمارے فقہاء کے نزدیک متفق علیہ ہیں اور ماہر فقیہ صاحب جواہرؒ کے الفاظ میں "لاخِلافَ اَجِدُہ فی شَیئٍ مِنْہا" یعنی: "ان شرائط میں میرے خیال کے مطابق کوئی اختلاف نہیں" اور جنھیں مرحوم شہید ثانیؒ نے اتفاقی اور اجماعی شرائط قرار دیا ہے، وہ سات ہیں:

۱۔ بلوغ' اس شرط کی بناء پر نابالغ بچے کا قاضی ہونا ممنوع ہے اگر چہ وہ علم وآگاہی اور تقویٰ کی اعلیٰ منزل پر فائز ہی کیوں نہ ہو چونکہ نابالغ افراد کی کوئی شرعی ذمہ داری نہیں ہوتی اور وہ شرعی قوانین کے دائرے سے خارج ہوتے ہیں لہٰذا اسی دلیل کی وجہ سے ان کی قضاوت پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

۲۔ کمال عقل' اس شرط کی رو سے دیوانہ اور ناقص العقل افراد چونکہ روحانی طور پر غیر معتدل مزاج کے حامل ہوتے ہیں اس لئے مسند قضاوت پر بیٹھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور اس کی دلیل کسی بیان وتوضیح کی محتاج نہیں۔

۳۔ اسلام وایمان' اس شرط کی رو سے جو شخص مسلمان نہ ہو اور مکتب اہل بیتؑ پر اعتقاد بھی نہ رکھتا ہو، اس کی قضاوت قابل قبول نہیں اس کی وجہ بھی واضح ہے۔

۴۔ عدالت' یعنی تقویٰ سے بالاتر مرتبہ جس کے باعث وہ گناہان کبیرہ کے ارتکاب اور گناہان صغیرہ پر اصرار سے باز رہے، یقینی طور پر جو شخص تقویٰ کے اس مرتبے کا حامل نہ ہو اس سے درست قضاوت کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

۵۔ علم وآگاہی' قوانین الٰہی جو لوگوں کے حقوق سے متعلق ہوں اور حدود و دیات وقصاص اور معاملات اور اسی طرح اسلامی قضاوت سے آگاہی قاضی کے لئے نہایت ضروری ہے وہ شخص جس میں یہ شرط (اجتہاد مطلق یا جزوی اجتہاد) نہ پائی جاتی ہو یعنی وہ مجتہد نہیں لیکن تمام حقوقی مسائل وغیرہ سے آگاہ ہے تو کیا ایسے شخص کی قضاوت نافذ (قابل قبول) ہو گی یا نہیں؟ یہ مسئلہ علماء وفقہاء کے درمیان اختلافی ہے۔

اگر چہ فقہاء کے درمیان مشہور اور معتبر اجتہاد ہی ہے، یہاں تک کہ بعض کے نزدیک قاضی کا شہر کے فقہاء کی نسبت اعلم ہونا بھی

ضروری شرط ہےلیکن یہ قول ضعیف ہے۔ بہرحال اگر مجتہدین مطلق بقدر کافی موجود نہ ہوں تو پھر سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ ان لوگوں سے استفادہ کیا جائے جو مجتہد نہیں،لیکن مجتہد تقلید کے نتیجے میں تمام مسائل سے آگاہ ہیں۔

۶۔ پیدائشی طہارت یعنی حلال زادہ ہونا، کیونکہ ناجائز فرزند اگر چہ خود کسی گناہ کا مرتکب نہیں ہوا،مگر وہ معاشرۂ اسلامی میں مقبول نہیں ہوسکتا اور اس کی قضاوت کا بھی یہی حال ہے بلاشک وتردید قاضی ایسا شخص ہو جسے سب قبول کریں اور اُس کی بات بھی مانیں۔اس کے علاوہ جو شخص حلال زادہ نہ ہو اُس میں گناہ اور گمراہی کا زیادہ احتمال پایا جاتا ہے۔(غور فرمائیں)۔

۷۔ ذکوریت، علماء اسلام کے درمیان مشہور یہی ہے کہ قاضی کا مرد ہونا ضروری ہے اگر چہ بعض فقہاء اہل سنت جیسے ابوحنیفہ اس حکم میں متردد یا مخالف ہیں۔[1]

واضح اور روشن ہے کہ خواتین پر جذبات واحساس کا غلبہ ہوتا ہے جس کے نتیجے میں وہ قضاوت جیسے سخت امور کی ذمہ دار نہیں لے سکتیں۔علاوہ برایں یہ موضوع علماء شیعہ کے ہاں اجماعی اور اتفاقی ہے (کہ عورت قاضی نہیں ہوسکتی)۔اس باب میں تین اور شرائط بھی ہیں جو علماء کے درمیان اختلافی ہیں:

۸۔حریت، اس بناء پر قاضی کو آزاد ہونا چاہیے اور غلام اس منصب پر فائز نہیں ہوسکتا،لیکن بہت سارے علماء کے نزدیک یہ شرط ناقابل قبول ہے۔

۹۔نابینا نہ ہونا۔ ۱۰۔بہرا نہ ہونا۔

درحقیقت ان آخری تین شرائط کی کوئی دلیل موجود نہیں، بنابرایں قضاوت کی صلاحیت کے لئے آزاد وغلام کے درمیان کوئی فرق نہیں پایا جاتا (خوش بختی سے غلامی کا موضوع ہمارے زمانے میں کلی طور پر مفقود ہے)، جہاں تک بینائی اور شنوائی (سماعت) کا تعلق ہے تو اس ضمن میں کہا جاسکتا ہے کہ اگر قضاوت کا ایسے موضوعات سے تعلق ہو جس میں قاضی کو دیکھنے یا سننے کی ضرورت نہ ہو مثلاً قاضی نابینا ہے لیکن کانوں کے ذریعے ساری گفتگو سن کر درست قضاوت کرسکتا ہے یا بہرا ہے لیکن آنکھوں سے کیس کی فائل پڑھ کر درست فیصلہ کرسکتا ہے تو اس صورتحال میں اس کی قضاوت کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں۔

اگر چہ غالباً ایک نابینا اور بہرا شخص سارے امور میں قضاوت کی صلاحیت نہیں رکھتا، بنابرایں مقدمہ واجب کے عنوان سے ان دونوں شرائط کی رعایت غالباً لازم ہے۔مذکورہ بالا بیان کے مطابق کہ سات شرائط کا ہونا لازم اور تین آخری شرائط وصفات کا ہونا لازم نہیں، درحقیقت بصورت اشارہ تھا اور ان کی تفصیلی شرح کے لئے فقہ استدلالی میں لکھی گئی کتابوں کا مطالعہ ضروری ہے۔[2]

---

[1] ابوحنیفہ سے نقل کیا گیا ہے کہ وہ اموال میں عورت کی قضاوت کو قبول کرتے ہیں لیکن طبری کے قول کے مطابق وہ مطلق طور پر عورت کی قضاوت کے قائل ہیں (بدایۃ المجتہد، ج ۲،ص ۴۶۰، کتاب الاقضیہ)

[2] اس بارے میں قارئین جواہر کی جلد ۴۰ صفحہ ۱۲۔ ۲۳۔ کا مطالعہ کرسکتے ہیں۔

شرائط کمال

مذکورہ بالا دس صفات وشرائط کے علاوہ روایات اسلامی میں قاضی کے لئے بعض دوسری شرائط وصفات کا اعتبار بھی کیا گیا ہے، جنھیں شرائط کمال کے طور پر جاننا چاہیے۔عہد نامہ مالک اشتر میں شرائط واجب کے ساتھ ساتھ ان شرائط کمال کے ایک اہم حصے کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ان کی تفصیل کچھ اس طرح سے ہے:

۱۔فضلیت، قاضی کا تمام لوگوں یا (اہل شہر) سے افضل ہونا:

(ثُمَّ اخْتَرْ لِلْحُكْمِ بَيْنَ النّاسِ اَفْضَلَ رَعِيَّتِكَ فِي نَفْسِكَ)

۲۔صاحب حوصلہ اور باہمت ہونا:(مِمَّن لا تَضيقُ بِهِ الاُمُورُ)۔

۳۔ وسعت قلبی:(وَلا تُمَحِّكُهُ الْخُصُومُ)۔

۴۔ ضدی اور ہٹ دھرم نہ ہونا:(وَلا يَتَمادى فِي الزَّلَّةِ)۔

۵۔حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والا ہونا:(وَلا يَحْصَرُ مِنَ الْفَيْئِ اِلَى الْحَقِّ اِذا عَرَفَهُ)۔

۶۔ لالچی اور حریص نہ ہونا:(وَلا تُشْرِفُ نَفْسُهُ عَلى طَمَعٍ)۔

۷۔ سطحی تحقیق پر قناعت کرنے والا نہ ہونا:(وَلا يَكْتَفِي بِاَدْنى فَهْمٍ دُونَ اَقْصاهُ)۔

۸۔ شبہات پیش آنے کی صورت میں سب سے زیادہ محتاط ہونا:(وَاَوْقَفَهُمْ فِي الشُّبُهاتِ)۔

۹۔ دلیل کے مطابق عمل کرنے کا سختی سے پابند ہونا:(وَاَخَذَهُمْ بِالْحُجَجِ)۔

۱۰۔شکایات کرنے والوں کے بار بار رجوع کرنے سے رنجیدہ اور خستہ نہ ہونا:(وَاَقَلَّهُمْ تَبَرُّماً بِمُراجَعَةِ الْخَصْمِ)۔

۱۱۔حقائق کے انکشاف میں سب سے زیادہ صابر ہونا:(وَاَصْبَرَهُمْ عَلى تَكَشُّفِ الاُمُورِ)۔

۱۲۔ حق کے آشکارا ہونے پر قاطعانہ طور پر فیصلہ سنانا:(وَاَصْرَمَهُمْ عِنْدَ اِتِّضاحِ الْحُكْمِ)۔

۱۳۔چاپلوسوں کی چاپلوسی سے فریب نہ کھانا اور مداحوں کی تعریف وتمجید سے وہ ان کی طرف مائل نہ ہو:

(مِمَّنْ لا يَزْدَهِيهِ اِطْراءٌ وَلا يَسْتَمِيلُهُ اِغْراءٌ)۔

۱۴۔بیت المال کو قاضی کے اخراجات کا کفیل بیت المال کو ہونا چاہیے اور اسے بیت المال سے اس قدر پیسہ ملنا چاہیے کہ جس کے باعث وہ کسی کا محتاج نہ رہے اور اس کی نظر لوگوں کے ہاتھوں اور جیب پر نہ ہو:

(وَافْسَحْ لَهُ فِي الْبَذْلِ مايُزِيلُ عِلَّتَهُ وَتَقِلُّ مَعَهُ حاجَتُهُ اِلَى النّاسِ)۔[1]

علاوہ ازیں روایات اسلامی میں کچھ اور احکام بھی قاضی کے لئے ثابت ہیں۔انھیں بھی شرائط کمال میں سے شمار کرنا چاہیے،

---

[1] نہج البلاغہ، عہد نامہ مالک اشتر۔

جن (احکام) کی تفصیل یہ ہے کہ وہ لوگوں کی طرف سے کھانے کی دعوت کو قبول نہ کرے۔ تحفے قبول نہ کرے، سودا سلف خریدنے کے لئے بذات خود بازار جانے سے اجتناب کرے، کسی جھگڑے کے طرفین میں سے کسی کو اپنے ہاں کھانے کی دعوت نہ دے اور چاہیے کہ وہ ان تمام ایسے امور سے اجتناب کرے جن سے یہ خوف ہو کہ ان امور کے باعث لوگ اسے متاثر کر کے اس کے زاویہ سوچ کو تبدیل کر دیں اور اسے اپنی طرف متوجہ کر لیں جس کی وجہ سے ممکن ہے کہ وہ شعوری یا لاشعوری طور پر خلاف حق قضاوت پر مجبور ہو جائے۔

قرآن اور قاضی کی صفات

قرآن مجید میں اگرچہ قاضی کی صفات و شرائط ایک علیحدہ اور تفصیلی صورت میں بیان نہیں ہوئیں، لیکن بعض تعبیرات اور آیات ایسی بھی ملتی ہیں جن میں مذکورہ بالا صفات میں سے چند اہم صفات کو جمع کر دیا گیا ہے۔

۱۔ قرآن مجید میں ایک مقام پر خواہش نفس کی پیروی کو عادلانہ فیصلے کی راہ میں رکاوٹ اور حق سے انحراف و روگردانی کا سبب شمار کیا گیا ہے۔ فرمان خدا تعالیٰ ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۣ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ

یعنی: ''اے ایمان والو! مکمل طور پر عدالت قائم کرنے والے بنو، اور شہادت دو تو خدا کے لئے اگرچہ یہ شہادت خود تمہارے یا تمہارے والدین یا قرابتداروں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو کیونکہ اگر وہ غنی یا فقیر ہوں تو خدا اس بات کا زیادہ سزاوار ہے کہ ان کی حمایت کرے، پس اپنی خواہش نفس کی پیروی نہ کرو ورنہ حق سے منحرف ہو جاؤ گے۔''[1]

۲۔ یہی مطلب حضرت داؤدؑ کی قضاوت اور حکومت کے واقعات میں ایک دوسری شکل میں بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت داؤدؑ کو مخاطب کر کے فرماتا ہے:

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ

یعنی: ''اے داؤد! ہم نے تمہیں زمین پر اپنا جانشین اور نمائندہ مقرر کیا ہے، پس لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ قضاوت (فیصلہ) کرو اور خواہش نفس کی پیروی نہ کرو کیونکہ یہ تمہیں خدا کی

---

[1] سورہ نساء۔ ۱۳۵

راہ سے بھٹکا دے گی۔''[1]

درنتیجہ قرآن، ام المفاسد یعنی خواہش نفس کی پیروی سے پرہیز کو قضاوت اور شہادت کی حقیقی شرائط میں سے ایک شرط شمار کرتا ہے اور اس کا نقطۂ مقابل تقویٰ کی وہ عالی ترین سطح ہے جو حق وعدالت کی راہ سے ہر قسم کے انحراف کے راستے میں رکاوٹ ہے۔ یہاں تک کہ والدین وفرزند کے تعلق یا رشتہ داری جو ایک اہم اور بہت قوی رشتہ اور تعلق ہے وہ بھی تقویٰ کے سامنے بے بس نظر آتا ہے۔

۳۔ایک اور مقام پر "ما انزل الله" (جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے) کے مطابق قضاوت کو ایمان وعدالت کی شرط قرار دیا گیا ہے۔ا[2]

اور قرآن میں اللہ تعالیٰ رسول اکرمؐ کو تاکید کرتا ہے کہ تمہاری قضاوت خدا کے حکم کے مطابق ہونی چاہیے اس ضمن میں قرآن یوں گویا ہے:

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ؕ [3]

واضح ہے کہ "ما انزل الله" کے مطابق فیصلہ کرنا اسی وقت ممکن ہے جب احکام الٰہی کے بارے میں کافی آگاہی ہو۔

۴۔ایک اور مقام پر رسول اکرمؐ کو متنبہ کر کے فرماتا ہے (تاکہ دوسرے لوگ اپنا حساب خود کر لیں کہ وہ کتنے پانیوں میں ہیں) کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ (اے رسولؐ) لوگوں کے ذاتی میلانات اور خودغرضی پر مبنی ان کے وسوسے عدالت کے مطابق تمہاری قضاوت کے راستے میں رکاوٹ بن جائیں:

وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ؕ

یعنی: ''اور لوگوں کے درمیان جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے، کے مطابق فیصلے کرو اور ان کی خواہشات نفس اور ہوس کی پیروی نہ کرو اور ہوشیار رہو کہ خدا نے جو کچھ تم پر نازل کیا ہے، اس کے بعض احکام سے کہیں وہ تمہیں منحرف نہ کر دیں۔''[4]

۵۔اسی طرح خدا تعالیٰ قرآن مجید میں یہ تنبیہ بھی کرتا ہے کہ جس طرح دوستی کو عدالت پر مبنی قضاوت کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننا چاہیے اسی طرح ضروری ہے کہ دشمنی اور خصومت میں بھی حق وعدالت کی راہ سے انحراف کا سبب نہ بنیں پس فیصلہ کرنا اور شہادت دینا حق وعدالت کے مطابق ہو، چاہے ان کا تعلق دوست سے ہو یا دشمن سے سورۂ مائدہ کی آٹھویں آیت میں ارشاد فرماتا ہے:

---

[1] سورہ ص۔۲۶

[2] سورہ مائدہ۔۴۴،۴۵،۴۷۔

[3] سورہ نساء ۱۰۵

[4] سورہ مائدہ۔۴۹

"وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ"

یعنی: ''کسی جماعت کے ساتھ تمہاری دشمنی اس بات کا سبب نہ بنے کہ تم عدالت کو ترک اور گناہ کا ارتکاب کرو، عدالت (کے ساتھ قضاوت) کرو کیونکہ یہ پرہیز گاری سے نزدیک تر ہے۔''

نتیجہ

مذکورہ بالا آیات، روایات اور بزرگ فقہاء کے فتاویٰ میں قاضی کی ضروری صفات اور اسی طرح اس کی صفات کمال سے متعلق جو کچھ نقل ہوا ہے اس سے بخوبی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام نے اس مسئلے پر بہت زیادہ توجہ دی ہے اور بڑی باریک بینی سے عادلانہ قضاوت کے مسئلے کا تعاقب کیا ہے اور اپنے مکتب کی پیروی کرنے والوں کو عادلانہ قضاوت کے مسئلے کا اس قدر پابند قرار دیا ہے کہ قاضی کو حق وانصاف کی راہ سے ذرا سے انحراف کی بھی اجازت نہیں یہاں تک کہ بعض مسائل، پر بھی توجہ دی ہے اور خبردار کیا ہے۔ جو چند واسطوں سے ممکن ہے قاضی پر اثر انداز ہوں اور اسے جادۂ حق وعدالت سے منحرف کردیں۔

اگر آداب قضاوت پر مشتمل فصل کے بعد آنے والے صفحات میں ذکر کی جائے گی مطالب ان شرائط میں اضافہ کریں تو اسلام کا اس مسئلے کو غیر معمولی اہمیت دینا زیادہ واضح ہو جاتا ہے یہاں تک کہ دوسرے مکاتب کے عدالت خواہی کے نعروں کا رنگ اس کے مقابلے میں پھیکا نظر آتا ہے۔

اسلام میں قضاوت کے آداب

اہم مسئلہ یہ ہے کہ ادیان الٰہی ایک مضبوط اخلاقی پشت پناہ قضاوت فیصلہ سازی اور وہ اصول جو فیصلہ سازی اور عدالتی تنظیم پر حاکم ہیں، کی بدولت مادی مکاتب سے بہت آگے ہیں بلکہ ان دونوں (ادیان الٰہی اور مکاتب مادی) کا آپس میں موازنہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ان احکام میں بے پناہ لطافت اور باریک بینی نظر آتی ہے اور اگرچہ ان میں سے بعض احکام زمانہ گذشتہ سے تعلق رکھتے ہیں اور شاید آج کل قابل استفادہ نہ ہوں لیکن اصولی نقطۂ نظر سے عدالتی مسائل کی نسبت فائدہ بخش ہیں۔ یہاں ہم مرحوم محقق نے ''شرائع'' میں آداب القضاء کی بحث میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے اور درحقیقت یہی احادیث اور کلمات فقہاء کا نچوڑ ہے، اسی کو بیان کرنا کافی سمجھتے ہیں۔ محقق فرماتے ہیں: ''مستحب ہے کہ قاضی ان امور کی رعایت کرے اور ان کا لحاظ رکھے۔''

۱۔ اسے چاہیے کہ وہ اس علاقے کے لوگوں کے بارے میں جن پر اسے بحیثیت قاضی مقرر کیا گیا ہے، پوری پوری تحقیق کرے (ان لوگوں کے رہن سہن سے آگاہی حاصل کرے اور ان کے اخلاقی اور اقتصادی حالات سے آشنا ہو، علاقے کے علماء صالح افراد اور حتیٰ کہ سابقہ قاضیوں کے ساتھ بھی شناسائی پیدا کرے، تا کہ اسے اپنے فرض کی ادائیگی میں کافی بصیرت حاصل ہو، چونکہ اس علاقے کے احوال اور رسم و رواج سے آگاہی عادلانہ قضاوت کے مسئلے میں کافی مؤثر ہوتی ہے)۔

۲۔ جب اپنی تقرری کے مقام پر پہنچے تو اپنی رہائش (اور مرکز قضاوت) کو شہر کے وسط میں قرار دے تا کہ سب شکایت کرنے والے مساوی طور پر اس تک پہنچ سکیں!

۳۔ شہر میں داخل ہوتے ہی اپنی آمد کی منادی اور اعلان کروائے تا کہ سب مظلومین باخبر ہو جائیں۔

۴۔ عدالت کھلے اور آشکار امقام پر قائم ہونی چاہیے تا کہ سب آسانی کے ساتھ اس تک دسترسی پیدا کر سکیں (نہ کہ بند دروازوں کے پیچھے اور پولیس کے محاصرے میں)۔

۵۔ شہر میں داخل ہونے کے ساتھ ہی لوگوں کی تمام اسناد و مدارک اور فائلوں کو سابق قاضی سے وصول کرے اور اسی طرح اس سے اس کے پاس رکھی ہوئی لوگوں کی امانتوں کو بھی اپنے قبضے میں لے (اس زمانہ میں یہ رواج تھا کہ بہت سے لوگ اپنی قیمتی اشیاء کو بطور امانت قاضی کے پاس رکھ دیتے تھے، اسی طرح وہ اموال بھی قاضی کے پاس بطور امانت ہوتے تھے جن کی کیفیت نزاعی اور اختلافی ہوتی تھی)۔

۶۔ اگر محل عدالت (فیصلہ گاہ) مسجد ہو تو قاضی کو چاہیے کہ مسجد میں داخل ہوتے ہی تحیت مسجد کی نماز پڑھے۔ اس کے بعد قبلے کی طرف پشت کر کے بیٹھ جائے تا کہ مدعی اور صاحب شکایت لوگوں کا رخ قبلے کی طرف ہو (اور وہ محسوس کریں کہ وہ بارگاہ الٰہی کے روبرو ہیں)

۷۔ اسے (قاضی کو) چاہیے کہ قید خانے میں موجود قیدیوں کے بارے میں مکمل تحقیق کرے اور ان قیدیوں کو آزاد کر دے جن کے زندان میں رہنے کی کوئی خاص وجہ نہیں، اور اگر کوئی معقول وجہ ہو تو شکایت کرنے والے کو بلا کر مقدمے کا دوبارہ جائزہ لے، اسی طرح

یتیموں کے سرپرست، حاکم کے امین اور یتیموں کے مال کے محافظ افراد کے بارے میں اچھی طرح تحقیق کرے، اور اگر ان میں کچھ نااہل افراد ہوں تو جلد از جلد انھیں برطرف کر کے صالح افراد کو ان امور پر مامور کرے۔

۸۔ عدالت گاہ میں علماء و دانشور افراد کی ایک جماعت کو بھی مدعو کرے تاکہ وہ لوگ اس کی قضاوت پر نظر رکھیں اور اس سے کوئی غلطی سرزد ہونے کی صورت میں وہ اسے آگاہ کریں۔

۹۔ بذات خود قاضی کو خرید و فروخت کے لئے بازار نہیں جانا چاہیے (تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ اس کی توجہ حاصل کرنے کے لئے اس کے ساتھ رعایتی انداز میں پیش آئیں جس کے نتیجے میں وہ شعوری یا لاشعوری طور پر ان سے متاثر ہو جائے)۔

۱۰۔ عدالت گاہ میں ضروری ہے کہ اس کا چہرہ ایسا نہ ہو جس پر بل پڑے ہوں اور اس سخت رویے کی وجہ سے لوگ اپنا مافی الضمیر وضاحت کے ساتھ پیش نہ کر سکیں، اسی طرح اس کا چہرہ اتنا نرم اور ملائم بھی نہیں ہونا چاہیے کہ لوگ اس کے باعث گستاخ اور جسور ہو جائیں اور "مدعی یہ گمان کرنے لگیں کہ یہ تو حلوا ہے۔"

۱۱۔ قاضی، شہادت دینے والوں کے درمیان ترجیح کا قائل نہ ہو (شاہد آشنا اور غیر آشنا اور رشتہ دار اور اجنبی کو یکساں قرار دے، جب شہادت دینے کی تمام شرائط ان میں موجود ہوں)۔

۱۲۔ ہر ہفتے کی فائلوں کو جمع کر کے ان کا ایک منظم انداز میں ریکارڈ رکھے اسی طرح ہر ماہ اور ایک ہر سال کی فائلوں کو ضبط تاریخ کے ساتھ بھی منظم کر کے حفاظت سے ریکارڈ روم کے سپرد کر دے (یا ان کی تنظیم و ترتیب کے بارے میں ضروری احکام صادر کرے)۔ اسی طرح یہ عظیم فقیہ قاضی کی ذمہ داریوں اور جن امور کی اسے رعایت کرنی چاہیے کے بارے میں یوں فرماتے ہیں: حاکم (قاضی) کی سات ذمہ داریاں ہیں:

۱۔ قاضی پر واجب ہے کہ وہ جھگڑے اور تنازعے کے فریقین کے درمیان، سلام کرنے، بیٹھنے، ان کی طرف دیکھنے اور ان کی بات سننے، اور قضاوت میں عدالت کے سلسلے میں مساوات اور برابری کو بروئے کار لائے۔ (اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ فریقین میں سے کسی ایک کو احترام کے ساتھ سلام کرتا یا اس کے سلام کا جواب دیتا ہے تو دوسرے فریق کے ساتھ بھی اس کا سلوک ایسا ہی ہونا چاہیے اور قضاوت کے مسئلے میں کسی فریق کا اعلیٰ مقام کسی طرح اس پر اثر انداز نہیں ہونا چاہیے اور اگر وہ کسی ایک فریق کو چند لحظے توجہ سے دیکھتا ہے تو دوسرے کو بھی اسی انداز میں دیکھے اور اگر ایک فریق کی باتوں کو توجہ سے سنتا ہے تو دوسرے فریق کے ساتھ بھی اس کا رویہ ایسا ہی ہونا چاہیے، مختصر یہ کہ کمرۂ عدالت میں فریقین کے جزئی احترام و آداب میں مکمل مساوات ہونی چاہیے تاکہ بخوبی کلی انحرافات کی روک تھام کی جا سکے)۔

۲۔ قاضی کے لئے ضروری ہے کہ وہ تنازعے کے فریقین میں سے کسی فریق کو کسی ایسی بات کی تلقین نہ کرے جو دوسرے کے ضرر اور زیان کا باعث بن سکتی ہو۔

۳۔ اگر فریقین (دونوں فریق) خاموش ہو جائیں تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ کسی ایک کو بات کرنے کا اشارہ نہ کرے، بلکہ اس صورتحال میں بہتر یہی ہے کہ وہ دونوں کو مخاطب کر کے کہے: "آپ دونوں جو کہنا چاہتے ہیں کہیں" یا یہ کہے کہ مدعی اپنی شکایت پیش کرے اور اس کی وضاحت کرے۔

۴۔ جب بھی جھگڑے کا حل واضح طور پر سامنے آجائے اسے چاہیے کہ جلد از جلد فیصلہ سنائے اور مستحب یہ ہے کہ اس سے قبل ان کو آپس میں صلح کرنے کی ترغیب دے، اگر فریقین صلح پر آمادہ نہیں ہوتے تو پھر اپنا فیصلہ صادر کرے۔

۵۔ جب کبھی شکایات ترتیب کے ساتھ پیش کی گئی ہوں، ضروری ہے کہ باری کی رعایت کی جائے اور باہمی نزاع کرنے والوں کے معاشرتی مقام کی وجہ سے ان کے مقدمے کو پہلے نہ نپٹایا جائے اور ترتیب واضح نہ ہونے کی صورت میں قرعہ اندازی کی جانی چاہیے۔

۶۔ اگر مدعی علیہ دعویٰ کے ضمن میں کوئی اور دعویٰ پیش کرے تو قاضی کو چاہیے کہ وہ اس کی بات پر توجہ نہ دے جب تک کہ پہلے نزاع اور دعویٰ کا فیصلہ نہیں ہو جاتا۔

۷۔ جب بھی فریقین میں سے کوئی ایک دعویٰ پیش کرنے میں پہل کرے اور قاضی کو اسے دوسرے پر ترجیح دینی چاہیے۔[۱] ہم اس بات کو دہراتے ہیں کہ ان مسائل کے بارے میں جامع اور استدلالی بحث و تحقیق کے لئے حدیث کے معروف منابع (کتابوں) کی طرف رجوع ضروری ہے۔ جو کچھ یہاں بیان کیا گیا ہے وہ صرف کتابوں میں بیان شدہ مطالب کا نچوڑ اور مختصر خلاصہ ہے اور اس سے مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ ہم بتا سکیں کہ اسلام کے عدالتی نظام پر حاکم ثقافت، کس قسم کی ثقافت ہے اور اس کے اور دوسرے مکاتب پر حاکم ثقافت کے درمیان کیا فرق ہے۔ یہ نکتہ بھی اہم اور قابل ذکر ہے جس میں قاضی کو یہ تاکید کی گئی ہے کہ وہ غیظ و غضب کی حالت میں مسند قضاوت پر نہ بیٹھے۔[۲] اسی طرح قاضی کو بھوک، پیاس اور نیند کی حالت میں کمرۂ عدالت میں حاضر ہونے سے گریز کرنا چاہیے (کیونکہ ممکن ہے کہ یہ امور اس کی قضاوت پر اثر انداز ہوں اور وہ غلط فیصلہ صادر کر بیٹھے)۔[۳]

خلاصہ کلام یہ کہ قاضی کو چاہیے کہ وہ متوجہ رہے کہ کوئی کلی و جزئی موضوع اسے حق و عدالت کی راہ سے منحرف کر کے باطل کی طرف کھینچ کر نہ لے جا سکے۔

اسلامی قضات کو تنبیہ

لوگوں کے درمیان اہل لوگوں کی قضاوت اور فیصلہ کرنا واجب کفائی بلکہ بعض صورتوں میں واجب عینی و شخصی ہے اور یہ کام بذات خود اہم عبادات میں سے شمار ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود قاضی کو خبردار کیا گیا ہے کہ وہ اپنے کام (قضاوت) میں بے حد احتیاط کرے۔ رسول اکرمؐ کی ایک معروف حدیث ہے:

"لِسانُ الْقاضی بَیْنَ جَمْرَتَیْنَ مِنْ نارٍ، حَتّٰی یَقْضی بَیْنَ النّاسِ فَاِمّا اِلَی الْجَنَّةِ وَاِمّا اِلَی النّارِ"

---

[۱] جواہرالکلام، ج ۴۰، ص ۱۳۹ تا ۱۴۹۔

[۲] وسائل الشیعہ، ج ۱۸، ص ۱۵۶۔

[۳] کنزالعمال، ج ۶، ص ۱۰۳، حدیث ۱۵۰۴۰۔ لمعہ، کتاب القضاء۔

یعنی: ''قاضی کی زبان آگ کے دوشعلوں کے درمیان (رہتی) ہے جب تک اس کی قضاوت اختتام پذیر نہیں ہوتی (پھراس کے بعد) وہ یاتو بہشت کا راہی ہوتا ہے یا جہنم کا۔'' [1]

ایک اور حدیث جو امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے، فرماتے ہیں:

"اَلْقُضاۃُ اَرْبَعَۃ،ثَلاثَۃ فی النّارِوَواحِدفِی الْجَنَّۃِ، رَجُل قَضی بِجَورٍ وَھُوَیَعْلَمُ فَھُوَفِی النّارِ، وَرَجُل قَضی بِجَورٍ وَھُوَ لایَعْلَمُ فَھُوَفِی النّارِ، وَرَجُل قَضی بِالْحَقِّ وَھُوَلایَعْلَمُ فَھُوَفِی النّارِ، وَرَجُل قَضی بِالْحَقِّ وَھُوَیَعْلَمُ فَھُوَفِی الْجَنَّۃِ"

''قاضیوں کے چار گروہ ہیں، جن میں سے تین اہل جہنم اور ایک اہل جنت میں سے ہے، وہ قاضی جو جان بوجھ کر ناحق اور ظلم پر مبنی فیصلے کرتا ہے۔ اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور جو ناحق فیصلہ کرتا ہے لیکن جان بوجھ کر نہیں وہ بھی اہل جہنم میں سے ہے اور جو حق کے مطابق فیصلہ کرتا ہے لیکن اس کا یہ فیصلہ لاعلمی اور نا آگاہی کے باعث اس سے صادر ہوتا ہے ایسا قاضی بھی جہنمی ہے اور حق وعدالت کے مطابق اور علم وآگاہی کے ساتھ فیصلے کرنے والا ہی اہل جنت میں سے ہے۔ [2]

درنتیجہ، قاضی کی قضاوت اگرچہ حق وعدالت کے مطابق ہو لیکن وہ آگاہی اور علم کے بغیر اگر اس نتیجہ پہ پہنچے یا دوسرے لفظوں میں حق کے مطابق اس کے فیصلے کی رسائی اتفاقاً ہو تو ایسے شخص سے خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں باز پرس ہوگی اس کے باوجود کہ اس کے فیصلے کی وجہ سے حق، حقدار کو مل جاتا ہے۔ یہ مطلب قضاوت کے مسئلے میں اسلام کی نہایت درجے کی تاکید اور اہمیت کی عکاسی کرتا ہے۔

مادی مکاتب فکر اور اسلامی قضاوت میں فرق

آج کل کی دنیا میں عدالتی نظام بہت وسیع اور زرق و برق کے حامل ہیں، لیکن اگر ان کے فیصلہ جات کا اسلامی عدالتی نظام اور فیصلوں کے ساتھ موازنہ کیا جائے تو ان کا کم حیثیت اور کم قیمت ہونا عیاں ہو جاتا ہے۔ خاص طور پر مذکورہ ذیل فرق قابل غور ہیں:

۱۔ اسلام میں قاضی کا مسائل و احکام میں صاحب نظر ہونا ضروری ہے اور فقط قانونی مواد سے اس کی آگاہی کافی نہیں بلکہ ان مسائل و احکام کے اصول و مبانی کو از روئے اجتہاد جاننا اس کے لئے لازم ہے۔ دوسرے لفظوں میں مسئلہ قضاء میں اجتہاد شرط ہے جبکہ آج کی دنیا میں فقط مواد قانونی سے آگاہی کافی سمجھی جاتی ہے ان دونوں نقطۂ ہای نظر کے درمیان فرق واضح ہے۔

واضح تر الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ ان احکام سے آگاہی، جو مثلاً ''تحریر الوسیلۃ'' میں بیان کئے گئے ہیں، ممکن ہے کہ تقلیدی یا

---

[1] وسائل الشیعہ، ج۱۸، ص۱۵۷، باب ۲، از ابواب آداب القاضی۔

[2] وسائل الشیعہ، ج۱۸، ص۱۱، حدیث ۶۔

اجتہادی طریقہ سے ہو اگر چہ قاضی کی ذمہ داری بہر حال یہ ہے کہ وہ ان احکام اور ان مسائل کے درمیان مطابقت قائم کرے جن کا تعلق دعویٰ سے ہے اور اس (مطابقت) کا مقصد یہ ہے کہ صاحب حق کو غیر صاحب حق سے جدا کیا جائے۔

لیکن تقلیدی طور پر ''تحریر الوسیلۃ'' سے آگاہ ہونے اور اجتہادی طریقے سے آگاہ ہونے کے درمیان بہت زیادہ فرق ہے کیوں کہ اجتہادی طور پر آگاہی کے لئے ضروری ہے کہ مجتہد، ان تحریر شدہ احکام کے اصول کا قرآن، سنت، اجماع اور عقل کی روشنی میں سراغ لگائے (یعنی مثلاً کتاب تحریر الوسیلۃ میں درج شدہ احکام کی جانچ پڑتال کے لئے حدیث اور فقہ کی بڑی بڑی کتابوں کو کھنگالے اور فقہاء و محدثین کی آراء سے آگاہی حاصل کرے) اسلام اجتہادی طریقے کی تاکید کرتا ہے۔

۲۔آج دنیا کے عدالتی نظام میں قاضی پر، قضاوت و عدالت کے دائرے میں ہی اعتماد کرنا کافی سمجھا جاتا ہے، لیکن اسلام میں اتنی مقدار پر اکتفا کرنا کافی نہیں، بلکہ قاضی کو ہر جہت سے پاک ہونا چاہیے، چونکہ عدالت کا مطلب ہر قسم کے گناہ سے پرہیز کرنا ہے، چاہے وہ مسائل قضاوت کے دائرے میں ہوں یا نہ ہوں۔ واضح ہے کہ وہ شخص جو ہر حال میں گناہ سے پرہیز کرتا ہو اور جو کسی مخصوص دائرے میں پرہیزگار رہو، ان دونوں کے درمیان بہت فرق ہے، لہٰذا دوسرے شخص میں پہلے شخص کی نسبت لغزش اور خطا کا احتمال زیادہ ہے۔

۳۔آج دنیوی عدالتی نظام کے مطابق قاضی، اگر چہ لاعلمی کی صورت میں حق پر مبنی قضاوت کرے، ذمہ دار نہیں لیکن جیسا کہ مذکورہ بالا سطور میں اشارہ کیا گیا ہے، ایسا قاضی اسلامی نقطۂ نظر سے خدا کی بارگاہ میں جوابدہ ہے بلکہ حق کے مطابق فیصلے کے ساتھ ساتھ اس کے حق ہونے کی آگاہی بھی اس کے لئے ضروری ہے۔ (غور فرمائیں)

۴۔اسلام کے عدالتی نظام میں رشوت لینا نہ صرف گناہ کبیرہ ہے بلکہ بعض روایات کے مطابق کفر و شرک کی سرحد ہے۔ امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:

''اَمَّا الرَّشَاءُ فِي الْحُكْمِ فَهُوَ الْكُفْرُ بِاللّٰهِ''[1]

اسلام میں قاضی کے لئے تحفہ قبول کرنا بھی ممنوع ہے (البتہ یہ وہ تحفہ ہے جو قاضی کو اس کے منصب کی وجہ سے دیا جاتا ہے خواہ وہ قضاوت سے پہلے ہو یا بعد میں) اشعث بن قیس اور اس کا رات کے وقت حضرت علیؑ کے گھر تحفے کے طور پر حلوا لے کر آنے کا واقعہ مشہور ہے، جب آپؑ نے اس سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ تو اس نے جواب دیا: تحفہ اور ہدیہ ہے جو آپؑ کی خدمت میں لایا ہوں! یہ سن کر آپؑ سخت غضبناک ہوئے اور اسے مخاطب کر کے فرمایا:

''هَبَلَتْكَ الْهَبُولُ اَعَنْ دِيْنِ اللّٰهِ اَتَيْتَنِي لِتَخْدَعَنِي ؟!''

ترجمہ:'' وہ ماں جس کا بچہ مر گیا ہو تجھ پر روئے کیا تو دین خدا کی آڑ میں میرے پاس آیا ہے تا کہ مجھے

---

[1] وسائل الشیعہ، ج۱۸، ص ۱۶۳، باب تحریم الرشوہ، حدیث ۸۔

فریب دے سکے؟! (بظاہر تو نے اس حلوے کو تحفے کا نام دیا ہے جو درحقیقت رشوت ہے)۔"[۱]

قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ اسلام میں رشوت لینے اور دینے والا اور اسی طرح ان دو کے درمیان واسطہ بننے والا سب ذمہ دار اور ملعون ہیں، رسول اکرمؐ کی ایک حدیث ہے:

"لَعَنَ اللّٰهُ" "الرّاشِی" وِ "الْمُرْتَشِی" "وَالرّائِشَ الَّذِی بَیْنَهُما"[۲]

قرآن مجید کی بھی بعض آیات میں کئی بار رشوت خوری کے مسئلے کی طرف اشارہ کرکے اس کی مذمت کی گئی ہے۔ ان آیات میں سے ایک سورۂ بقرہ کی آیت ۱۸۸ ہے جس میں فرمایا گیا ہے:

"وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ"

یہ آیت جس میں تمام دنیا کے مسلمانوں کو مخاطب کرکے حکم دیا گیا ہے کہ "ایک دوسرے کے اموال کو آپس میں بذریعہ باطل اور ناحق مت کھاؤ اور بذریعہ گناہ لوگوں کے مال کا حصہ ہڑپ کرنے کے لئے اس کا ایک حصہ بطور رشوت قضات کو نہ دو حالانکہ تم جانتے ہو کہ (یہ عمل گناہ ہے)۔

فخر رازی نے اس مقام پر ایک دلچسپ تعبیر ذکر کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ "اِدْلاء" کا مادہ "دَلْو" ہے اور "دَلْو" اس ظرف کو کہتے ہیں جس کے ذریعے کنویں سے پانی کھینچ کر نکالا جاتا ہے اور رشوہ کا مادہ بھی رشاء ہے جس کا معنی رسی ہے پس جس طرح پانی سے بھرے ہوئے ڈول کو رسی کے ذریعے اوپر کھینچتے ہیں، رشوت دینے والے بھی لوگوں کے مال کو رشوت کے ذریعے اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ جی ہاں! "وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ" سے تعبیر کرنا اس موضوع کی طرف ایک لطیف اشارہ اور تشبیہ ہے۔

سورۂ مائدہ کی آیت ۴۴ سے بھی استفادہ ہوتا ہے کہ علماء یہود اپنے مخصوص منافع کی خاطر احکام الٰہی کو تبدیل کر دیتے تھے اس مسئلے کی سخت مذمت کرتے ہوئے قرآن فرماتا ہے:

وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝۴۴

"میری آیات تھوڑی سی قیمت کے بدلے مت فروخت کرو اور وہ لوگ جو خدا کے نازل کردہ احکام پر عمل نہیں کرتے، کافر ہیں!"

ان آیات سے بخوبی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ قضاوت اور حکم پہلے درجے میں خدا کے لئے ثابت ہے اور اس کے بعد وہ جس کو مصلحت سمجھے، منتقل کر دے دوسرے الفاظ میں خدا کے علاوہ دوسرے لوگ اپنے احکام و قضاوت کا جواز خدا ہی سے حاصل کرتے ہیں اور توحید افعالی اور (توحید) حاکمیت بھی یہی تقاضا ہے۔ (غور فرمائیں)

---

[۱] نہج البلاغہ، خطبہ ۲۲۴۔

[۲] میزان الحکمۃ، ج ۴، ص ۱۴۵۔

اسلامی حدود وتعزیرات

اسلامی عدالتی نظام کے موضوع پر بحث کے ذیل میں ضروری ہے کہ مسئلہ حدود وتعزیرات کی طرف بھی ایک سرسری اشارہ ہونا چاہیے (البتہ اس کی وسیع بحث کے لئے ایک علیحدہ کتاب یا کئی کتابیں تحریر کرنے کی ضرورت ہے) یہ بحث درحقیقت اسلام میں عدالت کے مسئلے کی تکمیل کنندہ بحث ہے کیونکہ قاضی کی ذمہ داری، اثبات حقوق اور حدود کو جاری کرنا ہے تاکہ وہ تجاوز کرنے والوں کو ان کی پہلی جگہ پر لا بٹھائے اور منحرف اور طرح طرح کی آلودگیوں سے آلودہ افراد کو تنبیہ کرے۔ یہاں چند موضوعات قابل توجہ ہیں۔

ا۔اسلام میں حدود وتعزیرات کا فلسفہ

اس میں شک نہیں کہ احکام الٰہی اس وجہ سے وضع کئے گئے ہیں کہ لوگوں کو عدل وانصاف اور امن وامان کی راہ کی طرف ہدایت کی جائے تاکہ افراد انسان کسب فضائل، نفی رذائل اور سیر الی اللہ اور قرب الٰہی کے باعث اپنی تخلیق کے اعلیٰ مقصد تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکیں۔ اور چونکہ احکام الٰہی بطور تنہا تمام نفوس پر اثر انداز نہیں ہوتے لہٰذا بشارت کے ہمراہ انذار (ڈرانے) کا عمل بھی ضروری ہے تاکہ یہ انذار لوگوں کی حرکت اور انجام عمل کا باعث بن سکے۔

چونکہ اخروی بشارتیں اور انذار، بعض لوگوں کو بُرے اعمال سے روکنے اور انفرادی ومعاشرتی ذمہ داریاں انجام دینے پر اکسانے کے لئے کافی نہیں لہٰذا ان لوگوں کے لئے جو حدود الٰہی سے تجاوز کرتے اور حق وعدالت کو پامال کرتے ہیں، دنیوی سزا کا ہونا لازم ہے، تاکہ یہ دنیوی سزائیں ان لوگوں کے لئے جو تربیت دینی اور بقدر کافی تقویٰ الٰہی سے محروم ہوتے ہیں، احکام کو جاری اور نافذ کرنے کا ضامن ثابت ہوں۔

بے شک وشبہ نظام اسلامی اور غیر اسلامی ومادی نظاموں کے درمیان اس لحاظ سے فرق ہے چونکہ دنیوی اور مادی نظاموں میں دنیوی اور مادی سزاؤں کے علاوہ کوئی چیز ایسی نہیں جو ان کو لاگو کرنے کی ضمانت دے (یعنی اگر کوئی شخص اس جرم کا ارتکاب کرے گا تو اسے یہ سزا ملے گی، پس مادی اور دنیوی سزا قانون کے نفاذ اور اسے جاری کرنے کی واحد ضامن، لہٰذا ہر وہ حکم اور قانون جس میں قانون کی خلاف ورزی کرنے والے کے لئے کوئی سزا نہ ہو، ان کی نظر میں حکم اور قانون شمار نہیں ہوتا بلکہ اسے فقط ایک اخلاقی تاکید کا نام دیتے ہیں۔

جبکہ اسلامی اور دینی نظام میں قلبی اعتقادات، معنوی معاہدے (جن کی پابندی لازم ہے) قیامت میں اللہ کی عظیم عدالت میں پیش ہونے پر ایمان اور یہ عقیدہ کہ دنیا میں ہر انسان کے عمل کا خدا نگران ہے، وہ اہم محرکات ہیں جو قوانین اسلامی کے نفاذ کے اہم اور قوی ضامن ہیں لیکن چونکہ یہ الٰہی محرکات بطور تنہا سارے انسانوں پر اثر انداز نہیں ہوتے لہٰذا مذکورہ اعتقادی ضمانت کے ساتھ ساتھ مادی ضمانت اور دنیوی سزاؤں کا ہونا بھی ضروری ہے۔ شارع مقدس نے مجرموں کو سزا دینے اور ان پر شرعی حد جاری کرنے کو بے حد اہمیت دی

ہے۔کئی روایات میں وارد ہوا ہے:

"حَدٌّ یُقامُ فِی الاَرْضِ اَزْکی مِنْ مَطَرِ اَرْبَعینَ لَیْلَةً وَاَیّامِها"

''زمین پر جاری کی جانے والی ایک شرعی حد چالیس روز وشب کی بارش سے زیادہ ثمر بخش اور مفید ہے!''

یہ حدیث رسول اکرمؐ، امام باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ سے بھی نقل کی گئی ہے اور بعض متون میں "اَزْکی" کی بجائے "اَفْضَل" یا "اَنْفَع" کے کلمات استعمال ہوئے ہیں۔[1]

آیت شریفہ ''...یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا'' (سورۂ روم/۱۹) کی تفسیر میں امام موسیٰ کاظمؑ ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

"لَیْسَ یُحییها بِالْقَطرِ وَلکِنْ یَبْعَثُ اللهُ رِجالاً فَیُحْیونَ الْعَدْلَ فَتُحْیَی الاَرْضُ لِاِحْیاءِ الْعَدلِ، ثُمَّ قالَ: "وَلَاِقامَةُ الْحَدِّ فیهِ اَنْفَعُ فِی الاَرْضِ مِنَ الْقَطرِ اَرْبَعینَ صَباحاً"

''خدا زمین کو فقط بارش کے ذریعے زندہ نہیں کرتا بلکہ وہ کچھ افراد کو مبعوث کرتا ہے جو عدالت وانصاف کو زندہ کرتے ہیں، اس کے بعد زمین، عدالت کے زندہ ہونے کے باعث زندہ ہو جاتی ہے اس کے بعد امامؑ مزید فرماتے ہیں: یقیناً عدالت قائم کرنے کے لئے ایک حد کو جاری کرنا زمین پر چالیس دن تک برسنے والی بارش سے کہیں زیادہ نفع بخش ہے!''[2]

ایک حد کو جاری کرنا کیوں کر چالیس روز وشب کی بارش سے زیادہ نفع بخش، افضل اور ازکی (پاکیزہ تر) نہ ہو جبکہ معاشرے کی سلامتی، اس کا امن وامان اور اس کی برقراری وثبات ہر خیر وبرکت کی اصل واساس ہے، اس لئے کہ پر برکت بارشوں، نعمتوں کی فراوانی اور اقتصادی فوائد ومنافع کا حصول امن وامان کے بغیر ممکن نہیں اور معاشرتی امن وامان، اثبات حقوق اور حدود کو جاری کئے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ امن وامان کے مفقود ہونے کی صورت میں لوگ ایک دوسرے کی جان کے درپے ہو جاتے ہیں اور ظلم وفساد پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔

جس کی وجہ سے شہر ویران اور بندگان خدا کمزور سے کمزور تر ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے کعبے کی بنیاد رکھی (یا اس کی تجدید کی) اور اس سرزمین کے بارے میں خدا سے چند تقاضے کئے جن میں سے ایک تقاضا یا دعا مکہ کے امن وامان کے بارے میں تھی، آپؑ نے عرض کی:

رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ط

---

[1] وسائل، ج۱۸، باب ۱، از ابواب مقدمات حدود، حدیث ۲، ۳، اور ۴۔

[2] وسائل، ج۱۸، باب ۱، از ابواب مقدمات حدود، حدیث ۳

''اے میرے رب! اس سرزمین کو شہر امن قرار دے اور اس کے رہنے والوں کو جو خدا اور روز آخرت پر ایمان رکھیں، طرح طرح کے پھلوں سے رزق عطا کر۔''[1]

اس طرح حضرت ابراہیم ؑ نے امن وامان کو انواع واقسام کے رزق سے پہلے خدا کی بارگاہ سے طلب کیا، کیونکہ آپؑ جانتے تھے کہ امن وامان کی نعمت کے بغیر دوسرے عطیات ربانی سے استفادہ ممکن نہیں۔

۲۔حدو تعزیر کا مطلب

''حدود''؛ حد کی جمع ہے جس کا لغت میں معنی ہے ''منع''۔شرعی سزاؤں میں سے بعض کو ''حدود'' کے ساتھ موسوم کرنا اس وجہ سے ہے کہ یہ لوگوں کو مجرمانہ افعال سے منع کرنے کا سبب بنتی ہیں، لیکن فقہاء کے الفاظ میں یہ ایک شرعی اصطلاح کی حیثیت سے ایک مخصوص سزا کے معنی میں ہے کہ جو بعض گناہوں کے ارتکاب کی وجہ سے مکلف افراد پر جاری کی جاتی ہیں۔رہی بات ''تعزیر'' کی تو لغت میں یہ لفظ ''تأدیب'' اور کبھی ''بزرگ شمار کرنے، مدد کرنے اور منع کرنے'' کے معانی میں بھی استعمال ہوا ہے اور اصطلاح فقہاء میں اس سے مراد وہ سزا یا اہانت (توہین) ہے کہ شریعت میں اس کی کوئی خاص مقدار معین نہیں کی گئی اور یہ قاضی کی صوابدید پر منحصر ہے کہ وہ جرم کی حیثیت، اور مجرم کی قوت برداشت کو پیش نظر رکھ کر اسے تعزیر کرے۔

اس بناء پر ''حد'' اور ''تعزیر'' کے درمیان فرق کو صرف ایک جملے میں بیان کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ ''حد'' ایک معین اور ثابت سزا ہے لیکن تعزیر کی مقدار غالباً معین نہیں ہوتی اور ہم نے جو ''غالباً'' کہا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ چند موارد میں روایات کی رو سے تعزیرات معین ہیں جن کی شرح وتفصیل کتاب الحدود میں بیان کی گئی ہے اگر چہ اس مسئلے میں بھی اختلاف ہے کہ ان موارد میں مقدار تعزیر کا معین ہونا قطعی ہے یا بیان مقدار مثال ومصداق کے طور پر ہے۔[2]

۳۔حدود اسلامی کی تعداد

اسلام میں گناہ کبیرہ کے بارے میں دس حدود بیان کی گئی ہیں کہ جن میں سے چار مقدمات کو قرآن مجید میں واضح طور پر ذکر کیا گیا ہے جبکہ بقیہ (حدود) کا سنت سے استفادہ ہوتا ہے۔

(ا) حدّ زنا

سورۂ نور کی آیت ۲ میں مذکور ہے:

---

[1] سورہ بقرہ۔۱۲۶

[2] قواعد شہید، ج ۲، ص ۱۴۲

اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیۡ فَاجۡلِدُوۡا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنۡہُمَا مِائَۃَ جَلۡدَۃٍ ۪ وَّلَا تَاۡخُذۡکُمۡ بِہِمَا رَاۡفَۃٌ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اِنۡ کُنۡتُمۡ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ ۚ وَلۡیَشۡہَدۡ عَذَابَہُمَا طَآئِفَۃٌ مِّنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۲﴾

''زنا کار مرد و عورت میں سے ہر ایک کو سو تازیانے مارے جائیں اور اگر تم خدا اور روز جزا پر ایمان رکھتے ہو تو ان کی نسبت تمہاری جھوٹی محبت اور الفت حکم الٰہی جاری کرنے میں مانع نہیں ہونی چاہیے! (علاوہ ازیں) ضروری ہے کہ مؤمنین کی ایک تعداد ان دونوں کی سزا کا مشاہدہ کرے!''

اس آیت میں زنا کار عورت اور مرد کی حدّ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اگرچہ بعض مستثنیٰ صورتوں اور جزئیات جیسے شادی شدہ عورت اور مرد کا زنا اور محرم عورت کے ساتھ زنا اور اس طرح کی اور باتیں آیت شریفہ میں مذکور نہیں بلکہ یہ ساری تفصیلات سنت اور روایات سے معلوم ہوتی ہیں۔

(۲) چوری کی حدّ

سورۂ مائدہ کی آیت ۳۸ میں مذکور ہے:

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَۃُ فَاقۡطَعُوۡۤا اَیۡدِیَہُمَا جَزَآءًۢ بِمَا کَسَبَا نَکَالًا مِّنَ اللّٰہِ ؕ وَاللّٰہُ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ ﴿۳۸﴾

''چور مرد اور عورت کا ہاتھ ان کے اس بدعمل (چوری) کی وجہ سے خدا کی طرف سے سزا کے طور پر قطع کر دیا جائے اور خدا عزیز و حکیم ہے۔''

اس معاملے میں بھی چور کا ہاتھ کاٹنے سے متعلق بعض مستثنیٰ صورتیں موجود ہیں جن کا ذکر سنت اور روایات میں موجود ہے اور معلوم ہے کہ قرآن کی روش یہ ہے کہ وہ اصولی مسائل کو بیان کرتا اور ان کی تفصیل کو سنت کے حوالے کر دیتا ہے۔

(۳) حدّ قذف

ان لوگوں کی سزا سے متعلق، جو پاکدامن افراد کی طرف پاکدامنی کے منافی عمل کو منسوب کرتے ہیں (یعنی ان پر تہمت لگاتے ہیں) سورۂ نور کی آیت ۴ میں یہ فرمایا گیا ہے:

وَالَّذِیۡنَ یَرۡمُوۡنَ الۡمُحۡصَنٰتِ ثُمَّ لَمۡ یَاۡتُوۡا بِاَرۡبَعَۃِ شُہَدَآءَ فَاجۡلِدُوۡہُمۡ ثَمٰنِیۡنَ جَلۡدَۃً وَّلَا تَقۡبَلُوۡا لَہُمۡ شَہَادَۃً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ﴿۴﴾

یعنی: ''وہ لوگ جو پاکدامن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں اور پھر اپنے مدعا (دعویٰ) پر چار گواہ نہیں لاتے،
انھیں اسی (۸۰) کوڑے لگائے جائیں اور ان کی شہادت ہرگز قبول نہ کی جائے، یہی لوگ تو فاسق ہیں!'
یہ سخت سزا جو تہمت لگانے والے افراد (جو پاکدامن افراد کی طرف پاکدامنی کے منافی عمل کی نسبت دیتے ہیں) کے لئے اس وجہ سے بیان کی گئی ہے کہ ایسی کڑی اور سخت سزائیں ہی معاشرے کی پاکیزگی اور انسان کی عزت واحترام کی حفاظت کرسکتی ہیں اسی طرح ان سزاؤں ہی کی وجہ سے فواحش اور فساد کے پھیلنے کا راستہ روکا جاسکتا ہے، اس مسئلے کی شرائط خصوصیات اور مستثنیٰ صورتوں کو بھی احادیث وروایات میں بیان کیا گیا ہے۔

(۴) حدّ محارب

قرآن مجید میں ان لوگوں کے لئے جو معاشرے کے امن میں خلل ڈالتے اور وہ لوگ جو لوگوں کے جان ومال اور ناموس پر مسلح انداز میں حملہ کرتے ہیں بہت سخت سزائیں بیان کی گئی ہیں جن کی وجہ سے اہل شر افراد کے شر سے محفوظ رہا جاسکتا ہے۔سورۂ مائدہ کی آیت ۳۳ میں ارشاد خدا تعالیٰ ہے:

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ؕ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۳۳﴾

''وہ لوگ جو خدا اور اس کے رسولؐ کے ساتھ جنگ کرتے اور (دھمکی اور اسلحہ کے ساتھ) لوگوں کے جان ومال اور ناموس پر حملہ کرتے ہیں، ایسے لوگوں کی سزا یہ ہے کہ انھیں قتل کیا جائے یا سولی پر لٹکایا جائے یا ان کے دائیں ہاتھ کی چار انگلیاں اور بایاں پاؤں یا اس کے برعکس کاٹ دیا جائے یا انھیں ان کی سرزمین سے جلاوطن کردیا جائے، یہ رسوائی ان کے لئے دنیا میں ہے اور آخرت میں ایک عظیم عذاب ان کے لئے تیار کیا گیا ہے!''

جیسا کہ مذکورہ بالا سطور میں اشارہ کیا گیا ہے، محارب سے مراد وہ شخص ہے جو اسلحہ کے ساتھ لوگوں کو دھمکا کر ان کی جان یا مال اور ناموس پر حملہ کرے، یہ حملہ بصورت راہزنی یا شہروں کے اندر چاقو وغیرہ کے ذریعے لوگوں کے جان ومال اور ناموس پر حملے کی صورت میں ہوسکتا۔ ایسے راہزنوں اور چاقو استعمال کرنے والوں کی یہی سزا ہے۔قابل توجہ بات یہ ہے کہ لوگوں کے جان واموال اور عزت وناموس پر حملہ کرنے والوں کو خدا اور رسولؐ سے جنگ کرنے والے قرار دیا گیا ہے اور یہ دلیل ہے اس بات کی کہ اسلام نے معاشرہ کے امن وامان، آزادی اور حقوق انسانی کی رعایت کی زبردست اور غیر معمولی تاکید کی ہے۔آیا یہ چار اقسام کی سزائیں (اسلحے کے ذریعے قتل، سولی پر لٹکانا،

انگلیاں اور پاؤں کاٹنا) بصورت اختیاری ہیں یعنی قاضی ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرسکتا ہے؟ یا بصورت معین ہیں یعنی ان میں سے ہر ایک مخصوص جرم کے متناسب اور اس کے مقابلے میں ہے۔اس ترتیب سے کہ:

وہ محاربین جنھوں نے بے گناہ لوگوں کو قتل کیا ہے، کی سزا قتل ہے اور وہ جنھوں نے لوگوں پر حملہ کر کے ان کے اموال لوٹے ہیں ان کی سزا انگلیاں کاٹنا ہے۔قتل اور لوٹ مار دونوں میں ملوث ہونے کی صورت میں سزا قتل ہے اور لوگوں کی عبرت کی خاطر وہ سولی پر لٹکائے جائیں گے اور وہ (محاربین) جنھوں نے لوگوں کو ڈرانے کے لئے ان پر اسلحہ تانا ہوا ور قتل وغیرہ کا ارتکاب نہ کیا ہو تو ان کی سزا جلاوطنی ہے۔ اس بارے میں فقہاء کے درمیان مفصل بحث وگفتگو ہے جس کی تفصیل یہاں بیان نہیں کی جاسکتی؛ اس سے متعلق تفصیلی گفتگو کے لئے کتب فقہی کی (کتاب حدود، بحث''حدّ محارب'') کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔) نیز کتب تفسیر خاص طور پر تفسیر نمونہ اس سلسلے میں مفید ومعاون ثابت ہوسکتی ہے۔[1]

ان چار حدود کا تذکرہ آیات قرآنی میں کیا گیا ہے مگر وہ چھ حدود جن کا ذکر فقط سنت (احادیث) میں ہوا ہے، ان کا بیان درج ذیل ہے:

(۵) حدّ مرتد

مرتد سے مراد ایسا شخص ہے جو اسلام قبول کرنے کے بعد اس سے پلٹ جائے اور اسلام سے اپنی علیحدگی کا اعلان کرے؛ ایسے فرد کے لئے اسلام میں سخت سزا تجویز کی گئی ہے۔اس سزا کی حکمت اور فلسفے کے بارے میں ہم بعد میں اشارہ کریں گے۔قرآن مجید میں ان کی شدید مذمت اور ان کے لئے خدا تعالیٰ کے عذاب عظیم ہی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور سزا دینے کی کیفیت ذکر نہیں کی گئی۔سورۂ نحل کی آیت ۱۰۶ میں ارشاد فرماتا ہے:

مَنۡ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنۡۢ بَعۡدِ اِيۡمَانِهٖۤ اِلَّا مَنۡ اُكۡرِهَ وَقَلۡبُهٗ مُطۡمَٮِٕنٌّۢ بِالۡاِيۡمَانِ وَلٰـكِنۡ مَّنۡ شَرَحَ بِالۡكُفۡرِ صَدۡرًا فَعَلَيۡهِمۡ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ‌ۚ وَلَهُمۡ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ ﴿۱۰۶﴾

ترجمہ:''وہ لوگ جو اسلام وایمان لانے کے بعد کافر ہوگئے، سوائے ان لوگوں کے جن پر دباؤ ڈالا گیا (اور انھوں نے ظاہری طور پر اسلام سے جدائی کا اظہار کیا) حالانکہ ان کے دل ایمان سے مطمئن ہیں اور! جن لوگوں نے اپنے سینے کو کفر کی قبولیت کے لئے وسیع کرلیا ہے ایسے لوگوں پر خدا کا غضب اور ایک عظیم عذاب ان کے انتظار میں ہے۔''

ایک اور مقام پر فرماتا ہے:

كَيۡفَ يَهۡدِى اللّٰهُ قَوۡمًا كَفَرُوۡا بَعۡدَ اِيۡمَانِهِمۡ وَشَهِدُوۡۤا اَنَّ الرَّسُوۡلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ

[1] تفسیر نمونہ، ج ۴، ص ۳۶۰، ذیل آیت مورد بحث۔

الْبَيِّنٰتُ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۶﴾ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۷﴾

”خدا تعالیٰ اس قوم کی جس نے ایمان اور رسول خداؐ کی حقانیت کی گواہی دینے اور اپنے پاس روشن دلیلیں آ جانے کے بعد بھی کفر اختیار کیا، کیسے ہدایت کرسکتا ہیں ان کی سزا یہ ہے کہ خدا فرشتوں اور سب لوگوں کی ان پر لعنت ہے۔“ [۱]

جیسا کہ کہا گیا ہے کہ آیات قرآن میں مرتد کی حد کی طرف کوئی اشارہ موجود نہیں، لیکن دردناک اور شدید عذاب جوان کے لئے ثابت ہے اجمالی طور پر دنیا کی سخت سزا کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔ فقہاء کے درمیان مشہور یہ ہے کہ مرتد اگر فطری ہو (یعنی اس کا نطفہ اس حال میں ٹھرا ہو کہ اس کے ماں باپ یا کم از کم ان میں سے ایک مسلمان ہو) تو اس کی سزا قتل ہے اور اس کا توبہ کرنا بھی قبول نہیں (بشرطیکہ وہ مرد ہو) اور اگر مرتد ملی ہو یعنی غیر مسلم ماں باپ سے پیدا ہوا ہو تو سب سے پہلے اس کے سامنے توبہ کرنے کی تجویز پیش کی جائے گی۔ پس اگر وہ توبہ کر لیتا ہے تو اس کے لئے کوئی سزا نہیں، بصورت دیگر (یعنی توبہ نہ کرنے کی صورت میں) اس کی حدّ قتل ہے۔

وہ لوگ جن کا حکم مرتد کا سا ہے ایسے لوگ ہیں جو نعوذ باللہ رسول اکرمؐ کو گالی دیں۔ آنحضرتؐ کے بارے میں ناشائستہ الفاظ استعمال کریں اور آپؐ کی توہین کے مرتکب ہوں، اسی طرح آئمہ معصومینؑ اور جناب فاطمہ زہراء × کے بارے میں بھی ایسے ناشائستہ افعال کا مرتکب بھی مرتد کے حکم میں آتا ہے۔ درحقیقت یہ فعل ارتداد (مرتد ہونے) کے اسباب میں سے ایک سبب ہے لہٰذا اسے بصورت حد علیحدہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں اگرچہ بعض فقہاء نے کتاب حدود میں اس مسئلے کو مستقل اور جداگانہ طور پر بیان کیا ہے۔ منابع اسلامی میں چند خاص روایات بھی موجود ہیں جو ایسے (ناشائستہ افعال کے مرتکب) افراد کا خون مباح قرار دیتی ہیں۔ [۲]

مرتد کے بارے میں اس قدر سختی کیوں؟

اسلام ان لوگوں کے بارے میں کوئی سخت گیری نہیں کرتا جو ابھی تک مشرف باسلام نہیں ہوئے بلکہ انھیں منطقی طریقے اور مسلسل تبلیغ کے ذریعے اسلام کی طرف دعوت دیتا ہے۔ اگر وہ دعوت اسلام قبول نہیں کرتے اور ذمیوں کی شرائط کے مطابق مسلمانوں کے ساتھ صلح وصفائی کے ساتھ رہنا پسند کریں تو اسلام نہ صرف یہ کہ انھیں امان دیتا ہے بلکہ ان کی جان و مال اور جائز منافع کی حفاظت کی بھی ضمانت فراہم کرتا ہے۔

لیکن ان لوگوں کے بارے میں اسلام کا رویہ نہایت سخت ہے جو اسلام قبول کر لینے کے بعد اس سے پھر جاتے ہیں کیونکہ ان کا یہ عمل معاشرۂ اسلامی کی بنیادوں کو متزلزل کر دینے کا سبب بنتا اور حکومت اسلامی کے خلاف ایک قسم کی بغاوت شمار ہوتی ہے اور غالباً یہ عمل ان

---

[۱] سورۂ آل عمران/۸۶/۸۷

[۲] وسائل، ج۱۸ص۴۵۸، کتاب الحدود، باب ۲۵، حدیث ۱ تا ۴ اور باب ۲۷ص۴۶۱، حدیث ۱ تا ۶۔

کی بدنیتی کا عکاس ہوتا ہے۔

لہٰذا جیسا کہ اشارہ کیا گیا ہے کہ ایسا (مرتد) شخص جس کے والدین اس کے نطفے کے انعقاد کے وقت مسلمان ہوں اور سادہ تر الفاظ میں مسلمان زادہ ہو اور اسلام سے پھر جائے اور اس پھر جانے کو علانیہ ظاہر کرے اور عدالت اسلامی میں اس کا اسلام سے برگشتہ ہونا پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے تو ایسی صورت میں اسلام اس کا خون مباح قرار دیتا ہے پس اس کے اموال اس کے مسلمان ورثاء کے درمیان تقسیم ہو جاتے ہیں اور اس کی زوجہ اس سے جدا ہو جاتی ہے اور بظاہر اس کی توبہ بھی قبول نہیں ہوتی یعنی یہ تینوں احکام اس کے بارے میں بہر حال جاری ہوں گے لیکن اگر وہ واقعاً نادم اور پشیمان ہو جاتا ہے تو اس صورت میں اس کی توبہ خدا کی بارگاہ میں قابل قبول ہوگی (البتہ اگر مجرم عورت ہو تو اس کی توبہ بہر حال قبول کی جائے گی اور اس کے بارے میں قتل کا حکم صادر نہیں ہوگا) اور اگر وہ پشیمان نہ ہو لیکن ظاہری طور پر اپنے ارتداد کے بارے میں کوئی گفتگو بھی نہ کرے تو کسی کو اس سے کوئی غرض نہیں (اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے گا)۔

اگر اسلام سے پھر جانے والا شخص مسلمان زادہ نہ ہو تو اس صورت میں اسے توبہ کرنے کا پابند کیا جائے گا، توبہ کر لینے کی صورت میں اس کی توبہ قبول کی جائے گی اور وہ تمام سزاؤں سے بری ہو جائے گا اور توبہ نہ کرنے کی صورت میں اس پر حد جاری ہوگی (ان تمام صورتوں میں اس کی ظاہری توبہ کافی ہے اور ہم اس بات پر مامور نہیں کہ اس کے باطن کا بھی کھوج لگائیں) مرتد فطری کا سیاسی حکم ان لوگوں کی نظر میں جو اس کے مضمون اور حکمت سے آگاہ نہیں، ممکن ہے کہ ایک قسم کی خشونت اور سختی ہو اور اپنے عقیدے کو دوسروں پر مسلط کرنے اور اسے آزادی سے محروم کرنے کے مترادف ہو۔

لیکن اگر ہم اس حقیقت کو پیش نظر رکھیں کہ یہ احکام فقط ان لوگوں کے لئے ثابت ہیں جو اپنے ان فاسد اور باطل عقائد کا برملا اظہار کرتے اور ان کی تبلیغ کا مشن اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں اور اس طرح حکومت اسلامی کے خلاف قیام کرتے ہیں اس کے برعکس یہ احکام ان لوگوں کے لئے نہیں ہیں جو اپنے فاسد عقائد کو اپنے باطن میں چھپائے رکھتے ہیں اور ان کا اظہار نہیں کرتے، تو اس صورت میں واضح ہو جاتا ہے کہ یہ سختی بلاوجہ نہیں اور آزادی فکر کے بھی منافی نہیں اور اس کے مشابہ قوانین، شرق و غرب کے کئی ایک ممالک میں مختلف صورتوں میں موجود ہیں جن کے باعث حکومت ان کے خلاف قیام کرنے والے افراد کا خون مباح قرار دیتی ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ اسلام قبول کرنا عقل و منطق کے مطابق ہونا چاہیے۔ خاص طور پر وہ شخص جو مسلمان ماں باپ سے پیدا ہوا اور ایک اسلامی ماحول میں پروان چڑھا ہو، ایسے شخص کی نسبت بہت بعید نظر آتا ہے کہ اسلام اور اس کے احکامات اس کے لئے معین و واضح نہ ہوں، اسی طرح اس کا اسلام سے برگشتہ ہونا ایک سازش اور خیانت ہے نہ یہ کہ ہم اس کے ارتداد کو اس کی غلطی اور حقیقت سے ناآشنائی قرار دیں لہٰذا ایسا شخص اس قسم کی سزا کا بالکل مستحق ہے۔ قرآن مجید سورۂ آل عمران کی آیت ۷۲ اور ۷۳ میں ایک گروہ کے بارے میں فرماتا ہے کہ اس (گروہ) نے ایک منصوبہ بندی سے سازش کے تحت پہلے قبول اسلام کا اظہار کیا، بعدازاں جب اسے اسلام میں کوئی قابل ذکر چیز نظر نہ آئی تو اس (گروہ) نے اسلام کو چھوڑ کر اس سے دوری اختیار کی، مقصد اس کا یہ تھا کہ اس طریقے سے اہل ایمان کے ایمان کو متزلزل کیا جائے۔ سورۂ آل عمران کی آیت ۷۲ میں ہے:

وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ﴿۷۲﴾

یہودیوں کے ایک گروہ نے کہا: (جائیں اور ظاہری طور پر) جو کچھ اہل ایمان پر نازل کیا گیا ہے، دن کے آغاز میں اس پر ایمان لائیں اور دن کے ختم ہونے پر کافر ہو جائیں (اور پہلی حالت کی طرف پلٹ جائیں، اس لئے کہ لوگ تمہیں اہل کتاب اور آسمانی بشارتوں سے آگاہ سمجھتے ہیں اور یہ کام انھیں (اہل ایمان کو) متزلزل کرنے کے لئے کافی ہے)۔

مختصر یہ کہ:

اولاً: مرتد فطری کی توبہ کا حکم ان افراد کے ساتھ مختص ہے جو مرد اور مسلمان زادہ ہوں اور آغاز سے ہی اسلام قبول کر لیں اور بعد از اں اس سے پھر جائیں لیکن جو شخص اسلام کو آغاز بلوغت سے قبول نہیں کرتا، اس کے لئے مرتد کا حکم ثابت نہیں۔

ثانیاً: وہ لوگ جو تحقیق میں مشغول ہوں ان کے لئے بھی یہ حکم ثابت نہیں یہاں تک کہ اگر وہ اپنی تحقیق کے نتیجے میں اسلام کی بجائے کسی دوسرے آئین (دین) کی طرف مائل ہو جائیں، بشرطیکہ اسلام کے خلاف بات نہ کریں، تو ایسے لوگ بھی ان سزاؤں کے مستحق نہیں۔

ثالثاً: جب کبھی مرتدین سے چشم پوشی کرتے ہوئے ان کے مقابلے میں خاموشی اختیار کی جائے تو اس بات کا خوف رہتا ہے کہ ان کے بعض گروہ (صدر اسلام میں موجود یہودیوں کی طرح) مسلمانوں کے خلاف سازشوں کے جال پھیلائیں گے اور لوگوں کے عقائد کی بربادی اور حکومت اسلامی کے خلاف قیام کی خاطر اپنے ارتداد کے اظہار کو وسیلہ بنائیں گے، یہی وہ مقام ہے جہاں سے ایک عظیم افراتفری اور بحرانی صورتحال کا اسلامی معاشرے میں داخل ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ تخریبی سرگرمیاں عام طور پر بہت جلدی اپنا اثر دکھاتی ہیں، اسلام نے ایسے عمل (مرتد ہونے) کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے اور اس کے مقابلے میں بے حد سخت ردعمل ظاہر کیا ہے۔

(۶) شراب پینے کی حدّ

قرآن مجید کی کئی آیات میں شراب خوری کے گناہ ہونے اور اس کی برائی کے غیر معمولی ہونے کی بحث کی ہے، لیکن حدّ شراب کو بیان نہیں کیا گیا، لیکن احادیث میں اس کی حدّ اسی تازیانے بیان کی گئی ہے۔ برید بن معاویہؒ کی امام جعفر صادقؑ سے مروی ایک حدیث میں ہے:

"اِنَّ فِی کِتابِ عَلِیٍّ یُضْرَبُ شارِبُ الْخَمْرِ ثَمانِینَ وَ شارِبُ النَّبیذِ ثَمانِینَ"

"وہ کتاب جو امیر المؤمنینؑ کی تحریر اور رسول اکرمؐ کے املا کا نتیجہ ہے، اس میں تحریر ہے کہ جو کوئی شراب

پیئے اسی طرح جو شخص نبیذ پیئے دونوں کو اسّی اسّی (۸۰) تازیانے مارے جائیں۔" [1]

(خمر؛ شراب انگور جبکہ نبیذ؛ کھجور سے تیارہ کردہ شراب کو کہتے ہیں اور کبھی نبیذ یا دونوں کو ایک وسیع تر معنی میں استعمال کیا جاتا ہے)۔ بعض روایات میں بیان ہوا ہے کہ شراب خور کی سزا اسی تازیانے اس لئے مقرر کی گئی ہے کہ جب کوئی شراب پیتا ہے تو مست ہو جاتا ہے اور اس حال میں وہ ناروا باتیں کرتا اور لوگوں کی ناموس پر تہمتیں لگاتا ہے۔ اسی وجہ سے حدّ قذف (تہمت) اس پر جاری کی جاتی ہے۔ [2]

(۷) حدّ اغلام

قرآن مجید میں اس عمل کی برائی اور اس کے ایک عظیم گناہ ہونے کو قوم لوط سے متعلق قصے میں بیان کیا گیا ہے اور بعض مفسرین کی رائے میں سورۂ نساء کی آیت نمبر ۱۶ میں اجمالی طور پر اس کی حدّ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، ارشاد ربانی ہے:

وَالَّذٰنِ يَأْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿١٦﴾

"اور وہ لوگ جو نہایت برے کام (لواط) کو انجام دیتے ہیں انھیں اذیت دی جائے اور اگر توبہ کر کے اپنی اصلاح کریں تو ان سے اعراض اور درگزر کیا جائے، اس لئے کہ خدا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔"

البتہ یہ مطلب اس صورت میں ہے جب "الَّذَانِ" سے مراد دو مرد اور "يَأْتِيَانِهَا" میں ضمیر "ها" سے لواط کی طرف اشارہ ہو، حالانکہ یہ ضمیر کلمہ فحشاء کی طرف پلٹتی ہے جو اس سے پہلے والی آیت میں ذکر ہوا ہے اور جو زنا کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ بہر حال اغلام اور ہم جنس پرستی کی حدّ روایات اسلامی کے مطابق قتل ہے، بشرطیکہ دخول ہوا ہو اور دخول نہ ہونے کی صورت میں سزا تازیانے ہیں۔ اور اس بارے میں ائمہ معصومینؑ سے متعدد روایات نقل کی گئی ہیں۔ [3]

(۸) حدّ مساحقہ

مساحقہ یعنی عورتوں کی آپس میں ہم جنسی پرستی، کی بھی اسلام میں شدید حدّ ہے اور مشہور قول کے مطابق یہ حدّ سو تازیانے ہے اور عورت کے شادی شدہ اور غیر شادی شدہ ہونے میں کوئی فرق نہیں۔ ائمہ طاہرینؑ سے منقول کئی روایات میں یہ مطلب بیان ہوا ہے۔ [4]

---

[1] مرآت العقول، ج ۲۳، ص ۳۳۰، حدیث ۴

[2] مرآت العقول، ج ۲۳، ص ۳۳۱، حدیث ۷

[3] وسائل الشیعہ، ج ۱۸، ص ۴۱۶ اور صفحات بعدی، ابواب حد اللواط

[4] وسائل الشیعہ ج ۱۸، ص ۴۲۴، ابواب حد السحق والقیادہ

قرآن مجید میں واضح طور پر یہ مطلب نظر نہیں آتا، لیکن بعض مفسرین کی رائے میں سورۂ نساء کی آیت ۱۵ میں اسی مطلب کی طرف اشارہ ہے۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

وَالّٰتِیۡ یَاۡتِیۡنَ الۡفَاحِشَۃَ مِنۡ نِّسَآئِکُمۡ فَاسۡتَشۡہِدُوۡا عَلَیۡہِنَّ اَرۡبَعَۃً مِّنۡکُمۡ ۚ فَاِنۡ شَہِدُوۡا فَاَمۡسِکُوۡہُنَّ فِی الۡبُیُوۡتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰہُنَّ الۡمَوۡتُ اَوۡ یَجۡعَلَ اللّٰہُ لَہُنَّ سَبِیۡلًا ﴿۱۵﴾

''تمہاری عورتوں میں سے جو (عورتیں) منافی عفت عمل کا ارتکاب کریں تو ان کے بارے میں چار افراد کو گواہی دینے کے لئے طلب کرو اگر وہ (ان کے خلاف) گواہی دے دیتے ہیں تو ان عورتوں کو اپنے گھروں میں بند کردو، یہاں تک کہ انھیں موت آجائے یا یہ کہ خدا تعالیٰ ان کے لئے کوئی راہ قرار دے۔''

لیکن اکثر مفسرین کی نظر میں اس آیت کا اشارہ زنا کی طرف ہے اس سے پہلے کہ سورۂ نور میں تازیانوں کا حکم نازل ہو، اس آیت اور اس کے بعد والی آیت میں موجود قرائن وشواہد اسی دوسرے قول کی تائید کرتے ہیں۔

(۹) قیادت (دلاّلی) کی حدّ

قیادت کا مطلب ہے کہ عورتوں اور مردوں کے درمیان واسطہ بننا تاکہ اس واسطے کی وجہ سے وہ منافی عفت اعمال کا ارتکاب کریں۔ قیادت بھی ان افعال میں سے ایک ہے جن کی اسلام میں ایک معین حدّ مقرر کی گئی ہے (اگرچہ یہ حدّ قرآن میں مذکور نہیں) اور قول مشہور کے مطابق اس کی حدّ ۷۵ تازیانے ہیں جو زنا کی حد کی تین چوتھائی ہے۔[۱]

(۱۰) حدّ ساحر

قرآن مجید میں جادو کی مذمت واضح طور پر نظر آتی ہے، موسیٰ اور فرعون کے واقعات میں، حضرت موسیٰ کی زبان سے فرمایا گیا ہے:

"وَلَا یُفۡلِحُ السّٰحِرُوۡنَ"

یعنی: ''جادوگر ہرگز کامیاب نہیں ہوں گے۔''[۲]

ہاروت اور ماروت دو فرشتوں کے قصے میں بھی جادو کی مذمت عیاں ہے، ان آیات میں سحر کو کفر کی حد میں داخل قرار

---

[۱] کتاب جواہر، ج ۴۱، ص ۴۰۰، اور کتاب وسائل، ابواب حد السحقو القیادہ، باب ۵، ص ۱۸، ص ۴۲۹

[۲] سورہ یونس۔ ۷۷

دیا گیا ہے،[1]

لیکن قرآن میں جادوگر کی حدّ کے بارے میں کوئی ذکر نہیں ملتا، البتہ روایات میں جادوگر کی حدّ قتل بیان کی گئی ہے۔[2]

اس بارے میں کہ یہ حدّ کسی قید و شرط کے بغیر ثابت ہے یا یہ کہ حدّ ان لوگوں کے لئے ثابت ہے جو جادو کو جائز سمجھ کر انجام دیتے ہیں یا بالفاظ دیگر مرتد ہو جاتے ہیں؟ اس بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف نظر ہے۔ اسی طرح علماء کے درمیان اس بارے میں بھی اختلاف ہے کہ سحر و جادو کی حقیقت کیا ہے؟ کیا جادو کی کوئی حقیقت بھی ہے یا یہ محض ایک قسم کا تخیلاتی فعل ہے یا اس کا کچھ حصہ حقیقت اور کچھ تخیل پر مبنی ہے؟ فقہی کتب میں ان امور کے بارے میں تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔[3]

وہ چیز جس پر توجہ ضروری ہے وہ یہ کہ جادوگروں کے بارے میں اسلام کی غیر معمولی سختی ممکن ہے اس وجہ سے ہو کہ وہ لوگ انبیاءؑ کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوتے تھے، بالکل ویسے ہی جیسے فرعون کے جادوگروں کے قصے میں بیان ہوا ہے اور کبھی وہ سادہ لوح افراد کو فریب دے کر انھیں انبیاءؑ کے معجزوں کو تسلیم کرنے سے روکتے تھے اور یہ ایک ایسا عظیم گناہ ہے جو بڑی سے بڑی سزا کا متقاضی ہے۔

مذکورہ بالا بیان اسلام میں حدود الٰہی کی فہرست پر مشتمل ہے جس کو بیان کرنے کا مقصد معاشرے کو پاک کرنا اور لوگوں کے درمیان بے امنی، فساد اور برائیوں کے پھیلاؤ کی راہ کو روکنا اور مسدود کرنا ہے۔ لیکن ان کے علاوہ جیسا کہ اشارہ کیا گیا ہے، اسلام میں کچھ سزائیں بھی موجود ہیں جنھیں فقہاء ''تعزیرات'' کا نام دیتے ہیں (جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے تعزیر کا مطلب منع کرنا، ادب سکھانا، تعظیم و احترام اور مدد کرنا ہے اور یہ سارے مطالب تعزیر بمعنی سزا میں جمع ہیں کیونکہ تعزیر مجرم کو جرم و گناہ سے منع کرتی اور ادب سکھاتی ہے اور مستقبل میں اس کے احترام و اکرام کا باعث بن کر خواہش نفس اور شیطان پر غالب آنے میں اس کی مددگار ہوتی ہے)۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ تعزیرات سے مراد وہ سزائیں ہیں جو اسے گناہوں کے مقابلے میں ہوتی ہیں جن کے بارے میں کوئی خاص ''حدّ'' مقرر نہ کی گئی ہو۔ اس کی توضیح یہ ہے کہ ہر قانون اپنے نفاذ کی لازمی ضمانت چاہتا ہے یعنی اسے ایک ایسی پشت پناہی کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کے نفاذ (جاری ہونے) کی محرک اور باعث بن سکے اور اگر قانون کو نافذ کرنے کے لئے کوئی سہارا اور پشت پناہ موجود نہ ہو تو ایسا قانون فقط ایک اخلاقی تاکید میں تبدیل ہو جاتا ہے اور کسی عمل کی بجا آوری یا اس سے اجتناب میں اس کا کوئی کردار نہیں ہوتا۔

بالکل درست ہے کہ محرکات الٰہی اور ثواب و عذاب بروز قیامت اہل ایمان کے لئے بہترین محرک اور ترغیب ہیں، لیکن اسلام فقط الٰہی و اخروی محرکات پر قناعت نہیں کرتا، اگرچہ انھیں بے حد قدر و قیمت کا حامل قرار دیتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ دنیوی اور مادی محرکات کا بھی ان میں اضافہ کرتا ہے تاکہ وہ ضعیف الایمان افراد جن پر محرکات الٰہی و اخروی کم اثر انداز ہوتے ہیں کم از کم دنیوی سزاؤں کے خوف سے قوانین و حدود الٰہی کی حفاظت اور پاسداری کی کوشش کریں (تاکہ) کہیں ایسا نہ ہو کہ معاشرہ فاسد و مفسد اور بے ایمان

---

[1] سورہ بقرہ۔ ۱۰۲

[2] وسائل، ج۱۸، ص۵۷۶

[3] یہ موضوع کبھی ماسب محرمہ کی بحث ''تحریم سحر'' کے عنوان سے زیر بحث لایا گیا ہے اور کبھی کتاب حدود میں حد ساحر (جادوگر) کی بحث میں بیان ہوا ہے۔

وضعیف الایمان لوگوں کے کھیل کا میدان نہ (جولانگاہ) بن جائے۔

اور چونکہ گناہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں اوران کا ارتکاب کرنے والے ان سے آ گاہی، عمر اور سابقۂ گناہ اور اسی طرح زمان ومکان اور سزاؤں کو برداشت کرنے کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بہت مختلف ہوتے ہیں، لہٰذا ان تمام گناہوں کی سزا، جن کی شریعت اسلام میں کوئی خاص حد معین نہیں کی گئی، کی مقدار اور کیفیت کو قاضی کی صوابدید اور تشخیص پر چھوڑ دیا گیا ہے تاکہ وہ نہایت احتیاط کے ساتھ حالات کا ہر جہت سے بغور جائزہ لے کر مجرم کے لئے صحیح ومناسب سزا تجویز کر سکے۔

درحقیقت اسلامی سزائیں سوائے چند محدود مقامات کے کہ جنھیں حدود کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے، سبھی تغیر پذیر ہیں اور مجرم کے حالات اور گناہ کی کمیت (مقدار) اور کیفیت کا (ان سزاؤں کے متغیر ہونے میں) میں ایک خاص اثر ہے لہٰذا سزا کو معین کرنا قاضی کی صوابدید پر منحصر ہے۔

☆☆☆☆☆

اسلامی تعزیرات کے چند اہم موضوعات

۱۔ یکسانیت

اگر چہ باب تعزیرات میں سزاؤں کی تعیین و تشخیص میں قاضی حضرات کا آزاد ہونا ایک واضح نقطۂ قوت ہے جو انھیں اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ مجرموں کی سزائیں نہایت احتیاط کے ساتھ تجویز کریں، لیکن بعض اوقات یہ مسئلہ اس بات کا باعث بنتا ہے کہ قاضی حضرات مختلف علاقوں میں ایک ہی جرم کی مختلف سزائیں تجویز کریں (ماضی میں یہ بات کوئی مشکل پیدا نہیں کرتی تھی کیونکہ عملی طور پر تمام علاقے ایک دوسرے سے جدا تھے) لیکن آج مواصلات اور قریبی روابط کی بدولت یقینا مشکل پیدا ہوسکتی ہے۔

اس بات کے پیش نظر قضات اور دوسرے ماہرین کو مل بیٹھ کر تعزیرات کی حدود معین کرنے میں کوئی مانع اور خرابی نہیں البتہ نہ ایک معین صورت میں بلکہ زیادہ سے زیادہ اور کم سے کم قید، جرمانہ اور اسلامی سزاؤں وغیرہ کو مدنظر رکھ کر ان پر گفتگو کریں تاکہ وحدت رویہ (ایک سا سلوک) حاصل ہو سکے۔ یہ بات اسلامی قوانین کے عین مطابق ہے اور ہمارے زمانے میں کم از کم (بطور ثانوی عنوانات) ان کی مشروعیت اور جواز سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ تعزیر کوڑوں ہی کی سزا میں منحصر نہیں

جیسا کہ کہا گیا ہے کہ تعزیر کا ایک وسیع معنی ہے جس کی رو سے منع و تادیب بھی اس کے دائرے میں آتے ہیں اور شرع اسلام اور اصطلاح فقہاء میں اس معنی کی تبدیلی پر کوئی دلیل موجود نہیں۔ (یعنی تعزیر حقیقت شرعیہ یا حقیقت متشرعہ کی حامل نہیں) اسی طرح اصطلاح فقہاء میں بھی یہ کلمہ سابقہ معنی کو چھوڑ کر کسی نئے معنی میں استعمال نہیں ہوا اگر چہ بہت سارے فقہاء نے روایات کی پیروی میں غالباً اس کے ایک خاص مصداق یعنی ضرب و تازیانے بھروسہ کیا ہے۔

لیکن اس معروف مصداق کو بیان کرنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ہم تعزیر کے مفہوم سے تازیانے اور کوڑے ہی سمجھیں؛ اگر چہ بعض افراد کو یہ توہم ہوا ہے کہ ان کی نظر میں تعزیر ضرب اور کوڑوں کے ساتھ مساوی ہے البتہ فقہاء کی عبارات اور روایات کی بیشتر تحقیق سے یہ توہم اور تصور باطل ہو جاتا ہے۔

مرحوم علامہ حلی قدس سرہ اپنی کتاب ''تحریر'' میں کہتے ہیں: تعزیر ہر اس جرم و گناہ کے لئے ثابت ہے جس سے متعلق کوئی ''حدّ'' بیان نہ کی گئی ہو۔ علامہ مزید کہتے ہیں:

"وَهُوَ يَكُونُ بِالضَّرْبِ وَالْحَبْسِ وَالتَّوْبِيخِ مِنْ غَيْرِ قَطْعٍ وَلَا جَرْحٍ وَلَا أَخْذِ مَالٍ"

یعنی: تعزیر کبھی ضرب، قید یا ڈانٹ ڈپٹ کے ذریعے، عضو کاٹے، زخمی کئے اور مال لئے بغیر متحقق ہوتی

ہے۔[1]

کتاب "اَلْفِقْهُ عَلَى الْمَذَاهِبِ الاَرْبَعَة" میں ابن قیم کے کلام کو نقل کرنے اور یہ کہ اس (ابن قیم) کی عبارت کی بظاہر دلالت اس بات پر ہے کہ حاکم (قاضی) جس بات کو مصلحت پر مبنی جانے، خواہ وہ زندان (جیل) ہو یا ضرب (تازیانے) اس کے مطابق مجرموں کو تعزیر کرسکتا ہے؛ کے بعد (صاحب کتاب) کہتے ہیں:

"وَبِالْجُمْلَةِ فَاِنَّ التَّعْزِيرَ بَاب وَاسِع يُمْكِنُ لِلْحَاكِمِ اَنْ يَقْضِى بِهِ عَلَى كُلِّ الْجَرَائِمِ الَّتِى لَمْ يَضَعِ الشَّارِعُ لَهَا حَدّاً اَوْ كَفَّارَةً عَلَى اَنْ يَضَعَ الْعُقُوبَةَ الْمُنَاسِبَةَ لِكُلِّ بِيْئَةٍ وَ لِكُلِّ جَرِيْمَةٍ مِنَ سَجْنٍ اَوْ ضَرْبٍ اَوْ نَفْيٍ اَوْ تَوْبِيخٍ اَوْ غَيرِ ذٰلِكَ"

یعنی: خلاصہ یہ کہ تعزیر کا باب وسیع ہے اور وہ حاکم و قاضی کو اجازت دیتی ہے کہ وہ ان تمام جرائم جن کے بارے میں شارع نے کوئی حد و کفارہ مقرر نہیں کیا، ایک مناسب سزا تجویز کرے جو ہر معاشرے اور ہر گناہ سے مناسبت رکھتی ہو، چاہے یہ سزا قید، ضرب یا صرف ڈانٹ ڈپٹ وغیرہ پر مشتمل ہو۔[2]

(غور فرمائیں)

یہ تھا فقہاء خاصہ (شیعہ) اور فقہاء عامہ (اہل سنت) کی آراء کا خلاصہ۔ اس سے قطع نظر فقہ کے مختلف ابواب میں جو بکثرت روایات ہم تک پہنچی ہیں وہ بھی واضح طور پر اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ تعزیر کا مفہوم و مصداق دونوں نہایت وسیع ہیں اور اگر اس کا تذکرہ کیا جائے تو معاملہ کافی طولانی ہوجائے گا۔ تفصیل کے خواہش مند افراد ہماری کتاب "حدود و تعزیرات" کی ابحاث تعزیر کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ مختلف ابواب فقہ میں وارد شدہ احادیث، عبارات فقہاء اور لغت کی کتب سے مجموعی طور پر بخوبی یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ حاکم اسلامی (قاضی) نوع تعزیر کے انتخاب میں آزاد ہے اور درج ذیل مقامات سب کے سب تعزیرات (پر مشتمل) ہیں البتہ تعزیر کا انتخاب، مجرم کی حالت، معاشرتی ماحول، گناہ کی مقدار کیفیت اور دیگر جہات کو سامنے رکھ کر عمل میں آنا چاہیے:

i- مختلف صورتوں میں ضرب (مارنا)۔

ii- مختلف اور متفاوت کیفیت و کمیت کے مطابق مجرم کو قید کرنا۔

iii- جرمانہ؛ یعنی مال کی ایک خاص مقدار کو مجرم سے وصول کرنا، یا اسے ایک خاص مدت کے لئے قید (بند) کردینا (جس طرح ٹریفک کے قوانین کی خلاف ورزی کرنے والی گاڑیوں کو متوقف کیا جاتا ہے)۔

iv- سب کے سامنے یا تنہائی میں مجرم کی سرزنش اور ڈانٹ ڈپٹ کرنا۔

---

[1] تحریر، ج۲، ص۲۳۹

[2] الفقہ علی المذاہب الاربعہ، ج۵، ص۴۰۰

v- مختصر یا طولانی مدت کے لئے کسی اور مقام کی طرف اسے جلا وطن کرنا۔ اسی طرح اُسے مجرموں کے ساتھ معاملہ کرنے سے اوران کے پاس اس کی آمد ورفت کو روکنا۔

vi- مجرم کو پابند قرار دینا کہ وہ اپنے ملک یا شہر یا گھر سے باہر نہیں جا سکتا۔

vii- مدت معین اور ایک خاص عرصے کے لئے اسے کاروبار کرنے سے ممنوع قرار دینا۔

viii- بعض عہدوں اور معاشرتی حقوق سے مجرم کو محروم قرار دینا۔

ix- ذرائع ابلاغ کے ذریعے محدود یا وسیع پیمانے پر اسے معاشرے سے متعارف کرانا (تاکہ سب اس کے جرم سے آگاہ ہو جائیں)۔

x- مجرم کو بعض اعزازات اور خصوصیات سے محروم قرار دینا مثلاً مجرم اگر روحانی ہے تو لباس روحانیت زیب تن کرنے کو اس کے لئے ممنوع قرار دینا۔

اس طرح کے کچھ اور امور جو مجرم کو دوبارہ جرم کی طرف متوجہ ہونے سے باز رکھنے والے ہوں اور ایسے امور جن سے دوسرے بھی اس سے عبرت حاصل کریں اور اس جیسے افعال کی انجام دہی سے پرہیز کریں۔

۳۔تعزیرات میں حاکم کے اختیار کا مطلب

قاضی کے اختیار کی مقدار کے بارے میں فقہاء کے درمیان لمبی چوڑی بحث ہے، لیکن سب (فقہاء) اس بات پر متفق ہیں کہ تعزیر کو بہر حال حدّ سے کمتر ہونا چاہیے البتہ تعزیر کو کون سی حدّ کی نسبت کمتر ہونا چاہیے؟ حدّ زنا یا کمترین حدود کی نسبت کمتر ہو؟ یا تعزیر گناہ کے مطابق ہو؟ اس بارے میں بھی فقہاء کا آپس میں اختلاف ہے اور اس کی تفصیل فقہی کتب میں موجود ہے۔

یہاں جس چیز کو ذکر کرنا لازم ہے وہ یہ ہے کہ قاضی کے تعزیر کی مقدار و کمیت اور کیفیت کو انتخاب کرنے میں تخییر و اختیار سے مراد یہ نہیں کہ کے شخصی اور ذاتی میلانات و رجحانات کا اس مسئلے (یعنی تعزیر) میں عمل دخل ہو بلکہ (اس اختیار سے) مراد یہ ہے کہ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے نہ ہوں (بلکہ کھلے ہوں) تاکہ وہ مجرم اور اس کی سزا کے درمیان ہر سمت سے تناسب کو پیش نظر رکھ سکے، درحقیقت قاضی بظاہر با اختیار ہے لیکن حقیقت میں نہیں، اس لئے کہ وہ ہر جرم کی ایک خاص سزا تجویز کرتا ہے۔ اس معنی میں کہ اگر جرم اور اس کی سزا ایک ماہ قید کی متقاضی ہو یا بیس تازیانے مجرم کے جرم کے متناسب ہوں تو قاضی ایک تازیانہ بھی کم یا زیادہ نہیں کر سکتا، یا ایک دن زیادہ یا کم قیدی کو جیل میں نہیں رکھ سکتا اور جرمانے کی صورت میں ایک روپیہ بھی کم یا زیادہ وصول نہیں کر سکتا۔ (غور فرمائیں)

۴۔قرآن مجید میں ذکر تعزیرات

قرآن مجید میں تعزیر کے بعض نمونے نظر آتے ہیں جو اسلام کے اس حکم کلی کا مصداق شمار ہوتے ہیں۔

الف: جنگ تبوک میں شرکت سے گریز کرنے والوں کی داستان

توضیح یہ کہ: سورۂ توبہ کی آیت ۱۱۸ میں ارشاد ہے:

وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ۭ حَتّٰٓي اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُھُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ ۭ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ ھُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝١١٨

''خدا تعالیٰ نے ان تین افراد کو بخش دیا (جنھوں نے جنگ تبوک میں شرکت نہ کی اور مدینہ ہی میں ٹکے رہے اور جن سے مسلمانوں نے قطع تعلق کرلیا) اس حد تک کہ زمین اپنی تمام وسعتوں سمیت ان پر تنگ ہو گئی! یہاں تک کہ وہ ان کے درمیان اپنے لئے کوئی جگہ نہ پاتے تھے! اب ایسی حالت میں انھوں نے جان لیا کہ عذاب خدا سے پناہ گاہ فقط خدا ہی ہے۔ اس کے بعد خدا نے اپنی رحمت کو ان کے شامل حال فرمایا تا کہ وہ توبہ کریں، خدا تعالیٰ بہت توبہ قبول کرنے والا اور مہربان ہے۔''

اس آیت شریفہ میں بطور اشارہ اور تفاسیر و روایات میں تفصیلاً بیان ہوا ہے کہ رسول اکرمؐ نے جنگ تبوک میں شرکت نہ کرنے والے ان تین افراد کے لئے ایک عجیب تعزیر انجام دی، یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے رسول اکرمؐ کے فرمان کو کوئی اہمیت نہ دی اور بلا جواز جنگ میں شرکت نہ کی۔ یہ تین افراد بعض روایات کے صریح بیان کے مطابق کعب بن مالک، مرارۃ بن ربیع اور ھلال بن امیہ تھے۔ اگر چہ ان افراد کا تعلق منافقین سے نہ تھا لیکن سستی اور سہل انگاری کے باعث انھوں نے جنگ تبوک میں شرکت سے گریز کیا، مگر جلد ہی وہ اپنے عظیم گناہ کی طرف متوجہ ہو گئے اور دل میں ندامت اور پشیمانی محسوس کی۔

جب رسول اکرمؐ میدان تبوک سے واپس آئے تو یہ تینوں افراد آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور لگے عذر خواہی اور معذرت کرنے، لیکن رسول اکرمؐ نے ان کے ساتھ کوئی بات نہ کی اور مسلمانوں کو بھی ان کے ساتھ بات چیت نہ کرنے کا حکم دیا، جس کے نتیجے میں لوگوں نے ان کے پاس آنے جانے کا سلسلہ منقطع کرلیا یہاں تک کہ ان کی عورتیں اور بچے رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے تا کہ آپؐ کی اجازت کے ساتھ ان سے علیحدگی اختیار کریں، رسول اکرمؐ نے مکمل طور پر جدائی کی اجازت نہ دی، لیکن انھیں حکم دیا کہ وہ ان (افراد) سے نزدیک نہ ہوں۔

اس وقت وہ ایک عجیب قسم کی اجتماعی اور معاشرتی گھیراؤ میں گھر گئے اور زمین اپنی بے پناہ وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی، یہاں تک کہ اس ذلت وخواری سے نجات حاصل کرنے کے لئے مدینہ کو ترک کرنے اور ارد گرد کے پہاڑوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے ان کے عزیز و رشتہ دار ان کے لئے کھانا پانی لاتے لیکن ان کے ساتھ ذرا سی بات بھی نہ کرتے! ان میں سے ایک نے بقیہ دونوں افراد کو مخاطب کر کے کہا: اب جبکہ تمام لوگوں نے ہم سے قطع تعلق کرلیا ہے، پس تیار ہو جاؤ کہ ہم بھی ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں شاید اس طرح خدا

ہماری توبہ قبول کرلے! اس تجویز پر عمل کیا گیا اور آخر کار پچاس روز تک خدا کی بارگاہ میں گریہ وزاری کے نتیجے میں خدا تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کرلی اور مذکورہ بالا آیت شریفہ نازل ہوئی۔[1]

اس تاریخی واقعے میں تھوڑے سے غور وفکر سے واضح ہو جاتا ہے کہ درحقیقت یہ ایک اہم تعزیر تھی جو ایک معنوی زندان (قید خانے)، تحقیر وتذلیل اور معاشرے سے وقتی طور پر جلاوطنی وغیرہ پر مشتمل تھی اس کا مجرموں کے ساتھ ساتھ دوسرے مسلمانوں پر بھی ایک عجیب اثر ہوا اور اس کے باعث اس قسم کے گناہوں کے ارتکاب کی مستقبل میں کوئی گنجائش نہ رہی۔ یہ داستان اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ تعزیر ایک عام اور عمومی مفہوم ہے اور فقط کوڑے اور تازیانے کے ساتھ ہی خاص نہیں اور (یہ داستان) اس بات کی بھی گواہ ہے کہ تعزیرات کی بعض اقسام اپنے اثرانداز ہونے میں تازیانوں سے کہیں زیادہ سخت اور معاشرے میں نہی عن المنکر کا قوی سبب بنتی ہیں۔

ب: ثعلبہ کا قصہ

ایک دوسرے مقام پر انصار کے ایک شخص (ثعلبہ بن حاطب) کے بارے میں سورۂ توبہ کی آیات ۷۵ تا ۷۸ تک نازل ہوئی ہیں:

وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ۝ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ۝ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ۝ اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ۝

ان میں سے بعض نے خدا کے ساتھ یہ عہد وپیمان کیا کہ اگر خدا نے ہمیں اپنے فضل سے روزی دی تو ہم یقینا صدقہ دیں گے اور صالحین وشاکرین میں سے ہوں گے لیکن جب خدا تعالیٰ نے ان کو اپنے فضل سے نوازا تو انھوں نے کنجوسی کی اور خدا کے حکم سے روگردانی اور اس کی خلاف ورزی کی۔ خدا نے اس کو اپنی ملاقات کے دن تک ان کے دلوں میں برقرار کردیا۔ یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ انھوں نے حکم خدا کی خلاف ورزی کی اور جھوٹ کہا، کیا انھیں معلوم نہیں کہ خدا ان کے اسرار اور سرگوشیوں سے آگاہ ہے اور خدا تعالیٰ ہر قسم کے غیب سے بھی آگاہ ہے؟!

بہت سارے مفسرین کی رائے میں یہ آیت انصار کے ایک شخص ثعلبہ بن حاطب کے بارے میں نازل ہوئی ہیں جو ایک فقیر اور نادار شخص تھا اور پابندی کے ساتھ مسجد میں حاضر ہوتا اور رسول اکرمؐ سے اپنے لئے دعا کی درخواست کرتا تا کہ خدا اسے بہت زیادہ مال سے

[1] مجمع البیان اور تفسیر ابوالفتوح رازی، آیت موضوع بحث کے ذیل میں اور سفینۃ البحار با تلخیص۔

مالامال کردے۔رسول اکرمؐ نے اس کی پیہم خواہش کے جواب میں فرمایا:

"قَلیل تُؤَدّی شُکرَهُ خَیرٌ مِنْ کَثیرٍ لا تُطِیقَهُ"

''وہ تھوڑی سی نعمت جس کا تم حق ادا کرسکو اس زیادہ نعمت سے بہتر ہے جس کا تم حق ادا نہ کرسکو''

لیکن وہ اپنے اصرار سے باز نہ آیا اور قسم کھا کر کہا کہ اگر خدا تعالیٰ اسے مال ودولت عطا کردے تو وہ اس کے تمام حقوق کو ادا کرے گا، ناچار رسول اکرمؐ نے اس کے حق میں دعا کردی۔

تھوڑی ہی مدت میں اس کا ایک نہایت مالدار چچازاد مر گیا اور وراثت میں کافی دولت اس کے ہاتھ لگی، اس کی دولت وثروت میں آئے دن اضافہ ہوتا چلا گیا۔ بھیڑ بکریوں کے بہت سارے گلوں کا بھی مالک ہوگیا، لیکن جب رسول اکرمؐ نے زکوٰۃ جمع کرنے والے مامور کو اس کے پاس زکوٰۃ لینے کی غرض سے بھیجا تو اس کم ظرف ندیدے نے نہ صرف حق الٰہی کی ادائیگی سے انکار کیا بلکہ خود زکوٰۃ کے شرعی (اور حکم شارع ہونے) پر بھی اعتراض کیا اور اسے اہل کتاب سے لئے جانے والے جزیہ کے ساتھ مشابہ چیز قرار دیا (اس طرح رسول اکرمؐ کی طرف زکوٰۃ پر مامور شخص) خالی ہاتھ واپس آیا اور مذکورہ بالا آیات اس کی کنجوسی کی مذمت اور عہد شکنی کے بارے میں نازل ہوئیں!

ان آیات کا نزول بذات خود اس کے بارے میں ایک شدید تعزیر ثابت ہوئی اس لئے کہ اس (نزول آیات) سے اس کی بدعملی اور بدبختی سب پر عیاں ہوگئی۔

ایک روایت کے مطابق وہ (ثعلبہ) اپنے معاشرتی خسارے کو دور کرنے اور سابقہ حیثیت کو بحال کرنے کے لئے رسول اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے مال کی زکوٰۃ دینا چاہی تو آپؐ نے اس سے زکوٰۃ قبول نہ کی! رسول اکرمؐ کے دنیا سے رخصت فرمانے کے بعد وہ مال زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے خلیفہ اول کے پاس آیا تو خلیفہ نے بھی زکوٰۃ قبول نہ کی! پھر خلیفہ دوم اور خلیفہ سوم نے بھی قبول کرنے سے انکار کیا اور کہا: چونکہ رسول اکرمؐ نے تمہاری زکوٰۃ قبول نہیں کی لہٰذا ہم بھی قبول نہیں کرتے اور یہ شخص خلافت عثمان کے دوران دنیا سے چل بسا۔[1]

اگرچہ مذکورہ بالا آیات میں مسئلہ تعزیر کی کوئی تصریحی وضاحت موجود نہیں لیکن آیات میں اس کے عمل کی مذمت اور لوگوں کا اس سے آگاہ ہونا اور رسول اکرمؐ اور خلفاء کا اس کے ایسا سلوک کرنا، تعزیر کا ایک واضح مصداق (مثال) ہے۔ اس مسئلے نے خود اس پر اور ساتھ دوسروں پر گہرا اثر ڈالا اور یہی تعزیر سے مطلوب بھی ہے کہ وہ (تعزیر) مجرموں کو جرم سے باز رکھے، چاہے وہ (تعزیر) معنوی سزا پر مشتمل ہو یا مادی سزا پر۔

ج: آیت ایذاء

جیسا کہ سابقہ بیانات میں اشارہ کیا گیا ہے کہ قرآن مجید میں خدا تعالیٰ نے ان مردوں اور عورتوں کو (جو شادی شدہ نہ ہوں) زنا

[1] اس روایت کے پہلے حصے کو اکثر مفسرین نے نقل کیا ہے جبکہ اس کا آخری حصہ تفسیر فخر رازی، ج۱۶، ص۱۳۸، اور تفسیر ابوالفتوح رازی ج۶ ص۴۷ پر آیا ہے

کے ارتکاب کی وجہ سے سزا دینے کا حکم دیا اور فرمایا ہے:

وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِہَا مِنْکُمْ فَاٰذُوْھُمَا ج ..." [1]

اگر یہاں ''ایذاء'' (اذیت دینے) سے مراد وہی حدّ شرعی ہے جس کی طرف آیت شریفہ میں ارشاد ہوا ہے: ''الزَّانِیَۃُ وَالزَّانِی ...'' (سورۂ نور ر ۲) تو اس صورت میں اس کا تعزیرات کی بحث کے ساتھ کوئی تعلق نہیں لیکن اگر ہم اس بات کے قائل ہوں کہ ایذاء سے مراد وہ مطلق سزا ہے جس کی حد وحدود معین نہیں کی گئیں اور اس کا تعلق حد زنا کے نازل ہونے سے قبل کے عرصے سے ہے جیسا کہ بعض مفسرین کی رائے ہے تو اس صورت میں یہ (ایذاء) تعزیرات میں سے شمار ہوگی، اس لئے کہ یہ ایک غیر معین سزا ہے جس کا تعلق حد زنا کی تعیین وتشریع سے قبل کے زنا کار افراد سے ہے۔

مرحوم طبرسی نے بھی تفسیر مجمع البیان میں اس جملے ''فَاٰذُوْھُمَا'' (ان دونوں کو اذیت دو) کے دو معنی بیان کئے ہیں جو دونوں تعزیرات کے مطابق ہیں پہلا یہ کہ (ایذاء) سے مراد زبان سے سرزنش کرنا اور جوتے مارنا اور دوسرا یہ کہ اس سے مراد صرف زبانی سرزنش ہے۔ [2]

د: آیت نشوز

ناشزہ (نافرمان) عورتوں (بیویوں) کے بارے میں بھی ایک حکم قرآن میں دکھائی دیتا ہے کہ وہ بھی تعزیرات کے مصادیق میں سے ایک مصداق اور ان کی مثالوں میں سے ایک مثال ہے۔ اگرچہ اس مقام پر شوہروں کو یہ اجازت دی گئی ہے کہ وہ احتیاط کا لحاظ رکھ کر اس حکم کو جاری (نافذ) کریں۔ قرآن اس ضمن میں یہ فرماتا ہے:

وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَھُنَّ فَعِظُوْھُنَّ وَاھْجُرُوْھُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْھُنَّ ج فَاِنْ اَطَعْنَکُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَیْھِنَّ سَبِیْلًا ط ، [3]

یعنی: ''وہ عورتیں جن کی نافرمانی اور سرکشی ومخالفت کا تمہیں خوف ہو انھیں وعظ ونصیحت کے ذریعے سمجھاؤ اور (اگر یہ وعظ ونصیحت ان پر اثر نہ کرے) تو بستر میں ان سے دوری اختیار کرو اور اگر یہ بھی موثر نہ ہو اور شدت وسختی کے بغیر بات نہ بنے تو انھیں تنبیہ کرو پس اگر تمہاری پیروی کریں تو ان پر ظلم وتعدی نہ کرو۔''

ناشزہ عورتوں سے مراد وہ عورتیں ہیں جو وظیفۂ زوجیت انجام دینے سے انکار اور روگردانی کریں اور مختلف غیر مناسب علامات ان میں ظاہر ہوں۔ [4]

---

[1] سورہ نساء ۱۶

[2] مجمع البیان، ج ۳، ص ۲۱

[3] سورہ نساء ۳۴

[4] نشوز کا مادہ نشز ہے اور یہ وزن کا ہم وزن ہے نشوز کا لغوی معنی ہے بلند زمین اور جب زوجین (میاں بیوی) کے متعلق استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد ازدواجی تعلقات سے سرکشی ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا آیت شریفہ میں اس قسم کی عورتوں کے بارے میں تین قسم کی تعزیر کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔سب سے پہلے وعظ ونصیحت سے (ہمیں فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ تمام مقامات پر وعظ ونصیحت تعزیرات کے مراحل میں سے ایک مرحلہ ہے اس لئے کہ جرم وخطا سے باز رکھنے کا ایک موثر عامل ہے) دوسری قسم ان سے علیحدگی اور تیسری بدنی سزا ہے اور ان تینوں مراحل میں سے ہر مرحلہ اس صورت میں وقوع پذیر ہوگا جب اس سے پہلا مرحلہ غیر مؤثر واقع ہوا۔

اور اگر یہ سوال کیا جائے کہ اگر مرد حضرات مخالفت، نشوز اور سرکشی کا مظاہرہ کریں تو کیا وہ بھی اس قسم کی سزا کا سامنا کریں گے؟ اس کے جواب میں ہم کہیں گے جی ہاں! لیکن مردوں کو اس قسم کی سزا دینا عورتوں کی ذمہ داری نہیں لہٰذا یہ سزا حاکم شرع (قاضی) کے سپرد کی گئی ہے وہی اس بات کا ذمہ دار ہے کہ وہ خلاف ورزی کرنے والے مردوں کو مختلف طریقوں سے بشمول تنبیہ بدنی اگر لازم ہو، اپنے وظائف کو انجام دینے اور ذمہ داریوں کو پورا کرنے پر آمادہ کرے۔(غور فرمائیں)

اس مرد کی داستان معروف ہے جس کا اپنی بیوی کے ساتھ رویہ نہایت سخت تھا اور حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنے پر کسی صورت میں تیار نہیں ہوتا تھا، حضرت علی - نے اسے نہایت شدت کے ساتھ یہاں تک کہ تلوار کے ذریعے دھمکا کر حق کو تسلیم کرنے پر آمادہ کیا۔یہیں سے اس سوال کا جواب جو اس آیت کو پیش کرتے وقت بہت سوں کے ذہنوں میں پیدا ہوسکتا ہے، واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ کیسے ممکن ہے کہ اسلام مردوں کو یہ اجازت دے کہ وہ عورتوں کو تنبیہ بدنی کر سکیں (یعنی جسمانی سزا دینے کے مجاز ہیں) حالانکہ یہ عمل احترام انسان کے خلاف ہے، خاص طور پر وہ انسان جو اس کا (کی) شریک زندگی ہے؟ اس لئے کہ:

اوّلاً: جسمانی سزا یا تنبیہ بدن سے مراد یہ نہیں کہ مرد کوڑا اٹھائے اور عورت کو اتنا مارے کہ اس کی ہڈی پسلی ایک کردے، یا اس کے منہ پر اس طرح طمانچے مارے جس سے اس کا چہرا نیلا پڑ جائے، کیونکہ ان میں سے کوئی صورت بھی شرع اسلام میں نہ صرف یہ کہ جائز نہیں بلکہ اس سے دیت بھی واجب ہوجاتی ہے۔تنبیہ بدنی سے مراد ایسی تنبیہ ہے جو نرم انداز میں ہو نہ زخم کا باعث بنے اور نہ چہرے کو سرخ وسیاہ یا نیلا کردے، یہاں تک کہ بعض مفسرین نے آیت شریفہ کی توضیح میں کہا ہے مار ایسی ہو جیسے مسواک کی لکڑی سے ہاتھوں پر مارا جائے یا تنبیہ اس طرح کی ہو جو اسے تھوڑا سا دکھ پہونچائے لیکن اس ضرب (مار) کو سخت اور زخم کا سبب نہیں بننا چاہیے۔

ثانیاً: اس بات کو بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ عورتوں کی چار قسمیں ہیں: بعض عورتیں باایمان اور صالح ہوتی ہیں جو اپنی ذاتی لیاقت اور تربیت کے نتیجے میں اپنے خاندانی ماحول کی ذمہ داریوں سے مکمل طور پر آگاہ ہوتی ہیں انھیں اپنے شوہروں کی نظر میں مکمل طور پر قابل عزت واحترام ہونا چاہیے۔

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ

یعنی: ان کے ساتھ شائستہ طور پر معاشرت کرو اور حسن سلوک سے پیش آؤ“ [1]

---

[1] سورہ نساء۔۱۹

کا حکم ایسی ہی عورتوں کے لئے ہے۔ بعض دوسری عورتیں اپنی خاندانی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں کوتاہی کرتی اور شوہر کے لئے درد سر کا باعث بنتی ہیں لیکن اس کی کوتاہیاں بہت سخت قسم کی نہیں لہٰذا وعظ و نصیحت کے باعث اپنی غلطی کی طرف متوجہ ہو جاتی ہیں۔ اور خوف خدا اور اپنے تقویٰ کے باعث راہ حق کی طرف پلٹنے میں تاخیر نہیں کرتیں؛ آیت مذکورہ بالا میں جملہ "فَعِظُوهُنَّ" درحقیقت انھیں کے لئے ہے۔

تیسری قسم کی عورتیں وہ ہیں جن کا نشوز اور نافرمانی زیادہ گہری اور عمیق ہوتی ہے، یہ عورتیں شوہر کی بے توجہی اور ناراضگی کی وجہ سے اپنی غلطی کا احساس کر لیتی ہیں اور اپنی روحانی لطافت کی وجہ سے شوہر کے خفیف قسم کے ردعمل کے نتیجے میں ان کی روح متاثر ہوتی ہے اور جلد ہی وہ صلح صفائی کو اپنا لیتی ہیں اور مذکورہ بالا آیت میں موجود یہ جملہ "وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ" گویا انھیں کے بارے میں ہے۔

فقط چوتھی قسم کی عورتیں ایسی ہوتی ہیں جو شوہروں کے مقابلے میں سرکشی اور اپنی ذمہ داریوں کو پامال کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتیں قانون شکنی کی راہ پر ہٹ دھرمی سے گامزن ہوتی ہیں اس قدر تقویٰ کی حامل بھی نہیں ہوتیں جو انھیں ایسے افعال کی انجام دہی سے روک سکے ان سے جدائی اور بے توجہی بھی ان پر اثر انداز نہیں ہوتی اور انھیں راہ راست پر لانے کے لئے سوائے شدت و سختی کے کوئی چیز باقی نہیں بچتی۔

فقط یہی وہ مقام ہے جس میں اسلام نے شوہر کو بدنی تنبیہ اور ضرب کے ذریعے تعزیر کی اجازت دی ہے۔ اور یہ ایک ایسا عمل ہے جو شرقی و غربی (مشرقی اور مغربی) معاشروں میں موجود ہے یہاں تک کہ اعتراض کرنے والے بھی اس قسم کے حالات میں ایسے عمل سے استفادہ کرتے ہیں اور مذکورہ شرائط کی موجودگی میں ایسا سلوک کچھ عجیب بھی نہیں اور یہ کسی طرح بھی انسانی کرامت وعزت کے منافی نہیں۔

ثالثاً: یہ موضوع فقط عورتوں ہی کی ذات میں منحصر نہیں (ان ہی کے ساتھ خاص نہیں) بلکہ اگر مرد حضرات بھی اپنی ذمہ داریاں پوری نہ کریں تو انھیں بھی ان چار مراحل کا سامنا کرنا پڑے گا یعنی پہلے پہل ضروری ہے کہ انھیں وعظ و نصیحت کی جائے (نصیحت کے کارگر نہ ہونے کی صورت میں) معنوی تعزیرات جیسے معاشرے میں ان سے بے توجہی اور بے اعتنائی برت کر انھیں غیر حقیقت پسندانہ روش سے باز رکھنے کی کوشش کی جائے اور اگر یہ سب کچھ کارگر واقع نہ ہو تو لازم ہے کہ انھیں ضرب وغیرہ کے ذریعے سزا دے کر راہ راست پر لایا جائے، البتہ چونکہ یہ عمل عام طور پر عورتوں کے بس سے باہر ہوتا ہے اور مردوں کا عورتوں پر تسلط اس عمل کی بجا آوری میں رکاوٹ بنتا ہے۔

لہٰذا (حاکم شرع) کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسے سرکش اور مجرمانہ روش کے حامل مردوں کو ان کی ذمہ داری سے آشنا کرے۔

مذکورہ بالا تین نکات کے پیش نظر ہم گمان نہیں کرتے کہ کوئی صاحب انصاف انسان اس فرمان پر اعتراض کرتے ہوئے اسے انسانی عزت و وقار کے منافی سمجھے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ان تین احکام کے فوراً بعد بلا فاصلہ قرآن یہ ارشاد فرماتا ہے:

"فَإِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ سَبِيلًا"

یعنی: اگر وہ (عورتیں) اطاعت کریں اور راہ راست کی طرف واپس آ جائیں تو ان پر ظلم و تعدی نہ کرو۔

اسلام میں زندان کے احکام

اشارہ

جیسا کہ اس سے قبل تعریزات کی بحث میں ذکر کیا گیا ہے؛''زندان'' جرائم کی روک تھام کے لئے انجام دی جانے والی تعزیرات کی اقسام میں سے ایک قسم ہے، علاوہ ازیں بسا اوقات ملزموں کو فرار سے روکنے اور مقروض لوگوں پر اپنے قرضے ادا کرنے کے لئے دباؤ ڈالنے کی خاطر انھیں گرفتار کر کے زندان میں رکھنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا، یہی وجہ ہے کہ فقہ اسلامی میں زندان کے احکام خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ اسلامی حکومت سے مربوط ابحاث کی تکمیل کی خاطر ان احکام کو بھی اشارۃً بیان کرنا ضروری ہے، اگر چہ اس بحث کا حق ادا کرنے کے لئے ایک علیحدہ کتاب بلکہ کئی کتابوں کی تالیف کی ضرورت ہے اور بعض اہل تحقیق نے اب تک اس سلسلے میں کئی کتابیں بھی تحریر کی ہیں۔[1]

ا۔ زندان کی تاریخ

کوئی نہیں جانتا کہ تاریخ بشریت میں پہلا زندان کب تعمیر ہوا، اس لئے کہ اس مسئلے کا تعلق ان ایام سے ہے جب سالہا سال قبل انسان نے اجتماعی اور معاشرتی زندگی میں قدم رکھا، جب سے حکومت کا قیام عمل میں آیا تو بظاہر یوں لگتا ہے کہ زندان بھی (حکومت کے ساتھ ہی) وجود میں آیا ہے بلکہ حکام کے علاوہ بھی ستمگر اور ظالم و جابر مالک (جاگیردار وغیرہ) اپنی رعایا کو تنبیہ کرنے کے لئے زندان بناتے تھے، یہاں تک کہ انھیں حیوانات کے قیام کی جگہ پر بھی قید کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے تھے۔

اسلام میں زندان کی تعمیر سے متعلق مؤرخین کا اتفاق ہے کہ رسول اکرمؐ کے زمانے میں کوئی زندان سرکاری طور پر موجود نہیں تھا، یہ اس وجہ سے نہیں تھا کہ آپؐ اسے ناجائز سمجھتے تھے بلکہ اس کا بڑا سبب معاشرۂ اسلامی کی محدودیت اور عدم وسعت تھا اور خاص طور پر آغاز اسلام میں لوگ الٰہی قوانین کے زیادہ پابند تھے جبکہ ان کی خلاف ورزی کرنے والے کم ہی ہوتے تھے۔ لہٰذا قرآن میں کوئی جملہ تک ایسا نظر نہیں آتا جو یہ ظاہر کرے کہ اس زمانے میں زندان کا وجود تھا۔ لیکن زندان کے نہ ہونے کے باوجود ایسے مجرم جنھیں گرفتار کر کے ان کے جرم کی حقیقت معلوم کرنا ضروری ہوتا تھا یا وہ مقروض افراد جو قرضہ ادا کرنے کی استطاعت کے باوجود اسے ادا نہیں کرتے تھے یا وہ قیدی جو اسلامی جنگوں میں مسافروں کے ہاتھ لگتے تھے انھیں زیر نظر رکھنے کے لئے کئی دوسرے طریقے استعمال کئے جاتے تھے جن میں سے بعض کو یہاں بیان کیا جاتا ہے:

---

[1] اس سلسلے میں لکھی گئی کتابوں میں سے ایک ڈاکٹر شیخ احمد وائلی کی تالیف، احکام السجون، ہے جس کا فارسی میں ترجمہ ''احکام زندان'' کے نام سے آقائے بکائی تبریزی نے کیا ہے مذکورہ بالا ابحاث کے منابع اور ماخذ میں سے ایک ماخذ مذکورہ کتاب بھی ہے۔

ا۔ بسا اوقات مجرم افراد کو مسجد کے کسی کونے میں قید کر دیا جاتا تھا اور چونکہ تالے وغیرہ کے نہ ہونے کی وجہ سے کسی کو اس پر نگران کے طور پر مقرر کر دیا جاتا تھا تاکہ فرار نہ ہو جائے، یا اس کے ارد گرد ایک خط کھینچ دیا جاتا اور اسے تاکید کر دی جاتی کہ اس حصار سے قدم باہر نہ نکالے ورنہ وہ اپنے عمل کا خود ذمہ دار ہوگا! اور وہ (مجرم) بھی خصوصی معاشرتی دلائل و وجوہات کی بناء پر اور اس وجہ سے کہ کہیں اس کا جرم زیادہ سنگین نہ ہو جائے، دائرے سے قدم باہر نہ رکھتا اور بعض روایات میں کلمہ ''ترسیم'' (خط کھینچنے) کے ساتھ تعبیر کرنے سے شاید اسی مطلب کی طرف اشارہ ہو۔

۲۔ دالان میں قید کرنا؛ اس لئے کہ اکثر گھروں میں گھر کے دروازے اور صحن کے درمیان دالان ہوتے تھے اور بسا اوقات صحن کی داخلی جانب بھی ایک دروازہ ہوتا تھا اور دونوں دروازوں کے بند ہونے کی صورت میں دالان عملی طور پر، زندان میں تبدیل ہو جاتا تھا۔

۳۔ خود گھر، ایک قسم کا زندان ہوتا تھا، چنانچہ قرآن حکم دیتا ہے کہ بدکار عورتوں کو گھروں میں قید کریں یہاں تک کہ وہ موت سے ہمکنار ہو جائیں۔ (سورۂ نساء/ ۱۵) البتہ یہ حکم زنا کاروں کی حد کے نازل ہونے سے پہلے کا ہے اور حدّ کے نزول کے ساتھ ہی یہ حکم بھی منسوخ ہو گیا۔

۴۔ ساتھ ساتھ رکھنا؛ یہ بھی زندان ہی کی ایک صورت تھی یعنی قرض خواہ مقروض با استطاعت کو جدھر جاتا اپنے ساتھ لے جانا، اور جب تک وہ قرض ادا نہ کر دیتا اسے اپنے آپ سے جدا نہ کرتا۔

۵۔ اسیروں (قیدیوں) کی غلامی کا مسئلہ؛ یہ مسئلہ بھی زندان کا قائم مقام ہے، جس کے احکام اسلامی فقہ میں تفصیلاً بیان ہوئے ہیں۔ البتہ یہ زندان کی بالکل ابتدائی اور سادہ شکلیں تھیں اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ اسلامی معاشرے کی وسعت زندگی کی پیچیدگی اور مجرم افراد کی تعداد میں اضافے کے باعث اس کی شکل وصورت بہت حد تک بدل گئی اور زندان ایک مخصوص عمارت کی صورت میں وجود میں آ گیا، اگرچہ دوسرے ممالک میں صدیوں پہلے زندان مکمل صورت میں موجود تھے۔

سب سے پہلا زندان خلیفۂ دوم کے زمانے میں قائم ہوا

اگرچہ بعض مؤرخین اس بات پر مصر ہیں کہ پہلے تین خلفاء کے زمانے میں زندان، یعنی؛ وہ خاص مقام جہاں مجرموں کو پابند رکھا جائے، موجود نہیں تھا اور فقط امیر المؤمنین علیؑ کے زمانے میں زندان قائم ہوا، لیکن یہ دعویٰ ان بہت ساری روایات کے منافی ہے جو یہ کہتی ہیں کہ خلیفہ دوم پہلی شخصیت ہے جس نے زندان قائم کرنے کا اقدام کیا۔ اس کا شاہد وہ مطلب ہے جسے ''ابن ھمان'' نے فقۂ حنفی کے بارے لکھی گئی کتاب ''شرح فتح الغدیر'' میں بیان کیا ہے، وہ نقل کرتے ہیں: ''رسول اکرمؐ اور خلیفۂ اول کے دور میں زندان کا کوئی وجود نہیں تھا اور مجرم افراد کو مسجد یا گھر کے دالان میں قید کیا جاتا تھا یہاں تک کہ خلیفہ دوم نے مکہ میں چار ہزار درہم کا ایک گھر خرید کر اسے زندان قرار دیا۔ (شرح فتح الغدیر، ج۵، ص۴۷۱)

خلیفۂ دوم کا مکے میں گھر خریدنے کا تذکرہ، بعض دوسری کتب مثلاً النظم الاسلامیۃ اور الجنایات المتحدہ بین القانون والشریعۃ

میں بھی آیا ہے۔ان سب حضرات نے صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ خلیفہ دوم نے یہ گھر مکہ کے ایک سردار ''صفوان بن امیہ'' سے خریدا تھا، ابواسحق شیرازی نے کتاب المھذب میں جو فقہ شافعی کے مطابق لکھی گئی ہے، میں خلیفہ دوم کی گھر کی خریداری اور پھر اسے زندان میں تبدیل کرنے کا تذکرہ کیا ہے۔[1]

اس امر کا ثبوت یہ بھی ہے کہ خلیفہ دوم کے زمانے میں بعض شعراء کچھ مسائل کو شعر کی زبان میں ادا کرتے جو خلیفہ کو پسند نہ آتے یا خلاف شرع ہوتے تھے اور اس پر حضرت عمر ان شعراء کو زندان میں ڈالنے کا حکم دیتے تو وہ شعراء زندان سے کچھ اشعار لکھ کر خلیفہ کو بھیجتے جو ان کی بے گناہی اور عذر خواہی پر مشتمل ہوتے تھے، مجموعی طور پر یہ عمل بھی اس بات کا زندہ گواہ ہے کہ خلیفہ دوم کے زمانے میں زندان موجود تھا۔ان میں سے ایک شاعر حطیئہ نامی بھی تھا، حضرت عمر نے اسے زندان میں قید کر رکھا تھا، اس نے یہ دو شعر کہے اور انھیں حضرت عمر کے پاس کسی طرح بھجوا دیا:

ماذا تَقُولُ لأَفْراخٍ بِذِی مَرَخٍ
حُمرِ الْحَواصِلِ لاماءٍ وَلاشَجَر!
اَلْقَیْتَ کاسِبَهُمْ فی قَعْرِ مُظْلَمَةٍ
فَارْحَمْ عَلَیْكَ سَلامُ اللهِ یاعُمَر!

وہ ان اشعار میں اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کی زبوں حالی کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچتا ہے: ''سرخ پوٹوں والے چوزے جو ذی مرخ کے مقام پر بغیر پانی اور درخت کے پڑے ہیں تو ان کے بارے میں کیا کہے گا؟! تو نے ان کی روٹی کمانے والے کو تاریک گہرائی میں پھینک دیا ہے، اور ان پر رحم کر تجھ پر خدا کا سلام ہو اے عمر!''

خاص طور پر ''قعر مظلمۃ'' (تاریک گہرائی) کے الفاظ سے بخوبی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ زندان تنگ و تاریک تھا یعنی کال کوٹھڑی تھی۔بعض اور قرائن بھی اس بات کے گواہ ہیں کہ اس قسم کا زندان اس زمانے میں موجود تھا کیونکہ اسلامی مما لک کے بے پناہ وسیع و عریض ہونے سے طبیعی بات ہے کہ جرائم میں بھی اضافہ ہوتا ہوگا ایسی صورتحال میں یہ تسلیم کرنا ناممکن ہے کہ مجرم افراد کو زیر نظر رکھنے کے لئے اصلاً کوئی زندان ہی موجود نہ تھا۔

امیر المؤمنین علیؑ کے دور میں زندان

ان لوگوں کی رائے میں، جو یہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر کے زمانے میں زندان کا کوئی نام و نشان نہیں تھا اور اس کے برعکس وہ جن کا اصرار ہے کہ زندان اس دور میں موجود تھا، ان دونوں قسم کی آراء کے درمیان توافق اور اتفاق کی واحد صورت یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ حضرت

---

[1] المھذاب، ج ۲، ص ۲۹۴

عمر نے زندان کی تعمیر کا اقدام نہیں کیا اور چار ہزار درہم کے بدلے صفوان بن امیہ سے خریدے جانے والے مکان سے بطور زندان استفادہ کیا، لیکن جناب امیر المؤمنین علیؑ کے دور میں آپؑ نے ذاتی طور پر زندان کی تعمیر کا اقدام کیا (تا کہ اہل زندان کے انسانی حقوق کا بہتر طور پر لحاظ رکھنے کے ساتھ ساتھ زندان دے ان کے فرار کا راستہ روکا جا سکے)۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ آپ نے پہلا زندان چٹائیوں سے بنایا جس میں روشنی اور ہوا کا بآسانی گذر ہوتا تھا اور اس کا نام ''نافع'' رکھا (شاید یہ نام رکھنے سے غرض یہ ہو کہ یہ زندان اخلاقی اعتبار سے مجرموں کی روح پر اثر انداز ہو اور اس طرح ان کی جلد اصلاح ہو سکے) لیکن اس کی وضع وقطع سے سوء استفادہ کیا گیا اور چور وغیرہ اس کی دیواروں میں سوراخ کر کے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے ناچار امامؑ نے مٹی سے ایک مضبوط زندان تعمیر کرایا اور اس کا نام ''مُخَیَّس'' رکھا۔

جیسا کہ اوپر بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ خلیفہ دوم کے دور میں اسلامی ممالک کی سرحدیں اتنی پھیل چکی تھیں کہ مجرموں کے لئے زندان کے بغیر اس روز کے معاشرے کا نظام چلانا ناممکن تھا، اور ظاہری طور پر اس موضوع سے انکار پر اصرار کا تعلق سیاسی مسائل اور قومی تعصّبات سے ہے ورنہ اس پر تاریخ بھی گواہ ہے اور قرائن بھی۔

بہرحال اس زمانے میں زندان ایک ایسی جگہ ہوتی تھی جہاں اہل جرم اور با استطاعت مقروضین وغیرہ کو رکھا جاتا تھا اور سیاسی مخالفین کو ہرگز قید نہیں کیا جاتا تھا اور جب کبھی (سیاسی مخالفین) کا وجود ناقابل برداشت سمجھا جاتا انھیں جلا وطن کر دیا جاتا، چنانچہ حضرت ابوذر کی داستان سے کم وبیش سبھی آگاہ ہیں کہ جب خلیفہ سوم اور ان کے اردگرد منڈلانے والوں کو ابوذر کی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر مشتمل گفتگو پسند نہ آئی اور وہ لوگ اسے برداشت نہ کر سکے تو انھیں ایک بے آب وگیاہ مقام کی طرف جلا وطن کر کے بھیج دیا جس کا نام ''ربذہ'' ہے اور جناب ابوذر اسی بدترین آب وہوا کے مقام پر دار فنا سے دار بقا میں منتقل ہو گئے اور خدا کے جوار رحمت میں جگہ پائی۔

لیکن جیسا کہ ہم دیکھیں گے کہ بنی امیہ کے دور حکومت میں زندان کی کیفیت بالکل ہی بدل گئی اور وہ سیاسی مخالفین، جائز اعتراض کرنے والوں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے والوں کا مرکز بن گیا۔

۲۔زندان کی اقسام اور فلسفہ

آزادی کے ساتھ انسان کے عشق کا سرچشمہ، ترقی وتکامل کے ساتھ اس کا عشق ہے کیونکہ کوئی موجود قید وبند میں پے در پے، کمالات کے حصول کے لئے کوئی حرکت انجام نہیں دے سکتا، یہاں تک کہ حیوانات بھی قفس سے رنجیدہ ہوتے ہیں اگر چہ ان کی زندگی کے تمام وسائل وہاں فراہم ہوں اور وہ آزاد ہونے کو قفس کی زندگی پر ترجیح دیتے ہیں، اگر چہ قفس سے باہر انھیں کیسے ہی خطرات کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے۔

یہی وجہ ہے کہ وہ جاندار جو پنجرے میں بند ہوتے ہیں نہ ان کے سر میں کوئی جوش وخروش، نہ گلے میں کوئی صدا اور نہ بدن میں کوئی ہیجان ہوتا ہے مگر یہ کہ ان کی پیدائش ہی قفس (پنجرے) میں ہوئی ہو اور وہ آزادی کے ذائقے سے نا آشنا ہوں۔ اگر حیوانات میں یہ مسئلہ ایک پوشیدہ غریزے کی صورت میں ہے تو انسان میں یہ جذباتی ادراک اس کے عقلی ادراک کے مناسب ہے اور وہ عقل

ودلیل کے ذریعے اپنی آزادی کوطلب کرتا ہے، بالکل اسی وجہ اور اسی دلیل کے باعث زندان اور آزادی سے محرومی انسان کے لئے سخت ترین سزا ہے۔

بلاشبہ پوری ظالمانہ تاریخ میں زندان، خودغرض، کینہ توز اور انتقام جُو افراد کے ہاتھ میں ایک ہتھیار کے طور پر استعمال ہوتے رہے ہیں تاکہ وہ اس ذریعے سے اپنے ناجائز مقاصد پورے کرسکیں، لیکن یہ سب کچھ زندان کے حقیقی فلسفے اور مجرمانہ ذہنیت کے حامل افراد کی اصلاح کے مثبت نتائج اور معاشرتی فساد کے ساتھ مقابلے کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنتے۔ آزادی سے محرومی، زندانی افراد پر دباؤ ڈالنے کی غرض سے ایک بھاری پتھر کی طرح ہے تاآنکہ مندرجہ ذیل دس اہداف میں سے کوئی ایک وقوع پذیر ہو:

i-ایذائی وعقوبتی زندان

اس قسم کے زندان عام طور پر ان افراد کے لئے ہوتے ہیں جو کسی جرم کے مرتکب ہوئے ہوں انھیں آزادی سے محروم کیا جاتا ہے تاکہ وہ اپنے اعمال کی برائی کی طرف متوجہ ہو کر آئندہ اس قسم کے اعمال سے اجتناب کریں، اسی طرح دوسرے بھی عبرت حاصل کریں۔ زندان کی یہ قسم زمانہ قدیم سے لے کر اب تک رائج رہی ہے اور ہر حکومت کے (چند مستثنٰی صورتوں کے علاوہ) ایسے زندان رہے ہیں۔

ii-اصلاحی زندان

زندان کی یہ قسم ان لوگوں کے لئے ہوتی ہے جو کسی بری عادت کے اسیر ہوں (مثلاً نشہ آور اشیاء کے استعمال کے عادی افراد) اور وعظ ونصیحت اور تعلیمات ان پر کوئی اثر نہ کریں، اس صورت میں اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ انھیں معاشرے کے دیگر افراد سے جدا کرکے ایک مختصر یا طویل مدت کے لئے زندان میں رکھا جائے تاکہ ان کی اصلاح ہو اور وہ منشیات کے استعمال کو ترک کردیں۔

iii-احتیاطی زندان

کوئی اہم حادثہ مثلاً قتل کسی جگہ رونما ہوتا ہے اور واقعی قاتل کا پتہ بھی نہیں چلتا، لیکن ایک فرد یا کئی افراد اس قتل کے ملزم ہوتے ہیں، بلاشبہ اصلی قاتل کا پتہ چلایا جانا ضروری ہوتا ہے لیکن ممکن ہے کہ ملزم قتل راہ فرار اختیار کرے اور جرم کے ارتکاب کے کافی شواہد کے ثابت ہونے کے بعد، اس تک دسترسی حاصل نہ ہو۔ ایسی صورت میں قتل کے ملزم یا ملزمان کو وقتی طور پر گرفتار کرلیا جاتا ہے، تحقیق کے بعد اگر وہ بے گناہ ثابت ہوں تو معذرت کے ساتھ انھیں آزاد کردیا جاتا ہے اور جرم ثابت ہونے کی صورت میں اپنے جرم کا بدلہ پاتے ہیں۔ اس قسم کے زندان بھی تقریباً ہر جگہ رائج ہیں۔ واضح سی بات ہے کہ اگر ملزم درحقیقت بے گناہ ہو تو جلد از جلد اس کے بارے میں تحقیقات کرائی جائیں اور اس کی گرفتاری کا عرصہ جس قدر ممکن ہو مختصر ہونا چاہیے۔

iv- تادیبی زندان

اس قسم کا زندان زیادہ تر بچوں کے لئے ہوتا ہے جن پر قانون لاگو نہیں ہوتا، لیکن اگر انھیں کھلی آزادی دے دی جائے تو وہ اس سے سوء استفادہ کر کے گمراہی کا راستہ اختیار کر سکتے ہیں۔ لہٰذا ان کے بعض جرائم کی وجہ سے انھیں زندان میں ڈالا جاتا ہے تا کہ وہ ادب سیکھیں اور تربیت حاصل کر سکیں۔

v- سیاسی زندان

عام طور پر سیاسی قیدی ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جن کی سیاسی سرگرمیاں معاشرے کی مصلحت اور موجود نظام کے خلاف ہوں، کبھی وہ معاشرے کی مصلحت کے خلاف نہیں ہوتیں بلکہ اس کے حق میں ہوتی ہیں لیکن وہ خود غرض حکومت کی مصلحتوں کے مطابق نہیں ہوتیں (جیسے آج کی دنیا کے اکثر ممالک میں مخالفین کو اگرچہ وہ حق پر ہوں قید کر دیا جاتا ہے)۔

vi- استحقاقی زندان

استحقاق سے یہاں مراد حق وصول کرنا ہے، مثلاً اگر کوئی کسی کا مقروض ہے اور یہ مقروض قرض کی ادائیگی کی طاقت رکھنے کے باوجود اس کی ادائیگی نہیں کرتا تو اس صورت میں مقروض شخص کو قید کر کے زندان میں ڈال دیا جاتا ہے تا کہ اس پر دباؤ ڈالا جائے جس کے نتیجے میں وہ طلبگار یعنی قرض خواہ کا حق لوٹانے پر آمادہ ہو جائے، البتہ اس مقام پر جونہی وہ قرض کی ادائیگی پر آمادہ ہوتا ہے، اُسے آزاد کر دیا جائے گا، کیونکہ اسے زندان میں رکھنے کا مقصد اور ہدف پورا ہو چکا ہے۔

vii- حفاظتی زندان

زندان کی یہ قسم شاذ و نادر ہی وقوع پذیر ہوتی ہے اور ان لوگوں کے لئے ہوتی ہے جن سے لوگ بہت تنگ ہوتے ہیں ایسے لوگ اگر آزاد چھوڑ دیئے جائیں تو لوگوں کی جان خطرے میں پڑ سکتی ہے حالانکہ اگر یہ (ذہنی مریض قسم کے افراد) کسی جرم کے مرتکب بھی ہوں تو قتل کے مستحق نہیں ہوتے، اس صورت میں حکومت جو لوگوں کی جان اور مال کی محافظ ہوتی ہے لوگوں کے غصے کی آگ کو بجھانے کے لئے اس قسم کے افراد کو ایک عرصے کے لئے زندان کی چار دیواری میں منتقل کرتی ہے تا کہ وہ نئے ماحول کے عادی ہو جائیں اور خطرہ ٹل جانے کی صورت میں آزاد کر دیئے جاتے ہیں، البتہ جیسے ہم نے کہا ہے کہ اس قسم کے زندان بہت کم ہوتے ہیں اور عام طور پر معاشرتی انقلابوں، طوفانوں اور عمومی ہیجانی کیفیات میں جنم لیتے ہیں۔

مذکورہ بالا سات اقسام کے زندان ایک معقول مقصد اور فلسفے پر مشتمل ہیں۔ اس معقول فلسفے کے مقابلے میں زندان کے غیر معقول اور ظالمانہ فلسفے اور اہداف کے محرکات بھی وجود رکھتے ہیں جو آج اور کل کی دنیا میں موجود اکثر زندانوں کے اصلی عوامل و اسباب ہیں۔

اس ضمن میں چند اقسام کا نام لیا جاسکتا ہے جن کی تفصیل پیش کی جاتی ہے:

۱۔ انتقامی زندان

یہ ایک ایسا زندان ہوتا ہے جس کا کوئی معقول مقصد نہیں ہوتا اور ظالم و جابر حکمران اپنی رعایا کے بعض آزاد لوگوں یا بعض خاص لوگوں سے کینہ اور ناحق عداوت کی بنا پر انھیں زندان میں ڈال دیتے ہیں اور بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ زندان میں اتنی طولانی مدت گذارتے ہیں کہ اس کے دوران ہی وہ موت سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔

۲۔ مقاومت کو ختم کرنے کے لئے بنائے جانے والے زندان

ظالم و جابر حکمران، حق و عدالت کے لئے قیام کرنے والے افراد کی روحانی اور جسمانی جدوجہد کو ختم کرنے کے لئے انھیں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے کے لئے زندان کے سپرد کر دیتے ہیں، اور کبھی زندان میں ایسے افراد کے ساتھ حقارت آمیز اور ظالمانہ سلوک کے علاوہ انھیں روحانی اور جسمانی طور پر سخت اذیتوں کا نشانہ بنایا جاتا ہے، واضح ہے کہ حق کے مطابق قیام کرنے والے افراد ایسے امتحان و آزمائش سے صحیح و سالم طور پر باہر بلکہ گاہے کندن بن کر سامنے آتے ہیں اور ان کی قوت قیام میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔

بالکل فولاد کی طرح جو مزید سخت ہونے کے لئے بھٹی میں ڈالا جاتا ہے، لیکن اس کے برعکس ضعیف اور گاہے متوسط افراد پر یہ زندان منفی اثر ڈالتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ آزادی کے بعد اپنا راستہ تبدیل کر لیتے ہیں یہاں تک کہ بعض اوقات اہل ظلم و جور کے لئے آلۂ کار بن جاتے ہیں کیونکہ زندان میں ان پر خصوصی کام ہو چکا ہوتا ہے۔

۳۔ راہنماؤں سے رابطہ ختم کرنے کے لئے قائم شدہ زندان

یہ زندان مذہبی اور سیاسی راہنماؤں کے لئے خاص ہوتے ہیں کیوں کہ جب اہل جور و ستم حکمران ان کے مقابلے سے عاجز ہو جاتے ہیں تو ان راہنماؤں کا اپنے پیروکاروں سے رابطہ منقطع کرنے کے لئے انھیں (راہنماؤں کو) زندان میں مقید کر دیتے ہیں، لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ زندان اکثر الٹا نتیجہ دیتے ہیں اور پیروکار افراد کو مزید متحد اور رہبروں کو زیادہ محترم، زیادہ باعظمت اور زیادہ معروف بنا دیتے ہیں۔

۴۔ مزاحمت کو برطرف کرنے کے لئے قائم کردہ زندان

کبھی ایسے بھی ہوتا ہے کہ کوئی مرد عالم، دانشور اور سائنسدان یا کمانڈر؛ مختصر یہ کہ کوئی لائق شخص ارباب اقتدار کی خودغرضی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرتا ہے، ایسے افراد کو زندان کی نذر کر دیا جاتا ہے تاکہ آسودگی کے ساتھ اور کسی مزاحم کی مزاحمت کے بغیر اپنی خودغرضی پر مشتمل خواہشات کی تکمیل کی جاسکے۔ یہاں تک کہ تاریخ میں ایسے ظالم اور بدنما اہل جور و ستم کا تذکرہ بھی موجود ہے جو خوبصورت بیویوں کے شوہروں کو قید میں ڈال دیتے تھے تاکہ ان کی بیویوں پر قبضہ کر سکیں!

۵۔ پاک و پاکیزہ لوگوں کے لئے زندان

تاریخ میں سب سے زیادہ عجیب وہ زندان ہیں جو بے گناہ اور پاکیزہ افراد کے لئے بنائے جاتے رہے ہیں اور تسلیم کرنا چاہیے کہ گناہوں سے آلودہ اور شرمناک ماحول میں بے گناہی سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں؛ ایسے معاشرے میں پاکدامنی ایک بڑا عیب شمار ہوتی ہے اس لئے کہ یہ پاکدامنی اہل گناہ کے منصوبوں پر پانی پھیر دیتی ہے پوری تاریخ میں یوسف ؑ جیسے افراد ظالم وجابر حکمرانوں کے زندان میں پابند سلاسل رہے ہیں اور وہ فقط اس لئے کہ ان افراد کی خواہش صرف یہ تھی کہ وہ پاک پاکیزہ رہیں۔ شاعر اس بارے میں کہتا ہے:

بی گناہی کم گناہی نیست در دیوان عشق

یوسف ازدامان پاک خود بہ زندان رفتہ است

یعنی: بے گناہی دیوان عشق میں کوئی کم گناہ نہیں کیونکہ یوسف ؑ اپنی پاکدامنی کے باعث زندانی ہوئے۔

واضح ہے کہ اس قسم کے زندان جو ہر قسم کے عقلی وشرعی فلسفے سے محروم ہیں ہمارے موضوع سخن سے خارج ہیں، فقط ایک ضروری وضاحت کی خاطر اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

۳۔ قرآنی نقطہ نگاہ سے زندان

یقیناً زندان کے لئے مذکورہ اہداف میں سے اکثر اہداف معقول اور قابل تصور ہیں؛ درحقیقت ان اہداف ومقاصد کے پیش نظر زندان ایک معاشرتی ضرورت ہے چاہے وہ مجرموں کی سزا، ان کی اصلاح وتادیب، خطرات کی برطرفی اور سرچشمۂ فساد کو ختم کرنے کی خاطر ہو یا ان کے علاوہ بعض دوسرے مقاصد کے لئے ہو، قرآن مجید میں بھی اس مطلب کو متعدد اشارات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

البتہ عربی زبان اور قرآن وسنت میں زندان کے ہم معنی الفاظ بکثرت موجود ہیں، جن میں سے بعض واضح طور پر زندان کے ہم معنی جبکہ بعض قابل بحث وگفتگو ہیں۔ ان الفاظ میں سے ایک لفظ "سجن" ہے جو سورۂ یوسف کی نو آیات میں حضرت یوسف ؑ کی قید کی مناسبت سے ہے (کبھی بصورت سجن اور کبھی اس کے مشتقات کی صورت میں) استعمال ہوا ہے اور ایک مقام پر سورۂ شعرا میں فرعون کی داستان میں بھی نظر آتا ہے کہ وہ حضرت موسیٰ ؑ و سجن (زندان) کی دھمکی دیتے ہوئے کہتا ہے:

لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ﴿٢٩﴾

یعنی: "(اے موسیٰ) اگر تم نے میرے علاوہ کسی کو اپنا معبود تسلیم کیا تو میں تمہیں اہل زندان میں سے قرار دوں گا۔"[1]

اس بیان سے بخوبی استفادہ ہوتا ہے کہ موسیٰ ؑ اور فرعون حتیٰ کہ اس سے قبل یوسف ؑ اور عزیز مصر کے زمانے میں بھی حقیقی معنوں میں زندان موجود تھا جس میں گنہگار اور بے گناہ افراد کو قید کیا جاتا تھا، اس طرح کہ وہ سالہا سال زندان میں پڑے رہتے اور بھلا دیئے

---

[1] سورہ شعراء۔۲۹

جاتے تھے۔ دوسرا لفظ "حبس" جو قرآن میں دو دفعہ استعمال ہوا ہے، لیکن زندان کے معنی میں نہیں لیکن احادیث میں بطور وسیع اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔[1]

لفظ "امساك" قرآن میں فقط ایک مقام میں وارد اور زندان کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور اس کا تعلق زنا کار عورتوں سے ہے جو زنا کی حدّ کے نزول سے پہلے کا حکم تھا، یہ تعبیر سورۂ نساء کی آیت ۱۵ میں ہے جس کی تفصیل بعد میں ذکر کی جائے گی۔ لفظ "نفی" (یعنی سرزمین سے جلا وطن کر دینا) سورۂ مائدہ کی آیت ۳۳ میں آیا ہے جس کی تفسیر بعض حضرات نے زندان سے کی ہے۔ اسی طرح لفظ "ارجاء" ہے جو سورۂ اعراف کی آیت ۱۱۱ میں موسیٰؑ اور فرعون کے قصے میں آیا ہے، بعض حضرات کی رائے میں "ارجاء" سے مراد زندان میں قید کرنا ہے اس وجہ سے کہ فرعون کے درباریوں نے اسے جناب موسیٰؑ اور ہارونؑ کو جادوگروں کے جمع ہونے تک زندان میں قید کرنے کا مشورہ دیا تھا:

"قالُوا اَرْجِهْ وَ اَخاهُ وَ اَرْسِلْ فِي الْمَدائِنِ حاشِرِينَ"

یہی معنی تھوڑے سے فرق کے ساتھ سورۂ شعراء کی آیت ۳۶ میں بھی نظر آتا ہے:

قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَابْعَثْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۳۶﴾

لیکن اکثر مفسرین نے "ارجاء" کی اس معنی میں تفسیر نہیں کی بلکہ ان کی رائے میں اس کا مطلب مؤخر کرنا اور تاخیر میں ڈالنا ہے، فرعون کے مقابلے میں جناب موسیٰؑ کا معجزوں کو ظاہر کرنا اور فرعون کا جادوگروں سے مقابلے کا پروگرام تشکیل دینا وغیرہ کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو بہت بعید نظر آتا ہے کہ وہ انھیں زندان میں قید کرنے کا حکم دے۔

بہرحال جو چیز مسلّم ہے یہی ہے کہ قرآن میں ایک مقام ایسا ہے جس میں زندان کا حکم نظر آتا ہے اور جسے "امساك" کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے (جیسا کہ مذکورہ بالا سطور میں بھی اشارہ کیا گیا ہے) ارشاد ربانی ہے:

وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰىهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ﴿۱۵﴾

یعنی: اور تمہاری عورتوں میں سے جو زنا کی مرتکب ہوں ان پر چار مسلمان گواہوں کو طلب کرو اگر وہ ان کی بدکاری کی گواہی دے دیتے ہیں تو ان عورتوں کو اپنے گھروں میں روکے رکھو یہاں تک کہ انھیں موت آ جائے یا خدا تعالیٰ ان کے لئے کوئی راہ قرار دے۔[2]

---

[1] ان احادیث کے بارے میں بیشتر اطلاع کیلئے میزان الحکمۃ، ج ۲، ص ۲۲۶ تا ۲۵۱ کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے کیونکہ اس کتاب میں ان لوگوں کے بارے میں جن کو حبس کرنا جائز ہے اور ان کے بارے میں جنھیں ابدی قید کی سزا دی گئی ہے اور اسی طرح قیدیوں کے حقوق اور حرمت کو تفصیلاً مختلف ابواب میں ذکر کیا گیا ہے۔

[2]

مفسرین کے درمیان مشہور یہی ہے کہ یہ آیت ان عورتوں کی سزا کے بارے میں ہے جوزنا کی مرتکب ہوتی تھیں۔ یہ حکم حدّ زنا کے نزول سے پہلے کا ہے اوراس آیت میں ان کے لئے ابدی زندان کی سزا بیان کی گئی ہے، اگر چہ یہ حکم بعدازاں تازیانے اورسنگسار کے حکم میں تبدیل ہوگیا۔

"فَأَمْسِكُوهُنَّ فِي الْبُيُوتِ حَتَّى يَتَوَفَّاهُنَّ الْمَوْتُ"

یعنی: ''انھیں گھروں میں پابند رکھو یہاں تک کہ انھیں موت آجائے''

اس جملے میں اگر چہ زندان کا کوئی ذکر نہیں لیکن گھروں میں بند رکھنا وہ بھی ساری زندگی، زندان ابدی ہی کے مشابہ ہے۔ فقط اسی ایک مقام پر قرآن میں حکم زندان نظر آتا ہے۔

۴۔روایات میں زندان میں ڈالنے کے مواقع

روایات میں ابدی اورغیرابدی زندان کے متعدد مقامات بیان کئے گئے ہیں، جن میں سے بعض کی تفصیل یہ ہے:

۱۔قتل میں مدداورمعاونت:

اگرکوئی شخص کسی کو پکڑکررکھے اورکوئی دوسرا اسے قتل کرے تو اس صورت میں فقہ اسلامی کی رو سے قتل کرنے والے کی سزا موت اور پکڑنے والے کو ہمیشہ کے لئے زندان میں قید کیا جائے گا۔ یہ حکم ہمارے فقہاء کے مابین اتفاقی واجماعی ہے اور معتبر منابع اور مآخذ میں منقول روایات بھی اس حکم کی تائید کرتی ہیں۔ حضرت علیؑ سے مروی ایک حدیث میں ان دو افراد کے بارے میں، جن میں سے ایک کسی کو پکڑتا اور دوسرا قتل کرتا ہے، آپؑ نے یہ فیصلہ دیا:

"يُقْتَلُ الْقَاتِلُ وَ يُحْبَسُ الآخِرُ حَتّى يَمُوتَ غَمّاً كَما حَبَسَهُ حتّى ماتَ غَمّاً"

یعنی: ''قاتل کوقتل کر دیا جائے اور دوسرے (پکڑنے والے) کو محبوس (قید) کیا جائے یہاں تک کہ غم واندوہ سے مرجائے جس طرح اس نے مقتول کو پکڑا تا کہ وہ غم واندوہ کی حالت میں مرجائے۔''[۱]

۲۔قتل کا حکم دینا:

فقہ اسلامی کے مطابق اگرکوئی کسی دوسرے کوکسی بے گناہ کےقتل پر مجبور کرے یہاں تک کہ حکم عدولی کی صورت میں اسے قتل کی دھمکی دے اس مامور کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی بے گناہ کوقتل کرے، اس لئے کہ جب مسئلہ قتل وخون کا ہوتو اس صورت میں تقیہ جائز نہیں؛ "وَالْمأمُورُ مَعْذُور" (مأمور مجبور ہوتا ہے) اس مقام پر ایک بے بنیاد بات ہے۔ ایسی صورت حال میں اگرکوئی شخص حکم اسلامی کو

---

[۱] وسائل الشیعہ، ۱۹ حدیث ۱، باب ۱۷، ابواب قصاص النفس۔

اہمیت نہ دیتے ہوئے اس ظالم شخص کی دھمکی کے باعث کسی بے گناہ کو قتل کر دے تو اس کے بارے میں اسلامی فرمان یہ ہے کہ قاتل کو قصاص کی بنا پر قتل اور اس کا حکم دینے والے کو ہمیشہ کے لئے زندان میں قید کیا جائے! امام محمد باقرؑ نے ایسے شخص کے بارے میں فرمایا:

"یُحْبَسُ الْآمِرُ بِقَتْلِهِ حَتّٰی یَمُوْتَ"

یعنی قتل کا حکم دینے والے کو زندان میں بند کر دیا جائے یہاں تک کہ وہ موت سے ہمکنار ہو۔[۱]

۳۔تکرار سرقت:

بار بار چوری کرنے کی صورت میں حکم یہ ہے کہ تیسری دفعہ چوری کرنے پر چور کو دائمی قید کی سزا دی جائے، اس حکم کو بزرگ علماء نے امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ سے نقل کیا ہے۔[۲]

۴۔مرتد فطری عورتیں:

اگر مرتد فطری عورتیں توبہ کرنے کرنے پر آمادہ نہ ہوں تو ان کے بارے میں بھی زندان میں دائمی قید کا حکم ثابت ہے۔ امام محمد باقر -اور امام جعفر صادق - سے مروی روایت میں ہے:

"وَالْمَرْئَةُ اِرْتَدَّتْ عَنِ الْاِسْلامِ اُسْتُتِیبَتْ، فَاِنْ تَابَتْ وَاِلاّ خُلِّدَتْ فِی السِّجْنِ"

یعنی: مرتد عورت کو توبہ کرنے کو کہا جائے گا، اگر اس نے توبہ کر لی تو ٹھیک اسے آزاد کر دیا جائے گا ورنہ زندان میں دائمی قید بھگتے گی۔[۳]

زندان میں ابدی قید کی چند اور صورتیں بھی ہیں جن کی تفصیل کے لئے فقہی کتب کا مطالعہ ضروری ہے۔ وقتی زندان جو تعزیری پہلوؤں پر مشتمل ہوتے ہیں ان کی صورتحال بالکل مختلف ہے، ان کا انحصار جرم، مجرم کی قوت برداشت اور کچھ دوسری شرائط پر ہے۔ قتل کے ملزمان جبکہ ان کے فرار کا خوف ہو اور وہ شخص جو قاتل کو قتل کا جرم ثابت ہونے کے بعد فرار ہونے میں مدد دے، وہ حاملہ عورت جس کا زنا ثابت ہو چکا ہو اور اس کے فرار کا بھی امکان ہو جبکہ وضع حمل اور اس پر حدّ جاری کرنے تک ضروری ہے کہ اسے زندان میں رکھا جائے، ایک محفوظ جگہ سے جو شخص چوری کرے، وہ مقروض جو ادائیگی کی طاقت کے باوجود اپنا قرض ادا نہ کرے، ایسا شخص جو جھوٹی گواہی دے، وہ شخص جو کسی ایسے مجرم کی سرپرستی کرے جس کا جرم مدعی کے حاضر ہوتے ہی ثابت ہو جائے، اور بالآخر وہ لوگ جو منکرات کے مرتکب ہوئے ہوں اور زندان میں قید کئے بغیر ان منکرات کے ترک پر آمادہ نہ ہوں، ایسے سارے افراد عارضی قیدی شمار ہوتے ہیں۔

---

[۱] وسائل الشیعہ ،۱۹ حدیث۱، باب ۱۳، ابواب قصاص النفس۔

[۲] وسائل، ج۱۸،ص ۴۲۹، باب ۵، ابواب حد السرقہ۔

[۳] وسائل، ج۱۸، ۵۴۹، باب ۴، ابواب حد المرتد، حدیث ۶۔

۵۔قیدیوں کے ساتھ انسانی سلوک

جیسا کہ اس سے قبل بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ پوری تاریخ میں موضوع زندان سے بے پناہ سوءاستفادہ کے باوجود زندان اجتماعی اور انسانی نقطۂ نظر سے جرائم کی روک تھام اور تربیت افراد کے لئے نہایت ضروری ہے لیکن درست شرائط وحدود کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے۔قید کی شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ اہل زندان کے حق میں انسانی حقوق کا خیال رکھا جائے اور ان کے ساتھ ایک انسان جیسا سلوک کیا جائے ان پر ظالمانہ پابندیاں عائد نہ کی جائیں۔

کسی کو کسی اور کے گناہ کی پاداش میں اسیر نہ کیا جائے،کوئی قیدی اپنے استحقاق سے حتیٰ کہ ایک گھنٹہ بھی زیادہ زندان میں نہ رکھا جائے تمام پروگرام قیدی کی تعلیم وتربیت کے طور پر انجام پائیں،دوسرے لفظوں میں زندان کو مجرموں کی پرورش اور انتقام جوئی کا مرکز ہونے کی بجائے ایک تربیتی مرکز ہونا چاہیے اور ضروری ہے کہ اس تربیتی مرکز کی خصوصیات بھی اس کے اندر موجود ہوں۔

حضرت یوسف -کے قصے میں مصر میں ان کے قیدی ہونے سے بخوبی استفادہ ہوتا ہے کہ یہ زندان اس قدر ظالمانہ ہوتے تھے کہ بعض اوقات قیدی ہمیشہ کے لئے اپنی زندگی اسی میں گذار دیتے اور فراموش کر دیئے جاتے اور فقط کسی غیر متوقع حادثے کے رونما ہونے کی صورت میں ہی ظالم حکمرانوں کو قید میں پڑے ہوئے مظلوم قیدی یاد آجاتے اس طرح کا حادثہ پیش نہ آنے کی صورت میں آخر عمر تک زندان ہی میں پڑے رہتے۔

اگر یوسفؑ تعبیر خواب کا علم نہ جانتے ہوتے اور فرعون مصر بھی وہ معروف خواب نہ دیکھتا اور اس کی تعبیر کے لئے ایک آزاد شدہ قیدی کی وساطت سے حضرت یوسف -کے دامان میں پناہ نہ لیتا تو آپؑ بھی شاید آخر عمر تک قید میں ہی رہتے،حالانکہ یوسف -کسی گناہ کے مرتکب بھی نہیں ہوئے تھے،ان کا گناہ صرف تقویٰ اور عزیز مصر کی زوجہ زلیخا کے ہوس پر مشتمل تقاضے سے انکار تھا،البتہ ناپاک اور گناہ آلود ماحول میں پاکیزگی اختیار کرنا کوئی کم گناہ نہیں!

قرآن فرماتا ہے:یوسف -کی بھرپور کوشش تھی کہ وہ زندان کے ماحول کو تعلیم وتربیت کے مرکز میں بدل ڈالیں،جس میں قیدیوں کی اصلاح ہو اور انھیں توحید وخدا پرستی کی تعلیم دی جائے کیونکہ توحید ہی ہر نیکی و پاکیزگی کی اصل اور سرچشمہ ہے اگر وہ لوگ (قیدی) حضرت یوسف -سے کسی سادہ سے مسئلے مثلاً خواب کی تعبیر کے بارے میں سوال کرتے تو آپؑ فوراً معارف الٰہی اور تربیتی مسائل کے موضوع کی طرف آجاتے اور فرماتے:

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَ اَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۳۹﴾ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۰﴾

اے میرے قیدی دوستو!کیا متفرق اور پراگندہ (متعدد) خدا بہتر ہیں یا خدا واحد وقہار؟!خدا کی بجائے

جن معبودوں کی تم پرستش کرتے ہو سوائے اس اسم و نام کے جو تم اور تمہارے آباؤ اجداد نے انھیں دیئے ہیں، کچھ بھی نہیں، خدا تعالیٰ نے ان کے لئے کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی، حکم فقط خدا کے لئے ثابت ہے، اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے غیر کی پرستش نہ کرو، یہی ہے دائمی و مستحکم دین ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ [1]

درست ہے کہ یوسف -خود ایک قیدی تھے لیکن ان کا عمل ظاہر کرتا ہے کہ اگر حکومت کی باگ دوڑ بھی ان کے ہاتھوں میں آجائے تو بطریق اولیٰ ان کی کوشش یہی ہوگی کہ زندان کا ماحول ایک تعلیمی ادارے اور مرکز الٰہی میں تبدیل ہوجائے جہاں قیدیوں کی الٰہی قانون کے مطابق تعلیم و تربیت ہو اور اس ماحول میں قیدیوں کو اپنی تربیت گذشتہ زندگی پر ایک نظر اور غلط افکار اور پروگراموں پر تجدید نظر کا جو موقعہ ملا ہے اس سے وہ زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کریں۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ گناہوں سے آلودہ نہایت برے لوگوں کو اگر زندان میں کوئی اچھا اور نیک ساتھی مل جاتا ہے تو بہت جلد ان کی اصلاح ہوجاتی ہے، اس لئے کہ زندان سے باہر انھوں نے اپنے ماضی میں جھانکنے اور اس پر تجدید نظر کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی ہوتی لہٰذا زندان ان کے لئے ایک توفیق ہے جو انھیں مجبوراً حاصل ہے۔ احادیث میں قیدیوں کے حقوق انھیں نماز جمعہ میں شرکت اور دوستوں اور عزیزوں سے ملاقات کے لئے رخصت دینے کے بارے میں بہت اعلیٰ مطالب نظر آتے ہیں۔

ان احادیث میں سے ایک حدیث میں امام جعفر صادق -نے فرمایا:

"عَلَى الإمامِ اَنْ يُخْرِجَ الْمُحْبَسينَ فِي الدّيْنِ، يَوْمَ الْجُمُعَةِ اِلَى الْجُمُعَةِ، وَ يَوْمَ الْعِيدِ اِلَى الْعِيدِ فَيُرْسِلُ مَعَهُمْ فَاِذا قَضَوُا الصَّلاةَ وَ الْعِيدَ رَدَّهُمْ اِلَى السِّجْنِ"

"مسلمانوں کے پیشوا پر لازم ہے کہ وہ ان قیدیوں کو جو قرض ادا نہ کرنے کی وجہ سے یا اور وجوہات کے باعث زندان میں ہیں، روز جمعہ، اور روز عید نماز عید کے لئے سپاہیوں کے ہمراہ جانے کی رخصت دے اور جب نماز جمعہ اور نماز عید اختتام پذیر ہو تو وہ انھیں واپس زندان میں لے آئیں۔" [2]

توجہ رہے کہ نماز جمعہ اور عیدین، دو دو خطبوں پر مشتمل ہوتی ہیں جن کا تعلیم و تربیت کے لحاظ سے ایک غیر معمولی اثر ہے۔ ایک اور حدیث تو اس سے ایک قدم اور آگے ہے جس کا مضمون یہ ہے:

"اِنَّ عَلياً عَلَيهِ السَّلامُ كانَ يُخْرِجُ اَهْلَ السُّجُونِ-مَنْ حُبِسَ فى دَيْنٍ اَوْ تُهْمَةٍ- اِلَى الْجُمُعَةِ فَيَشْهَدُونَها وَ يُضَمِّنُهُمُ الاَوْلِياءَ حَتّى يَرُدُّوهُم"

علیؑ ان قیدیوں کو جو قرض کی عدم ادائیگی یا کسی دوسرے الزام میں زندان میں پڑے ہوتے، نماز جمعہ میں

---

[1] سورہ یوسف۔۳۹۔۴۰

[2] وسائل، ج۱۸ص۲۲۱، باب من یجوز حبسہ، حدیث ۲۔

حاضر ہونے کے لئے لاتے اور ان کے عزیزوں اور رشتہ داروں سے یہ ضمانت لیتے کہ وہ انھیں واپس زندان میں لائیں گے۔[1]

(ٹھیک ان رخصتوں کی طرح جو آج کل بعض اسلامی ملکوں میں رائج ہیں)۔ایک اور حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت علیؑ ہر روزِ جمعہ کو زندان کا چکر لگاتے، وہ لوگ جو حدّ جاری ہونے کے انتظار میں ہوتے، ان پر حدّ جاری کرتے (اور آزاد کر دیتے) اور جس کسی پر کوئی حدّ نہ ہوتی اسے بھی آزاد کر دیتے۔[2]

آیات و روایات اور وہ احکام جو اس ضمن میں وارد ہوئے ہیں، اُن اسے جامع دستورات کو اخذ کیا جا سکتا ہے نمونے کے طور پر چند روایات ملاحظہ فرمائیں:

ا۔ جب عبدالرحمن ابن ملجم، قاتل حضرت علیؑ کو گرفتار کر کے حوالہ زندان کیا گیا تو امام علیؑ نے اس کے ساتھ نرم رویہ اختیار کرنے کی تاکید فرمائی، اس ضمن میں اپنے فرزندان اور ارد گرد موجود افراد کو مخاطب کر کے فرمایا:

"اَطْعِمُوهُ وَاسْقُوهُ و اَحْسِنُوا اَسارَهُ"

یعنی: "اسے کھانا دینا، سیراب کرنا اور شائستہ انداز میں اپنی قید میں رکھنا۔"[3]

معروف و مشہور یہی ہے کہ جب امامؑ اس حال میں تھے کہ سر مبارک پھٹا ہوا تھا اور بستر پر تھے کبھی بے ہوش اور کبھی ہوش میں آجاتے تھے، امام حسن - نے دودھ کا ایک پیالہ آنحضرتؑ کو دیا آپؑ نے تھوڑا سا پی کر فرمایا: "باقی دودھ اپنے قیدی ابن ملجم کو دے دو۔"[4]

مرحوم علامہ مجلسی ایک اور حدیث میں نقل کرتے ہیں کہ جب ابن ملجم کو حضرت علیؑ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو آپؑ نے اس سے کچھ باتیں کیں بعد ازاں اپنے فرزند حسن - سے خطاب کر کے فرمایا:

"اَرْفِقْ یا وَلَدی بِأَسیرِكَ وَ ارْحَمْهُ وَ اَحسِنْ اِلَیْهِ و اَشْفِقْ عَلَیْهِ. اَلا تَری اِلی عَیْنَیْهِ قَدْ طارَتا الی اُمِّ رَأْسِهِ وَ قَلْبُهُ یَرْجِفُ خَوْفاً وَرُعْباً وَفَزَعاً. فَقالَ لَهُ الْحَسَنُ علیه السلام یا اَباهُ! قَدْ قَتَلَكَ هذا اللَّعینُ الْفاجِرُ وَ اَفْجَعَنا فیكَ وَ اَنْتَ تَأْمُرُنا بِالرِّفْقِ بِهِ؟! فَقالَ لَهُ نَعَمْ یا بُنَیَّ نَحْنُ اَهْلُ بَیْتٍ لانَزْدادُ عَلَی الذَّنْبِ اِلَیْنا اِلاّ کَرَماً وَ عَفْواً وَ رَحْمَةً وَالشَّفَقَةَ مِنْ شیمَتِنا لا مِنْ شیمَتِهِ. بِحَقّی عَلَیْكَ فَاَطْعِمْهُ یابُنَیَّ مِمّا تَأْکُلُهُ، وَ اَسْقِهِ مِمّا

---

[1] مستدرک، ج ۱۷، ص ۴۰۳، حدیث ا

[2] میزان الحکمۃ، ج ۲، ص ۲۵۰

[3] بحار، ج ۴۲، ص ۲۳۹

[4] بحار، ج ۴۲، ص ۲۸۹

تَشْرَبُ وَ لا تُقَيِّدْ لَهُ قَدَماً ، وَ لا تَغُلَّ لَهُ يَداً "

اے میرے فرزند! اپنے قیدی کے ساتھ نرم دلی کے ساتھ پیش آنا اس کے ساتھ نیکی اور اس پر رحم کرنا؛ کیا نہیں دیکھتے کہ اس کی آنکھیں خوف کے باعث اوپر کو چڑھی ہوئی ہیں اور اس کا دل رعب اور وحشت کی وجہ سے لرز رہا ہے؟! حسن - نے عرض کی: بابا جان! اس ملعون نے آپؑ کے قتل کا سامان فراہم کیا اور ہمیں اس عظیم مصیبت میں مبتلا کیا، پھر بھی آپؑ اس کے بارے میں نرم رویہ اختیار کرنے کی باتیں کرتے ہیں؟! (جواب میں) آپؑ نے فرمایا: ہاں، اے میرے فرزند! ہم ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جو اپنے اوپر ڈھائے گئے ظلم وستم کے مقابلے میں سوائے عفو و کرم اور رحمت و شفقت کے اظہار کے کوئی اور ردعمل ظاہر نہیں کرنا، یہ ہماری عادت ہے نہ اس کی میں تمہیں اپنے حق کی قسم دیتا ہوں کہ اسے وہی کھلانا جو تم خود کھاتے ہو اور اسے بھی وہی کچھ پلانا جو خود پیتے ہو، اس کے پاؤں میں زنجیر اور ہاتھوں میں ہتھکڑی نہ لگانا![1]

۲۔ مرحوم شیخ طوسی اپنی کتاب ''خلاف'' میں کہتے ہیں: جب کبھی کوئی کسی چھوٹے بچے کو پکڑ کر از راہ ظلم قید کر لے اور کوئی دیوار اس پر گر پڑے یا کوئی حیوان درندہ اسے مار ڈالے، یا سانپ اور بچھو اسے ڈس لے جس کے نتیجے میں اس کی موت واقع ہو جائے تو یہ قید کرنے والا اس کے خون کا ضامن ہے، بعد ازاں فرماتے ہیں:

"دَلِيلُنا اِجْماعُ الْفِرْقَةِ وَ اَخْبارُهُمْ"

یعنی اس مطلب پر ہماری دلیل تمام علماء امامیہ کا اتفاق و اجماع اور ان کی روایات ہیں۔[2]

اس بیان سے صاف پتہ چلتا ہے کہ زندان کو امن وامان کا حامل اور صاف ستھرا ہونا چاہیے اور اگر بدامنی اور آلودگی کے نتیجے میں کوئی حادثہ رونما ہو جائے تو قید کرنے والا اس خون کا ضامن اور ذمہ دار ہے۔

۳۔ مرحوم شیخ طوسی اپنی کتاب ''مبسوط'' میں بعض فقہاء سے نقل کرتے ہیں کہ اگر کسی کو کسی کمرے میں قید کر کے کمرے کا دروازہ بند کر دیا جائے اور گھٹن اور کم ہوا کے باعث وہ قیدی مر جائے تو قید کرنے والا اس کی دیت کا ضامن ہوگا۔[3]

اس مطلب کو گرسنگی (بھوک) وغیرہ کی صورت میں بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اس سارے بیان سے مجموعی طور پر بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ زندان میں قید شخص کو کافی ہوا اور غذا وغیرہ ملنی چاہیے اور ضروری ہے کہ اس کی زندگی اور سلامتی کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو۔

۴۔ بہت سارے فقہاء نے آداب قاضی کی بحث میں لکھا ہے کہ قاضی کو چاہیے کہ شہر میں داخل ہوتے ہی قیدیوں کے بارے

---

[1] بحار، ج ۴۲ ص ۲۸۷، ۲۸۸

[2] کتاب خلاف، ج ۳، ص ۹۴، کتاب اجنایات، مسئلہ ۱۹

[3] احکام زیاندر اسلام، ص ۲۶۳

میں اطلاع حاصل کرکے ان کی فائلوں کی جانچ پڑتال کرے تا کہ اگر کسی کی مدت قید ختم ہوگئی ہو یا کوئی قیدی اگر بلا جواز و دلیل زندان میں ہے تو انھیں فوراً آزاد کردے۔

اسی طرح بعض فقہاء نے تصریح کی ہے کہ جب قاضی شہر میں داخل ہوتو لازم ہے کہ تمام شہروں میں اعلان کیا جائے کہ قاضی فلاں روز قیدیوں کے امور کو نپٹائے گا اور جس کسی کا کوئی عزیز قید ہو وہ اس دن حاضر ہوجائے اور جب قیدی کی قید کے مدعی حاضر ہوجائیں تو قیدیوں کے نام یکے بعد دیگرے پکارے جائیں اوران سے ان کی قید کا سبب پوچھا جائے بعدازاں مدعی سے سوال کیا جائے قیدی کی قید کی اطمینان بخش دلیل دستیاب ہونے کی صورت میں اسے پھر سے داخل زندان کردیا جائے گا اور مدعی نہ ہونے کی صورت میں قیدی کا نام بلند آواز میں پکارا جائے گا تا کہ اگر کوئی مدعی ہوتو وہ قاضی کی عدالت میں پیش ہوکر اپنا دعویٰ پیش کرسکے اس صورت کے برعکس اسے آزاد کردیا جائے گا۔[1]

قیدیوں کی حمایت میں ابویوسف کا تاریخی لائحہ عمل

عباسیوں کا زمانہ تاریخ اسلام کا سخت گھٹن اور اضطراب کا دور تھا اور اس کا ایک زندہ ثبوت یہ ہے کہ اس دور میں زندانوں کی تعداد میں بے پناہ اضافہ ہوا۔قیدیوں پر سخت دباؤ ڈالا جاتا اور بے گناہ افراد کو بے بنیاد الزامات کی بنیاد پر گرفتار کرکے زندانوں میں ڈال دیا جاتا تھا اور قرون وسطیٰ کے زندانوں کی یاد تازہ کی جاتی تھی۔

ان زندانوں کی وحشت ناک خبریں حکومت کی طرف سے لگائے گئے سخت سنسر کے باوجود رفتہ رفتہ باہر بھی پہنچ گئیں اور لوگوں کے اعتراضات ہر طرف سے بلند ہونے لگے، خاص طور پر لوگوں نے علماء وقت پر دباؤ ڈالا کہ اس ظالمانہ کارروائی کو ختم کرنے کی کوشش کریں، اس ضمن میں جو مثبت عمل انجام دیا گیا وہ مشہور فقیہ اہل سنت ابویوسف شاگرد ابوحنیفہ کا تاریخی فیصلہ تھا۔

عباسی خلیفہ ہارون الرشید نے لوگوں کا منہ بند کرنے کے لئے ابویوسف کے سامنے تجویز پیش کی کہ وہ اسلام اور فقہ اسلام کی روشنی میں قیدیوں کے ساتھ سلوک کی کیفیت کے بارے میں ایک لائحہ عمل تیار کرے، ہارون الرشید کا سوال خاص طور پر اس بارے میں تھا کہ مجرم اہل شر وفساد اور چور افراد جب گرفتار ہوکر راہی زندان ہوتے ہیں تو کیا لازم ہے کہ ان کے لئے غذا تیار کی جائے؟ اور اگر لازم ہے تو کیا اس غذا کو زکوۃ کے مال سے تیار کیا جائے؟ یا کسی اور مال سے؟ مجموعی طور پر یہ کہ ان کے ساتھ کیسا سلوک روا رکھا جائے؟

واضح ہے کہ ہارون الرشید کو قیدیوں سے کوئی ہمدردی نہیں تھی بلکہ لوگوں کے احتجاج نے اسے مجبور کردیا تھا، ابویوسف نے جواباً ایک تفصیلی لائحہ عمل مرتب کرکے خلیفہ کے پاس بھیج دیا جس میں شجاعت آمیز صراحت کے ساتھ اس نے احکام اسلام کو تحریر کیا اور سلطنت میں موجودہ صورتحال پر بھی کڑی تنقید کی اس نے اپنے سوال وجواب کے دائرے کو قیدیوں، چوروں اور اہل شر افراد تک ہی محدود نہ رکھا، کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ عباسیوں کے زندانوں میں بیشتر قیدی سیاسی (قیدی) ہیں! اس تاریخی تحریر کو بارہ حصوں میں خلاصہ کرکے

---

[1] جواہرالکلام، ج ۴۰ص ۷۴

یہاں پیش کیا جاتا ہے: (غور فرمائیں)

ا۔جب قیدیوں کے پاس کھانے کے لئے کچھ نہ ہوتو ضروری ہے کہ محل زکوٰۃ (نادار لوگوں کے حق) یا بیت المال (عمومی حقوق) کے خرچ سے انھیں کھانا فراہم کیا جائے اور (اے ہارون) تمہیں اختیار ہے کہ ان دو میں سے جسے چاہو انتخاب کرلو۔

۲۔واجب ہے کہ ہر قیدی کے لئے اس کی ضرورت کے مطابق راشن تیار کیا جائے اور اس امر میں کسی قسم کی کوتاہی کرنا جائز نہیں!

۳۔اس بات پر نظر رکھو کہ اگر مشرکین میں سے بھی کوئی شخص گرفتار کیا جائے تو جب تک اسلامی عدالت کی طرف سے اس کا فیصلہ صادر نہیں ہوتا، ضروری ہے کہ اس کے ساتھ بھی یہی اچھا سلوک کرو اور اس کے کھانے کا بھی بندوبست کرو چہ جائیکہ ایک مسلمان قید میں پڑا ہو، کیا یہ حق کے مطابق ہے کہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے یہاں تک کہ بھوک سے مر جائے؟!

۴۔اے خلیفہ! گذشتہ خلفاء ہمیشہ قیدیوں کے بارے میں (اچھے رویہ) کی تاکید کرتے اور ان کے لئے موسم گرما اور سرما کے علیحدہ لباس تیار کراتے تھے، اور اس راہ کے سب سے پہلے راہی امیر المؤمنین علیؑ تھے، اور ان کے بعد کے خلفاء بھی اس مسئلے کی اہمیت کے قائل تھے۔

بعض راویان حدیث نے مجھے بتایا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز کا تاکیدی حکم تھا کہ زندانوں میں کسی کو اس طرح پابہ زنجیر نہ کریں کہ وہ کھڑے ہو کر نماز ادا نہ کر سکے اور کسی کو رات سے لے کر صبح تک ہتھکڑی نہیں لگنی چاہیے سوائے ان لوگوں کے جنھوں نے بے گناہوں کا خون بہایا ہے۔

۵۔حکم دے کہ قیدیوں کی خوراک کی مقدار کے مطابق نقد رقم ہر ماہ کے آغاز میں انھیں دے دی جائے اس لئے کہ مجھے اس بات کا خوف ہے کہ اگر غذا جنس کی صورت میں ان کے حوالے کی جائے، تو زندان کے مامورین اس سے کچھ نہ کچھ چرا لیں! اور غذا کا قابل توجہ حصہ قیدیوں تک نہ پہنچ پائے؛ (ابو یوسف نے اس مقام پر بنی عباس کے زندانوں میں حکم فرما فساد کو واضح ترین صورت میں بیان کیا ہے)۔

۶۔کسی قابل اعتماد اور صاحب خیر شخص کو حکم دو کہ وہ ان تمام قیدیوں کا نام ایک رجسٹر میں ثبت کرے جو بیت المال سے راشن حاصل کرتے ہیں وہ اس رجسٹر کو اپنی نگرانی میں رکھے اور ہر ماہ کے آغاز میں بذات خود زندان جائے اور اس رجسٹر کے مطابق ایک ایک قیدی کے نام لے کر پکارے اور اس کے اخراجات کی رقم اس کے ہاتھ میں دے میرے خیال میں دس دینار ایک ماہ کے خرچ کے لئے ایک فرد کے لئے کافی ہوں گے (اگر دینار کو ایک مثقال، اٹھارہ چنوں، کے برابر سونے کی حیثیت سے ملاحظہ کریں تو آج کی کرنسی میں یہ ایک بہت بڑی رقم ہوگی اور یہاں تک کہ اس زمانے کے اعتبار سے بھی ایک بڑی رقم تھی ابو یوسف نے اس مقدار کا انتخاب اس لئے کیا کہ اگر اس سے کم رقم بھی قیدیوں کو دیں تو پھر بھی ان کی ضرورت کے مطابق رقم ادا کریں)۔

۷۔میں نے یہ بات سنی ہے کہ بعض اوقات مامورین قیدیوں کو پابند سلاسل حالت میں لوگوں کے سامنے لا کھڑا کرتے ہیں تاکہ لوگ ان پر ترس کھا کر انھیں صدقہ وخیرات دیں اور اس طرح کچھ رقم قیدیوں کے لئے اکٹھی ہو جاتی ہے! اس ناشائستہ عمل سے پرہیز کرو کیونکہ خدا تعالیٰ ایسے عمل سے راضی نہیں میرے خیال میں مشرکین بھی مسلمان اسیروں کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرتے پس کیسے ممکن ہے کہ

مسلمان اسیروں کے ساتھ ایسا سلوک روا رکھا جائے؟! پھر یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ رقم جسے صدقات کے ذریعے جمع کیا جاتا ہے وہ قیدیوں کو دے دی جاتی ہے۔

۸۔ جب کوئی زندان میں فوت ہو جائے اور اس کے کوئی قریبی رشتہ دار بھی نہ ہوں تو لازم ہے کہ اس کے غسل وکفن کے وسائل مناسب انداز میں بیت المال کے ذریعے فراہم کئے جائیں، اسی طرح ایک مسلمان کی حیثیت سے اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے اور پھر سپرد خاک کیا جائے۔ باوثوق افراد نے مجھے خبر دی ہے کہ بعض اوقات کوئی غریب الوطن قیدی زندان میں فوت ہو جاتا ہے اور اس کی میت ایک یا دو روز تک زمین پر پڑی رہتی ہے تا کہ قیدی لوگ ذمہ دار افراد سے پوچھیں کہ بتایئے ہماری ذمہ داری اس میت کے بارے میں کیا ہے؟ اس دوران قیدی افراد اس غم انگیز منظر کو ختم کرنے کے لئے مل جل کر پیسے جمع کرتے ہیں تا کہ کسی ایسے شخص کو دیں جو اسے قبرستان تک پہنچادے اور غسل وکفن اور نماز جنازہ کے بغیر سپرد خاک کر دے، یہ ایک ایسا دردناک عمل ہے جو کسی مسلمان کے لئے قابل برداشت نہیں!

۹۔ میرے خیال میں اگر تم حکم دو کہ حدود وتعزیرات اسلامی پر صحیح طور پر عمل ہو تو قیدیوں کی تعداد بہت کم ہو سکتی ہے کیونکہ مجرم ذہنیت کے لوگ جب اپنی آنکھوں سے ان سزاؤں کے مناظر دیکھیں گے تو یہ ان کی روح پر اثر انداز ہوں گے! قیدیوں کی تعداد میں اضافے کا ایک اور سبب یہ ہے کہ بہت سارے لوگ زندان میں آنے کے بعد بھلا دیئے جاتے ہیں اور ان کے معاملے کا تعاقب (پیچھا) نہیں کیا جاتا لہٰذا بعض افراد کو اس کام پر مامور کرو کہ وہ ہر روز قیدیوں کے ریکارڈ کا مطالعہ کریں اور جلد از جلد ان کے معاملے کو نپٹائیں اگر ان کے خلاف کوئی دلیل ہو تو انھیں سزا دے کر آزاد اور دلیل کے نہ ہونے کی صورت میں ان کی قید ختم کر کے انھیں آزاد کر دیا جائے۔

۱۰۔ خطا کاروں کی سزا میں افراط کا رویہ نہ اپنایا جائے اس کا خصوصی اور تاکیدی حکم صادر کرو کسی کو اسلامی سزا جو مجاز ہے، سے زیادہ سزا نہ دی جائے، مجھے بتایا گیا ہے کہ تمہارے مامورین صرف الزام کی بنیاد پر قیدیوں کو مارتے ہیں یہاں تک کہ بعض جرائم کی صورت میں ۲۰۰ تا ۳۰۰ یا کم وبیش تازیانے بھی لگائے گئے ہیں! اسلام میں یہ سب کچھ جائز نہیں مسلمان کے بدن کی حرمت حرام ہے اور بغیر وجہ کہ اس کو آزار نہیں پہنچایا جا سکتا۔

۱۱۔ جب کوئی قید کسی ایسے جرم کا مرتکب ہوا ہو جس کی وجہ سے ضروری ہے کہ اس سے قصاص لیا جائے یا اس نے ایسا عمل انجام دیا ہے جو قابل حد وتعزیر ہے تو یہ احکام اسلامی اس پر جلد از جلد جاری کئے جائیں اور وہ بلاوجہ زندان میں نہ پڑا رہے اور اگر صاحبان قصاص خون معاف کر دیں اور مجرم سے درگذر کریں تو اس صورت میں بھی اسے فوراً آزاد کیا جائے۔

۱۲۔ قصاص کے ممکن نہ ہونے کی صورت میں مجرم کامل دیت کی ادائیگی کرے اس کے بعد کچھ عرصہ زندان میں گذارے یہاں تک کہ توبہ کے آثار اس پر ظاہر ہوں اس صورت میں بلا تاخیر اسے آزاد کیا جائے تا کہ وہ اپنی راہ لے اور جہاں جانا چاہے چلا جائے۔ [۱]

یہ تاریخی دستاویز جو عباسی حکمرانوں کے ہم عصر ایک فقیہ کی قیدیوں کے بارے میں اسلامی طرز فکر کو بیان کرتی ہے، ممکن ہے اس سلسلے میں بعنوان نمونہ ومثال اسلامی تعلیمات کی ایک سند قرار دی جا سکے۔

---

[۱] نقل از کتاب الخراج، ص ۱۴۶۔ با تلخیص

ادارہ حسبہ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر

اشارہ

کسی قانون کی قدر و قیمت اس وجہ سے ہوتی ہے کہ دیکھا جائے کہ اس کا نفاذ کس حد تک ہے، بہترین قوانین اگر نافذ نہ ہوں تو ان کی حیثیت محض کاغذی ہوتی ہے معاشرے میں موجود کسی درد و مشکل کی دوا نہیں ہوتے اس کے برعکس بہت کمزور قوانین کو بھی اگر بہتر طور پر نافذ کیا جائے تو ممکن ہے کہ ایک حد تک مشکل کو حل کر سکیں۔ اس دلیل کے پیش نظر اسلام اور حکومت اسلامی میں قوانین کے نفاذ اور جرائم کی روک تھام کے لئے ایک وسیع اور جامع لائحہ عمل کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ یہ لائحہ عمل مندرجہ ذیل امور پر مشتمل ہے:

۱۔ نظام قضائی (عدالتی نظام)

۲۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری

۳۔ مسئلہ حسبہ

عدالتی نظام اور حدود و تعزیرات کے اجراء (جاری کرنے) سے متعلق کافی حد تک گفتگو ہو چکی ہے اب ہم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور موضوع حسبہ کے بارے میں کچھ گفتگو کریں گے۔ حقیقت میں حدود کا اجراء و نفاذ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہی کی شاخیں ہیں، اس لئے کہ ہم جانتے ہیں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے تین مرحلے ہیں، جن میں سے دو مرحلے واجب کفائی کے طور پر عوام الناس کی ذمہ داری ہیں اور ایک مرحلے کی ذمہ دار حکومت ہے۔

۱۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر قلبی (یعنی انسان دل میں برائیوں سے بیزار اور خوبیوں کا مشتاق ہو (بعض حضرات کی رائے میں اس مرحلے سے مراد یہ ہے کہ انسان نفرت یا دلی لگاؤ کے آثار کو اپنے چہرے پر یا عمل کے ذریعے ناراضگی اور رضامندی کی صورت میں ظاہر کرے) یہ ترک واجبات اور انجام محرمات کے مقابلے میں تمام لوگوں کی ذمہ داری ہے۔

۲۔ زبان کے ذریعے امر بالمعروف و نہی عن المنکر یعنی انسان شروع میں نرم و ملائم اور محبت آمیز انداز میں وعظ و نصیحت کرے اور اثر نہ ہونے کی صورت میں تند و سخت انداز اختیار کر کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری انجام دے۔

۳۔ ہاتھ کے ذریعے امر بالمعروف و نہی عن المنکر یا دوسرے الفاظ میں واجبات کو ترک کرنے اور محرمات کو انجام دینے والوں کے خلاف قہر آمیز اور عملی اقدام کرنا، یہ چاہے بدنی سزا کے ذریعے ہو یا حبس اور زندان اور اس کے مشابہ عمل کے ذریعے اور جیسا کہ کتب فقہی میں کہا گیا ہے کہ یہ مرحلہ حکومت کی ذمہ داری ہے اور ممکن نہیں کہ اسے عوام الناس کے سپرد کر دیا جائے کیونکہ ایسا کرنا

شدید گڑبڑ اور سخت بحران کا باعث بن سکتا ہے اور یہ مرحلہ وہی ہے جسے فقہ اسلامی اور عبارات فقہاء و مؤرخین میں ''وظیفہ حسبہ'' کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔

اس اشارے کے ساتھ ہی ہم قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اس مطلب کا مزید جائزہ لیتے ہیں:

۱۔ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ (آل عمران/۱۱۰)

۲۔ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾ (آل عمران/۱۰۴)

۳۔ لَيْسُوْا سَوَآءً ؕ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ (آل عمران/ ۱۱۳ و ۱۱۴)

۴۔ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۷۱﴾ (توبہ/۷۱)

۵۔ اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾ (توبہ/ ۱۱۲)

۶۔ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴿۴۱﴾ (حج/۴۱)

۷۔ يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۱۷﴾ لقمان/۱۷)

ترجمہ:

۱۔ تم ایک بہترین امت ہو جسے لوگوں کے فائدے کے لئے خلق کیا گیا ہے کیونکہ تم لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے اور خدا پر ایمان رکھتے ہو۔

۲۔ چاہیے کہ تم میں سے ایک ایسی جماعت ہو جو نیکی کی دعوت اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (کی ذمہ داری) انجام دے ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

۳۔ اہل کتاب سب یکساں نہیں، اہل کتاب میں سے بعض افراد ایسے ہیں جو ایمان اور حق کی خاطر قیام کرتے اور رات کے اوقات میں آیات خدا کی تلاوت کرتے ہیں اس حال میں کہ وہ سجدے میں پڑے ہوتے ہیں خدا اور آخرت پر ایمان رکھتے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر انجام دیتے ہیں اور نیک کام انجام دینے میں ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرتے ہیں یہی لوگ صالحین میں سے ہیں۔

۴۔ باایمان مرد و زن ایک دوسرے کے ولی (یاور اور مددگار) ہوتے ہیں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ ادا کرتے اور خدا اور رسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں، خدا جلد ہی اپنی رحمت کو ان کے شامل حال قرار دے گا بے شک خدا تعالیٰ عزیز اور حکیم ہے۔

۵۔ توبہ، عبادت، حمد و سپاس (شکر)، سیاحت اور رکوع و سجود کرنے والے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے والے اور حدود الٰہی کے محافظ ہی (حقیقی مومن ہیں)، (اور اس قسم کے) اہل ایمان کو بشارت دے دو!

۶۔ (خدا کے دوست وہ ہیں) جنھیں اگر ہم زمین پر صاحب قدرت قرار دیں تو یہ نماز قائم اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں (اسی طرح) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے ہیں اور تمام امور کا اختتام اور انجام اللہ ہی کے لئے ہے۔

۷۔ (لقمان نے کہا) میرے بیٹے! نماز قائم کرو اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر انجام دو اور جو مصائب تمھیں لاحق ہوں ان پر صبر کرو کیونکہ یہ سب کچھ اہم امور میں سے ہے!

آیات کا خلاصہ اور تفسیر

نفاذ احکام کے سلسلے میں ایک اہم قدم

مذکورہ بالا آیات وہ خصوصی آیات ہیں جن میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جیسے اہم فریضے کو بیان کیا گیا ہے جو اس فریضے کی مختلف جہات کو ظاہر کرتی ہیں۔ سب سے پہلی آیت میں قرآن مجید امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ایک عمومی حکم کے طور پر بیان کرنا اور اسے امت اسلامی کی ایک اہم خصوصیت قرار دیتا ہے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ فریضہ سابقہ امتوں میں موجود نہیں تھا بلکہ مراد یہ ہے کہ

امت اسلامی میں اس (فریضے) کوایک اصل اصیل اور رکن رکین (یعنی مستحکم قاعدے اور رکن) کی حیثیت دی گئی ہے، ارشاد ہے:

''تم ایک بہترین امت ہو جسے لوگوں کے فائدے کے لئے خلق کیا گیا ہے کیونکہ تم لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے اور خدا پر ایمان رکھتے ہو۔''

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ط

دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک طرف تو قرآن امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ایک خصوصیت کے طور پر متعارف کراتا ہے جس کے باعث اسلام عالی ترین دین اور امت اسلامی ایک مثالی امت قرار پاتی ہے اور دوسری طرف سے ان دونوں ذمہ داریوں کو خدا پر ایمان سے پہلے ذکر کرتا ہے اور یہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ جب تک یہ فریضہ اسلامی اصولوں کے طور پر عوام الناس میں نافذ نہ ہو، لوگوں کے ایمان کی بقاء کی بھی ضمانت فراہم نہیں ہوتی۔

جی ہاں! ایسا ہی ہے اگر ان دو اصولوں کو فراموش کر دیا جائے تو دلوں میں ایمان کی جڑیں ڈھیلی پڑ جاتی ہیں، اس کی شاخیں و پتے کملا جاتے اور آخر کار اس کے ستون منہدم ہو جاتے ہیں۔ ضمناً اس بیان سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ مسلمان اس وقت تک ایک ممتاز امت شمار ہوں گے جب تک وہ نیکی کی طرف دعوت اور فساد کے ساتھ مقابلے کو فراموش نہیں کریں گے اور جس دن ان دو عظیم الٰہی ذمہ داریوں کو فراموش کر دیا جائے گا اس دن نہ وہ بہترین امت رہیں گے اور نہ ہی معاشرہ انسانی کے لئے سودمند اور نفع بخش! جی ہاں! مسلمان اسی وقت جہان میں موجود امم (امتوں) کی قیادت وراہنمائی کر سکتے ہیں اور دنیا انکے وجود سے خیر و برکت حاصل کر سکتی ہے جب وہ ان دو عظیم ذمہ داریوں کو عمومی سطح پر جاری کریں۔

دوسرے الفاظ میں: امت اسلامی کے ایک ایک فرد پر لازم ہے کہ وہ اس امر (امر بالمعروف و نہی عن المنکر) کے بارے میں اپنی ذمہ داری محسوس کرے جبکہ اس کے برعکس آج کی دنیا میں فتنہ وفساد سے نبرد آزما ہونا اور اپنی ذمہ داری پوری کرنے کی دعوت دینا فقط حکومتی مامورین کے ذمے ہے اور باقی لوگ اپنے آپ کو ہر قسم کی ذمہ داری سے بری الذمہ قرار دیتے اور اجتماعی ومعاشرتی مسائل کے مقابلے میں خود کو غیر جانبدار سمجھتے ہیں، لیکن ایک مسلمان یہ کہتے نظر آتا ہے کہ: یہ (امر بالمعروف اور نہی عن المنکر) ایک عمومی ذمہ داری ہے جس کے دائرے میں چھوٹے بڑے پیر وجوان عورت مرد عالم اور جاہل سبھی آتے ہیں۔ لفظ معروف (جانا پہچانا) اور منکر (انجانا) پر اعتماد بھی قابل توجہ ہے، اس لئے کہ یہ ایک طرف سے ظاہر کرتا ہے کہ واجبات ومحرمات ایسی چیزیں ہیں جنھیں انسان کی عقل وروح بخوبی پہچانتی ہے لہٰذا انسان واجبات سے محبت کرتا ہے جبکہ منکرات اور محرمات اس کے لئے انجانی اور باعث نفرت چیزیں ہوتی ہیں۔

دوسری طرف سے بدیہی اور واضح ہے کہ اگر ان دو فریضوں کو بھلا دیا جائے اور معاشرے کو منکرات (پر عمل کرنے) کی عادت پڑ جائے اور اہل معاشرہ اچھائیوں، برائیوں اور اعمال معروف کو ترک کر دیں تو معروف ان کی نظر میں منکر اور منکر، معروف میں تبدیل ہو جائے گا اور یہ ایک عظیم خسارہ ہے جو کسی معاشرے کا دامن گیر ہو جائے، یہ وہی مصیبت و بدبختی ہے جس نے اکثر معاشروں کو اپنی گرفت

میں لے رکھا ہے کہ ان میں منکر اور معروف نے اپنی جگہیں تبدیل کر لیں ہیں (یعنی منکر اور معروف کی تمیز ختم ہو چکی ہے)۔

دوسری آیت کے پیش نظر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ایک اور شعبہ ہے جو امت کے بعض افراد کے ساتھ مخصوص ہے دوسرے الفاظ میں اس کا تعلق خاص طور پر حکومت اور اس کے کارندوں کے ساتھ ہے، ارشاد فرماتا ہے:

ترجمہ: ''ضروری ہے کہ تم سے کچھ لوگ نیکی کی طرف دعوت اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا وظیفہ انجام دیں، ایسے ہی لوگ کامیاب ہیں۔''

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

جب اس آیت کو گذشتہ آیت کے سامنے رکھا جائے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ایک عمومی فریضہ قرار دیتی ہے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس (پہلی آیت) میں ان دو عظیم ذمہ داریوں کے ایک مرحلے میں قلب و زبان کا اور دوسرے میں شدت عمل کا حکم ہے اور دلچسپ یہ ہے کہ کامیابی اس آیت میں ان لوگوں کے لئے بیان ہوئی ہے جنھوں نے یہ دونوں ذمہ داریاں پوری کی ہیں۔[1]

اُمَّۃ کے ساتھ تعبیر کرنا شاید اس نکتے کی طرف اشارہ ہو کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اس مرحلے میں کام ایک لائحہ عمل اور ادارہ سازی کی صورت میں انجام پانا چاہیے اور ہم جانتے ہیں کہ جو کام شدت عمل اور حکومت کے ہاتھوں میں انجام پاتے ہیں وہ ان دو امور (لائحہ عمل کی تشکیل اور ادارہ سازی) کے بغیر ممکن نہیں ہوتے۔ اس آیت شریفہ کا اختتامی حصہ بخوبی گواہی دے رہا ہے کہ دنیا و آخرت کی ہر کامیابی چاہے انفرادی ہو یا اجتماعی ان دو عظیم فریضوں کو انجام دینے میں ہے۔

تیسری آیت میں ان دو عظیم ذمہ داریوں کے سلسلے میں ایک اور لطیف اشارہ موجود ہے جو اس کے شأن نزول سے واضح ہو جاتا ہے۔ اس آیت کے شان نزول کے بارے میں علماء نے کہا ہے کہ قوم یہود کے کچھ دانشمند اور نیک لوگوں نے اسلام قبول کر لیا اور مسلمانوں کے ساتھ ملحق ہو گئے، یہودیوں کے سردار اس واقعے سے سخت نالاں ہوئے اور ان لوگوں کے بارے میں کہنے لگے: ہمارے کچھ برے لوگوں نے اسلام قبول کیا ہے اور اگر وہ درست لوگ ہوتے تو اپنے آباؤ اجداد کے دین سے ہرگز نہ پھرتے! مذکورہ بالا آیت انھیں جواب دیتی ہے کہ

ترجمہ: ''وہ (اہل کتاب) سارے یکساں نہیں: ان میں سے بعض حق و ایمان اور اطاعت خدا کے لئے

---

[1] بعض حضرات نے جو آیت شریفہ میں موجود مِن کو زائدہ یا بیانیہ قرار دیا ہے اور اس صورت میں تمام اہل ایمان اس آیت کے مفہوم میں شامل ہو جاتے ہیں، آیت شریعہ کے ظاہر کے خلاف ہے بلکہ ظاہری یہی ہے کہ مِن تبعیض کیلیے ہو یعنی تم سے ایک گروہ کو یہ فریض انجام دینا چاہیے۔ اسی طرح بعض حضرات کی رائے میں مِن تبیعضیہ واجب کفائی پر دلالت کیلئے ہے یہ بھی خلاف ظاہر ہے کیونکہ واجب کفائی سب پر واجب ہوتا ہے البتہ اس کے وجوب کی نوعیت واجب عینی سے مختلف ہوتی ہے۔ (بیشتر توضیح اسی بارے میں علم اصول میں دی گئی ہے)۔

قیام کرتے اور مسلسل رات کے اوقات میں سجدے کی حالت میں خدا کو یاد کرتے ہیں۔ ان کا خدا اور قیامت کے دن پر ایمان ہے، اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو انجام دیتے اور نیک کاموں کی بجا آوری میں ایک دوسرے پر سبقت لینے کی کوشش کرتے ہیں اور یہی لوگ صالحین میں سے ہیں۔''

لَيْسُوْا سَوَآءً ؕ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ۝۱۱۳ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ؕ وَاُولٰٓىِٕكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ۝۱۱۴

قرآن اس مقام پر اسلام قبول کرنے والے اہل کتاب میں سے صالحین کی خصوصیت کو تین چیزوں میں بطور خلاصہ بیان کرتا ہے: خدا اور آخرت پر ایمان، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی انجام دہی اور نیک کاموں میں ایک دوسرے پر سبقت۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا اور روز قیامت پر ایمان لانے کے بعد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر صالحین کی واضح ترین علامت اور نشانی ہے کیونکہ تمام نیک اعمال کی جڑ اسی عمل میں پوشیدہ ہے۔

چوتھی آیت میں اہل ایمان کی اولین خصوصیت کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر قرار دیا گیا ہے، یہاں تک کہ اقامت نماز، ادائیگی زکوٰۃ اور خدا اور رسولؐ کی اطاعت کو بھی اس کے بعد ذکر کیا گیا ہے! اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر یہ دو عظیم ذمہ داریاں انجام نہ دی جائیں تو خدا کی اطاعت و بندگی اور عبادت کی اساس خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

ترجمہ: ''باایمان مرد و زن ایک دوسرے کے ولی (یاور اور مددگار) ہوتے ہیں اور وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ ادا کرتے اور خدا اور رسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں، خدا جلد ہی اپنی رحمت کو ان کے شامل حال قرار دے گا بے شک خدا تعالیٰ عزیز اور حکیم ہے۔''

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓىِٕكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۝۷۱

اس جملے کی تفسیر میں کئی ایک احتمالات دیئے گئے ہیں جن میں سے ایک احتمال یہ ہے کہ وہ لوگ خدا اور اسلام کے اصول میں ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ اور متحد ہیں، دوسرا احتمال یہ ہے کہ وہ امور دنیا و دین میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اور تیسرا احتمال یہ ہے کہ وہ تعلیم و تربیت کے ذریعے دوسروں کو کمالات کے بلند مراتب اور مدارج پر پہنچاتے ہیں۔ واضح ہے کہ یہ تینوں تفسیریں ایک دوسرے کے منافی نہیں اور آیت کے مفہوم میں تینوں کا جمع ہونا ممکن ہے، اس لئے کہ آیت شریفہ میں ولایت (اولیاء ہونے) کو مطلق طور پر ذکر کیا گیا ہے جو (ولایت) اہل ایمان کے مختلف جہات میں باہمی تعلق کو بھی اپنی حدود میں شامل کر لیتی ہے۔

پانچویں آیت میں وہ نفع بخش تجارت، جو سچے باایمان افراد خدا کے ساتھ جہاد میں شرکت کے عنوان سے کرتے ہیں اور اپنی جان کا معاوضہ اس کی بہشت کی صورت میں حاصل کرتے ہیں، کو ذکر کرنے کے بعد اس نفع بخش معاملے پر خدا انھیں مبارک باد دیتا اور اسے ایک عظیم کامیابی قرار دیتا ہے اور ان کے اوصاف کو نو صفات کی صورت میں خلاصہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: وہ لوگ توبہ اور عبادت کرنے والے، شکر گذار، سیاحت کرنے والے (یعنی عبادت الٰہی کے مراکز کے درمیان یا میدان جہاد کے درمیان آمد و رفت رکھنے والے ہیں) سجدہ و رکوع اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو بجالانے اور حدود الٰہی کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ (اے رسولؐ) ایسے اہل ایمان کو بشارت دے دو۔

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴿۱۱۲﴾

درحقیقت پہلے چھ اوصاف میں (امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور حدود الٰہی کی حفاظت) اور معاشرتی اور اجتماعی فساد اور ابتری کے خلاف ان کے مقابلے، حق وعدالت کے استحکام اور احکام الٰہی کے نفاذ، کی طرف اشارہ ہے اور ان سب (اوصاف) کے بعد خدا کی طرف سے بشارت اور خوشخبری کو مطلق طور پر بیان کیا گیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں پہلے چھ اوصاف کی نظر خلق وخالق کے باہمی تعلق اور رابطے پر ہے جبکہ آخری تین اوصاف کی توجہ مخلوق کے آپس میں تعلق پر ہے اور آخر میں بیان کی گئی بشارت کا تعلق دنیوی اور اُخروی سعادت دونوں سے ہے۔

چھٹی آیت شریفہ میں اس مسئلے کے ایک اور پہلو کی طرف اشارہ ہے اور وہ اس کا حکومتی پہلو ہے دوسرے لفظوں میں اسلامی حکمرانوں کی ذمہ داریوں سے ایک اہم ذمہ داری امر بالمعروف اور نہی عن المنکر شمار ہوتی ہے، ارشاد حق تعالیٰ ہے

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ﴿۴۱﴾

ترجمہ: ''خدا کے دوست وہ لوگ ہیں جنھیں اگر ہم زمین پر طاقت وقدرت عطا کریں تو وہ نماز قائم، زکات کو ادا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو انجام دینے والے ہیں اور تمام امور کا اختتام خدا ہی کے لئے ہے۔''

خدا کی مدد کا وعدہ جو اس سے پہلی آیت ''وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ'' میں بیان ہوا ہے، اس کا تعلق درحقیقت ایسے افراد سے ہے جو جب زمین پر قدرت اور اقتدار حاصل کرتے ہیں تو نہ فقط خود نماز پڑھتے ہیں بلکہ نماز کو تمام روئے زمین پر قائم کرتے ہیں، اس کے علاوہ لاچار اور بے کس اور بے بس افراد کے حقوق ان تک پہنچاتے اور پھر ایک وسیع پیمانے پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا وظیفہ دیتے ہیں۔ اگرچہ بعض حضرات نے یہ گمان کیا ہے کہ اس آیت میں مذکورہ افراد سے مراد مہاجرین کی جماعت ہے لیکن روز روشن کی طرح واضح ہے کہ آیت شریفہ ایک وسیع تر مفہوم کی حامل ہے اور قیامت تک کے افراد اس مفہوم میں شامل ہو سکتے ہیں۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید نماز پڑھنے کو اقامت (نماز) سے تعبیر کرتا ہے جس کا مطلب ہے برپا یا قائم کرنا، صرف منافقین کے سلسلے میں قیام سے تعبیر کیا ہے نہ کہ اقامۃ سے "وَ اِذَا قَامُوْا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى" (نساء/ ۱۴۲) تعبیر ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ حقیقی اہل ایمان نہ فقط خود نماز پڑھتے ہیں بلکہ کوشش کرتے ہیں کہ نماز پورے معاشرے میں قائم اور برپا ہو، بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ اس میں یہ اشارہ ہے کہ (حقیقی مومن) نہ فقط ظاہری نماز کو بجالاتے ہیں بلکہ کوشش کرتے ہیں کہ روح وحقیقت نماز کو کمال وصحت کی شرائط سمیت قائم اور برپا کریں (ان دونوں کے درمیان اتفاق پیدا کرنا بھی کوئی مشکل نہیں)۔

ساتویں اور آخری آیت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے میں ہم ایک اور نکتے کا سامنا کرتے ہیں اور وہ یہ کہ یہ دو احکام فقط دین اسلام میں ہی موجود نہیں بلکہ گذشتہ امتوں میں بھی اس پر تاکید کی جاتی رہی ہے، (اگرچہ اسلام میں اس کی شکل وصورت بنیادی اور وسیع تر ہے) قرآن اس دانشمند اور حکیم شخص لقمان کی زبانی یوں نقل کرتا ہے: اے میرے فرزند! نماز قائم کرو اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا وظیفہ انجام دو اور اپنے اوپر نازل ہونے والی مصیبت پر صبر کرو (کیوں) کہ یہ اہم اور اساسی امور ہیں!

يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝

اس مقام پر انسان کی کامیابی کے چار عوامل واسباب بیان کئے گئے ہیں: نماز قائم کرنا، معروف کا حکم، منکر سے نہی اور صبر واستقامت۔ اس جملے: "إِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ" (یعنی یہ اہم امور میں سے ہے) کا اشارہ ممکن ہے خاص طور پر صبر واستقامت کی طرف ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا تعلق چاروں اصول سے ہو۔ یہ نکتہ بھی لائق توجہ ہے کہ صبر واستقامت اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ساتھ ساتھ ہونا ان دونوں کے باہمی اور قریبی رابطے کی طرف اشارہ ہو۔ اس لئے کہ ان دو عظیم الٰہی ذمہ داریوں کو انجام دینا بسا اوقات شدائد ومشکلات کے ہمراہ ہوتا ہے، اور صبر واستقامت کے بغیر ان دو مقاصد کو حاصل نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح یہ دو نماز سے بھی قریبی تعلق رکھتے ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ نماز فحشاء اور منکر سے نہی (منع) کرتی ہے یا بالفاظ دیگر نماز امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اصلی پایہ ہے:

اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ۭ ' (عنکبوت/ ۴۵)

یہ عظیم ذمہ داری؛ روایات کی نظر میں

روایات واحادیث میں بھی اس اہم ذمہ داری کو انجام دینے کی غیر معمولی انداز میں تاکید کی گئی ہے اور اسے تمام فرائض الٰہی کے اجراء ونفاذ کا ضامن اور امن وامان اور آبادی نیز عدل وانصاف کے پھیلنے اور رائج ہونے کا سبب قرار دیا گیا ہے۔

۱۔ رسول اکرمؐ ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

"مَنْ اَمَرَ بِالْمَعْرُوفِ وَنَهٰى عَنِ الْمُنْكَرِ فَهُوَ خَلِيفَةُ اللّٰهِ فِى اَرْضِهِ، وَخَلِيفَةُ رَسُولِ اللّٰهِ، وَخَلِيفَةُ كِتَابِهِ"

''جو شخص امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے وہ خدا کی زمین پر اس کا خلیفہ ہے اسی طرح وہ رسول خداؐ اور کتاب خدا کا بھی خلیفہ ہے۔''[1]

یعنی وہ بالکل انہی جیسے کام انجام دیتا ہے۔

۲۔ آنحضرتؐ کی ایک اور حدیث میں واضح طور پر ملتا ہے کہ آپؐ منبر پر رونق افروز تھے کہ ایک شخص نے آپؐ سے پوچھا، اے رسول خداؐ! مَنْ خَيْرُ النّاسِ؟ کون سب لوگوں سے بہتر ہے؟ اس کے جواب میں آپؐ نے فرمایا:

"اَمَرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَاَنْهاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاَتْقاهُمْ لِلّٰهِ وَاَرْضاهُمْ"

''وہ شخص جو سب سے زیادہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا وظیفہ انجام دے اور سب سے زیادہ متقی اور خدا کی رضا پر راضی ہو۔''[2]

۳۔ رسول اکرمؐ ایک اور حدیث میں ارشاد فرماتے ہیں:

"لَتَاْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلَتَنْهُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ اَوْلَيَعُمَّنَّكُمْ عَذابُ اللّٰهِ:"

تم سب کو ضرور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینا چاہیے ورنہ یقینی طور پر عذاب الٰہی تمہارا گھیراؤ کرلے گا۔[3]

۴۔ ایک معروف حدیث میں حضرت علیؑ بھی فرماتے ہیں:

" وَما اَعْمالُ الْبِرِّ كُلِّها وَالْجِهادُ فى سَبيلِ اللّٰهِ عِنْدَ الاَمْرِ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّهى عَنِ الْمُنْكَرِ اِلاّ كَنَفْثَةٍ فى بَحْرٍ لُجِّىٍ"

''تمام نیک اعمال بشمول جہاد، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مقابلے میں ایسے ہی ہیں جیسے آب دہن (لعاب دہن) کے مقابلے میں ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر۔''[4]

۵۔ امام محمد باقر - ایک مختصر مگر واضح بیان میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فلسفے اور حکمت کو اس طرح بیان فرماتے ہیں: اس مختصر عبارت میں ان دو عظیم فریضۂ الٰہی کے سات مقاصد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، آپؑ فرماتے ہیں:

"اِنَّ الاَمْرَ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّهىَ عَنِ الْمُنْكَرِ فَريضَةٌ عَظيمَةٌ بِها تُقامُ الْفَرائِضُ وَتَاْمَنُ

---

[1] مجمع البیان، ذیل آیہ ۱۰۴ آل عمران، ج ۲، ص ۴۸۴

[2] مجمع البیان، ذیل آیہ ۱۰۴ آل عمران، ج ۲، ص ۴۸۴

[3] ۳۔ وسائل الشیعۃ، ج ۱۱، ص ۴۰۷، حدیث ۱۲، باب ۳، ابواب امر بہ معروف و نہی از منکر

[4] نہج البلاغہ، کلمات قصار، کلمہ ۳۷۴

الْمَذَاهِبُ وَتُحَلُّ الْمَكَاسِبُ وَتُرَدُّ الْمَظَالِمُ وَتَعْمُرُ الْاَرْضُ وَ يُنْتَصَفُ مِنَ الْاَعْدَاءِ وَيَسْتَقِيمُ الْاَمْرُ"

ترجمہ: ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرائض الٰہی میں سے ایک اہم فریضہ ہے کہ باقی فرائض اس کے ذریعے برپا اور قائم ہوتے ہیں، ان دو کے ذریعے راستے پر امن ہوجاتے ہیں، کاروبار اور کمائی حلال ہوتی ہے، مظلوموں کے حقوق ان تک پہنچتے ہیں، زمین آباد ہوجاتی ہے، دشمنوں سے انتقام لینا ممکن ہوجاتا ہے اور تمام امور اپنے صحیح راستے پر چل پڑتے ہیں۔''[1]

اس موضوع سے متعلق اسلامی پیشواؤں سے اس قدر احادیث نقل ہوئی ہیں کہ اگر انھیں جمع کیا جائے تو ایک مستقل اور علیحدہ کتاب بن جائے۔ اس مقام پر چند نکات کی جانب توجہ کرنا ضروری ہے:

۱۔ حکومت کی بہترین قسم وہ ہے جس میں تمام لوگ شریک ہوں، بالفاظ دیگر حکومت کے پائے عوام کے کندھوں پر ہوں، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر دراصل مسئلہ حکومت کو عمومیت بخشنے اور اس (حکومت) میں عوامی شرکت کو یقینی بنانا ہے، اس لئے کہ اسی طریقے سے بہت سے جرائم کی روک تھام ہوسکتی ہے اور لوگ اپنی انفرادی اور اجتماعی ذمہ داریوں سے آشنا ہوسکتے ہیں اور اس بات کے پیش نظر کہ جرائم کا مقابلہ کرنے والے مامورین (جیسے پولیس وغیرہ) کی تعداد ان لوگوں کے مقابلے میں بہت کم ہوتی ہے جن سے ارتکاب جرم کا خوف ہوتا ہے، لہٰذا ایسی صورتحال میں اس اسلامی فریضے کی اہمیت واضح تر ہوجاتی ہے کیونکہ فقط اسی طریقے سے معاشرے کی بہتری اور فلاح کا سامان مہیا ہوسکتا اور جرائم کی راہ روکی جاسکتی ہے۔

وہ فرمان جو یہ کہتا ہے کہ اگر گھر کے اندر فرزند کسی جرم کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کے والدین اس کے ذمہ دار ہیں اور اگر ماں باپ کسی جرم کے مرتکب ہوں تو بالغ فرزند ان کی نسبت ذمہ داری کا ثبوت دے، اسی طرح اگر دنیا کے مشرقی حصے میں کوئی گناہ واقع ہو اور مغربی حصے میں موجود کوئی شخص اس کی روک تھام پر قادر ہونے کے باوجود اسے نہ روکے تو وہ اس گناہ میں شریک سمجھا جائے گا، یہ فرمان بلاشبہ گناہ کی روک تھام اور ذمہ داریوں کو انجام دینے کی دعوت میں نہایت عمیق و وسیع اثر کا حامل ہے۔

یہ سب کچھ ایسی صورتحال میں ہے کہ آج کی دنیا اور تمام الحادی و مادی حکومتوں میں جرائم و مفاسد کو روکنے کی ذمہ داری ایک چھوٹے سے خاص گروہ کے سپرد کردی گئی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی کارگردگی بہت محدود اور کم ہے۔ یہیں سے اس اسلامی فرمان کی اہمیت وعظمت کے ساتھ ساتھ حکومت اسلامی کا عوامی ہونا بھی واضح ہوجاتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ عوام ایک پولیس مین کی طرح عمل کریں، بلکہ ان کا فریضہ نیکی کی دعوت اور برائی سے مقابلے کی حد تک ہے اور یہ عمل کبھی وعظ ونصیحت اور کبھی فاسد اور مفسد افراد سے قطع تعلق کی صورت میں ہوتا ہے۔

[1] وسائل الشیعۃ، ج۱۱ص۳۹۵، حدیث۶، باب۱

۲۔تعزیرات کی بحث میں یہ کہا جا چکا ہے کہ یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے وسیع حکم کا ایک شعبہ ہیں، وہی شعبہ جس کا اختیار فقط حاکم شرع کو حاصل ہوتا ہے اور دوسرے اس میں دخالت کا کوئی حق نہیں رکھتے، اور جیسا کہ وہاں بھی ذکر ہوا ہے کہ تعزیر کا مقصد گناہوں کے ارتکاب اور ان کی تکرار سے باز رکھنا ہے اور اس راہ میں قاعدہ اَلاَسْهَلُ فَالاَسْهَلُ (آسان سے آسان تر) سے استفادہ کرنا چاہیے یعنی ہمیشہ سادہ تر مراحل سے آغاز اور ان کے غیر مؤثر ہونے کی صورت میں پیچیدہ اور سخت تر رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ دوستانہ یاد دہانی، نرم انداز میں سرزنش، شدید سرزنش، بے توجہی اور قطع تعلق اور آخر کار زندان و تازیانہ، جرمانہ، معاشرتی اور اجتماعی توہین و توبیخ اور اس طرح کی دوسری چیزیں، یہ سب وہ مراحل ہیں جو تعزیر کے طور پر انجام دیئے جاتے ہیں یا دوسرے الفاظ میں یہ سب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے نمونے اور مصادیق ہیں۔ اس دلیل کو پیش نظر رکھتے ہوئے حدود و تعزیرات سے متعلق فقہی مباحث میں تعزیر کے جواز و مشروعیت کو ثابت کرنے کے لئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے دلائل پر تکیہ اور اعتماد کیا جاتا ہے۔

۳۔ان دو الٰہی ذمہ داریوں ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کی اجتماعی امن و امان، نفاذ و اجراء قوانین، منکرات کے خلاف جنگ، جرائم اور قیدیوں کی تعداد کم ہونے اور تمدن اجتماعی کی ترقی و پیشرفت میں مددگار ہونے میں، تاثیر، (اثر اندازی) ناقابل انکار ہے اور تجربے سے ثابت ہو چکا ہے کہ جو معاشرہ ان دو ذمہ داریوں کو شعوری اور صریح طور پر انجام دے وہ پاک صاف اور امن و امان کا گہوارہ بن جائے گا اور وہ لوگ جو ان دو سے غفلت برتتے ہوئے انھیں فراموش کر دیں اور جرائم اور گناہوں کے معاملے میں الگ تھلگ رہیں، منحوس نتائج و عواقب سے روبرو ہوں گے اور ظلم و فساد اور فحاشی وغیرہ ان کے گھروں میں بھی داخل ہو جائیں گے اور ایسے معاشرے میں کوئی شخص امن محسوس نہیں کر پائے گا اور بالکل ویسے ہی جیسے رسول اکرمؐ کی حدیث مبارک میں بیان ہوا ہے، مصیبت اور عذاب الٰہی ان کے دامن گیر ہو جائے گا اور امام علیؑ کے الفاظ میں ایسی صورتحال میں حل مشکلات اور دفع مصیبت کے لئے نیک لوگوں کی دعا بھی بارگاہ الٰہی میں قبول نہیں ہوگی۔

"فَيُوَلّٰى عَلَيْكُمْ شِرارُكُمْ ثُمَّ تَدْعُونَ فَلا يُسْتَجابُ لَكُمْ"۔[1]

۴۔امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا عمل جیسا کہ معلوم ہے حقیقی طور پر ثقافتی اور تمدنی عمل سے شروع ہوتا ہے، اس بناء پر ذرائع نشر و ابلاغ اور تمام سمعی و بصری تبلیغات (نشریات) جو کسی نہ کسی طرح لوگوں کی علمی سطح بلند کرنے اور انھیں نیکی و پاکیزگی، اخلاق انسانی، اصول فضیلت اور فساد سے بیزاری کی طرف متوجہ کرنے سے سروکار رکھتے ہیں، یہ سب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے دائرے میں ایک خاص جگہ اور مقام رکھتے ہیں یہاں تک کہ تعلیم و تربیت کے مراکز اور اعلیٰ علوم، جو نونہالوں اور جوانوں کو درست اعتقادی اصول، انسانی معیار اور اجتماعی قوانین و آداب سے روشناس کراتے اور ان کی تعلیم و تربیت کے اقدام کرتے ہیں، کا بھی اس دائرے میں ایک خاص مقام ہے، کیونکہ یہ سب امور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں شریک ہو سکتے ہیں، لہٰذا ان دو اہم اجتماعی ذمہ داریوں کو نافذ کرنے میں ان مراکز کا کردار واضح ہو جاتا ہے۔

---

[1] نہج البلاغہ، مکتوب ۴۷۔

یہ نکتہ بھی اہمیت کا حامل ہے کہ عام طور پر امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو فروع دین کے دو شعبے شمار کیا جاتا ہے لیکن ایک لحاظ سے ان کا دامن اس قدر وسیع ہے کہ اصول اعتقاد کے ایک بڑے حصے کو بھی اپنے دائرے میں شامل کر لیتا ہے کیونکہ یہ سب اس راہ میں مؤثر اور کارساز ہیں اور عقائد کی اساس کو مضبوط کر کے ہی مفاسد سے جنگ ممکن ہے، اسی طرح عبادات بھی ان کا مقدمہ ہیں۔

۵۔ بعض حضرات کے گمان کے برعکس، امر بالمعروف ونہی عن المنکر ایک مذہبی رسم ہی نہیں بلکہ ایک واضح عقلی فلسفے کا بھی حامل ہے۔ (غور فرمائیں)

اس کی وضاحت یہ ہے کہ اجتماعی روابط کے پیش نظر اور یہ کہ کوئی اچھا یا برا کام، معاشرۂ انسانی میں ایک خاص مقام تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ دوسرے مقامات تک بھی جا پہنچتا ہے، ایک برائی آگ کی طرح ہوتی ہے کہ جس پر اگر قابو نہ پایا جائے تو مسلسل دوسری جگہوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے کر خاکستر کر دیتی ہے، لہٰذا فساد اور برائیوں کے خلاف جنگ ایک اجتماعی فریضہ ہے۔ اس مطلب کو واضح کرنے کے لئے بہترین تعبیر وہی ہے جسے رسول اکرمؐ کی ایک حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ:

''ایک گناہ گار اور جرائم پیشہ شخص لوگوں کے درمیان اس احمق شخص کی مانند ہے جو لوگوں کے ساتھ کشتی میں سوار ہوا ہو، اور جب کشتی وسط سمندر میں پہنچ جائے تو وہ کلہاڑا اٹھا کر اپنی جگہ کو کاٹ کر اس میں سوراخ کرنے پر تل جائے، لوگوں کے اعتراض کرنے پر ان کو یہ جواب دے کہ میں اپنے حصے کی جگہ پر سوراخ کر رہا ہوں تمہیں اس سے کیا مطلب ہے؟ یقیناً یہ ایک احمقانہ بات ہے، اگر دوسرے لوگ اسے اس خطرناک کام سے باز نہیں رکھتے، تو تھوڑی ہی دیر میں سب غرق ہو جائیں گے۔''[۱]

۱۔ تفسیر ابوالفتوح رازی، ج ۳، ص ۱۴۲۔

یہیں سے واضح ہو جاتا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر دوسروں کی نجی (پرائیویٹ) زندگی میں قطعاً کوئی مداخلت نہیں بلاشبہ اسلام دوسروں کی خصوصی (ذاتی) زندگی میں مداخلت اور ان کے امور میں تجسس کو حرام قرار دیتا ہے اور قرآن اسے واضح طور پر بیان کرتا ہے (سورۂ حجرات) لیکن امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی محدودیت اجتماعی طور پر ناپسندیدہ عمل ہے جو معاشرے کی تقدیر پر اثر انداز ہوتی ہے، لوگوں کی تقدیر ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوئی ہے اور معاشرے کے ہر فرد کا جرم وانحراف پورے معاشرے کے انحراف کا باعث بنتا ہے۔

اس بناء پر کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے والوں سے یہ کہے کہ تمہارا اس سے کیا تعلق؟ (جاؤ اپنا کام کرو) اس کا جواب یہ ہے کہ یہ مسئلہ ہم سب کا ہے، اس لئے کہ ہم سب کی تقدیر ایک دوسرے کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ مثلاً حکومت وبائی امراض کی روک تھام کے لئے اپنے مامورین کو ویکینشین پر مامور کرتی ہے کیا کسی کو حق حاصل ہے کہ وہ ان سے یہ کہے: تمہارا اس سے کیا تعلق ہے؟ بیمار ہوں گا تو میں، خطرے کا سامنا میں نے کرنا ہے، چلو اپنا رستہ لو، تم کون ہوتے ہو میری ذاتی زندگی میں مداخلت کرنے والے؟! سارے لوگ اسے یہی جواب دیں گے کہ تمہاری سلامتی دوسروں کی سلامتی سے جدا نہیں اور تمہاری بیماری دوسروں کے بیمار ہونے کا سبب بن سکتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ وہ ہم سب کے ساتھ مربوط ہے، اس بناء پر قبول کرنا چاہیے کہ ان دو فریضوں کی انجام دہی انسان کی اجتماعی زندگی کے آثار سے متعلق ہے اور اسی طرح ان کا تعلق اجتماعی حقوق و فرائض سے بھی ہے۔ یہ تھا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور اس کا اسلامی حکومت کے اہداف و مقاصد میں پیشرفت کے کردار کا خلاصہ۔

حکومت اسلامی میں حسبہ اور محتسب کا ادارہ

یہ بحث امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ساتھ مکمل طور پر مربوط ہے اور درحقیقت یہ اسی بحث کا ایک شعبہ ہے کیونکہ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے دو شعبے ہیں، پہلا شعبہ عمومی ہے جس کا تعلق تمام لوگوں کے ساتھ ہے، دوسرا شعبہ خصوصی ہے جس کا ربط حکومت کے ساتھ ہے، اس خصوصی شعبے میں ممکن ہے شدت اور سختی کرنا ایک لازمی امر ہو اور ایسا کرنا عوام کا کام نہیں، بلکہ حکومت کے تجربہ کار افراد (مامورین) ہی اس کے ذمہ دار ہیں، اور یہ عمل ''حسبہ'' کی اساس کو تشکیل دیتا ہے۔[1]

وضاحت:

''حسبہ'' لغت میں مادہ احتساب سے اسم مصدر ہے اور جیسا کہ اہل لغت نے کہا ہے کہ اس کا مطلب اجر خدا کی طلب کے لئے مشکلات کے مقابلے میں صبر اور سر تسلیم خم کرنا ہے، اسی طرح ثواب کی خاطر اعمال خیر کو انجام دینے کی کوشش کرنا بھی اس کا ایک معنی ہے اور چونکہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا یہ شعبہ اطاعت خدا کی راہ میں اور اس کی رضا حاصل کرنے اور منکرات کے خلاف جنگ کرنے کے لئے کوشش کرنا ہے لہٰذا اسے ''حسبہ'' کا نام دیا گیا ہے۔ کتاب التحقیق میں ''حسبہ'' کے اصل معنیٰ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ لفظ دراصل آزمائش کے قصد سے فکر و نظر کو استعمال کرنے اور تحقیق اور عمل درآمد کرنے کے معنی میں ہے۔

یہ تفسیر محتسب کے کام سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے کیونکہ وہ معاشرے (ملک) کے مختلف حصوں سے خبریں حاصل کر کے ان کے مطابق عمل درآمد کرتا ہے اور ہر حرکت کو پیش نظر رکھتا ہے اور اس (حرکت) کے انحرافی ہونے کی صورت میں یاددہانی کراتا ہے اور اگر اس کا کوئی اثر نہ ہو تو طاقت کے ساتھ اس کا مقابلہ کرتا ہے۔

ادارہ ''حسبہ'' خلفاء کے دور میں ایک معروف ادارہ ہوتا تھا جو کاریگروں، اہل تجارت، کاشتکاروں اور عوام کے امور کی منکرات اور جرائم کے اعتبار سے نگرانی کرتا تھا اور محتسبین جہاں بھی خلاف قانون کارروائی دیکھتے فوراً اس کے مرتکب فرد یا افراد کو منع کرتے اور مؤثر نہ ہونے کی صورت میں ان افراد کو اسی جگہ سزا دیتے یا گرفتار کر کے قاضی و زندان کے سپرد کر دیتے۔

بعض حضرات کی رائے میں اس مسئلے کی اصل کی برگشت زمانۂ رسول اکرمؐ کی طرف ہے، آپؐ بذات خود محتسب کا وظیفہ انجام دیتے تھے اور کبھی اپنی غیبت کے دوران کسی اور کو یہ وظیفہ انجام دینے کے لئے انتخاب فرماتے، لیکن یہ بات تسلیم کرنی چاہیے کہ اس زمانے حتیٰ کہ

---

[1] التحقیق فی کلمات القرآن الکریم، ج ۲، مادۂ حسب۔

قدیم فقہاء کے دور میں بھی اس لفظ کو (اس معنی میں) استعمال کرنے کا رواج اور معمول نہیں تھا، اور ایسے لگتا ہے کہ یہ لفظ پہلی بار اموی اور عباسی خلفاء کے دور میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اس شعبے کے لئے انتخاب کیا گیا۔

بہرحال رسول اکرمؐ کے زمانے کی اخبار و روایات جو ہم تک پہنچی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ لفظ ''حسبہ'' آج کے معنی ومفہوم میں اس وقت رائج نہیں تھا لیکن اس کا حقیقی مفہوم یعنی حکومت اسلامی کی اجتماعی امور پر نگرانی کی مکمل طور پر رعایت کی جاتی تھی کبھی رسول اکرمؐ یہ وظیفہ کسی اور کو سونپ دیتے اور کبھی اسے بذات خود انجام دیتے تھے۔

ان احادیث میں سے ایک یہ حدیث ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ فتح مکہ کے بعد رسول اکرمؐ نے سعید بن عاص کو بازار مکہ پر مامور فرمایا (تا کہ وہ درست اور عادلانہ خرید وفروخت پر نظر رکھیں)

"اِسۡتَعۡمَلَ رَسُولُ اللّٰهِ سَعِيدَ بۡنَ سَعِيدِ بۡنِ الۡعاص بَعۡدَ الۡفَتۡحِ عَلی سُوقِ مَكَّةِ۔" [1]

یہاں تک کہ بعض روایات بتاتی ہیں کہ بعض عورتیں، عورتوں سے مربوط مسائل (پردہ وغیرہ) کی نگرانی کرتی تھیں، ان میں سے ایک عورت ''سحراء بنت نھیک'' [2] بھی تھی جس نے آنحضرت کا زمانہ پایا تھا، یہ عورت اس کام پر مامور تھی، بازاروں میں گردش کرتی اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتی تھی (اگرچہ بعض کی رائے میں وہ رسول اکرمؐ کی بجائے خلیفۂ دوم کے دور میں اس کام پر مامور تھی)۔ [3]

اور بہت سے موقعوں پر رسول اکرمؐ بذات خود یہ اہم وظیفہ دیتے خاص طور پر لین دین میں ملاوٹ جعل سازی اور ذخیرہ اندوزی کے مسائل پر کڑی نظر رکھتے۔ ان میں سے ایک حدیث کا مضمون یہ ہے:

"اِنَّ رَسُولَ اللّٰه صلی الله علیه وآله وسلم مَرَّ بِالۡمُحۡتَكِرِينَ فَاَمَرَ بِحُكۡرَتِهِمۡ اَن تُخۡرَجَ اِلی بُطُونِ الاَسۡواقِ، وَحَيۡثُ تَنۡظُرُ الاَبۡصارِ اِلَيۡها"

ترجمہ: رسول اکرمؐ نے ذخیرہ اندوزوں کی ایک جماعت کے پاس سے گذرتے ہوئے انھیں حکم دیا کہ وہ ذخیرہ شدہ چیزوں کو بازار میں لوگوں کے سامنے لے آئیں۔ [4]

لوگوں نے تجویز پیش کی کہ اے رسول خدا ان چیزوں کا نرخ بھی معین فرمادیں لیکن آپؐ نے نرخ کی تعیین سے اجتناب فرمایا۔

ایک اور حدیث میں مذکور ہے کہ رسول اکرمؐ ایک ایسے شخص کے پاس سے گذرے جس نے اچھے اور ناقص غلے کو آپس میں ملا دیا تھا، آپؐ نے فرمایا: تم نے ایسا کیوں کیا؟ اس نے عرض کیا کہ میرا مقصد یہ تھا کہ اس طرح سارا غلہ فروخت ہوجائے گا، آپؐ نے یہ سن کر فرمایا:

---

[1] الترتیب الادریہ نوشتہ کتانی، ج۱، ص ۲۸۵ (کتانی نے یہ روایت استیعاب عبدالبر سے نقل کیا ہے)۔

[2] نھیک (شریک کے وزن پر ہے دراصل طاقتور اونٹ اور کاٹدار تلوار کے معنی میں ہے افراد قاطع کو نھیک کہا جاتا ہے)

[3] التراتیب الادرایہ نوشتۂ کتانی، ج، ص ۲۸۵

[4] وسائل، ج ۱۲، ص ۳۱۷، حدیث ۱، باب ۳

"مَیِّزْ کُلِّ واحِدٍ مِنْهُما عَلیحِدّة۔ لَیْسَ فی دینِنا غِشٌّ!"

ہر ایک کو دوسرے سے جدا کر دو (اور ہر حصے کی علیحدہ قیمت مقرر کرو) ہمارے دین میں جعل سازی اور ملاوٹ (کی کوئی گنجائش) نہیں![1]

عہد نامہ مالک اشتر میں بھی ذکر ہوا ہے کہ جناب امیرؑ نے انھیں فرمان دیا:

"اِمْنَعْ مِنَ الاِحْتِکارِ فَاِنَّ رَسُولُ اللهِ صلی الله علیه وآله وسلم مَنَعَ مِنْه، وَلْیَکُنْ الْبَیْعُ بَیْعاً سَمِعاً بِموازینَ عَدْلٍ، وَ اَسْعارٍ لا تُجْحِف بِالْفَریقَیْنِ مِنَ الْبائِعِ وَ الْمُبْتاع، فَمَنْ قارَفَ حُکْرَۃً بَعْدَ نَهْیِكَ اِیّاهُ۔ فَنَکِّلْ بِهِ وَ عاقِبْهُ فی غَیْرِ اِسْرافٍ"

ذخیرہ اندوزی کو سختی کے ساتھ روکو کیونکہ رسول اکرمؐ نے اس سے منع فرمایا ہے، معاملات آسان شرائط کے ساتھ طے کئے جائیں، عادلانہ ترازو اور مناسب نرخوں کے ساتھ خرید و فروخت ہونی چاہیے اس طرح کہ نہ فروخت کرنے والا اور نہ ہی خریدار نقصان و زیاں کے شکار ہوں اور اگر کوئی تمہارے منع کرنے کے باوجود ذخیرہ اندوزی سے باز نہ آئے تو اسے سزا دو ایسی سزا جو حد سے زیادہ نہ ہو۔[2]

اسی طرح ہم حضرت علیؑ کے حالات زندگی میں یہ بھی پڑھتے ہیں کہ آپؑ ذاتی طور پر حسبہ سے مربوط امور کی ذمہ داری انجام دیتے تھے، کبھی قصابوں کے بازار سے آپؑ کا گذر ہوتا تو انھیں خلاف قانون اعمال سے منع فرماتے۔[3] اور کبھی ماہی گیروں کے کام کی نگرانی کرتے اور انھیں حرام مچھلیاں فروخت کرنے سے منع فرماتے۔[4]

لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ مسئلہ حسبہ نے وسعت حاصل کر لی اور رفتہ رفتہ اس نے ایک اہم اور وسیع ادارے کی صورت اختیار کر لی اور اس کے مامورین محتسب کے نام و عنوان سے کوچہ و بازار اور چھوٹی بڑی سڑکوں پر شب و روز گشت کرتے اور مختلف اجتماعی معاملات پر نظر رکھتے اور قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کو موقع ہی پر سزا دیتے اور کبھی مجرم کو گرفتار کر کے قاضی کے پاس بھیج دیتے (جیسے آج کل ٹریفک پولیس کرتی ہے)۔

دائرہ حسبہ میں اس قدر وسعت آ گئی کہ تمدن اسلامی کا مشہور مورخ جرجی زیدان اس بارے میں لکھتا ہے: حسبہ، قضاوت کی مانند ایک دینی منصب ہے اور قاضی کی طرح محتسب بھی ناپسندیدہ امور (خلاف قانون امور اور برائیوں) پر نظر رکھا اور لازم حد تک تعزیر اور تا

---

[1] کنز العمال، ج ۴، ص ۱۵۹۔

[2] نہج البلاغہ، مکتوب ۵۳۔

[3] کنز العمال، ج ۴، ص ۱۵۸

[4] وسائل، ج ۱۶، ص ۳۳۲

دیب کرسکتا ہے اور وہ بھی لوگوں کو شہروں میں عمومی مصلحتوں کی رعایت کرنے کی ترغیب دیتا ہے، جیسے گذر گاہوں کو مسدود کرنے سے روکنا، سامان کی نقل و حمل کرنے والوں اور صاحبان کشتی کو اس بات سے روکنا کہ وہ سواری پر حد سے زیادہ سامان نہ لادیں اور زیادہ افراد کو نہ سوار کریں، اسی طرح وہ یہ حکم بھی صادر کرتا ہے کہ گرنے والی خطرناک دیواروں کو منہدم کر دیا جائے اور راہگیروں کو نقصان پہنچانے والی ہر چیز کو راستے سے ہٹا دیا جائے اور اسی طرح کاروباری امور اور وزن و پیمانے میں جعلسازی اور دھوکہ دہی پر نظر رکھتے ہوئے ہر قسم کے جور و ستم اور ناانصافی کی روک تھام کا اہتمام کرتا ہے۔

یہ امور دراصل قاضی کے فرائض تھے، لیکن چونکہ قاضی عملاً ان تمام امور کو انجام نہیں دے سکتا تھا لہٰذا انھیں علیحدہ کر کے انھیں ایک جدا فریضہ قرار دیا گیا۔ اس امر (فریضے) کی سربراہی اور نگرانی لازمی طور پر ایک صالح اور دیندار شخص کے سپرد کی جاتی تھی کیونکہ یہ ایک خدمت دینی شمار ہوتی تھی (اور محتسب اس مقام و منصب کے بغیر اس سے عہدہ برآ ہونے پر قادر نہیں ہوتا تھا)۔ امور حسبہ کا نگران تحقیقات کی خاطر بقیہ علاقوں میں اپنے نمائندے بھی مقرر کرتا تھا، وہ روزانہ کسی مسجد میں قیام کرتا اور اس کے نمائندے بازاروں میں پیشہ ور اور کاروباری افراد پر نظر رکھتے تھے۔

مصر میں امور حسبہ کا سربراہ (نگران) ایک دن مسجد قاہرہ اور دوسرے دن مسجد فسطاط میں بیٹھ جاتا اور اپنے نمائندوں کو کوچہ و بازار میں بھیج دیتا تاکہ وہ گوشت کی کیفیت اور کھانے پکانے کے مراکز پر نظر رکھ سکیں اور اسی طرح چار پایوں پر لادے جانے والے بوجھ کی بھی نگرانی کریں اور کسی کو اجازت نہ دیں کہ وہ ان کی طاقت سے زیادہ ان پر بوجھ لادیں، پانی بھر کر لانے والے ماشکیوں کو پانی کے ظروف کو ڈھک کر رکھنے کا حکم دیتے اور یہ کہ وہ پانی کے ظرف کی ظرفیت کی مقدار یعنی چوبیں ڈول کا خیال رکھیں کریں اور اپنے بدن کی حفاظت کی خاطر چھوٹی چھوٹی زرد قمیضیں پہنے رکھیں۔ (یہ نمائندے) مدرسہ و مکتب کے معلمین کو آگاہ کرتے کہ وہ بچوں کو شدید اور سخت سزائیں نہ دیں اور جسم کے نازک حصوں پر مارنے سے اجتناب کریں، اسی طرح عوام الناس کے ساتھ ساتھ معلمین کے لئے بھی یہ حکم تھا کہ وہ والدین کو آگاہ کریں کہ وہ اپنی اولاد کو فریب دینے سے گریز کریں۔

اسی طرح محتسب ٹکسال (سکے ڈھالنے کے ادارہ) پر بھی نظر رکھتا تھا کہ کہیں جعلی سکے نہ بنائے جائیں (یعنی ان میں سونے یا چاندی کی مقدار کم ہو)۔ اندلس میں اس منصب کو "خِطَّةُ الاِحتِسابِ" کہا جاتا تھا جس کی سرپرستی ایک قاضی کے سپرد ہوتی تھی، اس کا معمول ہوتا تھا کہ وہ خود سوار ہو کر بازاروں میں گشت کرتا اور اس کے مامورین اور مددگار اس کے ہمراہ ہوتے تھے، آٹے کے پیڑوں کا وزن معلوم کرنے کے لئے مخصوص ترازو اس کے ایک ساتھی کے ہاتھ میں ہوتا (تاکہ اگر روٹی کا وزن مقررہ وزن سے کم ہو تو اس نان فروش کو سزا دی جائے) اسی طرح ضروری تھا کہ قصاب کی دوکان میں گوشت پر ایک کاغذ لگا ہو جس پر گوشت کی قیمت درج ہوتا کہ قصاب اسے زیادہ قیمت پر نہ فروخت کر سکے، خیانت کی صورت میں فروخت کرنے والے کی خیانت مخفی نہیں رہتی تھی کیونکہ بعض اوقات محتسب کسی کنیز یا بچے کو بازار سے کوئی چیز خریدنے کے لئے بھیجتا، پھر محتسب خود اس کا وزن اپنے پاس موجود ترازو پر کرتا، اگر وزن کم ہوتا تو اس سے وہ یہ اندازہ لگا لیتا کہ باقی لوگوں کے ساتھ بھی اس کا لین دین ایسا ہی ہوگا (لہٰذا اسے قانون کے مطابق سزا دیتا)۔ وہ لوگ حسبہ سے مربوط بہت سے

موجودہ قوانین کو اپنے مدارس میں پڑھاتے بالکل ایسے ہی جیسے فقہاء احکام فقہ کی تدریس کرتے ہیں۔[1]

اس مجموعی کلام اور حسبہ کے بارے میں تحریر شدہ کتابوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آج جو کام بلدیہ، پولیس، حکومتی تعزیرات، محکمۂ تعلیم اور قضاوت کے سپرد ہیں، ادارہ حسبہ ان کا ذمہ دار تھا۔ اور یہ حکومت اسلامی کا ایک فعال شعبہ شمار ہوتا تھا، خاص طور پر منکرات کے خلاف اس کی جنگ بے حد اہمیت کی حامل ہے، یہی وجہ ہے کہ شعراء کے کلام میں محتسب اور اس کے کارہائے نمایاں واضح طور پر منعکس ہیں۔

بعض منابع و مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ محتسب ہونا واجب کفائی کے عنوان سے مسلمانوں کے درمیان معروف رہا ہے، اس لئے کہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں ''حسبہ'' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ایک شاخ (شعبہ) ہے اور یہاں تک کہ عورتوں میں سے بعض افراد کو اس منصب کے لئے انتخاب کیا جاتا تھا تاکہ وہ خواتین سے مربوط امور کی نگرانی کریں۔

''دائرۃ المعارف دھخدا'' میں وظائف محتسب کی بحث میں ہے: محتسب کا وظیفہ (فریضہ) اولاً مذہبی قوانین کا اجراء ونفاذ اور اعمال حرام سے منع کرنا تھا، اور ثانیاً ان امور کے صحیح طور پر نافذ العمل ہونے پر نظر رکھتا تھا، جن کا تعلق معاشرے کے افراد کے عمومی روابط اور ان کی فلاح و بہبود سے ہو، اسی طرح اس کی ذمہ داری یہ بھی ہوتی تھی کہ وہ راہوں کو مسدود یا تنگ کرنے کے عمل کو روکے۔ اسی طرح پیمانے اور وزن کی نگرانی، جو آج کل بلدیہ کے ذمے ہے، محتسب کی ذمہ داری تھی، یہ تمام امور دراصل قاضی کے ذمے ہوتے تھے لیکن بعدازاں اسے ایک علیحدہ ذمہ داری قرار دے دیا گیا تاکہ قاضی پر ان امور کا اضافی بوجھ نہ پڑے۔[2]

اسی طرح اس کتاب میں وظائف محتسب کو مَعَالِمُ الْقُرْبَةِ نامی کتاب سے تفصیلاً نقل کیا گیا ہے کہ شاید یہ کتاب احکام حسبہ کے بارے میں جامع ترین کتاب ہو، اس میں تقریباً ان تمام امور کی نگرانی محتسب کی ذمہ داری ہے۔ مثلاً تمام قسم کے کاروبار، پیداواری اور ملازمتی مسائل اور تعلیم و تربیت وغیرہ۔ ان امور میں سے بعض یہ ہیں: کوچہ و بازار میں امور منکر پر کڑی نظر رکھنا، نانبائیوں کے امور اور وزن و پیمانہ کی درستگی، ذبح کرنے والوں اور ذبح خانوں کی شرائط کے بارے میں تحقیقات، صاحبان حمام، اطباء، اساتذہ، مؤذن حضرات، خادمین مسجد، واعظان، مکتوب نویسان کے مسائل اسی طرح تاجروں، تیراکوں، معماروں، دلالوں، صرافوں، اور زرگروں وغیرہ کے امور کی تحقیق اور ان کی نگرانی بھی محتسب کا وظیفہ شمار ہوتی تھی۔[3]

جہاں تک مسئلہ حسبہ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے مابین فرق و تفاوت کی بات ہے تو بعض کتابوں جیسے الاحکام السلطانیہ میں بہت سارے فرق اور اختلافات گنوائے گئے ہیں جن کی تعداد نو تک جا پہونچتی ہے ۳ لیکن ان سب کو ایک جملے میں بطور خلاصہ بیان کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ: حسبہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا وہ شعبہ ہے جس کا حکومت کے ساتھ تعلق ہوتا ہے جو لازم اور ضروری موقعوں

---

[1] تاریخ تمدن اسلامی جرجی زیدان، ج۱ص ۲۵۲

[2] لغت نامہ دھخدا، مادۂ حسبہ

[3] لغت نامہ دھخدا، مادۂ حسبہ

پر شدت عمل اور سختی کو بھی اختیار کر سکتا ہے، بنابرایں محتسب حکومت کی طرف سے منصوب ہوتا ہے اور اسے کچھ لوگوں کی مدد حاصل ہوتی ہے جو معاشرے کے اہم امور کی نگرانی کرتے ہیں۔

یہ سب لوگ بیت المال سے تنخواہ حاصل کرتے ہیں اور ضروری ہو تو مجرمان کو گرفتار کر کے انھیں تعزیر کرتے اور سزا دیتے ہیں، لیکن امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا عمومی شعبہ اس صورتحال کا حامل نہیں ہوتا۔ (غور فرمائیں)

☆☆☆☆☆

رکن چہارم: تعلیم و تربیت

اشارہ

حکومت اسلامی کے اہم ارکان میں سے ایک رکن درست تمدن وثقافت کی اشاعت اور تعلیم وتربیت ہے۔ اس بات کے پیش نظر کہ انسان تمام مخلوقات میں سے ایک متمدن مخلوق ہے یعنی اس کے اعمال اور طرز عمل اس کے افکار اور نظریات سے انعکاس سے ہوتا ہے، معاشرے میں تبدیلی اور ہر قسم کی اصلاح انسانی فکر وروح پر اثر انداز ہوئے بغیر ممکن نہیں۔ درست اسی وجہ سے آج کے معاشروں میں مختلف سیاسی اجتماعی، عسکری اور اقتصادی مقاصد تک رسائی حاصل کرنے کے لئے اقوام کی تہذیب وتمدن پر اثر انداز ہونے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ذرائع ابلاغ یعنی میڈیا چاہے مطبوعات (کتابوں اور اخباروں) کی صورت میں ہو، یا ریڈیو، ٹیلی ویژن وغیرہ کی صورت میں ہو اُسے ارکان حکومت کے ایک رکن کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے اور حکومت کے تین ستونوں (مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ) کے مقابلے میں چوتھا ستون شمار کیا جاتا ہے، بلکہ بہت سے دانشوراسے حکومت اور معاشرے کا سب سے اہم رکن (ستون) قرار دیتے ہیں اور اس پر بہت زیادہ سرمایہ بھی خرچ کیا جاتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے نہ کہ مبالغہ آرائی، کیونکہ اگر ذرائع ابلاغ ونشریات (میڈیا) صحیح وسالم ثقافت کی نشر واشاعت کے لئے ایک جامع اور مؤثر لائحہ عمل تشکیل دیں تو مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ کو پنپنے کا بہتر موقع ملتا ہے، ان سب کا بوجھ ہلکا ہوجاتا ہے اور معاشرے کے افراد خود بخود (بغیر کسی دباؤ کے) اپنے فرائض انجام دینے لگتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ حکومت اسلامی کا دستور العمل جو قرآن مجید اور سنت قطعی وواقعی سے استنباط اور مرتب کیا گیا ہے اور جس کا تعلق چودہ سو سال پہلے سے ہے، اس (دستور العمل) میں انسان کے تصور سے زیادہ ثقافتی، تعلیمی وتربیتی امور اور بشارت دینے اور انذار کرنے (ڈرانے) پر اعتماد کیا گیا ہے اور مختلف لائحہ عمل کی مختلف شکلوں کو اس مقصد کے لئے توجہ کا مرکز بنایا گیا ہے۔

یہ موضوع نہایت قابل غور ہے کہ حکومت اسلامی کی واضح ترین قسم یعنی؛ رسول اکرمؐ کی حکومت ایک ثقافتی بنیاد پر ہی قائم ہوئی تھی اور آنحضرتؐ نے ایک ثقافتی انقلاب کی بنیاد پر اسے استوار کیا تھا آپؐ نے تیرہ سال مکے میں تعلیم وتربیت اور ثقافت وعقائد اسلامی کی ترویج اور نشر واشاعت میں گذارے اور اپنے اصحاب کی اس انداز سے تربیت فرمائی کہ وہ ہجرت کے بعد مدینہ میں اسلامی حکومت کے اصلی بانی قرار پائے، یعنی سیاسی واجتماعی نظام، اسی ثقافتی انقلاب کی بنیاد پر قائم ہوا۔ نظریات وافکار کا احیاء، تمام اسلامی دستورات، احکام کا سرچشمہ ہے، یہاں تک کہ رسول اکرمؐ اپنے مخالفین سے فقط یہی تقاضا کرتے ہوئے فرماتے تھے: ''سنجیدگی کے ساتھ اللہ کے لئے قیام کرو پھر خوب غور وفکر کرو''

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا

(سورۂ سبا/٤٦)

رسول اکرمؐ ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

"اِنَّ التَّفَكُّرَ حَياةُ قَلْبِ الْبَصيرِ، كَما يَمْشِي الْمُسْتَنيرُ فِي الظُّلُماتِ بِالنُّورِ"

''غوروفکر کرنا ایک بابصیرت دل کی زندگی ہے،جس طرح انسان تاریکی میں روشنی کے ذریعے چلتا ہے۔ [۱]

(یعنی معاشرتی وانفرادی مشکلات کے حل میں غوروفکر تفکر کے نور کے ساتھ قدم آگے بڑھاؤ)۔ایک اور حدیث میں امام علیؑ فرماتے ہیں:

"بِالْفِكْرِ تَنْجَلي غَياهِبُ الأُمُورِ"

غوروفکر کے ذریعے تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں۔ [۲]

ایک اور معروف حدیث میں ہے:

"تَفَكُّرُ ساعَةٍ خَيْرٌ مِنْ عِبادَةِ سِتّينَ سَنَةٍ"

کچھ دیر غوروفکر کرنا ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے۔ [۳]

اوراسی بنیاد پر ہم مندرجہ امور کے بارے میں گفتگو کریں گے اور اس ضمن میں قرآن مجید سے راہنمائی اور مدد لیں گے۔

۱۔اسلام میں علم،تعلیم اور تربیت کی نشرواشاعت۔

۲۔فقط علوم دینی ہی اہمیت کے حامل نہیں۔

۳۔روایات واحادیث میں مفید علوم کا حاصل کرنا۔

۴۔اسلام میں معلم کا مقام اور۔

۱۔اسلام میں تعلیم وتربیت

قرآن مجید میں تعلیم،تعلم اور علم کی اشاعت کے بارے میں بکثرت آیات موجود ہیں،لیکن ان سب آیات کے تذکرے کی اس مختصر کتاب میں گنجائش نہیں لہٰذا یہاں ہم ان کی واضح مثالوں اور نمونوں کو اشارتاً ذکر کرتے ہیں:

۱۔اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ۭ يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ڏ وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا ﴿١٢﴾ [۴]

---

[۱] بحارالانوار،ج۸۹،ص۱۷۔

[۲] غررالحکم۔

[۳] بحارالانوار،ج۶۶،ص۲۹۳۔

[۴] (سورۂ طلاق/۱۲)

۲۔''كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ﴿۱۵۱﴾ (سورۂ بقرہ/۱۵۱)

۳۔''رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ (سورۂ بقرہ/۱۲۹)

۴۔وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴿۴۳﴾ (سورۂ نحل/۴۳)

۵۔وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ؕ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ﴿۱۲۲﴾

(سورۂ توبہ/۱۲۲)

۶۔''يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴿۲۶۹﴾ '(سورۂ بقرہ/۲۶۹)

۷۔''اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ﴿۱۵۹﴾ (سورۂ بقرہ ۱۵۹)

ترجمہ:

۱۔''خدا تعالیٰ وہی ہے جس نے سات آسمان پیدا کئے اور ان کی طرح زمین بھی، اس کا فرمان مسلسل ان میں نازل ہوتا ہے تا کہ تم جان لو کہ خدا تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے اور یہ کہ اس کا علم ہر چیز پر محیط ہے۔''

۲۔''اسی طرح جس طرح (قبلہ تبدیل کر کے ہم نے اپنی نعمت تم پر کامل کر دی) ایک رسول کو ہم نے تمہاری طرف بھیجا تا کہ وہ ہماری آیات پڑھ کر تمہیں سنائے اور تمہیں پاک کرے اور تمہیں کتاب اور حکمت سکھائے اور جو کچھ تم نہیں جانتے تھے وہ کچھ تمہیں سکھائے۔''

۳۔''اے پروردگار! ان کے درمیان ایک رسول کو اپنی طرف سے مبعوث فرما تا کہ وہ تیری آیات انھیں پڑھ کر سنائے اور انھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور پاک کرے اس لئے کہ تو قدرت اور حکمت والا ہے۔''

۴۔ ''اور تم سے پہلے سوائے ایسے افراد کے جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے، ہم نے نہیں بھیجے اے لوگو! اگر تم نہیں جانتے تو ان سے پوچھ لو جو جاننے والے ہیں۔''

۵۔ ''یہ بات شائستہ نہیں کہ اہل ایمان سب کے سب (میدان جہاد کی طرف) کوچ کریں، ہر گروہ میں سے ایک طائفہ کیوں کوچ نہیں کرتا (اور ایک حصہ مدینہ منورہ میں نہیں رہ جاتا) تاکہ دین (کے معارف و احکام الٰہی سے) آگاہی حاصل کریں اور اپنی قوم کے پاس واپس آنے کے بعد ان کو (عذاب الٰہی) سے ڈرائیں، شاید (وہ لوگ خدا کے حکم کی مخالفت) سے ڈریں اور پرہیز کریں۔''

٦۔ ''خدا جسے چاہے حکمت (دانش) عطا کرتا ہے، اور جسے حکمت و دانش عطا کی جائے اسے (بہت بھلائی) عطا کی گئی ہے اور سوائے اہل عقل کے (ان حقائق کا کوئی ادرک نہیں کرتا) اور فقط وہی متذکر ہوتے ہیں۔''

۷۔ ''وہ لوگ جو واضح دلائل اور وسیلہ ہدایت کے نازل ہونے کے بعد انہیں چھپاتے ہیں جب کہ ان لوگوں کے لیے ہم نے کتاب میں بیان کر دیا ان پر خدا لعنت کرتا ہے اور سب لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت کرتے ہیں۔''

تعلیم و تربیت سے متعلق ان سات آیتوں پر جو قرآن مجید کی دسیوں آیات میں سے منتخب کی گئی ہیں ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام نے اس معاملے کو غیر معمولی اہمیت دی ہے۔

پہلی آیت، اس کائنات کو ایک علمی مرکز کے طور پر متعارف کراتی ہے کہ جس کی تمام مخلوقات کو اپنے متعلق انسان کے علم و دانش کی خاطر پیدا کیا گیا ہے، مقصد ان مخلوقات کو پیدا کرنے کا یہ ہے کہ انسان ان کے بارے میں غور و فکر کریں اور اپنے رب کے علم و قدرت سے آشنائی حاصل کریں، بالفاظ دیگر پوری کائنات کی تخلیق کا مقصد علم و دانش ہے، خدا تعالیٰ کا فرمان ہے: ''خدا تعالیٰ وہ ہے جس نے سات آسمان پیدا کئے اور یہی کیفیت آسمانوں کی طرح زمین کی بھی ہے اس کا فرمان ہمیشہ آسمانوں اور زمینوں کے درمیان نازل ہوتا رہتا ہے (اور اس نے ہمیشہ انھیں اپنی ربوبیت کے زیر سایہ رکھا ہے) تاکہ تم جان لو کہ خدا تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے اور اس کا علم تمام چیزوں پر محیط

ہے۔"[1]

یہ دراصل ایک دلچسپ نکتہ ہے کہ زمینوں اور آسمانوں کی تخلیق اور ان کی دائمی تدبیر، انسان کی حس جستجو کو متحرک کرنے اور اسرار کائنات میں اس کے غور وفکر کرنے کا وسیلہ ہے، جس کے نتیجہ میں انسان خدا کی قدرت اور اس کے علم سے آگاہ ہوتا ہے؛ پس یہ سب انسان کی تربیت اور قربتِ خدا کے حصول کے مقدمات اور وسائل ہیں اسی طرح اس بات کی آگاہی کہ احکام شریعت، احکام تخلیق کی طرح ایک محتاط اور دقیق حساب کے مطابق ہیں، پس یہ تخلیق علم و آگاہی کی خاطر ہے۔

دوسری آیت میں رسول اکرمؐ کی بعثت کے مقصد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ مقصد یہ ہے کہ آپؐ آیات الٰہی کے زیر سایہ لوگوں کی تعلیم وتربیت کریں، ارشاد خدا ہے:

ترجمہ: "جیسے ہم نے ایک رسولؐ کو تم میں سے مبعوث کیا ہے تا کہ وہ ہماری آیات کی تمہارے سامنے تلاوت کرے اور تمہیں پاک کر دے، حکمت سے آشنا کرے اور جو کچھ تم نہیں جانتے تھے اس سے تمہیں آگاہ کرے"

" كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِنْكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ"

اس مقام پر رسول اکرمؐ کی نبوت کے مقصد کے طور پر ہی کتاب وحکمت کی تعلیم پر تکیہ نہیں کیا گیا ، بلکہ ان امور کی تعلیم کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے جن تک نزول وحی کے بغیر دسترسی کا کوئی امکان نہیں۔ اس جملے پر "يُعَلِّمُكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ" (غور فرمائیں) اس طرح تخلیق کائنات کا ہدف علم ودانش کی ترقی اور رسول اکرمؐ کی بعثت کا مقصد بھی علم وحکمت کی اشاعت اور انسانوں کی تربیت اور پرورش ہے۔

تیسری آیت سے بخوبی استفادہ ہوتا ہے کہ یہ عظیم اور عالی مقصد یعنی تعلیم وتربیت اور حکمت کی تعلیم، ابراہیم خلیل اللہ کی امت کے لئے دعا میں بھی بیان ہوا ہے، چنانچہ آپؑ خدا تعالیٰ سے درخواست کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں:

ترجمہ: "اے پروردگار! ان کے درمیان (یعنی امت اسلام میں) انہی میں سے ایک رسول مبعوث فرما جو

---

[1] سات آسمانوں کی متعدد تفسیریں کی گئی ہیں، ایک معروف تفسیر یہ ہے کہ آسمانوں اور ہوائی کُرے اور ثابت وسیار ستارے جو ہمیں دکھائی دیتے ہیں ان سب کا تعلق پہلے آسمان سے ہے اور اس سے پرے چھ اور عظیم جہان ہیں اور سات زمینوں کے بارے میں ایک تفسیر یہ ہے کہ وہی عوالم (عالم) جو اوپر کی طرف ہیں ایسے ہی عوالم کرۂ زمین کی نچلی طرف بھی موجود ہیں۔ یہی مطلب رسول اکرمؐ کی ایک حدیث میں ایک دلچسپ عبارت کے ساتھ نقل ہوا ہے کہ آپؐ نے فرمایا: کیا تم لوگ جانتے ہو کہ تمہارے پاؤں کے نیچے کیا ہے؟ تو لوگوں نے کہا خدا اور اس کا رسولؐ بہتر جانتے ہیں۔ تو آپؐ نے فرمایا: "الأَرْضُ وَ تَحْتَهَا أَرْضُ أُخْرى بَيْنَهُمَا خَمْسَ مِائَةَ عامٍ" یعنی تمہارے پاؤں کے نیچے کرۂ زمین ہے اور اس کے نیچے ایک اور زمین ہے کہ جن کے درمیان پانچ سو سال کا فاصلہ ہے۔ (تفسیر روح البیان، ج ۱۰، ص ۴۴)۔ سات آسمانوں سے متعلق مزید وضاحت تفسیر موضوعی، پیام قرآن، ج ۲، ص ۱۷۸ میں ملاحظہ کیجیے۔

تیری آیات ان کے سامنے پڑھے اور انھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے، کیونکہ تو صاحب قدرت وحکمت ہے (اور اس بات پر قادر ہے)''

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۲۹﴾

اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دو مقاصد (تعلیم وتربیت) سابقہ امتوں میں بھی رائج رہے ہیں۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس آیت اور اس بارے میں نازل ہونے والی بعض دوسری آیات میں بھی تعلیم کتاب اور تزکیہ کے ساتھ ساتھ حکمت کی تعلیم کی بات ہوئی ہے، لہٰذا دیکھنا یہ ہے کہ اس مقام پر حکمت سے کیا مراد ہے؟ اس کی متعدد تفسیریں بیان کی گئی ہیں۔ پہلی تفسیر یہ ہے کہ حکمت سے مراد معارف دینی اور ان کے احکام سے متعلق آگاہی ہے اور دوسری تفسیر یہ ہے کہ اس سے مراد رسول اکرمؐ کی سنت ہے کیونکہ اسے (سنت کو) کتاب اللہ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے؛ بعض کی رائے میں اس سے مراد وہ علامات اور نشانیاں ہیں جو حق کو باطل سے جدا کرتی ہیں اور (حکمت کی تفسیر میں) یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے مراد آیات متشابہہ کا مفہوم ہے اور رسولؐ کے لئے اس کی تعلیم دینا ضروری ہے۔[1]

لیکن اگر ہم حکمت کے لغوی مفہوم یعنی جہل وخطا سے باز رکھنے والی چیز اور ہر چیز کو اس کی مناسب جگہ پر رکھنے پر توجہ کریں تو ایسے نظر آتا ہے کہ حکمت سے مراد یہ ہے کہ انسان احکام کے اسرار، اسباب اور نتائج نیز کائنات اور انسان کی تخلیق کے اسرار، اپنی سرنوشت اور انجام کے بارے میں آگاہی حاصل کرے۔

چوتھی آیت میں ایک کلی قاعدے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو تعلیم وتربیت کے مسئلے کی بنیاد ہے، ارشاد فرماتا ہے: اگر تم نہیں جانتے تو اہل علم سے پوچھو: ''فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ''۔ یہ آیہ شریفہ اگرچہ سابقہ انبیاء کی، صفات کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو انسان ہی کی جنس سے تھے اور بظاہر دوسرے افراد سے مختلف نہیں تھے، لیکن معلوم ہے کہ اس آیت کے وسیع مفہوم کو محدود نہیں کیا جاسکتا اور حکم اپنی عمومیت (عام ہونے) پر باقی ہے۔

یہ درحقیقت ایک بنیادی اصل (قانون) ہے جس کی صحت اور درستگی کو تمام عقلاء تسلیم کرتے ہیں کہ ہمیشہ نہ جاننے والوں کو جاننے والوں سے علم حاصل کرنا چاہیے کیونکہ علوم ودانش دراصل ان تجربات اور غور وفکر کا نتیجہ ہوتے ہیں جنھیں گذشتگان حاصل کرتے اور آنے والی نسلوں کے سپرد کردیتے ہیں، بعد والی نسلیں ان میں اضافہ کرکے اپنے بعد والوں کو منتقل کردیتی ہیں، اسی ترتیب کے ساتھ انسان کا علم اور اس کی دانش دن بدن ترقی حاصل کرتی چلی جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ تعلیم انسان کی معنوی اور مادی بنیادوں کو مضبوط کرنے میں اور اُس کی معاشرتی پیش رفت میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

اس مقام پر غزالی سے نقل شدہ ایک جملہ مطلب کو واضح تر کردیتا ہے اس سے کسی نے پوچھا: اسلام کے اصول وفروع پر تمہیں جو

---

[1] تفسیر کبیر، فخر رازی، ج ۴، ص ۶۶، موضوع بحث آیت۔

علمی تسلط حاصل ہے اسے تم نے کہاں سے حاصل کیا؟!اس نے جواب میں مذکورہ بالا آیت یعنی ''فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ'' کی تلاوت کی؛یعنی ''علم کل علماء اور دانشمندوں سے سوال کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔''[1]

اہل بیت ÷ سے منقول متعدد روایات میں اہل ذکر کی تفسیر ائمہ معصومینؑ سے کی گئی ہے۔[2] لیکن چونکہ معلوم ہے کہ اس قسم کی تفسیریں کسی مطلب کو منحصر کر دینے کے معنیٰ میں نہیں بلکہ اتم واکمل (کامل ترین) فرد اور مصداق کو ظاہر کرنے کے لئے ہوتی ہیں، اس قسم کا مفہوم قرآن کی اکثر آیات میں نظر آتا ہے۔

پانچویں آیت مسلمانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کرتی ہے: ''معلمین اور متعلمین'' اور حقیقت میں ہر مسلمان کو ان دو گروہوں میں سے ہونا چاہیے؛ یا پڑھائے یا پڑھے، یا معلم ہو یا متعلم (شاگرد) قرآن میں ارشاد باری ہے: شائستہ نہیں کہ سب مسلمان نکل پڑیں کیوں ایک گروہ سے ایک طائفہ کوچ نہیں کرتا تا کہ وہ (معارف اسلامی اور احکام سے) آگاہی حاصل کرے اور اپنی قوم کے پاس واپس آ کر اسے (خدا کے عذاب سے) ڈرائے، شاید وہ لوگ (خدا کی مخالفت سے) ڈر جائیں:

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا كَافَّةً ۚ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ ﴿۱۲۲﴾

پوری تاریخ میں علماء نے اس آیت کے ذریعے استدلال کیا ہے تاکہ علوم اسلامی حاصل کرنے کے وجوب کو واجب کفائی کے عنوان سے دوسرے لوگوں کے لئے ثابت کر سکیں، علاوہ ازیں عمل کرنے کے لئے علم حاصل کرنے کو سب علماء واجب عینی قرار دیتے ہیں۔

آج دنیا کے اکثر ممالک میں علم حاصل کرنا سب پر لازم ہے اور از روئے قانون ہر بچے کا پڑھنا ضروری ہے اور اگر وہ نہ پڑھے تو اس کا سرپرست جوابدہ ہوتا ہے، لیکن کسی جگہ تعلیم دینا قانونی طور پر لازم نہیں بلکہ ہر کسی کو اختیار ہے کہ وہ تعلیم دے یا نہ دے، لیکن اسلام میں جس طرح علم حاصل کرنا واجب ہے اسی طرح دوسروں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنا بھی وجوب ولزوم کا پہلو رکھتا ہے، اس کی ایک دلیل یہی مذکورہ بالا آیت یعنی آیہ نفر ہے، کیونکہ ایک طرف سے جملہ ''فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ'' کے ذریعے علم حاصل کرنے کے لئے نکل پڑنے کو واجب قرار دیا جاتا ہے۔[3]

تو دوسری طرف سے جملہ ''وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ'' کے ذریعے تعلیم دینے کو بھی واجب اور لازم شمار کیا جاتا ہے البتہ جملہ ''لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ'' میں مذکور یہ الٰہی فرائض ہیں، جو عمل کرنے کے مقدمات ہیں۔ اسی بناء پر بعض اوقات بعض علماء اسلام کئی کئی دن کا سفر طے کر کے ایک شہر سے دوسرے شہر تک جاتے ہیں تا کہ وہ ایک حدیث حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں، اس کی

---

[1] تفسیر روح البیان، ج ۵، ص ۷ ۳۔

[2] ان روایات سے آگاہی کے لئے تفسیر البرہان، ج ۲، ص ۳۶۹ کی طرف رجوع کریں، قابل توجہ یہ ہے کہ یہ الفاظ اہل سنت کی روایات میں بھی آئے ہیں، شواہد التنزیل حسکانی، ج ۱، ص ۴۴ ۳ اور احقاق الحق، ج ۳، ص ۴۸۲ کا مطالعہ فرمائیں۔

[3] علماء ادب کے بقول کلمہ ''لولا'' تخضیضیہ ہے جو ملامت اور سرزنش کے موقع پر کہا جاتا ہے اور واضح ہے کہ سرزنش ترک واجب اور ارتکاب حرام کی وجہ سے کی جاتی ہے۔

ایک مثال یہ ہے کہ ''جابر'' ایک حدیث (جو کسی عالم کے پاس موجود تھی) کی خاطر مدینہ سے مصر گئے تا کہ اس سے وہ حدیث سن کر اپنے پاس محفوظ کرسکیں، لہٰذا کہا جاتا ہے کہ کوئی شخص بھی سفر کئے بغیر مرحلۂ کمال تک نہیں پہنچ سکتا (کیونکہ اس طرح وہ مختلف شہروں کے علماء سے رابطہ کر کے ان کے علم و تجربے سے مستفیذ ہوتا ہے۔ اسی طرح کوئی شخص بھی ہجرت کئے بغیر منزل مقصود پر نہیں پہنچ سکتا۔[1]

سورہ کہف میں حضرت خضر -اور حضرت موسیٰ -کے واقعے میں آیا ہے کہ عظیم پیغمبر موسیٰ -نے بعض علوم حاصل کرنے کے لئے طولانی، تکلیف دہ اور پر مشقت راہ کو طے کیا، تا کہ اس مرد الٰہی (حضرت خضر -) کے پاس پہنچ کر ان سے علم حاصل کرسکیں۔ چھٹی آیت میں ایک اور اہم تعبیر جو علم و دانش حاصل کرنے کے بارے میں ہے، اس کا ذکر کچھ اس طرح ہے: خدا دانش و حکمت جسے چاہے عطا کرتا ہے اور جسے حکمت عطا کی جائے، اسے خیر کثیر عطا کیا جاتا ہے، اور صرف اہل عقل ان حقائق کو سمجھ سکتے ہیں:

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۗ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿٢٦٩﴾

واضح ہے کہ اس تعبیر ''مَنْ يَشَاءُ'' (جسے خدا چاہے) سے یہ مراد نہیں کہ خدا تعالیٰ حکمت و دانش کو بلا وجہ لوگوں کو عطا کرتا ہے، بلکہ جیسا کہ معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادہ ہمیشہ اُس کی حکمت کے ہمراہ ہوتی ہے۔ یعنی جسے وہ لائق سمجھتا ہے اسے عطا کرتا ہے اور یہ لیاقت یا کد و کاوش اور علم حاصل کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ مشقت برداشت کرنے سے پیدا ہوتی ہے یا خود سازی اور تقویٰ اختیار کرنے سے کیونکہ تقویٰ بصیرت اور روشن ضمیری کا سرچشمہ ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس آیت میں علم و دانش کو خیر کثیر کہا گیا ہے اور یہ ایک ایسی تعبیر ہے جو تمام نیکیوں اور خوبیوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے یعنی خیر دنیا و آخرت، خیر مادی و معنوی اور تمام جہات میں خیر غرض ہر قسم کے خیرات اس خیر کثیر میں سمٹ جاتے ہیں۔

مفسر عالیقدر مرحوم علامہ طباطبائی اس مقام پر ایک نکتے کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: جملہ ''وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ'' بصورت فعل مجہول ذکر ہوا ہے جبکہ اس سے پہلا جملہ فعل معروف پر مشتمل ہے (اور فرماتے ہیں: خدا تعالیٰ جسے چاہتا ہے علم و حکمت عطا کرتا ہے) تا کہ واضح ہو کہ حکمت و دانش ذاتی طور پر خیر کثیر کا سرچشمہ ہے نہ فقط خدا تعالیٰ کی طرف منسوب ہونے کی بناء پر بلکہ ذات و حقیقت علم، خیر کثیر (فراوانی) ہے![2]

آخری آیت اس مسئلے کے ایک اور رخ کی طرف اشارہ کرتی ہے اور وہ ہے علم و دانش کو چھپانے کی شدید مذمت لہٰذا ارشاد حق تعالیٰ ہے: ''وہ لوگ جو ہماری طرف سے روشن دلائل اور ہدایت کے وسیلے کے نازل ہونے کے بعد، جسے ہم نے لوگوں کے لئے (آسمانی) کتاب میں بیان کر دیا ہے، اگر چھپاتے ہیں تو خدا ان پر لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت کرتے ہیں''

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي

---

[1] تفسیر روح البیان، ج ۳، ص ۷ ۵۳۔

[2] تفسیر المیزان، ج ۲، مذکورہ آیت کے ذیل میں ملاحظہ فرمائیے۔

الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ﴿۱۵۹﴾

اللہ تعالیٰ کی لعنت (یعنی اللہ تعالیٰ کا ان کو اپنی رحمت سے دور کرنا) اور لعنت کرنے والوں کی لعنت ان شدید ترین تعبیرات میں سے ایک ہے جو قرآن مجید میں گناہوں میں سے کسی گناہ کے بارے میں آئی ہے۔ اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علم و دانش کا کتمان (چھپانا) کس قدر برا اور قابل مذمت ہے۔ یعنی ایسے علوم کو چھپانا جو لوگوں کی ہدایت کا وسیلہ ہیں۔ ایک اور آیت میں، جو اس آیت کے بعد سورۂ بقرہ میں بلا فاصلہ ذکر ہوئی ہے آیا ہے کہ پشیمانی اور خدا کی طرف برگشت اور توبہ کے بعد روشن مسائل کے چھپانے کا مداوا فقط اسی صورت میں ممکن ہے کہ انھیں آشکار کیا جائے اور یہ اس بات کو بخوبی ظاہر کرتا ہے کہ علم چھپانے کی تلافی اسی وقت ہو سکتی ہے جب اسے ظاہر کیا جائے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَيَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ [۱]

اگرچہ یہ آیت اہل کتاب کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جو رسول اکرمؐ کی علامات اور نشانیوں کو، جو انھوں نے اپنی کتابوں میں دیکھ رکھی تھی، چھپاتے تھے۔ لیکن بدیہی واضح ہے کہ مفہوم آیت میں وسعت ہے اور ہر اس علم کا کتمان جو لوگوں کے لئے سرچشمہ ہدایت ہو اس وسیع مفہوم میں شامل ہو سکتا ہے۔ معصومین ؑ سے منقولہ روایات بھی یہی ظاہر کرتی ہیں یہاں کہ علم کا مطلق مفہوم مُراد ہے (نہ کوئی خاص شانِ نزول)۔ رسول اکرمؐ ایک حدیث کے مطابق فرماتے ہیں:

"مَنْ سُئِلَ عَنْ عِلْمٍ يَعْلَمُهُ، فَكَتَمَهُ اُلْجِمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِلِجَامٍ مِنْ نَارٍ"

"وہ شخص جو جن علوم کو جانتا ہے اس سے اگر ان کے بارے میں کچھ پوچھا جائے اور وہ اسے چھپائے تو روز قیامت اس کے منہ پر آگ کی لگام ڈالی جائے گی" [۲]

رسول اکرمؐ ہی سے مروی ایک اور حدیث میں اس مطلب کو مزید واضح کیا گیا ہے:

"مَنْ كَتَمَ عِلْماً نافِعاً عِنْدَهُ، اَلْجَمَهُ اللهُ يَوْمَ الْقِيامَةِ بِلِجامٍ مِنْ نارٍ"

جو شخص اپنے پاس موجود مفید اور نافع علم کو چھپائے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے منہ پر آگ کی لگام ڈالے گا۔ [۳]

واضح ہے کہ یہ الفاظ تمام انسانوں کے لئے ہر قسم کے مفید علوم کے بیان پر مشتمل ہیں۔ ایک اور حدیث میں آنحضرتؐ نے اس مطلب کو صراحت کے ساتھ بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"مَنْ عَلِمَ شَيْئاً فَلا يَكْتُمْهُ"

---

[۱] سورۂ بقرہ/ ۱۶۰

[۲] مجمع البیان، ج ۱ اور ۲، ص ۲۴۱۔

[۳] کنز العمال، ج ۱۰، ص ۲۱۶، حدیث ۲۹۱۴۲ اور بحار الانوار، ج ۲، ص ۷۸۔

جو شخص کسی چیز کے بارے میں علم رکھتا ہے وہ اسے ہرگز چھپا کر نہ رکھے۔[1]

۲۔ فقط علوم دینی ہی اہمیت کے حامل نہیں

ممکن ہے کہ بعض لوگ یہ تصور کریں کہ علم، تعلیم و تعلم اور ان کی نشر و اشاعت کے بارے میں قرآن اور احادیث میں جو اتنی تاکید کی گئی ہے، وہ فقط دینی علوم اور حکومت اسلامی کی بحث میں جن دوسرے علوم کی وسعت بھی مرکز توجہ ہے، ان کے ساتھ ان (تاکیدات) کا کوئی تعلق نہیں۔ لیکن یہ ایک فاش غلطی ہے کیونکہ آیات قرآن کے ساتھ ساتھ روایات سے بھی تعلیم و تربیت اور علم کی اہمیت بطور مطلق ذکر ہوئی ہے۔ اس مطلب پر بکثرت شواہد موجود ہیں جن میں سے مندرجہ ذیل آیات قرآن ہیں:

۱۔ حضرت آدم - کے واقعے میں تعلیم اسماء کا بیان ہوا ہے جس کا اشارہ تمام موجودات کی تخلیق کے اسرار کی طرف ہے نہ فقط علوم دینی کی طرف: ''وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا''۔ (سورۂ بقرہ/۳۱)

۲۔ سورۂ الرحمن میں خدا کی طرف سے تعلیم بیان کا ذکر ہے اور اسے آغاز سورہ میں ایک عظیم عطیۂ الٰہی کی صورت میں بیان کیا گیا ہے اور عظیم ترین نعمتوں کے مجموعے کا اس میں ذکر کیا گیا ہے: ''عَلَّمَهُ الْبَيَانَ''۔ (سورۂ الرحمن/۴)

۳۔ سورۂ یوسف میں تعبیر خواب کے علم اور خوابوں کے آنے والے حوادث سے حکایت کرنے کی طرف حضرت یوسف کے قول کی حکایت کرتے ہوئے فرماتا ہے: ''ذَٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِي رَبِّي''۔ (سورۂ یوسف/۳۷)

۴۔ پھر اسی سورہ میں ملک کا انتظام چلانے اور بیت المال کے انتظام سے متعلق اشارہ کر کے حضرت یوسف - کی زبان سے عزیز مصر سے مخاطب ہو کر ارشاد فرماتا ہے:

قَالَ اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ ۖ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ ۝ [2]

۵۔ (اسی ملکی انتظام چلانے کے سلسلے میں) طالوت اور جالوت کے واقعے میں قرآن اس زمانے کے نبی حضرت اشموئیل - کی طرف سے طالوت کو (انتظامی امور) چلانے پر مامور کرنے کی دلیل بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

قَالَ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ

خدا تعالٰی نے اسے (طالوت کو) تم میں سے منتخب کیا ہے اور اسے وسیع علم اور جسمانی قدرت عطا کی ہے۔[3]

واضح ہے کہ طالوت کا بقیہ بنی اسرائیل سے ممتاز ہونا فقط معارف الٰہی جاننے کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ سیاسی اور انتظامی امور کے

---

[1] کنز العمال، حدیث ۲۹۱۴۵۔

[2] سورۂ یوسف/۵۵

[3] سورۂ بقرہ/۲۴۷

بارے میں اس کی بصیرت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جو اس ذہین وفطین اور مدبر جوان کی سرشت میں موجود تھی۔

۶۔ حضرت داوٗدؑ کے واقعے میں "صنعة لبوس"، زرہ سازی کے علم کا تذکرہ کیا گیا ہے جو ان کے لئے ایک عظیم فخر تھا بلکہ مجمع البیان میں طبرسی کے بقول "لبوس" کا تعلق ہر قسم کے اسلحے سے بھی ہے اور اس سے مراد فقط زرہ نہیں [۱]

اس سلسلے میں قرآن فرماتا ہے:

وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ [۲]

۷۔ سورۂ کہف میں خضر -اور موسیٰؑ کے واقعے ان علوم کا تذکرہ ہے جو خضرؑ نے موسیٰؑ کو سکھائے اور ان میں سے کسی علم کا علوم دینی سے کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ وہ ایسے علوم تھے جو انسانی معاشرے کو بہترین صورت اور نظام کے مطابق چلانے کے کفیل تھے۔ اس بارے میں قرآن فرماتا ہے:

فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ﴿۶۵﴾

اس مقام پر (موسیٰؑ اور ان کے ہم سفر یوشعؑ) نے ہمارے بندگان میں سے ایک ایسے بندے کو پایا جسے ہم نے اپنی رحمت کا مشمول قرار دے کر علم کثیر سے مالا مال کر دیا تھا۔ [۳]

بعد کی آیات میں ان علوم کے تین نمونے بطور تفصیل بیان کیے گئے ہیں کہ جن میں سے کسی کا تعلق بھی علوم دینی سے نہیں بلکہ سب کا تعلق امور زندگی کی تدبیر اور انتظام سے ہے۔

۸۔ سورۂ نمل میں حضرت سلیمانؑ کی پرندوں کے ساتھ گفتگو کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اور قرآن اسے حضرت سلیمانؑ کے لئے باعث فخر قرار دیتا اور فرماتا ہے:

وَقَالَ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ

(حضرت سلیمانؑ نے کہا) اے لوگو! مجھے پرندوں کی بولی سکھائی گئی ہے۔ [۴]

۹۔ سورۂ کہف کی آخری آیات میں ذوالقرنین - کے واقعے میں ان کی سدّ بندی کے واقعے کو ایک اہم واقعہ کی صورت میں بیان کیا گیا ہے اور یہاں تک کہ فاسد و مفسد قبائل (یاجوج و ماجوج) کے حملوں سے حفاظت کے لئے ایک نہایت مضبوط آہنی دیوار بنانے کے بارے میں ان کی تدبیر کی کیفیت اور جزئیات کو بیان کرتے ہوئے قرآن فرماتا ہے:

---

[۱] مجمع البیان، ذیل آیت ۸۰/ سورۂ انبیاء؛ لیکن آیت میں کچھ ایسے قرائن ملتے ہیں کہ جن کا بیشتر اشارہ "زرہ" کی طرف ہے۔

[۲] سورۂ انبیاء/ ۸۰

[۳] سورۂ کہف/ ۶۵

[۴] سورۂ نمل/ ۱۶

اٰتُوْنِیْ زُبَرَ الْحَدِیْدِ ؕ حَتّٰۤی اِذَا سَاوٰی بَیْنَ الصَّدَفَیْنِ قَالَ انْفُخُوْا ؕ حَتّٰۤی اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا ۙ قَالَ اٰتُوْنِیْۤ اُفْرِغْ عَلَیْهِ قِطْرًا ﴿۹۶﴾

''(آپؑ نے لوگوں سے کہا) لوہے کے بڑے بڑے ٹکڑے میرے پاس لاؤ (اور انھیں ایک دوسرے پر رکھو) یہاں تک کہ وہ (ٹکڑے) دو پہاڑوں کے درمیانی فاصلے کو ڈھانپ لیں، بعدازاں کہا (ان کے اطراف میں آگ روشن کرو) اور اسے پھونکیں مار کر ہوا دو (انھوں نے ایسا ہی کیا) یہاں تک کہ لوہے کے ٹکڑے سرخ اور نرم ہو گئے، پھر کہا: اب پگھلا ہوا تانبا لاؤ تا کہ میں اسے ان پر ڈال دوں۔'' [1]

سدّ سازی سے متعلق یہ علم بھی خدا کی طرف سے ایک عطیہ تھا۔

۱۰۔ سورۂ لقمان میں بھی کئی آیتوں میں حضرت لقمانؑ کی اپنے بیٹے کو کئی نصیحتوں کا تذکرہ ملتا ہے اور یہ ایسے احکام پر مشتمل ہے جن کا تعلق نفسیات اور معاشرتی امور سے ہے جن کی رعایت کرنا زندگی میں بے حد اہمیت رکھتا ہے، آپ اپنے بیٹے کو حکم دیتے ہیں کہ لوگوں کے ساتھ بے توجہی اور ترشروئی کے ساتھ ہرگز پیش نہ آؤ، متکبرانہ انداز سے زمین پر مت چلو، چلنے میں اعتدال سے کام لو، بلند اور سخت لہجے میں بات کرنے سے پرہیز کرو اور اپنے تمام کاموں میں صبر و استقامت کی رعایت کرو۔ (سورۂ لقمان/۱۷ تا ۱۹) یہ سب کچھ اس حال میں ہے کہ خدا تعالیٰ نے لقمانؑ کو علم وحکمت کا حامل ہونے کی وجہ سے بزرگ اور باعظمت قرار دیا ہے یہاں تک کہ ان کی بات کو اپنی بات کے ہمراہ اور ایک ہی انداز میں بیان کیا ہے!

۱۱۔ سورۂ سبا میں حضرت سلیمانؑ کے حالات میں اس تعمیر اور فنکاری کا ذکر ہے جسے جنات سلیمانؑ کی نگرانی میں انجام دیتے تھے:

یَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا یَشَآءُ مِنْ مَّحَارِیْبَ وَتَمَاثِیْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِیٰتٍ ؕ

جو کچھ سلیمانؑ ان جنوں سے چاہتے اور انھیں اس کا حکم دیتے، تو وہ (فوراً اس کی تعمیل کرتے ہوئے) ان کے لئے معابد، تمثال، غذا کے بڑے بڑے ظروف اور حوض اور اپنے مقام پر ٹکی ہوئی دیگیں بنا ڈالتے تھے! [2]

اور اس سے پہلی آیت میں دھاتوں کے پگھلانے کا علم جو حضرت سلیمانؑ کو حاصل تھا، کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن فرماتا ہے

"وَأَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ"

یعنی: ''ہم نے سلیمانؑ کے لئے پگھلے ہوئے تانبے کے چشموں کو جاری کیا۔'' [3]

---

[1] سورۂ کہف/۹۶

[2] سورۂ سبا/ ۱۳

[3] سورۂ سبا/ ۱۲

۱۲۔سورۂ بقرہ میں قرآن مجید حضرت داؤدؑ کی حکومت کے بارے میں فرماتا ہے:

"وَقَتَلَ دَاوُودُ جَالُوتَ وَآتَاهُ اللهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ"

داؤدؑ نے جالوت کو قتل کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے انھیں حکومت اور حکمت بخشی اور جو کچھ وہ چاہتے تھے انھیں اس کی تعلیم دی۔[۱]

واضح ہے کہ علم وحکمت سے مراد اس مقام پر وہ علم ہے جو ملک ومملکت کا نظام چلانے کے لئے ضروری ہوتا ہے اور اگر اس کا ایک وسیع تر معنی بھی ہو تو علوم کا یہ حصہ قطعی طور پر نظام حکومت کو بھی اپنے دامن میں جگہ دیتا ہے۔ مذکورہ آیات اور بعض دوسری آیات قرآن میں موجود مجموعی اشارات سے بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ بعض لوگوں کے گمان کے برعکس جو یہ کہتے ہیں کہ قرآن نے فقط علوم دین اور معارف الٰہی کو اہمیت دی ہے اور دوسرے علوم کے بارے میں کوئی بات نہیں کی، قرآن نے علوم کی ان اقسام کو غیر معمولی اہمیت دی ہے اور انھیں عظیم عطیات ربانی کی حیثیت دی ہے اور مسلمانوں کو مادی اور معنوی زندگی میں مفید علوم حاصل کرنے کی ترغیب دلائی ہے۔

۳۔احادیث میں مفید علوم حاصل کرنے کی تاکید

احادیث میں بھی آیات قرآن کی پیروی میں، صرف علوم دینی ہی کو حاصل کرنے کی ترغیب نہیں دی گئی، بلکہ ان کے علاوہ مادی ومعنوی زندگی میں مفید علوم حاصل کرنے پر بھی زور دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل احادیث ملاحظہ فرمائیں:

۱۔رسول اکرمؐ کی ایک معروف حدیث میں آیا ہے کہ:

"أُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ بِالصِّيْنِ فَإِنَّ طَلَبَ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ"

علم حاصل کرو اگرچہ وہ ملک چین میں ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے۔[۲]

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ملک چین اس زمانے میں دنیا کا سب سے دور ملک سمجھا جاتا تھا، اس بناء پر مراد یہ ہے کہ علم کے پیچھے میں جاؤ اگرچہ وہ دنیا کے سب سے دور ملک میں ہی کیوں نہ ہو۔ واضح ہے کہ وہ علم جو اس زمانے میں چین کے ملک میں موجود تھا، معارف قرآنی ودینی پر مشتمل نہیں تھا، کیونکہ ان کی جگہ تو مراکز وحی تھے، بلکہ مراد دنیوی اعتبار سے مفید علوم ہیں۔

۲۔ایک اور حدیث میں امام علیؑ فرماتے ہیں:

"اَلْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ فَاطْلُبُوهَا وَلَوْ عِنْدَ الْمُشْرِكِ"

---

[۱] سورۂ بقرہ/۲۵۱

[۲] بحار الانوار، ج۱ص۱۸۰اور کنز العمال، حدیث ۲۸۶۹۷۔

حکمت صاحبان ایمان کی گمشدہ چیز ہے پس اسے طلب کرو اگرچہ وہ مشرکین کے پاس ہی کیوں نہ ہو۔[1]

واضح ہے کہ مشرکین کے پاس پائے جانے والے علوم، معارف توحید اور علوم الٰہی ہرگز نہیں ہو سکتے، بلکہ وہ کوئی دوسرے مفید علوم ہی ہیں جو زندگی میں کام آسکیں اور کبھی ان کے پاس موجود ہوتے ہیں۔ اس قسم کی احادیث اس معروف کہاوت ''علم کا کوئی وطن نہیں'' کی ترجمانی کرتے ہوئے تاکید کرتی ہیں کہ علم و دانش مومنین کی گمشدہ چیز ہے، ان کا حق ہے کہ جس جگہ اور جس کے پاس ملیں وہ انھیں حاصل کریں۔ چنانچہ ایک اور حدیث میں ذکر ہوا ہے:

"كَلِمَةُ الْحِكْمَةِ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ فَحَيْثُ وَجَدَهَا فَهُوَ اَحَقُّ بِهَا"

یعنی: ''حکیمانہ کلمات مومن کی گمشدہ چیز ہے، جس جگہ انھیں دریافت کرے وہ انھیں حاصل کرنے کا زیادہ حقدار ہے۔''[2]

۳۔ رسول اکرمؐ کی ایک معروف حدیث میں مذکور ہے:

"اَلْعِلْمُ عِلْمَانِ: عِلْمُ الْاَدْيَانِ وَ عِلْمُ الْاَبْدَانِ"

یعنی: ''علم دو قسموں پر مشتمل ہے: علوم دینی اور علوم طب (پہلا علم انسان کی روح کی سلامتی کا اور دوسرا اس کے بدن کی سلامتی کا باعث ہے)۔''[3]

۴۔ آنحضرتؐ ایک اور حدیث میں فرماتے ہیں:

"اَلْعِلْمُ ثَلَاثَةٌ: اَلْفِقْهُ لِلْاَدْيَانِ وَ الطِّبُّ لِلْاَبْدَانِ وَ النَّحْوُ لِلِّسَانِ"

یعنی: علم کی تین اقسام ہیں: ادیان کے بارے میں علم و آگاہی، ابدان کے لئے علم طب اور زبان کے خطا سے محفوظ ہونے کے لئے نحو (ادبیات) سے آگاہی۔[4]

اس حدیث شریف میں علوم الٰہی و بشری کے تین اہم شعبوں کو بیان کیا گیا ہے: علوم دینی، علم طب اور علم نحو و ادبیات جو حقیقت میں دوسرے علوم کی کلید (چابی) ہیں۔

۵۔ امیر المؤمنین -سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ:

"اَلْعُلُومُ اَرْبَعَةٌ: اَلْفِقْهُ لِلْاَدْيَانِ وَالطِّبُّ لِلْاَبْدَانِ وَالنَّحْوُ لِلِّسَانِ، وَالنُّجُومُ لِمَعْرِفَةِ

---

[1] بحار الانوار، ج ۷۵، ص ۳۴

[2] بحار الانوار، ج ۲، ص ۱۹۹، حدیث ۵۸

[3] بحار الانوار، ج ۱، ص ۲۲۰ حدیث ۵۲

[4] بحار الانوار، ج ۵، ص ۴۵، حدیث ۵

الاَزْمانِ"

علم کی چار قسمیں ہیں: فقہ؛ دین کے لئے، طب؛ بدن کے لئے، نحو واد بیات: زبان کے لئے اور ستارہ شناسی اوقات کی تشخیص کے لئے۔[1]

۶۔امام جعفر صادقؑ ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

"وَ كَذٰلِكَ اَعْطٰی(اَلاِنْسانَ) عِلْمَ مافیهِ صَلاح دُنْیاهُ كَالزِّراعَةِ وَالغِراسِ وَاسْتِخْراجِ الاَرَضِیْنَ، وَاقْتِناءِ الاَغْنامِ وَالاَنْعامِ وَاسْتِنْباطِ المِیاهِ، وَمَعْرِفَةِ الْعَقاقِیر الَّتی یُسْتَشْفٰی بِها مِنْ ضُرُوبِ الاَسْقامِ، وَالْمَعادِنِ الَّتی یُسْتَخْرَجُ مِنْها اَنْواعُ الْجَواهِرِ، وَ رُكُوبِ السُّفُنِ وَالْغَوْصِ فِی الْبَحْرِ... وَالتَّصَرُّفِ فِی الصِّناعاتِ وَ وُجُوهِ الْمَتاجِرِ وَالْمَكاسِبِ"

امام جعفر صادقؑ نے اس روایت کے مطابق مفید علوم کو شمار کرنے کے ضمن میں جو خدا تعالیٰ نے اپنے لطف وکرم سے انسان کو عطا کئے ہیں ارشاد فرمایا ہے: اسی طرح خدا تعالیٰ نے انسان کو وہ علوم عطا کئے ہیں کہ اس کی دنیا کی اصلاح ان میں ہے۔جیسے زراعت، باغبانی، مردہ زمین کو زراعت کے لئے تیار کرنا، مویشی پالنا، زمین سے پانی نکالنا، ان جڑی بوٹیوں کی شناخت جو کئی قسم کی بیماریوں کی دوا ہیں، ان معادن کی شناخت کہ جن سے جواہر نکالے جاتے ہیں، کشتیوں پر سواری، دریاؤں میں غوطہ خوری اور انواع واقسام کی مصنوعات تشکیل دینا اور مختلف قسم کی تجارت اور کاروبار وغیرہ کو انجام دینا۔[2]

اس ترتیب سے امامؑ نے ان تمام علوم کو خدا تعالیٰ کی بخشش اور اس کا عطیہ شمار کیا ہے اور انسانوں کو اس کی تعلیم کی تشویق وترغیب دلائی ہے۔

۷۔رسول اکرمؐ ایک حدیث میں باپ پر اولاد کے حقوق بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وَیُعَلِّمَهُ كِتابَ اللهِ وَ یُطَهِّرَهُ وَ یعَلِّمَهُ السِّباحَةِ"

باپ پر فرزند کے حقوق میں سے ایک حق یہ ہے کہ اسے کتاب خدا کی تعلیم دے، گناہوں سے پاک کرے اور فن تیراکی سکھائے۔[3]

---

[1] بحار الانوار، ج۱،ص۲۱۸۔

[2] بحار الانوار، ج۳،ص۸۳۔

[3] وسائل، ج۱۵،ص۱۹۹، باب۸۸، حدیث۷،

اس حدیث سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ فن تیرا کی بھی اسلام کے قانون ساز کی نگاہ میں اوجھل نہیں رہا اور اس کی تعلیم کی اپنے فرزندوں کو تاکید کی ہے۔

۸۔ایک اور حدیث میں حضرت موسیٰ بن جعفر -فرماتے ہیں:

"وَبَعْدَ عِلْمِ الْقُرآنِ ما يَكُونُ اَشْرَفَ مِنْ عِلْمِ النُّجُومِ وِ هُوَ عِلْمُ الاَنْبياءِ وَالاَوْصِياءِ وَ وَرَثَةِ الاَنْبياءِ الَّذينَ قالَ اللهُ عَزَّوَجَلَّ:" وَ عَلاماتٍ وَ بِالْنَجم هُمْ يَهْتَدونَ"

''یعنی: علم قرآن کے بعد کوئی علم، علم نجوم اور ستارہ شناسی سے بہتر نہیں اور یہ انبیاء، اوصیاء اور ان کے وارثوں کا علم ہے؛ وہی لوگ جن کے حق میں خدا تعالیٰ نے فرمایا: خدا تعالیٰ نے علامات مقرر کی ہیں اور ستاروں کی مدد سے ان کی راہنمائی کی جاتی ہے۔[1]

مجموعی طور پر مذکورہ بالا آیات و روایات اور دوسری روایات جن کو ذکر کرنے سے بات طولانی ہوجائے گی، سے بخوبی استفادہ کیا جاسکتا ہے کہ کیسے اسلام نے ایک طاقتور علمی تحریک کی بنیاد رکھی؟ یہی وجہ ہے کہ دو تین صدیوں کے گذرنے کے ساتھ ہی اس آبرومند پودے نے نشوونما پائی اور اس کی شاخ و برگ نے پورے عالم اسلام کو اپنے سائے میں لے لیا اور وہ اتنا پھلا پھولا کہ تھوڑی ہی مدت میں مختلف شعبوں میں کثیر تعداد میں معارف الٰہی، فلسفہ، طب، صحت و تندرستی، جغرافیہ، فزکس، کمسٹری اور دیگر علوم فنون پر کتابیں لکھی اور شائع کی گئیں جن میں سے ایک حصہ ترجمے اور دوسرا حصہ اسلامی دانشمندوں کی جدید تحقیقات پر مشتمل تھا۔

وہ دانشمند جنھوں نے اسلامی تاریخ تمدن کو موضوع بحث بنایا یا اس کے بارے میں کوئی کتاب لکھی، جسے مغرب کے علماء انھوں نے تاریخ تمدن اسلامی کی اہم فصل کو مسلمانوں کی علمی تحریک کے ساتھ مختص کیا اور مسلمانوں کے زیر نظر آب و تاب اور وسعت پانے والے مختلف علوم کو ان کے دانشمندوں کے نام کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ یہ نکتہ نہایت دلچسپ ہے کہ مغربی مؤرخین نے واضح طور پر اعتراف کیا ہے کہ یورپ کی نشاۃ علمی کا سرچشمہ مسلمانوں کی نشاۃ علمی ہے اور اہل یورپ اپنی علمی سوغات میں اسلامی دانشوروں کے مرہون منت ہیں! کتاب ''تاریخ تمدن مغرب اور مشرق میں اس کی بنیادیں'' جو چند ایک مغربی دانشوروں کی تالیف ہے، میں ذکر کیا گیا ہے کہ ''جب ہم بیزانس[2] اور مسلمانوں کی مگربی تمدن کے سلسلے میں خدمات کو دیکھیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ مشرق کی طرف سے ایک بڑی روشنی مغرب کی تابانی کا باعث بنی ہے!''

ڈاکٹر ماکس میرہوف ''میراث اسلام'' نامی کتاب میں لکھتا ہے: ''علوم عرب یعنی مسلمانوں کے علوم ایک ماہ تابان کی طرح تھے

---

[1] بحار الانوار، ج ۷۴، ص ۱۴۶ اور سورہ نحل۔ ۱۱۶۔

[2] بیزانس، مشرقی روم کا بادشاہ تھا جس کا پایہ تخت بیزانس کہلاتا تھا (اور اب ترکی کے بعض حصے پر مشتمل ہے اور بیزانس موجود استنبول میں رہا ہے)

جنھوں نے قرون وسطیٰ کے یورپ کی تاریک راتوں کو منور کیا اور جب علوم جدیدہ ظاہر ہوئے، چاند بے رنگ ہو گیا لیکن اسی چاند نے تاریک راتوں میں ہماری راہنمائی کی اور ہمیں اس مقام پر لا کھڑا کیا اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ ابھی بھی اس کی تابانی و تابش ہمارے ساتھ ہے!''[1]

اسی کتاب کی ایک اور عبارت میں آیا ہے: ''.....مختصر یہ کہ (علمائے اسلام کی کتابوں کے ترجمے) سے مشرقی علوم باران رحمت کی طرح یورپ کی خشک زمین پر برسے اور اسے زرخیز و پرثمر بنا دیا اس طرح آہستہ آہستہ اہل یورپ مشرقی علوم سے آشنا ہوئے!'' وہ اپنی یاداشتوں (ڈائری) میں علوم طبیعی اور طب کے عنوان کے تحت لکھتا ہے: ''جو کچھ ان آخری سالوں میں دریافت ہوا ہے اس نے جہان اسلام کے قدیم علوم کی تاریخ پر ایک جدید نور افشانی کی ہے بطور مسلم یہ دریافتیں ابھی کافی نہیں اور دنیا مستقبل قریب میں علوم اسلامی کی اہمیت کا مزید سراغ لگائے گی۔''[2]

ایک اور بیان میں لندن یونیورسٹی کے عربی کے استاد پروفیسر گیب کے مقالے جو ''اسلامی ادبیات کے یورپ پر اثرات'' کے عنوان سے لکھا گیا ہے' اسے اس طرح نقل کرتے ہیں: ''جب ہم گزشتہ (ایام) پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مشرقی ادبیات، مغرب کے تمدن کا خمیر اور سرچشمہ ہیں، اور وہ اس طرح کہ مشرقی نظریات اور افکار نے مغرب کے قرون وسطیٰ کے لوگوں کی تاریک روح کو اپنی نورانیت سے منور کر دیا اور ان کی ایک وسیع تر جہان کی طرف رہنمائی کی!''[3]

جرجی زیدان مشہور عیسائی مؤرخ ''تاریخ تمدن اسلامی'' نامی کتاب میں' ان علوم پر اسلام کے اثرات جو بیرونی دنیا سے حلقۂ اسلامی میں داخل ہوئے' کی بحث میں یوں لکھتا ہے: ''جب تمدن اسلامی اوج کمال پر پہنچا اور اجنبی علوم اسلامی دنیا میں عام ہونے لگے تو مسلمان انھیں حاصل کرنے میں مشغول ہو گئے، اسلامی علماء میں سے کچھ لوگوں نے اپنے نبوغ اور بے پناہ ذہانت کے بل بوتے پر ان علوم کے اصلی صاحبان کو پیچھے چھوڑ دیا اور ان میں نئے افکار و آراء اور دریافتوں کا اضافہ کیا، اس طرح سے علوم کو تنوع اور کمال نصیب ہوا اور انھوں نے اسے اسلامی تمدن اور آداب اسلامی کا حصہ بنا دیا اور جب اہل یورپ علوم یونان کو دوبارہ یورپ میں واپس لے لئے متحرک اور کمر بستہ ہوئے تو انھوں نے بیشتر علوم کو اسلامی رنگ میں عربی زبان سے حاصل کیا!''[4]

ایک اور عبارت میں لکھتا ہے: ''تمدن اسلامی سے متعلق تعلیم کے کردار کے بارے میں جو کچھ ہم نے کہا ہے اس سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ حکمت اور علم مختلف رکوں اور پہلوؤں سے (مسلمانوں کے ہاں) خوب پھلے پھولے اور علماء، فقہاء، اطباء اور فلاسفہ نے اپنے نبوغ اور خداداد ذہانت کے خوب جوہر دکھائے۔''

مختصر یہ کہ دنیا کی عمومی تاریخ میں یا وہ کتابیں جو بطور خاص اسلامی تمدن کے بارے میں لکھی گئی ہیں، (ان کتابوں) میں

---

[1] میراث اسلام، ص ۱۳۴

[2] میراث اسلام، ص ۱۱۱

[3] تاریخ تمدن اسلامی، جرجی زیدان، ج ۳، ص ۱۹۶

[4] تاریخ تمدن اسلامی جرجی زندان، ج ۳ ص ۲۲۲

مسلمانوں کی نشاۃ علمی اور تاریخ علم وتمدن انسانی پر اس کے طویل المدت یا مختصر اثرات کے بارے میں شرق وغرب کے مؤرخین کے بہت سے اعترافات نظر آتے ہیں جن میں سب کا تذکرہ ایک علیحدہ کتاب کا متقاضی ہے اور مذکورہ بالا بیان ان اعترافات کا ایک بے حد کم اور ناچیز حصہ ہے۔

۴۔ اسلام میں استاد کا مقام

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ علم حاصل کرنا اسلامی نقطۂ نظر سے واجب عینی ہے اور بعض صورتوں میں واجب کفائی شمار ہوتا ہے، یعنی بعض علوم کو حاصل کرنا سب کے لئے ضروری ہے اور وہ علوم جو خاص افراد کے لئے ہیں اور سب لوگوں کا انھیں حاصل کرنا آسان نہیں، واجب کفائی ہیں۔علوم کی تعلیم دینا بھی ایسے ہی ہے، بعض علوم ایسے ہیں کہ جن سے آگاہ لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ سب کو ان کی تعلیم دیں جبکہ بعض علوم کی تعلیم وتدریس واجب کفائی ہے۔مجموعی طور پر ان تمام علوم کا حصول جن کے ساتھ معاشرے کی معنوی اور مادی وابستگی ہوتی ہے، کبھی سب پر اور کبھی بعض خاص افراد پر واجب ہوتے ہیں۔اسی وجہ سے کسی مسلمان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ جدید علمی پیشرفت سے علیحدگی اختیار کرے، بلکہ حکومت اسلامی کے ارکان کی مضبوطی اور تقویت کی خاطر تعلیم وتعلم کی زیادہ سے زیادہ کوشش کی جانی چاہیے اور یقینا اگر مسلمان اس سلسلے میں کسی کوتاہی کا ارتکاب کریں جو اسلامی ممالک کی پسماندگی کا سبب ثابت ہو تو وہ خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں جوابدہ ہیں!

قرآن مجید سب سے پہلا معلم خدا تعالیٰ اور پہلا شاگرد حضرت آدمؑ کو قرار دیتا ہے اور سب سے پہلا علم جو حضرت آدمؑ کو سکھایا گیا، اسے علم الاسماء شمار کرتا ہے (قوی احتمال ہے کہ اسماء سے مراد موجودات جہان اور راز تخلیق سے آگاہی ہے)۔فقط حضرت آدمؑ ہی نہیں تھے جنھیں خدا نے تعلیم دی، بلکہ حضرت یوسفؑ کو بھی تعبیر خواب کا علم مرحمت فرمایا: ''وَعَلَّمْتَنِي مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ '' (سورۂ یوسف/۱۰۱) اور حضرت سلیمانؑ کو پرندوں کی بولی (زبان) سکھائی۔''وَقَالَ يَاأَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنطِقَ الطَّيْرِ '' (سورۂ نمل/۱۶) اور حضرت داؤدؑ کو زرہ سازی کی تعلیم دی، ''وَعَلَّمْنَاهُ صَنْعَةَ لَبُوسٍ لَكُمْ '' (سورۂ انبیاء/۸۰) اور حضرت خضر -کو فراوان اور کثیر علم عطا کیا، ''وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَدُنَّا عِلْمًا '' (سورۂ کہف/۶۵) اور فرشتوں کو علم وآگاہی فراوان عطا کی، ''سُبْحَانَكَ لاَعِلْمَ لَنَا إِلاَّ مَا عَلَّمْتَنَا '' (سورۂ بقرہ/۳۲) اور اس نے انسانوں کو بھی تعلیم دی ''عَلَّمَهُ الْبَيَانَ '' اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خدا تعالیٰ نے رسول اکرمؐ کو وہ کچھ سکھایا جس کا جاننا معمولی انداز میں آپؐ کے لئے ممکن نہیں تھا، ''وَعَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ''(سورۂ نساء/۱۱۳) خدا کے عظیم فرشتے یعنی فرشتۂ وحی حضرت جبرائیل -آنحضرتؐ نے بہت سی تعلیمات حاصل کیں، ''عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَى '' (سورۂ نجم/۵)[1]

انبیائے کرام بھی عظیم ترین معلمین کے زمرے میں قرار پائے ہیں جنھوں نے دنیا ودین سے متعلق بکثرت علوم سے نوع انسان کو آشنا کیا، قرآن مجید رسول اکرمؐ کے بارے میں فرماتا ہے: آپؐ لوگوں کو علم وحکمت سکھاتے ہیں۔

---

[1] اکثر مفسرین نے ''شدید القوی '' سے جبرائیلؑ مراد لئے ہیں لیکن بعض کی رائے میں اس سے مراد خود خدا تعالیٰ ہے۔

''وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتابَ وَالْحِكْمَةَ'' (سورۂ جمعہ/ ۲) یہی لائحہ عمل ہر نبی نے اپنی امت کے بارے میں انجام دیا اور انھیں دنیا و دین کے علم سے مستفید فرمایا۔ علماء جو پیغمبروں کے وارث ہیں، انھوں نے پیغمبروں کے بعد تعلیم دینے کی ذمہ داری اپنے سر لی اور لوگوں کو علم و دانش سے روشناس کرایا، ایسے علماء کا مقام قرآن کی نظر میں اس قدر بلند و بالا ہے کہ ان کے بارے میں ارشاد الٰہی ہے:

''يَرْفَعِ اللّٰهُ الّذينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَ الَّذينَ اُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجاتٍ''

''خدا تعالیٰ ایمان لانے والوں اور وہ جنھیں علم عطا کیا گیا ہے، کو عظیم درجات بخشتا ہے۔'' [۱]

احادیث مبارکہ میں معلم کا مقام اس قدر اعلیٰ ہے کہ خدا اور اس کے فرشتے اور تمام موجودات حتیٰ کہ چیونٹیاں اپنے بلوں اور مچھلیاں دریاؤں اور سمندروں میں اس شخص پر درود بھیجتی ہیں جو لوگوں کو امور خیر کی تعلیم دیتا ہے، چنانچہ ایک حدیث میں رسول خداؐ فرماتے ہیں:

''اِنَّ اللّٰهَ و مَلائِكَتَهُ حَتَّى النَّمْلَةِ فِى جُحْرِها وَ حَتّى الْحُوتِ فِى الْبَحْرِ يُصَلُّونَ عَلى مُعَلِّمِ النّاسِ الْخَيْرَ''[۲]

کئی اور احادیث میں بھی یہی مضمون بیان ہوا ہے۔ رسول اکرمؐ ایک اور حدیث میں فرماتے ہیں:

''اَلا اُخْبِرُكُمْ بِاَجْوَدِ الاَجْوَدِ؟ اللّٰهُ الاَجْوَدُ الاَجْوَدُ! وَ اَنَا اَجْوَدُ وُلْدِ آدَمَ! وَ اَجْوَدُكُمْ مِنْ بَعْدى رَجُل عَلِمَ عِلْماً فَنَشَرَ عِلْمَهُ يُبْعَثُ يَوْمَ الْقِيامَةِ اُمَّةً وَحْدَهُ!'':

کیا میں تمہیں سب سے زیادہ عطا کرنے والے سے بھی زیادہ عطا کرنے والے کے بارے میں آگاہ نہ کروں؟ عطا کرنے والوں میں سب سے زیادہ عطا کرنے والا خدا ہے اور میں اولاد آدمؑ میں سے سب سے زیادہ عطا کرنے والا ہوں اور میرے بعد تم میں سے سب زیادہ عطا کرنے والا وہ ہے جو علم و حکمت کو حاصل کر کے اسے پھیلائے (نشر کرے) اور دوسروں کو بھی سکھائے ایسا شخص بروز قیامت ایک امت کے طور پر مبعوث کیا جائے گا۔[۳]

امت کے ساتھ تعبیر کرنا بخوبی ظاہر کرتا ہے کہ معلمین کی وجودی وسعت انسانی معاشرے میں ان کی تعلیمات کی وسعت کی مناسبت سے صورت پذیر ہوتی ہے اور وہ جس قدر شاگردوں کی تربیت کریں گے اسی نسبت سے ان کی معاشرتی اور معنوی شخصیت وسیع تر ہوتی جائے گی اور ایک مرحلے میں ایک امت کی صورت اختیار کر لے گی۔ علم و دانش اور تمدن کی نشر و اشاعت کی اہمیت اسلام میں اس حد

---

[۱] سورۂ مجادلہ/ ۱۱ح

[۲] کنز العمال، حدیث ۲۸۷۳۶۔

[۳] میزان الحکمۃ، ج ۶، ص ۴۷۴۔

تک ہے کہ ایک معروف حدیث کے مطابق مجلس علم کو جنت کے باغات میں سے ایک باغ قرار دیا گیا ہے۔[1]

دلچسپ بات یہ ہے کہ اسلام میں علم حاصل کرنے کے لیے بطور مقدمہ وتمہید جو بھی کام کیا جائے اُسے عبادت شمار کیا گیا ہے۔ رسول اکرمؐ ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

"مُجالَسَةُ الْعُلَماءِ عِبادَةٌ"

یعنی: "علماء کے ساتھ بیٹھنا عبادت ہے۔"[2]

ایک اور حدیث میں امام موسیٰ کاظم -فرماتے ہیں:

"اَلنَّظَرُ اِلی وَجْهِ الْعالِمِ حُبّاً لَهُ عِبادَةٌ"

محبت کے ساتھ عالم کے چہرے کو دیکھنا عبادت ہے۔[3]

اسی طرح ایک اور حدیث میں رسول اکرمؐ جناب ابوذرؓ سے مخاطب ہوکر فرماتے ہیں:

"اَلْجُلُوسُ ساعَةً عِنْدَ مُذاكَرَةِ الْعِلْمِ خَيْرٌ لَكَ مِنْ عِبادَةِ سَنَةٍ، صِيامٍ نَهارِها، وَقِيامِ لَيْلِها وَالنَّظَرُ اِلى وَجْهِ الْعالِمِ خَيْرٌ لَكَ مِنْ عِتْقِ اَلْفِ رَقَبَةٍ"

علمی مذاکرے میں ایک ساعت شرکت کرنا تمہارے لئے ایک سال کی عبادت سے بہتر ہے، (ایسا سال) جس کے تمام دنوں میں تم روزہ رکھو اور راتیں عبادت میں گزار دو اور عالم کے چہرے پر نگاہ کرنا تمہارے لئے ایک ہزار غلاموں کو آزاد کرنے سے بہتر ہے![4]

اس سلسلے میں بکثرت روایات ہیں اگر ان سب کا تذکرہ کیا جائے تو بات بہت طویل ہوجائے گی لہٰذا اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم اس بحث کو جناب لقمان حکیم سے روایت شدہ ایک حدیث کے ساتھ ختم کرتے ہیں۔ لقمان حکیم اتنی باعظمت شخصیت کے مالک ہیں کہ

---

[1] س حدیث کو اگرچہ ہم نے اسلامی مآخذ ومنابع میں نہیں پایا، لیکن بعض حدیثوں میں بیان ہوا ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا: "بادِرُوا اِلی رِیاضِ الْجَنَّةِ قالُوا یارَسُولَ اللهِ وَما رِیاضُ الْجَنَّةِ؟ قالَ حِلَقُ الذِّکْرِ" یعنی جنت کے باغات کی طرف تیزی سے حرکت کرو، عرض کیا گیا: اے رسول خدا! جنت کے باغات کیا ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ذکر کی مجالس وحلقے۔ مرحوم فیض وافی کی جلد اول میں اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں: حلقۂ ذکر سے یہاں مراد مجلس علم ہے جیسا کہ اس باب کی دوسری احادیث سے استفادہ ہوتا ہے۔ (وافی، ج۱، ص۱۷۷) یہ حدیث صحیح ترمذی میں بھی تھوڑے سے فرق کے ساتھ بیان ہوئی ہے: "اِذا مَرَرْتُمْ بِرِیاضِ الْجَنَّةِ فَارْتَعُوا قالَ وَما رِیاضُ الْجَنَّةِ؟ قالَ حِلَقُ الذِّکْرِ" (صحیح ترمذی، ج۵، ص۵۳۲، باب ۸۳، حدیث ۳۵۱۰)۔

[2] بحارالانوار، ج۱، ص۲۰۴۔

[3] بحارالانوار، ج۱، ص۲۰۵۔

[4] بحارالانوار، ج۱، ص۲۰۳۔

ان کی باتوں کو قرآن مجید میں خدا تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے۔ آپ نے اپنے فرزند سے فرمایا:

"یابُنَیَّ جالِسِ الْعُلَماءَ... فَاِنَّ اللهَ عَزَّوَجَلَّ یُحْیِی الْقُلُوبَ بِنُورِ الْحِکْمَةِ کَما یُحْیِی الاَرْضَ بِوابِلِ السَّماءِ"

یعنی: میرے بیٹے! علماء کے ہم نشین بنو...... کیونکہ خدا تعالیٰ دلوں کو علم کے نور سے روشن کرتا ہے، جس طرح بارش کے موٹے موٹے قطرے زمین کو زندہ کرتے ہیں۔ [1]

بیان شدہ امور سے بخوبی روشن ہو جاتا ہے کہ مسئلہ تعلیم و تربیت اور دانش و تمدن کی اشاعت کو اسلامی دستور العمل میں بالعموم اور حکومت اسلامی کے پروگرام میں بالخصوص نہایت اہمیت حاصل ہے اور تعلیم و تربیت کو غیر معمولی اہمیت دینا حکومت اسلامی کی ذمہ داری ہے۔

۵۔ بالواسطہ اور بلاواسطہ تعلیمات

گزشتہ صفات میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ زیادہ تر بلاواسطہ تعلیم و تربیت سے متعلق تھا۔ مدارس وغیرہ میں تدریس کرنا لیکن اسلام میں بالواسطہ تعلیمات بھی کثرت کے ساتھ ہیں جن کا اثر کئی لحاظ سے بلاواسطہ تعلیمات کی نسبت وسیع اور عمیق تر ہے۔ اسلامی عبادات خاص طور پر وہ عبادات جو جماعت کی صورت میں انجام دی جاتی ہیں مثلاً نماز جماعت، نماز جمعہ اور حج وغیرہ ایسے امور میں سے ہیں جو لوگوں کی اجتماعی تعلیم پر بہت قوی اثر ڈالتی ہیں۔

نماز جماعت جو دن رات میں پانچ بار انجام دی جاتی ہے، مسلمانوں کو، اتحاد، مساوات اور برادری کا درس دیتی ہے اور معاشرے کے مختلف طبقات جو بعض اوقات معاشرے میں مختلف ذمہ داریوں کے نتیجے میں ایک دوسرے سے مکمل طور پر کٹے ہوتے ہیں اور پورے سال میں ایک بار بھی ایک دوسرے سے مل نہیں پاتے نماز جماعت انھیں یکجا اور ایک ساتھ جمع کرتے ہوئے معاشرتی مسائل میں ہم فکری اور ہم دلی سے انھیں آشنا کرتی ہے۔

نماز جماعت کی صفیں جن پر روحانیت چھائی ہوتی ہے، اسلامی معاشرے کے اجتماعی مسائل سے آگاہی اور ان کے حل کا ایک ذریعہ بھی ہے۔ مسلمان آغازِ اسلام میں نماز جماعت کے ذریعے اپنے بے شمار دشمنوں کے مقابلے۔۔۔ صفوں وحدت کے علاوہ ایک دوسرے سے آگاہی حاصل کرتے تھے اور اس طرح حکومت اسلامی کے منصوبوں کو سرعت کے ساتھ عملی جامہ پہنانے میں اپنا کردار ادا کرتے تھے۔

نماز جماعت میں اسلامی احکام کے مطابق سورۂ حمد اور دوسری سورہ کی قرائت کے وقت فقط امام جماعت ان دو سورتوں کو پڑھتا ہے اور اس طرح اجتماعی نظم وضبط کو زندہ کیا جاتا ہے اور روحانیت آمیز (نظم وضبط) کے ذریعے ان دو سورتوں کے مفہوم کو امام جماعت لوگوں

[1] بحار الانوار، ج۱، ص ۲۰۴۔

کے دلوں میں پروان چڑھاتا ہے۔

یہ نکتہ اہمیت کا حامل ہے کہ مختلف مناسبتوں کے لحاظ سے قرآن کی مختلف سورتوں اور آیتوں کو سورۂ حمد کے بعد تلاوت کے لئے منتخب کیا جاتا ہے ان میں سے ہر ایک سورت معارف اسلامی، اخلاق اور سیاسی و معاشرتی تعلیمات پر مشتمل ہوتی ہے۔ جس وقت یہ آیات اور سورتیں ایک دلنشین انداز میں امام جماعت کے ذریعے پڑھی جاتی ہیں، جبکہ باقی سب افراد کھڑے ہوئے اور ایک گہرے سکوت میں ڈوبے ہوتے ہیں، تو ان پر ان سورتوں اور آیتوں کا ایک قوی اور بے نظیر اثر پڑتا ہے اور سب کو مضمون آیات میں غور و فکر کا موقع ملتا ہے اور عبادت کی روحانیت اس اثر گذاری کو کئی گنا بڑھا دیتی ہے اور اگر یہ عبادات اسلامی آداب، حضور قلب اور پوری توجہ کے ساتھ انجام دی جائیں جو، ان کی قبولیت کی اصلی شرط ہے، تو یہ نماز جماعت اسلامی معاشرے کے لئے ایک پر ثمر اور با اثر مکتب کی صورت اختیار کر سکتی ہے اور اس سے قطع نظر یہ دشمنوں اور اغیار کے لئے ایک تعلیمی درس ثابت ہو سکتی ہے اور اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب وہ مسلمانوں کو صف بستہ اور منظم نماز جماعت کی صورت میں دیکھتے ہیں تو غور و فکر کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے ایک حدیث میں امام رضا -فرماتے ہیں:

"اِنَّما جُعِلَت الْجَماعَةُ لِئَلّا يَكُونَ الْاِخْلاصُ وَالتَوحيدُ وَالاِسْلامُ وَالْعِبادَةُ لِلّٰهِ اِلاّ ظاهِراً مَكْشوفاً مَشْهُوراً، لِاَنَّ فی اِظْهارِهِ حُجَّةً عَلى اَهْلِ الشَّرْقِ وَالْغَرْبِ... مَعَ ما فيهِ مِنَ الْمُساعَدَةِ عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوى، وَالزَّجْرِ عَنْ كَثيرٍ مِنْ مَعاصِی اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ"

"نماز جماعت کو قائم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ایمان، توحید، اسلام اور خدا کی عبادت ظاہر اور آشکار طور پر انجام پائے کیونکہ عبادت کے اظہار سے دنیا کے مشرق و مغرب پر حجت تمام ہو جاتی ہے (اور اس سے اسلام اور تعلیمات اسلام کے بارے میں زیادہ سے زیادہ غور و فکر کی ترغیب ملتی ہے)...... اس کے علاوہ یہ نیکی اور تقویٰ کی بنیاد پر امداد (اور ایک دوسرے کے حال سے آگاہی اور آپس میں سب کا ایک دوسرے کے ساتھ تعاون) اور اسی طرح بہت سارے گناہوں اور معصیت الٰہی کی روک تھام کا سبب بنتا ہے (کیونکہ جب لوگ شب و روز میں چند بار اس روحانی فضا میں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں تو دوسروں کے حقوق پر تجاوز اور گناہوں کے ارتکاب سے شرم اور دائمی طور پر حاضر ہونے کی وجہ سے) اجتناب کرتے ہیں۔"[1]

مختصر یہ کہ مسلمانوں کی بیداری اور تعلیم و تربیت پر نماز جماعت کا اثر انداز ہونا کسی پر پوشیدہ نہیں، اسی طرح دشمنوں کی سازشوں کی بیخ کنی اور ان کی طاقت کو ختم کرنے میں بھی اس کی اثرات کسی سے ڈھکے چھپے نہیں۔

یہی وجہ ہے یہ عبادت نہایت اہم ہے اور اس کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے اور احادیث میں اس کی اس قدر فضیلت اور ثواب بیان ہوا ہے کہ جس انسان حیران ہو جاتا ہے۔ رسول اکرمؐ ایک حدیث میں بیان فرماتے ہیں:

"مَنْ مَشى اِلى مَسْجِدٍ يَطْلُبُ فيهِ الْجَماعَةَ كانَ لَهُ بِكُلِّ خُطْوَةٍ سَبْعُونَ اَلْفَ حَسَنَةٍ، وَ

[1] وسائل الشیعۃ، ج ۵، ص ۳۷۲۔

يُرْفَعُ لَهُ مِنَ الدَّرَجاتِ مِثْلُ ذٰلِكَ، فَاِنْ ماتَ وَهُوَ عَلٰى ذٰلِكَ، وَكَّلَ اللهُ بِهِ سَبْعِينَ اَلْفَ مَلَكٍ يَعُودُونَهُ فى قَبْرِهِ وَ يُبَشِّرُونَهُ وَ يُؤْنِسُونَهُ فى وَحْدَتِهِ وَ يَسْتَغْفِرونَ لَهُ حَتّى يُبْعَثُ۔"

''وہ شخص جونماز جماعت میں شرکت کی غرض سے جاتا ہے تو اسے اس کے ہر قدم کے بدلے میں ستر ہزار نیکیاں ملیں گی اور اسی مناسبت سے اس کے درجات بھی بلند ہوں گے اور اگر اسی حالت میں دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے تو خدا تعالیٰ ستر ہزار فرشتوں کو مامور کرتا ہے کہ وہ قبر میں اس سے ملاقات کریں اور اسے بشارت دیں اور تنہائی میں اس کے مونس ہوں اور قیامت تک اس کے لئے استغفار کرتے رہیں!''[۱]

٦۔نماز جمعہ اور اس کے تربیتی اثرات

نماز جمعہ ایک اور اہم عبادت اور سیاسی وعبادی اجتماع ہے۔ جو تعلیم و تربیت کے لحاظ سے اسلامی معاشرے پر بالواسطہ اور بلا واسطہ گہرے اثرات چھوڑتی ہے۔ یہ باعظمت اور پرشکوہ نماز ہر ہفتے میں ایک بار قائم کی جاتی ہے اور ایک شہر کے تمام مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایک ہی نماز جمعہ میں شرکت کریں۔[۲]

نماز جمعہ میں نماز سے قبل دو خطبے بیان کئے جاتے ہیں جو وعظ و نصیحت، تقویٰ و پرہیز گاری کی تاکید اور خاص طور پر معاشرے کے اہم سیاسی اور معاشرتی مسائل پر مشتمل ہوتے ہیں جو روحانی لطافت، گناہوں کی آلودگی سے طہارت اور پاکیزگی کے ساتھ ساتھ لوگوں کی معارف اسلامی سے آگاہی، اجتماعی وسیاسی واقعات سے آگاہ ہونے اور ان کے سلسلے میں درست رویہ اپنانے کا باعث بنتے ہیں یہی نہیں بلکہ یہ خطبات روح دینی اور معنوی نشاط کے سائے میں مشکلات کے حل کے لئے عمومی تعاون کی فضا بھی فراہم کرتے ہیں۔

دو خطبے بیان کرنا نماز جمعہ کے واجبات میں سے ہے، خطبے کے آداب کے بارے میں احادیث اور فقہ کی کتابوں میں آیا ہے کہ خطیب اس قدر بلند آواز سے خطاب کرے کہ تمام لوگوں کو اس کی آواز اچھی طرح سنائی دے اور تمام لوگوں کو خطبے کے دوران خاموش رہنا چاہیے اور وہ خطیب کی طرف متوجہ ہو کر اس کی باتوں پر کان لگائے رہیں۔ خطیب کو فصیح و بلیغ ہونا چاہیے جو مسلمانوں کے احوال و مسائل سے آگاہ ہو اور اہل اسلام کے مفادات سے باخبر، شجاع اور حق بیانی میں صریح لہجے کا مالک ہو، اس کے علاوہ اسے ایسا ہونا چاہیے کہ اس کا حسن سلوک اور طرز عمل معاشرے پر اس کے کلام کے مؤثر ہونے کا سبب بنے اور اس کی طرز زندگی سے لوگوں کو یاد خدا آجائے۔

---

[۱] وسائل الشیعہ، ص ۳۷۲، حدیث ۷۔

[۲] مکتب اہل بیت کے پیروکاروں کا یہی عقیدہ ہے جبکہ اہل سنت کے نزدیک نماز جمعہ متعدد جگہ پر نماز جماعت کی طرح مختلف مساجد میں منعقد کی جاسکتی ہے (الفقہ علی المذاہب الاربعۃ، ج ۱، ص ۳۸۵)۔

ان خطبوں میں مسلمانوں کے اہم دینی اور دنیوی مسائل کو بیان کیا جانا چاہیے اور وہ سب کچھ بیان ہونا چاہیے جو بیرونی مما لک اور اندرونی ملک مسلمانوں کے ساتھ ہو رہا ہے، اسی طرح اہم سیاسی، اجتماعی اور اقتصادی مسائل ترجیحات کو پیش نظر رکھ کر پیش کئے جائیں اور ضروری آگاہی سے لوگوں کو مستفید اور انھیں دشمنوں کی سازشوں سے باخبر کیا جائے اور ان کے منصوبوں کو نقش بر آب کرنے کے لئے مختصر یا طویل مدت کے لائحہ عمل سے انھیں آگاہ کیا جائے۔

خطیب کے لئے ضروری ہے کہ وہ ذہین، بیدار اور اسلام کے مادی و معنوی مسائل میں صاحب فکر و مطالعہ ہو اور نماز جمعہ کے اس اجتماع سے مسلمانوں کی آگاہی اور مقاصد اسلامی کی پیشرفت کے لئے بہترین استفادہ کر سکے۔ ایک جامع اور پُر معنی حدیث میں امام رضا ـ نے فرمایا: ''نماز جمعہ کے خطبے اس لئے ہوتے ہیں کہ نماز جمعہ ایک عمومی لائحہ عمل ہے۔ خدا تعالیٰ امیر مسلمین کو یہ امکان فراہم کرتا ہے کہ وہ لوگوں کو وعظ و نصیحت کے ذریعے خدا کی اطاعت کی ترغیب دلائے اور خدا کی معصیت و نافرمانی سے انھیں بچنے کی تلقین و تاکید کرے۔''

آپؑ نے مزید فرمایا:

"وَ تَوْقِيفِهُمْ عَلَى ما أَرادَ مِنْ مَصْلَحَةِ دِينِهِمْ وَ دُنْياهُمْ وَ يُخْبِرُهُمْ بِما وَرَدَ عَلَيْهِمْ مِنَ الآفاقِ مِنَ الأَهْوالِ الَّتِي لَهُمْ فِيهَا المَضَرَّةُ وَ المَنْفَعَةُ"

''اور وہ (خطیب) انھیں اہم واقعات سے آگاہ کرے جو اس تک مختلف مقامات سے پہنچتے ہیں اور جو لوگوں کے نفع و نقصان اور عام زندگی گزارنے میں مؤثر واقع ہو سکتے ہیں۔'' اس کے بعد آپؑ نے فرمایا: ''یہ جو نماز جمعہ میں دو خطبے مقرر کئے گئے ہیں اس لئے ہیں کہ ایک خطبے میں خدا کی حمد و ثنا، تمجید و تقدیس الٰہی (اور اخلاقی و معنوی مسائل کا) بیان ہو اور دوسرے میں معاشرتی ضرورتوں، تنبیہات، دعا اور اسلامی معاشرے کی اصلاح سے متعلق اوامر و نواہی اور احکامات کا بیان ہو جن سے آشنائی عوام الناس کے لئے ضروری ہے۔''[1]

لوگوں کی سیاسی اور اجتماعی مسائل کے بارے میں آگاہی پیدا کرنے میں نماز جمعہ آج جو کردار ادا کر رہی ہے وہ کسی پر پوشیدہ نہیں، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ذرائع و ابلاغ کے ذریعے دشمن کے ہفتے بھر کے پروپیگنڈے نماز جمعہ کے ایک ہی خطبے کے ذریعے اپنا اثر کھو دیتے ہیں اور اگر مسلمان اس اہم اسلامی پروگرام کو صحیح انداز میں جان لیں اور اسے اسی طرح انجام دیں جیسے اسلام چاہتا ہے اور بعض ضعیف النفس اور غیروں کی آلۂ کار حکومتوں کی طرح اس عظیم عبادت کا چہرہ مسخ نہ کریں، تو وہ تمدن اور تعلیم و تربیت پر اس کے مثبت اثرات اور اس کی اس کی برکات سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

نماز عیدین (عید الفطر و عید الاضحیٰ) جو ساتھ مشابہت رکھتی ہے اپنے ان دو خطبوں کی وجہ سے جو نماز کے بعد بیان کئے جاتے ہیں، نماز جمعہ ہی کی طرح اثرات و برکات رکھتی ہیں۔

---

[1] وسائل الشیعہ، ج۵، ص۳۹، حدیث۶۔

۷۔حج کے عظیم اجتماع کے تمدنی اور ثقافتی اثرات

ایک اور اسلامی عبادت جو مسلمانوں کی تعلیم وتربیت، علم کی نشر واشاعت، اتحاد ووحدت اور شان وشوکت کے لحاظ سے بہت مؤثر ہے، وہ عبادت حج ہے جو ہر سال پوری دنیا کے کروڑوں مسلمانوں کو اپنی طرف دعوت دیتی ہے اور انھیں ایک عظیم اجتماع کی صورت میں جمع کر کے معنوی اور مادی تعلیمات سے بہرہ مند کرتی ہے۔ یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ فریضہ حج ہر صاحب استطاعت مسلمان پر پوری زندگی میں فقط ایک بار واجب اور کئی دفعہ بجالانا مستحب ہے۔

اس سلسلے میں عورت، مرد، بوڑھے، جوان، گورے، کالے، پڑھے لکھے اور ان پڑھ میں کوئی فرق نہیں، یہی وجہ ہے کہ ہر سال مسلمانوں کی علمی ثقافتی، سیاسی اور اقتصادی شخصیات حجاج کے ہمراہ خانہ خدا کی زیارت کے لئے آتی ہیں اور اس عرصے میں مکہ، مدینہ اور دیگر مقامات پر (ان شخصیات) کا آپس میں رابطہ قائم رہتا ہے اور اس طرح معلومات کا آپس میں قابل ملاحظہ تبادلہ ہوتا ہے۔ خاص طور پر ان آخری چند سالوں میں بہت سارے مسلمان اس عظیم معنوی اجتماع کی اہمیت سے آشنا ہو چکے ہیں اور اسی وجہ سے وہ حج کے پرشکوہ مناسک کی ادائیگی کے ضمن میں اجتماعات، سمینار اور کانفرنسیں منعقد کرتے ہیں تا کہ مختلف ممالک کے دانشور حضرات ان میں جمع ہوں اور اپنے ثقافتی تحائف اور سوغاتوں کا آپس میں تبادلہ کریں۔ قرآن مجید ایک مختصر جملے میں فلسفۂ حج اور اس کے مقاصد کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ"

''لوگ اس مقدس سرزمین کی طرف اس لئے آتے ہیں تا کہ اپنے منافع کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں!''[۱]

مفسرین نے اس مقام پر کلمہ "منافع" پر بہت گفتگو کی ہے، لیکن ایک بات واضح ہے کہ اس لفظ کے مفہوم میں کوئی محدودیت نہیں لہٰذا یہ لفظ تمام منافع اور معنوی برکات اور مادی سیاسی، ثقافتی اور معاشرتی فلسفوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

ربیع بن خیثم نے اس کلمہ کی تفسیر امام جعفر صادق ؑ سے پوچھی تو آپؑ نے فرمایا: ''اس سے مراد دنیا وآخرت دونوں کے منافع ہیں''۔[۲]

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق ؑ نے ہشام بن حکم کے جواب میں فلسفۂ حج کے بارے میں اس کے چند پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا ہے جن میں سے پہلی بات یہ ہے کہ اس کے طفیل تمام دنیا کے مسلمان ایک دوسرے سے آشنا ہوتے ہیں، پھر اس کے اقتصادی منافع اور حج کے باعث پیدا ہونے والے مشاغل اور آخر کار اس کے ثقافتی اثرات کی طرف آپؑ نے اشارہ کیا اور فرمایا:

"وَ لِتُعْرَفُ آثَارُ رَسُولِ اللهِ صلی الله علیه وآله وسلم وَ تُعْرَفُ اَخْبَارُهُ وَ يُذْكَرُ وَلا يُنْسى"

---

[۱] سورہ حج ۲۸/

[۲] تفسیر نور الثقلین، ج۳، ص۴۸۸۔

نیز اس کا مقصد یہ بھی ہے کہ رسول اکرمؐ کے آثار واخبار کی معرفت حاصل ہو (اور اسلامی علوم ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوں) اور انھیں بھلا نہ دیا جائے۔[1]

بہرحال اگر کوئی شخص حج کے مراسم ومناسک پر غور کرے، خاص طور پر نزدیک سے ان کا مشاہدہ کرے تو وہ اس کے تعلیمی اور ثقافتی پہلو کی اہمیت سے آگاہ ہوجائے گا جو بلاشبہ کم نظیر یا بے نظیر ہے۔ جی ہاں! حج ہر سال ایک عظیم ثقافتی کانفرنس یا کانفرنسوں میں تبدیل ہوسکتا ہے اور اسلامی دانشور مکہ میں اپنی موجودگی کے دوران جمع ہوکر حج کے خاص معنوی اثرات کے علاوہ اپنے نئے اور بدیع افکار کو دوسروں تک منتقل کرسکتے ہیں۔

اس گھٹن آلود فضا میں جب ستمگر اور ظالم خلفاء وسلاطین مسلمانوں کو معارف اسلامی کی نشر واشاعت کی اجازت نہیں دیتے تھے، وہ اس فرصت سے استفادہ کرتے جو فریضۂ حج انھیں فراہم کرتا تھا، اس طرح وہ اپنی بہت سی مشکلات حل کرلیتے اور ائمہ ھدیٰؑ اور بزرگ علماء سے رابطہ قائم کرکے معارف اور قوانین اسلام اور سنت رسول اکرمؐ پر پڑے ہوئے پردے کو اٹھا دیتے اور اپنے شہروں اور ملکوں کی طرف واپسی کے وقت، اہم معنوی اور اخلاقی پیغام اپنے ہمراہ لاتے تھے۔

۸۔معروف مساجد اور زیارتگاہوں کے اثرات

وہ مراکز جو اسلامی ثقافت کی نشر واشاعت میں اور عوام کو آگاہ کرنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک ہمارے دینی پیشواؤں کے مزارات بھی ہیں کہ لوگ ہمیشہ اسلامی ممالک گوشے گوشے سے معنوی سفر کی حیثیت سے ان پر حاضری دیتے ہیں اور اس طرح یہ تبادلہ اطلاعات اور انتقال معلومات اور اجنبی ثقافتوں کی یلغار کے خلاف جنگ کا بہترین وسیلہ ہیں۔ اسلام میں بعض ایسی معروف مساجد موجود ہیں جن کی زیارت کا حکم دیا گیا ہے باصطلاح ان کی طرف ''رخت سفر'' کا حکم ہے اور ان میں عبادت کے ذریعے اپنے دل وجان کو نور معنویت میں غرق کرکے دور ونزدیک کے علاقوں سے آئے ہوئے مسلمانوں کے ساتھ عملاً ثقافتی تعلق قائم کرکے اسے مضبوط کیا جاتا ہے۔ ایک حدیث میں امیر المؤمنین -فرماتے ہیں:

"لَایُشَدُّ الرِّحالُ اِلاّ اِلٰی ثَلاثَۃِ مَساجِدَ: اَلْمَسْجِدِالْحَرامِ وَمَسْجِدِ الرَّسُولِ وَمَسْجِدِ الْکُوفَۃِ"

صرف تین مساجد کے لئے کمر ہمت باندھو: مسجد الحرام، مسجد نبوی جو مدینہ میں ہے اور مسجد کوفہ۔[2]

یہ مطلب اہل سنت کی معروف کتب میں بھی بیان ہوا ہے۔ ایک حدیث میں رسول اکرمؐ فرماتے ہیں:

---

[1] وسائل الشیعہ، ج۸، ص۹، حدیث ۱۸۔

[2] وسائل الشیعہ، ج۳، ص ۵۵۲، احکام مساجد، باب ۴۴، حدیث ۱۶۔

"لاتُشَدُّ الرِّحالُ اِلّا ثَلاثَةِ مَساجِدَ:مَسْجِدی هذا وَ مَسْجِدِالْحَرامِ وَمَسْجِدِ الْاَقْصی"

سفر صرف تین مساجد کی طرف ہونا چاہیے: میری مسجد، مسجد الحرام اور مسجد الاقصیٰ ۔ [۱]

واضح ہے کہ یہ دو حدیثیں آپس میں منافات نہیں رکھتیں کیونکہ جب دونوں کو ایک ساتھ ملایا جائے تو چار مساجد مورد توجہ قرار پاتی ہیں، بدیہی ہے کہ ان احادیث سے مراد تین یا چار مساجد کی اہمیت کو بیان کرنا ہے اور اس کا مفہوم ہرگز یہ نہیں اگر انسان کسی دوسری مسجد میں شرکت کے لئے رخت سفر باندھے تو اس نے خلاف شرع عمل انجام دیا ہے جیسا کہ بعض بے شعور افراد گمان کرتے ہیں کیونکہ اگر ان احادیث کا مفہوم تحریم (حرام ہونا) ہو تو مطلق طور پر ہر سفر سوائے ان تین سفروں کے حرام ہونا چاہیے جبکہ جائز سفر بے شمار ہیں۔(توجہ رہے کہ "لاتُشَدُّ الرِّحالُ" مطلق ہے اور سارے سفر اس کی حدود میں آجاتے ہیں!) اسی سے ملتا جلتا مطلب بحار الانوار میں بھی آیا ہے۔ [۲]

اس قسم کی مساجد درحقیقت اہم علمی وثقافتی مراکز ہیں اور صدر اسلام میں سالہا سال درس وبحث کا مرکز رہی ہیں اور بزرگ علماء ان میں اپنے شاگردوں کی تعلیم وتربیت کا فریضہ انجام دیتے رہے ہیں۔ اب بھی مسجد الحرام اور مسجد نبویؐ میں پورے سال مجالس علمی منعقد کی جاتی ہیں اور دوسرے ممالک مثلاً سوریہ، عراق اور ایران کی اہم مساجد تعلیم وتربیت کا مرکز ہیں اور کبھی بہت ہی بڑی بڑی کلاسیں ان میں تشکیل دی جاتی ہیں اور شاید ان مساجد میں عبادت کے قصد سے دور ونزدیک کے مقامات سے آنے اور ان کی طرف رخت سفر باندھنے کی مسلمانوں کو ترغیب دینا شاہد اس وجہ سے ہو کہ مسجد سے معنوی استفادے کے علاوہ وہ لوگ ان مساجد کے ماضی میں کارناموں کی طرف بھی متوجہ ہوں اور ان کے علمی پہلوؤں سے بھی استفادہ کریں۔

یہی بات پیشوایان اسلامؑ کے مقدس حرموں میں بھی موجود ہے کیونکہ ان کے مزار کا صحن یا حرم غالباً علوم اسلامی کی تدریس کا مرکز رہا ہے اور اب بھی ہے اور ان مقامات (مزارات) سے زیارت کے علاوہ میں علمی استفادہ بھی کیا جاتا ہے۔ یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ بعض زیارتگاہیں جیسے امام علی الرضا – کے حرم کی ہر سال بارہ ملین سے زیادہ لوگ زیارت کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس مقام پر پورے سال عظیم اجتماعات منعقد ہوتے رہتے ہیں اسی طرح سمینار، کانفرنسیں اور مجالس علمی کا انعقاد بھی جاری رہتا ہے اور یہ تمام چیزیں مسلمانوں کی تعلیم وتربیت پر نہایت گہرے اثرات چھوڑتی ہیں۔

---

[۱] صحیح مسلم، ج۲، ص ۱۰۱۴، کتاب الحج، باب ۹۵، حدیث ۱۳۹۷۔

[۲] بحار، ج۹۶، ص ۲۴۰، باب ۴۴، حدیث ۲۔

حکومت اسلامی میں مطبوعات کا کردار

اشارہ

بلاشبہ آج کی دنیا میں تعلیم وتربیت کے اہم ذرائع میں سے ایک ذریعہ مطبوعات ہیں، جو صنعت اور ٹیکنالوجی کی ترقی کی وجہ سے پوری دنیا میں پھیل چکی ہیں اور افکار عامہ کی اصلاح یا خرابی اور اسے خوشنما یا بدنما بنانے کا ایک قوی اور مضبوط عامل ہیں اور عصر حاضر میں کہ ایک اخبار یا مجلہ بیک وقت دنیا کے کئی براعظموں میں چھپ کر پورے دنیا میں ضائع ہورہا ہے اور افکار عامہ کو کسی نہ کسی طرح متاثر کررہا ہے۔یقینی طور پر ماضی میں مطبوعات کا کردار اس قدر وسیع نہیں تھا۔ بہرحال کتاب ولائبریری کا ہمیشہ سے پوری تاریخ میں تعلیم وتربیت اور علوم کے ایک نسل سے دوسری نسل میں انتقال اور ثقافتوں کے تکامل میں ایک غیر معمولی کردار رہا ہے۔اس اشارے کے ساتھ ہی ہم قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے ہیں اور جو اہمیت قرآن نے کتاب وکتابت کو دی ہے اس کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں، یقینی طور پر کتاب وکتابت آغاز اسلام ہی میں مسلمانوں کی علمی تحریک اور کوشش کا سبب بنی ہے۔اس ضمن میں قرآن مجید میں بکثرت آیات آئی ہیں:

۱۔نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ① (سورۂ قلم/۱)

۲۔اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ③ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ④ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ⑤

(سورۂ علق/۳تا۵)

۳۔وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۪ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ'(سورۂ بقرہ/۲۸۲)

۴۔وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ؕ''(سورۂ بقرہ/۲۸۲)

۵۔وَمَآ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ كُتُبٍ يَّدْرُسُوْنَهَا (سورۂ سبأ/۴۴)

۶۔اِيْتُوْنِیْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ④

(سورۂ احقاف/۴)

۷۔رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ② فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ③ (سورۂ بیّنہ/۲و۳)

ترجمہ:

۱۔قسم ہے قلم کی اور اس کی جو وہ لکھتے ہیں۔

۲۔ پڑھ کہ تمہارا رب سب سے زیادہ کرامت و بزرگی والا ہے، وہی جس نے قلم کے ذریعے تعلم دی انسان کو، اس چیز کی جسے وہ نہیں جانتا تھا۔

۳۔ ضروری ہے کہ کوئی لکھنے والا عدالت کے مطابق اس (سند کو) تمہارے درمیان تحریر کرے، اور وہ جو کتابت سے آشنا ہے لکھنے سے پرہیز نہ کرے، ایسے ہی جس طرح خدا نے اسے تعلیم عطا کی ہے، پس وہ ضرور لکھے۔

۴۔ شاہد اور کاتب کو ہرگز (حق گوئی کی وجہ سے) کوئی نقصان نہ پہنچے۔

۵۔ ہم نے (اس سے پہلے) آسمانی کتاب نام کی کوئی چیز انھیں نہیں دی کہ وہ اسے پڑھیں (اور اس پر اعتماد کر کے تمہاری باتوں کو جھٹلائیں)

۶۔ کسی کتاب آسمانی (اس کتاب سے پہلے) یا گذشتگان کے کسی علمی اثر (کتاب وغیرہ) کو میرے پاس لاؤ (جو تمہارے صدق گفتار کی دلیل بن سکے) اگر تم اپنے وعدے میں سچے ہو۔

۷۔ خدا کی طرف سے ایک رسول (ان کے پاس آئے) جو پاکیزہ صحیفوں کو انھیں پڑھ کر سنائے اور جن میں صحیح اور قدر و قیمت کی حامل کتب (تحریریں) ہوں۔

تشریح

آیات قرآنی میں اہم مسائل کی تاکید کے لئے بعض اوقات قسم پر اعتماد کیا جاتا ہے کبھی یہ قسم خدا کی ذات پاک کی اور اکثر مقامات پر کائنات کی اہم مخلوقات کھائی جاتی ہے: مثلاً سورج، چاند اور زمین وغیرہ کی۔ ہمارے موضوع کی پہلی آیت، سورۂ قلم کی اولین آیت ہے جس میں قلم کی قسم اور وہ تمام مسائل کی قسم اُٹھائی گئی ہے جو قلم سے لکھے جاتے ہیں، اس کے بعد قرآن فرماتا ہے: ''نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ...'' درحقیقت یہاں جس چیز کی قسم کھائی گئی ہے ظاہری طور پر ایک چھوٹی سی چیز ہے۔ سرکنڈے کا چھوٹا سا ٹکڑا یا اس کے مشابہ کوئی چیز، اور تھوڑا سا رنگین محلول بعد ازاں وہ سطور جو نا چیز صفحات پر لکھی جاتی ہیں، لیکن حقیقت میں تمام انسانی ثقافتوں، علوم و دانش، بیداری، فکر و اندیشہ اور تشکیل مذاہب کا سرچشمہ اور تعلیم و تربیت اور ہدایت و آگاہی بشر کا منبع یہی معمولی سی چیز میں ہی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اہل دانش انسانی حیات کو دو زمانوں میں تقسیم کرتے ہیں: ''زمانۂ تاریخی'' اور ''زمانۂ قبل از تاریخ'' اور کہتے ہیں کہ انسان کا تاریخی زمانہ اس وقت سے شروع ہوا جب لکھنے کا عمل ایجاد ہوا اور انسان قلم ہاتھ میں لے کر اپنی زندگی کے واقعات کو صفحات پر لکھنے کے قابل ہوا اور اس سے پہلے زمانے کو زمانۂ قبل از تاریخ کہتے ہیں۔ یہ بات یاد رہنی چاہیے کہ یہ آیت ایک ایسے ماحول میں نازل ہوئی جو دنیا کا پسماندہ ترین ماحول تھا اور اس میں کوئی لکھنے اور قلم کی اہمیت سے واقف نہیں تھا، چند افراد جن کا تعلق مکہ سے تھا، معمولی پڑھے

لکھنے اور پڑھنے اور لکھنے سے کسی قدر آشنا تھے، وہ مکہ جو حجاز کا سب سے بڑا عبادتی، سیاسی اور اقتصادی مرکز تھا (بعض اہل دانش کے بقول) ان پڑھے لکھے افراد کی تعداد بیس تک بھی نہیں پہنچتی تھی، ایسے ماحول میں قلم کی قسم کھانا، کس قدر عظمت اور شان وشوکت رکھتا ہے؟!

قرآن کے قسم کھانے کی حکمت اور اس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو ان امور کی رغبت دلائی جائی جن کی قسم کھائی جا رہی ہے، اور اس آیت میں بھی یہی ہے کہ یہ افکار پڑھنے لکھنے، کتابیں لکھنے دوسروں کی کتابوں کے ترجمے اور عالم اسلام میں علوم کی نشر واشاعت کا سبب ثابت ہوئے۔ ہمارے زیر بحث دوسری آیت، قول مشہور کے مطابق وہ پہلی آیت ہے، جو جبل النور کی بلندی پر غار حرا میں رسول اکرمؐ کے قلب اطہر پر نازل ہوئی اور یہ وحی کی سب سے پہلی چنگاری تھی، قدرتی طور پر یہ آیہ شریفہ اہم مسائل کی طرف اشارہ کرتی ہے، جب آیات قرآن کی تلاوت کا حکم رسول کو دیتی ہے تو یوں ارشاد ہوتا ہے:

''پڑھ کے تیرا پروردگار سب سے زیادہ بزرگوار ہے، وہ (وہی ہے) جس نے قلم کے ذریعے تعلیم دی اور انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا''

"اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ"

اس ترتیب کے مطابق خداوند اپنی ربوبیت وکرامت کو بیان کرنے کے بعد قلم کے ذریعے تعلیم کو بیان کرتا ہے جو "مَا لَمْ يَعْلَمْ" کا سرچشمہ ہے۔ اس طرح وحی کا آغاز قلم سے پیدا ہونے والی حرکت سے ہوتا ہے۔ اور یہ بات نہایت بامعنیٰ ہونے کے ساتھ ساتھ ہر مسلمان کے لئے سبق آموز ہے۔ انہی تعبیرات وبیانات کی وجہ سے مسلمانوں کی مسلسل اور عمیق توجہ کتاب وکتابخانے اور تعلیم علوم کی طرف مبذول ہوئی اور اگر احادیث میں یہ آیا ہے کہ ''مداد علماء'' (علماء کے قلم کی سیاہی) ''دماء شہیداء'' (شہیدوں کے خون) پر فوقیت رکھتی ہے تو یہ اسی وجہ سے ہے کہ خون شہید کی بنیاد وہ عقائد ومعارف ہیں جو زیادہ تر قلم سے ظاہر ہوئے ہیں، علاوہ ازیں خون شہداء کی بقا بھی علماء کے قلم کی سیاہی (روشنائی) ہی کی وجہ سے ہے۔

اصولی طور پر انسان اور افکار کی منتقلی کے درمیان تفاہم وہم آہنگی کے صرف دو طریقے ہیں: بیان وقلم؛ اس فرق کے ساتھ کہ بیان ایک زمانے میں اور ایک جگہ حاضر افراد کے درمیان وتعلق پر مشتمل ہوتا ہے، لیکن قلم کے ذریعے ہر زمانے میں، ہر انسان کے دوسرے انسان اور حال، ماضی اور آئندہ کی نسلوں کے آپس کے تعلقات برقرار ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ایک دانشور کا قول ہے:

"بَيانُ اللِّسانِ تُدْرِسُهُ الاَعْوامُ وَ ما تُثْبِتُهُ الاَقْلامُ باقٍ عَلَى مَرِّ الاَيّامِ"

''زبان کے ذریعے بیان سالوں کے گذرنے کے ساتھ ہی پرانا اور فراموش ہو جاتا ہے لیکن جو کچھ قلم ثبت کرتا ہے، ہمیشہ باقی رہتا ہے۔''

اسی بناء پر اہل علم ودانش کے درمیان یہ مطلب معروف رہا ہے کہ قلم کی نوک بناتے وقت جو چھلکے گرتے ہیں ان کو پاؤں کے نیچے نہ گرائیں کیونکہ یہ بھی قابل احترام ہیں! قابل توجہ بات یہ ہے کہ جس طرح ''بیان'' انسان کی خصوصیت ہے قلم بھی اس کی خصوصیات

میں سے ہے، بلکہ یہ بیان سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے اور یہ بعید نہیں کہ خدا کی طرف سے تعلیم، خواہ تعلیم مستقیم یعنی انبیاء مثلاً آدم - یا ادریس - کے ذریعے ہوئی ہو یا غیر مستقیم طریقے سے، یعنی نوع بشر کو پڑھنے اور لکھنے کی استعداد بطور عطیہٴ الٰہی اور اس کی بخشش کے طور پر ہو ایک عظیم ترین نعمت شمار ہے اور وحی کے آغاز کے ساتھ ہی اس پر اعتماد کرنا اور عظمت خدا کو بیان کرنے کے بعد اس کی طرف اشارہ کرنا اس کی عظمت کی دلیل ہے۔

تیسری آیت میں جو قرآن مجید کی طولانی تریں آیات میں سے ایک ہے، جو لوگوں کے درمیان اسناد کی تنظیم و تشکیل سے متعلق ہے، اس میں قلم کی طرف ایک خاص توجہ دی گئی ہے، ارشاد ہوتا ہے: کوئی لکھنے والا عادلانہ انداز میں (قرضے کی سند کو) تحریر کرے:

"وَلْيَكْتُبْ بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ"

بعد از اں اللہ تعالیٰ مزید ارشاد فرماتا ہے: وہ شخص جو لکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے اسے حق حاصل نہیں کہ وہ لکھنے سے انکار کرے، اسی طرح جیسے خدا نے اسے تعلیم دی ہے (اور اس سے اجتناب نہیں کیا)۔ "وَلاَ يَأْبَ كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللهُ فَلْيَكْتُبْ" یہاں بھی لکھنے کی صلاحیت کو قرآن ایک عطیہ الٰہی شمار کرتا ہے اور جسے خدا نے یہ صلاحیت دی ہے اسے تاکید کرتا ہے کہ وہ ان پڑھ لوگوں کے حق کو ثابت کرنے کے لئے ان کی مدد کرے اس صلاحیت کو ان کے لئے تحریر لکھنے میں استعمال کرے۔

اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اسی آیت کے دوران ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ شاہد اور کاتب کو (اس کی دیانت داری کی وجہ سے) کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے: "وَلاَ يُضَارَّ كَاتِبٌ وَلاَ شَهِيدٌ" اس آیت کو جو ایک خاص صورت (قرض کی اسناد کو لکھنے) کے بارے میں نازل ہوئی اگر ہم وسعت دین اور اس خاص صورت سے قطع نظر کریں تو دوسرے موارد اور صورتوں، کو اس خصوصیت کے ساتھ ملحق کریں جن سے اس قلم کے عطیے کے ذریعے، افراد بشر کی مدد کا استفادہ کیا جا سکتا ہے، اور اسی طرح لکھنے والوں سے عدم تعرض اور دوسرے لفظوں میں آزادی قلم کو اس وسیع مفہوم میں داخل کریں تو ہم ایک ایسے نقطے پر پہنچتے ہیں جس پر بشریت صدیوں بعد پہنچی ہے اگرچہ ابھی تک عملی طور پر کافی مشکلات ہیں۔

ہمارے موضوع کی پانچویں آیت میں قرآن مجید آیات الٰہی کے مخالفین کی سرزنش کرتا ہے کہ آخر وہ کون سی قابل قبول دلیل کی بنیاد پر حق کی مخالفت پر تلے ہوئے ہیں لہٰذا ارشاد فرماتا ہے: ہم نے اس سے پہلے کوئی کتاب انھیں نہیں دی جسے وہ پڑھیں (اور اس پر اعتماد کر کے آپؐ کو جھٹلائیں) اور آپؐ سے پہلے ہم نے کوئی رسول بھی ان کی طرف نہیں بھیجا:

"وَمَا آتَيْنَاهُمْ مِنْ كُتُبٍ يَدْرُسُونَهَا وَمَا أَرْسَلْنَا إِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِنْ نَذِيرٍ"

یہاں اگرچہ کتب سے مراد کتب آسمانی ہیں، لیکن کتاب اور درس و تدریس اور حصول علم کا موضوع انبیاء کے مبعوث ہونے کے ساتھ ذکر ہوا ہے۔ لہٰذا یہ دوسری معتبر دلیلوں میں سے ایک معروف دلیل کے طور پر کتاب کی اہمیت اور اس کے کردار کو روشن کرتی ہے اسی قسم کا مفہوم سورہٴ قلم آیت ۳۷ میں منکرین اسلام کی سرزنش اور ان کے مواخذ کے بارے میں بھی موجود ہے، ارشاد فرماتا ہے: "أَمْ لَكُمْ كِتَابٌ فِيهِ تَدْرُسُونَ" کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے جسے تم پڑھ کر حفظ کرتے ہو اور اس پر اعتقاد کی مخالفت کرتے ہو؟!

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کتاب بہت سی صورتوں میں ایک معتبر دلیل وسند کے لحاظ سے قابل استفادہ ہے۔ اصولی طور پر قرآن کا انبیاء کی کتب آسمانی کے بارے میں مسئلہ کتاب وکتابت پر اس قدر اعتماد کرنا، خواہ دنیا کے معاملات میں ہو یا قیامت کی عدالت اور نامہ اعمال کے بارے میں، اسلام وقرآن کے کی نظر میں اس موضوع کی اہمیت کو اُجاگر کرتے ہیں۔

احادیث میں کتاب وقلم کی اہمیت

کتاب وکتابت کے بارے میں بکثرت احادیث رسول اکرمؐ وائمہ معصومینؑ کی طرف سے ہم تک پہنچتی ہیں اور ان کے چند نمونے اور مثالیں ذیل میں ذکر کی جاتی ہیں:

۱۔ رسول اکرمؐ نے ایک حدیث میں فرمایا: "قَيِّدُوا الْعِلْمَ" علم کو زنجیریں پہنا دو (تاکہ تم سے فرار نہ کر سکے)۔ کسی نے عرض کیا: "وَمَا تَقْيِيدُهُ؟" کیسے اسے زنجیروں میں جکڑیں؟! آپؐ نے فرمایا: "كِتَابَتُهُ" لکھ کر۔[۱]

۲۔ آپؐ نے ایک اور حدیث میں فرمایا:

"اُكْتُبُوا الْعِلْمَ قَبْلَ ذَهَابِ الْعُلَمَاءِ وَاِنَّمَا ذَهَابُ الْعِلْمِ بِمَوْتِ الْعُلَمَاءِ"

علم ودانش کو لکھ لو اس سے قبل کہ علماء تمہارے درمیان سے اٹھ جائیں، کیونکہ اگر لکھو گے نہیں تو علماء کی موت کے ساتھ علم ودانش بھی تم سے رخصت ہو جائیں گے۔[۲]

۳۔ امام جعفر صادقؑ نے اپنے اصحاب میں سے ایک شخص سے فرمایا:

"اُكْتُبْ وَبُثَّ عِلْمَكَ فِي اِخْوَانِكَ فَاِنْ مِتَّ فَوَرِّثْ كُتُبَكَ بَنِيكَ، فَاِنَّهُ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ هَرْجٌ مَا يَاْنِسُونَ فِيهِ اِلَّا بِكُتُبِهِمْ"

"لکھو اور اپنے علم کو اپنے بھائیوں میں پھیلاؤ اور جب دنیا سے جانے لگو تو اپنی کتابیں اپنے فرزندوں کے لئے بطور وراثت چھوڑ جاؤ کیونکہ فتنوں سے پر ایک زمانہ آنے والا ہے جس میں لوگ فقط اپنی کتابوں سے مانوس ہوں گے۔"[۳]

۴۔ آپؑ ایک اور حدیث میں فرماتے ہیں:

"مَنَّ اللّٰهُ عَلَى النَّاسِ بَرِّهِمْ وَفَاجِرِهِمْ بِالْكِتَابِ وَالْحِسَابِ وَلَوْلَا ذٰلِكَ لَتَغَالَطُوا"

---

[۱] بحار الانوار، ج۲، ص۱۵۱۔

[۲] کنز العمال، حدیث ۲۸۷۳۳۔

[۳] بحار، ج۲، ص۱۵۰۔

خدا تعالیٰ نے نیکوں اور بدوں پر لکھنے اور حساب کے ذریعے احسان کیا ہے اگر کتاب و کتابت نہ ہوتی تو لوگ غلطیوں میں مبتلا ہو جاتے۔[1]

۵۔امام علیؑ ایک دلچسپ تشبیہ کے ساتھ ایک مختصر کلام میں ارشاد فرماتے ہیں:

"اَلْكُتُبُ بَساتينُ الْعُلَماءِ"

یعنی :"کتابیں علماء کے باغات ہیں۔"[2]

باغ مختلف مناظر،لطیف ہوا،انواع واقسام کے پھلوں،مختلف پتوں، پھولوں اور ادویات کے طور پر استعمال ہونے والی جڑی بوٹیوں پر مشتمل ہوتا ہے، بعینہ کتابیں بھی ان سارے فوائد وآثار کی حامل ہوتی ہیں۔

۶۔ایک اور حدیث میں رسول اکرمؐ بڑے دلچسپ الفاظ میں فرماتے ہیں جن میں آپؐ کتاب و کتابت کی اہمیت کو حیرت انگیز انداز میں بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ثَلاث تَخْرُقُ الحُجُبَ، وَتَنْتَهِى اِلى ما بَيْنَ يَدَىِ اللهِ: صَريرُ اَقْلامِ الْعُلَماءِ، وَوَطْىُ اَقْدامِ الْمُجاهِدِينَ، وَ صَوتُ مَغازِلِ الْمُحْصَناتِ:

"تین صدائیں ایسی ہیں جو پردوں کو پھاڑ کر خدا کی بارگاہ میں جا پہنچتی ہیں؛قلم کی حرکت کرنے کی آواز (کاغذ یا تختے پر لکھتے وقت) اور مجاہدین کے چلنے کی آواز (میدان جہاد میں) اور پاکدامن خواتین کے چرخہ چلانے (کاتنے) کی آواز۔"[3]

اگر چہ یہ صدائیں بظاہر بہت آہستہ ہوتی ہیں لیکن باطن میں پرشور وغوغا، اور ان میں سے ہر ایک انسانی معاشروں کے ایک بنیادی مسئلے کی طرف اشارہ کر رہی ہے: یعنی"علم وکتابت"، "جہاد" اور "کام اور کوشش"۔

۷۔امام صادقؑ توحید مفضل میں نوع بشر پر خدا کی نعمتوں کے سلسلے میں فرماتے ہیں:

"وَ كَذٰلِكَ الْكِتابَةُ الَّتى بِها تُقَيَّدُ اَخْبارُ الْماضِيْنَ لِلْباقينَ وَ اَخْبارُ الْباقينَ لِلاٰتينَ وَبِها تُخَلَّدُ الْكُتُبُ فِى الْعُلُومِ وَالاٰدابِ وَغَيْرِها وَبِها يَحْفِظُ الاِنْسانُ ذِكْرَ ما يَجْرى بَيْنَهُ وَ بَيْنَ غَيْرِهِ مِنَ الْمُعامِلاتِ وَالْحِسابِ، وَلَوْلاهُ لانْقَطَعَ اَخْبارُ بَعْضِ الاَزْمِنَةِ عَنْ بَعْضٍ، وَاخْبارُ الْغائِبينَ عَنْ اَوْطانِهِم، وَ دَرَسَت الْعُلُومُ وَ ضاعَتِ الاٰدابُ،

---

[1] فروغ کافی،ج۵،ص۱۵۵۔

[2] غرر الحکم۔

[3] الشہاب فی الحکم الآداب،ص۲۲۔

وَعَظُمَ ما يَدْخُلُ عَلَى النّاسِ مِنَ الْخَلَلِ فِى اُمُورِهِمْ وَمُعامِلاتِهِمْ، وَمايَحْتاجُونَ إلَى النَّظَرَ فيهِ مِنْ اَمْرِ دِينِهِمْ وَ مارُوِىَ لَهُمْ مِمّا لايَسَعُهُمْ جَهْلُهُ"

اسی طرح ایک اور نعمت الٰہی کتابت ہے کہ جس کے ذریعے گزشتہ لوگوں کے حالات و واقعات اور موجودہ لوگوں کے احوال آئندہ آنے والوں کے لئے محفوظ کئے جاتے ہیں اور اس طرح مختلف علوم و آداب پر مشتمل ان کتابوں کے وسیلے سے وہ علوم ہمیشہ محفوظ رہتے ہیں اور پھر اسی کتابت کے ذریعے وہ معاہدے، معاملات اور حساب کتاب جو انسانوں کے مابین طے پاتے ہیں، محفوظ ہو جاتے ہیں اور اگر کتابت نہ ہوتی تو ایک زمانے کا دوسرے زمانے کے بارے میں رابطہ منقطع ہو جاتا، وطن سے دور افراد کا رابطہ بھی اپنے اہل وطن سے کٹ جاتا، علوم وفنون، آداب ورسوم اور سنن وقوانین ضائع ہو جاتے، لوگوں کے امور و معاملات اور دین کے ضروری امور اور ان کے لئے بیان کی گئی روایات جن سے ان کی آگاہی لازم تھی سب ایک شدید خلل کا شکار ہو جاتے۔"[1]

۸۔اس بحث کو ایک اور حدیث پر ختم کیا جاتا ہے جو علمی آثار (کتابوں) کو باقی رکھنے کو غیر معمولی اہمیت دیتی ہے اور اہل علم ودانش کو بے مثل و بے نظیر ترغیبات کے ذریعے اس کام (کتابت) کی طرف دعوت دیتی ہے۔اس حدیث میں رسول اکرمؐ سے نقل کیا گیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"اَلْمُؤمِنُ اِذا ماتَ وَ تَرَكَ وَرَقَةً واحِدَةً عَلَيْها عِلْم، تَكُونَ تِلْكَ الْوَرَقَةُ يَوْمَ الْقِيامَةِ سِتْراً فِيما بَيْنَهُ وَ بَيْنَ النّارِ وَاَعْطاهُ اللّٰهُ تَبارَكَ وَتَعالى بِكُلِّ حَرْفٍ مَكْتُوبٍ عَلَيْها مَدِينَةً اَوْسَعُ مِنَ الدُّنْيا سَبْعَ مَرّاتٍ"

"مومن دنیا سے رخصت ہوتے وقت اگر ایک ورق جس پر علمی باتیں تحریر ہوں، یادگار کے طور پر چھوڑ جائے تو وہ ورق قیامت کے دن اس کے اور دوزخ کے درمیان حائل ہو جائے گا اور خدا تعالیٰ اسے اس ورق پر لکھے ہوئے ہر حرف کے بدلے میں ایک شہر عطا کرے گا جو اس دنیا سے سات گنا بڑا ہوگا!"[2]

اسلامی حکومتوں کو چند اہم تاکیدات

مذکورہ بالا آیات و روایات سے مجموعی طور پر یہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے کہ اگر مسلمان ظہور اسلام کی ابتدائی صدیوں میں حیرت انگیز

---

[1] بحار، ج۵۸،ص۲۵۷۔

[2] بحار الانوار، ج۱،ص۱۹۸۔

تیز رفتاری کے ساتھ علوم وفنون کی طرف توجہ کرتے اور اس علمی، نشاۃ کہ جس کی حدود یورپ تک پہنچ چکی تھیں اور جو اسلامی ثقافت کی بنیاد پر استوار تھی، تو واضح ہے کہ اسلامی حکومتیں اس مسئلے کو بے حد اہمیت دیتیں جو معاشرے کی حیات اور دین و دنیا کے پھلنے پھولنے کا باعث ہیں۔ اسی طرح جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ اس کے مطابق اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ درج ذیل اُصولوں کو بروکار لائے اور ان پر عملدرآمد کرے۔

۱۔ لکھنا پڑھنا میں اس قدر عام ہو جائے کہ کوئی ایک بھی ان پڑھ شخص باقی نہ رہے اور سب کے سب پڑھنے اور لکھنے کی نعمت سےبہرہ مند ہوں اور اس سلسلے میں ہر قسم کی کوتاہی اور سہل انگاری کی حکومت اسلامی ذمہ دار ہے۔

۲۔ عوام الناس اور اہل دانش کے لئے عمومی اور خصوصی کتابخانوں اور لائبریریوں جو مختلف علوم وفنون کی کتابوں پر مشتمل ہوں، کا قیام بھی حکومت کی ذمہ داری ہے اور اس سلسلے میں ہر قسم کی سرمایہ کاری نہ صرف شریعت کے مدنظر ہے بلکہ مسلمانوں کی طاقت وقدرت کا وسیلہ اور انفرادی و معاشرتی خرابیوں کے خلاف جنگ کا بھی سبب ہے اس کے ساتھ ساتھ معاشرے کی ترقی بھی اسی کی مرہون منت ہے۔

۳۔ حکومت اسلامی میں ذرائع ابلاغ کو فقط اخباری، سیاسی اور دیگر مشاغل اور سرگرمیوں کے لئے ہی مختص نہیں ہونا چاہیے بلکہ (ذرائع ابلاغ) کا ایک بڑا حصہ ان علوم کی نشر و اشاعت کے لئے بھی مخصوص ہونا چاہیے جنھیں ایسے انداز میں نشر کیا جائے کہ وہ تمام لوگوں کی طبیعت اور مزاج کے موافق ہوں اور جدید سائنسی دریافتیں ایک وسیع انداز میں اسلامی معاشرے میں نشر کی جانی چاہئیں تاکہ اس طرح مسلمانوں کی پسماندگی کی روک تھام کی جا سکے۔

۴۔ حکومت اسلامی کو چاہیے کہ وہ اہل قلم، دانشوروں، علماء اور تمام محققین کی حوصلہ افزائی کے لئے ہر قسم کے وسائل سے استفادہ کرے اور اس کے اسباب فراہم کرے، نئی اور بدیع علمی کتابوں کے مصنفین کے لئے خصوصی انعامات رکھے جائیں اور علماء دانشوروں اور اہل تحقیق افراد کو اس طرح خراج تحسین پیش کیا جائے کہ تمام لوگ علم ودانش کے شائق اور گرویدہ ہو جائیں۔

۵۔ مدارس اور یونیورسٹیوں کی وسعت اور ان کے نصابی لائحہ عمل پر غور وفکر کرتے ہوئے چھان بین کی جائے اور اسلامی وغیر اسلامی محققین کی نئی اور جدید تحقیقات سے استفادہ اسلامی حکومت کے لائحہ عمل میں سرفہرست ہونا چاہیے اور اس سلسلے میں اسلام کا پسندیدہ کام انجام پائے، جس کو آیات وروایات میں پیش کیا گیا ہے۔ جدید مصنوعات اور ٹیکنالوجی سے آگاہی بھی اس امر سے جدا نہیں، کیونکہ فقہ اسلامی میں ثابت ہو چکا ہے کہ وہ تمام امور جو اسلامی معاشرۂ کی حفاظت کے لئے ضروری ہیں انھیں حاصل کرنا ہر شخص پر واجب ہے اور کسی مسلمان کے لئے ان امور سے غفلت کرنا جائز نہیں۔

لائبریریوں کا قیام

مسئلہ تعلیم وتربیت سے متعلق حکومت اسلامی کے اہم فرائض میں سے ایک فریضہ پبلک لائبریریاں قائم کرنا ہے، کیونکہ اکثر لوگ زیادہ کتابیں فراہم کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے جبکہ وہ علم ودانش کے طالب اور خواہاں ہوتے ہیں، بالفرض اگر استطاعت رکھتے

بھی ہوں تو ضروری نہیں کہ ایک بڑا سرمایہ ہر گھر میں (کتابوں کے انبار کی صورت میں) بیکار پڑا رہے کیا ہی خوب ہے کہ (یہ علمی سرمایہ) کتابخانوں کی شکل میں محفوظ کیا جائے اس طرح اخراجات میں بھی کافی کمی آئے گی اور عوام بھی، خواہ امیر ہوں یا غریب، چھوٹے ہوں یا بڑے، انواع واقسام کی کتب مثلاً دینی، علمی، ادبی، تاریخی اور سیاسی وغیرہ تک دسترسی حاصل کر پائیں گے۔ قدیم زمانے سے لوگ اس مقصد کی خاطر کتابیں جمع کرتے تھے اور لائبیریاں بناتے تھے، یہی وجہ ہے کہ ہزاروں سال قبل دنیا کے مختلف مقامات پر کتب خانے قائم کئے جاتے رہے ہیں اگرچہ بعض کی صورت اور حالت ابتدائی اور نہایت سادہ ہوتی تھی۔

اسلامی معاشروں میں اسلام کی علم ودانش پر خصوصی تاکید کی وجہ سے دوسری صدی ہجری میں عظیم اور شان وشوکت حامل لائبریریوں کی بنیاد رکھی گئی، جن کے بارے میں غیر اسلامی مورخین بھی اپنی حیرت زدگی کو پنہاں نہیں رکھ سکتے۔ جرجی زیدان مشہور عیسائی مؤرخ نے بغداد، اندلس اور مصر وغیرہ کے کتب خانوں کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے جو اس بات کا شاہد ہے کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں مسلمانوں کا علم کس قدر پیش رفتہ تھا۔ ان اہم کتابخانوں میں سے جن بعض کا اس نے تذکرہ کیا ہے ایک کتابخانہ ''بیت الحکمۃ'' ہے جو بغداد میں تھا قوی امکان ہے کہ اسے ہارون الرشید نے بنوایا تھا اور علم طب، علوم اسلامی اور دوسرے علوم میں مدون کتابیں اس جگہ جمع کی گئی تھیں۔[۱]

بغداد کی بہت سی شخصیات نے بیت الحکمۃ کی پیروی میں کئی دوسرے کتابخانے بھی قائم کئے اور ان میں ہزاروں کتابیں جمع کیں۔ مامون الرشید اسلامی ممالک میں کتابخانہ کی بنیاد رکھنے والوں میں پیش قدم تھا اور اس امر میں اس کی اقتداء کرنے والے اندلس کے بعض حکمران تھے، جن میں سے ایک ''المستنصر باللہ'' بھی تھا جس نے چوتھی صدی ہجری میں اس معاملے کو بہت زیادہ اہمیت دی، اس نے شہر قرطبہ میں ایک کتب خانہ بنوایا جس میں دنیا بھر سے کتابیں اکٹھی کیں، اس نے تاجر لوگوں کو ایک خطیر رقم دے کر اس بات پر مامور کر رکھا تھا کہ وہ دنیا میں گردش کریں اور علمی کتب جمع کریں، بعض حضرات نے اس کتاب خانے میں موجود کتابوں کی تعداد چار لاکھ بتائی ہے۔[۲]

یہ تعداد بہت عظیم اور قابل توجہ وستائش ہے۔ چونکہ اس زمانے میں کتابیں مخطوطات کی صورت میں ہوتی تھیں (یعنی ہاتھ سے لکھی جاتی تھیں) اور ایک کتاب لکھنے کے لئے کئی ہفتے یا کئی ماہ وسال لگ جاتے تھے، اندلس کے بہت سے سرداروں نے اس کی پیروی میں اس ملک کے دوسرے شہروں میں بھی کتابخانے قائم کئے یہاں تک، کہا جاتا ہے کہ صرف ''غرناطہ'' میں سات عمومی کتب خانے تھے اور اس کا سبب یہ تھا کہ لوگ کتابوں کے بہت زیادہ شائق تھے، یہاں تک کہ کتابیں جمع کرنا اور کتب خانے قائم کرنا عظمت اور شخصیت کی علامت سمجھا جاتا تھا، یہاں تک کہ وہ سردار جو پڑھنے لکھنے سے نابلد تھے ان کی بھی کوشش ہوتی تھی کہ اپنے گھر میں قابل قدر وقیمت کتب خانہ قائم کریں۔

''فاطمیون مصر'' کے عصر میں بھی بڑے بڑے کتب خانوں کی بنیاد رکھی گئیں جن میں سے بعض کو ''خزانۃ الکتب'' کا نام دیتے تھے اور مختلف قسم کی کتابیں جمع کرنے کے لئے وافر مقدار میں مال خرچ کیا جاتا تھا اور بسا اوقات ایک ہی کتاب کے کئی نسخے مختلف خطوں

---

[۱] تاریخ تمدن، جرجی زیدان، ج ۳، ص ۲۲۸۔

[۲] تاریخ تمدن، جرجی زیدان، ج ۳، ص ۲۰۳۔

اور مختلف قسم کی آرائش وزیبائش کے ساتھ تیار اور جمع کیے جاتے تھے، یہاں تک کہ لکھا گیا ہے کہ ایک کتب خانے میں جسے ''یعقوب بن کلس'' نے بنوایا تھا قرآن مجید کے ۲۴۰۰ نسخے اور تاریخ طبری کے ۱۲۰۰ نسخے موجود تھے اور اس کتب خانے کی کتابوں کا مجموعہ سولہ لاکھ تھا کہ جن میں صرف ۶۵۰۰ کتابیں، ستارہ شناسی ہندسہ اور فلسفہ پر مشتمل تھیں۔[1]

ویل ڈورانٹ اپنی کتاب تاریخ تمدن میں لکھتا ہے: خلفاء فاطمی کا کتب خانہ نقوش سے مزین سینکڑوں کتابوں پر مشتمل تھا جن میں ۲۴۰۰ نسخے قرآن مجید کے تھے۔ قاہرہ میں خلیفہ کا کتب خانہ ''الحاکم بامر اللہ'' کے دور میں ایک لاکھ اور ''المستنصر'' کے دور میں دو لاکھ کتابوں پر مشتمل تھا۔[2]

اگر ہم کتابوں کی اس تعداد کا موازنہ آج کے کتب خانوں کی کتابوں کی تعداد سے کریں جو آج کل بہت سے شہروں میں ہیں تو ہمیں ایک واضح فرق نظر آئے گا، اس کے باوجود کہ آج کل چھاپ خانوں اور صنعت کی پیشرفت غیر معمولی ہے اور کتاب چھاپنے کا مسئلہ نہایت آسان ہے، جبکہ ماضی میں فقط ہاتھ سے لکھی ہوئی کتابیں ہوتی تھیں۔ اس لحاظ سے مذکورہ اعداد وارقام غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں، ہم اس گفتگو کو مشہور مؤرخ ویل ڈورانٹ کے ایک جملے کے ساتھ ختم کرتے ہیں، وہ کہتا ہے: ''اکثر مساجد میں کتب خانہ ہوا کرتا تھا، بیشتر شہروں میں بھی پبلک لائبریریاں تھیں جن میں بکثرت کتابیں موجود ہوتی تھیں اور ان کے دروازے طالبان علم کے لئے کھلے رہتے تھے......، فقط ''ری'' کی پبلک لائبریری کی کتابوں کی فہرست دس ضخیم جلدوں پر مشتمل تھی اور بصرہ کے کتب خانے میں جو لوگ مطالعہ کرتے تھے، انھیں ایک قسم کا وظیفہ اور امداد بھی دی جاتی تھی!

''یاقوت حموی'' مشہور جغرافیہ دان تین سال تک اپنی کتاب ''معجم البلدان'' کے لئے معلومات جمع کرنے کے لئے مرو اور خوارزم کے کتب خانوں میں مشغول رہا، جب منگولوں نے بغداد کو تباہ کیا، چھتیس پبلک لائبریریاں وہاں موجود تھیں، اور یہ تعداد ان بے شمار لائبریریوں کے علاوہ ہے جو خصوصی تھیں چونکہ اُس دور میں مالداروں کے ہاں کافی تعداد میں کتابیں جمع کرنے کا رواج تھا۔ ''امیر بخاری'' نے ایک طبیب کو اپنے دربار میں آنے کی دعوت دی، اس نے دعوت قبول نہ کی اور کہا کہ مجھے اپنی کتابیں لادنے کے لئے چار سو اونٹوں کی ضرورت ہے، جب ''واقدی'' دنیا سے رخصت ہوا تو اس نے کتابوں سے بھرے ہوئے چھ سو صندوق اپنے بعد چھوڑے، ہر صندوق کو اٹھانے کے لئے دو مرد لازم تھے!

صاحب بن عباد جیسے بعض بزرگان کے پاس یورپ کے تمام کتب خانوں جتنی کتابیں تھیں، ''مینگ ہوانگ'' کے دور میں چین کے علاوہ دنیا کے کسی دوسرے ملک میں آٹھویں صدی عیسوی سے گیارہویں صدی عیسوی (دوم تا پنجم ہجری) تک اسلامی ممالک میں جو ذوق وشوق کتابوں کے بارے میں نظر آتا وہ کہیں اور دکھائی نہیں دیتا تھا اور ان چار صدیوں میں مسلمانوں کی تمدنی

---

[1] تاریخ تمدن، جرجی زیدان، ج۳، ص۲۳۱۔

[2] تاریخ تمدن ویل ڈورانٹ، ج۴، ص۳۶۷۔

اور ثقافتی زندگی اوج کمال پر پہنچ گئی۔[1]

کئی صدیوں تک خاص طور پر قرون وسطیٰ میں جب اہل یورپ تاریک ترین دور سے رہے تھے، اسلامی ممالک علم، تمدن اور ثقافت کا گہوارہ تھے۔ ہم اپنے اصل مطلب سے دور نہ ہو جائیں، مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ تعلیمات اسلام کس حد تک تعلیم و تربیت، کتب خانوں کے قیام اور علم و دانش کی پیش رفت میں موثر رہی ہیں اور یہیں سے اس اہم اور حیات بخش مسئلے کے بارے میں اسلامی حکومت کی ذمہ داریاں بھی واضح ہو جاتی ہیں۔

☆☆☆☆

[1] تاریخ تمدن ویل ڈورانٹ، ج ۴، ص ۳۰۴۔

دفاع اور مسلح افواج

اشارہ

اگر دنیا جاہ طلب ظالموں، طاقت کی زبان بولنے والے تجاوز گر حکمرانوں سے پاک ہوتی تو ملکی سرحدوں کی حفاظت کے لئے کسی فوجی اور عسکری طاقت کی ضرورت ہی پیش نہ آتی، اور دنیا کے تمام لوگ اپنے ملکوں میں امن وامان کے ساتھ زندگی گزارتے اور ایک دوسرے کے ساتھ صحیح وسالم ثقافتی، سیاسی اور اقتصادی روابط قائم کرتے۔ لیکن بعض افراد اور قوموں میں ظلم وتجاوز گری پائی جاتی ہے جس کے باعث اکثر ایک فرد کسی دوسرے فرد پر یا کوئی قوم کسی دوسری قوم پر چڑھائی کر دیتی ہے۔ اس قسم کے حالات میں سب کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے آپ کو اتنا طاقتور بنائیں تا کہ پُر امن فضا میں سکون کا سانس لے سکیں، کیونکہ افسوس کے ساتھ آج کل کمزوروں کو پاؤں تلے روندا جاتا ہے اور جس کی وجہ سے مسلح افواج کا وجود ضروری ہو جاتا ہے۔

درست ہے کہ ان افواج کی موجودگی بھی اس قابل نہیں ہو سکتی کہ وہ تجاوز وتعدی کی راہ میں رکاوٹ بنے لیکن یہ کسی حد تک ماضی میں بھی رکاوٹ رہی ہیں اور اب بھی ہیں چونکہ اکثر ایسے ہوتا ہے کہ حملہ آور قوتیں اندھا دھند اور خطرناک انداز میں حملہ کر دیتی ہیں اور یہ حملے، جوئے کی بازی کی مانند ہوتے ہیں جن میں ہار جیت کا پتہ نہیں چلتا یا انھیں اپنی کامیابی کی بھاری قیمت چکانی پڑتی ہے اور یہی چیزیں بسا اوقات تجاوز کی راہ میں بھی رکاوٹ ثابت ہوتی ہیں۔ اس سے قطع نظر وہ ملت اور قوم جو کسی تہذیب وتمدن کی مالک اور آزادی کی خواہاں ہوتی ہے اور چاہتی ہے کہ اس کی ثقافت دنیا کے دوسرے لوگوں پر بھی اثر انداز ہو، اس کے لئے بھی اپنے مشن کی تبلیغ کے لئے طاقت پر بھروسہ کئے بغیر ایک آزاد ماحول میں رہنا ممکن نہیں، اور یہ مسلح افواج کی تشکیل کا دوسرا فلسفہ اور مقصد ہے۔

اگر ہم اس مسئلے کو ایک وسیع تناظر میں دیکھیں تو ہمیں یہ کہنا چاہیے کہ زندگی ''جہاد'' کے بغیر ممکن نہیں چونکہ ہر زندہ اور ذی روح موجود کو اپنی زندگی جاری اور باقی رکھنے کے لئے کئی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو زندگی کے ہر لمحے اس کے سامنے نظر آتے ہیں اور اگر یہ زندہ مخلوق کسی دفاعی اسلحے سے لیس نہ ہو تو جلد ہی صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہے۔ انسان کا بدن جو بذات خود ایک چھوٹا جہان (عالم صغیر) ہے اور سارا جہان کبیر (کائنات) بصورت خلاصہ اس میں موجود ہے، اس مسئلے کی ایک واضح مثال ہے کیونکہ (انسانی زندگی) تمام مدت، دن رات چاروں طرف (سانس کے ذریعے، کھانے پینے اور بدن پر کسی زخم کے لگنے) سے مختلف قسم کے جرثوموں (virus) کا نشانہ بنتی ہے اور اگر بدن کے اندر ایک مضبوط دفاعی نظام موجود نہ ہو تو یہ مختصر سی مدت میں انواع واقسام کی بیماریوں کا شکار ہو کر ختم ہو جائے۔

جی ہاں! خون کے سفید خلیے (White cells) جسم میں داخل ہونے والے ہر بیرونی دشمن کا مقابلہ کرتے ہیں اور طبیعاتی اور کیمیائی جنگ کے ذریعے اس کا مقابلہ کرتے ہیں یہاں تک کہ اگر وقتی طور پر یہ بیرونی دشمن (وائرس وغیرہ کامیاب بھی ہو جائیں اور انسان بیمار پڑ جائے تو پھر بھی یہ (سفید خلیے) دشمن کے مغلوب ہونے اور انسان کے صحت مند ہونے تک ان کے خلاف جنگ جاری رکھتے ہیں۔

ان مسلح دفاعی سپاہیوں کی تعداد کئی ملین بتائی گئی ہے اور ان کا مطالعہ اور طرز عمل انسان کو تخلیق کے اسرار سے آگاہ کرتا ہے جس کی وجہ سے وہ بے اختیار اپنے خالق کی بارگاہ میں جھک جاتا ہے۔ انسانی معاشرہ اور دنیا کے مختلف ممالک بھی اس عمومی قانون سے مستثنیٰ نہیں اور اپنی زندگی کی بقاء کے لئے ایک مسلح عسکری طاقت کے محتاج ہیں۔ اس اشارے کے ساتھ ہی ہم قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں جہاد، اس کے فلسفے (مقصد) اور احکام نیز اس کے آثار ونتائج کے بارے میں بکثرت آیات ذکر ہوئی ہیں جن میں سے گیارہ آیات کو یہاں بیان کیا جاتا ہے:

۱۔ أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ﴿٣٩﴾ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَنْ يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا ۗ وَلَيَنْصُرَنَّ اللَّهُ مَنْ يَنْصُرُهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ﴿٤٠﴾ (سورۂ حج/ ۳۹ تا ۴۰)

۲۔ وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ ۚ فَإِنِ انْتَهَوْا فَإِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٣٩﴾ (سورۂ انفال/ ۳۹)

۳۔ وَإِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَوْلَاكُمْ ۚ نِعْمَ الْمَوْلَىٰ وَنِعْمَ النَّصِيرُ ﴿٤٠﴾
(سورۂ انفال/ ۶۰)

۴۔ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَأَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَرْصُوصٌ ﴿٤﴾
(سورۂ صف/ ۴)

۵۔ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ ۚ إِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ ۚ وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ يَغْلِبُوا أَلْفًا مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ ﴿٦٥﴾ (سورۂ انفال/ ۶۵)

۶۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنْجِيكُمْ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿١٠﴾ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿١١﴾ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ وَمَسَاكِنَ طَيِّبَةً فِي جَنَّاتِ عَدْنٍ ۚ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿١٢﴾ وَأُخْرَىٰ تُحِبُّونَهَا ۖ نَصْرٌ مِنَ اللَّهِ وَفَتْحٌ قَرِيبٌ ۗ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٣﴾ (سورۂ صف/ ۱۰ تا ۱۳)

۷۔ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۫ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ؕ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۱۱﴾ (سورۂ توبہ/ ۱۱۱)

۸۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۫ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۲۰۰﴾

(سورۂ آل عمران/ ۲۰۰)

۹۔ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۷۳﴾ (سورۂ توبہ/ ۷۳۔ سورۂ تحریم/ ۹)

۱۰۔ لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ؕ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۹۵﴾

(سورۂ نساء/ ۹۵)

ترجمہ:

۱۔ وہ لوگ جن پر جنگ مسلط کی گئی ہے انھیں جہاد کی اجازت دے دی گئی ہے کیونکہ ان پر ظلم ہوا ہے اور خدا ان کی مدد پر قادر ہے، وہی لوگ جنھیں ان کے گھروں سے بغیر کسی وجہ سے نکالا گیا ہے، سوائے اس کے کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے اور اگر خدا بعض لوگوں (کے شر) کو بعض دوسرے لوگوں کے ذریعے دفع نہ کرے تو دیر و کلیسا و صومعات عبادت گاہیں (یہود و نصاریٰ کی) اور وہ مساجد جن میں کثرت کے ساتھ ذکر خدا ہوتا ہے، ویران ہو جائیں اور خدا تعالیٰ ان لوگوں کی مدد کرتا ہے (جو اپنے دین کا دفاع کریں) خداوند قوت والا اور شکست ناپذیر ہے۔

۲۔ ان کے ساتھ جنگ کرو تا کہ فتنہ گری اور (شرک و آزادی سے محرومی) کی بساط لپیٹ دی جائے اور سارا دین فقط خدا کے ساتھ مخصوص ہو اور اگر وہ لوگ (فتنہ انگیزی) اور مخالفانہ امور سے باز آ جائیں تو (خدا ان کی توبہ قبول کرے گا) اور خدا جو عمل وہ انجام دیتے ہیں اس سے باخبر اور اسے دیکھنے والا ہے۔

۳۔ ہراس چیز کی جس کی استطاعت رکھتے ہواس کو دشمن کے ساتھ مقابلے کے لئے تیار رکھو! اور (اسی طرح) سدھائے ہوئے گھوڑے بھی (میدان جنگ کے لئے) تا کہ اس (سب) کے ذریعے خدا کے دشمن اور اپنے دشمن کو خوفزدہ کرو۔

۴۔ خدا تعالیٰ ان لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو اس کی راہ میں قتال کرتے ہیں اور سیسہ پلائی دیوار ثابت ہوتے ہیں!

۵۔ اے رسولؐ مؤمنو کو جنگ کی رغبت اور شوق دلاؤ! تمہارے با استقامت بیس افراد دشمن کے دوسو افراد پر بھاری ہوں گے، اور سو افراد کفار کے ہزار افراد کے مقابلے میں کامیاب ہوں گے کیونکہ کفار ایک نافہم اور بے سمجھ گروہ ہے۔

۶۔ اے ایمان والو! کیا میں تمہاری راہنمائی ایسی تجارت کی طرف نہ کروں جو تمہیں دردناک عذاب سے بچائے؟! خدا اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اپنے مال و جان کے ساتھ راہ خدا میں جہاد کرو، اگر تم یہ جان لو تو تمہارے لئے ہر چیز سے بہتر ہے۔ (اگر تم لوگ ایسا کرو گے) تو وہ تمہارے گناہ بخش دے گا اور تمہیں جنت کے باغوں میں داخل کرے گا جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہوں گی اور بہشت جاودانی کے پاک و پاکیزہ مساکن میں جگہ دے گا اور یہ عظیم کامیابی ہے! اور ایک اور (نعمت) جسے تم پسند کرتے ہو تمہیں عطا کرے گا اور وہ خدا کی نصرت و مدد اور عنقریب ملنے والی کامیابی ہے اور مومنوں کو اے رسولؐ (اس عظیم کامیابی کی) بشارت دے دو۔

۷۔ اے ایمان والو! (مشکلات اور ہوا و ہوس کے مقابلے میں) استقامت کا مظاہرہ کرو اور دشمنوں کے مقابلے میں ڈٹے رہو اپنی سرحدوں کی نگرانی کرو اور خدا کی نافرمانی سے بچو تا کہ کامیابی سے بہرہ مند ہو سکو!

۸۔ خدا تعالیٰ نے مومنوں سے ان کی جان و مال خرید لئے ہیں تا کہ (اس کے مقابلے میں) ان کے لئے جنت قرار دے (ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ) راہ خدا میں قتال کرتے ہیں، قتل کرتے اور قتل ہوتے ہیں، یہ خدا کا برحق وعدہ ہے جسے تورات، انجیل اور قرآن میں اس نے ذکر فرمایا ہے اور خدا سے بڑھ کر کون اپنے وعدے کا پاس کرنے والا ہے؟! جو معاملہ تم نے خدا سے کیا ہے اس کی تمہیں بشارت (اور مبارک) ہو اور یہی ہے وہ عظیم کامیابی!

۹۔ اے رسولؐ! کافروں اور منافقوں کے ساتھ جہاد کرو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ، ان کا ٹھکانہ

دوزخ ہے اور کیا ہی برا انجام ہے ان کا۔

۱۰۔ وہ مومن افراد جو بیماری اور کسی پریشانی کے بغیر جہاد سے کترائیں ہرگز راہ خدا میں جان و مال کے ساتھ جہاد کرنے والوں کے ہم پلہ نہیں ہیں، خدا تعالیٰ نے جان و مال کے ساتھ جہاد کرنے والوں کو قاعدین (جہاد کو ترک کرنے والوں) پر برتری عطا کی ہے اور ان دو گروہوں میں سے ہر ایک کے ساتھ خدا تعالیٰ نے (ان کے نیک اعمال کے مطابق) اچھے بدلے اور پاداش کا وعدہ کیا ہے اور مجاہدین کو پیچھے رہ جانے والوں پر برتری بخشی ہے۔

تشریح

جہاد کی روح دفاع ہے نہ فوجی یلغار

ان آیات میں سے پہلی آیت، مفسرین کی ایک جماعت کی رائے کے مطابق، جہاد کے بارے میں پہلی آیت ہے، اس آیت میں جہاد کے ایک اہم مقاصد سے پردہ اٹھا کر مسلمانوں کے خلاف مسلح قیام اور جہاد کی اجازت دی گئی ہے، کہ جن کے شدید دباؤ کا وہ شکار ہو چکے تھے۔ ارشاد ربانی ہے:

''جن لوگوں پر ظلم و ستم روا رکھا گیا اور ان پر جنگ مسلط کی گئی ہے، انھیں جہاد کی اجازت دے دی گئی ہے، اور اللہ تعالیٰ ان کی مدد پر قادر ہے۔''

"أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ"

اس مقام پر مسلمانوں کو جہاد کی اجازت کے ہمراہ خدا تعالیٰ نے کامیابی کے وعدے سے بھی سرافراز فرمایا ہے، اور اس کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ دشمن نے ظالمانہ انداز میں جنگ کی ابتدا کی ہے اور اس کے مقابلے میں خاموشی اختیار کرنا غلط ہے، کیونکہ یہ خاموشی مخالفین کی جرأت اور جسارت اور دوستوں کی کمزوری اور ناامیدی کا باعث بن سکتی ہے۔

مرحوم طبرسی تفسیر مجمع البیان میں کہتے ہیں: مشرکین عرب، مسلمانوں کو مسلسل اذیتوں کا شکار بنائے رکھتے تھے اور زخمی افراد ہمیشہ رسول اکرمؐ کی خدمت میں آتے اور ان کی شکایت کرتے تھے ان کی حالت زار کو دیکھ کر آپؐ فرماتے: ''صبر کرو مجھے ابھی جنگ کی اجازت کا حکم نہیں ملا'' یہاں تک کہ آپؐ نے ہجرت فرمائی اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اور یہ سب سے پہلی آیت ہے جو

مسلمانوں کو جنگ کی اجازت دیتی ہے [1]۔

قابل توجہ یہ ہے کہ اس سے پہلی آیت میں قرآن مجید فرماتا ہے:

"اِنَّ اللّٰهَ یُدافِعُ عَنِ الَّذینَ آمَنُوا"

یعنی: "خدا تعالیٰ اہل ایمان کا دفاع کرتا ہے۔"

یعنی اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ کسی گوشے میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں اور خدا کی طرف سے دفاع کا انتظار کریں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی روش اور طریقہ یہ ہے کہ وہ مومنوں کا دفاع تب کرے گا جب وہ دشمن کے خلاف جہاد کے سلسلے میں ذمہ داری پوری کریں گے پس وہی لوگ خدا کی مدد کو اُمید رکھ سکتے ہیں جو جہاد کے بارے میں اپنی ذمہ داری کو ترک نہ کریں۔ اس کے ساتھ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ بعد والی آیت (سورۂ حج ر ۴۰) میں اللہ تعالیٰ اس مقدس دفاع کی رغبت وشوق دلاتے ہوئے فرماتا ہے:

الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ

اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جن دشمنوں نے تمہیں خدا پر ایمان کے جرم میں تمہیں تمہارے گھروں سے نکال باہر کیا ہے، اگر ان کے خلاف قیام نہ کرو تو تمہاری دنیا بھی خطرے میں ہے اور دین وایمان اور مساجد ومعابد بھی۔

چونکہ جہاد کا حکم ہجرت کے بعد صادر ہوا ہے، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام میں جہاد کی بنیاد کو تشکیل دینے والا عامل صرف دشمن کے مقابلے میں اپنا دفاع ہے، کیونکہ پورے تیرہ سال مسلمانوں نے ہر قسم کی اذیتوں عہد شکنی اور مار پیٹ اور زخم کھانے کے باوجود اسلحے کو ہاتھ تک نہیں لگایا کہ شاید دشمنوں کو عقل آ جائے۔ لیکن آخر کار یہ صبر وتحمل اور اجتماعی دربدری ہجرت کی صورت میں رونما ہوئی جبکہ انواع واقسام کی معاشرتی اور اقتصادی پابندیوں اور شدید حالات کا سامنا جاری تھا یہاں تک کہ ہجرت کے بعد بھی مشرکین مکہ کی یہ ظالمانہ کاروائیاں جاری رہیں، کیا ایسی صورتحال میں کسی بھی صاحب عقل کے نزدیک جائز ہے کہ اہل ایمان بیٹھے رہیں اور دشمن کی بے رحمی اور سنگدلی کا نشانہ بنتے رہیں؟!

دوسری آیت، پہلی آیت میں مذکورہ مقصد کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ جو ہر زمانے اور ہر مقام پر جہاد کو ضروری قرار دیتی ہے۔ "ان کے ساتھ قتال کرتے رہو یہاں تک کہ فتنہ وفساد (اہل شرک کا دباؤ، اور آزادی سے محرومی کی فضا) کا خاتمہ ہو جائے اور دین ودیانت (اور عبادت خدا ہی کے لئے) مخصوص ہو کر رہ جائے:

"وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلّٰهِ"

---

[1] جن لوگوں نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ یہ اولین آیت جہاد ہے ان میں سے علامہ طباطبائیؒ المیزان میں برسوئی، روح البیان میں، علامہ مشہدی، کنز الدقائق اور آلوسی روض المعانی میں اسی رائے کے قائل ہیں اگرچہ بعض حضرات کے نزدیک "وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ ......" (سورہ بقرہ ر ۱۹۰) اور بعض کے نزدیک "اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِینَ ......" (توبہ ر ۱۱۱) جہاد کے بارے میں پہلی آیت ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ قرآن مجید کا اسی آیت کے ذیل میں صراحت کے ساتھ فرما رہا ہے:

''اگر وہ لوگ فتنہ انگیزی سے دستبردار ہو جائیں تو آپ بھی ان سے معترض نہ ہوں، خدا تعالیٰ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔''

''فَإِنِ انتَهَوْا فَإِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ بَصِيرٌ''

فتنہ گروں کے خلاف جنگ سے کیا مراد ہے؟

بعض مفسرین نے فتنہ کو شرک کے ساتھ تعبیر کیا ہے، لیکن بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد دباؤ ڈال کر اہل ایمان کو شرک کی طرف پلٹانا ہے۔ تفسیر المیزان میں لفظ فتنہ کی اصل کو مدنظر رکھتے ہوئے اس سے وہ سب امور مراد لئے گئے ہیں جن کے ذریعہ لوگوں کو آزمایا جاتا ہے، یہ امور قدرتی طور پر لوگوں کے لئے مشکل اور سخت ہوتے ہیں اور غالباً فتنہ، امن وامان اور صلح وآتشی کے ختم ہو جانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ہم نے تفسیر نمونہ میں سورۂ بقرہ کی آیت ۱۹۳ کے ذیل میں آیات قرآنی سے استدلال کے کرتے ہوئے اس لفظ ''فتنہ'' کے پانچ معانی بیان کئے ہیں:

۱۔ آزمائش

۲۔ فریب دینا

۳۔ مصیبت اور عذاب

۴۔ شرک اور بت پرستی

۵۔ گمراہ کرنا اور گمراہی

لغت کی بعض کتابوں مثلاً لسان العرب میں بھی ان میں سے اکثر معانی کو بیان کیا گیا ہے۔ واضح ہے کہ موضوع بحث آیت میں فتنہ، آزمائش یا فریب وبلا کے معنی میں نہیں ہو سکتا لہٰذا اس کا مطلب شرک ہے یا مشرکین کا دوسرے لوگوں کو گمراہ کرنا اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے ایک وسیع تر مفہوم سمجھا جائے، اس صورت میں یہ (فتنہ) شرک اور مشرکین کی ظالمانہ کارروائیوں کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے، ایسی صورتحال میں جب تک کفار کی جانب سے مسلمانوں کو اپنا عقیدہ تبدیل کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے اس وقت تک ان کے اس عمل کے باعث ان کے خلاف جنگ کرنا جائز ہے اور آزادی کے حصول اور دشمن کی ظالمانہ کارروائیوں کی روک تھام کے لئے، مسلمانوں کو جہاد کی آزادی اور اجازت ہے، لیکن جب وہ اپنی جابرانہ کارروائیوں سے دستبردار ہو جائیں تو جنگ تمام ہو جائے گی، لہٰذا فتنے کے خلاف جنگ بھی ایک قسم کا دفاعی جہاد ہے۔

تیسری آیہ شریفہ میں مسلمانوں کو دشمن کے خلاف جنگ کے لئے ہر قسم کی طاقت کو تیار رکھنے کا حکم دیا گیا ہے، ارشاد قرآنی ہے:

''وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ''

بعد ازاں اس زمانے میں ایک اہم جنگی ضرورت کو بطور نمونہ ومثال پیش کیا گیا ہے، لہٰذا ارشاد قرآنی ہے: ''میدان جنگ کے لئے تربیت

یافتہ گھوڑے آمادہ کرو"۔"وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ"۔ اوراس کے بعدوالے جملے میں قرآن مجید طاقت کوتیار رکھنے کے حقیقی مقصد کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:"اس کا اورمقصد یہ ہے کہ اس (طاقت) کے ذریعے تم لوگ دشمنان خدااوراپنے دشمنوں کو ہراساں کرو"۔"تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ"۔ پس قوت اور طاقت کے ساتھ تیاری اوراس کا مظاہرہ کسی پر حملے کی خاطر نہیں بلکہ مقصد دشمن کوخوفزدہ کرنا ہوتا ہے اوریہی خوف وحشت جنگ سے بچنے کا باعث بنتی ہے۔

درحقیقت دفاعی بنیاد کی تقویت ہمیشہ ایک موثر دفاع اوردشمن کے حملے سے بچاؤ کا ذریعہ رہی ہے اور یہ ایک عالی شان مقدس اور عقل ومنطق کے مطابق مقصد ہے۔ یہ نکتہ بھی قابل توجہ رہے کہ اس آیہ شریفہ کا مفہوم بہت ہی وسیع ہے، جو ہرقسم کی معنوی، مادی، عسکری، اقتصادی اورثقافتی قوت وطاقت کی فراہمی کے مفہوم کو اپنے اندرشامل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، خاص طور پر (یہ مفہوم) ہرزمانے کے مناسب وسائل (طاقت کی فراہمی) پراعتماد کرتا اوراس کی تاکید کرتا ہے اورظاہر کرتا ہے کہ مسلمانوں کو ہرگز آرام اورسکون کے ساتھ نہیں بیٹھ جانا چاہیے بلکہ انھیں کوشش کرنی چاہیے کہ وہ اپنے زمانے کے جدیداور پیچیدہ ترین اسلحے تک دسترسی پیدا کریں یہاں تک کہ اس امر میں دوسروں پرسبقت حاصل کریں،لیکن ان سب امورکا اصل مقصد کسی پرحملہ نہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ اس طرح فتنوں کی آگ کو دباتے ہوئے ہرطرح کے ظالمانہ رویے اوردشمن کے امکانی حملے کی روک تھام کی جاسکے۔

چونکہ پیشرفتہ اسلحہ کی فراہمی عظیم اخراجات کے ہی باعث ممکن ہے اورلوگوں کی عمومی شرکت کے بغیر امکان پذیر نہیں،لہٰذا مذکورہ بالا آیت کے آخری جملے میں ارشاد ہے:"اور جو کچھ تم راہ خدا میں خرچ کروگے وہ تمہاری طرف ہی لوٹا دیا جائے گااورتمہارے اوپر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔"

"وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ شَيْءٍ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تُظْلَمُونَ"

یہ نکتہ بھی قابل اہمیت ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے بعد کی آیت (انفال/۶۱) میں صراحت کے ساتھ فرماتا ہے:

"اگروہ لوگ صلح کی جانب مائل ہوں تو آپ بھی ان کے ساتھ صلح کا اظہار کریں اور خدا پراعتماد کریں، بے شک وہ سننے اورجاننے والا ہے۔"

"وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ"

وہ آیت جو طاقت فراہم کرنے کا حکم دیتی ہے اس کے بعد اس آیت کا ذکر بہت ہی بامعنی اوراسلام کی صلح پسندانہ روح پرتاکید کی حیثیت رکھتی ہے یعنی اگرآیہ شریفہ مسلمانوں کو بہترین اور عالی ترین اسلحہ اورعسکری قوت کی فراہمی کا حکم دیتی ہے تو اس سے مراد صلح کے ارکان کو مضبوط کرنا ہے نہ کہ کسی پرحملہ کرنا ہے۔

چوتھی آیہ شریفہ میں قرآن مجید مسئلہ جہاد کی ترغیب وتشویق دلاتے ہوئے اسے مقدس مقاصد کی شرط کے ساتھ مشروط قرار دیتا ہے اوراس کے بعد مسلمین کی صفوف میں وحدت پرزوردیتا ہے، جودشمن کے خلاف جنگ میں کامیابی کاایک بے حداہم عامل ہے،لہٰذا اس سلسلے میں ارشاد ہوتا ہے:"خداتعالیٰ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو اس کی راہ میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح مضبوطی کے ساتھ جنگ کرتے ہیں۔"

"إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَأَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَرْصُوصٌ"

جہاد کے بارے میں بیان شدہ آیات میں فِي سَبِيلِهِ (راہ خدا میں) کی تعبیر اختیار کرنا، اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ جہاد کو خود غرضی، وسعت طلبی، حصول برتری، دوسروں کے حقوق اور سرزمینوں کے غصب یا انتقامی جوئی اور خواہشات نفس کی بنیاد پر استوار نہیں ہونا چاہیے بلکہ اُسے فقط حق وعدالت اور خدا کی خوشنودی کی خاطر انجام دینا چاہئے، بہت ساری آیات میں ان الفاظ کی تکرار ایسی جنگوں کی روک تھام کے لئے ہے جن کے محرکات مادی اور شیطانی ہوتے ہیں اور یہی وہ چیز ہے جو اسلام کی مسلح عسکری قوت کو دوسری (غیر اسلامی عسکری قوتوں سے) ممتاز کرتی ہے۔ (غور فرمائیں)

بُنْيَانٌ مَرْصُوص میں "بنیان" کا مطلب ہے بنیاد، اور مرصوص کا مادہ "رصاص" یعنی سیسہ ہے۔ پس بُنْيَانٌ مَرْصُوص کے الفاظ استعمال کرنا، استحکام اور اتحاد کو بیان کرنے کے لئے ہے کیونکہ گزشتہ دور میں سیسے کو پگھلا کر اسے گارے کی طور پر استعمال کیا جاتا تھا اور شاید بنیان مرصوص سے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ دشمن سیلاب کی طرح تباہ کن ہوتا ہے اور مسلمانوں کی صفیں اس سیلاب کے مقابلے میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ان کا مقابلہ کرتی ہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ اس آہنی رکاوٹ کی طرف اشارہ ہو جسے ذوالقرنین نے یاجوج، ماجوج جیسی خونخوار اور خون ریز قوم کے حملوں سے حفاظت کے لئے تعمیر کرایا تھا اور یہ ہر اس رکاوٹ کے لئے کنایہ ہے جسے کسی حملہ آور سے بچاؤ کے لئے بنایا جاتا ہے۔

دونوں صورتوں میں اس تعبیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی جہاد صرف دفاعی حیثیت رکھتا ہے، کیونکہ سد اور رکاوٹیں تاریخ میں ہر قسم کے یاجوج و ماجوج کے سیلاب کے مقابلے میں ایک مؤثر دفاع کا وسیلہ رہی ہیں چونکہ کوئی سد یا رکاوٹ کسی حملے کو علامت نہیں بلکہ دفاع کی علامت ہے۔ جس طرح ان رکاوٹوں میں اگر کوئی خلل واقع ہو جائے تو یہ بکھر جاتی ہیں اسی طرح اگر مجاہدین اسلام کی صفوں میں بھی اختلاف وانتشار پیدا ہو جائے تو اس کے سبب سے وہ دشمن کے مقابلے میں شکست کھا جائیں گے، جبکہ اللہ تعالیٰ ایسی صفوف کو پسند کرتا ہے جن کے درمیان مکمل اتحاد واتفاق اور پوری ہم آہنگی ہو۔

پانچویں آیہ کریمہ میں رسول اکرمؐ کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ آپؐ دشمن کے خلاف مسلمانوں کو جنگ کا شوق اور رغبت دلائیں اور یہ آیت ان آیات کے بعد ہے جن میں دشمن کو ڈرانے اور جنگ کی روک تھام کے لئے اپنی قوت اور طاقت کو آمادہ رکھنے کی ترغیب لائی گی ہے، اسی طرح یہ آیت اس آیت کے بعد ہے، جو صلح کی ترغیب وتشویق دلاتی ہے۔ درحقیقت جنگ دشمنوں کے حملوں کو روکنے کا آخری حربے کے طور پر جائز قرار دی گئی ہے، پہلے عسکری تیاری، پھر قوی اور طاقتور انداز میں صلح کی دعوت اور آخرکار جنگ کا حکم صادر ہوتا ہے لہٰذا ارشاد ہوتا ہے:

"اے رسولؐ اہل ایمان کو دشمن کے خلاف جنگ کی ترغیب دو"

"يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ"

اس کے بعد کامیابی کے سب سے اہم عامل یعنی استقامت اور پامردی کی طرف اشارہ کر کے فرماتا ہے: "اگر تم میں سے بیس با استقامت

افراد ہوں تو وہ دوسو افراد پر بھاری ہوں گے اور اگر سو افراد ہوں تو وہ کفار کے ہزار افراد پر کامیابی حاصل کر سکتے ہیں کیونکہ کفار ایسے لوگ ہیں جو فہم وفراست سے خالی ہیں۔''

"إِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ وَإِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ يَغْلِبُوا أَلْفًا مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ"

ایک طرف سے وہ (کفار) اس قدر جاہل اور نادان ہیں کہ عقل ومنطق کی راہ اُنہیں سجائی ہی نہیں دیتی وہ صرف طاقت کی زبان سمجھتے ہیں جبکہ دوسری طرف سے ان کے ضعف اور ناتوانی کا سبب میدان جنگ میں ہے یعنی وہ جم کر مقابلے کی سکت نہیں رکھتے اور وہ اس لئے کہ ان کی جنگوں میں ان کے سامنے کوئی خاص ہدف اور مقصد نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ اہل ایمان میں سے ایک فرد با استقامت وآ گاہ کفار کے دس افراد اور بیس افرادان کے دوسو افراد پر غالب آسکتے ہیں! راغب اصفہانی اپنی کتاب المفردات میں لکھتے ہیں:

''تحریض کا لغوی مفہوم کسی چیز کو مزین کرنا اور اس کی راہ کی رکاوٹیں دور کر کے، اس کی ترغیب دینا ہے، اور حقیقت میں خدا پر اور روز آخرت پر ایمان، اسی طرح مجاہدین اور راہ خدا میں شہید ہونے والوں کو عظیم اجر وثواب عطا کرنا وغیرہ کے ذریعے اسلامی جانبازوں کے راہ کی تمام رکاوٹیں برطرف کر کے اس بہت سخت عمل کو ان کے لئے آسان بنا دیا جاتا ہے۔ یہ آیت ظاہری اور مادی قوتوں کے باہمی موازنے کے افسانے کی حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ مسلمانوں کے پاس بعض ایسی روحانی اور معنوی قوتیں بھی ہیں جن پر اعتماد کر کے وہ دشمن کے بظاہر بہت بڑے لشکر کو بھی شکست دے سکتے ہیں۔

چھٹی آیہ شریفہ ایک دوسرے طریقے سے جہاد کی ترغیب دلاتے ہوئے جہاد کو ایک نفع بخش تجارت کے ساتھ تشبیہ دیتی ہے جو عذاب الیم سے نجات اور دنیا وآخرت کی کامیابی کا باعث ہے، ارشاد ہے:

''اے ایمان والو! کیا میں تمہاری ایسی تجارت کی طرف راہنمائی نہ کروں جو تمہیں دردناک عذاب سے آزادی بخشے، خدا اور رسول پر ایمان لاؤ اور خدا کی راہ میں اپنے اموال اور جانوں کے ساتھ جہاد کرو، یہ تمہارے لئے ہر چیز سے بہتر ہے۔''

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَى تِجَارَةٍ تُنْجِيكُمْ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ۝ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ"

اس کے بعد، آیات میں قرآن مجید مجاہدین کو مغفرت، جنت کے باغات میں داخلے، جنات عدن کی پاک وپاکیزہ رہائش گاہوں، نجات اور دنیا میں عنقریب واقع ہونے والی کامیابی کی نوید سناتا ہے۔''

"يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ وَمَسَاكِنَ طَيِّبَةً فِي

جَنّٰتِ عَدْنٍ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ٭ وَأُخْرَى تُحِبُّونَهَا نَصْرٌ مِنَ اللهِ وَفَتْحٌ قَرِيبٌ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ"

ان آیات میں نفع بخش تجارت کا سرمایہ جو دنیا و آخرت کی آزادی اور نجات کا سبب ہے، ایمان اور جہاد کا باہمی مرکب ہے؛ یعنی ''عقیدہ'' اور ''جہاد'' اس کے دو بنیادی ارکان ہیں وہ جہاد جو مال کے ذریعے بھی انجام پاتا ہے اور جان کے ساتھ بھی کیونکہ سامان جنگ کی فراہمی، جو مجاہدین کی کامیابی کا ایک اہم ذریعہ ہے، مال و منال خرچ کئے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی، کیونکہ اللہ تعالیٰ جہاد کے نتیجے کو صرف مغفرت و بخشش اور جاودانی اور ہمیشہ رہنے والی نعمتوں ہی میں منحصر نہیں کرتا بلکہ اس دنیا میں قریب الوقوع کامیابی کو بھی اس کا ایک بلند پایہ نتیجہ قرار دیتا ہے۔ (غور فرمائیں)

تجارت کے ساتھ تعبیر کرنے میں یہ نکتہ بھی مضمر ہے کہ انسان بہرحال کچھ نہ کچھ سرمایہ رکھتا ہے اور یہ دنیا ایک ایسی تجارت گاہ ہے جہاں اس فانی سرمائے کو جاودانی اور باقی رہنے والے سرمائے میں تبدیل کیا جاسکتا ہے اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب انسان خدا کے ساتھ معاملہ اور لین دین کرے اس ذات پاک کے ساتھ کہ ہر خیر و برکت اور سعادت اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے اور اس کے ساتھ تجارت، کرامت، عطا اور ہر قسم کی بخشش کا باعث ہے۔ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ ان آیات میں مخاطب مومنین ہیں اور اس کے باوجود انھیں ایمان لانے کی دعوت دی جارہی ہے، حقیقت میں اس سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگ ایمان کے ابتدائی اور ظاہری مراحل کو عبور کرکے اس کے عالی درجات تک رسائی حاصل کریں جن تک رسائی اعمال صالحہ اور جہاد ہی کے ذریعے ممکن ہے اس لئے کہ ایمان ایک ثمر بخش درخت ہے جس کی ابتدا چھوٹے سے پودے سے ہوتی ہے اور پھر اس کی شاخیں آسمانوں میں پھیل جاتی ہیں اور وہ انواع و اقسام کے پر برکت پھلوں سے لد جاتا ہے، یہ عمل کمال کے مختلف درجوں کو طے کرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔

ساتویں آیت میں اس پہلی آیت کے مضمون کو ایک دوسرے لباس میں پیش کیا گیا ہے، جو ایک ایسے معاملے کی منظر کشی کرتی ہیں جس میں خریدار خدا تعالیٰ اور فروخت کرنے والے مؤمنین ہیں اور سامان تجارت اہل ایمان کے جان و مال ہے اور اس کا معاوضہ دائمی جنت جاوداں اور اس کی سند اور تحریر تین عظیم آسمانی کتابیں تورات، انجیل اور قرآن ہیں، ارشاد حق تعالیٰ ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۫ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ؕ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ

یہ نفع بخش تجارت اپنے چاروں ارکان اور مضبوط اسناد (دستاویز) اور وثیقوں کے ساتھ ایک ایسی اہم تجارت ہے جو ممکن ہے ایک شخص کے لئے ساری عمر جاری رہے، یہی وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ فوراً اور بلا فاصلہ مؤمنین کو اس سود مند معاملے کی مبارک باد پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: ''یہ معاملہ جو تم نے خدا کے ساتھ کیا ہے تمہیں مبارک ہو، اور یہ ایک عظیم کامیابی ہے۔''

فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿١١١﴾

جی ہاں! یہی وہ الٰہی ترغیبات تھیں جو اسلامی سپاہ کے عزم و ہمت کو عالی ترین سطح پر لانے کا سبب بنیں، اور وہ افراد کی کمی اور بے سروسامانی کے باوجود جلد ہی مشرق و مغرب میں موجود دشمنوں پر چھا گئی۔

آٹھویں آیہ کریمہ میں پھر مومنین سے خطاب کر کے انھیں دشمن کے حملوں کے مقابلے میں صبر و ہمت اور آمادگی کا حکم دیتے ہوئے فرماتا ہے:

''اے اہل ایمان! صبر کا مظاہرہ کرو اور دشمن کے مقابلے میں استقامت و پامردی اختیار کرو، سرحدوں کی نگرانی بھی انجام دو اور خدا کی معصیت اور نافرمانی سے اجتناب کرو تا کہ تم کامیاب قرار پاسکو۔''

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۣ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۲۰۰

اس آیہ شریفہ میں اہل ایمان کو چار اہم حکم دیئے گئے ہیں جن پر عمل کرنا ان کی سربلندی، کامیابی اور عزت کا ضامن ہے۔

پہلا حکم مختلف حوادث اور خواہشات نفس کے مقابلے میں صبر واستقامت کو اختیار کرنا ہے۔ اس سلسلے میں ارشاد ہوتا ہے: اصْبِرُوْا (صبر کرو) کیونکہ حقیقت میں صبر ہی تمام کامیابیوں کا اصلی سبب ہے۔ اس کے بعد مصابرہ (جو باب مفاعلہ سے ہے) یعنی دشمن کے مقابلے میں صبر واستقامت کا اظہار، دوسرے الفاظ میں اس (مصابرہ) کا مفہوم یہ ہے کہ جس قدر مشکلات زیادہ شدید ہوں اسی قدر تمہارے صبر کو بھی زیادہ ہونا چاہیے اور جتنی دشمن کی استقامت زیادہ ہو اس سے کہیں زیادہ تمہاری پامردی اور استقامت ہوتا کہ دشمن مغلوب ہوجائے۔ (وَصَابِرُوْا)

تیسرے حکم کا تعلق ''مرابطہ'' کے ساتھ ہے، ارشاد ہے کہ ''وَرَابِطُوْا'' اس جملے کا مادہ اور ماخذ ''رباط'' ہے جس کا مطلب کسی چیز کو کسی جگہ باندھنا ہے۔ (مثلاً کسی جگہ گھوڑے کو باندھنا) اور یہ آمادگی کی طرف اشارہ ہے اور اس کا واضح نمونہ اور روشن مثال آمادگی اور سرحدوں کی نگرانی ہے، چونکہ اہل لشکر اس مقام پر اپنی سواریوں اور جنگی وسائل و آلات کو جمع کر کے ان کی نگرانی کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے بعض مفسرین نے اس کی تفسیر گھوڑوں اور سواریوں کو سرحدوں پر جمع کرنے اور دشمن کے مقابلے میں آمادی سے کی ہے، اور انھوں نے یہاں تک کہا ہے کہ اس کے وسیع مفہوم کے دائرے میں آج کل کے آلات جنگ بھی آتے ہیں خواہ وہ بری، بحری اور ہوائی آلات ہوں یا دوسرے آلات جنگ ہوں۔[1]

البتہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ آیت شریفہ عقیدتی اور ثقافتی سرحدوں کے بیان پر مشتمل نہیں کیونکہ ''رابطوا'' کا مفہوم اس قدر وسیع ہے کہ دشمن سے دفاع کے لئے ہر قسم کی آمادگی اس میں داخل ہوسکتی ہے، لہٰذا بعض روایات میں علماء کو سرحدوں کے محافظ قرار دیا گیا ہے جو ابلیس کے لشکر کے سامنے سینہ سپر ہو کر ان لوگوں کو اس لشکر کے حملوں سے بچاتے ہیں جو اپنے دفاع سے قاصر ہوتے ہیں۔ امام جعفر صادق -فرماتے ہیں:

---

[1] تفسیر مراغی، ج ۴، ص ۱۷۲۔

"عُلَمئُ شیعَتِنا مُرابِطُونَ فِی الثَّغرِ الَّذی یَلِی اِبْلِیسَ وَ عَفاریتَهُ وَ یَمْنَعُونَهُ عَنِ الْخُرُوجِ عَلٰی ضُعَفاءِ شیعَتِنا وَ عَنْ اَنْ یَتَسَلَّطَ عَلَیْهِمْ اِبْلِیسُ"

ہمارے شیعہ علماء وہ سرحدی محافظ ہیں جو ابلیس کے لشکر کے سامنے صف آراء اور ضعیف شیعوں پر اس لشکر کے حملے سے ان کا دفاع کرتے ہیں۔[1] یہاں تک کہ حضرت علیؑ سے مروی بعض روایات میں ''رابطوا'' سے یکے بعد دیگرے نمازوں کا انتظار مراد لیا گیا ہے۔[2]

کہ یہ بھی درحقیقت لشکر شیطان کے مقابلے میں تیار رہنے کی ایک صورت ہے۔ (غور فرمائیں) چوتھا حکم تقویٰ الٰہی اختیار کرنا ہے، یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ صبر واستقامت اور مرابطہ سب تقویٰ، اخلاص اور پرہیزگاری کے ہمراہ ہوں اور انھیں ہر قسم کے دکھلاوے، اور ریاکاری سے پاک ہونا چاہیے۔ نویں آیت یہ حکم دیتی ہے کہ دشمنوں کے خلاف دو محاذوں پر جنگ کرو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آو، داخلی دشمنوں یعنی منافقین اور دوسرے بااثر عناصر کے خلاف جو مسلمانوں کے درمیان کسی نہ کسی جگہ موجود ہوتے ہیں اور اسلامی حکومت کو کمزور کرنے کے لئے ہر موقعے سے استفادہ کرتے ہیں اور بیرونی دشمنوں کے خلاف جن کی طرف کفار کے عنوان سے اشارہ کرتے ہوئے قرآن فرماتا ہے:

''اے رسولؐ کفار و منافقین کے خلاف جنگ کرو اور ان کے ساتھ شدت سے پیش آو، ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور کیا ہی برا انجام ہے ان کا!''

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْهِمْ ؕ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ

البتہ جہاد ایک وسیع مفہوم کا حامل ہے جس کے دائرے میں مسلح جنگ، ثقافتی اور معاشرتی جنگیں، سختی، تلخ کلامی اور دھمکی وغیرہ سبھی آجاتے ہیں اس بنیاد پر اگر روایات میں ہمیں یہ ملتا ہے کہ رسول اکرمؐ نے منافقین کے خلاف مسلحانہ طور پر جنگ نہیں کی (جیسا کہ امام جعفر صادقؑ کی روایت میں آیا ہے کہ اِنَّ رَسُولَ اللهِ لَمْ یُقاتِلْ مُنافِقاً قَطُّ)[3] تو یہ بات مذکورہ آیت کے منافی نہیں۔

آیت کریمہ میں جو کچھ ذکر ہوا ہے ایک حکم کلی ہے کہ اگر منافقن مقررشدہ حدود کی خلاف ورزی نہ کریں تو ان کے خلاف فقط غیر مسلح اقدامات کئے جائیں گے، لیکن اگر ان کی سازشیں خطرناک حد تک بڑھ گئی ہوں تو ان کے خلاف مسلحانہ جہاد کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں، جیسا کہ حضرت علیؑ کے دور میں کئی دفعہ یہ صورتحال پیش آئی۔ دوسرے الفاظ میں اگرچہ رسول اکرمؐ کا منافقین کے ساتھ نرم رویہ تھا،

---

[1] بحار، ج ۲، ص ۵۔

[2] مجمع البیان، ج ۱۱ اور ۲، ص ۵۶۲۔

[3] مجمع البیان، ج ۱۰، ص ۳۱۹۔

لیکن کتاب فی ظلال القرآن میں سید قطب شہید کے مطابق نرمی کا اپنا مقام ہے اور شدت وسختی کا اپنا اور ان میں سے ہر ایک اگر اپنی جگہ استعمال نہ ہو تو نقصان دہ ثابت ہوگی۔ بنا بریں پر کوئی مشکل نہیں کہ خاص حالات میں ان کے ساتھ نرم رویہ اپنایا جائے اور دوسرے حالات میں نہ صرف سختی بلکہ مسلح اقدامات بھی کئے جائیں۔[1]

دسویں اور آخری آیت میں مجاہدین اور اسلام کی عسکری طاقتوں کے بلند مرتبے اور دوسروں پر ان کی واضح برتری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن فرماتا ہے:

''وہ مؤمنین جو کسی بیماری، پریشانی یا قابل قبول عذر کے بغیر جہاد سے پہلوتہی کرتے ہیں، ان مجاہدین کے برابر نہیں جو راہ خدا میں اپنی جان ومال کے ساتھ جہاد کرتے ہیں؛ بلکہ خدا تعالیٰ نے جان ومال کے ساتھ جہاد کرنے والے ان مجاہدین کو گھروں میں بیٹھے رہنے والوں پر اہم فضیلت عطا کی ہے اور ان میں سے ہر ایک کے ساتھ (ان کے نیک اعمال کی مناسبت سے) ثواب کا وعدہ کیا ہے، لیکن مجاہدین کو قاعدین پر ایک خاص اور عظیم فضیلت بخشی ہے۔''

لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۭ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ۭ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ۭ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ۹۵

اس طریقے سے قرآن مجید مسلمانوں کو مجاہدین اور پیچھے رہ جانے والوں کے دو گروہوں میں تقسیم کرتا ہے اور پھر قاعدین کے بھی دو حصے بنا دیتا ہے: ''ناتواں اور معذور افراد'' اور ''توانا وصحیح وسالم افراد''، جنھوں نے سستی اور کاہلی کے باعث جہاد میں شرکت سے اجتناب کیا۔ بعد ازاں عظیم درجات، فضل کبیر اور اللہ کی رحمت ومغفرت کو صرف مجاہدین کے شامل حال قرار دیتا ہے۔ یہیں سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ آج کل معمولاً دشمن کے خلاف جنگ ایک خاص گروہ (فوج) کا فریضہ سمجھا جاتا ہے اس کے برعکس اسلام میں یہ ہر اس فرد کا فرض ہے جو اسلحہ اٹھانے اور دشمن کے خلاف لڑنے کی طاقت رکھتا ہے، یہی وجہ ہے کہ رسول اکرمؐ کے زمانے میں کوئی فوج تشکیل نہیں دی گئی تھی اور جنگ کے موقع پر اسلحہ اٹھانے کی طاقت رکھنے والے افراد قرآن مجید کی ہدایت اور اس کے حکم کے مطابق اسلحہ اٹھا کر میدان جنگ کا رخ کرتے تھے یعنی آج کل کی اصطلاح میں سب سے رضاکارانہ طور پر جنگ میں شرکت کرتے تھے اور یہی چیز مسلمانوں کی عظیم عسکری طاقت کا راز تھی۔

---

[1] فی ظلال القرآن، ج ۴، ص ۲۵۵۔

مسلح افواج اورعوامی رضا کار

مذکورہ بالا آیات کے علاوہ بہت ساری دوسری آیات سے بھی،حکومت اسلامی میں فوج اوراس کی خصوصیات کامل طور پر روشن ہو جاتی ہیں اور اسلامی عسکری نظام اور دوسرے معاشروں میں موجود عسکری اورفوجی نظام کے مابین فرق اور امتیاز نمایاں ہوجاتا ہے۔

البتہ ہم چونکہ ایک ایسے زمانے میں ہیں جس میں عسکری فنون بہت پیچیدہ ہو چکے ہیں اوران کے بارے میں خصوصی مہارت درکار ہوتی ہے لہٰذا ان فنون میں ماہرافراد اور خصوصی مہارت رکھنے والے پڑھے لکھے اور تربیت یافتہ افسران سے استفادہ کئے بغیر کوئی چارہ نہیں۔اس طرح لازم ہے کہ کچھ افراد مسلح افواج کے طور پر موجود رہیں جورات دن اہم دفاعی امور پر غور وفکر کریں اور ہروقت دشمن کے مقابلے کے لئے آمادہ رہیں،لیکن اس کے باوجود عوامی رضا کاروں کا کردار اپنی جگہ پر محفوظ ہے اوران کی اہمیت مسلم ہے بلکہ ان کے بغیر فوج بھی مطلوبہ نتیجے تک نہیں پہنچ سکتی، چنانچہ آٹھ سالہ ایران وعراق کی باہمی جنگ میں اس عظیم قوت کے کردار کا بخوبی مشاہدہ ہو چکا ہے کہ اگر یہ رضا کارانہ ہوتے تو ایران کا ایک بڑا حصہ عراقی حملے کے نتیجے میں ہاتھ سے نکل جاتا،یہی رضا کارفوج تھی جس نے صدام کی سپار کو، جسے سپر طاقتوں کی حمایت حاصل تھی، پیچھے دھکیل دیا تھااوران کے منصوبے خاک میں ملادیئے تھے۔

لہٰذا اگر کہا جائے رضا کارفوج ایک خاص زمانے، مثلاً زمانۂ رسول اکرمؐ کے ساتھ مخصوص تھی، چونکہ اس زمانے میں آج کی طرح پیچیدہ فنون عسکری موجود نہیں تھے تو ایسے لوگوں کی یہ سوچ بالکل غلط ہے۔آج بھی عوامی رضا کارفوج کا اسلامی ممالک کے دفاع میں کردار قابل انکار نہیں۔

اس بات کا دوسرا شاہد فلسطینی سپاہی ہیں،ہم جانتے ہیں کہ مقبوضہ علاقوں میں اسرائیل کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کرنے والی یہی رضا کار فوج ہے، ایک ایسی فوج جس میں چھوٹی عمر کے نوجوان شریک ہیں اور جو اسلحے سے محروم ہونے کی وجہ سے پتھروں سے استفادہ کرتے ہیں!اگر ہم اس مطلب کا چشم دید مشاہدہ نہ کرتے تو یہ بات ناقابل یقین تھی کہ پیچیدہ اسلحہ،ایٹمی بم، پیشرفتہ میزائل جن کی رسائی ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک ہے، کے اس زمانے میں لوگ پتھر کے اسلحے کے ساتھ میدان میں آئیں اورانہی پتھروں کے ساتھ دشمن کو بے بس کردیں!مقبوضہ فلسطین میں اسرائیل کے مقابلے میں کوئی منظم فوج نہیں، جو کچھ ہے یہی رضا کار ہیں جنھوں نے وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ کافی تجربات حاصل کر لئے ہیں اور میدان عمل میں ایک تربیت یافتہ لشکر کی طرح لڑ رہے ہیں اور بعض افراد اس ابتدائی انداز کی جنگ میں مشغول ہیں اور دشمن جو پاؤں سے لے کر سر تک مسلح ہے، کو بے چارگی اور بے بسی کا نمونہ بنا دیتے ہیں!

بنابریں حکومت اسلامی کو رضا کارفوج سے استفادہ کرنے کی اسلامی سنت سے صرف نظر نہیں کرنا چاہیے۔اگر رضا کار افراد دنیا میں کم نظر آتے ہیں اور صنعتی طور پر ترقی یافتہ حکومتیں ان (رضا کاروں) سے استفادہ نہیں کرسکتیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک عظیم فریضۂ الٰہی کے عنوان سے جہاد کے واجب ہونے کا عقیدہ ان کے ہاں نہیں، وہ جنگ کو صرف حکومت کی ذمہ داری سمجھتے ہیں لیکن اسلام میں یہ ہرایک فرد کی ذمہ داری ہے۔شہادت کی اعلیٰ قدر و قیمت اور شہداء کی انتہائی عظمت ایک ایسی چیز ہے کہ اسلام کے علاوہ اس کا کہیں اور نام ونشان موجود نہیں، یہی وجہ ہے کہ رضا کاروں جیسی جان نثاری وفدا کاری دوسروں کے پاس نہیں،لیکن یہی جذبہ مسلمانوں میں ہمیشہ سے موجود رہا ہے۔

البتہ وہ ممالک جن پر یہ ثقافت حکم فرما نہیں، جب انتہائی مجبور ہوجاتے ہیں اور ان کا ملک تباہی و بربادی کے دہانے پر کھڑا ہوتا ہے تو اس وقت ممکن ہے کہ عوامی رضا کار فوج تشکیل دیں، لیکن اسلام میں ہمیشہ اور ہر حال میں ایسی رضا کار طاقت موجود رہی ہے۔ لہٰذا حکومت اسلامی کو چاہیے کہ وہ اس دینی ثقافت کی مزید قدر و قیمت کی قائل ہو اور عوامی رضا کار فوج کو حالت صلح میں بھی غیر معمولی اہمیت دے، بلکہ رضا کاروں کو مرحلہ وار ترقی یافتہ فنون جنگ کی تربیت دے تا کہ خطرے کی صورت میں تمام تربیت یافتہ افراد کو میدان جنگ کی طرف روانہ کیا جا سکے۔

شہداء کی تعظیم و تکریم اور ان کے خاندان کا احترام اور اس کی مادی و معنوی قدردانی اسلامی احکام کا ایک حصہ ہے اور ان تدبیروں میں سے ہے جن کی وجہ سے اسلامی رضا کاروں کا عزم و حوصلہ محفوظ اور قائم رہتا ہے اور اگر اس بات کو بھلا دیا جائے تو یہ اسلامی رضا کاروں کے عزم و ہمت کی کمزوری کا باعث ثابت ہوگی۔ کس قدر خوبصورت ہے کہ ہماری مساجد کے ساتھ رضا کاروں کے مرکز بھی تشکیل دیئے جاتے ہیں اور رضا کاروں کی سرگرمیاں نماز کی طرح عبادت کی حیثیت رکھتی ہے، یہ ایسے امور ہیں جو فقط عقیدے اور مذہبی ثقافت کے زیر سایہ ہی ممکن ہیں۔

فوجی تربیت

آیت شریفہ

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ (سورۂ انفال/ ۶۰)

جس کی وضاحت گذشتہ بحث میں بیان ہو چکی ہے، اسے بخوبی استفادہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ امن و امان کی حالت میں بھی اپنی فوجی طاقت کی حفاظت کریں اور آئے دن فنون جنگ میں جو ترقی ہو رہی ہے اس کے مطابق مسلسل فوجی تربیت میں بھی جدت کا مظاہرہ کریں، اسی طرح جدید ترین جنگی آلات کو ہر قیمت پر حاصل کریں اور اس بات کے پیش نظر کہ آیت کریمہ میں مذکور لفظ **قوۃ** تمام معنوی، مادی، انسانی اور غیر انسانی قوت و طاقت پر مشتمل ہے، لہٰذا ان سب قوتوں کے لحاظ سے آمادہ رہیں۔ سورۂ نساء کی آیت ۷۱ میں ارشاد ہوتا ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا﴿٧١﴾

''اے ایمان والو! دشمن کے مقابلے میں اپنی استعداد اور آمادگی کی حفاظت کرو حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اور دشمن کے طرف ایک دستے یا کئی دستوں کی صورت میں حرکت کرو''

اس بات پر توجہ کرتے ہوئے کہ حِذر (جو خضر کے وزن پر ہے) کا مطلب خطرے کے مقابلے میں بیداری، ہوشیاری اور آمادگی ہے اور کبھی اس وسیلے اور آلہ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جس کی مدد سے خطرے کا مقابلہ کیا جاتا ہے، اس لحاظ سے بھی مسلمانوں کی دشمن کے مقابلے میں دائمی آمادگی کی ضرورت بخوبی روشن ہو جاتی ہے۔ جملہ "**فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ أَوِانْفِرُوْا جَمِيْعًا**" میں اگر ''نفر کہ جو کوچ کرنے کے

معنیٰ میں ہے کو مدنظر رکھا جائے تو یہ اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ مسلمانوں کو غافل نہیں رہنا چاہیے کہ دشمن ان پر حملہ کردے بلکہ انھیں چاہیے کہ دشمن کے حملے سے قبل اس پر حملہ کردیں اور اس امر کے لئے مختلف طریقوں سے استفادہ کیا جائے، کبھی پراگندہ اور بکھرے ہوئے گروہوں کی صورت میں اور کبھی ایک منظم لشکر کی طرح دشمن پر حملہ کریں، بہرحال یہ سب کچھ وقت کے تقاضوں کے مطابق ہونا چاہیے۔

سبق ورمایہ (سواری اور تیراندازی کا مقابلہ)

اسلام میں عسکری اور فوجی تربیت کے سلسلے میں نہ صرف تیراندازی اور گھڑسواری کی ترغیب دلائی گئی ہے بلکہ مقابلے اور ہار جیت کی شرط لگانے کی بھی اجازت دی گئی ہے، باوجود اس کے اسلام جوئے اور ہار جیت میں شرط بندی کے سخت خلاف ہے اور اسے گناہ کبیرہ شمار کرتا ہے لیکن اس موضوع کو بعض مخصوص مقاصد کی خاطر حرمت کے دائرے سے خارج قرار دیا گیا ہے۔

امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:

"اِنَّ الْمَلائِكَةَ لَتَنْفِرُ عِنْدَ الرِّهانِ، وَتَلْعَنُ صاحِبَهُ ما خَلاالْحافِرَ وَالْخُفَّ وَالرِّيشَ وَالنَّصلَ"

فرشتے ہار جیت کی شرط بندی کے وقت دور ہوجاتے اور اس عمل سے نفرت کرتے ہیں اور شرط لگانے والوں پر ان کی لعنت ہوتی ہے، لیکن گھڑسواری اور تیراندازی پر شرط بندی اس سے مستثنیٰ ہے۔[1]

دلچسپ بات یہ ہے کہ اس قسم کے مقابلے رسول اکرمؐ کی موجودگی میں اور کبھی آپؐ کے مالی تعاون کے ذریعے انجام پاتے تھے، امام زین العابدین -ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

"اِنَّ رَسُولَ اللهِ(ص) اَجْرى الْخَيْلَ وَجَعَلَ سُبَقَها اَواقِيَ مِنْ فِضَّةٍ"

رسول اکرمؐ نے گھڑسواری کے مقابلے کا حکم دیا اور مقابلے کے مال کے طور پر کئی اوقیہ چاندی مقرر فرمائی (یعنی مقابلہ جیتنے والے کے لئے یہ انعام مقرر فرمایا)۔ حتیٰ کہ بعض روایات کے مطابق آپؐ نے بعض مقابلوں میں ذاتی طور پر شرکت فرمائی![2]

---

[1] وسائل الشیعہ، ج ۱۳، ص ۳۴۷، حدیث ۶، باب ۱ (کتاب سبق ورمایہ) بعض علماء نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ لفظ "نصل" کا فقط تیر ہی معنی نہیں بلکہ اس کے دائرے میں تمام تیز نوک والے آلات آجاتے ہیں جیسے نیزہ وخنجر وغیرہ کہ انھیں دور پھینکنے کا مقابلہ ہوتا تھا، اسی طرح لفظ "خف" شترسواری اور ہاتھی کی سواری کے مقابلے پر بھی مشتمل ہے اور "حافر" گھوڑے کے علاوہ تمام سم دار چار پایوں پر بھی مشتمل ہے۔ "ریش" پر کے معنی میں ہے جو تیر کی طرف اشارہ ہے چونکہ عام طور پر تیروں کے پچھلے حصے میں "پر" لگاتے تھے تاکہ تیر کی حرکت کو منظم کرے۔

[2] وسائل الشیعہ، ج ۱۳، ص ۳۴۹، حدیث ۵، اور ص ۳۵۱، حدیث ۴۔

آداب جہاد

کسی مکتب کی اصلیت اور حقیقت کو جاننے اور پرکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ دشمن کے خلاف خاص طور پر میدان جنگ میں اور اس کے بعد جنگی قیدیوں کے ساتھ، اس کے سلوک اور جنگی نتائج وعواقب کے مقابلے میں اس کے طرز عمل کی تحقیق کی جائے۔ قرآنی آیات اور احادیث، آداب جنگ کے ضمن میں اس حقیقت کو واضح انداز میں ثابت کرتی ہیں کہ اسلام نے سخت ترین ماحول یعنی میدان جنگ میں بھی اخلاقی اور انسانی مسائل کو نظرانداز نہیں کیا ہے۔ اور ہر جگہ قہر وغضب کو لطف اور سختی وتندی کو رحمت وشفقت کے ساتھ مخلوط کیا ہے، یقینی طور پر حکومت اسلامی کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان آداب کو؛ جو اسلام سے بیگانہ افراد کی طرز قضاوت پر گہرے نقوش چھوڑتے ہیں اور جن (آداب) میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اسلام کی طرف توجہ مبذول کرانے اور اس کے بارے میں تجدید نظر کا باعث بن سکیں؛ عمل میں لائے اور ان کو عملی جامہ پہنائے۔ قرآنی آیات میں کئی بار عدالت اور دشمن کے مقابلے میں معقول اور انسانی حدود سے تجاوز نہ کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ ایسی آیات میں سے ایک سورۂ بقرہ کی آیت ۱۹۰ ہے جس میں فرمایا گیا ہے:

وَقَاتِلُوا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۹۰﴾

''وہ لوگ جو تم سے جنگ کرتے ہیں ان کے خلاف اللہ کی راہ میں (اس کی خاطر) جنگ کرو اور حد سے تجاوز اور تعدی نہ کرو بے شک خدا تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

اس آیت شریفہ میں درحقیقت تین نکتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے؛ پہلا نکتہ یہ کہ جنگ کو خدا کے لئے اور اس کی راہ میں ہونا چاہیے نہ کہ جاہ طلبی اور انتقام کی خاطر۔ دوسرا نکتہ یہ کہ جنگ کو تجاوز کرنے والوں کے خلاف ہونا چاہیے یعنی جب تک جنگ تم پر ٹھونسی نہیں جاتی اس وقت تک اسلحہ اٹھانے سے گریز کرو۔ تیسرا نکتہ یہ کہ میدان جنگ میں حد سے تجاوز نہ کرو اور اخلاقی اصول کا لحاظ رکھو، بنابریں اگر دشمن اپنا اسلحہ زمین پر رکھ کر جنگ سے دستبردار ہو جائے تو اس پر حملہ نہ کرو، اسی طرح ان لوگوں کو ہرگز نہ چھیڑا جائے جو جنگ کی طاقت سے محروم ہیں مثلاً بوڑھے افراد، بچے اور عورتیں وغیرہ باغات اور کھیتوں کو تباہ کرنا، قابل استفادہ گھروں کو مسمار وویران کر دینا، ایسا اسلحہ استعمال کرنا جس کے باعث لوگوں کے گروہ کے گروہ قتل ہو جائیں یہ سب بے گناہوں پر ظلم وستم اور غیر انسانی طریقوں کی مثالیں ہیں جو اسلام کی نظر میں ممنوع ہیں۔ اسی سورۂ بقرہ کی آیت ۱۹۴ میں اسی چیز پر مزید تاکید کرتے ہوئے قرآن مجید فرماتا ہے:

فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾

''جو کوئی تم پر تجاوز کرے اسی طرح سے تم بھی اس پر تجاوز کرو اور خدا سے ڈرو (حد سے زیادہ تجاوز سے

پرہیز کرو) اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ پرہیز گاروں کے ساتھ ہے۔''

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر تم خدا کی مدد اور نصرت کے خواہاں ہو تو ضروری ہے کہ ظلم و تعدی سے میدان جنگ میں بھی اجتناب کرو۔ اسی معنی پر ایک دوسری شکل میں سورۂ مائدہ کی آیت ۲ میں تاکید کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ صراحت کے ساتھ فرماتا ہے:

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ؕ

''وہ لوگ جنہوں نے (صلح حدیبیہ کے موقع پر) تمہیں مسجد الحرام میں داخل ہونے سے منع کیا ان کے ساتھ خصومت اور عداوت اس بات کا باعث نہیں بنی چاہیے کہ تم ان پر ظلم و ستم اور تجاوز کرو (اور دشمن کے حدیبیہ میں سخت گیرانہ رویے کی وجہ سے تمہارا انتقامی جذبہ تم پر غالب نہیں آنا چاہیے)

احادیث میں بھی دشمن کے خلاف میدان جنگ میں اور جنگ کے خاتمے کے بعد اصول انسانی کی رعایت کے سلسلے میں مختلف بیانات کی صورت میں بکثرت احکام موجود ہیں جن میں انسانی جذبات اور صلح پسند روح بخوبی نظر آتی ہے۔ صاحبان سیر نے حضور اکرمؐ کی سیرت کے بارے میں لکھا ہے کہ جب آپؐ کسی لشکر کو جنگ کی طرف روانہ کرتے تو لشکر کے سرداروں کو مع لشکر طلب فرماتے اور انھیں ارشاد و نصیحت کرتے ہوئے فرماتے: ''خدا کا نام لے کر چل پڑو اور خدا سے مدد مانگو اور اس کے لئے اور دین رسول خداؐ کا لئے جہاد کرو، اے لوگو مکر و فریب نہ کرنا اور جنگی مال غنیمت سے چوری کو جائز نہ سمجھنا اور دشمن کے قتل ہونے کے بعد اس کے اعضاء نہ کاٹنا، بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کو قتل نہ کرنا، غاروں اور ویرانوں میں پناہ گزین عابدوں اور راہبوں کو قتل کرنے سے پرہیز کرنا۔

درختوں کو جڑ سے نہیں اکھاڑنا مگر مجبوری کی صورت میں، کھجور کے درختوں کو مت جلانا اور نہ ہی انھیں دریا برد کرنا، پھلدار درختوں کو اکھاڑنے سے پرہیز کرنا، زراعت کو آگ نہیں لگانا چونکہ تم خود بھی اس کے محتاج ہو سکتے ہو، حلال گوشت جانوروں کو نہیں مارنا مگر اسی قدر جو تمہاری غذائی ضرورت پوری کر سکے، دشمن کے پانی کو زہر آلود نہ کرنا اور کسی حیلے اور فریب سے کام نہ لینا۔'' آنحضرتؐ نے خود بھی دشمنوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک روا رکھا، دشمن پر کبھی شبخون نہیں مارا اور آپؐ نفس امارہ کے خلاف جہاد کو ہر چیز سے بالاتر سمجھتے تھے۔ [1]

مندرجہ بالا احکامات پر غور و فکر جن میں نہایت باریک بینی کا لحاظ رکھا گیا ہے سے بخوبی ظاہر کرتا ہے کہ اسلام نے جنگ سے متعلق کسی اخلاقی مسئلے سے صرف نظر نہیں کیا اور رسول اکرمؐ بذات خود ان اخلاقی مسائل کا خیال رکھتے تھے، آپؐ کا رویہ ان لوگوں کی طرح نہیں تھا جو زبانی طور پر تو خوب حقوق انسانی اور رعایت حقوق بشری کا دم بھرتے ہیں، لیکن عملی طور پر ان کی باتیں صدا بصحرا ثابت ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ نفس کے خلاف جہاد' جو بہترین جہاد ہے' اس نکتے پر تاکید اور اس مطلب کی طرف اشارہ ہے کہ حقیقی مسلمان وہی ہے جو میدان جنگ میں انسانی اصولوں کی رعایت کرتا ہے۔

مذکورہ بالا بیان سے یہ نکتہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام کیمیائی اسلحہ اور ہر اس اسلحے کے خلاف ہے جو کئی لوگوں کے بیک وقت

---

[1] منتھی الآمال، ج ۱، ص ۱۶ (رسول اکرمؐ کے فضائل کے باب میں)، علامہ مجلسی نے بحار الانوار میں اسی کے مشابہ مطلب کو جلد ۹۷، صفحہ ۲۵ پر بیان کیا ہے۔

قتل کا باعث بنے اور اسے ممنوع قرار دیتا ہے لہٰذا اسلامی حکومت کا فریضہ ہے کہ وہ اس قسم کے اسلحوں سے مکمل طور پر پرہیز کرے۔ایک اور حدیث میں حضرت علیؑ فرماتے ہیں:

"فَإِذا كانَتِ الْهَزِيمَةُ بِإِذْنِ اللهِ فَلا تَقْتُلُوا مُدْبِراً وَلا تُصِيبُوا مُعْوِراً وَلا تُجْهِزُوا عَلى جَرِيحٍ وَلا تُهِيجُوا النِّساءَ بِأَذىً وَإِنْ شَتَمْنَ أَعْراضَكُمْ وَسَبَبْنَ أُمَرائَكُمْ"

''جب خدا تعالیٰ کے اذن سے انھیں شکست دے دو تو میدان سے بھاگنے والوں، ناتواں افراد اور مجروحین کو قتل نہ کرو اور عورتوں کو اذیتوں کے ذریعے هیجانی کیفیت سے دوچار نہ کرو اگر چہ وہ تمہیں گالیاں ہی کیوں نہ دیں اور تمہارے سرداروں کی بدگوئی ہی کیوں نہ کریں۔[1]

رسول اکرمؐ کی مذکورہ بالا حدیث میں جو کچھ بیان ہوا ہے کہ آپؐ ہمیشہ جنگ سے پہلے سرداران لشکر اور اہل لشکر کو جو تاکیدی نصیحت فرماتے' اس کے پیش نظر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ جہاد اور دشمن کے خلاف جنگ کے یہ احکامات اسلام کے اصلی دستورالعمل کا حصہ ہیں جسے زندہ رکھنے کے لئے اسلامی حکومت کو سرتوڑ کوشش کرنی چاہیے۔

جہاد کی اقسام

اگر چہ بعض محققین اسلامی جہاد کو دو قسموں ابتدائی جہاد اور دفاعی جہاد میں تقسیم کرتے ہیں اور یہ دو قسمیں آگے مزید قسموں میں تقسیم ہو جاتی ہیں، لیکن در حقیقت جہاد ابتدائی بھی جہاد دفاعی کی ایک قسم ہے جو آئندہ آنے والی توضیحات سے واضح ہو جائے گا، اس اشارے کے بعد دوبارہ ہم قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے ہیں اور جہاد کی انواع واقسام کے قرآنی بیان کو موضوع بحث بناتے ہیں:

ا۔ جہاد ابتدائی

سورۂ حج کی آیت ۳۹ میں جو بعض حضرات کی رائے میں جہاد کی سب سے پہلی آیت ہے، میں ارشاد حق تعالیٰ ہے:

أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰي نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُۨ ؀۳۹

''وہ لوگ جو دشمن کے حملوں کا نشانہ بنے ہیں انھیں جہاد کی اجازت دے دی گئی ہے، اور خدا تعالیٰ ان کی نصرت پر قادر ہے۔''

اس کے بعد اس آیت کے بعد مطلب کی وضاحت کے لئے ارشاد فرماتے ہیں:

"اَلَّذِينَ اُخْرِجُوا مِنْ دِيارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلاّ اَنْ يَقُولُوا رَبُّنَا اللّٰهُ"

---

[1] نہج البلاغہ، مکتوب ۱۴۔

''وہی لوگ جو بلا وجہ اپنے گھروں سے نکالے گئے (ان کا قصور اگر تھا تو یہی) کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب فقط اللہ ہے۔''

یہ آیت جس کی ابتدا ''اذن'' کے لفظ کے ساتھ کی گئی ہے ان لوگوں کی رائے کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتی ہے جو اسے پہلی آیت جہاد قرار دیتے ہیں اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے قبل ایسا کوئی اذن موجود نہیں تھا۔ بہر حال اس سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ حکم جہاد جس کی مشروعیت اور جواز کا حکم دیا گیا ہے وہ دشمن کے مقابلے میں دفاعی جہاد ہی ہے، وہی دشمن جنھوں نے مسلمانوں کو ہجرت اور اپنے گھروں کو بغیر کسی گناہ کے، چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ہاں! اگر ان کا کوئی گناہ تھا تو یہی کہ وہ توحید کے معتقد اور یکتا پرست تھے۔ بعض دوسرے مفسرین کی رائے میں پہلی آیت جہاد سورۂ بقرہ کی آیت ۱۹۰ ہے جو یہ کہتی ہے کہ

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ

''وہ لوگ جو تمہارے ساتھ برسر پیکار ہیں ان کے خلاف راہ خدا میں قتال کرو۔''

اگر ہم اس رائے کو مان لیں تو پھر بھی جہاد دشمن کے حملوں کا منہ توڑ جواب دینے کی اساس پر قائم ہے اور ہر صاحب عقل انسان جانتا ہے کہ خونخوار دشمن کے حملوں کے جواب میں خاموش رہنا کوئی عقلی اور منطقی عمل نہیں۔ ''فِي سَبِيلِ اللهِ'' سے تعبیر کرنا اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ اسلام کا دفاع بھی خواہشات نفس کی پیروی اور جاہ طلبی کی بجائے خدا کے لئے اور الٰہی معیار کے محور پر گھومتا ہے! یہ اسلام میں جہاد کی پہلی شکل ہے لیکن دفاعی جہاد کا ہرگز یہ مطلب نہیں لینا چاہیے کہ حکومت اسلامی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہے، یہاں تک کہ دشمن اہل اسلام کے گھروں پر حملہ کر دیں اور پھر وہ دفاع کی غرض سے اٹھ کھڑی ہو، بلکہ اس کے برعکس جب وہ محسوس کرے کہ دشمن جنگ کے لئے تیار ہے اور اس کا قصد اسلامی فوج پر حملہ کرنا ہے تو ضروری ہے کہ اسلامی حکومت پہل کرتے ہوئے ایسا کام کرے جس سے دشمن میں حملے کی طاقت ہی نہ رہے۔

۲۔فتنہ کی آگ کو بجھانے کے لئے جہاد

سورۂ بقرہ کی آیت ۱۹۳ میں ارشاد الٰہی ہے:

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۭ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۝۱۹۳

''اور ان (دشمنوں) کے خلاف جنگ کرو تا کہ فتنے کی آگ بجھ جائے اور اگر وہ رک جائیں اور فتنہ پردازی سے دستبردار ہو جائیں تو ان کے ساتھ مزاحمت نہ کریں اس لئے کہ ستم گروں کے علاوہ کسی پر تعدی (چڑھائی) کرنا جائز نہیں۔''

جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا گیا ہے کہ ''فتنہ'' کی تفسیر میں علماء کے درمیان اختلاف ہے،لیکن فتنہ کی ہم جو بھی تعبیر کریں چاہے اس سے مراد فساد پیدا کرنا یا مؤمنین کو اذیتوں کا نشانہ بنانا ہو، یا وہ شرک اور بت پرستی جو دوسروں پر اپنا عقیدہ مسلط کرنے کے ساتھ مخلوط ہو اور چاہے اس کا مطلب اہل ایمان کو فریب میں مبتلا کر کے انھیں گمراہ کرنے کی کوشش ہو، جو کچھ بھی ہو دشمن کی طرف سے حملہ شمار ہوتا ہے،لہٰذا اس (فتنہ) کے مقابلے میں بھی جہاد دفاعی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ جملہ "فَإِنِ انتَهَوْا فَلاَ عُدْوَانَ إِلاَّ عَلَى الظَّالِمِينَ" بھی بخوبی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مقصد فقط ظالموں کے ظلم وستم کا خاتمہ کرنا ہے۔قابل توجہ امر یہ ہے کہ اسی سورہ بقرہ کی آیت ۱۹۱ میں ہے:

وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ

''انھیں جہاں پاؤ قتل کر دو اور انھیں وہیں سے باہر نکالو جہاں سے انھوں نے تمہیں باہر نکالا ہے اور فتنہ قتل وغارتگری سے بدتر ہے۔''

یہ آیت،گزشتہ آیت کے پیش نظر کہ جس میں حملہ کرنے والے مشرکین کا ذکر ہے،واضح طور پر ان لوگوں کے خلاف جنگ کی دعوت دیتی ہے جنھوں نے مجرمانہ انداز میں حملے کر کے مسلمانوں کو ان کے گھروں سے نکال باہر کیا تھا خاص طور پر وہ جو مسلمانوں کو اپنا دین تبدیل کرنے کے لئے ان پر دباؤ ڈالتے اور سخت اذیتوں کا نشانہ بناتے تھے'قرآن نہ صرف ان لوگوں کے خلاف جنگ کو جائز بلکہ واجب قرار دیتا ہے۔

اگر چہ بعض روایات اور مفسرین کی عبارات میں ''فتنہ'' سے مراد شرک لیا گیا ہے؛لیکن آیۂ شریفہ اور اس کے قبل وبعد کی آیات میں ایسے قرائن موجود ہیں جو بخوبی ظاہر کرتے ہیں کہ اس سے مراد ہر قسم کا شرک اور بت پرستی نہیں بلکہ مراد مشرکین مکہ کے اعمال کی طرح کے اعمال ہیں،یعنی وہ مسلسل مسلمانوں کو اپنا عقیدہ تبدیل کرنے کے لئے اپنے جبر کا نشانہ بناتے تھے۔تفسیر المنار میں آیت کا مفہوم یوں بیان ہوا ہے:

"حَتّٰى لَا تَكُونَ لَهُمْ قُوَّةٌ يَفْتِنُونَكُمْ بِهَا وَ يُؤْذُونَكُمْ لِأَجْلِ الدِّينِ وَ يَمْنَعُونَكُمْ مِنْ إِظْهَارِهِ أَوِ الدَّعْوَةِ إِلَيْهِ"

ان کے خلاف جنگ جاری رکھو تا کہ دین کی تبدیلی اور اسلام کے اظہار اور اس کی طرف دعوت سے باز رکھنے کے لئے وہ تم پر ظلم وستم ڈھانے کی طاقت سے محروم ہو جائیں۔[1]

یقینی طور پر ایسا فتنہ اور آزادی سے محروم کرنا اور عقیدے کی تبدیلی کے لئے ہر قسم کا ظلم وستم روا رکھنا قتل سے بدتر ہے۔بنا برایں جملہ:''وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلّٰهِ '' اس بات کی طرف اشارہ ہوگا کہ ''فتنہ'' کی برطرفی اس میں ہے کہ ہر کوئی آزادی کے ساتھ خدا کی عبادت کرے اور کسی چیز اور کسی انسان سے نہ ڈرے، نہ یہ کہ مشرکین آزاد ہوں تا کہ خانہ کعبہ کو بت کدے میں تبدیل کر دیں اور پاک دل مسلمان علانیہ طور پر ''اللہ اکبر'' اور ''لا الہ الا اللہ'' بھی نہ کہہ سکیں۔بہر حال اس سورہ کی آیات ۱۹۰، ۱۹۱ اور ۱۹۳ جو سب آپس میں

[1] المنار، ج ۲،ص ۲۱۱۔

مرتبط ہیں بخوبی ظاہر کرتی ہیں کہ فتنے کی آگ کو بجھانا جہاد اسلامی کے لئے ایک ہدف کے عنوان سے حقیقت میں دفاعی پہلو کا حامل ہے جو مسلمانوں کو ثقافتی، معاشرتی اور عسکری دشمنوں کے حملوں سے بچاتا ہے۔

۳۔ مظلومین کی حمایت کی خاطر جہاد

سورۂ نساء کی آیت ۷۵ مسلمانوں کو مظلوموں کی حمایت اور ظالموں سے مقابلے کی دعوت دیتی ہے:

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ﴿۷۵﴾

''راہ خدا میں اور ان مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر جنھیں ضعیف و ناتواں بنا دیا گیا ہے، کیوں جہاد نہیں کرتے وہی مظلوم لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ اے خدا! ہمیں اس شہر (مکہ) سے جس کے رہنے والے ظالم و ستمگر ہیں، باہر کر دے اور ہمارے لئے اپنی طرف سے یاور و مددگار مقرر فرما!''

اس آیت کریمہ میں پہلے راہ خدا میں جہاد کی بات کی گئی ہے اور پھر فوراً ہی ان مظلوموں کا تذکرہ کیا گیا ہے جنھیں سنگدل دشمن نے اس قدر اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا ہے کہ وہ اپنے گھروں کو چھوڑنے پر راضی ہو گئے ہیں، ہماری رائے میں دونوں کی برگشت ایک ہی معنی کی طرف ہے؛ کیونکہ اس قسم کے مظلومین اور لاچار لوگوں کی مدد جہاد فی سبیل اللہ کا واضح اور روشن نمونہ ہے۔ یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ''مستضعف'' اور ضعیف کے درمیان ایک واضح فرق ہے، ضعیف، ناتواں اور کمزور شخص کو کہتے ہیں، لیکن مستضعف وہ ہوتا ہے جو اہل جور و ستم کے ظلم کے باعث ضعیف ہوا ہے، چاہے یہ تضعیف (کمزور کرنا) فکری و ثقافتی ہو یا معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی۔ (غور فرمائیں) واضح ہے کہ جہاد کی یہ قسم بھی دفاعی ہے، ظالموں کے مقابلے میں ان مظلومین کا دفاع، مذکورہ بالا تین مقاصد جہاد اسلامی کے حقیقی اور اصلی مقاصد ہیں، اگرچہ اسے جہاد ابتدائی اور جہاد دفاعی دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، لیکن روح و حقیقت سب کی جہاد دفاعی ہی ہے، یہی وجہ ہے کہ تاریخ اسلام میں ہمیں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا کہ جس سے ظاہر ہو کہ کفار مسلمانوں کے ساتھ صلح و مسالمت پر راضی اور آمادہ ہوں اور مسلمانوں نے ان کی اس خواہش کو ٹھکرا دیا ہو۔

آج بھی حکومت اسلامی کو کسی سے کوئی پرخاش نہیں اور جب تک جنگ اس پر ٹھونس نہیں دی جاتی وہ کسی کے ساتھ جنگ نہیں کرتی، لیکن مظلومین کے دفاع کو یہ اپنی اصلی ذمہ دار سمجھتی ہے اور دشمن کی طرف سے مرعوب کرنے، وحشت زدہ کرنے، ہر قسم کی پابندی، دباؤ اور آزادی سے محرومی کو ایک قسم کا اعلان جنگ سمجھتی ہے لہٰذا اپنے آپ کو دفاع کا ذمہ دار شمار کرتی ہے۔ ایک بار پھر ہم دہراتے ہیں کہ مفہوم دفاع یہ نہیں کہ انسان بیٹھ کر دشمن کے حملے کا انتظار کرے اور حملے کے بعد اسے اپنے دفاع کی سوجھے، بلکہ دشمن کی نقل و حرکت کو محسوس کرے اور جنگی آمادگی کو خاص طور پر نازک صورتحال میں محفوظ رکھے اور قبل اس کے غفلت کے عالم میں دشمن کے حملے کا نشانہ بنے، دشمن پر کاری ضرب لگا کر اس کے عزائم خاک میں ملا دے۔

حکومت اسلامی اور مسئلہ صلح

بلاشبہ جنگ اور خونریزی نہ صرف یہ کہ انسان کی فطرت سلیم کے ساتھ سازگار نہیں بلکہ کائنات کی تمام مخلوقات کے قوانین کے ساتھ بھی مناسبت نہیں رکھتی۔ظالمانہ اہداف تک رسائی کے لئے جنگ ایک قسم کی بیماری، انحراف اور شدت وسختی کا ذریعہ ہے، یہاں تک کہ حق وعدالت کی خاطر برپا کی جانے والی مقدس اور دفاعی جنگیں بھی صراط مستقیم سے کسی گروہ کے انحراف کے نتیجے میں وقوع پذیر ہوئی ہیں اور گاہے سالم افراد اور اقوام پر بھی مسلط کردی جاتی ہیں۔ جنگ کا نتیجہ ہمیشہ انسانوں اور سرمایہ کا ضیاع ،شہروں اور آبادیوں کی ویرانی اور دشمنی وخصومت میں شدت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ جب تک ممکن ہواس سے پرہیز کیا جائے بلکہ انسانوں اوران کی خدا دادصلاحیتوں کومعاشروں کی فلاح و بہبود کے لئے صرف ہونا چاہیے۔

ہم جانتے ہیں کہ انسان کے اندر ایک دائمی جنگ برقرار ہے جو بیماریاں پیدا کرنے والے بیرونی جراثیموں کے خلاف ہے، خون کے سفید جسیمے جو بدنی مملکت کے ہوشیار دفاعی سپاہی ہیں ان کا مقابلہ اور جنگ ان مختلف قسموں کے جراثیموں کے ساتھ ہوتا ہے جو پانی، ہوا، غذا اور جسم پر لگے زخموں کے ذریعے بدن میں داخل ہوجاتے ہیں۔ یہ جنگ بھی درحقیقت ایک دفاعی جنگ ہے اور اگرہمیں ایسا ماحول میسر آجائے جس میں یہ جراثیم بدن کی مملکت پرحملہ نہ کرسکیں تو یہ جنگ بھی ختم ہوجائے گی۔وہ صاحبان فکر ونظر جو استعماری طاقتوں کے مفادات میں کام کرتے ہیں،بعض اوقات کوشش کرتے ہیں کہ جنگ کو ایک ایسی چیز ثابت کریں جو انسانی فطرت کے موافق ہے اور تجاوز کرنے والوں کو یہ اجازت دیں کہ وہ طاقت کے ذریعے اپنی وسعت طلبی کے مقاصد واہداف تک رسائی حاصل کریں۔

یہ لوگ ڈارون ازم کے چار اصولوں میں سے ایک اصل یعنی بقاء کی جنگ کو اس بات کو ثابت کرنے کے لئے اپنی دلیل اور بہانہ قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں: انسانوں کے درمیان جنگ وتنازع ہمیشہ برقرار رہنا چاہیے اور اگر ایسا نہ ہوتو جمود اور سستی روئے زمین پر چھا جائے گی اور نسل بشر زمانہ قدیم کی طرف پلٹ جائے گی! لیکن دائمی جنگ اس بات کا باعث بنتی ہے کہ طاقتور زندہ رہیں اور کمزور چلتے بنیں،اس طرح انتخاب اصلح صورت پذیر ہوتا ہے!

بعض اوقات یہ لوگ قرآنی آیات کی اپنی رائے کے مطابق غلط اور انحرافی تفسیر کرکے اس سے اپنا مقصد پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔لیکن ان کی یہ دلیل بہت کمزور ہے کیونکہ بالفرض اگرہم ''اصل تنازع بقاء'' کو درندوں کے بارے میں قبول کرلیں۔کہ یہ بھی ڈارون ازم کے چاروں اصولوں پر تنقید کرنے والے دانشوروں کی رائے کے مطابق ناقابل قبول ہے،تو اس کا عالم انسانیت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، چونکہ انسان، تعاون بقاء اور سالم رقابت (مقابلے) کے ذریعے جس طرح آج کی دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ صنعتی اور سیاسی میدان میں مختلف گروہوں کے درمیان مقابلے کی فضاء میں انسان اپنی بقاء کو قائم رکھے ہوئے ہے اور امن وامان کے ماحول میں ان کی زندگی باقی اور جاری ہے،لہٰذا انسانوں کی زندگی کی اساس باقی رہنے میں تعاون ہے نہ باقی رہنے کے لیے جنگ ونزاع ہے۔

بہرحال ہمیں کوئی ایسی دلیل نہیں ملتی جو جنگ کی خوبی کو ثابت کرے، وہ بھی ایسی جنگ کی خوبی کو جس کے نقصانات صدیوں تک

قابل تلافی نہیں، چاہے وہ انسانی جانوں کے ضائع کی صورت میں ہو، یا صنعتی اور زرعی نقصان کی صورت میں جیسا کہ ہمارے زمانے کی جنگیں ایسی ہی ہیں۔ فقط ایک بیمار ذہن ہی اس قسم کی تباہ کُن جنگوں کی حمایت کرسکتا ہے۔اس اشارے کے ساتھ ہم اب قرآن مجید کی طرف رجوع کرکے حکومت اسلامی میں صلح طلبی کے موضوع پر گفتگو کرتے ہیں:

۱۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِى السِّلْمِ كَآفَّةً ۠ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۰۸﴾ (بقرہ/۲۰۸)

۲۔ وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۶۱﴾

(انفال/۶۱)

۳۔ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ﴿۹۰﴾ (نساء/۹۰)

۴۔ وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِىْ تَبْغِىْ حَتّٰى تَفِىْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ﴿۹﴾ (حجرات/۹)

۵۔ "وَالصُّلْحُ خَيْرٌ" (نساء/۱۲۸)

۶۔ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِى الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿۲۰۵﴾ (بقرہ/۲۰۵)

۷۔ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ (نساء/۹۴)

ترجمہ:

۱۔اے ایمان والو! سب کے سب صلح وآشتی میں داخل ہوجاؤ اور شیطان کے قدموں پر قدم نہ رکھو کیونکہ وہ تمہارا کھلم کھلا دشمن ہے۔

۲۔اگر وہ لوگ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کی طرف میلان ظاہر کرو اور خدا پر توکل کرو کہ وہ سننے اور جاننے والا ہے۔

۳۔......پس اگر وہ لوگ تم سے کنارہ گیری کر کے تمہارے ساتھ جنگ سے باز آجائیں اور صلح کی درخواست کریں تو خدا تعالیٰ تمہیں ان سے جنگ کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

۴۔ جب کبھی مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں اُلجھ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کراؤ اور اگر ان میں سے کوئی ایک دوسرے پر تجاوز کرتا ہے تو تجاوز گر کے ساتھ قتال کرو تا کہ وہ حکم خدا کی طرف واپس آ جائے اور جب جنگ سے برگشت کے لئے زمین ہموار ہو جائے تو ان کے درمیان عادلانہ انداز میں صلح کراؤ اور وانصاف سے کام لو کیونکہ خدا عدل وانصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

۵۔ اور صلح بہتر ہے۔

٦۔ جب وہ منہ پھیر لیتے ہیں اور آپؐ کے پاس سے اٹھ جاتے ہیں تو زمین پر فساد (اور خون ریزی) کی کوشش کرتے ہیں اور زراعت اور چوپایوں کو برباد کرتے ہیں (حالانکہ جانتے ہیں) کہ خدا تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا۔

۷۔...... جو اظہار صلح و دوستی کرے اسے مت کہو کہ تم مسلمان نہیں ہو۔

شرح وخلاصه

پہلی آیت میں تمام دنیا کے اہل ایمان کو صلح وآشتی اور امن وامان کے ساتھ رہنے کی دعوت دی گئی اور جنگ کو شیطان کے اقدامات قرار دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ''اے ایمان والو! سب صلح وآشتی میں داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدموں پر قدم نہ رکھو کیونکہ وہ تمہارا کھلم کھلا دشمن ہے۔''

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿٢٠٨﴾

اس آیۂ شریفہ میں ایک طرف سے اہل ایمان سے خطاب ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ صلح وسلامتی صرف سایۂ ایمان ہی میں میسر ہے۔

اور دوسری طرف سے لفظ ''كافة'' (سب) پر اعتماد اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ قانون صلح میں کوئی استثناء موجود نہیں جبکہ بغیر مجبوری کے جنگ اسلام اور قرآنی تعلیمات کے خلاف ہے۔

اور تیسری طرف سے ''خطوات الشيطان'' سے تعبیر کرنا، اس حقیقت کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ جنگ کے عوامل واسباب رفتہ رفتہ فراہم ہوتے ہیں اور جن وانس میں موجود شیاطین انسان کو قدم بقدم اس آگ کی طرف لے جاتے ہیں اور عربی کی ایک معروف ضرب المثل کے مطابق

''اِنَّ بَدْوَ الْقِتالِ اللِّعامُ!'' ایک خونی جنگ کا آغاز ایک طمانچے سے ہوتا ہے؛ لہٰذا جنگ کو پہلے مرحلے میں ہی ختم کر دینا

ضروری ہے۔

اور چوتھی طرف سے یہ استفادہ ہوتا ہے کہ ہر وہ کام جو صلح وامن کو ختم کرنے میں مددگار ثابت ہو ایک شیطانی عمل ہے؛ اور ایسا ہو بھی کیوں نہ؟ حالانکہ جنگ وہ آتش سوزاں ہے جو تمام مادی ومعنوی، انسانی اور غیر انسانی قوتوں کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے، خاص طور پر ہمارے زمانے کی جنگیں جو ہر زمانے کی جنگوں کی نسبت زیادہ وحشت ناک، تباہ کن اور مہنگی جنگیں ہیں اور اعداد وشمار جمع کرنے والوں کے مطابق ایک خونی جنگ کے نتیجے میں ہونے والے نقصانات کی تلافی بعض اوقات پورے سو سال میں بھی پوری نہیں ہوتی، وہ بھی مالی تلافی، ورنہ جانی تلافی ناممکن ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب خدا تعالیٰ نے فرشتوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ میں آدمؑ کو پیدا کرنا چاہتا ہوں تو فرشتوں نے اس مخلوق کے جس اہم عیب کی طرف اشارہ کیا وہ زمین پر خون ریزی اور فساد ہی تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے بڑھ کر ان کی نظر میں کوئی عیب نہیں تھا:

قَالُوٓا اَتَجۡعَلُ فِيۡهَا مَنۡ يُّفۡسِدُ فِيۡهَا وَيَسۡفِكُ الدِّمَآءَ ۚ (بقرہ/۳۰)

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ صاحبان لغت کے مطابق ''سلم'' اور ''سَلم'' ہر دو صلح کے معنی میں ہے کیونکہ اس کی ذات پاک صلح وامن اور سلامتی کا سرچشمہ ہے اور کتاب التحقیق کے قول کے مطابق مادہ سِلم (یعنی سلامت) خصومت کی ضد اور اس کے مقابلے میں ہے۔ جس کا لازمہ آفات ومصائب سے رہائی اور سلامتی وعافیت تک رسائی ہے اور اسلام کو اس وجہ سے اسلام کہتے ہیں کہ جو دنیا وآخرت میں صلح وسلامتی کا سرچشمہ ہے اور ''سُلَّمٌ''، جس کا معنی سیڑھی ہے، ایک ایسا آلہ ہے جس کے ذریعے انسان ایک بلند سطح پر جا کر سلامتی کے ساتھ واپس اتر سکتا ہے! حیرت انگیز بات یہ ہے کہ بعض مفسرین نے آیت کے لفظ ''سِلم'' کے معنی کے کئی احتمالات بیان کئے ہیں جن میں سے کوئی ایک بھی آیت کے ظاہری معنی کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا۔

دوسری آیت ان لوگوں کی طرف اشارہ کرتی ہے جو مسلمانوں کے ساتھ برسرپیکار ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے: اگر وہ لوگ صلح کرنے پر مائل ہوں تو تم بھی اس کی طرف مائل ہو اور خدا پر اعتماد کرو کہ وہ سننے اور جاننے والا ہے۔

وَاِنۡ جَنَحُوۡا لِلسَّلۡمِ فَاجۡنَحۡ لَهَا وَتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ﴿۶۱﴾

قابل توجہ امر یہ ہے کہ سورۂ انفال میں یہ آیت ایک ایسی آیت کے بعد واقع ہوئی ہے جو مسلمانوں کو ہمیشہ جنگ کے لئے تیار رہنے اور دشمن کو خوفزدہ کرنے کی خاطر ہر قسم کی طاقت وتوانائی فراہم کرنے کا حکم دیتی ہے، یعنی آخری ہدف اور مقصد جنگ نہیں بلکہ یہ بھی صلح کی تقویت اور اس کی اساس کو مضبوط کرنے کی ایک صورت ہے کیونکہ اگر جنگ کی پوری تیاری نہ ہو تو دشمن کی برتری کی طلب اور کشور کشائی کی ہوس کو لگام نہیں دی جا سکتی۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ ''جَنَحُوا'' کا مادہ ''جَناح'' ہے جس کا مطلب خضوع، میلان اور کسی چیز کی طرف حرکت کرنا ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ صلح کی ابتدائی گفتگو کا بھی خیر مقدم کرو۔ تَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ یعنی خدا پر بھروسہ کرو، جیسے الفاظ گویا اس نکتے

کی طرف اشارہ ہیں کہ جب دشمن صلح پر مائل ہوتا ہے تو بعض افراد منفی باتیں کرنا شروع کر دیتے ہیں اور صلح کی جانب ہر قسم کے میلان کو فریب اور مکر وحیلہ سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کی بھرپور مخالفت کرتے ہیں تا کہ کم از کم ان کے اندر وسوسہ ہی پیدا کر دیا جائے۔قرآن فرماتا ہے: جب صلح طلبی کی معقول علامتیں دشمن کی طرف سے ظاہر ہوں تو انھیں مثبت جواب دو اور خدا پر توکل کرو اور احتیاط کو پیش نظر رکھ کر کسی قسم کے وسوسے کی پروا نہ کرو!

یہ آیت ان آیات میں سے ایک ہے جو صلح طلبی کو ایک بنیادی اصل کے طور پر حکومت اسلامی کے سپرد کرتی ہے اور اسے اس اصل پر عمل کرنے کی تاکید کرتی ہے اور یہ جو بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ آیت، آیات جہاد کے ذریعے منسوخ ہو چکی ہے۔[1]

فقط ایک خیال ہے، جس پر کوئی دلیل موجود نہیں چونکہ آیات جہاد اور اس آیت کے درمیان کوئی تضاد نہیں اور نسخ پر اعتقاد کی کوئی ضرورت بھی نہیں۔تیسری آیت میں کفار کے ایک جنگجو گروہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن مجید فرماتا ہے:

''اگر وہ (کفار) تم سے کنارہ گیری کر کے جنگ سے دستبردار ہو جائیں اور صلح کی تجویز پیش کریں تو خدا تمھیں ان سے جنگ کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔''

فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا۝۹۰

''خدا تعالیٰ نے ان کے خلاف تمہارے لئے کوئی راہ مقرر نہیں کی'' کے الفاظ سے تعبیر کرنا، دشمن کی طرف سے دعوت صلح کو قبول کرنے کی پوری تاکید ہے، ایسی صلح جو شرافت اور سچائی پر مبنی ہو نہ کہ ذلت اور جھوٹ پر۔

قابل توجہ یہ ہے کہ اس آیت کے شان نزول کے بارے میں ذکر ہوا ہے کہ یہ ''اشجع'' نامی گروہ کے بارے میں نازل ہوئی، جب ان میں سے کچھ لوگوں نے مسعود بن رجیلہ کی سرکردگی میں مدینہ کے قریب پڑاؤ ڈالا۔رسول اکرمؐ نے اپنے کچھ نمائندے ان کی طرف بھیجے تا کہ ان کے سفر سے متعلق باخبر ہوں، انھوں نے کہا: ہم اس لئے آئے ہیں تا کہ محمدؐ کے ساتھ دشمنی ترک کرنے کا پیمان باندھیں (عہد کریں) (اور دوسرے لوگوں کے ساتھ تمہارے جھگڑوں میں غیر جانبدار رہیں)، رسول اکرمؐ نے کافی مقدار میں کھجوریں ان کے لئے تحفہ کے طور پر لے جانے کا حکم دیا اور ان کے ساتھ جنگ نہ کرنے کے پیمان پر آپؐ نے دستخط فرمائے۔

واضح ہے کہ آیت کا مفہوم ایک عمومی اور دائمی قانون پر مشتمل ہے اگرچہ شان نزول کوئی خاص واقعہ ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ معلوم ہے کہ شان نزول آیات کے عام اور غیر محدود مفہوم کو خاص اور محدود نہیں کرتا۔چوتھی آیت میں گفتگو ان جنگوں کے بارے میں ہے جو کبھی کبھار اسلامی مملکت کے اندر، دو مخالف گروہوں کے درمیان چھڑ جاتی ہیں یعنی مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں برسرپیکار ہو جائیں تو اس آیت کی رو سے تاکید ہے کہ ان کے درمیان صلح وصفائی کرائی جائے اور اگر صلح کے تمام راستے بند ہو جائیں تو باغی اور ظالم گروہ کے خلاف صلح

[1] تفسیر فخر رازی، ج ۱۵ ص ۱۸۷۔

کی برقراری کے لئے جنگ کرنا واجب ہے۔ اس ضمن میں ارشاد الٰہی ہے: جب کبھی اہل ایمان کے دو گروہ آپس میں جنگ ونزاع کریں تو ان کے درمیان صلح برقرار کرو۔

وَاِنۡ طَآٮِٕفَتٰنِ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اقۡتَتَلُوۡا فَاَصۡلِحُوۡا بَيۡنَهُمَا ۚ

اس کے بعد مزید فرماتا ہے: پس اگر ان دو میں سے ایک دوسرے پر تجاوز (ظلم) کرے تو ظالم گروہ کے خلاف قتال کرو یہاں تک کہ وہ حکم خدا کی طرف لوٹ آئے۔

فَاِنۡۢ بَغَتۡ اِحۡدٰٮهُمَا عَلَى الۡاُخۡرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِىۡ تَبۡغِىۡ حَتّٰى تَفِىۡٓءَ اِلٰٓى اَمۡرِ اللّٰهِ ۚ

اور پھر آخر میں مسئلہ صلح کی طرف دوبارہ رجوع کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے: پس اگر ظالم گروہ ظلم و جنگ سے باز آجائے تو ان دونوں کے درمیان عادلانہ انداز میں صلح برقرار کرو اور عدل وانصاف کو بروئے کار لاؤ کیونکہ خدا تعالیٰ عدل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

فَاِنۡ فَآءَتۡ فَاَصۡلِحُوۡا بَيۡنَهُمَا بِالۡعَدۡلِ وَاَقۡسِطُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُقۡسِطِيۡنَ ۞

آغاز آیت سے بخوبی استفادہ ہوتا ہے کہ اسلامی مملکت کے اندر صلح کی برقراری اور اختتام جنگ بھی ایک بنیادی قانون ہے کہ جس پر عمل کرانے کے لیے آخری کوشش کے طور پر جنگ تک کی جا سکتی ہے۔ اور ذیل آیت سے بھی اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ صلح کو عدل پر مبنی ہونا چاہیے نہ کہ ظلم اور ذلت پر، چونکہ غیر عادلانہ قسم کی صلح ہمیشہ متزلزل اور ناپائیدار ہوتی ہے اور اپنے اندر جنگی جراثیم کو پروان چڑھاتی ہے۔

قابل توجہ نکتہ یہ کہ اس آیت شریفہ میں کبھی عدل اور کبھی قسط کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ مفردات میں راغب اصفہانی کے بقول ''عدل'' ایک ایسا لفظ ہے جس سے مساوات کا مفہوم ملتا ہے اور ''قسط'' عادلانہ حصے اور نصیب کے معنی میں ہے (البتہ اگر یہ لفظ ''قسط'' ثلاثی مجرد کی صورت میں استعمال ہو تو دوسروں کا حصہ لینے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اس سے ظلم کا معنی سمجھا جاتا ہے، اور کبھی باب افعال یعنی اقساط کی صورت میں استعمال ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دوسروں کو ان کا حصہ دے دینا اور اس صورت میں اس سے عدل وعدالت کا معنی مراد لیا جاتا ہے)

راغب کے اس بیان اور دیگر بیانات کی رو سے کلمہ ''قسط'' اور ''عدل'' معنی ومفہوم کے اعتبار سے یکساں ہیں، لیکن ممکن ہے کہ ان کے درمیان یہ فرق موجود ہو کہ لفظ ''قسط'' و ''اقساط'' ایسی صورت میں استعمال ہوتے ہیں کہ جب بہت سے لوگ ایک چیز میں شریک ہوں، اگر ہر ایک کا حصہ کامل طور پر اسے دے دیا جائے تو یہ عمل ''قسط'' ہے لیکن اگر بعض کو بعض پر ترجیح دی جائے، تو یہ ظلم وستم ہے۔ لیکن عدالت کا مقابل ظلم ہے، یہ ایک وسیع تر مفہوم پر مشتمل ہے شرکت اور غیر شرکت کے ساتھ ساتھ دیگر صورتوں کے لئے بھی مستعمل ہے لہٰذا اگر کوئی مال کسی کا مسلم حق ہو اور وہ اسے دے دیا جائے تو عدالت اور اگر اسے نہ دیا جائے (یا اس سے اسے محروم کر دیا جائے) تو ظلم ہے۔ [1]

---

[1] حقیقت میں ان دونوں کے درمیان عموم خصوص مطلق کی نسبت ہے۔ ''قسط'' کا ایک خاص مفہوم ہے کہ جو صرف شرکت کی صورتوں پر مشتمل ہے جبکہ عدالت کا مفہوم وسیع تر ہے جو شرکت اور غیر شرکت دونوں پر مشتمل۔

پانچویں آیت میں ذاتی اور خصوصی اختلافات کو مدنظر رکھتے ہوئے حکم دیا گیا ہے کہ اگر مرد اور اس کی زوجہ کے درمیان اختلاف رونما ہو جائے تو ان کے درمیان صلح کرا دو، اس ضمن میں ارشاد ہے: اگر عورت (زوجہ) کو شوہر کی زیادتی، اس کی بے توجہی یا روگردانی کا خوف ہو تو ان کے آپس میں صلح کر لینے میں کوئی حرج اور مانع نہیں (اور ہر ایک صلح کی خاطر اپنے بعض حقوق سے چشم پوشی کرے) بعد ازاں اضافہ کرتا ہے کہ "صلح بہتر ہے" "وَالصُّلْحُ خَيْرٌ" درست ہے کہ اس جملے کا تعلق خاندانی اختلافات کی صورت کے ساتھ ہے، لیکن جملے کا مفہوم بہت وسیع ہے۔

جو دو افراد، دو گروہوں، دو قوموں یا دو ملکوں کے باہمی اختلاف کو بھی شامل ہو سکتا ہے۔ (غور فرمائیں) قابل توجہ یہ ہے کہ ان آیات میں جو یکے بعد دیگرے ذکر کی گئی ہیں، صلح کی تین صورتوں پر تاکید کی گئی ہے: مسلمانوں اور ان کے دشمنوں کے درمیان ہونے والی صلح جس کے دشمن خواہاں ہوں۔ مسلمانوں کے بعض گروہوں کے درمیان ہونے والی جنگ کے خاتمے کے لئے صلح۔ اور ایسے دو افراد کے درمیان صلح جو باہم نزاع و اختلاف کا شکار ہوں۔ عادلانہ اور آبرومندانہ انداز میں واقع ہونے والی صلح بہر حال مطلوب ہے اور اسلام اس کی حمایت کرتا ہے۔ حکومت اسلامی کی ذمہ داری بھی یہی ہے کہ وہ تینوں مرحلوں میں صلح کے ستونوں کو مضبوط کرے!

چھٹی آیت جو براہ راست صلح کی طرف اشارہ تو نہیں کرتی لیکن ایک واضح پیام ضرور دیتی ہے کیونکہ یہ بعض منافقین کے بارے میں یوں کہتی ہے: (وہ ایک پر فریب اور پر کشش ظاہر کا مالک ہے لیکن) جب تم سے روگردانی کرتا (اور تمہارے پاس اٹھ کر چلا جاتا) ہے تو زمین پر فساد برپا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور زراعت کو اجاڑتا اور چوپایوں کو ہلاک کرتا ہے اور خدا تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا۔

وَإِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۗ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ﴿۲۰۵﴾

اور اس کے بعد والی اسی سورۂ بقرہ کی آیت میں اس قسم کے لوگوں کو جہنم کے سخت عذاب کی خبر دی گئی ہے۔ واضح ہے کہ جنگیں زمین پر فساد، مال و وسائل کی بربادی، زراعت اور مویشیوں کی تباہی کے علاوہ اور کیا دیتی ہیں، اسی وجہ سے اسلام کی نظر میں یہ (جنگیں) قابل نفرت ہیں اور جب تک جنگ کا حقیقی سبب پیدا نہ ہوا اس وقت تک اس سے بہر طور گریز کرنا چاہیے، دوسرے الفاظ میں صلح ایک بنیادی قانون اور جنگ ایک استثنائی صورت ہے۔

نتیجہ

مجموعی طور پر مذکورہ بالا آیات سے بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ حکومت اسلامی صلح و صفائی اور دوستی کے ستونوں پر استوار ہے، اور قرآن میں یہ ایک معروف قانون کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ قانون اپنوں کے لئے بھی ہے اور اغیار کے لئے بھی یہاں تک کہ گھر کے افراد اور تمام عام افراد بھی اس قانون سے مستثنیٰ نہیں ہیں بنا بر ایں اسلام اس وقت تک کسی کو جنگ کی اجازت نہیں دیتا جب تک یہ جنگ اس پر مسلط نہ کر دی جائے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ مسلمان جنگ کی آمادگی سے دستبردار ہو جائیں تا کہ ان کی خاموشی سے دشمن کی حوصلہ

افزائی ہو اور وہ ان پر حملہ آور ہو جائیں اور اسی طرح یہ مطلب بھی نہیں کہ یہ آیات، ذلت آمیز اور کمزور صلح کی تاکید کر رہی ہیں کیونکہ یہ دونوں صورتیں جنگ کے عوامل و اسباب میں سے ہیں اور عادلانہ صلح کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں۔

احادیث میں بھی انسانی معاشرے کے اندر صلح و سلامتی کی خاطر ہر قسم کی کوشش کو سراہا گیا ہے اور اس کی تاکید کی گئی ہے یہاں تک کہ ایک حدیث شریف میں ہے کہ

"اَجْرُ الْمُصْلِحِ بَیْنَ النّاسِ کَالْمُجاهِدِ فی سَبیلِ اللّٰهِ"

لوگوں کے درمیان صلح و صفائی کرانے والے کا اجر و ثواب راہ خدا میں جہاد کرنے والوں کے برابر ہے۔"

یعنی یہ تصور نہیں کرنا چاہیے کہ راہ خدا میں جہاد کرنے والوں کا جو اجر عظیم بیان ہوا ہے وہ صلح کرانے والوں کو شامل حال نہیں ہوگا، بلکہ صلح کرانے کی کوشش کرنے والے لوگ میدان جہاد میں مورچوں میں بیٹھے ہوئے مجاہدین کی طرح ہیں۔ ایک اور حدیث شریف میں امیر المؤمنین علیؑ فرماتے ہیں:

"مِنْ کَمالِ السَّعادَةِ السَّعیِ فی صَلاحِ الْجُمْهُور"

"عوام الناس کی اصلاح کی کوشش کرنا خوش بختی سعادت کی انتہا ہے۔"[1]

ممکن ہے کہ یہ حدیث ایک وسیع مفہوم کی حامل ہو جس کی وجہ سے ہر قسم کی معاشرتی صلاح کو شامل ہو جائے، لیکن اس کے جنگ کے مقابلے میں صلح پر مشتمل ہونے میں کوئی شک نہیں۔ جناب مالک اشتر کو دیئے گئے فرمان میں، جو حکومت اسلامی سے متعلق موضوعات کی بنیاد ہے، صلح کی طرف میلان (مائل ہونے) کے بارے میں کچھ اس طرح بیان ہوا ہے:

"وَلا تَدْفَعَنَّ صُلْحاً دَعاكَ اِلَیْهِ عَدُوُّكَ وَلِلّٰهِ فیهِ رِضیً فَاِنَّ فِی الصُّلْحِ دَعَةً لِجُنُودِكَ وَ راحَةً مِنْ هُمُومِكَ وَاَمْناً لِبِلادِكَ"

"وہ صلح جس کی تجویز دشمن کی طرف سے پیش کی جائے اور خدا کی رضا بھی اس میں ہو، اسے مت ٹھکرانا، کیونکہ یہ صلح تمہاری سپاہ کے آرام اور تجدید قوت اور تمہارے لئے غم و اندوہ سے نجات اور تمہاری مملکت کے لئے امن و امان کا باعث ہے!"

اس مقام پر امام علیؑ نے صلح کے چار اہم فلسفے بیان فرمائے ہیں: لوگوں کے لئے امن و امان، لشکر کے لئے تازہ دم ہونے اور اپنی قوتوں کو یکجا کرنے کی فرصت اور ملک کے سربراہ کے لئے سکون اور راحت کا حصول۔ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ امامؑ کی نظر میں ہر صلح مفید نہیں بلکہ وہ صلح مفید ہے جو خدا کی رضا کی خاطر ہو یعنی جو مسلمانوں کی عزت و آبرو کا باعث اور عدل و انصاف کی وسعت و اشاعت کا سبب ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مالک اشتر کو یہ حکم بھی دیتے ہیں کہ صلح کے پیمان کے بعد دشمن پر کڑی نظر رکھی جائے کیونکہ بعض اوقات دشمن کا صلح

---

[1] غرر الحکم (منقول از میزان الحکمۃ، ج ۵، ص ۳۶۳)۔

سے مقصد غافل کرنا ہوتا ہے لہٰذا احتیاط اور دور اندیشی سے کام لیا جائے بلکہ یہاں حسن ظن بھی درست نہیں:

"وَلٰكِنَّ الْحَذَرَ مِنْ عَدُوِّكَ بَعْدَ صُلْحِهِ فَاِنَّ الْعَدُوَّ رُبَّمَا قَارَبَ لِيَتَغَفَّلَ فَخُذْ بِالْحَزْمِ وَاتَّهِمْ فِي ذٰلِكَ حُسْنَ الظَّنِّ"[1]

[1] نہج البلاغہ، مکتوب ۵۳۔

جنگی قیدی

اشارہ

ہمیشہ جنگوں میں کچھ لوگ قید ہو جاتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض اوقات سپاہی ایسے حالات میں گھر جاتے ہیں کہ جن کے باعث جنگ جاری رکھنا ان کے لئے ممکن نہیں ہوتا مثلاً کبھی ان کا جنگی سامان یا راشن ختم ہو جاتا ہے یا وہ دشمن کے محاصرے میں آ جاتے ہیں ایسی صورتحال میں ان کا جنگ جاری رکھنا خودکشی کے مترادف ہوتا ہے پس ایسے حالات میں وہ مجبوراً جنگ سے دستبردار ہو جاتے اور اپنی شکست تسلیم کر لیتے ہیں۔ عقل و منطق کا فیصلہ یہ ہے کہ ان اسیروں کو قتل نہ کیا جائے بلکہ انھیں میدان جنگ سے نکال کر کسی محفوظ جگہ پر زیر نگرانی رکھا جائے کیونکہ اس عمل سے دشمن کی بعض طاقت میدان جنگ سے خارج ہو جاتی ہے اس کے علاوہ ان کے ذریعے قیدیوں کے تبادلے کے طور پر اپنے قیدیوں کو دشمن کی قید سے چھڑایا جا سکتا ہے یا پیمان صلح کے وقت خصوصی مراعات حاصل کرنے، جنگ کے مزید جاری رہنے کو روکنے اور انھیں جیل میں ڈال کر دشمن پر نفسیاتی اثر ڈالنے کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ خونریزی کی آخر کوئی وجہ ہونی چاہیے لہٰذا جب دشمن اپنی شکست تسلیم کر لے تو اس صورت اس کا خون بہانے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔ ان وجوہات کے پیش نظر ہمیشہ جنگوں میں قیدی بنانے کا مسئلہ در پیش رہا ہے اور اسلام میں بھی جنگی قیدیوں کے بارے میں وسیع اور اہم احکام نظر آتے ہیں جن پر جنگی قیدیوں کے سلسلے میں عمل کرنا اسلامی حکومت کے لئے ضروری ہے۔ اس اشارے کے ساتھ ہی ہم دوبارہ قرآن کی طرف رجوع کر کے اس بارے میں قرآنی نقطۂ نظر سے آگاہی حاصل کرتے ہیں:

۱۔ فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ؕ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ۙ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً (محمد/۴)

۲۔ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِى الْاَرْضِ ؕ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖۗ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ (انفال/۶۷)

۳۔ يٰۤاَيُّهَا النَّبِىُّ قُلْ لِّمَنْ فِىْۤ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰٓى ۙ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِىْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّاۤ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (انفال/۷۰)

ترجمہ:

۱۔ جب میدان جنگ میں (حملہ آور) کفار کا سامنا کرو تو ان کی گردنیں مار دو (اور یہ کام جاری رکھو) یہاں تک کہ دشمن گھٹنے ٹیک دے، اس موقع پر اسیروں کو مضبوطی سے باندھ دو پھر یا تو ان پر احسان کرتے ہوئے

انھیں آزاد کردو یا ان سے ان کی آزادی کے بدلے میں فدیہ لو۔

۲۔ کسی نبی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ (دشمن) پر مکمل کامیابی حاصل کئے بغیر اسیر اور قیدی بنائے (اور زمین پر اپنے قدم مضبوط کرے) تم لوگ دنیا کی ناپائیدار متاع کے طالب ہو لیکن خدا تمہارے لئے آخرت کا خواہاں ہے اور خدا تعالیٰ قادر اور حکیم ہے!

۳۔ اے رسولؐ! جو قیدی تمہارے قبضے میں ہیں ان سے کہو: اگر خدا تمہارے دلوں میں کوئی خیر دریافت کرے (اور تمہاری نیتیں پاک ہوں) تو وہ جو تم سے لیا گیا ہے اس سے بہتر تمہیں عطا کرے گا اور تمہیں بخش دے گا اور خدا تعالیٰ بخشندہ و مہربان ہے۔

تشریح:

پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو مخاطب اور ان کی قاطعیت اور استقامت کو لازم قرار دے کر فرماتا ہے: جب میدان جنگ میں تم کفار کا سامنا کرو تو پوری طاقت کے ساتھ ان پر حملہ کرو اور ان کی گردنیں کاٹ ڈالو؛

فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ

واضح ہے کہ ''لقیتم ''میں ''لقاء'' جنگ کے معنی میں ہے نہ کہ اس سے مراد ہر قسم کی لقاء یعنی ملاقات ہے۔ آیت کا آخری حصہ جس میں جنگی قیدیوں کے بارے میں گفتگو ہے؛ اس بات کا بہترین شاہد ہے۔

اسلام میں جنگیں ہمیشہ مجبوری کی حالت میں کی جاتی ہیں' لہٰذا مذکورہ بالا حکم کا منطقی اور عقلی ہونا بالکل واضح ہے، اس لئے کہ اگر دشمن کے مقابلے میں طاقت پر مبنی اور قاطعانہ رویہ نہ اپنایا جائے تو شکست سے دچار ہونا یقینی ہو جاتا ہے، ہر انسان جو میدان جنگ میں دشمن کا سامنا کرتا ہے اگر دشمن پر کاری ضرب نہ لگائے تو گویا وہ اپنے آپ کو موت کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس کے بعد آیت مزید کہتی ہے: یہ کاری ضربیں اسی طرح لگاتار ہونی چاہیں یہاں تک کہ دشمن گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جائے۔ اور اس کے بعد قیدی بنانے کا موقع آجاتا ہے انھیں قید کر کے مضبوطی سے باندھ دیا جائے۔

حَتَّىٰ إِذَا أَثْخَنتُمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ

بہت سارے مفسرین نے اس جملے کی تفسیر شدت و کثرت کے ساتھ دشمن کے قتل اور کشت و خون سے کی ہے، لیکن چونکہ یہ جملہ جو ''ثخن '' سے لیا گیا ہے جس کا مطلب سختی اور صلابت ہے، لہٰذا کہ اس سے مراد دشمن پر مکمل تسلط، واضح غلبہ اور آشکار کامیابی ہے، یعنی جنگ کو پوری قوت و طاقت کے ساتھ جاری رکھا جائے یہاں تک کہ دشمن مکمل طور پر مغلوب ہو جائے۔ (لہٰذا مقصد بہت زیادہ کشت خون اور قتل

وخونریزی نہیں بلکہ دشمن پر غلبہ حاصل کرنا ہے)۔

بہرحال مذکورہ بالا آیت ایک اہم جنگی حکم پر مشتمل ہے اور وہ یہ کہ دشمن کی شکست کے بغیر جنگ روکنا اور قیدی بنانا درست نہیں؛ کیونکہ ایسا عمل انجام دینا جنگ میں مسلمانوں کی حیثیت کو متزلزل کرنے کا باعث اور قیدیوں کے امور کی نگرانی اور انھیں محاذ جنگ کے پیچھے کسی مقام پر منتقل کرنے کا عمل مسلمانوں کے اصلی ہدف تک پہنچنے میں مانع بنے گا۔ اس بات کی طرف توجہ رہے کہ ''شدوا الوَثَاق'' میں ''وَثَاق'' سے مراد رسی یا ہر وہ چیز ہے جس کے ساتھ کسی کو باندھا جائے اور یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ قیدیوں کو مضبوطی سے باندھ کر انھیں اپنی زیر نگرانی رکھنا لازم اور ضروری ہے تا کہ ایسا نہ ہو کہ وہ موقع سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں پر کاری ضرب لگا سکیں۔

اس کے بعد جنگی قیدیوں کا حکم بیان کرتے ہوئے یہ آیت کہتی ہے: یا تو ان پر احسان کر کے (عوض کے بغیر) رہا کر دو یا ان سے فدیہ لے کر آزاد کر دو! ''فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً''۔ یہاں مسلمانوں کو قیدیوں سے متعلق دو امور میں سے ایک کو اختیار کرنے کا حق دیا گیا ہے؛ بغیر کسی شرط کے رہا کرنا اور فدیہ لے کر آزاد کرنا، فدیہ سے مراد وہ جرمانہ ہے جو دشمن اپنے قیدیوں کی رہائی کے بدلے میں ادا کرتا ہے، درحقیقت یہ جرمانہ جنگ کے نتیجے میں ہونے والے بعض نقصانات کے بدلے میں ادا کیا جاتا ہے۔

قابل توجہ امر یہ ہے کہ فقہاء نے روایات کی پیروی میں جنگی قیدیوں سے متعلق ایک تیسری راہ کا بھی ذکر کیا ہے اور وہ قیدیوں کو غلام بنانا ہے، لیکن چونکہ قیدیوں کو غلام بنانے کا مسئلہ اس زمانے میں عام طور پر رائج تھا، آیت شریفہ میں اس کی طرف کوئی اشارہ موجود نہیں، شاید آیت میں اس حکم کو بیان نہ کرنے کی وجہ یہ ہو کہ ''غلامی'' جس کا ہم نے اپنے مقام پر تفصیلی ذکر کیا ہے، ایک خاص زمانے کا حکم تھا جو مخصوص حالات میں انجام دیا جاتا تھا، اور اس کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر یہ تھا کہ غلام رفتہ رفتہ آزاد ہو جائیں یہاں تک کہ مسئلہ غلامی کا کوئی نام ونشان باقی نہ رہے، یہی وجہ ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں فقط قیدیوں کی بلا شرط رہائی یا جرمانہ لے کر آزاد کرنے کی بات ہوئی ہے (دونوں طرف سے قیدیوں کا تبادلہ بھی اپنے قیدیوں کی رہائی کے مقابلے میں ایک قسم کا جرمانہ اور غرامت ہی ہے)۔

اسی طرح کتب فقہی میں ایک چوتھا حکم بھی قیدیوں کے بارے میں موجود ہے (اور وہ ہے قیدیوں کو قتل کرنا) اس کا بھی آیت شریفہ میں کوئی ذکر نہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ قیدیوں کا قتل، قیدیوں کے بارے میں اصلی احکام میں سے کوئی حکم نہیں بلکہ یہ ایک استثناء ہے یعنی یہ ثانوی حکم سب قیدیوں کے لیے نہیں بلکہ ان قیدیوں کے بارے میں ہے جو خطرناک جنگی مجرم ہوں۔[1]

جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کو آیت شریفہ کا حکم منسوخ نہیں ہوا اور اس کے منسوخ ہونے پر کوئی دلیل بھی ہمارے پاس نہیں اور اگر بعض احکام کا آیت شریفہ میں ذکر نہیں ہوا تو بہرحال اس کی بھی کوئی نہ کوئی وجہ ہے۔ دوسری آیت میں قیدی بنانے کی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: کسی نبی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنی جگہ (پوزیشن) کو کافی حد تک مضبوط کئے بغیر (اور دشمن پر کاری ضرب لگا کر اسے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کئے بغیر) کسی کو قیدی بنائے۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ؕ

''يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ''

---

[1] فخر رازی نے اس آیت کی تفسیر میں عدم قتل اور غلامی کے بارے میں جو گفتگو کی ہے وہ ہمارے بیان کے ساتھ قدرے مشابہ ہے: تفسیر فخر رازی، ج ۲۸ ص ۴۴

کے ساتھ تعبیر کرنے سے، جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا گیا ہے، بہت زیادہ کشت وخون مراد نہیں بلکہ "فِي الْأَرْضِ" کے پیش نظر مضبوط کرنا، دشمن پر کامل طور پر برتری حاصل کرنا اور علاقے پر مکمل تسلط حاصل کرنا ہے اور بالفرض اس سے مراد خونریزی ہو تو یہ اس وقت تک ہے جب تک دشمن اپنی شکست تسلیم نہیں کر لیتا۔

درحقیقت یہ تعبیر ذیل آیت میں مذکور بیان کے بالکل مشابہ ہے جس میں فرمایا گیا ہے: ''حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اوزارَها" یہاں تک کہ جنگ اپنے بھاری بوجھ کو زمین پر رکھ دے۔ اور اس سے ہماری پیش کردہ تفسیر کی تائید ہوتی ہے۔ اہم نکتہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو جنگی مقاصد کے حصول سے پہلے جنگی قیدی بنانے سے پرہیز کا جو حکم دیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض نو مسلم حضرات کا بڑا مقصد جنگی قیدی بنانا ہوتا تھا، تاکہ وہ قیدی جب اپنی آزادی کا فدیہ ادا کریں تو اس مال میں سے انھیں بھی کچھ مل جائے اور یہ کام بعض اوقات اس بات کا سبب بنتا تھا کہ وہ جنگی خطرات سے چشم پوشی کریں اور غیر اہم مسائل کی طرف پوری طرح توجہ دیں جس کی وجہ سے اسلامی لشکر دشمن کی کاری ضرت کا نشانہ بن جائے، بالکل ویسے ہی جیسے جنگ احد میں مال غنیمت سمیٹنے کے نتیجے میں جو کچھ پیش آیا۔ لہٰذا ذیل آیت میں ارشاد الٰہی ہے:

''تم لوگ دنیا کے ناپائیدار مال ومتاع کے طلبگار ہو جبکہ خدا تعالیٰ تمہارے لئے آخرت کا خواہاں ہے اور خدا عزیز اور حکیم ہے۔''

تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۗ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٦٧﴾

ضمناً اس آیت سے یہ استفادہ بھی ہوتا ہے کہ جنگ میں قیدی بنانا نہ صرف رسول اکرمؐ کے زمانے میں بلکہ گذشتہ انبیاء کے زمانوں میں بھی رائج اور معمول رہا ہے البتہ اس آیت شریفہ میں تاکید کی گئی ہے کہ قیدی بنانے کا عمل سود جوئی اور فائدہ حاصل کرنے کے لئے نہیں ہونا چاہیے بسا اوقات مسلمانوں کی مصلحت قیدیوں کو فدیہ لئے بغیر آزاد کردینے میں ہوتی ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن بعد والی آیت میں ان لوگوں کو تنبیہ کرتا ہے جو جنگ کے اہم مقاصد کو اپنے ذاتی منافع پر قربان اور معاشرے کی اہم مصلحتوں کو خطرے میں ڈال دیتے، اس ضمن میں فرماتا ہے: اگر خدا کا سابقہ فرمان نہ ہوتا (کہ حجت کے بغیر کسی قوم کو سزا دے) تو اس چیز کی وجہ سے جو تم نے انجام دی ہے، (مال دنیا تک رسائی کی خاطر اسلامی ضوابط کے خلاف قیدی بنانے پر) تمہیں ضرور بڑی سزا ملتی۔ ان سارے بیانات سے واضح ہو جاتا ہے کہ اولاً قیدی بنانے کا اقدام دشمن پر مکمل تسلط کے بعد ہو (اگرچہ یہ غلبہ کسی مخصوص جنگی محاذ پر ہی کیوں نہ ہو) ثانیاً یہ کہ قیدی بنانا کسی مادی فائدے یعنی فدیے وغیرہ کی خاطر نہ ہو، چونکہ اکثر ایسے ہوتا ہے کہ انسانی ہمدردی اور مسلمانوں کی مصلحت کی خاطر انھیں فدیہ کے بغیر آزاد کرنا پڑتا ہے، اس قسم کی صورتحال میں وہ افراد جو مادی اہداف کی خاطر دشمنوں کو قید کرتے ہیں مشکل ہی سے اس حکم الٰہی کو تسلیم کرتے ہیں۔

موضوع بحث تیسری آیت میں قرآن مجید قیدیوں کو تسلی دیتا اور ان کی دلجوئی کرتا ہے، ایسی دلجوئی جو ان کی حیثیت کے احترام اور ان کے درد اور پریشانیوں سے آگاہی کی علامت ہے، فرماتا ہے: اے رسول! جو قیدی تمہاری زیر نگرانی ہیں ان سے کہہ دو کہ اگر خدا

تمہارے دل میں موجود کسی نیک امر سے آگاہ ہو جائے (یعنی اگر تمہاری نیت ٹھیک ہو) تو وہ تمہیں اس سے بہتر عطا کرے گا جو کچھ تم سے لے لیا گیا ہے اور اپنی مغفرت کو تمہارے شامل حال کرے گا اور اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔

يَآيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْٓ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰٓى ۙ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

پہلے جملے میں لفظ ''خَيْرًا'' اسلام، ایمان اور پیروی حق کی طرف اشارہ ہے اور جملہ دوم میں ''خَيْرًا'' سے مراد خدا تعالیٰ کی طرف سے عطا ہونے والے وہ معنوی اور مادی ثواب ہیں جو خدا پر ایمان کے زیر سایہ انھیں نصیب ہوں گے اور یہ فدیئے کے عنوان سے ادا شدہ مال یا جس چیز سے وہ میدان جنگ میں محروم ہوئے ہیں' کی نسبت کئی گنا زیادہ ہیں۔ جملہ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ (اگر خدا جان لے) جیسا کہ کئی بار کہا جا چکا ہے۔ کا مطلب معلوم چیز کا عالم خارج میں موجود ہونا ہے، وگرنہ خدا ازل سے ہر چیز کو جانتا ہے اور اس کے علم میں کسی نئی چیز کا اضافہ ممکن نہیں، فقط معلومات ہیں جو وقت گذرنے کے ساتھ موجود ہوتی ہیں جیسے فلاں قیدی کے دل میں فلاں نیت کا پیدا ہونا۔

اس اجر و ثواب کے علاوہ قیدیوں کے بارے میں خدا کا ایک اور لطف ان کے ان گناہوں کی مغفرت ہے جو ایمان لانے کے بعد یقینی طور پر ان کی فکر کی بے چینی کا سبب اور روح کی اذیت کا باعث بن سکتے ہیں اور خدا کی مغفرت اس اذیت و بے چینی کے خاتمے کی ضامن ہے۔ یہ تھی ان آیات کی مختصر تفسیر جو قرآن مجید میں قیدیوں کے سلسلے میں بیان ہوئی ہیں۔

قیدیوں کے بارے میں احادیث

جنگی قیدیوں کے ساتھ مہربانی اور ان کے بارے میں اصول انسانی کی رعایت کے سلسلے میں ائمہ طاہرینؑ سے بکثرت احادیث نقل کی گئی ہیں جو اس ضمن میں اسلامی تعلیمات کی عظمت کو ظاہر کرتی ہیں۔

۱۔ جب عبدالرحمن بن ملجم نے جب امیر المؤمنین - کے سر اقدس پر تلوار کی ضرب لگائی اور اسے گرفتار کر لیا گیا تو آپؑ نے امام حسن - اور امام حسینؑ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"اِحْبِسُوا هٰذَا الْاَسِيْرَ، وَاَطْعِمُوْهُ وَاسْقُوْهُ وَاَحْسِنُوْا اِسَارَهُ"

اس اسیر کو قیدی بنا لو، اسے پانی سے سیراب اور غذا سے سیر کرو اور قید کے دوران اس کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔[1]

۲۔ امیر المؤمنین - سے ہی مروی ایک حدیث میں آپؑ نے فرمایا:

"اِطْعَامُ الْاَسِيْرِ وَالْاِحْسَانُ اِلَيْهِ حَقٌّ وَاجِبٌ وَاِنْ قَتَلْتَهُ مِنَ الْغَدِ!"

''قیدی کو کھانا کھلانا اور اس کے ساتھ نیکی اور حسن سلوک کرنا ایک واجب حق ہے اگر چہ وہ قتل کا مستحق ہو اور

---

[1] مستدرک الوسائل، ج ۲، ص ۲۵۷۔

تم اسے قتل ہی کیوں نہ کردو۔"[1]

یہ حکم ہر قسم کے قیدیوں کے لیے ہے چاہے وہ مومن ہوں یا کافر، لہٰذا امام جعفر صادقؑ سے منقول ایک اور حدیث میں آپؑ نے صراحت کے ساتھ فرمایا:

"اِطْعامُ الْاَسیرِ حق عَلَی مَنْ اَسَرَهُ وَاِنْ کانَ یُرادُ مِنَ الْغَدِ قَتْلُهُ فَاِنَّهُ یُنْبَغی اَنْ یُطْعَمَ وَیُسقی وَ یُرْفَقَ بِهِ کافِراً کانَ اَوْ غَیْرَهُ"

اسیر کو کھانا کھلانے اسیر کرنے والے پر ایک مسلم حق ہے اگرچہ اسے اگلے دن ہی قتل کردے، یہاں بھی اس کا حق ہے کہ اسے کھانا پانی دیا جائے اور اس کے ساتھ نرمی برتی جائے خواہ مومن ہو یا کافر۔[2]

حضرت علیؑ کے قاتل ابن ملجم کی اسیری کی قید کے واقعے کے بارے میں کچھ اور روایات بھی ہیں جو حضرت علیؑ کی قیدیوں کے بارے میں (خواہ وہ جنگی قیدی ہوں یا غیر جنگی) انتہا درجے کی محبت کو ظاہر کرتی ہیں۔ ان میں سے ایک حدیث میں ہے کہ: جب حضرت علیؑ بستر شہادت پر تھے تو آپؑ نے امام حسن مجتبیٰ -کو مخاطب کرکے فرمایا: میرے بیٹے! اپنے قیدی کے ساتھ نرم رویہ رکھنا، اس پر ترس کھانا اور اس کے ساتھ نیکی کرنا اور اس کے ساتھ ہمدردی سے پیش آنا۔ اسی اثنا میں آپؑ بیہوش ہوگئے، جب دوبارہ ہوش آیا تو امام حسن -نے دودھ سے بھرا ایک پیالہ آپؑ کی خدمت میں پیش کیا، آپؑ نے تھوڑا سا دودھ نوش کیا اور پیالے کو منہ سے ہٹالیا اور فرمایا: اسے اپنے قیدی کے لئے لے جاؤ، پھر مزید فرمایا:

"وَحَقّی عَلَیْكَ یابُنَیَّ! اِلاّ ما طَیَّبْتُمْ مَطْعَمَهُ وَ مَشْرَبَهُ وَارْفِقُوا بِهِ اِلی حینَ مَوْتی وَتُطْعِمُهُ مِمّا تَاْکُلَ وَتُسْقیه مِمّا تَشْرَبُ:"

"اے میرے بیٹے! میں تمہیں اپنے حق کی قسم دیتا ہوں کہ اس کے کھانے پینے کی اشیاء کو پاک و پاکیزہ رکھنا، اور میری موت واقع ہونے تک اس سے نرمی کرنا، جو خود کھاتے ہو اسے وہی کھلانا اور جو خود پیتے ہو اسے وہی پلانا۔"[3]

یہ نکتہ بھی قابل اہمیت ہے کہ قیدیوں کی رہائی کے بدلے جو غرامت (جرمانہ) ان سے وصول کی جائے وہ ان کے حال کے مناسب ہونی چاہیے، بالکل ویسے ہی جس طرح رسول اکرمؐ نے بدر کے جنگی قیدیوں کے سلسلے میں رعایت فرمائی، بلکہ ایک ثقافتی اور تمدنی عمل کے عوض بھی انھیں آزاد کیا جا سکتا ہے، چنانچہ تاریخ میں مذکور ہوا ہے کہ جنگ بدر کے بعد ایک اہم تاریخی اقدام کے طور پر رسول اکرمؐ نے

---

[1] وسائل، ج۱۱، ص۶۹۔

[2] وسائل، ج۱۱، ص۶۸۔

[3] مستدرک الوسائل، ج۳، ص۲۵۸، حدیث۴، چاپ قدیم۔

اعلان فرمایا کہ اسیروں میں جو لوگ پڑھے لکھے ہیں وہ مسلمانوں کے دس بچوں کو پڑھانے لکھانے کے بدلے میں آزاد کر دیئے جائیں گے۔[1] یہ سب اس وقت ہوا کہ بعض دیگر قیدیوں نے اپنی آزادی کے لئے چار چار ہزار درہم ادا کئے تھے اور محتاج و نادار افراد کو فدیہ لئے بغیر آزاد کر دیا گیا تھا۔

---

[1] سیرۂ حلبی، ج ۲، ص ۱۹۳۔

مسلمانوں اور غیر مسلموں کا باہمی تعلق

حکومت اسلامی اور مذہبی اقلیتیں

اشارہ

اسلامی حکومت سے متعلق بعض اختلافی مسائل میں سے ایک مسئلہ مذہبی اقلیتوں کے ساتھ اس کے طرز عمل اور رویئے کا مسئلہ ہے؟ لیکن یہ مخصوص صورتحال مسئلے کی پیچیدگی کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے دو سبب ہیں: پہلا سبب بہت سارے افراد کی اسلامی تعلیمات اور قوانین اسلام سے نا آگاہی اور بے بنیاد تعصّبات کے چنگل میں اسیر ہونا ہے اور دوسرا یہ کہ دشمن کا اپنے غلط پروپیگنڈے اور تبلیغ کے ذریعے اپنے ہم عقیدہ لوگوں کو آئین اسلام سے دور کرنا ہے، چونکہ اسے معلوم ہے کہ اسلامی تعلیمات میں اس قدر کشش اور جاذبیت ہے کہ اگر دوسرے ادیان کے ماننے والے ان سے آگاہ ہوجائیں تو وہ بہت جلد ان سے اثر قبول کرلیں گے۔

اسی وجہ سے دشمنان اسلام ہمیشہ انھیں (اپنے ہم عقیدہ افراد کو) مسلمانوں سے دور رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ جبکہ حقیقت حال یہ ہے کہ اسلام دیگر مذاہب کی پیروی کرنے والوں کے ساتھ دوستانہ روش کے ساتھ پیش آتا ہے اور انھیں آپس میں مل جل کر صلح وصفائی کی زندگی گزارنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس کی وضاحت آئندہ صفحات میں آئے گی۔ اس اشارے کے بعد اب ہم دوبارہ قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے ہیں اور پہلے آیات کا تذکرہ اور اس کے بعد ان روایات کی تفسیر میں نقل ہونے والی روایات پیش کی جائیں گی۔

۱۔ لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓي اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ (ممتحنہ/ ۸و۹)

۲۔ قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰي يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ۝ (توبہ/ ۲۹)

۳۔ وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِىَ اَحْسَنُ ڰ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَاِلٰـهُنَا وَاِلٰــهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝

(عنکبوت/ ۴۶)

۴۔ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾ (آل عمران/ ۶۴)

۵۔ لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۸۲﴾ (مائدہ/ ۸۲)

ترجمہ:

۱۔ خدا تعالیٰ تمھیں ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور عدالت کرنے سے منع نہیں کرتا جو دین کے معاملے میں تمہارے ساتھ برسر پیکار نہیں اور جنھوں نے تمھیں تمہارے گھروں اور دیار سے باہر نہیں نکالا، کیونکہ خدا عدالت کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ وہ تمھیں فقط ان لوگوں کے ساتھ دوستی سے منع کرتا ہے جنھوں نے امر دین میں تمہارے ساتھ جنگ کی اور تمھیں تمہارے گھروں سے نکال باہر کیا، یا تمھیں تمہارے گھروں سے نکالنے میں مدد گی، ایسے لوگوں کی دوستی اختیار نہ کرو اور جو کوئی بھی ان کے ساتھ دوستی رکھتا ہے ظالم اور ستمگر ہے۔

۲۔ اہل کتاب میں سے ان لوگوں کے ساتھ قتال کرو جو نہ خدا پر یقین رکھتے ہیں نہ روز جزا پر، اور نہ وہ خدا و رسولؐ کی حرام کردہ چیزوں کو حرام سمجھتے اور نہ ہی دین حق کو قبول کرتے ہیں (یہ حکم قتال اس وقت تک ہے) جب تک وہ برضا و رغبت سر تسلیم خم کر کے اپنے ہاتھوں سے جزیہ ادا نہیں کرتے۔

۳۔ اہل کتاب کے ساتھ سوائے اچھی روش کے مجادلہ نہ کرو مگر ان میں سے وہ لوگ جنھوں نے ظلم کیا ہے اور ان سے کہہ دو کہ ہم ان تمام باتوں پر ایمان لائے ہیں جو ہم پر اور تم پر خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل کی گئی ہیں اور ہمارا اور تمہارا معبود ایک ہے اور ہم اس کے سامنے مکمل طور پر خاضع ہیں اور ہمارا سر تسلیم خم ہے۔

۴۔ کہہ دو کہ اے اہل کتاب آؤ اس بات پر جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہیں اور وہ یہ کہ ہم خدائے یکتا و واحد کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کا کوئی شریک نہ قرار دیں اور ہم سے بعض دوسرے

بعض لوگوں کو خدا کی حیثیت نہ دیں اور اگر وہ (اس دعوت سے) روگردانی کریں تو کہو کہ گواہ رہنا کہ ہم مسلمان ہیں (اور خدا کے حضور میں ہماری جبین نیاز خم ہے)۔

۵۔ یقینا یہودیوں اور مشرکوں کو تم اہل ایمان کا سخت ترین دشمن پاؤ گے اور انھیں اہل ایمان کا نزدیک ترین دوست پاؤ گے جو یہ کہتے ہیں کہ "ہم نصاریٰ ہیں" یہ اس وجہ سے ہے کہ ان میں عالم اور تارک دنیا افراد ہیں اور وہ حق کے مقابلے میں تکبر اور بڑے پن کا اظہار نہیں کرتے۔

تشریح:

سابقہ آیات مسلمانوں کو دشمنان خدا کی دوستی سے بچنے کی تلقین، اہل ایمان اور رسول اکرمؐ کے ساتھ ان کی کینہ توزی اور زبان اور ہاتھ سے بے گناہ مسلمانوں کو اذیتیں دینے کے تذکرے پر مشتمل ہیں جبکہ اس پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: خدا تمھیں ان لوگوں کے ساتھ نیکی کرنے اور عدالت کے ساتھ پیش آنے سے منع نہیں کرتا جنھوں نے نہ تو دین کے معاملے میں تمہارے ساتھ جنگ کی ہے اور نہ ہی تمھیں تمہارے گھروں سے نکالا ہے، کیونکہ خدا عدالت کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ

اس کے بعد اللہ تعالیٰ بیشتر تاکید کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے: خدا تعالیٰ تمھیں فقط ان لوگوں کی دوستی سے منع کرتا ہے جنھوں نے دین کے معاملے میں تمہارے ساتھ جنگ کی ہے اور تمھیں تمہارے گھروں سے نکالا ہے یا گھروں سے باہر کرنے میں مدد فراہم کی ہے ان کے ساتھ دوستی کو اور جو بھی انھیں دوست رکھے ظالم ہے؛

اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝

ان دو آیات اور ان سے قبل سورۂ ممتحنہ کی آیات کے شان نزول اور ان آیات میں موجود قرائن کو دیکھا جائے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ آیات مشرکین اور بت پرستوں کی طرف ناظر ہیں اور انھیں دو گروہوں میں تقسیم کرتی ہیں:

وہ گروہ جس کے افراد مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرتے رہے ہیں جنھوں نے مسلمانوں کو اذیتیں دیں اور ہر قسم کی عہد شکنی کے مرتکب ہوئے جبکہ دوسرے گروہ کے افراد مسلمانوں کے ساتھ صلح اور مسالمت آمیز زندگی گذارنے پر آمادہ تھے۔ ان آیات میں گروہ اول کے افراد کے ساتھ محبت اور دوستی کا تعلق رکھنے سے منع کیا گیا ہے جبکہ گروہ دوم کی نسبت دوستی کی اجازت دی گی ہے، اور جو لوگ گروہ اول کے ساتھ دوستی قائم کرتے ہیں، انھیں ظالم جبکہ گروہ دوم کے ساتھ دوستانہ مراسم بڑھانے والوں کو صاحب عدالت کہا گیا ہے۔ جب مشرکوں

اور بت پرستوں کے بارے میں حکم خدا ایسا ہو تو یہ حکم اہل کتاب کے کفار کے لئے بطریق اولیٰ ثابت ہے۔

بعض مفسرین نے اس آیت میں مذکورہ حکم کو منسوخ اور آیت ۵ سورۂ توبہ کو اس کا ناسخ قرار دیا ہے:

فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ

لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ آیت، سورۂ توبہ کی بقیہ آیات کی شہادت کے باعث ان عہد شکن مشرکوں سے تعلق رکھتی ہے جو مسلمانوں کے خلاف علانیہ دشمنی اور مخالفت پر کمر بستہ تھے، اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آیت منسوخ نہیں ہوئی بلکہ سورۂ توبہ کی آیات کا تعلق پہلے گروہ کے ساتھ ہے۔

بعض مفسرین نے اس آیت سے متعلق یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابوبکر کی طلاق یافتہ بیوی مکہ سے اپنی بیٹی ''اسماء'' کے لئے کچھ تحائف لے کر مدینہ آئی اور چونکہ اس وقت اس کی ماں مشرکہ تھی لہٰذا اسماء نے انھیں قبول کرنے سے نہ صرف انکار کیا بلکہ اپنی ماں کو گھر میں داخل ہونے کی اجازت بھی نہ دی، مذکورہ بالا آیت شریفہ نازل ہوئی اور رسول اکرمؐ نے اسے حکم دیا کہ وہ اپنی ماں کے ہدیے کو قبول کر لے اور اس کے ساتھ عزت و احترام کے ساتھ پیش آئے۔[1]

بہر حال ان آیات سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلقات کے بارے میں ایک عمومی قانون کا پتہ چلتا ہے جو کسی خاص زمان و مکان میں محدود نہیں اور وہ یہ کہ مسلمان' اسلام کے خلاف عدم قیام اور اسلام کے دشمنوں کو مدد فراہم نہ کرنے والے ہر فرد، گروہ، جماعت یا ملک کی نسبت ذمہ دار ہیں کہ ان کے ساتھ صلح و صفائی اور مسالمت کی راہ اختیار کریں چاہے وہ لوگ مشرک ہوں یا اہل کتاب۔ یہاں تک کہ اگر کوئی جماعت یا ملک دشمنوں کی صف میں ہو اور اپنا طرز عمل تبدیل کر لیں تو مسلمانوں کو چاہیے کہ انھیں بحیثیت دوست قبول کر لیں اور ان کے ساتھ دشمنی کو ترک کر دیں، البتہ اس روش کا معیار ان کا موجودہ رویہ ہے۔

''جزیہ'' کی حقیقت

دوسری آیت میں کہ جو سورۂ توبہ کا حصہ ہے، مشرکوں اور بت پرستوں کی نسبت ضروری احکام کے بیان کے بعد اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کے بارے میں گفتگو ہے؛ آیہ شریفہ کہتی ہے: اہل کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جو خدا اور روز جزا پر ایمان نہیں رکھتے، خدا اور رسول کی حرام کردہ چیزوں کو حرام نہیں سمجھتے اور نہ ہی دین حق کو مانتے ہیں، قتال کرو یہاں تک کہ وہ برضا و رغبت اپنے ہاتھوں سے ''جزیہ'' ادا کر دیں۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۲۹﴾

[1] روح البیان، ج ۹، ص ۴۸۱، یہ روایت بہت ساری کتب تفسیر اور صحیح بخاری میں بھی لفظی اختلافات کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔

یقیناً اہل کتاب کے بارے میں آیت شریفہ کا لہجہ سخت ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل کتاب بالخصوص ''یہود'' کا رویہ اسلام کی نسبت بہت سخت تھا، یہ لوگ جنگ احزاب اور بعض دوسری جنگوں میں دوسرے دشمنوں کے ہم آواز اور ہم فکر بن گئے، اس کے علاوہ بعض جنگوں مثلاً جنگ خیبر میں انھوں نے مسلمانوں کے خلاف جنگ کی اور یہی نہیں بلکہ رسول اکرمؐ کے قتل کا منصوبہ بھی بنایا اور مشرکین کے لئے جاسوسی کا کام بھی کرتے تھے۔

اس بات کے پیش نظر کہ مذکورہ بالا آیت سورۂ توبہ کی آیات میں سے ہے اور سورۂ توبہ ہجرت کے نویں سال نازل ہوئی، اس وقت اسلامی غزوات ختم ہوچکی تھیں اور لازم تھا کہ اسلام اپنا لائحہ عمل تمام مخالفین کے سامنے واضح کردے۔

سب سے پہلے مشرکین کو خبردار کیا گیا کہ وہ اپنی حیثیت واضح کریں، عہد شکن افراد کے مقابلے میں اعلان جہاد کیا مگر یہ کہ وہ اپنی شکست تسلیم کرلیں اور جو لوگ اپنے عہد کے پابند تھے ان کی نسبت قرارداد کے اختتام تک عہد کی پابندی اور اس کے ساتھ وفاداری کو قائم رکھا (اس مطلب کی جھلک اس سورہ کی ابتدائی آیات میں نظر آتی ہے)۔ اس کے بعد قرآن مجید، موضوع بحث آیت میں مشرکوں کے ساتھ ہمیشہ تعاون کرنے والے اہل کتاب کے خلاف اعلان جنگ کرتے ہوئے ان کی تین صفات بیان کرتا ہے:

پہلی صفت ان کی یہ ہے کہ وہ نہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں نہ روز جزا پر ''لَا یُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْیَوْمِ الْآخِرِ'' درست ہے کہ یہود و نصاریٰ بظاہر خدا اور روز آخرت کو قبول کرتے تھے لیکن درحقیقت انھوں نے انھیں خرافات کے ساتھ آلودہ کردیا تھا، توحید سے منحرف ہوکر تثلیت اور شرک کی راہ اپنائی اور ''معاد'' یعنی دوبارہ زندہ ہونے کو روحانی زندگی سمجھنے لگے اور اہم بات یہ کہ ان کے اعمال میں مبداء (خدا) اور معاد کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی تھی اور وہ طرح طرح کے گناہوں سے آلودہ ہوچکے تھے کہ گویا مبداء و معاد پر ان کا ایمان ہی نہ تھا۔ دوسری صفت ان کی یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ حرام الٰہی کو حرام نہیں سمجھتے تھے۔ ''وَلَا یُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ''

ان کی تاریخ گواہ ہے کہ وہ محرمات سے اجتناب نہیں کرتے تھے اور ایسے گناہوں کا ارتکاب کرتے تھے جو تمام آسمانی شریعتوں میں حرام قرار دیئے گئے تھے اور ان کے ہاں دین خدا بظاہر آداب و رسوم کی صورت اختیار کرچکا تھا (بالکل ایسے ہی جیسے آج کل دین ان کے ہاں ایک ذاتی اور نجی مسئلہ سمجھا جاتا ہے جو فقط ہفتہ وار دعاؤں اور بعض اخلاقی مسائل تک محدود سمجھا جاتا ہے؛ جن کی کوئی جھلک ان کی اجتماعی زندگی میں نظر نہیں آتی مثال کے طور پر صہیونی اپنے فوائد و منافع تک رسائی حاصل کرنے میں ہر قسم کے جرم کا ارتکاب کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے)۔ ان کی تیسری صفت یہ ہے کہ وہ دین حق کو بالکل تسلیم نہیں کرتے۔ ''وَلَا یَدِینُونَ دِینَ الْحَقِّ'' کیونکہ انھوں نے دین کو بالکل ہی بدل کر رکھ دیا اور اسے بنیادی اور انسانی مسائل سے بالکل خارج کرکے خرافات کا مجموعہ بنادیا تھا۔

یہ تین اوصاف درحقیقت ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں اور یہی وہ اوصاف تھے جو انھیں اسلام کے مقابلے اور انواع واقسام کی عہد شکنی کی طرف دعوت دیتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود آیت کے آخر میں ان کے سامنے صلح و آشتی کی ایک راہ کھولتے ہوئے قرآن فرماتا ہے: ''حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَةَ عَنْ یَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ'' یہاں تک کہ وہ جزیہ (فی کس کے حساب سے ٹیکس) کو خاضعانہ انداز میں ادا کریں۔

راغب ''مفردات'' میں کہتے ہیں: ''جزیہ'' وہ چیز ہے جو ان اہل ذمہ (غیر مسلموں) سے لیا جاتا ہے جو اسلامی ممالک میں مسلمانوں کے ساتھ زندگی گزارنے کا عہد کرتے ہیں اور جزیہ کو جزیہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ اس جزا کی مانند ہے جو اس لئے ادا کی جاتی ہے کہ اس کے بدلے میں ان کی جان و مال محفوظ رہے۔ کتاب التحقیق میں ذکر کیا گیا ہے کہ جزیہ، جزا اور بدلے کے معنی میں ہے اور یہ وہی مال ہے جو غیر مسلموں سے لیا جاتا ہے۔ بہرحال ''جزیہ'' کی اصل جزاء وہی ہے اس وجہ سے کہ جو رقم وہ جزیہ کے طور پر ادا کرتے ہیں وہ مفت اور بلاعوض ہوتی بلکہ اسلامی حکومت اس کے مقابلے میں ذمہ دار ہوتی ہے کہ ان کے جان و مال اور عزت و آبرو کا دفاع کرے اور انھیں مکمل امن و امان کا ماحول فراہم کرے۔

بعض کے نزدیک ''جزیہ'' کا مادہ ''جزء'' ہے اس لئے کہ جزیہ عام طور پر مال کی ایک کم مقدار ہوتی ہے جو سالانہ ہر فرد کے حساب سے ادا کی جاتی ہے۔ عَنۡ یَدٍ (یعنی اپنے ہاتھ سے) اس سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جزیہ کو ہر شخص بذات خود ادا کرے اور ادائیگی کے لئے کسی کو وکیل مقرر نہیں کیا جاسکتا؛ لیکن بعض حضرات معتقد ہیں کہ یہ تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جزیہ کو نقد صورت میں ادا کیا جانا چاہیے۔ اس بنا پر ادائیگی کے لئے وکیل منتخب کیا جاسکتا ہے لیکن جزیہ کی رقم کو نقد ہونا چاہیے نہ کہ ادھار، یا یہ کہ مراد یہ ہے کہ جزیہ فقط امیر لوگوں سے وصول کیا جائے اور محتاج و نادار افراد پر یہ اسلامی ٹیکس معاف ہے۔ ان تین معانی میں سے جو معنی بھی صحیح ہو اصل مسئلہ میں کوئی مشکل پیدا نہیں ہوتی اگرچہ تینوں معنوں کو جمع کرنا بھی ممکن ہے۔

رہی بات ''صَاغِرُون'' کی تو اس کی غیر مناسب تفسیریں کی گئی ہیں؛ یہ لفظ ''صِغَر'' سے مشتق و ماخوذ ہے جس کا مطلب عاجزی اور (بڑائی کے مقابلے میں) خود کو چھوٹا ظاہر کرنا (چھوٹے پن کا اظہار کرنا ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ ''جزیے'' کی ادائیگی اسلام، مسلمین اور قوانین اسلام کے احترام کو ملحوظ رکھ کر کی جائے، بالفاظ دیگر جزیہ کی ادائیگی اس بات کی علامت ہے کہ ایک سالم اور محترم اقلیت، ایک محترم اکثریت کی حیثیت کو تسلیم کر کے اس کے ساتھ صلح و مسالمت آمیز فضا میں رہنا چاہتی ہے اور یہ جو بعض مفسرین نے اس کی تفسیر اصل کتاب کے ساتھ مذاق اور ان کی توہین و تحقیر سے کی یہ چیز کلمہ ''صَاغرین'' کے لغوی مفہوم سے اخذ نہیں ہوتی اور نہ ہی یہ (تفسیر) اسلامی تعلیمات کے مطابق ہے اور نہ ان احکام کے ساتھ کوئی مناسبت رکھتی ہے جو اقلیتوں کے ساتھ طرز عمل کے بارے میں ہم تک پہنچے ہیں، درحقیقت اس تفسیر میں اپنی خاص ذہنیت اور طرز فکر کو آیت پر مسلط کیا گیا ہے۔

یہیں سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اس آیت کے اس جملے کے بارے میں جو نزاع، بعض حضرات نے برپا کیا ہے اور اسے (جزیے کو) انسانی مسائل اور مسالمت آمیز باہمی زندگی کے خلاف قرار دیا ہے، ایک بے بنیاد چیز ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ جزیہ عام طور پر مال کی ایک بہت کم مقدار پر مشتمل رہا ہے جو اس ذمہ داری کے بدلے میں ادا کیا جاتا تھا کہ مسلمان اہل ذمہ کی جان و مال کی حفاظت کریں اور بعض روایات کے مطابق بعض اوقات اس کی مقدار تقریباً ایک دینار سالانہ تھی! یہاں تک کہ جو لوگ اس مقدار کی ادائیگی کی بھی استطاعت نہیں رکھتے تھے انھیں معاف کر دیا جاتا تھا (اس سے قبل کہا جا چکا ہے کہ بعض حضرات نے عَنۡ یَدٍ کا یہ مطلب لیا تھا)۔

بحث وگفتگو میں بہترین روش کا انتخاب

تیسری آیت مسلمانوں کی اہل کتاب کے ساتھ گفتگو کے بارے میں ہے جو تاکید کرتی ہے کہ ان کے ساتھ بہترین طرز گفتگو کو اختیار کیا جائے۔ ارشاد الٰہی ہے: اہل کتاب کے ساتھ سب سے بہتر انداز میں کلام کرو۔ ''وَلاَ تُجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلاَّ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ''، یہ ایک عمومی، جامع اور اساسی مفہوم ہے۔ ''جدال'' دراصل رسی بٹنے اور اسے مضبوط کرنے کے معنی میں ہے اور جب دو افراد آپس میں بحث کرتے ہیں تو ہر ایک یہی چاہتا ہے کہ دوسرے کو اس کے عقیدے سے پھیر کر رکھ دے اس عمل کو مجادلہ کہا جاتا ہے، یہاں اس سے مراد منطقی اور عقلی بحث وگفتگو ہے۔ جملہ ''بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ'' (اس روش کے مطابق جو بہترین ہو) سے کیا مراد ہے؟

اس بارے میں بعض مفسرین نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ ان کے ساتھ نرمی، ملائمت اور محبت کا سلوک کیا جائے، یعنی روکھے پن کے مقابلے میں نرم، غیظ وغضب کے مقابلے میں بردباری، شرارت کے مقابلے میں خیر خواہی اور عجلت کے مقابلے میں سکون واطمینان کا مظاہرہ کیا جائے۔ بہرحال یہ ایک بہت جامع تعبیر ہے جو باہمی بحث مباحثے کے تمام طریقوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے، چاہے وہ (بحث) الفاظ میں ہو یا مضمون کلام میں، چاہے گفتگو کے انداز میں ہو یا دوسری حرکات میں، بنابرایں جملے کا مفہوم کچھ اس طرح ہو جاتا ہے کہ ان کے ساتھ مؤدبانہ گفتگو کی جائے، کلام کا لہجہ دوستانہ اور کلام کا مضمون منطقی اور دلیل پر مبنی، آواز میں چیخ اور ہنگامہ خیزی کا عنصر نہ ہو اور ہاتھ، آنکھ اور آبرو کی حرکات جو بیان کو کامل کرتی ہیں، اسی انداز اور اسی روش کے مطابق انجام پانی چاہئیں۔

یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ بحث وگفتگو کا مقصد برتری حاصل کرنا اور غالب آنا نہیں، بلکہ مقصد یہ ہے کہ آپ کو بات، مخاطب کی روح کی گہرائیوں میں جاگزین ہو جائے اور وہ مخاطب اسلام کے متعلق صحیح موقف اختیار کرے اور جان لے کہ روح اسلام روح صلح جوئی ہے، بہرحال آیت شریفہ کا یہ جملہ مسلمانوں کو تاکید کرتا ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ ان کا سلوک صلح جویانہ اور مسالمت آمیز ہونا چاہیے۔ البتہ یہ سارے امور اس طرح انجام دیئے جائیں کہ ان میں ناتوانی کی آمیزش نہ ہو اور وہ (اہل کتاب) ان سے سوء استفادہ نہ کر سکیں۔ فقط ایک گروہ کو اس حکم سے استثناء کرتے ہوئے قرآن فرماتا ہے: مگر وہ لوگ جو ظلم وستم کے مرتکب ہوئے ہیں۔

''إِلاَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ'' اور یہ ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو صلح آمیز باہمی زندگی نہیں گذارنا چاہتے تھے اور محبت اور نرمی سے سوء استفادہ کرتے تھے، وہ لوگ جو حق کے ساتھ عناد اور دشمنی رکھتے تھے اور اس کے باوجود کہ انھوں نے رسول اکرمؐ کی نشانیاں اپنی کتابوں میں پڑھ رکھی تھیں، انھیں چھپانے کی کوشش کرتے تھے، ان کی کیفیت یہ تھی کہ نہ حالت جنگ میں تھے نہ حالت صلح میں، نہ دوستی نہ باہمی زندگی جس میں محبت اور احترام ہو، یقیناً ایسے اشخاص اس حکم سے مستثنیٰ ہونے ہی چاہئیں۔

آیت کے تسلسل میں مزید پرکشش جملے بھی ذکر ہوئے ہیں: ان سے کہہ دیں ہم اس سب پر جو خدا کی طرف سے ہم پر یا تم پر نازل ہوا ہے ایمان رکھتے ہیں، ہمارا اور تمہارا خدا ایک ہی ہے اور ہماری جبین نیاز اسی کے آگے جھکی ہوئی ہے۔''

وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَاِلٰـهُنَا وَاِلٰـهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ

مُسْلِمُوْنَ ﴿۴۶﴾

درحقیقت یہ ''بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ'' کے ساتھ مجادلہ کرنے کا ایک واضح نمونہ ہے یعنی قرآن مجید نے اس بارے میں فقط کلیات اور عمومات کے ذکر پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اسے واضح مصادیق اور روشن مثالوں کے ساتھ بیان کیا ہے۔ضمناً یہ جملہ اس بات کی بھی ترجمانی کرتا ہے کہ صلح جو اور مسالمت آمیز باہمی زندگی کے ستونوں کو مضبوط کرنے کے لئے مشترکہ پہلوؤں پر اعتماد ہونا چاہیے مثلاً خدائے واحد اور تمام کتب آسمانی وغیرہ پر ایمان۔

لیکن مشترکہ پہلوؤں پر زور اور تاکید کا مطلب یہ نہیں کہ مسلمان ان کی بدعات کو قبول کرلیں اور اپنے دین سے دستبردار ہو جائیں اور شاید ''وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُوْنَ'' اسی مطلب کی طرف ایک لطیف اشارہ ہو۔امام جعفر صادق ؑ کی ایک حدیث میں آپؑ نے ''مجادلۂ احسن'' کا ایک نمونہ بتاتے ہوئے فرمایا: ''سورۂ یاسین کے آخری حصے کو ملاحظہ کرو،تم دیکھو گے کہ کس طرح مختلف طریقوں سے شیرین مگر محکم اور منطقی دلیل پر مبنی انداز میں منکرین معاد کو جواب دیا گیا ہے۔''[1]

اس آیت کا مضمون ایک دوسری شکل میں سورۂ نحل میں بھی آیا ہے، چنانچہ فرمایا گیا ہے:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ؕ

اپنے پروردگار کی طرف حکمت (علم ومنطق) اور موعظۂ حسنہ کے ساتھ دعوت دو اور ان (مخالفین) کے ساتھ احسن طریقے سے بحث وگفتگو کرو۔[2]

قابل توجہ بات یہ ہے کہ مذکورہ بالا آیت ان دس اخلاقی احکام میں سے پہلے حکم پر مشتمل ہے جو اس سورہ میں مخالفین کے ساتھ حسن سلوک کے بارے میں بیان ہوئے ہیں۔درحقیقت جملہ اول یعنی ''اُدْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ'' عقلی استدلال کی طرف ناظر ہے یعنی اہل استدلال وفکر ونظر کے ساتھ عقلی استدلال کا راستہ اختیار کیا جائے۔اور ''وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ'' کی تعبیر عاطفی اور جذباتی ابحاث کی طرف اشارہ ہے اور یہ طریقہ ان لوگوں کے ساتھ اختیار کیا جانا چاہیے جو کچھ زیادہ اہل استدلال نہیں ہوتے بلکہ جذباتی مسائل سے سروکار رکھتے ہیں۔خاص طور پر ''حسنہ'' کو ''موعظہ'' کی صفت قرار دینا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ گفتگو سختی، مخاطب کی تحقیر وتذلیل اور اس پر غلبے کے جذبے اور اسے ضد بازی پر اکسانے والے عوامل سے پاک ہونی چاہیے، واضح ہے کہ اس قسم کا موعظہ دلوں پر اثر کرتا ہے۔اور ''مجادلۂ احسن'' کے ساتھ ایسے لوگوں سے پیش آیا جائے جن کا ذہن غلط غیر درست مسائل کا انبار بنا ہوا ہے اس لئے ضروری ہے کہ صحیح مناظرہ کے ذریعے ان کے ذہن کو صاف کیا جائے تا کہ وہ حق کو قبول کرنے کے لئے آمادہ ہوسکیں۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین، ج ۴، ص ۱۶۳ (سے اقتباس) ذیل آیت موضوع بحث۔

[2] سورۂ نحل/ ۱۲۵

ایک مشترک بنیادی اُصول کی دعوت

چوتھی آیت میں اہل کتاب سے خطاب کرکے قرآن انھیں مشترکہ مسائل یعنی توحیداور اس کے فروع کی طرف دعوت دیتے ہوئے فرماتا ہے: کہواے اہل کتاب آؤ اس بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے اور وہ یہ کہ خدائے واحد کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ جانیں اور ہم میں سے بعض دوسروں کو اللہ کے علاوہ اپنے ارباب قرار نہ دیں۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ

اور آخر میں مزید اضافہ فرماتا ہے: اگر وہ اس دعوت سے روگردانی اور انحراف کریں تو یہ کہیں کہ گواہ رہو کہ ہم مسلمان ہیں۔ (اور ہم توحیدی راستے پر گامزن ہیں)۔

مشترکہ مسئلہ کی طرف دعوت دینا دومختلف مذاہب کے پیروکار افراد کے لئے مل جل کر زندگی گذارنے کا بہترین طریقہ ہے، کیونکہ عموماً کسی مذہب سے منسلک افراد کو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اپنے تمام عقائد کو چھوڑ کر دوسروں کے تابع ہوجاؤ، اگر چہ یہ بات منطقی تو ہو سکتی ہے لیکن عملی نہیں، پس بہتر یہی ہے کہ اگر دوسرے ادیان کو ماننے والے اسلام کی حقانیت کے دلائل سے آگاہ ہوکر بھی اس کی طرف مائل نہیں ہوتے تو انھیں ان کے عقائد سمیت ان کے حال پر چھوڑ دیں اور مشترکہ امور میں تعاون جاری رکھیں اور تمام آسمانی ادیان کے درمیان مشترک امر خدا کی ذات وصفات میں اس کی توحید ہی ہے۔

یہاں تک کہ تثلیت کے طرفدار مسئلہ تثلیت کی اس طرح تفسیر کرتے ہیں کہ وہ خدا کی وحدانیت کے ساتھ سازگار ہوجائے اور اسے ''تثلیت میں وحدت'' کا نام دیتے ہیں (توجہ رہے کہ تثلیت یعنی خداؤں کا عقیدہ عیسائی علماء کی تصریح کے مطابق حضرت عیسیٰ -اور ان کے بعد کی ایک سوسال تک موجود نہیں تھا اور کئی اسباب کے باعث بعد میں پیدا ہوا ہے) اگر چہ ''عقیدہ تثلیت'' واضح تناقض اور تضاد کا حامل ہے لیکن اسے توحید کے ساتھ سازگار کرنے کی کوشش اس بات کی دلیل ہے کہ وہ (اہل تثلیت) اصل توحید کے وفادار ہیں۔

درحقیقت صلح آمیز باہمی زندگی کی دعوت اور مشترکہ پہلوؤں پر اعتماد ''مجادلہ احسن'' کی ایک واضح مثال ہے جو سابقہ آیت میں بیان ہوا تھا اور یہ اس بات کی ترجمانی بھی کرتا ہے کہ اسلام ہرگز نہیں چاہتا کہ دوسرے مذاہب کی پیروی کرنے والوں کو جبراً دین اسلام میں کھینچ لائے۔ دلچسپ یہ ہے کہ ہجرت کے ساتویں سال (صلح حدیبیہ کے بعد) رسول اکرمؐ نے دنیا کی عظیم حکومتوں کے سربراہوں کے نام خطوط لکھے اور انھیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی' ان سربراہوں میں مصر کا سربراہ ''مقوقس''، روم کا بادشاہ ''ہرقل'' اور ایران کا فرمانروا ''کسریٰ'' شامل تھے، آپؐ نے ان خطوط کے نیچے مذکورہ بالا آیت کی طرف اشارہ فرمایا، مقصد یہ تھا کہ کم از کم ادیان آسمانی کو ایک دوسرے سے ملانے والے حلقۂ زنجیر یعنی اصل توحید پر سب کو اتفاق ہونا چاہیے تاکہ اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ تعاون اور مل جل کر رہنے کی راہ ہموار ہو۔

یہ بات اسلام کی صلح طلبی اور مسالمت آمیز فضا میں دوسرے ادیان آسمانی کے پیروؤں کے ساتھ مل جل کر زندگی گذارنے کی ایک علامت ہے کہ جس کی جڑیں رسول اکرمؐ کے مبارک زمانے تک پہنچی ہیں (یعنی اس قرآنی فرمان کونافذ کرنے کی داغ بیل آپؐ نے ہی ڈالی تھی)۔

پانچویں اور آخری آیت میں قرآن مجید دوسرے ادیان کی پیروی کرنے والوں کے مختلف موقف کی طرف اشارہ اور ہر ایک کے متعلق اس کے حال کے مطابق گفتگو کرتے ہوئے فرماتا ہے: یہود اور مشرکین کومومنین کا بدترین دشمن، لیکن وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں انھیں اہل ایمان کا نزدیک ترین دوست پاؤ گے؛

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِیۡنَ اٰمَنُوا الۡیَهُوۡدَ وَالَّذِیۡنَ اَشۡرَكُوۡا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقۡرَبَهُمۡ مَّوَدَّةً لِّلَّذِیۡنَ اٰمَنُوا الَّذِیۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّا نَصٰرٰی ؕ

اس کے بعد نصاریٰ کی دوستی کو ان الفاظ کے ساتھ بیان کرتا ہے: کیونکہ ان کے درمیان قسیسین (علماء) اور تارک دنیا افراد موجود ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے؛

ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنۡهُمۡ قِسِّیۡسِیۡنَ وَرُهۡبَانًا وَّاَنَّهُمۡ لَا یَسۡتَكۡبِرُوۡنَ ﴿۸۲﴾

یہ الفاظ بخوبی ظاہر کرتے ہیں کہ اسلام ان لوگوں کی نسبت جو دشمنی کی راہ نہیں اپناتے فقط ان کی مخالفت نہیں کرتا بلکہ انھیں مسلمانوں کے بہترین دوست کی حیثیت سے متعارف کراتا ہے اور ان کے بزرگان کو علم ودانش، ترک دنیا اور عدم تکبر کے باعث قابل تعریف وستائش قرار دیتا ہے اور اس طرح کھلے دل کے ساتھ ان کا استقبال کرتا ہے جو دوستی کے خواہاں ہیں اور اسلام ان کے بزرگوں کی قدر وقیمت کا قائل ہے، اور اگر یہودیوں کے خلاف رسول اکرمؐ کے دور میں مختلف موقف اور طرز عمل رہا ہے تو یہ یہودیوں کے ساتھ دشمنی کی خاطر نہیں تھا بلکہ اس کا سبب ان کی عہد شکنی، عداوت اور عرب کے وحشیوں کے ساتھ ان کا تعاون تھا، یہی وجہ ہے کہ اس آیت میں یہود اور مشرکین کو ایک ساتھ اور ایک جیسا قرار دیا گیا ہے لیکن عیسائیوں کے ساتھ غالباً مسلمانوں کے اچھے مراسم تھے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ عیسائی تین خداؤں یعنی تثلیت کے عقیدے کی وجہ سے مسلمانوں سے یہودیوں کی نسبت کافی دور تھے جو (یہود) صراحت کے ساتھ توحید کو مانتے تھے لیکن چونکہ عمل کے اعتبار سے یہودی، نصاریٰ کے برعکس مسلمانوں سے قلبی عداوت رکھتے تھے، لہٰذا اسلام نے عیسائیوں کے ساتھ صلح آمیز باہمی زندگی کی طرف زیادہ توجہ دی ہے، افسوسناک بات یہ ہے کہ آج بھی وہی حالت ہے یعنی یہود ہر جگہ اسلام اور مسلمین کے خلاف عہد شکنی کرتے اور دشمنی رکھتے ہیں لیکن عیسائیوں میں ایسے افراد یا حکومتیں ہیں جن کے اہل اسلام کے ساتھ اچھے تعلقات ہیں۔

جو کچھ بیان ہوا ہے اس سے مجموعی طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلام وسعت قلبی اور بزرگواری کے ساتھ دوسرے آسمانی مذاہب کے ساتھ حسن سلوک اور باہمی زندگی (بشرطیکہ یہ سب کچھ صلح وصفائی، دوستی اور ایک دوسرے کے احترام کی بنیاد پر قائم ہو) کو قبول کرتا ہے اور مسلمانوں کو ذمہ دار بناتا ہے کہ وہ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ اچھا طرز عمل اختیار کریں اور آپس میں بحث مباحثہ میں بھی ادب، منطق اور انصاف کو ملحوظ رکھیں اور اس طریقے سے دوسروں کی دین اسلام کی طرف راہنمائی کریں اس کے برعکس روکھے پن تلخ وطنز آمیز گفتگو، شدت اور نامناسب سلوک سے اجتناب کریں۔

دیگر اہل مذاہب کے ساتھ باہمی زندگی کے بارے میں احادیث

احادیث وروایات میں بھی اس سلسلے میں بہت سے نکات نظر آتے ہیں:

۱۔حضرت علی -، مالک اشتر کو دیئے گئے فرمان میں فرماتے ہیں:

وَاَشْعِرْ قَلْبَكَ الرَّحْمَةَ لِلرَّعِيَّةِ وَالْمَحَبَّةَ لَهُمْ وَاللُّطْفَ بِهِمْ وَلاتَكُونَنَّ عَلَيْهِمْ سَبُعاً ضارِياً تَغْتَنِمُ اَكْلَهُمْ، فَاِنَّهُمْ صِنْفانِ، اِمّا اَخٌ لَكَ فِي الدِّينِ اَوْنَظيرٌلَكَ فِي الْخَلْقِ:

(اے مالک!) اپنے دل کو اپنی رعایا کے ساتھ رحمت، محبت اور لطف (کے جذبات) سے سرشار کرو اور ایک درندے کی طرح مت بنو کہ انھیں ہڑپ کر لینے کو غنیمت جانو، اس لئے کہ رعایا دو قسم کے افراد پر مشتمل ہوتی ہے، بعض افراد تمہارے دینی بھائی ہیں جبکہ بعض دوسرے (غیر مسلم) تمہاری ہی طرح کے انسان ہیں۔[1]

غیر مسلموں کے ساتھ دوستانہ انداز میں مل جل کر رہنے کے بارے میں اس سے بڑھ کر واضح اور سچے الفاظ نہیں ہیں، امام علیؑ نے اس فرمان میں محبت، نرمی اور لطف ورحمت کو اسلامی حکومت کے سربراہ کی ذمہ داری قرار دی ہے اس سے معاشرے کے افراد کی ایک دوسرے کے مقابلے میں ذمہ داری واضح ہو جاتی ہے۔

۲۔ایک اور حدیث میں امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں کہ حضرت علیؑ ایک دفعہ ایک کافر ذمی کے ہمسفر تھے، ذمی نے آنحضرتؑ سے پوچھا: آپ کہاں جانے کا قصد رکھتے ہیں؟ آپؑ نے فرمایا: کوفہ، جب وہ ذمی شخص ایک دوراہے پر آپؑ سے جدا ہوا؛ آپؑ بھی اسی کے ہمراہ چل پڑے، ذمی نے کہا: کیا آپؑ کوفہ جانے کا قصد نہیں رکھتے؟! آپؑ نے فرمایا: ہاں کیوں نہیں؛ اس نے عرض کیا: پس آپؑ نے راہ کوفہ کو کیوں چھوڑ دیا؟ آپؑ نے فرمایا: میں نے جان بوجھ کر ایسے کیا ہے! اس نے عرض کیا: اگر آپؑ جانتے تھے تو پھر آپؑ نے ایسا کیوں کیا؟ تو جواباً آپؑ نے فرمایا:

هذامِنْ تَمامِ حُسْنِ الصُّحْبَةِ اَنْ يُشَيِّعَ الرَّجُلُ صاحِبَهُ هُنَيْئَةً اِذا فارَقَهُ، وَ كَذٰلِكَ اَمَرَنانَبِيُّنا!:

''حسن صحبت ومعاشرت کا کمال یہ ہے کہ جب انسان سے اس کا ہم سفر جدا ہونے لگے تو اسے رخصت کرنے کے لئے تھوڑا سا اس کے ساتھ چلے، ہمارے رسولؐ نے ہمیں یہی حکم دیا ہے۔'' ذمی نے تعجب کے ساتھ پوچھا: کیا سچ مچ ایسے ہی ہے؟! امامؑ نے فرمایا: ہاں؛ ذمی نے کہا: جو لوگ آپ کی پیروی کرتے ہیں یہ انہی کے

---

[1] نہج البلاغہ، مکتوب ۵۳۔

عظیم اخلاق وافعال کا نتیجہ ہے، پس میں گواہی دیتا ہوں کہ میں آپ لوگوں کے دین پر ہوں![1]

۳۔رسول اکرمؐ نے ایک حدیث میں فرمایا:

مَنْ ظَلَمَ مُعاهَداً وَ كَلَّفَهُ فَوْقَ طاقَتِهِ فَأَنا حَجِيجُهُ يَوْمَ الْقِيامَةِ

جوکوئی کسی غیر مسلم ذمی شخص پر ظلم کرے' یا اس سے اس کی طاقت سے زیادہ کام لے تو قیامت کے دن اس کا حساب میں خود چکاؤں گا اور اس کے حق کا مطالبہ کروں گا۔[2]

۴۔ایک اور حدیث جو ابو یوسف کی کتاب خراج میں بیان کی گئی ہے اور وہ یہ کہ ''حکیم بن حزام'' نے دیکھا کہ ''عیاض بن غنم'' نے اہل ذمہ میں سے بعض افراد کو جزیہ نہ ادا کرنے کی پاداش کے طور پر دھوپ میں کھڑا کر رکھا تھا اور ان پر دباؤ ڈال رہا تھا۔ ''حکیم'' نے کہا: اے عیاض! یہ کیا کر رہے ہو؟ میں نے رسول اکرمؐ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ:

"اِنَّ الَّذين يُعَذِّبُونَ النّاسَ فِي الدُّنيا يُعَذِّبُونَ فِي الآخِرَةِ"

یعنی: ''جو افراد لوگوں کو دنیا میں عذاب سے دوچار کرتے ہیں خدا تعالیٰ انھیں آخرت کے عذاب میں مبتلا کرے گا۔''[3]

یہ مسئلہ مسلمانوں میں اس قدر معروف تھا کہ ''عمر بن عبدالعزیز'' سے نقل کرتے ہیں کہ اس کے ایک گورنر ''علی بن ارطاۃ'' نامی نے اس کی طرف لکھا: میرے پاس چند ایسے افراد ہیں جنھیں اگر اذیت نہ پہنچاؤں تو وہ خراج ادا نہیں کریں گے' جواب میں عمر بن عبدالعزیز نے اس کی طرف لکھا: یہ بات سچ مچ بہت عجیب ہے کہ تم مجھ سے انسانوں کو عذاب دینے کی اجازت طلب کر رہے ہو؟ گویا میں عذاب الٰہی کے مقابلے میں تمہاری سپر (ڈھال) ہوں، گویا میری رضامندی اور اجازت تمہیں عذاب الٰہی سے بچالے گی (اگر تمہارا یہی خیال ہے تو سخت غلطی کا ارتکاب کر رہے ہو) جب میرا خط تم تک پہنچے تو جو کوئی اپنی مرضی سے خراج ادا کرتا ہے ادا کرے ورنہ وہ قسم کھا کر کہے (کہ میں خراج کی ادائیگی کی طاقت نہیں رکھتا اور اسی قسم پر قناعت کرلو) اس کے بعد مزید کہا: خدا کی قسم میں قیامت کے دن اس حال میں خدا سے ملاقات کروں کہ وہ حق بیت المال کو ادا نہ کر کے جرم کے مرتکب ہوئے ہوں یہ میرے لئے اس کی نسبت زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہے کہ میں خدا سے اس حال میں ملوں کہ میں نے انھیں عذاب اور اذیتوں کا نشانہ بنایا ہو![4]

جیسا کہ آپ ملاحظہ کر رہے ہیں اس حدیث میں ''آزار و اذیت'' (عذاب) کی بات کی گئی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خراج

---

[1] بحارالانوار، ج۱۴،ص ۵۳۔

[2] فتوح البلدان بلاذری،ص ۱۶۷۔

[3] الخراج،ص ۱۲۴۔

[4] الخراج،ص ۱۱۹۔

دینے والوں کا تعلق غیر مسلم افراد سے تھا۔ یہی مضمون ایک اور حدیث میں بھی آیا ہے جس میں عنوان ''ناس'' پر تکیہ کیا گیا ہے، ''سعید بن زید'' نے جب دیکھا کہ کچھ لوگ جزیہ ادا نہ کرنے کے باعث اذیت کا نشانہ بنائے جا رہے ہیں تو کہا: میں نے رسول اکرمؐ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے مَنْ عَذَّابَ النّاسَ عَذَّبَهُ اللهُ: کہ جو شخص لوگوں کو اذیت کرتا اور عذاب میں مبتلا کرتا ہے خدا اسے عذاب میں مبتلا کرے گا۔[1]

۵۔ نہج البلاغہ کے خطبہ جہاد میں اس بات کو ایک اور انداز میں بیان کیا گیا ہے:

وَلَقَدْ بَلَغَنِی اَنَّ الرَّجُلَ مِنْهُمْ كانَ يَدْخُلُ عَلَى الْمَرْئَةِ الْمُسْلِمَةِ وَالاُخْرى اَلْمُعاهَدَةِ فَيَنتَزِعَ حِجْلَها وَ قُلْبَها وَ قَلائِدَها وَ رُعُثَها ما تَمْتَنِعُ مِنْهُ اِلاَّ بِالاِسْتِرْجاعِ وَالاِسْتِرْحامِ... فَلَو اَنَّ اِمْرَءً مُسْلِماً ماتَ مِنْ هذا اَسَفاً ما كانَ بِهِ مَلُوماً، بَلْ كانَ بِهِ عِنْدِی جَدِيراً:

''جب حضرت علیؑ کو یہ خبر ملی کہ معاویہ کے غارت گر لشکر نے سرحدی شہر ''انبار'' پر حملہ کر کے آپؑ کے مقرر کردہ عامل ''حسان بن حسان'' کو قتل کر دیا اور مسلمانوں کا مال ومتال لوٹ لیا ہے تو آپؑ نے لوگوں کو جہاد کی دعوت دی اور جہاد سے متعلق معروف خطبہ پڑھا، خطبے کے دوران آپؑ نے یوں ارشاد فرمایا: مجھے خبر ملی ہے کہ (لشکر معاویہ کے) بعض افراد مسلمان اور غیر مسلم عورتوں کے گھروں پر ٹوٹ پڑے، وہ غیر مسلم عورتیں جو ذمی تھیں (اور جن کی جان ومال اور ناموس مسلمانوں کی پناہ میں تھے) ان کی پازیب، کنگن، گلوبند اور گوشوارے چھین لئے حالانکہ ان کے پاس اپنے دفاع کے لئے سوائے درخواست رحم اور آنسو بہانے کے کوئی اور ذریعہ نہ تھا، اگر اس وحشت ناک حادثے کے بعد کوئی مسلمان شخص غم واندوہ اور افسوس کے باعث مر جائے تو وہ قابل ملامت نہیں بلکہ میری نظر میں اسے مر ہی جانا چاہیے۔''[2]

یہاں امامؑ نے دفاع کے لازم ہونے میں ذمی عورتوں کو مسلمان عورتوں کے برابر قرار دیا ہے اور ان کے مال کی لوٹ کھسوٹ سے اس قدر رنجیدہ اور غمگین ہوئے ہیں کہ فرماتے ہیں: اگر کوئی یہ خبر سن کر غم وغصہ اور حزن وملال کے باعث مر جائے تو وہ کسی سرزنش کے لائق نہیں! اہل ذمہ کی حیثیت جان ومال اور عزت وآبرو کے دفاع کے بارے میں اس سے بہتر اور واضح سلوک کی مثال نہیں ملتی۔

٦۔ ایک حدیث میں ذکر ہوا ہے کہ حضرت علیؑ نے اپنے دور خلافت میں ایک نابینا شخص کو دیکھا جو گلیوں میں بھیک مانگ رہا تھا اور لوگوں سے مدد کی درخواست کر رہا تھا، آپؑ کو تعجب ہوا کہ اسلامی حکومت میں ایسا منظر کیوں دیکھنے میں آیا ہے۔ جب لوگوں سے اس ماجرا کے بارے میں آپؑ نے پوچھا تو انھوں نے عرض کیا: اے امیر المؤمنین - یہ ایک عیسائی ہے جس کی مدد کرنے سے لوگ گریز کرتے ہیں،

---

[1] الخراج، ص ۱۲۴ و ۱۲۵۔

[2] نہج البلاغہ، خطبہ ۲۷۔

علیؑ نہایت غمگین ہوئے اور فرمایا:

"اِسْتَعْمَلْتُمُوهُ حَتّٰى اِذَا كَبُرَ وَ عَجَزَ مَنَعْتُمُوهُ؟ اَنْفِقُوا عَلَيْهِ مِنَ بَيْتِ الْمَالِ"

جب یہ شخص مضبوط اور تنومند تھا تو تم لوگوں نے اس کی طاقت سے فائدہ اٹھایا اب جب کہ وہ بوڑھا اور ناتواں ہوگیا ہے اس کو تم نے اس کے حال پر چھوڑ دیا ہے؟! (یہ انسانیت، اخلاق اور مروت کے خلاف ہے!) آپؑ نے مزید فرمایا: مسلمانوں کے بیت المال سے اس پر خرچ کرو (یعنی اس کی تنخواہ مقرر کرو)۔[1]

مسلمانوں کا غیر ذمی افراد کے ساتھ طرز عمل

بسا اوقات یہ خیال کیا جاتا ہے کہ غیر مسلم فقط دو قسموں پر مشتمل ہیں؛ "اہل ذمہ" اور "محاربین" یعنی وہ لوگ جنھوں نے مسلمانوں کے ہمراہ صلح کے ساتھ رہنے کا عہد و پیمان کیا ہے اور وہ لوگ جو مسلمانوں کے خلاف حالت جنگ میں ہیں، اس لحاظ سے جو کوئی اہل ذمہ نہیں اس کا تعلق محاربین کے گروہ سے ہے اور اس کی جان و مال کا کوئی احترام نہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ غیر مسلم افراد کے چار گروہ ہیں کیونکہ مذکورہ بالا دو اقسام کے علاوہ "معاهد" اور "مہادن" بھی غیر مسلم ہیں۔ "معاهد" یعنی (وہ غیر مسلم جن کا مسلمانوں کے ساتھ عہد و پیمان ہوتا ہے اگر چہ وہ اسلامی حکومت کے حدود سے باہر ہوں اور اقلیت نہ سمجھے جاتے ہوں) اور "مہادن" جو نہ اقلیت ہیں اور نہ معاہد اور جو نہ مسلمانوں کے ساتھ عہد و پیمان کی حالت میں ہیں نہ حالت جنگ میں بلکہ جداگانہ طور پر مسلمانوں سے علیحدہ اپنے ملک میں زندگی بسر کرتے ہیں اور مسلمانوں کے لئے کسی مزاحمت کا باعث نہیں بنتے۔ آج کی دنیا میں ان چار گروہوں کی واضح مثالیں موجود ہیں:

۱۔ وہ اقلیتیں جو اسلامی ممالک کے اندر رہتی اور ان کے قوانین کی پابندی کرتی ہیں حکومت اسلامی ان کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کرنے کی پابند ہے اور ان کے حقوق کا دفاع کرتی ہے، وہ حکومت اسلامی کو جو ٹیکس دیتی ہیں انھیں ٹیکس کے بجائے جزیہ قرار دیا جاسکتا ہے جیسے کہا جاچکا ہے کہ جزیہ، جزاء سے اخذ ہوا ہے اور یہ وہ چیز (ٹیکس) ہے جسے اسلامی حکومت ان کے دفاع کے اخراجات کے طور پر ان سے وصول کرتی ہے، یہی لوگ ذمی یا اہل ذمہ ہیں۔

۲۔ بعض ممالک جیسے اسرائیل اور امریکہ جو موجودہ حالات میں مسلمانوں کے ساتھ حالت جنگ میں ہیں اور مسلمانوں کے خلاف کسی عہد شکنی اور ضرر رسانی سے دریغ نہیں کرتے، یہی کافر حربی ہیں جن کی نسبت مسلمان کسی عہد کے پابند نہیں۔

۳۔ کچھ غیر اسلامی ممالک ایسے بھی ہیں جن کے مسلمانوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات ہیں اور ان کے ساتھ اہل اسلام کے سفارتی روابط بھی قائم ہیں اور کبھی ان کے ساتھ تجارتی، اقتصادی اور ثقافتی معاہدے بھی تشکیل دیئے جاتے ہیں یا اقوام متحدہ کے ذریعہ اہل اسلام اور ان کے درمیان بالواسطہ معاہدے ہوتے ہیں یہ سب "معاهد" کی مثالیں ہیں اور ضروری ہے کہ ان کے ساتھ براہ راست یا اقوام متحدہ کی وساطت سے کئے گئے معاہدوں کے مطابق عمل درآمد ہو اور ان معاہدوں کا احترام کیا جائے بہت سارے یورپی اور ایشیائی غیر مسلم ممالک کا

---

[1] وسائل الشیعہ، ج ۱۱، ص ۴۹ (باب ۱۹ از ابواب جہاد العدو)۔

اس ضمن میں نام لیا جا سکتا ہے۔

۴۔ممکن ہے کہ کچھ ایسے غیر اسلامی ممالک بھی ہوں جو اسلامی حکومت کے ساتھ نہ حالت جنگ میں سے ہیں اور نہ ہی اس کے ساتھ ان کا کوئی معاہدہ ہے، اور نہ ہی سفارتی تعلقات قائم ہیں لیکن نہ وہ مسلمانوں کے ساتھ کوئی مزاحمت کرتے ہیں اور نہ مسلمان ان کے ساتھ، ایسے ممالک کے لوگوں کے ساتھ بھی اہل اسلام کو انسانی اور اخلاقی اصولوں کے تحت پیش آنا چاہیے۔

مذکورہ بالا بیان سے یہ نکتہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اہل ذمہ فقط وہ اہل کتاب ہیں جو اسلامی ممالک میں زندگی گزارتے ہیں اور احکام جزیہ یا علانیہ طور پر گناہان کبیرہ کے ارتکاب سے اجتناب جیسے احکام کا تعلق ''اہل ذمہ'' سے ہے اور وہ اہل کتاب جو اپنے ممالک میں رہتے ہیں اہل ذمہ نہیں کہلاتے اگرچہ مسلمانوں کے ساتھ ان کا کوئی معاہدہ ہی کیوں نہ ہو، یہ لوگ بعض اوقات ''معاہد'' اور کبھی ''محارب'' اور کبھی ''مہادن'' ہوتے ہیں۔(غور فرمائیں)

حکومت اسلامی اور انٹیلی جنس ادارے

اشارہ

بلاشبہ تجسس کرنا اور لوگوں کے پوشیدہ اسرار کی ٹوہ لگانا ایک قابل مذمت اور ناپسندیدہ فعل ہے، خدا تعالیٰ ''**ستار العیوب**'' یعنی: عیبوں کی پردہ پوشی کرنے والا ہے اور اس کے بندوں کو بھی ایسا ہی ہونا چاہیے مگر وہ لوگ جو پردہ دری کریں، شرم وحیا کو بالائے طاق رکھ دیں اور علانیہ طور پر گناہوں کا ارتکاب کریں تو ان کا احترام ختم ہوجاتا ہے بلکہ وہ خود اپنے احترام کے خاتمے کا باعث بنتے ہیں۔ قرآن مجید نے سورۂ حجرات میں واضح طور پر اس موضوع کو بیان کیا ہے اور اس ضمن میں فرمایا ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۡاِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ؕ

اے صاحبان ایمان بہت سی بدگمانیوں سے بچو کیونکہ بعض گمان گناہ ہیں اور ہرگز دوسروں کے امور کے بارے میں تجسس نہ کرو اور تم میں سے کوئی کسی دوسرے شخص کی غیبت نہ کرے۔[1]

اس مقام پر تین عظیم گناہوں کا ذکر کیا گیا ہے: ''بدگمانی''، ''تجسس'' اور ''غیبت'' اور ان تینوں گناہوں میں سے ہر گناہ درحقیقت کسی دوسرے گناہ کا مقدمہ اور سبب ہے، بعض اشخاص کے بارے میں سوءظن (بدگمانی) کے باعث ان کے بارے میں تجسس بھی کیا جاتا ہے اور تجسس اس بات کا سبب بنتا ہے کہ ان کے عیوب اور خطاؤں کے بارے میں آگاہی حاصل ہوجائے اور لوگوں کے عیوب وخطا سے آگاہی کے باعث ایک دوسرے کی غیبت کرنے کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ غیبت جو بہت ہی بڑا گناہ اور کینہ وعداوت اور تفرقے بے اعتمادی کا سرچشمہ ہے۔ اصولی طور پر اسلامی نقطۂ نظر سے ہر شخص کی عزت وآبرو اس کا اہم سرمایہ ہے جو کئی وجوہات کی بنیاد پر اس کے جان مال سے بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ رسول اکرمؐ ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

"اِنَّ الدِّرْهَمَ يُصيبَهُ الرَّجُلُ مِنَ الرِّبا اَعْظَمُ عِنْدَاللهِ فِي الْخَطِيئَةِ مِنْ سِتٍّ وَثَلاثينَ زِنْيَةٍ يَزْنيها الرَّجُلُ، وَاَرْبَى الرِّبا عِرْضُ الرَّجلِ الْمُسْلِمِ"

''ایک درہم جسے کوئی شخص سود کے ذریعے کماتا ہے اس کا گناہ کسی شخص کے چھتیس مرتبہ زنا کرنے سے بالاتر ہے اور ہر سودی گناہ سے بڑھ کر گناہ کسی مسلمان کی آبرو (کو ضائع کرنا) ہے۔''[2]

---

[1] (سورۂ حجرات / ۱۲

[2] المحجۃ البیضاء، ج۵، ص ۲۵۳۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ معاشرے میں کسی شخص کی عزت وآبرو اُس کا سب سے بڑا سرمایہ ہے اور اس کے مقابلے میں دوسری چیزیں (مال ودولت وغیرہ) ناچیز شمار کی جاتی ہیں؛ بلاشبہ بدگمانی، تجسس اور غیبت اس نہایت قیمتی سرمائے (آبرو) کو خطرے میں ڈال دیتی یا اس کی تباہی اور بربادی کا باعث بنتی ہیں۔ لیکن اس صورتحال کے باوجود ایسے مواقع بھی پیش آتے ہیں کہ اگر حسن ظن اور خوش گمانی کی خاطر تجسس نہ کیا جائے اور پوشیدہ رازوں سے پردہ نہ ہٹایا جائے تو اسلامی معاشرے کو کئی خطرات کا سامنا ہوسکتا ہے، چاہے یہ خطرہ داخلی منافقوں کی سازش کا ہو یا بیرونی دشمنوں کا کوئی منحوس سازشی منصوبہ ہو جسے وہ ملک میں موجود اپنے ایجنٹوں کے ذریعے عملی شکل دینا چاہتے ہیں۔

ایسے موقعوں پر حسن ظن کو ایک طرف رکھ کر سوءظن کے ساتھ معاملے کا جائزہ لینا چاہیے اور اہم اور اعلیٰ مقاصد کی حفاظت کی خاطر تجسس اور جاسوسی پر عمل درآمد ہونا چاہیے اور یہی سراغرسانی اور جاسوسی کے نظام اور محکمے کی تشکیل کا فلسفہ اور مقصد ہے، یہ ایک ایسا فلسفہ ہے جسے عقل اور شرع کی تائید حاصل ہے، اگرچہ دنیا پرست افراد اور خودغرض استکباری حکومتیں اس سے غلط فائدہ اٹھاتی رہی اور اٹھا رہی ہیں، لیکن ان کا یہ غلط فائدہ اٹھانا اس موضوع کی اہمیت کو کم نہیں کرتا اور اس کے ضروری ہونے سے انکار کا باعث نہیں بنتا چونکہ کون سا مقدس قانون ہے کہ جس سے سوءاستفادہ نہیں کیا گیا؟!

مختصر یہ کہ لوگوں کی نجی زندگی اور دیگر امور میں تجسس نہ کرنا ایک اصل (قانون) ہے جس کی حفاظت ہونی چاہیے لیکن خاص مواقع پر تجسس مستثنیٰ ہے جس پر حدود وشرائط کی پابندی کے ساتھ ایک الٰہی ذمہ داری کے عنوان سے عمل ہونا چاہیے۔ درحقیقت اس استثناء میں مہم اور اہم کے قانون کی رعایت کی گئی ہے اور اس کی حیثیت ثانوی قانون کی سی ہے۔ لوگوں کی عزت وآبرو کی حفاظت بہت اہمیت کی حامل ہے لیکن اسلامی معاشرے، نظام حکومت اور امن وامان کی برقراری اس سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خاص معاملات میں پہلا حکم دوسرے حکم پر فدا ہوجاتا ہے۔

مذکورہ بالا بیان سے واضح ہوجاتا ہے کہ دوسروں کے معاملات میں تجسس ہمیشہ ایک اطمینان بخش دلیل کی بنا پر جائز ہے اور بغیر دلیل کے لوگوں کے معاملات کی جاسوسی کرنا جائز نہیں۔ مذکورہ بیان اسلامی معاشرے کے داخلی مسائل سے تعلق رکھتا ہے۔

اسلامی معاشرے سے باہر یہ مسئلہ زیادہ واضح اور روشن ہے، مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ غیر اسلامی معاشروں میں پیش آنے والی صورت احوال سے باخبر ہوں چونکہ ممکن اس کا تعلق مسلمانوں کی تقدیر کے ساتھ بھی ہو، انھیں چاہیے کہ وہ سازشوں سے ابتداء ہی میں باخبر ہوکر ان کا خاتمہ کردیں، اور دیر سے ان کے بارے میں آگاہی کی صورت میں ممکن ہے کہ ان کے خاتمے پر قادر نہ ہوں یا اس کی انھیں بھاری قیمت چکانی پڑے! حکومت اسلامی (اور دنیا کی ساری حکومتوں) میں تجسس (جاسوسی) کی ایک اور قسم بھی رائج ہے اور وہ ہے اسلامی (اور غیر اسلامی) حکومتی عہدیداروں کی کارگردگی پر نگرانی، اور یہ اس لئے ہوتی ہے تاکہ اطمینان حاصل ہوجائے کہ وہ اپنی ذمہ داریاں بطور احسن انجام دے رہے ہیں اور لوگوں کے حق میں کسی ظلم وستم کے مرتکب تو نہیں ہو رہے اور اپنے عہدے سے سوءاستفادہ تو نہیں کر رہے۔

بہرحال قرآنی آیات سے استفادہ ہوتا ہے کہ تجسس اور جاسوسی کا مسئلہ اسلام کے ابتدائی دور میں بھی موجود تھا اور دشمن اسلام طاقتوں کی جاسوسی کے مقابلے میں رسول اکرمؐ نے بھی جاسوسی کا ایک نظام قائم کیا تھا تاکہ اس کے ذریعے دشمنوں کی جاسوسی پر مبنی

سرگرمیوں کو بے اثر بنایا جا سکے۔ سورۂ توبہ کی آیت ۴۷ میں قرآن مجید مسلمانوں کو منافقین کی جاسوسی پر مبنی سرگرمیوں کی نگرانی کے بارے میں ہوشیار رہنے کی تاکید کرتے ہوئے فرماتا ہے: اگر وہ (منافقین) تمہارے ہمراہ (تبوک کے میدان جنگ کی طرف) چلے جاتے تو تمہیں اضطراب اور پریشانی کے علاوہ کچھ نہ دیتے اور بہت تیزی کے ساتھ تمہارے درمیان فتنہ انگیزی کرتے اور تمہاری صفوں میں ان کے جاسوس موجود ہیں اور خداوند ظالموں سے آگاہ ہے۔

لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَاْاَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝۴۷ [1]

ممکن ہے کہ سَمّٰاع سے مراد جاسوس ہو یا وہ شخص مراد ہو جس کی سماعت بہت تیز ہو، لیکن پہلی صورت آیت کے مفہوم کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ ادھر تنبیہ اور ہوشیاری کی تلقین ہے جب کہ اس سے پہلے والی چند آیات میں رسول اکرمؐ کو منافقین کو پہچاننے کا حکم ملتا ہے، ارشاد الٰہی ہے: خدا تعالیٰ نے تمہیں بخش دیا، تم نے انھیں میدان جہاد میں شرکت سے اجتناب کی اجازت کیوں دی تاکہ سچ کہنے والوں اور جھوٹ بولنے والوں کے درمیان تمیز ہو جائے؟

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ۝۴۳ [2]

حاطب اور سارہ کے جاسوسی کا قصہ

فتح مکہ سے قریبی ایام میں پیش آنے والے ''حاطب بن ابی بلتعہ'' کے واقعے سے بھی یہ پتہ چلتا ہے کہ رسول اکرمؐ نے جاسوسی کے خلاف ایک مضبوط نظام تشکیل دے رکھا تھا۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ جب رسول اکرمؐ فتح مکہ کے لئے آمادہ ہو چکے اور مدینہ میں اس کی کامیابی کی اسباب فراہم کر لئے تو اب آپؐ کی بھرپور کوشش تھی کہ یہ خبریں مکہ میں نہ پہنچیں، اسی اثناء میں ایک مسلمان ''حاطب بن ابی بلتعہ'' جو جنگ بدر اور بیعت رضوان میں شرکت کر چکا تھا؛ شیطانی وسوسے کا شکار ہو گیا اور اس نے سوچا ممکن ہے مشرکین مکہ، مکہ میں موجود اس کے بے سرپرست خاندان کو مشکلات کا نشانہ بنائیں، لہٰذا اس نے چاہا کہ وہ مشرکین کی مدد کرے تاکہ وہ اس کے اہل خانہ کے لئے کوئی مزاحمت اور مشکل نہ پیدا کریں!

مکہ میں رہنے والی ''سارہ'' نامی ایک عورت مدینہ آئی ہوئی تھی اور اب واپس مکہ جانا چاہتی تھی، حاطب نے اہل مکہ کے نام ایک خط لکھا، اور اسے سارہ کے حوالے کیا اور اسے دس دینار یا دس درہم بھی دیئے تاکہ وہ یہ خط مشرکین مکہ تک پہنچا دے، خط کی عبارت یہ تھی:

''رسول اکرمؐ تمہاری طرف آنا چاہتے ہیں اپنے دفاع کی تیاری کر رکھو!''

---

[1] (توبہ/۴۷) اَوْضَعُوا مادہ ایضاع سے ماخوذ اور سرعت کے ساتھ چلنے کے معنی میں ہے اور یہاں اس سے مراد یہ ہے کہ منافقین بہت جلد سادہ لوح مسلمانوں کے درمیان فتنہ، تفرقہ اور نفاق پیدا کر دیتے تھے۔

[2] توبہ/ ۴۳

رسول اکرمؐ اس جاسوسی کے اس خطرناک منصوبے سے آگاہ ہو گئے (کہا جاتا ہے کہ جبرائیل امینؑ نے اس واقعے کی آنحضرتؐ کو اطلاع دی تھی) آپؐ نے فوراً حضرت علیؑ، عمار، زبیر، طلحہ، مقداد اور ابومرثد کو حکم دیا کہ وہ گھوڑوں پر سوار ہو کر مکہ کی جانب روانہ ہوں اور فرمایا: راستے میں ایک "مقام" پر تم لوگ ایک عورت تک پہنچو گے جس کے پاس حاطب کا مشرکین مکہ کے نام ایک خط ہے جو اس سے لے لینا۔

یہ لوگ روانہ ہو گئے اور رسول اکرمؐ کی بتائی ہوئی جگہ پر انھوں نے اسے جا لیا، وہ قسمیں کھانے لگی کہ اس کے پاس کوئی خط نہیں! اس کے سامان کی احتیاط کے ساتھ تلاشی لی گئی لیکن خط نہ ملا، حضرت علیؑ کے سوا سب نے واپسی کا ارادہ کیا، لیکن آپؑ نے فرمایا: نہ رسول اکرمؐ نے دروغ گوئی سے کام لیا ہے اور نہ ہم جھوٹ بول رہے ہیں؛ آپؑ نے تلوار کھینچ لی اور اس عورت سے مخاطب ہو کر فرمایا: "خط باہر نکالو ورنہ تمہاری گردن ماردوں گا!"

سارہ ڈر گئی اور خط کو جسے اس نے سر کے بالوں میں چھپا رکھا تھا، باہر نکال لیا، خط کو رسول اکرمؐ کی خدمت میں پہنچا دیا گیا۔ حضرتؐ نے وہ خط حاطب کو دکھا کر کہا: جانتے ہو یہ خط کس کا ہے؟ اس نے عرض کیا: جی ہاں، آپؐ نے فرمایا: تم نے یہ کام کیوں کیا ہے؟ اس نے وہی عذر پیش کیا جو بیان ہو چکا ہے، آنحضرتؐ نے مصلحتاً اس کا عذر قبول کر لیا، لیکن جناب عمر سے نہ رہا گیا اور بول پڑے: اے رسول خدا! اجازت دیجئے کہ اس منافق (جاسوس) کی گردن ماردوں! رسول اکرمؐ نے فرمایا: یہ شخص بدری مجاہد ہے اور مجاہدین بدر کی خدا کی نظر میں ایک خاص اہمیت ہے۔ سورہ ممتحنہ کی ابتدائی آیات میں مسلمانوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ اس قسم کے کاموں کی تکرار سے سخت پرہیز کریں کیونکہ یہ کام ان کی دنیا و آخرت کی تباہی کا سبب ہے۔[1]

اس واقعے میں دشمن کے لئے جاسوسی کی گئی تھی لیکن رسول اکرمؐ کی جاسوسی کے خلاف منصوبہ بندی (چاہے وہ جبرائیلؑ یا کسی اور ذریعے سے ہو) نے دشمن کے منصوبے کو ناکام کر دیا، اس طرح لشکر اسلام کی مکہ کی طرف روانگی کی خبر مکہ تک نہ پہنچی اور اہل مکہ لشکر اسلام کے داخلے سے مکمل طور پر غافل اور بے خبر رہے، یہی وجہ تھی کہ مشرکین کا سب سے بڑا مرکز کسی خونریزی اور جنگ کے بغیر مسلمانوں کے ہاتھ آ گیا اور یہ ایک بے حد اہم کامیابی تھی اس کے برعکس اگر وہ جاسوس عورت اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتی تو شاید بہت زیادہ خونریزی ہوتی، بہرحال اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ جاسوس یا جاسوسی کے خلاف قائم کئے گئے ادارے کسی قوم کی تقدیر اور سرنوشت میں کس قدر اہمیت رکھتے ہیں۔

حذیفہ کی سراغرسانی کا واقعہ

رسول اکرمؐ کے زمانے میں جاسوسی اور سراغرسانی کے واقعات میں سے ایک جنگ احزاب میں حذیفہ کا واقعہ ہے۔ بہت ساری تاریخوں میں ذکر ہوا ہے کہ جنگ احزاب کے دوران ایک رات جب دشمن کے لشکر کے مختلف گروہوں یعنی احزاب میں پھوٹ پڑ گئی، رسول اکرمؐ نے فرمایا: کیا تم لوگوں میں سے کوئی ایسا ہے جو اس تاریکی میں دشمن کے لشکر میں جائے اور کسی خبر کا سراغ لائے، جو کوئی یہ کام

[1] زیادہ تر مفسرین نے اس شان نزول کو سورۂ ممتحنہ کی ابتدائی آیات کے سلسلے میں متعدد مختلف طریقوں سے بیان کیا ہے۔

انجام دے گا جنت میں میرا ساتھی ہوگا؟! مشہور صحابی رسولؐ جناب حذیفہؓ کہتے ہیں: رسول اکرمؐ کے جواب میں کوئی بھی شخص شدید تھکاوٹ، بھوک اور خوف و وحشت کی وجہ سے نہیں اٹھا، رسول اکرمؐ کی نظر مجھ پر پڑی، آنحضرتؐ نے مجھے پکار کر فرمایا: ''جاؤ اور میرے لئے دشمن کے لشکر کی کوئی خبر لاؤ اور اس کے علاوہ کوئی عمل انجام نہ دینا یہاں تک کہ پلٹ کر یہیں آ جاؤ!'' حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں: میں قریش کے لشکر میں گیا اور صورتحال یہ تھی کہ طوفانی ہوا چل رہی تھی جس کی وجہ سے اہل لشکر کا سارا ساز و سامان اور خوراک وغیرہ برباد ہو چکے تھے۔

اچانک سردار قریش ابوسفیان کو میں نے دیکھا جو اس تاریکی میں چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا: اے قریش! (میں تم سے مخاطب ہوں) تم میں سے ہر ایک اپنے ساتھ والے شخص کو اچھی طرح پہچان لے، کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی غیر شخص یہاں موجود ہو! حذیفہؓ کہتے ہیں: میں نے پہل کی اور فوراً اپنے ساتھ بیٹھے (یا کھڑے) شخص سے پوچھا: تم کون ہو؟ اس نے جواب دیا: میں فلاں شخص ہوں، میں نے کہا: بہت اچھا۔[1]

اس کے بعد ابوسفیان نے کہا: خدا کی قسم یہ جگہ ٹھہرنے کے قابل نہیں، ہمارے اونٹ اور گھوڑے ہاتھ سے نکل گئے، بنی قریظہ کے یہودیوں نے اپنا معاہدہ توڑ دیا ہے اور اس ہوا اور شدید طوفان نے ہماری کوئی چیز سالم نہیں چھوڑی، اٹھو اور چل پڑو، میں چلنے کے لئے تیار ہوں، پھر وہ عجلت کے ساتھ اپنی سواری کی طرف بڑھا، میں نے سوچا ایک تیر سے اس کا کام تمام کر دوں، جونہی میں نے تیر چلانا چاہا مجھے رسول اکرمؐ کا فرمان یاد آ گیا کہ ذرا سی بھی خطا کئے بغیر واپس چلے آنا اور مجھے صرف تمہاری لائی ہوئی خبر کی ضرورت ہے، میں واپس چلا آیا اور سارا ماجرا آنحضرتؐ کو کہہ سنایا۔[2]

قرآن مجید کی آیات سے پتہ چلتا ہے کہ سراغرسانی کا عمل گزشتہ انبیاء کے ادوار میں بھی رائج رہا ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات اس مقصد کے لئے پرندے بھی استعمال کئے جاتے تھے، جیسا کہ حضرت سلیمانؑ اور ہدہد کی داستان میں ذکر ہوا ہے کہ وہ حضرت سلیمانؑ کے لئے دور دراز کے علاقوں کی خبریں لاتا تھا۔ اس کے بعد حضرت سلیمان- کا پیغام جو آپؑ کی حکومت کی کسی دوسرے ملک کے ساتھ تعلقات کے عنوان پر مشتمل ہوتا تھا، اس ملک میں پہنچا دیتا۔[3]

احادیث، میں سراغرسانی کی تاکید

اس مسئلہ کی جھلک احادیث اور تاریخ میں بھرپور طریقے سے نظر آتی ہے اور ان کے مطالعے سے اس حقیقت کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔ لہٰذا حکومت اسلامی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس مسئلے سے غفلت نہ برتے اور دو قسم کے امور کو نہایت احتیاط کے ساتھ عملی جامہ پہنائے: دشمن کی فوج، سیاسی اور اقتصادی کارروائیوں پر نظر رکھے کیونکہ ان کا کسی نہ کسی تعلق طرح سے مسلمانوں کے ساتھ بھی ہوتا ہے اور اس کے علاوہ دشمن کی جاسوسی پر مبنی سرگرمیوں کا بھی مقابلہ کرنا چاہیے جو اپنے مخصوص انداز سے خفیہ ٹھکانوں سے آگاہ ہو کر ان کے بارے

---

[1] شرح مواہب کے حاشیہ پر موجود سیرۂ ابن ہشام میں یہ واقع اس طرح بیان ہوا ہے کہ حذیفہ کہتے ہیں: میں نے اپنے دائیں طرف بیٹھے شخص سے پوچھا: تو کون ہے؟ تو اس نے کہا: معاویہ بن ابوسفیان ہوں۔ پھر اپنی بائیں طرف بیٹھے شخص سے پوچھا: تو کون ہے؟ تو اس نے کہا: عمرو بن عاص ہوں (اس وقت معاویہ اور عمرو بن عاص مشرکین کے لشکر میں تھے) سیرۂ ابن ہشام، ج ۳، ص ۲۴۳، طبع دار احیاء تراث العربی۔

[2] شرح مواہب، ج ۲، ص ۲۰۸ پر بھی اس کے مشابہ مطلب بیان ہوا ہے۔

[3] سورۂ نحل آیت ۲۰ سے ۲۶ تک (مزید وضاحت کے لئے تفسیر نمونہ، ج ۱۵، ص ۴۳۹ کا مطالعہ فرمائیں)۔

میں قیمتی اور مخفی اسرار کو چرالے جاتے ہیں۔اس ضمن میں روایات اور تاریخی واقعات کے کچھ نمونے یہاں بیان کئے جاتے ہیں:

ا۔امام علی بن موسیٰ الرضاؑ ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

" كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ(ص) اِذا بَعَثَ جَيْشاً فَاَتَّهَمَ اَميراً، بَعَثَ مَعَهُمْ مِنْ ثُقاتِهِ مَنْ يَتَجَسَّسُ خَبَرَهُ"

''رسول خداؐ جب کسی لشکر کو کسی سپہ سالار کی زیر قیادت بھیجتے جو کسی وجہ سے ممکن تھا کسی تہمت کا نشانہ بن جائے آپؐ اس کے ساتھ ہی کسی قابل اعتماد شخص کو بھیجتے تا کہ وہ اس (سپہ سالار) کی کاروائیوں سے آگاہ کرتا رہے۔''[1]

ممکن ہے کہ وہ امیر کئی لحاظ سے قابل اعتماد ہولیکن موقعے کی نزاکت کے باعث ضروری ہوتا تھا کہ کوئی ایسا شخص بھی ہو جو اس کی کارکردگی پر نظر رکھ سکے کہ خدانخواستہ وہ کسی ایسے انحراف کا شکار نہ ہوجائے، جس کی تلافی مسلمانوں کے لئے ممکن نہ ہو۔مذکورہ حدیث وسائل اور قرب الاسناد (طبع جدید)[2] کے موافق ہے، لیکن بعض کتب میں ''فاتّهم'' کی بجائے ''فَاَمَّهُمْ'' ذکر کیا گیا ہے جس کا مطلب لشکر کا میر قرار دینا ہے لیکن اس کے ہمراہ سراغرساں اور جاسوس کو معین کرنا ''فاتّهم'' کے ساتھ زیادہ مناسب ہے اور ایسے شخص کا انتخاب ممکن ہے بعض خصوصیات کے لحاظ سے ہو جو کسی اور میں نہ پائی جاتی ہوں۔(غور فرمائیں)

۲۔''سَرِیّہ'' عبداللہ بن جحش (سریہ اس جنگ کو کہتے ہیں جس میں رسول اکرمؐ نے بذاب خود شرکت نہ فرمائی ہو) کے بارے میں رسول اکرمؐ نے ''عبداللہ'' کو مہاجرین کی ایک جماعت (لشکر) کے ساتھ روانہ فرمایا، آپؐ نے ایک خط لکھ کر اسے دیا اور فرمایا: جب تک دو دن کی مسافت طے نہ کر لو خط کو نہ کھولنا، اس کے بعد خط کھول کر اس کے مضمون کے مطابق عمل کرنا'' عبداللہ نے ایسے ہی کیا۔دو دن بعد جب اس نے خط کھولا تو دیکھا کہ اس میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ جب تم میرا خط پڑھو تو اپنا سفر جاری رکھو یہاں تک کہ مکہ اور طائف کے درمیان واقع نخلستان میں پہنچ جاؤ اور وہاں دشمن کی گھات میں بیٹھ جاؤ اور ان کے بارے میں خبریں حاصل کر کے انھیں میرے پاس بھیجو (یہ ایک طویل واقعہ ہے اور اس کے ذیل میں ذکر ہوا ہے کہ اس جگہ عبداللہ اور قریش کے لشکر کے درمیان جھڑپ ہوئی، قریش کو شکست ہوئی اور بڑی مقدار میں مال غنیمت اور دو قیدیوں کے ہمراہ عبداللہ کا لشکر رسول اکرمؐ کی خدمت میں واپس آیا)۔[3]

ماجرا کے اس حصے کو بیان کرنے کا مقصد رسول اکرمؐ کے اصحاب کی جاسوسی پر مبنی کارگردگی کی طرف اشارہ کرنا ہے۔

۳۔ جنگ بدر کے واقعے کے بعد جب ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں نے مکہ واپس جانا چاہا، ابوسفیان نے چیخ کر کہا: آئندہ سال اسی سرزمین بدر پر ہماری اور تمہاری پھر ملاقات ہوگی۔رسول اکرمؐ نے اپنے ایک صحابی سے فرمایا کہ وہ جواب میں کہے: ہاں! ایسا ہی

---

[1] وسائل الشیعہ، ج۱۱، ص ۴۴۔

[2] طبع مؤسسہ آل بیتؑ۔

[3] سیرۂ ابن ہشام، ج۲، ص ۲۵۲ اور کامل ابن اثیر، ج۲، ص ۱۱۳۔

ہے ہماری آئندہ ملاقات کی جگہ یہی ہے! اس کے بعد آپؐ نے اس جگہ سے کوچ کیا؛ رسول اکرمؐ نے علیؑ سے فرمایا: ان (مشرکین) کا تعاقب کرو اور دیکھو کہ وہ کیا کررہے ہیں اور کہاں جانا چاہتے ہیں اگر وہ گھوڑوں کی بجائے اونٹوں پر سوار ہیں تو مکہ کا قصد رکھتے ہیں اور اگر گھوڑوں پر سوار ہیں اور اونٹوں کو ہمراہ لے جارہے ہیں تو ان کا قصد مدینے کا ہے، خدا کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اگر ان کا ارادہ مدینے پر حملہ کرنا ہوا تو میں ان کے خلاف ضرور جنگ کروں گا! حضرت علیؑ نے خفیہ انداز میں ان کا تعاقب کیا اور دیکھا کہ وہ گھوڑوں کو چھوڑ کر اونٹوں پر سوار مکہ کی سمت گامزن ہیں۔[1]

حضور اکرمؐ کی طرف سے جاسوسی کا یہ عمل جو حضرت علیؑ کے توسط سے انجام دیا گیا، ایک بے حد نازک عمل تھا جو مسلمانوں کی سرنوشت اور تقدیر پر بہت اثر انداز ہوا کیونکہ اس کی وجہ سے مسلمان غفلت کا شکار ہونے سے بچ گئے۔

۴۔ جنگ احد میں بھی رسول اکرمؐ نے لشکر قریش کے آنے سے پہلے دو جاسوس بھیجے کہ وہ قریش کے لشکر کی تعداد اور کیفیت کے بارے میں راستے ہی میں آگاہ ہو کر اس کی خبر دیں، اسی طرح جب وہ میدان احد میں داخل ہو کر جاگزین ہو گئے تو آپؐ نے ''حباب بن منذرؓ'' کو خفیہ طور پر ان کے سراغ میں بھیجا اور حکم دیا کہ وہ لشکر قریش میں داخل ہو کر اہل لشکر کی تعداد کا اندازہ لگائیں اور ان کی کیفیت کے بارے میں خبر لائیں اور یہ بھی فرمایا کہ جب تم کوئی میرے لئے خبر لاؤ تو سب لوگوں کے سامنے اسے بیان نہ کرنا! لیکن اگر ان کی تعداد کم ہو تو علانیہ طور پر بیان کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں (لیکن چونکہ ان کی تعداد زیادہ تھی) انھوں نے خفیہ انداز میں یہ خبر رسول اکرمؐ کے گوش گذار کی۔[2]

اس حدیث سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ رسول اکرمؐ کے جاسوسی پر مامور افراد دشمن کی روانگی سے لے کر میدان جنگ میں داخل ہونے تک ان کے لشکر پر کڑی نظر رکھتے تھے۔

۵۔ نہج البلاغہ کے خطوط سے اچھی طرح ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت علیؑ کے جاسوسی ادارے پوری اسلامی مملکت کے مسائل کی نگرانی کرتے تھے، مالک اشتر کے نام حضرت علیؑ کے فرمان میں خفیہ افراد کی سرکاری عہدیداروں کی نگرانی کی کیفیت کے بارے میں یوں نقل ہوا ہے:

وَابۡعَثِ الۡعُیُونَ مِنۡ اَهۡلِ الصِّدۡقِ وَالۡوَفاءِ عَلَيۡهِمۡ فَاِنَّ تَعاهُدَكَ فِي السِّرِّ لِاُمُورِهِمۡ حَدۡوَةٌ لَهُمۡ عَلَى الاِسۡتِعۡمالِ الۡاَمَانَةِ وَالرِّفۡقِ بِالرَّعِيَّةِ:

''راست گو اور باوفا افراد کو حکومتی عہدیداروں کے حال کی تحقیق کے لئے منتخب کرو اور ان کے اعمال کو زیر نظر رکھو، اس لئے کہ دائمی طور پر خفیہ تحقیق اس بات کا سبب بنتی ہے کہ وہ ایمانداری کے ساتھ اپنے فرائض انجام

[1] سیرۂ ابن ہشام، ج۳، ص۱۰۰۔

[2] مغازی واقدی، ج۲، ص۲۰۶ اور ۲۰۷۔

دیں اور اپنے ماتحت لوگوں کے ساتھ نرمی اور حسن سلوک کا برتاؤ کریں!'

البتہ جاسوسی پر مامور افراد کی کارروائی کی یہ وہ قسم ہے جسے وہ حکومت کے اندر اور حکومتی عہدیداروں کے بارے میں انجام دیتے ہیں۔

۶۔حضرت علیؑ مکہ کے گورنر ''قثم بن عباس''، عبداللہ بن عباس کے بھائی کے نام ایک خط میں یہ تحریر فرماتے ہیں: " اَمّا بَعْدُ فَاِنَّ عَیْنِی بِالْمَغْرِبِ[1] کَتَبَ اِلَیَّ یُعْلِمُنِی اَنَّهُ وَجّهَ اِلَی الْمَوْسِمِ اُناس مِنْ اَهْلِ الشّامِ اَلْعُمْیُ الْقُلُوبِ الصُّمِّ الاَسْماعِ الکُمهِ الاَبْصارِ اَلَّذِینَ یَلْبِسُونَ الحَقَّ بِالباطلِ وَیُطیعُونَ المَخْلُوقَ فی مَعْصیَتِهِ الخالِقِ... فَاَقِمْ عَلی ما فی یَدَیْكَ قیامَ الحازِمِ الصَّلیبِ "، یعنی: ''مغرب (شام) میں موجود میرے خفیہ مامور نے اطلاع دی ہے کہ (معاویہ کی طرف سے) لوگوں کا ایک گروہ حج کے لئے بھیجا گیا ہے، یہ گروہ ایسے افراد پر مشتمل ہے جو بے بصیرت، اندھے، بہرے اور حق کو باطل کے ساتھ ملانے والے ہیں اور خدا کی نافرمانی اور مخلوق کی اطاعت کرتے ہیں......اس مطلب کے پیش نظر اپنی ذمہ داری کا احساس کرو اور اسے اس طرح پورا کرو جس طرح ایک مضبوط اور دور اندیش انسان پورا کرتا ہے۔''[2]

ایسے نظر آتا ہے کہ معاویہ کی طرف سے امامؑ کے خلاف قثم بن عباس کو خیانت (غداری) کی دعوت دی گئی اور حجاج کے امور کو بے سروسامانی سے دوچار کرنے کی سازش تیار کی گئی جس کی اطلاع معاویہ کی حکومت میں موجود امامؑ کے خفیہ مامور نے سرعت کے ساتھ آپ تک پہنچا دیا تھا اور آپؑ نے بھی اس سازش کو ناکارہ بنانے کے لئے فوری اقدام فرمایا۔اس مقام پر ان خفیہ مامورین (جاسوسوں) کا ذکر کیا ہے جو دشمن کے لشکر کے اندر داخل ہو کر مخفیانہ طور پر اطلاعات حاصل کر کے اس کی خبر دیتے تھے!

۷۔عثمان بن حنیف کو لکھے گئے خط میں جناب امیر المؤمنین۔تحریر فرماتے ہیں:

" اَمّا بَعْدُ یابْنَ حُنَیْفٍ فَقَدْ بَلَغَنی اَنَّ رَجُلاً مِنْ فِتْیَةِ اَهْلِ الْبَصْرةِ دَعاكَ اِلی مَأْدُبَةٍ فَأَسْرَعْتَ اِلَیْها تُسْتَطابُ لَكَ الاَلْوانُ وَ تُنْقَلُ اِلَیْكَ الجِفانُ "

''اے حنیف کے بیٹے! مجھے خبر دی گئی ہے کہ بصرہ کے ایک صاحب ثروت شخص نے تمہیں کھانے کی دعوت دی تو تم نے اس کی طرف جانے میں جلدی کی، جبکہ صورتحال یہ تھی کہ رنگ برنگ کے کھانے بڑے بڑے ظروف میں یکے بعد دیگرے تمہارے سامنے پیش کیئے جا رہے تھے......''[3]

اس خط سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ خفیہ مامورین کے ذریعے نہ صرف سیاسی اور عسکری بلکہ ان اخلاقی مسائل کی خبریں بھی حاصل کی جاتی تھیں جو اسلامی تعلیمات خاص طور پر زاہدانہ اصول کے خلاف تھے اور مسائل کی جزئیات بھی خفیہ مامورین کی باریک بین نظروں سے

---

[1] شام اور اس کا پایہ تخت دمشق، کوفہ، جو حضرت علی -کا مرکز حکومت تھا، کے مغرب میں واقع ہے۔

[2] نہج البلاغہ، مکتوب ۳۳۔

[3] نہج البلاغہ، مکتوب ۴۵۔

اوجھل نہیں رہتی تھیں۔اسی سے ملتا جلتا مطلب امامؑ کے استخر کے گورنر منذر بن جارود کے نام آپؑ کے ایک خط میں نظر آتا ہے،اس خط میں امام علیؑ یہ تحریر فرماتے ہیں:''تمہارے باپ کی لیاقت اور صلاحیت تمہاری نسبت میرے اچھے گمان کا سبب بنی،میرا خیال تھا کہ تم بھی اپنے باپ کے نقش قدم پر چلو گے اور اسی کی طرح تمہاری روش بھی ہوگی!

"فَإِذا أَنْتَ فِيما رُقِّيَ إِلَيَّ عَنْكَ لا تَدَعُ لِهَواكَ انْقِياداً وَلا تُبْقِي لِآخِرَتِكَ عَتاداً، تَعْمُرُ دُنْياكَ بِخَرابِ آخِرَتِكَ وَتَصِلُ عَشِيرَتَكَ بِقَطِيعَةِ دِينِكَ"

''(لیکن) مجھے اچانک خبر دی گئی ہے کہ تم خواہش نفس کی پیروی میں بھول چوک کا شکار ہو جاتے ہو اور آخرت کے زادراہ کے طور پر کسی چیز کو باقی نہیں رکھتے! اپنی آخرت کی ویرانی کے باعث اپنی دنیا کو بھی برباد کر رہے ہو اور اپنے رشتہ داروں کے ساتھ تعلق کو دین سے قطع تعلق کی قیمت کے ساتھ برقرار رکھے ہوئے ہو!''[۱]

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص نے اپنے اور اپنے رشتہ داروں کے لئے چار لاکھ درہم بیت المال سے ہتھیا لئے تھے! امامؑ نے اسے اس کے عہدے سے معزول کر دیا اور ایک مدت تک زندان میں قید رکھا۔[۲]

یہاں ہمیں نظر آتا ہے کہ خبر رسانی پر مامور افراد نے ایک گورنر کی خیانت کا انکشاف کر کے اس کی خبر امامؑ تک پہنچائی اور امامؑ نے بھی اس کے مقابلے میں شدید ردعمل ظاہر کیا۔

۸۔امام حسن مجتبیٰ -کی سیرت میں ہے کہ اپنے والد گرامی حضرت علیؑ کی شہادت اور لوگوں کی طرف سے آپؑ کی بیعت انجام پا جانے کے بعد معاویہ نے دو جاسوس بھیجے: ایک بصرہ اور دوسرا کوفہ میں تاکہ وہ ان دونوں شہروں کے بارے میں خبریں اس کی طرف بھیجیں اور امام حسن -کی خلافت کو ختم کرنے کے لئے منافقین سے استفادہ کریں اور اس ضمن میں کسی بھی کوشش سے مضائقہ نہ کریں،لیکن امام حسن -کے وہ افراد جو جاسوسی کے خلاف اقدام پر مامور تھے،انھوں نے اس مسئلے کا سراغ لگا لیا،کوفہ آنے والے جاسوس کو گرفتار کر لیا گیا اور ایک خط دوسرے جاسوس کی تمام ذاتی صفات کی ساری تفصیل کے ساتھ بصرہ بھیجا،اس طرح دوسرے جاسوس کو بھی گرفتار کر کے کیفر کردار تک پہنچا دیا گیا۔اس کے بعد آپؑ نے معاویہ کے نام ایک خط تحریر فرمایا جس میں یہ ذکر تھا: تو جاسوس بھیج کر اور فتنہ انگیزی برپا کر کے گویا جنگ کا خواہاں ہے اگر ایسا ہی ہے تو میں بھی تیار ہوں۔[۳]

۹۔جنگ صفین کے بعد قبیلہ ''بنی ناجیہ'' کے کچھ لوگوں نے ''فریث بن راشد'' کی سرکردگی میں امام علیؑ کی مخالفت کا اعلان کر دیا،

---

[۱] نہج البلاغہ،مکتوب ۷۱۔

[۲] سفینۃ البحار،مادہ''نذر''۔

[۳] بحار الانوار،ج ۴۴،ص ۴۵،حدیث ۵۔

امامؑ نے اس سے فرمایا: میرے پاس آؤ تاکہ میں تمہیں کچھ مسائل کی طرف متوجہ کروں، وہ آپؑ کی خدمت میں نہ آیا اور اپنے ساتھیوں سمیت وہاں سے بھاگ گیا۔ان لوگوں کو راستے میں امامؑ کا ایک وفادار ساتھی ملا جسے انھوں نے شہید کردیا جبکہ انھیں لوگوں نے ایک یہودی کو ذمی ہونے کی وجہ سے چھوڑ دیا، امامؑ نے تمام علاقوں پر معین اپنے گورنروں کے نام خط لکھے جن کا مضمون یہ تھا: "کچھ لوگ جنھوں نے گناہ عظیم کا ارتکاب کیا ہے، بھاگ نکلے ہیں اور میرے خیال میں وہ بصرہ کی طرف گئے ہیں، ان کی جستجو میں رہو اور اپنے علاقوں میں جاسوس پھیلا دو اور ان کے بارے میں جو خبر ملے اس سے مجھے مطلع کرو۔" (وَاجْعَلْ عَلَيْهِمُ العُيُونَ فِي كُلِّ نَاحِيَةٍ مِنْ أَرْضِكَ ثُمَّ اكْتُبْ إِلَيَّ بِمَا يَنْهَى إِلَيْكَ عَنْهُمْ)۔ [1]

مذکورہ بالا روایات اور دوسری روایات اور تاریخی واقعات سے جن سب کو ذکر کرنے سے بات بہت طویل ہو جانے کا خوف ہے، بخوبی واضح ہوجاتا ہے کہ رسول اکرمؐ اور ائمہ معصومینؑ کے دور میں جاسوسی اور اطلاعاتی نظام بہت فعال تھا، دشمنوں کی سازشوں کو بے نقاب کرنے میں بھی اور دشمن کی جاسوسی کو ناکام بنانے اور سرکاری عہدیداروں کی کارکردگی کی محتاط انداز میں تحقیق کرنے اور ان پر کڑی نظر رکھنے میں بھی نیز اسلامی حکومت کے اندر موجود منافقین کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا سراغ لگانے میں بھی یہ نظام بہت مؤثر تھا۔

البتہ ہمارے زمانے میں دوسرے معاملات کی طرح جاسوسی اور جاسوسی کے خلاف کارروائی کے مسائل مکمل طور پر تبدیل، پیچیدہ اور وسیع ہو چکے ہیں اور ترقی یافتہ اور جدید ٹیکنالوجی کے باعث یہ کام بہت زیادہ پھیل چکا ہے۔ بلاشبہ حکومت اسلامی کے لئے جاسوسی اور جاسوسی کے خلاف اقدام کرنے کے لئے زمانہ گزشتہ کے سادہ طریقوں پر عمل کرنا اور انہی پر قناعت کر لینا ممکن نہیں، بلکہ ضروری ہے کہ وہ نظام جاسوسی کے لئے تمام ضروری اور جدید ترقی یافتہ وسائل سے مستفیذ ہوتا کہ دشمنوں کی کوئی سازشی کارروائی مخفی نہ رہے اس کے علاوہ سرکاری عہدیداروں کی سرگرمیاں اور مختلف پارٹیوں اور جماعتوں کی کارروائیاں، نظم وضبط اور امن وامان برقرار رکھنے اور مفاسد کا قلع وقمع کرنے کے لئے بھی خبر رسانی کے جدید طریقوں سے استفادہ ضروری ہے۔ پس اسلامی حکومت کے لئے اس سلسلے میں جدید ترین آلات و وسائل کو استعمال کرنا ضروری ہے اور فقط زمانہ سابقہ کے قدیم وسائل پر قناعت کر کے انھیں کو کافی نہیں سمجھنا چاہیے۔

درست ہے کہ اس مقصد کے لئے بے پناہ پیسے کی ضرورت ہے لیکن اس بات کے پیش نظر کہ بعض اوقات اس راہ میں کی گئی کم سرمایہ کاری عسکری، سیاسی اور اقتصادی میدانوں میں کی گئی بڑی سرمایہ کاری سے بھی اہم اور بڑے نقصانات سے بچاؤ کا سبب بن جاتی ہے، اس راستے میں ہونے والی ہر سرمایہ کاری کفایت شعاری اور اعتدال پر مبنی ہونی چاہیے۔ مثلاً اگر ادارۂ جاسوسی دشمن کے کسی جگہ رکھے ہوئے بم کا وقت پر انکشاف کر کے اسے بیکار کردے تو اس کے اس عمل سے بہت ساری انسانی جانوں اور اقتصادی نقصان کی روک تھام ہو سکتی ہے اور اس سے بھی اہم یہ کہ دشمن کی ناپاک فوجی سازش کو بے نقاب کر کے وسیع اور بہت زیادہ نقصانات سے بچا جا سکتا ہے۔

---

[1] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید، ج ۳، ص ۱۳۰۔

چھپ کر گفتگو سننا

بلاشبہ لوگوں کی ٹیلفون پر کی گئی گفتگو کو سننا اور اس کی باتوں کے بارے میں جستجو کرنا تا کہ ان کے اسرار سے آگاہی حاصل کی جائے، تجسس حرام کی ایک واضح مثال ہے اور سورۂ حجرات کی آیہ شریفہ اور روایات کی رو سے ناجائز ہے۔ رسول اکرمؐ نے ایک حدیث میں فرمایا:

"لَاتَتَّبِعُوا عَثَرَاتِ الْمُسْلِمِينَ، فَإِنَّهُ مَنْ تَتَبَّعَ عَثَرَاتِ الْمُسْلِمِينَ تَتَبَّعَ اللهُ عَثْرَتَهُ وَ مَنْ تَتَبَّعِ اللهُ عَثْرَتَهُ يَفْضَحْهُ"

''مسلمانوں کی لغزشوں کی جستجو نہ کرو چونکہ جو مسلمانوں کی لغزشوں کی جستجو کرتا ہے اور خدا اس کی لغزشوں کی جستجو کرتا ہے خدا تعالیٰ مسلمانوں کی لغزشوں کی جستجو کرنے والوں کو رسوا اور ذلیل کرتا ہے!''

دلچسپ یہ ہے کہ حدیث کے شروع میں مخاطب لوگوں کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے:

يَامَعْشَرَ مَنْ اَسْلَمَ بِلِسَانِهِ وَلَمْ يُسْلِمْ بِقَلْبِهِ:

''اے وہ لوگو جو زبان سے تو ایمان لا چکے لیکن دل سے اسلام قبول نہیں کیا۔''[1]

اصول کافی باب ''من طلب عثرات المسلمین و عوراتھم'' کہ مذکورہ بالا حدیث اسی باب سے اخذ کی گی ہے، اس باب میں ہلا کر رکھ دینے والی بہت سی احادیث ہیں ٹوہ لگانے اور جاسوسی کرنے (چھپ کر باتیں سننے) کا حرام ہونا مسلمانوں میں بالکل واضح تھا، چنانچہ جب زمانۂ عمر میں حضرت عمر ایک رات مدینے کی گلیوں میں گشت کر رہے تھے تو اچانک ایک گھر سے ایک مرد کے گانے کی آواز سنائی دی، حضرت عمر دیوار پھلانگ کر اندر تشریف لے گئے اور بلند آواز سے پکار کر کہا: اے دشمن خدا تو نے یہاں خدا کی نافرمانی کی بساط سجا رکھی ہے! کیا تمہارا گمان یہ ہے کہ خدا تمہاری پردہ پوشی کرے گا؟! اس شخص نے کہا: جناب خلیفہ جلدی نہ کریں! میں نے اگر ایک گناہ کیا ہے تو آپ نے تین گناہ انجام دیئے ہیں! کیونکہ خدا فرماتا ہے: ''لَا تَجَسَّسُوا'' (تجسس نہ کرو) اور آپ نے تجسس کیا ہے! خدا فرماتا ہے: ''وَاْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ اَبْوَابِهَا'' گھروں میں ہمیشہ دروازوں سے داخل ہو، اور آپ بلا اجازت دیوار پھلانگ کر اندر آئے ہیں! خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے:

"لَا تَدْخُلُوا بُيُوتاً غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوا وَ تُسَلِّمُوا عَلٰى اَهْلِهَا"

اپنے گھروں کے علاوہ دوسرے لوگوں کے گھروں میں مت داخل ہو یہاں تک کہ اہل خانہ سے اجازت لو اور انھیں سلام کرو! (اور آپ نے ان میں سے کوئی عمل انجام نہیں دیا)۔ (حضرت عمر شرمندہ ہو گئے) اور کہا اگر میں تمہیں معاف کر دوں تو کیا اس کام سے دستبردار ہو جاؤ گے؟

---

[1] اصول کافی، ج ۲، ص ۳۵۵، حدیث ۴۔

اس نے کہا: ہاں، حضرت عمر نے اسے معاف کر دیا اور باہر نکل گئے![1]

بہر حال اس میں شک نہیں کہ چھپ کر لوگوں کی باتیں سننا یعنی ان کی باہمی گفتگو ریکارڈ اور اسے کنٹرول کرنا، چاہے وہ زبانی اور آمنے سامنے کی باتیں ہوں یا ٹیلیفون کے ذریعے یا ان کے پرائیویٹ خطوط ہوں، سب تجسس کے زمرے میں آتے ہیں، جو کہ حرام ہے۔ لیکن بعض اوقات حکومت اسلامی بعض صورتوں میں اس عمل (تجسس) کے ارتکاب پر مجبور ہو جاتی ہے اور یہ صورتحال اس وقت پیش آتی ہے جب اسلام اور مسلمین کے خلاف دشمن کی کسی سازش کا خوف ہو جو انسانوں اور ان کے اموال کے لیے خطرے کا باعث بن رہی ہو تو، اس قسم کے حالات میں تفتیش وتجسس پر عمل کئے بغیر کوئی چارہ نہیں ہوتا، بالکل اسی طرح جس طرح منشیات وغیرہ کے سراغ لگانے کے لیے شہروں کے بیرونی راستوں پر لوگوں اور اُن کے سامان وغیرہ کی تلاشی لی جاتی ہے!

درحقیقت اس مسئلے کا تعلق تزاحم واجبات یا واجب وحرام کے تزاحم (ٹکراؤ) کے ساتھ ہے اور ضروری ہے کہ اس مسئلے میں اہم اور غیر اہم اور دیگر ترجیح بخش عوامل کا خیال رکھا جائے اور ان کے مطابق طرز عمل اختیار کیا جائے۔ بہر حال: مسلمانوں کے امور میں تجسس حرام ہے، لیکن ان کے انسانی جانوں اور معاشرۂ اسلامی کی حفاظت اور دشمنوں کی سازشوں کو ناکام بنانا کہیں زیادہ اہم ہے۔ اس لحاظ سے جہاں کہیں ان چیزوں کا خطرہ ہو ان کی روک تھام کے لئے تجسس وغیرہ جائز ہوتا ہے۔

تفتیش اور جسمانی سزائیں

بلاشبہ کسی کو بلاوجہ اذیت میں مبتلا کرنا جائز نہیں اور اس سے پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ کسی کو اعتراف پر آمادہ کرنے کے لئے اس پر تشدد کرنا جائز نہیں اور ہر وہ اقرار واعتراف جو مار پیٹ کے ذریعے حاصل کیا جائے اس کی کوئی حیثیت نہیں، ایسا اعتراف کسی شرعی اور قانونی قدر وقیمت کا حامل نہیں ہوتا۔ حضرت امام علیؑ نے ایک حدیث میں فرمایا ہے:

"مَنْ اَقَرَّ عِنْدَ تَجْرِيدٍ اَوْ تَخْوِيفٍ اَوْ حَبْسٍ اَوْ تَهْدِيدٍ فَلا حَدَّ عَلَيْهِ"

"وہ شخص جو برہنہ کرنے، خوفزدہ ہونے یا قید اور دھمکی کے باعث کسی جرم کا اعتراف کرے، اس پر کوئی حد جاری نہیں ہوگی!"[2]

لیکن اگر ملزم پر جو الزام ہے اگر وہ ثابت نہیں ہوسکا، لیکن وہ کسی ایسے واضح گناہ کا مرتکب ہو چکا ہو تو اس واضح جرم کی خاطر اُسے "تعزیر" کی جاسکتی ہے۔ مثلاً کسی چور کو کسی کے گھر میں داخل ہوتے وقت گرفتار کر لیا جائے، جبکہ اس کی چوری ثابت نہ ہوئی ہو، اس صورتحال میں اگر اسے اجازت کے بغیر کسی کے گھر میں داخل ہونے کی وجہ سے "تعزیر" کی جائے اور اس خیال سے اعتراف کر لے کہ اعتراف نہ کرنے کی صورت میں اسے تشدد کا سامنا کرنا پڑے گا اور قرائن سے بھی اس کے اعتراف کی سچائی ثابت ہوتی ہو (جیسے اس مال

---

[1] کنز العمال، ج۳ص۸۰۸، حدیث ۸۸۲۷۔

[2] وسائل، ج۱۸، حدیث ۲، باب ۷، از ابواب حد السرقۃ۔

مسروقہ کو برآمد کرلیا جائے جس کی علامات اس نے بتائی ہیں) یہ اعتراف قابل اہمیت اور قدر و قیمت کا حامل ہوسکتا ہے کیونکہ واضح اور قطعی قرائن وشواہد اس کے اعتراف کو واقعیت کے مطابق ثابت کرتے ہیں۔

غیر ملکی جاسوسوں کے بارے میں بھی یہی طریقہ اپنایا جا سکتا ہے یہاں تک کہ اگر کوئی قطعی اور یقینی جرم صادر نہ بھی ہوا ہو، لیکن شرعی حاکم کو یقین یا قوی گمان ہو کہ اس کے پاس ایسی اہم اطلاعات ہیں جو مسلمانوں اور مملکت اسلامی کے امور کے سلسلے میں زیادہ اہمیت رکھتی ہیں، تو ایسی صورتحال میں اس پر سختی کی جا سکتی ہے، لیکن ایسی سختی جو اخلاق انسانی کے خلاف نہ ہو۔

اس سے پہلے ''حاطب بن ابی بلتعہ'' کے واقعے میں بیان کیا جا چکا ہے کہ جب ''سارہ'' نامی جاسوس عورت مشرکین مکہ کے نام خط کو حضرت علیؑ کے حوالے کرنے پر بالکل آمادہ نہ ہوئی تو آپؑ نے اس پر تلوار کھینچ لی اور فرمایا کہ اگر خط نہیں دو گی تو قتل کر دی جاؤ گی، اس نے خوف کے مارے خط کو اپنے بالوں میں سے نکالا اور آپؑ کے حوالے کر دیا۔ یہ اعتراف روحی سختی کے نتیجے میں کیا گیا اور واقعیت کے عین مطابق تھا۔

معلوم ہے کہ اس قسم کی شدت وسختی ایسے حالات میں عقل وشرع کے خلاف نہیں، چونکہ اس مسئلے کی اہمیت اس حد تک ہے جو اتنی مقدار میں سختی کو جائز قرار دیتی ہے، اگر رسول اکرمؐ کی فتح مکہ کی خبر مشرکین تک پہنچ جاتی تو بے پناہ خونریزی کے بعد جنگ کا نتیجہ حاصل کیا جاتا۔

حضرت علیؑ کے فیصلوں میں بھی کئی واقعات ملتے ہیں جن میں اہم مسائل درپیش ہوتے تھے، اگر مجرم لوگ اعتراف پر آمادہ نہ ہوتے تو حضرتؑ بیان کردہ طریقے کے مطابق مطلب کا انکشاف کرا لیتے مثال کے طور پر ان دو ایسے افراد کا باہمی جھگڑا جس میں ہر ایک کا دعویٰ یہ تھا کہ میں آقا ہوں اور دوسرا میرا غلام ہے، امامؑ نے فرمایا: دیوار میں دو سوراخ کئے جائیں اور پھر وہ دونوں اپنے سر ان میں داخل کریں، پھر آپؑ نے فرمایا: اے قنبر! رسول اکرمؐ کی تلوار لاؤ اور غلام کا سر تن سے جدا کر دو! وہ شخص جو واقعی غلام تھا اس نے وحشت کے مارے اپنا سر سوراخ سے باہر نکال لیا، علیؑ نے اس سے مخاطب ہو کر فرمایا: کیا تو نے نہیں کہا تھا کہ تم غلام نہیں بلکہ آقا ہو! اسے اعتراف حقیقت کے بغیر کوئی چارہ نظر نہ آیا۔[1]

بلاشبہ یہ سختی غلام کی ناراضگی کا باعث بنی، لیکن حقیقت حال معلوم کرنے کے لئے اس قدر دباؤ ڈالنا جائز ہے، خبر رسانی (وجاسوسی) کے مسائل میں بھی ایسا ہی ہے، بلکہ اس سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ دوسرے الفاظ میں اہم اور اہم تر واجبات ومحرمات کا باہمی تضاد اور ٹکراؤ اس قسم کی شدت اور سختی کی اجازت دیتا ہے۔ لیکن اس جواز (اجازت) کی آڑ میں اس قانون سے غلط فائدہ اٹھا کر ملزم کو ہرگز تشدد اور روح فرسا اذیتوں کا نشانہ نہیں بنانا چاہئے اسی طرح ذراسی بدگمانی کی بنیاد پر اس استثنائی حکم کو اپنے لئے مباح قرار دینے سے گریز کیا جائے۔

---

[1] وسائل، ج ۱۸، باب ۲۱، از ابواب کیفیت الحکم، حدیث ۴، ص ۲۰۸۔

اس بات کوفراموش نہیں کرنا چاہیے کہ سختی اور شدت کا استعمال ایک استثنائی حکم ہے اور ضرورت کے وقت اور انسانی حقوق کا پاس کرتے ہوئے، سزا کی مقدار اور کیفیت کو پیش نظر رکھ کر اس پر عمل کیا جائے۔ یہیں سے ایک اور نکتہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ خبر رسانی پر مامور افراد بعض اوقات ایک اہم اور حساس خبر کو حاصل کرنے کے لئے دشمن کا بھیس بدلنے پر مجبور ہوجاتے ہیں تاکہ اس طرح وہ دشمنوں کے ساتھ آسانی سے گھل مل سکیں، اس قسم کے حالات میں بعض اوقات وہ کئی ایک گناہوں کے مرتکب بھی ہوتے ہیں، مثلاً حرام غذا کھانے اور ظاہراً اسلام اور مقدسات اسلام کے خلاف باتیں کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں تاکہ اس طرح کسی خبر یا کئی ایک خبروں کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائیں۔ یہ مسئلہ بھی واجب اور حرام کے باہمی تزاحم (ٹکراؤ) اور ''اہم وغیر اہم'' کے زمرے میں داخل ہے کیونکہ جب کبھی مقصد اور ہدف ارتکاب شدہ گناہ کی نسبت اہم اور اس سے بالاتر ہوتو اس مقصد کی خاطر ایسا گناہ جائز شمار ہوتا ہے۔

سوال: کیا مقصد وسیلے کو جائز قرار دیتا ہے؟

ممکن ہے کہا جائے: کیا یہ کلام مادی والحادی گروہ کے راہنماؤں کے اس بیان کے ساتھ ہم آہنگ اور متناسب نہیں جو یہ کہتے ہیں کہ: اَلْغایاتُ تُبَرِّرُ الْوَسائط: مقصد وہدف وسائل وذرائع کو، جائز قرار دیتا ہے؟ اس سوال کے جواب میں فقط ایک نکتے کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے اور وہ یہ کہ وہ (مادہ پرست) لوگ جو اس خود ساختہ قانون کا ورد کرتے اور دم بھرتے ہیں، اس کے لئے کسی قید وشرط کے قائل نہیں یعنی ان کا کہنا یہ ہے کہ ہدف ومقصد خواہ جائز ہو یا ناجائز، اس تک رسائی کے لئے ہر جائز وناجائز ذریعے اور وسیلے سے فائدہ اٹھانا چاہیئے، اس دلیل کی بناء پر اپنے اقتصادی مفادات کی خاطر وہ لوگ خونی جنگیں برپا کرتے ہیں جن میں ہزاروں بے گناہ افراد لقمۂ اجل بن جاتے ہیں اور ان کا مقصد ان سے فقط یہ ہوتا ہے کہ ان کے ناجائز مفادات وفوائد کو ذرا سا نقصان بھی نہ پہنچے۔

لیکن انہی مکتب کے پیروکار اس سلسلے میں اس کے دونوں پہلوؤں کا انکار کرتے ہیں یعنی نہ ہر ہدف کو کافی اور جائز سمجھتے ہیں نہ ہر وسیلے اور ذریعے کو مجاز قرار دیتے ہیں بلکہ نہایت محتاط انداز میں اسے اہم وغیر اہم قانون کے تحت قرار دیتے ہیں، اہمیت بھی ایسی جو عقل وشرع کے مطابق ہو نہ وہ اہمیت جو ذاتی مفاد اور شیطانی خواہشات کے موافق ہو۔ ''اہم ومہم'' یا ''اہم وغیر اہم'' کے قانون کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص نشہ آور چیز استعمال کرتا ہے اور اس کے نتیجے میں سوجاتا ہے، یہ سونا اس کی موت کا سبب بھی بن سکتا ہے لہٰذا اگر اس کے چہرے پر چانٹے مار کر اسے بیدار کیا جائے تو اس کا بھلا اسی میں ہے نہ کہ نیند میں، اس سے بڑھ کر یہ کہ کسی خطرناک دشمن کے چنگل سے ملک کو نجات دینے کی خاطر ممکن ہے جنگی اخراجات کا کچھ حصہ لوگوں سے زبردستی وصول کیا جائے، یا کسی خطرناک بیماری سے بچاؤ کی غرض سے لوگوں کو ان کے گھروں تک محدود رہنے پر پابند کیا جائے تاکہ سب کو بیماری سے بچاؤ کے حفاظتی ٹیکے لگائے جا سکیں۔

مکتب انبیاء کے پیروؤں کی روش ایسی ہی ہے جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے جبکہ الحادی اور مادی مکتب کے پیروکار اس سلسلے میں کسی شرط وقید کے قائل نہیں اور اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہر جائز وناجائز طریقے کا استعمال جائز سمجھتے ہیں۔

حکومت اور ولایت سے متعلق پیام قرآن کی جلد دہم یہاں اختتام پذیر ہوتی ہے اور اس طرح قرآنی نقطۂ نظر سے عقائد و

معارف اسلامی پر مشتمل تفسیر موضوعی کا ایک مکمل کورس تکمیل پذیر ہوتا ہے، خدا تعالیٰ نے جو توفیق اپنے کمزور بندوں کے شامل حال فرمائی ہے اس پر ہم اس ذات کا شکر ادا کرتے ہیں۔

خداوندا! اس ناچیز خدمت کو ہماری طرف سے قبول فرما اور اسے روز آخرت کا ذخیرہ قرار دے اور قرآنی نقطۂ نظر سے معارف وعقائد اسلام سے آگاہی کے متمنی حضرات کو اس سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرما۔

☆☆☆☆☆